بھارت کے
فرعون
خُفیہ مِشن
اے حمید
50

گاڑی جالندھر کے ریلوے سٹیشن سے آگے نکل آئی تھی۔

اب امرتسر کا سٹیشن آرہا تھا۔ مجھے امرتسر کے سٹیشن پر ہی اترنا تھا۔ جس ڈبے میں
ں بیٹھا تھا وہ ہندو سکھ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ سب مسافر اپنی
نی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ صرف ایک مسافر اس ڈبے میں ایسا تھا جو تھوڑی تھوڑی
ر بعد مجھے گھور کر دیکھ لیتا تھا۔ یہ آدمی سکھ نہیں تھا۔ اگر سکھ نہیں تھا تو ظاہر ہے ہندو
وگا۔ کیونکہ پاکستان بن جانے کے بعد مشرقی پنجاب میں ایک بھی مسلمان نہیں رہا تھا۔
س آدمی کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہوگی۔ سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر
موٹے شیشوں کی عینک لگی تھی۔ کھدر کا میلا سا تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کھدر کے کرتے
کے اوپر صدری پہن رکھی تھی۔ صدری کے اوپر کی جیب کی ساتھ انڈین پن لگا تھا۔ نچلی
جیب میں رکھی پاکٹ بک کا اوپر والا حصہ صرف نظر آرہا تھا۔ یہ ہندو یقیناً انڈیا کی خفیہ
پولیس یعنی سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ شاید وہ دلی سے ٹرین میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ کیونکہ
مجھے یاد ہے جب جالندھر کے سٹیشن پر گاڑی رکی تھی تو میں پلیٹ فارم والی کھڑکی میں سے
سر باہر نکالے دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کو میں نے ٹرین کے ایک ڈبے سے نکل کر اپنے ڈبے
کی طرف آتا دیکھا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ دلی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

میرے پاس باقاعدہ پاکستان کا پاسپورٹ تھا اور اس پر ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ مگر ویزا
صرف دلی شہر کا لگا ہوا تھا۔ میں دلی شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے قانون شکنی کی تھی

اور دلی شہر سے ٹرین میں سوار ہو کر امرتسر کی طرف چل پڑا تھا۔ آخر میں نے یہ قانون
سکنی کیوں کی تھی؟ اس کا جواب میری زندگی کی وہ حیرت انگیز جذبہ حب الوطنی، قومی
حمیت، اور جذبہ غیرت میں ڈوبی ہوئی سچی داستان ہے جو میں آپ کو سنانے چلا ہوں۔ یہ
زمانہ پاک بھارت جنگ 65 سے ایک سال پہلے کا زمانہ تھا۔ مشرقی پنجاب میں خالصتان کی
تحریک کی وجہ سے بھارت کی حکومت نے پنجاب کے شہروں کا ویزا دینا بند کر رکھا تھا۔
چنانچہ میں نے دلی شہر کا ویزا لگوا لیا۔ وجہ دلی شہر کی درگاہوں اور تاریخی مقامات کی سیرو
سیاحت لکھی۔ دلی میں میرے والد صاحب کے ایک دوست سنگر مشینوں کی مرمت کا کام
کرتے تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ بھارتی باڈر کی چیک پوسٹ والوں کو میں نے
والد کے اس دوست کا نام اور ایڈریس غلط لکھوایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں دلی کی
سیرو سیاحت کے لئے بھارت میں داخل نہیں ہوا تھا۔ میرا ایک خاص مشن تھا اور مجھے دلی
سے بغیر ویزے کے امرتسر جانا تھا۔ اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے کتنے دن کتنے مہینے غیر
قانونی طور پر انڈیا میں رہنا ہو گا۔

میرا مشن ایک مقدس مشن تھا۔ یہ مشن کیا تھا؟ یہ آپ کو آگے چل کر خود بخود
معلوم ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ میرے وقت مقررہ پر بھارت سے واپس پاکستان نہ
جانے کی صورت میں پولیس میرے والد کے دوست کو گرفتار کرے یا اسے تنگ کرے۔
میرے والد صاحب کے اس دوست کا نام ظہیرالدین تھا اور چاندنی چوک میں اس کی ایک
چھوٹی سی دکان تھی۔ جہاں وہ سلائی مشینوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کو میں نے بالکل
نہ بتایا کہ میں اصل میں کس مشن کو لے کر بھارت آیا ہوں۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی
نہیں تھی۔ اس شریف آدمی کے پاس میں دو دن رہا اور پنجاب او. انڈیا کے بارے میں
کافی معلومات حاصل کرتا رہا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے امرتسر مجیٹھ، ویر کا بٹالہ، گور
داسپور اور کتھو نگل کے سوا انڈیا کا کوئی علاقہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس
وقت میری عمر یہی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی اور میں اپنے قصبے مجیٹھ کے ایک ہائی سکول
میں پڑھ رہا تھا۔ میری والدہ کی وفات ہو چکی تھی۔ میری صرف ایک چھوٹی بہن تھی۔ والد

صاحب نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو پڑھا لکھا کر
لائق بنانا اور ہمیں باپ کے ساتھ ساتھ والدہ کی بھی شفقت عطا کرنا اپنی زندگی کا مقصد
بنا لیا تھا۔ جب پاکستان بن گیا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تو ہم
بھی ایک قافلے میں شامل ہو کر مجیٹھے نکل پڑے۔ پاکستان پہنچنے سے پہلے ہم پر کیا بیتی؟ یہ
میری سچی داستان کی اصل بنیاد ہے جو میں آپ کو ذرا آگے چل کر بتاؤں گا۔ ابھی میں
صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ پاکستان آنے کے بعد میں دوبارہ کبھی انڈیا نہیں گیا تھا۔ اب میں
واپس اپنے والد صاحب کے دوست ظہیرالدین کے پاس آتا ہوں جس سے میں نے ریل
گاڑیوں کے اوقات وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔ میرے پاس اتنی
ہی انڈین کرنسی تھی جتنی کرنسی کی قانونی طور پر مجھے اجازت تھی۔ میرا مشن ایسا تھا کہ
مجھے دلی سے نکلنے کے بعد اپنی تمام ضروریات جائز اور ناجائز طریقوں سے خود ہی پوری کرنی
تھیں۔ اس وقت میں چوبیس پچیس سال کا صحت مند بھرپور جوان تھا۔ میں نے جان بوجھ
کر شلوار قمیض نہیں پہنی تھی۔ کیونکہ یہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا
تھا۔ اگرچہ ابھی یہ ہمارا قومی لباس نہیں بنا تھا۔ میں لاہور سے ہی پرانی مگر مضبوط کپڑے
کی بنی ہوئی ولایتی جینز ٹائپ کی پتلون اور اسی رنگ کی میالی سی جیکٹ پہن کر چلا تھا۔
پاؤں میں جوگر شوز پہن لئے تھے۔ دلی میں آکر میں نے دیکھا کہ وہاں بھی نوجوانوں میں
اس قسم کا ہپی ٹائپ کا رف ٹف لباس بڑا مقبول تھا۔ اس لباس سے یہ بالکل نہیں پتہ چلتا
تھا کہ یہ آدمی مسلمان ہے یا ہندو ہے۔

ظہیرالدین کے گھر میں دو دن رہنے کے بعد میں نے ایک روز انہیں کہا کہ میں جامع
مسجد دیکھنے جا رہا ہوں۔ وہاں سے میں سیدھا دلی کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ میں نے پہلے
سے معلوم کر لیا تھا کہ امرتسر جالندھر کی طرف گاڑی کس وقت چلتی ہے۔ میں نے سٹیشن
پر آکر امرتسر کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر آکر بیٹھ گیا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو میں
بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ یہ موسم ایسا تھا
جس کو ہمارے پنجاب میں خوش بہار کا موسم کہتے ہیں۔ یعنی مارچ کے مہینے کا موسم۔ میں

پاکستان میں ہی تھا تو ایک دو بارشیں بھی ہوگئی تھیں جس سے موسم میں خنکی آگئی تھی۔ دلی میں بھی موسم خوشگوار تھا۔۔

گاڑی امرتسر کی طرف چل پڑی۔

دلی کے بارے میں میں نے سنا بھی تھا اور سکول کی کتابوں میں پڑھا بھی تھا کہ وہاں مسلمان بادشاہوں نے کئی سال تک حکومت کی ہے اور وہاں مسلمانوں کی بڑی یادگار عمارتیں محل اور قلعے ہیں۔ مگر میں نے سوائے جامع مسجد کے اور کچھ نہ دیکھا۔ میرا مشن ایسا تھا کہ میرا دھیان اپنے آباؤ اجداد کی تاریخی عمارتوں کی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ جامع مسجد میں بھی میں ایک دن نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔ میں کوئی نمازی پرہیزگار نوجوان نہیں تھا۔ پاکستان میں کبھی کبھار ہی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ مجھے نماز پڑھنی آتی بھی نہیں تھی۔ مگر دلی کی جامع مسجد میں میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوکر اپنے مشن کی کامیابی کے لئے ضرور دعا مانگنا چاہتا تھا۔ جب وہاں گیا تو نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ نمازی پہلے سے موجود تھے۔ میں بھی وضو کرکے ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ نماز کے بعد ہاتھ پھیلا کر آنکھیں بند کرکے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ وہ مجھے میرے مشن میں کامیاب کرے اور مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اپنے مرحوم باپ کی روح کو سکون پہنچا سکوں۔ میں جامع مسجد کی عظمت اور شان و شوکت دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اتنی عظیم الشان مسجد بنانے والے مسلمان اسے ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ کیونکہ میں نے دلی میں دیکھا تھا کہ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں کے مقابلے میں اتنی اچھی نہیں تھی۔

گاڑی امرتسر کی طرف دوڑی چلی جارہی تھی۔ ایکسپریس ٹرین تھی۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی جارہی تھی۔ پاکستانی پاسپورٹ میری جیب میں تھا اور اس پر صرف دلی کا ویزا لگا ہوا تھا۔ اگر پولیس کا کوئی آدمی میری چیکنگ کرتا تو مجھے گرفتار کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں ویزے کے بغیر مشرقی پنجاب کے شہروں کی طرف جارہا تھا۔ کئی بڑے شہروں کے سٹیشن آئے۔ گاڑی وہاں تھوڑی دیر کے لئے رکتی اور پھر آگے روانہ ہو جاتی۔ اس طرح سفر طے کرتے کرتے

گاڑی پنجاب میں داخل ہوگئی۔ لدھیانہ آیا اور گزر گیا۔ پھر جالندھر کے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ مجھے دلی سے چلتے وقت ہی اس بات کا دھڑکا لگا تھا کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی میرے پیچھے نہ لگا ہو۔ جالندھر سکھوں کا شہر تھا۔ پلیٹ فارم پر تقریباً سبھی سکھ ہی سکھ نظر آئے۔ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر ہندو کو دیکھا کہ پچھلے کسی ڈبے سے نکلا اور ہمارے ڈبے میں داخل ہوگیا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن جب گاڑی چلی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف تھوڑی دیر بعد گھور کر دیکھ لیتا ہے۔ یہ وہی ہندو تھا جو اب بھی میرے ڈبے میں دوسرے مسافروں کے ساتھ کونے میں بیٹھا کسی وقت مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتا تھا اور جس کا ذکر میں اپنی داستان کے شروع میں کر چکا ہوں۔ جب میرے دل میں خیال پختہ ہوگیا کہ یہ شخص ضرور خفیہ پولیس کا آدمی ہے تو پہلا رد عمل مجھ پر یہ ہوا کہ میرے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ اپنے ملک میں نہیں تھا۔ بلکہ دشمن ملک میں تھا۔ ہندو سکھوں کے ملک میں تھا جہاں کے مسلمان شہریوں کی کوئی عزت آبرو نہیں تھی۔ پاکستانی مسلمان کی جان و مال کے تحفظ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویزا پاسپورٹ رکھنے کے باوجود بھارتی پولیس جس پاکستانی مسلمان کو چاہے پکڑ کر تھانے لے جا سکتی تھی۔ میں نے ایسے کئی واقعات سنے تھے کہ بھارتی پولیس کسی پاکستانی مسلمان کو دلی بمبئی یا کسی دوسرے شہر میں یونہی پکڑ کر تھانے لے گئی اور پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ عام طور پر بھارتی پولیس ایسے پاکستانیوں پر جاسوسی کا الزام لگا کر انہیں جیلوں میں بند کر دیتی اور ان پر اسقدر تشدد کیا جاتا کہ وہ جیل میں ہی سسک سسک کر مرجاتے۔

یہی وجہ تھی کہ جب مجھے یقین سا ہوگیا کہ یہ ادھیڑ عمر کا نہرو کٹ صدری والا ہندو سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور میرے پیچھے لگا ہوا ہے تو میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ میرا پہلا رد عمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا دھیان اپنے خدا کی طرف اور پھر اپنے مشن کی طرف کرلیا۔ میرا آدھا خوف دور ہوگیا۔ کیونکہ میں جان کی بازی لگا کر پاکستان سے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے نکلا تھا۔ اور دل میں یہ عہد کرکے نکلا تھا کہ

اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے مجھے مرنا نہیں ہے۔ اور اگر مرنے کا وقت آگیا تو چھ سات کافروں کو مار کر مروں گا۔ خدائے ذوالجلال اور اس کے نبی پاک پر یقین کامل نے مجھے حوصلہ دیا اور میرے دل سے خوف بالکل نکل گیا۔ اب میں اس خفیہ پولیس والے ہندو سے بچ نکلنے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔

اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ شخص اچانک مجھے نہیں پکڑے گا۔ کیونکہ ایسا وہ جب چاہے کر سکتا تھا۔ اس کا اپنا ملک تھا۔ اپنی حکومت اور اس کی اپنی پولیس تھی جو ٹرین کے ساتھ بھی سفر کر رہی تھی۔ اس کے اپنے ہندو سکھ لوگ تھے۔ اگر وہ مجھے پکڑ کر صرف یہ اعلان کر دے کہ میں پولیس کا آدمی ہوں اور یہ لڑکا پاکستان کا جاسوس ہے تو ڈبے کے سارے مسافر نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ ہو جائیں گے بلکہ مجھ پر حملہ بھی کر دیں گے۔ لیکن ابھی تک اس نے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اصل میں وہ میری نگرانی کر رہا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ میں ویزے کے بغیر امرتسر کی طرف کہاں جا رہا ہوں۔ کس سے ملنے جا رہا ہوں اور میرے ساتھی جاسوس کہاں کہاں پر ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس پر خفیہ پولیس کے آدمی ہونے کا ذرا سا شک بھی ہو۔ مگر اس کے بار بار میری طرف گھور گھور کر دیکھنے سے مجھے نہ صرف اس پر شک ہوا تھا بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ جو بعد میں سچ ثابت ہوا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا۔ گاڑی کی دونوں جانب دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر سے تیزی سے گزر رہی تھی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ پلیٹ فارم کے آخر میں ایک تختے پر ہندی میں کسی سٹیشن کا نام لکھا ہوا تھا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سکھ مسافر سے پوچھا کہ یہ کونسا سٹیشن گزرا ہے تو اس نے کہا۔

"مانا والہ"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ امرتسر کا سٹیشن آنے ہی والا تھا بارہ سال پہلے جب میں ضلع امرتسر کے قصبے مجیٹھے کے ہائی سکول میں پڑھا کرتا تھا تو

اسکول کے لڑکے آکر سیر کرنے گاڑی میں بیٹھ کر مانا والے آجایا کرتے تھے۔ یہ سٹیشن کا نام اردو میں لکھا ہوتا تھا۔ اب یہ نام ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ اردو کا نام ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک تبدیلی میں نے محسوس کی۔ دوسری تبدیلی میں نے یہ دیکھی کہ جالندھر سے لیکر مانا والے تک راستے میں دونوں جانب جو دیہات کھیتوں میں دکھائی دیئے ان میں کسی جگہ کوئی مسجد نظر نہیں آئی تھی۔ ورنہ پہلے ان دیہات میں کسی نہ کسی جگہ درختوں میں سے کسی نہ کسی مسجد کے مینار ضرور نظر آیا کرتے تھے۔ یہ سکھوں کے دیہات تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے مسجدوں کو مسمار کر دیا تھا۔ کئی جگہ ان مسجدوں کو گردواروں یا مندروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

گاڑی مانا والہ کے سٹیشن سے کافی آگے نکل گئی تھی۔ اب مجھے علاقہ اپنا جانا پہچانا لگنے لگا تھا۔ ایک پھاٹک آکر گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی آموں کا ایک گھنا باغ آیا جس کے گرد چار دیواری کھنچی ہوئی تھی۔ میں نے یہ باغ پہچان لیا۔ اسے سرداروں کا باغ کہتے تھے اور یہاں گرمیوں کے موسم میں ہم سکول کے لڑکوں کے ساتھ آم توڑنے آیا کرتے تھے۔ ہم باغ کی دیوار پر چڑھ کر آم توڑتے اور راکھے کے آنے سے پہلے آم توڑ کر چھلانگیں لگا کر بھاگ جایا کرتے تھے۔

اس کے بعد وہ ریلوے لائن آگئی جو امرتسر کے امرودوں کے باغ کے پہلو سے ہوتی ہوئی ہمارے گاؤں مجیٹھ کی طرف جاتی تھی۔ اس ریلوے لائن کو دیکھ کر میں اداس ہو گیا۔ میں کئی بار اپنے والد اور چھوٹی بہن کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اس لائن پر سے گزرا تھا۔ یہ ریلوے لائن آم اور امرود کے باغوں کی طرح ویسی کی ویسی تھی۔ اب ٹرین امرتسر شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کی ایک جانب شریف پورہ تھا جو پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کا گڑھ تھا۔ اور دوسری طرف کمپنی باغ شروع ہو گیا تھا۔ ڈنڈا پولیس کا پھاٹک بھی گزر گیا تھوڑی دیر بعد ٹرین امرتسر کے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔

ہندو سکھ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ میں نے آنکھ بچا کر خفیہ پولیس والے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بڑے سکون سے

بیٹھ سگریٹ پی رہا تھا اور اس نے نگاہ مجھ پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس مصیبت
سے کیسے بچا جائے۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے یہ امرتسر سٹیشن کے پلیٹ فارم
اترتے ہی مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رینگتی ہوئی رک
گئی ۔ میں نے پلیٹ فارم پر تین چار سکھ پولیس کانسٹیبلوں کو دیکھا تو ایک بار پھر جسم میں
خوف کی لہر دوڑ گئی۔ گاڑی یہاں آکر ختم ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے سارے کے سارے
مسافر ٹرین سے باہر نکل رہے تھے اور کافی شور شرابا مچ گیا تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں ڈبے
سے اتر گیا۔ میں نے پہلے ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ پلیٹ فارم کے گیٹ سے باہر نہیں
نکلوں گا۔ ہر ڈبے کے باہر مسافروں کا کافی رش تھا۔ ایک قلی سر پر بہت سا سامان اٹھائے
میرے آگے آگے جا رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پہلو سے ہو کر اگلے ڈبے کے مسافروں
میں گھس گیا اور وہاں سے دوسرے ڈبے کے دروازے میں سے گزر کر ڈبے کے اندر چلا
گیا جو تقریباً خالی تھا۔ اس کے دوسرے دروازے میں جلدی سے لٹک کر نیچے ریلوے
لائن پر اتر گیا۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ یہاں لائن کے ساتھ ساتھ لوہے کا جنگلا
لگا ہوا تھا۔ ایک جگہ جنگلے کا ایک پائپ اکھڑا ہوا تھا۔ کچھ مسافر اس میں سے گزر کر سامنے
والے پلیٹ فارم کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ سامنے والے پلیٹ فارم
نکل گیا اور وہاں سے دوسری جانب جہاں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا اتر گیا۔

یہ ساری جگہیں میری دیکھی بھالی تھیں اور میں نے محسوس کیا تھا کہ بارہ سال میں
یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میرا ارادہ ریلوے لائینوں پر سے گزر کر سامنے والی دیوار
پھلانگ کر ریگو برج کو جانے والی سڑک پر نکل آنے کا تھا۔ جب کبھی ہم سکول کے دوست
درست مجیٹھے سے بغیر ٹکٹ ریل گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر آتے تھے تو اسی دیوار کو پھلانگا
کرتے تھے۔ دیوار زیادہ دور نہیں تھی۔ دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے پہلی بار پیچھے مڑ کر
دیکھا کہ وہ سی آئی ڈی والا کہیں میرے پیچھے پیچھے تو نہیں آ رہا۔ مجھے اس کی شکل کہیں نظر
نہیں آئی۔

میں بڑا خوش ہوا۔ ایک جگہ سے میں نے دیوار پھلانگی اور دوسری طرف سڑک

آ گیا۔ امرتسری مسلمانوں کو معلوم ہو گا کہ ریگو برج کو جو سڑک جاتی تھی اس کی بائیں
جانب گول باغ ہوا کرتا تھا۔ اس گول باغ سے پہلے ایک چھوٹا سا میدان آتا تھا جہاں کوئی
سبزہ نہیں تھا۔ بادامی رنگ کی مٹی کا میدان تھا۔ اس میدان میں دو بزرگوں کے مزار
تھے۔ جن میں سے ایک بزرگ کا نام فتح شاہ بخاریؒ تھا اور دوسرے بزرگ کا نام شنکر شاہؒ
صاحب تھا۔ خدا معلوم دوسرے بزرگ کا اصلی نام کیا تھا مگر سب لوگ ان کے مزار کو
شنکر شاہ کے مزار کے نام سے ہی یاد کرتے تھے اور ان کا یہ نام مشہور تھا۔ یہ دونوں مزار
پاس پاس تھے۔ شنکر شاہ کے مزار کے احاطے میں درخت تھے اور ایک کنواں بھی تھا۔

فتح شاہ بخاریؒ کے مزار کے اردگرد دھریک کے درخت ہوتے تھے۔ اس مزار کو فتح
شاہ بخاری کے مزار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بچپن میں مجھے یاد ہے میری والدہ تاری کے
چاولوں کی دیگ پکوا کر یہاں مہینے کی پہلی جمعرات کو لایا کرتی تھی۔ میں اور میری چھوٹی
بہن اور والد صاحب بھی ساتھ آیا کرتے تھے۔ تاری نمکین چاول ہوتے تھے جن میں
ہلدی کی آمیزش کی جاتی تھی اور بڑے لذیذ ہوتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد میرے
والد صاحب نے یہ فرض سنبھال لیا۔ وہ ہر جمعرات کو دیگ پکا کر لاتے اور فتح شاہ بخاریؒ
کے مزار پر خود لوگوں میں تقسیم کرتے۔ ہم سارا دن مزار شریف پر گزارتے۔ میں اپنی
بہن کے ساتھ میدان میں دوڑیں لگاتا فتح شاہ بخاریؒ کے مزار کا متولی والد صاحب کا
دوست بن گیا تھا۔ والد صاحب اسے شاہ جی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ والد صاحب نے
بستر مرگ پر لیٹے ہوئے مجھے جو اہم مشن تفویض کیا تھا اس کے سلسلے میں کہا تھا کہ میں
امرتسر جا کر سید فتح شاہ بخاریؒ کے متولی سے ملوں۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی تک زندہ ہو۔ وہ
میرے مشن کے سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔

چنانچہ امرتسر کے ریلوے یارڈ کی دیوار پھلانگنے کے بعد میں نے سڑک پار کی اور
گول باغ میں داخل ہو گیا۔ میں بارہ سال کے بعد گول باغ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہاں بھی
سوائے چند ایک درختوں کے کوئی چیز نہیں بدلی تھی۔ کچھ درخت ضرور غائب ہو گئے تھے۔
گراؤنڈ میں گھاس بھی پہلے سے کم نظر آ رہی تھی۔ باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ میں

باغ کی گراؤنڈ میں سے گزر کر خالی میدان میں داخل ہوگیا۔ اس میدان کا ایک کنارا امرتسر کے ہال کے گیٹ کے قریب سیڑھیوں والے پل کی طرف جا لگتا تھا۔ اسی میدان میں سید فتح شاہ بخاریؒ کا مزار تھا۔ یہاں ضرور تبدیلی آچکی تھی۔ میدان کے کنارے کنارے کھوکھے ہی کھوکھے بنے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں پھلوں کی منڈی بن گئی ہوئی ہے۔ ایک طرف ریڑھے اور چھکڑے کھڑے تھے۔ مزار کی چاردیواری ویسے کی ویسی تھی اور معلوم ہوا کہ ہندو سکھ یہاں آکر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ میرے بچپن کے دھریک کے درخت بہت زیادہ گھنے ہوگئے تھے۔ مزار کے چھوٹے سے دروازے پر اسی طرح چمکدار جھالروں والا سہرا لٹک رہا تھا اور فضا میں اگربتیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی شام کی سیاہی آہستہ آہستہ آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی اور مزار کے اندر مٹی کے کچھ دیئے بھی جل رہے تھے اور دروازے کے اوپر والا بلب بھی روشن ہوگیا تھا۔

ایک سکھ اپنی بیوی کے ساتھ ہاتھ باندھے سر جھکائے مزار کے اندر سے باہر نکل رہا تھا۔ دو تین ملنگ درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ خدا جانے یہ مسلمان ملنگ تھے جو میرٹھ انبالے کے شہروں سے آگئے تھے۔ کیونکہ امرتسر شہر میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ مجھے ابھی تک سی آئی ڈی والے ہندو کا خیال لگا ہوا تھا۔ میں نے یہاں مزار میں داخل ہونے سے پہلے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شام کا اندھیرا میدان میں پھیلنے لگا تھا۔ مجھے وہ خفیہ سروس کا ہندو کانسٹیبل کہیں نظر نہ آیا۔ یقیناً" اس سے میری جان چھوٹ گئی تھی۔ میں مزار کے اندر داخل ہوگیا۔ ایک طرف کھڑے ہوکر دعائے فاتحہ پڑھی اور پھر بائیں جانب ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی اس طرف غور سے دیکھا۔ کوٹھڑی کے اندر بجلی کا بلب روشن تھا۔ ایک بوڑھا آدمی جس نے سبز رنگ کے کپڑے پہنے تھے اور سفید داڑھی تھی، کوٹھڑی کے باہر ایک طرف بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے قریب جاکر سلام کیا تو اس آدمی نے آنکھیں کھول دیں اور کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کہاں سے آئے ہو یہاں؟"

اس کی اردو خالص اہل زبان والوں کی اردو لگتی تھی۔ میں نے کہا۔ "دلی سے آیا ہوں شاہ صاحب سے ملنا ہے"

میں نے شاہ صاحب کا نام لیا جو مجھے والد صاحب نے بتا دیا تھا۔ اس شخص نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اندر چلے جاؤ"

کوٹھڑی کا دروازہ چھوٹا سا تھا اور کھلا تھا۔ میں نے جوتے باہر اتارے اور اندر داخل ہوگیا۔ ایک بزرگ صورت سبز پوش آدمی گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے بڑے سکون کے عالم میں بیٹھا تھا۔ آنکھیں تھوڑی بند تھوڑی کھلی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ انگلیاں تسبیح کے دانوں پر چل رہی تھیں۔ میں سلام کرکے ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ بزرگ نے نیم وا آنکھوں سے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی۔ وعلیکم السلام کہا اور پھر اپنی کیفیت میں ڈوب گئے۔ کوٹھڑی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ موقع بڑا مناسب تھا۔ میں بات شروع کرنے ہی والا تھا کہ بزرگ نے فرمایا۔

"بھائی کہاں سے آئے ہو؟ پہلے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا"

میں نے فتح شاہ بخاریؒ کے متولی کا نام لے کر کہا کہ مجھے شاہ صاحب سے ملنا ہے۔ میں دلی سے آیا ہوں۔ میں نے ابھی انہیں بالکل نہ بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ بزرگ نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"برخوردار! شاہ صاحب کو انتقال فرمائے تو سات برس ہوگئے ہیں۔ مجھے بتاؤ۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ مجھے سید غلام علی شاہ کہتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان پر اپنے دل کا راز افشا کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر کچھ شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سید صاحب نے کڑک کر آواز میں پوچھا۔

"یہ باہر کیا ہو رہا ہے حیدر علی؟"

مزار کا ایک ملازم گھبرایا ہوا اندر آیا اور بولا۔

"شاہ جی باہر پولیس آئی ہے۔ تھانیدار بھی ساتھ ہے۔ کہتا ہے یہاں کوئی پاکستان کا جاسوس چھپا ہوا ہے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ سی آئی ڈی والا ہندو جو جالندھر یا شاید دلی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا وہ پولیس لے کر مجھے گرفتار کرنے آگیا ہے۔ میں نے جلدی سے سید صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا۔

"شاہ جی! میں پاکستان سے ایک نیک مقصد لے کر آپ کے دولت خانے پر حاضر ہوا ہوں۔ یقین کریں میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور آپ کے بڑے بھائی میرے والد صاحب کے دوست تھے۔ میں ان کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس وقت مجھے پولیس سے بچالیں باقی باتیں میں آپ کو بعد میں بتا دوں گا"

سید صاحب بڑے دلیر انسان تھے۔ کوٹھڑی کے کونے میں لکڑی کا ایک کافی بڑا صندوق پڑا تھا۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔"

"اس صندوق میں چھپ جاؤ۔ جلدی کرو"

میں نے صندوق کھولا۔ صندوق میں سبز رنگ کی کچھ چادریں تہہ کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ میں اس میں ٹانگیں سینے کے ساتھ لگا کر لیٹ گیا۔ سید صاحب نے صندوق بند کر کے تالا لگا دیا۔ مجھے ایسی آواز آئی جیسے انہوں نے صندوق کے اوپر کوئی ٹوکرا رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی سید صاحب بلند آواز میں بولتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

یہاں پاکستانی جاسوس کا کیا کام۔ یہ فقیروں کا ڈیرا ہے"

سید صاحب کی آواز ذرا دور ہی گئی تھی کہ مجھے اندازہ ہوا کہ تھانیدار سپاہیوں کے ساتھ مزار کے اندر آچکا تھا۔ وہ کوٹھڑی کے باہر کھڑا سید صاحب سے پوچھنے لگا۔

"شاہ جی! ہمارے مخبر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ ایک پاکستانی مزار میں آیا ہے جو دلی سے چلا تھا۔ اس کے پاس صرف دلی کا ویزا ہے مگر وہ امرتسر پہنچ گیا ہے۔

ہمیں مزار کی تلاشی لینی ہوگی"

سید صاحب نے فرمایا۔

"شرما جی! آپ بے شک تلاشی لے لیں مگر یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم بھارتی حکومت کے وفادار ہیں۔ اگر کوئی پاکستانی جاسوس یہاں آتا تو سب سے پہلے ہم آپ کو اس کی اطلاع کرتے۔ بلکہ اسے پکڑ کر باندھ لیتے۔ آپ ضرور تلاشی لیں آیئے"

صندوق کے اندر میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ ایک تو اندر حبس تھا اس کی وجہ سے' دوسرے اس خوف سے کہ اگر ہندو تھانیدار نے صندوق کھلوا لیا تو میں بھی مارا گیا اور میرے ساتھ سید صاحب پر بھی آفت نازل ہو جائے گی۔ مگر سید صاحب نے بھارتی حکومت اور انڈیا کے ساتھ اپنی وفاداری کی باتیں کچھ ایسے انداز میں کیں کہ ہندو تھانیدار کو زیادہ غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ تھانیدار کی آواز آئی۔

"شاہ جی! ہمیں آپ کی وفاداری پر ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہے۔ مگر ہم بھی اپنی نوکری سے مجبور ہیں۔ ہمارے مخبر نے بتایا ہے کہ اس نے پاکستانی جاسوس کو جو نوجوان لڑکا ہے مزار کی طرف جاتے دیکھا ہے۔"

سید صاحب نے فوراً تھانیدار کی بات کاٹی۔

"حضور والا! اگر پاکستانی جاسوس یہاں آتا تو وہ ہماری نظروں سے بچ کر نہیں جاسکتا تھا۔ ہم تو اسی وقت اسے پکڑ کر بٹھا لیتے۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسا نوجوان ادھر سے گزرا ہو۔ آپ خود ملاحظہ فرمالیں۔ ہاں وہی لوگ ہیں جو روز یہاں پر موجود ہوتے ہیں"

ہندو تھانیدار نے اپنے کسی سپاہی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اوئے بھاگ یہاں سے! پوڑیوں والے پل کی ناکہ بندی کی تھی کہ نہیں؟ ہو سکتا ہے وہ ادھر سے نکل گیا ہو"

بھاگ سنگھ شاید کوئی کانسٹیبل تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

"ہاں جی! ادھر دو کانسٹیبل لگا دیئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ وہ ادھر ہی گیا ہوگا۔ یہاں وہ نہیں ہے۔ اچھا شاہ جی آپ کو تکلیف دی۔ ایک بات ہے۔ اگر کوئی اجنبی چہرہ آپ کو یہاں نظر آجائے تو اسے کسی طریقے سے یہیں روک لیں اور ہمیں تھانے میں اطلاع کر دیں"

سید صاحب نے جواب میں کہا۔

"حضور والا! آپ فکر ہی نہ کریں کسی پاکستانی جاسوس کی کیا مجال کہ مزار پر آئے اور پھر بچ کر نکل جائے۔"

یہ لوگ باتیں کرتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ میری جان میں جان آگئی۔ بند صندوق کے اندر مجھے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ بند صندوق میں کہیں کہیں جو تھوڑی بہت درزیں تھیں بس ان میں سے تھوڑی بہت تازہ ہوا اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سبز رنگ کی چادروں میں سے جو دیسی عطر کی تیز خوشبو آرہی تھی اس نے بھی میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ مجھے زبردست گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

اس طرح دو تین منٹ مزید گزر گئے۔ پھر کسی کے قدموں کی آواز آئی صندوق کے اوپر سے ٹوکرا ہٹا دیا گیا۔ صندوق کا تالا کھلا اور ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔

مجھے باہر کی تازہ ہوا لگی تو نیم مردہ جسم میں جیسے جان پڑ گئی۔ جلدی سے صندوق سے نکل آیا۔ سید صاحب کوٹھڑی کے دروازے کے آگے اس طرح کھڑے تھے کہ باہر سے کسی کی نظر اندر نہیں پڑ سکتی تھی۔ انہوں نے پلٹ کر باہر دیکھا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔

بھائی تم نے تو ہمیں مروا دیا تھا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم پاکستان سے یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو"

میں نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میں جاسوس نہیں ہوں"

سید صاحب نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"میاں آہستہ بولو۔ تھانیدار اپنا کوئی نہ کوئی آدمی سفید کپڑوں میں یہاں ضرور چھوڑ گیا ہوگا"

میں نے کہا۔

"براہ کرم مجھے آج کی رات کسی طرح اپنے پاس چھپا لیں۔ میں جو کوئی بھی ہوں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا"

سید صاحب دری پر بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ انہوں نے ایک دوبار گہرا سانس لیا چھت کی طرف منہ اٹھا کر یااللہ خیر! اسلام کی خیر! پاکستان کی خیر کہا اور صندوق کی طرف اٹھ کر گئے۔ صندوق میں سے سبز رنگ کی چادر نکال کر میری طرف پھینکی اور کہا۔

"اسے اس طرح اوڑھ لو کہ تمہاری پتلون وغیرہ بالکل دکھائی نہ دے۔"

پھر انہوں نے تکیئے کے پیچھے سے سبز رنگ کی کپڑے کی ٹوپی نکال کر مجھے دی۔ ٹوپی پر گوٹہ لگا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔

"اسے سر پر پہن لو"

یہ ٹوپی ایسی تھی جو مزاروں میں جو مرید اور بالکے ہوتے ہیں وہ پہنتے ہیں۔ میں نے ٹوپی سر پر کھینچ کر اس طرح پہن لی کہ میرے کان بھی اس میں چھپ گئے۔ سید صاحب نے میرا جائزہ لیا اور اٹھتے ہوئے فرمایا۔

"جب تک میں نہ آؤں یہیں کونے میں چھپ کر بیٹھے رہو۔"

وہ کوٹھڑی سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے کوٹھڑی پر تالا ڈال دیا۔ میں کونے میں بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور الحمد شریف پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ میرا بچنا مشکل تھا۔ جب مجھے بند کوٹھڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو اچانک باہر سے کسی ملنگ کے دھمال ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ یہ

آواز کوٹھڑی کے باہر سنائی دے رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی ملنگ کوٹھڑی کے باہر دھمال ڈال رہا ہے۔ پھر یہ آواز رک گئی۔ اب کوٹھڑی کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور کوٹھڑی میں جلتے بلب کی روشنی میں ایک سبز پوش ملنگ اندر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور کہا۔

"میرے ساتھ دھمال ڈالتے باہر آجاؤ۔ جب تک میں نہ کہوں دھمال ڈالتے رہنا۔"

وہ مجھے کھینچ کر باہر لے گیا۔ اور دھمال ڈالنے لگا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ دھمال ڈالنی شروع کردی۔ مزار پر اس وقت دو تین درویش قسم کے لوگ ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ملنگ دھمال ڈالتا مجھے مزار کے پچھلے دروازے سے نکال کر مزار کے عقب میں لے گیا جہاں کچھ قبریں تھیں۔ ان کے پیچھے درخت تھے اور درختوں کے پیچھے دو چار کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے ایک کوٹھڑی میں دھکیل دیا اور کہا۔

"یہاں سے باہر مت نکلنا"

یہ کوٹھڑی شاہ جی والی کوٹھڑی کے مقابلے میں تنگ اور خالی خالی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ فرش پر صرف صف بچھی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ قلندروں والی سبز ٹوپی اتار کر میں نے پرے رکھ دی۔ شاہ صاحب نے مجھے مزار سے اس کوٹھڑی تک پہنچانے کا بڑا کامیاب طریقہ نکالا تھا۔ پولیس اگر مزار سے جاتے ہوئے پیچھے اپنا کوئی خفیہ آدمی چھوڑ بھی گئی ہو گی یا ان ملنگوں میں پولیس کا کوئی جاسوس ہو گا تو اسے مجھ پر شک نہیں پڑ سکتا تھا کیونکہ میں جس شکل صورت میں شاہ جی کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا وہاں سے نکلتے وقت میرا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

میں اپنی زندگی کے حیرت انگیز اور سچے واقعات بیان کر رہا ہوں۔ یہاں میں ایک بات کی شروع میں ہی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ بھی اسے نوٹ کرلیں۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے اکثر لوگوں کے اصلی نام نہیں

لکھوں گا۔ شہروں کے نام اور محل وقوع بھی درست اور صحیح ہو گا مگر نام اور لوگوں کے حلیے میں نے بدل دیئے ہوں گے۔ کیونکہ بھارت ہمارا دشمن ملک ہے اور مقبوضہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ کشمیری حریت پرستوں کی قربانیاں اور جدوجہد جاری ہے۔ لوگوں کے صحیح نام اور حلیے اور بعض جگہوں کے حقیقی نام لکھنے سے جہاد آزادی کشمیر کی تحریک کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر امرتسر میں سید فتح علی شاہ بخاری" کا مزار موجود ہے۔ مگر ان کے متولی شاہ جی اور ان کے فرزند سید صاحب کا نام میں نے بدل دیا ہے۔ سید صاحب سے میری ملاقات بھی امرتسر میں کسی دوسری جگہ پر ہوئی تھی۔ مگر میں اس جگہ کا نام نہیں لکھ سکتا۔ لیکن جو واقعات میں بیان کروں گا وہ بالکل سچے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد میں واپس مزار کی اس کوٹھڑی میں آتا ہوں جہاں ایک درویش نے مجھے چھپا دیا تھا۔

کوٹھڑی میں بیٹھے مجھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ باہر مزار پر بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ آخر مجھے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جو درویش مجھے کوٹھڑی میں بند کر گیا تھا اس نے دروازے پر باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ قدموں کی چاپ کوٹھڑی کے پاس آکر رک گئی۔ پھر تالہ کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور سید صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور میرے پاس صف پر بیٹھ گئے اور مجھ سے پوچھا۔

"اب مجھے بتاؤ تم کس مقصد کو لیکر بھارت میں آئے ہو اور تم نے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی ہے"

میں جس مقصد کو لے کر اپنے دشمن ملک بھارت میں داخل ہوا تھا اور جس کی خاطر میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا وہ میری زندگی کا مشن تھا۔ اس مشن کو بیان کرنے کے لئے مجھے واپس اگست 1947ء کے اس خون میں ڈوبے ہوئے دن کی طرف لوٹ کر جانا ہو گا جب میرا باپ مجھے اور میری چھوٹی بہن کو لیکر اپنے گاؤں سے نکلا تھا۔ گاؤں پر سکھوں نے حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ گاؤں کے مسلمانوں پر تھا۔ سکھوں نے ہندوؤں کے

ساتھ مل کر مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کردیا۔ گاؤں میں ایک شور مچ گیا۔ دیکھ
دیکھتے مسلمانوں کے مکان جلنے لگے۔ ہمارا باپ مجھے اور میری چھوٹی بہن کو لے کر مکا
کے صحن کی پچھلی دیوار والے دروازے سے باہر کو بھاگا۔ میری عمر اس وقت آٹھ نو سا
کی ہوگئی۔ میری بہن مجھ سے ایک ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی رو
لگے تھے۔ ہمارے باپ نے ہم دونوں کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور ہمیں بھی اپنے سا
دوڑا رہا تھا۔ آگے اونچی فصل والے کھیت آگئے۔ وہ ہمیں لے کر فصل میں گھس گ
اس نے ہمیں وہیں چھپا دیا اور خود بھی ہمارے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے رونا بند کر
تھا۔ ہم پر دہشت طاری تھی۔ ہمارے باپ کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ خ
تھے اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمیں آہستہ سے کہتا۔

"اللہ کرم کرے گا۔ اللہ کرم کرے گا۔ آواز نہ نکالنا"

گاؤں کی طرف سے ہمیں عورتوں بچوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سکھ
کے ست سری اکال کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔ میں ان نعروں سے واقف تھا
سکھوں نے مجھے جب دوسرے گاؤں سے آتے تھے تو ہمارے گاؤں کے گردوارے
رات جاتے ہوئے یہی نعرے لگایا کرتے تھے۔ فصل چاولوں کی تھی اور زیادہ اونچی نہ
تھی۔ باپ نے ہمیں اپنے ہاتھ فصل میں لٹا رکھا تھا۔ کچھ سکھوں کی آوازیں سنائی دیں
کھیتوں کی طرف آرہے تھے۔

ہمارے باپ نے ہم دونوں کو اپنے ساتھ لگالیا۔ مجھے میرے باپ کے دل کی تیز
دھڑکن صرف سنائی دے رہی تھی۔ سکھ آپس میں باتیں کرتے ہمارے قریب سے گ
گئے۔ ایک سکھ نے کہا۔

"فصل کو آگ لگادو۔ اندر کوئی مسلا نہ چھپا ہوا ہو"

دوسرے نے کہا۔ "سارے مسلے وڑ چھڈے نے۔ اتھے کنے آناں سی-----"

پھر ایک عورت کی چیخ اور منتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ کوئی مسلمان عورت
جس کو سکھ اغوا کرکے لے جارہے تھے۔ ... جو ان کو خدا اور سکھوں کے کسی گورو صا

کا واسطہ دے کہہ رہی تھی کہ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ عورت کی بلکتی ہوئی آوازیں
دور ہوتے ہوتے غائب ہوگئیں۔ ہم اپنے باپ کے ساتھ کھیت کے کیچڑ میں جانے کتنی دیر
تک چھپے رہے پھر چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ میرے باپ نے سہمی ہوئی آواز میں
ہمیں کہا۔

"ابھی لیٹے رہنا"

پھر اس نے آہستہ سے فصل میں سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک دھان
کے خوشوں میں سے سر باہر نکالے دیکھتا رہا۔ پھر سر نیچے کرلیا اور ہمارے پاس منہ لاکر سر
گوشی میں کہا۔

وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بچالیا ہے۔ ابھی باہر نہیں نکلنا۔ سمجھے؟۔
ابھی باہر نہیں نکلنا۔ اللہ کو یاد کرو۔ گھبراؤ مت۔ اللہ نے ہمیں بچالیا ہے"

میں نے کرتا اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ میری بہن نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔
ہمارے کپڑے کھیت کے کیچڑ میں لت پت ہوگئے تھے۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی دھندلی
ہونے لگی۔ جب سورج غروب ہوگیا اور اندھیرا سا چھا گیا تو ہمارا باپ ہم دونوں کو لے کر
کھیتوں میں سے نکلا اور چھوٹی نہر والے پل کی طرف چل دیا۔ میں نے مڑ کر اپنے گاؤں
مجیٹھ کی طرف دیکھا۔ یہ ہمارا گاؤں بھی تھا اور قصبہ بھی تھا۔ کئی مکان جل رہے تھے۔
میرے باپ نے میرا سر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"پیچھے مت دیکھو"

نہر کے پل سے پہلے ٹاہلیوں کے بے شمار درخت آتے تھے۔ یہاں ہم گولیاں اور گلی
ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ نہر کے پل پر سے گزرنے سے پہلے ہمارے باپ نے ہمیں درختوں
کے پاس بٹھا دیا اور کہا۔

"یہاں سے ہلنا مت۔ میں آگے دیکھ کر آتا ہوں"

ہم دنوں بہن بھائی سہم کر وہیں بیٹھ گئے۔ ہم پر اس قدر دہشت چھائی ہوئی تھی کہ
ہم آپس میں ایک دوسرے سے کوئی بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ شام کے گہرے ہوتے

اندھیرے ہی ہم نے اپنے باپ کو دیکھا کہ وہ جھک جھک کر چلتا چھوٹی نہر کے پل کے پار گیا۔ ایک طرف بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اٹھا اور دوڑ کر ہمارے پاس واپس آیا۔ ہمیں بازوؤں سے پکڑا اور اپنے ساتھ دوڑاتا نہر کے پل پر سے گزر کر دوسری طرف کھیتوں میں گھس گیا۔ کھیتوں کے درمیان چلنے کے لئے چھوٹی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی جسے پنجابی میں وٹ کہتے ہیں۔

ہم وٹ پر چلتے چلے گئے۔ شام کو اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ہمارے باپ کو پتہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ ہمیں کھیتوں میں چلاتا رہا۔ ہم دونوں بہن بھائی ننگے پاؤں تھے۔ ہمارے باپ نے اپنی پرانی جوتی پہنی ہوئی تھی۔ یہ جوتی میں کئی سالوں سے اس کے پاؤں میں دیکھ رہا تھا۔ یہ پنجابی جوتی تھی جو اس زمانے میں گاؤں کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ اگر ذرا ٹوٹ جاتی تو وہ اسے مرمت کروا کر پھر پہن لیتا تھا۔ آگے ریلوے لائن آگئی۔ ریلوے لائن شام کے اندھیرے میں ویران ویران تھی۔ یہ ریلوے لائن امرتسر کی طرف جاتی تھی۔ ہمارا باپ ہمیں ریلوے لائن پار کرا کر دوسری طرف لے گیا۔ ادھر ایک کھال تھا جس میں بارش کا پانی جمع رہتا تھا۔ کھال پر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پر سے گزر کر آگے گئے تو اندھیرے میں درختوں کی دور تک جاتی قطار دھندلی دھندلی سی نظر پڑی۔ ہمارے باپ نے ہمیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"پترو! گھبرانا نہیں۔ اللہ کو یاد کرتے رہو خدا نے چاہا تو ہم پاکستان پہنچ جائیں گے"

مجھے یاد ہے۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا۔ "میاں جی! پاکستان کہاں ہے؟" میرے باپ نے جواب میں کہا تھا۔ "امرتسر سے آگے جہاں لاہور ہے وہاں پاکستان ہے۔" آگے امرودوں کے باغ آگئے۔ یہاں امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ یہ مسجد کچی دیواروں والی تھی۔ ہمارا باپ ہمیں اس مسجد میں لے آیا۔ مسجد بالکل خالی پڑی تھی۔ مسجد میں ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جو کھلی تھی یہاں مسجد کے مولوی صاحب رہتے تھے۔ مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ ان کا سامان مسجد کے

صحن میں بکھرا پڑا تھا۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے شام حبس آلود تھی۔ پہلے ہمارا باپ ہمیں مولوی صاحب کی کوٹھری میں لے گیا۔ مگر وہاں سخت گرمی اور حبس تھا۔ پھر وہ ہمیں مسجد کی چھت پر لے آیا۔ یہاں اتنا حبس نہیں تھا۔ ہم نے نیچے باری باری آکر وضو کرنے والی ٹوٹیوں کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیا۔ باپ نے ہمیں اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس نے میری بہن اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"پترو! گھبرانا نہیں۔ ہم اللہ کے گھر میں ہیں۔ سکھ ہندو نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنا ملک پاکستان بنائیں۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا اور ان کے گھروں کو آگ لگانی شروع کر دی ہے۔ ہمیں بھوک لگی ہوگی۔ مگر یہاں کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا۔ صبر شکر کر کے رات گزار دو صبح اللہ مالک ہے۔"

ہم نے ساری رات مسجد کی چھت پر کبھی جاگ کر کبھی سو کر گزار دی۔ صبح ہونے سے پہلے جب پو پھٹ رہی تھی تو ہمارا باپ ہمیں لے کر مسجد سے نکل آیا۔ اب ہم کھیتوں کی آڑ لیتے درختوں کی ان قطاروں کی طرف چلنے لگے جو شام کو ہمیں دور نظر آتی تھیں۔ ان درختوں کے درمیان سے ایک چھوٹی سی پکی سڑک گزرتی تھی۔ یہاں ہمیں مسلمان مہاجرین کا ایک قافلہ مل گیا جو گورداسپور سے پاکستان کی طرف جا رہا تھا۔ ہم بھی اس قافلے میں شامل ہوگئے۔ قافلہ جب امرتسر شہر کے باہر کھیتوں میں پہنچا تو سکھوں کے ایک بہت بڑے جتھے نے حملہ کر دیا۔ قافلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ کچھ سکھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ باقی دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے لگے۔ بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے نیزوں پر اچھالا۔ ہمارا باپ ہمیں پکڑ کر کھیتوں کی طرف بھاگا۔ میں اور میری چھوٹی بہن چیخ چیخ کر رونے لگے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک سکھ کا گھوڑا دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے جھک کر میری چھوٹی بہن پر تلوار کا وار کیا تلوار میری بہن کی گردن پر پڑی اور اس کی گردن

آدھی کٹ کر ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ گر پڑی۔ میرا باپ اس کے اوپر گر پڑا۔
نے پہلی بار اپنے باپ کو روتے ہوئے دیکھا۔ میری بہن کی گردن سے خون کا فوارہ نکل ر
تھا۔ میں زور زور سے رو رہا تھا۔ میرے باپ نے میری بہن کو کاندھے پر ڈالا۔ میرا با
پکڑا اور کھیتوں میں ایک طرف دوڑ پڑا۔ کچھ دور جا کر وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑا۔
میاں جی میاں جی پکارتا روتے ہوئے اپنے باپ کو اٹھانے لگا۔ میری بہن کھیت میں ا
طرح پڑی تھی کہ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ کر ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھ
میرا باپ رو رہا تھا۔ میری بہن کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ مگر میری بہن مر چکی تھی۔ ا
میں ہمارے پیچھے سکھوں کے نعرے سنائی دیئے۔ میرے باپ نے میری بہن کی لاش
ایک طرف رات ڈالا اور میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کو بے تحاشا دوڑ پڑا اور مجھے بھی سا
دوڑانے لگا۔

کھیتوں سے نکل کر ایک کھلی جگہ آ گئی جہاں ایک کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک
ٹرک سامنے سے آ رہا تھا۔ ٹرک ہمیں دیکھ کر ایک فوجی جس کے ہاتھ میں رائفل
ٹرک میں سے چھلانگ لگا کر اترا اور میرے باپ سے پوچھا۔

''مسلمان ہو؟''

میرے باپ نے کہا۔ ''ہاں جی مسلمان ہیں۔ میری بیٹی سکھوں نے شہید کر دی

اور ایک بار پھر میرا باپ رونے لگا۔ اپنے باپ کو روتے دیکھ کر میں بھی رونے

یہ بلوچ رجمنٹ کے جوان تھے۔ انہوں نے ہمیں ٹرک میں بٹھایا اور امرتسر کے ریف
کیمپ میں لے آئے۔ اس کیمپ میں ہم دو دن رہے۔ میرا باپ میری بہن کو یاد کر
روتا رہتا تھا۔ میں بھی ساتھ رونے لگتا تھا۔ اپنی بہن کی لاش میری آنکھوں کے سا
آجاتی تھی۔ اس کی کٹی ہوئی گردن اور گردن میں سے ابلتا ہوا خون شاید میں ساری ز
فراموش نہ کر سکوں۔

تیسرے دن ہمیں ایک مال گاڑی میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ بٹھا دیا گیا اور
مال گاڑی نے ہمیں لاہور پاکستان پہنچا دیا۔ پاکستان آ کر دو تین دن والٹن کے ریفوجی ک

یہیں پڑے رہے۔ پھر گوجرانوالے چلے گئے۔ وہاں میرے والد کے قریبی رشتے دار رہتے
تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو ایک دکان الاٹ کروا کر دے دی۔ مجیٹھ قصبے میں میرے
والد صاحب کی پرچون کی دکان تھی جہاں آٹا دال چاول وغیرہ بیچتے تھے۔ گوجرانوالے میں یہ
دھندا نہ چل سکا تو والد صاحب لاہور آ گئے۔ میری چھوٹی بہن کا غم والد صاحب کو اندر ہی
اندر گھن کی طرح کھانے لگا تھا۔ مگر وہ میری تعلیم سے بھی غافل نہیں تھے۔ وہ خود تو چار
جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ قصبے میں اسلامی تاریخی ناول بڑے شوق سے پڑھا کرتے
تھے۔ کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا تو مجھ سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ محمود غزنوی ان کا پسندیدہ
ہیرو تھا۔ ہم نے باغبان پورے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ والد صاحب نے
یہاں پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ مجھے سکول میں داخل کرا دیا۔ وہ مجھے مسجد
میں قرآن شریف پڑھنے کے لئے بھی بھیجتے تھے۔ میں نے قرآن پاک حفظ تو نہیں کیا مگر
پورا ترجمے کے ساتھ پڑھ لیا۔ قرآن پاک نے میرے اندر اسلام اور پاکستان کے لئے
گہری محبت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ والد صاحب سردیوں کی رات کو مجھے اپنی چارپائی پر پاس
بٹھا کر محمود غزنوی اور محمد بن قاسم کے کارنامے کتاب میں سے پڑھ کر سناتے ذرا ہوش
سنبھالا تو میں نے بھی ان کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کبھی کبھی رات کو میں سو رہا ہوتا تو
والد صاحب کے ہچکیاں بھر کر رونے کی آواز سے میری جاگ کھل جاتی۔ وہ میری چھوٹی
بہن کو یاد کر کے روتے رہتے تھے۔

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں کالج میں داخل ہو گیا۔ والد صاحب کو بیٹی کے
غم نے وقت سے پہلے بوڑھا اور کمزور کر دیا تھا۔ میں ان کی بڑی دلجوئی کرتا مگر بیٹی کے قتل
کا منظر نہ وہ بھولتے تھے نہ میں ہی بھول سکا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ میں زیادہ تفصیل میں
نہیں جاؤں گا۔ میں نے بی۔ اے پاس کر لیا اور ایک کارخانے میں مجھے کلرک کی نوکری
مل گئی۔ اس زمانے میں مجاہدین کشمیر کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بھارت نے کشمیر میں
کشمیریوں کی مرضی کے خلاف اپنی فوجیں بھیج کر وہاں قبضہ کر لیا تھا۔ بھارتی فوج بھارتی
حکومت کے اشارے پر کشمیریوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم توڑ رہی تھی۔ کشمیری مجاہدین

پر بے پناہ تشدد کیا جارہا تھا۔ عورتوں کو اغوا کیا جاتا۔ حریت پرست کشمیریوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر انہیں شہید کیا جارہا تھا۔ والد صاحب یہ سب کچھ اخباروں میں پڑھتے تو ان کا چہرہ شعلے کی طرح تمتمانے لگتا۔ وہ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ مگر مسلمان کشمیری مجاہدین پر انڈین فوجیوں کے ظلم وستم کی خبریں پڑھ کر وہ سینے پر ہاتھ مار کر کہتے۔

"مرنے سے پہلے میں جہاد کشمیر میں ضرور حصہ لوں گا اے خدا مجھے اتنی طاقت عطا فرما کہ میں مقبوضہ کشمیر میں جاکر مجاہدوں کے شانہ بشانہ کافروں کے خلاف جہاد کروں"

ایک رات وہ دکان بند کرکے گھر آئے تو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "میاں جی! میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں"

والد صاحب نے مجھے بازو سے پکڑ کر بٹھا دیا اور کمزور آواز میں کہا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

سردیوں کی رات تھی۔ گھر میں نوکرانی ہوتی تھی جو گھر کی صفائی وغیرہ کے علاوہ کھانا بھی تیار کردیتی تھی۔ والد صاحب چارپائی پر لحاف اوپر کرکے لیٹ گئے۔ میں ان کے لئے چاول تھالی میں ڈال کر لایا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے چاول واپس لے جانے کو کہا۔ میں دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آگئی اور میں سوگیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ والد صاحب مجھے آواز دے رہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ ان کا کمزور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے بدن میں خون بالکل نہیں ہے۔ میں گھبرا سا گیا۔ والد صاحب نے آہستہ سے کہا۔

میں کلثوم کو نہ بچا سکا۔ مجھے اس کا بڑا غم ہے"

میں نے ان کا کمزور ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میاں جی! اللہ کو یہی منظور تھا۔ آپ غم نہ کیا کریں"

والد صاحب نے جیسے میری بات بالکل نہیں سنی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر میرا بازو پکڑ لیا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت حیرت انگیز طور پر بڑی سخت تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"ایک دن تمہیں بھی مرنا ہے۔ مگر میری طرح بستر پر لیٹے لیٹے مت مرنا۔ کشمیر کے جہاد میں کافروں سے لڑتے لڑتے شہید ہونا۔ مجھے دفن کرنے کے بعد امرتسر جانا۔"

والد صاحب نے فتح شاہ بخاریؒ کے مزار کے متولی کا نام لے کر مجھے ہدایت کی میں مزار کے شاہ جی سے جاکر ملوں۔ وہ مجھے جہاد کشمیر کے میدان جنگ میں پہنچا دے گا۔ والد صاحب نے میرے بازو کو اپنی گرفت میں مزید مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"جب مقبوضہ کشمیر آزاد ہو جائے تو میری قبر پر آکر مجھے یہ خبر ضرور سنانا۔ مجھ سے وعدہ کرو"

میں نے کہا۔ "میاں جی! میں وعدہ کرتا ہوں"

والد صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی آگئی۔ انہوں نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ اور آہستہ آہستہ بولے۔

"جس کھیت میں میں اپنی بیٹی کی لاش چھوڑ آیا تھا۔ وہاں جاکر فاتحہ پڑھنا۔ اور اونچی آواز میں کہنا کہ کلثوم اپنے باپ کو معاف کر دینا وہ تجھے دشمنوں کی زمین پر بے گوروکفن چھوڑ آیا۔ وعدہ کرو۔ وعدہ کرو۔۔۔۔"

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے میاں جی کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں میاں جی۔ وعدہ کرتا ہوں"

اس کے ساتھ ہی میاں کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ والد صاحب سے کئے ہوئے دونوں وعدے میرے سینے پر لکھے تھے۔ ان دونوں وعدوں کو پورا کرنا میری زندگی کا

مشن بن گیا تھا۔ یہی وہ مشن تھا جس کو لے کر میں بھارت میں داخل ہوا تھا۔ چھوٹی بہن پاکستان کے نام پر اسلام کے نام پر شہید ہوئے تھی وہاں فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچانا۔ میاں جی کا پیغام اس کی روح کو پہچانا اور اپنی زندگی جہاد کشمیر کے لئے وقف کر دینا۔

یہ ساری باتیں یہاں تو میں نے پوری تفصیل سے لکھی ہیں۔ لیکن اس رات فتح شاہ بخاری کے مزار کی کوٹھڑی میں سید صاحب کے چھوٹے بھائی کو میں نے مختصراً بیان کیں اور اس شخص کا نام لیا جس کے پاس میرے والد صاحب نے کہا تھا مزار کا متولی بڑے شاہ جی مجھے پہنچا دیں گے۔ یہ کوئی خاص مجاہد تھا۔ میں اس کا اصلی نام یہاں نہیں لکھوں گا۔ آپ جو چاہے اس کا نام رکھ لیں۔ چلیں کمال شاہ نام رکھ لیں۔ سید صاحب میری ساری باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"میرے عزیز! تم بڑا نیک مقصد لے کر پاکستان سے آئے ہو۔ جن صاحب کا تم نے نام لیا ہے۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ کبھی کبھی رات کے وقت پولیس والوں کی نظروں سے چھپ کر میرے بڑے بھائی صاحب کو ملنے یہاں آیا کرتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "بس آپ کسی طرح مجھے ان کے پاس پہنچا دیں۔"

سید صاحب کہنے لگے۔

"ان کے بارے میں میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ہردہ ضلع ہوشنگ آباد مدھیہ پردیش سے آیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں میرے بڑے بھائی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ زبردست مجاہد اور تربیت یافتہ کمانڈو ہیں۔ بھارتی فوج کی کمانڈو فورس میں ہوا کرتے تھے۔ وہاں سے ریلیز ہونے کے بعد اب ہردہ ضلع ہوشنگ آباد کے کسی قریبی جنگل میں رہتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس بارے میں بڑے شاہ صاحب نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

اب یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ والد صاحب مجھے اس مجاہد اور تربیت یافتہ کمانڈو کے پاس کیوں بھجوا رہے تھے۔ جہاد کشمیر میں شریک ہو کر شہید ہونا کوئی مشکل

نہیں ہے۔ آپ فائرنگ کرتے ہوئے بھارتی فوج کی کسی پوسٹ کے سامنے آکر کھڑے ہو جائیں۔ آپ کی فائرنگ سے کوئی دشمن مرے یا نہ مرے، دشمن کی گولی آپ کو آکر لگے گی اور آپ اسی وقت شہید ہو جائیں گے۔ آپ کی شہادت میں کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا۔ لیکن اس شہادت کا آزادی کشمیر کی تحریک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ وہ شہادت تحریک کے لئے بے حد مفید ہوتی ہے جو دشمن کو کسی فوجی آپریشن کے بعد زبردست اور دور رس نقصان پہنچانے کے بعد حاصل کی جائے۔ دشمن کو ایسا نقصان میں کمانڈو بن کر ہی پہنچا سکتا تھا اور اگر خدا نے میری قسمت میں شہادت کی سعادت لکھی ہوئی ہے تو میں یہ شہادت کمانڈو آپریشن کے ساتھ دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے بعد ہی حاصل کر سکتا تھا۔ والد صاحب یہی چاہتے تھے کہ میں جہاد کشمیر میں شامل ہونے سے پہلے کمانڈو کی پوری تربیت حاصل کروں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کمال شاہ صاحب کو منتخب کیا تھا جو مجھے مزار کے متولی سید صاحب کے توسط سے ہی مل سکتے تھے۔ اب جب چھوٹے سید صاحب نے مجھے بتایا کہ کمانڈو کمال شاہ بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش کے ہردہ ضلع میں کسی جنگل میں رہتے ہیں تو صورت حال میرے لئے مزید پیچیدہ ہوگئی تھی۔ میں نے سوائے امرتسر مجیٹھ کے علاقے کے ہندوستان کا اور کوئی علاقہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مدھیہ پردیش کس بلا کا نام ہے اور ہردہ نام کا جنگل کہاں پر ہے۔ مگر میں نے کمانڈو کمال شاہ صاحب کے پاس جانے کا دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ میرے والد صاحب کی آخری خواہش بھی تھی اور میں بھی کمانڈو بن کر کافروں سے اپنی چھوٹی بہن کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اور اب تو ہر وہ لڑکی جو مقبوضہ کشمیر میں کافروں کے ظلم و تشدد سے شہید ہوتی تھی وہ مجھے اپنی بہن کلثوم ہی لگنے لگتی تھی۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔

"میں کمال شاہ صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں مجھے بتائیے کہ میں ان کے پاس کیسے پہنچ سکتا ہوں۔"

سید صاحب نے باہر کوئی آہٹ محسوس کی ہوگی۔ انہوں نے مجھے چپ ہو جانے کا

اشارہ کیا اور جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئے اور کسی سوراخ میں سے باہر د لگے۔ پھر پیچھے ہٹے اور مجھے کہا۔

"برخوردار! اس وقت رات کافی گزر چکی ہے تم یہیں سو جاؤ۔ صبح میں خود تمہارے پاس آؤں گا۔ تم میرے آنے سے پہلے باہر نہ نکلنا"

سید صاحب چلے گئے۔ بند کوٹھڑی میں حبس اور گرمی ضرور تھی۔ یہاں پنکھا نہیں تھا۔ مگر چونکہ ابھی گرمی کا موسم باقاعدہ شروع نہیں ہوا تھا اس لئے کوٹھڑی تھوڑے سے حبس اور گرمی نے مجھے زیادہ دیر تک تنگ نہ کیا اور مجھے نیند آگئی۔

صبح مجھے سید صاحب نے ہی آکر جگایا۔ میرا لباس بس ابھی تک سوائے سبز ٹوپی ملنگوں والا ہی تھا۔ وہ اپنے ساتھ میرے اتارے ہوئی کپڑے یعنی جینز پتلون جیکٹ جوگر شوز بھی لائے تھے۔ انہوں نے میرے کپڑے ایک طرف رکھ دیئے اور کہا۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔ ہم ناشتے پر باتیں کریں گے۔"

میں کوٹھڑی سے نکل کر کھلی فضا میں آیا تو بڑا اچھا لگا۔ دن کافی نکل چکا تھا۔ صاحب مجھے ایک دوسری کوٹھڑی میں لے آئے جس کا فرش پکا اور چھت بھی اونچی تھ اندر ایک پلنگ بچھا تھا دو تین کرسیاں اور چھوٹی تپائی بھی تھی۔ یہاں میں نے ان کے سا حلوے پوڑی کا ناشتہ کیا۔ ناشتے پر وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار کی باتیں کر رہے۔ کہنے لگے۔

"یہاں وہ بات نہیں ہے جو انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ انگریزوں کے زمانے میں تو ہم مسلمان ہندوؤں کے ساتھ برابر کی حیثیت سے رہتے تھے۔ مگر اب یہاں ہندوؤں کے غلام ہیں۔ ہم چاہے کچھ کرلیں بھارت کی حکومت ہمیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھے گی۔ وہ ہندوستان کے ہر مسلمان کو پاکستان کا جاسوس سمجھتی ہے۔ تم پاکستان کے مسلمان ہر لحاظ سے خوش نصیب ہو۔ تم ایک آزاد ملک میں رہتے ہو۔ تمہاری اپنی حکومت ہے خواہ کیسی بھی حکومت ہے مگر تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اسلام کے راستے پر چل کر زندگی

بسر کر سکتے ہو۔ یہاں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اعلیٰ سرکاری عہدے صرف ہندوؤں کے لئے وقف ہیں۔ مسلمان لڑکا چاہے کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ نوکری دی بھی جاتی تو گھٹیا درجے کی نوکری دی جاتی ہے ہم بھارت کے مسلمان تو ہمیشہ پاکستان کی خیر سگالی کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ پاکستان کی وجہ سے تھوڑی بہت ہماری بھی یہاں عزت بن جاتی ہے۔"

ناشتے کے بعد سید صاحب کہنے لگے۔

"میں نے چائے کے لئے کہہ دیا ہے۔ چائے پر اصلی باتیں کریں گئے"

میں نے ان سے پولیس کے بارے میں پوچھا کہ باہر اب کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ سید صاحب بولے۔

"میرے عزیز! یہاں کچھ پتہ نہیں کہ باہر جو ملنگ بیٹھے ہیں ان میں سے کوئی خفیہ پولیس والا ہے۔ ایک ملنگ پر مجھے شک تھا۔ کیونکہ اس کی شکل نئی نئی تھی۔ وہ چلا گیا ہے۔ اس لئے فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں"

میں نے کہا۔ "یہاں کا تھانیدار کیا نام تھا اس کا؟"

"شرما جی"

"ہاں وہ تو آپ کو میرے بعد پریشان نہیں کرے گا"

سید صاحب سر کو ہلکا سا جھٹک کر بولے۔

"ہم چاہے کچھ کرلیں یہ انڈین پولیس والے کبھی کسی مسلمان پر اعتبار نہیں کرتے۔ وہ ہمیں بھی پاکستان کا جاسوس ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن شرما تھانیدار کو کبھی یقین نہیں آسکتا۔ ہم بھی ان کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ اور پھر کبھی ایسا ہوا بھی نہیں کہ تمہاری طرح سے کوئی پاکستانی یہاں آئے اور ہمیں اسے چھپانا پڑ جائے۔ میرے بڑے بھائی یعنی بڑے شاہ صاحب ہوا کرتے تھے تو ان سے ملنے کبھی کبھار وہی کمانڈو مجاہد صاحب ضلع ہوشنگ آباد کے جنگلوں سے نکل کر آیا

کرتے تھے۔ ان دنوں امرتسر کا ایک سکھ تھانیدار ہوتا تھا۔ ایک بار وہ ان کی بو لیتا یہاں آگیا تھا اور بڑے شاہ صاحب سے اس کی بابت پوچھ گچھ کی تھی مگر بڑے شاہ صاحب نے سکھ تھانیدار کی خوب خبر لی تھی اور اسے یہ کہہ کر مزار سے نکال دیا تھا کہ اگر اب تم یہاں آئے تو میں دلی سیدھا پنڈت نہرو کی بیٹی سے جاکر تمہاری شکائت کروں گا۔ بس اس کے بعد یہاں کوئی پولیس والا نہیں آیا۔"

اتنے میں ایک لڑکا چائے لے کر آگیا۔ چائے کا دور چلنے لگا۔ لڑکا چلا گیا تو سید صاحب کہنے لگے۔

"تمہاری بات اور ہے میاں۔ تم پاکستانی جاسوس نہیں ہو۔ اگر جاسوس ہوتے بھی تو خدا کی قسم ہم تمہیں اپنے سینے سے لگاتے۔ پاکستان کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ مگر تم ایک بلند ترین مقصد لے کر یہاں آئے ہو۔ اگر تمہارے پاسپورٹ پر امرتسر کا بھی ویزا لگا ہوتا تو شاید تمہیں اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ مگر چونکہ تمہارے پاس دلی کا ہی ویزا تھا اور تم وہاں سے چھپ کر یہاں آئے ہو اس لئے قدرتی بات ہے کہ تمہارے پیچھے خفیہ پولیس لگ گئی۔ کیونکہ دلی دار الحکومت ہے جو پاکستانی دلی کا ویزا لگوا کر آتے ہیں پولیس ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے اگر کوئی پاکستانی دلی سے سے باہر کسی شہر کا رخ کرے تو پھر وہ اسے جاسوس سمجھ کر اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ مگر تم فکر نہ کرو میں یہاں اب تمہیں پریشان کرنے کوئی پولیس والا نہیں آئے گا۔"

میں نے مطلب کی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بتائیے کہ میں مجاہد کمانڈو کمال شاہ صاحب کے پاس کس طرح پہنچ سکتا ہوں"

سید صاحب کہنے لگے۔

"میں تمہیں ہر وہ ضلع ہوشنگ آباد تک پہنچنے کا راستہ تو بتا دوں گا۔ مگر اس کے آگے تمہیں خود کمال شاہ صاحب کو تلاش کرنا ہوگا۔ مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ ہر وہ سے کوئی دس گیارہ میل دور دریائے زبدا کے کنارے سابق ریاست اندور کی حدود میں گویت نام کا ایک گاؤں ہے بس یہیں سے وہ جنگل شروع ہوتا ہے جس کے اندر کہیں کمال شاہ صاحب لئے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ وہاں وہ خاص خاص کشمیری حریت پرستوں کو کمانڈو کی ٹریننگ دیتے ہیں۔"

میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سید صاحب جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔

باہر کوئی عورت آئی تھی۔

سید صاحب باہر نکل کر عورت سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر اندر آکر دروازہ بند کرکے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔

"ہردہ شہر جس کا آپ نے نام لیا ہے یہ کہاں پر ہے۔ اور یہاں جانے کے لئے مجھے کونسی ریل گاڑی پکڑنی ہوگی"

سید صاحب نے کہا۔

میاں تم ہندوستان۔ میں بالکل نئے نئے آئے ہو۔ اب تمہیں کیا بتاؤں کہ مدھیہ پردیش کہاں ہے اور کیا ہے۔ بھوپال اور بمبئی کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا"

میں نے یہ نام پاکستان میں اخباروں اور رسالوں میں پڑھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"نام ضرور سنے ہیں مگر معلوم نہیں یہ شہر کہاں پر واقع ہیں۔"

سید صاحب کہنے لگے۔

"یہاں سے آدمی بمبئی جائے تو بمبئی بھوپال لائن پر ایک شہر آتا ہے جس کا نام ہردہ ہے۔ یہ ضلع ہوشنگ آباد کا بڑا اہم شہر ہے اور اناج کی بڑی منڈی ہے۔ یہاں پسنجر ٹرین بھی ٹھہرتی ہے اور ایکسپریس ٹرین شاید تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ بس تمہیں یہیں جانا ہوگا۔ امرتسر سے تمہیں ہردہ کا ٹکٹ مل جائے گا۔

میں اپنا آدمی تمہارے ساتھ کردوں گا۔ وہ خود تمہیں گاڑی میں بٹھا آئے گا۔ آگے تمہیں خود احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

میں نے ابھی تک سید صاحب کو اپنے والد صاحب کی دوسری وصیت کے بارے میں بتایا تھا کہ میری چھوٹی بہن کو سکھ غنڈے نے فسادات میں شہید کر دیا تھا اور میرا پ بچی کی لاش کھیتوں میں جس جگہ چھوڑ کر میرے ساتھ بھاگا تھا مجھے وہاں جاکر فاتحہ بھی ھنا ہے اور اپنی شہید بہن کی روح سے والد صاحب کی طرف سے معافی بھی مانگنی ہے۔

جب میں نے انہیں اس بارے میں بتایا تو وہ بولے۔ یہ بڑا جذباتی سا کام تمہارے الد صاحب تمہارے سپرد کر گئے ہیں۔ تمہارے پیچھے پہلے ہی خفیہ پولیس لگی ہوئی ہے۔ ہاں کھیتوں میں وہ جگہ تلاش کرتے پھرو گے۔ بارہ سال گزر گئے ہیں اس بات کو۔ معلوم میں اب وہاں کھیت ہوں گے کہ کوئی بلڈنگ بن گئی ہوگی"

میں نے کہا۔

"یہ میرے والد صا ب کی وصیت تھی۔ میں ہر حالت میں ان کی وصیت کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ امرتسر شہر کے اردگرد کا سارا علاقہ میرا جانا پہچانا ہے۔ جب پاکستان بنا تو مجھے اس وقت کافی ہوش تھا۔ میں وہ جگہ پہچان لوں گا جہاں میرے میاں جی نے میری بہن کی لاش کو زمین پر رکھ دیا تھا۔ میں اس وقت ان کے ساتھ تھا۔"

سید صاحب کچھ تذبذب میں پڑ گئے۔ سرہلا کر بولے۔

"برخوردار! میں تمہیں وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی ہے جو چاہے کرو"

میں نے کہا۔

"میں شام کے وقت جب اندھیرا ہو جائے گا تو جاؤں گا۔ مجھے وہ جگہ یاد ہے۔ قریب ہی ریلوے پھاٹک تھا اور امرتسر شہر کے شریف پورے کی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔"

سید صاحب کہنے لگے۔

"""اب شریف پورے کا نام سکھوں نے سنگھ پورہ رکھ دیا ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر آج شام کو وہاں چلے جانا۔ لیکن ایک بات کا تمہیں مجھے یقین دلانا ہوگا"

"فرمایئے" میں نے پوچھا۔

سید صاحب نے کہا۔

"اگر خدا نہ کرے تمہیں پولیس نے پکڑ لیا تو پوچھ گچھ کے وقت ہمارا نام نہ لینا۔"

میں نے کہا۔

آپ یقین رکھیں۔ پولیس مجھ پر کیسا بھی تشدد کیوں نہ کرے۔ میری زبان پر آپ کا نام نہیں آئے گا"

سید صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ سر کو ہلاتے ہوئے بولے۔

"بھائی! تم یہاں کی پولیس کے تشدد سے واقف نہیں ہو۔ خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔۔۔۔"

اور وہ سر جھکائے اٹھ کر چلے گئے۔ دوپہر تک میں اسی کمرے میں رہا۔

پھر سید صاحب آگئے۔ کہنے لگے۔

"جتنا کچھ میں نے اپنے طور پر پتہ کرایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امرتسر پولیس کو یقین ہوگیا ہے کہ تم امرتسر سے نکل چکے ہو۔ اب ایسا ہے کہ میں چاہتا ہوں۔ یہ کام تم آج شام ہی کرلو۔ مگر تمہارا اکیلے ہی جانا بہتر ہوگا"

میں سورج غروب ہونے تک وہیں اسی کمرے میں رہا۔ جب سورج ڈوب گیا شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں سید صاحب کو بتا کر مزار سے نکل کھڑا ہوا۔ میں

اور جیکٹ والے لباس میں ہی تھا۔ مزار والے میدان کو پار کرنے کے بعد میں گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ نالہ آگے کی طرف جاتا ہے۔ اس نالے نے مجھے جی ٹی روڈ پر پہنچا دیا۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک جاری تھی۔ میں جی ٹی روڈ پر رام تلائی تک چلتا گیا۔ یہاں سے میں بائیں جانب ریلوے پھاٹک کی طرف ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی خفیہ پولیس والا میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ ریلوے پھاٹک پر آکر میں نے سامنے کی جانب دیکھا جدھر آگے جاکر مجیٹھ جانے والی ریلوے لائن جاتی تھی۔

یہاں کھیتوں کی ایک تکون سی بنی ہوتی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ یہاں ابھی تک کھیت ہی تھے۔ کوئی نئی بستی نہیں بنی تھی۔ میں یاد داشت کے سہارے ان کھیتوں میں آگیا۔ چلتے چلتے اس مقام پر پہنچا جہاں سے میرے باپ نے مجھے اور میری چھوٹی بہن کلثوم کا بازو پکڑ کر ریلوے لائن پار کی تھی۔ آگے جو چھوٹی سی کچی مسجد ہوا کرتی تھی وہ اب وہاں نہیں تھی۔ امرودوں کے باغ بھی ویسے کے ویسے ہی تھے۔ آگے وہ کھیت آگئے جہاں میرا باپ ہمیں لے کر بھاگا تھا اور سامنے سے ایک گھوڑ سوار سکھ گھوڑا دوڑاتا آیا تھا اور اس نے میری بہن کی گردن پر تلوار کا وار کیا تھا۔ یہاں سے میرا باپ میری زخمی بہن کو اٹھا کر کھیتوں میں بھاگتا ہوا چلا گیا تھا۔ میں روتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ میں اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا کہ کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں میری پیاری بہن کی لاش ہم چھوڑ گئے تھے؟ پورا یقین نہیں آرہا تھا۔ میں کچھ قیاس کر رہا تھا۔ کچھ اندازہ لگا رہا تھا۔ شام کا اندھیرا بھی گہرا ہوگیا تھا۔ کھیتوں پر رات کے اولیں اندھیرے کی چادر سی پھیلنے لگی تھی۔ اچانک مجھے چنبیلی کے پھولوں کی ہلکی سی مہک آئی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے ادھر ادھر کسی کھیت میں چنبیلی لگی ہو اور یہ اس کے پھولوں کی خوشبو ہوا کے ساتھ ادھر آگئی ہو۔ میں نے دوسرے کھیت میں جانے کے لئے قدم اٹھائے تو چنبیلی کی خوشبو تیز ہوگئی۔ بالکل اس طرح لگنے لگا جیسے کسی نے چنبلی کے پھول میرے چہرے کے قریب کر دیئے ہوں۔ ایک دم سے مجھے یاد آگیا کہ

میری چھوٹی بہن کلثوم بالوں میں چنبلی کا تیل لگایا کرتی تھی۔ میں وہیں ساکت سا ہوگیا۔ چنبیلی کی خوشبو پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری شہید بہن کی روح میرے پاس کھڑی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔ یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں ہم کلثوم کی لاش چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی۔ اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"کلثوم! میاں جی نے کہا تھا مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری میت بے گور کفن چھوڑ آیا تھا۔ میری بہن مجھے بھی معاف کر دینا"

اور میں روتے روتے وہیں کھیت میں بیٹھ گیا اور مٹی کو ہاتھ لگا کر اپنے ہاتھ کو بار بار چومنے اور اپنی شہید بہن سے معافیاں مانگنے لگا۔ میں دیر تک کھیت میں بیٹھا دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے روتا رہا۔ جب میرا غم کچھ ہلکا ہوا تو آہستہ آہستہ چلتا کھیت سے باہر نکل آیا۔ اس وقت چاروں طرف رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چنبیلی کی خوشبو میرے ساتھ ساتھ آرہی تھی۔ جب میں ریلوے پھاٹک پر پہنچا تو چنبیلی کی خوشبو پہلے سے ہلکی ہوگئی۔ میں جی ٹی روڈ پر آیا تو چنبیلی کی خوشبو مجھ سے جدا ہوگئی تھی۔ اپنی شہید بہن کو یاد کر کے میری آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے اندھیرے میں ٹاہلیوں کے درختوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ میں نے آہ بھر کر کہا۔

"الوداع میری بہن! اب حشر کے روز ملاقات ہوگی"

جس وقت میں مزار پر واپس آیا تو مزار کی بتیاں روشن تھیں۔ سید صاحب مزار کے باہر ایک طرف بے چینی سے ٹہلتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آئے اور سخت ناراض ہو کر بولے۔

"تم نے کمال کر دیا۔ اتنی دیر لگا دی۔ میں تو سخت پریشان ہوگیا تھا۔ جلدی سے پیچھے کواٹروں والی کوٹھڑی میں چلے جاؤ۔ تمہارے پیچھے تو کوئی نہیں لگا ہوا؟"

میں نے کہا۔

"میرا نہیں خیال پیچھے کوئی لگا ہو"

"خدا کے واسطے جلدی سے اندر جاؤ۔ میں آتا ہوں"

یہ کہہ کر سید صاحب مزار کے اندر چلے گئے۔ میں دوسری طرف والے دھریک کے درختوں میں سے گزر کر عقبی کواٹر نما کوٹھڑی میں آگیا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب بھی آگئے۔ انہوں نے واسکٹ کی جیب سے ریل گاڑی کا زرد رنگ کا ایک ٹکٹ نکال کر مجھے دیا اور کہنے لگے۔

"یہ امرتسر سے ہردہ سٹیشن تک کا ریل گاڑی کا ٹکٹ ہے۔ یہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ گاڑی رات کو 9 بج کر چالیس منٹ پر امرتسر سے روانہ ہوتی ہے۔ تم آج رات ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ ہم بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

میں نے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھ لیا اور سید صاحب کا شکریہ ادا کیا انہوں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا بٹوہ نکالا۔ اسے کھولا۔ اور اس میں سے انڈین کرنسی کے دس دس کے چھ نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"کاش میں اس سے زیادہ تمہارے لئے کچھ کر سکتا اسے میری جانب سے نذر سمجھ کر قبول کر لینا"

میں نے کہا۔

"شاہ جی! میرے پاس انڈین کرنسی موجود ہے۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

مگر سید صاحب نے روپے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا۔

"اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں۔ ابھی ٹرین میں کافی ٹائم ہے۔ میں نے کھانا منگوایا ہے۔ کھانا میرے ساتھ کھا کر ہی جانا۔"

میں نے پوچھا کہ ٹرین ہردہ سٹیشن پر کس وقت پہنچے گی۔ سید صاحب نے کہا۔

"یہ بڑا لمبا سفر ہے میرے عزیز۔ بس تم ڈبے کے کسی کونے میں بیٹھ جانا۔ جب

آج کی رات اور کل کی رات بھی ٹرین میں گزر جائے تو کسی مسافر سے پوچھ لینا کہ بھوپال کتنی دور ہے۔ بھوپال کے بعد ہوشنگ آباد کا سٹیشن آئے گا۔ اس کے بعد ہردہ کا چھوٹا سٹیشن آئے گا۔ بس وہیں اتر جانا۔"

پھر انہوں نے جیب ہی سے چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر کھولی۔ اس میں سے کسی کا نام پڑھا۔ اور نوٹ بک بند کرکے جیب میں رکھی اور مجھے کہا۔

"ہردہ جاکر ایک شخص سے مل لینا۔ وہ مجاہد کمانڈو کمال شاہ کا ٹھکانہ تمہیں بتادے گا۔ یہ آدمی دو ایک بار کمال شاہ کمانڈو کے ساتھ یہاں بھی آچکا ہے۔ اس کے آگے میرا نام لینا۔ ہرگز ہرگز کسی اور سے کمال شاہ کمانڈو کا ذکر نہ کرنا۔"

میں نے سید صاحب کو یقین دلایا کہ میں کمال شاہ کا نام کسی کے آگے نہیں لوں گا۔ سید صاحب کہنے لگے۔

"اس شخص کا نام ہے۔۔۔۔۔"

مگر میں آپ کو اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ وہ آج بھی زندہ ہے۔ میں اُس کا پتہ بھی آپ کو نہیں بتاؤں گا جو سید صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ اس طرح اس شخص کو نقصان پہنچنے کا شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ میں اس شخص کا فرضی نام جمیل رکھ لیتا ہوں۔ سید صاحب نے مجھے جمیل کا پورا ایڈریس بھی بتا دیا اور کہا۔

"دنیاوی اخلاق کے اعتبار سے جمیل کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ وہ بدمعاش ٹائپ آدمی ہے۔ مگر پاکستان کا سچا عاشق ہے اور کشمیر کے جہاد میں بھی حصہ لے چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں خود لے کر کمانڈو کمال شاہ کے پاس نہ جائے مگر تمہیں اس کا ٹھکانہ بتادے گا۔"

میں نے سید صاحب سے کہا کہ مجھے جمیل کا نام اور پتہ کاغذ پر لکھ دیں۔ انہوں نے کہا۔

"نہیں۔ تم دشمن ملک میں ہو اور تمہارے پاس ہردہ بھوپال وغیرہ کا ویزا نہیں ہے۔ تم جمیل کا نام پتہ اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔"

میں اپنے ذہن میں جمیل کا نام اور اس کا ایڈریس دہرانے لگا۔ مجھے سب یاد ہوگیا۔ اتنے میں کھانا آگیا۔ میں نے سید صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔ اتنی دیر میں رات کے پونے نو بج گئے۔ سید صاحب بولے۔

"اپنا پاسپورٹ سنبھال کر رکھنا۔ یہ پاکستانی پاسپورٹ ہے اگر راستے میں کوئی پوچھ بھی لے تو کہہ دینا کہ میں نے دلی کا ویزا لگوایا تھا مگر بھوپال کی سیر کرنے آگیا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات نہ کرنا۔ اب تم یہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پر چلے جاؤ۔ بمبئی جانے والی گاڑی یہیں سے تیار ہوتی ہے۔ قلی سے پوچھ لینا۔ یہ ٹرین کسی نہ کسی پلیٹ فارم پر ایک طرف کھڑی ہوگی۔ مسافر بھی بیٹھے ہوں گے۔ تم بھی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جانا اور زیادہ باہر نہ پھرنا۔۔۔۔۔"

پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے امرتسر سٹیشن کا راستہ معلوم ہے؟ میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو اپنے والد کے ساتھ یہیں سے گاڑی میں بیٹھ کر لاہور جایا کرتا تھا"

"بس ٹھیک ہے۔ لو پھر خدا حافظ۔ میں پہلے نکل جاتا ہوں تم کوٹھڑی سے نکل کر پچھلی طرف سے گراؤنڈ پار کرکے سیڑھیوں والے پل کی طرف چلے جانا"

سید صاحب نے مجھے گلے لگایا۔ پھر مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے دو منٹ بعد میں بھی کوٹھڑی سے نکل کر مزار کے پیچھے جو درخت تھے ان کے درمیان سے ہوتا ہوا گراؤنڈ میں آگیا۔ گراؤنڈ کے آگے ریلوے لائن کی اونچی دیوار تھی۔ ذرا آگے سیڑھیوں والا پل تھا جو ریلوے یارڈ کے اوپر بنا ہوا تھا۔ یہ سارے راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ جب میں گراؤنڈ میں سے رات کے اندھیرے میں گزر رہا تھا تو

میں نے محسوس کیا تھا کہ کوئی شخص میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک جگہ رک کر میں نے پیچھے
کر دیکھا بھی مگر مجھے کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ایک آدمی
تعاقب کر رہا تھا۔

رات کے پونے نو بجے کا وقت تھا۔ امرتسر شہر میں کوئی اتنی زیادہ روشنیاں نہ
تھیں۔ ریلوے لائن پر سگنل کی سرخ سبز بتیاں نظر آتی تھیں۔ دائیں جانب مکانوں
روشنی تھی۔ سڑک پر کافی فاصلے فاصلے پر سٹریٹ لیمپ روشن تھے۔ سیڑھیوں والا ریلوے
کا پل مجھ سے تھوڑی دور ہی رہ گیا تھا۔ میں سڑک پار کر کے پل کی طرف بڑھا تو اچانک
کسی نے پیچھے سے میرے بازو کو پکڑ کر پنجابی میں پوچھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں؟ ایک
کے لئے میرا جسم خوف کے مارے بے جان سا ہو گیا۔ وہ آدمی اب میرے سامنے آگیا
یہ وہ ہندو نہیں تھا۔ جو اس سے پہلے میرے خیال کے مطابق دلی سے میرا پیچھا کر رہا
اور جس نے مجھے گرفتار کرانے کے لئے مزار پر بھی چھاپہ ڈلوایا تھا۔ یہ آدمی بھی ہندو
سکھ نہیں تھا مگر جوان اور اچھے ڈیل ڈول والا تھا۔ تنگ ہندووانہ پاجامہ اور کرتا پہنا
تھا۔ اوپر صدری پہن رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ صدری کی جیب میں تھا۔ میں نے
گھبراہٹ پر بہت حد تک قابو پالیا تھا۔ میں نے بھی پنجابی میں بڑے اعتماد سے کہا۔

"گھر جا رہا ہوں"

"کہاں ہے تمہارا گھر؟"

وہ میرے بالکل سامنے تھا۔ اس نے میرا ایک بازو ابھی تک اپنی گرفت میں لے
تھا۔ میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم میرا بازو تو چھوڑو۔
سینما کے پاس ہے میرا گھر۔"

وہ شخص بڑی عیاری سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔

میں نے فوراً کہا۔

"موہن چند۔"

موہن چند نام کا ایک ہندو لڑکا مجیٹھ کے سکول میں میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔

وقت اچانک مجھے اس کا نام یاد آگیا تھا۔ اس آدمی نے ایک ہاتھ سے میرا بازو پکڑے رکھا۔
دوسرا ہاتھ جو اس کی صدری میں تھا اس نے باہر نکالا تو اس میں ایک پستول تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا وہاں تم اپنا اصلی پاکستانی نام بتاؤ گے"

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ تھانے جانے کا مطلب یہ تھا کہ پولیس کو معلوم
ہو جاتا کہ میں پاکستانی ہوں۔ پاسپورٹ پر دلی کا ویزا لگا تھا مگر میں غیر قانونی طور پر امرتسر
آگیا ہوں۔ پولیس نے ظاہر ہے مجھے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لینا تھا اور پھر مجھ پر
تشدد اور اذیتوں کا ایک ناقابل ختم سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایک سیکنڈ میں مجھے اپنے مقاصد
اور امیدوں کے محل مسمار ہوتے نظر آئے۔ ایک بات بالکل واضح تھی کہ میں اس شخص
سے بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا اور پولیس میری تلاش میں مزار پر پہلے
بھی چھاپہ مار چکی تھی۔ اب میں اس کے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔ میں نے اس کے باوجود
آخری کوشش کے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میرا نام
موہن چند ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے
پستول والا ہاتھ صدری کی جیب میں ڈال لیا اور بولا۔

"میرا نشانہ بڑا پکا ہے۔ تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے پستول کی گولی
تمہیں وہیں سڑک پر گرا دے گی۔ چپ چاپ میرے ساتھ تھانے چل پڑو"

وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ چلانے لگا۔ اس کا رخ ہال بازار کی طرف تھا۔ میں
سمجھ گیا کہ وہ مجھے کوتوالی لے جا رہا ہے۔ کوتوالی کا تھانہ ہال بازار کے آخری سرے پر تھا۔
پاکستان بننے سے پہلے جب کبھی میں اپنے میاں جی کے ساتھ امرتسر آتا تھا تو کوتوالی کے
قریب سے کئی بار گزرا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ ہال بازار میں دو مسجدیں بھی ہیں۔ مگر
ظاہر ہے پاکستان بن جانے کے بعد اور مسلمانوں کے امرتسر شہر خالی کر دینے کے بعد یہ
مسجدیں ویران ہو گئی تھیں۔ میں اس خفیہ پولیس والے کے شکنجے میں جکڑا ہوا اس کے
ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم لال گیٹ کے نیچے سے گزر کر ہال بازار میں آگئے۔ میں نے
دل میں پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک بار تو فرار ہونے کی کوشش ضرور کروں گا چاہے گولی لگنے

سے زخمی کیوں نہ ہو جاؤں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ شخص فائر کرے اور گولی مجھے نہ لگے
رات کا وقت ہے میں اندھیرے میں کسی نہ کسی طرف نکل سکتا ہوں۔ ہال بازار میں ہر
سکھ آجا رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ کچھ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہم مسجد خیرالدین کے
آگے سے گزر گئے۔ اس کے آگے گول ہٹی والا چوک آتا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ یہاں سے
ایک بازار رام باغ کی طرف نکلتا ہے۔ اس بازار میں طوائفیں بیٹھتی تھیں۔ مجرا بھی ہو
تھا۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ اس بازار میں سے بھی دو تین بار گزرا تھا۔ کیونکہ
وہاں آٹے دال اور پرچون کی دکانیں بھی تھیں۔

میں نے دل میں طے کرلیا کہ جیسے ہی گول ہٹی والا چوک آئے گا میں رام باغ کی
طرف دوڑ پڑوں گا۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ کیونکہ تھانے پہنچنے کے بعد میری
اور میرے مشن کی موت یقینی تھی۔ مجھے ہر حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے جان کی
بازی لگانی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا چوک میں گول ہٹی کھلی تھی۔ یہ سکھوں کی مٹھائی کی
دکان ہوا کرتی تھی جہاں منیاری کا سامان اور تلواریں کرپانیں بکا کرتی تھیں۔ خفیہ پولیس
والے نے میرا بایاں بازو پکڑ رکھا تھا۔ اپنا دوسرا ہاتھ جس میں پستول تھا اس نے صدری کی
جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ میں نے گہرے گہرے لمبے لمبے سانس لینے شروع کردیئے اور دل
میں خدا سے کہا۔

"میرے مولا! اس وقت میری مدد فرما۔ میں تیرے دین کے راستے پر جہاد کرنے
نکلا ہوں۔ مجھے ان کافروں کے ہاتھوں مرنے سے بچالے"

میرا بھی وہ بھرپور شباب کا زمانہ تھا۔ میرا ہڈ کاٹھ بھی بڑا مضبوط تھا۔ بدن میں جوان
خون اور اسلام کا جوش و جذبہ موجزن تھا۔ گہرے سانس لینے سے میرے خون میں پوری
آکسیجن شامل ہوگئی تھی۔ جیسے ہی میں چوک میں پہنچا۔ میں نے یا علی ؑ کا نعرہ لگا
ایک ہی جھٹکے سے اپنے آپ کو کافر پولیس والے سے چھڑایا اور رام باغ کی طرف جانے
والے طوائفوں کے بازاروں میں اندھا دھند بھاگ اٹھا۔ مجھے یقین تھا کہ بازار میں رات

ہے۔ خفیہ پولیس والا میرے پیچھے ضرور بھاگے گا مگر گولی فائر نہیں کرے گا۔ اور ایسا ہی
ہوا میرے پیچھے کوئی فائر نہ ہوا۔ شور ضرور اٹھا۔ پکڑلو پاکستانی جاسوس کو پکڑلو خفیہ پولیس
والا چلاتا ہوا میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ مگر میرے اندر کوئی ایسی طاقت آگئی تھی کہ ایک
دو آدمیوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر میں انہیں گرا کر آگے نکل گیا۔ لیکن یہ
بات میں جانتا تھا کہ جہاں سارا شہر میرا مخالف ہو وہاں زیادہ دیر تک میں بھاگ نہیں سکتا۔
مجھے فوراً کسی جگہ چھپ جانے یا جل دے کر کسی دوسری طرف نکل جانے کی ضرورت
تھی۔

یہ بازار اگر چہ میرا دیکھا بھالا تھا مگر میں اس کی گلیوں کی بھول بھلیوں سے واقف نہ
تھا۔ مجھے بائیں جانب ایک گلی نظر آئی۔ میں گلی میں گھس گیا۔ گلی آگے جاکر مڑ گئی۔ میں
بھی بھاگتا بھاگتا اسی طرف گھوم گیا۔ میرے پیچھے مجھے لوگوں کے قدموں کی آواز دور ہوتی
محسوس ہوئی۔ شاید کسی نے لوگوں کے ہجوم میں مجھے گلی میں مڑتے نہیں دیکھا تھا۔ گلی
میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ بجلی کا کوئی کھمبا نہیں تھا۔ مگر میری بد قسمتی کہ جیسے ہی بھاگتا
بھاگتا میں ذرا آگے گیا تو معلوم ہوا کہ گلی آگے جاکر بند ہو گئی ہے۔ اب میرا پکڑا جانا یقینی
تھا۔ بازار میں مجھے پاکستانی جاسوس کو پکڑلو کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ میں کسی مکان کی
سیڑھیاں تلاش کرنے لگا کہ کسی مکان کے اوپر چڑھ کر چھتوں چھتوں پر سے ہوتا ہوا
دوسرے بازار میں نکل جاؤں۔ ایک دروازہ نظر آیا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا میں نے
اندھیرے میں دوسری طرف گھوم کر دیکھا۔ اچانک مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"میرے سوامی! میرے ناتھ! تم آگئے؟"

گلی میں اندھیرا ضرور تھا مگر اسی اندھیرے میں میں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ
جہاں گلی بند ہوتی تھی اس کی دیوار کے ساتھ ہی ایک مکان کی بیٹھک کی کھڑکی کھلی تھی۔
اس میں ایک عورت کا چہرہ نظر آیا جو مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلاتے ہوئے
بار بار کہہ رہی تھی۔

"میرے سوامی! میرے ناتھ تم آگئے۔ آجاؤ میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہاری

"داسی ہوں"

مجھے اس وقت یہ معلوم کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ یہ عورت کون ہے اور اس کے سوامی کون ہیں۔ میں اس کی طرف لپک کر گیا۔ کھڑکی زمین سے کوئی چار فٹ اونچی تھی اور کھلی تھی۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر عورت پیچھے ہٹ گئی۔

میں کھڑکی میں سے اندر کود گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں نے عورت سے کہا۔

"کھڑکی بند کردو"

اس عورت نے جو خدا جانے کون تھی فوراً کھڑکی بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اب میں فرش پر بیٹھا ہانپ رہا تھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کسی مکان کی اس قسم کی بیٹھک تھی کہ جس کی کھڑکی اس گلی میں کھلتی تھی اور دروازہ کسی دوسری گلی میں کھلتا تھا۔ مجھے طبلے بجنے اور گھنگھروؤں کی جھنکار کی آوازیں سنائی دیں۔ میں کسی طوائف کے مکان کی نچلی بیٹھک میں آگیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ یہ عورت کون تھی۔

اس عورت نے بے اختیار مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور خوشی سے نہال ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔

"میرے سوامی! میرے ناتھ! آخر تم نے اپنی پتنی کو معاف کر دیا۔ آخر تم میرے پاس آگئے۔ ہے بھگوان! تیری کرپا ہے۔۔۔۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور مجھ سے کس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔ میرا ایک کان باہر کی آوازوں پر بھی لگا تھا۔ مجھے دھڑکا لگا تھا کہ خفیہ پولیس والا لوگوں کو لے کر گلی میں ضرور آئے گا۔ اگرچہ مکان کی کھڑکی بند تھی مگر وہ کھڑکی کھل بھی سکتا تھا۔ اگر انہوں نے مجھے اس گلی میں گھستے دیکھ لیا ہے اور گلی آگے جا کر بند ہو جاتی ہے تو لا محالہ وہ یہی سمجھیں گے کہ میں اسی مکان میں گھسا ہوں۔ مگر گلی میں خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو صرف طبلے اور گھنگھروؤں کی آواز ہی پریشان کر رہی تھی۔ اوپر چھت

کوئی طوائف مجرا کر رہی تھی جس کے پاؤں کی تھاپ بھی چھت پر سنائی دینے لگی تھی۔

میں نے آہستہ سے عورت سے کہا۔

"یہاں کوئی اور دروازہ بھی ہے؟"

عورت نے ابھی تک مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا اور بار بار میری بلائیں لے رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ اتنے میں اس عورت نے خدا جانے کہاں سے موم بتی اور ماچس نکالی اور موم بتی روشن کر دی۔ موم بتی کی روشنی میں جو چیز مجھے سب سے پہلے نظر آئی وہ اس عورت کے ایک پاؤں میں پڑی ہوئی لوہے کی زنجیر تھی۔ میں ٹھٹک سا گیا۔ پھر عورت کو دیکھا۔ یہ پچیس تیس سال کی جوان ہندو عورت تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ سفید ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ مانگ میں سیندور بھی بھرا ہوا تھا۔ رنگ گورا تھا اور بڑی صحت مند عورت تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت سی جھلک رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ جلتی ہوئی موم بتی اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ اس نے موم بتی میرے چہرے کے آگے لا کر اس طرح دائیں بائیں تین چار مرتبہ گھمائی جس طرح آرتی اتاری جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ڈانس کرتے ہوئی گانے لگی۔ وہ دھیمی آواز میں کوئی بھجن گا رہی تھی جس کے یہ بول مجھے آج بھی یاد رہ گئے ہیں۔

میں تیری داسی جنم جنم کی

کرپا کر اپنایو

میرے رام رمیا

او میرے رام رمیا

میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ اس کوٹھے کی طوائف کی کوئی پاگل بیٹی یا بہن تھی جسے بیٹھک میں زنجیر ڈال کر بند کر دیا گیا تھا کہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے۔ بیشک طوائفوں کی بھی اپنی ایک عزت ہوتی ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر یہ عورت طوائف کی بیٹی یا بہن نہ ہوتی تو وہ اسے کبھی اپنے گھر میں نہ رکھتی۔ میرے لئے یہ پاگل عورت

بھی اس وقت فرشتہ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ مگر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا
میرے لئے وہاں سے نکل جانا بہت ضروری تھا۔ پولیس پاکستانی جاسوس کی آسانی سے جا
نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پولیس نے سارے علاقے میں گھر گھر تلاشی لینی تھی۔ ابھی میں
سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں قدموں کی آواز گونجی۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ عورت نے بھجن گانا او
رقص کرنا بند کر دیا۔ کھڑکی کو اندر سے اس عورت نے کنڈی لگا دی تھی۔ باہر سے ک
نے زور زور سے کھڑکی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"کھڑکی کھولو۔ کھڑکی کھولو"

میں نے عورت سے کہا۔ "خبردار کھڑکی نہ کھولنا"

پاگل عورت کو ایک دم غصہ آگیا۔ سانے موم بتی بجھا دی اور بولی۔

"راکھشس پھر میرے رام کو مجھ سے الگ کرنے آگئے ہیں؟ یہ راون نے بھیجے
ہیں۔ میں ابھی ان کی خبر لیتی ہوں"

وہ لپک کر کھڑکی کی طرف گئی۔ کھڑکی کی کنڈی اتار کر کھڑکی کھولی باہر منہ نکالا اور با
جو لوگ بھی کھڑے تھے ان کو ایسی ایسی فحش گالیاں دینے لگی کہ میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا کہ
عورت جو ابھی میرا بھائی یا تلسی داس کا بھجن گا رہی تھی اتنی فحش گالیاں کیسے دینے لگ
ہے۔ باہر ہی سے کسی نے پکار کر کہا۔

"اوئے یار یہ تو روپا کنجری کی پاگل بیٹی ہے"

اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔ پاگل عورت اس وقت تک کھڑکی سے منہ باہر نکا
انہیں گالیاں دیتی رہی جب تک کہ وہ لوگ گلی سے باہر نہیں نکل گئے۔ پھر اس نے کھڑ
بند کر کے کنڈی لگا دی ور ساڑھی کی ذھب میں سے ماچس نکال کر موم بتی روشن کر
کھڑکی کی سل پر رکھ دی اور میرے آگے ہاتھ باندھ کر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی وہ آگے پیچھے
آہستہ آہستہ ہل رہی تھی اور بولے جا رہی تھی۔

"میرے رام رمیا! میرے کرشن کنھیا! اب اپنی داسی کو چھوڑ کر نہ جانا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ایک خاص طرز کے ساتھ ایک بار پھر آہستہ آہستہ بھجن گا لگی۔

"میرے تو رام رمیا پر بھوجی
میرے تو گردھر گوپال
دوسرا نہ کوئی رے
میں تیری داسی جنم جنم کی

اس عورت کے پاؤں میں جو پتلی سی لوہے کی زنجیر پڑی تھی اس کا ایک سرا فرش میں کھونٹی گاڑ کر اس کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میں نے موم بتی کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا۔ کونے میں ایک چارپائی بچھی تھی جس پر میلا کچیلا سا بستر لگا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بو کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ چارپائی کی پائنتی کی طرف ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ دروازہ باہر سے بند کیا ہوا تھا۔ پاگل عورت نے مجھے دروازے کی طرف جاتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف آئی اور پیچھے سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور روتے ہوئے بولی۔

"میرے گھن شام! اپنی داسی کو چھوڑ کر نہ جانا۔ میں تو جنم جنم سے تمہارے درشن کی پیاسی یہاں بیٹھی تھی۔ تم آئے تو میری بگھیا میں بہار آگئی۔ میرے سوامی! میرے ناتھ!-----"

وہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور اسے لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے حوصلہ دیا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ چھت کے اوپر کوٹھے میں طبلے باقاعدہ کھڑک رہے تھے۔ گھنگرو بج رہے تھے اور کوئی طوائف جو اس پاگل عورت کی ماں یا بہن تھی گانا گا رہی تھی اور ڈانس بھی کر رہی تھی۔ چھت پر اس کے پاؤں زور زور سے پڑنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

میں نے اس عورت سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے میری داسی؟"

میں اس کی زبان میں اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس عورت نے ہاتھ

جوڑ رکھے تھے۔ کہنے لگی۔

"سوامی جی! آپ اپنی بالکی کا نام بھی بھول گئے؟ ہائے میرے بھاگ پھوٹے۔

میں سچ مچ بڑی ابھاگن ہوں۔ سوامی جی! آپ کی پتنی کا نام سوگندی ہے۔"

پھر وہ جھوم جھوم کر گانے لگی۔

ہے رہی میں تو پریم دیوانی

میرا درد نہ جانے کوئی

وستوا مولک دی میرے ست گورو

کرپا کر اپنائیو

ہے ری میں تو پریم دیوانی۔۔۔۔۔۔

میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اگر چہ یہ دوسرا
مصیبت ہلاکت خیز نہیں تھی اور اس سے میں آسانی سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔ گ
ابھی میں کھڑکی میں سے کود کر فرار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ا
سارے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہوگا۔ مجھے یاد آگیا کہ آگے رام باغ
پولیس سٹیشن بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی گلی میں سے نکل کر بازار میں آیا پکڑا جاؤ
گا۔ اسی لئے میرا کچھ دیر اسی دیوانی عورت کے پاس رہنا بہت ضروری تھا۔ مجھے یہ ڈر بھ
لگا ہوا تھا کہ اوپر سے کوئی آدمی نیچے آگیا تو وہ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردے گا۔ ا
شور مچا دے گا۔ لیکن اوپر مجرا بڑے عروج پر تھا۔ اس لئے کسی کے ابھی نیچے آنے
امکان نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اس نیم دیوانی عورت سے مجھے اپنے سوال کے ٹ
جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں اس سے پوچھتا کچھ تھا اور وہ کچھ اور ہی جواب دے د
تھی یا پھر ہاتھ باندھ کر بھجن گانے لگتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ جو دروازہ ہے یہ باہر کہاں کھلتا ہے؟"

ایک دم سے جیسے وہ اپنی عقل میں واپس آگئی۔ کہنے لگی۔

"باہر گلی میں کھلتا ہے سوامی جی!"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"دروازہ باہر سے کس نے بند کیا ہے؟ یہ کون آکر کھولتا ہے؟"

اسی ہوش مندی کے موڈ میں اس نے جواب دیا۔

"میری بڑی دیدی آدھی رات کے بعد جب مجرا ختم ہو جاتا ہے تو آکر کھولتی
ہے مجھے دودھ اور پیڑے کھلاتی ہے۔ پھر چلی جاتی ہے۔"

اس وقت وہ ہوش مندی کے موڈ میں تھی۔ میں جلدی جلدی اس سے اپنے مطلب
کی معلومات حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اوپر اور کون کون رہتا ہے؟"

عقل کی جو لہر ایک پل کے لئے آئی تھی وہ گزر گئی۔ کہنے لگی۔ "سوامی
جی! آپ پرلوک سے آرہے ہیں تھک گئے ہوں گے۔ میں آپ کے پاؤں
داب دیتی ہوں"

پھر وہ میرے بوٹ اتارنے لگی۔ میں نے پاؤں پیچھے کرلئے۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر
نیچے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھی تھی۔ پھر اس نے میرے کپڑے اتارنے کی کوشش کرتے
ہوئے کہا۔

"لایئے میں آپ کے شریر کو پرسن کرتی ہوں"

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ "نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔ خبردار"

اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کرلئے اور بولی۔

"اچھا تو پھر میں اپنے کپڑے اتار دیتی ہوں"

میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار! ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں چارپائی پر بیٹھی رہو۔ نہیں تو ہم
واپس چلے جائیں گے"

وہ رونے لگی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جانا میرے سوامی! آپ جیسا کہو گے میں ویسے

ہی کروں گی۔ میں اپنی ساڑھی نہیں اتارتی۔۔۔۔"

اور وہ وہیں فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے جھومنے اور دھیمی آواز میں بھجن گانے لگی۔ اوپر مجرے کی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی اور طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ صرف ناچنے والی کے قدموں کی تاپ جو چھت پر پڑتی تھی زور سے سنائی دے رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ کہاں میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بھوپال کی طرف جارہا تھا اور کہاں اس جگہ آکر پھنس گیا ہوں۔ وقتی طور پر اس پاگل عورت کے پاس آکر میں پولیس سے ضرور گیا تھا مگر ابھی خطرے کی تلوار میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ پولیس اس طوائف کے مکان پر آکر اس کی تلاشی بھی لے سکتی تھی اور وہ نیچے پاگل عورت کے کمرے میں بھی دیکھنے آسکتی تھی کہ کہیں پاکستانی جاسوس وہاں تو نہیں چھپا ہوا۔ ہردہ سٹیشن تک کا تھ کلاس کا ریلوے ٹکٹ اور بھارتی کرنسی نوٹ میں نے مزار سے چلتے وقت ہی اپنی جراب میں چھپا کر رکھ لئے تھے۔ میری جیب میں صرف ایک عام سا چاقو پاسپورٹ اور پندرہ بیس روپے انڈین کرنسی کے تھے۔ ریل کے ٹکٹ کی معیاد چھ سات دنوں تک ہوتی تھی اور میں دوسرے تیسرے روز بھی ٹرین پکڑ سکتا تھا مگر اتنے روز میں وہاں ٹھہر ہی نہیں سکتا تھا۔ آدھی رات کے بعد اس پاگل عورت کی بڑی بہن جو اوپر مجرا کر رہی تھی مجرا ختم کر کے نیچے آنے والی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر ضرور شور مچائے گی۔ اس کے ساتھ ایک آدھ آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ آدھی رات کے بعد میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ مجھے آدھی رات سے پہلے پہلے وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ فرار ہونے کا راستہ ایک ہی تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر میں باہر چھلانگ لگاؤں گا اور گلی میں سے نکل جاؤں گا۔ مجھے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ ذرا رات گہری ہو جائے۔ مگر یہ طوائفوں کا بازار تھا جس کی رونق رات گئے تک قائم رہتی تھی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سے واپس ریلوے سٹیشن پر نہیں جاؤں گا۔ ریلوے سٹیشن پر جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنے کے برابر تھا۔ وہاں تو پولیس میرا

اش میں مجھ سے پہلے پہنچ چکی ہوگی۔ میں جی ٹی روڈ پر جاکر اس کے ساتھ ساتھ کھیتوں چلا جالندھر کی طرف جانا چاہتا تھا۔ راتوں رات جس قدر آگے نکل سکتا نکل جانا چاہتا صبح اگر راستے میں کوئی بڑا سٹیشن آگیا تو وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر امرتسر شہر سے دور جانا چاہتا تھا۔ یہی میرا پروگرام تھا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ رات کچھ اور گزر ائے۔ اوپر مجرے کی آواز رک گئی تھی۔ میں پونے نو بجے مزار سے چلا تھا۔ اس وقت میرے اندازے کے مطابق رات کے دس سوا دس بجے کا وقت تھا۔ مجرا رک گیا تھا۔ آدمیوں کے اونچی آواز میں بولنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ میری بالکی دیوانی عورت میرے سامنے اسی طرح فرش پر بیٹھی ہاتھ باندھے آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کر کوئی اشلوک پڑھ رہی تھی جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گلی میں کوئی ہے یا نہیں۔ ایک دم سے دیوانی اچھل کر اٹھی اور پیچھے سے آکر مجھے لپٹ گئی اور میری منتیں کرنی لگی۔

"سوامی! میرے ناتھ! مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب میں یہاں سے فرار ہونے لگوں گا تو یہ عورت تو مجھے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگاتے دیکھ کر شور مچادے گی۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ شور کی آواز سن کر اوپر سے لوگ نیچے آسکتے تھے۔ کیونکہ اب مجرا بھی نہیں ہو رہا تھا اور شور کی آواز اوپر جاسکتی تھی۔ میں جلدی سے واپس چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔

میں عورت کو تسلیاں دینے لگا۔

"تم کیوں گھبراتی ہو؟ میں تمہیں چھوڑ کر تھوڑے جارہا ہوں۔۔۔۔ تم تو میری بالکی ہو میری پتنی ہو"

عورت یہ سن کر جیسے نہال ہوگئی اور میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر بولی۔

"میرے گردھر گوپال! میرے سوامی دکھ بھنجن"

اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ عورت مجھے کھڑکی سے کودتا دیکھ کر صرف اپنے انداز
شور ہی مچا سکتی ہے۔ میرے پیچھے نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہو
تھی۔ وہ صرف کھڑکی کی تک ہی جا سکتی تھی۔ میں کچھ وقت اور وہاں گذرانا چاہتا تھا
رات ذرا زیادہ گزر جائے۔

اوپر چھت پر ایک بار پھر طبلے کھڑکنے گھنگھرو بجنے لگے۔ مجرا پھر شروع ہو گیا تھا۔
اس مجرے کے دوران ہی وہاں سے بھاگنا تھا۔ مجرے کے شور میں اوپر والے اس عور
کے شور مچانے کی آواز نہیں سن سکتے تھے اور گلی بالکل خالی تھی۔ گلی میں کسی مکا
دروازہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی گلی تھی جس میں سارے مکانوں کے پچھواڑے لگتے ت
جب میرے اندازے کے مطابق رات اتنی گزر گئی کہ مجھے وہاں سے نکل جانا چاہیے
میں بھاگنے کے لئے تیار ہو گیا۔ دیوانی عورت ابھی تک میرے گھٹنوں پر سر رکھے
تھی۔ خدا جانے وہ منہ ہی منہ میں کیا الا بلا پڑھ رہی تھی۔ موم بتی اس کھڑکی کی سل
لگی ہوئی تھی جس کو کھول کر مجھے گلی میں کودنا تھا۔ میں نے بڑے پیار سے عورت کے
پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

”مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس لگی ہے“

چارپائی کے پاس ایک صراحی رکھی ہوئی تھی جس کے اوپر گلاس اوندھا پڑا تھا۔
بے چاری عورت یہ سن کر جلدی سے اٹھی اور صراحی کے پاس جا کر گلاس میں پانی ڈا
لگی۔

بس یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ لپک کر کھڑکی کے
گیا۔ کھڑکی کی کنڈی کھولی اور دوسرے لمحے میں اندھیری گلی میں تھا۔ مجھے اپنے
دیوانی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے سوامی میرے سوامی کہہ کر مجھ
رہی تھی۔ یہ آواز طبلے اور گھنگھروؤں کے شور میں دب کر رہ گئی اور میں گلی میں
کر بازار میں آگیا۔ گلی میں میں دوڑتا ہوا آیا تھا۔ بازار میں آتے ہی میں آہستہ آہستہ
لگا۔ بازار میں پہلے جتنا رش نہیں تھا۔ سوائے پان سگریٹ کی دکانوں کے باقی ساری د

تھیں۔ تماش بین گلے میں ہار ڈالے ادھر ادھر منڈلاتے پھر رہے تھے۔ میں بند دکانوں
ئے ساتھ ساتھ چلتا رام باغ والے چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں رونق زیادہ تھی۔
ہاں ایک شرابی نے ہڑبونگ مچا رکھا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ مجھے موقع مل گیا۔ یہ
ں نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں پولیس کا سپاہی کوئی نہیں تھا۔ چوک کے بائیں جانب رام باغ کا
پولیس سٹیشن تھا۔ میں اس طرف جانے کی بجائے سامنے والی گلی میں گھس گیا۔ یہ گلی بد
و والے بازار کی طرف نکل جاتی تھی۔ ان راستوں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ بد
و والا بازار خالی پڑا تھا۔ یہاں سے میں پاتھی گراؤنڈ میں داخل ہو کر آگے جی ٹی روڈ پر
آگیا۔ میرے بائیں جانب شریف پورہ کی آبادی تھی جو پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کا
گڑھ ہوا کرتی تھی۔ اب اس کا نام سید صاحب کے بیان کےمطابق سنگھ پورہ رکھ دیا گیا
تھا۔ جی ٹی روڈ پر سے میں دوسری جانب کھیتوں میں اتر گیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔
رات کا وقت تھا۔ سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی ٹرک یا تانگہ گزر جاتا تھا۔ کھیت
سنسان تھے۔ چاروں طرف رات کے اندھیرے نے چادر تان رکھی تھی۔ میں رام تلائی
سے بھی آگے نکل گیا۔ پھر بائیں جانب مقبول پورے والی بستی آئی اور وہ بھی گزر گئی۔
س کے بعد بجلی والی نہر کا پل آگیا۔ میں نے اچھی طرح چاروں طرف دیکھ بھال کر پل
عبور کیا اب میں غیر آباد علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ کھیتوں کی بجائے اب میں سڑک کے
کنارے ٹاہلیوں کے درختوں کے نیچے سے ہو کر چلنے لگا تھا۔ دور سے کسی ٹرک یا بس کی
روشنی نظر آتی تو میں کھیت میں چھپ جاتا۔ اس طرح میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔
میرے بدن میں جوانی کا خون تھا۔ تھکاوٹ بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن رات
بھر پیدل چلنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے سوچا مجھے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنا
چاہیے۔ تاکہ اگر کسی سٹیشن پر جالندھر کی طرف جانے والی کوئی گاڑی نظر آئے تو اس
میں سوار ہو جاؤں۔ ریل گاڑی کا ٹکٹ میرے پاس ہی تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ
ریلوے لائن کس طرف ہے۔ میں جی ٹی روڈ سے ہٹ کر کھیتوں میں آگیا۔ فصل اونچی
نہیں تھی۔ مجھے کسی سگنل کی بتی کی تلاش تھی۔ میں کھیتوں میں چلتا رہا۔

کوئی آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد مجھے دور ریلوے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔ میں ا
طرف چلنے لگا۔ وہاں سے ریلوے لائن زیادہ دور نہیں تھی۔ ریل کی پٹڑی زمین سے ز
اونچی تھی۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ اندازہ نہیں کہ میں کتنی
تک چلا ہوں گا۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ جسم پسینے میں شرابور ہوگیا تھا۔ ا
تک کوئی سٹیشن بھی نہیں آیا تھا۔ میں سانس لینے کی خاطر ریلوے لائن کے پاس بیٹھ گ
پیچھے سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دور انجن کی لائ
چمک رہی تھی۔ میں لائن سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی شور مچاتی گزر گ
جب تک ٹرین کی پچھلی لال بتی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی میں اسے دیکھتا ر
میں اس گاڑی کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اگلا سٹیشن کتنی دور ہے
جب تھکاوٹ کچھ دور ہوئی تو میں اٹھ کر لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ یہ اطمینان ض
تھا کہ میں امرتسر پولیس کے چنگل سے نکل آیا تھا۔ رات بڑی خاموش تھی۔ آسمان
تارے چمک رہے تھے۔ راستے میں ایک بڑی نہر کا پل آیا۔ میں نے لائن کے درمیان
سے سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتے ہوئے پل عبور کیا۔ دور کھیتوں میں کسی گاؤں کی دو
بتیاں جلتی نظر آئیں۔ پھر یہ گاؤں بھی گزر گیا۔ میں چلتے چلتے واقعی تھک گیا تھا۔ میں
سوچا کہ کوئی محفوظ سی جگہ دیکھ کر باقی رات وہاں آرام کرنا چاہیے۔ جب صبح ہو تو ان
روشنی میں سفر کرنا چاہیے۔

اندھیرے میں سوائے کھیتوں پر پھیلی ہوئی دھندلی سی تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں
تھا۔ میں ایک جگہ تھک کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں اب اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں
میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے نشیب میں ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے۔ میں ڈھلا
سے اتر کر وہاں آگیا۔ یہ چبوترہ پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا اور چھوٹا سا تھا۔ پتہ نہیں یہ کس
بنوایا ہوا تھا۔ بہر حال رات بسر کرنے کے لئے یہ اچھی جگہ تھی۔ پنجاب میں مارچ ا
کے دنوں میں راتیں خشک ہوتی ہیں۔ میرا بدن گرم تھا۔ میں چبوترے کے فرش پر با
سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جب ذرا بدن کی گرمی دور ہوئی تو سردی محسوس ہونے لگی۔ میں

گھٹنے اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لئے اور گیند سا بن کر آنکھیں بند کر لیں۔ بہت تھکا ہوا تھا۔
نیند نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب ایک ریل گاڑی شور مچاتی لائن پر سے گزری۔ میں نے
آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آسمان پر صبح کا نور پھیلنے لگا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ میں اگرچہ دو
تین گھنٹے ہی سویا تھا مگر میری ساری تھکاوٹ دور ہوگئی تھی۔ میں نے کلمہ شریف پڑھ کر
منہ پر ہاتھ پھیرا اور آگے روانہ ہوگیا۔ میں ریلوے لائن سے ہٹ کر کھیتوں کے ساتھ
ہو کر چل رہا تھا۔ دن کی سفیدی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ پھر سورج نکل آیا۔ دور
تک کھیت ہی کھیت تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں
جانب کافی فاصلے پر ایک گاؤں آیا۔ میں آگے نکل گیا۔ یہ سارے گاؤں سکھوں کے ہی ہو
سکتے تھے۔ ظاہر ہے وہاں کوئی مسلمان گھر نہیں تھا۔ میں کسی گاؤں میں نہیں جا سکتا تھا حیرانی
کی بات تھی کہ ابھی تک کوئی سٹیشن نہیں آیا تھا۔

میں کافی دیر تک چلتا رہا۔ کھیت ختم ہوگئے تو ویران زمین کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک
چھوٹی سی ندی آئی جس کے کنارے کیکر کے درخت تھے۔ میں نے کیکر کی ایک شاخ توڑ
کر اس کی مسواک بنائی۔ اس سے دانت صاف کئے۔ ندی کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔
تھوڑا سا پانی بھی پیا۔ اس کے بعد دوبارہ آگے چل پڑا۔ کہیں کہیں سکھ ہندو کسان کھیتوں
میں ہل چلاتے نظر آرہے تھے۔ مگر وہ مجھ سے کافی دور تھے۔ دور سے ایک گڈ آتی نظر
آئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ گڈ چارے سے لدی ہوئی تھی۔ اس پر
ایک سکھ بیٹھا تھا۔ گڈ کے آگے دو بیل جتے ہوئے تھے۔ جب گڈ گزر گئی تو میں درخت کی
اوٹ سے نکل آیا۔ اب پھر کھیت شروع ہوگئے تھے۔ ایک جگہ دور رہٹ چل رہا تھا۔
روں روں کی آواز آرہی تھی۔ میں چلتا گیا۔ ایک گاؤں آگیا جو کافی بڑا لگتا تھا۔ کچے
مکانوں کی سفید سفید دیواریں اور ان پر جھکے ہوئے درخت دھوپ میں صاف نظر آرہے
تھے۔ مگر یہ گاؤں مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں اس گاؤں سے کترا کر آگے نکل گیا۔
مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر وہاں میں کسی سے کھانے پینے کو طلب نہیں

کر سکتا تھا۔ یہ گاؤں بھی ظاہر ہے ہندو سکھوں کا ہی تھا۔ دھوپ کافی نکل آئی تھی اور
چلتے مجھے پسینہ آرہا تھا۔ وہاں کوئی سڑک یا راستہ تو تھا نہیں۔ میں کھیتوں کھیت چل رہا
کبھی چلتے چلتے ایک کھیت میں آجاتا۔ کبھی دوسرے کھیت کی مینڈھ پر چلنے لگتا۔ یہاں فصلیں
میرے قد کے برابر اونچی تھی۔ میں ایک کھیت کی مینڈھ پر سے گزر رہا تھا۔ میری
ست ہو گئی تھی۔ مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔
وہیں رک گیا۔ یہ عورت کسی بچے کو کچھ کہہ رہی تھی۔ میں وہیں سے واپس مڑنے
تھا کہ میرے قدم اپنے آپ رک گئے۔ اصل میں اس عورت نے جو فصل کے
ایک ایسا جملہ بول دیا تھا جس نے میرے قدم روک دیئے تھے۔ اس عورت نے
زبان میں کہا تھا۔

"کہو پتر لا الہ الا اللہ........"

ساتھ ہی کسی آٹھ نو سال کے لڑکے نے کہا۔

"لا الہ الا اللہ........"

میں حیران سا ہو کر وہیں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا یہ مسلمان عور
کہاں سے آگئی ہے اور یہ اپنے بیٹے کو کھیتوں میں بٹھا کر کلمہ شریف کیوں پڑھا رہی
مشرقی پنجاب میں جتنے مسلمان خاندان آباد تھے انہیں سن 1947ء میں ہندو سکھوں نے
کر دیا تھا اور جو بچ گئے تھے وہ بھاگ کر پاکستان آگئے تھے۔ یہ مشرقی پنجاب کا علاقہ
یہاں کسی مسلمان گھرانے کا موجود ہونا ناممکن بات تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا۔ وہ عو
اپنے بیٹے کو کلمہ شریف پڑھنا سکھا رہی تھی۔ میں نے فصل میں سے دیکھنے کی کوش
مگر فصل اتنی گھنی تھی کہ مجھے وہ عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ فصل اونچی بھی
میرے سامنے کھیت کی مینڈھ دور تک چلی گئی تھی۔ میں مینڈھ سے ایک طرف ہٹ
فصل کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھا تھا۔

عورت نے تین چار مرتبہ لڑکے کو کلمہ شریف یاد کرایا اور پھر کہا۔

"جا پتر اب سکول جا۔ دیر نہ ہو جائے"

مجھ سے کوئی پچاس گز دور ایک جگہ سے فصل کے پودے ایک طرف ہٹے اور فصل
کے اندر سے ایک سات آٹھ سال کا لڑکا باہر نکلا جس نے قمیض اور نیکر پہن رکھی تھی۔
یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکا سکھ تھا۔ اس کے سر پر پگڑی تو نہیں تھی لیکن اس نے
بالوں کا جوڑا سر کے اوپر بنا کر جوڑے کو رومال سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ
عورت بھی کھیت سے باہر نکل آئی جو اس سکھ لڑکے کو کلمہ شریف یاد کرا رہی تھی۔
میرے لئے یہ عجیب و غریب لمحہ تھا جس کو میرا دماغ حل نہیں کر سکا تھا۔ سکھ لڑکے کے
پیچھے گلے میں سکول کا بستہ لٹک رہا تھا۔ وہ ایک جگہ اپنی ماں سے جدا ہو کر دوسرے کھیت کی
طرف چل دیا۔ اس کا اسکول اس طرف ہوگا۔ اب مینڈھ پر وہ عورت اکیلی جارہی تھی۔
وہ شلوار قمیض میں تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس بات سے بھی مجھے حوصلہ ہوا کہ یہ
عورت مسلمان ہے اس سے مجھے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

میں جلدی اٹھا اور عورت کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ عورت دوسرے
کھیت کی طرف مڑنے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر کہا۔

"بہن جی! ذرا رکنا"

عورت وہیں رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور سر پر دوپٹہ ٹھیک
کرنے لگی۔ میں نے اس کے قریب جا کر اسے اسلام علیکم کہا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ حیران
ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ میں نے پنجابی میں
کہا۔

"بہن جی! میں بھی مسلمان ہوں"

میں نے کلمہ شریف پڑھ دیا اور کہا۔

"بہن جی! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کا بیٹا سکھ ہے اور آپ اسے
کلمہ شریف یاد کرا رہی تھیں۔"

میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں فصل میں چھپ کر ان ماں بیٹے کی باتیں سن رہا
تھا۔ عورت کی عمر تیس بتیس سال کے قریب ہوگی۔ رنگ صاف تھا اور چہرے پر ایک

عجیب سی اداسی کا تاثر تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم مسلمان ہو تو یہاں کیسے آگئے ہو"

میں نے کہا۔

"بہن جی! میں پاکستان سے ویزا لگوا کر امرتسر آیا تھا۔ ریل گاڑی میں بیٹھ کر دلی جارہا تھا۔ راستے میں ایک سٹیشن پر گاڑی رکی۔ میں پانی پینے کے لئے اترا اور گاڑی چل دی۔ اب پیدل ہی اگلے اسٹیشن کی طرف جارہا تھا کہ ذرا سیر بھی ہو جائے گی اور اگلے سٹیشن پر دوسری گاڑی بھی پکڑ لوں گا۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے آپ کی آواز سنی کہ آپ کسی لڑکے کو کلمہ شریف یاد کرارہی تھیں۔ میں وہیں رک گیا۔ میں ابھی تک حیران پریشان ہوں کہ آپ سکھ عورت ہیں مگر اپنے بیٹے کو مسلمانوں کا کلمہ شریف یاد کراتی ہیں۔ یہ کیا راز ہے؟"

اتنا میرے دل کو یقین تھا کہ یہ عورت مسلمان ہے۔ کیونکہ کسی سکھ عورت کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنے سکھ بیٹے کو اسلام کا کلمہ یاد کرائے۔ لیکن میں نے اپنے اس کو اس پر ظاہر نہ کیا اور سے یہی کہا کہ وہ سکھ عورت ہو کر اپنے بیٹے کو کلمہ پاک کیوں کرارہی تھی۔ عورت کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ اس نے میرے سوال جواب دینے کی بجائے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تم پاکستان سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ یہ میرا پاسپورٹ دیکھ لو"

اور میں نے اسے پاسپورٹ نکال کر دکھایا۔ عورت پڑھی لکھی لگتی تھی۔ اس پاکستانی پاسپورٹ کو غور سے دیکھا۔ پھر اسپر لگی ہوئی میری تصویر دیکھی۔ پھر پاسپورٹ چوم کر آنکھوں سے لگایا جب اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کیا تو اس کی آنکھوں میں تھے۔ معمہ اور پیچیدہ ہوگیا تھا۔ میں چپ کھڑا اس کو تک رہا تھا۔ عوت نے دوپٹے آنسو پونچھے۔ ایک نظر پیچھے کھیتوں کی طرف دیکھا اور اداس لہجے میں کہا۔

"وہاں آجاؤ بھائی"

وہ مجھے فصل کے اندر لے گئی۔ یہاں تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اب اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں پریشان ہوگیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں یونہی اسے تسلیاں دینے لگا۔ رونے سے جب اس عورت کے دل کا غبار ذرا دھلا تو وہ کہنے لگی۔

"میں سکھ نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ مگر ایک سکھ کی بیوی بنا دی گئی ہوں"

میں دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔ تب اس بدنصیب مسلمان عورت نے اپنی جو دردناک کہانی سنائی وہ میں آپ کو اپنے لفظوں میں سناتا ہوں۔ جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو مشرقی پنجاب میں ہندو سکھوں نے مل کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کردیا۔ مسلمانوں کے گھروں کو جلا دیا۔ انہیں بے دردی سے قتل کیا گیا۔ ان کے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ مسلمان عورتوں کو اغوا کرلیا گیا۔ ہر طرف مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی۔ جو مسلمان کسی طرح جانیں بچاکر قافلوں کی شکل میں پاکستان کی طرف چلے انہیں بھی معاف نہیں کیا گیا۔ پاکستان کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے جگہ جگہ سکھوں نے ان پر حملہ کئے۔ نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کرلے گئے۔ اس عورت کا نام رضیہ بانو تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ ان کا گھر کرتار پورہ کے قصبے میں تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو اس وقت رضیہ بانو کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ ایک ماں تھی۔ باپ تھا۔ سکھوں نے قصبے کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کردیا۔ رضیہ بانو کا باپ اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر گھر سے بھاگا۔ سکھوں نے اس کا پیچھا کیا۔ رضیہ بانو کا بیان ہے کہ سکھوں نے اس کے سامنے اس کے ماں باپ اور دو چھوٹے بھائیوں کو کرپانیں مار مار کر شہید کردیا۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک سکھ کے گھر میں تھی۔ یہ سکھ اسے اغوا کرکے لے آیا تھا۔ پہلے تو ایک سال تک اس نے رضیہ کو ویسے ہی گھر میں ڈال رکھا۔ پھر اس سے سکھوں کے رواج کے مطابق شادی کرلی۔ رضیہ کے تین بچے پیدا ہوئے جو دو چار

چار سال کی عمر تک پہنچ کر مرگئے۔ پھر یہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام باپ نے بشن سنگھ رکھ
رضیہ بانو نے بتایا کہ میرے ساتھ قسمت نے جو کچھ کرنا تھا وہ ہوگیا تھا۔ مگر میں چاہتی
کہ میرا بچہ سکھ نہ بنے وہ مسلمان بن کر زندگی گزارے۔ چنانچہ اس نے اپنے سکھ خاو
سے چھپ کر اسے نماز پڑھنی اور کلمہ شریف پڑھنا بھی سکھا دیا تھا۔ رضیہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے اپنے سکھ بیٹے کا خفیہ نام غلام علی رکھا ہے۔ لڑکا مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ میں نے اسے نماز پڑھنی بھی سکھا دی ہے۔ جب ہم گھر میں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ میرے ساتھ مل کر دو نفل بھی ادا کرلیتا ہے۔ میں اسے باقاعدہ نماز نہیں پڑھا سکتی۔ اس کا سکھ باپ بڑا ظالم اور متعصب سکھ ہے۔ ہم نے یہ بات اس سے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ میرے بیٹے نے کلمہ شریف کے علاوہ الحمد شریف بھی مجھ سے سیکھ کر زبانی یاد کر رکھی ہے۔ مگر میں ہر روز جب وہ اسکول جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہاں تک آتی ہوں اور راستے میں اسے کلمہ شریف یاد کراتی رہتی ہوں۔ میرا بیٹا اندر سے پورا مسلمان بن چکا ہے۔ اب میری زندگی کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ کسی طرح اپنے بیٹے کو لے کر پاکستان جاؤں اور پھر وہاں سے کبھی واپس نہ آؤں۔ مگر میرا خاوند مجھے پاکستان کا نام تک نہیں لینے دیتا۔"

پھر اس نے ہندو سکھ عورتوں کی طرح میرے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"بھائی! میرے بیٹے کو کسی طرح پاکستان پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی"

میں اس مسلمان عورت کی الم ناک داستان سن کر سکتے میں آگیا تھا۔ میرے سا
ایک ایسی مظلوم عورت ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی جس نے اپنے ماں باپ بھائیوں کو ہی
اپنی عزت کو بھی پاکستان پر قربان کر دیا تھا۔ یہ سن سنتالیس میں مشرقی پنجاب میں
سکھوں کے ہاتھوں اغواہ شدہ ایک مسلمان عورت کا المیہ نہیں تھا۔ بلکہ ایسی ہزا
لاکھوں مسلمان عورتوں کا المیہ تھا جو نہ جانے بھارت کے دیش میں کافروں کے دیش

کہاں کہاں کیسی کیسی ذلت کی زندگیاں بسر کر رہی تھیں۔ یا مرکھپ گئی تھیں میں قوم کی ان بدنصیب بیٹیوں کی تصویر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں کو دکھانا چاہتا ہوں جو وی سی آر پر بھارتی فلموں کے گانے لگا کر رقص کرتے ہیں۔ یہ عورت جو کبھی ایک غیرت مند باپ کی مسلمان بیٹی رضیہ بانو تھی' اب کلدیپ کور کے نام سے اپنی کوکھ سے ایک سکھ لڑکے بشن سنگھ کو جنم دے کر پال رہی تھی اور چھپ چھپ کر اسے قرآن شریف پڑھا رہی تھی' نماز پڑھا رہی تھی اور کلمہ شریف یاد کرا رہی تھی۔ اور میرے آگے رو رو کر ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی کہ میرے بچے کو کسی طرح پاکستان پہنچا دو میں تمہاری احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔

میں نے اپنے ہاتھ سے رضیہ بانو کے ہاتھ نیچے کر دیئے اور کہا۔

"میری بہن! اگر یہ بات میرے اختیار میں ہوتی تو میں ابھی تمہیں اور تمہارے بیٹے کو یہاں سے نکل کر پاکستان لے جاتا۔ مگر میری بہن یقین کرنا میں مجبور ہوں۔ خواہش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس بات کا تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میں تمہارے پاس آؤں گا اور تمہارے ساتھ تمہارے بچے کو بھی پاکستان پہنچادوں گا۔ مجھے معاف کر دینا میری بہن!"

رضیہ بانو عرف کلدیپ کور کے چہرے پر ایک ایسا غم' ایسی اداسی چھاگئی تھی کہ جو صدیوں کا غم اور صدیوں کی اداسی لگتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"تم یہاں بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں"

میں نے قوم کی اس بدنصیب بیٹی کے پاؤں کو ایک ہاتھ سے چھو کر وہ ہاتھ اپنی آنکھوں پر لگایا اور اٹھتے ہوئے کہا۔

"زندگی رہی تو ایک بار بہن تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں فصل میں سے نکل کر کھیت کی مینڈھ پر آیا اور ریلوے لائن کی طرف چل پڑا۔ میرا دل پاکستان کی اس مظلوم بہن کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ کتنی دیر تک میں چلتا

گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ میں کہاں سے کہاں آگیا ہوں۔ جب اپنے ہوش و حواس میں آیا تو دیکھا کہ میں ایک ریلوے پھاٹک کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ ریل کا پھاٹک بند تھا۔ گاڑی آنے والی تھی۔ پھاٹک کی دونوں جانب کچی سڑک پر ایک دو ریڑھے کھڑے تھے۔ ایک سکھ بھینس کا رسا ہاتھوں میں تھامے بھینس کو ریلوے لائن پار کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دور سے ریل کے انجن نے سیٹیاں دینی شروع کر دیں۔ پھاٹک والے نے شور مچا دیا۔ سکھ اتنی دیر میں بھینس کو لائن پار کرا چکا تھا۔ اس بار گاڑی جالندھر دلی کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں پھاٹک سے کچھ دور ہی کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین آگئی۔ اس کا انجن کوئلے سے چلنے والا انجن تھا۔ ابھی تک میں نے انڈیا میں ریل گاڑیوں کے آگے لگے ہوئے کوئلے سے چلنے والے انجن ہی دیکھے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ چونکہ انڈیا میں کوئلہ کئی مقامات سے نکالا جاتا ہے اس لئے زیادہ تر ریل گاڑیاں کوئلے کے انجنوں سے ہی چلتی ہیں۔ ٹرین شور مچاتی لائن کے دونوں طرف گرد اڑاتی گزر گئی۔ سورج کافی اوپر آچکا تھا اور چلتے وقت دھوپ مجھے چبھنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کب تک پیدل چلتا رہوں گا۔ میں امرتسر والی خطرے کی فضا سے کافی دور نکل آیا ہوں۔ بہتر ہے کہ میں جی ٹی روڈ پر واپس چلا جاؤں اور وہاں سے کسی ٹرک یا بس میں بیٹھ کسی اگلے شہر پہنچ جاؤں۔ وہاں سے پھر میں ٹرین پکڑ لوں گا۔ چنانچہ میں ریلوے پھاٹک سے کچی سڑک پر ہو گیا۔

یہ دیہاتی علاقہ تھا۔ کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ میرا لباس ا ایسا تھا کہ لگتا تھا شہر سے کوئی لڑکا گاؤں اپنے عزیزوں سے ملنے آیا ہے یا مل کر واپس جا ر ہے۔ کچی سڑک کھیتوں میں دو چار موڑ کاٹنے کے بعد جالندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ نکل آئی۔ یہاں ایک جانب مجھے درخت کے نیچے بوڑھا سکھ نظر آیا جو چھابے میں ناگ پوری سنگترے رکھے بیچ رہا تھا۔ اس قسم کا ایک سنگترہ میں نے سید صاحب کے ہاں کھ تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ یہ ناگپور کا سنگترہ ہے مگر ساتھ ہی کہا تھا کہ پاکستان کے کنوؤں نے بھارت کے ناگ پوری سنگترے کو مات کر دیا ہے۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیا

بھی محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے سوچا کہ سکھ کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ نہ جانے وہ کیا پوچھ بیٹھے اور کیا جواب منہ سے نکل جائے۔ پھر خیال آیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اسے کیا پتہ کہ میں کون ہوں۔ بھارتی کرنسی میرے پاس موجود تھی۔ میں سردار جی کے پاس چلا گیا اور پوچھا۔

"سردار جی سنگترے کیسے لگائے ہیں؟"

میں نے پنجابی میں بات کی تھی۔ سردار جی نے ایک سنگترہ اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"کھا کر دیکھو مہاراج"

میں نے کہا۔ "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ناگپوری ہیں"

میں نے چار سنگترے اٹھا لئے اور پوچھا کہ کتنے پیسے دوں۔ سردار جی نے بے نیازی سے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ایک روپیہ دے دو"

میں نے اسے ایک روپے کا نوٹ دیا اور آگے چل دیا۔ میں اس جگہ سے کوئی سواری نہیں پکڑنی چاہتا تھا کیونکہ وہاں قصبے کا موڑ تھا اور ریڑھوں گڈوں وغیرہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں چلتے چلتے جب کافی آگے نکل گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر چاروں سنگترے کھا گیا۔ میری بھوک بھی کسی حد تک دور ہو گئی اور پیاس بھی مٹ گئی۔ میں سڑک کے کنارے ایک طرف کھڑا ہو کر کسی لاری وغیرہ کا انتظار کرنے لگا۔

ایک لاری آئی جو مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ دیا مگر وہ نہ رکی۔ اس کے بعد ایک ٹرک آیا جس پر سامان لدا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا مگر وہ بھی نہ رکا۔ دور سے ایک جیپ آتی نظر پڑی۔ میں سڑک سے ہٹ کر ذرا دور کھڑا ہو گیا۔ اس خیال سے کہ یہ کہیں پولیس وغیرہ کی جیپ نہ ہو۔ مگر یہ سویلین جیپ تھی۔ ایک سکھ سویلین کپڑوں میں اسے چلا رہا تھا۔

جیپ بھی گزر گئی۔ میں نے اسے ہاتھ نہ دیا۔ میں قدم قدم پیدل ہی چل پڑا۔

تھوڑی دور تک چلا ہوں گا کہ پیچھے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ایک بس آرہی تھی۔ سڑک کے درمیان ایک گدھا آگیا تھا جس کے لئے ڈرائیور ہارن دے رہا تھا۔ دور سے میں بس کو پہچان نہ سکا۔ میں نے اسے ہاتھ دے دیا۔ بس خالی تھی۔ کھڑکیوں میں سلاخیں لگی تھیں۔ بس میرے قریب آکر رک گئی۔ یہ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا کہ بس کی پیشانی پر انگریزی میں پولیس لکھا تھا۔ یہ پولیس کی گاڑی تھی۔ سکھ ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلاتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ باؤ آجاؤ"

سکھ ڈرائیور سویلین کپڑوں میں تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ پولیس کا آدمی ہی ہوگا۔ یہ بس تھانے سے حوالاتیوں کو عدالت میں لانے لے جانے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ میں بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا مقام نہیں تھا۔ سکھ ڈرائیور نے دو تین بار ہارن دے کر اونچی آواز میں کہا۔

"آجاؤ باؤ آجاؤ اندر۔۔۔۔۔کہاں جانا ہے"

اس نے اپنے ساتھ والی کھڑکی کھول دی۔ میں اندر جاکر بیٹھ گیا۔ بس آگے چل پڑی۔ سکھ ڈرائیور ہنس مکھ قسم کا آدمی تھا۔ کہنے لگا۔

"باؤ تم پولیس کی گاڑی دیکھ کر شاید ڈر گئے تھے۔ فکر کرنے کوئی بات نہیں۔ یہ گاڑی ضرور پولیس کی ہے مگر میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔"

اس نے بتایا کہ امرتسر میں اس کا موٹر ورکشاپ ہے۔ یہ گاڑی جالندھر سٹی پولیس کی ہے۔ اور رنگ کے لئے اس کے پاس امرتسر آئی ہوئی تھی اور اب وہ اسے واپس جالندھر لے جارہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

کہاں جاؤ گے باؤ؟

تمہارا نام کیا ہے؟

کیا کام کرتے ہو؟

ایک ہی سانس میں اس نے مجھ سے تین سوال پوچھ لئے تھے۔ میں نے اس قسم کے

سوالوں کے جواب پہلے سے ہی سوچ کر اپنے ذہن میں کمپیوٹر کی طرح فیڈ کر رکھے تھے۔
میں نے اسے اپنا ایک فرضی ہندووانہ نام بتایا اور کہا کہ میں امرتسر کے کالج میں پڑھتا ہوں
جالندھر اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔

”فکر کی کوئی گل ہی نہیں ہے۔ سمجھو جالندھر پہنچے کہ پہنچے۔ میں جی ٹی روڈ پر
سٹھ میل سے گھٹ کبھی گاڑی نہیں چلاتا۔“

سامنے ایک گائے آگئی۔ سکھ ڈرائیور نے اسے گالی دی اور بریک لگا کر ہارن پر ہا
دینے لگا۔ وہ گائے کو گالیاں دیتا کچے پر سے گاڑی نکال کر آگے لے گیا۔ جالندھر وہاں سے
زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے تب پتہ چلا کہ میں امرتسر سے پیدل چلتے ہوئی دس پند
میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی جالندھر شہر کی آبادی شروع ہوگئی۔ ہر
طرف سکھ ہی سکھ نظر آرہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے اتنے سکھ کبھی نہیں دیکھے تھے
جالندھر شہر بھی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بس پولیس سٹیشن جائے گی۔ م
نے سکھ ڈرائیور سے ایک جگہ رکنے کے لئے کہا۔ ”بس سردار جی! میں یہیں اتروں گا۔“

میں نے سردار جی کا شکریہ ادا کیا اور بس سے اتر گیا۔ یہاں سے مجھے ریلوے سٹیشن
جانا تھا۔ میں نے ایک سائیکل رکشا دیکھا جو خالی تھا۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور اسے ریلو
سٹیشن چلنے کو کہا۔ سائیکل رکشے والا بوڑھا سکھ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رکشا چلاتا ایک طر
کو چل پڑا۔ کئی بازار آئے اور گزر گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں معلوم
سردار جی دلی جانے والی گاڑی کس وقت چلتی ہے۔ رکشا والے سکھ نے ہانپتے ہوئے کہا

”پتہ نہیں جی۔ ٹیشن پر جا کر پتہ کریں۔“

جالندھر ریلوے سٹیشن کی ایک طرف رکشا رک گیا۔ یہاں کافی لوگ تھے۔ میں
چہ امرتسر سے کافی دور نکل آیا تھا مگر میں ابھی تک پنجاب میں تھا اور اپنے آپ
خطرے سے محفوظ نہیں سمجھ رہا تھا اس لئے بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ٹکٹ
جیب میں تھا۔ ایک قلی سے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ دلی جانے والی ٹرین شام کو چھ بجے
گی۔ اس وقت ابھی دن کا ایک بھی نہیں بجا تھا۔ اتنا وقت گزارنا میرے لئے ایک

مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے سٹیشن کے سامنے ایک دکان میں بیٹھ کر دال روٹی
کھائی۔ پھر سٹیشن کے سامنے والے بازار میں ہی ادھر ادھر پھرنے لگا۔ ایک جگہ سینما
ہاؤس نظر پڑا۔ ایکٹر ایکٹرسوں کے بڑے بڑے بورڈ لگے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس سینما
ہاؤس میں صبح دس بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک مسلسل فلم چلتی ہے۔
اس وقت بھی کوئی فلم چل رہی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور سینما ہاؤس میں آکر بیٹھ گیا۔
یہاں میں بڑے سکون سے وقت گزار سکتا تھا۔

کوئی انڈین فلم لگی تھی۔ نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مجھے فلم میں کام کرنے والے ایکٹروں
سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں تو وقت گزارنے وہاں آیا تھا۔ آنکھیں سکرین پر فلم
دیکھ رہی تھیں اور دماغ اپنے مشن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اس بات کا بھرپور
احساس تھا کہ میں دشمن ملک انڈیا میں ہوں جو پاکستان کا دشمن نمبر ایک ہے اور جس نے
پاکستان کے جائز وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو
سکے ہردہ ضلع ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں مجاہد کمانڈو کمال شاہ کے پاس پہنچوں۔ ان سے
فوجی کمانڈو کی ٹریننگ حاصل کروں اور پھر کشمیر میں آکر حریت پرست کشمیریوں کے شانہ
بشانہ بھارتی فوج کے خلاف لڑوں اور کافروں کو مارتا ہوا شہید ہو جاؤں اور اگر شہادت کا
رتبہ حاصل نہ کر سکوں تو جب تک مقبوضہ کشمیر بھارتی ظلم و استبداد کے شکنجے سے آزاد
نہیں ہو جاتا اس وقت تک کافروں سے جنگ کرتا رہوں اور جب مقبوضہ کشمیر آزاد ہو
جائے تو واپس پاکستان جا کر اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھوں اور پھر بلند آواز میں کہوں۔
میاں جی! کشمیر آزاد ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

مجھے پتہ ہی نہ چلا اور فلم ختم ہوگئی۔ میں یہی سمجھا کہ فلم ختم ہوگئی ہے مگر معلوم ہوا
کہ انٹرول ہوا ہے۔ پہلے سوچا کہ اندر سینما ہال میں ہی بیٹھا رہوں۔ پھر خیال آیا کہ باہر
نکل کر چائے پینی چاہیے۔ حالانکہ مجھے چائے کی طلب کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ جو کہتے
ہیں کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے میں بھی کسی غیبی طاقت کے اشارے
پر اٹھا اور سینما ہال کے باہر آگیا۔ باہر دن کی روشنی تھی۔ ابھی کتنا دن باقی تھا۔ مجھے شام

کے ساڑھے پانچ بجانے تھے۔ کیونکہ جالندھر سے دلی جانے والی گاڑی شام کے چھ
چلتی تھی۔

سینما کے احاطے کے اندر ہی ایک طرف دیوار کے ساتھ چائے پان سگریٹ
دکانیں تھیں۔ میں ایک دکان کے پاس کھڑے ہو کر چائے پینے لگا۔ چائے پینے کے بعد
نے جیب سے پیسے نکال کر چائے والے کو دیئے اور پان سگریٹ کے کھوکھے والے
طرف بڑھا۔ میں سگریٹ کا عادی نہیں ہوں مگر کبھی کبھی چائے پینے کے بعد سگریٹ
جی چاہتا ہے۔ میں نے پان سگریٹ کے کھوکھے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے
سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے سامنے ایک
کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس کی ساتھ ایک سویلین کپڑوں والا آدمی بھی تھا جو سکھ نہیں
یقیناً" ہندو ہوگا اور خفیہ پولیس کا آدمی ہی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں کانپ
مگر فوراً" میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑے اعتماد سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

سکھ کانسٹیبل اور خفیہ پولیس والا دونوں میری طرف گھور کر دیکھ رہے تھے اور
کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی سکھ کانسٹیبل نے میری آنکھوں میں آنکھیں
ڈالے پوچھا۔

"کون ہو بھئی تم؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔ "بھگوان کا بنایا ہوا آدمی ہوں۔ تمہیں نظر نہیں آرہا؟"
ہندو خفیہ پولیس والے نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر زور سے دباتے ہوئے پوچھا

"امرتسر کیا بسنے گئے تھے؟"

سکھ کانسٹیبل نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچا اور گالی دے کر کہا۔

"ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ سب پتہ چل جائے گا تم پاکستان سے یہاں کس لئے
آئے ہو۔ چلو"

اس نے مجھے آگے کو دھکا دیا۔ بس یہی سکھ کانسٹیبل کی غلطی تھی اور وہیں میں

جھٹکتے ہی عقل سے کام لیا جیسے ہی دھکا کھا کر میں اس سے دو قدم آگے لڑکھڑایا وہیں
سیدھا ہو کر بجلی کی طرح اتنی زور سے اور اتنی تیزی سے بھاگا کہ مجھے خود پتہ نہ چل
کہ میں کب سینما ہال کے احاطے سے نکل کر بازار میں آیا اور بازار میں جاری ٹریفک
بچتا بچاتا اسی طرح دوڑتا کب دوسرے بازار میں پہنچ گیا۔ میرے پیچھے کانسٹیبل اور
کے ساتھی کے بھاگنے اور شور مچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر یہ میری زندگی اور
کا سوال تھا۔ خدا جانے اسی وقت میری اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ میں
ڑھی سے بھی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ بھاگتا چلا جارہا تھا۔ جس کسی کے پاس سے گزرتا
اپنے آپ کو بچانے کے لئے پرے ہو جاتا اور مجھے راستہ دے دیتا اور میں اسے حیران
ہاں چھوڑ کر آگے نکل جاتا۔ مگر مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں
تک آرہی تھیں۔ یہ آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس
تعاقب کر رہی تھی۔ میں دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ
میں زیادہ دور تک نہیں دوڑ سکوں گا۔ اچانک میرے سامنے ریلوے پھاٹک آگیا۔
وے پھاٹک بند تھا۔ ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ میں نے بائیں جانب ایک نگاہ ڈالی تو ایک
گاڑی کو چھک چھک کرتے آتے دیکھا۔ میں اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اتنا بھی
ش نہ رہا کہ میں ریل کے نیچے آسکتا ہوں۔ میں نے دوڑ کر ریلوے لائن پار کرلی۔ عین
لمحے ٹرین سیٹی پر سیٹی بجاتی شور مچاتی میرے پیچھے سے گزرنے لگی۔ اس ٹرین نے
ے اور پولیس کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ ٹرین بھی مال گاڑی تھی جو
لمبی تھی۔ میں نے دوڑنا بند کر دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا دوسرے پھاٹک کے پہلو میں
لوہے کی چرخی لگی تھی اس میں سے نکل گیا۔ کچھ لوگوں نے مجھے آواز بھی دی کہ پاگل
ہو تم؟ ریلوے پھاٹک کی دوسری طرف بھی کچھ گاڑیاں تانگے اور رکشے کھڑے
۔ مال گاڑی سست رفتار کے ساتھ کھڑ کھڑ کرتی ابھی تک گزر رہی تھی۔
میں پیچھے دیکھے بغیر سامنے منہ کئے جارہا تھا۔ کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر سڑک کی
جانب درخت کے نیچے ایک لاری کھڑی تھی۔ لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی

ایک لڑکا لاری کے پچھلے دروازے کے پاس کھڑا آوازیں دے رہا تھا۔

"چلو اک سواری لدھیانہ"

مجھے معلوم تھا کہ لدھیانہ جالندھر کے بعد دوسرا بڑا شہر آتا ہے اور یہ دلی کی
جاتے ہوئے ہی آتا ہے۔ میں دوڑ کر بس میں سوار ہوگیا میرے بیٹھتے ہی بس چل
میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک بار پھر خطرہ ٹل گیا تھا۔ بس جی ٹی روڈ پر دوڑتی چلی
تھی۔ ہندو سکھ سواریاں لدی ہوئی تھیں۔ عورتیں بھی بچوں کو لئے بیٹھی تھیں۔
میں سڑک کے کنارے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں آئے اور گزر گئے۔ ایک چھوٹا
آگیا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ یاں بس کچھ دیر رکی اور پھر آگے روانہ ہوگ
علاقے میرے لئے بالکل نئے تھے۔ دن کی روشنی کم ہونی لگی تھی۔ سورج مغر
طرف غروب ہونا شروع ہوگیا تھا۔ بس راستے میں جگہ جگہ رکنے لگی۔ کوئی سواری
پر ہاتھ دیتی تو بس کھڑی ہو جاتی۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ مجھے یہی خطرہ لگا
جالندھر پولیس نے آگے ریلوے سٹیشنوں اور چھوٹے شہروں اور قصبوں کے تھا
ضروری ٹیلی فون پر خبر کر دی ہوگی کہ ایک پاکستانی جاسوس پولیس کی حراست سے
ہوگیا ہے۔ پولیس نے ان لوگوں کو میرا حلیہ بھی بتا دیا ہوگا۔ پکڑے جانے کا ڈر
ہوا تھا۔

کسی جگہ بس رکتی تو میں غور سے باہر کا جائزہ لیتا۔ میں نے ایک سواری سے پ
لدھیانہ کتنی دور رہ گیا ہے۔ وہ کوئی ہندو تھا۔ اس نے میری طرف غور سے د
پوچھا۔

"ماراج تم پہلی دفعہ لدھیانے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں پہلے بھی ایک دوبار گیا ہوں۔ مگر ریل گاڑی پر گیا تھا۔"

وہ ہندو تھوڑی دیر مجھے گھورنے کے بعد باہر دیکھنے لگا۔ شام کا دھندلکا کھیتوں
اور آسمان کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ ایک بڑی نہر آئی۔ بس اس کے پل پر سے گ

وڑی دور جا کر بس کی رفتار ہلکی ہوگئی۔ پھر وہ سڑک کے کنارے پر ہو کر رک گئی۔
واریاں باہر دیکھنے لگیں۔ کسی نے ڈرائیور سے پنجابی میں پوچھا کہ کیا ہوگیا ہے۔ ڈرائیور
نے کہا۔

"پتہ کراتے ہیں۔ ساری گاڑیاں کھڑی ہیں"

مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ میں نے کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر
دور تک لاریوں اور بسوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"جا اوئے پتہ کر کیہ گل اے؟"

کلینر بھی سکھ تھا وہ دوڑتا ہوا آگے گیا۔ سواریاں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ کسی
ا۔ شاید آگے کوئی پل ٹوٹ گیا ہے۔ کسی نے کہا۔ کوئی ٹکر ہوگئی ہوگی۔ اتنے میں
بھے واپس آتا نظر آیا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"سردار! آگے پولیس چیکنگ کر رہی ہے"

میرا دل زور سے دھڑکا۔ ڈرائیور نے گالی دے کر پوچھا کہ کس چیز کی چیکنگ کر رہی
پلیس۔ کلینر بولا۔

"کہتے ہیں کوئی پاکستانی جاسوس بھاگ گیا ہے"

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری اندر سے کیا حالت ہوئی ہوگی۔ بظاہر میں بڑے
ان سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا اور اپنے چہرے سے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے
کیا طوفان مچا ہوا ہے۔ اب مجھے وہاں سے بھاگنا تھا۔ ایک دم اٹھ کر بھاگنے سے لوگوں
ھ پر شبہ ہو سکتا تھا او وہ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر سکتے تھے۔ میں ایک آدھ
بظاہر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے یونہی ٹٹولہ اور
ڈ والی سواری سے پوچھا۔

"بھاپاجی آپ کے پاس ماچس ہوگی؟"

سواری نے نفی میں سر ہلایا تو میں یہ کہہ کر نیچے اتر گیا۔ کہیں سے ماچس تلاش کرتا
ماسگریٹ پینے کو جی چاہتا ہے۔ میں بس سے اتر کر دو قدم چل کر آگے گیا۔ پھر رک کر

ایسے دیکھنے لگا جیسے مجھے کسی پان سگریٹ کے کھوکھے کی تلاش ہو۔ اس کے بعد میں دشمنوں کے ساتھ لڑائی لڑی جا رہی تھی۔ مجھے ہینڈ گرینڈ کا ہی نہیں پتہ تھا کہ اس کا پن
ٹہلتا اگلی لاری کے پاس چلا گیا۔ وہاں سے ٹہلتا ہوا دوسروں اور پھر تیسری لاری کے کھینچ لینے کے بعد اسے کتنی دیر تک اپنے ہاتھ میں رکھ کر دشمن پر پھینکنا ہوگا۔ میرے
میں آگیا۔ کچھ سواریاں سڑک پر اتر آئی تھیں اور پولیس والوں کو برا بھلا کہہ رہی تھیلئے فوجی کمانڈو کی ٹریننگ بڑی ضروری تھی۔ میں فوجی کمانڈو بن کر کشمیر کے محاذ پر لڑنے
یونہی جہاں چاہتے ہیں گاڑی کھڑی کروا کر چیکنگ کرنے لگتے ہیں۔ میں سڑک پار ور دشمن کے ٹھکانوں پر شب خون مار کر اسے برباد کرنے کے لئے بے تاب تھا لیکن
دوسری جانب جو درخت تھے ان کے نیچے آگیا۔ سڑک کی دوسری طرف جھاڑیاں اُگارتی پولیس میرے راستے میں شدید رکاوٹ بن گئی تھی۔ بلکہ اس بات کا واضح خطرہ
تھیں۔ ان کے پیچھے کھیت تھے جو شام کے تیزی سے پھیلتے دھندلکے میں گم ہو رہے موجود تھا کہ اگر میں پکڑا گیا تو میری جہاد میں شامل ہو کر کافروں سے جنگ کرنے کی آرزو
میں ٹہلتا ٹہلتا جھاڑیوں کے پیچھے آگیا۔ یہاں ایک جگہ چھپ کر میں نے لاریوں اور ناک میں مل سکتی تھی۔
کی قطار کی طرف دیکھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں دوڑ کر کھیتوں میں گھ انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا میں کھیتوں سے باہر نکل کر ایک چھوٹی سی ندی کے
اور جتنی تیز چل سکتا تھا چلنے لگا۔ دوڑنا میرے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کنارے کنارے تیز تیز چل رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ اور
کھیتوں کی کٹائی ہو چکی تھی اور وہاں مجھے کچھ کسان بھی نظر آ رہے تھے جو کٹی ہوئی فص آگے کہاں اور کس شہر میں نکل آؤں گا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں بھارتی پنجاب کی
ایک طرف رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے دور رہ کر آگے نکل گیا۔ میں جی ٹی روڈ پولیس سے کافی دور نکل چکا تھا۔ رات کا اندھیرا کھیتوں میدانوں میں اتر آیا تھا۔ میں نے
سمت سیدھا جانے کی بجائے بائیں جانب مغرب کی طرف ہو گیا تھا۔ تاکہ پولیس لڑی کے کنارے ایک جگہ بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ تھوڑا سا آرام کیا۔ جب سانس
ٹھیک ہو گیا تو ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ندی آگے جا کر اسی طرف گھوم گئی تھی جدھر
سکوں۔
ہر لمحے گہرا ہوتا ہوا اندھیرا میری مدد کر رہا تھا۔ جب میں کچھ دور نکل گیا تو آگے میرے اندازے کے مطابق جی ٹی روڈ تھی۔ چنانچہ میں نے ایک چھوٹی سی پلیا پر سے
میں دوڑنے لگا۔ میں چیکنگ کرتی پولیس کی پہنچ سے جتنی دور نکل سکتا تھا نکل جانا ندی عبور کی اور دوسری رات ایک کھلی جگہ پر آ کر چلنے لگا۔ یہاں فصل کٹی ہوئی تھی۔
تھا۔ مجھے غصہ بھی آ رہا تھا کہ کم بخت ابھی سے پولیس نے مجھے پریشان کرنا شروع ایک طرف کچھ درخت تھے۔ میں آگے نکل گیا۔ سوچنے لگا کہ آخر کب تک چلتا جاؤں گا۔
ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں سیز فائر لائن عبور کر کے سیدھا مقبوضہ کشمیر میں داخ معلوم کرنا چاہیے کہ میں کس طرف جا رہا ہوں اور آگے کونسا علاقہ آجاتا ہے۔ مگر وہاں
جاتا اور مجاہدوں کے ساتھ مل جاتا۔ مگر میرے والد صاحب کو معلوم تھا کہ کشمیر میں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا جس سے میں یہ معلوم کر سکتا۔ چلتے چلتے کھیت ختم ہو گئے اور
کا سامنا بھارت کی تربیت یافتہ فوج سے ہے اس لئے مجھے تھوڑی بہت فوجی تربیت بنجر زمین شروع ہو گئی۔ یہاں بیل گاڑیوں اور مال مویشی کے گزرنے کے لئے راستہ سا بنا
حاصل کرنی چاہیے تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں کمال شاہ نامی ہوا تھا۔ ایک جگہ کچھ فاصلے پر بہت سے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ ان کے درمیان کسی
یافتہ فوجی کمانڈو کے پاس جا کر کمانڈو کی باقاعدہ تربیت حاصل کروں اور اس کے بدنے آگ روشن کر رکھی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ وہاں جا کر کسی سے پوچھوں کہ یہ
کشمیر میں شامل ہو کر انڈین فوج کے خلاف لڑوں۔ میری بھی اب یہی خواہش تھی۔ نادانستہ کدھر جاتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح خواہ مخواہ شک پڑ سکتا ہے کہ
مجھے تو رائفل چلانی بھی نہیں آتی تھی اور کشمیر کے محاذ پر برین گنوں سٹین گنوں اور آخر میں کون ہوں جو اس طرح بغیر جانے بوجھے اس علاقے میں کیوں پھر رہا ہوں۔ میں

درختوں کے جھنڈ سے ہٹ کر آگے گزر گیا۔ آگے ایک گاؤں کی کچھ روشنیاں سی
آئیں۔ میں گاؤں کی طرف جانے کی بجائے اس کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گیا۔
مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ خیال آیا کہ گاؤں میں جاتا ہوں ضرور کچھ نہ کچھ کھانے کو
جائے گا۔ لیکن میں نے اس خیال کو دماغ سے نکال دیا۔ کیونکہ یہ پاکستان کا گاؤں
تھا۔ ہمارے دشمن ملک انڈیا کا گاؤں تھا۔ ہندو سکھوں کا گاؤں تھا اور ان کی پولیس میرے
پیچھے لگی ہوئی تھی۔

چند قدم چلا ہوں گا کہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جلدی سے
تو بھینس کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ یہ کوئی بھینس تھی جو درخت کے ساتھ بندھی
تھی اور کالی ہونے کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں نظر نہیں آئی تھی۔ بھینس بیٹھی
تھی۔ مگر مجھ سے ٹھوکر لگنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں وہیں رک گیا اور رات
اندھیرے میں بھینس کے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ بھینس دو ایک بار بولنے کے بعد چپ ہو
تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے چپکارا۔ بھینس نے اپ
ہلائی۔ میں اس کے جسم کو پیار کرتا رہا۔ پھر بڑے آرام سے اس کے جسم پر ہاتھ پھی
پھیرتے اس کے نیچے بیٹھ گیا اور اس کے تھنوں کو پیار سے سہلانے لگا۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں بھینس مجھے دولتی نہ مارے کیونکہ ظاہر ہے وہ کسی اور
ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ بڑی شریف بھینس تھی۔ اس نے مجھے کچھ نہ کہا اور
اس کا دودھ پینے لگا۔ پہلے تو اس کا دودھ نہ نکلا۔ پھر میرے حلق میں نیم گرم دودھ
دھاریں لگیں۔ بھینس خاموشی کھڑی رہی۔ میں نے خوب جی بھر کر اس کا دودھ پیا اور
زبان میں اس کا شکریہ ادا کر کے چل پڑا۔ میری بھوک اور پیاس مٹ گئی تھی۔ میں
میدان میں سے گزر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا اب خوب گہرا ہو گیا تھا اور صرف اتنا
آرہا تھا کہ میں زمین کو دیکھ کر چل سکتا تھا۔ آگے ایک اور چھوٹا سا گاؤں آیا۔ اس
قریب ہی ایک گردوارہ تھا۔ گردوارے دروازے پر بلب روشن تھا اندر سے شبد کیرتن
ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

مجھے نہ اس گاؤں کا پتہ تھا کہ اس کا نام کیا ہے اور نہ یہ پتہ تھا کہ آگے کون سا گاؤں
آئے گا۔ میں اندھیرے کے سمندر میں چلا جا رہا تھا۔ دل نے کہا کہ یوں چلتے جانا ٹھیک
نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ واپس جالندھر پہنچ جاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ چھپ کر
رات بسر کرو۔ صبح جالندھر پہنچ جاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ چھپ کر رات بسر کرو۔ صبح
جب سورج کی روشنی نکلے تو پھر پتہ کرو کہ لدھیانہ شہر کس طرف ہے اور اس طرف چلو۔
یسے بھی میں چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ وہاں یا تو اندھیرے میں دھندلے دھندلے کھیت نظر
آتے تھے یا بنجر میدان آجاتا تھا۔ رات بسر کرنے کے لئے کوئی ایسا ٹھکانہ دکھائی نہیں دیتا
جہاں اگر میں صبح تک بھی سوتا رہوں تو مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔

چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بے شمار درخت پاس پاس اگے ہوئے تھے۔ یہ
شاید آموں کا کوئی باغ تھا۔ ابھی درختوں پر آم نہیں لگے تھے۔ یہ آموں کا موسم بھی نہیں
تھا۔ درختوں کے نیچے بڑا گہرا اندھیرا تھا۔ کسی کتے نے میری بو سونگھ لی تھی درختوں کی
طرف سے اس کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا آموں کے باغ سے آگے
نکل گیا۔ وہاں دو چار درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے سوچا ان درختوں کے نیچے پڑ
کر رات گزار دوں گا۔ آخر مجھے ایسی ہی کسی جگہ پر رات بسر کرنی پڑے گی۔ کوئی بستر چار
پائی تو یہاں مجھے مل نہیں سکتا۔ میں ان درختوں کے پاس گیا تو مجھے وہاں ایسی بو آئی جیسے
کسی نے لکڑیاں جلا کر بجھا دی ہوں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور درختوں کے نیچے جگہ
صاف کر کے بیٹھ گیا۔ اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رات کو کھلی جگہوں پر اوس گرنے
سے ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ ان درختوں کے نیچے ٹھنڈ بالکل نہیں تھی۔
اوس بھی نہیں گر رہی تھی۔ میں نے ایک درخت سے ٹیک لگا دی۔ سوچا اسی طرح
بیٹھے بیٹھے جتنی رات باقی رہ گئی ہے گزار دوں گا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی
کوشش کرنے لگا۔

فضا میں جلی ہوئی لکڑیوں کی بو اسی طرح آرہی تھی۔ میں نے یہی خیال کیا کہ یہاں
قریب ہی گاؤں میں کسی نے تندور جلا کر بجھا دیا ہو گا یا لکڑیوں کا الاؤ روشن کیا ہو گا۔ میں

سمٹ سمٹا کر درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے نیم دراز تھا اور سوائے نیند کے
کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھ پر کچھ دیر بعد ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہو
گئی۔ میں نیند کی آغوش میں ہی تھا کہ کسی چیونٹی نے مجھے کاٹا اور میں ایک جھٹکے کے سا
اٹھ بیٹھا اور پتلون کے اندر ہاتھ ڈال کر پنڈلی پر بیٹھی چیونٹی کو مسل دیا۔ میں نے دو
آنکھیں بند کیں تو مجھے کسی کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں کھو
دیں اور کان اس آواز پر لگا دیئے۔ ساتھ ہی رات کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ
دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز کسی عورت کی تھی۔ وہ رک رک کر کچھ بول رہی تھ
پہلے تو مجھے ایسے لگا کہ وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ مگر جس سے وہ باتیں کر رہی تھی
اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ آواز رک گئی۔ پانچ دس سیکنڈ کے بعد عورت کی آواز
آنے لگی۔ میرے سامنے دس بارہ قدموں کے فاصلے پر سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں۔
آواز ان سرکنڈوں کے پیچھے سے آرہی تھی۔ میں اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا
اچانک سرکنڈوں کے پیچھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور جھک
چلتا ہوا سرکنڈوں کی طرف بڑھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور ر
کس چیز کی ہے۔ میں سرکنڈوں کے پاس ہو کر بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے دو چار سرکنڈ
کو ہاتھوں سے ایک طرف ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف مجھے چھوٹا سا چبو
نظر آیا جو زمین سے ایک دو فٹ اونچا تھا۔ اس چبوترے کے ایک جانب مٹی کا دیا جل
تھا۔ اس دیئے کی روشنی میں میں نے ایک عورت کو دیکھا دونوں ہاتھ جوڑ کر منہ میں
پڑھتے ہوئے چبوترے کا چکر لگا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ ضرور کوئی چڑیل یا بھوت
ہے۔ مگر عورت کا جسم اور آواز چڑیلوں ایسی نہیں تھی۔ میں یہ سوچ کر وہیں چھپ
بیٹھا رہا کہ معلوم کرنا چاہیے یہ عورت یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

عورت پر دیئے کی روشنی پڑ رہی تھی۔ جب وہ دیئے کی روشنی کے قریب
گذری تو مجھے اس کی شکل بھی نظر آگئی۔ عورت جوان تھی اور اس نے شلوار قمیض
رکھی تھی۔ صرف لمبے بال شانوں پر کھلے تھے۔ چبوترے پر مجھے دیئے کی ہلکی ہلکی ر

اچھی جلی بجھی لکڑیاں پڑی نظر آرہی تھیں۔ عورت چبوترے کے گرد کچھ چکر لگانے
بعد رک گئی۔ وہ مجھ سے بمشکل پانچ چھ قدموں کے فاصلے پر تھی۔ وہ جلتے ہوئے چراغ
پاس بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ تین بار ہاتھ باندھ کر
ے کی طرف جھکی۔ پھر اس نے پہلے اپنی قمیض اتاری۔ اس کے بعد شلوار بھی اتار
اب وہ میرے سامنے بالکل عریاں حالت میں کھڑی تھی۔

مجھ پر پہلا اثر یہ ہوا کہ میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ پھر خیال آیا کہ پتہ تو لگے
یہ عورت آدھی رات کو اس ویران جگہ پر چراغ لے کر کیا کرنے آئی ہے۔ میں نے
ما کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ ایک چھڑی سے چبوترے کی جلی بجھی
یوں کو کرید رہی تھی۔

”یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ کہیں واقعی کوئی چڑیل نہ ہو“
میرے دل میں خیال آیا۔ مگر اب میں اس معمے کو حل کرنا چاہتا تھا وہاں سے ڈر کر
نہیں چاہتا تھا۔ عورت نے چھڑی سے لکڑیوں کی راکھ کو کریدتے کریدتے اس میں
کوئی گول سی چیز لکڑی سے اٹھا کر باہر نکالی اور اس کو چراغ کی لو کے قریب لا کر غور
دیکھنے اور دھیمی آواز میں کچھ پڑھنے لگی۔ میں یہ دیکھ کر واقعی ڈر گیا کہ یہ ایک جلی
انسانی کھوپڑی تھی۔ عورت نے کھوپڑی کو ہاتھ لگایا۔ کھوپڑی گرم تھی۔ اس نے
پڑی کو زمین پر رکھ دیا۔ وہ اپنے ساتھ پانی کا ڈبہ بھی بھر کر لائی تھی۔ اس نے کچھ منتر
پڑھتے پڑھتے کھوپڑی پر ڈبے میں سے تین چار بار پانی ڈالا جب کھوپڑی ٹھنڈی ہو گئی تو
گود میں لے کر بیٹھ گئی اور یوں آگے پیچھے ہلتے ہوئے کچھ پڑھنے لگی جیسے بچے کو
یاں دے رہی ہو۔ میں اب ساری بات سمجھ گیا تھا۔

یہ مرگھٹ یا شمشان بھومی تھی۔ جہاں ہندو سکھ اپنے مردوں کو جلاتے
تھے۔ یہ عورت وہاں رات کے وقت چلہ کاٹنے آئی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وہ
کسی قریبی گاؤں کی عورت تھی۔ میرے دماغ میں ایک سکیم آئی۔ میں
سرکنڈوں میں سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگیا۔ مجھے دیکھ کر عورت کی

چیخ نکل گئی۔ اس نے جلدی سے کھوپڑی پھینکی اور زمین پر پڑی ہوئی قمیض اٹھا کر اپنے آگے کرلی۔ میں نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا مگر جلدی سے کپڑے پہن لے"

عورت نے جلدی سے کپڑے پہن لئے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"بھگوان کے لئے کسی کو نہ بتانا کہ میں یہاں آئی تھی"

میں نے کہا۔

"تو یہاں یہ سب کچھ کیا کر رہی تھی اور یہ کھوپڑی کس کی ہے؟"

عورت نے بتایا کہ وہ ایک ہندو عورت ہے۔ پانچ سال ہوئے اس کی شادی ہو مگر اولاد نہیں ہوئی۔ کسی سادھو نے اسے بتایا کہ اگر وہ کسی کنواری لڑکی کے جلے مردے کی کھوپڑی آدھی رات کو اپنی گود میں لے کر ایک خاص منتر کا جاپ کرے کی گود ہری ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ عورت جو ساتھ والے گاؤں کی تھی وہاں اولاد کی چلہ کرنے آئی تھی۔ اسے پتہ چلا تھا کہ شام کو اس گاؤں کی ایک کنواری لڑکی مر اور اسے جلا دیا گیا ہے۔

عورت میری منت سماجت کر رہی تھی کہ میں گاؤں میں جاکر کسی کے آگے ذکر نہ کروں نہیں تو اس کا چلہ بھرشت ہو جائے گا۔ میں نے اسے کہا۔

"فکر نہ کر میں کسی کو نہیں بتاتا۔ کیونکہ میں خود یہاں پردیسی ہوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے"

"کیا؟" عورت نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ یہ علاقہ کونسا ہے اور لدھیانے کو جانے کے لئے مجھے کس طرف جانا چاہیے"

پھر میں نے اسے بتایا کہ میری بس نکل گئی تھی اور میں یونہی کھیتوں میں چل راستہ بھول گیا ہوں۔ عورت نے کہا۔

"تم بڑی دور نکل آئے ہو۔ یہاں سے آگے ایک قصبہ چولیاں آئے گا۔ وہاں سے قصبہ بیاس کو جانے والے یکے مل جاتے ہیں۔ بیاس سے تم ریل گاڑی میں بیٹھ کر لدھیانہ پہنچ جانا۔"

وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑنے لگی۔

"میرا ذکر کسی غیر آدمی سے بھی نہ کرنا۔ نہیں تو میرا اولاد کی خاطر چلہ بھرشٹ ہو جائے گا"

میں نے کہا۔

"وعدہ کرتا ہوں۔ میں اپنے کسی دوست سے بھی اس کا ذکر نہیں کروں گا"

سکیم میری یہی تھی کہ اس عورت سے کسی ایسے گاؤں یا قصبے کے بارے میں پوچھا جہاں سے میں لدھیانہ پہنچ سکوں۔ چونکہ اس قسم کے چلے گھر والوں اور گاؤں سے چھپ کر راز داری کے ساتھ کئے جاتے ہیں اس لئے مجھے یقین تھا کہ یہ میرے بارے میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ اگر کسی کو بتائے گی تو وہ سب پہلے یہ پوچھے گا کہ تم آدھی رات کو گاؤں کے باہر کیا کرنے گئی تھیں۔

میں نے عورت سے اتنا ضرور کہا کہ اس قسم کے توہمات سے کچھ نہیں ہوا کرتا۔ گھر اپنے بھگوان کے آگے پرارتھنا کرو اگر بھگوان کی مرضی ہوئی تو وہ تمہاری گود ضرور کردے گا عورت حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تم مجھے ہندو نہیں لگتے۔ کیونکہ کوئی ہندو اس قسم کی بات نہیں کر سکتا"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"میں ہندو ہی ہوں۔ بس ولائیت کا پڑھا ہوا ہوں اور اس قسم کے توہمات کو نہیں مانتا۔ اب تم واپس اپنے گھر جاؤ"

عورت نے چبوترے پر جلتا ہوا چراغ پھونک مار کر بجھا دیا اور میرے قریب ہو کر

"تم اتنی رات گئے کہاں جاؤ گے۔ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں جاؤں اور تمہارا خاوند اور گاؤں والے پکڑ کر مارنا شروع کر دیں"

عورت ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ عورت ٹھیک عورت نہیں ہے۔ اس کا ثبوت بھی مجھے فوراً مل گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا سانس لے کر کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔ گاؤں کے باہر ایک کوٹھڑی ہے۔ وہاں چارپائی بھی وہاں تم رات گزار لینا"

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اس عورت سے کہا۔

"تم اپنے گاؤں جاؤ۔ میں کسی اگلے گاؤں میں جاکر رات بسر کرلوں گا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے چل دیا۔ میں نے کچھ دور جاکر واپس مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے وہ عورت نظر آئی۔ ضرور وہ بھی اپنے گاؤں کی طرف روا ہوگی۔

اب مجھے چولیاں گاؤں کی تلاش تھی۔ رات کے اندھیرے میں تو مجھے یہ گا مل سکتا تھا۔ میں ایک بار پھر کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کرنے لگا جہاں میں رات گزار ایک جگہ کھیتوں میں مجھے رہٹ کا چاک دکھائی دیا۔ ستاروں کی روشنی میں مجھے ا میں چیزوں کے ہیولے صاف نظر آرہے تھے۔ یہ رہٹ تھا مگر خاموش تھا۔ کوئی وہاں پر نہیں تھا۔ ایک طرف ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا تخت پڑا تھا۔ یہ میرے لئے تخت سے کم نہیں تھا۔ میں اس پر فوراً لیٹ گیا اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میرے شمشان بھومی والی عورت کا خیال آنے لگا۔ میں نے اپنی قوت ارادی سے اس ذہن سے جھٹک دیا۔ میرا مشن ایک مقدس جہاد کا مشن تھا۔ اور میں اپنے ذہن کی نفسانی آلودگیوں سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے خدا کو یاد کیا۔ آنکھیں بند مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آنکھ اس وقت

دو تین کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے قریب سے گزرے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر آسمان پر سپیدہ سحر پھوٹ رہا تھا۔ مشرق کی طرف ستاروں کی چمک ماند پڑ رہی تھی اور نیلی روشنی کی جھلکیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ میرے وہاں سے نکل جانے کے لئے یہ بڑا اچھا وقت تھا۔ اگر میری آنکھ دن نکلے کھلتی تو اس بات کا امکان تھا کہ رہٹ پر کوئی کسان بیل لے کر آجاتا۔ میں اٹھا اور جس سمت شمشان بھومی والی عورت نے اشارہ کر کے گاؤں چولیاں کا نام لیا تھا اس طرف چلنے لگا۔

سورج نکلنے تک میں ایک گاؤں کے قریب پہنچ گیا۔ کھیتوں میں سکھ ہل چلا رہے تھے۔ ایک آدمی سر پر فصل یا چارے کا گٹھا رکھے گاؤں کی طرف جارہا تھا۔ ایک سکھ کھیت میں پانی لگا رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں بھی بے نیازی سے آگے گزر گیا۔ سامنے سے ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ چولیاں گاؤں یہی ہے؟

وہ رک گیا اور بولا۔

"یہی ہے۔ تم نے کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نمبردار صاحب سے ملنا ہے۔ مل لوں گا میرا خیال ہے وہ گھر پر ہی ہوں گے"

یہ کہہ کر میں نمستے کہہ کر آگے چل پڑا۔

میں ٹھیک گاؤں میں پہنچا تھا۔ گاؤں کی دوسری طرف کیکر کے درختوں کے نیچے کچھ یکے کھڑے تھے۔ ایک یکے میں دو عورتیں' ایک ہندو لالہ اور ایک سکھ دیہاتی بیٹھا تھا۔ کوچوان بھی سکھ تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو دور ہی سے آواز دی۔

"باؤ جی بیاسا جانا ہے تو آجاؤ"

بیاسا سے مراد بیاس گاؤں یا بیاس کا قصبہ یا شہر تھا۔ جو کچھ بھی تھا مجھے وہیں جانا تھا۔

میں یکے میں بیٹھ گیا۔ یکہ چل پڑا کوچوان نے مجھ سے تین روپے کرایہ لیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے نہایت تکلیف دہ سفر کے بعد یکے نے مجھے بیاس نام کے قصبے میں پہنچا اب تو یہ قصبہ ایک شہر بن گیا ہوگا اس وقت یہ ایک قصبہ ہی تھا۔ یکہ بیاس نام ریلوے سٹیشن کے باہر اڈے پر جاکر رکا تھا۔ معمولی سے دیہاتی اسٹیشن کی عمارت جیسی کہ ہر جگہ دیہاتی سٹیشنوں کی عمارت ہوا کرتی تھی معلوم ہوا کہ دلی جانے والی پسنجر ٹرین ایک گھنٹے بعد آنے والی ہے۔ وہاں مسافروں کا کوئی رش نہیں تھا۔ ٹکٹ میر پاس ہی تھا۔ میں نے ایک کے باہر بیٹھ کر بند مکھن کھایا اور چائے پی۔ کچھ دیر وہیں رہا۔ پھر اٹھ کر سگرٹوں والے کھوکھے پر جاکر ایک سگریٹ خرید کر سلگایا اور سٹیشن طرف آگیا۔ گیٹ پر کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہیں تھا۔ میں پلیٹ فارم پر آگیا۔ اینٹوں کا پلیٹ فارم تقریباً پڑا تھا۔ میں ایک بنچ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں ماحول جائزہ لینے لگیں۔ وہاں پولیس والا کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ ہندو سکھ مسافر پلیٹ فارم پر اپنی گٹھڑیاں اور ٹرنک رکھ کر بیٹھ گئے۔ کہیں سے ایک ٹی ٹی بھی آگیا۔ نے ریلوے کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اتنے میں کی جانب سگنل ڈاؤن ہوگیا۔ گاڑی آرہی تھی۔ قلی بھی پہنچ گئے تھے۔

پسنجر ٹرین چھک چھک کرتی آگئی۔ سارے ڈبے تھرڈ کلاس کے تھے جو سواریوں بھرے ہوئے تھے۔ میں ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ گاڑی بیاس کے اس سٹیشن پندرہ بیس منٹ تک کھڑی رہی۔ میری نگاہیں پلیٹ فام پر ہی لگی رہیں۔ یہی دھڑکا لگا کہ کہیں سے کوئی پولیس والا مجھے تلاش کرتا وہاں نہ آجائے۔ مگر کوئی سپاہی دکھائی نہ دیا انجن نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین ایک بہت بڑے دریا پر گزرنے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ دریائے بیاس ہے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے لدھیا آیا۔ یہ کافی بڑا سٹیشن تھا۔ میں ڈبے میں ہی چھپ کر بیٹھا دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ کو پولیس والا ادھر نہ آجائے۔ پلیٹ فارم پر مجھے ایک دو وردی والے سپاہی نظر آئے تھے مگر کسی نے میرے ڈبے کا رخ نہ کیا۔ ٹرین یہاں دیر تک رکی رہی۔ آخر وہ چلی تو میر

جان میں جان آئی۔

پسنجر ٹرین ہونے کی وجہ سے ایک تو وہ ہر سٹیشن پر رکتی تھی اور اس کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ چلتی رہی۔ چلتی چلی گئی۔ لدھیانے کے بعد کئی چھوٹے چھوٹے سٹیشن آئے۔ پھر بڑا شہر انبالہ آگیا۔ یہاں بھی گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ یہاں سے چلی تو کہیں شام کے وقت کرنال کا بڑا شہر آیا۔ اس کے بعد پانی پت اور سونی پت کے شہر آئے اور وہ بھی گزر گئے۔ معلوم ہوا کہ اب روہتک کا شہر آئے گا اور پھر گاڑی دلی پہنچ جائے گی۔ اس گاڑی نے دلی پہنچتے پہنچتے رات کے نو بجا دیئے۔ دلی کے سٹیشن پر اترتے ہی میں نے موٹر رکشا لیا اور سیدھا والد صاحب کے دوست ظہرالدین صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور مجھے ڈانٹنے بھی لگے کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے ایک فرضی کہانی گھڑ کر انہیں سنادی میرے پاسپورٹ پر دلی کا ویزا اگرچہ لگا ہوا تھا مگر جتنے دن مجھے وہاں ٹھہرنے کی اجازت تھی اس کی مدت گزر چکی تھی۔ ظہرالدین صاحب کہنے لگے۔

”میاں! ویزے کی مدت کے بعد ٹھہرنا جرم ہے پولیس تمہیں پکڑ سکتی ہے اور مجھے بھی پریشان کر سکتی ہے۔“

میں نے انہیں کہا۔

”انکل آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کل واپس پاکستان چلا جاؤں گا“

وہ کہنے لگے۔

”میاں! جاتی دفعہ تمہیں پولیس سٹیشن رپورٹ کرنی ہوگی۔ پولیس تمہیں ویزے کی مدت سے زیادہ قیام کرنے پر وہیں پکڑ لے گی“

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہرحال میں نے جوں توں کر کے رات ظہر الدین صاحب کے گھر پر گزاری۔ دوسرے دن اپنے کپڑے ڈرائی کلین کرائے۔ نہا دھو کر شیو وغیرہ بنائی۔ جتنے انڈین کرنسی کے نوٹ میرے پاس باقی رہ گئے تھے ان میں سے کچھ ایک پاؤں کی جراب میں چھپائے کچھ جیکٹ کی جیب میں پاسپورٹ کے ساتھ رکھ لئے۔ چھوٹا چاقو ابھی تک میرے پاس ہی تھا۔ خیال آیا کہ اس کو یہیں کہیں پھینک دیتا ہوں

کیونکہ اس کا ابھی تک مجھے کوئی مصرف نظر نہیں آیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے جیب
ہی رہنے دیا۔ ظہیرالدین صاحب اپنی دکان پر جا چکے تھے۔ میں بھی کچھ دیر بعد ان
مکان سے نکل آیا۔

اگر چہ میرے پاسپورٹ پر دلی کا ویزا لگا ہوا تھا مگر جو قانونی مدت وہاں قیام کی
حاصل تھی وہ پوری ہو چکی تھی اور اب میں غیر قانونی طور پر انڈیا میں رہ رہا تھا اور مجھ
پکڑ کر جیل میں بند کیا جا سکتا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہ کی اور سیدھا رکشا پکڑ کر ریلو
سٹیشن پہنچ گیا۔ یہ ایک موٹر رکشا تھا اور اس پر زرد اور نیلا رنگ کیا ہوا تھا۔ سٹیشن پر
میں نے اپنی گاڑی کے بارے میں معلوم کیا۔ انکوائری کلرک ہندو خاتون تھی جس
ماتھے پر تلک لگایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دوپہر کو ایک گاڑی بمبئی جائے گی۔ وہ پسنجر
ٹرین ہے۔ ہر سٹیشن پر ٹھہرے گی۔ شام کے سوا چھ بجے بمبئی ایکسپریس کا ٹائم ہے۔
رن تھرو گاڑی ہے۔ میں پسنجر ٹرین سے تنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے بمبئی ایکسپریس پکڑنے
فیصلہ کر لیا۔ اس عورت نے میرے دریافت کرنے پر مجھے بتایا کہ یہ ٹرین دوسرے
دوپہر کے بعد ہوشنگ آباد پہنچے گی۔

میں واپس ظہیرالدین صاحب کے مکان پر یا ان کی دکان پر آنے کی بجائے سید
بادشاہی مسجد پہنچ گیا۔ یہ میرے نزدیک سب سے محفوظ جگہ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا ہوا
کہ دلی میں میرے پیچھے خفیہ پولیس کا کوئی آدمی نہیں لگا ہوا۔ یہ سارا مسلمانوں کا علاقہ
وہیں دوپہر کے وقت میں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد واپس مسجد میں آ
دوپہر کے بعد جو نماز ہوتی ہے وہ میں نے بادشاہی مسجد یا جامع مسجد میں ہی باجماعت پڑھ
بمبئی ایکسپریس سوا چھ بجے چھوٹتی تھی۔ میں ایک گھنٹہ پہلے سٹیشن پر آ گیا۔ امرتسر
ہردہ ضلع ہوشنگ آباد کا جو تھرڈ کلاس کا ٹکٹ سید صاحب نے مجھے لے کر دیا تھا وہ
نے گیٹ پر ٹکٹ چیکر کو بالکل نہ دکھایا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ ا
دن میں کہاں رہا۔ اگر چہ اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی اور ٹکٹ پندرہ بیس روز
کام آ سکتا تھا۔ پھر بھی حفظ ماتقدم کے طور پر میں پلیٹ فارم کا ٹکٹ لے کر سٹیشن

اندر گیا۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔ میں گیٹ سے کچھ دور جا کر
ایک بنچ کے کونے میں بیٹھ گیا۔ ہندو سکھ مسلمان مسافر اپنا اپنا سامان لے کر چلے آ رہے
تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ریلوے پولیس کے دو کانسٹیبل باتیں کرتے
مسافروں کو دیکھتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔

اتنے میں بمبئی ایکسپریس آ گئی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں میں ہلچل سی مچ گئی۔ میں بھی
اٹھ کر مسافروں کے ہجوم میں گھس گیا۔ گاڑی پیچھے سے بھری ہوئی آئی تھی۔ تھرڈ کلاس
کے ایک ڈبے میں مجھے بھی جگہ مل گئی۔ ٹرین چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پہلے اس کا
انجن بدلا گیا۔ پھر خدا جانے اس کے ڈبوں میں کیسا کیسا سامان لادا جانے لگا۔ کوئی آدھے
پون گھنٹے بعد انجن نے وسل دیا گاڑی نے لالٹین کی سبز روشنی دکھائی اور ٹرین چل پڑی۔
اس وقت دن ڈوب گیا تھا اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ میں کونے والی سیٹ پر دبک
کر بیٹھا رہا۔ ٹرین آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ دلی کی آبادی بڑی دور دور تک پھیلی
ہوئی تھی۔ شہر کے مکانوں کارخانوں وغیرہ کی روشنیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔
واقعی دلی بہت پھیلا ہوا شہر تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کے کئی دوسرے بڑے بڑے شہر
آئے۔ میں جاگتا رہا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے جب کبھی میں ریل گاڑی
میں سفر کیا کرتا تھا تو مجھے چلتی ریل گاڑی کی آواز سے نیند آنے لگتی تھی۔ مگر یہاں نیند
نہیں آ رہی تھی۔ دلی کے بعد بڑا شہر گڑگانواں آیا۔ اس کے بعد متھرا۔ پھر بھرت پور۔ پھر
آگرہ کا شہر آیا۔ چاندنی رات نہیں تھی ورنہ لوگ کہہ رہے تھے کہ ریل گاڑی میں سے
دور تاج محل کا منظر نظر آیا کرتا ہے۔ یہاں تاج محل کی مشہور تاریخی عمارت تھی جو
مسلمان بادشاہ شاہجہان نے اپنی بیوی ممتاز محل کے لئے بنائی تھی۔ میں نے ہندوستان میں
اور بھی کئی شاندار تاریخی عمارتیں دیکھیں جو مسلمان بادشاہوں نے بنائی تھیں۔ ہندو ان
عمارتوں کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آگرہ کے بعد دھول پور کا اسٹیشن آیا۔ پھر گوالیار کا شہر آ گیا۔ اس وقت رات تقریباً
گزر چکی تھی اور پو پھٹنے والی تھی۔ گولیار شہر سے گاڑی چلی تو مجھے نیند آ گئی۔ میرے

سوتے میں جھانسی اور للت پور کے شہر بھی گزر گئے۔ تب میں اٹھ بیٹھا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی تو میں نے اتر کر چائے اور بند مکھن کھایا۔ یہی چیز ہر چھوٹے سٹیشن پر مل جاتی تھی دوپہر تک ٹرین جنگلوں میں سے گزرتی رہی۔ میں نے اس سے پہلے اتنے بڑے بڑے جنگل نہیں دیکھے تھے۔ ایک مسافر نے مجھے بتایا کہ یہ جنگل شیر ہاتھی اور دوسرے درندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعد میں مجھے بھی اس کا تجربہ ہوگیا۔ یہ پہاڑی علاقہ بھی تھا اور کہیں کہیں ہرے بھرے میدان اور کھیت بھی آجاتے تھے۔

معلوم ہوا کہ آگے بھوپال کا سٹیشن آرہا ہے مجھے دلی سٹیشن پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ بھوپال کے بعد ہوشنگ آباد کا سٹیشن آتا ہے۔ مجھے ہوشنگ آباد ہی اترنا تھا۔ چنانچہ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس دوران کسی سٹیشن پر کسی پولیس والے نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ کوئی انٹیلی جنس کا آدمی بھی میرے تعاقب میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو مجھے ضرور شبہ پڑ جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ میں انڈیا کے پنجاب کے علاقے سے بہت دور نکل آیا تھا۔ بھوپال پہنچتے پہنچتے شام کے چھ بج گئے۔ چونکہ شروع گرمیوں کا موسم تھا اس لئے ابھی دن کی روشنی کافی تھی۔ یہاں لاہور اور ہمارے پنجاب والا خوش بہار کا موسم بالکل نہیں تھا۔ یہاں گرمی شروع ہوگئی تھی۔ ٹرین کے ڈبے کے پنکھے دن رات چلتے تھے۔ رات کو بھی ہمارے پنجاب والی خنکی نہیں ہوتی تھی۔ بھوپال کے بارے میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے جو مسلمان تھا اور بمبئی جارہا تھا بتایا کہ بھوپال مسلمان ریاست ہوا کرتی تھی مگر اب اس پر بھی دوسری ریاستوں کی طرح انڈیا کی حکومت نے قبضہ کرلیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بھوپال کے مسلمان حکمران نے پاکستان کے قیام میں بڑی مدد کی تھی اور قائداعظم اکثر یہاں آکر ٹھہرا کرتے تھے اور وہ بھوپال کے حکمران پر جن کا میں نام بھول رہا ہوں بڑا اعتماد کرتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر مشرق علامہ اقبال جنہوں نے سب سے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا وہ بھی والی بھوپال کے دوست تھے اور اکثر بھوپال آکر قیام کیا کرتے تھے۔

ہوشنگ آباد کا سٹیشن آیا تو میں ریل گاڑی سے اتر گیا۔ اتنا لمبا سفر طے کیا تھا کہ بیٹھے

بیٹھے تھک گیا تھا۔ ہوشنگ آباد کا سٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ درمیانہ سا ریلوے سٹیشن تھا۔ میرے پاس ہردہ تک کا ٹکٹ تھا مگر یہ گاڑی وہاں نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس لئے یہاں اتر گیا تھا۔ یہاں سے مجھے لاری وغیرہ پر سوار ہو کر ہردہ جانا تھا۔ اس وقت شام کا دھندلکا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ سٹیشن سے باہر آکر میں نے ایک چھوٹی سی دوکان میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور لاری اڈے کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ہردہ کے لئے آخری لاری کوئی آدھے گھنٹے تک روانہ ہونے والی ہے۔ لاری اڈے پر جلدی جلدی پہنچا۔ لاری تیار کھڑی تھی۔ مسافروں سے بھر رہی تھی۔ کچھ مسافر چھت پر بھی اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں بھی لاری میں بیٹھ گیا۔ لاری اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔ ہوشنگ آبا شہر سے نکلتے ہی لاری گھنے جنگل میں داخل ہوگئی۔ جنگل کے درمیان چھوٹی سی پکی سڑک بنی ہوئی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ سڑک پر بجلی کا ایک بھی کھمبا نہیں تھا۔ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جنگل کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی ہوگئی تھی جو بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد لاری نے ہردہ پہنچا دیا۔

یہ ایک معمولی سا نیم پہاڑی جنگلاتی شہر تھا۔ امرتسر میں سید صاحب نے بتایا تھا کہ یہاں اناج کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہیں مجھے اس آدمی سے ملنا تھا جس کا فرضی نام میں نے آپ کے آگے جمیل لیا تھا۔ سید صاحب نے بتایا تھا کہ جمیل کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ وہ بدمعاش ٹائپ کا آدمی ہے مگر بڑا پکا مسلمان اور جہاد کشمیر میں حصہ بھی لے چکا ہے۔ جمیل کی وساطت سے مجھے مجاہد کمانڈو کمال شاہ کے پاس پہنچنا تھا۔ سید صاحب نے مجھے اس کا پورا ایڈریس زبانی یاد کرا دیا تھا۔

ہردہ شہر اگرچہ چھوٹا سا تھا اور چھوٹے چھوٹے بازار تھے مگر کافی بارونق تھا۔ دکانوں اور مکانوں اور بازاروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اکثر دکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ کچھ ہوٹل بھی تھے جن میں فلمی گانوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ یہاں کوئی رکشا نہیں تھا۔ ایک تانگے والے کو جمیل کا ایڈریس بتا کر کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔ تانگہ مجھے مختلف بازاروں اور ایک چھوٹے سے میدان میں سے گزار کر اس خاص بازار میں لے آیا۔ جہاں

جمیل نام کا آدمی رہتا تھا۔ یہ بازار مجھے بڑا پر اسرار سا لگا۔ ایک منزلہ کواٹر نما مکانوں کے آگے اندھیرا اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں برآمدے میں کوئی عورت سیڑھیوں میں یا ستون کے پاس فرش پر بیٹھی بیڑی سگریٹ پیتی نظر آجاتی تھی۔ کچھ آدمی بھی ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک پان والے کی دکان سے میں نے جمیل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پان لگاتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب پیچھے چلے جائیں۔ پیچھے کواٹر ہے جمیل دادا کا"

جمیل دادا مجھے اپنے کواٹر کے برآمدے میں ہی مل گیا۔ وہ چار پائی پر بیٹھا تھا۔ برآمدے میں بلب کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک آدمی اس کی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرر تھا۔ ایک آدمی اس کے بازو کو اوپر کر کے دبا رہا تھا۔ جوان آدمی تھا۔ بال گھنگریالے سیا تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ میں نے جا کر سلام کیا اور کہا۔

"جی مجھے جمیل صاحب سے ملنا ہے"

جمیل نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پوچھا۔

"کون ہو تم۔ کہاں آئے ہو؟ میں ہی جمیل ہوں۔ کہو کیا کہنا ہے؟"

اس کی آواز بڑی رعب دار تھی۔ میں نے سید صاحب کا نام ۔ لے کر کہا کہ مجھے امرتسر سے انہوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سید صاحب کا نام سن کر جمیل دادا نے دونوں آدمیوں سے کہا۔

"جاؤ بے جا کر ہوٹل سے چائے اور پیسٹری لاؤ۔"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔

اس نے کہا۔

"بیٹھو بھائی۔ یہاں آجاؤ۔ کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی شکریہ کھانا میں نے ہوشنگ آباد کے سٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔"

جب اس کے دونوں نوکر چلے گئے تو جمیل نے میری طرف تھوڑا سا جھک کر

رازداری سے پوچھا۔

"سید صاحب کا یہاں کسی اور کے آگے نام تو نہیں لیا؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ مجھے خود سید صاحب نے بھی منع کر دیا تھا کہ میرا نام سوائے آپ کے اور کسی کے آگے نہ لوں"

جمیل نے میری باتوں اور زبان کے لہجے سے کچھ اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تم پنجابی ہو۔ مگر انڈیا کے پنجاب میں تو کوئی مسلمان نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"جی میں پاکستان سے آیا ہوں"

یہ سن کر جمیل دادا ایک پل کے لئے مجھے تکتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے مجھے اپنے گلے لگایا۔ مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اپنے پاس چارپائی پر مزید قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"پاکستان پر میری جان قربان۔ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے۔ اب بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

یہاں میں اپنے قارئین اور اپنی اس سچی داستان کے پڑھنے والوں کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے صرف ہردہ شہر کے جمیل کا نام ہی فرضی نہیں رکھا بلکہ ہردہ شہر بھی میں نے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ مجاہد کمانڈو کمال شاہ کا نام بھی یہ نہیں اور وہ بھی ضلع ہوشنگ آباد کے جنگل میں نہیں رہتا۔ اگر میری یہ داستان پڑھ کر انڈیا کی حکومت وہاں چھاپہ بھی مارے تو اسے وہاں نہ کوئی جمیل ملے گا نہ کمال شاہ کمانڈو ہی ملے گا۔ یہ دونوں پاکستان کے پرستار اور اسلام کے مجاہد ابھی بفضل تعالیٰ زندہ ہیں۔ جمیل صاحب بھی بھارت کے ایک شہر میں رہ رہے ہیں اور مجاہد کمانڈو کمال شاہ بھی بھارت کے ایک دور افتادہ جنگل میں اس عمر میں بھی کشمیری مجاہدین کو کمانڈو ٹریننگ دے رہے ہیں مگر یہ جنگل ضلع ہوشنگ آباد کا جنگل نہیں ہے۔ اصل جنگل کا اب سوائے کشمیری مجاہدین کے کسی کو

بھی علم نہیں ہے۔ آگے چل کر بھی میں ضرورت کے مطابق جگہوں کے نام اور
خاص لوگوں کے نام تبدیل کرتا جاؤں گا۔ میں یہ بھی نہیں لکھوں گا کہ ہم جب راتوں
کمانڈو مشن پر روانہ ہوتے تھے تو کن کن راستوں سے گزر کر اپنے ٹارگٹ پر پہنچتے تھے۔
ٹارگیٹ آپ کو ضرور صحیح بتادوں گا مگر جو کشمیری مجاہد اس میں گائیڈ کرتے تھے نہ ان
نام بتاؤں گا اور نہ ان راستوں کے بارے میں بتاؤں گا جہاں سے گزر کر ہم ٹارگٹ
اٹیک کرتے تھے۔ کیونکہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ ابھی مجاہدین آزادی کشمیر کی جنگ
رہے ہیں اور مقبوضہ کشمیر کو بھارتی جبرو استبداد سے آزاد کرانے کے لئے اپنی جانیں قر
کر رہے ہیں۔

اب میں واپس پاکستان کے پرستار جمیل دادا کے پاس آتا ہوں۔ جب اس نے
سے پوچھا کہ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا کہ
میں کس غرض کے لئے انڈیا آیا ہوں اور یہ کہ میں جہاد کشمیر میں حصہ لینا اور کمال
صاحب سے کمانڈو کی ٹریننگ لے کر کشمیر کی جنگ میں بطور کمانڈو بھارتی جارحیت کا مقا
کرنا چاہتا ہوں۔ جمیل دادا نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور آنکھوں
لگایا۔ کہنے لگا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ تم مجھ سے بڑھ کر
خوش قسمت ہو۔ میں کشمیر کی لڑائی زیادہ دیر نہیں لڑسکا۔ بس ایک مجبوری
راستے میں رکاوٹ بن گئی تھی۔"

اتنے میں چائے آگئی۔ وہ دیر تک مجھ سے پاکستان کے بارے ہی میں باتیں کرتا رہا
مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی کہ یہ شخص پاکستان سے اتنی دور کافروں کے ملک
میں بیٹھا ہے اور اس کے دل میں اسلام اور پاکستان کے لئے محبت کا بے پناہ جذبہ موجز
ہے۔ اصل میں یہ خدا اور اس کے رسول صلعم کے دین اسلام کا رشتہ تھا جس
فاصلوں کو سمیٹ دیا تھا اور سینکڑوں میل دور بیٹھا ایک مسلمان مجاہد پاکستان کے مسلمان
کے دل کی دھڑکن سن رہا تھا اور پاکستان کی خاطر، کشمیر کی خاطر ہر وقت اپنی جان قر

رنے کے لئے تیار تھا۔

رات گہری ہونے لگی تو جمیل دادا نے برآمدے میں میرا بستر لگا کر پنکھا چلا دیا اور کہنے

"تم آرام کرو۔ صبح منہ اندھیرے تمہیں خود لے کر کمال شاہ کے پاس جاؤں
گا"

اس نے برآمدے کی بتی بجھادی۔ پنکھے کی ہوا نے مچھروں کو میرے پاس نہ آنے دیا
ر مجھے بڑی جلدی نیند آگئی۔ منہ اندھیرے جمیل دادا نے مجھے جگا دیا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی چلنا ہے"

میں منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گیا۔ جمیل دادا نے دو نالی بندوق کاندھے پر ڈال رکھی

"یہ جنگل بڑے خطرناک ہیں۔ جنگلی درندوں سے اکثر آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔
میں بندوق کے بغیر کبھی یہاں نہیں آتا"

شہر کی آبادی پر پچھلے پہر کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان کے مشرقی کناروں پر صبح کاذب
ہلکا ہلکا نور جھلکنے لگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شہر کے مضافات سے نکلتے ہی جمیل
دادا مشرق کی سمت کھیتوں میں چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ کافی دیر تک ہم
کھیتوں میں چلتے گئے۔ پھر کھیت ختم ہو گئے اور چھوٹی چھوٹی، سوکھی گھاس کا میدان شروع
ہو گیا۔ اس میدان کے پار دور سے جنگل کے درختوں کے ہیولے نظر آنے لگے تھے۔ یہ
ہیولے ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر اوپر تک چلے گئے تھے۔ جمیل دادا نے ان کی طرف اشارہ کیا
بولا۔

"یہ وسطی ہند کے بڑے گھنے جنگل ہیں۔ یہ اتنے گھنے ہیں کہ تجربہ کار شکاری
بھی اکثر راستہ بھول جاتے ہیں۔ وہ بھی گائیڈ کے بغیر نہیں چلتے۔ مگر تم فکر نہ
کرو۔ مجھے ایک ایک درخت ایک ایک موڑ ایک ایک پتھر کا علم ہے۔"

ہم جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے پہلو سے ہو کر چلتے

گئے۔ پھر ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف آگئے۔ اتنی دیر تک صبح کی سُر
روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی مگر درختوں میں ہلکا ہلکا اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ راستے
میں ایک سور ملا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ جمیل دادا نے اپنے ساتھ مجھے بھی جلدی
سے ایک طرف کر دیا۔ سور بالکل ناک کی سیدھ آیا تھا اور اسی طرح آگے نکل گیا۔ پھر
پلٹا نہیں۔ ادھر ہی درختوں میں خوک خوک کی آواز نکالتا غائب ہوگیا۔

ٹیلوں کے درمیان ایک چھوٹا سا تالاب دیکھا جس کے کنارے ایک جانب ہرن اور
دوسری طرف ایک بھورا ریچھ پانی پی رہا تھا۔ جمیل دادا نے ریچھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بھورا ریچھ اس جنگل کا سب سے خطرناک درندہ ہے۔ کسی کے پیچھے پڑ
جائے تو پھر اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ آدمی درخت پر چڑھ جائے تو یہ درخت
کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور اپنے شکار کے اترنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ان جنگلوں میں شیر بھی ہوتے ہوں گے آدم خور شیر"

جمیل دادا بولا۔

"ہر شیر آدم خور نہیں ہوتا۔ شیر بہت بوڑھا ہو جائے اور اپنے شکار کے پیچھے
زیادہ تیز نہ بھاگ سکے تو بھوک مٹانے کے لئے انسانوں پر حملے کرنے لگتا ہے
کیونکہ جانوروں کے مقابلے میں انسان زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا۔ ایک بار
اسے انسانی خون کی چاٹ لگ جائے تو پھر وہ آدم خور بن جاتا ہے۔ یا کسی
اناڑی شکاری کی گولی سے اگر اس کا کوئی دانت ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے تب
بھی وہ انسانوں پر حملے شروع کر دیتا ہے اور آدم خور بن جاتا ہے۔ ویسے عام
شیر انسان پر حملے میں پہل نہیں۔ بلکہ اکثر انسان کو دیکھ کر ذرا سا غرا کر دوسری
طرف چلا جاتا ہے۔"

ہم شیر کی باتیں کر رہے تھے کہ جنگل میں ایک جانب سے شیر کی دھاڑ سنائی
میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

جمیل دادا نے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اس شیر نے کسی جانور کو شکار کر لیا ہے۔ اب
وہ اسے گردن سے دبوچ کر اپنے ٹھکانے پر لے جائے گا۔"

ٹیلوں کی چڑھائی چڑھتے اترتے میں تھک گیا تھا مگر چلتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے جمیل
دادا سے آخر پوچھ ہی لیا کہ کمال شاہ مجاہد کمانڈو کا ٹھکانہ ابھی کتنی دور ہے۔ جمیل دادا نے
مسکرا کر کہا۔

"تم ضرور تھک گئے ہو گے۔ مگر اس کا ذکر کمال شاہ کے آگے نہ کرنا۔ وہ ایسے
نوجوانوں کو اپنا شاگرد نہیں بناتے جو جنگل میں چلتے چلتے تھک جاتے ہیں۔ جب
وہ تمہاری کمانڈو ٹریننگ شروع کریں گے تو دو دن میں تمہیں سب سے پہلے
گھوڑے کی طرح طاقتور بنائیں گے۔ اس کے بعد-----"

اور جمیل دادا چپ ہوگیا۔

"اس کے بعد کیا دادا؟" میں نے پوچھا۔

جمیل دادا نے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کمال شاہ مجاہد کمانڈو ہیں۔ وہ اسلام کے شیر ہیں۔ وہ تمہیں بھی اسلام کا شیر بنا
دیں گے۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کو شیر بننے کی
ضرورت ہے-----"

دشوار گزار جنگل میں چلتے رہنے کی وجہ سے میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ گرمی اور
لا بھی جنگل میں بہت تھا۔ ایک جگہ راستے میں پہاڑی ندی آگئی۔ ندی کا پاٹ چوڑا تھا
اس میں چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ پانی پنڈلیوں تک تھا مگر اس کی رفتار تیز
تھی۔ جمیل دادا نے میرے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا تھا۔ اس طرح ہم نے ندی پار کر لی۔
ندی کی دوسری طرف پھر جنگل ہی جنگل تھا۔ بائیں جانب یہ جنگل ایک ٹیلے کی
چڑھائی تک چلا گیا تھا۔ یہاں بانس اور دیودار کے درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ
اگے ہوئے تھے۔ جنگل جھاڑیاں قدم قدم پر ہمارا راستہ روک رہی تھی۔ اس جنگل کے

عین درمیان میں ایک اور ندی آئی۔ یہ ندی چھوٹی سی تھی اور اس کا پانی درختوں سے
چھن کر آنیوالی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ یہاں ہم نے منہ ہاتھ دھوکر تھوڑی دیر آرام کیا
اس کے بعد پھر آگے چل پڑے۔ کچھ دور جاکر درختوں کا گھنا پن چھٹنے لگا۔ درخت
دور ہوگئے۔ ان کے درمیان چھوٹی بڑی چٹانیں آگئیں جو زمین میں سے باہر نکلی
تھیں۔ جمیل دادا اب سنبھل سنبھل کر چلنے لگا تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر چٹانوں کا
جائزہ لیا۔ پھر سرہلا کر بولا۔

"ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

ہم چند قدم آگے گئے ہوں گے کہ اچانک ایک چٹان کے پیچھے سے ایک آدمی نکل کر
ہمارے سامنے آگیا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اپنی چہرے پر اس طرح
سبز صافہ باندھ رکھا تھا کہ مجھے اس کی صرف چمکتی ہوئی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ میں
گھبرا گیا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی ڈاکو ہو۔ مگر جمیل دادا بڑے اطمینان سے کھڑے رہے۔
آدمی نے پوچھا۔

"کون ہو؟"

جمیل دادا نے جواب میں کہا۔

"کمانڈر سے کہو محمود غزنوی کے مجاہد آئے ہیں"

اس آدمی نے دوسرا سوال کیا۔

"کافروں کے کتنے بت توڑ کر آئے ہو؟"

جمیل دادا نے فوراً کہا۔

"ایک سو ایک۔۔۔۔۔"

اس آدمی نے اپنی بندوق کی نالی نیچی کرلی اور آگے چلتے ہوئے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ"

جمیل دادا نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

"یہ کمال شاہ کے باڈی گارڈ کمانڈو ہیں۔ اور میں نے ہمارے درمیان جو مکالمے

ہوئے ہیں وہ ہمارے خفیہ اشارے تھے جو صرف شاہ صاحب کے اپنے آدمیوں
کو ہی معلوم ہیں"

وہ آدمی ہمیں دو تین چٹانوں کے درمیان سے لے کر ایک بڑی چٹان کے پاس لے
آیا جہاں چٹان کے اندر ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔ غار کے دہانے کے آگے اس طرح کا
ایک باڈی گارڈ فوجی انداز میں اٹن شن کھڑا تھا جس طرح کا باڈی گارڈ ہمارے آگے
چل کر ہمیں وہاں لایا تھا۔ اس باڈی گارڈ نے بھی منہ سر سبز رنگ کے صافے سے ڈھانپ
رکھا تھا۔ ہاتھ میں رائفل تھی اور کمر کے گرد گولیوں کی پٹی بندھی تھی۔ ہمارے والے
باڈی گارڈ نے ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور غار کے دہانے پر کھڑے باڈی گارڈ سے دو
تین باتیں کیں۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا۔ ہمارے پاس آیا اور بولا۔

"کمانڈر نے تمہیں بلایا ہے۔ جاؤ"

جمیل دادا مجھے لے کر غار میں داخل ہوگئے۔

غار کے اندر کافی چوڑا راستہ بنا ہوا تھا۔

جمیل دادا کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمانڈو کمال شاہ سے ملنے
بھی وہاں آ چکا ہے۔ اس نے میرے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے کہا۔

"کمال شاہ کو یہاں سب کمانڈر کہتے ہیں تم بھی انہیں اسی لقب سے مخاطب کرنا"

غار آگے جا کر بائیں طرف مڑ گیا۔ آگے ایک کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں چٹان کی
بھی کافی اونچی تھی اور اوپر چٹانی چھت میں ایک جگہ کسی شگاف میں سے دن کی
اندر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ زمین پر ایک جگہ شیر کی کھال بچھی ہوئی ہے۔
کھال پر ایک پختہ عمر کا آدمی چٹان کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اس کے پا
ایک طرف مٹی کی صراحی رکھی ہے۔ دیوار پر اس کے سر کے پیچھے سبز جزدان
ہوئی کوئی کتاب لٹکی ہوئے ہے جو یقیناً قرآن شریف ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے سوا
کچھ نہیں تھا۔ اس آدمی کی شرعی داڑھی تھی جس میں کثرت سے سفید بال آ
رنگ صاف تھا۔ آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں ایسی چمک تھی۔ جسم نہ بھاری تھا
اس نے بھی سر پر سبز رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ قریب ہی اس کی رائفل
میگزین کی پیٹی پڑی تھی۔ جمیل دادا نے جاتے ہی السلام و علیکم کہا۔ یہ کمال شاہ
یا کمانڈر تھا۔ اس نے وعلیکم السلام کہہ کر جمیل دادا سے مصافحہ کیا۔ اور میری طرف

مجھ سے بھی مصافحہ کیا اور جمیل دادا سے پوچھا۔

"یہ نوجوان کون ہے؟"

جمیل دادا نے کہا۔

"کمانڈر! یہ پاکستان سے جہاد کشمیر میں شامل ہونے کے لئے آیا ہے۔ امرتسر والے سید صاحب نے انہیں آپ کے پاس کمانڈو ٹریننگ کے لئے بھیجا ہے۔"

کمال شاہ اسی دوران مجھے مسلسل گھورتے رہے۔ پھر پوچھا۔

"امرتسر والے سید صاحب کے پاس تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

میں نے اپنے والد صاحب کا نام لیا اور کہا کہ وہ سید صاحب کے دوست تھے اور آپ سے بھی ملا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب کا نام سن کر کمال شاہ کمانڈو کی آنکھوں کی چمک مزید تیز ہو گئی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور میرے والد صاحب کا نام لے کر کہا۔

"تو تم ------ صاحب کے بیٹے ہو؟"

میں نے ادب سے کہا۔ "جی ہاں"

انہوں نے میرے والد صاحب کی خیریت دریافت کی۔ میں نے کہا کہ وہ پاکستان میں فوت ہو چکے ہیں۔ پس اس پر کمال شاہ کمانڈو نے کسی قسم کے افسوس کا اظہار کئے بغیر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"دعائے مغفرت"

ہم نے بھی اپنے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ کمال شاہ کمانڈو نے بلند آواز میں سورہ فاتحہ پڑھی اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کشمیر کی لڑائی میں لڑنے کا شوق تھا تو سیدھا کشمیر چلے جاتے۔ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

میں ذرا ٹھٹک سا گیا۔ کمال شاہ کمانڈو سے مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے بھی صاف لفظوں میں جواب دیا۔

"کمانڈر! میں مقبوضہ کشمیر جاکر آسانی سے مجاہدین میں شامل ہو سکتا تھا۔ مگر میں کمانڈو بن کر کشمیر کے جہاد میں شامل ہونا چاہتا ہوں"

"وہ کیوں؟"

کمال شاہ کمانڈو نے بھنوئیں اوپر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"وہ اس لئے کمانڈر! کہ میں ایک مجاہد جوان بن کر دشمن کے ساتھ جھڑپ میں ایک دو کافروں کو مار سکتا ہوں۔ لیکن کمانڈو بن کر میں دشمن کے مورچوں کے پیچھے جاکر ان کے ایمونیشن ڈپو اڑا سکتا ہوں۔ ان کی سپلائی لائن تباہ کر سکتا ہوں۔ وہ پل اڑا سکتا ہوں جن پر سے دشمن کی فوج کے کنوائے ایمونیشن اور اسلحہ لے کر گزرتے ہیں۔ اس طرح میں اکیلا کمانڈو ایک بریگیڈ جتنی تباہی مچا سکتا ہوں"

کمال شاہ کمانڈو کی عقابی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ میری با بڑے غور سے سن رہے تھے۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو انہوں نے کہا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ کمانڈو جب اپنے مشن پر جاتا ہے تو زندہ واپس آنے کے لئے نہیں جاتا"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں اسلام کے نام پر مرنے کے لئے آیا ہوں۔ لیکن مرنے سے پ کشمیری مسلمانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کرنے والی، میری کشمیری بہنو اور بیٹیوں کو بے عزت کرنی والی انڈین فوج کی دو چار چھاؤنیاں ضرور تباہ ک چاہتا ہوں۔ تب میری روح بڑی خوشی کے ساتھ میرے جسم سے نکلے گی۔"

جمیل دادا کے چہرے پر بھی میری باتیں سن کر ایک چمک سی آگئی تھی۔

کمانڈو کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ اس پر میری باتوں کا کوئی زیادہ اثر نہ

اس نے پاس پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھی اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم نے کبھی گھوڑا دیکھا ہے؟"

کمانڈر کے اس سوال پر میں ہنس پڑا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر کمال شاہ کمانڈو ایک دم غصے میں آکر بولا۔

"اچھا۔ ہنستے ہو۔ تمہاری ساری ہنسی نکال دوں گا بولو، کبھی گھوڑا دیکھا ہے؟"

میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

"جی ہاں۔ دیکھا ہے"

اس نے کرخت لہجے میں دوسرا سوال کیا۔

"کیا کبھی خرگوش دیکھا ہے؟"

"جی ہاں دیکھا ہے"

"کبھی کوئی چیتا دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔ دیکھا ہے"

اب میں سوال کے فوراً بعد جواب دے دیتا۔ کمانڈر نے پوچھا۔

"کیا کبھی سانپ دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔۔ دیکھا ہے"

کمال شاہ نے رائفل پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا۔

"تم نے گھوڑا دیکھا ہے مگر میں تمہیں گھوڑا بناؤں گا تم نے خرگوش کو دیکھا ہے مگر میں تمہیں خرگوش بنا کر جنگل میں دوڑاؤں گا۔ تم نے سانپ کو دیکھا ہے مگر میں تمہیں سانپ بنا کر یہ سکھاؤں گا کہ جب سانپ دشمنوں میں گھر جاتا ہے تو زمین اسے چھپنے کے لئے کیسے جگہ دے دیتی ہے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

میں کمانڈر کی اصل نیت سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے کمانڈو ٹریننگ کی تمام سختیوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"کمانڈر! میں اسلام کے نام پر شہید ہونے آیا ہوں۔ مگر آپ سے یہ گر سیکھنا ہے۔ چاہتا ہوں کہ شہید ہونے سے پہلے میں دشمن کے کتنے مورچے تباہ کر

سکتا ہوں۔ اس کے کتنے کنوائے برباد کر سکتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ کافر کیسے
ہلاک کر سکتا ہوں۔ میں جموں کشمیر رائفلز کا صرف ایک ہندو فوجی مار کر شہید
نہیں ہونا چاہتا۔۔۔۔"

کمال شاہ کمانڈو نے جمیل دادا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"دادا اب تم جاسکتے ہو۔ میں اس نوجوان کو پکا مسلمان بنا کر کشمیر کے محاذ پر بھیج
دوں گا"

جمیل دادا نے کمال شاہ کمانڈو سے ہاتھ ملایا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"خدا حافظ"

جمیل دادا چلا گیا۔ وہاں چائے آگئی۔ تام چینی کے گول ٹرے میں چائے کی چینک
اور دو پیالیاں رکھی تھی۔ باڈی گارڈ چائے رکھ کر باہر نکل گیا۔ کمال شاہ نے پیالیوں
چائے ڈال کر ایک پیالی مجھے دی۔ چائے کالی سیاہ تھی۔ اس میں دودھ بالکل نہیں تھا۔
نے ایک گھونٹ پیا تو معلوم ہوا کہ چائے میں چینی بھی نہیں ہے۔ میں نے بالکل نہ
کہ چائے ایسی کیوں ہے۔ کمال شاہ کمانڈو چائے پینے لگا۔ چائے پینے کے بعد وہ
کھال سے اٹھا۔ رائفل ایک طرف رکھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نماز پڑھتے ہو کہ نہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں"

کمال شاہ کمانڈو نے غصیلی آواز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم کبھی کبھی مسلمان ہوتے ہو"

غار کے باہر دہانے پر دونوں باڈی گارڈ اٹن شن کھڑے تھے۔ کمال شاہ کمانڈو کو
دیکھ کر انہوں نے زور سے اپنی اپنی رائفل پر ہاتھ مارا۔ کمال شاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اذان دو"

اس وقت ایک کمانڈو نے ہتھیار زمین پر رکھ کر اذان دینی شروع کر دی۔ وہ

آواز سے اذان نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی آواز چند گز کے فاصلے تک ہی
جاتی ہوگی۔ خدا جانے کہاں سے چھ سات باڈی گارڈ کے حلیے کے آدمی درختوں جھاڑیوں
کے پیچھے سے نکل آئے۔ ان سب نے سروں پر سبز صافے یا رومال باندھ رکھے تھے۔ میں
ان کی صرف آنکھیں ہی دیکھ سکتا تھا۔ یہ سب کمانڈو ہی تھے۔ ان میں سے ایک نے
امامت کرائی۔ ہم سب نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ مجھے معلوم نہیں وہ نماز
کا وقت تھا یا نہیں۔ میرا خیال ہے ضرور نماز کا وقت ہوگیا ہوگا۔ نماز کے بعد کمانڈو یا
کمانڈر کمال شاہ نے میر طرف دیکھ کر کہا۔

"چل کر کھانا کھالو"

میں اس کے ساتھ دوبارہ غا کے اندر آگیا۔ ایک کمانڈو کھانا لے آیا۔ چار روٹیاں
تھیں جن کے اوپر تھوڑا سا اچار رکھا تھا۔ کمانڈر نے (میں اب کمال شاہ کمانڈو کو کمانڈر ہی
لکھوں گا) دو روٹیاں اور تھوڑا سا اچار ڈال کر مجھے پکڑا دیں۔ خود تھوڑا سا اچار اور دو
روٹیاں لے لیں اور کھانے لگا۔ یہ دوپہر کا کھانا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ رائفل سنبھال
کر اٹھا اور باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ چلو"

غار میں ایک جگہ دیوار کے ساتھ کچھ رائفلیں اور گولیوں کی ایک بیلٹ پڑی تھی۔
اس نے ایک رائفل اور گولیوں کی بیلٹ اٹھا کر مجھے دی اور غار سے نکال کر پہاڑی ٹیلے
کے پاس لے گیا۔

"کبھی رائفل چلائی ہے؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں مگر ایک دوبار ہی چلائی ہے"

اس نے ٹیلے کے ایک درخت کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ پھر مجھے رائفل میں میگزین
ڈال کر دی اور کہا۔

"درخت کو ٹارگٹ بنا کر فائر کرو"

میں نے فائر کیا۔ مجھے دھکا لگا۔ گولی ٹارگٹ پر بالکل نہ لگی۔ کمانڈر نے مجھے دوسری بار رائفل بھر کر دی اور کہا۔

"دوبارہ فائر کرو۔ نظر ٹارگٹ پر رکھو"

میں نے دوسری بار فائر کیا۔ مجھے پھر دھکا لگا۔ میں ذرا پیچھے کو لڑکھڑا گیا اور گولی خدا جانے کہاں کی کہاں نکل گئی۔ کمانڈر نے تیسری بار رائفل بھر کر مجھے دی اور کہا۔

"ایک بار پھر فائر کرو"

تیسری بار بھی گولی نشانہ پر نہ لگی۔ لیکن اس دفعہ رائفل کا دھکا لگتے ہی میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ کمانڈو نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"شاباش جوان! تم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اچھا کیا۔ جب تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا اور رائفل کے دھکے کو اپنے بدن میں جذب کرنا آجائے گا تو تمہارا نشانہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میرے ساتھ آگے چلو"

میں نے رائفل کاندھے پر ڈال لی۔ میگزین کی پٹی کمر کے ساتھ باندھ لی اور کمانڈر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم جنگل کے ایک تنگ سے راستے سے جھاڑیاں ہٹاتے گزر رہے تھے کمانڈر نے میری طرف دیکھے بغیر آگے کی طرف چلتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔

"جانگلی انسان جھاڑیوں میں چلتے ہوئی آواز پیدا نہ کرو۔ خرگوش کی طرح چلو"

میں شرمندہ سا ہو گیا مگر یہ ٹریننگ تھی۔ میں نے فوراً" کہا۔

"یس سر!"

کمانڈر رک گیا۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئی کہا۔

"ہم یس سر نہیں ہمیں صرف کمانڈر بولو تم مسلمان مائی باپ کی اولاد ہو انگریز کی اولاد نہیں"

میں نے فوراً" کہا۔

"ٹھیک ہے کمانڈر"

کمانڈر نے کرخت لہجے میں کہا۔

"اب چلو۔ ایڈوانس کرو۔ ڈبل سے چلو"

اور وہ میرے آگے آگے ڈبل سے دوڑنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ڈبل مارچ کرتے ہوئے دوڑنے لگا۔ جھاڑیاں میرے جسم کے ساتھ الجھ رہی تھیں مگر میں ڈبل مارچ کرتا چلا جا رہا تھا۔ درختوں میں اس قدر حبس اور گرمی تھی کہ میرے بدن سے پسینے بہنے لگے۔ آگے ٹیلے کی چڑھائی تھی۔ کمانڈر نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"اب تم ہمارے پیچھے پیچھے پہاڑ کے اوپر چڑھے گا۔"

ایک تو ٹیلے کی چڑھائی بڑی دشوار تھی دوسرے جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ ٹیلے کے اوپر پہنچتے پہنچتے میرا برا حال ہو گیا۔ ہاتھوں میں خراشیں پڑ گئیں۔ چہرے پر بھی خراشیں آگئیں تھیں۔ سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میں نے اوپر پہنچتے ہی اپنی جیکٹ اتار دی کمانڈر نے سختی سے کہا۔

"جیکٹ نہیں اتارے گا۔"

میں نے جلدی سے جیکٹ دوبارا پہن لی۔ میری کمانڈو ٹریننگ شروع ہو گئی تھی۔ روباسی روٹیوں پر تھوڑا سا اچار ڈال کر جو اس کمانڈر نے مجھے کھلایا تھا۔ وہ پسینہ بن کر نکل چکا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ مگر میں ڈر کے مارے چپ رہا کہ خدا جانے کمانڈر مجھے کیا پینے کو کہہ دے۔ کمانڈر مجھ سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ وہ بڑھاپے کی دہلیز میں قدم رکھ چکا تھا مگر اس کا سانس میرے مقابلے میں اتنا نہیں پھولا تھا۔ وہ لوہے کے اعصاب کا آدمی بن چکا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹیلے پر میں نے پانچ منٹ آرام کیا ہو گا کہ کمانڈر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں جائے گا۔ گو۔ گو۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ٹیلے کی ڈھلان پر دھکا دے دیا۔ میں جھاڑیوں میں گر پڑا۔ مگر جلدی سے اٹھا اور تیز تیز ڈھلان اترنے لگا۔ وہ بھی خرگوش کی طرح چھلانگیں لگاتا میرے آگے آگے ڈھلان اتر رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے اوپر خرگوش ہونے کا گمان

ہونے لگا تھا۔ جب وہ مجھے غار کے پاس واپس لایا تو میرا برا حال ہو رہا تھا۔ سارا بدن درد
کرنے لگا تھا۔ پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ ایک طرف ہو کر درخت کے
نیچے بیٹھ گیا۔ ایک باڈی گارڈ یا کمانڈو ہمارے لئے پانی کا جگ بھر کر لے آیا۔ کمانڈر نے
جگ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے صرف چار گھونٹ سے زیادہ مت پینا"

مجھے گھوڑے کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ مگر کمانڈر کا حکم تھا۔ میں نے اپنے اوپر جبر
کرکے صرف چار گھونٹ پیئے۔ کمانڈر نے جگ مجھ سے لے لیا اور خود بھی گن کر چار
گھونٹ پیئے۔ پھر بولا۔

"اب تم ادھر لیٹ کر آرام کرے گا"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ لیٹنے سے میرے بدن کو کافی آرام ملا۔ میں
نے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگا کیا میں یہ کمانڈو ٹریننگ برداشت کرسکوں گا؟ میرے
اندر سے ایک آواز آئی۔ "یہاں سے اٹھ کر واپس بھاگ جاؤ" دوسری آواز آئی۔ "شرم
کرو۔ گھر سے کافر دشمن سے جنگ کرنے نکلے ہو کیا منہ لے کر واپس جاؤ گے؟ باپ کی
روح کو حشر کے دن کیا منہ دکھاؤ گے؟" میں نے فیصلہ کرلیا کہ چاہئے کچھ ہو جائے میں
اب پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ کسی نے میرا بازو زور سے ہلا کر مجھے جگا دیا۔
میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ سارا بدن بری طرح اکڑا ہوا تھا۔ شام کے سائے جنگل کے
درختوں میں اترنا شروع ہوگئے تھے۔ کمال شاہ کا ایک باڈی گارڈ مجھے جگا رہا تھا۔ اس نے
اشارے سے کہا۔

"اندر چلو"

وہ مجھے غار میں کمانڈر کمال شاہ کے پاس لے آیا۔ کمانڈر اسی طرح شیر کی کھال پر اپنی
کمانڈو کی وردی میں رائفل گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے سنگترہ کھانے کو دیا اور
پوچھا۔

"اب کیا خیال ہے تمہارا؟ اگر ارادہ بدل لیا ہے تو مجھے بتادو۔ میرا آدمی تمہیں

جنگل سے پار لے جائے گا۔ پھر تم واپس اپنے ملک چلے جانا"

میں نے کہا۔

"کمانڈر جب تک میری ٹریننگ پوری نہیں ہو جاتی میں واپس نہیں جاؤں گا"

کمانڈر مسکرایا۔

"شاباش! تم بہادر نوجوان ہے۔ پاکستان کو تم ایسے بہادر جوانوں کی ضرورت
ہے۔ میں پاکستان کے سارے جوانوں کو ٹریننگ دے کر کمانڈو بنا دینا چاہتا
ہوں۔ تمہارا مقابلہ ایک ایسی مکار قوم سے ہے جس نے پاکستان کے وجود کو
کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہندو تمہارا دشمن ہے۔ تمہارے پاکستان کا دشمن ہے۔ وہ
تمہارے ملک پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لئے کہ پاکستان کے تمام
جوانون کو کمانڈو بن کر شیروں کی طرح دشمن کے آگے ڈٹ جانا ہوگا"

میں نے محسوس کیا کہ کمال شاہ کمانڈو جب مجھے کمانڈو ٹریننگ دے رہا تھا تو اس کا لہجہ
ں پنجاب رجمنٹ کے کسی تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو کا تھا۔ اس وقت جب وہ میرے
نے بیٹھا تھا تو بڑی شستہ اردو زبان میں بات کر رہا تھا۔ ٹریننگ کے دوران وہ مجھے
ٹ کا کوئی فوجی لگتا تھا۔ اب وہ مجھے کسی اردو بولنے والے صوبے کا آدمی لگتا تھا۔

رات کو عشاء کی نماز بھی وہیں درختوں کے نیچے باجماعت پڑھی گئی۔ اس کے بعد
ے کا الاؤ روشن ہوگیا۔ کمانڈر کے آدمی جنگل میں سے ایک ہرن اور دو چار جنگلی مرغ
ر لے آئے۔ انہیں صاف کرکے سیخ پر چڑھا کر آگ کے اوپر لٹکا دیا گیا۔ سب نے مل
بھنی ہوئے مرغ اور ہرن کا گوشت کھایا۔ رات ذرا گہری ہوئی تو کمانڈر نے ایک چھوٹی
گھاس پھونس کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور خالص فوجی صوبیدار انسٹریکٹر کے لہجے
ں مجھے حکم دیا۔

"اب تم اس جھونپڑی میں جاکر سو جائے گا"

میں اٹھا اور حکم کی تعمیل میں جھونپڑی میں چلا گیا۔ جھونپڑی میں بڑا حبس تھا۔ مچھر
تھے۔ کمانڈر ابھی باہر الاؤ کے پاس ہی بیٹھا اپنے آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے

باہر آ کر کہا۔

"کمانڈر! جھونپڑی کی بجائے میں باہر سو جاؤں تو کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟"

کمانڈر نے سختی سے کہا۔

"تم جھونپڑی کے اندر ہی سوئے گا۔ ہمارا ڈسپلن خراب نہ کرو۔ نہیں تو ہم تمہیں باڈر پار بھیج دے گا"

میں خاموشی سے واپس جھونپڑی میں آگیا۔

کچھ پہاڑی ٹیلوں کی اترائی چڑھائی اور جنگل میں ڈبل مارچ کا سخت تھکا ہوا تھا۔ ہرن کے گوشت کی خماری چڑھی ہوئی تھی۔ جھونپڑی میں گھاس کا نرم بستر بچھا تھا۔ لی ہی غنودگی طاری ہونی شروع ہو گئی۔

اس کے بعد مچھر مجھے کاٹتے رہے مگر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ خدا جانے کتنی دیر سویا ہوں گا کہ کسی نے مجھے پاؤں سے ٹھوکر مار کر جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جھونپ میں اندھیرا تھا۔ میرے پاس ایک اونچا لمبا انسانی سایہ کھڑا تھا۔ مجھے کمانڈر کی کرخت آ آئی۔

"چلو اوئے اٹھو"

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھا۔ میں نے پوچھا

"کہیں جانا ہے کمانڈر؟"

کمانڈر نے مجھے جھونپڑی کے باہر دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی بتاتا ہے کہاں جانا ہے۔"

جھونپڑی کے باہر آ کر میں نے دیکھا کہ ابھی رات ہی تھی۔ خدا جانے ابھی کتن رات باقی تھی۔ صبح نہیں ہوئی تھی۔ باہر ایک درخت کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی۔ کمانڈر اپنی کمانڈو وردی میں تھا اور رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ باہر آ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"اب یہاں سے میرے ساتھ دوڑ لگائے گا۔

سٹارٹ-----"

وہ دوڑ پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ہم بالکل اس طرح دوڑ رہے تھے ں طرح آج کل لوگ جوگنگ کرتے ہیں۔ کمانڈر میرے آگے آگے تھا۔ جنگل میں رات اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر کمانڈر جنگل کے ایسے علاقے میں مجھے اپنے ساتھ دوڑا رہا تھا اں جھاڑیوں کو صاف کر کے پتلا سا راستہ بنا دیا گیا۔ اس نے میرے کندھے سے بھی ائفل لٹکا دی تھی۔ رات کے اندھیرے میں راستہ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دور لے کے بعد دوڑتے دوڑتے کمانڈر نے اپنی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں اس طرح کڑلی جس طرح دشمن کی کسی پوسٹ پر چارج کرتے ہوئے فوجی پکڑ لیتے ہیں۔ اس نے د آواز میں مجھے حکم دیا۔

"رائفل اٹیک پوزیشن میں کرلو"

میں نے جلدی سے رائفل کاندھے سے اتار کر دونوں ہاتھوں میں پکڑلی اور خدا کا ادا کیا۔ کیونکہ کاندھے پر لٹکی ہوئی رائفل بار بار میری کمر سے ٹکرا کر مجھے سخت اذیت ے رہی تھی۔ ہم دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ درختوں کے بیچ میں جنگلی جھاڑیوں کے رمیان بنائی گئی پگ ڈنڈی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ ادھر ادھر مڑ جاتی تھی۔ ختم نہیں وتی تھی۔ دوڑتے دوڑتے میرا سانس پھول گیا۔ جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ مگر میں رک ہیں سکتا تھا۔ میرا انسٹرکٹر اور مجاہد کمانڈو کمال شاہ عرف کمانڈر جوانوں کی طرح کوئیک ح کرتا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کوئی چھ سات میل ہم ضرور دوڑے ہوں گے جگہ آگے تالاب آگیا۔ کمانڈر وہاں رک گیا۔ پلٹ کر بولا۔

"اب تم یہاں بیٹھ جائے گا۔ جب تک ہم واپس نہیں آئے گا تم ادھر ہی بیٹھا رہے گا۔"

یہ کہہ کر وہ تالاب کی طرف دوڑتا ہوا درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ یا یہ شخص اتنے بیابان جنگل میں آدھی رات کو مجھے کس لئے اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ میں یہ تا ہوا وہیں بیٹھ گیا اور رائفل میں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی کہ اگر کسی طرف سے

کوئی جنگلی درندہ آگیا تو اس پر فائر کرسکوں گا۔ کچھ دیر بعد میرا سانس ٹھیک ہوا تو میں اندھیرے میں گھور گھور کر ماحول کا جائزہ لیا۔ بڑے بڑے درخت سنسان جنگل کی را کے اندھیرے میں بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ بڑا ڈرا سناٹا تھا۔ یوں لگتا کہ ابھی کس طرف سے کوئی شیر یا کوئی چڑیل نکل کر مجھ سے چمٹ جا گی۔ کمانڈر مجھے اندھیرے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کدھر غائب ہوگیا تھا۔ اچا دور سے شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ میں خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری بار شیر کی دھ بالکل قریب سے سنائی دی۔ شیر کی دہشت نے مجھے پتھر کی طرح ساکت کردیا۔ اگر رائفل میرے ہاتھ میں تھی مگر موت سامنے نظر آرہی تھی۔ شیر کہاں مجھے رائفل کرنے کا موقع دے گا۔ شیر تیسری بار دھاڑا تو میں نے رائفل وہیں پھینکی اور درخت طرف بھاگا درخت کی شاخوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا مگر مجھ پر ایسا خوف طاری تھا شاخوں پر ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر ایک بار میں اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اچھلا شاخ کو پکڑ لیا۔ پھر ٹانگوں کو جھلا کر ٹہنی سے لپٹ گیا۔ شیر اچھل کر مجھے پکڑ سکتا تھا۔ اندھیرے میں شاخوں کو ادھر ادھر ہٹاتا اوپر والے ایک دو شاخے پر جا کر بیٹھ گیا۔

مجھ پر واقعی شیر کا خوف طاری تھا۔ اس کے بعد شیر کی دھاڑ سنائی نہ دی۔ شاید کسی دوسری طرف نکل گیا تھا۔ لیکن میں اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ وہیں درخت کے شاخے پر بیٹھا رہا۔ اگرچہ مجھے مچھر اور چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے جب مجھے دیر ہوگئی اور مچھروں اور چیونٹیوں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ رہی تو میں درخت نیچے اتر آیا۔ نیچے اترتے ہی میں نے رائفل اٹھائی اور اس کو تان کر درخت کے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس ڈر سے کہ اگر اچانک شیر کسی طرف سے نکل آیا تو اس کردوں گا۔ شیر کو گولی لگے یا نہ لگے مگر رائفل کے دھماکے کی آواز سے کم از کم وہ ضرور بھاگ جائے گا۔ میں اسی پوزیشن میں رائفل تانے بیٹھا رہا۔ شیر بھی نہ آیا کمانڈر بھی نہ آیا۔

پو پھٹنے لگی۔ جنگل میں پچھلے پہر کا ہلکا ہلکا نور سا پھیلنے لگا۔ درختوں کے تنے

جھاڑیوں کے خاکے واضح ہونے لگے۔ میں تھوڑی تھوری دیر بعد آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف کا جائزہ لے لیتا تھا۔ درختوں پر پرندوں کی چہکاریں شروع ہوگئیں۔ ایک لنگور نے سامنے والے درخت سے میرے والے درخت پر چھلانگ لگائی اور پھر ایک شاخ پر جھولتا ہوا تیسرے درخت کی طرف نکل گیا۔ تالاب جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ صبح صبح کوئی جنگلی درندہ پانی پینے نہ آجائے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تو میں دھڑا دھڑ فائرنگ کرنے لگوں گا۔ میرے پاس گولیوں کی کمی نہیں تھی۔ میں حیران تھا کہ کمانڈر میرے پاس واپس کیوں نہیں آیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید وہ میری ہمت اور حوصلے کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ دن کی سفید سفید روشنی جنگل میں اتر آئی تھی۔ واپسی کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ چنانچہ میں اٹھا اور واپس اس چھوٹے سے تنگ راستے پر چل پڑا جو جھاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔

دن کی روشنی میں مجھے اتنا ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ تاہم رائفل میں نے ہاتھوں میں اس طرح پکڑ رکھی تھی کہ ذرا سے خطرے پر فوراً" فائر کر سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے جنگل کا راستہ ختم ہوا۔ جب میں کمانڈر کے ہائیڈ آؤٹ پر واپس آیا تو دن کافی نکل آیا تھا۔ سورج درختوں کے اوپر کافی بلندی پر آگیا ہوا تھا۔ غار کے باہر کوئی بھی آدمی نظر نہ آیا۔ میں اپنے گھاس پھونس کے جھونپڑے کے باہر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کمانڈر مجھے آدھی رات کو جھونپڑے سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اتنے میں کمانڈر غار میں سے نکلا۔ اس کے ساتھ دونون باڈی گارڈ تھے۔ غار کے باہر آکر اس نے میری طرف دونوں باڈی گارڈ تھے۔ غار کے باہر آکر اس نے میری طرف دیکھا اور اکیلا میرے پاس آگیا۔

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کمانڈر نے مجھے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس کی کہ جنگل میں میری رات کیسی گزری۔ اس نے یہ بھی نہ بتایا کہ وہ مجھے چھوڑنے کے واپس کیوں نہیں آیا تھا۔ بس میری طرف ایک نظر دیکھا اور فوجی انسٹرکٹروں والے کرخت لہجے میں کہا۔

"اب تم اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر کھانا کھائے گا۔ اس کے بعد تمہاری ضابطے
کے ساتھ ٹریننگ شروع ہو گا۔ گو۔"
میں جھونپڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک باڈی گارڈ میرے لئے کھانا
آیا۔ دو روٹیاں اور اس کے اوپر رکھا ہوا رات والے ہرن کے گوشت کا ٹکڑا۔ میں
باڈی گارڈ سے کہا۔
"مجھے اتنی بھوک نہیں ہے بھائی۔ یہ تو ناشتے کا وقت ہے۔"
باڈی گارڈ نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ میں نے بمشکل ایک روٹی ہرن
گوشت کے ساتھ کھائی۔ اس روز مجھے صبح کے وقت چائے بھی نہ ملی۔ باہر سے کمان
آواز آئی۔
"نیا رنگروٹ باہر نکلو۔ ڈبل سے ------"

میں جلدی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ کمانڈر کمانڈو کی فل وردی میں رائفل کاند
لٹکائے کھڑا تھا۔ سبز رومال سر پر باندھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا اور یہ کہکر چل پڑا۔
"ایڈوانس ------"
میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھے جنگل کے ایک اور راستے پر چلاتا ہوا
کھلی وادی میں لے آیا۔ یہ وادی چھوٹی سی تھی۔ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ در
میں اونچی نیچی زمین پر کہیں اونچی اونچی گھاس تھی اور کہیں درختوں کے جھنڈ الگ ا
ہو کر کھڑے تھے۔ کمانڈر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں بیٹھنے لگا تو اس نے چلا کر کہا۔
"تم یہاں بیٹھ کر آرام کرنے نہیں آیا۔ یہ تمہاری خالہ کا ریسٹ ہاؤس نہیں
ہے۔ چلو۔ اس وادی کے دو چکر لگاؤ۔ ڈبل مارچ کرتے ہوئے۔ گو ----"
اس نے اتنی زور سے فوجی انداز میں "گو" کہا کہ میں بے اختیار دوڑ پڑا۔ وادی
گرداگرد ایک پگ ڈنڈی بنا دی گئی تھی۔ یہاں نئے رنگروٹوں سے دوڑیں لگوائی
تھیں۔ میں ڈبل مارچ کرتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ تھک کر ذرا رکا تو دور سے کمانڈر کی

واز آئی۔
"ابھی ریسٹ نہیں کرے گا تم۔ گو"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کمانڈر ایک اونچی جگہ پر بیٹھا مجھے برابر نگاہ میں رکھے ہوئے
ا۔ زیادہ کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ جب میں نے وادی کے دو چکر پورے کئے تو
ں خچر کی طرح ہانپ رہا تھا اور پسینے میں شرابور تھا۔ کمانڈر خوش ہو کر بولا۔
"شاباش! اب تم پورا خچر بن گیا ہے ہم تمہیں پہلے خچر بنائے گا۔ پھر گھوڑا بنائے
گا۔ اس کے بعد تمہارے کان کھینچ کھینچ کر خرگوش بنا دے گا۔"
دوپہر تک کمانڈر مجھے دوڑاتا' ٹیلوں پر چڑھاتا اتارتا رہا۔ ایک جگہ برساتی جوہڑ تھا
جس کا پانی سبزی مائل تھا۔ وہاں آ کر کمانڈر نے حکم دینے کے لہجے میں کہا۔
"اب تم اس تالاب کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے گا۔ پانی کو ہاتھ سے ادھر
ادھر ہٹائے گا۔ پھر صرف ایک کپ پانی پئے گا۔"
جوہڑ کا پانی اتنا گندا لگ رہا تھا کہ میں نے کہا۔
"کمانڈر مجھے پیاس نہیں ہے"
حالانکہ مجھے بڑی پیاس لگی تھی مگر میں جوہڑ کا گندا پانی نہیں پینا چاہتا تھا۔ کمانڈر نے
اکر کہا۔
"تمہارا مائی باپ بھی یہ پانی پئے گا۔ گو"
اس نے مجھ پر رائفل تان لی۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ مجھے اس شخص سے ڈر لگنے لگا
تھا۔ اس کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ سچ مچ مجھے گولی ہی مار دے۔ میں نے جھک کر جوہڑ کے پانی
کو ہاتھ سے ادھر ادھر ہلایا اور آنکھیں بند کر کے دو چلو پانی پی گیا۔ کمانڈر کی آواز آئی۔
"شاباش! اب تم اس جوہڑ میں غوطہ لگا کر اس کے دوسرے کنارے پر جائے
گا۔ اگر تم نے سر پانی سے باہر نکالا تو ہم فائر کر دے گا"
میں کمانڈر کے اس عجیب و غریب حکم پر حیران پریشان ہی ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے

جوہڑ میں دھکا دے دیا۔ میں نے ناک منہ آنکھیں بند کرلیں۔ جوہڑ کے پانی کی تہہ پر
درختوں کی جھاڑیاں تھیں ان میں میرا پاؤں پھنس گیا۔ مگر میں نے جلدی سے اسے کھینچ
نکالا اور جتنی تیزی سے پانی کے اندر رہ کر تیر سکتا تھا تیرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف
چل پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ جس وقت کمانڈر نے مجھے جوہڑ میں دھکا دیا اس وقت میں
سانس اوپر کی طرف لے رہا تھا اور میرے جسم میں کافی آکسیجن تھی۔ جوہڑ زیادہ چوڑا نہیں
تھا۔ پھر بھی ایک سانس میں غوطہ لگا کر پانی کے اندر ہی اندر تیر کر دوسرے کنارے تک
جانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ جبکہ پانی کے اندر جو جھاڑ جھنکاڑ تھا وہ بھی میرا راستہ روک
تھا۔ مگر میں اس طرح مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں آزادی کشمیر کی لڑائی میں جاکر مرنا چاہتا تھا
میرے اندر زبردست طاقت آگئی۔ اور میں نے ایک ہی سانس میں جوہڑ کو پار کرلیا۔ جب
میرے ہاتھ پانی کے اندر دوسرے کنارے کی دیوار سے ٹکرائے تو میں نے سر باہر نکا
لیا۔ کمانڈر کی گولی کا ڈر برابر لگا ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے جوہڑ پار کرلیا تھا۔ کمانڈ
پہلے ہی سے دوسرے کنارے پر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ دے کر مجھے جوہڑ سے با
کھینچ لیا۔ میں لمبے لمبے سانس لینے لگا اپنے بازو دیکھے تو دہشت سے میری چیخ نکل گ
میری کہنیوں تک بازوؤں کے ساتھ جونکیں چمٹی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی جلد
ساری جونکیں کھینچ کھینچ کر اتاریں۔ اسی طرح پنڈلیوں پر بھی جونکیں چمٹ کر میرا خو
چوس رہی تھیں۔ دو جونکیں میری گردن سے بھی لگی ہوئی تھیں۔

کمانڈر پاس کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

"شاباش! اب میرے پیچھے آجاؤ"

وہ آگے چل پڑا۔ جونکوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد میں بھی اس کے
روانہ ہوگیا۔ وہ مجھے بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر لے آیا جہاں شف
پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ کمانڈر نے حکم دیا۔

"اس میں تم نہائے گا۔ کپڑے دھوئے گا۔
گو۔۔۔۔گو"

وہ ایک طرف جھاڑیوں کے پاس رائفل لے کر بیٹھ گیا۔ میں چشمے میں اتر گیا۔
پانی شفاف تازہ پانی میں کپڑے اتار کر دھوئے۔ اچھی طرح غسل کیا اور جوہڑ کے پانی کی
ساری آلائشیں دھوڈالیں۔ پھر کپڑے نچوڑ کر گیلے ہی پہن لئے۔

اس دوران کمانڈر نے اپنا کمانڈو نائف یعنی خاص قسم کا چاقو نکالا ہوا تھا اور اسی سے
درخت کی ٹہنیاں کاٹ رہا تھا۔ پھر اس نے وہاں آگ جلائی اور مجھے کہا۔

"تم اس سامنے والی جھاڑی میں جائے گا وہاں تمہیں ایک بڑا مینڈک بیٹھا ہوا
ملے گا تم اسے پکڑ کر ہمارے پاس لائے گا۔۔۔۔گو"

میں مشین کی طرح جھاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔ جھاڑی میں غور سے جھک کر دیکھا۔
ک طرف سے مینڈک کی آواز آئی۔ خدا جانے یہ مینڈک وہاں کہاں سے آگیا تھا۔ مجھے
ن ہے کہ یہ مینڈک کمانڈر نے خود وہاں رکھا تھا۔ میں نے مینڈک کو لپک کر پکڑ لیا اور
انڈر کے پاس لے آیا۔ کمانڈر نے میرے دیکھتے دیکھتے چاقو سے مینڈک کی گردن الگ کر
ا۔ اس کا پیٹ چاک کرکے انتڑیاں وغیرہ نکال کر پھینک دیں۔ پھر اسے آگ پر رکھ کر
ننے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مینڈک کس لئے بھون رہا ہے۔ اچانک میرا دل
چل کر میرے حلق کے قریب آگیا۔ کہیں یہ مینڈک مجھے کھلانے کے لئے تو نہیں بھون
ا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمانڈر نے مینڈک کی ایک ٹانگ کاٹ کر میری طرف
نکی اور کہا۔

"اب تم اس کو کھا جائے گا۔۔۔۔گو"

دوسری ٹانگ کمانڈر خود چبانے لگا۔ میں نے زندگی میں کبھی مینڈک نہیں کھایا تھا۔
ینڈک کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں نے کبھی مینڈک نہیں کھایا"

کمانڈر بولا۔

"تمہارے سامنے اگر ہم مینڈک کی ٹانگ کھاتا ہے تو تمہیں بھی کھانا پڑے گا۔
نہیں تو تمہیں گولی مار دے گا۔۔۔۔گو"

اور کمانڈر نے رائفل کی نالی کا رخ میری طرف کر دیا۔ اس عجیب و غریب سخت
ضدی شخص سے کسی چیز کی بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور مینڈ
کی ٹانگ میں ڈال کر چبانے لگا۔ میں نے ناک کے ذریعے سانس لینا بھی بند کر دیا تھا
مجھے مینڈک کے جلے ہوئی گوشت کی بو نہ آئے۔ میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے
عذاب کے ساتھ مینڈک کی ٹانگ کھائی۔ جب کھا چکا تو کمانڈر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے
حکم دیا۔

"اپنے پاؤں کے جوتوں سے اس آگ کو اچھی طرح بجھادو۔ گو۔۔۔۔۔"
اب تم اس تالاب کے گرد پندرہ چکر پورے کرے گا۔ ہم یہاں کھڑے ہو کر
رہے گا۔ پورے پندرہ چکر لگائے گا۔ گو"

وہ کڑک کر بولا۔ میں روبوٹ مشین کا آدمی بن گیا تھا۔ اس نے گو کہا اور میں
پڑا۔ تالاب کا حلقہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پھر بھی پندرہ چکر لگاتے لگاتے میں ہلکان ہو گیا۔
پندرہ چکر پورے ہو گئے تو میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ کمانڈر نے خوش ہو
مجھے دیکھا اور بولا۔

"شاباش جوان! اب تم گھوڑا بن گیا ہے۔ پورا گھوڑا بن گیا ہے۔ اب واپس
اپنے ہیڈ کوارٹر جائے گا۔"

جس وقت ہم واپس کمانڈر کمال شاہ کے غار والے خفیہ ٹھکانے پر آئے تو دن
شروع ہو گیا تھا۔ تھکان کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کمانڈر میرے ساتھ میر
جھونپڑے میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں چائے آگئی۔ ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ اب کمانڈر پھر
شاہ بن گیا تھا۔ شستہ اردو میں کہنے لگا۔

"میں نے تمہارے اس آہنی عزم کو دیکھ لیا ہے جو تمہارے خون میں گردش کر
رہا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ میں پاکستان کے ہر جوان کے خون میں
اس عزم کو گردش کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ قائداعظم نے مسلمانوں کو یہی آہنی
عزم عطا کیا تھا۔ پاکستان کی نئی نسل کو اس آہنی عزم کے ساتھ اپنے ملک کی

ترقی کے لئے قربانیاں دینی ہیں۔ یاد رکھو۔ یہ تمہارے آرام کرنے کے نہیں
کام کرنے کے دن ہیں۔ انتھک محنت کرنے اور ہر وقت فوجی جوان کی طرح
چوکس رہنے کے دن ہیں۔ تمہارا دشمن، تمہارے وطن پاکستان کا دشمن
تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ وہ موقع کی تلاش میں ہے اسے موقع ہرگز نہ دینا۔
اسے یقین دلا دو کہ تم اسلام کے سپاہی ہو۔ محمود غزنوی اور محمد بن قاسم اور
سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج کے سپاہی ہو۔ اپنی سرحد کو پہچانو۔ اپنے
دشمن کو پہچانو۔ اپنے فرض کو پہچانو۔ پھر دنیا کی کوئی مخالف طاقت پاکستان کو اپنی
جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ یاد رکھو مسلمانوں نے پاکستان کے لئے بے بہا قربانیاں
دی ہیں۔ یہ ملک قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔ تم کمزوری دکھاؤ گے تو تم ختم ہو
جاؤ گے مگر پاکستان کبھی ختم نہیں ہو گا۔ قدرت کسی دوسری نسل کو تربیت دے
کر اسے مصیبتوں تکلیفوں اور اذیتوں کا عادی بنا کر تمہاری جگہ پر لے آئے
گی۔"

میں بڑی توجہ سے کمال شاہ کمانڈو کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے عزم کو
مستحکم کر رہی تھیں۔ میرے اندر محمود غزنوی اور صلاح الدین ایوبی کا جذبہ حریت
لے رہی تھیں۔ میری ساری تھکان روز ہو گئی۔ کمانڈر اٹھا اور بولا۔

"اب تم آرام کرو۔ رات کو غار کے اندر رائفل شوٹنگ کی ٹریننگ کا مرحلہ
شروع ہو گا۔ اس کے بعد تمہیں اندھیرے میں چیتے کی طرح دشمن پر جھپٹ کر
ایک سیکنڈ کے اندر اندر چاقو سے اس کی بائیں جانب یا دائیں جانب والی شہ
رگ کاٹنے کی ٹریننگ دی جائے گی۔ پھر فوجی ایمونیشن ڈائنا مائیٹ، بوبی ٹریپ
اور سپر مائنز کی ٹریننگ دی جائے گی۔ ابھی تم ایک گھنٹہ کے لئے سو جاؤ۔ ایک
گھنٹے کے بعد ایک آدمی تمہیں جگا کر غار میں سے آئے گا"

میں واقعی مشین بن گیا تھا۔ وہیں جھونپڑی کے گھاس کے فرش پر لیٹ گیا اور یقین
کا مجھے آگئی۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد کمانڈر کا آدمی مجھے جگا کر غار میں لے آیا۔ یہاں

چٹان کی دیوار کے ساتھ فاصلے فاصلے پر چاند ماری کی طرح کے نشان بنے ہوئے تھے۔ یہ
رائفل ٹریننگ شروع ہوگئی۔ اس زمانے میں ابھی کلاشنکوفیں وغیرہ نہیں آئی تھیں۔ تھ
ناٹ تھری کی رائفلیں اور برین گنیں سٹین گنیں اور مشین گنیں ہی فوج میں استع
ہوتی تھیں۔ غار کے اندر رائفل کی ٹریننگ اس لئے دی جاتی تھی کہ فائر کی آواز جنگل
پیدا نہ ہو۔ کیونکہ یہ کمال شاہ کا خفیہ ٹھکانہ تھا اور یہاں کشمیری مجاہدین کی نئی نسل کو کما
ٹریننگ دی جاتی تھی۔ بیس روز تک میں غار کے اندر نشانے بازی کی تربیت حاصل
رہا۔ میں نے اس دوران ٹھیک نشانے پر گولی فائر کرنا سیکھ لیا۔ اس میں میرے شوق
کمانڈر کی اعلیٰ تربیت کا بھی اثر تھا۔ اس دوران رات کے اندھیرے میں جنگل میں د
پر جھپٹ کر پیچھے سے اس کی گردن دبوچنے اور چاقو سے اس کی شہ رگ کاٹنے کی ٹر
بھی ہوتی تھی۔ درخت کے پیچھے آدمی کی ڈمی بنا کر کھڑی کردی جاتی ڈمی کی گردن
گھنگھرو باندھ دیئے جاتے۔ مجھے کمانڈو چاقو دے کر حکم دیا جاتا کہ ڈمی کی گردن پر
سے آکر اس طرح چاقو چلاؤں کہ ڈمی کی آدھی گردن بھی کٹ جائے اور گھنگھرو کی ذر
بھی آواز نہ پیدا ہو۔ یہ بڑی مشکل ٹریننگ تھی۔ شروع شروع میں میں ڈمی کی گرد
چاقو چلاتا تو گھنگھرو جھنجھنا اٹھتے۔ کمانڈر کی پیچھے سے کرخت آواز آئی۔

”تم جنگلی لوگ کو کب عقل آئے گا ٹرائی گین۔۔۔۔۔“

کمانڈو ٹریننگ کے دوران کمال شاہ مجھ سے ہر قسم کی سخت کلامی کرتا تھا۔ بر
دینے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ دو تین ہفتوں کے بعد جا کر میں اتنا ماہر ہوگیا کہ کمانڈر
ہاتھ میں لیکر سیکنڈ والی سوئی کا بٹن دبا کر گو کہتا اور میں درخت کے پیچھے کھڑی دشمن ک
پر چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ کر اتنی مہارت سے چاقو پھیرتا کہ ا
آدھی گردن کٹ جاتی اور کیا مجال ہے جو گھنگھرو کی آواز پیدا ہوتی۔ یہ سارا آ
صرف تین سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد میری ٹارچر برداشت کرنے کی تر
مرحلہ آیا۔ کمال شاہ نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور کہنے لگا۔

”کمانڈو گھیرے میں آکر اگر دشمن کے قابو آجائے تو دشمن اسے اتنی غیر انسانی

اذیتیں دیتا ہے کہ ایک بار تو بڑے بڑوں کا دل گردہ ہل جاتا ہے۔ دشمن ایک
عام سپاہی سے اتنی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ لیکن اگر کمانڈو اس کے ہاتھ
آجائے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کمانڈر کو اتنی اذیتیں دے اس کے ساتھ
ایسی درندگی کا سلوک کرے کہ وہ گھبرا کر اپنے ساتھی کمانڈوز کے نام اور اپنے
خفیہ ٹھکانے کا محل وقوع بتادے۔ یہ دشمن کی بہت بڑی فتح اور ایک کمانڈو کی
بہت بڑی شکست ہوتی ہے۔ اس طرح دشمن تمام کمانڈوز کو ختم کرکے اپنے
ایمونیشن ڈمپوں' سپلائی ڈپوؤں' فوجی کانوائیوں اور ہزاروں کی فوجی نفری کو تباہ
ہونے سے بچالیتا ہے۔ ہم تمہیں اتنا ٹارچر نہیں کریں گے کہ تم مرجاؤ۔ مگر
اتنی اذیتیں ضرور دیں گے کہ تمہارا جسم انہیں برداشت کرنے کا عادی ہو
جائے۔ بس ہم اتنا ہی کرسکتے ہیں آگے سارا کام تمہارے ایمان کی قوت نے
کرنا ہوگا۔ لیکن جس وقت ہم تمہیں ٹارچر کریں تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ دشمن
تمہیں اس سے کئی گنا زیادہ ٹارچر کرے گا۔ ہم تمہیں زندہ رکھیں گے دشمن
تمہیں مارنے کے لئے ٹارچ کرے گا۔۔۔۔“

اپنے مجاہد کی کمانڈر اور مرد مومن کمال شاہ کی باتیں اب یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں کہ
س قدر سچا انسان تھا۔ اس کی ایک ایک بات سچی تھی۔ اگر میں اس کی تربیت کی بھٹی
ے نہ نکلا ہوتا تو آج اپنی زندگی کی سچی داستان سنانے کے لئے شاید زندہ نہ ہوتا۔
ے کمانڈر نے' اس مرد مومن نے میرے جسم کو ملک و قوم اور اسلام کی سربلندی کی
ر بڑی سے بڑی اذیت کو سہہ جانے کے قابل ہی نہیں بنایا بلکہ مجھے یہ بھی سکھایا کہ
ن کا ٹارچر' اس کی غیر انسانی اذیتیں جب برداشت کی حد سے آگے نکل جائیں تو پھر
طرح اپنے جسم کو اپنے شعور اور احساسات کو اللہ کی مرضی کے سپرد کردیا جاتا ہے۔
کے محاذ پر دو تین بار ایسا ہوا کہ دشمن نے مجھے ایسی ایسی درندہ صفت اذیتیں دیں
جھے محسوس ہوا کہ میں زندہ نہیں رہا۔ میں مرگیا ہوں۔ لیکن میں زندہ تھا۔ صرف
نے اپنے کمانڈر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے وجود کو اپنے

شعور کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔

قصہ مختصر کمانڈر کمال شاہ کے خفیہ ٹھکانے پر میری کمانڈو ٹریننگ ایک خاص مدت کے
بعد ختم ہوگئی۔ اس ٹریننگ نے مجھے گھوڑا، خچر، خرگوش، لومڑی، شیر، چیتا سبھی کچھ بنا دیا
سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے ایک سچا پاکستانی اور اسلام کا شیدائی بنا دیا۔ اسلام کا شیدائی
میں پہلے بھی تھا لیکن کمال شاہ کی تربیت نے مجھے شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام
سپاہی بھی بنا دیا۔ ایسا بے خوف سپاہی جو صرف اللہ سے ڈرتا تھا۔ جس کا اٹھنا بیٹھنا
پھرنا، جہاد کرنا، دنیاوی معاملات کرنا صرف اللہ اور اللہ کے لئے تھا۔ جس کے جسم میں ج
اور روح صرف اس لئے مقید تھی کہ اسے ایک دن اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جائے۔
اللہ کی امانت تھی۔ یہ اس مرد مومن کی تربیت کا اثر تھا کہ جب میں کشمیر کے محاذ پر ا
کے دشمنوں سے لڑ رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خدا میرے ساتھ ہے۔ جیسے
کے فرشتے میرے ساتھ مل کر کافروں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔

کمال شاہ کے پاس میں نے چھ مہینے گزارے۔ یہ کمانڈو ٹریننگ کے لئے کوئی
عرصہ نہیں تھا۔ مگر اتنی کم مدت میں ہی اس نے مجھے ایک مکمل کمانڈو اور ایک سرفر
مجاہد بنا دیا۔ میں اگر لوہا تھا تو کمانڈر نے مجھے فولاد بنا دیا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ
ٹریننگ کے دوران مجھے اذیت کے کن کن مراحل سے گزارا گیا۔ صرف اتنا ضرور کہو
کہ اگر میرے اندر جذبہ ایمانی زندہ نہ ہوتا تو میں اس مرحلے پر ٹریننگ ادھوری چھو
بھاگ گیا ہوتا۔ اس مرد مومن نے میرے جسم کو فولاد اور اسپات سے بھی زیادہ مضب
دیا۔ مجھے ایسا لگتا کہ میں اگر نعرہ حیدری لگا کر کسی چٹان کو زور سے مکا ماروں گا تو ا
از کم ایک بار اپنی جگہ سے ضرور ہلا دوں گا۔ میں اونٹ کی طرح ایک بار پانی پی کر ا
پر دو دن تک زندہ رہ سکتا تھا۔ میں جنگل کے پتوں اور پودوں کی جڑوں سے خو
حاصل کرنا جان گیا تھا۔ میں گھوڑے کی طرح کئی کئی میل تک دوڑ سکتا تھا۔ خچر کی
کئی من بوجھ سر پر رکھ کر کئی کئی میل پیدل چل سکتا تھا۔ پہاڑی بکرے کی طرح ت
اٹھی ہوئی چٹانوں پر چڑھ سکتا تھا۔ دشمن پر چیتے کی عیاری کے ساتھ اچانک حملہ کر کے

رگ کاٹ سکتا تھا۔ خرگوش کی طرح دشمن کو قریب آتا دیکھ کر اپنے آپ کو
وں میں چھپا سکتا تھا۔ میں نے اپنا سانس کمانڈو ٹریننگ میں اتنا پکا لیا تھا کہ پانی میں
گا کر پانی کے اندر کافی دیر تک بیٹھا رہ سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی
ندر کی طرح درختوں درختوں پھلانگتا ہوا جنگل کے دوسرے کنارے تک پہنچ سکتا

میری جسمانی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ کمانڈر کمال شاہ نے میری روحانیت کی تربیت
ی۔ انہوں نے میری روح کو بھی طاقتور اور تابناک بنا دیا تھا۔ انہوں نے میری
کو تمام آلائشوں سے پاک کر کے میری نگاہ کو پاک اور کردار کو بے باک بنا دیا تھا۔ وہ
روحانی تربیت کے دوران اکثر یہ الفاظ دہرایا کرتے۔

"جوان! میں تجھے اللہ اور رسولؐ کی امانت کا صحیح رکھوالا بنانا چاہتا ہوں۔ میں
چاہتا ہوں کہ تم اسلام اور مسلمان کی عزتوں کے رکھوالے بن جاؤ۔ تم پاکستان
کی سرحدوں کو پہچان جاؤ۔ تم اپنے فرض کو پہچان جاؤ۔ تم اپنے دشمن کو پہچان
جاؤ۔ میں تجھے سلطان محمود غزنوی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی سپاہ کا مجاہد
بنانا چاہتا ہوں۔۔۔۔"

اور جب میری ٹریننگ ختم ہوئی تو روحانی اور جسمانی طور پر میرے اندر محمود غزنوی
سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج کے سپاہی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ کمانڈر نے میرا نشانہ
ندر پختہ کر دیا تھا کہ میں میری گولی پہاڑ کی چوٹی کے درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے کو
دیتی تھی۔ جب میری ٹریننگ مکمل ہوگئی تو کمال شاہ نے عصر کی نماز مجھے حسب
ل اپنے ساتھ ہی پڑھائی۔ نماز کے بعد ان کے خاص آدمی غار سے چلے گئے تو انہوں
اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ جب غار میں میں اور کمال شاہ اکیلے
ئے تو انہوں نے کہا۔

"جوان! تمہاری کمانڈو ٹریننگ ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی۔ اس کا آخری
مرحلہ باقی ہے۔"

میں نے بڑے ادب سے عرض کی۔

"کمانڈر! آپ حکم کریں۔ میں حاضر ہوں"

اب میرے اندر بھی وہ پہلے دن والی بات نہیں تھی۔ پہلے میں ان کی ٹریننگ
گھبرا کر بھاگ جانے کی ترکیبیں سوچتا تھا۔ مگر میرے جذبہ جہاد نے مجھے روک رکھا
اب وہ بات نہیں تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ کمال شاہ سے اس مرد مومن سے جس
طاقت ایمانی اور تربیت کامل حاصل کر سکوں حاصل کرلوں۔ چنانچہ جب انہوں نے مجھے
کہ ابھی مجھے ٹریننگ کے ایک آخری مرحلے سے بھی گزرنا ہوگا تو مجھے یوں محسوس
جیسے کوئی شخص جس نے مجھے اپنا سارا خزانہ سونپ دیا ہو کہہ رہا ہو کہ ابھی تمہیں کچھ
زروجواہرات دینے باقی رہ گئے ہیں وہ بھی لے لو۔ کمال شاہ صاحب مجھے شیر کی کھال
اٹھا کر اپنے ساتھ غار کے پیچھے لے گئے۔ یہاں دیوار کے اندر ایک چھوٹی سی تن
کوٹھڑی سی بنی ہوئی تھی۔ کمال شاہ نے اندر جاکر لالٹین روشن کردی۔ میں بھی کوٹھ
میں آگیا۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوق پڑا تھا جس کو تالا لگا ہوا تھا۔
شاہ نے اپنی جیکٹ کی جیب سے چابی نکال کر صندوق کو کھولا۔ پھر اس میں سے چمڑ
ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔ تھیلی کا منہ تسمے سے بند کیا ہوا تھا۔

وہ مجھے واپس غار میں اپنی نشست گاہ میں لے آئے۔ مجھے سامنے بٹھالیا اور کہا۔

"ابھی باہر شام کا وقت ہے۔ تمہاری ٹریننگ کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ تم اس وقت جنگل میں جاؤ گے۔ تم اس جنگل سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہو۔ جہاں بانس کے جھنڈوں والا ٹیلا ہے اس ٹیلے کے پار کرونڈے کی چھوٹی پہاڑیوں والا جنگل ہے۔ اسے ہم کرونڈا بن کہتے ہیں۔ یہ جنگل ہم نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں دکھایا تھا۔ تاکہ آج اپنی تربیت کے آخری مرحلے میں تم وہاں جاؤ تو وہ جنگل تمہارے لئے بالکل اجنبی ہو۔ اس جنگل میں چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹیلے ہیں جو سینکڑوں میل تک شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے ہیں۔ ان ہی ٹیلوں کے درمیان ایک جگہ مغلوں کے زمانے سے پہلے کی ایک باؤلی ہے۔ باؤلی سمجھتے ہو

ناں؟ بادشاہوں کے زمانے میں جب امراء وزراء اور بادشاہ شکار پر جاتے تھے تو کبھی کبھی ان کی بیگمات اور خاندان کی شاہی خواتین بھی ان کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ جنگل میں ان کے غسل وغیرہ کے لئے ان کے پرانے کپڑے دھونے کے لئے کسی زمین دوز قدرتی چشمے کے گرداگرد پتھروں کی دیوار کھڑی کر کے اندر چشمے تک سیڑھیاں بنا دی جاتی تھیں۔ اوپر چھت ڈال دی جاتی تھی تاکہ شاہی خواتین وہاں آزادی اور حیاداری سے نہا سکیں اور ان کی لونڈیاں اور نوکرانیاں ان کے اتارے ہوئے کپڑے وغیرہ دھو سکیں بادشاہوں کا زمانہ گزر گیا۔ تو یہ باؤلیاں ویران ہو گئیں۔ ایسی ہی ایک ویران باؤلی کرونڈا بن کی پہاڑیوں میں بھی ہے۔ تمہیں رات کے اندھیرے میں اس ویران باؤلی کو تلاش کرنا ہے۔ اس باؤلی کے اندر نیچے پانی تک سیڑھیاں اترتی ہیں۔ اس باؤلی کے اندر سے ایک خفیہ سرنگ جنگل کے دوسرے حصے کی طرف جاتی ہے۔ اس سرنگ میں ایک جگہ چٹانی دیوار میں ایک شگاف نما کوٹھڑی بنی ہوئی ہے۔ اس کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ ہندوؤں کی ایک دیوی ہولا دیوی کا چھوٹا سا بت لگا ہوا ہے۔ اس بت کے بارے میں ہندوؤں نے مشہور کر رکھا تھا کہ جو کوئی مسلمان اس بت کے پاس جائے گا ہولا دیوی اسے جلا کر راکھ کر دے گی۔ مگر میں ایک رات وہاں گیا اور ہولا دیوی کے بت کو توڑ کر اس کا سر الگ کر کے اپنے ساتھ رسی سے باندھ کر زمین پر گھسیٹتا ہوا یہاں لے آیا۔ اب میں اس بت کے سر کو کمانڈو ٹریننگ کے آخری مرحلے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔ ہولا دیوی کے بت کا دھڑ جو چھ سات انچ بڑا ہے۔ میں نے وہیں رہنے دیا تھا۔ اسے میں نے وہیں پتھروں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا ہے۔"

پھر کمال شاہ نے تھیلی کھول کر اس میں سے ہولا دیوی کے بت کا سر نکال کر مجھے دکھایا۔ یہ عورت کا کرکٹ کے گیند جتنا بڑا پتھر کا سر تھا۔ اس کا رنگ سیندھوری تھا۔ آنکھیں ناک اور موٹے موٹے ہونٹ بنے ہوئے تھے۔ کانوں میں صرف سوراخ تھے۔

ان میں کوئی بندے وغیرہ نہیں بنائے گئے تھے۔ پتھر کو تراش کر بال بنائے گئے تھے۔ درمیان میں سے مانگ نکلی ہوئی تھی اور پیچھے پتھر ہی کا چھوٹا سا جوڑا بنا ہوا تھا۔ شکل صورت سے یہ دیوی کوئی ڈائن وغیرہ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ گردن سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کمال شاہ نے کہا۔

"میں نے نعرہ حیدری مار کر اس کے منہ پر زور سے مکا مارا تھا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ میں اسے اپنی بت شکنی کی یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ پھر جب میں نے یہاں کشمیری مجاہدین کو کمانڈو ٹریننگ دینے کا سلسلہ شروع کیا تو میں نے اس بت کو بھی کمانڈو ٹریننگ کے کورس میں شامل کرلیا۔ تب میں ایک روز باؤلی میں واپس گیا اور سرنگ میں جاکر ہولا دیوی کے بت کا دھڑ بھی دیوار میں سے اکھاڑ کر اسے وہیں ایک جگہ پتھروں میں چھپا دیا۔ اب تمہیں راتوں رات اس باؤلی میں جانا ہے۔ باؤلی کی سرنگ تلاش کر کے سرنگ کے اندر ہولا دیوی کی کوٹھڑی ڈھونڈتی ہے اور وہاں سے اس بت کا دھڑ لاکر مجھے دینا ہے یہ جب تم اس بت کا دھڑ لاکر مجھے دے دو گے تو تمہاری ٹریننگ کا آخری مرحلہ بھی مکمل ہو جائے گا۔ پھر تم پورے کمانڈو بن جاؤ گے اور میں تمہیں جہاد کشمیر میں شامل ہونے کی باقاعدہ اجازت دے دوں گا۔ اس بت کے سر کو غور سے دیکھ لو۔ اس کے دھڑ پر بھی اس قسم کا سیندھوری رنگ پھرا ہوا ہے۔ تمہیں صرف اپنے ساتھ کمانڈو چاقو لے جانے کی اجازت ہوگی۔ اب تم نکل جاؤ۔۔۔۔۔"

میں کچھ کہنے لگا تو کمال شاہ ایک دم فوجی انسٹرکٹر بن گئے اور کرخت آواز میں دیا۔

"تم ابھی جائے گا اور راتوں رات واپس اس بت کا دھڑ لا کر مجھے دے گا۔ گو۔۔۔۔"

آگے سے بولنے کا کوئی مقام ہی نہیں تھا۔ میں لیس کمانڈر کہہ کر تیز تیز قدم اٹھا

سے نکل کر اپنے جھونپڑے میں آیا۔ وہاں سے میں نے اپنا کمانڈو چاقو لیا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ ابھی پوری طرح سے رات کا اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ آسمان پر ڈوبتے سورج کی تھوڑی لالی موجود تھی جو بڑی تیزی سے رات کی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سارا جنگل اور جنگل کے راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ میں چھ مہینوں کی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اس جنگل کے ایک ایک درخت ایک ایک جھاڑی سے واقف ہوگیا تھا۔ صرف کروندے کا جنگل میرے لئے بالکل نیا جنگل تھا۔ اسے کمال شاہ نے جان بوجھ کر صرف آج کے دن کے لئے میری نگاہوں سے اوجھل رکھا تھا۔ میں نے بڑی آسانی سے جنگل کا پہلا علاقہ طے کرلیا۔ آگے وہ جنگلی راستہ آگیا جو کمانڈو ٹریننگ کے لئے جھاڑیاں کاٹ کر بنایا گیا تھا اور جو اس تالاب کی طرف جاتا تھا جس میں میرے کمانڈر نے مجھے دھکا دیا تھا۔

کمانڈر نے بتایا تھا کہ یہاں سے جنوب کی جانب ایک ٹیلے کی چڑھائی ہے جس کی دوسری جانب وہ وادی ہے جہاں مجھے چھ ماہ تک خچر کی طرح دوڑایا گیا تھا۔ میں تالاب کو چھوڑ کر جنوب والے ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر وادی میں آیا تو رات کا اندھیرا پوری طرح چھا گیا تھا۔ مگر اب رات چاہے کتنی گہری ہو، اس کا اندھیرا میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ کمال شاہ کمانڈر کی تربیت نے مجھے اندھیرے میں چیزوں کو دیکھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ وادی کی ایک پگ ڈنڈی پر جنوبی ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔ کمانڈو چاقو کھول کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو جنگل سے مجھے بڑا ڈر لگتا تھا مگر اب یہ ڈر خوف اتر چکا تھا۔ میرے اندر ایسا اعتماد پیدا ہوگیا تھا کہ اگر شیر بھی مجھ پر حملہ کردے تو مرنے سے پہلے میں اسے بھی زندہ نہ چھوڑتا۔

ٹیلے کی چڑھائی آگئی۔ اندھیرے میں ڈھلان پر اگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ اس ٹیلے کے پار وہ جنگل تھا جس سے میں ابھی ناآشنا تھا۔ اور جہاں مجھے ہولا دیوی کی باؤلی کو تلاش کرنا تھا۔ یہ شروع رات تھی۔ سناٹوں میں کسی کسی پرندے کی آواز آجاتی تھی۔ میری بائیں جانب نیچے وادی میں

دو تین گیدڑ چلاتے ہوئے گزر گئے۔ میں ٹیلے کی دوسری جانب آ گیا۔ یہاں ایک طرف
کھڑے ہو کر میں نے اندھیرے میں آنکھیں سکیڑ کر جائزہ لیا یہ جنگل ذرا مختلف تھا۔ اس
میں کہیں بھی درختوں کے گھنے جھنڈ نہیں تھے۔ دور دور اکا دکا درخت نظر آ رہا تھا۔ گھاس
جگہ جگہ اگی ہوئی تھی۔ کہیں کالی سیاہ چٹانوں کے ہیولے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چلنے
کے لئے کوئی پگ ڈنڈی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر جنوب کی سمت چل
پڑا۔

جھاڑیاں اور گھاس میرا راستہ روکتا تو میں چاقو سے انہیں صاف کر کے گزر جاتا۔ کافی
دور تک چلنے کے بعد زمین پر اونچی اونچی گھاس ختم ہو گئی۔ تاریکی میں جگہ جگہ زمین سے
ابھرے ہوئے نوکیلے پتھر ہی پتھر تھے۔ میں ایک پتھر پر ذرا دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ میں نے
اپنی ساری توجہ اپنے سانس پر مرکوز کرتے ہوئے اپنی ایک خاص صلاحیت کو بیدار کیا۔
صلاحیت کئی ماہ کی مشقت کے بعد کمال شاہ نے میرے اندر پیدا کی تھی۔ اس کی مدد سے
میں جانوروں کی طرح فضا میں پانی کی بو سونگھ لیتا تھا۔ میں نے ایک بار اپنا سارا سانس باہر
نکال کر آہستہ آہستہ سانس کو اوپر کھینچنے لگا۔ میں رک رک کر سانس کھینچ رہا تھا۔ پانی کی
ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت کے لئے مجھے محسوس ہوئی اور غائب ہو گئی۔ میں نے اس عمل
کو چھ سات مرتبہ دہرایا۔ ہر بار بہت ہی قلیل وقفے کے لئے پانی کی عجیب سی بو محسوس
ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی میں نے بڑی جدوجہد کے بعد اس بو کی سمت کا تعین کیا اور اس
طرف چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں رک جاتا اور پانی کی بو محسوس کرنے کی کوشش
کرتا اور جس سمت سے وہ بو آ رہی تھی اس طرف اندازے سے روانہ ہو جاتا۔

اس دوران پتھریلا میدان ختم ہو گیا تھا اور چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں پہنچ
تھا۔ اندھیرے میں میری آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح کبھی سکڑ کر اور کبھی پوری
کر چیزوں کو دیکھنے کی برابر کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے اپنی ضرورت کے مطابق سب
نظر آ رہا تھا۔ دور کچھ درخت کھڑے تھے۔ ان کے درمیان مجھے ایک دیوار سائے کی
نظر آئی۔ میں اس طرف چلتے چلتے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک چار دیواری ہے

ں کی پچھلی جانب گیا تو وہاں سیڑھیاں نیچے اندھیرے میں اترتی تھیں۔ یہاں پانی کی
رطوب بو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً" میں کروندے بن کی ہولا دیوی والی باؤلی پر
نچ گیا تھا۔ میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ سیڑھیاں نیچے اندھیرے میں جا کر گم ہو گئی
ہیں۔ نیچے اس قدر گہرا اندھیرا تھا کہ میں بھی اندھیرے میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں نے اللہ
سولؐ کا مبارک نام لیا۔ کلمہ شریف پڑھا اور سیڑھیاں اترنی شروع کر دیں۔ سیڑھیاں
تم ہوئیں تو مجھے سیاہ اندھیرے میں پانی کے ایک حوض کی جھلک سی دکھائی دی۔ یہ باؤلی
تی۔ کمانڈر نے کہا تھا کہ اس باؤلی میں ایک خفیہ سرنگ کو راستہ جاتا ہے۔ میں دیوار کے
ساتھ ہاتھ لگائے آہستہ آہستہ حوض کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ ایک عجیب ہیبت ناک
ہول تھا۔ اگر میں تربیت یافتہ کمانڈو نہ ہوتا تو خوف سے بے ہوش ہو گیا ہوتا۔ لیکن میں
بڑے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ دیوار ختم ہو گئی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔
وہاں دیوار میں دائرے کی شکل کا ایک شگاف تھا۔ یہ سرنگ ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے
شگاف میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے دوسری طرف کچھ نظر نہ آیا۔ میں شگاف
میں داخل ہو گیا۔ میرے پاؤں چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پڑے جو سرنگ کے اندر بکھرے
ہوئے تھے۔

میں ایک ہاتھ سرنگ کی دیوار پر رکھ کر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ مجھے سرنگ میں
اس کوٹھڑی تک پہنچنا تھا جس کی دیوار میں ہولا دیوی کا بت لگا ہوتا تھا اور جس کا سر کاٹ
کر کمانڈو کمال شاہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور بت کا دھڑ اس نے وہیں پتھروں میں چھپا دیا
تھا۔ مجھے اس دھڑ کو لے کر واپس کمال شاہ کے پاس جانا تھا۔ کمانڈر کمال شاہ نے کہا تھا کہ
دیوی کی مورتی والی کوٹھڑی دیوار میں ایک گہرے شگاف کی طرح ہے۔ وہ کوئی باقاعدہ
کوٹھڑی نہیں ہے۔ بہر حال میں سرنگ میں آ گیا تھا۔ ہولا دیوی کی مورتی والا شگاف بھی
اسی دیوار میں ہو گا۔ میں دیوار کو اب دونوں ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا۔
اس گھپ اندھیرے میں بھی مجھے اب تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا تھا۔ آخر مجھے دیوار کا
شگاف مل گیا۔ میں نے شگاف کی اندرونی دیوار پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ وہاں کوئی

مورتی لگی ہوئی تھی جسے کھرچ کر اکھاڑا گیا ہے۔

میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا تھا۔

یہی ہولا دیوی کی مورتی والا شگاف تھا۔ میں پتھر کی ڈھیری کو تلاش کرنے لگا جس میں کمال شاہ نے مورتی کے دھڑ کو چھپا دیا تھا۔ ذرا سی کوشش کے بعد میرا پاؤں پتھر کی ایک ڈھیری سے ٹکرایا میں وہیں بیٹھ گیا اور پتھروں کو ادھر ادھر ہٹانے لگا۔ نیچے سے ہولا دیوی کے بت کا چھوٹا سا دھڑ نکل آیا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا اس کا سر غائب تھا۔ مجھے اپنی کامیابی پر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے آخری مرحلے کو بھی کامیابی سے مکمل کرلیا تھا۔ میں نے مورتی کا دھڑ بغل میں دبایا اور سرنگ میں واپس مڑا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مورتی کا دھڑ تھوڑا تھوڑا گرم ہے۔ میں نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے پتھروں کے نیچے دبے رہنے کی وجہ سے اس میں ہلکی ہلکی گرمائش پیدا ہوگئی ہو۔ میں سرنگ سے نکل کر باؤلی کے حوض پر آگیا۔ میں نے اپنا رخ سیڑھیوں کی طرف کرلیا۔ اور دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد سیڑھیاں آگئی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ پچاس ساٹھ قدم تک چلتا گیا مگر سیڑھیاں نہ آئیں۔ میں نے دیوار کو ٹٹول کر دیکھا۔ دیوار وہی تھی جس کے ساتھ لگ کر میں سرنگ تک گیا تھا۔ میں آگے چل پڑا۔ مزید پچاس قدم تک چلتا گیا مگر سیڑھیاں نہ آئیں۔ دیوار ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ قدم دیوار کے ساتھ اور چلا تو سرنگ آگئی۔ یہ وہی سرنگ تھی جس سے میں مورتی کا دھڑ لے کر ابھی نکلا تھا۔

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں سوچنے لگا۔ سیڑھیاں جو اوپر جاتی ہیں کہاں غائب ہوگئی ہیں؟

میں نے باؤلی کی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے چار پانچ چکر لگائے۔

ہر بار سرنگ آجاتی۔ سیڑھیاں نہیں آرہی تھیں۔ مجھے کیسے یقین آتا کہ دیوار میں اوپر جانے والی سیڑھیاں غائب ہوگئی ہیں۔ میں وہ سیڑھیاں اتر کر ہی نیچے باؤلی کے حوض پر آیا تھا۔ تو کیا میرے ساتھ کوئی جادو طلسم کا کھیل ہو رہا ہے؟ جادو اپنی جگہ پر برحق مگر میں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ جادو کا اثر مجھ پر بھی ہو سکتا ہے اور جادو کے زور سے کسی مکان کی سیڑھیاں بھی غائب ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات ایک حقیقت کی طرح میرے سامنے تھی کہ دیوار میں سیڑھیاں غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے بار بار بڑی اچھی طرح سے چار دیواری کو ٹٹول ٹٹول کر اور گھور گھور کر دیکھا۔ مجھے کہیں اوپر جاتی سیڑھیاں نہ ملیں۔ ہر بار سرنگ کا دہانہ آجاتا تھا۔ ہولا دیوی کی مورتی پتھر کا بغیر سر کے دھڑ میری بغل میں تھا۔ میں تنگ آکر سرنگ کے دہانے میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہاں اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مجھے حوض کے پانی کی سطح کی دھندلی سی جھلک ہی کسی وقت دکھائی دیتی تھی۔ غور سے دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ فضا میں حبس تھا اور ان سے ایک جگہ پر بند پانی کی بو رچی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ سرنگ میں چل کر دیکھنا چاہیے۔ شاید اس میں آگے جاکر کوئی راستہ اوپر نکلتا ہو۔

میں اٹھا اور سرنگ کے اندھیرے میں احتیاط سے قدم اٹھاتا چل پڑا۔ میرا ایک ہاتھ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ میں اس شگاف تک آگیا جس کی دیوار میں ہولا دیوی کی مورتی ہوا

کرتی تھی۔ میں شگاف سے بھی آگے نکل گیا۔ سرنگ بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ کئی جگہوں
پر مکڑیوں کے جالے میرے منہ کو لگے۔ میں نے ہاتھوں سے انہیں صاف کیا اور قدم قدم
چلتا چلا گیا۔ کچھ دور جاکر سرنگ ایک طرف مڑ گئی۔ میں بھی سرنگ کے ساتھ ہی اُد
طرف مڑ گیا۔ میں اندھیرے میں بہت دیکھ بھال کر چل رہا تھا۔ میرا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔
سرنگ یہاں آکر بند ہوگئی تھی۔ میرے آگے سرنگ کی چٹانی دیوار تھی۔ کچھ دیر وہیں کھڑ
سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں زمین کے نیچے باؤلی کی چار دیواری میں قید ہو چ
تھا۔ یہاں سے باہر نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن میرا دل اسے ماننے کو تیار نہی
تھا کہ یہ کسی آسیب یا بھوت پریت کی شرارت ہے۔ میں نے اس قسم کے توہمات کو کبھ
کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر آسیب اور بھوت پریت کا کوئی وجود تھا بھی تو میرے اند
ایمان کی اتنی زبردست طاقت تھی کہ وہ میرے قریب پھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔

میں وہیں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ اور خدا سے دعا مانگی کہ اے رب العالمی
میں تیرا حقیر بندہ ہوں۔ اسلام کے نام پر جہاد کرنے نکلا ہوں۔ کافروں کے ملک میں ہوں
اگر یہاں کافروں نے کوئی جادو ٹونا کیا ہوا ہے تو مجھے اس سے محفوظ رکھنا اور مجھے سید
راستہ دکھانا۔۔۔۔ اللہ کے حضور دعا مانگنے کے بعد مجھے اپنی روح میں ایک حیرت انگ
توانائی محسوس ہوئی۔ میری روح اور جسم دونوں پہلے سے زیادہ توانا ہوگئے۔ میں سرن
میں واپس مڑا تو اچانک ایک ہلکی سی خوشبو محسوس ہوئی۔ جیسے خوشبو کی ایک لہر میر
قریب سے ہو کر نکل گئی ہو۔ میں ایک لمحے کے لئے وہیں رک گیا۔ یہ خوشبو چنبیلی
خوشبو تھی۔ میری چھوٹی شہید بہن کلثوم سر میں چنبیلی کا تیل لگاتی تھی تو یہی خوشبو
کرتی تھی۔ کیا میری بہن کی روح میرے پاس آئی ہے۔ اپنی شہید بہن کو یاد کر کے مے
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دوبارا خوشبو نہ آئی۔ میں سرنگ میں سے نکل کر باؤلی کے حو
کے پاس آگیا۔ حوض کے پانی کی سطح اندھیرے میں دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔
دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا تو ایک جگہ دیوار غائب تھی۔ میں نے بیٹھ کر زمین پر
لگایا تو حیران رہ گیا۔ یہ سیڑھیاں تھیں جو اوپر جارہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا

ھیاں چڑھ کر باؤلی کی چار دیواری سے نکل آیا۔

ہولا دیوی کی مورتی کا آدھا دھڑ میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میں نے اسے باہر نکال
ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جنگل میں ابھی رات ڈھلنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ میرے حساب سے
ھی رات کا وقت ہوگا۔ میں جس راستے سے آیا اسی راستے پر واپس روانہ ہوگیا۔ کھلی
امیں آکر مجھے نئی تازگی کا احساس ہوا تھا۔ میں کروندے بن کی چٹانوں اور اونچی اونچی
ماس میں سے گزر کر جنوبی ٹیلے تک آگیا۔ پھر ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف والی
ی میں اتر گیا۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ جنگل کے اندھیرے اور سناٹے سے مجھے
ابھی ڈر خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ صرف کسی جنگلی درندے کا خطرہ تھا۔ اپنی
ظت کے لئے میں نے کمانڈو چاقو کھول کر اپنے سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اپنے
ے تک پہنچنے کے لئے ابھی جنگل میں کافی سفر باقی تھا۔ جس وقت میں اڈے پر پہنچا تو
ت ڈھلنا شروع ہوگئی تھی۔ کمال شاہ کمانڈر کے غار کے باہر لالٹین روشن تھی۔ باڈی
رڈ رائفلیں لئے پہرے پر کھڑے تھے۔ میری آہٹ پر انہوں نے رائفلیں تان لیں۔
ں نے دور ہی سے کوڈ ورڈ بولا۔ وہ وہیں رک گئے۔ میں ان کے قریب پہنچا تو ایک باڈی
رڈ نے میرا نام لے کر کہا۔

"کمانڈر جاگ رہا ہے"

میں غار کے اندر چلا گیا۔ کمال شاہ شیر کی کھال پر بیٹھا قرآن شریف کی تلاوت کر رہا
۔ دیوار کے ساتھ لالٹین روشن تھی۔ میں ادب سے ایک طرف ہو کر دوزانو بیٹھ گیا۔
ھ دیر بعد کمال شاہ نے قرآن شریف کو بند کر کے چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور جزدان میں
یٹ کر دیوار پر لٹکا دیا اور میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بت کا دھڑ لے آئے ہو؟"

میں نے جیب سے مورتی کا ٹوٹے ہوئے سر والا دھڑ کمال شاہ کے قدموں میں رکھ
۔ اس نے مورتی کے دھڑ کو اٹھا کر غور سے دیکھا۔ پھر اسے کونے میں ایک طرف
ینک دیا اور حکم دینے کے لہجے میں کہا۔

"اب تم جاکر سو جائے گا۔ صبح تم سے بات ہوگئی"

میں سلام کرکے اٹھا اور غار میں سے نکل کر اپنی گھاس پھوس والی جھونپڑی میں آکر لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کی تو چھوٹی بہن کلثوم یاد آنے لگی۔ ضرور اس کی روح اللہ کے حکم سے میری راہ نمائی کرنے سرنگ میں آئی تھی۔ ورنہ مجھے چنبیلی کی خوشبو کبھی نہ آتی۔ اس کی شہادت کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا جب گھوڑا سوار سکھ تلوار لہراتا کھیت میں آیا تھا اور اس نے میری بہن کی گردن پر وار کیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بہن کی روح کو مخاطب کرکے کہا۔

"میری بہن مجھے کافروں سے تمہارے علاوہ ان ہزاروں مسلمان بہنوں کا انتقام لینا ہے۔ جن کو سکھوں ہندوؤں نے سن سنتالی میں بے عزت کیا تھا۔ تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک میں کافروں سے ایک ایک مسلمان بہن کی بے عزتی اور اس پر کئے گئے ظلم کا بدلہ نہیں لے لیتا....."

اس کے بعد میں سوگیا۔

پچھلے پہر رات کے تین بجے مجھے جگا کر کمال شاہ کمانڈو کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت وہ اپنی فل کمانڈو وردی میں سر پر سبز رومال باندھے کاندھے پر رائفل لٹکائے غار کے باہر کھڑا تھا۔ دو باڈی گارڈ اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ ایک باڈی گارڈ کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ میں نے جاتے ہی کمال شاہ کو فوجی انداز میں ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ کیا۔ اس نے ہاتھ اوپر لے جاکر میرے سلیوٹ کا جواب دیا۔ پیچھے غار کے دہانے پر لالٹین جل رہی تھی۔

کمال شاہ نے ایک نظر مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔

"جوان! جس دن کے لئے ہم نے تمہیں تیاری کرایا تھا وہ دن آج آگیا ہے۔ تم اللہ اور اس کے نبی پاک صلعم کے نام کا پورا پورا رکھوالا بن گیا ہے۔ ہم نے

تم کو بہت تنگ کیا۔ تم کو اونٹ گھوڑے خچر کی طرح بھگایا اور مارا پیٹا۔ صرف تمہیں گالی نہیں بکا باقی تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ تم کو دھوپ میں چار چار گھنٹے دوڑایا۔ تمہیں دو دو دن بھوکا رکھا پیاسا رکھا۔ تم کو اتنا ٹارچر کیا کہ تمہاری جگہ کوئی اور جوان ہوتا تو بھاگ جاتا۔ مگر غور کرو کہ یہ سلوک ہم نے تمہارے ساتھ کیوں کیا؟ اس لئے کیا کہ تم اللہ اور اس کے نبی پاکؐ کے اسلام کا سچا باڈی گارڈ بن سکو۔ اب تمہارا مقابلہ کافر ہندو سکھ گورکھا اور ڈوگرہ فوجی سے ہے جو اتنا آسان ٹارگٹ نہیں ہے۔ اس نے بھی تمہاری موافق پورا پورا ٹریننگ لیا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح لڑنا جانتا ہے۔ تم میں اور اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ کے نام پر سر کٹانا جانتے ہو۔ ‏م اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر شہید ہوجانے کو زندگی اور آخرت کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتے ہو۔ ہم نے تمہیں فل کمانڈو کی تربیت پورا کر دیا ہے اب ‏ ‏فل کمانڈو بن گیا ہے۔ صرف اس لئے کہ تم کشمیری حریت پرستوں کے شانہ ‏نانہ لڑسکو۔ ہندوستان کی کافر حکومت نے کشمیریوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے وہ نہیں چاہتی کہ کشمیری کشمیر میں اسلام کی شمع روشن کرکے اس کی روشنی ‏ں آزادی سے زندگی بسر کریں۔ کشمیری کی بقاء اپنے اسلام کی بقا کی جنگ لڑ ‏ہے ہیں۔ جاؤ اور ان کے ساتھ مل کر کافروں کے خلاف جہاد کرو۔۔۔۔۔ ‏ارا آدمی تمہیں ہردہ کے سٹیشن تک چھوڑنے جائے گا۔ اس کے بعد تمہیں ‏ہاں سے پانچ بجے ٹرین ملے گا۔ تم اس میں بیٹھ جائے گا۔ تمہارا دلی تک کا ‏کٹ ہماری جیب میں ہے۔ دلی تم ایک آدمی سے جاکر ملے گا۔ اس کا نام پتہ ‏م نے ایک کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ وہ کاغذ ٹکٹ کے ساتھ ہم تمہیں دے گا۔ ‏ں آدمی کا نام پتہ تم اچھی طرح یاد کرکے کاغذ کو پھاڑ کر پھینک دے گا۔ آگے ‏ہیں کیا کرنا ہے؟ یہ وہ دلی والا آدمی تمہیں بتائے گا۔"

‏ر کمانڈر نے اپنے اس باڈی گارڈ کی طرف اشارہ کیا جس نے چھوٹی سی گٹھڑی اٹھائی

ہوئی تھی۔ کمانڈر نے گٹھڑی لے کر مجھے پکڑائی اور کہا۔

"اس میں تمہارے کپڑے ہیں۔ تم جھونپڑی میں جاکر یہ کپڑے پہن لے گا۔
اس کے بعد ہم تمہارے پاس آئے گا۔ گو"

میں نے گٹھڑی لے کر سیلوٹ کیا اور سیدھا جھونپڑی میں گھس گیا۔ میں نے گٹھڑی
کھولی تو اس میں ایک بادامی رنگ کا کھدر کا کرتہ اور اسی رنگ کا تنگ موہری والا پاجامہ
تھا۔ شمالی ہندوستان کے ہندو لوگ گرمیوں میں عام طور پر یہی لباس پہنتے ہیں۔ ساتھ ایک
پونا کی چپل تھی۔ جب میں نے یہ کپڑے پہن لئے تو کمانڈر جھونپڑی میں داخل ہو
جھونپڑی میں لالٹین روشن تھی۔ کمانڈر نے مجھے ہردہ سے دلی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ
اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ دیا۔

"یہ تمہارا ریل گاڑی کا ٹکٹ ہے۔ اس کاغذ پر اس آدمی کا نام پتہ اور حلیہ لکھا
ہوا ہے جس کو دلی میں جاکر رپورٹ کرو گے۔ اس کو ابھی سے یاد کرنا شروع
کردو۔ جب اچھی طرح یاد ہو جائے تو کاغذ کو پرزے پرزے کرکے جنگل میں
پھینک دینا۔"

پھر اس نے اپنی دوسری جیب سے مجھے کمانڈو چاقو نکال کر دیا اور بولا۔

"یہ چاقو ہم تمہیں نہیں دے گا۔ راستے میں اگر تم پکڑے گئے تو یہ چاقو تمہیں
پاکستانی کمانڈو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ تمہارا پاسپورٹ ہم نے تمہارے
کرتے کی جیب میں رکھ دیا ہے۔ اس کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن
اگر تم چاہو تو اپنے پاس رکھ سکتے ہو"

میں نے کرتے کی چور جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں میرا پاکستانی پاسپورٹ موجود تھا۔
نے وہ کمانڈر کو دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں اسے ضائع کرنے کی جرات نہیں
کر سکتا۔ یہ میرے پیارے وطن پاکستان کا پاسپورٹ ہے۔"

کمانڈر نے کہا۔

"یہ پاسپورٹ میرے لئے بھی ایک مقدس امانت ہے۔ یہ تمہاری امانت میرے
پاس محفوظ رہے گی"

اور کمانڈر نے پاسپورٹ مجھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے مجھے
ن کرنسی میں پانچ پانچ روپے کے بیس نوٹ دے کر کہا۔

"دلی تک تمہارے لئے یہ رقم کافی ہوگی۔ آگے وہ آدمی تمہارا ذمہ دار ہوگا
جس کو تم جاکر رپورٹ کرو گے۔ اب اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ وقت
بہت کم رہ گیا ہے"

میں کمانڈر کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آگیا۔ باہر ایک باڈی گارڈ گھوڑے پر بیٹھا تھا۔
ا خالی گھوڑا پاس ہی کھڑا تھا۔ کمانڈر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جوان! تمہیں زیادہ ہدایتیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے ہندوؤں والا
لباس پہنا ہے۔ اپنا کوئی بھی ہندوؤں والا نام رکھ لینا۔ تم ہندو بن کر دلی تک
جائے گا۔ کوئی پوچھے کہاں سے آرہے ہو تو کہہ دینا تم بمبئی میں اپنے بڑے
بھائی سے ملنے گئے تھے جو دادر میں کپڑے کی دکان کرتا ہے۔ اپنے آپ کو
پنجابی ہندو ظاہر کرنا۔ کیونکہ تمہاری اردو دلی لکھنؤ والوں کی اردو نہیں ہے۔
اب جاؤ۔۔۔۔"

اس نے مجھے گلے لگایا اور کہا۔

"اللہ تمہیں شہادت کا مرتبہ عطا کرے"

میں کچھ جذباتی ہوگیا۔ میں نے کمانڈر کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے واسطے الفاظ نہیں ہیں کمانڈر"

اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"بلو مت۔۔۔۔گو"

ایک دم پلٹ کر اپنے غار کی طرف چل دیا۔ میں خالی گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ باڈی گارڈ
ہ گھوڑے کو لیکر آگے آگے اور میرا گھوڑا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کمال شاہ کا باڈی

گارڈ مجھے ایک ایسے راستے سے لے گیا جو جنگل کے باہر باہر سے گزرتا تھا اور جہاں
درخت کم اور گھاس زیادہ تھی۔ یہاں ہم گھوڑوں کو دوڑاتے چلے گئے۔ اس طرح سے
راستہ جلدی طے ہوگیا۔ مگر ہمیں راستے میں ہی صبح ہوگئی تھی اور آسمان پر سپیدہ سحر پھیلنے
لگا تھا۔ جس وقت ہم ہردہ کے چھوٹے سے شہر میں پہنچے تو باڈی گارڈ نے اپنی گھڑی دیکھ کر
کہا۔

"گاڑی آنے میں ابھی پچیس منٹ باقی ہیں۔ ہم ٹھیک وقت پر آگئے ہیں۔"

شہر میں ابھی چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکثر دکانیں بند تھیں۔ کسی مندر میں
گھنٹیاں بجنے کی آواز آرہی تھی۔ باڈی گارڈ مجھے خالی سڑک پر گزار کر ریلوے سٹیشن ہردہ
کی پچھلی طرف لے آیا۔ اس نے کہا۔

"سامنے سٹیشن ہے۔"

میں گھوڑے سے اتر پڑا۔ باڈی گارڈ نے گھوڑے کی باگ تھامی اور مجھ سے کوئی بات
کئے بغیر دونوں گھوڑے دوڑاتا واپس چلا گیا۔ میں دوسری طرف سے ہوکر سٹیشن کے
چھوٹی سی ڈیوڑھی والے گیٹ پر آگیا۔ یہاں دو تین یکے کھڑے تھے جن میں سے سواریاں
اتر رہی تھیں اور اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا رہی تھیں۔ ٹکٹ میرے پاس ہی
تھا۔ گیٹ پر ایک ٹکٹ چیکر پرانی سی وردی پہنے موجود تھا۔ اس نے میرا ٹکٹ لے کر اس
مین اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے اوزار سے ایک طرف سوراخ کیا اور ٹکٹ
مجھے واپس دے دیا۔ میں پلیٹ فارم پر آکر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹکٹ جیب میں
رکھنے لئے ہاتھ ڈالا تو مجھے محسوس ہوا کہ کمال شاہ نے مجھے دلی میں جس آدمی کو رپورٹ
کرنے کے لئے اس کا نام پتہ اور حلیہ لکھ کر دیا تھا وہ کاغذ میری جیب میں ہی پڑا ہے اور
راستے میں میں نے اسے نکال کر یاد ہی نہیں کیا تھا۔

میں جلدی سے اٹھا اور پلیٹ فارم پر ٹہلتا ٹہلتا' اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے
ہوئے مسافروں کے قریب سے گزرتا دور نکل گیا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کے آخری
سرے تک پہنچ گیا جہاں سٹیشن کے نام کا اردو انگریزی اور ہندی زبانوں میں تختہ لگا تھا

ں جانب پلیٹ فارم کی آہنی چھت کے نیچے کھمبے کے ساتھ لکڑی کا ایک بکس رکھا ہوا
۔ میں اس بکس پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بظاہر بڑی بے نیازی سے جیب میں سے
ذ نکال کر کھولا۔ اس پر دلی والے آدمی کا نام اس کا حلیہ اور اس کا ایڈریس لکھا تھا۔
آپ کو اس کا نام پتہ اور حلیہ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ وہ آدمی آج بھی دلی میں ہے اور
کشمیر میں ایک اور ہی انداز سے شریک ہے۔ میں نے بار بار کاغذ پر لکھی تحریر کو پڑھا۔
مجھے اس آدمی کا نام پتہ اور حلیہ زبانی پکا پانی یاد ہوگیا تو میں کاغذ کو آہستہ آہستہ
نے لگا۔ جب کاغذ پرزے پرزے ہوگیا تو میں نے ان پرزوں کو مٹھی میں بند کیا۔ اٹھ
دوسری طرف والی ریلوے لائن پر آیا اور اسے پلیٹ فارم پر اندر کی جانب ریلوے
نا پر بکھیر دیا۔

اس کام سے مطمئن ہوکر میں واپس پلیٹ فارم کے بینچ پر آکر بیٹھ گیا۔ ریل گاڑی کو
سے آنا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ایکسپریس ٹرین ہے مگر ہردہ سٹیشن پر تھوڑی دیر کے
رکتی ہے۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر بیٹھے تھے۔ کینٹین بھی کھلی تھی۔ کچھ لوگ کاؤنٹر پر
ے ناشتہ وغیرہ کر رہے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ میں نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ مگر اب
پاس میرے لئے اتنی اہم چیزیں نہیں رہی تھی۔ کمانڈو کی ٹریننگ نے مجھے لوہے کا
بنا دیا تھا۔ یہ میری مرضی تھی میں جب چاہے ناشتہ کروں۔ نہ بھی کروں تو کوئی فرق
پڑتا تھا۔ اتنے میں دور سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ بھارت میں چونکہ کوئلہ
پایا جاتا ہے اس لئے وہاں بھاپ والے انجن کی گاڑیاں عام چلتی ہیں۔ ڈیزل اور بجلی کی
یوں کا ابھی اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ پھر ٹرین آکر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ دو مریل جسم
لے کالے سے ریلوے پولیس کے سپاہی پلیٹ فارم پر ڈنڈے ہاتھوں میں لئے نظر
ے۔ لیکن وہ کینٹین کے کاؤنٹر پر کھڑے مزے سے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی
رے مسافروں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین سٹیشن پر بمشکل
نٹ رکی اور چھک چھک کرتی آگے روانہ ہوگئی۔

مجھے معلوم تھا کہ دلی تک کا سفر کافی لمبا ہے۔ میں نے ڈبے کے کونے میں لیٹرین کے

پ... اپنے لئے جگہ بنالی۔ کھڑکی میری سیٹ کے ساتھ ہی تھی۔ ٹرین ایکسپریس تھ
چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی چلی جارہی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوشنگ آباد کا سٹیشن آیا
ٹرین یہاں سے چلی تو اس کی رفتار کافی تیز ہوگئی۔ آگے بھوپال کا نیم پہاڑی جنگلاتی علا
شروع ہوگیا۔ مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے گہری نگاہ سے ڈبے میں بیٹھے مسافروں
جائزہ لیا۔ مجھے کوئی بھی مشکوک چہرہ نظر نہ آیا۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ سر لگا کر آنکھ
بند کرلیں۔ نیند نے ہلکے ہلکے ہلکورے دیتے ہوئے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ جب
میری آنکھ کھلی تو گاڑی للت پور کے پلیٹ فارم میں داخل ہورہی تھی۔ میں کافی دیر
سویا رہا تھا۔ للت پور سے ٹرین چلی تو جھانسی کے سٹیشن پر جاکر رکی۔ اس وقت دوپہر
چکی تھی۔ جھانسی کافی بڑا جنکشن تھا۔ یہاں ٹرین کو کافی دیر رکنا تھا۔ میں پلیٹ فام پر
آیا۔ ایک کینٹین پر جاکر میں نے دال چاول کھائے چائے پی۔ وہیں سے سگریٹ کا
پیکٹ اور ماچس خریدی۔ سگریٹ سلگایا اور کینٹین کی اوٹ میں ایک بنچ کے کونے پر
کر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ سگریٹ پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میں چاہتا تھ
دیکھنے والوں کو میں بھی عام ہندو نوجوان ایسا نارمل نوجوان لگوں۔ سگریٹ بھارت
نوجوان عام پیتے تھے۔

ٹرین کے ایک ڈبے میں ریلوے کے ملازم بڑے بڑے ٹوکرے اور لکڑی کے بکے
رہے تھے۔ انجن گاڑی سے الگ ہو چکا تھا۔ میری عقابی نگاہیں برابر پلیٹ فارم پر
پھرنے والوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ریلوے پولیس کے دو تین سپاہی ادھر ادھر
رہے تھے مگر میری طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ آخر انجن آکر ٹرین کے ساتھ لگ
اس پانچ منٹ بعد انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ میں دوڑ کر اپنے ڈبے
آگیا۔ جھانسی سے روانہ ہوکر گاڑی ایک بار پھر جنگلوں میں سفر کرنے لگی۔ راستے میں
ندی نالے دریا آئے۔ دتیہ کا شہر آیا۔ وہاں بھی گاڑی کچھ دیر کے لئے رکی۔ اس کے
ویلور نام کا بڑا شہر آیا۔ جب گاڑی گوالیار پہنچی تو رات ہوچکی تھی۔ یہاں میں نے
فارم پر اتر کر وہی اپنی پسندیدہ ڈش بند مکھن کھالیا۔ مجھے رات کو کھانے کی ضرورت

چائے پی اور ڈبے میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ جس طرح کہ لمبے سفر میں ہوا کرتا
میری ساتھ والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا ہندو بیٹھا تھا۔ اس سے کبھی کبھی تھوڑی
بات چیت ہو جاتی تھی۔ وہ بھی دلی جارہا تھا۔ وہاں کپڑے کا چھوٹا موٹا بزنس کرتا تھا۔
نے اسے اپنا ایک ہندووانہ نام بتا دیا اور کہا کہ بمبئی اپنے بڑے بھائی سے ملنے گیا تھا
واپس امرتسر اپنے شہر جارہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی جیسا کہ کمال شاہ نے مجھے
ت کی تھی۔ میرا اردو کا لہجہ پنجابی آمیز تھا۔ اس لئے میرے واسطے یہی بہتر تھا کہ میں
وامرتسر کا ہندو ظاہر کروں۔

ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ آدھی رات کو کہیں آگرہ کا شہر آیا اور گزر گیا۔ میں
سیٹ پر ہی کچھ سویا کچھ جاگتا بیٹھا رہا۔ پھر میں بھی دوسرے مسافروں کی طرح وہیں
بیٹھا سوگیا۔ اب مجھ میں وہ بات نہیں رہی تھی کہ سفر کی تھکان محسوس ہو اور نیند
ں نہ ہونے سے سردرد کرنے لگے۔ کمال شاہ کی ٹریننگ نے میرے اعصاب لوہے کے
یے تھے۔ میرے لئے دس منٹ کی نیند بھی بہت تھی۔ دن نکل آیا تھا جب ٹرین متھرا
سٹیشن پر رکی۔ یہاں کچھ سادھو قسم کے لوگ ہاتھوں میں ترشول اور کرمنڈل پکڑے
یں پہنے ڈبے میں آگئے۔ ضعیف الاعتقاد ہندو مسافروں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔
ا اپنی سیٹیں دے دیں اور ان کی تواضع پوڑیوں کچوریوں کی کرنے لگے۔ میں خاموشی
اپنی کونے والی سیٹ پر بیٹھا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ یہاں سے گاڑی چلی تو گڑگانواں کا
ن بھی آکر گزر گیا۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا کہ دلی شہر کے مضافات شروع ہوگئے۔ چھ
پہلے جب میں دلی سے ٹرین میں بیٹھ کر کمال شاہ مجاہد کمانڈو سے ملنے چلا تھا تو میں ایک
ک نوجوان تھا۔ میں سہا ہوا تھا۔ قدم قدم پر مجھے یہی ڈر لگ رہا تھا کہ بھارتی پولیس
ا پیچھا کر رہی ہے۔ اور مجھے کسی وقت کسی بھی جگہ پکڑ کر اذیت ناک ٹارچر کے جہنم
ا دھکیل سکتی ہے۔ میرے اندر ایک خوف بیٹھ گیا تھا۔ یہ اس مرد مومن کمال شاہ کا
ل تھا کہ اس نے میرے دل سے 'میری رگوں میں گردش کرنے والے خون سے کافر کا
ل نکال کر خدا کا خوف داخل کر دیا تھا۔ اب میں محتاط پہلے سے زیادہ تھا مگر خوف زدہ

بالکل نہیں تھا۔ میری آنکھیں پہلے سے زیادہ مہارت اور گہرائی کے ساتھ ڈبے میں بیٹھے
ہوئے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

دلی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گاڑی رکی تو میں بڑے آرام سے ڈبے سے نکلا۔ کرتے
کی جیب سے ٹکٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑا۔ ایک طرف کھڑے ہو کر سگریٹ سلگایا او
دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ چلتا گیٹ پر آگیا۔ ٹکٹ چیکر ٹکٹ لے لے کر ہاتھ میں
ہی جمع کرتا جارہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی ٹکٹ لے لیا۔ اس کے پاس ایک کانسٹیبل
سٹول پر بیٹھا مسافروں کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ سٹیشن کے احاطے سے باہر آکر میں ۔
ایک موٹر رکشا لیا اور اسے ایک جگہ کا نام بتا کر کہا کہ مجھے وہاں پہنچا دو۔ دلی میں جس
شخص سے ملنے کے لئے مجھے کہا تھا۔ میں اس کا نام اور جگہ پوشیدہ رکھوں گا۔ اس کا ایک
فرضی نام گل خان رکھ لیتے ہیں۔ موٹر رکشا دلی کی بھاری ٹریفک والی سڑکوں سے گزرتا شہر
سے باہر چھوٹی چھوٹی نئی بستیوں میں آگیا۔ یہ ماڈرن اور نئی بستیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے
کواٹر نما اور کوٹھی نما مکانات ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ آگے چھوٹے چھوٹے صحن تھے
جن میں درخت اور پودے لگے تھے۔ رکشا اس آبادی سے بھی نکل گیا۔ جب بائیں
جانب ایک غیر آباد جگہ پر پرانی بارہ دری کا کھنڈر میں نے دیکھا تو میں نے رکشا رکوایا
اسے کرایہ ادا کیا اور کھنڈر کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی جس میں کافی حدت
تھی۔ لیکن میں نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے مجھے زیادہ گرمی نہیں لگ رہی
تھی۔ ویسے بھی میرا جسم موسموں کے شدید اثرات سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ کمانڈر کمال شاہ
نے مجھے زبانی بتایا تھا کہ کھنڈر کے پیچھے ایک سوکھا ہوا برساتی نالہ آئے گا۔ اس نالے
دوسری جانب تمہیں کچھ پرانے کواٹر نظر آئیں گے۔ ان کواٹروں میں ایک چھوٹی سی مسجد
بھی ہے۔ اس مسجد میں جاکر کسی بھی نمازی سے اس خاص آدمی کا نام پوچھ لینا جس کو
نے جاکر رپورٹ کرنی ہے۔ کمال شاہ نے مجھے کچھ کوڈ ورڈ بھی بتا دیئے تھے جو مجھے اس
آدمی کے آگے بولنے تھے۔ یہ خاص خفیہ الفاظ یا وہ شخص جانتا تھا یا کمال شاہ اور یا پھر اب
مجھے معلوم تھے۔

میں نالے کے بوسیدہ سے پل پر سے ہوتا ہوا کواٹروں کی چھوٹی سی بستی میں آگیا۔
ایک چھوٹی سی کواٹر نما مسجد بھی تھی۔ مسجد میں ایک مولوی صاحب وضو کرنے والی
ں ٹونٹی کے آگے بیٹھے مسواک کر رہے تھے۔ میں جوتے اتار کر مسجد کے صحن میں
طرف ہو کر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ
آدمی کے بارے میں مولوی صاحب مجھے ضرور بتا سکتے تھے۔ مولوی صاحب نے دو
ار کلی کی اور پھر صافے سے منہ اور داڑھی پونچھتے اٹھ کر باہر جانے لگے تو مجھے دیکھ
ل گئے۔

اتنی دیر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے خالص دلی والوں کی نفیس اور بامحاورہ
یں مجھ سے پوچھا کہ میاں اجنبی لگتے ہو کہاں سے آئے ہو۔ میں نے اپنی پنجابی اردو
ا۔

"مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔ مالیر کوٹلہ سے آیا ہوں"

مالیر کوٹلہ بھارتی پنجاب کا ایک ریاستی شہر ہے جہاں سن سنتالیس کے فسادات میں
ن محفوظ رہے تھے اور انہیں سکھوں نے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ ان کی حفاظت کی تھی۔
کے پیچھے سکھوں کی مذہبی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جسے یہاں بیان کرنا میں ضروری نہیں
۔ اتنا بتا دینا ہی کافی ہے مالیر کوٹلہ میں پنجابی مسلمان اب بھی آباد تھے۔

مولوی صاحب نے پوچھا۔

"یہاں کس سے ملنا ہے میاں؟"

میں نے وہ نام بتایا جو مجھے کمال شاہ نے بتایا تھا۔ مولوی صاحب بولے

"میاں وہ تو من موجی آدمی ہے۔ کبھی نماز پڑھنے مسجد میں آجاتا ہے۔ کبھی
نہیں آتا۔"

میں نے اس شخص کا جو فرضی نام گل خان رکھا ہے اب میں اسے اسی نام سے
ںا گا۔ گل خان کے بارے میں مولوی صاحب نے مزید بتایا کہ سامنے والی قطار
ری کواٹر میں رہتا ملے جاکر پتہ کرلو۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت گھر پر ہی ہو۔

"ویسے وہ شہر کے کسی بینک میں ملازمت کرتا ہے۔"

میں نے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور مسجد سے نکل کر سامنے والی کواٹروں کی قطار کے آخری کواٹر کے پاس آکر رک گیا۔ یہ غریبانہ سے کواٹر تھے۔ شہتوت کے ایک درخت کے نیچے دو تین بکریاں بیٹھی تھیں کچھ بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ گل خان کے کواٹر کا دروازہ بند تھا۔ اندر صحن میں نیم کا بہت بڑا پیڑ اگا ہوا تھا جس نے کواٹر ٹھنڈی چھاؤں کر رکھی تھی۔ دروازے کے باہر مجھے گھنٹی کا بٹن نظر نہ آیا تو میں۔ دروازے پر دستک دے دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد صحن میں کسی کے قدمو کی چاپ سنائی دی ساتھ ہی بھاری رعب دار آواز بھی آئی۔

"آرہا ہوں بھائی آرہا ہوں۔ دروازہ نہ توڑو"

دروازہ کھلا اور میرے سامنے درمیانے قد کا ایک سرخ و سپید آدمی کھڑا تھا۔ پچاس برس کے قریب ہوگی مگر صحت بڑی اچھی تھی۔ سر کے بال خشخشی تھے جن میں بال کثرت سے اگے ہوئے تھے۔ ململ کے کرتے کے نیچے چوخانہ تہمد باندھا ہوا تھا۔ گول تھا۔ آنکھیں عقاب کی طرح چمکیلی اور تیز تھیں۔ حاجیوں والا زرد رومال کاندھو تھا۔ میری طرف غور سے دیکھ کر اس شخص نے جس کا فرضی نام میں نے گل خان ہے پوچھا۔

"کیوں میاں کس سے ملنا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"مجھے کمال شاہ صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے"

اس مرد مومن کا نام سن کر گل خان دروازے میں سے تھوڑا سا آگے ہو کر دائ بائیں دیکھا اور کہا۔

"اندر آجاؤ"

اندر چھوٹا سا صحن تھا جس پر نیم کے درخت نے سایہ کر رکھا تھا۔ درخت کے ایک چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی کے پاس ہی لوہے کی کرسی پڑی تھی۔ کونے میں کھڑا

نلکے نیچے بالٹی میں تھوڑا تھوڑا پانی گر رہا تھا۔ ساتھ ہی چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ سامنے ر کا کمرہ تھا جس کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ اندر چھت کے ساتھ چلتے ہوئے پنکھے کی مجھے جھلک نظر آرہی تھی۔ گل خان مجھے اسی کمرے میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کر چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا تھا۔ ایک ٹرنک پڑا تھا۔ ٹی کے ساتھ کچھ کپڑے لٹک رہے تھے پلنگ کے اوپر دیوار پر خانہ کعبہ کی رنگین ر والا کیلنڈر لگا تھا۔ ایک سٹول اور دو پرانی کرسیاں بھی تھیں۔ گل خان نے مجھے ی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود میرے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ کمرے کی عقبی دیوار میں سلاخ دار کھڑکی کھلی تھی۔ اس کا میلا سا پھول دار پردہ چنا ہوا تھا۔ کمرے میں اس ڑکی میں سے دن کی روشنی آرہی تھی۔

گل خان نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور کوڈ ورڈز میں ایک جملہ بولا۔ مجھے کمال شاہ ے سب کچھ زبانی بتا دیا ہوا تھا۔ میں نے بھی اس کے جواب میں ایک جملہ بول دیا۔ یہ ری طرف سے گل خان کے کوڈ ورڈ کے جواب میں کوڈ ورڈ تھا۔ اس کے بعد گل خان ے کوڈ ورڈز میں پوچھا۔

"جب تم ٹیلے پر سے دریا میں گرے تھے تو اس سے اگلا سٹیشن کس شہر کا آیا تھا؟"

مجھے اس بے ہنگم مگر اہم کوڈ کا جواب معلوم تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"اگلا سٹیشن شاہ مراد کا تھا"

گل خان نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔

"کتنے ماہ کمانڈو ٹریننگ لی ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔

"چھ ماہ"

گل خان نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا

"شاہ صاحب نے تمہیں اے کلاس کمانڈو کی تربیت دی ہے اس کا مطلب ہے

تمہیں کچھ روز میرے پاس رہ کر بھی ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی۔"

میں نے پوچھا۔

"اب کس بات کی ٹریننگ ہوگی؟"

گل خان نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا"

مجھے اکتاہٹ ضرور محسوس ہوئی۔ کیونکہ میں جلد سے جلد کشمیر کی لڑائی میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ گل خان نے مجھے جو کچھ سکھایا اس علم کے بغیر میں اے کلاس کمانڈو ہوتے ہوئے بھی ادھورا کمانڈو تھا۔ گل خان نے ایکسپلو سویز کا ماہر تھا۔ خدا جانے اس نے یہ ٹیکنیکل علم کہاں سے حاصل کیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے مجھے یہ بتایا کہ بارود سے دھماکہ کیوں ہوتا ہے۔ مجھے بتایا کہ ہوا کا دباؤ کیا ہوتا ہے اور اگر کسی بم میں لوہے کے ٹکڑے، کیل اور شیشے کی کرچیاں نہ بھی ہوں تو وہ جہاں پھٹتا ہے وہاں ہوا کا خلا کیوں پیدا ہوتا ہے اور دھماکے کے پریشر سے چیزیں اپنی جگہ سے کیوں اڑ جاتی ہیں۔ پھر اس نے مجھے ڈائنامائیٹ کے چھوٹے چھوٹے مگر انتہائی طاقتور میگنیٹک بم بنانے سکھائے۔ وہ مجھے صبح صبح اٹھا کر اپنے ساتھ دریائے جمنا کے پار کسی تاریخی کھنڈر میں لے جاتا۔ وہاں اس نے ایک خفیہ سرنگ میں اے کلاس کمانڈوز کی تربیت کے لئے ایکسپلو کا سارا سامان رکھا تھا۔ اس نے مجھے ٹائم بم کی تربیت بھی دی اور یہ بھی سکھایا کہ قلم کاغذ ماچس لائیٹر انگوٹھی سگریٹ سگار رسٹ واچ اور ٹوتھ برش کو انتہائی دھماکے خیز بم میں کیسے تبدیل کیا جاتا ہے۔ بموں کے چھوٹے چھوٹے ماڈل وہ سرنگ کے اندر خفیہ جگہ پر میرے سامنے بناتا اور پھر ان میں تیزاب اور بارود کے ملانے سے چھوٹے چھوٹے دھماکے کر کے دکھاتا۔ سب سے آخر میں اس نے مجھے ایسا بم دکھایا جو انسانی جسم کے اندر جاکر پھٹتا تھا۔ یہ درد کی گولی جتنا تھا۔ گل خان نے کہا۔

"یہ بم آدمی اگر درد یا کسی بھی درد کی گولی سمجھ کر کھالے تو انسان کے جسم میں جاکر یہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ آدمی کے معدے میں جو تیزابی مادہ ہوتا ہے

وہ آہستہ آہستہ اس بم کی گولی کو گلا کر جب اس کی تہہ میں چھپائے گئے مادے تک پہنچتا ہے تو آدمی کے معدے میں ایک دھماکہ ہوتا ہے اور اس کا پیٹ پھٹ جاتا ہے اور جسم دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ چھ منٹ لگتے ہیں"

گل خان نے اس قسم کے ٹیبلٹ بم پلاسٹک کے لفافوں میں ایک لڑی کی شکل میں ڈال کر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر درد دور کرنے کی ایک مشہور دوا کا نام بھی چھپا ہوا تھا۔ ان بموں کی تعداد پندرہ تھی۔ گل خان نے ان پندرہ ٹیبلٹ بموں کا پیکٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ان ٹیبلٹ بموں کو تم نے کمانڈو ایکشن کے دوران خاص خاص موقعوں پر استعمال کرنا ہوگا۔ یہ انڈین فوج کے پندرہ بڑے بڑے اور خاص خاص افسروں کو ہلاک کرنے کے لئے ہیں۔ لیکن میں تمہیں ان کے بنانے کی ترکیب اور فارمولا بھی بتائے دیتا ہوں تاکہ اگر ان کے بعد بھی ضرورت پڑے تو تم خود انہیں تیار کر سکو"

گل خان نے مجھے ٹیبلٹ بم بنانے کا پورا فارمولا سمجھا دیا اور اسے لکھ کر بھی دے دیا۔ یہ فارمولا اس طرح لکھا گیا تھا کہ سوائے میرے اور گل خان کے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ کوڈ ورڈز میں لکھا گیا تھا اور اس میں گرم مصالحوں، دار چینی جائفل، الائچی اور کالی مرچوں کے نام بار بار آتے تھے۔ اگر اسے کوئی دیکھ بھی لے تو یہی لگتا تھا کہ یہ گوشت کا مزیدار سالن ہے یا بریانی تیار کرنے کا نسخہ ہے۔

گل خان کہنے لگا۔

"اگر کسی ایسے آدمی کو تم یہ ٹیبلٹ بم پانی یا چائے کافی کے ساتھ کھلا دوگے جس کے معدے میں تیزابیت زیادہ ہوگی تو یہ بم دو منٹ میں بھی پھٹ سکتا ہے۔"

مجھے یہ بم دشمن کے سرکردہ آدمیوں کو جہنم میں پہنچانے کے لئے بڑا کارآمد لگا۔ یہ

ایک ڈرامائی بم تھا۔ اس کا کسی کو کوئی ثبوت بھی نہیں مل سکتا تھا۔

میں گل خان کے پاس پورے ایک ہفتے رہا اور وہاں سے جب نکلا تو میں
ایکسپلوسیوز کا ماہر بن چکا تھا اور پندرہ ٹیبلٹ بم جو اسپرو کی گولیوں کی شکل میں پلا
میں لپٹے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا میں بند تھے میرے پاس تھے۔ میں نے اس
ٹیبلٹ بم بنانے کا نسخہ بھی ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ یہ چھوٹی سی گول ڈبیا میں نے پلاسٹک
لفافے میں ڈال کر اپنے پیٹ کے ساتھ باندھ لی تھی تاکہ محفوظ رہے۔

اب گل خان نے مجھے ایک ایسے کشمیری مجاہد کا اصلی نام اور پتہ زبانی یاد کرایا
جموں شہر میں رہتا تھا۔ گل خان نے اس مجاہد کا نام لے کر کہا۔

"تم اسے جاکر رپورٹ کرو گے۔ وہ تم سے کوڈ ورڈ میں ایک سوال کرے گا۔ تم
کوڈ ورڈ میں اس کا جواب دو گے"

گل خان نے مجھے یہ کوڈ ورڈ والا جواب بھی اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دیا
اس مجاہد کا حلیہ بھی بتا دیا۔ دلی میں گل خان کے پاس یہ میری آخری رات تھی۔ صبح
مجھے ریلوے سٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر جالندھر روانہ ہونا تھا جہاں سے مجھے جموں
لئے دوسری گاڑی پکڑنی تھی۔ گل خان کہنے لگا۔

"جالندھر میں حالات آج کل حکومت کے سخت خلاف ہیں۔ خالصتان کی تحریک
زوروں پر ہے اگر وہاں صورت حال بدلتی نظر آئی تو ٹرین کا انتظار نہ کرنا۔ کسی
لاری میں بیٹھ کر جموں پہنچ جانا۔ اگر پکڑے جاؤ تو سب سے پہلے معدے میں
جاکر پھٹنے والے ان ٹیبلٹ بموں کو ضائع کر دینا۔ کیونکہ اگر یہ دشمن کے ہاتھ
آگئے تو اس بات کا امکان ہے کہ اس انتہائی قیمتی اور کشمیر کی کمانڈو جنگ میں
کام آنے والے بم کا راز فاش ہو جائے۔ یہ بات کشمیری مجاہدین کی تحریک
آزادی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ میں تجھے کچھ نہیں بتانا چاہتا کہ
یہ ٹیبلٹ بم کمانڈو لڑائی میں کہاں کہاں استعمال ہو رہے ہیں۔"

گل خان نے صبح صبح مجھے اٹھا دیا۔ مجھے ناشتہ کرایا اور کہا۔

"میرا آدمی بارہ دری کے کھنڈر کی دوسری طرف ٹرک لے کر تمہارا انتظار کر
رہا ہے۔ وہ تمہیں سٹیشن پر پہنچا دے گا۔ جو جو سبق میں نے تمہیں سکھائے
ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اب آگے تمہیں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا۔ اگر پکڑے
گئے تو اپنی عقل سے کام لے کر بتانا ہوگا کہ تم کون ہو اور جموں کیا کرنے
جا رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ کمانڈر کمال شاہ نے تمہیں بڑے سے بڑا ٹارچر
برداشت کرنے کی زبردست تربیت دی ہے۔ لیکن انڈین پنجاب کی سکھ پولیس
نے اذیت دینے کے نئے نئے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اگر اذیت برداشت
سے باہر ہو جائے تو مر جانا مگر دشمن کے آگے میرا اور کمال شاہ کا نام ہرگز نہ
لینا۔ تمہارے اکیلے کے مرجانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر تم نے
میرا یا کمانڈر کمال شاہ کا نام بتا دیا تو تحریک آزادی کشمیر کو ناقابل تلافی نقصان
پہنچے گا۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"محترم! میں تو آیا ہی تحریک آزادی کشمیر پر جان قربان کرنے کے لئے ہوں۔ یہ
کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کا موقع ملے اور میں اپنی جان قربان نہ کروں"

گل خان نے مجھے گلے سے لگا کر میری پیٹھ پر تھاپڑا دیا اور بولا۔

"اب تم نکل چلو۔۔۔۔۔۔۔اللہ حافظ!"

اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ کوارٹروں پر پچھلے پہر کا اندھیرا اور خاموشی چھائی ہوئی
ئی۔ میں تیز تیز قدموں سے کوارٹروں کی آبادی سے نکل کر بارہ دری کے کھنڈر کی طرف
وگیا۔ راستہ میرا جانا پہچانا تھا۔ بارہ دری کے دوسری طرف آیا تو وہاں اندھیرے میں کچی
ڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر گل خان کے آدمی نے ٹرک
ٹارٹ کر دیا۔ میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور ٹرک دلی شہر کی طرف چل
پڑا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ یہ اکتوبر کے شروع کا موسم تھا اور رات کو خنکی ہو جاتی تھی۔
گل خان نے مجھے نائیلون کی نسواری رنگ کی ایک جیکٹ پہنا دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"جموں میں سری ہوگی۔ یہ وہاں تمہارے کام آئے گی"

ٹرک نے مجھے دلی کے ریلوے سٹیشن کے باہر اتار دیا۔ جس ٹرین میں مجھے جالند
تک جانا تھا وہ کلکتہ کی طرف آرہی تھی۔ یہ بات مجھے گل خان نے بتادی تھی اور تاکید
تھی کہ چونکہ پنجاب میں سیکورٹی بڑی سخت ہے اور انٹیلی جینس کے آدمی ریلوے سٹیشنو
پر اکثر منڈ لاتے پھرتے ہیں اس لئے وقت سے پہلے پلیٹ فارم پر مت جانا اور کلک
ایکسپریس کی آخری بوگی کے کسی ڈبے میں بیٹھنے کی کوشش کرنا۔ ہو سکتا ہے گل خان
اس بات کا تجربہ ہو کہ انٹیلی جینس والے آخری ڈبوں کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ کلک
ایکسپریس کے آنے میں ابھی بیس منٹ رہتے تھے۔ میں اتنی دیر سٹیشن کے باہر ہی ا
جگہ گھاس کے پلاٹ میں بیٹھا رہا۔ جب ٹرین کے آنے میں چھ سات منٹ رہ گئے تو
سٹیشن میں آگیا۔ ٹکٹ میں نے آتے ہی لے لیا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ ٹرین لیٹ نہ
تھی۔ ٹھیک وقت پر آئی۔ میں گل خان کی ہدایت کے مطابق پچھلی بوگی کی طرف گیا۔
ٹرین کلکتہ سے امرتسر تک چلتی تھی۔ اس میں کافی رش تھا۔ میں نے گرے کلر کا ہندوانہ
کرتہ اور تنگ موہری کا پاجامہ اور گل خان کی دی ہوئی نائیلون کی نسواری جیکٹ پہن
ہوئی تھی۔ پاؤں میں بنگلوری چپل تھی۔ میری کمر کے ساتھ وہ رومال بندھا جس میں
پلاسٹک کے لفافے میں بند وہ چھوٹی سی ڈبیا تھی جس کے اندر اسپرو کی گولیوں کی شکل
کے پندرہ ٹیبلٹ بم تھے۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی فکر تھی کیونکہ یہ ایک کمانڈو کا بڑا
قیمتی سرمایہ تھا۔ یہ پندرہ ٹیبلٹ بم دشمن کے پندرہ کمانڈروں یا جرنیلوں کو برباد کرسکتے
تھے۔ پلیٹ فارم میں آتے وقت بھی میں نے کمانڈو کی عقابی نگاہوں سے لوگوں کا جائزہ
تھا اور ڈبے میں بیٹھنے کے بعد بھی میں نے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کو خا
نگاہوں سے دیکھا۔ مجھے ان میں کوئی مشتبہ شخص دکھائی نہ دیا۔

یہ میری بھول تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ آدمی چاہے جتنا مکمل ہو جائے کہیں نہ کہیں
اس سے غلطی ضرور ہو جاتی ہے۔ مجھ سے بھی غلطی ہوگئی تھی۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ م
نے اپنی کمانڈو ٹریننگ اور فنی مہارت اور چہرہ شناسی کی اپنی صلاحیت پر ضرورت سے زیا

بھروسہ کرلیا تھا۔ اصل میں ایک آدمی اس وقت سے ہی میرے پیچھے لگ گیا تھا جب میں
لی سٹیشن کے سامنے والے پلاٹ میں میں گھاس پر بیٹھا تھا۔ یہ دلی پولیس کے انٹیلی جینس
بیورو کا آدمی تھا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ مگر میں اس کی نگاہوں میں تھا اور میری بد
قسمتی کہ وہ میرے ڈبے میں آکر میری سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ جب تک گاڑی
کھڑی رہی اس شخص نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ جب گاڑی دلی شہر سے کافی آگے نکل
گئی تو اس نے مجھ سے باتیں شروع کردیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر
ے سگریٹ پیش کیا۔

"آپ سگریٹ پئیں گے؟"

مجھ سے یہ حماقت ہوگئی کہ میرے منہ سے نکل گیا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ اصل
ں مجھے سگریٹ کی واقعی عادت نہیں تھی اور اس کا نشہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک تربیت
ہ کمانڈو کی حیثیت سے مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا کہ میں سٹیشن کے باہر پلاٹ میں بیٹھا ہوا
تو سگریٹ پی رہا تھا۔ اس آدمی نے مسکراتے ہوئے یہی بات کہی۔

"مگر آپ باہر پلاٹ میں تو سگریٹ پی رہے تھے"

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایک سیکنڈ میں میں سمجھ گیا کہ یہ انٹیلی
س کا آدمی ہے اور اس وقت سے میری نگرانی کر رہا ہے میں سٹیشن کے باہر پلاٹ
ں بیٹھا تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔

"بات یہ ہے مہاراج کہ اس وقت میرا سگریٹ پینے کو جی نہیں چاہتا۔ میں کبھی
کبھی ہی سگریٹ پیتا ہوں"

اس شخص کا حلیہ یہ تھا کہ عمر جوانی کی حدود پار کر رہی تھی۔ بالوں پر تھوڑا تھوڑا
ضاب لگا ہوا تھا۔ سر درمیان سے کچھ گنجہ تھا۔ بدن بھاری تھا۔ میلی سی خاکی رنگ کی
ض کے اوپر میل خورے کلر کا ٹھنڈا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ نیچے گبرڈین کی پتلون تھی۔ وہ
ریٹ انگلیوں میں لے کر ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس کے کش لگا رہا تھا۔ دو ایک بار وہ کھانسا تو

ساتھ والے مسافر نے اس کی طرف ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اس آدمی نے ہنس کر کہا۔

”یہ لو مہاراج سگریٹ پھینک دیتے ہیں“

اور اس نے سگریٹ سیٹ پر سے ذرا سا اٹھ کر میری کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ پھر وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

”بھاپاجی آپ امرتسر جارہے ہیں کیا؟“

میں جان بوجھ کر کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں نے ساری حکمت ذہن میں تیار کرلی تھی کہ مجھے اس کے سوالوں کے کیا جواب دینے ہیں۔ پہلے تو میں نے ظاہر کیا کہ میں نے اس کی بات نہیں سنی۔ جب اس نے میرے گھٹنے کو انگلیوں سے ذرا ہلاتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا تو میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ہاں جی امرتسر جانا ہے مجھے“

جالندھر کا ویسے بھی مجھے نام نہیں لینا تھا۔ امرتسر کا نام میں نے اس لئے بول دیا کہ اگر اس نے امرتسر کے بارے میں پوچھا کہ وہاں کہاں رہتے ہو تو میں امرتسر شہر کے بازاروں اور محلوں سے کافی واقف تھا۔ اس کے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ اس نے جب پوچھا کہ امرتسر کہاں رہتے ہو بھاپاجی تو میں نے بے نیازی سے کہا۔

”سنگھ پورے میں رہتا ہوں“

وہ آدمی بڑا چالاک تھا۔ کہنے لگا۔

”سنگھ پورے میں پاکستان سے آئے ہوئی شرنارتھی رہتے ہیں کیا تم بھی پاکستان سے آئے تھے؟“

میں نے کہہ دیا۔

”ہاں جی۔ میرے ماتا پتا کا گھر لاہور سنت نگر میں تھا“

لاہور میں جو ہندوؤں کے محلے تھے ان سب کا مجھے پتہ تھا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے خوش ہو کر کہا۔

”مہاشہ جی ہم بھی لاہور کے رہنے والے ہیں ہمارا گھر شاہ عالمی میں تھا“

یہ اچھی خاصی عمر کا ہندو تھا۔ اس نے لاہور کی باتیں شروع کردیں میں بڑا خوش ہوا کہ انٹیلی جینس والے کے سوال جواب سے جان چھوٹی۔ میں نے لاہور کے ہندوؤں کے محلوں اور وہاں مسلمانوں کے حملوں اور مکانوں کو آگ لگانے کی فرضی کہانیاں بیان کرنی شروع کردیں۔ اس دوران میں انٹیلی جینس ایجنٹ کو ایک نظر دیکھ لیتا۔ وہ میری طرف دیکھ کر اسی طرح مسکرا رہا تھا جیسے اسے میری کسی بات کا یقین نہ آرہا ہو۔ میں دوسرے مسافر سے لاہور شہر کی باتیں کر رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ جالندھر تک بڑا لمبا سفر ہے۔ انٹیلی جینس کا آدمی تو میری جان نہیں چھوڑے گا اس سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے میں فل کمانڈو تھا اور کشمیر کے محاذ پر دشمن کی صفوں میں تباہی مچانے جارہا تھا اگر اس آدمی نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا جو یہ کر سکتا ہے تو یہ میرے مشن کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ میری کمر کے ساتھ بندھی ہوئی اسپرو کی گولیاں یعنی ٹیبلٹ بم بھی برآمد ہو جائیں گے۔ میں نے اگر کہا کہ یہ سردرد کی گولیاں ہیں تو پولیس پوچھے گی کہ سردرد کی گولیوں کو پلاسٹک کی ڈبی میں بند کر کے کمر کے ساتھ باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر پولیس کی لیبارٹری میں ان گولیوں کا تجزیہ کیا گیا تو فوراً یہ راز کھل جائے گا کہ ان گولیوں میں دھماکہ خیز مادہ بھرا ہوا ہے۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا۔ اب مجھے ڈر خوف کوئی نہیں تھا۔ صرف ذہن الجھ سا گیا تھا کہ اس انٹیلی جینس والے کی وجہ سے کہیں میرا مشن ادھورا نہ رہ جائے۔

کلکتہ ایکسپریس ہوا سے باتیں کرتی اپنی منزل کی طرف اڑی جارہی تھی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ راستے میں کسی جگہ موقع دیکھ کر کسی بھی چھوٹے بڑے سٹیشن پر چائے وغیرہ پینے کے بہانے اتر جاؤں گا اور وہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔ ظاہر ہے اگر یہ آدمی میرے پیچھے اتر بھی آیا تو دوڑنے میں میرا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔ میں کمانڈو تھا۔ اور گھوڑے کی طرح دوڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوگیا۔ اب میں نے یہ سکیم بنائی جب دن ڈھل جائے گا اور شام کا اندھیرا ہونے لگے گا تب ٹرین سے اتروں گا۔ جس بات سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہے اور ایک خاص مقصد لے کر میرا

پیچھا کر رہا ہے وہ بات یہ ہوئی کہ اس نے میرا اچانک پکڑ لیا اور عیاری سے مسکرائے ہوئے کہا۔

"ماراج! میرا وچار یہ کہتا ہے کہ آپ کو پاکستان سے آئے دو مہینے ہی ہوئے ہیں۔ آپ کا وچار کیا کہتا ہے"

میں اپنے حواس کو پوری طرح سنبھالے ہوئے تھا اور بظاہر بڑی بے نیازی اور اع کے ساتھ بول رہا تھا۔ اس آدمی کے اس سوال پر میں نے کسی قدر برہم ہو کر کہا۔

"آپ کوئی جوتشی ہیں؟ اگر آپ جوتشی ہیں تو آپ کو جیوتش ودیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ میری عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی جب میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ اپنا سب گھر بار پاکستان میں لٹوا کر امرتسر آیا تھا۔ تب سے لے کر آج تک میں کبھی پاکستان نہیں گیا"

وہ عیار آدمی برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ماراج ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟

میں کندن لال کہہ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ میرا شک اب یقین میں بدل گیا تھا۔ آدمی تھا پنجابی' ہندو۔ یا دلی کی انٹیلی جینس پولیس یا جالندھر امرتسر کی انٹیلی جینس پولیس آدمی تھا۔ وہ مجھ سے پنجابی میں ہی بات کر رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"بڑا اچھا نام ہے۔ سہگل جی کا بھی یہی نام تھا۔ وہ جالندھر میں رہتا تھا آپ بھی کہیں جالندھر تو نہیں جا رہے؟"

میرا دل ذرا سا تیز دھڑکا مگر فورا" ہی اپنے معمول پر آگیا۔ اس نے جان بوجھ کر اس شہر کا نام لیا تھا جہاں میں جا رہا تھا۔ جو شہر اس وقت میرا ٹارگٹ تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے بلف چال چلی ہو لیکن یہ اس کی کام کر گئی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اگلے سٹیشن پر کسی نہ کسی بہانے ٹرین سے اتر کر فرار ہو جاؤں گا۔ ایک بار فرار ہو گیا تو چا دن کی روشنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا باپ بھی مجھے نہ پکڑ سکے گا۔

مصیبت یہ تھی کہ یہ ایکسپریس ٹرین تھی۔ سٹیشن پر سٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ مجھے

معلوم نہیں تھا کہ اگلا بڑا سٹیشن کونسا آ رہا تھا۔ ایک مسافر نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا۔ نے کسی عورت سے کہا۔

"اماں بس اب میرٹھ آیا ہی سمجھو"

میرٹھ ایک بڑا شہر تھا۔ اس کا سٹیشن بھی بڑا تھا۔ یہاں اگر میں ایک دفعہ اتر کر پوش ہونے میں کامیاب ہو گیا تو پھر پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں کسی بھی طرف جاؤں گا اور کہیں سے بھی کوئی لاری پکڑ کر کسی دوسرے شہر پہنچ جاؤں گا۔ کبھی کبھی ڈو مشن میں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بالکل نپی تلی درست رپورٹوں کی روشنی میں ٹ تک پہنچنے کی سکیم تیار کی جاتی ہے۔ مگر کمانڈو جب اپنے ٹارگٹ پر پہنچتا ہے تو اکثر بھی ہوتا ہے کہ حالات بدل چکے ہوتے ہیں اور وہاں پھر اپنی عقل سے کام لے کر کسی ری سکیم پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا امکان بھی تھا کہ اگر میں پکڑا جاؤں تو ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ ایسی صورت میں مجھے سب سے پہلے ٹیبلٹ بم کی گولیوں فوظ کرنا تھا۔

میں جس سیٹ پر بیٹھا تھا ٹائیلٹ اس کے ساتھ ہی تھی۔ میں ٹائیلٹ میں چلا گیا۔ زے کو اندر سے چٹخنی لگا کر میں نے فورا" اپنی کمر کے گرد بندھا ہوا رومال کھولا۔ اس پلاسٹک کی جو چھوٹی سی ڈبی بندھی ہوئی تھی اسے کھول کر اس میں سے ٹیبلٹ بم کی کی ٹکیوں کا فیتہ جو میں نے تہہ کر کے رکھا ہوا تھا نکال کر جیب میں ڈال لیا۔ ڈبی اور ل وہیں ٹائیلٹ میں سے نیچے لائینوں میں پھینک دیا۔ اب کسی کو ان گولیوں کے فیتے ک نہیں پڑ سکتا تھا۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہی سمجھتا کہ یہ اسپرو کی گولیاں ہیں۔

ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ میرٹھ کا سٹیشن آ رہا تھا۔ میں ٹائیلٹ سے نکل کر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ انٹیلی جینس ایجنٹ جھک کر میرے والی کھڑکی میں سے باہر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ باہر کیوں دیکھ رہا وہ یقینا" ریلوے پولیس کے سپاہیوں کو بلانا چاہتا تھا۔ ٹرین رکی تو عین سامنے دو کانسٹیبل کھڑے نظر آئے۔ انٹیلی جینس ایجنٹ نے انہیں اشارہ کیا اور خود ڈبے کے

دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے پکڑے جانے میں اب کوئی شبہ نہیں تھا۔ پولیس کانسٹیبل
اپنے آدمی کا مخصوص اشارہ پاکر ڈبے کی طرف بڑھے۔ میرے پاس فرار ہونے کی کوشش
کرنے کے لئے صرف تین چار سیکنڈ تھے۔ ابھی انٹیلی جینس ایجنٹ ڈبے کے دروازے
تک نہیں پہنچا تھا اور کچھ مسافر میرٹھ کے سٹیشن پر اترنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے
تھے۔ میں نے ان کی آڑ لی اور ڈبے کی دوسری طرف والی کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ یہ
کام اتنا آسان نہیں تھا جتنی آسانی سے میں نے بیان کر دیا۔ کوئی عام آدمی یہ نہیں کر سکتا
تھا۔ مگر مجھے اس کی ٹریننگ دی گئی تھی اور یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا دوسری
طرف ریل کی ایک اور پٹڑی تھی اور اس کے آگے دوسرا پلیٹ فارم تھا۔ میں نے تیزی
سے لائن عبور کی اور اچھل کر دوسرے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا اور تیز تیز قدموں سے
سامنے والے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اسی دوران پیچھے سے کانسٹیبلوں نے سیٹیاں بجانی شروع
کر دی تھیں۔ مگر میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ دوسرے پلیٹ فارم پر چونکہ
کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی اس لئے گیٹ خالی تھی۔ میں تیز قدم اٹھاتا گیٹ سے نکل گیا
سامنے سڑک تھی۔ ایک طرف رکشے وغیرہ کھڑے تھے۔ میں نے جو پہلا خالی رکشا دیکھا
اس میں بیٹھ کر رکشے والے سے کہا۔

"چلو"

اس نے پوچھا۔

"کدھر جانا ہے بابو جی؟"۔

میں نے کہا

"تم چلو ابھی بتاتا ہوں"

یہ موٹر رکشا تھا۔ بائیسکل والا رکشا نہیں تھا۔ رکشا چل پڑا۔ دن کے دس بجے کا
ہو گا۔ بازار کھلے تھے۔ بڑی رونق تھی۔ ٹریفک بھی کافی تھی۔ میں نے پچھلی کھڑکی کا پر
کر پیچھے دیکھا۔ دوسرے رکشے اور گاڑیاں اور تانگے وغیرہ آ رہے تھے۔ ان میں پولیس
کوئی گاڑی نہیں تھی۔ لیکن ایسا ہو سکتا تھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی کسی دوسرے رکشے

تعاقب کر رہا ہو۔ اس زمانے میں ابھی موبائیل ٹیلی فون کا رواج نہیں ہوا تھا۔ خفیہ
ی اتنی جلدی پولیس کو الرٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس نے مجھے سٹیشن سے رکشا میں
ہوتے دیکھ لیا تھا تو ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے رکشے میں میرا پیچھا کر رہا ہو۔ لیکن
کا امکان بہت کم تھا۔

انڈیا میں جب کمانڈو کے ساتھ ایسی صورت پیش آتی ہے تو قدرتی طور اس کے دل
وہاں کے کسی مسلمان کا یا مسجد کا ہی خیال آتا ہے۔ کیونکہ انڈیا میں مسلمان کروڑوں
تعداد میں آباد ہیں۔ اگرچہ وہ ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر اسلام کا
ط رشتہ ہر مسلمان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ لیکن کمال شاہ نے مجھے یہ
ت بھی کر دی تھی کہ اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آجائے تو سوچ سمجھ کر کسی
ان کے ہاں پناہ لینا۔ اگر پناہ بھی لینی پڑ جائے تو اسے اپنے بارے میں ہرگز نہ بتانا کہ تم
ن ہو اور کس مشن پر کہاں جا رہے ہو۔ اپنے آپ کو پاکستانی بھی ظاہر نہ کرنا اور پاکستان
بارے میں زیادہ باتیں بھی نہ کرنا۔ میرے محترم استاد اور مرد مومن کمال شاہ نے مجھے
ی بتا دیا تھا کہ انڈیا کی پولیس چاہے کیسی بھی ہے مگر اس کی خفیہ پولیس بڑی چاق و
د ہے۔ اس سے کبھی غافل نہ ہونا۔ چنانچہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ انٹیلی جینس ایجنٹ
ر میرے تعقب میں ہے۔ رکشا ایک چوک میں پہنچا تو ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کو جانا کہاں ہے بابو؟"

میں نے کہا۔

"بائیں طرف والے بازار میں چلو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

رکشا بائیں طرف والے بازار کی طرف گھوم گیا یہ بازار رونق والا نہیں تھا۔ یہ زمانہ
پینسٹھ کی انڈیا پاکستان جنگ سے ایک سال پہلے کا زمانہ تھا اور ابھی شہروں کی آبادی اتنی
نہیں بڑھی تھی۔ کشمیر کے محاذ پر حریت پرست کشمیری اپنی آزادی اور اپنے بقا کی
برابر لڑ رہے تھے۔ اسی جنگ سے تنگ آکر انڈیا نے اگست 1965ء میں آزاد کشمیر پر
کر دیا تھا۔ وہ اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر آزاد کشمیر کو بھی ہڑپ کر لینا چاہتا تھا

تاکہ پورے کشمیر پر اس کا ناجائز قبضہ ہو جائے۔ مگر یہ سودا اسے بڑا مہنگا پڑا۔ جب آزاد کشمیر پر اس نے اٹیک کیا اور اپنی بھاری نفری اور چین کا ہوا دکھا کر امریکہ سے لئے ہوئے بے پناہ اسلحہ کے زعم میں اس نے پاکستان کی سرحد پر بھی گولہ باری شروع کر دی اور اس کی توپوں کے گولے پاکستان کے دیہات اعوان شریف میں گرے تو پاکستانی فوج میدان میں آگئی۔ اس کے بعد انڈیا کو جس عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور جس قدر ذلت آمیز ہزیمت اٹھانی پڑی وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ میں آگے چل کر اس زمانے کے حالات بھی بیان کروں گا۔ ابھی تو میں رکشے میں بیٹھا میرٹھ شہر کے کسی بازار میں سے گزر رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ خفیہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

مجھ پر گھبراہٹ وغیرہ بالکل طاری نہیں تھی۔ لیکن میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے الرٹ ضرور ہو چکا تھا۔ اس وقت میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے شک بلکہ بہت حد تک یقین تھا۔ جس بازار میں میرا رکشا جا رہا تھا اس کے آگے بھی ایک چوک آتا تھا۔ جیسے ہی رکشا چوک کے قریب پہنچا دوسری سڑک پر سے پولیس کی ایک گاڑی بڑی تیزی سے آئی۔ چوک میں آکر گاڑی کو بریک لگی۔ اس میں سے چار پانچ کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر نکلے اور انہوں نے بازار کو بلاک کر دیا ایک انسپکٹر ہاتھ میں پستول لئے بازار کے درمیان میں آکر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے آگے ایک گاڑی اور ایک رکشا جا ر تھا۔ اس نے ہاتھ دے کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا۔

"رکشا روکو"

جیسے ہی رکشے کی رفتار ذرا کم ہوئی میں نے رکشے میں سے چھلانگ لگادی اور سا ایک گلی میں گھس گیا۔ خفیہ پولیس والے نے اپنی اعلیٰ کارکردگی دکھاتی تھی۔ ضرور ا نے مجھے سٹیشن کے باہر رکشے میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا اور کسی طریقے سے پولیس سٹیش اطلاع کر دی تھی اور خود رکشا یا کوئی اور سواری لیکر میرے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔

مجھے اب یہ خطرہ تھا کہ گلی آگے سے بند نہ ہو۔ گلی بند نہیں ہوتی تھی۔ میں دوڑ کی بجائے تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ گلی بالکل خالی تھی۔ دونوں جانب مکان تھے۔

ڑی دور جاکر ایک اور بازار میں نکلتی تھی جو نسبتاً چھوٹا بازار تھا اور اس کی دکانیں بھی لی تھیں۔ یہاں مجھے مکانوں کے درمیان ایک مسجد کا دروازہ دکھائی دیا۔ مسجد کا دروازہ ف پہچانا جاتا ہے۔ میں سیدھا دو چار سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ چپل اتار بغل میں دبائی اور مسجد کے صحن میں سے گزر کر منبر والے چھوٹے سے ہال کمرے میں یا۔ یہاں ایک بزرگ صورت سفید ڈاڑھی والا بھاری بھرکم آدمی بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ بھی اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس نے اس سارے علاقے کو یرے میں لیا ہوگا اور تھوڑی دیر میں پولیس تلاشی لیتی ہوئی اس مسجد میں بھی پہنچ جائے ۔ یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ پولیس کو میرے پاکستانی جاسوس یا کشمیری حریت پسند نے کا یقین ہو چکا ہے اور وہ ہر حالت میں مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ یہ ان لوگوں کا اپنا تھا۔ پولیس کو یہ بھی یقین ہو گیا ہوگا کہ میں مسلمان ہی ہو سکتا ہوں اور وہ مجھے تلاش ی مسجد میں ضرور آئے گی کیونکہ ایک مسلمان حریت پسند اس قسم کے حالات میں مسجد ہی پناہ لے سکتا ہے۔ میں نے اس بزرگ سے جو کچھ کہنا تھا وہ سوچ لیا تھا۔ مگر میرے زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں خدا سے یہ دعا مانگنے لگا کہ بزرگ دعا مانگنے سے جلد فارغ ۔

اتنے میں اس بزرگ نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اٹھ کر باہر جانے لگا تو میں نے السلام م کہا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور وعلیکم السلام کر کے مسجد کے صحن کی ف بڑھ گیا۔ میں نے آواز دے کر کہا۔

"آپ سے ایک بات کرنی تھی"

وہ بزرگ رک گیا اور دو قدم چل کر واپس میرے قریب آکر بولا۔

"کہو میاں۔ کیا بات ہے؟"

معاملہ بڑا نازک تھا۔ اصل حقیقت چھپانے سے کام نہیں بن سکتا تھا۔ اور اصل یقت بیان کر دینے سے میرے لئے مزید خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ مسلمان بزرگ کسی ری قسم کا انڈین مسلمان بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت صرف اس بات کی ضرورت تھی

کہ اس مسلمان کے دل میں جذبہ ایمانی کو بیدار کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"میں الحمد اللہ مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے نبی پاکؐ کے نام پر کشمیر میں اسلام کی خاطر جہاد کر رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے یہاں آیا تھا۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لئے کسی جگہ چھپا دیجئے۔ آپ کو جنت کا ثواب ملے گا"

اس بزرگ کے دل میں ایمان کا جذبہ پہلے ہی سے بیدار تھا۔ وہ پکا مسلمان تھا۔ اس نے دوسری بات ہی نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔

"مسجد کی چھت پر چلے جاؤ۔ وہیں بیٹھے رہنا میں آکر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا"

میں دیوار کے ساتھ والی سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کی چھت پر جا کر بیٹھ گیا۔ میری دونوں جانب مکانوں کی دیواریں میں اوپر تک چلی گئی تھیں۔ عقب میں کوئی مکان نہیں تھا۔ وہاں بھی ایک سیڑھی نیچے شاید کسی گلی میں جاتی تھی۔ مگر میں بزرگ کی ہدایت کے مطابق مسجد کی چھت پر ہی بیٹھا رہا۔ دوسرے بازار کی طرف سے پولیس کی سیٹیوں کی مخصوص آوازیں دو تین بار سنائی دیں۔ پولیس موجود تھی اور میری تلاش شروع ہو گئی تھی۔ جس رکشے میں میں سفر کر رہا تھا اس کے ڈرائیور نے ضرور پولیس کو بتا دیا ہو گا کہ میں فلاں گلی میں گھسا تھا۔ پولیس اس گلی میں پہنچنے ہی والی ہو گی۔ یا ہو سکتا ہے پہنچ گئی ہو اور اس مسجد کی طرف آ رہی ہو جس کی چھت پر میں چھپ کر بیٹھا ہوں۔ میں نے سوچا کہ بزرگ کو حالات کی سنگینی کا کہاں احساس ہو گا۔ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے میں دوسری طرف والی سیڑھیاں اترنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ وہی بزرگ ان سیڑھیوں میں نمودار ہوا اور اشارے سے مجھے بلا کر کہا۔

"جلدی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

مسجد کی یہ عقبی سیڑھیاں ایک تنگ گلی میں اترتی تھیں۔ گلی خالی تھی۔ وہ بزرگ میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہے

ہ۔ میں بھی خاموش تھا۔ آگے جا کر یہ تنگ سی گلی ایک بازار میں نکل آئی۔ یہاں ایک ان کے باہر ایک پرانا سا ویسپا سکوٹر کھڑا تھا۔ بزرگ نے مجھے سکوٹر کے پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ وں نے سکوٹر سٹارٹ کیا اور مجھے لے کر بازار میں اس سمت کو مڑ گئے جو پولیس کی ان والے بازار سے مخالف سمت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے خطرے کے علاقے سے ر لے جانا چاہتے ہیں۔ بزرگ بڑی مہارت اور تیز رفتار کے ساتھ سکوٹر چلا رہے تھے۔ ین چوراہے عبور کرنے کے بعد انہوں نے ایک جگہ سے ریلوے کا پل پار کیا۔ دوسری ب گھاس منڈی تھی۔ سکوٹر وہاں سے بھی آگے نکل گیا۔ اس دوران بزرگ بالکل وش رہے۔ گھاس منڈی کے آگے شہر کی پرانی اور گنجان آبادی والا علاقہ شروع ہو گیا۔ ا دو تین تنگ سے بازاروں میں سے گزرنے کے بعد ہمارا سکوٹر ایک گلی میں داخل ے کے بعد ایک مکان کی ڈیوڑھی میں آ کر رک گیا۔

بزرگ نے سکوٹر سے اتر کر بیٹھک کا دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا۔

"اندر آ جاؤ میاں"

یہ چھوٹی سی بیٹھک تھی جس کی فضا میں گھٹن اور ٹھنڈک سی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ ے نے بتی جلا دی۔ بیٹھک کا فرش ننگا تھا۔ دو تین آرام کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز ان کرسیوں کے درمیان پڑی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے دروازہ بند ے چٹخنی چڑھا دی اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"اب بتاؤ میاں اصل بات کیا ہے اور تم کون ہو؟ میں تو تمہیں کشمیری حریت پسند مجاہد سمجھ کر تمہیں بچا کر یہاں لے آیا ہوں۔ مگر تم مجھے اپنی باتوں سے کشمیری نہیں لگتے۔"

اصل حقیقت میں نے اس بزرگ کو بھی نہ بتائی۔ میں نے کہا۔
"میں مالیر کوٹلے کا رہنے والا پنجابی ہوں۔ شوق شہادت میں سرشار ہو کر کشمیر کے محاذ
حریت پرست مجاہدوں میں شامل ہوا ہوں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ میں کشمیری نہیں ہوں
لیکن مسلمان ہوں"
وہ بزرگ کہنے لگے۔
"تم عین وقت پر میرے پاس آگئے تھے اگر ذرا دیر کر دیتے تو پولیس نے تمہیں
پکڑ لینا تھا۔ پولیس مسجد والی گلی میں تمہاری تلاش میں پہنچ گئی تھی۔ اب بتاؤ تم
کہاں جانا چاہتے ہو؟"
میں نے اپنی جیب سے جالندھر کا ریلوے ٹکٹ نکال کر دکھایا اور کہا۔
"میں جالندھر پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہاں سے کسی نہ کسی طرح جموں کشمیر چلا جاؤں
گا۔"
بزرگ کہنے لگے۔
"اس کے لئے ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پولیس ریلوے
سٹیشن اور لاری اڈوں پر تمہاری نگرانی کر رہی ہوگی۔ خفیہ ایجنسی کے جس
آدمی نے تمہیں دیکھا ہوا ہے اس نے تمہارا حلیہ پولیس کو بتا دیا ہوگا۔"
وہ بزرگ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مگر میرا اس شہر میں زیادہ دیر تک رکے رہنا

ں تھا۔ اس دوران پولیس شہر کی پوری پوری ناکہ بندی کر سکتی تھی اور پھر میرے لئے
رٹھ شہر سے نکلنا مزید مشکل ہو جاتا۔ میں نے کہا۔
"محترم کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے کسی طرح شہر سے باہر نکال دیں"
وہ کہنے لگے۔
"نکالنے کو تو میں ابھی تمہیں اپنے سکوٹر پر بٹھا کر شہر سے باہر پہنچا سکتا
ہوں۔ لیکن بھارتی پولیس کچی گولیاں نہیں کھیلی۔ وہ جگہ جگہ اور خاص طور پر
شہر سے باہر جانے والے راستوں پر لوگوں کو روک کر پوچھ گچھ کر رہی ہو گی
چور قاتل اور ڈاکو کے لئے پولیس اتنا تردد نہیں کرتی۔ کیا دوسرے ملک کے
جاسوس اور کشمیری مجاہدوں کو پکڑنے کے لئے تو وہ جان کی بازی بھی لگا دیتی
ہے۔ خدا نہ کرے اگر ہم پکڑے گئے تو تمہارے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا۔
تم تو پولیس کی حراست سے نکل کر فرار بھی ہو سکتے ہو مگر میری تو ساری نسل
برباد ہو جائے گی"
میں خاموش رہا۔ بزرگ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ انہوں نے عین موقع پر میری مدد کی
۔ میں ان کی انسانی اور اسلامی ہمدردی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر
چنے کے بعد وہ کہنے لگے۔
"تم ایسا کرو کہ کسی نہ کسی طرح رات ہو لینے دو اتنی دیر یہاں چھپے رہو۔
یہاں کوئی تمہیں پکڑنے نہیں آئے گا۔ جیسے ہی رات ذرا گہری ہو گی میں
تمہیں سکوٹر پر بٹھا کر شہر سے باہر چھوڑ آؤں گا۔ جی ٹی روڈ پر پہنچ کر تم کسی
چلتی بس لاری یا ٹرک میں سوار ہو جانا۔ میرٹھ شہر کے کسی بس اڈے یا اسٹیشن
سے تمہارا گاڑی پکڑنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔"
انہوں نے بڑی اچھی سکیم بتائی تھی۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ میں یہاں رات
نے کا انتظار کروں گا۔ میں نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اس پر وہ بزرگ بولے۔
"میاں شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور

کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کا پرستار ہوں۔ ہماری انڈین حکومت نے کشمیریوں کی مرضی کے خلاف جموں کشمیر میں صرف ناجائز قبضہ ہی نہیں کر رکھا بلکہ اس کی فوج وہاں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑ رہی ہے۔ اب میری جوانی کی عمر نہیں رہی ورنہ میں خود جہاد کشمیر میں شامل ہو کر کافر ہندوؤں کے خلاف جنگ کرتا"

میں میرٹھ شہر کے اس بھارتی مسلمان بزرگ کے اس جذبے سے بڑا متاثر ہوا دوپہر کا کھانا میں نے وہیں بیٹھک میں ہی کھایا۔ اوپر اس بزرگ کی معمر والدہ ایک ملاز کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ اس کے بڑے لڑکے نے شادی کے بعد شہر میں الگ مکان بن ہوا تھا۔ دو لڑکیوں کی وہ شادی کر چکے تھے جن میں سے ایک سہارن پور میں اور دوسر الہ آباد میں رہتی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں بیٹھک میں ہی سو گیا۔ بزرگ بیٹھک کو باہر سے تالا لگا گئے تھے۔ میں کافی حد تک بے فکر ہو گیا تھا چنانچہ شام تک س رہا۔ شام کو آنکھ کھلی تو وہ بزرگ بھی آ گئے۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کی چینک اور دو پیالیاں رکھ کر لائے تھے۔ ہم نے بیٹھک میں ہی چائے پی۔ وہ جہاد کشمیر کے بارے میں باتیں بھی کرتے رہے۔ بزرگ نے اپنے لئے چائے کی تیسری پیالی بناتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"تم اور چائے پیو گے"

میں نے کہا۔

"جی نہیں شکریہ"

وہ اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولے۔

"بھائی مجھے سر درد کی بڑی پرانی شکائت ہے۔ شام کو یہ درد تیز ہو جاتی ہے۔ چائے کے ساتھ اسپرو کی دو ایک گولی کھالوں تو بالکل ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ جلدی میں دکان سے اٹھ کر آ گیا ہوں۔ اسپرو کی ٹکیاں لانی یاد نہیں رہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی۔ پھر ماچس نکالنے لگا

م بم ٹیبلٹ کی دو ٹکیاں باہر نکل آئیں وہ بزرگ بولے۔

"میاں یہ تو اسپرو کی ٹکیاں ہیں۔ لاؤ دو گولیاں مجھے دے دو۔"

انہوں نے میری جھولی میں پڑی ٹیبلٹ ٹائم بم کی ٹکیاں اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا میں نے جلدی سے ٹکیاں اٹھا کر جیب میں ڈال لیں اور کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ یہ اسپرو کی گولیاں نہیں ہیں۔ یہ تو جوڑوں کے درد کی دوا ہے"

میں تو اس خیال سے لرز گیا کہ اگر فرض کر لیا وہ بزرگ جلدی سے ایک گولی اٹھا کر نہ میں ڈال کر نگل جاتے تو کیا ہوتا۔ جب وہ بزرگ چائے کے خالی برتن لے کر چلے گئے میں نے کرتے کی چور جیب میں سے یعنی اس جیب میں سے جو کرتے کے پہلو میں خفیہ ر بنا دی جاتی تھی اور جسے چور کیسہ کہتے تھے' میں نے اس میں سے اسپرو ٹیبلٹ بم تہ باہر نکال لیا۔ باقی تیرہ گولیاں پلاسٹک کے فیتے میں ہی بند تھیں یہ دو گولیاں شاید بھاگ دوڑ اور رکشے سے چھلانگ لگانے کی وجہ سے فیتے سے باہر نکل آئی تھیں۔ نے ان دونوں اسپرو بم کی گولیوں کو بھی فیتے میں ڈال کر پلاسٹک کا فیتہ اچھی طرح سے کر جیب میں رکھ لیا۔ آگے سے میں اسپرو گولیوں یعنی اسپرو ٹیبلٹ بم کی ٹکیوں کو ٹیبلٹ بم ہی لکھوں گا۔

یہ بزرگ بڑا پکا اور سچا مسلمان مومن تھا۔ اگر اس وقت وہ میری مدد نہ کرتا تو میرا ں کے ہاتھوں پکڑا جانا یقینی تھا۔ میرٹھ کے کسی بازار میں اس کی گوٹے کناری کی دکان ۔ اس نے مجھے بتایا کہ تحریک پاکستان میں میرٹھ کے مسلمانوں نے بڑا بھرپور حصہ لیا وہ کہنے لگا۔

"میرٹھ کے مسلمان بڑے دلیر مسلمان ہیں ہندو تو اب بھی ہم سے دب کر رہتا ہے۔ ٹھیک ہے حکومت ضرور ہندو کی ہے مگر ہم بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔"

اس بزرگ نے میری بڑی خدمت کی۔ اس کا مجھے اپنے گھر میں چھپا لینا بہت بے

ڈری اور دلیری کی بات تھی۔ اس بزرگ نے اپنے سارے خاندان کا مستقبل داؤ پر لگا دیا تھا۔ آج بھی وہ بزرگ مجھے یاد آتا ہے تو میں اس کی بہادری اور اخلاقی جرات پر واہ واہ کر اٹھتا ہوں۔ شام کو وہ آئے تو بولے۔

"میاں میں نے غسل خانے میں گرم پانی رکھوا دیا ہے جا کر نہا لو۔"

اس موسم میں شام کو خنکی ہو جاتی تھی۔ میں نے غسل کیا۔ رات ہو گئی۔ وہ اوپر سے کھانا لے آئے۔ ہم نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کہنے لگے۔

میں لاری اڈے اور ریلوے سٹیشن کا ایک چکر لگا کر دیکھ آیا ہوں۔ وہاں مجھے پولیس معمول سے زیادہ نظر آئی ہے۔ تمہارا اس طرف جانا واقعی مناسب نہیں ہے۔ میں تمہیں سکوٹر پر بٹھا کر شہر سے باہر جالندھر جانے والی سڑک پر چھوڑ آؤں گا"

جب انہیں معلوم ہوا کہ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں اور ان علاقوں سے واقف نہیں ہوں تو وہ کہنے لگے۔

"دیکھو میاں۔ جالندھر شہر یہاں سے کافی دور ہے۔ وہ مشرقی پنجاب میں ہے۔ اور تم ابھی اتر پردیش میں ہو۔ یہاں سے نکلو گے تو آگے بڑا شہر مظفر نگر آئے گا۔ اس کے بعد تم سہارن پور پہنچو گے۔ سہارن پور کے بعد انبالہ آجائے گا۔ انبالے کے آگے بھارتی پنجاب شروع ہوتا ہے۔ انبالے کے بعد لدھیانہ اور پھر جالندھر آئے گا"

سفر باقی لمبا تھا۔ ان معنوں میں کہ پولیس میرا پیچھا کر رہی تھی۔ جی ٹی روڈ پر بھی سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں جی ٹی روڈ سے ہٹ کر کھیتوں میں پیدل سفر کروں۔ جو ممکن نہیں تھا۔ میں دل میں یہی طے کر لیا تھا کہ اللہ کا نام لے کر نکل پڑتا ہوں۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو گا جب وہ بزرگ مجھے اپنے سکوٹر کے پیچھے بٹھا کر گلی میں سے نکلے۔ بازاروں میں کافی خاموشی تھی۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر

تھی مگر سڑک کے کنارے بتیاں روشن تھیں۔ وہ مجھے ایسے راستوں سے لے کر گئے کہ جہاں روشنیاں زیادہ نہیں تھیں اور پولیس کا چیکنگ کا خطرہ نہیں تھا۔ ہم کھیتوں سے بھی گزرے۔ پھر جی ٹی روڈ آگئی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ اس نے مجھے دو کھمبوں کے درمیان جہاں ذرا اندھیرا تھا اتار دیا اور کہا۔

"لو بھائی اب تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ یہاں جو لاری جالندھر کی طرف جانے والی آئے گی اس کی پہلے چیکنگ ہو چکی ہو گی۔ پھر بھی ذرا ہوشیار ہو کر بیٹھنا۔ خدا حافظ!"

میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ ہلا کر سکوٹر سٹارٹ کر کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں جی ٹی روڈ پر اکیلا کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف درخت تھے جن میں اندھیرا تھا۔ پیچھے میرٹھ شہر کی جانب شہر کی تھوڑی تھوڑی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں سڑک سے اتر کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس بزرگ نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ کسی ٹرک وغیرہ کو ہاتھ دینے کی کوشش نہ کرنا ہو سکتا ہے وہ پولیس والوں کی گاڑی ہو۔ لاری کی نشانی انہوں نے یہ بتائی تھی کہ سواریوں والی لاری کی پیشانی پر بھی ایک بتی جل رہی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرٹھ کی طرف سے ایسی ہی ایک لاری آتی دکھائی دی۔ میں نے آگے ہو کر اسے ہاتھ دیا مگر لاری نہ رکی۔ شاید رات کے وقت ڈرائیور رکنا نہیں چاہتا تھا یا شاید لاری سواریوں سے پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ ایک ٹرک آ کر گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری لاری آئی میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ بھی نہ رکی۔ یہ لاری بھی سواریوں والی لاری تھی۔ اس کے بعد آدھا گھنٹہ میں سڑک کے کنارے درخت کے نیچے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا مگر سواریوں والی لاری نہ آئی۔ شاید رات بارہ بجے کے بعد میرٹھ سے سواریوں والی لاری نہیں چلتی تھی۔ جب یہ خیال ذہن میں پیدا ہو گیا تو میں نے سوچا کہ میں ساری رات تو یہاں بیٹھ نہیں سکتا۔ بہتر ہے کہ کوئی ٹرک وغیرہ آئے تو اسے ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اسی شہر سے نکلنا بھی ضروری تھا۔

مزید آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اس دوران جالندھر انبالے کی طرف سے دو تین ٹرک آئے اور میرٹھ کی طرف نکل گئے۔ میرٹھ کی طرف سے صرف ایک ٹرک گذرا جس نے میرے ہاتھ کے اشارے پر بھی ٹرک نہیں روکا۔ آخر دور سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں تو میں سڑک کے کنارے آکر کھڑا ہو گیا۔ روشنیاں قریب آئیں تو میں نے ہاتھ کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی کار تھی۔ کار پہلے تو آگے نکل گئی۔ تھوڑی دور جا کر رکی اور پھر اسی طرح پیچھے کو آنے لگی اور میرے قریب آکر ٹھہر گئی۔ کار کے اندر کی بتی روشن ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نیلی ساڑھی والی عورت بیٹھی ہے جس نے خوب میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کھڑکی شیشہ نیچے کیا اور مجھ سے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

میں اس عورت کی دلیری پر بڑا حیران ہوا کہ آدھی رات کے وقت اس نے سنسان جگہ پر ایک اجنبی آدمی کے لئے گاڑی روک دی ہے اور اب پوچھ رہی ہے کہ کہاں جا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"بس مجھے اگلے شہر تک لے چلیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی؟"

اس نے دروازہ کھول دیا اور کہا۔

"اندر آجاؤ"

میں جلدی سے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا دروازہ بند کر دیا گاڑی آگے چل پڑی۔ گاڑی میں کسی عطر کی بڑی مسحور کر دینے والی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عورت نے گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اگلا شہر تو مظفر نگر ہے۔ کیا تم مظفر نگر جاؤ گے؟"

میں نے کہا

"اگر آپ کو اس سے بھی آگے جانا ہے تو مجھے آگے لے جائیں۔ میں آگے جا کر اتر جاؤں گا"

عورت ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"آخر تمہیں کہاں جانا ہے۔ میں تو لدھیانے جا رہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ لدھیانے چلو گے؟"

میں نے کہا

"آپ کی مہربانی ہو گی مجھے لدھیانے ہی جانا ہے۔"

عورت نے آہستہ سے کہا۔

چلو لدھیانے ہی چلے چلو۔ کہاں سے آرہے ہو اور میرٹھ شہر سے باہر اتنی دور تم کیسے کھڑے تھے؟"

میں نے یونہی کہہ دیا کہ یہاں ایک قریبی گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ا تھا۔ رات کو جانے کا پروگرام اس لئے بنایا کہ کل دن کے وقت لدھیانے پہنچ جاؤں

"میرا دوست ہی مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے کہ تھا کہ ہاتھ دینے سے کوئی نہ کوئی لاری ضرور تمہیں بٹھا لے گی مگر دو لاریاں آکر نکل گئیں کوئی نہیں رکی"

اس عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں یار ہم تمہیں لدھیانے لے چلیں گے۔ اور تم سے کرایہ بھی نہیں لیں گے۔"

یہ کہہ کر عورت کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ پنجابی میں مجھ سے بات کر رہی تھی۔ جب نے یار کا لفظ ادا کیا تو میں محتاط ہو گیا۔ عورت کی آواز مردوں ایسی بھاری آواز تھی۔ کی عمر چالیس برس کے قریب ہو گی۔ رنگ گورا تھا۔ بالوں میں خضاب لگایا ہوا تھا۔ وں کے گرد حلقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے سگریٹ کٹ اور لائیٹر نکال کر مجھے دیا اور بولی۔

"پلیز مجھے اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا دو۔ تم سگریٹ پیتے ہو

نال؟"

میں نے کہا

"جی ہاں۔ کبھی کبھی پی لیتا ہوں"

"ویری گڈ! بس ایک سگریٹ اپنے لئے بھی سلگالو"

یہ سگریٹ بڑی اعلیٰ کوالٹی کے تھے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا کر اس عورت کو دیا۔ ایک سگریٹ خود سلگا لیا۔ گاڑی ایک خاص رفتار کے ساتھ جی ٹی روڈ پر انبالے کی جانب رواں دواں تھی۔ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

"گانا سنو گے؟ مجھے تو پنجابی گانے بڑے پسند ہیں"

گاڑی کی فضا کسی عورت کے پنجابی گانے سے گونجنے لگی۔ گانے وغیرہ کا مجھے بر واجبی سا شوق تھا۔ کہیں کوئی ریکارڈ لگا ہو تو سن لیتا تھا۔ انڈیا کے فلمی گانے میں کبھی نہیں سنتا تھا۔ کیونکہ انڈیا میرا دشمن ملک تھا۔ یہ پنجابی گانا جس کی ٹیپ اس عورت نے لگا تھی فلمی گانا نہیں تھا۔ عجیب سی آواز تھی گانے والی کی۔ بالکل مردانہ آواز تھی۔ عورت ساتھ ساتھ ہلکی سی آواز میں خود بھی گانے لگی۔

گاڑی نے دو تین میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سڑک پر ایک جگہ پولیس کے آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ ہاتھوں کے اشاروں سے گاڑی کو رکنے کے لئے کہہ ر تھے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا ساکت سا ہو گیا۔ اتنا وقت بھی نہ چلا کہ میں گاڑ دروازہ کھول کر باہر کود کر بھاگ سکوں۔ اس عورت نے بڑی بے نیازی سے گاڑی پو کے سپاہیوں کے بالکل پاس جا کر روک دی اور کھڑکی کا شیشہ اتارتے ہوئے رعب آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ گاڑی کیوں روکی ہے؟"

سڑک پر دو پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ اتنی دیر میں درختوں میں سے نکل کر تین پولیس کانسٹیبل آ گئے۔ ان سب کے کاندھوں پر رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ پو

کانسٹیبل نے کہا۔

"میڈم جی ایک ملزم مفرور ہے اس کی تلاش میں ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

اس عورت نے غصیلی آواز کے ساتھ کہا۔

"میں تمہیں ملزم لگتی ہوں؟ جانتے ہوں میں کون ہوں؟"

اس نے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر کانسٹیبل کو دکھایا۔

"یہ دیکھو۔ میں تمہارے انسپکٹر جنرل پولیس کی بیوی ہوں"

سارے کانسٹیبل گاڑی سے پرے ہٹ کر اٹنشن ہو گئے۔ انہوں نے بڑے زور سے سیلوٹ مارا اور بھاگ کر سڑک پر جو رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی اسے ہٹا دیا۔ جب ہاری گاڑی ان کے قریب سے گذری تو سپاہیوں نے ایک بار پھر سیلوٹ کیا۔ میں تو اللہ کے کرم پر حیران رہ گیا۔ کہاں مجھے یہ لگ رہا تھا کہ بس اب پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور کہاں یہ کہ وہی پولیس جو مجھے گرفتار کرنے کے لئے وہاں آئی تھی سلام کر کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور سگریٹ باہر پھینک یا۔ تب میں نے اس عورت سے کہا۔

"آپ اتنے بڑے پولیس آفیسر کی پتنی ہیں اور رات کو اکیلی سفر کر رہی ہیں۔ کوئی ڈرائیور بھی آپ نے نہیں لیا۔ آپ واقعی بڑی بہادر عورت ہیں"

میں نے سوچا کہ اس عورت کی تھوڑی بہت تعریف ضرور کر دینی چاہئے اس نے سکرا کر کہا۔

"آئی جی پولیس کی بیوی ہوں اس لئے تو اکیلی بھی سفر کر لیتی ہوں۔ مجھے کون ہاتھ لگائے گا۔ ویسے بھی میں مردوں سے نہیں ڈرتی۔ آخر مرد ایک عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کیا برا سلوک کر سکتا ہے؟ مجھے سب کچھ پسند ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ یہ عورت کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے اس کے بارے میں

سوچنا بند کر دیا۔ کیونکہ مجھے اس عورت سے اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی تھی کہ وہ مجھے میرٹھ شہر سے نکال کر لے جائے۔ اب جب کہ مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہو چکا تھا کہ وہ آئی جی پولیس کی بیوی ہے تو وہ میرے لئے بہت بڑا خطرہ بھی تھی۔ میں تو ایک طرح سے اپنے آپ پولیس کے گھیرے میں آگیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لدھیانے جا رہی ہے۔ راستے میں ہو سکتا ہے مزید پولیس کے آدمی اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے آجائیں۔ وہ مجھے دیکھیں گے تو ضرور پوچھیں گے کہ میں کون ہوں۔ اس طرح اس بات کا پورا امکان تھا کہ میرا راز فاش ہو جائے اور میں پکڑا جاؤں۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اس عورت کے ساتھ زیادہ دور نہیں جاؤں گا اور اگلے شہر مظفر نگر میں ہی اتر جاؤں گا۔ میں نے اس عورت سے یونہی باتیں کرنے کی غرض سے کہا۔

"لدھیانے میں تو آپ کی بہت بڑی کوٹھی ہو گی آخر آپ پولیس کے سب سے بڑے افسر کی پتنی ہیں"

اس نے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہماری سرکاری کوٹھی تو انبالے میں ہے مگر میں لدھیانے اپنی ماتا جی کے پاس جا رہی ہوں"

میں سوچنے لگا کہ اگر میں اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر لدھیانے تک بھی چلا جاؤں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ پولیس کے پاس میری تصویر تو ہے نہیں۔ انٹیلی جنس کے آدمی نے تو میری شکل ہی دیکھی تھی اور میرا حلیہ زیادہ سے زیادہ میرٹھ کی پولیس والوں تک ہی محدود ہو گا۔ یہ عورت بہت بڑے پولیس افسر کی بیوی ہے اور مجھ پر کچھ مہربان بھی لگتی ہے کم از کم اس کی باتوں سے اور میرے ساتھ جو اس کا رویہ تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اسی اعتبار سے میں اس کے پاس ایک طرح محفوظ بھی تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر مجھے بیٹھا دیکھ کر کوئی پولیس والا اس سے پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ لدھیانے تک اسی عورت کی گاڑی میں بیٹھ کر جانا چاہئے۔ لیکن میں اب بھی بڑا حیران تھا کہ یہ عورت رات کے وقت اکیلی گھر سے

دور جانے کے لئے کیسے نکل آئی تھی۔ میں نے اس کو مزید ٹٹولنے کی غرض سے کہہ

"میڈم! یہ راستہ بڑا ویران ہے۔ رات کو یہاں ڈاکو وغیرہ بھی آسکتے ہیں"

وہ بولی۔

"تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہر وقت موجود ہوتا ہے"

اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سامنے والا ڈیش بورڈ کھول کر مجھے اندر رکھا ہوا پستول

"اس میں بارہ گولیاں بھری ہوئی ہیں"

وہ اصل میں ریوالر تھا جس کو وہ پستول کہہ رہی تھی۔ اسلحے کی پہچان اسے مجھے زیادہ تھی۔ اس نے گانے کی ٹیپ بند کر دی تھی۔ کہنے لگی۔

"یار مجھے ایک اور سگریٹ لگا کر دو۔"

ں نے اسے دوسرا سگریٹ لگا کر دیا تو کہنے لگی۔

"تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے۔ لدھیانے میں کہاں رہتے ہو۔ شکل صورت سے تو تم مجھے کوئی سٹوڈنٹ لگتے ہو"

ں نے کہا۔

"یس میڈم میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں بی اے کا سٹوڈنٹ ہوں۔ یہ رافائنل ایئر ہے"

ں کالج کا نام میں نے اس لئے دیا تھا کہ گورنمنٹ کالج ہر شہر میں ہوتا ہے۔ گاڑی کے شہر کے درمیان سے گذر گئی تھی۔ اب آگے سہارن پور شہر آنے والا تھا۔ وہ

"تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

ائیونگ میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران مجھے ہیوی وہیکل

کی ڈرائیونگ بھی سکھائی گئی تھی۔ کار تو میں لاہور میں بھی چلا لیا کرتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ میں ڈرائیو کر لیتا ہوں"

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے جا کر روک دی اور جمائی لے کر بولی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ آگے تم گاڑی چلاؤ"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر آگے پولیس کے کسی سپاہی نے روک لیا تو میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ میری گاڑی ہے۔ اس مسئلے کو اس عورت نے خود ہی حل کر دیا۔ اس نے پرس میں سے آئی جی پولیس کا کارڈ نکال کر مجھے دیا اور کہا۔

"اگر راستے میں کوئی پولیس والا روکے تو اسے یہ کارڈ دکھا دینا۔ وہ بھاگ جائے گا"

اب میری تسلی ہو گئی۔ میں گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ میں اس بات پر بڑا حیران ہو رہا تھا کہ مشرقی پنجاب کے سب سے بڑے پولیس آفیسر کی بیوی یوں اکیلی گھر سے نکل پڑ ہے اور اس کے خاوند کو بھی پتہ نہیں ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ آگے پولیس ک اطلاع کر دیتا کہ میری بیوی کی حفاظت کی جائے وہ اپنی مرضی سے یا ناراض ہو کر میرٹھ سے لدھیانے جا رہی ہے۔

یہ عورت سکھ تھی اور اس نے مجھے اپنا نام ہرپال کور ڈھلوں بتایا تھا۔ ڈھلوں اس کے آ جی پولیس خاوند کی ذات تھی۔ اپنی شکل شبہات اور باتوں سے مجھے وہ کچھ دوسری قسم عورت لگتی تھی۔ مگر مجھے اس کے کردار کے کسی بھی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں اس علاقے سے نکل جاؤں۔ اور پولیس کی دسترس باہر جاؤں۔ اس کے لئے قدرت نے مجھے ایک حیرت انگیز موقع فراہم کر دیا تھا یعنی خ پولیس میری حفاظت کر رہی تھی۔ ہرپال کور پچھلی سیٹ پر سو گئی تھی۔ کار جی ٹی روڈ مظفر نگر کو پیچھے چھوڑ آنے کے بعد اب سہارن پور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سڑک ویرا اور اندھیری تھی۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں سے سڑک نظر آتی تھی۔ یہاں سڑک کنارے بجلی کے کھمبے بھی نہیں تھے۔ میں درمیانی رفتار سے گاڑی لے جا رہا تھا۔ اچا

سڑک پر درخت کا بہت بڑا تنا بالکل درمیان میں پڑا نظر آ گیا۔ میں نے وہیں بریک لگا ۔ بریک یکدم لگانے سے ہرپال کور کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پیچھے سے نیند بھری آواز پوچھا۔

"کیا ہوا ہے؟ بریک کیوں لگا دی؟"

میں ابھی اس کو جواب دینے ہی والا تھا کہ اچانک دو آدمی میری کھڑکی کے سامنے ے۔ انہوں نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک نے رائفل کا بٹ زور سے مار کر کھڑکی شہ توڑا اور رائفل کی نالی میری کنپٹی سے لگا کر کہا۔

"جو کچھ مال پانی ہے نکال دو"

ہرپال کور نے جب دیکھا کہ ڈاکو آ گئے ہیں تو گھبرانے کی بجائے اس نے بڑے رعب کہا۔

"میں آئی جی پولیس کرتار سنگھ ڈھلوں کی بیوی ہوں۔ سیدھی طرح جدھر سے آئے ہو ادھر چلے جاؤ نہیں تو ساری عمر جیل میں سڑتے رہو گے"

دوسرے ڈاکو کے پیچھے درخت کے پاس ایک اور ڈاکو بندوق تانے کھڑا تھا۔ اس نے آواز دے کر کہا۔

"ارے اندر عورت بھی ہے۔"

تیسرے ڈاکو نے سنا تو وہیں سے آواز دی۔

"ارے عورت کو نکال کر لے چلتے ہیں"

جس ڈاکو نے میری کنپٹی کے ساتھ رائفل کی نالی لگائی ہوئی تھی اس نے اندر ہاتھ کر کھڑکی کھول دی اور مجھے باہر نکلنے کو کہا۔ میں باہر نکل آیا انہوں نے ہرپال کور کو بھی کر گاڑی سے نکال لیا۔ ہرپال کور ڈاکوؤں کو گالیاں دینے لگی۔ مجھے اتنا پتہ تھا کہ کور کا ریوالور ڈیش بورڈ میں ہے۔ مگر ڈاکوؤں نے مجھے ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ نے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اب صورت حال کا نقشہ ایسا تھا کہ ایک ڈاکو رائفل کی لی گردن سے لگائے میرے پاس کھڑا تھا۔ ایک ڈاکو کار کی تلاشی لے رہا تھا۔ جو ڈاکو

کار کی تلاشی لے رہا تھا اس نے ڈیش بورڈ میں سے ریوالور نکال کر کہا۔

"ارے یہ پستول بھی ہے"

ریوالور انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب ڈاکو ہرپال کور کو اپنے ساتھ لے جا
کے لئے اسے کھینچنے لگے۔ ہرپال کور نے چیخ کر مجھے کہا۔

"تم مرد ہو کہ کیا ہو؟"

ان ڈاکوؤں میں سے کسی کو خبر نہیں تھی کہ ان کی موت ان کے سروں پر منڈلا
لگی ہے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے پاس ایک تربیت یافتہ کمانڈو کھڑا ہے۔
مجھے اس عورت کا ایک عام ڈرائیور سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جو دو ڈاکو ہرپال کور کو پکڑ
ایک طرف کھینچ رہے تھے انہوں نے اپنی بندوقیں یا رائفلیں کاندھوں پر ڈال ر
تھیں۔ وہاں درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس ابھی تک جل رہی تھ
ان کی روشنی کے عکس میں مجھے ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ جس ڈاکو نے رائفل
کی نالی میری گردن کے ساتھ لگائی ہوئی تھی وہ برابر میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ شاید وہ اس
بات کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کے ساتھی عورت کو کھینچ کر سڑک سے کچھ دور لے جائیں
تو وہ مجھے دھکا دے کر خود بھی ان کے پاس چلا جائے۔

لیکن اس دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل
کام نہیں تھا۔ سکھ عورت نے مجھے طعنہ دیا تھا کہ تم مرد ہو کر تماشہ دیکھ رہے ہو، تمہیں
کیا ہو گیا ہے۔ میں اس کے طعنے سے بالکل مشتعل نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ میں اس وقت
تک اپنی حکمت عملی طے کر چکا تھا۔ بس وہ صرف ایک لمحہ ہی تھا۔ جس طرح بجلی چمک
غائب ہو جاتی ہے میں نے اپنے الٹے ہاتھ کو ایک خاص زاویے سے اپنے پہلو میں کھڑ
ڈاکو کی رائفل کی نالی پر زور سے مارا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس کے سا
ہی میں نے ڈاکو کی ناف پر لات ماری۔ وہ ہائے کہہ کر جھکا تو میں نے اس کی گردن ا
بازو کے شکنجے میں لے کر ایک جھٹکا دیا۔ ایک تربیت یافتہ کمانڈو کا ایک جھٹکا ہی کافی ہ
ہے۔ جھٹکا دینے سے پہلے میں نے اس کی گردن کا رخ دوسری طرف کر دیا تھا۔ ڈاکو

ردن کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔ اندھیرے میں دوسرے ڈاکوؤں کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے
اتھی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ کچھ فاصلے پر بھی تھے اور وہاں اندھیرا بھی تھا۔ میں نے
ائفل اٹھالی۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ تین سیکنڈ لگے ہوں گے۔ ڈاکو کی صرف ایک
ہائے نکلی تھی۔ مجھے کچھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس کے منہ سے ہائے کی آواز کیوں
لی۔ کیونکہ کمانڈو ٹریننگ کے مطابق مجھے اس کی ناف کے نیچے ایک ایسے مقام پر لات
ے ضرب لگانی چاہئے تھی کہ جہاں ضرب لگتے ہی آدمی کو اس قدر شدید تکلیف ہوتی ہے
کہ اس کے منہ سے ہائے بھی نہیں نکلتی۔ لیکن ٹریننگ کے بعد یہ میرا پہلا اصلی آپریشن
ھا۔ اس لئے تھوڑی سی غلطی ہو گئی تھی۔ درختوں میں مجھے دونوں ڈاکوں اندھیرے میں
ہی صاف نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ اب میری آنکھیں ایک کمانڈو کی عقابی آنکھیں تھیں۔
ں ڈاکو سکھ عورت کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے اور وہ زمین پر بیٹھی ہوئی شور
ہی تھی۔ میں نے رائفل کی نالی کا رخ ایک ڈاکو کی طرف کیا۔ اس کے سر کو ٹارگٹ
زد میں لیا اور فائر کر دیا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل سے فائر کا دھماکہ ہوا اور ڈاکو
ل کر پیچھے کو گر پڑا۔ میں اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ رائفل کی میگزین میں دو چارجر
سے لوڈ کئے ہوئے تھے۔ میں نے پلک جھپکتے ہی سیفٹی کیچ کو آگے کیا اور دوسرے ڈاکو
سینے کو شست میں لے کر ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے فائر کا دھماکہ ہوا اور تیسرا ڈاکو بھی وہیں
ہو گیا۔ میں نے رائفل وہیں پھینک دی اور دوڑ کر سکھ عورت کو زمین پر سے اٹھایا
ران پریشان ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے فائر کئے تھے؟ میرا پستول تمہیں مل گیا تھا۔"

میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میڈم۔ ریوالور میں نے ڈیش بورڈ سے نکال لیا تھا۔ موقع پاتے
ہی میں نے ان پر فائر کر دیا"

سکھ عورت میری تعریفیں کرنے لگی۔ جس ڈاکو کی لاش کار کے پاس پڑی تھی اور
کی گردن کا منکا میں نے توڑ دیا تھا سکھ عورت کا ریوالور اس کے پاس تھا۔ میں نے

سکھ عورت کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اس کی آنکھ بچا کر ریوالر ڈاکو کی لاش کے قریب سے اٹھالیا۔ میں جلدی سے ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا۔ گاڑی کا انجن بند تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ میں نے لائیٹس بجھا کر انجن سٹارٹ کیا۔ لائیٹیں روشن کیں اور گاڑی کو فسٹ گیئر میں ڈال کر تیزی سے نکال کر آگے لے گیا۔ سکھ عورت کے ابھی تک حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور پولیس کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

"میں ساری پولیس کو ڈس مس کرادوں گی میں واہگورو کی قسم کھاتی ہوں۔ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گی۔ اگر تم بہادری نہ دکھاتے تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبایا اور کہا۔

"کندن جی! میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گی"

میں نے کہا۔

"میڈم یہ تو میرا فرض تھا۔"

وہ دائیں بائیں سر مار رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ تم بڑے جودھا ہو۔ میرا خاوند تو بڈھا کھوسٹ ہے۔ تمہاری جگہ وہ ہوتا تو کچھ بھی نہ کرتا۔ مجھے تمہارے جیسا خاوند چاہئے تھا۔ لدھیانہ آلینے دو۔ میں ساری پولیس گارڈ کو لائن حاضر کرادوں گی۔"

اور وہ مشرقی پنجاب کی پولیس کو گالیاں دینے لگی۔ پھر وہ سگریٹ سلگا کر پینے لگی۔ اس کا ریوالور میں نے ڈیش بورڈ کے اندر رکھنے کی بجائے اس کے اوپر رکھ دیا تھا۔ اس نے ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی عین وقت پر میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اگر ساتھ نہ لاتی یا بھول جاتی تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا"

اس نے ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور حیران ہو کر بولی۔

"کندن جی! اس کا سیفٹی کیچ تو لاک ہے تم نے فائر کیسے کیا تھا؟"

میں نے کہا۔

"میں نے فائر کرنے کے بعد اسے لاک کر دیا تھا۔"

اچھا ہوا کہ اس نے ریوالور کا میگزین چیمبر کھول کر نہیں دیکھا۔ اگر دیکھتی تو اس میں پوری کی پوری بارہ گولیاں موجود تھیں۔ ایک بھی گولی فائر نہیں ہوئی تھی۔ میں خوامخواہ اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے ڈاکوؤں کی رائفل سے انہیں ہلاک کیا ہے اور ایک ڈاکو کی گردن توڑ کر اسے مارا ہے۔ سکھ عورت ہرپال کور نے ریوالور ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ پھر میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"تمہارے لئے سگریٹ لگاؤں"

"جی نہیں شکریہ۔ میں گاڑی چلا رہا ہوں"

"تو پھر میرے سگریٹ کا ایک کش لگالو"

اور اس نے اپنی انگلیاں میرے منہ کے قریب کر دیں۔ میں نے ایک ہلکا سا کش لیا ر کہا۔

"میڈم پلیز! میں سگریٹ نہیں پینا چاہتا"

"کوئی بات نہیں کندن جی! سہارن پور کے بعد میں خود ڈرائیو کروں گی۔

اس کے بعد وہ پھر ڈاکوؤں کو اور پولیس کو گالیاں دینے لگی۔ گاڑی سہارن پور شہر ں داخل ہو گئی تھی۔ ابھی شہر کی پہلی سڑک میں آئے تھے بلکہ شہر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ سڑک کے کنارے کی روشنیوں میں مجھے سڑک کی دونوں جانب پولیس کی چار پانچ گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ پولیس کی پوری گارڈ سڑک کے دونوں جانب اٹن شن کھڑی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ میری مخبری ہو گئی ہے اور سہارن پور کی پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے پوری نفری کے ساتھ آن پہنچی ہے۔ ایک سکھ تھانیدار کی وردی میں سڑک کے درمیان کھڑا ہاتھ کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس دوران ہماری گاڑی سکھ تھانیدار کے قریب پہنچ کر رک گئی تھی۔ سکھ عورت نے بڑی شان سے کہا۔

"یہ سب میری آؤ بھگت کے واسطے آئے ہیں۔ میرے بڈھے خاوند کو پتہ چل گیا ہو گا کہ میں گھر سے اکیلی لدھیانے جا رہی ہوں۔ میں نے نوکر کو بتا دیا تھا۔ بڈھا کھوسٹ میرے ساتھ کبھی کہیں نہیں جاتا۔ میں اکیلی جاتی ہوں تو پولیس کو خبردار کر دیتا ہے۔"

سکھ تھانیدار نے ہرپال کور کی سیٹ والی کھڑکی کے پاس آکر بڑے ادب سے سلیوٹ کیا اور پوچھا۔

"شریمتی جی آپ ہمارے آئی جی صاحب کی پتنی ہیں۔ ہم آپ کا سواگت۔۔۔۔"

ہرپال کور نے تھانیدار کو ڈانٹ کر کہا۔

"راستے میں ہم پر ڈاکو پڑا ہے۔ ڈاکو مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ یہ میرا کزن میرے ساتھ نہ ہوتا اور پستول کے فائر کر کے انہیں ٹھکانے نہ لگاتا تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا"

میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ جملہ ہربار دہراتی تھی کہ اگر ڈاکو مجھے پکڑ کر لے جاتے تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس جملے سے وہ ایک خاص قسم کی لذت حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ سکھ تھانیدار نے اسی وقت حوالدار اور سب انسپکٹر کو بلا کر حکم دیا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے واردات کی ہے۔ فوراً سارے علاقے کو گھیرے میں لے لو۔ پھر اس نے ہرپال کور سے پوچھا۔

"یہ واردات کہاں ہوئی ہے میڈم؟"

"یہاں سے پندرہ بیس میل پیچھے"

تھانیدار نے اسی وقت پولیس کی گارد پیچھے روانہ کر دی اور ہرپال کور سے معافیاں مانگنے لگا کہ یہ ہماری غلطی ہے ہمیں معاف کر دیں۔ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے وہی یہ وارداتیں کر رہا ہے۔ ہم ابھی انہیں پکڑ کر آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ ہرپال کور نے کہا۔

"اب وہاں تمہیں ان کی لاشیں ہی ملیں گیں"

تھانیدار نے ادب سے کہا۔

"میڈم! ہمیں آئی جی صاحب کا فون آگیا تھا لدھیانے آپ کی ماتا جی کے گھر تک ہماری پولیس کا سکواڈ آپ کے ساتھ جائے گا"

ہرپال کور نے کرخت لہجے میں تھانیدار کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اب تمہاری سکواڈ کا کیا فائدہ ہو گا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ جب ڈاکوؤں نے ہمیں پکڑا تھا اس وقت تمہاری پولیس کہاں تھی؟ میں تمہاری ساری پولیس کے کان پکڑوا دوں گی۔ لدھیانے جاتے ہی ڈھلوں صاحب کو فون کرتی ہوں"

تھانیدار گھبرا گیا۔ خوشامدیں کرنے لگا۔ ہرپال نے مجھے کہا۔

"کندن جی! گاڑی چلاؤ"

میں نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

سہارن پور سے نکلنے کے بعد ہماری گاڑی اس طرح جی ٹی روڈ پر جا رہی تھی کہ ے آگے بھی پولیس کی گاڑی تھی اور پیچھے بھی مسلح پولیس گارڈ کی گاڑی آ رہی تھی۔ ا کور میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی مزے سے سگریٹ پی رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم تھک گئے تو میری سیٹ پر آجاؤ میں گاڑی چلاتی ہوں۔ تم بے شک پچھلی سیٹ پر لیٹ کر تھوڑی دیر آرام کر لو"

نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک میں ویسے ہی پولیس کی حراست میں تھا۔ یہ حراست مجھے گرفتار کرنے کے لئے نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے میری حفاظت لئے تھی۔ دوسرے نیند اب میری غلام بن چکی تھی۔ وہ میرے حکم کی منتظر رہتی میں جب اسے حکم دیتا تھا وہ آتی تھی۔ یہ میری کمانڈو ٹریننگ کا کمال تھا اور میرے کمال شاہ کا بھی کمال تھا۔

میں نے کہا۔

"نہیں میڈم! مجھے بالکل نیند نہیں آرہی۔ میں بڑے مزے سے گاڑی چلا رہا ہوں۔"

ہرپال کور نے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"کندن جی! تم مجھے میڈم نہ کہو۔ مجھے ہرپال کہو۔ مجھے اچھا لگے گا"

وہ اپنے بڈھے خاوند کی برائیاں کرنے لگی۔

"مرن جوگا شراب پی پی کر برباد ہوگیا ہے ایک تو ویسے ہی عمر میں مجھ سے تیس سال بڑا ہے۔ جانتے ہو کندن جی! میں اس کی دوسری بیوی ہوں۔ بس میرا گانا سننے آیا کرتا تھا۔ وہیں مجھ پر لٹو ہوگیا۔ اب اس میں ذرا بھی دم نہیں رہا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں ہوتا۔ سرکار میں اس کی بہت چلتی ہے۔ وزیروں منتریوں کو اس نے دوست بنا کر رکھا ہے۔ ان کے ہر جائز ناجائز کام کر دیتا ہے۔ اس لئے ابھی تک ریٹائر نہیں ہوا----"

جب سکھ عورت نے یہ کہا کہ اس کا خاوند اس کا گانا سننے آیا کرتا تھا تو ساری میری سمجھ میں آگئی اور اس عورت کا سارا کردار میرے سامنے واضح ہوگیا۔ اب عورت میرے لئے کوئی معمہ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی اسے ایسا ہی کرنا چاہئے اب صرف مجھے اس سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ کیونکہ میں اس راستے کا مسافر نہیں جس راستے پر وہ مجھے لے جانا چاہتی تھی۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ لدھیانے تک عورت کے ساتھ چلوں کہ انبالہ پہنچ کر گاڑی سے اتر جاؤں اور وہاں سے کوئی ٹرین لوں۔ اگرچہ میں ایک طرح سے پولیس کے ہاتھوں محفوظ تھا پھر بھی خطرہ تھا کہ پنجاب کی پولیس کے پاس میرا حلیہ نہ پہنچ گیا ہو اور میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ کیونکہ اس طرح پولیس کی معیت میں زیادہ دیر تک رہنا مناسب نہیں تھا۔ کسی وقت بھی میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔

جب ہماری گاڑی انبالے پہنچی تو وہاں ہم رک گئے۔ پولیس نے ہماری زبر خاطر مدارت شروع کر دی۔ ہمیں بہترین برتنوں میں چائے پلوائی گئی۔ ساتھ اعلیٰ

بسکٹ بھی تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر ہرپال کور سے کہا۔

"ہرپال جی! میرا خیال ہے میں انبالے ہی اتر جاتا ہوں"

"وہ کیوں؟"

ہرپال کور نے پریشان سا ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا۔

"مجھے یاد آگیا ہے کہ انبالے میں مجھے اپنے ایک دوست کو ایک ضروری پیغام پہنچانا ہے۔ آپ کے ساتھ اب پولیس کی پوری گارد ہے۔ ڈر کی کوئی بات نہیں ہے"

ہم گاڑی میں ہی بیٹھے تھے۔ گاڑی میں اندھیرا سا تھا۔ ہرپال کور نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"کندن جی! تمہیں میری جان کی قسم ہے۔ لدھیانے تک میرے ساتھ چلو۔ پھر بے شک وہاں سے اپنے گھر چلے جانا"

میں انکار نہ کر سکا۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر بھی ڈھلنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر انبالے میں رکنے کے بعد ہم لدھیانے کی طرف چل پڑے۔ لدھیانہ شہر کی آبادی میں ہماری گاڑی پولیس کی گاڑیوں کی حفاظت میں داخل ہوئی تو وہاں سے لدھیانہ پولیس کی ایک ویگن بھی پولیس کے حفاظتی سکواڈ میں آن شامل ہوئی۔ اس وقت ہرپال کور نے خود سٹیرنگ سنبھال لیا تھا اور وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ میں اسے کہہ نہ سکا کہ یہاں گاڑی روکو میں اترنا چاہتا ہوں۔ آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ اگر میں کسی جگہ اتر گیا تو پولیس کا کوئی آدمی میرے پیچھے نہ لگ جائے۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عورت کے گھر تک ہی جانا بہتر ہے۔ وہاں سے میں موقع محل دیکھ کر نکل جاؤں گا اور جالندھر جانے والی کوئی بس لاری یا ٹرین پکڑ لوں گا"

ہماری گاڑی شہر کے فیشن ایبل علاقے میں آگئی تھی۔ یہاں کشادہ باغیچوں والی پرانی ٹائپ کی کوٹھیاں تھیں جن کے برآمدوں میں بلب جل رہے تھے۔ اس وقت تک

ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر صبح کا نور چاروں طرف جھلکنے لگا تھا۔ ہرپال کور گاڑی ایک کوٹھی کے اندر لے گئی اور پورچ میں جا کر کھڑی کر دی۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کندن جی! تم ایک بہادر نوجوان ہی نہیں ہو۔ تم نے میری جان بھی بچائی ہے۔ میں تمہیں اپنی ماتا جی سے ضرور ملاؤں گی"

پولیس کی گاڑی وہاں سے واپس چلی گئی تھیں۔ ہرپال کور نے مجھے ایک سجے ہوئے بڑے ہال کمرے میں بٹھایا اور کسی کو آواز دی۔ ایک نوکرانی دوڑتی ہوئی آنکھیں ملتی آئی اور ہرپال کور کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا۔

"ماتا جی جاگ رہی ہیں۔ سردار جی کا تین چار دفعہ فون آچکا ہے میرٹھ شہر سے"

ہرپال کور نے نوکرانی کو کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آؤ کندن جی! میں تمہیں ماتا جی سے ملاتی ہوں"

میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی ج بیڈ روم میں تھا۔ دیواروں پر شیشے میں جڑی ہوئی سکھوں کے گرو صاحبان کی رنگی تصویریں لگی تھیں۔ صوفہ سیٹ کے ساتھ ڈبل بیڈ پر بوڑھی عورت شیر کی کھال جیسا چ کمبل گھٹنوں تک لئے تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کے بال سفید تھے اور چ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ہرپال کور کی ماتا جی تھیں۔ صرف ایک بات اس بوڑھی خاتو میں مجھے نمایاں اور الگ نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ اس کے بوڑھے ہونٹوں پر پان کی لا جمی ہوئی تھی۔ قریب ہی سنہری پاندان اور بیڈ کے پائے کے پاس اگالدان پڑا تھا۔ ہرپا کور کو دیکھتے ہی وہ عورت غصے میں آگئی۔

"ہرپالو! تو حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈھلوں کا میرٹھ سے کئی بار فون آچکا ہے۔ تو پاگل تو نہیں ہو گئی۔ آخر تجھے رات کے وقت اکیلی سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہرپال کور اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی اور بڑے پیار سے اس کا بوڑھا ہاتھ اپنے ہاتھوں لے کر بولی۔

"ماتا جی! میں اس بڈھے کی گود میں کب تک بیٹھی رہوں۔ نہ مرتا ہے نہ میری جان چھوڑتا ہے"

ماں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

ہرپال کور نے کہا۔

"ماتا جی! کندن ہے۔ لدھیانے کے کالج میں پڑھتا ہے۔ راستے میں میرا دوست بن گیا ہے۔ اس کو لفٹ دے کر لائی ہوں۔ بڑا بہادر جوان ہے"

ہرپال کور نے اپنی ماں کو راستے میں ڈاکہ پڑنے والے واقعے کے بارے میں کچھ نہ ۔اس بوڑھی عورت نے بیزاری سے کہا۔

"اچھا اچھا جاؤ اب میری جان نہ کھاؤ"

ہرپال کور مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس کا کمرہ بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ روں پر انڈین فلم ایکٹرسوں کی بڑے سائز کی نیم عریاں تصویریں لگی تھیں۔ دھیمی سی نی ہو رہی تھی۔ ایک ڈبل بیڈ تھا جس پر ریشمی بستر لگا تھا۔ کھڑکی پر مخمل کا بھاری پردہ ا۔ اوپر ایئر کنڈیشنر لگا تھا۔ پلنگ کے پاس ہی صوفہ سیٹ تھا۔ ایک شیشے کی الماری میں کے گلاس اور چینی کے نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ پلنگ کی دونوں جانب ٹیبل لیمپ ۔ ان میں سے صرف ایک ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ ہرپال کور میرے سامنے دیوار کی منہ کر کے ساڑھی اتارنے لگی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے اس کی ہنسی آواز آئی۔

"کندن جی! بڑے شرماتے ہو۔ اچھا پھر ایسا کرو۔ سامنے والے غسل خانے میں جا کر نہا دھو لو۔ پھر اکٹھے چائے پیئیں گے اور میں تمہیں تمہارے کان پر چھوڑ آؤں گی۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ سامنے دیوار میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا جو بند تھا۔ میں اسے کھول کر اندر چلا گیا۔ سفید ٹائیلوں والا بڑا خوبصورت صاف ستھرا غسل خانہ تھا ضرورت کی ہر شے وہاں موجود تھی۔ نہانے کے لئے ٹب بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے اچھ طرح سے دانت صاف کئے۔ میری تھوڑی تھوڑی شیو بڑھ آئی تھی۔ وہاں مجھے نیا سیفٹی ریزر اور بلیڈ بھی پڑے ہوئے مل گئے۔ خدا جانے ہرپال کور نے یہ سیفٹی ریزر اور بل کس لئے رکھے تھے۔ کیونکہ اس کا خاوند سکھ تھا اور سکھ شیو وغیرہ نہیں بناتے۔ میں جلدی جلدی شیو بنائی۔ پھر ٹب میں فوارے کے نیچے بیٹھ کر نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ م جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس کے بعد کپڑے پہن کر بالوں میں کنگھی کی۔ اور باہر نکل آیا۔

ہرپال کور بیڈ روم میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسا موقع ہے یہاں سے فرار جانا چاہئے۔ میں نے دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے پرد کر کھڑکی کھولنی چاہی۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ پردہ پھر سے گرا کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹیبل پر ہرپال کور کے سگریٹوں کا پیکٹ پرس اور لائیٹر پڑا تھا۔ اتنے میں ہرپال کور درو کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ باریک ریشمی جارجٹ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کے بال کھلے تھے جن میں وہ ایک ہاتھ سے کنگھی کر تھی۔ اس کے آتے ہی کمرے میں بڑے اعلیٰ کوالٹی کے پرفیوم کی خوشبو پھیل گئی۔ دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

"تم بڑے اچھے لگتے ہو مجھے کندن جی۔"

وہ صوفے پر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کنگھی میز پر پھینک کر بالوں کا پیچھے بناتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تمہیں ابھی اپنے گھر نہیں جانے دوں گی اس کو بھی اپنا گھر ہی سمجھو۔"

میں نے ذرا پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہرپال جی! مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے میری ماتا جی بھی میرا انتظار کر

رہی ہوں گی۔"

وہ میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ بولی۔

"چھوڑو یار۔ ناشتہ کر کے چلے جانا۔ میرا ڈرائیور تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔ اپنی ماتا جی کو یہاں سے ٹیلی فون کر دو۔ بس۔ اور کیا چاہئے تمہیں"

میں نے کہا۔

"ہمارے گھر میں فون نہیں ہے"

وہ ہنس کر بولی۔

"میں پولیس افسر کی بیوی ہوں۔ تم نے میری شان دیکھ لی ہے۔ تم چلے گئے تو میں پولیس بھیج کر تمہیں گھر سے بلوا لوں گی پھر کیا کرو گے؟"

میں نے دل میں سوچا کہ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مجھے لومڑی عیاری سے کام لینا ہو گا۔ لومڑی میرے لئے کوئی انوکھا جانور نہیں تھا۔ کمانڈو ٹریننگ دوران مجھے لومڑی بھی بنایا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ مجھے اس کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی کہ اس قسم کے حالات پیش آجائیں تو کس طرح لومڑی کی مکاری اور عیاری سے کام تا ہے۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہرپال جی! میں ابھی گھر نہیں جاتا۔"

ہرپال کور نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے موڈ بدلنے کے لئے فوراً کہا۔

"مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے"

جلدی سے الگ ہو کر اس نے زور سے آواز دی۔ نوکرانی دروازہ کھول کر اندر ہرپال نے کہا۔

"ناشتہ ابھی تک کیوں نہیں لگایا؟"

نوکرانی نے کہا۔

"میڈم جی لگا دیا ہے۔ میں یہی کہنے آئی تھی"

دوسرے کمرے میں جا کر ہم دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ ناشتہ خالص ہندو سکھوں کا
تھا۔ یعنی حلوہ پوڑیاں کچوریاں اور دہی وغیرہ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مجھے واپس اپنے بیڈ
روم میں لے آئی۔ یہاں بیڈ کی ایک جانب سیاہ رنگ کا ٹیلی فون بھی پڑا تھا۔ ٹیلی فون کی
گھنٹی بجی۔ ہرپال کور ساڑھی درست کرتی ہوئی اٹھی اور ٹیلی فون اٹھا کر بولی۔

"ہیلو"

دوسری طرف سے اس کا سکھ خاوند بول رہا تھا۔ اس کا پتہ مجھے ہرپال کی گفتگو سے
ہو گیا۔ وہ بڑے درشت لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی اور اس طرح جھڑک رہی تھی
جس طرح نوکروں کو جھڑکا جاتا ہے۔ صاف پتا لگ رہا تھا کہ اس کا خاوند اپنی بیوی سے بے
حد ڈرتا ہے اور اسے اپنے پاس رکھنے پر مجبور ہے۔ ہرپال کور نے یہ کہہ کر فون بند کر
دیا۔

"اب مجھے فون نہ کرنا۔ میں ساری رات کی جاگی ہوئی ہوں اب سونے جا
رہی ہوں"

پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"تم سمجھ گئے ہو گے۔ یہ میرے بڈھے خاوند ڈھلوں کا فون تھا۔ میرٹھ
میں بیٹھا شراب پی رہا ہے۔ میں اسے شراب کے نشے میں مدہوش چھوڑ کر آئی
تھی۔"

پھر اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم شراب پیتے ہو کندن جی؟ ضرور پیتے ہو گے۔ انڈیا میں تو سبھی پیتے
ہیں"

میں نے کہا۔

"نہیں ہرپال جی! میں شراب نہیں پیا کرتا"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"چلو نہ پینا۔ میں کبھی کبھی تھوڑی سی پی لیا کرتی ہوں۔ مگر شام کو پیتی

ہوں تم میرے پاس رہو گے تو میں تمہارے سامنے پیئوں گی"

اس دوران میرے دماغ میں ایک اور سکیم بالکل مکمل ہو کر تیار ہو چکی تھی۔ میں
ں عورت کی خاص طور پر پولیس میں جو حیثیت تھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جموں
بنا چاہتا تھا۔ کیونکہ لدھیانہ سے جالندھر اور جالندھر سے جموں تک اکیلا جانے میں مجھے
ستے میں کئی خطرات پیش آسکتے تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں خالصتان کی
یک کا بڑا زور تھا اور سکیورٹی اتنی سخت تھی کہ میرے ساتھ کچھ بھی پیش آسکتا تھا۔ جبکہ
عورت مشرقی پنجاب کے آئی جی پولیس کی بیوی تھی اور اس کا اثر ورسوخ میں دیکھ چکا
۔ میں نے اس کے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک سکیم تیار کر لی تھی۔
نچہ اس سکیم پر عمل کرتے ہوئے میں نے ہرپال کور سے کہا۔

"ہرپال جی! میرا من آپ سے الگ ہونے کو بالکل نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے
اپنی ماتا جی کا بھی خیال لگا ہوا ہے۔ انہیں میں نے میرٹھ سے چلتے ہوئے فون کر
دیا تھا کہ میں لدھیانے صبح کے وقت پہنچ جاؤں گا۔ اب وہ میری راہ دیکھ رہی
ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ گھر جا کر انہیں بتا دوں کہ میں آگیا ہوں اور پھر کوئی
بہانہ بنا کر وہاں سے نکل کر آپ کے پاس آجاؤں گا۔"

ہرپال کور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میرا ڈرائیور تمہیں گاڑی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ تم اسی گاڑی
میں واپس آجانا"

"میں یہی چاہتا تھا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

وہ مجھے لے کر کوٹھی کی لابی میں آگئی۔ یہاں پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی جس
دی پوش سکھ ڈرائیور کپڑے سے صاف کر کے چمکا رہا تھا۔

ہرپال کور نے ڈرائیور سے کہا۔

"منگل سنگھ! کندن جی کو شہر لے جاؤ۔ انہیں وہاں ایک کام ہے۔ اس
گاڑی میں واپس لے آنا"

منگل سنگھ ڈرائیور نے سلام کر کے کہا۔

"اچھا بی جی"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی کوٹھی کے پورچ سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"مہاراج کدھر کو جانا ہے"

میں نے اپنی سکیم پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"گورنمنٹ کالج کی طرف چلو"

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کہاں پر ہے۔ ڈرائیور نے اچھا جی کہا اور گاڑی کو آگے سے موڑ کر دوسری سڑک پر لے آیا۔ لدھیانہ شہر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ یہ شہر مجھے عام شہروں کی طرح لگا۔ پرانے مکانوں والے کہیں کھلے اور کہیں گھٹے گھٹے بازار تھے۔ سڑکوں پر ہر قسم کی سواری چل رہی تھی۔ سکھ کرپانیں لٹکائے آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ شلوار قمیض اور ساڑھی والی عورتیں بھی آ جا رہی تھیں۔ گاڑی مختلف بازاروں سے گھومتی ہوئی ایک عمارت کے گیٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ عمارت کے اوپر گورنمنٹ کالج لدھیانہ انگریزی اور ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں تھوڑی دیر ٹھہرو میں کواٹروں میں اپنی ماتا جی سے بات کر کے ابھی
آتا ہوں"

سکھ ڈرائیور کو میں نے اس لئے اپنی فرضی ماتا جی سے ملنے کا کہہ دیا تھا کہ وہ کسی شک شبہے میں نہ پڑے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی آئی جی پولیس ڈھلوں صاحب کی اس طوائف زادی بیوی کے کردار سے بخوبی واقف تھا۔ اور ہرپال کور ایک طوائف ہونے کے ناطے اپنی مرضی کے لوگوں سے اکثر ملتی جلتی رہتی تھی۔ اس کا خاوند کسی مجبوری کی وجہ سے اپنی طوائف بیوی کے آگے بے بس تھا۔ ہرپال کور ہی نے مجھ

ھی بتایا کہ یہ کوٹھی اس کے خاوند نے اس کے اور اس کی ماتا جی کے لئے خاص طور پر
ائے پر لے کر دے رکھی ہے تا کہ اس کی ماتا طوائفوں کے بازار والے اپنے کوٹھے میں
رہے۔ کیونکہ ہرپال کور اپنی ماتا جی سے ملنے طوائفوں کے بازار میں بے دھڑک چلی جایا
تی تھی۔ ہرپال کور کے خاوند کا کوئی رشتے دار اس کو نہیں ملتا تھا۔ ڈھلوں صاحب کی
کوٹھی جالندھر میں تھی جہاں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا مگر وہ اکثر میرٹھ میں دیکھے جاتے
، جہاں بقول ہرپال کور ڈھلوں صاحب نے کسی طوائف سے دوستی کر رکھی تھی۔
حال میں اس عورت کے سارے حالات اور بیک گراؤنڈ کو پوری طرح سمجھ گیا تھا۔
رت زبردست طبیعت کی مالک تھی اور اس کا خاوند کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے
گے بھیگی بلی بن چکا تھا۔ انہی حالات کی روشنی میں میں نے اس عورت کے ذریعے جموں
نے کی سکیم بنائی تھی۔ کالج کھلنے کا ٹائم ہو چکا تھا۔ کالج میں ہندو سکھ لڑکے کتابیں ہاتھوں
لئے ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ گراؤنڈ میں کچھ لڑکے کرکٹ بھی کھیل رہے تھے۔
کالج میں داخل ہو کر گراؤنڈ کی دوسری طرح درختوں میں جا کر تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر
اور کالج کے گیٹ پر آ کر ڈرائیور سے کہا۔

"چلو واپس چلو"

جب میں واپس آیا تو ہرپال کور بڑی بنی سنوری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

ماتا جی سے کہہ آئے ہو ناں کہ تم کل گھر واپس آؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"وہ ایسا ہوا ہے ہرپال جی کہ ماتا جی اور پتا جی جموں چلے گئے ہیں۔ وہاں میری بڑی بہن جی رہتی ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ گھر میں صرف نوکر ہی تھا۔ ماتا جی انہیں کہہ گئی تھیں کہ کندن آئے تو اسے کہنا کہ وہ بھی کالج سے چھٹی لے کر جموں پہنچ جائے اب مجھے جموں جانا پڑے گا"

ہرپال کور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی اور ایک خاص انداز سے
طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جموں جانا کونسی مشکل بات ہے۔ میرا ڈرائیور تمہیں خود جموں چھوڑ آئے گا۔ مگر تم آج کا سارا دن اور ساری رات میرے پاس رہو گے صبح صبح تمہیں میرا ڈرائیور لے جائے گا۔ جموں زیادہ دور نہیں ہے۔ دوپہر تک تم وہاں پہنچ جاؤ گے"

میری سکیم کامیاب ہو رہی تھی۔ مگر اس عورت کے ساتھ سارا دن اور ساری رات رہنا میرے لئے ایک کڑا امتحان تھا۔ ایک جوان پاکباز مرد کے لئے اس سے زیادہ سخت امتحان اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے اس امتحان میں سرخ رو ہونے کا فیصلہ کرلیا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔

"اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو ٹھیک ہے میں آپ کے پاس ٹھہر جاتا ہوں"

وہ سارا دن اور ساری رات میں نے اس مردمار قسم کی طوائف زادی کے پاس کس قسم کے امتحان میں پڑ کر گذاری یہ ایک الگ کہانی ہے جس کو میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال ایک کمرے میں بند رہ کر دن بھی گذر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ جب پچھلی رات کے چار بجے تو میں نے ہرپال کور کو جگا کر کہا۔

"ہرپال جی میرا جموں جانے کا وقت ہو گیا ہے"

ہرپال کور جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اس معاملے میں وہ بڑی ذمے دار اور اپنے قول کی سچی عورت تھی۔ اس نے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہوا ہے۔ وہ گاڑی میں ہی سویا ہوا ہو گا۔ اسے جگا دینا۔ وہ تمہیں جموں لے جائے گا۔ مگر ذرا ٹھہرو"

وہ پلنگ پر سے اٹھ کر الماری کی طرف گئی۔ الماری میں سے اس نے مجھے انڈین کرنسی کے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے اور کہا

"یہ اپنے پاس رکھنا۔ ان میں سے اپنی بیمار دیدی کے لئے پھل فروٹ

بھی خرید کر لے جانا۔"

میں روپے نہیں لے رہا تھا مگر ہرپال کور نے زبردستی نوٹ میری گل خان والی نائیلون کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیئے اور میرا ماتھا چوم کر کہنے لگی۔

"کندن جی! مجھے تم سے سچ مچ پریم ہو گیا ہے جلدی لدھیانہ واپس آجانا۔ واپس آکر سیدھا میرے پاس آنا۔"

میں جانے لگا تو اس نے مجھے روک کر کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔"

اس نے الماری کا نچلا دراز کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا ڈبا نکالا۔ ڈبے میں سے ریلوے کے ٹکٹ کے برابر ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا وزٹنگ کارڈ ہوتا ہے۔ مگر اس پر کسی کا نام پتہ وغیرہ بالکل نہیں لکھا تھا۔ ہرپال کور نے کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کارڈ اپنے پاس رکھنا۔ راستے میں کوئی پولیس والا اگر پوچھے تو اسے یہ کارڈ دکھا دینا۔ اول تو میری گاڑی دیکھ کر پولیس تمہیں کہیں بھی نہیں روکے گی۔ لیکن تم جانتے ہو کہ آج کل خالصتان کی موومنٹ چل رہی ہے۔ ہو سکتا پولیس تمہیں روک کر چیکنگ وغیرہ کرے۔"

میں نے کارڈ کو غور سے دیکھا۔ اس پر انگریزی حروف میں صرف LOOT3 لکھا تھا۔ یعنی ایل زیرو زیرو ٹی تھری۔ میں نے ہرپال کور نے یونہی پوچھا کہ یہ کس کا نمبر ہے؟ وہ بولی۔

"تمہیں اس سے کیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ جادو کا نمبر ہے۔ پولیس کا بڑے سے بڑا افسر اور چھوٹے سے چھوٹا ملازم بھی اس نمبر کی اصلیت کو جانتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جائے گا"

اس نے میرا منہ چوما اور کہا۔

"میرے پریتم اب دیر نہ لگانا جموں سے لدھیانہ آکر سیدھے میرے پاس

آتا۔"

میں نے ہندوؤں کی طرح ہرپال کور کو پرنام کیا اور بیڈ روم سے نکل گیا۔ اکتوبر کے شروع میں چار بجے ابھی رات کا ہلکا اندھیرا چھایا ہوتا ہے۔ میں کوٹھی کے پورچ میں آیا تو وہاں گاڑی کھڑی تھی اور اندر ڈرائیور منگل سنگھ سویا ہوا تھا۔ میں نے اسے جگایا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بے چارہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

"سردار جی! جموں جانے کے لئے تیار ہو ناں؟"

منگل سنگھ گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے مجھے سلیوٹ مار کر کہا۔

"مہاراج بالکل تیار ہیں جی۔ بیٹھو گاڑی میں"

میں جان بوجھ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی پورچ سے نکل کر لدھیانے کی سنسان نیم اندھیری سڑکوں پر نکل آئی۔

کار جی ٹی روڈ پر جالندھر کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

سڑک پر رات کو چلنے والے ٹرکوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ میں کار کی پچھلی نشست پر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اب مجھے اس بات کی ذرا بھی پریشانی نہیں تھی کہ پولیس مجھے پکڑے گی۔ میرے پاس ہرپال کور کا دیا ہوا کارڈ موجود تھا جس پر خفیہ پولیس کا کوئی کوڈ نمبر درج تھا۔ یہ کارڈ آگے بھی میرے بڑے کام آسکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی جیکٹ کی اندر والی جیب میں سنبھال کر اسپرو ٹیبلٹ بم کی گولیوں والے پلاسٹک کے لفافے کے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ جیسے جیسے کار آگے بڑھ رہی تھی دن کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ جالندھر کی آبادی شروع ہوئی تو دن نکل آیا تھا۔ یہاں ایک جگہ پولیس کے کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھ دے کر کار کو روک لیا۔ یہ سپاہی سکھ تھے۔ وہ ڈرائیور کے پاس آئے اور پوچھا کہ کہاں سے آ رہے ہو۔ کہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے کہا۔

"مہاراج یہ آئی جی صاحب کے سمدھی ہیں۔ انہیں جموں لے جا رہا ہوں"

اصل میں ہرپال کور کی کار پولیس کی کار نہیں تھی اور اس کی نمبر پلیٹ بھی پولیس کی نہیں تھی۔ یہ اس زمانے کی بڑی قیمتی ٹیوٹا گاڑی تھی جو اس کے خاوند ڈھلوں صاحب نے خاص طور پر باہر سے منگوا کر اپنی چہیتی بیوی کو دی تھی۔ سکھ کانسٹیبل نے ڈرائیور سے کہا۔

"مہاراج آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہم بھی ڈیوٹی سے مجبور ہیں۔ اپنا لائسنس دکھاؤ"

ڈرائیور منگل سنگھ نے لائسنس دکھایا۔ لائسنس پر کہیں یہ نہیں لکھا تھا کہ یہ مشرقی پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس کا ڈرائیور ہے۔ کانسٹیبل نے لائسنس واپس ڈرائیور کو دیتے ہوئے اپنے ساتھی کانسٹیبل کو بلا لیا اور کہا۔

"یہ کہتا ہے میں آئی جی صاحب کے سدھی کو جموں لے جا رہا ہوں؟"

دوسرا کانسٹیبل میری کھڑکی کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ پوچھا۔

"مہاراج آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے بڑے اطمینان سے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے کہا۔

"منگل سنگھ ڈرائیور نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں جموں جا رہا ہوں"

کانسٹیبل بولا۔

مہاراج جموں میں حالات گڑ بڑ ہیں۔ ہماری ڈیوٹی لگی ہے کہ کسی گاڑی کو چیکنگ کے بغیر جموں سائیڈ کی طرف نہ جانے دیا جائے۔ آپ کو ہمارے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا"

میں نے جیب سے ہرپال کور کا دیا ہوا کارڈ نکال کر کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ کارڈ دیکھ لو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں اور یہ گاڑی کس کی ہے؟"

کارڈ کو کانسٹیبل نے ہاتھ میں لے کر دیکھا تو فوراً سیدھا ہو گیا۔ اس نے اسی وقت کارڈ مجھے واپس کر دیا اور سلام کر کے بولا۔

"شما کر دینا مہاراج۔ ہم مجبور ہیں۔ ہماری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔"

میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"چلو بھئی آگے چلو"

خفیہ کوڈ والے کارڈ نے اپنی کرامت دکھا دی تھی۔ یہ اس کارڈ کا ٹیسٹ تھا جو میری ع سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ کام مشکل حالات میں ے بڑے کام آسکتا تھا۔ یہ تو ایک طرح سے الہ دین کا چراغ میرے ہاتھ آگیا تھا۔ ہو ا ہے اس کا کوئی توڑ بھی ہو جو کہ ضرور ہو گا لیکن ابھی تک مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ ں تک تو یہی ہوا تھا کہ کارڈ کا خفیہ کوڈ نمبر پڑھتے ہی کانسٹیبل نے سلیوٹ مار دیا تھا۔ ایسا ن ہو سکتا تھا کہ یہ کارڈ اگر میں کسی پولیس کے اعلیٰ افسر کو دکھاتا تو مجھ سے پوچھ گچھ تا اور پوچھتا کہ یہ کارڈ میں نے کہاں سے لیا ہے اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے وہ ی دوسرا کوڈ ورڈ بھی مجھ سے پوچھتا۔ لیکن ابھی وہ مقام نہیں آیا تھا اور کم از کم جموں ں میرا راستہ صاف تھا۔

گاڑی جالندھر سے ہوشیار پور کی طرف ہوگئی۔ ہوشیار پور پہنچ کر ہم نے ناشتہ کیا۔ ئے پی۔ میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ ڈرائیور ہوٹل میں سے سب کچھ میرے لئے لے یا تھا۔ یہاں جالندھر لدھیانہ کے مقابلہ میں دن کے وقت گرمی بالکل نہیں تھی۔ آگے ں کا پہاڑی علاقہ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات مجھے سکھ ڈرائیور نے بتائی تو میں نے

"ہاں سردار جی میں جانتا ہوں۔ کئی بار جموں آچکا ہوں"

حالانکہ یہ سارا علاقہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہوشیار پور سے چلے تو اونچے نیچے ے بھرے ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی وادیوں کا علاقہ شروع ہو گیا۔ ہوا تازہ اور خنک ہوتی ی۔ جموں کے قریب کچھ خشک پہاڑیاں آئیں۔ میدانی علاقہ بھی آیا جہاں دھوپ میں ڑی حدت تھی۔ آگے جا کر چڑھائی شروع ہوئی تو موسم مزید خوشگوار ہو گیا۔ ہماری کار ا شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو یہاں سڑک پر باقاعدہ رکاوٹ کھڑی کی ہوئی تھی۔ ہاں ٹرک وغیرہ ایک طرف قطار میں کھڑے تھے اور پولیس ان کی چیکنگ کر کے انہیں ے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ وہ دن کے تین بجے کا وقت ہو گا۔ میں گاڑی سے

نکل کر سڑک کے کنارے ٹہلنے لگا۔ سیکریٹ پولیس کے خفیہ کوڈ نمبر والا کارڈ میری جیب
میں تھا مجھے کسی کا ڈر خوف نہیں تھا۔ میں نے یونہی وقت کاٹنے کے لئے سگریٹ بھی سلگا
لیا۔ میں اگر چاہتا تو ڈرائیور کو اپنا سیکریٹ کارڈ دے کر آگے بھجوا سکتا تھا تاکہ پولیس ہمیں
جانے کی اجازت دے دے مگر مجھے اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنے
ذہن میں اس آدمی کا نام پتہ اور حلیہ اور وہ کوڈ الفاظ یاد کر کے دہرا رہا تھا جس سے ملنے
کے لئے مجھے دلی والے گل خان نے ہدایت کی تھی۔ مجھے اس شخص کا نام حلیہ اور پتہ اور
اس کے آگے بولے جانے والے کوڈ الفاظ بالکل نہیں بھولے تھے۔ یہ سب کچھ میں
راستے میں بھی یاد کرتا رہا تھا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور ٹرک گاڑیاں اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی رہیں تو میں کار میں
آکر بیٹھ گیا اور میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"گاڑی کو نکال کر آگے لے چلو۔ میں پولیس سے خود بات کرتا ہوں"

بے چارا ڈرائیور بھی بیٹھے بیٹھے تنگ آگیا تھا۔ اس نے فوراً انجن سٹارٹ کیا اور
گاڑی کو سڑک کی ایک طرف سے نکال کر وہاں لے گیا جہاں سڑک پر پولیس نے رکاوٹ
کھڑی کر رکھی تھی۔ ہماری کار کو آتے دیکھ کر دو تین پولیس کانسٹیبل ڈنڈے لے کر آگے
آگئے اور کار کو رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ گاڑی رکی تو کانسٹیبل نے کہا۔

"قطار میں لے جاؤ گاڑی کو قطار میں لے جاؤ پیچھے لے جاؤ۔۔"

میں نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر کانسٹیبل سے کہا۔

"اپنے کسی افسر کو بلاؤ۔ جلدی کرو۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے"

ہمارے پاس نئی کار دیکھ کر پولیس والے ویسے ہی ذرا ٹھٹک سے جاتے ہیں۔ جب
میں نے اسے اپنے پولیس افسر کو بلانے کے لئے کہا تو وہ جلدی سے سڑک کے کنارے
بنے ہوئے کھوکھے کے اندر چلا گیا۔ کوئی پولیس افسر اندر بیٹھا تھا۔ اس نے کوئی پرواہ نہ
اور اپنی انا کو مجروح نہ ہونے دیا۔ دو تین منٹ لگا کر باہر نکلا اور بڑی شان بے نیازی سے
چلتا ہوا میرے قریب آکر پوچھا۔

"کیوں جی! کیا بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے سب لوگ قطار میں کھڑے
ہیں۔ آپ کو بھی قطار میں کھڑے ہو کر آنا چاہئے"

میں نے بڑے آرام سے جیب میں سے سیکریٹ پولیس کا کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔
کارڈ میں نے اس کو نہ دیا بلکہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھا۔ کارڈ کو اس نے جھک کر دیکھا اور
را پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

"سوری سر! ویری سوری!"

اس نے دوڑ کر پولیس کانسٹیبل کو رکاوٹ ہٹانے کا اشارہ کیا۔ رکاوٹ ہٹ گئی اور
اری کار جموں شہر میں داخل ہو گئی۔ گاڑی جب ایک پرانے مندر کے قریب سے گذری
ڈرائیور نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ سر آپ کو کس محلے میں جانا ہے۔ میں کیا بتاتا۔ یہ شہر
میں پہلی بار دیکھ رہا تھا جس خاص آدمی سے میں ملنے جا رہا تھا۔ اس کے محلے کا نام میں
نا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

تم ایسا کرو کمپنی باغ چلو۔ وہاں سے ہمارا گھر قریب ہی ہے۔ میں وہاں اتر
جاؤں گا تم واپس چلے جانا"

گل خان نے کہا تھا کہ اس خاص آدمی کا مکان کمپنی باغ کی ایک قریبی بستی میں ہے۔
ں بستی کا نام میں یہاں نہیں لکھوں گا۔ اگر نام لکھ بھی دوں کوئی فرق نہیں پڑے گا
یونکہ وہ مجاہد اب اس بستی سے چلا گیا ہوا ہے۔ پھر بھی بطور احتیاط میں بستی کا نام نہیں
ھ رہا جموں کا کمپنی باغ ایک نہر کے کنارے پرانے ریلوے سٹیشن کے قریب ہی واقع
ہے۔ اس کی ایک جانب دریائے توی گذرتا ہے۔ یہاں تقسیم ملک کے بعد دو تین نئی
بادیاں پڑ گئی ہیں جن میں سے شاستری نگر اور گاندھی نگر بڑی مشہور ہیں۔ جموں میں
رسم دن کے وقت اتنا ٹھنڈا نہیں تھا۔ سائے میں خنکی ضرور تھی۔ شہر کے مکانوں کی
دٹ پہاڑی علاقوں جیسی تھی۔ سب مکانوں اور کوٹھیوں کی چھتیں ڈھلوان تھیں۔ کمپنی
غ کے راستے میں کئی مندر آئے۔ صرف ایک مسجد کے مینار دور سے دکھائی دیئے تھے۔
رائیور نے ایک باغ کے گیٹ کے پاس ایک طرف کر کے گاڑی روک دی اور کہا۔

"لیجئے مہاراج آپ کا کمپنی باغ آ گیا"

میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"اب تم گاڑی واپس لے جاؤ اور شریمتی جی کو میرا پرنام کہنا"

"اچھا مہاراج!"

ڈرائیور ہرپال کور کی گاڑی لے کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔

میں کمپنی باغ کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ گل خان نے جیسے جیسے مجھے بتایا تھا ویسے ویسے چلتا میں اس خاص آبادی میں آ گیا جہاں ہمارا اپنا آدمی جس کا فرضی نام میں صادق رکھ لیتا ہوں رہتا تھا۔ وہ مجھے اپنی دکان پر ہی مل گیا۔ اس کی دکان کس چیز کی تھی اور کہاں تھی؟ یہ میں ظاہر نہیں کروں گا۔ آپ کو ان باتوں سے دلچسپی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے اس کی دکان پر جا کر اسے سلام کیا۔ اور گل خان کا ایک خفیہ نام لے کہا کہ مجھے اس نے بھیجا ہے۔

صادق دکان میں بیٹھا کسی چیز کی مرمت کر رہا تھا۔ اگر میں نے اس چیز کا نام لکھ دیا تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کی دکان میں کیا کام ہوتا تھا۔ صادق نے میری طرف صرف اس وقت دیکھا جب میں نے اسے سلام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ جب میں نے گل خان کا خفیہ نام لیا تب بھی اس نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں چپ چاپ بیٹھ رہا۔ صادق نے نوکر سے کہا۔

"چائے لے آؤ"

چائے آ گئی۔ صادق نے کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے چائے پیالیوں میں ڈالی۔ ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ اب اس نے خاص کوڈ الفاظ میں ایک جملہ بولا۔ اس کے جواب میں میں نے وہی جملہ بول دیا جو گل خان نے مجھے یاد کرا دیا تھا۔ صادق نے خفیہ کوڈ کا دوسرا جملہ بولا۔ میں نے بھی کوڈ والا دوسرا جملہ بول دیا۔ تب صادق خاموش ہو گیا۔ وہ چائے پیتے ہوئے دکان کے باہر بازار میں سے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ دکان میں ایک گاہک موجود تھا جس کو صادق کا نوکر کچھ چیزیں دکھا رہا تھا۔ جب گاہک چلا گیا تو صادق۔

ے کہا۔

"رامو! بھاگ کر سگریٹ لے آ"

یہ نوکر ہندو ڈوگرہ تھا۔ وہ دکان سے نکل گیا تو صادق نے چائے پیتے ہوئے میری دیکھے بغیر مجھ سے پوچھا۔

"پہلے کبھی جموں کشمیر آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ پہلی بار یہاں آیا ہوں"

وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ اس کی نگاہیں بازار پر لگی تھیں۔ پھر اس نے پیالی میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو بازار ہے اس کی بائیں جانب چلتے جانا۔ پہلے ایک گلی آئے گی۔ وہ گلی چھوڑ دینا اس کے بعد ایک اور گلی آئے گی جس کے باہر کمیٹی کا نلکہ لگا ہوا ہے۔ اس گلی میں داخل ہو جانا۔ وہاں تمہیں گودام نظر آئیں گے۔ آخر میں ایک گودام آئے گا۔ اس کے دروازے پر تالا لگا ہوگا۔ میں تمہیں چابی دیتا ہوں۔ تالہ کھول کر گودام میں میرا انتظار کرو۔ اندر سے دروازے کو چٹخنی لگا دینا۔ میں آ کر آواز دوں گا اور پوچھوں گا پرتاپ سنگھ دفتر سے آ گئے ہیں۔ پھر تم دروازہ کھول دینا"

صادق نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے مجھے تالے کی چابی نکال کر دی اور

"چلے جاؤ"

میں اٹھ کر بازار میں آ گیا اور بائیں طرف چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک گلی آئی میں نے وہ گلی چھوڑ دی۔ دوسری گلی آئی جس کے باہر کمیٹی کا نلکہ لگا تھا تو میں اس گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کی دونوں جانب گوداموں کے دروازے تھے جو بند تھے۔ یہاں کوئی مکان بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخری گودام کا تالا کھول کر میں اندر چلا آیا اور

دروازے کو بند کرکے چٹخنی لگا دی۔ اب میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ ایک لمبا سا کمرا تھا
جس میں بہت سارا سامان پڑا تھا۔ لکڑی کے کھوکھے اور بکس بھی پڑے تھے۔ گلی والی
دیوار کے روشندان میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ایک دھیمی روشنی والا بلب
چھت کے ساتھ لٹکا جل رہا تھا۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھی پڑا تھا۔ میں ایک سٹول پر بیٹھ کر
صادق کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد باہر سے کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور
پوچھا۔

”پرتاپ سنگھ دفتر سے آ گئے ہیں؟“

میں نے چٹخنی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ صادق اندر آ گیا۔ اندر آتے ساتھ ہی اس
نے دروازہ بند کرکے چٹخنی لگا دی اور مجھے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ گودام کے
کونے میں بھی ایک چھوٹا سا دروزہ تھا۔ صادق نے اسے کھولا۔ اندر ایک کوٹھری تھی
اس کی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ صادق نے بٹن دبایا۔ چھت سے لگا بلب روشن ہو گیا
یہاں ایک چارپائی اور تین پرانی کرسیاں پڑی تھیں۔ صادق نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا
خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

”تم پنجابی مسلمان لگتے ہو۔ پاکستان کے کس شہر سے آئے ہو“

”میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ وہ مسکرایا

”ماشاءاللہ!“

پھر کہنے لگا۔

”کمال شاہ صاحب نے تمہیں کتنے مہینے کمانڈو ٹریننگ دی ہے؟“

”چھ مہینے“

”اس کا مطلب ہے تم فل کمانڈو بن چکے ہو۔ ورنہ کمال شاہ زیادہ سے
زیادہ تین مہینے ٹریننگ دیتے ہیں۔“

میں نے اسے بتایا کہ مجھے گل خان نے بھی ہائی ایکسپلوزیز کی ٹریننگ دی ہے۔ صا

مجھ سے پوچھا۔

”گل خان نے تمہیں ٹیبلٹ بم دیئے ہیں؟“

میں نے جیب سے اسپرو ٹیبلٹ بم کی ٹکیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں اور وہ
ولا بھی اسے دکھایا جس پر دار چینی‘ الائچی‘ کالی مرچ وغیرہ کے نام اور مقدار لکھی تھی
اہر کسی پکوان کا نسخہ لگتا تھا مگر یہ سارے الفاظ کوڈ ورڈ تھے اور ان کو کھولنے یعنی ڈی
ر کرنے سے ٹیبلٹ بم خود تیار کرنے کا فارمولا ظاہر ہو جاتا تھا۔ گل خان نے مجھے وہ
ہ بھی بتا دیا تھا جس کی مدد سے میں الائچی دار چینی اور کالی مرچ کے الفاظ اور حروف کو
ل کر فارمولے میں تبدیل کر سکتا تھا۔

گل خان نے اسپرو ٹیبلٹ بم کا فیتہ مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ سردرد والی اسپرو کی ٹکیاں ہیں۔“

پھر اس نے ایک کشمیری حریت پرست کمانڈو کا نام لیا اور کہا۔

”تم اس کشمیری مجاہد کو جا کر رپورٹ کرو گے۔ یوں سمجھ لو کہ اس آدمی
سے ملنے کے بعد اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔“

میں نے پوچھا۔

”یہ کشمیری کمانڈو مجھے کہاں ملے گا؟“

صادق بولا۔

”جموں سے تم کشمیر جانے والی لاری میں بیٹھ کر سری نگر جاؤ گے۔ سری
نگر شہر کے درمیان میں دریائے جہلم بہتا ہے۔ اس دریا پر سات پل بنے
ہوئے ہیں۔ تم کسی ایک پر سے دریا پار کرکے شہر کی دوسری جانب پہنچ کر شمال
کی جانب جو پہاڑیاں ہیں اس طرف جاؤ گے ان پہاڑیوں کے درمیان کئی
درے بنے ہوئے ہیں“

اس کے بعد صادق نے مجھے حریت پسند کشمیری کمانڈو تک پہنچنے کے لئے جو راستہ بنایا
ہ راستہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ صادق نے مجھے سارا راستہ

سمجھا دیا کہ میں کن کن پہاڑیوں اور پہاڑی دروں سے گذر کر کشمیری حریت پرست کمانڈو تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کشمیری کمانڈو کا فرضی نام میں شیروان رکھتا ہوں۔ اب میں اس کمانڈو کو اس نام سے یاد کروں گا۔ آپ بھی یہ نام اپنے ذہن میں بٹھا لیں۔ کیونکہ آگے میرے کمانڈو مشن اسی کمانڈو شیروان کی راہنمائی میں ہی ہوں گے۔

صادق کہنے لگا۔

"تم پہلے کبھی کشمیر نہیں گئے۔ اس لئے تمہیں بہت ہوشیاری کے ساتھ یہ سفر طے کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس کوئی اسلحہ یا کمانڈو چاقو وغیرہ تو نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ایسی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔ صرف یہ اسپرو ٹیبل بم ہیں۔ ان کا کوڈ ورڈ میں لکھا ہوا نسخہ ہے اور کچھ انڈین کرنسی میں روپے ہیں۔"

صادق نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو مجھے یقین ہے کہ راستے میں اگر کوئی دشواری پیش آئی تو اس سے بخوبی نمٹ لو گے"

میں نے خدا جانے کیوں صادق کو پنجاب سیکرٹ پولیس کا وہ خفیہ کارڈ نہ دکھایا جس پر خاص نمبر لکھا ہوا تھا اور جس کو دیکھ کر پولیس بھی گھبرا کر مجھے راستہ دے دیتی تھی۔ بس میں نے یہی سوچا کہ اس خفیہ کارڈ کو خفیہ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ صادق کو بتانے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

وہ کہنے لگا۔

"سری نگر ایک دن ایک رات کا سفر ہے۔ تمہیں پرانے ریلوے سٹیشن کے قریب جموں سری نگر لاری اڈے سے کوئی نہ کوئی بس لاری مل جائے گی۔ راستے میں کسی سے زیادہ بات نہ کرنا۔ سی آئی ڈی کے آدمی تقریباً ہر لاری میں ساتھ ہوتے ہیں۔ تمہیں زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ حالات دیکھ کر بات کرنا۔ لیکن اپنے آپ کو مسلمان ظاہر نہ کرنا۔

کوئی بہت پوچھے تو کہہ دینا کہ کشمیر کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔ آج کل وہاں سیبوں کا موسم بھی ہے۔ کشمیر کے سیب اسی موسم میں ہوتے ہیں۔"

میں نے صادق سے پوچھا کہ مجھے جموں سے کس وقت چلنا چاہئے۔

اس نے کہا۔

"آج کی رات تم جموں میں ہی رہو گے۔ کل صبح ہونے سے پہلے اڈے پر پہنچ جانا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تمہیں اکیلے ہی لاری اڈے جانا ہوگا اب پہلے میں جاؤں گا۔ میرے جانے کے دس منٹ بعد تم گودام کو تالا لگا کر میری دکان پر آ جانا۔ ہم وہیں کھانا وغیرہ کھائیں گے۔ رات تم میری دکان میں ہی بسر کرو گے۔ میں احتیاطاً تمہیں اپنے مکان پر نہیں لے جا رہا۔ یہاں دو وجہ سے سیکورٹی بڑی سخت کر دی گئی ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ سکھ خالصتان بنانے کے لئے زبردست تحریک چلا رہے ہیں۔ جموں کے سکھ اس تحریک کے حامی ہیں اور کچھ سکھ کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی بھی حمایت کرتے ہیں مگر کھل کر نہیں۔ دوسری وجہ کشمیری حریت پسندوں کی تحریک آزادی کشمیر ہے جس کے شعلے سارے مقبوضہ کشمیر میں بھڑک رہے ہیں۔ جگہ جگہ خفیہ پولیس کے آدمی عجب عجیب حلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں تمہیں ان سے بھی خبردار رہنا ہوگا۔ اب میں جاتا ہوں"

صادق چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد میں بھی گودام بند کر کے گلی میں سے گذر کر بازار میں آیا اور پھر اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس وقت دکان پر ایک گاہک اور صادق کا ہندو ملازم بھی موجود تھا۔ صادق نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"مہاراج آپ کے کام میں ذرا دیر لگے گی آپ گھر چلیں میں لڑکے کے ہاتھ پہنچا دوں گا"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں شاہ جی۔ میں یہیں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں۔ مجھے کوئی

خاص کام بھی نہیں ہے۔"

صادق کسی چیز کی مرمت کر رہا تھا۔ میں اس چیز کا نام نہیں لکھ رہا۔ وہ کہنے لگا۔

"آپ کی مرضی ہے۔"

میں دکان کے اندر کونے والے بنچ پر بیٹھ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ صادق نے ہند ملازم سے کہا۔

"رامو تمہارے پتا جی بیمار ہیں تم چھٹی کیوں نہیں کر لیتے۔ جا کر پتا جی کی سیوا کرو۔ تمہاری ماتا اکیلی ہوں گی۔"

رامو خوش ہو کر بولا۔

"استاد جی! میں آپ سے چھٹی مانگتے ہوئے ڈر رہا تھا۔"

صادق نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ جاؤ چھٹی کرو۔ میں کام سنبھال لوں گا۔ آج کوئی زیادہ کام بھی نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ صادق نے جان بوجھ کر اپنے ہندو ملازم کو دکان سے رخصت کر د تھا۔ رامو چلا گیا۔ دوسرا گاہک بھی جب چلا گیا تو صادق کہنے لگا۔

"یہاں کسی کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کس کو خفیہ پولیس نے اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ خاص طور پر اپنے ہندو ملازم پر تو مجھے بالکل اعتبار نہیں ہے اب تم ایسا کرو۔ دکان کے پیچھے جو کوٹھری ہے وہاں جا کر آرام کرو۔ ہم وہیں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔"

میں دکان کی پچھلی کوٹھری میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ہرپال کور ک خیال آگیا۔ اس عورت نے نادانستہ طور پر میری بڑی مدد کی تھی۔ اس کی وجہ سے میں ب فکر ہو کر جموں پہنچ گیا تھا۔ پھر اسی کی وجہ سے میرے ہاتھ انڈین سیکورٹی پولیس کا وہ خفی کارڈ آگیا تھا جس پر لکھا ہوا پراسرار نمبر میرے بڑے کام آیا تھا اور آگے چل کر بھی کا آنے والا تھا۔ جب صادق کا گھریلو ملازم اس کا کھانا لے کر آیا تو صادق نے دکان کا دروا

کر دیا اور کھانا لے کر کوٹھری میں آگیا۔ کوٹھری میں گرمی بالکل نہیں تھی۔ یہ پہاڑی ؤں میں ستمبر کا موسم تھا۔ جموں اگرچہ کوہ مری اور کشمیر کی طرح کا پہاڑی علاقہ نہیں پھر بھی وہاں پنجاب کے میدانوں والی گرمی بالکل نہیں تھی۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ کے بعد میں وہیں سو گیا۔ رات تک سویا رہا۔ صادق نے کوئی آٹھ بجے رات دکان بند تو مجھے کوٹھڑی میں سلا کر گیا۔ کوٹھڑی کے پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جہاں ایک تنگ تھا۔ اسی صحن میں غسل خانہ موجود تھا۔ صادق جاتے ہوئے کہہ گیا کہ میں صبح صبح اؤں گا۔

میں بڑے مزے سے ساری رات آرام سے سویا رہا۔ صبح صبح صادق آگیا۔ اس وقت پھٹ رہی تھی۔ صادق کہنے لگا۔

"اب تم یہاں سے نکل کر سیدھے لاری اڈے پہنچو۔ کوئی رکشہ تانگہ لے لینا۔ اسے کہنا پرانے جموں ریلوے سٹیشن کے سامنے جو لاری اڈہ ہے وہاں لے چلے وہاں سے سری نگر کو لاریاں جاتی ہیں۔ باقی میں نے کشمیری کمانڈو کی بابت تمہیں جو کچھ سمجھا دیا ہے اسے یاد رکھنا اور اسی کو جا کر رپورٹ کرنا۔ میں نے تمہیں جو خاص شعر یاد کرایا ہے یہ شعر صرف کشمیری کمانڈو کو الگ جا کر سنا دینا اور کہنا کہ مجھے اس شعر کے شاعر نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ سمجھ جائے گا کہ تم کون ہو اور کس غرض کے لئے اس کے پاس آئے ہو۔ باقی باتیں تم اس سے زبانی کر لینا۔ اب خاموشی سے دکان میں سے نکل جاؤ۔"

میں منہ ہاتھ دھو کر پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ صادق سے مصافحہ کیا اور دکان سے کر بازار میں ایک طرف چلنے لگا۔ ابھی جموں شہر میں دن کی روشنی پوری طرح نہیں تھی۔ دور سے کسی مندر کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک سائیکل رکشا میں مل گیا۔ میں اس میں بیٹھ کر جموں سری نگر لاری اڈے پر آگیا۔ یہاں ایک لاری ی دیر پہلے سری نگر کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ دوسری لاری کے لئے ٹکٹ کھل گئے لاری اڈے کی اونچی چھت کے نیچے ادھر ادھر کچھ لوگ بیٹھے ناریل کا حقہ پی رہے

تھے۔ کچھ سواریاں سو رہی تھیں۔ میں نے سری نگر کا ٹکٹ خریدا اور ایک طرف خالی
پر بیٹھ گیا۔ یہاں جموں آنے کے بعد پہلی دفعہ میں نے دو فوجیوں کو دیکھا۔ وہ وردی میں
تھے۔ وہ ٹکٹ والی کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے میرے قریب سے گذرے تو بلب کی
روشنی میں میں نے ان کے کاندھے پر جموں کشمیر رائفلز لکھا ہوا پڑھا۔ یہ دونوں ڈوگر
فوج کے جوان تھے۔ انہوں نے فوجی تھیلے اٹھائے ہوئے تھے اور ان کی رائفلیں سلنگو
کے ساتھ کاندھوں پر لٹک رہی تھی۔ ان کی وردیاں گرم تھیں۔ ظاہر ہے وہ کشمیر کے محا
پر جا رہے تھے جہاں یقیناً سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ لگا لیا تھا اور خاموش بیٹھ
مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور ماحول کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک خالی لار
آکر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے بلند آواز میں کہا۔

"سری نگر جانے والی سواریاں آجائیں"

میں جلدی سے اٹھا اور لاری میں پچھلے دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا
اس سیٹ کا انتخاب میں نے اس لئے کیا تھا کہ اگر حالات کہیں نازک صورت اختیار
جائیں تو میں لاری سے کود سکوں۔ دیکھتے دیکھتے لا.ی بھر گئی۔ جموں کشمیر رائفلز کے دونو
ڈوگرہ فوجی بھی اسی لاری میں آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لاری اپنی منزل کی طرف روا
ہو گئی۔ جموں شہر سے باہر نکلے تو سپیدہ صبح چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ راستے میں ا
بہت بڑے محل کی عمارت آئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ جموں کے سابق راجہ کا
تھا۔ ایک جانب پہاڑی ڈھلان پر مکانات بنے ہوئے تھے جہاں ایک مندر کا کلس چمک
تھا۔ لاری جموں سری نگر روڈ پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ لاری مسافروں سے بھر چکی تھ
اس لئے راستے میں کوئی سواری ہاتھ دیتی تو ڈرائیور گاڑی نہیں روکتا تھا۔

راستے میں سڑک کے کنارے جموں کی دیہاتی عورتیں سروں پر ٹوکرے یا
لکڑیوں کے گٹھے یا دودھ کے برتن رکھے شہر کی طرف جاتی نظر آئیں۔ ان عورتوں کا لب
ہندو عورتوں والا تھا۔ دور اوپر اونچی پہاڑی پر کسی مندر کا کلس طلوع ہوئے سورج
سنہری کرنوں میں چمکتا نظر آیا تو لاری میں بیٹھے ہوئے ہندوؤں نے بلند آواز میں نعرہ لگایا

"جے شیراں والی ماتا کی جے"

معلوم ہوا کہ یہ جموں کا مشہور مندر شیراں والی ماتا کا مندر تھا۔ اب ہم جس علاقے
ے گذر رہے تھے وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ کہیں چڑھائی آجاتی۔ کہیں ڈھلان شروع ہو جاتی۔
ڑیوں پر جنگلی جھاڑیاں اور کافی درخت اگے ہوئے تھے۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ کبھی
ی ان پہاڑیوں کی طرف سے گرم ہوا کا جھونکا اور کبھی سرد ہوا کا جھونکا آجاتا تھا۔ آگے
پہاڑی قصبہ آیا جس کے آگے پہاڑی سرنگ میں لاری داخل ہو گئی۔ سرنگ کی
سری جانب خشک اور چٹانوں جیسی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا سڑک اب اونچائی پر
ئی تھی۔ نیچے دور دریائے توی سانپ کی طرح بل کھاتا نظر آرہا تھا۔ لاری چٹانوں کے
میان بنی ہوئی سڑک پر جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو پہاڑی جنگل کی سڑک پر چلتی
ں پھر اودھم پور آگیا۔ یہ آرمی ہیڈ کوارٹر ہے اور جموں کشمیر کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ
فوجی چھاؤنی یہیں پر ہے۔ دونوں ڈوگرہ فوجی یہاں اتر گئے۔ اودھم پور کے آگے پھر
ڑانی علاقہ آگیا۔ یہاں جگہ جگہ کیکر کے درختوں کے جھنڈ نظر آرہے تھے میں ان
ختوں کو دور ہی سے پہچان سکتا تھا۔ اس کے آگے صنوبر اور دیودار کے درختوں کے
نڈ گذرنے لگے۔ سڑک کے کنارے کنارے دونوں جانب کہیں کہیں مکئی کے کھیت
ہاتے تھے۔ یہاں پہلی بار ہوا میں پہاڑوں والی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

آخر ایک سو پانچ کلو میٹر کا سفر طے کرنے کے بعد ہماری لاری کد پہنچ کر رک گئی۔ کد
صحت افزا مقام ہے۔ یہاں چشمہ بہہ رہا تھا۔ سب مسافر لاری سے اتر گئے۔ میں نے
ا اتر کر چشمے کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ چشمے کے پانی کے دو تین گھونٹ پئے۔ قریب
کھانے پینے او چائے کی دکانیں تھیں جنہیں شمالی بھارت میں ڈھابے کہا جاتا ہے۔ یہاں
انے لدھیانہ جموں سے نکلنے کے بعد پہلی بار دکانوں پر اردو میں لکھے ہوئے دو چار بورڈ
دیکھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کے آبادی والے علاقے شروع
گئے ہیں۔ لاری کد سے روانہ ہوئی تو رام بن جا کر رکی۔ رام بن دریائے چناب کے
ارے آباد ہے۔ ہر طرف دھوتیوں والے ہندو نظر آرہے تھے۔ کہیں کہیں مسلمان بھی

لمبے فرن پہنے نظر آجاتے تھے۔ مگر رام بن میں ہندو زیادہ آباد تھے۔ لاری یہاں سے پھر
آگے روانہ ہوگئی۔ اس دوران کسی مسافر کے ساتھ میری زیادہ بول چال اس لئے نہ ہو
سکی کہ اکثر مسافر اترتے چڑھتے رہے۔ لاری میں ابھی تک میرے لئے کوئی تشویش ک
بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں ایک جگہ دو تین پولیس کے سپاہی بھی لاری میر
سوار ہوئے مگر کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ وہ آگے جاکر اتر گئے۔

پٹنی ٹاپ ایک مقام آیا۔ یہاں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر دیودار کے بے شمار درخت
تھے۔ یہاں معلوم ہوا کہ کشمیر کا علاقہ شروع ہو رہا ہے۔ یہاں خنکی بڑھ گئی تھی۔ چنانچ
میں نے اپنی نائیلون کی جیکٹ کے بٹن بند کرلئے۔ یہاں میں نے دھابے میں بیٹھ کر کھا
کھایا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ یہ بادل دیودار کے درختوں میں سے ہو کر گزر
تھے۔ یہاں پینے کا پانی بڑا ٹھنڈا تھا۔ اس کے بعد بنوت کا شہر آیا۔ یہ جگہ بھی کافی ٹھنڈک
والی تھی۔ لگتا تھا کہ مری میں آگیا ہوں۔ یہاں دکانوں اور مکانوں پر اردو میں لکھے ہو
بورڈ زیادہ تھے۔ یہاں سے مسلمانوں کی اکثریت شروع ہوگئی تھی۔

کشمیر کی وادی تک ابھی لاری نے آدھا سفر طے کیا تھا۔ رات کے نو بجے کے قریب
لاری بانہال پہنچ کر ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے اعلان کیا کہ رات بانہال میں ٹھہریں گے۔ لار
صبح سری نگر روانہ ہوگی۔ یہاں ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ لاری کے اڈے میں ایک ل
ہال کمرہ تھا یہاں مسافروں نے اپنے بستر لگا لئے۔ میرے پاس کوئی بستر نہیں تھا۔ مجھے بس
کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں کونے والے ایک بنچ پر سمٹ سمٹا کر پڑ گیا۔ دال خشک
میں نے تھوڑا بہت کھا لیا تھا۔ سردی ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر میرا جسم کمانڈو ٹریننگ
نے سردی گرمی برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ میں نے وہیں رات گذار دی۔ دوسر
دن صبح چھ بجے لاری سری نگر کے لئے چلی۔ بانہال کی بڑی لمبی سرنگ بھی آکر گذر گئ
پھر قاضی کنڈ کا قصبہ ایا۔ یہاں کشمیر کا کلچر صاف طور پر نظر آنے لگا تھا۔ جگہ جگہ مسجد
تھیں۔ کشمیری خواتین سر پر دوپٹہ باندھے پھرن پہنے بازار میں آجا رہی تھیں۔ کشمیر
جوان اور بوڑھے لمبے لمبے فرغل پہنے ہوئے تھے۔ یام پور کے آس پاس زعفران ک

بت بھی دیکھے۔ اب ہم کشمیر کی وادی میں داخل ہو چکے تھے۔

سری نگر کوئی پچاس ساٹھ میل دور رہ گیا تھا کہ ایک جگہ سڑک پر ڈوگرہ فوجی کھڑے
ے۔ انہوں نے لاری رکوالی۔ میں ہوشیار بیٹھ گیا۔ اور فوجی لاری کے پاس آئے۔ انہوں
ے سارے مسافروں کو بڑے غور سے دیکھا۔ پھر لاری کو چیک کیا۔ لاری کے اوپر چھت
چڑھ کر سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور لاری کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔ گھنٹے
گھنٹے کے سفر کے بعد ڈوگرہ چھاؤنی کے گیٹ کے آگے لاری رک گئی۔ یہاں بھی ڈوگرہ
ج کے سپاہیوں نے جن میں ایک سکھ بھی تھا لاری کی چیکنگ کی۔ جب ان کی تسلی ہو
ی تو انہوں نے لاری کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد لاری سری نگر
میں داخل ہوگئی۔ میں نے کشمیری مجاہدین کا یہ شہر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اخباروں
ں اس شہر کے بازاروں مسجدوں اور نشاط باغ کی تصویریں ہی دیکھی تھیں۔ موسم یہاں
دیوں کا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر بادل نہیں تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ لاری
ے میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ میں اڈے سے نکل کر سیدھا دریائے جہلم کی طرف چل پڑا
، میں نے راستے میں دیکھ لیا تھا۔ ہماری لاری اس کے ایک پل پر سے گذری تھی۔

میں نے کسی سے نہ پوچھا اور خود ہی اندازے سے دریا کے ایک پل پر پہنچ کر اسے
ر کیا۔ دوسری جانب بازار تھے۔ بازاروں میں پولیس اور ڈوگرہ فوج کے سپاہی پھر رہے
ے۔ کشمیری جوانوں کے چہروں کے ناقابل شکست عزم کی چمک تھی۔ یہاں سارا ماحول
لامی تھا۔ مسجدیں جگہ جگہ تھیں۔ خانقاہیں تھیں۔ دکانوں پر کہیں کوئی ہندی کا بورڈ نظر
ں آتا تھا۔ سب بورڈ اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھے ہوئے تھے۔ مجھے ایسے محسوس
ا جیسے میں پاکستان میں آگیا ہوں۔ میں ایک ریستوان میں آکر بیٹھ گیا۔ پاکستان سے نکلنے
، بعد پہلی بار میں نے پاکستانی کھانا یعنی پلاؤ روغن جوش کے ساتھ کھایا۔ ہو کوئی کشمیری
ان میں بات کر رہا تھا۔ اردو زبان بھی عام بولی جاتی تھی۔ ریستوران میں قائد اعظم کی
ویر لگی ہوئی دیکھ کر سر فخر سے بلند ہوگیا۔ کئی دکانوں کے اوپر پاکستانی پرچم بھی لہرا رہے
ے۔

یہاں سے مجھے اپنے کشمیری مجاہد کمانڈو کی تلاش میں شمال کی جانب جو پہاڑیاں تھیں اس طرف جانا تھا۔ میں اندازہ لگا کر شہر کی شمال کی طرف بازاروں میں چلتا گیا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد میں شہر سے باہر آگیا۔ سڑک کے دونوں جانب چنار اور سفیدے کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ ہرے بھرے کھیت تھے۔ سیب کے درخت بھی دیکھے۔ کشمیری کسان مرد عورتیں کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ کشمیری کسانوں کی حالت انتہائی فلاکت زدہ تھی۔ ہندو حکمرانوں نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر کے یہاں کے حقیقی کشمیری مسلمانوں کی معاشی زندگی کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ کشمیر کی ساری دولت ہندو غاصب سمیٹ رہا تھا اور کشمیری مسلمان جو کشمیر کے مالک تھے غریبانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں نے دور شمال کی جانب پہاڑوں پر نگاہ ڈالی۔ جموں والے ہمارے آدمی یعنی دکاندار صادق نے یہاں مجھے پہاڑیوں کی ایک خاص نشانی بتائی تھی۔ میں نے اس نشانی کو دو پہاڑوں کے درمیان ایک جگہ دیکھا تو اسی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اس شعر کو دل ہی دل میں بار بار دہرا رہا تھا جو مجھے کشمیری کمانڈو شیروان کے آگے جا کر سنانا تھا اور جو اس بات کا خفیہ اشارہ تھا کہ میں کمال شاہ کا تربیت یافتہ کمانڈو ہوں اور جہاد کشمیر میں شریک ہونے آیا ہوں۔ مجھے کشمیری کمانڈو شیروان کو یہ خاص شعر سنانے کے بعد جو اردو کا شعر تھا یہ بھی کہنا تھا کہ مجھے اس شعر کے شاعر نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

آسمان پر بادل برابر چھائے ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گذر رہا تھا۔ کسی کھیت میں ہل چلا ہوا تھا۔ کسی کھیت میں فصل لہرا رہی تھی۔ چلنے سے مجھے سردی نہیں لگتی تھی۔ جسم گرم ہو گیا تھا۔ پہاڑ ابھی دور تھے۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے چلنے کے بعد میں پہاڑوں کی ترائی میں یعنی ان کے دامن میں پہنچ گیا۔ راستے میں ایک دو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں والے گاؤں بھی آئے۔ یہاں کشمیری عورتیں کہیں دھان کوٹ رہی تھیں۔ کہیں لکڑیاں کاٹ رہی تھیں۔ پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو جنگلی جھاڑیاں بھی شروع ہو گئیں۔ آخر میں پہاڑ کے دامن میں اس جگہ پر آگیا جہاں دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ راستہ دوسری طرف جاتا تھا۔ یہاں وہ درہ تھا جس

ارے میں جموں والے صادق نے مجھے بتایا تھا۔ دو پہاڑوں کے درمیان اس تنگ سے
ے میں جنگلی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میرے لئے ان میں سے گذرنا کوئی مشکل
تھا۔ اگرچہ میرے پاس کمانڈو چاقو تو نہیں تھا۔ مگر ایک تربیت یافتہ کمانڈو کے فولادی
ان جھاڑیوں کو توڑنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ میں ہاتھوں سے جھاڑیوں کو توڑتا ہوا
ادھر ہٹاتا راستہ بناتا درے میں سے گذر گیا۔

آگے ایک کھلی جگہ تھی جہاں چھوٹے چھوٹے درخت اور گھاس تھی۔ کچھ فاصلے پر
اڑیاں تھیں جن کی ڈھلانوں پر چڑھ کے درخت اوپر تک اگے ہوئے تھے۔ ان کی
ں پر بادل ہی بادل تھے۔ جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا سردی بڑھ رہی تھی۔ مجھے ان
وں کے درمیان سے گذر کر آگے جانا تھا۔ وہی منزل تھی۔ میں چلتا چلتا ان پہاڑیوں
اس آگیا۔ یہاں بھی پہاڑیوں کے درمیان تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک گلی سی تھی
میں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہاں سے گذرتے ہوئے مجھے آدھا گھنٹہ لگ
میں درے سے باہر نکلا تو سامنے دیوار اور چنار کے درختوں کا ایک گھنا پہاڑی جنگل
اں بے حد نشیب و فراز تھے۔ کہیں زمین ایک دم نشیب میں اتر جاتی۔ کہیں اچانک
ی شروع ہو جاتی۔ یہ قدرتی جنگل تھا۔ کہیں کوئی پگڈنڈی تک نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ
سے انسانوں کا گذر نہیں ہوتا۔ آس پاس کوئی انسانی آبادی بھی نہیں تھی۔ میں ایک
پر پہنچ کر رک گیا۔ چشمے کا پانی ایک ٹیلے کی جھاڑیوں میں سے نیچے چھوٹے سے
میں گر رہا تھا۔ میں نے یہاں منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پی کر پیاس بجھائی پانی واقعی کشمیر
شموں کا آب حیات تھا۔

اتنی دیر میں سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جس کی وجہ سے میری طرف
ا ڈھلانوں پر ایک دم گہری چھاؤں اور اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ
را ہونے سے پہلے پہلے مجھے کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کے ٹھکانے تک پہنچ جانا چاہئے
ہ جموں والے صادق نے مجھے یہاں جو خاص نشانی بتائی تھی وہ مجھے رات کے
رے میں نظر نہیں آسکتی تھی۔ یہ ایک خاص نشانی تھی۔ میں اٹھ کر ایک طرف چل

پڑا۔ چند قدم چلنے کے بعد پہاڑی شگاف نظر آئے۔ یہاں ایک جانب کھڑے ہو کر میں نے صادق بھائی کی ہدایت کے مطابق بالکل سیدھ میں دیکھا۔ ایک جگہ میں نے دو درختوں کی خاص نشانی دیکھ لی۔ یہ درخت انگریزی کا ایک خاص لفظ بنائے ہوئے ایک جانب جھکے ہوئے تھے۔ مجھے ان درختوں کے پاس پہنچنا تھا۔ میں آگے چل پڑا۔ جب ان درختوں کے قریب پہنچا تو اچانک میری دونوں جانب سے تین آدمی نکل کر میرے سامنے آگئے۔ انہوں نے سیاہ رومال منہ اور سر پر اس طرح باندھ رکھے تھے کہ مجھے صرف ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ وہ نیم کمانڈو کے لباس میں تھے۔ دو جوانوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ تیسرے نے اردو زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیسے آگئے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی جواب دوں انہوں نے میرے ہاتھ پیچھے باندھ کر مجھے سر سے دباتے ہوئے نیچے بٹھا دیا اور کشمیری زبان میں ایک دوسرے سے کوئی بات کی۔ ان میں سے ایک نے سٹین گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ میں نے کہا۔

"بھائی میں مسلمانوں ہوں۔ مجھے اپنے لیڈر کے پاس لے چلو۔ مجھے کمال شاہ صاحب نے بھیجا ہے"

کمال شاہ کا نام سن کر وہ ٹھٹھک سے گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا فوراً ایک مجاہد نے میری آنکھوں پر کالی پٹی باندھی اور مجھے بازو سے پکڑ ایک طرف لے جانے لگا۔ کئی اونچی نیچی جگہوں سے گذر کر مجھے ایسے لگا کہ میں جھاڑیوں کے درمیان آگیا ہوں۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر مجھے نیچے بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے آپس میں کشمیری میں کوئی بات چیت کی۔ ایک مجاہد نے مجھ سے اردو میں پوچھا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پاکستان سے جہاد کشمیر میں شامل ہونے کا جذبہ لے کر آیا ہوں۔"

وہ میری تلاشی لینے لگے۔ میری جیب سے اسپرو ٹیبلٹ بم والا پلاسٹک کا لفافہ اور برٹ ایجنسی کا کارڈ نکلا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ کارڈ پر کس کا نمبر لکھا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بھائی یہ کارڈ کمانڈ مجاہد کمال شاہ صاحب نے مجھے دیا ہے کہ اسے کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کو پہنچا دوں۔ اور باقی سر درد کی گولیاں ہیں"

یہاں تو میں نے کشمیری کمانڈو لیڈر کا نام شیروان ہی لکھا ہے۔ ان کے آگے میں نے اس کا اصل نام لیا تھا۔

یہاں مجھ سے ایک بڑی زبردست بھول ہو گئی تھی۔ مجھے ایک کمانڈو کی حیثیت سے ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا۔ میں نے ان لوگوں کی شناخت معلوم کئے بغیر بتا دیا تھا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور کمال شاہ نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ لوگ انڈین فوج کے کمانڈو بھی ہو سکتے تھے جو اس علاقے میں کشمیری حریت پسندوں کی تلاش میں چھپ کر نگرانی کر رہے ہوں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کے آدمی ہی تھی۔ وہ مجھے وہاں سے اٹھا کر ایک اور جگہ لے گئے۔ یہاں انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ میں ایک سرنگ کے دہانے کے اندر بیٹھا تھا جہاں دیوار پر لالٹین جل رہی تھی۔ ایک آدمی سٹین گن لئے میرے سامنے بیٹھا رہا۔ باقی کسی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں مجاہد واپس آئے اور مجھے ساتھ لے کر ایک اور غار میں آگئے۔ یہاں کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ سیاہ رومال میں چھپا رکھا تھا۔ وہ چوڑے قد کاٹھ کا ایک جوان آدمی تھا۔ آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سٹین گن اپنے گھٹنوں پر رکھی تھی۔ وہ کمانڈو کی وردی میں تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمہیں کمال شاہ صاحب نے یہاں بھیجا ہے؟"

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"پہلے مجھے اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ تم ہی کمانڈو لیڈر شیروان ہو"

اس کے تینوں ساتھی وہیں موجود تھے۔ غار میں دو تین سیکنڈ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میں نے بڑا معقول سوال کیا تھا۔ وہ مسکرانے لگا۔ پھر کہا۔

"دلی میں تم کس آدمی سے ملے تھے؟"

میں نے گل خان کا نام لے دیا۔ کمانڈو شیروان نے دوسرا سوال کیا۔

"جموں میں کس کے پاس ٹھہرے تھے؟"

میں نے صادق کا نام لیا تو شیروان بولا۔

"اس نے تمہیں میری اور اپنی شناخت کے لئے کوئی خفیہ لفظ ضرور بتایا ہو گا۔ کیا تم بتا سکتے ہو؟"

میں نے صادق کا بتایا ہوا اردو کا شعر پڑھ کر سنایا تو کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

"جس شاعر کا یہ شعر ہے اس کا نام کیا ہے؟"

اس سوال سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ کشمیری کمانڈو شیروان ہی ہے۔ شیروان کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ میں صحیح آدمی ہوں اور مجھے کمال شاہ صاحب نے ہی گل خان اور جموں والے صادق صاحب کی راہ نمائی میں اس کے پاس بھیجا ہے۔

کمانڈو شیروان مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنے آدمی ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں بھی یقین آجانا چاہئے کہ تم کمانڈو شیروان کے سامنے بیٹھے ہو"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ مجھے یقین آگیا ہے۔ اب کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے"

کشمیری کمانڈو شیروان نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر گلے ملا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"تم لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی پر جاؤ اور ہمارے لئے چائے بھجوا دو"

اب غار میں میں اور کمانڈو شیروان دونوں اکیلے تھے۔ میری جیب سے انڈین سیکرٹ لیس کے خاص نمبر والا جو کارڈ نکلا تھا وہ کارڈ اور اسپرو ٹیبلٹ بم کی گولیوں والا لفافہ انڈو شیروان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مجاہد میری تلاشی لینے کے بعد یہ چیزیں اس کے الے کر چکے تھے۔ کمانڈو شیروان نے اسپرو کی گولیوں کو دیکھ کر کہا۔

"یہ تو سردرد کی گولیاں ہیں۔ مگر یہ کارڈ پر کس کا نمبر لکھا ہوا ہے"

میں کشمیری کمانڈو شیروان سے ان چیزوں کا راز نہیں چھپا سکتا تھا۔ میں نے دونوں وں کی اصل حقیقت بیان کر دی۔ انڈین سیکرٹ پولیس کے خفیہ نمبر والا کارڈ دیکھ کر وہ ش ہوا۔ کہنے لگا۔

"یہ نمبر بہت کام آسکتا ہے۔ باقی یہ اسپرو ٹیبلٹ بم والی گولیاں خاص خاص بھارتی فوجی اور پولیس افسروں کو ٹھکانے لگانے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ گولی کسی کو کھلانے کے لئے اس شخص کا اعتماد حاصل کرنا بھی ضروری ہو گا۔ ایسا تو کسی خاص مشن میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ گولیاں تم اپنے پاس رکھو۔"

پھر کمانڈو شیروان نے وہ کاغذ دیکھا جس پر بظاہر پلاؤ وغیرہ بنانے کے مصالحوں کا نسخہ ا تھا۔ اس کے بارے مین' میں نے اسے بتایا کہ یہ اسپرو بم بنانے کا فارمولا ہے تو اس گل خان کی فنی مہارت کی بڑی تعریف کی۔ کہنے لگا۔

"یہ نسخہ ہم یہاں محفوظ جگہ پر سنبھال کر رکھیں گے۔ گولیاں تم اپنے پاس ہی رکھو۔ کیونکہ آئندہ کسی کمانڈو مشن میں یہ استعمال کی جا سکتی ہیں۔"

اس کے بعد کمانڈو شیروان نے مجھے کشمیر کے محاذ کی ساری صورت حال سمجھائی اور کھول کر بتایا کہ کہاں کہاں انڈین ملٹری فورس نے اپنے مورچے اور فیلڈ ہیڈ کوارٹر بنا ے ہیں۔ اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں جموں رائفلز کی آرٹلری رجمنٹ نے پہاڑی پر کچھ میڈیم توپیں نصب کر رکھی ہیں۔ یہ گن پوسٹیں ہم ابھی تک تباہ نہیں کر سکے۔ ان کے

گولے ہمارے خفیہ ٹھکانوں کی نشان دہی پر گرتے ہیں اور ہمیں شدید نقصان اٹھا کر وہاں سے کسی دوسری جگہ فرار ہونا پڑتا ہے۔ ان توپوں کی شیلنگ سے کئی بار ہمارے ایمونیشن کے ذخیرے بھی تباہ ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"انڈین فوج کو آپ لوگوں کے خفیہ ٹھکانوں کا کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ آپ اس کا سدباب کیوں نہیں کرتے؟"

کمانڈو شیروان بولا۔

"ملٹری انٹیلی جنیس کے آدمی سفید کپڑوں میں مسلمانوں کا بھیس بدل کر ساری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح انہیں ہمارے خفیہ ٹھکانے کا سراغ مل جاتا ہے اور ان پہاڑیوں پر لگی ہوئی توپیں وہاں گولہ باری شروع کر دیتی ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

"آپ لوگ ان گن پوسٹوں کے عقب میں جا کر اپنا خفیہ ٹھکانہ کیوں نہیں بنا لیتے"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"ایسا ہم کر تو کر سکتے ہیں مگر اس طرح ہم اپنے محاذ سے بہت دور ہو جائیں گے۔ ہمیں یہاں رہ کر انڈین فوج کے کنوائیوں پر بھی اٹیک کرنا ہوتا ہے تاکہ وادی میں مقیم ڈوگرہ رجمنٹوں کو سپلائی نہ پہنچ سکے۔ ہم اس وادی میں کسی جگہ چھپے رہنے پر مجبور ہیں۔ اور یہ ساری وادی اور اس کی پہاڑیاں انڈین آرٹلری رجمنٹ کی توپوں کی زد میں ہیں۔ ان توپوں کو تباہ کرنے کے لئے ہماری کئی کمانڈو پارٹیاں رات کو جا چکی ہیں مگر کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ہمارے کئی جوان شہید ہو چکے ہیں۔ ہمیں ہر حالت میں ان توپوں کو خاموش کرنا ہے۔"

ایک مجاہد ہمارے لئے چائے لے کر آ گیا۔ یہ کشمیری سبز چائے تھی اور چھوٹے دار میں تھی۔ ساتھ دو پیالیاں اور نمکین قلچے بھی تھے۔ یہ نمکین قلچے چھوٹے سائز تھے اور میں نے پہلی بار کھائے۔ کشمیری چائے کے ساتھ ان کا ذائقہ بڑا مزیدار لگا۔

کشمیری کمانڈو شیروان نے نقشے والا کاغذ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔

"اس پر کل بات کریں گے۔"

پھر وہ مجھے کمانڈو ٹریننگ کی باتیں کرنے لگا۔ بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے انڈو کی فل ٹریننگ لی ہوئی ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"کمال شاہ ایک مرد مومن ہے۔ اس نے جتنے مجاہدوں کو ٹریننگ دے کر ہمارے پاس بھیجا ہے انہوں نے اپنی فنی مہارت اور جرات سے کام لے کر فوج کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ان میں سے اکثر کمانڈو شہید بھی ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مشن پر گئے۔ ٹارگٹ تو مار لیا مگر خود واپس نہ آ سکے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کمانڈو جب کسی مشن پر جاتا ہے تو اس کے زندہ واپس آجانے کی بہت کم امید ہوتی ہے۔ وہ خود بھی موت کو قبول کر کے اپنے مشن پر روانہ ہوتا ہے۔"

پھر کمانڈو شیروان نے جہاد کشمیر کی مزید تفصیلات بتائیں اور کہنے لگا۔

"ہمارے حریت پرست کشمیری مجاہد وادی اور شہروں کے ہر محاذ پر انڈین فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شہید ہوتا ہے تو سات آٹھ ڈوگرہ فوجیوں کو جہنم میں پہنچا کر شہید ہوتا ہے۔ ہم کشمیری کمانڈو ہیں۔ ہمارا کام محاذ سے پیچھے ان پہاڑیوں میں ہی رہ کر انڈین فوج کے سپلائی کانوائیوں' اس کے ایمونیشن ڈپوؤں اور دوسری فوجی تنصیبات پر کمانڈو اٹیک کر کے انہیں تباہ کرنا ہے۔ لیکن انڈین آرٹلری کی یہ توپیں ہر جگہ وادی میں ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔ ہمیں کسی ایک جگہ بیٹھ کر کسی مشن کی سکیم تیار نہیں کرنے دیتیں۔ اس ہائیڈ آؤٹ میں آئے ہمیں صرف دو روز ہی ہوئے ہیں۔

ابھی تک انڈین ملٹری انٹیلی جینس کو ہمارے اس ہائیڈ آؤٹ کا سراغ نہیں مل سکا۔ جیسے ہی کسی جاسوس نے اس پہاڑی کی نشان دہی کی یہاں توپوں کی شیلنگ شروع ہو جائے گی۔ ہمارے لئے سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ ہم ان پہاڑیوں کے علاوہ اور کسی طرف نہیں جاسکتے۔ کیونکہ جموں سے سری نگر جانے والی سڑک ان ہی پہاڑیوں سے گذرتی ہے اور ملٹری سپلائی اور ایمونیشن لے کر فوجی ٹرک اسی سڑک پر سے گذرتے ہیں جنہیں ہمیں ہر حالت میں تباہ کرنا ہوتا ہے۔"

ہم چائے بھی پیتے رہے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ کمانڈو شیروان کی زبانی مجھے جہاد کشمیر کے تقریباً ہر محاذ کی تفصیل معلوم ہو گئی۔ شیروان کہنے لگا۔

"اس وقت ہمارا سب سے پہلا ٹارگٹ جنوبی پہاڑیوں پر لگی آرٹلری کی توپیں ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کل کتنی توپیں ہیں؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"فائرنگ کے وقت صرف چار توپیں پوائنٹ آؤٹ ہوئی ہیں۔ اور یہ جنوبی پہاڑ کی ڈھلوان اور چوٹی پر فاصلے فاصلے پر نصب ہیں۔ میں صبح کے وقت تمہیں یہ جگہ دور سے دکھاؤں گا۔ ہماری جتنی کمانڈو پارٹیاں ان توپوں کو تباہ کرنے گئی ہیں ان میں سے صرف ایک مجاہد شدید زخمی حالت میں کسی نہ کسی طرح واپس آنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ہمارے کئی جوان کمانڈو واپس نہیں آسکے۔ یا تو وہ وہیں شہید ہو گئے یا انہیں بھارتی فوج نے پکڑ لیا۔ جو زخمی مجاہد واپس آنے میں کامیاب ہوا تھا اس نے بتایا ہے کہ وہ صرف ایک توپ کے بنکر تک ہی پہنچ سکا تھا۔ یہ توپ سیمنٹ کی موٹی دیوار کے اندر لگی ہوئی ہے اور وہیں مشین گن پوسٹ بھی ہے۔ جو ذرا سے شک پڑنے پر اندھا دھند گولیوں

کی بوچھاڑیں مارنے لگتی ہے۔"

رات کے دس بجے میں نے کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کے ساتھ کھانا کھایا اور وہیں ڑ کر سو گیا۔ دوسرے روز کافی دن چڑھے اٹھا۔ میری کئی دنوں کی نیند پوری ہو گئی تھی۔ اد رکھیں۔ کمانڈو چاہے کتنا ہی فولاد کا آدمی کیوں نہ ہو۔ ایک وقت آتا ہے کہ اسے بھی پنی نیند پوری کرنی ہوتی ہے اور اپنے جسم کی توانائی بحال کرنی ہوتی ہے۔

کمانڈو لیڈر شیروان رات کو تین آدمیوں کے ساتھ کسی مشن پر گیا ہوا تھا۔ وہ دوپہر کے وقت آیا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ کمانڈو یروان نے مجھے بتایا کہ اسے خبر ملی تھی کہ انڈین آرمز بریگیڈ کا ایک کانوائے گذرنے والا ہے۔ ہم ساری رات ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھے رہے مگر کانوائے نہیں آیا۔

"معلوم ہوتا ہے شیڈول میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہوگی۔ تم سناؤ۔ رات اچھی طرح سے گذری؟ آؤ بیٹھ کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر نئے مشن پر باتیں کریں گے۔"

ہم نے خفیہ غار میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس وقت وادی کشمیر کے آسمان پر بادل چھائے ئے تھے اور ہلکی بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کشمیری کمانڈو لیڈر روان نے کہا۔

"تمہیں یہ لباس تبدیل کر دینا چاہئے۔ یہاں موسم سرد ہے۔"

اس نے میرے لئے کمانڈو کی نئی وردی منگوائی۔ یہ کوئی خاص وردی نہیں تھی۔ رے خاکی رنگ کی گرم پتلون گرم قمیض اور گرم جیکٹ تھی۔ سر پر میں نے کشمیری یت پرست کمانڈوز کی طرح سیاہ رومال باندھ لیا۔ مگر کمانڈو شیروان کی طرح میں نے بھی پنے منہ کو نہ ڈھانپا۔ جس وقت شیروان کو یقین ہو گیا تھا کہ میں ان کا اپنا آدمی ہوں تب ل نے اپنے منہ کے آگے سے سیاہ کپڑا ہٹا دیا تھا۔ اب اس نے بھی صرف اپنے سر پر یاہ رومال باندھا ہوا تھا ہم نے ظہر کی نماز غار میں ہی پڑھی۔ نماز کے بعد ہم نے آزادی ثمیر کے لئے خدا کے حضور دعا مانگی۔

غار کے اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے لالٹین ہر وقت روشن رہتی تھی۔ کمانڈو شیروان نے جیب میں تہہ کیا ہوا نقشہ نکال کر اپنے گھٹنوں پر پھیلایا اور بھارتی فوج نے جو جنوبی پہاڑ پر توپیں لگا رکھی تھیں ان کی پوزیشن مجھے سمجھانے لگا۔ ابھی اس کو گفتگو شروع کئے ایک منٹ ہی ہوا ہو گا کہ ہمیں غار کے باہر ایک خاص قسم کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں سمجھ گئے کہ یہ دشمن کے توپ کے گولے کی آواز ہے جو ابھی ہمارے اوپر آکر گرے گا۔ مگر ہم پہاڑی کے اندر تھے اتنے میں غار کے باہر دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد گولہ باری شروع ہو گئی۔ گولے ہمارے غار کے اردگرد پھٹ رہے تھے۔ کمانڈو شیروان اور میں غار سے باہر نکل آئے تھے۔ ہمارے دوسرے حریت پرست کشمیری کمانڈو ساتھی ایک جگہ سے ایمونیشن کے بکس نکال نکال کر غار کی عقبی پہاڑی کی طرف دوڑ دوڑ کر لے جا رہے تھے۔ ساری وادی توپوں کی گولا باری سے گونج رہی تھی۔ کمانڈو شیروان نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے دشمن کو خبر مل گئی ہے کہ ہمارا نیا ہائیڈ آؤٹ کہیں اس پہاڑی میں ہے۔ جلدی سے پیچھے کی طرف نکل چلو"

انہوں نے دوسری جگہ پہلے سے چن رکھی تھی۔ یہ وہاں سے دور ایک پہاڑی کے پیچھے جو چٹانیں تھیں وہاں ایک بہت بڑی چٹان کے اندر والا قدرتی غار تھا۔ اس کے آگے سے تیز رفتار پہاڑی ندی گذرتی تھی۔ چٹان کے غار تک جانے کے لئے ایک خفیہ راستہ تھا۔ ہم توپوں کی گولا باری میں وہاں سے اپنا سارا اسلحہ اور ایمونیشن نکال کر نئی جگہ پر لے آئے جنوبی پہاڑ کی ڈھلان اور چوٹی پر لگی ہوئی بھارتی آرٹلری کی چاروں توپیں وقفے وقفے سے پہاڑی پر ایک ہی جگہ گولے فائر کرتی رہیں۔ ہمارا کوئی کشمیری مجاہد نہ زخمی ہوا نہ شہید ہوا۔ نئے چٹانی غار میں آکر شیروان کہنے لگا۔

"یہ ڈرامہ ہمارے ساتھ پچھلے کئی مہینوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ آس پاس وادی میں چرواہوں اور کسانوں کے بھیس میں پھرتے بھارتی ملٹری انٹیلی جینس کے جاسوسوں کو ذرا ہمارے ٹھکانے کا سراغ ملتا ہے تو اوپر کی پہاڑیوں سے اس مقام پر شیلنگ شروع ہو جاتی ہے۔ بھارتی فوجی اس طرف خود آکر چھاپہ

مارنے سے گھبراتے ہیں۔ ایک بار ہمارے دوسرے محاذ پر وہ ایسی غلطی کر بیٹھے تھے ہمارے حریت پسند مجاہد ہائیڈ آؤٹس میں پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ انڈین فوج کی پلاٹون جیسے ہی پہاڑی جنگل میں داخل ہوئی ان پر چٹانوں اور درختوں کے پیچھے سے گولیوں اور گرینڈوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ایک بھی بھارتی فوجی بچ کر نہیں گیا تھا۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"میرے ساتھ اپنا ایک کمانڈو کر دو۔ میں آج رات کو ہی یہ توپیں تباہ کرنے کے مشن پر جاتا ہوں"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کمانڈر! ایک محاذ پر ایک وقت میں صرف ایک ہی جرنیل کو لڑنا چاہئے۔ تم یہاں پیچھے رہو گے۔ کوئی مجاہد میرے ساتھ کر دینا جو ان پہاڑی راستوں سے اچھی طرح واقف ہو باقی میں سنبھال لوں گا۔ بارش بھی ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ بارش رات بھر جاری رہے ایسے خطرناک کمانڈو مشن کے لئے بارش بڑی فائدے مند ثابت ہوتی ہے۔"

نئے ہائیڈ آؤٹ میں آکر میں نے ایک بار پھر نقشے پر توپوں کی پوزیشن کا اندازہ لگایا۔ وقت یہ توپیں شیلنگ کر رہی تھیں اس وقت میں نے ایک ٹیکری پر کھڑے ہو کر ہوالے پہاڑ کی ڈھلان کا غور سے مشاہدہ کیا تھا۔ توپ جب گولا فائر کرتی ہے تو رات ت اس میں سے شعلہ نکلتا دکھائی دیتا ہے لیکن دن کے وقت صرف دھواں نکلتا یہ دن کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ پہاڑ کی ڈھال پر چار جگہوں سے گولے فائر ہو تھے۔ ان چاروں جگہوں سے فائر کے بعد دھواں نکلتا دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا توپیں پہاڑ کی چوٹی سے کافی نیچے ایک لائن میں نصب کی گئی ہیں اور ان چاروں کے

درمیان میرے حساب سے زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر گز کا فاصلہ تھا جو پہاڑی جنگل ہونے
کی وجہ سے سو گز بھی ہو سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں میں نے اپنے ذہن میں بٹھالی تھیں اور
اس کی روشنی میں نقشے پر کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کے لگائے ہوئے پنسل کے نشانات
دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے ساری پوزیشنیں ذہن میں اچھی طرح بٹھالیں تو کمانڈو لیڈر
شیروان سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اسی وقت اپنے مشن پر نکل جانا چاہیے"

کمانڈو لیڈر شیروان نے میرے ساتھ ایک کشمیری کمانڈو کر دیا جس کا اصل نام کچھ
اور تھا۔ فرضی نام میں جہانگیر بٹ رکھ لیتا ہوں۔ یہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور میری طر
جوان اور توانا تھا۔ اسی وقت رات کے نو سوا نو بجے کا ٹائم ہو گا۔ ہمارے پاس ایک ایک
سٹین گن تھی۔ آٹھ آٹھ گرنیڈ تھے۔ کمانڈو چاقو میرے پاس بھی تھا اور ایسا ہی ایک خاص
چاقو جہانگیر بٹ کے پاس بھی تھا۔ جہانگیر بٹ تمام پہاڑی علاقوں سے واقف تھا۔ جس
وقت ہم اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکلے تو رات تاریک تھی مگر بوندا باندی رک گئی تھی۔
اخروٹ اور چنار کے اونچے اونچے درختوں سے اندھیرے میں بارش کا رکا ہوا پانی ٹپ ٹپ
گر رہا تھا۔

جہانگیر بٹ مجھے ایک پہاڑی کے پیچھے سے نکال کر ایک چھوٹی سی وادی میں لے آیا
زمین بارش کی وجہ سے گیلی تھی۔ مگر جنگلی گھاس کی وجہ سے پھسلن زیادہ خطرناک نہیں
تھی۔ وادی کے درختوں کا اندھیرا ہمیں کچھ نہیں کہتا تھا۔ ہم دونوں اے ون کمانڈو تھے
اور اندھیرے میں بھی اپنا ٹارگٹ دیکھ سکتے تھے۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ اس
قسم کے کمانڈو مشن پر جاتے ہوئے خاموشی سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ صرف
انتہائی ضرورت کے وقت ہم ایک دوسرے سے ایک آدھ بات سرگوشی میں کر لیتے۔ زیادہ
تر ہم اندھیرے میں اشاروں سے کام لیتے۔

ہم وادی سے نکل گئے۔ اب وہ پہاڑ ہمارے سامنے تھا جس کی ڈھلان پر چوٹی
قریب انڈین آرمی کی کسی آرٹلری رجمنٹ نے اپنی چار میڈیم توپیں ڈپلائے کر ر

اور جو کشمیری مجاہدین کو خاص طور پر حریت پرست کمانڈوز کو سخت نقصان پہنچا رہی
۔ جہانگیر بٹ چلتے چلتے رک گیا۔ وہ جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر میرے قریب ہو کر
آواز میں بولا۔

"دوست! ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

ہم نے ایک برساتی پہاڑی نالہ عبور کیا۔ پانی ہماری پنڈلیوں تک تھا مگر بڑا تیز رفتار
دوسرے کنارے پر جنگل کا ایک کھلا تختہ آ گیا۔ یہاں کہیں کہیں عمودی چٹانیں رات
اندھیرے میں اوپر کو اٹھی نظر آ رہی تھیں۔ جہانگیر بٹ ان جنگلاتی پہاڑی راستوں کا
ی تھا۔ ہم چلتے چلتے ایک کھڈ میں اتر گئے۔ یہ کھڈ آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی تھی۔
میں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ راستہ پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ کھڈ میں ہم کافی دیر
چلتے رہے۔ اس کے دونوں کنارے دیواروں کی طرح اونچے تھے۔ کھڈ سے باہر نکلے تو
ار اور چنار کے درختوں کے جھنڈ اوپر کو جا رہے تھے۔ جہانگیر بٹ نے آہستہ سے کہا۔

"دوست! یہاں سے خطرناک ایریا شروع ہو رہا ہے۔ یہ اس پہاڑ کی
ڈھلان ہے جہاں توپیں لگی ہوئی ہیں"

میں نے کہا۔

"ان گن پوسٹوں کی گشتی پارٹیاں بھی رات کو ضرور گشت پر ہوں گی۔"

جہانگیر بٹ نے آہستہ سے کہا۔

"ہمیں ان سے بھی ہوشیار رہنا ہو گا۔"

چیڑھ کے درختوں کا جنگل پہاڑ کی ڈھلان پر ذرا اوپر جا کر اچانک ختم ہو گیا۔ اب
لان پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں میں نے اندھیرے میں ایک جگہ رک کر اوپر دیکھا۔
ہی پہاڑی ڈھلان تھی جہاں میں نے شروع رات میں توپوں کو فائر کرتے دیکھا تھا۔ مگر
ائی کافی بلندی تک چلی گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے درمیان پانچ پانچ گز کا فاصلہ
ا کر جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ یہاں گن پوسٹوں کی گشتی
ا کا کوئی بھی ڈوگرہ فوجی ہمیں مل سکتا تھا۔ ہم بڑی احتیاط کے ساتھ بغیر آواز پیدا کئے

آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں اندازے سے دشمن کی توپوں کے بنکروں کو پوائنٹ آؤٹ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جب ہم تقریباً پہاڑ کی آدھی چڑھائی چڑھ گئے تو میں نے جہانگیر بٹ کو اپنے منہ سے ایک پرندے کی ہلکی سی آواز نکال کر روک دیا۔ وہ وہیں جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں ٹیک کر چلتا اس کے پاس گیا اور سرگوشی میں کہا۔

"مجھے سگریٹ کے تمباکوں کی بو محسوس ہوئی ہے"

جہانگیر بٹ نے سانس دو تین بار اوپر کھینچ کر فضا کو سونگھا اور آہستہ سے بولا۔

"لگتا ہے گن پوسٹ کی پٹرول پارٹی کے آدمی آس پاس ہی کہیں ہیں"

سگریٹ کی بو بہت ہلکی تھی۔

اسے ایک کمانڈو ہی فضا میں سونگھ سکتا تھا۔ بو مسلسل نہیں آرہی تھی۔ اس کی ایک ی سی لہر ہمارے قریب سے ہو کر گذر گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے جھاڑیاں گیلی تھیں۔ وہیں بیٹھ گئے۔ پھر میں نے جہانگیر بٹ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ جلدی سے مجھ سے دس م کے فاصلے پر بائیں جانب ہو کر جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ میری ناک فضا میں سگریٹ کی بو تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جہانگیر بٹ کمانڈو کے کان میں یہ کہا تھا کہ اگر گشتی پارٹی ، ڈوگروں کی دو دو چار چار کی ٹولی ادھر آئے تو اسے گذر جانے دینا۔ ہمیں خوا مخواہ ان مانڈو اٹیک کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ اگر ہم ان پر جھپٹے تو ن کے دو فوجیوں کی تو چشم زدن میں گردن توڑ دیں گے لیکن اگر تیسرے فوجی نے بھی فائر کر دیا تو اوپر گن پوسٹ پر دشمن بیدار ہو جائے گا اور ہمارا مشن بھی ساتھ ہی م ہو جائے گا۔

ہم دس پندرہ منٹ تک جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ دوبارہ نہ تمباکو کی بو آئی نہ ہی دشمن کی گشتی پارٹی کا کوئی فوجی ادھر سے گذرا۔ میں دبے پاؤں چل کر جہانگیر کے پاس گیا اور اسے بھی کہا کہ ہمیں مزید اوپر چلنا ہو گا۔ چڑھائی دشوار گذار تھی۔ ہم اپنی ٹریننگ کے مطابق آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے درمیان تھوڑا فاصلے ڈالے چڑھتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دور اوپر گئے تو چھوٹے چھوٹے درختوں نے ہمارا راستہ

روک لیا۔ ہم کبھی کسی درخت کے بائیں طرف سے اور کبھی دائیں جانب سے ہو کر چڑھائی چڑھتے گئے اور کوشش کر کے اپنی سمت کو برقرار رکھا۔

اچانک ہمیں انسانی آوازیں سنائی دیں۔ ہم وہیں اپنی اپنی جگہ پر دبک گئے۔ دو آدمی باتیں کرتے آ رہے تھے۔ یہ گشتی پارٹی کے ڈوگرہ سپاہی ہی ہو سکتے تھے۔ آوازیں قریب آئیں تو سگریٹ کی بو بھی آئی۔ گشتی پارٹی کو پٹرول ڈیوٹی پر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ڈوگرے سگریٹ پی رہے تھے۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ سگریٹ مٹھی میں چھپا کر پی رہے ہیں کیونکہ جس طرف سے آوازیں آ رہی تھیں اس طرف مجھے سگریٹ کی چمک ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی۔

دونوں ڈوگرہ سپاہی اپنے کسی کمانڈنگ آفیسر کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ میں جھاڑی کے پیچھے بیٹھے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ درختوں کے درمیان مجھے دو سائے دکھائی دیے جو ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے سانس روک لی کمانڈو جہانگیر بٹ نے بھی سانس روک لیا ہو گا۔ رات کے اندھیرے میں ڈوگرہ سپاہی ہمارے سامنے سے ہمارے درمیان سے گذر گئے۔ وہ جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر پہاڑ کے پہلو میں سے ہو کر جا رہے تھے۔ نہ وہ چڑھائی چڑھ رہے تھے نہ ڈھلان پر نیچے اتر رہے تھے۔ جب وہ دور چلے گئے اور ان کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں تو جہانگیر بٹ جھاڑیوں سے نکل کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہم ٹارگٹ کے قریب پہنچ گئے ہیں"

میں نے اسے کہا۔

"اوپر چار توپیں لگی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کا درمیانی فاصلہ ساٹھ ستر گز سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ایک گن پوسٹ پوائنٹ آؤٹ ہو جائے تو وہ میرا ٹارگٹ ہو گا۔ تم اس کے متوازی دوسری گن پوسٹ پر اٹیک کرو گے"

ہم نے اپنے پاس جو آٹھ آٹھ گرنیڈ اور ایک ایک سٹین گن رکھی ہوئی تھی

انتہائی مجبوری کا اسلحہ تھا۔ یعنی یہ اس وقت استعمال کرنا تھا جب دوسرا کوئی چارہ کار نہ رہا ہو۔ وگرنہ ہمارا مشن ایک خاموش کمانڈو مشن تھا۔ ہمیں چار گن پوسٹوں پر اس طرح حملہ کرنا تھا کہ مورچے میں موجود ڈوگرہ فوجیوں کو مشین گن فائر کرنے کی مہلت نہ مل سکے۔ ہم دشمن کو خاموشی سے چیتے کی طرح جھپٹ کر آناً فاناً ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ اگر ایک گن پوسٹ کی مشین گن فائر ہوتی ہے تو دوسرے پوسٹ کے سپاہی ایک دم فائر کھول سکتے تھے۔ اس طرح ہماری سکیم کے ناکام ہو جانے کا خطرہ تھا۔

میں نے اندھیرے میں پہاڑی کے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر بٹ سے کہا۔

"میرے حساب کے مطابق ایک گن کو اسی جگہ ہونا چاہئے۔"

اچانک چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ ہم نے سر نیچے کر لئے۔ دشمن کو شاید شک پڑ گیا تھا کہ کشمیری کمانڈو پارٹی اٹیک کرنے آ رہی ہے یا پھر اس نے احتیاط کے طور پر ایک ساتھ تین روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے تھے۔ یہ روشنی راؤنڈ ایسے تھے کہ جن کے ساتھ پیراشوٹ بندھے ہوئے تھے۔ روشنی کے گولے آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ ساری وادی روشن ہو گئی تھی۔ میری نگاہیں اوپر لگی ہوئی تھیں۔ پہلا روشنی راؤنڈ پیراشوٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ نیچے آ کر درختوں میں غائب ہو گیا۔ دوسرے روشنی راؤنڈ میں بھی میں اوپر نہ دیکھ سکا۔ تیسرا روشنی راؤنڈ فائر ہوا تو اچانک مجھے اوپر جھاڑیوں میں سے ایک گن کی نالی باہر نکلی ہوئی نظر آ گئی۔ میں نے جہانگیر بٹ کا کندھا ہلا کر اشارے سے اوپر گن کی نالی یا بیرل دکھایا۔ اس نے خوش ہو کر آہستہ سے کہا

"دوست! یہ میڈیم گن کی نالی ہے"

"یا اللہ! یہ تیرا کرم ہے"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ روشنی راؤنڈ بجھ گئے تھے۔ وادی اور پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر ایک بار پھر تاریکی چھا گئی تھی۔ دشمن نے روشنی راؤنڈ کی روشنی میں ہمیں تو نہیں دیکھا تھا مگر ہم نے دشمن کی چار توپوں میں سے ایک توپ کو دیکھ لیا تھا۔ ہم نے اس توپ کے رخ کی جانب چڑھائی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ہم اس طرح چڑھائی چڑھ رہے تھے

جس طرح کوئی چیتا یا شیر اپنے شکار کو دیکھ کر دبے پاؤں اپنے جسم کو سکیڑ کر اس کی طرف آواز کئے بغیر بڑھتا ہے۔ ہم سانس بھی بڑی آہستہ سے لے رہے تھے۔ ہم توپ کے بنکر کے قریب آگئے تھے مگر ہمیں پتہ نہیں تھا۔ پتہ اس وقت لگا جب اچانک گن پوسٹ کے بنکر میں سے کسی سپاہی نے دوسرے کو آواز دی اور اسے کچھ کہا جو ہماری کچھ میں نہ آسکا۔ یہ آواز سنتے ہی ہم نے اندھیرے میں اپنے اپنے کمانڈو چاقو نکال لئے۔ گرنیڈ ہماری جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ سٹین گن کو ہم نے پیٹھ پر اس طرح ڈال رکھا تھا کہ چلتے وقت اس کی ہلکی سی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ چاقو نکالتے ہی میں نے جہانگیر بٹ کو گن پوسٹ کی دائیں جانب اوپر جانے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں الگ الگ ہو کر اوپر رینگنے لگے۔ چڑھائی پر رینگنا ہمت طلب کام تھا اور ہمت ہمارے پاس موجود تھی۔ فاصلہ ڈال کر جھاڑیوں کی جڑوں کو پکڑ پکڑ کر اوپر کی طرف رینگ رہے تھے۔

تاریکی میں مجھے اوپر کوئی دس پندرہ گز کے فاصلے پر میڈیم گن کی نالی بنکر سے باہر نکلی ہوئی نظر آئی۔ یہ نالی جہانگیر بٹ نے بھی ضرور دیکھ لی ہوگی۔ کیونکہ وہ میرے متوازی مجھ سے سات گز کے فاصلے پر اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ ہم جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اس طرح رینگ رینگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ اس کام کی ہمیں سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ میں توپ کی نالی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ یہ ایک پکا بنکر نما مورچہ تھا جس کے اوپر گنبد سا بنا ہوا تھا۔ کمانڈو جہانگیر بٹ بنکر کی دوسری طرف نکل گیا۔ میں بائیں جانب بنکر کی دیوار کے ساتھ لگ کر رینگتا ہوا آگے ایک چھوٹے سے چبوترے پر آگیا۔ گن پوسٹ کا راستہ پیچھے کی جانب تھا۔ یہاں بنکر میں مجھ سے کوئی ایک فٹ اوپر دو سوراخ تھے۔ یقیناً یہاں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ سوراخ چوکور تھے۔ تاریکی میں مجھے مشین گن کی نالی نظر نہیں آئی تھی۔

میں سانپ کی طرح چبوترے کے پتھروں پر رینگ رینگ کر مورچے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں مجھے ایک اور گول سوراخ نظر آیا۔ اس میں سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے گردن اونچی کر کے سوراخ کے ساتھ اپنی

آنکھیں لگا دیں۔۔ اندر ایمونیشن کے بکسوں پر تین فوجی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہاں سردی زیادہ تھی اور ہوا بھی سرد چل رہی تھی۔ وہ تمام چینی کے مگ ہاتھوں میں لئے پائے پی رہے تھے۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ گردن نیچی کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر سکیم ے مطابق بنکر کے عقب میں ایک جانب جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری رف جو جھاڑیاں تھیں ان کی طرف ایک سائے کو رینگ کر بڑھتے دیکھا۔ یہ میرا ساتھی مانڈو جہانگیر بٹ تھا۔ وہ بھی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ سکیم کے مطابق میں نے ایک چھوٹا اپتھر اٹھا کر آہستہ سے بنکر کے گنبد کے اوپر اچھال دیا۔ پتھر نے سیمنٹ کے گنبد پر گرنے ے آواز پیدا کی۔ بنکر کے اندر کچھ تیز تیز آوازیں آئیں۔ پھر ایک سپاہی بنکر کے روازے سے نکل کر باہر آگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے چلنے کے انداز ے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بات اس کے ذہن میں نہیں ہے کہ وہاں کوئی کشمیری کمانڈو بھی سکتا ہے۔ وہ غالباً یہی سمجھ رہا تھا کہ درخت کے اوپر سے کوئی شاخ یا پھل ٹوٹ کر بنکر کی ت پر گرا ہے۔ پھر بھی وہ محتاط ضرور تھا۔ وہ بنکر کی دوسری طرف گھوم کر کھڑا ہو گیا۔ ا نے آواز دی۔

"ادھر کون ہے؟"

اس دوران میں جھاڑیوں کے پیچھے سے رینگتا ہوا اس کے عقب میں آگیا تھا۔ میں پ کی طرح رینگ کر ڈوگرہ سپاہی کے عقب میں آیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سانپ کے ینگنے کی آواز پیدا ہو سکتی تھی مگر میری معمولی سی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری ھیں اپنے شکار پر جم گئی تھیں۔ اب ایک لمحہ آنے والا تھا۔ وہ لمحہ ایک سیکنڈ کا رواں حصہ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک سیکنڈ کا ایک سوواں حصہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے دہ دیر لگانا مجھے میرے استاد کمانڈو کمال شاہ نے نہیں سکھایا تھا۔

آخر وہ لمحہ آگیا۔ جیسے ہی ڈوگرہ اپنے بنکر کی طرف مڑ کر جانے لگا میں اس پر چھلانگ لر اس کی گردن اپنے دائیں بازو کے شکنجے میں لے کر بائیں ہاتھ والا چاقو اس کی گردن پوری طاقت سے پھیر چکا تھا۔ چاقو کے پھیرتے ہی میں نے اسے وہیں زمین پر لٹا کر اس

کے حلق پر اپنا پاؤں رکھ کر دبایا تاکہ اس کے نرخرے میں سے سانس نکلنے کی آواز پیدا نہ ہو۔ اس آپریشن میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا۔ ڈوگرہ فوجی کی لاش بنکر کے عقب میں زمین پر پڑی تھی۔ میں اس کی لاش کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا جھاڑیوں میں لے گیا۔ اور نظریں ایک بار پھر بنکر کے دروازے پر لگادیں۔ کوئی دس پندرہ سیکنڈ کے بعد ایک اور ڈوگرہ سپاہی بنکر کے دروازے پر آگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ سلنگ کے ساتھ اس کے کاندھے سے لٹک رہی تھی۔

اس دوسرے ڈوگرے نے پہلے ڈوگرے کا نام لے کر اسے گالی دی اور پھر پوچھا کہ وہ کدھر مرگیا ہے۔ جب اس کے مرے ہوئے ساتھی نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو وہ میری طرف آنے کے بجائے دوسری طرف چلا جدھر جھاڑیوں میں میرا ساتھی کمانڈو جہانگیر بٹ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس دوسرے ڈوگرہ سپاہی کو جہانگیر بٹ والی جھاڑیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھاگئی۔ میں جہانگیر بٹ کی تربیت کے کمال پر اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنا کام کرچکا تھا۔ سکیم کے مطابق اسے دوسرے ڈوگرے کو ہلاک کرنے کے بعد میرے پاس آجانا تھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ جھاڑیوں میں سے نکل کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔ یہ کمانڈو جہانگیر بٹ تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کمانڈو نائف کھلا ہوا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے گھاس پر چاقو کو رگڑ کر ڈوگرہ فوجی کا خون صاف کیا اور سرگوشی میں کہا۔

"اندر صرف ایک ہی ہے"

"ہاں---"

میں نے بغیر آواز کے سرگوشی میں جواب دیا۔ ہم دونوں کی نگاہیں بنکر کے دروازے پر لگی تھیں جس پر نمدہ گرا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہلکی روشنی تھی۔ میں نے جہانگیر بٹ اشارہ کیا۔ ہم دونوں الگ الگ ہو کر گیلی گھاس پر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے بنکر کی طرف بڑھے اور پھر اس کے دروازے کی دونوں جانب بنکر کی پختہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوئے۔ کھلے چاقو ہم دونوں کے ہاتھوں میں تھے۔ بنکر کے اندر جو کوئی بھی ڈوگرہ فوجی آ

رہ گیا تھا اسے اپنے دو ساتھیوں کے لئے باہر نکلنا ہی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسے ہی اس نے دروازے پر پڑا ہوا نمدا اٹھایا۔ ہم نے اسے وہیں دبوچ لیا۔ اس کا کام تمام کرنے کی بجائے اسے ہم اندر بنکر میں لے گئے اور اسے سے پوچھا کہ باقی کی تین گن پوسٹیں کہاں ہیں۔ وہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں چاقو اور سٹین گنیں اور سرپر بندھے ہوئے سیاہ رومال دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ ہم کشمیری حریت پرست مجاہد ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے نہ مارنا"

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اسے دوسری تین گن پوزیشنوں کا پتہ نہ ہو اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم اس سے اپنا مطلب حاصل کئے بغیر مار ڈالتے۔ تھوڑے سے ٹارچر کے بعد اس نے باقی کی تینوں گن پوسٹوں کی نشان دہی کر دی۔ یہ گن پوسٹیں میرے اندازے کے عین مطابق وہاں سے متوازی لائن میں پچاس پچاس گز کے فاصلے پر تھیں۔ اس کے بعد ہم اسے مورچے سے نکال کر باہر لے آئے میں نے اسکی گردن کو ایک جھٹکا دیا اور اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ مورچے کے اندر مشین گن بھی لگی ہوئی تھی۔ میڈیم گن کے ایمونیشن کے چھ سات بکس بھی پڑے تھے۔ دوسرے اسلحہ کے بکس بھی تھے۔ اس ڈوگرہ فوجی سے ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ نیچے جو پٹرول گشت کر رہی ہے وہ کس پوسٹ کی ہے اس نے بتایا تھا کہ وہ تیسری گن پوسٹ کی ٹیم ہے۔

وہاں سے ہم دوسری گن پوسٹ کی طرف چل پڑے۔ وہ بھی ہمیں مل گئی جو وہاں سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر بائیں جانب تھی۔ رات کے اندھیرے اور خاموشی میں ہم اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے۔ یہ توپ بھی پختہ بنکر کے مورچے میں تھی۔ باہر سناٹا طاری تھا۔ دروازے پر نمدا لٹک رہا تھا۔ توپ کا بیرل باہر نکلا ہوا تھا۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے بنکر کے ایک سوراخ میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ دیکھ لیا کہ اندر دشمن کے چار فوجی موجود تھے۔ یہاں ہمیں کسی کو باہر نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں اپنی مطلوبہ معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ ہم سٹین گنیں لے کر ایک دم سے بنکر میں داخل ہوئے اور جاتے ہی فائر کھول دیا۔ چاروں فوجی خون میں لت پت ادھر ادھر

گرتے ہوئے تڑپنے لگے۔ یہاں سے ہم تیسری گن پوزیشن پر گئے۔ وہاں بھی ہمیں اسی
طرح چارج کر کے اندر موجود ڈوگرہ فوجیوں کو ہلاک کرنا تھا مگر ہم بنکر کے دروازے پر ہی
پہنچے تھے کہ گشتی ٹیم کے فوجی اچانک ایک طرف سے نکل آئے انہوں نے ہمیں للکارا۔
ہم نے فائر کھول دیا۔ بنکر کے اندر سے بھی فوجی مشین گنیں لے کر باہر نکل آئے۔

اب ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم نے اوپر تلے تین گرنیڈ پھینکے۔ تین
دھماکے ہوئے اور پٹرول پارٹی کے فوجیوں اور بنکر میں سے باہر نکل کر جو سپاہی آئے تھے
ان کے پرخچے اڑ گئے۔ گرنیڈ کے دھماکوں نے چوتھی گن پوسٹ کے سپاہیوں کو چوکنا کر
دیا۔ وہاں سے روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے اور ساتھ ہی ہم پر گولیوں کی بوچھاڑیں آئیں۔
ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ پہاڑوں میں روشنی راؤنڈ کے فائر ہونے سے دن نکل آیا تھا۔ میں
نے جہانگیر بٹ کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑ کر گن پوسٹ کے دروازے پر گیا اور ایک طرف لیٹ
کر اس نے اندر پن نکال کر دو گرنیڈ لڑھکا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں پیچھے کی
جانب جھاڑیوں میں بھاگنے لگے۔

ہم بمشکل تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ گن پوسٹ میں دو دھماکے ہوئے۔ یہ ہمارے
دو گرنیڈوں کے دھماکے تھے مجھے تیسرے خوفناک دھماکے کا انتظار تھا جو بنکر کے اندر توپوں
کے ایمونیشن کے پھٹنے سے ہونا تھا۔ بنکر کے دروازے کا پردہ اڑ گیا تھا۔ اندر سے دھواں
نکل رہا تھا۔ میں نے جہانگیر سے کہا۔

"دوسری اور پہلی گن پوسٹوں کی طرف ڈبل سے۔۔۔"

مجھے معلوم تھا کہ ابھی گن پوسٹ کے اندر سے ایمونیشن پھٹنے والا ہے۔ ہم دوسری
گن پوسٹ کے بنکر کی طرف اندھیرے میں دوڑ پڑے چوتھی گن پوسٹ کی طرف سے
برابر فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں ہمارے اوپر سے گذر رہی تھیں۔

پھر ایک دھماکہ ہوا۔ یہ ایسا دھماکہ تھا کہ پہاڑ ہل گیا۔ ہم ہوا کے شدید دباؤ سے تین
چار گز آگے گر پڑے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گن پوسٹ کے بنکر میں سے آگ کے
شعلے اٹھ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دھماکے جاری تھے۔ ہم اٹھ کر دوسری گن پوزیشن

ر آئے۔ یہاں بھی دو گرنیڈ بنکر کے اندر ڈالے اور جتنی تیز دوڑ سکتے تھے پہلی گن پوزیشن
ی طرف دوڑنے لگے۔ ہم ابھی آدھے راستے میں تھے کہ ایک بھیانک دھماکے نے ساری
ہاڑی علاقے کو لرزا دیا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے تھے۔ دوسری گن بھی صاف ہو گئی تھی۔
ب ہم پہلی گن پوزیشن میں آئے۔ اس کا بنکر بھی خالی پڑا تھا۔ روشنی راؤنڈ بار بار آسمان
ر زمین کو روشن کر رہے تھے۔ ہمیں پہلی گن پوزیشن صاف نظر آ رہی تھی۔ ہم نے
ں بنکر میں گرنیڈ پھینکے اور دوڑ کر ایک جھاڑی کے پاس زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔
ہاں کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کمانڈو جہانگیر بٹ سے کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔ گرنیڈ نہیں چلے۔"

ہم اٹھے اور پہاڑی بکروں کی طرح ڈھلان کی جھاڑیوں میں چھوٹی چھلانگیں
اتے نیچے اترنے لگے۔ ہم جھاڑیوں یں الجھ رہے تھے۔ گر رہے تھے مگر اترائی اترتے
لے جا رہے تھے۔ چوتھی گن پوسٹ کی طرف روشنی راؤنڈ چھوڑے جا رہے تھے۔ مشین
ن کی فائرنگ بھی برابر ہو رہی تھی۔ اتنے میں اوپر بڑا زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بجلی
ا چمک گئی اور بنکر کی اینٹیں اور پتھر ہمارے آگے جا کر گرے۔ ہمارے دونوں گرنیڈوں
نے کچھ دیر بعد بلاسٹ ہو کر ایمونیشن کے بکس اڑا دیئے تھے۔ ساتھ ہی گن پوسٹ بھی
ڑ گئی تھی۔

اچانک چوتھی توپ گرج اٹھی۔ اس نے گولا باری شروع کر دی۔ مگر اس کے گولے
ے اوپر سے گذر کر نیچے وادی اور پہاڑیوں پر گر کر پھٹ رہے تھے۔ ہم راستہ بدل کر
ری طرف ہو گئے۔ کمانڈو جہانگیر بٹ آگے آگے تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان سے اتر کر ہم ذرا
ا لینے کے لئے ایک جگہ بیٹھ کر اوپر دیکھنے لگے۔ روشنی راؤنڈ فائر ہونا بند ہو گئے
۔ چوتھی توپ برابر تھوڑے وقفے کے ساتھ شیلنگ کر رہی تھی۔ اوپر چوٹی کے
ے پہاڑی ڈھلان پر تین جگہوں سے جہاں گن پوزیشنیں تھیں وہاں سے ابھی تک
ں اور شعلے اٹھ رہے تھے۔ چھوٹے اسلحہ کے پھٹنے کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔
ڈ جہانگیر بٹ نے کہا۔

"دوست! ایک گن پوزیشن تباہ ہونے سے بچ گئی"

میں نے کہا۔

"یہ گن اب یہاں نہیں رہے گی۔ اسے یہاں سے ہٹا دیا جائے گا۔ فکر نہ کرو"

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے وادی میں واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ جب ہم وادی سے نکل کر کھڈ میں اترنے لگے تو چوتھی توپ کی گولا باری رک گئی تھی۔

جب ہم کھڈ میں سے گزرتے ہوئے باہر نکلے تو پیچھے مڑ کر ایک نگاہ پہاڑ کی طرف ڈالی۔ تباہ شدہ توپوں کی تینوں پوزیشنوں میں موت کی خاموشی طاری تھی۔ ان میں سے دھواں ضرور اٹھ رہا ہو گا جو رات کی تاریکی میں ہمیں دکھائی نہ دیا۔ ہم اب بڑے اطمینان سے رات کی تاریکی میں چنار، چڑھ اور اخروٹ کے درختوں کے درمیان سے ہو کر اپنے چٹانوں والے خفیہ ٹھکانے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جس وقت ہم اپنے اڈے پر پہنچے تو کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان نے اور ہمارے دوسرے کمانڈو مجاہدوں نے مسکراتے چہروں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ایک کشمیری مجاہد نے نعرہ لگایا۔

"ہم پہلا دھماکہ سن کر ہی باہر نکل آئے تھے دشمن کے روشنی راؤنڈ نے ان کی تباہی کے منظر کو نمایاں کر کے ہمیں دکھایا۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ تیسری گن پوسٹ کو ہم تباہ نہ کر سکے۔ ہم سے ذرا سی غلطی ہو گئی بنکر کے باہر ایک فوجی گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ہم اندھیرے میں اسے دیکھ نہ سکے۔ اس نے برسٹ مارا تو ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔"

کمانڈو شیروان نے بھی میری بات دہراتے ہوئے کہا۔

"یہ اکیلی گن وہاں سے ہٹالی جائے گی"

ایک کشمیری مجاہد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے تباہ شدہ پوزیشنوں پر پھر سے گنیں نصب کر دی جائیں کمانڈو شیروان نے ہاتھ کا مکا بناتے ہوئے کہا۔

خدا کی قسم دشمن دس بار وہاں گنیں لگائے گا ہم دس بار اپنی جان کی بازی لگا کر انہیں تباہ کر دیں گے۔ تباہ کرتے رہیں گے۔"

ہم چٹان کے اندر جو قدرتی غار تھا وہاں بیٹھے تھے۔ غار کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے نج اٹھی۔

دوسرے روز ہم نے اپنی یہ کمیں گاہ بدل دی اور دیودار کے جنگل والی پہاڑیوں میں ، خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں آ گئے۔ یہاں ہمارے کچھ کشمیری عسکریت پرست مجاہد پہلے سے ود تھے۔ کمانڈو لیڈر شیروان ان کا کمانڈر تھا۔ یہ جگہ مقبوضہ کشمیر میں موجود بھارتی ں فورس کی مین سپلائی لائن والی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ سری نگر شہر کے سان کشمیریوں پر بھارتی فوجی بے پناہ ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ ذرا سے شک پر کشمیری مانوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دیا جاتا۔ فائرنگ کر کے نہتے شہریوں کو شہید کر دیا ۔ اس کے جواب میں ہمارے کشمیری حریت پرست مجاہد بھی گھات لگا کر بھارتی فوجیوں ملے کر کے انہیں جہنم میں پہنچا رہے تھے۔ ہمارا کام اپنے حریت پرست کشمیری مجاہدین ، ذرا مختلف تھا۔ یہ مجاہد محاذ پر بلکہ میدان میں آ کر آزادی کشمیر کی جنگ لڑ رہے تھے ب کہ ہم میدان جنگ کے پیچھے رہ کر دشمن کی فوجی تنصیبات کو تباہ کرتے۔ فوجی ائیوں پر گھات لگا کر اٹیک کرتے اور ایمونیشن اور سپلائی کے ٹرکوں کو راکٹ لانچروں ، اڑا دیتے ہمارا ایکشن کمانڈو ایکشن تھا۔ ہمارا ایک کامیاب کمانڈو ایکشن دشمن کی فوج ایک بریگیڈ کی تباہی جتنا نقصان پہنچاتا تھا۔

نئی پناہ گاہ (ہائیڈ آؤٹ) میں آنے کے بعد کشمیری کمانڈو لیڈر اور ہمارا کمانڈو شیروان ، دوپہر کے وقت ایک خفیہ جگہ پر لے گیا۔ یہ جگہ ایک پہاڑی کے شگاف میں زمین د کر زمین کے نیچے تھی۔ یہاں کمانڈو ایکشن میں کام آنے والے نقشے، دور بینیں اس اور ایک دو انتہائی سیکریٹ فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان سیکرٹ فائلوں میں اپنے وسوں کی فراہم کردہ رپورٹیں تھیں جن میں کشمیر میں موجود بھارتی فوجوں کی مختلف ٹوں کے کمانڈروں کے نام حلیے اور بعض کی تصویریں بھی تھیں۔ یہ ایک چھوٹی

سے کوٹھڑی تھی جس کی دیوار کے طاق میں بیٹری سے روشن ہونے والی ایک لالٹین روشن تھی۔ کمانڈو شیروان نے یہ لالٹین لکڑی کے بکس کے اوپر رکھ دی۔ اس بکس کے اردگرد چار سٹول پڑے تھے۔ ہم سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان نے ایک نقشہ کھول کر بکس پر پھیلا دیا۔ یہ درمیانے سائز کا نقشہ تھا جو سفید کاغذ پر ہاتھ سے بنایا گیا تھا۔ اس پر جگہ جگہ نیلے اور سرخ رنگ کے نشان لگے تھے۔ کمانڈو شیروان نے نقشے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے بھائی! یہ ہندوستان کی تین جنوبی ریاستوں کا نقشہ ہے۔ تامل ناڈو، راجستھان اور آندھرا پردیش کیا تمہیں بھارت کے ان صوبوں میں جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں نے انکے نام ضرور سن رکھے ہیں مگر یہاں گیا کبھی نہیں"

کمانڈو شیروان نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔

"یہ بھارت کے شمال مغربی صوبے راجستھان کا ایک اہم مقام بلارا ہے----"

ابھی کمانڈو شیروان نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ اچانک دو کشمیری کمانڈو اندر داخل ہوئے۔ ایک اٹن شن ہو کر رائفل لئے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا کشمیری زبان میں بڑے تیز تیز لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ کمانڈو شیروان ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"

ہم زیر زمین تہہ خانے سے جلدی جلدی باہر نکل آئے۔ کمانڈو شیروان نے اپنے باڈی گارڈ سے اردو میں پوچھا۔

"کمانڈو جہانگیر بٹ کہاں ہے؟"

اس نے سینے سے لگائی مشین گن پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"کمانڈو! جہانگیر بٹ پڑال کے مجاہدین کے مورچے میں ہی ہے"

میں نے کمانڈو شیروان سے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی ہے کمانڈر؟"

اس وقت ہم اپنی ہائیڈ آؤٹ کے باہر چنار کے بہت بڑے درخت کے نیچے کھڑے ۔ کمانڈو شیروان نے غصے میں اس طرح سانس لیا کہ اس کے منہ سے پھنکار کی سی ز نکلی۔ کہنے لگا۔

"پڑال کے پہاڑی گاؤں میں بھارتی فوجیوں نے حملہ کر کے مکانوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ چار مجاہد شہید ہو گئے ہیں۔ بھارتی فوجی ایک کشمیری مجاہد اور گاؤں کی دو مسلمان لڑکیوں کو پکڑ کے لے گئے ہیں"

اتنے میں کمانڈو جہانگیر بٹ بھی آگیا۔ کمانڈو شیروان نے اس سے پوچھا۔

"بھارتی فوجی ہماری لڑکیوں کو لے کر کہاں گئے ہیں؟"

جہانگیر بٹ کہنے لگا۔

"مجھے جو اطلاع ملی ہے اس کے مطابق سپاہی ہمارے ایک مجاہد اور گاؤں کی دو لڑکیوں کو اچھو ٹیکری والے فوجی کیمپ کی بیرکوں میں لے گئے ہیں"

کمانڈو شیروان کے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ نے اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے دباتے ہوئے جہانگیر بٹ سے کہا۔

"اسی وقت اچھو ٹیکری والی بھارتی فوجی کیمپ کی بیرکوں میں جاؤ اور اپنے مجاہد اور دونوں لڑکیوں کو وہاں سے نکال کر لاؤ۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ گے۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو، جاؤ"

یہ کہہ کر کمانڈو لیڈر شیروان ہائیڈ آؤٹ کے اندر چلا گیا۔ جب میں اور کمانڈو جہانگیر ی تیاری کر کے ہائیڈ آؤٹ کے آگے سے گذرے تو ہمیں کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان ندر سے آتی تیز تیز آواز سنائی دی۔ وہ ٹرانسمیٹر پر اپنی زبان میں کسی سے غصے میں بات

کر رہا تھا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے ہائیڈ آؤٹ کے آگے سے گذر گئے۔ جہانگیر بٹ نے بھارتی فوجی کیمپ کی بیرکیں دیکھی ہوئی تھیں۔ ہم ایک آسان پہاڑی راستے سے گذر کر آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسی ٹیلے کے دامن میں پہنچ گئے جہاں یہ فوجی کیمپ تھا۔ ہم سامنے والے ٹیلے کے نشیب میں آگئے۔ جہانگیر بٹ کا خیال تھا کہ یہاں نشیب میں کوئی مشین گن کا مورچہ ضرور ہو گا۔ ہم نے اچھی طرح دیکھا کہ وہاں کوئی مشین گن پوسٹ نہیں تھی۔ اصل میں یہاں بھارتی فوج کی زیادہ نفری نہیں تھی۔ یہ ایک طرح کا ٹرانزٹ کیمپ تھا۔ آمنے سامنے دو پکی بیرکیں تھیں۔ درمیان میں ایک طرف ایک فوجی ٹرک اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک سنتری ان کے قریب ہی پہرہ دے رہا تھا۔ ہمیں کشمیری مجاہد اور کشمیری لڑکیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے جہانگیر بٹ سے پوچھا۔

”کہیں ہم غلط ٹارگٹ پر تو نہیں آگئے؟“

جہانگیر بٹ نے کہا۔

”نہیں۔ ہمارے جاسوس نے گرفتار کشمیری مجاہد کی جیپ کو اسی کیمپ میں جاتے دیکھا ہے۔ دونوں دیہاتی کشمیری لڑکیاں بھی اسی جیپ میں تھیں۔“

ہم جھاڑیوں کے پیچھے چلتے بیرکوں کے اوپر نشیب میں ایک ایسی جگہ پر آگئے جہا سے ہمیں کیمپ کے باہر مشین گن پوسٹ صاف نظر آئی۔ جہانگیر بٹ کہنے لگا۔

”میں بیرک کی دوسری طرف جا کر دیکھتا ہوں“

وہ جانے ہی لگا تھا کہ سامنے والی بیرک سے دو سنتری ایک کشمیری نوجوان اور لڑکیوں کو لے کر باہر نکلے۔ لڑکیوں کے ہاتھ کھلے تھے کشمیری مجاہد کے ہاتھ پیچھے بند تھے۔ جہانگیر بٹ نے آہستہ سے کہا

”یہ ہمارا مجاہد وانی ہے۔ لڑکیاں اس کے گاؤں کی ہیں۔ یہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں“

میری نظریں بھارتی فوجیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ قیدیوں کو سامنے والی بیرک لے گئے۔ جہانگیر بٹ نے مجھے اشارہ کیا۔ یہ اشارہ ایکدم سے اٹیک کرنے کا تھا۔ ہم

ی سکیم بنائی تھی۔ کہ اچانک گرنیڈوں سے حملہ کر کے سٹین گنوں کے فائر کی بوچھاڑ
کیمپ میں افراتفری پھیلائی جائے اور اپنے آدمیوں کو نکال کر لے جائیں۔ ہمارے
بارہ بارہ گرنیڈ تھے۔ اچانک کیمپ میں دھماکہ ہوا۔ یہ مارٹر گولے کا دھماکہ تھا جو کیمپ
عین درمیان میں ان فوجیوں پر گر کر پھٹا تھا جو بیرک سے باہر آ رہے تھے۔ ان کے
خچے اڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی کیمپ پر مارٹر گولے برسنے لگے۔ اور پوسٹ تباہ ہو گئی
گیر بٹ بولا۔

”ہمارے مجاہد سامنے والی ٹیکری پر پہنچ گئے ہیں یہ اچھا ہوا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ ہمارے پہلے دو گرنیڈ
ن گن پوسٹ پر گر کر پھٹنے اور پوسٹ تباہ ہو گئی۔ بیرکوں میں سے بھارتی فوجی گولیاں
رتے اور سٹین گنوں کی بوچھاڑ میں مارتے نکل آئے۔ مگر مجاہدین کی مارٹر گن کا فائر
ل آ رہا تھا۔ انڈین فوجی فائرنگ کرتے عقبی بیرک کی طرف دوڑے۔ وہ ہماری زد میں
۔ ہم نے سٹین گن کے برسٹ فائر کر کے انہیں خاک اور خون میں نہلا دیا۔ سامنے
ے ٹیلے کی جانب سے مجاہدین کے اللہ اکبر کے نعرے گوج اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی
ین کو ہم نے ٹیلے کی نشیب سے دوڑ دوڑ کر نیچے کیمپ کی طرف آتے دیکھا۔ اتنی دیر
یمپ کی انڈین فوج کی نفری نے پوزیشنیں سنبھال لیں تھیں۔ جب ہم نے ان پر پیچھے
ولیاں برسائی شروع کر دیں تو وہ ایک دوسرے اوپر گرنے لگے۔

اب ہم بھی ڈھلان سے اتر کر کیمپ کی عقبی بیرک کی دیوار کی اوٹ میں آگئے۔
ے کی جانب سے مجاہدین کی کمپنی بھی اللہ اکبر کے نعرے لگاتی نیچے آگئی۔ اس کیمپ
ھارتی فوج کی بہت تھوڑی نفری تھی۔ جتنے ڈوگرے سامنے آئے انہیں ختم کر دیا گیا۔
ر فرار ہو گئے ہوں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کشمیری مجاہدین بھی ہم میں آ کر مل گئے۔
ے اپنے مجاہد اور دونوں لڑکیوں کو بیرک سے نکال کر آزاد کرا لیا۔ یہاں ایک بیرک میں
کا تھوڑا سا ذخیرہ تھا۔ اسے اڑا دیا گیا۔ فوجی جیپ اور ٹرک میں بھی گرنیڈ رکھ کر
تباہ کر دیا۔ کشمیری مجاہدین حریت پرست وانی اور دونوں کشمیری بیٹیوں کو ساتھ لے

کر اپنے محاذ کی طرف واپس چلے گئے۔ میں اور جہانگیر بٹ بھی وہاں سے اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ مشن ہماری توقع کے خلاف بڑی جلدی مکمل ہو گیا تھا۔

ہائیڈ آؤٹ میں جا کر کمانڈو لیڈر شیروان کو پوری رپورٹ دی تو وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"مجھے یقین تھا ہمارے آدمی کیمپ پر ضرور اٹیک کریں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ بھارتی حکومت کو پتہ ہی نہیں کہ وہ جس کشمیری قوم کے حق خود ارادیت کو کچلنا چاہتی ہے وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے پانچ سو سال سے جنگ لڑ رہی ہے۔ آخر فتح کشمیریوں کی ہوگی۔"

اس رات کشمیری مجاہد لیڈر کمانڈو شیروان نے میرے ساتھ ایک بڑی اہم میٹنگ کی۔ اسے میں نے اہم اس لئے کہا ہے کہ اس میٹنگ نے میری کمانڈو اور کمانڈو سپائنگ کارگذاریوں کی ایک ایسی راہ متعین کی جس نے آگے چل کر نہ صرف کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی تحریک کو بے پناہ تقویت دی بلکہ بھارتی ہائی کمانڈ کے ایوانوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ اور ساری دنیا کے ممالک پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ہندوستان کی ہ
حکومت نے کشمیری مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو کچل کر اپنی فوج کی مدد سے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور کشمیر کا بچہ بچہ اپنی آزادی کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان جہاد میں نکل آیا ہے۔ اس اہم ترین میٹنگ کے بعد میری کمانڈو سپائینگ کارروائیوں نے کشمیر میں متعین بھارتی فوجیوں کے مورال کو زبردست دھکا لگا۔ دوسری طرف کشمیری مجاہدین کا مورال بلند ہوا اور انہیں آزادی کی منزل قریب نظر آنے لگی۔ لکھنے کو تو میں نے بڑی آسانی سے لکھ دیا ہے مگر اس کے لئے مجھے کیسے کیسے ہمت شکن حالات سے واسطہ پڑا اور کیسے کیسے نازک ترین مراحل سے گذرنا پڑا اور کشمیری مجاہدین کو کتنی قربانیاں دینی پڑیں' یہ آپ کو آگے چل کر خود ہی معلوم ہو جائے گا جب میں اپنے کمانڈو سپائینگ آپریشنز کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ کشمیری لیڈر کمانڈو شیروان نے عشاء کی نماز میرے ساتھ ہی پڑھی۔ عشاء کی نماز کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور ہائیڈ آؤ

ے تہہ خانے میں آ گئے۔ پٹرال ٹیکری کے کمانڈو ایکشن سے پہلے ہم اس تہہ خانے میں بیٹھے تھے اور کمانڈو شیروان انڈیا کے نقشے پر بھارتی صوبوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دوبارا وہی نقشہ کھول کر انڈیا کے مختلف صوبوں کی بابت تفصیلات سے آگاہ کرے گا۔ لیکن اس نے نقشے کی بجائے جیب سے ایک چھوٹی سے سبز رنگ کی پاکٹ بک نکالی۔ بڑی احتیاط سے اس کے ورق الٹا کر کچھ پڑھتا رہا۔ پھر پاکٹ بک میز پر رکھ دی اور آہستہ آہستہ میز پر انگلی بجانے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ میں اس کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ دیوار کے طاق میں بیٹری والی لالٹین روشن تھی۔

کمانڈو شیروان نے میز پر کہنیاں ٹکائیں۔ ذرا سا آگے کو جھکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب دشمن ملک سے جنگ شروع ہو جاتی ہے تو ایک لڑائی تو اگلے مورچوں پر ہوتی ہے۔ یہ لڑائی دونوں ملکوں کی زمینی فوجیں لڑتی ہیں۔ ایک لڑائی مورچوں کے پیچھے بھی لڑی جاتی ہے۔ یہ لڑائی مورچوں کے پیچھے کمانڈوز لڑتے ہیں۔ رات کے وقت تربیت یافتہ کمانڈو پارٹیاں اندھیرے میں دشمن کے اگلے مورچوں کے بہت پیچھے جان کی بازی لگا کر جاتی ہیں۔ ان کا کام دشمن کے ایمونیشن کے ذخیروں کو اڑانا' بہت پیچھے لگے ہیوی اور میڈیم توپ خانے کی توپوں کو تباہ کرنا اور رات کے اندھیرے میں کیمو فلاج کر کے چھپائے ہوئے ٹینکوں کو ہٹ کرنا اور انہیں برباد کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مشن پر گئے ہوئے کمانڈو اکثر زندہ واپس نہیں آتے۔ وہ اپنے ملک کی آبرو بچانے کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں لیکن دشمن کو اتنا زبردست نقصان پہنچاتے ہیں کہ آمنے سامنے کی جنگ میں ایک ہزار فوجیوں کی نفری میں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن ایک جنگ اس سے بھی پیچھے لڑی جاتی ہے۔ یہ تیسری جنگ دشمن کے ملک میں جا کر اس کی ناک کے نیچے بیٹھ کر لڑی جاتی ہے۔ یہ تیسری جنگ سپاہی یعنی جاسوس لڑتے ہیں۔ وہ دشمن کے گھر میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی

ذہانت اعلیٰ تربیت اور فولادی اعصاب کی مدد سے دشمن کی فوجوں کے ایسے اہم راز اپنے ہیڈ کوارٹر کو پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ جنگ کا نقشہ ہی پلٹ جاتا ہے اور بعض اوقات دشمن کو شکست بھی ہو جاتی ہے------"

چھوٹے سے سماوار میں سے گرم کشمیری قہوہ پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کمانڈو شیروان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ جو باتیں مجھے بتا رہا تھا مجھے نہ صرف ان باتوں کا بخوبی علم تھا بلکہ کمال شاہ اور گل خان نے مجھے اس کی ٹریننگ بھی دے رکھی تھی۔ کشمیری قہوے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد کمانڈو شیروان نے پیالی میز پر رکھی اور بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ جو باتیں میں نے بیان کی ہیں ان سے تم بخوبی واقف ہو اور میری اطلاع کے مطابق تم مورچوں کے پیچھے رات کے اندھیرے میں لڑی جانے والی کمانڈوز کی جنگ اور دشمن کے ملک میں اس کے گھر میں بیٹھ کر لڑی جانے والی خاموش جنگ کی ٹریننگ بھی لے چکے ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کمانڈر شیروان اٹھ کر تہہ خانے کے کچے فرش پر ٹہلنے لگا۔ پھر میز پر آ کر بیٹھ گیا اور مجھ سے متوجہ ہو کر کچے فرش پر ٹہلنے لگا۔ پھر میز پر آ کر بیٹھ گیا اور مجھ سے متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"کشمیر کا بچہ بچہ جوان بوڑھا اور خواتین بھارتی قابض فوج کے خلاف ایک طرح سے کمانڈو جنگ ہی لڑ رہا ہے۔ کیونکہ ہماری کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہے۔ ہمارے کشمیری مجاہد دشمن کو بھی برباد کر رہے رہیں اور خود بھی شہید ہو رہے ہیں یوں ہم اپنے خون سے آزادی کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا مشاہدہ تم خود بھی کر چکے ہو۔ لیکن ہمارے پاس ایسے تربیت یافتہ کمانڈوز کی تعداد بہت کم ہے جو دشمن کے عقب میں جا کر اس کو کاری ضرب لگا سکیں۔ پھر بھی ہماری کمانڈو پارٹیاں دشمن کے فوجی کیمپوں اور فوجی کانوائیوں پر حملے کر کے انہیں بھاری نقصان پہنچاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے

پاس ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں جو دشمن کے گھر میں اس کی ناک کے نیچے بیٹھ کر اس کی شہ رگ پر کاری ضرب لگائیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو یہ کام سپاہی یعنی تربیت یافتہ جاسوس کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا جاسوس ہو جو ٹرینڈ کمانڈو بھی ہو تو وہ دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ سکتا ہے۔"

کشمیری کمانڈو شیروان ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں اپنی قہوے کی پیالی خالی چکا تھا۔ کمانڈو شیروان نے اپنی پیالی کے ٹھنڈے قہوے کا ایک گھونٹ بھرا اور میری ـ دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"میرے دوست! یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تم ایک ٹرینڈ کمانڈو بھی ہو اور ایکسپلوسیوز اور انٹیلی جینس کے رموز سے بھی آگاہ ہو۔ تم نوجوان ہو۔ پڑھے لکھے ہو۔ انگریزی زبان پر تمہیں عبور حاصل ہے۔ تم جب انگریزی یا اردو میں بات کرتے ہو تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم کشمیری ہو۔ جبکہ ہمارا کشمیری بھی اپنے لہجے سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اس خاص صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن کو اس کے گھر کے اندر جا کر کاری ضرب لگائی جائے۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی پر خطر اور نازک مشن ہو گا۔ قدم قدم پر جان کا خطرہ ہو گا۔ لیکن تمہارے جذبہ حریت تمہاری قابلیت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ تم ناکام نہیں واپس آؤ گے"

اب میں نے اپنی زبان کھولی اور کہا۔

"کمانڈر! تم مجھے آڈر دو۔ میں تیار ہوں۔ مجھے حکم دو کہ کس طرح اسلام' پاکستان اور آزادی کشمیر کے جہاد میں کام آسکتا ہوں۔ میں اس مقصد کے لئے ہر قدم پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوں"

کمانڈو لیڈر شیروان نے کہا۔

"بس ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تمہیں ہر قدم پر جان قربان نہیں کرنی۔ تمہیں ہر قدم پر زندہ رہ کر اپنے مشن کو پورا کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! مجھے میرے مشن سے آگاہ کیا جائے۔ میں تمہیں اللہ کے فضل وکرم سے یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری توقعات پر پورا اتروں گا۔"

اب کمانڈو لیڈر شیروان نے میز پر الٹی رکھی ہوئی پاکٹ بک اٹھائی اس کے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو غور سے پڑھا اور پاکٹ بک بند کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہم کشمیری مجاہدین آزادی کشمیر کے محاذ پر بھارتی فوجوں کے ظلم و ستم کا پورے جذبے اور جوش کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہماری کوئی پروفیشنل فوج نہیں ہے۔ ہمارے پاس کہیں سے اسلحہ بھی نہیں آتا۔ ہم دشمن کے ایمونیشن ذخیروں پر شب خون مار کر اسی کا اسلحہ اس کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمیں محدود وسائل اور محدود نفری کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جبکہ دشمن کے پاس نہ جنگی میٹریل کی کمی ہے نہ فوج کی نفری کی۔ ہم اس کا ایک ایمونیشن ڈپو اڑاتے ہیں تو وہ اس کی جگہ دوسرا ایمونیشن ڈپو بنا لیتا ہے۔ اس کی دو گنیں برباد کرتے ہیں۔ ان کی جگہ وہ فوراً نئی گنیں لا کر کمی پوری کر لیتے ہے۔ ہم گھات لگا کر اس کے دس فوجی ہلاک کرتے ہیں تو ان کی جگہ فوراً دوسرے فوجی آجاتے ہیں۔ بھارتی ہائی کمانڈ کے پاس کشمیر میں مروانے کے لئے فوجوں کی کمی نہیں ہے۔ ہندوستان کی ساری فوج کو نہ تم تباہ کر سکتے ہو نہ میں اکیلا تباہ کر سکتا ہوں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے دماغ کے اعصابی مرکز پر ضرب لگائی جائے جو کشمیر کے فوجی معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔ اسے بوکھلا دیا جائے۔ اس کو ہر موومنٹ پر نگاہ رکھتے ہوئے اسے سبوتاژ کیا جائے یوں کشمیر کے محاذ پر جو بھارتی فوج ڈیپلائے ہے اس کا مورال تباہ ہو گا اور آزادی کشمیر کی تحریک کو نئی طاقت ملے

گی۔ اس کا مورال مزید بلند ہو گا"

میں بڑے غور سے کشمیری لیڈر کمانڈو شیروان کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ میں نے

ا۔

"سر! حکم کرو مجھے کیا کرنا ہو گا"

میں اس وقت ایکٹو کمانڈو کی حیثیت سے بول رہا تھا۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"یہ میں نے تمہید باندھی تھی۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ تم نے شاید را کا نام نہیں سنا۔ یا شاید سنا ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ میرے لئے یہ نام بالکل اجنبی تھا۔ ان دنوں ہندوستان میں اندرا ندھی کی حکومت تھی اور بھارت کی خفیہ ایجنسی را (RAW) کا نیا نیا قیام عمل میں آیا تھا راس خفیہ ادارے نے بیرونی ممالک خاص طور پر کشمیر افیئرز اور پاکستان کے بارے میں ں انتہائی خفیہ رپورٹوں کے ذریعے اپنے ملک کے واسطے اہم کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ں ساری باتوں کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ کمانڈو لیڈر شیروان بولا۔

"بھارت کی مرکزی حکومت کے مختلف خفیہ ادارے ہیں۔ مثال کے طور پر انٹیلی جینس بیورو (آئی بی) انٹرنل سیکورٹی اور نیشنل سیکورٹی گارڈ جو وی آئی پی کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ باڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) اور سپیشل برانچ (سی آئی ڈی) یہ محکمے وزارت داخلہ کے ماتحت ہیں۔ ان کے علاوہ وزارت خزانہ کے خفیہ ادارے ڈی آر آئی اور این آئی بی ہیں۔ ملٹری انٹیلی جینس، میری ٹائم انٹیلی جینس اور ایئر فورس انٹیلی جینس وزارت دفاع کے ماتحت ہیں۔ لیکن را کا خفیہ ادارہ براہ راست وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ماتحت ہے اور اس کا ہیڈ آفس کیبنٹ سیکرٹریٹ میں ہے۔ را مخفف ہے ریسرچ اینڈ اینیلیسز ونگ کا۔ یہ خفیہ ادارہ بھارتی حکومت کا اعصابی مرکز ہے۔ یہ ادارہ حکومت کو ہر قسم کی ملکی اور غیر ملکی سرگرمیوں کی رپورٹیں مہیا کرتا ہے اور ان رپورٹوں کی روشنی میں دشمن ملک کے اندر دہشت گردی اور تخریب

کاری کے پروگرام تیار کئے جاتے ہیں۔ کشمیر میں را کی سرگرمیاں بہت محدود
ہیں کیونکہ یہاں بھارت اپنے فوجی یونٹ دھڑا دھڑ جھونک رہا ہے۔ اور دہشت
گردی اور تخریب کاری کا سارا کام بھارتی فوج انجام دے رہی ہے۔ جس کا
مقابلہ کشمیری مجاہد اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر ہر محاذ پر کر رہے ہیں۔ اس وقت
کشمیر کے ہر محاذ پر ہم مجاہدین کا غلبہ ہے اور انڈین فوج کو ہماری گوریلا
سرگرمیاں زبردست نقصان پہنچا رہی ہیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق بھارتی
حکومت نے را (RAW) کے تعاون سے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب
کاری کا ایک بڑا لمبا اور خطرناک پروگرام وضع کیا ہے بلکہ پاکستان کئی شہروں
میں را کے بھیجے ہوئے خفیہ دہشت گردوں نے اپنی تخریبی کاروائیاں شروع بھی
کردی ہیں۔ اس سے بھارتی حکومت کا مقصد پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی
استحکام کو نقصان پہنچانا ہے۔ دوسرے انڈیا کی حکومت یہ سمجھ رہی ہے کہ
پاکستان کشمیری مجاہدین کی مدد کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے تم نے خود
دیکھ لیا ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ اپنے محدود وسائل میں رہ کر خود ہی لڑ
رہے ہیں۔ ہمارے پاس جو اسلحہ ہے وہ دشمن کے ایمونیشن کے ذخیروں سے
چھینا ہوا اسلحہ ہے۔ ہم دشمن کی گولیاں اس کے سینے میں اتار رہے ہیں۔"

کمانڈو شیروان ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ میں بھی پوری توجہ اور خاموشی سے
اس کی باتیں سن رہا تھا جو میرے لئے انتہائی اہم اور بالکل نئی ہیں۔ شیروان کہنے لگا۔

"کشمیر افیئرز کے بارے میں بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کو بھی یہی خفیہ ادارہ
"را" ہی تمام تر خفیہ معلومات مہیا کر رہا ہے اور ان معلومات کو سامنے رکھ کر
کشمیر میں بھارتی فوجی یونٹ بھیجے اور ڈیپلائے کئے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں
کہ تم بھارتی دارالحکومت دلی میں بیٹھ کر کسی طرح اس خفیہ ادارے تک
رسائی حاصل کرو اور کشمیر میں انڈین یونٹوں کی سرگرمیوں کے بارے میں
ہمیں پوری پوری معلومات دو۔ یہ معلومات تم ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے خفیہ

کوڈ میں ہم تک پہنچا دو گے۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے پوچھا۔

"کیا مجھے دلی پہنچ کر گل خان سے رابطہ قائم کرنا ہو گا؟"

کمانڈو شیروان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ گل خان نے تمہیں جتنا کچھ بتانا تھا بتا چکا ہے۔ اب تم ایک
دوسرے آدمی سے ملو گے۔ اس آدمی کا تعلق نہ پاکستان سے ہے اور نہ وہ انڈیا
کا کوئی پیشہ ور جاسوس ہے۔ یہ شخص بھارت میں رہنے والا دوسرے مسلمانوں
کی طرح ایک مسلمان ہے۔ بھارت میں بسنے والے دوسرے کروڑوں
مسلمانوں کی طرح اس کے سینے میں بھی اسلام کی شمع روشن ہے اور وہ مخالف
ہواؤں کے تھپیڑوں میں بھی اس چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہے۔ تم اس
آدمی کو جا کر ملو گے۔"

"یہ مرد مجاہد مجھے کہاں ملے گا؟"

میرے اس سوال کے جواب میں کمانڈو شیروان نے مجھے اس بھارتی مسلمان کا نام
ایڈریس بتایا جو میں ظاہر نہیں کروں گا۔ میں اس کا فرضی نام شیر علی رکھ لیتا ہوں۔
ڈو شیروان نے کہا کہ شیر علی انگریزوں کے زمانے کی ہندوستانی فوج کی سگنل کور میں
چکا ہے اور سگنلز کے خفیہ کوڈ سائیفر اور ڈی سائیفر کرنے میں ماہر ہے۔ شیروان نے
کہ شیر علی علی گڑھ ہندوستان میں ہی پیدا ہوا تھا اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی سے
نے سائنس کے مضامین کے ساتھ گیارہ بارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔ کمانڈو شیروان
بتایا کہ شیر علی نے نئی دلی کے بارہ کھمبے کے علاقے میں ایک فیشن ایبل ریستوران
ل رکھا ہے۔ اس نے مجھے ریستوران کا نام بھی بتایا جو میں یہاں نہیں لکھوں گا۔

"تم دہلی جا کر شیر علی سے ملو گے۔ وہ تمہیں خود بتائے گا کہ تمہیں کیا کرنا
ہے اور وہ تمہارے لئے کیا کر سکتا ہے۔ جس روز تم یہاں سے دلی کے لئے
روانہ ہو گے میں اسے خفیہ کوڈ میں وائرلیس پر تمہارا نام اور تمہاری روانگی کی

اطلاع کر دوں گا۔ تمہیں ایک خاص خفیہ جملہ بھی بتاؤں گا جو تم اس کے آگے
جا کر بولو گے جس کے جواب میں وہ بھی ایک خاص جملہ بولے گا۔ بہرحال ابھی
تمہیں میر صاحب کے پاس کم از کم تین ماہ رہ کر ہندوستان کے مختلف صوبوں'
ان کے کلچر اور خاص طور پر ہندو دیو مالا اور سنسکرت زبان کے بارے میں
ابتدائی تعلیم حاصل کرنی ہو گی۔ میں کل ہی تمہیں میر صاحب کے پاس پہنچا
دوں گا۔"

مجھے بڑی ذمے داری کا کام سونپا جا رہا تھا۔ یہ کام ایسا تھا کہ جہاں ہر قدم پر خطرات کا
سامنا تھا۔ کمانڈو ایکشن میں تو ایک خاص مشن پر جانا ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ چار چھ
گھنٹوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ آدمی یا کامیاب لوٹتا ہے یا وہیں شہید ہو جاتا ہے لیکن جو
مشن کمانڈو شیروان میرے سپرد کر رہا تھا وہ ایک مسلسل کمانڈو سپائینگ کا مشن تھا۔ اس
مشن میں دشمن کے گھر میں جا کر بیٹھ جانا تھا اور واپس نہیں آنا تھا اور وہاں اپنے آپ ک
زندہ رکھ کر دشمن کے ناپاک عزائم کے بارے میں مکمل خفیہ رپورٹیں حاصل کر کے انہ
مجاہدین تک پہنچانا تھا۔ یہ کمانڈو سپائینگ کا مشن حقیقت میں میرے مزاج کے عین مطا
تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اسلام اور جہاد کشمیر کے لئے کوئی ایسا کام کروں جو پ
کسی نے نہ کیا ہو اور جس میں مجھے جان کی بازی لگانی پڑے۔ میں خوش تھا کہ آخر مج
میری مرضی کا ایک مشن مل گیا ہے۔ اس طرح میں اسلام پاکستان اور جہاد کشمیر کو تقوی
پہنچانے کے لئے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتا تھا۔

دوسرے دن کمانڈو شیروان نے مجھے کشمیر کے دور دراز ایک پہاڑی مقام پر پہنچاد
یہاں لکڑی کے ایک جھونپڑے میں میر صاحب سادہ اور عبادت گزاری کی زندگی بس
رہے تھے۔ ان کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ سفید داڑھی تھی۔ سادہ سے کشمیری فرن
ملبوس تھے۔ جس وقت میں اپنے گائیڈ کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ
پڑھنے کے بعد تسبیح پڑھ رہے تھے۔ گائیڈ نے مجھے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا اور خود
صاحب کے پاس جا کر انہیں سب کچھ گوش گذار کر دیا۔

قصہ مختصر میر صاحب نے میری تعلیمی ٹریننگ شروع کر دی۔ میر صاحب سنسکرت
ور فارسی کے عالم فاضل تھے۔ انہیں ہندو کلچر ہندو دیو مالا اور ہندو مذہب کے مختلف
وں کی تاریخ پر پورا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے مجھے سب سے پہلے سنسکرت زبان کی
ائی تاریخ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ زبان ہندوستان کے ہندوؤں کی زبان نہیں ہے بلکہ
طی ایشیاء سے جو آریا لوگ یہاں آئے تھے اور پھر یہاں سے مختلف شاخوں میں تقسیم
کر ایران یورپ کی طرف چلے گئے تھے سنسکرت ان کی زبان تھی۔ انہوں نے مجھے
کرت کے وہ الفاظ بتائے جو ہماری پنجابی زبان' ایران والوں کی فارسی زبان اور یورپ
دوسری زبانوں میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ میر صاحب نے مجھے بتایا کہ جب
ریا قبیلے کے لوگ جو چوڑے قد کاٹھ کے اور سرخ و سفید تھے وسط ایشیا کے میدانوں
ے اتر کر ہندوستان کے شمال میں آئے تو یہاں دراوڑ قوم کے لوگوں کی حکومت تھی جو
وٹے قد کے تھے اور جن کا رنگ سیاہ تھا۔ آریاؤں نے انہیں شکست دی اور وہ لوگ
دوستان کے جنوب کی طرف بھاگ گئے۔ جو شمالی علاقوں میں رہ گئے انہوں نے گورے
ٹے آریاؤں کی اطاعت قبول کر لی۔ میر صاحب نے فرمایا۔

"دراوڑ قوم کی اپنی زبان تھی۔ آج کل جو ہندی زبان ہندوستان کے
برہمن ہندو بولتے ہیں وہ سنسکرت اور دراوڑی زبان کی ملی جلی زبان ہے۔"

میر صاحب نے مجھے ہندو دیوی دیوتاؤں کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ یہ وہ علم تھا جو
گے چل کر میرے بڑے کام آنے والا تھا۔ کیونکہ مجھے ایک پڑھا لکھا اور ہندو بن کر ہندو
اشرے میں رہنا تھا۔ میر صاحب نے مجھے ہندوستان کے صوبوں آندھرا پردیش' تامل
ڈ' مہاراشٹر' گجرات کاٹھیاوار' مدھیہ پردیش' کرناٹک وغیرہ کے بارے میں بھی بہت کچھ
لومات بتائیں۔ انہوں نے مجھے بدھ مت جین مت کبیر پنتھ اور برہمن ازم کے بارے
بھی بتایا کہ ہندوؤں کے یہ مذہبی فرقے کن کن صوبوں میں زیادہ آباد ہیں۔ کس
وبے میں کس ہندو دیوتا کی پوجا ہوتی ہے۔ ویدوں کی کتابوں کے بارے میں میر صاحب
ے فرمایا۔

"ہندوؤں کے بلکہ آریا ہندوؤں کے چار وید ہیں رگ وید' یجروید' سام وید' اتھرو وید آگے ان کی چار شاخیں ہیں اور شرحیں ہیں جو اپنشد کہلاتی ہیں۔ ان میں کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ انسان کہاں سے آیا۔ اسے کہاں جانا ہے اور دیوی دیوتاؤں کے تعریفی اشعار' عقل و شعور کی باتوں کے علاوہ جادو ٹونے اور منتر وغیرہ کی بھرمار ہے۔ ہندوستان میں اب ویدوں کو کوئی نہیں پڑھتا۔ صرف گیتا پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے جو مہا بھارت کی جنگ میں کرشن کی ایک چھوٹی سی تقریر ہے۔ اسے تم خود پڑھ لینا۔ دلی میں تمہیں اس کا انگریزی ترجمہ مل جائے گا۔ ہندو تہذیب اس وقت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہزاروں دیوی دیوتاؤں بتوں' جانوروں' سانپوں' بندروں اور پہاڑوں' درختوں دریاؤں کی پوجا ہوتی ہے۔ ہندو ازم کوئی خاص ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک کلچر ہے۔ دیو مالا ہے۔ ہندو دیوی اور دیوتاؤں کے معاملے میں ایک دوسرے سے ہزاروں اختلاف رکھتے ہوں مگر مسلمان اور اسلام دشمنی میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا کہ ہندو نے پاکستان کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جس روز پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا ہندو قوم اسی روز سے پاکستان کو ختم کرنے کی ناپاک کوششوں میں لگی ہوئی ہے------"

میں تین ماہ میر صاحب کے پاس رہا۔ جب واپس کمانڈر شیروان کے پاس آیا تو ہندو ازم اور ہندو قوم کی ذہنیت اور اس کی دیوی دیوتاؤں کی دیومالا کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر چکا تھا کہ خود کمانڈر شیروان کو بھی معلوم نہیں تھا۔

اب میں اپنے سیکرٹ اور خطرناک اور طویل مشن پر روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار تھا۔ شیروان نے مجھے وہ کوڈ الفاظ بتائے اور یاد کرائے جو مجھے نئی دلی میں شیر علی کے فیشن ایبل ریستوران میں اس کے سامنے بولنے تھے اور ان کے جواب میں اس سے کوڈ الفاظ معلوم کرنے تھے۔ پندرہ کے پندرہ اسپرو کی ٹکیاں والے ٹیبلٹ بم' ان بموں کا کوڈ ورڈ میں لکھا ہوا نسخہ اور سیکرٹ پولیس خفیہ نمبر والا کارڈ میرے پاس ہی تھا۔ شیروان نے سر

…د کی دوائی اسپرو کی گولیوں کا نیا پتا منگوا کر اس میں سے اسپرو کی گولیاں نکال کر ان کی … اسپرو بم والی گولیاں بڑی مہارت کے ساتھ لگا دیں۔ اسپرو کے پلاسٹک کے پتے یعنی …ے کو تہہ کر کے مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اسے عام اسپرو کی گولیوں کے پتے کی طرح اپنی جیب میں رکھنا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میرے آدھے سر میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں اسپرو کی ایک گولی کھا لیا کروں۔ ان ٹیبلٹ بموں کے تیار کرنے کا جو نسخہ ہے اس کو تہہ کر کے اپنی جیکٹ کی اندر والی جیب میں خفیہ پولیس کے خاص نمبر والے کارڈ کے ساتھ ہی رکھ لو۔ تمہیں اب کسی کمانڈو چاقو اور پستول وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا آدمی تمہیں بس سٹینڈ تک چھوڑنے تمہارے ساتھ جائے گا۔ آگے تم خود سفر کرو گے۔ ہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ دلی پہنچنے کے بعد خود گل خان سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہاں کسی مشکل میں پھنس جاؤ تو اس سے مدد حاصل کر سکتے ہو۔ کیونکہ اب تم جس مشن پر جا رہے اس کی راہ نمائی شیر علی کرے گا۔"

اس کے بعد کمانڈو شیروان نے مجھے اپنے بٹوے میں سے شیر علی کی ایک تصویر نکال دکھائی جو پاسپورٹ سائز کی تھی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تصویر تھی جس کے نقش …ے اور آنکھیں بڑی چمک دار تھیں۔ داڑھی مونچھ غائب تھی۔ سر کے بال سفید ہو …ے تھے۔

"یہ ہمارے مرد مجاہد شیر علی کی تصویر ہے۔ یہ حیرت انگیز خوبیوں والا آدمی ہے۔ یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔ اس کی شکل اپنے ذہن میں بٹھا لو۔"

پھر شیروان نے مجھے شیر علی کے نئی دلی والے فیشن ایبل ریستوران کا نام بتایا اور …ا سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں آج رات شیر علی کو وائرلیس پر تمہارے بارے میں پیغام پہنچا دوں

گا۔ تمہاری روانگی کی تاریخ کل طے ہو گی۔"

اس کے ساتھ ہی ہم تہہ خانے سے باہر آگئے۔ باہر آئے تو پتہ چلا کہ برف گر رہ
تھی۔ معلوم ہوا کہ برف آدھی رات کے بعد گرنا شروع ہوئی تھی۔ ہم سو گئے۔ صبح اٹھ
برف گرنا بند ہو گئی تھی۔ سردی بہت شدید تھی۔ کیونکہ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ میں نے
ناشتہ کمانڈو شیروان کے ساتھ غار میں ہی کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"نیچے میدانوں میں اتنی سردی نہیں ہو گی جتنی یہاں کشمیر کی وادی میں
ہے۔ پھر بھی جیکٹ کے نیچے بند گلے والا سویٹر پہن لینا۔"

اس وقت دن کے نو بج رہے تھے۔ اتنے میں میرا گائیڈ آگیا۔ وہ بھی کشمیری مجاہد تھا
مگر عام کپڑوں میں تھا۔ میں چلنے لگا تو کمانڈو شیروان مجھے گلے لگا کر ملا۔

"اب تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ تمہارے دلی پہنچنے کی خبر مجھے مل جائے
گی۔ تم ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہے ہو جو تمہیں دشمن کے مورچے میں بیٹھ
کر لڑنی ہو گی۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ لیکن یاد رکھو خدا بھی ان کی مدد کرتا
ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ خدا حافظ!"

اتنا کہہ کر کمانڈو شیروان غار کے اندر چلا گیا۔

میں اپنے گائیڈ کے ساتھ بس سٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ پہاڑی راستے برف میں چھپ
گئے تھے۔ یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ہم کافی لمبا پہاڑی سفر طے کر کے شہر کے لاری اڈ
پر آگئے۔ یہاں گائیڈ مجھ سے جدا ہو گیا۔ ایک بس جموں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی
میں اس میں سوار ہو گیا۔ دس سوا دس بجے بس اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

میرا لباس ایک عام پڑھے لکھے ہندو نوجوان جیسا تھا۔ گرم پتلون، جوگر کے شوز، ب
گلے کے سویٹر کے اوپر گرم جیکٹ۔ سامان کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بریف کیس تک نہ
تھا۔ کمانڈو کبھی سامان کے ساتھ سفر نہیں کرتے۔ کیونکہ جب وہ اپنے مشن پر روانہ ہو
ہیں تو کچھ پتہ نہیں ہوتا سفر کے کس موڑ پر حالات کیا رخ اختیار کر لیں او میں اچانک
کس طرف بھاگنا پڑے۔ ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد میں اگلے روز صبح

شہر پہنچ گیا۔ راستے میں کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان سے
نے میں بات چیت جاری رہی۔ راشٹریہ سیوک سنگ پارٹی کا ان دنوں انڈیا میں بڑا زور
یں بڑھ چڑھ کر اس متعصب ہندو جماعت کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف بولتا
جموں توی کے سٹیشن پر آیا تو گاڑی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی ایک گھنٹہ ویٹنگ روم
بیٹھا اخبار وغیرہ دیکھتا اور چائے پیتا رہا۔ آخری گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔ میرے
انٹر کلاس کا دلی تک کا ٹکٹ تھا۔ ابھی انڈیا کی ریل گاڑیوں میں انٹر کلاس موجود تھی۔
یں یہ کلاس ختم کر دی گئی۔ ٹھیک وقت پر گاڑی دلی کی طرف چل پڑی۔

ٹرین مشرقی پنجاب کے میدانی علاقوں میں آئی تو سردی کی وہ شدت ختم ہو گئی جو اور
کشمیر کی پہاڑیوں میں تھی۔ کشمیر کی پہاڑیوں میں تو برفباری ہو رہی تھی۔ مگر نیچے میدانوں
میں سردی کم از کم مجھے خوشگوار لگ رہی تھی۔ جالندھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ مجھے دلی کے
لئے گاڑی بدلنی پڑے گی۔ یہاں مجھے ایک گھنٹہ رکنا پڑا۔ یہ عرصہ میں نے پوری طرح
چوکس رہ کر گذارا۔ کیونکہ یہاں خفیہ پولیس میرا پیچھا کر چکی تھی۔ اگرچہ میرے پاس
ترپ کا پتا یعنی سنٹرل سیکرٹ پولیس کا خفیہ نمبروالا کارڈ موجود تھا۔ پھر بھی مجھے کافی ہوشیار
رہنا پڑا۔ کیونکہ یہ خفیہ کارڈ میں کسی خاص موقع پر کام میں لانا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ
تھی کہ یہ خفیہ نمبروالا کارڈ اگر مجھے کسی بھاری مصیبت سے بچا سکتا تھا تو کسی اس سے بھی
زیادہ بھاری مصیبت میں پھنسا بھی سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر اس بات پر کوئی پولیس
اہل کار ذرا سی بھی تفتیش کرتا کہ یہ کارڈ میرے پاس کہاں سے آگیا ہے تو میرا بھانڈا
پھوٹ سکتا تھا۔ یہ کارڈ تو رواں روی میں میرے کام آسکتا تھا کہ میں گاڑی میں بیٹھا ہوا
گاڑی کو پولیس کی ناکہ بندی نے روک لیا ہے۔ میں کارڈ دکھاؤں اور گذر جاؤں۔ لیکن
اگر کسی جگہ میں پکڑا جاتا ہوں اور یہ کارڈ دکھاتا ہوں تو مجھ سے پوچھ گچھ ہو سکتی تھی کہ
کارڈ میرے پاس کیسے آگیا ہے؟

بہرحال ایک گھنٹہ گذر گیا۔

میں دوسری گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ دلی تک کوئی

ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ یہ کوئی رات کے آٹھ سوا آٹھ بجے کا وقت ہو گا جب گاڑی
بھارت کے دارالحکومت دلی کے سٹیشن میں داخل ہوئی۔ اس شہر میں پہلے بھی آچکا
تھا۔ مرد مجاہد گل خاں نے مجھے اسی شہر میں دھماکہ خیز یعنی ایکسپلوزیز کی تربیت دی تھی۔
کمانڈو ٹریننگ کے جو سبق باقی رہ گئے تھے وہ بھی گل خان کی زیر ہدایت میں نے پورے
کئے تھے۔ مگر کشمیری کمانڈو شیروان نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں سوائے
انتہائی اہم ضرورت کے گل خان سے ملنے سے گریز کروں۔ شیر علی کے ریستوران کا نام
اور اس کا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے دلی سٹیشن سے نکلتے ہی ٹیکسی لی اور
اسے نئی دلی کے علاقے بارہ کھمبے چلنے کا کہا۔ دلی شہر روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ سڑکوں پر
بہت زیادہ ٹریفک تھی۔ نئی دلی کے علاقہ شہر کا ماڈرن اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔ یہاں ایک
جگہ دائرے کی شکل میں بہت سی دکانیں اور سٹور ہیں۔ ان دکانوں کے آگے دائرے کی
شکل میں چھت والا فٹ پاتھ بنا ہوا ہے جہاں کتنے ہی ستون لگے ہیں۔ یہی بارہ کھمبے کا علاقہ
تھا۔ یہاں میں پہلے بھی گل خان کے ساتھ ایک دو بار آچکا تھا۔

ٹیکسی میں نے چھوڑ دی اور شیر علی کے ریستوران کی تلاش شروع کر دی۔ ایک
جگہ نیون سائن میں لکھے ہوئے کافی شاپ کے انگریزی الفاظ جگ مگ کر رہے تھے۔ یہی
شیر علی کے ریستوران کا نام تھا۔ یعنی کافی شاپ۔ اس ریستوران کا اصلی نام میں نے چھپا
لیا ہے۔ اصلی نام کچھ اور تھا۔ مگر اب اگر میں اصلی نام بھی لکھ دوں تو کوئی فرق نہیں
پڑے گا کیونکہ اب وہاں نہ شیر علی ہے اور نہ اس کا ریستوران ہی باقی ہے۔

ریستوران کے باہر دروازے میں دلی کی مشہور قطب صاحب کی لاٹھ کا چھوٹا ماڈل
شیشے کے بکس میں میں سجا ہوا تھا۔ اندر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ دروازہ شیشے کا تھا۔ میں
ریستوران میں داخل ہو گیا فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ جا بجا رات کے کھانے کی
میزیں لگی تھیں جہاں عورتیں مرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ فضا میں بانسری کے دھیمے
سُر موسیقی کا جادو جگا رہے تھے۔ عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ نوجوان لڑکیوں نے
بھرپور میک اپ کیا ہوا تھا اور بالوں میں پھولوں کے گجرے لگائے ہوئے تھے۔ کئی لڑکیوں

نے گھٹنوں سے پھٹی ہوئی جینز پہن رکھی تھیں۔ باہر سردی تھی مگر ریستوران کی فضا
پھولوں اور مختلف قیمتی پرفیومز کی مہک کے ساتھ ہلکی ہلکی گرماہٹ بھی تھی۔ جس نے
بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔

ایک باوردی نوجوان ویٹر میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کے مینو کا
تھا۔ اس نے مجھ سے میرے ٹیبل کا نمبر پوچھا۔ میں نے اسے انگریزی میں کہا کہ
ریستوران کے مالک سے ملنا ہے۔ کمانڈو ٹریننگ اور کمانڈ سپائینگ کی بریفنگ کے دو
یہ بات خاص طور پر میرے ذہن نشین کر دی گئی تھی کہ میں انڈیا کے اپر کلاس یا اپر
کلاس کے لوگوں میں خاص طور پر انگریزی میں بات کروں۔ کیونکہ انڈیا میں انگریزی
ور سوخ زیادہ ہے۔ چنانچہ میرے انگریزی بات کرنے پر ویٹر نے سر کو ذرا سا جھکا کر
سر کہا اور مجھے اپنے ساتھ ایک راہ داری میں لے گیا۔ راہ داری میں بھی سرخ قالین
ہوا تھا۔ وہ ایک دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس دروازے کے باہر مائیکرو فون
باکس لگا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر انگریزی میں ہی کہا کہ سر ایک صاحب آپ سے ملنا چا
ہیں۔ سپیکر پر دھیمی سی آواز آئی۔

"کون ہیں یہ صاحب؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے ویٹر کو جواب دینے کی بجائے مائیک کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"سر! میں آندھرا پردیش سے آیا ہوں۔ مجھے کاروباری سلسلے میں شیر علی
صاحب سے ملنا ہے"

"انہیں اندر بھیج دو"

سپیکر پر ایک لمحے کے لئے آواز بلند ہوئی اور پھر سپیکر خاموش ہو گیا۔ ویٹر
دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"سر! اندر تشریف لے جائیں"

وہ چلا گیا۔ میں نے دروازے کی پیتل کی ہتھی کو ذرا سا بائیں جانب گھما کر د
کھولا۔ کمرے میں اعلیٰ قسم کے غیر ملکی پرفیوم اور سگار کی تیز خوشبو میرے قریب

نکل گئی۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ سنہری باڈر والا صوفہ
بڑا قیمتی تھا۔ گلدان میں ولائتی گلابوں کا گل دستہ سجا ہوا تھا۔ دیوار پر صرف تین فریم
ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ درمیان میں مہاتما گاندھی کی تصویر تھی اور دائیں بائیں
نہرو اور اندرا گاندھی کی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کے نیچے بڑے صوفے پر
علی کھدر کے کرتے کے اوپر بھورے رنگ کی گرم نہرو واسکٹ پہنے بڑے اطمینان سے
ایک سوٹ بوٹ والے آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کی
مجھے کمانڈو شیروان نے کشمیر سے چلتے وقت دکھا دی تھی۔

شیر علی نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بھنوئیں اٹھا کر میری طرف دیکھا
خالص کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے کھڑے کھڑے اردو میں کہا۔

"میں دلی کا ہوں مگر والد صاحب کے ساتھ حیدر آباد میں بزنس کرتا
ہوں۔ اسی سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں"

شیر علی نے بڑی بے نیازی سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لئے
اور سوٹ بوٹ والے آدمی سے باتوں کو سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ سوٹ بوٹ والا
بریف کیس میں سے کچھ کاغذات نکال کر اسے دکھانے لگا اور انگریزی میں کہا۔

"سر! منتری صاحب کے پی اے آپ کے دوست ہیں۔ اگر آپ منتری
جی کو نہیں کہنا چاہتے تو ان کے پی اے سے کہہ کر یہاں دستخط کروا دیجئے۔ میرا
دو کروڑ کا بل چھ ماہ سے رکا ہوا ہے۔

شیر علی نے اس آدمی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ کاغذات اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں منتری جی کے پی اے سے
بات کرتا ہوں آپ ایسا کریں کل مجھے کسی وقت فون کر کے معلوم کر لیں"

سوٹ بوٹ والا آدمی بریف کیس میں کاغذ رکھنے کے بعد اٹھا ہندوؤں کی طرح ہاتھ

جوڑ کر شیر علی کو پرنام کیا اس کا شکریہ ادا کیا اور سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھا۔ شیر
علی اب میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ سگار پی رہا تھا۔ میری نگاہیں سوٹ بوٹ والے آدمی
لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ کمرے سے نکل گیا اور دروازہ بند ہو گیا تو میں خاموشی سے شیر
علی کو دیکھنے لگا۔ شیر علی نے سگار کا ہلکا سا کش لیا۔ اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی نے
بجلی کی روشنی میں ہلکا سا لشکارا مارا۔ یہ شخص واقعی بڑے ٹھاٹھ سے یہاں رہ رہا تھا۔

"فرمائیے۔ آپ کیسے تشریف لائے ہیں"

کمانڈو سپائی کا ایک سنہری اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ فضول گفتگو کبھی نہیں کرتا
وہ وقت کی قیمت پہچانتا ہے۔ چنانچہ میں نے فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے
وہ خفیہ کوڈ جملہ بول دیا جو مجھے کمانڈو شیروان نے بتایا تھا۔ میری زبان سے یہ جملہ سنتے
شیر علی نے پہلا کام یہ کیا کہ ساتھ ہی تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسور اٹھا کر کسی سے
کہا۔

"مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ میں بڑی ضروری کاروباری میٹنگ میں ہوں"

ریسور رکھتے ہوئے شیر علی میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اگرچہ شکل صورت سے یہ
بات ثابت ہو چکی تھی کہ یہی مرد مجاہد شیر علی ہے مگر ضابطے کے مطابق ضروری تھا کہ
میرے کوڈ والے خفیہ جملے کا جواب خاص کوڈ میں دے۔ میں ٹکٹکی باندھے شیر علی کو تک
رہا تھا۔ میں نے کوڈ الفاظ ایک بار پھر دہرائے۔ اب شیر علی کو یاد آگیا کہ اسے بھی کوڈ میں
جواب دینا ہے۔ چنانچہ اس نے جواب میں ایک خفیہ جملہ بولا۔ یہ وہی جملہ تھا جو کمانڈو
شیروان نے مجھے بتایا تھا۔ شیر علی صوفے سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ اسے لاک کیا
اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"آئیے اندر چل کر بزنس پر بات کرتے ہیں"

اس کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بیڈ روم تھا۔ یہاں سنگل بیڈ لگا تھا۔ چھو
صوفہ سیٹ بچھا تھا۔ درمیان میں کافی ٹیبل پر کرناٹک کی ڈانسنگ گرل کا کانسی کا مجسمہ ر
تھا۔ کونے میں چھوٹی میز پر رام اور سیتا کی دو مورتیاں سجی ہوئی تھیں۔ شیر علی کے بڑے

ے اور بیڈ روم کا سارا ماحول ہندووانہ تھا۔ بیڈ روم میں آکر شیر علی نے مجھے بیٹھنے کا
ہ کیا۔ پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ سگار اس نے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔
ے لگا۔

"بیڈ روم میں میں تم سے زیادہ آزادی سے بات کر سکتا ہوں۔ اگرچہ
ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر بھی میں بے حد احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ میرے
ہاں سرکاری درباری ہر قسم کے آدمیوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ خاص طور پر میں تم
سے یہاں بیڈ روم میں ہی بات کرنی مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے شیروان کا پیغام
مل گیا تھا۔ میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میں تمہیں کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی سمجھتا
تھا مگر تم تو بالکل نوجوان ہو۔ بہر حال تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ تم نے کھانا
کھایا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ سٹیشن سے سیدھا آپ کے پاس ہی آ رہا ہوں"

"تو پھر ایسا کرو کہ نیچے چل کر پہلے کھانا کھا لو اس کے بعد تم سے باتیں
ہوں گی۔ آؤ میرے ساتھ"

شیر علی مجھے اپنے ساتھ نیچے ڈائننگ ہال میں لے گیا۔ ایک کونے میں اس کے خاص
انوں کے لئے میز لگی ہوئی تھی۔ وہاں ہم بیٹھ گئے۔ کھانا بڑا پر تکلف تھا۔ اس دوران
مجھ سے دلی کے موسم اور پلوشن کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ بیرا کوئی ڈش لے کر آتا
وہ آندھرا پردیش کے موسم کی باتیں شروع کر دیتا۔ ریستوران کا مینجر بھی وہاں آگیا۔
انے آتے ہی جھک کر شیر علی سے کہا۔

"سر! میں خدمت کے لئے حاضر ہوں سر!"

شیر علی نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ان سے ملو کرم جی۔ یہ میرا بھانجہ ارسلان ہے۔ سات برس لندن میں
رہ کر واپس بھارت آیا ہے۔ اب حیدر آباد میں کیٹرنگ کا کام شروع کیا ہے"

منیجر کا نام وکرم کمار تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہا اور انگریزی میں کہا۔

"سر! کسی چیز کی ضرورت ہو۔ میں حاضر ہوں"

منیجر چلا گیا تو شیر علی کہنے لگا۔

"یہاں میں تمہیں اپنا بھانجہ ہی ظاہر کروں گا۔ یاد رکھنا تمہارا نام ارسلان ہے۔ تم صرف آج کی رات میرے پاس ہی رہو گے۔ اس کے بعد تمہاری رہائش کا الگ بندوبست کر دیا جائے گا۔ لیکن تم اس دوران میرے ریستوران سے باہر نہیں جاؤ گے۔ میرے بیڈ روم میں ہی رہو گے میں نہیں چاہتا کہ آج رات کے بعد یہاں کے آدمی تمہیں دوبارا دیکھیں۔"

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ سمجھ گیا کہ یہ میرے اس مشن کا ایک حصہ ہی ہو گا جس کو لے کر میں کشمیر سے چلا تھا اور اس شخص شیر علی کے پاس آیا تھا جو انڈیا کے دارالحکومت میں بیٹھا تھا اور جس کی زیر ہدایت مجھے اپنے انتہائی اہم اور خفیہ مشن کو شروع کرنا تھا۔ جہاں ہماری میز لگی تھی وہاں بڑی مدھم روشنی تھی اور ہماری شکلیں پانچ چھ گز کے فاصلے سے شاید ہی کسی کو نظر آتی ہوں۔

کھانا کھانے کے بعد میں شیر علی کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے کہا۔

"اب تم یہاں آرام کرو۔ میں رات کے پچھلے پہر آؤں گا۔ دروازہ اندر سے لاک کر لینا"

یہ کہکر کر وہ چلا گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ شیر علی کے ذہن میں ضرور کوئی خاص سکیم ہے۔ میرے لئے کوئی خاص پروگرام ہے۔ مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ میں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اب چاہے کتنے ہی طوفان آئیں مجھے ہر حالت میں ہر طوفان کا مقابلہ کرنا تھا اور اسلام' پاکستان اور جہاد کشمیر کے عظیم مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ضرورت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کر دینی تھی۔

میں بمشکل تین چار گھنٹے ہی سویا ہوں گا کہ شیر علی نے آکر مجھے جگا دیا۔ اس نے اپنی

چابی سے دروازہ کھول لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا"

وہ مجھے پچھلے دروازے والی گلی میں سے نکال کر سڑک پر لے آیا۔ سردیوں کی رات کا پچھلا پہر تھا۔ سخت سردی تھی۔ ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ شیر علی کی سیاہ رنگ کی چھوٹی انڈین گاڑی ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے مجھے اپنی ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ نہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے اور نہ اس نے ہی کوئی بات کی۔ گاڑی نئی دلی کی کشادہ اور پچھلے پہر کے اندھیرے میں ویران سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی شہر کے جنوب کی طرف چلی جا رہی تھی۔ دلی میں نے کافی گھوم پھر کر دیکھی تھی مگر یہ علاقہ بالکل اجنبی لگ رہا تھا۔

میں نے یونہی پوچھ لیا کہ یہ علاقہ کونسا ہے۔ شیر علی نے اپنے سیاہ اور کوٹ کے کالر چڑھا رکھے تھے اور اس کی آنکھیں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ آہستہ سے بولا۔

"بے معنی سوال کیوں پوچھتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے تمہاری تربیت میں کچھ کمی باقی رہ گئی ہے"

میں شرمسار سا ہو کر چپ ہو گیا۔ گاڑی اب شہر کے ایسے علاقے میں سے گذر رہی تھی جہاں دور دور کوٹھیوں کی روشنی نظر آتی تھی۔ سڑک پکی تھی اور لگتا تھا کہ کسی دوسرے شہر کو جاتی ہے۔ کافی دور جانے کے بعد ایک جگہ شیر علی نے گاڑی بائیں جانب چھوٹی سڑک پر نکال دی۔ یہ سڑک شکستہ سی تھی اور دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ یہاں سڑک پر بجلی کا کوئی کھمبا بھی نہیں لگا تھا۔ بڑا اندھیرا تھا۔ شیر علی نے گاڑی کی بڑی لائٹس بند کر کے چھوٹی بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی تھی۔ سڑک دو تین جگہوں سے دائیں بائیں گھومی۔ پھر اندھیرے میں ایک مکان کی دیوار کے ساتھ جا کر رک گئی۔

ہم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ یہ مکان نہیں کوئی مال گودام لگتا تھا۔ ایک طرف بوریوں کا ڈھیر لگا تھا۔ شیر علی گودام کے دروازے کا تالا کھول کر مجھے اندر لے گیا۔ گودام

کے اندر سلین اور سردی تھی۔ میں نے ہاتھ گرم پتلون کی جیبوں میں دے لئے۔ شیر علی نے جیب سے ٹارچ نکال لی تھی۔ اس کی روشنی میں ہم ایک جگہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک ڈیوڑھی میں آگئے۔ ڈیوڑھی میں بھی آگے ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کے آگے لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ شیر علی نے ٹارچ زمین پر رکھ کر کہا۔

"ہاتھ ڈال کر میرے ساتھ الماری ایک طرف کرو"

ہم نے الماری کو ایک طرف کھسکا دیا۔ پیچھے دروازہ تھا جو بند تھا۔ شیر علی نے دروازے کا تالا کھول دیا۔ اندر سے ٹھنڈی مرطوب ہوا کا جھونکا میرے شانوں کو چھو کر گذر گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ بلکہ کوٹھڑی تھی شیر علی نے کسی جگہ دیوار پر لگا ہوا بٹن دبایا۔ کوٹھڑی میں روشنی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں دیوار کے ساتھ ایک میز پر دو تین وائرلیس سیٹ فوٹوگرافی کا سامان' ایک انلارجنگ آپریٹس مائیکرو فلم بنانے والا کیمرہ پڑا تھا۔ یہاں فلم ڈیویلپنگ کا پروسس بھی موجود تھا۔ شیر علی نے سٹول میز کے قریب کر دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ خود اوور کوٹ اتار کر دوسرے سٹول پر بیٹھ گیا۔ کوٹھڑی میں مرطوب ٹھنڈک تھی۔ قریب ہی ایک مائیکرو سکوپ پڑی تھی۔ شیر علی کہنے لگا۔

"تمہیں یہاں رہ کر مائیکرو فلم پروسیسنگ' خفیہ کوڈ' فوٹوگرافی اور سگنل کے خفیہ اشاروں کی ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی۔۔۔"

میں نے بیزاری کے ساتھ پوچھا۔

"یہ ٹریننگ کتنے دنوں کی ہوگی؟؟"

"تین ماہ لگیں گے"

میں ٹریننگیں لے لے کر تنگ آگیا تھا۔ اب میں میدان عمل میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے پتا چلا بلکہ ثابت ہو گیا کہ یہ ٹریننگ کورس کس قدر ضروری تھے۔ ان کے بغیر کوئی بھی کمانڈو جاسوس ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بلکہ الٹا اس کا دشمن کے ہاتھوں پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے بہت جلدی پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہ آخری ٹریننگ کا مرحلہ بھی بے حد ہمت طلب اور مشکل نکلا۔ مجھے اس کوٹھڑی اور اس کے ساتھ والے نسبتاً کشادہ ہال کمرے میں تین ماہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ مجھے گودام کی خستہ حال متروکہ عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شیر علی صبح منہ اندھیرے آجاتا تھا۔ وہ ناشتہ اور کھانا ساتھ لاتا تھا۔ دوپہر تک وہ مجھے فوٹوگرافی اور سگنل کے خفیہ اشاروں اور مائیکرو سکوپ پر مائیکرو فلم پروسیسنگ کی مشکل ترین ٹریننگ دیتا۔ میرے یہ تین مہینے انتہائی مشقت کے مہینے تھے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں قید میں رہ کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہوں۔ لیکن شیر علی نے ان تین مہینوں میں مجھے وائرلیس اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے خفیہ یعنی کوڈ اشاروں سے پیغام رسانی اور مائیکرو فلم پروسیسنگ کا ماہر بنا دیا۔ مائیکرو فلم کی ایک نئی ٹکنیک شیر علی نے مجھے سمجھائی اور اس کی پوری پوری تربیت دی۔ جاسوسی اور خفیہ پیغام رسانی کے اس طریقے کو پکڑنا بہت مشکل تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے جاسوسوں نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا۔ انڈیا میں یہ بالکل نیا تھا۔ اور اس کی کامیابی کے سو فیصد چانس تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک عام خیر خیریت کے خط میں ہر جملے کے بعد جو نقطہ ڈالا جاتا یعنی فل سٹاپ کا نقطہ۔ یہ انٹیلی جینس کا نقطہ ہوتا تھا۔ یہ کسی بھی فقرے کے آخر میں کاغذ پر جملے کے بعد چپکا دیا جاتا تھا۔ اس نقطے میں وہ پورا خفیہ پیغام ہوتا تھا جسے الگ کاغذ پر لکھ کے مائیکرو سکوپ سے چھوٹے سے چھوٹا کرتے ہوئے ایک نقطے میں مرکوز کر دیا جاتا تھا اور پھر یہ نقطہ سوئی سے اٹھا کر کاغذ پر فقرے کے آخر میں بطور فل سٹاپ چپکا دیا جاتا تھا۔ جس کو یہ پیغام بھیجنا ہوتا تھا وہ شخص اس نقطے کو اٹھا کر مائیکرو سکوپ یا کسی دوسرے آلات کے ذریعے انلارج کرتا اور سارا مضمون اس کے سامنے آجاتا تھا۔

شیر علی نے مجھے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر خفیہ سگنلز کے اشارے بھی زبانی یاد کروائیے۔ ان اشاروں کی مدد سے میں کوڈ الفاظ میں اپنے ساتھی کو انڈیا میں کسی بھی جگہ پیغام پہنچا سکتا تھا اور اس کا پیغام وصول بھی کر سکتا تھا۔ جب میری ٹریننگ ختم ہو گئی تو شیر علی مجھے رات کے وقت اس مال گودام کے قید خانے سے نکال کر اپنے ریستوران والے بیڈ روم میں

لے گیا۔ کہنے لگا۔

"اب تم سو جاؤ۔ کل کا دن بھی تم اسی بیڈ روم میں رہو گے اور آرام کرو گے۔ کل رات کو میں تمہیں کچھ باتیں زبانی بتاؤں گا جو انتہائی ضروری ہیں۔ اس کے بعد اپنے سیکرٹ مگر خطرناک مشن پر روانہ ہو جاؤ گے"

وہ رات اور اگلا دن میں نے شیر علی کے بیڈ روم میں قید تنہائی میں گذارا۔ دوسرے دن رات کے آٹھ بجے شیر علی نے اپنا کھانا بیڈ روم میں ہی منگوا لیا۔ نوکر کھانا لے کر آیا تو اس نے مجھے باتھ روم میں چھپا دیا۔ کہنے لگا۔

"میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ اب تمہیں میرے ہاں دیکھیں۔"

کھانے کے بعد اس نے سگار سلگا لیا۔ الماری میں سے کالے رنگ کی ایک پاکٹ بک نکال کر میرے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کمانڈو شیروان نے تمہیں را (RAW) کے بارے میں جو بریفنگ دی ہے اس سے اس نے مجھے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ تمہارا مشن بڑا نازک ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جیسی تمہیں تربیت دی گئی ہے اور اسلام' پاکستان اور کشمیر کی جنگ آزادی کے بارے میں تمہارے دل میں جو جذبہ موجود ہے اگر تم نے عقل مندی اور ہوشیاری سے کام لیا تو تم اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہو گے اور جہاد کشمیر' پاکستان کے استحکام اور اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دو گے اور ہندو سامراج کی اسلام دشمن سازشوں کو کاری ضرب لگاؤ گے--- اب تمہیں وہ سکیم بتاتا ہوں جس پر عمل کرتے ہوئے تمہیں اپنے مشن کو کامیاب بنانا ہے۔ اس وقت کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہیں اور انڈین فوجی یونٹوں کو ہر محاذ پر شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ بھارتی حکومت کشمیر میں دھڑا دھڑ فوجیں بھیج رہی ہے اور ان کو اسلحہ کی سپلائی دن رات جاری ہے۔ اندار حکومت کی منسٹری آف کشمیر افیئرز کی فوجی شاخ کو خفیہ ادارے را کے ماتحت کر دیا گیا ہے را کا ہیڈ کوارٹر تو دلی میں کیبنٹ

سیکرٹریٹ میں ہی ہے لیکن کشمیر میں فوجی سرگرمیوں کے تمام امور کشمیر افیئرز والی شاخ کے ہیڈ آفس میں طے پاتے ہیں دلی سے احمد آباد منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ غیر ملکی انٹیلی جنیس کی نظریں اس پر نہ پڑ سکیں۔ اس راز کو انتہائی خفیہ رکھا گیا ہے۔ اس محکمے کا انچارج گجرات کا کاٹھیاوار کا رہنے والا ایک تجربہ کار سول آفیسر ہے جس کا نام جی ڈی پانڈے یعنی گوکل داس پانڈے ہے۔ اس کے محکمے کو سپیشل سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں کشمیر میں جتنی نئی فوجی یونٹیں جاتی ہیں اور ان کے لئے جہاں جہاں سے اسلحہ سے بھری ہوئی سپیشل ملٹری ٹرینیں جموں کی طرف روانہ ہوتی ہیں وہ سب اس محکمے کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ اس محکمے کا براہ راست بھارتی فوجی ہائی کمانڈ سے سلسلہ جڑا ہوا ہے۔ انڈین فوجی ہائی کمانڈ کشمیر میں فوجوں کی نقل و حرکت کی جو سکیم تیار کر کے اس محکمے کے سربراہ جی ڈی پانڈے کو بھیج دیتا ہے اور پھر مسٹر پانڈے کا محکمہ اس سکیم پر عمل کرتے ہوئے فوجوں کو بھارت کی مختلف چھاؤنیوں سے روانگی اور اسلحہ کی ترسیل کا سارا کام خفیہ طور اپنی نگرانی میں کراتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں نے قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا تھا لیکن بھارتی حکومت نے فوراً وہاں اپنی فوجیں داخل کر کے کشمیر پر زبردستی اپنا قبضہ جما لیا تھا اب کشمیری مسلمان جن کی ریاست کشمیر میں واضح اکثریت ہے اپنے حق خود اختیاری کے لئے لڑ رہے ہیں تو انڈین حکومت یہ سمجھتی ہے کہ پاکستان ان کشمیری مسلمانوں کی اپنے کمانڈو بھیج کر مدد کر رہا ہے جو بالکل غلط بات ہے۔ کیونکہ کشمیری مسلمانوں کا تو بچہ بچہ کمانڈو بن کر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے انہیں باہر کی مدد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرف سے کشمیری مسلمانوں کو اسلام کے ناطے اخلاقی مدد ضرور مل رہی ہے لیکن فوجی مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ بھارتی حکومت نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کی مدد کر

رہا ہے اس لئے اندارا گاندھی کی حکومت پاکستان میں تخریب کاری کا ایک بہت خطرناک اور وسیع منصوبہ بنا رہی ہے۔ یہ منصوبہ اندرا گاندھی کے تیار کردہ اسی بدنام خفیہ ادارے را کی کشمیر افیئرز والی شاخ کے ذریعے تیار کیا جا رہا ہے اور اس کا انچارج بھی یہی ڈی جی پانڈے ہے۔ اس ناپاک منصوبے کے ذریعے پاکستان میں تخریب کاری کی جائے گی۔ بم کے دھماکے کئے جائیں گے۔ مساجد میں بم پھینک کر مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑایا جائے گا۔ مذہبی منافرت پھیلائی جائے گی۔"

میں بڑی توجہ سے شیر علی کی باتیں سن رہا تھا۔ میرا ذہن اس کی باتوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک پل کے لئے وہ خاموش ہو کر میری طرف غور سے دیکھنے اور سگار کے کش لگانے لگا۔ پھر اسی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولا۔

"تمہیں احمد آباد جا کر را کی کشمیر افیئرز کے ہیڈ آفس کے انچارج جی ڈی پانڈے یعنی گوگل داس پانڈے تک رسائی حاصل کرنی ہے رسائی بھی اس طریقے کی حاصل کرنی ہے کہ وہ تم پر بے حد اعتماد کرنے لگے۔ اس کے بعد تم نے احمد آباد میں ہی اپنا ایک خفیہ ہیڈ کوارٹر بنانا ہو گا۔ تم کشمیر میں تازہ انڈین فوجی یونٹوں کی نقل وحرکت اور اسلحہ کی سپلائی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے ان معلومات کی رپورٹ کوڈ الفاظ میں مجھے یہاں پہنچاؤ گے۔ میں نے تمہیں اپنے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے خفیہ سگنل بتا دیئے ہیں بلکہ تمہیں یاد کرا دیئے ہیں۔ ایک بات یاد رکھنا۔ تم مجھے ہمیشہ رات کے بارہ باجے سے ایک بجے کے درمیان ریڈیو ٹرانسمیٹر پر پیغام دیا کرو گے۔"

میں نے شیر علی کو سوال کیا۔

"میں اس سے پہلے احمد آباد کبھی نہیں گیا۔ اس شہر کے بارے میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہاں ایک عرصہ تک مسلمانوں بادشاہ حکومت کرتے رہے ہیں اور سلطان رضیہ سلطانہ اسی صوبے کی ملکہ تھی اور دوسرے یہ کہ ہندوؤں

کا مشہور مندر سومنات اسی صوبے میں کسی جگہ پر واقع ہے جس کے بت محمود غزنوی نے پاش پاش کئے تھے اور ہندو راجاؤں کے بے پناہ لشکر کو سومنات کے میدان میں شکست فاش دی تھی؟"

شیر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ اسی صوبے گجرات کاٹھیاواڑ کا دارالحکومت ہے اور اس کا اسلامی نام احمد آباد ہے یہ کپڑے کے کارخانوں کا شہر ہے اور بہت بڑی تجارتی منڈی ہے اور یہاں قطب شاہی خاندان کے کئی شاہی محلات اور تاریخی عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ بہر حال وہاں ہمارا ایک گجراتی مسلمان مجاہد تمہاری ابتدائی امداد کے لئے موجود ہو گا۔ وہ تمہاری کچھ دور تک راہ نمائی کرے گا۔ آگے سارا کام تم اکیلے ہی کرو گے۔ اب میری بات توجہ سے سنو۔ یہ جو مسٹر جی ڈی پانڈے ہے میں تمہیں اس کی تصویر بھی دکھا دوں گا۔ یہ شخص ویسے تو انڈین بیورو کریسی کا پرانا آئی سی ایس افسر ہے۔ بڑا پڑھا لکھا ہے۔ مگر دوسرے ہندوؤں کی طرح یہ بھی بے حد توہم پرست آدمی ہے۔ یہ جینی ہے۔ یعنی جین مت کا پیرو کار ہے اور جین دھرم کو ہی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس لئے تم اسے جین مت کے ایک وروان سادھو کے روپ میں ملو گے۔ کمانڈو شیروان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ کشمیر میں تمہیں ہندو ازم کے تمام فرقوں کی مکمل تعلیم دی گئی ہے۔ یقیناً تم جین مذہب کے بارے میں پوری معلومات رکھتے ہو گے۔ ویسے میں تمہیں انگریزی میں لکھا ہوا ایک کتابچہ بھی دوں گا جس میں جین مذہب کے بانی مہاویر کی زندگی کے حالات اور ہندو دھرم کے اس فرقے کے بارے میں مکمل معلومات درج ہیں۔ مہاتما گاندھی بھی جین مت کے ماننے والوں میں سے تھا۔ مگر جی ڈی پانڈے تو جین دھرم کا دیوانہ ہے اور اس دھرم کے بانی مہاویر کا عاشق ہے تم اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا اعتماد حاصل کرو گے۔

اب یہ تمہاری موقع شناسی اور عقل پر منحصر ہے کہ تم جی ڈی پانڈے کو کس حد تک اپنے قابو میں کرتے ہو۔ ویسے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے پورے قابو کیا جائے۔ تھوڑی بہت رسائی حاصل کر لینے سے ہمارا کام نہیں چلے گا۔"

میں خاموشی سے بیٹھا شیر علی کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو بڑ غور سے سن رہا تھا اور اسے اپنے دماغ میں بٹھاتا جا رہا تھا۔ کیونکہ ان باتوں نے آگے چ کر میرے کام آنا تھا۔

شیر علی کہنے لگا۔

"ہمارا احمد آباد والا آدمی اس سلسلہ میں بھی تمہاری مدد کرے گا۔ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ آدمی کوئی جاسوس نہیں ہے۔ اس کا پاکستان سے بھی کوئی واسطہ تعلق نہیں ہے۔ وہ بھارت میں رہنے والے ہزاروں مسلمانوں کی طرح کا ایک عام مسلمان ہے جس کو ہندو اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہے اور جس کی ترقی کے تمام راستے ہندو نے مسدود کر رکھے ہیں۔"

شیر علی نے مجھے اس آدمی کا نام بتایا۔ میں اصلی نام کی جگہ آپ کو اس کا فرضی بتائے دیتا ہوں۔ میں نے اس کا فرضی نام کریم بھائی رکھا ہے۔ یہ نام گجرات کاٹھیاواڑ مسلمانوں میں بڑا عام نام ہے۔ شیر علی نے کہا۔

"ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کریم بھائی کو بھی اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ہندو اسلام کا دشمن ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پوری نسل کو یا تو ہندو بنا دینا چاہتا ہے یا پھر اسے معاشی اور اقتصادی اعتبار سے اتنا تباہ حال کر دینا چاہتا ہے کہ بھارت کے مسلمان کی حیثیت ایک بھکاری سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ کریم بھائی نے اپنے اور اسلام کے دشمن کے خلاف مرتے دم تک جہاد کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس کا دشمن اور میرا دشمن اور ہمارے دین اسلام کا دشمن صرف ہندو اور ہندو ہی ہے سکھ تو جدھر مندر جاتا ہے اسی

طرف جاتے ہیں ان کی انڈیا میں اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک طرح سے وہ بھی مسلمانوں کے دشمن ہی ہیں۔"

پھر شیر علی نے مجھے بتایا کہ کریم بھائی مجھے احمد آباد کے ریلوے سٹیشن پر لینے آیا ہو ا۔

"میں اسے تمہارے جانے کے بعد اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع کر دوں گا۔ میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں"۔

شیر علی نے مجھے پاکٹ بک میں سے کریم بھائی کی پاسپورٹ سائز کی تصویر دکھائی۔ نے اس شکل کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا۔

"تم احمد آباد کے ریلوے سٹیشن پر اسے پہچان کر اس کے پاس جاؤ گے۔ وہ تمہیں سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک کے بک سٹال پر کھڑا ملے گا۔ تم السلام علیکم کہہ کر اس سے مصافحہ کرو گے۔ وہ کوڈ الفاظ میں تم سے پوچھے گا۔ آپ نے تو پچھلے سٹیشن پر اترنا تھا۔ تم اس کے جواب میں کہو گے۔ مجھے شیر کے شکار کا شوق ہے۔ کیا تم مجھے شیر کے شکار پر لے چلو گے۔ بس تمہاری شناخت مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد کریم بھائی تمہیں اپنے ہاں لے جائے گا۔ اب میں تمہیں را کے کشمیر افیئرز کے ہیڈ کوارٹر کے انچارج مسٹر جی ڈی پانڈے کی تصویر دکھاتا ہوں۔"

شیر علی نے اسی پاکٹ بک میں سے مجھے جی ڈی پانڈے کی تصویر بھی نکال کر دکھائی۔ ایک بھاری چہرے اور موٹی توند والے بیمار سے ہندو کی تصویر تھی جس کے سر کے بال ب تھے۔ کانوں کے اوپر تھوڑے تھوڑے سفید بالوں کی جھالر سی لگی تھی۔ مونچھوں ، بال بھی سفید ہو چکے تھے۔ اس نے سفید ململ کا کرتہ پہننا ہوا تھا جیسا اس زمانے کے رسی لیڈر پہنا کرتے تھے اور اب بھی پہنتے ہیں۔ نیچے اس نے ململ کی دہری دھوتی پہنی ی تھی اور باغ میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ شیر علی نے کہا۔

"یہ پانڈے کی کوٹھی کے لان میں اتری ہوئی تصویر ہے۔ یوں سمجھ لو کہ

تم نے اس شخص پر فتح حاصل کرنی ہے اور اس کے دل ودماغ پر قبضہ کرنا ہے اور یہ کام تم دولت مند بن کر' ملک کے لیڈر بن کر' ملک کے ہیرو بن کر نہیں کر سکتے۔ صرف اس شخص کے عقیدے کی نازک رگ کو اپنے ہاتھوں میں کر سکتے ہو اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم جین مت کے وِدوان اور شاستری بن کر اس کے سامنے جاؤ۔ اگر تم نے اپنی باتوں سے اس کو متاثر کر لیا تو پھر سمجھ لو کہ تمہارا آدھے سے زیادہ کمانڈو مشن اسی وقت مکمل ہو گیا۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ پر' انڈین فوجی ہائی کمانڈ کی ساری حکمت عملی اسی شخص جی ڈی پانڈے کے آفس میں تیار ہوتی ہے۔"

باتیں کرتے کرتے رات کے ساڑھے نو بج گئے۔ شیر علی نے اپنے ملازم کو جو کھانا لے کر آیا تھا کہہ دیا تھا کہ میں اب سو جاؤں گا۔ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس دوران وہاں کوئی بھی نہ آیا۔ شیر علی نے خود بجلی کی کیتلی میں پانی گرم کر کے کافی تیار کی۔ شیر علی کہنے لگا۔

"جینی وِروان یا سادھو بننے کے لئے تمہارے لئے ضروری ہو گا کہ تم جینی اوتار ساوردھن کی مڑھی پر جا کر وہاں سے چار گانٹھوں والا منگل سوتر لے کر اسے اپنی دائیں کلائی میں باندھو۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ جینی اوتار کون تھا اور اس کی مڑھی کہاں پر ہے؟"

شیر علی نے کہا۔

"ہندو دھرم خود بھی چوں چوں کا مربہ ہے اور اس کے آگے جو فرقے ہیں ان کی باتیں بھی عقل سے کوسوں دور ہیں۔ جین مت والوں کا عقیدہ ہے کہ جین مت کے بانی مہاویر جے وردھن نے تیسری بار بیکانیر کے ایک راجہ کے گھر اوتار بنکر جنم لیا تھا اور اس کا نام ساوردھن تھا۔ ساوردھن بھی مہاویر کی طرح راج پاٹ چھوڑ کر جنگلوں میں ساری عمر رہا اور مرنے کے بعد لوگ

اسے نندی کنڈ لے گئے جو بیکانیر سے 8 میل کے فاصلے پر ہے اور جہاں اس زمانے کے راجہ کی داشتاؤں کی مڑھیاں ہیں جن کے اوپر سنگ مرمر کی چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے قریب ہی جینی اوتار ساوردھن کی مڑھی ہے جہاں ایک چھوٹا سا مندر بنا ہے۔ وہاں ایک گیانی پنڈت بیٹھتا ہے۔ یہ منگل سوتر تمہیں وہی پنڈت دے گا مگر اس سے پہلے اس بات کی پوری تسلی کرے گا کہ تم جین مت کے بارے میں پوری معلومات رکھتے ہو اور مہاویر سوامی کے سچے پرستار ہو۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"اس بات کی فکر نہ کریں۔ میں اس پنڈت کو قائل کر لوں گا۔"

اس کے بعد مجھے شیر علی نے انگریزی کی چھوٹی سی کتاب نکال کر دی جو جین مت کے بانی مہاویر جے وردھن کے بارے میں تھی۔

"اسے تم پوری طرح پڑھ لینا۔ یہ تمہاری معلومات میں مزید اضافہ کرے گی۔"

سگار کی راکھ آتش دان میں جھاڑتے ہوئے شیر علی نے کہا۔

"باقی تمہارے پاس جو ٹیبلٹ بم اسپرو کی گولیوں کی شکل میں ہیں وہ تم اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھنا۔ یہ دھماکہ خیز خفیہ بم تمہارے بڑے کام آسکتے تھے ہیں مگر انہیں خاص خاص موقع پر استعمال کرنا۔ اس کوڈ زبان میں لکھا ہوا فارمولا بھی تم اپنے پاس ہی رکھنا۔ میں نے اگر تمہیں کوئی معمولی خیریت کا کوئی خط لکھا تو خط کی آخری سطر کے آخری فل سٹاپ والے نقطے کو اٹھا کر انلارج کر لینا۔ اسی میں تمہارے نام میرا خاص پیغام ہو گا۔ تم بھی اگر کوئی پیغام مجھے ریڈیو سگنل کے ذریعے نہ پہنچانا چاہو تو خط لکھ دینا اور اپنا پیغام خط کے آخری فقرے کے آخر میں فل سٹاپ میں بند کر دینا۔ میں اس نقطے کو انلارج کر کے تمہارا خفیہ پیغام پڑھ لوں گا۔ باقی تمہیں اگر کوئی خفیہ پیغام ریڈیو سگنل کے ذریعے

کمانڈو شیروان کو دینا ہو تو تمہیں شیروان نے اپنے ٹرانسمیٹر کے خفیہ اشارے ضرور سمجھا دیئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ وہ سگنل اشارے مجھے یاد ہو چکے ہیں اور آپ کے ٹرانسمیٹر سیٹ کے خفیہ سگنل بھی میں نے ذہن نشین کر لئے ہیں۔"

شیر علی بولا۔

"اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ مجھے ریڈیو سگنل کے ذریعے جب بھی کوئی پیغام بھیجنا ہو تو ہمیشہ رات کے بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان بھیجنا۔ اس وقت میرا خفیہ چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ میرے اسی بیڈ روم میں میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ کمانڈو شیروان بھی مجھے اسی وقت پیغام کے سگنل بھیجتا ہے۔"

رات کے دس بج چکے تھے۔ میں شیر علی سے پوچھنے ہی والا تھا کہ مجھے احمد آباد اپنے مشن پر کسی وقت روانہ ہونا ہے کہ اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا تھوڑا سا حلیہ تبدیل کر لو۔ تمہاری مونچھیں نہیں ہیں۔ تم چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھ لو اور بالوں کا سٹائل بھی تبدیل کر لو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ریستوران کے آدمیوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ یہ میری مجبوری تھی کیونکہ احمد آباد میں تم ایک ہندو بن کر جاؤ گے جو جین مت کا ماننے والا ودوان اور شاستری ہے۔ تم اپنا کوئی ہندوانہ نام ابھی مت رکھنا۔ کریم بھائی تمہیں گجرات کاٹھیاواڑ کا کوئی ہندوانہ نام بتا دے گا۔ دوسرے ماڈرن سادھو بن کر جی ڈی پانڈے کے پاس جاؤ۔ آگے وہاں جیسے حالات ہوں ویسے ہی کرنا۔ کریم بھائی اس سلسلے میں تمہیں صحیح مشورہ دے گا۔ جین مت کا سادھو بننے کے لئے تمہیں لمبے بال لمبی داڑھی رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گا۔ بس سفید کرتا سفید دھوتی اور چپل ہی کافی رہے گی۔ جین مت کے سادھو صفاچٹ بھی ہوتے ہیں۔ صرف ماتھے پر تمہیں جینی تلک لگانا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آج ہی سے مونچھیں بڑھانی شروع کر دیتا ہوں۔ بالوں کا اسٹائیل بھی تبدیل کر لیتا ہوں۔ اگر جٹا دھاری سادھو بننا پڑا تو وہ بھی بن جاؤں گا اگر کریم بھائی نے کہا کہ انگریزی کپڑوں والا ماڈرن سوامی ہی بنا رہوں تو یہی کپڑے ٹھیک رہیں گے۔ صرف ماتھے پر تلک لگا لوں گا"

شیر علی نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وہ میرے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"احمد آباد میں اتنی سردی نہیں ہوتی۔ وہاں تمہیں سویٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ صرف ایک کوٹ ہی کافی رہے گا۔ یا یہ جیکٹ جو تم نے پہن رکھی ہے ٹھیک رہے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لباس کا فیصلہ بھی تم کریم بھائی سے مل کر ہی کرنا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں سفید کھدر کا کرتہ پاجامہ اور کھدر کی جیکٹ پہننے کا مشورہ دے۔ کیونکہ آج کل کے ماڈرن جینی سادھو عام طور پر ایسا ہی لباس پہنتے ہیں۔ صرف کٹر قسم کے جینی سادھو یا تو ننگے رہتے ہیں اور یا پھر سفید کھدر کا کرتہ اور دھوتی پہنتے ہیں۔ اچھا اب تم آرام کرو"

میں نے پوچھا۔

"مجھے احمد آباد کس وقت روانہ ہونا ہو گا؟"

شیر علی نے ماتھے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ بتانا تو میں تمہیں بھول ہی گیا تھا۔ وہ ایسا ہے کہ میں نے بروڑہ ایکسپریس میں تمہاری سیکنڈ کلاس کی سیٹ ریزرو کروا دی ہے۔ تمہیں سب سے پہلے احمد آباد جا کر کریم بھائی سے ملاقات کرنی ہو گی۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ تمہیں پلیٹ فارم نمبر ایک کے بک سٹال پر ملے گا۔ تمہیں اس کی فوٹو بھی دکھا دی ہے۔ اس سے ملنے کے بعد تم بیکانیر ساووردھن اوتار کی مڑھی پہ جاؤ گے اور وہاں کے جینی پنڈت سے چار گانٹھوں والا کلائی پر باندھنے

کے لئے منگل سوتر حاصل کرو گے۔ اس کے بعد تم را کے احمد آباد والے ہیڈ کوارٹر کے چیف گوگل داس پانڈے سے رابطہ پیدا کرنے کے بارے میں کوئی حکمت عملی تیار کرو گے۔ تمہاری گاڑی صبح سوا چھ بجے نئی دلی کے سٹیشن سے چلے گی۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہو گی۔"

شیر علی دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور جین مت کے بانی کے بارے میں اس نے مجھے جو انگریزی کتابچہ دیا تھا اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ کوئی ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب تھی۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ساری کتاب پڑھ لی۔ اس کتاب سے جین مت کے بانی اور جین دھرم کے متعلق میری معلومات میں بڑا اہم اضافہ ہوا اور ان معلومات نے آگے چل کر مجھے بے حد فائدہ پہنچایا۔

صبح ساڑھے پانچ بجے شیر علی نے مجھے جگا دیا۔ پچھلی گلی والی سڑک پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گاڑی میں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ سردیوں کے موسم میں صبح پانچ بجے تک ہلکا ہلکا رات کا اندھیرا باقی رہتا ہے۔ نئی دلی کی سڑکوں پر بتیاں جل رہی تھیں۔ گاڑیوں کی ٹریفک ابھی سے شروع ہو گئی تھی۔ شیر علی نے نئی دلی کے سٹیشن سے کچھ فاصلے پر ہی گاڑی روک دی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"خدا پر بھروسہ رکھنا۔ تمہارے سامنے بڑا اہم مگر خطرناک مشن ہے۔ ایک بات میں تمہیں ضرور کہوں گا۔ کمانڈو جاسوس کے ہر وقت پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر کبھی پکڑے گئے اور دشمن کے تشدد کی اذیت برداشت نہ کر سکے اور موت سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تو ہم میں سے کسی کا نام زبان پر نہ لانا۔"

میں نے شیر علی کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"اس سے پہلے کہ آپ لوگوں کا نام میری زبان پر آئے میری زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہو گی۔"

شیر علی نے گاڑی سے باہر نکل کر مجھے گلے لگایا اور مجھ سے مزید کوئی بات نہ کی۔ خدا

حافظ بھی نہ کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

نئی دلی کا ریلوے سٹیشن اب بہت شاندار ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ چھوٹا سا سٹیشن ہوا کرتا تھا۔ باہر گاڑیاں پارکنگ میں کھڑی تھیں۔ صبح ہو رہی تھی۔ ٹکٹ میرے پاس ہی تھا۔ میں گیٹ پر ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دکھا کر پلیٹ فارم پر آ گیا اور سیکنڈ کلاس کے ریفرشمنٹ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ بروڑہ ایکسپریس نے دلی سے آنا تھا۔ وہ کچھ لیٹ آئی۔ میری سیٹ سیکنڈ کلاس میں ریزرو تھی۔ یہ چار سیٹوں والا ڈبہ تھا۔ تین اور مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا اور اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گیا۔ نئی دلی سے احمد آباد تک کافی لمبا سفر تھا۔ ٹرین پورے راجستھان میں سے ہو کر گذری۔ راستے میں جو بڑے بڑے شہر آئے ان کے نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ پہلے الور کا سٹیشن آیا۔ پھر جے پور اور اجمیر شریف آئے۔ اس کے بعد بیوار اور اودھے پور کے سٹیشن بھی گذر گئے۔ اس کے بعد احمد آباد تک کوئی بڑا شہر نہ آیا ٹرین کافی دیر تک چلتی رہی۔ میں دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب احمد آباد پہنچا۔ راستے میں ایک جگہ ٹرین کو لائن زیر تعمیر ہونے کی وجہ سے کافی دیر رکنا پڑا۔

احمد آباد کا ریلوے سٹیشن میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم نمبر سات پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں ایک قلی سے پوچھ کر پلیٹ فارم نمبر ایک پر آ گیا۔ میں بک سٹال تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک جگہ مجھے کاؤنٹر کے اوپر رسالے اور کتابیں وغیرہ نظر آئیں۔ میں بک سٹال کی طرف بڑھا۔ بک سٹال کے کونے میں ایک شخص کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے بڑے سکون سے کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ کریم بھائی تھا۔ میں آگے بڑھ کر اسے السلام علیکم کہا اور اس سے مصافحہ کیا۔

کریم بھائی نے کوڈ الفاظ استعمال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نے تو پچھلے سٹیشن پر اترنا تھا۔"

میں نے اس کے جواب میں خفیہ زبان میں کہا۔

"مجھے شیر کے شکار کا شوق ہے۔ کیا تم مجھے شیر کے شکار پر لے چلو

گے؟"

کریم بھائی نے بیڑی پھینک دی اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے لے کر سٹیشن سے باہر آگیا۔ یہاں واقعی موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے جیکٹ کے بٹن کھول دیئے۔ سٹیشن کے باہر بڑی رونق تھی۔ گجراتی لوگ دھوتی کرتہ' پینٹ قمیض پہنے سڑک پر آجا رہے تھے۔ ان کے رنگ زرد تھے۔ گجراتی عورتیں رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ کچھ شلوار قمیض والی عورتیں بھی نظر آئیں۔ سڑک پر خوب ٹریفک تھی۔ سامنے ایک دیوار پر فلموں کے گجراتی اور ہندی زبانوں میں لکھے ہوئے بڑے بڑے پوسٹر لگے تھے۔ ایک طرف رکشا اور ٹیکسی سٹینڈ تھا۔ کئی مردوں نے کاندھوں پر چھتریاں لٹکا رکھی تھیں۔

کریم بھائی مجھ سے دو تین قدم آگے چل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش نہ کی۔ ایک طرف پارکنگ سٹینڈ پر کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کریم بھائی نے ایک پرانی بوسیدہ سی نسواری رنگ کی چھوٹی مورس گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی سٹیشن کے احاطے سے نکل کر احمد آباد کے بازاروں میں سے گذرنے لگی اس وقت تک احمد آباد میرے لئے بالکل اجنبی شہر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد میں شہر کی تمام سڑکوں' محلوں اور ماڈرن بستیوں اور کالونیوں سے واقف ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں یہاں یہ نہیں ظاہر کروں گا کہ کریم بھائی مجھے شہر سے باہر کونسی بستی اور علاقے میں لے گیا۔ اس نے گاڑی ایک جگہ درختوں کے پاس کھڑی کر دی۔ یہاں آس پاس آبادی کافی فاصلے پر تھی۔ دور ریلوے لائن تھی جہاں ایک مال گاڑی گذر رہی تھی۔ کریم بھائی مجھے ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ یہ غیر آباد علاقہ تھا۔ ایک جانب کافی دور فیکٹریوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ ایک کوارٹر نما کھپریل کی ڈھلواں چھت والا شکستہ سا مکان آگیا جس کے احاطے میں لکڑی کے پرانے کھوکھے اور

ریفریجریٹروں کے خالی خول اور ادھر ادھر پڑے تھے۔ ان پر زنگ لگ رہا تھا۔ کوارٹر کے آگے چھوٹا سا ورانڈہ تھا۔ کریم بھائی نے چابی لگا کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہم اندر چلے گئے۔ یہ چھوٹا سا معمولی سامان والا کمرہ تھا۔ ایک پرانا پلنگ' دو بید کی کرسیاں' ایک سٹول' ایک تپائی تھی۔ دیواریں بالکل خالی تھیں۔ ایک کھڑکی تھی جو پچھلی طرف نکلتی تھی۔ کریم بھائی نے کھڑکی کھولی اور دوسری طرف تاڑ کے درخت نظر پڑے اور تازہ ہوا اندر آئی۔

"تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتا ہوں"

کچن برآمدے میں ایک طرف بنا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور کریم بھائی کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے مجھے ذرا متاثر نہ کیا تھا۔ شیر علی کے بیان کے مطابق اس شخص کو میرے انتہائی اہم مشن میں بڑا خاص رول ادا کرنا تھا۔ مگر مجھے نہیں لگتا تھا کہ یہ شخص کریم بھائی اتنے ذمے دار فرائض کو ادا کر سکے گا۔ لیکن بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ شخص واقعی کمال کی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس نے شہر کے ایک بازار میں ٹی وی اور ریفریجریٹروں کی مرمت کی دکان کھول رکھی تھی۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ شادی نہیں کی تھی۔ اپنی دکان کے اوپر چوبارے میں اکیلا رہتا تھا۔ محلے کی مسجد اور جین مندر کو ہر ماہ باقاعدگی سے چندہ دیتا تھا۔ جینی ہندوؤں پر اثر ڈالنے کے لئے اس نے اپنی دکان کے آگے پلاسٹک کا ٹب رکھا ہوا تھا جس میں ہر روز وہ پسا ہوا نمک ڈال دیتا تھا۔ گائیاں وہاں سے گذرتے ہوئے نمک چاٹا کرتی تھیں۔ احمد آباد میں یہ بات میں نے خاص طور پر دیکھی تھی کہ جینی ہندو جن کی احمد آباد میں اکثریت تھی گائیوں کو نمک چٹاتے تھے۔ آوارہ گائیاں اور بیل گلی محلوں میں عام پھرتے تھے۔ ہندو عورتیں ان کے آگے نمک اور چارہ ڈالتی تھیں۔ جین مت کے دو بڑے اہم فرقے ہیں۔ ایک فرقے کا نام ڈگمبر ہے۔ دوسرے فرقے کا نام سوتمبر ہے۔ ڈگمبر فرقے کے جینی سادھو ننگے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کوئی لباس نہیں پہنتے۔ گلیوں' بازاروں میں الف ننگے چلتے پھرتے ہیں۔ ہندو عورتیں گھروں سے نکل کر ان ننگے ڈگمبر سادھوؤں کو دہی' کھیر' آلو بھاجی اور پوڑیوں سے تواضع کرتی ہیں۔ دوسرے فرقے سوتمبر

کے سادھو سفید لباس پہنتے ہیں اور اپنے منہ پر ایک سفید رومال باندھے رکھتے ہیں تاکہ
کوئی جراثیم ان کے منہ میں داخل ہو کر ہلاک نہ ہو جائے۔ کیونکہ جین دھرم اہنسا یعنی
عدم تشدد ایک اہم ترین عقیدہ ہے۔ یہ لوگ کسی جانور کیڑے مکوڑے مکھی تک کو نہیں
مارتے۔ چارپائیوں میں اگر کھٹمل پڑ جائیں تو یہ لوگ انہیں بھی نہیں مارتے۔ اس کا علاج
یہ کرتے ہیں کہ دن کے وقت کھٹملوں والی چارپائی پر کسی مزدور کو پیسے دے کے سلا دیتے
ہیں۔ کھٹمل جی بھر کر اس مزدور کا خون پی لیتے ہیں۔ پھر یہ جینی رات کو جب اس چارپائی
پر سوتے ہیں تو کھٹمل انہیں کچھ نہیں کہتے۔ آگے چل کر میں جین دھرم کے بارے میں
بہت سی دلچسپ باتیں آپ کو بتاؤں گا۔

بہرحال کریم بھائی میرے بڑے کام کے آدمی نکلے۔ شیر علی نے یونہی مجھے اس آدمی
کے پاس نہیں بھیجا تھا۔ اس شخص میں بنیادی بات یہ تھی کہ وہ سچا مسلمان اور اسلام اور
پاکستان کا شیدائی تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ مضبوط پاکستان کے ساتھ ہی ہندوستان کے بارہ
کروڑ غلام مسلمانوں کی نجات وابستہ ہے۔ بعد میں جب میں نے کریم بھائی سے پوچھا کہ
اس نے شادی کیوں نہیں کی تو اس نے جواب دیا۔

"میں ایسی اولاد نہیں پیدا کرنا چاہتا جو ہندوستان میں ہندوؤں کی غلام بن
کر زندگی بسر کرے"

کریم بھائی کچن میں سے دو پیالیاں چائے کی بنا کر لے آیا۔ کہنے لگا۔

"اس کوارٹر کو خرید کر میں نے اپنا گودام بنایا ہوا ہے۔ بظاہر یہ ایک گودام
ہے مگر اس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ ہے جہاں میں نے بہت سی ایسی چیزیں
رکھی ہیں جن کی تمہیں اور مجھے ضرورت پڑے گی۔"

ہم چائے پینے لگے۔ کریم بھائی نے بیڑی سلگالی۔ کہنے لگا۔

"تمہیں سب سے پہلے ہندوستان میں عام بولی اور لکھی جانے والی ہندی
زبان سیکھنی ہو گی۔ یہ میں تمہیں چار مہینوں میں سکھا دوں گا۔ یہ کوئی مشکل
زبان نہیں ہے ہندی بولنا لکھنا اور سمجھنا تمہارے مشن کے لئے انتہائی ضروری

ہے۔ میں یہاں کبھی کبھی آتا ہوں۔ مگر تمہیں غیر معینہ مدت تک اس کوارٹر
میں رہنا ہو گا"

میں نے کہا۔

"مجھے تو منگل سوتر لینے کے لئے ساور دھن اوتار کی مڑھی پر بیکانیر بھی
جانا ہے۔"

کریم بھائی نے بیڑی کا کش لگانے کے بعد کہا۔

"وہ مجھے سب معلوم ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہاں تم کسی بھی وقت
جا سکتے ہو۔ لیکن فی الحال تمہیں مستقل طور پر اس کوارٹر میں رہ کر مجھ سے
ہندی زبان سیکھنی ہو گی۔ ہندی زبان جانے بغیر اپنے مقصد کی طرف ایک قدم
بھی نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں کچن میں تمہیں ضرورت کی ہر شے موجود ملے گی۔
میں رات کو تمہیں ہندی پڑھایا کروں گا۔ ساتھ والے کمرے میں' میں نے
تمہارے لئے دھوتی کرتے کے دو جوڑے رکھ دیئے ہیں۔ یہ لباس اتار کر
انہیں پہن لینا۔ یہاں کبھی کوئی نہیں آتا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا آدمی آجائے تو تم
جینی ہندو بن کر اس سے بات کرنا۔ جین مت کے بارے میں تم بہت علم رکھتے
ہو۔ یہ بات مجھے شیر علی نے اپنے خفیہ پیغام میں بتا دی تھی۔ اب میں جاتا
ہوں۔ رات کو کسی وقت آؤں گا۔ کچن میں تمہارے لئے کافی راشن موجود
ہے۔ کھانا وغیرہ تم خود تیار کرو گے۔ اب میں رات کو آؤں گا"

کریم بھائی چلا گیا۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ میں جلدی آپ کو اس مقام پر لے جانا
چاہتا ہوں جہاں سے میرے اصل مشن کا آغاز ہوتا ہے۔ مختصراً ایسا ہے کہ میں تین مہینے
کریم بھائی کے اس ویران کوارٹر میں رہا۔ اس دوران کریم بھائی نے مجھے اس طریقے سے
ہندی زبان پڑھائی کہ میں اس زبان کو بولنے سمجھنے اور اسے لکھنے کے قابل ہو گیا۔
اس دوران کریم بھائی دو تین بار کوارٹر کے پچھلے کمرے کے نیچے جو تہہ خانہ تھا وہاں

اکیلا ہی گیا۔ مجھے اس نے تہہ خانے میں جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے اس ک
ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ میری ساری توجہ ہندی زبان سیکھنے کی طرف تھی۔ جب مجھ
ہندی زبان میں کافی شد بد ہو گئی اور میں یہ زبان پڑھنے کے قابل ہو گیا تو کریم بھائی ن
ایک رات مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔

"تم نے جو اپنا نام داس ورتھنا رکھا ہے یہ بالکل موزوں نام ہے۔ اب تم اسی نام سے یہاں کے اونچے طبقے کی سوسائٹی میں اپنا تعارف کراؤ گے۔ تم نے مونچھیں بھی بڑھالی ہیں۔ ان کو زیادہ نہ بڑھانا۔ بس اسی طرح چھوٹی ہی رکھنا بالوں کو ذرا اور بڑھا کر ان کے پٹے بنالو اور جب بیکانیر جانے لگو تو ماتھے پر جین مت کا سرخ تلک ضرور لگالینا۔"

میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"کریم بھائی! مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں را کے کشمیر افیئرز والے ہیڈ آفس کے انچارج گوکل داس پانڈے سے روابط پیدا کرنے کے لئے کس راستے سے ہو کر جانا ہو گا؟"

کریم بھائی مسکرایا۔

"انڈیا کی اونچی سوسائٹی خاص طور پر ہندو سوسائٹی میں راہ ورسم بڑھانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ شراب اور عورت ہے۔ شراب تم نہیں پیوؤ گے کیونکہ تم ایک جینی وِدوان اور جین دھرم کے کٹر پیروکار کی حیثیت سے گوکل داس پانڈے تک پہنچنا چاہتے ہو۔ اس کے لئے بھی کسی عورت کا سہارا بہت ضروری ہے۔ تم نے سنا ہو گا بلکہ اخباروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں بھی دیکھا ہو گا کہ انڈیا کا سب سے بڑا لیڈر گاندھی بھی دو نوجوان لڑکیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر جلسے جلوسوں میں آیا کرتا تھا۔ یہاں اس قسم کی باتوں کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اونچے طبقے کی ہندو سوسائٹی کس قدر مادر پدر آزاد ہے اس کا اندازہ تمہیں خود آگے چل کر ہو جائے گا۔ میں تمہیں اپنی معلومات

کے حوالے سے اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ را ہیڈ آفس کے انچارج اور اسلام دشمن پاکستان دشمن کٹر جینی گوکل داس پانڈے کی صرف ایک ہی اولاد ہے اور وہ ایک جوان لڑکی ہے جس کا نام میناکشی ہے۔ وہ بڑی تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس نے شادی نہیں کی۔ وہ شادی کے خلاف ہے۔ آزاد خیال اور پوری فیشن ایبل لڑکی ہے۔ یہاں احمد آباد میں ایک پکی عمر کی خوش شکل ہندو عورت ریتا لینی سارا بائی نے اپنا ایک ڈانس سنٹر کھول رکھا ہے۔ گوکل داس پانڈے کی اکلوتی بیٹی میناکشی اسی ڈانس سنٹر میں میوزک اور ڈانس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ تمہیں میناکشی تک رسائی حاصل کرنی ہو گی۔ اس کام میں میں تمہاری مدد کروں گا۔ میناکشی کے ذریعے تم بڑی آسانی سے را کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کے انچارج جی ڈی پانڈے تک پہنچ سکو گے۔ لیکن سب سے پہلے اب تمہیں بیکانیر ساوردھن کی مڑھی پر جا کر منگل سوتر حاصل کرنا ہو گا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ بیکانیز وہاں سے کتنی دور ہے اور مجھے کس روز وہاں جانا ہے۔ کریم بھائی نے جواب دیا۔

"تم اسلام کے کمانڈو سپاہی ہو اور کمانڈو سپاہی کے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ تم کل صبح بیکانیر کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں یہاں سے اٹھا کر ریلوے سٹیشن تک چھوڑ آؤں گا۔ بیکانیر کے لئے احمد آباد سے صبح صبح ایک ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ تم اس ٹرین کے ذریعے بیکانیر پہنچو گے۔ آگے تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

میں غور کرنے لگا۔ بہت ہی باتوں پر مجھے غور کرنا تھا۔ میں کانٹوں سے بھرے ہوئے
سا میں داخل ہو رہا تھا۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے مجھے کئی باتیں سوچنی تھیں۔ کئی
سا پر غور کرنا تھا۔ کریم بھائی کہنے لگا۔

"تمہارے اسپرو ٹیبلٹ بم کی پندرہ ٹکیاں میں نے نیچے تہہ

خانے میں سنبھال کر رکھ لی ہیں۔ ان بموں کا فارمولا بھی ان کے ساتھ ہی میرے پاس محفوظ ہے۔ جس وقت ان چیزوں کے استعمال کا وقت آئے گا تم یہاں سے لے جاسکتے ہو۔ تہہ خانے کی ایک فالتو چابی میں نے پچھلے کمرے میں لکڑی کی جو الماری ہے اس کے اوپر رکھ دی ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں"

کریم بھائی مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہاں فرش ایک میلی کچیلی سی دری سے ڈھکا ہوا تھا۔ کونے میں لکڑی کی بڑی الماری تھی۔ کریم بھائی نے اوپر ہاتھ ڈال کر چابی لی پھر کونے میں ایک جگہ دری کو فرش پر سے ہٹایا۔ نیچے لکڑی کے فرش میں ایک جگہ سے چوکھٹا ہٹایا۔ نیچے لکڑی کا زینہ اترتا تھا۔ آگے چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہاں تالا لگا تھا۔ کریم بھائی نے چابی لگا کر تالا کھولا۔ دروازہ کھول کر اندر بٹن دبایا۔ تہہ خانے میں دھندلی روشنی ہو گئی۔ یہاں چھوٹی میز کے آمنے سامنے دو سٹول پڑے تھے دیوار کے ساتھ الماری تھی۔ کریم بھائی نے الماری کا نچلا خانہ کھولا اس کے اندر دو ٹرانسمیٹر رکھے تھے ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تھا جس کے ذریعے پیغام بول کر دیا بھی جاسکتا تھا اور پیغام سنا بھی جاتا تھا۔ دوسرا چھوٹا ٹرانسمیٹر تھا جس کے ذریعے صرف پیغام کے سگنل ہی دیئے جاسکتے تھے۔

کریم بھائی نے مجھے دونوں ٹرانسمیٹر دکھاتے ہوئے کہا۔

"ان پر دلی میں شیر علی اور کشمیر میں کمانڈو شیروان کے ساتھ ہمارا رابطہ قائم رہے گا۔ شیر علی نے دلی میں تمہیں وہ خفیہ سگنل بتا دیئے ہوں گے جن کے ذریعے تم اس سے اور کمانڈو شیروان سے رابطہ کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ خفیہ کوڈ سگنل مجھے یاد ہیں"

کریم کہنے لگا۔

"اب میں تمہیں وہ خفیہ اشارے سمجھاتا ہوں جن کے ذریعے تم یہاں میرے ساتھ اس ٹرانسمیٹر پر مجھ سے بات کرسکتے ہو۔"

اس نے ایک ریڈیو ٹرانسیٹر اون کر دیا۔ سیٹیوں کی آوازیں ابھریں۔ پھر یہ آوازیں بند ہو گئیں۔ کریم بھائی نے ایک ناب پر تین بار خاص انداز میں خاص خاص وقفوں کے ساتھ انگلی بجائی۔ تین بار مختلف ویو۔ستھ کے سگنل کی ٹون سنائی دی۔ اس نے کہا۔

"یہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کا خفیہ اشارہ ہے"

اس کے بعد کریم بھائی نے مجھے اپنے دونوں ٹرانسمیٹروں کی فریکو۔نسی بتائی۔ بلکہ مجھے زبانی یاد کرادی۔ کہنے لگا۔

"اس فریکو۔نسی پر خفیہ سگنل کا اشارہ دے کر تم مجھ سے بات کرسکتے ہو۔ میں ہر رات کو بارہ بجے سے ایک بجے تک اس تہہ خانے میں موجود ہوتا ہوں۔ اس وقت تم مجھ سے ریڈیو ٹرانسیٹر پر بات کرسکتے ہو۔ جو پیغام دینا ہو مجھے دے سکتے ہو"

میں نے کہا۔

"شیر علی نے بھی یہی ٹائم دیا ہے۔ یعنی رات کے بارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کو فضا میں ریڈیو ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون اور فوجی وائرلیس کے سگنلز اتنے زیادہ نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے دونوں ٹرانسیٹر میں ایک اضافی ٹیپ لگی ہوئی ہے اس ٹیپ پر دن کے وقت میری عدم موجودگی میں بھی تمہارا پیغام اس پر ریکارڈ ہو جائے گا جو مجھ تک پہنچ جائے گا۔"

اس نے الماری کا خانہ بند کر دیا اور تہہ خانے کا دروازہ لاک کر کے ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں آ گئے۔

اس نے تہہ خانے کی چابی الماری کے اوپر کونے میں رکھ دی

"یہاں یہ چابی محفوظ رہتی ہے۔"

میں نے کمرے میں آکر پوچھا۔

"کریم بھائی! یہ سگنلز تو پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ کیا کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ تو نہیں ہوا؟"

کریم بھائی نے مسکراتے ہوئے ہو کہا۔

"میرے کمانڈو دوست! یاد رکھو۔ کمانڈو سپائی کی سب سے بڑی کمزوری اس کے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے خفیہ سگنلز ہوتے ہیں۔ یہ سگنلز اگر دشمن کے ریڈار پر یا اس کے وائرلیس ریسوینگ سیٹ پر پکڑے جائیں تو دشمن ان کی مدد سے کمانڈو سپائی کو پکڑ سکتا ہے۔ یہ سگنلز دشمن کو کمانڈو سپائی کے گھر تک لے آئیں گے۔ اس اعتبار سے یہ سگنلز اگر کمانڈو کے دوست ہیں۔ مددگار ہیں تو اس کے سب سے بڑے دشمن بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان سے کسی حد تک بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ٹرانسمیٹر پر اشد ترین ضرورت کے وقت پیغام نشر کرو۔ دوسرے یہ کہ دو تین دفعہ پیغام نشر کرنے کے بعد فریکو-ئنسی تبدیل کر دو۔ میں نے تمہیں ایک ہی فریکو-ئنسی بتائی ہے۔ اس فریکو-ئنسی کے شروع اور آخر میں ویوتھ کو تھوڑا آگے پیچھے کرو گے یعنی اس کی رفتار میں

ایک سیکنڈ کے وقف سے کمی بیشی کرتے رہو گے تو دشمن کو یہ شک نہیں پڑے گا کہ یہ ہربار ایک ہی فریکو-ئنسی پر ایک ہی طرح کے سگنل کہاں سے نشر ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے"

میں ریڈیو سگنلز میں کافی ٹریننگ لے چکا تھا۔ کریم بھائی کی باتیں اگرچہ ٹیکنیکل ھیں مگر میں انہیں پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ میں نے کریم بھائی سے کہا کہ میرے پاس کوئی یا چھوٹے سے سائز کا ریڈیو ٹرانسمیٹر ضرور ہونا چاہئے جس کے ذریعے ہنگامی مالات میں میں کم از کم احمد آباد کی فضا کے اندر رہ کر آپ تک کوئی ضروری پیغام پہنچا کوں۔ کیونکہ ہنگامی حالات میں اس جگہ آنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔

اس پر کریم بھائی نے جواب دیا۔

"اس مشکل کا حل میں نے پہلے ہی سے تیار کر رکھا ہے۔ میں تمہیں ایک سگریٹ کیس دوں گا جس کے ساتھ ہی چھوٹا سا سگریٹ لائٹر لگا ہو گا۔ یہ لائٹر اصل میں ریڈیو ٹرانسمیٹر ہو گا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر کریم بھائی اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ ں سیاہ رنگ کا پلاسٹک کا چھوٹا لفافہ تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر اس نے لفافے میں سے سیاہ نگ کی کسی دھات سے تیار کیا ہوا عام قسم کا سگریٹ کیس نکال کر مجھے دکھایا۔ اسے ھولا۔ اس کے اندر سگریٹ بھرے ہوئے تھے۔ پھر اس نے سگریٹ کیس بند کیا۔ گریٹ کیس کے کونے میں سگریٹ لائٹر تھا جس میں ایک بٹن لگا تھا۔ اس نے بٹن بار بار بایا۔ بار بار شعلہ نکل کر بجھ جاتا۔ اس نے اس بٹن کو انگلی کے دباؤ سے ذرا سا نیچے کر یا۔ پھر بٹن دبایا کہ لائٹر میں سے شعلہ نہ نکلا۔ اس کی جگہ سگنل کی ہلکی ہلکی ٹون سنائی ی۔ کریم بھائی مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اب یہ سگریٹ لائٹر ریڈیو ٹرانسمیٹر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس پر تم میرے ٹرانسمیٹر سیٹ کی فریکو-ئنسی مقرر کر کے جہاں سے چاہو مجھے سگنل کے ذریعے پیغام پہنچا سکتے ہو۔ مگر تم صرف خفیہ کوڈ سگنل ہی میں پیغام پہنچا سکو گے۔ مجھ

سے بات نہ کر سکو گے۔ یہ یہاں میرے پاس ہی پڑا رہے گا۔ جب تم بیکانیر
ساور دھن او تار کا منگل سوتر حاصل کر کے واپس آؤ گے تو میں یہ تمہارے
حوالے کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ سگریٹ کیس کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کسی جگہ چھپا کر رکھ
دیا۔ جس کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ واپس میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ کل صبح تیار رہنا۔ اور کپڑے بھی بدل لینا۔ اس پتلون
جیکٹ کی بجائے سفید کھدر کا کرتہ، سفید پاجامہ چپل اور بادامی رنگ کی کھدر کی
نہرو جیکٹ پہن لینا۔ یہ سارے کپڑے دوسرے کمرے میں چارپائی پر پڑے
ہیں۔

اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے
بعد میں نے کچن میں جا کر انڈوں کا آملیٹ بنایا اور اسے ڈبل روٹی کے ساتھ کھا کر سو گیا۔

صبح اس وقت اٹھا جب کریم بھائی مجھے جگا رہا تھا۔

"سٹیشن چلنا ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ"

میں جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گیا۔ میں نے کھدر کا پاجامہ کرتہ اور کھدر کی
صدری پہن لی تھی۔ کریم بھائی نے جیب سے چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس میں تلک لگا
والا سرخ رنگ تھا۔ اس نے میرے ماتھے پر جینی دھرم کے طریقوں کے مطابق میرے
ماتھے پر تلک لگا دیا اور کہنے لگا۔

"اب تم پورے داس وردھنا جینی ہندو بن گئے ہو۔ اپنا نام یاد رکھنا۔ داس
وردھنا یعنی جین مت کے بانی مہاویر وردھنا کا نوکر۔ اپنے ماضی کے بارے میں
تم نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہی بیان یاد رکھنا۔ یعنی تمہاری پیدائش دلی میں ایک
جینی ہندو گھرانے میں ہوئی۔ تمہارے ماں باپ تمہیں چار پانچ سال کا چھوڑ کر
ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ تمہارے ایک رشتے دار نے تمہیں اناتھ
آشرم یعنی دلی کے یتیم خانے میں داخل کروا دیا۔ دلی کا یہ جینی اناتھ آشرم بڑا

مشہور ہے۔ وہاں تم میٹرک تک پڑھے۔ پھر ایک بوڑھا جینی اور اس کی بیوی
تمہیں بیٹا بنا کر امریکہ لے گئے۔ وہاں تم ایک کالج میں دو سال تک پڑھتے
رہے۔ جب دونوں بوڑھا بوڑھی مر گئے تو تم واپس ہندوستان آ گئے۔ تم پر
جین دھرم کا بڑا اثر تھا۔ چنانچہ تم مہاویر کی طرح ہندوستان کے جنگلوں میں
نکل گئے اور چھ سال تک تپسیا کرتے اور رشی منی جوگیوں کی خدمت کرتے
اور ان سے جین دھرم کے بارے میں گیان حاصل کرتے رہے۔ اب احمد آباد
آ گئے ہو اور یہاں جین دھرم کی خدمت کر کے باقی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔
تمہیں دنیا کا کوئی لالچ نہیں ہے اور تم نے شادی بھی اس لئے نہیں کی۔ بس
اس کہانی کو پوری طرح یاد کر رکھنا۔ اب چلو سٹیشن پر چلتے ہیں۔ تمہیں پیسوں
کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

میں نے کہا۔

"میرے پاس شیر علی کے دیئے ہوئے کافی روپے ہیں اگر ضرورت پڑی تو واپس
آ کر لے لوں گا"

کریم بھائی اور میں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں تمہیں میں کبھی دقت یا کمی محسوس نہیں ہو گی۔
ہندوستان کے مسلمان پاکستان کو طاقت ور دیکھنے اور اسلام کے نام کو سربلند
کرنے کی خاطر اپنی جانیں بھی قربان کر سکتے ہیں۔ ہماری ایک ایسی خفیہ تنظیم
یہاں احمد آباد میں موجود ہے۔ جو اس مقصد کے لئے ہر قسم کا مالی تعاون کرے
گی۔"

احمد آباد کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے دن نکل آیا تھا۔ کریم بھائی نے اسٹیشن
سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ گاڑی روک لی۔ کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں اپنی دکان نہیں دکھائی۔ میں اپنے ساتھ تمہیں دکان پر لے جانا
بھی نہیں چاہتا۔ تم اگر کبھی آئے بھی تو ایک عام ہندو گاہک داس وردھنا کے

روپ میں آؤ گے ۔ ابھی تم بیکانیر جا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہاں تمہیں دو تین دن لگ جائیں۔ جب واپس آؤ تو یہاں ریلوے اسٹیشن ہی سے مجھے اس نمبر پر ٹیلی فون کر دینا۔ میں تمہیں لینے یہاں آجاؤں گا۔ خدا حافظ!" اس نے مجھے ٹیلی فون نمبر لکھ کر دے دیا۔ اور مجھے اتار کر چلا گیا۔ میں اسٹیشن کی عمارت کی طرف چل پڑا۔

معلوم ہوا بیکانیر کو کوئی گاڑی سیدھی نہیں جاتی۔ جودھ پور سے گاڑی بدلنی پڑتی ہے۔ جودھپور جانے والی گاڑی کے چلنے میں ابھی گھنٹہ سوا گھنٹہ رہتا تھا۔ یہ وقت میں نے بک سٹال پر ہندی اردو انگریزی کے رسالے دیکھتے اور کاؤنٹر پر آکر چائے پیتے گذار دیا۔ پلیٹ فارم پر کافی رونق تھی۔ یہاں آکر مجھے پہلی بار اپنی ایک شدید غلطی کا احساس ہوا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ میں گجراتی جینی خاندان میں پیدا ہوا تھا اور مجھے گجراتی زبان بالکل نہیں آتی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اپنی فرضی کہانی میں اپنے ماں باپ کو گجراتی نہیں بلکہ اتر پردیش کے جین بت کو ماننے والے ہندو ظاہر کروں گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی فاش غلطی تھی کہ میں کہیں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ یہ بات میں نے اپنے ذہن میں پکی کر لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ عین وقت پر میں نے اپنی خطرناک غلطی درست کر لی۔

جودھپور جانے والی گاڑی آگئی۔ یہ پسنجر قسم کی گاڑی تھی ۔ راجستھان کے دیہاتی مسافروں سے پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ مجھے بھی ایک ڈبے میں تھوڑی سی جگہ مل گئی۔ یہ سفر بھی کافی لمبا تھا۔ اور ریگستانی علاقے کا سفر تھا۔ گاڑی تقریباً ہر اسٹیشن پر رکتی تھی۔ بڑا شہر میہنا آیا۔ صحرائی میدان شروع ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں سرسبز کھیت کا ٹکڑا نظر آجاتا تھا۔ سردوہی شہر آیا۔ پھر گڈوار۔ یہاں پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ شام کے وقت ٹرین مارواڑ پہنچی۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے لوگوں کے مقابلے میں یہاں کے لوگ اونچے لمبے تھے۔ بوڑھوں نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ داڑھیاں درمیان سے مانگ نکال کر اوپر کو باندھی ہوئی تھیں۔ سر پر بڑے بڑے پڑی دار پگڑ تھے۔ دیہاتی عورتوں نے چاندی کے زیور اور کہنیوں تک کانچ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ کافی انتظار کے بعد گاڑی راجستھان

کے بڑے شہر جودھپور پہنچی۔ یہاں سے میں نے بیکانیر کے لئے گاڑی بدلی۔ دوسری گاڑی رات کے دس بجے چلی۔ میں نے جگہ بنا لی تھی۔ دو تین گھنٹے سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو ناگور کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہوئی تھی۔ ناگور شہر راجستھان کا بڑا مشہور شہر ہے۔ اس شہر نے بڑے عالم فاضل مسلمان شاعر علماء اور دانشور پیدا کئے ہیں۔

صبح ہو رہی تھی کہ ٹرین بیکانیر پہنچ گئی۔

خدا کا شکر ادا کیا۔ بڑا تھکا دینے والا بلکہ بور کر دینے والا سفر تھا۔ سفر میں دو ایک مسافروں سے باتیں بھی ہوتی رہیں۔ میں نے انہیں اپنا نام داس وردھن ہی بتایا اور کہا کہ بیکانیر میں اپنی ماسی کے ہاں ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ بیکانیر ایک بارونق شہر تھا۔ یہ میں آج سے تقریباً پچیس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں کافی تاریخی قلعے اور محلات تھے۔ مگر میرا ٹارگٹ اوتار ساوردھن کی مڑھی تھی جو بیکانیر شہر سے آٹھ میل شمال مشرق کی طرف واقع تھی۔ اس جگہ کا نام نندی کندہ ہے۔ یہاں سنگ مرمر کی چھتریوں والی کتنی ہی مڑھیاں ہیں۔ یہ ایک طرح کا قبرستان ہے جہاں روایت کے مطابق کسی راجہ کی چہیتی داشتاؤں کی ہڈیاں دفن ہیں۔

بیکانیر کے اسٹیشن سے میں سیدھا ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں گیا۔ ایک کمرہ کرائے پر لے کر غسل کیا۔ ناشتہ کیا اور پھر ایک ٹیکسی لے کر نندی کنڈ کی چھتریوں والی مڑھیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا راستہ صحرائی تھا اور ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ اور منزل معلوم تھی۔ آٹھ میل کا فاصلہ ایک گھنٹے ہی طے ہوا۔ میں سنگ مرمر کی مڑھیوں میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی نے اپنے پاس ہی رکھی۔ ایک جگہ چھوٹا سا جین مندر بنا ہوا تھا۔ یہی اس گیانی پنڈت کا گھر تھا۔ جس سے میں جین مت کا اہم ترین نشان چار گانٹھوں والا منگل سوتر لینے آیا تھا۔ جینی پنڈت ایک کوٹھری میں اوتار ساوردھن کی مڑھی کے قریب بیٹھے تھے۔ دو ملازم ان کی خدمت کر رہے تھے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو بڑی بے نیازی سے فرمایا۔

"تم ابھی نوجوان ہو۔ پہلے جین دھرم کا پورا گیان حاصل کرو تب میرے پاس

منگل سوتر لینے آنا"

میں نے انہیں سمجھایا کہ میں بچپن ہی سے جین مت کا پرستار ہوں۔ خود بھی جینی ماتا پتا کا بیٹا ہوں۔ آپ میرا امتحان لے لیں اگر کامیاب ہو گیا تو منگل سوتر دے دیجئے گا۔ پنڈت نے سفید رومال سر پر باندھ رکھا تھا۔ وہ سفید لباس میں تھا۔ کہنے لگا۔ "تم کس لئے منگل سوتر کی خواہش کر رہے ہو؟" میں نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ مجھے پنڈت کے اس قسم کے سوالات کے کیا جواب دینے ہیں۔ میں نے کہا۔

"گورو دیو! میں اناتھ ہوں۔ میں برہم چاری بھی ہوں۔ میں اپنا جیون جین مت کے پرچار میں گذار دینا چاہتا ہوں۔ اس سنسار کا مجھے کوئی لالچ نہیں ہے"

پنڈت نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا۔

"جیسی تمہاری اچھیا۔ مگر منگل سوتر ہم اسی کو دیتے ہیں جو جین دھرم کا وردان ہوتا ہے۔ تمہیں میرے کچھ سوالوں کے جواب دینے ہوں گے کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا "میں تیار ہوں گورو جی!"

پنڈت مجھ سے جین مت کے بارے میں بہت ہی ابتدائی معلومات کے متعلق پوچھتا رہا۔ میں نے جین دھرم کی ساری تاریخ پڑھ رکھی تھی۔ ہر سوال کا جواب دیتا گیا۔ آخر میں پنڈت نے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب ایک عام جینی شاید نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ جین مت اور بدھ مت میں کیا فرق ہے"

اگر گوتم بدھ اور مہاویر وردھن کی زندگی کے حالات اور تعلیمات کو دیکھا جائے تو ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں راج کمار تھے۔ دونوں جوانی میں راج محل چھوڑ کر نروان کی تلاش میں جنگلوں میں نکل گئے۔ دونوں نے محبت اور رحم کا پرچار کیا۔ دونوں آواگون کے قائم تھے۔ دونوں ذات پات کی تقسیم کے خلاف تھے۔ دونوں مورتیوں کی پوجا کے خلاف تھے۔ مگر ان دونوں کی تعلیمات میں ایک بڑا باریک مگر بڑا بنیادی فرق

تھا۔ فرق یہ تھا کہ گوتم بدھ اس بات کا قائل تھا کہ انسان بھوکا رہ کر اور اپنے جسم کو تکلیف پہنچا کر ٹارچر کر کے نروان حاصل نہیں کر سکتا۔ ضروری ہے کہ انسان غذا بھی کھائے اور جسم کو تکلیف نہ پہنچائے اور فاقہ کشی نہ کرے۔ جب کہ جین مت کا بانی مہاویر کہتا ہے کہ صرف فاقہ کشی اور جسم کو ٹارچر کرنے ہی سے نروان مل سکتا ہے۔ یہ جین مت کے بنیادی عقیدے میں شامل ہے۔ چنانچہ جین دھرم کے ماننے والوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ کھانا پینا بند کر دیتا ہے اور فاقے کی وجہ سے ایک روز خاموشی سے مرجاتا ہے۔ جینی اسے نروان اور نجات کی موت کہتے ہیں۔

جب میں نے پوری تفصیل کے ساتھ پنڈت کو جین مت اور بدھ مت کا بنیادی فرق سمجھایا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"دھن ہو دھن ہو۔ تم واقعی جینی دھرم کے وردان ہو۔ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں جینی منگل سوتر پہناؤں گا۔"

اس نے صندوق میں سے کیسری رنگ کا منگل سوتر نکالا۔ یہ دس بارہ دھاگوں کو جوڑ کر انہیں بٹ دے کرائی کی طرح بنایا ہوا تھا۔ اس میں یکساں فاصلے پر چار گانٹھیں تھیں۔ پنڈت نے میرے بائیں ہاتھ کی کلائی میں منگل سوتر باندھا اور بولا۔

"اب تمہیں ایک سو روپے رکھشا دینی ہو گی"

میں نے اسی وقت سو روپے کا نوٹ نکال کر پنڈت کو دے دیا۔ نوٹ اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"مگر ابھی ایک رسم باقی ہے"

"وہ کیا؟ وہ بھی بتا دیجئے گورو دیو!"

پنڈت کہنے لگا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو کہ اتنی چھوٹی عمر میں منگل سوتر حاصل کر لیا ہے۔ لیکن تمہیں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر ایک رات بیٹھ کر ہری اوم کا جاپ کرنا ہو گا۔ تم ایک لاکھ مرتبہ ہری اوم کا جاپ کرو گے۔ رات کے پچھلے پہر

جب تم ایک لاکھ مرتبہ ہری اوم کا جاپ کر چکو گے تو ساوردھن اوتار کی مڑھی کے سرہانے والے سوراخ میں سے سفید روشنی نکلے گی۔ پھر یہ روشنی سرخ ہو جائے گی۔ اس کا مطلب ہو گا کہ اوتار ساوردھن نے تمہارا منگل سوتر سوئیکار (قبول) کر لیا ہے۔ اگر روشنی سرخ نہ ہوئی اور سفید ہی رہی اور تھوڑی دیر بعد غائب ہو گئی تو اس کا مطلب ہو گا کہ اوتار ساوردھن نے تمہارے منگل سوتر کو قبول نہیں کیا۔ پھر تمہیں یہ سوتر مجھے واپس کرنا ہو گا۔ اگر تم نے منگل سوتر مجھے واپس نہ کیا اور بھاگ گئے تو تم ایک لاکھ چوراسی ہزار مرتبہ چوہے کی شکل میں جنم لو گے اور تمہیں کبھی نروان نہ مل سکے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ پنڈت نے یہ محض پیسہ کمانے کا ڈھکوسلہ بنایا ہوا ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ اگر روشنی سرخ ہو گئی تو تم مزید دو سو روپے روشنی والے سوراخ میں ڈالو گے۔ یہ تمہاری رکھشا ہو گی۔ میں نے کہا۔

"میں اس امتحان کے لئے بھی تیار ہوں گورو دیو" مجھے اس امتحان کے لئے ساوردن اوتار کی مڑھی پر کس وقت جانا ہو گا؟"

پنڈت نے بتایا کہ رات جب آدھی گذر جائے گی تب میں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر جا کر بیٹھ جاؤں گا اور ایک لاکھ مرتبہ ہری اوم کا جاپ کروں گا۔ یہ پنڈت بھی جانتا تھا کہ کوئی انسان اتنے تھوڑے وقت میں ایک لاکھ بار ہری اوم کا جاپ نہیں کر سکتا۔ مگر اس نے یہ فراڈ ایسے ہی چلا رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں آج ہی آدھی رات کو مڑھی پر بیٹھ جاؤں گا"

میں نے پنڈت سے اجازت لی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا اور یونہی بیکانیر شہر کی سیر کرنے نکل پڑا۔ یہاں گرمی بہت تھی۔ بازاروں میں قسم قسم کی چیزیں بک رہی تھیں۔ کئی غیر ملکی سیاح بازار میں گھوم رہے تھے۔ مجھے ایک بازار کے کونے پر ایک مسجد کا گنبد اور مینار نظر آئے۔ دل پر ایک دم خوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ ابھی تک میں ہندو بن کر کفر بک رہا تھا۔ میرے

لئے اب لازم ہے کہ اس مسجد میں جاؤں اور اگر دو نفل نہیں پڑھ سکتا تو مسجد کے امام صاحب سے ہی یونہی دو چار باتیں کر لوں۔ چنانچہ میں مسجد میں آ گیا۔ چھوٹی سی مسجد تھی۔ امام صاحب بوڑھے آدمی تھے۔ صحن میں ایک طرف محراب پر چڑھی ہوئی بیل کی چھاؤں میں بیٹھے کوئی کتاب گھٹنوں پر رکھے پڑھ رہے تھے۔ میرے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ میرا پہناوا بھی ہندوؤں ایسا تھا۔ اسی لئے مسجد کے اندر صحن میں نہ گیا۔ وہیں کھڑا رہا۔ امام صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑی تو دور ہی سے پوچھا کہ کیا بات ہے بھائی۔ تم شکل وصورت سے مسلمان نہیں لگتے۔ یہاں کیسے آئے ہو؟ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مندر مسجد کو میں بھگوان کا گھر ہی سمجھتا ہوں۔ بس ادھر سے گذرا تو من میں خیال آیا کہ بھگوان کے گھر کو پرنام کرتا چلوں"

امام صاحب ذرا سا مسکرائے۔ انہوں نے مجھے مسجد میں آنے کے لئے بالکل نہ کہا۔ بس اتنا کہہ کر مطالعے میں مشغول ہو گئے

"اچھا اچھا"

میں نے مسجد کے محراب پر لکھے ہوئے کلمہ طیبہ کو دو تین بار دل میں پڑھا۔ خدا سے اپنی کفر کی باتوں کی معافی مانگی اور امام صاحب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کر کے واپس چل دیا۔ مسجد کے دروازے سے نکل کر میں اپنے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ سوچا تھوڑا سا آرام کر لینا چاہئے۔ ساری رات جاگنا ہے۔ مجھے کچھ ایسے لگا تھا کہ جب میں مسجد سے نکلا تھا تو بازار کی دوسری طرف دکان کے باہر ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس نے مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ اور جب میں بازار میں چلنے لگا تھا تو وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں چلتے چلتے محتاط ہو گیا۔ آخر میں نہ تو ہندو تھا اور نہ کوئی عام مسلمان شہری تھا۔ میں دشمن ملک میں کمانڈو سپائی کی حیثیت سے ایک انتہائی اہم مشن پر آیا ہوا تھا۔ اس آدمی کی دھندلی سی شکل میں نے دیکھ لی تھی۔ میں بظاہر بڑی بے نیازی سے بازار میں ایک طرف ہو کر چل رہا تھا لیکن میری چھٹی بلکہ ساتویں حس بھی بیدار ہو چکی تھی۔ یہ سوچ کر ایک لمحے کے لئے میں واقعی پریشان ہو گیا کہ میرے پاس سنٹرل سیکریٹ پولیس کے خفیہ نمبر والا کارڈ نہیں

تھا۔ وہ میں کریم بھائی کے تہہ خانے کی الماری میں ہی دوسری چیزوں کے ساتھ چھوڑ آیا تھا۔ چلتے چلتے میں رک گیا۔ میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ جس شخص کو میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے دیکھا تھا وہ میرا تعاقب کر رہا ہے یا نہیں۔

میں رک کر دکانوں کے بورڈ پڑھنے لگا۔ یہ ظاہر کیا جیسے مجھے کسی خاص دکان کی تلاش ہے۔ پھر اپنی نگاہیں دکانوں کے باہر لگے بورڈوں پر ڈالتے ہوئے میں نے گردن گھما کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ بازار میں کوئی رش بالکل نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو آدمی مجھے مسجد سے باہر نکلتے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ مجھ سے کوئی پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر ایک دکان کے باہر کھڑا دکاندار سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے بھی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر دکاندار سے باتیں کرنے لگا۔

یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یہ شخص خفیہ پولیس کا آدمی ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ میرا پیچھا کرنے میں حق بجانب تھا۔ کیونکہ میرا حلیہ ہندوؤں والا تھا اور میں مسجد سے باہر نکلا تھا۔ اسی بات پر اسے شک ہوا ہو گا کہ اگر میں ہندو ہوں تو مسجد میں کیا لینے گیا تھا۔ اگر مسلمان ہوں تو میں نے ہندوؤں والا حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔ یہ پاکستان کا سرحدی شہر تھا۔ بیکانیر سے آگے مغرب کی جانب بارڈر کا صحرا تھا۔ یہاں بڑی سخت سکیورٹی تھی۔ چنانچہ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے میرا خاموشی سے پیچھا کرنے لگا تھا کہ اصل میں' میں کون ہوں؟ کہیں پاکستان کا جاسوس تو نہیں ہوں؟ وہ وہیں مجھے روک کر مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر سکتا تھا۔ مجھے تھانے بھی لے جا سکتا تھا۔ میں انڈیا کے بارڈر شہر میں تھا اور سکیورٹی یہاں سخت تھی اور پولیس کی انٹیلی جینس کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ اگر اس شخص نے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں اور میرے ساتھ اور کون کون ۔ہے۔ یہ میری سوچ تھی۔

اب میرا ذہن بھی الرٹ ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ واپس اپنے ہوٹل نہ جاؤں اور خفیہ پولیس والے کو جل دے کر کسی طرف غائب ہو جاؤں اور آدھی رات تک وہیں بیٹھا رہوں۔ اس کے بعد ٹیکسی لے کر چھتریوں والی مڑھیوں کی طرف چل لوں۔ پھر سوچا

کہ ایسا کرنے سے خفیہ پولیس کا شک یقین میں بدل جائے گا کہ میں واقعی پاکستانی جاسوس ہوں۔

ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ہوٹل میں آ گیا۔ یہاں میں نے اپنا نام داس وردھن ہی لکھوایا تھا اور یہ بھی لکھوایا تھا کہ میں احمد آباد میں رہتا ہوں اور یہاں اوتار ساوردھن کی مڑھی کی یاترا کرنے آیا ہوں۔ میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ وہ شخص برابر میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس وقت مجھے سیکرٹ پولیس کے جادو اثر نمبر والا خفیہ کارڈ بہت یاد آیا۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا تو اس انٹیلی جینس کے آدمی سے ایک سیکنڈ میں نجات حاصل کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا مشن اتنا بڑا تھا کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میں خاطر میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بعض اوقات یہ چھوٹی چھوٹی پریشانیاں اور کسی معمولی سی آئی ڈی کے آدمی کی پوچھ گچھ بڑے سے بڑے کمانڈو سپائی کے بڑے سے بڑے مشن کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔ مجھے بیکانیر کے اس معمولی سے خفیہ پولیس افسر سے الجھن ہونے لگی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ شام کو میں نے کھانا بھی کمرے میں ہی منگوایا۔ اسی دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا۔ میں ایک تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو تھا۔ میں اس خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی میری جان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑا کرتے۔ خاص طور پر جب انہیں کچھ شک پڑ جائے تو پھر تو یہ اگلے کو حوالات میں پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ بلکہ اس دوران اس شخص نے اپنے متعلقہ افسروں کو بھی میرے بارے میں بتا دیا ہو گا کہ ایک مشکوک آدمی کا پیچھا کر رہا ہوں۔

مجھے رات کے بارہ بجے سنگ مرمر کی چھتریوں والی مڑھیوں میں پہنچنا تھا۔ گیارہ بجے ہوٹل سے نکل کر میں نے ٹیکسی لی اور نندی کنڈ کی طرف چل پڑا۔ یہی اس علاقے کا نام تھا۔ بیکانیر کے رہنے والے حضرات اس نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے میں نے اردگرد ایک سرسری سی نگاہ ضرور ڈالی۔ مجھے خفیہ پولیس والا

کہیں نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ وہاں موجود ہے اور میرے پیچھے آئے گا۔
بہرحال مجھے اپنا کام ہر حالت میں پورا کرنا تھا۔ میں وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پنڈت جی کے
آشرم میں پہنچ گیا۔ میں اس چھوٹی سی کوٹھڑی کو آشرم ہی کہوں گا۔ پنڈت جی نے مجھے
خالی ہاتھ آتے دیکھا تو ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوتار ساوردھن کے چیلوں کے لئے کچھ نہیں لائے؟"

میں نے پشیمان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"گوروجی! غلطی ہوگئی"

"یہ بہت ضروری تھا۔ اچھا تم ایسا کرو۔ ایک سو روپیہ بھنڈار خانے میں جمع
کرادو۔ مجھے دے دو۔ میں خود سب میں بانٹ دوں گا"

میں نے مزید ایک سو روپے کا نوٹ پنڈت جی کے حوالے کر دیا۔ پنڈت جی نے مجھے
اپنے قریب بٹھالیا اور کہنے لگے۔

"اوتار ساوردھن کی مڑھی کے اردگرد راجہ کی داشتاؤں کی مڑھیاں ہیں۔
ہمارے گوروجی کہا کرتے تھے ان داشتاؤں کی روحیں لومڑیاں بن کر رات کو
بین کرتی ہیں۔ ان سے ڈرنا مت۔ کچھ داشتاؤں کی بدروحیں خوبصورت
عورتوں کا روپ بدل کر برہنہ ہو کر اچانک سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے قریب
میں مت آنا۔ اور دھیان لگا کر ہری اوم کا جاپ جاری رکھنا۔ بھگوان مہاویر
سے میری پرارتھنا ہے کہ وہ تمہارا منگل سوتر قبول کرلے۔ اب وقت ہوگیا
ہے جاؤ اور مڑھی پر بیٹھ کر جاپ شروع کردو۔ میں نے تمہیں مڑھی دکھا دی
ہوئی ہے"

میں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر جاکر بیٹھ گیا جو وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر سنگ
مرمر کی چھتریوں اور بارہ دریوں والی مڑھیوں کے درمیان واقع تھی۔ چونکہ یہ ایک اوتار
کی مڑھی تھی۔ اس لئے اس کا چبوترہ ذرا اونچا تھا اور اوپر سنگ مرمر کی چھتری کے
چاروں طرف کپڑے کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ

سے رات کو یہاں ٹھنڈ ہوگئی تھی۔ مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ نے میرا
جسم لوہے کا بنا دیا تھا۔ چبوترے کے درمیان میں سنگ مرمر کا چوکور پتھر رکھا ہوا تھا۔ اس
کے نیچے بقول پنڈت کے جین مت کے اوتار ساوردھن کی ہڈیاں دفن تھیں۔ پتھر کے اوپر
گیندے کے پھولوں کے باسی اور کچھ تازہ ہار پڑے تھے۔ میں چبوترے کی دیوار سے ٹیک
لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے کوئی جاپ وغیرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں را کے احمد آباد
والے ہیڈ آفس کے انچارج گوکل داس پانڈے کی اکلوتی اور فیشن ایبل ماڈرن لڑکی
میناکشی کو اپنے دام میں پھنسانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مڑھی
کے پتھر پر بھی نگاہ ڈال لیتا کہ کب وہاں جو سوراخ تھا اس میں سفید روشنی ہوتی ہے۔ یہ
سوراخ میں نے دن کے وقت بھی دیکھ لیا تھا۔ یقیناً پاکھنڈی پنڈت نے زمین کے نیچے سے
بجلی کی تار لے جاکر اس کے اندر سفید اور سرخ روشنی والے دو بلب لگا دیئے ہوئے
تھے۔ ان کو وہ اپنی کوٹھڑی سے بٹن دبا کر روشن کر دیتا تھا۔ اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر
ان سے پیسے بٹورتا تھا۔ چار گانٹھوں والا زعفرانی رنگ کا منگل سوتر میری بائیں کلائی کے
ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میرے نزدیک نہ اس منگل سوتر کی کوئی روحانی اہمیت تھی نہ میں کسی
اوتار وغیرہ کی روح کا قائل تھا۔ یہ میری اور میرے مشن کی ضرورت تھی جس کو مجھے ہر
حالت میں پورا کرنا تھا۔ رات ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آسمان پر ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے چاند نکل کر اوپر آگیا۔ اس کی
زرد سرخی مائل چاندنی میں صحرائی رات ہلکی ہلکی روشن ہو کر اور زیادہ پر اسرار لگنے لگی۔
میری بائیں اور دائیں جانب راجہ کی داشتاؤں کی قبروں والی سنگ مرمر کی چھتریاں ساکت
کھڑی تھیں۔ پنڈت نے مجھے مزید اپنے جال میں پھنسانے کے لئے کہا تھا کہ کبھی کبھی
جاپ کرتے ہوئے بعض داشتاؤں کی بدروحیں لومڑیوں کی شکل میں وہاں آکر رونے لگتی
ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی داشتہ کی بد روح عورت کا روپ دھار کر برہنہ حالت میں سامنے
آن کھڑی ہوتی ہے۔ ان سے ڈرنا مت۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
ویسے بھی مجھے ان باتوں سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گذر گیا۔ مڑھی کے پتھر کے سوراخ میر
روشنی نہ ہوئی۔ زرد بڑا سا چاند مشرق میں ریت کے ٹیلوں کے کافی اوپر آکر دوبارہ نیچے جا
شروع ہو گیا تھا اور چاندنی سمٹنے لگی تھی۔ لیکن چاند کی روشنی میں مجھے آس پاس کی چیزیر
برابر دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے پولیس انٹیلی جنیس والے آدمی کا بھی خیال لگا ہوا تھا۔
کبھی ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے نندی کنڈ تک نہ آیا ہو۔ ضرور وہ بھی یہیر
کہیں چھپ کر میری حرکات کا جائزہ لے رہا ہو گا۔ اگرچہ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔
دو ڈھائی گھنٹے گذر گئے۔ چاند غروب ہوتے ہوتے مشرق میں ریت کے ٹیلوں ک
اوپر آگیا۔ مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ مگر میں نے فوراً اپنے اوپر کنٹرول کر لیا
لیکن کوئی ایک منٹ بعد پھر غنودگی سی ہونے لگی۔ اسی غنودگی کے عالم میں مجھے اپنے پیچھ
کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر پیچھے دیکھا
پیچھے کوئی نہیں تھا۔ سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور چھتریوں والی قبریں خاموش تھیں۔ تہ
مجھے فضا میں ایک دہشت کا احساس ہوا۔ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا
تھوڑی دیر میں دہشت کا احساس ختم ہو گیا۔ میں بڑی بے چینی سے پتھر کے سوراخ میں
ہونے والی روشنی کا انتظار کر رہا تھا۔ کم بخت پنڈت کہیں سو تو نہیں گیا؟ وہ بٹن۔
سوراخ کے اندر والا بلب روشن کیوں نہیں کرتا۔ میں نے دکھشنا دینے کے لئے سو
روپے کے دو نوٹ پہلے ہی سے صدری کی جیب میں ڈال رکھے تھے۔
اتنے میں مجھے پھر وہی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اب اس آہٹ کے ساتھ ہلکی
جھنکار بھی سنائی دی تھی۔ جیسے کسی نے پاؤں میں چاندی کی پائل باندھ رکھی ہو۔ میں
جلدی سے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا۔ اس بار یہ آواز دائیں جانب سے آئی تھ
دائیں جانب مجھ سے کوئی پندرہ قدموں کے فاصلے پر سنگ مرمر کی بارہ دری تھی۔ غرو
ہوتی پھیکی چاندنی میں مجھے بارہ دری میں ایک عورت نظر آئی جس نے زعفرانی رنگ
ساڑھی پہن رکھی تھی۔ مجھے اس کی شکل پوری طرح سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
بارہ دری کے ستون کے گرد بازو ڈالے کھڑی میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھ

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی پاکھنڈی پنڈت کی بھیجی ہوئی عورت ہے جو اسی قسم کی حرکتوں سے لوگوں پر اپنی جعلی روحانی طاقت کا رعب جما کر انہیں اپنا مطیع بنائے رکھتا ہے۔ اب میں اسی انتظار میں تھا کہ یہ عورت کب برہنہ ہو کر میرے سامنے آتی ہے۔ کیونکہ پنڈت نے مجھے یہی کہا تھا۔ میں بغیر کسی ڈر خوف کے پندرہ قدموں کے فاصلے پر بارہ دری کے ستون سے لگ کر کھڑی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت بالکل ایک مورتی کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے ستون سے الگ ہوئی۔ اس نے دور سے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور سر کو جھکا کر مجھے سلام کیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی میری طرف آنے لگی۔

میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ پاکھنڈی پنڈت کی بھیجی ہوئی اس عورت کو میں آتے ہی پنجابی زبان میں دو چار گالیاں دے کر بھگا دوں گا۔ جیسے جیسے یہ عورت میرے قریب آرہی تھی ایک خاص قسم کی خوشبو بھی میرے قریب ہوتی جاتی تھی۔ میں دل میں ہنس دیا کہ کم بخت پنڈت نے اسے اپنے جسم پر لگانے کے لئے کوئی غیر ملکی اعلیٰ قسم کا پرفیوم بھی دیا ہے۔ عورت مجھ سے کوئی پانچ قدموں کے فاصلے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ ابھی تک جوڑ رکھے تھے۔ جس طرح ہندو عورتیں مورتی کی پوجا کرتے وقت جوڑے رکھتی ہیں۔ چاند آدھا ریت کے ٹیلے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس عورت کا آدھا رخ چاند کی طرف تھا۔ اسی طرف اس کے کان میں پڑا ہوا سرخ پتھر چمک رہا تھا۔ وہ ایک چھریرے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ بالوں کی مانگ درمیان سے نکلی ہوئی تھی۔ ماتھے پر بھی سونے کی لڑی میں پرویا ہوا سرخ پتھر چمک رہا تھا۔ زعفرانی ساڑھی میں وہ غروب ہوتے چاند کی دھیمی روشنی میں ایک شعلے کی طرح لگ رہی تھی۔

میں اس عورت کو دو چار گالیاں دے کر بھگانے ہی والا تھا کہ اس نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"راناجی! مجھے پہچانا نہیں۔ میں آپ کی داسی آپ کی پتنی چندریکا ہوں"

اس عورت کی آواز میں ایک عجیب سا طلسم تھا جس سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن فوراً ہی میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر دل سے نکال دیا اور عورت کی طرف

متوجہ ہو کر کہا۔

”میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ تمہارا اور تمہارے پاکھنڈی پنڈت کے فراڈ کو بھی خوب سمجھتا ہوں۔ میں ویسا آدمی نہیں ہوں جیسا تم مجھے سمجھتی ہو۔ اس لئے فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ“

عورت اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ جب میں نے دوسری بار اسے زیادہ سختی سے ڈانٹا تو مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکتے نظر آئے۔ گہرا سانس لے کر بولی۔

”پتی دیو! مجھے میرے برے کرموں کی سزا ملی ہے۔ کہ مجھے میرا پتی بھی نہیں پہچانتا۔ میں تمہاری پتنی چندریکا ہوں میرے سوامی۔ مجھے اپنے گلے لگا لو۔ میرا پنر جنم سپھل ہو جائے گا“

وہ ذرا آگے بڑھی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے غصے سے کہا۔

”بھاگ جاؤ بیسوا عورت۔ میں تمہارے فریب میں آنے والا نہیں ہوں“

عورت وہیں رک گئی۔ اس نے اداس نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی واپس بارہ دری والی مڑھی کی طرف چلنے لگی۔ اس وقت چاند ریت کے ٹیلے کے پیچھے چھپ گیا تھا اور صحرا میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ عورت مجھے بارہ دری کے اندر تک جاتی دکھائی دی پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں دل میں ڈرامہ باز پنڈت اور اس کی بھیجی ہوئی عورت کو برا بھلا کہتا بیٹھ گیا۔ اتنے میں سوراخ میں روشنی ہو گئی۔ کم بخت پنڈت نے بجلی کا بٹن دبا دیا تھا۔ روشنی تین چار سیکنڈ تک سفید ہی رہی۔ یعنی سوراخ کے اندر کہیں لگا ہوا چھوٹا سفید بلب ہی جلتا رہا۔ اس کے بعد روشنی سرخ ہو گئی۔ اسے سرخ ہونا ہی تھا۔ پنڈت نے مجھ سے دو سو روپے بھی تو وصول کرنے تھے۔ میں نے اس وقت دل میں پنڈت کو دو چار گالیاں دیں اور صدری کی جیب میں سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر سوراخ کے اندر ڈال دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سرخ روشنی بھی بجھ گئی۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔

صحرا میں بڑی خوشگوار خنک ہوا چل رہی تھی۔ اسی ہوا میں ابھی تک مجھے وہ خوشبو محسوس ہو رہی تھی جو اس عورت کی زعفرانی ساڑھی میں سے آ رہی تھی۔ پھر یہ خوشبو ہلکی ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اس وقت رات کے ڈھائی تین بجے کا عمل ہو گا۔ اب وہاں میرا بیٹھنا بیکار تھا۔ میرا اور پنڈت دونوں کا کام ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ واپس پنڈت کے پاس ہی چلتا ہوں۔ میں اٹھا اور پنڈت کی کوٹھڑی کی طرف چلنے لگا۔ ریت کے ٹیلوں پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ ریت ٹھنڈی اور نرم تھی۔ اوس گر رہی تھی۔ خنکی بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ صحرائی علاقے میں دن تو گرم ہوتا ہے مگر رات بڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ چاند کے ڈوب جانے کے بعد ستاروں کی ٹمٹماہٹ زیادہ ہو گئی تھی۔ میں ریت کے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر جا رہا تھا۔ ٹیلوں کے نشیب میں اندھیرا تھا۔ ایک دو بار مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی چند قدم میرے ساتھ چل کر الگ ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ رک کر میں نے چاروں طرف دیکھا وہاں سوائے میرے دوسرا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور آگے چل پڑا۔

پنڈت کی کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے سوراخ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پنڈت مڑھی والے سوراخ کی بتی بجھانے کے بعد اپنی کوٹھڑی کی بتی بھی بجھا کر سو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر ایک لاکھ ہری اوم کا جاپ کر کے صبح ہی واپس آؤں گا۔ کوٹھڑی کے باہر ایک طرف لکڑی کا پرانا بنچ بچھا [illegible] لیٹ گیا۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں میں نے منگل سوتر والا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ ابھی میں پوری طرح سویا نہیں تھا کہ اچانک مجھے لگا کسی نے میرے منگل سوتر والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی صحرائی چوہا وغیرہ ہو گا۔ جو میرے ہاتھ کے اوپر سے گذر گیا ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے ہاتھ پر باقاعدہ کسی کے ہاتھ کی گرمی اور انگلیوں کا دباؤ محسوس کیا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا

ہے یہاں کسی کی بدروح بھٹکتی پھر رہی ہو۔ مجھے وہ سارا علاقہ ہی آسیب زدہ لگنے لگا تھا۔

میں دوبارہ بنچ پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے نیند آگئی اور کوئی ہوش نہ رہا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دن نکل آیا تھا اور پنڈت مجھے جگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بالک! مڑھی سے کب واپس آئے؟ جاپ پورا کر لیا تھا کیا؟"

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور پنڈت سے کہا۔

"جاپ پورا ہو گیا تھا گورو دیو!"

"کیا اوتار ساوردھن کی آتما نے تمہارا منگل سوتر سوئیکار کر لیا؟"

میں نے دل میں کہا کیسا مکار پنڈت ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے مگر مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔

"ہاں گورو دیو! میرا منگل سوتر ساوردھن کی آتما نے سوئیکار کر لیا ہے۔ میں نے دو سو روپے کی دکھشنا بھی سوراخ میں ڈال دی تھی"

پنڈت نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"دھن ہو۔ دھن ہو۔ بچہ تو بڑا خوش قسمت ہے۔ جا اب تیرا ہر جنم میں کلیان ہو گا"

میں نے کہا۔ "گورو جی اب آگیہ دیں۔ میں واپس احمد آباد جاؤں گا"

پنڈت مجھ سے کچھ اور رقم بٹورنی چاہتا تھا۔ دونوں ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہ نہ نہ بچہ۔ ابھی تیرا کرم کانڈ پورا نہیں ہوا۔ تیرے منگل سوتر پر مجھے مہاویر جی کا خاص منتر پڑھ کر پھونکنا ہو گا۔"

میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"اس کے کتنے پیسے ہوں گے؟"

پنڈت نے فوراً جواب دیا۔

"ایک سو روپیہ دکھشنا ہو گی۔ زیادہ نہیں"

میں وہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے پنڈت کو سو روپے نکال

کر دیئے) اور کہا۔

"یہ کرم کانڈ بھی ابھی پورا کر دیں گورو جی۔ یہ لیجئے پورے سو روپے ہیں"

پنڈت بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ پہلے کچھ چائے پانی کر لیں۔ وہاں برآمدے میں آجاؤ۔"

کوٹھڑی کی دائیں جانب ایک چھوٹا سا ورانڈا تھا جہاں ایک چارپائی اور کرسی پڑی تھی۔ پنڈت نے اپنے کسی چیلے کو آواز دے کر چائے اور پوڑیاں لانے کو کہا۔ ہم برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ پنڈت نے میرا منگل سوتر والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سنسکرت کے اشلوک پڑھنے لگا۔ سنسکرت زبان کو میں فوراً پہچان لیتا تھا۔ اگرچہ میں پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ منتر پڑھ رہا تھا کہ ملازم چائے اور پوڑیاں لے کر آگیا۔ اس نے ٹرے چارپائی پر رکھ دیا۔

پنڈت نے منتر مختصر کر کے میری کلائی پر بندھے ہوئے زعفرانی منگل سوتر پر دو بار پھونکا اور مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

"اب تیرا سارا کام ہو گیا ہے۔ اب تو اوتار ساوردھن کا پکا بھگت بن گیا ہے۔ یہ لو پوڑیاں کھاؤ"

جلدی جلدی میں نے تھوڑا بہت کھایا۔ پنڈت نے کیتلی میں سے چائے پیالی میں ڈال کر مجھے دی۔

"داس وردھن! تو بڑا وردان ہے۔ تو نے جینی دھرم کا کرم کانڈ بھی پورا کر لیا ہے۔ اب تو جین بھگت بن کر مہاویر جی کے بھگتی مارگ کا پرچار کر۔ تیرا پنر جنم ختم ہو جائے گا"

میں نے کہا۔

"گورو جی! یہ سب تمہاری کرپا ہے۔ میں نے یہی سوچا ہے کہ اب باقی جیون مہاویر جی کی بھگتی کر کے ہی گذاروں"

جہاں ہم ورانڈے میں بیٹھے تھے وہاں ذرا فاصلے پر ایک درخت تھا۔ شاید کیکر کا

درخت تھا۔ اسی درخت کے ساتھ ایک بکری اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ میری نگاہ یونہی اس طرف گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی رات والی عورت درخت کے پاس کھڑی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ کم بخت یہاں بھی آگئی ہے۔ پھر سوچا کہ یہ تو پنڈت ہی کی تنخواہ دار ملازمہ ہے اور اسی کے کہنے پر رات کو مڑھی پر جاپ کرنے والوں کے پاس جاتی ہے اور اپنے آپ کو پرلوک کی دیوی ظاہر کر کے ان پر اثر ڈالتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس عورت کے سامنے پنڈت کی خبر لیتا ہوں۔ اسی عورت نے وہی رات والی زعفرانی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ دن کی روشنی میں اس کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے نقش بڑے تیکھے تھے اور رنگ سانولا تھا وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہماری طرف آنے لگی۔

میں نے پنڈت جی سے کہا۔

"گوروجی! آپ بڑے وروان جینی ہیں۔ آپ تو اپنے پجاریوں کو جو کہیں وہ آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ پھر آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ عورت کو پیسے دے کر مڑھی پر جاپ کرنے والوں کے پاس ان پر اثر ڈالنے کے لئے بھیجتے ہیں۔"

پنڈت تو بڑا حیران ہو کر مجھے تکنے لگا۔ بولا۔

"میں نے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔ وہ جو میں نے تمہیں برہنہ عورت کے بارے میں خبردار کیا تھا تو وہ تو ایک بدروح ہے۔ یہاں سب قبریں اور مڑھیاں ہیں۔ یہاں رات کو اکثر بدروحیں پھرتی رہتی ہیں۔ میں نے اسی کام کے لئے کوئی عورت نہیں رکھی ہوئی"

اسی دوران وہ زعفرانی ساڑھی والی عورت جس نے مجھے اپنا نام چندریکا بتایا تھا ہمارے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی اور میری طرف مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا ترش لہجے میں کہا۔

"تو پھر یہ عورت رات کو میرے پاس کس نے بھیجی تھی؟"

میں نے جس طرف اشارہ کیا تھا پنڈت جی نے اس طرف دیکھا۔ پھر زیادہ حیران ہو کر میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"تو کس عورت کی بات کر رہا ہے؟"

میں نے مزید غصیلی آواز میں کہا۔

"یہ عورت جو ہمارے سامنے کھڑی ہے کیا آپ کو نظر نہیں آرہی؟"

پنڈت نے ایک بار پھر جس طرف میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ اس طرف دیکھا۔ اب پنڈت کے چہرے پر ایسے تاثرات ظاہر ہوئے جیسے اسے میری دماغی صحت پر شک ہونے لگا ہے۔ اس نے کہا۔

"یہاں تو کوئی عورت نہیں ہے۔ تم کس عورت کی بات کر رہے ہو؟"

مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ پاکھنڈی پنڈت دن کی روشنی میں میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک عورت ہمارے سامنے کھڑی ہے اور یہ مجھے یہ تاثر دے کر بیوقوف بنا رہا ہے کہ یہاں تو کوئی عورت نہیں ہے۔ زعفرانی ساڑھی والی عورت مجھ سے کوئی ایک قدم دور کھڑی تھی۔ میں غصے میں اٹھا کہ اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر پنڈت کو بتاؤں کہ میں اس عورت کی بات کر رہا ہوں۔ جو تمہاری رکھیل ہے جیسے ہی میں نے اس عورت کی کلائی پکڑنی چاہی میرا ہاتھ اس عورت کی کلائی کے آر پار ہو گیا۔ جیسے میں نے ہوا کو پکڑنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے بوکھلاہٹ میں عورت کے بازو پر ہاتھ ڈالا تو اس کا بازو بھی میرے ہاتھ میں نہ آیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عورت ہوا کی بنی ہوئی ہے۔

زعفرانی ساڑھی والی عورت میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ باندھ کر کہا۔

"پتی دیو! جب تک تم میرے پتی ہونے کا اقرار نہیں کرو گے مجھے اس جنم میں نہیں چھو سکو گے"

میں کچھ ڈر ضرور گیا تھا۔ لیکن اپنے ہوش و حواس میں تھا میں نے اسے کوئی بدروح سمجھتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔

"تو جس کی بدروح ہے اسی کے پاس واپس چلی جا میں تیرے آسیب میں آنے

والا نہیں ہوں"

پنڈت کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ بولا۔
"بچہ! تجھ پر اوم نام کے جاپ کا اثر ہو گیا ہے۔ کوئی بدروح تیرے پیچھے لگ گئی
ہے۔ یہاں لیٹ جا۔ میں ابھی منتر پڑھ کر بدروح کو بھگاتا ہوں"

زعفرانی ساڑھی والی چندریکا کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ اس نے پنڈت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہنے لگی۔ "میں جاتی ہوں پتی دیو۔ بھگوان تمہیں سکھی رکھے"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور خاموشی سے واپس درخت کی طرف چلی گئی۔ درخت کے پیچھے جاتی وہ مجھے ضرور نظر آئی۔ اس کے بعد جیسے وہ غائب ہو گئی۔ پنڈت نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"بیٹا یہاں چارپائی پر لیٹ جا۔ میں ابھی بدروح کو بھگا دیتا ہوں"

میں نے پنڈت جی سے کہا۔

"اس کی اب ضرورت نہیں ہے گورو جی! بدروح چلی گئی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ میں واپس جاؤں گا"

میں نے پنڈت جی کے گھٹنوں کو ہندوؤں کی طرح چھوا اور ریت کے ٹیلوں کی طرف چل دیا جن کے پیچھے نندی کنڈ کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں سے اکثر یکے بیکانیر شہر کی طرف جاتے رہتے تھے۔ زعفرانی ساڑھی والی عورت کا خیال میرے دل میں ضرور تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ یہیں نندی کنڈ میں ہی رہ جائے گی۔ میرے ساتھ نہیں لگی رہے گی۔ میں اسے کوئی بدروح ہی سمجھ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی بدروح کو دیکھا تھا اور وہ بھی ایک خوبصورت عورت کی شکل میں۔

نندی پور گاؤں میں یکوں کا اڈہ تھا۔ وہاں تین چار یکے کھڑے تھے۔ سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی ایک یکے میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے خفیہ پولیس کے آدمی کا خیال آگیا کہ کہیں وہ بھی میرا پیچھا کرتا وہاں نہ آگیا ہو۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ گردن گھما کر

آس پاس دیکھا۔ وہاں تقریباً سب دیہاتی عورتیں اور مرد ہی تھے۔ وہ خفیہ پولیس والا آدمی مجھے دکھائی نہ دیا۔ میں مطمئن ہو کر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد یکہ سواریوں کو لے کر بیکانیر شہر کی طرف چل پڑا۔ بیکانیر وہاں سے آٹھ میل دور تھا۔ یہ کچا ریتلا راستہ تھا جو بڑی سڑک سے نکل کر نندی کنڈ کے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ جب بڑی سڑک آئی تو یکہ اس کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اسی سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی ٹرک گاڑی یا فوجی جیپ گذر جاتی تھی۔

بیکانیر شہر پہنچ کر میں اپنے ہوٹل میں آگیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جو لاری اڈے کے عقب میں واقع تھا۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ غسل خانہ ساتھ ہی تھا۔ اسی لئے مجھے دوگنا کرایہ دینا پڑا تھا۔ میں نے کمرے میں آتے ہی غسل کیا۔ کپڑے پہنے ہوٹل کا ملازم لڑکا آگیا۔ اس نے پوچھا۔

"بھوجن کس وقت لاؤں سر"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے جودھپور کو گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

لڑکا بولا۔

"گاڑی تو شام کو سات بجے جاتی ہے سر آپ لاری پر کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہاں سے گھنٹے گھنٹے بعد جودھپور کو لاریاں چلتی ہیں"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم ایسا کرو میرے لئے چائے لے آؤ"

کمرے میں کل کا ہندی کا اخبار پڑا تھا۔ میں ہندی پڑھ لکھ لیتا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔ چھت کے ساتھ لگا ہوا پنکھا دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی جس میں سے ہوا اندر آرہی تھی جو آہستہ آہستہ گرم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ بیکانیر میں دن کے وقت تیز ہوائیں چلتی رہتی تھیں اور ان میں ریت کے ذرے شامل ہوتے تھے۔ اس وقت بھی یہی گرم ہوا کھڑکی میں سے اندر آرہی تھی۔ میں

اخبار رکھ کر کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھا۔ یہ کھڑکی ہوٹل کی پچھلی جانب کھلتی تھی۔ یہاں سے دور دور تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلے اور ان میں بنے ہوئے مکان نظر آتے تھے۔ کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر نیچے ایک درخت تھا۔ میں کھڑکی بند کرنے لگا تو زعفرانی ساڑھی والی عورت چندریکا مجھے ایک بار پھر دکھائی دی۔ وہ درخت کے نیچے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور جیسے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ کم بخت یہ بدروح میرا پیچھا کرتے یہاں بھی آگئی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اس بدروح سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں؟ پھر خیال آیا کہ یہ بے ضرر سی ہوائی مخلوق ہے۔ مجھے خوامخواہ اپنا خاوند جتانے لگی ہے۔ ہندو عورت کی بدروح ہونے کی وجہ سے وہ آواگون پر عقیدہ رکھتی ہے اور یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ میں پچھلے جنم میں اس کا خاوند رہ چکا ہوں۔ میں ہندوؤں کے آواگون کے عقیدے سے بخوبی واقف تھا۔ اپنا نام چندریکا بتاتی ہے اور کسی کو چھو بھی نہیں سکتی نہ اسے کوئی چھو سکتا ہے۔ بالکل بخارات کی طرح ہے۔ اگر کبھی کبھی سامنے آجاتی ہے تو آتی رہے۔ میرا کیا بگاڑتی ہے◆

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی درخت کی طرف دیکھا۔ چندریکا کی بدروح وہاں پر نہیں تھی۔ اب میری ساری توجہ اپنے مشن کی طرف تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کرسی پر بیٹھ کر غور کرنے لگا کہ مجھے را کے انچارج گوگل داس پانڈے کی بیٹی میناکشی پر کس طرح غلبہ حاصل کرنا چاہئے۔ آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ غنودگی سی طاری ہو گئی اور سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر بتی جلائی گھڑی دیکھی۔ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ ہوٹل کے لڑکے نے کہا تھا کہ بیکانیر سے شام کے وقت گاڑی جودھپور کو جاتی ہے۔ میں نیچے جانے لگا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہوٹل والا لڑکا چائے کی پیالی لئے کھڑا تھا۔

"سر! میں پہلے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر چلا گیا تھا۔ آپ شاید سو رہے تھے"

میں نے کہا۔

"جودھپور جانے والی گاڑی کا ٹائم کیا ہے؟"

لڑکا بولا

"سات بجے والی گاڑی تو چلی گئی ہوگی۔ اب رات کو بارہ بجے ایک گاڑی جائے گی"

مجھے بڑا افسوس ہوا کہ خوامخواہ سو گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔ میں اب ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور جتنی جلدی ہو سکے واپس احمد آباد پہنچ کر اپنے مشن کا آپریشن شروع کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی لے لی اور لڑکے سے کہا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اگر سو گیا تو مجھے گیارہ بجے رات کو آکر جگا دینا۔ دروازہ کھلا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے سر!"

لڑکا چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ چائے ختم کی تو کمرے میں کچھ گرمی سی محسوس ہوئی اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی میں سے بیکانیر کے صحرائی خنک ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ میرے پاس کوئی سامان تو تھا نہیں۔ اکیلی جان تھی۔ کلائی میں منگل سوتر بندھا تھا۔ ماتھے پر جین مت کا تلک لگا تھا۔ جیب میں انڈین کرنسی کے ڈیڑھ دو سو روپے باقی محفوظ پڑے تھے۔ بظاہر احمد آباد تک میرا راستہ صاف تھا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا حلیہ پورا جینی ہندوؤں ایسا تھا۔ میں ہندی میں بات کر سکتا تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ کہ میں مسلمان ہوں۔

جودھپور کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی تین چار گھنٹے پڑے تھے۔ کمانڈو ٹریننگ نے میرے اعصاب کو فولاد سے بھی زیادہ صبر آزما اور مضبوط بنا دیا تھا۔ میں بند کمرے میں بیٹھ کر تین چار گھنٹے انتظار کر سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ چونکہ میری ساری توجہ جلد از جلد احمد آباد پہنچنے کی ہے اس لئے غیر شعوری طور پر میرے اعصاب اضطراب کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ میں پلنگ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

آنکھیں بند کر لیں۔ سوچا تھوڑی دیر آرام کر لیتا ہوں۔ آگے ٹرین میں احمد آباد تک بڑا لمبا سفر ہے۔ جودھپور میں گاڑی بھی بدلنی پڑے گی۔ میرا خیال خفیہ پولیس کے آدمی کی طرف چلا گیا۔ کہیں وہ میرا پیچھا کرتا ہوٹل تک نہ پہنچ گیا ہو۔ لیکن سارا دن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے بارے میں اس کا یہ شبہ کہ میں ہندو کے بھیس میں مسلمان پاکستانی جاسوس ہوں دور ہو گیا ہو اور اس نے میرا پیچھا کرنا ترک کر دیا ہو۔ ورنہ وہ ہوٹل کے اردگرد منڈلاتا ضرور نظر آجاتا۔ اتنے میں مجھے دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں میں نے جو منظر دیکھا اس نے ایک بار تو میرے جسم کو برف کی طرح ٹھنڈا کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا خون میری رگوں میں جم گیا ہے۔ دروازے میں وہی خفیہ پولیس والا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور پستول کا رخ میری طرف تھا۔ اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"تم مسلمان ہو۔ پاکستانی جاسوس ہو۔ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کوئی حرکت نہ کرنا۔ میرا پستول بھرا ہوا ہے اور میرا نشانہ کبھی خالی نہیں گیا"

میں نے بھی بڑی جلدی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور کہا۔

"مہاشہ جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نہ تو مسلمان ہوں نہ پاکستانی جاسوس ہوں۔ میں جینی ہندو ہوں۔ میرا نام داس وزدھن ہے۔ نندی کنڈ کے پنڈت جی سے منگل سوتر لینے آیا تھا۔ اب واپس احمد آباد جا رہا ہوں"

خفیہ پولیس والے نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"تھانے چل کر جب تمہارا پاجامہ اتروایا گیا تو تمہارے مسلمان ہونے کا راز کھل جائے گا۔ نیچے پولیس کی گارد تمہیں گرفتار کرنے کے لئے موجود ہے۔ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو تمہاری لاش خون میں تڑپ رہی ہوگی۔ خاموشی سے اٹھ کر میرے آگے لگ کر نیچے چلو"

اگر دیکھا جائے تو میں مصیبت میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ اگرچہ اس خفیہ پولیس

والے ہندو سپاہی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک تجربہ کار ٹرینڈ کمانڈو کو للکار رہا ہے۔ لیکن جب دشمن کے ہاتھ میں پستول ہو اور پستول کی نالی کا رخ کمانڈو کے سینے کی طرف ہو تو کمانڈو بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ جو بات مجھے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کی پولیس میرا چہرہ ایک مشتبہ جاسوس کی حیثیت سے دیکھے۔ اگر مجھے تھانے لے جایا گیا تو وہ پولیس آفیسر میری تصویر بھی اتاریں گے۔ میرے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان بھی لے لیں گے۔ میں اگر اس کے بعد پولیس کی حراست سے فرار بھی ہو جاؤں تو راجستھان کی پولیس کے پاس میری تصویر اور انگلیوں کے نشان ریکارڈ میں موجود ہوں گے۔ میری تصویر اخباروں میں ایک مفرور پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے چھپ جائے گی اور یہ تصویر ظاہر ہے را کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کے انچارج گوکل داس پانڈے کی نظر سے بھی گذرے گی جو میرا اصل ٹارگٹ ہے اور یوں میرا انتہائی اہم مشن شروع ہونے سے پہلے ہی ملیامیٹ ہو جائے گا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ اس خفیہ پولیس والے ہندو آفیسر کو کمرے کے اندر ہی قتل کر دیا جائے تا کہ میرا راز کمرے سے باہر نہ نکلنے پائے۔ کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ میرے ختنے ہو چکے تھے اور یہ راز کھل جانے کے بعد میرے سارے مشن کے برباد ہو جانے میں کوئی شک شبہ نہیں تھا۔ میرے اندر کا کمانڈو بیدار ہو گیا۔ مجھے ہر حالت میں اس خفیہ پولیس والے کو قتل کرنا تھا۔ میں نے ایک طریقہ سوچ لیا اور آہستہ سے پلنگ پر سے اٹھا۔ خفیہ پولیس افسر کے پستول کی نالی کا رخ سیدھا میرے دل کی طرف تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا بھارت کے فرعون حصہ دوم

"کمانڈو آپریشن" میں پڑھیے

بھارت کے
فرعون
کمانڈو آپریشن
اے حمید
50

پستول خفیہ پولیس والے کے ہاتھ میں تھا۔

پستول کی نالی کا رخ میری طرف تھا۔ میں پلنگ سے اٹھ کر ہاتھ اوپر اٹھائے اس کی طرف بڑھا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کی ایک طرف ہوگیا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں کوئی عام قسم کا پاکستانی جاسوس ہوں جو خفیہ معلومات حاصل کرنے کے لئے راجستھان کا بارڈر کراس کر کے ہندوستان میں داخل ہوگیا ہے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو بھی ہوں۔ مجھے اس کے قریب سے گذرتے ہوئے صرف دو سیکنڈ چاہئے تھے۔ صرف دو سیکنڈوں میں مجھے اس ہندو خفیہ پولیس والے کا کام تمام کر دینا تھا۔ مجھے اگر کوئی خطرہ تھا تو صرف اس بات کا کہ گھبراہٹ میں کہیں اس کا پستول نہ چل جائے۔ کیونکہ پستول چل جانے سے جو دھماکہ ہو گا وہ ہوٹل والوں کو خبردار کر سکتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میں نے جس زاویے سے اس پر اٹیک کرنا تھا وہ میں نے سوچ لیا تھا۔ وہ مجھے پستول کی نوک پر نیچے لے جانا چاہتا تھا جہاں اس کے بقول بیکانیر پولیس کی گارد موجود تھی۔ جیسے ہی میں اس کے قریب سے گذرا ایک بجلی سی چمکی اور دوسرے لمحے خفیہ پولیس افسر کا پستول نیچے فرش پر گر چکا تھا اور اس کی گردن میرے دائیں بازو کے آہنی شکنجے میں تھی۔ صرف ایک جھٹکا ہی کافی تھا۔ میری کمانڈو ٹریننگ کے تینوں استادوں نے مجھے انسانی جسم کی ہڈیوں خاص طور پر گردن کی ہڈی کے

بارے میں تفصیل سے بتایا ہوا تھا کس طرح دشمن کی گردن کو شکنجے میں جکڑ کر کس سمت کو جھٹکا دینا ہے۔ میں نے بالکل اپنی ٹریننگ کے مطابق جھٹکا دیا تھا۔ خفیہ پولیس کا ہندو سپاہی بڑا آسان شکار تھا۔ ایک جھٹکا اس کے لئے بہت زیادہ تھا۔ جب میں نے اسے فرش پر گرا کر اس کی گردن کو ٹٹولا تو اس کی گردن کی ہڈی دو تین جگہوں سے ٹوٹ چکی تھی۔

سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ صدری کی جیب سے رومال نکال کر اس کی گردن پر پڑے ہوئے اپنی انگلیوں کے نشان اچھی طرح رگڑ کر مٹا دیے۔ پھر اس کی لاش کو اس طرح گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے چھپا دیا کہ میرا ہاتھ اس کے جسم کے کسی حصے کو نہ چھوئے۔ پستول کو میں نے رومال سے پکڑ کر خفیہ پولیس افسر کی لاش کے قریب ہی پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ پلنگ کے اوپر جو چادر پڑی تھی وہ پلنگ کی پٹی پر نیچے تک لٹکی ہوئی تھی اور کمرے میں کوئی داخل ہو تو اسے لاش نظر نہیں آسکتی تھی۔ اب مجھے اس بات کی تصدیق کرنی تھی کہ یہ شخص اپنے ساتھ پولیس کے سپاہی لایا تھا یا نہیں۔ میرا کمرہ اس معمولی سے ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا اور اس کی ایک کھڑکی بازار میں ہوٹل کے سامنے کھلتی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر نیچے دیکھا۔ اس خفیہ پولیس والے نے میرے ساتھ بلف چال چلی تھی۔ نیچے پولیس نہیں تھی۔ وہ اکیلا ہی مجھے گرفتار کرنے آیا تھا۔ اس نے ٹھیک سوچا تھا پستول اس کے پاس تھا اور میں ایک عام قسم کا بقول اس کے پاکستانی جاسوس تھا۔ وہ پستول دکھا کر آسانی سے مجھے آگے لگا سکتا تھا۔ اگر اسے کسی طرح بھی یہ پتہ چل جاتا کہ میں ایک زبردست تربیت یافتہ سرفروش قسم کا کمانڈو ہوں تو وہ یہ حماقت کبھی نہ کرتا اور اپنے ساتھ پولیس کی پوری گارد لاتا۔ لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

اس کے باوجود میں نے سامنے سے نیچے اترنے کا خطرہ مول نہ لیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس کے سپاہی آس پاس چھپے ہوئے ہوں۔ ہوٹل کے ملازم لڑکے کو میں نے کہہ دیا ہوا تھا کہ میں رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا اور ابھی آرام کر رہا ہوں۔ میں نے پچھلی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ شام کا دھندلا دھندلا اندھیرا ہو رہا تھا۔ صحراؤں میں شام کا وقت دیر

تک برقرار رہتا ہے۔ یعنی شام دیر تک چھائی رہتی ہے۔ باہر جو درخت تھا اس کی دو چار بڑی بڑی شاخیں ہوٹل کی کھڑکی کے ساتھ تو نہیں لگی ہوئی تھیں مگر قریب سے ہو کر اوپر چلی گئی تھیں۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران اگر مجھے چیتے کی ہوشیاری اور گھوڑے کی طرح مسلسل دوڑتے بھاگتے رہنا سکھایا گیا تھا تو بندر کی طرح درخت پر چڑھنے اترنے کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔

میں نے کمرے کی بتی جلتی رہنے دی۔ کھڑکی پر چڑھ کر درخت کی بڑی شاخ پر چھلانگ لگا دی۔ میں جھول کر دوسری شاخ پر جا کر ٹک گیا۔ نیچے نگاہ ڈالی۔ اس طرف کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ کھلی جگہ تھی' سامنے بھی ایک درخت تھا جہاں ایک گائے اور بکری بندھی تھی۔ میں بڑے اطمینان سے نیچے اترا اور ایک طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بیکانیر شہر کی ایک بڑی سڑک پر آگیا۔ یہاں معمولی سی ٹریفک تھی۔ یہ پاکستان بننے کے گیارہ بارہ سال بعد کا زمانہ تھا۔ اس شہر میں ابھی اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اتنا اندازہ تھا کہ کم از کم دو تین گھنٹے تک میرے کمرے میں خفیہ پولیس والے کی لاش کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ مجھ سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی کہ میں ہوٹل کے ملازم لڑکے سے پوچھ بیٹھا تھا کہ جودھپور جانے والی گاڑی بیکانیر کے اسٹیشن سے کس وقت چلتی ہے۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی سات آٹھ گھنٹے باقی تھے۔ ہوٹل والے کو جیسے ہی لاش کا پتہ چلا وہ فوراً پولیس کو خبر کر دے گا۔ پولیس نے اپنے آدمی کی لاش دیکھی تو فوراً حرکت میں آجائے گی۔ جب پولیس کو پتہ چلے گا کہ جس کمرے سے لاش ملی ہے اس کمرے میں جو [illegible] ٹھہرا ہوا تھا اسے جودھپور جانا تھا تو پولیس فوراً اسٹیشن پر پہنچ جائے گی۔ اگرچہ پولیس کو میری شکل کا علم نہیں تھا لیکن ممکن ہے پولیس ہوٹل کے ملازم لڑکے کو ساتھ لے آئے جو میری شکل پہچانتا تھا اور جس کو میں نے بتایا تھا کہ میں رات کی گاڑی سے جودھپور جاؤں گا۔ اس طرح میرے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔

چنانچہ میں نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ میں سیدھا لاری اڈے چلا گیا۔ جودھپور سے بیکانیر آتے ہوئے درمیان میں ناگور نام کا ایک بڑا شہر آیا تھا۔ میں نے لاری کے اڈے سے

معلوم کیا کہ ناگور کو کوئی لاری جاتی ہے۔ پتہ چلا کہ رات کو کوئی لاری نہیں جاتی صبح جائے گی۔ میں انتظار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرے لئے اس شہر میں رہنا شدید خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا وہ نازک گھڑی قریب آتی جا رہی تھی جب بیکانیر پولیس کی ساری فوج نے میری تلاش میں نکل کھڑا ہونا تھا اور پورے شہر لاریوں کے اڈے اور ریلوے اسٹیشن کی ناکہ بندی کر لینی تھی۔ میں جس خفیہ پولیس افسر کو قتل کر کے اس کی لاش ہوٹل کے کمرے میں پلنگ کے نیچے چھپا آیا تھا اس کا راز زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے تک ہی چھپا رہ سکتا تھا۔

میری پرابلم اور میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں صرف ایک کمانڈو ہی نہیں تھا میں ایک جاسوس بھی تھا۔ اگر کمانڈو ہوتا اور پکڑا جاتا تو میں ٹارچر برداشت کر سکتا تھا اور اپنی جان پر کھیل کر جیل سے یا حوالات سے یا پولیس کی حراست سے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میرے سامنے ایک انتہائی اہم اور طویل مشن تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ انڈیا کی پولیس کے ریکارڈ پر میرا نام میری شکل اور میری انگلیوں کے نشان نہ آئیں۔ اس طرح میرا مشن اپنے آغاز ہی میں تباہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے میرا پولیس کی نگاہوں سے روپوش ہو جانا بے حد ضروری تھا۔ ٹرین کے ذریعے جودھپور جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لاری کوئی نہیں اس طرف جاتی تھی۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ میں پیدل ہی جودھپور ناگور جانے والی سڑک پر چل پڑوں اور صبح ہونے تک بیکانیر سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ لیکن اس میں بھی یہ خطرہ موجود تھا کہ پولیس میری تلاش میں ناگور جودھپور شاہراہ پر آ سکتی تھی۔ میں لاری اڈے سے نکل کر شہر سے تھوڑا باہر ایک مندر کے پاس تالاب کے کنارے بیٹھا تھا۔

مندر میں مورتی پوجا ہو رہی تھی اور گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی جانب مکانوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ایک دن پہلے صبح کے وقت میں نے بیکانیر سے جودھپور کو جاتی بڑی سڑک دیکھ لی تھی۔ اس سڑک پر ہندی میں ایک تختی بھی لگی ہوئی تھی میں نے سوچا کہ یہاں بیٹھے رہنا اپنے آپ کو مزید خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔

بہتر یہی ہے کہ میں بڑی سڑک پر جاتا ہوں۔ شاید وہاں کوئی تدبیر بن جائے کیونکہ ابھی لاش کا راز کھلنے میں ڈیڑھ گھنٹہ یقیناً باقی تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ہوٹل کے لڑکے کا میرے کمرے میں جانے کا امکان نہیں تھا۔ میں تالاب کے کنارے سے اٹھا اور اندازے سے ہائی وے یعنی بیکانیر جودھپور شاہراہ کی طرف چل پڑا۔ ایک جگہ سے مجھے پوچھنا بھی پڑا۔ آخر میں بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہ سڑک اتنی کشادہ نہیں تھی مگر پکی تھی۔ محصول چنگی پر ایک دو ٹرک کھڑے تھے۔ ایک ٹرک بیکانیر شہر میں داخل ہونے والا تھا اور ایک ٹرک کا رخ جودھپور ناگور کی طرف تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس ٹرک ڈرائیور سے بات کرنی چاہئے۔ اگر میں ٹرک پر سوار ہو جاؤں تو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اس خطرناک شہر سے کافی دور نکل جاؤں گا۔

یہ سوچ کر میں اس ٹرک کی طرف بڑھا جس کا رخ جودھپور ناگور کی طرف تھا۔ محصول چونگی پر ایک بڑا سا بلب روشن تھا۔ لکڑی کے کھوکھے کے اندر ایک آدمی بیٹھا کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ایک پگڑی اور داڑھی والا آدمی اس کے پاس جھک کر کھڑا تھا۔ یہ سکھ معلوم ہوتا تھا۔ میں ٹرک کے قریب آ گیا۔ ڈرائیور کی سیٹ خالی تھی۔ ایک دبلا پتلا آدمی ٹرک کے قریب ہی اینٹوں پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ ٹرک کا کلینر لگتا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر نمستے کہا اور پوچھا کہ یہ ٹرک کس طرف جا رہا ہے۔ اس آدمی نے مجھے غور سے اوپر نیچے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے مہاراج۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"رانا بھائی مجھے ناگور بڑا ضروری جانا ہے گاڑی چھوٹ گئی ہے۔ اگر یہ ٹرک ناگور جا رہا ہے تو مجھے بٹھا لو۔ میں پیسے دے دوں گا"

مجھے معلوم تھا کہ راجستھان میں رانا کا لفظ بڑا عزت و تکریم کا لفظ ہے۔ میں نے جان بوجھ کر کلینر کو رانا بھائی کہا تھا۔ وہ بڑا خوش ہوا اور اٹھ کر میرے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"سردار جی چونگی بابو کے پاس گئے ہیں تم اس سے بات کر لو۔ ہے تو وہ ڈرائیور

مگر بڑا اچھا آدمی ہے۔ تمہیں بٹھا لے گا۔ ہم مال لے کر ناگور ہی جا رہے ہیں۔"

اتنے میں سکھ ڈرائیور بھی چونگی والے کھوکھے سے نکل کر آگیا۔ اس نے مجھے کلینر کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تو جھومتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں بھئی کیا بات ہے؟"

کلینر نے اسے بتایا کہ مہاشہ جی کو ناگور جانا ہے۔ میں نے سکھ ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"سردار جی! ناگور میں میری ماتا جی کی بیماری کا تار آیا ہے۔ اس وقت کوئی ریل گاڑی یا لاری بھی نہیں جاتی۔ آپ مجھے بٹھا لیں تو بڑی کرپا ہوگی۔ میں کرایہ دے دوں گا۔"

سکھ ڈرائیور نے تھوڑی پی رکھی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔

"کرایہ ورایہ رہنے دو جی۔ بیٹھ جاؤ پیچھے"

پھر اس نے کلینر سے کہا۔

"چل اوئے ان کو پیچھے بٹھا دے"

ٹرک میں بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ بیچ میں بیٹھنے کے لئے کافی جگہ تھی۔ کلینر نے مجھے بوریوں کے درمیان بٹھا دیا اور تختہ لگا دیا۔ یہ تختہ ٹرک کے پیچھے آدھے دروازے تک لگا تھا اور میں بوریوں کے پیچھے بیٹھا سڑک کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک چل پڑا۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھی کوئی ٹرک گذر جاتا تھا۔ شہر سے نکلنے کے بعد ٹرک نے رفتار پکڑ لی۔ سڑک ریت کے اور اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان گذر رہی تھی۔ آسمان پر تارے کہیں کہیں چمکتے نظر آرہے تھے۔ ریت کے ٹیلے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صرف ان کی چوٹیاں نیلگوں ستاروں والے آسمان کے پس منظر میں نظر آرہی تھیں۔ ٹرک کے پیچھے بیٹھنے سے ہوا کے تھپیڑے مجھ پر پڑ رہے تھے اور ان میں ریت کے ذرے بھی تھے۔ میں نے اپنے آپ کو بوریوں کے پیچھے چھپا لیا۔ ہوا ٹھنڈی بھی ہوگئی تھی۔ اچانک مجھے چندریکا بدروح یا ہوائی مخلوق کا خیال آگیا جو مجھے اپنے

کسی پہلے جنم کا خاوند سمجھتی تھی اور جو بیکانیر والے ہوٹل کی کھڑکی کے باہر بھی ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بلا سے بھی پیچھا چھوٹا اور بیکانیر کی بدروح بیکانیر ہی میں رہ گئی۔ ٹرک صحرائی رات میں سڑک پر ایک خاص رفتار کے ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک ناگور کس وقت پہنچے گا۔ اتنا ضرور معلوم تھا کہ یہ کافی لمبا سفر ہے۔

ایک دو دفعہ میں نے بوریوں سے ٹیک لگا کر سونے کی کوشش بھی کی مگر ٹرک کے پیچھے سے جو ہوا کے تھپیڑے پڑ رہے تھے۔ وہ سونے نہیں دیتے تھے۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے کے بعد کسی قصبے کی روشنیاں آگئیں۔ ٹرک سڑک کے کنارے ایک جگہ رک گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جلدی سے نیچے اتر کر کپڑوں پر پڑی ہوئی ریت جھاڑنے لگا۔ سکھ ڈرائیور بھی نیچے اتر رہا تھا۔ یہاں چائے کی دو تین دکانیں تھیں جہاں فلمی گیتوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ سکھ ڈرائیور نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"آجاؤ مہاراج آجاؤ۔ چائے پانی چھک لیں"

میں ہندوؤں کی طرح عاجزی سے مسکراتا ہوا ہاتھ سینے پر باندھے سکھ ڈرائیور کی طرف بڑھا۔

"پیچھے ریت مٹی تو بڑی پڑی ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں بادشاہو۔ ناگور اب زیادہ دور نہیں۔"

ہم نے چائے کی دکان کے باہر لوہے کی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پی۔ اس دوران سکھ ڈرائیور نے جیب سے چھوٹی بوتل نکال کر اس میں سے دو تین گھونٹ بھی لگا لئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ناگور میں کہاں رہتا ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ مجھے ناگور کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ہمارا گھر بڑے مندر کے پیچھے گلی میں ہے۔ میں دھرم ویر ہائی سکول میں ٹیچر ہوں۔"

سکھ ڈرائیور کو تھوڑی تھوڑی چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے میری بات پر کوئی زیادہ دھیان نہ دیا۔ ہوٹل والے کا نام لے کر اسے ایک گالی دی اور کہا کہ سوڈے واٹر کی بوتل بھیجے۔

کوئی پون گھنٹہ وہاں رکنے کے بعد ٹرک پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اتنا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ہم ناگور پو پھٹے پہنچیں گے۔ اس وقت مجھے جودھپور جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی مل سکتی تھی۔ اگر ریل گاڑی نہ ملی تو میں کسی بس میں سوار ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک ہوٹل میں پولیس افسر کی لاش مل گئی ہوگی۔ اور بیکانیر کی پولس نے میری تلاش میں شہر کی ناکہ بندی کر لی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جودھپور پولیس کو بھی قتل کی اطلاع کر دی گئی ہو۔ اور اسے میرا حلیہ بتا دیا گیا ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اب بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میں ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے کی حدود میں داخل ہونے والا تھا۔ اس حساب سے مجھے ناگور پہنچ کر ہرگز ریلوے اسٹیشن کا رخ نہیں کرنا چاہئے۔ میرے لئے یہی بہتر تھا کہ میں ناگور سے بھی جودھپور جانے والی کوئی لاری پکڑ لوں۔ لاری میں چیکنگ کا اتنا امکان نہیں تھا۔ یہ خیال سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی میں گہری نیند سو گیا۔ آنکھ کھلی تو پو پھٹ رہی تھی اور ٹرک ایک بڑے شہر کی روشنیوں والی سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ ہم ناگور پہنچ گئے تھے۔

ٹرک اڈے میں جا کر رک گیا۔ میں نے اتر کر سکھ ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور کچھ پیسے دینے چاہے مگر سکھ ڈرائیور نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"سردار جی! میں آپ کا دھنوادی ہوں"

ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ رات کا اندھیرا باقی تھا۔ ناگور کوئی اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ میں نے ٹرکوں کے اڈے پر ہی ایک مزدور سے جودھپور کے لاری اڈے کا پتہ معلوم کیا اور اڈے پر آگیا۔ یہاں ایک لاری آکر رکی تھی۔ اس میں سے سواریاں اتر رہی تھیں۔ دو تین لاریاں قریب ہی کھڑی تھیں۔ معلوم ہوا کہ جودھپور جانے والی لاری آدھے گھنٹے بعد چلے گی۔ میں وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے چائے کی دکان تھی میں وہاں

آیا رات کو کچھ نہیں کھایا تھا۔ میرے ایسے تربیت یافتہ کمانڈو کو بھوک لگتی ضرور ہے مگر بھوک تنگ کبھی نہیں کر سکتی۔ بہرحال مجھے بھی بھوک لگی تھی۔ دکان میں بیٹھ کر جو کچھ کھا سکتا تھا سیر ہو کر کھایا۔ چائے پی۔ اتنے میں جودھپور جانے والی لاری تیار ہو گئی تھی۔ ٹکٹ لے کر دوسرے راجستھانی مسافروں کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ لاری جودھپور کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ بھی ریتلے ٹیلوں میدانوں کا سفر تھا۔ کہیں کہیں کوئی ہرا بھرا کھیت آجاتا تھا۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی اور شکستہ بھی تھی۔ لاری زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی۔ دوپہر کے وقت لاری نے جودھپور پہنچا دیا۔ یہاں میں بے حد محتاط ہو گیا۔ لاری میں سفر کے دوران میں نے ایک مسافر سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ میرا پروگرام جودھپور سے مارواڑ کے ایک شہر پالی تک بذریعہ بس سفر کرنے کا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ٹرین پکڑ کر حالات کے مطابق احمد آباد کی طرف کوچ کر جانا تھا۔ چنانچہ جودھپور کے اڈے پر اترنے کے فوراً بعد میں نے وہیں سے پالی جانے والی لاری کا پتہ کیا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے مارواڑ کے شہر پالی جانے والی لاری مل گئی۔ مگر یہ ایک گھنٹے کا عرصہ میں نے جودھپور کے لاری اڈے پر انتہائی پریشانی میں گذارا۔ کیونکہ یہاں کی پولیس کو میرے اندازے اور میرے خیال کے مطابق یہ اطلاع خود مل گئی تھی کہ اس حلیے اس لباس کا نوجوان بیکانیر میں پولیس افسر کو قتل کر کے اس طرف آ رہا ہے۔ میں نے یہ سارا وقت لاری اڈے میں ایک بہت بڑے درخت کے پیچھے چھوٹی سی چائے کی دکان میں بیٹھ کر گذارا۔ لاری تیار ہوئی تو اس میں اس وقت سوار ہوا جب وہ چلنے لگی تھی۔ پالی تک کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ احمد آباد جانے والی گاڑی جونا ریلوے اسٹیشن سے ملے گی جو پالی سے پون گھنٹے کا لاری کا سفر تھا۔ میں فوراً وہاں سے دوسری لاری میں بیٹھ کر جونا آگیا۔ یہ اسٹیشن جودھپور احمد آباد مین لائن کا اسٹیشن تھا۔ یہاں سے مجھے اجمیر شریف سے آنے والی گاڑی مل گئی جو سیدھی احمد آباد جا رہی تھی۔

یہ کافی لمبا سفر تھا۔ شام ہو رہی تھی جب گاڑی چلی۔ یہ کوئی ایکسپریس گاڑی نہیں

تھی۔ جگہ جگہ کھڑی ہوتی تھی۔ خدا خدا کر کے میرا سفر کٹا اور میں اگلے دن احمد آباد پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم پر اترتے ہی میں نے کریم بھائی کو اس کے دیئے ہوئے نمبر پر ٹیلی فون کیا اور اسے بتایا کہ میں آگیا ہوں۔ اس نے کہا۔

"اسٹیشن کے پیچھے جو ریلوے پل ہے اس کے پاس آجاؤ۔ میں تمہیں لینے آرہا ہوں"

احمد آباد ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کا کافی رش تھا۔ پولیس کے سپاہی بھی ادھر ادھر کھڑے اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ مگر میری طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ میں اسٹیشن سے نکل کر ریلوے پل کی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پل کافی بڑا تھا۔ گاڑیاں' بیل گاڑیاں' سکوٹر آجا رہے تھے۔ میرا حلیہ بالکل ہندوؤں والا تھا۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ کلائی میں منگل سوتر بندھا تھا۔ احمد آباد میں مسلمان بھی بھاری تعداد میں رہتے تھے۔ مگر مجھے یہاں جینی ہندو بن کر ہی رہنا تھا۔ اتنے میں دور سے مجھے کریم بھائی کی پرانی مورس کار آتی دکھائی دی۔ کریم بھائی نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی میرے قریب آکر رکی۔ کریم بھائی نے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی ایک طرف چل پڑی۔

کریم بھائی نے مجھ سے منگل سوتر کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ منگل سوتر مجھے مل گیا ہے۔

"کوئی پریشانی تو نہیں اٹھانی پڑی؟"

میں نے کہا۔

"ایک خفیہ پولیس والے کو قتل کرنا پڑا ہے"

کریم بھائی نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ گاڑی شہر کی مصروف سڑکوں پر سے نکل کر نسبتاً ویران علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔

"لاش پر انگلیوں کے نشان تو نہیں چھوڑ آئے؟"

میں نے کہا

"نشان پڑے تھے۔ میں نے رومال سے اچھی طرح صاف کر دیئے تھے"

"تمہیں پولیس نے دیکھا تو نہیں؟"

میں نے جواب دیا۔

"صرف اسی خفیہ پولیس افسر نے دیکھا تھا جسے میں نے ٹھکانے لگا دیا"

"اچھا کیا"

میں نے کریم بھائی کو ہوائی مخلوق چندریکا کے بارے میں یہ سوچ کر کچھ نہ بتایا کہ اسے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور پھر اس ہوائی مخلوق کا ہمارے مشن سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ کریم بھائی مجھے شہر سے باہر والے اپنے پرانے گودام نما کوارٹر میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ جاتی دفعہ کہہ گیا کہ میں رات کو آؤں گا۔ یہ وقت میں نے کچن میں کھانا تیار کرنے' کافی بنانے اور کمرے میں کھڑکی کے پاس اکیلا بیٹھ کر اپنے مشن کے بارے میں سوچ بچار کرتے گذار دیا۔ رات ہو گئی تھی کمرے میں کریم بھائی نے مجھے بجلی کی بتی جلانے سے منع کر رکھا تھا۔ صرف کونے میں ایک موم بتی روشن کی ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دور سے کسی کو کوارٹر میں روشنی نظر آئے۔

آدھی رات کے وقت کریم بھائی اپنی گاڑی لے کر آگیا۔

گاڑی کی ڈگی میں سے اس نے اٹیچی کیس نکالا اور اسے کمرے میں لے آیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں یہ کپڑے بدل کر نئے کپڑے پہننے ہوں گے میں تمہارے لئے دو نئے جوڑے لے آیا ہوں"

یہ سفید کھدر کے کرتے پاجامے اور بادامی رنگ کی واسکٹ تھی اس نے کپڑے اٹیچی کیس سے نکال کر چارپائی پر ایک طرف رکھ دیئے اور یہ کہہ کر کچن کی طرف چلا گیا کہ میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔ میں چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کریم بھائی کافی کے دو مگ بنا کر لے آیا۔ ہم کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ اس نے میرے منگل سوتر کو غور سے دیکھا۔ کہنے لگا۔

"اب تم جین مت کے پکے وِدوان ہو گئے ہو۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ تم کٹڑ جینی شاستری ہو۔ اب کل سے تمہیں اپنے مشن کا آغاز کرنا ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ اپنے بال نہیں کٹوائے۔ اپنے بالوں کو گردن تک جتنا لمبا کر سکتے ہو لمبا کر لو۔ اس سے تمہارا حلیہ جینی پروفیسروں والا ہو جائے گا۔ ایک بات یاد رکھنا۔ تم گجراتی زبان روانی سے نہیں بول سکتے۔ تمہارا اردو بولنے کا لہجہ بھی پنجابیوں والا ہے۔ سب کو یہی بتانا کہ تم پنجاب کے کسی شہر میں ہندو برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے تمہارے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ تمہارے کسی رشتے دار نے تمہاری پرورش کی۔ پھر تم امریکہ چلے گئے وہاں سے واپس ہندوستان آئے تو جین دھرم کا مطالعہ کیا۔ اس دھرم نے تمہیں بے حد متاثر کیا اور تم نے اپنی ساری زندگی جین دھرم کے مطالعے اور پرچار کے لئے وقف کر دی۔ اب تم گجرات کاٹھیاواڑ میں رہ کر جین دھرم کی خدمت اور پرچار کرنا چاہتے ہو کیونکہ یہ جین مت کے بانی مہاویر وردھمان کی جنم بھومی ہے۔ بس اس بیان کو رٹ لینا۔ اور اسی پر قائم رہنا۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں نے بھی پہلے ہی سے یہ سوچ رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا را کے ڈائریکٹر جی ڈی پانڈے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اس کی بیٹی میناکشی کا سہارا لینا ضروری ہے؟"

کریم بھائی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور یہ جی ڈی پانڈے تک رسائی حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ بھی ہے۔ کیونکہ پانڈے اپنی اکلوتی اولاد میناکشی سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور میناکشی بھی جین دھرم کو جیون کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے۔ تم چاہے کتنے دولت مند نوجوان بن کر بھی اس کے پاس جاؤ گے اسے متاثر نہ کر سکو گے۔ احمد آباد بمبئی وغیرہ میں میناکشی کے کئی

دولت مند رشتے دار نوجوان موجود ہیں۔ اس کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی طرح اس کے مذہبی جذبات پر اتنا گہرا اثر ڈالو کہ وہ تمہاری گرویدہ ہو جائے۔ وہ بڑی پڑھی لکھی لڑکی ہے اور جین دھرم اور برہمن مت کے بارے میں بہت علم رکھتی ہے۔ اور جین دھرم کی ودوانوں اور جوگی سادھوؤں کی بڑی عزت کرتی ہے"

میں چپ بیٹھا تھا۔ کریم بھائی بھی خاموش ہو گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"کیا تم میناکشی پر اتنا اثر ڈال سکو گے' تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ دشمن کو پلک جھپکنے میں ٹھکانے لگا سکتے ہو۔ تم ہائی ایکسپلوسوز کے بھی ماہر ہو۔ ڈائنامیٹ لگا کر بڑے سے بڑے پل کو ایک سیکنڈ میں اڑا سکتے ہو۔ لیکن کیا تم ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کے دل کو اس طرح سے اپنی مٹھی میں لے سکتے ہو کہ وہ تمہاری گرویدہ ہو جائے اور تمہیں اپنے باپ جی ڈی پانڈے سے ملوانے بھی لے جائے؟"

میں نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا"

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام مجھے بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ مشکل ان معنوں میں کہ میں مذہبی بحث مباحثے سے تو میناکشی پر اپنا بھرپور اثر ڈال سکتا تھا۔ لیکن اسے اپنا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ پر قبضہ جمانے والی بات مجھے مشکوک لگ رہی تھی اس کے لئے کسی کرامت کی ضرورت تھی۔ کوئی شعبدہ دکھانے کی ضرورت تھی اور شعبدہ اور کرامت میرے پاس نہیں تھی۔

کریم بھائی کہنے لگا۔

"تم اب سو جاؤ۔ میں بھی اسی مسئلے پر مزید غور کرتا ہوں۔ کیونکہ ہمیں پکا قدم اٹھانا ہوگا۔ شروع میں ہی اگر پاؤں جم کر نہ پڑا تو خطرہ ہے کہ سارا مشن کہیں دھرے کا دھرا نہ رہ جائے"

میں نے کریم بھائی سے سوال کیا۔

"کیا ہمیں کسی دوسرے طریقے سے را کے ہیڈ کوارٹر کی کشمیر کے بارے میں حکمت عملی اور کشمیر میں فوجی یونٹوں کی نقل و حرکت اور پاکستان میں را کے ایجنٹوں کی ابتدائی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں؟"

کریم بھائی نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"احمد آباد میں را کا جو خفیہ ہیڈ کوارٹر ہے اور جس کا ڈائریکٹر میناکشی کا باپ گوگل داس پانڈے ہے ساری حکمت عملی اسی دفتر میں طے کی جاتی ہے۔ یہی محکمہ سری لنکا میں تامل ٹائیگرز کی مدد کرتا ہے اور یہی محکمہ پاکستان میں تخریب کار بھیجنے کی پالیسی وضع کر چکا ہے اور وہ ابتدائی بلیو پرنٹ بھی اسی محکمے میں جی ڈی پانڈے کی نگرانی میں تیار ہوتے ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے کشمیر میں مجاہدین آزادی کی تحریک جہاد کو کچلنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس لئے جی ڈی پانڈے کے ہیڈ کوارٹر میں گھس کر بیٹھنا اور اس شخص کا اعتماد حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اور اس عیار اور تجربہ کار بیوروکریٹ کا اعتماد تم میناکشی کے ذریعے ہی حاصل کر سکتے ہو۔ اسی کے لئے تو تمہیں شعبدہ دکھانا ہوگا۔

کریم بھائی میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا تم کوئی شعبدہ دکھا سکتے ہو؟"

پھر خود ہی اس نے اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ کام کوئی شعبدہ باز ہی کر سکتا ہے۔ کمانڈو نہیں کر سکتا۔ اچھا۔ ایک دن مزید غور کر لیتے ہیں۔ میں کل رات کو پھر آؤں گا تم بھی کچھ سوچ رکھو۔ میں بھی کچھ سوچوں گا ہو سکتا ہے کوئی کارگر تدبیر ہمارے دماغوں میں آجائے۔

کریم بھائی چلا گیا۔ اس شخص کی باتیں حقیقت پسندانہ تھیں۔ را (RAW) کے کشمیر افیئرز والے ہیڈ کوارٹر کے چیف جی ڈی پانڈے تک پہنچنے کا راستہ اس کی اکلوتی

میناکشی کو درمیان سے نکال دیا جائے تو پھر اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے والی بات تھی۔ پھر مجھے ایک طویل اور دشوار گذار راستے سے گذر کر مسٹر پانڈے تک پہنچنا پڑتا تھا۔ اور اس میں بھی کامیابی کی امید پانچ فی صد سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر اس شخص کی بیٹی نہ ہوتی تو لامحالہ مجھے یہی طویل اور دشوار گذار راستہ اختیار کرنا پڑتا یعنی میں ایک ہندو جین بھگت کے روپ میں جی ڈی پانڈے تک رسائی حاصل کرتا۔ پھر اس پر اپنا اثر جماتا۔ پھر اس کا اعتماد حاصل کرتا۔ جو بگلے کے سر پر موم رکھ کر اس کو پکڑنے والی ترکیب تھی۔ اب جب کہ اس کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی موجود تھی تو میں یہ راستہ شارٹ کٹ سے بڑی آسانی سے طے کر سکتا تھا اور پہلے ہی اٹیک میں را کے خفیہ شعبے کی فائلوں تک پہنچ جاتا۔

مگر کریم بھائی نے ٹھیک کہا تھا کہ میناکشی کمپیوٹر سائنس کے ماڈرن زمانے کی پڑھی لکھی لڑکی تھی اس کے روشن اور ترقی پسند دماغ کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے جین دھرم کی باتیں ایک کارگر رول ادا ضرور کر سکتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے کوئی شعبدہ دکھانے کی بھی اشد ضرورت تھی۔ سوال یہ تھا کہ میں شعبدہ کیسے دکھا سکتا تھا؟ ان خیالوں میں گم سم میں دیر تک کوارٹر کے بند کمرے میں بیٹھا رہا۔ نیند بالکل غائب تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ کشمیر میں کشمیری حریت پرست بے سروسامانی کے عالم میں تربیت یافتہ فوجوں کا بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے بھارتی فوج کے پاس بے پناہ اسلحہ اور جنگی سازو سامان تھا۔ ان کی نفری بھی زیادہ تھی۔ جب کہ کشمیری حریت پرستوں کے پاس وہی بندوقیں اور اسلحہ تھا جو وہ بھارتی فوجیوں سے چھین کر لے جاتے تھے۔ ان کی نفری بھی کم تھی۔ وہ صرف اپنے جذبے اور اللہ اور رسولؐ کے نام پر آزادی اور اسلام کی جنگ لڑ رہے تھے اور شہید ہو رہے تھے۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے بھارتی فوجی ہائی کمان کی خفیہ سکیموں کی رپورٹیں حاصل کر کے انڈین فوجی یونٹوں کی نقل وحرکت پر کاری ضرب لگانی تھی۔ ان کی ہر نئی فوجی حکمت عملی کو تباہ کرنا تھا اور ان پر یہ لرزا دینے والی حقیقت کا انکشاف کرنا تھا کہ کشمیری حریت پرست دشمن کے گھر تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے صرف جہاد کشمیر کی تحریک کو زبردست تقویت

ہی نہیں ملتی تھی بلکہ کشمیر کے محاذ پر کشمیریوں پر ظلم و ستم توڑنے والی بھارتی فوجی یونٹوں کا مورال بھی ختم ہو جاتا تھا۔

میرے پاس کریم بھائی سگریٹ کا ایک پیکٹ اور ماچس چھوڑ گیا تھا۔ یہ تو آپ کو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں کبھی کبھی سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ کریم بھائی مصلحتاً سگریٹ چھوڑ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مجھے ایک ایسا سگریٹ کیس دیا ہوا تھا جس کے ساتھ ہی لائٹر لگا ہوا تھا۔ اسی لائٹر کے اندر بہت ہی چھوٹے سائز کا بڑا طاقتور ٹرانسمیٹر فٹ تھا۔ اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے میں بھارت کے اندر رہ کر کشمیر سے لے کر نیچے راس کماری تک اپنے ساتھی کے ریسیونگ سیٹ پر سیکرٹ پیغام کے سگنل بھیج سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں یہ ظاہر کروں کہ میں سگریٹ پیتا ہوں۔ یہ طاقتور ٹرانسمیٹر والا سگریٹ لائٹر کریم بھائی نے میرے اسپرو ٹیبلٹ بم کی پندرہ ٹکیوں کے ساتھ ہی اسی کوارٹر کے تہہ خانے کی الماری میں رکھ دیا تھا۔ جہاں وائرلیس سیٹ مائیکرو فلم ڈیویلپمنٹ کا دوسرا سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ سگریٹ لائٹر اور اسپرو ٹیبلٹ بم کی ٹکیاں آگے چل کر دشمن کو موقع بہ موقع ختم کرنے میں میرے کام آنے والی تھیں۔ اسپرو ٹیبلٹ بم کے بارے میں میں اپنے قارئین کو ایک بار پھر بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کس قسم کے بم تھے۔ میری کمانڈو ٹریننگ کے دوران یہ بم اور ان کو تیار کرنے کا نسخہ مجھے میرے دلی کے مجاہد کمانڈو انسٹرکٹر گل خان نے دیا تھا۔ دیکھنے میں یہ سر درد دور کرنے کی اسپرو کی ٹکیاں لگتی تھیں۔ مگر یہ انتہائی دھماکہ خیز بم تھے۔ مجاہد کمانڈو انسٹرکٹر اور ہائی ایکسپلوسیوز کے ماہر گل خان نے ہر ٹکیہ کے اندر خاص کیمیکلز کا مرکب تیار کر کے ڈال رکھا تھا۔ جب اس ٹکیہ کو اسپرو کی گولی سمجھ کر کوئی پانی کے ساتھ نگل لیتا تھا تو تین اور چار منٹ کے اندر اندر معدے میں جا کر اسپرو کی گولی کے ساتھ اس کے اندر چھپا ہوا کیمیائی مرکب بھی حل ہو جاتا اور پھر معدے کے تیزاب سے حل ہو کر وہ کیمیائی مرکب ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتا تھا اور ساتھ ہی دشمن کے جسم کے پرزے اڑ جاتے تے اس کا تجربہ گل خان نے دلی شہر سے باہر ایک کتے پر لیا تھا۔ اس نے میرے سامنے ایک آوارہ کتے کو پکڑ کر درخت کے ساتھ باندھا۔ اس

کے منہ میں زبردستی اسپرو ٹیبلٹ بم کی گولی ڈال دی۔ ہم گھڑی کی سوئیوں کو تکنے لگے۔ گل خان مجھے ساتھ لے کر کتے سے کوئی پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ ساڑھے چار منٹ کے بعد کتا جو زور زور سے بھونک رہا تھا۔ سر ڈال کر بیٹھ گیا اس کا جسم اینٹھنے لگا۔ اور پھر ایک دھماکہ ہوا اور دوسرے لمحے کتے کے جسم کے پرزے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ گل خان نے کہا تھا کہ یہ کمانڈو جاسوسی کی دنیا میں میری ایک بالکل نئی ایجاد ہے۔ وہ ہنس کر بولا تھا۔

"اگر میں جرمنی میں ہوتا تو ہٹلر کا گسٹاپو کا محکمہ مجھے سر آنکھوں پر اٹھا لیتا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ یہ بم اسلام کے دشمنوں' پاکستان اور کشمیریوں کے دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے استعمال ہو گا"

میری ایکسپلوسیوز کی کمانڈو ٹریننگ کے دوران گل خان نے مجھے اس اسپرو ٹیبلٹ بم کا پورا فارمولا سمجھا بھی دیا تھا اور لکھ کر بھی دے دیا تھا۔ یہ فارمولا ایک کاغذ پر کوڈ الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ یعنی کاغذ پر دار چینی' بادام' کالی مرچ اور سونف کی مقدار لکھی تھی۔ ایک نظر دیکھنے سے یہی لگتا تھا کہ یہ بڑی اعلیٰ قسم کی بریانی تیار کرنے کا نسخہ ہے مگر ان الفاظ کو ڈی کوڈ کرنے سے ان کیمیکلز کی صحیح مقدار اور ان کے امتزاج کا فارمولا سامنے آجاتا تھا۔ یہ فارمولا بھی کریم بھائی نے طاقتور ٹرانسمیٹر والے سگریٹ کیس کے ساتھ ہی تہہ خانے کی الماری میں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔

تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ توپوں میں گولے لوڈ ہو چکے تھے۔ صرف پہلے فائر آرڈر کی ضرورت تھی۔ پھر میری اور انڈین فوجی ہائی کمانڈ کی سیکرٹ جنگ شروع ہو جانی تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ پہلا گولہ کس محاذ سے فائر کیا جائے۔ اس کے لئے ہم نے جی ڈی پانڈے کی بیٹی میناکشی والا محاذ چنا تھا مگر یہاں ضرورت اس بات کی تھی کہ پہلا گولا ہی صحیح ٹارگٹ پر جا کر لگے۔ اگر نشانہ خطا چلا گیا تو اس بات کا خدشہ تھا کہ ہمیں شدید نقصان اٹھانا پڑے۔

میں یہی سوچتا ہوا اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں صرف ایک موم بتی ہی

جل رہی تھی ۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر رات کی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر ایک جانب درختوں کے پیچھے چاند طلوع ہو چکا تھا جس کی پھیکی پھیکی زرد چاندنی رات کے اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ جس جگہ پر کریم بھائی کا یہ گودام نما کوارٹر تھا وہاں سے کچھ فاصلے پر ریلوے لائن گذرتی تھی۔ مجھے دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریل گاڑی کے گذرنے کی آواز کچھ دیر تک آتی رہی پھر غائب ہو گئی۔

کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ میں کمرے سے نکل کر باہر درختوں کے نیچے آکر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میرا دماغ صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ میناکشی کو اپنے قبضے میں کرنے کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میرے چاروں طرف گہری خاموشی طاری تھی۔ ریل گاڑی کے گذر جانے کے بعد یہ خاموشی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ بہت دور احمد آباد کے کسی کارخانے کی روشنیاں ستاروں کی طرح جھلملاتی نظر آرہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر کا زرد اور اداس چاند جیسے درختوں کے پیچھے آکر رک گیا تھا۔ سگریٹ میرے ہاتھ میں جل رہا تھا۔ یہ سگریٹ میں نے کریم بھائی کی دی ہوئی ڈبیا میں سے کمرے سے بارہ آتے ہوئے سلگا لیا تھا۔ میں نے سگریٹ کا ہلکا کش لگایا اور اسے زمین پر مسل کر بجھا دیا۔

اچانک مجھے پائل کی ہلکی سی جھنکار سنائی دی۔ میں اس جھنکار کو پہچانتا تھا۔ یہ ہوائی مخلوق چندریکا کے پائل کی جھنکار تھی۔ جھنکار کی آواز میرے قریب سے ہو کر گذر گئی۔ مجھے چندریکا نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے دل میں بیزاری کے ساتھ کہا کہ یہ کم بخت مجھے تنگ کرنے پھر آگئی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ بیکانیر کی نندی کنڈ والی مڑھیوں میں ہی رہ گئی ہوگی۔ مگر یہ میرا پیچھا کرتی احمد آباد بھی پہنچ گئی تھی۔ میں چپ چاپ بیٹھا چندریکا کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ آئی ہے تو میرے سامنے ظاہر ضرور ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔ چند لمحوں کے بعد پائل کی جھنکار دور سے سنائی دی۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ قریب آنے لگی۔ جیسے کوئی غیبی عورت پاؤں میں پائل باندھے دھیرے

دھیرے چلتی میری طرف بڑھ رہی ہو۔ میں اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ جھنکار کی آواز میرے قریب آکر رک گئی۔ چندریکا ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ میں دل میں اس بدروح کو برا بھلا کہنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی چندریکا ظاہر ہو گئی۔ وہ اسی زعفرانی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ ماتھے پر سونے کی زنجیر والا ہیرا چمک رہا تھا۔ کانوں میں بھی قیمتی پتھر تھے۔ اس نے پہلے روز کی طرح ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے برا بھلا کیوں کہتے ہو میرے پتی دیو؟ کبھی میری پائل کی جھنکار سن کر تمہارے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ اب تم میری صورت سے بھی بیزار ہو۔"

میں چپ بیٹھا رہا۔ چندریکا نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔

"آہ میرے پریتم۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم نے اس بار ایک مسلمان کے گھر میں جنم لیا ہے اگر کسی ہندو کے گھر میں جنم لیتے تو تمہیں میرے ساتھ گذارے ہوئے پچھلے جنم کے سارے واقعات' ساری محبت بھری باتیں یاد ہوتیں۔ آہ! بھگوان نے مجھے میرے کسی مہاپاپ کی سزا دی ہے کہ تمہیں کسی مسلمان کے گھر میں جنم دے کر پچھلے جنم کی ساری باتیں بھلا دیں"

مجھے اس بدروح پر غصہ آنے لگا۔ میں نے کہا۔

"چندریکا! تم ایک بدروح ہو۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑدو۔ مجھ سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں الحمد للہ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں۔ بت پرست نہیں ہوں بت شکن ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار تم جاؤ تو پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھاؤ"

چندریکا نے اسی طرح ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ چہرے پر ایک گہری اداسی چھائی تھی۔ چاند اس کے پیچھے خاموش ایک جگہ رکا ہوا تھا۔ اس نے آہ بھر کر کہا۔

"میرے پتی دیو! تم ہر جنم میں میرے خاوند رہے ہو میرے پتی دیو رہے ہو۔

پچھلے جنم میں میں راجستھان کے راجہ کے دربار کی نرتکی تھی اور تم دربار کے
نرتکار تھے۔ ہم دونوں کی راجہ نے خود شادی کرائی تھی۔ اس روز محل کو
چراغوں سے سجایا گیا تھا۔ پھر ہونی ہو کر رہی۔ تم بیمار پڑ گئے اور یم دوت نے
تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ تمہاری موت کے ایک مہینہ بعد میں بھی زندہ نہ
رہی۔ نندی کنڈ میں جہاں میں پہلی بار تمہیں ملی تھی پتھر کی چھتری والی میری
مڑھی موجود ہے وہاں میرے پاؤں کے نشان بھی ہیں۔ تمہاری مڑھی بھی
میرے ساتھ ہی بنائی گئی تھی۔ میرے پریتم! مجھے پہچانو اپنی چندریکا کو پہچانو!"
میں نے تنگ آ کر اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"دفع ہو جا یہاں سے اور پھر اپنی شکل مجھے کبھی نہ دکھانا۔ نہیں تو میں ایسا عمل
پڑھ کر پھونکوں گا کہ تم جل کر بھسم ہو جاؤ گی۔"
ہوائی مخلوق یا آپ یوں کہہ لیں کہ چندریکا کی بدروح نے اپنا سر جھکا دیا اور آنسوؤں
بھری آواز میں بولی۔
"میرے کنور جی! میری قسمت میں اس جنم میں تمہاری جدائی لکھ دی گئی ہے۔
مجھے اگلے جنم کا انتظار ہے جب تم بھگوان کی کرپا سے کسی برہمن کے گھر میں
جنم لو گے۔ پھر تمہیں میرے ساتھ گذارے ہوئے پچھلے جنموں کے سارے
زمانے یاد آ جائیں گے۔ پھر ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اپنے مانس جنم کا
سارا رستہ طے کریں گے"
میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو"
چندریکا نے عاجزی سے کہا۔
"کنور جی! مجھے اس طرح ڈانٹ کر میرا دل نہ توڑو تم نے تو ہمیشہ مجھ سے پریم
بھرے شبدوں میں پکارا ہے۔ تمہارا پریم تمہاری محبت مجھے تمہارے پیچھے لئے
لئے پھرتی ہے۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے نہیں لاتی۔ کیونکہ

مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے نہیں پہچانتے اور مجھے پسند نہیں کرتے ہو۔ جب تم
نے بیکانیر کے ہوٹل میں ایک آدمی کو قتل کیا تھا تو میں تمہارے کمرے میں
موجود تھی مگر میں صرف اس خیال سے تمہارے سامنے نہیں آئی کہ تم میری
شکل دیکھنا پسند نہیں کرتے"
میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"اگر اس وقت تم میرے کمرے میں موجود تھیں جب پولیس والے نے میری
طرف پستول تان رکھا تھا تو تم نے خود اسے ختم کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ مجھے گولی
مار دیتا اور میں مر جاتا تو تم تو خوش ہوتیں کہ چلو مرنے کے بعد تم میری روح
سے ملاقات کر سکو گی"
چندریکا نے کہا۔
"نہیں میرے کنور جی! ایسی بات نہیں تھی۔ مجھے تمہارے دشمن کے دل کا
حال معلوم تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول ضرور تھا مگر اس کا ارادہ تمہیں قتل
کرنے کا نہیں تھا۔ اس کے دل کا حال مجھ پر کھلا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ
تمہاری ٹانگ پر گولی چلا کر تمہیں زخمی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بھی اس نے ارادہ
نہیں کیا تھا۔ اگر وہ اس قسم کا کوئی ارادہ کرتا تو میں تو اس کے پاس ہی کھڑی
تھی۔ میں اس کی گردن کو ایک انگلی سے چھو کر اسے ہمیشہ کی نیند سلا سکتی
تھی۔"
میں نے کہا۔
"مگر تمہارا تو کوئی جسم ہی نہیں ہے۔ یاد ہے میں نے نندی کنڈ کی مڑھیوں میں
رات کے وقت تمہاری کلائی پکڑنی چاہی تھی مگر تمہاری کلائی میرے ہاتھ میں
نہیں آئی تھی۔ تم تو ہوا کی لہر کی طرح ہو۔ تمہارے جسم کا کوئی مادی وجود نہیں
ہے۔ پھر تم میرے دشمن کی گردن کو کیسے چھو سکتی تھیں۔ تم جھوٹ بول رہی
ہو"

چندریکا نے گہری آواز میں کہا۔

"میرے کنور! تم یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو۔ تم ویدوں اور پرانوں کا سارا علم بھول چکے ہو۔ میرا کوئی مادی وجود نہیں ہے۔ مگر میرا جسم مادے کی توانائی سے بنا ہوا ہے۔ یہ توانائی میرے محبوب کے لئے شبنم کی طرح ٹھنڈی ہے مگر میرے اور میرے محبوب کے دشمن کے لئے کڑکتی ہوئی بجلی ہے جو اسے ایک آن میں جلا کر بھسم کر سکتی ہے"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لہرا سا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ عورت میرے مشن میں میری بہت مدد کر سکتی ہے۔ اس کی خفیہ طاقت سے میں بڑا کام لے سکتا ہوں۔ میں اسے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چندریکا نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میرے کنور! میرے پتی دیو! تم جو سوچ رہے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔ میں تمہارے دل کے اندر چھپے ہوئے خیالوں' ارادوں کو پڑھ رہی ہوں۔ سن رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم بھارت میں ایک خاص مقصد لے کر آئے ہو۔ میں اس مقصد کے حاصل کرنے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میں مجبور ہوں۔ ہاں اگر تمہارا کوئی دشمن تمہیں جان سے مار ڈالنے کا ارادہ لے کر تمہاری طرف بڑھے گا تو میں اسے ضرور ختم کر دوں گی۔ اس لئے کہ اگر تم کسی کے ہاتھوں قتل ہو کر مر گئے تو یہ موت غیر طبعی موت ہو گی۔ پھر مجھے ایک لاکھ سال تک تمہارے کسی انسانی روپ میں جنم لینے کا انتظار کرنا ہو گا۔ اس لئے میں ہر قدم پر تمہیں غیر قدرتی موت سے بچاؤں گی۔ لیکن تمہارے کہنے پر اپنے ملک بھارت ورش کے کسی ہندو واسی کو قتل نہیں کروں گی۔ میں بھارت ورش میں ہندو عورت کے روپ میں پیدا ہوئی تھی اور اسی بھارت ورش کی بھومی میں میری خاک مل گئی ہے۔ میں نے اگر اپنی جنم بھومی سے غداری کرتے ہوئے تمہاری مدد کی تو میرا اگلا جنم ایک کروڑ سال کے لئے کتیا

کے روپ میں ظاہر ہو گا۔ جو میں کیسے قبول کر سکتی ہوں"

اس بدروح چندریکا کی باتوں سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ میرے عزائم سے واقف ہے۔ اور اسے میرے دل کا سارا حال معلوم ہے کہ میں کیا مقصد لے کر انڈیا میں داخل ہوا ہوں۔ مگر چونکہ وہ مجھے اپنا خاوند سمجھ بیٹھی تھی اور مشکل وقت میں میرے کام آ سکتی تھی اسی لئے میں نے سوچا کہ اس عورت کو دھتکارنا نہیں چاہئے۔ وہ کم بخت میرے یہ خیالات جان گئی۔ کہنے لگی۔

"میرے پتی دیو! میرے کنور جی! اگر تم مجھے دھتکار بھی دو گے تو میں تم سے ناراض نہیں ہوں گی۔ مجھے تو تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری حفاظت کرنی ہو گی تا کہ تم قدرتی موت مرنے کے بعد دوبارہ میرے ساتھ آ کر مل جاؤ۔"

میں نے سوچا کہ اس عورت کے ساتھ بغیر منافقت کے پوری سچائی کے ساتھ بات کرنی چاہئے۔ میں نے کہا۔

"اگر تم میرے دل کے خفیہ ارادوں سے واقف ہو ہی گئی ہو اگر تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ میں کیا سکیم دل میں لے کر انڈیا میں آیا ہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنے ہندو بھائیوں اور میرے دشمنوں کو میرے ارادوں سے خبر نہیں کرو گی۔ تم تو اسی شہر میں مجھے کسی بھی لمحے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا سکتی ہو"

چندریکا نے کہا۔

"اگر پچھلے جنم میں تم میرے خاوند نہ رہ چکے ہوتے تو میں اب تک تمہیں گرفتار کروا چکی ہوتی۔ بلکہ اس وقت جب بیکانیر کے ہوٹل میں پولیس افسر نے تمہاری طرف پستول تان رکھا تھا تو میں اس کی دل میں خیال ڈال دیتی کہ اسے ہلاک کر دو اور وہ تمہیں اسی وقت گولی چلا کر مار ڈالتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میں ایسا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتی۔ ہندو عورت کا پتی جس کو تم مسلمان خاوند کہتے ہو اس کے لئے بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔ مجھ پر تو

تمہاری حفاظت کی ذمے داری پڑ گئی ہے۔ اگر تم مسلمانوں کے ملک پاکستان سے نکل کر بیکانیر کی مڑھیوں میں نہ آتے تو میری تم سے شاید اس جنم میں کبھی ملاقات نہ ہوتی۔ لیکن یہ شدنی تھی۔ اسے ہو کر ہی رہنا تھا۔ میری قسمت تمہیں پاکستان سے یہاں کھینچ کر میرے پاس لے آئی۔ لیکن بھگوان نے مجھے میرے برے کرموں کی یہ سزا دی کہ تم مسلمان کی حیثیت سے میرے پاس آئے ہو۔ مجھے اس جنم کا پاپ کاٹنا پڑے گا اور اگلے جنم کے لئے تمہاری حفاظت کرنی پڑے گی کہ تم غیر قدرتی موت نہ مارے جاؤ۔ بوڑھے ہو کر قدرتی موت مرو۔ تا کہ مرنے کے بعد ہندو مذہب کے مطابق جوان ہو کر میرے پاس آجاؤ۔

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں را کے احمد آباد والے ہیڈ کوارٹر کے چیف تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اس کی اکلوتی بیٹی میناکشی کو اپنا مطیع اور اپنی مریدنی بنانے کی فکر میں ہوں"

چندریکا ابھی تک میرے سامنے اسی طرح کھڑی تھی۔ چاند درختوں کے کافی اوپر آکر آہستہ آہستہ نیچے جھکنا شروع ہو گیا تھا۔ میں درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ چندریکا نے اس کے جواب میں کہا۔

"مجھے تمہارے دل کا سارا حال معلوم ہے۔ تمہارے سارے ارادوں کا پتہ ہے"

میں نے صاف صاف لفظوں میں اس سے کہا۔

"تو پھر میناکشی کو میری مریدنی بنانے میں میری مدد کرو۔"

چندریکا نے سرد آہ بھری اور کہا۔

"تم جو مقصد لے کر بھارت ورش میں آئے ہو وہ تم جانو اور تمہارا کام۔ مجھے اس میں داخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ میں اس میں دخل دینا بھی نہیں

چاہتی۔ تمہاری جان کی حفاظت کی ضرور ذمے دار ہوں اور وہ ذمے داری میں اس وقت تک نبھاتی رہوں گی جب تک تم بھارت کے ملک میں ہو۔"

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ میں نے بھی اس کی بات نہ کاٹی۔ ایک پل خاموش رہنے کے بعد چندریکا نے کہا۔

"ہاں ایک بات میں تمہاری خاطر، اپنے پتی دیو کی خاطر ضرور کر سکتی ہوں۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ کیا بات ہے؟ جلدی بتاؤ"

چندریکا بولی۔

"اگر تم اپنی کلائی پر بندھے ہوئے منگل سوتر پر ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے صرف ایک بار یہ کہہ دو کہ چندریکا! تم میری پتنی ہو۔ میں تمہارا پتی ہوں۔ اس جنم میں ہم جدا ہو گئے ہیں۔ اگلے جنم میں ہم پھر مل جائیں گے۔ تو میں تمہیں گوکل داس پانڈے کی اکلوتی بیٹی میناکشی کے بارے میں ایسی راز کی باتیں بتاؤں گی کہ جب تم ان کا ذکر اس کے آگے کرو گے تو وہ تمہاری دیوانی ہو جائے گی۔ تمہاری مریدنی ہو جائے گی۔ پھر تم اسے جو کہو گے وہ وہی کرے گی۔"

پہلے میں نے سوچا کہ مجھے اس قسم کے جملے ادا نہیں کرنے چاہئیں۔ کیا معلوم ان میں کوئی خاص طلسمی منتر ہو اور اس کا مجھ پر اثر ہو جائے اور مجھے بہت گناہ ہو۔ پھر خیال آیا کہ اس قسم کی باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ یہ سب ہندوؤں کے بت پرستوں والے توہمات ہیں۔ مسلمان تو بت شکن ہے بت پرست نہیں ہے۔ اور پھر محض یہ دو تین جملے ادا کرنے سے میرے سیکریٹ مشن کی کامیابی کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ میں نے چندریکا سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں یہ جملے دہرانے کو تیار ہوں"

پھیکی چاندنی میں میں نے پہلی بار چندریکا کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دیکھی جیسے اس

کے دل کی کلی کھل اٹھی ہو۔ اس نے بے اختیار ہو کر کہا۔

”میرے پتی دیو! اب زیادہ دیر مجھے نہ تڑپاؤ جو کچھ میں نے تمہیں کہا ہے وہ اپنی میٹھی آواز میں بول کر میرے جنم جنم کے پیاسے کانوں میں امرت رس گھول دو“

میرا کیا جاتا تھا۔ میں نے اسی وقت اپنا ہاتھ بائیں کلائی پر بندھے ہوئے منگل سوتر پر رکھا اور چندریکا کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے ذرا سا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”چندریکا! تم میری پتنی ہو۔ میں تمہارا پتی دیو ہوں۔ اس جنم میں ہم جدا ہو گئے ہیں۔ اگلے جنم میں ہم پھر آن ملیں گے“

چندریکا تو خوشی سے جھوم گئی۔ کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں تم نے دل سے یہ بات نہیں کہی۔ مجھ سے اپنا مطلب نکالنا ہے لیکن اپنا مطلب نکالنے کے لئے بھی تم نے مجھے اپنے ہونٹوں سے امرت رس پلایا ہے۔ میں تمہاری دھنوادی ہوں۔ اس لئے کہ خاوند اگر جھوٹ موٹ بھی اپنی بیوی کی تعریف کرے تو بیوی کو خوشی ضرور ہوتی ہے۔ میں بھی تم سے خوش ہو گئی ہوں۔“

میں نے کہا۔

تو پھر اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو اور مجھے میناکشی کے متعلق وہ راز کی باتیں بتاؤ جو سوائے میناکشی کے دوسرا کوئی نہیں جانتا“

چندریکا کہنے لگی۔

”پہلی راز کی بات تو میں تمہیں یہ بتاتی ہوں کہ میناکشی ہر روز صبح نہانے کے بعد نیا رنگدار جانگیہ پہنتی ہے۔ جس روز تم اسے ملو گے اس نے سرخ رنگ کا جانگیہ پہنا ہوگا۔ دوسری راز کی بات یہ ہے کہ اس کی ناف کے نیچے پچھلے ایک ہفتے سے اچانک ایک پھوڑے یا پھنسی کا ابھار سا پیدا ہو گیا ہوا ہے۔

جس کے بارے میں اس نے شرم کے مارے ابھی تک اپنی خاص لیڈی ڈاکٹر کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ اور وہ ابھی کسی کو اس کے بارے میں کچھ بتائے گی بھی نہیں۔ تیسری راز کی بات یہ ہے کہ میناکشی نے اپنی ایک خفیہ ڈائری بنا رکھی ہے جس کا نام اس نے پریم گرنتھ رکھا ہوا ہے۔ اپنی اس خفیہ ڈائری میں وہ اپنی دل کی باتیں صاف صاف لکھ دیتی ہے۔ اس ڈائری میں اس نے اپنے ایک چاہنے والے چندرکانت کے بارے میں آج صبح ہی لکھا تھا کہ یہ شخص مجھے لنکا کا راون لگتا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے مگر میں اس کے ساتھ پریم کا ڈرامہ رچا کر اسے بے وقوف بنا رہی ہوں۔ چوتھی خاص بات یہ ہے کہ جس روز تم میناکشی سے ملنے جاؤ گے اس سے ایک رات پہلے میں اس کے خواب میں دیوی درگاہ ماتا کے روپ میں آؤں گی اور اسے کہوں گی کہ میناکشی اگلے جنم میں تیرا جنم لومڑی کے روپ میں ہوگا۔ بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ یہ اشارے بتاؤ گے تو میناکشی تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔ آگے اس سے کام لینا تمہارا کام ہے“

میرے لئے اتنے اشارے ہی کافی تھے۔ چندریکا نے RAW را کے چیف جی ڈی پانڈے تک پہنچنے بلکہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے واسطے میرا راستہ آسان کر دیا تھا اور میری کامیابی کا پہلا دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے چندریکا کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔

”اس کے عوض میں تم سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہوں گی کہ ہمیشہ مجھے اپنی پتنی یعنی بیوی سمجھنا اور اگر کبھی میں تم سے کسی خواہش کا اظہار کروں تو انکار مت کرنا انکار کرو گے تو مجھ سے تم نے جو جو فائدے حاصل کئے ہوں گے وہ نقصان میں بدل جائیں گے۔“

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میرے نقصان سے اس کی کیا مراد ہے۔ مگر اس وقت مجھے ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ میں غور کرنا ہی چاہتا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں چندریکا میں ہمیشہ تمہیں اپنی پتنی یعنی بیوی ہی سمجھوں گا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ تم میرے لئے اتنا کچھ کر رہی ہو تو میں بھی ہمیشہ تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا"

میں نے سوچا آخر اس ہوائی مخلوق کو جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اپنی بیوی کہہ دینے اور سمجھ لینے میں کیا حرج ہے۔ اتنی دیر میں آسمان پر صبح کا ہلکا ہلکا نور پھیلنے لگا۔ وہاں کھڑے کافی دیر سے باتیں کر رہے تھے۔ چاند کو غروب ہوئے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"اچھا چندریکا اب میں جاتا ہوں"

چندریکا دو تین قدم چل کر میرے قریب آگئی وہ ہلکی ہلکی خوشبو جو پہلے مجھے اس کے جسم سے دور سے آ رہی تھی اب قریب سے آنے لگی۔ یہ قدیم مندروں میں لگنے والے لوبان کی خوشبو تھی۔ جو میرے اعصاب کو بوجھل کر رہی تھی۔ وہ میرے اتنا قریب آگئی کہ مجھے اس کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

"سوامی! میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لو"

میں نے سوچا کہ یہ تو ہوائی جسم والی ہے۔ اس کا کوئی مادی جسم نہیں ہے۔ چلو اس کی خواہش پوری کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں اپنی جگہ پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔

چندریکا جسم موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کے بدن کی گرمی اور خون کی حرارت دوڑ رہی تھی۔ میرے خدا کیا یہ عورت زندہ ہو گئی ہے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چندریکا نے اسی طرح سانس لیا جیسے وہ لذت و سرور کے انتہائی مقام پر پہنچ چکی ہو۔ اس کے ہونٹوں سے نیم مدہوشی کے عالم میں یہ الفاظ نکلے۔

"آہ! میرے پتی دیو! ایک ہزار برس کے بعد تمہارے جسم کی لذت نصیب ہوئی ہے"

میں نے ڈر کے مارے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچنا چاہا تو چندریکا میرے ساتھ لگ گئی۔ اس کی زعفرانی ساڑھی میں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ جیسے اسے بخار ہو گیا ہو۔ اس کے بدن کی حرارت میرے بدن میں داخل ہو رہی تھی اور مجھے اپنا جسم گرم ہو کر انگارہ بنتا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ چندریکا سے الگ کر لیا۔ وہ بازو کھولے میرے سامنے کھڑی حسرت ویاس سے مجھے تک رہی تھی۔ سرد آہ بھر کر بولی۔

"میرے پتی دیو! بہت جلد ہم دونوں کا ملاپ ہو گا۔ اب میں جاتی ہوں"

اور وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے پرنام کر کے واپس مڑی اور آہستہ آہستہ چلتی درختوں کے نیچے رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

را کے چیف جی ڈی پانڈے پر اپنا اثر رسوخ جمانے اور اس کے بھرپور اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے اس کی اکلوتی بیٹی میناکشی کے ذریعے مجھے جو کرشمہ یا شعبدہ دکھانا تھا اس کی طاقت مجھے چندریکا کے ذریعے حاصل ہو گئی تھی۔ کریم بھائی نے رات کو جاتے وقت کہا تھا کہ میں کل رات آؤں گا۔ تم اس نقطے پر غور کر رکھو کہ میناکشی پر کس طریقے سے اپنا اثر جما سکتے ہو۔ کریم بھائی بھی یہی چاہتا تھا کہ میں میناکشی کے ذریعے اس کے باپ اور را RAW کے کشمیر پاکستان افیئرز کے چیف مسٹر جی ڈی پانڈے تک رسائی حاصل کروں۔ کیونکہ پانڈے کو اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت محبت تھی۔

چونکہ اب میناکشی کو اپنے قبضے میں کرنے والا منتر میرے ہاتھ آ چکا تھا تو مزید ایک دن انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ دن نکلنے کے بعد کریم بھائی کو اس کے خفیہ نمبر پر فون کر کے اسے یہاں بلاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں نے میناکشی تک رسائی حاصل کرنے کا ایک طریقہ سوچ لیا ہے۔ اچانک خیال آیا کہ چندریکا نے مجھے اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتانے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔ اس نے شروع ہی میں مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو میرے سارے فائدے نقصان میں بدل جائیں گے۔ وہ اپنی اور میری ملاقاتوں کو راز میں رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے بھی سوچا کہ مجھے کسی کو چندریکا کے بارے میں کچھ بتا کر خواہ مخواہ اپنا نقصان کرنے کی کیا

ضرورت ہے۔ مجھے تو آم کھانے سے غرض ہے۔ اور آم لا کر چندریکا نے میری جھولی میں ڈال دیئے تھے۔

میں نے کریم بھائی کو صبح ٹیلی فون کر کے بلانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ وہ سارا دن میں نے بڑی بے چینی سے گذارا۔ رات ہوئی تو کریم بھائی آ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا کہ میں نے میناکشی پر اثر رسوخ جمانے کا کوئی طریقہ سوچا ہے کیا؟ میں نے یونہی مگر بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

”کریم بھائی! ایک طریقہ میں نے سوچ لیا ہے۔ طریقہ یہی ہے کہ میں جین دھرم کا سوامی بن کر اس کے پاس کلب میں یا جہاں وہ شام کے وقت اپنی سہیلیوں یا دوستوں کے ساتھ بیٹھتی ہے جا کر اسے ملوں گا اور اپنی باتوں سے اس کے دل کو اپنے قبضے میں کر لوں گا“

کریم بھائی مسکرانے لگا۔

”تم کمانڈو ہو۔ کوئی جادوگر یا نقلی کرامتیں دکھانے والے سادھو جوگی نہیں ہو۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میناکشی ماڈرن ہندوستان کی اونچی سوسائٹی کی پڑھی لکھی ماڈرن لڑکی ہے۔ اس نے ہر گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ وہ امریکہ میں بھی چار سال گذار چکی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے تمہاری باتوں سے متاثر نہیں ہو گی“

لیکن جو مجھے معلوم تھا وہ کریم بھائی کو معلوم نہیں تھا۔ جو منتر مجھے چندریکا سکھا گئی تھی۔ میناکشی کے جو راز مجھے چندریکا بتا گئی تھی ان کی بھی کریم بھائی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ اگر میں اسے چندریکا کی باتیں بتا دیتا تو کریم بھائی کہتا کہ ابھی جا کر میناکشی سے ملاقات کرو۔ مگر میں مجبور تھا کریم بھائی کو چندریکا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

”کریم بھائی! میں نے ہندو دھرم کے تمام فرقوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ہندو دھرم کے بارے میں بہت علم حاصل کیا ہوا ہے۔ مجھے چاروں ویدوں اور

اپنشدوں اور سوتروں کا بھی علم ہے۔

اور جین دھرم کے بارے میں تو میں نے گہرا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ میں انشاء اللہ اس مشن میں ناکام نہیں ہوں گا۔ میری یہ پہلی کمانڈو مہم کامیابیوں سے ہمکنار ہوگی۔

کریم بھائی مجھے اس قدر پراعتماد دیکھ کر حیران سا ضرور ہوا۔ مگر یہ بات تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ میرے ہاتھ ایک ایسا خفیہ منتر آگیا ہے کہ جس کے پھونکنے سے میرے انتہائی اہم کمانڈو مشن کا پہلا دروازہ کھل جائے گا۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تم تیار ہو تو میں بھی تیار ہوں۔ میناکشی کے بارے میں' میں نے اپنے ذرائع سے سب کچھ معلوم کرلیا ہے کہ اس کی مصروفیات کیا کیا ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا میناکشی کو ڈانس اور میوزک کا بڑا شوق ہے۔ وہ شام کے وقت احمد آباد کے مشہور اور اونچی سوسائٹی کے ڈانس سنٹر سارا بائی ڈانس سنٹر میں کلاسیکل ڈانس کی تعلیم حاصل کرنے جاتی ہے۔ یہ کوئی ڈانس کا صرف سکول نہیں ہے بلکہ اونچی سوسائٹی کی عورتوں اور احمد آباد کے امیر گجراتی سیٹھوں اور سرکاری افسروں کے نوجوان لڑکوں کا ایک طرح سے کلب بھی ہے۔ یہ ڈانس سنٹر سارا بائی مرحوم کی بیٹی رینا لینی چلاتی ہے۔ یہ ڈانس سنٹر احمد آباد کے بادشاہ سلطان احمد شاہ گجراتی کی مشہور تاریخی مسجد کے قریب ہی واقع ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ احمد آباد کا شہر سلطان احمد شاہ گجراتی نے آباد کیا تھا۔ میں چاہوں گا کہ تم صبح سے یہاں نکل کر سیدھے احمد آباد میں سیاحوں کے مشہور ہوٹل ٹرائیڈنٹ ہوٹل میں جا کر اپنے لئے کمرہ لے لو۔ وہاں تم یہی ظاہر کرو گے کہ تم دلی سے جین مندروں اور گاندھی جی کے آشرم کی یاترا کرنے احمد آباد آئے ہو۔ یہ ایک فائیو سٹار ہوٹل ہے مگر تمہارے مشن کا تقاضا ہے کہ تم اسی ہوٹل میں جا کر قیام کرو۔ خواہ دو دن ہی قیام کرو۔ اس کے لئے میں تمہیں کچھ رقم اپنی مسلم کمیٹی کے فنڈ میں سے نکال

کر دے دوں گا۔"

مجھے چونکہ اپنے مشن کی کامیابی پر پورا بھروسہ تھا اس لئے میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"کریم بھائی! تم مجھے صرف ایک دن ایک رات کا ہوٹل کا خرچہ دے دینا۔ اس کے بعد سارا انتظام میں خود کرلوں گا۔"

وہ گہرے غور و فکر کے انداز میں آہستہ آہستہ سر ہلاتا رہا۔ پھر بولا۔

"میرا خیال ہے تم اپنا لباس یہی سفید کرتہ پاجامہ اور نہرو جیکٹ ہی رکھنا۔ تم نے میناکشی کو اپنے لباس سے نہیں بلکہ اپنی باتوں اور اپنی جین دھرم کے عالموں والی گفتگو سے متاثر کرنا ہے"

"ہاں یہ کپڑے ہی ٹھیک رہیں گے"

"نہیں نہیں۔ میں ایسا ہی ایک نیا جوڑا صبح اپنے ساتھ لیتا آؤں گا"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کریم بھائی اگلے روز آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ میں کچھ دیر میناکشی سے ملاقات اور اس کے ساتھ اپنی اہم ترین تاریخی ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر سو گیا۔

دوسرے روز کریم بھائی دن کے دس گیارہ بجے کے قریب آگیا۔ اس کے ہاتھ میں شاید بیگ تھا جس میں میرے لئے سفید کھدر کا پاجامہ کرتا اور نئی بادامی رنگ کی واسکٹ تھی۔ میں نہا دھو کر تیار ہو چکا تھا۔ فوراً نیا جوڑا پہن لیا۔ کریم بھائی اپنے ساتھ میناکشی کی ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر بھی لایا تھا۔ اس نے مجھے تصویر دکھائی اور کہا۔

"یہ میناکشی کی ایک ماہ پہلے کی اتری ہوئی تصویر ہے۔ مجھے یقین ہے تم سارا بائی ڈانس سنٹر میں اب اسے پہچان لوگے"

پھر اس نے ایک لفافہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"اس میں دو ہزار روپے کے نوٹ ہیں۔ ٹرائیڈنٹ ہوٹل کا چوبیس گھنٹے سنگل بیڈ روم کا کرایہ آٹھ نو سو روپے کے قریب ہے۔ باقی روپے تم اپنے پاس

رکھنا۔ تمہارے کام آئیں گے اگر مزید روپوں کی ضرورت پڑے تو مجھے میرے خفیہ ٹیلی فون نمبر پر ٹیلی فون کر دینا تمہیں روپے پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"کریم بھائی! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ تم بے فکر رہو"

کریم بھائی نے حیران سا ہو کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ تمہارے ہاتھ کوئی خفیہ خزانہ تو نہیں آگیا؟"

میں نے ہنس کر کہا

"کریم بھائی! میرا خفیہ خزانہ تو میرا اپنے اللہ پاک اور اس رسول پاک ؐ پر میرا ایمان ہے۔ میری یہ مہم اسلام اور پاکستان کی مہم ہے۔ میں اگر اپنے مشن میں ثابت قدم رہا تو اللہ پاک اپنے حبیب کے صدقے میری ضرور مدد کرے گا"

کریم بھائی بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"ماشاء اللہ! پاکستان کے ہرنوجوان کا یہی عقیدہ اور یہی عزم ہونا چاہئے۔ ہمارے لئے پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ اس قلعے کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنا کر قائم رکھنے میں ہی ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی بقا ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر اٹھو۔ میں تمہیں ٹرائیڈنٹ ہوٹل کے قریب اتار دوں گا"

کریم بھائی کی پرانی مورس گاڑی کوارٹر کے عقب میں درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی شہر کی طرف چل پڑی۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور کبھی دھوپ بھی نکل آتی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ گاڑی شہر کے مضافات میں سے نکل کر شہر کی گنجان آبادی والے علاقے میں آگئی۔ یہاں کافی ٹریفک تھی۔ دکانیں کھلی تھیں زیادہ تر کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ احمد آباد میں کپڑا بنانے کے بے شمار کارخانے تھے۔ یہ شہر شروع ہی سے پارچہ سازی کی صنعت کا بہت بڑا مرکز رہا تھا۔ احمد آباد ماڈرن شہر بھی تھا اور پرانا شہر بھی تھا۔ اس کے بازاروں میں ماڈرن اور قدیم دونوں زمانوں کا امتزاج تھا۔ ایک طرف اگر بجلی کی لوکل ٹرینیں چلتی تھیں اور دوسری طرف بازاروں میں بیل گاڑیاں بھی

چلتی تھیں۔ اگر شہر کے فیشن ایبل علاقے میں ہائی رائیز بلڈنگیں تھیں تو شہر کے اندر نیم روشن گلی کوچوں میں پرانے مکان اور پرانے جین مندر بھی تھے۔ مگر اس شہر کی اسلامی عہد میں تعمیر شدہ تاریخی عمارتیں اور مسجدیں سیاحوں کو سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ ان میں قطب شاہی کے عہد کی مشہور تالاب اور ستونوں والی مسجد تھی۔ شہر کے مرکز میں کنکر کنکریاں نام کی مشہور جھیل اور پارک واقع تھی جسے سلطان قطب الدین نے اپنے عہد میں بنوایا تھا۔ مغل عہد حکومت میں اس جھیل کے گرداگرد ایک جنگل ہوتا تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر شکار کھیلنے آتا تھا۔ کنکر کنکریاں جھیل کو اب بڑا ماڈرن کر لیا گیا ہے اور اس میں پیڈل سے چلنے والی کشتیاں چلتی ہیں۔ جھیل کے اردگرد سنگ مرمر کی بارہ دریاں ابھی تک اپنی شان وشکوہ کے ساتھ موجود ہیں اور اسلامی عہد کے جاہ وجلال کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہاں شاہی مہمانوں کے نہانے کے لئے ان بارہ دریوں کے نیچے باؤلی کی شکل میں ایک شاہی حمام بھی بنا ہوا ہے جس کے اب صرف آثار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ جھیل کی ایک جانب ہمارے لاہور کے شالامار باغ کی طرز کا ایک باغ بھی ہے۔ انڈیا کے اس تاریخی شہر احمد آباد میں رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر کے کلچر پر اسلامی کلچر کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ گجراتی زبان میں فارسی اور عربی کے بے شمار الفاظ بولے جاتے ہیں اور یہاں مسلمان بادشاہوں کے زمانے کی کئی تاریخی عمارتیں اور مساجد موجود ہیں کریم بھائی کی مورس گاڑی اب شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر شہر کے فیشن ایبل علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ گجراتی عورتیں ساڑھیوں کے علاوہ شلوار قمیض میں بھی ملبوس تھیں۔ نوجوان لڑکیوں نے پتلون قمیض بھی پہن رکھی تھی۔ کئی لڑکیاں سکوٹر چلاتی بھی نظر آئیں۔ ہماری گاڑی ایک کشادہ سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ جس کی ایک جانب کوٹھیاں اور بنگلے تھے اور دوسری جانب اونچی بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ پھر ایک پارک آگیا۔ کریم بھائی نے اس پارک کے پیچھے آکر گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔

"ٹرائیڈنٹ ہوٹل اس پارک کے جنوبی گیٹ کے بالکل سامنے ہے۔ اب تم وہاں جاؤ گے اور اپنے مشن کا آغاز کرو گے۔ سارا بائی ڈانس سنٹر کا حدود اربعہ

اور ایڈریس میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ وہاں تم شام ہونے کے بعد جاؤ گے اور یہ ظاہر کرو گے کہ تم اپنی کسی رشتے دار لڑکی کو وہاں ڈانس کی تعلیم دلوانا چاہتے ہو۔ میناکشی وہاں شام کو ضرور آتی ہے۔ اسے تم پہچان لو گے اس کے بعد تمہاری ذہانت اور چرب زبانی کا امتحان شروع ہو گا۔ خدا حافظ!"

میں گاڑی سے نکل کر خاموشی سے پارک کے جنوبی گیٹ کی طرف چل پڑا۔ کریم بھائی گاڑی موڑ کر وہیں سے واپس چلا گیا دن کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ پارک میں بچے فٹ بال وغیرہ کھیل رہے تھے۔ میں پارک کے جنگلے والی دیوار کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی پر جین دھرم کا منگل سوتر بندھا تھا۔ ماتھے پر جین دھرم کا سفید تلک لگا تھا۔ لباس سفید کھدر پاجامے کا تھا۔ پاؤں میں کولہا پوری چپل تھی۔ میں بالکل جینی ہندو لگ رہا تھا۔ جنوبی گیٹ پر آکر میں نے سامنے نگاہ ڈالی۔ کشادہ سڑک کی دوسری جانب ایک تین منزلہ فائیو سٹار ہوٹل کی ماڈرن بلڈنگ کھڑی تھی۔ میں سڑک پار کرکے ہوٹل کے گیٹ میں سے گذرتا ہوا اس کی لابی میں آگیا۔ باہر کچھ گاڑیاں اور ایک ٹورسٹ بس کھڑی تھی۔ لابی کا دروازہ شیشے کا تھا۔ اندر کی فضا کولنگ کی وجہ سے ہلکی ہلکی خنک تھی۔ فضا میں رجنی گندھا کے پھولوں کی دھیمی دھیمی مہک رچی ہوئی تھی۔ ان پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لابی کے کونوں میں کرسٹل کی میزوں پر سجے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی فون سن رہی تھی۔ میں اس کے پاس آگیا۔ لڑکی نوجوان تھی۔ بالوں کے جوڑے میں موتیے کے سفید پھول سج رہے تھے۔ اس نے سبز کناروں والی زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ یہ دونوں رنگ گجرات کاٹھیاواڑ کے خاص رنگ ہیں۔ لڑکی نے فوراً ٹیلی فون رکھ دیا اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں دلی سے احمد آباد کے تاریخی مندروں کی یاترا کو آیا ہوں۔ میرا نام داس وردھن ہے۔ میں دو تین دن ہوٹل میں قیام کروں گا۔ لڑکی نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ ایک کارڈ میرے آگے رکھ دیا۔

"پلیز اس پر اپنا نام اور دلی کا ایڈریس لکھ دیں"

میں نے کارڈ پر اپنا نام داس وردھن اور دلی کا ایک جعلی ایڈریس لکھ دیا۔ اس نے اپنے رجسٹر پر بھی میرے نام کا اندراج کیا۔ اور آٹھ سو روپے کی ادائیگی کے لئے کہا۔ میں نے اسی وقت ادائیگی کر دی۔ لڑکی نے ایک ہوٹل بوائے کو اشارہ کیا اور چابی اس کو دے کر کہا۔

"صاحب کو اوپر ان کے کمرے میں پہنچا دو"

لڑکے نے مجھ سے میرے سامان کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے کہا۔ "میں ٹورسٹ ہوں۔ انڈین ٹورسٹ میرے پاس کوئی سامان نہیں۔"

لڑکی مسکرا دی۔ میں ہوٹل بوائے کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر ہوٹل کی دوسری منزل پر آگیا۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ سنگل بیڈ روم والا کمرہ تھا مختصر مگر خوبصورت فرنیچر سجا تھا۔ ٹیلی فون بھی لگا تھا۔ میں نے ہوٹل بوائے کو پانچ روپے ٹپ دیئے اور کہا۔

"ابھی میں سوامی نارائن جی کے مندر جا رہا ہوں ایک گھنٹے بعد آکر بھوجن کروں گا۔ میں جینی ہوں۔ صرف دہی اور سبزی کھاؤں گا"

ہوٹل بوائے نے کہا۔ "اوکے سر"

میں نے اس کے جانے کے بعد کمرے کا جائزہ لیا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ یہاں سے سڑک اور پارک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ باتھ روم میں جا کر صابن سے ہاتھ صاف کئے اور کمرے کو تالا لگا کر نیچے لابی میں آیا۔ چابی کاؤنٹر پر دی اور باہر آکر ٹیکسی لی اور اسے لالا بازار چلنے کو کہا۔ لالا بازار احمد آباد شہر کا کاروباری سنٹر ہے اور ہمارے لاہور کے انار کلی بازار کی طرح ہے۔ یہاں آکر میں نے ایک بریف کیس اور کچھ دوسرا ضروری سامان خریدا اور واپس ہوٹل میں آگیا۔ دوپہر کو بادل نخواستہ سبزی خوروں والا کھانا کھایا اور پھر تھوڑی دیر کے لئے سو گیا۔ جب اٹھا تو دن کی روشنی ماند پڑ چکی تھی اور شام کی آمد آمد تھی۔ میں نے غسل کیا۔ ماتھے پر چھوٹی ڈبی کھول کر جینی تلک لگایا۔ بریف کیس میں سے نیا سفید رومال اور نئی خریدی ہوئی چھوٹی ڈائری نکال کر واسکٹ کی جیب میں رکھی۔ دوسری جیب

میں سو سو روپے کے دو نوٹ ڈالے اور ہوٹل کی لابی سے نکل کر ٹیکسی سٹینڈ پر آگیا۔
اب میں سارا بائی ڈانس سنٹر جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ میں نے ٹیکسی لی اور اسے سارا بائی ڈانس سنٹر چلنے کو کہا۔ ٹیکسی سڑک پر ایک طرف روانہ ہو گئی۔ شام کا سرمئی دھندلکا سڑک کے درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سڑک کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ سارا بائی ڈانس سنٹر پہنچتے پہنچتے شام گہری ہو چکی تھی۔ سارا بائی ڈانس سنٹر سڑک سے ہٹ کر ایک دو منزلہ خوبصورت کوٹھی میں قائم تھا۔ گیٹ پر گجراتی اور انگریزی زبان میں سنٹر کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ گیٹ کے پاس سٹول پر ایک گورکھا چوکیدار بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ریتالینی دیوی اندر ہی ہیں۔ گورکھے نے کہا۔ جی ہاں"

میں کوٹھی کے برآمدے کی طرف بڑھا جہاں خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ کوٹھی کے باغیچے میں بھی روشنی تھی۔ درمیان میں شیو دیوتا کی مورتی لگی تھی جس میں اسے ڈانس کرتے دکھایا گیا تھا۔ دو گاڑیاں برآمدے کی ایک جانب کھڑی تھیں۔ برآمدے میں چھوٹے سے خوبصورت کاؤنٹر کے پیچھے ایک گجراتی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے قریب گلدان میں رجنی گندھا کے پھول سج رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر کہا۔

"میرا نام داس وردھن ہے۔ مجھے دیوی ریتالینی جی سے ملنا ہے۔"

میں نے یہ جملے انگریزی زبان میں ادا کئے تھے۔ لڑکی نے بھی بڑی سادہ مگر خوبصورت انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ میں ریتالینی دیوی سے کس لئے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔

"میں اپنی بھانجی کو یہاں ڈانس سکھانا چاہتا ہوں۔ میں دلی سے آیا ہوں"

لڑکی نے کہا۔

"اندر ویٹنگ روم میں تشریف رکھیں۔ میں دیوی ریتالینی کو آپ کے بارے میں اطلاع کرتی ہوں"

میں ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے سے دو عورتیں اور ایک

ادھیڑ عمر مرد بیٹھا تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر انڈیا کے مشہور ڈانسروں کی پینٹ کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ کارنس کے اوپر دونو جانب شیو دیوتا کے ڈانس کے پوز والے کانسی کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ کارنس کے اوپر کسی خوبصورت مگر ذرا زیادہ عمر کی عورت کی آئل میں پینٹ کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ اس عورت کے جوڑے میں بھی موتیے کے پھول سجے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ناک ستواں تھا اور وہ تھوڑا سا مسکرا رہی تھی۔ تصویر کے نیچے انگریزی میں کچھ لکھا تھا جو دور سے میں پڑھ نہیں سکتا تھا۔ یہ اس ڈانس سنٹر کی مالکہ ریتالینی دیوی کی ہی تصویر ہو سکتی تھی۔ ایک دبلی پتلی مگر خوش شکل لڑکی ڈرائنگ روم کے اندر کی جانب کھلنے والے دروازے کا پردہ ہٹا کر آئی۔ اس نے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی خواتین اور ان کے مرد کو اشارے سے بلایا۔ تینوں اندر چلے گئے اور اسے کچھ دیر کے بعد طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کی آواز آنے لگی۔ پھر گھنگھروؤں کی ہلکی ہلکی جھنکار بھی سنائی دینے لگی۔ ایک آدھ منٹ کے بعد یہ آوازیں رک گئیں۔ میں صوفے پر بڑے سکون سے بیٹھا رہا۔ دروازے کا پردہ ہٹا۔ دونوں عورتیں اور مرد اندر سے نکلے اور گجراتی میں آپس میں باتیں کرتے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہی لڑکی ایک بار پھر آئی۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ کیا داس وردھن میرا ہی نام ہے؟ میں نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں ہی داس وردھنا یا داس وردھن ہوں" لڑکی نے کہا۔

"پلیز فالو می"

وہ مجھے ایک نیم روشن راہ داری میں سے گذار کر ایک بڑے کشادہ اور روشن روشن کمرے میں لے گئی جہاں قالین بچھے تھے۔ ایک طرف تخت پر گاؤ تکیے لگے تھے۔ تانپورے اور طبلوں کی جوڑیاں بھی موجود تھیں۔ ایک بوڑھا آدمی ہارمونیم بجا رہا تھا اور ایک لڑکی رقص کرنے کے بعد گھنگھرو اتار رہی تھی۔ بڑے قیمتی صوفے تھے۔ دیواروں پر پردے لٹک رہے تھے۔ جابجا کرشن اور گوپیوں اور شوپاروتی کی رقص کے انداز کی تصویریں لگی تھیں۔ کونوں میں بھی شیو دیوتا کے کانسی کے مجسمے کھڑے تھے۔ لڑکی نے ایک

صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بیٹھیں۔ دیوی جی ابھی آتی ہیں"

جو لڑکی گھنگھرو اتار رہی تھی اس نے گھنگھروؤں کو اتار کر چوما۔ ماتھے سے لگایا۔ ہا
ہارمونیم بجانے والے بوڑھے کے حوالے کر کے بوڑھے کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر ا
کانوں کو ہاتھ لگایا اور ہاتھ جوڑے پچھلے قدموں کمرے سے نکل گئی۔ ہارمونیم بجا
والے بوڑھے نے میری طرف بالکل توجہ نہ دی اور دھیمے سروں میں ہارمونیم بجاتا رہا۔

میں نے اپنے اوپر وہی متکبرانہ کیفیت طاری کر لی تھی جو ایک نقلی پیر اپنے
ضعیف الاعتقاد مرید کے گھر جا کر اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے۔ میں بڑی شان سے گر
اٹھائے بیٹھا بوڑھے کو ہارمونیم پر انگلیاں چلاتے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں عقبی درواز
ریشمی پردہ ہٹا اور ایک گورے رنگ کی بھرے بھرے بدن والی عورت اندر داخل ہوئی
اس کے لمبے بال شانوں پر موتیے اور رجنی گندھا کے پھولوں کے ہاروں سے بندھے ہو
تھے۔ کان میں نیلے رنگ کے پتھر چمک رہے تھے۔ گلے میں بھی اسی رنگ کے پتھروں کا
تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز اور گہرے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ب
کے نیچے اس کا گورا بدن صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ انڈیا میں عور
اسی طرح لباس پہنتی ہیں اور بلاؤز کے نیچے ناف سے ذرا اوپر تک ان کے پیٹ
ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت
جس کی ڈرائنگ روم میں تصویر لگی تھی۔ عمر اس کی تیس اور پینتیس برس کے در
ہو گی اس نے ایک شان بے نیازی سے میری طرف نگاہ ڈالی اور مجھ سے کوئی بات کئے
ہارمونیم بجانے والے بوڑھے سے متوجہ ہو کر کہا۔

"مہاراج! آپ اوپر والے کمرے میں جائیں سٹوڈنٹ لڑکیاں آ گئی ہوں گی"

مہاراج ہارمونیم بند کر کے اٹھے۔ عورت کو نمسکار کیا اور باہر نکل گیا۔ اب
عورت نے جو یقیناً ریتالینی دیوی ہی تھی میری طرف دیکھا۔ چہرے پر ایک نقلی مسکر
سجائے وہ میرے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ نقلی مسکراہٹ فوراً چہر

غائب ہو گئی۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

"آپ اپنی کزن کو ڈانس سنٹر میں ایڈمٹ کرانا چاہتے ہیں؟"

میں نے اپنے چہرے کو پتھر کی طرح سنجیدہ بنایا ہوا تھا۔ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"ہاں میڈم"

"لیکن آپ کی کزن تو دلی میں رہتی ہے"

میں نے کہا۔

"وہ احمد آباد اپنی ماسی کے پاس آ کر رہ لے گی" مگر میڈم آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا"

اس عورت نے ذرا سا چونک کر میری طرف دیکھا۔ جیسے اسے میرا اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اسے اچھا نہ لگا ہو۔ کہنے لگی۔

"میں ریتالینی دیوی ہوں۔ سارا بائی ڈانس سنٹر کی مالکہ"

میں نے بھی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا میری کزن کو آپ کے ہاں داخلہ مل جائے گا؟" ریتالینی دیوی کو یہ بات بھی محسوس ہوئی تھی کہ میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ ڈانس سنٹر کی مالکہ ہے۔ اس کا بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے چڑ سی گئی ہے اپنی ساڑھی کے پلو کو اپنے گھٹنوں کے اوپر کرتے ہوئے اس نے بیزاری کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا۔

"سوری سر! اس وقت سنٹر میں کسی نئے سٹوڈنٹ کے داخلے کی گنجائش نہیں ہے"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ایک بار پھر غور کر لیجئے"

ریتالینی بھی بڑی مزاج دار عورت تھی۔ اس نے بھی میرے جینی بھگتوں والے لباس کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ دراصل گجرات کے شہروں میں اس حلیے کے جینی

بھگت عام طور پر دیکھنے میں آتے تھے۔ ذرا ترش لہجے میں کہنے لگی۔
"سر! میں نے غور کر کے ہی آپ کو بتایا ہے۔ آئی ایم سوری"
اب میں نے اپنے رویے میں تھوڑی نرمی پیدا کر لی۔ میری حکمت عملی کا تقاضا بھی
یہی تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میڈم! بات یہ ہے کہ میری کزن کو آپ کے سنٹر میں رقص کی تعلیم حاصل
کرنے کا بے حد شوق ہے۔ وہ آپ کی زبردست فین ہے اگر آپ نے اسے
داخل نہ کیا تو اسے زبردست صدمہ ہو گا۔"
میرے نرم لہجے کا رینالینی پر اثر ہوا۔ وہ بھی تھوڑا سا مسکرائی۔ کہنے لگی۔
"آپ دو ایک دن انتظار کر لیں۔ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"
میں نے اسے اپنے ہوٹل کا بتایا تو وہ اس سے بھی متاثر ہوئی۔ کیونکہ ٹرائیڈنٹ
ہوٹل مہنگا فائیو سٹار ہوٹل تھا۔ سر کو اثبات کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولی۔
"آئی سی۔ آئی سی۔
مجھے میناکشی کا انتظار تھا۔ چندریکا نے کہا تھا کہ جس رات تم سارا بائی ڈانس سنٹر جاؤ
گے میناکشی اسی رات وہاں ضرور آئے گی اور چندریکا کی باتیں صحیح ہو رہی تھیں۔ میں نے
رینالینی سے پوچھا کہ کیا وہ سٹوڈنٹس کو یہیں رقص کی تعلیم دیتی ہیں اس نے کہا۔ "کلاس
اوپر والے ہال کمرے میں لگتی ہیں"
اوپر والے کمرے سے طبلے ہارمونیم کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگی تھیں۔ تب میں
نے رینالینی دیوی کو اپنے بارے میں بتایا کہ میں دلی کے کاستھ ہندو گھرانے میں پیدا ہوا
تھا۔ بچپن میں ماتا پتا وفات پا گئے۔ میرے انکل نے میری پرورش کی بنارس یونیورسٹی سے
ایم اے فزکس میں کیا۔ پھر چار سال امریکہ میں تعلیم حاصل کی لیکن بچپن سے طبیعت
جین دھرم کی طرف لگا ہوا تھا۔ پھر میں نے نوکری چھوڑ دی اور جنگلوں میں نکل گیا
چار برس تک جنگلوں میں سادھو سنتوں کے ساتھ رہا۔ ہندو اور جین دھرم کا گیان حاصل
کیا اور اب اپنی زندگی جین مت کے پرچار کے لئے وقف کر دی ہے۔ اس کے بعد میں

نے یوگا، کرم کانڈ، موسیقی، رقص، چار ویدوں، اپنشدوں اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے
بارے میں انگریزی میں ایسی باتیں کیں کہ رینالینی پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اب وہ میری
طرف پوری طرح متوجہ ہو گئی تھی اور میری ہر بات کو بڑے غور سے سننے لگی تھی۔ یہی
میں چاہتا تھا وہ مجھے اوپر والے ہال کمرے میں لے گئی جہاں لڑکیاں مہاراج سے ڈانس کی
تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ تان پورہ چھڑا ہوا تھا۔ ہارمونیم پر لہرا بج رہا تھا اور چار پانچ
لڑکیاں ساڑھیوں کے پلو پیٹ کے ساتھ لپیٹے کتھک رقص کر رہی تھیں۔ میں نے
رینالینی سے پوچھا۔
"کیا تم بھارت ناٹیم رقص کی تعلیم بھی دیتی ہو؟"
اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں مہاراج۔ بھارت ناٹیئم رقص ہی تو اصل ہمارے بھارت ورش کا
رقص ہے۔ کتھک رقص کا تو مغل بادشاہوں نے رواج دیا تھا۔"
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کتھک رقص خیر سے مسلمان بادشاہوں نے اورنگ زیب
کے زمانے کے بعد ایجاد کیا تھا اور اسی رقص نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو ڈبو
دیا تھا۔ میں نے رقص کرتی لڑکیوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ ان میں احمد آباد میں را A W
R کے چیف مسٹر پانڈے کی بیٹی میناکشی نہیں تھی۔ میناکشی کا چہرہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔
کریم بھائی نے مجھے اس کی فوٹو دکھائی ہوئی تھی۔ چندریکا نے کہا تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔
مجھے وہاں رک کر میناکشی کا انتظار کرنا تھا۔ تھوڑی دیر گذری ہو گی کہ ایک دراز قد کی
خوبصورت شکل وصورت والی گندمی رنگ کی لڑکی بڑی خوبصورت ریشمی ساڑھی پہنے ہال
کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے ہارمونیم پر بیٹھے ہوئے بوڑھے کو نمسکار
کہہ کر اس کے گھٹنوں اور پاؤں کو چھوا۔ پھر ہمارے قریب آئی اور رینالینی دیوی کو نمسکار
کہہ کر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہی
تھی۔
"میڈم سوری! آج مجھے دیر ہو گئی۔ اصل میں میری اپنی گاڑی کی چابی کہیں گم

ہو گئی تھی۔ میں ڈیڈی کی گاڑی میں آئی ہوں"

یہ میناکشی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ میں میناکشی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دل میں کہہ رہا تھا

میناکشی دیوی! بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میرے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگایا کرو گی"

میناکشی نے میری طرف بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ وہ رینالینی سے باتیں کر رہی تھی۔ صوفے پر اس کے پاس بیٹھی تھی اور اپنے بالوں کو سر کے پیچھے باندھ رہی تھی۔ جیسے رقص کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ اچانک مجھے لوبان کی تیز خوشبو آئی۔ یہ خوشبو ہوائی مخلوق اور میری فرضی پتنی چندریکا کے لباس سے آیا کرتی تھی۔ میں نے یونہی دائیں طرف دیکھا تو چونک کر رہ گیا۔ چندریکا میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اس نے مجھے ہاتھ باندھ کر خاموشی سے نمسکار کیا اور پھر اپنی بند مٹھی میری واسکٹ کی جیب میں ڈال دی میناکشی بدستور رینالینی دیوی سے باتیں کر رہی تھی۔ لڑکیاں رقص میں مصروف تھیں کسی نے چندریکا کو نہیں دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ سوائے میرے اسے دوسرا کوئی نہیں دیکھ رہا۔ چندریکا کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ میناکشی آج رات ضرور آئے گی۔ دیکھ لو وہ آگئی ہے۔ اس کے بارے میں میں نے جو باتیں تمہیں بتائی ہیں انہیں یاد رکھنا۔ میری کسی بات کا آگے سے جواب نہ دینا کیونکہ یہاں سوائے تمہارے نہ تو کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ میری آواز ہی سن رہا ہے۔ میناکشی کی گاڑی کی چابی میں نے گم کی تھی۔ وہ میں نے تمہاری صدری کی جیب میں ڈال دی ہے۔ تم میناکشی کو یہ چابی دے کر اس پر اتنا اثر ضرور ڈال سکتے ہو کہ وہ اس کے بعد تمہاری ہر بات کو غور سے سنے۔"

میں چندریکا کی کسی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اگر میں بولتا تو وہ سب حیران ہو کر مجھے دیوانہ سمجھنے لگتے کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں۔

چندریکا کہنے لگی۔

"اب میں تمہاری نظروں سے بھی غائب ہو جاتی ہوں تاکہ تم پوری توجہ سے اپنے منصوبے پر عمل کر سکو۔ مگر میں یہاں موجود ہوں گی۔

پھر اس نے گہرا سانس بھرا۔ میری طرف جھکی۔ لوبان کی خوشبو تیز ہو گئی اور چندریکا نے اپنا رخسار میرے گال کے ساتھ لگا کر بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میرے سوامی! میرے پتی دیو! بہت جلد ہمارے جسموں کا بھی ملاپ ہونے والا ہے"

اس کم بخت ہوائی مخلوق کا جسم عام زندہ عورتوں کے جسم ایسا ہو چکا تھا۔ وہ میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میری انگلیاں دو تین چابیوں سے ٹکرائیں جو ایک چھلے میں پروئی ہوئی تھیں یہ میناکشی کی گاڑی کی چابیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ چندریکا نے بڑا اچھا ترپ کا پتا مجھے دے دیا تھا۔

رینالینی دیوی میناکشی سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے میناکشی سے میرا بڑے اچھے الفاظ میں تعارف کروایا میناکشی نے رسمی انداز میں میری طرف دیکھ کر نمسکار کیا۔ اس پر میری شخصیت کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ انڈیا میں علم موسیقی اور رقص اور ہندو دیوی دیوتاؤں اور چار ویدوں کے علم جاننے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے بعد میناکشی بھی رقص کرتی لڑکیوں میں شامل ہو گئی۔ اب لڑکیوں نے کتھک رقص کی بجائے بھارت ناٹیم رقص کے توڑے ناچنے شروع کر دیئے تھے۔ رینالینی دیوی میرے پاس بیٹھی اس رقص کی اور رقص سکھانے والے مہاراج کی تعریف کرتی جا رہی تھی۔ میں معمولی دلچسپی کے ساتھ لڑکیوں کو رقص کرتے دیکھ رہا تھا۔ میں اسی وقت کے انتظار میں تھا کہ کب رقص کی تعلیم ختم ہو اور میناکشی سے مجھے بات کرنے کا موقع ملے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد بریک ہو گئی لڑکیاں کمر کے گرد بندھے ہوئے ساڑھیوں کے پلو کھولتی، بالوں کو چہروں پر سے ہٹاتی ایک طرف جا کر بیٹھ گئیں۔ میناکشی رینالینی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اگرچہ ہال کمرے میں ہلکا ایئر کنڈیشنر لگا ہوا تھا مگر پھر بھی میناکشی کے چہرے پر رقص کرنے کی

ورزش سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اپنے پرس میں سے ٹشو پ نکال نکال کر چہرے کے پسینے کو ان میں جذب کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ رینالینی سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ اتنے میں نوکرانی لڑکی کولڈ ڈرنکس لے آئی۔ میں نے بھی ایک گلاس لے لیا۔

میناکشی صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور بڑے سکون سے کولڈ ڈرنکس گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔ رینالینی اٹھ کر دوسری لڑکیوں کے پاس چلی گئی اور انہیں ہاتھوں سے نرت کر کے بھارت ناٹیم رقص کے بارے میں ضروری باتیں بتانے لگی۔ مجھے میناکشی سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ میں اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ میناکشی میری طرف بالکل متوجہ نہیں تھی۔ میں اس کے لئے غیر دلچسپ قسم کا ایک اجنبی آدمی تھا۔ وہ کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے رینالینی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے انگریزی میں میناکشی سے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"تم بہت جلد ڈانس میں بڑا نام پیدا کرو گی"

میناکشی میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور تھینک یو کہہ کر دوبارہ دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ یہی سمجھی کہ میں بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح اس کی خوشامد کر رہا ہوں۔ میں نے صوفے پر ذرا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے رازداری کے انداز میں کہا۔

"میڈم! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تم نے اپنی گاڑی کی چابیاں کہاں رکھی تھیں؟"

میناکشی نے تعجب کے انداز میں میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں میری گاڑی کی چابیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس نے رسمی طور پر کہا۔

"نہیں کہیں رکھ دی ہوں گی"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہندو دیوتاؤں کے انداز میں آہستہ سے انگریزی میں کہا۔

"مگر مجھے معلوم ہے کہ تم نے گاڑی کی چابیاں کہاں رکھی تھیں۔ اور میں وہاں

سے تمہاری چابیاں اٹھا کر لے آیا ہوں"

میناکشی خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں جو اس کے لئے ایک اجنبی آدمی ہوں اس کی گاڑی کی چابیوں کا بار بار کیوں ذکر کر رہا ہوں۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور چابیاں نکال کر اس کے پاس صوفے پر رکھ دیں اور کہا۔

"یہی تمہاری گاڑی کی چابیاں ہیں نا؟"

میناکشی نے چابیوں کے گچھے کو دیکھا اور تھوڑا سا چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں میرے لئے حیرت احترام اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میں نے کونے میں بیٹھی ہوئی سٹوڈنٹ لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بے نیازی مگر بڑے باوقار انداز میں میناکشی سے انگریزی میں کہا۔

"یہ کرشمہ میں نے تمہیں اس لئے دکھایا ہے کہ میں دیوتاؤں کا اشارہ پا کر یہاں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ تم پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مجھے دیوتاؤں نے تمہاری رکھشا کے لئے تمہارے پاس بھیجا ہے یہ کرشمہ دکھانا بڑا ضروری تھا۔ میرے پاس اور بھی کچھ طاقتیں ہیں۔ مگر انہیں وقت آنے پر ظاہر کروں گا۔ دیوتاؤں نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم ایک روز ہندوستان کی بہت بڑی ڈانسر بنو گی سارے پرانتوں میں تمہاری شہرت ہو گی' تمہارے چرچے ہوں گے۔

میناکشی پر میرے کرشمے یا شعبدہ بازی کا اثر ضرور ہوا تھا مگر اتنا اثر نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ بھی مجھے ہندوستان کے ان سادھوؤں کی طرح سمجھ رہی تھی جو اپنی چھوٹی موٹی روحانی طاقت کا اظہار گم شدہ چیزوں کو سامنے لا کر کرتے ہیں۔ واقعی اس قسم کی بازی گری اور شعبدہ بازی انڈیا کے سادھوؤں کے ایک طبقے میں عام پائی جاتی تھی۔ مگر میرے پاس ابھی ٹرمپ کے کچھ اور پتے بھی تھے۔ میں نے میناکشی کی طرف متوجہ ہو کر دھیمی آواز میں کہا۔

"شاید تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آیا۔ شاید تم بھی مجھے بھارت ورش کے

عام جوگی سادھوؤں کی طرح سمجھتی ہو۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے جنگلوں میں شیو دیوتا کی بڑی تپسیا کی ہے۔ یہ اسی تپسیا کا نتیجہ ہے کہ میں نے شیو دیوتا کا قرب اور آشیرباد حاصل کر لیا ہے۔ مجھے چونکہ سنسار کا کوئی لالچ نہیں۔ کوئی لوبھ نہیں اس لئے شیو دیوتا نے مجھے اپنا دوست بنا لیا اور مجھے یہ خوش خبری دے کر تمہارے پاس بھیجا جو میں نے تمہیں سنا دی ہے۔"

میناکشی نے انگریزی میں تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیوتا شیوجی نے میرے بارے میں تمہیں کیا بتایا ہے؟"

اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھے ایسا نوجوان سمجھ رہی ہے جو اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے جھوٹی موٹی روحانی طاقت حاصل کر کے اس کے پاس آگیا اور اب اس پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے اپنے چہرے پر جلال کے تاثرات پیدا کر لئے میناکشی کی آنکھوں میں آنکھ ڈال دیں اور بڑے ڈرامائی لہجے میں مگر دھیمی آواز میں کہا۔

"اگر تم یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ شیو جی دیوتا نے مجھے تمہارے بارے میں اور کیا کچھ بتایا ہے تو سنو۔ تم نے ساڑھی کے پیٹی کوٹ کے نیچے آج سرخ رنگ کا جانگیہ پہنا ہوا ہے۔ سنو! پچھلے کچھ دنوں سے تمہاری ناف کے نیچے ایک پھوڑے کا چھوٹا سا ابھار بن رہا ہے جس کے متعلق تم نے ابھی تک اپنی لیڈی ڈاکٹر سے بھی بات نہیں کی اور سنو"

میناکشی کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیا اور ادھر ادھر دیکھ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"پلیز! یہاں یہ باتیں نہ کریں۔ پلیز دوسرے کمرے میں آجائیں۔"

وہ مجھے ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ یہ ایک مختصر سا مگر خوبصورت سا سجا کمرہ تھا۔ درمیان میں گول میز کے گرد کرسیاں لگی تھیں اس نے دروازہ بند کیا اور مے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

"پلیز! بیٹھ جائیں"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک بات آپ کو بھی بتا دوں کہ ہندو عورت خواہ کتنی پڑھ لکھ جائے۔ خواہ وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرے مگر وہ اندر سے بے حد توہم پرست اور جادو ٹونے جوتش اور اسی قسم کی دوسری ضعیف الاعتقادی کی پرستار عورت ہوگی۔ یہ توہم پرستی ہندو عورت کے خون کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے احمد آباد کے فائیو سٹار ہوٹلوں، کلبوں اور گلی کوچوں میں بڑی بڑی پروفیسر ٹائپ کی ہندو جینی عورتوں کو جین مت کے الف ننگے جوگیوں کے سامنے بیٹھ کر ان کے منہ میں لڈو اور دہی ڈالتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے تو میناکشی کو ایسا شعبدہ دکھایا تھا کہ شاید کوئی دوسرا جوگی یا سادھو ایسا شعبدہ نہ دکھا سکتا۔

وہ میری طرف عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"گورو جی! آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ میں نے آج لال رنگ کا انڈر ویئر پہنا ہوا ہے اور میری ناف کے نیچے دو تین ہفتوں سے ایک پھوڑے کا ابھار سا نکل آیا ہے۔ میں شرم کے مارے کسی کو نہیں بتاتی۔ آپ واقعی دیوتا شیوجی کے بھگت ہیں۔ پلیز مجھے کچھ اور بھی بتایئے میری ناف کے نیچے جو پھوڑا بن رہا ہے اس کا دیوتا شیو جی سے پوچھ کر کوئی علاج بتایئے۔ اب تو ڈانس کرتے ہوئے مجھے یہاں درد بھی ہونے لگا ہے۔ آپ ذرا دیکھیں"

میناکشی نے کسی قسم کی شرم حیا محسوس کئے بغیر ساڑھی کا پلو پرے ہٹایا اور پیٹ پر ساڑھی کو ناف سے بھی نیچے تک کھینچ کر لے گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ناف سے کافی نیچے بائیں جانب ایک سرخی مائل ابھار سا بنا ہوا تھا۔ اس وقت میں ہوائی مخلوق چندریکا کی ہوائی طاقت کا مزید قائل ہو گیا۔ میں نے انگلی سے سرخ ابھار کو چھوا تو میناکشی کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی جیسے اسے درد محسوس ہوا ہو۔ میں نے کہا۔

"ساڑھی اوپر کر لو"

اس نے جلدی سے ساڑھی اوپر کر لی اور عاجزانہ انداز میں کہنے لگی۔

"پلیز اس کا کوئی علاج کر دیں۔ یہ پھوڑا بن گیا تو میں کیا کروں گی۔ میں تو شرم کے مارے جیتے جی مرجاؤں گی"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں دیوتا شیو جی سے باتیں کروں گا۔ وہ ضرور تمہاری بیماری کا کوئی علاج بتا دیں گے۔"

میناکشی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

"اگر میں بیمار ہو گئی تو میں بھارت کی مشہور ڈانسر کیسے بن سکوں گی۔ شیو جی مہاراج کو میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ وہ مجھ پر کرپا کر دیں اور مجھے ٹھیک کر دیں"

میں نے میناکشی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے جسم سے انتہائی اعلیٰ قسم کے پرفیوم کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا مزید اعتماد حاصل کرنے کے لئے اسے اپنے ساتھ لگانا بہت ضروری تھا۔ یا آپ یہ سمجھ لیں کہ مجھے اس وقت کسی نفسانی خواہش نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ بہرحال میں بھی جوان تھا۔ اگرچہ میرا کردار ایک زبردست تربیت یافتہ مسلمان کمانڈو کی حیثیت سے اب تک بے داغ رہا تھا اور مجھے اسے بے داغ ہی رکھنا تھا لیکن میں جھوٹ بھی نہیں بولوں گا۔ اس وقت میناکشی کو اپنے ساتھ لگانے کی زبردست خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی اور میں ایک لمحے کے لئے بے بس ہو گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"دیوتا شیو جی مہاراج کو میں تمہاری پرارتھنا پہنچا دوں گا۔ اور ان سے تمہاری بیماری کا کوئی علاج کوئی اپائے بھی ضرور پوچھ لوں گا۔ تم بے فکر رہو۔"

ابھی تک میں نے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے الگ کرنا چاہا تو وہ خود مجھ سے لپٹ گئی اور میرے سینے پر سر رکھ کر بولی۔

"میرے گورو دیو! مہاراج! مجھے اپنے سے الگ نہ کرنا میں جیون بھر تمہاری

سیوا کروں گی۔ تم جو کہو گے کروں گی"

میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ کیونکہ معاملہ حد سے آگے بڑھنے لگا تھا۔ اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور کہا۔

"میناکشی! تمہاری سب پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ شیو جی مہاراج تمہاری رکھشا کریں گے"

اب وہ اور میں دونوں ہندی میں بولنے لگے تھے۔ مجھے اچانک یاد آگیا کہ چندریکا نے میناکشی پر اپنا اثر قائم کرنے کے لئے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ جس رات تم اسے ملنے جاؤ گے اس سے پہلی رات کو میں اس کے خواب میں آؤں گی اور یہ بات کہوں گی۔ مجھے چندریکا کی وہ بات بھی یاد آگئی۔ دوسرے روز اس بات کو ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے میناکشی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔

"اور ہاں میں ایک بات تمہیں کہنی بھول گیا تھا یہ بتاؤ کہ کل رات تمہارے خواب میں درگا ماتا آئی تھیں؟"

میناکشی کے حلق سے مارے حیرت کے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بے اختیار ہو کر بولی۔

"میرے گورو دیو! تم تو انتریامی ہو۔ تم کو تو میرے اندر باہر کا میرے سوتے جاگتے کا سارا حال معلوم ہے"

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور پریشان ہو کر کہنے لگی۔

"ہاں ہاں۔ درگا میا رات میرے خواب میں آئی تھی۔ اس نے ایک ایسی بات مجھے کہہ دی ہے کہ جس سے میں ساری رات پریشان رہی ہوں۔ اور اسی پریشانی میں سارا دن گھر میں بیٹھی رہی۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"درگا ماتا نے یہی کہا تھا ناں کہ میناکشی تمہارا اگلا جنم لومڑی کے روپ میں ہو گا"

فرط عقیدت سے میناکشی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

بولی۔

"ہاں۔ درگا میا نے یہی کہا تھا گوروجی! یہ ماتا نے کیوں کہا۔ بھگوان کے واسطے شیو جی سے کہیں کہ میرا اگلا جنم لومڑی کے روپ میں نہ ہو۔ میں ساری عمر آپ کی ابھاگی رہوں گی۔"

میرا یہ تیر بھی ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

"شانت رہو میناکشی! تمہارا اگلا جنم لومڑی کے روپ میں نہیں ہوگا۔ میں شیوجی مہاراج سے کہہ کر تمہارے سارے پاپ دھلوا دوں گا"

میناکشی کرسی سے نیچے اتر کر میرے پاؤں پر گر پڑی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اوپر اٹھا کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ وہ میرے ہاتھوں کو بار بار چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اب میری نظر سامنے والی دیوار کی طرف گئی تو میں نے دیکھا کہ وہاں دیوار میں ایک شیلف بنا ہوا تھا جس میں ہر قسم کی شراب کی بوتلیں اور شیشے کے قسم قسم کے گلاس پڑے تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا کاؤنٹر بھی بنا ہوا تھا۔ سارا اب ڈانس سنٹر کی ریتالینی دیوی نے اونچے طبقے کے عیاش اور مالدار بوڑھوں کی عیاشوں کا سا انتظام وہاں کر رکھا تھا۔ ویسے بھارت میں شراب عام تھی اور اونچی سوسائٹی کے تقریباً گھر میں ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ میناکشی جلدی سے مجھ سے الگ ہو کر اپنی ساڑھی' بلاؤز اور بال ٹھیک کرنے لگی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

اس نے انگریزی میں پوچھا۔ "کون؟"

دوسری طرف سے ریتالینی کی آواز آئی۔

"کیا سوامی جی مہاراج اندر ہیں؟"

ابھی ریتالینی دیوی نے میرا کوئی شعبدہ نہیں دیکھا تھا لیکن وہ میری باتوں سے ہی حد متاثر ہو گئی تھی۔ میناکشی نے کہا۔

"آجائیں اندر میڈم۔ سوامی مہاراج اندر ہی ہیں۔"

اس وقت میناکشی نے میرے آگے اپنا ہاتھ کھول دیا تھا ریتالینی مسکراتی ہوئی ہمارے قریب آگئی۔ میناکشی نے کہا۔

"میں سوامی جی کو اپنے ہاتھ کی ریکھائیں دکھا رہی تھی۔"

ریتالینی دیوی بھی کرسی کھینچ کر میرے قریب آگئی اور اپنی ہتھیلی کھول کر میرے آگے کرتی ہوئی بولی۔

"پلیز سوامی مہاراج! میرا ہاتھ بھی دیکھیں"

مجھے خاک بھی ہاتھ کی ریکھائیں دیکھنی نہیں آتی تھیں۔ اس وقت چندریکا بھی میرے پاس نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے اس کے جسم اور لباس سے اٹھنے والی لوبان کی خوشبو نہیں آرہی تھی۔ میں نے ریتالینی کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"میڈم! تمہارا ہاتھ پھر کبھی دیکھیں گے"

ریتالینی نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے میناکشی سے کہا۔

"میناکشی تمہارا دوست آیا ہوا ہے"

پھر ہنس پڑی۔ میناکشی نے پوچھا۔

"وہ چندر کانت؟"

میں چوکنا ہو گیا۔ یہ وہی چندر کانت تھا جس کے بارے میں چندریکا نے مجھے بتایا تھا کہ میناکشی اس سے نفرت کرتی ہے مگر یونہی اسے بے وقوف بنانے کے لئے اس کے ساتھ پیار کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ریتالینی دیوی ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔ میناکشی کے چہرے پر چندر کانت کا نام سن کر ناگواری کے جو تاثرات ابھرے تھے وہ ابھی تک برقرار تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میناکشی! اگر تم چندر کانت سے نفرت کرتی ہو تو پھر اس کے ساتھ جھوٹی محبت کا اظہار کیوں کرتی ہو؟"

میناکشی آخر فیشن ایبل ماڈرن طبقے کی لڑکی تھی اور اس میں اونچی سوسائٹی کی تقریباً سبھی خامیاں موجود تھیں۔ مجھ سے بھی اصل حقیقت چھپانے لگی۔ بولی

"نہیں سوامی جی! میں اس سے نفرت نہیں کرتی۔ بس وہ مجھے پسند نہیں ہے"
میں نے اس کا ایک اور خفیہ راز طشت ازبام کرتے ہوئے کہا۔
"اگر تم اس سے نفرت نہیں کرتی ہو تم پھر تم نے اپنی جو ایک خفیہ ڈائری بنا رکھی ہے اس میں یہ کیوں لکھا تھا کہ میں چندر کانت سے نفرت کرتی ہوں اور اس کے ساتھ پریم کا ڈرامہ کر رہی ہوں"

میناکشی پر حیرت کا ایک اور حملہ ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے میرا منہ تکتی رہ گئی۔ میں مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے اپنی خفیہ ڈائری کا نام پریم گرنتھ رکھا ہوا ہے"

آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ جس انسان کے اتنے خفیہ راز میں کھول کر اس کے آگے بیان کر دوں گا تو کیا وہ میرا مطیع اور میرا مرید نہیں ہو جائے گا؟ میناکشی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک بار پھر میرے قدموں پر گر پڑی۔ میں اسے اٹھانے لگا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور کہا۔

"چلو دوسرے کمرے میں چلو۔ لوگ کیا کہیں گے"

میناکشی نے انگریزی میں کہا۔

"میں لوگوں کی کیا پروا کرتی ہوں۔ میرے سوامی جی۔ میرے گورو دیو میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس سے زیادہ میرے لئے خوشی کی اور کیا بات ہو گی۔"

مگر میں اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے یعنی ہال کمرے میں لے آیا۔ وہاں لڑکیاں رقص کے توڑوں پر پاؤں تھرکا رہی تھیں۔ صوفے پر رینالنی کے ساتھ ایک موٹی توند والا نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر پیٹ زیادہ عمر کے آدمیوں کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ میناکشی نے آہستہ سے کہا۔

"یہی کم بخت چندر کانت ہے"

میں رینالینی کے پاس جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے چندر کانت کے ساتھ بھی میرا

بڑے زبردست الفاظ میں تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ میں جین مت کا بہت بڑا ودوان ہوں اور سوامی مہاویر وردھنا کا بھگت ہوں اور امریکہ میں پھر سات سال پڑھتا رہا ہوں۔ میرے امریکہ میں چھ سات برس تک پڑھنے والی بات نے چندر کانت کو زیادہ متاثر کیا۔ وہ مجھ سے امریکہ کے بارے میں باتیں پوچھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پہلی فلائٹ میں امریکہ جا کر کسی کالج میں داخل ہو جانا چاہتا ہے مگر اسے ویزا نہیں مل رہا تھا۔ پھر اس نے میناکشی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"مینا جی! میں تو آدھے گھنٹے سے تمہارے انتظار میں یہاں بیٹھا ہوں۔ تم سوامی جی کو اندر ہاتھ دکھا رہی تھیں"

میناکشی نے تنک کر کہا۔

"تو میں کیا کروں پھر مجھے بتا کر آئے تھے؟"

چندر کانت خاموش ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اسے اس بات کا تعجب ہو رہا ہے کہ آج اچانک میناکشی اتنی بے رخی کیوں دکھا رہی ہے۔ کچھ دیر دیوی رینالینی کے پاس بیٹھے رہنے کے بعد میں جانے لگا تو میناکشی بھی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی۔

"سوامی جی! میں آپ کو آپ کے ہوٹل ڈراپ کر دوں گی۔"

میں اس کے ساتھ سارا بائی ڈانس سنٹر سے باہر آ گیا۔ باہر اس کی قیمتی گاڑی ایک طرف کھڑی تھی۔ یہ گاڑی اس کے باپ اور RAW را کے چیف اور میرے ٹارگٹ جی ڈی پانڈے کی تھی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میناکشی مجھے چھوڑنے میرے ہوٹل تک آئے۔ کیونکہ میں نے اپنے کمانڈو سپائینگ مشن کا پہلا مرحلہ پورا کر لیا تھا اور اب مجھے اپنے اصل ٹارگٹ یعنی میناکشی کے باپ تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ اس کا بھرپور اعتماد حاصل کرنا تھا۔ اور اس کے لئے میناکشی سے بات کرنی اور اسے استعمال میں لانا بہت ضروری تھا۔

میناکشی میری زبردست مطیع ہو چکی تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ اطاعت گذاری اور عقیدت کا یہی جذبہ اس کے باپ جی ڈی پانڈے کے اندر بھی بیدار کروں اور اس کے بعد

RAW کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کی سیکریٹ ملٹری سروس کی فائلوں کے خفیہ راز اپنے قبضے میں کرنا شروع کر دوں۔

یہی میرا اصل مشن تھا۔

گاڑی میناکشی خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ شہر کی کشادہ سڑکوں پر خوب روشنی ہو رہی تھی۔ دور نزدیک شہر کی اونچی نیچی عمارتوں میں بھی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میناکشی اگر اپنے باپ سے میرا تعارف ایک پہنچے ہوئے جینی بھگت کے روپ میں کرواتی ہے تو اس کا اس کے باپ پر اتنا اثر نہیں پڑ سکتا تھا جتنا اثر اس طرح پڑتا کہ اگر مجھے میناکشی کے باپ کی بھی دو ایک خفیہ باتیں معلوم ہوتیں۔ اس بارے میں صرف چندریکا ہی میری مدد کر سکتی تھی۔ گاڑی ٹرائیڈنٹ ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئی تو میناکشی نے کہا۔

"سوامی جی! تم میرے ساتھ میرے بنگلے پر کیوں نہیں چلتے۔ کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ میں تمہیں اپنے پتا جی سے ملاؤں گی۔ وہ بھی بڑے جینی بھگت ہیں"

میں نے کہا "میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا میناکشی! تمہارے پاس تو میں خود چل کر آیا تھا۔ اور صرف اس لئے کہ شیو جی نے مجھے خواب میں تمہاری شکل دکھا دی تھی اور تمہارے بارے میں ساری راز کی باتیں بتا دی تھیں اور تمہاری مشکل خواب میں دیکھ کر ہی تم مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ تمہارے ساتھ تو پریم محبت والا معاملہ ہے۔ تمہارے پتا جی سے مل کر میں کیا کروں گا۔ تم گھر جاؤ"

میناکشی گاڑی میں سے میرے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔ کہنے لگی۔

"سوامی جی! میں تمہارے کمرے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی"

خفیہ ٹرانسمیٹر، خطرناک سگنل

میناکشی میرے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں آ گئی۔

میں اسے اپنے کمرے میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ میں نے اس کو اپنا جتنا مطیع اور مریدنی بنانا تھا بنا لیا تھا۔ اس کا مورچہ میں نے فتح کر لیا تھا۔ اب مجھے اصل مورچے کو فتح کرنا تھا۔ کمرے میں آ کر وہ صوفے پر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ جو کچھ مجھ سے چاہتی تھی مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ مگر میں وہ کچھ نہیں چاہتا تھا۔ میں جو اس سے چاہتا تھا وہ اسے معلوم نہیں تھا۔ میں نے ہوٹل سروس کو فون کر کے کافی منگوا لی۔ ہم کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میناکشی مجھ سے اپنی زندگی کے آنے والے حالات کے بارے میں ہر قسم کے سوال پوچھ رہی تھی جن کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو اس کی زندگی کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم تھا جتنا مجھے ہوائی مخلوق چندریکا نے بتایا تھا۔ میں نے تنگ آ کر اسے کہا۔

"میناکشی! تم اپنی جیون ریکھا کے بارے میں جو کچھ مجھ سے پوچھ رہی ہو مجھے وہ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے مجھ سے ہر قسم کے سوال مت پوچھو۔ ہاں اتنا ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ جتنی مجھے اجازت ملتی رہے گی اتنا اتنا میں تمہیں بتاتا رہوں گا۔"

وہ بولی۔

"مگر سوامی جی آپ تو واپس دلی چلے جائیں گے۔ پھر میں کیا کروں گی۔ میرا یہاں کون ہو گا جو مجھے ساری باتیں بتائے گا"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ابھی مجھے احمد آباد میں کافی دن ٹھہرنا ہے۔ کئی مندروں کی یاترا کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے مہاویر جی کا چلہ بھی کاٹنا پڑے جس میں کم از کم چھ سات مہینے لگ جائیں گے"

میں نے احمد آباد میں اپنے طویل قیام کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی تھی وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔ پھر اچانک اس نے اپنی ساڑھی پیٹ پر سے نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"سوامی جی! پلیز شیو بھگوان کی کوئی منتر پڑھ کر میرے پھوڑے والے ابھار پر پھونک دیں۔ میں اچھی ہو جاؤں گی"

میں نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میناکشی پلیز! ساڑھی اوپر کر لو سروس بوائے آگیا تو وہ کیا سوچے گا۔ میں شیو بھگوان سے تمہارے روگ کا علاج ضرور پوچھوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں"

میناکشی نے ساڑھی اوپر کرلی۔ اس کے بعد ضد کرنے لگی کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر جاؤں اور کھانا اس کے ساتھ کھاؤں۔

"میں تمہیں پتا جی سے بھی ملاؤں گی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ وہ خود جین دھرم کے بڑے ودوان ہیں۔ تم سے مل کر بڑے خوش ہوں گے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا کہ بھولی لڑکی میرا اصل ٹارگٹ تو تمہارا باپ ہی ہے۔ تمہارے باپ کو میں اسی طرح نہیں ملوں گا۔ میں نے میناکشی سے کہا۔

"آج نہیں۔ پھر کسی روز تمہارے گھر ضرور جاؤں گا۔ تمہارے پتا جی سے بھی ملوں گا تم مجھے اپنے گھر کا فون نمبر دے دو"

میناکشی نے پرس میں سے چھوٹی سی ڈائری نکال کر اس کے ورق پر کوئی ٹیلی فون لکھا۔ ورق پھاڑ کر مجھے دیا اور کہا۔

"یہ میرے بیڈ روم میں لگے ہوئے ٹیلی فون کا خاص نمبر ہے۔ اگر میں نہ بھی ہوں تو آپ جو پیغام دیں گے وہ ریکارڈ ہو جائے گا اور مجھے مل جائے گا۔ آپ کے کمرے کا نمبر میں نے لکھ لیا ہے۔ میں اب چلتی ہوں کل فون کروں گی"

انگریزی میں بات کرتے وقت تو آپ جناب کے الفاظ نہیں آتے۔ مگر میناکشی جب ہندی میں مجھ سے بات کرتی تو کبھی مجھے آپ کہہ کر اور کبھی تم کہہ کر مخاطب کرتی یہ بات اس کے دل کی جذباتی کیفیات کی عکاسی کرتی تھی۔ وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اسے چھوڑنے دروازے تک آیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے وہ میرے قدموں میں جھک گئی۔ میرے پاؤں چھوئے پھر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر چومے، سینے سے لگائے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میں نے دروازہ بند کر کے گہرا سانس لیا اور صوفے پر آکر اپنے آپ کو گرا دیا۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سروس کو فون کر کے کہا کہ ایک ویجی ٹیرین کھانا اوپر بھجوا دو۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے کافی پی اور گھڑی پر وقت دیکھا رات کے نو بج رہے تھے۔

میں نے اسی وقت فون سروس کو کال کر کے کہا کہ مجھے ٹیلی فون کی ڈائریکٹ لائن دی جائے۔ فون سروس والوں نے مجھے ایک نمبر بتایا کہ یہ نمبر دو بار گھمائیں۔ ٹیلی فون ڈائریکٹ ہو جائے گا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ فون کی لائن ڈائریکٹ ہو گئی۔ میں نے کریم بھائی کا خفیہ نمبر ڈائل کیا۔ دو بار گھنٹی بجی پھر کریم بھائی نے فون اٹھا کر کہا ہیلو۔ میں نے کوڈ الفاظ میں اپنا نام بتایا اور اپنی مہم کے بارے میں اسے خوش خبری سنائی کہ میں نے پہلا مورچہ فتح کر لیا ہے۔ اب اصل ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ کریم بھائی نے غیر جذباتی آواز میں بڑے سکون کے ساتھ کوڈ الفاظ میں ہی جواب دیا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور بار بار فون نہ کروں۔ فون صرف اشد ضرورت کے وقت کروں۔ کریم بھائی نے فون بند کر دیا ہم کوڈ الفاظ میں بات کر رہے تھے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی ہمارا فون سن بھی لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ ہم احمد آباد میں چل رہی ہندوستانی فلموں کے بارے میں

بات کر رہے ہیں۔ پھر بھی کریم بھائی نے مجھے زیادہ سے زیادہ محتاط رہنے اور کم سے کم فون
پر بات کرنے کی ہدایت کی تھی اور میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
میں اس کے بعد اپنے کمرے میں ہی رہا۔ میرے پاس ہوٹل میں مزید ایک روز قیام
کرنے کے پیسے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل کریم بھائی سے کسی وقت ملاقات کر کے
اس سے مزید کچھ رقم لوں گا کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ را سیکریٹ ایجنسی کے چیف
تک مکمل طور پر رسائی حاصل کرنے میں ابھی مزید چار چھ دن لگ جائیں گے اور مجھے
ہوٹل میں ہی اتنے دن ٹھہرنا پڑے گا۔ رات کے گیارہ بجے تک میں اپنے بستر پر لیٹا
انگریزی اخبار کا مطالعہ کرتا رہا۔ اصل میں مجھے ہوائی مخلوق چندریکا کا انتظار تھا۔ میں اس
سے را کے چیف مسٹر پانڈے کی زندگی کے کچھ خفیہ راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ رات کے
بارہ بج گئے مگر چندریکا نہ آئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میناکشی کے ساتھ میرا بے تکلف ہو
اچھا نہیں لگا۔ اسی لئے وہ نہیں آ رہی تھی۔ ضرور وہ مجھ سے ناراض ہے۔ میں پریشان
ہونے لگا۔ کیونکہ چندریکا سے ملاقات بڑی ضروری تھی۔ مسٹر پانڈے پر اپنا اعتماد جمانے
کے لئے اس کی زندگی کے دو ایک خفیہ راز معلوم کرنے بہت ضروری تھے۔ اس کے بغیر
میں ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں نے دو ایک بار کمرے کی فضا سونگھنے کی
کوشش کی مگر چندریکا کے جسم سے اٹھنے والی لوبان کی خوشبو کا دور دور تک نشان نہیں مل
رہا تھا۔

میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔

میں بستر سے اٹھ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میز پر رکھی شیشے کی صراحی میں سے پانی
نکال کر پیا۔ کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ ہی جل رہا تھا جس کی روشنی بڑی خواب ال
تھی میں نے ذرا اونچی آواز میں چندریکا کو مخاطب کر کے کہا۔

"چندریکا! اگر تمہیں میرا میناکشی کے ساتھ بے تکلف ہونا برا لگا ہے تو مجھے
معاف کر دو۔ تم خود بھی میرے دل کا حال جانتی ہو۔ آخر میں جوان آدمی ہوں
کسی کمزور جذباتی لمحے کی گرفت میں آ کر میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا تو

اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس سے پریم کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اپنی پتنی
کہا ہے تو اب اس وعدے کو نبھاؤں گا۔ تم جیون بھر میری پتنی ہی رہو گی۔"
ابھی میں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ کمرے میں لوبان کی خوشبو پھیل گئی۔
چندریکا آ گئی تھی۔ خوشی سے میرا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر اچانک میں نے دیکھا کہ چندریکا میرے
سامنے والے صوفے پر بیٹھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ میں نے کہا۔

"چندریکا! تم نے بہت اچھا کیا کہ آ گئیں میں تو تمہارے بغیر سخت پریشان ہو رہا
تھا"

چندریکا کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"اس لئے کہ تم کو ابھی مجھ سے غرض ہے۔ مجھ سے مطلب ہے جب تمہارا
مطلب نکل جائے گا تو تم مجھے چھوڑ دو گے۔ لیکن میں تمہیں اس وقت تک
نہیں چھوڑوں گی جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے گا کہ تم میرے پرکھوں کی
جنم بھومی پر تباہی لانے کی کوشش میں لگے ہو۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی
میں تمہیں اپنا پتی ہی سمجھتی ہوں۔ تم سے پریم کرتی ہوں اور یہی پریم مجھے بار
بار کھینچ کر تمہارے پاس لے آتا ہے۔"

میں نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"تمہارا شکریہ۔ اچھا اب میری پرابلم یہ ہے کہ"

چندریکا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں تمہاری پرابلم کیا ہے۔ تم میناکشی کے باپ مسٹر پانڈے کی
زندگی کے کچھ خفیہ راز معلوم کرنا چاہتے ہو"

میں نے مزید کھسیانا سا ہو کر کہا۔

"ہاں ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ پلیز! مجھے اس شخص کی زندگی کے ایک دو ایسے
راز بتا دو کہ جب میں انہیں ظاہر کروں تو جی ڈی پانڈے میرے پاؤں پر گر
پڑے"

چندریکا کا چہرہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟ میں تمہاری مدد صرف اس لئے کر رہی ہوں کہ تم پچھلے جنم میں میرے خاوند رہ چکے ہو اور اس جنم میں بھی میرے پتی ہو۔ اس کا خود تم اقرار کر چکے ہو"

میں نے کہا۔

"بالکل میں اقرار کر چکا ہوں"

چندریکا نے کہا۔

"اور تم نے مجھے وچن دیا ہے کہ تم بیوی ہونے کی حیثیت سے میری ایک خواہش ضرور پوری کرو گے"

میں اس وقت اپنے ٹارگٹ پر اٹیک کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ ٹارگٹ میرے سامنے تھا اور اس کے راستے کا پہلا قلعہ میں نے فتح کر لیا تھا۔ مجھے چندریکا کی کیا پرو تھی۔ اگر میں اس سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کرتا اور وہ مجھ سے ناراض ہو کر ہمیشہ کے لئے چلی جاتی ہے تو میرے لئے سو بار جائے۔ مجھے صرف ابتداء میں اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ میرا مشن ہی ایسا تھا مجھے مینا کشی پر پاؤں رکھ کر را RAW کے چیف تک پہنچنا تھا۔ میں نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

"چندریکا! مجھے اپنا وچن اپنا وعدہ یاد ہے تمہاری جو بھی خواہش ہو گی میں ضرور پوری کروں گا۔ مگر مجھے را کے چیف جی ڈی پانڈے کی کوئی ایسی کمزوری کوئی ایسی مشکل ضرور بتاؤ جس میں وہ پھنسا ہوا ہو اور جس کو حل کر کے میں اس کا اعتماد حاصل کر لوں۔"

چندریکا بولی

"تو سنو! احمد آباد میں را کا چیف اور مینا کشی کا باپ مسٹر جی ڈی پانڈے شوگر کا مریض ہے۔ اس کے گردوں میں پتھری بھی ہے۔ کبھی کبھی اسے گردے کی درد کا شدید دورہ پڑتا ہے جس روز تمہیں مینا کشی اپنے ساتھ گھر لے جائے گی اسی روز تمہاری موجودگی میں اسے گردے کا دورہ پڑے گا۔ تم اس کے پیٹ پر درد والی جگہ پر ہاتھ لگا دینا۔ وہ اسی وقت اچھا ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسٹر پانڈے کے ترقی کی فائل دلی سیکریٹریٹ گئی ہوئی ہے۔ وہاں وہ دو سال سے پڑی ہے۔ اس پر وزیراعظم اندرا گاندھی کے دستخط ہونے باقی ہیں۔ اگر اندرا گاندھی کے دستخط ہو جائیں تو مسٹر پانڈے کو ترقی مل جائے گی اور اس کا مستقبل منور ہو جائے گا۔ تم اسے کوئی بھی تاریخ دے دینا اور کہہ دینا کہ فلاں تاریخ کو تمہاری فائل اندرا گاندھی کے دستخطوں کے ساتھ واپس آجائے گی اور تمہیں ترقی مل جائے گی۔ میں تمہارے لئے یہ کام خود دلی جا کر اندرا گاندھی کے دل میں دستخط کرنے کا خیال ڈال کر فائل پر دستخط کروا لوں گی۔ بس اس کے سوا میں تمہارے لئے مسٹر پانڈے کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا۔

"تمہارا شکریہ چندریکا! میرے لئے یہی بہت ہے۔ آگے میں خود سنبھال لوں گا"

چندریکا صوفے پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا وہ میرے قریب آگئی۔ لوبان کی خوشبو تیز ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ پھر الٹے قدم پیچھے ہٹتے ہٹتے بند دروازے کے پاس جا کر میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

میں بڑا خوش تھا۔ میری بے چینی دور ہو گئی تھی۔ چندریکا نے را کے چیف کو قابو میں لانے کے لئے میرے ہاتھ میں ترپ کے دو پتے دے دیئے تھے۔ اس کے بعد میں اطمینان سے سو گیا دوسرے روز دن کے دس بجے کے قریب میں نے کریم بھائی کو خفیہ نمبر پر فون کیا اور کہا کہ آپ سے ملاقات بہت ضروری ہے۔ اس نے کہا۔

"ایک گھنٹے بعد ویران کوارٹر میں آجانا"

اور اس نے فون بند کر دیا۔

میں ایک گھنٹے بعد شہر سے باہر ریلوے لائن کے قریب جو ہمارا خفیہ کوارٹر تھا اور جس کے تہہ خانے میں میری کمانڈو جاسوسی کا سارا سامان پڑا تھا وہاں پہنچ گیا۔ کریم بھائی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اسے چندریکا سے اپنی رات والی ملاقات کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ میناکشی سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کی پوری تفصیل سنا دی اور کہا۔

"میناکشی کے ذریعے اب میں را کے چیف سے ملنے والا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں اس شخص کو اپنا مرید بنانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا"

کریم بھائی نے پوچھا۔

"اس وقت تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے شاید ٹرائیڈنٹ ہوٹل میں مزید کچھ روز قیام کرنا پڑ جائے۔ میرے پاس اس وقت تمہاری دی ہوئی رقم میں سے ہوٹل کے صرف ایک دن کا کرایہ باقی ہے۔ مجھے کچھ اور رقم کی ضرورت ہے۔"

کریم بھائی بولا

"مزید رقم تمہیں تمہارے ہوٹل میں پہنچ جائے گی۔ تم شام کو چار اور پانچ بجے کے درمیان اپنے کمرے میں ہی رہنا۔ ایک لڑکا تمہارے لئے پھولوں کا گلدستہ لائے گا اسی گلدستے کے اندر ایک لفافہ ہو گا۔ لفافے میں کچھ روپے ہوں گے"

میں نے کریم بھائی کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔

"شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنے مشن کی کارروائی تیزی سے آگے بڑھانی چاہئے مجھے خبر ملی ہے کہ دیولالی کی پہاڑیوں میں بھارتی فوج کا جو بہت بڑا گولہ بارود کا ذخیرہ ہے وہاں سے اس مہینے کے آخر میں اسلحہ سے بھری ہوئی ایک مال گاڑی جموں کی طرف روانہ ہونے والی ہے۔ مجھے یہ بھی خبر ملی

ہے کہ اس گاڑی میں کشمیری مجاہدوں کے خلاف استعمال کئے جانے والے نیپام بموں کے راکٹ بھی بھاری تعداد میں ہوں گے یہ نیپام بم والے راکٹ کشمیریوں کے گھروں کو آگ لگانے کے لئے استعمال ہوں گے۔ یہ سارا اسلحہ کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس مال گاڑی کے دیولالی سے روانہ ہونے کا صحیح وقت معلوم کرو۔ تا کہ دیولالی اور جموں کے درمیان کی جگہ پر اس گاڑی کو تباہ کیا جائے"

میں نے کہا

"میں یہ معلوم کرلوں گا۔ آپ بے فکر رہیں"۔

کریم بھائی نے کہا

"میں بے فکر رہوں یا نہ رہوں تمہیں ہر حالت میں کشمیریوں کے خلاف استعمال ہونے والے گولہ بارود کی گاڑی کو راستے میں تباہ کرنا ہے"

میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"میں اپنے دشمن کو بھی پہچانتا ہوں اور اپنے فرض کو بھی پہچانتا ہوں۔ مجھے اس بات کی ٹریننگ دی گئی ہے۔ میں اپنی جان خدا کے سپرد کر کے اسلام' پاکستان اور کشمیری مجاہدوں کی جنگ لڑنے یہاں آیا ہوں۔ کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال ہونے والے گولہ بارود کی مال گاڑی جموں نہیں پہنچ سکے گی۔"

کریم بھائی نے اپنے کوٹ کی جیب سے چابی نکال کر دی اور کہا۔

"یہ کوارٹر کے خفیہ تہہ خانے کی چابی ہے۔ اگر تمہیں دلی شیر علی کو یا کشمیر کے محاذ پر کمانڈو شیروان کو ریڈیو ٹرانسمیٹر پر کوئی پیغام دینا پڑے تو یہاں آجانا۔ مگر اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ تمہارا کوئی پیچھا نہ کر رہا ہو"

میں نے چابی لے لی۔ کریم بھائی اس کے بعد اکیلا ہی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کوارٹر کا دروازہ بند کر کے تالہ لگایا اور احمد آباد سے دلی جانے والی ریلوے لائن کی طرف سے ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک چوک میں سے ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل

میں پہنچ گیا۔ ہوٹل میں آیا تو معلوم ہوا کہ میناکشی کا دوبار فون آچکا تھا۔ اس نے ایک با
فون نمبر لکھوایا تھا کہ میں آتے ہی اسے اس نمبر پر فون کرلوں۔ میں نے اسے فون کیا تو وہ
ملنے کو بے چین تھی۔ کہنے لگی میں ابھی آرہی ہوں۔ بڑی ضروری بات کرنی ہے۔ میں
نے بظاہر مصروفیت کا عذر پیش کیا مگر وہ نہ مانی اور بولی۔

"میرے گورو دیو! میں آرہی ہوں"

اور اس نے فون بند کر دیا۔

کوئی دس منٹ بعد وہ ہوٹل کے میرے کمرے میں تھی۔ آتے ہی اس نے جھک کر
میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگی۔

"سوامی جی! آپ کہاں تھے۔ میں نے کئی بار فون کیا مگر آپ نہ ملے"

میں نے کہا

"سوامی نارائن جی کے مندر میں درشن کرنے گیا ہوا تھا۔ آؤ بیٹھو"

وہ میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے بھڑکیلے نیلے رنگ کی ریشمی
ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جوڑے میں موتیے کی بجائے رجنی گندھا کے پھول سجے ہوئے
تھے۔ لباس سے ایک نئے ولایتی پرفیوم کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ کہنے لگی۔

"میں نے پتا جی کے آگے آپ کا ذکر کیا تو وہ آپ سے ملنے کو بے چین ہو گئے۔
کہنے لگے ایسے انتریامی سوامی جی سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ میں نے پتا
جی کو سب کچھ بتایا کہ کس طرح آپ نے میری خفیہ بیماری پہچان لی اور مجھے
میری گاڑی کی گمشدہ چابیاں بھی لا کر دے دیں"

میں نے دل میں کہا کہ تمہارے پتا جی سے تو میں ایسا ملوں گا کہ وہ ساری عمر یا
رکھیں گے۔ اس کم بخت سے ملنے کے لئے تو میں نے یہ سارا ڈرامہ رچایا ہے۔ اوپر سے
میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں میناکشی! میں جوگی سادھو آدمی ہوں بڑے افسروں کو نہیں ملا کرتا۔
تمہارے پاس تو اس لئے آگیا کہ شیو جی بھگوان کا اشارہ ملا تھا کہ تمہارے پاس

جاؤں اور تمہیں یہ خوش خبری سناؤں کہ تم ایک روز ہندوستان کی بہت بڑی
ڈانسر بننے والی ہو"

میناکشی نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"سوامی! کل تو آپ نے کہا تھا کہ آپ میرے گھر ضرور آئیں گے۔ پھر آج
کیوں انکار کر رہے ہیں"

میں نے کہا

"وہ تو میں صرف تمہاری خاطر تمہارے گھر جانے کو کہہ رہا تھا"

میناکشی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگی۔

"سوامی جی! پلیز میرے پتا جی کو اپنے درشن ضرور دیں۔ ان کو شوگر کی تکلیف
ہے۔ گردے میں بھی پتھری ہے۔ آج گردے میں تھوڑی درد ہو رہی
تھی ورنہ وہ تو میرے ساتھ ہی آتے"

میں نے دل میں کہا میری خیالی بیوی اور ہوائی مخلوق چندریکا نے اپنا کام شروع کر دیا
تھا اور مسٹر پانڈے کے گردے پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"اچھا تمہاری خاطر میں شام کو تمہارے پتا جی سے ملنے چلا چلوں گا"

میناکشی بڑی خوش ہوئی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو چوم لیا اور اس کے ساتھ
آنکھیں لگائیں اور کہا۔

"میں شام کو لینے خود آؤں گی"

وہ چلی گئی۔ شام تک میں اپنے کمرے میں ہی پڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ شام کو چار
اور پانچ بجے کے دوران کریم بھائی کا بھیجا ہوا کوئی لڑکا میرے لئے مزید رقم لے کر آرہا
ہے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر
ایک لڑکا ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لئے کھڑا تھا۔ گلدستے کے گرد سرخ رنگ کا کاغذ لپٹا ہوا
تھا اس نے مجھے نمسکار کیا اور بولا

"سر! یہ آپ کے لئے ہے"

میں نے لڑکے کو پانچ روپے انعام دیا اور گلدستہ لے کر دروازہ بند کر دیا۔ گلدستے کا کاغذ جلدی سے اتار کر پھولوں کو الگ الگ کیا تو اس کے اندر ایک نیلے رنگ کا لفافہ چھپا ہوا تھا۔ لفافہ کھولا تو اس میں چار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔ ہوٹل میں میرا ایک دن اور ایک رات کا کرایہ پورا ہو چکا تھا۔ میں اسی وقت نیچے گیا اور مزید چوبیس گھنٹوں کے لئے کمرہ بک کرا لیا۔

ساڑھے پانچ بجے میناکشی گاڑی لے کر پہنچ گئی۔ میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ اور اس کے پتاجی سے ملنے چل پڑا۔ میناکشی کا بنگلہ شہر کے امیر ترین علاقے میں واقع تھا۔ بہت بڑے باغ میں بنا ہوا یہ بنگلہ دو منزلہ تھا۔ باغ میں قسم قسم کے موسمی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اونچے اونچے پرانے درخت تھے۔ جیسے ہی گاڑی پورچ میں جا کر کھڑی ہوئی ایک وردی پوش ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

میناکشی مجھے ساتھ لئے بنگلے کے خوبصورت اور کشادہ ڈرائنگ روم میں سے گذار کر اپنے پتاجی کے کمرے میں لے گئی یہ اس کے باپ کا بیڈ روم تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ بیڈ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ ڈبل بیڈ والے پلنگ پر ایک بھوری بھوری مونچھوں والا ایک پختہ عمر کا آدمی جس کی توند پھولی ہوئی تھی۔ پلنگ کے تکیوں سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے خیر مقدم کے لئے اٹھنے لگا تو میں نے کہا۔

"نہیں نہیں آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ آپ بیمار ہیں۔ آرام سے لیٹے رہیے"

یہ اسلام اور پاکستان کا دشمن، کشمیری مجاہدین کا قتل عام کرنے والا مسٹر گوتم داس پانڈے تھا۔ پاکستان دشمن سیکرٹ سروس را RAW کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کا چیف اور میرا اصل ٹارگٹ میناکشی کی زبانی اس تک میری ساری کارگزاری پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اس نے مجھے جین مت کے روایتی لباس میں دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

"سوامی جی! آپ تو مہاویر کے بھگت ہیں۔ بیٹی میناکشی نے آپ کی باتیں سنائیں

تو میں نے کہا بیٹی مہاویر جی کے بھگتوں کے پاس بڑی طاقتیں ہوتی ہیں آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے"

اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ اس پر میری شخصیت کا اتنا رعب نہیں بیٹھ سکا جتنا رعب اس کی بیٹی میناکشی پر پڑ چکا تھا۔ میناکشی کو میری طاقت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مسٹر پانڈے کو بھی تجربہ کروانے کی ضرورت تھی جس کے لئے چندریکا نے مجھے بالکل تیار کر رکھا تھا۔

اس بیڈ روم میں چائے لگا دی گئی۔ طرح طرح کی مٹھائیاں اور پھل کانسی کی تھالیوں میں بھر کر لائے گئے تھے۔ میناکشی نے خود چائے بنا کر مجھے پیش کی۔ اس کے باپ مسٹر پانڈے نے میری کلائی میں مہاویر کے اوتار وردھنا کا منگل سوتر دیکھ کر کہا۔

"سوامی جی! یہ منگل سوتر آپ نے نندی کنڈ کے بھگت جی سے لیا ہو گا"

میں نے کہا

"جی ہاں۔ مگر بڑی پرکشا کے بعد یہ بھی ملا ہے"

میناکشی بولی

"ڈیڈی! سوامی جی تو بڑے ودوان ہیں۔ مہاویر جی کے سچے بھگت ہیں"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں"

مسٹر پانڈے بڑا پرانا اور منجھا ہوا بھارتی سی ایس پی افسر اور بیوروکریٹ تھا۔ وہ ابھی پوری طرح میرے قبضے میں نہیں تھا اور مجھ سے اس طرح متاثر بھی نہیں تھا۔ جس طرح میں اسے متاثر کر کے اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ میرے پاس جوگی سادھوؤں والی کوئی شعبدہ بازی ہے جس کے ذریعے میں نے اس کی بیٹی پر اپنا اثر ڈال رکھا ہے۔ دوسری طرف میں اسی انتظار میں تھا کہ چندریکا کب اس پر گردے کی درد کا حملہ کرتی ہے کیونکہ چندریکا نے کہا تھا کہ جب میں مسٹر پانڈے سے ملنے جاؤں گا تو اس پر گردے کی درد کا شدید دورہ پڑے گا۔ میں چائے پیتے اور میناکشی سے باتیں کرتے، اس کی باتوں کا جواب دیتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد مسٹر پانڈے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ مسٹر پانڈے کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ ٹیک لگائے

پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اس نے دو ایک بار آہستہ سے پہلو بدلا۔ پھر چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔ میناکشی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے ڈیڈی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں نے دل میں کہا۔ اس دشمن اسلام کی طبیعت کیسے ٹھیک ہو سکتی تھی۔ اب تو اس کی کم بختی کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ مسٹر پانڈے نے پیٹ کی ایک جانب کو لیے کے اوپر ہاتھ رکھتے ہوئے تکلیف دہ انداز میں کہا۔

"درد کچھ زیادہ ہی ہونے لگا ہے"

میناکشی نے کہا۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں"

مسٹر پانڈے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا نہیں نہیں بیٹی اس کی ضرورت نہیں۔

ٹرانکولائزر میرے پاس موجود ہے"

اچانک مسٹر پانڈے کے حلق سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ چندریکا نے حملہ کر تھا۔ وہ گردے کی شدید درد سے دہرا ہو گیا۔ میناکشی فوراً ڈاکٹر کو فون کرنے میز پر ر فون کی طرف گئی تو میں نے کہا۔

"میناکشی! ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پانڈے جی کی تکلیف ابھی دور ہو جائے گی"

میناکشی تو میرے چمتکار میرے کرشمے دیکھ چکی تھی۔ وہیں رک گئی اور ہاتھ جوڑ بولی۔

"پلیز سوامی جی! میرے ڈیڈی کو ٹھیک کر دیں"

مسٹر پانڈے کو واقعی شدید درد شروع ہو چکا تھا۔ وہ پلنگ پر تڑپ رہا تھا۔ میں صو سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور پانڈے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"مسٹر پانڈے، جس جگہ درد ہوتا ہے وہاں میرا ہاتھ رکھ دیں"

مسٹر پانڈے درد سے بلبلا رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے جسم پر جہاں گردے ہوتے ہیں رکھ دیا اور دل میں کہنے لگا۔ چندریکا اب میری عزت رکھ لینا۔ جو تم نے کہا تھا وہ کر دکھانا۔

اور ایسا ہی ہوا میرے ہاتھ کے میرے پانڈے کے جسم پر رکھنے کی دیر تھی کہ اس کا سارا درد ایک دم سے کافور ہو گیا۔ کہاں وہ درد سے بلبلا رہا تھا اور کہاں اب پہلو کے بل لیٹا بالکل ساکت ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا شدید گردے کا درد صرف ایک آدمی کے ہاتھ لگانے سے ختم ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

"مسٹر پانڈے! اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ آپ کی تکلیف ختم ہو گئی۔"

وہ آہستہ سے سیدھا ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ واقعی درد بالکل جاتا رہا ہے تو وہ بستر پر ذرا سا اوپر ہو کر پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا وہ میری طرف احسان مند اور حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"سوامی جی! آپ نے تو کمال کر دیا۔ ذرا سا بھی درد باقی نہیں رہا"

میں نے کہا۔

"پانڈے جی! مجھے آپ کے لئے سوامی ہری ناتھ جی کے مندر میں جا کر ایک چلہ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد آپ کو گردے کا درد ساری زندگی نہیں ہو گا"

پانڈے بڑی عاجزی اور عقیدت کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میناکشی کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"ڈیڈی! میں نے نہ کہا تھا کہ سوامی جی تو انترجامی گورو ہیں"

پانڈے اب اٹھ کر بالکل ٹھیک ٹھاک ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"سوامی جی! میرے گردے میں تین پتھریاں ہیں۔ ساری تکلیف ان پتھریوں کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے مجھے شوگر بہت زیادہ ہے آپریشن خطرناک ثابت ہو سکتا ہے"

میں نے کہا۔

"مسٹر پانڈے! آپ گھبرائیے نہیں میں آپ کی ساری پتھریاں ختم کر دوں گا"

میں یہ کام ایک دم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے نیچے لگا رہے اور اسے میری ضرورت محسوس ہوتی رہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں ترپ کا وہ دوسرا پتا نکالوں جو مجھے چندریکا نے دیا تھا۔ میں نے پانڈے سے کہا۔

"ذرا مجھے اپنا ہاتھ دکھائیں"

اس نے اپنی بھدی سی پھولی ہوئی ہتھیلی بڑے اشتیاق اور عقیدت کے ساتھ میرے آگے کر دی۔ مجھے اس ہتھیلی پر سوائے بیکار قسم کی لکیروں کے اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے بڑے ماہر ہاتھ دیکھنے والوں کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی ہتھیلی کو ادھر ادھر سے دبا کر دیکھا اور کہا۔

"اپنا ہاتھ پیچھے کر لیں۔ مجھے جو دیکھنا تھا دیکھ لیا"

میناکشی نے پوچھا۔

"گورو دیو! آپ نے کیا دیکھا ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتائیے"

میں نے اپنی توجہ پانڈے کی طرف کر لی اور اس کی طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"پانڈے جی! آپ کی ترقی کی فائل اوپر پردھان منتری کے سیکریٹریٹ میں گئی ہوئی ہے"

پانڈے نے فوراً کہا۔

"ہاں ہاں جی۔ گئی ہوئی ہے مگر دو سال ہو گئے ہیں وہیں پڑی ہے۔ دراصل وہاں میرا ایک دشمن بیٹھا ہے۔ وہ فائل کو دبائے ہوئے ہے۔ صرف اس پر اندرا جی کے دستخط ہونے ہیں۔ ایک بار دستخط ہو جائیں تو میرا بیڑا پار ہو جائے گا۔ میں جس جگہ پر بیٹھا ہوں اس پوسٹ پر پکا ہو جاؤں گا اور میری ترقی بھی ہو جائے گی"

میناکشی نے مجھ سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز گورو جی! میرے ڈیڈی کا کام کر دیں آپ تو سب کچھ کر سکتے ہیں"

میں نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے بڑی شان بے نیازی سے کہا۔

"ہو جائے گا۔ سب کام ہو جائے گا۔ تھوڑا وقت لگے گا۔ اس کے لئے مجھے ایک خاص چلہ کرنا پڑے گا"

پانڈے نے میری خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

"سوامی جی! آپ جتنی رقم کہیں گے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ پلیز آپ چلہ شروع کر دیں۔ یہ میری زندگی میرے مستقبل کا سوال ہے"

میں نے کہا۔

"میں ابھی آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا ویسے اتنا ضرور وشواش دلاتا ہوں کہ اگر میں نے چلہ کیا تو آپ کی فائل پر اندرا گاندھی جی فوراً دستخط کر دیں گی"

پانڈے بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"آپ دھن ہیں۔ دھن ہیں' بس آج سے مجھے بھی اپنا بھگت سمجھیں۔ جو حکم کریں گے اسے فوراً پورا کروں گا۔"

میں یہی چاہتا تھا۔ مسٹر پانڈے کا اصرار تھا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر ان کے بنگلے میں آجاؤں۔ کہنے لگا۔

"اوپر پورا پورشن خالی پڑا ہے۔ آپ جب تک احمد آباد میں ہیں ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ یہ ہمارے بڑے بھاگ ہوں گے"

میناکشی نے بھی اس خواہش کا شدت سے اظہار کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں نے ہوٹل کے کمرے کا کرایہ اگلے چوبیس گھنٹوں کے لئے ادا کر دیا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔

"کل شام کو سوچ کر بتاؤں گا"

میناکشی مجھے چھوڑنے میرے ہوٹل تک آئی۔ جانے سے پہلے میرے گھٹنوں کو چھو کر ہاتھ باندھ کر بولی۔

"سوامی جی! آپ ہمارے گھر آجائیں گے تو ہماری ساری تکلیفیں' سارے کشٹ

دور ہو جائیں گے“

میں نے کہا۔

”میں کل سوچ کر بتاؤں گا“

کہنے لگی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کل پانچ بجے شام آپ کو لینے آؤں گی۔ آپ تیار رہیے گا“

وہ چلی گئی۔ میں نے رات کو کریم بھائی کو فون پر بتایا کہ میں نے گوگل داس پانڈے والا مورچہ بھی فتح کر لیا ہے۔ اور را RAW کی پاکستان اور کشمیر افیرز والی سیکریٹ فائلوں تک پہنچ گیا ہوں۔

ہم کوڈ الفاظ میں باتیں کر رہے تھے۔ مگر کوڈ لفظوں میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کریم بھائی نے کہا۔

”میں صبح آٹھ بجے تمہارے پاس آؤں گا۔ ناشتہ تمہارے ساتھ ہی کروں گا“

اس نے فون بند کر دیا۔

صبح ٹھیک آٹھ بجے کریم بھائی میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ ناشتے پر میں نے اسے بتایا کہ مسٹر پانڈے پر میں نے اپنی گفتگو اور جین دھرم کی باتوں سے اتنا گہرا اثر جما لیا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں ہوٹل چھوڑ کر اس کے بنگلے میں چلا آؤں۔ میں نے وہاں چندریکا کی، سے جو شعبدہ بازی دکھائی تھی اس کا ذکر کریم بھائی سے بالکل نہ کیا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کریم بھائی کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے تمہیں آج شام ہوٹل چھوڑ کر مسٹر پانڈے کے ہاں چلے جانا چاہئے۔ اور جتنی جلدی ہو سکے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ نیپام راکٹ بموں والی اسلحہ کی فوجی گاڑی جموں کب اور کس وقت دیولالی سے روانہ ہو گی۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ گاڑی دیولالی اور جموں توی کے درمیان ہی کسی جگہ تباہ ہو جانی چاہئے۔ اگر اس فوجی مال گاڑی

کا اسلحہ کشمیر پہنچ گیا تو اس میں جو نیپام راکٹ بم ہیں وہ کشمیری مجاہدین کے مورچوں میں تباہی مچا دیں گے اور کشمیری مسلمانوں کے گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیں گے۔“

میں نے کہا۔

”کریم بھائی! یہ تم بھی جانتے ہو کہ اتنی جلدی اتنے ٹاپ سیکریٹ کی باتیں مسٹر پانڈے سے معلوم کرنی بہت مشکل ہیں۔ لیکن میرا ٹارگٹ یہی ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ جتنی جلدی ہو سکے ایمونیشن والی اس فوجی گاڑی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کروں“

کریم بھائی اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

”ایک بات یاد رکھنا را کے چیف مسٹر پانڈے کے بنگلے سے مجھے ہرگز ہرگز فون نہ کرنا وہ بھارت کی ٹاپ سیکرٹ سروس کا چیف ہے۔ اس کے گھر سے جو فون کیا جاتا ہے یا باہر سے جو فون آتا ہے اس کو احمد آباد کی سنٹرل انٹیلی جینس پولیس کا خاص عملہ ریکارڈ کرتا ہے اور پوری چیکنگ کے بعد معلوم کر لیتا ہے کہ فون کہاں کیا گیا تھا اور باہر سے فون کہاں سے آیا تھا۔ مجھے فون کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ریلوے اسٹیشن، پوسٹ آفس کے ٹیلی فون بوتھ سے یا کسی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کر لینا۔ آگے تم ان باتوں کو بہتر سمجھتے ہو۔ آخر تم ایک ٹرینڈ کمانڈو سپاہی ہو۔“

میں کریم بھائی کو چھوڑنے کمرے کے دروازے تک آیا۔ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے میرا نام لے کر کہا۔

”تم نے مسٹر پانڈے تک پہنچنے کی جو کامیابی حاصل کی ہے میں اسے انتہائی معمولی کامیابی سمجھتا ہوں اصل مرحلہ اب سامنے آیا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جہاں تمہاری کمانڈو ٹریننگ، تمہاری فراست، چالاکی اور عیاری کو پرکھا جائے گا۔ تمہارے اصل امتحان کا وقت آگیا ہے یہاں میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں

کر سکتا۔ کیونکہ مجھے کمانڈو سپائینگ کی نہ تو کوئی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہے اور نہ مجھے ان باتوں کا کوئی تجربہ ہے۔ تمہیں خود حالات کا ایک ذہین کمانڈو کی طرح جائزہ لینا ہو گا۔ خود ہی آرڈر ایشوع کرنا ہو گا اور خود ہی اس آرڈر پر اس طرح عمل کرنا ہو گا کہ تم ٹارگٹ مار لو۔ میں تمہیں جاتے ہوئے ایک ہی بات کہوں گا کہ دیولالی کے ایمونیشن ڈپو سے جموں توی جانے والے اسلحہ کی فوجی ٹرین کا تباہ ہونا لازمی ہے۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ میری طرف گھور کر دیکھا اور بولا۔

"اب تمہیں بے حد احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ تم RAW را کے چیف کے بنگلے پر رہ رہے ہو گے۔ احمد آباد کی سنٹرل انٹیلی جینس کے آدمی تمہاری نگرانی شروع کر دیں گے۔ میں تمہیں کبھی وہاں قیام کرنے کا مشورہ نہ دیتا۔ لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔ تم اگر باہر کسی جگہ رہتے اور مسٹر پانڈے سے راہ و رسم رکھتے تب بھی خفیہ پولیس تمہاری نگرانی شروع کر دیتی۔ باہر رہ کر تمہاری گرفتاری بڑی آسان تھی مگر را کے چیف کے مہمان بلکہ گورو کی حیثیت سے پولیس اس وقت تک تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی جب تک کہ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو اور تمہارا مسٹر پانڈے کے قریب رہنا بہت ضروری بھی تھا۔ اس دفعہ تم مجھ سے فون پر رابطہ کرو گے اس کے بعد کوئی پیغام وغیرہ دینا ہو تو تم مجھے رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان ریڈیو ٹرانسمیٹر پر کوڈ الفاظ میں پیغام دے سکتے ہو۔ میں ہر رات بارہ سے دو بجے تک اپنے تہہ خانے والے کوارٹر میں موجود ہوں گا۔"

میں نے کہا۔

"مگر میرے پاس کوئی منی ٹرانسمیٹر نہیں ہے۔ سگریٹ کیس والا ٹرانسمیٹر میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ میناکشی اور مسٹر پانڈے کو معلوم ہے کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

کریم بھائی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر

دروازے کا گول ہینڈل گھما کر ایک دم سے دروازہ کھول دیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"مجھے شک سا ہوا تھا کہ باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ بہرحال میں تمہارے لئے چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر کا انتظام کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے میں ایک گھنٹے بعد تمہیں ریڈیو ٹرانسمیٹر بھیج دوں۔ وہی لڑکا جو پھول لایا تھا ایک گھنٹے بعد ایک اور پھولوں کا گلدستہ لے کر آئے گا۔ گلدستے میں تمہیں ایک لفافہ ملے گا۔ اسی لفافے میں تمہارے لئے چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود ہو گا۔ میرے تہہ خانے والے ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی اور مجھے بلانے کے سگنل تو تمہیں زبانی یاد ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہیں"

"ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں۔ میری دکان پر بالکل نہ آنا۔ اور ریلوے لائن والے تہہ خانے کا رخ بھی انتہائی دیکھ بھال کے بعد کرنا۔ کیونکہ آج رات تم را کے چیف کے ہاں قیام کرنے جا رہے ہو اور کل سے احمد آباد کی خفیہ پولیس تمہارا پیچھا کرنا شروع کر دے گی۔ خدا حافظ!"

کریم بھائی نے آہستہ سے دروازہ کھول کر کاریڈور میں جھانک کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔

میں دروازہ بند کر کے پلنگ پر آ کر نیم دراز ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے مشن کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگا۔ جب تک میں نے میناکشی اور اس کے باپ اور را کے احمد آباد والے ہیڈ کوارٹر کے چیف مسٹر جی ڈی پانڈے تک رسائی حاصل نہیں کی تھی میں بڑی آسانی سے راستہ طے کرتا جا رہا تھا۔ اس میں مجھے چندریکا کی امداد بھی حاصل تھی۔ مگر میرے مشن کا مشکل ترین مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ یہاں سے آگے چندریکا نے بھی میری مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتی تو بڑی آسانی سے

مجھے را کے ہیڈ کوارٹر سے کشمیر میں بھارتی فوجوں کی نقل وحرکت اور پاکستان میں را کے تخریب کاری کے منصوبوں والی سیکریٹ فائلیں لا کر دے سکتی تھی۔ مگر نندی کنڈ کی مڑھی پر ہی اس نے صاف لفظوں میں مجھے کہہ دیا تھا۔

"میں جانتی ہوں تم بھارت میں کیا منصوبے لے کر آئے ہو۔ اگر تم پچھلے جنم میں میرے پتی میرے خاوند نہ رہ چکے ہوتے تو میں تمہیں زندہ نہ چھوڑتی۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ اگر میں نے تمہیں بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے جوانی میں ہی ہلاک کروا دیا یا تم کسی حادثے میں مارے گئے تو مجھے اگلے جنم میں ایک لاکھ سال تک تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔ اسی لئے بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے تک تمہاری حفاظت میری ذمے داری بن گئی ہے۔ لیکن میں بھارت دیس کی باسی ہوں۔ اس دھرتی نے مجھے جنم دیا اور اسی دھرتی کی خاک میں میری ہڈیوں کے پھول دفن ہیں۔ یہ میری جنم بھومی ہے۔ میں اپنی جنم بھومی سے غداری نہیں کر سکتی۔ تمہارے لئے صرف دو کام کروں گی۔ پہلا کام یہ کہ تمہیں میناکشی اور مسٹر پانڈے کی نظروں میں ایک پہنچے ہوئے جادوگر جینی گورو کی حیثیت دے دوں گی۔ دوسرا کام یہ کروں گی کہ اگر تمہارے بوڑھے ہونے تک بھارت دیس کے اندر اندر تمہاری زندگی کو کوئی مہلک خطرہ پیش آئے تو تمہیں بچانے کے لئے فوراً وہاں پہنچ جاؤں۔ اس کے علاوہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اور مجھے کہنا بھی نہ۔"

میں چندریکا کی مدد سے جہاں تک پہنچنا تھا پہنچ گیا تھا۔ اس کے آگے میں اس کا محتاج بھی نہیں تھا۔ آگے مجھے جو کام کرنا تھا اس کی مجھے پوری ٹریننگ مل چکی تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم پلنگ پر آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا کہ دروازے پر آہستہ سے ٹھک ٹھک ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے بتایا کہ مجھے پلنگ پر لیٹے سوا گھنٹہ گذر چکا ہے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر وہی لڑکا گلدستہ لئے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے گلدستہ لے لیا۔ لڑکا واپس چلا گیا۔ دروازے کو

اندر سے لاک کر کے میں نے گلدستہ کھول دیا۔ اس کے اندر لفافہ تھا۔ لفافے میں ایک ماچس کی ڈبیا کے سائز کا سگریٹ لائٹر رکھا ہوا تھا۔

میں نے سگریٹ لائٹر کا غور سے مطالعہ کیا۔ اس ایک پیچ یعنی سکریو نچلی طرف بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے چھوٹے چاقو کی مدد سے سکریو کھولا تو سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ ایک انتہائی طاقتور چھوٹا سا ٹرانسمیٹر تھا جس پر خفیہ سگنل دیئے بھی جا سکتے تھے۔ اور سگنل وصول بھی کئے جا سکتے تھے۔ اس طاقتور ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بات بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے سکریو یعنی پیچ کو دوبارہ کس دیا اور سگریٹ لائٹر اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ دوپہر کو کھانا کھا کر میں پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ مجھے را کے چیف پانڈے کے آفس سے کشمیری مجاہدین آزادی کے خلاف استعمال ہونے والے اسلحہ کی ٹرین کے بارے میں صحیح صحیح معلومات کیسے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے میں اتنی جلدی مسٹر پانڈے سے اس قسم کا انتہائی خفیہ راز نہیں پوچھ سکتا تھا۔ وہ تو فوراً مجھے دوسرے ملک کا جاسوس سمجھ کر گرفتار کروا دیتا خواہ اس کو مجھ سے کتنا بڑا فائدہ ہی کیوں نہ پہنچنے والا ہو۔ کیونکہ یہ نیشنل سکیورٹی کا معاملہ تھا اور ہندو نیشنل سطح پر بہت کم غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر وہ مجھے گرفتار نہ بھی کرواتا تو کم از کم وہ مجھے جموں جانے والی فوجی اسلحہ کی ٹرین کے متعلق کچھ نہ بتاتا اور آگے سے بے حد محتاط ہو جاتا مجھے تو از خود جموں توی جانے والی اسلحہ کی گاڑی کے ٹائم اور تاریخ کا سراغ لگانا تھا۔ یہ ایک طرح سے میرا پہلا امتحان بھی تھا۔ میں کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ لیکن میں کسی فائنل نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور سو گیا۔ سو کر اٹھا تو سہ پہر کے سوا چار بج رہے تھے۔ جلدی سے اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے' ماتھے پر جین دھرم کی تین سفید لکیریں ڈالیں اور میناکشی کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شام کو مجھے لینے آئے گی۔ میں نے کافی منگوائی اور صوفے پر بیٹھ کر کافی پینے اور آگے مجھے جو کچھ کرنا تھا اس پر غور کرنے لگا۔

پہلے ہی مرحلے پر ایمرجنسی کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کریم بھائی کی انفارمیشن کے مطابق اسلحہ کی ٹرین جس میں نیپام راکٹ بھاری تعداد میں تھے اس مہینے کے آخر میں کسی

تاریخ کو دیولالی سے روانہ ہونے والی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق دیو لالی سے فوجی ٹرینیں جن میں گڈز ٹرینیں بھی ہوتی ہیں دو ایک بار انڈیا کے مختلف شہروں کی طرف جاتی ہی رہتی ہیں اور گڈز ٹرینیں یعنی فوجی سپلائی کے سامان والی مال گاڑیاں وضع قطع کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں دیولالی سے روانہ ہونے والی کسی مال گاڑی کو دیکھ کر آپ یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ اسی میں فوج کے لئے سپیئر پارٹس وغیرہ کا سامان جا رہا ہے یا اسلحہ لدا ہوا ہے۔ مجھے خاص طور پر اس گاڑی کی تاریخ اور روانگی کا وقت معلوم کرنا تھا جس میں کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال ہونے والا گولہ بارود اور نیپام بم کے راکٹ لدے ہوئے تھے۔ میرے پاس وقت بھی بہت تھوڑا تھا۔ یعنی مہینے کی آخری تاریخوں کے آنے میں صرف پندرہ بیس دن باقی تھے۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا۔ ان پندرہ بیس دنوں کے اندر اندر ہی کرنا تھا۔

میناکشی ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ گئی۔

میں نے اپنی مختصر سی ضروری چیزیں اپنے بریف کیس میں سنبھال کر رکھ لی تھیں۔ خفیہ ٹرانسمیٹر والا سگریٹ لائٹر میری واسکٹ کی جیب میں تھا۔ میں میناکشی کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں آگیا۔ یہاں ہوٹل کے کاؤنٹر پر ایک رجسٹر میں اپنے ہوٹل چھوڑنے کے خانے میں دستخط کئے اور ہوٹل کی لابی سے نکل کر میناکشی کی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ آج اس نے بادامی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ گلے میں ماڈرن فیشن کی بادامی رنگ کے منکوں والی مالا تھی۔ اس نے پرفیوم بھی کوئی دوسری لگا رکھی تھی جس کی خوشبو بڑی خواب انگیز تھی۔ میں اس گجراتی ہندو لڑکی کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ یہ مجھے کسی اور طرف لے جا رہی تھی جو میرا اصل راستہ نہیں تھا۔ میں نے اس لڑکی سے جتنا کام لینا تھا لے چکا تھا۔ اب کسی انتہائی ضرورت اور ایمرجنسی کے وقت ہی وہ میرے کام آسکتی تھی۔ اب میرا اصل ٹارگٹ اس کا باپ تھا۔

راستہ میں میناکشی اپنی ناف کے نیچے والے ابھار کے بارے میں مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اسے بڑی تشویش تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں یہ کینسر نہ بن جائے۔ اس لئے میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتی۔ کہیں وہ یہ نہ کہہ دے کہ یہ کینسر ہے"

میں نے سنجیدہ اور باوقار انداز میں کہا۔

"اس کی فکر تم مجھے دے دو۔ تمہارا یہ ابھار میں دور کر دوں گا۔ بھگوان نہ کرے اگر تمہیں کینسر بھی ہو گیا تو میں بھگوان شیوا کی مدد سے وہ بھی ختم کر دوں گا"

میناکشی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں سوامی جی! مجھے کینسر نہیں ہونا چاہئے میں تو خودکشی کر لوں گی"

وہ اس قسم کی باتیں کرتی رہی اور گاڑی ان کے بنگلے میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ مسٹر پانڈے مجھے لینے کے لئے بلکہ میرا سواگت کرنے کے لئے لابی میں ایک ملازمہ کے ساتھ خود موجود تھا۔ میں بڑی شان سے گاڑی میں سے نکل کر سادھو سنتوں کی طرح ہاتھ اوپر اٹھائے مسٹر پانڈے کی طرف بڑھا۔ جیسے اسے آشیرباد دے رہا ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھوئے اور بولا۔

"سوامی جی! میرے دھن بھاگ کہ آپ میری کٹیا میں پدھارے"

وہ انگریزی کی بجائے اب ہندی زبان میں مجھ سے بات کرنے لگا تھا۔ جس طرح چیلے اپنے گرو سے بات کرتے ہیں۔ اس نے میناکشی سے کہا۔

"میناکشی! سوامی جی کو اوپر ان کے کمرے میں لے جاؤ میں ابھی آتا ہوں"

گردے کی تکلیف دور ہو جانے کی وجہ سے مسٹر پانڈے پہلے سے زیادہ صحت مند اور چاق وچوبند نظر آ رہا تھا۔

میناکشی مجھے لے کر اوپر والے پورشن میں آگئی۔ ملازمہ نے میرا بریف کیس تھام لیا تھا۔ اوپر تین کمرے تھے۔ ایک بیڈ روم' ایک ڈائننگ روم اور ایک ڈرائنگ روم' ڈرائنگ روم کے آگے ایک کشادہ ٹیرس یعنی بالکونی تھی۔ سارے کمرے بڑے خوبصورتی سے سجے تھے۔ ریشمی پردے' قیمتی فرنیچر' کچن اور باتھ روم بھی بہت اعلیٰ تھا۔ تینوں کمروں

میں شیو بھگوان کے رقص کے انداز والے کانسی کے بت کونوں میں رکھے تھے۔ ڈرائنگ روم کی دیوار پر جین دھرم کے بانی مہاویر وردھمن کی پینٹ کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ اس تصویر کی دائیں اور بائیں جانب پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کی تصویریں لگی تھیں۔ میزوں پر پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ ہر کمرے میں ٹیلی فون لگا تھا۔

تھوڑی دیر میں میناکشی کا باپ مسٹر پانڈے بھی وہاں آگیا ہاتھ باندھ کر بولا۔

"سوامی جی! کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجھے شما کر دینا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کیجئے"

میں نے کہا

"سب ٹھیک ہے۔ ہم جین دھرم کے سادھو بھگت ہیں۔ ہم تو ننگی زمین پر بھی رات گذار لیتے ہیں"

رات کا کھانا میناکشی اور مسٹر پانڈے نے میرے ساتھ مل کر وہیں ڈائننگ روم میں کھایا۔ مجبوراً مجھے سبزیاں اور دال کھانی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ جینی سبزی خور ہوتے ہیں ا گوشت پیاز لہسن وغیرہ بالکل نہیں کھاتے۔ بڑا بے مزہ کھانا تھا۔ کھانے کے بعد مس پانڈے نے میناکشی سے کہا۔

"بیٹی! تو سوامی جی کے پاس بیٹھ میں نیچے جاتا ہوں۔ دلی سیکریٹریٹ سے ایک ضروری کال آنے والی ہے"

وہ چلا گیا۔ دلی سیکریٹریٹ سے آنے والی ضروری کال کا سن کر میرا خیال اپنے مش کی طرف چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مسٹر پانڈے کو دلی سیکریٹریٹ سے جو ضروری کالیں آ ہیں ان کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔ ہو سکے تو انہیں اوپر والے ٹیلی فون کے ذریعے ٹیپ کر لینا ہو گا۔ میناکشی نے کافی اوپر ہی منگوالی۔

ہم ٹیرس میں آکر بیٹھ گئے۔ رات بڑی خوبصورت تھی دریائے سابرمتی کی طر سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ نیچے باغیچے میں بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ اونچے طبقے کے لوگوں کا علاقہ تھا۔ بڑے بڑے باغیچوں والی کشادہ کوٹھیاں تھیں۔ ٹر

کا شور بالکل نہیں تھا۔ بڑی پر سکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میناکشی مجھ سے اپنے مستقبل کا حال پوچھنے لگی۔ میں کب انڈیا کی سب سے بڑی ڈانسر بنوں گی؟ میری شادی کس سے ہوگی؟ میں خوبصورت ہی رہوں گی نا؟ وغیرہ وغیرہ میں اس کے ہر سوال کے جواب میں مسکرا کر کہتا۔

"میناکشی! تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں جب تک تمہارے ساتھ ہوں تم جو چاہو گی وہی ہو گا"

میناکشی نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر میرے دونوں ہاتھ اپنے سینے سے لگا لئے۔

میں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لئے اور اسی کے شانے کو پیار سے تھپتھپا کر کہا۔
"اب تو نیچے جا کر آرام کر میرا بھی پرارتھنا کا وقت ہو گیا ہے"
میناکشی نے بڑی بے باکی سے کہا
"سوامی جی! میں آپ کے کمرے میں نہ سو جاؤں؟ ڈیڈی کچھ نہیں کہیں گے۔
میں آپ کے قدموں میں سو جاؤں گی"
یہ لڑکی میرے کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کنٹرول کرنا ضروری تھا۔ میں
نے اسے ہلکا سا ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"میناکشی! تم ہماری پرارتھنا' ہماری تپسیا' بھنگ کرنا چاہتی ہو؟ تمہیں معلوم نہیں
کہ مہاویر جی کو ایسی باتیں ناپسند ہیں۔ جاؤ نیچے جا کر سو جاؤ"
میناکشی کچھ ڈر سی گئی۔ جلدی سے اٹھی۔ میرے پاؤں چھوئے اور نمسکار کہہ
ساڑھی سنبھالتی واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی بیڈ روم میں آ گیا۔ کچھ دیر
صوفے پر بیٹھا شیلف میں سے انگریزی کی ایک کتاب نکال کر پڑھتا رہا۔ مجھے کیا خاک
پرارتھنا اور تپسیا کرنی تھی۔ میرے ذہن میں تو ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ کشمیر
اسلحہ لے کر جانے والی فوجی ٹرین کس تاریخ کو کس وقت بھارت کے ریلوے اسٹیشن
دیولالی سے جموں توی کی طرف روانہ ہو گی اور اس ٹرین کا ڈیپارچر نمبر کیا ہو گا۔

جب میں سوچ سوچ کر تھک گیا اور کوئی مناسب ترکیب میری سمجھ میں نہ آئی تو میں
اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میری مونچھیں کافی بڑی ہو گئی تھیں
اور بال بھی لمبے ہو گئے تھے۔ مجھے دلی والے مجاہد اور اپنے ساتھی اور ایک طرح سے ماسٹر
سپاہی شیر علی نے مشورہ دیا تھا کہ میں اپنی مونچھیں بڑی کر لوں اور بال بھی بڑھا لوں کیونکہ
مجھے شیر علی کے ریستوران والوں نے ایک نظر دیکھ رکھا تھا اور خاص طور پر ریستوران
کے ہندو لاؤنج منیجر سے تو میرا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ وہ میری شکل سے خاصا واقف ہو گیا
تھا اور یہ بات یہاں احمد آباد میں میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ دلی کے ماسٹر
سپاہی شیر علی نے اس سے میرا تعارف اپنا بھانجا کہہ کر کرایا تھا۔ اس حساب سے ہندو لاؤنج
منیجر کو معلوم تھا کہ میں ہندو نہیں بلکہ مسلمان ہوں جب کہ احمد آباد میں ہندو جینی کے
روپ میں اپنی کمانڈو جاسوسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ اصل میں اس وقت تک
شیر علی میرے مشن سے آگاہ نہیں تھا کہ میں اتنے اہم اور نازک مشن پر انڈیا میں آیا
ہوں۔ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا اور اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اب
میں یہی کروں کہ اپنا حلیہ تھوڑا بہت تبدیل کر لوں۔
ماسٹر سپاہی شیر علی نے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ میں دلی آؤں تو اسے خفیہ طور پر
رات کو ملوں اور کوئی پیغام دینا ہو یا کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کو کوئی پیغام دینا ہو تو ریڈیو
ٹرانسمیٹر پر اس سے کوڈ الفاظ میں بات کروں۔ میرے پاس اپنے دلی کے ماسٹر سپاہی شیر علی
اور کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان دونوں کے ٹرانسمیٹروں کی فریکوینسیاں اور خفیہ ناموں
کے اشارے موجود تھے۔ غسل خانے کے آئینے میں ہی میں نے اپنی پیشانی پر بنے ہوئے
جینی ہندوؤں کے تلک کے نشان دیکھے۔ مجھے ہنسی آ گئی میں نے وہیں تولیے سے رگڑ کر
نشان مٹا دیئے پھر منہ ہاتھ دھویا۔ صبح کو مجھے پھر یہ تلک کے نشان ماتھے پر لگانے تھے۔ یہ
میرے مشن کا تقاضا تھا۔
اس کے بعد میں نے بیڈ روم کی سوائے پلنگ کے ٹیبل لیمپ کے باقی ساری بتیاں
بجھا دیں۔ بالکونی کو کھلنے والے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے پردے کو تھوڑا سا

ایک طرف ہٹا کر باہر دیکھا۔ بالکونی کے اوپر سے مسٹر پانڈے کے بنگلے کا گیٹ اور بنگلے
آگے سے گذرنے والی چھوٹی سی سڑک کا سارا منظر باغ کے قمقموں کی روشنی میں دکھا
دے رہا تھا۔ میں جانتا تھا اس بنگلے کے باہر سیکریٹ پولیس کے دو ایک آدمی ضرور ڈیو
موجود رہتے ہوں گے۔ اور انہوں نے ایک جینی سوامی کے روپ میں مجھے بنگلے میں
پانڈے کی بیٹی کے ساتھ آتے ضرور دیکھا ہوگا۔ بنگلے کا گیٹ بند تھا۔ باہر ایک گو
چوکیدار سٹول پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ وقت رات کے سوا دس
کا تھا۔ مجھے وہاں سوائے گورکھا چوکیدار کے اور کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میں پیچھے ہٹنے
تھا کہ ایک سایہ سا ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر کوٹھی کے گیٹ کے قریب سے
آگے نکل گیا۔ چند قدم آگے جا کر یہ انسانی سایہ رک گیا۔ یہاں روشنی تھی یہ کوئی دبلا
آدمی تھا۔ اس نے بنگلے کی بالکونی کی طرف چہرہ اٹھا کر تھوڑی دیر دیکھا اور واپس سڑک
دوسری جانب کے درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

یہ سوائے سیکریٹ سروس کے آدمی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے لئے یہ
تعجب کی بات نہیں تھی۔ نیشنل سیکورٹی کے ٹاپ کے آفیسر کی کوٹھی کے باہر خفیہ پو
والوں کی نگرانی ضروری تھی اور یہ بات مسٹر پانڈے کو بھی معلوم ہوگی۔ میں صرف
دیکھنا چاہتا تھا کہ رات کے وقت بنگلے کے باہر سیکریٹ سروس کے آدمی موجود رہتے
نہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ سرکاری اداروں کے سربراہوں اور وزیروں کی کوٹھیں
کے باہر مسلح پولیس پہرہ دیتی ہے مگر سیکریٹ سروس اور خاص طور پر را اور سنٹرل
جینس سروس جیسے بھارتی خفیہ اداروں کے دفاتر اور سربراہوں کی رہائش گاہوں کے
مسلح پولیس نہیں لگائی جاتی تاکہ خوامخواہ لوگوں کی نظریں اس طرف نہ اٹھیں۔
اداروں کو جان بوجھ کر نامعلوم معمولی اور گمنام سا رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں
خاص طور پر مسٹر پانڈے کے بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے نوٹ کیا تھا۔ کہ بنگلے
کے نام کی گجراتی اور انگریزی زبان میں لکھی ہوئی جو تختی لگی تھی اس پر اس کا صرف
لکھا ہوا تھا۔ نیچے را RAW ہیڈ کوارٹر کے چیف کا عہدہ بالکل نہیں لکھا تھا۔

میں اس حقیقت سے باخبر تھا کہ یہ جو انٹیلی جینس کا آدمی بنگلے کے سامنے والے
درختوں میں آتا جاتا نظر آیا ہے اس نے مجھے اندر جاتے دیکھ لیا ہے اور یا تو اس نے اپنی
ڈائری میں نوٹ کر لیا ہوگا اور اگر اس کے پاس کوئی چھوٹا ٹرانسیٹر نہیں ہے تو قریبی ٹیلی
فون بوتھ سے اپنے ادارے کے سربراہ کو بتا دیا ہوگا کہ مسٹر پانڈے کے گھر ایک اجنبی
جینی سوامی جی اس کی بیٹی کے ہمراہ داخل ہوئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خفیہ پولیس
والوں کو کل ہی پتہ چل جائے گا کہ میں مسٹر پانڈے کے بنگلے پر ٹھہرا ہوا ہوں اور کل ہی
سے میری بھی نگرانی شروع ہو جائے گی۔ ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی جائے گی جو میرے
پیچھے لگا رہے گا اور میری نقل و حرکت نوٹ کرتا رہے گا اور جہاں جہاں میں جاتا ہوں اس
سے اپنے باس کو آگاہ کرتا رہے گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ کیونکہ ایک تو مجھے ایسے
خفیہ پولیس والوں سے نمٹنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ دوسرے میں نے اپنی نقل و حرکت
میں محتاط رہنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

میں ٹیرس والے پردے کو ٹھیک کر کے پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور
سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں ٹیلی ویژن سیٹ پڑا تھا۔ ابھی بھارت میں بھی نیا نیا
ٹیلی ویژن یعنی دور درشن آیا تھا اور بلیک اینڈ وائٹ ہی چلتا تھا۔ یہ میں سن 1964ء کی
بات کر رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ان دنوں کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیاں بڑی تیز ہو گئی
تھیں۔ اور بعد میں کشمیری مجاہدین کی پے درپے کامیابیوں سے بوکھلا کر ستمبر 1965ء میں
بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔

ابھی مجھے پوری طرح نیند نہیں آئی تھی۔ غنودگی کے عالم میں تھا کہ مجھے کمرے کی
فضا میں ایک خوشبو سی محسوس ہوئی یہ خوشبو میرے لئے اب اجنبی نہیں تھی۔ یہ لوبان
کی خوشبو تھی۔ چندریکا کی زعفرانی ساڑھی اور اس کے گندمی بدن سے اٹھنے والی خوشبو
تھی۔ میں آنکھیں کھول کر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ روم میں ٹیبل لیمپ کی خواب
آور ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوبان کی خوشبو برابر آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے
پوچھا۔

"چندریکا! کیا تم ہو؟"

مجھے چندریکا کی ہلکی سی نقرئی ہنسی کی آواز آئی۔ چندریکا میرے بیڈ روم میں مو
تھی۔ میں نے کہا۔

"اگر تم میرے کمرے میں آگئی ہو تو میرے سامنے ظاہر کیوں نہیں ہوتیں؟"

چندریکا میرے سامنے ظاہر نہ ہوئی۔ اس کی آواز آئی۔

"میناکشی کے گھر میں آنا مبارک ہو"

میں نے کہا۔

"چندریکا! تم میرے دل کا سارا حال جانتی ہو۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں کیا مشن لے کر تمہارے ملک بھارت میں آیا ہوا ہوں۔ پھر بھی تم مجھ پر شک کرتی ہو؟"

چندریکا کی آواز آئی

"میں تم پر شک کہاں کرتی ہوں؟ میں تو تمہیں ایک خوبصورت نوجوان گجراتی ڈانسر کے گھر میں مہمان بن کر آنے کی مبارک باد پیش کر رہی ہوں"

میں نے چندریکا سے کہا۔

"نہیں نہیں چندریکا جو تم سمجھ رہی ہو وہ بات نہیں ہے۔ مجھے میناکشی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یقین کرو جب سے تمہارے ملک اور تمہاری جنم بھومی بھارت میں داخل ہوا ہوں صرف تم ایک ایسی لڑکی ہو جو مجھے اچھی لگی ہے اور اب تو میں نے تمہیں اپنی بیوی ہونا بھی تسلیم کر لیا ہے"۔

اصل میں اس وقت مجھے ضرورت تھی کہ میں چندریکا کی تھوڑی بہت خوشامد
اگرچہ اس نے مجھے سختی سے کہہ دیا ہوا تھا کہ وہ میری کسی بھی ایسی تخریبی کاررو
شامل نہیں ہوگی اور اس کارروائی میں میری مدد نہیں کرے گی جو اس کی جنم بھو
نقصان پہنچانے والی ہو۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ خوشامد عورت کو بہت پسند ہوتی ہے
کوئی مرد کسی عورت کی تعریف کرے اور اس سے اپنی وابستگی اور محبت کا اظہار ک

وہ پگھل جاتی ہے۔ جب میں نے چندریکا سے اس قسم کی پریم بھری بات کی تو وہ ظاہر ہو گئی آج رات اس نے زعفرانی ساڑھی کی بجائے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ اس ساڑھی میں واقعی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔
کہنے لگی۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے معلوم نہیں کہ تم اپنے دل میں کیا سوچ رہے ہو اور تم نے کیا سوچ کر میری تعریف کی ہے اور مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہے؟"

پھر اس نے میرا اسلامی نام لیا۔ اسے میرے پاکستان والے اسلامی نام کا بھی علم تھا جو میں نے ابھی تک اپنی سچی آپ بیتی پڑھنے والے قارئین کو بھی نہیں بتایا۔ وہ میرا اسلامی نام لے کر مخاطب ہوئی۔

"تم دنیا کی ہر عورت کو بے وقوف بنا سکتے ہو مگر مجھے نہیں۔ کیونکہ تمہارے دل میں جو کچھ ہوتا ہے میں اسے پڑھ لیتی ہوں۔ میں تو صرف تمہارے اس جنم کے مادی جسم کی دیوانی ہوں۔ کیونکہ میرا پچھلے جنم کا خاوند اور کنور پتی صرف تمہارے مادی جسم کی شکل میں موجود ہے۔ تمہارا ذہن تمہارے خیالات اور عقیدے میرے پچھلے جنم کے ہندو خاوند والے نہیں ہیں۔ اگر تم اس جنم میں ہندو پیدا ہوتے تو میں تمہیں کب کی یہاں سے نکال کر پرلاک کو لے گئی ہوتی۔ مگر یہ میری بدقسمتی ہے کہ تم اس جنم میں بھارت کے کسی ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کی بجائے ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہو۔ یہ مجھے میرے برے کرموں کا پھل ملا ہے۔ تم میری تعریف کرو چاہے نہ کرو۔ مجھ سے محبت کرو چاہے نہ کرو۔ میں تو تمہارے اس جنم میں تمہارے بوڑھے ہو کر مر جانے تک تمہارے ساتھ رہوں گی اور جب تمہاری روح تمہاری آتما تمہارے مادی جسم کو چھوڑ کر باہر نکلے گی تو میں اس سے لپٹ کر اسے اپنے ساتھ پرلوک لے جاؤں گی"

میں نے بھی کھلے دل سے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ میری روح دوسرے جنم میں تم سے محبت کرے، تمہیں اپنی پیاری بیوی سمجھے تو پھر مجھے صرف اتنا بتا دو کہ دیولالی کے ریلوے اسٹیشن سے اسلحہ لے کر ملٹری ٹرین کس روز اور کس وقت جموں توی جا رہی ہے۔"

چندریکا کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔ وہ بولی۔

"میں نے تمہیں پہلی اور آخری بار بتا دیا تھا کہ میں تمہاری کسی ایسی کارروائی میں شامل نہیں ہوں گی جس کا مقصد میری جنم بھومی بھارت کو نقصان پہنچانا ہو"

میں نے کہا۔

"لیکن تم میری کاروائی میں برابر کی شریک ہو۔ تم نے جو مجھے میناکشی اور مسٹر پانڈے تک پہنچانے کی غرض سے جو شعبدہ بازیاں میرے ذریعے کی ہیں تو یہ بھی بھارت کے خلاف تخریبی کارروائی میں شریک ہونے کے برابر ہی ہیں"

چندریکا نے سخت چڑ کر کہا

"یہ میری مجبوری تھی۔ بس میں تمہاری اس حد تک ہی مدد کر سکتی ہوں۔ اس کے آگے میں تمہاری کسی کمانڈو کارروائی کسی کمانڈو مشن میں نہ شریک ہوں گی نہ تمہاری کوئی مدد کروں گی۔ آئندہ مجھے ہرگز ہرگز اس قسم کی کوئی بات نہ کہنا۔"

میں چندریکا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ بھی ہو میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی دل جوئی کرنے کے انداز میں کہا۔

"اچھا میری جان! میں آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کروں گا۔ میرا تم سے وعدہ رہا"

چندریکا کے چہرے پر ایک عجیب دل آویز سی مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگی۔

"سوامی! تم نے مجھے میری جان کہا ہے۔ مجھے اپنے پچھلے جنم کا وہ زمانہ یاد آ گیا ہے جب میں اور تم راجستھان کے صحراؤں میں سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ تم چاندنی رات میں میرے سامنے شوا ڈانس کرتے تھے۔ پھر میں بھی تمہارے ساتھ رقص میں شامل ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں دیر تک صحرا کی چاندنی میں رقص کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی کسی طرف کوئی مور بھی آ کر ہمارے ساتھ رقص میں شامل ہو جاتا تھا۔ پھر جب رقص تھم جاتا تو ہم جھیل کنارے بیٹھ کر پریم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کاش! تمہیں تمہاری روح کو وہ ساری باتیں یاد آ جائیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کے بارے میں دل میں کوئی برا خیال بھی نہ لایا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسے سب پتہ چل جاتا ہے خوامخواہ اسے ناراض کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اتنی بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ میرے کمانڈو مشن میں میری کوئی مدد نہیں کرے گی۔ میں نے دل میں آخری بار فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ میں اس سے کسی قسم کی مدد نہیں مانگوں گا۔ وہ بڑی محبت کے موڈ میں تھی۔ پہلے روز کی طرح میرے آگے ہاتھ باندھ کر بولی۔

"میرے کنور جی! میرے سوامی! جب میں راجستھان کے راجہ کے محل میں شاہی نرتکی ہوا کرتی تھی اور تم شاہی نرت کار ہوتے تھے تو تمہارے پاس بڑے روپے پیسے ہوتے تھے۔ اب میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ تمہیں تھوڑے سے پیسے لینے ہوتے ہیں تو تم اپنے احمد آباد والے دوست سے مانگتے ہو۔ مجھ سے اپنے خاوند اپنے پتی دیو کی یہ غریبوں ایسی حالت دیکھا نہیں جاتی۔ اسی لئے یہ میرا کنگن بازار میں لے جا کر فروخت کر دینا۔ تمہیں کافی رقم مل جائے گی۔"

اور اس نے اپنی کلائی میں سے کنگن اتار کر مجھے دے دیا۔ کنگن چاندی کا تھا اور اس پر ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ میں نے شکریے کے ساتھ کنگن رکھ لیا۔ تب میرے

دل میں ایک خیال آیا اور میں نے اس سے کہا۔

"چندریکا! تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو اور بھگوان کو اپنے سامنے جان کر وعدہ کرو۔"

اس نے پوچھا۔

"کونسا وعدہ؟"

میں نے کہا۔

"تم نے میرے احمد آباد والے دو۔ت کا ذکر لیا ہے جس سے میں نے کچھ رقم لی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں میری یہاں کی ساری سرگرمیوں کی پوری خبر ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی میری سرگرمیوں کے بارے میں کسی کے آگے کوئی ذکر نہیں کرو گی۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔

"میرے کنور جی! میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم بھارت درش میں رہ کر جو کچھ کر رہے ہو اور آگے چل کر جو کچھ کرو گے اس کی نہ تو میں خبر رکھوں گی اور اگر مجھے خبر بھی ہو گئی تو کسی کو کچھ نہ بتاؤں گی"

میں نے کہا۔

"اپنی جنم بھومی کی محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر بھی میری تخریبی سرگرمیوں کا راز کسی کو نہ بتاؤں گی۔ یہ بھی وعدہ کرو؟

چندریکا نے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی جنم بھومی بھارت کی محبت سے مجبور ہو کر بھی میں تمہاری تخریبی سرگرمیوں کا کسی کے آگے ذکر نہیں کروں گی۔ یہ وعدہ میں اپنے بھگوان کو حاضر جان کر یعنی سا کھشک جان کر تم سے کرتی ہوں۔ اب تو تمہیں خوش ہو جانا چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ اب میں تم سے بہت خوش ہوں"

پھر مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"چندریکا! تم نے مجھے میناکشی اور اس کے باپ کو اپنے قابو میں کرنے کی خاطر جو طلسمی گر اور شعبدے بتائے تھے اس سے پہلے تم نے مجھ سے بھی وعدہ لیا تھا کہ زندگی میں میں تمہاری ایک خواہش ضرور پوری کروں گا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ خواہش کیا ہے؟"

چندریکا نے شرماتے اور کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ مگر اپنی یہ خواہش وقت آنے پر تم سے کہوں گی۔ ابھی اس کے اظہار کرنے کا وقت نہیں آیا۔ اب میں جاتی ہوں---؟

میں نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ جاتے جاتے وہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولی۔

"میری ایک بات یاد رکھنا۔ میناکشی کو زیادہ اپنے قریب مت آنے دینا۔ اور ہاں۔ تم اپنی داڑھی کیوں نہیں بڑھا لیتے؟ پچھلے جنم میں تمہاری بڑی خوبصورت راجپوتوں ایسی سیاہ داڑھی ہوا کرتی تھی۔"

اتنا کہہ کر وہ مسکرائی اور میرے بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف گئی اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چاندی کے کنگن کو غور سے دیکھا۔ اس میں چھ سات قسم کے رنگ برنگے ہیرے اور کچھ سفید چھوٹے موتی جڑے ہوئے تھے۔ مجھے پیسوں کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی تھی تو کریم بھائی نے احمد آباد کے مسلمانوں کی جو خفیہ رفاہی تنظیم قائم کر رکھی تھی اس کے فنڈ میں سے نکال کر مجھے دے دیتا تھا لیکن چندریکا اگر یہ کنگن مجھے دے گئی تھی تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ کل کسی وقت صرافہ بازار جا کر اسے بیچ ڈالوں گا۔ آخر وہ کنگن مجھے اپنے پاس رکھ کر کرنا بھی کیا تھا۔

دوسرے دن میں دیر سے اٹھا۔ معلوم ہوا کہ مسٹر پانڈے اپنے آفس جا چکے ہیں
میناکشی گھر میں موجود تھی۔ ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے میناکشی سے
کہا۔

"میں سوامی نارائن جی کے مندر پر ارتھنا کرنے جا رہا ہوں۔ دوپہر کے بعد
واپس آجاؤں گا"

وہ بڑی عاجزی سے بولی۔

"میرے سوامی! میرے گورو دیو! سوامی جی کے آگے میرے لئے بھی ضرور
پرارتھنا کرنا"

میں نے کہا۔

"ضرور کروں گا"

وہ بولی۔

"میں آپ کو سوامی جی کے مندر میں چھوڑ آتی ہوں"

میں اصل میں سوامی جی کے مندر میں نہیں بلکہ کنگن فروخت کرنے احمد آباد
صرافہ بازار میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ ہمیں مہاویر جی کا آدیس ہے کہ سوامی نارائن
کے مندر اکیلا ہی جاؤ۔"

میناکشی خاموش ہو گئی۔ میں نے کنگن اپنی واسکٹ کی جیب میں سگریٹ لائیٹر ٹرانسمیٹر
کے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ میں اکیلا ہی مسٹر پانڈے کے بنگلے سے نکل کر ایک طرف روانہ
ہو گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ صرافہ بازار کہاں پر ہے۔ میں کوٹھیوں اور بنگلوں کے
علاقے سے نکل کر ایک بڑے بازار میں آگیا جہاں بسیں ویگنیں رکشے وغیرہ چل رہے
تھے۔ میں نے ایک خالی ٹیکسی کو روک لیا۔

بنگلے سے نکلتے ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک آدمی میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ یہ
پولیس کا آدمی ہی ہو سکتا تھا۔ جب میں ٹیکسی میں سوار ہونے لگا تو میں نے بڑی چالاکی سے

پیچھے دیکھا تھا۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی بھی ایک ٹیکسی کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر رہا
تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت صرافہ بازار جانا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ میرے صرافہ بازار
جانے اور دکان پر کنگن فروخت کرنے کی ساری رپورٹ ممکن ہے مسٹر پانڈے تک بھی
پہنچ جائے۔ میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔

"سوامی نارائن جی کے مندر چلو"

ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میں نے تھوڑی دور جا کر سامنے والے شیشے میں سے دیکھا۔
خفیہ پولیس والے کی ٹیکسی بھی ہماری ٹیکسی کے پیچھے پیچھے تھوڑا فاصلہ ڈال کر چلی آ رہی
تھی۔ میں اس خفیہ پولیس والے کو دھوکا دے کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا چاہتا
تھا اور میرے ایسے ٹرینڈ کمانڈو کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

میری ٹیکسی شہر کے مختلف بازاروں میں سے گذرتی سوامی نارائن جی کے مندر کی
طرف جا رہی تھی۔ میں نے یہ مندر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کسی جین بھگت کا مندر
ہی تھا۔ دو ایک بازاروں میں سے گذرنے کے بعد میں پیچھے مڑ کر عقبی شیشے میں سے دیکھ
لیتا تھا۔ خفیہ پولیس والے کی ٹیکسی برابر میرا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ابھی
میں کوئی مجرم یا غیر ملکی جاسوس نہیں تھا۔ وہ تو صرف میری نقل و حرکت کی نگرانی کرنے پر
مامور تھا اور اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا۔

ٹیکسی ایک بازار کا موڑ گھوم کر دوسرے بازار میں داخل ہوئی تو سامنے سوامی نارائن
جی کا مندر تھا۔ مندر کے باہر کچھ گاڑیاں اور رکشے کھڑے تھے۔ پجاری اندر آجا رہے
تھے۔ ان میں عورتیں زیادہ تھیں۔ میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ اور مندر کے اندر داخل ہو
گیا۔ دالان میں بڑی سی قنات لگی تھی۔ باہر سے آئے ہوئے یاتری بھی وہاں بیٹھے تھے۔
جین مت میں بھی بدھ کی طرح بتوں کی پوجا سے منع کیا گیا ہے مگر مہاویر وردھمن کی وفات
کے بعد اس کے پجاریوں نے خود اس کا بت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی اور یہ پوجا
اب تک چلی آ رہی تھی۔ دالان میں ایک درخت کے نیچے ایک ننگا فقیر لیٹا ہوا تھا۔ ہندو
عورتیں اور مرد اس کے آگے حلوہ پوری اور دہی کے دونے رکھ رہے تھے۔ وہ بالکل

الف ننگا تھا اور ہندو عورتوں کو ذرا سی بھی شرم حیا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ سار
تفصیلات میں اپنی طرف سے نہیں لکھ رہا۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کا مظاہرہ آج بھی پاکستا
کی نئی نسل کے نوجوان ہندوستان کے شہروں خاص طور پر گجرات کاٹھیاواڑ کے شہروں ا
قصبوں میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں بنارس متھرا گیا الہ آباد ا
ناگ پور میں بھی ننگے جٹا دھاری سادھو عام دیکھنے میں ملتے ہیں۔ ہندو نوجوان اور بوڑ
عورتیں ان الف ننگے سادھوؤں کی بھی پوجا کرتی ہیں اور ان کے آگے دودھ مکھن حل
پوڑی پیش کرتی ہیں۔ مگر جن شہروں میں جین دھرم کا زیادہ اثر ہے وہاں تو الف ننگے فق
گلیوں بازاروں میں چلتے پھرتے، دکانوں پر کھڑے ہو کر لوگوں سے حلوہ پوڑی مٹھائ
سے اپنی سیوا کراتے اکثر نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جین مت میں ایک فر
کا نام ڈگمبر ہے۔ ڈگمبر فرقے کے لوگ گھروں میں بھی الف ننگے رہتے ہیں۔ اگر
اب گھروں میں جینی لوگوں کے ننگے رہنے کا رواج نہیں رہا لیکن اس فرقے کے سا
جوگی آج بھی ننگے پھرتے ہیں۔

یہاں میں پاکستان کی نئی نسل سے ایک سوال پوچھتا ہوں مجھے بتائے اگر پاکستان نہ
اور اس قسم کے الف ننگے سادھو آپ کے گھروں اور بہو بیٹیوں کے سامنے سے ا
گذرتے رہتے اور آپ انہیں روک بھی نہ سکتے تو آپ کا ہندو قوم کے ساتھ زندہ ر
اور زندگی بسر کرنا ایک عذاب نہ بن جاتا؟ اس لئے ہمارے قائد اعظم نے دو ٹوک اعلا
کر دیا تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں رہتی ہیں۔ ایک ہندو اور دوسری مسلمان اور ا
دونوں کے رہن سہن اور تہذیب و کلچر اور مذہب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی
مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطہ زمین کا ہونا لازمی اور قدرتی امر ہے جہاں وہ اپنے د
اور اپنی تہذیبی روایات کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

میں جذبات کی رو میں بہہ کر کہاں سے کہاں نکل گیا ہوں۔ اصل میں جب پاکستان
نئی نسل اور پاکستان کے استحکام کا سوال آتا ہے تو میں جذباتی بھی ہو جاتا ہوں۔ کیو
پاکستان ہم مسلمانوں کے لئے کتنا ضروری تھا؟ اس کی نئی نسل کو خبر نہیں ہے۔ پاکستان

لئے ہمارے اجداد نے بلکہ خود ہم نے کتنی بڑی قربانیاں دی ہیں؟ اس کی بھی نئی نسل کو خبر
نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی نئی نسل کو بتایا ہی نہیں گیا کہ پاکستان جب بن
رہا تھا تو مسلمانوں کو کس بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ عورتوں کے ساتھ کیسی کیسی
درندگی ہو رہی تھی۔ کیسے کیسے ماؤں کے شیر جوان بیٹوں کو مکانوں میں بند کر کے آگ میں
زندہ جلایا جا رہا تھا۔

بہر حال پاکستان تو قائم و دائم رہنے کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم و دائم رہے
گا اور ہماری آنے والی نسلوں کو اس خطہ زمین اس اسلامی ملک پاکستان کی قدر و قیمت کا
ضرور اندازہ ہو جائے گا۔

اب میں اپنی داستان اور کمانڈو آپ بیتی سنانے کی طرف واپس آتا ہوں۔ میں نے
آپ بیتی کا سلسلہ وہاں چھوڑا تھا جہاں میں احمد آباد کے مشہور جین مندر سوامی نارائن کے
مندر میں آ گیا تھا۔ چندریکا کا دیا ہوا کنگن میری جیب میں تھا اور سیکریٹ پولیس کا آدمی
میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ یہ مندر کافی بڑا مندر تھا اور اس کے دو تین دروازے تھے۔ میں
نے چل پھر کر اس کا جائزہ لیا تھا۔ میں نے اپنا تعاقب کرنے والے سیکریٹ پولیس کے
آدمی کو اپنے پیچھے مندر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ مندر میں
داخل ہو چکا ہے اور مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ سیکریٹ سروس کے آدمی بڑے منجھے
ہوئے اور تجربہ کار آدمی ہوتے ہیں۔ وہ جس پر ایک بار نگاہ رکھ لیں پھر اسے اپنی نگاہوں
سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ اب میرا کمال اور میری کمانڈو ٹریننگ کا تقاضا یہ تھا کہ میں
اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ میں مندر کے
ایک بڑے ہال کمرے میں آ گیا۔ یہاں مہاویر وردھمن کا ننگا بت بنا ہوا تھا۔ پجاری اس کے
قدموں میں مہنت کے پاس پھل مٹھائیاں اور پیسے رکھ رہے تھے۔ اس ہال کمرے کا ایک
دروازہ پچھلی طرف کھلتا تھا۔ یہاں پجاری عورتوں مردوں کا کافی رش تھا۔ میں بھی اس
رش میں گھس گیا اور جھک کر لوگوں کے درمیان سے ہوتا دوسرے دروازے میں سے
نکل گیا۔ دوسری طرف ایک باڑھ بنی ہوئی تھی۔ میں اس میں سے بھی گذر گیا اور اب

مندر کی عقبی سڑک پر تھا۔ یہاں مجھے جو پہلا رکشا نظر آیا اس میں بیٹھ گیا اور رکشا وا۔
سے کہا۔

"چلو"

یہ موٹر رکشا تھا۔ رکشا سٹارٹ ہو اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ میں نے پیچھے مڑ
دیکھا۔ سڑک خالی تھی۔ میں سیکریٹ پولیس والے کی زد سے نکل آیا تھا مجھے ہنسی آگئ
اصل میں خفیہ پولیس والا بھی مجھے گرفتار کرنے کے لئے میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔
صرف میری نقل وحرکت کی رپورٹ اوپر پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ اس کا روٹین کا یعنی معمول
کام تھا۔ آخر میں بھارت کی اتنی اہم سیکریٹ ایجنسی را کے چیف کے گھر مہمان بن کر
ہوا تھا۔ خفیہ پولیس کا فرض تھا کہ وہ میری نگرانی کرے اور ضمنی بھرے۔ مجھے بھی اُ
جڑاؤ کنگن فروخت نہ کرنا ہوتا تو میں خفیہ پولیس کے آدمی سے بچنے کی بالکل کوشش
کرتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ متعلقہ محکمے کو یہ رپورٹ دے کہ را کے چیف کے ہاں
جینی بھگت ٹھہرا ہوا ہے وہ صرافہ بازار میں کنگن فروخت کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا
یہ رپورٹ میناکشی کے باپ مسٹر پانڈے کو بھی ملے گی۔ میں اپنے بارے میں مسٹر پانڈے
کسی قسم کے شکوک وشبہات میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

موٹر رکشا ذرا آگے گیا تو ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا کہ صاب کہاں جائے گا۔
میں نے کہا۔

"صرافہ بازار لے چلو"

اس نے کہا۔

"یہاں صرافہ بازار تو کوئی نہیں ہے لا بازار لئے چلتا ہوں۔ وہاں صرافوں کی کچھ
دکانیں ہیں"

احمد آباد کا لا بازار ہمارے لاہور کے بالکل انار کلی بازار جیسا ہے۔ فرق صرف اتنا
کہ انار کلی کے مقابلے میں دوگنا چوڑا ہے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی
اس بازار کا نام لا بازار (LAW) کس نے اور کیوں رکھا ہے۔ اسی بازار میں سکوائش

نارنگی آم کے جوس کی دکانیں بھی تھیں اور ساڑھیوں ملیاری اور ریڈی میڈ کپڑوں کی
دکانیں بھی تھیں۔ بازار کے اندر ایک بازار تھا جہاں صرافوں اور جوہریوں کی دکانیں نظر
آئیں۔ میں ایک دکان میں گھس گیا۔ ایک زرد رنگ کا بھاری توند والا گجراتی سیٹھ گدی
پر بیٹھا کسی سے فون پر گجراتی زبان میں فون کر رہا تھا۔ میں دکان کے اندر کرسی پر اسی
طرح بیٹھ گیا کہ بازار سے گذرنے والے مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سیٹھ فون بند کر کے
میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے واسکٹ کی جیب سے کنگن نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔
وہ کبھی کنگن کو اور کبھی میری طرف دیکھتا۔ میرا خیال ہے یہی سوچ رہا ہو گا کہ میرا حلیہ تو
جین مت کے سادھو سنتوں والا ہے اور پھر یہ کنگن میرے پاس کہاں سے آگیا۔ میں نے
اس کا شک دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بتایا کہ یہ میری بڑی موسی کا خاندانی
کنگن ہے۔ اس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے واسطے ولایت جا رہا ہے۔ موسی کے پاس
اپنے بیٹے کو ولایت بھیجنے کے لئے اتنے پیسے نہیں تھے۔ چنانچہ وہ اپنا یہ خاندانی کنگن
فروخت کرنا چاہتی ہے۔

گجراتی سیٹھ نے میری وضاحت کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ بار بار کنگن پر جڑے
ہوئے ہیرے موتیوں کو آتشی شیشے کی مدد سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کنگن کوئی
نایاب قسم کی چیز ہے۔ اس نے کنگن میرے سامنے شیشے کے کاؤنٹر پر رکھ دیا اور بظاہر بڑی
بے نیازی سے بولا۔

"یہ پرانے ٹائپ کا ہے آج کل اس کا فیشن نہیں ہے۔ بولو اس کا کیا لے گا؟"

مجھے معلوم تھا کہ سیٹھ جھوٹ بول رہا ہے۔ کنگن انتہائی قیمتی تھا۔ مگر اس سے کوئی
کاروبار کرنے نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی مجھے ایک معقول رقم مل جاتی تو میرے لئے بہت
تھا۔ میں نے کہا۔

"سیٹھ تم جو دے سکتا ہے بول دو"

سیٹھ نے ایک بار پھر کنگن کو غور سے دیکھا اور بولا۔

"ہم تمہیں اس کا بیس ہزار روپیہ دے گا۔ اس کے آگے ایک پیسہ بھی نہیں

دے گا۔"

کنگن کم از کم دو اڑھائی لاکھ کی مالیت کا ہو گا۔ لیکن میرے لئے بیس ہزار ہی کافی تھا۔ ۱۹۶۰ء کے زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سیٹھ۔ کنگن رکھ لو اور بیس ہزار روپیہ نکالو"

سیٹھ نے کنگن کاؤنٹر کی دراز میں رکھ لیا اور ہزار ہزار روپے کے بیس نوٹ گن کر میرے حوالے کر دیئے نہ اس نے مجھ سے رسید لکھوانے کا کہا نہ میں نے رسید کی کوئی بات کی۔ بیس ہزار روپے واسکٹ کی اندر والی جیب میں ڈال کر میں بازار میں آگیا۔ اب مجھے سی آئی ڈی والے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اگر وہ مجھے لا بازار میں گھومتے پھرتے دیکھ رہا ہے تو دیکھتا رہے۔

وہاں سے نکل کر میں دو بارہ نارائن جی کے مندر میں واپس آگیا۔ یہاں نقلی قسم کی پوجا وغیرہ کی۔ مہنت نے میری کلائی میں منگل سوتر دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج آپ تو ودوان ہیں۔ مجھے کوئی سیوا بتایئے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"مہنت جی! میں تو مہاویر جی کا بھگت ہوں۔ اپنے ہاتھ سے گیندے کے دو پھول دے دیں"

مہنت نے مجھے گیندے کے پھولوں کا پورا ہار دے دیا۔ میں نے ہار اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور مندر کے گیٹ کے آگے سے ٹیکسی لے کر واپس مسٹر پانڈے کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے میناکشی سے کہا تھا کہ میں دوپہر کے بعد آؤں گا مگر میرا کام جلدی ہو گیا تھا۔ میں اپنے اوپر والے کمرے میں آگیا۔ میں نے بیس ہزار کے نوٹ اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہی رہنے دیئے۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ جمو توی جانے والے ملٹری ٹرین کی معلومات حاصل کرنے کے لئے مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔

احمد آباد کا موسم اس روز حبس آلود سا تھا۔ ٹیرس کی طرف کھلنے والی لمبی کھڑکیوں

سفید پردے گرے ہوئے تھے۔ میرے پورشن کا ایئر کنڈیشنر بھی چل رہا تھا۔ کمرے میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ اتنے میں مجھے باہر موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑکیوں کے پاس آگیا۔ پردہ ذرا سا ہٹا کر شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ مسٹر پانڈے کی کار بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ گاڑی میں اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے جو دور سے مجھے یورپین لگے۔ کیونکہ ان کے رنگ گورے تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا واپس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ میناکشی کی گجراتن ملازمہ نے جس کو گھر میں سب بائی جی کہتے تھے مجھے اوپر جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے لئے ٹھنڈا مشروب اور کافی بنا کر لے آئی۔

"صاحب کو کافی اچھا لگتا ہے۔ اس لئے کافی بھی لے آئی ہوں"

میں نے ہنس کر کہا۔

"بائی! تم بڑی اچھی ہو۔"

اس نے ٹرے میز پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"سوامی مہاراج! میرا مالک روز رات کو شراب پی کر مجھے پیٹتا ہے۔ اس کو ٹھیک کر دو۔ آپ مہاویر کے بھگت ہیں۔ مجھ پر کرپا کرو۔"

میں نے ٹھنڈے مشروب کے دو گھونٹ پی کر کافی کی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔

"بائی چنتا نہ کرو۔ ہم تمہارے لئے ضرور پرارتھنا کرے گا۔ تمہارا مالک تمہارا غلام بن جائے گا"

وہ بڑی خوش ہوئی اور ساڑھی کے پلو سے میز کا سرا صاف کرنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"نیچے کون آیا ہے گاڑی میں؟"

بائی بولی۔

"مالک آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کیا اکیلے ہی آئے ہیں دفتر سے؟"
وہ کہنے لگی۔
"نہیں صاحب۔ مہمان بھی ہیں گورے ہیں۔ یہ کبھی کبھی آیا کرتے ہیں۔ اچھا سوامی جی۔ میں چلتی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے گھنٹی بجا کر بلا لینا"
میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے بائی"
وہ چلی گئی تو میں سوچنے لگا کہ یہ گورے یورپ کے کس ملک کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ضرور مسٹر پانڈے نے ان سے کوئی بڑے راز کی باتیں کرنی ہوں گی جو انہیں ساتھ لے کر آفس سے بنگلے پر آئے ہیں۔
اتنے میں میرے کمرے کی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے میناکشی کی آواز آئی۔
"سوامی! آپ نارائن جی کے مندر سے درشن کر کے واپس آگئے ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ آپ کو وہاں دیر لگے گی۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ میں شام کو واپس آؤں گا"
میں نے کہا۔
"مہاویر جی کے آگے خاص پرارتھنا کرنی تھی۔ وہ کری اور واپس آگیا۔ ایک دو بازاروں کی سیر ضرور کی ہے۔ تمہارا احمد آباد شہر بڑا خوبصورت شہر ہے"
وہ خوش ہو کر بولی۔
"میں آرہی ہوں۔ آپ جائیں نہیں"
اس نے نمسکار کہہ کر فون بند کر دیا۔ میناکشی قریب ہی کسی جگہ سے فون کر رہی تھی۔ دس منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اس کی کار بنگلے میں داخل ہوئی۔
کمرے میں آتے ہی اس نے معمول کے مطابق میرے قدم چھوئے اور ادب سے میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"میں چوک والے شاپنگ سنٹر میں تھی۔ میرے دل نے کہا فون کروں۔ گورو جی آگئے ہوں گے اور آپ آگئے ہوئے تھے۔"
وہ حسب معمول مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔
"کل رات ڈانس سنٹر میں رینالینی دیوی آپ کا پوچھ رہی تھی۔ کہنے لگی سوامی جی سے کہنا مجھے بھی درشن دے دیا کریں"
میں نے بے نیازی سے کہا۔
"اسے کہو مہاویر جی کی طرف دھیان لگائے۔"
اس سے پہلے کہ میناکشی کوئی اور بات کرتی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے ڈیڈی اچانک دفتر سے گھر کیوں آگئے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟ وہ بولی۔
"جب انہیں کسی باہر کے آدمیوں سے کوئی خاص میٹنگ کرنی ہوتی ہے تو انہیں لے کر گھر آجاتے ہیں۔ وہ سیکریٹ میٹنگ دفتر میں کبھی نہیں کرتے"
میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے بظاہر بڑی بے پروائی سے پوچھا۔
"کیا کوئی خاص مہمان آئے ہیں؟"
میناکشی نے بڑی راز داری سے میری طرف جھک کر کہا۔
"آپ سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ اسرائیلی یہودی ہیں۔ دلی میں ہمارے رکھشا منتری کے فوجی کنسلٹنٹ ہیں مہینے میں دو ایک بار ہمارے ڈیڈی سے سیکریٹ میٹنگ کرنے دلی سے احمد آباد ضرور آتے ہیں۔"
میں میناکشی سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے موضوع بدلتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہا۔
"گورو جی! کل سے ناف کے نیچے ابھار پر پھر درد ہونے لگا ہے۔ مجھ پر کرپا کیجئے۔ شو جی بھگوان سے کہہ کر مجھے اچھا کر دیں"
میں نے کہا۔
"اچھا میں تمہاری خاطر آج رات شو جی بھگوان سے پرارتھنا کروں گا۔ اس کے

بعد تم اچھی ہو جاؤ گی"

میناکشی نے میرے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"گورو جی! میں جیون بھر آپ کا ابھاری رہوں گی۔ آپ کی سیوا کروں گی۔ بس میری یہ بیماری دور کر دیں"

میں نے اسے پوری تسلی دی تو اسے بے حد اطمینان ہو گیا۔ اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں شروع کر دیں کہ میں جب انڈیا کی سب سے بڑی ڈانسر بن جاؤں گی تو آپ کو سونے کا تاج پہناؤں گی۔ آپ کی آرتی اتاروں گی۔ میں ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اصل میں میرا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ انڈین گورنمنٹ نے اسرائیلی حکومت کے ساتھ فوجی مشاورتی امور کے سلسلے میں ایک خفیہ معاہدہ کر رکھا ہے اور اسرائیلی فوجی ماہرین بھارت میں موجود ہیں اور پاکستان کے خلاف بھارت حکومت کی تخریبی کارروائیوں میں پوری طرح شامل ہوتے ہیں۔ خاص طور کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدین کی تحریک آزادی کے کچلنے کے لئے اسرائیلی کمانڈو بھی سرگرم عمل ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسرائیل بھی پاکستان کا دشمن ہے اور بھارت بھی پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کی ناپاک کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ یہ پاکستان کے دو دشمنوں کا گٹھ جوڑ تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نیچے مسٹر پانڈے کے پاس جو اسرائیلی فوجی ماہرین دلی سے خاص طور پر آئے ہیں اور وہ کس مسئلے پر بات چیت کر رہے ہیں۔ یہ معلوم کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس معاملے میں میناکشی سے کچھ پوچھنا یا اسے اپنے اعتماد میں لینا میرے مشن کے لئے ایک خطرناک اقدام ثابت ہو سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس نقطے پر غور کرتا رہا اور میناکشی سے اس معاملے میں پھر کوئی بات نہ کی۔ وہ پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی۔ اسے خیال آسکتا تھا کہ آخر میں اسرائیلی فوجی مشیروں کے بارے میں اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہا ہوں۔

میناکشی برابر اپنی بیماری اور اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کئے جا رہی تھی۔ پھر

اس نے گھڑی دیکھی اور بولی۔

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اچھا ہوا میں بھی آگئی۔ ہم اکٹھے بھوجن کریں گے"

کھانے کے لئے بھوجن کا لفظ مجھے بڑا زہر لگتا تھا مگر اس وقت میں میناکشی کو یہ لفظ بولنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔

"میں ابھی آتی ہوں"

یہ کہہ کر میناکشی نیچے چلی گئی۔ باہر سے کار سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ پردہ ذرا سا ہٹا کر نیچے دیکھا۔ مسٹر پانڈے کا ڈرائیور گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی کا انجن سٹارٹ ہو گیا ہوا تھا۔ اور مسٹر پانڈے اپنے اسرائیلی مہمانوں سے گاڑی کے باہر کھڑے ہاتھ ہلا کر انہیں رخصت کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ مسٹر پانڈے خود دفتر نہیں جا رہے تھے۔ میں نے اسرائیلی مہمانوں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ دور سے مجھے ان کے گورے چہرے ہی نظر آ رہے تھے۔ یہ تین اسرائیلی فوجی مشیر تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک بریف کیس تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی بنگلے کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ مسٹر پانڈے واپس مڑے میں بھی کھڑکی سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں واسکٹ کی جیب میں سے سگریٹ لائٹر والا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت اپنے ماسٹر سپاہی کریم بھائی سے کچھ اہم باتیں کرنی بہت ضروری تھیں۔ مگر میں ریڈیو ٹرانسمیٹر پر اس سے یہ باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ سیڑھیوں پر میناکشی کے قدموں کی خاص آواز آئی۔ وہ جس انداز سے سیڑھیاں چڑھتی تھی میں اس سے آشنا تھا۔ میں نے لائیٹر جلدی سے جیب میں رکھ لیا۔ میناکشی نے آتے ہی مسکرا کر کہا۔

"ڈیڈی کہتے ہیں ہم سب کھانا مل کر کھائیں گے۔ انہوں نے مجھے یہ پوچھنے کے لئے بھیجا ہے کہ اگر آپ کو پسند ہو تو کھانا نیچے کھا   یا ڈیڈی بھی اوپر ہی آجائیں"

میں نے بے تعلق سا ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ نیچے ہی کھالیں گے۔"

مسٹر پانڈے شوگر کے مریض تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے تو دم پھول جاتا تھا۔ میں او
میناکشی نیچے اترے تو وہ میرے سواگت کو سیڑھیوں کے پاس ہاتھ باندھے کھڑے تھے
میرے گھٹنے چھو کر نمسکار کہا اور بولے۔

"شما کر دیجئے گورودیو! سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو سانس پھول جاتا ہے۔ میری یہ
تکلیف بھی دور کر دیں۔ آپ انتریامی ہیں۔"

میں بڑے پہنچے ہوئے سادھوسنت کی طرح ایک ہاتھ آشیرباد دینے کے انداز میں او
اٹھائے ان کے آگے آگے چلتا ڈرائینگ روم میں آگیا۔ پھر وہی سبزیوں والا پھیکا کھانا لگا
تھا۔ کھانے پر مسٹر پانڈے میناکشی کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ مجھے اس کی بھی ف
ہے۔ کہیں اچھا سا یوگ مل جائے تو یہ بھی اپنے گھر آباد ہو۔ میناکشی نے کہا۔

"ڈیڈی! میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔"

مسٹر پانڈے مسکرانے لگے۔

"سوامی جی! آپ ہی اسے کوئی سیکھشا دیں یہ آپ کی بھگتنی ہے۔"

مسٹر پانڈے نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"آج صبح ڈاکٹر میری ایکسرے رپورٹ دے گیا ہے۔ ایکسرے میں میرے
گردے کی تین پتھریاں صاف نظر آرہی ہیں۔ آپ کی کرپا سے میری کڈنی کا
درد تو ختم ہو گیا ہے اب ان پتھریوں کو بھی ختم کرا دیں۔ میں تو آپ کے چرن
دھو کر پیوں گا۔"

میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ مسٹر پانڈے کی دو پتھریاں ضرور ختم کرا
چاہئیں اور رات کو چندریکا کو بلانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دو پتھریاں غائب کرنے میں
چندریکا کامیاب ہو گئی تو مسٹر پانڈے میرا مزید معتقد ہو جائے گا۔ تیسرے پتھری میں
دوسرے موقع کے لئے رہنے دوں گا۔ میں نے اسے کہا۔

"پانڈے جی! تمہارے گھر میں قدم رکھا ہے تو مہاویر جی کی کرپا سے اس گھر کے

سارے کشٹ دور کر دوں گا۔ آج رات مہاویر جی کے چرنوں میں حاضری دوں
گا۔"

مسٹر پانڈے کا زرد چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ جلدی سے الماری میں سے ایکس رے
کی فلم نکال کر لے آیا۔ مجھے دکھائی۔ اس میں ایک گردے میں واقعی تین پتھریاں واضح
طور پر نظر آرہی تھیں۔ دو پتھریاں بڑی تھیں ایک تھوڑی چھوٹی تھی۔ رات کو میں نے
مہاویر جی کے چرنوں میں حاضری دینے کا جھوٹا ڈرامہ رچایا۔ اپنے بیڈ روم کی صفائی کرائی
اگربتیاں لگائیں۔ پھولوں کے ہار لا کر رکھے۔ تین دیئے جلائے اور ہدایت کر دی کہ رات
کے وقت کوئی آدمی کوئی نوکرانی میرے بیڈ روم کے قریب سے بھی نہ گذرے۔

میں پلنگ کے پاس قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میناکشی میرے آگے پیچھے پھر رہی
تھی۔ میں نے اسے حکم دیا۔

"اب تم بھی چلی جاؤ اور صبح تک یہاں مت آنا۔ جاؤ"

وہ ڈر کر فوراً چلی گئی۔

جب میں بیڈ روم میں اکیلا رہ گیا تو اٹھ کر سب سے پہلے اگربتیاں بجھائیں کیونکہ ان
کی تیز خوشبو سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔ دیئے بھی بجھا دیئے۔ پلنگ پر تھوڑی دیر لیٹ کر
آرام کیا۔ اس وقت رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔ پورے بارہ بجے میں پلنگ سے اتر کر
صوفے پر آکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ چندریکا کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ میری تیسری
آواز پر کمرے میں ایک دم سے لوبان کی خوشبو پھیل گئی۔ میں خوش ہوا۔ دوسرے لمحے
چندریکا میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی اور میری طرف گھور کر دیکھ رہی تھی۔
کہنے لگی۔

"تم جو کھیل کھیل رہے ہو مجھے اس سے نفرت ہے مگر کیا کروں۔ تمہاری پتنی
ہونے کی وجہ سے آواگون کے چکر میں پھنس چکی ہوں۔ مجبور ہوں۔"

میں نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"چندریکا! اگر تم میری پتنی ہو تو میں بھی تو تمہارا پتی ہوں۔ تمہارا خاوند ہوں۔"

اسی جنم میں اگر میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گیا ہوں تو اگلے جنم میں پھر تمہارے پاس واپس آجاؤں گا۔ ہمارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔"

چندریکا کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ صوفے سے اٹھ کر میرے ساتھ آکر بیٹھ گ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے سے لگایا اور جذباتی لہجے میں سانس بھر کر بو

"کنور جی! میرے ناتھ! میرے سوامی! تم جب مجھے اپنی پتنی کہتے ہو تو میرے اندر خوشی کے جھرنے بہنے لگتے ہیں۔ پھر میں سب دکھ درد بھول جاتی ہوں۔"

میں نے سوچا اور لوہا گرم ہے اسی وقت چوٹ لگا دینی چاہئے میں نے اس کا ہاتھ لیا اور کہا۔

"تو پھر مجھے جموں توی جانے والی اسلحہ کی ٹرین کی تاریخ اور وقت بتا دو"

چندریکا نے ایک دم اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور جلدی سے اٹھ کر سامنے والے صو پر چلی گئی۔ اس کی آواز بھی تلخ ہو گئی۔

"میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ آئندہ اگر تم نے مجھ سے میری جنم بھومی بھارت کو نقصان پہنچانے والی کوئی بات پوچھی تو میں تمہاری زندگی کے آخری لمحوں تک تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ مجھ سے مسلمانوں خاوند بن کر کبھی بات نہ کرنا"

میں نے فوراً معذرت پیش کر دی اور کہا۔

"آئندہ ایسی بات نہیں پوچھوں گا۔ میں پکا وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن اس وقت میں نے تمہیں دو چھوٹی سی معمولی سی باتوں کے لئے بلایا ہے۔"

چندریکا میری طرف خاموش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے ک

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میناکشی کو جو بیماری لگ گئی ہے اسے ختم کر دو۔ دوسری بات یہ ہے کہ میناکشی کے باپ کے گردے میں تین پتھریاں ہیں۔ ان میں سے دو پتھریاں غائب کر دو۔ تم انکار نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ تم اس معاملے میں پہلے بھی میری مدد کر چکی ہو اور میں تمہاری مدد کی وجہ سے ہی یہاں تک پہنچا ہوں"

چندریکا نے کہا۔

"تم جہاں تک پہنچ گئے ہو بس میں تمہاری یہاں تک ہی مدد کر سکتی تھی۔ اس کے آگے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ تمہیں خود ہی کرنا ہو گا میں تمہاری کسی تخریبی کارروائی میں شریک نہیں ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہاری بات پر عمل کروں گا"

چندریکا نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"میرے پاس آجاؤ"

میں اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر اپنا ہرہ میرے قریب لے آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں لوبان کی خوشبوؤں والے کسی گہرے کنوئیں میں اتر گیا ہوں۔ چندریکا نے اپنا سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کا ہاتھ میرے سینے پر چل رہا تھا۔ میں اسی طرح بت بنا بیٹھا تھا۔ میں اپنی طرف جواب میں کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اچانک چندریکا پیچھے ہٹ گئی۔ اپنی ساڑھی کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

"یہ میں کیا کر رہی ہوں؟ یہ تو میں نے ایک خاص رات کے لئے سنبھال کر رکھنا ہے۔ جب تم میرے پچھلے اور آنے والے جنم کے خاوند مجھ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرو گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

میں نے یونہی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں نے تمہیں جو کچھ کہا ہے اس کے بارے میں بھی بتاؤ"

چندریکا بولی۔

"مسٹر پانڈے سے کہنا کہ صبح دس بجے کے بعد اپنے گردوں کا ایک اور ایکسرے کرائے اس ایکسرے میں اس کے گردوں کی پتھریاں ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکی

ہو نگی"

"اور میناکشی کی بیماری کیسے دور ہو گی۔ وہ بھی پریشان ہے اور مجھے ابھی اس کی بھی ضرورت ہے۔"

چندریکا نے کہا۔

"صبح تمہارے لئے چائے لے کر میناکشی ہی آئے گی۔ اس کی ناف کے نیچے جو ابھار ہے اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر ایک منٹ کے لئے آنکھیں بند کر لینا۔ جب ہاتھ اٹھاؤ گے تو میناکشی کی بیماری بھی ختم ہو گئی ہو گی"

میں چندریکا کا شکریہ ادا کرنے لگا تو وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے جسم کے ساتھ لگ کر بولی۔

"تم کیوں میرا شکریہ ادا کرتے ہو میرے پتی دیو! شکریہ تو میں تمہارا اس رات کو ادا کروں گی جب تم میرے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرو گے"

میرے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ خدا جانے یہ عورت اپنی عنایات کے بدلے مجھ سے کس قسم کا وعدہ پورا کرانا چاہتی تھی۔ بہرحال اب میں پھنس چکا تھا۔ مجھے اس سے کیا ہوا کم از کم ایک وعدہ ضرور پورا کرنا تھا۔ چندریکا نے میرے ماتھے کو چوم لیا۔ پھر خود ہی شرما کر بیڈ روم کی خواب انگیز روشنی میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب میں بے تابی سے صبح ہونے کا انتظار کرنا لگا۔

مگر ابھی صبح ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں نے بیڈ روم کی بتی بجھائی اور سو گیا۔ جس وقت بیدار ہوا بیڈ روم دن کی روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا۔ رات میں نے ٹیرس والے شیشے کے دروازوں کے سفید پردے سمیٹ دیئے۔ وہاں سے دھوپ بیڈ روم میں آرہی تھی۔ میں نے سب کو منع کر رکھا تھا کہ میرے کمرے میں کوئی نہ آئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دن کے آٹھ بجنے والے تھے۔ میں نے انٹرکام فون کا بٹن دبایا۔ نیچے یہ دوسرا فون میناکشی کے بیڈ روم میں تھا۔ یہ اسی کے بیڈ روم کے فون کا نمبر تھا۔ میناکشی نے فوراً ریسیور اٹھالیا۔

"ھیلو"

میں نے کہا۔

"میں تمہارا گورودیو داس ورھن بول رہا ہوں"

"گورو جی نمسکار نمسکار۔ میں تو کب سے آپ کے فون کا انتظار کر رہی تھی مجھے معلوم تھا آپ مجھے ضرور فون کریں گے"

میں نے کہا۔

"میرے لئے کافی خود بنا کر اوپر لے آؤ اور تمہارے ڈیڈی ابھی دفتر تو نہیں گئے نا؟"

میناکشی کی آواز آئی۔

"جی نہیں گورو جی! ڈیڈی دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہے ہیں"

میں نے کہا۔

"تم اکیلی ہی میرے لئے کافی لے کر آجاؤ اور اپنے ڈیڈی سے کہو کہ مجھ سے ملے بغیر دفتر نہ جائیں"

"جو حکم مہاراج۔ میں ابھی کافی لا رہی ہوں"

میں غسل خانے میں منہ ہاتھ دھونے چلا گیا

میں نے باتھ روم میں منہ ہاتھ دھویا۔

ماتھے پر ڈبی میں سے نیا تلک لگایا۔ اس ڈبی میں سفید جیسی تلک کا رنگ بھرا ہوا تھا اور بازار سے مل جاتی تھی۔ میری ڈاڑھی بڑھنے لگی تھی۔ چندریکا کے اشارے پر میں نے شیو کرنی بند کر دی تھی۔ غسل خانے سے باہر آکر صوفے پر بڑے سکون سے بیٹھ گیا اور شیلف میں سے ایک جاسوسی ناول نکال کر پڑھنے لگا۔ بیڈ روم کی سیڑھیوں پر میناکشی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے جاسوسی ناول شیلف میں رکھا اور قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اور ذرا اونچی آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ دوسری بار دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے بڑے جلالی انداز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میناکشی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"میں ہوں گورو جی میناکشی۔ آپ کی بالکا"

"آجاؤ"

ین نے اسی بارعب آواز میں کہا۔ میناکشی بیڈ روم میں آگئی۔ میں کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آج اس نے ساڑھی کی بجائے بغیر آستینوں کی ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں اس کا جسم باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے

ہ جانے کو کہا۔ وہ کافی کا ٹرے میرے قریب ہی قالین پر رکھ کر بڑی مشکل سے دو زانو ہو ر بیٹھ گئی۔ کیونکہ تنگ پتلون میں اس کے دو زانو ہو کر بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

میں یونہی اشلوک پڑھتا رہا۔ اشلوک سنسکرت کے تھے اور بالکل صحیح تھے۔ مجھے علوم تھا کہ کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں نے اشلوک پڑھنا بند کر کے آنکھیں کھول دیں ر میناکشی کی طرف دیکھا۔ اس کے بال شانوں پر کھلے تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے سکار کیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"بالکا! تیرا کام ہو گیا ہے۔ بھگوان شو جی نے میری پرارتھنا سوئیکار کر لی ہے"

میناکشی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے قدموں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور بار ریہی بولتی رہی۔

"دھن ہیں آپ میرے گوردیو! دھن ہیں آپ میرے گورو جی! ----"

میں نے کہا۔

"اپنے ڈیڈی سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے مل کر آفس جائیں"

میناکشی میرے لئے کافی بنا رہی تھی۔ بولی۔

"جی ہاں گورودیو! وہ کہہ رہے تھے میں سوامی جی سے ملنے خود اوپر آؤں گا"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ انہیں اوپر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں کہو کہ میں خود فون پر پندرہ منٹ بعد ان سے بات کروں گا پندرہ منٹ بعد آکاش پر ایک شبھ لگن ہونے والا ہے۔ میں ٹھیک اس وقت تمہارے ڈیڈی سے بات کروں گا"

میناکشی نے اسی وقت انٹر کام پر نیچے ڈیڈی تک ساری بات پہنچا دی۔ میں نے کافی کے دو گھونٹ پیتے ہوئے میناکشی سے کہا۔

"تمہارے ڈیڈی کا کام بھی ہو گیا سمجھو"

میناکشی خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"گورو جی! میری بیماری شو بھگوان دور کر دیں گے نا؟"

میں نے کہا۔

"تمہاری بیماری ختم کرنے کا مجھے شوجی بھگوان نے حکم دے دیا ہے۔ صرف پندرہ منٹ انتظار کرو۔ میں سب سے پہلے تمہارے ڈیڈی سے بات کرنا چاہتا ہوں"

میں نے گھڑی کلائی پر سے اتار کر سامنے رکھ لی تھی اور اس پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ یہ محض فراڈ تھا۔ ڈرامہ تھا۔ ابھی پندرہ منٹ پورے نہیں ہوئے تھے کہ میں نے میناکشی سے کہا۔

"نیچے اپنے ڈیڈی سے میری بات کراؤ"

میناکشی نے اس وقت نیچے ڈیڈی کے کمرے کا نمبر گھمایا۔ اور ڈیڈی سے کہا۔

"ڈیڈی! گورو جی سے بات کریں۔"

میں نے ریسیور ہاتھ میں لے لیا۔ دوسری طرف مسٹر پانڈے بول رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑی عاجزی سے نمسکار کہا اور بولے۔

"گورو جی! مجھے حکم کریں۔"

میں نے آواز میں جلال پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"گوکل داس! آج دن کے دس بجے سے پہلے پہلے اپنے گردے کا ایکس رے کرواؤ۔ ایک منٹ بھی زیادہ نہ ہو دس بجے سے پہلے پہلے گردے کا ایکس رے ہو جانا چاہئے۔ پھر مہاویر بھگوان کی لیلا دیکھنا۔ بس اب زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میناکشی تجسس آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے تجسس میں ہی رہنے دیا اور کہا۔

"اب میں تمہاری بات کرتا ہوں۔ اٹھ کر بیڈ روم کے دروازے کو کنڈی لگا دو تا کہ کوئی اندر نہ آئے"

وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی چٹخنی لگا کر میرے سامنے آ کر ادب سے بیٹھ گئی۔

میں نے اسے پر جلال آواز میں کہا۔

"گھٹنوں کے بل میرے سامنے کھڑی ہو کر پتلون کو ناف سے نیچے کرو"

وہ تو میری پکی مریدنی تھی۔ میں اگرچہ پیر جھوٹا تھا مگر مریدنی سچی تھی۔ میں قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ رشی مینوں کی طرح گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ فوراً میرے سامنے ہو کر گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ اس نے پتلون کے اوپر والے بٹن کھول کر پتلون ناف سے نیچے تک کھسکا دی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے جانگیہ نہیں پہنا ہوا تھا۔ ناف کے نیچے پھوڑے کا ابھار باقاعدہ موجود تھا اور گلابی رنگت اختیار کرنے لگا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ اگر میں اس ابھار کو ٹھیک نہ کر سکا تو میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے دل میں اپنے خدا کا نام لے کر اپنا ہاتھ میناکشی کے پیٹ کے ابھار پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرے کان میں چندریکا کی آواز آئی۔

"ایک منٹ تک ہاتھ ابھار کے اوپر ہی رکھو۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھا دینا میں صرف یہی کہنے آئی تھی۔"

اس کے ساتھ ہی لوبان کی جو ہلکی سی خوشبو مجھے آنے لگی تھی وہ فوراً غائب ہو گئی۔ میری نگاہ گھڑی کی سوئیوں پر تھی۔ مجھے میناکشی کے جسم کے ابھار میں ہلکی ہلکی دھڑکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ جب ٹھیک ایک منٹ گذر گیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اوپر کھسکانے لگا۔ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ خدا میری لاج رکھ لینا۔ تو میری نیت کو جانتا ہے۔ مجھے ہاتھ رکھے رکھے محسوس ہو گیا کہ میناکشی کے جسم کا ابھار غائب ہو گیا ہے۔

میں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ ابھار واقعی غائب تھا۔

میں نے کہا۔

"میناکشی! جاؤ تمہارے پاپ دور ہو گئے ہیں۔ تمہاری بیماری جاتی رہی ہے"

میناکشی نے سر جھکا کر اپنی ناف کے نیچے دیکھا تو خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اسے

پتلون کے بٹن بند کرنے بھی یاد نہ رہے۔ وہ اسی طرح پتلون چھوڑ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ میں گورو کی طرح اس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور کہا۔

"بالکا! تیرا کلیان ہو گیا ہے۔ اب یہ تکلیف تجھے کبھی نہیں ہوگی۔ اب اٹھ کر پتلون کے بٹن بند کر اور دروازے کی چٹخنی کھول دے۔"

میناکشی نے سر قدموں سے اٹھایا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جلدی سے پتلون کے بٹن بند کر کے وہ دروازے کی طرف گئی اور چٹخنی کھول کر واپس میرے سامنے آکر ادب سے بیٹھ گئی۔ آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

"گورودیو! آپ نے میری کایا پلٹ دی ہے میں پھر سے زندہ ہو گئی ہوں۔ میرے گورودیو! میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے آگیا دیں۔ میں اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں"

میں نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

"اب بھارت کی سب سے مشہور ڈانسر بننے کی تیاریاں شروع کر دو۔"

وہ بچوں کی طرح مسکرا اٹھی۔ کہنے لگی۔

"آپ کی کرپا میرے ساتھ رہی تو میں بھارت کی ہی نہیں ساری دنیا کی مشہور ڈانسر بن کر دکھاؤں گی"

"اوش! اوش!"

میں نے یہ لفظ جس کا مطلب تھا ضرور ضرور یقیناً یقیناً دوبار دہرایا اور میناکشی سے کہا۔

"اب میرے لئے کافی کی ایک اور پیالی بناؤ"

وہ فوراً میری پیالی میں کافی انڈیلنے لگی۔ پھر اس نے ان لڑکوں کی باتیں شروع کر دیں جو رینالینی کے ڈانس سنٹر اور دوسری پارٹیوں میں اس سے محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کہنے لگی۔

"میں نے چندر کانت کو صاف جواب دے دیا ہے۔ مجھے تو کوئی بھی لڑکا اب

اچھا نہیں لگتا۔ میں اب شادی ہی نہیں کروں گی۔ بس سارا جیون آپ کی سیوا میں بتا دوں گی"

میں آہستہ آہستہ سر ہلاتا رہا اور کافی پیتا رہا۔

دوسری طرف دس بجے سے پہلے پہلے کوئی سوا نو بجے دن مسٹر پانڈے اپنے ڈاکٹر کے کلینک میں جا کر اپنے گردوں کا ایکس رے کروایا۔ جب ایکس رے ریزلٹ دیکھا تو ڈاکٹر اور مسٹر پانڈے حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ مسٹر پانڈے کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی اور ڈاکٹر ایکس رے کی فلم کو چمکتے ہوئے شیشے کی پلیٹ پر رکھ کر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ ایکس رے کی فلم میں مسٹر پانڈے کے گردے کی تین پتھریوں میں سے دو بڑے سائز کی پتھریاں غائب تھیں۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔

"سر! یہ تو کوئی چمتکار ہوا ہے میری میڈیکل لائف میں یہ پہلا کیس ہے کہ ایک دن پہلے گردے میں پتھریاں موجود ہوں اور دوسرے دن بغیر آپریشن اور بغیر کسی دوائی کے غائب ہو گئی ہوں"

مسٹر پانڈے کو اور میناکشی کو میں نے منع کر رکھا تھا کہ وہ میری شعبدہ بازیوں جن کو وہ میری کرامتیں سمجھ رہے تھے کسی سے بات نہ کریں اور اس راز کو اپنے تک ہی رکھیں۔ چنانچہ مسٹر پانڈے نے ڈاکٹر کو میرے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ بس یہی کہا۔

"یہ سب بھگوان کی کرپا ہے ڈاکٹر۔ بھگوان مہاویر نے میرے کشٹ دور کر دیئے ہیں۔"

مسٹر پانڈے اس وقت اپنی گاڑی میں بیٹھ کر میرے پاس آگیا۔ ایکس رے کی فلم والا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت میناکشی بھی میرے پاس ہی تھی۔ وہ میرے کپڑوں کو خود دھو کر استری کر رہی تھی۔ مسٹر پانڈے خود ہی اوپر چڑھ آئے تھے۔ ان کا سانس پھولا ہوا تھا مگر چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ آتے ہی کہنے لگے۔

"گورو جی! آپ مہاویر بھگوان کے سچے اوتار ہیں۔ یہ دیکھئے ایکس رے۔

میرے گردے کی تین میں سے دو پتھریاں غائب ہیں۔"

میناکشی بھی دوڑ کر ہمارے پاس آ گئی۔ میں نے ایکس رے فلم دیکھی۔ واقعی گردے میں تین کی بجائے صرف ایک پتھری تھی۔ مسٹر پانڈے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! اب یہ پتھری جو رہ گئی ہے اسے بھی ختم کرا دیں۔ آپ تو پیونٹی کے گھر میں نرائن بن کر پدھارے ہیں۔"

میناکشی بھی ایکس رے کی فلم دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ میں نے مسٹر پانڈے سے کہا۔

"گوکل داس! جب تیسری پتھری کے ختم کرنے کا وقت آئے گا تو اسے بھی ختم کر دوں گا ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

مسٹر پانڈے کی تیسری پتھری اور اس کی ترقی کی فائل کا معاملہ کسی مشکل وقت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا سب سے بڑا مسئلہ جموں جانے والی اسلحہ کی ملٹری ٹرین کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس حقیقت سے میں پوری طرح باخبر تھا کہ خواہ میں نے لاکھ سوچ کر اپنی طرف کسی بہانے بھی بات کو چھیڑا اور اسلحہ کی ٹرین کا ذکر کیا تو مسٹر پانڈے فوراً محتاط ہو جائے گا۔ آخر وہ ایک تجربہ کار عمر رسیدہ منجھا ہوا انڈین آئی سی ایس افسر تھا اور بڑی ذمے دار پوسٹ پر تھا۔ وہ تو مجھے کبھی نہیں بتائے گا کہ اسلحہ کی ٹرین دیو لالی سے کس دن کس وقت روانہ ہونے والی ہے۔ اسے چاہے مجھ پر جاسوس ہونے کا شک نہ بھی پڑے پھر بھی وہ اپنے حساس ادارے کی ذمے داریوں کا خیال کرتے ہوئے اس معاملے پر اپنی لاعلمی کا اظہار کر دے گا۔

اس میں کوئی شک شبہ نہیں تھا کہ دونوں باپ بیٹی میرے انتہائی معتقد ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں زندہ کرامتیں دکھائی تھیں۔ وہ میرے مرید کیوں نہ ہوتے۔ لیکن جس مقصد کے واسطے میں نے یہ سارا ڈرامہ رچایا تھا وہ پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں نے اس مسئلے میں اپنے ماسٹر سپاہی کریم بھائی سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کریم بھائی نے مجھے اشد ترین ضرورت کے سوا ٹیلی فون کرنے سے منع کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے

رات کو ریڈیو ٹرانسمیٹر پر مرموز یعنی کوڈ الفاظ میں بات کروں گا۔

رات کے بارہ بجے میں نے بیڈ روم میں پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بریف کیس سے سگریٹ لائیٹر والا چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال کر اسے آن کیا۔ کریم بھائی کے ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی ملائی اور کوڈ سگنل دیا۔ دوسری طرف سے بھی سگنل آنے لگے۔ میں نے دھیمی آواز میں کوڈ الفاظ میں معلوم کیا۔ دوسری طرف کریم بھائی بول رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں ضروری بات کرنے کے لئے ملنا چاہتا ہوں"

کریم بھائی نے مختصر ترین کوڈ الفاظ میں جواب دیا۔

"کل اسی وقت اپنے ہائیڈ آؤٹ میں آجانا۔ اب سگنل مت دینا"

اور دوسری طرف سے ٹرانسمیٹر بند کر دیا گیا۔ اگلے دن میں نے مہاویر کے مندر میں جا کر پوجا کرنے کا بہانہ بنایا اور کوئی دس بجے مسٹر پانڈے کی کوٹھی سے اس کی گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ اس کی گاڑی میں اس لئے گیا کہ باہر بیٹھی سی آئی ڈی کو کوئی شک نہ پڑے۔ اور اتنی جلدی ان میں سے کوئی آدمی میرے تعاقب میں نہ آسکے۔ میں سیدھا مہاویر کے بڑے مندر میں پہنچ گیا۔ ڈرائیور مجھے مندر کے باہر چھوڑ کر چلا گیا۔ بنگلے کی نگرانی کرنے والے سی آئی ڈی کے آدمی اگر ڈرائیور سے پوچھیں گے بھی تو وہ بھی یہی کہے گا کہ میں سوامی جی کے مہاویر کے مندر میں چھوڑ کر آرہا ہوں۔ اس لئے میں خفیہ پولیس والوں سے مطمئن تھا۔ رات کے وقت اتنی جلدی کوئی ٹیکسی پکڑ کر میرے پیچھے نہیں آسکتا تھا اور ابھی میرا معاملہ ان لوگوں کے لئے اتنا سنگین بھی نہیں ہوا تھا۔

مہاویر کے مندر میں میں وقت ضائع کئے بغیر دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ ٹیکسی پکڑی اور اسے اس علاقے کی طرف جانے کو کہا جہاں ہماری خفیہ ہائیڈ آؤٹ یعنی ریلوے لائن کے قریب واقع کریم بھائی کا پرانا اور بے آباد کوارٹر تھا۔ میں نے دو فرلانگ پہلے ہی سڑک پر ٹیکسی چھوڑ دی اور وہاں سے پیدل چل کر کوارٹر پہنچ گیا۔ کریم بھائی ابھی نہیں آیا تھا۔ میں کوارٹر کے صحن میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ دور احمد آباد کی کسی فیکٹری کی دھندلی روشنیاں نظر

آ رہی تھیں۔ اتنے میں مجھے کوارٹر کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں ہوشیار ہو گیا اور اٹھ کر دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ مگر یہ کریم بھائی تھا۔ اس نے صحن میں سے گزرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"اندر آجاؤ"

ہم کوارٹر کے چھوٹے کمرے میں موم بتی جلا کر بیٹھ گئے۔ کریم بھائی نے مجھ سے اصل معاملے پر کوئی بات پوچھے بغیر کہا۔

"آئندہ مسٹر پانڈے کے گھر سے وائرلیس ٹرانسمیٹر پر کوئی خفیہ پیغام نہ بھیجنا۔ تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ پانڈے را کا چیف ہے اس کے گھر سے نکلنے والا ریڈیو سگنل ٹیپ ہو سکتا ہے۔"

واقعی مجھ سے بڑی خطرناک بھول ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کریم بھائی نے بیڑی سلگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اسے کس لئے بلایا ہے۔ میں نے اسے اسرائیلی فوجی ماہرین کی مسٹر پانڈے کے گھر میں خفیہ میٹنگ کے بارے میں بتایا اور کہا۔

"مسٹر پانڈے ان اسرائیلی فوجی مشیروں کے ساتھ ٹاپ سیکریٹ میٹنگیں اپنے بنگلے میں کرتا ہے۔ دلی سے اسرائیلی فوجی مشیروں کا ایک وفد احمد آباد آیا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسی ہفتے مسٹر پانڈے کے گھر میں کوئی اور سیکریٹ میٹنگ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی چھوٹے سائز کا مگر بڑا طاقتور مائیکرو فون اور ہیڈ فون دے دیا جائے جو میں نیچے ڈرائینگ روم میں کسی جگہ لگا دوں اور وہاں جو باتیں ہوں وہ میں اوپر سن سکوں کیونکہ اسرائیلی مشیروں کے ساتھ پانڈے کی میٹنگ پہلی منزل کے ڈرائینگ روم میں ہوتی ہیں۔"

کریم بھائی خود فوج کے سگنل کور میں رہ چکا تھا اور وائرلیس کے فن میں ماہر تھا۔ کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک ایسا طاقتور مائیکرو فون بھجوا دوں گا جس کے لئے تمہیں کسی

ہیڈ فون کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ مائیکرو فون تم ڈرائینگ روم میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کے اندر فٹ کر دینا۔ تم اوپر اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے فون کا ریسیور اٹھاؤ گے تو نیچے جو کوئی بھی باتیں کر رہا ہو گا تم ان کی باتیں سن لو گے۔"

یہ بڑا ہی کار آمد اور محفوظ طریقہ تھا۔ میں نے کہا۔

"یہ مائیکرو فون مجھے جلد مل جانا چاہئے۔ کیونکہ اسرائیلی وفد ابھی تک احمد آباد میں ہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جانے سے پہلے ان کی مسٹر پانڈے سے ایک اور خفیہ میٹنگ ہو"

کریم بھائی بولا۔

"ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر میری طرف چہرہ اٹھا کر بولا۔

"احمد آباد کے کناری چوک میں ایک سینما ہاؤس ہے جس کا نام راکسی سینما ہے۔ اس کا شو دن ساڑھے تین بجے شروع ہوتا ہے۔ تم کل راکسی سینما میں دن کا شو دیکھو گے۔ انٹرول کے وقت تم سینما ہاؤس کی دوسری منزل والی کینٹین پر چائے پینے آؤ گے۔ جہاں تم کھڑے ہو کر چائے پی رہے ہو گے وہیں کاؤنٹر پر ایک آدمی تمہارے پاس آکر چائے کا آرڈر دے گا اور پھر تمہاری واسکٹ کی جیب میں ایک لفافہ ڈال دے گا۔ اسی لفافے میں مائیکرو فون ہو گا"

میں نے کہا۔

"کل سینما ہاؤس جانے سے یہ بہتر نہیں کہ میں کل کسی وقت یہاں اپنے کوارٹر والے ہائیڈ آؤٹ میں آجاؤں"

کریم بھائی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اتنی چھوٹی سی بات کے لئے یہاں آنا مناسب نہیں۔ خفیہ پولیس کا آدمی تمہاری نگرانی کرتا تمہارے پیچھے پیچھے یہاں ضرور پہنچ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ آدمی مجھے پہچانے گا کیسے؟"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"اس آدمی نے تمہاری شکل دیکھ رکھی ہے۔ وہ تمہیں پہچان لے گا۔"

پھر اس نے مجھ سے جموں جانے والی اسلحہ کی ٹرین کے بارے میں سوال کیا کہ اس کے بارے میں مجھے کوئی معلومات ملی ہے یا نہیں۔ میں نے فکر مندی کے ساتھ کہا۔

"کریم بھائی! مجھے خود اس بارے میں بڑی فکر ہے۔ میں مسٹر پانڈے کی ناک کے نیچے تو جا کر بیٹھ گیا ہوں اور مجھے ان لوگوں کا بے حد اعتماد بھی حاصل ہو لیا ہے۔ مگر مجھے کوئی ایسا طریقہ نہیں سوجھ رہا کہ میں اسلحہ کی ٹرین کے متعلق معلومات حاصل کر سکوں۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ میں نے جیسے ہی اس ٹرین کے بارے میں مسٹر پانڈے سے بہانے بہانے بھی کوئی بات کی تو وہ محتاط ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھ پر بھی شک کرنے لگے کہ کہیں میں کوئی جاسوس تو نہیں ہوں"

کریم بھائی نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہو ٹرین کی تاریخ اور وقت کا معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر تم اس امتحان میں کامیاب نہ ہوئے تو میں بھی یہی کہوں گا کہ تمہاری کمانڈو سپائینگ کی تربیت ادھوری تھی یا تم اس قابل نہیں تھے کہ تمہیں ٹریننگ دی جاتی"

کریم بھائی نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ جس کو سن کر مجھے غصہ آگیا۔ مگر وہ سچ کہہ رہا تھا۔ یہ میرے امتحان کی گھڑی تھی اور مجھے اس امتحان میں ہر حالت میں کامیاب ہو تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ٹرین کی تاریخ اور اوقات کے متعلق دیولالی جا کر بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے"

کریم بھائی نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اسلحہ سے بھری ہوئی ایسی فوجی گاڑی ہے جس میں جدید ترین نیپام بم راکٹوں کی بھاری تعداد کشمیر کے محاذ پر بھیجی جا رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ٹرین دیولالی کے فوجی گیریزن سے روانہ ہو گی اور وہاں سیکورٹی اتنی سخت ہو گی کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکے گی تمہیں مسٹر پانڈے کے پیٹ میں گھس کر اس راز کو معلوم کرنا ہے۔ اب ایسا کرو کہ تم پہلے نکل جاؤ۔ میں تمہارے بعد یہاں سے نکلوں گا تم سارے راستوں سے واقف ہو چکے ہو۔ ریلوے لائن کی طرف سے ہو کر بڑی سڑک پر جانا"

کریم بھائی پہلے نکل گیا۔ میں کوارٹر میں ہی بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ بعد میں بھی نکل کر ذھیرے میں احمد آباد سے دلی کی طرف جانے والی ریلوے لائن کی طرف چل پڑا۔ آگے ا کر میں دوسری جانب کھیتوں میں اتر گیا اور پھر بڑی سڑک پر آگیا۔ یہاں کافی چلنے کے بعد ھے ایک موٹر رکشا ملا۔ اس میں سوار ہو کر میں سوامی نارائن جی کے مندر میں چلا آیا۔ یونکہ اتنی رات گئے میرا مسٹر پانڈے کے بنگلے پر جانا خفیہ پولیس والوں کو شک میں ڈال کتا تھا۔ ویسے بھی میں میناکشی کو اسی مندر میں رات بھر پوجا پاٹھ کرنے کا کہہ کر آیا تھا۔ ں صبح تک مندر میں ہی رہا۔ جب کافی دن نکل آیا تو بنگلے پر واپس آگیا۔

میں اپنے ساتھ مندر سے شرادھ کے پھول اور تھوڑی سے مٹھائی لایا تھا۔ وہ میں نے مسٹر پانڈے اور میناکشی کو دی۔ انہوں نے بڑی عقیدت سے ان چیزوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور کھانے لگے۔ میں نے کہا۔

"رات بھر پوجا کرتا رہا ہوں۔ اب اوپر جا کر آرام کروں گا۔ دوپہر کے بعد مجھے پھر مندر جانا ہے"

اوپر آکر میں نے کلاک پر الارم لگایا اور سو گیا۔ پورے دو بجے الارم بج اٹھا۔ میں ے اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ میناکشی گھر پر ہی تھی۔ مسٹر پانڈے آفس جا چکے ے۔ میناکشی نے میرے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ اتنی دیر میں سینما کا وقت ہو گیا۔ میں تیار بیٹھا ا۔ میں نے کہا۔

"اب میرے مندر جانے کا ٹائم ہو گیا ہے"

میناکشی کہنے لگی۔

"گوروجی! مجھے ڈانس سنٹر جانا ہے۔ میں آپ کو سوامی جی کے مندر ڈراپ کروں گی"

میں نے سختی سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"میناکشی! میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مہاویر کے بھگت اس کی پوجا کرنے میں مندر پیدل جاتے ہیں۔ کسی کی گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جاتے"

میناکشی فوراً ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"شما کردیں گوروجی!"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم مجھے بڑے بازار کے چوک تک چھوڑ سکتی ہو۔ وہاں سے مجھے اپنے تلک کے لئے نئی ڈبی خریدنی ہے"

میں میناکشی کی گاڑی میں بیٹھ کر ہی بنگلے سے نکلا۔ اس کا یہ فائدہ تھا کہ باہر جو پولیس والا بیٹھا تھا وہ اتنی جلدی ٹیکسی لے کر میرے پیچھے نہیں آسکتا تھا۔ اس روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں بڑے بازار کے چوک میں گیا اور یونہی ایک طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ جب میناکشی کی گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں رک گیا۔ واپس چوک میں آکر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے سینما ہاؤس جس کے باہر بڑے بڑے بورڈ لگے تھے۔ یہاں کوئی دھارمک یعنی ہندو مائی تھالوجی کی چل رہی تھی۔

یہ بات میرے حق میں اچھی تھی۔ میرا حلیہ جین مت کے بھگتوں ایسا تھا۔ ماتھے تلک بھی لگا تھا۔ کوئی دیکھتا تو یہی کہتا کہ بھگت جی دھارمک فلم دیکھنے آئے ہیں۔ میں لے کر سینما ہال میں بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہو گئی۔ عجیب قسم کی فضول فلم تھی۔ دیوی بادلوں میں اڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر آگ کے تیر برسا رہے تھے۔ مجھے انٹرول کا

انتظار تھا۔ بڑی مشکل سے انٹرول ہوا۔ میں نے ایک آدمی سے سینما ہاؤس کی دوسری منزل والی کینٹین کا پوچھا اور سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آگیا۔ یہاں ایک طرف کینٹین بنی ہوئی تھی۔ کاؤنٹر پر کچھ لوگ کھڑے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور چائے پینے لگا۔ اتنی دیر میں ایک دبلے جسم کا آدمی میرے بالکل ساتھ آکر کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا اور میری طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں رومال تھا جو اس نے سمیٹ کر اپنی ہتھیلی میں پکڑ رکھا تھا۔

میں چائے پی رہا تھا کہ اس آدمی نے بڑے اطمینان سے رومال میری واسکٹ کی جیب میں ڈال دیا اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ میں جس مقصد کے لئے وہاں آیا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے پیالی کاؤنٹر پر رکھی۔ پیسے دیئے اور سیڑھیاں اتر کر سینما ہاؤس سے باہر آگیا۔ یہاں سے میں رکشا لے کر سیدھا سوامی نارائن کے مندر پہنچ گیا۔ مجھے یہاں کچھ وقت ضرور گزارنا تھا۔ میں پوجا والے کمرے کے کونے میں صف پر بیٹھا مالا کا منکا پھیر رہا تھا۔ یہ مالا جھوٹے موتیوں کی تھی اور مجھے اسی مندر کے مہنت نے دی تھی۔ میں نے ابھی تک واسکٹ میں سے رومال نکال کر مائیکرو فون نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد میں اٹھا اور مندر سے نکل کر ٹیکسی لی اور بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے خاص طور پر ٹیکسی اس لئے لی تھی کہ میں بڑے آرام سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر مائیکرو فون کا جائزہ لے سکوں گا۔ جب ٹیکسی کافی آگے نکل گئی تو میں نے جیب سے نکال کر کھولا۔ اس میں ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں انگوٹھے کے ناخن کے سائز کا پلاسٹک کا ایک مائیکرو فون تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور اس کے اوپر کی جانب بڑی باریک جالی سی لگی تھی۔ پیچھے لوہے کی باریک تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ اصل میں یہ مقناطیس تھا۔

میں نے اسے لفافے میں بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور رومال وہیں ٹیکسی کی سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ بنگلے پر آیا تو گجراتن ملازمہ بائی جی نے کہا کہ میناکشی کا فون آیا تھا کہ وہ شام کی چائے میرے ساتھ پینا چاہتی ہے۔ میں نے آہستہ سے سرہلایا اور اوپر اپنے کمرے

میں آکر دروازہ بند کیا اور صوفے پر بیٹھ کر ایک بار پھر مائیکرو فون کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ انتہائی طاقتور آلہ ہے اب اس مائیکرو فون کو نچلی منزل کے ڈرائینگ روم والے ٹیلی فون کے اندر فٹ کرنا تھا۔ یہ کام میں میناکشی کے ہوتے ہوئے نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت بڑا سنہری موقع تھا۔ اس گھر میں مجھے بڑی آزادی تھی۔ میں سارے بنگلے میں جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ نوکر نوکرانیاں بھی میرے اس رتبے سے بڑے مرعوب تھے۔ وہ بھی مجھے کوئی بہت بڑا رشی منی سمجھ رہے تھے۔

میں نچلی منزل میں آکر ڈرائینگ روم میں سامنے والے صوفے کے کونے میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ یہاں میں اس لئے بیٹھا تھا کہ میرے قریب ہی چھوٹی تپائی پر ٹیلی فون پڑا تھا۔ ڈرائینگ روم کے پردے گرے ہوئے تھے۔ بائی اندر آگئی۔ کہنے لگی۔

"گورو جی! آپ کے لئے کافی بنا کر لاؤں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں بائی لے آؤ۔ آج یہاں بیٹھ کر کافی پینے کو دل چاہتا ہے"

وہ خوش خوش کچن کی طرف چل دی۔ دوسرے نوکر ادھر ادھر کام کاج میں لگے تھے۔ ڈرائینگ روم اور باہر والی لابی بالکل خالی تھی۔ میں نے جلدی سے ٹیلی فون کو نیچے سے کھولا۔ جیب سے مائیکرو فون نکال کر اس کے اندر پیچھے کر کے رکھا تو وہ فوراً چپک گیا ایک نظر دیکھنے سے مائیکرو فون ٹیلی فون کی مشینری کا حصہ ہی لگتا تھا۔ میں نے فون کو اچھی طرح سے بند کیا اور دوبارہ تپائی پر رکھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ اب مجھے اس مائیکرو فون کی طاقت کو آزمانا تھا۔ اتنے میں ملازمہ بائی جی کافی لے کر آگئی۔ میں بڑے سکون سے کافی پینے لگا۔ بائی جی ایک بار پھر اپنے خاوند کا رونا لے کر بیٹھ گئی اور مجھ سے پرارتھنا کرنے کی التجائیں کرنے لگی۔ مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے بائی سے کہا۔

"تم ایک کام کرو بالکا!"

"آگیا کریں مہاراج"

بائی جی فوراً چوکس ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میں اوپر جا کر سمادھی لگاتا ہوں۔ تم یہاں بیٹھ کر پچاس بار اوم نام کا جاپ کرو بھگوان نے چاہا تو تمہارا خاوند بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بڑی خوش ہوئی اور فوراً صوفے کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"جب میں کمرے سے نکلا جاؤں تب جاپ شروع کرنا۔ اور آواز کے ساتھ رام کا نام لینا"

یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل کر اوپر والی منزل کے اپنے ڈرائینگ روم میں آگیا۔ اس بنگلے میں تو ہر کمرے میں ٹیلی فون لگا تھا جو انٹر کام کے ساتھ ایک دوسرے سے ملا ہوا تھا۔ ڈرائینگ روم میں آتے ہی میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان کے ساتھ لگایا تو خوشی سے اچھل سا پڑا۔

مجھے نیچے ملازمہ کے ہری اوم ہرے راما' ہرے کرشنا کا جاپ کرنے کی صاف آواز آرہی تھی۔ میرے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک آدھ منٹ میں ملازمہ کے ہری اوم ہرے راما ہرے کرشنا کا پاٹھ سنتا رہا۔ پھر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا تھا۔ اب ڈرائینگ روم میں مسٹر پانڈے جس کے ساتھ جو بات بھی کرے گا میں اسے آسانی سے سن سکوں گا۔ لیکن اس بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ اگر اسرائیلی ماہرین میں سے کوئی آدمی وہاں آئے گا تو وہ ایمونیشن ٹرین کے بارے میں بھی ضرور بات کرے گا۔ کیونکہ بظاہر اسرائیلی فوجی ماہرین یا فوجی مشیروں کا جموں جانے والی اسلحہ کی ٹرین سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے مسٹر پانڈے کی گفتگو سے کئی دوسرے فوجی اور بھارت کے دفاع کے بارے میں اور پاکستان میں را کے ایجنٹوں کے ذریعے انڈیا کی حکومت جو تخریبی پروگرام تیار کر چکی تھی اس کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہونے کی توقع تھی۔

باہر بادل زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ میں کمرے سے اٹھ کر باہر کشادہ بالکونی میں آکر بید کی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی خوشگوار خشک ہوا چل رہی تھی۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ مجھے بالکونی سے میناکشی کی گاڑی بنگلے میں داخل ہوتی نظر آئی۔

اس کے ساتھ ہی بونداباندی شروع ہوئی۔ میں بالکونی سے اٹھ کر واپس کمرے میں آ کر
بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میناکشی پہلے نیچے اپنے کمرے میں جائے گی۔ وہ ڈرائینگ روم
میں سے گذر کر اپنے کمرے میں جائے گی۔ اپنے کمرے میں جا کر اپنا میک اپ دوبارہ سیٹ
کرے گی۔ واپسی میں پھر ڈرائینگ روم میں سے گذر کر اوپر میرے پاس آئے گی۔ اس
دوران ہو سکتا ہے وہ کسی نوکر یا ملازمہ سے کوئی بات بھی کرے۔ چنانچہ میں اپنا لگایا ہوا
مائیکروفون دوبارا ٹیسٹ کرنے کے لئے کمرے میں گیا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹیلی فون ریسیور
کان سے لگایا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے میناکشی کی آواز آئی۔ اس نے ڈرائینگ روم میں سے گذرتے
ہوئے کسی نوکر کو آواز دی تھی۔ اس کے بعد باہر باغیچے میں بولتے پرندوں کی ہلکی ہلکی
آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا۔ کوئی پانچ منٹ بعد میناکشی
کی دور سے قریب ہوتی ہوئی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ ملازمہ بائی جی سے کہہ رہی تھی کہ
گوروجی کو بتا دیا تھا کہ میں چائے ان کے ساتھ پیوں گی؟ پھر بائی جی کی آواز آئی کہ جی ہاں
بی بی جی میں نے بتا دیا تھا۔ بائی کی آواز ذرا دور سے آئی تھی۔

مائیکروفون واقعی انتہائی طاقتور تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے ذریعے مجھے را
کے ہیڈ آفس کے تھوڑے بہت راز ضرور معلوم ہو جائیں گے۔ میں نے ریسیور رکھ دیا
اور بالکونی کی دروازہ نما لمبی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔
اتنے میں میناکشی اوپر آ گئی۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے نمسکار کیا اور میرے پاؤں
چھوئے۔ آج اس نے فالسہ کلر کی چھاپ دار ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کے
لباس سے بالکل نئی قسم کے پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"گوروجی! آج بڑی خوبصورت بارش ہو رہی ہے۔ میں آپ کے لئے چائے
کے ساتھ کھانے کے لئے رس ملائی لائی ہوں۔"

احمد آباد کی رس ملائی کا واقعی جواب نہیں تھا۔ ہم نے بالکونی والے دروازے نما
کھڑکی کے پاس بیٹھ کر چائے پی۔ میناکشی مجھ سے بھارت ناٹیم رقص کی باتیں کرنے لگی۔

جب سے میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک دن بھارت کی مشہور ڈانسر بن جائے گی اس نے
بڑی محنت سے ڈانس سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میری بڑھی ہوئی شیو کو دیکھ کر اس نے
پوچھا۔

"گوروجی! آپ ڈاڑھی بڑھا رہے ہیں کیا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ پربھو شو جی کی مرضی ہے کہ میں داڑھی رکھ لوں۔"

خوش ہو کر بولی۔

"گوروجی! آپ کو داڑھی بڑی سجے گی مجھے داڑھی اچھی لگتی ہے۔ اس سے
آدمی مرد لگتا ہے اور آپ تو میرے گوردیو ہیں۔"

میناکشی کا باپ مسٹر پانڈے کو دفتر سے دیر ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں
نے اس سے پوچھا کہ اس کا ڈیڈی ابھی تک دفتر میں ہی ہے کیا؟ میناکشی بولی۔

"ڈیڈی کا بمبئی سے کوئی مہمان آیا ہوا ہے وہ اس کے ساتھ ہی آئیں گے"

میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مہمان کون ہے؟ کیا کوئی انگریز گورا ہے؟"

میناکشی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں گوروجی یہ تو ہندوستانی کرنل ہے۔ میں نے ڈیڈی کو فون کیا تھا انہوں
نے بتایا تھا کہ بمبئی سے کرنل شرما آئے ہیں ہم گھر پر چائے پئیں گے۔ ان کے
لئے بھی میں رس ملائی لائی ہوں۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بمبئی سے فوجی کرنل آیا ہے تو انکی باتیں ضرور سننی
چاہئیں۔ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات ہاتھ لگ جائے۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی۔ میناکشی نے
اپنے پیٹ پر ناف کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"گوروجی! آپ کی مہربانی اور کرپا سے تو میری ساری تکلیف دور ہو گئی ہے۔
آپ نے تو مجھے اک نیا جیون دے دیا ہے۔"

اور اس نے فرط عقیدت سے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر اس نے کہا۔

"میناکشی! میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا میں جب تک تمہارے شہر میں رہوں گا تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ تم فکر نہ کیا کرو"

میناکشی تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"نہیں نہیں گوروجی! ہم آپ کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ ہم ہمیشہ آپ کو اپنے پاس رکھیں گے۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ گوروجی تو مہاویر جی کا اوتار بن کر ہمارے گھر میں اترے ہیں۔ ہمارے گھر کے سارے دکھ درد دور ہو گئے ہیں۔"

اس دوران میری آنکھیں بالکونی سے آگے بنگلے کے گیٹ پر لگی رہیں۔ میں نے دور سے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس دیکھیں۔ میناکشی نے بھی گاڑی کی روشنیاں دیکھیں تو کہا۔

"ڈیڈی آگئے ہیں۔ میں نیچے جا کر مہمان کے لئے چائے کا انتظام کرتی ہوں۔ میں پھر آؤں گی کھانا آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گی"

اس وقت بادلوں کی وجہ سے شام کو ہلکا ہلکا اندھیرا جلدی ہو گیا تھا۔ میناکشی چلی گئی اس کے جانے کے بعد میں کمرے میں آکر صوفے پر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان کے ساتھ لگایا۔ مسٹر پانڈے کی آواز آئی وہ اپنے بھارتی فوجی افسر مہمان کرنل شرما کو انگریزی میں بے تکلفی سے بیٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ مجھے ایک ہی فکر تھی کہ کہیں وہ چائے ڈائننگ روم میں نہ پئیں۔ کیونکہ اس طرح میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ مسٹر پانڈے اپنے مہمان کرنل شرما کو لے کر باتیں کرتے ڈائننگ روم کی طرف چلے گئے۔ اب ان کی آوازیں دور سے بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر ریسیور رکھ دیا اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر بالکونی کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ریسیور

کان سے لگا کر دیکھ لیتا۔ ابھی تک یہ لوگ ڈائننگ روم میں ہی بیٹھے تھے۔ ایک بار ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو مجھے مسٹر پانڈے اور کرنل شرما کی انگریزی میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ باتیں کرتے ڈرائینگ روم کی طرف آرہے تھے۔ پھر ان کی باتوں کی آواز ایک ہی جگہ سے آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے ہیں۔ کرنل شرما مسٹر پانڈے سے دلی کے فوجی سیکریٹریٹ میں جو دفتری سیاست چل رہی تھی اس کی باتیں کر رہا تھا۔ مسٹر پانڈے کہنے لگا۔

"میری ترقی کے کاغذات بھی ہیڈ آفس میں ایک شخص نے دبا رکھے ہیں۔ وہ اندرا جی کے پاس فائیل جانے ہی نہیں دیتا۔ بھارت کو ایسے ہی لوگوں نے تباہ کیا ہے۔"

پھر کرنل شرما کی آواز آئی۔

"لگتا ہے کہ ابھی ہم دونوں میں سے کسی کی بھی ترقی نہیں ہوگی"

"وہ کیوں؟"

مسٹر پانڈے نے انگریزی میں پوچھا۔ کرنل شرما نے کہا۔

"آپ کو تو مجھ سے زیادہ معلوم ہونا چاہئیے کہ اندرا گاندھی پاکستان کو سبق سکھانا چاہتی ہے۔ کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئی ہیں۔ ہم اخباروں میں چاہے کچھ بیان دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں ہمارے فوجی یونٹ بہت نقصان اٹھا رہے ہیں۔"

مسٹر پانڈے نے کہا۔

"لیکن ہماری طرف سے تو کشمیر کے محاذ پر برابر اسلحہ سپلائی کیا جا رہا ہے اور اب تو اسرائیل نے جو ہمیں نیپام بم کے راکٹ دیئے ہیں ان کی آدھی ٹرین بھر کر ہم کشمیر کے محاذ پر اپنی فوجوں کو بھجوا رہے ہیں۔"

کرنل شرما نے ہنس کر کہا۔

"پانڈے جی! جب یہ ایمونیشن وہاں پہنچے گا تب دیکھیں گے۔ یہ سب کہنے کی

باتیں ہیں۔"

میں اپنی جگہ پر بالکل ساکت ہو گیا۔ جس راز کی مجھے تلاش تھی وہ راز افشا ہونے والا تھا۔ میں نے ریسیور اپنے کان کے بالکل ساتھ لگا لیا اور انگلی سے دوسرا کان بند کر لیا۔ مجھے مسٹر پانڈے کی آواز سنائی دی۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ انگریزی میں کہا۔

"کیا بات کرتے ہو کرنل شرما۔ میں نے ڈیپارچر آرڈر بھی ایشو کر دیا ہے۔ یہ ٹرین دیو لالی سے اس مہینے کی بیس تاریخ کو رات کے بارہ بجے دیولالی کے فوجی گریزن والے ریلوے ہالٹ سے روانہ ہو جائے گی"

کرنل شرما نے قہقہہ لگا کر پوچھا۔

"کیا واقعی؟"

مسٹر پانڈے نے کہا۔

"یار تم کو یقین کیوں نہیں آتا۔ تم کشمیر فرنٹ پر جا رہے ہو۔ وہاں جا کر بریگیڈیئر تیواڑی کو میری طرف سے بتا دینا کہ اس بار ہم کشمیریوں کو مزا چکھانے کے لئے اسرائیلی نیپام راکٹ بھیج رہے ہیں بریگیڈیئر کو کہنا کہ بے شک ان بموں سے کشمیر کے سارے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دے۔ آدھی ٹرین راکٹوں سے بھر کر بھیج رہا ہوں۔ تم مذاق سمجھتے ہو کیا؟ کشمیر بھارت کے لئے بڑا اہم فرنٹ ہے----"

کرنل شرما کی آواز آئی۔

"ویری گڈ! اگر یہ بات ہے تو ہماری فوجی یونٹوں کے لئے تو یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ اچھا یار اب میں چلتا ہوں۔ گیارہ بجے کی فلائیٹ پکڑ کر بمبئی واپس جانا ہے اور وہاں سے صبح صبح سری نگر والی ملٹری فلائیٹ پکڑنی ہے۔"

مسٹر پانڈے کی آواز سنائی دی۔

"میں تو چاہتا تھا کہ تم کھانا کھا کر جاتے"

"نو مائی ڈیئر فرینڈ۔ پھر کسی روز سہی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"او کے----"

ان دونوں کے باتیں کرنے کی آوازیں کمرے سے باہر نکل کر میرے کانوں سے دور ہو گئیں۔ مسٹر پانڈے نے دیو لالی کے فوجی گیریزن سے ٹرین کے چلنے کی جو تاریخ اور وقت بتایا تھا وہ میں اس وقت سے اپنے دماغ میں دہرائے جا رہا تھا۔ جب ریسیور پر ان کی آوازیں آنا بند ہو گئیں تو میں جلدی سے ریسیور رکھ کر اٹھا۔ بریف کیس میں سے نوٹ بک نکال کر اس پر کوڈ لفظوں میں بیس جون رات بارہ بجے دیو لالی لکھا اور نوٹ بک بریف کیس میں رکھ کر بریف کیس کو لاک کر دیا۔

پھر میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر یوں دراز ہو گیا جیسے میں سو میٹر کی دوڑ جیت کر آ رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ راز جو میرے لئے اہم ہی نہیں تھا بلکہ میرے لئے ایک امتحان بن چکا تھا مجھے اتنی آسانی سے اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے معلوم ہو جائے گا۔ میں نے حساب لگایا۔ بیس تاریخ کے آنے میں ابھی دس روز باقی تھے۔ پورے دس دن ----- ان دس دنوں میں مجھے اپنے ٹارگٹ پر اٹیک کرنے کے لئے تمام ضروری اور ابتدائی تیاریاں مکمل کرنی تھیں۔ اب کریم بھائی سے ملاقات ضروری تھی۔ میں نے اسی رات کریم بھائی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رات کا کھانا ہم سب نے مل کر نیچے کھایا۔ مسٹر پانڈے نے دبی زبان میں مجھ سے اپنی ترقی والی فائل کے بارے میں ذکر کیا اور کہا۔

"گوروجی! اب یہ کرپا بھی کر دیجئے۔ آپ کا داس ہوں۔ کسی طرح میری فائل پر اندراجی کے دستخط ہو جائیں۔ پھر میری ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی---"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گوکل داس! وقت آنے پر بھگوان مہاویر کی کرپا سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ بہت جلد یہ وقت آنے والا ہے۔ اس کے لئے مجھے ایک خاص چلہ کرنا ہو گا۔ جس رات چلہ کروں گا اس کے دوسرے دن

تمہاری فائل پر اندرا جی کے دستخط ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔"

مسٹر پانڈے ہاتھ باندھے جو آپ کی اچھیا مہاراج جو آپ کی مرضی گورودیو کہتا رہا۔ رات کے دس بجے میں سونے کا کہہ کر اوپر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ مجھے رات کے بارہ بجے کے بعد کریم بھائی سے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بات کرنی تھی۔ میں نے سوائے ٹیبل لیمپ کے بیڈ روم کی باقی ساری بتیاں بجھا دی تھیں۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی بڑی مدھم تھی اور صرف پلنگ تک ہی محدود تھی۔ اتنی دیر تک میں انگریزی کا ایک جاسوسی ناول پڑھتا رہا۔ جب گھڑی نے رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ بجائے تو میں نے خفیہ جگہ پر رکھا ہوا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکالا۔ اس کو آن کر کے فریکوینسی ملائی اور کوڈ سگنل کے اشارے دیئے۔ دوسری طرف سے بھی مجھے سگنل کے اشارے ملنے لگے۔ میرا ماسٹر سپاہی اپنے ٹرانسمیٹر کے پاس موجود تھا۔ میں نے کوڈ میں کریم بھائی کا نام پوچھا اس نے اپنا کوڈ نمبر اور نام بتایا۔ پھر مجھ سے میرا خفیہ نمبر اور کوڈ نام پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ملاقات کل ضرور ہونی چاہئے۔ مجھے ٹرین کا راز مل گیا ہے۔ دوسری طرف سے کریم بھائی نے کوڈ میں کہا۔

"کل اپنے وقت پر ہائیڈ آؤٹ میں پہنچ جانا۔ اور کوئی بات؟"

میں نے کہا۔

"نہیں"

اس نے کہا۔

"راجر"

اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سگنل بند ہو گئے۔ میں نے ٹرانسمیٹر بند کر کے ٹرانسمیٹر کو جو ک سگریٹ لائیٹر کی شکل میں تھا کمرے میں ایک خاص جگہ پر چھپا دیا۔ دراصل میں ٹرانسیٹ والا سگریٹ لائیٹر اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ کسی نے دیکھ لیا تو خو مخواہ اس کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ اگر میں سگریٹ نہیں پیتا تو میں نے لائیٹر ا پاس کیوں رکھا ہوا ہے۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھایا اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اس وقت با بالکونی سے بارش کی آواز آرہی تھی۔ بارش دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور کشمیر کے محاذ پر جانے والی اسلحے کی ٹرین کو اڑانے کے بارے میں مختلف منصوبوں پو غور کر رہا تھا۔ اچانک مجھے ایسے لگا جیسے کوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آواز میرے بیڈ روم والے دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ پھر دروازے پر آہستہ سے کسی نے دستک دی۔ میں فوراً دستک کی آواز کو پہچان گیا۔ یہ میناکشی تھی۔ مجھے اس پر سخت جھنجھلاہٹ ہوئی کہ اتنی رات گئے وہ میرے بیڈ روم میں کیا کرنے آئی ہے۔ کیا کرنے آئی ہے اس کے بارے میں میں اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے غصہ اس لئے آرہا تھا کہ یہ کیوں آئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کروں اور اسے کس طرح سمجھاؤں۔ وہ واقعی مجھ سے بے حد محبت کرنے لگی تھی۔ اور ایک انتہائی عقیدت مند ہندو عورت کی طرح وہ مجھ سے جسمانی ملاپ چاہتی تھی جو میرے مسلک کے خلاف بات تھی۔ میں اسے دھتکارنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات میرے حق میں کسی مرحلے پر نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور پوچھا کون ہے۔ دوسری طرف سے میناکشی کی سرگوشی ایسی آواز آئی۔

"میں ہوں گورو جی۔ میناکشی!"

میں نے دروازہ کھولا تو میناکشی میرے قدموں پر گر پڑی۔

"مجھے شما کر دیں گورودیو! میرے بدن میں آپ کے پریم کی آگ لگی ہوئی ہے۔ آپ میرے لئے شو جی بھگوان کے مہمان ہیں۔ مجھے اپنی پاروتی بنا لیں۔ مجھے اپنی پاروتی بنا لیں-----"

وہ ایسے التجائیں کر رہی تھی۔ جیسے اس پر کوئی بھاری مصیبت نازل ہو گئی ہو۔ وہ سلیپنگ ڈریس میں تقریباً نیم عریاں تھی۔ ہندو عورتیں جیسا کہ میرے مشاہدے میں آیا ہے اپنے جسم کو عریاں کرنے میں کوئی عار یا شرم محسوس نہیں کرتیں۔ خاص طور جب ان پر کسی دیوی دیوتا یا سادھو سنت سے پریم وغیرہ کا بھوت سوار ہو گیا ہو۔ میناکشی کی بھی یہی

حالت تھی۔ لیکن مجھے اسلام کے اصولوں کے مطابق جو کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ اپنے کردار کو چٹان کی طرح مضبوط رکھنا ہے۔ کبھی جنسی ترغیبات کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا۔ ایک مرد مومن کمانڈو کی اصل طاقت اس کا ایمان اور خدا پر یقین ہوتا ہے اور خدا پر یقین اور ایمان کو جو چیز طاقت اور توانائی پہنچاتی ہے وہ انسان کا بلند کردار ہوتا ہے۔ وہ جانوروں کی طرح کبھی جذبات کی رو میں نہیں بہتا۔ وہ ہر حالت اور صورت حال میں اپنے جنسی جذبات کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔ وہ خود اپنا فاتح ہوتا ہے۔ ہوشنگ آباد کی پہاڑیوں میں جس مرد مجاہد نے مجھے پہلی بار ٹریننگ دی تھی وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اس کی زبان پر اقبال کا یہ شعر ہر وقت رہتا تھا۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

وہ مجھے کہا کرتا تھا۔

"جوان! اپنے جسم کی طاقت کو اپنے اندر سنبھال کر رکھو۔ یہ خدائی نور ہے۔ یہ خدائی توانائی ہے اس کی طاقت کا مقابلہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھی نہیں کر سکتیں۔ جب تک آدمی کے اندر اس کے بدن کی طاقت موجود ہے وہ بڑی سے بڑی چٹان سے بھی ٹکرا کر اسے پاش پاش کر سکتا ہے۔ یہ طاقت ہی انسان کے اندر رہ کر اس کے جسم کی کمزوریوں کا علاج کرتی ہے اور ایک وقت آنے پر خدا کا نور بن کر اس کے جسم کو اس کی روح کو منور کر دیتی ہے۔"

اس مرد مومن کی ساری باتیں مجھے یاد تھیں اور میں نے اپنے کمانڈو مشن پر نکلنے کے بعد آج تک ان پر عمل کیا تھا۔ میں نے میناکشی کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو میناکشی! نہ تو میں بھگوان سمان ہوں اور نہ تم میری پاروتی بن سکتی ہو۔ میں تو مہاویر کا بھگت ہوں جاؤ نیچے جا کر سو جاؤ۔ کسی نے تمہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔ تمہارے ساتھ میری بھی بدنامی ہوگی"

مگر میناکشی پر تو جنسی عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی

مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ کر کے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار اگر تم نے آئندہ اس قسم کی حرکت کی۔ نہیں تو یاد رکھو۔ میں تمہیں ایسی بددعا دوں گا کہ تمہارے جسم میں پھر سے کینسر کے پھوڑے نکل آئیں گے۔۔۔۔"

یہ سن کر میناکشی خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کا بھوت اسی وقت اتر گیا۔ ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سر جھکا دیا اور روتے ہوئے بولی۔

"گورودیو! مجھے شما کر دیں۔ میں بھٹک گئی تھی۔ مجھے شما کر دیں۔ مجھے بھول ہو گئی۔۔۔۔"

وہ روئے جا رہی تھی اور مجھ سے معافیاں مانگے جا رہی تھی۔ مجھ پر جو زبردست بلا ایک نیم عریاں عورت کی شکل میں نازل ہوئی تھی وہ دور ہو گئی تھی۔ میرا یہ ایمان ہے کہ انسان کے اندر اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی خواہ کتنی ہی طاقت کیوں نہ ہو' جب تک اللہ کی رضا اور اللہ کا فضل اس میں شامل حال نہ ہو وہ گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے انسان کو اپنے کردار کو بلند تر' مضبوط تر بنانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا بھی طالب رہنا چاہیے۔

میناکشی سر جھکائے شرمسار سی ہو کر وہیں سے واپس سیڑھیاں اتر گئی۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ بستر پر آکر لیٹ گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے گناہ سے بچا لیا تھا۔ رات گزر گئی۔

دوسرے دن میناکشی میرے سامنے آئی تو اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ شرمسار سی تھی۔ میں نے اسے پاس بلا کر اسے دو تین اچھی اچھی باتیں کہیں۔ وہ خوش ہو گئی اور میرے پاؤں چھو کر بولی۔

"گوروجی! آپ سچ مچ بھگوان سمان ہیں"

میں نے اسے کہا کہ آج رات کو مجھے پوجا کے لئے سوامی نارائن کے مندر میں جانا ہو

گا۔ رات آٹھ بجے جاؤں گا اور ایک دو بجے رات واپس آجاؤں گا۔ تم اپنی گاڑی کی چابیاں مجھے دے دینا۔ میناکشی نے انتہائی عقیدت سے کہا۔

"گوروجی! آپ ابھی سے چابیاں لے کر اپنے پاس رکھ لیں"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں بالکا! مجھے رات آٹھ بجے دے دینا۔"

دن بھر میں اپنے اوپر والے کمرے میں ہی رہا آدھی رات کے وقت مجھے اپنے ماسٹر سپائی کریم بھائی سے ملنے جانا تھا اور اسے یہ اچھی خبر سنانی تھی کہ مجھے جموں جانے والی ایمونیشن کی ٹرین کی تاریخ اور وقت کا سراغ مل گیا ہے۔ رات کو میں نے میناکشی اور مسٹر پانڈے نے مل کر کھانا کھایا۔ مجھے آدھی رات کے وقت ماسٹر سپائی سے ملنا تھا مگر میں گھر سے آٹھ نو بجے ہی نکل جانا چاہتا تھا تاکہ ان لوگوں کو شک نہ پڑے کہ میں آدھی آدھی رات کو کہاں جاتا ہوں۔

ٹھیک نو بجے میں نے میناکشی سے چابیاں لیں اور اس کی گاڑی لے کر سوامی نارائن کے مندر کی طرف چل پڑا۔ مجھے بہرحال مندر ضرور جانا تھا۔ تاکہ اگر کوئی میرا پیچھا بھی کر رہا ہو تو اسے یہی پتہ چلے کہ میں مندر میں پوجا کرنے آیا ہوں۔ میں رات گیارہ بجے تک مندر میں بیٹھا بظاہر پوجا کرتا اور منکوں کی مالا پھیرتا مگر دل میں اسلحہ کی گاڑی کو اڑانے کے بارے میں طرح طرح کے منصوبے سوچتا رہا۔ گیارہ بج کر تین منٹ پر میں مندر سے گاڑی لے کر نکلا اور شہر کے باہر کے نسبتاً ویران اور غیر آباد علاقوں سے گذرتا ہوا ریلوے لائن کے قریب واقع اپنے کوارٹر والے ہائیڈ آؤٹ میں پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے وہاں سے تھوڑی دور ایک جگہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے اندھیرے میں کھڑی کر دی تھی۔

میں ذرا پہلے آگیا تھا۔ رات بارہ بجے ماسٹر سپائی کریم بھی پہنچ گیا۔ ہم کوارٹر کے خالی سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں نے فرش کے کونے میں موم بتی روشن کر رکھی تھی۔ جب میں نے کریم کو بتایا کہ میں نے جموں جانے والی اسلحہ کی فوجی ٹرین کا سراغ لگا لیا۔ تو اس نے میری طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"ذرا ٹھہرو"

وہ اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ دروازے کو تھوڑا سا کھول کر اندھیرے میں باہر دیکھا۔ دروازے کو بند کیا اور واپس آکر میرے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔

"ٹرین کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ اسلحہ سے بھری ہوئی یہ فوجی مال گاڑی اس مہینے کی بیس تاریخ کو آدھی رات کے وقت دیولالی کے فوجی گیریزن کی ہالٹ لائن سے روانہ ہوگی۔ پھر میں نے خفیہ مائیکروفون کے ذریعے مسٹر پانڈے اور کرنل شرما کی جو باتیں سنیں تھیں وہ ساری کی ساری بیان کر دیں۔ کریم بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"تم نے اپنے پہلے کمانڈو ایکشن کا پہلا امتحان پاس کر لیا ہے۔ اب تمہیں یہ گاڑی تباہ کرنی ہو گی"

میں نے اسے بتایا کہ کرنل شرما اور مسٹر پانڈے کی باتوں سے تمہاری اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی ہے کہ اس ٹرین میں اسرائیل کے دیئے ہوئے نیپام راکٹ بموں کی بہت بھاری تعداد کشمیر کے محاذ پر لے جائی جا رہی ہے۔

"مسٹر پانڈے نے کرنل شرما سے کہا تھا کہ کشمیر فرنٹ پر بریگیڈیئر کو بتا دینا کہ ہم تمیں اتنے زیادہ نیپام راکٹ سپلائی کر رہے ہیں کہ تم کشمیر کے سارے مسلمانوں کے گھروں کو جلا کر راکھ کر سکتے ہو"

کریم بولا۔

"اس گاڑی کو تباہ کرنا بڑا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ گاڑی ہرگز ہرگز جموں صحیح سلامت نہیں پہنچنی چاہیے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟"

ماسٹر سپائی کریم بھائی نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہا۔
پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔
"ہمیں اس گاڑی کو جھانسی اور بھوپال کے درمیان تباہ کرنا ہو گا۔ میرے ذہن میں ایک ویران ریلوے سٹیشن آگیا ہے جس کا نام ڈگھاٹ ہے۔ یہاں سے ہم ٹرین پر اٹیک کر سکتے ہیں"
میں نے پوچھا۔
"ڈگھاٹ ریلوے سٹیشن میں کون سی خاص بات ہے اور اس سے پہلے ہم کسی جگہ گاڑی کو تباہ کیوں نہیں کر سکتے۔"
ماسٹر سپائی کریم نے مجھے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"یہ ایک ملٹری ٹرین ہے۔ اسلحہ سے بھری ہوئی ہے اور خاص طور پر اس میں نیپام بم کے راکٹوں کی بھاری تعداد موجود ہے۔ ظاہر ہے اس کی سیکورٹی کے زبردست انتظام کئے گئے ہوں گے سیکورٹی گارڈز کی پوری پلاٹون اس کے ساتھ سفر کر رہی ہو گی۔"
میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"لیکن ہم اس گاڑی کو بھارتی پنجاب کے علاقے میں بھی تباہ کرنے کی کوشش

کر سکتے ہیں وہاں ہمیں خالصتان تحریک کے سکھوں کی بھی مدد مل سکتی ہے۔"
کریم بھائی بولا۔
"پنجاب میں گاڑی پر ہمارا حملہ ناکام بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خالصتان کی تحریک اور کشمیری کمانڈوز کے خطرے کے پیش نظر اسلحہ سے لدی ہوئی یہ گاڑی جب بھارتی پنجاب کی حدود میں داخل ہو گئی تو اس کی سیکورٹی مزید سخت کر دی جائے گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے سیکورٹی گارڈز کا ایک ایک اضافی ڈبہ بھی لگا دیا جائے جس کی چھت پر انڈین گنر مشین گنیں لگائے مورچے بنا کر بیٹھے ہوں۔ پنجاب سے پہلے پہلے خاص طور پر مدھیہ پردیش کا جو علاقہ ہے یہاں فوجی نقطہ نگاہ سے ٹرین کو کسی تخریبی کاروائی کا خطرہ نہیں ہے یہاں کبھی کسی فوجی ٹرین پر کشمیریوں کا کمانڈو اٹیک نہیں ہوا۔ اس لئے سیکورٹی کے حکام یہاں ٹرین کی سیکورٹی کی جانب سے نارمل رہیں گے۔ ہمارے کمانڈو اٹیک کے لئے یہی علاقہ سب سے موزوں رہے گا اور اس علاقے میں صرف ڈگھاٹ نام کا ایک ایسا غیر آباد ویران سا دیہاتی ریلوے سٹیشن ہے جہاں سے ہم ٹرین پر اٹیک کر سکتے ہیں۔"
میں نے ڈگھاٹ کے بارے میں مزید پوچھا تو ماسٹر سپائی نے کہا۔
"یہ سارا علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔"
میں نے کہا۔
"ٹرین کو تباہ کرنے کے لئے ہمیں تمہارے خیال میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ریلوے لائن میں دو تین جگہوں پر زبردست دھماکے سے پھٹنے والے بم لگا دیں۔"
ماسٹر سپائی کریم کہنے لگا۔
"اگر ٹرین میں صرف گولہ بارود ہی لدا ہوتا تو ہم ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن میری

اطلاع کے مطابق ٹرین کے تین ڈبے نیپام راکٹوں سے بھرے ہوئے ہیں اور نیپام راکٹوں کے بارے میں تازہ ترین تحقیقات کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس کے ڈیٹونیٹر فیوز کو ضرب نہ لگائی جائے یا اس پر کسی دوسرے راکٹ کی ڈائریکٹ ہٹ نہ لگائی جائے یہ نہیں پھٹتا۔ ہم اگر ریلوے لائن کو اکھاڑ بھی دیتے ہیں تو اس کے دو ہی نتیجے سامنے آسکتے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ کہ ہو سکتا ہے انجن ڈرائیور دور سے پٹڑی کو اکھڑا ہوا دیکھ لے۔ یا قریب جاکر ٹرین روکنے میں کامیاب ہو جائے۔ یا اگر روکتے روکتے ٹرین کے دو تین ڈبے الٹ بھی جائیں تو اس سے ساری گاڑی کو نقصان پہنچنے کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ نیپام راکٹ یقیناً پچھلے ڈبوں میں بھرے ہوئے ہوں گے۔ فرض کریں کہ ساری کی ساری گاڑی ہی الٹ جاتی ہے تب بھی یہ ضروری نہیں کہ ساری ٹرین کے اسلحے کو آگ لگ جائے۔ یہ جدید سائنس کا زمانہ ہے۔ اسلحہ کو یقیناً پوری طرح سے محفوظ بنا کر ٹرین میں لے جایا جا رہا ہو گا۔"

میں نے بھی کمانڈو تربیت کے دوران اسلحہ وغیرہ کی پوری ٹریننگ لے رکھی تھی۔ میں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان ڈبوں یا بوگی پر جس میں نیپام راکٹ لے جائے رہے ہیں راکٹ فائر کرنے ہوں گے"

کریم نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہمیں راکٹ لانچر سے راکٹ فائر کرنے ہوں گے اور چلتی ٹرین پر نشانہ لگانا ہو گا اور نشانہ بھی صرف ان ڈبوں کا لگانا ہو گا جن میں نیپام راکٹ ہوں گے"

میں نے کہا۔

"اس بارے میں کیسے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ نیپام راکٹ پچھلے ڈبوں میں ہی بھرے ہوئے ہوں گے"

کریم بولا۔

"اس کا مجھے پورا یقین ہے۔ مجھے اس بارے میں اپنے ذرائع سے بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ خطرناک اسلحہ ٹرین کی عقبی بوگیوں یا بوگی میں لدا ہوا ہو گا"

مجھے ایک خیال آگیا۔ میں نے کہا۔

"کیا راستے میں کوئی پہاڑی سرنگ نہیں آتی؟ میرا مطلب ہے کہ کیا ہم سرنگ میں ٹرین پر حملہ نہیں کر سکتے؟"

"نہیں نہیں۔ یہ ہرگز نہ سوچنا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سرنگیں بمبئی سے پوری سٹیشن تک اوپر تلے آتی ہیں۔ دیولالی سے آگے برہان پور تک دو ایک سرنگیں آتی ہیں مگر وہ چھوٹی ہیں۔ ویسے بھی سرنگ میں چھپ کر ہم ڈبے پر راکٹ فائر نہیں کر سکتے۔ اگر فائر کر بھی دیا تو ساتھ ہی ہمارے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔ مڈگھاٹ کا سٹیشن اس کمانڈو ایکشن کے لئے بالکل موزوں رہے گا۔ میں تمہیں پہلے ساتھ لے جا کر یہ جگہ دکھا دوں گا۔ ابھی ٹرین کے چلنے میں دس دن باقی ہیں۔ ہم کل ہی مڈگھاٹ کا سپاٹ دیکھنے کے لئے احمد آباد سے روانہ ہو جائیں گے۔ ہمیں احمد آباد سے بذریعہ بس رتلام تک سفر کرنا ہو گا۔ رتلام سے ہم ٹرین پکڑیں گے اور بھوپال آجائیں گے۔ مڈگھاٹ بھوپال اور جھانسی کے درمیان ایک سٹیشن ہے تم ایسا کرنا۔ صبح دس بجے احمد آباد کے شوپوری والے بس اڈے پر پہنچ جانا۔ وہاں سے رتلام کے لئے لاریاں چلتی ہیں تمہیں جو پہلی لاری ملے تم اس میں سوار ہو کر رتلام پہنچ جانا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ تم رتلام کے لاری اڈے پر میرا انتظار کر سکتے ہو۔ میں وہاں تمہارے تھوڑی دیر بعد ہی پہنچ جاؤں گا۔ ہم احمد آباد سے اکٹھے سفر نہیں کریں گے۔ اور کوئی خاص بات؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں"

ماسٹر سپائی اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے۔ میں جاتا ہوں"

یہ کہ کر کریم تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی اپنی گاڑی میں بیٹھا مسٹر پانڈے کے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ رات کے اڑھائی بجے میں گھر پہنچا۔ کمرے میں آتے ہی صبح آٹھ بجے کا الارم لگا کر سو گیا۔ صبح الارم نے مجھے جگا دیا۔ ناشتے کی میز پر میناکشی اور مسٹر پانڈے موجود تھے۔ میں نے مندر سے کچھ پھول لے کر گاڑی میں رکھ لئے تھے۔ میں نے وہ پھول انہیں دیئے اور کہا۔

"رات میں دو بجے تک بھگوان مہاویر کے نام کی مالا کا جاپ کرتا رہا۔ یہ پھول تمہارے لئے بھگوان مہاویر نے بھیجے ہیں"

میناکشی اور مسٹر پانڈے نے گیندے کے پھول بڑی عقیدت سے لئے اور انہیں بار بار چوم کر آنکھوں سے لگانے لگے۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ مجھے دو ایک دن کے لئے دلی جانا پڑ گیا ہے۔ میناکشی نے فکرمند سی ہو کر پوچھا۔

"گوروجی! خیر تو ہے ناں؟"

"ہاں ہاں"

میں نے کہا۔

"رات کو میں نے دلی اپنی بھانجی کو فون کیا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے وہ تمہارے ڈانس سنٹر میں داخل ہو کر بھارت ناٹیم سیکھنا چاہتی تھی۔ مگر رات معلوم ہوا کہ وہ بڑی بیمار ہے۔ اسی لئے مجھے آج ہی احمد آباد سے دلی جانا پڑ گیا ہے"

مسٹر پانڈے نے فوراً کہا۔

"میں ابھی فون کر کے آپ کی کسی فلائٹ میں سیٹ ریزرو کروا دیتا ہوں"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں ہوائی جہاز میں سفر کرنا پسند نہیں کرتا۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔

دس بجے بروده ایکسپریس دلی جاتی ہے میں اسی میں چلا جاؤں گا۔"

مسٹر پانڈے کو ذرا تشویش سی ہوئی۔ کیونکہ ابھی اس کے گردے کی ایک پتھری اس کے گردے میں موجود تھی اور اس کے ترقی کی فائیل پر اندرا گاندھی کے دستخط ہونے بھی باقی تھے کہنے لگا۔

"گوروجی! آپ جلدی واپس آجائیں گے نا؟ آپ نہیں ہوں گے تو مجھے تو ایسے لگے گا جیسے اس گھر سے بھگوان روٹھ کر چلا گیا ہے"

میں نے اسے تسلی دی۔

"گوکل داس! تمہارا ہمارا ایسا سمبندھ ہو گیا ہے کہ یہ اس جنم میں تو نہیں ٹوٹے گا۔ میں دو تین دن سے زیادہ دلی نہیں ٹھہروں گا۔ مجھے بھی تو یہاں مہاویر جی کے مندر میں ہر روز حاضر ہو کر پوجا پاٹھ کرنی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے میں ایک چلہ کاٹ رہا ہوں۔"

مسٹر پانڈے اور میناکشی دونوں کی تسلی ہوئی۔ مسٹر پانڈے نے ناشتے کی ٹیبل سے اٹھتے ہوئے میناکشی سے کہا۔

"بیٹی تم خود گوروجی کو سٹیشن پر چھوڑ آنا۔ ڈرائیور کے ساتھ مت بھیجنا"

میناکشی نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی!"

جب مسٹر پانڈے اپنے آفس چلے گئے تو میں نے میناکشی سے کہا۔ کہ میں اکیلا ہی سٹیشن جاؤں گا۔ اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میناکشی تو میرے ہر حکم کو بھگوان کا حکم سمجھتی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"جیسے آپ کی مرضی گوروجی"

مجھے معلوم تھا کہ جیسے ہی میں بنگلے سے باہر نکلا خفیہ پولیس کا آدمی اپنے معمول کے مطابق میرے پیچھے نکل پڑے گا۔ ہاں اگر میں گاڑی میں جاؤں گا تو وہ میرا تعاقب کرنے کا اتنا تردد نہیں کرے گا۔ کیونکہ ابھی تک میں ان کی نظروں میں مسٹر پانڈے کے گھر ٹھہرا

ہوا ایک سادھو سنت ہی تھا۔ انہیں ابھی میرے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔ وہ بر روٹین میں میری نگرانی کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے میناکشی سے کہا

"تم ایسا کرنا کہ مجھے سوامی نارائن کے مندر چھوڑ دینا میں دلی جانے سے پہلے وہاں پرارتھنا کرنا چاہتا ہوں"

میناکشی فوراً تیار ہو گئی۔

ابھی دس نہیں بجے تھے۔ میں میناکشی کی گاڑی میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ بنگلے سے نکلا۔ ظاہر ہے خفیہ پولیس والوں نے مجھے دیکھا ہو گا۔ لیکن گاڑی میں دیکھ کر میرا پیچھا کرنے کا خیال دل سے نکال دیا ہو گا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ میری نگرانی سے انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں بنگلے سے نکل کر مندر ہی جاتا ہوں۔

میناکشی نے مجھے نارائن جی کے مندر کے دروازے پر اتار دیا اور مجھے نمسکار کہہ کر چلی گئی۔ میں نے کچھ وقت مندر میں گزارا۔ اور پھر مندر کے دوسرے دروازے سے نکل کر موٹر رکشا لیا اور پوری بازار کے لاری اڈے پر پہنچ گیا۔ آدھ گھنٹہ بعد مجھے رتلام جانے والی بس مل گئی۔ اور میں رتلام کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سارا راستہ کافی لمبا تھا۔ احمد آباد سے نکلنے کے بعد کچھ دیر تک علاقہ تھوڑا ریتلا اور تھوڑا سرسبز آتا رہا۔ پھر نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ بہر حال بس ڈیڑھ بجے کے قریب رتلام پہنچی۔ رتلام شہر میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ یہاں میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ کریم بھائی نے کہا تھا کہ میں لاری اڈے پر ہی اس کا انتظار کروں۔ چنانچہ میں نے وہیں ایک چھوٹی سی کینٹین میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور کریم بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں اور لاریاں قریب ہی آکر رکتی تھیں اور مسافر اترتے تھے۔ کافی دیر بعد ایک لاری آکر رکی۔ اس میں سے جو مسافر اترے ان میں کریم بھائی بھی تھا۔ میں احتیاطاً اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہا۔ کریم نے اتر کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ میرے پاس آگیا۔

"جب تم بنگلے سے نکلے تھے تو کوئی انٹیلی جینس کا آدمی تو تمہارے پیچھے نہیں لگا

تھا؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں میناکشی کی گاڑی میں بیٹھ کر پہلے سیدھا مندر گیا تھا۔ پھر ہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد رکشا لے کر لاری اڈے آیا تھا۔ وہ بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"

ہم لاری اڈے سے نکل کر بازار میں آگئے۔ اس نے ایک موٹر رکشا کو ہاتھ دے کر روکا اور کہا۔

"ریلوے سٹیشن چلو"

راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کھانا کھا لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ہاں کھا لیا ا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور ریلوے سٹیشن تک خاموش رہا۔ میں نے کوئی بات رنی چاہی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

ریلوے سٹیشن آکر معلوم ہوا کہ بھوپال جانے والی گاڑی شام کے وقت چلے گی۔ ریم کہنے لگا۔

"یہاں سے بھوپال تک کا سارا علاقہ جنگلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان جنگلوں میں شیر ہاتھی سب درندے ہوتے ہیں رات تو ہمیں بھوپال میں پڑ جائے گی۔ ہم شام کی گاڑی ہی پکڑیں گے اتنی دیر ہم ایک گھاٹ پر چل کر بیٹھتے ہیں"

کریم کو اس شہر کے سارے علاقوں کا پتہ تھا۔ وہ مجھے ایک گھاٹ پر لے آیا جس کے اتھ ہی ایک بڑی کشادہ ندی بہہ رہی تھی۔ یہاں گھاس پھونس کی جھونپڑی کی ایک ئے کی کینٹین بنی ہوئی تھی۔ ہم کینٹین کے باہر لوہے کی پرانی کرسیوں پر چائے منگوا کر ٹھ گئے۔ وہ کہنے لگا۔

"یہاں سے واپس احمد آباد پہنچتے ہی مجھے سب سے پہلے اپنے ایک خاص آدمی کو دیولالی بھیجنا ہو گا۔ وہ اپنے ذرائع سے اس بات کی تصدیق کرنے کی کوشش کرے گا کہ دیولالی کے فوجی گیریزن سے بیس تاریخ کی رات کو ایک فوجی مال گاڑی روانہ ہو رہی ہے کہ نہیں۔ وہ اس گاڑی کا نمبر اور اس کے ڈبوں کا کلر

وغیرہ معلوم نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ اس وقت یہ گاڑی گیریزن کے اندر تک گئی ہوئی ریلوے لائن پر کھڑی ہو گی مگر وہ گیریزن میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ وہ صرف اس کی روانگی کی تصدیق کرنے کی ہی کوشش کرے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ فوجی مال گاڑی دیولالی سے روانہ ہو چکی ہے"

ماسٹر سپائی نے کہا۔

"ہمارا ایک آدمی جل گاؤں کے ریلوے سٹیشن پر اس رات ریلوے قلی کے بھیس میں موجود ہو گا۔ دیولالی سے آگے جل گاؤں کا بڑا سٹیشن ہے۔ جیسے ہی فوجی مال گاڑی جل گاؤں سے رن تھرو گزرے گی وہ ریڈیو ٹرانسیٹر پر ہمیں مڈ گھاٹ خبر کر دے گا۔ ہم دونوں مڈگھاٹ کے سٹیشن کی قریبی پہاڑی میں موجود ہوں گے۔"

میرے اس سوال پر کہ یہ ٹرین دیولالی کے فوجی گیریزن سے روانہ ہونے کے بعد مڈگھاٹ کے سٹیشن پر کب پہنچے گی اس نے کہا۔

"اس فوجی گاڑی کا روٹ میرے حساب سے یہ ہونا چاہئے۔ وہ دیولالی سے جل گاؤں' بھوساول' برہان پور' کھنڈوا' ہوشنگ آباد' بھوپال' جھانسی' گوالیار' آگرہ اور دلی ۔ دلی سے آگے دو روٹ ہو سکتے ہیں۔ ایک روٹ پانی پت کرنال کی طرف سے جالندھر اور دوسرا روٹ میرٹھ انبالہ لدھیانہ اور جالندھر۔ جالندھر سے پہنچ کر اسی گاڑی کو ہوشیار پور کٹھوعہ سے ہوتے جموں توی پہنچنا ہے۔ اگرچہ یہ گاڑی کسی سٹیشن پر نہیں رکے گی۔ اس کا سفر رن تھرو ہو گا۔ لیکن کسی کسی جگہ تھوڑی دیر کے لئے پانی وغیرہ لینے کے لئے رک سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"پھر تو یہ مڈگھاٹ کے سٹیشن پر بھی نہیں رکے گی اور ہمیں چلتی ٹرین پر اٹیک کرنا ہو گا"

وہ بولا۔

"ہمیں موونگ ٹارگٹ یعنی چلتی ٹرین پر ہی راکٹ فائر کرنے کے لئے تیار رہنا ہو گا۔ اور ٹرین کی پچھلی تین چار بوگیوں پر اوپر تلے راکٹوں کا ریپڈ فائر کرنا ہو گا۔ اگلے ڈبوں پر فائر کرنے سے فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"اور اگر اتفاق سے یا کسی خطرے کے پیش نظر نیپام راکٹوں کی پیٹیاں اگلے ڈبوں میں لدی ہوئی ہوئیں تو پھر کیا ہو گا؟"

کریم نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا۔

"پھر جو اللہ کی مرضی ہو گی وہی ہو گا بہر حال ہم پچھلے ڈبوں کو ہٹ کریں گے"

جب میں نے یہ سوال کیا کہ ہمارے پاس راکٹ لانچر اور راکٹ کہاں سے آئیں گے تو ماسٹر سپائی اور پاکستان اور اسلام کے سچے عاشق کریم بھائی نے کہا۔

"ہندوستان کی ہندو حکومت مسلمانوں کی جانی دشمن ہے۔ وہ ہندوستان سے ہمارا نام ونشان مٹا دینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے وہ باقاعدہ ایک پروگرام بنا کر اس پر عمل کر رہی ہے ہندوؤں کا اپنا تو کوئی دین مذہب نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کے نئی نسل کے مسلمان نوجوانوں کو ہندو بنانے کی مذموم کوشش کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر مہینے کسی نہ کسی شہر میں ہندو مسلم فسادات کرائے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ان ناپاک عزائم کے خلاف ہم بھارتی مسلمان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر ہماری جنگ خفیہ جنگ ہے۔ اس جنگ کی حکمت عملی یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ دینی تعلیم کی طرف لا رہے ہیں اور ان کو ہندو حکومت کے اسلام دشمن عزائم سے آگاہ کر رہے ہیں۔ اب میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ انڈین ملٹری ٹرین کو اڑانے کے لئے راکٹ کہاں سے آئیں گے۔ میں نے اپنے طور پر یہاں کچھ پرجوش' اسلام کے شیدائی اور پاکستان دوست مسلمانوں

کو خفیہ طور پر ساتھ ملا کر ایک خفیہ جمعیت بنائی ہوئی ہے۔ اس کا مظاہرہ تم
نے دیکھ ہی لیا ہو گا۔ یہ اسی ہماری اسلامی جمعیت کے ممبر تھے جو تمہارے پاس
ہوٹل میں پھولوں کا گلدستہ دے گئے اور مائیکرو فون پہنچا گئے یہ کوئی اتنی
بردست جمعیت ہے۔ اور ہمارا مقصد تخریب کاری بھی نہیں ہے بلکہ اپنے
حقوق کا تحفظ ہمارا مقصد ہے اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے
استحکام کا خیال رکھا جائے اور کشمیر کے محاذ پر اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑنے
والے کشمیری مجاہدوں کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔ ہمارے آدمی احمد آباد میں
زندگی کے ہر شعبے کے ادارے میں موجود ہیں۔ وہ ہمیں جدید قسم کے دور سے
مار کرنے والے راکٹ اور راکٹ لانچر مہیا کریں گے۔ تم ان کی فکر نہ کرو۔
صرف انڈین فوجی اداروں میں ہماری ابھی تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اس کی
وجہ صرف یہ ہے کہ اول تو مسلمانوں کو نازک اور حساس فوجی اداروں میں
ملازم نہیں رکھا جاتا اور اگر مزدوروں ایسے کام کرنے کے لئے ملازم رکھا بھی
جاتا ہے تو انہیں حساس مقامات کے نزدیک بھی نہیں آنے دیا جاتا یہ راکٹ
لانچر ہمارے اعلیٰ ترین کاری گر خود بنا کر ہمیں دیں گے اور راکٹ یہ لوگ
کہاں سے لائیں گے؟ اس کی خود مجھے بھی خبر نہیں ہے بہر حال یہ لوگ یہ
تمام چیزیں ہمیں مہیا کر دیں گے۔"

کافی دیر تک ہم اس چھوٹے سے ندی کنارے والے ریستوران کے باہر بیٹھے باتیں
کرتے رہے۔ جب دن کی روشنی کم ہونے لگی تو ہم اٹھ کر ریلوے سٹیشن آ گئے۔ یہاں
سے بھوپال کی طرف جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے۔ یہ پسنجر ٹرین تھی۔ اس نے رات
کے دس بجے ہمیں بھوپال پہنچایا۔ رات ہم نے سٹیشن کے قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل
میں گزاری۔ صبح صبح اٹھ کر ایک بار پھر ریلوے سٹیشن پہنچے۔ یہاں سے پھر آگے جھانسی کی
طرف جانے والی ایک مسافر ٹرین میں سوار ہوئے اور آدھ گھنٹے بعد مڈگھاٹ کے سٹیشن
اتر گئے۔ یہ سٹیشن ایک پہاڑی کے دامن میں تھا۔ بالکل ویران سٹیشن تھا۔ مسافر گاڑی

ی تو اس میں ہمارے علاوہ صرف ایک مسافر اترا جو تھوڑی دیر کے بعد نظروں سے
جھل ہو گیا۔ پلیٹ فارم پر سٹیشن کے عملے کا صرف ایک آدمی نظر آیا جو سٹاف کے
مرے کے باہر ہاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں لئے خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی تو
ں نے سبز جھنڈی لہرا دی۔ گاڑی چھک چھک کرتے سٹیشن سے نکل گئی۔ اس آدمی نے
ارے ٹکٹ چیک کئے اور بولا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

کریم بھائی اس علاقے کا واقف تھا۔ اس نے کسی جگہ کا نام لے کر کہا وہاں جنگل
ں کٹائی ہو رہی ہے وہاں جائیں گے۔ ٹکٹ چیکر نے کہا۔

"دھیان سے جانا۔ آج کل ادھر ایک آدم خور شیر آیا ہوا ہے"

یہ کہکر وہ دفتر کے کمرے میں گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ کریم بھائی مجھے ساتھ لے کر
یٹ فارم کے شمال کی طرف چل پڑا۔ کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا۔ یہ جنگل بڑے خطرناک ہیں۔ یہ ہندوستان کے وسطی
پہاڑی جنگلوں کا علاقہ ہے۔ یہ خطرناک گھنے جنگل آگے جھانسی سے لے کر
نجیب آباد کی پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

ہم باتیں کرتے پلیٹ فارم کے آخری سرے تک پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے ایک
یلے کی چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ دور دور تک ان کی
دشنی میں بھورے رنگ کی اونچی نیچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے دامن
ر ڈھلانیں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ کریم بھائی کہہ رہا تھا۔

"اس مڈگھاٹ نام کے ویران ریلوے سٹیشن پر ریلوے ملازم بھی آنے سے
گریز کرتے ہیں۔ جس سے دشمنی لینی ہو اس کو یہاں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔
، اس سٹیشن پر کوئی کوئی مسافر ٹرین ہی رکتی ہے۔ میں نے بھوپال سے ٹکٹ لینے
سے پہلے دریافت کر لیا تھا کہ یہ ٹرین مڈگھاٹ رکے گی یا نہیں۔ جب ٹکٹ بابو
نے بتایا کہ گاڑی مڈگھاٹ رکے گی تو میں نے ٹکٹ لئے تھے۔ بہر حال یہ اس

اعتبار سے بھی خطرناک سٹیشن ہے کہ رات کبھی کبھار جنگلی درندے آجاتے
ہیں اور پلیٹ فارم پر آزادی سے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔"
ہم ٹیلے کی چڑھائی تھوڑی سی چڑھنے کے بعد زمین کے متوازی ہو کر ٹیلے کے
جھاڑیوں میں چلنے لگے۔ کوئی دس پندرہ منٹ اسی طرح چلنے کے بعد ایک چٹان کے
نکلے تو کریم یہاں رک گیا اور بولا۔
"یہاں سے ذرا نیچے نظر ڈالو"
میں نے نیچے نگاہ ڈالی تو دن کی روشنی میں مجھے ریل کی پٹڑی چمکتی نظر آئی۔ یہ
کوئی پچاس فٹ کی ڈھلان تھی۔ ڈھلان جہاں ختم ہوتی تھی وہاں مڈگھاٹ سٹیشن کا پلی
فارم شروع ہو جاتا تھا۔ ریلوے لائن مشرق سے جنوب تک دور تک نظر آرہی تھی۔ کر
بھائی بولا۔
"یہاں سے ہم ملٹری ٹرین کو دور سے آتا ہوا بھی دیکھ سکتے ہیں اور وہ دیر تک
ہماری نگاہوں کے سامنے سے گذرتی رہے گی۔ یہ پہاڑ کی چڑھائی ہے یہاں
ٹرین کی رفتار بھی نہیں ہوگی۔"
اس نے ایک کھمبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ کھمبا پانی کا پائپ ہے۔ یہاں ٹرین کا انجن پانی لینے کے بھی رک سکتا ہے۔"
میں نے کہا۔
"اگر انجن یہاں پانی لینے کے لئے رکے گا تو باقی کی ساری ٹرین تو پیچھے دور ہو گی اس ط
ٹارگٹ ہماری رینج سے دور ہو جائے گا۔"
اس نے کہا۔
"بھوپال سے آگے مال گاڑی کو دو انجن لگا دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ پہاڑی علاقے
میں سے ٹرین آسانی سے گذر سکے۔ چنانچہ ملٹری مال گاڑی کے بھی دو انجن
ہوں گے۔ ایک انجن آگے لگا ہو گا۔ ایک انجن پیچھے لگا ہو گا۔ جب پہلا انجن
پانی لے لے گا تو ٹرین آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگے گا تاکہ پچھلے انجن کو پانی

لینے کے واسطے کھمبے کے نیچے لایا جائے۔ اگرچہ واقعی ٹرین یہاں پانی لینے کے
لئے رک گئی تو ہمیں ٹرین کو اڑانے کے لئے بڑا آسان ٹارگٹ مل جائے گا۔"
میں نے اس سے پوچھا۔
"ٹرین یہاں پہنچے گی کس وقت؟"
کریم بھائی نے کہا۔
"دیو لالی سے چل کر عام ٹرینیں یہاں دوسرے دن رات کے وقت پہنچتی ہیں
مگر یہ اسلحے سے لدی ہوئی مال گاڑی رن تھرو ہوگی۔ میرے اندازے کے
مطابق یہ دوسرے دن شام کے وقت پہنچی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
یہاں پلیٹ فارم کے کھمبوں پر بجلی کے بلب روشن ہوں گے۔ ہم گاڑی پر
راکٹ فائر کر سکیں گے۔ ٹرین پر حملہ کرنے کے لئے اس ریلوے سٹیشن کو میں
نے اس لئے چنا ہے کہ دیو لالی سے جھانسی تک سارے راستے میں اس سے
زیادہ دور افتادہ ویران اور بے نام ونشان سٹیشن اور کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ
چاروں طرف سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھرا ہوا ہے ہم ٹرین
اڑانے کے بعد آسانی سے روپوش ہو سکتے ہیں۔ آس پاس کوئی پولیس سٹیشن یا
کوئی فوجی گیریزن بھی نہیں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس سٹیشن پر ریلوے
کا عملہ بھی دو تین آدمیوں کا ہی ہوتا ہے یہاں کوئی قلی بھی کہیں دیکھنے میں
نہیں آیا۔ یہ ساری باتیں ہمارے مشن کے لئے بڑی موزوں اور فائدہ مند
ہیں۔ اسی لئے میں نے اس سٹیشن کا انتخاب کیا ہے۔ جھانسی سے آگے نیم
پہاڑی اور نیم میدانی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک تو وہاں ہر سٹیشن کے آس
پاس آبادیاں ہیں۔ دوسرے وہاں ٹرین کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے۔ یہاں تو
مال گاڑیاں رینگ رینگ کر چلتی ہیں ہاں اگر رن تھرو گاڑی ہو اور اس کو دو
انجن لگے ہوں تو اس کی رفتار ذرا تیز ہوتی ہے۔"
میں نے ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت سے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ واقعی یہاں سے

ٹرین پر راکٹ فائر کرنا آسان تھا۔ ٹرین اگر تیز رفتار بھی ہو تب بھی اسے نشانہ بنانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ ایک تو ریلوے لائن نیچے اترائی میں تھی دوسرے راستے میں رکاوٹ کوئی نہیں تھی۔ ٹارگٹ رات کے وقت بھی اور موونگ حالت میں بھی دکھائی دیتا تھا اور زیادہ فاصلے پر بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے ماسٹر سپائی سے پوچھا۔

"اگر ہم ٹارگٹ ہٹ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہاں سے ہمارے فرار کی کیا صورت ہو گی؟"

کریم کہنے لگا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں وہ راستہ دکھاتا ہوں جہاں سے ہم فرار ہوں گے"

ہم واپس ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے۔ میں نے کہا۔

"ہم یہاں کسی پہاڑی غار میں بھی رات کو چھپ سکتے ہیں"

وہ کہنے لگا۔

"اسلحہ سے بھری ہوئی ایک فوجی ٹرین کی تباہی کے ساتھ ہی اس سارے علاقے کو فوج اپنے گھیرے میں لے لے گی اور فوجی کمانڈو سدھائے ہوئے کتوں کے ساتھ تخریب کاروں کی تلاش میں نکل پڑے گی۔ ہم جنگل میں اگر کسی شیر کی کچھار میں بھی چھپے ہوں گے یا زمین کے اندر بھی چھپ کر بیٹھے ہوں گے تو کمانڈو ہمیں پکڑ لیں گے۔ ٹرین اڑانے کے بعد ہمیں فوراً اس علاقے سے نکل جانا ہو گا۔ میں تمہیں وہ علاقہ دکھانا چاہتا ہوں جہاں سے ہم فرار ہوں گے۔"

پہاڑی ٹیلے سے اترنے کے بعد ہم درختوں کے گھنے جھنڈوں میں آگئے۔ یہاں زمین ہموار تھی۔ گھاس کے بیچ میں ایک پتلی سے پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ اس پگ ڈنڈی پر سے گذرتے ہوئے ہم سیاہ اور بھورے رنگ کی چٹانوں کے درمیان آگئے۔ اس کے تھوڑا آگے ایک دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس کے دوسرے کنارے کے درخت بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ مگر دریا کا بہاؤ تیز تھا۔ کریم نے کہا۔

"ہم یہاں آکر دریا پار کریں گے۔ یہاں ہمیں کوئی کشتی وغیرہ نہیں مل سکے گی۔ ہمیں تیر کر دریا پار کرنا ہو گا۔"

"کیا دوسرے کنارے پر ہم محفوظ ہوں گے؟ کیا ادھر انڈین سیکورٹی پولیس کے آدمی نہیں آجائیں گے؟"

کریم نے کہا۔

"دریا کے دوسرے کنارے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے درمیان سے بھوپال جانے والی سڑک گذرتی ہے۔ اس سڑک پر رات کے وقت سبزیوں پھلوں اور ڈیزل تیل لے جانے والے ٹرکوں کی ٹریفک تقریباً ساری رات جاری رہتی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی ٹرک میں لفٹ مل جائے گی۔ اگر لفٹ نہ ملی تو ہم وہاں سے آگے جانے کا کوئی دوسرا انتظام کر لیں گے۔ بہر حال یہاں سے فرار ہونا ہمارے لئے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔"

ہم کچھ دیر کے لئے دریا کے کنارے اونچے اونچے نرکلوں کے پاس بیٹھ گئے۔ بڑی شگوار ہوا چل رہی تھی۔ کریم کہنے لگا۔

"اگر کوئی حادثہ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو یہ بات یاد رکھنا کہ تمہیں ہر حالت میں اس دریا کو ضرور پار کرنا ہے۔ کیونکہ دریا پار کرنے کے بعد ہی تم بھوپال جانے والی سڑک پر آکر وہاں سے بھوپال یا کسی دوسرے شہر جا سکو گے۔"

میں نے اس سارے علاقے کا نقشہ اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیا۔ کچھ دیر ہم وہاں ے اپنے منصوبے کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد اٹھ کر دوسری طرف پہاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے مڈگھاٹ کے سٹیشن پر آگئے۔ یہاں سے کوئی ایک گھنٹہ ہمیں مسافر ٹرین ملی جو آگرہ سے آرہی تھی۔ اس میں بیٹھ کر ہم واپس بھوپال آگئے۔ پال سے ہمیں شام کے وقت ایک ایکسپریس ٹرین میں سوار ہوئے اور رتلام پہنچے۔ ں سے دوسری لاری میں بیٹھے اور رات کے گیارہ بجے احمد آباد پہنچ گئے۔

ماسٹر سپائی کریم بھائی سٹیشن ہی سے جدا ہو گیا۔ میں نے ٹیکسی لی اور مسٹر پانڈے کے بنگلے پر آ گیا۔ مینا کشی جاگ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر حسب معمول بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"سوامی جی! آپ نے بڑی کرپا کی جو دلی سے واپس آ گئے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب شاید آپ کے درشن نہ ہوں"

میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بالکا"

اس نے میری کزن کا حال پوچھا۔ میں نے کہا۔

"وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے ماتا پتا نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں اور وہیں اس کا علاج کرائیں۔ اچھا اب میں اوپر جاتا ہوں۔ سفر کی وجہ سے بہت تھک گیا ہوں"

مینا کشی جلدی سے بولی۔

"سوامی جی! میں آپ کے پاؤں دبا دوں؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں"

میں اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ پیچھے مجھے دو باتوں کی فکر تھی۔ ایک تو میں اپنا لائٹر ٹرانسمیٹر بیڈ روم میں چھوڑ آیا تھا۔ اگرچہ میں نے اسے خفیہ جگہ پر پر چھپایا ہوا تھا۔ پھر بھی مجھے اس کی فکر ضرور تھی۔ دوسرے مجھے یہ تشویش بھی تھی کہ کہیں پہلی منزل کے ڈرائنگ روم والے ٹیلی فون کے اندر لگایا ہوا میرا چھوٹا مائیکرو فون کسی نے نہ دیکھ لیا ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ میرے پیچھے ڈرائنگ روم کا فون خراب ہو جائے۔ مکینک آ کر اسے کھولے اور اندر لگے ہوئے مائیکرو فون کا راز فاش ہو جائے۔ مگر خدا کا شکر رہا۔ ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ پھر بھی میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مائیکرو فون اپنی جگہ پر ٹھیک ہے اپنے کمرے کے ٹیلی فون کا ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں خاموشی تھی۔ ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے میز پر کوئی چیز

رکھی ہو۔ ساتھ ہی مینا کشی کے گنگنانے کی آواز آنے لگی میں نے ریسیور رکھ دیا۔

ابھی تک میرا کوئی راز افشا نہیں ہوا تھا۔

اب میں نے سگریٹ لائیٹر والا ریڈیو ٹرانسمیٹر اپنی جیب میں رکھنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ اس کے کسی کے ہاتھ لگنے کا بالکل ہی اندیشہ نہ رہے۔ دوسرے یا تیسرے دن شام کے وقت میں رینا لینی کے ڈانس سنٹر میں رینا لینی کے پاس بیٹھا سٹوڈنٹ لڑکیوں کو ڈانس کی تعلیم حاصل کرتے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لڑکیوں کے ماتا پتا بھی کمرے میں موجود تھے۔ مینا کشی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ طبلے پر ٹھیکہ لگا ہوا تھا۔ لڑکیاں تال پر رقص کر رہی تھیں۔ رینا لینی دیوی میرے پاس صوفے پر بیٹھی تالی بجا کر طبلے کے بول دہرا رہی تھی۔ اتنے میں نوکر نے بڑے ادب کے ساتھ صوفے کے پیچھے سے آ کر مجھے آہستہ سے کہا۔

"مہاراج! آپ کا فون آیا ہے۔ کوئی ورما صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں"

میں چپکے سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں آ گیا جہاں فون میز پر پڑا تھا۔ اس کا ریسیور الگ رکھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوائے کریم بھائی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے کریم بھائی کی آواز آئی۔

"آج رات ہائیڈ آؤٹ پر پہنچو۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ میں نے ریسیور رکھا اور واپس ہال کمرے میں رینا لینی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ رینا لینی دیوی رقص کی تال دینے میں مگن تھی۔ تھوڑی دیر بعد مینا کشی آ گئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وہ بھی رقص کرتی رہی۔ پھر ہم دونوں بنگلے پر واپس آ گئے۔ میں نے اسے کہا۔

"مجھے رات کو مہاویر جی کے درشنوں کے لئے مندر جانا ہے۔ مجھے گاڑی کی چابی دے دینا۔ تم نے کہیں نہیں جانا؟"

مینا کشی نے عاجزی سے کہا۔

"گورو جی! مجھے تو کہیں نہیں جانا۔ اگر جانا بھی ہوتا تو میں نہ جاتی"

میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے گاڑی لے کر بنگلے سے نکل گیا۔ پہلے حسب معمول نارائن جی کے مندر گیا۔ وہاں پندرہ بیس منٹ گذارے اور پھر اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ویران کواٹر سے تھوڑے فاصلے پر درختوں میں گاڑی کھڑی کی اور کوارٹر میں آکر بیٹھ گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد کریم بھائی بھی پہنچ گیا۔

آتے ہی بولا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ کوئی انٹیلی جینس کا آدمی تمہارے پیچھے نہیں لگا ہوا؟"

میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ میں مسٹر پانڈے کے بنگلے کے باہر بیٹھی ہوئی انٹیلی جینس ٹیم سے قدرتی طور پر کچھ بے نیاز سا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر جب میں گاڑی میں نکلتا تھا تو اپنی نگرانی کئے جانے کے اندیشے سے بالکل بے پروا ہو جاتا تھا۔ میں نے کہا۔

"میرا نہیں خیال کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے"

کریم بھائی اٹھ کر بند دروازے کے پاس گیا۔ اس نے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر دروازہ بند کر دیا۔ میرے پاس آکر سٹول پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"تمہیں اب بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے مجھے شک ہے کہ تمہاری نگرانی ہو رہی ہے ممکن ہے کوئی آدمی تمہارا پیچھا کرتا یہاں تک بھی آیا ہو۔ بہر حال واپسی پر تم میرے نکلنے کے آدھ گھنٹہ بعد نکلنا اور یہاں سے سیدھا مندر جانا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد بنگلے پر جانا۔"

میں نے یہ بات نوٹ کر لی۔ میں نے کریم بھائی سے پوچھا کہ وہ خاص بات کیا۔ جس کے لئے اس نے مجھے بلایا ہے۔ وہ بولا۔

"میرے آدمی نے دیو لالی سے اس بات کی اطلاع دی ہے کہ بیس تاریخ کو رات کے وقت جو ملٹری ٹرین اسلحہ لے کر جموں جا رہی ہے اس کے تین ڈبوں کا رنگ سرخ ہے۔ سارے ڈبے مال گاڑی کے بند ڈبے ہیں مگر ساتھ ایک مسافر ٹرین والا ڈبہ بھی لگا ہے جس میں فوجی جوان سیکورٹی کی خاطر ساتھ جا

رہے ہیں۔"

میں نے یہ بات بھی نوٹ کر لی اور کریم بھائی سے کہا۔

"یہ نشانی ٹرین کو پہچاننے میں ہماری مدد کرے گی۔ اب ہمیں بالکل تیار رہنا چاہئے۔"

وہ کہنے لگا۔

"کل رات کو دو راکٹ لانچر اور بارہ راکٹ میرے پاس پہنچ جائیں گے ہمیں اٹھارہ تاریخ کو ہی یہ سامان لے کر منڈ گھاٹ سٹیشن پر پہنچ جانا ہو گا۔ ہم سٹیشن کے پیچھے ایک پہاڑی غار میں چھپ کر ٹرین کا انتظار کریں گے۔ آج کے بعد ہماری ملاقات اٹھارہ تاریخ کو بھوپال کے ریلوے سٹیشن والے اسی ہوٹل میں ہو گی جہاں ہم نے ایک رات گذاری تھی۔ تم جس روز چاہو احمد آباد سے روانہ ہو جانا۔ مگر اٹھارہ تاریخ کو بھوپال کے ہوٹل میں موجود ہونا۔ میں تمہارے پاس اٹھارہ تاریخ کی رات کو پہنچوں گا اور ایک الگ کمرے میں ٹھہروں گا۔ وہاں میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ وہ اتنا بڑا ہوٹل نہیں ہے۔"

میں نے راکٹ لانچر اور راکٹوں کے بارے میں پوچھا کہ یہ سامان کیا وہ اپنے ساتھ لائے گا۔ اس نے کہا۔

"جب ہم منڈ گھاٹ کی پہاڑی غار میں پہنچیں گے تو یہ سامان پہلے سے وہاں موجود ہو گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اب نہ میں تمہیں فون کروں گا اور نہ تم مجھے فون کرو گے۔ ہماری ملاقات اب اٹھارہ تاریخ کو بھوپال کے ہوٹل میں ہو گی۔ تم پہلے نکل جاؤ۔ میں بعد میں نکلوں گا۔ مگر ہوشیار رہنا۔ مجھے شبہ ہے کہ تمہارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

میں خاموشی سے باہر نکل گیا۔ کواٹر کے احاطے میں اندھیرا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی تھیں۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے اندھیرے میں کوئی شک شبے والی بات محسوس نہ ہوئی۔ پھر بھی میں کواٹر کی

عقبی دیوار کو پھاند کر ان درختوں کی طرف گیا جہاں میں نے میناکشی کی گاڑی کھڑی کی ہوئی تھی۔ میں اندھیرے میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کوئی شخص میری گاڑی کے گرد تو نہیں منڈلا رہا۔ میں پانچ منٹ تک چھپ کر گاڑی کو دیکھتا رہا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر میں خاموشی سے چل کر گاڑی کے پاس آیا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف سے واپس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کریم بھائی کی ہدایت کے مطابق میں وہاں سے سیدھا سوامی نارائن جی کے مندر پہنچا۔ وہاں کوئی آدھ گھنٹہ گذارا اور اس کے بعد بنگلے کی طرف چل پڑا۔

میں نے اپنے کمرے میں جین مت کے بانی مہاویر کی ایک کانسی کی مورتی منگوا کر رکھ چھوڑی تھی اور اس کے پاؤں میں روز پھول رکھ دیتا تھا اور اگر بتیاں بھی سلگا دیا کرتا تھا۔ میناکشی بھی پھول لے آیا کرتی تھی۔ میں نے وہاں یہ بتا دیا ہوا تھا کہ میں دن بھر اپنے کمرے میں بھگوان مہاویر کی پوجا پاٹھ میں مصروف ہوتا ہوں میری اجازت کے بغیر میرے کمرے میں کوئی نہ آئے۔ لیکن یہ میرا معمول تھا کہ جب شام کو مسٹر پانڈے اپنے کسی خاص مہمان کے ساتھ یا اکیلا یا میناکشی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھتا تو میں اپنے ٹیلی فون کا ریسیور تھوڑی دیر بعد اٹھا کر سن لیتا تھا کہ مسٹر پانڈے کسی سے کوئی اہم بات تو نہیں کر رہا۔ ابھی تک اس نے کسی سے کوئی ایسی خفیہ رازداری کی بات نہیں کی تھی اور کوئی اسرائیلی یا بھارتی فوج کا افسر بھی اسے ملنے نہیں آیا تھا۔

رات کو کھانے پر کبھی کبھی یا صبح ناشتے پر میری مسٹر پانڈے سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ہر بار ہاتھ باندھ کر یہی کہتا کہ آپ کی مہربانی سے میرا گردے کا درد تو بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اب جو تیسری پتھری گردے میں رہ گئی ہے اسے بھی دور کر دیں۔ یا پھر مجھ سے اپنی ترقی کی فائیل کے بارے میں بڑی عاجزی سے فرمائش کرنے لگتا کہ بھگوان مہاویر سے کہہ کر میری فائیل پر اندرا گاندھی جی کے دستخط کروا دیں۔ میں اسے صرف تسلی دیتا کہ یہ کام وقت آنے پر پورا ہو جائے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ مسٹر پانڈے کی یہ دونوں کمزوریاں میں نے اپنے قبضے میں کر رکھی تھیں اور میں چندریکا سے اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہتا

تھا۔ چندریکا سے بھی کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس سے ملاقات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور وہ اپنے طور پر بھی مجھ سے ملنے نہیں آئی تھی۔ اسلحہ کی ٹرین پر حملہ کرنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میں نے پندرہ تاریخ کو میناکشی اور مسٹر پانڈے سے کہا کہ میں سومنات جی کے مندر کی یاترا کو جانا چاہتا ہوں۔ دو ایک روز میں جاؤں گا اور وہاں دو دن مندر میں بھگوان سومنات کی پوجا کروں گا۔

"مجھے مہاویر بھگوان نے حکم دیا ہے کہ وہاں جاؤں اور پھول مالا چڑھاؤں"

میناکشی اور مسٹر پانڈے نے فرمائش کی کہ میں ان کے لئے بھی وہاں پرارتھنا کروں۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا۔ آخر میری روانگی کا وقت آ گیا۔ میں سترہ تاریخ کو دوپہر کو احمد آباد سے بظاہر سومنات کے مندر کے لئے اور حقیقت میں بھوپال جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔ ایک رات اور ایک دن سفر میں گزرا۔ اٹھارہ تاریخ کی شام کو میں بھوپال میں تھا۔ وہاں ریلوے سٹیشن کے قریب جو معمولی سا ہوٹل تھا وہاں ایک کمرہ لے کر ٹھہر گیا۔ اب مجھے اپنے ماسٹر سپائی کریم بھائی کا انتظار تھا۔ اسی روز رات کے وقت کریم بھائی بھی آ گیا۔ اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں سے میرے کمرے کا نمبر معلوم کر لیا تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی کہ اس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور تو کریم بھائی اندر آ گیا۔ اس نے پرانی سی ٹھنڈی جیکٹ اور اسی کلر کی پرانی جینز پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اندر آ کر کہنے لگا۔

"اس لفافے میں تمہاری جیکٹ اور پتلون ہے۔ یہ جین بھگتوں والے کپڑے اتار کر پتلون جیکٹ پہن لو۔ اپنے کھدر کے کپڑے اسی لفافے میں بند کر کے پلنگ کے نیچے رکھ دینا۔ ہوٹل والوں سے کہہ دینا کہ تم اپنی ماتا جی سے ملنے جھانسی جا رہے ہو۔ کمرے کا تین چار دن کا ایڈوانس کرایہ بھی ادا کر دینا۔ کہہ دینا کہ تمہارے واپس آنے تک کمرہ بند رہے۔ میں بھی ایسا ہی بہانہ بنا کر یہاں سے نکلوں گا۔ کمرے کی چابیاں ہمارے پاس ہی رہیں گی۔ مشن مکمل ہونے

کے بعد اگر ہم زندہ رہے تو اسی ہوٹل میں آ کر تم اپنا لباس تبدیل کر کے واپس احمد آباد روانہ ہو جاؤ گے۔ ہم صبح چھ بجے مڈ گھاٹ جانے کے لئے یہاں سے نکلیں گے۔ اب تم آرام کرو"

وہ چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کھدر کا کرتہ پاجامہ اتار کر گہرے نیلے رنگ کی پرانی جینز پہنی۔ جیکٹ پلنگ کے پاس ہی رکھ دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ چھوٹے کلاک پر میں نے صبح پانچ بجے کا الارم لگا دیا تھا۔

ٹھیک پانچ بجے صبح الارم بجنے لگا۔

میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ جیکٹ پہنی اور نیچے آ گیا۔ کاؤنٹر پر رات کی ڈیوٹی والا ملازم موجود تھا۔ میں نے اسی سے کہا کہ میں اپنی ماتا جی سے ملنے جھانسی جا رہا ہوں۔ دو تین دن میں واپسی ہو گی۔ کمرے میں میرا سامان پڑا ہے۔ اسے کوئی نہ کھولے اس کے ساتھ ہی میں نے چار دن کا کرایہ اور اوپر ایک سو روپے ملازم کو انعام کے طور دیئے۔ وہ بے حد خوش ہوا کہنے لگا۔

"سر! آپ کا کمرہ بالکل بند رہے گا کوئی فکر ہی نہ کریں"

میں ہوٹل سے باہر آ کر ایک طرف اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ کریم بھائی بھی میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"سٹیشن پر چل کر ناشتہ کریں گے"

بھوپال کا سٹیشن بڑا بارونق سٹیشن تھا۔ شہر بھی مسلمانوں کی تاریخی روایات کا حامل ہے۔ یہ کبھی مسلمانوں کی بہت بڑی مشہور ریاست تھی مگر کانگریس حکومت کے وزیر داخلہ پٹیل نے جب ہندوستان کی ساری ریاستوں کو ختم کیا تو ریاست بھوپال کا سورج بھی غروب ہو گیا۔ شہر ہمیشہ سے علمی ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ مگر اب وہاں ہندو کلچر کی چھاپ روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اندرا گاندھی کی حکومت ریاست بھوپال میں مسلمانوں کی روایات کو مسخ کر رہی تھی اور مسلمانوں پر ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ بھوپال سٹیشن سے ہمارے ہوتے ہوئے دو تین گاڑیاں جھانسی دلی کی

طرف گئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی مڈ گھاٹ کے ویران سٹیشن پر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آخر رات کے ایک بجے ہمیں ایک پسنجر ٹرین ملی جو اس سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے رکتی تھی۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ مڈ گھاٹ کا سٹیشن وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر اس پسنجر ٹرین نے پورے دو گھنٹے کے بعد ہمیں وہاں پہنچایا۔

سٹیشن پر سوائے ہم دونوں کے اور کوئی مسافر نہ اترا۔

سٹیشن پر ہو کا عالم تھا۔ عملہ غائب تھا۔ دفتر بند تھا۔ پلیٹ فارم پر جو تین چار کھمبے لگے تھے ان کے بلب روشن تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس روشنی میں ریلوے لائن پلیٹ فارم کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک صاف نظر آ رہی تھی۔ گاڑی ہمیں اتار کر آہستہ آہستہ چلتی آگے نکل گئی۔ ہم ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کریم کہنے لگا۔

"اس روشنی میں ہمیں ٹارگٹ اوپر سے صاف نظر آ جائے گا۔ چونکہ ملٹری ٹرین میں سوائے ایک ڈبے کے باقی سارے ڈبے مال گاڑی کے لگے ہوں گے اس لئے ان ڈبوں میں روشنی نہیں ہو گی۔ پلیٹ فارم کے کھمبوں کی روشنی ہماری مدد کرے گی۔ چلو اب ہم اوپر چلتے ہیں۔"

چاروں طرف پہاڑیوں میں گھرے ہوئے اس ویران سٹیشن پر ہیبت ناک خاموشی طاری تھی۔ ہم پیچھے سے ہو کر ٹیلے کی چڑھائی چڑھتے ہوئے سٹیشن سے کوئی پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر ایک دوسری پہاڑی کے دامن میں آ گئے۔ یہی وہ پہاڑی تھی جہاں ہماری پناہ گاہ تھی۔ یہ ایک قدرتی غار تھا جو پہاڑی کے اندر پندرہ بیس فٹ تک چلا گیا تھا۔ کریم بھائی نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر روشن کی۔ مجھے اس کی روشنی میں غار کی دیوار کے ساتھ ایک بڑا تھیلا لگا ہوا دکھائی دیا۔ یہ کافی بڑا تھیلا تھا۔ کریم نے ٹارچ مجھے تھمائی اور تھیلے کا زپ کھول دیا۔ تھیلے میں دو راکٹ لانچر' چھ راکٹ' چار بڑی موم بتیاں دو تام چینی کے مگ اور ایک بڑے سائز کی تھرمس بوتل تھی۔ ہم نے سب سے پہلے موم بتی روشن کر کے پتھر پر لگا دی۔ میں نے راکٹ لانچروں اور راکٹوں کو بڑے غور سے دیکھا۔

یہ بالکل نئے راکٹ لانچر تھے۔ لگتا تھا کسی آرڈیننس ڈپو سے اڑائے گئے ہیں۔

ہم نے تھرمس میں سے کافی نکال کر پی۔ ایک بڑا ڈبہ بسکٹوں کا بھی تھیلے میں سے نکل آیا تھا۔ کچھ بسکٹ کھائے اور اپنے منصوبے کی تفصیلات پر گفتگو کرنے لگے۔ غار میں جو آدمی تھیلا رکھ گیا تھا اس نے پہلے ہی سے جگہ کو صاف کر کے وہاں ناریل کی شاخوں کی ایک صف بچھا دی ہوئی تھی۔ ہم صف پر لیٹ کر سو گئے۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب غار میں دن کی روشنی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے تھرمس میں سے کافی نکال کر پی۔ پھر قریبی دریا پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں جو گھاس پھونس کی جو جھونپڑا نما کینٹین درختوں کے نیچے بنی ہوئی تھی۔ وہ بند تھی۔ کریم نے کہا۔

"یہ دوپہر کے وقت کھلے گی۔ یہاں سے ہمیں کھانے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔"

کریم بھائی نے جیب سے ایک ماچس کی ڈبی کے سائز کا ٹرانسمیٹر نکال کر مجھے دکھایا اور کہا۔

"اس ٹرانسمیٹر پر ہمارا آدمی ہمیں اطلاع کر دے گا کہ گاڑی دیولالی کے گیریزن سے چل پڑی ہے۔"

یہ انیس تاریخ کا دن تھا۔ سارا دن ہم نے ان پہاڑیوں میں ادھر ادھر چل پھر کر ماحول کا جائزہ لیتے گزار دیا۔ جھونپڑے والی کینٹین کھل گئی تھی۔ وہاں سے ہم نے کچھ چاول اور مچھلی کھائی۔ رات کو بھی وہیں سے کھانا کھایا۔ کینٹین والے کو ہم نے یہی بتایا کہ ہم نے یہاں کٹائی کا ٹھیکہ لینا ہے اور جنگل میں درختوں کا ذخیرہ دیکھنے آئے ہیں۔ آخر بیس تاریخ کا دن طلوع ہوا۔ بیس تاریخ کی رات کو بارہ بجے کے بعد اسلحہ سے لدی ہوئی ملٹری ٹرین نے دیولالی کے فوجی گیریزن کی ٹوپ لائن سے جموں کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ہم دریا کے گھاٹ والی جھونپڑا کینٹین کے باہر بیٹھے کافی دیر تک اپنے منصوبے پر غور کرتے رہے۔ ہم نے اس کمانڈو ایکشن کے ایک ایک پہلو پر غور کیا۔ بظاہر یہ کمانڈو ایکشن بڑا آسان اور واضح تھا۔ ایک مال گاڑی نے بہت ہلکی رفتار کے ساتھ سٹیشن کے کھلے پلیٹ فارم پر سے

گزرنا تھا۔ ہم نے پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے اس پر یکے بعد دیگرے چھ راکٹ فائر کرنے تھے۔ اور پھر وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ لیکن اس بظاہر آسان ایکشن میں کئی مسائل پوشیدہ تھے۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ ٹرین کا شیڈول ہی بدل گیا ہو۔ کسی وجہ سے ٹرین کی تاریخ تبدیل کر دی گئی ہو۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عین ممکن ہے اسرائیل سے لئے گئے نیپام راکٹ اس ٹرین میں نہ آ رہے ہوں۔ تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ ٹرین کو دو انجن لگے ہوں گے۔ ممکن ہے اس کی رفتار ہمارے اندازے کے خلاف زیادہ تیز ہو اور ہم متحرک ٹارگٹ پچھلے تین چار ڈبوں کو براہ راست ہٹ نہ کر سکیں۔ یہ بہت ضروری تھا کہ ہمارے راکٹ یا تو گولہ بارود والے یا نیپام راکٹوں والے ڈبوں کو ہٹ کریں۔ اگرچہ میں نے متحرک ٹارگٹ کو ہٹ کرنے کی زبردست ٹریننگ لے رکھی تھی لیکن اس بات کا امکان موجود تھا کہ جذباتی ہیجان میں میرا راکٹ نشانے پر نہ لگے۔ تین راکٹ مجھے اور تین ہی راکٹ میرے ساتھی کریم بھائی نے فائر کرنے تھے۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ نشانے اور خاص طور پر متحرک ٹارگٹ پر نشانہ لگانے میں کتنی مہارت رکھتا ہے۔

دیولالی سے بیس تاریخ کی آدھی رات کو چلی ہوئی مال گاڑی نے ہمارے حساب کے مطابق اکیس تاریخ کی شام کو مڈگھاٹ سٹیشن پر سے گزرنا تھا۔

اکیس تاریخ کی سہ پہر کو جب کہ سورج ابھی بھوپال کی جنگلاتی پہاڑیوں کے اوپر ہی تھا میں اور کریم بھائی اپنے پہلے سے چنے ہوئے ٹھکانے پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہ وسطی ہند کے خطرناک جنگلوں کا ایک ویران اور غیر آباد علاقہ تھا۔ ہم نے ایک چٹان کی اوٹ میں مورچہ بنا لیا تھا۔ نیچے پچاس ساٹھ فٹ کی پتھریلی ڈھلان مڈگھاٹ سٹیشن کے پلیٹ فارم تک چلی گئی تھی۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ ریلوے لائن بھی خالی پڑی تھی۔ راکٹ لانچر اور چھ کے چھ راکٹ ہمارے قریب ہی گھاس میں پڑے تھے۔ چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر کریم بھائی کے ہاتھ میں تھا اور وہ بار بار اسے اون کر کے کان سے لگا کر اپنے اس ساتھی کی آواز سننے کی کوشش کرتا جس نے ایمونیشن ٹرین کی دیولالی سے روانہ ہوتے وقت ہمیں اطلاع

دینی تھی مگر اس کی کوئی اطلاع ہمیں نہیں ملی تھی۔ میں پریشان تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ کہیں ٹرین کی روانگی کا شیڈول نہ تبدیل کر دیا گیا ہو۔ مگر کریم بھائی کوئی خاص پریشان نہیں تھا۔ وہ یہی کہتا کہ ہمارا آدمی اگر کل کسی وجہ سے اطلاع نہ دے سکا تو عین وقت پر اس کا سگنل ضرور ملے گا۔ اور اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ ہمیں چٹان کی اوٹ میں آکر بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ٹرانسمیٹر پر سگنل آنے لگے۔ پھر کوڈ الفاظ میں کسی نے کچھ کہا۔ کریم بھائی نے جواب میں کوڈ الفاظ میں کچھ کہا۔ ٹرانسمیٹر بند کر دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ٹرین بھوپال کے آؤٹر سگنل سے رن تھرو کر دی گئی ہے۔"

اس وقت سورج پہاڑیوں کے پیچھے ہو رہا تھا۔

جنگل اور ڈھلان کے درختوں پر شام کا اندھیرا اترنے لگا تھا۔ کریم بھائی کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔ کہنے لگا۔

"ہمارا آدمی دیولالی گیریزن سے ٹرین کی روانگی کا سراغ نہیں لگا سکا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سیکورٹی بہت سخت ہو گی۔ خیر اچھا ہوا ہمیں ٹرین کی اطلاع مل گئی۔ اب ہمارا وار خالی نہیں جانا چاہئے۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"انشاء اللہ ہم ٹارگٹ مار لیں گے۔ ہم پاکستان، اسلام اور کشمیر کے مسلمانوں کی دشمن اندرا گاندھی کو بتا دیں گے کہ مسلمان زندہ ہے۔ اسلام زندہ ہے اور انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں دبا سکتی"

کریم بھائی نے گھاس میں چھپائے ہوئے راکٹ لانچر نکال کر ایک لانچر مجھے دیا۔ ایک اپنے پاس رکھ لیا اور بولا۔

"یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے جس میں اگر ہم ثابت قدم رہے اور صرف خدا اور اس کے رسول پاکؐ کی خاطر جہاد کرتے رہے تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ لانچر سامنے رکھ کر ٹارگٹ کو دیکھو"

ہم دونوں نے راکٹ لانچر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے اپنے کاندھوں پر رکھے اور نیچے پلیٹ فارم کو اور ریلوے لائن کو نشانے میں سے دیکھا۔ پلیٹ فارم پر جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھ سات کھمبے لگے تھے ان کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور ٹارگٹ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ ابھی ہم نے لانچروں میں راکٹ نہیں ڈالے تھے۔ ہم بیٹھ گئے اور لانچر سامنے جو پتھر کی بڑی ڈھلوان سی تھی اس کے ساتھ لگا دیئے۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ ہمارا اس ماسٹر سپائی نے ٹرین پر راکٹ فائر کرنے کے لئے بڑی موزوں جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے بہتر اس سے زیادہ ویران اور بے آباد ریلوے سٹیشن شاید ساری بھوپال جھانسی لائن پر نہیں تھا۔ خدا جانے انگریزوں نے یہاں کیا سوچ کر سٹیشن بنا دیا تھا۔ کیونکہ آس پاس کوئی گاؤں تک نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے انگریزوں کے زمانے میں یہاں کوئی آبادی ہو مگر اب تو وہاں دور دور تک ویرانی چھائی ہوئی تھی اور یہ ویرانی ہماری بے حد مدد گار ثابت ہو رہی تھی۔

جس طرف سے ٹرین نے آنا تھا اس طرف ریلوے لائن پر دور ایک آؤٹر سگنل تھا۔ یہ ڈبل سگنل تھا۔ چونکہ یہ سنگل ٹریک ریلوے سٹیشن تھا اس لئے پیچھے کسی سٹیشن پر پسنجر اور مال گاڑیوں کو روک کر ایکسپریس گاڑیوں کو پہلے گذارا جاتا تھا۔ جب دلی کی طرف سے کوئی گاڑی یہاں سے بھوپال اور دیولالی کی طرف جاتی تو ڈبل سگنل کی جو بتی سرخ ہوتی وہ سبز ہو جاتی۔ اور جب بھوپال کی طرف سے کوئی ٹرین آتی تو دوسرے سگنل کی جو بتی بادامی روشنی دے رہی ہوتی تھی وہ غائب ہو جاتی۔ اس کا مطلب تھا کہ بھوپال کی طرف والی سگنل کی بتی جو پہلے سرخ تھی اب سبز ہو گئی ہے اور ٹرین کو سٹیشن کے رن تھرو گزرنے کا اشارہ مل گیا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے کریم نے بتائیں۔ ہماری نظریں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ریلوے لائن پر کچھ فاصلے پر لگے ہوئے سگنل کے کھمبے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ڈبل سگنل کی ایک بتی سرخ تھی اور دوسری بتی میں سفید روشنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی سگنل ڈاؤن نہیں ہوا ہے۔

ہمارے پیچھے پہاڑی کی چڑھائی تھی جس پر اگی ہوئی جنگلی جھاڑیاں رات کے

اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں۔ کیونکہ سورج پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ اگر اوپر سے کوئی نیچے دیکھتا تو ہم اسے نظر نہیں آسکتے تھے۔ ایک تو جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں اندھیرا تھا دوسرے ہم چٹانوں کی اوٹ میں تھے۔ کریم نے چمکیلی سوئیوں والی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"ٹرین کو بھوپال سے چلے ہمارے آدمی کی اطلاع کے مطابق ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ اسے کسی سٹیشن پر رکنا نہیں ہے۔ اس لئے اب کسی وقت بھی یہاں پہنچ جائے گی۔"

اب رات ہو گئی تھی۔ اندھیرا ہمارے چاروں جانب پھیل گیا تھا۔ سوائے نیچے پلیٹ فارم کی روشنیوں کے سارے علاقے میں کسی جگہ کوئی روشنی نہیں تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گھنے جنگل کی طرف سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی پرندے کی کوہو کوہو کی آواز آجاتی تھی۔ حیرانی اور خوشی کی بات تھی کہ ابھی تک نیچے مڈگھاٹ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک بھی آدمی چلتا پھرتا نظر نہیں آیا تھا۔ پھر ایک آدمی سٹیشن آفس کے برآمدے سے نکل کر پلیٹ فارم کے مغربی سرے کی طرف جاتا نظر آیا۔ کریم بھائی اور میں اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"یہ سگنل ڈاؤن کرنے جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ ملٹری ٹرین کو رن تھرو کیا جا رہا ہے۔"

ہم بالکل بے حس و حرکت نیچے اس آدمی کو آؤٹر سگنل کی طرف جاتے دیکھ رہے تھے۔ جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا تھا اور ڈھلان اترتی تھی وہ وہاں جا کر ریل کی پٹڑی کے قریب اندھیرے میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کریم کہنے لگا۔

"سگنل کی روشنیوں پر نگاہ رکھنا۔ اگر سرخ بتی سبز ہو گئی تو اس کا مطلب ہو گا کہ جھانسی سے آنے والی کوئی ایکسپریس ٹرین یہاں رکے بغیر گذرنے والی ہے۔ اگر دوسرے سگنل کی سفید روشنی غائب ہو گئی تو اس کا مطلب ہو گا کہ بھوپال کی جانب سگنل کی جو بتی پہلے سرخ تھی وہ سبز ہو گئی ہے اور کوئی ٹرین یہاں

سے رن تھرو گزرنے والی ہے۔ اور یہ ٹرین فوجی ایمونیشن والی مال گاڑی ہی ہو گی۔"

ہم نے اپنے اپنے لانچروں میں راکٹ چڑھا لئے۔ یہ راکٹ لانچر سیفٹی کیچ والے لانچر تھے۔ ہماری انگلیاں ٹریگر پر تھیں مگر ہم نے ابھی سیفٹی کیچ نہیں کھولے تھے۔ ہم اندھیرے میں بت بنے اپنی آنکھیں دور سگنل کی سرخ اور سفید بتیوں پر جمائے ہوئے بیٹھے تھے۔ رات کی موت ایسی خاموشی میں ہمیں سگنل بدلنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک سگنل کی سفید روشنی غائب ہو گئی۔ کریم بھائی نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"ہماری گاڑی آ رہی ہے۔ لانچروں کے سیفٹی کیچ کھول دو۔ مگر انگلی ٹریگر کے نیچے رہے۔"

میں نے بھی اپنے لانچر کا سیفٹی کیچ کھول دیا اور لانچر اپنے سامنے رکھ کر انگلی ٹریگر کے نیچے کر لی۔ ہم نے کل چھ راکٹ ٹرین پر فائر کرنے تھے۔ ایک ایک راکٹ ہمارے لانچر میں لوڈ تھا۔ اور دو دو راکٹ ہمارے قریب ہی زمین پر پڑے تھے۔

سگنل کی بتی سبز ہو چکی تھی۔ یہ روشنی ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس کا رخ بھوپال سے آنے والی ٹرین کی طرف تھا۔ ہماری جانب اس سگنل کا جو رخ تھا اس کی سفید روشنی غائب تھی۔ ہماری آنکھیں اس طرف تھیں جدھر سے ٹرین نے گھنے جنگلوں کی تاریکی میں سے نکل کر آنا تھا۔ ہم ہمہ تن گوش بھی تھے۔ کیونکہ وہاں اتنی گہری خاموشی تھی کہ انجن کی آواز دور ہی سے ہمیں آجانی چاہئے تھی اور ایسا ہی ہوا۔ سگنل ڈاؤن ہونے کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد دور بہت دور گھنے جنگلوں کی خاموشی میں ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔

کریم بھائی نے یہ آواز سنتے ہی کہا۔

"الرٹ ٹرین آ رہی ہے"

ہم چوکس ہو گئے اور لوڈڈ لانچر ہم نے اپنے سینے کے ساتھ لگا لئے۔ ہم بالکل خاموش تھے۔ ہماری نگاہیں دور جنگل کے اندھیرے میں اس طرف لگی تھیں جس طرف

ے انجن کی روشنی نے نمودار ہونا تھا۔ الٹی گنتی شروع ہو رہی تھی۔ ٹارگٹ لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب آ رہا تھا۔ اگر یہ ایمونیشن والی فوجی ٹرین ہی تھی تو تھوڑی ہی دیر بعد مڈ گھاٹ کے ویران سٹیشن پر قیامت برپا ہونے والی تھی۔ بارود کے دھماکوں اور شعلوں کا یک ایسا جوالا مکھی پھٹنے والا تھا کہ جس کا اس سارے علاقے کے درختوں اور پہاڑیوں نے پہلے کبھی مشاہدہ نہیں کیا ہو گا۔ اب ہمیں دور سے ریل کے انجن کی چھک چھک کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز دور سے آ رہی تھی اور بڑی آہستہ آہستہ قریب ہو رہی تھی۔

کریم بولا۔

"گاڑی کی رفتار بہت کم ہے"

واقعی انجن کی چھک چھک بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ یہاں پہاڑی ٹریک کی ھائی تھی۔ کریم بھائی آہستہ سے بولا۔

"گاڑی کی رفتار کم ہونا ہمارے لئے بہت بہتر ہے۔ ٹرین اگر یہاں پانی لینے کے لئے نہ بھی رکی تب بھی ہمارے لئے ٹارگٹ مار لینا آسان ہو گا"

ٹرین نے رات کے اندھیرے میں کسی پہاڑی کا موڑ کاٹا تو اس کے انجن کی روشنی رے جھلملاتی ہوئی نظر آئی۔ یہ روشنی اور انجن کی آواز آہستہ آہستہ قریب ہونے لی۔ میرے ماسٹر سپائی نے کمانڈو آفیسر کی طرح آہستہ سے حکم دیا۔

سٹینڈ ٹو"

ہم نے اپنے اپنے لانچروں میں لوڈ کئے ہوئے راکٹ چیک کئے۔ سیفٹی کیچ پر ہاتھ ر کر دیکھا کہ وہ اوپن تھے۔ اس کے بعد لانچر اپنے اپنے بائیں کاندھے پر رکھ لئے۔ نا آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اس کے انجن کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ انجن نے ہ بار وسل دیا۔ دوسرے انجن کی سیٹی کی آواز پیچھے سے آئی۔ ٹرین کو دو انجن لگے ے۔ انجن کی چھک چھک کی آواز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ نہ وہ کم ہوئی تھی نہ ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ٹرین اسٹیشن پر رکے گی نہیں بلکہ گذر جائے خدا جانے کہاں سے سٹیشن کا ایک بدقسمت ملازم ہاتھ میں سبز بتی والی لالٹین لئے

پلیٹ فارم پر آگیا اور لالٹین کو آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ کریم بھائی نے کہا۔ "نیلنگ"
اور ہم دونوں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے۔ ٹرین اب آؤٹر سگنل کی حدود سے نکل کر پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی تھی۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنی میں ہمیں ٹرین صاف نظر آنے لگی۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ مال گاڑی تھی اس کا اگلا انجن ایک ہی رفتار سے چھک چھک کرتا پلیٹ فارم پر آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے ایک ڈبے میں روشنی تھی۔ کریم نے آہستہ سے کہا۔

"تم اس روشنی والے ڈبے کو ہٹ کرو گے یہ سیکورٹی گارڈ کا ڈبہ ہے"

میں نے لانچر سیدھا کر کے انجن کو زد میں لے لیا۔ کریم سرگوشی میں بولا۔

"ٹارگٹ ہٹ ہونا چاہئے۔ میں پچھلے چوتھے ڈبے کو ہٹ کروں گا۔ اوکے۔ گو"

مال گاڑی کا انجن اب پلیٹ فارم کے بالکل درمیان میں آگیا تھا اور وہ ایک ہی رفتار سے آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹریننگ کے مطابق انجن سے کچھ سینٹی میٹر آگے کا نشانہ لیا اور اللہ کا نام لے کر ٹریگر دبا دیا۔ میرے لانچر میں سے شوں کر کے راکٹ نکلا اور انجن کے ساتھ والے سیکورٹی گارڈ والے ڈبے میں لگنے کی بجائے انجن پر جا کر لگا اور ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ گیا۔ انجن میں آگ لگ گئی اور اس کی چھک چھک ہلکی ہو گئی۔ میرا راکٹ شاید انجن کے پہیوں پر جا کر لگا تھا۔ کریم نے چیخ کر کہا۔

"کیا کر رہے ہو"

اس کے ساتھ ہی اس کے راکٹ لانچر سے راکٹ فائر ہوا جو سیکورٹی گارڈ والے ڈبے میں گھس کر زبردست دھماکے سے پھٹا اور اس ڈبے کو آگ لگ گئی۔ آدمیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ انجن آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ گاڑی بھی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ گاڑی کی آخری بوگیاں ہمارے سامنے تھیں۔ گاڑی کے پیچھے سے مشین گنوں اور رائفلوں کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ پیچھے بھی سیکورٹی گارڈز کا ڈبہ لگا تھا۔ ہمارے دوسرے دونوں راکٹ باری باری ٹرین کے درمیانی ڈبوں میں جا کر لگے اور لوہے کی چادروں کو چیر کر اندر جا کر پھٹے اندر جو اسلحہ تھا اس میں قیامت خیز دھماکے

شروع ہو گئے۔ ہم دوڑ کر دوسری طرف چلے گئے۔ کریم نے چلا کر کہا۔

"پچھلے دونوں ڈبوں کو ہٹ کریں گے"

ہمارے لانچروں میں آخری ایک ایک راکٹ لوڈ تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہمارے یہ دونوں راکٹ ایمونیشن کی ٹرین کی پچھلی دو بوگیوں میں آگے پیچھے جا کر ہٹ ہوئے۔ یہ وہ ڈبے تھے جن میں نیپام راکٹوں کے کریٹ بھرے ہوئے تھے۔ میرے اللہ! ان دونوں ڈبوں میں جو دو دھماکے ہوئے ان کی آواز میں قیامت تک نہیں بھول سکوں گا۔ پہاڑوں میں جیسے زلزلہ آگیا۔ آگ دھوئیں اور شعلوں کی کالی گھٹائیں سی مڈگھاٹ کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئیں۔ ان گھٹاؤں میں دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیپام راکٹ پھٹنے لگے۔ انہوں نے اسلحہ کی ساری گاڑی میں آگ لگا دی۔ یہ بارود کی آگ تھی جس کے شعلے دھماکوں کے ساتھ بلند ہو رہے تھے۔ راکٹ دھوئیں کے بادلوں میں سے نکل نکل کر دائیں بائیں اوپر نیچے درختوں پہاڑیوں' چٹانوں سٹیشن کی دیواروں سے ٹکرا کر ہیبت ناک دھماکوں کے ساتھ پھٹ رہے تھے اور آگ لگاتے جا رہے تھے۔ ساری ٹرین شعلوں کی زد میں تھی۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ سٹیشن اڑ گیا تھا۔ زبردست دھماکے ہو رہے تھے۔ گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ پہاڑ ہل رہے تھے۔ چٹانیں لرز رہی تھیں۔ نیپام راکٹ ہوائیوں کی طرح فضا میں بلند ہو کر پھٹ رہے تھے۔ کریم نے چلا کر کہا۔

"گو"

ہم نے راکٹ لانچر جھاڑیوں میں پھینکے اور ٹیلے کی دوسری طرف نشیب میں دوڑ پڑے۔ ہم اندھیرے میں دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ یہ راستہ ہم نے ان کی روشنی میں دیکھا ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ ہم ڈھلان سے اتر کر ہموار زمین پر درختوں کے درمیان آگئے۔ یہاں اونچی ہاتھی چھواں گھاس کے درمیان ایک پگ ڈنڈی تھی جس پر گذر کر ہم دن کے وقت دریا پر گئے تھے۔ ہم آگے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتے پگ ڈنڈی سے گذر گئے۔

سامنے دریا آگیا۔ سٹیشن پر گولہ بارود کے دھماکے ابھی تک جاری تھے۔ نیپام راکٹ

آس پاس کے درختوں میں پھٹ رہے تھے۔ ان راکٹوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی تھی۔ ان راکٹوں میں آگ لگانے والا مواد بھرا ہوا تھا۔ سٹیشن کی طرف آسمان روشن تھا۔ شعلے بلند ہو رہے تھے۔ بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ دھماکوں سے زمین لرز رہی تھی۔ آگ کے شعلوں کی وجہ سے آسمان روشن تھا۔ اس روشنی میں دریا کی سطح نظر آ رہی تھی۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ اس کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ کریم بھائی نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

میں نے اسے بتایا کہ چار پانچ سو روپے ہیں۔ وہ دریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب ہمیں دریا کے پار جانا ہے۔ دریا کا بہاؤ تیز ہے۔ ہو سکتا ہے ہم دریا پار کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دور ہو جائیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ تم دریا کے دوسرے کنارے پر جہاں بھی نکلو وہاں میرا انتظار نہ کرنا۔ راتوں رات بھوپال والے ہوٹل میں پہنچ کر تمہارا جو کھدر کا لباس وغیرہ پڑا ہے اسے غائب کر دینا۔ اگر تم سے پہلے میں وہاں پہنچ گیا تو میں تمہارے کپڑوں کو وہاں سے لے جاؤں گا۔ کیونکہ صبح ہونے تک ملٹری پولیس بھوپال کے سٹیشن کے اردگرد کے علاقے کو گھیرے میں لے کر چیکنگ شروع کر دے گی۔ ہو سکتا ہے وہ سٹیشن والے ہوٹل میں بھی آئے۔ انہیں تمہارے کمرے میں جینی بھگتوں والے تمہارے کپڑے ملے تو یہ بات تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرحال اگر راتوں رات بھوپال پہنچ سکے تو ٹھیک ہے۔ اگر دن نکل آیا تو بھوپال والے ہوٹل کا رخ نہ کرنا۔ وہاں ملٹری انٹیلی جنیس کے آدمی یقیناً موجود ہوں گے۔

میں نے کہا۔

"ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے"

کریم بھائی نے کہا۔

"اوکے۔ میں دریا میں اترتا ہوں"

اور کریم نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ انی کا بہاؤ واقعی بڑا تیز تھا۔ دیکھتے دیکھتے دریا کی تیز رفتار موجیں کریم کو مجھ سے کافی دور لے گئیں۔ ہم دریا کے دوسرے کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ ور تک مجھے کریم پانی میں ہاتھ چلاتا نظر آتا رہا۔ پھر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ں خود بڑی تیزی سے تیر کر دوسرے کنارے کی طرف جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ گر دریا کا بہاؤ مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہا تھا۔ دریا چڑھا ہوا ہو تو اس میں تیرنا بہت شکل ہوتا ہے۔ آدمی صرف پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی آسانی سے تیر سکتا ہے۔ میں بڑا ھا تیراک تھا۔ میرے بدن میں طاقت بھی تھی۔ اس کے باوجود دریا کی بپھری ہوئی وجیں مجھے کچھ نہیں کرنے دے رہی تھیں۔ ایک جگہ دریا کے عین درمیان میں گرداب ا۔ یہاں پانی ایک مرکز کے گرد تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں اس گرداب میں پھنستے پھنستے ا۔ میں نے تیرتے تیرتے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کریم بھائی مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ یہاں ھیرا تھا اور پھٹتے ہوئے گولہ بارود اور نیپام راکٹوں کے پھٹنے کی روشنی اور دھماکے دور تے جا رہے تھے۔

دریا کا پاٹ بھی کافی بڑا تھا۔ مجھے اسی بات کی خوشی تھی کہ ہمارا کمانڈو آپریشن انتہائی میاب رہا تھا اور ہم نے نیپام راکٹوں اور گولہ بارود سے بھری ہوئی بھارتی فوجی ٹرین اڑا ی تھی جس کا سارا اسلحہ کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا تھا۔ میں یا کی طوفانی موجوں سے لڑتا ایک خاص رفتار کے ساتھ بازو اور ٹانگیں چلاتا دریا کے سرے کنارے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے دوسرے کنارے کے خت قریب آتے نظر آنے لگے۔ آخر میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور جھاڑیوں کو ڑتا ہوا کنارے کی گیلی اور کچی منڈیر پر چڑھ گیا۔ میں تھک گیا تھا۔ وہیں دو چار منٹ بیٹھا رہا۔ میری پتلون اور جیکٹ پانی میں شرابور ہو گئے تھے۔ میں نے دونوں کپڑے ر کر جتنا نچوڑ سکتا تھا نچوڑ کر دوبارہ پہنے اور خدا کا نام لے کر درختوں میں چلنے لگا۔

وہاں مجھے کریم بھائی آس پاس کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ دریا کے

دوسرے کنارے پر درختوں کے پیچھے ایک سڑک آئے گی جہاں سے رات کو چلنے والے کسی ٹرک میں مجھے لفٹ مل جائے گی۔ یہ کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ بہرحال ایک تربیت یافتہ کمانڈو ٹارگٹ مارنے کے بعد دشمن کے علاقے سے نکل آئے تو اس کے لئے واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنا اتنا مشکل کام نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں جھانسی بھوپال روڈ سے کافی دور ہو گیا ہوا تھا اور مدھیہ پردیش کے سب سے زیادہ خطرناک اور گنجان جنگلوں والے علاقے میں نکل آیا تھا۔ یہاں درخت اس قسم کے تھے کہ ان کے تنے ستونوں کی طرح کافی اوپر تک چلے گئے تھے اور ان کے اوپر گھنی شاخیں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ درختوں کے درمیان گھاس جنگلی جھاڑیاں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرا زیادہ تھا۔ میں کافی دیر تک چلتا رہا۔ نہ درختوں کا سلسلہ ختم ہوا نہ جھانسی بھوپال روڈ ہی نظر آئی۔ مجھے احساس ہوا کہ دریا کی موجوں نے مجھے کافی آگے پہنچا دیا ہے۔ ایک جگہ رک کر میں نے سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی اور پھر چلنے لگا۔

ایک تو اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ دوسرے جھاڑیاں راستہ روک رہی تھیں۔ میں غیر ارادی طور پر مشرق کی جانب ہوتا گیا جب کہ مجھے مغرب کی سمت چلنا چاہئے تھا۔ اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب اتنے گھنے درخت آگئے کہ ان کی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کوئی مناسب جگہ دیکھ کر مجھے رات گذار دینی چاہئے۔ ان کی روشنی میں پتہ چل سکے گا کہ میں کہاں آگیا ہوں اور مجھے کس طرف جانا چاہئے۔ مناسب جگہ وہاں کوئی بھی نہیں تھی۔ اندھیرے میں میرے اردگرد درخت اور جھاڑیاں اور اونچی نیچی گھاس ہی گھاس تھی۔ حبس اتنا تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ مجھے سانپ بچھو کا بھی ڈر تھا۔ اور یہ بھی ڈر تھا کہ کسی آدم خور قسم کے شیر سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ میرے پاس چاقو تک نہیں تھا۔ آخر میں ایک درخت پر چڑھ کر اس کے دو شاخے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں مجھے چیونٹیوں اور مچھروں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ چیونٹیاں اتنی تھیں کہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں جلدی سے درخت سے نیچے اتر آیا۔ کپڑوں کو اچھی طرح سے جھاڑا اور گنجان درختوں سے باہر نکلنے کے لئے ایک طرف

آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ ایک کھلی جگہ آگئی۔

آدمی گھپ اندھیرے میں بھی کچھ دیر رہے تو اسے چیزوں کے خاکے سے نظر آنے لگتے ہیں۔ میں ویسے بھی جنگل کے اندھیروں کا عادی تھا۔ اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران مجھے ہوشنگ آباد کے گھنے جنگلوں میں نہ جانے کتنی راتیں اسی طرح گذارنی پڑی تھیں۔ یہاں زمین پر گرے پڑے گیلے پتوں اور درختوں کی شاخوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف اندھیرے میں ایک چٹان نظر پڑی جس کا ایک چھجہ سا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ رات گذارنے کے لئے یہ بڑی موزوں جگہ تھی۔ چٹان پر جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی جس کی شاخیں رسوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ میں ان کو پکڑ کر چٹان کے چھجے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ یہاں مچھر ضرور تھے مگر چیونٹیاں نہیں تھیں۔ میں نے چٹان سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں سو جانا چاہتا تھا۔ مگر حبس اور گرمی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جیکٹ اتار دی۔ اب میں صرف بنیان میں تھا۔ اس سے مجھے تھوڑا سا سکون ملا اور آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

چڑیوں اور دوسرے پرندوں کی پرشور جھنکاروں نے مجھے جگا دیا۔ آنکھیں کھولیں تو سارے جنگل میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دھوپ بعض درختوں سے چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ دن کی روشنی نے مجھے ایک نئی توانائی عطا کی۔ میں چٹان کے چھجے سے اتر آیا اور شمال کے رخ چلنے لگا۔ چلتے چلتے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اچانک ایک چھوٹی سی ندی سامنے آگئی۔ یہاں کنارے پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ میں یہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ جیکٹ کی جیب میں سے انڈین کرنسی کے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر دھوپ میں سکھانے کے لئے رکھ دیئے۔ پتلون اور جیکٹ اتنے گیلے نہیں رہے تھے۔ پھر بھی میں نے انہیں اتار کر دھوپ میں ڈال دیا اور ندی میں اتر کر نہانے لگا۔ ندی کا پانی ٹھنڈا تھا۔ میں نے تھوڑا سا پانی پی بھی لیا۔ پانی بڑا صاف تھا۔ ندی میں نہانے سے طبیعت قدرے بشاش ہو گئی۔ تھوڑی دیر وہاں آرام کیا اور کپڑے پہن کر ندی کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

ندی آگے جا کر ایک طرف گھوم گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گھوم گیا۔ یہاں میں نے کالے سانپوں کا ایک جوڑا دیکھا جو کنارے سے ذرا نیچے ریت میں کنڈل مارے بیٹھا تھا۔ دونوں سانپوں نے مجھے دیکھ کر گردنیں اونچی کیں اور اپنے پھن کھول دیئے۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا میں نے ندی میں چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے پر کافی دور تک دوڑتا چلا گیا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں سانپوں کے جوڑے سے کافی آگے نکل آیا ہوں تو قدم قدم چلنا شروع کر دیا۔ اب مجھے کسی حالت میں بھی بھوپال واپس نہیں جانا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ملٹری پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی رتلام سے لے کر بھوپال تک کے سارے علاقے میں پھیل چکے ہوں گے اور سڑکوں وغیرہ کی ناکہ بندیاں کر کے چیکنگ شروع ہو گئی ہو گی اور ہوٹلوں میں بھی چھاپے مارے جا رہے ہوں گے۔ اور کشمیری کمانڈوز کو تلاش کیا جا رہا ہو گا۔ یقیناً ملٹری انٹیلی جینس اس نتیجے پر پہنچی ہو گی کہ اسلحہ کی ٹرین کو کشمیری کمانڈوز نے ہی اڑایا ہے۔

میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ جھانسی کی طرف نکل جاؤں گا۔ وہاں کسی ہوٹل میں ایک دن اور ایک رات ٹھہروں گا اور اس کے بعد احمد آباد کی طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ میرے ماتھے پر جینی ہندوؤں والا تلک بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ کمانڈو آپریشن پر نکلتے وقت میں نے یہ تلک مٹا دیا تھا اور کلائی پر جو منگل سوتر بندھا ہوا تھا وہ بھی اتار کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا جو اب بھی میری جیب میں ہی پڑا تھا۔ اب میں موقع محل کے مطابق اپنے آپ کو مسلمان بھی ظاہر کر سکتا تھا۔

ندی کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے میں ایک ایسی جگہ پر آ گیا جہاں ندی سے ہٹ کر درختوں کے نیچے لکڑیوں کی کٹائی اور چرائی کا کام ہو رہا تھا۔ آرا مشین چل رہی تھی۔ کچھ مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔ ان لوگوں سے معلوم ہو سکتا تھا کہ میں کس علاقے میں نکل آیا ہوں۔ میں ندی کے کنارے سے اتر کر ان مزدوروں کے پاس آ گیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک شخص درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ گھٹنوں پر رجسٹر کھولے اس میں کچھ لکھ رہا تھا۔ کپڑے اس نے صاف ستھرے پہن رکھے تھے۔ وہ منشی لگتا تھا۔ اس کے

ندھوں پر سبز رومال پڑا تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ مسلمان ہے۔ میں اس کے یب گیا تو اس ادھیڑ عمر آدمی نے میری طرف دیکھا۔ اب مجھے اس کے ماتھے پر پڑا ہوا راب بھی نظر آ گیا۔ میں نے السلام علیکم کہا تو اس نے بڑی خوش اخلاقی سے وعلیکم السلام ہا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کام ہے۔ میں نے ایک فرضی کہانی گھڑ کر اسے سنا دی کہ اپنے ست کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ ایک جگہ ہاتھیوں کے غول دیکھ کر ہم بھاگے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

اس آدمی نے قدرتی طور پر یہی پوچھا کہ ہم کہاں سے شکار کھیلنے جنگل میں آئے ھے۔ میں نے کہا۔

"دراصل ہم جھانسی سے چلے تھے۔ دو دن راستے میں ایک فاریسٹ ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ پھر اس جنگل میں آ گئے۔ ہماری دوسری ٹیم دوسرے جنگل میں ہے میں تو دلی سے اپنے دوست کے پاس جھانسی آیا تھا۔ مجھے اس علاقے کی واقفیت بھی نہیں ہے۔ یہ بتائیں کہ جھانسی یہاں سے کتنی دور ہو گا"

وہ شخص کچھ حیرانی کے تاثرات کے ساتھ مجھے تک رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میاں جھانسی تو یہاں سے بہت دور ہے اور دوسری ریلوے لائن پر ہے تم تو باسودہ شہر کے آس پاس پھر رہے ہو"

میں نے سوچا کہ چلو کوئی شہر تو قریب ہے۔ میں نے کہا۔

"آپ مجھے باسودہ شہر کا راستہ بتا دیں۔ وہاں سے میں کسی نہ کسی طرح جھانسی پہنچ جاؤں گا"

اس آدمی نے رجسٹر بند کر دیا۔ مجھے چارپائی پر اپنے پاس بٹھایا اور ایک مزدور کو آواز ے کر کہا۔

"میاں ان کے لئے شربت تو لاؤ"

شربت لیموں پانی کا تھا۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

"تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہمارا ٹرک کٹی ہوئی لکڑیاں

لینے آئے گا۔ میں تمہیں اس میں بٹھادوں گا۔ وہ باسودہ شہر ہی جائے گا"

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں جنگل میں اس مہمان نواز مسلمان منشی کے پاس بیٹھا لکڑیوں کی چرائی ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک خستہ حال سا ٹرک آگیا۔ اس پر چری ہوئی لکڑیوں کے سلیپر لادے گئے۔ منشی نے مجھے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا دیا۔ اس ٹرک نے مجھے ڈیڑھ گھنٹے بعد مدھیہ پردیش کے جنگلوں سے نکال کر باسودہ شہر پہنچا دیا۔

اس زمانے میں باسودہ اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ ایک بازار میں مسلم ہوٹل کا بورڈ لگا تھا۔ یہ ایک دکان تھی۔ میں دکان کے اندر آکر میز کے گرد کرسی پر بیٹھ گیا میری ساتھ والی میز پر تین آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔

"میاں کہنے والے کہتے ہیں کہ دھماکہ اتنا بڑا تھا کہ ڈگھاٹ کا پورا اسٹیشن پوری پہاڑی اڑ گئی ہے۔ بھوپال سے ادھر کوئی گاڑی نہیں آرہی"

دوسرا آدمی کہنے لگا۔

"سنا ہے فوجی ٹرین تھی"

"ہاں میاں۔ اس میں گولہ بارود لدا ہوا تھا۔ یہ کشمیری مجاہدین کا ہی کارنامہ ہے۔ تم دیکھ لینا کشمیر سے ایک دن ہندو سکھ فوجیوں کو بھاگنا پڑے گا۔"

تیسرے آدمی نے میری طرف دیکھ کر اپنے ساتھی کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کوئی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی ہے"

وہ بے نیازی سے بولا۔

"خدا جانے بھائی۔ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں"

اور وہ تینوں اٹھ کر چلے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ فوجی ٹرین کی تباہی کی خبر سب جگہ پھیل چکی تھی۔ یہ تینوں آدمی باسودہ کے مسلمان تھے مگر اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹرین کی تباہی کی باتیں کرتے کرتے نہ صرف رک گئے تھے بلکہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔

میں نے اس چھوٹی سی دکان میں خوب سیر ہو کر آلو گوشت اور بریانی کھائی۔ احمد آباد جین ہندو کے روپ میں سبزیاں کھاتے کھاتے میں تنگ آگیا تھا۔ یہاں سے میں باسودہ ے اسٹیشن پر آگیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ جھانسی جانے والی گاڑی باسودہ اسٹیشن سے شام کے وقت تیار ہو کر جائے گی۔ کیونکہ ڈگھاٹ سٹیشن پر فوجی گاڑی کے پٹڑی سے جانے کی وجہ سے ریلوے بھوپال جھانسی ریلوے ٹریک بند ہو گیا ہے۔ اور اب دلی نے والی گاڑیاں رتلام سے راجستھان کے شہر کوٹا اور بھرت پور سے ہوتی ہوئی دلی پہنچتی ۔ اس وقت دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے جھانسی کا ٹکٹ خرید کر جیب میں لیا تھا۔ شہر میں آکر چلنے پھرنے کی بجائے میں وہیں باسودہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی رہا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ سٹیشن آفس کے آگے چائے وغیرہ کی چھوٹی کینٹین تھی جس کے کاؤنٹر پر دو تین مسافر کھڑے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ خالی یوں کے کچھ ڈبے پلیٹ فارم کی دوسری طرف ریلوے لائن پر کھڑے تھے۔ ایک انجن گرم جوشی سے شنٹ کرتا ادھر سے ادھر آجا رہا تھا۔ شاید اسی انجن نے شام کو ی جانے والی گاڑی تیار کرنی تھی۔

شام ہو گئی۔ پلیٹ فارم کی بتیاں جل اٹھیں۔ اس دوران میں تین بار کاؤنٹر پر کھڑے رچائے پی چکا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک خالی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔ اس وقت جھانسی دلی کی طرف جانے والے کافی مسافر پلیٹ فارم پر اپنے اپنے سامان اور بال ا کے ساتھ آکر جمع ہو چکے تھے۔ گاڑی کے لگتے ہی مسافروں نے خالی ڈبوں پر ہلہ بول گر خالی ڈبے زیادہ تھے۔ میں بھی ایک نسبتاً خالی ڈبے میں آکر بڑے آرام سے کھڑکی پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ گاڑی شروع ہی سے پسنجر ٹرین بن گئی۔ راستے میں ٹے سے چھوٹا اسٹیشن بھی آتا تو وہاں کھڑی ہو جاتی اور دیر تک کھڑی رہتی۔ اس ٹرین جھے اگلے دن رات کے دس گیارہ بجے جھانسی پہنچایا۔ پلیٹ فارم پر اتر کر میں نے خدا ر ادا کیا۔ کتابوں والے سٹال پر جا کر اخبار دیکھے۔ ہر اخبار میں ڈگھاٹ پر فوجی ٹرین کی کی خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ ہر اخبار نے فوجی ذرائع کے مطابق

یہی لکھا تھا کہ یہ کام کشمیری مجاہدین کا ہے اور شہری پولیس اور ملٹری پولیس اس ٹرین کی تباہی کے ذمہ دار تخریب کاروں یعنی کشمیری مجاہدین کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ مجرموں کو بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ ریلوے اسٹیشن پر بھی جگہ جگہ ملٹری پولیس کے جوان نظر آئے۔ گیٹ پر بھی پولیس کے دو سپاہی کھڑے باہر نکلنے والے ہر مسافر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی بالکل پروا نہ کی اور ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے کر باہر نکل گیا۔ جھانسی ہندوستان کے مشہور شہروں میں سے ہے اس شہر سے مسلمانوں کی بڑی انمول دینی' علمی اور ادبی روایات وابستہ ہیں۔ مگر اس شہر میں بھی میں نے مسلمانوں کو غربت اور معاشی پس ماندگی کی حالت میں دیکھا۔

میں کسی مسلمان ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ یہاں مجھے اپنے ماسٹر سپائی کی ہدایت کے مطابق کم از کم تین روز قیام کرنا تھا تاکہ جب میں ٹرین میں سوار ہو کر واپس احمد آباد جاتے ہوئے بھوپال اور رتلام کے شہروں سے گذروں تو ملٹری اور سول پولیس کی سیکورٹی کے اقدامات تھوڑے نرم پڑ چکے ہوں۔ میں جھانسی ریلوے اسٹیشن کے آس پاس کے بازاروں میں گھومنے پھرنے لگا۔ ابھی رات کے بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ جھانسی شہر میں کافی رونق تھی۔ یہاں بہت سے ہوٹل تھے۔ ایک ہوٹل کی دوسری منزل پر لگا ہوا تاج محل ہوٹل کا نیون سائن بورڈ روشن نظر آیا تو میں نے اسی ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ میں نے اپنا نام عمران علی لکھوایا اور کہا کہ میں بریلی میں پلاسٹک کی ڈونگے بالٹیاں بنانے کا کاروبار کرتا ہوں۔ یہاں جھانسی میں مارکیٹ کا جائزہ لینے آیا ہوں۔

رات میں نے بڑے آرام سے اپنے کمرے میں سو کر گذاری۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت شہر میں تھوڑی دیر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ شام کو ہوٹل میں واپس آگیا۔ یہاں دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت یہی چاہ رہی تھی کہ جلدی سے احمد آباد جاؤں اور مسٹر پانڈے سے ملٹری ٹرین کی تباہی کا حال سنوں اور یہ معلوم کروں کہ کیا ٹرین میں نیپام بم والے سارے راکٹ تباہ ہو گئے تھے یا نہیں یا جو بھی صوت حال ہو طریقے طریقے سے معلوم کروں۔ مجھ سے تیسرے دن جھانسی میں نہ رہا گیا۔

میں دوسرے روز ہی رات کی گاڑی میں بیٹھ کر احمد آباد روانہ ہو گیا۔ مڈگھاٹ کا ریلوے ٹریک بند تھا۔ اسلحہ بارود کے دھماکوں سے چونکہ سارے کا سارا اسٹیشن ہی اڑ گیا تھا اس لئے گاڑیاں ابھی اس طرف سے ہو کر بھوپال احمد آباد نہیں جاتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے کمانڈو آپریشن نے واقعی بڑی تباہی مچائی تھی۔ جس گاڑی میں میں سوار تھا وہ جھانسی سے بھرت پور' اور بھرت پور سے کوٹا ہوتی ہوئی احمد آباد پہنچی۔ اس وقت دن کے بج رہے تھے۔ میں لالا بازار گیا وہاں سے اپنے لئے کھدر کا نیا کرتہ پاجامہ صدری چپل اور تلک لگانے والی ڈبی خریدی۔ اس دکان کے اندر ہی جینز جیکٹ اتار کر لفافے میں بند کیا۔ دوسرے کپڑے بدلے۔ ایک پارک میں پرانے کپڑوں کا لفافہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ کلائی پر منگل سوتر بھی باندھ لیا اور پارک میں ہی ایک طرف بیٹھ کر ماتھے پر تلک بھی لگا لیا۔ جو رقم بچی تھی وہ جیب میں رکھ لی اور ٹیکسی لے کر مسٹر پانڈے کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

مسٹر پانڈے ابھی دفتر نہیں گئے تھے۔ میناکشی سو رہی تھی وہ خود ڈائننگ روم میں بیٹھے ناشتے کے بعد سگار پی رہے تھے۔ مسٹر پانڈے جب کبھی کسی دفتری مسئلے کے بارے میں پریشان ہوتے تھے اور سگار سلگا کر منہ میں رکھ لیتے تھے۔ مجھے ہاتھ باندھ کر ملے۔ میرے گھٹنوں کو چھوا اور بڑی لجاجت سے بولے۔

"گورو دیو! میں تو آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ سومنات جی کی یاترا ضرور اچھی رہی ہوگی۔ آپ نے میرے لئے بھی ضرور پرارتھنا کی ہوگی۔"

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسٹر پانڈے میرے لئے چائے بنانے لگے۔ شکل سے کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کی پریشانی کی وجہ معلوم تھی۔ میں نے کہا۔

"گوکل داس! ہم نے تمہارے لئے خاص طور پر شری کرشن بھگوان کے نام کا جاپ کیا ایک ہزار سوتروں کا پاٹھ کیا"

مسٹر پانڈے نے چائے کی پیالی میرے آگے بڑے ادب سے رکھتے ہوئے۔ بجھے دل اور مردہ سی آواز میں کہا۔

"مہاراج! میں تو بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں"

"کیوں گوکل داس! کیا ہوا؟ بتاؤ۔ آخر ہم یہاں کس لئے بیٹھے ہیں۔ ہم سے جو ہو سکے گا تمہارے لئے کریں گے"

مسٹر پانڈے نے میرے قریب کرسی گھسیٹ لی اور بولا۔

"آپ کو تو شاید معلوم ہی نہیں کہ میری دفتری ذمے داریاں کیا کیا ہیں اور کس قسم کی ہیں میں نے بھی کبھی آپ سے ان کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ مہاویر کے سچے بھگت ہیں۔ آپ دنیاداری کے جھمیلوں سے کوسوں دور ہیں۔"

میں نے جان بوجھ کر آواز کو رعب دار بناتے ہوئے کہا۔

"گوکل داس! اپنی مشکل بتاؤ۔ ادھر ادھر کی باتیں مت کرو"

میں چائے پینے لگا۔ مسٹر پانڈے نے جلدی سے ہاتھ باندھ لئے اور بولا۔

"گورو دیو! گولہ بارود سے بھری ہوئی ایک ٹرین ہم نے کشمیر فرنٹ پر اپنے فوجی یونٹوں کے لئے بھیجی تھی۔ اسے کشمیری کمانڈوز نے اڑا دیا ہے"

میں نے ان جان بنتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ کوئی پسنجر ٹرین تھی؟"

گوکل داس بولا۔

"نہیں مہاراج سارے کے سارے ڈبے مال گاڑی کے تھے اور ان میں اسلحہ لدا ہوا تھا۔"

میں نیپام راکٹوں کی تباہی کی تصدیق چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا اس میں کوئی خاص قسم کا اسلحہ تھا؟"

"ہاں مہاراج! اس میں اگنی راکٹ تھے۔ انہیں نیپام راکٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہم نے خاص طور پر کشمیر فرنٹ کے لئے کسی دوسرے ملک سے حاصل کئے تھے۔ وہ بھی دوسرے اسلحہ کے ساتھ بھسم ہو گئے"

میں نے کہا۔

"گوکل چند اسی قسم کے حادثے تو دنیا کے ملکوں میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم کیوں پریشان ہو؟"

مسٹر پانڈے نے کہا۔

"مہاراج! اس ٹرین کو دیولالی سے جموں توی تک پہنچانے کی ذمے داری میرے محکمے کے سپرد تھی۔ میرے محکمے کا ایک خاص سیکورٹی سٹاف بھی ساتھ جا رہا تھا۔ مہاراج اوپر پنجاب اور جموں کشمیر میں تو اس قسم کے دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے پرانت میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کشمیری کمانڈوز نے بھوپال اور جھانسی کے درمیان کسی فوجی گاڑی کو اڑا دیا ہو۔ مہاراج ڈگھاٹ کے اسٹیشن پر تو بڑی تباہی ہوئی ہے۔ سٹیشن کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں مہاراج کہ ہمارا محکمہ سنٹرل نیشنل سیکورٹی کا بڑا امپارٹنٹ محکمہ ہے اور خاص پردھان منتری اندرا جی کے ماتحت ہے۔ اوپر تو طوفان مچ گیا ہوا ہے۔ میرے خلاف بھی انکوائری شروع ہو گئی ہے"

گوکل داس کی آواز مزید بجھ گئی۔ بولا۔

"میں اپنی ترقی کی فکر میں تھا اور یہاں میری نوکری اور میرے پورے سرکاری کیریئر کی ساکھ خطرے میں پڑ گئی ہے۔ مہاراج! پلیز میرے لئے کچھ کیجئے۔ نہیں تو نہ صرف یہ کہ مجھے نوکری سے ڈس مس کر دیا جائے گا بلکہ میری پنشن بھی ضبط ہو جائے گی اور ساری زندگی کے لئے بدنامی کا داغ ماتھے پر لگ جائے گا۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ ہم جو چاہتے تھے۔ ویسے ہی ہوا تھا میں نے مسٹر پانڈے کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گوکل داس! تم چنتا مت کرو۔ ہم سے جو ہو سکے گا تمہارے لئے کریں گے۔ ہم بھگوان شیو جی کے چرنوں میں خود تمہاری ارداس پیش کریں گے"

مسٹر پانڈے میری شعبدہ بازیاں دیکھ چکا تھا جن کو وہ میری کرامتیں سمجھ رہا تھا۔ میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"مہاراج میری لاج رکھ لیں۔ مجھے برباد ہونے سے بچالیں۔"

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ میں نے ایک خاص مقصد ذہن میں رکھتے ہوئے اسے کہا۔

"تمہیں کہہ دیا ناں کہ چنتا مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم تمہارے لئے بھگوان شیو جی کا خاص چلہ کریں گے۔ آئندہ اگر کوئی اس قسم کی ذمے داری تمہارے سر پر پڑنے والی ہو تو ہمیں خبر کر دینا۔ ہم تمہیں بچالیں گے۔"

میرا تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا تھا۔ مسٹر پانڈے نے مجھے ہمارے اگلے کمانڈو آپریشن کا ٹارگٹ خود ہی بتا دیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھ سے غلطی ہو گئی کہ آپ کو کچھ نہ بتایا۔ ورنہ یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اب اگلے مہینے کے پہلے ہفتے میں کسی روز ہمارا ایک بہت بڑا مال بردار بحری جہاز اسرائیل کی کسی بندرگاہ سے کوبرا جنگی ہیلی کاپٹروں کی پوری کھیپ اور میڈیم فیلڈ توپیں لے کر دوارکا کی بندگارہ پر آکر لگے گا۔ اگر اس دوران مجھے نوکری سے چھٹی نہ مل گئی تو اس کی سیکورٹی کی ذمے داری بھی میرے محکمے کے سپرد ہو گی۔ مگر مہاراج پہلے آپ مجھے اس مشکل سے بچائیں جس میں پھنس چکا ہوں۔"

مسٹر پانڈے نے مجھے بہت بڑا ٹارگٹ دے دیا تھا۔ میں نے اپنی معلومات کے لئے اس سے پوچھا۔ ہم انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ بیچ میں کبھی کبھی وہ ہندی بولنے لگ جاتا تھا۔ میں انگریزی میں اس سے زیادہ تر اس لئے بھی بات کرتا تھا کہ اگرچہ میں ہندی پوری طرح جانتا تھا مگر کسی وقت میرے منہ سے فارسی اور عربی کا کوئی لفظ نکل جاتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"گوکل داس! ہندوستان ایک غریب ملک ہے مجھے بتاؤ کہ ہماری حکومت آخر

اتنا دولت خرچ کر کے یہ اسلحہ کس لئے منگوا رہی ہے۔ ہماری پاکستان سے کوئی جنگ تو نہیں لگی ہوئی"

پانڈے کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کشمیر پر ہم نے وہاں کے کشمیری مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ کشمیری مسلمان ہمارے غیر قانونی قبضے کے خلاف جہاد کی لڑائی لڑ رہے ہیں جو ایک قسم کا دھرم یدھ ہوتا ہے۔ وہاں ہماری فوج بھی عاجز آگئی ہے ہم یہ سارا اسلحہ کشمیر فرنٹ پر کشمیری مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے منگوا رہے ہیں۔ کیونکہ مہاراج کشمیر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو پورا مشرقی پنجاب بھی ہمارے پاس نہیں رہے گا۔ سکھ وہاں فوراً خالصتان بنالیں گے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر سیدھا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"گورو دیو! مجھ پر بڑی بھاری پتا آن پڑی ہے۔ مجھے اس پتا میں سے نکال لیجئے۔ میں سارا جیون آپ کے چرنوں میں گذار دوں گا"

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے مسٹر پانڈے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے جلال آکر کہا۔

"تمہیں کچھ نہیں ہو گا گوکل داس! کچھ نہیں ہو گا۔ ہم تمہاری رکھوالی کریں گے۔ اب ہم اوپر آرام کرنے جا رہے ہیں۔"

میں نے اپنے کمرے میں آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خفیہ جگہ پر چھپائے ہوئے ئٹ لائیٹر ٹرانسمیٹر کو نکال کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر محفوظ پڑا تھا۔ اس دوران نیچے ںگ روم کے ٹیلی فون میں لگایا ہوا میرا مائیکروفون بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں نے ر اٹھا کر کان سے لگایا۔ ڈرائنگ روم میں باہر کی آوازوں کی بھنبھناہٹ صاف سنائی رہی تھی۔ میرا بریف کیس جس میں میرے کافی روپے بند تھے الماری کے ایک میں بالکل محفوظ پڑا تھا۔ میں نے چابی لگا کر اسے بھی کھول کر دیکھا۔ سارے کرنسی

نوٹ موجود تھے۔ اتنے پیسے ہی کم ہوئے تھے جتنے میں نکال کر لے گیا تھا۔ یہاں میری کسی چیز کو کسی نوکر وغیرہ کے ہاتھ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کے سب نوکروں وغیرہ کو معلوم تھا کہ میں انتریامی سنت سادھو ہوں مجھے ایک ایک بات کا پتہ چل جاتا ہے۔ میں یہ خبر اپنے سپائی کریم بھائی تک پہنچانے کے لئے بے تاب تھا کہ اگلے مہینے کے پہلے ہفتے بھارت کا ایک مال بردار بحری جہاز جنگی ہیلی کاپٹر اور میڈیم فیلڈ توپوں کی بھاری کھیپ لے کر دوارکا کی جیٹی پر لگنے والا ہے۔ اس کو میں مسٹر پانڈے کے بنگلے سے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر یہ خبر نہیں سنا سکتا تھا۔ یہاں سے اسے فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے باہر کسی محفوظ جگہ سے اس کو ٹیلی فون کر کے دن یا رات کے وقت ملاقات کا کوئی وقت طے کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے ٹیلی فون کرنے کے لئے مینا کشی کے ساتھ گاڑی میں باہر نکلنا چاہئے۔ اس طرح میں نگرانی کرنے والوں کی نظروں سے بچ سکتا تھا۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ فوجی ٹرین کی تباہی کے بعد مسٹر پانڈے کی اعلیٰ سطح پر انکوائری شروع ہو گئی ہے عین ممکن تھا کہ کوٹھی کے باہر معمول کی ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے سیکریٹ سروس کے آدمیوں کو الرٹ کر دیا گیا ہو اور اب وہ ہنگامی بنیادوں پر میری نگرانی شروع کر دیں۔ اب میرا اس بنگلے سے اکیلا نکل کر سوائے کسی مندر کے دوسری جگہوں پر جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ مسٹر پانڈے کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مینا کشی ابھی اپنے کمرے میں ہی ہے۔ وہ رات کو ڈانس سنٹر سے دیر سے آئی تھی۔ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر مینا کشی کے کمرے کا نمبر ڈائیل کیا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں ہی تھی۔ میری آواز سن کر خوش ہو کر بولی۔

"گورو جی آپ کب آئے؟ پتا جی تو آپ کے آنے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔"

اس نے فکر مند ہو کر کہا۔

"ڈیڈی بہت پریشان ہیں گورو جی! ان کے خلاف انکوائری شروع ہو رہی ہے"

میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے ڈیڈی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں ان کے پاس ہی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا ہوں۔"

مینا کشی نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

"گورو جی! پلیز میرے ڈیڈی کو اس پریشانی سے بچا لیں۔ آپ تو سب کچھ کر سکتے ہیں"

میں نے کہا۔

"تم بے فکر رہو۔ مجھ سے جو ہو سکا وہ کروں گا بھگوان نے چاہا تو تمہارے ڈیڈی پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔ ہاں۔ میں نے اس وقت تمہیں اس لئے فون کیا ہے کہ مجھے مہنت جی سے ملنے مندر جانا ہے۔ ان کے لئے سومنات مندر کے بڑے پنڈت جی کا ایک خاص سندیسہ لایا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنی گاڑی میں مندر تک چھوڑ آؤ"

تھوڑی دیر بعد میں مینا کشی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا نارائن جی کے مندر کی طرف جا
تھا۔ بنگلے سے نکلتے وقت میں نے سامنے والے شیشے میں سے پیچھے نگاہ ڈالی تھی۔ مجھے
ک کے سامنے درخت کے پاس ایک آدمی اٹھ کر دوسری طرف جاتا دکھائی دیا تھا۔ اب
محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ یہ سیکریٹ سروس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے
پولیس کی کوئی خاص گاڑی کہیں قریب ہی موجود ہو اور وہ اس میں بیٹھ کر میرے
ب میں آئے۔ ملٹری ایمونیشن کی ٹرین کی تباہی اور مسٹر پانڈے کے خلاف اوپر کی سطح
نکوائری شروع ہو جانے کے بعد خفیہ پولیس کے یہ اقدامات بالکل ضابطے کے مطابق
مینا کشی مجھے مندر کے دروازے پر اتار کر چلی گئی۔ میں مندر کے بڑے کمرے میں
ن مہاویر کی بڑی مورتی کے پاس کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھا مالا کا جاپ کرتا رہا۔
کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ مالا کے دانوں پر چل رہے تھے مگر ذہن سوچ رہا
یہاں سے کیسے باہر نکلوں؟ کس طرف سے باہر نکلوں اور کہاں جا کر ماسٹر سپائی کریم

بھائی سے فون پر رابطہ قائم کروں اب مجھے یہ دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں اچانک پولیس آکر مسٹر پانڈے کے بنگلے میں میرے کمرے کی تلاشی لینی نہ شروع کر دے۔ وہ نیشنل سیکورٹی کے نام پر ایسا کر سکتی تھی۔ تلاشی لینے کی صورت میں میرا سگریٹ لائیٹر والا ریڈیو ٹرانسمیٹر برآمد ہو سکتا تھا۔ یہ میرے غیر ملکی جاسوس ہونے کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ مگر یہ خطرہ تو بہر حال مجھے مول لینا ہی تھا۔ میں کوئی پون گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا۔

پھر اٹھ کر مورتی کے قدموں کو چھو کر ہاتھ آنکھوں کے ساتھ لگائے اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا مندر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ پوجا کرنے ولے شردھالو اس دروازے سے بھی آجا رہے تھے۔ میں نے درواازے کی دوسری جانب نگاہ دوڑائی۔ اگر خفیہ پولیس کا کوئی آدمی میرے پیچھے لگا ہوا تھا تو وہ یقیناً اسی دروازے پر موجود ہو گا۔ وہاں دو تین آدمی تھے۔ یہ عام گجراتی ہندو تھے جو ایک سٹال پر سے پھولوں کی مالائیں خرید رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب جو ہو سو ہو مجھے تو بہر حال یہاں سے نکلنا ہی ہے۔ بڑے دروازے سے نہیں تو عقبی دروازے سے ہی سہی۔ اور میں عقبی دروازے سے نکل گیا۔

یہاں ایک چھوٹی سی سڑک مندر کی دیوار کے ساتھ گھومتی ہوئی دوسری طرف بڑی سڑک پر نکل جاتی تھی۔ میں بڑے سکون سے ہندو سادھوؤں کی طرح قدم قدم چلتا۔ ایک ہاتھ میں مالا چلاتا بڑی سڑک پر آگیا۔ یہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی اور بڑے چوک والے سینما ہاؤس کے سامنے جو ریستوران تھا وہاں اتر گیا۔ اس ریستوران سے میں پہلے بھی ایک بار ٹیلی فون کر چکا تھا۔ فون کاؤنٹر کے پیچھے ایک تپائی پر پڑا رہتا تھا میں نے ریستوران کے مالک سے اجازت لے کر کریم بھائی کا نمبر گھمایا۔ اس نے میری آواز سنتے ہی پوچھا۔

"کوئی خاص بات؟"

یہ شخص ٹیلی فون پر ہمیشہ مختصر اور شارٹ ہینڈ میں گفتگو کرتا تھا۔ میں نے کہا۔

"سوامی مہاویر جی کی جینتی قریب آرہی ہے آپ سے اس بارے میں بات کرنی تھی"۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ایک گھنٹے بعد کنکر کنکریاں جھیل کے پاس سلطان قطب الدین کی مسجد کے پیچھے آجانا"

اور اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے بہر حال وہاں پہنچنا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک گھنٹہ یہاں پر گزارا جائے کہ اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی میرے پیچھے لگا ہوا بھی ہے تو اسے شک بھی نہ پڑے اور اسے دھوکہ سے اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کی بھی کوشش کی جائے۔ میں ریستوران سے نکل آیا۔ سامنے بس سٹاپ تھا۔ لوگ بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں نے دل میں ایک سکیم بنا لی تھی۔ جیسے ہی بس آئی لوگ اس میں سوار ہونے کے لئے ایک دم آگے بڑھے۔ میں بھی لوگوں کے ہجوم میں گھس گیا۔ اس بس کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ پیچھے تھا جہاں سے لوگ سوار ہوتے تھے۔ دوسرا دروازہ ڈرائیور کی سیٹ کے سامنے دوسری طرف کھلتا تھا۔ یہاں سے سواریاں اترتی تھیں۔ بس کے اندر آتے ہی میں ٹکٹ کی تلاش کے بہانے اگلے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ پھر دوسرے دروازے کے پاس آکر جلدی سے نیچے اتر گیا۔ نیچے اترتے ہی میں نے ایک رکشے کو ہاتھ دیا۔ وہ رک گیا۔ میں اس میں گھس گیا اور ڈرائیور سے کنکر کنکریاں جھیل کی طرف چلنے کو کہا۔

اس قسم کی صورت حال میں میں اس سے زیادہ احتیاط نہیں کر سکتا تھا۔ اگر واقعی اب بھی کوئی آدمی میرے پیچھے آرہا تھا تو پھر اس سے نجات حاصل کرنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں صرف اس وقت کمانڈو اٹیک کا آخری حربہ استعمال کرنے کا قائل تھا جب دوسرا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا ہو۔

موٹر رکشے نے مجھے کنکر کنکریاں جھیل والے پارک کے دروازے پر پہنچا دیا۔ یہ جھیل احمد آباد کی بڑی مشہور جھیل اور تفریحی مقام ہے۔ میں پہلے بھی اس جھیل کا ذکر کر چکا ہوں۔ سلطان قطب الدین نے اس جھیل کو بڑی ترقی دی تھی اور آس پاس گھنے پھل دار درخت لگوائے تھے۔ جہانگیر بادشاہ یہاں تفریح اور شکار کی غرض سے اکثر آیا کرتا تھا۔ سلطان قطب الدین نے جھیل کنارے ایک عالی شان مسجد بھی بنوائی تھی جو اپنی شان

وشوکت اور جاہ وجلال کے ساتھ آج بھی قائم تھی۔ جھیل کے کنارے کنارے دور تک اس تاریخی مسجد کا برآمدہ چلا گیا تھا۔ برآمدے کے ستونوں کا عکس جھیل کے ساکن پانی میں جھلملاتا نظر آتا تھا۔ میں مسجد کے پیچھے چلا آیا۔ یہ جگہ نسبتاً ویران ویران سی تھی۔ ایک بارہ دری کا کھنڈر سا باقی رہ گیا تھا۔ میں کھنڈر کے ایک جانب ہو کر سائے میں بیٹھ گیا۔

میں نے مالا کا جاپ شروع کر دیا تھا اور یوں بیٹھا تھا جیسے بھگوان کا سمرن کر رہا ہوں۔ میں کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہاں کوئی مشکوک آدمی نظر نہ آیا۔ ٹھیک وقت پر ایک طرف سے کریم بھائی آتا دکھائی دیا۔ وہ میرے قریب سے ہو کر آگے نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے صرف اتنا کہا۔

"فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے چلے آؤ"

میں نے ایسا ہی کیا۔ آگے درختوں کے درمیان ایک جگہ پرانے زمانے کا ایک ٹوٹا پھوٹا مینار تھا جس کی نچلی منزل ہی باقی رہ گئی تھی۔ اس مینار میں دروازہ تھا اور سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ جس طرح ہمارے لاہور کے مقبرہ جہانگیر کے میناروں میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ کریم بھائی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا تھا۔ میں بھی نیچے اتر گیا۔ نیچے ایک چھوٹے سے بند غار کے اور کچھ نہیں تھا۔

کریم بھائی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کوئی خاص بات؟"

میں نے اسے دوارکا کی بندرگاہ پر اگلے مہینے کے پہلے ہفتے میں آنے والے بحری جہاز کے بارے میں جلدی جلدی ساری تفصیل بیان کر دی۔ وہ بولا۔

"اس جہاز میں جو کوبرا گن شپ ہیلی کاپٹر آرہے ہیں وہ یقیناً کشمیر کے فرنٹ پر کشمیری مجاہدوں کے خلاف ہی استعمال ہوں گے اور میڈیم توپ خانہ بھی کشمیر محاذ کے لئے ہی منگوایا گیا ہے۔ ورنہ اس قسم کے اسلحہ منگوانے کی اس وقت ضرورت نہیں تھی۔ یہ سارا اسلحہ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو

کچلنے کے لئے ہی منگوایا گیا ہے۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ پر مجاہدین ہر روز زبردست کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔ بھارتی فوجوں کا بہت جانی نقصان ہو رہا ہے"

میں نے کہا۔

"پھر تو اس جہاز کی تباہی بہت ضروری ہے"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"اس کے لئے تمہیں دوارکا جانا ہو گا۔ لیکن پہلے تم سومنات جاؤ گے اور مندر میں ایک پجاری سنت بن کر حالات کا جائزہ لو گے۔ دوارکا وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں اس مشن میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ مگر میں پہلے دوارکا جا کر جائزہ لوں گا کہ ہم بندرگاہ میں کس طریقے سے داخل ہو سکتے ہیں اور ہمیں جہاز تک پہنچنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہو گا۔ کیونکہ اس جہاز کی سیکورٹی کا بڑا زبردست انتظام کیا گیا ہو گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں جہاز کو تباہ کرنے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہو گی؟"

کریم نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں جہاز کی بندرگاہ میں آمد سے ایک ہفتہ پہلے دوارکا میں موجود ہوں گا۔ تم سومنات کے مندر میں ہی پجاری کی حیثیت سے رہو گے۔ میں تمہیں وہیں آکر مل لوں گا۔ اگرچہ یہ مرچنٹ نیوی کا مال بردار جہاز ہو گا مگر اس کی آمد کو انتہائی خفیہ رکھا جائے گا کیونکہ اس جہاز پر فوجی اسلحہ لوڈ ہو گا۔ لیکن مجھے اپنے ذرائع سے اس جہاز کی آمد کا پتہ چل جائے گا۔ اگر یہ جہاز یورپ یا جنوبی افریقہ کی کسی بندرگاہ سے آرہا ہے تو اب تک وہاں سے چل چکا ہو گا۔ اس کی آمد کی تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق ہی عمل کرنا

ہو گا۔ تم ایک ہفتہ پہلے سومنات چلے جاؤ گے اور میں دوار کا پہنچ جاؤں گا۔"
میں نے کہا۔

"جہاز کو دو طرح سے تباہ کیا جا سکتا ہے یا تو اس کے پیندے میں میگنٹ ٹائم بم لگا کر اسے ڈبو دیا جائے یا اس کے انجن روم اور اسلحہ خانے میں ٹائم بم رکھ کر اسے اڑا دیا جائے۔"

کریم بھائی نے میری طرف تھوڑا سا مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

"ایک بات یاد رکھنا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے انڈین ملٹری انٹیلی جینس اور ملٹری پولیس اتنی احمق نہیں ہے کہ جہاز کو ہمارے لئے خالی چھوڑ دے اور ہم اپنی من مانی کاروائی کر کے واپس آجائیں اس کمانڈو اپریشن میں ہو سکتا ہے ہمیں اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑ جائے"

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"خدا کی قسم اگر میں اپنی جان قربان کر کے اس جہاز کو تباہ کر سکتا ہوں تو میں ایک بار تو کیا اسلام اور کشمیری مسلمانوں کے لئے ہزار بار اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔"

کریم بھائی نے مجھے اپنے گلے لگا لیا۔

سومنات کی گناہ آلود دیوداسی

جب ہم نے ساری بات کر لی تو کریم کہنے لگا۔

"میں پہلے جاؤں گا۔ تم میرے جانے کے پانچ منٹ بعد یہاں سے نکلنا"

یہ کہہ کر وہ برج کے کھنڈر کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ں بھی باہر نکل آیا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے رد گرد کا جائزہ لیا۔ مجھے بظاہر وہاں کوئی شک شبے والا آدمی دکھائی نہ دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں خفیہ سروس والے کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا لنگر کنکریاں جھیل کی پارک کی طرف آگیا۔ گیٹ کے سامنے کئی خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ں نے ایک ٹیکسی لی اور اسے سوامی نارائن جی کے مندر چلنے کا کہا۔

دوپہر تک میں سوامی جی کے مندر میں بیٹھا پوجا پاٹھ کرتا رہا مالا پھیرتا رہا اور ماحول کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ میں نے دوپہر کا بھوجن بھی مندر کے اندر ہی کیا۔ دوپہر کے بعد کوئی ین بجے میں ٹیکسی لے کر مسٹر پانڈے کے بنگلے پر واپس آگیا۔ مینا کشی ڈانس سنٹر گئی ہوئی تھی۔ ملازمہ بائی جی نے مجھ سے کھانا لانے کے لئے پوچھا تو میں نے اسے کہا کہ میں بھوجن ندر ہی میں کر آیا تھا۔

میں اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ سب سے پہلے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ نیچے والے ڈرائنگ روم سے بائی جی کے جھاڑ پونجھ کرنے اور کسی وقت کوئی فلمی

گانا گنگنانے کی ہلکی سی آواز آجاتی تھی۔ میرا خفیہ مائیکرو فون اپنی جگہ پر لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے کمرے میں جہاں اپنا سگریٹ لائیٹر والا ریڈیو ٹرانسمیٹر چھپا کر رکھا ہوا تھا اسے نکال کر دیکھا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میرے بریف کیس میں کرنسی نوٹ بھی ویسے ہی رکھے ہوئے تھے۔ اب مجھے ان چیزوں کے بارے میں اتنا بے فکر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ میں ان خفیہ چیزوں کو جو مجھے پکڑوا سکتی تھیں یہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ چھپا دوں۔ سب سے پہلے تو میں نے کمرے کی خفیہ جگہ سے سگریٹ لائیٹر والا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال کر واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں ٹیلی فون میں لگایا ہوا مائیکرو فون نکالنے نیچے آگیا۔ نیچے بائی جی ابھی تک جھاڑ پوجھ میں مصروف تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"میرا فون کچھ خراب ہو گیا ہے۔ یہاں سے فون کر کے دیکھتا ہوں"

وہ مسکرانے لگی اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں نے یونہی ریسیور اٹھا کر فرضی نمبر گھمانے لگا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ بائی جی کمرے سے باہر جائے تو اپنا کام شروع کروں۔ فی الحال مجھے اس خفیہ مائیکرو فون کو لگانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگلے اہم ٹارگٹ کی خبر مسٹر پانڈے نے اپنی مجبوری کے تحت خود مجھے دے دی تھی۔ یہ مائیکرو فون میں بعد میں بھی فٹ کر سکتا تھا۔ بائی جی باہر جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔ فریج میں سے نہیں باہر نلکے کا تازہ پانی لانا"

"اچھا گورو جی"

وہ جھاڑن وہیں میز پر چھوڑ کر ساڑھی کا پلو کمر کے گرد باندھتی ہوئی ڈرائینگ روم سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے ٹیلی فون کے نچلے حصے کو کھول کر اندر چمٹا ہوا مائیکرو فون نکال کر جیب میں رکھا اور جلدی جلدی ٹیلی فون کو جوڑ کر میز پر رکھ دیا۔ بائی جی میرے لئے پانی لے کر آئی تو میں اپنا کام کر چکا تھا۔

پانی پی کر میں اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ بریف کیس میں جو کرنسی نوٹ پڑے تھے

ان کی مجھے اتنی فکر نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ یہ ساری رقم مجھے مینا کشی کے پاس رکھوا دینی چاہئے۔ اس کے پاس خواہ کتنی بھی رقم ہو گی کوئی شک نہیں کرے گا۔ میں پلنگ پر لیٹ کر انگریزی کا اخبار پڑھنے لگا۔ مگر ذہن بار بار دوار کا مشن کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں نے دوار کا کی جیٹی پر آنے والے اسلحہ کے جہاز کا نام دوار کا مشن رکھ لیا تھا۔ میں نے سومنات کا مندر بھی ابھی تک نہیں دیکھا تھا اور دوار کا شہر بھی کبھی نہیں گیا تھا۔ یہ دونوں جگہیں میرے لئے اجنبی تھیں۔ سومنات کے مندر کی طرف سے تو میں بے فکر تھا۔ مگر دوار کا کی بندر گاہ پر لگنے والے جہاز کو اڑانے کی ابھی تک کوئی ترکیب پوری طرح میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ کریم بھائی کے آدمی دوار کا میں بھی تھے۔ مگر وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ ہمیں جہاز کی آمد اور بندر گاہ پر لگنے کی اطلاع کر دیں۔ لیکن میں دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر مسٹر پانڈے کی اطلاع درست ہے اور کشمیری مسلمانوں پر آتش و آہن برسانے والا اسلحہ لے کر ایک جہاز اگلے ماہ کے پہلے ہفتے واقعی داور کا کے ساحل پر لگنے والا ہے تو چاہے مجھے اپنی جان دینی پڑ جائے میں اس جہاز کو تباہ کر کے چھوڑوں گا۔ یہ میرا جذباتی فیصلہ تھا۔ مگر ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ کسی بھی کمانڈو ایکشن میں اگر آپ کے جذبات' آپ کا جذبہ شامل نہیں ہے تو آپ اس اپریشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جذبہ بہت بڑی طاقت ہے۔ اور دل میں اسلام کا جذبہ ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پاک سے محبت کا جذبہ ہو۔ اپنے دین اسلام کا فرض پورا کرنے کا جذبہ ہو۔ صرف اللہ اور اللہ کے لئے عمل کرنے کا جذبہ ہو تو میں آپ کو سچ بتاتا ہوں کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مشن میں کامیاب ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں یہی وہ جذبہ مسلمان مجاہدوں کے سینوں میں موجزن تھا کہ اسلام دیکھتے دیکھتے ساری دنیا پر چھا گیا اور اسلامی لشکر نے قیصر و کسریٰ اور روم جیسی زبردست سلطنتوں کے پرخچے اڑا دیئے۔

میرے دل میں بھی پورا نہ سہی مگر تھوڑا بہت یہی جذبہ موجزن تھا۔ میں اسی جذبے کو لے کر اپنے طور پر مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار کافروں سے جنگ کرنے سرحد پار کر

کے ہندوستان میں داخل ہو گیا تھا۔ کیونکہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمہارے ہمسائے میں اگر مسلمانوں پر کفار ظلم و ستم کر رہے ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا اور جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ میرے سینے میں اللہ پاک کا یہ ارشاد تھا اور میرے سامنے کفار کے لشکر تھے۔ قدم قدم پر میری جان کو خطرہ تھا۔ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ میں گرفتار ہو سکتا تھا اور مجھ پر اذیت ناک تشدد کا سلسلہ شروع ہو سکتا تھا۔ میں ہندوستان میں اپنے کسی لالچ کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں یہاں انڈین فلمیں دیکھنے اور ناگ پوری سنترے اور ہری چھالیہ کھانے اور کوئی کاروبار کرنے یا سمگلنگ کرنے نہیں آیا تھا۔ میں تو صرف اس لئے آیا تھا کہ مظلوم کشمیریوں پر بھارتی فوج جو ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں اور اس کے خلاف جہاد میں شریک ہو جاؤں اور ہندوستان میں مقیم ان مسلمانوں کا دکھ درد بھی بانٹ سکوں جنہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دلی، لکھنؤ، آگرہ، جھانسی، گوالیار، بھوپال، بہار، جے پور، بریلی، میرٹھ، نگینہ، کان پور، احمد آباد اور نہ جانے کن کن شہروں میں مسلم لیگ کے جلسے جلوسوں میں پاکستان زندہ باد قائد اعظم زندہ باد لے کر رہیں گے پاکستان کے نعرے لگائے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح اپنے گھروں کو نذر آتش ہوتے اور اپنے بچوں کو شہید ہوتے دیکھا۔ لیکن جب پاکستان بن گیا تو پاکستان کو ہمارے حوالے کر کے انہوں نے اپنا آپ دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ اب ہندوؤں نے ہندوستان میں صدیوں سے مقیم مسلمانوں کو اپنا غلام، اپنا یرغمالی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ شاہ محدث دہلوی سے لے کر مولانا اشرف علی تھانوی تک اور امیر خسروؒ سے لے کر میر و غالب تک ان کے صدیوں پرانے انمول دینی، علمی و ادبی ورثے کو مسخ کر کے ہندو کی حکومت وہاں کے مسلمانوں پر چانکیہ برہمن ازم اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا ان پر مسلط کر رہی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کو پاکستان کے حق میں نعرے لگانے کی یہ سزا دی جا رہی ہے کہ ان کی آنے والی نسلوں کو شدھی کر کے انہیں ہندو بنایا جا رہا ہے۔ ہندو لیڈر صاف صاف اعلان کر رہے ہیں کہ ہندوستان میں اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں صرف اور صرف ہندو بن کر رہنا ہو گا۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے جو کچھ

خاندان پاکستان میں آ کر آباد ہو گئے ہیں ان کے آدھے سے زیادہ رشتے دار آج بھی ہندوستان میں ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں ہندوستان میں رہنے والے اور پاکستان سے محبت کرنے والے، تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر پاکستان کا ساتھ دینے والے ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں مقیم ان بہادر مسلمانوں کو سلام محبت پیش کرنا چاہتا تھا اور انہیں بتانا چاہتا تھا کہ مسلمان دنیا کے جس کونے میں بھی رہ رہا ہو وہ اسلام کے مقدس اور کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتے میں پرویا ہوا ہوتا ہے۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ پاکستان کے مسلمان ان کے دکھ درد سے آگاہ ہیں اور پاکستان کے مسلمانوں نے ان کی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا اور پاکستان کے مسلمان ان سے محبت کرتے ہیں۔ بس میں یہی مقاصد لے کر پاکستان میں آزادی، سکون اور پر مسرت زندگی چھوڑ کر ہندوستان میں آیا تھا۔ میں ہندوستان کے تمام شہروں میں رہنے والے اپنے تمام مسلمان بھائی بہنوں کے ساتھ مل کر ہندوؤں کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور ان کی آزادی، حق خود ارادی اور اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینا چاہتا تھا۔

یہی میرا کمانڈو مشن تھا

میں اخبار پرے پھینک کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل اس وقت اسلام، پاکستان اور اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی محبت میں شعلے کی طرح گرم ہو کر روشن ہو گیا تھا۔ میں اس گرمی اور روشنی کو اپنے جسم کے ذرے ذرے سے شعاعوں کی مانند پھوٹتے اور اپنے اردگرد روشنی اور گرمی کا ہالہ بناتے دیکھ رہا تھا۔ عین اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اللہ، اس کے رسولؐ پاک، اسلام اور پاکستان سے محبت کی جس روشنی نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا میں اس ہالے سے باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے مینا کشی بول رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"گورو جی معاف کر دیں۔ آپ آرام کر رہے تھے میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی"

میں نے انگلیوں سے اپنی آنکھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں دی تم نے۔"

کہنے لگی۔

"میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ بائی جی نے بتایا کہ بھوجن آپ نے مندر میں ہی کر لیا تھا۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ مندر میں مجھے دیر تک رہنا تھا اس لئے بھوجن مہنت جی کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھا"

میناکشی نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں اوپر آجاؤں؟ آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ آجاؤ"

مجھے خود میناکشی سے کام تھا۔ میں اپنی بریف کیس والی رقم اس کے پاس رکھوانا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں میناکشی اوپر آگئی۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور پشواز پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"آج مہاراج نے کتھک ڈانس کی ریہرسل کروائی تھی"

پھر وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگ رہی ہو وہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"گورو جی! مجھے ڈیڈی کی بڑی فکر لگ گئی ہے۔ وہ پہلے ہی شوگر کے مریض ہیں اوپر سے جو ٹرین کا حادثہ ہوا ہے وہ ان کی انکوائری شروع ہو گئی ہے اس کی وجہ سے وہ بے حد نڈھال نڈھال سے دکھائی دیتے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا کہ ابھی آگے آگے دیکھنا ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے اوپر سے بڑی ہمدردی کے ساتھ کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انہیں کہہ دو کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔"

میناکشی کہنے لگی۔

"صبح جب آپ کو مندر میں چھوڑ کر گھر واپس آئی تھی تو ڈیڈی آفس سے اچانک گھر آگئے۔ ان کے ساتھ نیشنل سیکورٹی کے کچھ لوگ بھی تھے۔ وہ دیر تک کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے دیکھا ڈیڈی کا رنگ پیلا ہو گیا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ نیشنل سیکورٹی کے آفیسر تھے"

میں نے میناکشی سے پوچھا۔

"وہ لوگ کیا کہنے آئے تھے؟"

وہ بولی۔

"ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ وہ یہی پوچھ رہے تھے کہ انہوں نے ملٹری ٹرین کی روانگی کے متعلق کس کس سے بات کی تھی۔ ڈیڈی نے انہیں کہا کہ میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں ایک ذمے دار ادارے کا ذمے دار افسر ہوں۔ میں کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جس سے ملک کی نیشنل سیکورٹی کے لئے خطرہ پیدا ہو۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"انہوں نے کچھ اور بھی پوچھا تھا تمہارے ڈیڈی سے؟"

میناکشی نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں گروجی! انہوں نے ڈیڈی سے پوچھا تھا کہ آپ کے بنگلے میں جو مہمان سوامی جی آکر ٹھہرے ہوئے ہیں ان کا آپ سے کیا سمبندھ ہے۔"

میں نے میناکشی کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"تمہارے ڈیڈی نے اس کے جواب میں کیا کہا؟"

"ڈیڈی نے کہا کہ وہ میرے گوروجی ہیں۔ بھگوان مہاویر جی کے بھگت ہیں۔ یہاں مہاویر جی کے بڑے مندر کی یاترا کو آئے ہوئے ہیں۔"

جس بات کا مجھے خدشہ تھا وہی بات شروع ہو گئی تھی۔ اب میرے لئے وہاں رہنا کسی بہت بڑے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ لیکن میں ابھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ صرف ایک ہی بات کا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا ہوا تھا۔ میرا یہ راز صرف میرا پاجامہ اتروانے سے طشت از بام ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں مسلمان تھا اور میرا ختنہ ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسی کمزوری تھی کہ جس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ میں اسے کسی صورت میں بھی نہیں چھپا سکتا تھا۔ میری یہ کمزوری میرے سارے کئے کرائے پر ایک سیکنڈ میں پانی پھیر سکتی تھی۔ اس کمزروی پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔

بہر حال میں نے ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔ میں نے میناکشی سے کہا۔

"میناکشی! اگر میری وجہ سے نیشنل سیکورٹی والے تمہارے ڈیڈی کو پریشان کر رہے ہیں تو میں آج سے یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ میرا کیا ہے۔ میں تو سادھو سنت ہوں۔ مہاویر جی کا بھگت ہوں۔ جتنے دن یہاں کی یاترا کرنی ہے میں سوامی جی کے مندر میں جا کر ڈیرا لگا لوں گا"

میناکشی ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بھگوان کے لئے ایسا نہ سوچیں گوروجی! ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ ڈیڈی نے ان لوگوں کو بالکل مطمئن کر دیا تھا اور وہ بھی اس معاملے میں بالکل مطمئن ہو کر یہاں سے گئے ہیں۔ بلکہ ڈیڈی نے بتایا تھا کہ ایک سیکورٹی آفیسر نے تو یہ بھی کہا تھا کہ سوامی جی بڑے بھلے آدمی ہیں۔ ہمیں ان پر کسی قسم کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم تو ویسے روٹین میں ان کے بارے میں پوچھ رہے

تھے"

میں سب جانتا تھا کہ اب میں نیشنل سیکورٹی اور احمد آباد کی سیکریٹ سروس والوں کی باقاعدہ نظر میں آگیا ہوں۔ اور اب میری کڑی نگرانی شروع ہو جائے گی بلکہ ہو گئی ہو گی۔ سیکورٹی آفیسر نے جان بوجھ کر میناکشی کے ڈیڈی مسٹر پانڈے سے یہ بات کہی تھی کہ ہمیں گوروجی پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے۔ تاکہ اگر یہ بات مجھ تک پہنچے تو میں اپنی طرف سے مطمئن ہو جاؤں۔ لیکن میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہی نہیں ایک ٹرینڈ سپاہی بھی تھا جس کو اس قسم کے اسرار و رموز پوری طرح سمجھا دیئے گئے تھے۔ میں نے میناکشی سے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں اور کچھ روز ٹھہر جاتا ہوں۔ میں تو تمہارے کہنے پر یہاں آگیا تھا ورنہ مجھے تو رینالینی دیوی اپنے ڈانس سنٹر سے نہیں آنے دے رہی تھی۔"

میناکشی نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں گوروجی! آپ کے تو سب داس ہیں۔ آپ تو جس گھر میں جائیں گے ان کی قسمت کھل جائے گی"

میں اٹھ کر الماری میں سے اپنا بریف کیس لے آیا۔ بریف کیس میں سے کرنسی نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میناکشی کے آگے کافی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کچھ روپے ہیں۔ انہیں اپنے پاس رکھ لو یہاں تمہارے گھر آنے سے پہلے ایک شردھالوں نے مجھے دیئے تھے۔ اس وقت سے بریف کیس میں ہی پڑے ہیں۔ میرے تو یہ کسی کام کے نہیں ہیں اگر تمہیں کبھی ضرورت پڑے تو ان میں سے خرچ کر لینا۔ نہیں تو ویسے ہی اپنے پاس رہنے دینا"

میناکشی بولی۔

"گوروجی! یہ آپ کی امانت میرے پاس اسی طرح پڑی رہے گی"

اس نے کرنسی نوٹوں کی پتلی پتلی تینوں گڈیاں اٹھا کر اپنی چنری کے پلو میں لپیٹ

لیں۔ میں نے اپنے دوار کا ٹارگٹ پر روانہ ہونے والے مشن کی پیش بندی کرتے ہوئے مینا کشی سے کہا۔

"دو چار دنوں تک ہو سکتا ہے مجھے درگا میا کی یاترا اور درشنوں کے لئے کلکتہ جانا پڑ جائے۔ لیکن میں وہاں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔"

مینا کشی نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"گوروجی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟ مجھے درگاہ ماتا کے درشنوں کا بڑا شوق ہے"

میں نے کہا۔

"نہیں مینا کشی مجھے درگاہ میا کے دربار میں اکیلے ہی حاضری دینی ہوگی۔"

پھر بڑے ڈرامائی انداز میں میں نے فکر مند ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ رات بھگوان شیوجی میرے سپنے میں آئے تھے۔"

"اچھا دھن بھاگ آپ کے۔ کیا کہہ رہے تھے بھگوان شوجی؟"

مینا کشی کا چہرہ فرط شوق سے کھل اٹھا میں نے کہا۔

"میں نے کل رات ان کی خاص پرارتھنا کی تھی اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں ان سے تمہارے ڈیڈی کی بپتا کا کوئی علاج پوچھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کل رات شوبھگوان نے میرے سپنے میں آکر مجھے حکم دیا کہ میں کلکتے درگا دیوی کے بڑے مندر میں جاکر ایک ہفتہ چلہ کروں۔ اس کے بعد پانڈے جی کے سارے کشٹ دور ہو جائیں گے۔"

مینا کشی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"گوروجی! آپ سچ مچ مہان ہیں۔ آپ بہت گریٹ ہیں۔ آپ شوبھگوان کے بھی اوتار ہیں آپ کی جے ہو۔ پلیز درگاہ میا کا چلہ کاٹنے کلکتے ضرور جائیں۔ مجھے یقین ہے آپ کے چلہ کاٹنے سے ڈیڈی کی ساری بپتا دور ہو

جائے گی۔"

رات کے کھانے پر مسٹر پانڈے کو جب میں نے بتایا کہ صرف اس کی خاطر درگا ماتا ے بڑے مندر میں پرارتھنا کرنے کلکتے جا رہا ہوں تو وہ میرے آگے بچھ گیا۔ مینا کشی بھی ں موجود تھی۔ میں نے دوار کا مشن کے لئے زمین ہموار کر لی تھی۔ اب اس کی راز ری کی ضرورت تھی۔ میں خفیہ سروس والوں کو غلط راستے میں ڈالنا چاہتا تا۔ چنانچہ میں نے مسٹر پانڈے اور مینا کشی دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شوجی بھگوان نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ میں اپنی اس یاترا کو لوگوں سے پوشیدہ رکھوں اس لئے میں تم دونوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ میرے درگاہ ماتا کی یاترا پر کلکتے جانے کے بار،ے میں کسی سے ذکر نہ کیا جائے۔ اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے یہ بات ظاہر کر دی تو نہ صرف میری یاترا ناکام ہو جائے گی بلکہ گوکل داس تمہارا کام بھی نہیں ہو گا"

دونوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے کلکتے جانے کے رے میں کسی کو نہ بتائیں گے۔ مسٹر پانڈے کہنے لگا۔

"گورودیو! مجھے کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی کیسے چلا سکتا ہوں"

میں نے خفیہ پولیس کو غلط راہ پر ڈالنے کے لئے اسے کہا۔

"ہاں اگر کوئی پوچھے کہ گوروجی بنگلے میں نظر نہیں آتے۔ کیا کہیں چلے گئے ہیں تو اسے یہی کہنا کہ گوروجی نندی کنڈ کے مندر کی یاترا کرنے بیکانیر گئے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ نیشنل سیکورٹی والے کسی نہ کسی کو بھیج کر مسٹر پانڈے سے میرے رے میں ضرور معلوم کریں گے کہ میں اچانک کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ کیونکہ ایک بات ی تصدیق ہو گئی تھی کہ احمد آباد کی سیکرٹ پولیس کو مجھ پر شک پڑ چکا ہے اور اس نے یری نگرانی سخت کر دی ہے۔ مسٹر پانڈے نے کہا۔

"گورو جی! آپ جس طرح کہیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

اس وقت بھی سگریٹ لائیٹر والا ریڈیو ٹرانسمیٹر میری واسکٹ کی جیب میں تھا۔ گویا اپنے غیر ملکی جاسوس ہونے کا بہت بڑا ثبوت میں وہاں اپنی جیب میں لئے بیٹھا تھا۔

رات بستر پر لیٹا میں ہوائی مخلوق چندریکا کا یونہی انتظار کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میں ایک نئے مشن کی تیاریاں کر رہا ہوں ہو سکتا ہے وہ مجھ سے ملنے آجائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ جب سے میں نے انڈین فوج کی ایمونیشن کی ٹرین اڑائی تھی تب سے چندریکا غیر حاضر تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آئی تھی۔ مجھے اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں تو ویسے بھی اسے ایک ہندو عورت کی بدروح ہی سمجھتا تھا۔ وہ چاہے مجھے لاکھ اپنے پہلے جنم کا پتی جا خاوند سمجھے۔ اس نے مجھے دو ایک زبردست فائدے ضرور پہنچائے تھے اور اس کے لئے میں چندریکا کا شکر گزار تھا۔ اس کے میرے پاس نہ آنے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میں نے ایمونیشن کی گاڑی اڑا کر اس کی جنم بھومی پر حکومت کرنے والی ہندو حکومت کے مفادات کو اور اس کی فوج کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ جس کے متعلق چندریکا کھلے لفظوں میں واضح کر چکی تھی کہ بھارت کے خلاف میرے کسی بھی مشن کو سخت ناپسند کرتی ہے مجھے اس کی پسند ناپسند کی ظاہر ہے کوئی پروا نہیں تھی۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ یہ بدروح مجھے اپنا خاوند سمجھ بیٹھی تھی اور اگلے جنم میں مجھ سے ہمیشہ کے ملاپ کی توقع رکھتی تھی۔

ایک دن بعد میری ماسٹر سپائی کریم بھائی سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ مرچنٹ نیوی کا ایک بہت بڑا مال بردار جہاز بھارت کے لئے اسلحہ لے کر آرہا ہے اور نہر سویز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس جہاز پر کافی تعداد میں توپیں، توپوں کے سپئیر پارٹس اور کوبرا ہیلی کاپٹر لدے ہوئے ہیں۔ میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"ہمیں اپنے مشن پر روانہ ہو جانا چاہئیے"

وہ بولا۔

"تم کل صبح سومنات کے مندر کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں دوارکا جب تا

ہوں۔ تازہ اطلاع کے مطابق جہاز تین چار یا زیادہ سے زیادہ پانچویں دن دوارکا کی بندرگاہ میں داخل ہو جائے گا۔ کیونکہ بڑے مال بردار جہاز کی رفتار اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ میں تمہیں سومنات کے بڑے مندر میں ہی ملوں گا۔ تم میری تلاش میں ادھر ادھر نہ پھرنا۔ میں خود تمہیں تلاش کر لوں گا۔ سومنات کا مندر میں نے تمہارے لئے اس واسطے منتخب کیا ہے کہ ایک تو یہ تاریخی مندر دوارکا کی بندگاہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دوسرے وہاں تم ایک سادھو کے بھیس میں زیادہ محفوظ ہو گے۔ میں دوارکا میں جہاز لگنے کے بعد سارے حالات معلوم کر کے تم سے آن ملوں گا اور اس کے بعد ہی جہاز کو تباہ کرنے کی کوئی سکیم تیار کی جا سکے گی"

ہماری ملاقات ایک خفیہ جگہ پر ہوئی تھی۔ جب شام ہو گئی تو ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بنگلے پر آنے کے بعد میں نے میناکشی اور اس کے باپ کو بتا دیا کہ میں کل درگا ماتا کی یاترا کو کلکتے جا رہا ہوں۔ دونوں بڑے خوش ہوئے۔ میناکشی کا ڈیڈی تو بہت ہی خوش تھا۔ وہ میری کراماتیں دیکھ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے خلاف اندرا گاندھی کے سیکرٹریٹ میں جو اعلیٰ سطح کی خفیہ انکوائری شروع ہو چکی ہے وہ میری اس یاترا سے ختم ہو جائے گی۔ رات کو میں نے میناکشی سے کہا۔

"مجھے درگاہ ماتا کے بھگت کے روپ میں اس کی یاترا کو جانا ہو گا۔ تم ایسا کرو کہ میرے لئے گیروے رنگ کی ایک چادر اور کالے منکوں والی دو تین مالائیں بازار سے خرید کر لے آؤ۔ درگا ماتا کو کالے رنگ کی مالا بہت پسند ہے۔ اور کسی کو ہرگز نہ بتانا کہ تم یہ چیزیں میرے لئے خرید رہی ہو"

میناکشی نے کہا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں گوروجی! میں ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتی"

وہ گاڑی لے کر بازار کی طرف چل دی۔ احمد آباد کا لا بازار ہمارے لاہور کی انارکلی اور کراچی کی کلفٹن سٹریٹ کی طرح ہے۔ وہاں ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں اور گیروے

رنگ کا کپڑا تو تھانوں کے حساب سے پڑا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ کلر ہندو سادھو سنتوں اور دروانوں کا مذہبی کلر ہے۔ میناکشی کی عدم موجودگی میں' میں نے سگریٹ لائیٹر والے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو خفیہ جگہ پر چھپا دیا۔ یہ خفیہ جگہ اب میں آپ کو بھی بتائے دیتا ہوں۔ میناکشی کے کمرے میں آدمی کا وزن کرنے والی چھوٹی سی مشین پڑی رہتی تھی۔ میں نے وہ اپنے کمرے میں منگوا کر رکھ لی تھی۔ میں اس کے اندر ریڈیو ٹرانسمیٹر چھپا دیا کرتا تھا۔ یہ میرے حساب سے اس بنگلے میں سب سے محفوظ جگہ تھی۔ سومنات روانہ ہونے سے پہلے بھی میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر وزن کرنے والی مشین کو نیچے سے کھول کر اس کے اندر چھپا کر رکھ دیا۔ میرے پیچھے اگر کوئی گھر کی تلاشی بھی لیتا تو وزن کرنے والی مشین کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا سکتا تھا۔

میرے سر کے بال بڑھ کر گردن تک آگئے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بھی بڑھ گئی تھی۔ مگر اتنی زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ بس اس نے میرا آدھا چہرہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح ڈھانپ دیا تھا۔ مونچھیں میں تھوڑی تھوڑی کتروا دیا کرتا تھا۔ گیروے رنگ کا کھدر کا کپڑا میں نے لفافے میں ڈال کر رکھ لیا۔ میناکشی سے میں نے اپنے پیسوں میں سے دو ہزار روپے کی رقم لے کر پاس رکھ لی۔ یہ رقم میں نے ایک رومال میں ڈال کر اپنی کمر کے گرد باندھ لی تھی۔ اس کی مجھے کہیں بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اب صرف بنگلے کے باہر بیٹھی ہوئی خفیہ پولیس کی نگاہوں سے بچ کر نکلنے کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کا میرے پاس ایک ہی حل تھا کہ میں میناکشی کی گاڑی میں بیٹھ کر سٹیشن پر یا بس سٹینڈ پر جانے کی بجائے سوامی جی کے مندر چلا جاؤں اور میں نے یہی کیا۔

صبح صبح میں اور میناکشی بنگلے سے نکل گئے۔ میں سفید کھدر پاجامے اور واسکٹ میں تھا۔ سادھو کا بھیس میں نارائن جی کے مندر میں جا کر بدلنا چاہتا تھا۔ میناکشی کو میں نے بتا دیا تھا کہ پہلے سوامی نارائن جی کے مندر میں بھگوان مہاویر کے درشن کروں گا۔ وہاں سے گیروے کپڑے پہن کر کلکتے درگاہ ماتا کی یاترا کو نکل جاؤں گا۔ اگرچہ ہم منہ اندھیرے بنگلے سے نکلے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ خفیہ پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی میرے تعاقب میں

ضرور نکل پڑا ہو گا۔

میناکشی مجھے مندر میں چھوڑ کر چلی گئی۔

میں نے وقت ضائع کئے بغیر مندر کے کے ایک غسل خانے میں جا کر اپنے کپڑے اتار کر لفافے میں ڈالے اور گیروے کلر کی بڑی چادر کو دھوتی کی طرح باندھ کر اس کا باقی حصہ جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ گلے میں کالے منکوں والی مالائیں ڈال لیں۔ ماتھے پر کالی ماتا کا سرخ تلک لگایا کلائی میں منگل سوتر پہلے ہی سے بندھا ہوا تھا۔ جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو پورا سادھو بنا ہوا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ خفیہ پولیس کا وہ آدمی جو میرے پیچھے پیچھے مندر میں آیا ہے ضرور مندر کے عقبی گیٹ پر ہو گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خفیہ پولیس کے دو آدمی ہوں۔ ایک مندر کے بڑے گیٹ پر اور دوسرا مندر کے عقبی گیٹ پر موجود ہو۔ یہاں سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکلنا بڑا ضروری تھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو میرے سومنات جانے کی خبر ہو۔

میں مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

میں مندر کے بڑے کمرے میں ایک ستون کے پاس بیٹھا مالا کا جاپ کر رہا تھا کہ جوگی سادھوؤں کا ایک جلوس کھڑتالیں بجاتا بھجن گاتا مندر کے ہال کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں آکر انہوں نے مہاویر کی بڑی مورتی کے آگے آرتی اتاری اور مہاویر کی بھگتی کے بھجن گانے شروع کر دیئے۔ کوئی ایک گھنٹہ تک یہ سادھو سنت یہی کچھ کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ رقص کرتے گاتے بجاتے کمرے سے باہر چلے تو میں بھی ان کے جلوس میں شامل ہو گیا۔ یہ جلوس مندر کے صحن میں بنی ہوئی دوسرے اوتاروں کی مورتیوں کے آگے رک کر بھجن گاتے اور آگے چل پڑتے۔ آدھا گھنٹہ انہوں نے وہاں لگا دیا۔ اس کے بعد یہ جلوس مندر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی ان کے درمیان دھمال ڈالتا سر جھکائے رقص کرتا بھجن گاتا ان کے ساتھ ہی مندر سے نکل گیا۔

سادھو سنتوں کا یہ جلوس دو تین بازاروں میں سے گزرتا ہوا جب ایک گلی کے قریب پہنچا تو میں بڑے آرام سے جلوس میں سے نکل کر گلی میں داخل ہو گیا۔ اس گلی میں

سے نکل کر دوسرے بازار میں پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے ایک موٹر رکشا لیا اور لاریوں کے اڈے پر آگیا یہاں سے دوارکا اور سومنات کے مندر کی یاترا کے لئے لاریاں بسیں چلتی تھیں۔ اس وقت تک دن کافی نکل آیا تھا۔ آسمان پر ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایک لاری اس وقت بالکل تیار تھی۔ یہ سومنات کے آدھے راستے تک کسی قصبے کو جاتی تھی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ سڑک چھوٹی تھی۔ کہیں ریت آجاتی۔ کہیں دلدلی سا علاقہ شروع ہو جاتا۔ کہیں بھورے رنگ کے ٹیلے شروع ہو جاتے۔ جہاں پہنچ کر اس لاری نے واپس احمد آباد لوٹنا تھا وہاں سے میں نے سومنات جانے والی بس پکڑ لی۔ اس طرح دو جگہوں سے لاریاں بدلنے کے بعد میں دوپہر کے وقت سومنات پہنچ گیا۔

سومنات کا نام آپ نے بھی ضرور سنا ہو گا۔ یہ تاریخی مندر جزیرہ نمائے گجرات کاٹھیاواڑ کے جنوب مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس مندر میں دیوتا سومنات کا ایک بہت بڑا بت ہے۔ مسلمان فاتح سلطان محمود غزنوی نے گیارہویں صدی عیسوی میں اس مندر کے سارے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ سومنات کے بڑے مندر کو اسلامی یلغار سے بچانے کے لئے ہندوستان کے تمام ہندو راجہ اپنی اپنی فوجیں لے کر وہاں پہنچ گئے تھے مگر بت شکن محمود غزنوی کی مختصر سی فوج نے نعرہ تکبیر بلند کر کے ہندوؤں کی بہت بڑی فوج پر حملہ کر دیا اور اسے شکست فاش دی اور سومنات کے مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب محمود غزنوی خود گرز ہاتھ میں لے کر سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کے لئے آگے بڑھا تو مندر کے مہنت اور برہمن اس کے قدموں میں گر پڑے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ ہم سے اس بت کے برابر سونا تول کر لے لیجئے۔ مگر ہمارے بت کو نہ توڑیں۔ یہ ہمارا دیوتا ہے۔ تب محمود غزنوی نے ایک تاریخی جملہ کہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بت فروش نہیں

"بلکہ بت شکن کہلوانا چاہتا ہوں"

اور اس نے گرز کی ایک ہی ضرب کاری سے سومنات کے بت کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ بت شکن محمود غزنوی کی اس ضرب کاری نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے

لئے راستہ کھول دیا تھا۔

سومنات کا مندر ایک قلعہ نما چار دیواری کے اندر تھا۔ مندر کیا تھا مندروں کا ایک بہت بڑا کمپلیکس تھا۔ چھوٹے چھوٹے کئی مندر بہت بڑے احاطے کے اندر پھیلے ہوئے تھے جن کے سنہری کلس دن کی ابر آلود روشنی میں بھی چمک رہے تھے۔ ان کے درمیان سب سے بڑا مندر تھا جس میں سومنات کا بہت بڑا بت رکھا ہوا تھا۔ یہاں ہندوستان کے کونے کونے سے یاترا کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ چھوٹے بڑے مندروں سے دن رات بھجن کرتن کرنے کی آواز آتی رہتی تھیں۔ مندر کے احاطے میں گھنے درختوں کے نیچے جٹا دھاری سادھو سادھی لگائے آسن جمائے ہر وقت بیٹھے نظر آتے تھے۔ ہندو عورتیں اور مرد مٹھائیوں اور پھلوں اور پھولوں کے دونے لا کر ان کے چرنوں میں رکھتے تھے۔ مندر کی ایک جانب قیمتی پتھروں کی روش والا ایک شاندار بڑا تالاب تھا جس میں عورتیں مرد اکٹھے اشنان کرتے۔ صرف اتنا کیا گیا تھا کہ ہندو عورتوں کے لئے نہانے کی تھوڑا الگ جگہ بنا دی گئی تھی لیکن من چلے تیرتے ہوئے اشنان کرتی عریاں ہندو عورتوں کے قریب آجاتے۔ ہندو عورتیں انہیں کچھ نہ کہتی تھیں بلکہ اشنان کرنے اور منہ ہی منہ میں اشلوک پڑھنے میں مشغول رہتی تھیں وہاں سومنات کے مندر میں میں نے یہ بھی سنا کہ ہندو عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر سومنات جی کے پوتر تالاب میں اشنان کرتے ہوئے کوئی مرد اگر کسی ہندو عورت کے عریاں بدن کو اوپر سے نیچے تک بری نظروں سے دیکھ لے تو مرد کو گناہ ملتا ہے لیکن عورت کے سارے پاپ جنم جنم کے لئے جھڑ جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں جب میں ایک ہندو سادھو اور سومنات جی کے بھگت کے روپ میں مندر میں داخل ہوا۔

میں نے دوسرے یاتریوں کی طرح جاتے ہی پوتر تالاب میں اشنان کیا۔ کمرے کے ساتھ رومال میں بندھے ہوئے نوٹ میں نے بڑی احتیاط سے اپنے سامنے کنارے پر رکھ لئے تھے۔ اشنان کرتے کے بعد سنت جی سے ماتھے پر تلک لگوایا اور ان کی خدمت میں سو روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہاں پانچ دس روپے سے زیادہ

کوئی بھی اسے نذرانہ نہیں دیتا تھا۔ اسے سو روپے دینے کا میرا مقصد تھا۔ میں نے پہلے سے معلوم کرلیا تھا کہ سومنات کے مندر میں باہر سے آنے والے یاتریوں کے لئے رہائش کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ بس ایک طرف لمبے لمبے برآمدے بنے ہوئے ہیں۔ وہیں یاتری رات کو بال بچوں کے ساتھ سو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مہنت یا سنت کی سیوا کردی جائے تو رہنے کو ایک کمرہ بھی مل جاتا ہے۔ جس سنت کو میں نے سو روپے کا نذرانہ دیا تھا اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر پیٹ موٹا تھا اور گردن بھینسے کی طرح ہو رہی تھی اور وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا لگتا تھا۔

میں تلک لگوانے کے بعد اس کے پاس بیٹھ گیا اور کہا۔

"ہم درگا ماتا کے بھگت ہیں شو پوری سے یاترا کرنے آئے ہیں۔ ہمیں ایک الگ جگہ چاہئے کیونکہ ہمیں رات کو بھگوان شوا کی نام کا جاپ کرنا ہوتا ہے"

اور میں نے چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر سو روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر سنت جی کے پاس رکھ دیا۔ اس نے جلدی سے نوٹ اٹھا کر اپنی صدری کی جیب میں ڈالا۔ اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ میرے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"آپ بھگوان جی کے درشن کر کے آجائیں۔ میں آپ کو بڑی اچھی جگہ لے چلوں گا"

میں سومنات کے بڑے بت والے مندر میں آگیا۔

سومنات کے بڑے بت پر سونے کا پترا چڑھا تھا یا سارے کا سارا سونے کا تھا۔ ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے قدموں کے پاس ایک بڑا موٹا تازہ مہنت بیٹھا پجاریوں سے دکھشا کے روپے وصول کر کر کے ایک طرف زمین کے نیچے بنے ہوئے کسی صندوق میں ڈالے جا رہا تھا۔ اس کے پاس پھلوں پھولوں اور مٹھائی کے دونوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد مندر کے کارکن پجاری لڑکے اور لڑکیاں بڑی بڑی ٹوکریوں میں بھر کر لے جاتی تھیں۔ تمام لڑکے نو عمر تھے۔ تمام لڑکیاں نوجوان

تھیں۔ یہ سومنات دیوتا کی سیوا اور بلکہ دیوداسیاں تھیں۔ ان لڑکیوں میں سے کوئی بھی معمولی شکل و صورت کی دبلی پتلی نہیں تھی۔ سبھی صحت مند اور بھرے بھرے بدن کی تھیں۔ کھلے بالوں میں پھولوں کے گجرے بندھے ہوئے تھے۔ ماتھوں پر سرخ تلک لگے تھے۔ گلے میں سرخ موتیوں کی مالائیں تھیں۔ کلائیوں کے ساتھ بھی سفید پھولوں کے گجرے بندھے تھے۔ آنکھوں میں کاجل لگے تھے خوبصورت چہروں پر پسینے کی ہلکی ہلکی تہہ شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

یہ مندر ایسا تھا کہ یہاں ملک کے کونے کونے سے بڑے بڑے سادھو سنت بھی آکر ماتھا ٹیکتے تھے اور دکھشا پیش کرتے تھے۔ میں نے بھی وہیں سے خریدی ہوئی مٹھائی کی ایک ٹوکری اور سو روپے کی دکھشا پیش کی۔ مگر میں نے ماتھا نہ ٹیکا۔ تھوڑی دیر مندر کے لمبے لمبے کمروں اور برآمدوں میں مالا ہاتھ میں لئے پھرتا رہا۔ میں منہ ہی منہ میں ایسے بڑبڑاتا جاتا تھا جیسے اشلوک کا جاپ کر رہا ہوں لیکن حقیقت میں میں اس زمانے کے ایک مشہور فلمی گانے کے بول دہرا رہا تھا۔

کوئی گھنٹے دو گھنٹے کے بعد میں تلک لگانے والے سنت کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی گدی پر کسی دوسرے آدمی کو بٹھایا اور مجھے ساتھ لے کر مندر کے جنوبی حصے کی طرف چل پڑا۔ یہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ایک پرانا تاریخی تالاب تھا جس میں اتر کر اشنان کرنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ذرا فاصلے پر ایک کنواں تھا۔ دو دیوداسیاں اور وہ دو سیوا دار لڑکے کنوئیں میں ڈول کھینچ کھینچ کر پانی نکال کر قریب رکھے کانسی کے مٹکوں میں بھر رہے تھے۔ اس تالاب کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو زمین سے ذرا اونچے چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں کی تھیں مگر چھت گھاس پھونس کی ڈھلواں تھی۔ آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ سنت کوٹھڑی کا تالا کھول کر مجھے اندر لے آیا۔ اس نے دیوار پر لگا بٹن دبا کر بتی جلا دی۔ کہنے لگا۔

"مہاراج اس سے اچھی جگہ سومنات جی کے مندر میں آپ کو اور کوئی نہیں لے کر دے سکتا۔ آپ اگر گانجے کا شوق کرتے ہیں تو وہ بھی آپ کو

یہاں پہنچ جائے گا۔"

پھر میری طرف دیکھ کر ہلکی سی آنکھ مار کر بولا۔

"اور اگر آپ تھوڑے سے پیسے خرچ کر لیں گے تو میں آپ کو احمد آباد سے منگوائی ہوئی ولائتی دارو کی بوتل بھی کہیں نہ کہیں لادوں گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں سنت جی! میں دارو گانجا نہیں پیتا۔ مجھے تو ایشور نام کی خماری چاہئے۔"

وہ کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔ پھر میرے ساتھ کوٹھڑی سے باہر آگیا اور چابی مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"مہاراج! دوسروں سے تو ہم اس کا روزانہ کرایہ پچیس روپے لیتے ہیں لیکن آپ سے بیس روپے لے لیا کریں گے اگر آپ روز کا پچاس روپے کرایہ دے دیا کریں تو آپ کو دو وقت کا کھانا اور صبح کا ناشتہ بھی مل جایا کرے گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ میں نے اس کے کندھے کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بچہ! ہم اونچی برہمن جاتی کے سادھو سنت ہیں۔ اچھی جگہ رہتے ہیں۔ اچھا بھوجن کرتے ہیں۔"

میں نے چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر تین سو کے نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"ابھی یہ رکھو۔ باقی جتنے دن ہم یہاں رہیں گے ساتھ ساتھ کرایہ ادا کرتے جائیں گے اور جاتے ہوئے تمہارا انعام بھی تمہیں ضرور دیں گے۔"

وہ بار بار ہاتھ جوڑنے لگا۔

"مہاراج! ہم بھی آپ ایسے مہاپرشوں کے سہارے یہاں زندہ ہیں۔ آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لئے چائے پانی اور نیا بستر ابھی بھجوائے دیتا ہوں۔"

کوٹھڑی میں ایک چارپائی دو لکڑی کی پرانی کرسیاں تھیں۔ چھت پر پنکھا لگا تھا۔ کھڑکی
پیچھے پرانے تالاب اور کنوئیں کی طرف کھلتی تھی۔ برآمدے کے کونے میں غسل خانہ تھا۔
رے لئے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ مجھے یہاں کونسا زیادہ دن ٹھہرنا تھا۔ اپنے ماسٹر سپائی
ریم بھائی کا ہی انتظار کرنا تھا جس نے کہا تھا کہ میں دوار کا میں صورت حال پورا جائزہ
نے کے بعد دو چار دنوں میں سومنات کے مندر میں پہنچ جاؤں گا۔ رہائش ناشتے اور کھانے
نے کی طرف سے میں بے نیاز ہو گیا تھا۔ میں دن کے وقت اپنی کوٹھڑی میں آرام کرتا۔
م کو مندر میں آجاتا۔ یہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ بھجن کیرتن ہو رہا ہوتا۔ سومنات کے
ے مندر میں رات کے وقت دیوداسیوں کا رقص شروع ہو جاتا۔ دیو داس لڑکے بھی
، رقص میں شریک ہو جاتے۔ ہر طرف اگربتیوں اور لوبان کی خوشبوئیں اڑ رہی
ئیں۔ دیو داسیوں کے چہروں پر رقص کرتے ہوئے پسینے کے قطرے بجلی کی روشنی میں
تیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ بڑے مہنت جی استھان پر اپنے ہٹے کٹے پجاریوں کے
میان بڑے مزے سے بیٹھے دیوداسیوں کے رقص سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے۔
ں وقت مزے میں آکر جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگاتے اور دیو داسیوں پر تھال میں سے
ندے کے پھول لے کر نچھاور کرتے۔ دیوداسیاں ان پھولوں کو بڑا متبرک سمجھ کر جلدی
، اٹھا کر اپنی چولیوں میں چھپا لیتیں۔ بعد میں مجھے میری کوٹھڑی والے سنت نے بتایا کہ
ت کو جب رقص ختم ہو جاتا ہے تو بڑے مہنت تمام دیوداسیوں کو اپنے خاص کمرے
بلا کر ایک ایک کر کے سب کی چولیوں کی تلاشی لیتے ہیں۔ جس دیوداسی کی چولی میں
ندے کے پھول زیادہ ہوتے ہیں وہ اس کو رات بھر کے لئے اپنی بیوی بنا کر کمرے میں
لیتے ہیں۔ سنت نے یہ بھی بتایا تھا کہ بڑے مہنت جی کے کمرے میں ائیر کنڈیشنر لگا ہوا
ریشمی بستر ہے۔ الماری میں ولائیتی شراب کی بوتلیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔

اس آدمی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بڑے مہنت کو شہر کا سب سے معزز آدمی اور
نت دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اونچی سوسائٹی میں بڑا آنا جانا ہے۔ لوگ اپنے
ے میں ان کا آنا بڑا متبرک اور شبھ سمجھتے ہیں۔ مہنت جی کو اگر کسی اونچے گھرانے کی

کوئی خوبصورت لڑکی پسند آجائے تو وہ اسے یہ کہہ کر اپنے مندر میں بلا لیتے ہیں کہ دیوتا سومناتھ نے اس لڑکی کو اپنی بیوی چن لیا ہے اس کو دیوداسی بنا دیں۔ لڑکی کے ماں باپ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے اور لڑکی دلہن بنا کر بارات کی شکل میں مندر میں لاتے ہیں اور منہت جی کے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں۔ کئی پڑھی لکھی لڑکیاں یہ سنتے ہی گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ مگر اب انہیں ایسا نہیں کرنے دیا جاتا۔ ان کے ماں باپ یہ خوش خبری سنتے ہی کہ دیوتا سومناتھ نے ان کی بیٹی کو اپنی پتنی بنا لیا ہے لڑکی کو کمرے میں بند کر کے باہر پہرہ بٹھا دیتے ہیں۔ اب کبھی کبھی کوئی لڑکی خودکشی بھی کر لیتی ہے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

"یہ ساری دیوداسیاں سومناتھ دیوتا کی بیویاں ہیں۔ اور دیوتا کی طرف سے خاوند کے فرائض منہت جی ادا کرتے ہیں یہ لڑکیاں ساری جوانی مندر میں داشتہ بن کر گزار دیتی ہیں۔ جب بوڑھی ہو جاتی ہیں تو منہت جی کے حکم سے انہیں شہر سے باہر ایک آشرم میں بھیج دیا جاتا ہے۔"

میرے لئے یہ کوئی انوکھی اور حیرت انگیز باتیں نہیں تھیں۔ میں نے ہندو دیومالا اور ان کے مذہب کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ ان کے مذہب میں اس قسم کی خرافات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مجھے سومناتھ کے مندر میں آئے تیسرا دن تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے ماسٹر سپائی کریم بھائی کو دو دن کے بعد مندر میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میں تیسرے دن رات کے وقت دیوتا سومناتھ کے بڑے بت والے کمرے میں بیٹھا پہلے بھجن منڈلیوں کے بھجن کیرتن اور پھر دیوداسیوں کے رقص دیکھتا رہا۔ دراصل مجھے کام تو کوئی نہیں تھا۔ صرف اپنے ماسٹر سپائی کریم بھائی کا انتظار ہی کرتا تھا۔ بڑا منہت بڑی شان سے اپنے اطلس و کم خواب والے استھان پر بیٹھا دیوداسیوں کو رقص کرتے دیکھ رہا تھا۔ اور خوش ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ پاس کے چاندی کے طشت میں سے گیندے کے پھول اٹھا کر ان کی طرف پھینک دیتا۔ دیوداسیاں رقص بھول کر جلدی جلدی گیندے کے پھول اٹھا کر اپنی چولیوں میں ٹھونسنے لگ جاتیں۔ اتنے میں ایک ہٹے کٹے پجاری اور منہت کے باڈی گارڈ

قریب آکر اس کے کان میں کچھ کہا۔ منہت نے خوش ہو کر سر ہلایا۔ پھر اٹھ کر بت
آگے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں بھی اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں آگیا۔ اس وقت باہر ہلکی ہلکی بوندا
ی شروع ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنی کوٹھڑی
آکر بتی بھی نہ جلائی اور ویسے ہی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کی دیوی
آہستہ آہستہ تھپکیاں دے کر سلانے لگی۔ چھت والا پنکھا بند تھا۔ دروازہ آدھا کھلا
باہر سے بارش میں بھیگی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکے آرہے تھے۔ میری
ٹھڑی جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں سومنات مندر کے بہت بڑے احاطے کے دور
نے میں تھی۔ یہ جگہ دن کے وقت بھی خالی خالی سی رہتی تھی۔ کبھی کبھی کنوئیں سے
بھرنے مندر کی نوکرانیاں وغیرہ آجاتی تھیں۔ اس وقت رات آدھی گذر چکی تھی اور
ی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف مندر میں سے بھجن کیرتن کی دبی دبی آوازیں سنائی
رہی تھیں۔ میں ابھی پوری طرح سویا نہیں تھا کہ مجھے ان آوازوں میں ایک نئی آواز
ی دی۔ ایسے لگا جیسے کوئی دوڑتے ہوئے آکر اچانک رک گیا ہے۔ پھر برآمدے میں کسی
قدموں کی تیز تیز چاپ سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے
برآمدہ نظر آرہا تھا۔ مجھے برآمدے میں ایک انسانی سایہ نظر پڑا جو ایک پل کے لئے
مدے میں آکر رکا اور پھر تیزی سے میری کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون ہے؟"

میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"بھگوان کے لئے مجھے کہیں چھپا لو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں تمہیں بہت روپے دوں گی اس وقت مجھے ان سے بچا لو"

یہ کسی لڑکی کی آواز تھی جس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔ مجھے اس کا
نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک سایہ اپنی چارپائی کی پائنتی کی طرف کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔
انے پوچھا۔

"تم کون ہو۔ اور کون تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟"

لڑکی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولی۔

بھگوان کے لئے مجھے اس وقت کہیں چھپا لو۔ میں تم کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ نہ جانے بے چاری کس مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ کسی کے ظلم سے بھاگ کر آئی ہے۔ اس وقت تو اس کو چھپا دیتا ہوں۔ بعد میں معلوم کر لوں گا کہ یہ کون ہے اور اس پر کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ میں نے کہا۔

"میری چارپائی کے نیچے چھپ جاؤ"

وہ جلدی سے میری چارپائی کے نیچے گھس گئی۔ میری چارپائی پر جو پھلکاری نما چادر بچھی ہوئی تھی اس کے پلو دونوں طرف سے کوٹھڑی کے فرش کو چھو رہے تھے۔ میں نے چارپائی سے اٹھ کر بتی روشن کر دی۔ اب میری کوٹھڑی بالکل خالی لگتی تھی۔ میں برآمدے میں آکر سادھوؤں کی طرح آسن جما کر بیٹھ گیا۔ مگر میری آنکھیں کھلی تھیں اور میں دائیں بائیں کنکھیوں سے برابر دیکھ رہا تھا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی مگر زیادہ تیز نہیں تھی۔ اتنے میں بڑے مندر کی طرف سے دو آدمی دوڑتے ہوئے آتے نظر آئے۔ وہ میرے برآمدے کے باہر رک گئے۔ یہ مندر کے ہٹے کٹے پجاری تھے۔ ایک نے قریب آکر پوچھا۔

"سادھو مہاراج ادھر کوئی لڑکی تو نہیں آئی؟"

میں نے کہا۔

"نہیں بابا لوگ ہم نے تو کسی عورت کو ادھر آتے نہیں دیکھا"

انہوں نے میری کوٹھڑی میں غور سے دیکھا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ چارپائی بھی خالی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات کی اور دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں ہری اوم تت ست ہری اوم تت ست کا جاپ کرتا اٹھا۔ کچھ دیر یونہی برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ پھر کوٹھڑی میں داخل ہو کر دروازہ بند

کر کے چٹخنی لگا دی۔ میں نے لڑکی کو آواز دے کر کہا۔

"باہر آجاؤ۔ وہ لوگ چلے گئے ہیں"

لڑکی چارپائی کے نیچے سے نکل آئی۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی نما ساڑھی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چولی بھی غائب تھی۔ وہ چارپائی کے کونے میں بیٹھ گئی اور ساڑھی سے اپنے نیم عریاں بدن کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

شاید میں نے اس سے زیادہ خوبصورت عورت آج تک نہیں دیکھی تھی۔

بت شکن شہید کی نوارانی قبر

اس لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ جسم دبلا تھا مگر جسم کی ساخت انتہائی حسین تھی۔ رنگ ہلکا سانولا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"بھگوان کے لئے بتی بجھا دیں مہاراج"

اس نے روشنی میں میرا سادھوؤں والا حلیہ دیکھ کر مجھے مہاراج کہا تھا۔ میں نے بتی بجھا دی۔ کوٹھڑی میں ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس سے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ جو لوگ تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے وہ یہاں سے مایوس ہو کر جا چکے ہیں۔ یہ لوگ تو مندر کے پجاری تھے۔ یہ تمہارے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟ تم کون ہو؟"

لڑکی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"مہاراج! میرا نام کوشیلا ہے۔ میں اناتھ ہوں میرے ماتا پتا سور گباش ہو چکے ہیں۔ اپنی ماسی کے پاس رہتی ہوں۔ میں اسکول میں پڑھتی ہوں۔ ایک دن اپنی ماسی کے ساتھ مندر میں بھگوان کے درشن کے لئے آئی تو بڑے منت جی نے مجھے اپنی پتنی بنانے کے لئے چن لیا۔ اس کے آدمی میری ماسی کے گھر آکر مجھے اٹھا کر لے گئے۔ میں روتی رہی مگر میری کسی نے نہ سنی۔ ماسی نے کہا تو سوبھاگیہ وتی ہے کہ بھگوان نے تجھے اپنی پتنی بنایا ہے۔ مجھے بڑے منت نے دو

دن سے ایک تہہ خانے میں بند رکھا۔ دو عورتیں روز آکر میرے جسم کی مالش کرتیں۔ آج رات انہوں نے مجھے نہلا دھلا کر تیار کیا اور بڑے منت کے کمرے میں پہنچا دیا۔ بڑے منت نے کمرے میں آتے ہی پہلے شراب پی۔ پھر میری چولی نوچنے لگا۔ اس نے میری چولی پھاڑ کر پھینک دی۔ وہ نشے میں تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئی۔ اس کے آدمی میرے پیچھے دوڑے۔ میں اندھیرے میں مندر کے احاطے میں دوڑتی پھری۔ آپ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا دیکھا تو یہاں آ گئی۔"

لڑکی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کے لئے مجھے راکھشوں سے بچالیں میں پڑھ لکھ کر استانی بننا چاہتی ہوں میں بھگوان کی پتنی نہیں بننا چاہتی"

اس نے روتے ہوئے اپنا سر میرے بازو کے ساتھ لگا دیا۔ خدا جانے اس لڑکی کو پہلی نظر دیکھنے سے ہی مجھ پر کیا جادو سا ہو گیا تھا کہ میرے اندر کا شیطان بیدار ہو گیا۔

میں نے اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے شروع میں ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ آپ کے آگے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ لوگوں کے نام جگہوں کے نام ضرور غلط بتاؤں گا۔ کیونکہ یہ ان مسلمانوں کی سیکورٹی کا معاملہ ہے جو آج بھی ہندوستان میں بیٹھے ہندوؤں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور دشمن کے مورچوں کے اندر بیٹھ کر دشمن سے جنگ کر رہے ہیں۔ باقی ساری باتیں میں سچ لکھوں گا۔ باقی آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ چنانچہ میں نے آپ کو سچ سچ بتا دیا ہے کہ اس لڑکی کے جسم نے میرے جسم کے اندر ایک آگ سی لگا دی تھی۔ یا میرے جسم کے اندر جو آگ میں نے دبا کر رکھی ہوئی تھی اسے پھر سے بھڑکا دیا تھا۔ میں نے شیطانی جذبات سے مغلوب ہو کر اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں لڑکی کو منہ اندھیرے یہاں سے نکال کر جہاں وہ کہتی ہے وہاں پہنچا دوں گا اور اس کے بعد اس کے بدن کی آگ سے اپنے بدن کی آگ کے شعلے جتنے بھڑک سکتے ہیں بھڑکاؤں گا۔

دیکھا جائے تو میرا یہ فیصلہ میرے مسلک اور زندگی کے بلند اخلاقی ضابطوں کے بالکل
خلاف تھا۔ مگر میرے اندر کا شیطان مجھ پر غالب آچکا تھا۔ مجھے اس وقت سوائے اس لڑکی
کے جسم کے اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے لڑکی کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ان بدمعاشوں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ کیا تم
اپنی ماسی کے پاس واپس جانا چاہتی ہو؟"

لڑکی کا ننگا بازو میرے ہاتھ کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ اور میرا ہاتھ اس کے بازو کی
گرم لرزش کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں کرہ
ارض کے پہلے گھنے جنگل میں ہوں۔ یہ کرہ ارض کے جنگل کی پہلی رات ہے اور یہ لڑکی
دنیا کی پہلی عورت ہے۔ اب آپ مجھے لاکھ برا بھلا کہیں۔ مجھے بدمعاش۔ بدکار اور بدکردار
کہیں۔ مگر میں نے تو جو کچھ میرے دل میں تھا۔ اسے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ کیونکہ میں
نے آپ سے کہہ رکھا ہے کہ میں اپنی حیرت انگیز آپ بیتی بیان کرتے ہوئے جھوٹ نہیں
بولوں گا۔

لڑکی بھی میرے ساتھ لگ گئی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کپکپا رہا تھا۔ پھر وہ جلدی
سے الگ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"نہیں نہیں مہاراج! میں ماسی کے گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے پھر منت
کے حوالے کر دے گی۔"

"پھر تم کہاں کہاں جاؤ گی؟"

میں نے لڑکی کے بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"مہابلیشوری میں میری پھوپھو کملا بائی رہتی ہے۔ وہ وِدوا ہے۔ گھروں
کے کام کاج کرتی ہے۔ مجھے اس کے پاس پہنچا دیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی"

آج جب میں اپنی آپ بیتی آپ کو سنا رہا ہوں تو میں بھی غور کر رہا ہوں اور آپ بھی
غور کریں کہ جب انسان کے ہاتھ سے خدا کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور شیطان اس پر
غالب آجاتا ہے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ جب اس حسین اور خوبصورت جسم والی لڑکی

نے کہا کہ مجھے مہابلیشوری کملا بائی کے گھر پہنچا دیں تو میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے۔ میں بھی
اس کے ساتھ ہی وہیں ٹھہر جاؤں گا اور جی بھر کے عیش کروں گا۔ میں اس لمحے بالکل
بھول ہی گیا کہ میرا مشن کیا ہے اور میں کس عظیم مقصد کو لے کر اپنا آپ خطرے میں
ڈال کر بغیر ویزا پاسپورٹ کے دشمن کے ملک میں آیا ہوا ہوں۔

میں اس لڑکی کوشیلا کے بالوں کو سہلا رہا تھا اور اس نے بھی میرا ہاتھ پیچھے نہ کیا تھا۔
شیطان اس کی طرف سے بھی مجھ پر حملہ کر رہا تھا۔ وہ مزید میرے ساتھ لگ گئی تھی۔ میں
نے کہا

"یہ مہابلیشوری یہاں سے کس طرف اور کتنی دور ہے؟"

کوشیلا نے اپنا سر میرے سینے سے لگائے رکھا اور بولی۔

"یہاں سے دکھن کی طرف ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔ میں آپ کو راستہ
بتا دوں گی۔ میں اپنے پتا جی کے ساتھ وہاں جایا کرتی تھی"

میں نے سوچا کہ اسے لے کر ابھی نکل جانا چاہئے۔ زیادہ وقت گذر گیا تو بڑے منت
کے آدمی مندر کی ناکہ بندی کر لیں گے۔ میں نے اسے کہا۔

"چلو میں تمہیں تمہاری پھوپھو کے گھر لئے چلتا ہوں۔"

وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

"آپ بہت اچھے ہیں مہاراج"

میں نے اسے وہیں بیٹھنے کو کہا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر کوٹھڑی سے باہر نکل
آیا۔ بارش باریک پھوار کی طرح پڑ رہی تھی۔ سامنے والی جھاڑیوں اور درختوں میں رات
کا اندھیرا گہرا تھا۔ اس طرف مندر کی کچی دیوار تھی جس کے ساتھ ہی اینٹوں پتھروں کا
ڈھیر لگا تھا۔ آس پاس مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میں نے کوشیلا کو باہر آنے کے لئے کہا۔ وہ
جلدی سے باہر آگئی۔ میں نے کوٹھڑی کے دروازے کو تالا لگایا اور اس لڑکی کو جس نے مجھ
پر جادو سا کر دیا تھا ساتھ لے کر اینٹوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا۔ وہاں سے ہم نے مندر کی
دیوار پھاندی اور دوسری جانب جھاڑیوں والے ریتلے راستے پر تیز تیز چل پڑے۔ میں نے

کوشیلا سے کہا۔

"یہ راستہ مندر کے دکھن کو جاتا ہے۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ آگے ہمیں کس طرف جانا ہو گا؟"

وہ ان تمام راستوں سے واقف تھی۔ اس کا بچپن یہیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے گذرا تھا۔ کہنے لگی۔

"مہاراج آگے دریا کا کنارا ہے۔ وہاں مچھیروں کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ ہم کشتی میں بیٹھ کر دریا کے کنارے کنارے چلتے گئے تو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مہا بالیشوری کا گاؤں آجائے گا۔ ہم پتا جی کے ساتھ یہیں سے ناؤ میں بیٹھ کر جایا کرتے تھے۔"

جس کو وہ دریا کا کنارہ کہہ رہی تھی وہ سمندر کا پانی تھا جو ایک بہت بڑی جھیل کی شکل میں اس طرف آگیا ہوا تھا۔ اس میں ہو سکتا ہے دریا بھی شامل ہو گیا ہو۔ کیونکہ یہ سارے کا سارا علاقہ ڈیلٹے کا علاقہ تھا۔ ہم کافی دور تک نکل گئے۔ بارش ہلکی ہلکی پھوار کی طرح پڑ رہی تھی۔ کوشیلا نے اندھیرے میں میرا بازو تھام رکھا تھا اور سہمی ہوئی سی میرے بالکل ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ شیطان نے میرے لئے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ مجھ پر شیطان غالب آچکا ہے۔

آخر ہم جھیل پر پہنچ گئے۔

یہاں ایک جانب تار کے اونچے اونچے درختوں کی قطار کے پاس پانی میں کچھ چھوٹی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کشتی آہستہ سے کھولی۔ اس میں کوشیلا کو بٹھایا۔ کشتی کو کھینچ کر پانی میں ذرا آگے لے گیا۔ پھر خود بھی کشتی میں چڑھ گیا اور دکھن کی جانب کشتی کا رخ کر کے چپو چلانے لگا۔ کشتی چھوٹی تھی اور اس میں دو آدمی ہی بیٹھ سکتے تھے۔ کوشیلا میرے قریب ہی کشتی کا کنارا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ جھیل میں اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے دھندلے دھندلے جسم اور شکلیں نظر آرہی تھیں۔

شیطان مجھ پر کیا غالب آتا اس میں خود شیطان بن گیا تھا۔ میں نے دریا میں کشتی چلاتے ہوئے کوشیلا سے کہا کہ تم اتنی اچھی لڑکی ہو۔ تم یہاں اپنی زندگی کیوں برباد کر رہی ہو۔ یہاں تمہارا کوئی بھی خیال نہیں رکھے گا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ بنارس لے چلوں گا۔ وہاں میرا بہت بڑا گھر ہے۔ گھر کے ساتھ آم کا باغ ہے۔ کھیتی ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ میں نے شادی نہیں کی۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔ تم میرے گھر میں رہنا۔ میں تمہیں وہاں سکول میں داخل کرا دوں گا۔ تمہیں پڑھا لکھا کر استانی بنا دوں گا۔ کوشیلا تو بے حد خوش ہوئی۔ اس نے اپنا سر میرے گھٹنوں سے لگا دیا اور کہنے لگی۔

"مہاراج! مجھے اپنے ساتھ بنارس لے چلیں۔ میں آپ کی بڑی سیوا کروں گی۔ میں بڑا اچھا بھوجن بنا لیتی ہوں۔ میں آپ کے کپڑے بھی دھویا کروں گی۔۔۔"

میرے دل میں ایک لمحے کے لئے اپنے کمانڈو مشن کا خیال آیا اور یہ بھی خیال آیا لہ میرا ماسٹر سپائی کریم بھائی کل یا پرسوں میری تلاش میں سومنات کے مندر میں پہنچنے والا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ کوئی بات نہیں۔ میں کوشیلا کو کملا بائی لے پاس چھوڑ کر سومنات کے مندر میں آجاؤں گا۔ کریم بھائی سے ملاقات ہوئی تو جان جھ کر بیمار بن جاؤں گا اور کہوں گا کہ میں تو یہاں آکر بیمار پڑ گیا ہوں۔ ایک ہفتہ دے ۔ اس کے بعد دوار کا آپریشن پر چلیں گے۔ یہ بڑی کچی باتیں تھیں مگر میرا اس طرف لکل دھیان نہیں جا رہا تھا کہ کریم بھائی جو اتنا ہوشیار شخص ہے میرے بارے میں کیا چے گا۔ اس کو تو کبھی میری بیماری کا یقین نہیں آئے گا۔ مگر مجھ پر ہوس کا جو بھوت ہانک سوار ہو گیا تھا اس نے مجھے عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا ہوا تھا۔

ہماری کشتی کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک جھیل کے کنارے کنارے جنوب کی طرف چلتی ئک۔ جب دور سے کچھ چٹانیں سی نظر آئیں تو کوشیلا نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان پہاڑیوں کے پار میری پھوپھو کا گاؤں ہے۔"

بہرحال ہم اس کی پھوپھو کملا بائی کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ گاؤں کیا تھا دور تک اندھیرے میں جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔ پیچھے ٹیلے کی ڈھلان پر کچھ مکانوں کے خاکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ادھر بجلی کی روشنیاں کہیں کہیں ٹمٹما رہی تھیں۔ جھونپڑیوں میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بارش کی پھوار رک گئی تھی۔ کوشیلا مجھے ساتھ لئے ایک جھونپڑی کے دروازے پر آگئی۔ اس نے بند دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

"دائی ماں۔ دائی ماں۔ میں ہوں کوشیلا"

دو تین بار آواز دینے اور بانس کے بند دروازے پر ہاتھ مارنے سے اندر سے کملا بائی کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے رے؟"

کوشیلا نے جلدی سے کہا۔

"میں ہوں دائی ماں۔ کوشیلا۔"

جھونپڑی کی بانس کی دیوار کی درزوں میں سے نظر آرہی تھی۔ دروازہ کھلا۔ ایک عورت نے دروازہ کھولتے ہی کوشیلا کو دیکھ کر گلے لگا لیا۔

"اری کوشیلا۔ تو اس وقت کیسے آگئی۔ آؤ۔ اندر آؤ۔"

کوشیلا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دائی ماں یہ میرے مہاراج ہیں"

کملا بائی نے دھوتی کا پلو سنبھالتے ہوئے مجھے پرنام کیا۔ یہ ایک پختہ عمر کی عورت تھی جس نے صرف ایک دھوتی باندھ رکھی تھی جس کا ایک پلو اس نے اپنے جسم پر ڈال رکھا تھا۔ جھونپڑی میں ایک ہی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک مونڈھا پڑا تھا۔ کملا بائی نے لیمپ کی بتی اونچی کی تو میں نے دیکھا کہ کملا بائی کے ہونٹ پان کی سرخی سے لال ہو رہے تھے۔ کانوں میں چاندی کی بالیوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔ شرما بھی رہی تھی۔ کوشیلا نے جلدی جلدی اسے اپنی ساری کہانی سنا دی۔ کملا بائی

بڑی چہک کر بولی۔

"اری تو اس جنم جلی کے پاس رہتی ہی کیوں ہے یہاں میرے پاس تجھے کس شے کی کمی ہے؟ میرے پاس رہ جا۔ پٹیلوں کے چار گھر تمہیں بھی دلا دوں گی۔ کوئی پٹیل تم پر مہربان ہو گیا تو میری طرح تیرے کانوں میں بھی چاندی کی بالیاں ہوں گی۔"

اور وہ منہ پھاڑ کر ہنس دی۔ یہ عورت جس کا نام کملا بائی تھا صاف ظاہر تھا کہ کھیلنے کھلانے والی عورت ہے۔ کشتی میں مجھے کوشیلا نے سمجھا دیا تھا کہ میں کملا بائی سے بنارس جانے کی کوئی بات نہ کروں۔

"وہ مجھے اپنے سے الگ نہیں کرے گی"

کوشیلا اپنی پھوپھو کی ذہنیت اور اس کے دھندے سے واقف تھی مگر اس نے میرے ساتھ بنارس جانے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ جب کملا بائی نے اسے اپنے پاس رہنے کی پیش کش کی تو کوشیلا نے لیمپ کی روشنی میں میری طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہلکی سی آنکھ ماری۔ وہ کملا بائی سے کہنے لگی۔

"ہاں پھوپھو میں اب تمہارے پاس ہی رہوں گی۔ تو جیسے کہے گی ویسے ہی کروں گی۔"

کوشیلا کے آنکھ مارنے سے میرے اندر بیٹھا ہوا' بلکہ میرے سارے جسم میں پھیلا ہوا شیطان خوشی سے جھوم اٹھا۔ کملا بائی نے کوشیلا کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھایا ہوا تھا۔ اس کی بلائیں لیتی ہوئی بولی۔

"تو میرے ساتھ ہی سوجا۔ صبح میں تمہیں بڑے پٹیل جی کے گھر لے چلوں گی"

میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! آپ نے بڑی کرپا کی جو اس بے چاری اناتھ لڑکی کو غنڈوں سے بچا کر میرے پاس لے آئے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹ

جائیں۔ تھوڑی سی رات رہ گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بائی جی۔ مجھے واپس جانا ہے۔"

میں اٹھ کر جھونپڑی سے باہر آیا تو کوشیلا بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آگئی۔ میرے ساتھ لگ کر آہستہ سے بولی۔

"مہاراج! آپ نہ جائیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں کوشیلا میرا جانا ضروری ہے۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ تھوڑا سا کام ہے اسے نمٹا کر کل رات کو ہی واپس آجاؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ بنارس لے چلوں گا۔"

کوشیلا خوش ہو گئی۔ پچھلی رات کے اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں آپ کی راہ دیکھوں گی۔ میں دائی ماں کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ آپ آئیں گے تو ہم یہاں سے بھاگ کر بنارس چلے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی کریں گے۔ اب تو اندر جا کر سو جا۔"

کوشیلا ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

"مہاراج! مجھے چھوڑ کر نہ جائیں"

میں نے اسے بادل نخواستہ اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"چنتا کیوں کرتی ہے۔ میں کل شام کو ہی آجاؤں گا۔ تم تیار رہنا"

"میں تیار رہوں گی مہاراج"

اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا اور میں اندھیرے میں اس سے الگ ہو کر تیز تیز قدموں سے جھیل کی طرف چل پڑا۔ کشتی کو کھینچ کر میں نے

کنارے پر جھاڑیوں میں چھپا دیا ہوا تھا۔ چھوٹی سی کشتی تھی اسے دوبارا کھینچ کر جھیل کے پانی میں لے آیا۔ اس میں بیٹھا اور واپس روانہ ہو گیا۔ جھیل کا پانی بالکل ساکن تھا۔ چپو چلانے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے پیچھے صبح کاذب کی بڑی ہلکی ہلکی روشنی جھلکنے لگی تھی۔

کشتی میں میں اکیلا تھا۔ کشتی ہلکی تھی۔ میں جلدی مچھیروں کی اس بستی میں آگیا جہاں سے ہم نے یہ کشتی چرائی تھی۔ مچھیروں کی جھونپڑیوں میں مچھیروں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ پڑے ہیں۔ میں کشتی ایک طرف کنارے پر لے آیا۔ کشتی سے اترا اور اسی راستے پر اندازے کے مطابق چل پڑا جس راستے سے کوشیلا مجھے جھیل تک لائی تھی۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح نہیں چھٹا تھا۔ میں اندازے سے چل رہا تھا۔ یہ وہی ریتلا رستہ تھا جس کی دونوں جانب جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ چلتے چلتے میں کافی دور آگیا ہوں۔ مگر ابھی تک مجھے سومنات کے مندر کی روشنیاں نظر نہیں آئی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہیں میں راستہ تو نہیں بھول گیا۔

میں رک گیا۔ اندھیرے اور آسمان پر آہستہ آہستہ پھیلتی روشنی کے دھندلکے میں میں نے جائزہ لیا۔ اردگرد دیکھا۔ رستہ وہی تھا۔ وہی جھاڑیاں تھیں۔ مگر ایک فرق میں نے محسوس کیا کہ پہلے تاڑ کے درخت نظر آتے تھے وہ غائب تھے۔ پھر بھی میں آگے چلنے لگا۔

اب جھاڑیاں بھی ختم ہو گئیں اور ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے شروع ہو گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ اب مجھے اصل راستہ تلاش کرنا تھا۔ میں نے مغرب کی طرف رخ کر لیا اور ریت کے ٹیلوں میں داخل ہو گیا۔ ایک ٹیلہ ختم ہوتا تو دوسرا ٹیلہ شروع ہو جاتا۔ پو پھٹنے لگی تھی۔ ٹیلوں کے خاکے اور اردگرد کا ماحول واضح ہونے لگا تھا۔ جس زمین پر میں چل رہا تھا وہ ریتلی ضرور تھی مگر ریت سخت ہو کر پتھر بن گئی تھی۔ ریت کے ٹیلے ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے۔ میں نے سوچا کہ واپس اسی جگہ پر پہنچنا چاہئے جہاں سے میں اس طرف مڑا تھا۔ میں واپس چل پڑا۔ مگر اب میں ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں پھنس چکا تھا۔ لاچار ہو کر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ چاروں طرف

نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر ششدر سا ہو کر رہ گیا کہ میں ایک لق ودق صحرا میں آگیا تھا جہاں میرے چاروں جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ میں تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں۔ سورج نہیں نکلا تھا مگر دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ہمت کی اور مغرب کی طرف رخ کر کے ٹیلوں کے درمیان چل پڑا۔ یہ سوچ کر کہ آخر کہیں تو ان ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہو گا۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی لیکن میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران مجھے زیادہ سے زیادہ دیر تک پیاسا رہنے کی تربیت ملی ہوئی تھی۔ مگر بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ پیاس میری برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ میں بڑا حیران بھی ہوا کہ اتنی جلدی مجھے اتنی پیاس کیوں لگ گئی ہے۔ جب کہ دھوپ بھی نہیں نکلی ہوئی تھی اور جب میں ٹیلوں میں داخل ہوا تھا تو پیاس کا احساس تک نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ میرا حلق خشک ہونے لگا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمنے لگیں۔ میں ایک ٹیلے کے پاس بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ دل یہی کہتا تھا کہ میں راستے سے بھٹک گیا ہوں اور تھوڑی ہمت کر لوں تو ان ٹیلوں کی بھول بھلیوں سے نکل جاؤں گا۔

تھوڑی دیر آرام کرنے سے پیاس کا احساس کچھ کم ہو گیا۔ میں پھر چلنے لگا۔ دو تین ٹیلوں کے درمیان سے گذرا ہوں کہ پیاس نے مجھے اس طرح نڈھال کر دیا جیسے میں تین دنوں سے پیاسا ہوں۔ حلق میں ریت سی اڑنے لگی۔ جسم پر اتنی کمزوری طاری ہو گئی کہ دو قدم چلتا تو لڑکھڑا سا جاتا۔ آس پاس ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی درخت تھا نہ جھاڑی تھی کہ اس کی جڑوں کو نچوڑ کر حلق تر کر لیتا۔ میں ایک اونچے ٹیلے کے پاس آ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ یہ ٹیلہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا سارا جسم ریت بن گیا ہے۔ اگر مجھے کہیں سے پانی نہ ملا تو میں ریت کی دیوار کی طرح گر جاؤں گا اور ریت کے ساتھ ریت بن جاؤں گا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔

اچانک مجھے ایک خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خوشبو ہلکی تھی اور سامنے والے ٹیلے کی طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ٹیلے کی دوسری طرف ضرور جھاڑیاں ہوں گی جن میں پھول کھلے ہوئے ہوں گے اور وہاں پانی بھی ضرور ہو گا۔ میں جدھر سے خوشبو آرہی تھی اس طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا خوشبو زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ آخر میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چلا کر ٹیلے کی دوسری طرف نکل آیا۔ وہاں آکر دیکھا کہ کہیں کوئی جھاڑی نہیں تھی۔ کہیں کوئی پھول نہیں تھے۔ مگر خوشبو اس طرح آرہی تھی اور پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ میں تھک ہار کر بیٹھ گیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگنے لگا۔ ہمت کر کے اٹھا اور سامنے کچھ فاصلے پر جو ٹیلہ تھا اس کی طرف بڑھنے لگا کہ شاید اس جانب جھاڑیاں ہوں اور پانی مل جائے۔ خوشبو بھی اسی طرف آرہی تھی۔ ٹیلہ ریتلے پتھر کا تھا۔

میں اس کی دوسری طرف آگیا۔

ٹیلے کی اس جانب غار کا دہانہ تھا جس کے آدھے حصے کو جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔ میں قریب گیا تو غار کے اندر سے خوشبو کے جھونکے آرہے تھے۔ یہ خوشبو مجھے شروع ہی سے عجیب وغریب لگی تھی۔ ایسی خوشبو میں نے پہلی کبھی نہیں سونگھی تھی۔ میرا خیال یہی تھا کہ یہ کسی نایاب صحرائی پھول کی خوشبو ہوگی۔ میں نے سوچا کہ غار کے اندر چل کر دیکھنا چاہئے کہ خوشبو کہاں سے آتی ہے اور کس پھول کی ہے۔ دل میں خیال بھی تھا کہ ممکن ہے غار کے اندر پانی کا کوئی چشمہ نکل کر زمین کے نیچے بہہ رہا ہو۔

غار کے دہانے پر تو دن کی روشنی تھی مگر اندر اندھیرا تھا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا خوشبو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ غار آگے جا کر ایک طرف گھوم گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گھوم گیا۔ یہاں اندھیرا گہرا تھا مگر کونے میں روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں نکل رہی تھیں۔ میں نے قریب جا کر دیکھا کہ روشنی کی یہ کرنیں پتھروں کے ایک ڈھیر کے نیچے سے پھوٹ رہی تھیں۔

میں بڑا حیران ہوا کہ یہاں پتھروں کے اندر روشنی کہاں سے آگئی ہے۔ میں نے کچھ

پتھروں کو کافی زور لگا کر ایک طرف ہٹایا تو میری آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نیچے ایک قبر کی لحد تھی۔ میت کا کفن لحد میں ایسے پڑا تھا جیسے میت ابھی ابھی اس کے اندر سے نکل کر گئی ہو۔ روشنی سے ساری قبر ساری لحد جگمگا رہی تھی۔ وہاں اس قدر خوشبو تھی کہ مجھے اپنا آپ خوشبو بن کر فضا میں تحلیل ہوتا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کفن کو ہاتھ لگایا تو وہ بالکل تازہ اور صاف تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی میت کو آج ہی یہاں دفن کیا گیا ہے۔ میں نے لحد کے سرہانے کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے ایک کھڑکی سی نظر آئی۔ روشنی اور خوشبو کا سیلاب اس کھڑکی میں سے نکل رہا تھا۔ مجھ پر ایک مقدس ہیبت سی چھا گئی۔ حیرانی کی بات ہوئی کہ مجھے اس سے پہلے جو کمزوری اور شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی وہ اب غائب تھی۔ اس روشنی نے میرے جسم میں جیسے ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔

میں قبر کی کھڑکی کی جانب گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا بڑھا۔ کھڑکی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ وہاں روشنی کا ایک پردہ ہی کہوں گا۔ کیونکہ روشنی کے اس غبار کے آگے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری زبان پر اپنے آپ کلمہ پاک جاری ہو گیا۔ میں روشنی کے غبار میں داخل ہو گیا۔

جیسے ہی میں اس غبار سے نکل کر دوسری طرف آیا جہاں کھڑا تھا وہیں ساکت سا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف ایک کیف انگیز نورانی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ کیف و نور کی اس فضا میں روح پرور خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں اور ان خوشبوؤں میں وہ خوشبو بھی ہے جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ سنگ مرمر کی سفید براق روشیں ہیں جن میں سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ ان روشوں کی دونوں جانب ایسے سایہ دار درخت کھڑے ہیں کہ جن کے تنے، شاخیں اور پتے زمرد مرجان اور ہیرے موتیوں کی طرح دمک رہے ہیں۔ ان درختوں پر حسین و جمیل طائران خوش الحان اللہ پاک کی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔ درختوں کے درمیان آب شفاف کی ایک مرمریں نہر بہہ رہی ہے کہ جس کی سطح پر ستاروں کی آب و تاب ہے۔ اس نہر کے کنارے زمرد کا ایک تخت بچھا ہے جس پر

ایک نورانی چہرے والا جوان رعنا سبز عمامہ باندھے بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسا جلال ہے، ایسا نور ہے کہ میری نگاہ نہیں ٹھہر رہی۔ اوپر درخت کی ایک سفید پھولوں بھری شاخ اس جوان پر جلال کے چہرے کے پاس آکر جھک گئی ہے جیسے اس کی نورانی پیشانی کو چومنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے دائیں طرف سرخ عقیق میں سے تراشا ہوا ایک پیالہ رکھا ہے۔ وہ اشارے سے مجھے اپنی طرف بلاتا ہے۔

میں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ اس کے قریب جاتا ہوں اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اس شخص کی آنکھوں سے نورانی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ چاروں طرف خوشبوئیں ہی خوشبوئیں ہیں۔ نور ہی نور ہے۔ روشنی ہی روشنی ہے۔ روشنی ایسی شفاف اور ٹرانسپیرنٹ ہے کہ ہماری دنیا کی روشنی اس کا سایہ محسوس ہونے لگی ہے۔ یہ روشنی آنکھوں اور روح میں ابدی سکون کی لازوال کیفیت بن کر اتر رہی ہے۔ میرے وجود کا وزن ختم ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی انگلی تک کا بوجھ محسوس نہیں ہو رہا۔ اس سرمدی ماحول کی نورانی لطافتوں نے میری تمام کثافتوں کو تھوڑی دیر کے لئے ختم کر دیا ہے۔ میں زمردیں تخت پر بیٹھے اس شخص کو سلام علیکم کہتا ہوں۔ وہ وعلیکم اسلام کہہ کر انتہائی پر سکون شیریں آواز میں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے اس باغ عدن کی خوشبو کی ایک لہر بھیج کر بلایا ہے۔ سنو! میرا نام سیدی حسن علی ہے۔ میں مجاہد اسلام سلطان محمود غزنوی کے اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد میں میں شرکت کرنے یہاں آیا تھا۔ اسی میدان میں کفار کے بہت بڑے لشکر کے ساتھ ہماری جنگ ہوئی تھی۔ میں اسی معرکہ حق وباطل میں اسی جگہ شہید ہوا تھا۔ اس جنگ میں اسلام کی فتح ہوئی اور سلطان محمود غزنوی نے اللہ کی توحید کا پرچم بلند رکھتے ہوئے سومناتھ کے مندروں کے سارے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔"

میں نے کچھ بولنے کی کوش کی مگر میری زبان نے میرے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔ شہید کا نورانی چہرہ میری طرف تھا۔ اس نے کہا۔

"جن ٹیلوں میں سے تم گذر کر آئے ہو ان ٹیلوں کے آس پاس بہت سے شہیدوں کے جسم دفن ہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ تمام شہیدوں کی روحیں جنت الفردوس میں حیات ابدی پا کر اللہ کی حمد وثنا میں مصروف ہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے یہاں بلایا ہے کہ تمہارے دل میں اللہ اور اس کے رسول ؐ پاک کے نام پر جہاد کرنے اور شہید ہونے کا جذبہ زندہ ہے۔ مگر تم شیطان کے بہکاوے میں آگئے ہو۔ اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہو خدا کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دنیا اور آخرت میں انسان کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہاتھ میں آیا ہوا خدا کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ میں سیدھی راہ پر واپس لا رہا ہوں۔ تم ایک بہت بڑا مقصد لے کر دشمن ملک میں داخل ہوئے ہو۔ تم نے صرف اسلام کی سربلندی' پاکستان کے استحکام اور یہاں کے مسلمانوں پر کافر جو ظلم ڈھا رہا ہے اس کے خلاف جہاد کرنے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے تم جنت کے راستے پر چل رہے تھے لیکن شیطان اور اپنے نفس کے بہکاوے میں آکر تم نے یہ راستہ چھوڑ دیا اور اس راستے پر چل پڑے جو دوزخ کی طرف جاتا ہے۔ واپس جنت کے راستے پر آجاؤ بس مجھے تمہیں صرف یہی کہنا تھا۔

یاد رکھو۔ دنیائے فانی ایک مومن کے لئے امتحان کی جگہ ہے۔ اور ایک سچا مومن ہر امتحان میں کامیاب رہتا ہے اور آخرت کی حیات ابدی پا کر جنت الفردوس میں رب ذوالجلال کا قرب حاصل کرتا ہے۔ واپس اپنی دنیا میں جا کر کفر واسلام کی جنگ میں ایک سچے مرد مومن کی طرح سرگرم عمل ہو جاؤ۔ پھر تم دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر سرخ رو ہو گے۔۔۔۔"

پھر اس جوان پر نور پر جلال نے تبسم فرمایا تو میری روح میں جیسے توانائی کی نئی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ میں کوئی بات نہ کر سکا۔ شہید کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا۔ میں اپنے

اندر جواب دینے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ پر ویسے ہی ساکت سا ہو کر کھڑا رہا اور جیسے جنت الفردوس کا وہ نورانی منظر میری آنکھوں سے دور ہوتا گیا۔ پھر اتنی روشنی ہو گئی کہ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ روشنی آہستہ آہستہ دور ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میں غار میں اس شہید کے مرقد کے پاس کھڑا ہوں جو پہلے کھلا ہوا تھا اور مجھے اس کی لحد دکھائی دی تھی مگر اب قبر بند تھی۔ غار میں وہی سرمدی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو مجھے صحرائی ٹیلوں میں سے کھینچ کر یہاں تک لے آئی تھی۔ میں غار سے باہر آگیا۔ آسمان پر سے بادل غائب ہو چکے تھے۔ نیلا آسمان صاف اور شفاف ہو کر سورج کی تابناک روشنی میں چمک رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ میری پیاس غائب ہو چکی تھی۔ میں اپنے جسم میں ایک نئی طاقت ایک نئی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ گناہ کے سارے خیال معدوم ہو چکے تھے۔ میں اپنے کئے پر نادم اور پشیمان تھا اور میرے لبوں پر توبہ استغفار کا ورد جاری تھا۔ اللہ پاک نے اپنے فضل وکرم سے مجھے برے راستے سے ہٹا کر پھر سے سیدھی راہ دکھائی دی تھی۔ میں ایک ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ جیسے ہی اس ٹیلے سے نکلا سامنے سومنات شہر کی ساحلی بستی کے مکان اور سومناتھ مندر کے سنہری کلس دھوپ میں چمکتے نظر آرہے تھے۔

میں تیز تیز چلنے لگا۔ مندر کے بڑے دروازے میں سے گذر کر اپنی کوٹھڑی کے قریب پہنچا تو برآمدے کی ایک جانب مجھے کریم بھائی نظر پڑا۔ وہ جوگیوں کے بھیس میں تھا اور برآمدے کے پاس زمین پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آیا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں صبح سے یہاں بیٹھا ہوں"

میں نے کوٹھڑی کا تالہ کھولتے ہوئے کہا۔

"سمندری جھیل کی طرف صبح صبح سیر کرنے نکل گیا تھا۔ واپسی پر راستہ بھول گیا۔"

وہ میرے ساتھ ہی کوٹھڑی میں آگیا۔ ہم چارپائی پر بیٹھ گئے دروازہ کھلا ہی رکھا تا کہ کوئی وہاں سے گذرے یا ہماری طرف آئے تو ہم اپنی باتوں کا موضوع تبدیل کر سکیں۔

کریم بھائی کہنے لگا۔

"حالات نے ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے"

میں نے پوچھا۔

"کیا اسلحے والا جہاز کسی دوسری بندرگاہ کی طرف چلا گیا ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مرچنٹ نیوی کا مال بردار جہاز بھاری مقدار میں اسلحہ وغیرہ لے کر دوارکا کے ساحل پر ہی ہے"

"تو پھر صورت حال کیسے بدل گئی ہے؟"

میرے سوال پر اس نے کہا۔

"صورت حال اس طرح بدل گئی ہے کہ جہاز تو دوارکا کی بندرگاہ پر موجود ہے مگر اس میں لدا ہوا سارا اسلحہ 'کوبرا ہیلی کاپٹر میڈیم فیلڈ گنیں اور توپوں ٹینکوں کی گنوں کے پرزوں کے کریٹ جہاز سے اتار کر دوارکا کے قلعے میں جو فوجی ایمونیشن ڈپو ہے وہاں پہنچا دیئے گئے ہیں۔"

میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"اتنی جلدی یہ سارا مال کیسے قلعے میں پہنچا دیا گیا؟ جہاز بندرگاہ پر کب لگا تھا؟"

کریم بھائی نے سانس لے کر کہا۔

"جہاز کے دوارکا پہنچنے کا ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ جس روز میں دوارکا پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ جہاز کو گودی میں لگے دو روز ہو گئے ہیں اور جہاز پر سے سارا اسلحہ وغیرہ اتار کر دوارکا کے قلعے میں پہنچا دیا گیا ہے"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے اب ہمارا ٹارگٹ مرچنٹ نیوی کا جہاز نہیں بلکہ دوارکا کا قلعہ ہے"

کریم بھائی دو تین سیکنڈ خاموش رہا۔ پھر بولا۔

"جہاز کا ٹارگٹ اتنا مشکل نہیں تھا۔ وہ کھلا ٹارگٹ تھا مگر دوارکا فورٹ کے اندر جا کر اسلحہ تباہ کرنے میں ہمیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ گجرات کاٹھیاواڑ کا ایک اہم ترین فوجی اڈہ ہے۔ اس میں فوجی ساز وسامان اور گولہ بارود کا بھاری ذخیرہ ہروقت موجود رہتا ہے۔ یہاں انڈین فوج کے حفاظتی یونٹ ہروقت چوکس رہتے ہیں۔ قلعے کا صرف ایک ہی بڑا دروازہ ہے جہاں فوجی گارڈ پہرہ دیتی ہے۔ قلعے کے اوپر دو مشین گن پوسٹیں ہیں۔ باقی قلعے کی چاروں طرف بڑی اونچی پرانی دیوار ہے۔ اس دیوار پر بھی فوجی اسلحہ لے کر ہر وقت گشت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ساری معلومات دوارکا میں موجود ہمارے خاص آدمی نے مجھے مہیا کی ہیں"

میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"کریم بھائی! ایک ہزار برس پہلے اسی قلعے کو محمود غزنوی کی فوجوں نے اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں فتح کیا تھا۔ یہی قلعہ تھا جس کے دفاع کے لئے ہندو راجہ اپنی ساری فوجیں لے کر مجاہد اسلام کو شکست دینے جمع ہو گئے تھے۔ ہندو راجاؤں کا خیال تھا کہ وہ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی چھوٹی سی فوج کو پہلے ہی ہلے میں شکست دے دیں گے۔ مگر شکست کس کی ہوئی تھی؟ کفار کی۔ محمود غزنوی کی چھوٹی سی فوج نے ہندو راجاؤں کے بہت بڑے لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہمیں اپنے مجاہدوں کی تاریخ کو ہمیشہ سامنے رکھنا ہو گا۔ تم کفار کی تعداد اور ان کے دفاع پر مت جاؤ اگر ہمارے سینوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ پاک دین کی شمع روشن ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں اللہ کی راہ میں شہید ہونے کا جذبہ زندہ ہے تو پھر ہمیں اپنے مشن میں کامیاب ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

کریم بھائی مجھے عجیب حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرا نام لے کر بولا۔

"تم مجھے اس وقت سلطان محمود غزنوی کی فوج کے ایک مجاہد لگ رہے

ہو"

میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میرے اندر یہ جذبہ جو تھوڑی دیر کے لئے شیطان کے بہکاوے میں آکر سو گیا تھا دوبارہ جس مرد مجاہد نے بیدار کیا ہے وہ سلطان محمود کی فوج کا ایک شہید مجاہد ہی تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کریم بھائی ہندوستان کے ہر مسلمان کو اب سلطان محمود غزنوی کی فوج کے مجاہد بننے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایک ہزار برس بعد یہاں ایک بار پھر کفر واسلام کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔"

کریم بھائی نے پرجوش لہجے میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دوست! ہم یہ جنگ پورے جذبے اور بہادری کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ اگرچہ ہم نہتے ہیں ہم پر کافروں کی حکمرانی ہے۔ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ ہماری کوئی باقاعدہ فوج بھی نہیں ہے۔ مگر ہمارے دلوں میں اسلام کی شمع روشن ہے ہماری زبان پر کلمہ توحید کا ورد جاری ہے۔ ہمیں اپنے عظیم اسلامی ورثے کی عظمت کا احساس ہے۔ ہم یہ جنگ اس وقت لڑتے رہیں گے جب تک کہ ہندوستان میں ہم مسلمانوں کو ہمارے جائز حقوق نہیں مل جاتے۔"

میں نے اٹھ کر کریم بھائی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور کہا۔

"کریم بھائی ہم دینی بھائی ہیں۔ اسلامی بھائی ہیں ہمارے درمیان اسلام کا کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم ہے۔ یہ کبھی مت سوچنا کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں اور تم دلی کے رہنے والے ہو۔ تمہاری زبان اور ہے اور میری زبان اور ہے۔ نہیں۔ ایسا خیال بھی اپنے دل میں مت لانا۔ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ پاک کے دین پر چلنے والے مسلمان ہیں۔ ہمارا دین اسلام ہے۔ ہماری زبان اسلام ہے۔ ہمارا صوبہ اسلام ہے ہمارا وطن اسلام ہے۔"

ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ یہ اللہ اور اس کے نبیؐ پاک کی محبت میں چھلکنے والے آنسو تھے۔ یہ یک جہتی طاقت اور ناقابل شکست توانائی کے آنسو تھے۔

میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں سنت جی کو ناشتے کا کہہ کر ابھی آتا ہوں"

اس نے پوچھا۔

"یہ سنت جی کون ہیں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"سومنات کے مندر میں آنے والوں کو تلک لگاتے ہیں۔ تم تو باہر ہی سے تلک لگا کر آئے ہو۔ میں نے انہیں اس کوٹھڑی کا ایک ہفتے کا کرایہ اور راشن کے پیسے سب ادا کر دیئے ہوئے ہیں۔"

میں کوٹھڑی سے نکل کر مہنت کے پاس آگیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔

"مہاراج آپ کہاں چلے گئے تھے۔ لڑکا دوبارہ ناشتہ لے کر آپ کی کوٹھڑی میں گیا تھا۔"

میں نے کہا۔

"ہم سادھو سنت ہیں۔ پربھات کے سمے باہر درختوں میں بیٹھ کر بھگوان کے نام کا جاپ کرتے ہیں۔ اسی لئے دیر ہوگئی۔ میرا ایک بنارس کا جوگی بھائی بھی آیا ہوا ہے۔ دو آدمیوں کے لئے ناشتہ بھیج دو۔"

سنت بولا۔

"جو حکم مہاراج! ابھی بھجواتا ہوں"

ناشتہ کرتے ہوئے میں نے کریم بھائی سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوبرا ہیلی کاپٹر اور میڈیم فیلڈ گنیں جو خاص طور پر کشمیر کے محاذ پر بھیجنے کے لئے منگوائی گئی ہیں انہیں جتنی جلدی ہو سکے تباہ کر دیا جائے۔"

کریم بھائی نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ابھی تک تو یہ سارا اسلحہ دوارکا کے فوجی

قلعے میں ہی پڑا ہے۔ مگر اسے بہت جلد کشمیر کے محاذ پر روانہ کر دیا جائے گا۔ اور اس بار یہ اسلحہ کسی ایک خاص فوجی ٹرین میں لاد کر نہیں لے جایا جائے گا۔ مڈگھاٹ کے سٹیشن پر اسلحہ کی گاڑی کے تباہ ہو جانے کے بعد فوج اسلحے کی اس کھیپ کو مختلف ٹرکوں اور مختلف گاڑیوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے روانہ کرے گی۔ اگر ایک بار یہ فوجی ساز وسامان قلعے سے نکل گیا تو پھر اسے تباہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں رہے گی ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس قلعے کے اندر ہی کرنا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"دوار کا میں ہمارے کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا قلعے کے اندر آنا جانا ہو؟"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"ہمارا دوار کا میں کوئی باقاعدہ گروہ نہیں ہے۔ یہاں مسلمان ویسے بھی کم تعداد میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس وہاں صرف دو ہی آدمی ہیں۔ میں ان میں سے ایک آدمی نئی پرانی عمارتوں میں لکڑی کا کام کرتا ہے۔ وہ ایک محنت کش غریب گجراتی مسلمان ہے اور محض اسلام کے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مدد کے جذبے کی خاطر ہمارے گروہ میں شامل ہوا ہے۔ دوسرا آدمی میونسپل کمیٹی دوار کا کا معمولی ٹھیکدار ہے۔ وہ سورتی میمن ہے۔ بڑی ٹھیکیداریاں تو ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہیں لیکن چھوٹا موٹا ٹھیکہ اسے بھی مل جاتا ہے۔ تم میرے ساتھ دوار کا چلو گے تو وہاں کوئی پروگرام طے کریں گے۔ پھر میں تمہیں ان لوگوں سے بھی ملاؤں گا۔"

ناشتہ کرنے کے بعد ہم سومنات کے ایک لاری اڈے سے بس میں بیٹھے اور دوار کا پہنچ گئے۔ سومنات سے دوار کا کا فاصلہ چند ایک میل ہی ہے۔ دوار کا میں بھی مندروں کی بھرمار تھی۔ خستہ حال سڑکوں پر بیل گاڑیاں پرانے رکشے اور کہیں کہیں یکہ ٹائپ کے تانگے ہی چل رہے تھے۔ دوار کا کا قلعہ شہر سے باہر سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کی

ایک دیوار سمندر کی طرف تھی۔

کریم بھائی مجھے لاری اڈے سے اپنے لکڑی کا کام کرنے والے آدمی کے گھر لے جانے کی بجائے ایک ایسی غریب بستی میں لے آیا جہاں دلدلی میدان کے کنارے ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور چھپروں کی چھتوں والے کواٹرز اور جھونپڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ اسی غریب بستی میں ایک جھونپڑی نما کواٹر کریم نے کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ ہندو جوگی کے روپ میں وہاں آیا تھا اور اس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ہردوار سے دوار کا اور سومنات کے مندروں کی یاترا کرنے آیا ہے۔ جھونپڑی نما کواٹر کا صرف ایک ہی کمرہ تھا جس کی دیواروں کا پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ زمین پر ناریل کے پتوں کی صف بچھی تھی۔ کونے میں پانی کی صراحی اور مٹی کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت ابھی دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ میرا حلیہ بھی جینی دھرم کے سادھوؤں والا تھا۔ اس اعتبار سے ہم دونوں جوگی اور سادھو کے حلیے میں تھے۔ جس کسی نے بھی ہمیں بستی میں دیکھا تو وہ یہی سمجھے کہ یہ دو سادھو یاترا کرنے دوار کا آئے ہوں گے۔ کیونکہ دوار کا اور سومنات میں ہمارے حلیے کے بہت سادھو جوگی پھرتے تھے۔

کریم نے مجھے جھونپڑی نما کواٹر میں بٹھایا اور بولا۔

"تم یہاں بیٹھو میں اپنے آدمی کے پاس جاتا ہوں اور کچھ مزید باتیں معلوم کر کے آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں صف پر لیٹ گیا۔ میرا خیال کوشلا کی طرف چلا گیا جو یقیناً میرا انتظار کر رہی ہو گی کہ میں آج یا کل کسی وقت اس کے پاس اس کی پھوپھو کملا بائی کے مہابالیشوری والے گھر جاؤں گا اور اسے ساتھ لے کر بنارس کی طرف نکل جاؤں گا۔ اچانک مجھے اس نیم عریاں سانولا جسم اور اس کے بازوؤں کا خیال آنے لگا۔ میں نے اسی وقت سچے دل سے لاحول پڑھا اور یقین کریں کہ کوشلا کا نیم عریاں جسم اور بازوؤں کا خیال میرے دل سے ایسے نکل گیا کہ جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمانڈو اپریشن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد کوشلا کا پھر خیال مجسم ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ وہ

گھبرا کر اپنی ساڑھی سے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر لاحول پڑھ کر اس شیطانی خیال کو بھگا دیا۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ یہ شیطانی خیال برابر مجھ پر حملہ کرتا رہے گا اور میری بہادری یہ ہے کہ میں بھی اس کا مقابلہ کرتا رہوں اور ہر بار اسے شکست دوں اور بھگا دوں۔ اسی میں میرے کردار کی نشوونما اور روح کی عظمت اور صیقل کا راز پوشیدہ تھا میں انسان تھا۔ کوئی فرشتہ نہیں تھا کہ میرے ذہن میں برائی کا کوئی تصور ہی نہ ہو۔ مجھے انسانیت کی اعلیٰ ترین منزل سے گذر کر ہر برائی کا مقابلہ کرتے ہوئے فرشتوں کی منزل تک پہنچنا تھا۔ جب چار پانچ مرتبہ کوشیلا کے نیم عریاں بدن اور بنارس میں اس کے ساتھ عیش کی زندگی گذارنے کے شیطانی خیال کا میں نے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن سے بھگا دیا تو اس کے بعد یہ شیطانی خیال بہت حد تک دم توڑ گیا اور میں نے پوری توجہ اور یکسوئی سے اپنے دوار کا آپریشن کے بارے میں غور شروع کر دیا۔ یقین کریں اس وقت مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں نے بھی مجاہد اسلام سلطان محمود غزنوی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سومنات کے مندر کا ایک بہت بڑا بت پاش پاش کر دیا ہے۔

کوشیلا سومنات کا بڑا خطرناک بت تھا۔

میں نے دوارکا کے قلعے میں داخل ہونے کے ہر پہلو پر غور کیا۔ یہ ایک فوجی قلعہ تھا اور بقول کریم بھائی کے قلعے میں سیکورٹی کا زبردست انتظام تھا۔ گیٹ پر ہر وقت مسلح گارڈ موجود رہتی تھی۔ دروازے کے اوپر مشین گن پوسٹیں تھیں۔ قلعے کی دیوار کے اوپر بھی سنتری ڈیوٹیاں بدل بدل کر دن رات گشت کرتے رہتے تھے۔ اس اعتبار سے قلعے کے اندر کسی سویلین کا جانا ناممکن تھا وہ قلعے کے اندر چھوٹے موٹے کام کرنے والا نہ ہو۔ ایسے آدمی کے پاس بھی سیکورٹی کی طرف سے دیا گیا شناختی کارڈ ضرور موجود ہوتا ہوگا۔ یہ مشن مجھے مڈگھاٹ والی فوجی ٹرین اڑانے سے زیادہ پیچیدہ لگ رہا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد کریم بھائی واپس آگیا۔ وہ اپنے ساتھ ابلے ہوئے چاول جن میں آلوؤں کی بھاجی ملی ہوئی تھی اور چھ سات چھوٹے چھوٹے پھلکے رومال میں باندھ کر لایا تھا۔ جب اس نے صف پر بیٹھ

کر رومال کھولا تو میں نے ہنس کر کہا۔

"کریم بھائی تم جوگیوں کے حلیے میں ہو یہ بھوجن کہیں سے مانگ کر تو نہیں لائے؟"

کریم ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"نہیں بھائی ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ ہم ہندوستان کے مسلمان اپنے اس حق کے لئے تو دشمن حکومت سے لڑ رہے ہیں کہ ہمیں ہندو کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔"

میں نے معذرت پیش کی اور کہا۔

"بھائی میں تو مذاق کر رہا تھا"

وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ یہ تو میں سمندر کے کنارے اپنے جس ہائیڈ آؤٹ میں اپنے آپ کو سورج دیوتا کا پجاری سادھو ظاہر کر کے رہ رہا ہوں وہاں ہمارا آدمی جو لکڑی کا کام کرتا ہے میرے لئے لے کر آیا تھا۔ اس میں میرے لئے دوپہر اور رات دونوں ٹائم کا کھانا تھا۔ جب میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا کہ ہمارا ایک سرفروش کمانڈو بھی دوار کا پہنچ گیا ہے تو وہ کہنے لگا۔ میں اور کھانا لے آتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں اس وقت یہ ہم دونوں کے لئے کافی ہے رات کو دیکھا جائے گا۔"

ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ دوارکا میں کریم بھائی کے جو دو خاص آدمی تھے ان میں ایک جو ترکھان کا کام کرتا تھا اس کا نام طاہر علی تھا اور دوسرا آدمی جو دوارکا میونسپل کمیٹی کے چھوٹے موٹے ٹھیکے لیتا تھا اس کا نام رستم گوہا تھا۔ گوہا شاید اس کی ذات تھی۔ یہ ہندوؤں کی بھی ذات ہے۔ اس کے آباؤاجداد نے سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں بت پرستی چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ کریم بھائی بتانے لگا۔

"ان دونوں میں سے کسی کا بھی قلعے کے اندر آنا جانا نہیں ہے۔ لیکن لکڑی کا کام کرنے والے طاہر علی نے اس بات کا کہیں سے سراغ لگایا ہے کہ قلعے کے اندر جو اسلحہ اور فوجی ساز وسامان کی پیٹیاں جہاز سے اتار کرلائی گئیں تھیں وہ قلعے کی پہلی منزل میں دروازے کے ساتھ والے بڑے ہال کمرے میں لگا دی گئیں ہیں۔ گن شپ کوبرا ہیلی کاپٹر بھی ڈس اسمبل شکل میں بڑے بڑے کریٹوں میں بند اسی ہال کمرے میں رکھے ہوئے ہیں اور خیال ہے کہ دروازے کے ساتھ والے ہال کمرے میں جو ساز وسامان یا گولہ بارود رکھا جاتا ہے وہ بہت جلد آگے یونٹوں کو سپلائی کر دیا جاتا ہے"

میں بڑے غور سے کریم بھائی کی بات سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اس اطلاع کے مطابق ہمارے پاس کمانڈو آپریشن کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے۔"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ مگر بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

میں نے اسے کہا۔

"کریم بھائی جو آدمی قلعے کے اندر جا کر یہ خبر لایا ہے کہ کشمیر کے محاذ پر سپلائی کیا جانے والا فوجی ساز وسامان قلعے کے بڑے دروازے کے ساتھ والے ہال کمرے یا مال گودام میں رکھا ہوا ہے وہ کون ہے؟"

کریم بائی نے جواب دیا۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ یہ ہمارا اپنا آدمی رستم گوہا ہی ہے جو دوارکا میں چھوٹی موٹی ٹھیکداری کرتا ہے۔ اس کا استاد پارسی ٹھیکدار ہے۔ آج کل اسی بڑے ہال کمرے والے گودام میں بڑے بڑے نئے کریٹ یا لکڑی کے کھوکے تیار کروائے جا رہے ہیں۔ اس کا ٹھیکہ پارسی ٹھیکدار کو ملا ہوا ہے اور وہی اپنی نگرانی میں یہ کام کروا رہا ہے۔ میرے کہنے پر ایک روز رستم گوہا اپنے استاد

پارسی ٹھیکدار سے کسی بہانے ملنے چلا گیا تھا اور اسی نے یہ خبر لا کر مجھے دی تھی کہ بحری جہاز سے اتارے گئے مال کو وہاں سے لے جانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میری اس آدمی رستم گوہا سے ملاقات کرا دو میں اس سے دو ایک باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ شاید ہماری مشکل کا کوئی حل نکل آئے"

کریم بھائی بولا۔

"یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ تم آج ہی رات کو میری سمندر والی جگہ پر آجانا میں رستم گوہا کو وہاں بلوا لوں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہاری ساحل سمندر والی جگہ کہاں ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"میں تمہیں رات کو یہاں سے اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ یہ جھونپڑی والا کواٹر تو میں نے صرف تمہاری خاطر کرائے پر لیا تھا۔ میرا اصل ہائیڈ آؤٹ تو ساحل سمندر والی چٹانیں ہیں جہاں ایک کھوہ میں بیٹھ کر میں بظاہر پتیار کرتا ہوں۔ اور دن کے وقت ادھر ادھر کے لوگوں کو دکھانے کی خاطر باہر نکل کر ریت پر سورج دیوتا کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میں سورج کی پوجا کر رہا ہوں۔ یہ اس لئے کہ کسی کو مجھ پر شک نہ پڑے۔ بہرحال اس وقت تو میں اپنے آدمی رستم گوہا سے ملنے جا رہا ہوں تاکہ میں اسے رات کو سمندر والے ٹھکانے پر آنے کا کہہ دوں۔ پھر شروع رات کے وقت میں اندھیرا ہوتے ہی تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ ہمیں یہاں اپنے آدمیوں سے ملنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں انڈین فوج کی چھاؤنیاں یا ایمونیشن ڈپو ہیں وہاں کے

مسلمانوں کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔

اس کے بعد کریم بھائی چلا گیا۔ میں وہیں صف پر لیٹا رہا اور اپنے مشن کی تفصیلات پر غور کرتا رہا۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ آہستہ آہستہ تیار ہونا شروع ہو گیا تھا۔

شروع رات میں کریم بھائی آکر مجھے ساحل سمندر پر واقع اپنے ہائیڈ آؤٹ میں لے گیا۔ یہاں سمندر کا ساحل دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک جانب دوار کا شہر کی اور دوسری جانب دوار کا قلعے کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہاں ریت پر بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ ایک چٹان کی کھوہ میں کریم بھائی نے اپنا جوگیوں والا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ ایک کرمنڈل اور پانی سے بھرا ہوا پیتل کا کٹورہ موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوار کا میں کریم بھائی کا خاص آدمی رستم گوہا بھی آگیا۔ پتلا دبلا آدمی تھا۔ گجراتیوں کی طرح کرتہ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کاندھے کے ساتھ چھتری لٹک رہی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی۔

کریم نے میرا تعارف کرایا۔ اس نے السلام علیکم کہکر مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ بھی کریم بھائی کی طرح بیڑی پیتا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ تارے نکلے ہوئے تھے۔ سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ ہم وہیں اندھیرے میں چٹان کے پاس پتھروں پر بیٹھ گئے۔ میں نے رستم گوہا سے پوچھا۔

"بھائی! کیا تم دوبارا قلعے کے اندر اور خاص طور پر اس گودام کے اندر جا سکتے ہو جہاں جہاز سے فوجی سامان اتار کر رکھا گیا ہے۔"

رستم گوہا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"قلعے کے اندر فوجی کسی باہر کے آدمی کو نہیں جانے دیتے۔ میرا پارسی استاد چونکہ اندر کام کروا رہا ہے تو ایک بار اس سے ملنے اور اسلحہ وغیرہ کا سراغ لگانے چلا گیا تھا۔ اس کو بڑی مشکل سے مجھے ساتھ لے جانے کی اجازت ملی تھی۔"

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"رستم بھائی! یوں سمجھ لو کہ خواہ کتنی مشکل پیش آئے۔ خواہ تمہیں اس

کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے آنے والے دو دنوں کے اندر اندر تمہیں قلعے میں ہر حالت میں داخل ہونا ہو گا اور اس گودام میں جانا ہو گا جہاں جہاز سے اتارا ہوا فوجی سامان پڑا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے۔"

رستم گوہا اگرچہ دبلا پتلا سا آدمی تھا لیکن معلوم ہوا کہ اس کے سینے میں شیر دل مسلمانوں والا جذبہ کارفرما ہے۔ اس نے صرف دو یا تین سیکنڈ تک ماتھے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچا۔ پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"میں قلعے کے اندر چلا جاؤں گا۔ یہ بتائیں کہ مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہو گا"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"رستم بھائی میں تمہاری دلیری سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسا ہی دلیر بننا پڑے گا اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں قلعے کے اندر جا کر کیا کرنا ہو گا"

کریم اور رستم دونوں میرے قریب ہو گئے۔

میرا راز فاش ہو چکا تھا

میں نے رستم بھائی کو ساری بات سمجھا دی۔

میں نے اسے بتایا کہ کسی طریقے سے مجھے اسلحہ کے گودام کا نقشہ یا خاکہ معلوم ہونا چاہئے کہ میڈیم فیلڈ گنوں کے کریٹ کہاں پڑے ہیں۔ کوبرا ہیلی کاپٹروں کے ڈسیمبل کریٹ گودام میں کس جگہ رکھے ہیں۔ گودام میں گولا بارود کا ذخیرہ بھی ہے یا نہیں۔ رات کے وقت وہاں گارڈ ڈیوٹی کی کیا پوزیشن ہوتی ہے اور کیا گودام کی عقبی سمندر کو لگنے والی دیوار میں کوئی روشندان ہے یا نہیں ہے۔ یہ اور دوسری ساری متعلقہ تفصیل سمجھاتے ہوئے میں نے رستم گوہا (جس کو اب میں رستم بھائی ہی کہوں گا) سے کہا۔

"رستم بھائی! یہ تفصیل مجھے جیسے بھی ممکن ہو کل شام تک ضرور مل جانی چاہئے۔ یہ کام تمہیں ہنگامی بنیادوں پر کرنا پڑے گا"

کریم بھائی بھی رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جیسے بھی ہو اپنے پارسی استاد کے ساتھ تم خود کل قلعے کے اندر چلے جاؤ۔ اور خود اسلحہ کے گودام کا پورا نقشہ ذہن میں تیار کر کے لاؤ۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

رستم بھائی اندھیرے میں ہماری طرف دیکھ رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں بھی تھا کہنے لگا۔

"میں آخری حد تک کوشش کروں گا بس یوں سمجھ لیں کہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ میں کل دوپہر کے بعد آپ کو اسی جگہ رپورٹ کروں گا۔"

جب رستم بھائی چلا گیا تو کریم مجھ سے کہنے لگا۔

"مجھے پوری امید ہے کہ رستم یہ کام کر گزرے گا"

میں نے کہا۔

"دوست! وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہاتھ آیا ہوا شکار ہاتھ سے نکل جائے۔"

کریم بھائی جو اس وقت بھی ہندو سادھو کے بھیس میں تھا کہنے لگا۔

"رستم بڑا ہوشیار اور اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ یہ ہمیں مایوس نہیں کرے گا۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنی جھونپڑی والے کواٹر میں چلے جاؤ۔ جس وقت بھی رستم کوئی خبر لے کر آیا میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم وہاں سے مت ہلنا"

میں واپس جھونپڑی نما کواٹر میں آگیا۔

رات گزر گئی۔ اگلے روز میں وہیں جھونپڑی میں ہی رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل کر دوارکا کے بازاروں کا ایک چکر لگایا۔ میں بھی جینی سادھوؤں والے بہروپ میں تھا۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں میرے ایسے کئی سادھو لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک ڈھابے میں بیٹھ کر تھوڑا بہت کھانا کھایا اور واپس اپنے جھونپڑی نما کواٹر میں آگیا۔ دوپہر کے وقت مجھے دور سے کریم بھائی اور رستم بھائی آتے دکھائی دیئے۔ میں جھونپڑی کے باہر ہی جھوٹ موٹ کا آسن جمائے بیٹھا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔

دونوں اندر آگئے۔ کریم بھائی نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ باہر کوئی آدمی نہیں تھا۔ جب دونوں میرے قریب صف پر بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا۔

"کیا کچھ کام بنا؟"

کریم بھائی کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"معاملہ مشکل نظر آتا ہے"

میں نے رستم بھائی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کیا قلعے میں جانے کا کوئی سبب نہیں بن سکا؟"

رستم بھائی کہنے لگا۔

"جام نگر کے فوجی گیریزن سے ملٹری انٹیلی جینس کا کوئی کیپٹن ہری ناتھ اسلحہ کے ذخیرے کی چیکنگ اور سیکورٹی کے انتظامات کا جائزہ لینے آرہا ہے۔ اس وجہ سے قلعے کے اندر باہر کے آدمیوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ صرف میرا پارسی استاد اور اس کے دو کاریگروں کو اندر جانے کی اجازت ہے۔ باہر سے جو صفائی کرنے والے کبھی کبھی بلا لئے جاتے تھے ان کو بھی روک دیا گیا ہے۔"

اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لہرا گیا۔ رستم بھائی نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ ملٹری انٹیلی جینس کا کیپٹن ہری ناتھ جام نگر سے کب یہاں پہنچے گا؟"

رستم بھائی بولا۔

"میرے پارسی استاد نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ دو ایک دن میں یہ آفیسر قلعے میں پہنچ جائے گا۔"

کریم بھائی نے تجسس کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"تم کیپٹن ہری ناتھ کے بارے میں اتنا کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔"

پھر میں نے رستم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"رستم بھائی! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مجھے ملٹری انٹیلی جینس کے اس کیپٹن

ہری ناتھ کے جام نگر سے چلنے اور دوارکا پہنچنے کا صحیح وقت اور تاریخ معلوم ہو جائے؟ اور اس بات کا بھی سراغ لگ سکے کہ وہ جام نگر سے فوجی طیارے میں آرہا ہے یا فوجی گاڑی میں آرہا ہے۔ یہ ساری تفصیل بہت ضروری ہے۔"

رستم بھائی کہنے لگا۔

"میں آج شام اپنے پارسی استاد سے مل کر یہ سب کچھ کسی طریقے سے معلوم کر لوں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ اسے بھی یہ ساری باتیں معلوم ہوں"

میں نے کہا۔

"وہ قلعے کے اندر اپنے مزدور لے جا کر ان سے کام کرواتا ہے مجھے یقین ہے کہ اسے ملٹری انٹیلی جینس کے کیپٹن کی آمد کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گا۔ تم اس سے مل کر پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو"

کریم بھائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں نے کمانڈو آپریشن کی حکمت عملی صورت حال کے مطابق بالکل بدل دی تھی۔ جب رستم بھائی دوسرے دن صبح آنے کا کہکر چلا گیا تو کریم بھائی مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کس قسم کا پلان بنا رہا ہوں۔ جب میں نے اسے اپنے خفیہ پلان کی تفصیلات بتائیں تو وہ پہلے تو بہت خوش ہوا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"اس میں خطرہ بہت زیادہ ہے۔ یہ تلوار کی دھار پر ننگے پاؤں چلنے والی سکیم ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہمارے منصوبے کو خاک میں ملا سکتی ہے"

میں نے کریم بھائی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! مجھے سب سے پہلے اللہ پر اور اس کے بعد اپنی کمانڈو ٹریننگ پر پورا بھروسہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کیپٹن ہری ناتھ فوجی طیارے کے ذریعے آجائے۔ اگر وہ سڑک کے روٹ پر سے آرہا ہو گا تو یقین کرو میرا منصوبہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا"

رات گئے تک میں اور کریم بھائی اپنے نئے کمانڈو آپریشن کی تمام جزئیات پر غور

وفکر کرتے رہے۔ منصوبہ پیچیدہ ضرور تھا۔ اس میں ہر قدم پر راز کے فاش ہو جانے اور میرے پکڑے جانے کا خطرہ تھا لیکن دوسری صورت میں تیر ٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھتا تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب کریم بھائی مجھے اپنے جھونپڑی نما کوارٹر میں چھوڑ کر اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چلا گیا۔ صبح بہت جلدی آگیا۔ ابھی پو پھٹ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی مجھے جگا دیا۔ کہنے لگا۔

"میں رات کو سو نہیں سکا۔ یہی خیال آتا رہا کہ اگر ہمارا منصوبہ ناکام ہو گیا تو یہ جتنے کوبرا ہیلی کاپٹر' میڈیم فیلڈ گنیں اور گولہ بارود جہاز میں آیا ہے اور دوارکا کے قلعے میں ڈمپ ہے یہ سارے کا سارا کشمیری مجاہدین پر استعمال ہو گا"

میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"دوست! ایمونیشن سے بھری ہوئی جو گاڑی ہم نے مڈگھاٹ کے سٹیشن پر اڑائی تھی اس کے بارے میں بھی ہم اسی طرح سوچتے تھے۔ مگر اس کا جو حشر ہوا ہے وہ ساری دنیا کو معلوم ہے"

میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اگر ہم نے عقل مندی' ہوشیاری اور ثابت قدمی سے کام لیا تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ یہ بتاؤ کہ رستم بھائی سراغرسانی کر کے کب آرہا ہے"

"میرا خیال ہے وہ دوپہر سے پہلے نہیں آئے گا۔ اسے اپنے پارسی ٹھیکدار استاد کے گھر جا کر ساری تفصیلات معلوم کرنی ہوں گی۔ دعا کرو کہ پارسی ٹھیکدار کو یہ ساری باتیں معلوم ہوں"

دوپہر تک کریم بھائی میرے پاس ہی رہا۔ ہم دونوں سادھو جوگیوں کے بھیس میں جھونپڑی کے باہر بیٹھے وہاں سے گذرنے والوں کو دکھانے کے لئے منکوں کی مالا کا جاپ کرتے رہے اور ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے رہے۔

دوپہر کے بعد دور سے ہمیں رستم بھائی آتا نظر آیا۔ کریم بھائی بولا۔

"رستم آگیا ہے۔ ہمیں جھونپڑی کے اندر چلے جانا چاہئے"

ہم ایک دوسرے کے پیچھے اٹھ کر جھونپڑی کے اندر آگئے۔ تھوڑی دیر بعد رستم مائی بھی سیدھا جھونپڑی میں آیا اور ہمارے پاس صف پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف والیہ نظروں سے دیکھا۔ کریم بھی خاموش تھا۔ رستم بھائی نے کہا۔

"مجھے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ جو ملٹری انٹیلی جنیس کا کیپٹن ہری ناتھ جام نگر کے فوجی گیریزن سے چیکنگ کے لئے آرہا ہے یہ پہلے راجپوت رائفلز کی سگنل کور میں تھا۔ دوسری بات جو خاص طور پر میں نے معلوم کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کیپٹن پہلی با دوارکا فورٹ میں چیکنگ کے لئے آرہا ہے۔ اس سے پہلے وہ فورٹ میں کبھی نہیں آیا۔ تیسری بات یہ معلوم کی ہے کہ کیپٹن ہری ناتھ آج اور کل کا دن چھوڑ کر پرسوں دوپہر کے بعد فوجی جیپ میں اپنے اردلی کے ساتھ جام نگر سے چلے گا اور ماہم پوری اور گادرا سے ہوتا ہوا شام ہونے سے پہلے پہلے دوارکا فورٹ پہنچ جائے گا۔"

میرے لئے یہ معلومات بہت تھیں۔ حقیت یہ ہے کہ مجھے اتنی توقع ہی نہیں تھی جتنی معلومات رستم بھائی حاصل کر کے لے آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے رستم کو بھی اپنے کمانڈو آپریشن سے آگاہ کر دیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کیپٹن ہری ناتھ قلعے میں پہلی بار آرہا ہے اور اسے وہاں کسی فوجی افسر یا جوان نے نہیں دیکھا؟"

رستم بھائی کہنے لگا۔

"میرے پارسی استاد نے اپنی طرف سے جو کھوج لگایا ہے اس کے مطابق تو یہ فوجی افسر پہلی بار دوارکا آرہا ہے اور اسے وہاں کسی افسر یا جوان نے آج تک نہیں دیکھا"

اس نقطے کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ فکر تھا۔ کیونکہ اسی ایک نقطے پر میرے کمانڈو آپریشن کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار تھا۔ میں نے رستم سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں اس بارے میں تم ایک بار پھر پوری طرح سے سراغرسانی کرلو کہ یہ ہندو کیپٹن دوارکا فورٹ کے فوجی جوانوں اور افسروں کے لئے بالکل نیا چہرہ ہے۔

کریم بھائی نے بھی رستم سے یہی کہا کہ وہ پوری طرح اس بارے میں تسلی کرے۔ رستم بولا۔

"پھر میں کل شام کو ہی اس کی بابت آپ کو کچھ بتا سکوں گا"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تم کل شام کو یہاں آکر بتا دینا۔ تب تک ہم دوسری ضروری تیاریاں کرتے ہیں۔ دو دن باقی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹارگٹ کا ہم نے تعین کر لیا ہے۔ شکار کو نشانے کی زد میں لے لیا ہے۔ اب صرف ٹریگر ہی دبانا ہے۔"

جب رستم دوسرے دن شام کو آنے کا کہکر چلا گیا تو میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"کریم بھائی ہمیں ابھی چل کر جام نگر سے دوارکا آنے والی سڑک کی ریکی کرنی ہوگی اس کا جائزہ لے کر دوارکا کے قریب کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں بڑی سڑک میں سے کوئی چھوٹی سڑک نکل کر درختوں جھاڑیوں یا کسی بھی طرف جاتی ہو"

کریم بھائی نے کہا۔

"یہ ساری سڑک میری دیکھی ہوئی ہے۔ ماہم پوری قصبہ آدھے راستے میں ہے۔ گادرا کا قصبہ دوارکا سے سڑک پر بیس تیس میل ہی ہے ہم یہاں کوئی جگہ تلاش کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں یہ کام ابھی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور ضروری کام بھی ہے جو صرف تم ہی کرسکتے ہو اور تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ وہ کام یہ ہے کہ کہیں سے انڈین ملٹری پولیس کے جوانوں کی پوری وردیاں چاہئیں دو پستول بھی بیلٹ کے ساتھ ہوں گے خواہ وہ نقلی ہی کیوں نہ ہوں۔ میں اس کمانڈو آپریشن میں فائرنگ نہیں کروں گا۔ تمہارے پاس ایک چاقو ہونا چاہئے۔ مجھے چاقو کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ انٹیلی جینس کے کیپٹن ہری ناتھ کی وردی خون آلود نہیں ہونی چاہئے۔"

کریم بھائی کچھ دیر غور کرنے کے بعد بولا۔

"فوجی وردیاں یہاں دوارکا میں نہیں ملتیں۔ یہ ہمیں جام نگر کے پرانے بازار سے مل جائیں گی اس کے لئے میں آج ہی جام نگر چلا جاؤں گا کل صبح دونوں وردیاں فوجی یونٹ اور ملٹری پولیس کی خاص ٹوپیاں جن کا انڈین ملٹری پولیس میں اسی سال رواج ہوا ہے لے کر واپس آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اب یہاں سے دوارکا جام نگر سڑک پر چلتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ اب ہمارا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے"

صورت حال کی ایمرجنسی اور نزاکت کا کریم بھائی کو بھی پورا احساس تھا۔ ہم اسی وقت جھونپڑی سے نکلے اور اسی سڑک کی طرف چل پڑے جو دوارکا سے جام نگر کی طرف جاتی تھی۔ جن لوگوں نے یہ علاقہ دیکھا ہوا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ یہ علاقہ گھنے جنگلوں والا نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر ڈیلٹے کا دلدلی علاقہ ہے۔ دوارکا کے تین طرف سمندر ہے۔ صرف ایک طرف خشکی ہے۔ شہر سطح سمندر کا پانی اندر تک آگیا ہے۔ کہیں ریت ہی ریت ہے اور کہیں دلدلی میدان شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں جگہ جگہ سمندری جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ جو سڑک جام نگر کو جاتی ہے وہ ساحل سے کافی ہٹ کر ہے مگر جوار بھاٹا کی راتوں میں سمندر یہاں تک بھی مار کرتا ہے اور سڑک ٹریفک کے لئے بند ہو جاتی ہے۔ یہ بات میرے منصوبے کو تقویت پہنچاتی تھی۔

ہم رکشے میں آئے اور سڑک کے شروع میں اترنے کی بجائے رکشے کو لے کر گادرا کی طرف چل دیئے۔ میں سڑک کی دونوں جانب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شہر سے کوئی تین چار میل باہر نکلنے کے بعد اچانک ایک جگہ مجھے بڑی سڑک میں سے ایک چھوٹی سی سڑک ناریل اور تاڑ کے جھنڈوں کی طرف جاتی نظر آئی۔ میں نے کریم کو اشارہ کیا اس نے وہیں رکشا رکوا کر اسے پیسے دیئے اور واپس بھیج دیا۔ میں اس جگہ پر آگیا جہاں بڑی سڑک میں سے ایک چھوٹی سڑک نکلتی تھی۔ جام نگر کو جاتی بڑی سڑک کوئی اتنی بڑی سڑک نہیں تھی بقول کریم بھائی کے ماہم پوری سے آگے جا کر یہ سڑک کشادہ ہو جاتی تھی۔ یہاں سے یہ کچھ خستہ حال بھی تھی۔ دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ناریل اور تاڑ کے درخت آجاتے تھے۔ جو چھوٹی سڑک اس میں سے نکل رہی تھی وہ درختوں کے جھنڈوں اور جھاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے آس پاس کے ماحول کا پورا جائزہ لیا اور کریم بھائی سے کہا۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک بیل گاڑی اور ایک ٹرک ضرور گذرا تھا۔ ہم واپس دوارکا آگئے۔ کریم بھائی اس شام کو جام نگر کے لئے روانہ ہو گیا۔ جام نگر میں ایک بازار ہے جس کا نام پرانا بازار ہے۔ اس بازار میں دنیا جہان کی ہر شے مل جاتی ہے۔ کریم بھائی نے یہاں سے وہ سارا سامان اور ملٹری پولیس کی گہرے سبز رنگ کی وردیاں اور ٹوپیاں خریدیں جو اس زمانے میں بھارتی ملٹری پولیس میں جاتی تھیں۔ فوجی بوٹ اور بیلٹ اور ایک نقلی پستول جو ہولسٹر میں بند تھا اور بیلٹ کے ساتھ لگا تھا اور اپنے لئے ایک چاقو بھی خرید لیا۔ وہ اسی رات واپس دوارکا پہنچ گیا۔ مگر مجھے دوسرے دن صبح کے وقت آکر ملا۔ کہنے لگا۔

"میں نے سارا سامان لا کر اپنے ہائیڈ آؤٹ میں رکھ لیا ہے۔"

اصل میں پرانا بازار ایک طرح کا لنڈا بازار بھی تھا۔ جس طرح ہمارے لنڈے بازار میں استری کی ہوئی پرانی خاکی فوجی پتلونیں قمیضیں اور فوجیوں کے کاندھوں پر لگائے جانے

والے فیتے اور بٹن وغیرہ مل جاتے ہیں اسی طرح یہ چیزیں پرانے بازار سے بھی مل جاتی تھیں۔ میں نے اسے پاس بٹھالیا اور کہا۔

"کریم بھائی اب تمہیں احمد آباد بھی جانا ہو گا۔ وہاں سے ٹیبلٹ بم کی گولیاں اور میگنٹ بم بنانے کے لئے ضروری سامان بھی لانا ہے۔ یہ سارا سامان تم نے اپنے احمد آباد والے ویران کواٹر کے تہہ خانے میں رکھا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے کمانڈو آپریشن کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے۔"

کریم بھائی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

"یہ سارا سامان میں اپنے ساتھ ہی لے کر دوارکا آیا تھا۔ تم نے تو اس کا ذکر نہیں کیا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اس کی ضرورت پڑے گی۔ یہ سامان میں نے اپنے ساتھی رستم بھائی کے مکان پر رکھا ہوا ہے۔"

میں نے بے اختیار ہو کر کریم بھائی کا ہاتھ چوم لیا۔ واقعی یہ شخص انتہائی ذمے دار ماسٹر سپاہی تھا۔ میں نے اسے کہا کہ دو کام بڑے ضروری ہیں جو ہمیں کرنے ہوں گے۔

"پہلا یہ کام ہے کہ ہمیں کسی پوشیدہ جگہ پر بیٹھ کر میگنٹ ٹائم بموں کی طاقت کو کم از کم تین گنا زیادہ طاقتور کرنا ہو گا۔ دوسرے ٹیبلٹ بم کی گولیوں کو سیال شکل دے کر اس کی مدت اور معدے میں جا کر دھماکے سے پھٹنے کے دورانیہ کو چار پانچ منٹ سے بڑھا کر دس پندرہ منٹ کرنا ہو گا"

کریم بھائی بھی میری طرح ہائی ایکسپلوسیوز کا ماہر تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کام بھی جلد ہو جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ اگر کسی شے کی ضرورت پڑی تو دوارکا شہر کے ایک بازار میں تیزاب اور قلمی شورہ وغیرہ ہر شے مل جاتی ہے۔"

سہ پہر کے وقت رستم گوہایا رستم بھائی نے آنے کے لئے کہا ہوا تھا۔ وہ بھی آگیا۔ اس نے آکر اس بات کی تصدیق کر دی کہ ملٹری انٹیلی جنیس کا کیپٹن ہری ناتھ پہلی ہی بار دوارکا فورٹ کے اسلحہ کے ذخیرہ کا دورہ کرنے اور سیکورٹی کی چیکنگ کے لئے آرہا ہے۔

اس تصدیق نے میرے کمانڈو مشن کے بلیو پرنٹ کو مکمل کر دیا۔ اب اس پر عمل کرنا ہی باقی تھا۔ رستم نے کیپٹن ہری ناتھ کے جام نگر سے بذریعہ سڑک روزانہ ہونے کی جو تاریخ بتائی تھی اس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اپنے شیڈول کے مطابق وہ دوسرے روز تیسرے پہر دوارکا فورٹ پہنچنے والا تھا۔

کریم بھائی میری سکیم سے پوری طرح واقف تھا۔ اس بڑے اہم مگر خطرناک کمانڈو آپریشن میں اسے میرے ساتھ رہنا تھا۔ رستم بھائی کو ہم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنے کمانڈو مشن کے لئے ہمیں ایک ملٹری ایم پی جیپ کی بھی ضرورت تھی مگر اس کا انتظام ہونا مشکل تھا۔ میں نے ملٹری جیپ کے بغیر ہی پوری سکیم ذہن میں تیار کر لی تھی۔

اب ہمیں اسپرو ٹیبلٹ قسم کے چھوٹے مگر انتہائی دھماکہ خیز آتشیں بم تیار کرنے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ حسن گل نے مجھے کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہائی ایکسپلوسویز کی بھی پوری تربیت دی تھی۔ اسپرو ٹیبلٹ بم تو پندرہ کے پندرہ ابھی تک ویسے ہی کریم بھائی کے احمد آباد والے کوارٹر کے تہہ خانے میں پڑے تھے۔ اس کا نسخہ بھی وہیں پڑا تھا۔ لیکن ہمیں طاقتور بم بنانے کا فارمولا آتا تھا۔

ہم نے رستم بھائی کو واپس بھیج دیا اور خود بازار میں کیمیکلز وغیرہ کا ضروری سامان خریدنے چل دیئے۔ میں آپ کو اس کی پوری تفصیل نہیں سناؤں گا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہم نے آدھا دن اور آدھی رات لگا کر پندرہ انتہائی طاقتور دھماکہ خیز آتش گیر بم تیار کر لئے۔ یہ بم چیونگ گم کی شکل میں تھے اور میں نے اسے کھانسی کی گولیوں والے چوکور پیکٹ میں بند کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ کریم بھائی بھی میرے ساتھ سمندری چٹان والی ہائید آؤٹ میں ہی تھا۔ تمام متعلقہ سامان ہم وہاں ساتھ لے آئے تھے۔ ٹھیک دو بجے ہم نے کمانڈو آپریشن کی تیاری شروع کر دی۔ میری ڈاڑھی مونچھ جو بڑھی ہوئی تھی انہیں بڑے مناسب اور شائستہ حد تک ترشوا لیا تھا۔ بال جو گردن تک آئے ہوئے تھے ان کی بھی ایسی حجامت بنوالی تھی جیسی فوجی افسروں کی ہوا کرتی ہے۔ ہم نے ملٹری پولیس کے جوانوں کی وردی پہن لی۔ سر پر ملٹری پولیس کی سرخ

بیرٹ کیپ رکھ لی۔ ہاتھوں میں سفید دستانے پہن لئے۔ بازوؤں کے ساتھ ایم پی M.P کے سرخ بلے لگا لئے۔ ہم دنوں کی بیلٹ کے ساتھ پستول کے ہولسٹر لگے ہوئے تھے۔ میرے ہولسٹر میں نقلی پستول تھا جب کہ کریم بھائی کے ہولسٹر میں اصلی بھرا ہوا پستول تھا۔ یہ ہنگامی صورت حال کے لئے تھا۔ کریم کو میں نے ایک کمانڈو چاقو بھی دے دیا تھا۔

کریم بھی ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ میری پتلون کی جیب میں دو بڑی اہم چیزیں تھیں۔ ایک ڈبی جس میں پندرہ چیونگ گم کی گولیوں کی طرح کے دھماکہ خیز بم تھے اور ایک نائیلون کی مضبوط باریک رسی کا ٹکڑا تھا۔ میں نے اپنے پاس اصلی پستول یا کمانڈو چاقو اس لئے نہیں رکھا تھا کہ مجھے یہ چیزیں اپنے کمانڈو آپریشن میں کم از کم کیپٹن ہری ناتھ پر استعمال نہیں کرنی تھیں۔ ہمارے پاؤں میں فوجی بوٹ تھے جس کے اندر پتلون کے پائنچے دے کر ہم نے تسمے باندھ لئے۔ جب ہم پوری طرح تیار ہو کر ہائیڈ آؤٹ سے باہر نکلے تو ہم پورے انڈین ملٹری پولیس کے فوجی جوان لگ رہے تھے۔

ہم ساحلی چٹانوں کے پیچھے سے ہو کر بڑی سڑک پر آ گئے۔ یہاں ہم نے ایک ٹیکسی لی اور دوارکا سے جام نگر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ سڑک پر آ کر ہم اپنے سپاٹ سے کوئی آدھ فرلانگ پیچھے ہی اتر گئے۔ یہاں سے ہم پیدل چلتے جام نگر دوارکا روڈ پر اس جگہ آ گئے جہاں سے ایک پتلی سڑک نکل کر تاڑ ناریل کے درختوں اور اونچی اونچی جھاڑیوں کی طرف چلی گئی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ہمیں کمانڈو ایکشن شروع کرنا تھا۔ جہاں ہمیں اسلام، پاکستان اور کشمیری مجاہدین کے لئے اپنی جان کی بازی لگانی تھی۔ اس وقت ہمیں اگر کوئی فکر یا پریشانی تھی تو صرف اس بات کی تھی کہ کہیں ملٹری انٹیلی جنیس کے کیپٹن ہری ناتھ نے اپنا شیڈول نہ تبدیل کر لیا ہو اور وہ نہ آئے۔ میں نے بھی اس کیپٹن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ بس اندازے سے مجھے اس کی شناخت کرنی تھی اور فوجی جیپ دیکھ کر اسے روکنا تھا۔

اس دوران سڑک پر سے ایک فوجی ٹرک گذرا جو جام نگر کی طرف سے آ رہا تھا۔ اس میں بیٹھے ہوئے انڈین فوجیوں نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ ہم نے بھی ہاتھ

ہلا کر جواب دیا۔ وہ ہمیں انڈین ملٹری پولیس کے جوان سمجھ رہے تھے۔ فوجی ٹرک کے ڈرائیور نے ایم پی کے دو جوانوں یعنی ہمیں دیکھ کر ٹرک روکنا چاہا تھا مگر ہم نے اشارہ کیا کہ گذر جاؤ۔ وہ یہی سمجھے تھے کہ ہم چیکنگ کے لئے کھڑے ہیں۔ اسی وقت دن کی روشنی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کیپٹن ہری ناتھ کی جیپ کو اگر آنا ہے تو وہ شام کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے آجائے۔ اندھیرا ہو جانے پر جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن ہوں گی اور ان کی روشنی میں فوجی جیپ کی دور سے پہچان مشکل ہو گی۔ ہم سڑک کی ایک جانب کھڑے تھے۔ کریم بھائی خاموش تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ ہماری نظریں جام نگر کو جاتی سڑک پر لگی تھیں۔ جام نگر کی طرف سے لاریاں بیل گاڑیاں اور ٹرک وغیرہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے گذر جاتے تھے اس کے بعد سڑک کچھ وقت کے لئے بالکل خالی ہو جاتی تھی۔ کریم کہنے لگا۔

"کہیں کیپٹن نے شیڈول تو نہیں بدل لیا؟"

میں نے دور سڑک پر نگاہیں جما رکھی تھیں۔ میں نے اسی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر وہ کل یا پرسوں آنے والا ہو گا تو ہم کل یا پرسوں بھی اس جگہ اس کے سواگت کو موجود ہوں گے۔ بس یہ دعا کرو کہ وہ ٹرین یا ہوائی جہاز سے نہ آجائے ایسی صورت میں ہمارا کمانڈو مشن فیل ہو جائے گا۔"

دن کی روشنی مزید کم ہو گئی تھی۔ سورج دوارکا شہر کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ میں مسلسل سڑک پر دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے دور سڑک پر ایک سیاہ دھبہ سا ابھرتا نظر آیا۔ یہ دھبہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا۔ میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"دوست! الرٹ ہو جاؤ"

کریم بھائی سڑک کی دوسری جانب جا کر بالکل میرے متوازی فوجی جوانوں کی طرح اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ میری نظریں مسلسل اس دھبے کو دیکھ رہی تھیں جو دور تک سیدھی سڑک پر اب واضح ہو گیا تھا۔ یہ فوجی جیپ تھی۔ میں نے اپنے دستانے والے ہاتھوں کی انگلیوں کو ورزش کے انداز میں دو تین بار حرکت دی اور اٹن شن ہو گیا۔ میں نے کریم

بھائی سے کہا۔

"ٹارگٹ قریب آرہا ہے۔ میں بات کروں گا او کے"

"او کے"

کریم نے جواب میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

فوجی جیپ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا مجھے ایک فوجی افسر اور پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا دوسرا فوجی صاف نظر آرہا تھا۔ میں جلدی سے سڑک کے درمیان میں آگیا اور ٹریفک سارجنٹ کی طرح بایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر دائیں ہاتھ سے چھوٹی سڑک کی طرف اشارہ دیا۔ فوجی جیپ سڑک سے اتر کر اس جگہ کھڑی ہو گئی جہاں سے چھوٹی سڑک بڑی سڑک سے نکل کر ناریل کے جھنڈوں اور اونچی جھاڑیوں کی طرف جاتی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر انڈین فوج کے کیپٹن کی ہری وردی میں ملبوس ایک درمیانے قد کاٹھ کا آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے انگریزی میں چلا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جوان؟"

میں کوئیک مارچ کرتا جیپ کے پاس گیا۔ ایڑیاں جوڑ کر بڑے زور سے کیپٹن کو سلیوٹ مارا۔ کریم بھائی بھی میرے پیچھے پیچھے اسی طرح قواعد کرتا آیا اور اس نے بھی زور سے سلیوٹ کیا۔ میں نے کہا۔

"سر! مجھے دوارکا گیریزن کے آفیسر کمانڈنگ صاحب نے آپ کو لینے بھیجا ہے۔ سر آپ کا شبھ نام کیپٹن ہری ناتھ ہے نا؟"

کیپٹن ہری ناتھ نے بیزاری سے کہا۔

"میں کیپٹن ہری ناتھ ہی ہوں مگر ادھر تم جانگلیوں نے ہمیں کس لئے روکا ہے؟"

میں نے ایک بار پھر ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ مارا اور کہا۔

"سر! آگے سڑک پر سمندر کی باڑ کا پانی آگیا ہے۔ سڑک ڈوب گئی ہے۔ میں آپ کو گائیڈ کروں گا سر۔ ہم اس چھوٹی سڑک سے ہو کر جائیں گے سر!"

کیپٹن ہری ناتھ نے سخت بیزاری کے انداز میں سر ہلایا اور پوچھا۔

"تمہاری جیپ کہاں ہے؟"

میں نے فوراً اٹن شن ہو کر جواب دیا۔

"سر! آگے بڑی سڑک پر کھڑی ہے سر"

کیپٹن ہری ناتھ نے اپنے اردلی سے کہا۔

"ایک جوان کو پیچھے بٹھالو۔"

اور میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تم یہاں آجاؤ۔ جلدی کرو۔ ڈبل سے"

ہم ڈبل سے چلتے جیپ میں آکر بیٹھ گئے۔ کریم بھائی پچھلی سیٹ پر اردلی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں اگلی سیٹ پر کیپٹن ہری ناتھ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے جس زاویے سے اٹیک کرنا تھا وہ زاویہ بنا لیا تھا۔ کریم بھائی کی طرف دھیان دینے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ کیپٹن ہری ناتھ نے سخت بددلی کے ساتھ انگریزی میں گالی دیتے ہوئے جیپ چھوٹی سڑک پر ڈالی اور اس کا رخ ناریل کے درختوں کی طرف کر دیا۔ میں نے صرف آدھے سیکنڈ کے لئے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ پیچھے بڑی سڑک خالی ہے کہ نہیں۔ بڑی سڑک شام کے دھندلکے میں خالی پڑی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کیپٹن ہری ناتھ کا پستول ہولسٹر میں بند اس کی بیلٹ کے ساتھ لگا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا پلک جھپکنے میں کرنا تھا۔ اور کیپٹن ہری ناتھ پلک جھپکنے میں ہولسٹر میں سے پستول نکال کر مجھ پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔

میرے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں پھڑپھڑانے لگی تھیں۔ ٹارگٹ میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ سوچنے کا وقت گذر چکا تھا۔ اب ایکشن کا وقت تھا۔ ایک بجلی کو اچانک چمکنا تھا او کیپٹن ہری ناتھ پر قہر بن کر ٹوٹ پڑنا تھا۔ جیسے ہی کیپٹن ہری ناتھ نے جیپ کو چھوٹی سڑک پر بائیں جانب موڑا ایک خاموش بجلی چمکی۔ اور کیپٹن ہری ناتھ کی گردن میرے فولاد بازو کے شکنجے میں تھی۔ گردن کو شکنجے میں لینے اور زبردست جھٹکے سے گردن کے منکے ک

توڑ دینے کا عمل ایک ہی تھا۔ مجھے گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی بڑی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ جیپ بے قابو ہو کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس دوران کریم بھائی بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ کیپٹن ہری ناتھ کا بے جان سر ڈرائیونگ وہیل پر ٹکا تھا۔ اس کے اردلی کا سر کریم بھائی کی گود میں جھکا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا شاید اسے کمانڈو چاقو استعمال کرنا پڑے۔ مگر اس نے بھی ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کمانڈر کی طرح اردلی کی گردن توڑ کر اسے بے آواز موت مار دیا تھا۔ ہم چھلانگیں لگا کر جیپ سے باہر نکل آئے۔ میں نے کریم سے کہا۔

"لاشوں کو جھاڑیوں میں لے چلو"

ہم کیپٹن ہری ناتھ اور اس کے اردلی کی لاشوں کو گھسیٹ کر جھاڑیوں میں لے گئے۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ملٹری پولیس والی وردی اتار ڈالی۔ اس دوران کریم بھائی نے کیپٹن ہری ناتھ کی وردی اتار دی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کیپٹن کی وردی پہن لی۔ اس کی فوجی پتلون مجھے ذرا چھوٹی تھی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ اپنے ملٹری پولیس والے فوجی بوٹ نہ اتارے اس طرح فوجی بوٹوں کا اوپر والا حصہ میرے ٹخنوں کے اوپر پتلون کے چھوٹے پائینچوں تک چلا گیا۔ درختوں میں شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں نے کیپٹن کی بش شرٹ کی تلاشی لی۔ ایک بٹوہ نکلا۔ اس میں اس کی پاس بک اور آئی ڈی کارڈ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ آئی ڈی کارڈ پر اس کی تصویر نہیں لگی ہوئی تھی۔ کچھ انڈین کرنسی تھی۔ ہندی میں لکھا لفافے سمیت ایک خط تھا جس کو پڑھنے کی مجھے فرصت نہیں تھی۔ جب میں پورا کیپٹن ہری ناتھ بن گیا تو میں نے اپنی پہلی وردی کی جیب میں سے چیونگ گم دھماکہ خیز بموں کی ڈبی نکال کر پتلون کی پچھلی جیب میں سنبھال کر رکھی اور کریم بھائی سے کہا۔

"ان لاشوں اور جیپ کا اس جگہ رہنا ٹھیک نہیں۔ صبح لوگ انہیں دیکھ سکتے ہیں"

کریم بھائی نے ایک طرف اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"انہیں لے کر ادھر چلتے ہیں۔ وہاں ایک جگہ ہے"

ہم نے دونوں لاشوں کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور جیپ سٹارٹ کر کے اس طرف جھاڑیوں میں چلے جدھر کریم بھائی نے چلنے کے لئے کہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جھاڑیاں ختم ہو گئیں اور شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ایک تالاب سا آگیا جس کی سطح پر چوڑے چوڑے پتوں والی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کریم بھائی نے وہیں جیپ رکوائی اور کہا۔

"یہ دلدلی تالاب ہے۔ اس میں پھینکی ہوئی لاشوں کی ہڈیاں بھی قیامت تک باہر نہ آسکیں گی۔"

ہم نے کیپٹن ہری ناتھ اور اس کے اردلی کی لاشوں کو دلدلی تالاب میں پھینک دیا اور وہاں کھڑے انہیں دیکھنے لگے۔ لاشیں آہستہ آہستہ بیلوں کے پتوں میں اترنے لگیں۔ اور دونوں لاشوں کو تالاب کی دلدل نے نگل لیا۔ ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ میں خود جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ کریم بھائی ملٹری پولیس کے سنتری کی وردی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جیپ بڑی سڑک پر آکر دوارکا شہر کی طرف روانہ ہوئی تو میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"تم اب واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں جا کر یہ وردی بدل کر دوبارہ سادھوؤں والا بھیس اختیار کرو گے۔ آگے جو بھی کرنا ہے مجھے خود ہی کرنا ہو گا۔ تم مجھ سے رابطہ قائم نہیں کرو گے۔ مجھے کچھ نہیں پتہ قلعے کے اندر جانے کے بعد کس قسم کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے جس ہندو کیپٹن ہری ناتھ کو قتل کرنے کے بعد اس کی وردی پہنی ہوئی ہے اس کے آگے پیچھے کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں انٹیلی جینس کا کیپٹن ہری ناتھ ہوں۔ جام نگر ہیڈ کوارٹر سے دوارکا فورٹ میں جہاز سے لائے ہوئے فوجی ساز سامان اور گولا بارود کی چیکنگ کرنے آیا ہوں۔ اس سے پہلے میرا تعلق راجپوت رائفلز کی سگنل کور سے تھا۔ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں میرے ماں باپ بہن بھائی کون ہیں؟ میں کس شہر کا

رہنے والا ہوں؟ ان باتوں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ اگرچہ میں ان تمام باتوں سے بچ کر چلوں گا مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ذرا سی بھول میرا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ اس لئے تم میری فکر نہ کرنا۔ اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا اور زندہ رہا تو تمہیں تمہارے ہائیڈ آؤٹ میں آکر ہی ملوں گا۔ اگر مر گیا تو پھر اگلے جہان خدا کے دربار میں ملاقات ہو گی۔۔۔۔"

میں جان بوجھ کر جیپ آہستہ آہستہ چلا رہا تھا تاکہ دوارکا کے فوجی اڈے پر اس وقت پہنچوں جب رات کا اندھیرا ہو گیا ہو۔ میں ساتھ ساتھ کریم بھائی سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دوارکا فورٹ میں جو فوجی یونٹ ہے اس کے کسی سپاہی یا افسر نے اصلی کیپٹن ہری ناتھ کو دیکھ رکھا ہو۔ ایسی صورت میں بہت ممکن ہے کہ میں قلعے میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی گرفتار کر لیا جاؤں۔ میرا جرم صرف یہی نہیں ہو گا کہ میں وہاں بھارتی فوج کی جاسوسی کرنے آیا تھا بلکہ مجھ پر انڈین فوج کے ایک افسر کا قتل بھی ثابت ہو جائے گا خواہ اس افسر کی لاش ملے یا نہ ملے۔ میں جانتا ہوں مجھے شدید ٹارچر کے اذیت ناک مرحلوں سے گذرنا پڑے گا۔ میں ان کے ٹارچر سے نہیں ڈرتا ٹارچر تو میں جب تک برداشت کر سکا تم لوگوں کا نام زبان پر لائے بغیر برداشت کر لوں گا۔ جب برداشت نہ کر سکا تو اپنی جان اپنے مالک کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن اس بات کا افسوس اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا کہ میں اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ خواہ مجھے ہزار بار اپنی جان قربان کرنی پڑے میں اپنے ٹارگٹ کو مار کر ہی جان دوں گا"

ہماری فوجی جیپ اب شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ شہر میں بتیاں روشن تھیں۔ میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"تم دوارکا قلعے تک میری راہ نمائی کرو گے۔ اس کے بعد تم چلے جاؤ

گے۔ او کے؟"

مجھے دن کے وقت اس نے دوار کا فورٹ ایک بار دکھایا تھا۔ اس اندازے سے میں فوجی جیپ کو شہر کے سب سے بڑے بازار سے نکال کر لے گیا۔ تالاب والے مندر کے پاس پہنچ کر میں نے اس سے پوچھا کہ اب کدھر جانا ہے۔ کریم بھائی نے مجھے بائیں طرف مڑنے کو کہا۔ میں نے اس طرف جیپ کو موڑ لیا۔ یہاں سمندر کی طرف سے ہوا آ رہی تھی۔ شہر کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور دور دوار کا قلعے کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ان روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کریم بھائی نے کہا۔

"یہ سڑک سیدھی دوار کا فورٹ کو جاتی ہے"

میں نے وہیں ایک جانب جیپ روک لی کریم بھائی جیپ سے اتر پڑا۔ میں بھی جیپ سے اتر آیا۔ یہاں روشنی نہیں تھی۔ صرف فوجی جیپ کی ہیڈ لائیٹس کی ہی روشنی تھی۔ کریم بھائی نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔

"تمہیں اللہ کے سپرد کیا"

میں نے مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ کریم بھائی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ایڑیاں جوڑ کر مجھے سلیوٹ کیا۔ میں نے بھی اسی طرح اس کے فوجی سلیوٹ کا جواب دیا۔ جیپ میں بیٹھا اور اسے تیزی سے نکال کر آگے لے گیا۔ دوار کا قلعے کی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔ میرے لئے ایک نئے ڈرامے کی سٹیج پر پردہ اٹھنے والا تھا۔ مجھے اس ڈرامے میں اپنے نئے کردار کو اس طرح نبھانا تھا کہ میرا کردار اصلی معلوم ہو۔ ڈرامہ دیکھنے والوں کو ایک لمحے کے لئے بھی شک نہ پڑے کہ میں اداکاری کر رہا ہوں۔ ڈرامہ نقلی تھا۔ میرا کردار نقلی تھا۔ مگر سٹیج اصلی تھا۔ ڈرامہ دیکھنے والے اصلی تھے۔ اگر ذرا سی بھی بھول چوک ہو گئی تو دیکھنے والے مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر میری موت' میرے مشن کی موت یقینی تھی۔ جیپ دوار کا قلعے کے اور قریب ہو گئی تھی۔ قلعے کی پرانی دیوار اور بڑے گیٹ پر لگی ہوئی روشنیاں اب صاف نظر آنے لگی تھیں۔

میں نے کلمہ شریف پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک ماری اور جیپ کی رفتار تیز کر دی۔

چند لمحوں کے بعد میری فوجی جیپ قلعے کے دروازے پر تھی۔ قلعے کا پرانا دروازہ تھا۔ صرف بیریئر لگا ہوا تھا۔ دونوں جانب ملٹری پولیس کے چاق و چوبند فوجی جوان کھڑے تھے۔ اوپر والی فلڈ لائیٹ کی تیز روشنی میں انہوں نے فوجی جیپ کو دیکھا تو ان میں سے ایک جوان مارچ کرتا میری جیپ کے پاس آیا۔ اس نے میری وردی اور کاندھے پر لگے ہوئے کپتانی کے نشان کو دیکھ کر سلیوٹ مارا۔ میں نے بٹوے میں سے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر تیز فوجی لہجے میں کہا۔

"کیپٹن ہری ناتھ شرما۔ ملٹری انٹیلی جینس"

فوجی جوان نے میرے کارڈ کو بالکل چیک نہ کیا۔ دوڑ کر بیریئر اٹھا دیا۔ میری جیپ ان کے قریب سے گذر کر قلعے میں داخل ہوئی تو دونوں نے صرف ایڑیاں بجا کر میری تعظیم کی۔ ملٹری گارڈ نے اندر کوارٹر گارڈ والوں کو فون پر میری آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ جب میری جیپ کوارٹر گارڈ کے قریب آئی جہاں رجمنٹ کے فلیگ مسٹ کے ساتھ ہی بھارت کا قومی پرچم لہرا رہا تھا اور تیز روشنیاں ہو رہی تھیں تو دو فوجی تیز تیز قدم اٹھاتے کوارٹر گارڈ سے نکل کر میری طرف بڑھے۔ میں نے جیپ روک لی۔ ان میں سے ایک میجر رینک کا اور دوسرا کیپٹن رینک کا افسر تھا۔

میں بڑے اطمینان کے ساتھ جیپ میں سے اتر کر ان کی طرف بڑھا۔ میرے ڈرامے کا پہلا سین شروع ہو گیا تھا۔ صرف ایک انتہائی نازل اور انتہائی خطرناک پردہ حائل تھا کہ ان میں سے کسی نے اصلی کیپٹن ہری ناتھ کو دیکھا ہوا نہ ہو۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کو سلیوٹ کیا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے میجر سے انگریزی میں کہا

"میں کیپٹن ہری ناتھ ہوں۔"

میجر اور دوسرے کیپٹن نے باری باری مجھ سے فوجی انداز میں زوردار مصافحہ کیا اور کہا۔

"میں میجر ڈیو پٹیل ہوں اور یہ کیپٹن شوپرشاد ہے"

ہم انگریزی میں ہی باتیں کرتے کواٹر گارڈ کے کمرے کی طرف بڑھے۔ میجر پٹیل کہہ رہا تھا۔

"ہمیں جام نگر سے جو اطلاع ملی تھی اس کے مطابق ہمیں سہ پہر سے تمہارا انتظار تھا کیا راستے میں کوئی ٹریفک جام تھا کیپٹن؟"

میں نے بے نیازی سے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ میں جام نگر ہی سے لیٹ چلا تھا۔"

میجر پٹیل اور کیپٹن پرشاد کا رویہ میرے ساتھ انتہائی نرم اور بڑے گرم جوش میزبانوں والا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ملٹری انٹیلی جنیس کا کیپٹن تھا اور ان کے سنٹر کی چیکنگ کے لئے آیا تھا۔ فوجی ایمونیشن ڈپوؤں میں کسی قسم کی ہیرا پھیری نہیں ہوا کرتی۔ سیکورٹی کے معاملے میں یا کہیں فوجی ڈسپلن کے معاملے میں کوئی خامی پکڑی جا سکتی ہے اور فوجی اعتبار سے یہ ناقابل معافی جرم ہوتا ہے اور افسروں اور فوجی عہدیداروں کی ترقیاں رک جاتی ہیں۔

کواٹر گارڈ میں میرے لئے ٹھنڈے مشروب کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا تھا۔ دو فوجی جوان خدمت پر مامور تھے۔ ہم کواٹر گارڈ کے عقبی لان میں بیٹھ گئے۔ میز پر شمپین وہسکی اور بیئر کی بوتلیں رکھی تھیں۔ میجر پٹیل نے انگریزی میں ہی کہا۔

"سرا اردلی تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

میں نے کہا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ تو آنے کو تیار تھا مگر میں نے خود ہی اسے روک دیا۔ کہا کہ اتنا لمبا سفر نہیں ہے جام نگر سے دوارکا تک ہی جانا ہے"

میجر پٹیل نے شراب کی بوتلوں والی ٹرالی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"کیپٹن! بیئر شوق کرو گے یا وسکی چلے گی"

میں نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"سوری میجر! میں ڈرنک نہیں کرتا"

وہ ہنسنے لگا اور انگریزی میں ہی بولا۔

"مجھے حیرت ہوئی ہے"

میں نے بھی انگریزی میں ہی مگر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے مہان نیتا مہاتما گاندھی جی بھی ڈرنک نہیں کرتے تھے۔"

میجر پٹیل شرمندہ سا ہو کر سر کھجانے لگا۔ پھر اس نے اپنے لئے اور کیپٹن پرشاد کے لئے گلاس میں برف اور وسکی ڈال کر سوڈا ڈالا اور بولا۔

"آئی ایم سوری کیپٹن! ہم صرف رات کو تھوڑا سا شوق کر لیتے ہیں۔"

میں نے انہیں سخت لہجے میں یاد دلایا تھا کہ میں یہاں ان کے جونیئر عہدیدار کی حیثیت سے نہیں آیا بلکہ ان کی کارکردگی' ان کے ڈسپلن اور وہاں کی سیکورٹی کا جائزہ لینے آیا ہوں اور میری رپورٹ پر ان کی ترقیاں رک سکتی ہیں ویسے بھی ملٹری انٹیلی جنیس والوں سے دوسری رجمنٹوں کے افسر لوگ ذرا گھبراتے ہیں اور ان کے سامنے محتاط ہو جاتے ہیں۔ میرے لہجے کی سختی کو ان دونوں نے بھی محسوس کیا تھا اور اب ان کا رویہ خوشامدانہ ہو گیا تھا۔

کیپٹن پرشاد نے میرے لئے لیمن جوس کا گلاس بنا کر مجھے پیش کیا اور کہا۔

"سر! آپ ایمونیشن وغیرہ کی چیکنگ ابھی کرنا پسند کریں گے یا۔۔۔"

میں نے کہا۔

"ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ کام صبح بھی ہو سکتا ہے"

میجر پٹیل نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"سر! آپ رات کو کھانے پر کیا پسند کریں گے۔ ڈنر پر آپ کو دوسرے افسروں سے بھی ملانا ہے۔ ہم سب آپ کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے"

معلوم ہوا کہ میجر ڈیو پٹیل اس فوجی سنٹر کا کمانڈنگ آفیسر ہے اور وہاں بھاری تعداد
میں فوج کی نفری موجود ہے۔ ڈنر پر میرا دوسرے فوجی افسروں سے تعارف کرایا گیا۔ ان
میں دو تین میجر تھے باقی کیپٹن اور لفٹیننٹ تھے۔ کسی فوجی افسر کی فیملی ان کے ساتھ نہیں
تھی۔ ڈنر پر میں بڑا سنجیدہ بنا رہا اور کسی سے زیادہ بات نہ کی۔ اس بات کو دیکھ کر مجھے بڑی
تسلی ہو گئی تھی کہ یہاں اصلی کیپٹن ہری ناتھ کو پہلے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہوا تھا۔ اس
کے باوجود خطرے کی تلوار جبکہ تلواریں میرے سر پر لٹک رہی تھیں۔ سب سے بڑی
تلوار اصلی کیپٹن ہری ناتھ کے گھر والوں کی تھی۔ اگر جام نگر میں اس کی بیوی موجود تھی
تو خطرہ تھا کہ وہ اپنے خاوند کے خیریت سے دوارکا پہنچ جانے کی بابت معلوم کرنے جام نگر
سے ٹیلی فون کر دے۔ یا اس کے گھر میں سے کوئی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے
فون نہ کر دے۔ بہرحال میں نے اس بارے میں پہلے سے ذہن میں سوچ لیا ہوا تھا کہ ایسی
صورت میں مجھے کیا کرنا ہو گا۔ لیکن ایک بات واضح تھی کہ مجھے وہاں جو کچھ بھی کرنا تھا
جلدی کرنا چاہئے تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر تک رکے رہنے اور ڈرامہ کرتے رہنے کا خطرہ
مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ میرا بھانڈا کسی وقت بھی کسی بھی بات پر پھوٹ سکتا تھا۔

آفیسر کمانڈنگ میجر پٹیل نے میرے لئے رہائش کا بھی بڑا اعلیٰ بندوبست کر رکھا تھا۔
آفیسر میس کے رہائشی کوارٹرز کا سب سے خوبصورت کوارٹر میرے لئے پہلے سے تیار کر رکھا
تھا۔ دو کمرے تھے۔ بیڈ روم۔ ڈرائینگ روم۔ باتھ روم ساتھ ہی تھا۔ سفید چادریں بیڈ
پر بچھی تھیں۔ اردلی میری خدمت کو موجود تھا۔ میجر پٹیل مجھے ساتھ لے کر بیڈ روم
دکھانے آیا تو کہنے لگا۔

"کیپٹن! تم اپنا سامان بھی ساتھ نہیں لائے میرا خیال ہے جلدی سے گھر پر
ہی بھول گئے ہو گے"

اور وہ ہنسنے لگا۔ میں اسی طرح سنجیدہ بنا رہا۔ یہ بات اس کی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔
میرے ساتھ کم از کم ایک چھوٹا سا بریف کیس ہی ہوتا۔ یہ خامی مجھ سے اور کریم بھائی
سے رہ گئی تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ جس وقت ہم نے کیپٹن ہری ناتھ اور اس کے اردلی

کی لاشوں کو دلدلی تالاب میں پھینکا تھا تو ایک چھوٹا اٹیچی کیس بھی ان کے ساتھ ہی پھینک
دیا تھا۔ اس وقت یہ خیال ہی نہ آیا کہ یہ اٹیچی کیس مجھے اپنے پاس رکھ لینا چاہئے تھا۔ ہو
سکتا تھا اس میں کیپٹن کا سلیپنگ سوٹ اور کچھ دفتری فائلیں ہی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے
کہ میرے پاس کوئی ایک فائیل بھی نہیں تھی جو کہ اصولی طور پر ہونی چاہئے تھی۔ میں
نے مسکراتے ہوئے تھوڑی بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے میجر پٹیل سے کہا۔

"مجھے دو ایک دن سے زیادہ تو یہاں رہنا نہیں اور پھر مجھے معلوم تھا کہ تم
لوگ رات کو کم از کم مجھے ایک سلیپنگ سوٹ ضرور دے دو گے۔"

میرے بے تکلفانہ رویے پر میجر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا

"ہم تو آپ کی ہر خدمت کرنے کو تیار ہیں۔ نو پرابلم سر! نو پرابلم!"

میں نے اسے کہا کہ میں صبح آٹھ بجے اس گوڈاون کے آرسنل کی چیکنگ کرنا چاہوں
گا جہاں ٹرانسپورٹ شپ سے پچھلے دنوں دوسرے اسلحہ کے ساتھ میڈیم فیلڈ گنیں اور
کوبرا گن شپ ہیلی کاپٹر لا کر سٹاک کئے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ اسلحہ دو ایک روز میں ہمیں
کشمیری کے محاذ پر سپلائی کرنا ہے۔ میجر پٹیل نے اپنا ہاتھ سیلوٹ کے انداز میں ماتھے پر لے
جاتے ہوئے کہا۔

"یس سر۔ میں اور کیپٹن پرشاد صبح آٹھ بجے گوڈاون نمبر ون کے گیٹ پر
موجود ہوں گے۔"

اس کے بعد میں نے یہ کہکر اسے بھیج دیا کہ میں اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔ نیند
کوسوں دور تھی۔ بستر پر لیٹا پہلو بدلتا رہا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ کسی طرح رات گذر جائے
اور صبح گوڈاون میں جا کر اسلحہ کی پوزیشن کا جائزہ لوں اور پندرہ کے پندرہ چیونگ گم والے
بم وہاں اہم جگہوں پر لگا دوں۔ چیونگ گم کی ان چوکور گولیوں کے اندر دھماکہ خیز آتش گیر
مادے کو پھاڑنے کے لئے ایک باریک سی بہت ہی باریک نلکی لگائی گئی تھی۔ ٹیبلٹ کو
ایک طرف سے دبانے پر یہ نلکی ٹوٹ جاتی تھی اور اس کے اندر بھرا ہوا تیزاب آہستہ
آہستہ نلکی کے دو چکروں میں سے ہوتا ہوا کوئی ایک گھنٹے میں بارود تک پہنچتا تھا۔ اس کے

بعد آتش گیر دھماکہ ہوتا تھا اور اردگرد کی ہر شے کے پرخچے اڑ جاتے تھے۔ ان ٹیبلٹ بموں کا دورانیہ ایک گھنٹہ تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بم لگانے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے وہاں سے نکل جانا تھا۔

کبھی سوتے کبھی جاگتے رات کسی نہ کسی طرح گذر گئی۔ صبح اٹھ کر میں نے غسل کیا۔ وردی پہنی اور تیار ہو کر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا۔ اردلی ناشتہ لے کر آگیا۔ میں نے اسے رات ہی کو ہدایت کر دی تھی کہ میں ناشتہ ڈرائینگ روم میں ہی کروں گا۔ میس MESS میں نہیں کروں گا۔ ناشتہ کرتے کرتے آٹھ بج گئے میں سیدھا گوڈاؤن نمبرون کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں میجر پٹیل اور کیپٹن پرشاد میرے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔ گوڈاون کا چھوٹا سا دروازہ کھلا تھا جہاں ایک اسلحہ بردار سنتری گارڈ ڈیوٹی پر چاق وچوبند کھڑا تھا۔

میجر اور کیپٹن نے آگے بڑھ کر میرا خیر مقدم کیا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ایک فائل تھی۔ میجر نے مجھے اپنی فائیل دیتے ہوئے کہا۔

"اس میں آرسنل کی پوری ڈیٹیل درج ہے"

ہم گوڈاون میں داخل ہو گئے۔ میرے خدا! گودام کے اندر اسلحہ کا انبار لگا تھا۔ اونچی چھت والے اس ہال کمرے میں دیوار کے ساتھ اسلحہ کے کریٹ لگے تھے۔ درمیان میں قطاروں کی صورت میں ہر قسم کے اسلحہ کے ڈھیر بڑی ترتیب سے میزوں پر سجے ہوئے تھے۔ میں نے یونہی فائیل کو دیکھ دیکھ کر چیکنگ شروع کر دی۔ میں نے میجر پٹیل سے گن شپ کوبرا ہیلی کاپٹروں اور میڈیم فیلڈ گنوں کے بارے میں پوچھا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ میجر پٹیل مجھے دوسری طرف لے گیا۔ جہاں بہت بڑے بڑے کریٹ ایک دوسرے کے ساتھ لگے دوسری دیوار تک چلے گئے تھے۔ اس نے کہا۔

"ہیلی کاپٹروں اور فیلڈ گنوں کا مرچنڈائیز ہے سر۔"

میں بڑے غور سے کریٹوں کو ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ کیپٹن پرشاد نے پوچھا۔

"سر! اس دفعہ ہم یہ اسلحہ اور دوسرا سامان ٹرین کے ذریعے نہیں بلکہ

الگ الگ سویلین ٹرکوں میں ایک ایک دن کا وقفہ ڈال کر جموں بھیج رہے ہیں"

میں نے آہستہ سے سرہلا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ مشورہ ہماری انٹیلی جینس کور نے ہی ہائی کمانڈ کو دیا تھا۔ کشمیری کمانڈوز دیولالی سے جموں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مڈگھاٹ کے واقعے سے ہم نے کافی سبق حاصل کیا ہے۔"

ہم ایک میز کے قریب آئے تو یہاں ڈائنامائیٹ کی سکوں والے میڈیم سائیز کے جدید ترین ٹائم بم بڑے قرینے سے چار قطاروں میں رکھے ہوئے تھے۔ میں وہاں رک گیا۔ یہ چیز میرے کام کی تھی اور میرے کام آسکتی تھی۔ یہ میگنٹ بم تھے۔ میں نے ایک ٹائم بم کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ان ٹائم بموں کا دورانیہ بھی دو گھنٹے ہی تھا۔ ان کے فیوز الگ کئے ہوئے تھے۔ میں نے ٹائم بم میز پر رکھ دیا اور وہاں کی سیکورٹی کے بارے میں میجر پٹیل کو ضروری ہدایات دیتا اس دیوار کی جانب آگیا جہاں میڈیم کے علاوہ ہیوی فیلڈ گنوں کے گولوں کی لاتعداد کریٹ ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ میری چیکنگ کے واسطے کریٹوں کے اوپر کے حصے کھول دیئے گئے تھے۔ یہ گولے کشمیر کے محاذ پر فائر کرنے کے لئے باہر سے منگوائے گئے تھے۔

میں آدھا گھنٹہ گوڈاون میں رہا اور میں نے چیکنگ اور سیکورٹی کے بارے میں انتہائی یک سوئی ظاہر کی جیسے مجھے اس اسلحہ کی سیکورٹی کا بے حد خیال لگا ہوا ہو۔ اس کے بعد میں فائل ہاتھ میں لئے اس چھوٹے سے کمرے میں آگیا جو مجھے دے دیا گیا تھا۔ یہاں فون بھی لگا تھا۔ میں نے میجر پٹیل سے کہا کہ میں اکیلا بیٹھ کر رپورٹ تیار کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ میجر اور کیپٹن اپنے اپنے آفس رومز کی طرف چلے گئے جو کوارٹر گارڈ کے سامنے ہی تھے۔ اس دن صبح ہی سے دوارکا کے آسمان پر کالے کالے بادل جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جس چھوٹے سے کمرے میں میرے لئے میز کرسی لگا دی گئی اس کی کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ میں فائل سامنے کھولے بیٹھا تھا۔ مجھے اب

صرف ایک کام کرنا تھا کہ گوڈاون نمبرون میں جاکر موزوں جگہ پر اپنے ٹیبلٹ بموں کے علاوہ وہاں جو میگنٹ ٹائم بم پڑے تھے ان کو بھی لگا کر ان کے فیوز اون کر کے بٹن دبا کر کلاک کی ڈیجیٹل الٹی گنتی کو شروع کر دینا تھا۔ یہ کام کوئی اتنا وقت طلب یا دشوار نہیں رہا تھا۔ میں بلا روک ٹوک گوڈاون میں داخل ہو کر یہ کام سرانجام دے سکتا تھا۔ میں صرف ایک بت کا انتظار کر رہا تھا۔ میجر پٹیل نے مجھے بتایا تھا کہ اسرائیل کی کسی بندرگاہ سے اسلحے کی ایک اور کھیپ لے کر مرچنٹ نیوی کا بحری جہاز روانہ ہونے والا ہے۔ مجھے اس جہاز کی روانگی کی تاریخ اور وقت معلوم کرنا تھا جس کے بارے میں میجر پٹیل نے بتایا تھا کہ دوپہر کے بعد ہمیں حیفہ کی بندرگاہ سے جہاز کی روانگی کا سگنل مل جائے گا۔

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے میجر پٹیل کی آواز آئی۔

"سر! جام نگر سے آپ کی کال ہے"

اور اس کے ساتھ ہی ایک عورت کی آواز آئی۔

ہیلو ناتھ جی! میں پر اپتا بول رہی ہوں۔ آپ نے تو کہا تھا میں دوارکا پہنچتے ہی فون کر دوں گا۔ آپ نے کوئی فون نہیں کیا۔ آپ کو اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ آپ کی پتنی پیچھے پریشان ہو گی۔"

یہ اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی بول رہی تھی جس کا نام پر اپتا تھا۔ ایک بار تو میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کیونکہ یہ بڑا نازک مقام تھا۔ یہاں میری ذرا سی بے احتیاطی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی اور مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر سکتی تھی۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہ میرا گلا خراب ہو گیا ہے کھانس کر کہا۔

"آئی ایم سوری پر اپتا! آئی ایم سوری"

اور آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ دوسری طرف سے پر اپتا نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

"ناتھ جی! آپ کی آواز کو کیا ہو گیا ہے آپ کھانس کیوں رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میرا گلا خراب ہو گیا ہے۔ رات کو لیمن جوس کچھ زیادہ پی لیا تھا۔
اچھا۔ ابھی میں میٹنگ میں ہوں۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں خود فون کرتا ہوں۔ او کے بائی بائی"

اور میں نے فون بند کر دیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن تھوڑی تیز ہو گئی تھی۔ کہیں اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی کو شک تو نہیں پڑ گیا کہ اس کے خاوند کی جگہ کوئی دوسرا آدمی بول رہا تھا۔ بہرحال خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ خطرہ قریب آئے جا رہا تھا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں اسی وقت فائیل ہاتھ میں لے کر اٹھا اور دفتر سے نکل کر سیدھا اسلحہ کے گوڈاون نمبرون کی طرف چل پڑا۔ یہ گوڈاون چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ گوڈاون کا دروازہ بند تھا اور اسے لاک لگا ہوا تھا۔ باہر ڈیوٹی پر گارڈ سنتری کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر صرف ایڑیاں بجا کر میری تعظیم کی میں نے کہا۔

"جوان دروازہ کھولو۔ مجھے ضروری چیکنگ کرنی ہے"

سنتری مجھے جانتا تھا کہ میں انٹیلی جینس کا کیپٹن ہری ناتھ ہوں اور ہیڈ کوارٹر سے فوجی ساز وسامان اور سیکورٹی کی چیکنگ کے لئے آیا ہوں۔ اس مجھے اپنے جی او سی GOC کے ساتھ صبح چیکنگ کے لئے اندر جاتے بھی دیکھا تھا۔ اس نے فوجی انداز میں کہا۔

"سر! کیپٹن پرشاد ڈپو لاک کر کے چابی اپنے ساتھ لے گئے ہیں"

میں وہیں سے اپنے آفس میں آگیا۔ وہاں سے انٹرکام پر کیپٹن پرشاد کو فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ وہ اپنی سیٹ پر نہیں تھا میں نے میجر پٹیل کو فون کیا اور کیپٹن پرشاد کا پوچھا۔ وہ کہنے لگا۔

"سر! وہ تو نیول ہیڈ کوارٹر گیا ہوا ہے۔ کوئی خاص بات ہو تو فرمائیں"

میں نے کہا۔

"مجھے سٹور میں کچھ آئیٹمز چیک کرنی تھیں۔ وہ گوڈاون لاک کر گیا

ہے۔ اس کی ڈپلیکیٹ چابی تمہارے پاس ہے تو مجھے بھجوا دو"

میجر پٹیل نے جواب دیا۔

"سر! سیکورٹی کے معاملے میں وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ ڈپلیکیٹ چابی بھی اسی کے پاس ہوتی ہے۔ فکر نہ کریں۔ وہ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

میں فون بند کرنے لگا تو میجر پٹیل بولا۔

"سر! آپ کی مسز آپ کے لئے پریشان تھیں۔ آپ نے ان سے بات کرتے ہوئے فون اچانک بند کر دیا تو وہ مجھ سے آپ کی صحت کے بارے میں پوچھنے لگیں کہ آپ کا گلا کیوں خراب ہو گیا ہے۔"

میں نے ذرا سا کھانس کر کہا۔

"گلے میں معمولی سی خراش ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے"

میجر پٹیل بولا۔

"سر! اپنی مسز کو دوبارا فون ضرور کر لیجئے۔ وہ تو کہہ رہی تھیں کہ میں خود آکر آپ کی خیرت معلوم کرتی ہوں"

میں نے جلدی سے کہا۔

"وہ تو خوانخواہ پریشان ہو جاتی ہے ٹھیک ہے۔ میں اسے ابھی فون کرتا ہوں"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ کہیں واقعی اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی یہاں پہنچ ہی نہ جائے۔ جام نگر سے دوارکا کا فاصلہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے۔ سارا دن بسیں اور لاریاں چلتی رہتی ہیں۔ میں پریشان سا ہو کر کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس وقت باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

میرے لئے عجیب مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ میں ٹارگٹ پر پہنچ کر بے بس ہو گیا تھا۔ اگر فرض کر لیا اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی پراتیما اچانک آجاتی ہے تو پھر کیا ہو گا؟ وہ

اپنے خاوند کی جگہ ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران رہ جائے گی اور پھر میرا سارا راز فاش ہو جائے گا۔ اور عین ٹارگٹ پر پہنچ کر میرا کمانڈو آپریشن ناکام ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ مجھے رات ہونے سے پہلے پہلے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا جائے۔

میں میجر پٹیل سے زیادہ پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کیپٹن پرشاد کب واپس آئے گا۔ اس خیال سے کہ اسے شک نہ پڑ جائے کہ آخر مجھے کیا جلدی ہے اور میں بار بار کیوں پوچھ رہا ہوں۔ بغیر پوچھے مجھ سے رہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے دو تین بار فون کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا اور پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اسلحہ کے گوڈاون میں داخل ہونے کا دوسرا کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ ایسی کوئی بظاہر ایمرجینسی بھی نہیں تھی کہ جس کا بہانہ بنا کر میں میجر پٹیل سے کہتا کہ گوڈاون کا تالا توڑ دیا جائے۔ اگر فرض کر لیا میں تالا تڑوا بھی دیتا ہوں تو اس صورت میں میجر پٹیل میرے پاس ہی کھڑا ہو گا اور جب میں آئیٹمیں چیک کرنے کے بہانے سٹور میں جاؤں گا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی آجائے گا اور میں اسے روک نہیں سکوں گا۔

میں عجیب وغریب الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ صورت حال بڑی پریشان کن شکل اختیار کر گئی تھی۔ میں ایک خطرناک دوراہے پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے مڑ سکتا تھا۔ میں نے سوچا میجر پیٹل کو فون کر کے پوچھتا ہوں کہ نیول ہیڈ کوارٹرز میں کیپٹن پرشاد کس نمبر پر مل سکتا ہے تاکہ اسے فون کر کے فوراً واپس بلاؤں جیسے ہی میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے میرج پٹیل کی آواز آئی۔

"سر! ابھی ابھی کیپٹن پرشاد کا فون آیا تھا۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"مجھے اس کا فون نمبر دو۔ میں خود اس سے بات کروں گا"

میجر پٹیل نے کہا۔

"سر! اس نے اپنا نمبر نہیں دیا۔ وہ دوارکا نیول بیس (BASE) کے ایئر

کموڈور گانیگواڈ کے آفس میں بیٹھا ہے جو ایمونیشن کی نئی شپ منٹ آ رہی
ہے اس کے بارے میں ضروری ڈس کشن کر رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں
ایئر کموڈور کے ساتھ جیٹی پر جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک واپس آجاؤں گا"
میں نے فون بند کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ گوڈوان کا تالا توڑ دینا چاہئے۔ پھر خیال آیا
کہ تالا میجر پٹیل کے سامنے توڑا جائے گا۔ لازمی بات ہے کہ وہ آئیٹمیں چیک کروانے
میرے ساتھ ہی اندر آئے گا۔ میں اسے کس طرح روکوں گا۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ
میرے اکیلا ایمونیشن سٹور میں جانے سے اسے شک پڑ جائے۔ میں نے سوچا کہ جو ہو گا
دیکھا جائے گا۔ میں اسے اندر جانے سے روک دوں گا اور کہہ دوں گا کہ بعض آئیٹمیں
میں اکیلا ہی چیک کرنی چاہتا ہوں۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے میجر پٹیل کو دوبارہ فون
کیا اور کہا کہ بعض آئٹموں کی چیکنگ ضروری ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم گوڈ اون کا
تالا توڑ دیں؟ میجر پٹیل نے کسی قدر حیرانی کا اظہار کیا اور بولا۔

سر! ایسی کوئی ایمرجنسی والی بات نہیں ہے۔ تالا توڑنے کی کیا ضرورت
ہے۔ اور پھر ہم سوائے اس حالت میں کہ سٹور میں آگ لگنے کا خطرہ ہو گوڈ
اون کا تالا نہیں توڑ سکتے۔ سر! آپ تو ملٹری کے بائی لاز سے واقف ہی ہیں۔
سر! یہ ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں آپ تو ابھی ہمارے
پاس ہی ہیں۔"

اس نے بات بالکل صحیح کی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے میجر ایسی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔ کیپٹن پر ئے گا تو
چیکنگ ہو جائے گی۔"

میجر پٹیل بولا۔

"سر! تالا توڑنے کے لئے بھی ہمیں جام نگر میں آپ کے انٹیلی جنس
والوں کو اطلاع دینی پڑے گی۔ ان کو اطلاع دینے کے بعد ہی ہم ایمونیشن
سٹور کا تالا توڑ سکیں گے۔"

اب تو تالا توڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ہلکا سا بناوٹی قہقہہ لگاتے

ہوئے کہا۔

"ارے نہیں میجر نہیں۔ فار گٹ اٹ۔ ہاں جیسے ہی کیپٹن پرشاد آئے
اسے میرے پاس بھجوا دیجئے گا۔"

"او کے سر"

میں نے بوجھل دل کے ساتھ ٹیلی فون ریسیور رکھ دیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی اپنی
آپ بیتی سناتے ہوئے آپ کو بتایا تھا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کمانڈوز ایک ایک
انچ کی پیمائش کروا لینے اور پوری پوری جانچ پڑتال کرنے اور ہر پہلو پر کئی کئی دن غور و فکر
کرنے کے بعد ایک پلان تیار کرتے ہیں لیکن ٹارگٹ پر پہنچنے کے بعد ایسے حالات پیدا ہو
جاتے ہیں کہ صورت حال ہی بدل جاتی ہے۔ اس مقام پر پھر کمانڈو کی ذاتی عقل و دانش'
فراست موقع شناسی اور اعصاب کی مضبوطی کام آتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی
صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ سارے کا سارا پلان بالکل ٹھیک چلتے چلتے عین نشانے پر پہنچ
کر اچانک نئی شکل اختیار کر گیا تھا۔ چنانچہ اب مجھے بھی ذاتی عقل اور اعصاب کی مضبوطی
کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جو میں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود قدرتی بات تھی کہ میں سخت بے چین
تھا۔

میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر بدستور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بارش موسلا دھار
میں تھی۔ ہلکی ہلکی برکھا کی جھڑی سی لگی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑا سوچتا
رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا سوائے کیپٹن
پرشاد کے انتظار کرنے کے اور اس کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ یہ وقت مجھ سے
گذارا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ دیر میز پر رکھی فائل کھول کر اس پر درج ملٹری ایمونیشن کی
آئیٹم دیکھتا رہا۔ پھر اسے بند کر کے اٹھا۔ اپنے آفس روم سے نکل کر ہلکی بوندا باندی میں
احاطے کی سڑک پار کر کے سامنے میجر پٹیل کے آفس میں آگیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"سر! کیپٹن تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ وہاں کوئی ایمرجنسی پڑ گئی ہو گی۔
آپ میرے پاس بیٹھیں۔ میں کافی منگواتا ہوں"

میں بیٹھ گیا۔ اسنے اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی پراتیا کی باتیں شروع کر دیں۔ کہ

لگا۔

"سر! آپ اپنی مسز کو فون ضرور کریں۔ میرا خیال ہے آپ نے فون کر دیا ہوگا۔ وہ بڑی پریشان تھیں۔ آپ کا گلا خراب ہے اور آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں میں ابھی سٹور سے آپ کے لئے ٹیبلٹ منگواتا ہوں"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں میجر۔ اس کی ضرورت نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں"

اور میں تھوڑا سا کھانس کر خاموش ہوگیا۔ میں نے اسے یونہی کہہ دیا کہ ہاں میں نے اپنی مسز کو فون پر تسلی دے دی تھی۔ اتنے میں اردلی کافی لے آیا۔ ہم کافی پینے لگے۔ میجر مجھ سے فورٹ کی سیکورٹی کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"سر! ہم نے تو یہاں سیکورٹی بڑی سخت رکھی ہوئی ہے"

پھر خود ہی ہنس کر بولا۔

"اب ہمیں معلوم نہیں آپ کی انٹیلی جنیس کو ہماری سیکورٹی کے بارے میں کیا رپورٹ پہنچتی ہے"

میں نے بے دلی سے کہا۔

"ڈونٹ وری میجر! ہمیں جو رپورٹ پہنچی ہے وہ غلط نہیں ہوتی۔ ویسے میں نے یہاں سیکورٹی کا انتظام تسلی بخش پایا ہے۔"

ہم انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ میجر پٹیل بڑا خوش ہوا۔

"تھینک یو سر! تھینک یو"

وہاں بیٹھے باتیں کرتے اور کافی پیتے آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ اب باقی کا آدھا گھنٹہ مجھے وہاں گذارنا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے میجر پٹیل سے کہا۔

"میں کچھ دیر آرام کرنے اپنے کواٹر میں جاتا ہوں۔ کیپٹن پرشاد آئے تو مجھے اطلاع کر دینا"

"او کے سر۔ میں اسی وقت فون کر دوں گا"

میجر پٹیل مجھے چھوڑنے برآمدے تک آیا۔ حالانکہ اس کا رینک مجھ سے بڑا تھا مگر میں

وہاں ملٹری انٹیلی جنیس کی طرف سے سیکورٹی کی چیکنگ کے لئے آیا تھا اس لئے وہ میری زیادہ سے زیادہ خوشامد میں لگا ہوا تھا۔

باہر بونداباندی دیکھ کر بولا۔

"میں چھاتہ منگواتا ہوں"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"نو نو میجر۔ اس کی ضرورت نہیں۔ اٹ از او کے۔ او کے۔

اور میں بونداباندی میں ہی اپنے رہائشی کواٹر کی طرف چل پڑا۔ میری اس وقت کی کیفیت ایسی تھی کہ جیسے کوئی شخص تنی ہوئی رسی پر چلتے چلتے اچانک رک گیا ہو۔ یا اسے کسی مجبوری کی وجہ سے روک دیا گیا ہو۔ میں کیپٹن ہری ناتھ کی وردی میں تھا۔ سر پر بیرٹ کیپ تھی۔ مجھے بونداباندی کا بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی اچانک دوار کا گریزن میں نہ آجائے۔ اس کے آنے سے نہ صرف میرا مشن ناکام ہوتا تھا بلکہ میرا گرفتار ہونا بھی یقینی تھا۔

میں اپنے کواٹر میں آکر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا۔ پندرہ کے پندرہ دھماکہ خیز ٹیلبٹ بم میری پتلون کی جیب میں تھے۔ کم بخت کیپٹن پرشاد کو بھی آج ہی نیول ہیڈ کواٹر جانا تھا۔ میں دل میں اسے گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے مجھے تھوڑی سی تسکین ملی۔ میں بالوں میں کنگھی پھیر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں جلدی سے باتھ روم سے نکال اور ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف میجر پٹیل بول رہا تھا۔ اس نے پر مسرت لہجے میں کہا۔

"سر! کیپٹن پرشاد آگیا ہے۔ میں اسے آپ کی طرف بھیج رہا ہوں۔ گوڈاون نمبرون کی دونوں چابیاں اس کے پاس ہی ہیں--"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تھینک گاڈ---"

میجر پٹیل نے شرارت بھری آواز میں کہا۔

"سر! اس کے ساتھ آپ کے واسطے ایک سرپرائز بھی ہے۔"

"سرپرائز؟"

میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میجر پٹیل کی ہنسی کی آواز آئی۔ کہنے لگا۔

"سر! آپ کو تھوڑی دیر بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ بڑا خوشگوار سرپرائز ہے سر!"

اور اس نے ہنستے ہوئے ٹیلی فون بند کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ خوشگوار سرپرائز کیا ہو سکتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میجر نے میرے لئے کوئی تحفہ نہ بھیجا ہو گا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اصلی کیپٹن ہوں اور مجھے اس کی کارکردگی کی رپورٹ اوپر بھجوانی ہے۔ بہرحال میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کیپٹن پرشاد گوڈاون کی چابی لے کر آ گیا تھا۔ اتنے میں مجھے ڈرائینگ روم کے برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ڈرائینگ روم کا پردہ ہٹا اور کیپٹن پرشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر! جام نگر سے ہماری بھابی اور آپ کی مسز آئی ہیں۔"

میں اپنی جگہ پر ایک لمحے کے لئے سن ہو کر رہ گیا۔ اتنے میں ایک عام شکل صورت کی ساڑھی والی عورت ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔ کیپٹن پرشاد نے کہا۔

"لیجئے بھابی جان سنبھالئے اپنے پتی دیو کو"

وہ عورت میری طرف حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کیپٹن پرشاد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ تو میرا خاوند ہری ناتھ نہیں ہے۔"

اس کے بعد کیا ہوا' بھارت کے فرعون حصہ سوئم

"ایکشن دوارکا" میں پڑھیئے

بھارت کے
فرعون
ایکشن دوارکا
اے حمید
50

کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی کا میری طرف دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ تو میرا خاوند نہیں ہے۔ ایسے ہی تھا جیسے کسی نے وہاں دستی بم پھینک دیا ہو۔ ایک خاموش دھماکہ ہوا۔ اس دھماکے کی آواز نہیں تھی مگر میرے قدموں کے نیچے زمین ہل گئی۔ میرے سر کے اوپر جو ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کی رسی ٹوٹ گئی۔ اب تلوار کی نوک سیدھی میرے سر میں گھسنے والی تھی۔ میرے پاس ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہیں تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر مجھے ان دونوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ دوسری صورت میں میری موت اور میرے کمانڈو مشن کی موت یقینی تھی۔ کیپٹن پرشاد جو اس عورت کے ساتھ آیا تھا اس نے جب سنا کہ میں اس عورت کا خاوند یعنی اصلی کیپٹن ہری ناتھ نہیں ہوں تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

اس کے بعد میں نے اسے مزید حیران ہونے کا موقع نہ دیا۔ میں اس پوزیشن میں ہی نہیں تھا کہ اسے زندہ حالت میں وہاں سے باہر جانے کی اجازت دیتا۔ میری ساری کی ساری کمانڈو ٹریننگ ایک ہزار وولٹ کی برقی توانائی بن کر میرے بازوؤں کے پٹھوں میں سمٹ آئی تھی۔ کیپٹن پرشاد میری بائیں جانب کوئی تین قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس ہندو عورت کے منہ سے یہ جملہ نکلے ایک سیکنڈ بھی پورا نہیں ہوا ہوگا کہ میں نے چھلانگ لگا کر کیپٹن پرشاد کی ٹھوڑی کے نیچے فلائنگ کک اتنی زور سے لگائی کہ وہ دھڑام سے پیچھے کو جاگرا۔ ہندو عورت دہشت زدہ ہو کر باہر کو بھاگی۔ میں نے اچھل کر اسے بھی دبوچ کر وہیں گرا لیا۔ اس عورت کو میں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیپٹن پرشاد کا جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں لے کر زبردست

جھٹکا دیا۔ کٹک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی دو ٹکڑے ہو گئی۔ ہندو عورت کی گگھی بندھ گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی میں اسے کھینچ کر غسل خانے میں لے گیا۔ اس کی ساڑھی پھاڑ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ اس کے ہاتھ پیچھے باندھے اور غسل خانے کے ٹب میں دھکا دے کر جلدی سے باہر آیا۔ کیپٹن پرشاد کی لاش پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اسلحہ کے گودام کی دونوں چابیاں نکالیں۔ ایک چابی جو ڈپلی کیٹ تھی وہیں رہنے دی۔ دوسری چابی اپنی جیب میں رکھی۔ اس کی لاش کو بھی گھسیٹ کر غسل خانے میں لے جا کر ڈال دیا اور غسل خانے کا دروازہ بند کر کے باہر سے چٹخنی لگا دی اور ٹیلی فون کا ڈائل گھما کر میجر پٹیل کو فون کیا۔

دوسری طرف سے میجر پٹیل نے ہیلو کہا تو میں نے کہا۔

"میجر! میں کیپٹن ہری ناتھ بول رہا ہوں۔ تمہاری بھابی پہنچ گئی ہے۔ شکریہ۔ میں اور کیپٹن پرشاد اور تمہاری بھابی اس وقت کافی پی رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تمہارے ہاں آرہے ہیں۔ پھر اکٹھے اسلحہ ڈپو اور دوسرے گوداموں کی چیکنگ کرنے چلیں گے"

میجر پٹیل نے ہنس کر کہا۔

"سر! اس وقت میں بھی آپ کے پاس آکر بھابی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کافی پیتا مگر میں کام میں سخت مصروف ہوں"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"نو پرابلم میجر! تھوڑی دیر بعد ہم خود تمہارے پاس آرہے ہیں۔ پھر اکٹھے کھانا کھانے باہر چلیں گے"

"تھینک یو سر تھینک یو۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ ذرا کیپٹن پرشاد سے میری بات کرا دیں"

میں نے کہا۔

"اس وقت وہ باتھ روم میں چلا گیا ہے۔ باہر نکلتا ہے تو تمہاری بات کراتا ہوں"

"ڈونٹ وری سر! کوئی بات نہیں۔ اوکے بائی سر!"

"بائی"

اور میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

آخری بار غسل خانے کا دروازہ کھول کر میں نے اندر دیکھا۔ ٹب میں پڑی ہوئی اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے کراہ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ اٹھ کر غسل خانے کے دروازے تک آکر لاتیں مار کر دروازے کو توڑ نہیں سکتی تو کم از کم شور ضرور مچا سکتی ہے۔ میں نے اندر جا کر اس کی ساڑھی کا ایک اور ٹکڑا پھاڑا اور اس کے دونوں پاؤں بھی باندھ دیئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے حلق سے غرغر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے غسل خانے کو بند کر کے چٹخنی لگائی۔ ڈرائنگ روم کی دیوار میں لگے ہوئے قد آدم شیشے میں اپنی وردی کو اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا اور تیز تیز قدموں سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

اب مجھے دوار کا فورٹ کے سب سے بڑے گولہ بارود کے ذخیرے یعنی آرسنل اور ایمونیشن ڈمپ میں پہنچ کر وہاں بم لگانے تھے جو چیونگم کی پندرہ ٹکیوں کی شکل میں میری جیب میں محفوظ پڑے تھے۔ باہر بوندا باندی رک گئی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ میں آفیسرز میس کی دوسری طرف سے ہوتا ہوا اسلحہ کے گودام کی طرف گیا۔ سامنے کی طرف سے جانے سے میجر پٹیل کی نظر اپنے دفتر کی کھڑکی سے مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ ایمونیشن کو برا ہیلی کاپٹروں اور میڈیم اور ہیوی گنوں کے گولہ بارود کے ذخیرے والے گودام کے دروازے پر گارڈ پہرے پر موجود تھا۔ میں کیپٹن ہری ناتھ کی فل وردی میں تھا اور گارڈ اس سے پہلے مجھے میجر پٹیل کے ساتھ وہاں آکر اسلحہ وغیرہ کی چیکنگ کرتے دیکھ بھی چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ میں احمد آباد ہیڈ کوارٹرز سے دوار کا فورٹ میں اسلحہ گولہ بارود اور سکیورٹی کی چیکنگ کے لئے آیا ہوں اس لئے اس نے مجھے دیکھ کر اٹن شن ہو کر سلیوٹ مارا۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر لے جا کر سلیوٹ کا جواب دیا اور چابی اسے دے کر کہا۔

"دروازہ کھولو جوان۔ ضروری چیکنگ کرنی ہے"

گارڈ سنتری نے مجھ سے چابی لی۔ ڈبل مارچ کرتا دروازے تک گیا اور اس کا تالا کھول کر پیچھے ہٹ کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے چابی لے کر کہا۔

"دیکھو جوان میں سیکریٹ چیکنگ کی ڈیوٹی پر ہوں۔ کسی کو اندر مت آنے دینا"

"ٹھیک ہے سر!"

گارڈ سنتری نے سلیوٹ مار کر کہا۔ گودام میں داخل ہونے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ میرے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ تھے۔ اس دوران مجھے وہ سب کچھ کر ڈالنا تھا جس کے لئے میں نے اپنی جان کی بازی لگائی ہوئی تھی اور جو میرا کمانڈو مشن تھا۔ گودام ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا جس کے چھ سات سیکشن بنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں میں پہلے بھی میجر پٹیل اور کیپٹن پرشاد کے ساتھ یہاں آکر تمام اسلحہ گولہ بارود وغیرہ کی چیکنگ کر چکا تھا۔ اور جیسا کہ آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ میں نقلی کیپٹن ہری ناتھ بن کر دوارکا فورٹ کے اس ایمونیشن کے ذخیرے کی چیکنگ کے لئے آیا تھا۔ اصلی کیپٹن ہری ناتھ جس کو ہیڈ کوارٹر نے واقعی چیکنگ کے لئے بھیجا تھا میں نے اپنے ماسٹر سپائی کریم کے ساتھ مل کر راستے میں ہی ہلاک کر ڈالا تھا اور اس کی وردی پہن کر خود کیپٹن ہری ناتھ بن کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

سب سے پہلے میں اس سیکشن میں گیا جہاں اسرائیلی حکومت کی مدد سے انڈیا کی حکومت نے کشمیری مجاہدین کے ٹھکانوں اور ان کے گھروں پر بمباری کرنے اور راکٹ برسانے کے لئے کوبرا ہیلی کاپٹر منگوا کر بڑے بڑے کریٹوں کی شکل میں رکھے ہوئے تھے ان کریٹوں میں ہیلی کاپٹروں کے سارے پارٹس تھے۔ میں نے جیب سے پلاسٹک کا وہ لفافہ نکال لیا تھا جس میں قیامت خیز دھماکے سے پھٹنے والے انتہائی طاقتور چیونگ گم بم تھے۔ بم میں نے ماسٹر سپائی اور ہائی ایکسپلوسیوز کے ماہر کریم بھائی کے ساتھ مل کر خود بنائے تھے۔ میں نے ایک کریٹ چھوڑ کر پانچ کریٹوں کے ساتھ چیونگ بم چپکائے اور ان کے اوپر جو چھوٹا سا ٹیٔن لگا تھا اسے دبا دیا۔ اب ان بموں کو ایک گھنٹے کے بعد قیامت

دھماکوں سے پھٹنا تھا۔

اس کے بعد میں تیز تیز چلتا ہوا دوسرے سیکشن میں آگیا جہاں ہیوی اور میڈیم توپوں کے ڈی سیمبلڈ پارٹس پڑے تھے۔ میں نے یہاں بھی تین بم چپکا کر ان کے ٹین جو ٹائم ڈیوائس تھے دبا دیئے۔ آخر میں میں اس سیکشن میں آگیا جہاں گولہ بارود کا بھاری ذخیرہ موجود تھا۔ یہاں میں نے ٹارگٹ پہلے سے چن رکھے تھے۔ میرے پاس صرف سات بم رہ گئے تھے۔ یہاں زیادہ بم لگانے کی ضرورت نہیں تھی یہ سیکشن خود ایک بہت بڑا بم تھا۔ اسے صرف آگ لگانے کی ہی ضرورت تھی۔ پھر بھی میں نے ایک بم وہاں لگا دیا جہاں لمبی میز پر ہینڈ گرنیڈ بموں اور ہیوی آرٹلری کے گولوں کا بہت بڑا ذخیرہ ڈھیریوں اور دس بارہ قطاروں کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ وہاں بم لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں سے نکل جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر نکل آیا۔ ڈیوٹی پر کھڑے سنتری نے ایڑیاں بجا کر میری تعظیم کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"او کے جوان! سب چیکنگ ہو گیا۔ اب ہم میجر پٹیل کے آفس میں جا رہا ہے۔ کیپٹن پرشاد آئے تو بول دینا ہم میجر صاحب کے پاس ہے"

"ٹھیک ہے سر!"

سنتری نے ادب سے ایڑیاں بجا کر کہا۔

ایمونیشن ڈمپ کے آگے چھوٹی سی پتھریلی ڈھلواں سڑک تھی جو باغیچے کے گرد گھومتی ہوئی کوارٹر گارڈ روم کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں میری جیپ اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی تھی بادل اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ لگتا تھا بارش ہونے والی ہے میں نے جیپ میں بیٹھ کر انجن سٹارٹ کیا اور اسے آہستہ سے موڑ کر دوارکا فورٹ کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر چیک پوسٹ تھی۔ بیریئر ڈاؤن تھا۔ دونوں جانب ملٹری پولیس کے سنتری کھڑے تھے۔ مجھے وہ لوگ شکل سے پہچانتے تھے۔ ویسے بھی میں کیپٹن کی وردی میں

تھا۔ میں نے جیپ آہستہ کر دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور بیریئر اٹھا دیا۔ میں دوارکا فورٹ سے باہر تھا۔ باہر آتے ہی میں نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ دن کی روشنی بادلوں کی وجہ سے کافی کم ہو گئی تھی۔ اب مجھے دوارکا کے ساحل سمندر کی جانب جانا تھا جہاں سمندری چٹانوں میں ہمارا ہائیڈ آؤٹ تھا یہ سارا راستہ مجھے معلوم تھا۔ علاقہ غیر آباد تھا۔ میں جیپ کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔ میری دائیں طرف سمندر آ گیا۔ یہاں دور تک چھوٹی بڑی چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنی نشانی والی دو جھکی ہوئی چٹانوں کے قریب پہنچا تو میں نے جیپ سمندری لہروں میں ڈال دی جب سمندر کی لہریں جیپ کے اندر تک آنے لگیں تو میں نے چھلانگ لگائی اور کمر تک پہنچے ہوئے سمندر کے پانی میں سے گزرتا اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چلنے لگا۔

یہاں میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

میرے حساب سے میرے لگائے ہوئے بموں کے پھٹنے میں بیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ چٹان قریب ہی تھی جس کے کھوہ میں ہم نے اپنا ہائیڈ آؤٹ یا پناہ گاہ بنائی ہوئی تھی۔ میں نے اندر جاتے ہی فوجی وردی اتار دی اور اپنا وہی جوگیوں والا لباس پہن لیا۔ میرے پاس چھ ٹائم بم بچ گئے تھے۔ وہ پلاسٹک کے لفافے میں تھے۔ میں نے ایک رومال میں انہیں لپیٹا اور رومال کو اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔ میں چٹان کی کھوہ سے باہر آ کر چٹان کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ میں نے اور کریم نے اس لئے چنی تھی کہ یہاں سے دوارکا فورٹ کی دیوار دور سے نظر آتی تھی۔ میری نگاہیں دوارکا فورٹ کی دیوار پر لگی تھیں۔ اگر میرے لگائے ہوئے بم ٹھیک وقت پر پھٹ پڑے تو اس دیوار کے پرخچے اڑنے والے تھے۔ کیونکہ میرے قیافے کے مطابق یہ دیوار قلعے کے گولہ بارود والے ذخیرے کی عقبی دیوار تھی۔

سورج بادلوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ بادلوں کی سیاہی شام کی سیاہی میں گھل مل رہی تھی۔ بارش ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی سمندر کی طرف تیز ہوا چل رہی تھی۔ میری نظریں دوارکا فورٹ کی دیوار پر لگی تھیں جو آہستہ آہستہ شام کی سیاہی میں تحلیل

ہونے لگی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چمکتی ہوئی سوئیوں نے مجھے بتایا کہ ابھی بموں کے پھٹنے میں سات منٹ باقی ہیں۔ یہ سات منٹ سات دنوں کے برابر لمبے ہو گئے۔ میں چٹان کے اوپر بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ تین منٹ گزر گئے۔ چار منٹ باقی رہ گئے۔ پھر تین منٹ باقی رہ گئے۔ پھر دو اور پھر ایک منٹ باقی رہ گیا۔ میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار تھوڑی تیز ہو گئی۔ میں نے دل میں دعا مانگی۔ یا پاک پروردگار! تیرے دین کے نام پر جہاد کرنے والے کشمیری مجاہدین کے لئے یہ جنگ لڑ رہا ہوں۔ میں نے اسلحہ اور ہیوی آرٹلری کے اس سازوسامان میں بم لگائے ہیں جسے کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا ہے۔ تو میری لاج رکھنا۔ میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔

وقت پورا ہو گیا تھا۔ میرے لگائے ہوئے پہلے دونوں بموں کو اب بلاسٹ ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کے بعد لگائے ہوئے بموں میں پندرہ بیس سیکنڈوں کا وقفہ تھا۔ میں پوری آنکھیں کھول کر دوارکا فورٹ کی دیوار کو دیکھ رہا تھا جو رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے اور سیاہ بادلوں کی تاریکی میں اب مجھے بالکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مگر ابھی تک وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری مٹھیاں اپنے آپ بھنچ گئی تھیں۔ دھماکہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ بم بنانے کے فارمولے میں کسی چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ میری ساری محنت ساری جدوجہد بیکار ہو کر رہ گئی تھی۔ میری نگاہیں انتہائی مایوسی کے عالم میں بادلوں کی تاریکی اور رات کی سیاہی میں چھپی ہوئی دوارکا فورٹ کی دیوار کی طرف لگی تھیں اور میرے دل پر ناامیدیوں کے سائے منڈلانے لگے تھے کہ اچانک آسمان پر بادلوں میں روشنی کا غبار سا چمک اٹھا۔ اس کے بعد ایسی گونج کی آواز آئی جیسے دور کسی نے ہیوی آرٹلری کی توپ کا فائر کیا ہو۔ ساتھ ہی جس چٹان پر میں بیٹھا تھا وہ ایسے ہلی جیسے زلزلے کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کے بعد دھماکے کی ایک اور گونج بلند ہوئی۔ روشنی کی جگہ دوارکا فورٹ کی جانب بادلوں میں شعلے اس طرح بلند ہوئے جیسے وہاں کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ پھر دھماکوں پر دھماکے ہونے لگے۔ باری باری آتش فشاں پھٹنے لگے۔ آسمان کو سرخ زرد سفید اور نیلے رنگ کے شعلوں نے روشن کر کے

رات کو دن بنا دیا۔ دھماکے اس قدر قیامت خیز تھے کہ اتنی دور سے کان پھٹتے محسوس ہونے لگے۔ میں چٹان پر لیٹ گیا اور سر اٹھا کر دوارکا کے فورٹ کو تکنے لگا جہاں اب سوائے آگ کے بلند ہوتے نیلے سفید زرد سرخ شعلوں اور سفید اور سیاہ دھوئیں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اپنا سر سجدے میں گرا دیا۔ دوارکا فورٹ کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ خدا جانے وہاں کس قدر طاقتور گولہ بارود اور بم تھے کہ ہر دھماکے پر ایٹم بم کے دھماکے کا گمان ہو رہا تھا۔ زمین ہل رہی تھی آسمان شعلہ بن کر سرخ ہو گیا تھا۔ دھماکوں کا سلسلہ دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد شعلے بدستور بلند ہوتے رہے۔ میں جلدی سے چٹان سے اترا۔ کیپٹن ہری ناتھ کی فوجی وردی کو چادر میں لپیٹ کر سمندر کی لہروں کی طرف اچھالا اور ہائیڈ آؤٹ میں واپس آ کر اپنا چھوٹا بٹوہ جس میں کچھ روپے تھے اپنے سادھوؤں والے لمبے کرتے کی بغلی جیب میں ڈالا اور چٹانوں کے درمیان سے ہوتا شہر کی طرف چل پڑا۔

میں دوارکا شہر کو دور سے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے ساتھی کمانڈو اور ماسٹر سپائی کریم کے پاس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو اس نے مجھے از خود ملنے کے لئے منع کر رکھا تھا دوسرے مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ دوارکا میں کس جگہ پر ہوگا۔ اس نے مجھے یہی کہا تھا کہ وہ خود مجھ سے ملنے ہائیڈ آؤٹ میں آئے گا۔ میں سمندر سے ہٹ کر چلتا ہوا سڑک پر آ گیا جو دوارکا شہر کی طرف جاتی تھی۔ شہر دوارکا فورٹ کے شعلوں سے روشن ہو رہا تھا۔ آسمان پر آتش بازیاں چل رہی تھیں۔ راکٹ شوں شوں کی آوازوں میں چیختے چلاتے آسمان کی طرف بادلوں کو چیرتے جا رہے تھے۔ سڑک پر شہر کی طرف سے ایک ٹرک بڑی تیزی سے آیا اور گزر گیا۔ اس کے بعد موٹر گاڑیاں تیز رفتاری سے گزرنے لگیں۔ سڑک پھٹتے اور جلتے ہوئے اسلحہ کے ذخیرے کے شعلوں میں روشن ہو رہی تھی۔ مجھے گاڑیوں میں گھبرائے ہوئے لوگوں کے خوف زدہ چہرے نظر آئے۔ لوگ شہر سے بھاگے جا رہے تھے۔ ایک آدمی موٹر سائیکل پر تیزی سے آیا میرے قریب سے گزرتے

ہوئے اس کا انجن خراب ہو گیا۔ وہ بار بار پاؤں چلا کر موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی ادھر کیا ہوا ہے؟"

وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شہر میں زلزلہ آ گیا ہے۔ ہر طرف آگ لگی ہے یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے ہیں۔"

وہ موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے بھاگ گیا۔ اس کے بعد ایک اور آدمی بوکھلایا ہوا دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا لیکن وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے چلا کر بولا۔

"پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔ بھاگ جاؤ بابا۔ پاکستانی فوج آ گئی ہے"

میں نے گہرا سانس لیا اور خاموشی سے واپس چل دیا۔ میں سمندری چٹان کے کھوہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے کسی کے پانی میں چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ آسمان پر جلتے ہوئے دوارکا فورٹ کے شعلوں کی روشنی اب مدھم پڑ چکی تھی۔ میں نے دھندلی روشنی میں ایک انسانی سائے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو سادھوؤں کی طرح آواز بلند کر کے پوچھا۔

"کیوں بابا! کون ہو تم؟"

اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چلتا ہوا میرے قریب آیا تو وہ ہمارا احمد آباد والا ماسٹر سپائی کریم بھائی تھا۔ کہنے لگا۔

"اندر آ جاؤ"

ہم کھوہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے جیب سے موم بتی نکال کر روشن کر دی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"ہمارا مشن توقع سے بڑھ کر کامیاب رہا"

میں نے اسے مختصر طور پر سارا واقعہ سنایا۔ کریم اپنے ساتھ میرے لئے لفافے میں دو

روٹیاں اور آلو کی بھجیا لایا تھا۔ میں روٹی کھانے لگا وہ اٹھ کر باہر گیا۔ پھر واپس کھوہ میں آ کر بولا۔

"ایمونیشن ابھی تک پھٹ رہا ہے"

اندر سے بچے کھچے ایمونیشن کے پھٹنے کی دھمک مجھے بھی سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے کب تک یہاں چھپے رہنا ہو گا۔ کریم نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تمہیں کم از کم دو دن یہاں گزار کر احمد آباد گوکل داس پانڈے کے گھر جانا ہو گا۔"

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں گوکل داس پانڈے احمد آباد میں انڈیا کی پاکستان دشمن خفیہ تنظیم را کے مقامی ہیڈ کوارٹر کا چیف تھا اور ہوائی مخلوق چندریکا کی مدد سے میں نے اسے اور اس کی بیٹی میناکشی کو جو شعبدہ بازی دکھائی تھی اس کی وجہ سے وہ میرا زبردست مرید بن چکا تھا۔ پانڈے نے مجھے اپنے عالی شان بنگلے میں ٹھہرا رکھا تھا۔ وہیں سے مجھے یہ خفیہ اطلاع ملی تھی کہ دوارکا فورٹ میں اسلحے کی بھاری کھیپ اسرائیلی حکومت کے تعاون سے ایک سمندری جہاز کے ذریعے پہنچ چکی ہے۔ یہ اسلحہ خاص طور پر کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا تھا۔ میں گوکل داس پانڈے کے ہاں جینی سادھو کے بھیس میں رہ رہا تھا۔ میں نے سومنات مندر کی یاترا کا بہانہ بنایا اور کریم بھائی کے ساتھ دوارکا پہنچ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ کریم کہہ رہا تھا۔

"اس سے پہلے ہم مڈگھاٹ کے سٹیشن پر کشمیر کے محاذ پر جانے والے گولہ بارود سے لدی ہوئی ٹرین اڑا چکے ہیں جس پر را کے چیف مسٹر پانڈے کی انکوائری شروع ہو گئی تھی۔ اب ہم نے دوارکا فورٹ کا گولہ بارود اور اسلحہ اور فوجی سازوسامان کا سارے کا سارا ذخیرہ اڑا دیا ہے۔ یقیناً مسٹر پانڈے کے بنگلے کے باہر سیکرٹ سروس کے آدمیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہو گا۔ تم کل وہاں پہنچے تو خفیہ پولیس والوں کو تم پر شک پڑ سکتا ہے۔ وہ لوگ پہلے ہی تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم دو تین دن کے بعد جاؤ۔"

کریم کا مشورہ صحیح تھا۔ میں نے اس سے شہر کی فضا کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے

لگا۔

"شہر میں تو قیامت کا سماں ہے۔ سب یہی کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کے جہازوں نے بم باری کی ہے۔ لوگ دوارکا چھوڑ کر احمد آباد کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کریم بھائی چلا گیا۔

میں نے تین دن چٹانوں کی ہائیڈ آؤٹ میں گزارے۔ کریم بھائی دن میں کسی وقت آ کر مجھے کھانے پینے کو دے جاتا تھا۔ چوتھے روز وہ آیا اور کہنے لگا۔

"اب تم احمد آباد روانہ ہو جاؤ۔ میں کل احمد آباد پہنچوں گا۔ وہاں پہنچ کر مجھے میرے خفیہ نمبر پر بھی ہرگز ہرگز فون نہ کرنا ریلوے لائن والے خفیہ کوارٹر کی طرف بھی مت جانا۔ میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ ہاں اگر کسی قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے تو میرے خفیہ نمبر پر ڈائل کر کے صرف تین بار ہیلو ہیلو ہیلو بول دینا۔ تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ جائے گا۔"

میں اسی روز دوارکا سے احمد آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔

چیونگ گم کی شکل میں چھ ٹائم بم پلاسٹک کے لفافے میں بند میری کمر کے گرد بندھے ہوئے تھے۔ میں سادھوؤں والے لمبے گیروے کرتے اور اسی رنگ کی کھدر کی دھوتی میں ملبوس تھا۔ فرق صرف اتنا پڑ گیا تھا کہ میرے بال پہلے کی طرح لمبے نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے کیپٹن ہری ناتھ کا روپ دھارنے سے پہلے فوجیوں کی طرح بال کٹوا لئے تھے۔ اس کا علاج میں نے یہ کیا تھا کہ سر پر بھی گیروے رنگ کا رومال باندھ لیا تھا۔ تین دن بعد بھی دوارکا شہر میں خوف و ہراس کی فضا تھی۔ ریلوے سٹیشن خالی خالی تھا۔ میں دوپہر کے تین بجے احمد آباد پہنچا۔ سٹیشن پر انگریزی اور گجراتی کے اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ دوارکا فورٹ کی تباہی پر ہر اخبار نے پولیس اور سیکورٹی کے نظام پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ قلعے کی تباہی کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور را کے احمد آباد والے ہیڈ کوارٹر کے چیف اور اپنے بے دام مرید گوکل داس پانڈے کے بنگلے پر آ گیا۔ خفیہ سروس والے تو وہاں پہلے ہی ادھر ادھر موجود تھے۔ لیکن اب بنگلے کے گیٹ پر ایک سنتری

بھی پہرے پر کھڑا تھا۔ میں اندر جانے لگا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس سے ملنا ہے۔

میں نے سادھوؤں کی طرح ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہری اوم! بچہ تم یہاں نئے آئے ہو۔ اندر جا کر خبر کرو کہ گورو دیو سومنات کی یاترا سے واپس آ گئے ہیں"

اس دوران مسٹر پانڈے کی اکلوتی حسین بیٹی میناکشی اوپر والی منزل کے ٹیرس پر آ گئی۔ اس نے مجھے دیکھا تو گارڈ سے کہا۔

"گورو جی کو آنے دو"

میں بنگلے میں داخل ہو گیا۔ میناکشی میرے سواگت کو نیچے پہنچ چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"گورو جی! بڑی بپتا آن پڑی ہے۔ پتاجی کو دلی ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔ یہاں پولیس کا سخت پہرہ لگا ہے"

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیوں بھلا؟ ایسی کون سی بات ہو گئی ہے؟"

میں میناکشی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اوپر والی منزل میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ کہنے لگی

"آپ کو نہیں پتہ؟ دوارکا میں فوج کا جو ایمونیشن ڈمپ تھا کشمیری کمانڈو نے اسے اڑا دیا ہے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں بچا۔ پرائم منسٹر نے خود پتاجی کو نئی دلی طلب کر لیا ہے"

میں اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میناکشی میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور میرے گھٹنوں کو پکڑ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"گورو دیو! بھگوان کے لئے میرے پتاجی کو بچا لیں کہیں انہیں سزا نہ ہو جائے۔ سارا الزام ان پر لگایا جا رہا ہے کہ ان کی غفلت کی وجہ سے کشمیری کمانڈوز کو دوارکا کا فورٹ تباہ کرنے کا موقع ملا"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔ بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔ تمہارے پتاجی کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا"

میناکشی میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"جب تمہارے گورو جی اس گھر میں ہیں تم لوگوں پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ میں آج رات ہی شیو جی مہاراج کا چلہ کرتا ہوں۔"

میناکشی ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"گورو جی صرف آپ ہی ہمارے گھر کو تباہی سے بچا سکتے ہیں"

میں نے میناکشی کی ٹھوڑی ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ میرے لئے اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر لاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میناکشی مجھے اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک مقدس جہاد کے مشن پر انڈیا آیا ہوا تھا اور اس جہاد کا تقاضا تھا کہ میں اپنے دامن کو ہوس کے چھینٹوں سے آلودہ نہ ہونے دوں اور اپنے کردار کو جتنا بھی باوقار اور پاک صاف رکھ سکتا ہوں پاک صاف رکھوں۔ ہر عظیم مقصد کی کامیابی کے واسطے کردار کا بے داغ اور طاقتور ہونا شرط اول ہے۔ میناکشی کافی تیار کرنے نیچے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے ٹیلی فون میں جو مائیکرو فون لگایا ہوا تھا وہ دوارکا مشن پر جاتے ہوئے اپنے سگریٹ لائٹر والے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ساتھ دونوں کو وزن کرنے والی مشین کے اندر چھپا دیا تھا۔ وزن کرنے والی مشین میرے باتھ روم کے باہر ہوتی تھی مگر اب کسی نے اسے اٹھا کر غسل خانے کی اندر رکھ دیا تھا۔ میں اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور وزن کرنے والی مشین کو نیچے سے کھولنے لگا۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ میرا ریڈیو ٹرانسمیٹر اور قمیض کے بٹن کے سائز کا مائیکرو فون مشین کے اندر موجود تھا۔

میں نے اسے وہیں رہنے دیا۔ مشین کا ڈھکنا لگا کر پیچ کس دیئے اور منہ دھو کر بالوں میں کنگھی پھیری۔ گیروے رنگ کا رومال دوبارہ سر پر باندھا اور ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف سے میناکشی کی آواز آئی۔

"گورو دیو! میں آپ کے لئے کچوریاں بنا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے شما کر دیں"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں بالکی۔ کوئی بات نہیں"

دوسری منزل والے کمرے کی ٹیرس والی شیشے کی دیوار کے پردے گرے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر ایک طرف سے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ یہاں سے نیچے بنگلے کے گیٹ کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کے سامنے کچھ فاصلے پر جو درختوں کا جھنڈ تھا اس کے نیچے لکڑی کے بنچ پر دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی ان کے قریب کھڑا تھا۔ جو آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ایک نگاہ بنگلے کی اوپر والی منزل کی طرف ڈالی۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کوئی بات کی اور درختوں کی دوسری طرف جو رستہ باہر سڑک کی طرف جاتا تھا اس طرف چلا گیا۔

آپ میری کہانی میں پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہ خفیہ پولیس کے آدمی تھے۔ جو احمد آباد کی سیکرٹ پولیس کی طرف سے یہاں تعینات کئے گئے تھے اور اس کی مسٹر پانڈے کو خبر ہو چکی تھی۔ اسے یہی کہا گیا تھا کہ نیشنل سیکورٹی کی خاطر ان کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہاں اس بات کی نگرانی ہو رہی تھی کہ مسٹر پانڈے کے بنگلے پر کون کون اس سے ملاقات کرنے آتا ہے۔ مڈگھاٹ کے سٹیشن پر ہم نے جو اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی ٹرین اڑائی تھی اس کے بعد یہاں سیکورٹی سخت کر دی گئی تھی اور میں بھی جب باہر کہیں جاتا تھا تو خفیہ سروس کا ایک آدمی باقاعدہ میرے پیچھے لگ جاتا تھا۔ اگرچہ مسٹر پانڈے نے ان لوگوں کو بتایا ہوا تھا کہ یہ ہمارے گورو جی ہیں اور دلی سے یہاں جین مندروں کی یاترا کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ لیکن خفیہ پولیس والوں کو میری یاترا

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ برابر میری نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اور دوار کا فورٹ کی تباہی کے بعد تو سیکرٹ سروس والوں کی سرگرمیاں تیز ہو جانا یقینی بات تھی۔

میں نے بھی نوٹ کیا کہ پہلے درختوں کے نیچے کوئی بنچ نہیں ہوتا تھا اور آدمی بھی ایک ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اب وہاں تین آدمی آ گئے تھے اور ایک آدمی میرے کمرے پر گہری نگاہ ڈالنے کے بعد وہاں سے ابھی ابھی کسی جگہ گیا تھا۔ مجھے قدرتی طور پر تشویش ضرور ہوئی لیکن میں اپنے طور پر مطمئن تھا کہ چونکہ پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اس لئے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکے گا۔ لیکن یہاں میں نے تھوڑی غفلت کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے تھا کہ اس علاقے میں حالات انتہائی تشویش ناک حد تک سنگین ہو چکے تھے۔ مڈگھاٹ پر فوجی ایمونیشن کی ٹرین کی تباہی کے بعد دوار کا کا مشہور گولہ بارود کے ذخیرے کا تباہ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ جب کہ احمد آباد میں پاکستان دشمن تنظیم را کے چیف کو انڈیا کی پرائم منسٹر اندرا گاندھی نے دلی بھی طلب کر لیا ہوا تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ آدمی کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار کیوں نہ ہو یہ اس کی فطرت میں ہے کہ کہیں اس سے غلطی یا بھول ضرور ہو جاتی ہے۔ حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ میں مسٹر پانڈے کے بنگلے سے نکل جاتا۔ لیکن میں اس خیال سے وہاں بیٹھا رہا کہ شاید مجھے کوئی اور خفیہ اطلاعات مل جائیں۔ کیونکہ ان دنوں را کی خفیہ تنظیم کی جانب سے انڈیا گورنمنٹ نے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کا ایک خطرناک پروگرام بنایا تھا میں اس پاکستان دشمن منصوبے کو شروع ہونے سے پہلے ہی تباہ کر دینا چاہتا تھا اور اس کے بارے میں مجھے سب سے مستند اطلاعات مسٹر پانڈے کے گھر سے ہی مل سکتی تھیں۔

اس حقیقت کی میں ایک بار پھر یہاں وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں پاکستانی ضرور تھا مگر مجھے پاکستان کی طرف سے انڈیا میں جاسوسی کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا۔ میں پاکستان سے کشمیری مجاہدین کی جدوجہد آزادی سے اپنی محبت اور اپنے والد صاحب کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے بارڈر کراس کر کے انڈیا میں داخل ہوا تھا۔ میں پہلے بھی اپنے قارئین کو بتا چکا ہوں اور اب بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میرے والد صاحب بستر مرگ پر

تھے۔ وہ مشرقی پنجاب کے آگ اور خون کے سمندر سے مجھے اور میری چھوٹی بہن کلثوم کو
لے کر اپنے گاؤں سے پاکستان کی طرف چلے تھے کہ قافلے پر سکھوں کے جتھے نے حملہ کر
دیا۔ ہم چھوٹے تھے۔ والد صاحب ہم دونوں کو لے کر کھیتوں میں دوڑ پڑے۔ ایک سکھ
نے تلوار لے کر ہمارا پیچھا کیا۔ اس نے میری چھوٹی بہن کلثوم کی گردن پر تلوار ماری اور
کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ گئی اور وہ وہیں شہید ہو گئی۔ والد صاحب کسی نہ کسی طرح
اپنی اور میری جان بچا کر پاکستان پہنچ گئے۔ وہ اپنی بیٹی اور میری چھوٹی بہن کلثوم کو یاد کر
کے رویا کرتے تھے۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو کشمیر میں آزادی کی جنگ تیز ہو رہی
تھی۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا اور کہا۔

"بیٹا! میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری دو خواہشیں پوری
کرو۔ پہلی خواہش یہ ہے کہ جہاں تمہاری بہن کلثوم شہید ہوئی تھی وہاں جا کر فاتحہ پڑھ کر
میری بیٹی کی روح کو ثواب پہنچاؤ اور دوسری خواہش یہ ہے کہ جہاد کشمیر میں شریک ہو کر
اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے ساتھ مل کر کفار کے خلاف لڑو اور جب کشمیر آزاد ہو
جائے تو میری قبر پر آکر کہہ دینا کہ میاں جی کشمیر آزاد ہو گیا ہے۔"

میرے والد صاحب کی یہی دو خواہشیں تھیں جنہیں پورا کرنے کے لئے میں نے
کمانڈو کی زبردست ٹریننگ لی۔ ہائی ایکسپلوسویز کی تربیت لی اور پاکستان کی سلامتی اور
استحکام کے لئے کافروں کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ یہی میرا مشن تھا۔ انڈیا میں آکر مجھے
معلوم ہوا کہ پاکستان دشمن را کی خفیہ تنظیم سرکاری سطح پر پاکستان میں دہشت گردی اور
تخریب کاری کے منصوبے بنا رہی ہے اور پاکستان میں اس کے ایجنٹوں نے تخریب کاری
شروع بھی کر دی ہے۔ چنانچہ میں نے جہاد کشمیر میں شرکت کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی
میں اس مشن کو بھی شامل کر لیا کہ انڈیا میں رہ کر میں بدنام زمانہ بھارتی را کے پاکستان کے
خلاف منصوبوں کو برباد کرنے کی ہر طرح سے کوشش کروں گا خواہ اس میں میری جان ہی
کیوں نہ چلی جائے۔ لہٰذا میں اپنے قارئین سے جو میری زندگی کی سچی داستان پڑھ رہے
ہیں درخواست کروں گا کہ وہ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ میں پاکستان کی حکومت کی
طرف سے انڈیا میں جاسوسی کرنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ ساری جدوجہد اپنے طور پر کر رہا
تھا میری خفیہ سرگرمیوں کا پاکستان کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور آپ میری
داستان میں یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ میں جب بارڈر کراس کر کے انڈیا میں داخل ہوا تھا تو
سب سے پہلے ان کھیتوں میں گیا تھا جہاں میری بہن کو سکھ نے شہید کیا تھا۔ مجھے وہ کھیت
وہ جگہ یاد تھی۔ اس وقت میری عمر چھ سات برس کی تھی۔ اب میں 20 برس کا نوجوان
تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر فاتحہ پڑھی اور اپنی شہید بہن کی روح کو ثواب پہنچایا۔ ظاہر ہے
اب وہاں اس کی لاش کی ہڈیاں بھی نہیں رہی تھیں۔ کھیت میں کئی بار ہل چل چکا تھا۔ کئی
بار فصل اگ چکی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے کشمیر کی
طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کے سارے حالات آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔

اتنے میں مسٹر پانڈے کی حسین بیٹی میناکشی میرے لئے کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے
ریشمی ساڑھی کا پلو کمر کے ساتھ باندھ رکھا تھا وہ میرے لئے کچوریاں بھی بنا کر لائی تھی۔

"گوروجی! پتہ نہیں میری بنائی ہوئی کچوریاں آپ کو پسند بھی آئیں گی کہ نہیں۔"

وہ کافی بنانے لگی۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میناکشی! تم جو بناؤ وہ مجھے پسند ہے تم خود بھی مجھے بڑی پسند ہو۔"

وہ شرما گئی۔ کبھی کبھی میں اسے خوش کرنے کے لئے اس سے ایسی باتیں کر لیا کرتا
تھا۔ اوپر سے تو میں اس قسم کی شوخی کی باتیں کر رہا تھا لیکن دل میں ایک کھد بد سی لگی
ہوئی تھی۔ بار بار میرا دھیان اس خفیہ سروس والے آدمی کی طرف جاتا تھا جس نے
میرے دوسری منزل والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ پھر درختوں کے نیچے بیٹھے
ہوئے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کوئی بات کی تھی اور ایک چل دیا تھا۔ کہیں یہ لوگ
میری واپسی کے انتظار میں تو نہیں تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انہیں میرے کشمیری
کمانڈو ہونے کا یقین ہو گیا ہو اور مجھے واپس بنگلے میں آتا دیکھ کر وہ آدمی فون پر خفیہ
پولیس چیف کو اطلاع دینے گیا ہو۔ اس وقت اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اس
بنگلے سے نکل جانا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے میں نے اپنے دل کے اس خیال پر

کوئی توجہ نہ دی۔

اور پھر خوبصورت میناکشی جو واقعی دل سے مجھ سے محبت کرتی تھی میرے سامنے بیٹھی تھی اور کچوری کی پلیٹ میرے سامنے پیش کر کے کہہ رہی تھی۔

"گوروجی! لیجئے نا"

میں نے کچوری اٹھائی اور کھانے لگا۔ کچوری واقعی بڑے مزے دار تھی۔ میناکشی نے کافی کی پیالی میرے آگے رکھی اور ساڑھی کا پلو کھولتی ہوئی ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔

"میں پتاجی کو بتاتی ہوں کہ گورودیو آگئے ہیں۔"

ٹیلی فون اس نے گود میں رکھ لیا اور بار بار کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد اسے نمبر مل گیا۔

"ہیلو! میں میناکشی پانڈے احمد آباد سے بول رہی ہوں۔ پلیز مسٹر گوکل داس پانڈے سے میری بات کروا دیجئے۔ میں ان کی پتری ہوں۔ جی۔ یس۔ یس۔"

اس کے بعد میناکشی انگریزی میں بات کرنے لگی۔ میں کافی پیتے ہوئے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

"پلیز کوشش کریں۔ مجھے ڈیڈی سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے جو کوئی بھی بول رہا تھا میناکشی اسے سننے لگی۔ پھر اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے ٹیلی فون ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ پرائم منسٹر کے سکریٹری کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔"

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"میناکشی جب میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تمہارے ڈیڈی کو کچھ نہیں ہوگا۔ پھر کیوں فکر کرتی ہو"

میناکشی نے کہا۔

"میں پتاجی کو آپ کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ وہ بڑے خوش ہوتے۔ انہیں

حوصلہ ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے وہ آپ سے بھی بات کر لیتے مگر یہ پرائم منسٹر ہاؤس کے بیوروکریٹس بڑے سنگ دل ہیں۔"

میرے صرف کان میناکشی کی باتیں سن رہے تھے۔ دل کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ایک عجیب بے چینی سی میرے اندر لگی ہوئی تھی۔ میں نے میناکشی سے پوچھا۔

"یہاں کہیں میرا سگریٹوں کا پیکٹ تو نہیں پڑا ہوا؟"

میرا دل سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے ذہنی خلفشار کو تحلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت میری جیب میں سگریٹ نہیں تھے۔ دوارکا مشن پر میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ سگریٹ نہیں رکھے تھے۔ میناکشی جلدی سے بولی۔

"ہاں گوروجی! آپ کا سگریٹ کا ایک پیکٹ مجھے آپ کے کمرے کی صفائی کرتے ملا تھا۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا"

وہ دوڑ کر الماری کی طرف گئی۔ اس کے دراز میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر لے آئی۔ ماچس بھی وہیں ساتھ ہی تھی۔ اس میں چار سگریٹ تھے۔ میں نے سگریٹ لگا لیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری ساری توجہ شیشے کی دیوار پر گرے ہوئے پردے پر تھی۔ میں نے میناکشی سے کہا۔

"یہ پردہ کیوں گرایا ہوا ہے۔ باہر کی روشنی اندر آنی چاہیئے"

میں نے قریب جا کر پردہ ایک طرف ہٹا دیا اور کونے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا۔ بنگلے کے سامنے درختوں میں وہی دو خفیہ پولیس والے بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تیسرا آدمی جو جا چکا تھا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں دیوار سے ہٹ کر میناکشی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔

"گوروجی! کیا بات ہے۔ آپ کچھ تھکے تھکے سے نظر آتے ہیں۔ آپ نے بڑا لمبا سفر کیا ہے۔ آپ آرام کریں۔ میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ وہ ہاتھ باندھ کر مجھے نمسکار کہہ کر نیچے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اٹھا اور شیشے کی دیوار کے کونے میں

کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ بظاہر وہاں کوئی بھی تشویش والی بات نظر نہیں آرہی تھی۔
خفیہ سروس والے آدمی بنچ پر بیٹھے تھے۔ وہ وہاں بیٹھے ہی ہوتے ہیں۔ ان کا ایک آدمی
اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ظاہر ہے اسے کوئی کام یاد آگیا ہو گا۔ اور وہ چلا گیا۔ پھر میرے دل کو
کس بات کی بے چینی لگی تھی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ حقیقت یہ تھی
کہ میرا دل مجھے ایک آنے والے انتہائی خطرناک حادثے سے آگاہ کر رہا تھا مگر اس کی
آگاہی اور اس کے اشارے میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

مطلع دوارکا سے لے کر احمد آباد تک ابر آلود چلا آرہا تھا۔ یہاں بھی آسمان پر گہرے
بادل چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ میں ابھی تک
سادھوؤں والے لباس میں تھا۔ یعنی گیروے رنگ کا لمبا چولا جس کی بغلی جیب میں میرا
تھا جس میں کچھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ گیروے رنگ کی دھوتی۔ کمر کے ساتھ رومال
میں چھ چھوٹے ٹائم بم پلاسٹک میں موجود بندھے ہوئے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے دوپہر کے
بعد کی روشنی شام ہونے سے پہلے ہی سرمئی سی ہو رہی تھی۔

میں شیشے کی دیوار کے پاس کھڑا گیٹ کے سامنے والے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں
خفیہ پولیس کے آدمی بنچ پر بیٹھے بیڑیاں سگریٹ پی رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک
آدمی کسی طرف سے نکل کر آیا اور ان آدمیوں کے پاس چائے کے دو شیشے کے گلاس رکھ
کر چلا گیا۔ وہ دونوں چائے پینے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ میں
نے اپنے آپ سے کہا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ مجھے خوامخواہ کا وہم ہو
رہا ہے کہ یہاں میرے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ میں نے پردہ برابر کر دیا۔ پردہ
گرانے سے کمرے میں اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ اندھیرا مجھے اچھا لگا۔ میں صوفے پر بیٹھنے کی
بجائے دیوان پر نیم دراز ہو کر سگریٹ پینے لگا اور سوچنے لگا کہ میرا مشن انتہائی کامیاب
ہے۔ اب مجھے مسٹر پانڈے سے را کے پاکستان دشمن منصوبوں کے بارے میں معلومات
حاصل کرنی ہو گی تاکہ اس سے پہلے کہ کوئی تخریب کار پاکستان میں دہشت گردی پر روانہ
ہو میں اسے یہیں ختم کر دوں۔

مجھے سیڑھیوں والے چھوٹے برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں
نے گردن گھما کر دیکھا۔ مینا کشی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔
اس نے ساڑھی تبدیل کر لی تھی اور اب صرف بادامی رنگ کی ریشمی پتلون اور اسی رنگ
کی کھلے گریبان والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے آتے ہی کمرے میں اعلیٰ ترین پرفیوم
کی خوشبو پھیل گئی۔ میں دیوان پر اسی طرح لیٹا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے دیوانہ
وار پیار کرتی ہے اور میری طرف سے کسی قسم کی پیش قدمی نہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی
مجھ سے پیار محبت کی باتیں کر لیتی ہے۔ میں نے اسے اس کی اجازت دے رکھی تھی اور
اس کے جذبات کو ایک خاص حد تک جانے کی اجازت دے دیا کرتا تھا۔ وہ میرے دیوان
کے پاس آکر قالین پر بیٹھ گئی اور میری پنڈلیاں دباتے ہوئے بولی۔

"گورو جی! مجھے اس خیال نے نیچے بیٹھنے نہیں دیا کہ آپ تھکے ہوئے پریشان لگتے
ہیں۔ میں آپ کو آرام پہنچانے کے خیال سے آگئی ہوں۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟"

مجھے اس وقت مینا کشی کی پنڈلیاں دبانا اچھا لگ رہا تھا۔ میں تھکا ہوا بھی تھا۔ اور چاہتا
تھا کہ کوئی میرے قریب بیٹھ کر مجھے سکون پہنچائے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں مینا کشی! مجھے اچھا لگ رہا ہے"

مینا کشی کو اور کیا چاہئے تھا۔ اس نے پنڈلیاں دباتے دباتے اوپر اٹھ کر میرے ہاتھ
سے سگریٹ لے لیا اور بولی۔

"گورو جی! میں آپ کو زیادہ سگریٹ نہیں پینے دوں گی۔ اس سے کینسر ہو جاتا ہے"

میں نے کہا۔ "مگر یہ تو وہی سگریٹ ہے جو تم دے گئی تھیں"

اس نے سگریٹ میز پر رکھے ایش ٹرے میں بجھا کر ڈال دیا اور واپس آکر قالین پر
بیٹھنے کی بجائے دیوان پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت مینا کشی پر کچھ بھوت زیادہ
ہی سوار تھا۔ میں ذرا پرے ہو گیا۔ وہ میرے سینے پر سہلانے کے انداز میں آہستہ آہستہ
ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر گہرے بادل، کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا
اور مینا کشی کی ریشمی قمیض اور ریشمی پتلون سے آتی پرفیوم کی مہک۔ سارا ماحول بے حد

رومانٹک بن رہا تھا۔ مگر میں اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہا
کیونکہ آدمی خطا کا پتلا ہوتا ہے اور اس پر کسی بھی وقت شیطان اگر غالب نہیں آتا تو ہم نے
ضرور کر سکتا ہے۔

اچانک میناکشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"گورو جی! دیکھیں۔ آپ کی پرارتھنا سے میرے پیٹ پر زخم کا نشان بھی نہیں رہا"

میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے میناکشی اس طرح کھڑی تھی کہ اس نے ا
قمیض اوپر اٹھا کر پیٹ ننگا کیا ہوا تھا اور پتلون بھی اوپر سے کافی نیچے کھسکا رکھی تھی۔ ا
کی ناف کے نیچے کا ابھار صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ قمیض نیچی کر لو۔"

میناکشی نے بڑی عاجزی کی ساتھ کہا۔

"گورو جی! میری آپ سے صرف ایک التجا ہے بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری
کو نہ ٹھکرائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے پیٹ میرے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"میرے پیٹ پر جہاں زخم کا نشان تھا وہ جگہ چوم لیں۔ مجھے یقین ہے آپ
چومنے سے میرے سارے پاپ دھل جائیں گے۔ پھر میں اگلے جنم میں آکاش کی اپسرا
کر جنم لوں گی۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ میرے عشق میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے اس کی بات ا
لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کا جی خوش ہو جائے گا میں نے سر اٹھایا۔ منہ آگے کر
اس کے پیٹ کو چوما اور جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"بس اب نیچے اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی میں تمہیں
اجازت نہیں دوں گا۔"

مگر خدا جانے میناکشی کو کیا ہو گیا تھا۔ جنسی جذبات کے معاملے میں میں نے اسے

بھی اس قدر بے چین اور اپنے آپ سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو مجھ پر گر پڑی۔ اس
قمیض اتار کر پرے پھینک دی اور میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ میں جھوٹ نہیں
بولوں گا۔ میں نے آپ کو اپنی داستان سنانے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آپ کو سارے
واقعات حرف بحرف اسی طرح بیان کروں گا جس طرح وہ میرے ساتھ پیش آئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے ارادوں کی چٹان بھی ہل گئی۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہل
گیا۔ میں اپنا ہاتھ میناکشی کے جسم سے الگ کرنا چاہتا تھا مگر وہ الگ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی
طاقت نے اسے میناکشی کے جسم کے ساتھ اس طرح پیوست کر دیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے
یک انچ کیا ایک سوتر کے برابر بھی اوپر نہیں اٹھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ
جنسی جذبات بھی زندگی کی دوسری حقیقتوں کی طرح ایک بہت بڑی حقیقت اور ایک بہت
بڑی طاقت ہے اور اس طاقت کو انسان کبھی بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ اس طاقت کو صحیح رخ پر
ڈالنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس وقت میری یہ طاقت غلط رخ پر پڑ چکی تھی۔ میناکشی تو
پگھل ہوئی جا رہی تھی۔

عین اس وقت کونے کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجنے لگی۔ میں
جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جن خدشوں اور تشویش سے میں نے ذہنی طور پر چھٹکارا حاصل
کر لیا تھا وہ سارے خدشے اور تشویشناک خیالات دوبارہ میرے دماغ میں بیدار ہو گئے۔
میناکشی بھی جلدی سے الگ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"کہیں پتا جی کا دلی سے فون نہ آیا ہو"

وہ ریشمی قمیض الٹی سیدھی پہنتی فون کی طرف دوڑی۔ ریسیور اٹھا کر بولی۔

"ہیلو"

پھر اس نے فون میز پر رکھ دیا اور پتلون اوپر کرتے ہوئے میرے قریب آکر کہنے
لگی۔

"گورو جی! آپ کا فون ہے۔ جلدی فون سن کر آجانا"

وہ دیوان پر لیٹ گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف گیا۔ اس بات پر

سخت حیران تھا کہ مجھے یہاں فون کس نے کیا ہے۔ میں نے تو سوائے کریم بھائی کے اور
کسی کو یہاں کا فون نمبر نہیں دیا اور اس نے بھی یہاں کبھی فون نہیں کیا۔ اور اس وقت
اس کے فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے ریسیور کان کے ساتھ لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہیلو! میں گوروداس وردھنا بول رہا ہوں"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"فوراً روپوش ہو جاؤ"

اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ ہمارے ماسٹر
سپائی کریم بھائی کی آواز تھی۔ کریم نے مجھے جو پیغام دیا تھا یہ کوئی بھی ماسٹر سپائی اپنے
کمانڈو جاسوس کو اس وقت دیتا ہے جب کمانڈو جاسوس انتہائی خطرناک حالات میں گھر چکا
ہو۔ یہ ایسا ہی پیغام ہوتا ہے جو کسی جہاز کا پائلٹ جب جہاز گر کر کریش ہونے والا ہو تو
آس پاس کے کنٹرول سنٹروں کو مے ڈے مے ڈے کہہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ
کہ کچھ کر سکتے ہو تو کرو کیونکہ میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ "روپوش ہو جاؤ" کا
پیغام جب کسی کمانڈو جاسوس یا عام جاسوس کو ملتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ
موت تمہارے سر پر پہنچنے والی ہے بھاگ سکتے ہو تو جہاں اور جس حالت میں بھی ہو جان
بچا کر بھاگ جاؤ۔

یہ پیغام ملتے ہی مجھے اپنے سارے خدشے اور اندیشے درست نظر آنے لگے۔ میں
نے سب سے پہلے میناکشی سے کہا۔

"نیچے جاؤ۔ فوراً"

میرا لہجہ اس قدر تیز اور تحکمانہ تھا کہ میناکشی ڈر کر اٹھی اور اپنا لباس ٹھیک کرتی ہوئی
سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے دوڑ کر پردے کو ہٹایا اور بنگلے
کے گیٹ پر نگاہ ڈالی میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے تیز ہو گئی۔ پولیس کی
گاڑیاں تیزی سے ایک طرف سے آئیں اور بنگلے کے سامنے آکر ایک دم بریکیں لگنے

دھچکوں کے ساتھ رک گئیں۔ اب سوائے بھاگنے کے میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں
تھا۔ میں اپنے کمرے کا کئی بار اس خیال سے جائزہ لے چکا تھا کہ اگر کبھی ایمرجنسی کے
حالات پیدا ہو گئے تو مجھے کیا کرنا ہوگا اور کس طرف سے فرار ہونا ہوگا۔ میرے دوسری
منزل والے کمرے کے عقب میں نیچے نوکروں کے کوارٹروں کی چھت تھی۔ اس چھت
تک ایک پائپ گیا ہوا تھا۔ میرے کمرے کی عقبی کھڑکی اور کوارٹروں کی چھت کے
درمیان ایک روشندان کا چھوٹا چھجہ بھی باہر کو نکلا ہوا تھا۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے مسٹر
پانڈے کے بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچ چکی تھی اور بہت ممکن تھا کہ پولیس کے کچھ سپاہی
اس خیال سے بنگلے کی پچھلی طرف بھی آجائیں کہ کہیں میں پچھلی طرف سے نہ نکل
جاؤں۔ اس لئے میرے پاس سوچنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔

میری کمانڈو ٹریننگ کی تمام صلاحیتیں ابھر آئی تھیں۔ اس وقت میں ایک جینی سادھو
کی بجائے ایک انتہائی تربیت یافتہ تجربے کار کمانڈو بن چکا تھا۔ میں کھڑکی میں سے باہر نکل
کر نیچے روشندان کے چھجے پر آگیا اور پائپ کو پکڑ کر اس سے بھی نیچے نوکروں کے کوارٹر
کی چھت پر کود گیا۔ میں اس طرح کودا کہ اپنا سر دونوں بازوؤں میں کر لیا اور چھت پر
آتے ہی قلابازی کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری جانب بنگلے کی عقبی گلی تھی جس کے آگے
اینٹوں کی قد آدم دیوار تھی۔ میں کوارٹروں کی چھت سے گلی میں کودا اور دوڑ کر دیوار پر
چڑھا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ یہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں ہر قسم کے
درخت اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میری حالت اس وقت اس چیتے کی طرح
تھی جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو اور اس کی طرف سرپٹ بھاگ رہا ہو۔ مجھے نہیں معلوم
میں نے کس طرح وہ میدان پار کیا۔ آگے ایک اور دیوار آگئی جس پر بیلیں چڑھی ہوئی
تھیں۔ میں یہ دیوار بھی پھلانگ گیا۔ دوسری طرف ایک سڑک تھی جس پر ٹریفک آجا
رہی تھی۔ مجھے کوئی خالی رکشا یا ٹیکسی نظر نہ آئی۔ میں اب بھاگ تو نہیں رہا تھا مگر سڑک
کی دوسری طرف درختوں کے پیچھے آکر تیز تیز مغرب کی طرف چلا جا رہا تھا۔ مجھے اتنا
معلوم تھا کہ مغرب کی سمت چلنے سے میں احمد آباد شہر سے باہر نکل جاؤں گا۔

مگر میں زیادہ دیر پیدل چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ پولیس کو جب میں گوکل داس پانڈے کے بنگلے پر نہیں ملا ہوں گا اور میناکشی نے پولیس کو بتایا ہو گا کہ میں تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں تھا اور مجھے کسی کا فون آیا تھا تو پولیس سمجھ گئی ہو گی کہ میں دوسری منزل سے بنگلے کے پیچھے کی طرف کود کر بھاگ گیا ہوں اور پولیس یقیناً میرے پیچھے اسی طرف آ رہی ہو گی۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جانا چاہئے تھا۔ مگر مجھے کوئی ٹیکسی رکشا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک ٹرک پر پڑی جو سڑک پر پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ آگے سڑک کا موڑ تھا۔ میں موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں آ کر ٹرک کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ جب ٹرک موڑ گھوما تو میں نے اس کے پیچھے دوڑ کر اس کے لٹکتے ہوئے رسے کو پکڑا اور لٹک گیا۔ پھر ایک ٹانگ اوپر رکھ کر خود کو ٹرک کے پیچھے بوریوں کے درمیان گرا دیا۔

میں ٹرک پر لدی ہوئی بوریوں کے درمیان جہاں گرا تھا کچھ دیر وہیں پڑا رہا۔ پھر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ٹرک میں نیچے سے اوپر تک کسی چیز سے بھری ہوئی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ٹرک تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑتا جا رہا تھا۔ بوریوں کے اوپر ترپال ڈال کر رسیوں سے باندھ دی گئی تھی۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں کافی جگہ تھی اور ایک ٹائر کی سٹپنی اور دو خالی ڈبے پڑے تھے۔ جس طرح میں بیٹھا تھا باہر سے دیکھنے پر صرف میری گردن ہی نظر آتی تھی۔ اس خیال سے میں نے اپنا سر نیچے کر لیا کہ اگر پولیس کی گاڑی میری تلاش میں اس سڑک پر آئے تو میں اسے دکھائی نہ دوں۔

آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ بارش ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ٹرک کس طرف جا رہا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شہر سے باہر نکل رہا ہے یا آگے جا کر واپس شہر کی غلہ منڈی کی طرف مڑ جائے گا۔ اس وقت میرے لئے یہ بات ہی کافی تھی کہ میں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے ڈر نکلا ہوں۔ میں ٹرک کے پیچھے بوریوں کے درمیان اس طرح نیم دراز ہو کر لیٹا تھا کہ مجھ اوپر پیچھے کو جاتے ہوئے درخت نظر آ رہے تھے۔ سڑک بالکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ٹرک

اپنی خاص رفتار سے چلتا رہا۔ اس نے سڑک پر ایک موڑ بھی کاٹا۔ پھر سیدھا ہو کر سامنے کے رخ چلنے لگا۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ ٹرک احمد آباد شہر سے باہر کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے دل میں یہی پروگرام بنایا تھا کہ شہر سے باہر نکلتے ہی میں کوئی مناسب جگہ اور موقع دیکھ کر ٹرک سے چھلانگ لگا دوں گا اور کسی جنگل میں غائب ہو جاؤں گا۔ کچھ دن جنگل میں ہی گزاروں گا اور اس کے بعد کسی طرح حلیہ بدل کر دلی پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ دلی میں ہمارا ایک دوسرا ماسٹر سپائی گل خان تھا۔ مجھے اب اس کے پاس پہنچ کر کسی اگلے کمانڈو مشن کی تیاری کرنی تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے بریکیں لگائیں اور ٹرک کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ ٹرک کسی جگہ رک رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ آگے کوئی ٹریفک سگنل والا چوک آ گیا ہے۔ ڈرائیور لال بتی کے اشارے پر ٹرک کو روک رہا ہے۔ لیکن آگے صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ میں نے سر باہر نکال کر آگے کی طرف دیکھا تو میرا رنگ اڑ گیا۔ چوک میں پولیس کی پوری مسلح گارڈ موجود تھی۔ سب انسپکٹر نے ٹرک ڈرائیور کو باہر نکلنے کے لئے کہا۔ ساتھ ہی دو سپاہی ٹرک کا پچھلا حصہ چیک کرنے کے لئے میری طرف بڑھے۔ میں نے اپنے آپ کو پیچھے گرا دیا۔

باہر نکل کر بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر سپاہی کے پاس رائفل تھی۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت تھے وہ بڑی آسانی سے گولی مار سکتے تھے۔ ایک ثانیہ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے پچھلے سارے واقعات فلم کی طرح گھوم گئے۔ مجھے ٹرک کی دونوں جانب سے پولیس والوں کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ٹرک کے پیچھے آ رہے تھے۔ ظاہر ہے پولیس نے میری تلاش کے لئے احمد آباد شہر سے باہر جانے والے سارے راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی اور ایک ایک گاڑی کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اگرچہ پولیس کے پاس میری کوئی فوٹو نہیں تھی لیکن میناکشی نے اور گیٹ والے گارڈ نے میرا حلیہ پولیس کو بتا دیا ہو گا اور میں ابھی تک اسی حلیے یعنی سادھوؤں والے لباس میں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو گرفتار ہونے کے لئے تیار کر لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں

تھا۔ ٹرک میں بوریاں ایک دوسری کے اوپر اس طرح رکھی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ صرف سامنے تھوڑی سی جگہ تھی جہاں میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ سپاہی ٹرک کے عقب میں آگئے۔

میں ان کے سامنے بوریوں کے پاس سکڑ کر بیٹھا انہیں تکنے لگا۔ دونوں پولیس والوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جو انہوں نے ٹرک کی بوریوں کی جانب تان رکھی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ مزاحمت کرنی بیکار تھی۔ یہی طے کیا کہ جاسوس کمانڈو کا گرفتار ہو جانا بھی اس کھیل کا ایک حصہ ہے آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پولیس کے سپاہیوں کو چاہئے تھا کہ رائفلوں کا رخ ایک دم میری طرف کر کے شور مچا دیتے کہ مفرور پیچھے ہے۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے نہ تو دوسرے پولیس سنتریوں یا اپنے سب انسپکٹر کو آواز دی اور نہ آگے بڑھ کر مجھے پکڑا۔ بلکہ انہوں نے مجھے آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ بس مجھے ایسا لگا جیسے ان کی نظریں میرے آس پاس بوریوں کا ہی جائزہ لے رہی ہیں پھر ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔

"سرا پیچھے مفرور مجرم نہیں ہے"

اور دونوں ٹرک کے اگلے حصے کی طرف چل دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا کہ کہیں میں غائب تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں غائب بھی نہیں تھا اور ان سپاہیوں کو میں دکھائی بھی نہیں دیا۔ میں ٹرک کے پیچھے اپنے پورے جسم اور اپنے لباس کے ساتھ موجود تھا۔ پھر یہ سب کیسے ہو گیا کہ سپاہی میری تلاش میں ٹرک کے پیچھے آئے۔ میں پیچھے ان کے سامنے ہاتھ اٹھائے بیٹھا تھا اور ان کو دکھائی نہیں دیا۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس دوران ٹرک سٹارٹ ہوا اور آگے چل پڑا۔

ٹرک چوک میں سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ چوک میں ایک جانب احمد آباد پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر سڑک کے درمیان آنے والی گاڑیوں کو روک کر ان کی چیکنگ کر رہے تھے۔ ٹرک چوک میں سے گزرنے کے بعد

پوری رفتار سے چلنے لگا۔ میں ابھی تک عالم حیرت میں تھا۔ اگرچہ میری زندگی میں بڑے بڑے عقل کو حیران کر دینے والے مافوق الفطرت واقعات رونما ہو چکے تھے مگر اس واقعے نے ایک بار تو مجھے بھی چکرا دیا تھا۔ ٹرک شہر کی آبادی والے علاقے سے نکل کر کھیتوں میدانوں اور غیر آباد علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ پھر دریائے سابرمتی کا پل آگیا۔ ٹرک پل پر سے گزرنے لگا۔ جب پل کی دوسری طرف پہنچا تو اچانک مجھے لوبان کی تیز خوشبو محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ کیونکہ یہ ہوائی مخلوق یا جے پور کی نرتکی کی بدروح چندریکا کی خوشبو تھی۔ یہ عورت مجھے جے پور کی سنگ مرمر کی چھتریوں والی مڑھیوں میں ملی تھی اور اس نے میرے سامنے ظاہر ہو کر کہا تھا کہ تم پچھلے جنم میں میرے خاوند رہ چکے ہو۔ اسے سخت صدمہ تھا کہ میں اس جنم میں کسی ہندو گھرانے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کی ان بے سروپا توہمات کی باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا تھا مگر میں اس کا شکر گزار ضرور تھا کیونکہ اس نے جیسا کہ آپ میری کہانی میں پڑھ چکے ہوں گے مصیبت کے وقت میری بڑی مدد کی تھی۔

میں نے اسے آواز دی۔

"چندریکا! کیا یہ تم ہو؟"

چندریکا میرے سامنے ظاہر ہو گئی۔ وہ زعفرانی کلر کی گوٹہ لگی بڑی قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں پہلے روز کی طرح سفید پھولوں کا گجرا سج رہا تھا۔ مگر خلاف معمول اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ورنہ پہلے وہ مجھ سے ملنے آتی تھی تو مسکرا رہی ہوتی تھی۔ وہ میرے پاس ہی ٹرک کے پچھلے حصے میں بوریوں کے پاس کھڑی تھی۔ پھر وہ ایک بوری پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم پچھلے جنم میں میرے خاوند نہ رہ چکے ہوتے اور میں نے تم سے تمہاری مدد کرنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں کبھی تمہاری مدد کو نہ آتی"

میں سمجھ گیا کہ ٹرک میں پولیس کے سپاہیوں کو جو میں موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیا وہ اسی بدروح چندریکا کی شعبدہ بازی تھی۔ میں چپ رہا۔ چندریکا نے کہا۔

"جب پولیس کے آدمی ٹرک کے پیچھے تمہاری تلاش میں آئے تھے تو میں تمہارے آگے کھڑی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس والوں کو تم نظر نہیں آئے۔"

میں نے کہا۔

"چندر ریکا! میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

چندر ریکا کے چہرے پر گہری متانت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"مگر آج کے بعد میں تمہاری مدد کو نہیں آؤں گی میں تمہیں یہی بتانے کے لئے تمہارے سامنے ظاہر ہوئی ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تمہارے سامنے بھی نہ آتی۔"

میں نے ذرا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ آخر مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے؟"

چندر ریکا کے لہجے میں درشتی آگئی۔ کہنے لگی۔

"یہ درست ہے کہ تم پچھلے جنم میں میرے پتی دیو رہے اور اگلے جنم میں بھی تمہیں واپس میرے پاس آنا ہے۔ لیکن آخر میں برہمن ہندو ہوں۔ بھارت ماتا کی سنتان ہوں۔ میں یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ تم میرے ملک بھارت ورش کو تباہ کرو۔"

میں نے اسے کہا۔

"سین چندر ریکا! تم نے خود ہی پچھلی ملاقات میں مجھے کہا تھا کہ تم میرے معاملے میں دخل نہیں دو گی تم میری اگر مدد نہیں کرو گی تو میرے کمانڈو مشن کی مزاحمت بھی نہیں کرو گی۔ اب کیا بات ہو گئی ہے کہ تم اپنے قول سے پھر گئی ہو"

چندر ریکا نے اسی درشت لہجے میں کہا۔

"تم نے دوارکا فورٹ کو جس طرح برباد کیا ہے مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں تمہیں آخری بار یہ کہنے کے لئے آئی ہوں کہ اب میں کسی مشکل وقت میں تمہاری مدد کرنے کو نہیں آؤں گی۔ یہ آخری بار تھی جب میں آج تمہیں پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچا لیا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے کسی کمانڈو مشن میں دخل نہیں دوں گی۔ میں اس وعدے پر قائم رہوں گی۔ تم

جو چاہے کرو۔ میں دخل نہیں دوں گی۔ لیکن اگر تم پکڑے گئے اور تمہیں گولی سے اڑا دیا گیا یا تمہیں پھانسی لگ گئی تب بھی میں تمہیں بچانے نہیں آؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم نے خود ہی کہا تھا کہ تمہیں میری غیر قدرتی اور بڑھاپے سے پہلے کی موت قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح تمہارے عقیدے کے مطابق تمہیں میرے اگلے جنم کے لئے ایک لاکھ سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

چندر ریکا نے جواب دیا۔

"ہاں میں جانتی ہوں کہ اگر تم بوڑھے ہو کر قدرتی موت نہ مرے تو مجھے ایک لاکھ سال تک تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر مجھے یہ بھی قبول نہیں کہ تم میرے ملک بھارت کو نقصان پہنچاؤ اور میں تمہاری مدد کرتی رہوں۔"

میں نے بھی تھوڑا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو تم بھارت کے حکمرانوں کو جا کر یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ کشمیریوں پر ظلم و ستم کرنا، ان کے مکانوں کو آگ لگانا، ان کی خواتین کو بے عزت کرنا، ان کے نوجوانوں کو گولیوں سے اڑانا بند کر دیں۔ کشمیر کے لوگ اپنا حق خود ارادی مانگتے ہیں جو ان کا جائز حق ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے بھارت نے کشمیر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے تمہاری بھارت ماتا اندرا گاندھی پاکستان میں را کے تخریب کار بھیج کر وہاں بے گناہ انسانوں کا خون بہا رہی ہے۔ تم اندرا گاندھی کو جا کر کیوں نہیں سمجھاتیں کہ وہ پاکستان میں تخریب کار بھیجنے بند کر دے۔ میں نے تو یہاں صرف گولہ بارود کے وہ ذخیرے اڑائے ہیں جو اپنی آزادی کے لئے جہاد کرنے والے کشمیریوں کے خلاف استعمال کئے جانے تھے۔ میں نے کسی ریلوے سٹیشن، بس سٹیشن کسی سینما ہال، کسی ایئر پورٹ کسی شاپنگ سنٹر میں بم کا دھماکہ نہیں کیا۔ میں نے تو تمہارے بھارت کے کسی بے گناہ انسان کا خون نہیں بہایا تم مجھے سمجھانے کی بجائے بھارت کے حکمرانوں کو جا کر سمجھاؤ کہ وہ بے گناہ انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنا بند کرے۔

میری باتوں کا چندریکا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ الٹا وہ غصے میں آگئی۔ کہنے لگی۔
"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں یہ کہہ کر جا رہی ہوں کہ اب میں اگر تمہارے معاملے میں دخل نہیں دوں گی تو تمہاری مدد کرنے بھی نہیں آؤں گی۔ تم جانو اور تمہارا کام"
اور چندریکا میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔

چندریکا کے غائب ہونے کے بعد لوبان کی خوشبو بھی غائب ہوگئی۔

اگرچہ چندریکا نے کئی بار عین وقت پر میری مدد کی تھی اور میں اس کا شکر گذار تھا لیکن اس کے ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو جانے سے ایک طرح کا اطمینان بھی ہوا۔ کیونکہ یہ عورت جو اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرتی تھی میرے لئے ذہنی الجھن کا باعث بھی تھی۔ اس کی ساری بے سروپا توہماتی باتیں میرے اسلامی عقیدے کے خلاف تھیں جو مجھے پسند نہیں تھیں۔ میں اس کی مدد کا محتاج نہیں تھا۔ میں خدا کی مدد کا محتاج تھا اور اسی کا محتاج رہنا چاہتا تھا۔

ٹرک اس وقت اونچے نیچے میدان میں سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں ریت کے بھورے رنگ کے ٹیلے نظر آرہے تھے۔ بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ شام آرہی تھی۔ دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک کس شہر کی طرف جا رہا ہے۔ میرے لئے یہی تسلی کافی تھی کہ میں احمد آباد شہر سے نکل آیا تھا اور مزید اس شہر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دیہاتی آبادی شروع ہوگئی۔ کوئی شہر یا قصبہ آرہا تھا۔ میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ اگر ٹرک یہاں پر رکتا ہے تو مجھے ٹرک سے اتر کر کسی جگہ چھپ جانا تھا۔ سڑک کے کنارے دو تین بیل گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ٹرک کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ ٹرک یہاں رکنے والا تھا۔ میں ہوشیار ہوگیا۔ جیسے ہی ٹرک سڑک

سے اتر کر کچے راستے پر آیا میں نے ٹرک میں سے چھلانگ لگا دی۔ میں جھاڑیوں میں گرا۔ میری کمانڈو ٹریننگ نے مجھے سکھایا ہوا تھا کہ تیز رفتار ٹرک ریل گاڑی یا آہستہ ہوتے ہوئے ٹرک اور ریل گاڑی میں سے کس طرح منہ آگے کی طرف رکھ کر چھلانگ لگائی ہے اور چھلانگ لگانے کے ساتھ ہی کس طرح دو چار قدم آگے کی طرف دوڑنا ہے۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر بھی میں جھاڑیوں میں گر گیا۔

جلدی سے اٹھا اور درختوں کے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

ٹرک ایک اڈے پر جا کر رک گیا تھا۔ یہ کوئی قصبہ تھا۔ سڑک کی دونوں جانب لکڑی کے کھوکھوں کی دکانیں تھیں جہاں چائے سگریٹ وغیرہ بک رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا یہاں سے کوئی دوسری سواری پکڑوں یا اسی ٹرک میں سوار ہو جاؤں۔ میں سب سے پہلے یہ پتہ کرنا چاہتا تھا کہ یہ سڑک آگے کون سے شہر کو جاتی ہے۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ آگے سے کوئی گاڑی آتی تھی یا پیچھے سے کوئی گاڑی کراس کرنا چاہتی تھی تو اگلی گاڑی کو سڑک پر سے کچے پر اترنا پڑتا تھا۔ راستے میں کوئی ریلوے پھاٹک بھی نہیں آیا تھا۔ یہاں بھی دور تک کوئی ریلوے سگنل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ کوئی ریلوے سٹیشن قریب ہو گا۔ اور میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل کر کسی ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر کوئی گاڑی پکڑ لیتا۔ یہ ضرور تھا کہ میں خطرے والے شہر احمد آباد سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا گمان ضرور تھا کہ احمد آباد پولیس نے آس پاس کے بڑے شہروں کو میرے فرار ہونے کی وائرلیس پر اطلاع کر دی ہو گی اور پولیس سٹیشنوں کو میرا حلیہ بھی بتا دیا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں کوئی معمولی مجرم نہیں تھا۔ میں دوارکا فورٹ کو تباہ و برباد کر کے فرار ہوا تھا۔ ایک بات کا خیال بھی مجھے آتا تھا کہ پولیس نے میرے کمرے کی زبردست تلاشی لی ہو گی اور عین ممکن ہے کہ انہیں غسل خانے کے باہر رکھی ہوئی وزن کرنے والی مشین میں سے مائیکرو فون اور چھوٹا ٹرانسمیٹر مل گیا ہو۔ یہ چیزیں مجھے غیر ملکی جاسوس اور تخریب کار ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ میں درخت کی اوٹ میں جھاڑیوں کے پاس بیٹھا یہ سوچ بھی رہا تھا اور اس ٹرک کو

بھی دیکھ رہا تھا جس پر بیٹھ کر میں آیا تھا۔ ٹرک پر کچھ اور سامان لادا جا رہا تھا۔ یہ سامان ترپال کھول کر بوریوں کے اوپر رکھا جا رہا تھا۔ جب سامان لادا جا چکا تو اس پر دوبارا ترپال ڈال دی گئی۔ شام کی ہلکی ہلکی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ دور ایک کھوکے کے باہر بجلی کا بلب روشن ہو گیا تھا۔

میری نگاہیں ٹرک پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے اسی ٹرک پر سوار ہو کر آگے جانا تھا۔ میں نے ٹرک کی کھڑکی کھول کر ڈرائیور کو اپنی سیٹ پر بیٹھتے دیکھا۔ اس نے دو تین بار ہارن دیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا ٹرک کی طرف آیا۔ اور دوسری طرف سے کھڑکی کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ کلینر ہی ہو سکتا تھا۔ ٹرک چلنے والا تھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر سڑک کی دوسری طرف آ کر تیز تیز آگے کو چلنے لگا۔ مجھے آگے جا کر چلتے ٹرک میں سوار ہونا تھا۔ میں ٹرک سے آگے نکل کر ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ٹرک چل پڑا تھا۔ ابھی اس نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے دو چار قدم دوڑ کر اس کے پیچھے جو رسی لٹک رہی تھی اسے پکڑا اور اچھل کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔

قصبے کی آبادی والے علاقے سے دور نکلنے کے بعد ٹرک نے ایک خاص نپی تلی رفتار پکڑ لی۔ سامان زیادہ لدے ہونے کی وجہ سے ٹرک کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ ٹرک ایک بار پھر غیر آباد میدانوں اور چھوٹے بڑے ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ لیکن میری سخت کمانڈو ٹریننگ نے مجھے دیر تک بھوکا پیاسا رہنا سکھا دیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد رات ہو گئی۔ آس پاس میدانوں میں اندھیرا ہو گیا۔ میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ اب اگر کوئی بڑا قصبہ یا چھوٹا شہر آیا تو میں ٹرک سے اتر جاؤں گا اور کسی نزدیکی ریلوے سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ وہاں جا کر مجھے کم از کم یہ تو معلوم ہو گا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔

میری منزل دلی تھی۔ اور یہ بات واضح نہیں تھی کہ یہ ٹرک دلی والے روٹ پر چل رہا ہے یا راجستھان کی طرف جا رہا ہے۔ میدانوں کے منظر سے کوئی چیز کھل کر صاف نہیں

ہو رہی تھی۔ نہ ریت کے ٹیلے تھے کہ میں سمجھتا کہ میں راجستھان کے صوبے میں دا
ہو گیا ہوں اور نہ جنگل اور گہرا سبزہ تھا کہ مجھے یہ خیال آتا کہ ٹرک رتلام کی طرف جا
ہے جو بمبئی سے دلی جانے والی مین لائن پر واقع تھا۔ کوئی دو گھنٹے تک ٹرک اسی رفتار
سڑک پر چلتا گیا اس کے بعد مجھے اردگرد کہیں کہیں روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ضرو
کسی شہر کی روشنیاں تھیں۔ کوئی شہر آرہا تھا۔ میں ٹرک کے پیچھے بیٹھا تھا۔ روشنیاں مے
عقب سے آکر گزر رہی تھیں۔ میں نے دور سرخ رنگ کی بتی دیکھی۔ یہ ریلوے
کی بتی ہی وہ سکتی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ اب مجھے علم ہو سکتا تھا کہ میں کہاں پر ہوں
آگے کون سا شہر ہو گا۔ ویسے درخت وغیرہ بتا رہے تھے کہ یہ راجستھان کا علاقہ نہیں
زیادہ تر تاڑ کے درخت ہی راستے میں نظر آئے تھے۔ اور تاڑ کے درخت راجستھان
نہیں ہوتے۔

ٹرک کی رفتار ایک بار پھر آہستہ ہونے لگی۔ اردگرد مکانوں کی روشنیاں نظر آنے
تھیں۔ پھر ٹرک ایک بازار میں داخل ہو گیا۔ دکانیں کھلی تھیں۔ ان دکانوں کی وضع
سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ ٹرک ایک اڈے کی طرف مڑ
جیسے ہی میں نے اڈے میں کچھ اور ٹرکوں کو دیکھا میں ٹرک میں سے کود کر باہر آگیا۔
سادھوؤں کے لباس میں تھا اور اس لباس میں ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ لوگ
عزت سے پیش آتے تھے۔ لوگ سادھوؤں سے اس لئے بھی ڈرتے تھے کہ اگر ا
نے سادھو مہاراج کی تکریم نہ کی تو کہیں وہ انہیں شراپ یعنی بد دعا نہ دے دے۔
سیدھا ایک کھوکے پر گیا جہاں بہت بڑے توے پر پھلکے پکائے جا رہے تھے۔ میں نے
بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر روٹی اور دال کھائی۔ پانی پیا۔ دوسرے کھوکھے پر جا کر
سگریٹ لیا۔ دونوں کھوکھوں والوں نے مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ لیا۔ میں ایک طرف
بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ مجھے پہنچا ہوا سادھو سمجھ کر ایک بوڑھا دبلا پتلا آدمی مے
پاس آگیا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتائیں"

میں نے بھی پہنچے ہوئے سادھوؤں کی طرح اداکاری کرتے ہوئے اسے نزدیک آنے
کو کہا۔ جب وہ آدمی میرے قدموں کے پاس بیٹھ گیا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تیرا کلیان ہو بابا ہمیں کسی سیوا کی ضرورت نہیں۔ ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں۔ کسی
سے کچھ نہیں مانگتے۔"

وہ آدمی میری پنڈلی دبانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بابا! ہم اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس شہر کا نام کیا ہے"

اس آدمی نے کہا۔

"گورو جی! یہ جبوہا شہر ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

"بابا اس کے آگے کون سا شہر ہے اور اس کے آگے کون سا شہر آتا ہے"

وہ آدمی بولا۔

"گورو مہاراج! آگے شردھا پور کا شہر آتا ہے۔ اس کے آگے بہت بڑا شہر اندور
ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں دلی لائن پر ہی تھا۔ میں نے
دوسری پنڈلی اس آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بابا لوگ! یہاں کوئی سٹیشن بھی ہے جہاں ریل گاڑیاں چلتی ہیں؟"

اس آدمی نے بتایا کہ جبوہا کا ریلوے سٹیشن وہاں سے قریب ہی ہے

"مہاراج! اگر آپ کو ریلوے سٹیشن جانا ہے تو میں آپ کو اپنے یکے پر چھوڑ آتا
ہوں۔ میں شہر میں یکہ چلاتا ہوں"

مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"تمہارا کلیان ہو۔ جاؤ جا کر اپنا یکہ ادھر لے آؤ۔"

اس آدمی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! یکہ ریلوے سٹیشن جانے والی سڑک پر وہ سامنے کھڑا ہے۔ اگر تکلیف نہ

ہو تو میرے ساتھ آجائیے۔ یہاں لاری اڈے پر یکہ لانے نہیں دیتے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو بابا لوگ! ہم وہیں چلتے ہیں"

یکہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا کچے راستے پر سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھیتوں
اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور سے سٹیشن کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ابھی
آدھے راستے میں تھا کہ بادلوں میں بجلی چمکی۔ ہلکی گرج سنائی دی اور بارش ہونے
یکے پر چھت پڑی تھی۔ میں پچھلی نشست کے درمیان میں ہو کر بیٹھا تھا۔ جس کی
سے بارش سے بچا ہوا تھا۔ یہ جبوہا کا سٹیشن تھا۔ پہلے میں ادھر کبھی نہیں گزرا تھا۔ یہ
آباد سے اندور کی برانچ لائن تھی۔ اندور سے اوپر بھوپال جھانسی سے دلی آگرہ کی مین لا
شروع ہوتی تھی۔

جبوہا کا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ ایک ہی لمبا پلیٹ فارم تھا۔ میں نے احتیاطاً دلی کا ٹ
لے لیا اور پلیٹ فارم پر آکر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ پلیٹ فارم پر چند ایک ہی دی
ٹائپ کے مسافر بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں پلیٹ فارم پر گیٹ سے
فاصلے پر سٹیشن کی چھت کے نیچے بیٹھا تھا۔ چھت پر بارش کی بوندیں گرنے کی آواز
آرہی تھی۔ اندور جانے والی پسنجر ٹرین کوئی ایک گھنٹے بعد آئی۔ مسافروں سے بھری
تھی۔ یہ احمد آباد سے آرہی تھی۔ میں اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ بڑے غور سے ایک ا
ڈبے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی پولیس کا سپاہی نہیں تھا۔ ٹرین رکی تو کچھ مسافر اترے۔
سوار ہو گئے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ٹرین کے ساتھ پولیس کا کوئی سپاہی نہیں
میں ٹرین کے پچھلے ڈبوں میں سے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ ڈبے میں کافی رش تھا۔
گیروے لباس میں دیکھ کر ایک مسافر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"پدھاریئے مہاراج؟"

میں نے بھی انکار نہ کیا اور اس آدمی کی سیٹ پر خوب چوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹرین
تین منٹ ہی رکی۔ پھر چل پڑی۔ ایک مسافر نے تھیلے میں سے مٹھائی نکال کر مجھے

کی۔ دوسرے نے صراحی میں سے کٹورے میں پانی بھر کر پیش کیا۔ غرض کہ میری خوب
آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ میں نے بھی سنسکرت اور ہندی کے دوہے اور اشلوک پڑھ کر
نہیں طرح طرح کے اپدیش دینے شروع کر دیئے۔ سارے ڈبے کے مسافر میری طرف
توجہ ہو گئے۔ ٹرین اندور کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ مگر ابھی اندور بہت دور تھا۔
بھی ہندوؤں کے عام سادھو جوگی لوگوں کی طرح اداکاری کر رہا تھا۔ ایک عورت کی گود
بچہ دیکھا تو اس عورت کی طرف گھورتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا۔

"تو ستی ساوتری ہے۔ تیرا بالک بڑا ہو کر افسر لگے گا۔"

عورت کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور بار بار مجھے پرنام کرنے لگی۔ ایک آدمی کی
نکھوں کو جھک کر دیکھا اور کہا۔

"تمہیں جو پریشانی ہے بابا لوگ اس کے لئے صبح اٹھ کر بھگوان مہاویر کے نام کی مالا کا
سو ایک مرتبہ جاپ کیا کر۔ تیری ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔"

اس آدمی نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور رونے لگا۔ دنیا میں ایسا کون آدمی ہو گا جسے
پریشانی نہیں ہو گی۔ یہ سادھو لوگ سارے فراڈ ہوتے ہیں اور لوگوں کی اسی کمزوری
فائدہ اٹھا کر ان پر اپنا اثر جما لیتے ہیں اور ان سے خدمتیں کرواتے ہیں۔ اس ڈرامہ
سے میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ ڈبے میں ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں نام
ری پکا جین بھگت ہوں۔ جب سب لوگوں پر میرا اثر بیٹھ گیا اور میں نے بھی اپنی تیز
وں سے ہر ایک مسافر کا جائزہ لے کر دیکھ لیا کہ ان میں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی نہیں
تو بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر کے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے آرام کرتا دیکھ
سب پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔

ٹرین دوڑتی جا رہی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ کھلا تھا۔ بارش تیز ہو گئی تو پانی کی بوچھاڑ اندر
لگی۔ میں نے آنکھیں بند کئے ہوئے بلند آواز میں حکم دیا۔

"کھڑکی کا شیشہ چڑھا دو"

فوراً کسی مسافر نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے تین چار سٹیشنوں پر کھڑی ہونے کے بعد شردھا پور کے بھی
بڑے سٹیشن پر رکی تو میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ آنکھیں ادھر ادھر گھما کر پلیٹ فا
کا جائزہ لیا۔ مجھے صرف ایک ہی دبلا پتلا پولیس کا سنتری نظر آیا۔ یہاں سے ٹرین چلی
آگے بڑی دیر تک چلتی رہی۔ راستے میں ایک دریا کا پل بھی آیا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی
میں نے کھڑکی کا شیشہ اتروا دیا تھا۔ ٹھنڈی اور بارش میں بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے اندر
آ رہے تھے۔ شردھا پور کے سٹیشن سے ہمارے ڈبے میں ایک ٹی ٹی چڑھ آیا تھا۔ اس لی
سب کے ٹکٹ چیک کئے۔ مجھ سے اس نے ٹکٹ کا نہ پوچھا۔ انڈیا میں سادھوؤں فقیروں
اور نابیناؤں کو ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت ہے۔ میں نے اسے بلا کر کہا۔

”تم نے ہمارا ٹکٹ چیک نہیں کیا بابو۔ ہم سادھو لوگ ضرور ہیں۔ پرنتو ہمارا
ورش کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ یہ لو ہمارا ٹکٹ بھی چیک کرو۔“

ٹی ٹی نے بڑے ادب سے میرا ٹکٹ چیک کیا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مسافر
میرا مزید رعب بیٹھ گیا۔ مجھے اب اندور کا انتظار تھا ان دیہاتی مسافروں پر مجھے مزید ر
جمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ مسافروں نے دوارکا فوٹ میں گولہ بارود کو آگ لگ
باتیں شروع کر دیں۔ وہ لوگ بڑے ڈرے ہوئے تھے کہ کشمیر کے کمانڈو انڈیا کے
دراز شہروں تک پہنچ رہے ہیں۔ میں آنکھیں بند کئے خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا
رات کے کسی لمحے مجھے نیند آ گئی۔ ٹرین ساری رات چلتی رہی۔ دوسرے دن کوئی
بجے کے قریب اندور کا سٹیشن آ گیا۔ اندور ایک بڑا شہر اور جنکشن تھا۔ یہاں مجھے ہو
رہنے کی ضرورت تھی۔ سٹیشن پر چند ایک پولیس والے ادھر ادھر پھرتے دیکھے۔
ریلوے پولیس تھی۔ پھر بھی میں محتاط ہو گیا۔ یہاں سے مجھے ایک دوسری ٹرین میں
ہونا تھا جو دلی جا رہی تھی۔ یہ ٹرین کسی دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔
میں پل پر سے ہو کر اس پلیٹ فارم پر آیا۔ ٹرین فارم پر آیا۔ ٹرین تیار کھڑی
اسے احمد آباد سے آنے والی پسنجر ٹرین کا ہی انتظار تھا۔ میں ٹرین میں سوار ہونے کی
ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ جب ٹرین کے انجن نے سیٹی دی ا

مطمئن ہو گیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے تو دوڑ کر ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یہاں
سے بمبئی بروڈہ مین لائن کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ٹرین بھی ایکسپریس تھی۔ خدا جانے
اس کا کیا نام تھا۔ آزادی ملنے کے بعد انڈیا نے بھی سب پرانی ریل گاڑیوں کے نام بدل
دیئے تھے۔ اندور سے آگے بڑا سٹیشن بھوپال ہی تھا۔ اس کے بعد جھانسی گوالیار آگرہ اور
تھا۔ یہ ریلوے ٹریک میرا دیکھا بھالا تھا۔ ٹرین نے اندور سٹیشن سے نکلتے ہی سپیڈ پکڑ
تین ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین بھوپال کے گرد ونواح میں داخل ہو چکی
یہ بہت اہم ریلوے جنکشن تھا۔ یہاں مجھے خطرہ تھا کہ پولیس نے کہیں سٹیشن کی
ناکہ بندی نہ کر رکھی ہو۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ ایک سٹیشن پیچھے اتر جاؤں۔ لیکن جب
ٹرین اسی سٹیشن پر نہ ٹھہری تو میں ڈبے میں بیٹھا رہا۔
ٹرین بھوپال کے کشادہ ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی۔ ریل کی پٹڑیوں کے
بدلنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ٹرین کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ بھوپال کے سٹیشن کی
عمارت قریب آ رہی تھی۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں نے کھڑکی میں سے سر
نکال کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر اتنے مسافر نہیں تھے جتنی پولیس تھی۔ یہ پولیس کی دو
مین گارڈیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میری تلاش میں وہاں آئی تھیں۔ ٹرین کا انجن اور
اگلے دو تین ڈبے ہی ابھی پلیٹ فارم میں داخل ہوئے تھے۔ میں ڈبے کے دوسرے
دروازے میں سے خاموشی سے نیچے دوسری ریلوے لائن پر اتر گیا۔ پھر ریلوے لائنوں کو
پھلانگتا ریلوے یارڈ کی اس جانب نکل آیا جہاں دو چار خالی ڈبے کھڑے تھے۔ میں ایک
خالی ڈبے میں چڑھ کر اس کے دوسرے دروازے میں سے دوسری طرف نیچے اتر گیا۔
اب میں ریل کی پٹڑیوں کے جال سے نکل آیا تھا اور تیز تیز ایک طرف چل رہا تھا۔
بھوپال سٹیشن پر میں اس سے پہلے کبھی اترا نہیں تھا۔ بس ٹرین میں بیٹھا آگے نکل گیا تھا۔
یہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے رک کر دیکھا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔
جس پلیٹ فارم پر میری ٹرین کھڑی ہوئی تھی وہ مجھ سے کافی فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں
سٹیشن کے مال گوداموں کی طرف آ گیا تھا۔ بادل پیچھے سے آسمان پر چلے آ رہے تھے۔ یہاں

بارش رک چکی تھی۔ میری بائیں جانب کسی گودام کا احاطہ تھا جس کا گیٹ کھلا تھا۔ سا
گیٹ کی دوسری جانب مجھے تانگے اور ٹیکسیاں وغیرہ کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ میں گودام
احاطے میں سے گزر کر سڑک پر آیا۔ میں نے بھوپال کے کسی سیتلا مندر کا نام سن رکھا
کہ وہاں ایک بڑا تالاب ہے جس میں سونے کی نتھنیوں والی مچھلیاں تیرتی ہیں۔ اس
سوا یہ شہر میرے لئے اجنبی تھا۔ اتنا مجھے ضرور معلوم تھا کہ اس شہر میں مسلمان بھا
اکثریت میں آباد ہیں۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو سیتلا مندر چلنے کا کہا اور پچھلی سیٹ
بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے دوسرے ٹیکسی ڈرائیور ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں وہا
سے فوراً فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر پولیس کی اتنی بھاری نفری مجھے گرفتار کر
پلیٹ فارم پر موجود تھی تو پولیس سٹیشن کے باہر بھی موجود ہوگی۔ ٹیکسی پارک سٹیشن
مین دروازے سے ایک طرف ہٹ کر تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بڑے رعب
کہا۔

"مورکھ! دیر کیوں کرتا ہے۔ ہماری پوجا پاٹھ کا وقت ہو رہا ہے۔ ہمیں جلدی مند
پہنچنا ہے۔"

ڈرائیور یقیناً کوئی مسلمان تھا۔ اس پر میری بات کا کوئی زیادہ اثر نہ ہوا۔ بس
خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا اور انجن سٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے کچھ
نہیں تھا کہ بھوپال شہر میں یہ سیتلا مندر کہاں پر ہے۔ ٹیکسی شہر کے ایک پرانے درواز
والی سڑک پر سے ہوتی ہوئی شہر کے گنجان علاقے سے گزرنے لگی۔ یہاں سے گزر
کے بعد ایک اور دروازہ آیا ٹیکسی اس دروازے سے دوبارہ شہر سے باہر آگئی۔ پھر کئی ایک
علاقوں سے گزرنے کے بعد ایک غیر آباد سڑک پر سے ہوتی ہوئی سیتلا مندر پہنچ گئی۔ سیتلا
مندر ایک ٹیلے کے دامن میں پرانا سا مندر تھا۔ مندر کے مخروطی مینار کے اوپر زعفرا
رنگ کے دو تین جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ شردھالو لوگ مندر کے پرا
دروازے میں سے گزر کر اندر جا رہے تھے۔ میں بھی کچھ سادھو لوگوں کے پیچھے پیچھے مند
میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک احاطہ تھا۔ سامنے مندر کا بڑا دروازہ تھا جس کی سیڑھیاں چڑھ

کر اوپر جانا پڑتا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بالکل ویسا ہی ماحول تھا
جیسا میں اس سے پہلے مندروں کا ماحول دیکھ چکا تھا۔

میری اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ کسی طرح میں اپنا سادھوؤں والا
لباس تبدیل کروں۔ کیونکہ میری احمد آباد سے فرار ہوتے وقت یہی شناخت تھی اور
پولیس اسی لباس میں مجھے پکڑ سکتی تھی۔ مگر مندر میں لباس تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں
ایک طرف درخت کے نیچے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ میں نے درخت کی طرف منہ کر کے جیب
سے بٹوہ نکال کر پیسے گنے میرے پاس ایک سو کے قریب روپے موجود تھے۔ ان پیسوں میں
میں بازار سے سلے سلائے نئے کپڑے خرید سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ذرا اندھیرا ہو تو میں
شہر میں جا کر نئے کپڑے خرید کر پہن آؤں۔

اس مندر میں سوائے وقت گزارنے کے میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ اگرچہ وہاں یہ
خطرہ ضرور تھا کہ کہیں پولیس میری تلاش میں مندروں میں چھاپے مارتی وہاں بھی نہ پہنچ
جائے۔ لیکن یہ کوئی اتنی ایمرجنسی والی بات نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے
بعد اٹھ کر مندر کے عقب میں آگیا۔ یہاں وہ تالاب تھا جس میں نتھنیوں والی مچھلیاں تیر
رہی تھیں جو توہم پرست ہندو لوگ منتیں مانتے تھے وہ بازار سے کوئی کوئی سنہری یا زرد
رنگ کی مچھلی خرید کر اس کے نتھنوں میں سونے کی بالی ڈال کر اسے تالاب میں چھوڑ
دیتے تھے۔ تالاب کنارے عورتیں اور مرد کھڑے مچھلیوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو میں اس خیال سے مندر کے بڑے دروازے کی طرف
چل پڑا کہ شہر میں جا کر کسی دوکان سے سلی سلائی قمیض پتلون خرید کر پہنتا ہوں تاکہ اس
خطرناک حلیے سے تو نجات ملے۔ جیسے ہی میں مندر کے بڑے گیٹ کے قریب آیا میں
نے پولیس کی ایک گاڑی سڑک پر سے آکر وہاں رکتی دیکھی۔ گاڑی کے رکتے ہی تین چار
پولیس کے سپاہی گاڑی میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکلے اور مندر کی طرف بڑھے۔ میں
وہیں سے پلٹ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا مندر کے عقب میں آیا اور باہر نکلنے کا کوئی
راستہ تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا۔ جہاں ایک سادھو زمین پر بیٹھا

سلفے کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ مجھے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ یہ دروازہ ک
طرف نکلتا ہے۔ میں جلدی جلدی چلتا دروازے سے نکل گیا۔ دوسری طرف مندر ک
ٹیلے کی ڈھلان تھی۔ نیچے ایک گہری کھائی تھی جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ میں ڈھلان اتر
کھائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ گندے پانی کا نالہ نہیں تھا۔ یہ کوئی برساتی نالہ تھا ج
میں اس علاقے کا گندا پانی بھی گرتا تھا۔ نالے کے ساتھ چلتے چلتے میں ایک پلی کے پا
آگیا۔ چڑھائی چڑھ کر میں پلی پر سے ہوتا ہوا شہر کی طرف جانے کی بجائے دوسری جان
جہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے۔ مڑ گیا۔

میں اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ میں اس راستے پر پڑ گیا ہوں جو آگے جا
بھوپال کے خطرناک جنگلوں میں نکل جاتا ہے۔ لیکن اس وقت مجھے کسی طرح اپنے آپ
پولیس کی گرفت سے بچانا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور درختوں کے نیچے رات
اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کچا راستہ تھا جو درختوں کے نیچے جھاڑیوں کے درمیا
سے آگے جا رہا تھا۔ میرے لئے اس قسم کا ماحول کوئی اجنبی نہیں تھا۔ اس سے پ
ہوشنگ آباد کے گھنے جنگلوں میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران کافی وقت گزار چکا تھا۔ پھر
میں جنگل میں زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جنگل میں کچھ دور آگے جا
مجھے کوئی ایسا محفوظ ٹھکانہ مل جائے جہاں میں رات گزار سکوں اور صبح کا اجالا ہوتے
یہاں سے دور کسی دوسری طرف نکل جاؤں۔ دن کی روشنی میں جنگل اتنا خطرناک نہ
ہوتا۔ ویسے بھی میں نہتا تھا۔ میرے پاس نہ تو کوئی پستول تھی اور نہ کمانڈو چاقو ہی تھا۔

اچانک مجھے طبلے ہارمونیم کی آواز آئی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اس جنگل میں ط
ہارمونیم کون بجا رہا ہے۔ آواز کچھ فاصلے سے آ رہی تھی۔ اس وقت میں جھاڑیوں
اونچی اونچی گھاس کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔ ذرا آگے جا کر کچا راستہ ایک طرف
مڑ گیا۔ میں نے کچھ فاصلے پر بجلی کے بلب کی روشنی دیکھی۔ میں اس خیال سے روشنی
طرف چل پڑا کہ یہ کوئی گاؤں ہی ہو سکتا ہے یہاں مجھے رات گزارنے کے لئے کوئی
جگہ مل جائے۔ ہارمونیم اور طبلے کی آواز جہاں روشنی ہو رہی تھی اسی طرف سے آ

تھی۔ پھر گھنگھروؤں کی آواز بھی آنے لگی۔ لگتا تھا وہاں شادی بیاہ کی کوئی تقریب ہے اور
مجرا ہو رہا ہے۔ میں اس طرف جانے والے راستے سے ہٹ کر دوسری طرف سے ہو کر
ادھر چلنے لگا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا طبلے ہارمونیم اور گھنگھروؤں کی آواز قریب آ رہی
تھی۔ اب کسی عورت نے گانا شروع کر دیا تھا۔ ذرا قریب جا کر میں نے دیکھا کہ ایک
مکان کے آگے درختوں کے درمیان شامیانہ لگا ہے۔ اور نیچے ایک عورت زرق برق
لباس میں طبلے کی تھاپ پر رقص کر رہی ہے۔ کچھ لوگ اس کے اردگرد دائرے کی شکل
میں بیٹھے تھے۔

میں ان لوگوں کی منڈلی سے پیچھے نکل کر کوئی پناہ گاہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا
گاؤں تھا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ مکانوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ اس قسم کے
دیہات میں جانوروں کو باندھنے کے لئے باڑے ضرور بنے ہوتے ہیں۔ میں اس قسم کی جگہ
کی تلاش میں تھا۔ جیسے ہی میں بیاہ شادی کی تقریب والے مکان کے نزدیک سے گزرا
ایک آدمی اچانک کسی طرف سے نکل کر میرے سامنے آگیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

”مہاراج! ہمارے دھن بھاگ کہ آپ ایسے مہاتما کے درشن ہو گئے۔“

میں ابھی تک سادھوؤں جوگیوں والے حلیے میں ہی تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ اس
آدمی نے اونچی آواز میں جدھر ڈانس ہو رہا تھا ادھر منہ کر کے کہا۔

”ارے گردھر لال! دیکھ مہاتما جی نے پرویش کیا ہے۔ ارے تیرا بیٹا بڑا ہو کر افسر
بنے گا بڑا اچھا شگون ہوا ہے رے۔“

گانے بجانے والی منڈلی سے ایک نوجوان جس نے ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھ
رکھی تھی دوڑتا ہوا آیا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں تمبو کے نیچے لگے بڑے بلب کی کافی
روشنی پڑ رہی تھی۔ نوجوان نے جس کا نام گردھر لال تھا آتے ہی میرے قدموں کو چھوا
اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”مہاراج! میں کتنا سوبھاگی ہوں کہ آپ نے میرے بچے کے جنم دن پر درشن
دیئے۔ مجھے نراش نہ کیجئے گا۔ مجھے سیوا کرنے کا موقع دیں۔“

کچھ اور لوگ بھی آگئے جو اس نوجوان کے دوست اور رشتے دار لگتے تھے۔ ر
نے میرے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اب اگر میں وہاں سے چلا
جاتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں بابا دنیا داری کے جھمیلوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ پرنتو
مجبور کرتے ہو تو چلے چلتے ہیں۔"

اس دوران گانا بجانا بند ہو گیا۔ وہ لوگ بڑی عزت توقیر کے ساتھ مجھے لے کر گا
بجانے والی محفل میں لے آئے اور ایک طرف جہاں دری پر سفید چادر بچھی تھی اور
تین گاؤ تکئے رکھے ہوئے تھے وہاں بٹھا دیا۔ معلوم ہوا کہ گاؤں کے ایک نوجوان گرد
لال کے ہاں پہلی اولاد ایک لڑکا پیدا ہوا تھا اور اس خوشی میں اس نے شہر سے ایک گا
بجانے والی کو مجرا کرنے کے لئے بلا رکھا تھا۔ محفل میں پندرہ بیس آدمی ہی بیٹھے تھے۔ مجھے
دیکھ کر وہ سب احترام سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سب کو تیز نگاہ
سے دیکھا۔ ان میں کوئی بھی آدمی مجھے اپنے لئے خطرناک دکھائی نہ دیا۔

میں خاموشی سے تکئے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گردھر لال میرے پاؤں دبا
لگا۔ گانے بجانے والی اپنی جگہ پر اسی طرح درمیان میں بیٹھی تھی۔ ایک ہٹے کٹے موٹے تا
والے آدمی نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑا اور کہا۔

"اری جا کر گورو جی کے چرن چھو"

میں نے محسوس کیا کہ طوائف مجبوراً اٹھی اور پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھرو چھنا
میرے قریب آئی۔ جھک کر اس نے میرے قدموں کو بڑی بے دلی سے ہاتھ لگایا اور
دوسری طرف موڑ کر واپس چلی گئی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ کیونکہ ہندو عورتیں اور خا
طور پر ہندو طوائف عورتیں جوگی سنیاسیوں کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ یہ بات ہندوستان
اتنی دیر سے رہتے ہوئے کئی بار میرے مشاہدے میں آچکی تھی۔ مگر اس طوائف نے
سادھو جوگی کو دیکھ کر کسی قسم کی عقیدت مندی اور گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔
دوران میں طوائف کا بھرپور جائزہ لے چکا تھا۔

اس کی عمر چوبیس پچیس سال کی ہوگی۔ رنگ گورا تھا۔ نقش بڑے تیکھے اور آنکھیں
خاص طور پر بڑی خوبصورت تھیں۔ اس نے بڑی قیمتی نیلے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی
تھی جس پر چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے پھول بلب کی روشنی میں ستاروں کی طرح
چمک رہے تھے۔ اس نے سونے کا زیور بھی کافی پہنا ہوا تھا۔ جس موٹے آدمی نے اسے
میری طرف بھیجا تھا وہ خود بھی میرے قریب آیا۔ میرے قدموں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر
بولا۔

"مہاراج! گوری بائی بڑی ضدی ہے۔ اس کو معاف کر دیجئے گا۔ ہم تو آپ کے
سیوک ہیں مہاراج"

گوری بائی اس نوجوان طوائف کا نام تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آشیرباد دینے کے انداز
میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بچہ! جوگی سنیاسی کسی سے ناراض نہیں ہوا کرتے۔"

طوائف نے مجرا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ٹھمری گا رہی تھی۔ میری ٹھمری کی طرف
کوئی توجہ نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں رات گزاری جا سکتی ہے۔ یہ
سارے بے ضرر سے آدمی لگ رہے تھے۔ اتنے میں انہوں نے میرے سامنے پوریوں
کچوریوں اور مٹھائیوں سے بھرا ہوا تھال اور پانی کا جگ لا کر رکھ دیا۔ یہ مسلمانوں والی
خوراک نہیں تھی۔ ہم مسلمان تو پلاؤ، چاول روٹی اور گوشت والا سالن کھانے کے عادی
ہیں مگر اتنی دیر سے ہندوؤں کے ملک میں رہتے رہتے مجھے اس قسم کے کھانوں کی عادت
ہو گئی تھی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے سیر ہو کر پوریاں کچوریاں کھائیں۔
گردھر لال نے بڑی عقیدت سے مجھے عمدہ قسم کا سگریٹ پیش کیا۔ میں نے سگریٹ بھی لگا
لیا۔ جوگی سنیاسی ہندوستان میں سگریٹ وغیرہ عام پی لیا کرتے ہیں وہ تو سب کے سامنے
سلفے کے بھی لمبے لمبے کش لگاتے ہیں۔ میں مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور اب طوائف
کے گانے کی طرف بھی دھیان دیا۔ ٹھمری گاتے ہوئے وہ ساتھ اٹھ کر رقص بھی کرنے
لگی تھی۔ لوگ اس پر پیسے اور نوٹ لٹا رہے تھے جنہیں وہی موٹا آدمی جو طوائف کا مالک

لگتا تھا جلدی جلدی اٹھا کر ایک تھیلی میں ڈالے جاتا تھا۔

اتنے میں وہاں ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

طوائف گاتے گاتے ایک آدمی کے ہاتھ سے روپے کا نوٹ لینے اس کے پاس گئی
اس آدمی نے طوائف کی چٹکی لی۔ طوائف نے ہائے اللہ کہہ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا
اس کے مالک موٹے آدمی نے غصے کے ساتھ کہا۔

"ہائے اللہ کیوں کہتی ہے ری ہائے رام کہا کر"

طوائف نے بھی غصے میں جواب دیا۔

"نہیں کہوں گی ہائے رام۔ ہائے اللہ ہی کہوں گی"

موٹے آدمی نے اٹھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ طوائف رونے لگی اور بے
اختیار ہو کر ہاتھ اوپر اٹھا کر بولی۔

"اے اللہ! مجھے ان ظالموں سے بچا لے"

موٹے آدمی نے طوائف کو بازو سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا اور گالی دے کر کہا۔

"بک بک بند کر اور ناچ دکھا۔ چل ناچ"

وہ تالی بجانے لگا اور طبلے والے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چلو استاد جی۔ تم کیوں ڈھیلے پڑ گئے ہو۔"

طبلہ زور زور سے بجنے لگا۔ ہارمونیم کی لے بھی تیز ہو گئی۔ طوائف نے بھی ناچنا
شروع کر دیا۔ مگر اس کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ
بادل نخواستہ ناچ رہی ہے۔ میں اس کی طرف اب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ حقیقت
واضح ہو گئی تھی کہ یہ طوائف مسلمان ہے۔ ہندو نہیں ہے اور اسے زبردستی نچوایا جا رہا
ہے۔ چونکہ میں بھی مسلمان تھا اس لئے قدرتی طور پر مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی
مگر میں اس کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود اپنے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ پھر
بھی میں نے سوچا کہ اس عورت کا پتہ کرنا چاہئے کہ اگر یہ مسلمان ہے اور طوائف نہیں
ہے تو اس پیشے میں کیسے آ گئی ہے۔

آدھی رات تک مجرا جاری رہا۔ جب مجرا ختم ہو گیا تو میرے عقیدت مند میزبان
گردھر لال نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! اگر آپ رات یہاں بسرام کرنا چاہتے ہیں تو یہ ہمارے بڑے بھاگ ہوں
گے آپ کے لئے میں نے چوبارے میں بستر لگوا دیا ہے۔"

میں نے گردھر لال سے پوچھا۔

"یہ گانے والی یہیں رہے گی یا واپس شہر چلی جائے گی؟"

گردھر لال نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ بولا۔

"مہاراج! آپ کی اچھیا ہو تو آپ حکم کریں وہ رات یہیں رہ لے گی۔ یہ لوگ
میرے غلام ہیں۔ اگر انہیں واپس جانا بھی ہوا تو نہیں جائیں گے۔"

میں نے مہاتما لوگوں کی طرح ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا

"گردھر لال! ہمیں اس نرتکی عورت میں آکاش کی نرتکیوں کا روپ نظر آتا ہے۔
ہم اسے کچھ اپدیش دینا چاہتے ہیں۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس بھیج دینا۔ ہم
تیرے پتر کے واسطے بھگوان شیو سے خاص پرارتھنا کریں گے۔"

گردھر لال اپنے بیٹے کے حق میں بھگوان شیو کے آگے پرارتھنا کا سن کر بہت خوش
ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج آپ اپنے کمرے میں پدھاریں۔ میں نرتکی کو لے کر آپ کے پاس آتا
ہوں"

اس نے مجھے اپنے ملازم کے ساتھ کر دیا۔ گردھر لال کا چوبارا گاؤں میں پکا چوبارا تھا۔
اوپر والی منزل میں ایک چھوٹے سے کمرے میں میرے لئے پہلے سے بستر لگوا دیا گیا تھا۔
میں بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا ہے اور
ظاہر ہے میری منزل دلی تھی مگر ٹرین کا راستہ اب میرے لئے محفوظ نہیں رہا تھا۔ میں نے
بھی فیصلہ کیا کہ گردھر لال کے تعاون سے میں کسی ٹرک وغیرہ میں بیٹھ کر آگے گوالیار
آگرہ تک جانے کی کوشش کروں گا۔ اتنے میں گردھر لال طوائف کو لے کر آ گیا۔

طوائف کے خوبصورت چہرے پر سخت ناراضگی کے اثرات تھے۔ کمرے میں بلب جل رہا تھا۔ جس چارپائی کے بستر پر میں نیم دراز تھا اس کے پاس ہی لوہے کی دو کرسیاں اور چھوٹی سی تپائی پڑی تھی۔

گردھر لال ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ کی داسی حاضر ہے۔"

اتنا کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ طوائف وہیں دروازے کے پاس کھڑی مجھے نفرت انگیز آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس سے کسی قسم کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ میں تو صرف اس سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اگر وہ مسلمان عورت ہے اور اس پیشے کو پسند بھی نہیں کرتی تو پھر وہ ان کنجر قسم کے لوگوں کے ساتھ کیوں رہ رہی ہے۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

طوائف وہیں کھڑی رہی۔ جب میں نے اسے زبان سے کہا کہ بیٹھ جاؤ نرتکی تو وہ غصے میں آکر بولی۔

"تم مہاتما ہو گے اپنے گھر پر ہو گے یا ان ہندوؤں کے لئے ہو گے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ میں تم سے بالکل نہیں ڈرتی۔ مجھے معلوم ہے تم نے مجھے یہاں کس لئے بلایا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھو۔ میں مسلمان ہوں۔ سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے نہیں ڈرتی۔ اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی"

طوائف کا اردو بولنے کا لہجہ پنجابی تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ پنجابی لڑکی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایک مسلمان پنجابی لڑکی یا طوائف ان لوگوں کے پاس اتنی دور کیسے آگئی؟ کیونکہ مشرقی پنجاب میں تو ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک بھی پنجابی خاندان پیچھے نہیں رہا تھا۔ یا تو وہ لوگ قافلوں کی شکل میں سارے کے سارے پاکستان کی جانب ہجرت کر گئے تھے یا سکھوں ہندوؤں نے انہیں ان کے گھروں یا کھیتوں یا ریلوے سٹیشنوں پر بال بچوں سمیت شہید کر دیا تھا۔ میں نے طوائف کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"نرتکی! ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے"

اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"تو پھر مجھے یہاں کس لئے بلایا ہے تم نے؟ میں جاتی ہوں"

جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر کہا۔

"ٹھہرو نرتکی! اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ میں نے تمہیں اس گناہ کی دلدل سے نکالنے کے لئے بلایا ہے تو کیا تم میرے ساتھ چلی چلو گی؟"

طوائف لڑکی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور نفرت سے کہا۔

"تم ہندو ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ تم مجھے یہاں سے کیوں نکالو گے؟ ایسا فریب میں کئی بار پہلے بھی کھا چکی ہوں لیکن گناہ کی ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں گرا دی گئی۔"

میں نے اسے اپنے رویے کو مشفقانہ بناتے ہوئے مزید نرم لہجے میں کہا۔

"گوری بائی! میں تمہیں اس گندی نالی سے اس لئے نکالنا چاہتا ہوں کہ جب موٹے ہندو دلال نے تمہیں مارا تھا تو تم نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ مجھے اس جہنم کی زندگی سے بچا لے۔"

طوائف لڑکی نے طنزاً کہا۔

"تمہیں آخر مجھ سے کس لئے ہمدردی ہے مہاتما جی؟ کیا میں تمہاری خالہ لگتی ہوں؟ کیا تم مسلمان ہو؟"

میں نے تھوڑا مسکرا کر کہا۔

"نرتکی اگر فرض کر لو کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کے ناطے تمہیں کافروں کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا ہوں تو کیا پھر بھی تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گی؟"

طوائف لڑکی میرے پاس آئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اگر تم مسلمان ہو تو تم نے یہ ہندو سادھوؤں والا ڈھونگ کیوں رچا رکھا ہے؟"

میں نے اسے جواب دیا۔

"اس کی بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔"

وہ بولی۔

"اگر تم مسلمان ہو تو کلمہ شریف پڑھ کر سناؤ"

اصل میں جس وقت مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ لڑکی مسلمان ہے اور نہ جانے کن اذیت ناک حالات کی وجہ سے اسے ہندوؤں نے پکڑ کر اس دھندے میں ڈال دیا ہے اس وقت سے میرے دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کافروں کے جال سے نکال کر ہندوستان کے کسی شہر کے مسلمانوں کے رفاہی ادارے کے حوالے کر دوں۔ میں نے اسے کلمہ شریف پڑھ کر سنایا تو اس نے سر جھکا لیا اور بڑے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بولی۔

"مگر کلمہ شریف تو ایک ہندو بھی اسے یاد کر کے پڑھ سکتا ہے۔ ایک کافر نے مجھے اسی طرح دھوکا دیا تھا۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہیں ان ظالم کافروں سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور وہ کیا حالات تھے جنہوں نے تمہیں گناہ کے اس مقام تک پہنچایا۔"

چونکہ میری نیت خراب نہیں تھی اس لئے میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ طوائف لڑکی آنچل سے آنسو پونچھ کر اپنی داستان حیات شروع کرنے والی تھی کہ دروازہ دھڑاک سے کھلا اور اس کا موٹا ہندو ایجنٹ اس حالت میں اندر آگیا اس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

اس نے اندر آتے ہی دروازے کو اپنے کاندھے سے بند کیا اور مجھے گالی دے کر بولا۔

"او ڈھونگی مہاتما تو ہماری عورت کو یہاں سے بھگا کر لے جانا چاہتا ہے؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا"

اور اس نے مجھ پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ یہ اس موٹے ہندو کی سخت غلطی اور

بد قسمتی تھی کہ اس نے مجھ پر خنجر سے وار کر دیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس نے جس آدمی پر وار کیا ہے وہ ایک انتہائی تربیت یافتہ صف اول کا کمانڈو ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ یہ جرات کبھی نہ کرتا۔ لیکن جب کسی کی موت آئی ہوئی ہو تو کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ میرے بازو یا ٹانگوں پر خنجر کا وار کرتا تو بھی میں اسے کچھ نہ کہتا۔ بس صرف اسے کسی طرح بے ہوش کر کے وہیں ڈال دیتا۔ لیکن اس نے خنجر کا وار سیدھا میری گردن پر کیا اور میری گردن کاٹنے کی کوشش کی۔ وہ موٹا تازہ ہٹا کٹا تھا۔ اگر مجھ سے ذرا سی بھی غفلت ہو جاتی تو ایک بار تو اس نے میری گردن میں خنجر اتار دیا تھا۔ لیکن یاد رکھیں ایک تربیت یافتہ مسلمان کمانڈو سوتے ہوئے بھی غافل نہیں ہوتا۔

جیسے ہی اس کا خنجر والا ہاتھ میری گردن کے پاس آیا اور وہ مجھ پر گرا میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا اور اس کے خنجر والے بازو کو نیچے سے ہاتھ مار کر اوپر کو اچھالا اور اپنے دائیں بازو کو کہنی تک اس کے حلق کے اوپر رکھ کر اتنی زور سے نیچے کو جھٹکا دیا کہ اس کا نرخرہ اس کی گردن کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی کے جوڑوں میں جا کر پھنس گیا۔

یہ ایسا کاری وار تھا کہ اسے کوئی بھینسا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ میں نے کبھی کسی انسان کے منہ سے پہلے ایسی آواز نہیں سنی تھی اور وہ پچھاڑ کھا کر وہیں چارپائی کے پاس فرش پر بے جان ہو کر گر گیا۔ طوائف لڑکی تڑپ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی اور اب سہمی ہوئی اور دہشت زدہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی فرش پر پڑی اپنے ہندو دلال کی بے جان لاش کو دیکھ رہی تھی۔ اب میرا اور اس مسلمان طوائف لڑکی دونوں کا وہاں ٹھہرنا پھانسی کے پھندے کو اپنے گلے میں ڈالنے کے برابر تھا۔ پھر بھی میں اس لڑکی کی مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے اسے کہا۔

"میں یہاں سے فرار ہو رہا ہوں۔ کیا تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟"

طوائف لڑکی میری بہادری سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم سچ مچ مسلمان ہو تو مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جانا۔ یہ لوگ جگو کی لاش دیکھ کر

مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

معلوم ہوا کہ اس موٹے دلال کا نام جگ دیال تھا۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ میں نے اسے کھول کر نیچے دیکھا۔ باہر تنگ سی گلی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دلال کی موت اسے اکیلا ہی وہاں لے آئی تھی۔ میں نے چارپائی پر بچھی ہوئی نیلے رنگ کی کھدر کی چادر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے اپنی چمکیلی ساڑھی اتار کر یہ چادر لپیٹ لو۔ جلدی کرو۔ اس ساڑھی کی چمک لوگ اندھیرے میں بھی دیکھ لیں گے۔"

میں نے چادر لڑکی کے کاندھے پر پھینک کر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ اس کمرے کے آگے کوئی دو تین فٹ کی گیلری تھی جو آگے سیڑھیوں کے دروازے تک جاتی تھی۔ یہ سیڑھیاں نیچے پہلی منزل کی ڈیوڑھی میں اترتی تھی۔ یہ طوائف لڑکی جب گردھرلال کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرنے آئی تھی تو اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بدکردار جوگی کے پاس رات بسر کرنے آرہی ہے چنانچہ وہ سوائے کانوں کے سونے کے کانٹوں کے باقی سارا زیور اتار کر رکھ آئی تھی۔ گردھرلال نے نہ جانے کیوں طوائف لڑکی کے دلال جگو کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے یقین ہو کہ جگو لڑکی کو میرے پاس اکیلی بھیجنے پر تیار نہیں ہو گا اور اگر تیار ہو گا تو بھاری رقم طلب کرے گا۔ دلال کی موت اسے کھینچ کر لے آئی تھی۔

میں نے دروازہ بند کر کے پلٹ کر دیکھا۔ کمرے میں جلتے بجلی کے بلب کی روشنی میں طوائف لڑکی منہ دیوار کی طرف کئے ساڑھی اتار رہی تھی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"جلدی کرو۔ دیر کیوں کر رہی ہو۔ کوئی آگیا تو تم یہیں رہ جاؤ گی"

لڑکی نے ساڑھی اتار کر کونے میں پھینکی۔ اس نے نیچے نیلے رنگ کا لہنگا سا باندھ رکھا تھا۔ اسی رنگ کی اوپر قمیض تھی۔ وہ جلدی سے چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کے بازو کو مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا میرے ساتھ جنگل میں دوڑ سکو گی؟"

طوائف لڑکی نے کہا۔

"میں اس جہنم سے نکلنے کے لئے ساتویں منزل سے بھی کود سکتی ہوں۔"

ہم جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر چھوٹی سی گلی میں آگئے۔ یہاں سے میں جنگل کی طرف رخ کرنے لگا تو لڑکی نے کہا۔

"ادھر کیوں جاتے ہو؟ اس طرف آؤ میرے ساتھ"

وہ اس شہر بھوپال سے اچھی طرح واقف تھی۔ میں اس کے پیچھے ہو گیا۔ پھر اس کے آگے آکر کہا۔

"ادھر تو شہر ہے۔"

شہر کی جانب جاتے ہوئے مجھے اپنا خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں میں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ اس نے کہا۔

"ہم شہر میں نہیں جائیں گے۔"

"کوئی ایسا راستہ اختیار کرو جو ہمیں بھوپال سے باہر نکال کر لے جائے۔ میں دلی کی طرف جانا چاہتا ہوں"

وہ مجھ سے ایک قدم آگے چل رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"پہلے بھوپال سے تو نکلیں مہاتما جی"

میں نے اسے کہا۔

"کیا تم سٹیشن پر جانا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔

"تم دیکھتے چلو۔ فکر نہ کرو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گی"

میں نے کہا۔

"میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔ میں تو صرف تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں"

لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"تمہاری شکر گزار ہوں مہاراج! پتہ نہیں تمہیں شکر گزار کے معنی بھی آتے ہیں نہیں"

میں خاموش رہا۔ ہم شہر کی ایک باہر کی آبادی کے قریب سے ہو کر گزر رہے تھے یہاں اندھیرا تھا۔ ایک طرف مکان تھے دوسری طرف اندھیرے میں دور تک کھیت کھیت تھے یا گھاس کا میدان تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم ایک جگہ چھوٹا سا کوئی پل عبور کیا۔ دوسری جانب مکان شروع ہو جاتے تھے جس پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کہیں روشنی نظر آتی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے بازار میں آگئے۔ کوئی دیہاتی بازار لگتا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ لڑکی نے مجھے ایک جگہ کھڑا کیا اور خود ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئی۔ میں سوچنے لگا یہ کہاں گئی ہو گی۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا۔ کہنے لگی۔

"میں گھر سے کچھ کپڑے اور پیسے لے آئی ہوں"

معلوم ہوا کہ اس کا مکان اسی گلی میں تھا۔ اب ہم شہر کے باہر سے گزرنے والی سڑک پر آگئے۔ یہاں ایک سنیما گھر تھا جس کے باہر روشنی میں جو فلم چل رہی تھی اس کے بڑے بڑے بورڈ لگے تھے۔ ایک جانب کچھ خالی رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہاؤس میں سیکنڈ شو چل رہا تھا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر ایک خالی رکشا لیا۔ یہ موٹر رکشا تھا۔ رکشا میرے قریب لا کر بولی۔

"مہاراج آجائیں"

میں رکشے میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ رکشہ بھوپال کے مختلف بازاروں میں سے گزرنے لگا۔ میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد ہمارے سامنے بھوپال کا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں جلدی سے نیچے اتر آیا۔ لڑکی نے رکشے والے کو پیسے دیئے اور ہم سٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھے۔ اب مجھے یہ فکر لگی تھی کہیں یہاں کوئی پولیس والا نہ مجھے پہچان لے۔ لیکن خیریت گزری ہم ٹکٹ والی کھڑکی کے پاس آگئے۔ لڑکی نے آگرہ کے دو ٹکٹ لئے۔ اور مجھے ساتھ لے کر پلیٹ فارم کی طرف

بڑھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"گاڑی کب جائے گی؟"

اس کی کلائی پر زنانہ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"بس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل جائے گی یہ گاڑی پیچھے بمبئی سے آرہی ہے"

جب وہ مجھے ساتھ لے کر گردھر لال کے مکان سے نکلی تھی تو اسے معلوم تھا کہ ایک گاڑی رات کے سوا دس بجے کے قریب بھوپال سے دلی کی طرف جاتی ہے۔ میں جوگیوں والے حلیے میں تھا۔ لڑکی نے نیلی چادر بدن کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ چادر ذرا سی ایک طرف ہٹی تو میں نے دیکھا کہ اس کے نیچے اسی رنگ کی سوتی ساڑھی تھی۔ گھر میں اس نے چادر کے نیچے اسی رنگ کی عام سی ساڑھی پہن لی تھی۔

ہم پلیٹ فارم پر آکر کافی آگے جا کر ریلوے کے پڑے ہوئے سامان کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں تمہیں آگرہ پہنچا کر وہاں سے آگے دلی چلا جاؤں گا۔"

اس نے نیلی چادر سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ موسم رات کو سرد ہو جاتا تھا۔ اوپر دلی آگرہ کے علاقے سے سردی شروع ہو جاتی تھی۔ اس کا گورا چہرہ چادر کے درمیان میں سے چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس قسم کے گناہ آلود ماحول میں رہ کر بھی قدرتی حسن برقرار تھا۔ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر تم مجھے میرے گھر پہنچا کر واپس جاؤ گے"

میں نے پوچھا۔

"کیا آگرہ میں بھی تمہارا کوئی گھر ہے؟"

اس نے کہا۔

"نہیں۔ آگرہ سے تھوڑی دور ایک جگہ ٹنڈلہ ہے وہاں میری ایک جگری سہیلی رہتی ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ میں اس کے پاس کچھ دن ٹھہروں گی۔ پھر جہاں قسمت لے جائے گی چلی جاؤں گی۔"

وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو نرتکی؟"

وہ بولی۔

"اب مجھے یقین آگیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ جس بہادری سے تم نے جگو کو ہلاک ہے وہ ایک مسلمان ہی کر سکتا تھا۔ لیکن مہاراج تم نے یہ ہندو جوگیوں والا حلیہ کس بنا رکھا ہے؟ کیا تم لوگوں کو فریب دیتے پھرتے ہو جس طرح دوسرے سادھو کیا کر ہیں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ حلیہ میں نے محض شوق کی خاطر بنایا ہے"

"میں اسے نہیں مانتی۔"

وہ بولی۔

"تم ضرور کوئی پراسرار آدمی ہو۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اگر موقع ملا تو ضرور بتا دوں گا۔"

میں نے جو سادھوؤں والے کپڑے پہن رکھے تھے اس کی طرف سے مجھے خطرہ لگا کہ کہیں پولیس کا کوئی سپاہی مجھے پہچان نہ لے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم ایسا کرو۔ یہ اپنی نیلی چادر مجھے دے دو۔ تم نے تو نیچے ساڑھی پہن ہی ہے"

لڑکی نے جلدی سے چادر اتار کر مجھے دے دی۔ میں نے چادر کو اس طرح اپنے لپیٹ لیا کہ میرے گیروے رنگ کے جوگیوں والے کپڑے بہت کم دکھائی دیں۔

اتنے میں ٹرین آگئی۔ ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ ڈبے میں مرد عورتیں اکٹھے تھے۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ بھوپال سے آگرہ کا سفر کافی طویل سفر ہے۔ لڑکی نے اوپر

پر سونے کے لئے جگہ بنالی اور اوپر چڑھ کر لیٹ گئی۔ میں چادر کی بکل مارے سیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ میں نیند پر قابو پا سکتا تھا۔ ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ میں جب جی چاہتا بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ جب ضرورت محسوس کرتا جاگ پڑتا۔ جھانسی کا سٹیشن دوسرے دن آیا۔ ہم دونوں سٹیشن پر بالکل نہ اترے۔ ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ لڑکی جس کو دلال جگو گوری بائی کے نام سے پکارتا تھا اس کا اصلی نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ مجھے اس کا نام معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو اسے محفوظ ہاتھوں تک پہنچا کر اس سے الگ ہوجانا چاہتا تھا۔ مجھے آگے دلی اور اپنے ماسٹر سپائی گل خان سے جا کر ملنا تھا۔ جھانسی کے بعد گوالیار آیا اور پھر دوسرے دن رات کو ٹرین آگرہ پہنچ گئی۔ سٹیشن سے ہم منہ سر لپیٹ کر نکل گئے۔ لڑکی نے سٹیشن کے باہر آکر کہا۔

"ٹنڈلہ جانے والی ٹرین رات کو نہیں ملے گی۔ ہم لاری اڈے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے ٹنڈلہ کے لئے لاریاں آدھی رات تک چلتی رہتی ہیں۔"

وہ آگرہ شہر سے بھی بخوبی واقف تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس شہر کے بازار حسن میں بھی رہ چکی تھی۔ ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی جس نے ہمیں لاری اڈے پہنچایا۔ آگرہ میں سردی تھی۔ میں نے چادر لڑکی کو دینی چاہی۔ اس نے نہ لی اور کہا۔

"میرے پاس اٹیچی کیس میں ایک گرم چادر ہے"

اور اس نے اٹیچی کیس کھول کر نسواری رنگ کی گرم چادر نکال کر اوڑھ لی۔ لاری اڈے سے ہمیں آسانی سے ٹنڈلہ جانے والی بس مل گئی جس نے کوئی گھنٹے سوا گھنٹے میں ہمیں ٹنڈلہ پہنچایا۔ یہ اس زمانے میں چھوٹا سا شہر تھا۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ایک تانگے میں بیٹھ گئے لڑکی نے کسی محلے کا نام لیا جو اب مجھے بھول گیا ہے اور تانگہ اس محلے کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ محلہ شہر کے کونے میں تھا۔ ایک گلی تھی۔ لڑکی ایک معمولی سے مکان کے آگے جا کر رک گئی۔ اس نے بند دروازہ پر آہستہ سے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد مکان کے اوپر والے کمرے کی کھڑکی کھول کر کسی عورت نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

لڑکی نے اوپر دیکھ کر کہا۔

"اماں بی! میں ہوں رضوانہ"

کھڑکی میں جو عورت جھانک رہی تھی اس نے کہا۔

"اچھا بیٹی ٹھہرو۔"

کھڑکی بند ہو گئی۔ آواز کسی بوڑھی عورت کی تھی۔ اس کے کوئی ایک منٹ بعد نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا اور وہ "رضوانہ تم اس وقت کیسے" کہہ کر اس کے گلے گئی۔ پھر میری طرف ایک نظر دیکھا اور ہمیں اوپر لے گئی۔ ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ سردی تھی مگر کمرہ نیم گرم تھا۔ آمنے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں جن پر بستر اور ک پڑے تھے۔ جس عورت نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا وہ بوڑھی عورت بھی چا پر کمبل اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس نے رضوانہ کی بلائیں لے کر کہا۔

"بیٹی خیریت تو ہے۔ اس وقت اچانک تم کیسے آ گئیں؟"

رضوانہ نے کہا۔ (اب مجھے اس طوائف لڑکی کا چونکہ نام معلوم ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے رضوانہ ہی لکھوں گا)"

"اماں بی! بس اچانک آپ لوگوں سے ملنے کو جی چاہا اور آ گئی۔"

اس عورت نے میری طرف اور خاص طور پر میرے گیروے کپڑوں کی طرف د اور پوچھا۔

"یہ سادھو جی کون ہیں بیٹی؟"

رضوانہ نے کہا۔

"یہ بڑے پہنچے ہوئے سادھو ہیں اماں دلی جا رہے تھے۔ میں اکیلی تھی۔ میں انہیں کہا مجھے ٹنڈلہ چھوڑتے جائیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں"

میرے لئے اوپر والی کوٹھڑی میں بستر لگا دیا گیا۔ رضوانہ میرے لئے چائے اور کھانے کو لے کر آئی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ لیکن یہ معمہ ابھی حل نہیں ہوا کہ تم نے یہ بہروپ کس لئے بنا رکھا ہے۔ کیا تم اس راز کو نہیں کھولو گے؟"

میں ہنس پڑا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم اس برے دھندے میں کیسے آئیں۔"

رضوانہ نے ایک ثانیہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ ماضی کے زمانے میں کھو گئی ہو۔ یہ میں آپ کو ایک بار پھر بتاتا چلوں کہ جس زمانے میں میں انڈیا میں داخل ہوا تھا اس وقت پاکستان کو قائم ہوئے بارہ تیرہ برس بیت چکے تھے۔ رضوانہ نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور شکستہ سی آواز میں کہا۔

"ہمارا گھر لدھیانہ شہر کے باہر ایک بستی میں تھا۔ میرا باپ محکمہ نہر میں ہیڈ کلرک تھا۔ میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی جب پاکستان قائم ہونے کا اعلان ہوا۔ میرے دو بڑے بھائی اور ایک بڑی بہن تھی۔ مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں کی طرح لدھیانہ میں بھی مسلمانوں نے ڈٹ کر ہندو سکھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن 14 اگست کے بعد جب ڈوگرہ اور گورکھا فوج بھی ہندو سکھوں کے ساتھ شامل ہو گئی تو لدھیانہ کے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شہر میں مسلمانوں کے گھروں پر سکھوں ہندوؤں نے حملے شروع کر دیئے لوگ گھروں سے نکل کر قافلے کی شکل میں پاکستان کی طرف چل پڑے۔ ہم بھی پاکستان کی طرف نکل جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک سکھوں کے ایک جتھے نے ہماری بستی پر حملہ کر دیا۔ دس بارہ سکھ تلواریں کرپانیں لہراتے ہمارے گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے میرے والد کو تلواریں مار مار کر شہید کر دیا۔ میری ماں انہیں بچانے کے لئے روتی ہوئی آگے آئی تو اسے بھی ظالموں نے مار ڈالا۔ میرے بھائیوں نے ڈنڈوں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ دو سکھوں نے میری بڑی بہن کو اٹھا لیا اور لے گئے۔ ایک سکھ مجھے اٹھا کر لے گیا۔"

رضوانہ نے سرد آہ بھری اور بولی۔

"اس کے بعد میری دکھوں' عذابوں' اذیتوں اور گناہوں سے بھری ہوئی زندگی کا
آغاز ہو گیا۔ اگر اسلام میں خود کشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی مرچکی ہوتی۔ میں ایک
ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں مسلسل چلی گئی اور آج اس مقام پر پہنچ چکی ہوں جہاں تم مجھے
دیکھ رہے ہو"

رضوانہ کی اندوہناک آپ بیتی قیام پاکستان کے وقت ہندو سکھوں کے ہاتھوں اغوا
ہونے والی ہزاروں مسلمان عورتوں کی دردناک آپ بیتی تھی۔ میں اس وقت یہی سوچ رہا
تھا کہ اگر میری چھوٹی بہن کلثوم شہید نہ ہوتی اور اغوا ہو جاتی تو اس کا انجام بھی شاید ایسا
ہی ہوتا۔ میں نے رضوانہ سے کہا۔

"اب جب کہ تم گناہ کے جہنم سے نکل آئی ہو۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم
کسی طرح کوشش کر کے پاکستان چلی جاؤ۔"

رضوانہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔ کہنے لگی۔

"تم نے میرے ایک قاتل کو ہلاک کر دیا ہے۔ ابھی میرے تین قاتل زندہ ہیں۔
جب تک میں اپنے ہاتھوں ان کا خون نہیں کر لوں گی پاکستان نہیں جاؤں گی۔"

میں خاموش رہا۔ رضوانہ کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں اپنی زندگی کی داستان سنا دی ہے۔ اب تم اس راز پر سے پردہ ہٹاؤ
کہ تم اصل میں کون ہو اور مسلمان ہو کر سادھو کے بھیس میں کس لئے پھر رہے ہو؟"

اس لڑکی رضوانہ کو اپنے بارے میں اصلیت بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
اور پھر اسے اپنے بارے میں حقیقت بیان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اسے یونہی
ایک فرضی کہانی جوڑ کر سنا دی کہ میرا ایک بہت پیارا مسلمان دوست گم ہو گیا ہے۔ مجھے
کسی نے بتایا تھا کہ اسے ہندو سادھو اغوا کر کے گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف لے گئے ہیں۔
چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہندو سادھو بن کر اپنے دوست کو تلاش کروں۔

"بس یہ ہے میرے سادھو بننے کا راز"

رضوانہ جانے لگی تو میں نے اسے کہا۔

"میں صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں شاید معلوم ہو۔ کیا
صبح کے وقت آگرہ سے دلی کی طرف کوئی گاڑی جاتی ہے؟"

رضوانہ نے کہا۔

"صبح کے وقت ایک دو ایکسپریس ٹرینیں بمبئی کی طرف سے ضرور آتی ہیں۔ یہ تو
تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو گا۔"

میں اپنے سادھوؤں والے لباس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے رضوانہ
سے کہا۔

"اب میں چونکہ واپس دلی جا رہا ہوں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مجھے سادھوؤں کے حلیے
کی ضرورت نہیں رہی۔ کیا یہاں سے مجھے دوسرے کپڑے مل سکتے ہیں؟"

رضوانہ کچھ سوچ کر بولی۔

"میری سہیلی کا بھائی آگرہ کے کسی کارخانے میں ملازم ہے۔ وہ ہفتے میں ایک بار گھر
آتا ہے۔ اس کے کپڑے ضرور صندوق میں پڑے ہوں گے۔ میں اذان کے وقت آؤں
گی تو مردانہ کپڑے ساتھ لیتی آؤں گی۔"

وہ سلام کر کے چلی گئی۔ میں اس لڑکی کی زندگی پر سوائے افسوس کرنے اور دل میں
دکھ محسوس کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ پاکستان میں
رہنے والے مسلمانوں کو احساس ہونا چاہئے کہ پاکستان کتنی بڑی قربانیاں دے کر قائم ہوا
ہے اور اس کا وجود کس قدر ضروری اور قیمتی ہے۔ میری کمر کے ساتھ ٹائم بم جو چیونگ
گم کی ٹیبلٹ کی شکل میں تھے رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ یہ چھ دھماکہ خیز بم تھے۔
میں نے انہیں کمر کے ساتھ ہی بندھے رہنے دیا اور بتی بجھا کر بستر میں گھس گیا۔ مجھے
چندریکا اور میناکشی کا خیال آنے لگا۔ میں نے دونوں کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا اور
پھر مجھے نیند آگئی۔

صبح کی اذان کے وقت رضوانہ نے آکر مجھے جگایا۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ میرے لئے ایک پرانی پتلون۔ ایک پرانی قمیض جیکٹ اور بوٹ لے کر آئی تھی۔ یہ سارے کپڑے وغیرہ اس کی سہیلی کے بھائی کے تھے۔ کہنے لگی۔

"تم کپڑے تبدیل کر لو۔ میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں"

اس کے جانے کے بعد میں نے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ بہت غنیمت تھے۔ اس کی سہیلی کا بھائی میرے قد کاٹھ کا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے پتلون پوری آگئی۔ جیکٹ بھی پوری آگئی۔ سب سے زیادہ فکر مجھے جوتوں کی تھی کہ اگر وہ تنگ یا کھلے ہوئے تو میں انہیں نہیں پہن سکوں گا۔ لیکن جرابیں پہن کر وہ بھی پورے آگئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ سادھوؤں والے کپڑوں میں میرے پکڑے جانے کا بہت خطرہ تھا۔ ظاہر ہے احمد آباد پولیس اور سیکرٹ سروس والوں نے احمد آباد سے لے کر جھانسی بھوپال گوالیار آگرہ بلکہ دلی تک کی پولیس کو میرا حلیہ بتا کر انہیں الرٹ کر دیا ہو گا۔ میرے بال بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ اسی وضع قطع میں تھے جیسے کیپٹن ہری ناتھ کو ہلاک کرتے اور دوارکا فورٹ کو تباہ کرتے وقت تھے۔ مجھے احمد آباد کی سیکرٹ پولیس نے اسی وضع قطع کے بالوں میں دیکھا تھا۔ بالوں کو ایک ہی دن میں لمبے کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔

میں نے کمر کے گرد بندھا ہوا ٹائم بموں والا رومال کھول کر چھ کے چھ ٹیبلٹ بم سامنے رکھ لئے۔ یہ ٹائم بم انتہائی دھماکہ خیز تھے۔ ایسے ہی تو بم تھے جنہوں نے دوارکا

فورٹ کے اتنے بڑے ایمونیشن ڈمپ کو اڑا کر راکھ کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان بموں کو کمر کے ساتھ باندھنے کی بجائے مجھے کسی ڈبی میں ڈال کر جیب میں رکھ لینا چاہئے۔ اگر آگرہ سے دلی جاتے ہوئے راستے میں میں پکڑا گیا تو میری کمر کے گرد بندھی ہوئی چیونگ گم کی ٹیبلٹ کو دیکھ کر پولیس کو ضرور شک پڑ جائے گا اور جب انہوں نے لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیونگ گم نہیں بلکہ انتہائی دھماکہ خیز مواد کی چوکور گولیاں ہیں۔ اس طرح میرے غیر ملکی جاسوس یا کشمیری کمانڈو ہونے کا انہیں واضح ثبوت مل جائے گا۔ یہ ٹائم بم دیکھنے میں بالکل چیونگ گم لگتے تھے۔ وہی سائز اور وہی رنگ ہم نے انہیں دیا ہوا تھا۔ میرے پاس کوئی ڈبی نہیں تھی۔

رضوانہ چائے لے کر آگئی۔ اس نے میرے سامنے چیونگ گم کی گولیاں دیکھ کر پوچھا۔

"تم چیونگ گم بھی کھاتے ہو کیا؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"کھاتا نہیں چباتا ہوں"

رضوانہ نے ایک گولی اٹھا لی اور منہ میں ڈالنے لگی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھماکہ خیز ٹائم بم جس کو وہ چیونگ گم سمجھ رہی تھی اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ کا اظہار کیا تھا کہ رضوانہ حیران ہو کر بولی۔

"کیا اس میں زہر تھا؟"

میں نے کہا۔

"یونہی سمجھ لو"

میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے چھوٹی سی کوئی ڈبی لا دے۔ وہ نیچے گئی اور ٹین کی چھوٹی چوکور ڈبی لے آئی۔ میں نے چھ کے چھ چیونگ گم ٹائم بم ڈبی میں ڈالے۔ ڈبی کو بند کیا اور پتلون کی جیب میں سنبھال کر رکھ لی۔ وہ میرے کپڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں تو کپڑے بالکل ٹھیک آئے ہیں"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ اب مجھے سردی بھی نہیں لگے گی۔"

رضوانہ اپنے ساتھ کچھ روپے بھی لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں کچھ پیسے لائی ہوں یہ تم اپنے پاس رکھ لو تمہیں ضرورت پڑے گی۔"

میں نے اسے بٹوہ کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں رضوانہ میرے پاس یہ کچھ پیسے ہیں۔ دلی تک پہنچ جاؤں گا۔"

مگر اس نے مجھے زبردستی سو روپے دے دیئے۔ میں نے رکھ لئے۔ چائے پینے کے بعد میں جانے لگا تو رضوانہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگی۔

"تم سے بڑی تھوڑی دیر کی ملاقات رہی ہے۔ لیکن مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں ایک مدت سے تمہیں جانتی ہوں۔ اب تم جا رہے ہو جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔"

یہ لڑکی جذباتی ہو رہی تھی۔ مجھے چندریکا اور میناکشی دونوں عورتیں یاد آ گئیں۔ وہ بھی کبھی کبھی اسی طرح جذباتی ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس لڑکی رضوانہ کے جذبات سچے ہیں۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ہماری پھر بھی کبھی ملاقات ہو جائے"

وہ کہنے لگی۔

"تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تم نے مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں پھر میں کیسے امید لگاؤں کہ تم سے پھر بھی ملاقات ہو گی"

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا۔ اور کہا۔

"قدرت کو منظور ہوا تو ہم پھر بھی کبھی ضرور ملیں گے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں خدا حافظ!"

وہ مجھے چھوڑنے نیچے تک آئی۔ مکان کی ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ یہاں اس نے مجھے میری گردن میں باہنیں ڈال کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں اس جذباتی گرمجوشی کے لئے

بالکل تیار نہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں وہیں اس لڑکی کے پاس رہ جاؤں۔ انسان کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو ایک شیطان اس کے ساتھ ضرور لگا رہتا ہے جو اسے اس کے سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایک شیطان شروع ہی سے میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ آپ اس سے پہلے بھی میری داستان میں پڑھ چکے ہوں گے۔ جب شیطان نے مجھے اپنے قابو میں تقریباً کر لیا تھا مگر خدا نے مجھے عین موقع پر عقل دے دی اور میں بچ گیا۔

اس وقت بھی شیطان مجھ پر بڑی تیزی سے غالب آنے لگا تھا۔ رضوانہ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ عین وقت پر خدا نے مجھے عقل دے دی اور میں جلدی سے پیچھے ہٹا اور خدا حافظ کہہ کر مکان کی ڈیوڑھی سے نکل گیا۔

ٹنڈلہ شہر کی مسجدوں میں اذانیں ہو چکی تھیں۔ آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا تھا۔ مجھے وہاں کے لاری اڈے کا راستہ آتا تھا۔ رات کو جہاں جہاں سے ہم گزر کر آئے تھے وہ راستے میں نے یاد رکھے تھے۔ لاری اڈے پر ایک بس آگرہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مسافر آنے لگے۔ لاری آگرہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت میرا ذہن رضوانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی نہ جانے لدھیانہ کے کس محلے کی رہنے والی شریف ماں باپ کی اولاد تھی مگر 1947ء کے خونی حالات نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگر یہ اغوا نہ کی جاتی۔ اگر اسے سکھ اٹھا کر نہ لے جاتے تو آج اس کی شادی ہو چکی ہوتی اس کے بچے ہوتے۔ یہ اپنے خاوند کی خدمت اور بچوں کی پرورش کرتے ہوئے لدھیانہ شہر میں شریفانہ زندگی بسر کر رہی ہوتی۔

یہی سوچ رہا تھا اور سوچتا چلا جا رہا تھا کہ دن نکل آیا اور لاری آگرہ پہنچ گئی۔ لاری اڈے سے اتر کر میں سیدھا ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ پتہ چلا کہ دلی جانے والی ٹرین ایک گھنٹے بعد آئے گی۔

میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا ہوا تھا اس لئے کچھ بے فکر ہو گیا تھا اور پلیٹ فارم پر ایک طرف خاموشی سے بیٹھنے کی بجائے ادھر ادھر ٹہل کر کتابوں کے سٹال پر اخبارات

وغیرہ دیکھنے لگا۔ یہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ کمانڈو سپائی کو کبھی اور کسی بھی وقت
دشمن کے ملک میں غافل نہیں ہونا چاہئے وہ چاہے جس حلیے میں ہو دشمن ملک میں کر
بھی جگہ کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے۔

میں سٹال پر ایک اردو اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی
بالکل میرے آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ دوسرا اخبار دیکھنے کی بجائے میری طرف جھک کر
میرے اخبار کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے تو میں ویسے ہی کھڑا رہا لیکن جب وہ آدمی
پیچھے نہ ہٹا تو میں نے اخبار سٹال پر چھوڑ دیا اور خود پرے ہٹ گیا۔ اس آدمی نے مسکرا کر
میری طرف دیکھا اور کہا۔

"بھائی صاحب آپ کے پاس ماچس ہو گی"

اس دوران اس آدمی نے جیب سے سگریٹ نکال کر اسے انگلیوں سے سیدھا کرکے
منہ میں دبا لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں بھائی صاحب میں سگریٹ نہیں پیتا"

وہ سگریٹ منہ سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"بھائی صاحب آپ مجھے ادھر کے رہنے والے نہیں لگتے۔ کیا آپ پنجاب سے آئے
ہیں"

اس آدمی کا حلیہ یہ تھا کہ جسم دبلا پتلا تھا۔ عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ خشخشی ڈاڑھی
میں سفیدی آرہی تھی۔ سر پر جناح کیپ تھی۔ بدن پر پرانا سا گرم کوٹ اور نیچے پاجامہ
پہنا ہوا تھا۔ موسم سرد تھا جس کی وجہ سے اس نے قمیض کے سارے بٹن گلے تک بند
کئے ہوئے تھے۔ مجھے اس آدمی پر شک ہوا۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"پنجاب میں کس شہر سے آئے ہیں؟ آپ کا لہجہ جالندھریوں والا بھی نہیں ہے۔ کیا آپ
امرتسر سے آئے ہیں"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"جی ہاں"

اور وہاں سے ہٹ کر ایک طرف چل پڑا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے یوں
زادی سے پلیٹ فارم پر گھومنا پھرنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ آدمی یقیناً سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔
ا جانے اسے کس طرح مجھ پر شک پڑ گیا تھا کہ میں کوئی مشکوک آدمی۔ میں ٹی سٹال کے
ونٹر پر آگیا۔ چائے کا گلاس بنوایا اور کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر چائے پینے اور بک
ال کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آدمی وہاں نظر نہ آیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس
یبت سے پیچھا چھوٹا۔ سردی واقعی کافی تھی۔ گرم گرم چائے نے میرے بدن کو گرم کر
۔ اس وقت میرا جی سگریٹ پینے کو بہت چاہا۔ سگریٹ والا کھوکھا قریب ہی تھا۔ میں نے
ں جا کر ایک سگریٹ خریدا اور وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

اتنے میں کسی نے پیچھے سے مجھے کہا۔

"بھائی صاحب آپ تو کہتے تھے کہ میں سگریٹ نہیں پیتا"

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہی آدمی میرے پیچھے کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکرا
ا۔ اس کے ہاتھ میں بھی سگریٹ تھا جو سلگ رہا تھا۔ میں نے اپنے سگریٹ کی راکھ
ڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ کبھی کبھی پی لیا کرتا ہوں"

وہ آدمی میرے قریب ہو گیا۔ مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں صاف نظر آرہی
ں۔ اس نے اپنی آنکھیں مجھ پر جمائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب آپ مجھے امرتسر کے بھی نہیں لگتے۔ کہیں آپ لاہور کے رہنے
لے تو نہیں ہیں۔"

اس کے منہ سے لاہور کا نام سن کر میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ بات
ت ہونے لگی تھی کہ یہ آدمی خفیہ پولیس والا ہے اور اتنی آسانی سے میری جان نہیں
ڑے گا۔ وہ تنہا مقام بھی نہیں تھا۔ آگرہ سٹیشن کا پلیٹ فارم تھا۔ وہاں کافی لوگ تھے
ایک طرف مجھے پولیس کے سپاہی بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنے حواس کو قابو میں

رکھا۔ اس کی مجھے خاص طور پر اور بڑی سخت ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والا؟ آپ کو کس نے بتایا
میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ جائیے اپنا کام کریں"

میں یہ کہہ کر وہاں سے دوسری طرف چلا گیا۔ میرا رخ پلیٹ فارم کے شمالی سرے
جانب تھا۔ وہاں پلیٹ فارم کی ڈھلان تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ڈھلان اتر گیا۔ ریلو
لائن کراس کی اور دوسرے پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں چونکہ کوئی گاڑی آنے والی یا جا
والی نہیں تھی اس لئے پلیٹ فارم تقریباً خالی پڑا تھا۔ ٹی سٹال اور بک سٹاک کے کھو
بھی بند تھے۔ میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہی تھیں
سامنے والا پلیٹ فارم بھی مجھے نظر آرہا تھا۔ کیونکہ دو پلیٹ فارموں کی درمیانی لائن پر
گاڑی کھڑی نہیں تھی۔ جہاں وہ آدمی پہلے کھڑا تھا اب وہاں نہیں تھا۔ وہ خدا جانے کہاں
غائب ہو گیا تھا۔

اصل میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ مجھے وہاں سے چلے جانا چاہئے تھا مگر
ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں بنچ پر بیٹھا رہا۔ میری نگاہ پلی
فارم کے آخری حصے کی طرف گئی جہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں
وہی سی آئی ڈی کا آدمی دو سپاہیوں کے ساتھ میری طرف چلا آرہا ہے۔ اب مجھے وہاں
بھاگنا تھا۔ مگر میں نے ایک بار پھر تساہل سے کام لیا۔ بنچ سے ضرور اٹھا مگر آہستہ آ
دوسری طرف چلنے لگا۔ جیسے میں نے سپاہیوں کو دیکھا ہی نہیں۔ دوسری طرف نیچے ریلوے
پٹڑی تھی۔ میں ریل کی پٹڑی پر اتر گیا۔ ذرا آگے ایک خالی ڈبہ کھڑا تھا۔ میں اس
چڑھ گیا۔ اندر آتے ہی میں ایک دم ایکشن میں آگیا۔ تیزی سے خالی ڈبے کے دو
دروازے میں سے دوسری طرف اترا اور ریلوے لائن پر دوڑنے لگا۔ وہاں کوئی
ریلوے لائن نہیں تھی۔ ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میں تیزی سے نہیں
سکتا تھا۔ پھر بھی میں الانگتا پھلانگتا جتنی جلدی جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا۔ پیچھے

کر میں نے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے سٹیشن سے باہر نکلنے
کو راستہ بھی ہے یا نہیں۔ ریلوے یارڈ ختم ہوا تو سامنے ایک جانب دیوار آگئی۔ دیوار
بہت اونچی تھی۔ میں دوسری طرف دوڑ پڑا۔ ادھر آگے ایک ورکشاپ آگئی جہاں کچھ
مزدور ایک ریلوے انجن کی صفائی وغیرہ کر رہے تھے۔

مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی؟"

میں نے یونہی پوچھا۔

"رحمت علی مکینک یہیں کام کرتا ہے کیا؟"

"کون رحمت علی؟"

ایک نے پوچھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے سی آئی ڈی والا اور دونوں سپاہی
کہیں نظر نہ آئے۔ میں نے کام کرنے والے مزدوروں یا مستریوں سے کہا۔

"میرا واقف ہے۔ کہتا تھا۔ میں یہیں کام کرتا ہوں۔ شاید اس نے کوئی دوسری جگہ
ہو گی"

یہ کہہ کر میں ایک طرف چلا تو پیچھے سے ان میں سے کسی نے آواز دی۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو؟ باہر نکلنے کا دروازہ اس طرف ہے"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک مستری سامنے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔
میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ تھا جو ریلوے یارڈ کی
دوسری طرف نکلتا تھا۔ جیسے ہی میں اس دروازے سے باہر نکلا سامنے وہی سی آئی ڈی والا
کھڑا تھا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ چار سپاہی کھڑے تھے جن میں سے ایک سپاہی کے
ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے رائفل ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔
سی آئی ڈی کے آدمی نے اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی تین سپاہی میری طرف بڑھے اور
انہوں نے آن واحد میں دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ چوتھے سپاہی نے میری طرف رائفل
رکھی تھی۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ مجھے کس جرم میں پکڑ رہے ہو۔ میرے پاس دلی کا ٹکٹ ہے۔ میں ٹکٹ نہیں ہوں"

وہ آدمی مکارانہ ہنسی ہنسا۔

"مہاراج! آپ کو ہم لاہور لے جا رہے ہیں۔ ذرا تھانے تک ہمارے ساتھ چلیں"

وہ مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ ایک طرف تیز تیز چلانے لگے۔ میں بڑی آسانی سے گرفت سے نکل کر فرار ہو سکتا تھا مگر خطرہ مجھے رائفل والے سپاہی سے تھا جو رائفل تانے میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شاید انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ یہ آدمی کشمیری کمانڈو ہے اور اس کی طرف سے ذرا بھی غفلت نہ برتنا۔ ہم سڑک پر آئے تو وہاں پولیس والی جیپ کھڑی تھی۔ انہوں نے مجھے جیپ میں دھکیل دیا اور تین سپاہی اس طرح میرے دائیں بائیں اور پیچھے آگے آ گئے کہ میں ان کے شکنجے میں تھا۔ جس سپاہی کے پاس رائفل تھی وہ جیپ کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ سی آئی ڈی کا آدمی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔

جیپ سٹارٹ ہوئی اور بازار میں ایک طرف چل پڑی۔ مجھے ہر حالت میں ان کی حراست سے فرار ہونا تھا۔ اور اس قسم کے فرار کی مجھے سخت ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ میں اتنی آسانی سے پولیس کے جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔ میں نے رائفل والے کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کی رائفل کا رخ میری طرف نہیں تھا۔ جیپ جس بازار میں سے گزر رہی تھی وہاں لوگ آ جا رہے تھے اور ٹریفک بھی جاری تھی۔ اس قسم کا ماحول میرے فرار کے لئے بڑا موزوں تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ مجھے کس سپاہی کو نیچے سے ٹکر لگانی ہے اور کس سپاہی کی گردن توڑنی ہے۔ سب سے پہلے میں رائفل والے سپاہی کو بے کار کرنا چاہتا تھا۔ میں ابھی اس کا منصوبہ ہی تیار کر رہا تھا کہ جیپ اچانک ایک طرف مڑی اور ایک عمارت کے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں پہلے سے ایک بندوق بردار سپاہی پہرے پر موجود تھا۔

جیپ ایک احاطے میں آ کر رک گئی۔ میں پولیس کے تھانے میں پہنچ چکا تھا۔

دیکھ کر سامنے والے کمرے سے ایک سب انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جب مجھے جیپ سے اتارا جا رہا تھا تو سب انسپکٹر نے گالی دے کر کہا۔

"اس کو ہتھکڑی کیوں نہیں لگائی؟"

اس وقت ایک سپاہی نے میرے ہاتھ پیچھے کر کے مجھے ہتھکڑی لگا دی میں نے جنگ نہیں ہاری تھی۔ صرف ایک لڑائی ہار گیا تھا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ میں نے دوسری لڑائی کے لئے ذہن تیار کرنا شروع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس میری کوئی تصویر نہیں ہے جو احمد آباد کی پولیس نے انہیں بھیجی ہو۔ اگر انہیں احمد آباد پولیس نے میری گرفتاری کے لئے کوئی اطلاع دی ہے تو بھی میں کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کروں گا کہ میں وہی آدمی ہوں جس نے دوارکا فورٹ کا ایمونیشن کا ذخیرہ اڑایا ہے۔ یہ لوگ کسی طرح بھی کم از کم آگرہ میں بیٹھ کر مجرم ثابت نہیں کر سکتے۔ مجھے اسی وقت حوالات میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں نے چلا کر کہا۔

"مجھے کس جرم میں یہاں بند کیا گیا ہے۔ مجھے ٹیلی فون دیا جائے۔ میں ایس ایس پی کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے پتا جی کے دوست ہیں۔"

سب انسپکٹر پولیس جو شکل ہی سے بڑا جابر لگتا تھا۔ حوالات کی سلاخوں کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"ابھی ایس ایس پی صاحب بھی آ رہے ہیں۔ تم اپنے پتا جی کو بلانے کا انتظام کرو"

یہ کہہ کر وہ اپنے دفتر میں چلا گیا۔

حوالات میں تین حوالاتی کونے میں پرانا کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ان میں ایک سکھ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"بھاجی! کسی کی جیب کاٹی ہے یا ہیروئن سمگل کی ہے۔ ادھر آجاؤ۔ ادھر بڑی سردی ہے"

حوالات میں واقعی بڑی سردی تھی۔ تنگ سی حوالات تھی۔ میرا ذہن تیزی سے وہاں سے فرار کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ مگر بظاہر فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تھوڑی

دیر بعد وہی سب انسپکٹر ایک سپاہی کے ساتھ آیا۔ میری ہتھکڑی حوالات کے اندر
انہوں نے نہیں اتاری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں میرے خطرناک کمانڈو ہونے
اطلاعات مل چکی تھیں۔ میں احتجاج کرنے لگا کہ مجھے بتایا جائے کہ مجھے یہاں کیوں بند
گیا ہے۔ مجھے کس جرم میں ہتھکڑی لگائی گئی ہے۔ سب انسپکٹر مجھے ساتھ لے کر تھا
میں جو کشادہ برآمدہ تھا اس کے درمیان والے کمرے میں لے گیا۔

ایس ایس پی، ایس کے بھنڈاری لکھا تھا۔ اندر ایک بھاری تن و توش کا ہندو لالہ
کٹ گرم جیکٹ اور کھدر کا سوٹ پہنے بڑی کرسی میں دھنسا ہوا بیٹھا تھا۔ سب انسپکٹر
سلیوٹ کیا۔ ایس ایس پی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر سب انسپکٹر سے انگریزی میں پوچھا

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

اس نے کہا۔

"یس سر! مجھے پورا یقین ہے"

ایس ایس پی نے سنہری فریم والی عینک اتار کر رجسٹر پر رکھ دی اور سب انسپکٹر
طرف دیکھ کر کہا۔

"مسٹر جوشی اگر تمہارا یہ ونچر کامیاب ہوا تو تمہارے ساتھ میری بھی پرموشن
ہے۔ جاؤ۔ اس کی دو تصویریں اترواؤ"

میری سمجھ میں نہ آیا یہ میری تصویریں کس لئے اتروانے لگے ہیں۔ میں یہی سمجھا
کہ تھانے کی ریکارڈ کے لئے تصویریں اتروا رہے ہیں۔ وہ مجھے ایک دوسرے کمرے
لے گئے جہاں ایک فوٹوگرافر بیٹھا ایک تصویر کے نقوش باریک برش سے درست کر
تھا۔ فوراً میری دو تصویریں اتاری گئیں۔ اس کے بعد مجھے حوالات کی بجائے ایک
کمرے میں بند کر دیا گیا جس کو کوٹھڑی کہنا درست ہو گا۔ اس میں کوئی روشندان
تھا۔ صرف لوہے کا دروازہ تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا

کوٹھڑی کا ننگا فرش سردی میں اور زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہاں صرف فرش پر
میں ایک پرانا سا کمبل بچھا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور کمبل پڑا تھا۔ مجھے جیکٹ میں

سردی لگ رہی تھی۔ میں کونے میں کمبل لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ اب مجھ
سے پوچھ گچھ شروع کرنے والے ہیں۔ یہ مجھے ٹارچر کریں گے اور مجھ سے اعتراف
کروانے کی کوشش کریں گے کہ میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ مگر مجھے اس قسم کے ٹارچر کی
ہوشنگ آباد کے جنگل میں انتہائی اذیت ناک ٹریننگ مل چکی تھی۔ میرے ٹریننگ ماسٹر نے
مجھے ٹارچر کے شدید سے شدید مرحلوں میں سے گزارا تھا اور یہ بھی تربیت دی تھی کہ
جب اذیت حد سے گزر جائے تو مجھے اپنے جسم کو کس طرح سن کر کے اپنے اوپر ایک طرفہ
بے ہوشی طاری کر لینی ہے۔ یعنی ایسی بے ہوشی کہ جس میں جسم پر کسی اذیت کا کوئی اثر
نہیں ہوتا مگر آدمی ہوش میں رہتا ہے۔

ایک بات پر میں بڑا حیران تھا کہ انہوں نے ابھی تک میری تلاشی نہیں لی تھی۔ اس
کوٹھڑی میں میں دو دن تک بند رہا۔ تیسرے روز ایس ایس پی سب انسپکٹر جوشی کے ساتھ
خود میری کوٹھڑی میں آیا۔ دو سپاہی ساتھ تھے۔ یہاں میری ہتھکڑی اتار دی گئی تھی۔
سپاہیوں نے فوراً دو کرسیاں اندر ڈال دیں۔ سب انسپکٹر جوشی اور ایس ایس پی بھنڈاری
کرسیوں پر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ کوٹھڑی کی چھت کے ساتھ ایک بلب دن رات
روشن رہتا تھا۔ ایس ایس پی بھنڈاری بڑا خرانٹ اور تجربہ کار پولیس آفیسر تھا۔ اس نے
مجھ سے بڑی ملائمت اور نرمی کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ وہ کشمیر کے بارے میں باتیں
کرنے لگا کہ کشمیر کے مسلمان کشمیری ناحق اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ آدھے سے زیادہ
کشمیری مسلمان ہندوستان کے ساتھ ہیں اور وہ ہندوستان کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔

جب اس پولیس آفیسر نے آتے ہی کشمیر کی تحریک آزادی کے بارے میں گفتگو
شروع کی تو میں فوراً سمجھ گیا کہ ان لوگوں کو پتہ لگ چکا ہے کہ میں کشمیری کمانڈو ہوں۔
پھر بھی میں اپنی طرف سے بالکل انجان بنا رہا اور میں نے بلند آواز میں کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ کشمیر کے سارے مسلمان ہندوستان سے الگ ہو کر
پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی ہیں۔ ہندوستان نے زبردستی کشمیر پر اپنی فوج کے ذریعے
قبضہ کر رکھا ہے۔"

مجھے اتنی جلدی ایسی باتیں زبان سے نہیں نکالنی چاہئیے تھیں۔ ان باتوں نے کم از کم یہ ضرور ثابت کر دیا کہ میں کشمیر کی تحریک آزادی کا حامی ہوں اور کشمیری مسلمانوں کے حق خود ارادی کے حق میں ہوں۔ ایس ایس پی نے مسکراتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا اور کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارا کشمیری مجاہدین کی تحریک سے تعلق ہے۔ اور تم کشمیری کمانڈو ہو جسے بھارت میں تخریبی کارروائیوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔"

اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ مجھے کسی ملک نے انڈیا میں جاسوسی کے لئے نہیں بھیجا۔ کشمیر کی تحریک آزادی کی میں نے جو بات کی ہے وہ کشمیر اور بھارت کے ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے۔"

ایس ایس پی بھنڈاری مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے میرے بارے میں کسی خفیہ بات کا علم ہو چکا ہے۔ اس نے میری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف ذرا سا جھک کر پوچھا۔

"احمد آباد آگرہ اور دلی میں تمہارے دوسرے ساتھی کہاں کہاں پر ہیں؟ اگر تم ہمیں ان کے صحیح ٹھکانے بتا دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ہم تمہیں اپنی نگرانی میں پاکستان واپس پہنچا دیں گے۔"

میں نے بھی ایس ایس پی کو گھورتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں جالندھر میں محنت مزدوری کرتا ہوں۔"

"کیا تم ہندو ہو؟"

"ہاں میرا نام دیوی ناتھ ہے۔"

اس وقت یہی ہندوانہ نام میری زبان پر آیا اور میں نے یہی بول دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان لوگوں کو میرے بارے میں سب پتہ چل چکا ہے۔ اب انہوں نے صرف کوئی ثبوت ہی میرے سامنے لانا تھا۔

جب میں نے کہا کہ میں ہندو ہوں تو یہ اندھیرے میں کیا ہوا فائر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ہندو یا مسلمان ہونے کی قلعی ایک سیکنڈ میں کھل سکتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایس ایس پی بھنڈاری نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ میری پتلون کھولی جائے۔

دوسرے لمحے میرا مسلمان ہونا ثابت ہو گیا۔ سب انسپکٹر جوشی نے بھی نرم رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس اس بات کا مکمل ثبوت موجود ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو تم کشمیری کمانڈو بھی نہیں ہو۔ کیونکہ تم کشمیری نہیں ہو۔ مگر تم کشمیریوں کے ساتھ مل کر بھارت میں تخریبی کارروائیاں کرنے آئے ہو اور کر رہے ہو۔ ایس ایس پی صاحب نے تمہیں جو پیش کش کی ہے وہ تمہیں اذیت ناک موت سے بچا سکتی ہے۔ ہمیں صرف اتنا بتا دو کہ انڈیا میں تم لوگوں کے خفیہ ٹھکانے کہاں کہاں پر ہیں اور تمہارے ساتھ اور کون کون لوگ ہیں۔"

میرے پاس انکار کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مگر مجھے اقرار بھی نہیں کرنا تھا اپنے احمد آباد اور دلی والے ساتھیوں کے کسی حالت میں نام نہیں بتانے تھے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔

"میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔"

تب ایس ایس پی بھنڈاری نے مجھے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور گالی دے کر بولا۔

"ہم نے تمہاری تصویر احمد آباد سیکرٹ پولیس کو بھیجی تھی۔ وہاں سے انہوں نے ہماری تصویر دیکھ کر تصدیق کر دی ہے کہ تم ہی وہ پاکستانی جاسوس ہو جو گوکل داس پانڈے کے گھر میں جینی سادھو کے بھیس میں رہ رہا تھا جس کمرے میں تم رہتے تھے وہاں سے ہم نے مائیکروفون اور چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی برآمد کر لیا ہے۔ تم پولیس ریڈ پر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر آخر یہاں پکڑ لئے گئے۔ تم ہی وہ پاکستانی جاسوس ہو جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈنگھاٹ سٹیشن پر ملٹری ایمونیشن کی

گاڑی تباہ کی تھی۔ تم نے ہی دوار کا فورٹ کے ایمونیشن ڈمپ کو اڑایا ہے۔ کیا [illegible] بھی انکار کرتے ہو؟"

میرا سارا راز فاش ہو چکا تھا۔ میں نے دوسرا موقف اختیار کرلیا جو اصل حقیقت تھی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ مگر پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ مجھے پاکستان نے یہاں جاسوسی کے لئے نہیں بھیجا۔ میں اپنی مرضی سے صرف کشمیر کے نام پر اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ میں نے ٹرین اور دوار کا فورٹ کے اسلحہ کو بھی اس لئے تباہ کیا تھا کہ وہ اسلحہ میرے کشمیری بھائیوں کے خلاف استعمال کیا جانے والا تھا۔ میں نے آپ کو سچ بات بیان کر دی ہے۔ آپ میرے ساتھ جو چاہے سلوک کریں"

سب انسپکٹر جوشی نے کہا۔

"لیکن تم نے ابھی تک اپنے ساتھی کمانڈوز کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور میں نے اکیلے ہی مڈگھاٹ کی ٹرین اڑائی تھی اور دوار کا فورٹ کا ایمونیشن کا ذخیرہ تباہ کیا تھا"

ایس ایس پی بھنڈاری کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"احمد آباد سے چیف انٹیلی جینس آفیسر شام تک آگرہ پہنچ جائے گا۔ وہ تمہیں [illegible] ہے وہ تمہاری شناخت کرے گا۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ تم کس طرح اپنے منصوبوں کے بارے میں اور اپنے ساتھیوں کے نام پتے کس طرح نہیں بتاتے۔"

اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔

"اس کی کڑی نگرانی کی جائے"

یہ سپاہی سب انسپکٹر اور ایس ایس پی کے ساتھ ہی کوٹھڑی سے نکل گیا۔ باہر

نے کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے کو بند کر کے بھاری تالا لگا دیا اور پہلے والے سنتری سے کہا۔

"تم جاؤ۔ میں ڈیوٹی دوں گا"

پہلے والا سپاہی چلا گیا۔ میں بازی ہار چکا تھا۔ لیکن اس بات پر بڑا حیران تھا کہ ابھی کسی نے تھانے میں میری تلاشی نہیں لی تھی۔ خدا جانے وہ کس لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنی بہت غنیمت تھی کہ کوٹھڑی کے اندر مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔ ویسے جیب میں سوائے کچھ نقدی اور چھوٹی سی ڈبی کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس چھوٹی ڈبی میں چھ ٹائم بم بند تھے۔ یہ چیونگ گم بم کی چھ چوکور ٹکیاں تھیں جن کی وضع قطع چیونگ گم کی طرح بنائی گئی تھی لیکن ان کے اندر انتہائی دھماکہ خیز مواد بھرا ہوا تھا۔ آپ کو میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ ٹائم ڈیوائس والے چھوٹے سے بم دلی میں ہائی ایکسپلوسیوز کے ماہر گل خان کی زیر نگرانی تیار کئے گئے تھے۔ اس سے پہلے میرے پاس بموں کا محلول تھا جس کا ایک قطرہ پانی میں ڈال کر اگر وہ پانی پی لیا جائے تو اس قطرے دھماکہ خیز کیمیکلز معدے کے تیزاب سے مل کر چین ری ایکشن شروع کر دیتے ہیں اور منٹ کے بعد اس آدمی کے پیٹ میں دھماکہ ہوتا ہے اور اس کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ مگر دلی سے احمد آباد را RAW کے احمد آباد والے چیف گوکل داس پانڈے کی جاسوسی کرنے جب چلا تھا تو گل خان کے مشورے پر ہم نے اس محلول کو پہلے اسپرو کی گولیوں میں اور اس کے بعد میں نے خود اسے چیونگ گم کی ٹکیوں کی شکل میں بنالیا تھا تاکہ کسی کو ان پر شک نہ ہو۔ اس قیامت خیز دھماکوں والے ٹائم بم کا فارمولا بھی ہمارے پاس تھا جو اس وقت میرے پاس نہیں تھا بلکہ ہمارے احمد آباد والے ماسٹر سپائی کریم بھائی کے گھر سے باہر ریلوے لائن والے غیر آباد کوارٹر کے تہہ خانے میں میری دوسری خفیہ چیزوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

ایس ایس پی بھنڈاری کی زبانی مجھے علم ہو چکا تھا کہ احمد آباد سیکرٹ پولیس کا کوئی افسر وہاں سے آگرہ کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے اس نے مجھے گوکل داس

پانڈے کے گھر پر دیکھا ہو گا۔ اس کو میری تصویر بھی مل چکی تھی۔ اب اس نے
میں آکر صرف میری شناخت کرنی تھی اور اس کے بعد مجھ پر حیوانی ٹارچر کا سلسلہ
ہو جانا تھا۔ جس کو مجھے موت کی سرحدوں تک برداشت کرنا تھا۔ لیکن تشدد اور غیر
اذیت کے لمحات شروع ہونے سے پہلے ہی میں وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ سوال
کہ آگرہ کے اس پولیس سٹیشن کی سلاخوں والی کوٹھڑی سے کس طرح فرار ہوا جا
جس کے دروازے پر بھاری تالا پڑا تھا اور ایک رائفل بردار سپاہی دروازے کے
پہرہ دے رہا تھا۔ یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جو اس وقت میرے سامنے تھا اور مجھے
تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو ہونے کی حیثیت سے اس مسئلے کو بہت جلد حل کرنا تھا۔
مسئلے کا ایک حل میری جیب میں موجود تھا۔ لیکن یہ آخری حل تھا اور اس میں میری
جانے کا شدید خطرہ تھا۔ اگر میں جیب میں رکھی ہوئی ڈبی میں سے ایک چیونگ گم کی
نکال کر کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے میں کسی طرح لگا دوں تو ایک گھنٹے
زبردست دھماکے کے ساتھ دروازہ اڑ سکتا تھا۔ لیکن اس بم کی شدت اور طاقت
زیادہ تھی کہ اس بات کا خدشہ تھا کہ دروازے کے ساتھ پوری کی پوری کوٹھڑی کے
ساتھ ہی میرے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔

میں فرار کے کسی دوسرے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ میں
کھڑے سنتری کو کسی طرح دروازے کی سلاخوں کے پاس بلاؤں۔ سلاخوں میں سے
نکال کر اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالوں اور اس کی بیلٹ کے ساتھ جو چابیوں کا گچھا لٹک
تھا۔ وہ اپنے قبضے میں کروں اور اس میں سے اپنی کوٹھڑی کے دروازے والی چابی
دروازہ کھولوں اور تھانے کی عقبی دیوار پھلانگ کر فرار ہو جاؤں۔ یہ حل بالکل ایسا
کہ بگلے کو پکڑنے کے لئے اس کے سر پر موم رکھ دی جائے۔ دھوپ میں موم پگھل
بگلے کی آنکھوں پر گرے۔ بگلا اندھا ہو جائے تو پھر اسے پکڑ لیا جائے۔ کیونکہ اس مر
مرحلے میں کسی نہ کسی کے وہاں آجانے کا پورا امکان تھا۔ آخر وہ کوئی ویران مکان
تھا۔ آگرہ پولیس کا بڑا تھانہ تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ برآمدے میں پولیس کے سپاہی

دوسرے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ سامنے احاطے میں بھی ایک جانب جہاں گاڑیاں
کھڑی تھیں وہاں دو تین آدمی بنچ پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔

مجھے اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ احمد آباد سے اگر انٹیلی جنس چیف یہاں پہنچ گیا اور
مجھے شناخت کر لیا گیا تو مجھے یہاں سے ہتھکڑیاں اور ممکن ہے بیڑیاں ڈال کر واپس احمد آباد
لے جایا جائے۔ وہاں پہنچ کر میرے لئے فرار ہونا مزید مشکل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے جو کچھ
بھی کرنا تھا بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر ابھی کرنا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ یا نو بجے کا
ٹائم ہو گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ میں نے باہر کھڑے سنتری سے وقت پوچھا۔ اس
نے پہلے تو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ
ڈالی اور نفرت سے کہا۔

"نو بجنے والے ہیں۔ بس تمہاری موت میں تھوڑا وقت ہی باقی رہ گیا ہے۔"

میں کمبل اوڑھے کونے میں فرش پر بیٹھا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ اور وقت
گزرتا جا رہا مجھے احساس ہوا کہ اب سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ایکشن کا وقت
شروع ہو گیا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے اسی وقت کر ڈالنا چاہئے۔ آخر میں نے کوٹھڑی
کو دھماکے سے اڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں
ہے۔ اگر میری زندگی ہو گی تو بچ جاؤں گا۔ اگر مر گیا تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ مر جاؤں گا۔
لیکن انڈیا کی ہندو پولیس کے بے عزتی اور تشدد سے تو نجات حاصل کر لوں گا۔ مجھے
معلوم تھا کہ احمد آباد میں مجھ پر صرف تشدد ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ میری بے عزتی بھی کی
جائے گی۔ تشدد تو میں برداشت کر سکتا تھا۔ اس کی مجھے ٹریننگ ملی ہوئی تھی لیکن بے عزتی
اور ذلت میری برداشت سے باہر تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ کچھ دیر بعد آکر مجھے یہاں سے کسی
دوسری جگہ منتقل کر دیں جہاں مجھے چیونگ گم لگانے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اور ایک بات
یہ بھی تھی کہ بم لگانے کے بعد مجھے مزید ایک گھنٹے تک اس کے پھٹنے کا انتظار کرنا تھا۔ اس
کی کیمیاوی ساخت ایسی بنائی گئی تھی کہ بم کی چیونگ گم ٹکیا کسی جگہ چپکانے کے بعد اس

کے ایک طرف کے کنارے کو ذرا سا دبایا جاتا تھا۔ وہاں مواد کے نیچے چھوٹی سی شیشے
ٹیوب لگی تھی جس میں تیزاب تھا۔ دبانے سے شیشے کی ٹیوب ٹوٹ جاتی تھی اور تیزا
دھماکہ خیز مواد میں حل ہونے لگتا تھا۔ مگر اس کی رفتار ست تھی۔ یہ رفتار جان بوجھ
ست رکھی گئی تھی تاکہ کسی جگہ بم لگانے کے بعد ہمیں وہاں سے دور نکل جانے کا مو
ل سکے۔ ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد تیزاب نے مواد میں حل ہو کر ایک خاص کیمیا
تک پہنچنا تھا اور اس کے بعد دھماکہ ہونا تھا۔ مگر یہاں تو میں بم پھٹنے سے پہلے نہیں بھا
سکتا تھا۔ مجھے بم بلاسٹ ہونے کے بعد بھاگنا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اگر میں ز
بچ گیا تو بم لگانے کا فیصلہ درخت کی اس اونچی شاخ پر کلہاڑی چلانے کے برابر تھا جس
میں نے پناہ لے رکھی تھی۔ مگر اس کے سوائے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے کے ساتھ ہی میں نے کمبل کی بکل کے اندر ہی اندر پتلون کی جیب م
ہاتھ ڈال کر ڈبی نکالی۔ اسے کھولا اور چیونگ گم بم کی ایک چھوٹی چوکور ٹکیا نکال کر ڈبی
بند کر کے واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بم کی ٹکیا میرے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں تھی۔
اور میں کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کسی حد تک بچاؤ ک
ایک صورت یہ تھی کہ میں یہ بم دروازے کے باہر کی جانب دیوار سے چپکاؤں۔ لیکن یہ
کام بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا۔ سنتری دروازے کے سامنے چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ میں
نے اس کے قدموں کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ وہ ایک طرف سے پانچ قدم چل کر
دروازے کی دوسری جانب پہنچتا تھا۔ وہاں ایک لمحے کے لئے رک جاتا۔ پھر پلٹ کر واپس
قدم قدم چلنے لگتا۔ میں نے ذہن میں ایک سکیم تیار کر لی۔

اس کے ساتھ ہی میں کمبل اوڑھے اٹھا اور دروازے کے قریب آیا۔ سنتری نے
مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا بات ہے۔ پیچھے چل کر بیٹھو"

میں نے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر سو روپے کا نوٹ نکال لیا اور بڑی عاجزی کے

ساتھ جس طرح نشئی لوگ بولا کرتے ہیں سنتری کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! آپ کو آپ کے بھگوان کا واسطہ ہے میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ایک
سگریٹ بیڑی کہیں سے لا دیں۔ یہ سو روپیہ مجھ سے لے لیں"

میں نے سو روپے کا نوٹ اس کے آگے کر دیا۔ سنتری پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ
اس نے دائیں بائیں جائزہ لیا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ 1960ء کا زمانہ تھا۔ اس
زمانے تک سو روپے کے نوٹ کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ سنتری نے جلدی سے سو
روپے کا نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر
مجھے پیچھے دھکیل کر بولا۔

"چلو پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ چلو"

میں جلدی سے پیچھے ہو گیا۔ میں ایک نشئی کی اداکاری کر رہا تھا جس کا نشہ ٹوٹ رہا
تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ میرے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کے اندر چیونگ گم
بم چپکا ہوا تھا۔ میں وہیں سلاخوں کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ سنتری بولا۔

"ابھی کوئی آتا ہے تو تمہارے لئے بیڑی سگریٹ منگاتا ہوں۔ میں سگریٹ نہیں
پیتا۔"

میں نے دل میں اسے بڑی سخت گالی دی۔ وہ میرے منصوبے کو ناکام بنا رہا تھا۔ میرا
خیال تھا وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے ہٹ جائے گا مگر وہ سو روپے لے کر بھی اپنی جگہ
کھڑا رہا۔ میں نے کہا۔

"بھیا کسی دوسرے سنتری سے سگریٹ مانگ کر لے آؤ میرے لئے، تمہاری بڑی
مہربانی ہوگی"

اس نے ایک بار پھر مجھے غصے سے ڈانٹ دیا۔

"پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ تم وائسرائے لگے ہو کہ تمہارے لئے میں کسی سے سگریٹ
بھی مانگوں"

لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس دوران وہ برآمدے کے دوسرے کونے کی جانب

دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی ایسے سنتری کی تلاش میں تھا جو بیڑی وغیرہ پیتا ہو۔ مگر وہ میرے
سگریٹ بیڑی فراہم کرنے کے معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ سو روپے کا نوٹ
طرف سے ہضم کر گیا تھا۔ اب وہ دروازے کے باہر چل پھر کر دوبارہ پہرہ دینے لگا
اس دوران میں بے معلوم انداز میں کھسکتا ہوا دروازے کے کونے میں آگیا تھا۔ میں
اس کی موجودگی میں دروازے کی ایک جانب بم لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں وہیں کم
اوڑھے بیٹھا اس طرح آہستہ آہستہ کراہنے لگا تھا جس طرح واقعی میرا نشہ ٹوٹ رہا
سنتری اس دوران ادھر ادھر ضرور دیکھ لیتا تھا۔ شاید وہ میری خاطر کسی تمباکو پینے وا
چپڑاسی قسم کے آدمی کی تلاش میں تھا۔ ایک بار جب وہ دروازے کے آگے پہرہ دینے
انداز میں ٹہلتا ہوا ذرا آگے گیا تو میں نے کمبل میں سے ہاتھ نکال کر سلاخوں وا
دروازے کے کونے میں چیونگ گم کا ٹائم بم چپکا دیا۔ بم چپکانے کے ساتھ ہی میں نے
کا خاص کنارا ذرا سا دبا دیا۔ جس وقت سنتری پانچ قدم چلنے کے بعد واپس مڑا اس وق
میرا ہاتھ کمبل کے اندر تھا اور میں کراہنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ سنتری نے مجھے گالی د
کر کہا۔

"تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ چلو۔ پیچھے چلو ادھر دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھو۔ اٹھو"

مجھے تو خود اب کونے میں دیوار کے ساتھ جا کر ہی بیٹھنا تھا۔ کیونکہ اگر میری
بچنی تھی تو وہیں بچ سکتی تھی۔ میں نے دھماکے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ
والی دیوار کو دروازے اور سنتری کے ساتھ ہی بھک سے اڑ جانا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ
نہیں تھا کہ پچھلی دیواریں اور چھت اڑ کر کس طرف کو جاتی ہے۔ میری عقل کہ
تھی کہ اگر میں پچھلی دیواروں کے درمیان کونے میں فرش پر اوندھا لیٹ جاؤں تو دھ
کے زبردست دباؤ کے علاوہ سامنے والی دیواروں اور چھت کے ملبے سے بچ سکتا ہو
جب دھماکہ ہوتا ہے تو سب سے پہلا نقصان ہوا کے وہ تھپیڑے پہنچاتے ہیں جن میں
شدید دباؤ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بم میں ڈالے ہوئے لوہے کے کیل لوہے اور شیشے
ٹکڑے آدمیوں کو گولیوں کی طرح آ کر لگتے ہیں۔ لیکن میں نے جو بم چپکایا تھا اس

صرف دھماکہ پیدا کرتا تھا۔ اس میں لوہے کے کیل یا شیشے کے ٹکڑے بالکل نہیں تھے۔
لیکن اسے انتہائی دھماکہ خیز بنایا گیا تھا۔ زمین پر اوندھے لیٹنے میں ایک فائدہ ضرور تھا کہ
دھماکے سے پیدا ہونے والی ہوا کے شدید دباؤ کے تھپیڑے میرے اوپر سے نکل جاتے اور
بہت ممکن تھا کہ چھت کے ساتھ میرے پیچھے والی دیوار کو بھی اڑا ڈالتے۔ جو کچھ بھی تھا
اب مجھے ان سب کا مقابلہ کرنا تھا۔ بم میں نے لگا دیا تھا اور بم کے اندر کیمیاوی ردعمل
شروع ہو چکا تھا۔ میں نے سنتری کو آواز دے کر کہا۔

"مہاراج! ٹائم ہی بتا دیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے"

اس نے بیزاری سے گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"نو بج رہے ہیں"

مجھے ٹائم کا پورا حساب رکھنا تھا۔ اس بم کا تجربہ ہو چکا تھا۔ دوارکا فورٹ میں جو بم
میں نے لگائے تھے وہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد پھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اس حساب سے میرے
پاس صرف ایک گھنٹہ تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد پولیس سٹیشن میں قیامت برپا ہونے والی
تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس قیامت میں میں بھی رگڑا جاتا۔ لیکن جو کچھ کرنا تھا میں نے کر دیا
تھا۔ اب آگے تقدیر کا کھیل تھا۔ میں نے سوچا۔ زندگی ہو گی تو بچ کر نکل جاؤں گا۔ اگر
زندگی کا وقت پورا ہو چکا ہے تو اللہ مالک ہے۔ صرف ایک بات کا خیال مجھے پریشان کر رہا
تھا کہ اس دوران کسی وجہ سے مجھے اس کوٹھڑی سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہ بند کر دیا
جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایس ایس پی سیکورٹی کے پیش نظر مجھے سامنے والی قطار میں جو
حوالات تھے وہاں پہنچا دے۔ ایسی صورت میں میرے منصوبے پر پانی پھر سکتا تھا۔ بم کو تو
ایک گھنٹے بعد پھٹ کر وہاں تباہی مچانی ہی تھی لیکن اس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔
وقت گزرتا جا رہا تھا اور میں اپنے ذہن میں ایک ایک سیکنڈ کا حساب لگا رہا تھا۔ ایک
طرح سے ٹائم بم کی الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اس دوران تین بار باہر پہرہ
دینے والے سنتری سے وقت پوچھا۔ تیسری بار اس نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"خبردار جو اب تم نے ٹائم پوچھا ٹائم تو تم ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تم نے کہیں بم چلانا

ہے۔"

دوسری بار اس نے جب ٹائم بتایا تھا تو اس حساب سے بم کے پھٹنے میں آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ میرے پاس وقت کا حساب رکھنے کے لئے اب کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بس اندازے لگاتا جا رہا تھا کہ اب پانچ منٹ گزر گئے ہیں۔ اب آدھا گھنٹہ گزرے ہوئے بیس منٹ ہو گئے ہوں گے اور صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ جب میرے حساب بلکہ اندازے کے مطابق بم لگانے کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا یا گزرنے والا تھا تو میں احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے کونے میں جا کر بالکل دیوار کے ساتھ لگ کر اوندھا ہو کر لیٹ گیا اور مزید احتیاط سے کام لیتے ہوئے کمبل کا سرہانہ سا بنا کر اپنے سر کے اوپر رکھ لیا۔

سنتری نے سلاخوں کے پاس آکر میری طرف غور سے دیکھا۔ میں ایک آنکھ ذرا کھول کر اسے تک رہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کمبل منہ میں ڈال کر دانتوں میں دبا بھی لیا تھا۔ سنتری نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور بدستور ادھر اودھر چل کر پہرہ دینے لگا۔ اتنے میں تھانے کے اندر زور سے گھنٹہ بجا۔ یہ بالکل ایسا گھنٹہ تھا جیسے سکول کے زمانے میں جب پیریڈ ختم ہوتا تو بجا کرتا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ تھانوں میں جب ایک گھنٹہ گزر جاتا ہے تو اسی طرح گھنٹہ بجایا جاتا ہے۔

میں نے اپنا گال زمین پر جو کمبل بچھا ہوا تھا اس کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ میرے اوپر دوسرے کمبل کا سرہانہ تھا۔ اس طرح میرا سر بالکل چھپ گیا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اگر سنتری نے ٹھیک وقت بتایا تھا تو اس حساب سے بم کو لگے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ میں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ مجھے سنتری کی آواز آئی۔

"کیوں بے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ابے بولتا-----"

بس میں نے یہیں تک ہی اس کا فقرہ سنا۔ سنتری یہیں تک ہی بول سکا۔ یہ نامکمل جملہ اس کی زندگی کا آخری جملہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری بند آنکھوں کے اندر بجلی

چمک گئی۔ میرا جسم فرش پر سے دو فٹ اوپر اچھل کر ایک طرف کو گرا۔ ایک دھماکہ ہوا تھا جس کی آواز نے جیسے میرے کان بند کر دیئے تھے۔ میرے حلق سے قدرتی طور پر ایک چیخ نکل گئی تھی۔ میرے اوپر مٹی اور ملبہ گر رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ میں نے آنکھوں کے آگے آئے ہوئے کمبل کو زور سے پرے ہٹایا۔ مگر کمبل پرے نہ ہٹا۔ میرا سانس گھٹنے لگا تھا۔ میں نے ٹانگیں زور سے ایک طرف ہلائیں۔ میرے اوپر سے مٹی اور لکڑیاں دوسری طرف گرنے لگیں۔ میرا سر مٹی میں دب گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھوں سے مٹی پرے ہٹا کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ میں ملبے کے اندر گردن تک دھنس چکا تھا۔ میں بہت صحت مند تھا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا میں باڈی بلڈر قسم کا کمانڈو تھا۔ میں نے فوراً تھوڑی سی جدوجہد کر کے اپنے آپ کو ملبے میں سے باہر نکالا اور ادھر ادھر دیکھا۔

جہاں میری کوٹھڑی تھی اور جہاں میں بند تھا وہاں سوائے ملبے کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اٹھ کر ملبے کے ڈھیر کے اوپر سے نیچے چھلانگ لگائی اور ایک طرف کو دوڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا جسم سلامت تھا۔ نہ میری کوئی ہڈی ٹوٹی تھی نہ مجھے کوئی چوٹ لگی تھی۔ مجھے دوڑتے ہوئے لوگوں نے بلکہ تھانے کے عملے نے شاید دیکھ لیا تھا۔ اور کسی نے چلا کر کہا۔

"اسے پکڑو۔ اسے پکڑو۔ یہ بھاگ رہا ہے"

میرا رخ تھانے کے مین گیٹ کی طرف تھا جہاں پولیس کی دو گاڑیاں الٹی پڑی تھیں۔ صرف ایک گاڑی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میں جتنی طاقت سے اور جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگا۔ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے دوڑنے اور شور مچانے کی آوازیں آئیں۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ جیسے ہی میں بے تحاشا بھاگتا ہوا تھانے سے باہر آیا بازار میں سے اس وقت ایک موٹر سائیکل سوار میرے سامنے سے گزرا۔ بازار میں لوگوں کی آمد ورفت کی وجہ سے موٹر سائیکل کی رفتار ہلکی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سوار کو دھکا دیا۔ وہ موٹر سائیکل کے ساتھ ہی گرا۔ میں نے جلدی سے موٹر سائیکل اٹھایا۔ وہ ابھی تک چل رہا تھا

اس پر چھلانگ لگا کر بیٹھا اور جس طرف اس کا منہ تھا اس طرف اسے دوڑا دیا۔

میرے پیچھے مجھے کسی جیپ کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یقیناً یہ پولیس کی جیپ تھی جو میرے پیچھے آ رہی تھی۔ میں ٹریفک کے درمیان لوگوں سے موٹر سائیکل کو بچاتا تیز رفتاری کے ساتھ بازار کی بھیڑ سے نکل کر ایک جگہ پہنچا جہاں سے ایک خالی خالی سڑک بائیں طرف جاتی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو اس سڑک پر ڈالا اور اسے فل سپیڈ پر چھوڑ دیا۔ خدا جانے یہ سڑک کس طرف جاتی تھی اور موٹر سائیکل میں پٹرول کتنا تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو اس علاقے سے بس کسی نہ کسی طرح نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کے ہینڈل کی ایک طرف لگے ہوئے گول شیشے کو دیکھا۔ اس شیشے میں سے سڑک کا پچھلا منظر نظر آتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں پریشان ہوا کہ میرے پیچھے پولیس کی جیپ لگی ہوئی تھی۔ پولیس کی جیپ اپنے رنگ روغن سے صاف پہچانی جاتی تھی۔ اب مجھے ایک اور بات کا خطرہ تھا کہ اگر پیچھے سے پولیس نے فائر کیا تو میں بچ کر نہیں نکل سکوں گا۔ چھوٹی سی سڑک اونچے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ میں موٹر سائیکل کو سانپ کی طرح سڑک پر لہرا لہرا کر چلانے لگا۔ اس طرح سے توازن بگڑنے لگا۔ موٹر سائیکل کے الٹنے کا خطرہ تھا۔ میں نے اسے سیدھا کر لیا۔ ابھی تک پیچھے سے مجھ پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فائر کا دھماکہ ہوا۔ یہ پستول کے فائر کا دھماکہ تھا۔

گولی مجھے یا میری موٹر سائیکل کو نہیں لگی تھی۔ ظاہر ہے قریب سے ہو کر گزر گئی تھی۔ دوڑتے ہوئے ٹارگٹ پر انڈیا کی پولیس کا سپاہی ٹھیک نشانہ نہیں لگا سکتا تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی گولی اتفاق ہی سے مجھے لگ سکتی تھی۔ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں سڑک پر لوگ بھی آ جا رہے ہوں۔ پھر پولیس مجھ پر اس ڈر سے فائرنگ نہیں کرے گی کہ کہیں گولی کسی دوسرے راہ گیر کو نہ لگ جائے۔ اسی دوران پیچھے سے پولیس کی جیپ نے اوپر تلے مجھ پر تین فائر کئے۔ ایک گولی یقیناً موٹر سائیکل کے عقبی مڈگارڈ کو لگی تھی۔ کیونکہ مجھے اپنے پیچھے ایسی آواز سنائی دی جیسے

کسی نے مڈگارڈ پر زور سے ہتھوڑا مارا ہو۔ مگر ٹائر بچ گیا تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر اچانک ایک طرف سے ایک بہت بڑا ٹرک گڑ گڑ کرتا نکل کر سڑک پر آ گیا اور آگے کی طرف چل پڑا۔ میں جلدی سے موٹر سائیکل اس کے آگے لے آیا۔ پولیس کی جیپ مجھ سے کافی پیچھے تھی مگر ذرا آگے گیا تو مجھ پر ایک اور فائر ہوا۔ جیپ نے سائرن بجانا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ آگے مجھے سڑک پر گاڑیاں اور لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے یہ بڑی سڑک تھی جس سڑک پر میں موٹر سائیکل بھگائے لئے جا رہا تھا وہ چھوٹی تھی اور آگے جا کر بڑی سڑک کے ساتھ مل گئی۔ پولیس نے بڑی سڑک کی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سائرن بجانا شروع کر دیا تھا۔ بڑی سڑک پر آیا تو پولیس کے سائرن کی آواز سے لوگ اور گاڑیاں ایک طرف ہٹنے لگیں۔ کم بخت سڑک یہاں بھی خالی ہونے لگی تھی۔ پولیس کو فائرنگ کے لئے میدان خالی مل رہا تھا۔ سائرن کی آواز پر لوگ جلدی سے ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ میری موٹر سائیکل فل سپیڈ پر جا رہی تھی۔ آگے کسی دریا کا بہت بڑا پل آ گیا۔ جیسے ہی میری موٹر سائیکل پل پر آئی پولیس نے پیچھے سے مجھ پر پستول کے فائر شروع کر دیئے۔ ایک فائر رائفل کا بھی ہوا۔ اس کا دھماکہ سب سے زیادہ تھا۔

مجھے احساس ہونے لگا کہ اب میرا بچنا مشکل ہے۔ پل لوگوں اور گاڑیوں سے خالی ہو گیا تھا۔ پولیس نے اس طرح فائرنگ شروع کر دی تھی جیسے محاذ پر فوجی مورچے میں بیٹھے دشمن پر فائرنگ کرتے ہیں۔ اچانک میری موٹر سائیکل لڑکھڑائی۔ گولی اس کے پچھلے ٹائر کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ موٹر سائیکل بے قابو ہو گئی۔ میں نے اس پر سے چھلانگ لگائی۔ پل کے فٹ پاتھ پر لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور تک چلا گیا۔ پولیس کی جیپ میری طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھا۔ اور تو کچھ نہ سوجھا۔ میں پل کے آہنی گارڈروں کی قینچی پر چڑھا اور بغیر نیچے دیکھے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

دریا کی سطح کافی نیچے تھی۔ میں قلابازیاں کھاتا ہوا دریا میں جا کر گرا اور ٹھنڈے پانی کے نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا۔ اوپر سے پولیس جہاں میں گرا تھا وہاں گولیاں چلا رہی تھی۔

فائرنگ کی آواز مجھے دریا کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔ دریا میں گرنے کے فوراً
میری کمانڈو کی تمام صلاحیتیں اور سخت کوشی اور سختیوں کو برداشت کرنے کی طاقتیں ا
آئی تھیں۔ میں پانی کے اندر ہی اندر آگے بڑھنے لگا۔ دریا چڑھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن چو
کافی بڑا دریا تھا اس لئے اس کے پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ یہ تیزی بہاؤ مجھے بڑی تیزی
آگے کی طرف لئے جا رہا تھا۔ دریا کی سطح پر سے سر باہر نکالنے پر مجھ پر گولیوں کی بو
پڑ سکتی تھی۔ کیونکہ پولیس پل پر کھڑی برابر فائر کر رہی تھی۔

میں پانی کے اندر ہی اندر جتنی دور تک جا سکتا تھا ہاتھ پاؤں چلاتا نکل گیا۔ دریا کا
میری مدد کر رہا تھا۔ جب میرے سانس نے مزید سینے میں رکنے سے انکار کر دیا تو
ہاتھوں اور ٹانگوں کو سیدھا ہو کر چلاتا اوپر کی طرف آیا۔ میں نے اپنا سر باہر نکال کر ا
لمبا سانس لیا اور دوبارہ پانی کے اندر غوطہ لگا گیا۔ اب مجھے گولیاں چلنے کی آواز نہیں آ
تھی۔ شاید پولیس مجھے دریا کے آگے کسی جگہ کنارے پر پکڑنے کا انتظام کر رہی تھی۔
دور تک میں پانی کے اندر ہی اندر بڑھتا چلا گیا۔ جہاں سانس رکتا سر باہر نکال کر لم
سانس لے لیتا اور پھر دریا میں غوطہ لگا جاتا۔

آپ ہوشنگ آباد میں میری کمانڈو ٹریننگ کے دوران پڑھ چکے ہیں کہ میرے انسٹ
اور استاد کمانڈو مجاہد نے مجھے پانی میں تیرنے اور پانی کے اندر زیادہ سے زیادہ دیر تک
رہنے کی زبردست تربیت دی تھی۔ میں عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک سانس
روک سکتا تھا۔ پانی کے اندر مجھے سردی کا بھی زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اگرچہ آ
میں یہ سردیوں کا موسم تھا اور جب میں دریا میں گرا تھا تو مجھے پانی بے حد ٹھنڈا لگا
لیکن پانی میں غوطہ لگانے کے بعد اس کی شدید ٹھنڈک ختم ہو گئی تھی۔

آخر ایک جگہ میں اپنے آپ کو دریا کی سطح پر لے آیا۔ میں نے دونوں باز
ٹانگیں چلاتے ہوئے گھوم کر پیچھے پل کی طرف دیکھا تو حیران ہوا۔ کیونکہ میں پل سے
آگے نکل آیا تھا۔ پل پر مجھے لوگ دور سے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ میں نے دریا
کناروں کی طرف دیکھا۔ یہ جمنا کا دریا تھا اور اس کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ حالانکہ سر

ے موسم کی وجہ سے دریا کا پانی اترا ہوا تھا اور کئی جگہوں پر مجھے ریت ابھری ہوئی نظر
آ رہی تھی۔ مگر میں نے دریا کے عین وسط میں چھلانگ لگائی تھی جہاں دریا کا پانی کافی تھا
اور پاٹ بھی چوڑا تھا اور اس کا بہاؤ بھی تیز تھا۔ جیکٹ اور پتلون کی وجہ سے میں پوری
آسانی سے نہیں تیر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اپنی کمانڈو ٹریننگ اور بہترین تیراک ہونے کی
وجہ سے میں آگے ہی آگے تیرتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس طرح تیر رہا تھا کہ میری ٹانگیں پانی
کے اندر مینڈک کی طرح قینچی کی مانند کھلتی اور بند ہو رہی تھیں۔ صرف دریا کے اوپر
میرے بازو بڑے سکون کے ساتھ چل رہے تھے۔

میں نے تیرتے تیرتے تھوڑا سا رخ بائیں جانب والے کنارے کی طرف موڑ لیا۔
میں کنارے کے قریب ہونے لگا۔ میں دریا میں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ دریا کی سطح پر
پانی سرد تھا جس سے میرا جسم برف ہونے لگا تھا۔ میں تیرتے تیرتے دور کافی آگے جا کر
کنارے پر آ گیا۔ یہاں اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ یہ دریائی سرکنڈے تھے۔ میں ان کے
درمیان پانی میں چلتا جا رہا تھا۔ دریا کا کنارا اونچا تھا۔ میں جھاڑیوں کو پکڑ کر کنارے پر چڑھ
گیا۔ میں اوپر آتے ہی بیٹھ گیا اور آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ کھیت ہی کھیت تھے جن
کے درمیان دلدلی میدان بھی تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ میں نے دائیں
جانب نگاہ کی تو میری آنکھیں دیکھتی ہی رہ گئیں۔ دائیں جانب دور تاج محل کی حسین
تاریخی عمارت نظر آ رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تاج محل کے گنبد اور میناروں کے
اوپر کے حصے چمک رہے تھے۔

مگر اس وقت میں تاج محل کی سیر نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس علاقے
سے اتنی دور نکل جانا تھا کہ پولیس آسانی سے مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ دریا کے جس پل پر
سے میں نے چھلانگ لگائی تھی مجھے اتنا یاد ہے کہ اس کے نیچے سے ریل بھی گزرتی تھی۔
اس کا مطلب تھا کہ ریلوے سٹیشن آگے مشرق کی جانب تھا۔ لیکن میں اس وقت کسی بھی
سٹیشن پر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس نے ضرور دریا کے دونوں کناروں پر
آباد شہروں اور قصبوں کی پولیس کو خبردار کر دیا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ پولیس دریا کے

دونوں کناروں پر میری تلاش میں نکل بھی آئی ہو۔

میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی میں نے ر
سے پہلے تو جیکٹ اور قمیض اتار کر نچوڑی۔ انہیں دوبارا پہنا۔ پتلون کی جیبوں کو الٹ
نچوڑا۔ ڈبی کو کھول کر دیکھا۔ میری ڈبی میں پانچ چیونگ گم والے ٹائم بم رہ گئے تھے۔ پا
ڈبی کے اندر چلا گیا تھا۔ میں نے ڈبی میں سے پانی نکال کر بموں کو جیب میں رکھ لیا۔ اس
کے بعد اٹھا اور دریا کے کنارے کو چھوڑ کر شمال مشرق کی طرف گھاس کے میدان م
چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں ایک چھوٹے سے مٹی کے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پہلو م
ایک چھوٹی ندی بہہ رہی تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ آسمان پر کہیں کہی
بادل بھی تھے اور سورج بھی نکلا ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی مگر چلتے رہنے سے مجھے سر
نہیں لگ رہی تھی۔ ویسے بھی میں ایک سخت جان کمانڈو تھا اور مجھے سردی گرمی کا احسا
کم ہوتا تھا۔ ندی کے ساتھ میں ایک طرف گھوما تو درختوں اور اونچی اونچی جھاڑیوں
پیچھے مجھے ایک ریل گاڑی کھڑی دکھائی دی۔

جھاڑیوں کے قریب جا کر غور سے دیکھا تو یہ ایک مال گاڑی تھی۔ آگے ریل کی پٹڑی
پر مزدور کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے گاڑی کھڑی ہو گئی تھی۔ مال گاڑی کا رخ اح
آباد آگرہ کی بجائے دلی کی طرف تھا۔ کم از کم میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے سو
اگر میں اس مال گاڑی پر سوار ہو جاؤں تو کم از کم اس علاقے سے ضرور دور ہو جاؤں
جہاں چاروں طرف پولیس میری تلاش میں نکلی ہوئی تھی۔ مال گاڑی کھڑی تھی۔ مگر
کسی بھی وقت چل سکتی تھی۔ کافی آگے لگے ہوئے انجن میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ م
نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ وہاں سوائے ریل کی پٹڑی پر کام کرتے مزدوروں
اور کوئی نہیں تھا اور یہ مزدور بھی مال گاری کے کافی ڈبے چھوڑ کر انجن کے قریب کام
لگے تھے۔ میں نے تیز تیز چلتے ہوئے پیچھے سے ریلوے لائن پار کی اور مال گاڑی
دوسری طرف آ گیا۔ مال گاڑی کے ڈبوں کے لوہے کے دروازے بند تھے۔ میں ان ڈ
کے بالکل قریب ہو کر آگے جا رہا تھا۔ میں کسی ایسے ڈبے کی تلاش میں تھا جس کا درو

کھلا ہو۔

آخر مجھے ایک ڈبہ مل گیا۔ اس ڈبے کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ آگے رسے بندھے
ہوئے تھے اور ان رسوں میں سے تین چار گائیوں کے منہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ یہ مویشی
لے جانے والا ڈبہ تھا۔ اچانک انجن نے سیٹی دی۔ مال گاڑی کے پہیوں میں سے عجیب سی
آوازیں نکلیں اور وہ چل پڑی۔ میں دوڑ کر مویشیوں والے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ یہ چار
گائیں تھیں جن کے پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ ڈبے میں ایسی ہی بو پھیلی تھی جیسی
مویشیوں کے باڑے میں پھیلی ہوتی ہے۔ میں کونے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ مال
گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر یہ مال گاڑی
آگے جا کر کسی سٹیشن پر کھڑی بھی ہوئی تو کم از کم پولیس اس گاڑی میں مجھے تلاش کرنے
کی کوشش نہیں کرے گی۔ میں نے ایک طرح سے اپنے آپ کو کیموفلاج کر لیا تھا۔ ٹرین
آہستہ آہستہ سپیڈ پکڑ رہی تھی۔ مجھے گائیوں کی ٹانگوں میں سے باہر کے درخت پیچھے جاتے
کچھ کچھ نظر آ رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر یہ گاڑی دلی کی طرف جا رہی ہے تو میں اس
سے دو ایک سٹیشن پہلے ہی اتر جاؤں گا۔ کیونکہ دلی سٹیشن پر میرے پکڑے جانے کا خطرہ
تھا۔

مال گاڑی کے ڈبے میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔

یہاں سردی بہت کم تھی۔ اب میرے کپڑے بھی کافی سوکھ گئے تھے۔ مال گاڑی
ایک خاص رفتار ہوتی ہے مگر یہ مال گاڑی کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ اس
کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن مجھے خوشی ضرور ہو رہی تھی کہ میں آگرہ شہر
سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں کتنے ہی چھوٹے چھوٹے سٹیشن آئے۔ مال گاڑی کہیں
بھی کھڑی نہ ہوئی۔ مال گاڑیوں میں چونکہ بڑے بڑے شہروں کا مال لدا ہوتا ہے اس
عام طور پر وہ بڑے شہروں کے سٹیشنوں پر ہی رکتی ہیں اور ان کے پلیٹ فارم بھی ریلوے
یارڈ میں الگ بنے ہوتے ہیں۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ مال گاڑی آگرہ سے فیروز آباد
سے ہوتی ہوئی اوپر کان پور جانے کی بجائے نیچے انڈیا کے جنوب کی جانب باندہ نام کے
کی طرف جا رہی ہے۔ اس مال گاڑی نے شاید کہیں نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔
سے چلی تھی کہیں نہیں رکی تھی۔ یہاں تک کہ فیروز آباد اور اٹاوہ ایسے بڑے شہروں
بھی نہیں ٹھہری اور ریلوے یارڈ کی الگ لائن پر تیزی سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی
خدا جانے اس میں کس قسم کا سامان لدا ہوا تھا کہ جسے باندہ شہر میں پہنچانا ضروری تھا۔
دن مال گاڑی چلتی رہی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا کہ کہیں جا کر اس کی رفتار ہلکی ہو
لگی۔ سارا دن میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو بار ایک گائے کا دودھ پی کر میں نے
پیاس بجھائی تھی۔ میں نے دروازے کے آگے لگے ہوئے رسے میں سے سر باہر نکال
سامنے کی جانب دیکھا۔ کوئی سٹیشن آگے تھا۔ وہاں مال گاڑی کھڑی ہو گئی۔

میں چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ ریلوے ٹریک کے ساتھ کچھ دور تک آگے گیا۔
سٹیشن پر ایک دھندلا سا بلب جل رہا تھا۔ میں یہاں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا جانے کون
سا سٹیشن تھا۔ ابھی تک میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ ٹرین دلی کی طرف جا رہی ہے لیکن یہ
خیال ذہن میں ضرور آتا تھا کہ آگرہ سے دلی اتنی دور نہیں ہے۔ دوسرے راستہ اتنا
ویران نہیں ہے جن ویران راستوں سے یہ مال گاڑی سارا دن گزرتی رہی تھی۔ دوپہر
کے بعد دور دور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی نظر آنے لگی تھیں جب کہ آگرہ اور دلی کے
درمیان کا علاقہ میدانی ہے۔ وہاں کوئی پہاڑیاں نہیں ہیں۔ صرف ایک بات کی مجھے تسلی
ضرور ہو رہی تھی کہ میں آگرہ کی پولیس سے دور ہو گیا ہوں۔ اگر یہ ٹرین انڈیا کے مشرقی
شہروں کی طرف بھی جا رہی ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے دلی پہنچ سکتا تھا۔ میرے
پاس رضوانہ کے دیئے ہوئے کچھ روپے موجود تھے۔

مال گاڑی کا انجن شاید پانی لے رہا تھا۔ میں مویشیوں والے ڈبے میں بیٹھا بیٹھا تنگ
آ گیا تھا۔ میں نے سوچا مال گاڑی کا کوئی دوسرا خالی ڈبہ تلاش کرنا چاہئے۔ چلتے چلتے میں
سٹیشن کے پلیٹ فارم کے قریب پہنچ گیا۔ میں زیادہ آگے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ
پلیٹ فارم پر مجھے ٹرین کا گارڈ اور انجن ڈرائیور کے علاوہ دو تین آدمی نظر آ رہے تھے۔
میں واپس ہو گیا اور ایک ایک ڈبے کو شام کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے میں غور سے دیکھنے
لگا کہ کہیں کوئی ڈبہ تھوڑا سا کھلا ہوا مل جائے۔ ایک ڈبے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس
کی دونوں جانب دروازے کے باہر لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ میں ایک زنجیر کو پکڑ
کر ڈبے میں داخل ہو گیا۔ اس ڈبے میں کونے کی طرف بڑے بڑے بورے اور لکڑی
کے کریٹ لگے ہوئے تھے۔ یہاں مویشیوں والی گندی فضا نہیں تھی۔ مجھے یہ جگہ اچھی
لگی۔ میں ایک کریٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دل میں یہی فیصلہ کیا کہ اب رات کو آگے
جو بھی سٹیشن آئے گا اور اگر ٹرین وہاں کھڑی ہوئی یا اس کی رفتار ذرا ہلکی بھی ہوئی تو میں
اتر جاؤں گا۔

گائے کا دودھ میں نے سیر ہو کر پیا تھا۔ مجھے بھوک پیاس بالکل نہیں تھی۔ ویسے بھی

میں سخت جان تھا اور مجھے بھوکے پیاسے رہنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ مجھے بیٹھے
تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ لوگ باتیں کر
ایک دوسرے کو آوازیں دیتے میرے ڈبے کی طرف آرہے تھے۔ باہر نکلنے کا موقع نہ
تھا۔ آوازیں میرے ڈبے کے باہر آگئیں۔ معلوم ہوا کہ میرے والے ڈبے میں
سامان چڑھایا جا رہا ہے۔ میں اٹھا اور بڑے بڑے بوروں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ دو
مزدور ڈبے میں چڑھ آئے۔ وہ باہر سے سامان پکڑ پکڑ کر اندر لگانے لگے۔ میں خاموش پڑا
رہا۔ وہ لوگ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مجھے بھی وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب
وہ سامان ڈبے میں رکھ چکے تو باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے کے بعد انہوں نے یہ ظلم کیا کہ ڈ
کا لوہے کا دروازہ بند کر کے باہر سے اس میں سلاخ لگا دی جس سے میں ڈبے کو اندر
کھول نہیں سکتا تھا۔ ڈبے میں ایک دم اندھیرا ہو گیا۔

میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ لوہے کا تھا۔ اس میں درازیں ضرور تھ
مگر باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے
باتیں کرتے پلیٹ فارم کی طرف جا رہے تھے۔ میں ایک طرح سے مال گاڑی کے ڈبے میں
بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اسی جگہ ڈبے سے باہر نکل سکتا تھا جہاں کوئی باہر سے دروازہ
کھولے گا۔ اندھیرے میں مجھے تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا۔ جو سامان انہوں نے لگایا تھا
لکڑی کے کھوکھے تھے جو بند تھے۔ کچھ فرنیچر تھا جس کو رسیوں سے باندھا گیا تھا اتنے
ٹرین کو دھچکا لگا۔ میں گرتے گرتے سنبھل گیا اور وہیں نئے سامان والے کھوکھوں کے
بیٹھ گیا۔ یہ مال گاڑی پہلے بھی رن تھرو آرہی تھی۔ اب کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب اور کہا
جا کر رکتی ہے۔

چونکہ میں سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لئے صبر کر کے بیٹھا ر
ٹرین کافی دور تک آہستہ آہستہ چلتی رہی اس کے بعد اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ بند ڈ
ایک ہی فائدہ تھا کہ باہر سردی تھی مگر ڈبے کے اندر سردی نہیں لگ رہی تھی۔ مال گا
خدا جانے کہاں کہاں سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ رات کو سونے کے لئے کوئی

پانی چاہئے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ ٹرین اتنی جلدی رکنے والی نہیں ہے۔ میں نے
اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر لکڑی کے کھوکھوں کو ایک دوسرے کے برابر کر کے وہاں اتنی
جگہ بنالی کہ میں ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ سکتا تھا۔ میں اسی طرح لیٹ گیا۔ نیند نہیں آرہی
تھی۔ میں ہوائی مخلوق چندریکا اور پھر میناکشی اور رضوانہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے
اپنے کمانڈو مشن کا خیال آرہا تھا۔ میں اس طرح دربدر پھرنے کے لئے انڈیا میں نہیں آیا
تھا۔ میں نے ایک زبردست مشن کامیابی کے ساتھ مکمل کیا تھا۔ اب مجھے کشمیر کے محاذ پر یا
پاکستان دشمن بھارتی خفیہ تنظیم را کے ایجنٹوں کا سراغ لگا کر ان پر حملہ آور ہونا تھا تاکہ وہ
اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں تخریبی کارروائیاں نہ کر سکیں۔

اس طرح سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لق ودق صحرا میں چلا جا رہا ہوں۔ میرے
چاروں طرف ریت کے تپتے ہوئے ٹیلے ہی ٹیلے ہیں۔ آسمان پر سے سورج آگ برسا رہا
ہے۔ پیاس کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ جلتی ریت میرے ننگے پیروں کو جلا رہی
ہے۔ میں بمشکل رینگ رینگ کر چل رہا ہوں۔ لگتا ہے موت کے قریب ہو رہا ہوں اور
کسی لمحے مجھے موت آکر دبوچ لے گی۔ میں پیاس اور صحرا کی جھلستی ہوئی تپش سے
نڈھال ہو کر ایک جگہ گرم ریت پر گر پڑتا ہوں۔ میرے خشک ہونٹ پتھر کی طرح ہو گئے
ہیں۔ میری آنکھیں بند ہیں۔ میں موت کو گلے لگانے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ کیونکہ
موت ہی مجھے اس اذیت سے نجات دلا سکتی تھی۔ اتنے میں مجھے اپنے ہونٹوں پر پانی کے
ٹھنڈے قطروں کے گرنے کا احساس ہوتا ہے۔ میں بے ہوشی کے عالم میں سوچتا ہوں کہ
میں مر چکا ہوں۔ خدا نے میرے گناہ بخش دیئے ہیں اور میں جنت میں آگیا ہوں۔

پانی کے ٹھنڈے قطرے میرے خشک ہونٹوں میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ میری
آنکھیں بند ہیں۔ میں آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں لیکن کھول نہیں سکتا۔ پھر میرے جھلسے
ہوئے بدن کو اس قسم کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے اوپر بارش میں
بھیگے ہوئے کیلے کے پتوں کا سایہ ڈال دیا ہو۔ میں آنکھیں کھولنے کی بڑی کوشش کرتا

ہوں مگر کوشش کے باوجود آنکھیں نہیں کھل رہیں پھر مجھے اچانک ایک خوشبو محسو
ہوتی ہے۔ صحرا کی تپش بالکل نہیں رہی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میرے جسم کو چھو رہی ہے
اس ہوا میں ایسی خوشبو ہے کہ جو میں نے آج تک نہیں محسوس کی تھی۔ میرے ہونٹ
پر کچھ اور قطرے گرتے ہیں۔ یہ قطرے ٹھنڈے اور میٹھے ہیں۔ ایسی ٹھنڈک اور مٹھ
مجھے زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ یہ گویا جنت کے باغات کا شہد ہے۔ یہ ق
میرے پیاسے بدن میں توانائی بن کر سرائیت کر رہا ہے۔ میری پیاس اور تھکن سب
ہو چکی ہے۔ میں اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں۔

میں آواز دیتا ہوں۔

"یا اللہ! تو غفور الرحیم ہے۔ تو بخشن ہار ہے۔ تو نے مجھے بخش دیا میں تیرا ناچیز ب
ہوں۔ میں تیرا کیسے شکر ادا کروں۔"

مجھے اپنی آنکھوں پر کسی کی انگلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے کسی نے میری آنکھوں
اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ یہ انگلیاں پھولوں کی ڈالیوں کی طرح ہیں۔ ان انگلیوں سے رو
وجد میں لانے والی خوشبوئیں پھوٹ رہی ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مجھ
پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں رونے لگتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں مال گاڑی کے ڈبے میں لکڑی کے کھوکھوں پر ٹانگیں سکیڑے ویسے ہی پڑا
ریل کی پٹڑیوں کی کھٹاک کھٹاک کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پہلے تو مجھے احساس تک
ہوا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ میں ابھی تک خواب کی دنیا میں ہی تھا۔ پھر آ
آہستہ میں خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آنے لگا۔ کس قدر روح کو
دینے والا خواب تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں کہ شاید واپس خواب کی دنیا میں
جاؤں۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں کے قطرے میری آنکھوں کے کناروں
سے بہہ گئے۔ میں خواب میں بھی رو رہا تھا۔ یہ آنسو حقیقت کی دنیا میں آنے کے بعد
میری آنکھوں میں اسی طرح قائم تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ آنکھوں کے ساتھ لگا

شریف پڑھ کر چوم لیا۔

میں اٹھ کر دو زانو ہو کر کھوکھوں پر بیٹھ گیا۔ پھر ایک دم سے خدا کے حضور سجدے
میں گر پڑا اور دیر تک رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ جب میرے دل
کو تھوڑا سکون ہوا اور میں حقیقت کی دنیا میں پورے حواس کے ساتھ واپس آگیا تو اٹھ کر
لوہے کے دروازے کی درزوں میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا باہر سوائے
اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ خواب
کی روحانی کیفیت ابھی تک میرے دل اور دماغ پر طاری تھی۔ میں دوبارا سکڑ کر لیٹ گیا
اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر میں اس خواب کی دنیا میں دوبارہ داخل نہ ہو سکا۔ مجھے نیند
ضرور آگئی مگر پھر کوئی خواب نہ آیا۔

اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو ڈبے کے دروازے کی درزوں میں سے دن کی روشنی
اندر آرہی تھی۔ ٹرین اسی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ سے باہر دیکھا۔
ٹرین کھیتوں میں گزر رہی تھی اور درز میں سے سرد ہوا اندر آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ
دھوپ کہیں بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میدان بھی گزر
رہے تھے۔ کھیت بھی گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں آبادیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ دور دور
پہاڑیاں بھی تھیں۔ ٹرین کی رفتار بھی خدا خدا کر کے ہلکی ہو رہی تھی۔ کوئی شہر آرہا تھا۔
ٹرین کو یہاں رکنا تھا۔ میرے لئے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ٹرین کے رکنے کے بعد
سٹیشن کے عملے نے آکر باہر سے ڈبے کے دروازے کو کھولنا تھا اور اب میں ان سے
چھپ نہیں سکتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ انہیں کہہ دوں گا میں پچھلے سٹیشن پر اتفاق سے
اس ڈبے پر چڑھ گیا تھا۔ اور سو گیا۔ اب آنکھ کھلی تو ٹرین یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ میں جانتا
تھا کہ وہ لوگ مجھے زیادہ پریشان نہیں کریں گے کیونکہ میں نے کوئی سامان وغیرہ چوری
نہیں کیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار کر لیا
ٹرین کی رفتار مزید ہلکی ہو گئی۔

میں دروازے کے ساتھ لگا برابر باہر دیکھ رہا تھا۔ ٹرین ایک پل پر سے گزر رہی تھی۔

نیچے مجھے بیل گاڑیوں کے علاوہ ایک دو موٹر کاریں اور رکشے بھی چلتے نظر آئے۔ لگتا تھا کوئی اچھا خاصہ شہر ہے۔ اتنا بڑا شہر میرے لئے مشکل بھی پیدا کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے بڑے سٹیشنوں پر پولیس بھی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ اتنی دور تک اگر پولیس نے میرے بارے میں ریلوے پولیس کو خبردار کیا ہوگا۔ اس بات کا مجھے پورا یقین تھا کہ یہ دلی شہر نہیں ہے۔ کیونکہ دلی آگرہ سے ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہرگز نہیں تھا۔ مال گاڑی ریلوے یارڈ میں سے گزرتی رہی ایک خالی خالی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ پھر دروازے کے ساتھ لگ کر باہر دیکھنے لگا۔ دو آدمی باتیں کرتے پچھلے ڈبوں سے چلے آرہے تھے۔ میں جلدی سے کھوکھوں کے پیچھے آگیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر آدمی اندر آئے تو میں انہیں دیکھ کر کیا کہوں گا وہ کیا کہیں گے۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر ہتھوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ دروازے کی سلاخ دوسری طرف ہٹائی جا رہی تھی۔ سلاخ ہٹ گئی۔ کسی نے زور سے دروازے کو ایک طرف دھکیل دیا۔ کوئی اندر آنے ہی والا تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی۔

"ابے ادھر ابھی کہاں سے گھس رہے ہو پہلے اگلی بوگیوں کا سامان تو باہر نکالو"

اور میں نے محسوس کیا کہ جس آدمی نے دروازے کو کھولا تھا وہ کچھ بولتا ہوا آگے نکل گیا ہے۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ قفس کا دروازہ کھل چکا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی میں دبے پاؤں چلتا کھلے دروازے کے پاس آیا۔ ذرا سا سر باہر نکال کر دیکھا۔ تین مزدور قسم کے آدمی جنہوں نے ریلوے کی نیلی وردی پہنی ہوئی تھی آگے کو جا رہے تھے۔ میں نے دوسری طرف دیکھا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میں جلدی سے نیچے اتر گیا۔

اترتے ہی خدا کا شکر ادا کیا۔ جیکٹ کے بٹن بند کرتا ہوا خالی پلیٹ فارم پر پیچھے کی جانب چلنے لگا۔ پلیٹ فارم سے اتر کر میں ریلوے لائن پر آیا۔ یہاں مال گاڑی کے ڈبے ختم ہو جاتے تھے۔ بائیں جانب نگاہ ڈالی تو سامنے ریلوے یارڈ کی دیوار تھی۔ دیوار کی دوسری جانب کوئی سڑک تھی جہاں سے ٹریفک کے گزرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سڑک کی دوسری جانب دو چار مکان تھے۔ میں ریل کی پٹڑیوں پر سے گزر کر دیوار کے پاس آگیا۔ یہاں ایک جگہ بجلی کا کھمبا باہر سڑک کی جانب لگا تھا۔ میں نے کھمبے کو پکڑا اور سڑک پر آگیا۔

میرا جدھر منہ اٹھا میں ادھر ہی کو چل پڑا۔ ایک چوک میں پہنچ کر رک گیا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی چائے کی دکان تھی۔ میں دکان کے اندر آکر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک لڑکے نے آکر پوچھا کہ میں کھانا کھاؤں گا یا چائے پیوں گا۔ میں نے کہا

"کھانے میں کیا کیا پکا ہے؟"

اس نے کچھ سبزی ترکاری بتائی۔ میں نے کہا لے آؤ۔ لڑکا چلا گیا۔ میں کسی سے یہ بھی نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ میں نے دکان کی دیواروں کو دیکھا کہ شاید وہاں کسی کیلنڈر پر اس شہر کا نام لکھا ہو۔ مگر کسی کیلنڈر پر شہر کا نام نہیں تھا۔ میں نے بڑے سکون کے ساتھ کھانا کھایا۔ چائے منگوا کر پی۔ بل ادا کیا اور باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے دکان کے باہر لگے بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ وہاں لکھا تھا۔

شاہ جہاں ہوٹل۔ ریل بازار۔ باندہ

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ مال گاڑی نے مجھے دلی کی بجائے باندہ پہنچا دیا تھا جو وسطی انڈیا کے مشرق کی جانب ایک مشہور شہر تھا۔ اس طرف سے گاڑیاں صوبہ بہار بنگال اور نیچے اڑیسہ وغیرہ شہروں کی طرف جاتی تھیں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سٹیشن پر چل کر معلوم کرنا چاہئے کہ یہاں سے دلی کی طرف گاڑی کب جاتی ہے۔ میں ریلوے لائن والی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ آگے ریلوے سٹیشن کی عمارت آگئی۔ یہ سٹیشن نہ چھوٹا تھا نہ بڑا۔ بس درمیانہ درجے کا تھا۔ سٹیشن کے باہر تانگے اور رکشے کھڑے تھے۔ میں نے بکنگ آفس کی کھڑکی پر جا کر پوچھا کہ دلی کو گاڑی کس وقت جائے گی۔ کھڑکی کے پیچھے ایک سانولا سا دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا۔ بڑی بے زاری سے بولا۔

"یہاں سے پہلے کانپور جاؤ۔ وہاں سے تمہیں الہ آباد سے آنے والی گاڑی دلی لے جائے گی"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کانپور کو گاڑی کب جائے گی"

اس نے اور زیادہ بے زاری سے جواب دیا۔

"رات کو اڑھائی بجے جائے گی"

میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے رات کے اڑھائی بجے
اسی شہر میں رہ کر کانپور جانے والی گاڑی کا انتظار کرنا ہو گا۔ سٹیشن پر ٹھہرنا ٹھیک نہیں
ویسے بھی ابھی رات کے اڑھائی بجنے میں کئی گھنٹے رہتے تھے۔ باندہ شہر میرے لئے ا
تھا۔ اس طرف میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میرے پاس رقم کافی تھی۔ میں نے سوچا کہ پہلے
کے کسی اونچے درجے کے ریستوران میں چل کر بیٹھتا ہوں۔ وہاں کسی کو مجھ پر شک
نہیں پڑے گا۔ شہر میں ادھر ادھر پھرنے سے کسی کو بھی مجھ پر شک پڑ سکتا تھا۔ ریل
سٹیشن پر پولیس ہر وقت موجود رہتی ہے۔

یہ سوچ کر میں نے باہر آکر ایک تانگہ لیا اور کوچوان سے کہا۔

"کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلو جہاں اچھا کھانا وغیرہ ملتا ہو"

ہوٹل میں نے اس لئے کہا تھا کہ شاید ریستوران اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ و
شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتا ہوا شہر کی ایک بڑی سڑک کے کنارے واقع ایک ہوٹ
گیٹ پر لے آیا جس کا نام الیگزانڈریہ ہوٹل تھا۔ یہ واقعی ہوٹل تھا۔ یعنی یہاں ر
کے لئے کمرے بھی مل جاتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں ایک کمرہ ہی کرا
لے لوں۔ بڑی تنہائی میں وقت گزر جائے گا۔ آدھی رات کو نکل جاؤں گا۔ کاؤنٹر
ساڑھی پوش کٹے بالوں والی قبول صورت لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"مجھے ایک کمرہ چاہئیے"

وہ مسکرائی کہنے لگی۔

"آپ اکیلے ہی کمرے میں رہیں گے؟؟"

میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

"اکیلا ہوں اس لئے اکیلا ہی رہوں گا۔ اگر کوئی میرے ساتھ ہوتا تو وہ بھی ضرور
میرے ساتھ ہی رہتا۔"

وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"ایک سنگل بیڈ کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ پچاس روپے ہو گا۔"

اس زمانے میں یہ کرایہ بہت زیادہ تھا۔ مگر میری مجبوری تھی۔ میں نے کمرہ لے لیا۔
میں نے وہاں اپنا ہندوانہ نام کمل کمار لکھوایا اور ایڈریس بھی دلی کا غلط سلط لکھوا دیا۔
پچاس روپے ادا کئے۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے گھنٹی بجا کر نوکر کو طلب کیا۔ اس کو میرے
کمرے کی چابی دی اور کہا۔

"صاحب کو سولہ نمبر کمرے میں لے جاؤ"

یہ ہوٹل پرانی وضع کا انگریزی ٹائپ کا تھا جس طرح کبھی ہمارے شہر لاہور میں
یڈروز اور بار گنزا ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ اس کی دوسری منزل نہیں تھی۔ لگتا تھا دو
تین پرانی کوٹھیوں کو ملا کر ایک ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔ آگے وسیع باغیچہ تھا۔ کمروں کے آگے
آمدے بھی تھے۔ لڑکا مجھے سولہ نمبر کمرے میں چھوڑ کر سلام کر کے چلا گیا۔ کمرے میں
ٹورین طرز کا پرانا صوفہ اور پلنگ بچھا تھا۔ دروازے اور کھڑکی پر بھاری پردے گرے
ہوئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہاں ٹیلی فون بھی لگا ہوا تھا۔ ساتھ باتھ روم بھی تھا۔
سردی کی وجہ سے لڑکے نے جاتے ہوئے بجلی کا ہیٹر بھی آن کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ
اب نہا دھو بھی لینا چاہئے شاید پھر یہ موقع نہ ملے۔ میں غسل خانے میں گھس گیا۔ اچھی
طرح سے نہایا۔ وہی کپڑے دوبارہ پہن لئے۔ دوسرے کوئی کپڑے میرے پاس نہیں تھے۔

تھوڑی دیر میں وہی لڑکا آ گیا۔ کہنے لگا۔

"صاحب کھانا لاؤں یا کچھ اور"

میں نے کہا۔

"کچھ اور کیا؟"

وہ ذرا ہنس کر بولا۔

"صاحب وسکی وغیرہ؟"

میں نے کہا۔

"نہیں بھائی میں شراب وغیرہ نہیں پیتا تم ایسا کرو۔ یہ پیسے لو۔ میرے لئے فلیک کا ایک پیکٹ اور ایک ماچس لے آؤ اور چائے پہلے بھجوا دو۔"

میں نے اسے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میرے پاس ٹوٹے ہوئے پیسے نہیں تھے۔ یہ سو روپے کا ایک نوٹ تھا جو میں نے کاؤنٹر پر لڑکی کو دے دیا تھا۔ لڑکا چلا گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک لڑکی کی آواز آئی۔

"سر! رات کے کھانے پر آپ کوئی خاص چیز کھانا پسند کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"آپ کے ہاں جو کچھ تیار ہوتا ہے وہی کھا لوں گا۔ شکریہ!"

یہ کاؤنٹر والی لڑکی ہی تھی۔ اس نے اوکے سر کہہ کر فون بند کر دیا۔ ملازم لڑکا میرے لئے چائے لے کر آگیا۔ وہ سگریٹ بھی لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ روپے ٹپ دیئے تو وہ خوش ہوا۔ اس کے دل میں میرے لئے شاید ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگا

"صاحب آپ کس شہر سے آئے ہیں؟"

میں نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو بھائی؟"

وہ میرے قریب آگیا۔ بڑی رازداری کے انداز میں بولا۔

"صاحب! ہمارے ہوٹل میں ایک خفیہ پولیس کا آدمی ہر وقت موجود رہتا ہے۔ وہ مس شیلا سے آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ یہ آدمی کون ہے اس کا نام کیا ہے کہاں سے آیا ہے"

خفیہ پولیس کا نام سن کر میں خبردار ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"بھائی یہ تو ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ جو کوئی ہوٹل میں نیا مسافر آئے اس کے

بارے میں پوچھ گچھ کریں۔"

لڑکا مزید رازداری کے انداز میں بولا۔

"نہیں صاحب وہ تو ٹھیک ہے لیکن خفیہ پولیس والا آپ کے بارے میں مس شیلا سے کہہ رہا تھا کہ یہ آدمی مجھے کوئی جاسوس لگتا ہے سر کیا واقعی آپ جاسوس ہیں؟ مجھے یہاں سے اپنے ساتھ لے جائیں صاحب۔ مجھے جاسوس بننے کا بڑا شوق ہے"

میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی۔ اس خفیہ پولیس والے کو کیسے شک پڑ گیا کہ میں جاسوس ہوں۔ اگر اس نے مجھے جاسوس سمجھا ہے تو یقیناً پاکستانی جاسوس ہی سمجھا ہو گا۔ کیونکہ انڈیا میں جو کسی بھی ملک کا جاسوس پکڑا جائے پولیس یہی سمجھتی ہے کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے بلکہ اب تو انڈیا میں وہاں کے مسلمان ہیں پولیس ان میں سے ہر تیسرے آدمی کو پاکستان کا جاسوس سمجھتی ہے۔ میں نے لڑکے کو جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا اور کہا۔

"دیکھو! کسی کو بتانا مت۔ خفیہ پولیس والے کی نگرانی کرو۔ دیکھتے رہو کہ وہ کیا کرتا اور مس شیلا سے کیا باتیں کرتا ہے۔ یہ مس شیلا کون ہے؟"

لڑکا دس روپے کا نوٹ لے کر بڑا خوش ہوا۔ زیادہ خوشی اسے اس بات کی ہوئی کہ میں نے اسے جاسوسی کی ڈیوٹی پر لگایا تھا۔ اس نے نوٹ اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھا اور کر بولا۔

"صاحب! یہ مس شیلا کاؤنٹر والی لڑکی ہے بڑی بدمعاش ہے۔ رات کو اس کے کمرے میں شہر کے بدمعاش آتے ہیں۔ صاحب! یہ رات کو شراب بھی پیتی ہے۔ میں اس کی ساری خبر رکھتا ہوں۔ مجھے جاسوسی کا شوق جو ہے۔"

میں نے اسے مزید اعتماد میں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میاں میرا نام ہے صاحب۔ یہاں ہوٹل میں سب لوگ مجھے بلے میاں کہتے ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

"اگر تم نے خفیہ پولیس والے کی اچھی طرح سے جاسوسی کی اور اس کی ساری با
آ کر مجھے بتا دیں تو میں تمہیں اور بھی انعام دوں گا اور سنو۔ کسی کو ہرگز پتہ نہ چلے
میں نے تمہاری یہ ڈیوٹی لگائی ہے۔"

محمود میاں نے تجربہ کار جاسوس کی طرح آنکھیں ذرا سی سکیڑ کر کہا۔

"صاحب جی! میں نے بڑے بڑے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی میرے دل
حال معلوم کر سکے۔ اچھا سر۔ میں جاتا ہوں۔"

لڑکے کی ڈیوٹی میں نے ضرور لگا دی تھی لیکن میں خود بھی محتاط ہو گیا۔ مجھے ز
تشویش اس وجہ سے بھی نہیں تھی اس قسم کے ہوٹلوں میں پولیس کا اور خاص طور پر خ
پولیس کا ایک آدھ آدمی ضرور بیٹھتا ہے جو اس بات کی خبر رکھتا ہے کہ کون باہر سے
ہے اور کہیں کوئی سمگلنگ تو نہیں ہو رہی یا کسی واردات کے ہونے کا اندیشہ تو نہیں
عام طور پر اس قسم کے آدمی کو انگریزی ہوٹلوں والے خود بلا کر رکھوا لیتے ہیں۔ مجھے لڑ
سے بھی توقع تھی کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہونے لگی تو لڑکا مجھے آ کر اطلاع کر دے
اس کے باوجود مجھے بے چینی سی لگ گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس ہوٹل میں
میں نے غلطی ہی کی ہے۔ بہر حال اب جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ مجھے آگے کی بابت سوچنا
محتاط رہنا تھا۔

دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔

اس دوران دو بار ہوٹل کا لڑکا میرے پاس آیا اور اس نے یہی کہا کہ صاحب
پولیس والے نے اس کے بعد مس شیلا سے کوئی بات نہیں کی اور وہ ہوٹل سے باہر
گیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اس آدمی نے کہیں ٹیلی فون بھی نہیں کیا؟"

لڑکا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"صاحب۔ میرے سامنے تو اس نے کوئی فون نہیں کیا۔ اگر کہیں فون کرے گا
آپ کو اسی وقت آ کر بتا دوں گا۔ آپ یہاں سے فون پر سات نمبر گھما کر اس کی گفتگو

لیں گے۔"

لڑکے نے مجھے یہ بڑے پتے کی بات بتا دی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے ٹیلی فون
کے ڈائل کا سات نمبر گھما کر ریسیور کان سے لگایا۔ نیچے کاؤنٹر والی لڑکی مس شیلا کسی مرد
سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"بالکل نہیں۔ ایسی بات کرو گے تو میں تمہیں اپنے قریب بھی نہیں آنے دوں گی"

دوسری طرف مرد نے ایک بڑی فحش بات اسے کہہ دی جس کے جواب میں شیلا نے
کہا۔

"یہ بھی تب ہو گا جب تم وعدہ کرو گے کہ جو بات تم نے کملا کو کہی ہے آئندہ ایسی
بات کبھی نہیں کہو گے"

مرد نے کہا۔

"شیلا جی شما کرو۔ بھگوان کو ساکشی جان کر کہتا ہوں کملا کو اب میں کبھی منہ نہیں
لگاؤں گا۔ اچھا آج رات کتنے بجے آؤں؟"

شیلا نے جواب دیا۔

"نانا۔ بالکل نہ آنا۔ آج رات میں اپنے انکل کے گھر جا رہی ہوں۔ او کے۔ کل فون
کرنا"

اور فون بند ہو گیا۔ میں نے فون رکھ دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میں نے ایک بار پھر
سات نمبر گھما کر ریسیور اٹھایا کہ شاید خفیہ پولیس والا تھانے وغیرہ میں میری بابت کوئی فون
نہ کر رہا ہو۔ مگر فون پر کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ فون بند تھا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔
اس خیال سے میں نیچے بھی نہیں گیا تھا کہ خواہ مخواہ خفیہ پولیس والے کی نظروں میں
آ جاؤں گا۔ میں کمرے میں ہی بیٹھا سگریٹ پھونکتا اور اخبار رسالے پڑھتا رہا۔ مجھے احمد
آباد والے اپنے ماسٹر سپائی کریم کا خیال بھی آیا کہ اسے میری فکر ہو گی۔ یہ تو اسے معلوم
ہو گیا تھا کہ میں احمد آباد میں را کے چیف گوکل داس پانڈے کے بنگلے سے فرار ہو چکا
ہوں۔ اب وہ میرے کسی وائرلیس پیغام کا انتظار کر رہا ہو گا۔ یہ وائرلیس سگنل میں اسے

دلی کے ماسٹر سپائی گل خان کے پاس جا کر ہی دے سکتا تھا۔ کیونکہ میرے پاس کوئی ر ٹرانسمیٹر وغیرہ نہیں تھا اور اس کے فون نمبر پر میں کسی دوسرے شہر سے فون کر کے ا کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی کریم نے مجھے اس نمبر پر فون کرنے سے کر رکھا تھا۔ میں نے کھانا منگوا لیا۔ وہی لڑکا کھانا لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"صاحب! خفیہ پولیس والا تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر گیا تھا۔ میں نے اس کا کیا۔ وہ ساتھ والے سینما ہاؤس میں گیا تھا۔ وہاں کا گیٹ کیپر اس کا دوست تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ پھر ہوٹل میں واپس آگیا تھا"

میں اس خفیہ پولیس والے سے اب مطمئن اور بے فکر ہو گیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی سپیرا اس سانپ کو گلے میں ڈال کر اس سے بے فکر ہو جاتا ہے جس کا زہر دیا گیا ہو۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کافی منگوا کی پی جائے میں نے شیلا کو فون پر کافی کا کہنے کے لئے ریسیور اٹھایا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا

"آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے"

دروازہ کھلا اور سامنے مس شیلا کھڑی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"سر! میں نے آپ کو انٹرفیئر کیا۔ سوری سر! کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"آجاؤ۔ میں تمہیں فون کر کے کافی منگوانے لگا تھا۔"

وہ بولی۔

"میں نے آپ کے لئے کسی دوسری چیز کا انتظام کیا تھا سر۔ آپ برا تو نہیں گے؟"

"کس چیز کا انتظام؟"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پرس میں سے سکاچ وسکی کا ہاف نکال کر میز دیا۔

"سر! یہ خاص تحفہ ہے جو میری ایک آنٹی نے مجھے لندن سے بھیجا تھا۔ میں اس خیال سے لے آئی ہوں کہ آپ اسے دیکھ کر انکار نہیں کریں گے۔"

میں نے شیلا کو اس لئے بھی واپس نہ بھیجا کہ میں اس سے کسی طریقے سے خفیہ پولیس والے کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شراب کو میں نے ہاتھ نہیں لگانا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"میں نے آپ کو کاؤنٹر پر ہی بتا دیا تھا کہ میں شراب وغیرہ نہیں پیتا"

شیلا نے اپنے بلاؤز کو دونوں ہاتھوں سے اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ شراب نہیں ہے۔ یہ تو وسکی ہے آپ پی کر تو دیکھیں"

"مگر تم مجھ پر یہ مہربانی کس لئے کر رہی ہو؟"

میرے اس سوال پر اس لڑکی نے نیم طوائفانہ مسکراہٹ کے ساتھ گردن کو ایک جھٹکا دے کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اس لئے کہ آئی لائیک یو سر مجھے تم بڑے اچھے لگے ہو۔"

یہ اس کا کاروباری جملہ تھا۔ ہوٹل کا لڑکا مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا اور میں نے ٹیلی فون پر کسی مرد کے ساتھ اس کی گفتگو بھی سن لی تھی۔ مگر میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا۔ میں نے آہستہ سے اس کی بانہیں اپنے گلے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا۔ اب میں تمہیں اپنے دل کی بات بتائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں کبھی کبھی وسکی ضرور پیتا ہوں۔ مگر میں ہمیشہ رات کو ایک بجے کے بعد وسکی پیتا ہوں۔ اگر تم رات ایک بجے کے بعد میرے پاس آجاؤ تو میں تمہارے ساتھ وسکی ضرور پی لوں گا۔"

شیلا صوفے پر بیٹھ گئی۔ بلاؤز کو ایک بار پھر اوپر چڑھاتے ہوئے بولی۔

"میں جاؤں گی ہی نہیں۔ ایک بجے تک بلکہ اس کے بعد بھی تمہارے پاس ہی رہوں گی"

میں نے دل میں اسے گالی دی اور سوچا کہ یہ بلا کہاں سے میرے پیچھے پڑ گئی ہے
میں نے سوچا کہ اس سے کم از کم خفیہ پولیس والے کے بارے میں تو کچھ معلومات حاصل
کر لینی چاہیئے۔ میں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس کا نام مجھے معلوم تھا مگر میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرا نام شیلا جونسن ہے۔"

میں نے کہا۔

"شیلا! مجھے یہ بتاؤ کہ جب میں کاؤنٹر پر کھڑا تھا تو تمہاری دائیں جانب کرسی پر ا
آدمی بیٹھا تھا کیا وہ تمہارا فادر جونسن تھا؟"

شیلا نے اسے گالی دے کر کہا۔

"وہ حرامی میرا فادر کہاں سے ہو گیا۔ ارے وہ تو پولیس کا ٹاؤٹ ہے۔ بس شام
رات کے ایک بجے تک پولیس کی ڈیوٹی دیتا ہے کہ ہوٹل میں کون کون آتا ہے۔ کون
ہے۔ وہ تو تمہارے بارے میں بھی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کمل کمار جی بڑے کاروباری آدمی ہیں دلی میں رہتے ہیں۔ میرے جا
والے ہیں"

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا۔ تم تو مجھے جانتی بھی نہیں تھیں"

مس شیلا جونسن نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"اس لئے ڈارلنگ کہ تم مجھے پہلی نظر میں ہی اچھے لگنے لگے تھے۔"

وہ اپنا چہرہ میرے قریب لا رہی تھی کہ میں نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔

"مجھے یاد آ گیا۔ مجھے اپنی پتنی کو فون کرنا ہے۔ اس نے کہا تھا باندہ پہنچ کر مجھے
خیریت فون پر ضرور بتا دینا"

مس شیلا پیچھے ہٹ گئی۔ کہنے لگی۔

"اچھا میں پھر آؤں گی۔ تم فون کر لو"

وہ چلی گئی تو میں نے شکر ادا کیا۔ میں نے سٹیشن پر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اپنی جیب میں ڈبی کے اندر رکھے ہوئے چیونگ گم بم ٹیبلٹ کو چیک کیا۔ بٹوے میں جتنے روپے باقی رہ گئے تھے انہیں گن کر دوبارہ بٹوے میں رکھا۔ سامان تو میرے پاس تھا نہیں۔ بس ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی رکشا پکڑنا تھا اور سٹیشن پہنچ جانا تھا۔ انکوائری کلرک کے مطابق دلی جانے والی ٹرین میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ اس خیال سے کہ مس شیلا دوبارہ وارد نہ ہو جائے میں نے سوچ لیا تھا کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی نکل جاؤں گا۔

انڈیا میں ٹیلی ویژن ابھی نیا نیا شروع ہوا تھا۔ کمرے میں ایک ٹیلی ویژن بھی رکھا ہوا تھا جس کو میں نے ابھی تک نہیں چلایا تھا۔ اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ میں نے اس کا بٹن دبایا کہ تھوڑی دیر کوئی پروگرام ہی دیکھا جائے۔ ابھی ٹی وی بلیک اینڈ وائیٹ تھا۔ انڈیا کے کسی شہر کی ڈاکومینٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک پروگرام بند ہو گیا اور ایک لیڈی اناؤنسر نے سامنے آ کر اعلان کیا کہ دریاؤں میں اچانک زبردست سیلاب کا پانی آ جانے سے الہ آباد جھانسی اور ضلع باندہ کے اتری (شمالی) علاقوں میں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی ہے۔ باندہ سے دلی کانپور الہ آباد جانے والی ساری ریل گاڑیاں کینسل کر دی گئی ہیں اور محکمہ ریلوے کی جانب سے ریلوں کے نئے شیڈول کا جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ خبر میرے لئے کافی پریشان کن تھی کیونکہ مجھے باندہ سے رات کی گاڑی سے دلی روانہ ہونا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر فون کیا کہ مجھے ریلوے انکوائری کا نمبر ملایا جائے۔ کاؤنٹر پر کوئی دوسرا کلرک رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے نمبر ملا دیا۔ باندہ ریلوے سٹیشن کی انکوائری بے حد مصروف تھی۔ کئی بار فون کرنے کے بعد نمبر ملا۔ وہاں سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ باندہ سے کوئی گاڑی دلی کانپور الہ آباد کی طرف نہیں جا رہی۔ اس طرف سیلاب کی وجہ سے ساری ریلوے لائنیں پانی میں ڈوب چکی ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ خیال آیا کہ نیچے ناگ پور حیدر آباد کی طرف نکل جاتا ہوں۔ باندہ سے نیچے جنوبی ہندوستان کی جانب پہلا بڑا شہر جبل پور تھا۔ لیکن

یونہی دربدر ہونے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ اگر میں بانڈہ میں پولیس والوں سے محفوظ ہوں
پھر مجھے اسی جگہ رہ کر اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب دلی جانے والا ریلوے ٹریک
کھل جائے اور اگر بانڈہ میں میں محفوظ نہیں ہوں تو جبل پور اور ناگ پور میں بھی محفو
نہیں ہوں گا۔ جہاں تک بانڈہ کا تعلق تھا یہاں مجھے بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جس خ
پولیس والے کی ڈیوٹی اس انگریزی ہوٹل میں لگی ہوئی تھی تحقیق کے بعد وہ بے ض
ثابت ہو چکا تھا۔ دو ایک بار اس نے شیلا سے میرا رسمی طور پر پوچھا تھا اس کے بعد وہ
سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سیلاب اتر جائے گا اور دلی کا ریلوے ٹریک ج
بحال ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ دو ایک روز کی بات ہے مجھے اسی ہوٹل
ٹھہرے رہنا چاہئے۔ ایک تو یہ ہوٹل شہر سے باہر غیر آباد جگہ پر تھا۔ دوسرے یہ انگ
ٹائپ کا ہوٹل تھا یہاں بڑے امن سکون کی فضا تھی۔ میں سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔
خیریت رہی کہ کاؤنٹر گرل مس شیلا پھر نہیں آئی تھی۔ میں نے بجلی کا ہیٹر بند کر دیا۔ کیو
میں نے محسوس کیا تھا کہ کمرے میں گرمی زیادہ ہو گئی ہے ویسے بھی اس علاقے میں
ہندوستان کی نسبت سردی شدید نہیں تھی۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

صبح میرا ہوٹل بوائے جاسوس میرے لئے بیڈ ٹی لے کر آیا تو اس نے مجھے جگایا
بڑا پر جوش سا لگ رہا تھا۔ جیسے مجھے کوئی نئی خبر بتانے کو بے تاب ہو۔ ابھی میں نے
سے کچھ پوچھا بھی نہیں تھا کہ میرے پلنگ کے پاس آکر قالین پر بیٹھ گیا اور پر اسرار
میں بولا۔

"صاحب! ہوٹل میں ایک انگریز جاسوس آیا ہے"

میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد ہنس کر پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ جاسوس ہے؟"

ہوٹل بوائے بولا۔

"صاحب! میں دو باتیں اس کی آپ کو بتاتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ اس انگریز
ایک چھوٹا اٹیچی کیس ہے جس کو وہ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ میں اسے کمرے

گیا اور کہا صاحب لاؤ یہ اٹیچی میں الماری میں رکھ دوں تو اس نے کہا۔ نہیں نہیں۔
خود رکھ لوں گا"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اور دوسری بات کونسی ہے؟"

ہوٹل بوائے کہنے لگا۔

"صاحب دوسری بات آپ سنیں گے تو آپ کو بھی یقین آجائے گا کہ وہ کوئی جاسوس
ہے۔"

اچھا بتاؤ دوسری بات کیا ہے؟"

ہوٹل کا لڑکا ذرا میرے قریب آکر بولا۔

"صاحب! یہ انگریز وائرلیس پر کسی سے خفیہ باتیں کر رہا تھا"

میرے ذرا سے کان کھڑے ہوئے مگر اس کے باوجود میں خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

"اس کے پاس وائرلیس کہاں سے آگیا۔ اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ وائرلیس سیٹ
تھا؟"

ہوٹل بوائے بولا۔

"صاحب! میں نے بڑے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ مجھے جاسوس بننے کا شوق جو ہے۔
میں نے ناولوں میں پڑھا ہے کہ وائرلیس سیٹ بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی اور بعض
جاسوسوں کے پاس ایسے وائرلیس سیٹ بھی ہوتے ہیں جو انہوں نے سگریٹ کی ڈبیوں یا
ان کے اندر فٹ کر رکھے ہوتے ہیں۔"

میں تھوڑا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں نے پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اور اس انگریز کے پاس کس قسم کا وائرلیس سیٹ تھا؟"

ہوٹل بوائے نے کہا۔

"صاحب اس کے پاس چھوٹی سی ٹارچ تھی اس نے ٹارچ کے اندر وائرلیس سیٹ
لگا ہوا تھا۔"

اب میں نے اس سے بڑا اہم سوال پوچھا۔

"تم اسے کہاں سے دیکھ رہے تھے؟"

وہ راز داری سے کہنے لگا۔

"صاحب ہوٹل کے نوکروں نے ہر کمرے کے دروازے کھڑکیوں میں خفیہ سوراخ رکھے ہیں ان سوراخوں سے وہ کمرے کے اندر لیٹے ہوئے عورت مرد کی ساری حرکتیں دیکھا کرتے ہیں۔ اس انگریز کے کمرے کے دروازے میں بھی ایک سوراخ ہے۔ میں نے سوراخ میں سے دیکھا ہے۔"

پھر اس نے مجھے ساری بات بیان کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب یہ انگریز رات کو کوئی دس بجے کے قریب ہوٹل میں ایک ٹیکسی پر آیا تھا اس نے بتایا تھا کہ وہ حیدر آباد دکن سے بمبئی جا رہا تھا مگر سیلاب کی وجہ سے آگے ٹرینیں بند ہیں اس لئے ہوٹل میں ٹھہر گیا ہے۔ صاحب یہ انگریز اردو بھی اچھی طرح بول لیتا ہے۔ میں اسے کمرے میں لے کر گیا تو اس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا جس کو اس نے سنبھال کر پکڑا ہوا تھا۔ کمرے میں جا کر میں نے اٹیچی کیس لے کر الماری میں رکھنا چاہا اس نے مجھے اٹیچی کیس کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ چونکہ مجھے جاسوسی کا شوق ہے اس لئے مجھے فوراً شک پڑ گیا کہ اس اٹیچی کیس میں کوئی خاص نقشہ ہے اور یہ انگریز کوئی جاسوس ہے۔ رات کو کھانا لے کر بھی میں ہی اس کے کمرے میں گیا۔ ابھی میں کمرے کے باہر ہی تھا کہ مجھے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ انگریز کمرے میں اکیلا تھا۔ اب یہ کس سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے خفیہ سوراخ میں سے دیکھا تو صاحب اس انگریز کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کا پچھلا حصہ اس نے کھول رکھا اور اپنے منہ کے ساتھ لگا کر انگریزی میں کسی سے باتیں کر رہا تھا میں فوراً سمجھ گیا کہ وائرلیس پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ اب آپ ہی بتاؤ صاحب کہ کیا یہ انگریز جاسوس نہیں ہے؟"

میرے دل میں ایک شک یقین کی صورت اختیار کرنے لگا۔ میں احمد آباد میں را

چیف گوکل داس پانڈے کے بنگلے پر بعض اسرائیلی فوجی ماہرین کو آتے جاتے دیکھ چکا تھا اور یہ بات بھی میرے علم میں آچکی تھی کہ بھارتی وزارت دفاع نے اسرائیل کی حکومت کے ساتھ نیوکلر توانائی حاصل کرنے اور انڈیا میں نزدیکی اور دور مار میزائل تیار کرنے اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کا ایک خفیہ معاہدہ کر رکھا ہے جس کے تحت اسرائیلی فوجی اور نیوکلر سائنس کے ماہرین انڈیا میں آچکے ہیں۔ اور یہ ساری ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی تیاریاں ایٹم بم اور جوہری راکٹ بنانے اور انہیں پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے سلسلے میں کی جاری ہیں۔ جب ان ساری کڑیوں کو میں نے اپنے ذہن میں جوڑا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی اسرائیلی فوجی ماہر ہے جو حیدر آباد سے بمبئی جا رہا ہے اور اس کے بریف کیس میں یقیناً بعض کار آمد خفیہ راز ہوں گے جنہیں معلوم کرنا پاکستان کے قومی تحفظ کی خاطر ضروری ہے۔ یہ بات بھی تھی کہ بھارت نے اس زمانے میں بھابھا نیو کلیر ریسرچ سنٹر کے علاوہ حیدر آباد دکن میں بھی ایک نیو کلر ری ایکٹر قائم کیا ہوا تھا اور میری اطلاع کے مطابق بمبئی میں ایک نیا ایٹمی ری ایکٹر لگایا جا رہا تھا۔ میں نے ہوٹل بوائے کے سامنے کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار کئے بغیر کہا۔

"اچھا اگر تم اس انگریز کو جاسوس سمجھتے ہو تو کیا تم ایک کام کر سکتے ہو؟"

ہوٹل بوائے نے جو مسلمان لڑکا تھا سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"صاحب آپ بتائیں۔ میں ضرور کروں گا"

میں نے کہا۔

"کسی طرح اس انگریز کے بریف کیس میں جو کاغذات وغیرہ رکھے ہیں وہ نکال کر میرے پاس لاؤ۔ اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا کہ یہ انگریز جاسوس ہے کہ نہیں"

ہوٹل بوائے بولا۔

"یہ کونسا مشکل کام ہے صاحب۔ جب انگریز جاسوس کمرے سے باہر جائے گا تو میں اس کے اٹیچی کیس کو کھول کر سارے کاغذ نکال کر آپ کے پاس لے آؤں گا"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تم اس کا تالا کیسے کھولو گے۔ جاسوس ایسا تالہ لگاتے ہیں جس کی چابی اور کی
پاس نہیں ہوتی"

ہوٹل بوائے نے کہا۔

"صاحب! مجھے جاسوسی کا بڑا شوق ہے۔ میں نے بڑی محنت لگا کر لوہے کی ایک
تار بنا رکھی ہے جس سے ہر قسم کا تالا میں کھول لیتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس
انگریز کو باہر جانے دیں ہاں اگر وہ اٹیچی کیس ساتھ لے گیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا"

میرا خیال تھا کہ وہ بریف کیس کو اٹیچی کیس کہہ رہا ہے۔ میں نے اس کی وضا
کے واسطے ہوٹل بوائے سے پوچھا کہ اس انگریز کے پاس چمڑے کا تھیلا ہے یا چھوٹا
کیس ہے۔ ہوٹل بوائے نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"صاحب جی! میں نے چمڑے کے تھیلے دیکھے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس تھیلا
ہے۔ اٹیچی کیس ہے۔ چھوٹا اٹیچی کیس۔ میرا خیال ہے اس میں اس کے کپڑے بھی ہ

تب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ انگریز جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ انگریز
بلکہ اسرائیلی ہے اگر باہر گیا تو اٹیچی کیس کمرے میں ہی رکھ کر جائے گا۔ اتنا ضرور کر
کہ باہر جاتے وقت ہوٹلوں میں جیسا ہوتا ہے کمرے کی چابی کاؤنٹر کلرک کو نہیں د
بلکہ اپنے ساتھ ہی لیتا جائے گا۔

میں نے ہوٹل بوائے جس نے اپنا نام محمود بتایا تھا مزید اعتماد میں لیتے ہوئے
بیس روپے دیئے اور کہا۔

"محمود! اب تمہاری ڈیوٹی ہے کہ جب یہ انگریز جاسوس باہر جائے تو فوراً اس
اٹیچی کیس میں سے جتنے کاغذ ہیں نکال کر میرے پاس لے آؤ۔ میں تھوڑی دیر انہیں
کر واپس کر دوں گا"

ہوٹل بوائے روپے لے کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"صاحب آپ بے فکر رہیں۔ میرا خیال ہے وہ کسی نہ کسی وقت ہوٹل سے
ضرور جائے گا"

میں نے ہوٹل بوائے کو یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ اس بارے میں ہوٹل کے کسی
ملازم سے بات نہ کرے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"صاحب! کامیاب جاسوس تو وہی ہوتا ہے جو اپنا راز کبھی کسی کو نہ بتائے۔ میں جانتا
ہوں صاحب"

جب وہ چلا گیا تو میں نے سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ممکن
، اس شوقیہ جاسوس لڑکے کی وجہ سے بھارت کے کسی خفیہ ایٹمی پروگرام کا راز میرے
لگ جائے۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور ٹی وی آن کر دیا۔ بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن پر
اب کی صورت حال کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ ان اطلاعات کے مطابق ابھی تک
ں کی جانب یعنی دلی کی طرف ریلوے ٹرینوں کی آمد و رفت بالکل بند تھی۔ مجھے اب کوئی
ری نہیں تھی۔ میں جب تک اس اسرائیلی کے اٹیچی کیس کے کاغذات کو نہیں دیکھ لیتا
ٹل سے نہیں جا سکتا تھا۔

کاؤنٹر پر سے مس شیلا کا فون آ گیا۔ کہنے لگی۔

"سوری سر! آپ کی ٹرم ختم ہو گئی ہے۔ اگر آپ ہوٹل میں مزید ٹھہرنا چاہتے ہیں تو
ہمیں آ کر بتا دیں"

یہ بہت ضروری تھا۔ میں فوراً ہوٹل کی پرانی قسم کی چھوٹی سی لابی میں آ گیا۔ مس
لا میری طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے دلی جانا تھا مگر دلی کوئی
نا نہیں جا رہی۔ اس لئے مجبوراً مجھے ہوٹل میں مزید رکنا پڑے گا۔ مس شیلا رجسٹر
ل کر کہنے لگی۔

"سر! آپ کتنی دیر اور رکنا چاہتے ہیں"

میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور کہا۔

"دو دن تو ضرور ٹھہروں گا"

س شیلا نے میرے حساب میں رقم جمع کر دی۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ خفیہ
یس والا آدمی وہاں نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں جو آدمی تمہارا پہرہ دیتا تھا وہ نظر نہیں آ رہا"
مس شیلا نے ہنس کر کہا۔
"وہ تو سارے ہوٹل کا گارڈ ہے۔ دوپہر کو کہیں آئے گا۔"
ایک اور آدمی کاؤنٹر پر آ گیا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ بر
برآمدے میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ کہ برآمدے کے آخری کمرے میں سے
نے ایک گورے آدمی کو باہر نکل کر کمرے کے دروازے کو تالا لگاتے دیکھا۔ یقیناً
اسرائیلی فوجی مشیر تھا جس کو ہوٹل والا لڑکا انگریز سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور
نوٹ کی کہ اس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس نہیں تھا۔ وہ بڑے اعلیٰ قسم کے ہلکے بلیو رنگ
سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں اپنے دھیان میں چلتا گیا۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں
آنکھوں کے کناروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا رنگ اتنا گورا نہیں تھا۔ یہ اسرائیل
یروشلم ہی کا رہنے والا تھا۔ یعنی اس کو یروشلم میں رہتے ہوئے کافی مدت ہو چکی ہو
جس کی وجہ سے اس کا رنگ تھوڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی چھوٹی چھ
مونچھیں بھی تھیں۔ عمر چالیس سال سے کچھ اوپر لگ رہی تھی۔

میرا کمرہ اس کے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا
دروازہ بند کر کے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ دل میں یہی دعا کر رہا تھا کہ ہوٹل بوائے محمو
اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے خدا کرے کہ اسے معلوم ہو گیا ہو کہ "انگریز جاسو
اپنے کمرے سے جا چکا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں محمود کو تلاش کر کے اسے یہ خوش خ
سنا دوں۔ مگر مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیئے تھا اور میں نے ایسا کیا بھی نہیں۔ بس صبر کر
اپنے کمرے میں ہی رہا۔ میرے لئے یہ وقت گزارنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک بار میں
دروازہ کھول کر برآمدے میں جھانک کر دیکھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ میں واپس پلنگ پر آ کر
دراز ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر کسی
دستک دی۔ میں نے کہا۔

"آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے"
میرا خیال تھا کہ کمرے کی صفائی کرنے والا کوئی آدمی ہو گا۔ دروازہ کھلا تو ہوٹل
ئے محمود اندر داخل ہوا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے
پاس آگیا۔ اس نے ایک تربیت یافتہ جاسوس کی طرح فوراً دروازہ بند کر دیا اور قمیض کے
اندر ہاتھ ڈال کر کاغذوں کا ایک رول نکال کر میرے حوالے کر دیا۔
سانس ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگا۔
"صاحب! انگریز جاسوس اٹیچی کیس ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ بڑا اچھا ہوا۔ میں نے
پنی خاص تار سے اٹیچی کیس فوراً کھول لیا تھا۔ اندر جتنے کاغذ تھے میں لے آیا ہوں
صاحب آپ اسے دیکھ لیں۔ انگریز جاسوس سٹیشن پر گیا ہے۔ میں نے پتہ کر لیا تھا۔ میں
تھوڑی دیر میں آؤں گا۔"
وہ چلا گیا۔ میں نے دروازے کی چٹخنی لگا لی اور صوفہ سیٹ کے درمیان جو کافی ٹیبل
ہوئی تھی اس پر کاغذوں کے رول کھول دیئے۔ یہ سات آٹھ کاغذ تھے۔ ان میں کچھ
نیلے رنگ کے تھے۔ جو کسی پراجیکٹ کے بلیو پرنٹ لگتے تھے۔ باقی کاغذ موٹے اور
ید تھے میں نے انہیں غور سے دیکھنا شروع کیا۔ سفید کاغذوں پر نیلی سرخ اور سیاہ
سلوں سے انگریزی اور کسی دوسری زبان میں (جو بعد میں پتہ چلا کہ عبرانی زبان تھی) کچھ
مولے سے لکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں چھوٹے اور بڑے راکٹوں کے خاکے بنے
ئے تھے۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا جلدی سے ہوٹل کے کمرے میں ہوٹل والوں کی
ف سے رکھی ہوئی پنسل اور سلپوں والی کاپی اٹھائی اور ان کاغذوں کی جلدی جلدی
یں تیار کرنا شروع کر دیں۔ میں نے سات آٹھ منٹ کے اندر اندر سفید کاغذوں پر لکھے
ئے سارے فارمولے اور راکٹوں کے خاکے اور اس کے دائیں بائیں لکھے ہوئے الفاظ
بر اور ڈگریوں کے حروف سب کچھ سلپوں پر اتار لیا۔ اس کے بعد بلیو پرنٹ کا جائزہ
۔ نیلے کاغذ پر آڑھی ترچھی سفید لکیروں میں مربعے مکعب اور مستطیل بنے ہوئے تھے۔
کی پراجیکٹ کا نقشہ تھا۔ میں نے ان میں سے تین چار خاکوں کی نقل اتار لی اور نیچے

جو زاویے لکھے ہوئے تھے وہ بھی نقل کر لئے۔ اس کام میں مجھے پندرہ بیس منٹ
گئے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سارے کاغذوں کو سمیٹ کر ان کا ایک رول
میز کے نیچے چھپا دیا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل بوائے محمود اندر آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا
میں سمجھا کہ اسرائیلی واپس اپنے کمرے میں آچکا ہو گا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا وہ واپس آگیا ہے محمود؟"

"نہیں صاحب۔ واپس تو نہیں آیا۔ مگر کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔ آپ نے کا
کو دیکھ لیا ہے کیا؟"

میں نے میز کے نیچے سے کاغذوں کا رول نکال کر اس کے حوالے کرتے ہو
نیازی سے کہا۔

"یار ان کاغذوں میں تو خدا جانے کیا بک بک لکھی ہوئی ہے۔ میری تو سمجھ میں
آیا ہے کہ یہ انگریز جاسوس نہیں کوئی انجینئر ہے۔ ان میں کسی جگہ کا خاکہ بھی ہے"

اس نے جلدی جلدی کاغذوں کا رول قمیض کے اندر چھپا لیا اور بولا۔

"صاحب! میں جاتا ہوں۔ انگریز جاسوس کو پتہ چل گیا کہ اس کے کاغذ چوری
ہیں تو ہوٹل والے مجھے پکڑ لیں گے کیونکہ میں ہی اس کمرے میں سروس کرتا ہوں"

محمود فوراً چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں ان کاغذات کو نکال کر ایک بار پھر غور سے د
جن پر میں نے اسرائیلی کے کاغذات کی نقل اتاری تھی۔ یہ چار پانچ سلپس بن گ
جن کی دونوں جانب لکھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں پلنگ کے گدیلے کے نیچے چھپا کر
اور خود بازار چلا گیا۔ میرے پاس ابھی رضوانہ کے دیئے روپوں میں سے کچھ رو
تھے۔ میں اپنے لئے کپڑوں کا نیا جوڑا بھی خریدنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر اس ار
ملتوی کر دیا کہ دلی جا کر نئے کپڑے بنواؤں گا۔ اس زمانے میں ابھی پولی تھین یعنی
کے تھیلے وغیرہ نہیں چلے تھے لیکن موم جامہ بازار سے مل جاتا تھا۔ میں نے پتلے

موم جامے کا ایک رومال سائز کا ٹکڑا خریدا۔ پھر ایک موٹا کاغذ اور پکی نیلی پنسل خریدی
جس کی لکیریں پکی ہوتی ہیں۔

ہوٹل میں واپس آکر میں نے دروازہ لاک کر لیا اور میز پر کاغذ رکھ کر نیلی پنسل سے
اس پر راکٹوں کی ہو بہو تصویریں، فارمولے ان کے زاویئے اور کسی عمارت کا جو خاکہ بنا
ہوا تھا سارے کا سارا باریک باریک کر کے اس طرح اتار لیا کہ سب کچھ ایک بالشت بھر
کے کاغذ پر آگیا۔ اس کے بعد میں نے اسے تہہ کر کے بالکل تعویذ کی طرح کا بنایا اور اس
کے اوپر موم جامے کے ٹکڑے کو کاٹ کر اچھی طرح سے چڑھا دیا۔ وہ بالکل تعویذ لگ رہا
تھا۔ میرے بوٹوں کے تسمے لمبے لمبے تھے۔ میں نے ایک تسمے کو نکال کر اس تعویذ نما
دستاویز کو اس میں پرو دیا اور اسے اپنے ایک بازو پر باندھ لیا۔ یہ سارا انتظام میں نے صرف
اس خیال کے پیش نظر کیا تا کہ ابھی میرے سامنے خطرات سے پر ایک لمبا سفر تھا اور کچھ
نہیں تھا کہ اس دوران کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ میں نے دوسرے
بوٹ کا تسمہ نکال کر اس کے دو حصے کئے اور دونوں جوتوں میں ڈال لئے۔ ہوٹل کے کاغذ
کی جن سلپوں سے میں نے نقل کی تھی ان کو پھاڑ کر میں نے باتھ روم میں لے جا کر جلا
دیا۔ اب یہ دستاویز میرے پاس محفوظ ہو گئی تھی۔

دوپہر تک میں اپنے کمرے میں ہی رہا۔ دوپہر کو ہوٹل بوائے آگیا۔ بہت خوش تھا۔
کہنے لگا۔

"صاحب! میں نے ایسی ہوشیاری سے سارے کاغذ اٹیچی کیس میں رکھ کر اٹیچی کیس
کو تالا لگایا ہے کہ انگریز جاسوس کا استاد جاسوس بھی اگر آجائے تو اسے پتہ ہی نہیں چلے گا
کہ کسی نے تالا کھولا تھا۔"

میں نے ہوٹل بوائے کو شاباش دی۔

"محمود تم واقعی بڑے عقل مند ہو۔ تم بڑے ہو کر بہت مشہور جاسوس بنو گے۔"

وہ بولا۔

"صاحب! میں ہوٹل کی نوکری نہیں کرنا چاہتا مجھے اپنے ساتھ دلی لے جا کر جاسوس

بنادیں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا"

میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"محمود میں ابھی تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا لیکن دلی پہنچ کر تمہیں ضرور بلالو
تم مجھے اپنا پتہ دے دینا"

وہ ہاتھوں کو نچاتا ہوا بولا۔

"صاحب اپنا پتہ کیا ہو گا۔ بس الیگزانڈریہ ہوٹل پہنچ کر بلے میاں کو ملے لک
یہاں مجھے سبھی جانتے ہیں۔ صاحب! کھانے میں کیا لاؤں؟"

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ایک گھنٹہ آرام کیا۔ اٹھا تو ریلوے سٹیشن وا
کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک دلی کی جانب ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بحال نہی
سکی۔ میں اب جلدی دلی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ میں نے اسرائیلی فوجی ماہر کے جن کاغذا
نقل اتاری ہے وہ دلی میں اپنے ماسٹر سپائی گل خان کو جا کر دکھاؤں اور معلوم کروں
کس قسم کے راکٹوں کے نقشے ہیں اور ان کی تیاری کے سلسلے میں انڈیا کی حکوم
کوششیں کر رہی ہے اور پیشتر اس کے کہ یہ تیار ہوں ان کو کس طرح تباہ کیا جا سکتا
مگر دریاؤں کے سیلاب نے مجھے روک رکھا تھا۔ باندہ سے دلی کی جانب کوئی لار
نہیں چل رہی تھی کہ میں اسی طرح تھوڑا تھوڑا سفر طے کر دلی پہنچ سکتا۔

میں نے سوچا کہ باندہ سے نیچے جبل پور یا ناگ پور چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے
طرف نکل جاؤں گا اور کلکتے سے دلی والی کوئی ٹرین پکڑ لوں گا۔ مگر یہ بڑا لمبا سفر تھا
خبر نہیں تھی کہ اس طرف بھی دریا چڑھے ہوئے ہوں اور ٹرینوں کی آمد و رفت
چکی ہو۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ ایک دو روز یہیں باندہ کے ہوٹل میں ہی پڑا رہتا ہ
کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ مس شیلا کی ڈیوٹی دن کے وقت کاؤنٹر پر ہی تھی مگر ا
کوئی فون نہیں آیا تھا۔ ڈیوٹی کے وقت وہ بڑی محتاط رہتی تھی۔ میں اس سے اس
باشندے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں
ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو گا۔

سہ پہر کو مس شیلا نے فون کیا۔
کہنے لگی۔

"سر! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں"

میں نے کہا۔

"شکریہ! صرف تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم وقت نکال کر میرے پاس تھوڑی دیر
لئے آسکتی ہو؟"

اس نے طنزاً کہا۔

"کیا آپ کی بیوی نے آپ کو فون نہیں کیا؟"

معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ کاؤنٹر پر بالکل اکیلی ہے۔ میں نے کہا۔

"شیلا جی! آپ کی جگہ اور کوئی عورت نہیں لے سکتی"

میں جان بوجھ کر اس کی خوشامد کر رہا تھا۔ کیونکہ اب مجھے اس سے مطلب تھا اور
رتوں سے مطلب نکالنے کا میں شروع ہی سے بڑا ماہر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جہاد
ٹیم میں شرکت کو اپنا مقصد بنانے اور کمانڈو کی سخت ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد میں
لے اس قسم کی حرکتوں سے توبہ کر لی تھی۔ مس شیلا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

"مہاشے جی آپ تو دلیپ کمار ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔"

میں نے اس کی مزید خوشامد کرتے ہوئے اور مزید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں شیلا جی! یہ میرے دل کی آواز تھی۔ تم سچ مچ مجھے بڑی اچھی لگنے لگی

ہو"

شیلا نے کہا۔

"اس وقت تو میں ڈیوٹی پر ہوں۔ رات کو آؤں گی۔ اوکے۔ بائی"

اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ میں اس خیال سے کمرہ لاک کر کے نکل آیا
سٹیشن پر جا کر خود صورت حال معلوم کرتا ہوں۔ چابی دینے میں مس شیلا کے پاس کاؤنٹر
آیا تو اس نے کچھ شرما کر کچھ لجا کر بڑے دل ربا انداز میں میری طرف گردن ایک طر
کر کے دیکھا اور کمرشل انداز میں پوچھا۔

"سر! کتنی دیر تک آجائیں گے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"رات ہونے سے پہلے آجاؤں گا"

اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ چابی لے کر پیچھے لکڑی کے بنے ہوئے بورڈ
لٹکا دی۔ میں نے رکشا پکڑا اور سٹیشن پر آگیا۔ سٹیشن پر مسافر اپنے ساز و سامان کے سا
ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ صرف جنوب کی طرف گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ سٹیشن سے ن
کر میں کچھ دیر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ باندہ شہر زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ یہاں مسلمان بھی ر
تھے اور ہندو بھی۔ ایک جگہ گردوارے کی عمارت بھی نظر آئی۔ میں ایک چوک میں آ
سامنے سینما ہاؤس میں کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ چلو فلم ہی دیکھتے ہیں۔ کچھ وقت اس طرح کٹ جائے گا۔ ٹکٹ
کر میں گیلری میں آکر بیٹھ گیا۔ فلم پہلے سے چل رہی تھی۔ یہ کوئی کاؤ بوائز کی ویسٹرن
تھی۔ بس بیٹھا دیکھتا اور سوچتا رہا کہ میرا آئندہ کمانڈو مشن کیا ہونا چاہئے۔ اسرا
باشندے کے خفیہ ایٹمی راکٹوں والے کاغذات نے نہ صرف میرے جذبات کو مشتعل
رہا تھا بلکہ مجھے میرے کمانڈو مشن کی ایک اور سمت دکھا دی تھی۔ اس کا مطلب تھ
انڈیا کی حکومت پاکستان کے خلاف ایٹمی سطح پر جنگی تیاریاں شروع کر رہی تھی۔ اگر
قسم کے دورمار راکٹ اور میزائل بھارت کی حکومت تیار کر سکتی تھی تو اس کے آ

نیوکلر ڈیوائس لگا کر اسے ایٹمی راکٹ اور ایٹمی میزائل میں بھی تبدیل کر سکتی تھی اور ظاہر
ہے کہ یہ ساری جنگی تیاریاں اور ہلاکت خیز اسلحہ پاکستان کے خلاف ہی استعمال ہونے والا
تھا۔ انڈیا اس قسم کا اسلحہ اپنے دوسرے ہمسائے چین کے خلاف استعمال کرنے کی جرات
نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت عہد کر لیا کہ میں اپنے وطن پاکستان کی سلامتی اور
تحفظ کی خاطر اپنی زندگی کی بازی لگا کر بھارت کے ان جارحانہ عزائم کو تباہ و برباد کر دوں گا۔
ابھی یہ راکٹ وغیرہ کاغذی تیاریوں کے ابتدائی مرحلوں میں تھے اور اس کے لئے انڈیا
گورنمنٹ نے امریکہ کی مدد سے اسرائیلی سائنس دانوں کا تعاون حاصل کیا ہوا تھا۔ اس کا
مطلب تھا کہ اب اسرائیل انڈیا کو پاکستان اور کشمیر کے مجاہدین کے خلاف نہ صرف اسلحہ
گولہ بارود دے رہا تھا بلکہ انڈیا کو ایٹمی طاقت اور ایٹمی صلاحیتیں بھی مہیا کر رہا تھا۔

میرا ذہن ایسے ہی خیالوں میں الجھا رہا اور فلم ختم ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ جب میں
ٹکٹ لے کر سینما ہال میں داخل ہوا تھا تو انٹرول ہو چکا تھا۔ بھارت کے کئی شہروں میں میں
نے دیکھا تھا کہ وہاں انٹرول تک ٹکٹ فروخت ہوتے رہتے تھے۔ میں ہوٹل میں واپس
آگیا۔ اس وقت رات کے نو سوا نو بج چکے تھے۔ لابی کے کاؤنٹر پر مس شیلا کی جگہ کوئی
دوسری عورت موجود تھی۔ میں نے چابی لی اور اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے ہوٹل بوائے
نے آتا دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا وقفہ ڈال کر وہ میرے کمرے میں آیا اور سراغرسانوں کی طرح
میرے قریب آکر آہستہ سے کہنے لگا۔

"صاحب آج اس انگریز سے ملنے ایک میم بھی آئی تھی۔ دونوں بڑی دیر تک کمرے
میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے وسکی بھی منگوائی تھی۔ سر! مجھے تو یہ کوئی بڑا
خطرناک جاسوس لگتا ہے۔"

میں نے اسے ہنس کر ٹالتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں محمود! میں نے اس کے سارے کاغذ اچھی طرح سے دیکھے ہیں وہ کوئی
بڑے سول انجینئر جو سڑکیں یا پل وغیرہ بناتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ آج کھانے میں کیا
ہے، مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

محمود سراغ رساں سے ایک دم ہوٹل بوائے بن گیا اور اس نے کھڑے کھڑ
ہوٹل میں جتنے کھانے پکے تھے سارے کے سارے دہرا دیئے۔ میں نے کہا۔

"تم ایسا کرو میرے لئے چکن کری اور خشکہ لے آؤ۔"

"اور میٹھے میں کیا لاؤں سر؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم کافی لے آنا بعد میں"

"یس سر!"

اور ہوٹل بوائے سلام کر کے چلا گیا۔

کھانا میں نے اکیلے ہی کھایا اور کافی بھی اکیلے ہی بیٹھ کر پی۔ مجھے مس شیلا کا انتظا
تھا۔ میں اس سے اسرائیلی باشندے کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ ذات شریف کو
ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میں کچھ دیر صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا اور ٹیلی ویژن پر لوکل
خبریں سنتا رہا۔ بعد میں ٹیلی ویژن پر دریاؤں اور ٹرینوں کی صورت حال بتائی گئی جس میں
کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے ٹیلی ویژن بند کیا اور پلنگ پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

کوئی پونے گیارہ بجے کے قریب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ مس شیلا کی
دستک تھی۔ لڑکیوں کی دستکوں کا بھی مجھے بڑا تجربہ ہو چکا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شیلا
ہے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ مس شیلا کی ریشمی ساڑھی میں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی
تھیں۔ میں آگے سے ہٹ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"میں نے سوچا کہیں کمار جی سو نہ گئے ہوں"

میں نے دروازے کو چٹخنی لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں آنا ہو اور میں سو جاؤں"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور پرس ایک طرف رکھ کر اپنے بلاؤز کو ہاتھوں سے
کر رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"شیلا جی! کیا یہ بلاؤز بھی تمہیں تنگ ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے کمار جی۔ بس مجھے اس کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اونچا
کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اصل میں میں نہیں چاہتی کہ میری باڈی کی شیپ خراب ہو"
اس دوران اس نے اپنے پرس میں سے کاچ وسکی کا ایک کوارٹر نکال لیا تھا۔ کہنے
لگی۔

"آج میں اسی لئے تھوڑی وسکی لائی ہوں کہ میرے ساتھ تھوڑی سی تم بھی پیو
گے۔ میں دن بھر کاؤنٹر پر احمق لوگوں سے باتیں کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ رات کو
تھوڑی سی وسکی نہ پیوں تو مر جاؤں"

میں نے کہا۔

"نہیں شیلا جی میں نہیں پیئوں گا۔ میں نے کبھی پی ہی نہیں کہیں میری طبیعت نہ
خراب ہو جائے۔"

مس شیلا نے وسکی کی چھوٹی بوتل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں طبیعت خراب نہیں ہونے دوں گی۔"

وہ اٹھ کر ڈائینٹ ٹیبل کی طرف گئی۔ وہاں سے شیشے کے دو گلاس اٹھا کر میز پر
رکھے۔ پھر باتھ روم میں جا کر شیشے کے جگ میں پانی ڈال کر لے آئی۔

"بس تھوڑا سا سنگل پیگ بناؤں گی تمہارے لئے۔ ذرا میرا ساتھ رہے گا۔ تم کوئی
ویشنو تھوڑے ہو اور آج کل تو ویشنو بھی خوب پیتے ہیں۔"

میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انکار کیسے کروں۔ میں کسی زمانے
میں پیا کرتا تھا لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد اور ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے
جب میں اپنی شہید بہن کلثوم کی جائے شہادت پر فاتحہ خوانی کرنے اور جہاد کشمیر میں
شریک ہونے کے لئے پاکستان سے بارڈر کراس کر کے چلا تھا تو میں نے اس قسم کی تمام
خرافات سے توبہ کر لی تھی۔ لیکن یہاں یہ مشکل آن پڑی تھی کہ مجھے مس شیلا سے بہت
کچھ پوچھنا بھی تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو ہو سکتا ہے اس
کا موڈ آف ہو جائے اور وہ ایک گلاس چڑھانے کے بعد چلی جائے۔ اور مجھ سے کسی

بارے میں بھی کوئی بات نہ کرے۔

اس اثنا میں وہ میرے گلاس میں تھوڑی سی سکاچ وسکی ڈال چکی تھی۔ اس نے پا
سے میرا آدھا گلاس بھر دیا۔ پھر اپنا ڈبل پیگ بنایا اور میرا گلاس میری طرف بڑھا کر ا
گلاس اپنے ہاتھ میں اٹھا کر بولی۔

"چیئرز ----"

میں نے بھی اپنا گلاس اٹھالیا۔

"چیئرز ---"

میں نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ ایک گھونٹ پیا اور میرے حلق میں آگ کی ایک
لکیر سی نیچے اتر گئی۔ مس شیلا غٹا غٹ تین چار گھونٹ پی گئی۔ اس نے پرس میں ۔
اپنے سگریٹوں کی ڈبی نکالی ایک سگریٹ سلگا کر مجھے دیا۔ ایک سگریٹ لگا کر خود لیا ا
بولی۔

"اب ہوئی ناں بات۔ کمار جی! تم کو سوشل ہونا چاہیئے۔ ہماری دوستی کو ایک دو
ہی گزرے ہیں۔ پر سچ کہتی ہوں کہ مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے"

میں نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگا
ہوئے کہا۔

"شیلا جی! یہ تو میرے سوبھاگ ہیں کہ تم ایسی سوشیل لڑکی مجھ سے پریم کرتی ہے۔"

مس شیلا نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

"مگر تم کو تو اپنی پتنی سے پریم ہے۔ تم مجھ سے پریم بالکل نہیں کرتے۔ میں جانتی
ہوں"

میں نے دل میں کہا جانتی ہو تو جانتی رہو۔ جلدی سے شراب کا گلاس خالی کرو تا
تمہاری مت ماری جائے اور اسرائیلی باشندے کے بارے میں جو باتیں تم نے نہیں
بتائی وہ بھی مجھے بتا دو۔ یہاں میں آپ کو اور خاص طور پر اپنے نوجوان پڑھنے والوں
ضرور بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگائیں۔ میں کوئی نیک پاک آدمی نہیں

ہوں نہ ہی میں کوئی مولوی صاحب ہوں کہ جس نے کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔ میں
نے بہت شراب پی ہے اور اس شراب کے ہاتھوں مجھے جس قدر ذلت اور رسوائی اٹھانی
پڑی ہے وہ بھی میرے ضمیر کو کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ یاد رکھیں شراب سب سے پہلے
انسان سے اچھے برے کی تمیز چھین لیتی ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ کہاں بیٹھے
ہیں اور جس محفل میں آپ بیٹھے ہیں وہاں کس قسم کی بات کرنی ہے کس قسم کی بات
نہیں کرنی۔ شرابی کی آنکھوں میں ماں باپ بہن بھائی کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے۔ اور وہ
ذلیل وخوار ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے نشے بھی آدمی کی ذلت ورسوائی کا باعث بنتے ہیں
اور آدمی کا کردار اس قدر گر جاتا ہے کہ وہ اپنا نشہ پورا کرنے کے لئے ہر ایک سے بھکاری
بن کر پیسے مانگنے لگ جاتا ہے۔ یہ انسانیت کی توہین کا مقام ہے۔ یہ ذلت کا وہ گڑھا ہے کہ
ایک بار نشہ کرنے والا اس میں گر جائے تو پھر کبھی باہر نہیں نکلتا۔ آپ اپنے آپ کو اس
گڑھے میں گرنے سے بچائیں اور سگریٹ شراب اور دوسری نشے والی چیزوں کو ہاتھ بھی
نہ لگائیں۔ دوسرا لاکھ کہے کہ یہ بڑی اعلیٰ شراب ہے اور یورپ کے لوگ بھی پیتے ہیں
اور انہوں نے کتنی ترقی کی ہے۔ آپ دوسروں کی اس قسم کی باتوں پر یقین نہ کریں۔
ایک بات یہاں اور بھی یاد رکھیں۔ میں سارے یورپ امریکہ میں پھرا ہوا اور صرف پھرا
ہی نہیں وہاں مدت تک رہا بھی ہوں۔ یورپ امریکہ کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے کو
شراب اور جنسی بے راہ روی نے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ وہاں جس قسم کے
جرائم ہوتے ہیں ان کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے اور وہ لوگ اندر سے کس قسم کے
عذابوں میں مبتلا ہیں ان کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ مشرق
میں پیدا ہوئے ہیں اور مسلمان کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور آپ کے دین اسلام
نے آپ کو ایک مکمل ضابطہ اخلاق دیا ہے۔ میں نے شروع میں ہی آپ سے وعدہ کیا تھا
کہ اپنی داستان سناتے وقت میں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔ لہٰذا میں اس وعدے پر قائم
ہوں اور آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے بڑے گناہ کئے ہیں۔ بڑی شرابیں پی ہیں۔ بڑی
ذلتیں اٹھائی ہیں لیکن اپنے خداوند کریم کا شکر ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں

ہیں کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔ بلکہ وہ مجھے سیدھی راہ پر لے آیا اور
کریں اب یہ حالت ہے کہ کوئی شراب کا نام لے تو میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو
ہے اور میں اس محفل سے اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔ آپ اپنے آپ کو شراب سگریٹ ا
قسم کے نشے سے بچا کر رکھیں۔ آپ پاکستان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آپ نے پاکستان کا
اپنے ماں باپ کا نام روشن کرنا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا کریکٹر بلند
آپ باوقار ہوں۔ آپ کو اپنے اوپر پورا کنٹرول حاصل ہو اور آپ ہر قسم کی
ترغیبات سے بلند ہو کر دیانت داری سے اور محنت سے کام کریں تاکہ آپ دنیا میں
اور آخرت میں بھی سرخ رو ہو سکیں۔ یہ میں آپ کو نصیحتیں نہیں کر رہا بلکہ
ورسوائی کے گندے نالے دکھا رہا ہوں جن سے آپ کو بچنا ہے تاکہ آپ پاک
حیثیت سے ایک پاک صاف خوبصورت اور بلند کردار والی زندگی بسر کر سکیں۔

مس شیلا نے اپنا گلاس ختم کر لیا تھا۔ میں نے اپنے گلاس میں سے صرف
گھونٹ صرف اس لئے لے لیا تھا کہ یہ میرے وطن کی سیکورٹی کا مسئلہ تھا۔ یقی
تھوڑی سی شراب جو میرے حلق میں آگ بن کر اتر گئی تھی وہ میرے ضمیر کو جلا
اور میں دل ہی دل میں توبہ استغفار پڑھ رہا تھا۔ میرے گلاس میں باقی کی شراب ا
پڑی تھی پہلا ڈبل پیگ چڑھانے کے ساتھ ہی مس شیلا کی عقل اور اس کے شع
دفاعی مورچہ تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے اسرائیلی باشن
بارے میں پوچھا کہ یہ انگریز کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ مس شیلا نے اپنے۔
پیگ بناتے ہوئے کہا۔

"یہ انگریز کہاں ہے یہ تو یہودی ہے۔ jew ہے۔"

"اچھا اچھا۔ میرا خیال ہے یہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں بانڈہ آیا ہو گا۔ یہ
کاروباری لوگ ہوتے ہیں"

مس شیلا نے دوسرے پیگ کا ایک بڑا گھونٹ نگلنے کے بعد سگریٹ کا ک
بولی۔

"بانڈہ میں اس کا کوئی کاروبار وغیرہ نہیں ہے"

"تو پھر یہ ٹورسٹ ہو گا۔ انڈیا کی سیاحت کرنے آیا ہو گا"
میں نے جان بوجھ کر کہا۔

میں شیلا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان چھوٹی کافی ٹیبل تھا۔
وہ ٹیبل پر میری طرف جھک کر رازداری کے انداز میں کہنے لگی۔

"کمار جی! تم کچھ نہیں جانتے۔ تم انڈین ہو کر بھی نہیں جانتے کہ ہماری انڈین
گورنمنٹ ہماری ڈیفنس کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے"
میں نے بھولپن سے کہا۔

"ہاں شیلا جی۔ سچ مچ میں اتنا نہیں جانتا جتنا آپ جانتی ہیں۔"
مس شیلا نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے کی بجائے میز پر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہماری گورنمنٹ نے نیوکلر پاور بننے کے لئے کام شروع کر رکھا ہے۔ ہم ایٹم بم
اور ایٹمی راکٹ ایٹمی میزائل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اس ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لئے
اپنے دوست ملک اسرائیل کی مدد حاصل کی ہوئی ہے۔ اسرائیل کوئی اتنا بڑا ملک نہیں
ہے لیکن اسے امریکہ کا نیوکلر تعاون حاصل ہے امریکہ کی مدد سے اسرائیل بہت جلد ایٹمی
طاقت حاصل کرنے والا ہے۔"

میں بیچ میں ہوں ہاں اور گڈ ویری گڈ کہہ کر شیلا کو شہہ دیتا جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہی
تھی۔

"ہمارا اسرائیلی گورنمنٹ کے ساتھ پیکٹ ہوا ہے۔ اس لئے اسرائیلی فوجی مشیر
ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔ فوجی ماہرین بھی آتے رہتے ہیں یہ جو اسرائیلی ہمارے ہوٹل
میں آکر ٹھہرا ہے یہ بھی اسرائیل انڈیا پیکٹ کے تحت ہی انڈیا میں مقیم ہے۔"
میں نے انجان بن کر کہا۔

"مگر مس شیلا ایٹم بم اور ایٹمی راکٹ بنانے پر تو اربوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔
اتنے روپے ہماری بھارتی حکومت کے پاس کہاں سے آئیں گے؟"

مس شیلا نے بازو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بھگوان دے گا۔ لکشمی دیوی ہم پر مہربان ہے ہمیں امریکہ سے بھی مدد مل رہ
ہے۔ کمار جی ہم اپنے دشمن کو شکست دینے کی خاطر ایک وقت کا بھوجن چھوڑ سکتے ہیں"

میں نے ایک بار پھر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا دشمن چین ہی ہے ناں؟"

وہ بولی۔

"چین بھی ہے مگر ہمارا سب سے بڑا دشمن پاکستان ہے۔ ہمیں پاکستان کو ختم
ہے۔ ہم اس لئے ایٹم بم اور ایٹمی راکٹ میزائل بنانے کے پروگرام پر عمل کر ر
ہیں۔"

میں نے کہا۔

"مگر شیلا جی پاکستان تو ہم سے بہت چھوٹا ملک ہے۔ ہمیں اس سے ڈرنا نہیں چا
ہمارے انڈیا کے پاس تو بہت بڑی فوج ہے۔ پاکستان کے پاس تو اس کا تیسرا حصہ بھی
ہے۔"

شیلا نے کہا۔

"لیکن پاکستان ایک لڑنے مارنے والی بہادر قوم ہے۔ اس کا ایک سپاہی ہمارے
پچاس فوجیوں کا اکیلا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ پاکستان
فوجی مسلمان ہے۔ وہ اپنے مذہب کی خاطر اپنی جان قربان کرنی جانتا ہے۔ یہ بات ہمار
قوم میں اور ہماری فوج میں نہیں ہے۔ ہم ہندو لوگ بنیادی طور پر بزدل اور کاروبار
لوگ ہیں۔ ہم صرف دولت اکٹھی کرنا جانتے ہیں۔"

وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ شراب کے دوسرے پیگ نے اس کے شعور کی دو
دفاعی لائن بھی اڑا دی تھی۔ اب وہ بات کرتے کرتے موضوع سے ہٹنے لگی تھی۔ میں
اس کو مزید کریدتے ہوئے کہا۔

"یہ اسرائیلی فوجی ایکسپرٹ کہاں جا رہا ہے؟"

مس شیلا نے دوسرا بلکہ تیسرا چوتھا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"بڑا بدمعاش ہے یہ jew اس کی ایک گرل فرینڈ بھی اس کے ساتھ ہے۔ بھدی سی
ت ہے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ہم لوگ پہلے دلی جائیں گے۔ وہاں انڈین آرمی کے
ے ملاقات کرنی ہے۔ اس کے بعد بمبئی جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"بمبئی میں وہ فلم سٹوڈیو دیکھنے جا رہے ہوں گے"

مس شیلا کے دماغ اور شعور کی تیسری دفاعی لائن پر شراب نے اٹیک کر دیا تھا۔ اس
نہ سے پہلی بار میں نے بڑی فحش گالی سنی۔ گالی خدا جانے اس نے کس کو دی تھی۔
نے لگی۔

"تم بھی کاروباری بزدل ہندو ہو۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ ارے بمبئی کے پاس
ایٹمی ری ایکٹر ہے۔ اسرائیلی وہاں جا رہا ہے۔ کیا سمجھے؟ تمہارا گلاس ابھی تک بھرا
کیوں ہے۔؟ یہ فیئر نہیں ہے۔"

میں نے اپنا گلاس نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"شیلا جی! میں نے اور پی تو میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ پھر میں تم سے پریم
کر سکوں گا"

پریم کے نام پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کمار جی! میں پہلی نظر میں تم کو اپنا دل یعنی ہارٹ دے بیٹھی تھی۔ ورنہ میں کسی کو
مجھتی ہوں۔ یہاں ہزاروں آدمی آتے رہتے ہیں۔ میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی
دیکھتی۔ مگر تمہیں دیکھتے ہی میں تم سے محبت کرنے لگی تھی۔ کمار جی! یہ تو ایٹ منٹ
ہوتی ہے۔ مائی گاڈ کیا سچ مچ تم مجھ سے پریم کرتے ہو کمار جی؟"

میں نے اس عورت سے اسرائیلی باشندے کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کرنی
تھیں کر چکا تھا اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ وہ کسی
میرے کمرے سے نکل جائے۔ وہ ایک بار باتھ روم گئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے

قدم ذرا سے لڑکھڑا گئے تھے۔

وہ اٹھ کر میرے صوفے پر آ گئی۔ میں نے دل میں کہا۔

"جل تو جلال تو آئی بلا ٹال تو"

وہ مجھ سے محبت کی باتیں کرنے لگی۔ میرے لئے اس وقت یہ محض وقت
کرنے والی باتیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب آدمی کے سامنے کوئی
ہو اور خاص کر دینی یا ملکی سیکورٹی کا مقصد ہو تو محبت وغیرہ کی باتیں بڑی جھوٹی
باتیں لگتی ہیں۔

بس اب مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ میں نے اس عورت مس شیلا سے کس طر
حاصل کی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جب وہ میرے کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو مجھ
ناراض تھی۔ مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ بلکہ جاتے ہوئے اس نے مجھے گالی بھی
اس کے جاتے ہی میں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے اوپر سے چٹخنی لگا لی اور
دو دو تین تین بار دھویا۔ شراب کی بوتل وہ اپنے پرس میں ڈال کر لے گئی تھی۔
میں ابھی کچھ شراب باقی تھی۔ میں نے ہیٹر بند کر دیا۔ اور کمرے کی دوسری
کھڑکی کھول دی۔ دروازہ اس ڈر سے نہیں کھولا تھا کہ کہیں مس شیلا پھر اندر نہ
کھڑکی میں سے صاف تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد جب کمرے کی فضا
تو میں نے بتی بجھائی اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

شمالی انڈیا میں سیلاب کی صورت حال کافی بہتر ہو گئی تھی دریا بھی معمول
مگر ابھی تک ٹرینوں کی آمد و رفت بحال نہیں ہوئی تھی۔ ریلوے والوں
ریلوے لائنوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے تھے۔ مجھے بانڈہ کے ہوٹل میں
جب چار روز گزر گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس پیسے ختم ہو رہے ہیں
بھی ضائع ہو رہا ہے۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ مجھے
پور کی طرف نکل جانا چاہئے۔ جبل پور سے مجھے کان پور اور دلی جانے والی
ٹرین مل سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرف حالات اتنے خراب نہیں تھے۔

یں نے ریلوے سٹیشن جا کر پتہ کیا تو انہوں نے کہا کہ جبل پور سے اگر میں بلاس
چ جاؤں تو وہاں سے مجھے دلی جانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ یہ بڑا الٹا سفر
اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ جبل پور کو گاڑی دوپہر کے بعد
ہے۔ اس وقت دن کے دس گیارہ کا ٹائم ہو گا۔ میں ہوٹل واپس آ گیا۔ سب سے پہلے
نے ہوٹل بوائے محمود کو اپنی قمیض اتار کر دی اور کہا کہ اسے ایک گھنٹے کے اندر
ڈرائی کلین کروا لائے۔ وہ میرا بڑا برخوردار بن گیا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر
ڈرائی کلین کروا کر لے آیا۔ میں نے نہا کر قمیض پہن لی۔ اسرائیلی راکٹوں کا بلیو
تعویذ کی شکل میں میرے بازو کے ساتھ باقاعدہ بندھا ہوا تھا۔ چیونگ گم ٹائم بم بھی
ں بند میری جیب میں تھے۔ یہ ٹائم بم صرف چھ عدد ہی میرے پاس باقی رہ گئے تھے۔
ن کی بظاہر کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

یں نے ہوٹل میں کسی کو اپنے جانے کے بارے میں نہ بتایا۔ دوپہر کا کھانا میں نے
بجے ہی کھا لیا اور کمرے کو تالا لگا کر چابی کاؤنٹر پر دی۔ مس شیلا وہاں نہیں تھی۔ خدا
رات کو کہاں سوئی ہو گی اور کس حالت میں ہو گی۔ مجھے اس سے بھی اب کوئی
نہیں تھی۔ میری نظریں اپنی اگلی منزل کی طرف تھیں۔ میں نے رکشا پکڑا اور
ا بانڈہ کے سٹیشن پر آ گیا۔ جبل پور ناگ پور کی جانب ٹرینوں کی آمد و رفت ابھی تک
تھی۔ وہاں کسی نے یہ بھی کہا دریائے کاویری میں بھی سیلاب آ رہا ہے۔ شاید جبل
ے آگے گاڑی نہ جائے۔ میں نے سوچا کہ چلو یہاں سے تو نکلتے ہیں۔ آگے جو ہو گا
جائے گا۔ دوپہر کے بعد کوئی تین بجے کے قریب ایک گاڑی جبل پور سے آئی۔ اسی
نے واپس ناگ پور جانا تھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ بانڈہ سے جبل پور کا فاصلہ کافی
۔ ریلوے لائن جنوب کی طرف جاتی ہے۔ شام تک گاڑی معمول کے مطابق چلتی
۔ جب رات ہوئی تو ٹرین کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی اور وہ کسی کسی جگہ ٹھہر بھی جاتی
۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں جبل پور پہنچ گیا۔ جبل پور وسطی ہندوستان کا بڑا اہم
ہے۔ اس سٹیشن سے کئی طرف ٹرینیں جاتی تھیں۔

پتہ چلا کہ یہاں سے بلاس پور جانے والی گاڑی ناگ پور سے آئے گی تو پھر وہی
مسافروں کو لے کر بلاس پور جائے گی۔ رات کے دو بجے یہ گاڑی جبل پور پہنچی۔ میں
دوسرے مسافروں کے ساتھ اس میں سوار ہو گیا۔ مسافروں نے بتایا کہ دریائے کاویری
چڑھا ہوا ہے۔ یہاں سے گاڑی نے ریلوے لائن بدل لی تھی اور جنوب کی طرف جانے
بجائے اوپر شمال کی طرف رخ کر لیا تھا۔ ساری رات ٹرین چلتی چلی گئی۔ اگلے روز
ہوئی تو ٹرین بلاس پور سے ابھی کافی دور تھی۔ دونوں جانب کبھی کھیت آجاتے۔ کبھی گھ
کے میدان اور اونچی نیچی پہاڑیاں اور پتھریلے ٹیلے آجاتے۔ کئی ندیاں گزریں۔ سب
سب ندیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان کا پانی کناروں سے نکل کر کھیتوں اور میدانوں میں
رہا تھا۔ ایک جگہ ٹرین بڑی آہستہ ہو گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر د
ریلوے لائن کی دونوں جانب پانی ہی پانی تھا۔

ایک سٹیشن آیا تو ٹرین وہاں کافی دیر رکی رہی۔ ایک مسافر نے ڈبے میں واپس
بتایا کہ آگے دریا میں سیلاب ہے۔ ریلوے لائن ٹوٹ چکی ہے اس لئے یہاں سے
ناگ پور کیلاش پور کی طرف سے ہو کر بلاس پور جائے گی۔ میں عجیب مصیبت میں پھ
گیا تھا۔ دلی پہنچنا محال ہو گیا تھا۔ مگر میں سوائے صبر کرنے کے اور کچھ کر بھی نہیں
تھا۔ ٹرین وہیں سے ناگ پور جانے والی ریلوے لائن پر آ گئی۔ ناگ پور کی طرف وسطی
کے تاریک جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ ان جنگلوں کی پہاڑیاں دور سے دکھائی دے
تھیں۔ زمین زیادہ تر جنگلاتی تھی۔ اونچی نیچی بھی تھی۔ کہیں پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ
ہوا تھا۔ جنگل کے درختوں کے جھنڈ ریلوے لائن کی دونوں طرف نمودار ہوتے تو
ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔ ختم ہوتے تو گھاس کے میدان شروع ہو جاتے جن میں
کہیں کھیتیاں نظر آجاتی تھیں۔ ہمارے وزیر آباد گوجرانوالہ حافظ آباد کی طرح دور
تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت یہاں بالکل نہیں تھے۔ مسافروں کی زبان بھی
گئی تھی۔ ان کے رنگ کالے اور قد چھوٹے ہونے لگے تھے۔ یہ تامل اور زیادہ تر
زبان بولتے تھے مگر ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان بھی بولی جا رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار

لی ہو گئی تھی۔ یہ سارے کا سارا علاقہ کسی دریا کے سیلاب کی زد میں آ چکا تھا۔
کچھ خبر نہیں تھی گاڑی کس طرف جا رہی ہے اور کہاں پہنچائے گی۔ ایک جگہ ٹرین
ک گئی۔ آگے ریلوے لائن کی مرمت کی جا رہی تھی۔ یہاں سے رینگتی ہوئی چل کر وہ
نگیالی نام کے ایک نیم پہاڑی چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر آ کر رک گئی۔ جب اسے
ے کافی دیر ہو گئی تو میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ اتر کر آگے گیا۔ وہاں ایک ٹی
ی کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ آگے ریلوے لائن سیلاب میں بہہ گئی ہے۔ کچھ پتہ نہیں گاڑی
تنی دیر یہاں رکے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جبل پور واپس جانا پڑ جائے۔

مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ مگر اندر ہی اندر غصہ پی رہا تھا۔ مسافر بھی دل ہو کر پلیٹ
فارم پر اتر آئے۔ یہ ویران ویران سا سٹیشن تھا۔ کسی نے بتایا کہ منگیالی کا قصبہ اپنی بید کی
وں اور سانپوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ جب پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے اور ٹہلتے
میں تنگ آگیا اور ٹرین کے آگے جانے یا واپس جانے کے بارے میں بھی ابھی کوئی
نہ ہوا تھا تو میں نے سوچا کہ منگیالی قصبے میں ہی چلا جائے۔ کچھ وقت اسی طرح گزر
ے گا۔ دل میں یہ خیال بھی تھا کہ شاید اس قصبے سے آگے جانے والی کوئی لاری وغیرہ
جائے۔ کیونکہ لاریاں اور بسیں خطرہ مول لے کر بھی چلتی رہا کرتی ہیں۔

منگیالی کا قصبہ پہاڑی اور نیم پہاڑی دونوں کے درمیان تھا۔ کہیں زمین اونچی تھی
ا ڈھلان تھی۔ دو تین خالی خالی سے بازار تھے جن میں ایک منزلہ اور دو منزلہ پتھر کی
روں والے مکان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ لوگ دیہاتی قسم
تھے اور ہندوؤں کی طرح دھوتی کرتوں میں ملبوس تھے۔ کئی لوگوں کے بدن پر سوائے
ی سی دھوتی کے اور کچھ نہیں تھا۔ بڑی غریبی تھی۔ کالے کالے بیمار بیمار سوکھے
تھے۔ کئی دکانوں پر بید کا بنا ہوا سامان مثلاً ٹوکریاں وغیرہ بک رہی تھیں مگر گاہک نہ
نے کے برابر تھے۔ میں نے سن لیا تھا کہ یہ قصبہ اپنے زہریلے سانپوں کی وجہ سے بھی
ا ہے۔ ابھی تک مجھے وہاں کوئی سپیرا نظر نہ آیا تھا۔ کیونکہ جہاں سانپ زیادہ ہوں
سپیرے ضرور ہوا کرتے ہیں۔

ٹہلتے ٹہلتے میں قصبے سے باہر آگیا۔ اس وقت سورج دور بھورے رنگ کے ٹیلو
کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے درمیان یونہی سیر کرتا چلا جار
تھا۔ سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ کہیں کہیں کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ نار
اور تاڑ کے درخت کھیتوں کے کناروں پر اگے ہوئے تھے۔ ایک طرف پہاڑی تھی۔
پہاڑی کے دامن میں درختوں کے جھنڈ ہی جھنڈ تھے۔ خدا جانے یہ کس قسم کے درخ
تھے کہ ان کی چھتریاں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ میں دائیں جانب مڑ گیا کہ یہاں سے
واپس سٹیشن پر چلتا ہوں۔ جس طرف میں مڑا تھا ادھر ایک چھوٹا سا پہاڑی راستہ جھاڑیو
میں سے جا رہا تھا۔ میں نے ایک درخت کے نیچے ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ
عورت میری جانب دیکھ رہی تھی۔

اس کے قریب سے گزرنے لگا تو عورت ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھی عورت
تھی۔ رنگ سیاہ اور بدن پر صرف ایک ساڑھی ہی تھی۔ میں اسے فقیرنی سمجھا۔ میں نے
دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے مجھے نمسکار کیا او
بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"بیٹا کیا تم مسلمان ہو؟"

میں رک گیا۔ میں نے کہا۔

"ہاں مائی میں مسلمان ہوں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو"

وہ بوڑھی عورت روتے ہوئے میرے پاؤں پر گر پڑی اور بار بار سجدے کرنے لگی
میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو مائی؟"

بوڑھی عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ روتے ہوئے ب
بلک کر کہنے لگی۔

"بیٹا تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری بیٹی کی جان بچا لو۔"

میں بڑا حیران ہوا کہ میں اس کی بیٹی کی جان کیسے اور کہاں بچا سکتا ہوں وہاں سوا

ن عورت اور میرے تیسرا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"مائی میں تمہاری بیٹی کی جان کیسے بچا سکتا ہوں یہ لو ایک روپیہ۔"

بوڑھی عورت نے روتے روتے کہا۔

"بیٹا! میں بھکارن نہیں ہوں۔ میں مصیبت کی ماری عورت ہوں۔ میری بیٹی کو ایسی
ری لگ گئی ہے کہ وہ دو دن سے بے ہوش پڑی ہے۔ ہمارے گوروجی نے کہا ہے کہ
ر میں سورج غروب ہونے سے پہلے اس راستے پر آکر کھڑی ہو جاؤں اور مجھے کوئی
سلمان مل جائے تو میری بیٹی کی جان بچ جائے گی"

مجھے اس عورت سے ہمدردی پیدا ہونے لگی تھی۔ بے چاری مامتا کی ماری تھی۔
ں نے پوچھا۔

"مائی! کسی مسلمان کے مل جانے سے تمہاری بیٹی کی جان کیسے بچ سکے گی"

عورت نے آنسو ساڑھی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! گوروجی نے کہا ہے کہ اگر وہ مسلمان میری بیٹی کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا دے تو
ی بیٹی بھلی چنگی ہو جائے گی بیٹا میں کتنی سوبھاگن ہوں کہ مجھے تمہارے روپ میں ایک
لمان مل گیا ہے۔ مجھ پر دیا کرو مجھ پر ترس کھاؤ۔ میرے ساتھ چل کر اپنے ہاتھ سے
ی بیٹی کو پانی پلا دو۔ میری بچی کی جان بچ جائے گی۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اگر مر
تو میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔ ندی میں کود کر جان دے دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ اگر میرے پانی پلانے سے اس عورت کی بیٹی کی جان بچ سکتی ہے تو
اس کے ساتھ ضرور چلے جانا چاہئے۔ اگر یہ محض توہم پرستی ہی ہو تب بھی مجھے اس
ی ماں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اس کی بیٹی کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا دینا چاہئے۔
میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ انسانی ہمدردی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ میری ٹرین کا
کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب واپس روانہ ہوتی ہے۔ گارڈ نے تو یہی کہا تھا کہ آدھی رات
ہمیں آگے لائن کی حالت بہتر ہونے کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے عورت سے
ہا۔

"مائی تمہارا گھر کتنی دور ہے؟"

بوڑھی عورت نے ہاتھ باندھ کر بے حد خوشی کا اظہار کرتے اور میرا بار بار شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! وہ سامنے درختوں میں ہے۔ بھگوان تیرا بھلا کرے بیٹا۔ تو نے ایک دکھیا ماں کی پکار سن لی۔"

وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ ہم ہندو لوگ ہیں اور دیویکا دیوی کی پوجا کرتے ہیں مگر ہمارے گوروجی ہندو مت کے ساتھ مسلمانوں کے دھرم کو بھی بڑا اچھا سمجھتے ہیں۔ اسی واسطے انہوں نے میری بیٹی کو دو دن سے بے ہوش دیکھ کر کہا تھا کہ اگر اسے کوئی مسلمان اپنے ہاتھ سے پانی پلائے گا تو وہ مرے گی نہیں ورنہ مر جائے گی۔

ہم درختوں کے جھنڈ کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ درختوں کے انہی جھنڈوں کا پہلا جھنڈ تھا جو پہاڑی کے دامن میں مجھے اس طرف مڑتے ہی نظر آئے تھے۔ اس طرف سے ایک پگ ڈنڈی کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی ریلوے سٹیشن کی طرف جاتی تھی لیکن میں اس طرف نہ مڑا اور بوڑھی عورت کے ساتھ چلتا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم درختوں کے درمیان بنے ہوئے بانس اور ناریل کی شاخوں سے بنے ہوئے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔

عورت ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بیٹا! میری بیٹی اندر ہے۔ اندر جاؤ"

میں اس کے ساتھ جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑے میں خشک پتوں کے فرش پر ایک جوان عورت سیدھی لیٹی بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے سر کی جانب مٹی کی چھوٹی مٹکیاں پڑی تھیں جن کے اوپر مٹی کے پیالے اوندھے پڑے تھے۔ میں نے جھک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ اس کا سانس بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ بوڑھی عورت رونے لگی۔

"بیٹی! تیرے بھاگ جاگ اٹھے۔ مسلمان بھائی تیری مدد کو آگیا ہے۔ گوروجی کا وچن پورا ہو گا تو اچھی ہو جائے گی۔"

بوڑھی عورت نے جلدی سے ایک مٹکی میں سے تھوڑا سا پانی پیالے میں ڈالا اور میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! اپنے شبھ ہاتھوں سے میری بیٹی کو ایک گھونٹ پانی پلا دے۔ بھگوان میری بیٹی کو اچھا کر دے گا۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے بے ہوش لڑکی کا سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ اس کی ماں نے لڑکی کا سر پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے لڑکی کا منہ تھوڑا سا کھولا اور پیالہ اس کے منہ کے ساتھ لگا کر پانی اس کے منہ میں ڈال دیا۔ لڑکی کو کھانسی آگئی۔ اس کی بوڑھی ماں خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے مارے آنسو بہنے لگے۔ مجھے دعائیں دے دے کر کہتی جاتی تھی۔

"بیٹی کو ہوش آگیا۔ میری بچی کو ہوش آگیا ہے بھگوان میرے مسلمان بیٹے کو ساری خوش رکھنا۔ ہے بھگوان تو نے میری اکلوتی بچی کی جان بچا لی---"

لڑکی کو ہوش ضرور آگیا تھا مگر اس نے ابھی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ بوڑھی عورت نے لڑکی کا سر آہستہ سے خشک پتوں پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"بیٹے تو نے مجھ بیوہ عورت پر بڑی کرپا کی ہے۔ اب ایک اور کرپا کر کے میرے ہاتھ کا میٹھا شربت تھوڑا سا پی لے۔ یہ شبھ شگون ہے۔"

اس نے دوسری مٹکی سے مٹی کے پیالے میں شربت تھوڑا سا ڈال کر میرے ہاتھوں میں پیالہ تھمایا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"میرے بیٹے! میں تمہاری جنم جنم کی ابھاری رہوں گی۔ تو نے میری بچی کی جان بچا لی۔"

میں نے اس عورت کا دل رکھنے کے لئے شربت کا ایک گھونٹ پی لیا۔ شربت شاید گڑ کا تھا۔ بڑا میٹھا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ پیا اور پیالہ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ماتا جی اب میں چلتا ہوں۔ مجھے سٹیشن پر پہنچنا ہے۔"

بوڑھی عورت نے میرے قدموں پر گر کر مجھے سجدہ کر دیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر
ہوئے روئے جا رہی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"مائی یہ نہ کرو۔ یہ ہمارے مذہب میں حرام ہے۔"

عورت ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ م
طرف گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ پہلے والا عجز وانکسار اور آنسو نہ
تھے۔ اس دوران لڑکی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں لڑکی کی طرف ایک نگاہ ڈال
جھونپڑے سے باہر چلا گیا۔ دو تین قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں ماں بیٹی جھونپڑ
کے باہر کھڑی تھیں اور مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی ہا
جوڑ کر مجھے الوداعی نمسکار نہ کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ آدمی کی جب غرض پوری
جاتی ہے تو وہ کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ میں بمشکل چھ سات قدم چلا ہوں گا کہ مجھے چکر
آیا۔ یہ چکر اتنا شدید تھا کہ درخت میری آنکھوں کے آگے گھوم گئے اور میں زمین پر
پڑا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو بانس کی ایک چارپائی پر اس طرح جکڑ
ہوئے پایا کہ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چارپائی کے ساتھ بندھے ہوئے تھ
سب سے پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وہ دو
عورتیں فراڈ تھیں۔ سوال یہ تھا کہ یہاں مجھے کس لئے لایا گیا ہے۔ یہ کون لوگ ہ
انہوں نے مجھے کس مقصد کی خاطر چارپائی پر باندھ رکھا ہے۔ ان سوالوں میں سے ک
جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر اپنے ہاتھوں کی رسیاں تڑا
کوشش کی مگر میرے دونوں ہاتھ الگ الگ کر کے سرہانے کی جانب چارپائی کے بانس
ساتھ اتنے پکے کر کے باندھے گئے تھے اور رسیاں کچھ اس قسم کی تھیں کہ میرے
لگانے سے وہ میری کلائیوں میں دھنستی محسوس ہوتی تھیں۔

میں حیران پریشان بھی تھا اور بے بس بھی تھا۔ یا اللہ! یہ میرے ساتھ اچانک کیا

پس آ گیا ہے۔ آخر وہ فراڈ عورت کون تھی جس نے ایک جھوٹا ڈرامہ رچا کر مجھے اپنے
جال میں پھنسایا اور پھر بے ہوشی کا شربت پلا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ یہ چھوٹی سی نیم
روشن کوٹھڑی تھی جس کی سامنے والی دیوار کے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ کوٹھڑی میں
سوائے اس چارپائی کے جس پر میں جکڑا ہوا تھا اور کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ دیواریں
لگ رہی تھیں جیسے کسی پہاڑی کے اندر یہ کوٹھڑی بنائی گئی ہو۔ دیوار میں پتھر ابھرے
ئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اسرائیلی ایٹمی راکٹوں والے بلیو پرنٹ کا تعویذ میرے
کے ساتھ ہی بندھا ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے یہ نہیں اتار لیا۔ میں
پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا ورنہ دیکھتا کہ میرا بٹوہ اور وہ ڈبی
میں چھ چیونگ گم بم ہیں میری جیب میں ہے یا نہیں ہے۔

میری حالت ایسی تھی کہ مجھے خود اپنے آپ پر رحم آ گیا۔ اتنا بے بس میں نے اپنے
پ کو شاید ہی کبھی محسوس کیا ہو۔ مجھے اس نیم روشن غار نما کوٹھڑی کا کوئی دروازہ دکھائی
ں دے رہا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا
طلب تھا کہ بے ہوش ہونے کے بعد کافی وقت گزر گیا تھا۔ ضرور اس وقت رات کے
ں گیارہ کا ٹائم ہو گا۔ مجھے باہر آدمیوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ
آوازیں وہاں جہاں کہیں بھی دروازہ تھا وہاں آ کر رک گئیں۔ ایک دم ساری آوازیں
اموش ہو گئیں۔ پھر اچانک بین بجنے لگی۔ یہ بین سانپ کو نچانے کے لئے بجائی جاتی
ہے۔ کوئی پانچ ایک منٹ تک کوٹھڑی کے باہر بین بجتی رہی۔ اچانک بین خاموش ہو گئی۔
کوئی باہر دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ مجھے دیئے کی روشنی میں چار
عجیب وغریب حلیے والے آدمی نظر آئے۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے پگڑ بندھے تھے۔
گلے میں منکوں کی مالائیں تھیں۔ سب کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ رنگ کالے تھے۔
بدن پر گیروے رنگ کے لمبے لمبے کرتے تھے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں بین تھی۔

انہوں نے آتے ہی میری چارپائی کو اٹھایا اور کوٹھڑی سے نکال کر ایک غار نما راستے
یں ایک طرف چل پڑے۔ غار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار میں طاق تھے جہاں

دیئے جل رہے تھے۔ یہ کوئی جنگلی قبیلے کے لوگ تھے۔ شکل وصورت اور بین کی وجہ
مجھے یہ سپیرے لگے۔ مجھے ٹرین میں سفر کرتے اس آدمی کی بات یاد آگئی جس نے اس
کے بارے میں کہا تھا کہ یہاں کی بید کی ٹوکریاں اور سانپ بڑے مشہور ہیں۔ تو کیا
سپیرے مجھے سانپوں کے آگے ڈالنے کے لئے لے جا رہے تھے۔ میرا ذہن ماؤف نہیں
تھا۔ میں پوری طرح ہوش وحواس میں تھا اور برابر وہاں سے فرار ہونے کے بارے
سوچ رہا تھا۔ لیکن اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے لے کر کہاں جا رہے ہیں۔

یہ کوئی غار تھا جو پہاڑی کے اندر ہی اندر ادھر ادھر گھومتا ہوا خدا جانے کس طرف
چلا جاتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچنے کے بعد مجھے بین کی آواز آنے لگی۔ یہ ایک بین نہیں تھی
بلکہ تین چار بینیں اکٹھی بج رہی تھیں۔ میری چارپائی ذرا آگے گئی تو ایک ہال کمرہ آ گیا
چھت اونچی تھی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ دیوار کے آگے چبوترا بنا ہوا تھا چبوترے
پھن دار سانپ کا بہت بڑا بت نصب تھا۔ چبوترے کی دونوں جانب بڑے بڑے پگڑوں والے
لمبے لمبے گیروے کرتوں والے آدمی زمین پر خاموش بیٹھے تھے۔ وہ سب سپیرے ہی
سکتے تھے۔ دو سپیرے سانپ کے بت کی ایک جانب اور دو سپیرے سانپ کے بت
دوسری جانب بیٹھے بین بجا رہے تھے۔ ان کے آگے سانپوں کا ایک ایک جوڑا جھوم رہا
بت کے بالکل آگے دو لمبے لمبے پتھر کے سٹریچر قسم کے چھوٹے چبوترے بنے ہوئے تھے
میری چارپائی ان میں سے ایک سٹریچر نما چبوترے پر لا کر رکھ دی گئی۔

ایک بوڑھا سپیرا ایک طرف سے نکل کر میری طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی
لمبوترا ڈول تھا۔ وہ میرے سرہانے کی جانب آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک بوڑھے سپیرے نے
کر میرا منہ کھولنے کی کوشش کی تو میں نے اسے پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"تم لوگ کون ہو۔ مجھے یہاں کس لئے باندھ رکھا ہے؟"

جس بوڑھے سپیرے کے ہاتھ میں مٹی کا ڈول تھا اس نے کہا۔

"ہم تمہیں کچھ کھلا پلا رہے ہیں۔ اگر تم نے نہ کھایا تو مرجاؤ گے"

بوڑھے نے ڈول میں سے کسی پھل کے ٹکڑے نکال کر میرے منہ میں ڈا

ل شیریں اور لذیذ تھا۔ اس میں کیلے اور سنگترے کی خوشبو تھی۔ پھل کھلانے کے بعد
ڑھے نے اسی ڈول میں سے پھلوں کا شربت قسم کا کوئی مشروب میرے منہ میں تھوڑا کر
ے ڈالا۔ اس سے میرے بدن میں توانائی آگئی۔ مگر میری توانائی میرے کسی کام نہیں آسکتی
ی کیونکہ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ بوڑھا پیچھے ہٹ گیا۔
اروں سپیرے برابر بین بجا رہے تھے اور ان کے سامنے سانپوں کے جوڑے پھن کھولے
ھوم رہے تھے۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کہاں میں ایک محب وطن کمانڈو جو اپنے وطن
اکستان کے تحفظ کی خاطر اور جہاد کشمیر میں ایک مسلمان کی حیثیت سے شرکت کرنے کی
اطر انڈیا میں آیا تھا اور کہاں ان وحشی سپیروں کے چنگل میں آکر پھنس گیا ہوں۔ جن
وگوں نے انڈیا کے جنگل پہاڑ اور خاص طور پر وسطی انڈیا کے جنگلی قبائل کو نہیں دیکھا وہ
تنی آسانی سے یہ باتیں نہیں سمجھ سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے
یں بھی انڈیا کے دور دراز دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسے ایسے گمنام وحشی قبیلے
آباد ہیں کہ جو پتھر کے زمانے کے انسان کی طرح نہ صرف قدرت کے مظاہرات مثلاً آگ
پانی دریا پہاڑ اور درختوں کی پوجا کرتے ہیں بلکہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے واسطے
اپنے بچوں اور دوسروں کے بچوں کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اخبار میں
ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ بھارت کے فلاں صوبے کے پہاڑی گاؤں میں ایک آدمی نے
کالی ماتا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بچی کو کالی ماتا کے بت کے آگے لے جا کر ہلاک
کر دیا۔ جب ایسے آدمی کو پولیس گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ آدمی عدالت
میں یہی بیان دیتا ہے کہ مجھے خواب میں کالی ماتا نے کہا تھا کہ اپنی بچی کی قربانی دو۔ میں تم
سے خوش ہوں گی۔

ایسا ہی سپیروں کا کوئی یہ قبیلہ بھی تھا جس کے چنگل میں بدقسمتی سے پھنس گیا تھا۔
آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ میں اپنی سچی داستان آپ کو سناتے سناتے محض منہ کا ذائقہ
بدلنے کے لئے یا دہشت پیدا کرنے کے واسطے اس طرح کا واقعہ بیان کرنے لگ گیا ہوں۔

نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کوئی داستان گو یا افسانہ نگار نہیں ہوں۔ میں
تمام واقعات آپ کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ پیش آتے رہے۔ وقت یہ
آپ کو ان جنگلوں میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ جو لوگ ان جنگلوں میں رہ
چکے ہیں یا انہیں ان خطرناک جنگلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ میری باتوں کو کبھی
جھٹلائیں گے اور کبھی نہیں کہیں گے کہ میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اس
کے خوفناک واقعات بیچ میں لے آیا ہوں۔ آپ ذرا ایک بار بھارت کے ان وسطی
جنوبی جنگلوں میں نکل کر دیکھیں۔ پھر آپ افریقہ کے خوفناک جنگلوں کے بارے میں
دہشت ناک کہانیاں مشہور ہیں انہیں بھول جائیں گے۔ اس میں انڈیا کی گورنمنٹ
کے آئین کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان دور دراز دشوار گزار جنگلوں میں صدیوں سے
وحشی اور نیم وحشی قبیلے شروع ہی سے وحشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور جنوب میں جہاں
سانپوں کو دیوتاؤں کے اوتار سمجھ کر ان کی پوجا ہوتی ہے وہاں تو ایسی ایسی کہانیاں جنم
ہیں اور ایسے ایسے ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سامنے آتے ہیں
انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آج کی ترقی یافتہ سائنسی دنیا میں بھی ایسا ہو سکتا
آج بھی جنوب مشرقی بھارت کے صوبوں میں جہاں ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور لو
سانپوں کو دیوتا سمجھتے ہیں آپ کسی سانپ کو مار نہیں سکتے۔ میں مدراس کے قریب ا
گاؤں میں گیا تو میں نے گھروں کے صحن میں سانپوں کو یوں ادھر ادھر رینگتے دیکھا
طرح ہمارے دیہات کے مکانوں میں مرغیاں پھرتی ہیں۔ گھر کے بچے عورتیں ان سا
کو گلے میں ڈالے ان سے کھیل رہے تھے۔ انہیں دودھ پلا رہے تھے۔ ان لوگوں کا
یہ سانپ انہیں کچھ نہیں کہتے۔ کوئی چور گھر میں گھس آئے تو اسے ضرور ڈستے
انسانوں کے اعضائے تخلیق کی تو بھارت کے شہری مندروں اور گھروں میں بھی عام
ہوتی ہے۔ اس کو وہ شیولنگ کی پوجا کہتے ہیں۔ ان باتوں کو ان حقیقتوں کو آپ کے
بیان کرنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بھارت میں کوئی ایک ہندو دھرم نہیں ہے
دھرم کے بے شمار فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے دیوتاؤں کی اپنے حساب سے

انداز میں پوجا کرتا ہے۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں میں لاکھ فرقے ہیں مگر آوا
گون پر سبھی فرقے متفق ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ میری داستان میں پڑھ چکے
ہیں کہ میں نے راجستھان کے ایک دھرم استھان میں رہ کر جین مت کی پوری تعلیم حاصل
کی تھی۔ جین دھرم میں آواگون کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جاتا جس طرح ہندو برہمن
اسے تسلیم کرتے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ صرف اتنا کہہ کر اپنی داستان کی
طرف آتا ہوں کہ ہم جیسے بھی مسلمان ہیں ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں
مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔

اب میں وسطی ہند کے اس پہاڑی غار میں آتا ہوں جہاں میں پراسرار سپیروں کے
قبیلے کے قابو میں آگیا تھا اور ابھی تک مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک
کرنے والے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ چار سپیرے بڑے بڑے پگڑ باندھے
لمبے لمبے گیروے کرتے پہنے ناگ کے بت کی دونوں جانب بیٹھے بین بجا رہے تھے اور میں
رسیوں سے جکڑا ہوا بانس کی چارپائی پر پڑا تھا۔ اور چارپائی ناگ کے بڑے بت کے آگے
چبوترہ نما ذرا سے اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ چار آدمی
ایک اور چارپائی اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اس چارپائی پر کوئی عورت رسیوں میں جکڑی
ہوئی تھی۔ میں نے اس کے بال دیکھے جو سرہانے کی جانب چارپائی سے نیچے لٹک رہے
تھے۔ بین کے شور میں ان آدمیوں نے یہ چارپائی لا کر میرے ساتھ والے چبوترے پر رکھ
دی۔ میں نے نظریں پھیر کر دیکھا۔ چارپائی پر جو عورت بندھی ہوئی تھی وہ لڑکی لگتی تھی۔
اس کا رنگ زرد تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ خوف کے مارے نیم مردہ ہو رہی تھی۔
اس کے حلق سے یہ جملے نکل رہے تھے۔

"مجھے نہ مارو۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔ اماں مجھے بچالو۔"

میں چونکا۔ یہ لڑکی بھی میری طرح مسلمان تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ کسی
خاص مقصد کے لئے ایک مسلمان مرد اور ایک مسلمان عورت کو پکڑ کر لائے تھے۔ بین کا
شور بہت تھا۔ اس شور میں دونوں بڑے بڑے پگڑوں والے بوڑھے سپیروں نے ہماری

چارپائیوں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد وہ ناگ دیوتا کے آگے جھک
پیچھے ہٹ گئے۔

اب دو سپیرے ہاتھوں میں پٹاریاں لے کر آگے بڑھے۔ ایک سپیرا لڑکی کی چار
کے پاس اور ایک سپیرا میری چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے ایک ہی وقت
حلق سے عجیب سی آوازیں نکالیں اور پٹاری کھول کر ہم پر انڈیل دی۔ لڑکی کی چیخیں
گئیں۔ پٹاری میں سے چھوٹے بڑے کتنے ہی سانپ نکل کر ہمارے بندھے ہوئے جس
رینگنے لگے۔ میں خود بھی دہشت زدہ ہو گیا۔ کئی قسم کے سانپ میری گردن بازوؤں
ٹانگوں اور سینے پر ادھر ادھر رینگتے پھرتے تھے مگر ان میں سے کسی نے مجھے ڈسا نہیں
تمام سپیرے نعرے لگا رہے تھے۔

"ناگ منی کی جے۔ ناگ منی کی جے"

یہ خوفناک کھیل یا پوجا کوئی دس منٹ تک جاری رہی۔ اس کے بعد چار آدمی لڑ
کی چارپائی اٹھا کر لے گئے۔ لڑکی یقیناً خوف کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی کیونکہ اس
آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چار سپیروں نے میری چارپائی اٹھائی اور مجھے میری کوٹھڑی م
لا کر ڈال دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک میں زندہ تھا۔ ابھی تک ان د
سپیروں نے مجھے سانپوں سے ڈسوا کر ہلاک نہیں کیا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے با
سے تالا ڈال دیا گیا۔ سپیرے چلے گئے۔ ان کے قدموں اور باتیں کرنے کی آوازیں آہ
آہستہ دور جا کر خاموش ہو گئیں میں چارپائی پر رسیوں میں جکڑا ہوا پڑا تھا اور سوچ رہا
کہ اس عذاب سے مجھے کس طرح نجات مل سکتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر پوری طا
کے ساتھ رسیوں کو توڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب میرا جسم اکڑنے لگا تھا اور
محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ہمت کچھ دیر بعد جواب دے دے گی میں تربیت یافتہ
جان کمانڈو تھا۔ مگر جس طرح مجھے جکڑ دیا گیا تھا وہاں میری سخت جانی اور کمانڈو ٹریننگ
میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ طاق میں دیا جل رہا تھا۔ خدا جانے رات کتنی گزر

تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کو یاد کر کے دعائیں مانگنے لگا۔ نہ جانے کتنا وقت
گزر گیا کہ مجھے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی تالا
کھول رہا ہے۔

میں یہی سمجھا کہ کوئی سپیرا کوئی رسم پوری کرنے آیا ہو گا۔

طاق میں دیا جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی کوٹھڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ درو
لوہے کا تھا۔ اس کے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ اندر آنے والا
سپیرا نہیں تھا بلکہ ایک دبلی پتلی دراز قد لڑکی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بن
دیا۔ وہ دبے پاؤں چلتی میرے پاس آئی اور مجھ سے کوئی بات کئے بغیر میرے ہاتھو
رسیاں کھولنے لگی۔ مجھے ایسے لگا کہ اس لڑکی کو میں نے کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں
اس سے پوچھا۔

"کیا مجھے سانپوں کے کھڈ میں پھینکنے کے لئے لے جا رہی ہو؟"

لڑکی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خاموش رہو۔"

اب میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو جھونپڑی کے اندر
پر بے ہوش پڑی تھی اور بوڑھی عورت یہ کہہ کر مجھے اس کے پاس جھونپڑی میں
آئی تھی کہ تم مسلمان ہو بیٹا۔ میری بیٹی کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا دو۔ میری بیٹی کی
جائے گی۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"تم وہی جھونپڑی والی لڑکی ہو ناں؟ تم نے اور تمہاری ماں نے دھوکے سے
لوگوں کے ہاں پھنسا دیا ہے۔ میں اگر زندہ بچ گیا تو تمہیں نہیں چھوڑوں گا"

اس دوران لڑکی میرے دونوں کلائیوں کی رسیاں کھول چکی تھی۔ اس نے

یرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

"تم اسی طرح بولتے جاؤ گے تو ضرور زندہ نہیں بچو گے۔ میں تمہیں ان لوگوں کی قید
نکالنے آئی ہوں۔ زبان بند رکھو"

میرے بدن میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کیا واقعی یہ لڑکی مجھے ان خونی سپیروں کی قید
آزاد کرانے آئی تھی؟ اس نے میرے پاؤں بھی کھول دیئے۔ میں چارپائی پر اٹھ کر
کیا اور اپنی کلائیوں کو سہلانے لگا۔ لڑکی نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور دبے
دروازے کے پاس گئی۔ ذرا سا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ میں نے سب سے پہلا
یہ کیا کہ اپنی جیب ٹٹولی جیب میں چیونگ گم ٹیبلٹ والی ڈبی محفوظ پڑی تھی۔ اسرائیلی
رے کے بریف کیس سے اڑائے ہوئے راکٹوں میزائلوں اور نیوکلر پاور پلانٹ کے بلیو
کی نقل میں نے تہہ کر کے تعویذ میں رکھی تھی وہ تعویذ بھی میرے بازو کے ساتھ
طرح بندھا ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ان سپیروں نے میرے بٹوے میں سے
بھی نہیں نکالی تھی۔ میں چارپائی سے اتر کر کوٹھڑی میں ٹہل کر ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔
ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔

دروازے میں سے لڑکی اندر آئی۔ آتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ تو
تعالیٰ نے کوئی فرشتہ میری مدد کو بھیج دیا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا دروازے سے
گیا۔ وہ غار میں آگے آگے جا رہی تھی۔ یہ غار کی مخالف سمت تھی۔ ایک جگہ غار میں
سیڑھیاں آگئیں۔ ہم سیڑھیاں اتر گئے۔ نیچے فضا بے حد مرطوب تھی اور عجیب سی
بلی ہوئی تھی۔ یہاں اندھیرا بھی تھا۔ لڑکی رک گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دو اور میرے ساتھ ساتھ چلو۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ بڑی گہری سرنگ سی تھی۔ قدموں کے نیچے چھوٹے چھوٹے
رہے تھے۔ کچھ دور اندھیرے میں چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی۔ لڑکی رک گئی۔
نے سرگوشی میں کہا۔

"آگے سیڑھیاں ہیں۔ دیکھ کر چڑھنا"

میں اس کے ساتھ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں سیڑھیاں گن بھی رہا تھا۔ کوئی پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے ایسی روشنی نظر آئی جیسے رات کو تاروں بھری رات میں نیلی نیلی روشنی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی تازہ ہوا کے جھونکے بھی آنے لگے۔ یہ رات کی نیلی نیلی روشنی اور تازہ ہوا جس سرنگ میں سے ہم گزر رہے تھے اس کے دہانے سے آرہی تھی۔ غار کا دہانہ آیا تو ہم نکل کر جھاڑیوں کے درمیان آگئے۔

میں کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ تازہ سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ میں نے لڑکی کے کاندھے پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے جب ہم قریب سے گزرتے تو جھینگروں کی آوازیں خاموش ہو جاتیں۔ میں اب جنگل کی آزاد فضا میں نکل آیا تھا۔ اب ایک سپیرا تو کیا اگر سارے سپیرے بھی مل کر آجاتے تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”بہن جی تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم مجھے قید سے چھڑا کر لے آئی ہو۔ بس اب میں آگے خود ہی چلا جاؤں گا۔“

لڑکی چلتے چلتے رک گئی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں مجھے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور چہرے کے نقوش دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ اس نے کہا۔

”جو سانپ ناگ منی کی پوجا کے وقت تمہارے اور دوسری مسلمان لڑکی کے اوپر پھینکے گئے تھے ان کے منہ میں سے زہر کی تھیلیاں نکالی ہوئی تھیں۔ لیکن جن سانپوں کو ہمارے سپیروں نے تمہارے اور مسلمان لڑکی کے کپڑوں اور تمہارے جسموں کی بو سنگھا دی ہوئی ہے وہ بہت زہریلے سانپ ہیں۔ ان کے زہر ان کے منہ میں موجود ہے تم جہاں جاؤ گے یہ سانپ تمہارا پیچھا کریں گے اور تمہیں ڈس کر ہلاک کر ڈالیں گے۔“

میں نے کہا۔

”لیکن ابھی تو میرے پیچھے سانپ نہیں چھوڑے گئے۔ ابھی تو میں اس جنگل سے فرار ہو سکتا ہوں آگے کسی نہ کسی بستی یا شہر میں پہنچ جاؤں گا پھر سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ

سکیں گے“

لڑکی آگے چل پڑی۔ کہنے لگی۔

”اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ میں اسی لئے تمہیں نکال کر لے آئی ہوں۔ تھوڑی دیر میں پجاری سپیرے تمہیں کوٹھڑی سے لینے آئیں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوٹھڑی میں پہنچ بھی چکے ہوں۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہو تو وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ زہریلے سانپوں کی چھ جوڑیاں تمہاری تلاش میں چھوڑ دیں گے۔“

میں نے کہا۔

”کیا تم مجھے جہاں لے جا رہی ہو وہاں یہ سانپ میرے پیچھے نہیں آئیں گے؟“

لڑکی بولی۔

”تم خاموشی سے میرے پیچھے چلتے رہو ان باتوں کا مجھے تم سے زیادہ پتہ ہے۔ میں نے اس کا بھی انتظام سوچ رکھا ہے ساری عمر ہو گئی ہے ان خونی سپیروں میں رہتے ہوئے۔ میں سب گر جانتی ہوں۔“

میری یہ ہمدرد لڑکی جھاڑیوں اور اونچی گھاس والے میدان میں سے گزر کر اب ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ گھاس رات کی شبنم سے بھیگ رہی تھی جس کی وجہ سے میری پتلون کے پائینچے گیلے ہو گئے تھے۔ ٹیلے کے اوپر چٹانوں کے درمیان ایک قدرتی غار تھا۔ اس غار کے آگے نرکلوں کے اونچے اونچے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے دہانہ تھا جس کے آگے پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی۔ اس سل نے غار کا منہ بند کر دیا تھا۔ لڑکی نے سل ایک طرف ہٹا دی۔ تاروں کی روشنی میں مجھے غار میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنا معلوم ہوا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”یہ تو کوئی کھڈ یا کھوہ معلوم ہوتا ہے۔“

اس نے کہا۔

”میں پہلے اندر جاتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آنا“

وہ جھک کر بلکہ گھٹنوں کے بل ہو کر غار کے تنگ دہانے میں سے اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر گھس گیا۔ اندر ایک طرف سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ روشنی میں دیکھا کہ غار کے اندر کا حصہ تھوڑا کشادہ ہے اور چھت بھی اونچی ہے۔ لڑکی مجھے کچھ آگے لے گئی۔ دیوار میں ایک شگاف تھا۔ روشنی اس شگاف میں سے باہر نکل رہی تھی۔ شگاف کے اندر کافی کھلی جگہ تھی۔ یہاں مٹی کا ایک دیا دیوار کے کھتے میں روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے ایک لڑکی دونوں گھٹنے سینے سے لگائے کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی دکھائی دی۔

میں وہیں ٹھٹھک گیا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی ہے۔ جو لڑکی مجھے اپنے ساتھ لے آئی تھی اس نے کہا۔

"یہ لڑکی بھی مسلمان ہے۔ ہمارے آدمیوں نے اس کو بھی قید کر رکھا تھا۔ میں سے پہلے اسے نکال کر یہاں لائی تھی۔"

میں نے کونے میں بیٹھی لڑکی کو دیئے کی روشنی میں دیکھا تو میں نے اس کو بھی پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو میرے بعد ناگ منی کے بت کے سامنے لایا گیا تھا۔ وہ میری طرح ایک چارپائی پر بندھی ہوئی تھی۔ اس پر بھی میرے ساتھ ہی سانپ چھوڑے گئے تھے اور وہ دہشت زدہ ہو کر بار بار اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو اور خدا کو مدد کے پکار رہی تھی۔

مسلمان لڑکی میری طرف ڈری ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میری ہمدرد کہنے لگی۔

"تمہیں اپنے ساتھ اس لڑکی کو بھی نکال کر اپنے ساتھ لے جانا اور اسے اس کے ماں باپ کے گھر پہنچانا ہو گا۔ ہمارے سپیرے معلوم نہیں اسے کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں یہ کسی شہر کا نام بتاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے زیادہ شہر نہیں دیکھے۔ اس سے پوچھو کہ یہ کس شہر جانا چاہتی ہے۔"

میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"بہن! تمہارے ماں باپ کہاں رہتے ہیں؟"

لڑکی مڈل کلاس کے پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی پڑھی لکھی تھی یہ بعد میں معلوم ہوا۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

اس نے بتایا کہ اس کا نام نسیم بانو ہے۔ وہ بنارس شہر کی رہنے والی تھی۔ اس کے باپ کا گھر شہر کے جنوب مشرقی علاقے کی ایک بستی میں دریائے گنگا کے کنارے تھا۔ اس کے باپ کی شہر میں سٹیشنری اور سکول کی کتابوں کی دکان تھی۔ کہنے لگی۔

"ہمارا سکول دریا کی گھاٹ کے قریب ہے۔ ایک ہفتہ ہوا میں سکول سے واپس آرہی تھی کہ راستے میں ایک سپیرا سانپوں کا تماشہ دکھا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ تو امتحان میں اول آئے گی۔ تیرا ماتھا بتا رہا ہے۔ مجھے اپنے گھر لے جا کر بھوجن کرا۔ تجھے سانپ کا مہرہ دوں گا جس گھر میں مہرہ ہو وہاں سانپ بچھو کبھی نہیں آتا اگر کسی کو سانپ کاٹ لے تو یہ مہرہ سانپ کاٹے کے زخم پر رکھ دینا۔ وہ آدمی بچ جائے گا۔ ہمارے گھر میں دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے سانپ بچھو برسات میں نکل آتے تھے میں نے کہا چلو بابا میرے گھر چلو۔ میں تمہیں بھوجن کراتی ہوں۔ میں اسے لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ایک گلی میں سے گزری تو سپیرے نے خدا جانے کس طرح کا رومال میرے منہ کے اوپر رکھا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔"

میری ہمدرد لڑکی نے نسیم بانو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اب تم فکر نہ کرو۔ یہ تمہارا مسلمان بھائی بند ہے اسے بھی تمہاری طرح کچھ پلا کر بے ہوش کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دے گا۔"

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تم اس لڑکی کے پاس یہاں بیٹھو۔ میں یہ معلوم کر کے آتی ہوں کہ ہمارے آدمی تمہاری تلاش میں کیا کچھ کر رہے ہیں اور انہوں نے کس کس علاقے میں جاسوس سانپ چھوڑے ہیں کیونکہ اب تک تم دونوں کے فرار کا ان لوگوں کو پتہ چل گیا ہو گا۔ یہاں سے ہلنا بالکل مت۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔"

جب وہ جانے لگی۔ تو میں نے سوال کیا۔

"اگر تمہارے سپیروں نے ہمیں ہلاک کر دینے کے لئے جاسوس سانپ چھوڑ رکھے ہیں تو وہ میرے اور اس لڑکی نسیم بانو کے کپڑوں اور جسم کی بو پر یہاں بھی آجائیں گے"

وہ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"میرے ساتھ غار کے منہ تک آؤ"

میں اس کے ساتھ شگاف میں سے نکل کر غار کے دہانے پر آگیا۔ اس نے پتھر کی سل پرے گرا دی۔ غار کے دہانے میں سے جو کسی بڑے سوراخ کی طرح تھا ایسی روشنی اندر آنے لگی جیسے باہر آسمان پر پو پھٹ رہی ہو۔ وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے گئی۔ باہر آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی شبنمی ہواؤں میں کافی خنکی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کھڑے رہو"

میں غار کے دہانے کے آگے اگے ہوئے اونچے اونچے نرکلوں کے پاس ہی کھڑا گیا۔ لڑکی جھک کر جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ وہ اندھیرے میں خدا جانے ڈھونڈنے لگ گئی تھی۔ جب دو ایک منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کچھ پودے تھے۔ کہنے لگی۔

"یہ بڑی خاص قسم کی جڑی بوٹی ہے۔ جانتے ہو اس کی تاثیر کیا ہے؟ اگر اسے کر ان کے کچلے ہوئے ڈنٹھوں کو کسی جگہ رگڑ رگڑ کر مل دیا جائے تو ادھر سانپ کبھی نہ آئے گا۔ اس کی بو سے سانپ اس طرح ڈرتا ہے جس طرح انسان سانپ سے ڈرتا ہے۔"

اس نے میرے سامنے ڈنٹھوں کو پتھر پر رکھ کر دوسرے پتھر سے کچل دیا۔ پھر اس کچلے ہوئے ڈنٹھل اور شاخیں پتھر کی اس سل پر رگڑ رگڑ کر ملنے لگی جو غار کے دہانے رکھا جانے والا تھا۔ جب اس نے ساری کچلی ہوئی جڑی بوٹی پتھر کی سل پر اچھی طرح مل دی تو کہنے لگی۔

"اب تم اندر جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ ہمارے سپیروں نے جو سانپ تمہاری

لئے چھوڑے ہوئے ہیں وہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن انہیں ہماری بو تو ضرور آجائے گی اس طرح وہ غار میں نہیں آئیں گے لیکن باہر بیٹھ جائیں گے اور سپیرے سمجھ جائیں گے کہ ہم غار کے اندر ہیں"

لڑکی کہنے لگی۔

"سانپ کوئی پولیس کے سپاہی نہیں ہیں۔ اس جڑی بوٹی کی تیز بو اس وقت پہاڑی چاروں طرف دو دو فرلانگ تک پھیل چکی ہے۔ سانپ اس کی بو پا کر اس پہاڑی سے جائیں گے۔ تم بے فکر ہو کر بیٹھو میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

میں غار کے اندر آگیا۔ لڑکی نے باہر سے پتھر کی سل رکھ کر غار کا منہ بند کر دیا۔ میں اندر شگاف میں بنارس کی مظلوم مسلمان لڑکی نسیم بانو کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ رو تھی اور سخت ڈری ہوئی تھی۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کبھی اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس جا سکے گی۔ میں نے اسے بہت تسلی دی اور کہا۔

"تم اپنا ڈر خوف دور کر دو بہن۔ ہم بہت جلد یہاں سے نکل جائیں گے اور میں خود تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ مجھے دلی جانا ہے۔ میں بنارس سے ہوتا ہوا چلا جاؤں گا"

میری باتوں سے اس کی کافی ہمت بندھی۔ کہنے لگی۔

"بھیا! ان لوگوں کو ضرور پولیس کے حوالے کر دینا۔ اگر یہ رحم دل لڑکی مجھے میری لڑی سے میری رسیاں کھول کر یہاں نہ لاتی، تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا"

وہ رونے لگی۔

"میرے گم ہو جانے سے نہ جانے اماں ابو کا کیا حال ہو رہا ہوگا"

میں اسے تسلیاں دینے لگا کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جس نے ہمیں اتنی بڑی مصیبت نکال دیا ہے وہ ہمیں یہاں سے بھی نکال دے۔

"مجھے بھی اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ میں تمہیں خود تمہاری اماں اور ابو کے پاس پہنچاؤں

گا"

میں اس کا خیال بدلنے کے لئے اس سے اس کے سکول اور سکول کی سہیلیوں
باتیں کرنے لگا۔ کچھ وقت اسی طرح گزر گیا۔ سپیرن لڑکی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ باہر
ضرور دن چڑھ آیا ہو گا۔ اب خونی سپیرے اور ان کے سانپ ہماری تلاش میں سارے
جنگل میں نکل آئے ہوں گے۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہ سانپوں کا انسانی کپڑوں اور جسم
کی بو پر آجانا بیکار کی باتیں ہیں۔ میں اس لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل جاتا ہوں۔ سپیرے
کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ تو ہے نہیں کہ گھات لگا کر ہم پر فائر کر دیں گے۔ کوئی سامنے آئے
تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے ایسے کمانڈو کے ہاتھ سے زندہ بچے۔ پھر یہ سوچ
کر بیٹھا رہا کہ خدا جانے اس میں کوئی سچائی ہی ہو۔ سانپ ہماری بو پا کر جنگل میں ہمیں
ڈس نہ دیں۔ یہ غریب لڑکی کہیں ویسے ہی ڈر کر شور نہ مچا دے۔ بہتر یہی ہے کہ سپیرن
لڑکی کا انتظار کر لیا جائے۔ وہاں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کوئی
آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا کہ سپیرن لڑکی غار میں واپس آئی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ سپیرے سخت غصے میں ہیں اور سارے جنگل میں ہمیں تلاش
کرتے پھر رہے ہیں۔

"انہوں نے تمام زہریلے سانپ جن کو انہوں نے پہلے روز ہی تمہارے جسم اور
کپڑے سنگھا دیئے تھے تمہارے پیچھے چھوڑ دیئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ اس پہاڑی کی
طرف کوئی سانپ نہیں آرہا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے سانپوں کے ایک جوڑے کو اپنی
آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا منہ اس پہاڑی کی طرف تھا۔ انہیں تم دونوں کی بو آرہی
تھی لیکن جیسے ہی جڑی بوٹی کی تیز بو ہوا کے جھونکے کے ساتھ ان کے جسم سے ٹکرائی
اس طرح گھبرا کر ایک دم پیچھے کو بھاگے جیسے آگے آگ لگی ہو۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اب ہمیں کتنی دیر اور یہاں رہنا ہو گا"

سپیرن لڑکی اپنے ساتھ ابلی ہوئی شکر قندی اور ایک کٹورے میں گڑ کا شربت

۔ اس نے شکر قندی کیلے کے پتوں پر ڈال کر ہمارے آگے رکھ دی۔ کہنے لگی۔

"دن کے اجالے میں تمہارا یہاں سے نکلنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ تمہیں آج کا
اس جگہ بیٹھ کر گزارنا ہو گا۔ رات کو میں تمہیں خود ساتھ لے کر اس جنگل سے باہر
آؤں گی۔"

شکر قندی بڑی میٹھی تھی۔ مجھے بھوک بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ میں نے اور نسیم بانو
ں نے شکر قندی کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی گڑ کا شربت پیا۔ جسم میں تازگی آگئی۔
رن لڑکی یہ کہہ کر چلی کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوپہر کو دوبارہ آؤں گی۔ اس
جانے کے بعد نسیم بانو سے باتیں کرنے لگا۔ غار کے اندر سردی نہیں تھی۔ مگر سردیوں
وسم تھا اس وجہ سے گرمی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس مظلوم لڑکی کا خوف اب
دور ہو چکا تھا۔ ایک دو بار وہ میری کسی بات پر ہنسی بھی تھی۔ دوپہر کے وقت سپیرن
ہمارے لئے کھچڑی لے کر آئی جس میں آم کا اچار ملا ہوا تھا۔ وہ پانی بھی لائی تھی۔
ہم نے شوق سے کھایا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"باہر دن کتنا گزر گیا ہے؟"

اس نے بتایا کہ دوپہر ہو چکی ہے اور ہمارے آدمی تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک
ہیں۔ سارے سانپ بھی ناکام واپس آگئے ہیں۔ میں نے کہا۔

"تو پھر اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے"

وہ کہنے لگی۔

"جب تک باہر اندھیرا نہ ہو جائے یہاں سے نکلنے کا نام بھی نہ لینا۔ نہیں تو تمہارے
میں بھی ماری جاؤں گی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم کو ہماری مدد کا خیال کیسے آگیا؟"

سپیرن لڑکی خاموش ہو گئی۔ پھر بولی۔

"یہ میں نہیں جانتی۔ ایسا لگتا ہے کہ بھگوان نے میرے دل میں خیال ڈالا کہ میں

تمہاری مدد کروں۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ عورت تمہاری ماتا جی تھی کیا؟"

سپیرن لڑکی کہنے لگی۔

"نہیں۔ وہ میری اصلی ماں نہیں ہے۔ اس نے مجھے یہاں پالا ہے۔ مجھے خود نہیں
معلوم کہ میری ماں کون تھی۔ ایک بوڑھے سپیرے نے بتایا تھا کہ تم ایک جنگل میں
جھاڑیوں کے پاس پڑی رو رہی تھیں۔ تمہاری عمر اس وقت چھ سات ماہ کی ہوگی کہ
تمہیں وہاں سے اٹھا کر لے آئے۔ بھگوان جانے میری ماتا کون تھی اور وہ مجھے روتا ہوا
جھاڑیوں کے پاس کیوں چھوڑ گئی تھی۔ شاید ڈاکوؤں نے میری ماتا کو اغوا کیا ہوگا اور میں
اس کی گود میں ہوں گی۔ ڈاکو مجھے وہیں پھینک کر میری ماتا کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے
میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں ان سپیروں میں تھی۔ تب سے لے کر آج تک ان
رہ رہی ہوں۔ اچھا۔ اب میں چلتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"تم ہمیں لے کر یہاں سے کس طرف جاؤ گی؟ اور جس طرف تم ہمیں لے جاؤ
کیا وہاں سے کوئی شہر یا ریلوے سٹیشن قریب ہوگا؟"

اس نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تمہیں خود معلوم کرنا ہوگا۔ میں تمہیں
خطرناک جنگل سے باہر نکال کر واپس آجاؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ میرا زیادہ دیر
رہنا ٹھیک نہیں۔"

اور وہ چلی گئی۔ اس کے بعد ہمارے لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ بس باتیں
رہے۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ بنارس کی لڑکی نسیم بانو نے مجھ سے میرے بارے
پوچھا کہ میں کون ہوں اور ان کے جال میں کیسے پھنس گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے
میں بس اتنا ہی بتایا کہ بمبئی سے دلی جا رہا تھا۔ سیلاب کی وجہ سے بانڈہ شہر میں رک

جبل پور سے ہوتا ہوا کانپور کے راستے دلی چلا جاؤں گا۔ ٹرین میں بیٹھا۔ آگے جا کر
ریلوے لائن بہہ جانے کی وجہ سے ٹرین کھڑی ہو گئی۔ میں یونہی سیر کرنے سٹیشن سے نکل
آیا اور اس سپیرن لڑکی کی ماں مجھے دھوکے سے بے ہوش کر کے یہاں لے آئی۔

یونہی باتیں کرتے وقت گزرتا چلا گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر دیئے کی بتی
اونچی کر دیتا تھا۔ آخر سپیرن لڑکی آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پوٹلی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہارے لئے اس میں کھچڑی ڈال کر لائی ہوں۔ راستے میں جب بھوک لگے تو
کھا لینا۔"

میں نے اس سے کہا کہ اگر رات ہو گئی ہے تو ہمیں یہاں سے چل پڑنا چاہئے۔
سپیرن لڑکی نے کہا۔

"ابھی سورج غروب ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔ تھوڑا وقت اور بیٹھ جاؤ۔ جنگل
میں پوری طرح سے اندھیرا ہو لینے دو۔"

اس نے بتایا کہ سپیرے کل کسی نئی مسلمان لڑکی اور نئے مسلمان لڑکے کو پکڑنے
کے لئے نکلیں گے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ صرف مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو کیوں پکڑتے ہیں؟"

وہ کہنے لگی۔

"ان کے ہاں یہ ایک پرانی رسم چلی آرہی ہے یہ ہر سال کی پہلی اماوس کی رات کو
ناگ منی دیوتا کے آگے ایک مسلمان لڑکی اور ایک مسلمان لڑکے کی قربانی دیتے ہیں۔
اس سے پہلے یہ کئی مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کو ناگ منی دیوتا کے آگے ہلاک کر چکے
ہیں۔ تم خوش قسمت ہو اور پہلے مسلمان ہو کہ یہاں سے بچ کر جا رہے ہو۔"

میں نے دل میں سوچا کہ ان لوگوں کو یہاں زندہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے میں نے
سپیرن لڑکی سے کہا۔

"رات کو یہ سارے خونی سپیرے کہاں سوتے ہیں؟"

اس نے کہا۔

"جس غار میں تم قید تھے اور جہاں ناگ منی دیوتا کا بڑا بت ہے سارے سپیرے اُ
غار میں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سوتے ہیں۔"

میں نے اسی وقت ان لوگوں کو ناگ منی دیوتا سمیت بم سے اڑانے کا فیصلہ کر لیا
ٹائم بم میرے پاس موجود تھے مگر میں خود وہاں جا کر انہیں لگا نہیں سکتا تھا۔ اس غار کو ب
کرنے کے لئے میرے چیونگ گم والے دو ٹائم بم ہی کافی تھے میرا ذہن تیزی سے
بموں کو سانپ کے بت والے غار میں لگانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ سپیرن لڑکی رات
ہونے کا انتظار کرتے ہوئے ہمارے پاس ہی بیٹھی دوسری لڑکی سے باتیں کر رہی تھی او
اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹائم بم کیسے لگایا جائے۔ میں خود ان بمو
کو لگانے غار کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے سپیروں کی موجودگی سے کوئی خطرہ نہیں تھا
ان سب سے میں اکیلا کمانڈو ہی نمٹ سکتا تھا۔ مجھے خطرہ ان کے زہریلے سانپوں سے تھا
اگر وہ مجھ پر سانپ چھوڑ دیتے ہیں تو میرا زندہ بچنا مشکل تھا۔ سپیرن لڑکی کے ہاتھ اگر
بم کی ٹکیاں دے کر کہوں کہ یہ واپس جا کر ناگ منی کے غار میں چپکا دینا تو وہ ضرور پوچھ
گی کہ یہ کیا ہے اور تم اسے وہاں کیوں چپکانا چاہتے ہو۔ میرے پاس ان سوالوں کا کو
جواب نہیں تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد جب میرے ذہن میں خونی سپیروں کے غار
دھماکے سے اڑانے دینے کی کوئی ترکیب نہ آئی تو میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔

سپیرن لڑکی کو وقت کا برابر احساس تھا۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی کہ باہر اندھیرا
گیا ہو گا۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔ جانے سے پہلے اس نے ہم دونوں کو ہدایت کی ک
اس کے پیچھے پیچھے کم از کم پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔ غار سے نکلنے کے بعد
اور نسیم بانو سپیرن لڑکی کے درمیان پانچ قدموں کا فاصلہ رکھ کر چلنے لگے۔ رات کا اند
چھا چکا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے رات کے اندھیرے میں بھی تھوڑا
نظر آتا رہتا تھا۔ سپیرن لڑکی ہمارے آگے آگے جنوب کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ایک
میں اتر گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اتر گئے۔ اس کھائی کی دیواریں تین اطراف
کافی اونچی تھیں۔ صرف ایک راستہ بنا ہوا تھا۔ سپیرن لڑکی ہمیں لے کر کھائی سے بھی

ں۔ اسی طرح کھیتوں، گھاس کے میدانوں، کھڈوں، کھائیوں اور درختوں کے گھنے
ڈوں میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔ آسمان بڑا کھلا کھلا نظر آ رہا تھا۔
ے چمک رہے تھے۔ یہاں آ کر گھنے درختوں کے جھنڈ ختم ہو جاتے تھے۔ سپیرن لڑکی
ں گئی۔ جب میں اور نسیم بانو چلتے چلتے اس کے قریب آئے تو وہ کہنے لگی۔

"یہاں سپیروں کے جنگل کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ آگے تم خود ہی جاؤ گے۔ اور خود
اپنا راستہ تلاش کرو گے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آگے کوئی شہر ہے؟"

وہ کہنے لگی۔

"میں بہت دیر ہوئی ایک بار ماتا کے ساتھ اس طرف گئی تھی۔ مجھے یاد ہے یہاں سے
گے ہم نے بیل گاڑی میں سفر کیا تھا۔ پھر میں نے ریل گاڑی دیکھی تھی۔ اس کے آگے
گاؤں آیا تھا۔ میری ماتا اس گاؤں میں اپنی کسی رشتے دار سے ملنے گئی تھی۔ یہاں
ہم واپس آ گئے تھے۔ وہی گاؤں کہیں آگے آتا ہے۔"

میں نے سپیرن لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہمارے ساتھ جس ہمدردی کا سلوک کیا ہے اس کے لئے میں اور میری منہ
بہن نسیم بانو ہم دونوں تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں"

سپیرن لڑکی نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب تم وقت خراب نہ کرو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ پیچھے کسی کو شک پڑ گیا تو مجھے
وہ نہیں چھوڑیں گے۔ جاؤ۔"

اتنا کہہ کر سپیرن واپس مڑی اور تیز تیز قدموں سے چلتی جہاں درختوں کے جھنڈ
ع ہوتے تھے ان جھنڈوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اب میرا اور بنارس کی لڑکی
بانو کا سفر شروع ہو گیا۔ اس بے چاری نے کہاں اس قسم کے سفر کئے تھے۔ رات کے
ت۔ اندھیرا۔ ستاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اور راستے میں کبھی کوئی کھائی آ جاتی۔

کبھی کسی برساتی نالے سے گزرنا پڑتا۔ کبھی اونچی اونچی جھاڑیاں شروع ہو جاتیں۔ لڑ
تھوڑی دور چلتی تو ڈر کر بیٹھ جاتی کہ اندھیرے میں اسے کوئی سانپ نہ کاٹ لے۔ م
اسے حوصلہ دیتا۔ اس کی ہمت بندھاتا اور یہ خوف بھی دلاتا کہ ہو سکتا ہے خونی سپ
ہمارے تعاقب میں لگے ہوں۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دوبارہ چلنا شروع کر دیتی۔

ابھی تک مجھے وہاں کوئی پگ ڈنڈی وغیرہ نہیں ملی تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ آگے
کوئی گاؤں وغیرہ ہو گا۔ جس طرف سپیرن لڑکی نے ہمیں چلنے کو کہا تھا ہم اسی رخ پر آہستہ
آہستہ چلے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس ختم ہوئی
تو مجھے کھیتوں میں کھڑی فصل نظر آئی۔ میری نگاہیں اندھیرے میں بھی کھیتوں کو پہچان لیتی
تھیں۔ اس کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ ہم ذرا قریب ہو گئے تو واقعی وہ جوار یا باجرے کی
فصل تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"آگے کوئی نہ کوئی گاؤں ضرور ہو گا۔ وہاں سے کوئی پکی سڑک شہر کو بھی جاتی ہو گی"

وہ سانس لے کر بولی۔

"بھائی! ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ کہیں ہم راستہ تو نہیں بھول گئے؟"

لیکن ہم راستہ نہیں بھولے تھے۔ آگے ایک گاؤں آ گیا جس کے مکانوں پر رات
اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بس مکانوں کے خاکے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سارا میدانی علا
تھا۔ پہاڑیاں ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے۔ پگ ڈنڈی چوڑے کچے راستے میں تبدیل ہو گئی تھ
ہم گاؤں کے پہلو سے گزرے تو دور بجلی کے کھمبوں کی روشنی نظر آئی۔ میں نے لڑکی
کہا۔

"وہ دیکھو۔ یہ پکی سڑک کی روشنیاں ہیں یہ سڑک ضرور کسی شہر کو جاتی ہے"

"کون سا شہر آئے گا؟ بنارس تو بہت دور ہو گا۔"

ہم کسی نہ کسی طرح چلتے چلتے پکی سڑک پر آ گئے۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ ہم
کے کنارے ایک جگہ بیٹھ کر تھکان اتارنے لگے۔ لڑکی بہت زیادہ تھک گئی تھی۔
دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ اس دوران وہاں سے کوئی گاڑی یا ٹرک وغیرہ نہ گزرا۔

بی نا امید ہو گیا تو سوچا کہ مشرق کی طرف چل پڑتے ہیں۔ آگے کوئی نہ کوئی قصبہ یا
ضرور آ جائے گا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی موٹر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ میں وہیں
گیا۔ پیچھے دیکھا۔ کسی گاڑی کی روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ گاڑی ابھی دور تھی کہ
سڑک کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا اور گاڑی کو روکنے کے لئے دونوں بازو ہلانے لگا۔

گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ اب لڑکی نسیم بانو بھی میرے پاس آ گئی تھی۔ یہ گاڑی
فوجی ٹرک تھا۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ مجھ سے کہیں غلطی تو نہیں ہو گئی۔ فوجی
میرے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے پروا نہ کی۔ ٹرک میں سے
سکھ فوجی باہر نکل کر آیا اور پنجابی نما اردو میں بولا۔

"کون ہو تم۔ ادھر کیا کر رہے ہو"

میں نے اس سے کہا کہ یہ میری بہن ہے۔ ہمارے گاؤں میں سیلاب آ گیا تھا۔ جان
بھاگے۔ ماتا پتا سے بچھڑ گئے اور ادھر نکل آئے ہیں۔ ہمیں آگے کسی گاؤں میں پہنچا
۔ سکھ فوجی بولا۔

"آگے گاؤں نہیں ہے۔ ریوا ہے۔ چلو بیٹھو ٹرک میں۔"

ہم جلدی سے دوڑ کر ٹرک کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ٹرک بالکل خالی تھا۔ میں نے لڑکی
پوچھا۔

"یہ ریوا کوئی قصبہ ہو گا ہو سکتا ہے وہاں کوئی ریلوے سٹیشن بھی ہو"

لڑکی کہنے لگی۔

"ریوا تو شہر ہے۔ میری امی جی نے ایک بار اس شہر کا ذکر کیا تھا"

یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد فوجی ٹرک نے ہمیں ریوا پہنچا
یہ واقعی ایک شہر تھا۔ اگرچہ چھوٹا شہر تھا۔ رات کا وقت بازار سنسان پڑے تھے۔ میں
سکھ فوجی سے کہا۔

"سردار جی ہمیں سٹیشن پر اتار دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی"

سکھ فوجی نے ہمیں سٹیشن پر پہنچا دیا۔

سٹیشن کے گیٹ کے اوپر انگریزی اور اردو میں موٹے لفظوں میں "ریوا" لکھا تھا
رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سٹیشن پر چند ایک مسافر ہی ڈیوڑھی میں پڑے تھے۔ ہم بھی
وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں کسی سے پوچھتا ہوں کہ یہاں سے بنارس کس طرف ہے اور
کوئی گاڑی یہاں سے بنارس جاتی ہے یا نہیں"

مجھے ایک قلی مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بنارس کو جانے والی گاڑی کس
وقت جائے گی۔ وہ کہنے لگا۔

"یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی بنارس نہیں جاتی۔ ایک گھنٹے بعد ایک گاڑی آئے گی
وہ تمہیں مرزا پور پہنچا دے گی۔ مرزا پور سے بنارس کے لئے دوسری گاڑی پکڑ لینا۔"

میں نے واپس آکر مرزا پور کے دو ٹکٹ لے لئے۔ ایک گھنٹے بعد واقعی ایک ٹرین
آگئی۔ میں اور نسیم بانو ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اس گاڑی نے دوسرے دن صبح صبح ہمیں
مرزا پور پہنچا دیا۔ مرزا پور پہنچ کر پتہ چلا کہ بنارس وہاں سے تھوڑی دور ہی ہے۔ اس
میں اس طرف کا جو علاقہ تھا ادھر میں زیادہ نہیں آیا تھا۔ یہ بہت حد تک میرے لئے نیا
علاقہ تھا۔ بہرحال مرزا پور ہمیں ایک گاڑی کچھ دیر بعد مل گئی جس میں بیٹھ کر ہم بنارس
پہنچ گئے۔

بنارس ایک پرانا اور گندا شہر تھا۔ سٹیشن بھی مجھے پرانا لگا۔ انڈیا کے ہر صوبے
گندے مندے ننگے اور نیم ننگے سادھو لوگ جگہ جگہ چل پھر رہے تھے۔ بنارس دریا
گنگا کے کنارے آباد ہے۔ ویسے بھی بڑا پرانا شہر ہے۔ شہر کا گنجان حصہ بے حد گندا
اونچی نیچی گلیاں تھیں۔ کئی گلیوں میں پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ میں
بانو کو دریا کنارے والی بستی میں اس کے گھر لے گیا۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹے
بہن بھائیوں نے نسیم بانو کو دیکھا تو سب رونے لگ پڑے۔ میں نے انہیں کہا۔

"آپ لوگ کس لئے رو رہے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ میں آپ کی بچی
سالم بھیڑیوں کے چنگل سے نکال کر لے آیا ہوں"

ہم بانو بھی ہر ایک کے گلے لگ کر زارو قطار رو رہی تھی۔ ہم لوگ روتے بہت
ہ تو ہم لوگوں کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ رونے دھونے سے بہت واسطہ پڑتا
کچھ ویسے بھی ہمیں رونے کا بہت شوق ہے۔ خوشی اور غم دونوں موقعوں پر ہم
دتے ہیں۔ میں نے نسیم بانو کے والد کو جو ابھی گھر پر ہی تھا اور دکان پر نہیں گیا تھا
ہانی سنائی۔ وہ تو کانوں کو ہاتھ لگا کر بار بار آسمان کی طرف دیکھتے اور خدا کا شکر ادا
. میں نے کہا۔

اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں نے آپ کی امانت آپ کے پاس پہنچا دی ہے۔"

لوگ مجھے جانے نہیں دے رہے تھے مگر میرا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں وہاں سے
اہوا۔ سیدھا سٹیشن پر آگیا۔ وہیں ناشتہ کیا اور دو گھنٹے بعد ایک ٹرین میں سوار ہو کر
طرف روانہ ہو گیا جو میرا اصل ٹارگٹ تھا۔ دلی بنارس سے بہت دور تھا۔ راستے
پور کا سٹیشن آیا۔ پھر سلطان پور آیا۔ اس کے بعد لکھنؤ کا مشہور اور اسلامی
کا حامل شہر آگیا۔ یہاں گاڑی کو دیر تک رکنا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ میری
ی چھٹی حس ایک بار پھر بیدار ہو گئی تھی۔ اگرچہ میں احمد آباد دوارکا والے خطروں
ا دور نکل آیا تھا پھر بھی میں دشمن ملک میں تھا اور پولیس کہیں بھی شک پڑنے پر
فتار کر سکتی تھی۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر ٹہلنے کے بعد میں ڈبے میں آکر چوکنا ہو کر

لکھنؤ سے گاڑی چلی تو فتح گڑھ کے بڑے شہر کے سٹیشن پر ٹھہری۔ یہ کوئی ایکسپریس
ی۔ یہاں سے شاہ جہان پور بریلی اور مراد آباد سے ہوتی ہوئی دلی پہنچی۔ مجھے ٹرین
کرتے ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی۔ صبح ہونے والی تھی کہ ٹرین دلی کے
ں داخل ہوئی۔ یہ شہر میرا جانا پہچانا تھا اور میرے لئے خطروں سے بھرا ہوا تھا۔
نے سوچا کہ اپنے ماسٹر سپائی مغل ریستوران کے مالک کے پاس چلنا چاہئے۔ ایک
رکھیں کہ میں نے اپنے ماسٹر سپائی کا نہ تو نام اصلی لکھا تھا اور نہ اس کے
نا کا صحیح نام لکھ رہا ہوں۔ یہ بھی اس کے اصلی نام کی جگہ فرضی نام میں نے رکھا

ہوا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی بجائے بہتر ہے کہ مجھے اپنے دوسرے ماسٹر سپائی اور ہا
ایکسپلوسیز کے ماہر گل خان کے پاس چلنا چاہئے۔ اس کے گھر کا مجھے پتہ تھا۔ (گل خان
نام بھی میں نے فرضی رکھا ہوا ہے۔ اس کا اصلی نام اور تھا۔ یہ ہندوستان کا شہری مسلمان
پاکستان کا فدائی تھا اور آج کل دلی میں نہیں ہے بلکہ کینیڈا جا چکا ہے)۔ میں چاروں طرف
سے خبردار رہتے ہوئے سٹیشن سے نکل کر باہر آگیا۔ دلی میں کافی ٹھنڈ تھی۔ میں نے
جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کر لئے تھے۔ موٹر رکشا پکڑا اور گل خان کے گھر کی طرف چل
پڑا۔

میں آپ کو گل خان کے مکان کا حدود اربع نہیں بتاؤں گا۔ بس میں اس آبادی میں
آگیا جہاں ایک گلی میں وہ رہتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہ گیا۔ پھر
مجھے اپنے مکان میں لے گیا۔ کہنے لگا۔

”تم اتنے دن کہاں رہے؟ سری نگر سے شیروان نے آدمی بھیج کر تمہارا پتہ پوچھا
تھا۔ تم نے دوار کا اور مڈگھاٹ میں جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کی ہمیں بڑی خوشی
ہے۔“

گل خان نے میرے لئے چائے بنوائی۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر
اپنی ساری روداد بیان کی۔ کہنے لگا۔

”تم نے ایک محب وطن کمانڈو ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔“

پھر بولا۔

”مجھے وہ بلیو پرنٹ دکھاؤ جو تم اسرائیلی ایجنٹ کے کاغذات سے نقل کر کے لائے
میں نے اپنے بازو کے ساتھ بندھا ہوا تعویذ اتارا۔ اس میں سے پلاسٹک کے
میں لپٹا ہوا وہ کاغذ نکال کر گل خان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔
تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”یہ بھارت میں کسی ایٹمی ری ایکٹر کا نقشہ ہے اور یہ راکٹوں اور میزائلوں
خاکے ہیں اس کا مطلب ہے کہ انڈیا کی حکومت کشمیر اور پاکستان کے خلاف استعما

نے والے راکٹ اور میزائل بنانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا تم اس بلیو پرنٹ سے پتہ چلا سکتے ہو کہ یہ ایٹمی راکٹ اور میزائل کس جگہ پر
ہو رہے ہیں۔ یہاں ایک طرف انگریزی میں بمبئی لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے بمبئی
جو انڈین حکومت نے ایٹمی ری ایکٹر لگایا ہے یہ راکٹ میزائل اسی جگہ تیار ہوں
“

گل خان کہنے لگا۔

”اس بارے میں میں صحیح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمارا ایک آدمی نیوکلر فزکس کا
ہے۔ اس نے نیوکلر فزکس کا پورا کورس کیا ہوا ہے۔ وہی ہمیں یہ بلیو پرنٹ دیکھ کر
بتا سکے گا۔“

سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟“

گل خان نے کہا۔

”ہم اس کے پاس نہیں جا سکتے۔ میں آج رات کو اسے یہاں بلا لوں گا۔ تمہارے
چائے اور بناؤں؟“

شکریہ! تو پھر یہ بلیو پرنٹ تم اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ تمہارے تیار کئے ہوئے
م بموں نے بڑا کام دکھایا۔ دوار کا فورٹ کا اسلحے کا ذخیرہ انہی ٹائم بموں نے پورے
را اڑا دیا۔“

گل خان بولا۔

”ہم نے یہاں اخبارات میں سب کچھ پڑھ لیا تھا“

میں نے کہا۔

”مڈگھاٹ سٹیشن پر فوجی اسلحے کی ٹرین بھی انہی ٹائم بموں کی مدد سے ہم نے اڑائی
ریم بھائی بھی میرے ساتھ ہی تھا“

گل خان کہنے لگا۔

کریم بھائی سچا دین دار مسلمان اور نڈر مجاہد ہے۔ وہ تمہاری طرح تربیت یافتہ کمانڈو تو نہیں ہے لیکن بڑا بہادر آدمی ہے اور اسلام اور پاکستان کے نام پر تو وہ ہر وقت جان قربان کر دینے پر تیار ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں آتی دفعہ اس سے بھی احمد آباد میں نہیں مل سکا۔ را کے چیف پانڈے کے بنگلے پر ایک دم پولیس کا چھاپہ پڑ گیا اور مجھے بنگلے کی پچھلی کھڑکی سے کود کر فرار ہونا پڑا۔"

گل خان بلیو پرنٹ پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"تمہارا فرار ہو کر سیلاب کی وجہ سے باندرہ پہنچ جانا بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ تم وہاں نہ پہنچتے تو [illegible] کا یہ قیمتی بلیو پرنٹ کبھی ہمارے ہاتھ نہ آتا۔"

میں نے مغل ریسٹوران والے اپنے ماسٹر سپائی کا پوچھا تو گل خان بولا۔

"تم نے بڑا اچھا کیا کہ سٹیشن سے سیدھا میرے پاس آ گئے۔ مغل ریسٹوران پر دو روز پہلے ہی چھاپہ پڑا تھا اور پولیس ہمارے ماسٹر سپائی کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ کسی نے مخبری کی ہوگی یا ہمارے ماسٹر سپائی سے کوئی بھول ہو گئی ہوگی۔"

"اسے پولیس نے دلی میں رکھا ہوا ہے یا یہاں سے باہر کسی ٹارچر کیمپ میں منتقل کیا گیا ہے؟"

میرے اس سوال پر گل خان نے کہا۔

"ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور ہمیں اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ہمیں پیچھے نہیں آگے کی طرف دیکھنا ہے۔ اتنا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا کوئی بھی ماسٹر سپائی پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی اذیت ناک تشدد کے باوجود ہم میں سے کسی کا نام اور ٹھکانہ نہیں بتائے گا۔ وہ مر جائے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔"

گل خان نے راکٹوں والا بلیو پرنٹ سنبھال کر رکھ لیا۔ کہنے لگا۔

"میں اپنے آدمی سے ملنے جاتا ہوں۔ بلیو پرنٹ میں ساتھ نہیں لے جا رہا۔ کوشش کروں گا کہ وہ رات کو یہاں میرے مکان پر آ جائے۔"

ں نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا ہے اور کیا اس کے پیچھے انٹیلی جینس پولیس لگی ہے؟"

ل خان نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک سائنسی انسٹی ٹیوٹ میں ایک اہم عہدے پر کام کر رہا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا رابطہ ہم لوگوں سے ہے اور ام کشمیری مجاہدین اور پاکستان کا فدائی ہے اس لئے اسے بڑا محتاط ہو کر رہنا پڑتا ہے۔"

گل خان نے مجھے اس کا نام بتایا۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا آپ اسے جمشید کہہ لیں۔ گل خان نیو کلر فزکس کے پروفیسر جمشید سے ملنے چلا گیا۔ میں اس ان پر ہی رہا۔ گل خان اس دو کمروں والے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کی نہ بیوی ، بچے۔ وہ بڑا پابند صوم وصلوٰۃ تھا۔ محلے کی رفاعی کمیٹی کا ممبر تھا۔ یہ دلی کے ں کا محلہ تھا۔ وہاں کسی کو ذرا بھی معلوم نہیں تھا کہ گل خان ایک ٹرینڈ کمانڈو ہے ا ایکسپلوسیوز بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت وہ ٹائم بم تھے جو نے چیونگ گم کی شکل میں بنا کر مجھے دیئے تھے اور جنہوں نے مڈگھاٹ سٹیشن پر انڈین کی کشمیر جانے والی ایمونیشن ٹرین کو سٹیشن سمیت اڑا دیا تھا اور دوار کا فورٹ کے شن ڈمپ کو تباہ کر دیا تھا۔ اگرچہ سری نگر سے روانہ ہوتے وقت کشمیری مجاہد کمانڈو نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں از خود گل خان سے ملنے نہ جاؤں مگر میں نے اچھا سٹیشن سے سیدھا اس کے گھر چلا آیا۔ اگر میں اپنے ماسٹر سپائی کے ہاں دلی والے ران میں جاتا تو میرا پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جانا یقینی تھا۔ گل خان کا مکان میں ے پہلے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اور سرینگر جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اسی نے ٹوران تک پہنچنے کا راستہ بتایا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد گل خان واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"پروفیسر جمشید رات کو آئے گا۔ تم اوپر والے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں دوپہر

کو کھانا لے کر اوپر ہی آجاؤں گا۔ کمرے کی کھڑکیاں مت کھولنا۔ میں اسے ہمیشہ بن
ہوں۔ محلے میں کسی نے دیکھ لیا تو مجھ سے پوچھیں گے کہ اوپر کون آیا ہے۔ اگر
مسلمانوں کا محلہ ہے لیکن یہاں دو ایک آدمی پولیس کے مخبر بھی ہیں۔ مسلمانو
کمزوری انہیں لے ڈوبی ہے۔"

گل خان نے مجھے چابی دی۔ میں اوپر والے کمرے میں آگیا۔ مختصر سا کمرہ تھا
طرف دو کھڑکیاں کھلتی تھیں جو بند تھیں۔ موسم سردیوں کا تھا اس لئے مجھے بن
میں بھی سکون محسوس ہوا۔ ایک چارپائی بچھی تھی جس پر گرم کمبل اور بستر
چارپائی کے ساتھ ایک میز ایک کرسی لگی تھی۔ کونے میں چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔
کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا۔ دوسری جانب مکان کی چھت تھی۔ چھت پر
عورتیں بیٹھی دھوپ تاپ رہی تھیں۔ ایک لڑکی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں
تھکا ہوا تھا۔ چارپائی پر پڑ کر سو گیا۔

دوپہر کے بعد گل خان نے مجھے آکر جگایا۔ وہ میرے لئے کھانا لایا تھا۔ اس
ملازم رکھا ہوا تھا جو اسے کھانا وغیرہ پکا دیتا تھا۔ میں کھانا کھانے لگا۔ وہ میرے پاس
کہنے لگا۔

"ٹائم بموں کو تم ابھی اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم کچھ اور
لیں گے۔ یہاں دلی میں اس میں استعمال ہونے والی ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے

اس کے بعد وہ چلا گیا۔

میں اپنے کمرے میں کھانا کھانے کے بعد کمبل اوڑھ کر پھر سو گیا۔ شام
جب گل خان نے مجھے آکر جگایا۔ وہ میرے لئے بازار سے ایک نئی گرم قمیض
خرید کر لایا تھا۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا اور نئی پتلون کے ساتھ
پہن لی۔ جب ہم رات کا کھانا کھا چکے تو پروفیسر جمشید بھی آگیا۔

یہ ایک دبلا پتلا سانولے رنگ کا چمکیلے بالوں والا آدمی تھا۔ بالوں میں
سفیدی جھلک رہی تھی۔ کلین شیو تھا۔ اس نے گیبرڈین کا بھورے رنگ کا

ہوا تھا۔ گل خان نے میرا تعارف کرایا۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ملا۔ گل خان نے اسے
ے بارے میں پہلے سے بتا دیا ہوا تھا۔ ہم نچلی منزل کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔
مکان میں یہی دو کمرے تھے۔ ایک بیٹھک اور اس کے اوپر ایک کمرہ اوپر والے
ے میں آگے تھوڑا سا صحن تھا بتی جل رہی تھی۔ گل خان نے پروفیسر جمشید کو بلیو
ن والا کاغذ نکال کر دیا۔ پروفیسر نے کوٹ کی جیب میں سے عینک نکال کر لگائی اور میز پر
رنٹ رکھ کر اس پر جھک گیا۔ اس کے چہرے پر تجسس کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے
۔ گل خان نے پوچھا۔

"پروفیسر! تمہیں اس میں کوئی خاص بات نظر آئی؟؟"

پروفیسر جمشید نے بلیو پرنٹ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"انڈین گورنمنٹ تو پلوٹونیم بم کا دھماکہ کرنے اور نیو کلر راکٹ نیو کلر وار ہیڈ کے
ئل بنانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ یہ اسی کا خاکہ ہے۔"

گل خان نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ بھارت میں کس جگہ بن رہا ہے؟؟"

پروفیسر نے بلیو پرنٹ سے نظریں ہٹاتے ہوئے عینک اتار کر میز پر رکھ دی اور کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بھارتی حکومت نے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہی
لت کو ڈاکٹر بھابھا کی سرپرستی میں انڈین اٹامک انرجی کمشن قائم کر دیا تھا۔ اس نے
یافتہ ممالک سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوششیں بھی شروع کر دی تھیں۔ پھر
19ء میں بھارت کے پہلے ایٹمی ری ایکٹر نے کام شروع کر دیا تھا جو بمبئی میں ٹرامبے کے
ا رہے۔ اب اسی ایٹمی ری ایکٹر میں پلوٹونیم صاف کرنے کا پلانٹ لگایا گیا ہے۔ اس بلیو
ٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اسرائیل بھارت کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔
بلیو پرنٹ میں ان راکٹوں اور میزائلوں کے بھی خاکے بنائے گئے ہیں جن میں پلوٹونیم
ہیڈ کے ساتھ اس جگہ تیار کیا جائے گا۔"

گل خان نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں بھارت کب تک اپنے ایٹمی پروگرام میں کامیاب ہو جائے گا؟"
پروفیسر جمشید عینک لگا کر دوبار بلیو پرنٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔
"اس بلیو پرنٹ پر جو علامتیں اور خاکے بنائے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے
بھارت دو چار سالوں کے اندر اندر ایٹمی دھماکہ کرے گا اور وہ دنیا کے نقشے پر ایٹمی
بن کر سامنے آجائے گا۔ اس بلیو پرنٹ سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ بھارت پہلے پلو
بم کا دھماکہ کرے گا۔ پلوٹونیم کے ایک چھوٹے بم میں پانچ سے دس کلو گرام پلو
استعمال ہوتا ہے۔ امریکہ نے ہیروشیما پر تو ایٹم بم گرایا تھا مگر ناگاساکی پر اس نے پلو
گرایا تھا جس سے ناگاساکی کے دس ہزار شہری اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے۔ پلوٹونیم
بم سے کم ہلاکت خیز ہوتا ہے اور اس کا دائرہ اثر کسی ایک شہر تک ہی محدود رہتا
لازمی طور پر بھارت یہ بم وقت آنے پر پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا اور وہ
راولپنڈی اور لاہور کے شہروں کو تباہ کرنے کی ناپاک کوشش کرے گا۔"
میں نے کہا۔
"اس کا توڑ کیا ہو سکتا ہے؟ یعنی ہم پاکستان کے تحفظ کے لئے کیا اقدام ک
ہیں۔"
پروفیسر جمشید نے کہا۔
"سب سے بہترین توڑ تو یہ ہے کہ پاکستان بھی ایٹمی صلاحیت حاصل کرے۔ ا
پلوٹونیم بم بناتا ہے تو پاکستان کو ایٹم بم بنانا چاہئے تاکہ طاقت کا توازن برقرار رہے اور
معلوم ہو جائے کہ اگر اس نے لاہور یا کراچی پر پلوٹونیم بم گرایا تو پاکستان دلی
کلکتے پر ایٹم بم گرا کر انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دے گا۔ دشمن کے طاقتور حملے کو صر
سے زیادہ طاقت ور جوابی حملے سے ہی روکا جا سکتا ہے۔"
گل خان گہری سوچ میں تھا۔ کہنے لگا۔
"کیا ہم کسی طرح بھارت کے ایٹمی عزائم کو ناکام نہیں بنا سکتے؟"
پروفیسر جمشید عینک اتار کر رومال سے اس کے شیشے صاف کرنے لگا۔ اس

بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔
انڈیا نے اپنے ایٹمی پروگرام کو بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے۔ اس پروگرام کو
بنانے کے لئے بھارت میں وسیع پیمانے پر ایٹمی سائنس پر پر تحقیق کی جا رہی
بھارتی سائنس دانوں کی ایک پوری جماعت اس پر کام کر رہی ہے۔ اس کے
ام کو ناکام بنانا مشکل ہے ہاں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ بھارت کے باہر کے ملکوں سے
م یا پلوٹونیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے بھارت میں پہنچنے سے پہلے
پہنچنے پر تباہ کر دیں اس طرح سے ہم بھارت کے ایٹمی پروگرام کو موخر کر سکتے

خان نے جذباتی انداز میں کہا۔
اور اگر ہم بھارت کے ایٹمی ری ایکٹر کو ہی تباہ کر دیتے ہیں تو؟"
فیسر جمشید نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔
یہ کام اتنا آسان نہیں ہو گا"
نے کہا۔
پروفیسر! ہمارے لئے کوئی کام مشکل کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم نے اسلام یا
اور کشمیری مسلمانوں کی آزادی اور سلامتی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی
یہ بتاؤ کہ ایک ایٹمی ری ایکٹر میں وہ کون سا کلیدی مقام ہوتا ہے کہ اگر اسے اڑا
تو سارا ڈھانچہ تباہ ہو جائے۔"
فیسر جمشید نے کہا۔
جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس وقت بھارت میں بمبئی کے قریب ایک
ری ایکٹر کام کر رہا ہے جس کے بارے میں یہی مشہور کیا گیا ہے کہ وہاں سے بجلی کے
حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن مجھے ایک خفیہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ راجستھان
مقام پر زیر زمین ایک خفیہ ایٹمی ری ایکٹر بھی کام کر رہا ہے۔ وہاں پلوٹونیم صاف
پلانٹ دن رات کام کرتا ہے۔ وہاں پلوٹونیم تیار کیا جا رہا ہے۔ اصل ایٹمی مرکز

راجستھان کا یہ خفیہ پلانٹ ہے۔ اگر کسی طریقے سے ہم اسے اڑا دیں تو میرے انداز
کے مطابق بھارت کا ایٹمی پروگرام کم از کم سات آٹھ سال موخر ہو سکتا ہے۔"

میں نے گل خان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میں اس مشن کو قبول کرتا ہوں"

پھر میں نے پروفیسر سے متوجہ ہو کر کہا۔

"پروفیسر کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ اس زیر زمین ایٹمی ری ایکٹر کی کون سی ایک
حساس کلیدی جگہ ہے جہاں پر اٹیک کرنے سے یہ ایٹمی مرکز تباہ ہو سکتا ہے"

پروفیسر جمشید نے کہا۔

"میں اس بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے کل رات آپ کو بتا سکتا ہوں۔"

بات اگلی رات پر جا پڑی۔ اگلی رات کا وقت طے کر لیا گیا اور پروفیسر جمشید چلا گیا
اس کے جانے کے بعد میں اور گل خان باتیں کرنے لگے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ کشمیر
میں مجاہدین نے جہاد کی سرگرمیوں کو تیز کر دیا ہے۔ تازہ دم بھارتی فوجی یونٹیں وہاں پہنچ
رہی ہیں اور مجاہدین ان کے فوجی ٹھکانوں کو کمانڈو آپریشن سے تباہ کر رہے ہیں۔

وہ کہنے لگا۔

"مڈ گھاٹ پر تم لوگوں نے جو فوجی اسلحہ کی ٹرین اڑائی تھی اور پھر دوار کا فورٹ کو تباہ
کیا۔ اس سے مجاہدین آزادی کے حوصلے بہت بلند ہوئے ہیں۔ ان کا مورال اپ ہو
ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"میرا پروگرام تو یہ تھا کہ یہاں سے سیدھا کشمیر کے محاذ پر چلا جاؤں گا اور شیرا
اور دوسرے کشمیری کمانڈوز کے ساتھ مل کر جہاد میں شریک ہوں گا لیکن جب سے یہ
ہوا ہے کہ پاکستان کے خلاف بھارتی حکومت نے ایٹمی میزائلوں کی تیاری شروع کر
ہے میں نے جہاد کشمیر میں شرکت کا ارادہ کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ میں سب
پہلے راجستھان کے زیر زمین خفیہ ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔"

ل خان نے کہا۔

اس کے متعلق پروفیسر جمشید کل رات ہمیں کچھ بتا سکے گا کہ ہم کس طریقے سے
یکشن کر سکتے ہیں۔ میں اب سونے جاتا ہوں۔ صبح ملاقات ہو گی"

گل خان بھی چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ کر راجستھان کے اٹامک انرجی کمشن ری ایکٹر
ے میں سوچنے لگا۔ اس قسم کے حساس اداروں میں سیکورٹی کے بہت سخت انتظام
ہیں۔ ایٹمی ری ایکٹر میں جتنے سائنس دان، ٹیکنیشن کلرک مزدور وغیرہ کام کرتے
گے ان کے پاس باقاعدہ شناختی کارڈ ہوں گے۔ ان کی آتے جاتے زبردست چیکنگ
ہو گی۔ باہر کے آدمی کا داخل ہونا بہت مشکل ہو گا۔ پھر بھی میں پر امید تھا۔ مجھے
میرے ایٹمی ری ایکٹر میں داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا ہو
اس ری ایکٹر کو تباہ کرنا اب ضروری ہو گیا تھا۔ اگر یہ انڈیا کی سیکورٹی کا معاملہ
تان کی نیشنل سیکورٹی کا نازک مسئلہ بھی تھا۔ میں یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ جنگ
نے کی صورت میں انڈیا پاکستان کے شہروں پر پلوٹونیم بم یا ایٹمی میزائل گرا کر
بے گناہ پاکستانی عورتوں مردوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ یہ میرا
ر پاکستانی فریضہ تھا کہ میں دشمن کے ایٹمی ہتھکنڈوں کو جتنا نقصان پہنچا سکتا ہوں
نچاؤں۔ چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

سرا دن طلوع ہوا۔ گل خان میرے ساتھ ناشتہ کر کے چلا گیا۔ دوپہر کو آیا تو میرے
ھ گیا۔ وہ کچھ فکر مند تھا۔ کہنے لگا۔

یرے آدمی نے اطلاع دی ہے کہ نئی دلی کے تھانے میں تمہاری تصویر موجود
احمد آباد میں تم نے کوئی تصویر اتروائی تھی۔"

ں نے اسے بتایا کہ پولیس نے جب مجھے گرفتار کیا تھا تو میری تصویر اتروا کر احمد آباد
ی جہاں سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جو نقلی کیپٹن
تھ بن کر دوار کا فورٹ میں آیا تھا اور گولہ بارود کے ذخیرے کو تباہ کرنے کے بعد
گیا تھا۔

گل خان کہنے لگا۔

"اب تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اچھا کیا جو تمہیں یہاں سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ اگرچہ پولیس تمہیں دلی میں تلاش کرتی نہیں پھر رہی۔ ایسی کوئی ہنگا صورت حال نہیں ہے۔ لیکن پولیس کو تمہاری تلاش ضرور ہے اور دلی کے تمام پولیر سٹیشنوں کو خبردار کر دیا گیا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ جس قسم کے مخدوش حالات پیدا ہو گئے ہیں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ڈاڑھی مونچھیں بڑھا لوں اور جس قدر حلیہ بدل سک ہوں بدل لوں کیونکہ مجھے دلی اور راجستھان کے آس پاس ہی رہنا ہے اور کمانڈو آپریش شروع کرنا ہے۔"

گل خان بولا۔

"کم از کم یہ تو تمہیں ضرور کرنا ہو گا تمہارے سر کے بال زیادہ بڑے نہیں ہیں آج سے شیو کرنی بھی چھوڑ دو۔ اور یہاں سے ہرگز باہر مت نکلنا۔ محلے میں ابھی تک کسی کو تمہارے بارے میں علم نہیں ہے کہ تم میرے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ کیونکہ یہاں تمہاری مخبری ہو سکتی تھی"

میں نے اسے کہا۔

"ڈاڑھی مونچھوں کے بال بڑھنے میں تو بہت دن لگ جائیں گے۔ اتنے دن مر یہاں کیسے چھپا رہوں گا۔ کسی نہ کسی کو ضرور میرا پتہ چل جائے گا اور میں اس وقت کر حالت میں بھی گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا مشن ہے جسے مجھے ہ حالت میں پورا کرنا ہے۔ یعنی راجستھان کے انڈین ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی۔"

گل خان بولا۔

"رات کو پروفیسر جمشید کو آجانے دو وہ جو کچھ بتائے گا اس کی روشنی میں آگے کوأ فیصلہ کریں گے۔"

وہ دن بھی کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔ میں گل خان کے مکان کے اوپر والے کمرے ہی بند رہا۔ وہ مجھے پانچ بجے آکر چائے بھی بنا کر دے گیا۔ اس نے احتیاط کے طور پر ہانا وغیرہ پکانے والے ملازم کو بھی چھٹی پر بھیج دیا تھا۔ تاکہ کسی کو خبر تک نہ ہو کہ اس مکان میں ایک پراسرار اجنبی ٹھہرا ہوا ہے۔

رات کے دس بجے پروفیسر جمشید آیا۔

اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی امید افزا معلومات حاصل کر کے نہیں لایا۔ میں اور گل خان اوپر والے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ گل خان نے اس سے پوچھا کہ اس نے کیا معلومات حاصل کی ہیں۔

پروفیسر جمشید سگریٹ سلگا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بھارت کا یہ خفیہ ایٹمی ری ایکٹر راجستھان میں راج گڑھ سے آگے رام گڑھ کے مغرب میں دو صحرائی ٹیلوں کے درمیان زمین کے اندر بنایا گیا ہے۔ اس کا ریکارڈ کسی سرکاری فائل میں ایٹمی ری ایکٹر کی حیثیت سے نہیں ہے۔ صحرائی ٹیلوں کے درمیان ایک جانب چھوٹی سی دو منزلہ عمارت بنی ہوئی ہے جس کے باہر منرل یعنی معدنی ریسرچ سنٹر کا بورڈ لگا ہے۔ ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ یہاں معدنیات کے بارے میں تحقیق کا کام ہوتا ہے لیکن اس عمارت کے نیچے ایٹمی ری ایکٹر لگا ہوا ہے جس کو راستہ اسی آفس کے اندرونی احاطے کے ایک خفیہ کمرے سے ہو کر جاتا ہے۔ اس ایٹمی ری ایکٹر میں پلوٹونیم کا پلانٹ لگا ہے۔ جہاں افزودہ یورینیم اور ایٹمی ایندھن تیار کرنے پر بھی کام شروع ہو چکا ہے۔ یہ ایٹمی ری ایکٹر زمین کے نیچے کافی وسیع رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور انتہائی جدید پیمانے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ تازہ ہوا اور پانی کے نکاس کا پورا انتظام ہے۔ جہاں تک سکیورٹی کا معاملہ ہے تو میری معلومات کے مطابق اس دفتر اور خاص طور پر زیرِ زمین ایٹمی ری ایکٹر کے اندر وہاں کے کارکنوں کے سوا کسی دوسرے آدمی کا داخل ہونا ناممکن ہے۔ وہاں کوئی ڈیڑھ دو سو کے قریب سائنس دان اور ٹیکنیشن مختلف شفٹوں میں کام کرتے ہیں اور دن

کام ہو رہا ہے۔"

میں اور گل خان خاموشی سے پروفیسر جمشید کی باتیں سن رہے تھے۔ گل خان کچھ سا ہو گیا تھا۔ مگر میں ناامید نہیں تھا میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"وہاں کام کرنے والے لوگ کہاں رہتے ہیں؟"

پروفیسر نے بتایا کہ رام گڑھ سے پہلے راج گڑھ کے بڑے قصبے میں ان کے لئے پختہ روں اور تین تین کمروں والے کوٹھی نما کوارٹرز بنے ہیں۔ یہ لوگ وہاں رہتے ہیں نام نہاد منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی گاڑیاں انہیں لینے آجاتی ہیں۔ وہاں کسی بڑے نس دان کو بھی اپنی کار رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

"اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ کسی کو شک نہ پڑے کہ یہ اونچے عہدے کے لوگ راتنے چھوٹے سے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کیسے ملازم ہو گئے ہیں"

پروفیسر جمشید نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں کسی کو اپنی فیملی لانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ہفتہ وار چھٹی پر یہ لوگ لی یا دوسرے قریبی شہروں میں اپنی اپنی فیملی کو ملنے چلے جاتے ہیں۔ جو سائنس دان ے بڑے شہروں یعنی دلی، بمبئی کلکتہ سے یہاں آئے ہیں وہ مہینے میں ایک بار اپنے گھر ہیں انہیں صرف چار دن کی چھٹی ملتی ہے۔ یہاں ہر شے انتہائی رازداری میں رکھی ہے۔ اگر میں سرکاری سائنسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کام نہ کر رہا ہوتا تو اتنی ت بھی حاصل کرنا ناممکن تھا۔"

پروفیسر جمشید چونکہ ہمارا اپنا آدمی تھا اس لئے گل خان نے اسے بھی بتا دیا کہ نئی دلی لیس سٹیشن پر میری تصویر پہنچ چکی ہے۔ پروفیسر جمشید کی میں نے یہ عادت نوٹ کی جب بھی وہ کسی بات پر ذرا سوچنے لگتا تھا تو عینک اتار کر رومال سے اس کے شیشے رنے لگ جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔ وہ میری طرف تھا۔ پھر گل خان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے ہمارے دوست کو فوراً اپنا حلیہ تبدیل کرنا ہو گا"

گل خان نے کہا۔

"یہ کام ابھی سے شروع ہو گیا ہے"

میں نے کہا۔

"میں یہی کر سکتا ہوں کہ سر کے بال بڑھا لوں۔ داڑھی مونچھیں رکھ لوں۔ پلاسٹک سرجری تو میں کرا نہیں سکتا۔"

پروفیسر جمشید نے گہری سوچ میں سے ابھرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری پلاسٹک سرجری بھی کرائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے بڑی رازداری کی ضرورت ہوگی۔ اور پھر بہترین پلاسٹک سرجن مدراس میں ہے۔ مگر اس پر کافی رقم خرچ ہوگی۔ ہمارے پاس اتنے فنڈ نہیں ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی پروفیسر' میں اپنا حلیہ اس طرح تبدیل کروں گا کہ پولیس بھی مجھے نہیں پہچان سکے گی۔ میں تو اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ راجستھان کے ایٹمی ری ایکٹر میں کس طرح داخل ہوا جائے اور پھر صرف داخل ہونا ہی کافی نہیں۔ وہاں رہ کر ماحول کا جائزہ لینا ہو گا اور ایسی سکیم تیار کرنی ہوگی کہ ایٹمی ری ایکٹر کے پلانٹ کو دھماکے سے اڑایا جا سکے۔"

ہم تینوں خاموش ہو گئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا کیا ایسا کوئی ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ میں ایٹمی ری ایکٹر میں معمولی کلرک یا مزدور کی شکل میں بھرتی ہو جاؤں؟

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"وہاں کسی مقامی آدمی کو ملازم نہیں رکھا جاتا۔ جتنے کلرک یا آن سلکٹر ورکرز ہیں انہیں بھی ریواڑی کے شہر یا دلی سے بھرتی کر کے وہاں بھیجا گیا ہے۔ ان کی باقاعدہ بریفنگ ہوئی ہے اور ان سے تحریری حلف لیا گیا ہے کہ وہ باہر اپنی بیوی بچوں سے بھ ایٹمی ری ایکٹر کی سرگرمیوں کے بارے میں ذکر نہیں کریں گے۔ انہوں نے اپنے فیما

ں کو بھی یہی بتایا ہوا ہے کہ وہ رام گڑھ کے معدنیاتی ریسرچ سنٹر میں کام کرتے ہیں۔ ں راجستھان کی زمین کے اندر معدنی ذخائر کی بابت ریسرچ ورک ہوتا ہے۔"

میں نے یونہی پروفیسر سے سوال کر دیا۔

"اس ایٹمی ری ایکٹر کا ڈائریکٹر ضرور کوئی اسرائیلی ہو گا"

پروفیسر نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ اس کا ڈائریکٹر ایک سکھ سائنس دان ہے جس نے امریکہ اور سویڈن ایٹمی پروسیسنگ اور نیوکلر فزکس کی خاص طور پر تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا نام ٹر ارجن سنگھ سوڈھی ہے۔ اس کی فیملی بھی دلی میں رہتی ہے۔ وہ اکیلا راج گڑھ کے ئی کوارٹرز میں ایک نسبتاً بہتر چھوٹی سی کوٹھی میں اکیلا رہتا ہے۔ مہینے میں ایک بار دلی فیملی کے پاس جاتا ہے۔ ویسے اس کے بارے میں میرے سراغ رساں نے ایک پ بات ضرور بتائی ہے"

وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

پروفیسر مسکراتے ہوئے بولا۔

"سردار جی پیتے پلاتے بھی ہیں اور ہفتے کی رات کو ریواڑی میں کسی عورت کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں اس نے یہی بتایا ہوا ہے کہ ریواڑی میں اس کا چھوٹا بھائی رہتا ہے۔ اس کے پاس ویک اینڈ گزارنے چلا ہے۔"

میری خاص کمانڈو حس بیدار ہوئی۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

پروفیسر بولا۔

"میرے سراغ رساں کا کہنا ہے کہ یہ ریواڑی کی کوئی نیم طوائف ہندو عورت ہے اس کا نام درگاوتی ہے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک پوری کی پوری سکیم آگئی۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"آپ مجھے ریواڑی میں درگاوتی کے مکان کا پتہ لا کر دے سکتے ہیں؟"

گل خان میری طرف تکنے لگا۔

"یہ تم کس لئے پوچھ رہے ہو؟"

میں نے اسے کہا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ کیونکہ میرا کوئی منصوبہ ایسا نہیں ہوگا جس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ پڑے۔"

پروفیسر نے کہا کہ وہ اپنے آدمی سے درگاوتی کا ریواڑی کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے گل خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"گل خان بھائی! میں نے سر کے بال اور ڈاڑھی مونچھیں بڑھانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ اب میرے کام آئے گا"

اس نے پوچھا۔

"وہ کس طرح؟"

میں نے کہا۔

"مجھے سکھ بننا ہوگا۔ میں سکھوں کی طرح اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر پگڑھی باندھوں اور ڈاڑھی بھی سکھوں ایسی بڑھاؤں گا۔"

"مگر اس میں تو دو مہینے لگ جائیں گے"

"کوئی بات نہیں۔ میرے کمانڈو مشن کا تقاضا ہے کہ میں جب تک پورا سکھ نہ جاؤں۔ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھاؤں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ دلی پولیس آ سے مجھے پہچان نہیں سکے گی۔"

"لیکن تم سکھ بن کر کرو گے کیا؟" پروفیسر نے سوال کیا۔ میں نے اسے جواب دیا

"پہلے مجھے سکھ بن جانے دو۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ میرے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔ تم صرف مجھے اتنا بتا دو کہ کہیں دو مہینوں میں ایٹمی ری ایکٹر کا ڈائریکٹر ارجن سوڈھی یہاں سے تبدیل ہو کر تو نہیں چلا جائے گا؟"

پروفیسر جمشید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایٹمی ری ایکٹر کے پراجیکٹ میں کسی چھوٹے سے چھوٹے ملازم کو بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ساتھ لانگ ٹرم کے معاہدے ہوئے ہیں اور ڈائریکٹر ارجن سنگھ سوڈھی تو پلوٹونیم بم کے دھماکے اور ایٹمی راکٹ اور میزائل تیار کرنے تک وہیں رہے گا۔ یہ بات طے شدہ ہے۔"

میں نے مطمئن ہو کر کہا۔

"بس پھر ٹھیک ہے"

ان لوگوں نے مجھ سے بہت پوچھا کہ میری سکیم کیا ہے مگر میں نے یہی کہا کہ اپنی سکیم سکھوں والا حلیہ بنانے اور اپنا ایک نقلی سکھ نام رکھنے کے بعد بتاؤں گا۔

چونکہ ابھی مجھے اپنے سر کے اور ڈاڑھی کے بالوں کے بڑے ہونے کے انتظار میں کم از کم ڈیڑھ دو ماہ تک وہاں ٹھہرنا تھا اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے گل خان کے مکان سے کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں میں آسانی سے آس پاس چل پھر سکوں اور کوئی مجھے آسانی سے دیکھ بھی نہ سکے۔ ایسی جگہ دلی شہر کے شمال مغرب میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کے عقب میں جو پرانا قبرستان ہے وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر جنگلی بیریوں کے درختوں کے نیچے ایک پرانی قبر ہے۔ اس قبر کی چار دیواری کے پاس ایک پرانا مکان تھا یہاں گل خان مجھے لے آیا۔

"یہاں تم پر کسی کو شبہ نہیں پڑے گا۔ تم ویسے دن کے وقت مزار شریف کی طرف مت جانا۔ کیونکہ زیادہ لوگ اس طرف ہوتے ہیں۔ ایک لڑکا تمہیں صبح شام کھانا پہنچا دیا کرے گا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں دوسرے تیسرے دن آجایا کروں گا۔ اگر کسی قسم کی ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو کوشش کرنا کہ خواجہ صاحبؒ کے مزار کے بڑے گیٹ کے پاس پبلک ٹیلی فون بوتھ سے مجھے اس نمبر پر خبر کر دینا۔"

گل خان نے مجھے نمبر لکھ دیا۔ یہ ایک شکستہ دیواروں اور چھت والے اکیلے کمرے کا مکان تھا جس کے آگے چھوٹا سا صحن اور آگے دیوار تھی جس پر املی کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ چارپائی اور بستر پہلے سے پہنچا دیا گیا

تھا۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ دسمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ میں صبح صبح اٹھ کر مکان کے
پیچھے جو کھیت تھے اور جہاں مغلیہ زمانے کی ایک پرانی قبر کی چاردیواری تھی اس طرف سیر
کرنے نکل جاتا۔ تھوڑی دور تک سیر کرتا۔ وہیں تھوڑی سی ورزش کرتا۔ کیونکہ کمانڈو کو
اپنے آپ کو فٹ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک دس بارہ سال کا لڑکا سائیکل پر میرے لئے
دو وقت کا کھانا اور تھرمس میں چائے لے کر آجاتا۔ دن کا سارا وقت میں مکان کے اندر
اور مکان کے صحن میں دھوپ میں بیٹھ کر گزار دیتا۔ چھوٹا سا غسل خانہ مکان کے احاطے
کے کونے میں تھا۔ ایک دن چھوڑ کر گل خان بھی آجاتا اور میرے پاس بیٹھا مجھ سے باتیں
کرتا رہتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ نئی دلی پولیس کی جانب سے میری تلاش کے سلسلے میں
ابھی تک کوئی نمایاں کارروائی شروع نہیں کی گئی۔

”تمہاری تصویر نئی دلی کے تھانے میں دوسرے مجرموں کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے۔
ہم اگر وہاں سے تصویر نکال بھی لائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ ایک تصویر گم ہو جانے
کے بعد وہاں دوسری تصویر لگا دی جائے گی۔“

ہفتے کی شام کو پروفیسر جمشید بھی آجاتا۔ آہستہ آہستہ میرے سر کے اور ڈاڑھی
مونچھوں کے بال بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک قدرتی عمل تھا۔ گل خان نے دو تین بار مجھ سے
یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں سکھ بن کر کیا کروں گا۔ میں نے ہنس کر اسے
ٹال دیا۔ میں وقت آنے سے پہلے انہیں اپنے منصوبے اور کمانڈو ایکشن کے بارے میں
کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے منصوبے پر ضرور ہنسیں گے اور اسے
دور از کار اور ناقابل عمل بتائیں گے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی لیکن مجھے
مردوں کی نفسیات خاص طور پر سکھوں کی نفسیات کا گہرا تجربہ تھا۔ شاید اس لئے بھی
میں سکھوں کے مقدس شہر امرتسر کا رہنے والا تھا اور بچپن سے سکھوں کو دیکھتا چلا آیا تھا۔
مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کا سوفیصد نہ سہی ساٹھ فیصد ضرور یقین تھا اور میرے
ساٹھ فیصد کامیابی کافی تھی۔

دن کو سردی کی وجہ سے میں تھوڑی بہت دھوپ تاپ لیتا تھا۔ رات کے وقت ک

کر چارپائی پر بیٹھا اندھیرے میں سگریٹ پیتا رہتا۔ مجھے رات کے وقت لالٹین یا دیا
انے سے گل خان نے منع کر رکھا تھا۔ دسمبر کے آخر اور جنوری کے مہینے کے شروع
رشیں ضرور ہوا کرتی ہیں۔ یہ سردیوں کی بارشیں ہوتی ہیں اور بڑی ٹھنڈی ہوائیں
ہیں۔ گل خان نے مجھے ایک نیلے رنگ کا پرانا گرم اوور کوٹ دے دیا تھا کہ اگر
زیادہ ہو تو میں اسے پہن لیا کروں۔ مجھے اس شکستہ مکان میں آئے دس پندرہ دن ہو
تھے۔ میری ڈاڑھی کے اور سر کے بال کافی بڑھ آئے تھے۔ مگر ابھی سکھوں والی
ڈاڑھی نہیں بنی تھی اور سر کے بالوں کا بھی جوڑا نہیں بن سکتا تھا۔

ایک دن صبح کو ہی آسمان پر بادل چھانا شروع ہو گئے۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔
میں اضافہ ہو گیا۔ میں کمرے میں ہی دروازہ بند کر کے چارپائی پر کمبل اوڑھے لیٹا
گل خان ایک دن پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا۔ اس کے آنے کی امید نہیں تھی۔
ل والا لڑکا ٹفن کیریئر میں دو وقت کا کھانا اور چائے والی تھرمس دے کر جا چکا تھا۔ میں
ے کے بعد کچھ دیر کے لئے سو گیا۔

سو کر اٹھا تو مجھے باہر بادلوں کی گرج سنائی دی۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے
مجھ گیا کہ باہر شام ہو گئی ہے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کا ایک پٹ کھولا تو اندر سرد ہوا کا
کا آیا۔ مجھے کمانڈو ٹریننگ نے بہت سخت جان بنا دیا ہوا تھا۔ عام لوگوں کی طرح مجھے
ی گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا۔ یہی حال بھوک پیاس کا تھا۔ میں زیادہ سے
دیر تک بھوک اور پیاس کو برداشت کر سکتا تھا۔ میں کھڑکی میں ہی کھڑا رہا۔ باہر
ج غروب ہو چکا تھا اور شام کا سرمئی دھندلکا بادلوں کی وجہ سے زیادہ گہرا ہونے لگا تھا۔
نے ہاتھ الٹا کر کے کھڑکی سے باہر نکالا۔ ابھی بارش شروع نہیں ہوئی تھی بادل میں
ی تھوڑی دیر کے بعد ہلکی کبھی زیادہ گرج سنائی دے جاتی تھی۔

میرا دل کمرے کی فضا سے نکل کر باہر سیر کرنے کو مچلنے لگا۔ یہ جگہ ایک تو ویسے بھی
آباد علاقے میں تھی اور دوسرے سردی اور بادلوں کی وجہ سے دور دور تک کوئی انسان
پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لمبا گرم اوور کوٹ پہنا۔ کمرے کو تالا لگایا اور

مکان کے عقب میں جو میدان تھا اس کے ساتھ ساتھ درگاہ شریف کی طرف چلنے لگا۔ ہو
ہوا چل رہی تھی۔ خوب سردی پڑنے لگی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے وسطی ہند
کے تاریک جنگلوں کی راتوں کے اندھیرے دیکھے تھے۔ یہ تو شہر کی شام کا اندھیرا تھا۔ اس
میں مجھے ہر شے صاف نظر آرہی تھی۔ جنگلوں میں راتوں کو دربدری کرتے رہنے کی وجہ
سے میری آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں کی تھوڑی تھوڑی صفت پیدا ہو گئی تھی اور جہاں
دوسرے آدمی کو رات کے وقت کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا وہاں میں کچھ نہ کچھ دیکھ لیتا تھا۔

چلتے چلتے میں ان بیریوں کے درختوں کے پاس پہنچ گیا جو کسی مغلیہ دور کی کسی
قبر کی دیوار پر جھکے ہوئے تھے۔ جب میں قبر کے احاطے کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے قریب سے
گزرا تو میرے دل میں قبر پر فاتحہ پڑھنے کا خیال آگیا۔ میں نے وہیں سے اپنا رخ احا
کے دروازے کی طرف کر لیا۔ دروازہ دیوار سے زیادہ خستہ حال تھا۔ بس پرانی اینٹوں
چوکھٹ ہی رہ گئی تھی۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کی پرانی اینٹیں بھی جگہ جگہ
اکھڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے سنگ مرمر
ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر پر کوئی دیا نہیں جل رہا تھا۔ رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے
قبر پر ایک افسردہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاموشی سرد آہیں بھرتی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور قبر کے قریب ہی ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا
خدا جانے یہ کس شہزادے یا شہزادی یا کس گمنام ہستی کی قبر ہو گی۔ جس کی زندگی
کیسے ہنگاموں سے بھرپور گزری ہو گی۔ اور اب اس کی قبر پر سوائے ویران اور غم
انگیز خاموشی کے اور کچھ باقی نہیں۔ میں اپنی محدود سوچ کے مطابق انسان کی بے ثبا
غور کرنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں' میں نے سوچا' کہ اگر انسان اپنی موت کے تصـ
اپنی قبر کے تصور کو آنکھوں کے سامنے رکھے یا کبھی کبھی اس کا تصور ہی کر لیا کرے
بہت سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

بادلوں میں بجلی کی چمک پیدا ہوئی۔ دو سیکنڈ بعد بادل گرجے اور آہستہ آہستہ
گرج دور ہوتی گئی۔ یہاں سردی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ قبر کے احا

ساری رات کے اندھیرے میں گم ہو رہی تھی۔ جس طرف دیوار پر بیری کے درخت
ہوئے تھے اس طرف زیادہ اندھیرا تھا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہم بیری کے درختوں
سے ڈرا کرتے تھے اور گرمیوں کی دوپہروں میں ان درختوں کے پاس نہیں جایا کرتے
اگر جاتے بھی تو ایک خوف دل میں رہتا تھا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ بیری کے
ں میں چڑیلیں رہتی ہیں جو بچوں کو پکڑ کر ان کے کلیجے نکال کر کھا جاتی ہیں۔ بڑے ہو
ر خاص طور پر کمانڈو بن جانے کے بعد اس قسم کے ڈر خوف سے میرا ذہن پاک ہو
۔ اب تو ایسے ایسے خطرناک جنگلوں میں ایسے ایسے گھنے درختوں پر راتیں گزاری
کہ اگر آپ ان درختوں کو دن کے وقت دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔ میں مغلیہ عہد کی
قبر کے پاس شروع رات کے اندھیرے میں اطمینان سے بیٹھا تھا۔ مجھے بالکل ڈر
محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا۔

گرم اوورکوٹ میں مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ بادلوں میں ایک بار پھر بجلی
گئی اور اس کے بعد بادل گرجنے لگے۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ میں جہاں
تھا میرے اوپر درخت کی گھنی شاخیں تھیں۔ مجھے ان شاخوں میں بارش کے قطروں
رنے کی خاص آواز سنائی دی۔ بارش شروع ہو گئی تھی۔ پھر میرے سر پر بھی بارش
ایک بوندیں گریں۔ میں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہیے۔ میں اٹھنے لگا تو مجھے
لگا جیسے کسی نے سرد آہ بھری ہو۔ یہ آواز میں نے صاف سنی۔ میں نے آس پاس
رے میں دیکھا وہاں سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ آپ نے میری داستان میں
ہو گا کہ میں روحوں کا بڑا قائل ہوں۔ صرف قائل ہی نہیں ہوں بلکہ اکثر روحیں
ملتی رہی ہیں۔ میں یہی سمجھا کہ ضرور یہ اس مرحوم کی روح نے سرد آہ بھری ہے
کا جسد خاکی اس قبر میں پڑا ہے۔

میں جان بوجھ کر اس خیال سے وہاں بیٹھا رہا کہ اگر وہاں قبر والے کی روح آئی ہوئی
تو شاید مجھ سے کوئی بات کرے۔ میں نے روحوں سے اکثر باتیں کی تھیں اور ان کی
کی بھی تھیں۔ لیکن ان روحوں سے جب بھی میں نے سوال کیا کہ مرنے کے بعد

کی زندگی کیسی ہوتی ہے تو اس کے جواب میں ہر روح نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ کس
نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک روح نے تو مجھے یہ کہہ کر ایسے سوال
پوچھنے سے سختی سے منع کیا تھا۔

"یہ خدائی راز ہے۔ کسی روح کو یہ راز بتانے کی اجازت نہیں۔ اگر آئندہ تم نے یہ
سوال پوچھا تو میرا تمہارے پاس آنا جانا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

اس کے بعد میں نے کسی روح سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔ میں قبر کے پاس خاموش
بیٹھا رہا۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی روح مجھ سے ہم کلام ہو۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی
بادلوں کی گرج سنائی دیتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ بارش باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھی
معمولی سی بونداباندی ہونے لگی تھی جو درخت کے نیچے بہت کم محسوس ہوتی تھی۔

میں دیر تک وہاں قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ اب بونداباندی زیادہ ہونے لگی تھی۔ اند
بھی گہرا ہو گیا تھا۔ رات آگئی تھی۔ میں اٹھ کر اکیلی قبر کے مقبرے سے باہر آگیا اور ا
مکان کی طرف چلنے لگا۔ باہر آکر محسوس ہوا کہ بونداباندی باقاعدہ بارش کی شکل اختیا
رہی ہے۔ میں نے اپنے قدم تیز کرلئے۔ جب مکان کے قریب پہنچا تو بارش زیادہ تیز
گئی تھی۔ کمرے میں آکر میں نے اوورکوٹ اتار کر اسے جھاڑا اور دیوار میں ٹانگ
گل خان نے مجھے اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ اگر بہت ضرورت محسوس ہو تو
بتی جلا لینا۔ مگر جلانے سے پہلے کھڑکی دروازہ بند کرلینا اور موم بتی کو کونے میں رکھ کر
کے آگے کوئی چیز اس طرح رکھ دینا کہ اس کی روشنی کھڑکی اور دروازے کی درزوں
پڑے۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ کمرے میں تھوڑی سی روشنی ضرور ہونی چاہئے۔
کی اندھیری راتوں میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ نظر آتا رہتا ہے۔ لیکن رات کے وقت
کمرے میں اگر لائٹ نہ جل رہی ہو تو اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں
اپنے تجربے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ دیکھ لیتا تھا۔ مگر اس وقت دل چاہ رہا تھا کہ ذرا
ہو اور روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ پیا جائے۔

میری جیب میں تین چار موم بتیاں کاغذ میں لپٹی ہوئی موجود تھیں۔ میں نے

تی جلا کر کونے میں فرش پر لگا دی اور اس کے آگے کھانے کا جو ٹفن کیریر تھا وہ رکھ
فن کیریر کے سائے کے بہت بڑے بھوت نے پونے کمرے کو اندھیرے سے ڈھانپ
اب میں کھڑکی بھی کھول سکتا تھا لیکن احتیاط کے طور پر میں نے ایسا نہ کیا اور چارپائی
ار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگایا اور بند کھڑکی میں سے آتی بارش کی ہلکی ہلکی
سننے لگا۔ یہ بڑی رومانٹک سی آواز تھی۔ اس آواز کو شاعر لوگ بہت پسند کرتے
لیکن میں شاعر نہیں تھا۔ میں نے دور دراز گمنام بارانی جنگلوں کی ایسی ایسی
ادھار بارشیں دیکھی تھیں کہ جن کی آواز ایسی ہوتی تھی جیسے سمندر کی طوفانی
ں چٹانوں سے ٹکرا رہی ہوں۔ اس آواز سے انسان کا دل دہل جاتا تھا۔

میں بارش کی دھیمی دھیمی آواز بھی سن رہا تھا اور نیم وا آنکھوں سے بند دروازے
طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بند دروازے میں سے کوئی سفید
نکل کر اندر آگیا ہے۔ میں نے آنکھیں پوری کھول دیں۔ مگر سایہ کمرے میں آتے
جیسے غائب ہو گیا۔ میں نے دو تین بار آنکھیں جھپکائیں۔ شاید یہ میرا وہم تھا سگریٹ
ی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب افسردہ قسم کی یکسانیت سی چھائی
تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتا رہا۔ سردی کی وجہ سے میں نے کمبل
گھٹنوں پر ڈال رکھا تھا۔ جب سگریٹ ختم ہونے لگا تو میں نے جھک کر فرش پر رکھے
ے ایش ٹرے میں اسے بجھا دیا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور سونے کی تیاری
نے لگا۔ ابھی میں کمبل کو ٹھیک کر رہا تھا کہ بند دروازے کے پاس وہی سفید سا ہیولا
بار پھر نظر آیا۔

اب میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے تجربے اور میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا کہ یہ
ی چیز کا سایہ ہے۔ سایہ ابھی تک دروازے کے ساتھ والی دیوار کے پاس تھا۔ سائے کی
ید بادل ایسی سفیدی آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا
ر سائے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ کس مقصد کے لئے آئے ہو؟"

سفید سایہ آہستہ آہستہ فضا میں تیرتا ہوا میری چارپائی سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر
آکر رک گیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ سفید ہیولے نے اب ایک انسانی جسم کی شکل
اختیار کرلی تھی۔ میں نے مزید غور سے دیکھا یہ کوئی انیس بیس سال کا نوجوان تھا جس کا
لباس سر سے پاؤں تک سفید تھا۔ سر پر مغل شہزادوں والی پگڑی تھی پگڑی بھی سفید تھی۔
سائے نے بڑی صاف مگر دور سے آتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں مغل شہزادے کی روح ہوں۔ تم نے فاتحہ پڑھ کر مجھے ثواب پہنچایا تھا
آسمانوں پر میری روح کو سکون ملا۔ میں تمہیں تمہاری بھلائی کی ایک بات بتانے تمہارے
پاس آیا ہوں۔"

مجھے ذرا بھی ڈر خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ روحوں سے اکثر اس قسم کی میری
ملاقاتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ ویسے بھی نیک روحوں کو دیکھ کر دل کو بڑا سکون ملتا ہے۔ نیک
روحیں اپنے ساتھ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں لاتی ہیں۔ میں نے مغل شہزادے سے
مخاطب ہو کر کہا۔

"ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ کسی قبر کو دیکھے تو فاتحہ پڑھ کر مرنے والے کی روح
کو ثواب پہنچائے۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"مسلمان اپنے فرائض بھولتے جا رہے ہیں۔ میں تم سے اس لئے بھی خوش ہوں کہ
اسلام کا سچا جذبہ تمہارے اندر ابھی زندہ ہے اور مظلوم کشمیری مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر
اپنے گھر سے نکل کر دشمن ملک میں آئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"خدا مجھے اسلام' پاکستان اور اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں اور مجاہدوں کی مدد کی توفیق
عطا فرمائے۔ لیکن میرے دوست میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری بھلائی کی جو
بات کی ہے اور جس کی خاطر تم آسمانوں سے اتر کر زمین پر آئے ہو وہ کیا ہے؟"

مغل شہزادے کی روح کہنے لگی۔

"سنو! تم پر عنقریب ایک بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ میں تمہیں اس سے
رنے آیا ہوں"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا یہ کوئی آسمانی آفت ہے اور کیا میں اس سے خبردار ہو کر بچ سکتا ہوں؟"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"انسان اکثر اپنی پیدا کی ہوئی آفتوں اور عذابوں میں پھنستا ہے۔ تم پر بھی جو آفت
ہونے والی ہے وہ خود تمہاری پیدا کی ہوئی ہے۔"

میں بے چین سا ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ نیک روحیں ہمیشہ سچ بولتی ہیں۔ وہ جھوٹ
بولتیں۔ اگر مغل شہزادے کی اس نیک روح نے کہا ہے تو ضرور مجھ پر کوئی آفت
ہونے والی ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ آفت کس نوعیت کی ہوگی تو
نے جواب دیا۔

"یہ بتانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔ یہ قدرت خداوندی کے راز ہیں اور ہم ان
ں کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ تم چونکہ جہاد کشمیر میں شریک ہو کر کشمیری مسلمانوں پر ظلم
والے کفار کا مقابلہ کر رہے ہو اور تم نے اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کی سربلندی
لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہو اس
ل اللہ کے حکم سے تمہیں آنے والی آفت سے آگاہ کرنے آیا ہوں"

میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"اے نیک روح! میں اللہ کی راہ میں اپنے اوپر آنے والی آفتوں کی پروا نہیں کرتا۔
آفت میرے کسی گناہ کی سزا ہے تو میں اس کا مقابلہ بھی کروں گا۔ اور خدا کے
سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگوں گا۔"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"یہی ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے کہ اگر اس کو اپنے گناہوں کا احساس ہو تو وہ اللہ
پنے گناہوں کی معافی مانگے اور آئندہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ مجھے

قدرت خداوندی کی جانب سے ایک بات کی اجازت ملی ہے کہ میں تمہیں اتنا بتادوں کہ جب تم پر آفت نازل ہوگی تو تمہیں کیا کرنا ہوگا۔"

میں ہمہ تن متوجہ ہوگیا۔

"نیک روح! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا۔ مجھے بتاؤ کہ آت زدہ ہونے کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

مغل شہزادے کی روح نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے سفید نورانی چہرے نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی اور دور سے آنے والی آواز میں کہا۔

"ہندوستان کے شہر نجیب آباد کے باہر پتھر گڑھ کا پرانا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ نواب نجیب الدولہ مرحوم نے اپنے دور اقتدار میں بنوایا تھا۔ نواب نجیب الدولہ برصغیر پاک وہند میں حق وباطل' کفرو اسلام کی جنگ کے وہ بہادر مجاہد تھے جنہوں نے ہندوؤں کے اسلام دشمن ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور اسلام کا پرچم بلند کئے رکھا۔ پتھر گڑھ کا قلعہ اسی مجاہد کی یادگار ہے۔ اس قلعے کے عقب میں نجیب آباد کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں یہاں ایک خطرناک دشوار گزار جنگل ہے جس کا نام کجلی بن ہے۔ کجلی بن کے جنگل میں ایک ٹیلہ ہے جس کو لال پہاڑی کہتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس ٹیلے کی چوٹی پر ساتھ ساتھ دو سرخ رنگ کی مخروطی چٹانیں کھڑی ہیں۔ جب تم پر آفت نازل ہو تو تم کجلی بن کے جنگل کی لال پہاڑی پر جانا۔ یہاں پہاڑی کے دامن میں ایک پرانا کنواں ہے۔ اس کنوئیں کے پاس بانس کے جھنڈ میں ایک قبر ہے۔ اس قبر کا اب نشان ہی باقی رہ گیا۔ قبر کے پتھر زمین سے ابھرے ہوئے ہیں تم وہاں باوضو ہو کر فاتحہ پڑھنا۔ یہ اس مسلمان خا کی قبر ہے۔ جو کفرو اسلام کے معرکے میں مرہٹہ سپاہیوں کے ایک دستے سے مقابلہ ہوئی شہید ہوگئی۔ اگر اس شہید خاتون کی روح تمیں اپنی ملاقات کا شرف عطا کرنے آگئی تو اس کے آگے اپنی آفت بیان کرنا۔ وہ تمہیں بتائے گی کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے تم پر پڑی ہوئی آفت کیسے دور ہو سکتی ہے۔"

میں نے مغل شہزادے کے بیان کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا تھا اور ساری ل اپنے ذہن میں یاد کر لی تھی۔ اور اسے کئی بار ذہن میں دہرا بھی لیا تھا۔ مغل دے کی روح نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ اللہ تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔"

اور روح کا سفید سایہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جا کر غائب ہوگیا۔ مغل دے کی روح کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں کھو گیا۔ سوچنے لگا کہ کس قسم کی ت مجھ پر نازل ہونے والی ہے۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ پاک! گناہ گار تیرا بندہ ہوں۔ میری غلطی قصور معاف کر دینا اگر مجھ پر کوئی آفت ضرور آنے والی ہے تو اپنے کرم سے مجھے اتنا حوصلہ عطا کرنا کہ میں اسے برداشت کر سکوں۔ اس بعد میں نے اپنے بٹوے میں جو چھوٹی سی نوٹ بک تھی اس میں وہ تمام تفصیل درج لی جو مجھے مغل شہزادے کی روح نے بتائی تھی۔ نجیب آباد کے گھنے جنگلوں میں میں دوبار گیا ضرور تھا اور کجلی بن کے بارے میں بھی سن رکھا تھا مگر لال پہاڑی کبھی نہیں ی تھی۔ میں نے ابھی سے اپنے آپ کو آنے والی مصیبت کے لئے تیار کر لیا اور اس خیال کو دل سے نکال کر اپنے اگلے کمانڈو مشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ باہر بارش آواز تیز ہوگئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ سرد ہوا کے ساتھ بارش کی باریک ہار میرے چہرے سے ٹکرائی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کپڑے بدل کر موم بتی ئی اور سو گیا۔

گل خان اگلے روز شام کو آیا تو میں نے اسے مغل شہزادے کی روح کے بارے میں نہ بتایا۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا ہمارے کمانڈو مشن سے ی تعلق نہیں تھا۔ وہ کافی رات گئے تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دلی یس کو میری تلاش ضرور ہے مگر میری تلاش میں کوئی بڑے پیمانے پر مہم شروع نہیں ۔ صرف خفیہ ایجنسیوں کو خبردار کر دیا گیا ہے اور خفیہ پولیس کے آدمی ایئرپورٹ' ے سٹیشنوں' سینما گھروں اور بڑے بڑے ریستورانوں کے باہر تعینات کر دیئے گئے

ہیں۔ ان کے پاس میری تصویر بھی ہے۔ میں نے کہا۔

"اب تو میں یہاں سے سکھ بن کر ہی نکلوں گا۔ میرا حلیہ اتنا بدل گیا ہو گا کہ پہلی نظر میں کسی کو مجھ پر شک نہیں پڑ سکے گا"

"پھر بھی تمہیں ان علاقوں سے دور رہنا ہو گا جہاں خفیہ پولیس کے آدمیوں کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔"

میں نے گل خان کو بتایا کہ سکھ بننے کے بعد دلی میں نہیں رہوں گا۔ مجھے یہاں سے دوسرے شہر جانا ہو گا۔ اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"آخر تم اپنے منصوبے کو اتنا چھپا کر کیوں رکھ رہے ہو۔ ہم تمہارے اپنے آدمی ہیں۔ ہمیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"گل خان بھائی! حرج کی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نے عہد کر رکھا ہے کہ اپنے پراجیکٹ کا انکشاف صرف اس وقت کروں گا جب میں اپنے مشن پر روانہ ہوں گا"

گل خان تھرمس میں سے پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ وہ وقت بھی جلد آجائے گا۔"

ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ بارش دوپہر کے بعد تھم چکی تھی۔ گل خان کہنے لگا۔

"تم یہاں سے باہر سیر وغیرہ کے لئے کس وقت نکلتے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ صرف منہ اندھیرے قریبی کھیتوں میں جا کر ہلکی پھلکی ورزش کر لیتا ہوں۔ وہ بولا۔

"پھر بھی تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

رات کے دس بجے کے قریب گل خان چلا گیا۔

اسی طرح اس ویران مکان میں اکیلے رہتے ہوئے جب دو مہینے گزر گئے تو میں نے

ں کیا کہ اب کمانڈو مشن شروع کرنے کا وقت آگیا ہے۔ شام کو گل خان آیا میں نے بڑھی ہوئی چھوٹی ڈاڑھی اور سر کے لمبے بالوں کو سر کے اوپر اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔

"گل بھائی! میرا خیال ہے میں پورا سکھ بن گیا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

گل خان نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

"میرے حساب سے تمہیں ابھی دو ہفتے اور انتظار کرنا چاہئے۔"

مزید دو ہفتے بھی گزر گئے۔ اس روز گل خان اپنے ساتھ چھوٹا آئینہ بھی لایا تھا۔ میں آئینے میں اتنے دنوں کے بعد اپنی شکل دیکھی تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی نوجوان جوگی مجھے رہا ہے۔ میری مونچھوں کے بال میرے ہونٹوں کے اوپر گر رہے تھے۔ ڈاڑھی بے طریقے سے بڑھ چکی تھی۔ بال بھی جھاڑیوں کی طرح بڑھ گئے تھے۔ گل خان بولا۔

"اب تمہارا حلیہ بالکل سکھوں ایسا ہو گیا ہے۔ ذرا سر پر جوڑا تو باندھو"

میں نے سکھوں کے طرح بالوں کو اوپر کر کے جونڈا بنایا اور اس کے گرد رومال باندھ ب آئینہ دیکھا تو میں بالکل سکھ لگ رہا تھا۔ گل خان سے میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے جب میں نے سکھوں والی پگڑی باندھ لی اور ڈاڑھی کو بھی کانوں کی کھینچ کر باندھا تو پولیس والے مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

گل خان نے کہا۔

"خیال تو یہی ہے لیکن تمہیں اس کے باوجود بے حد احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ سی ئی والوں کی نظریں بڑی تیز ہوتی ہیں۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"کل تم میرے لئے وہ لباس لے آنا جو یہاں دلی میں یا اس کے آس پاس سکھ عام پہنتے ہیں"

خاص لباس نہیں ہوتا سکھوں کا۔ بس یہ لوگ عام طور پر تنگ موری کے پاجامے کھلے گریبان کا کرتہ واسکٹ یا گرم کوٹ پہنتے ہیں۔ کمر میں کرپان ہوتی ہے۔ اور لوازمات ہوتے ہیں جو سکھ دھرم کا حصہ ہیں۔ مثلاً کڑا، کرپان، کچھا کیس اور کنگھا۔

لیکن دلی میں پڑھے لکھے سکھ زیادہ تر انگریزی سوٹ پہنتے ہیں۔ یہ میں نے خاص طور پر
دیکھا ہے کہ سکھ گرمیوں سردیوں انگریزی سوٹ بڑے شوق سے پہنتے ہیں۔ گرمیوں میں
اگر کوٹ نہیں پہنتے تو قمیض پتلون ہی پہن لیتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ کل میں یہ ساری
چیزیں اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔"

میں نے اسے کہا۔

"مجھے کچھ روپوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسے باقی رہ گ
ہیں۔ کیا تم اس کا بندوبست کر سکو گے؟"

گل خان بولا۔

"اس کی تم کبھی فکر نہ کرنا۔ جیسا کہ یہ بات تمہارے علم میں ہوگی۔ ہم نے ایک
خفیہ فنڈ قائم کر رکھا ہے دلی کے مسلمان اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں اور پاکستانی بھائیو
سے صرف محبت ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ر
ہیں۔ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟"

میں نے پہلے سے حساب لگایا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"ابھی صرف پانچ ہزار روپے کی رقم ہی کافی ہوگی۔ اگر ضرورت پڑی تو میں تمہ
بتا دوں گا۔"

ٹھیک ہے میں کل یہ رقم بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں اسلحہ وغیرہ تو نہ
چاہئے؟

میں نے کہا۔

"نہیں میرے کمانڈو مشن کے پہلے مرحلے میں مجھے کسی قسم کے اسلحے کی ضرو
نہیں پڑے گی۔ ہاں جب میں راجستھان کے زیر زمین ایٹمی سنٹر میں داخل ہونے
کامیاب ہو گیا تو مجھے جس قسم کے اسلحے وغیرہ کی ضرورت ہوگی وہ میں تمہیں کسی ذ
سے بتا دوں گا یا خود تمہارے پاس آکر بتا دوں گا۔"

گل خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اپنا منصوبہ تم اب کل ہی بتاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"انشاء اللہ"

اگلے روز گل خان شام ہونے سے پہلے ہی آ گیا اس کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ تھا۔
یں میرے لئے کپڑے تھے۔ میں نے اسے خاص طور پر کہا تھا کہ مجھے پڑھے لکھے سکھ
پ دھارنا ہے اس لئے وہ میرے لئے پتلون کوٹ لایا تھا۔ ایک بندھی بندھائی
ں والی پگڑی تھی جو ان دنوں بازار میں نئی نئی بکنے لگی تھی۔ اس پگڑی کی خوبی یہ تھی
سے باندھنا نہیں پڑتا تھا۔ ٹوپی کی طرح پہن لی جاتی تھی۔ میں نے ریہرسل کے طور
سارے کپڑے پہن لئے۔ سر پر پگڑی بھی ٹھیک طرح سے جمالی۔ گلے میں کرپان
۔ ایک کلائی میں لوہے کا کڑا پہن لیا۔ سر کے جوڑے میں کنگھا بھی پھنسا لیا۔ نیچے
دیر یعنی کچھا بھی پہن لیا۔ ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو مروڑیاں بنا کر انہیں اوپر
کر کانوں کے پاس دوسرے بالوں میں پھنسا دیا۔ مونچھوں کے بڑھے ہوئے بالوں کو
نے اسی طرح رہنے دیا۔ بس ہاتھوں سے تھوڑا تھوڑا ایک طرف کر لیا۔ جب میں نے
ے میں اپنی شکل دیکھی تو یقین کریں کہ میں خود اپنے آپ کو نہ پہچان سکا۔ گل خان
طرف گردن ٹیڑھی کرکے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔

"دوست! تم تو سچ مچ بالکل سکھ لگتے ہو۔ پہچانے ہی نہیں جاتے۔ لیکن ایک بات

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

گل خان نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے جو ختنے ہو چکے ہیں اس کا کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اس کا وقت نہیں آنے دوں گا۔"

میں نے سارا لباس اتار دیا اور اپنے کپڑے پہن لئے۔ گل خان تھرمس میں چائے

لایا تھا۔ اس نے مجھے پانچ ہزار روپے بھی جو نوٹوں کی شکل میں تھے دے دیئے تھے جو میں
نے بٹوے میں سنبھال کر رکھ لئے تھے۔ چائے کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا
کمانڈو مشن کب اور کہاں سے شروع ہو گا۔

میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ چائے کا گھونٹ پیا اور پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

"گل خان! پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مشن میں تمہیں بھی میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا

"اچھا؟"

"ہاں" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "بلکہ تمہیں اپنی ساتھ کسی اور نوجوان کو بھی۔
جانا ہوگا۔ تم دونوں میرے کمانڈو مشن کے پہلے مرحلے میں میری مدد کرو گے تمہارا زیا
سے زیادہ دو دن کا کام ہو گا اس کے بعد تم دلی واپس آجاؤ گے۔ آگے سارا کام م
ہو گا۔"

"لیکن تمہارا پروگرام کیا ہے"؟

میں نے کہا۔

"یہ میں تمہیں ریواڑی پہنچنے کے بعد بتاؤں گا۔"

کیا ہمیں ریواڑی جانا ہو گا۔"

"ہاں۔ مگر اپنے ساتھ تم جس نوجوان کو لے کر جاؤ گے وہ اپنا آدمی ہونا چاہئے۔"

گل خان کہنے لگا۔

"ظاہر ہے اپنا ہی آدمی ہو گا۔ دوسرے آدمی کا تو یہاں کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

میں نے گل خان کو سمجھا دیا کہ انہیں اس قسم کا حلیہ بنانا ہو گا جس قسم کا حلیہ
علاقے کے اوباش قسم کے نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ اور انہیں اپنے ساتھ ایک پستول
رکھنا ہو گا جو خالی ہو گا۔ جیسے جیسے میں اپنے منصوبے کو بتاتا جاتا تھا گل خان کی حیرت
اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن میں اسے اصل پروگرام ابھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا۔

"ہمیں کب ریواڑی کے لئے روانہ ہونا ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"پہلے میں اکیلا جاؤں گا۔ وہاں سے میں تمہیں دو لفظی خط لکھوں گا کہ یہاں پلاسٹک
، کاروبار کی کافی گنجائش ہے آپ آجائیں۔ یہ خط ملتے ہی تم دونوں ریواڑی میرے
ۓ ہوئے پتے پر پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد میں تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا
ۂ اور میں کیا کرنے والا ہوں۔"

میں نے اپنا ایک سکھ نام بھی سوچ لیا تھا۔ جب اس بارے میں گل خان نے مجھ سے
پھا تو میں نے کہا۔

"میں نے اپنا نام جسونت سنگھ سوڈھی رکھا ہے"

میں پہلے بھی یہ بتا چکا ہوں اور اب بھی آپ کو بتاتا چلوں کہ گل خان ہمارا دلی میں
رہائی تھا۔ یہ مضبوط جسم والا کمانڈو ٹائپ آدمی تھا۔ پہلوانی بھی کرتا تھا۔ اس نے بھی
نگ آباد کے جنگل میں مرد مجاہد سے باقاعدہ کمانڈو ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ کمانڈو
ن پر کبھی کبھار ہی کشمیر کے محاذ پر گیا تھا۔ وہ ہائی ایکسپلوسویز کا ماہر تھا اور کیمسٹری میں
نے ایم اے کیا ہوا تھا۔ اس کا اصلی نام گل خان نہیں تھا۔ یہ تو میں نے اس کا فرضی
رکھا ہوا ہے اور اس کے مکان کا ایڈریس بھی اسی لئے نہیں لکھا کہ انڈیا کی حکومت
، پکڑ نہ لے۔ وہ کسی دوسرے ملک کا جاسوس نہیں تھا۔ وہ انڈیا کا باشندہ تھا۔ انڈیا کا
ں تھا۔ مسلمان ہونے کے ناطے وہ بھارت میں مسلمانوں کے جائز حقوق کے حصول کے
، اور کشمیر میں مظلوم کشمیری کفار کے ظلم و ستم کے خلاف جو جنگ لڑ رہے تھے ان کی
ادی اور حق خود اختیاری کا حامی تھا۔ پاکستان سے اسے اس لئے زبردست محبت تھی کہ
ان اسلامی ملک ہے اور پاکستان میں اس کے دینی بھائی رہتے ہیں اور بھارت کی
ت پاکستان کو نقصان پہنچائے یہ گل خان بھی دوسرے بھارتی مسلمانوں کی طرح ہرگز
ار کھ سکتا تھا۔

میں نے اسی رات گل خان سے سارے معاملات طے کر لئے اور کہا کہ وہ یہ معلوم
کے لائے کہ دلی سے ریواڑی جانے والی گاڑی کس وقت چلتی ہے۔ گل خان رات کو

جلدی چلا گیا۔

دوسرے روز وہ رات کو آیا۔ وہ ساری معلومات لے کر آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"دلی سے ریواڑی کی جانب دن میں تین چار گاڑیاں جاتی ہیں۔ جن میں پسنجر ٹرینیں بھی ہیں اور ایکسپریس ٹرینیں بھی ہیں۔ ریواڑی دلی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ دلی سے جے پور جانے والی لائن پر ہے۔ دلی سے آگے اس لائن پر گوڑ گاؤں بڑا سٹیشن آتا ہے۔ اس کے بعد فرخ نگر آتا ہے۔ پھر پٹاندی اور اس کے بعد ریواڑی آجاتا ہے۔ ایکسپریس ٹرین پر یہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر ہے۔"

میں نے گل خان سے پوچھا کہ صبح صبح کونسی گاڑی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک گاڑی دلی سے جے پور کے لئے تیار ہو کر صبح اذانوں کے وقت چلتی ہے۔ یہ گاڑی میرے لئے بڑی مناسب تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں منہ اندھیرے دلی کے سٹیشن سے نکل جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے دوسرے دن منہ اندھیرے یہ گاڑی پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ گل خان نے کہا۔

"میں آج کی رات تمہارے پاس ہی رہوں گا۔"

وہ رات کو میرے پاس اسی ویران سے کمرے میں رہا۔ رات ہم جلدی سو گئے۔ پو پھٹنے کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ گل خان کو جگایا مجھے کوئی نقلی ڈاڑھی مونچھ تو لگانی نہیں تھی۔ میری سکھوں والی ڈاڑھی مونچھ پہلے ہی سے تیار تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ اور پتلون قمیض پہن کر سر پر سکھوں والی پگڑی بالوں کا جوڑا بنانے کے بعد اچھی طرح سے جمالی۔ پگڑی نے میرے دونوں کان ڈھانپ دیئے تھے۔ گل خان نے [illegible] اپنی کلائی کی گھڑی دے دی۔ کرنسی نوٹ والا بٹوہ میں نے کوٹ کی بجائے پتلون کی [illegible] میں رکھ لیا جو بٹن لگانے سے بند ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی [illegible] کاٹنی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ گل خان نے مجھے بتایا کہ راجستھان میں دن کے وقت کل گلابی موسم رہتا ہے مگر رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ مجھے چندریکا کے سلسلے میں اس کا تجربہ تھا۔

"اس لئے میں نے تمہارے لئے زیادہ گرم کپڑے کی پتلون اور کوٹ نہیں خریدا۔"

میرے پاس چیونگ گم ٹیبلٹ کی شکل میں جو چھ ٹائم بم تھے وہ میں نے پہلے سوچا کہ گل خان کو دے دوں پھر کچھ سوچ کر ان کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ ہم نے نظام الدین اولیاء کے مزار شریف کے چوک میں آکر ایک موٹر رکشا لیا اور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ منہ اندھیرے کا وقت تھا۔ سڑک کی بتیاں ابھی روشن تھیں۔ سٹیشن پر پہنچے تو جے پور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگ چکی تھی۔ ڈبوں میں مسافر سوار تھے۔ کافی رش تھا۔ ہم نے وہیں پلیٹ فارم پر ٹی سٹال کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گل خان نے کھڑکی کے پاس آکر آہستہ سے کہا۔

"محتاط رہنا۔ مجھے تمہاری طرف سے اس وقت تک فکر رہے گی جب تک تمہارا خط نہیں ملتا۔"

میں نے آہستہ سے ہاتھ نکال کر گل خان سے مصافحہ کیا اور کہا۔

"گل بھائی! اب میں جانوں اور میرا کام تم جاؤ"

گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ گل خان چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی بعد گاڑی جے پور کی طرف روانہ ہو گئی۔

جس وقت میں ریواڑی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ریواڑی کا سٹیشن ایسا ہی تھا جیسے چھوٹے شہروں کے سٹیشن ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے میں نے اس بات کا جائزہ لیا کہ وہاں پولیس کے سپاہی کتنے ہیں اور کہاں کہاں پر ہیں۔ وہاں تین سپاہی تھے اور یہ ریلوے پولیس کے سپاہی تھے۔ میں ان کے پاس سے ہو کر گزر گیا۔ کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا۔ وہاں کئی دوسرے سکھ مسافر ٹرین سے اترے تھے۔ میں بھی ایک سکھ نوجوان کے حلیے میں تھا۔ سٹیشن کے باہر کل رکشے اور تانگے کھڑے تھے۔ دور ایک پرانی سی ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی ڈرائیور مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر بیڑی پھینک کر جلدی سے گاڑی سے نکل آیا۔ "آیئے سردار جی کدھر چلنا ہے بیٹھئے میں پہنچائے دیتا ہوں۔"

اس نے ماتھے پر لال تلک لگا رکھا تھا۔ ریواڑی میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ سٹیشن کے باہر مجھے سامنے دو تین مندروں کے عکس نظر آئے تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اسے سکھوں والے پنجابی لہجے میں کہا۔

"چل یار"

اس نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

"سردار جی کس طرف چلیں؟"

میں نے کہا۔

"بادشاہو تمہارے شہر کی سیل کرنے آئے ہیں کسی ہوٹل ووٹل میں لے چلو۔ جہاں کوئی مال پانی بھی مل جائے اور رات بھی کٹ جائے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نوجوان لڑکا تھا۔ میری طرف اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"بادشاہو فکر ہی نہ کرو"

ٹیکسی ریواڑی کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ سڑک پر آگئی۔ اس کی ایک جانب سبزیوں ترکاریوں کے کھیت تھے۔ دوسری جانب آبادی تھی۔ دن کے وقت سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ ہندو لوگ دھوتیاں باندھے گزر رہے تھے۔ موٹر گاڑی ایک بھی ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ ٹیکسی آبادی کی ایک کشادہ سڑک کی طرف گھومی تو مجھے کسی مندر میں بجتی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔

ٹیکسی ایک درمیانے درجے کی دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ جس کی پیشانی پر ہندی زبان میں رام جی ویشنو ہوٹل کا بورڈ لگا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے میں ہندی اور گجراتی زبانیں پڑھ بھی لیتا تھا اور گجراتی زبان تو تھوڑی بول بھی لیتا تھا۔ مجھے احمد آباد میں رہ کر اس کا کافی محاورہ ہو گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"اوئے یہ تو ویشنو ہوٹل ہے یہاں کیا مال پانی ملے گا۔ یہاں تو گوشت کی ایک بو بھی نہیں ملے گی۔"

ڈرائیور نے گھوم کر میری طرف پچھلی سیٹ پر دیکھا اور آنکھ مار کر کہا۔

"سردار جی! بس یہ صرف نام کا ہی ویشنو ہوٹل ہے۔ یہاں سب کچھ ملتا ہے۔ آیئے رے ساتھ اس کا منیجر میرا واقف ہے"

میں یہ ساری حرکتیں اور اپنے آپ کو اوباش قسم کا سکھ ظاہر کرنے کا ڈرامہ جان ہ کر کھیل رہا تھا۔ یہ میرے کمانڈو مشن کا بڑا اہم مرحلہ تھا۔ وہ مجھے ہوٹل کے منیجر کے ں لے گیا جو ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ سر پر گاندھی کیپ بلکہ کانگرسی ٹوپی ئی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے کاؤنٹر پر ایک طرف لوبان سلگ رہا تھا۔ ماتھے پر ویشنو کا تلک تھا۔ پیچھے کرشن کی تصویر لٹک رہی تھی۔ ہمیں آتا دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہ باندھ کر نمسکار کہا۔ ڈرائیور نے بھی نمسکار کیا اور کہا۔

"گوپال جی! ہمارے سردار جی دلی سے ریواڑی کی سیر کرنے آئے ہیں۔ کچھ دن آپ ے ہوٹل میں رہیں گے۔"

گوپال اس ہوٹل کے منیجر یا مالک کا نام تھا جو میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے میری رف دیکھا اور بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔

"سردار جی! آپ کو ہمارے ہوٹل میں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ آپ کا سامان کہاں ہے؟"

میں نے اپنا سکھوں والا پنجابی میں اردو بولنے کا لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"اوئے اپنا کوئی سامان نہیں ہے۔ ہم ادھر مکان بنانے نہیں آیا۔ سیر کے واسطے آیا ہے۔ یہاں ایک گردوارہ ہے اس کے بھی درشن کرنے ہیں۔ بتاؤ کوئی اچھا سا کمرہ خالی ہے۔ غسل خانہ ساتھ ہونا چاہئے۔"

وہ ہمیں ہوٹل کی پہلی منزل میں ہی پیچھے کی جانب واقع ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ بس غنیمت تھا۔ مجھے کمرے کی اچھائی برائی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مجھے تو وہاں کچھ نا گزارنے تھے۔ میں نے یونہی کمرے کے نقص نکالنے شروع کر دیئے۔ ہوٹل کا منیجر گھبرا سا گیا۔ اور کہنے لگا۔

"سردار جی! آپ جو کہیں گے ہم یہاں لا کر رکھ دیں گے۔ میں نیا پلنگ ابھی بچھوائے دیتا ہوں۔ بھگوان کی دیا سے آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

بیس روپے کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ تھا۔ میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر منیجر کے حوالے کیا۔

"ابھی یہ رکھو زیادہ دیر ٹھہرنا ہوا تو اور پیسے دے دوں گا۔ کیوں اوئے؟ اب تو خوش ہو ناں؟"

منیجر نوٹ لے کر خوش ہوا۔ کاؤنٹر پر آکر میں نے رجسٹر میں اپنا نام جسونت سنگھ سوڈھی لکھوایا اور دلی کا غلط سلط پتہ لکھوا دیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی پچاس روپے دیئے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگا۔

"سردار جی! مجھے حکم کریں میں کب یہاں آؤں آپ گردوارے کس وقت جائیں گے۔ میں سارے شہر کی آپ کو سیر کراؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"ایک گھنٹے بعد آجانا۔ ابھی میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ اب جاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور خوش خوش چلا گیا۔ میں کمرے میں آگیا۔ میرے پاس ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا۔ جس میں میری دو تین قمیضیں' دو بنیانیں اور کنگھی ٹوتھ برش صابن تولیہ وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ دوسری طرف کھیت تھے۔ کھیتوں میں دور ایک ٹریکٹر چل رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ٹیکسی ڈرائیور آگیا۔ میں نے اسے کمرے میں بلا لیا۔ اسے مزید پچاس روپے دیئے اور اوباش آدمی کا کردار ادا کرتے ہوئے سکھوں کے لہجے میں کہا۔

"دیکھ اوئے۔ مجھے کوئی گھٹیا قسم کا تماش بین نہ سمجھنا۔ دلی کانپور کی اونچی سے اونچی گانے والیاں میری دوست ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ریواڑی میں کوئی اونچے درجے کی گانے والی بھی ہے؟ اگر ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں واپس دلی جاتا ہوں۔"

ڈرائیور نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"سردار جی مہاراج! میں تو آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ بڑے اونچے درجے ے کھلاڑی ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ ایسا ہیرا دکھاؤں گا کہ دلی کانپور میں بھی نہ دیکھا گا۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

ڈرائیور بولا۔

"مہاراج! ویسے تو ریواڑی میں گانے والیوں کا کوئی بازار نہیں ہے۔ لیکن یہ عورتیں پنے اپنے گھروں میں ناچ گانے کا دھندا کرتی ہیں سرکار کو معلوم ہے۔ مگر سرکار نے ان کو ھندا کرنے کا لائسنس دے رکھا ہے۔"

میں نے اسے پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"اوئے اصل بات بیان کر۔ کون ہے اونچی درجے کی گانے بجانے والی جس کا تو کھان کر رہا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ پھر جلدی سے جیب میں رکھ لی۔ جانتا تھا کہ سکھ تمباکو نہیں پیتے اور میرے سامنے اسے سگریٹ کا پیکٹ نہیں نکالنا ہئے تھا۔ کہنے لگا۔

"سردار جی مہاراج! ایک بڑی خاندانی عورت ہے۔ رات کو دو گھنٹے دھندا کرتی ہے بھی صرف ناچ گانا۔ اور کچھ نہیں۔ خوبصورت بھی بہت ہے۔ ایرے غیرے کو اپنے گھر ں داخل ہی نہیں ہونے دیتی۔"

میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"اوئے اس کا نام بھی لو"

"اس کا نام درگاوتی ہے مہاراج"

یہی میرا ٹارگٹ تھا۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

اس کا مکان کہاں ہے؟"

وہ بولا۔

"مہاراج! میں لے چلوں گا آپ کو۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلو۔ ابھی چلو۔"

وہ میری بے تابی دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج درگاوتی دن کے وقت نہ تو ناچ گانا کرتی ہے نہ کسی سے ملتی ہے۔ رات کو آپ کو لے چلوں گا۔ آج کیا دن ہے؟"

میں نے کہا۔

"آج منگل وار ہے۔ کیوں۔ تم نے دن کیوں پوچھا۔"

وہ کہنے لگا۔

"مہاراج! اس لئے پوچھا ہے کہ درگاوتی ہفتے کی رات کو کسی سے نہیں ملتی۔"

"کیوں اوئے؟ ہفتے کو اسے کوئی بیماری لگ جاتی ہے؟ ہفتے کو وہ کیوں نہیں ملتی؟"

ٹیکسی ڈرائیور رازداری سے کہنے لگا۔

"مہاراج! ہفتے کی رات کو درگاوتی کا یار اس سے ملنے آتا ہے۔ ساری رات رہتا ہے اگلا سارا دن رہتا ہے اور شام کو چلا جاتا ہے۔"

ڈرائیور کی باتوں سے میری معلومات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"یہ اس کا یار کون ہے اوئے؟ میں اس کو اٹھا کر باہر پھینک دوں گا"

ڈرائیور نے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

"نہیں نہیں مہاراج! وہ کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہے۔ بہت بڑا افسر ہے۔ سنا ہے راج گڑھ سے آتا ہے۔ وہ بھی آپ کی طرح سردار جی ہے"

ٹیکسی ڈرائیور ہنسنے لگا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر مروڑا اور گالی دے کر کہا۔

"اوئے ہنستا کیوں ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور لہجے

پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار میں ہفتے کی رات کو درگاوتی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مگر آج تو ہفتہ ہے۔ ہم آج رات درگا بائی کے کوٹھے پر گانا سننے چلیں گے۔"

"جو حکم مہاراج! میں کتنے بجے آجاؤں؟"

"نو دس بجے آجانا"

"یہ ٹائم بالکل ٹھیک رہے گا مہاراج"

اور ٹیکسی ڈرائیور مجھے پرنام کر کے چلا گیا۔

رات کو وہ مجھے درگا وتی طوائف یا نیم طوائف کے پاس لے گیا۔ درگا وتی کا مکان آبادی سے باہر الگ تھلگ جگہ پر واقع تھا۔ وہاں املی اور نیم کے بڑے درخت تھے۔ مکان کیا تھا ایک پرانی خستہ حال ایک منزلہ کوٹھی تھی جس کی بیرونی دیواریں بارش اور دھوپ کی وجہ سے کالی ہو رہی تھیں۔ صحن میں گھاس اگ رہی تھی۔ کوٹھی کی چار دیواری کی حالت بھی بڑی شکستہ تھی۔ برآمدہ کے ستون پھولدار بیلوں میں چھپ گئے تھے۔ برآمدے کے آگے ایک چوکیدار سٹول پر ڈنڈا گھٹنوں پر رکھے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ وہ میرے ٹیکسی ڈرائیور کو جانتا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کہا۔

"رامو بھائی! سردار جی دلی کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ درگا بائی سے ملنے آئے ہیں۔ ذرا اندر خبر کر دو۔"

برآمدے کے آگے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ایک بلب برآمدے کے باہر جل رہا تھا جس کی روشنی سارے صحن اور درختوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ چوکیدار بولا۔

"بائی جی کے پاس آدمی بیٹھے ہیں۔ پھر کسی وقت آنا۔"

میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر چوکیدار کو دیا اور کہا۔

"یار تو کیوں ناراض ہوتا ہے۔ درگا بائی سے کہو ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جائیں گے۔"

چوکیدار نے سو روپے کا نوٹ صدری کی جیب میں ٹھونسا اور تیز تیز قدم اٹھا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر سے طبلے گھنگھروؤں کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بڑ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈرائیور ہنس کر بولا۔

"مہاراج آپ نے بڑا اچھا کیا۔ مگر سو روپے دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دس پندرہ ہی یہ راضی ہو جاتا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے یار ٹھیک ہے۔"

چوکیدار نے اندر جا کر درگا بائی کے آگے نہ جانے میری کتنی تعریف کی ہوگی کہ ے رئیس سردار جی ہیں۔ دلی سے خاص طور پر ملنے آئے ہیں۔ باہر آیا تو مسکرا رہا تھا۔ لگا۔

"بائی جی تو راضی نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا ہے۔ یے میرے ساتھ۔"

ٹیکسی ڈرائیور میرے ساتھ چلنے لگا تو میں نے اسے وہیں روک دیا۔

"تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔"

ٹیکسی ڈرائیور مایوس سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں چوکیدار کے ساتھ ایک کمرے میں گزر کر دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس آ گیا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یدار نے مجھے وہیں رکنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد واپس آیا۔

"آئیے سردار جی!"

اس نے دروازہ کھولا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے مجھے حنا کے عطر خوشبو آئی۔ کمرے میں چھت کے ساتھ ایک فانوس روشن تھا۔ قالین بچھا ہوا تھا۔ ار کے ساتھ صوفے لگے تھے۔ یہ کسی طوائف کا کمرہ نہیں لگتا تھا۔ صوفے پر ٹیبل پ کے پاس ایک بیس بائیس سال کی جوان عورت ہلکے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنے بنی سنوری بیٹھی تھی۔ اس نے سونے کے مختصر سے زیور پہن رکھے تھے۔ رنگ کھلتا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندیا لگی تھی۔ بہت خوبصورت نہیں تھی مگر نین نقش بڑے دلکش نے مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا سا مسکرا کر مجھے پرنام کیا اور بڑی صاف اردو ناہیں بولی۔

"مہاراج شما کر دیجئے گا۔ آج اصل میں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ویسے بھی بہت کم لوگوں سے ملتی ہوں۔ بیٹھئے آپ کیا پئیں گے؟"

میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور سکھوں کی طرح اپنی ڈاڑھی پر دو تین بار ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"درگاوتی جی! آپ کے بارے میں بالکل ٹھیک سنا تھا۔ آپ تو واقعی بہت خوبصورت ہیں اور آپ کا اخلاق بھی بہت اچھا ہے۔ ورنہ آپ ملنے سے انکار بھی کر سکتی تھیں۔ میں بھی آپ کا گانا سننے نہیں آیا۔ بس آپ کے درشن کرنے دلی سے ریواڑی آیا ہوں۔ آپ کی اتنی تعریف سنی کہ من آپ کے درشنوں کو مچلنے لگا۔"

چوکیدار دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ درگاوتی اپنی تعریف سے خوش ہوئی تھی۔ اس نے ٹیبل لیمپ کے قریب تپائی پر ایک جانب لگا ہوا بٹن دبایا۔ مجھے کوٹھی کے کسی کمرے سے آتی گھنٹی کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ درگاوتی کہنے لگی۔

"سردار جی مہاراج! وہ لوگ خود اچھے لوگ ہیں جو میری تعریف کرتے ہیں۔ ورنہ میں تو سیدھی سادی سی عورت ہوں۔"

ایک نوجوان خادمہ اندر آئی۔ اس نے جھک کر مجھے پرنام کیا درگاوتی نے اسے چائے لانے کو کہا۔ کیونکہ کمرے میں تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ تھی۔ اگرچہ ریواڑی میں سردیوں موسم اتنا شدید نہیں تھا۔ جتنا دلی میں تھا۔ میں نے درگاوتی کو بتایا کہ میرا جالندھر زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔ دلی میں ہماری دو کوٹھیاں ہیں۔ نیوکلر فزکس م بی۔ایس۔سی کیا ہوا ہے۔ (یہ نیوکلر فزکس میں بی۔ایس۔سی کرنے والی بات میں نے ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کہی تھی)۔ درگاوتی میری باتیں کچھ توجہ اور زیادہ بے نیاز سے سنتی رہی۔ لگتا تھا کہ وہ مجبوراً وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ خادمہ ٹرے میں چائے اور مٹھائیاں لے کر آگئی۔ درگاوتی نے خاص پیشہ ورانہ انداز میں چائے بنا کر مجھے پیش ک

میں نے جیب سے سو سو روپے کے دس نوٹ نکال کر درگاوتی کو پیش کئے۔

"درگا جی! میری طرف سے یہ چھوٹی سی شردھانجلی سویکار کریں۔"

یں نے دیکھا کہ درگاوتی کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا تھا۔ پہلے جو اس پر بیزاری کی ایک ی طاری تھی وہ بالکل غائب ہو گئی تھی۔ اس نے نوٹ لیتے ہوئے بڑی پیشہ ورانہ ے کہا۔

"مہاراج اس کی کیا ضرورت تھی۔ آج تو میرے سازندے بھی یہاں نہیں ہیں۔ آپ کو گانا بھی ڈھنگ سے نہ سنا سکوں گی۔"

یں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"درگا جی! ہم صرف آپ کا گانا سننے تھوڑے آئے ہیں۔ ہم تو آپ کے صرف درشن اہتے تھے۔ گانا پھر سن لیں گے۔ ایسی جلدی کیا ہے۔"

یں سکھوں کی طرح کبھی اپنے آپ کو میں کہتا اور کبھی اس علاقے کے رواج کے ہم کہنے لگتا۔ کمرے میں طوائفوں والا ماحول نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ گانے بجانے والا وئی دوسرا تھا۔ وہاں مجھے سوائے نوکرانی کے کوئی دوسری عورت یا مرد نظر نہیں آیا رگاوتی اب بڑی دلچسپی کے ساتھ میری باتیں سن رہی تھی اور خود بھی مجھ سے کھل ں کرنے لگی تھی۔

ہزار روپے نے بڑا کام دکھایا تھا۔ طوائفوں کے تالے صرف روپے کی چابی سے کھلتے درگاوتی بھی ایک طوائف تھی۔ اگرچہ بھارت کے بڑے شہروں کی طوائفوں کے یں اس کا سبھاؤ گھریلو عورتوں ایسا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں اٹھ کر چلنے لگا تو ا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"کھانا کھا کر جائیے گا مہاراج۔"

یں نے درگاوتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دبایا اور کہا۔

"سوہنیو! کل پھر آئیں گے۔"

رگاوتی شرما گئی۔ بولی۔

"کل ضرور آئیے گا میں انتظار کروں گی۔"

ا دوسرے کمرے کے دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی۔ میرا ڈرائیور برآمدے کے

باہر چوکیدار کے پاس سٹول پر اس کے ساتھ ہی ٹک کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلد
سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹیکسی میرے ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ ڈرائیور بڑا خوش تھا۔ کیونکہ میں ن
درگاوتی کی بڑی تعریف کی تھی۔ میں ہوٹل کے باہر ٹیکسی سے اترا تو ڈرائیور بولا۔

"مہاراج! کل کس وقت آؤں؟"

اب مجھے اس شخص کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اس سے جو کام لینا تھا۔ میں لے
تھا۔ میں نے کہا۔

"کل آنے کی ضرورت نہیں۔ تم پرسوں آجانا کل میں آرام کروں گا۔"

دوسری رات میں اکیلا ہی سائیکل رکشے میں بیٹھ کر درگاوتی کے گھر پہنچ گیا۔ اس
میری بڑی آؤ بھگت کی۔ دو تین آدمی پہلے سے وہاں بیٹھے تھے۔ میرے آنے پر درگا
نے انہیں رخصت کر دیا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ چھوٹا تھا۔ قالین
چاندنی بچھی تھی گاؤ تکئے لگے تھے۔ اگالدان پڑے تھے۔ ایک سارنگی والا اور ایک طبلے
بیٹھا تھا۔ پورا طوائفوں والا ماحول تھا۔ میں گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نوکرانی
ٹرے میں شراب کی بوتل اور دو گلاس لے کر آ گئی۔ میں نے درگاوتی سے کہا۔ "درگا
میں شراب نہیں پیتا۔ چائے منگوالیں۔ چائے ضرور پیوں گا۔"

وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

"تعجب ہے۔ آپ شراب نہیں پیتے۔ کوئی بات نہیں۔ میں بھی نہیں پیوں گی۔
میں بھی آپ کے ساتھ چائے پیوں گی۔"

چائے کے ساتھ بسکٹ اور مٹھائیاں بھی تھیں۔ چائے پیتے ہوئے درگاوتی ہار
سامنے رکھ کر اسے طبلے اور سارنگی کے ساتھ ملاتی رہی۔ پھر اس نے ایک غزل چھیڑ
اس کی آواز عام طوائفوں ایسی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اسے سو سو رو
ویلیں دیتا رہا۔ سازندے بھی حیران ہو رہے تھے۔ کیونکہ سو سو روپے کی ویل امیر
تماش بین بھی کم ہی دیتا ہے۔ میں نے سو روپے کی ایک ویل سازندوں کو بھی دے د

رات میں نے درگاوتی کے گانے پر دو ہزار روپے لٹا دیئے۔ مگر یہ روپے میری
ری تھی۔ میں اپنے کمانڈو پراجیکٹ کی بنیادیں استوار کر رہا تھا۔ رات ایک بجے
یں درگاوتی کے گھر سے واپس ہوٹل میں آیا۔ چار دنوں میں میں نے درگاوتی پر
خرچ کر دیئے کہ وہ مجھ سے بے حد متاثر ہوئی اور میرا دم بھرنے لگی۔ اب ہفتے
لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہفتے کی شام کو رام گڑھ راجستھان کے خفیہ نیوکلر پلانٹ یا
ایکٹر کا ڈائریکٹر سردار ارجن سنگھ سوڈھی آنے والا ہے۔ میں جمعے کی رات کو
کے گھر سے جدا ہونے لگا تو میں نے اسے کہا۔

رگا جی! اب کل آپ کے پھر درشن ہوں گے۔"

گاوتی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بڑے عجز کے ساتھ بولی۔

سونت جی!"

ب ہماری آپس میں کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ طوائفوں کے ہاں روپے کے ہاتھ
ے ہوتے ہیں۔ وہاں روپیہ درمیان کے سارے حجابات اٹھا دیتا ہے اور مہینوں کی
چند گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب وہ مجھے کبھی مہاراج اور کبھی سردار
بت کے موڈ میں ہوتی تو جسونت جی کہہ کر پکارنے لگتی تھی۔ اس نے کہا۔

جسونت جی! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کل میرے ایک مہربان اور
لنے والے آ رہے ہیں۔ کل میں آپ سے نہیں مل سکوں گی۔ مجھے شما کر دیجئے

ں نے اس سے مزید بالکل نہ پوچھا کہ اس کا یہ مہربان اور پرانا دوست کون ہے۔
پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مجھے تو معلوم تھا کہ سردار ارجن سنگھ سوڈھی
لا رہے ہیں۔ میں نے درگاوتی کو اپنے ساتھ لگا لیا اور پیار سے اس کے بالوں کو
ہوئے کہا۔

ئی بات نہیں درگا جی! میں کل دلی کا ایک چکر لگا لوں گا۔ کچھ روپے بھی تو لانے
ں۔"

وہ ہنس دی۔ میں نے بھی تھوڑا ہنس کر اس کے رخسار کو پیار کیا اور دو ایک روز بعد
آنے کا کہہ کر واپس اپنے ہوٹل میں آگیا۔ میں نے اسی وقت صبح دلی جانے کا پروگرام
طے کر لیا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میرے پاس پیسے تقریباً ختم ہو گئے تھے اور ابھی
درگاوتی پراجیکٹ پر تھوڑی سی مزید سرمایہ کاری کی ضرورت تھی۔ دوسرے میں نے
درگاوتی سے جو یہ کہہ دیا تھا کہ میں نے نیوکلر فزکس میں بی اے کیا ہوا ہے تو اس کا مجھے
ایک جعلی سرٹیفکیٹ بھی بنوانا تھا۔ کیونکہ آگے چل کر اس سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑنے
والی تھی۔

میں صبح صبح ایک بس میں بیٹھ کر دلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ دلی وہاں سے زیادہ دور
نہیں تھا اور ریواڑی سے بسیں چلتی ہی رہتی تھیں۔ دلی پہنچ کر میں نے گل خان کو اس
کے خاص نمبر پر ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ میں آگیا ہوں۔ اور اس کے نظام الدین اولیاءؒ والی
آبادی کے مکان پر جا رہا ہوں۔ گل خان نے کہا۔

"میں رات کو ہی آسکوں گا۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر پروفیسر جمشید کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ ایک خاص معاملے میں ان کا مشورہ
ضروری ہے۔"

گل خان نے کہا کہ وہ پروفیسر کو لیتا آئے گا۔ میں نے اسے فون بھی مزار شریف
والے مین گیٹ سے تھوڑی دور جو پبلک ٹیلی فون بوتھ تھا وہیں سے کیا تھا۔ وہاں
مغل شہزادے کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچایا اور یہ سوچتا ہوا
خان کے پرانے مکان کی طرف چل پڑا کہ مغل شہزادے کی روح نے مجھ پر نازل ہ
والی جس آفت کا ذکر کیا ہے خدا جانے وہ کب اچانک نازل ہو جائے۔

بہرحال اس بارے میں مجھے ایک الگ پریشانی سی ضرور لگ گئی تھی۔ کیونکہ
یقین تھا کہ نیک روحیں اگر آکر کوئی بشارت دیں تو وہ غلط بشارت نہیں ہوتی۔ مکان
تھا۔ اس کی چابی ہم نے ایک خاص جگہ چھپائی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں سے چابی نکا

زہ کھولا اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ اب مجھے وہاں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنا
انتظار کرنے کی مجھے عادت تھی۔ بلکہ یہ بات میری کمانڈو ٹریننگ میں شامل تھی۔ میں
ریواڑی کے بس اڈے سے کر کے چلا تھا۔ دوپہر کے وقت باہر جا کر ایک ہوٹل سے
کھایا۔ میں چونکہ اپنے اصلی حلیے میں نہیں تھا بلکہ سکھ نوجوان کے بھیس میں تھا
لئے مجھے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمرے میں
لیٹ گیا۔ مجھے نیند آگئی۔ کوئی چار پانچ بجے میری آنکھ کھلی۔ سردیوں کے دن چھوٹے
تے ہیں۔ جلدی شام پڑ گئی پھر رات ہوگئی۔ میں کمرے کے کونے میں موم بتی جلا کر بیٹھ
کھڑکی کا صرف ایک پٹ میں نے تھوڑا سا کھول رکھا تھا تاکہ باہر کے حالات سے باخبر
سکوں۔

رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی کہ گل خان اور پروفیسر جمشید بھی آگئے۔ گل خان
ے لئے کھانا ساتھ لایا تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے انہیں سارے واقعات بیان کر
۔ اس وقت میں نے انہیں اپنے منصوبے کی پوری تفصیل بیان کر دی۔ لیکن میں یہ
ل ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ خود پڑھ لیں گے کہ میں نے راجستھان رام گڑھ
زیر زمین بھارتی ایٹمی ری ایکٹر میں داخل ہونے کا کیا منصوبہ بنایا تھا۔

میں نے پروفیسر جمشید سے کہا کہ مجھے جسونت سنگھ سوڈھی کے نام کا ایک سرٹیفکیٹ
ے جس میں یہ درج ہو کہ میں نے نیوکلر فزکس میں بی۔ایس۔سی کیا ہے۔ وہ اور گل
آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ گل خان کہنے لگا۔

"یہ سرٹیفکیٹ تمہیں کب تک چاہئے؟"

میں نے اندازہ لگا کر اسے بتایا کہ مجھے ہفتہ دس دن کے بعد یہ سرٹیفکیٹ ضرور مل
جائے۔ گل خان بولا۔

"فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میرے کمانڈو مشن کا منصوبہ بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہا
پھر گل خان سے کہا۔

"جس روز میں تمہیں خط لکھوں اس کے دوسرے دن تم خود اور اپنے ساتھی کو لے کر ریواڑی میرے ہوٹل میں پہنچ جانا۔ لیکن ہوٹل میں رات کے وقت آنا"

میں نے اسے ہوٹل کا ایڈریس اور کمرہ نمبر لکھوا دیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں نے اس کا پورا انتظام کر لیا ہوا ہے۔ تمہارا خط ملتے ہی ہم دلی سے ریواڑی چل پڑیں گے۔"

پروفیسر جمشید نے پہلے تو مجھے سکھ کے حلیے میں دیکھ کر پہچانا ہی نہیں تھا۔ پھر پہچان لیا اور ہنس کر بولا۔

"سردار جی! تم تو پورے سکھ بن گئے ہو"

میں نے دلی پولیس کے بارے میں پوچھا کہ میرے بارے میں پولیس کی سرگرمیار کس مقام تک پہنچی ہیں۔ گل خان اپنے سراغ رساں کے ذریعے اس کے متعلق پوری پوری خبر رکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تازہ اطلاع کے مطابق تمہاری تصویر لکھنؤ کانپور اور پنجاب پولیس کو بھی دے دی گئی ہے۔ خفیہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ نگران کا خیال ہے کہ تم پاکستان واپس چکے ہو"

میں نے کہا۔

"بس کچھ عرصے تک انہیں اسی غلط فہمی میں مبتلا رہنا چاہئے۔ جب تک ہمارا ار گڑھ ایٹمی ری ایکٹر والا مشن مکمل نہیں ہوتا میں چاہتا ہوں کہ پولیس میرے بارے بالکل لاعلم رہے۔"

گل خان اور پروفیسر جمشید دوسرے دن شام کو آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ دوسرا بھی میں نے کچھ وقت کمرے میں سو کر اور کچھ باہر ٹہلتے ہوئے گزار دیا۔ شام کو میر دونوں ماسٹر سپائی آگئے۔ گل خان کو میں نے مزید کچھ روپوں کے لئے کہا تھا۔ وہ یہ رد بھی لے کر آیا تھا۔ شروع رات ہم نے مل کر کھانا کھایا اور میں ریواڑی جانے کے وہاں سے بس سٹینڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیونکہ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا اور د

ہفتے کا دن بلکہ ہفتے کی رات گزر چکی تھی جو رات ایٹمی سنٹر کے ڈائریکٹر سردار ارجن سوڈھی نے درگادتی کے ہاں گزارنی تھی۔ میں اتوار کے روز ہی ریواڑی پہنچ گیا۔ کے منیجر نے بتایا کہ اس دوران میرا ٹیکسی ڈرائیور دو تین بار آکر میرا پوچھ گیا تھا۔ دوپہر میں نے ہوٹل کے کمرے میں گزار دی۔ شام کو اٹھا نہا دھو کر کپڑے بدلے سکھوں والی جو بڑی پگڑی رکھی ہوئی تھی اس سے مجھے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ اگرچہ کوئی بوجھ نہیں تھا مگر مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے میرا سر جکڑ دیا ہے۔ شام را ٹیکسی ڈرائیور آگیا۔ میں نے سوچا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے گالیاں وغیرہ دے کر سے الگ کر دینا چاہئے۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ میں نے اسے ے میں بلا لیا۔

کہنے لگا۔

"مہاراج آپ دلی کیوں چلے گئے تھے؟ میں تو پریشان ہو گیا کہ بھگوان خیر کرے"

میں نے اسے غصے میں آکر کہا۔

"کیوں اوئے کھوتے دیا پترا۔ میں دلی کیوں نہیں جا سکتا۔ اور تم پریشان کیوں ہو گئے میں تمہارے پیسے مار کر چلا گیا تھا؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے اور عاجزی سے بولا۔

"مہاراج جی! میں آپ کا نوکر جو ہوا نوکروں کو اپنے مالک کی چنتا تو رہتی ہی ہے"

آدمی بڑا چالاک تھا۔ میں نے اسے بیس روپے دیئے اور کہا۔

"چل مجھے گردوارے لے چل۔ ماتھا ٹیکنا اے"

ٹیکسی ریواڑی کے گردوارے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے درگادتی کے بارے پوچھنے لگا۔ میں نے قدرے بے تعلقی سے کہا۔

"اچھی عورت ہے۔ بس دو ایک بار گیا ہوں"

اج! حکم کرو۔ میں کوئی نئی چیز دکھا دیتا ہوں۔"

ں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"بکواس نہ کراوئے جنگلی آدمی"

وہ چپ ہو گیا۔ گردوارہ آگیا۔ میں نے اندر جا کر گرو گرنتھ صاحب کے آگے ماتھا
ٹیکا۔ پرشاد لیا۔ گربانی کا پاٹھ کیا اور واپس ہوا۔ اس دوران میں چاروں طرف ماحول کا
جائزہ لیتا رہا اور محتاط رہا۔ گردوارے سے باہر نکل کر ٹیکسی کی طرف بڑھا تو وہاں دو پولیس
کے سپاہی نظر آئے۔ میں ذرا اونچی آواز میں گربانی کا پاٹھ کرتا ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ پولیس
والوں نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ان کی ویسے ہی وہاں ڈیوٹی لگی ہو گی۔ سکھ
بن جانے یعنی سکھ نوجوان کا روپ دھار لینے سے مجھے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا تھا کہ اس
خیال سے میرے ذہن پر جو تناؤ اور دباؤ سا رہتا تھا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں وہ کافی حد تک
دور ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود میں چاروں طرف سے باخبر رہتا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے
ٹیکسی ڈرائیور کو یہ کہہ کر چلتا کیا کہ وہ کل دن میں کسی وقت آکر پتہ کر جائے کہ مجھے
کہیں جانا تو نہیں۔

وہ پرنام کر کے چلا گیا۔ رات کو میں درگاوتی کے مکان پر جا پہنچا۔ میری جیب میں
پورے ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ میں نے بھی خوب عطر لگایا ہوا تھا۔ ریواڑی میں ہی میں
نے اس کے لئے عطر کی شیشی خرید لی تھی۔ اس کا میں نے درگاوتی کو تحفہ پیش کیا تو
بڑی خوش ہوئی۔ وہ بڑی بنی سنوری تھی اور کوئی سیٹھ قسم کا موٹا لالہ اس کے پاس بیٹھا
پان چبا چبا کر منہ مار رہا تھا۔ درگاوتی نے لالہ جی کو دو تین باتیں کر کے رخصت کر دیا۔ پھر
وہ مجھے لے کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ میرے لئے پھل اور مٹھائیاں آگئیں۔ چائے کا
دور چلنے لگا۔ درگاوتی نے مجھے دو تین ٹھمریاں سنائیں۔ میں نے ہزار روپیہ اس پر نچھاور کر
دیا۔

اب میں ہر رات اس کے پاس جاتا اس کا گانا سنتا اور ہزار بارہ سو روپے اس پر
نچھاور کر کے واپس آجاتا۔ اس طرح چھ دن گزر گئے۔ پھر ہفتے کی رات آگئی۔ درگاوتی
نے مجھ سے معذرت کی کہ کل رات میں فارغ نہیں ہوں گی۔ کل ہفتے کی رات ہے
میرے مہربان اور پرانے ملنے والے آرہے ہیں۔

"ہفتے کی رات آپ کو تو معلوم ہی ہے وہ میرے پاس گزارتے ہیں۔ کل کی رات
لئے مجھے شما کر دیجئے گا۔"

میں نے درگاوتی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بادشاہو! فکر کی کونسی بات ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم اتنی پیاری ہو۔ تمہارے تو بہت
کرنے والے ہوں گے۔ چلو میں بھی دلی اپنے ماتا پتا سے مل آتا ہوں اتوار کو واپس
ں گا۔"

میں اسی رات کی صبح کو ایک بار پھر دلی پہنچ گیا۔ اس بار میں نے جان بوجھ کر بس میں
کیا کہ وہاں لوگوں کی نظروں میں نہ آجاؤں۔ کیونکہ ریواڑی چھوٹا شہر تھا اور میں
بس سے دلی روانہ ہوتے ہوئے لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ میں نے ٹرین پکڑی
لی آگیا۔ آتے ہی گل خان کو فون کیا۔ اس نے یہ اچھی خبر سنائی کہ میرا بی۔ایس۔سی
لی سرٹیفکیٹ تیار ہو کر آگیا ہے۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"تم دوپہر کو ہی میرے پاس آجاؤ۔ رات ہونے کا انتظار نہ کرو۔"

وہ دوپہر کو آیا اور ساتھ میرے لئے کھانا چائے وغیرہ بھی لیتا آیا۔ اس نے مجھے
فکیٹ دیا۔ یہ دلی یونیورسٹی کا بی۔ایس۔سی کا سرٹیفکیٹ تھا۔ ایسی عمدہ نقل تیار کی گئی
کہ ہو بہو اصلی لگتا تھا۔ یونیورسٹی کی مہریں بھی لگی تھیں اور اس زمانے میں دلی
رٹی کا جو چانسلر تھا اس کے بھی پکے دستخط موجود تھے۔ سرٹیفکیٹ پر یہ بھی لکھا ہوا تھا
ں نے نیوکلر فزکس کے مضمون میں بی۔ایس۔سی درجہ اول میں پاس کیا ہے۔ گل
کہنے لگا۔

"میں نے اس کی ایک فوٹو کاپی کروا کر اپنے پاس رکھ لی ہے۔ تم اصلی سرٹیفکیٹ
لے جانا۔ ویسے اگر یہ گم ہو جائے تو دوسرا جعلی سرٹیفکیٹ بھی تیار ہو سکتا ہے۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"گل بھائی! اب کمانڈو ایکشن کا وقت آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے جانے
کے دوسرے دن اپنے خاص آدمی کو لے کر رات کے وقت میرے ہوٹل ریواڑی پہنچ

جاؤ۔ اپنے ساتھ پستول اور ایک بڑا چاقو لانا مت بھولنا۔ پستول تمہارے پاس رہے گا اور
چاقو دوسرے آدمی کے پاس ہوگا۔"

ہم نے ایک بار پھر اپنے منصوبے کی ساری تفصیل کو دہرایا اور میں نے اسے اچھ
طرح سے ذہن نشین کرادیا کہ ان لوگوں کو کس طرح غنڈوں کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ گ
خان بولا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ ہم پرسوں رات تمہارے پاس ہوں گے۔"

وہ دن اور اس کا اگلا دن میں نے دلی میں اسی مکان میں گزارا اور دوسرے دن ک
رات کو واپس ریواڑی آگیا۔ اس سے اگلی رات گل خان بھی اپنے ساتھی کو لے ک
میرے ہوٹل کا پتہ معلوم کر کے میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک باڈی بلڈر ٹائپ
کا نوجوان تھا جو اپنے گروپ کا ہی با اعتماد نوجوان تھا اس میں اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ ک
بھرا ہوا تھا۔ وہ کشمیر کے محاذ پر بھی لڑ چکا تھا اور بقول اس کے اس نے کئی ڈوگرہ فوجیوں
ہلاک کیا تھا۔ دونوں پتلون قمیض میں تھے اور بند گلے کی اونی جرسیاں پہنی ہوئی تھیں
ریواڑی میں دن کے وقت اتنی ٹھنڈ نہیں پڑتی تھی مگر رات کو سردی ہو جاتی تھی۔ ہ
نے رات کا کھانا اکٹھے ہی کھایا۔ اس کے بعد دونوں ہی چلے گئے۔ وہ سٹیشن کے پاس ک
ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے دن رات کو مجھے اپنے کمانڈو منصوبے کے پ
مرحلے پر عمل شروع کرنا تھا۔ میں رات کی بجائے شام کو ہی درگاوتی کے مکان پر چلا گ
ایک گھنٹہ اس کا گانا سنا۔ اس پر کچھ روپے نچھاور کئے اور کہا۔

"درگا جی! آج کسی سینما میں جا کر فلم دیکھی جائے بڑا دل چاہ رہا ہے۔"

وہ ذرا سوچنے لگی تو میں نے کہا۔

"بس انکار نہ کرنا درگا جی! میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ رات کا شو دیکھیں گے۔ میں جا
ٹکٹ بک کرا آتا ہوں۔ بڑی اچھی فلم چل رہی ہے۔"

درگاوتی نے مسکرا کر کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔"

ریواڑی میں ایک دو ہی سینما ہاؤس تھے اس زمانے میں ایک سینما ہاؤس نیا نیا بنا تھا۔
ہانے وہاں کونسی انڈین فلم چل رہی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ اتنا یاد ہے اس
دلیپ کمار نے کام کیا تھا۔ میں نے گیلری کی دو سیٹیں بک کرالیں۔ واپسی پر اس
نے کا جائزہ لینے لگا۔ جہاں مجھے درگاوتی کے ساتھ رکشا یا ٹیکسی میں گزرنا تھا۔ وہاں سے
ما میں گل خان کے پاس اس کے ہوٹل میں گیا۔ اسے بتایا کہ آج رات ہم سینما دیکھنے
ہے ہیں۔ واپسی پر ایکشن پلے ہوگا۔ میں نے ان دونوں کو ساتھ لیا۔ ایک ٹیکسی میں
اور دور سے انہیں درگاوتی کا مکان دکھا دیا۔ گل خان بولا۔

"ہم رات کا آخری شو ٹوٹنے کے بعد یہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے اسے بتا دیا تھا کہ درگاوتی کے مکان میں رات کو سوائے سازندوں کے اور
مرد نہیں ہوتا۔ آدھی رات کے بعد اگر اس کا کوئی آدمی آجاتا ہو تو اس کی مجھے خبر
۔ مگر رات بارہ ایک بجے تک وہ اکیلی ہی ہوتی ہے۔

دونوں واپس چلے گئے۔ میں نے درگاوتی کے پاس آکر اسے سینما کے ٹکٹ دکھائے
ہا۔

"سوہنیو! تیاری شروع کردو۔ دوسرا شو شروع ہونے میں تھوڑا وقت ہی رہ گیا
"

درگاوتی نے نئی مگر سادہ ساڑھی نکال کر پہنی اور چوکیدار کو بھیج کر ٹیکسی منگوائی۔
ا سازندوں سے کہا کہ وہ اس کے واپس آنے تک گھر پر ہی رہیں۔ ہم دونوں ٹیکسی
یٹھ کر سینما ہاؤس کی طرف روانہ ہوگئے۔ گل خان اور اس کے ساتھی کو میں نے
دیا تھا کہ انہیں کس وقت آنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ فلم دیکھ کر ہم واپس آئے تو رات
ب بج رہا تھا۔ دونوں سازندے کمرے میں سو رہے تھے۔ درگاوتی نے انہیں اٹھاتے
ے کہا۔

"تمہیں یہاں پہرہ دینے کے لئے کہا تھا اور تم لمبی تان کر سو رہے ہو۔ جاؤ پیچھے اپنی
ڑی میں جا کر سوؤ۔"

دونوں سازندے اٹھ کر چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی کے پیچھے کسی کوٹھڑی میں رات کو سوتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے کچھ فکر لگی۔ لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ سازندے کوٹھڑی میں جاتے ہی سو جائیں گے اور ویسے بھی میرے منصوبے میں پستول کے فائر کا دھماکہ شامل نہیں تھا۔ درگاوتی کہنے لگی۔

"جسونت جی! آج یہیں پر سو جاؤ۔ کہاں ہوٹل میں اس وقت جاؤ گے۔"

مجھے تو ہر حالت میں وہیں ٹھہرنا تھا۔ میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی"

میں کوٹ اتار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ درگاوتی دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔ میں نے وقت دیکھا۔ گل خان کے آنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ درگاوتی واپس آئی تو اس نے سلکی نائیٹی پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے جسم کے پیچ وخم نمایاں ہو کر نظر آرہے تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھنے لگی تو میں نے کہا۔

"میری جان جی! ذرا میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہیں دور سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اس لباس میں بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

بات یہ تھی کہ منصوبے کے مطابق اسے میرے ساتھ نہیں بلکہ سامنے والے صوفے پر بیٹھنا چاہئے تھا جس کے پیچھے دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے اطمینان کر لیا تھا۔ اس دروازے کو اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی۔ درگاوتی شرماتی ہوئی دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

میں اس کے حسن کی اس کے جسم کی تعریفیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ گل خان کے آنے میں پانچ سات منٹ رہ گئے تو میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ دھڑاک سے دروازہ کھلا اور گل خان اور اس کا ساتھی اس حالت میں اندر داخل ہوئے کہ گل خان کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے ساتھی کے ہاتھ میں برہنہ خنجر تھا۔ پروگرام کے مطابق گل خان نے آتے ہی درگاوتی کی گردن میں بازو ڈالا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ اس

چھلانگ لگا کر میرے پیچھے آگیا اور خنجر میری گردن پر رکھ دیا۔ درگاوتی کا دہشت ے رنگ اڑ گیا تھا۔ گل خان نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"کسی قسم کی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا میرا پستول بھرا ہوا ہے۔ اس عورت کے یک ہی گولی کافی ہو گی۔"

یں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے میں ذرا نہیں گھبرایا ہوں۔ میں درگاوتی پر یہی ظاہر کرنا ھا۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

گل خان نے کہا۔

"مجھے تم سے کچھ نہیں چاہئے۔"

پھر اس نے درگاوتی کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا۔

"بتا تمہارے زیور اور مال دولت کہاں پر ہے اگر آواز نکالی تو پستول کی گولی تیرا بھیجہ ے گی۔"

درگاوتی کو گل خان نے صوفے پر سے کھینچ کر اپنے آگے کھڑا کیا ہوا تھا۔ درگاوتی کی ،کے مارے بری حالت تھی۔ اس پر لرزہ طاری تھا۔ بڑی مشکل سے بولی۔

"مجھے نہ مارنا۔ سارے زیور روپے سامنے والی الماری میں ہیں۔"

ری کی چابی کہاں ہے؟"

گل خان نے پوچھا۔

"الماری کھلی ہوئی ہے۔"

درگاوتی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس کا ساتھی جو خنجر میری گردن پر رکھے کھڑا تھا۔ وہ پروگرام کے مطابق جان بوجھ ذرا غافل ہوگیا۔ گل خان جیسے ہی درگاوتی کو کھینچتا ہوا الماری کی طرف بڑھا میں نے خان پر چھلانگ لگا کر اسے زمین پر گرا دیا۔ اس کا پستول پرے جا پڑا۔ میں نے درگاوتی کھانے کے لئے گل خان کو جبڑوں پر زور سے مکا مارا اور پستول اٹھانے لگا۔ اتنے میں

اس کا ساتھی خنجر سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے کے پیچھے گرا دیا اور پستول اٹھا کر گرج کر کہا۔

"اوئے تم کو پتہ نہیں تھا کہ یہاں شیر دل جسونت سنگھ سوڈھی بیٹھا ہوا ہے۔ میں تو تم دونوں کو اڑا کر رکھ دوں گا۔"

گل خان اور اس کا ساتھی جیسا کہ انہیں سمجھا دیا گیا تھا ہاتھ کھڑے کر کے ایک طرف کھڑے تھے۔ درگاوتی میرے ساتھ لگ گئی تھی اور اس کا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"جسونت جی انہیں قتل نہ کرنا۔ میری بڑی بدنامی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو ان کی جان بخشی کر دیتا ہوں۔ لیکن میں انہیں پولیس کے حوالے ضرور کروں گا۔"

درگاوتی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ خوف کے مارے ابھی تک اس کے حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ کہنے لگی۔

"بھگوان کا واسطہ ہے۔ پولیس یہاں آئی تو وہ مجھے بھی پکڑ کر لے جائے گی۔ وہ مجھے بڑا خوار کرے گی۔ ان کو یہاں سے بھگا دو"

میں نے گل خان سے کہا۔

"سن اوئے وڈے غنڈیا اس عورت نے تمہاری جان بچالی ہے۔ تمہیں جیل جانے سے بھی بچا لیا ہے۔ اب یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اگر پھر کبھی اس گھر کا رخ کیا تو یاد رکھنا میں یہاں تمہارے سواگت کو موجود ہوں گا۔ پھر میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

گل خان نے پہلے سے طے شدہ مکالمے بولتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سردار جی! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔"

میں نے گل خان کا پستول اور اس کے ساتھی کا خنجر اپنے قبضے میں کر لیا۔ اور اٹھ کر ان کے قریب گیا۔ دونوں کی پیٹھ پر ایک ایک لات ماری اور انہیں کمرے سے نکال کر

ٹھی کے برآمدے میں لے آیا۔ باہر آکر دیکھا تو منصوبے کے مطابق انہوں نے چوکیدار منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے ستول کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ برآمدے میں آکر گل خان سرگوشی میں پوچھا۔

"کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"سب کام ٹھیک ہوا ہے۔"

پھر اونچی آواز میں دونوں کو بے ضرر سی گالی دے کر کہا۔

"خبردار اگر دوبارہ ادھر میں نے تم کو دیکھا۔ یاد رکھو۔ میں پنجابی بھی ہوں اور سکھ ہوں۔ دفع ہو جاؤ۔"

برآمدے کے اوپر روشن بلب کی روشنی میں بندھا ہوا چوکیدار ہمیں دیکھ رہا تھا۔ گل ن اور اس کا ساتھی دونوں بھاگ کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ پستول ے ایک ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں نے چوکیدار کے منہ سے کپڑا ۔ اس کی رسیاں کھولیں۔ وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ڈاکوؤں کو بھگا دیا ۔ فوراً واپس درگاوتی کے کمرے میں آیا۔

وہ صوفے پر پڑی تھی۔ اس کا رنگ ابھی تک زرد تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ں۔ میں نے اسے گلاس میں پانی لا کر پلایا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے حوصلہ لہ گھبرانے کی اب کونسی بات ہے۔ میں نے ڈاکوؤں کو بھگا دیا ہے۔ پھر پستول اور خنجر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"درگا جی! تمہارے کہنے پر میں نے انہیں چھوڑ دیا ورنہ میں دونوں کا خون کرنے والا ۔"

درگاوتی نے اپنا سر میرے ساتھ لگا دیا اور روتے ہوئے بولی۔

"جسونت جی! تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ کبھی نہیں اتی۔"

وہ رو رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا اور کہا۔

"درگا جی! رونے کی کونسی بات ہے بھلا میرے ہوتے ہوئے کس میں اتنی ہمت ہے کہ تمہاری طرف بری نظر بھی دیکھے۔"

وہ میرے ساتھ لگ کر بولی۔

"بھگوان کے لئے میرے پاس ہی رہنا۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔"

میں نے کہا۔

"بادشاہو! اب تو جیون بھر تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جا سکتے ہیں؟"

وہ ذرا اپنے ہوش و حواس میں آئی تو ہاتھ جوڑ کر میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو درگا جی! تمہارے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔"

وہ میری بہادری اور جواں مردی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"جسونت جی! اگر تم ہمت سے کام نہ لیتے تو میں لٹ گئی تھی۔"

ایک بات کا مجھے زندگی میں تجربہ بھی ہوا ہے اور میرا مشاہدہ بھی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ عورت مرد کے حسن، اس کی شہرت اور اس کی دولت سے بھی بہت متاثر ہوتی ہے مگر جتنا متاثر وہ مرد کی بہادری سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے اتنا متاثر نہیں ہوتی۔ شاید یہ قدرتی بات ہے۔ بہادر مرد کی عورت دل سے قدر کرتی ہے۔ میں نے یہ سارا ڈرامہ بھی اسی لئے رچایا تھا کہ وہ مجھ سے صرف شدت کے ساتھ متاثر ہی نہ ہو بلکہ میری زیر بار احسان ہو جائے۔ پھر مجھے اس سے جو کام نکالنا تھا اس کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اس نے مجھے خاص طور پر منع کر دیا کہ میں اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ اس نے چوکیدار کو بھی بلا کر کہا۔

"خبردار! کسی کو اس واقعے کا پتہ نہ چلے۔ تم سمجھو کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ سازند سو رہے ہوں گے۔ انہیں بھی کچھ نہ بتانا۔ میں نہیں چاہتی کہ پولیس مجھ سے پوچھ گچھ

یہاں آئے یا مجھے تھانے بلائے۔ میری بڑی بدنامی ہوگی۔ آج تک میرے ساتھ کبھی
ایسا واقعہ نہیں ہوا۔"

وہ رات میں نے درگاوتی کے مکان پر ہی بسر کی۔ دوسرے روز بھی میں دوپہر تک
کے پاس ہی رہا۔ پھر رات کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ گل خان اور اس کا ساتھی میری
کے مطابق واپس دلی روانہ ہو چکے تھے۔ میرے مشن کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔
ھے اس کے دوسرے مرحلے پر کام شروع کرنا تھا۔

میں رات کو درگاوتی کے پاس گیا تو اس کے لئے ریشمی ساڑھی کا ایک تحفہ بھی لیتا
وہ مجھے دیکھ کر اور ساڑھی کا تحفہ لے کر بڑی خوش ہوئی۔ مجھ سے رات کے واقعے
کر کے میری بہادری کی تعریفیں کرنے لگی۔ ہم چائے پی رہے تھے۔ میں نے اسے

"درگا جی! آج مجھے کوئی اپنی پسند کی چیز سناؤ۔"

سازندوں نے ساز چھیڑ دیئے۔ درگاوتی نے خدا جانے کس کی غزل سنائی۔ غزل کی
میرا بالکل دھیان نہیں تھا۔ میں اپنے اگلے مرحلے کی ابتدا کرنے والا تھا۔ اور اسی
ے میں سوچ رہا تھا۔ مگر اس دوران اسے سو سو روپے کی ایک ہزار کی ویلیں دینا
ں بھولا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ میں تقریباً ہر دوسرے روز اسے ایک ہزار روپے
کسی بہانے دے دیتا تھا۔ مجھ سے بڑھ کر تماش بین اسے کہاں مل سکتا تھا اور اب تو
ی مریدنی سی بن گئی تھی۔ اس نے مجھے صاف صاف کہا تھا کہ رات کو میری جگہ
سرا تماش بین ہوتا تو بھاگ جاتا۔ غزل ختم ہوئی تو میں نے باتوں ہی باتوں میں اسے

"درگا جی! میں تو چاہتا ہوں کہ دلی چھوڑ کر میں ریواڑی میں آجاؤں۔ پتاجی نے
جھے کی جائیداد پہلے ہی الگ کر دی تھی اور میں نے اسے بیچ کر دس لاکھ روپے
جمع کروا رکھے ہیں۔ سوچتا ہوں یہ سارے روپے یہاں ریواڑی کے کسی بینک
کرادوں اور کوئی مکان لے کر رہنے لگوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ دس لاکھ کا سن کر درگاوتی کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی تھی۔ آنی بھی چاہئے تھی۔ کہنے لگی۔

"تو تم یہاں آ کیوں نہیں جاتے۔ بے شک میرے پاس ہی رہ لینا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں درگا! یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں یہاں کوئی مکان لے لوں گا۔ میں مکان لے سکتا ہوں۔"

درگاوتی میرے قریب ہو گئی۔

"میں تمہیں بڑا اچھا مکان لے دوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

میں نے فکر مند ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں کوئی کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ یہ کہیں کہ میں باپ کی جائیداد پر عیش و عشرت کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی سی ملازمت بھی کرلوں تاکہ سماج میں میری تھوڑی بہت عزت بھی بن جائے۔ لوگ مجھے ذمے دار آدمی سمجھنے لگیں۔"

درگاوتی نے میرے مزید قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں ملازمت کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔"

میں نے درگاوتی کی طرف دیکھا۔

"تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟"

وہ بڑے فخر کے ساتھ کہنے لگی۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے ہفتے کی رات کو میرے پاس ایک پرانے مہربان آتے ہیں میں نے تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ میں نے تم سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا"

وہ بولی۔

"جانتے ہو وہ میرا دوست اور مہربان کون ہے؟"

کوئی لکھ پتی سیٹھ ہوگا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

کہنے لگی۔

"نہیں۔ وہ بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔ اس کا نام سردار ارجن سنگھ سوڈھی ہے۔ ی ذات بھی وہی ہے جو تمہاری ذات ہے۔"

"وہ میری کیا مدد کرے گا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

درگاوتی نے میری طرف جھک کر بڑی رازداری کے انداز میں کہا۔

"رام گڑھ میں کوئی دفتر ہے وہاں وہ سب سے بڑا افسر لگا ہوا ہے۔ میں اسے کہہ کر ن وہاں اچھی سی ملازمت دلوا دوں گی۔"

میں نے کہا۔

"اگر یہ ہو جائے تو بڑا اچھا ہے۔ پھر میں جب چاہوں تمہارے پاس بھی آجایا کروں "

وہ بولی۔

"رام گڑھ یہاں سے کونسا دور ہے۔ تم یہاں سے صبح جا کر شام کو واپس آجایا کرنا۔"

میں نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہو جائے تو میں گھر والوں کو بھی بتا سکوں گا کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہوں۔ ی ملتے ہی میں دس لاکھ روپے دلی والے اپنے بینک سے یہاں ریواڑی کے بینک میں لوا دوں گا۔ مگر سردار جی تمہاری بات مان جائیں گے۔ میرے پاس بی۔ایس۔سی کا بفکیٹ بھی ہے۔"

وہ گردن اونچی کر کے کہنے لگی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ سردار جی تو میرے غلام ہیں۔ بس اس ہفتے وہ آئیں گے تو ان سے بات کر کے تم سے ملوا بھی دوں گی۔ تم ایسا کرنا۔ مجھے اپنی بی۔ایس۔سی کی ت کا سرٹیفکیٹ دلی سے منگوا دینا۔"

میں نے کہا۔

"وہ تو میرے پاس ہی ہے۔ میں کل لیتا آؤں گا۔"

اتنا مجھے معلوم تھا کہ سردار جی ایک خفیہ ایٹمی سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔ شاید وہ ایک طوائف کے کہنے پر مجھے وہاں ملازمت نہ دیں۔ شاید انہوں نے درگاوتی کو بتایا ہی نہ ہو کہ وہ ایٹمی سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔ بہرحال میرے پاس نیوکلر فزکس میں فسٹ کلاس بی۔ایس۔سی پاس کرنے کا جو سرٹیفکیٹ تھا وہ انہیں سوچنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

دوسرے روز میں رات کو درگاوتی کے ہاں گیا تو اپنا نقلی سرٹیفکیٹ بھی لفافے میں ڈال کر لیتا گیا۔ مزید کچھ دن گزر گئے۔ پھر ہفتے کی رات آگئی۔ اس رات درگاوتی نے سردار ارجن سنگھ سوڈھی سے میری نوکری کے بارے میں بات کرنی تھی۔ میں اس رات ہوٹل میں ہی رہا۔ دوسرا دن بھی ہوٹل میں ہی گزارا۔ رات کو درگاوتی کے ہاں گیا تو وہ بڑی خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"جسونت جی! تمہارا کام ہو گیا سمجھو۔"

اس نے خدا جانے کس نازک لمحے کے دوران سردار جی سے میری بابت بات کی تھی کہ سردار جی نے مجھے نوکری دلانے کی حامی بھرلی تھی لیکن انہوں نے شرط لگائی تھی کہ میں اگلے ہفتے آؤں گا اور امیدوار نوجوان سے بھی ملوں گا اور اس کا سرٹیفکیٹ بھی دیکھوں گا۔ میں نے جان بوجھ کر زیادہ خوشی کا اظہار نہ کیا۔

"بھگوان جانے سردار جی نے تمہیں یونہی کہہ دیا ہوگا۔"

درگاوتی نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"یاد رکھو! عورت اگر کسی مرد سے کوئی کام کروانا چاہے تو وہ سب کچھ جانتی ہے کہ یہ کام اسے کس طرح کروانا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت حد تک ٹھیک کہہ رہی تھی۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ تاریخ کے بڑے بڑے فیصلے عورت کے بستر پر ہوئے ہیں۔ نہ جانے کتنے ایسے خونیں انقلاب ہیں جن کے پیچھے عورت کا ہاتھ کار فرما رہا ہے۔ عورت کی خواب گاہ میں مرد پر ایک ایسا نازک وقت آتا ہے کہ اس وقت عورت اس سے جو چاہے منوالیتی ہے۔

رگاوتی نے بھی سردار ارجن سنگھ سوڈھی کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ اسی لئے وہ اتنی پراعتماد
ی مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔

ہفتے کی شام کو سردار ارجن سنگھ سوڈھی رام گڑھ سے بلکہ راج گڑھ سے ریواڑی
گاوتی کے گھر آئے تو میں پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مجھے درگاوتی نے دوسرے کمرے
بٹھا دیا تھا۔ وہ سردار ارجن سنگھ سوڈھی کو لے کر گانے بجانے والے کمرے میں چلی
۔ اندر سے گانے بجانے کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کوئی پون گھنٹہ گزر گیا۔ میں
ے کمرے میں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ سگریٹ کی طلب پیدا ہوئی۔ مگر میں سگریٹ نہیں پی
تھا۔ کیونکہ میں سکھ بنا ہوا تھا۔ میں احتیاط کے طور پر اپنی جیب میں بھی سگریٹ نہیں
تا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تو درگاوتی کمرے سے نکلی۔ وہ اپنے بال درست کر رہی تھی۔
نے لگی۔

"آجاؤ۔"

میں گانے بجانے والے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے گاؤ تکیے کا سہارا لئے سردار
ن سنگھ سوڈھی اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی قمیض پتلون سے باہر نکلی ہوئی
۔ سر پر انہوں نے زرد رنگ کا رومال باندھ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں میرا سرٹیفکیٹ
۔ آنکھوں پر چشمہ لگا تھا اور وہ میرے سرٹیفکیٹ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے
تے ہی بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا اور اسی ادب کے ساتھ ان کے
وں کے پاس ایک ہو کر بیٹھ گیا۔

سردار صاحب کی عمر ساٹھ کی ہو چکی تھی۔ ڈاڑھی کافی سفید ہو گی جنہیں خضاب لگا
ر انہوں نے سیاہ کیا ہوا تھا۔ جسم بھاری تھا انہوں نے سرٹیفکیٹ سے نظریں ہٹا کر میری
ف گھور کر دیکھا درگاوتی ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"لڑکا بی۔ایس۔سی پاس ہے۔ پھر یہ بھی سوڈھی ہے۔ اسے اپنے دفتر میں کسی کام پر
ں۔ اس کی زندگی بن جائے گی۔"

سردار جی نے پوچھا۔

"نیوکلر فزکس کی تم نے تھیوری پڑھی ہے کہ پریکٹیکل بھی کیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"پریکٹیکل بھی کرتا رہا ہوں سر۔ میں نے یہ سبجیکٹ اسی لئے سلیکٹ کیا تھا سر کہ مجھے نیوکلر سائنس کا بڑا شوق تھا۔ میں نے آئن سٹائن کی تھیوری آف ریلیٹویٹی بھی پڑھی ہے سر۔"

سردار ارجن سنگھ سوڈھی نے دوبارہ میرے سرٹیفکیٹ پر نگاہ ڈالی۔

"تمہاری ڈویژن بھی فسٹ کلاس ہے۔"

میں کچھ کہنے لگا تو درگاوتی نے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ میں خاموش رہا۔ سردار جی نے سرٹیفکیٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"تم دو ایک دن بعد راج گڑھ میرے مکان پر آکر مجھے مل لینا میں سوچوں گا کہ تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے سرٹیفکیٹ لے کر سردار جی کا شکریہ ادا کیا اور درگاوتی کے دوسرے اشارے پر اسے ست سری اکال کہہ کر بڑے ادب سے کمرے سے نکل آیا۔

یہاں میں بات کو مختصر کرتے ہوئے آپ کو بتاتا ہوں کہ دو دن کے بعد میں ریواڑی سے راج گڑھ سردار جی کے دیئے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ سردار جی اپنے کوٹھی نما کوارٹر کے لان میں کرسی میز ڈال کر بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ یہ صوبہ راجستھان کا شمال مغربی علاقہ تھا۔ یہاں سردیوں میں دن کے وقت ہلکی گرمی ہوتی ہے۔ رات کو ٹھنڈ ضرور ہوتی ہے۔ شام کے وقت موسم بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔ میز پر بیئر کی بوتل پڑی تھی۔ ایک گلاس میں آدھی بیئر نظر آرہی تھی۔ سردار ارجن سنگھ جی نے پتلی سی جرسی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ سر پر رومال بندھا تھا۔ گھٹنوں پر تولیہ پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر ست سری اکال کہا اور ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

سردار جی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بید کی ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ میں سمٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سردار جی نے نوکر کو بلا کر اندر سے کاپی پنسل منگوائی۔ کاپی میری

…ں بڑھا کر کہا۔

"لکھو۔ ڈائریکٹر جنرل منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رام گڑھ۔"

میں کاپی پر انگریزی میں لکھتا چلا گیا۔ سردار جی نے کہا۔

"یہ کاغذ پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لو۔ کل ڈائریکٹر جنرل کے نام ایک اپلی کیشن لکھ کر …آنا کہ میں نیوکلر فزکس کا بی۔ایس۔سی ہوں۔ مجھے منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں …ے لائق کوئی نوکری عطا کی جائے۔ ساتھ اس سرٹیفکیٹ کی ایک کاپی لگا دینا۔ میں …ش کروں گا کہ تمہیں کوئی کام مل جائے۔ یہاں کسی سے ذکر نہ کرنا کہ تم مجھ سے …آئے تھے۔ اب تم جدھر سے آئے ہو ادھر ہی چلے جاؤ۔"

میں ست سری اکال کہہ کر خاموشی سے واپس چل دیا۔

اگلے روز میں نے ایک درخواست لکھی۔ اس کے ساتھ اپنے جعلی سرٹیفکیٹ کی کاپی لگائی اور شام کے وقت سردار جی کے ہاں جا کر انہیں دے دی۔ انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم واپس ریواڑی چلے جاؤ۔ میں درگاوتی کو جو بتانا ہوگا بتا دوں گا۔ اور کسی سے میری بابت کوئی بات نہ کرنا۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"سر! میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ تمہارے ماتا پتا دلی میں ہی ہوتے ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ درگاوتی نے اسے بتا دیا ہوگا کیونکہ میں نے اسے …تھا کہ میرے ماں باپ دلی میں ہیں۔

"ہاں جی دلی میں ہی رہتے ہیں۔ لیکن میری ان سے بنتی نہیں۔ پتا جی مجھے ہر وقت …تے رہتے ہیں کہ میں کوئی کام نہیں کرتا۔ میں نے پڑھ لکھ کر گنوایا ہے۔"

سردار ارجن سنگھ سوڈھی نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔

"مجھے تیرے ماتا پتا کے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر درگاوتی کی سفارش نہ …تم یہاں آ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے ماتا پتا کو بھی نہ بتانا کہ تم یہاں کام کرتے ہو۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ اس جملے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سردار جی نے مجھے وہاں

نوکری دے دی ہے۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ درخواست پر انہوں نے
محکمے کا نام مینرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھوایا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایٹمی ریسرچ سنٹر
نیوکلر انرجی سنٹر کو ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔ میں نے وفادار خادموں کی طرح فوراً ہاتھ
باندھ کر کہا۔

"سر! مجھے کیا ضرورت ہے ماتا پتا کو بھی بتانے کی۔ میں تو پہلے ہی ان سے نہیں ملتا۔

اب جاؤ۔"

میں چلنے لگا تو سردار جی نے کہا۔

"اور سنو! درگاوتی کے ہاں بھی زیادہ مت جانا۔ کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا سر! میں وہاں بھی نہیں جاؤں گا"

سردار جی نے انگلی ہلا کر مجھے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس روز واپس ریواڑی اور وہاں سے دلی پہنچ گیا۔ اب مجھے ایک دو دن کے بعد
درگاوتی سے رابطہ قائم کر کے اپنی نوکری کے بارے میں معلوم کرنا تھا جو یقیناً مجھے مل چکی
تھی۔ دلی آکر میں نے گل خان اور پروفیسر جمشید کو اپنی کامیابی کا مژدہ سنایا۔ پروفیسر جمشید
خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔

"یہ کام عورت کی وجہ سے ہوا ہے۔ سردار ارجن سنگھ سوڈھی نے سکھ ہونے کا
ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کی جگہ کوئی ہندو ہوتا تو تمہیں قریب بھی نہ پھٹکنے دیتا۔ کیونکہ
رام گڑھ کا زیر زمین ایٹمی ریسرچ سنٹر انڈیا کے حساس ترین اور اہم ترین سائنسی اداروں
میں سے ہے۔"

گل خان کہنے لگا۔

"ہم نے بھی تو ڈاکوؤں کا بڑا کامیاب رول ادا کیا تھا۔"

"یہ واقعہ اپنا کام دکھا گیا"

میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ دو تین دنوں کے بعد میں رام گڑھ کے ایٹمی ریسرچ سنٹر میں کوئی

کوئی ڈیوٹی دے رہا ہوں گا"

پروفیسر جمشید بولا۔

"میں حیران ہوں کہ ارجن سنگھ سوڈھی نے تمہارے ماں باپ کے بارے میں بھی
کوئی تحقیق نہیں کی۔ حالانکہ وہاں جس کسی کو ملازم رکھا جاتا ہے اس کی بے حد سکروٹنی
ہوتی ہے اس کے سارے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ میں سمجھتا
ہوں کہ تم بڑے خوش قسمت ہو"

"یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے"

گل خان نے کہا۔

پروفیسر جمشید کہنے لگا۔

"ایٹمی سنٹر میں ملازم ہونے کے بعد تمہیں زیر زمین وہاں کے تمام شعبوں کے نقشے
تیار کر کے مجھے دکھانے ہوں گے۔ انہیں دیکھ کر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کس مقام پر
اٹم بم لگانے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی کروں گا۔ کیونکہ ایک اعتبار سے میں وہاں اجنبی ہوں گا۔"

پروفیسر کہنے لگا۔

"لیکن تمہارے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ تم نے نیوکلر سائنس میں بی۔ایس۔سی
حاصل کیا ہے۔ اس اعتبار سے تمہیں نیوکلر فزکس کی ابتدائی معلومات ضرور ہونی چاہئیں"

میں نے جواب میں کہا۔

"کچھ ابتدائی معلومات کا مجھے علم ہے۔ باقی میں دو دن یہاں پر ہوں۔ کچھ تم سے
معلومات حاصل کروں گا۔"

رات کے ایک بجے کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔

ان کے سامنے بھی میں سگریٹ پیتا رہا تھا اور ان کے جانے کے بعد بھی میں نے سگریٹ لگایا اور تھرمس میں سے چائے کپ میں ڈال کر چارپائی پر بیٹھا آئندہ کے کمانڈو منصوبے پر غور و فکر کرنے لگا۔ اپنی سکھوں والی پگڑی اتار کر میں نے دیوار کے ساتھ لٹکا دی تھی اور سر کا جوڑا کھول دیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ یہ پگڑی اور سر کے بندھے ہوئے بال ہی پریشان کرتے رہتے تھے۔ اصل میں مجھے اس کی عادت نہیں تھی۔ دوسرے دن پروفیسر جمشید دن کے وقت ہی مجھ سے ملنے آگیا۔ اس نے مجھے نیوکلر انرجی پر ایک مختصر سا لیکچر دیا۔ پھر بتایا کہ نیوکلر پلانٹ کیا ہوتا ہے اور وہاں کس طرح یورینیم میں سے ان چند ایک عناصر کو صاف کر کے ایٹمی دھماکے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ پلاٹونیم کے بارے میں بھی اس نے مجھے تمام ابتدائی معلومات بتائیں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مادے کے تمام عناصر میں سے صرف یورینیم ہی ایک ایسا مادہ ہے جس کے تمام عناصر سے ایٹمی دھماکہ ہو سکتا ہے اس کو ایٹمی ایندھن بھی کہتے ہیں۔ ہر ایٹمی سنٹر میں اسی ایندھن کو بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میں نے پروفیسر کی ساری باتیں جتنی میری سمجھ میں آئیں میں نے انہیں اپنے ذہن میں بٹھا لیا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ میں رام گڑھ کے زیر زمین ایٹمی مرکز کے تمام ایٹمی پلانٹ کے شعبوں کے نقشے یا تصویریں اتار کر پروفیسر جمشید کو لا کر دوں گا اور وہ ایٹمی مرکز کی تباہی کے سلسلے میں میری مدد کرے گا۔ پروفیسر نے کہا۔

"ہمارے وسائل یہاں محدود ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تمہیں چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا کیمرہ لا کر دے سکوں جو تمہاری انگوٹھی یا تمہاری قمیض کے بٹن میں

نکس کر دیا جائے۔ لیکن پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں سیکورٹی چیکنگ کا کیا انتظام ہے کیونکہ غیر ضروری میٹل تمہارے لباس یا جسم پر چیک ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکے گا۔"

دو دن دلی والے مکان میں گل خان اور پروفیسر جمشید کی صحبت میں گزارنے اور روری تفصیلات طے کرنے کے بعد میں ریواڑی واپس چلا آیا۔ یہاں آتے ہی میں سیدھا گاوتی کے ہاں گیا۔ وہ بے تاب ہو کر مجھے ملی۔

"جسونت جی! آپ نے رام گڑھ میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔ میں تو آپ کی راہ دیکھتی ک گئی تھی۔"

میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میں رام گڑھ سے سیدھا دلی چلا گیا تھا۔ اسے بتانے کی ورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ لی۔

"بالکل نہیں۔ کیا انہوں نے مجھے کوئی خط بھی لکھنا ہے؟"

میں نے اسے بتایا

"میں نے نوکری کی درخواست لکھ کر سردار جی کو دے دی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب میں واپس جا کر انتظار کروں۔ وہ تمہارے پتے پر مجھے نوکری کی اطلاع کر دیں گے۔"

درگاوتی خوش ہو کر بولی۔

"بس سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ سردار جی میری بات کبھی نہیں ٹال سکتے۔ سمجھو کہ س نوکری مل گئی۔ تو کیا تم رام گڑھ میں رہو گے؟"

مجھے معلوم تھا کہ مجھے نوکری مل جانے کے بعد راج گڑھ کے ایٹمی ریسرچ محکمے کے ارٹروں میں ہی رہنا پڑے گا۔ صرف ہفتے کی رات میں ریواڑی آسکوں گا۔ لیکن میں اسے یہی کہا کہ ایسا کوئی ضروری نہیں ہے۔ میں ریواڑی اپنا مکان لے کر رہوں گا۔

یہاں سے روز رام گڑھ چلا جایا کروں گا۔ حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ریواڑی سے دلی قریب تھا مگر راج گڑھ کافی فاصلے پر تھا اور رام گڑھ تو راج گڑھ سے بھی تھوڑا آگے صحرائی ٹیلوں میں واقع تھا۔ مگر اب درگاوتی میرے واسطے ایک ایسا امتحانی پرچہ تھی جس کے تمام سوالات میں نے حل کر کے جوابات کا پرچہ داخل دفتر کر دیا تھا۔ اگر اس سے مجھے کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ اسے ہر ہفتے سردار ارجن سنگھ سوڈھی ملنے آتا تھا۔ اور سردار جی میرے باس تھے۔ اگر میں درگاوتی کو کسی بات سے ناخوش کرتا ہوں تو یہ میرے حق میں خطرناک بات ثابت ہو سکتی تھی۔ درگاوتی کا ایک اشارہ مجھے ایٹمی سنٹر کی نوکری سے الگ کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس وقت تک درگاوتی کو اپنے ہاتھ میں رکھنا تھا جب تک میں رام گڑھ کے زیر زمین ایٹمی مرکز میں دھماکہ نہیں کر لیتا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"درگاجی! تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ میں جہاں بھی رہا تم سے ملنے ضرور آتا رہوں گا۔ تمہارے بغیر میں اب رہ ہی نہیں سکتا۔"

میں نے اسے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر دیئے۔ درگاوتی نے نوٹ ساڑھی کے اندر چھپائے اور مجھے گلے لگا لیا۔

میں اپنی داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ کو بتاتا ہوں کہ راجستھان کے اس خفیہ زیر زمین ایٹمی سنٹر میں مجھے نوکری مل گئی۔ میرا یہ مشن کامیاب ہو گیا۔ درگاوتی کی سفارش سے میرے راستے کی وہ مشکلات بھی دور ہو گئیں جو ایٹمی سنٹر میں پہنچنے کے بعد مجھے پیش آئیں۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ پیش آئی کہ میں ایٹمی انرجی کی ریسرچ کے بارے میں ذرا سا بھی عملی تجربہ نہ رکھتا تھا۔ میرے لئے وہاں کے آلات اور ساز و سامان بالکل اجنبی تھا۔ بہت جلد سنٹر کے ڈائریکٹر سردار ارجن سنگھ سوڈھی کو پتہ چل گیا کہ میرا پریکٹیکل علم صفر ہے۔ مگر درگاوتی کی وجہ سے وہ مجبور تھا۔ درگاوتی کے عشق میں سمجھ لیں یا اس کے جسم کے نشیب و فراز میں سردار جی کچھ ایسے گم ہو چکے تھے کہ وہ خود ہی میرے راستے کی رکاوٹیں دور کرتے چلے گئے۔ انہوں نے مجھے اپنے شاندار زیر زمین آفس میں

ی روز بلا کر کہا۔

"مسٹر جسونت سنگھ! میں تمہارا کام دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم نے نقل مار کر کر فزکس میں فسٹ ڈویژن حاصل کی ہے۔ مگر میں تمہیں یہاں رکھنے پر مجبور ہوں۔ بات کان کھول کر سن لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری نالائقی اور نکمے پن کا یہاں کسی کو ہو۔ تمہیں جس ڈیوٹی پر لگایا جائے گا اس پر خاموشی سے کام کرتے رہنا۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا کہ تم فسٹ ڈویژن بی۔ ایس۔ سی پاس ہو۔ سمجھ گئے میں کیا کہہ رہا ہوں"

میں ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"گورو مہاراج! آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ جیسے آپ یں گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

یک ہے۔ اب تم جاؤ۔"

میں ست سری اکال کہہ کر باہر نکل گیا۔

مجھے زیر زمین ایٹمی سنٹر کے سٹور میں لگا دیا گیا۔ میرا کام مختلف سیکشن کے باہر کشادہ نگ کی راہ داری میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے خالی چوکور اور گول گول پلاسٹک اور ی کے ڈبوں کو ٹرالی پر لاد کر ڈسپوزل سیکشن میں پہنچانا اور سٹور میں آئے نئے میٹریل ڈبوں کو مختلف سیکشن میں تقسیم کرنا تھا۔ سٹور کیپر جو بڑا سخت مزاج ہندو لالہ تھا مجھے ان دے کر ہدایت کرتا کہ یہ پیکج فلاں سیکشن میں جائے گا اور یہ پیکج فلاں سیکشن میں ۔ مجھے سیکشن کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں دروازے کے باہر ہی سامان کر آگے نکل جاتا۔ یہ ان شعبوں کا میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی ان کے ازے کھلنے اور بند ہونے پر گہری نگاہوں سے جائزہ لے لیا تھا۔ اندر دیوار کے ساتھ ت تک سرخ سیاہ اور سبز رنگ کے گول چوکور میٹر اور خدا جانے کس کس طرح کے کے آلات لگے ہوئے تھے۔ ان کے آگے کاؤنٹر بنے ہوئے تھے جہاں سائنس دان کوٹ پہنے بیٹھے مختلف بٹن دباتے اور تختی پر لگے کاغذوں پر کچھ نوٹ کرتے رہتے

تھے۔

مجھے ایٹمی سنٹر کے نچلی سطح کے ورکرز والے کوارٹروں میں ایک کوارٹر مل گیا تھا۔ یہ ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ چھوٹے سے صحن کی ایک جانب کچن اور غسل خانہ تھا۔ میں نے روز مرہ کے استعمال کی سب چیزیں لا کر وہاں رکھ دی تھیں۔ یہ کوارٹرز جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں راج گڑھ قصبے میں واقع تھے۔ اور ایٹمی سنٹر رام گڑھ میں وہاں سے دس گیارہ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ روزانہ سنٹر کی گاڑیاں ملازمین کو صبح لے جاتیں اور شام کو چھوڑ جاتی تھیں۔ کچھ کوارٹرز کوٹھی نما تھے۔ ان میں سائنس دان رہتے تھے۔ یہاں کبھی کسی بچے یا عورت کی آواز نہیں آتی تھی۔ کسی کو فیملی ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہفتے کی شام کو وہ لوگ جن کے بیوی بچے ریواڑی یا دلی میں رہتے تھے راج گڑھ سے چلے جاتے اور اتوار کی شام کو واپس آجاتے۔

میں پہلے ہفتے کہیں نہ گیا۔ میں وہاں رہ کر ماحول کا بھرپور جائزہ لینا چاہتا تھا۔ سنٹر میں میری طرح کے کام کرنے والے ایک دو نوجوان میرے واقف بھی بن گئے تھے مگر ہماری واقفیت صرف سلام دعا تک ہی تھی۔ کوئی کسی سے گھل مل کر بات نہیں کرتا تھا۔ رات کو بڑی جلدی کوارٹرز کی کالونی میں سناٹا چھا جاتا۔ اس ایٹمی سنٹر کی بابت انتہائی راز داری سے کام لیا جا رہا تھا۔ سوائے سنٹر کے سائنس دانوں اور ٹیکنیشنوں کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں بھارتی حکومت ایٹم بم بنانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ان سب کو صرف اتنا ہی علم تھا کہ سنٹر میں ایسے جنریٹر بنانے پر ریسرچ ورک ہو رہا ہے جن سے بہت زیادہ بجلی پیدا کر کے راجستھان کے صحرا کو گل و گلزار بنا دیا جائے گا۔

دوسرے ہفتے میں بھی سنٹر سے چھٹی کے بعد دلی روانہ ہوگیا۔ مجھے راستے میں درگاوتی کے پاس رکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ دلی رات کے دو بجے کے قریب پہنچا۔ جاتے ہی گل خان کو اٹھایا اور اسے ساری تفصیل سنائی۔ اس نے کہا۔

"ابھی تم یہیں آرام کرو۔ صبح پروفیسر جمشید کو بلاتا ہوں۔ وہی تمہیں بتا سکے گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

باقی رات گل خان کے مکان پر ہی میں نے گزاری۔ صبح صبح گل خان نے مجھے نظام الدین اولیاء" کی آبادی والے خالی مکان کی طرف روانہ کر دیا اور خود پروفیسر جمشید کو لینے چل دیا۔ دن نکل آیا تھا کہ دونوں میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے پروفیسر کو ایٹمی سنٹر کی ایک ایک تفصیل سمجھائی۔ میں نے اسے بتایا کہ سنٹر میں کل پانچ سیکشن ہیں۔ ہر سیکشن میں بجلی کے عجیب عجیب قسم کے چھوٹے اور بڑے آلات اور مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ہر سیکشن میں صبح سے شام تک کام ہوتا رہتا ہے۔ کوئی کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ مجھے ان کمروں میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اگر اندر جانا ضروری ہوا تو میں کوئی ذریعہ پیدا کرلوں گا۔

پروفیسر جمشید بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ اس دوران وہ جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کرتا رہا۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ آنکھوں پر عینک چڑھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارا سنٹر کے ہر سیکشن میں جانا ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں کس شعبے میں کیا کام ہو رہا ہے اور پلوٹونیم صاف کرنے والا پلانٹ کہاں لگا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں مختلف شعبوں میں کسی نہ کسی طرح چلا جاؤں گا۔ مگر وہاں جو آلات اور مشینیں لگی ہوئی ہیں ان کی تفصیل میں تمہیں کیسے سمجھا سکوں گا؟ مجھے تو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ مجھے کوئی چھوٹے سے چھوٹا کیمرہ مہیا کیا جائے جو ہر شعبے کی بڑی جلدی اور بڑی صاف اور واضح تصویر اتار سکے۔"

پروفیسر جمشید نے ایک بار پھر اپنی عینک اتاری اور رومال نکال کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

یہاں گل خان نے بھی لقمہ دیا۔

"پروفیسر! یہ کام تم ہی کر سکتے ہو"۔

گل خان کو معلوم تھا کہ پروفیسر جمشید جس آفس میں کام کرتا ہے وہاں پیڑ پودوں کی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکو میٹری فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں اور پروفیسر کا ایسے سٹورز سے رابطہ رہتا ہے جہاں فلموں اور کیمرے کا ساز و سامان فروخت ہوتا ہے۔ پروفیسر جمشید نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ تم اگلے ہفتے آؤ گے تو میں نے تمہارے لئے کوئی نہ کوئی کیمرہ ضرور لا کر رکھا ہو گا"

میں اس روز یعنی اتوار کی شام کو دلی سے واپس راج گڑھ روانہ ہو گیا۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس خفیہ ایٹمی سنٹر کا محل وقوع کیا ہے۔ ریت کی سڑک ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے۔ یہاں رام گڑھ قصبے سے ذرا پہلے کھلے صحرا میں ریت کے اونچے اونچے دو ٹیلے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان ٹیلوں کی ریت پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہوئی تھی۔ یہاں وہ پرانی اور غیر اہم سی عمارت تھی جس کے باہر منرل ریسرچ سنٹر کا بورڈ لگا تھا۔ باہر ایک چپڑاسی سٹول پر بیٹھا اونگھتا یا بیڑی پیتا رہتا تھا۔ وہ صرف اس وقت ہوشیار ہو جاتا تھا جب ایٹمی سنٹر کے سائنس دان اور افسر وغیرہ عمارت میں داخل ہوتے تھے۔ عمارت کے اندر فرضی منرل ریسرچ سنٹر کے دو تین دفتر بنا دیئے گئے تھے جہاں شیلفوں میں بے معنی قسم کی فائلوں کے انبار لگے تھے۔ کمرے میں دو چار کلرک بیٹھے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ زیادہ وقت چائے پینے اور باتیں کرنے میں گزارتے تھے۔ کیونکہ ان کے آفس میں کوئی کام نہیں تھا۔ سارا کام نیچے زیر زمین ایٹمی سنٹر میں ہو رہا تھا۔ عمارت کے اندر کونے میں ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں ایک دروازہ تھا جس کی سیڑھیاں نیچے ایٹمی سنٹر کی بڑی راہ داری میں جا نکلتی تھیں۔ یہ دروازہ سٹیل کا تھا۔ باہر ایک چاق و چوبند پہرے دار ہر وقت موجود ہوتا تھا۔ سنٹر کے ہر ورکر اور افسر کے پاس اپنے اپنے پلاسٹک کے شناختی کارڈ تھے جنہیں وہ سنٹر میں آتے ہی اپنے اپنے سینے پر لگا لیتے تھے۔ سٹیل کا دروازہ کمپیوٹر کے ذریعے کھلتا تھا۔ ہر ورکر اپنا شناختی کارڈ دروازے کی

جانب دیوار میں لگے ہوئے چھوٹے سے کمپیوٹر میں ڈالتا۔ ہلکی سی آواز آتی۔ کارڈ باہر اور دروازہ اپنے آپ کھل جاتا۔ اگر کوئی ورکر شناختی کارڈ ساتھ لانا بھول جاتا تو اس روز سنٹر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور اس کی دو دن کی تنخواہ جاتی۔ سنٹر میں کام کرنے والوں کو سوائے دفتری کام کے اور کسی موضوع پر بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں کوئی سگریٹ وغیرہ بھی نہیں پی سکتا تھا۔ ماچس ٹر بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اوپر والے فولادی دروازے سے گزر کر نیچے زیر زمین سنٹر کی راہ داری والے گیٹ پر آتے تھے تو وہاں دو گارڈ ڈیوٹی پر ے ہوتے تھے۔ وہ ایک خاص راڈ کے ذریعے ہمارے لباس اور جسم کی تلاشی لیتے کہ خطرناک قسم کی چیز یعنی پستول وغیرہ تو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے۔

سارا دن سنٹر میں قبرستان والی خاموشی چھائی رہتی۔ جب میں ٹرالی پر ساز و سامان کسی سیکشن کے دروازے کے سامنے سے گزرتا تو بند دروازے میں سے اندر بجلی کی ں کے چلنے کی بڑی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب وہاں میرا دوسرا ہفتہ زر گیا۔ ہفتے کی شام کو میں اپنے ماتا پتا سے ملنے کا کہہ کر دلی روانہ ہو گیا۔ گل خان فیسر جمشید میرے انتظار میں تھے۔ پروفیسر نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اس میں ایک ایسی الہ دین کے چراغ والی شے ہے جو مجھے ایٹمی سنٹر کے اندر کا از کھول کر بتا دے گی"

ر اس نے ڈبیا کھولی۔ اس میں سے ایک ٹائی پن نکال کر مجھے دیا۔ یہ انگوٹھی کے نہری ٹائی پن تھا جس کے درمیان میں کالے رنگ کا چوکور نگینہ جڑا ہوا تھا۔ نے عینک کے شیشے صاف کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کہنے لگا۔

"دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا ٹائی پن ہے جسے لوگ اپنی ٹائی پر لگاتے ہیں تاکہ ٹائی کے ساتھ چپکی رہے۔ مگر اس کے درمیان میں جڑا ہوا جو نگینہ تم دیکھ رہے ہو یہ طاقتور لینز والا کیمرہ ہے۔"

پھر اس نے عینک آنکھوں پر لگائی اور ٹائی پن اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے ٹائی پن
نگینے کے اوپر ذرا سا باہر نکلا ہوا ایک پیچ دکھایا۔

"جس وقت تم اس پیچ کو دباؤ گے نگینے میں لگا ہوا کیمرہ اپنا کام شروع کر دے گا۔ جہاں جہاں تم جاؤ گے ان جگہوں کی تصویریں لیتا جائے گا۔ اس سے زیادہ مختصر اور کار آ
کیمرہ شاید مجھے کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ تم اسے اپنی ٹائی پر تھوڑا اوپر کر کے لگا لینا۔"

پروفیسر جمشید نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اب مجھے ایٹمی سنٹر کے مختلف سیکشن
نقشے تیار کرنے اور ان کے آلات کی تفصیلات یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اتوا
کی شام کو اپنی ڈیوٹی پر واپس آگیا۔ خفیہ کیمرے والا ٹائی پن میں نے وہیں سے اپنی ٹائی ک
ساتھ لگا لیا تھا۔ زیر زمین سنٹر میں جانے کے بعد ہمیں سفید کوٹ پہننا پڑتے تھے۔ ہم ا
جرسیاں یا کوٹ وغیرہ اتار کر دروازے کے ساتھ والے کلوک روم میں رکھ دیتے او
وہاں ٹنگے ہوئے اپنے سفید کوٹ پہن لیتے تھے اور سروں پہ سفید گاندھی کیپ پہ
لیتے تھے۔ میں چونکہ سکھ کے بھیس میں تھا۔ اس لئے مجھے ٹوپی نہیں پہننی پڑتی تھی۔ البتہ
میں نے ایک سفید پگڑی ضرور خرید لی تھی جسے میں ایٹمی سنٹر میں اپنی ڈیوٹی کے وقت پہ
لیتا تھا۔

سٹیل کے دروازے پر شناختی کارڈ کمپیوٹر میں ڈال کر دروازہ کھولنے سے پہلے ایک
الیکٹرانک راڈ ہمارے جسم کے آگے پیچھے پھیرا کر ہماری چیکنگ ہوتی۔ کہ ہم کوئی چیز چھ
کر تو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے۔ جس روز میں ٹائی پن لگا کر سنٹر میں داخل ہونے لگا
تو حسب معمول الیکٹرانکس راڈ میرے جسم کے آگے پیچھے پھیرا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹائ
پن دھات کا بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے کمپیوٹر میں ٹیں ٹیں کی آواز ضرور آئے گی۔
لیکن اس بات کا پروفیسر جمشید کو پہلے سے علم تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے جو ٹائی پن دیا تھا
یقیناً پلاسٹک کا تھا۔ میں چیکنگ کے مرحلے سے روز کی طرح بخیر و خوبی نکل گیا۔ اب میر
سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ایٹمی سنٹر کے جو پانچ شعبے اور پانچ کمرے تھے اور جہاں مختلف قسم
کے آلات لگے تھے ان کے اندر کس طرح جایا جائے۔ پروفیسر جمشید نے مجھے خاص طور پ

کی تھی اور کہا تھا۔

"تصویریں مجھے ان سیکشنوں کے اندر لگے ہوئے آلات کی چاہئیں۔ تاکہ مجھے علم ہو
کہ کون سا پلانٹ کہاں پر نصب ہے۔ اور کس پلانٹ میں اگر بم لگایا جائے تو اس کے
ے سارے کا سارا زیر زمین ایٹمی سنٹر دھماکے سے اڑ جائے گا۔"

مصیبت یہ درپیش تھی کہ ان پانچوں کمروں میں سوائے سنٹر کے سائنس دانوں اور
ماہرین کے اور کسی ورکر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر سیکشن کے بند
زے پر ایک باوردی گارڈ سٹین گن لئے کھڑا ہوتا تھا۔ کسی وقت اتفاق سے میں ٹرالی
ان لے کر وہاں سے گزرتا اور کسی سائنس دان کے اندر آنے جانے سے دروازہ
اور بند ہوتا تو میری نظر اندر پڑ جاتی تھی۔ مجھے بھی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔
نے سنٹر کے کسی دوسرے ورکر کو بھی کبھی ان خفیہ آلات والے کمروں میں آتے
نہیں دیکھا تھا۔

میرے ذہن نے بڑی تیزی اور یک سوئی سے ان کمروں میں داخل ہونے کی
دل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور اس کے بغیر میرا کمانڈو
یہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ زیر زمین ایٹمی سنٹر زمین کے اندر کافی جگہ
، ہوئے تھا۔ آمنے سامنے کمرے تھے۔ درمیان میں کشادہ راہ داری تھی جس کی
مت پر بجلی کے بلب سارا دن روشن رہتے تھے۔ ماحول میں ایک لمحے کے لئے بھی
ا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت فضا تازہ رہتی تھی۔ ایئر کنڈیشنگ کی وجہ سے
بھی رہتی تھی۔

ل سیکشن کا کمرہ راہ داری کے درمیان میں تھا میں نے ایک دو بار اس کمرے میں
پتلی عینک پوش عورت کو سفید کوٹ پہنے اندر جاتے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ ایک بار
کمرے کے سامنے سے ٹرالی پر سامان رکھے گزر رہا تھا تو دروازہ کھل گیا اور میں
اوہ دبلی پتلی سانولے رنگ کی عورت کمرے میں کاؤنٹر کے پاس بیٹھی کام کر رہی
سانے سوچا کہ اس عورت سے دوستی کرنی چاہئے۔ ہو سکتا ہے کمرے میں داخل

ہونے کا کوئی موقع مل جائے۔ مصیبت یہ تھی کہ وہاں کسی کو کسی سے فالتو بات کرنے کی
اجازت نہیں تھی۔ ہر کوئی منہ میں گھنگنیاں ڈالے رہتا تھا۔ کسی چیز کے بارے میں پوچھا
ہوتا تو دو لفظی بات ہوتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

میں نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ وہ دبلی پتلی سائنس دان عورت ایٹمی کالونی کے
ایک کوٹھی نما کوارٹر میں اکیلی رہتی ہے۔ خود ہی کھانا پکاتی ہے اور اتوار کی چھٹی والے دن
بھی کہیں نہیں جاتی۔ میں نے ایک منصوبے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ویسے بھی عورتوں
سے دوستی کرنے میں میں بڑا ماہر تھا۔ مگر یہ عورت سائنس دان تھی۔ بالکل سپاٹ جسم
تھا۔ بے رونق چہرہ تھا۔ شکل پر ہر وقت ایک فنا آلود اداسی سی چھائی رہتی تھی۔ میں نے
کبھی اسے کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے سوائے وہاں مجھے ان کمروں
میں داخل ہونے کا اور کوئی وسیلہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں اس
بے رنگ و بو قسم کی عورت کے ٹھنڈے بدن میں زندگی کی حرارت پیدا کر کے اس سے
دوستی استوار کر لیتا ہوں تو کسی وقت کم از کم اس سے کوئی ضروری بات کرنے کے بہانے
ہی میں اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کمرے کی تصویریں لے سکتا ہوں۔ کسی
سائنس دان سے مجھے اس کمزوری کی امید نہیں تھی۔ ایک عورت ہی یہاں میرے کام
آسکتی تھی۔

اس دوران میں نے اس سائنس دان عورت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات
حاصل کر لی تھیں۔ اس کا نام نرملا دیوی تھا۔ وہ جے پور راجستھان کی رہنے والی تھی۔ نا
کلر سائنسز میں اس نے ایم۔ایس۔سی کیا ہوا تھا۔ ماں باپ بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔
ایک بھائی تھا جو بمبئی میں کاروبار کرتا تھا۔ نرملا دیوی اسی لئے ہفتے اتوار کو بھی کہیں باہر
نہیں جاتی تھی اور اپنے کوارٹر میں ہی رہتی تھی۔ میں شام کے وقت سیر کے بہانے کالونی
میں نکل آتا۔ عجیب بات تھی وہاں سارے لوگ سینٹر سے واپس آکر اپنے اپنے کمروں میں
جیسے بند ہو جاتے تھے۔ کہیں کہیں کوئی سائنس دان یا ورکر اپنی رہائش گاہ کے صحن میں
پودوں کو پانی وغیرہ دیتا نظر آجاتا۔ یہ لوگ راج گڑھ سے قریبی رام گڑھ کے قصبے سے

بھر کا راشن خرید کر لے آتے تھے اور اس کے بعد کمروں میں بند ہو جاتے تھے۔ اس
کے پراسرار لوگوں سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ بہرحال کالونی میں کمروں سے باہر
نکلنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ میں شام کے وقت یا چھٹی کے دن نرملا دیوی کے کوارٹر کے
گرد دو ایک چکر لگانے لگا۔ ایک طرح سے میں نے اس کی نگرانی شروع کر دی تھی کہ
کس وقت کیا کر رہی ہوتی ہے اور اس کے مشاغل کیا ہیں۔ مگر یہ سائنس دان عورت
ب سے زیادہ تنہائی پسند تھی۔ کبھی میں نے اسے شام کے وقت یا چھٹی والے دن کے
بھی کمرے سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس کوئی نوکرانی بھی نہیں تھی۔
میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ عورت میرے کام آسکتی ہے۔ صرف ایک بار اس سے ملنے
کے سامنے بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے کی دیر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس پر اپنا
ڈال لوں گا۔ ایک روز میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں سنٹر سے چھٹی کے بعد
اپنے کوارٹر میں آنے کی بجائے راج گڑھ کے بڑے بازار میں آگیا۔ یہاں مٹھائیوں کی
بڑی اچھی دکان تھی۔ وہاں سے میں نے ایک سیر مٹھائی کا ڈبہ لیا اور اپنی کالونی کی
طرف چل پڑا۔ سائنس دان نرملا دیوی کے کوٹھی نما کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ وہاں سب
کوارٹروں کے دروازے بند ہی رہتے تھے۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔
کسی کے دروازے پر کال بیل نہیں لگی تھی۔ دو تین بار دستک دینے کے بعد اندر
کسی عورت کی نیم مردہ سی آواز آئی۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔
"کون ہے؟"
میں نے اردو میں کہا۔
"نرملا جی میں ہوں۔ جسونت سنگھ آپ کے ساتھ ہی سنٹر میں کام کرتا ہوں"
چار پانچ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اندر سے پھر اس عورت نے انگریزی میں پوچھا۔
"کس لئے آئے ہو؟"
میں نے بھی اس بار انگریزی میں جواب دیا۔
"میڈم! میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک ضروری چیز لایا ہوں۔ پلیز

مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔"

میں نے پتہ کرلیا تھا۔ وہ ماگھ کے دیسی مہینے کی سولھویں تاریخ تھی۔ مزید دس سیکنڈ کے وقفے کے بعد دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میرے سامنے دبلی پتلی سائنس دان عورت نرملا دیوی سفید ساڑھی اور سفید کوٹ پہنے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے گھر پر بھی دفتر والا لباس پہن رکھا تھا۔ صرف سر پر سفید گاندھی کیپ نہیں تھی۔ میں نے عورتوں پر اثر ڈالنے والی اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑی شستہ انگریزی میں کہا۔

"میڈم! میری ماتا جی ماگھ کی سولھویں کو گورو ارجن دیو جی کا پرشاد دیا کرتی ہیں میری ماتا جی تو یہاں نہیں ہیں۔ ان کی جگہ میں یہ پرشاد آپ کے لئے لایا ہوں۔ آپ کے پاس پرشاد لانے کی خاص وجہ یہ ہے میڈم کہ یہ پرشاد ماتا جی صرف عورتوں اور بچوں میں ہی بانٹتی ہیں۔ کسی مرد کو یہ پرشاد نہیں دیا جاتا۔ پلیز! اسے قبول کرلیجئے۔"

نرملا دیوی کے چہرے کے تاثرات میں ذرے جتنا بھی تغیر نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل سپاٹ چہرہ اٹھائے بے جان آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے لگا کہ یہ ایٹم کی بنی ہوئی عورت ہے میں نے اپنی باتوں میں ایک سیکنڈ کا بھی وقفہ نہ ڈالا اور مٹھائی والا ڈبہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز! اسے سویکار کریں۔ کالونی میں صرف آپ ہی ایک خاتون ہیں۔ ویسے بھی میں آپ کے سنجیدہ مزاج اور کلاسیکل خدوخال سے بڑا متاثر ہوں۔"

اس آخری جملے نے تھوڑا سا کام دکھایا۔ اس نے ڈبہ لے لیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ مجھے اندر آنے کے لئے کہے گی۔ مگر اس نے شکریہ کہہ کر دروازہ بند کردیا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اپنے دل میں اسے ایک واہیات سی پنجابی زبان میں گالی دی اور اپنی ڈاڑھی کو ایک ہاتھ سے اوپر چڑھاتے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ سکھ نوجوان کا بھیس بدلنے کے بعد میری کچھ عادتیں بھی سکھوں والی ہوگئی تھیں۔ مثلاً زبان پر پہلے سے زیادہ گالیاں آتی تھیں اور مجھے بات کرتے ہوئے انہیں روکنا پڑتا تھا۔ تھوڑی

ھوڑی دیر بعد سکھوں کی طرح مجھے ڈاڑھی کو ہاتھ سے اوپر چڑھانے کی بھی عادت پڑ گئی ھی۔ اپنے کوارٹر میں آکر میں نے بھی اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا اور اس عورت پر سی دوسری طرف سے حملہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ س عورت کو انگریزی بولنے کا بڑا شوق ہے۔ میں دلی سے ایک انگریزی کی کتاب خرید کر یا تھا جو اس وقت بالکل نئی کی نئی میرے پاس پڑی تھی۔ یہ کسی انگریز مصنف کا ناول تھا س کا نام مجھے اچھا لگا میں نے خرید لیا۔ ابھی میں نے اس پر اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ دو ن بعد میں شام کے وقت ایک بار پھر سائنس دان عورت نرملا دیوی کے ہاں پہنچ گیا۔ سب معمول دروازہ بند تھا۔ کچھ ڈرتے ڈرتے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے کے د اندر سے وہی مردہ سی آواز آئی۔ یہ سائنس دان نرملا دیوی کی آواز تھی۔ اس نے گریزی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا اور جلدی سے انگریزی میں ہی کہا۔

"میں تمہارے لئے ایک خوبصورت تحفہ لایا ہوں"

شاید تحفے کا سن کر یا خدا جانے اس کے دل میں کیا خیال آگیا۔ اس نے دروازہ کھول ا۔ آج پھر اس کے دروازہ کھولتے ہی مجھے ڈی ٹول کی ہلکی ہلکی بو محسوس ہوئی۔ اس نے ج بھی سفید کوٹ ساڑھی کے اوپر پہنا ہوا تھا۔ سر کے بالوں کا چھوٹا سا جوڑا بنا کر پیچھے ندھ رکھے تھے۔ میں یہ آپ کو بتاتا چلوں کہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی بیس ئیس سال ہوگی مگر وہ اپنی عمر سے دس سال بوڑھی لگتی تھی۔ جسم بالکل سپاٹ تھا۔ ے پر آج بھی ایسی مردنی چھا رہی تھی۔ جیسے ابھی ابھی کسی رشتے دار کو دفن کرکے آئی ۔ میں نے فوراً کتاب کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا اور جتنی اعلیٰ قسم کی انگریزی بول سکتا بولتے ہوئے کہا۔

"میڈم! یہ انگریزی ناول ہے۔ اس کا نام بہت خوبصورت ہے۔ مجھے امید ہے تم ے پسند کرو گی۔"

پتہ نہیں کیسے اس کا دل تھوڑا موم ہوا۔ اس نے کتاب کا پیکٹ لیا اور اس پر میں نے سبز رنگ کا کاغذ چڑھایا تھا اسے کھولنے لگی۔ مجھے برابر اس کی طرف سے ڈی ٹول کی بو آرہی تھی۔ اس کے جسم سے چاہے مگرمچھ کی بو آتی۔ میں اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ میرے زیر زمین ایٹمی کمانڈو مشن کی یہی ایک امید نظر آرہی تھی۔ کیونکہ میں نے وہاں دیکھا تھا کہ ایٹمی سنٹر کے مختلف شعبوں کے جو پانچ کمرے تھے اور جن کے باہر گارڈ موجود رہتا تھا وہاں کام کرنے والے خود کسی کو بلانا چاہیں تو وہ انہیں بلا سکتے تھے لیکن اس دوران گارڈ اس آدمی کے ساتھ اندر جاتا تھا۔ مجھے تو صرف سیکشن کے اندر جانا تھا اور پھر میرے ٹائی پن میں لگے ہوئے کیمرے نے پلانٹ کے تمام آلات کی تصویریں اتارنی شروع کر دینی تھیں۔ اس کے بعد میں دوسرے سیکشن کی تصویریں اتارنے کے متعلق بھی کوئی ترکیب سوچ سکتا تھا۔ مگر سب سے پہلے اس سیکشن میں داخل ہونا چاہتا تھا جہاں یہ سائنس دان عورت کام کرتی تھی۔ اس عورت کو میں کسی مرد سائنس دان کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے ورغلا سکتا تھا۔

کتاب کا کاغذ ہٹا کر اس نے اس کے سرورق کو دیکھا اور بے جان آواز میں بولی۔

"کتاب کا نام اچھا ہے"

میں نے گویا پتھر کو جونک لگالی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ اس کالونی میں کسی خوبصورت عورت سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔ یہ تو برہم چاریوں کی گپھا معلوم ہوتی ہے۔"

اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر نیم مردہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر انگریزی میں کہا۔

"آجاؤ"

میں اندر چلا گیا۔ اس کے پاس دو کمروں کا کوارٹر تھا۔ یعنی وہی کوارٹر نما کوٹھی۔ کمرے میں ہر طرف عجیب بد نظمی اور افراتفری نظر آئی۔ صوفوں میزوں اور پلنگ پر میلے کپڑے اور مختلف چیزیں پڑی تھیں۔ جو شے غسل خانے میں رکھنے والی تھی وہ کھانے کی

میز پر پڑی تھی۔ دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر لگی تھی جو ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ کوئی صوفہ کوئی کرسی ایسی نہیں تھی جس پر پرانے کپڑے یا کوئی برتن وغیرہ نہ پڑا ہو۔ مجھے بیٹھنے کو جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر میرا وہاں کچھ دیر بیٹھنا ضروری تھا۔ پلنگ کا کونا ذرا سا خالی تھا۔ میں وہاں بیٹھنے لگا تو سائنس دان نرملا دیوی جو دروازہ بند کر کے اس کے پاس ہی کھڑی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی وہیں سے بولی۔

"بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے"

میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ وہ وہیں سے بولی۔

"تمہیں معلوم نہیں ہم لوگ ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ آئندہ میرے ہاں نہ آنا۔ اب تم جاؤ۔"

میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ مجھے اس عورت سے کام نکالنا تھا۔ میں نے فوراً انگریزی میں ہی کہا۔

"مگر میڈم مجھے تمہارا کمرہ بہت اچھا لگا ہے۔ یہ تمہاری ہی طرح بڑا چارمنگ ہے مجھے اجازت دو کہ میں یہاں دو ایک منٹ بیٹھ کر تم سے باتیں کر سکوں"

وہ مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا بلب روشن تھا۔ یہ کمرے میں صرف ایک ہی بلب تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے سفید کپڑوں میں ملبوس چھوٹے سے جوڑے والی سپاٹ جسم کی وہ عورت کوئی بھوت پریت لگ رہی تھی جو کسی قبر میں سے نکل کر وہاں آگئی ہو۔ اس نے کتاب بند کی اور ایک کرسی پر سے میلے کچیلے کپڑے نیچے گرا کر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی اور گردن ٹیڑھی کر کے گھورنے لگی۔

"اچھا" وہ انگریزی بول رہی تھی۔ "تو تمہیں مجھ سے باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔ تم بالکل سکھ ہو۔ مجھے سکھوں کی یہ بات اچھی لگتی ہے کہ وہ اکھڑ ٹائپ کے ہوتے ہیں۔ اگر تم کو مجھ سے باتیں کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر اس وقت یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔"

میں کچھ کہنے لگا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"جاؤ۔"

میں اپنا سامنہ لے کر واپس چلا آیا۔

دو دن گزر گئے۔ میں ایک بار پھر سائنس دان عورت کے گھر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ تیسرے دن کی بات ہے میں صبح ایٹمی سنٹر کی زیر زمین جانے والی سیڑھیاں اتر کر دوسرے کارکنوں کے ساتھ سفید کوٹ پہنے کلوک روم میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے وہاں لوہے کی الماریوں کے پاس کھڑی ساڑھی کے اوپر سفید کوٹ پہن رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو باہر نکلتے ہوئے میرے قریب آکر اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔

"رات کے ایک بجے آنا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہو گا۔"

میں ہکا بکا سا ہو کر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ مجھے اتنی بڑی کامیابی کی ہرگز امید نہ تھی۔ سارا دن رات کے انتظار میں گزر گیا۔ سنٹر میں ساز و سامان کی ٹرالی بھی ادھر سے ادھر ڈھوتا رہا اور سوچتا بھی رہا کہ آخر اس کے دل میں میرے لئے اتنی محبت کیسے پیدا ہو گئی کہ اس نے مجھے خود رات کے ایک بجے گھر پر بلا لیا۔ رات کو ایک بجے بلانے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے اپنا کمانڈو مشن کامیاب ہوتا نظر آنے لگا۔

سنٹر سے چھٹی کے بعد انسٹی ٹیوشن کی ویگن میں بیٹھ کر اپنی کالونی میں آگیا۔ بڑی مشکل سے شام ہوئی۔ پھر کہیں رات ہوئی۔ اب رات کا ایک نہیں بج رہا تھا۔ کبھی رسالہ پڑھتا۔ کبھی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ عورت مجھے پھنسانے کی کوئی سازش تو نہیں کر رہی؟ پھر سوچا کہ اگر اس نے کوئی سازش کرنی ہوتی تو اپنے گھر میں نہ کرتی۔ میں نے اس منفی خیال کو دل سے نکال دیا۔ بڑی مشکل سے رات کے بارہ بجے۔ پھر ساڑھے بارہ بجے۔ میں نے نسواری رنگ کی قمیض اور اسی رنگ کی پتلون پہن لی تھی تاکہ اندھیرے میں آسانی سے نظر نہ آسکوں۔ میرے سر پر جو پگڑی تھی اس کا رنگ بھی گہرا تھا۔ کمر کے ساتھ میں جو سکھوں والی کرپان لٹکائے رکھتا تھا وہ بھی میں نے اتار کر کھونٹی کے ساتھ لٹکا دی تھی۔

ٹھیک ایک بجے میں اپنے کوارٹر کے پچھلے دروازے سے نکلا اور سائنس دان عورت

ملا دیوی کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ کالونی میں رات کو زیادہ روشنیاں کرنے کی اجازت ہیں تھی۔ کسی کسی کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی سب طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ ائنس دان عورت کا کوارٹر زیادہ دور نہیں تھا۔ میں سامنے سے آنے کی بجائے اس کے ب سے ہوتا ہوا سامنے والے برآمدے میں آگیا۔ برآمدے میں گھپ اندھیرا تھا۔ مرے کے روشندان پر بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ روازہ کھل گیا۔ اس نے دروازہ کھلا رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس کی نڈے بے جان لہجے والی آواز آئی۔ وہ اس وقت بھی انگریزی بول رہی تھی۔

"دروازہ بند کر کے بولٹ لگا دو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو گئی۔ اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر ا تھا۔ ٹیبل لیمپ گہرے شیڈ والا تھا اور بلب بھی بہت کمزور لگا تھا جس کی وجہ سے کمرے ں عجیب قسم کی آسیبی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ٹیبل لیمپ کے س وہی انگریزی کا ناول رکھا ہوا تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ل کھلے تھے جو بڑے مختصر تھے۔ وہ ان کا جوڑا بنانے لگی۔ کمرے کی فضا میں وہی ڈی ٹول بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی ہسپتال کے آپریشن روم میں آگیا ں۔

اس نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"یہاں آکر بیٹھ جاؤ"

میں پلنگ پر بیٹھنے لگا تو اس نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"یہاں نہیں۔ کرسی پر بیٹھو"

پلنگ کے پاس ہی کرسی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑا عمدہ اور قیمتی پرفیوم لگایا ا تھا۔ اس نے ناک سکیڑ کر پوچھا۔

"یہ عطر تم لگا کر آئے ہو؟"

میں نے احمقوں کی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"یس میڈم!"

وہ گردن پر اپنے تھوڑے سے بالوں کا چھوٹا سا جوڑا باندھتے ہوئے بولی۔

"پرفیوم مت لگایا کرو۔ ڈی ٹول لگایا کرو۔ یہ جراثیم کو ڈی انفیکٹ کرتی ہے۔"

اس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے میز پر سے میرا دیا ہوا ناول اٹھایا۔ اس کو کھولا۔ پھر زور سے بند کر کے مجھ سے بڑے تلخ لہجے میں کہنے لگی۔

"تم اتنے فحش ناول پڑھتے ہو؟ اگر تم پڑھتے ہو تو پڑھو۔ مجھے کیوں دیا تھا؟ کیا تم نے یہ ناول پڑھا ہے؟"

میں سخت ندامت محسوس کرنے لگا۔

"نہیں میڈم"

وہ کتاب کے ورق الٹنے پلٹنے لگی۔ پھر ایک جگہ کتاب کھول کر میری طرف بڑھائی اور کہا۔

"ذرا اسے پڑھو"

میں جھک کر ٹیبل لیمپ کی کمزور روشنی میں پڑھنے لگا۔ مائی گاڈ! کتاب واقعی بڑی واہیات تھی۔ میں تو سخت پریشان ہوا۔ یہ عورت تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مجھے اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھرتا محسوس ہوا۔ میں نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے سخت افسوس ہے میڈم۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کتاب اتنی واہیات ہو گی پلیز میری معذرت قبول کریں"

یہ جملہ میں نے اردو زبان میں کہا تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سائنس دان عورت مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مگر مجھے یہ کتاب بہت اچھی لگی ہے یہاں میرے قریب آجاؤ۔"

اس کے بعد ہماری پیار محبت کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ڈی ٹول کی بو میرے قریب سے قریب تر ہونے لگی۔ میں اس کے ساتھ جو پیار محبت کی باتیں کر رہا تھا وہ بالکل جھوٹی باتیں تھیں۔ مگر یہ باتیں میں اس لئے کر رہا تھا کہ یہ میرے کمانڈو مشن کا ایک حصہ

تھیں۔ آگے چل کر آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ باتیں کتنی ضروری تھیں اور اگر میں اس سے یہ باتیں نہ کرتا۔ اگر اس کے ساتھ جھوٹی اور نقلی محبت کا اظہار نہ کرتا تو میں اپنے مشن میں شاید کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

اس رات میری اور اس سائنس دان عورت نرملا دیوی کی دوستی پکی ہو گئی۔ اب میرا یہ معمول بن گیا کہ ایک رات چھوڑ کر میں رات کے ایک بجے کے بعد اس کے پاس پہنچ جاتا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس آجاتا۔ اس دوران باتوں ہی باتوں میں نے پتہ چلا لیا کہ کچھ دنوں سے ایٹمی سنٹر میں سیکورٹی سخت کر دی گئی تھی اور ایٹمی پلانٹ اور ساز و سامان والے سیکشنوں میں کوئی کارکن سنٹر کے کسی بھی کارکن کو جس کا کسی دوسرے شعبے سے تعلق ہو اپنے کمرے میں نہیں بلا سکتا تھا۔

"مگر جسونت! تم ہمارے کمرے میں آکر کیا کرو گے۔ وہاں سوائے کمپیوٹر اور ایٹمی مشینری کے ضروری آلات کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے تم کیا دیکھو گے"

میں نے کہا۔

"بس میری خواہش تھی کہ دیکھوں ایٹم بم کیسے بنتا ہے"

وہ ہنس پڑی۔ اب وہ ہنسنے بھی لگی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم نے تو سائنس پڑھی ہوئی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ ابھی تو ہم نے ایٹمی دھماکہ بھی نہیں کیا۔ ابھی تو ہم ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں دن کے وقت تھوڑی دیر کے لئے اندر آکر مشینوں کو دیکھوں۔ مجھے انہیں دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں جسونت سنگھ تم اب تو بالکل ہی ہمارے کمرے میں نہیں آسکتے"

میں نے کہا۔

"کیا آفس ٹائم کے بعد بھی میں اندر نہیں جا سکتا؟"

اس سوال سے میرا ایک خاص مقصد تھا۔ نرملا دیوی نے کہا۔

"آفس ٹائم کے تو فوراً بعد سارے کمروں کو تالے لگ جاتے ہیں اور ان کی چابیاں گیٹ پر رات کو پہرہ دینے والا گارڈ اپنے پاس رکھتا ہے۔ صرف ایک ایک ڈپلی کیٹ چابی ہر سیکشن کے انچارج کے پاس رہتی ہے۔ میں اپنے سیکشن کی انچارج ہوں اس لئے ایک ڈپلی کیٹ چابی میرے پاس ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ایمرجنسی پڑ سکتی ہے۔"

جس مقصد کے لئے میں نے اس سائنس دان عورت سے سوال پوچھا تھا وہ مقصد مجھے حاصل ہوگیا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جو سکیم سوچی تھی اس کے لئے اس عورت کے پاس جو چابی تھی اسے اڑانا بہت ضروری تھا۔ مگر ایک نقطہ ابھی حل طلب تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے اب سنٹر دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں ہے اور میں صرف اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ میں اس عورت سے پیار محبت بھی کئے جا رہا تھا۔ اس پیار محبت نے اس یخ بستہ عورت کی پرفیس پگھلانا شروع کر دی تھیں اور عقل کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا۔ جبکہ میں پوری طرح اپنے آپ میں تھا۔ میں نے یونہی پوچھا۔

"ہر سیکشن کی چابی الگ ہوتی ہوگی۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی ایمرجنسی پیدا ہو جاتی ہے تو ایک دم سے سارے کمرے نہیں کھولے جا سکتے گارڈ کو ایک ایک کمرے کی چابی تلاش کر کے لگانی پڑے گی۔ یہ سیکورٹی کے خلاف بات ہے؟"

نرملا دیوی پر ایک عجیب سرور کی کیفیت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ سارے سیکشنوں کو ایک ہی چابی لگتی ہے۔ مگر تم یہ کیا بکواس لے بیٹھے ہو؟"

"آئی ایم سوری نرملا جی۔ آئی ایم سوری۔ میں تو صرف نیشنل سیکورٹی کی وجہ سے پوچھ رہا تھا۔"

اس کے بعد میں نے عملی بکواس شروع کر دی جو بہت ضروری تھی۔ نرملا دیوی پر میں نے اپنا بھرپور اثر جما لیا تھا۔ پہلے میں ہفتے میں ایک دو بار رات کو اس کے کوارٹر میں

ا تھا۔ اب میں نے ایک دن چھوڑ کر جانا شروع کر دیا۔

چونکہ کالونی میں لوگ رات کو اپنے اپنے کوارٹروں میں بند ہو جاتے تھے اس لئے ہرے لئے آدھی رات کو نکل کر اندھیرے میں سائنس دان عورت کے کوارٹر میں گھسنا ئی مشکل کام نہیں تھا۔ پھر بھی میں بے حد احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اس دوران میں نے علوم کر لیا کہ نرملا دیوی اپنے سیکشن کی ڈپلی کیٹ چابی کچن میں شیلف کے اوپر مٹی کے ک گلدان میں رکھتی تھی۔ ایک رات میں وہاں سے چابی نکال کر لے آیا۔ راج گڑھ ے قصبے میں ایک تالے چابیاں بنانے والے کی دکان تھی۔ ہفتے کی رات کو میں چابی اڑا ر لایا تھا۔ اتوار کی صبح کو میں چابی لے کر دکاندار کے پاس گیا اور اسے کہا کہ مجھے ایک دو ٹوں میں اس چابی کی ایک ڈپلی کیٹ چابی تیار کر دے۔ میں نے پچاس روپے نکال کر ا وقت اس کو دے دیئے۔

پچاس روپے دیکھ کر دکاندار نے باقی کام چھوڑ دیا اور بولا۔

"سردار جی! آپ یہاں بیٹھیں۔ میں ابھی اس کی نقل بنا دیتا ہوں"

آدمی کاریگر بھی تھا۔ اس نے آدھے گھنٹے میں مجھے بالکل اسی طرح کی ایک دوسری با بنا کر دے دی۔ میں نے ایسا کیا کہ دکاندار کی بنائی ہوئی چابی نرملا دیوی کے کچن کے ران میں رکھ دی اور اصلی ڈپلی کیٹ چابی اپنے پاس رکھ لی۔ اس خیال سے کہ کہیں ن وقت پر دکاندار کی بنائی ہوئی چابی تالے میں لگنے سے انکار نہ کر دے۔

میرے سیکرٹ کمانڈو مشن کا پہلا مرحلہ بھارت کے اس زیر زمین خفیہ ایٹمی مرکز میں مت حاصل کرنا تھا۔ دوسرا سائنس دان عورت سے دوستی کر کے اس سے چابی حاصل تھا۔ یہ دونوں مرحلے کامیابی سے طے ہو گئے تھے۔ اب مجھے تیسرے مرحلے پر کام ع کرنا تھا۔ یہ مرحلہ پہلے دونوں مرحلوں سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا تھا۔ اس ک مرحلے پر عمل کرتے ہوئے مجھے چھپ کر ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں میں جا کر ا کے ایٹمی آلات اور ساز وسامان کی تصویریں اتارنی تھیں۔ میں نے اپنے ذہن میں جو بنائی تھی اس کے مطابق مجھے رات کے وقت جب سنٹر کے تمام سیکشن اور لیبارٹریاں

بند کر دی جاتی ہیں اور وہاں کوئی نہیں ہوتا اس وقت وہاں جا کر ایک ایک کر کے پانچوں کمروں کو کھولنا اور اندر لگے ہوئے آلات کی تصویریں بنانا تھیں۔ یہ کام میں چھٹی کے بعد سنٹر سے نکلنے کے بعد نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے معلوم کر لیا تھا۔ رات کے وقت زیر زمین سنٹر کے باہر گارڈز کا زبردست پہرہ لگ جاتا ہے۔ منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ والا مین گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا جاتا ہے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کے لئے میرا آفس ٹائم کے بعد سنٹر کے خفیہ تہہ خانے میں رہ جانا ضروری تھا۔ میں اس بات کا بھی جائزہ لے چکا تھا کہ چھٹی کے بعد ورکروں کی کوئی گنتی یا چیکنگ نہیں ہوتی تھی۔ یوں اگر چھٹی ہونے کے بعد کوئی ورکر اگر اندر رہ بھی جائے تو گیٹ پر گارڈ کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ یہ سیکورٹی کے نظام کی بہت بڑی خامی تھی۔ لیکن یہ خامی میرے حق میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ میں نے اس امر کی بھی تصدیق کر لی تھی کہ اندر صرف ایک ہی الارم لگا تھا جو آگ لگنے کی صورت میں شور مچاتا تھا۔ ایسا کوئی الارم نہیں تھا کہ اگر لیبارٹری کے دروازے کو کھولا جائے یا وہاں کسی ڈائیل یا دوسری کسی مشینری کو ہاتھ لگایا جائے تو الارم چیخ اٹھے۔ یہ ان لوگوں کی نالائقی تھی کہ انہوں نے ایسا انتظام نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ صبح آفس ٹائم پر سنٹر میں داخل ہوتے ہوئے ورکروں کی چیکنگ بہت سخت ہوتی تھی مگر ان کی گنتی نہیں ہوتی تھی۔ یعنی اگر کوئی ورکر کسی روز کام پر نہیں آتا تھا تو گیٹ پر ڈیوٹی دینے والوں کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ سیکورٹی کی اس ایک غفلت یا کمزوری نے بھی میری راہ ہموار کر دی تھی۔

مجھے اب کسی ایک رات کا انتخاب کرنا تھا جس رات کو مجھے آفس ٹائم کے بعد زیر زمین ایٹمی سنٹر سے باہر نہیں نکلنا تھا بلکہ وہیں کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جانا تھا۔ چھپ کر بیٹھنے کے لئے میں نے کافی دیکھ بھال کرنے کے بعد ایک جگہ چن لی تھی۔ یہ جگہ ایٹمی سنٹر کا کلوک روم تھا۔ یعنی وہ کمرہ جہاں ہر سائنس دان ٹیکنیشن ورکر زیر زمین سنٹر میں داخل ہونے کے بعد جا کر اپنا کوٹ اتار کر ایک لمبے کلوزٹ میں ٹانگ دیتا تھا اور دوسرے کلوزٹ سے ڈاکٹروں والا سفید کپڑے کا بنا ہوا کوٹ اتار کر پہن لیتا تھا۔ میں اس کلوزٹ کو استعمال

ر سکتا تھا۔ وہاں دن کے وقت کبھی کوئی پہرے دار بھی نظر نہیں آیا تھا۔

جس رات میں نے زیر زمین ایٹمی سنٹر میں رہنا تھا اس روز میں پوری طرح سے تیار ر کر کوارٹر سے نکلا۔ میں نے خفیہ کیمرے والا ٹائی پن ٹائی کے ساتھ لگایا۔ سائنس دان رت نے نرملا دیوی کے گلدان سے نکالی ہوئی سیکشنوں اور لیبارٹریوں کی ڈپلی کیٹ چابی بھال کر پتلون کی جیب میں رکھ لی اور انسٹی ٹیوٹ کی گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے ورکروں ساتھ ایٹمی سنٹر پہنچ گیا۔

سارا دن میں اپنے معمول کے کام میں لگا رہا۔

چار بجے سنٹر میں کام بند کر دیا جاتا تھا۔ میں پونے چار بجے سٹور روم سے نکل آیا۔ ں کمروں کے باہر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں وہیں ملازم ں۔ میں نے یونہی ایک خالی ڈبہ سٹور سے اٹھا لیا تھا۔ ڈبہ ہاتھوں میں تھامے میں ان کے ب سے گزر گیا۔ کسی گارڈ نے میری طرف خاص طور پر نہ دیکھا۔ بس ایک سرسری سی ر سے دیکھا اور اپنی ڈیوٹی پر پتھر کے بت کی طرح کھڑے رہے۔ کلوک روم سنٹر کی نگ کے شروع میں تھا۔ وہاں سے پتھر کی سیڑھیاں باہر کو جاتی تھیں۔ وہاں کوئی دروازہ ں تھا۔ دروازہ اوپر جا کر تھا جہاں آفس میں آتے ہوئے زبردست چیکنگ ہوتی تھی۔ نے ایک نظر پیچھے دیکھا۔ پانچوں کمروں کے باہر گارڈ اپنی جگہ پر چاق وچوبند کھڑے کسی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ میں جلدی سے کلوک روم میں داخل ہو گیا۔

کلوک روم میں بڑی دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا اس کمرے کا کوئی دروازہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لئے سیکورٹی کی ضرورت ہو۔ میں نے و والی دیوار کے کلوزٹ کا معائنہ کیا۔ یہاں واپسی پر کام کرنے والے جاتی دفعہ اپنے کوٹ لٹکا دیتے تھے۔ یہ کوٹ ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے آسانی سے جا سکتا تھا۔ یہ کلوزٹ خالی پڑا تھا۔ میں ڈبہ اٹھائے واپس آگیا۔ میں صرف سائیٹ کا ی بار معائنہ کرنے گیا تھا۔ چھپنا مجھے آفس ٹائم کے بعد تھا۔ اس کام کے لئے بھی بے تیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے میں پوری طرح تیار تھا۔ مشکل یہ

پیش آرہی تھی کہ وہاں دوسری کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں آفس ٹائم کے بعد چھپ سکتا۔ میں سٹور روم میں بھی نہیں چھپ سکتا تھا۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ آفس ٹائم کے ختم ہونے کے بعد گارڈ ہر کمرے میں جا کر پوری چیکنگ کرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سٹور روم کو آفس ٹائم کے بعد سٹور کیپر لالہ جی تالا لگا کر چابی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس کی انہیں خاص طور پر اجازت ملی ہوئی تھی۔ وہاں صرف کلوک روم ہی ایسی جگہ تھی جہاں میں آفس ٹائم کے ختم ہونے کے بعد گارڈز کی چیکنگ سے بچ سکتا تھا۔ ایک بار ان کے باہر نکلنے کے بعد میں وہاں آزادی سے چل پھر سکتا تھا۔ کیونکہ زیر زمین ایٹمی سنٹر کے اندر رات کے وقت صرف بتیاں جلتی رہتی تھیں۔ اندر کوئی گارڈ ڈیوٹی پر نہیں ہوتا تھا۔ گارڈ کا پہرہ رات کو صرف اوپر والے مین گیٹ پر ہی رہتا تھا۔

پورے چار بجے آفس ٹائم ختم ہو گیا۔

سائنس دان، فنی ماہرین اور ورکرز اپنے اپنے کام چھوڑ کر بڑی خاموشی اور تھکاوٹ کے ساتھ کلوک روم کی طرف چل پڑے۔ میں سٹور روم میں ہی تھا۔ سٹور کیپر چیزیں سنبھال رہا تھا۔ میں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنے میں اس کی مدد کر رہا تھا اور ترچھی نظروں سے راہ داری کو بھی دیکھ لیتا تھا جہاں ورکرز کلوک روم میں داخل ہوتے۔ اندر جا کر کلوزٹ میں سفید کوٹ لٹکاتے اور اپنے کوٹ پہن کر باہر آجاتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ صرف دو چار آدمی ہی رہ گئے ہیں تو میں بھی کلوک روم کی طرف چل پڑا۔ راہ داری میں پانچوں شعبوں کے کمروں کے باہر گارڈ پہرے پر باقاعدہ موجود تھے۔ میں ان کے سامنے سے گزر گیا۔

کلوک روم میں آیا تو وہاں صرف تین آدمی تھے جو سفید کوٹ ہینگروں میں لٹکا کر اپنے اپنے کوٹ پہن رہے تھے۔ میں بھی اپنا سفید کوٹ اتارنے لگا۔ میں جان بوجھ کر دیر لگا رہا تھا تا کہ یہ لوگ باہر نکل جائیں۔ کوٹ اتار کر میں نے کلوزٹ کے اندر ہینگر کے ساتھ لٹکا دیا۔ پھر دوسرے کلوزٹ میں سے اپنا کوٹ اتار کر پہننے لگا۔ اس دوران تینوں ورکرز سامنے والی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکے تھے۔ جیسے ہی کلوک روم ایک سیکنڈ کے

لئے خالی ہوا میں جلدی سے سفید کوٹوں والے کلوزٹ میں گھس کر کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میرے آگے ہینگروں میں لمبے لمبے سفید کوٹ لٹک رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی ہینگروں کو ادھر ادھر کرے تب ہی میں دکھائی دے سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہاں خاموشی چھانا شروع ہو گئی۔ پھر مجھے گارڈز کی آپس میں باتیں کرنے کی دور سے آوازیں آنے لگیں۔ وہ کمروں میں جا کر چیکنگ برہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد مجھے کمروں کے دروازے بند کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ایک کر کے پانچوں سیکشنوں اور لیبارٹریوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں کلوزٹ کے کونے میں سفید کوٹوں والے ہینگروں کے پیچھے دبک کر بیٹھا تھا۔ گارڈز باتیں کرتے قریب آ رہے تھے۔ ان کے بھاری بوٹوں کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے جائیں گے۔ مگر ان کے قدم کلوک روم کے باہر آ کر رک گئے۔

کسی گارڈ نے دوسرے سے کہا۔

"کانسی رام! ذرا ایک نظر اس کمرے کو بھی دیکھ لے۔ کہیں کسی کی کوئی شے گری بانہ ہو۔"

میں نے اپنا سانس روک لیا۔ ایک گارڈ کلوک روم میں داخل ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ سامنے کی دیوار والے کلوزٹ کو شاید دیکھ رہا تھا جہاں خالی ہینگر لٹک رہے تھے۔ کیونکہ ورکرز اپنا اپنا کوٹ اتارنے کے بعد پہن کر جا چکے تھے۔ باقی چاروں گارڈ کھڑے آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ سگریٹ بیڑی بھی پی رہے تھے۔ تمباکو کی بو آ رہی تھی۔ حالانکہ وہاں سگریٹ پینے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ مگر وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو چکے تھے۔ جو گارڈ کلوک روم میں تھا وہ کم بخت باہر جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مجھے لوہے کی کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی۔ بس یہی خطرہ تھا کہ کہیں وہ میرے کلوزٹ کے پاس آ کر سفید کوٹوں والے ہینگروں کو ادھر ادھر نہ کرنا شروع کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو میں سامنے کونے میں بیٹھا صاف نظر آ جاتا۔ پھر میں بھاری مصیبت میں مبتلا ہو

کے ساتھ سرخ رنگ کی اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ خدا جانے یہاں کیا ہوتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی وہاں کی ساری چیزوں کی تصویریں اتار لیں۔ اس کے ساتھ ہی میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ خدا کرے خفیہ کیمرے نے اپنا کام دکھا دیا ہو اور ان سارے کمروں یا لیبارٹریوں کی تصویریں اتر گئی ہوں۔ اس کمرے کو بھی میں نے لاک کیا اور راہ داری میں چلتا واپس کلوک روم میں آکر کلوزٹ میں چھپنے کی بجائے وہاں جو لوہے کی کرسی پڑی ہوئی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ مجھے اب ساری رات وہاں گزارنی تھی۔ میں نے کلائی کے ساتھ بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی بمشکل سوا پانچ ہی بجے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ یہاں فرش پر لیٹ جاؤں۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہیں۔ مجھے کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ میں جاگ کر رات گزاروں گا۔

رات گزرتی رہی۔ میں جاگتا رہا۔

بیٹھا بیٹھا بور ہو جاتا تو اٹھ کر کشادہ اور خالی راہ داری میں ٹہلنے لگتا۔ سخت جانی اور
تیں سہنے کی مجھے خوب ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک رات جاگنا کوئی مشکل نہیں
میں زمین کے نیچے تھا۔ اوپر سے کبھی کبھی ڈیوٹی پر متعین گارڈز کی آپس میں ہنسی مذاق
نے کی آوازیں آجاتیں۔ اس کے بعد پھر خاموشی ہو جاتی۔ خفیہ کیمرے والا ٹائی پن میں
ٹائی پر نہیں لگایا تھا۔ بلکہ اسے رومال میں لپیٹ کر پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں
قمیض کے اوپر سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ میرا اپنا کوٹ کلوک روم کے کلوزٹ میں تھا۔
ا میں ہلکی خنکی تھی۔ یہ خنکی ریفریجریشن والے اس پلانٹ کی وجہ سے تھی جو رات کے
ت بھی چل رہا تھا۔ رات کے وقت شاید اسے دوسرے درجے پر کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ
ے وقت جب مختلف مشینیں چل رہی ہوتی ہیں فضا میں زیادہ ٹھنڈک ہوتی تھی۔

رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے دس بجنے والے
میں کلوک روم میں آکر کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ مجھے تھوڑی دیر بعد نیند آنے
میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں غافل نہیں ہونا چاہتا
میں کمانڈو مشن کی پل صراط پر چل رہا تھا۔ مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔
جانے مجھے غنودگی کیوں آنے لگی تھی۔ حالانکہ نیند کے معاملے میں بہت سخت جان
میں اٹھ کر راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ اس راہ داری کا فرش اور دیواریں پختہ سیمنٹ کی
۔ راہ دری کوئی دس پندرہ فٹ چوڑی تھی اور دیواریں پندرہ بیس فٹ اونچی ہوں
چھت محراب دار تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھت میں ڈھکے ہوئے بلب

جل رہے تھے۔ اس طرح وہاں کافی روشنی تھی۔ میں نے سوچا کہ معلوم کرنا چاہئے یہاں پانی کے نکاس کا کیا انتظام ہے۔ کیونکہ یہ جگہ سطح زمین سے کافی نیچے تھی۔ ظاہر ہے کسی جگہ پر گندے پانی کے باہر نکالنے کے واسطے پمپ لگائے گئے ہوں گے میں چلتے چلتے راہ داری کے آخری کنارے پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ ہمارے سٹور روم سے دس بارہ قدم آگے تھی۔ یہاں مجھے ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی جنریٹر چل رہا ہو۔ وہاں کوئی جنریٹر نظر نہیں آرہا تھا۔ آواز بھی دبی دبی سی تھی۔ میں نے سامنے والی راہ داری کی دیوار کو ہاتھ لگایا۔ اس میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کان لگایا۔ آواز دیوار کی دوسری طرف سے آرہی تھی۔ دیوار میں بظاہر کوئی دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید جنریٹر دوسری طرف زمین کے اندر لگا ہوا تھا اور اس جنریٹر کی طاقت سے تہہ خانے کے پانی کا نکاس اوپر کسی صحرائی نالے میں ہوتا ہو گا۔ یہاں روشنی کم تھی اور ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں واپس ہونے لگا تو مجھے دیوار کی ایک جانب ایک چھوٹا سا گول ہینڈل نظر پڑا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ یہ لوہے کا چرخی نما ہینڈل تھا میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہئے۔ یہ ہینڈل کیا کام کرتا ہے۔ میں یونہی ہینڈل کو بائیں جانب گھمانے لگا۔ تین چار چکر کھانے کے بعد ہینڈل رک گیا۔ ساتھ ہی کٹک کی آواز آئی۔ میں نے چرخی کو ذرا سا اپنی طرف کھینچا تو دیوار میں چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ ساتھ ہی دوسری طرف سے بجلی کے جنریٹوں کے چلنے کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ میں نے آگے گردن نکال کر دیکھا۔

آگے تین چار سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ نیچے ایک کنواں تھا۔ کنویں کی دیوار پر ایک بلب روشن تھا۔ نیچے جنریٹر لگے تھے جو چل رہے تھے۔ میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لوہے کی ایک سیڑھی اوپر کنویں کے دہانے تک چلی گئی تھی۔ اوپر شاید کھلا آسمان تھا۔ مجھے کوئی تارا تو نظر نہ آیا مگر اوپر سے تازہ ہوا ضرور آرہی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور چرخی کو اسی طرح واپس گھما کر لاک کر دیا۔ ان لوگوں نے یہاں ہوا پانی اور فضا کو ٹھنڈا یا گرم رکھنے کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے یہ بھارتی حکومت کا بڑا اہم سائنسی بلکہ ایٹمی ریسرچ سنٹر تھا۔ اسے دوسرے ممالک کے سفارت خانوں سے

بے حد خفیہ رکھا گیا تھا تا کہ کسی ملک کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ بھارت نے ایٹم اور پلوٹونیم بم بنانے کی کوششیں شروع کر رکھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ راز صرف اسرائیل کی حکومت کو ہی معلوم تھا اور ایک خفیہ خبر یہ بھی تھی کہ در پردہ اسرائیل اور بھارت میں دفاعی معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔

میں واپس کلوک روم میں آکر بیٹھ گیا۔

کرسی پر نیم دراز ہو کر بیٹھا تھا اور خدا جانے کیوں اس وقت مجھے مغل شہزادے کی روح کا خیال آگیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اگر مغل شہزادے کی روح سچ بول رہی تھی تو بقول اس کے کوئی ناگہانی آفت آنے والی تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ آفت کس نوعیت کی ہو سکتی تھی۔ کیا مجھ پر کسی بیماری کا حملہ ہونے والا تھا؟ کیا میں پکڑا جانے والا تھا؟ یہی دو آفتیں ہو سکتی تھیں۔ اگرچہ میں روحوں کا قائل تھا اور نیک روحوں کی پیش گوئیاں بھی میں نے سچ ہوتی دیکھی تھیں لیکن مجھے اپنے خدا کی ذات پر بھروسہ تھا اور میرا تب بھی یہی ایمان تھا کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ وہی مالک ارض وسما ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔

میں نے مغل شہزادے کی پیش گوئی کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور سوچنے لگا کہ مجھے اسی اتوار کو خفیہ کیمرے کی فلم لے کر دلی پروفیسر جمشید کے پاس پہنچنا ہو گا۔ وہ یقیناً اس پلانٹ کی تصویروں کو دیکھ کر خوش ہو گا اور وہی مجھے بتائے گا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو گا اور اگلا مرحلہ کہاں سے شروع کرنا ہو گا۔ کافی دیر تک میں کلوک روم میں ہی بیٹھا رہا۔ رات گزرتی چلی گئی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پونے بارہ بجنے والے تھے۔ گویا آدھی رات تقریباً بیت چکی تھی۔ مجھے یہاں سے کہیں جانا تو تھا نہیں۔ اسی کلوک روم سے نکل کر اپنی ڈیوٹی پر سٹور روم میں پہنچ جانا تھا۔ اچانک ایسی آواز آئی جیسے اوپر والے گیٹ کو کوئی کھول رہا ہے۔ میں جلدی سے ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ دو آدمی تھے جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے اوپر سے نیچے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

میں چھلانگ لگا کر اٹھا اور کلوزٹ کے اندر سفید کوٹوں والے ہینگروں کے پیچھے چھپ

کر بیٹھ گیا۔ یا خدا خیر! یہ کم بخت اس وقت نیچے کیا کرنے آئے ہیں۔ ان کی آوازوں سے میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ یہ پانچ گارڈز میں سے دو گارڈز تھے۔ نیچے راہ داری میں آکر ایک کلوک روم کے باہر سیڑھیوں کے پاس رک گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"جا بے بنسی! تو جاکر چیکنگ کر آ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

دوسرے نے راہ داری میں آگے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"تو بڑا کام چور ہو گیا ہے رے۔ سردار جی کو تیری رپورٹ کرنی پڑے گی۔ ہاں ---"

جو گارڈ کلوک روم کے باہر کھڑا تھا مجھے اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ دوسرے گارڈ کے بھاری بوٹوں کی آواز راہ داری میں آگے چلی گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آدمی جو باہر کھڑا ہے کہیں اندر آکر کلوزٹ کو نہ دیکھنے لگے۔ ان کے اس وقت آنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ آدھی رات کو بھی نیچے آکر ایک راؤنڈ لگاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ ہر شے ٹھیک ٹھاک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لوگ اس وقت آئے جب میں کلوک روم میں آگیا ہوا تھا۔ اگر اس وقت آجاتے جب میں راہ داری کے آخری سرے پر تھا تو میں پھنس گیا تھا۔

جو گارڈ باہر سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا کوئی راجستھانی لوک گیت گنگنانے لگا۔ مجھے تمباکو کی بو آئی۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دور سے بھاری جوتوں کی آواز قریب آنے لگی۔ دوسرا گارڈ چیکنگ کے بعد واپس آرہا تھا۔

"کیوں رے بنسی! سب ٹھیک ہے رے؟"

دوسرے گارڈ نے اونچی آواز میں کہا۔

"سب ٹھیک ہے رے۔ پر تیری شکایت مجھے سردار جی کے آگے کرنی پڑے گی کہ ایک تو تو کام چور ہو گیا ہے دوسرے نیچے آکر بیڑی تمباکو پیتا ہے۔"

دوسرے گارڈ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور دونوں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ جب تک مجھے اوپر کا دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں آئی میں کلوزٹ میں ہی چھپ کر بیٹھا رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ان دونوں میں سے کم از کم کوئی نیچے نہیں آئے گا تو

میں کلوزٹ سے نکل کر راہ داری میں آیا۔ راہ داری میں ابھی تک بیڑی کے جلے ہوئے تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مصیبت آکر ٹل گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ باقی کا سارا وقت میں چوکنا ہو کر کلوک روم میں ہی بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ میری گھڑی نے صبح کے سات بجا دیئے۔ پورے آٹھ بجے نیوکلر پلانٹ میں کام شروع ہو جاتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ تیار کیا ہونا تھا بس اس طرح باہر نکلنا تھا جیسے میں بھی دوسرے ورکروں کے ساتھ نیچے آیا تھا اور سفید کوٹ پہن کر اب باہر نکل رہا ہوں۔ پونے آٹھ بجے اوپر والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں چھپ گیا۔ بہت سے آدمی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ یہ بھاری بوٹوں کی آواز تھی۔ یہ گارڈز تھے جو پلانٹ کے پانچوں کمروں کے باہر اپنی ڈیوٹی سنبھالنے آئے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے راہ داری میں آگے نکل گئے۔ کوئی دس منٹ بعد اوپر سے ورکروں نے آنا شروع کر دیا۔ میں اس چھوٹے سے کمرے میں دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑا تھا۔ جیسے ہی دو تین آدمی اندر داخل ہوئے میں خاموشی سے باہر نکل کر راہ داری میں آگیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ وہ یہی سمجھے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی اندر آیا تھا اور اب سفید کوٹ پہن کر اپنی ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔

یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔

سارا دن میں اپنے کام میں لگا رہا۔ ایک بار میں سائنس دان عورت نرملا دیوی کے کمرے کے آگے سے گزرا تو اتفاق سے ایک سائنس دان اس وقت کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ کمرہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے نرملا دیوی کو دیکھا۔ وہ گاندھی کیپ سر پر رکھے، گردن پر چھوٹا سا جونڈا باندھے اپنے کمپیوٹر کے آگے پتھر کے بت کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے آگے نکل گیا۔ ہفتے کا دن آیا تو میں نے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کو ریواڑی جانے والی بس پکڑی۔ ریواڑی پہنچا۔ وہاں سے دوسری بس میں بیٹھ کر دو اڑھائی گھنٹے بعد دلی پہنچ گیا۔ ایک کیمسٹ شاپ سے گل خان کو فون کیا اور کہا۔

"میں جالندھر سے آگیا ہوں۔ گھر پہنچنے والا ہوں"

گل خان نے میری آواز پہچان لی تھی۔ کہنے لگا۔

"تم پہنچو میں پروفیسر کو لے کر آتا ہوں"

شام کے سات بج رہے تھے۔ اخیر سردیوں کا زمانہ تھا۔ ابھی دن چھوٹے تھے۔ جلدی شام ہو جاتی تھی۔ سات بجے دلی شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ میں ٹیکسی لے کر نظام الدین" اولیاء کے مزار سے ذرا آگے جا کر اتر گیا۔ یہاں سے کچے راستے پر پڑ گیا۔ مغل شہزادے کی قبر کی چاردیواری کے قریب سے ہوتا ہوا گل خان کے خالی اور شکستہ مکان پر آگیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد گل خان اور پروفیسر جمشید بھی آگئے۔ میں نے خفیہ کیمرے والا ٹائی پن پروفیسر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر! میں نے اس کا بٹن دبا کر ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں میں چاروں طرف بڑے اطمینان سے گھمایا پھرایا ہے۔ اب خدا کرے کہ وہاں کی تصویریں آگئی ہوں۔"

پروفیسر نے ٹائی پن لے کر جیب میں رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"تم کو ابھی اس کیمرے کی طاقت کا اندازہ نہیں ہوا۔ نیگیٹو ڈیویلپ کر لوں تصویریں دیکھو گے تو کہو گے یہ کسی بڑے ایکسپرٹ فوٹو گرافر نے کھینچی ہیں۔"

میں نے انہیں اپنی واردات پوری تفصیل کے ساتھ سنائی۔ گل خان اور پروفیسر بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب میں پورے واقعات سنا چکا تو پروفیسر جمشید عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"تصویریں دیکھنے کے بعد ہی میں تمہیں بتا سکوں گا کہ کونسی لیبارٹری میں زیادہ حساس آلات لگے ہیں۔ ظاہر ہے دھماکے سے اندر کوئی ایٹم بم نہیں پھٹے گا۔ لیکن اگر ایٹمی پلانٹ میں غیر افزردہ پلاٹینم کی تھوڑی سی مقدار بھی موجود ہوئی تو ایک فرلانگ کے اندر اندر کا سارا علاقہ اڑ جائے گا اور زمین میں کئی فٹ گہرا گڑھا پڑ جائے گا۔"

میں نے اسے بتایا کہ یہ ایٹمی سنٹر دو ٹیلوں کے درمیان زیر زمین بنا ہوا ہے۔ وہ بولا۔

"یہ تو میں پہلے بھی جانتا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں صحرائی ٹیلے قریب ہی ہیں بس وہ دونوں ٹیلے دھماکے کے بعد کہیں دکھائی نہیں دیں گے۔"

میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ تصویریں کب تک ڈیویلپ ہو جائیں گی۔ کیونکہ مجھے

واپس بھی جانا تھا۔ صرف اتوار کا دن میرے پاس تھا۔ پروفیسر نے کہا۔

"صبح میں تصویریں ڈیویلپ کر کے لے آؤں گا کل مجھے بھی دفتر سے چھٹی ہے۔"

رات کے گیارہ بجے میرے دونوں محب وطن اور سچے دل سے اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والے ساتھی چلے گئے۔ میں سکھوں والے حلیے میں ہی تھا۔ مکان میں آتے ہی میں نے پگڑی اتار کر دیوار کے کیل سے لٹکا دی تھی اور بال کھول دیئے۔ بڑا سکون میسر آیا۔ ڈاڑھی بھی کھول دی۔ معلوم ہوا کہ میں پھر سے تر و تازہ ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی کرپان بھی دیوار کے ساتھ لٹکا دی تھی۔ غسل خانے میں جا کر اچھی طرح نہایا۔ بالوں میں کنگھی پھیری۔ رات کو سونے والا کرتہ پاجامہ پہنا۔ اوپر گرم چادر لے لی جو گل خان نے خاص طور پر وہاں میرے لئے رکھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ رات گلابی ٹھنڈک والی تھی۔ میں کھڑکی میں آگیا۔ آسمان پر نگاہ ڈالی۔ بڑے شفاف تارے نکلے ہوئے تھے۔ یونہی خیال آگیا کہ مغل شہزادے کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی جائے اور اس کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ میں نے مکان کو تالا لگایا اور میدان میں بنے ہوئے کچے راستے پر چلتا مغل شہزادے کے مقبرے والی چار دیواری کے پاس آگیا۔ رات بڑی شفاف اور نکھری ہوئی تھی۔ یہ موسم بہار کی آمد کی خوش خبری دینے والی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ آسمان صاف تھا اور ستارے جھرمٹوں کی شکل میں بڑی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ مقبرے کی دیوار پر جھکی ہوئی بیروں کی گھنی شاخیں ساکت تھیں۔ میں دوسری طرف سے مقبرے کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ مغل شہزادے کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی اور اس کی روح کی بخشش کے لئے خدا سے دعا مانگی اور وہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں درختوں پودوں اور جنگلی پھولوں کی خوشبو تھی۔ میری حالت اب یہ ہو گئی تھی کہ میرا ڈر خوف اتر گیا تھا۔ نہ مجھے رات کے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا نہ مجھے روحیں' بدروحیں جن بھوت اور چڑیلیں ڈرا سکتی تھیں۔ نیک روحوں کے آنے سے تو چاروں طرف ایک نور پھیل جاتا تھا اور دل میں ایسا سکون پیدا ہوتا تھا کہ میں بیان نہیں کر

سکتا۔

بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ اب جب کہ میں مغل شہزادے کی قبر پر آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ اس سے معلوم کروں کہ مجھ پر جو آفت نازل ہونے والی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ہی مجھے اس کے بارے میں بتا دے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ قبروں پر روحیں خاص طور پر نیک روحیں پہلے سے موجود نہیں ہوتیں۔ انہیں کلمہ شریف اور الحمد شریف پڑھ کر بلانا پڑتا ہے اور وہ اللہ کے حکم سے عالم بالا سے نیچے اس جگہ پر آتی ہیں جہاں ان کا جسد خاکی دفن ہوتا ہے۔ بندھیا چل کے جنگلوں میں ایک بار مجھے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ نیک روحیں زمین پر آنا پسند نہیں کرتیں۔ یہاں میں بزرگان دین کی ارواح مقدسہ کی بات نہیں کر رہا۔ میں صرف ان لوگوں کی ارواح کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے دنیا میں رہ کر اگر کچھ غلطیاں کیں تو ساتھ نیکی کے بھی بہت کام کئے ہوتے ہیں۔ ایسی نیک ارواح خدا کے دربار سے مغفرت پانے کے بعد جنت کے ایک مقام میں مقیم ہوتی ہیں۔ وہ وہاں بڑی خوش ہوتی ہیں اور ہر وقت اللہ تعالٰی کی حمد وثنا میں مشغول رہتی ہیں۔ بندھیا چل کے بزرگ نے کہا تھا۔

"ایسی روحیں بھی زمین پر اپنی مرضی سے نہیں آتیں۔ زمین کی مادی فضاؤں میں انہیں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بے حد لطیف ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی خدا کے حضور دعا مانگ کر انہیں بلائے اور بلانے والے کا اس روح سے کوئی قلبی واسطہ بھی ہو تو وہ روح زمین پر تھوڑی دیر کے اتر آتی ہے۔ لیکن اسے عالم بالا کے بعض راز افشا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ میں نے ایک بار پھر فاتحہ پڑھ کر مغل شہزادے کی روح کو ثواب پہنچایا اور خدا سے استدعا کی کہ وہ روح کو زمین پر اترنے کی اجازت عطا فرمائے۔

قبر پر کوئی دیا وغیرہ روشن نہیں تھا۔ قبر کا نشان بھی تقریباً ختم ہو رہا تھا۔ ج وہاں دیا کون جلاتا۔ میری چاروں جانب موسم بہار کے آغاز کی نیلی رات کا ایک نور سا پھیلا ہوا

تھا۔ اتنے میں مجھے قبر کے سرہانے کی جانب سفید ہیولا نظر پڑا۔ مغل شہزادے کی روح عالم بالا سے اتر آئی تھی۔

میں نے اسے السلام و علیکم کہا۔ روح نے وعلیکم السلام کہا۔ اور پرسکون دھیمی آواز میں پوچھا۔

"تم نے مجھے کس لئے بلایا ہے دوست؟"

میں نے کہا۔

"اے نیک روح! میں نے تمہیں عالم ابدی سے اس عالم خاکی میں آنے کی زحمت دی مجھے معاف کر دینا۔ لیکن جب سے تم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ بہت جلد مجھ پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے اس وقت سے مجھے ایک ہی بے چینی سی لگ گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس راز کو کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن میرے دوست! کیا تم مجھے اس آفت کے بارے میں کوئی اشارہ بھی نہیں دے سکتے جس سے کم از کم مجھے یہ معلوم ہ جائے کہ آفت کس قسم کی ہوگی اور میں پہلے سے اس کے لئے تیار ہو جاؤں اور اس ے نمٹنے کا کوئی انتظام کر لوں"

مغل شہزادے کی روح نے جواب میں کہا۔

"مجھے صرف اتنی ہی اجازت تھی جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔ اس سے آگے مجھے زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور میری جرات بھی نہیں کہ میں اس سے زیادہ نہیں کچھ بتا سکوں۔ یہ بھی تم پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس کی اجازت سے میں نے نہیں اتنا بتا دیا ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اس سلسلے میں مجھ سے مزید کوئی سوال ہ کرو"

میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"میں اللہ کی مشیت کے آگے سر جھکاتا ہوں میری کیا مجال کہ ذرا سی بھی سرکشی کر کوں۔ لیکن آخر میں ایک کمزور انسان ہوں۔ انسان جب تک اس مادی جسم میں رہتا ہے ل کے اندر تھوڑی بہت کمزوری بھی موجود رہتی ہے۔ کیا ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ تم

مجھے اس آنے والی آفت کے بارے میں ہلکا سا اشارہ ہی دے دو؟"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"نہیں میرے دوست۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ تمہیں بتانا تھا بتا چکا ہوں اب تم اس آنے والی آفت کا انتظار کرو اور اتنا یاد رکھو کہ اگر تم ثابت قدم رہے۔ تم نے خدا پر اپنا ایمان مضبوط رکھا اور آفت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جس طرح میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہیں نجیب آباد کے پتھرگڑھ قلعے کے عقبی جنگل کجلی بن میں جا کر شہید خاتون کی روح سے ملاقات کرنی ہو گی تم میری اس ہدایت پر پوری طرح عمل کرنا۔ اللہ کے فضل وکرم اور تمہاری ثابت قدمی اور آفت کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی طاقت سے تمہاری آفت دور ہو سکے گی۔"

میں نے مغل شہزادے کی روح کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے موجودہ کمانڈو مشن کے بارے میں مشورہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! کیا تم مجھے میرے موجودہ کمانڈو مشن کے بارے میں کوئی مشورہ دینا پسند کرو گے؟"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"یہ تمہارا عملی میدان ہے۔ تم اس وقت میدان عمل میں ہو اور کفر کے خلاف جہاد کر رہے ہو۔ تم نے اسلام کی سربلندی اور پاکستان کے استحکام کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت خیز خطرات میں ڈال رکھا ہے۔ یہ تمہارا جہاد ہے۔ اس میدان عمل میں تمہارے ہر عمل کا فیصلہ تمہاری نیت اور تمہارے عملی کردار کے مطابق ہو گا۔ اگر تم ثابت قدم رہے۔ تم نے خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اپنے کردار کو داغ دار نہ ہونے دیا اور تمہارا ہر قدم صرف اسلام اور اسلام کی سربلندی کے واسطے آگے بڑھا تو کائنات کی ساری مخفی قوتیں تمہارے ساتھ ہوں گی اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم کامیاب نہ ہو۔ تم اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہو گے۔"

میں نے مغل شہزادے کی روح سے مزید ایک سوال پوچھنا چاہا لیکن روح نے دھیمی

از میں کہا۔

"تمہارے دماغ میں مجھ سے پوچھنے کے لئے جو سوال پیدا ہو رہا ہے اس کا تعلق بھی اری سوچ تمہاری اپنی نیت اور تمہارے عملی کردار کی نوعیت سے ہے۔ جیسے تمہاری چ ہو گی، جیسی تمہاری نیت ہو گی۔ جیسا تمہارا عملی کردار ہو گا ویسا ہی اس کا نتیجہ بر آمد گا۔ اب میں واپس جا رہا ہوں۔ السلام وعلیکم"

میں نے آہستہ سے واعلیکم السلام کہا اور مغل شہزادے کی روح کا نورانی ہیولا توں کے اوپر اٹھ کر رات کی نورانی فضا میں تحلیل ہو گیا۔ میرے دل پر سکون کی ایک ب کیفیت طاری تھی۔ میں کچھ دیر اسی کیفیت میں وہاں بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اٹھا اور ن میں واپس آگیا۔

مغل شہزادے نے میرے سکھوں والے حلیے کے بابت کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس وقت قبر پر کوئی دوسرا شخص موجود ہوتا تو وہ بھی یہ دیکھ کر سخت حیران ہوتا کہ سکھ قبر پر بیٹھا دعا مانگ رہا ہے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ میرے سر پر اس وقت سکھوں پگڑی نہیں تھی اور میں نے سر کے بال بھی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ کمرے میں آ کر میں کونے میں جلتی ہوئی موم بتی بجھائی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ کھڑکی میں نے کھلی ہی ۔ یہاں راجستھان کے مقابلے میں رات کو خنکی زیادہ تھی۔ میں نے ہلکا کمبل اوپر کر ر سوچنے لگا کہ ایٹمی سنٹر کی تصویریں ضرور صحیح اتری ہوں گی۔ اس کے بعد مجھے ایٹمی یں چیونگ گم بم پلانٹ کرنے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جمشید نے مجھے گائیڈ کرنا تھا بم ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں میں سے کس کمرے میں لگانے ہیں۔ بم لگانے کے لئے نے اپنے ذہن میں ہفتے کی رات منتخب کر لی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بم اس وقت بلاسٹ جب وہاں کوئی ورکر موجود نہ ہوں۔ کیونکہ ہمیں اس اٹامک انرجی سنٹر میں کام کرنے ا سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں انہیں ناحق ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں اگر ی ہوتی تو میں انہیں بھی ایٹمی مرکز کے ساتھ ہی اڑا سکتا تھا۔ بلکہ اگر مزید مجبوری تو میں اپنے آپ کو بھی ہلاک کروا سکتا تھا۔ میں نے تو جان کی بازی لگا رکھی تھی اور

اگر خدا اور اس کے رسول ﷺ بتائے ہوئے راستے میں جہاد کرتے ہوئے مو
آجائے تو اس سے بڑھ کر میری اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔

میں اس قسم کے خیالات میں گم آہستہ آہستہ نیند کی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھ
غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک مجھے لوبان کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر
آنکھیں کھول دیں۔ یہ راجستھان کی مڑھیوں والی چندریکا بدروح کی بو تھی۔ میں
کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر رات کی دھندلی دھندلی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوبان کی
پہلے ہلکی تھی۔ اب تیز ہو رہی تھی۔ پھر کھڑکی کے پاس کمرے کے اندر چندریکا نمودار ہو
گئی۔ اس نے جوگیا رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خلاف معمول ہند
جوگیوں والا ترشول تھا۔ گلے میں کالے منکوں کی مالائیں تھیں۔ بال کھلے تھے اور آنکھو
سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

میں اس کی طرف گھورتے ہوئے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چندریکا! تم؟"

"ہاں! میں!"

اس کی آواز بھی تھوڑی بدلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ آج تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ پہلے تو تم نے ریشمی ساڑھی پہنی ہوتی تھی بالوں
میں پھولوں کا گجرا ہوتا تھا مگر آج تمہارے ہاتھ میں تیکھی نکروں والا ترشول ہے۔ کیا کس
کی جان لے کر آرہی ہو؟"

چندریکا بدروح کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ وہ بالکل ایک
بدروح لگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بھارت ماتا کو نقصان پہنچانے کے لئے جو کچھ کر رہے ہو مجھے اس کی ساری خبر
ہے۔ پہلے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں
گی۔ کیونکہ تم پچھلے جنم میں میرے پتی دیو رہ چکے ہو مگر میں بھارت ماتا کی اتنی زبردست
تباہی بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے تمہارے خلاف یدھ کرنے جنگ کرنے اور تمہاری

و ناکام بنانے کا فیصلہ کیا اور راجستھان کے اٹامک انرجی سنٹر کے ڈائریکٹر سردار ارجن
کے گھر جا کر اسے تمہاری سازش سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ تمہیں بھی
ار کرلے اور بھارت ماتا بھی تباہی سے بچ جائے۔ لیکن مجھے سخت دکھ ہے کہ میں ایسا
کی۔ کوئی نیک روح تمہاری مدد کر رہی ہے۔ میں سردار ارجن سنگھ کے گھر میں جا کر
کے سامنے ظاہر ہو گئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایٹمی سنٹر تباہ ہونے والا ہے۔
ں نے محسوس کیا کہ نہ تو وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ میری بات سن رہا ہے۔ میں نے
بازوؤں سے پکڑ کر ہلانا چاہا مگر وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں نہ آیا۔ آہ! اس وقت
یہ راز کھلا کہ ایک نیک اور مسلمان روح تمہاری مدد کر رہی ہے اور اس نے میرے
ے منصوبے پر پانی پھیر دیا ہے۔"

ں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ نیک روح جو بھی تھی وہ اللہ کے حکم ہی
ری مدد کر رہی تھی۔ اس نیک روح کی مدد ایسی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے بم لے کر
ی پلانٹ میں جا کر لگا دے۔ نہیں۔ یہ کام مجھے ہی کرنا تھا اور یہی ایک عمل مرد کی
تی ہے کہ وہ خود عمل کرے۔ خود جدوجہد کرے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے۔ یہ
ح اللہ کے حکم سے میری اس صورت میں مدد کر رہی تھی کہ وہ میرے منصوبے
ر مشن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے والوں کو مجھ سے دور رکھ رہی تھی۔ یہ بالکل
ات تھی کہ کوئی کاری گر اپنا کام کر رہا ہو اور اس کا استاد کام میں دخل دینے
یہ کہہ کر دور رکھ رہا ہو کہ کاری گر اس وقت کام کر رہا ہے۔ اس کے کام میں
ا اور اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ ورنہ اگر نیک روحیں مسلمانوں کی اس
ے مدد کرنے لگیں تو ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے۔ نہیں ایسا
ا۔ اس دنیا میں ہر انسان کی طرح ایک مسلمان کو بھی خدا پر یقین رکھتے ہوئے اور
بلند رکھتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اسی
جہد کر کے اپنے اعلیٰ مقصد کی راہ میں آئی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر کے ان
ے جنگ کرے جب وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو خدا کی

خوشنودی حاصل کرتا ہے۔ ہماری زندگی عمل پیہم کا نام ہے۔ ہمیں اپنے اعلیٰ کردار اور سرگرم عمل سے ہی اپنی زندگی کو کامیاب بنا کر خدا کے آگے سرخ رو ہونا ہے۔ یہی ہماری زندگی اور ہماری روح کی جدوجہد کا مقصد اعلیٰ ہے۔

میں نے بھی قدرے تلخ لہجے میں چندریکا بدروح سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سے میری کھلی جنگ ہے"

چندریکا کی بدروح نے ترشول اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اب تم سے میری کھلی جنگ ہے۔ میں تمہیں بھارت ماتا کو نقصان پہنچاتے اب نہیں دیکھ سکتی"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے بھارت ماتا کو نقصان نہیں پہنچا رہا۔ تمہاری بھارت ماتا میرے ملک کے بے گناہ بچوں عورتوں مردوں کو جو ہلاکت کی آگ میں جھونکنے کے ارادے بنا رہی ہے میں انہیں ناکام بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ تمہاری بھارت ماتا عیش کرتی رہے اور اس کے حکمران ایٹم بم بنا کر میرے وطن پاکستان کے شہروں پر پھینک کر انہیں تباہ کر دیں تو یہ تمہاری اور تمہارے بھارت ماتا کی بھول ہے۔ میں تمہارے ملک کے حکمرانوں کو ان کے ناپاک عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ پاکستان امن پسند ملک ہے۔ وہ اپنے ہمسائے ممالک کے ساتھ امن و آشتی سے رہنا چاہتا ہے لیکن تمہارا بھارت پاکستان کے خلاف زبردست جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ اب وہ پاکستان کے شہروں پر گرانے کے لئے ایٹم بم اور پلاٹونیم بم تیار کر رہا ہے میں ان مذموم عزائم کو جہاں تک اور جب تک مجھ سے ہو سکا ناکام بناؤں گا۔ یہ میرا ایک محب وطن پاکستانی کمانڈو اور مسلمان ہونے کے ناطے فرض بھی ہے۔"

بدروح چندریکا بپھر سی گئی۔ اس کے نتھنوں سے مجھے عجیب آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ جیسے کوئی زخمی ریچھنی تکلیف سے سانس لے رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنی کوشش کر کے دیکھ لو میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گی۔

ہمارے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گی۔ اگر مجھے کاش کے دیوتاؤں سے بھی مدد لینی پڑی تو ان سے بھی ضرور مدد لوں گی۔"

میں نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے صرف یہ شعر پڑھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

بدروح چندریکا نے ایک بھیانک چیخ ماری اور غائب ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد سوچنے لگا کہ یہ بدروح سر سے پاؤں تک شیطان کی آلہ کار بن گئی ہے۔ اب مجھے اس ناپاک عزائم سے بھی خبردار رہنا ہو گا۔ اگرچہ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ تھا اور میرا ان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ پھر بھی دشمن دشمن ہوتا ہے اور مسلمان کو اپنے دشمن سے تو کبھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے یہ بھی شک گزرا کہ ہو نہ ہو مجھ پر جو ت نازل ہونے والی ہے اور جس کی پیش گوئی مغل شہزادے کی روح نے بھی کر دی ے وہ آفت ضرور اس بدروح چندریکا کی وجہ سے ہی نازل ہو گی۔ کیونکہ چندریکا کے ملنے میں مجھ سے بھی بعض غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ اور انسان کو اس کی غلطی کی سزا ت کی طرف سے ضرور مل کر رہتی ہے۔ دنیا کی عدالت میں انسان غلطی کرنے کے د اپنا وکیل کر کے بری ہو سکتا ہے لیکن قدرت کی عدالت میں جرم کرنے والا کبھی بچتا۔ اسے سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سزا کی شدت اور مدت کم ہو ے۔ چنانچہ مجھ پر جو آفت نازل ہونے والی تھی وہ یقیناً میرے اپنے ہی کسی گناہ کی سزا وہ ٹل نہیں سکتی تھی۔ دنیا کی عدالت میں تو اپیل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے مگر ت کی عدالت میں کوئی اپیل نہیں ہوتی۔ میں دل میں خدا سے یہی دعا مانگنے لگا کہ اے پروردگار میری غلطیاں قصور معاف کر دے اور میری سزا کی شدت اور مدت میں کمی ما۔

یہ بھی عجیب رات تھی۔ ایک ہی رات میں دو روحوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک

بدروح تھی اور دوسری نیک روح تھی۔ بہرحال اب مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ بدروح چندریکا میری دشمن بلکہ کھلی دشمن بن گئی تھی اور اس نے میرے خلاف جنگ کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ میرے بچنے کی ایک گنجائش ضرور قدرت خداوندی نے رکھ دی تھی کہ اگر میں صاحب کردار رہتا ہوں اگر میں اپنے جہاد کے کمانڈو مشن میں ثابت قدم رہتا ہوں۔ اور اگر میں اپنے مشن پر صرف خدا اور خدا کے واسطے عمل کرتا ہوں اور اپنی کوئی ذاتی غرض اور ذاتی مفاد اس میں شامل نہیں کرتا ہوں تو پھر بدروح چندریکا میرے خلاف اپنے کسی مذموم منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا بدروح چندریکا نے خود اعتراف بھی کیا تھا۔ لیکن اگر میرے عمل میں میری ذاتی غرض‘ میرا ذاتی مفاد شامل ہو گیا یعنی میں نے اللہ اور رسول ﷺ کا دامن چھوڑ کر صرف اپنی عیش و عشرت اور دولت اکٹھی کرنے کے لئے کام شروع کر دیا تو بدروح چندریکا مجھ پر آسانی سے وار کر سکے گی۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج سے میرا ہر عمل اللہ اور اس کی خوشنودی کے لئے ہوگا۔ اور میں اسی کے دکھائے ہوئے راستے میں چلتے ہوئے دین اسلام کی سربلندی اور اسلام کے نام پر قائم ہوئے اپنے وطن پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کے لئے ہی کام کروں گا۔ اپنی ذاتی غرضوں ذاتی فائدوں اور عیش و عشرت کے خیال تک کو دل سے نکال دوں گا۔

اس کے بعد میں سو گیا۔ مجھے بڑی پرسکون نیند آئی۔

میں بیدار ہوا تو کھڑکی اسی طرح کھلی تھی اور دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ جب سے سکھوں والا حلیہ بنایا تھا کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میں شیو کرنے اور بال کٹوانے کی بک بک سے بچ گیا تھا۔ کپڑے بدلے اور سر پر سکھوں والی پگڑی جمائی۔ ڈاڑھی کو سکھوں کی طرح اوپر کو چڑھایا۔ گلے میں کرپان لٹکائی اور ناشتہ کرنے کے لئے مزار شریف والے چوک میں آگیا۔

یہاں دلی کے مسلمانوں کی نہاری کی بڑی دکانیں تھیں۔ ایک دکان میں بیٹھ کر دلی کی تاریخی نہاری کا ناشتہ کیا اور سکھوں کی طرح اپنی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بالوں کو رومال

ے اوپر کی طرف چڑھا چڑھا کر صاف کرتا وہاں سے اپنے مکان میں آگیا۔ چو۔ یں تین پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ مگر کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ سکھ بھیس بدلنے کے بعد سی آئی ڈی والوں سے مجھے کافی حد تک نجات مل گئی تھی۔ لیکن ں غافل اور بے پروا نہیں ہوا تھا۔ دلی پولیس اور دلی کی سیکرٹ پولیس کے پاس سرے خطرناک مجاہد کمانڈوز کی طرح میری تصویر بھی احمد آباد پولیس سٹیشن سے پہنچ چکی ی اور اگر کوئی ذہین سی آئی ڈی آفیسر مجھے قریب بلا کر غور سے دیکھتا تو وہ مجھے پہچان سکتا ا۔ چنانچہ میں پولیس کے سپاہی کو دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتا تھا۔ اگر قریب سے بھی گزرنا ے تو اپنے دھیان میں گردبانی کا جاپ کرتا گزر جاتا تھا۔

کوئی دس بجے کے قریب پروفیسر جمشید اور گل خان آگئے۔ وہ میرے لئے تھرمس یں چائے بھر کر لائے تھے۔ کھانا اب گل خان میرے لئے نہیں لاتا تھا۔ جب سے میں نے ھ نوجوان کا روپ بدلا تھا اسے معلوم تھا کہ میں باہر جا کر بھی کھانا کھا سکتا ہوں۔ پروفیسر شید ساری تصویریں ڈیویلپ کر کے لے آیا تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں سے لفافہ ال کر کھولا اور میرے آگے پندرہ سولہ پاسپورٹ سائز کی رنگین تصویریں رکھ دیں۔

”تصویریں تو بہت تھیں۔ یہ میں نے ان میں سے چھانٹی ہیں۔ ذرا دیکھو یہ تمہارے ر گراؤنڈ ایٹمی سنٹر کے سیکشن کی ہیں۔“

ساری تصویریں ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں کی تھیں۔ ایک ایک کمرے کی تین تین یریں تھیں جو مختلف زاویوں سے میرے ٹائی پن کے خفیہ کیمرے نے اتاری تھیں۔ یریں اس قدر صاف اور شفاف تھیں کہ میں کیمرے کی کارکردگی پر حیران رہ گیا کہ ئے چھوٹے سے کیمرے نے اتنی اچھی تصویریں کس طرح کھینچ لیں۔ اس دوران پروفیسر ید رومال سے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتا رہا۔ گل خان بھی جھک کر میرے ساتھ ہی یروں کو دیکھ رہا تھا۔ جب میں تصویریں دیکھ چکا تو پروفیسر جمشید نے عینک آنکھوں پر ا اور تصویروں میں سے ایک تصویر نکال کر میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں صرف اس کمرے میں ٹائم بم لگانے ہوں گے۔ باقی کسی کمرے میں لگانے کی

ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے تصویر کو غور سے دیکھا یہ پانچویں نمبر کے اس کمرے کی تصویر تھی جس کے اندر گول چبوترہ تھا اور چبوترے کے اوپر آپریشن روم کی طرح کے آلات لگے ہوئے تھے۔ پروفیسر جمشید کہنے لگا۔

"یہ ایٹمی سنٹر کا پروسیسنگ پلانٹ ہے۔ یہ اس انسٹی ٹیوٹ کا دل ہے۔ اگر تم اس کو تباہ کردو گے تو سارا ایٹمی مرکز تباہ ہو جائے گا۔"

گل خان بھی میرے ساتھ ہی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کہہ رہا تھا۔

"یہ ایک طرح کی ایٹمی بھٹی ہے جہاں پلوٹونیم کو پروسیس کیا جاتا ہے۔ تمہیں اس بھٹی کے اردگرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چار ٹائم بم لگانے ہوں گے۔ اس کے بعد کا سارا کام یہ بھٹی بموں سے اڑنے کے بعد خود ہی انجام دے دے گی۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے ٹارگٹ مل گیا ہے۔ میں یہ کام آنے والے ہفتے کی رات کو پورا کر دوں گا۔"

گل خان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کتنے ٹائم بم ہیں؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس صرف چھ ٹائم بم باقی رہ گئے ہیں۔ جو چیونگ گم ٹیبلٹ کی شکل میں ہیں۔ گل خان نے پروفیسر جمشید سے پوچھا۔

"پروفیسر! وہ بم میں نے ہی تیار کئے تھے اور تم نے بھی انہیں دیکھا تھا۔ تمہارے خیال میں اس ایٹمی ری ایکٹر کے لئے یہ بم مناسب رہیں گے۔ میرا مطلب ہے اگر یہ اپنی طاقت اور اثرات کی اعتبار سے مناسب نہ ہوں تو میں دوسرے اس سے زیادہ دھماکہ خیز ٹائم بم تیار کر سکتا ہوں۔"

پروفیسر جمشید نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ بم بہت طاقتور ہیں اور راجستھان کے پورے

ایٹمی ری ایکٹر کے لئے کافی ہیں۔ ان بموں نے پھٹ کر ایٹمی ری ایکٹر کے پلانٹ میں بھی دھماکہ کرنا ہے۔ وہ دھماکہ کتنی شدت کا ہوگا اگر انڈین پریس نے حکومت کے کہنے پر خبر کو دبا دیا تو تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ ہمارا کمانڈو دوست ہی ہمیں کچھ بتا سکے گا"

میں نے کہا۔

"میں تو ہفتے کی رات کو وہاں ٹائم بم لگانے کے بعد وہاں سے اسی وقت دلی کی طرف چل پڑوں گا۔"

پروفیسر جمشید نے گل خان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"اس کی ڈیوریشن کتنی ہے؟ میرا مطلب ہے تم نے اس بم میں جو ٹائم ڈی وائس فٹ کی ہوئی ہے۔ اس کا دورانیہ کتنا ہے؟"

گل خان نے کہا۔

"اس کا خفیہ بٹن دبانے کے بعد صرف ایک گھنٹے کے بعد بم بلاسٹ ہو جاتا ہے۔"

پروفیسر نے عینک اتار رکھی تھی۔ مگر وہ اس کے شیشے صاف نہیں کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس وقت تک ایٹمی ری ایکٹر کے ایریا سے کافی دور جا چکے ہو گے۔"

میں نے کہا۔

"میں دور کسی جگہ چھپ کر ری ایکٹر کی تباہی کو دیکھ بھی سکتا ہوں۔"

پروفیسر بولا۔

"اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو پھر تمہیں تباہی کی جگہ سے کافی دور رہنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تباہی کافی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا کہ کچھ فاصلے پر چھپ کر تباہی کا منظر دیکھوں۔ مگر وہاں صحرا ہی صحرا ہے۔ ریت کے ٹیلے کافی دور دور ہیں۔ پتھریلی ریت کے ٹیلے صرف ایٹمی مرکز کے

اوپر ہی ہیں۔"

پروفیسر جمشید نے کہا۔

"وہ دونوں ٹیلے پگھل کر پانی ہو جائیں گے۔ بلکہ بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔ یہ ابھی پلوٹونیم پروسیسنگ عمل میں ہے اگر آدھا گرام پلوٹونیم بھی تیار ہو چکا ہوتا تو ارد گرد کے بیس میل کے علاقے میں ہر شے پگھل کر بھاپ بن کر اڑ جاتی۔"

گل خان نے کہا۔

"کیا معلوم وہاں پلوٹونیم تیار ہو چکا ہو؟"

پروفیسر نے جواب دیا۔

"نہیں۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پلوٹونیم تیار ہو چکا ہوتا تو اس چھوٹی ایٹمی بھٹی کی جگہ وہاں بڑا ایٹمی پلانٹ لگا ہوتا۔ ابھی وہاں پلوٹونیم کے عناصر کو صرف صاف ہی کیا جا رہا ہے۔ لیکن وہاں جتنے عناصر صاف ہو چکے ہیں ان کی شدت اور حدت پھٹنے کے بعد اتنی تباہی پھیلائے گی کہ آس پاس کے لوگوں کو ہیروشیما اور ناگا ساکی کی تباہی یاد آجائے گی۔"

ہم دوپہر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر گل خان بازار سے جا کر کھانا لے آیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ پروفیسر نے مجھے مزید ہدایات دیں کہ بم کو ایٹمی بھٹی کی گولائی پر فرش سے ایک فٹ کے فاصلے پر لگانا اور اس طرح لگانا کہ کسی کو دکھائی نہ دیں۔ میں نے کہا۔

"میں ہفتے کی رات کو یہ کام کروں گا۔ اس وقت ایٹمی سنٹر میں کوئی نہیں ہوتا۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

گل خان نے مجھ سے پوچھا۔

"ٹائم بم ٹھیک حالت میں ہیں نا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل ویسے کے ویسے میرے پاس ڈبی میں بند پڑے ہیں۔ کیا زیادہ دن پڑے رہنے

سے ان کی شدت کم تو نہیں ہو جاتی؟"

گل خان نے ہنس کر کہا۔

"بالکل نہیں دوست! وہ اتنی ہی طاقت سے پھٹیں گے جتنی طاقت سے دوار کا فورٹ کے اسلحہ کے ذخیرے میں پھٹے تھے۔"

میں نے کہا۔

"ویری گڈ!"

گل خان بولا۔

"میں ہفتے کی رات کو اسی مکان میں آجاؤں گا۔ تم رات کو یا اگلی صبح جس وقت بھی آؤ گے میں یہاں پر موجود ہوں گا۔"

سہ پہر ہو رہی تھی۔ مزید پوچھنے اور سمجھنے سمجھانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے واپس راج گڑھ بھی جانا تھا۔ چنانچہ میں کوئی سوا تین بجے کے قریب گل خان اور پروفیسر جمشید سے رخصت ہو کر ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ ریواڑی کو ایک گاڑی چار بجے چلتی تھی۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر ریواڑی پہنچ گیا۔ مجھے وہاں درگاوتی سے ملنے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بس اڈے سے بس پکڑی اور شام ہو رہی تھی کہ راج گڑھ پہنچ گیا۔ کالونی پر شام کے سائے اتر رہے تھے۔ کیونکہ کالونی میں بتیاں کم روشن ہوتی تھیں اس لئے وہاں شام کا اندھیرا کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔

اپنے کوارٹر میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے جہاں ٹائم بموں والی ڈبی چھپا کر رکھی ہوئی تھی اسے نکالا۔ کھول کر چھ کے چھ ٹائم بموں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی۔ دیکھنے میں واقعی یہ چیونگم کی ٹکیاں لگتی تھیں۔ میں نے انہیں واپس ڈبی میں ڈال کر خفیہ جگہ پر سنبھال کر رکھ دیا۔ مجھے یہ بم لگانے کے لئے ہفتے کے دن کا انتظار کرنا تھا۔ دوسرے دن میں وقت پر ایٹمی مرکز پہنچ گیا۔ پہلے کی طرح کام کرتے اور ٹرالی میں سامان سٹور سے ادھر ادھر لاتے لے جاتے دن گزر گیا۔ رات کو یونہی خیال آیا کہ سائنس دان ٹھنڈی یخ عورت نرملا دیوی سے بھی ملاقات کر لینی چاہئے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ کوئی ایمرجنسی

تو پیدا نہیں ہونے والی۔ اپنی طرف سے تو میرا کمانڈو ایکشن کا منصوبہ بالکل تیار اور مکمل تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ منصوبے اپنی طرف سے ہر لحاظ سے مکمل کر لئے جاتے ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ عین وقت پر حالات کیا شکل اختیار کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات اتنی جلدی پلٹا کھاتے ہیں کہ کمانڈو مشن کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ سائنس دان عورت ایٹمی مرکز کے اندرونی حالات سے پوری طرح باخبر رہتی تھی۔ کیونکہ یہ اپنے سیکشن کی انچارج تھی۔ اس لئے اس سے کم ازکم ہفتے کی شام تک ملتے رہنا ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ایٹمی مرکز کے پانچوں کمروں میں لگنے والی اصل چابی میرے پاس تھی۔ میں نے اس کی نقل تیار کروا کر نرملا دیوی کے کچن والے گل دان میں ڈالی ہوئی تھی۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اس کو یہ علم تو نہیں ہوگیا کہ اس کے گل دان والی چابی نقلی ہے۔ اگرچہ ایک چابی اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ کچن والی چابی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر ان حالات کی نبض کو معلوم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں آدھی رات کے بعد پگڑی اتار کر سر پر سکھوں کی طرح رومال باندھ کر نرملا دیوی کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ کالونی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ شاید ہی کوئی کوارٹر ایسا تھا کہ جس کے اندر کوئی بتی روشن ہو۔ کسی کسی کوارٹر کی باہر کی بتی روشن تھی۔ میں کوارٹروں کے پیچھے سے ہو کر جا رہا تھا۔

سائنس دان عورت نرملادیوی کے کوارٹر پر بھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس عورت کی طرح اس کا کوارٹر بھی سرد ویران اور تاریک تھا۔ مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ میں اسے بتائے بغیر جا رہا ہوں۔ کہیں وہ گہری نیند نہ سو رہی ہو۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں فون پر شام کے وقت اسے خبر کر دیتا کہ میں آرہا ہوں۔ مگر اب میں اس کے کوارٹر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب سوائے دستک دینے کے میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر بالکل خاموشی چھائی رہی۔ میں نے دوسری اور تیسری بار دستک دی۔ پھر بھی خاموشی چھائی رہی۔ چوتھی بار دستک دینے سے اندر سے نرملا دیوی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر انگریزی میں ہی کہا۔ "میں ہوں جسونت سنگھ سوڈھی"

اور پھر سکھوں کی طرح اپنے آپ ہی ہنس پڑا۔ میں فوراً چونکا میرے اندر سکھوں والی عادتیں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور سنجیدہ ہوگیا۔ نرملا دیوی نے دروازہ کھول کر اپنا آدھا سویا آدھا جاگا ہوا چہرہ باہر نکالا۔ باہر بھی اندھیرا تھا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ باہر کا اندھیرا ذرا کم تھا۔ مجھے اس کی شکل ایسی لگی جیسے اچانک کوئی بھوت اندھیرے میں سے نکل کر میرے سامنے آگیا ہو۔ اس کے مختصر سے بال بڑے بے ہنگم طریقے سے کھلے تھے۔ اس نے سخت لہجے میں انگریزی میں کہا۔

"تم اس وقت کیا کرنے آئے ہو؟ تم نے شام کو فون کیوں نہیں کیا؟"

میں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میڈم! آئی ایم سوری۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"مگر تم سنٹر میں تو ڈیوٹی پر موجود تھے۔ اندر آجاؤ"

میں اندر کمرے میں چلا آیا۔ اب سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آگے کیا کروں۔ کیوں کہ کمرے میں اتنا گھپ اندھیرا تھا کہ میری آنکھیں جو جنگل کی تاریک راتوں میں دیکھ لیتی تھیں وہاں کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا میں ڈی ٹول کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے نرملا دیوی مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس طرح صوفے کے پاس لے گئی جس طرح کوئی کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے۔ اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔

"بولو کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"بس میڈم! تم سے ملنے کو بہت دل کرتا تھا۔ بے قرار ہو کر آگیا ہوں۔"

"تم اتنے دن کیوں نہیں آئے؟ اس ہفتے کی رات کہاں تھے؟

میں نے کہا۔

"بس میڈم میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ کوارٹر میں ہی پڑا رہا۔ کوئی خیر خبر لینے والا تو یہاں ہے نہیں۔"

وہ بالوں کا چھوٹا اور بدشکل سا جوڑا بنا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اور تو سب خیریت ہے؟"

وہ سرد لہجے میں ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"ہاں سب خیریت ہے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

آج اس نے کچھ زیادہ ہی ڈی ٹول کا استعمال کیا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے بستر سے ڈی ٹول کی تیز بو آ رہی تھی۔ مجھے وہ کسی ایسے مریض کا کمرہ لگ رہا تھا جس کا تازہ تازہ آپریشن ہوا ہو۔ میرا خود وہاں دم گھٹنے لگا تھا۔ جب میں نے معلوم کر لیا کہ سب ٹھیک ہے اور اسے نقلی چابی کا بھی پتہ نہیں لگا تو میرا وہاں بیٹھنا بیکار تھا۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"ست سری اکال۔ میں چلتا ہوں۔ سوری تمہیں ڈسٹرب کیا"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ بالکل لگ رہا تھا۔ جیسے کسی ہسپتال کی چڑیل میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں دروازے سے باہر نکلا تو اس نے کہا۔

"مجھے ڈسٹرب کرنے صرف ہفتے کی رات کو آیا کرو۔ اب جاؤ۔"

اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دل میں کہا۔

"میڈم اس ہفتے کی رات کو میں بہت مصروف ہوں گا۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں راج گڑھ اس زیر زمین ایٹمی مرکز کے اتنا قریب تو نہیں کہ یہ کالونی بھی اس کے ساتھ ہی اڑ جائے؟ مگر میرا خیال ہے ایسی بات نہیں تھی۔ پروفیسر جمشید نے کہا تھا کہ ایٹمی سنٹر کے دھماکے سے اردگرد دو فرلانگ کا علاقہ ہی متاثر ہو گا۔ اور اس کالونی کے کوارٹرز ایٹمی مرکز یعنی رام گڑھ کے قصبے سے کافی فاصلے پر تھے۔ بہرحال میرے لئے وہ نرملا دیوی سے آخری ملاقات ہی تھی۔ اب اس وقت خاص طور پر اس کے پاس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

دن گزرتے چلے گئے۔

آخر ہفتے کی رات آ گئی۔ یہ میرے کمانڈو ایکشن کی رات تھی۔ اس رات مجھے ایٹمی مرکز میں رہ کر ایٹمی پلانٹ والے کمرے میں چار ٹائم بم لگانے تھے۔ پہلے کی طرح میں اس روز بھی آفس ٹائم ختم ہوتے ہی سفید کوٹ اتار کر ہینگر میں لٹکانے کے لئے کلوک روم میں گیا اور وہیں کلوزٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چاروں ٹائم بم میری جیب میں موجود تھے۔ ڈبی میں دو بم میں نے الگ کر کے رکھ لئے تھے۔ مجھے ایٹمی بھٹی پر چار بم لگانے تھے۔ میں اس وقت تک کلوک روم میں ہی چھپا رہا جب تک کہ پانچوں گارڈ کمروں کو چیک کرنے کے بعد تالے لگا کر اوپر نہیں چلے گئے۔ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ یہ گارڈ مزید چیکنگ اور دیکھ بھال کے لئے آدھی رات کو بھی نیچے آتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بم آدھی رات کے بعد اور ان گارڈز کی دوسری چیکنگ کے بعد لگانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں سفید کوٹوں کے ہینگروں والے کلوزٹ میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جب ذرا اطمینان ہوا کہ ایٹمی سنٹر خالی ہو گیا ہے تو باہر نکل آیا۔ چابی میری جیب میں تھی جو سب کمروں کو لگ جاتی تھی۔ مگر مجھے اس وقت صرف کمرہ نمبر ۵ کو یہ چابی لگانی تھی۔

احتیاط کے طور پر میں راہ داری میں ٹہلتا ٹہلتا کمرہ نمبر ۵ کے پاس آ گیا۔ جیب سے چابی نکال کر اسے لگائی تالا کھل گیا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر بتیاں جل رہی تھیں۔ درمیان میں ایٹمی بھٹی صاف نظر آ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے دروازے کو دوبارہ لاک کر دیا اور دبے پاؤں چلتا واپس کلوک روم میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یا پاک پروردگار کوئی ایسی ویسی ایمرجنسی نہ پیدا ہو جائے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ میرا کمانڈو مشن فیل ہو جاتا بلکہ میں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اور کبھی راہ داری میں دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے رات کے گیارہ اور پھر ساڑھے گیارہ بج گئے۔

اوپر سے گارڈز کے چیکنگ کے لئے راؤنڈ لگانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں جلدی سے کلوک روم میں آکر چھپ گیا۔ ٹھیک بارہ بجے رات دونوں گارڈ اوپر سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور باتیں کرتے دونوں راہ داری میں آگے نکل گئے۔ آج دوسرا گارڈ کلوک روم کے پاس کھڑا نہیں ہوا تھا۔ مجھے ان کی دروازے کھولنے بند کرنے اور باتیں کرنے اور کبھی کبھی قہقہہ لگا کر ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔

پھر وہ آپس میں باتیں کرتے ہنسی مذاق کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ جب اوپر والے دروازے کے بند ہو جانے کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں کلوزٹ کے ہینگروں سے نکل کر باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں احتیاطاً" مزید کچھ وقت لگانا چاہتا تھا۔ محض اس خیال سے کہ کہیں وہ دوبارہ تو نیچے نہیں آجاتے۔ جب دس پندرہ منٹ گزر گئے اور اوپر بھی گہری خاموشی چھا گئی تو میں نے اللہ کا نام لیا اور کلوک روم سے نکل کر راہ داری میں آگیا۔ اس وقت میں ایک عام قسم کا آدمی نہیں تھا۔ اس وقت میں ایک سخت جان' اور سانپ سے زیادہ ہوشیار اور چیتے سے زیادہ چالاک ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ میرے قدم نپے تلے تھے۔ میں عام حالات کی طرح دبے پاؤں نہیں چل رہا تھا۔ میری چال ایک زبردست کمانڈو کی چال تھی جس نے اپنے ملک وملت کی سلامتی کی خاطر' اپنے وطن پاک کے معصوم بچوں' اور ماؤں بہنوں کی عزتوں کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی اور موت اپنی ہتھیلی میں لے کر دشمن کے ایک انتہائی حساس اور نازک ترین انسٹی ٹیوٹ میں ٹائم بم لگانے جا رہا تھا۔

میں کمرہ نمبر پانچ کے سامنے آکر رک گیا۔

کمرہ بند تھا۔ اوپر راہ داری کی چھت پر بلب جل رہا تھا جس کی روشنی دروازے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر تالے کے سوراخ میں گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ دروازہ کھول کر میں اندر آگیا۔ میں نے دروازہ فوراً بند کر دیا۔ میری پشت دروازے سے لگی تھی اور میری نگاہیں گول چبوترے پر لگی تھیں جہاں مجھے ٹائم بم لگانے تھے۔ اب مجھے فل ایکشن سے کام لینا تھا اور ایک مشین کی طرح اپنی ڈیوٹی اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ میں تیز

ز قدم اٹھاتا ایٹمی بھٹی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے پلاسٹک کا وہ چھوٹا سا لفافہ لا جس میں چار ٹائم بم پڑے تھے۔ میں نے پہلا ٹائم بم لے کر اسے ایٹمی بھٹی کے گول بوترے کی دیوار کے ساتھ فرش سے ایک فٹ اونچا کر کے چپکا دیا۔ اس کے بعد دوسرا ئم بم ذرا آگے کر کے چپکا دیا۔ اسی طرح میں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اروں ٹائم بم چپکا دیئے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے چاروں ٹائم بموں کا ک کر اچھی طرح سے جائزہ لیا اور پھر بسم اللہ پڑھ کر اس کے اندر جو ٹائم ڈیوائیس لگے ھے باری باری ان کے بٹن دبا دیئے۔ ایک گھنٹے بعد ان بموں کو پھٹ پڑنا تھا۔ میں نے نے قدم اٹھاتا کمرہ نمبر پانچ سے باہر نکل آیا۔ دروازے کو اسی طرح چابی لگا کر لاک کیا اور لوک روم کی طرف جانے کی بجائے راہ داری کے اس سرے کی طرف چلنے لگا جہاں ہرے کنوئیں کے اندر بجلی کے جنریٹر لگے تھے اور ایک چرخی سے دیوار میں طاق کھلتا ا۔ کیونکہ آج کی رات میں کلوک روم میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس کی وجہ محض اتنی سی ی کہ ایک گھنٹے بعد وہاں قیامت برپا ہونے والی تھی۔

یہ پروگرام میں نے پہلے سے بنا رکھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جنریٹروں والے اق کو میں پہلے بھی کھول کر دیکھ چکا تھا۔ ورگرنہ میرے لئے وہاں دن کے وقت ٹائم بم لگانا ب ناممکن بات تھی اور پھر مجھے صرف بم لگانے کے لئے پانچوں گارڈز کا خون کرنا پڑتا۔ جو ا کرتے ہوئے حالات میرے مخالف بھی ہو سکتے تھے اور میں پھنس بھی سکتا تھا۔ میں راہ ری کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا راہ داری کی آخری دیوار کے پاس آیا۔ وہاں چھوٹی سی نی دیوار میں ایک طرف ویسے ہی لگی تھی۔ میں نے چرخی کو گھمایا۔ چھوٹے سے طاق کا روازہ کھل گیا۔ دوسری طرف کنوئیں کی دیوار کے ساتھ لوہے کی سیڑھی اوپر سے نیچے ٹروں تک جا رہی تھی۔ جنریٹر چل رہے تھے۔ میں ٹانگ بڑھا کر لوہے کی سیڑھی پر آگیا ا بازو نیچے کر کے طاق کو اسی طرح دوبارہ بند کر دیا۔ اب میں اوپر چڑھنے لگا۔ لوہے کی ھی دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور اوپر کنوئیں کے دہانے تک جاتی تھی۔ مجھے لوم نہیں تھا کہ اس کنوئیں کے اوپر کوئی آہنی ڈھکنا بھی ہے۔ جس روز میں نے نیچے

سے اوپر دیکھا تھا تو کنوئیں کا منہ کھلا تھا اور مجھے آسمان پر تاروں کی روشنی نظر آئی تھی۔
آج میں نے اوپر دیکھا تو مجھے تاروں کی روشنی نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ باہر شاید
اندھیرا ہو گیا ہو۔ شاید بادل آگئے ہوں۔ میں سیڑھی چڑھتا جب کنوئیں کے منہ پر آیا تو
اس کا منہ بند تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے دیکھا۔ کنوئیں کے منہ پر لوہے کا بھاری ڈھکن
گرا ہوا تھا میں نے دونوں ہاتھوں سے زور لگایا۔ مگر ڈھکن ذرا بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔
میں آہنی سیڑھی پر کھڑے کا کھڑا ساکت سا ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز حالات کے لئے بھارت کے فرعون حصہ
چہارم ”را کی سازش“ میں پڑھیئے

بھارت کے
فرعون
را کی سازش
اے حمید
50

میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ایٹمی مرکز کے جنریٹرز کنوئیں والا ڈھکنا اوپر سے بند ہو سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کنوئیں کا منہ کھلا ہو گا جس طرح کہ میں نے ایک روز پہلے دیکھا تھا اور میں آسانی سے باہر نکل جاؤں گا۔ لیکن کنوئیں کا منہ لوہے کے ڈھکن سے بند تھا۔ میں کنوئیں کی دیوار کے ساتھ لگی لوہے کی سیڑھی پر کھڑا سوچنے لگا کہ اگر ڈھکن نہ کھلا تو میرا بچنا ناممکن ہے۔ میں نے ایٹمی بھٹی میں جو چاروں ٹائم بم لگائے تھے انہیں ایک گھنٹے بعد پھٹنا تھا۔ اور اس سارے ایٹمی سنٹر اور ریت کے ٹیلوں کے ساتھ مجھے بھی اڑ جانا تھا۔ مجھے اپنی موت کا کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن میں اس طرح اپنی زندگی کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے پاؤں لوہے کی سیڑھی پر جمائے اور دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے زور لگا کر ڈھکن کو اٹھانے کی کوشش کی۔ دو تین بار کوشش کرنے سے ڈھکن ذرا سا اپنی جگہ سے ہلا۔ جس طرف سے میں زور لگا رہا تھا اسی طرف سے ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔ مجھ پر ریت گری۔ ان لوگوں نے کنوئیں کے اوپر ڈھکن دے کر اوپر سے ریت ڈال دی تھی تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس کے نیچے ایٹمی سنٹر کے جنریٹر چل رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں بھارت کا یہ خفیہ ایٹمی سنٹر راجستھان میں رام گڑھ قصبے سے تھوڑی دور ویران ٹیلوں کے درمیان زیر زمین بنایا گیا تھا۔ اوپر دو تین کمرے بنا دیئے گئے تھے جس کے باہر

منرل ریسرچ سنٹر یعنی معدنیات کی تحقیق کا مرکز کے نام کا بورڈ لگایا ہوا تھا۔ حقیقت میں اس عمارت کے نیچے ایٹمی ریسرچ سنٹر تھا جہاں بھارتی حکومت نے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے اور ایٹمی میزائل کی تیاریوں کے سلسلے میں پلوٹونیم کو صاف کرنے کا پلانٹ لگایا ہوا تھا۔ یہ ساری تیاریاں پاکستان کے خلاف اور پاکستان کے شہروں پر جنگ کے وقت ایٹمی حملہ کرنے کے سلسلے میں ہو رہی تھیں ۔ میں نے سکھ کا روپ دھار کر جسونت سنگھ سوڈھی کے نام سے ریواڑی کی ایک طوائف کی سفارش سے ایٹمی سنٹر میں نوکری حاصل کرلی تھی اور اب ایٹمی بھٹی میں چار ٹائم بم لگا کر اس میں لگی ہوئی ٹائم ڈیوائس کا بٹن دبا کر آدھی رات کے وقت ایٹمی جنریٹرز روم کے کنوئیں میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے یہ بم آدھی رات کے وقت ایٹمی سنٹر کے اندر ہی رہ کر لگائے تھے اور اس کے صدر گیٹ سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ایسا کرنے سے میں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

پانچ سات منٹ کی زبردست کوشش سے میں نے کنوئیں کے اوپر پڑے ہوئے ڈھکن کو اتنا اوپر اٹھا دیا کہ میں اس میں سے باہر نکل سکتا تھا۔ میں رینگ کر کنوئیں سے باہر آگیا۔ یہ کنواں ایسا ہی تھا جیسا کہ ٹیوب ویل کا کنواں ہوتا ہے۔ ٹیوب ویل کے کنواں کے اوپر تو گول کمرہ سا بنا ہوتا ہے جب کہ اس ایٹمی سنٹر کے جنریٹر روم کے کنوئیں کو اوپر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ کیونکہ بھارتی حکومت اسے لوگوں سے خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں ایک طرف چل پڑا۔ یہ صحرا کا علاقہ تھا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ جن کی مدھم اور دھندلی روشنی میں مجھے دور دور تک پھیلے ہوئے راجستھان کے صحرائی ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ ایٹمی سنٹر کی زیر زمین عمارت ریت کے دو ٹیلوں کے درمیان تھی۔ ان ٹیلوں کی ریت کافی سخت ہو چکی تھی۔ میں جس ریت پر چل رہا تھا وہ بھی زیادہ بھربھری نہیں تھی۔ مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا میں نے آسمان کے ستاروں کو غور سے دیکھا۔ میں سمت کا تعین نہ کر سکا۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ دوسرے اردگرد ریت ہی ریت تھی۔ چھوٹے بڑے ٹیلے تھے میں ان ٹیلوں میں داخل ہو کر ان کی بھول بھلیوں سے پھنسنے سے بچنا چاہتا تھا۔

میں جتنا اندازہ لگا سکتا تھا اتنا اندازہ لگا کر ریت کے ٹیلوں میں جانے کی بجائے ان سے بچ کر دائیں جانب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح میرا رخ مشرق کی طرف ہو گیا ہے اور کچھ دیر تک چلنے کے بعد راج گڑھ کا قصبہ آجائے گا جہاں ایٹمی سنٹر میں کام کرنے والے سائنس دانوں اور عملے کے دوسرے آدمیوں اور خود میرا بھی کوارٹر تھا۔ میں بالکل سکھ بنا ہوا تھا۔ سر پر پگڑی تھی۔ قمیض پتلون پہنی ہوئی تھی۔ کمر میں کرپان لٹک رہی تھی اور سکھوں والی مونچھیں اور ڈاڑھی تھی۔ ایک بازو کی کلائی میں لوہے کا کڑا بھی تھا۔

میں نے رک کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا چاروں بموں کے پھٹنے میں پینتالیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں اس علاقے سے جتنی دور ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے جوگنگ کرنے والوں کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ زمین سخت تھی اور اس کے اوپر ریت کی پتلی سی تہہ بکھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے دوڑنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ پروفیسر جمشید نے کہا تھا کہ اگر ایٹمی فرنس میں ایک بٹہ دس گرام بھی افزودہ پلوٹونیم ہوا تو اس کے پھٹنے سے اردگرد کم از کم تین میل تک کسی چیز کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا اور ریت کے جن ٹیلوں کے نیچے ایٹمی سنٹر قائم ہے اس کی ریت پگھل کر بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔ اس لئے میں اس علاقے سے کم از کم چار پانچ کلومیٹر دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دوڑنے کی مجھے ٹریننگ کے دوران کافی مشق ہو چکی تھی میں پندرہ پندرہ میل کا چکر لگاتا رہا تھا۔ ایک جگہ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایٹمی سنٹر کے ریت کے ٹیلے کافی پیچھے رہ گئے تھے اور رات کی تاریکی میں ان کے دھندلے خاکے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔

میں جب کافی دور نکل گیا تو مجھے خیال آیا کہ اس وقت تک تو مجھے راج گڑھ کے کوارٹروں میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ راج گڑھ ایٹمی سنٹر سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا اور یہاں ہمارے کوارٹرز تھے جہاں ہمیں روزانہ ایٹمی سنٹر کی گاڑیاں لے کر جاتی تھیں ۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں پڑ گیا تھا۔ صحراؤں میں راستہ بھول جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سمجھو آدمی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میں نے رک کر

گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گھڑی کی سوئیاں چمک رہی تھیں۔ بموں کے دھماکے میں تیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں صرف پانچ منٹ تک سانس لینے کی غرض سے قدم قدم چلتا گیا۔ اس کے بعد مشرق کی جانب دیکھا۔ ستارہ صبح مشرقی افق کے کنارے پر نمودار ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں مشرق کی طرف ہی جا رہا تھا مگر دوڑتے دوڑتے صحرائی ٹیلوں میں راج گڑھ سے کچھ فاصلے پر بائیں جانب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا رخ درست کیا اور دوبارہ دوڑنے لگا۔

مجھے دور سے کچھ روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ میں خوش ہو گیا کہ راج گڑھ آ رہا ہے۔ راج گڑھ میں مجھے رکنا نہیں تھا بلکہ آگے نکل جانا تھا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ روشنیاں ریت کے ٹیلوں میں گم ہو گئیں۔ میں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان آ گیا تھا۔ ڈر تھا کہ میں کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور مشرق کی جانب نظر دوڑائی۔ خدا جانے وہ روشنیاں جو مجھے دور سے جھلملاتی نظر آئی تھیں اب کہاں غائب ہو گئیں تھیں۔ ایٹمی سنٹر والے ٹیلوں کے نظر آنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ میں ان سے کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک خیال آیا کہ انہی ٹیلوں میں کسی جگہ بیٹھ کر دن کی روشنی کے نکلنے کا انتظار کروں۔ دن کی روشنی میں مجھے راستہ معلوم ہو جائے گا۔ دھماکے کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کی شدید سے شدید زد سے بھی دور ہو چکا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ مجھے رکنا نہیں چاہئے۔ چلتے رہنا چاہئے۔ میں نے صبح کے ستارے کو اپنا راہ نما بنایا اور اس کی سمت ٹیلوں میں چلنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دھماکہ ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے چلنا بند کر دیا اور ایک ایسے ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا جہاں سے مجھے دور تک صحرا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ میرا رخ ایٹمی سنٹر کی جانب ہی تھا۔

میری نظر رات کے اندھیرے میں دور سیاہ دھبوں پر لگی ہوئی تھیں جو کسی وقت اندھیرے میں غائب ہو جاتے تھے اور کسی وقت نظر آنے لگتے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظریں جما دیں۔ اب اس علاقے میں تباہی مچنے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ خیال

آیا کہ کہیں بم کسی نے ناکارہ نہ کر دیئے ہوں۔ یا کسی فنی خرابی کی وجہ سے بلاسٹ ہی نہ ہوں۔ جب دس سیکنڈ باقی رہ گئے تو میں صحرا کے اندھیرے میں دور ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔ میں منہ میں الٹی گنتی کر رہا تھا۔ جب دس سیکنڈ بھی پورے ہو گئے تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اپنا سانس روک لیا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ دھماکہ نہ ہو۔ ہمارے ماسٹر سپائی گل خان نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اگر ان بموں کے فیوز کسی نے ناکارہ نہ کر دیئے تو یہ ٹھیک وقت پر قیامت خیز دھماکے سے پھٹ جائیں گے۔ اور گل خان ہائی ایکسپلوسیوز کا ماہر تھا۔ اس سے پہلے اس کے اس قسم کے بموں سے میں دوار کا فورٹ میں بھارتی فوج کا گولہ بارود اور فوجی ساز و سامان کا ذخیرہ تباہ کر چکا تھا۔ اور ایک بھارتی فوجی اسلحہ کی ٹرین بھی اڑائی تھی۔ جو جموں جا رہی تھی اور جس میں لدا ہوا اسلحہ کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا تھا۔ بم ضرور بلاسٹ ہوں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جنوب کی جانب آسمان ایک دم روشن ہو گیا۔ یہ روشنی ایسی تھی جیسے بغیر آواز کے بجلی چمکی ہو۔ اس کے ساتھ ہی زمین ہلنے لگی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اس کے بعد مجھے ایسا دھماکہ سنائی دیا جیسے کوئی مال گاڑی انجن سمیت فل سپیڈ سے کڑکڑاتی ہوئی میرے اوپر سے گزر گئی ہو۔ زمین ہل رہی تھی۔ دور صحرا میں روشنی بار بار چمک رہی تھی اور دھماکوں کی آوازیں دو دو سیکنڈوں کے وقفے سے آ رہی تھیں۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میرے لگائے ہوئے بموں نے اپنا کام کر دیا تھا پہلے روشنی چمکی تھی اب دور آسمان پر سرخ روشنی پھیل گئی۔ مجھے شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے نظر آنے لگے۔ مجھے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ایٹمی سنٹر کے دھماکوں کی شدت کتنی ہے۔ آسمان کا کنارا اس قدر سرخ ہو رہا تھا جیسے اس کے نیچے بہت بڑا جوالا مکھی پھٹ پڑا ہو۔ اب میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔

میں اٹھا اور مشرق کی سمت تیز تیز چلنے لگا۔ صبح کا ستارہ پچھلے پہر کے نیلے نور میں بھڑک رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ جو روشنیاں مجھے پہلے دکھائی دی تھیں وہ کہاں چلی گئی ہیں میرے چلتے چلتے آسمان پر صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ پھر مشرق کی جانب سے سورج کا سرخ تھال

نمودار ہوا۔ میں چلتا گیا۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اوپر آتا ہوا صاف معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جیسے اوپر آتا جاتا ہے ہمیں اس کی حرکت نظر آنی بند ہو جاتی ہے پھر ہم دھوپ کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سورج آہستہ آہستہ مشرق سے مغرب کی طرف جا رہا ہے۔ اوڈ اگر حقیقت کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو سورج اپنی جگہ پر ہی موجود رہتا ہے۔ ہماری زمین اس کی جانب رخ کر کے مغرب سے مشرق کی طرف گھوم رہی ہوتی ہے۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں۔ ایک وہ جو سورج کے گرد گھومنے سے ماہ وسال اور موسم بدلتے ہیں اور اپنے محور کے گرد گھومنے سے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ فزیکل سائنس کی باتیں ہیں جتنی مجھے معلوم تھیں میں نے آپ کو بتا دی ہیں۔ اس کے آگے اگر آپ کو جاننے کی خواہش ہو تو آپ کتابیں پڑھیں۔ یہ میں اپنی داستان بیان کرتے ہوئے آپ کو بتا رہا ہوں اس وقت جب میں صحرا میں چلا جا رہا تھا اور سورج طلوع ہو رہا تھا تو اس وقت میں یہ بالکل نہیں سوچ رہا تھا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے یا ہماری زمین اس کے آگے گھوم رہی ہے۔ اس وقت تو میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ میں ٹھیک رخ پر بھی جا رہا ہوں یا نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ دھماکے کے بعد اس سارے صوبے کی پولیس اور خفیہ سروس ہنگامی حالت کے تحت الرٹ ہو گئی ہو گی سارے علاقے کو پولیس نے اور بہت ممکن ہے بھارتی فوج نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو اور جگہ جگہ ناکہ بندی کر کے چیکنگ شروع ہو گئی ہو۔

میں اگرچہ بھارتی سکھ کے بھیس میں تھا اور میں نے ایٹمی سنٹر کی تمام نشانیاں ضائع کر دی تھیں لیکن اس کے باوجود اگر میں پولیس یا فوج کے نرغے میں آگیا تو مجھ سے پوری پوچھ گچھ کی جائے گی کہ میں کون ہوں اور اس وقت اکیلا اس طرف کیا کر رہا تھا۔ بہر حال میں کوئی عام قسم کا آدمی نہیں تھا اعلیٰ ترین تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ ہر قسم کے حالات سے نمٹنا میری ٹریننگ میں شامل تھا۔ اب مجھے چلتے چلتے تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ ریت بھی گہری ہو گئی تھی۔ میرے جوتے ریت میں گھسنے لگے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ سورج کی روشنی میں بھی مجھے دور دور تک کسی آبادی یا بجلی کے کھمبوں کا نام ونشان تک

دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی خطرہ تھا کہ میں کہیں صحرا میں بھٹک تو نہیں گیا؟

ریت کے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب ریت کے بڑے بڑے ٹیبے آ رہے تھے۔ میں نے ایک ٹیبے کے اوپر چڑھ کر دور نگاہ ڈالی۔ کچھ فاصلے پر مجھے ایک انسان دکھائی دیا جو اونٹ کی مہار تھامے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ میں آبادی سے دور نہیں ہوں۔ میں نے اس آدمی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں آگے سے ہو کر جا رہا تھا۔ دو تین ٹیبے عبور کرنے کے بعد میں اس جگہ آکر کھڑا ہو گیا جہاں سے شتر سوار نے گزرنا تھا۔

اونٹ والا قریب ہو رہا تھا۔ اس نے راجستھانی دیہاتی آدمیوں کی طرح سر پر بڑا سا پگڑ باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں لمبی چھڑی تھی۔ وہ اونٹ کی مہار تھامے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ جب میرے قریب آیا تو خود ہی رک گیا اور میری طرف دیکھ کر اس نے راجستھانی ہندوستانی میں مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس گاؤں میں جانا ہے۔ میں اس کی زبان یہاں نہیں لکھوں گا۔ بلکہ جو کچھ اس نے کہا تھا اسے سادہ اردو میں لکھوں گا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج مجھے ریواڑی جانا ہے۔ ادھر تھل میں ایک سنگی ساتھی سے ملنے آیا تھا۔ راستہ بھول گیا ہوں"

اونٹ والا مجھے اپنی چمکیلی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ریواڑی تو اس جانب ہے ماراج۔ چل میں تمہیں لئے چلتا ہوں۔ میں بھی ریواڑی ہی جا رہا ہوں۔ جانور کے اوپر بیٹھ جاؤ۔"

اونٹ پر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں لدی ہوئی تھیں۔ شتر سوار نے مجھے بڑی مشکل سے اونٹ کے اوپر چڑھا کر بٹھا دیا۔ اونٹ اوپر نیچے ہوتا' مجھے جھکولے دیتا چل پڑا۔ مجھے خیال آگیا کہ ریواڑی تو کافی دور ہے۔ راج گڑھ سے میں ٹرین میں وہاں جایا کرتا تھا اور دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ یہ اونٹ والا کیسے وہاں پہنچے گا اور کب پہنچے گا۔ کہیں اس نے مجھے کسی اور جگہ کا نام تو نہیں بتا دیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"ماراج جی! ریواڑی ہم کب پہنچیں گے؟"

اونٹ والا دیہاتی اپنی بولی میں بولا۔

"آج سارا دن چلیں گے۔ رات جھونجھانی میں گزاریں گے۔ دوسرے دن چلیں گے دوسری رات ڈیرو گڑھ میں آئے گی۔ تیسرے دن پہنچیں گے ریواڑی رات کو۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں اتنا لمبا سفر اونٹ پر طے نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی جن جگہوں کے اس نے نام لئے تھے۔ وہاں پولیس کی ناکہ بندی ضرور ہو گی۔ میں کسی مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"ماراج! تم مجھے جھونجھانی پہنچا دو۔ وہاں سے میں کسی لاری میں بیٹھ کر ریواڑی چلا جاؤں گا"

"جیسے تمہاری مرضی ماراج!"

اونٹ والا خاموش ہو گیا۔ اونٹ اپنی ست رفتار کے ساتھ صحرا میں چلتا گیا۔ سورج نکل آنے کی وجہ سے گرمی ہو گئی تھی۔ میری سکھوں والی پگڑی اور ڈاڑھی کی وجہ سے مجھے زیادہ گرمی لگنے لگی تھی۔ مگر مجھے یہ تکلیف برداشت کرنی ہی تھی۔ کیونکہ اصل میں میں صحرا میں بھٹک گیا تھا اور اب میرا جھونجھانی پہنچنا ضروری تھا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ ڈیرو سے ریواڑی تک ریل گاڑی جاتی ہے اور جھونجھانی سے مجھے ڈیرو تک کے لئے کوئی نہ کوئی لاری مل سکتی تھی۔ راستے میں ایک جگہ درختوں کا ایک جھنڈ آیا۔ یہ کیکر کی قسم کے درخت تھے۔ یہاں اونٹ والے نے اونٹ کو بٹھا دیا۔ میں اتر پڑا۔ یقین کریں میں کمانڈو ٹریننگ کے بعد بڑا سخت جان ہو گیا ہوا تھا مگر اونٹ کی سواری نے میرے جسم کے سارے پیچ ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ یہاں ریت میں ایک چھوٹا سا چشمہ بھی بہہ رہا تھا۔ اونٹ والے نے پوٹلی کھولی۔ اس میں گڑ اور مکئی کی روٹیاں تھیں۔ اس نے ایک روٹی اور گڑ مجھے بھی دیا۔ اس روٹی کا بہت مزا آیا۔

یہاں ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح شام ہونے کے کچھ دیر بعد جھونجھانی پہنچ گئے۔ میں نے اونٹ والے کا شکریہ ادا کیا۔ میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے اسے دس روپے دینے چاہے مگر اس نیک دل انسان نے نہ

لئے۔ جھونجھانی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ بجلی موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ رات کو وہاں سے کوئی لاری ڈیرو گڑھ نہیں جاتی۔ صبح ملے گی۔ میں نے سوچا کہ لاری اڈے پر ہی رات بسر کرنی چاہئے۔ وہاں آیا تو کئی دوسرے مسافر بھی وہاں پڑے تھے۔ میں نے اچھی طرح سے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہاں مجھے پولیس کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ لوگوں کو رام گڑھ کے ایٹمی سنٹر کے دھماکے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ رات کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ صبح کے وقت ایک لاری پیچھے کسی شہر سے آئی۔ اس کے ڈرائیور اور سواریوں نے بتایا کہ رام گڑھ میں بم پھٹا ہے۔ ایک سرکاری دفتر اڑ گیا ہے۔ یہ خبر سن کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کوئی کہتا یہ کشمیری مجاہدین کا کام ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ دھماکہ کانگریس کی مخالف جماعت نے کرایا ہے۔ ایک مسافر بولا۔

"ماراج اب تو ہر جگہ دھماکے ہوتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کون دھماکہ کراتا ہے۔ کون نہیں کراتا۔"

ڈرائیور کرسی پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"ماراج جی! یہ کون سا سرکاری دفتر تھا جہاں بم پھٹا ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"معلوم نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی سرکاری دفتر تھا۔ بھگوان جانے کیسا بم تھا۔ کہتے ہیں دو پہاڑیاں بھی ساتھ ہی اڑ گئی ہیں۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے سچے بادشاہ! تو اپنی کرپا کرنا۔"

پھر میں نے مزید سراغ رسانی کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

"ماراج ہماری پولیس کا وہاں کوئی آدمی نہیں تھا؟ پولیس کو ہماری سرکار نے کس لئے بھرتی کیا ہوا ہے؟"

ڈرائیور سگریٹ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"سردار جی! پولیس تو اب خبردار ہوئی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ اب کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ پر میں تو کہتا ہوں کہ یہ ضرور کشمیر کے کمانڈو کا کام ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ جھونجھانی سے آگے ڈیرو گڑھ تک بھی راستے میں پولیس کی چیک پوسٹیں ضرور ہوں گی۔ مگر میرا جانا ضروری تھا۔ اس خطرے سے تو مجھے ہر حالت میں گزرنا ہی تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد لاری ڈیرو گڑھ کی طرف جارہی تھی۔ وہاں سے کسی دوسرے شہر کی طرف جانا بھی اتنا ہی خطرناک تھا۔ یہ سارا راستہ ریتلا تھا۔ کہیں کہیں کوئی درخت نظر آجاتا تھا۔ گرمی بھی کافی تھی۔ لاری کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد ڈیرو گڑھ پہنچی۔ راستے میں پولیس کی کوئی چیک پوسٹ نہیں تھی۔ ڈیرو گڑھ بھی کافی بڑا قصبہ تھا اور ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ یہاں سٹیشن کے باہر اکثر لوگوں کو رام گڑھ کے دھماکے کے بارے میں باتیں کرتے پایا۔ لوگ خوف زدہ تھے۔ اس سے پہلے فوجی اسلحہ کی ٹرین اور دوارکا کا فوجی اسلحے کا قلعہ دھماکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ لوگ اس قسم کے خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ صوبہ گجرات سے اب کشمیری کمانڈوز نے راجستھان کا رخ کر لیا ہے یہاں بھی اب کسی جگہ دھماکے ہو سکتے ہیں۔

"ڈیرو گڑھ سے ٹرین سیدھی ریواڑی جاتی تھی جہاں سے مجھے دلی کی ٹرین پکڑنی تھی۔ میں ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم کے گیٹ کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہاں باوردی پولیس کے کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ وہ ایک آدمی سے اٹیچی کیس کو کھلوا کر چیک کر رہے تھے۔ میں ٹی ٹی کو ٹکٹ دے کر اندر جانے لگا تو پولیس نے مجھے روک لیا۔ ان میں ایک تھانیدار بھی تھا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔

"جسونت سنگھ سوڈھی"

میں نے اپنا نام بدلنے کی اس لئے ضرورت محسوس نہ کی تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ ایٹمی مرکز کی ساری ایڈمنسٹریشن اس کے سارے دفاتر اور دفاتر کا ریکارڈ خوفناک دھماکوں کی

آگ میں جل کر راکھ ہو چکا ہو گا۔ میرا نام ایٹمی سنٹر کی انتظامیہ کے رجسٹروں میں ہی درج تھا۔ تھانیدار راجستھان کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور دوسرا سوال کیا۔

"کہاں سے آرہے ہو سردار جی؟"

میں نے اس قسم کے سوالوں کے جواب پہلے ہی سے ذہن میں تیار کر رکھے تھے۔ میں نے کہا۔

"جھونجھانی سے دو میل دور ایک گوردوارہ استھان ہے۔ اس کی یاترا کو گیا تھا۔ اب واپس دلی جا رہا ہوں۔ دلی میں گردوارہ گرو تیغ بہادر میں گرنتھی بھائی کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہاں سے واپس اپنے شہر امرتسر چلا جاؤں گا۔"

میں نے ایک ہی بار ان تمام سوالوں کے جواب اسے دے دیئے تھے جو میرے خیال میں وہ مجھ سے اس کے بعد پوچھنے والا تھا۔ تھانیدار نے ایک سوال کر ہی دیا۔

"امرتسر میں کیا کرتے ہو؟"

"کوتوالی کے پاس رام گڑھیا ہائی سکول ہے وہاں حساب کا ٹیچر ہوں۔ میرے ماتا پتا بھی کوتوالی کے پاس ہی رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ"

یہاں سے مجھے رات کے وقت دلی کی گاڑی ملی۔ اس گاڑی میں کچھ مسافر راج گڑھ کے بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ رام گڑھ کا پورا قصبہ اور اردگرد کا سارا علاقہ دھماکے کے بعد اڑ گیا ہے۔

"سنا ہے وہاں ایٹم بم بن رہا تھا۔ بم وہاں سے کافی دور راج گڑھ میں تھے۔ ہمارے مکان کی چھت اڑ گئی۔ آدھا راج گڑھ تباہ ہو گیا ہے۔ ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے ہیں۔"

ایک مسافر نے کہا۔

"ایٹم بم چل گیا ہو گا۔"

"ہاں جی۔ آدھی رات کے وقت شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے دیکھے تھے۔ اتنی گرمی ہو

گئی تھی کہ ہم نے تالاب میں چھلانگیں لگادیں ۔ راج گڑھ کے لوگ گرمی میں جھلس کر بھی مرگئے۔ کوئلہ ہو گئے۔"

اس میں کچھ نہ کچھ مبالغہ ضرور تھا۔ گرمی سے مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ایٹمی مرکز میں معمولی سی مقدار میں افزودہ پلوٹونیم موجود ہو جس نے پھٹ کر گرمی کی شدت میں اضافہ کر دیا ہو۔ ایسی بات ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن ایسا ضرور ہوا تھا کہ اس ایٹمی مرکز کا ایٹمی پلانٹ' ریسرچ لیبارٹری اور سارا کچا یورینیم اور پلوٹونیم شعلے بن کر اڑ گیا تھا۔ اس واقعے سے بھارتی حکومت جو ایٹمی میزائل اور پلوٹونیم وار ہیڈ اسلحہ کی ابتدائی تیاریاں کر رہی تھی وہ پانچ سے دس سال تک پیچھے جا پڑی تھیں اور ہم یہی چاہتے تھے۔

رات کے پچھلے پہر ٹرین نے مجھے ریواڑی پہنچایا۔ یہاں ہر کسی کی زبان پر ایٹمی دھماکے کا ذکر تھا اور لوگوں میں کافی خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں کو میں نے یہ کہتے بھی سنا کہ بھارت نے جو ایٹم بم بنایا ہوا تھا وہ پھٹ گیا ہے اور سارا راجستھان تباہ ہو گیا ہے۔ ریواڑی کے ریلوے سٹیشن پر پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی اور مسافروں کے سامان کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ دلی والی ٹرین کوئی ایک گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑے ایک خالی ڈبے میں جا کر لیٹ گیا۔ ظاہر یہ کیا کہ مسافر ہوں اور ڈبہ خالی دیکھ کر وہاں سونے آگیا ہوں ۔ تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی کہ ڈبے کو دھچکا لگا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ ڈبے کے ساتھ ایک شنٹ کرتا انجن آکر لگ گیا تھا اور اب اسے کھینچ کر پلیٹ فارم سے لے جانے والا تھا۔ میں جلدی سے اتر کر سامنے پلیٹ فارم کے لوہے کے ستون کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ قریب ہی چھوٹا سا کھوکھا تھا جہاں دلی اور جے پور میں چھپنے والے ہندی اردو کے اخبار پڑے تھے۔ میں اردو کا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس پر رام گڑھ کے دھماکے کی خبر جلی حروف سے چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اخبار خرید لیا اور ایک طرف بیٹھ کر ساری خبر پڑھ ڈالی۔ اس خبر سے صاف لگتا تھا کہ گورنمنٹ نے اصلی نقصان ظاہر نہیں ہونے دیا۔ خبر میں صرف یہی بتایا گیا تھا کہ رام گڑھ کے معدنیات کے ریسرچ سنٹر میں کسی کشمیری کمانڈو

نے بم رکھ دیا تھا جو پھٹ گیا جس سے عمارت کو شدید نقصان پہنچا اور آگ لگ گئی۔ دو آدمی ہلاک ہو گئے اور چار زخمی ہوئے ہیں۔

یہ سراسر جھوٹی خبر تھی۔ بھارتی حکومت نے اصل خبر کو چھپا لیا تھا۔ حکومت اصلی خبر شائع کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہو گئی تھی اور خود میں نے صحرا میں رات کو ایٹمی سنٹر کے شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے دیکھے تھے۔ میں دوسرے روز دلی پہنچ گیا۔ یہاں بھی اخباروں میں ایٹمی سنٹر کی تباہی کی خبریں چھپی ہوئی تھیں ۔ میں سٹیشن سے سیدھا بستی نظام الدین" پہنچا۔ وہاں درگا شریف کے گیٹ کے قریب پبلک ٹیلی فون بوتھ سے گل خان کو فون کیا۔ اسے بتایا کہ میں آگیا ہوں ۔ گل خان نے کوڈ الفاظ میں کہا۔

"تم دسترخوان بچھاؤ۔ میں کھانا لے کر آرہا ہوں"

اس کا مطلب تھا تم پرانے گھر پہنچو میں آرہا ہوں۔ میں مغل شہزادے کی خانقاہ کی دیوار کے قریب سے ہوتا ہوا پرانے مکان پر آگیا۔ مغل شہزادے کی قبر کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے پھر خیال آیا کہ مغل شہزادے کی روح نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ مجھ پر عنقریب کوئی آفت نازل ہونے والی ہے مجھے ہوشیار رہنا چاہئے۔ میں ایک بار پھر سوچنے لگا کہ یہ آفت کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک آفت سے تو میں کامیاب و کامران نکل کر آرہا تھا۔ میرا کمانڈو مشن بڑی کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ مجھے مکان میں بیٹھے تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ گل خان اپنے ساتھ پروفیسر جمشید کو لے کر آگیا۔ آپ لوگوں کو میں بتا چکا ہوں کہ یہ دونوں انڈین نیشنل تھے۔ یعنی بھارت کے شہری تھے۔ مسلمان تھے۔ اور اسلام اور پاکستان کے لئے دل میں محبت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو کشمیر اور اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ یہ نہ تو پاکستان کے جاسوس تھے اور نہ انہیں کسی اور ملک نے انڈیا میں جاسوسی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ صرف پاکستان اور اسلام کی سربلندی اور استحکام اور کشمیر کی آزادی کی خاطر اپنے طریقے سے جہاد کر رہے تھے۔ یہ دلی میں میرے ماسٹر سپائی تھے اور ان کی نگرانی اور ہدایات کے تحت ہی میرے

کمانڈو مشن ترتیب پاتے تھے۔

پروفیسر جمشید حسب عادت جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کمانڈو مشن کی کامیابی پر ہماری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔"

گل خان نے بھی مجھے مبارک باد دی اور کہا۔

"بھارت سرکار نے حقیقت کو چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مگر سب لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ راجستھان میں رام گڑھ کے مقام پر جو زیر زمین ایٹمی ریسرچ سنٹر قائم تھا وہ بالکل تباہ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اصل تباہی کتنی ہوئی ہے؟ کیا وہاں تابکاری بھی پھیلی ہے؟"

یہ سوال میں نے پروفیسر جمشید سے کیا تھا جو نیوکلر فزکس میں بی اے کر چکا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ابھی پلوٹونیم اور یورنیم کچی حالت میں تھی۔ اس کی پروسیسنگ ہی ہو رہی تھی۔ اگر پلوٹونیم کی معمولی سی مقدار بھی افزودہ ہو چکی ہوتی تو جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا آس پاس کا تین میل کا علاقہ جل کر بھسم ہو گیا ہوتا اور ایٹمی تابکاری کا اثر ریواڑی اور جے پور تک پھیل سکتا تھا۔"

گل خان نے کہا۔

"لیکن ایٹمی ریسرچ سنٹر کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ بھارت سرکار کا پاکستان کے خلاف ایٹمی جارحیت کا پروگرام کم سے کم پانچ سال پیچھے پڑ گیا ہے۔"

پروفیسر جمشید آنکھوں پر چشمہ لگاتے ہوئے بولا۔

"میرے اندازے کے مطابق کم از کم سات سال کے لئے یہ پروگرام ضرور پیچھے پڑ گیا ہے۔"

لیکن بھارت اس پروگرام سے دستبردار نہیں ہو گا۔ اس کے پاس اور کئی ایٹمی ریسرچ سنٹروں کے پروگرام ہیں۔ اب اس کی ساری توجہ میری اطلاع کے مطابق حیدر آباد دکن کے دفاعی تحقیقاتی ادارے یعنی ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ لیبارٹری ڈی آر ڈی ایل پر مرکوز ہو جائے گی اس سنٹر نے پہلے ہی ایٹمی ریسرچ میں بڑے کامیاب نتائج دکھائے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق اس ادارے کو بھارت کے حساس ترین دفاعی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ بھارتی دور مار میزائل کے اس ادارے کا بانی ایک مسلمان سائنس دان ہے جس کا نام عبدالکلام ہے۔"

گل خان نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا اگلا ٹارگٹ حیدر آباد دکن کا یہ دور مار میزائلوں کا دفاعی ریسرچ سنٹر ہو گا۔ مگر اس سے پہلے ہمیں ایک اور مرحلہ درپیش ہے۔"

"وہ کیا ہے؟ مجھے بتائیں" میں نے پوچھا۔

گل خان کہنے لگا۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو پرائم منسٹر نے خاص اپنی نگرانی میں ایک خفیہ ادارہ بنایا ہے جس کا پورا نام بظاہر ریسرچ اینڈ اینلسنگ ونگ رکھا گیا ہے۔ اس کا مختصر نام را RAW ہے۔ یہ ادارہ بیرونی ممالک کے بارے میں سرکار کو خفیہ رپورٹیں مہیا کرتا ہے۔ اب اس ادارے نے پاکستان میں انتشار اور افراتفری پھیلانے کے لئے تخریب کاروں کو پاکستان بھیجنے کا پروگرام وضع کیا ہے۔ پہلے یہ بھارتی تخریب کار انڈین فوج کے ریٹائرڈ کمانڈوز میں سے لئے جاتے تھے۔ لیکن اب باقاعدہ دہشت گرد بھرتی کر کے ان کو تربیت دینے کے لئے دلی سے کچھ فاصلے پر ایک خفیہ تربیتی کیمپ قائم کیا گیا ہے۔ تمہیں اس تربیتی سنٹر میں بطور ایک دہشت گرد کے بھرتی ہو کر وہاں سے ساری معلومات حاصل کرنی ہیں کہ یہ بھارتی دہشت گرد ٹریننگ پوری کرنے کے بعد پاکستان میں کہاں جا کر قیام کرتے ہیں اور وہاں ان کے کون کون سے بھارتی جاسوس ہیں تاکہ حکومت پاکستان کو ان تخریب کاروں کی پوری رپورٹیں مہیا کر کے ان کا خاتمہ کیا جا سکے۔"

یہ مشن مجاہدانہ تھا۔ مجھے اس لئے بھی پسند آیا کہ اس کا براہ راست تعلق میرے وطن پاکستان کی سلامتی اور استحکام سے تھا جس کی خاطر میں ہر قربانی دے سکتا تھا۔ میں نے گل خان سے پوچھا۔

"تخریب کاری کے اس سنٹر میں بھرتی ہونے کی شرائط کیا ہیں اور میں کس طریقے سے اس سنٹر میں داخلہ لے سکوں گا۔"

گل خان نے کہا۔

"یہ ساری باتیں تمہیں سمجھا دی جائیں گی۔ سب سے پہلے تمہیں را کے ماتحت چلنے والے تخریب کاری کے اس ٹریننگ سنٹر کی نشان دہی کرائی جائے گی۔"

پروفیسر جمشید بولا۔

"تمہیں جتنی جلدی ہو سکے سکھوں والا حلیہ اب بدل دینا ہو گا۔ یہ ڈاڑھی مونچھیں اور سر کے بال منڈوا دو۔ کیونکہ راج گڑھ کے جن کوارٹروں میں تم رہتے تھے ان کوارٹروں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ ایٹمی سنٹر کے دھماکے نے بعض کوٹھیوں اور کوارٹروں کی چھتیں اڑا دی تھیں اور کچھ مکان زمین بوس بھی ہو گئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ایٹمی سنٹر کا چیف ارجن سنگھ سوڈھی جس نے درگاوتی کی سفارش پر تمہیں ایٹمی سنٹر میں ملازم رکھا تھا وہ زندہ ہے اور اس وقت دلی میں موجود ہے۔ وہ تمہیں اس حلیے میں پہچان لے گا۔ چونکہ دھماکے کے بعد تم کالونی سے غائب ہو گئے ہو اس لئے تم پر شک کیا جاسکتا ہے کہ یہ کام تم نے ہی کیا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"میں کل شہر جا کر یہ ڈاڑھی اور سر کے بال منڈوا دوں گا سر کے آدھے بال اور ڈاڑھی میں یہیں سے قینچی سے کاٹ کر جاؤں گا تاکہ کسی کو یہ شک نہ پڑے کہ میں سکھ ہو کر سر کے بال کیوں منڈوا رہا ہوں۔"

گل خان کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم ہمارے جانے کے بعد ابھی کر ڈالو۔ تمہیں شہر جانے کی

ضرورت نہیں۔ اسی بستی کے باہر نائی مل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آج ہی بالوں کا صفایا کراتا ہوں۔"

گل خان اور پروفیسر دوسرے دن صبح کے وقت آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے پگڑی وغیرہ اتار کر پلاسٹک کے لفافے میں کرپان کڑے کے ساتھ ہی بند کر دی اور قینچی سے اپنے سر کے لمبے بال آدھے سے زیادہ کاٹ ڈالے۔ اس کے بعد ڈاڑھی مونچھیں بھی جتنی تراش سکتا تھا تراش ڈالیں۔ اب میرا حلیہ سکھوں والا نہیں تھا۔ میں اپنے گردن تک آئے ہوئے بالوں اور خشخشی ڈاڑھی کے ساتھ کوئی شاعر یا قوال لگتا تھا۔ میں نے چیزوں کو ایک طرف سنبھال کر رکھا اور مکان کے دروازے کو تالا لگا کر بستی کی طرف چلا۔ بستی نظام الدین اولیاؒ کے آس پاس ابھی اتنی زیادہ آبادی نہیں ہوئی تھی اور نئی کالونیاں بھی اتنی نہیں بنی تھیں۔ سن 60ء تک یہاں کافی سکون تھا۔ میں بستی کے شمال کی جانب نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی دیہاتی حجام مجھے مل جائے گا جو عام طور پر کسی درخت کے نیچے تخت پوش یا کرسی ڈال کر لوگوں کی حجامتیں کرتے ہیں۔ مجھے ایک ایسا حجام نظر آگیا۔

بوڑھا آدمی تھا۔ پیپل کے درخت تلے شکستہ سی کرسی ڈال کر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ درخت کے ساتھ اس نے چھوٹا سا آئینہ کیل ٹھونک کر رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"بڑے میاں میری شیو بنا دو اور بال بھی چھوٹے کر دو۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جب میں بوڑھے حجام کو اس کی اجرت دے کر واپس اپنے مکان کی طرف چلا تو میں کلین شیو تھا۔ ڈاڑھی مونچھیں غائب تھیں۔ سر کے بال ایئر فورس کے کیڈٹوں کی طرح بہت چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ میرا پورا حلیہ بدل گیا تھا۔ اب میں اپنی اصل شکل میں واپس آچکا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں نے ایک چھوٹے سے ریستوران میں کھایا اور مکان میں آکر لیٹ گیا۔ میں شام تک مکان میں ہی رہا اور اپنے نئے مشن کے بارے میں غور کرتا رہا۔ مجھے اس اطلاع سے کافی تشویش ہو رہی تھی کہ را نے پاکستان میں اپنے تخریب کاروں کی ٹریننگ کے لئے باقاعدہ ٹریننگ سنٹر

بنا لیا ہے اور یہ لوگ پاکستان میں تخریب کاری کی باقاعدہ مہم شروع کرنے والے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ یہ تخریب کار تربیت حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں داخل ہوں انہیں ایک ایک کر کے جہنم میں پہنچا دوں اور میں نے یہ عہد کر لیا ان تخریب کاروں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔

سب سے دشوار مرحلہ اس ٹریننگ سنٹر میں داخل ہونے کا تھا۔ ظاہر ہے وہاں داخل ہونے والے کا پورا ریکارڈ چیک کیا جاتا ہو گا۔ یہ بات خاص طور پر دیکھی جاتی ہو گی کہ یہ امیدوار انڈین نیشنل ہو اور اس کا جھکاؤ پاکستان کی طرف نہ ہو۔ بلکہ کٹر قسم کا متعصب ہندو ہو۔ گل خان اور پروفیسر جمشید نے مجھے امید دلائی تھی کہ وہ یہاں میرے داخلے کا انتظام کر دیں گے۔ مجھے پوری توقع تھی کہ چونکہ ان لوگوں کا اثر و رسوخ ہر طبقے میں ہے اس لئے مجھے تخریب کاری کے سنٹر میں داخلہ مل جائے گا۔ میں نے گل خان اور پروفیسر میں سے کسی کو مغل شہزادے کی روح کی اس پیش گوئی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ مجھ پر عنقریب ایک آفت نازل ہونے والی ہے اور چندریکا کی بدروح کا بھی ان سے ذکر نہیں کیا تھا جو اب میری دشمن بن چکی تھی اور کسی بھی مرحلے پر مجھ پر حملہ آور ہو سکتی تھی۔ یہ باتیں انہیں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

دوسرے دن گل خان اور پروفیسر جمشید اپنے وقت پر مکان پر پہنچ گئے۔ وہ ناشتہ اور چائے کی تھرمس اپنے ساتھ لائے تھے۔ ناشتے کے بعد اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو گئی۔ پروفیسر جمشید جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تخریب کاری کا یہ ٹریننگ سنٹر یہاں سے شمال کی جانب پندرہ میل کے فاصلے پر ایک پرانے قلعے میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کو خفیہ رکھنے کی خاطر باہر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا دیا گیا ہے جس پر راشٹریہ سیوک سنگ لکھا ہوا ہے ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ یہاں ہنگامی حالات میں شہر میں امن بحال رکھنے اور پبلک کی خدمت کے واسطے رضا کاروں کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن پروفیسر اس تربیتی سنٹر میں بھرتی ہونے کی تو بڑی کڑی شرائط ہوں گی۔ میں وہاں کیسے بھرتی ہو سکوں گا"

اس پر گل خان مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یہ کام تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں اس سنٹر میں کیسے بھرتی کرایا جائے گا تمہیں صرف ایک کہانی گھڑنی ہو گی اور اسے اچھی طرح سے یاد کرنا ہو گا۔ کہانی یہ ہو گی کہ تم برہمن ہندو ہو۔ تمہارے ماتا پتا فسادات کے وقت پاکستان میں مارے گئے تھے۔ تم پاکستان سے اپنے ماتا پتا کا بدلہ لینا چاہتے ہو جس کی تم نے بچپن میں ہی قسم کھائی تھی۔ دلی میں ایک کانگریسی مسلمان ہے جو بدبخت مسلمان ہو کر بھی پاکستان کے خلاف ہے اور راشٹریہ سیوک سنگ کا بڑا چہیتا ہے ہم نے اس پر یہ ظاہر کیا ہوا ہے کہ ہم بھی نیشنلسٹ مسلمان ہیں اور کانگریس کو پسند کرتے ہیں اور پاکستان کے خلاف ہیں اس قسم کے آدمی سے دوستی کئے بغیر ہم پاکستان کے خلاف ان کے ناپاک عزائم سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ہم نے اس کٹر کانگریسی مسلمان کو اپنا ہمدرد بنا لیا ہوا ہے اس آدمی کا نام رحیم بخش ہے۔ تمہیں تخریب کاری کے تربیتی سنٹر میں بھرتی کروانے کے لئے ہم اس کانگریسی کی مدد لیں گے۔ پہلے ہم تمہیں اس سے ملائیں گے۔ تم اس کے آگے جو باتیں کرو گے وہ ہم تمہیں بتا دیں گے۔ ہمیں یہ بھی خبر مل چکی ہے کہ اس آدمی رحیم بخش کے کانگریسی تخریب کاری ٹریننگ سنٹر کے ڈائریکٹر لکشمی دیال سے گہرے تعلقات ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں مزید کچھ معلومات حاصل کر لینے دو۔ جیسے ہی ہماری معلومات مکمل ہو گئیں ہم تمہیں کانگریسی مسلمان کے پاس لے چلیں گے۔"

اس دن سے میرے نئے کمانڈو مشن پر کام شروع ہو گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں گل خان کی ہدایت کے مطابق مکان میں ہی بند رہا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے ہندی میں لکھی ہوئی گیتا کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ہندی زبان میں روانی سے پڑھ بھی لیتا تھا اور لکھ بھی لیتا تھا۔ گجرات میں میناکشی کے ہاں رہ کر میں نے گجراتی زبان بھی بولنی سیکھ لی تھی۔ ہندو دیومالا اور سنسکرت کا تفصیل

سے مطالعہ میں کشمیر کے بزرگ صوفی کی مدد سے کر چکا تھا۔ یہ باتیں میرے کمانڈو کیریئر کے لئے بہت ضروری تھیں۔ کیونکہ میں دشمن ملک میں تھا اور دشمن ملک میں رہتے ہوئے اور وہاں ان کے پاکستان دشمن عزائم کو تباہ کرنے کے لئے دشمن کی زبان اور اس کے کلچر کا جاننا بہت ضروری تھا۔ گل خان نے مجھے گیتا کی ایک چھوٹی سی کتاب بھجوا دی تھی۔ میں رات کے وقت موم بتی کی روشنی میں اسے کہیں کہیں سے پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس مکان میں بتی نہیں تھی اور رات کے وقت میں موم بتی اس طرح روشن رکھ سکتا تھا کہ اس کی روشنی کھڑکیوں پر نہ پڑے۔

اس دوران گل خان اور پروفیسر جمشید کانگریسی مسلمان کے ساتھ اپنے مشن میں مصروف رہے۔ ایک ہفتے کے بعد گل خان اکیلا شام کے وقت میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ پرانے قلعے والے ٹریننگ سنٹر میں میرے داخلے کے لئے راہ ہموار کر دی گئی ہے۔

"کل دوپہر کے بعد تم میرے ساتھ کانگریسی مسلمان رحیم بخش کے ہاں چلو گے۔ تمہارے بارے میں میں نے انہیں یہی بتایا ہے کہ تمہارا نام مرلی پرشاد ہے۔ تمہارے ماتا پتا لاہور میں فسادات میں مارے گئے تھے۔ تم آزادی ملنے کے بعد اب تک بھارت کے مختلف شہروں میں دربدر پھرتے رہے ہو۔ دلی میں تمہاری مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ تم نے میرے آگے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں پاکستان سے اپنے ماتا پتا کی موت کا بدلہ لینا چاہتا ہوں اور آگے میں بات کر لوں گا۔"

کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہنے کے بعد گل خان اگلے روز دوپہر کے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے روز وہ ٹھیک وقت پر میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے لئے تنگ موہری کا ہندوؤں والا پاجامہ اور کھدر کا کرتہ' نہرو کٹ جیکٹ اور کھدر کی کانگریسی ٹائپ کی صدری بھی لایا تھا۔ یہ کپڑے پرانے ہو رہے تھے۔ نئے نہیں تھے۔ میں نے اسی وقت انہیں پہن لیا۔ اس مشن کی راہ میں جو سب سے بڑا خطرہ در پیش تھا میں نے اس کے بارے میں گل خان سے کہا۔

"وہاں میری میڈیکل چیک اپ تو ضرور ہو گی۔ اس صورت میں میں اپنے مسلمان

ہونے کو نہ چھپا سکوں گا۔ بہتر ہوتا کہ مجھے کٹڑ کانگریسی مسلمان کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا۔"

گل خان نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ کسی مسلمان کو خواہ وہ کتنا ہی کٹڑ کانگریسی کیوں نہ ہو بھرتی نہیں کرتے۔ یہ ان کا پہلا اصول ہے کہ تخریب کار ہندو ہی لیا جائے گا۔ وہ سکھ پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حقیقت میرے پیش نظر تھی۔ جس شخص کی سفارش پر تمہیں تخریب کاری کے تربیتی سنٹر میں بھرتی کرایا جا رہا ہے اس کا اس قدر اثر ورسوخ ہے کہ تمہارے میڈیکل چیک اپ کا مرحلہ ہی نہیں آئے گا۔ اس بارے میں میں نے پورا اطمینان کر لیا ہے۔"

"پھر میں تیار ہوں۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر کے بعد میں اور گل خان موٹر رکشا میں بیٹھے تھے اور رکشا دلی کے بازاروں میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کانگریسی مسلمان رحیم بخش کا مکان ہندوؤں کے محلے میں ایک مندر کے پہلو میں تھا۔ اس کے مکان کے باہر کانگریس کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اس محلے میں داخل ہوتے وقت گل خان نے بھی جیب سے گاندھی کیپ نکال کر پہن لی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔ گل خان نے اپنا نام بتایا اور کہا۔

"رحیم صاحب سے کہو کہ ہم ملنے آئے ہیں"

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ گل خان کا اصلی نام گل خان نہیں تھا اور پروفیسر جمشید کا بھی یہ نام نہیں تھا۔ میں نے ان کے فرضی نام لکھے ہیں۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کرسیاں اور صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دیواروں پر تمام کانگریسی لیڈروں کی تصویریں لگی تھیں۔ اتنے میں ایک پختہ عمر کا اکہرے بدن کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے سر پر گاندھی کیپ تھی۔ کھدر کا کانگریسی کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ شکل ہی سے یہ شخص بد دماغ اور متعصب قسم کا

ہندو لگتا تھا حالانکہ وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا تھا۔ میں نے گل خان کی ہدایت کے مطابق اٹھ کر ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ اس آدمی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گل خان نے بات شروع کر دی۔

"یہ ہے وہ نوجوان مرلی پرشاد جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ اس وقت بھارت ورش کو ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے جو پاکستان کے دل سے دشمن ہوں۔ اس کے ماتا پتا کو مسلمانوں نے مار دیا تھا۔ یہ ان کا بدلہ پاکستان سے لینا چاہتا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میں حیران ضرور ہوا کہ گل خان جو پاکستان کا شیدائی بلکہ فدائی ہے پاکستان کے خلاف کس قسم کی زہریلی باتیں کر رہا ہے۔ مگر یہ ایک خاص حکمت عملی کے ماتحت سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"مہاراج! میرے دل میں تو مسلمانوں کے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے ماتا پتا لاہور میں مسلمانوں کی لگائی ہوئی گوالمنڈی کی آگ میں جل مرے تھے میں جب تک اس کا بدلہ نہیں لے لوں گا میری آتما کو چین نہیں ملے گا۔ میری آتما اگلے جنم میں بھی بھٹکتی رہے گی۔"

کانگریسی مسلمان نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شانت رہو شانت رہو۔ تمہیں مسلمانوں سے بدلہ لینے کا پورا پورا موقع ملے گا۔ یہ بتاؤ تم بارہ برس تک کیا کرتے رہے کہاں کہاں رہے؟"

میں نے گھڑی ہوئی کہانی اس کے آگے بیان کر دی کہ میں آزادی کے وقت چھ سات برس کا تھا۔ بھارت میں آکر کان پور اپنے چچا کے پاس چلا گیا۔ اس نے کچھ دنوں کے بعد گھر سے نکال دیا۔ پھر میں بھارت کے شہروں میں دربدر پھرتا رہا۔ اجین میں ایک سادھو نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا اور مجھے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی۔ بس اسی طرح دربدری کرتا یہاں دلی آگیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ بھارت ماتا کو ایسے جوانوں کی ضرورت ہے جو پاکستان میں جا کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کے شہروں کے پل اڑائیں اور وہاں اگروادیوں والا کام کریں تو میں نے خان سے بات کی اور یہ مجھے آپ کے پاس لے

آئے۔

میرے بڑے سوبھاگ ہوں گے کہ آپ کی مدد سے مجھے بھارت ماتا کی سیوا کرنے اور مسلمانوں سے بدلہ لینے کا موقع مل جائے گا۔"

کانگریسی مسلمان نے گل خان سے کہا۔

"لڑکا نوجوان ہے اور اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف آگ بھی بھڑک رہی ہے۔ ہمیں اس وقت ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے اسے کل دن کے دس گیارہ بجے میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے سیوک سنگ کے ڈائریکٹر لکشمی دیال کے پاس لے چلوں گا۔ وہ بڑا دیکھ بھال کر جوان بھرتی کرتے ہیں۔ ان کا ریکارڈ بھی دیکھا جاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ تمہارا آدمی ہے اور میں اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف بھڑکتی آگ کو دیکھ رہا ہوں اس لئے میں آج شام لکشمی دیال سے مل کر ساری بات طے کر لوں گا۔ تم سمجھو کہ مرلی پرشاد بھرتی ہو گیا ہے۔"

گل خان نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اٹھ کر کانگریسی مسلمان کے پاؤں چھوئے۔ وہ بولا۔

"بس اب پاکستان کے مسلمانوں سے ایسا بدلہ لینا کہ لکشمی دیال خود تمہاری تعریف کرتا نظر آئے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بھگوان کی کرپا سے ایسا ہی ہو گا آپ نشچنت رہیں۔"

گل خان نے مجھے کہا۔

"مرلی پرشاد! تمہیں رحیم بھائی کے ذریعے مسلمانوں سے بدلہ چکانے کا سنہری موقع مل گیا ہے۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"

کانگریسی مسلمان رحیم بخش نے کہا۔

"ٹھیک ہے کل اسی وقت آجانا۔ اب جاؤ۔"

گل خان نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھا۔ کانگریسی مسلمان کے پاؤں چھو کر

نمسکار کہا اور باہر نکل گیا۔ ہمارا پروگرام وہاں سے اکٹھے نکلنے کا تھا۔ مگر حالات ایسے بن گئے کہ مجھے اکیلے ہی وہاں سے نکلنا پڑا۔ میں بازار میں آکر مکان سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ کھڑا ہو کر گل خان کا انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ بھی آگیا۔ میرے قریب آکر کہنے لگا۔

"کل تم اکیلے ہی یہاں آؤ گے۔ میں کل رات کو آؤں گا۔ اب تم مجھ سے الگ ہو جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔ میں دوسری طرف چل دیا۔ ایک جگہ سے موٹر رکشہ لیا اور واپس بستی نظام الدینؒ اولیا والے خالی مکان میں آگیا۔ مجھے صرف بدروح چندریکا کا دھڑکا لگا تھا۔ وہ میری کھلی دشمن بن چکی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ میرا مشن تباہ کر سکتی تھی بلکہ مجھے بھی پکڑوا سکتی تھی۔ مجھے اگر کوئی چیز اس کے خلاف طاقت دیتی تھی تو وہ اپنے خدا پر میرا یقین ایمان تھا۔ میرا ایمان تھا کہ خدا کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر خدا کو منظور نہ ہوا تو اس کا وار مجھ پر چلے گا اگر خدا کو منظور ہوا تو چندریکا ایسی ایک ہزار بدروحیں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

اگلے روز میں ساڑھے دس بجے دن کانگریسی مسلمان کے گھر کے باہر موجود تھا۔ میں نے دستک دی۔ اسی لڑکے نے آکر دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"اندر آجاؤ۔"

اس نے مجھے اسی کمرے میں بٹھا دیا اور بولا۔

"ابا ابھی آتے ہیں"

چند لمحوں کے بعد کانگریسی مسلمان رحیم بخش آگیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تیار تھا۔ کہنے لگا۔

"چلو آؤ۔ میرے ساتھ آؤ"

اس کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی تھی جو محلے سے باہر بازار میں ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے مجھے ساتھ بٹھایا اور گاڑی چل پڑی۔ وہ خود گاڑی چلا رہا تھا۔ سارا راستہ وہ

پاکستان کے لیڈروں کے خلاف اور کانگریسی لیڈروں کی حمایت میں باتیں کرتا رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص مسلمان کس طرف سے ہے۔ اگر یہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو یہ ہندو کیوں نہیں ہو جاتا۔ اسے مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انڈیا میں اس قسم کے ہندو نما مسلمان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

ہماری گاڑی دلی شہر کے باہر شمال مغرب کی طرف نکل آئی۔

آزادی ملنے کے تیرہ سال بعد تک بھی ابھی اس علاقے میں نئی کالونیاں نہیں بنی تھیں۔ شہر کے قریب قریب کا علاقہ ضرور پھیل رہا تھا۔ ہماری دونوں جانب کبھی کھیت آجاتے۔ کبھی ویران خشک میدان آجاتے۔ آخر پرانے قلعے کا وہ کھنڈر آگیا جس کے باہر راشٹریہ سیوک سنگ کا ہندی میں لکھا ہوا بورڈ لگا تھا۔ گاڑی قلعے کے احاطے میں جا کر ایک جانب رک گئی۔

احاطے میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ قلعے کے بہت بڑے برآمدے میں سے ہوتے ہوئے کانگریسی مسلمان ایک کمرے کے باہر رک گیا۔ کمرے کا دروازہ بوسیدہ تھا اور اس پر چک پڑی ہوئی تھی۔ کانگریسی مسلمان نے چپڑاسی سے کہا۔

"صاحب سے کہو رحیم بخش آیا ہے"

وہ چک اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اندر سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔

"مہاشے رحیم بخش آجاؤ۔ اندر آجاؤ"

کمرے میں ایک چوڑی میز کے پیچھے کرسی پر ایک بھاری بدن والا سانولے رنگ کا آدمی بیٹھا تھا جس نے زعفرانی رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دلی میں موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی دو الماریاں کھڑی تھیں۔ وہ اٹھ کر رحیم بخش سے ملا۔ رحیم بخش نے اسے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا اور ادب سے کھڑا رہا۔ رحیم بخش نے میری طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"لکشمی دیال! تمہاری فوج کے لئے ایک اور مسلمانوں کا دشمن لایا ہوں۔ لو اسے سنبھالو۔ کل میں نے اس کے بارے میں تم سے بات کی تھی۔ یہ مرلی پرشاد ہے"

لکشمی دیال اس ٹریننگ سنٹر کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ میں بھرپور جوان تھا اور کمانڈو ٹریننگ نے میرے جسم کو طاقتور اور سڈول بنا دیا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ رحیم بخش نے اس سے کہا۔

"میں نے تو اپنی پوری تسلی لی ہے۔ اب تم اپنی تسلی کر بھی کر لو۔ اس کے ماتا پتا فسادات میں لاہور کی گوالمنڈی کی آگ میں جل گئے تھے۔ یہ پاکستان کے مسلمانوں سے اپنا ماتا پتا کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کو بتاؤ کہ بدلہ کس طرح لینا ہے۔"

لکشمی دیال کہنے لگا۔

"مہاشے رحیم بخش جی! تم اسے لائے ہو تم نے اگر اپنی تسلی کر لی ہے تو سمجھو کہ میری بھی تسلی ہو گئی۔"

مجھ سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی مرلی پرشاد"

"گوت کیا ہے؟"

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس سوال پر تھوڑا ضرور گھبرا جاتا لیکن میں نے ہندو دھرم شاستروں کو پڑھا تھا میں نے فوراً جواب دیا۔

"جی کائستھ برہمن"

"ہوں۔ برہمن ہو۔"

"ہاں جی"

"دلی میں کہاں رہتے ہو؟"

اس کے جواب میں کانگریسی مسلمان نے کہا۔

ہمارے ایک بڑے اعتماد والے کانگریسی مسلمان دوست ہیں یہ ان کے پاس رہتا

تھا۔ کچھ دنوں سے یہ کسی ہوٹل میں رہ رہا ہے۔"

لکشمی دیال ڈائریکٹر نے کانگریسی مسلمان سے کہا۔

"رحیم بھائی ہمیں ایسے ہی زہریلے اور پاکستان کے دشمن جوانوں کی ضرورت ہے تم اسے ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔ اس کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی چیکنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں"

میں بے حد خوش ہوا۔ کانگریسی مسلمان نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"میاں میں تمہیں لکشمی دیال جی کے حوالے کر رہا ہوں۔ اب ان پر ثابت کر دو کہ تم پاکستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہو۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھگوان کی دیا سے ایسا ہی کر کے دکھاؤں گا۔"

مگر دل میں کہا کہ ان لوگوں کو تو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ یاد رکھیں گے۔ کانگریسی مسلمان مجھے اس ٹریننگ سنٹر میں چھوڑ کر چلا گیا۔ لکشمی دیال نے مجھے ایک انسٹرکٹر کے حوالے کر دیا جس نے میرے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹول کر کہا۔

"تم باڈی بلڈر لگتے ہو"

میں نے ہندوؤں والی مکارانہ عاجزی سے کہا۔

"جی مجھے کثرت کرنے کا بڑا شوق ہے"

"ٹھیک ہے ہمیں ایسے نوجوان ہی چاہئیں مگر تمہارے دماغ میں چالاکی بھی ہونی چاہئے۔ ٹھیک ہے۔ اگر چالاکی نہیں ہو گی تو میں اس میں ڈال دوں گا۔ چلو"

وہ مجھے قلعے کی ایک بیرک میں لے گیا جہاں پہلے سے چار جوان فزیکل ٹریننگ کر رہے تھے۔ انہوں نے نیکریں اور ٹی شرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ میرے ہندو انسٹرکٹر کا نام کالی داس تھا۔ وہ کالے رنگ کا تھا۔ آنکھیں پیلی تھیں۔ شکل ہی سے عیار اور مکار لگتا تھا۔

اس نے ان چار جوانوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان کی عمریں تیس اور چالیس کے

درمیان تھیں۔ میری طرح ان کے جسم سڈول نہیں تھے۔ یہ چاروں ہندو تھے اور راشٹریہ سیوک سنگ کے آدمی تھے۔ انہیں پاکستان میں جا کر تخریب کاری کی تربیت دی جا رہی تھی۔ دوسرے دن سے میری بھی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کمانڈو ٹائپ کی ٹریننگ ہو گی۔ دوڑیں لگوائی جائیں گی دشمن پر پیچھے سے ایک دم حملہ کرنے اور چاقو چلانے کی تربیت دی جائے گی مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ صرف جسمانی ورزش دن میں ایک گھنٹہ ضرور کرائی جاتی تھی۔ زیادہ زور بم لگانے اور بم لگانے کے بعد وہاں سے کس طرح فرار ہونا ہے اس پر دیا جاتا تھا۔ میرے لئے یہ معمولی بات تھی۔ ایک گھنٹہ خود اسلحہ چلانے اور نشانہ بازی سکھائی جاتی۔ میں پہلے ہی ان تمام چیزوں میں ماہر تھا۔ تین دن میں ہی انسٹرکٹر کالی داس کو معلوم ہو گیا کہ میں بڑا ہونہار تخریب کار ہوں۔ میرا نشانہ ٹارگٹ پر بالکل ٹھیک لگتا تھا۔ میں نہ صرف طے شدہ وقت میں پٹاخہ بم، نقلی پل اور نقلی عمارت کے اندر لگا آتا بلکہ اس طریقے سے بم لگا کر وہاں سے فرار ہوتا کہ خود کالی داس کو بھی ایک آدھ منٹ تک پتہ نہ چلتا کہ میں کس طرف چلا گیا ہوں۔

وہ مجھ سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ٹریننگ کے پندرہ دن بعد ہی لکشمی دیال سے میری سفارش کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ مجھے تخریب کاروں کی ٹیم کا ہیڈ بنا دیا جائے۔ ان لوگوں کو کیا خبر تھی کہ میں ایک اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو ہوں۔ میں نے دست بدست فائیٹ میں بھی وہ کمال دکھایا کہ کالی داس حیران رہ گیا۔ کہنے لگا

"مرلی پرشاد! اگر مجھے تم ایسے دس بارہ جوان مل جائیں تو میں پاکستان میں تباہی مچا سکتا ہوں"

میں نے دل میں کہا "تباہی تو میں تمہارے ہندوستان میں مچاؤں گا۔ پاکستان کا تو تم بال بھی بیکا نہ کر سکو گے۔" اوپر سے کہا۔

"سر! آپ کا دھنواد!"

رات کو کھانے کے بعد کالی داس ہمیں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف آدھے گھنٹے کا ایک زہریلا لیکچر دیتا۔ مسلمانوں اسلام اور پاکستان کے خلاف وہ ایسی ایسی زہریلی باتیں کرتا

که میرا اس بات پر یقین مزید پختہ ہو گیا کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری تھا۔ جب ہماری ٹریننگ کو ایک مہینہ گزر گیا تو ہمیں تخریب کاری کی مہم پر جانے کا حکم مل گیا۔ اس دوران میں نے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ پاکستان میں کوئی مسلمان تخریب کار نہیں ہے۔ وہاں صرف ایک ہندو تخریب کار ان کا جاسوس ہے جس نے ہمیں انڈیا پاکستان کے جموں کشمیر والے بارڈر پر ملنا تھا اور ہمیں بارڈر پار کروا کر ساتھ لے جانا تھا۔ اور آگے ہم پانچوں تخریب کاروں کو پاکستان کے مختلف شہروں میں بموں کے دھماکے کرنے کے لئے بھیجنا تھا۔ جس روز ہمیں ٹریننگ سنٹر سے اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا اس دن ہمیں لکشمی دیال نے خود ایک لیکچر دیا اور کہا۔

"تم لوگ یہاں سے جموں توی جاؤ گے وہاں سے ہمارا خاص آدمی تمہیں ساتھ لے کر پاکستان کا بارڈر کراس کرائے گا اسلحہ اور ٹائم بم تمہیں ہمارا آدمی پاکستان کا بارڈر کراس کرنے کے بعد دے گا۔ اس کے پاس ٹائم بموں اور اسلحہ کا ذخیرہ موجود ہے۔ تم لوگ پاکستان کے شہروں میں ریلوے پلوں کو بم لگا کر اڑاؤ گے۔ لاریوں' بسوں ریلوے ٹرینوں اور سینما کی عمارتوں میں بموں کے دھماکے کرو گے۔ ہمارا جو آدمی تمہیں جموں میں ملے گا ہم تمہیں اس کا اصلی نام نہیں بتائیں گے۔ اس کا فرضی نام جیک ہو گا۔"

پھر لکشمی دیال نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارے پارٹی لیڈر مرلی پرشاد کو جیک کی تصویر دکھا دی جائے گی۔ جیک کو وائرلیس پر تمہارے آنے کی اطلاع کر دی گئی ہے۔ تم کل صبح منہ اندھیرے یہاں سے الگ الگ ہو کر ٹرین کے ذریعے جموں جاؤ گے۔ جموں توی کے ریلوے سٹیشن پر تمہارا پارٹی لیڈر مرلی پرشاد تمہیں ایک جگہ بٹھا کر خود پنجاب ہوٹل جائے گا جہاں جیک سے اس کی ملاقات ہو گی اس کے بعد جیک تمہاری راہ نمائی کرے گا
اب تم جا کر اپنے مشن پر روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دو۔ تم اپنے ساتھ کوئی فالتو جوڑا نہیں لے جاؤ گے صرف پتلون اور جیکٹ پہن کر جاؤ گے کلاس ڈس مس۔"

چاروں تخریب کار ہندو اٹھ کر چلے گئے۔ لکشمی دیال اور انسٹرکٹر کالی داس مجھے ایک

کمرے میں لے گئے۔ یہاں لکشمی دیال ڈائریکٹر نے مجھے جیک کے فرضی نام والے ہندو تخریب کار کی فوٹو دکھائی۔

"اس کا اصلی نام تمہیں بھی نہیں بتایا جائے گا اس کی شکل دماغ میں بٹھا لو۔ یہ جیک ہے۔ یہ تمہیں جموں شہر کے پنجاب ہوٹل کے کمرہ نمبر 9 میں ملے گا۔ اس سے ملنے کے بعد تم وہی کرو گے جس طرح وہ کہے گا۔ کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یس سر!"

"او کے۔ کل صبح منہ اندھیرے کالی داس تمہیں لے کر سٹیشن کی طرف روانہ ہو گا اب تم بھی جا کر تیاری کرو۔"

قلعے میں پرانے حجرے بنے ہوئے تھے۔ ان کو لکڑی کے تختے لگا کر چھوٹے کمروں میں بدل دیا گیا تھا۔ ایک کمرہ مجھے ملا ہوا تھا۔ میں کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا اس دوران مجھے صرف ایک بار شہر دلی جانے کا موقع ملا تھا اور میں نے گل خان سے ایک خفیہ ملاقات کی تھی اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک ہی بات پوچھی تھی۔

"تم ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ میں ابھی خود بھی نہیں جانتا۔ اتنا ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی ایک تخریب کار بھی اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ کوئی ایک بھی پاکستان کے کسی شہر میں بم کا دھماکہ نہ کر سکے گا"

"کیا تم انہیں مار ڈالو گے؟ اگر ایسا کر بیٹھے تو یہاں لکشمی دیال کو تم پر ضرور شک پڑ جائے گا کہ تم پاکستان کے آدمی ہو۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ پولیس مجھے گرفتار کر لے۔ کیونکہ تمہیں میں لے کر کانگریسی رحیم بخش کے پاس گیا تھا۔ رحیم بخش کو تو پولیس نہیں پکڑے گی۔ یہ سوچ لینا۔"

میں نے کہا۔

"خان بھائی تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں کوئی ایسا منصوبہ بناؤں گا کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔"

گل خان بولا۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے۔ بہرحال اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی گئی تو میں اپنا بچاؤ کرنا جانتا ہوں۔ یہاں دلی میں میرے کانگریسی لیڈروں سے خاص تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات میں نے اسی لئے بنائے ہوئے ہیں کہ اگر کبھی کوئی بات ہو جائے تو مجھ پر کوئی شک نہ کر سکے۔ تم جو کرو گے ٹھیک کرو گے۔ میں تمہاری سلامتی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے دعا گو رہوں گا۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"اس مشن پر مجھے تمہارے دھماکہ خیز چیونگ گم بموں کی بجائے دھماکہ خیز محلول کی ضرورت پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس محلول کی تھوڑی سی مقدار بنا کر دے دو۔"

گل خان اٹھ کر اندر گیا۔ اس وقت میں اس کے اپنے مکان میں بیٹھا تھا۔ اندر سے ایک نیلے رنگ کی شیشی لا کر اس نے مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ دھماکہ خیز محلول میں نے پہلے سے تیار کر کے رکھ لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مشن پر تمہیں اس کی ضرورت ہو گی۔"

اس نے ایک چھوٹی سی کالے رنگ کی شیشی میں دھماکہ خیز محلول ڈال کر اس کا پیچ دار ڈھکن بند کیا اور شیشی لفافے میں لپیٹ کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اس کو کس طریقے سے استعمال کرنا ہے۔ صرف میں نے اس کا ٹائم بڑھا دیا ہے۔"

"کتنا ٹائم بڑھایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

گل خان نے جواب میں کہا۔

"پہلے پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ اب اسے بڑھا کر دس منٹ کر دیا ہے۔ اس محلول کا صرف ایک قطرہ پانی، شراب یا چائے میں ڈال کر دشمن کو پلا دو گے تو دس منٹ کے بعد اس کی آنکھیں سرخ ہو کر ابل پڑیں گی اور ساتھ ہی اس کا جسم دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔"

میں نے شیشی لے کر جیب میں رکھ لی تھی اور جس وقت تخریب کاری کے ٹریننگ سنٹر میں لکشمی دیال ڈائریکٹر ہمیں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا لیکچر دے رہا تھا اس دھماکہ خیز محلول کی شیشی میری جیب میں موجود تھی۔ اس وقت میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مشن سے واپس آ کر میں پاکستان دشمن لکشمی دیال اور ٹریننگ سنٹر کے انسٹرکٹر کالی داس کو یہ دھماکہ خیز محلول ضرور چکھاؤں گا۔ تاکہ وہ بھی اس کے ذائقے سے تھوڑا واقف ہو جائیں۔

صبح صبح کالی داس ہمیں ٹریننگ سنٹر کے قلعے سے نکال کر ایک پرانی جیپ میں بٹھا کر دلی کے ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ وہ خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا ہم پانچوں تخریب کار پرانی پتلونوں اور معمولی سی جیکٹوں میں ملبوس خاموشی سے جیپ میں آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ دلی کی سڑکوں پر بجلی کی بتیاں روشن تھیں۔

ہمیں جموں توی ایکسپریس پکڑنی تھی۔ یہ ٹرین اس زمانے میں دلی سے صبح سوا چھ بجے چلتی تھی۔ کالی داس نے ہمیں تھرڈ کلاس کے پانچ ٹکٹ لے کر دیئے اور کہا۔

"تم لوگ الگ الگ ڈبوں میں بیٹھو گے۔ مگر ایک دوسرے کو اپنی نگاہ میں رکھو گے۔ صرف جموں توی کے سٹیشن کے باہر تم ایک جگہ اکٹھے ہو گے جہاں جیک آ کر تم میں شامل ہو جائے گا۔"

اس نے مجھ سے کہا۔

"مرلی پرشاد! جموں تک یہ لوگ تمہاری ذمے داری ہیں۔ تم ان کے پارٹی لیڈر ہو گے۔ جموں سے آگے جیک تمہارا پارٹی لیڈر ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"او کے سر!"

کالی داس نے ٹکٹ ہمارے حوالے کئے اور کہا۔

"بھگوان تمہاری رکھشا کرے"

میں نے دل میں کہا۔ بھگوان تو تمہاری رکھشا کرے گا کہ کیا کسی نہ کی ہو گی۔ اوپر سے کہا۔

"تھینک یو سر۔"

کالی داس نے آہستہ سے کہا۔

"جے ھند"

ہم نے بھی منہ ہی منہ میں یہ الفاظ دہرا دیئے۔ میں نے بڑی مشکل سے یہ دونوں لفظ زبان سے ادا کئے۔ ہم پلیٹ فارم پر آکر الگ الگ ہو گئے۔ الگ ہونے سے پہلے میں نے چاروں ہندو تخریب کاروں سے کہا۔

"جموں توی کے سٹیشن کے باہر ملاقات ہو گی۔ لیکن میں راستے میں اتر کر تم لوگوں کا دور سے حال چال معلوم کر لیا کروں گا۔"

میں نے جب دیکھا کہ چاروں تخریب کار ٹرین کے الگ الگ ڈبوں میں داخل ہو گئے ہیں تو میں بھی ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر جموں توی کے لئے روانہ ہو گئی۔ یہ سفر کافی لمبا تھا۔ ٹرین دلی سے وایا سونی پت' کرنال ہوتی ہوئی جالندھر جاتی تھی۔ جالندھر سے یہ ہوشیار پور کی طرف لائن بدل لیتی تھی۔ سارا دن سفر جاری رہا۔ اس دوران میں راستے میں سونی پت' کرنال اور انبالہ کے سٹیشنوں پر اتر کر اپنے تخریب کار آدمیوں کو دور سے دیکھتا رہا۔ وہ لوگ بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ شام کے وقت جالندھر آیا۔ یہاں سے ٹرین نے ریلوے ٹریک بدلا اور آگے امرتسر جانے کی بجائے ہوشیار پور کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہوشیار پور سے آگے بڑا سٹیشن جموں توی کا ہی تھا۔

رات کے آٹھ سوا آٹھ بج رہے تھے کہ ٹرین نے ہمیں جموں توی پہنچا دیا۔ ہم ایک ایک کر کے الگ الگ ہو کر سٹیشن سے باہر نکل آئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی

نگاہوں میں رکھا ہوا تھا۔ میں ان کے آگے آگے تھا۔ میں ایک جگہ اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق چاروں ہندو تخریب کار میرے پاس آگئے۔ میں نے انہیں کہا۔

"ہمارا ٹارگٹ پنجاب ہوٹل ہے۔ ہم الگ الگ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر9 میں جائیں گے۔ او کے؟"

سب نے دبی زبان سے کہا۔

"یس سر!"

اور ہم ایک بار پھر الگ الگ ہو گئے۔

میں اس سے پہلے جموں توی آچکا تھا۔ میرے لئے یہ شہر نیا نہیں تھا۔ میں نے ایک رکشا پکڑا اور اسے پنجاب ہوٹل چلنے کو کہا۔ پنجاب ہوٹل درمیانے درجے کا دو منزلہ ہوٹل تھا۔ میں نے کمرہ نمبر9 کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔

"دلی سے آپ کا ایک مہمان آیا ہے"

دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے درمیانے قد کا گھٹے ہوئے جسم والا ایک پکی عمر کا آدمی کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کالی داس کا بتایا ہوا کوڈ ورڈ بتایا تو وہ آدمی دروازے سے پیچھے ہٹ گیا اور بولا

"اندر آجاؤ۔ میرا نام جیک ہے"

کمرہ بے ترتیب چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کرسی پر سے چادر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"وہ الگ الگ کر کے آئیں گے۔"

جیک نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مجھے معلوم ہے۔ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تم نئے رنگروٹ لگتے ہو کیا تم پارٹی لیڈر ہو؟"

"ہاں"

"مرلی پرشاد تمہارا نام ہے؟"

"جی ہاں۔"

جیک کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔

"مجھے کالی داس نے تمہارا ریکارڈ بھجوا دیا تھا تمہارے ماتا پتا گوالمنڈی کی آگ میں جل کر سورگباش ہوئے تھے کیا؟"

"یس سر!"

"ٹھیک ہے۔ تم لاہور جاؤ گے اور گوالمنڈی کے اندر کسی بڑی دکان میں اکٹھے دو ٹائم بم لگا کر دھماکہ کرو گے۔ تمہیں اس سے ضرور خوشی ہو گی"

"کیوں نہیں۔ میں تو مسلمانوں سے اپنے ماتا پتا کی مرتیوں کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس سے اچھی اور کون سی بات ہو گی کہ جہاں میرے ماتا پتا کو جلایا گیا تھا وہیں میں اپنے دشمنوں کو بھسم کروں"

جیک اس دوران میری طرف مسلسل گھور کر دیکھتا رہا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں میرے چہرے کے پیچھے چھپے ہوئے کسی راز کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے دل میں کہا تم کیا تمہارے والد صاحب بھی اس راز کو معلوم نہیں کر سکتے جو میرے چہرے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک ایک کر کے ہمارے باقی تخریب کار ساتھی بھی آ گئے۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا ہندوؤں والا تھا۔ یعنی دال اور چھوٹی چھوٹی روٹیاں بلکہ چپاتیاں اور موٹے چاول اور دہی۔ مجھے دل میں گل خان کے ساتھ کھائے ہوئے مرغ روسٹ یاد آ رہے تھے۔ کھانے کے بعد چائے آ گئی۔ میں نے پارٹی لیڈر کی حیثیت سے جیک سے پوچھا۔

"سر! یہاں سے ہمیں کس وقت نکلنا ہو گا"

جیک نے مجھے ایک بار پھر گھور کر دیکھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ کسی وجہ سے میں اسے پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بتا دوں گا۔ اور اب تم پارٹی لیڈر نہیں ہو۔ اب تمہارا لیڈر میں ہوں۔ آگے میرا حکم چلے گا۔ جیسے میں کہوں گا ویسے ہی تمہیں کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"یس سر! جیسی آپ کی آگیا"

پارٹی لیڈر جیک جو شکل صورت سے باتوں سے اور اپنے زہریلے رویے سے بھی بڑا سخت متعصب ہندو لگتا تھا ہم سب کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم لوگ آج رات اور کل کا دن آرام کرو گے۔ کل اندھیرا ہوتے ہی ہم یہاں سے چل پڑیں گے۔ کل کا سارا دن میری اجازت کے بغیر کوئی ہوٹل سے باہر نہیں جائے گا۔ یہ جموں کشمیر کا علاقہ ہے یہاں دشمن کے جاسوس ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔"

رات کو ہم ایک ہی کمرے میں زمین پر چادریں لے کر لیٹ گئے۔ میں نے سوچا کہ اس آدمی جیک سے جس کا اصلی ہندوانہ نام مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا' اس کے ساتھ جتنی زیادہ دوستی ڈالی جا سکتی ہے ڈال کر اس سے یہ پتہ کرنا چاہئے کہ پاکستان میں جو ہمارا ہندو جاسوس تخریب کار بیٹھا ہوا ہے اور جس کے ساتھ وہاں جا کر ہم نے رابطہ پیدا کرنا ہے اس کا نام کیا ہے فور وہ پاکستان کے کس شہر میں کس خفیہ نام اور بھیس میں رہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان بن کر ہی پاکستان میں رہ رہا ہو گا۔ یہ اطلاعات مجھے جیک سے ہی مل سکتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اس انڈین تخریب کار کو بھی ان تخریب کاروں کے ساتھ ہی ہلاک کرنا چاہتا تھا اگر میں ان چاروں کو ہلاک کر کے اس ہندو تخریب کار کی تلاش میں پاکستان میں داخل ہو گیا تو میں اسے وہاں زندہ تو بالکل نہیں چھوڑوں گا مگر پھر میرے لئے واپس انڈیا کا بارڈر کراس کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں کسی حکومت کا

جاسوس تو تھا نہیں کہ حکومت بارڈر کراس کرانے میں میری مدد کرتی۔ میں تو یہ ساری کارروائیاں محض اپنے بل بوتے پر اور اپنے باپ کی وصیت پوری کرنے کے لئے اور میرے دل میں اسلام' جہاد کشمیر اور پاکستان کی سلامتی اور استحکام کا جو جذبہ تھا صرف اس کی وجہ سے کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ پاکستان میں مقیم ہندو تخریب کار کا کم از کم پتہ لگ جانا چاہئے۔ پھر میں کسی دوسرے طریقے سے اسے وہیں گرفتار کروانے یا ختم کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے جیک کے ساتھ حد سے زیادہ خوشامدانہ رویہ اختیار کر لیا۔ خود اس کو چائے بنا کر دی۔ وہ سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے جلدی سے ماچس جلا کر اس کے سگریٹ کو سلگا دیا۔ خوشامد بڑا خطرناک ہتھیار ہوتا ہے۔ یہ پتھر میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔ میرے خوشامدانہ رویے نے بڑی جلدی اثر دکھانا شروع کر دیا۔ جیک کی توجہ میری طرف ہونے لگی۔ وہ ہم سے کوئی بات کر رہا ہوتا یا ہمیں کچھ سمجھا رہا ہوتا تو میری طرف توجہ زیادہ دیتا۔ میں نے اس پر مزید اثر ڈالنے کے لئے مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے بڑے کم عرصے میں یقین دلا دیا کہ میں ایک کٹر برہمن ہندو ہوں اور میرے دل میں پاکستان کے مسلمانوں سے اپنے فرضی ماتا پتا کے جل مرنے کا بدلہ لینے کی آگ بھڑک رہی ہے۔

رات کے پہلے پہر جب ہمارے دوسرے ساتھی سو گئے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ جیک کونے والی چھوٹی میز پر ایک نقشہ رکھے اس کو جھک کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ جلایا تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"نیند نہیں آ رہی مرلی پرشاد؟"

میں نے کہا۔

"بھاپا جی! جب تک میں پاکستان کے مسلمانوں سے اپنے سورگباشی ماتا پتا کے خون کا بدلہ نہیں لے لوں گا۔ مجھے نیند نہیں آ سکتی۔"

جیک نے نقشہ تہہ کر کے پلاسٹک کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت جلد تمہیں اس کا موقعہ ملنے والا ہے تمہیں اپنے پرانے محلے گوالمنڈی میں کسی دکان میں ہی بم لگانے ہوں گے۔ تمہارا گھر گوالمنڈی میں ہی تھا ناں؟"

"ہاں۔ گوالمنڈی کی آگ میں ہی وہ جل مرے تھے۔"

جیک نے بھی سگریٹ سلگا لیا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنا رخ میری طرف کر لیا۔

"تم نے پہلے کبھی بم لگائے ہیں؟"

میں نے ان جان بنتے ہوئے کہا۔

"یہ کام میں نے پہلے تو کبھی نہیں کیا مگر چنتا نہ کریں۔ یہ کام میں بڑی ہوشیاری سے کروں گا۔"

"بس تمہیں بموں والا بریف کیس گوالمنڈی کی کسی دکان میں لے جا کر کسی ایسی جگہ رکھنا ہو گا جہاں آتے جاتے کسی کی نظر نہ پڑے۔"

مجھے لاہور والے ہندو تخریب کار کے بارے میں بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے جیک سے پوچھا۔

"کیا لاہور میں ہمیں اپنا لاہور والا جاسوس گائیڈ کرے گا؟"

"ہاں۔ وہی کرے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ ہمیں لاہور میں ہی ملے گا کیا؟"

جیک نے ہلکا سا کش لگا کر کہا۔

"نہیں۔ وہ ہمیں بارڈر کراس کر کے انڈیا کے ایک گاؤں میں ملے گا۔ اس کو اطلاع مل چکی ہے۔ جس وقت ہم وہاں پہنچیں گے وہ وہاں موجود ہو گا۔"

میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پاکستان میں ان لوگوں نے اور کون کون سے ہندو تخریب کار کہاں کہاں تعینات کر رکھے ہیں جیک سے کہا۔

"میں تو کہوں گا بھاپا جی کہ ہمیں پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے میں اپنے آدمی رکھنے چاہئیں جو ہر روز بم کا ایک ایک دھماکہ کریں۔"

جیک خاموش رہا۔ میں نے موقع مناسب جان کر وہ سوال کر دیا جو حقیقت میں پوچھنا چاہتا تھا۔

"بھاپا جی! اس وقت پاکستان میں ہمارے بھگوان کی کرپا سے کتنے آدمی کام کر رہے ہیں؟"

جیک میرے جال میں آگیا۔ کہنے لگا۔

"اس وقت تو یہی نندلال ایک ہی آدمی لاہور میں ہے۔ مگر ہمارا پروگرام پاکستان کے ہر شہر میں اپنے اگروادی جاسوس رکھنے کا ہے۔"

میرے خوشامدانہ سلوک نے اس ہندو تخریب کار جیک کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے مجھے پاکستان میں کام کرنے والے تخریب کار ہندو کا نام بھی بتادیا۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مجھے اس موضوع سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے جلدی سے بات کا موضوع ہی بدل دیا اور اس سے کہا۔

"پاکستان کے بارڈر پر سیکورٹی تو بہت ہو گی۔ ہم بارڈر کراس کر جائیں گے نا؟"

جیک نے جواب میں ہلکی سی جمائی لے کر کہا۔

"نندلال تم لوگوں کو ایسی جگہ سے بارڈر کراس کرائے گا جہاں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ وہ پہلے بھی ہمارے آدمی بارڈر پار لے جاتا رہا ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی طرف سے بڑے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جیک کرسی سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گیا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یہ جموں شہر کی خنک رات تھی۔ میں پہلے بھی اس شہر میں آتا جاتا رہا تھا۔ سردیوں کا موسم نکل رہا تھا۔ جموں کی رات ہلکی خنک تھی۔ اتنی کہ کمرے کا پنکھا نہیں چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہمارے ہندو تخریب کار گائیڈ جیک کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میری پتلون کی جیب میں دھماکہ خیز محلول کی کالی شیشی موجود تھی میں ان سب کی ایک ایک کر کے گردنیں توڑ کر انہیں موت کی نیند سلا سکتا تھا۔

مجھے اس ہندو تخریب کار نندلال کو بھی ہلاک کرنا تھا جس کو بھارتی خفیہ ایجنسی را نے لاہور میں تخریب کاری کے لئے لگا رکھا تھا۔ اور نندلال نے ہمیں پاکستان کے بارڈر پر انڈیا کی سرزمین پر واقع ایک سرحدی گاؤں میں ملنا تھا۔ اس وقت تک ان لوگوں کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہی میں نندلال سے ملاقات کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں دل میں مختلف منصوبے تیار کرنے لگا کہ انڈیا کے سرحدی گاؤں میں نندلال سمیت ان سب کو ایک ہی وقت میں کس طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے بعد کیا میں واپس ان لوگوں کے پاس جا سکوں گا جنہوں نے مجھے ہندو سمجھ کر پاکستان میں تخریب کاری کے لئے بھیجا تھا۔ جب کہ مزید تخریب کاری کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لئے میرا ان کے پاس واپس جانا ضروری تھا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

دوسرا دن اس طرح گزرا کہ ہم پانچ تخریب کار ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے رہے اور ہمارا ہندو لیڈر جیک یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ اسے کچھ ضروری انتظامات کرنے ہیں۔ وہ دوپہر کے بعد آیا۔ کہنے لگا۔

"سورج غروب ہونے کے بعد ہم یہاں سے چلیں گے۔ حالات بالکل ٹھیک ہیں کل سے سرحدوں پر کوئی جھڑپ بھی نہیں ہوئی۔"

جیک کو اب مجھ پر بڑا اعتماد ہو گیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد کے بارے میں میرے بعض مشوروں نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا تو وہ بولا۔

"مرلی پرشاد! تم میرے پیچھے پیچھے آؤ گے"

اس نے باقی تخریب کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سن لو۔ اگر میں پہاڑوں میں ادھر ادھر ہو گیا تو مرلی پرشاد تمہارا لیڈر ہو گا۔"

میں نے سر ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔"

سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا کہ ہماری پارٹی پاکستان کے بارڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہم دو دو ایک ایک کر کے ہوٹل سے نکلے۔ جیک نے ہمیں جموں شہر

سے باہر ایک جگہ اکٹھے ہونے کے لئے کہہ دیا تھا۔ جیک نے مجھے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ ہم بازاروں میں پیدل چلتے شہر کے مضافات میں سے ہوتے ہوئے میدان میں آگئے جہاں کہیں کہیں جوار کے کھیت تھے۔ دور پہاڑیوں کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ ہم ایک جوہڑ کے پاس آکر رک گئے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے دوسرے ساتھی بھی ایک ایک کر کے آگئے۔ یہاں سے ہم اکٹھے مل کر چل پڑے۔ جیک کو سارے راستے کا علم تھا۔ وہ اصل میں ایک تجربہ کار پرانا سمگلر ہندو تھا جو بارڈر پر سمگلنگ کیا کرتا تھا۔ را کی ایجنسی کے کارندوں نے اس کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کر کے اسے بھاری معاوضے پر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے گیا تو میدان اور کھیتوں پر اندھیرا سا چھا گیا۔ ہم کھیتوں کے درمیان ایک کچے راستے پر جا رہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ جیک آگے آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور باقی چاروں تخریب کار تھوڑا تھوڑا فاصلہ ڈال کر ہمارے پیچھے چلے آرہے تھے۔ ہمارے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہمارے لباس دیہاتی ٹائپ کے نہیں تھے بلکہ ہم نے میلی کچیلی پرانی پتلونیں پہنی ہوئی تھیں۔ یہ لباس ہمیں اس لئے پہنایا گیا تھا کہ ہمیں یہاں سے پاکستان کا بارڈر کراس کر کے سیدھا لاہور شہر میں داخل ہونا تھا۔ جیک کو معلوم تھا کہ ہمیں کس کس علاقے سے گزرنا ہے۔ ہم نیم میدانی علاقے سے گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ آجاتے تھے۔ اس کے بعد خشک جھاڑیوں والے بنجر میدان شروع ہو جاتے تھے۔ پہاڑیاں بھی زیادہ تر خشک تھیں۔ اور ابھی دور دور تھیں۔ ہم ان ہی کی طرف جا رہے تھے۔ ہم دو ڈھائی گھنٹے چلتے رہے۔ رات ہو گئی تھی۔ چونکہ جیک سارے پہاڑی رستوں سے واقف تھا اس لئے ہمیں چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لوگ چلتے چلتے تھک گئے۔ میں بالکل نہیں تھکا تھا۔ مجھے ہوشنگ آباد والے مرد مومن شاہ کمال نے دس دس بارہ بارہ میل پیدل دوڑا دوڑا کر گھوڑا بنا دیا ہوا تھا۔ جیک بھی تھک گیا تھا۔ یہ لوگ سمگلر ٹائپ کے لوگ تھے جنہیں صرف بموں لاریوں کے اڈوں کاروباری مراکز اور شاپنگ سنٹروں میں بم لگانے اور وہاں سے نکل آنے

کی ہی تربیت دی گئی تھی۔

ایک کنوئیں پر آکر ہم بیٹھ گئے۔ جیک نے کہا۔

"یہاں ہم پندرہ منٹ ریسٹ کریں گے۔"

اس نے ایک تھیلے میں سے بھنے ہوئے چنے نکال کر ہمیں دیئے ہم نے کنوئیں میں سے پانی نکال کر پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ میں نے جیک سے پوچھا۔

"سر! ہم ٹھیک ٹارگٹ کی طرف جا رہے ہیں ناں؟"

وہ بولا۔

"یہ سارا رستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ میں کئی بار یہاں سے گزرا ہوں۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ ہم نے ایک ایک سگریٹ پیا۔ جیک نے مغرب کی جانب پہاڑیوں کے سیاہ خاکوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان پہاڑیوں کی دوسری جانب پاکستان کا بارڈر ہے۔ ہم کل شام کے وقت وہاں پہنچیں گے۔ ہمارا آدمی نندلال وہیں ہمیں ملے گا۔"

سگریٹ ختم کر کے ہم پھر چل پڑے۔

آدھی رات تک چلتے رہے۔ اب ہم پہاڑیوں کے درمیان آگئے تھے۔ ان پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر رات کے اندھیرے میں چھوٹے قد کے درختوں کے دھبے نظر آرہے تھے۔ رات کے دو بجے تک ہم ان پہاڑیوں میں چلتے رہے۔ اس کے بعد ایک دریا آگیا۔ میں اسے دریا سمجھا۔ مگر جیک نے کہا کہ یہ دریا نہیں ہے پہاڑی نالہ ہے۔ دور پہاڑیوں کے درمیان گہری کھائی میں یہ نالہ شور مچاتا بہہ رہا تھا۔ ہم نے ایک پل پر سے نالے کو عبور کیا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر جا کر ہم تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔

اسی طرح ہم ان چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے درمیان صبح ہونے تک چلتے رہے۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو منظر کافی بدل چکا تھا۔ پہاڑی سلسلہ ختم ہو رہا تھا اور میدانی علاقہ شروع ہو رہا تھا۔ جیک کہنے لگا۔

"تھوڑی دور آگے ایک گاؤں ہے تم لوگ گاؤں کے باہر ایک جگہ چھپ کر بیٹھو گے۔ میں گاؤں سے تمہارے لئے کچھ کھانے پینے کے لئے لاؤں گا۔"

ہم تھوڑی دور گئے تو دور درختوں کے جھنڈ کے پاس گاؤں کے کچے مکان دکھائی دیئے۔ کھیتوں میں دو تین کسان ہل چلاتے بھی دکھائی دیئے۔ جیک نے ہمیں ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھنے کو کہا اور خود گاؤں کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہمارے لئے لسی کا کٹورا اور جوار کی روٹیاں اور ساگ لے کر آگیا۔ ہم سب نے ساگ روٹی کھائی۔ لسی پی۔ جیک کہنے لگا۔

"یہاں کا ایک زمیندار ہمارا اپنا آدمی ہے وہ سکھ ہے اور سمگلر ہے۔ اب ہم یہاں دو گھنٹے آرام کریں گے۔"

جھاڑیوں کے درمیان زمین پر خشک گھاس اگ رہی تھی۔ ہم وہیں لیٹ گئے۔ رات بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ سو گئے۔ جس وقت میری آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں میں نے دیکھا کہ جیک جاگ رہا تھا اور سگریٹ سلگائے دور ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم نے ڈیڑھ دو گھنٹے سو کر آرام کیا اور تازہ دم ہو کر آگے چل پڑے۔

یہ علاقہ اس قسم کا تھا۔ کہ کہیں زمین اونچی ہو جاتی تھی اور کہیں میدان آجاتا تھا۔ پہاڑیاں ہماری داہنی جانب پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں اس علاقے کو اپنے ذہن میں اچھی طرح یاد کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ واپسی پر مجھے اسی علاقے سے اپنے منصوبے اور سکیم کے مطابق اکیلا ہی واپس آنا تھا۔ اسی طرح چلتے چلتے اجاڑ علاقوں میں سے گزرتے شام کے سائے پھیلنے لگے۔ یہاں پہلی بار ہمیں کھیتوں میں کچھ فاصلے پر ایک فوجی جیپ جاتی نظر آئی۔

جیک نے مجھے کہا۔

"ہم انڈین بارڈر کے قریب پہنچ گئے ہیں اب ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ یہ انڈین بارڈر فورس کی جیپ تھی۔ یہ لوگ ہمارے دیش کے سپاہی ہیں مگر یہ ہمیں پوچھ گچھ کے لئے روک سکتے ہیں۔"

یہاں سے ہم نے راستہ تبدیل کر لیا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرف چلنے لگے۔ ان ٹیلوں میں چلتے چلتے رات کا اندھیرا ہو گیا۔ جیک نے ایک جگہ ہم سب کو روک دیا اور بولا۔

"یہاں سے پاکستان کا بارڈر دو چار فرلانگ کے فاصلے پر ہی ہے۔ اب ہم میں سے کوئی سگریٹ نہیں پیئے گا ماچس نہیں جلائے گا۔ یہ چیزیں دور سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ بارڈر سیکورٹی فورس کی پارٹیاں رات کے گشت پر ہوتی ہیں۔"

وہ ہمیں لے کر ٹیلوں کے درمیان دشوار گزار راستوں سے گزارتا ہوا ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد زرد رنگ کا غیر مکمل سا چاند مغرب کی طرف اوپر آگیا۔ اس کی پھیکی روشنی میں میں نے ایک جانب درختوں کا جھنڈ دیکھا جیک ہمیں اسی جھنڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ جب یہ جھنڈ ہماری بائیں جانب رہ گیا تو سامنے ایک مکان کی دیوار نظر آئی۔ جیک نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں اکیلا مکان میں جاؤں گا۔"

ہم وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ جیک مکان کی طرف چلا گیا۔ پھیکی چاندنی میں وہ مکان کے پاس جا کر جیسے غائب ہو گیا۔ یقیناً یہ وہی مکان تھا جہاں نندلال ہندو تخریب کار لاہور سے آکر ہمارا انتظار کر رہا تھا اور جس نے آگے اپنی راہ نمائی میں ہمیں پاکستان کا بارڈر کراس کرا کے لاہور لے جانا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جیک مکان سے نکل کر ہماری طرف آتا نظر آیا۔ اس نے بتایا کہ پاکستان سے ہمارا آدمی یعنی ہندو تخریب کار نندلال آگیا ہوا ہے۔

"میرے ساتھ آجاؤ"

ہم سب اس کے پیچھے مکان کی طرف چل پڑے۔ میرے سمیت ہم کل چھ آدمی تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ چارپائی پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جیک نے میرا اس سے خاص طور پر تعارف کرایا۔ یہ نندلال ہی تھا۔ جوان آدمی تھا۔ اس نے نسواری رنگ کا شلوار قمیض کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر جناح کیپ تھی۔ گویا اس ہندو تخریب کاروں کے لیڈر نے اپنا پورا حلیہ پاکستانی مسلمانوں

والا بنایا ہوا تھا۔ ہم زمین پر اور جیک اور نندلال چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیک نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ ہم رات کے پچھلے پہر بارڈر کراس کریں گے۔"

جیک بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اسلحہ کہاں ہے؟"

نند لال نے چارپائی کے نیچے سے ایک تھیلا کھینچا۔ اس میں دو سٹین گنیں تھیں۔

جیک نے سٹین گن کا میگزین چیمبر چیک کیا۔

"میگزین لوڈ ہے۔ خیال رکھنا"

جیک نے سٹین گن گھٹنوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں کوئی اناڑی نہیں ہوں۔ یہ بتاؤ کہ بارڈر پر کوئی سپیشل پٹرولنگ تو نہیں ہو رہی؟"

"میں نے سب چیک کر لیا ہے۔ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

جیک بولا۔

"سارے ٹارگٹ لاہور کے ہیں کہ دوسرے شہر بھی شامل ہیں؟"

تخریب کار نند لال نے کہا۔

"ایک ٹارگٹ لاہور کا ہے۔"

جیک نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"لاہور کا ٹارگٹ مرلی پرشاد کا ہے۔ یہ گوالمنڈی میں بم کا دھماکہ کرے گا۔ باقی کون کون سے شہر ہیں۔؟"

نند لال کہنے لگا۔

"باقی ابھی صرف دو شہر ہمارے ٹارگٹ پر ہیں۔ کراچی اور راولپنڈی۔ اس کے بعد ہمارا پروگرام پشاور کو نشانہ بنانے کا ہے۔"

"ویری گڈ۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں جو آدمی دے رہا ہوں سارے ٹرینڈ ہیں۔ اور خطرناک

دشمن ہیں مسلمانوں کے"

"ٹھیک ہے۔"

جیک نے رومال کھول کر باقی کی بچی ہوئی جوار کی روٹیاں نکال کر سامنے رکھ دیں۔ ان پر ساگ بھی رکھا ہوا تھا۔ نندلال نے جو مکان میں پہلے سے بیٹھا تھا اور جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی مٹی میں سے پانی کا ڈول بھر کر درمیان میں رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ میرے پاس جو دھماکہ خیز محلول شیشی میں بند پڑا ہے وہ ان لوگوں کو کس طرح پلا سکوں گا مجھے محسوس ہوا کہ یہاں چھ گلاس بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک ڈول ہی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں اگر ڈول میں دھماکہ خیز محلول ڈال دوں تو یہ سارے کے سارے ڈول میں سے پانی پئیں۔ اگر میں محلول کے قطرے پانی کے مٹکے میں ڈال دیتا ہوں تب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے تخریب کار اس میں سے ایک ہی وقت میں پانی نکال کر پئیں گے۔

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا۔ اس وقت میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جو لوڈڈ سٹین گن مجھے دی گئی ہے میں اس سے کام لوں گا۔ اگر یہ رات کو سو گئے تو ان کی گردنیں توڑنے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال معاملہ تھوڑا مشکل اور خطرے والا ہو گیا تھا۔ روٹیاں کھانے کے بعد نندلال نے چارپائی کی دوسری طرف نیچے ہاتھ ڈال کر تام چینی کی ایک چینک اور چھوٹی چھوٹی چار پانچ پیالیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو میں تم لوگوں کے لئے باہر چولہے پر چائے بناتا ہوں"

میرے دل میں امید کی شمع ایک بار پھر روشن ہو گئی۔ یہ چائے کی چینک میرے مشن کی تکمیل کر سکتی تھی۔ میں اپنی برخورداری کے ثبوت کے لئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھاپا جی۔ میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔"

جیک نے کہا۔

"ٹھیک ہے نندلال۔ مرلی پرشاد چائے بنانے میں تمہاری مدد کرے گا۔"

نندلال نے بہت کہا کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں لیکن میں اس سے پہلے

کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ باہر چھوٹے سے کچے صحن میں ایک درخت کے نیچے اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ہینڈ پمپ بھی لگا تھا۔ نندلال نے چولہے میں پہلے سے خشک لکڑیاں اور گھاس ڈال رکھی تھی۔ اس نے آگ جلا دی۔ میں نے پمپ میں سے پانی نکال کر چینک کو صاف کیا اور اس میں آدھے سے زیادہ پانی ڈال کر لے آیا۔

"بھاپا جی دودھ کہاں ہے؟"

نندلال بولا۔

"دودھ نہیں ہے۔ دودھ کے بغیر چائے پئیں گے۔ اس طرح رات کو نیند بھی نہیں آئے گی۔ ہمیں صبح منہ اندھیرے بارڈر کراس کرنا ہے۔"

اس نے چینک چولہے کے اوپر رکھ دی۔ پھر جیب سے چائے کی پڑیا نکال کر اس میں چائے ڈال دی۔ اس دوران میں نے پیالیاں دھو ڈالی تھیں اور انہیں ایک چنگیر میں رکھ دیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیونکہ پیالیاں پانچ تھیں۔ ویسے تو مجھے پانچ پیالیوں کی ہی ضرورت تھی۔ لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ اگر جیک نے چائے کی اپنی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے مروت میں کہہ دیا کہ مرلی پرشاد پہلے تم چائے پئیو۔ میں بعد میں پی لوں گا تو میں کس طرح انکار کر سکوں گا۔ لیکن اب سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کمانڈو ایکشن کا وقت آ گیا تھا۔ ٹارگٹ میرے سامنے تھا۔ اب مجھے اٹیک کرنا تھا۔ یہ اٹیک کا وقت تھا۔ دھماکہ خیز محلول کی شیشی میری جیب میں تھی۔ میں چاہتا تھا کسی طرح نند لال وہاں سے ادھر ادھر ہو اور میں چینک میں محلول کے چند قطرے ڈال دوں۔ مگر وہ وہیں چولہے کے پاس اینٹ پر بیٹھا تھا۔ جب چائے ابلنے لگی تو مجھے موقع مل گیا۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر کہا۔

"بھاپا جی آپ اندر چلیں میں پیالیوں میں چائے ڈال کر لاتا ہوں۔"

نندلال اس وقت اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گرم چینک کو پکڑنے کے لئے کسی رومال کی تلاش میں تھا جو اسے نہیں مل رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں رومال دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے"

اور وہ کوٹھڑی میں چلا گیا۔ چولہا کوٹھڑی کی اوٹ میں تھا اور کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو چولہا نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا۔ جیب سے محلول کی شیشی نکالی۔ اس کا ڈھکن کھولا اور چائے کی چینک میں اس کے دس بارہ قطرے گرا دیئے۔ شیشی دوبارہ بند کر کے جیب میں رکھ لی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ گل خان نے یہ جو دھماکہ خیز محلول تیار کیا تھا اس کی خاصیت یہ تھی کہ وہ انسانی معدے میں جا کر معدے سے پیدا ہونے والے تیزابی مادے کے ساتھ مل کر ہی پھٹتا تھا۔ معدے میں جانے کے بعد بھی وہ ایک دم سے نہیں پھٹتا تھا بلکہ معدے کے تیزابی مادے سے مل کر دس منٹ کے عمل کے بعد پھٹتا تھا۔ ویسے اسے کھولتے ہوئے پانی میں بھی ڈال دیا جائے تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا کیمیاوی عمل صرف انسانی معدے کے تیزابی مادے کے ساتھ حل ہونے کے بعد پورا ہوتا تھا۔

میں نے پانچوں پیالیاں چائے سے بھر دیں۔ چینک وہیں چولہے کے پاس رہنے دی اور پیالیوں کی چنگیر اٹھا کر کوٹھڑی میں آ گیا۔ کوٹھڑی میں پانچوں تخریب کار بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نندلال ان لوگوں کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب میں اندر آیا تو وہ کہہ رہا تھا۔

"میں مرلی پرشاد کو پہلے گوالمنڈی لے کر خود جاؤں گا۔ ہمیں کوئی ایسی دکان تلاش کرنی ہو گی جہاں رنگ روغن کا سامان فروخت ہوتا ہو۔ اس طرح بم پھٹنے کے بعد تباہی زیادہ پھیلے گی۔"

میں نے چنگیر چارپائی پر رکھ دی۔ یہ لمحہ میرے لئے سب سے زیادہ ہیجان خیز لمحہ تھا۔ پانچوں پیالیوں میں ان لوگوں کی موت موجود تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ کوئی پیالی میں سے چائے پہلے پئے۔ کوئی بعد میں پئے اور کوئی بالکل ہی نہ پئے۔ پھر یہ مرحلہ بھی آنے والا تھا جب جیک نے رواداری سے کام لیتے ہوئے مجھے پہلے چائے پینے کی دعوت دینی تھی۔ میں اس کے آگے زیادہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بڑے عیار لوگ تھے۔ زیادہ انکار کرنے سے انہیں شک پڑ سکتا تھا کہ آخر میں چائے نہ پینے پر اتنا

اصرار کیوں کر رہا ہوں۔

سٹین گن میرے کاندھے سے لٹک رہی تھی۔ چائے کا میرا مشن فیل ہو جانے کی صورت میں مجھے سٹین گن سے اندھا دھند فائرنگ ہی کرنی تھی۔ جوابی فائرنگ میں میرے ہلاک ہو جانے کا امکان باقاعدہ موجود تھا۔ میں نے چنگیر میں سے پیالیاں اٹھا اٹھا کر انہیں دینی شروع کر دیں۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں نے جیک کی طرف پیالی بڑھائی تو اس نے کہا۔

"مرلی پرشاد! تم پہلے پیو گے۔ میں بعد میں پی لوں گا۔"

میں نے دو تین بار انکار کیا لیکن جب جیک کا اصرار بڑھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھاپا جی۔ جیسے آپ کی مرضی میں ہی پہلے پی لیتا ہوں۔"

میں پیالی ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس دوران وہ سارے آدمی مزے سے چائے پی رہے تھے۔ میں نے پیالی ہونٹوں کے پاس لے جا کر جلدی سے نیچے رکھ دی اور کہا۔

"بڑی گرم چائے ہے۔ میں چائے کو ذرا ٹھنڈی کر کے پیتا ہوں۔"

جیک میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لاؤ میں ٹھنڈی کر دیتا ہوں۔"

اس نے میری پیالی ہاتھ میں لے کر اس میں تین چار پھونکیں ماریں اور پیالی مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اب پی جاؤ۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ جلدی پیالی خالی کرو۔ مجھے بھی پینی ہے۔"

میرے پاس صرف دس منٹ تھے۔ چاروں تخریب کار جیک کے سوائے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہے تھے۔ ان کی موت کی الٹی گنتی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پیالی دوبارہ اٹھا لی۔ مجھے کسی حالت میں یہ چائے نہیں پینی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے ایک سیکنڈ میں ہی سوچ لیا تھا۔ جیک اس وقت تخریب کار نندلال سے کچھ کہہ رہا

تھا۔ نندلال چائے کی آدھی پیالی خالی کر چکا تھا۔ ان چاروں کے معدے میں چائے کے ساتھ دھماکہ خیز مواد پہنچ چکا تھا اور اس نے معدے کے تیزابی مادے سے مل کر اپنا کیمیاوی عمل شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک دم ہاتھ کے اشارے سے جیک اور نندلال کو اس انداز میں خاموش رہنے کو کہا جیسے مجھے باہر کوئی آواز سنائی دی ہو۔ جیک نے میری طرف دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے چائے کی پیالی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"شی۔ باہر کوئی ہے"

اس کے ساتھ ہی میں سٹین گن ہاتھوں میں تھام کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے آپ کو موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ صحن میں آتے ہی میں دوڑ کر درختوں میں چلا گیا۔ یہاں چاندنی نہیں تھی۔ اندھیرا تھا۔ میں کوٹھڑی سے کوئی سو فٹ دور ایک درخت کے نیچے اس طرح بیٹھ گیا کہ میری سٹین گن کا رخ کوٹھڑی کے دروازے کی طرف تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیک اور نندلال بھی اسلحہ لے کر ضرور باہر نکلیں گے۔ مجھے نند لال کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو دھماکے سے پھٹنے والا تھا۔ مجھے جیک یعنی اپنے پارٹی لیڈر کی فکر تھی۔ اس نے دھماکہ خیز چائے نہیں پی تھی۔ اور اس کے پاس سٹین گن بھی تھی۔ میں سانس روکے سٹین گن کا رخ کوٹھڑی کی طرف کئے ان تخریب کاروں کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

کوٹھڑی کے اندر پانچ آدمی تھے۔

چار کو دھماکے سے اڑنا تھا۔ اگر جیک یعنی تخریب کار پارٹی کا لیڈر باہر نہ بھی نکلتا تو میرے، اندازے کے مطابق چار آدمیوں کے دھماکے میں اس کا بھی اڑ جانا یقینی تھا۔ کیونکہ اس دھماکہ خیز مواد کی تباہی کی شدت کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ صرف جیک نے چائے نہیں پی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ کوٹھڑی سے میرے نکل آنے کے بعد ہو سکتا ہے اس نے چائے کی پیالی میں سے ایک آدھ گھونٹ بھر لیا ہو۔ کسی آدمی کو دھماکے سے اڑانے کے لئے اس چائے کا ایک گھونٹ ہی کافی تھا۔ لیکن میں اندھیرے میں درخت کی اوٹ میں گھات لگا کر تیار بیٹھا تھا کہ اگر جیک دس منٹ کے اندر اندر ہلاک نہ ہوا تو میں اسے سٹین گن کے ایک ہی برسٹ سے بھون ڈالوں گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دس منٹ گزر چکے ہیں یا نہیں۔ اتنے میں کوٹھڑی میں سے ایک آدمی باہر نکل آیا۔ کوٹھڑی کے آگے صحن میں زرد چاند کی پھیکی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ نندلال تھا۔ اس نے میرے سامنے چائے پی تھی۔ اس کا جسم دھماکے سے پھٹنے کے قریب تھا۔

ساتھ ہی ہمارا پارٹی لیڈر جیک بھی آگیا۔ جیک کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ نندلال نے مجھے آواز دی۔

"مرلی پرشاد!"

میں درخت کے پیچھے دبک کر بیٹھا رہا۔ تین ہندو تخریب کار کوٹھڑی کے اندر ہی

تھے۔ نندلال نے ایک بار پھر مجھے آواز دی۔

"مرلی! کہاں ہو تم؟"

پھر اس نے جیک سے کہا۔

"مجھے معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔ جیک"

گل خان نے مجھے بتایا تھا کہ اس بار اس نے دھماکہ خیز محلول کا وقت تھوڑا بڑھا کر پانچ منٹ سے دس منٹ کر دیا ہے۔ یعنی پہلے یہ مواد پانچ منٹ میں پھٹ جاتا تھا مگر اب اسے پھٹنے میں دس منٹ لگتے تھے۔ مجھے پسینہ آگیا۔ کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ یا خدا کہیں گل خان کا تجربہ فیل تو نہیں ہو گیا۔

اس دوران ایک اور تخریب کار کوٹھڑی سے باہر آگیا۔ اس نے باہر آتے ہی پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے لالہ؟"

ابھی یہ فقرہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ ایک دھماکہ ہوا۔ پھر دوسرا دھماکہ ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے نندلال اور اندر سے جو تخریب کار باہر آیا تھا دونوں کے جسم پھٹ کر آگ کے شعلوں کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔ جیک اچھل کر ایک طرف گرا۔ وہ گرتے ہی اٹھا اور گھبراہٹ میں وہ سیدھا ان درختوں کی طرف دوڑ پڑا جہاں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جیک میری زد میں تھا۔ ٹریگر پر میری انگلی کا دباؤ پڑا اور سٹین گن سے پورا برسٹ نکل کر جیک کے جسم کو چھلنی کر گیا۔ وہ منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کے اندر دو دھماکے ایک ہی وقت میں ہوئے اور کوٹھڑی کی چھت اور دروازہ اڑ گئے۔ اندر سے شعلوں کا بادل اٹھ کر آسمان کی طرف ایسے بلند ہوا جیسے اندر کوئی چھوٹا ایٹم بم پھٹ گیا ہو۔ اس کے فوراً بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر کر جل رہے تھے۔ میں انڈین بارڈر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بلکہ بارڈر کے اوپر ہی بیٹھا تھا۔ بھارتی باؤنڈری سیکورٹی فورس کے سپاہیوں نے اس دھماکے کی آواز اگر سن لی تھی تو وہ ضرور اس طرف آ رہے ہوں گے اس لئے میرا وہاں ٹھہرنا مجھے ایک نئی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ

جیک کی لاش کو دیکھ کر تسلی کی کہ وہ زندہ تو نہیں ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ سٹین گن کی گیارہ بارہ گولیاں اس کے جسم کو ادھیڑ کر دوسری طرف سے نکل گئی تھیں۔ اس کی لاش خون میں لت پت اوندھی پڑی تھی۔ میں نے سٹین گن کاندھے سے لٹکائی اور دھندلی چاندنی والی رات میں واپس جموں شہر کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔

میری سٹین گن میں ابھی بہت گولیاں باقی تھیں۔ آدھے سے زیادہ اس کا میگزین بھرا ہوا تھا۔ میں اسی راستے پر چلا جا رہا تھا جس راستے پر پارٹی لیڈر جیک ہمیں لے کر آیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد کا بچا ہوا محلول میری جیب میں شیشی میں محفوظ پڑا تھا۔ میں اس کی کارکردگی پر بے حد خوش تھا۔ یہ کمال کی چیز ہمارے ماسٹر سپائی اور ایکسپلوسیوز کے ماہر گل خان نے بنائی تھی۔ میں پہلے تیز تیز چل رہا تھا۔ چاند تھوڑا اوپر آکر ایک طرف ٹیلے کے پیچھے ہو گیا۔ ماحول پر اندھیرا چھا گیا۔ اس خیال سے کہ یہ بارڈر کا علاقہ ہے مجھے یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہئے۔ میں نے جوگنگ کے انداز میں دوڑنا شروع کر دیا۔

جب میں جائے واردات سے کافی دور نکل گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر تھوڑا سانس لیا اور دوبارہ چل پڑا۔ اب میں نارمل رفتار سے جا رہا تھا۔ میں ٹھیک ان راستوں سے ہو کر گزر رہا تھا جن راستوں سے جیک ہمیں لے کر آیا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ پھر آسمان پر مشرق کی جانب نیلی روشنی کا غبار سا پھیلنے لگا۔ یہ صبح کاذب کی روشنی تھی۔ صبح کاذب کی روشنی اس روشنی کو کہتے ہیں جو صبح ہونے سے بہت پہلے مشرقی افق پر نمودار ہوتی ہے۔ اس کو کاذب اس لئے کہتے ہیں کہ یہ جھوٹی ہوتی ہے۔ یعنی لگتا ہے صبح ہو گئی ہے مگر ابھی صبح نہیں ہوئی ہوتی۔ عربوں نے صبح کی روشنیوں کے مختلف مدارج کے الگ الگ نام رکھے ہوئے ہیں۔ میں اس گاؤں کے قریب سے بھی گزر گیا جہاں سے جیک ہمارے لئے لسی اور جوار کی روٹیاں لایا تھا۔ میں اس گاؤں سے آگے پہنچا تو صبح کاذب کے بعد صبح صادق کی نورانی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میں نے ایک پہاڑی نالے منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑا پانی پیا اور اس کچی پگ ڈنڈی پر آگیا جو اونچے اونچے جوار کی فصل کے کھیتوں میں چلی جاتی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ابھی جموں کافی دور ہے اور اگر میں پیدل چلتا رہا تو مجھے مزید ایک دن ان پہاڑیوں اور میدانوں میں سے چلنا پڑے گا۔ جس طرح کہ ہم آتی دفعہ چل کر آئے تھے۔ میرے پاس اس سفر کو مختصر کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ دن کے وقت کسی جگہ چھپ کر سو جاؤں گا۔ تین چار گھنٹے سو کر پھر آگے چلوں گا۔ جب سورج نکل آیا اور چاروں طرف روشنی ہو گئی تو میں نے کھڑے ہو کر جائزہ لیا کہ میں کہیں اصل راستے سے بھٹک تو نہیں گیا۔ کچھ درختوں اور دو ایک چھوٹے ٹیلوں کو میں نے پہچان لیا۔ میں ٹھیک سمت جا رہا تھا۔

میری جیب میں انڈین کرنسی میں کچھ پیسے ضرور تھے مگر ہمیں غیر آباد راستوں سے بارڈر تک لایا گیا تھا۔ یہ ایسے راستے تھے جہاں لاریاں تانگے وغیرہ نہیں چلتے تھے۔ ورنہ میں کسی لاری یا یکے میں سوار ہو کر جموں جلدی پہنچ سکتا تھا۔ چلتے چلتے میری بائیں طرف آموں کا ایک گھنا باغ آگیا۔ یہ باغ ویران پڑا تھا۔ چونکہ آموں کی فصل کا موسم نہیں تھا اس لئے باغ میں کسی رکھوالے وغیرہ کا کوئی جھونپڑا نہیں تھا۔ ایک جگہ زمین تھوڑی صاف تھی۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میں خطرے کے مقام سے بہت دور نکل آیا ہوں اب بارڈر سکیورٹی فورس کے آدمی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے چنانچہ مجھے بڑی جلدی نیند آگئی۔

سو کر اٹھا تو سورج درختوں کے اوپر آگیا ہوا تھا۔ میں نے آم کے باغ سے باہر آکر دیکھا۔ دور سے مجھے وہ پہاڑ نظر آئے جن کی دوسری طرف جموں شہر تھا۔ ان پہاڑوں کو میں ایک دن پہلے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ کر ان کی نشانی دل میں لگا چکا تھا۔ میرے سامنے ویران میدان پھیلا ہوا تھا۔ میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ چھوٹا سا کنواں آیا۔ یہ کنواں شاید اسی لئے بنایا گیا تھا کہ آتے جاتے مسافر یہاں اپنی پیاس بجھا سکیں۔ کنوئیں کے اوپر چرخی کے ساتھ ٹین کا ڈونگا لٹک رہا تھا۔ میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ نیم پہاڑی علاقے کے کنوئیں بھی کافی گہرے ہوتے ہیں اور پانی کافی گہرائی میں جا کر نکلتا ہے۔

میں نے ڈونگا کنوئیں میں ڈال کر پانی نکالا۔ پانی صاف اور میٹھا تھا۔ مجھے بھوک ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر پیاس کی شدت زیادہ تھی۔ میں نے پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر آگے کو چل پڑا۔ دوپہر کے بعد قریباً تیسرے پہر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ایک جگہ امرودوں کا باغ دیکھا۔ یہ جنگلی امرودوں کا باغ تھا۔ درختوں پر کچے پکے امرود لگے تھے۔ میں نے چار پانچ پکے ہوئے امرود توڑ کر کھالئے۔ شام ہو رہی تھی کہ مجھے دور جموں شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جس وقت میں جموں شہر کے مضافات میں سے گزر رہا تھا تو رات ہو گئی تھی۔ دریا کی دونوں جانب شہر کی روشنیاں اونچی نیچی ڈھلانوں پر جھلملا رہی تھیں۔ یہاں میں نے ایک تانگہ لیا اور اس ہوٹل میں آگیا جہاں ہم سب نے ایک رات اور ایک دن گزارا تھا۔ ہوٹل والا میری صورت سے آشنا تھا۔ میں نے وہی کمرہ لے لیا جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ کمرے میں آکر میں نے جوتے اتار کر پھینکے۔ پاؤں دھوئے۔ اور بستر پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ دروازے کو میں نے اندر سے کنڈی لگالی تھی۔ ایسا سویا کہ دوسرے دن صبح کے وقت آنکھ کھلی۔ اٹھ کر غسل کیا۔ ناشتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ دلی جانے والی جموں توی ایکسپریس نکل چکی ہے اب دوپہر کو ایک پسنجر ٹرین جالندھر جائے گی۔ میں دوپہر تک ہوٹل ہی میں رہا۔ دوپہر سے ذرا پہلے ہوٹل سے نکلا اور سیدھا جموں کے ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ میں کوئی گولہ بارود کا ذخیرہ اڑا کر نہیں آیا تھا کہ جس کا لرزہ خیز دھماکہ ہوا ہو اور آس پاس کے لوگوں کو پتہ چل گیا ہو۔ بڑے آرام سے پانچ پاکستان دشمن بھارتی تخریب کاروں کو جہنم میں پہنچا دیا تھا چھوٹے چھوٹے محدود قسم کے چار دھماکے ہوئے تھے۔ چار تخریب کاروں کے جسم ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اور ایک تخریب کار کو سٹین گن کا برسٹ مار کر موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اگرچہ بارڈر کے قریب کا علاقہ تھا مگر دھماکوں کی آواز زیادہ دور تک نہیں گئی تھی اس لئے میں قدرے مطمئن تھا کہ پولیس یا خفیہ پولیس کا کوئی آدمی میری تلاش میں نہیں ہوگا۔

میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین جالندھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ایک

مرمت ہو رہا تھا۔ یہ صبح ہی ایک طرف سے کھولا گیا تھا۔ وہاں گاڑی نے دو گھنٹے لگا دیئے جالندھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ یہاں سے رات کو دلی جانے والی گاڑی ملی۔ دلی پہنچا تو صبح کاذب کا وقت ہو رہا تھا۔ سٹیشن پر اترتے ہی سیدھا بستی نظام الدین اولیاؒ کی طرف روانہ ہو گیا۔ موٹر رکشے نے جلدی پہنچا دیا۔ مغل شہزادے کی خانقاہ کے قریب سے ہوتا ہوا گل خان کے پرانے مکان میں آکر خفیہ جگہ سے چابی نکالی۔ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ دروازے کو کنڈی لگائی اور جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔

ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر کے اوپر سے ایک من کا بھاری وزن اتار دیا ہو۔ میرا کمانڈو مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ پانچوں تخریب کاروں کو لاہور میں متعین بھارتی تخریب کار سمیت میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اب سب سے مشکل مرحلہ آگے آرہا تھا۔ وہ مرحلہ یہ تھا کہ میں اگر دلی کے قلعے والے تخریب کار ٹریننگ سنٹر میں گیا تو سنٹر کے چیف کو کیا بتاؤں گا کہ میرے ساتھیوں کا کیا انجام ہوا۔ اگر وہ مارے گئے تو کیسے مارے گئے۔ کس نے انہیں مارا؟ اور اگر وہ مارے گئے تو میں کیسے زندہ بچ گیا۔ ضروری امر تھا کہ انہیں مجھ پر شک پڑتا کہ کہیں پاکستان کا جاسوس تو نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں پروفیسر اور گل خان سے مشورہ بہت ضروری تھا۔

جب ذرا دن چڑھا تو میں نے بستی نظام الدین کے گیٹ کے قریب جو ٹیلی فون بوتھ تھا وہاں سے گل خان کو فون کیا اور اسے کوڈ الفاظ میں بتایا کہ میں آگیا ہوں۔ گل خان نے کہا کہ وہ پہنچ رہا ہے۔

ایک گھنٹے بعد گل خان اور پروفیسر جمشید دونوں میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ساری روداد سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پروفیسر عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم نے سب کچھ جلدی میں کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں ان کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہئے تھا۔ اگر پاکستان جا کر تم انہیں ہلاک کرتے تو بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ اب معاملہ مشکوک ہو گیا ہے۔“

گل خان نے بھی پروفیسر کی تائید کی۔ میں نے کہا۔

"اگر میں ان کے ساتھ پاکستان چلا جاتا تو انہیں ہلاک کرنے کے بعد مجھے واپس آنے میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ پاکستان کا بارڈر کراس کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

پروفیسر جمشید نے گل خان کو مخاطب کر کے کہا۔

"گل خان! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کا واپس ان لوگوں کے پاس جانا مناسب رہے گا جنہوں نے اسے پارٹی کے ساتھ تخریب کاری کے واسطے پاکستان بھیجا تھا؟"

گل خان تھوڑی دیر غور کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اسے ان کے پاس نہیں جانا چاہئے۔ چاہے کیسی ہی کہانی گھڑ کر انہیں کیوں نہ سنائے ان لوگوں کو شک پڑنا ضروری ہے۔ یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ ساری پارٹی ختم ہو جائے اور ہمارا کمانڈو دوست زندہ واپس آجائے اور وہ بھی بھارتی سرزمین پر یہ واقعہ پیش آئے۔"

میں نے کہا۔

"میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم پاکستان کا بارڈر کراس کر رہے تھے کہ پاکستانی رینجرز سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہم نے بھی فائرنگ کی ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا۔ میرے ساتھی مارے گئے اس فائرنگ میں، اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکل آیا۔"

پروفیسر نے کہا۔

"میرا خیال ہے لکشمی دیال بڑا کائیاں آدمی ہے۔ وہ تمہاری کہانی پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اب تخریب کاروں کے ٹریننگ سنٹر کو بھول جاؤ۔"

میں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن پروفیسر برائی کی جڑ تو اپنی جگہ پر قائم ہے۔ میں نے آج ان کے پانچ تخریب کار ہلاک کئے ہیں تو کل وہاں سے مزید پانچ تخریب کار تیار ہو کر پاکستان سمگل کر دئے جائیں گے۔ میں تو برائی کو جڑ سے کاٹنا چاہتا ہوں۔ میں اس ٹریننگ سنٹر کو اس کے چیف

لکشمی دیال اور انسٹرکٹر کالی داس سمیت بم سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"

گل خان بولا۔

"میرا خیال ہے تم ایک بار تخریب کاروں کے ٹریننگ سنٹر ضرور جاؤ۔ نہیں جاؤ گے تو لکشمی دیال اور رحیم بخش کے آگے میری پوزیشن خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ کانگریسی مسلمان رحیم بخش نے تمہیں میری سفارش پر وہاں بھرتی کرایا تھا۔ ایک بار تم جا کر وہاں جو ڈرامہ کرنا ہے ضرور کرو۔ اس طرح میری پوزیشن تھوڑی محفوظ ہو جائے گی۔ اگر لکشمی دیال اور کالی داس نے واقعی تمہاری کہانی پر یقین کر لیا تو اس کے بعد تم بے شک ٹریننگ سنٹر کو بم سے اڑا کر روپوش ہو جانا۔"

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں"

میں نے گل خان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ گل خان نے اس سلسلے میں پروفیسر جمشید سے مشورہ مانگا تو وہ آنکھوں پر عینک جماتے ہوئے کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ ڈرامہ کرنا میرے خیال میں ضروری ہو گیا ہے۔"

گل خان نے مجھے کہا۔

"تو پھر تمہیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ تم ابھی وہاں چلے جاؤ۔ دوپہر کے بعد لکشمی دیال تمہیں ٹریننگ سنٹر میں شاید نہ ملے۔ مگر اپنا حلیہ ذرا خراب کر کے جانا۔ یہ تمہاری ذہانت کا امتحان ہے۔ اگر تم نے اچھی طرح سے اداکاری کی تو میرا خیال ہے تم ان لوگوں کو یقین دلانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہم رات کو یہاں آئیں گے۔ تم بھی اندھیرا ہونے کے بعد یہاں آکر رپورٹ کرنا۔ اب ہم جاتے ہیں تم ہمارے جانے کے تھوڑی دیر بعد یہاں سے نکل جانا۔ تمہیں ٹریننگ سنٹر کے راستے کا پتہ ہے ناں؟"

"بالکل پتہ ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد گل خان اور پروفیسر جمشید چلے گئے۔ میں نے سب سے پہلے تو دھماکہ خیز

محلول والی شیشی جیب سے نکال کر اپنے پلنگ کے نیچے چھپائی۔ پھر آئینے میں اپنی شکل
دیکھی۔ لمبے سفر کی وجہ سے میرے چہرے پر تھکان کے آثار موجود تھے۔ میں نے بالوں کو
تھوڑا اور پریشان کیا۔ کپڑے وہی رہنے دیئے۔ مکان کو تالا لگایا۔ چوک سے موٹر رکشہ
اور تخریب کاری کے ٹریننگ سنٹر کی طرف چل پڑا۔ کافی فاصلہ تھا۔ پون گھنٹے بعد رکشہ
پرانے قلعے کے کھنڈر والے ٹریننگ سنٹر کے باہر پہنچا۔ باہر وہی راشٹریہ سیوک سنگھ کا
بورڈ لگا تھا۔ میں سیدھا لکشمی دیال کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"مرلی پرشاد! تم اتنی جلدی کیسے واپس آگئے جیک کہاں ہے؟"

آپ کو معلوم ہی ہو گا جیک اس ہندو کا دوسرا نام تھا جس کی راہ نمائی میں ہم
نندلال کے پاس بارڈر پر پہنچنا تھا۔ جیک کو واپس آجانا تھا۔ اور مجھے دوسرے تخریب
کاروں کے ساتھ پاکستان کا بارڈر کراس کر کے لاہور جانا تھا۔ میں نے لکشمی دیال کے
کمرے میں انٹر ہوتے ہی اداکاری شروع کر دی تھی۔ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں
نے بڑے مایوسی کے انداز میں اسے ساری کہانی بیان کر دی کہ کس طرح جب ہم لوگ
پاکستان کا بارڈر کراس کر رہے تھے تو اچانک ایک طرف سے پاکستانی رینجرز کی جیپ آئی
اور اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ نندلال اور جیک کے پاس ایک ایک سٹین گن تھی
انہوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ مگر ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا۔ ہم انڈیا کے بارڈر کی
طرف بھاگے۔ مگر پاکستانی رینجرز نے ہمارا پیچھا کیا۔ وہ ہم پر برابر گنیں فائر کر رہے تھے
میرے دیکھتے دیکھتے نندلال جیک اور باقی ساتھیوں کو گولیاں لگیں اور وہ گر کر لڑکھڑانے لگے
پاکستانی رینجرز میری طرف فائرنگ کرتے دوڑے۔ میں نے ایک کھائی میں چھلانگ لگا دی
اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔

"مجھے نہیں پتا میں کیسے جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ ورنہ میرا بچنا ناممکن تھا۔
کھائی سے نکل کر جموں کی طرف منہ کر کے دوڑتا چلا گیا۔ انڈیا کے بارڈر میں داخل ہو کر
جان میں جان آئی۔"

میں نے گہری آہ بھر کر کہا۔

"مجھے اپنے ساتھیوں کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ بڑا دکھ ہے۔ کاش میں بھی ان کے
ساتھ ہی مر جاتا۔"

اور یقین کریں میں تھوڑی سی کوشش کے بعد آنکھوں سے آنسو جاری کرنے میں
کامیاب ہو گیا۔ اس دوران وہاں انسٹرکٹر کالی داس بھی آگیا تھا۔ دونوں میری من گھڑت
کہانی بڑے غور سے سن رہے تھے۔ میں ساتھ ساتھ ان کے چہروں کا بھی جائزہ لیتا جاتا
تھا۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ بالکل سپاٹ چہرے ہو گئے تھے۔ کبھی مجھے
محسوس ہوتا کہ انہیں میری کہانی پر پورا یقین ہو گیا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ وہ میری کہانی کو
محض ایک ڈرامہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ہاتھ باندھ کر اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سر! میں آپ کا دوشی ہوں۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں
مرا۔ میرے پیارے ساتھی سورگباش ہو گئے اور میں زندہ وہاں سے بھاگ آیا۔ مگر میرے
پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ میں پاکستانی رینجرز کی فائرنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں آپ
کے سامنے پیش ہو گیا ہوں۔ اب آپ کی مرضی ہے۔ مجھے جو چاہے سزا دیں۔ مجھے کوئی
اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر آپ مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہیں تو بے شک شوٹ کر دیں۔ میں
اپنے پیارے ساتھیوں کی موت کے بعد خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

اور میں بات ختم کرنے کے بعد ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
اس وقت مجھے اپنی پیاری بہن یاد آگئی تھی جس کو 1947ء میں ایک سکھ نے تلوار مار کر
شہید کر دیا تھا۔ میری آنکھوں سے صرف اپنی بہن کو یاد کر کے آنسو جاری تھے۔ لکشمی
دیال کرسی چھوڑ کر میرے قریب آکر ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے کاندھے کو
تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"مرلی پرشاد! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب رونے سے تو وہ لوگ واپس نہیں آجائیں گے۔
اس قسم کے واقعات تو ہمارے ساتھ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب تم اگلے مشن کی تیاری
کرو۔"

میں نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"سر! میں بالکل تیار ہوں۔ مجھے حکم دیا جائے کہ اگلا مشن کب روانہ ہوگا۔ میں سب سے پہلے پاکستان کا بارڈر کراس کروں گا۔"

اس پر تخریب کاروں کا متعصب ہندو انسٹرکٹر کالی داس بولا۔

"ابھی تم اوپر والے کمرے میں جا کر نہا دھو کر آرام کرو۔ رات کو تمہیں اگلے مشن کے بارے میں تفصیل سے بتایا جائے گا۔"

میں دل میں بے حد خوش بھی ہوا اور مطمئن بھی ہو گیا کہ میری اداکاری کامیاب ثابت ہوئی ہے اور جس بات کا خطرہ تھا وہ ٹل گیا ہے۔ آج بھی جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اتنا اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو اور چہرہ شناس ہونے کے باوجود ان لوگوں کے دل کا حال ان کے چہروں سے نہ پڑھ سکا۔

میں قلعے کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں آگیا۔ یہاں پانی کے نل کے نیچے نہانے کے لئے بالٹی ڈونگا پڑا تھا۔ میں نہا کر تازہ دم ہو گیا۔ اتنے میں انسٹرکٹر کالی داس اوپر میرے پاس آگیا۔ اس نے مجھے جیب سے سگریٹ نکال کر دیا۔ کہنے لگا۔

"دو سال پہلے بھی اسی طرح پاکستانی رینجرز کے ساتھ جھڑپ میں ہماری پارٹی کے سات آدمی مارے گئے تھے۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کبھی پوری کی پوری پارٹی بارڈر کراس کر جاتی ہے اور کبھی بارڈر کراس کرانے والے تجربہ کار گائیڈ کے ہوتے ہوئے بھی اچانک بارڈر فورس سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے اور ہمارے آدمی کچھ مارے جاتے ہیں کچھ بھاگ کر واپس آجاتے ہیں۔"

میں نے کالی داس کو اپنی پارٹی کی پاکستانی رینجرز کے ساتھ جھڑپ کی جھوٹی کہانی بڑی تفصیل کے ساتھ سنائی۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ پھر بولا۔

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہے بھیا۔ تم تو پہلی دفعہ بارڈر کراس کر رہے تھے۔ ہم تو اپنے اگروادی (تخریب کار) پاکستان بھیجتے ہی رہتے ہیں۔"

اس وقت میں نے دل میں باقاعدہ طے کر لیا کہ اب ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ یہ لوگ پاکستان کے بڑے خطرناک دشمن ہیں۔ ایسے دشمن جو پاکستان کے

شہروں میں اپنے تخریب کار بھیجنے سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کیا سکیم بنا رہا ہوں اور ان لوگوں نے میرے خلاف کیا سکیم تیار کر رکھی ہے۔ کالی داس جانے لگا تو بولا۔

"تم نیچے رسوئی میں جا کر بھوجن کر لو۔ اس کے بعد تمہیں اگلی پارٹی کے لیڈر سے ملاقات کراؤں گا۔"

میں نیچے رسوئی میں آگیا جہاں ایک ہندو باورچی گرم گرم پھلکے بنا رہا تھا۔ ایک پتیلے میں دال تھی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ پھر اوپر اسی کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اتنے دنوں سے سفر کرتا آیا تھا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو کمرے کی بتی جل رہی تھی اور کالی داس انسٹرکٹر مجھے آہستہ آہستہ ہلا کر جگا رہا تھا۔

"مرلی پرشاد! او مرلی پرشاد۔ اٹھو"

"جی مہاراج!"

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کالی داس مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"نیچے آؤ۔ تمہیں نئی پارٹی کے لیڈر سے ملاؤں۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پارٹی کب پاکستان جا رہی ہے سر؟"

میں بڑا خوش تھا کہ ایک اور تخریب کار پارٹی کو نیست و نابود کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ کچھ نہیں تو اس پارٹی میں چار پانچ ہندو تخریب کار تو ضرور ہوں گے۔ کالی داس بولا۔

"تمہارے سمیت چار آدمی ہوں گے۔ مگر اس بار تم امرتسر اٹاری والے بارڈر سے پاکستان میں داخل ہو گے۔"

"ٹھیک ہے سر!"

وہ مجھے تخریب کاری کے ٹریننگ سنٹر کے چیف لکشمی دیال کے کمرے میں لے آیا۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ اس نے مجھے چائے بنا کر دی اور بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تمہارے ساتھ تین اور آدمی ہوں گے۔ یہ بڑے پرانے سمگلر ہیں اور بارڈر کراس کرتے رہتے ہیں۔ اس بار یہ پاکستان میں ہمارے لئے بموں کے دھماکے کرنے جا رہے ہیں۔ ہم انہیں بھاری رقم ادا کر رہے ہیں۔ ویسے بھی چونکہ وہ ہماری طرح ہندو ہیں اسی لئے پاکستان کے خلاف تخریب کاری پر بڑی آسانی سے تیار ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم انہیں معاوضہ بھی دیں گے۔ تم اس پارٹی کے لیڈر ہو گے۔"

میں دل میں بے حد خوش ہوا کہ یہ لوگ مجھ پر کس قدر اعتماد کر رہے ہیں۔ میری اداکاری واقعی کام کر گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"سر! آپ کا دھنواد ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس بار میں پاکستان جا کر وہ تباہی مچاؤں گا کہ وہاں کے لوگ مدتوں یاد کریں گے۔"

لکشمی دیال نے کالی داس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"کالی داس! ہمیں ایسے جوان چاہئیں جو شیواجی مرہٹہ کا رول ادا کر سکیں"

وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"تینوں آدمی رات کو یہاں پہنچ جائیں گے۔ تمہاری پارٹی رات کے ٹھیک بارہ بجے یہاں سے ایک خاص ٹرک میں امرتسر کی طرف روانہ ہو گی۔ ریل گاڑی میں ہم تمہیں اس لئے نہیں بھیج رہے کہ ہم اس مشن کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ امرتسر سے تمہیں ایک گاؤں میں لے جایا جائے گا۔ وہاں تمہیں ٹرک چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔ آگے ایک سکھ سمگلر تم لوگوں کو ایک خاص جگہ سے بارڈر کراس کرائے گا۔ اور پاکستان کے اندر ایک خفیہ جگہ پر لے جائے گا جہاں ہمارا آدمی تمہیں بتائے گا کہ تم لوگوں نے پاکستان کے کس کس شہر میں بموں کے دھماکے کرنے ہیں۔ کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ سکتے ہو"

میں نے کہا۔

"سر! سب ٹھیک ہے۔ میں تو ابھی روانہ ہونے کے لئے تیار ہوں"

لکشمی دیال اٹھ کر میرے پاس آیا۔ میرے شانے کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"شاباش! ہمیں تمہارے ایسے اگروادی اور پاکستان کے دشمن چاہئیں۔ ابھی تم جا کر

آرام کرو۔ جب وہ آدمی آئیں گے تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔"

میں نمسکار کر کے اوپر کمرے میں آ گیا۔ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ مجھے ایک بار پھر پاکستان کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موقع مل رہا ہے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ میرے پاس دھماکہ خیز محلول کی شیشی نہیں تھی۔ اس دفعہ مجھے ان لوگوں کو دوسری طرح سے ہلاک کرنا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ ایک تجربہ کار کمانڈو کے پاس اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے واسطے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ میں سگریٹ پیتا اور سوچتا رہا کہ اس بار ان تخریب کاروں کو کس طرح ہلاک کروں گا۔

اتنے میں انسٹرکٹر کالی داس بھی آ گیا۔ وہ مجھ سے ہمارے نئے مشن اور نئی پارٹی کے آدمیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے خاص طور پر کہا۔

"مرلی پرشاد! تمہارے ساتھ جو آدمی جا رہے ہیں۔ یہ لوگ پیشہ ور سمگلر ہیں۔ تمہیں ان پر نگاہ رکھنی ہو گی۔ پاکستان پہنچ کر ان لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑنا۔ اپنی نگرانی میں ان سے بم لگوانا۔"

میں نے بڑی شان سے کہا۔

"سر! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں ان کی پوری نگرانی کروں گا اور ان پر کڑی نگاہ رکھوں گا۔ ہر ایک سے اس کی ڈیوٹی پوری لوں گا۔"

"شاباش!"

کالی داس نے وہیں چائے منگوالی۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ کالی داس کہنے لگا۔

"تم اس بار پہلا بم کا دھماکہ لاہور کے ریلوے سٹیشن پر کرو گے۔ ہم نے گوالمنڈی میں بم دھماکے کا پروگرام تبدیل کر دیا ہے۔ وہاں تم دو دن بعد دھماکہ کرو گے"

میں نے بڑے مصنوعی جوش کے ساتھ کہا۔

"سر! میں تو سب سے پہلے گوالمنڈی میں دھماکہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہیں میرے ماتا پتا جل کر مر گئے تھے۔"

کالی داس نے میری بات ٹوک کر کہا۔

"مر گئے تھے نہ کہو۔ سورگباش ہو گئے تھے کہا کرو"

فوراً مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اصل میں میں مسلمان تھا۔ اگرچہ میں نے ہندو کا روپ دھار رکھا تھا مگر میں بولتے وقت ان لوگوں کے خاص خاص موقع پر بولے جانے والے خاص الفاظ بھول جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"سورگباش ہو گئے تھے۔"

اس طرح اپنے نئے مشن پر گفتگو کرتے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ نیچے سے ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ باہر سے تینوں مہمان آگئے ہیں۔ کالی داس بولا۔

"جلدی سے نیچے آجاؤ۔ کوئی خاص چیز ساتھ لے جانی ہے تو وہ بھی لے لو۔ تمہیں یہیں سے امرتسر اٹاری بارڈر کی طرف روانہ ہونا ہے"

نیچے لکشمی دیال کے کمرے میں تین دیہاتی قسم کے آدمی بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں پرنام کیا۔ لکشمی دیال نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"مرلی پرشاد! یہ تمہاری پارٹی کے آدمی ہیں"

پھر اس نے ان سب کے باری باری نام بتائے۔ سب نے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ لکشمی دیال انہیں سمجھانے لگا۔

"مرلی پرشاد تمہارا پارٹی لیڈر ہو گا تمہیں اس کی ہر بات اس کا ہر حکم ماننا ہو گا۔ جیسے یہ کہے گا تم ویسے ہی کرو گے"

تینوں آدمیوں نے سر ہلاتے ہوئے باری باری کہا۔

"صاحب ہم ایسا ہی کریں گے جیسا یہ لیڈر ہمیں بتائے گا۔"

تینوں آدمی پکی عمر کے تھے اور چہرے مہرے سے بڑے تجربہ کار اور چالاک لگ رہے تھے۔ ہم نے وہیں بیٹھ کر چائے پی۔ باہر کسی ٹرک کے قلعے کے احاطے میں داخل ہونے اور پھر رکنے کی آواز آئی۔ کالی داس نے کہا۔

"ٹرک آگیا ہے۔ بھگوان کا نام لے کر چل پڑو۔"

ہم باہر نکل آئے۔ لکشمی دیال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راز داری سے کہا۔

"مرلی! امرتسر کے قریب گاؤں میں جہاں یہ ٹرک تم لوگوں کو چھوڑ دے گا وہاں تمہیں ہمارا خاص آدمی ملے گا اس کا نام ہربجن سنگھ ہے۔ وہاں سے تمہارا پارٹی لیڈر ہربجن سنگھ ہو گا۔ وہی تمہیں بارڈر کراس کرائے گا۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"سر! میری طرف سے نچنت رہیں یہ مشن بھگوان کی کرپا سے ہمارا سب سے کامیاب مشن ہو گا۔"

لکشمی دیال نے میرے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"شاباش! جاؤ۔ اور ٹھہرو"

اس نے بٹوے میں سے مجھے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ ویسے ہربجن سنگھ کے پاس کافی رقم ہو گی۔ تمہیں جتنی ضرورت ہو اس سے لے لینا۔ اسے میں نے خاص طور پر کہلوا بھیجا ہے کہ وہ تمہارا خاص خیال رکھے۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ پانچ تخریب کاروں کو ہلاک کرنے کے بعد میرے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جائے گا۔ مجھے تو یہ بھی امید نہیں تھی کہ یہ لوگ میری من گھڑت کہانی کا اعتبار بھی کریں گے۔ لیکن انہوں نے نہ صرف مجھ پر اعتبار کر لیا تھا بلکہ مجھے پہلے سے زیادہ اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔

بس میں یہاں سے مار کھا گیا۔ کیسے مار کھا گیا۔ آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ میں کیا بتاؤں گا آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا۔ ٹرک عام سائز کے ٹرکوں ایسا تھا۔ صرف اس کی باڈی اوپر سے بند تھی۔ دونوں سائیڈوں پر کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ اندر آمنے سامنے صرف دو بنچوں کی طرح کی سیٹیں تھیں۔ سیٹوں پر تکیے پڑے تھے۔ یہ ہمارے آرام کرنے کے واسطے تھے۔ ہم سوار ہو گئے تو ٹرک چل پڑا۔ تینوں آدمی آہستہ آہستہ میرے ساتھ

کھل گئے اور ہم آپس میں بے تکلف بھی ہو گئے۔ ان کی طرف سے زیادہ بے تکلفی کا اظہار ہوا تھا۔ یہ تینوں ہندو تھے۔ ان کے بیان کے مطابق بارڈر پر سمگلنگ ان کا پیشہ تھا مگر لکشمی دیال نے انہیں بھاری رقم دینے کا وعدہ کیا ہے جس کی وجہ سے ہم پاکستان کے شہروں میں بم لگانے جا رہے ہیں۔ ایک آدمی جس کا نام سکھ بیر تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج ہم نے آدھی رقم دلی میں ہی ان سے وصول کر لی ہے کیا معلوم یہ بعد میں مکر جائیں۔"

میں نے لکشمی دیال کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بھائی سکھ بیرا یہاں اس قسم کی بات نہیں ہوتی۔ جتنی رقم باقی ہے وہ جب تم پاکستان میں اپنا کام پورا کر لو گے تو تمہیں اسی وقت ادا کر دی جائے گی۔"

دلی سے امرتسر تک سفر بڑا لمبا تھا۔ ٹرک جب جمنا کا پل پار کرنے کے بعد شہر کے مضافات سے گزرتا ہوا جی ٹی روڈ پر آیا تو میں نے کہا۔

"دوستو! مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے تم بھی تھوڑی دیر آرام کر لو"

میں سیٹ پر سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ایک آدمی سامنے والی بنچ پر لیٹ گیا۔ باقی دونوں بنچ کے کونوں پر آمنے سامنے بیٹھے سگریٹ پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا کلینر لڑکا بیٹھا تھا۔ ٹرک کا پچھلا حصہ آدھا بند تھا۔ اوپر سے خوب ہوا اندر آ رہی تھی۔ مجھے بڑی جلدی نیند آ گئی۔ رات کے چار بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے سکھ بیر نے بتایا کہ رات کے چار بج گئے ہیں۔ ہم لوگ رات کے پچھلے پہر کو بھی رات ہی کہتے ہیں تاوقتیکہ صبح نہ ہو جائے۔ میں نے سکھ بیر سے پوچھا۔

"سکھ بیرا ہم کہاں تک آ گئے ہیں؟"

وہ بولا۔

"بس جی میرٹھ گزر گیا ہے۔ آگے مظفر نگر آئے گا۔ پھر سہارن پور اور آگے انبالہ۔"

ٹرک مظفر نگر رک گیا۔ یہاں اتر کر ہم نے لاری اڈے کی کینٹین پر چائے پی۔ کچھ

دیر آرام کیا اس کے بعد ٹرک جی ٹی روڈ پر سہارن پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ مظفر نگر میں ہی دن نکل آیا تھا۔ مگر ناشتہ ہم نے مظفر نگر سے آگے ایک چھوٹے سے شہر دیو بند میں کیا۔ یہاں سے ٹرک روانہ ہوا تو دوپہر سے تھوڑا پہلے ہم سہارن پور میں تھے۔ سہارن پور تھوڑی دیر کے لئے رکے اس کے بعد انبالہ آ گیا۔ مجھے پنجاب کی ڈی آئی جی پولیس کی طوائف بیوی ہرپال کور یاد آ گئی۔

انبالے سے ہم لدھیانے اور پھر جالندھر پہنچ گئے۔ یہاں سے امرتسر چالیس میل کے قریب ہی تھا۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ امرتسر کے سیڑھیوں والے پل کے ٹرکوں کے اڈے پر ٹرک کھڑا ہو گیا۔ یہاں ہم نے کھانا کھایا۔ ٹرک کا ڈرائیور ہماری خاطر داری میں لگا ہوا تھا۔ ہمیں امرتسر کے سرحدی گاؤں اٹاری پہنچانے کی اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہ ہر سٹیشن پر جہاں ٹرک رکتا تھا ہمیں آ کر پوچھ لیتا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ہمارے ناشتے چائے سگریٹ اور کھانے وغیرہ کا بل بھی وہی ادا کرتا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم کہیں پک نک منانے جا رہے ہیں۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم ٹرک میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور نے ہمیں بتا دیا کہ اب ہم اٹاری بارڈر والے گاؤں میں ہی جا کر رکیں گے۔

"ٹرک کی کھڑکیاں بند کر دو یہاں پاکستانی جاسوس بھی ہوتے ہیں"

ڈرائیور کی ہدایت پر ہم نے ٹرک کی کھڑکیاں بند کر دیں۔ ٹرک میں اندھیرا ہو گیا۔ پیچھے جو ٹرک کا آدھا حصہ کھلا تھا ڈرائیور نے اس پر بھی ترپال ڈال دی۔ میں نے کہا۔

"یار اندر تو اندھیرا ہو گیا ہے"

سکھ بیر بولا۔

"کوئی بات نہیں بھائیا جی! اٹاری یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر ساری کھڑکیاں کھول دیں گے۔"

یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہو رہا تھا جس کے بارے میں ان سب کو معلوم تھا۔ ٹرک ایک طرف گھوم کر آگے کو چل پڑا۔ مجھے لگا کہ ٹرک ایک چڑھائی چڑھ

رہا ہے۔ یہ امرتسر کے ریلوے پل کی چڑھائی تھی۔ یہاں سے ٹرک سیدھا چلنے لگا۔

ہم اندھیرے میں بیٹھے تھے ٹرک کوئی دس ایک منٹ تک چلتا رہا۔ اس نے ایک موڑ کاٹا۔ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ پھر چل پڑا۔ مگر اس کی رفتار بڑی آہستہ تھی۔ پھر ایک طرف کو گھوم کر رک گیا۔ ڈرائیور نے آکر پیچھے دروازے پر پڑی ہوئی ترپال اتار دی اور لوہے کا کنڈا اتار کر دروازے کا آدھا حصہ بھی نیچے گرا دیا۔ ٹرک میں باہر کی روشنی آگئی۔ یہ روشنی سامنے لگے ایک کھمبے پر جلتے بلب کی تھی۔ کھمبے کی روشنی میں مجھے تین وردی پوش سپاہی جنہوں نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں ٹرک کی طرف تیز تیز چلتے نظر آئے۔ میرے دل نے فوراً کہا۔

"دوست! پھنس گئے ہو"

میری پارٹی کے تینوں آدمی چھلانگیں لگا کر ٹرک سے اتر گئے۔ میں ابھی تک عجیب الجھن میں بنچ پر ہی بیٹھا تھا کہ ایک سکھ وردی پوش سپاہی نے ٹرک کے پاس آکر کہا۔

"نیچے آؤ اوئے تم بھی"

میری پارٹی کے آدمی ہنس ہنس کر سپاہیوں سے باتیں کرنے لگے۔ ایک نے ان میں سے کسی حوالدار کو مخاطب کر کے کہا۔

"بچن سنگھ! سنبھالو اپنے آدمی کو"

تین سپاہی جن میں حوالدار بچن سنگھ بھی تھا ٹرک میں آ گئے انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچ کر نیچے اتار لیا۔ دو سپاہی رائفلیں لے کر میرے دائیں بائیں ہو گئے۔ میں نے کہا۔

"تم کون ہو؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

حوالدار بچن سنگھ نے مجھے زور سے ایک تھپڑ مارا اور گالی دے کر کہا۔

"تمہیں پاکستان لے جا رہے ہیں۔"

مجھے میری غفلت اور بے سمجھی کی سزا مل رہی تھی۔ ان لوگوں نے بڑی مکاری اور عقل مندی سے مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ تخریب کاری ٹریننگ سنٹر کا لکشمی دیال

اور کالی داس مجھ سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ثابت ہوئے تھے۔ میں نے ان کے سامنے جو کہانی گھڑ کر بیان کی تھی اس سے وہ سمجھ گئے تھے کہ میں ڈرامہ کر رہا ہوں اور پارٹی کے آدمیوں کو میں نے ہی ہلاک کیا ہے اور یہ کہ میں پاکستان کا جاسوس ہوں۔ خود مجھے اپنی حراست میں لے کر پوچھ گچھ کرنے کی بجائے انہوں نے باقاعدہ سکیم بنا کر مجھے امرتسر جیل کے حوالے کر دیا تھا۔ جہاں سے میرا بھاگنا اتنا آسان نہیں تھا۔ جو حقائق مجھے بعد میں معلوم ہوئے ان کی تھوڑی سی جھلک میں آپ کو بیان کرتا چلوں۔

انڈیا کے مشرقی پنجاب میں سات جیل خانے اپنی بربریت اور پاکستانی شہریوں کے ساتھ غیر انسانی درندوں ایسا سلوک کرنے میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں نابقہ، فیروز پور، گورداسپور، امرتسر، جالندھر، پٹیالہ اور لدھیانہ کے جیل خانے ہیں۔ ان جیل خانوں میں بڑا ظالم عملہ رکھا جاتا ہے۔ ان جیلوں میں جرائم پیشہ قاتل اور ڈاکوؤں کے ساتھ ان پاکستانیوں کو بھی قید میں رکھا جاتا ہے۔ جنہیں بھارت میں ویزے کی مدت گزر جانے کے بعد پکڑ لیا جاتا ہے۔ یا بارڈر پر کوئی دیہاتی بھول کر انڈیا کے بارڈر والے کسی کھیت میں داخل ہو جاتا ہے تو اسے بھی پکڑ کر ان میں سے کسی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ان سب پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے جاسوس ہیں۔ آج بھی ان جیلوں میں ایسے کتنے ہی بے گناہ پاکستانی شہری تشدد اور قید و بند کی عوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال یا والی وارث نہیں۔ ایسے بھی پاکستانی ہیں جنہیں ان کے کنبوں کے ساتھ پکڑ لیا گیا۔ ان جیلوں میں معصوم پاکستانی بچے بھی اپنی ماؤں کے ساتھ قید ہیں۔ ان کو روز مارا پیٹا جاتا ہے اور ان سے صرف ایک ہی سوال پوچھا جاتا ہے۔

"بتاؤ بھارت میں اور کتنے پاکستانی جاسوس ہیں۔"

ان بے گناہ پاکستانیوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا چنانچہ ان پر دلناک تشدد کیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی پاکستانی تشدد سے ہلاک ہو جاتا ہے تو اسے ہیں گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا ہے۔ یہ حقائق خاص طور پر پاکستان کے ان نوجوانوں کو بتا رہا ہوں جو انڈیا کی وڈیو فلمیں گھر لے جا کر بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کے چترہار کے نیم

عریاں فحش فلمی گانے سنتے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کو خط لکھتے ہیں کہ
آپ کے پروگرام اور آپ کی فلمیں بڑی پسند ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں پاکستان
ان بے غیرت نوجوانوں کو ان جیلوں میں لے جا کر دکھاؤں کہ دیکھو جس بھارت کو
دیکھے بغیر تمہیں نیند نہیں آتی اس بھارت کے لوگ تمہارے بھائی بہنوں کے ساتھ
درندگی کا سلوک کر رہے ہیں اور کس طرح پاکستان کو دن رات برا بھلا کہتے رہتے
حوالدار بچن سنگھ تو جب بھی میری کوٹھڑی کے قریب سے گزرتا تو مجھے گالی دے
ضرور کہتا۔

"بلاؤ اپنے پاکستان کو۔ کہاں ہے تمہارا پاکستان۔"

مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ یہ امرتسر کی جیل ہے۔ اس جیل میں پاکستانی
ہونے والے ظلم و ستم کی کہانیاں میں دلی بمبئی میں بہت سن چکا تھا۔ اب میں خود
ظلم و ستم سہنے کے لئے لایا گیا تھا۔

دو آدمی مجھے گھسیٹ کر ایک کوٹھڑی میں لے آئے اور اس کا سلاخوں والا
بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا امرتسر کی جیل کی دو
بیرکیں تھیں۔ ان بیرکوں میں چھوٹی چھوٹی کتنی ہی کوٹھڑیاں تھیں۔ یہ قیدیوں کی کو
تھیں جنہیں جیل کی اصطلاح میں چکیاں کہا جاتا تھا۔ یہ کوٹھڑیاں کوئی دس فٹ
گیارہ بارہ فٹ چوڑی تھیں۔ ان میں تین تین چار چار قیدیوں کو جانوروں کی طرح
دیا جاتا۔ میں چونکہ نیا نیا آیا تھا اور مجھ سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا
مجھے جنوبی بیرک کی کوٹھڑی میں اکیلا رکھا گیا تھا۔ مجھے کوٹھڑی میں پڑے بمشکل بار
گزرے ہوں گے کہ میرے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دی گئیں اور اسی طرح
کر جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں لے جایا گیا جس کے کمرے کے باہر ایس
لکھا ہوا تھا۔ اندر جا کر دیکھا کہ وہ ایک سکھ تھا جس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھ
مشابہت رکھتی تھیں۔ اس نے سپاہیوں کو ایک طرف کھڑے ہونے کا اشارہ کیا
دس پندرہ سیکنڈ تک گھورنے کے بعد کہنے لگا۔

"یہاں بھارت میں اور کون کون سے پاکستانی جاسوس ہیں؟"

میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔"

اس سپرنٹنڈنٹ کا پورا نام سکھوندر دندر سنگھ دگل تھا۔ میں اسے دگل سنگھ ہی کہوں گا۔ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے میرے اندر حوصلہ پیدا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے کہ ہندو ہو کر پاکستان کے لئے جاسوسی کرتے ہو"

اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ مجھے ہندو ہی سمجھ رہے تھے۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"سردار صاحب ان لوگوں کو میرے بارے میں غلط رپورٹ ملی ہے۔ میں دیش بھگت ہوں اسی لئے پاکستان کے شہروں میں بم لگانے جا رہا تھا۔"

دگل سنگھ اس دوران ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ کہنے لگا۔

"مگر تم نے تو اپنی پارٹی کے سارے آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ ہندو ہو کر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

میں نے کہا۔

"سر! میں نے انہیں نہیں مارا۔ بارڈر پر پاکستانی رینجر فورس سے مقابلہ ہو گیا اور میرے ساتھی ان کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے۔"

لگتا تھا کہ میری باتوں کا دگل سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک فائل کھول کر سامنے رکھ لی۔ مجھ سے پوچھا۔

"تم برہمن ہندو ہو؟"

"ہاں جی۔ برہمن ہندو ہوں۔ میرا نام مرلی پرشاد ہے"

دگل سنگھ نے ایک سپاہی کو کہا۔

"اس کی پتلون اتارو"

سپاہی نے فوراً آرڈر پر عمل کرتے ہوئے میری پتلون اتار دی۔ میرے مسلمان

ہونے کا حتمی ثبوت نہیں مل گیا تھا۔ دگل سنگھ نے مجھے اور پاکستان کو گالی دے کر کہا۔

"میرا نام دگل ہے۔ سکھوندر سنگھ دگل۔ میں تو پاکستانی جاسوس کو اس کی چال سے پہچان لیتا ہوں۔ لے جاؤ اوئے اسے صبح اس کی خبر لوں گا۔ دیکھتا ہوں کیسے یہ اپنے ساتھی جاسوسوں کے نام نہیں بتاتا"

میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ میرا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اب شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ سپاہی مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ باہر لے جا کر انہوں نے میری مار کٹائی شروع کر دی۔ وہ مجھے لاتیں اور گھونسے مار رہے تھے اور پاکستان کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ میں سخت جان کمانڈو تھا۔ مگر ان لوگوں نے مجھے کچھ اس طرح سے مارا پیٹا تھا کہ میرا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی حوالدار بچن سنگھ ایک آدمی کے ساتھ اندر آ گیا۔ انہوں نے آتے ہی مجھ پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش برسا دی۔ میں جواب میں ان کی گردنیں توڑ سکتا تھا لیکن اگر ایسا کرتا تو مجھے وہیں شوٹ کر دیا جاتا۔ پھر انہیں ہلاک کرنے کا جواز مل جاتا۔ میں ان کی پٹائی سہتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ میں بارڈر کے گاؤں آیا ہوا تھا۔ غلطی سے بارڈر کراس کر کے انڈیا میں آ گیا۔ اور سوچا کہ دلی کی بھی سیر کرتا جاؤں۔

"اور راشٹریہ سیوک سنگ میں تیرا باپ گیا تھا؟ وہاں کیا لینے گئے تھے؟"

حوالدار بچن سنگھ نے یہ کہہ کر ایک بار پھر میری پٹائی شروع کر دی۔ وہ اس بے دردی سے مجھے پیٹ رہا تھا جیسے میں اس کا ازلی دشمن ہوں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ بھارت کا ہندو اور ہر سکھ پاکستان کے مسلمان کو اپنا ازلی دشمن سمجھتا ہے۔ جب وہ مجھے مار مار کر تھک گیا تو دوسرے آدمی نے میری کٹائی شروع کر دی۔ اس وقت میں نے ابھی کمانڈو ٹریننگ سے کام لیتے ہوئے اپنے جسم کو سخت بنا لیا اور اپنے اوپر بے ہوشی طاری کر لی۔ میرا جسم بے حس ہو گیا تھا مگر میں پوری طرح سے ہوش میں تھا۔ اور ان لوگوں کو نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے فرش پر بے حس پڑا دیکھ کر وہ لوگ رک

گئے۔ جو آدمی مجھے پیٹ رہا تھا اس نے کہا۔

"حوالدار! یہ تو مر گیا ہے"

"نہیں اوئے۔ اسے ابھی نہیں مارنا۔ اس سے دوسرے پاکستانی جاسوسوں کا پوچھ کر مارنا ہے۔"

انہوں نے میری نبض دیکھی اور پھر مجھے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ساری رات میں نے جگہ جگہ سے درد کرتے جسم کی اذیت برداشت کرتے گزار دی۔ صبح ہوئی تو مجھے کوٹھڑی سے نکال کر ایک دوسری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کوٹھڑی میں چھت کے ساتھ دو زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ دو تین سٹول پڑے تھے۔ ایک طرف لوہے کا شکنجہ دیوار کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

مجھے فرش پر پھینک دیا گیا۔ ایک آدمی چھت کی زنجیر کو ادھر ادھر کرنے لگا۔ اتنے میں دگل سنگھ دو آدمیوں کے ساتھ اندر آ کر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"اگر تم مجھے اپنے ساتھی جاسوسوں کے نام پتے بتا دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں نہ صرف چھوڑ دوں گا بلکہ تمہیں بارڈر کراس کرا کر پاکستان بھی بھجوا دوں گا۔ بولو۔ کیا کہتے ہو؟ تمہارے ساتھی کون کون ہیں اور بھارت کے کس کس شہر میں ہیں؟"

میں نے درد کی ٹیسیں برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں"

دگل سنگھ نے اشارہ کیا۔ دو آدمی آگے بڑھے۔ ایک نے میرے پاؤں زنجیر کے ساتھ باندھے۔ دوسرے آدمی نے دوسری زنجیر کو کھینچنا شروع کر دیا۔ اوپر چرخی لگی تھی۔ میں الٹا ہو کر لٹک گیا۔ میرا سر فرش سے کوئی پانچ فٹ اونچا تھا۔ باہر سے مٹی کا ایک بڑا پیالہ لا کر میرے سر کے نیچے رکھ دیا گیا۔ اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں میری ناک اور منہ میں گھسنے لگا۔ یہ ہرمل کا دھواں تھا۔ میں نے سانس روک لیا۔ لیکن کب تک سانس روک سکتا تھا۔ سانس لیا تو سارا دھواں میرے پھیپھڑوں میں داخل ہو گیا۔ مجھے

بے اختیار کھانسی آگئی۔ میری زنجیر کو ایک آدمی نے بانس سے پکڑ رکھا تھا۔

دگل سنگھ کی آواز آئی۔

"اب بھی بتا دو تمہارے دوسرے ساتھی کہاں کہاں پر ہیں۔ ان کی نشاندہی کر
میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں"

اس کے ساتھ ہی دھواں ایک بار پھر میرے منہ اور ناک کے رستے پھیپھڑوں
بھر گیا اور میں بری طرح کھانسنے لگا۔ مجھے میرے انسٹرکٹر مرد مومن کمانڈو کمال شاہ
ہوشنگ آباد کے جنگل میں بڑی زبردست اور ہر قسم کی اذیت برداشت کرنے کی ٹر
دی تھی مگر مجھے دھونی نہیں دی تھی۔ مجھے جو دھونی دی جا رہی تھی اس نے مجھے بے
کر دیا۔ اگرچہ میں سخت جان تھا۔ مگر آخر انسان تھا۔ جب تکلیف میری برداشت سے
ہو گئی اور میرا سانس رکنے لگا تو میں واقعی بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو میں سٹول پر بیٹھا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا
میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جا رہے تھے اور میرا سر لوہے کے شکنجے میں جکڑا ہوا
دگل سنگھ میرے سامنے سٹول پر بیٹھا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کہا۔

"بتاؤ تمہارے ساتھی جاسوس کہاں کہاں پر ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں۔ نہیں ہوں۔"

یقین کریں دھونی نے میرے جسم کی جیسے ساری طاقت چھین لی تھی۔ میرے
شکنجے میں کسا جانے لگا۔ جب مجھے اپنی کھوپڑی چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگی تو میں نے
کہ کیوں نہ ان لوگوں کو جھوٹ موٹ دو چار مسلمانوں کے نام بتا دوں اور پتے بھی
سلط بتا دوں۔ آپ ہی ڈھونڈتے پھریں گے۔ کم از کم میری جان تو اس عذاب سے چ
گی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بتاتا ہوں"

اس وقت شکنجہ ڈھیلا ہو گیا۔ دگل سنگھ نے اشارہ کیا میرے سر سے شکنجہ اتار لیا گیا۔
مجھے پانی پلایا گیا۔ دگل سنگھ خوش ہو کر کہنے لگا۔

"پہلے بتا دیتے تو کیا حرج تھا بتاؤ۔ کیا نام ہیں تمہارے ساتھی جاسوسوں کے اور وہ
کہاں کہاں پر ہیں۔"

پانی پینے کے بعد میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ میں نے کہا۔

"میرا صرف ایک ہی ساتھی جاسوس ہے اس کا نام خدا بخش ہے۔ وہ ناگ پور کے
محلہ چاندی والا کے مکان نمبر15 میں رہتا ہے۔"

ناگ پور شہر کا نام میں نے اس لئے لیا تھا کہ وہ وہاں سے بہت دور تھا۔ اس طرح
بھی انہیں دو چار دن لگ جاتے۔ دگل سنگھ نے فائل پر یہ نام اور پتہ لکھ لیا۔ پھر مجھ سے
مخاطب ہو کر پوچھا۔

"دلی میں تم جس آدمی گل خان کے پاس رہتے تھے تم نے اس کا نام نہیں لیا وہ بھی
تو تمہارا ساتھی ہے۔"

میں سنبھل گیا۔ گل خان پر شک پڑنا قدرتی بات تھی۔ ظاہر ہے گل خان نے ہی مجھے
کانگریسی مسلمان رحیم بخش کے ذریعے تخریب کار ٹریننگ سنٹر کے ڈائریکٹر لکشمی دیال سے
ملایا تھا اور اسی کی سفارش پر مجھے ہندو سمجھ کر بھرتی کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے گل خان کا
پکڑا جانا یقینی بات تھی۔ کانگریسی مسلمان رحیم بخش نے تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لی ہو گی
کہ گل خان اسے لے کر میرے پاس آیا تھا۔ میرا اس جاسوس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں
ہے۔ میں سوچنے لگا نہ جانے ہمارے ماسٹر سپائی گل خان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ لیکن مجھے
یقین تھا کہ وہ ضرور روپوش ہو گیا ہو گا۔ ایک اور بات بھی مجھے مسلسل پریشان کئے ہوئے
تھی۔ ان لوگوں کو ابھی میرے سابقہ ریکارڈ کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہیں بالکل علم نہیں ہو
سکا تھا کہ میں وہی کمانڈو ہوں جس نے بھوپال لائن پر اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی گاڑی اور
دوارکا فورٹ کا فوجی گولہ بارود کا ذخیرہ اڑایا تھا اور راجستھان کے ایٹمی سنٹر میں بھی میں نے

ہی دھماکہ کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ لکشمی دیال نے مجھے دلی پولیس کے حوالے
کرنے کی بجائے راتوں رات امرتسر جیل کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اس کی وجہ مجھے بعد
میں معلوم ہوئی اور وہ یہ تھی کہ دگل سنگھ لکشمی دیال کا دوست تھا اور وہ چاہتا تھا کہ
امرتسر جیل میں مجھے ٹارچر کر کے مجھ سے دوسرے پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں
معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر وہ مجھے دلی پولیس کے حوالے کر دیتا تو عین ممکن تھا کہ
میرا سابقہ گجرات کا ریکارڈ بھی پہنچ جاتا اور پھر مجھے ملٹری انٹیلی جینس کے حوالے کر دیا جاتا
اور انڈیا کی ملٹری انٹیلی جینس کے ہاتھوں میرا زندہ بچنا مشکل تھا۔

میں نے گل خان کے بارے میں دگل سنگھ سپرنٹنڈنٹ امرتسر جیل کے سوال کا جواب
دیتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔ میں اس کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے اس کے
ہاں صرف دو چار دن کے لئے ٹھہرا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کانگریسی مسلمان
کے ساتھ تعلقات ہیں اور اس کی سفارش سے میں راشٹریہ سیوک سنگ میں بھرتی ہو سکتا
ہوں۔"

دگل سنگھ نے کہا۔

"اس معاملے کی تفتیش بعد میں ہو گی۔ پہلے تم نے جو مجھے جو نام بتایا ہے ان کی
تصدیق ہو جائے۔ یاد رکھو اگر تم نے غلط نام بتایا ہے تو تمہیں اسی کوٹھڑی میں پھانسی پر لٹکا
دیا جائے گا"

میں سر جھکا کر خاموش رہا۔

مجھے میری پہلے والی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔

مجھے کھانے کے لئے روٹی دی گئی جس کے اوپر دال کا پوچا پھیر دیا گیا تھا۔ میرے
ساتھ پاکستانی جاسوس قیدیوں والا بدترین سلوک ہی ہوتا رہا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ مجھ
پر تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ ناگ پور پولیس کو ان لوگوں نے ضرور خبر کر دی ہو گی کہ اس نام
کے آدمی کا فلاں محلے میں جا کر پتہ کیا جائے اور اگر وہاں پر ہو تو اسے فوراً گرفتار کر کے
امرتسر جیل روانہ کر دیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ امرتسر پولیس نے اپنی پولیس پارٹی
ناگ پور روانہ کر دی ہو۔

اس طرح مجھے کچھ آرام کے دن مل گئے۔ مجھے بد روح چندریکا کا خیال بھی آیا کہ وہ
مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ اگر میں نے اس کی بات مان لی ہوتی تو اس وقت وہ ضرور
میری مدد کرتی۔ جس طرح کہ پہلے وہ اس قسم کے حالات میں ہمیشہ میری مدد کرتی رہی
تھی۔ مگر وہ مجھے بھارت میں ہندو بن کر رہنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اس کی شرط یہ تھی
کہ میں انڈین ملٹری کے اسلحہ خانوں اور گولہ بارود کے ذخیروں کو تباہ نہ کروں۔ یہ شرط
میں کیسے مان سکتا تھا۔ میرا تو مشن ہی یہی تھا۔ اور پھر میں صرف وہ ذخیرے اڑا رہا تھا جس
کا اسلحہ اور گولہ بارود کشمیر کے محاذ پر مجاہدین کے خلاف استعمال ہونا تھا۔ یہ ایک محب
وطن پاکستانی اور سچے مسلمان کا فرض تھا جسے میں ادا کر رہا تھا۔ میں اپنے مشن سے ایک
قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ چنانچہ چندریکا کی بد روح میری دشمن ہو گئی تھی۔ مجھے
مغل شہزادے کی روح کی پیش گوئی بھی یاد آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مجھ پر عنقریب
ایک بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ خدا جانے شاید وہ یہی آفت تھی کہ میں بھارتی
درندوں کے قابو آ گیا تھا جو میرے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کر رہے تھے۔ مجھے

تشدد کا خوف نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ میرے کمانڈو مشن کی سرگرمیاں رک گئی تھیں۔

میں نے رات کو کوٹھڑی کے فرش پر پڑے پڑے وہاں سے فرار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ مجھے اس جہنم سے صرف اسی صورت نجات مل سکتی تھی کہ میں کسی طریقے سے وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اگر میں کسی تھانے کے حوالات میں ہوتا تو وہاں سے فرار میرے لئے آسان تھا۔ کیونکہ تھانے میں عملہ زیادہ نہیں ہوتا اور پھر وہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور ایک دلیر کمانڈو کو فرار کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن یہ جیل تھی اور بہت بڑی جیل تھی جس میں عملے کے علاوہ مسلح پولیس کی پوری پلٹن ہروقت پہروں پر موجود رہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جیل کی دیوار جس نے جیل کو گھیر رکھا تھا کم از کم چار مرد اونچی تھی۔ ایک تو وہ کوٹھڑی تھی جس میں مجھے بند کیا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بھی سلاخوں والا تھا۔ اس کے آگے راہ داری تھی۔ اس کا دروازہ بھی سلاخوں والا تھا۔ اس طرح سے مجھے پہلے دو سلاخوں والے دروازے میں سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد جیل کی اونچی دیوار پر چڑھنا تھا۔ جیل کے چاروں کونوں پر اونچی مچانیں بنی ہوئی تھیں جہاں بندوقیں رائفلیں لئے ہندو سکھ سپاہی دن رات پہرے پر موجود رہتے تھے۔ رات کے وقت تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سرچ لائٹ کی روشنی دیوار کے دونوں جانب ڈالی جاتی تھی کہ کہیں کوئی قیدی بھاگنے یا نقب لگانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ جیل کی دیوار کے ساتھ اندر کی طرف رات کو گشتی پہرہ بھی ہوتا تھا۔

اپنے ایک جعلی جاسوس کا نام اور پتہ بتا دینے کے بعد میرے پاؤں کی بیڑیاں اتار دی گئی تھیں اور رات کے سات آٹھ بجے ایک رائفل بردار سپاہی مجھے تین چار منٹ کے لئے ٹہلائی کے لئے بھی لے جاتا تھا۔ مجھے بیرک کے ساتھ ہی ٹہلایا جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ رعایت چند روز کے لئے ہے جب انہیں پتہ چلا کہ میں نے فرضی آدمی کا نام پتہ بتایا تھا تو مجھ پر دوبارہ تشدد شروع ہو جائے گا اور مجھے بیڑیاں دوبارہ پہنا دی جائیں گی جیل سپرنٹنڈنٹ دگل سنگھ نے یقیناً امرتسر سے پولیس پارٹی کو ناگ پور روانہ کیا تھا۔ شا

ے ناگ پور کی پولیس پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بات کو تین دن مزید گزر گئے اور مجھ پر کسی قسم کی قیامت نہ ٹوٹی۔ اسی دوران میں فرار کی سکیموں پر غور کرتا رہا۔ بظاہر اس جیل خانے سے مجھے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ امرتسر کی جیل میں سیکورٹی کا بڑا سخت انتظام تھا۔ کوئی بھی قیدی لوہے کے جنگلے والے تین دروازے توڑ کر بڑے گیٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بڑے گیٹ کے دروازے پر بھی لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں اور وہاں ہروقت گارڈ موجود رہتی تھی۔ میں یہاں کوئی سکیم بنا کر ہی فرار ہو سکتا تھا اور فرار کی کوئی سکیم وہاں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

لیکن کہتے ہیں کہ جب خدا مہربان ہو تو غیب سے آدمی کی مدد کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ ایک رات کیا ہوا کہ سپاہی میری ٹہلائی کروا رہا تھا کہ ایک ٹرک جیل کے گیٹ سے اندر آیا اور سامنے والی جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس میں سے ڈرائیور نکل کر جیل کے اس طرف چلا گیا جدھر جیل کا تنور وغیرہ تھا۔ اس وقت میں کچھ فاصلے پر شمالی بیرک کے پیچھے ٹہل رہا تھا اور رائفل اٹھائے سپاہی مجھ سے چند قدم دور بڑا ہوشیار ہو کر کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹرک کو میں نے بڑے غور سے دیکھا۔ ٹرک کا پچھلا حصہ جیل کی دیوار کے بالکل ساتھ لگا ہوا تھا اور اس کے اوپر دیوار صرف چند فٹ ہی اونچی تھی۔ جیسے بادلوں میں اچانک بجلی چمک جاتی ہے بالکل اسی طرح ایک خیال میرے دماغ میں چمک اٹھا۔ میرے دل نے اسی وقت مجھے کہا۔ نکل جاؤ۔ اس کے بعد تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے اندر کی ساری توانائیاں بیدار ہو گئیں۔ میرے بازوؤں کے پٹھے تن گئے۔ میں اب جان پر کھیل جانے والا کمانڈو تھا۔

ٹرک ڈرائیور جیل کے کچن کی طرف گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا رات کا وقت تھا۔ جس جگہ ٹرک کھڑا تھا وہاں تک دیوار کے اوپر جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی بہت کم آ رہی تھی۔ میں نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور ہائے کی آواز نکال کر وہیں بیٹھ گیا۔ میں ہائے ہائے کرنے لگا۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ بیرک کے آس پاس کوئی آدمی نہیں تھا۔ سپاہی نے آواز دے کر پوچھا

"کیہ گل اے اوئے۔ اٹھ تاں!"

میں وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ سپاہی جلدی سے میرے پاس آکر مجھ پر جھکا۔ بر
میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ دوسرے لمحے اس کی گردن میرے بازو کے آہنی شکنجے میں
تھی۔ ایک جھٹکے کی بات تھی اور سپاہی کی گردن لٹک گئی۔ میں جیل کی دیوار کی طرف دوڑ
پڑا اور اس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں اندھیرا تھا۔ اتنے میں مچان پر لگی ہوئی سرچ لائیٹ کی
روشنی کا گول دائرہ ایک طرف سے ہوتا ہوا آیا اور میرے اوپر سے ہو کر گزر گیا۔ روشنی
کے اس دائرے کو ابھی دوبارہ ایک دومنٹ کے بعد وہاں آنا تھا۔ میں اٹھ کر ٹرک کی
طرف دوڑ کر گیا اور پیچھے سے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ لیکن اس
کی ایک طرف کی سائیڈ کی لکڑی کی دیوار جیل کی دیوار سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھی۔
میں ٹرک کی دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ جیل کی داور کی منڈیر مجھے صاف نظر آرہی تھی۔

میں نے اچھل کر منڈیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور ایک ٹانگ کو دیوار کے اوپر کر
کے دوسری ٹانگ بھی اوپر کر لی۔ منڈیر کے اوپر لیٹے لیٹے میں نے دوسری طرف دیکھا۔
نیچے اندھیرے میں مجھے جھاڑیاں سی نظر آئیں۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ کر
بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے آپ کو نیچے گرا دیا میں
جھاڑیوں میں گرا اور میرے جسم کو کانٹے سے چبھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور دیوار سے
ہٹ کر جیل کے دروازے کی مخالف سمت کو دوڑا۔

میں امرتسر شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں سے بچپن ہی سے واقف تھا مگر جس طرف
امرتسر جیل تھی اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہمارا گاؤں مجیٹھہ تھا جو
امرتسر کے قریب ہی واقع ہے اور میں بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ اور پھر اپنے گاؤں
کے سکول کے لڑکوں کے ساتھ اکثر امرتسر آیا کرتا تھا۔ میں ابھی چھ سال کا ہی تھا کہ
پاکستان بن گیا اور ہم مجیٹھہ سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ مجیٹھہ اور امرتسر سٹیشن کے
درمیان کھیتوں میں ہم پر سکھوں کے جتھے نے حملہ کر دیا اور میری بہن شہید ہو گئی۔ شہر
کے بازاروں سے میں واقف تھا لیکن کمپنی باغ سے آگے میں کبھی نہیں گیا تھا اور امرتسر

جیل خانہ کمپنی باغ کے شمال میں جہاں بجلی گھر تھا اس کے آگے جا کر آتا تھا۔

یہ سب کچھ اتنی اور جلدی اور آناً فاناً ہو گیا تھا کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا
کہ میں جیل کے دوزخ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے
قدرت نے سارا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ میں سڑک پر آگیا۔ اب میں دوڑ نہیں رہا
تھا لیکن قدرتی طور پر میرے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف
تھا۔ کہیں کہیں سڑک پر بجلی کے کھمبے پر روشنی نظر آرہی تھی۔ میں سڑک سے ہٹ کر
کھیتوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میرا رخ کمپنی باغ کے دوراہے کی طرف تھا۔ میرے
حساب سے کم از کم آدھ گھنٹے تک میرے فرار کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ
سپاہی نے مجھے پانچ منٹ ٹہلانے کے بعد واپس کوٹھڑی میں بند کر دینا تھا۔ اس کے بعد کوئی
آدھے گھنٹے کے بعد جمعدار نے آکر قیدیوں میں دال روٹی تقسیم کرنی تھی۔

میرے پاس بمشکل آدھا گھنٹہ تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے اندر اندر مجھے امرتسر شہر سے
باہر نکل جانا چاہئے تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں کمپنی باغ میں سے ہو کر مجیٹھہ
روڈ کی طرف پڑ جاؤں۔ کیونکہ وہ ایسا علاقہ تھا کہ جس کو میں رات کے اندھیرے میں بھی
پہچان سکتا تھا۔ مجھے مجیٹھہ اپنے گاؤں سے جدا ہوئے بارہ سال ہی گزرے تھے اور ہمارے
ملکوں میں اتنی جلدی شہروں میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ پرانی چیزیں اپنی جگہوں پر جوں کی
توں موجود رہا کرتی ہیں۔ لیکن میں مجیٹھہ گاؤں میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ پہلے بھی سکھوں
کا گاؤں تھا اور اب تو وہاں پاکستان کے علاقوں سے بھی سکھ آکر آباد ہو گئے ہوں گے۔ میں
چاہتا تھا کہ مجیٹھہ گاؤں کے قریب سے جو سڑک آگے جالندھر لدھیانے والی ریلوے لائن
کی طرف جاتی ہے اس طرف نکل جاؤں۔ میں تیز تیز چلتا کمپنی باغ والے دوراہے سے
گزر کر کمپنی باغ میں داخل ہو گیا۔ میرا حلیہ بھی خراب تھا۔ میلی چیکٹ قمیض اور میلی
پھٹی پرانی پتلون اور پاؤں میں جوتا تھا۔ جوتے کی حالت خراب نہیں تھی۔ اس لئے چلنے
میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آرہی تھی۔ امرتسر کی جیل میں مجھ پر کافی تشدد ہوا تھا اور
کافی مارا پیٹا گیا تھا۔ مگر میرے جسم کی توانائی پھر سے بحال ہو گئی تھی۔ یہ فکر ضرور تھا کہ

کہیں دوبارہ نہ پکڑا جاؤں۔ میں ابھی تک خطرے کے مقام سے دور نہیں ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جیل میں الارم چیخ اٹھے گا اور پولیس کو اطلاع کر دی جائے گی۔ ان جیل والوں نے فوراً میرا فوٹو بھی اتروا کر رکھ لیا تھا۔ پولیس کو میرا فوٹو دکھا کر میرے پیچھے لگا دیا جائے گا۔ ہر تھانے میں فون پر میرے فرار کی خبر کر دی جائے گی اور پولیس کی پارٹیاں مختلف سمت سے نکل کر مجھے شہر کے اندر ہی گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گی۔

جیل یا دشمن کے قیدی کیمپ سے فرار ہونا مشکل نہیں ہوتا آدمی کے اندر دلیری اور ہمت ہو تو فرار کا کوئی نہ کوئی سبب بن جاتا ہے۔ آدمی فرار ہو جاتا ہے لیکن اصل کام فرار کے بعد اپنے آپ کو اس وقت تک پولیس کے چنگل سے بچانا ہوتا ہے جب تک کہ آدمی خطرے کی سرحد سے باہر نہیں نکل جاتا۔ فرار سبھی ہو جاتے ہیں مگر اپنی منزل تک فرار کے بعد کوئی کوئی ہی پہنچتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ قسمت نے یاوری کی تھی اور قدرت نے میرے فرار کا از خود سامان مہیا کر دیا تھا اور میں نے جرات سے کام لے کر اپنے آپ کو جیل کی چاردیواری سے باہر پھینک دیا تھا مگر اصل کام جو فرار سے بھی زیادہ مشکل اور نازک تھا اب شروع ہو رہا تھا۔ جب مجھے اس علاقے سے نکل کر دلی پہنچنا تھا۔ میں دلی پہنچ کر اپنے ماسٹر سپائی گل خان اور پروفیسر جمشید کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان پ میری گرفتاری کے بعد کیا گزری اور کیا وہ دلی میں ہی تھے یا وہاں سے کسی طرف روپوش ہو گئے تھے۔ یہ معلوم کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ کسی اذیت ناک مشکل میں ہوں اور میں ان کی مدد کر سکوں۔

لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ خود میری اپنی مدد کرنے کا تھا۔ اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ مجھے خود کسی طریقے سے اپنے آپ کو امرتسر کی حدود سے باہر نکال لے ج تھا۔ مجھے امرتسر کی اس ہندو طوائف کا بھی خیال آیا جس کے گھر میں گھس کر میں چھپ گیا تھا۔ مگر میں اس طرف یعنی امرتسر کے طوائفوں والے بازار رام باغ کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہاں ہر وقت پولیس پھرتی رہتی تھی اور میں جاتے ہی پکڑا جا سکتا تھا۔

مجیٹھہ بھی کمپنی باغ سے کافی دور تھا۔ البتہ مجیٹھہ روڈ قریب تھی۔ رات کے نو پونے بجے کا وقت ہو گا۔ سردیوں کا موسم ختم ہو چکا تھا اور مارچ کا مہینہ شروع ہو گیا ہوا تھا۔ ات بڑی خوشگوار تھی اور کمپنی باغ کی فضا رات کے اندھیرے میں طرح طرح کے ہولوں کی خوشبوؤں سے بسی ہوئی تھی مگر اس وقت میرا دھیان پھولوں کی طرف بالکل یں جا رہا تھا۔ میں نہر کراس کر گیا۔ آگے بائیں جانب ہو گیا۔ یہاں کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ چوک میں پان کی دکان تھی جہاں فلمی گانے بج رہے تھے۔ میں آرام آرام سے چلنے لا تھا۔ میں وہیں سے ایک خالی سڑک پر ہو گیا۔ اس سڑک کی دونوں جانب جامن کے گھنے رخت ہوا کرتے تھے۔ میں نے درختوں کو غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے یہ جامن کے درخت ہی لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک میدان میں نکلتی تھی۔ اس میدان کو پار کر کے میں ہندوؤں کے ایک مرگھٹ کے ریب سے گزر گیا۔ اس مرگھٹ کو بھی میں پہچانتا تھا۔ یہاں بچپن میں ہندو کسی مردے کو لانے کے لئے لاتے تو ہم ایک طرف کھڑے ہو کر مردے کو جلتا دیکھا کرتے تھے۔ آگے کھووال کا چھوٹا سا گاؤں آتا تھا۔

مجھے دور سے گاؤں کی دو تین بتیاں جلتی نظر آئیں۔ اس گاؤں کی دوسری طرف ے جالندھر جانے والی ریلوے لائن تھی۔ مجھے وہاں جانا تھا۔ میں رکے بغیر چلتا گیا۔ جس رف سے میں گاؤں میں داخل ہوا وہ گاؤں کا عقبی حصہ تھا جہاں ایک چھپڑ یعنی جوہڑ ہوتا ۔ یہ جوہڑ آج بھی اندھیرے میں مجھے نظر آ گیا۔ میں گاؤں کی تنگ و تاریک گلیوں میں خل ہونے کی بجائے گاؤں کے باہر سے ہو کر آگے کی طرف چلنے لگا۔ ایک طرف کوئی یچہ تھا جہاں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پھر ایک آدمی پورن بھگت کی داستان نے لگا۔ میں گاؤں کے گندے نالے کی طرف ہو گیا۔ اتنے میں اچانک پیچھے مجھے موٹر ڑی کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ باغیچے کے باہر کھمبے پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ امنے اس کی روشنی میں ایک ٹرک کو رکتے دیکھا۔ ٹرک کے رکتے ہی اس میں سے ردی پوش پولیس کے سپاہی چھلانگیں لگا کر اترے اور کسی نے باغیچے میں بیٹھے لوگوں کو

مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہا۔

"خبردار اوئے۔ جہاں بیٹھے ہو بیٹھے رہو۔"

پھر سپاہیوں کو حکم دیا۔

"پنڈ کی ناکہ بندی کرلو۔ بھاگ کے جاؤ"

میں ایک بار تو سن ہو کر رہ گیا۔ پھر جلدی سے نالے کے پل پر سے گزر کر گاؤں ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ کسی سپاہی نے پیچھے سے آواز دی۔

"ٹھہر جا اوئے توں کون ایں؟"

میں نے گلی میں بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے جیل سے فرار ہونے کا پتہ چل گیا تھا اور پولیس نے میری تلاش میں اس گاؤں کی ناکہ بندی کرلی تھی اور اب وہ گھر گھر تلاشی لینے والی تھی اور میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ گاؤں کی گلیاں زیادہ لمبی نہیں ہوتیں۔ میں چند قدم ہی بھاگا تھا کہ آگے دیوار آگئی۔ یہ اندھیرے میں مجھے دیوار لگی مگر یہ ایک مکان تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور اندر سے کسی آدمی کے بھجن گانے کی آواز آرہی تھی وہ بغیر ساز کے پڑھنے کے انداز میں گا رہا تھا۔ میں ہندوؤں کے بھجن گانے اور اشلوک پڑھنے کے سارے طریقوں سے واقف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کٹر ہندو کا گھر ہے رات کے وقت سونے سے پہلے بھجن گا رہا ہے۔ مگر میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پولیس کے آدمی گلی تک آگئے تھے۔ مجھے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دل میں سوچا اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں مکان میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی سیڑھی مکان کی چھت پر جاتی ہو گی۔ میں چھت پر چلا جاؤں گا اور وہاں سے دوسری طرف کود کر رات کے اندھیرے میں بھاگ جاؤں گا۔ لیکن دروازے کے اندر ایک تنگ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے آگے ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا۔ بھجن گانے کی آواز اسی دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ اتنے میں مجھے پولیس کے آدمیوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پولیس میری تلاش میں گلی میں آگئی تھی۔ شاید کسی سپاہی نے مجھے گلی میں دوڑ کر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میرے پیچھے بھی موت تھی۔ آگے بھی

موت تھی۔ آگے جو موت تھی اس میں بچنے کی تھوڑی سی امید تھی۔ میں نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ اندر ایک آدمی لالٹین کے پاس چھوٹی سی کتاب لے کر بیٹھا بھجن گا رہا تھا' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کہا۔

"میں بے گناہ ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے بچا لیں"

اس آدمی نے ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔ پھر اٹھا۔ کتاب بند کر کے چارپائی پر رکھی اور سب سے پہلے دروازے کو کنڈی لگائی۔ مجھے چارپائی کے نیچے اشارہ کر کے کہا۔

"اس کے نیچے چھپ جاؤ۔"

میں چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ اس شخص نے چارپائی پر پڑی ہوئی چادر کھینچ کر اس طرح نیچے کر دی کہ باہر سے کوئی شخص چارپائی کے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دوبارہ چوکی پر لالٹین کے آگے بیٹھ کر بھجن گانے لگا۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ اس شخص نے پوچھا۔

"کون ہو بھائی؟"

"پولیس ہے۔ باہر آؤ"

وہ آدمی جو یقیناً ہندو تھا۔ کیونکہ ایک تو وہ بھجن گا رہا تھا۔ دوسرے اس کے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ تیسرے اس گاؤں میں تقسیم کے بعد کسی مسلمان کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اٹھا۔ مجھے دروازے کی کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لیا۔ دروازے پر پولیس کے سپاہی اور اس آدمی کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ سپاہی نے کہا۔

"یہاں کوئی آدمی تو نہیں آیا؟ ایک پاکستانی مسلمان جاسوس جیل سے فرار ہو گیا ہے۔"

پاکستان کا لفظ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ ہندو یقیناً پولیس کو بتا دے گا۔ کیونکہ

میں نے اس کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا تھا۔ مگر میں حیران رہ گیا جب اس
نے پولیس کانسٹیبل سے کہا۔

"یہاں تو صرف میں ہی ہوں۔ اور کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے پاکستانی جاسوس کا ح
دو اگر وہ یہاں آگیا تو میں اسے پکڑ کر تھانے لے آؤں گا۔"

پولیس کانسٹیبل نے کہا۔

"جوان آدمی ہے۔ میلی سے پتلون قمیض میں ہے۔ ڈاڑھی مونچھ نہیں ہ
خیال رکھنا۔ ہم گاؤں کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

وہ آدمی بولا۔

"چنتا نہ کریں۔ یہاں آیا تو بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

مجھے پولیس کانسٹیبل کے قدموں کے واپس جانے کی اور دروازہ بند کر کے
لگانے کی آواز آئی۔ میں چارپائی کے نیچے پڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا ہندو
اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ پاکستانی جاسوس ہوں اور
ہوں مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا بلکہ پولیس کے آگے جھوٹ بول کر مجھے بچا لیا
اس آدمی نے چارپائی کی چادر ہٹا کر نیچے جھک کر کہا۔

"ابھی نیچے ہی لیٹے رہو۔ کوئی پتہ نہیں پولیس پھر آجائے۔"

اس نے چادر کا پلو نیچے کر دیا اور چوکی پر بیٹھ کر دوبارہ بھجن گانے لگا۔ میں
چارپائی کے نیچے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور خدا
ادا کرنے لگا کہ اس نے عین وقت پر مجھے بچا لیا۔ لیکن اس بھجن گانے والے ہندو ک
تک مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس نے یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ میں
ہوں اور مجھ پر پولیس نے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا ہے۔ پھر بھی مجھے کیوں
ہے؟ یہاں میری عقل جواب دے گئی۔ کیونکہ یہ آدمی مجھے پاگل بھی نہیں معلو
تھا۔ اس دوران گلی میں پولیس آگئی تھی اور آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ
تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پولیس نے گھروں کی تلاشی لینی شروع کر دی ہے۔

وہ آدمی بھجن گاتے گاتے رک گیا۔ وہ چارپائی کے قریب ہی چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس
نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ اوپر آؤ۔ یہاں تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ باہر نکل آؤ"

میں جلدی سے چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔ کوٹھڑی کا اس نے آہستہ سے کنڈی
اتار کر دروازہ کھولا۔ آگے ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ اس نے مجھے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لو"

ڈیوڑھی میں اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ
رکھ دیا۔ وہ تین چار قدم چل کر ایک طرف مڑ گیا۔ یہاں سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں جو مجھے
آتے ہوئے اندھیرے میں نظر نہیں آئی تھیں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے
لگا۔ چھ سات سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اوپر ایک اور کوٹھڑی کا دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ
کھول دیا۔ کہنے لگا۔

"ٹھہرو۔ میں دیا جلاتا ہوں"

میں سیڑھیوں کے دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ اس نے دیا روشن کیا۔ چھوٹی سی
کوٹھڑی تھی۔ ایک طرف اونچا سا پلنگ تھا جس کے نیچے شاید چاولوں یا گندم کی بھری
ہوئی بوریاں پڑی تھیں۔ وہ بولا۔

"پلنگ کے نیچے ان بوریوں کے پیچھے چھپ جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو یہاں کوئی نہیں
آئے گا۔"

میں جلدی سے پلنگ کے نیچے گھس کر بوریوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیہاتی
ٹائپ کا پلنگ تھا جو اونچے ہوتے ہیں۔ ان کے پائے فرش پر بنے ہوئے مٹی کی چار چھوٹی
تھڑیوں کے اوپر رکھے ہوتے ہیں۔ میں وہاں لیٹنے کی بجائے بیٹھ سکتا تھا۔ اس آدمی نے
واپس جاتے ہوئے مٹی کا دیا بجھا دیا اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر سیڑھیاں اتر گیا۔
کوٹھڑی میں خاص طور پر پلنگ کے نیچے گرمی اور حبس تھا۔ مگر اس وقت میری جان پر بنی
تھی۔ اس کوٹھڑی میں بھی شاید کوئی کھڑکی تھی جو نیچے گلی میں کھلتی تھی۔ مجھے اس کھڑکی

میں سے نیچے گلی میں سپاہیوں اور دوسرے مکان کے لوگوں کی آوازیں صاف سنائی دے
رہی تھیں۔ پولیس مکانوں کی تلاشی بھی لے رہی تھی اور ان سے میرے بارے میں پوچھ
بھی رہی تھی اور انہیں ہدایت بھی کر رہی تھی کہ مفرور پاکستانی جاسوس ہے۔ اگر کہیں
نظر آجائے تو اسے فوراً پکڑ لینا اور پولیس کو اطلاع کر دینا۔

ایک بار پولیس کے سپاہی اس ہندو کے مکان کے باہر آگئے جس کے مکان میں میں
نے پناہ لے رکھی تھی۔ کسی سپاہی نے یا شاید حوالدار نے آواز دی۔

"دروازہ کھولو"

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی میرے میزبان ہندو نے کہا۔

"مہاراج! ایک سپاہی پہلے بھی تلاشی لے گیا ہے"

یہ کوئی دوسرا سپاہی یا حوالدار تھا۔ اس نے کہا۔

"مہاراج مجھے معلوم ہے۔ پر کیا پتہ کہ اب پاکستانی جاسوس یہاں گھس آیا ہو"

میرے میزبان ہندو نے کہا۔

"مہاراج اگر وہ یہاں آتا تو مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں مکان میں اکیلا
ہوں۔ بھگوان کا بھگت ہوں آپ نے تلاشی لینی ہے تو بے شک لے لیں"

کانسٹیبل یا حوالدار نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ مگر ہوشیار رہنا وہ اسی گاؤں میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ یہاں
آگیا تو اسے دبوچ لینا بے شک اس کی ٹانگ وانگ توڑ دینا۔"

اس کے بعد سپاہیوں کے گلی میں سے واپس جانے کی آوازیں آئیں۔ وہ آپس میں
ایک دوسرے سے کہہ بھی رہے تھے کہ جائے گا کہاں' ہے وہ اسی گاؤں میں۔ ابھی پکڑا
جائے گا۔ آوازیں دور جا کر غائب ہو گئیں۔ گلی میں رات کا سناٹا چھا گیا۔ میں پلنگ کے
نیچے بوریوں کے پیچھے سمٹ کر بیٹھا تھا۔ نیچے سے ایک بار پھر ہندو میزبان کے بھجن گانے
آواز آنا شروع ہو گئی۔ مجھے گرمی محسوس ہوئی تو میں پلنگ کے نیچے سے نکل کر پلنگ
ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور کوٹھڑی کے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ اس نیک دل ہندو نے مجھے پولیس سے تو بچا لیا ہے۔ مگر ابھی یہاں
سے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ اتنے میں نیچے بھجن گانے کی آواز بند ہو گئی۔ مجھے کسی کے
سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ دروازہ کھلا۔ یہ میرا
میزبان ہندو ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"پولیس چلی گئی ہے۔ فکر نہ کرو"

پھر اس نے دیا روشن کیا۔ کوٹھڑی میں دیے کی مدھم روشنی پھیل گئی۔

"باہر آجاؤ"

میں پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ اب میں نے اس شخص کو دیے کی روشنی میں غور
سے دیکھا۔ ساٹھ کے قریب اس کی عمر ہوگی۔ جسم دبلا تھا۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ بال سفید
ہو رہے تھے۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر
ایک عجیب قسم کی رحمدلی نظر آرہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ
کوئی ایسی مسکراہٹ نہیں تھی جو کوئی لطیفہ سن کر یا خوشی کی کوئی خبر سن کر چہرے پر آجاتی
ہے۔ یہ بڑی بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکرانے سے پہلے اور مسکرانے کے بعد کی
مسکراہٹ معلوم ہوتی تھی۔

مجھے کہنے لگا۔

"بیٹا نیچے آجاؤ"

اس کے منہ سے بیٹے کا لفظ سن کر میں اور بھی حیران ہوا۔ میں اس کے دشمن ملک کا
جاسوس تھا۔ پولیس کی حراست سے بھاگا ہوا تھا۔ اس شخص نے نہ صرف یہ کہ مجھے پناہ
دی تھی۔ بلکہ پولیس کے آگے جھوٹ بھی بولا تھا۔ مجھے بچا لیا تھا اور اب بڑی شفقت کے
ساتھ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہندو مذہب'
ہندو دیو مالا اور سنسکرت زبان کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ بلکہ یہ چیزیں میری ٹریننگ کا ایک حصہ
سمجھ کر مجھے پڑھائی گئی تھیں۔ تاکہ میں دشمن کی ذہنیت کو پوری طرح سمجھ جاؤں اور صحیح
طریقے سے سراغ رسانی کی لڑائی لڑ سکوں اور دشمن سے کسی محاذ پر بھی مار نہ کھا جاؤں

لیکن اس ہندو کا سلوک میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کا جوان بیٹا مرگیا ہو اور میری شکل اس کے بیٹے سے ملتی ہو۔

وہ مجھے نیچے اس کوٹھڑی میں لے گیا جہاں وہ چوکی پر بیٹھا بھجن گا رہا تھا۔ اس کوٹھڑی میں لالٹین روشن تھی جس کی بتی اس نے پولیس کے جانے کے بعد مدھم کر دی تھی۔ وہ چوکی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"تم یہاں سو جاؤ۔ صبح چلے جانا۔ اس وقت جاؤ گے تو پولیس تمہیں پکڑ لے گی"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں کہ میں نے آپ کے آگے جھوٹ بولا کہ میں ہندو ہوں۔ اب تو آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ میں بھی مانتا ہوں کہ میں واقعی مسلمان ہوں اور پاکستان سے آیا ہوں۔ لیکن ایک بات میں آپ سے ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

میں چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ تھا۔ چوکی پر آلتی پالتی مار کر کمر بالکل سیدھی کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بوڑھے اور ہلکے ہلکے تبسم والے چہرے پر لالٹین کی مدھم روشنی پڑ رہی تھی۔ میری طرف اس نے آنکھیں اٹھائیں اور میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے سوال کیا۔

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"اس لئے مہاراج کہ میں آپ کے اس سلوک پر اتنا حیران ہوں کہ شاید اتنا حیران میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مجھے ایک ہندو سے ایسے سلوک کی کبھی امید نہیں تھی"

اس شخص کے چہرے کے بے معلوم تبسم پر ذرا سا بھی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے پھر ایک سوال کر دیا۔

"تم یہ سب کچھ پوچھ کر کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"مہاراج! کم از کم میری حیرانی ضرور دور ہو جائے گی"

اس نے پھر ایک سوال پوچھ لیا۔

"تمہاری حیرانی دور ہو گئی تو پھر تمہارے پاس کیا رہ جائے گا؟"

اس کی یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کا بڑا دھن واری ہوں کہ آپ نے میری خاطر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے بچا لیا۔"

اس شخص نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تم مسلمان ہو کر ہندوؤں کی زبان کے لفظ کیوں استعمال کرتے ہو؟"

اب جب کہ اس شخص کے آگے ساری بات کھل چکی تھی اس لئے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"مہاراج! ہندو بن کر بھارت میں پھر رہا ہوں ہندی بولنے کی عادت پڑ گئی ہے"

وہ شخص ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی نرم مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"کچھ کھاؤ گے؟ میرے پاس اس وقت گڑ اور روٹی ہے۔"

مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ صرف پیاس لگی تھی۔ میں نے کہا۔

"صرف پانی پیوں گا مہاراج"

اس نے کونے میں رکھے مٹکے میں سے مجھے پانی نکال کر پلایا۔ کہنے لگا۔

"اس چارپائی پر نہیں۔ اوپر والی کوٹھڑی میں پلنگ پر جا کر سو جاؤ۔ تمہارا اس وقت یہاں سے نکلنا ٹھیک نہیں۔ منہ اندھیرے میں تمہیں جگا دوں گا۔ اس وقت چلے جانا۔ پولیس گاؤں سے جا چکی ہو گی۔"

میں اس شخص کو حیرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا اوپر چلا آیا۔ کوٹھڑی میں دیا جل رہا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔ نہ جانے

رات کتنی گزر چکی تھی۔ لیٹ کر سوچنے لگا کہ اس شخص کا احسان شاید میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔ خدا جانے یہ کوئی انسان تھا یا خدا نے میری مدد کے لئے آسمان سے کوئی فرشتہ اتار کر وہاں بٹھا دیا تھا۔ کتنے ہی دنوں سے امرتسر جیل کی کوٹھڑی کے سخت فرش پر راتوں کو پہلو بدلتا رہا تھا۔ اب پلنگ پر لیٹا تو نیند آنا شروع ہو گئی۔ یہ اطمینان بھی تھا کہ کوئی مجھے پکڑنے نہیں آئے گا۔ میں سو گیا۔

منہ اندھیرے مجھے اس شخص نے جگا دیا۔

وہ بڑے آرام سے میرا کندھا ہلا رہا تھا۔

"بیٹا اٹھو! تمہارے جانے کا وقت ہو گیا ہے"

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا۔

"میں نے تمہارے لئے چائے بنائی ہوئی ہے باہر غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھو لو"

وہ مجھے مکان کی دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے دالان میں لے گیا جہاں ایک بغیر چھت کے غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ نلکا لگا تھا۔ میں نے وہاں منہ ہاتھ دھویا۔ نیچے آگیا۔ کوٹھڑی میں اسی طرح لالٹین جل رہی تھی۔ چارپائی پر چادر اسی طرح بچھی تھی۔ اس پر ایک بھی سلوٹ نہیں پڑی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ شخص رات بھر بیٹھا رہا تھا۔ تانبے کے گلاس میں گرم چائے تھی۔ چنگیر میں ایک روٹی اور تھوڑا سا گڑ رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ ساری روٹی اور گڑ کھا لیا۔ روٹی باسی تھی اور بڑی لذیذ تھی۔ اوپر سے چائے بھی پی۔ تازہ دم ہو گیا۔ میں اس نیک دل ہندو کا شکریہ ادا کرنے لگا تو وہ بولا۔

"بیٹا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اب گاؤں سے نکل جاؤ اور جدھر جانا ہے چلے جاؤ۔ ابھی رات کا اندھیرا ہے۔ دن نکل آیا تو گاؤں کے آدمی تمہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آدمی ڈیوڑھی تک میرے ساتھ آیا۔ میں نے آخری بار اس شخص کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے مہاراج؟"

اس نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم میرا جو نام رکھ لوگے وہی میرا نام ہو گا اب جاؤ۔"

میں ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں آگیا۔

گلی میں اندھیرا تھا۔ یہ کوئی رات کے تین ساڑھے تین بجے کا وقت ہو گا۔ میں گلی میں سے قدموں کی آواز پیدا کئے بغیر گزر گیا۔ آگے کچی ڈھلان تھی۔ میں بائیں جانب ہو گیا۔ ایک کتا مجھے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ میں چلتا گیا۔ ایک جوہڑ آگیا۔ وہاں ایک خالی گڈا کھڑا تھا۔ گاؤں کے چند ایک مکان تھے۔ ان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سامنے مجھے سڑک کی روشنی نظر آئی۔ ضرور یہ جی ٹی روڈ ہی ہو گی۔ میں نے سوچا ریلوے لائن سے میں بائیں جانب نکل آیا ہوں۔ اب یہی بہتر ہے کہ جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ چلتا جاؤں اور دن نکلنے تک امرتسر شہر سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ یہاں پھر میں نے عقل کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ کیونکہ جی ٹی روڈ ایک ایسی سڑک تھی کہ جہاں پر تھوڑی بہت ساری رات ٹریفک جاری رہتی ہے اور شہر کی حد ختم ہونے تک اس سڑک کی دونوں جانب آدھ آدھ فرلانگ کے فاصلے پر کھمبوں پر بجلی کے بلب جلتے رہتے ہیں۔ مجھے ریلوے لائن کی طرف ہی جانا چاہئے تھا۔ میں اس خیال سے اس طرف آگیا تھا کہ ریلوے لائن وہاں سے کافی دور تھی اور مجھے ڈر تھا کہ راستہ ویران ہے کتے ہوں گے مجھے دیکھ کر بھونکیں گے اور میرے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔

میں جی ٹی روڈ پر چڑھنے کی بجائے اس کی دوسری جانب کھیتوں کی مینڈھ پر ہو کر چلا جا رہا تھا۔ بارہ برس کے بعد بھی امرتسر کی جی ٹی روڈ ویسی کی ویسی چھوٹی تھی۔ میں نے ایک جگہ رک کر سڑک کے پیچھے نگاہ دوڑائی تو مجھے عقب میں دور امرتسر شہر کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں ابھی امرتسر کی حدود میں ہی تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ فصل والے کھیت ختم ہو جاتے تو خالی کھیت آجاتے۔ آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی جھلکیاں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے چلنے کی رفتار اور تیز کر دی۔ آگے میری دائیں جانب ایک

آبادی آگئی۔ یہاں کہیں کہیں کھمبوں پر بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ میں ان سے دور ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا۔ ایک کھیت میں کسان ہل چلا رہا تھا۔ مجھے اس کا سایہ سا ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ ہل چلاتے ہوئے جانوروں کو چلتا رکھنے کے لئے جو آوازیں نکال رہا تھا صرف اس کی آواز آ رہی تھی۔ ایک خشک کھائی آگئی۔ آسمان پر صبح کاذب کی نیلی روشنی کی وجہ سے مجھے چیزیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ یہ کھائی خالی اور خشک تھی۔ میں اس میں اتر گیا اور سامنے والی چڑھائی چڑھ کر کھائی کی دوسری طرف آگیا۔

اس وقت جی ٹی روڈ میری ایک جانب کچھ فاصلے پر ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ جی ٹی روڈ کی پہچان ٹاہلی کے درخت تھے جو اس کی دونوں جانب قطاروں میں اگے ہوئے تھے کہیں قریب ہی کوئی مندر ہو گا۔ ادھر سے پوجا پاٹھ کرنے اور آرتی اتارتے وقت جو چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں ان کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ اس وقت مجھے بڑی شدت سے محسوس ہوا کہ میں ایک غیر مسلم ملک میں ہوں۔ ہندوؤں سکھوں کے ملک میں ہوں۔ کیونکہ اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ اگر میں کسی مسلمان ملک میں ہوتا تو اس وقت مسجدوں سے صبح کی اذان کی آوازیں بھی ضرور آتیں مجھے بارہ برس پہلے کا امرتسر اور امرتسر کے گاؤں یاد آنے لگے۔ بارہ برس پہلے صبح صبح جب میں اٹھا کرتا تھا تو دور دور سے اذانوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ مگر اب ان علاقوں میں بلکہ سارے مشرقی پنجاب میں ہندو سکھوں نے سب مسجدوں کو شہید کر دیا ہوا تھا۔ جو مسجدیں بچ گئی تھیں انہیں اصطبل بنا دیا گیا تھا یا ہندو سکھ شرنارتھی وہاں آکر رہنے لگے تھے۔

میں اس قسم کے خیالات سوچتا چلا جا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے پنجابی میں آواز دی۔

"کون ہے؟ رک جاؤ"

آواز کا سننا تھا کہ میں نے دوڑ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے بھی کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی اور ہر طرف اندھیرا تھا۔ میں ایک اونچی فصل والے کھیت میں گھس گیا۔ فصل شاید کماد کی تھی۔ میرے دوڑنے سے ٹہنوں کے ٹوٹنے

اور ادھر ادھر ہونے کی آواز پیدا ہوئی۔ مجھے اپنے پیچھے بھی ایسی ہی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی میرے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ یقیناً یہ کوئی پولیس کا سپاہی تھا۔ اگر پولیس کا آدمی نہیں تھا تو پولیس کا مخبر ہو گا۔ اس سارے علاقے میں پولیس نے لوگوں کو اور رات کو پہرہ دینے والوں کو میرے بارے میں ہوشیار کر دیا تھا۔ ضرور یہ کوئی چوکیدار تھا جس نے مجھے للکارا تھا اور میرے بھاگنے پر وہ بھی میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

کھیت ختم ہوا تو سامنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ میں ان درختوں میں گھس گیا۔ میں بے تحاشا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ دوڑنے میں وہ شخص میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تیز دوڑنا اور زیادہ سے زیادہ دیر تک دوڑتے رہنا میری کمانڈو ٹریننگ کا اہم حصہ رہا تھا۔ مگر میرے آگے درختوں کی اور جھاڑیوں کی رکاوٹیں آ رہی تھیں میرے پیچھے دوڑنے والے نے مجھے گالی دے کر بلند آواز میں کہا۔

"بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ آگے پولیس کھڑی ہے۔"

پولیس کا نام لے کر شاید اس نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پولیس کے نام سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پیچھے بھاگنے والے کو یقین ہے کہ میں وہی پاکستانی جاسوس ہوں جو امرتسر جیل سے بھاگا ہوا ہے اور جس کو پولیس تلاش کر رہی ہے۔

میں اونچے اونچے سرکنڈوں اور ٹبوں کے درمیان بھاگا جا رہا تھا۔ آسمان پر پھیکی پھیکی صبح کی روشنی ہونے لگی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں آخر کب تک دوڑتا رہوں گا۔ میرے پیچھے ایک ہی آدمی لگا ہوا ہے۔ میں اسے قابو کر سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں گھوم کر سرکنڈوں کی ایک اونچی جھاڑی کے پیچھے ہو کر گھات لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جو آدمی میرے پیچھے دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ تھک گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دوڑ رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کسی کو آواز دے کر کہا۔

"اوئے ایدھر آؤ اوئے۔ پاکستانی جاسوس کو میں نے پکڑ لیا ہے۔"

جیسے ہی وہ سرکنڈوں کے قریب سے گزر کر ایک دو قدم آگے گیا۔ میں نے پیچھے سے اس پر اس طرح چھلانگ لگائی کہ میرے سیدھے بازو نے اس کی گردن کو اپنے فولادی شکنجے

میں لے کر اپنے ساتھ ہی نیچے گرا دیا۔ یاد رکھیں۔ اگر خدا نہ کرے کسی اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو نے آپ کی گردن میں اپنے بازو کا شکنجہ ڈال دیا ہے تو پھر آپ اپنے آپ کو مردہ سمجھیں۔

میں نے اس آدمی کے ساتھ نیچے گرتے گرتے اس کی گردن کو صرف ایک جھٹکا دیا۔ اس کا سانس بند ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو وہیں چھوڑا اور اٹھ کر سامنے کی جانب دوڑ پڑا۔ جس طرف آبادی تھی میں اس علاقے کو چھوڑ کر جی ٹی روڈ والے ٹاہلی کے درختوں میں آگیا۔

اب میں چاہتا تھا کہ مجھے آگے جالندھر کی طرف جاتی کوئی ایسی سواری مل جائے جو مجھے اس خطرناک علاقے سے نکال دے۔ ایسی سواری کوئی ٹرک ہی ہو سکتا تھا۔ اپنے کمانڈو مشن کی سرگرمیوں کے دوران میں نے اکثر دو شہروں کے درمیان راتوں کو چلنے والے مال بردار ٹرکوں پر لفٹ لے کر کافی سفر کیا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ امرتسر جیل سے میرے فرار کی اطلاع اردگرد کے شہروں اور ضلع کے سارے تھانوں کو پولیس نے کر دی ہو گی اور بہت ممکن ہے کہ راستے میں پولیس نے ناکہ بندی بھی لگا رکھی ہو۔ پولیس چیکنگ بھی کر رہی ہو۔ میری تصویر پولیس کو مل گئی ہو گی۔ ٹھیک ہے ہر سپاہی کے پاس میری تصویر نہیں ہو سکتی تھی لیکن پولیس مجھے مشکوک سمجھ کر پکڑ ضرور سکتی تھی۔

میں ٹاہلی کے درختوں کی دوسری طرف سے ہو کر جی ٹی روڈ پر چل رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا دن کی روشنی سفید ہوتی جا رہی تھی۔ میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ جتنی انڈین کرنسی تھی وہ ساری امرتسر جیل کے عملے نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ اپنے لباس سے میں یا تو کوئی مزدور لگ رہا تھا یا مشکوک۔ دور مجھے سڑک کے کنارے کچے پر رکی ہوئی ایک موٹر کار نظر پڑی۔ اس کا ڈرائیور اس کا ٹائر بدل رہا تھا میرے قریب جانے تک اس نے ٹائر بدل لیا تھا اور اگلی سیٹ کھول کر بیٹھنے ہی والا تھا میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ پرنام کیا اور کہا۔

"مہاراج آپ کی بڑی کرپا ہو گی مجھے آگے تک لے جائیں۔ میری ماتا جی سورگباش

ہو گئی ہیں۔ میرے پاس گاؤں جانے کے لئے پیسے نہیں ہیں"

ڈرائیور بوڑھا آدمی تھا اور ہندو تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور کہا۔

"کہاں جاؤ گے؟ میں تو انبالے جا رہا ہوں"

میں نے کہا

"مہاراج مجھے جالندھر کے قریب میانوالے گاؤں جانا ہے۔"

میں نے اس خیال سے یونہی ایک فرضی گاؤں کا فرضی نام بول دیا تھا کہ پنجاب میں بے شمار چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اور ان گاؤں کے نام اسی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ اس نے کہا۔

"بیٹھ جا اندر۔ سویرے سویرے کیا کام لے کر آ گئے ہو۔ انکار بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ گاڑی سٹارٹ کر کے سڑک پر لے آیا اور گاڑی خالی سڑک پر چل پڑی۔ یہ پرانی سی موٹر کار تھی۔ خدا جانے کس ماڈل کی تھی اور اس کا کیا نام تھا۔ پھولی ہوئی نسواری رنگ کی گاڑی تھی۔ پچھلی سیٹ کافی نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس پر ایسے بیٹھ گیا کہ پیچھے سے کسی کو نظر نہ آسکوں۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

"تم کہاں کام کرتے ہو کہ تمہاری ماتا سورگباش ہو گئی اور اس نے تمہیں گاؤں جانے کا کرایہ بھی نہیں دیا۔"

سوال اس نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ میں جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ ڈرائیور مجھے سامنے لگے آئینے میں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! ایک دکان پر خراد کا کام سیکھتا ہوں۔ لالہ جی دلی گئے ہوئے تھے۔ ماتا جی کے سورگباش ہونے کی خبر ملی تو کسی سے پیسے نہیں مانگ سکتا تھا۔ دس پندرہ روز ہی ہوئے ہیں یہاں کام کرتے۔ اکیلا دکان کی چھت پر سوتا ہوں۔

اس کے بعد ڈرائیور نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے سیٹ پر کھسکتے کھسکتے اپنا سر نیچے کر لیا تاکہ پچھلے شیشے سے میں نظر نہ آسکوں۔ گاڑی ایک خاص رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ دھوپ چاروں طرف

پھیل گئی تھی۔ پیچھے سے ایک ٹرک آگیا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف کرلی۔ ٹرک گز
گیا۔ ڈرائیور نے گالی دے کر کہا۔

"اتنی تیز ٹرک چلاتے ہیں۔ ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوں گے"

میں بڑا چوکس ہو کر سامنے کی طرف سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ دور تک سڑک خالی تھی.
کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد کوئی قصبہ آیا جس کے مکان اور دکانیں جی ٹی روڈ کی دونو
جانب تھیں۔ خطرہ تھا کہ یہاں پولیس کا ناکہ نہ لگا ہو۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ گاڑ
قصبے سے گزر گئی۔ امرتسر سے جالندھر چالیس میل دور ہو گا۔ پون گھنٹے کے بعد جالندھ
کے آس پاس کا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ علاقہ میرا جانا پہچانا تھا۔ ڈرائیور نے سامنے وا
آئینے میں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اوئے تمہارا گاؤں کہاں ہے؟ آگے تو جالندھر آرہا ہے۔"

میں یونہی موٹر کی کھڑکی میں سے باہر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے حساب سے مُ
وہیں کسی جگہ اتر جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ جالندھر بڑا شہر تھا اور بڑا پولیس سٹیشن تھا و
ضرور پولیس میری تلاش میں گاڑیوں وغیرہ کی چیکنگ کر رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔

"بس مہاراج یہاں روک دیں۔ یہاں سے میرا گاؤں زیادہ دور نہیں ہے۔"

اس نے گاڑی کچے میں روک دی۔ میں نے نیچے اتر کر اس کا ہندی زبان میں شکر
ادا کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور موٹر آگے چلی دی۔ میں سڑک سے اتر کر کھیتو
میں داخل ہو گیا۔ میں ایک قوس کی شکل میں جالندھر شہر کے مغرب کی طرف سے ہو
ایک لمبا چکر لگا کر بہت آگے جا کر دوبارہ جی ٹی روڈ پر نکل آنا چاہتا تھا۔ ابھی تک میں
یہی فیصلہ کیا تھا کہ اسی طرح ٹرکوں اور موٹر گاڑیوں میں لفٹ لے کر دلی کی جانب جتنا آ
نکل سکتا ہوں نکل جاؤں گا۔ سوچنے کو تو میں نے سوچ لیا اور چلنے کو چل بھی پڑا مگر جالن
شہر آزادی ملنے کے بارہ سال بعد بہت پھیل گیا تھا۔ نئی نئی کالونیاں بن گئی تھیں۔ نئے
کارخانے لگ گئے تھے۔ آبادی بہت ہو گئی تھی۔ کھیتوں سے نکل کر میں نے سامنے
جانب دیکھا تو آبادیاں ہی آبادیاں تھیں۔ میں اپنے اندازے کے مطابق ذرا ایک جانب

گیا۔ میں نصف دائرے کی شکل میں جالندھر شہر کی آبادیوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا آگے
واپس جی ٹی روڈ پر جانا چاہتا تھا۔ لیکن آگے اتنی آبادی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا
کہ کس طرف سے رخ بدلوں؟

دن پوری طرح نکل آیا تھا۔

جگہ جگہ لوگ نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں ٹریکٹر بھی چل رہے تھے۔ میں ایک ج
سے گزرا جہاں درختوں میں اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ نوجوان ہندو سکھ وہاں زور کر رہے تھے
پاس ہی رہٹ چل رہا تھا۔ اس کا پانی ایک حوض میں سے ہو کر نالی کی شکل میں ا
طرف سے گزر رہا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور آہ
آہستہ پانی پینے لگا۔ میری طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ دو تین ہندو اکھاڑے کے کنار
بیٹھے بدن پر تیل کی مالش کرتے ہوئے اونچی اونچی آواز میں ایک دوسرے سے ہنس ہنس
مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔

ایک ہندو کہنے لگا۔

"سوہنیا اوئے خبردار ہو کر گھر جانا ایک پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے فرار ہ
ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ دوسرے ہندو نے ہنس کر کہا۔

"تم بڑی افواہیں اڑاتے رہتے ہو"

پہلے والا ہندو بولا۔

"میں نے پرتاپ اخبار میں خبر پڑھی ہے تم ان پڑھ ہو۔ پڑھے لکھے ہوتے تو یہ
ضرور پڑھتے"

اس دوران ذرا پرے بیٹھے ہوئے ایک ہندو نے کہا۔

"تارا ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے بھی پرتاپ میں یہ خبر پڑھی ہے۔ ایک پاکستانی جاسوس
ل توڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ وہ جالندھر انبالے کی طرف بھاگا ہے۔

اب میرا وہاں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں بڑے اطمینان سے اٹھ کر وہاں سے آگے
ل گیا۔ اخبار کے مطابق پولیس میرے پیچھے پیچھے جالندھر کی طرف آ رہی تھی اور اس
ے علاوہ امرتسر پولیس کی رپورٹ پر جالندھر کی پولیس بھی ہوشیار ہو گئی ہو گی۔ خطرہ
رے قریب آ گیا تھا۔ جالندھر شہر سے میں زیادہ واقف نہیں تھا۔ میں اندازے سے ہی
ف دائرے بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جی ٹی روڈ پر بہت آگے نکل جانا چاہتا تھا مگر
بادیاں اور نئی کالونیاں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر رکشا موٹریں اور سکوٹر چل
ہے تھے۔ لوگ دفتروں اور کالجوں کی طرف جا رہے تھے۔

جالندھر شہر کے صرف اس علاقے کو میں پہچانتا تھا جدھر مشرقی پنجاب کے ڈی آئی جی
لیس کی طوائف بیوی ہرپال کور کی کوٹھی تھی جہاں وہ اپنی طوائف ماں کے ساتھ رہتی
ی اور جہاں میں بھی دو تین راتیں گزار چکا تھا۔ ہرپال کور کا خیال آتے ہی میں نے سوچا
کیوں نہ اس کے ہاں جا کر کچھ دنوں کے لئے چھپ جاؤں۔ جب حالات ذرا معمول پر
گئے تو وہاں سے دلی روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر مجھے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ علاقہ یہاں
ے کس طرف ہے جہاں ہرپال کور کی کوٹھی ہے۔ یہ سکھ طوائف عورت مجھ سے بڑی
ت کرنے لگی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اسے اپنا نام جگدیش بتایا تھا اور اپنے
پ کو جالندھر کا رہنے والا اور کالج سٹوڈنٹ ظاہر کیا تھا۔ میں سوچ بھی رہا تھا اور چل بھی
رہا تھا۔

میں ایک کالونی کے کوارٹروں کے درمیان سے گزر گیا۔ آگے پھر ایک کالونی آ گئی۔
ے اندازہ لگا کر جی ٹی روڈ کی طرف ہو گیا۔ میں ایک چھوٹے سے ویران میدان میں
گزر رہا تھا جہاں کوڑے کرکٹ اور لوہے کے سکریپ کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے تھے۔
ان کو عبور کر کے چھوٹی سی سڑک پر آیا تو ایک جانب چار دیواری میں سبز رنگ کا
لہراتا نظر آیا۔ یہ جھنڈا ایک نیم شکستہ سے گنبد پر لگا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ

کوئی مزار ہے میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا مزار کے دروازے کے پاس آگیا۔ میں نے
اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک جانب چھوٹی سی مسجد کا صحن تھا۔ دوسری طرف گنبد وا
مزار کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے اوپر چھوٹی چھوٹی سبز جھنڈیاں لگی تھیں۔ ایک آ
دروازے کے پاس صف پر بیٹھا تھا۔ مسجد کے صحن میں بھی ایک آدمی صفیں تہہ کر
تھا۔ یہ کسی مسلمان بزرگ کا مزار تھا۔

اتنا مجھے معلوم تھا کہ جالندھر میں تقسیم کے وقت ایک بھی مسلمان باقی نہیں بچا تھ
کچھ عرصے کے بعد وہاں ریاست مالیر کوٹلہ کے پنجابی مسلمانوں نے آکر کاروبار شروع کر
تھا۔ کیونکہ ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں کو سکھوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس
وجہ یہ نہیں تھی کہ ریاست کا سربراہ مسلمان تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اورنگ ز
کے زمانے میں جب سکھوں کے ایک گورو کے بچوں پر ایک روایت کے مطابق مغل د
کی طرف سے ظلم وستم ہوا تو صرف ریاست مالیر کوٹلہ کے نواب نے اس کے خلاف آ
اٹھائی تھی۔ اس وقت سکھوں کے گورو نے پنتھ کو حکم صادر کر دیا تھا کہ آج سے ریا
مالیر کوٹلہ کے مسلمان ہمارے دوست ہیں۔ چنانچہ جب پاکستان بنا اور مشرقی پنجاب
مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تو ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمان محفوظ رہے تھے۔
ادھر ادھر کے دیہات سے پنجابی مسلمان یہاں آگئے تھے۔ یہ بات مجھے مالیر کوٹلہ کے
مسلمان نے ہی بتائی تھی۔ اب خدا جانے اس میں کہاں تک سچائی ہے۔

مشرقی پنجاب میں جو مسلمان بزرگوں کے مزار تھے مسلمانوں کے جانے کے بعد
سکھوں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ کیونکہ اکثر ان مزاروں پر ہندو سکھ مرد عورتیں بھی
ماننے آیا کرتی تھیں۔ میرے خیال میں یہ مزار بھی ایسا ہی تھا۔ مگر یہاں جو متولی باہر ب
اس کی شرعی ڈاڑھی تھی۔ وہ مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک
سوچ کر اس کے پاس جاکر سلام کیا اور بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہیں
طرف بیٹھ گیا۔

متولی نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آئے ہو۔ پنجابی ہو کیا؟"

میں نے جواب دیا۔

"جی میں مالیر کوٹلہ سے جالندھر ایک عدالت میں پیشی بھگتنے آیا ہوں۔ میرے چچا نے
مجھ پر دکان سے بے دخل کرانے کا کیس دائر کر رکھا ہے۔ سوچا ان بزرگ کے مزار پر آکر
دعا مانگ لوں"

متولی نے میری طرف اس کے بعد کوئی خاص توجہ نہ دی اور جو صندوقچی اس نے
اپنے سامنے رکھی ہوئی تھی اس میں سے پرانے تہہ کئے ہوئے کاغذ نکال نکال کر دیکھتا رہا۔

میں نے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"میرا یہاں کوئی جاننے والا نہیں۔ کوئی سفارش کرنے والا بھی نہیں۔ چچا نے مجھ پر
جھوٹا مقدمہ بنایا ہوا ہے۔ ہمارے محلے کے ایک بابو نے کہا تھا کہ جالندھر جاکر ڈی آئی جی
پولیس کے پاس جاکر میرا نام لینا وہ تمہاری مدد کرے گا۔ میں ان کے دفتر گیا تھا وہاں نہیں
تھے۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں۔ سوچتا ہوں ڈی آئی جی صاحب کے گھر جاکر ان
سے ملوں شاید وہ میری مدد کریں"

متولی نے کہا۔

"ڈی آئی جی تو سکھ سردار ہیں بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تم ان سے ضرور ملو۔ وہ اکثر
باہر ہی رہتے ہیں۔ یہاں ان کی بیوی کی کوٹھی ہے میں تمہیں اس کا پتہ بتاتا ہوں۔ جاکر
مل لو۔ شاید وہ تمہاری کوئی مدد کر دے۔"

اس نے مجھے ہرپال کور کی کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔ میں نے متولی سے یہ کہہ کر تھوڑے
پیسے ادھار لے لئے کہ میری جیب کٹ گئی تھی۔ مالیر کوٹلہ جاتے ہی یہ پیسے منی آرڈر کرا
دوں گا۔ میں سلام کر کے اٹھا اور سڑک پر ایک طرف چلنے لگا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ میرا
ہرپال کور کے ہاں جانا مناسب رہے گا یا نہیں۔ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔
لیکن پولیس چاروں طرف سے مجھے گھیرے میں لے رہی تھی۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ میں
اگر اسی طرح پیدل چلتا رہا تو جی ٹی روڈ پر یا کہیں نہ کہیں ضرور پکڑ لیا جاؤں گا۔ میں نے

ایک خالی موٹر رکشا لیا اور ہرپال کور کی کوٹھی جس علاقے میں تھی اس طرف روانہ ہو
گیا۔ کوٹھی کے گیٹ سے کافی پیچھے میں نے رکشا چھوڑ دیا۔ کوٹھی کو میں نے پہچان لیا تھا۔
پورچ اور لان خالی تھی۔ ہرپال کور کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ چوکیدار ایک طرف بیٹھ
بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ میرا حلیہ بہت شکستہ ہو رہا تھا۔ کپڑے میلے
کچیلے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ شریمتی ہرپال کور جی گھر پر ہیں مجھے ان سے ملنا ہے
میں ان کا رشتے دار ہوں تو وہ میری شکل صورت اور کپڑوں کو دیکھ کر بولا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اسے یقین آگیا کہ میں شریمتی جی کا کوئی قریب رشتے
دار ہوں جو ان سے مدد لینے آیا ہوں۔ کہنے لگا۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔ شریمتی جی اپنی ماتا کی خبر لینے ہسپتال گئی ہیں۔ ابھی آجائیں گی"

معلوم ہوا کہ ہرپال کور کی ماں ہسپتال میں داخل ہے۔ مجھے اس کی ماں سے کو
دلچسپی نہیں تھی۔ میں کوٹھی کے باغیچے میں کیاری کے پاس بیٹھ گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ
کے بعد ہرپال کور کی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔
اس کا پرانا سکھ ڈرائیور چلا رہا تھا جس کی شکل سے میں واقف تھا۔ ہرپال کور نے سرسری
نگاہ سے مجھے دیکھا مگر نہ پہچانا۔ میں اٹھ کر پورچ کی طرف گیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی ہو
گئی تھی۔ ہرپال کور گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی
میں نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"جگدیش جی تم ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں شریمتی۔ میں جگدیش ہی ہوں"

"اندر آجاؤ۔ آؤ۔ آؤ"

میں ہرپال کور کے ساتھ ڈرائینگ روم میں آگیا۔ ہرپال کور ویسی کی ویسی ہی
اس کے مردانہ حسن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مردانہ حسن میں نے اس لئے کہا

عورت ضرور تھی مگر مرد لگتی تھی۔ میں نے اسے ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنادی کہ میرے
پتا کی وفات کے بعد ہمارے حالات خراب ہو گئے۔ ہم نے اپنا جالندھر والا مکان بیچ دیا اور
بمبئی چلے گئے۔ وہاں میں نے اپنا کاروبار شروع کیا کاروبار میں نقصان اٹھانا پڑا۔ جو پاس تھا
سب ختم ہو گیا۔ ماتا جی بیمار رہ کر مر گئیں۔ میں نے بمبئی میں نوکری کی تلاش شروع کر
دی۔ کچھ عرصہ ادھر ادھر چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا رہا۔ مگر حالات نہ سدھر سکے۔ تنگ آکر
واپس جالندھر آگیا ہوں۔

"میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں، تھے کہ ریل کا ٹکٹ خرید سکتا۔ بغیر ٹکٹ کے آیا
ہوں۔"

ہرپال کور میری من گھڑت کہانی سے بہت متاثر ہوئی کہنے لگی۔

"تمہاری یہ حالت دیکھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا ہے جگدیش جی۔ پر تم فکر نہ
کرو۔ میں اپنے پتی سے کہہ کر تمہیں نوکری دلا دوں گی۔ جاؤ تم پہلے نہا دھو لو۔"

میں نے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا کہ اب اس کی حالت کیسی ہے۔

"مجھے چوکیدار نے بتایا ہے کہ ماتا جی بیمار ہو کر ہسپتال میں پڑی ہیں"

ہرپال کور نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"بس واہے گورو اپنی کرپا کر کے ماتا جی کو ٹھیک کر دیں۔ تم جا کر نہالو۔"

میں غسل خانے میں جا کر خوب مل مل کر نہایا۔ ہرپال کور نے مجھے خدا جانے کس کا
استری کیا ہوا کھدر کا کرتہ پاجامہ دیا۔ میں نے پہن لیا۔ نوکرانی چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ
لے کر آگئی۔ ہرپال نے پوچھا۔

"تم کھانا کھاؤ گے یا صرف چائے پیو گے؟"

میں نے کہا۔

"صرف چائے پیوں گا۔"

ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ہرپال کور میرے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔
کہنے لگی۔

"میرا خاوند سردار یہاں نہیں ہے۔ انبالے میں ہے۔ میں اس سے فون پر تمہار
نوکری کے بارے میں بات کروں گی۔ بلکہ میں اس سے تمہیں نوکری دلوا کر رہوں گ
آخر تم بی اے پاس ہو۔ بی اے کر لیا تھا ناں تم نے؟"

"ہاں۔ کر لیا تھا"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا دل تھوڑا سا تیز ہو کر دھڑکا۔ آخر یہ پنجاب ڈی آئی جی یا خدا جانے آئی جی پولیس کی کوٹھی تھی۔ یہاں پولیس کا بھی فون آسکتا
ہرپال کور نے فون اٹھایا۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے لائن
دوسرا شخص تھا اس سے کہا۔

"سردار جی تو انبالے میں ہی ہیں۔ ہاں کیا؟ انبالے میں نہیں ہیں؟ تو پھر دلی یا
تھلے فون کر کے پتہ کر لو یہاں وہ تین دن سے نہیں آئے۔ ہاں۔"

اس نے فون رکھ دیا اور جو کوئی بھی فون پر بات کر رہا تھا اس کو پنجابی کی چھو
گالی دے کر کہنے لگی۔

"بڈھا کھوسٹ سردار نئی نئی طوائفوں سے عیش کرتا پھرتا ہے اور یہ پولیس ا
اس کی تلاش میں ادھر ادھر فون کرتے رہتے ہیں۔"

میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ٹیلی فون پر کیا بات ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کوئی خاص بات تھی؟"

ہرپال کور کے خضاب والے کالے سیاہ بال شانوں پر کھلے تھے۔ وہ انہیں پیچھے
کر بیٹوں۔

"یہ سٹی سٹیشن کا ایس ایچ او گورمندر سنگھ تھا۔ کہہ رہا تھا کہ امرتسر جیل ۔
پاکستانی جاسوس فرار ہو گیا ہے اس سلسلے میں سردار جی سے کوئی آرڈر لینا ہے۔ میں
مجھے کیا پتہ بڈھا کس طوائف کے کوٹھے پر ہے جاؤ جا کر دلی میں دیکھو۔ اور اب ا
کپور تھلے میں بھی کسی طوائف سے یارانہ لگا لیا ہے۔ میری طرف سے جو مرضی
مجھے ہر ماہ قسط مل جاتی ہے۔ مجھے تو یہ سردار ویسے بھی زہر لگتا ہے۔"

ہرپال کور سامنے والے صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ اس کی ساڑھی اور
ؤز میں سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ میں یہ خبر سن کر بے حد محتاط ہو گیا تھا کہ
الندھر پولیس کو نہ صرف میرے فرار کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ یہاں کی پولیس میری
اش میں سرگرم ہو گئی ہوئی تھی۔ صرف ایک بچت تھی کہ میں آئی جی پولیس کی کوٹھی
ں بیٹھا تھا۔ یہاں مجھ پر اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ لیکن سب سے بڑی
ہیبت یہ تھی کہ میری فوٹو امرتسر پولیس کے پاس تھی اور وہاں سے یقیناً جالندھر سٹی
لیس سٹیشن بھی پہنچ گئی ہو گی۔ مجھے یہ بھی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر پولیس نے اخبار میں
ری تصویر چھپوا دی تو میں ہرپال کور کی کوٹھی میں ہی پکڑ لیا جاؤں گا۔ لیکن خدا کا شکر تھا
ہ جالندھر پولیس نے اخبار میں میری خبر ہی دی تھی۔ میری تصویر نہیں چھپی تھی۔ ہو
تا ہے کہ آج پولیس کے پاس میری تصویر نہ پہنچی ہو۔ کل تک پہنچ جائے۔ اس اعتبار
ے میں زیادہ دیر ہرپال کور کے پاس نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں ایک رات
اں بسر کر سکتا تھا مجھے اگلے روز وہاں سے ہر صورت میں دلی کی طرف روانہ ہو جانا
ہیے تھا اور جانا بھی اس طرح تھا کہ میں راستے میں پولیس کی ناکہ بندی اور چیکنگ سے
فوظ رہ سکوں۔ اس سلسلہ میں ہرپال کور میری مدد کر سکتی تھی۔ میں اسی لئے اس کے
ں آگیا تھا۔

رپال کور چائے پینے کے بعد کہنے لگی۔

"چلو میرے ساتھ شاپنگ سنٹر چلو۔ اپنی پسند کے ریڈی میڈ کپڑے خرید لو۔

میں وہاں سے ایک قدم باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں ہرپال جی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی کپڑے کافی ہیں اور پھر مجھے
ل واپس بمبئی بھی جانا ہے۔ ماتا جی کی سمادھی پر پھول چڑھانے ہیں۔ بمبئی سے واپس
ؤں گا تو پھر نئے کپڑے بنوا لوں گا۔"

ہرپال کور نے میری طرف آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھا۔

"ارے تو کیا تم میرے پاس صرف ایک دن ہی ٹھہرنے کے لئے آئے تھے؟ نہیں۔

جگدیش جی۔ میں تمہیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔"

اس نے اپنی عادت کے مطابق اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا اور پیار سے بولی

"اتنے دنوں بعد ملے ہو۔ میں تو تمہیں بڑا یاد کیا کرتی تھی۔ اچھا بتاؤ کیا تم نے
کبھی مجھے یاد کیا تھا؟"

میں اس وقت اس قسم کی باتوں کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس عورت کو پتہ ہی نہ
کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جو امرتسر جیل سے فرار ہوا ہے۔ جس نے ایک خون بھی
ہے۔ اور جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے۔ مگر مجبوری تھی۔ مجھے اس سے
بھری باتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ واقعی جھوٹی محبت کا
کرنا بہت بڑا صبر طلب کام ہے۔ میں نے بھی بادل نخواستہ اپنا بازو اس کی گردن میں
کر دیا۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ میں نے کہا۔

"ہرپال جی! میں چاہے جتنے بھی کشٹ اٹھاتا رہا پر واہگورو گواہ ہے کہ میں نے
بڑا یاد کیا۔ تم بہت یاد آتی رہی ہو۔"

اس نے میرا منہ چوم لیا۔ مجھے اس کے منہ سے شراب کی ہلکی سی بو آئی۔ میں
پوچھا۔

"کیا تم نے دن کے وقت بھی پینی شروع کر دی ہے؟"

وہ دوبارہ میرا منہ چوم کر بولی۔

"یونہی ہسپتال جاتے وقت سکاچ کا ایک ہلکا سا پیگ پی لیا تھا۔"

پھر اس نے اپنا بازو میری گردن سے نکال لیا اور اداس ہو کر کہنے لگی۔

"مجھے اپنی ماتا جی کی بڑی فکر ہے۔ تم نہیں جانتے۔ میری ماتا جی نے مجھے
مصیبتیں جھیل کر پالا ہے۔"

اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اس کے
پونچھوں۔ میں نے اس کی ساڑھی کے پلو سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"جی ہلکا نہ کرو ہرپال جی! واہگورو ماتا جی کو اچھا کر دے گا۔"

اس نے بڑی محبت کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا۔

"اگر تم باہر نہیں جانا چاہتے تو تم آرام کرو۔ میں تمہارے لئے پتلون قمیض خرید کر
لے آتی ہوں۔ مجھے تمہارے سائز کا پتہ ہے۔"

میں اسے روکتا ہی رہا مگر وہ نہ مانی اور گاڑی لے کر شہر کی طرف چل دی۔ میں
ڈرائنگ روم میں چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ کسی
بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ امرتسر پولیس
سٹیشن سے پولیس پارٹی میری تصویر لے کر جالندھر شہر کی طرف روانہ ہو چکی ہو گی۔ اور
تصویر اخباروں کے دفاتر میں پہنچا دی جائے گی اور کل کے اخباروں میں میری تصویر
ضرور چھپ جائے گی۔ مجھے ہر حالت میں صبح صبح منہ اندھیرے یہاں سے نکل جانا ہو گا۔
ورنہ میں پکڑا جاؤں گا۔

کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہرپال کور بازار سے واپس آئی۔ وہ میرے لئے دو اعلیٰ
کوالٹی کی قمیضیں اور دو جینز جرابیں رومال اور دو بنیانیں وغیرہ لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"میرے سامنے پہن کر دکھاؤ"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے سامنے نہیں، میں اندر جا کر پہنتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا تو پھر میں بھی اندر آؤں گی"

یہ عورت ہی اس قسم کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے اپنی داستان کے شروع میں
اس عورت کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا تھا اور اس کی شخصیت اور کردار کے ہر پہلو پر
روشنی ڈالی تھی۔ یہ طوائف رہ چکی تھی۔ اس کی طوائف ماں نے ایک سکھ سے شادی کر
لی تھی۔ یہ اسی سکھ کی اولاد تھی۔ قد کاٹھ مردوں ایسا تھا۔ چہرے پر زنانہ حسن کی بجائے
مردانہ وجاہت زیادہ تھی۔ دل کی بڑی کشادہ اور سچی تھی۔ منہ پھٹ تھی۔ رات کو تھوڑی
بہت سکاچ ضرور پیتی تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔ میں یونہی اسے

اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ مجھے موڈ میں آکر کہا کرتی تھی۔

"جگدیش تم مجھے ہندو نہیں لگتے۔ تم میں ساری عادتیں مسلمانوں والی ہیں۔ تم دل
ہو۔ تمہارے شانے چوڑے ہیں اور تم بہادر مردوں کی طرح محبت کرتے ہو"

وہ خود بھی بڑی بہادر اور دلیر عورت تھی۔ اپنی گفتگو میں چھوٹی موٹی گالی عام بول
کرتی تھی۔ جب شراب پی لیتی تھی تو بڑی فحش گالیاں نکالتی تھی۔ کسی وقت اس
افسردگی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ پھر وہ خدا جانے کیا کیا یاد کر کے رونا شروع کر دیتی تھی۔
میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آئی۔ اس کے باوجود میں نے دوسری طرف منہ کر
کپڑے بدلے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ پورے میرے سائز کے کپڑے لائی تھی۔ میر
جوتے پھٹ گئے تھے۔ کہنے لگی۔

"چلو میرے ساتھ جوتے بھی خرید لو۔ میں جوتے اکیلی نہیں خریدنا چاہتی تھی"

میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پولیس کی طرف سے خطرہ تھا کہ اگر پولیس کے پا
میری تصویر آگئی ہو گی تو میں مشکل میں پھنس سکتا ہوں۔ مگر وہ مجھے زبردستی گاڑی میں
کر لے گئی۔ ایک بہت بڑا شاپنگ سنٹر تھا۔ وہاں سے میں نے ایسے بوٹ خریدے جن
تلا ربڑ کا تھا۔ اس خیال سے کہ خدا جانے کب اور کہاں مجھے بھاگنا پڑ جائے اور سخت
والے جوتے مجھے پریشان نہ کریں۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ اس کے بعد وہ یہ
کر چلی گئی کہ میں ماتا جی کا کھانا لے کر ہسپتال جا رہی ہوں۔ تم آرام کرو۔ اس کے جا
کے بعد میں نے نوکرانی سے کہا۔

"میں کمرے میں سو رہا ہوں۔ مجھے جگانا مت"

اور میں ہرپال کور کے بیڈ روم میں جا کر اس کے نرم آرام دہ بستر پر لیٹ گیا۔
نہیں چاہتا تھا مگر نیند آگئی اور سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہرپال کور مجھ پر جھکی مسکرا
تھی۔

"شام ہو گئی ہے اب اٹھ کر نہا دھو لو چائے پی کر اکٹھے فلم دیکھنے جائیں گے"

میں اٹھ بیٹھا۔ چائے میز پر لگی ہوئی تھی۔

ہم چائے پینے لگے۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے یونہی پوچھ لیا۔

"کسی کا فون تو نہیں آیا تھا؟"

میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں پولیس چوکی سے پھر کوئی فون نہ آگیا ہو۔ کہنے لگی۔

"ہاں آیا تھا۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کس کا فون تھا؟"

وہ ایک چھوٹی سی گالی دے کر بولی۔

"بڈھے سردار میرے خاوند کا فون تھا۔ دلی سے آیا تھا فون۔ آج کل دلی میں عیش کر
ہا ہے۔ پر وہ کیا عیش کرے گا۔ اس کے پلے رہ کیا گیا ہے۔"

میں فلم دیکھنے کے لئے سینما ہاؤس بھی نہیں جانا چاہتا تھا مگر ہرپال کور پروگرام طے کر
ی تھی۔ کہنے لگی۔

"خبردار جو تم نے انکار کیا۔ تمہیں معلوم ہے میں تو اپنے خاوند کے ساتھ بھی کبھی
م دیکھنے نہیں جاتی۔ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ تم مجھے پیارے جو لگتے
د۔"

اتنے میں جوان خادمہ بڑے میں کچھ لے کر اندر آگئی۔ ہرپال کور نے اس کو سخت
ے ڈانٹ دیا۔

"تمہیں کئی بار کہا ہے دروازے پر دستک دے کر اندر آیا کرو۔"

وہ بے چاری شرمسار سی ہو کر خاموشی سے ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ وہ
ائے کے ساتھ کھانے کے لئے مزید کچوریاں بنا کر لائی تھی۔

میں نے اصل بات چھیڑ دی۔

"ہرپال جی! کیا خیال ہے صبح بمبئی کی ٹرین میں سیٹ بک کرا لوں؟"

ہرپال کور نے آہ بھر کر کہا۔

"میں مر گئی۔ جگدیش جی کیوں جدائی کی باتیں کر رہے ہو۔ چلے جانا۔ جب تمہیں

جانا ہی ہے تو چلے جانا۔"

میں نے کہا۔

"ہرپال جی ماتا جی کی سمادھ پر میں ہر منگل کی شام کو پھول چڑھاتا ہوں۔ پرسوں منگل ہے۔ کل یہاں سے جاؤں گا تو پرسوں ماتا جی کی سمادھ پر پھول چڑھا سکوں گا۔"

ہرپال نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"صبح بمبئے ایکسپریس میں سیٹ بک کرا دوں گی وہ جالندھر سے منہ اندھیرے ساڑھے چار بجے چلتی ہے۔"

میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"سینما جاتے وقت ریلوے سٹیشن سے ہو کر چلیں گے۔ ٹرین میں سیٹ بھی بک کرا لیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"وعدہ یہ کرنا ہوگا کہ ماتا جی کی سمادھ پر پھول چڑھانے کے فوراً بعد تم میرے پاس واپس آجاؤ گے اور اس کے بعد یہاں جالندھر میں ہی رہو گے۔ میں تمہیں بڑی اعلیٰ نوکری دلوا دوں گی بس پھر دونوں روز ملا کریں گے وعدہ؟" اس نے ہاتھ میرے آگے کر دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وعدہ۔"

"ویری گڈ۔ اب چلو پہلے سٹیشن چل کر تمہاری سیٹ بک کراتے ہیں پھر سینما ہاؤس چلیں گے۔ بڑی اچھی انگریزی فلم لگی ہے۔"

وہ بڑی جلدی تیار ہو گئی۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور ریلوے سٹیشن کی طرف چل دیئے۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ہرپال کور سے میری جگد

کے روپ میں آخری ملاقات ہے۔ کل میرے جانے کے بعد اس پر یہ حیرت انگیز راز کھل جائے گا کہ میں مسلمان پاکستانی جاسوس تھا جیسا کہ بھارتی پولیس نے میرے بارے میں مشہور کر رکھا تھا۔ اس خبر پر ہرپال کور کو کس قدر صدمہ ہوگا یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ کیونکہ اسے پاکستان اور انڈیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی پسند کے مردوں سے محبت کرنے والی' انہیں اپنے قبضے میں کر کے رکھنے والی عورت تھی اور میں اسے پسند آگیا ہوا تھا۔ اسے صرف یہ صدمہ ہوگا کہ اس کی پسند کا مرد اور وہ بھی ایک مسلمان مرد اس سے چھن گیا ہے۔ کیونکہ وہ سکھوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان مردوں کی زیادہ شیدائی تھی۔ لیکن وہ حیران بھی ضرور ہوگی کہ میں اتنی دیر اس کے پاس رہا اور اسے خود بھی معلوم نہ ہو سکا کہ میں مسلمان ہوں۔

جالندھر ریلوے سٹیشن کے بکنگ آفس میں جا کر ہم نے بمبئی جانے والی گاڑی کی سیکنڈ کلاس میں ایک سیٹ بک کرائی اور اس کے بعد سینما ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے اگرچہ دلی جانا تھا مگر میں ہرپال کور کو دلی کا نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرا راز فاش ہو جانے کے بعد پولیس نے اس سے ضرور پوچھنا تھا کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ اس لئے میں نے بمبئی کی سیٹ بک کرائی تھی مجھے راستے میں دلی اتر جانا تھا۔ جالندھر کی پولیس ہرپال کور کو میرے بارے میں کچھ نہ بھی بتاتی تب بھی اگلے روز اخباروں میں میری تصویر کا چھپ جانا یقینی تھا۔ اور ہرپال کور کے ہاں سارے اخبار آتے تھے۔

سینما ہاؤس میں کافی رش تھا۔ ہم نے ایک بکس لے لیا اور مزے سے جا کر بیٹھ گئے۔ اس دوران میں ہر طرف سے پوری طرح چوکس رہا۔ ہرپال کور کی گاڑی پر کوئی جھنڈا وغیرہ نہیں لگا تھا پھر بھی پولیس اس کی گاڑی کو دور سے پہچانتی تھی۔ راستے میں کئی جگہ پولیس کے سپاہیوں نے سلیوٹ بھی کیا۔ سینما ہاؤس کی پارکنگ لاٹ میں بھی فوراً دو سپاہی ڈبل مارچ کرتے آگئے اور سلیوٹ مار کر ادب سے کھڑے ہو گئے تھے ہرپال کور نے ان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"گاڑی کا خیال رکھنا۔ اگر میری گاڑی کی ذرا سی چیز بھی چوری ہوئی تو تمہاری

وردیاں اتروا دوں گی۔"

سپاہی سلیوٹ مار کر ایک بار پھر ادب سے کھڑے ہو گئے تھے۔ انگریزی فلم مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ اس میں بعض بڑے فحش سین بھی تھے۔ انڈیا کا سنسر بورڈ بڑا فراخ دل اور عیاش واقع ہوا تھا۔ ایسا کوئی سین آتا تو ہرپال کور سمٹ کر میرے ساتھ لگ جاتی۔

رات کو دس سوا دس بجے ہم فلم دیکھ کر سینما ہاؤس سے نکلے۔ ہرپال کور کہنے لگی۔

"اشوکا ہوٹل میں چل کر کھانا کھاتے ہیں"

اشوکا ہوٹل جالندھر کا اس زمانے میں سب سے ماڈرن ہوٹل تھا۔ ہوٹل والے بھی ہرپال کور کو جانتے تھے۔ ملازم ہمارے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ کونے میں ایک بڑی رومانٹک سیٹ تھی۔ دھیما سا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ گلدان میں گلاب کے پھول بھی سج رہے تھے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ہرپال کور نے مینو میری طرف بڑھا کر کہا۔

"اپنی پسند کا کھانا منگواؤ۔ میں آج تمہاری پسند کا کھانا کھاؤں گی"

میں نے مرغ بریانی کا آرڈر دیا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

"تمہاری ساری عادتیں مسلمانوں والی ہیں۔ جگدیش سچ سچ بتاؤ۔ کہیں تم مسلمان تو نہیں ہو"

میں نے ہنس کر کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں ہندو ہوں۔ میرا نام جگدیش ہے۔"

وہ میری طرف جھک کر کہنے لگی۔

"واہگورو کی سونہہ! اگر تم کہہ دیتے ناں کہ ہاں ہرپال میں واقعی مسلمان ہوں تو میں تم پر صدقے واری ہو جاتی۔"

وہ تہہ کیا ہوا ہوٹل والوں کا رومال کھول کر اسے اپنے زانوں پر رکھتے ہوئے بولی۔

"میرا ایک مسلمان یار ہوا کرتا تھا۔ وہ میری ماں کا گانا سننے آیا کرتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ تعلقات قائم کر لئے کیا بتاؤں۔ کیسا مرد آدمی تھا۔ ارے یہ دال کھانے والے ہندوؤں میں مسلمانوں والی طاقت کہاں سے آ سکتی ہے۔"

میں کسی کسی وقت ہوٹل کے سارے فلور کا جائزہ لے لیتا تھا۔ وہاں کوئی مشکوک چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ میرے خیال کے مطابق اس وقت اخباروں کے دفتروں میں پولیس کے اشتہار کے ساتھ یا پولیس والوں کی خبر کے ساتھ میری تصویر دھڑا دھڑ چھپ رہی ہو گی۔ یہ اخبار صبح کے وقت بازار میں آجانے تھے۔ یہ بھی خیال پریشان کر رہا تھا کہ یہ اخبار دلی تک میرا پیچھا کریں گے۔ اخبار ہوائی جہاز کے ذریعے جالندھر سے آگے دلی بمبئی پہنچ جاتے تھے۔ مجھے جالندھر سے دلی تک کا سفر بھی بے حد چوکنا اور ہر طرف سے ہوشیار رہ کر طے کرنا تھا۔ کسی بھی راستے میں کسی بھی سٹیشن پر کوئی مسافر اخبار میں چھپی ہوئی میری تصویر دیکھ سکتا تھا۔ کئی سٹیشنوں پر تو میں نے دن کے وقت پلیٹ فارم پر لڑکوں کو ایک ایک ڈبے کے پاس جا کر اخبار فروخت کرتے دیکھا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ ان باتوں کا خیال نہ کرتا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے دیتا کہ کہاں میری تصویر امرتسر سے آئے گی اور کہاں اخباروں میں چھپے گی۔ لیکن میں ایک پروفیشنل اور تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ مجھے پہلا سبق یہ دیا گیا تھا کہ دشمن کے ملک میں ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو کر نہیں بیٹھنا اور جس بات کا گمان بھی نہ ہو اس کے بارے میں یقین کرنا کہ وہ تمہارے ساتھ آ سکتی ہے۔ چنانچہ میں کمانڈو ٹریننگ کے اس پہلے درس پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے یقین کر لیا کہ صبح کے اخباروں میں میری تصویر اس خبر کے ساتھ ضرور آجائے گی کہ یہ ایک پاکستانی جاسوس کی تصویر ہے اور جو امرتسر کی جیل سے فرار ہو کر جالندھر دلی کی طرف بھاگا ہے۔ لوگ خبردار رہیں۔ جہاں اس شکل کا کوئی آدمی دیکھیں وہیں اسے پکڑ کر قابو کر لیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔

کھانا کھانے کے بعد ہم واپس آگئے۔ میں نے کوٹھی کے الگ بیڈ روم میں جا کر کپڑے بدلے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہرپال کور آگئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس نے ریشمی نائٹ پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہیں اتنی جلدی نہیں سونے دوں گی جگدیش جی! کل تو تم مجھ سے جدا ہو

رہے ہو۔ پتہ نہیں کب واپس آؤ۔ چلو میرے کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔"

میں جانتا تھا وہ مجھ سے کس قسم کی باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں وہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سردرد کا بہانہ بنایا تو وہ بولی۔

"لاؤ میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں"

وہ میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی اور میرا سر دبانے لگی۔ ریشمی نائٹی میں سے خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر سر دبانے کے بعد اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور کہنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ اس طرح نہیں۔ میرے کمرے میں چلو"

میں مجبور تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہاں مئے لالہ نام کا سارا بندوبست پہلے سے کیا جا چکا تھا۔ میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دوسری باتوں میں لگا دیا۔ مگر وہ دوسری باتوں میں لگنے والی نہیں تھی۔ میرے دل سے ایک آواز آئی۔

"گناہ نہ کرنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے"

میں آپ کو گناہ اور ثواب کا فلسفہ نہیں سمجھاؤں گا۔ کیونکہ اس کا فلسفہ میں بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن اتنا مجھے میرے تجربے نے بتایا ہے کہ گناہ کرنے سے آدمی کے اندر ایک آواز مسلسل آنا شروع ہو جاتی ہے جو گناہ کرنے والے کو ملامت کرتی رہتی ہے۔ آدمی اپنے کان بند بھی کر لے تو یہ ملامت کرنے والی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ نجیب آباد کے جنگلوں میں مجھے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ انسان کے بعض ایسے فعل ہوتے ہیں جن سے اس کی زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور بعض ایسے فعل ہوتے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کی عمر کم ہونا شروع ہو جاتی ہے یہ سارے تجربے یہ ساری باتیں مجھے میری آوارہ گردیوں اور ایڈونچر کی مہموں کے دوران ملے ہوئے اللہ کے نیک بندوں نے بتائی تھیں۔

مگر ہرپال کور کسی اور ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ میں اس کی مٹی کو پہچانتا تھا۔ چنانچہ

میں نے اس سے سکھ مذہب اور سکھ مت کے گرو صاحبان کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ ان باتوں نے اس پر کافی اثر کیا۔ وہ گلاس میں مے گلفام انڈیلنے لگی تھی۔ اس نے میری باتیں سن کر بوتل ایک طرف رکھ دی۔ پھر اس کے دل میں ایسا گداز پیدا ہوا کہ وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس نے مجھے اپنی زندگی کی ساری دردناک کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ ایک شریف عورت بن کر شادی کر کے گھر بسانا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں کی ماں بننا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں کو لائق بنانا چاہتی تھی مگر جس ماحول میں وہ پروان چڑھ رہی تھی اس ماحول نے اور اس ماحول کے لوگوں نے اسے ایسی عورت نہ بننے دیا۔

"میں کمزور تھی۔ نیکی کے کام کرنے میں کمزور تھی۔ میں نے ہار مان لی۔"

ہم کافی دیر تک اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ ماحول بالکل ہی بدل گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہرپال جی اب تم آرام کرو۔ میں بھی سونے کے لئے جاتا ہوں۔ صبح مجھے جلدی ٹرین پکڑنی ہے"

ہرپال کور نے پوچھا۔

"تم نے ٹائم پیس کا الارم لگا دیا ہوا ہے نا؟"

"ہاں یہ کام میں نے آتے ہی کر دیا تھا۔"

"اچھا اب تم آرام کرو"

میں ہرپال کور کے بیڈ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ آپ نے بھی یہ ضرور تجربہ کیا ہو گا کہ آدمی کو نیکی کا کوئی کام کر کے نیکی کا کام نہ سہی، کسی گناہ سے اپنے آپ کو بچا لینے کے بعد جو روحانی خوشی ہوتی ہے اس کے سامنے دنیا کی ہر خوشی ہیچ لگتی ہے۔ اس وقت میں بھی اپنے اندر روحانی خوشی کی ایک سرور انگیز لہر کو جاری وساری محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ مگر نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی

کہ مجھے بار بار اس اخبار کا خیال آرہا تھا جس میں صبح میری تصویر اور خبر چھپ کر آنے والی تھی۔ میں دیر تک پلنگ پر لیٹا یہی سوچتا رہا کہ صبح جس وقت میں بمبئی ایکسپریس میں سوار ہوں گا تو اس وقت تک شاید اخبار چھپ کر مارکیٹ میں آچکے ہوں گے۔ کہیں میں سٹیشن پر ہی نہ پکڑا جاؤں میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر جالندھر یا کسی دوسرے سٹیشن پر لوگوں نے مجھے پہچان لیا تو میں مقابلہ کروں گا اور اتنی آسانی سے ان کے قابو نہیں آؤں گا۔

میں نے اندھیرے میں گردن ایک طرف کر کے تپائی پر رکھے چھوٹے ٹائم پیس کو دیکھا۔ اس کی سنہری سوئیاں رات کا ڈیڑھ بجا رہی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں نہیں سوؤں گا۔ نیند تو پہلے بھی نہیں آرہی تھی۔ بہتر ہے کہ میں باقی کی رات جاگ کر گزاروں۔ چار بجے کے قریب تو مجھے وہاں سے نکل جانا تھا۔ میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے خیال آیا کہ ٹیبل لیمپ روشن کر دوں۔ پھر سوچا کہ اس کا کوئی فائد نہیں۔ اسی طرح بیڈ روم کے اندھیرے میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہرپال کور کا ڈرائیور مجھے چا بجے یہاں سے سٹیشن پر لے جائے گا۔ ہرپال کور تو اس وقت گہری نیند سو رہی ہو گی حالانکہ اس نے کہا تھا کہ مجھے ضرور جگا دینا۔ میں تمہارے ساتھ ریلوے سٹیشن جاؤں گ مگر میں اسے نہیں جگانا چاہتا تھا۔ خدا جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ اگر کوئی ایسی ویسی با ہو گئی تو کم از کم میں ہرپال کور کے سامنے اپنا راز فاش ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

مجھے ایک آواز آئی۔

اس آواز پر میں نے یقین نہ کیا۔ یہ کال بیل کی آواز تھی۔ کسی نے کوٹھی کے برآمدے والے دروازے کے باہر لگا گھنٹی کا بٹن دبایا تھا۔ مدھم گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ گھنٹی کی آواز دوسری بار آئی تو میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے معاملہ گڑ بڑ لگنے لگا۔ میں پلنگ پر سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور اندھیرے میں ادھ ادھر ہاتھ مارتا غسل خانے میں گیا۔ غسل خانے کی بتی روشن کر کے دروازہ اتنا بند کر د کہ غسل خانے کے بلب کی تھوڑی سی روشنی بیڈ روم میں آتی رہے۔ میں نے بیڈ ر

سا بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ کیونکہ مجھے نوکرانی کی آواز آئی تھی۔ وہ ہرپال کور کے بیڈ روم کے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر کہہ رہی تھی۔

"بی بی جی۔ باہر کوئی آیا ہے"

بیڈ روم کے دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ہرپال کور کی نیند میں ڈوبی ہوئی گالی کی آواز آئی۔

"کون آیا ہے اس وقت"

خادمہ نے کہا۔

"بی بی جی بڑے تھانیدار صاحب آئے ہیں جی ساتھ پولیس کے سپاہی بھی ہیں"

"وہ کیا لینے آئے ہیں آدھی رات کو؟"

ہرپال کور نے بڑی گندی گالی نکال کر پوچھا۔

خادمہ کی آواز آئی۔

"بی بی جی وہ کہتے ہیں بڑا ضروری ملنا ہے شرمیتی جی سے۔"

ہرپال کور گالیاں نکالتی بڑ بڑ کرتی جیسے کوریڈور میں آگئی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ بیڈ روم کے بالکل سامنے وہ دروازہ تھا جو ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ درمیان میں چھوٹی سی راہ داری یا کوریڈور تھا۔ میں نے ہرپال کور کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن کا فیتہ کمر کے گرد باندھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے خادمہ بھی داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں دبے پاؤں اپنے بیڈ روم سے نکلا اور ڈرائنگ روم والے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پہلے اپنا کان دروازے سے لگایا۔ پھر ذرا سا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر دروازے نے معمولی سی آواز پیدا کی۔ میں نے ہاتھ وہیں روک لیا۔ اس طرح کرنے سے دروازے میں اوپر سے نیچے تک ایک درز پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس درز میں سے دیکھا کہ سامنے صوفوں کے پاس ایک سکھ تھانیدار وردی میں بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ پیچھے چار سپاہی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ انہوں نے رائفلیں نیچی کر رکھی تھیں۔

ہرپال کور جاتے ہی اس پر برس پڑی۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے آدھی رات کو آکر پریشان کرنے والے؟ کیا میں کوئی چور ہوں میں نے کہیں ڈاکہ مارا ہے؟ میں صبح تم سب کی پیٹیاں اتروا کر لائن حاضر کرا دوں گی؟"

سکھ تھانیدار نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔

"بہن جی! ہمیں آپ کی حفاظت کے لئے آنا پڑا ہے۔ ورنہ ہم کبھی آپ کو اس وقت تکلیف نہ دیتے۔"

"میری حفاظت کے لئے؟" ہرپال کور نے تعجب سے پوچھا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

سکھ تھانیدار نے ادب سے کہا۔

"بات یہ ہے بہن جی کہ ایک خطرناک پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے بھاگ کر جالندھر آگیا ہے۔ وہ امرتسر میں ایک خون بھی کر چکا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ تم پولیس والے کیا کرتے ہو۔ تم اسے پکڑو جا کر۔ میرے پاس کیوں آگئے ہو؟"

سکھ تھانیدار نے عاجزی کے ساتھ کہا۔

"بات یہ ہے بہن جی! ہمیں رات کے نو بجے خبر مل گئی تھی کہ پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے بھاگ کر ایک چوکیدار کا خون کر کے جالندھر کی طرف آیا ہے۔ ہم نے اسی وقت شہر کی ناکہ بندی کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ ہم نے جی ٹی روڈ کے آس پاس کی ساری کالونیوں میں لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو شاہ جی کے مزار کے ایک آدمی نے ہمیں بتایا کہ ایک آدمی اس کے پاس آیا تھا اور وہ آئی جی صاحب کی کوٹھی کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ہم اس وقت آپ کی طرف دوڑ پڑے کہ یہ خطرناک قاتل قسم کا پاکستانی جاسوس ہے کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ بس جی ہم آپ کی خیریت معلوم کرنے آئے تھے۔ آپ کے پاس اس قسم کا کوئی اجنبی آدمی تو نہیں آیا؟"

اس دوران ہرپال کور صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اور سکھ تھانیدار کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ جب تھانیدار نے اپنی بات ختم کی تو ہرپال کور بولی۔

"یہاں کوئی اجنبی شخص نہیں آیا۔ اگر آتا تو میرا چوکیدار اسے کبھی اندر نہ گھسنے دیتا۔"

تھانیدار اسی طرح ادب سے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"بہن جی! وہ جیل توڑ کر اور قتل کر کے بھاگا ہے۔ وہ دیوار پھاند کر بھی اندر آسکتا ہے۔"

ہرپال کور نے غصے میں آکر کہا۔

"اگر آتا تو میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئی۔ میں سنگھنی ہوں۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول بھی ہے۔ میں اسے وہیں شوٹ کر دیتی۔ اب جاؤ اور شہر میں جا کر اپنے پاکستانی جاسوس کی تلاش کرو۔"

سکھ تھانیدار ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہنے لگا۔

"میں آپ کی حفاظت کے لئے کوٹھی کے باہر دو سپاہی چھوڑے جاتا ہوں۔ یہ ہمارا فرض ہے جی۔"

ہرپال کور نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اپنا فرض پورا کرتے جاؤ اور خبردار آئندہ مجھے اس طرح پریشان کیا تو میں تمہارا وہ حشر کراؤں گی کہ یاد رکھو گے۔ دفع ہو جاؤ۔"

سکھ تھانیدار نے اور اس کے پیچھے کھڑے چاروں سپاہیوں نے سلیوٹ کیا اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی دروازے سے ہٹ کر دبے پاؤں راہ داری سے گزرتا اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ اگر ہرپال کور کو شک پڑ گیا ہو گا کہ امرتسر جیل سے بھاگا ہوا پاکستانی جاسوس میں ہی ہوں تو وہ ضرور میرے کمرے میں آئے گی۔ وہ بڑی صاف صاف بات کرنے والی عورت ہے۔ وہ آتے ہی مجھ سے پوچھے گی کہ کیا میں ہی پاکستانی جاسوس ہوں؟ میں اس کے جواب میں کیا کہوں گا؟ بس میں اسی الجھن میں پھنس گیا تھا۔ معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ پولیس میری تلاش میں ہرپال کور کی

کوٹھی تک آگئی تھی۔ باہر دو مسلح کانسٹیبل بھی پہرہ دے رہے تھے۔ اب میری پر صرف اسی میں تھی کہ خدا کرے ہرپال کور کو میرے بارے میں شک نہ پڑا ہو کہ میں امرتسر جیل سے بھاگا ہوا پاکستانی جاسوس ہوں۔ جس طرح کی وہ باتیں سکھ تھانیدار سے رہی تھی اس سے تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ مجھے پاکستانی جاسوس نہیں سمجھ رہی لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اندر سے سارا معاملہ سمجھ گئی ہو مگر مجھے پولیس کے حوالے کروانا چاہتی ہو۔ بہرحال میں دونوں طرح سے پریشان تھا۔

بیڈ روم میں اندھیرا تھا۔ میں پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ میرے ا ایک ہیجان سا مچا ہوا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ ابھی یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ پر سوچتا اکیلا یہاں سے بھاگا تو باہر مسلح کانسٹیبل کھڑے ہیں۔ ہر طرف شور مچ جائے گا۔ میں ہمہ گوش بھی تھا یعنی میں نے بیڈ روم میں اور باہر کوریڈور میں چھائی ہوئی خاموشی پر کان لگائے ہوئے تھے کہ ابھی مجھے ہرپال کور کے قدموں کی آواز سنائی دے گی۔ وہ میرے کمرے کی طرف آ رہی ہو گی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ خاموشی اسی طرح چھائی رہی۔ ہ کور نہ آئی۔ میری نیند پہلے ہی اڑ چکی تھی۔ اب مجھ سے آرام سے وہاں بیٹھا بھی جا رہا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ سکھ تھانیدار نے کوٹھی چاروں طرف کچھ دوسرے سپاہی بھی اندھیرے میں پھیلا دیئے ہوں جو کوٹھی کے آ پاس کی نگرانی کر رہے ہوں۔ پولیس والے احمق نہیں ہوتے۔ میں حیران تھا کہ دا شریف کے متولی نے تھانیدار کو یہ کیوں بتا دیا کہ ایک آدمی آئی جی پولیس کی کوٹھی کا پوچھ رہا تھا۔ وہ مسلمان تھا۔ میں بھی مسلمان تھا۔ پھر خیال آیا کہ متولی کو جالندھر میں تھا۔ وہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس کوئی اپنا آدمی وہاں متولی بنا کر رکھ چھوڑا ہو تا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا پاکستانی جاسوس اد نکلے تو پولیس کو اطلاع مل جائے۔ کیونکہ یہ تو حقیقت ہے اور اس حقیقت سے انڈیا پاکستان دونوں ملک باخبر ہیں کہ بھارت میں پاکستان کے جاسوس اور پاکستان میں بھارت جاسوس کسی نہ کسی بھیس میں موجود رہتے ہیں۔ یہ ہر ملک کا حق ہوتا ہے اور اس

لئے باقاعدہ اصول اور ضوابط بنے ہوئے ہیں۔ کہ اگر کسی دوسرے ملک کا جاسوس پکڑا جائے تو اس پر باقاعدہ مقدمہ چلتا ہے اور اسے سال دو سال کے لئے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔

میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کبھی پلنگ پر بیٹھتا۔ کبھی اٹھ کر اندھیرے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگ جاتا۔ گھڑی رات کے سوا دو بجا رہی تھی۔ پورے پونے چار بجے کا میں نے الارم لگا کر رکھا تھا۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ ابھی ہرپال کور آجائے گی اور مجھ سے پوچھے گی کہ کیا میں واقعی پاکستانی ہوں؟ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے جلدی جلدی پتلون قمیض اور جوتے پہن لئے۔ میں فرار ہونے کے لئے بالکل تیار ہو جانا چاہتا تھا کہ اگر ہرپال کور کی نیت بدل بھی گئی تو میں اسے بڑی آسانی سے قابو کر لوں گا اور پلنگ کے ساتھ چادر سے باندھ کر وہاں سے جس طرح بھی ہو سکا بھاگ جاؤں گا۔ بمبئی ایکسپریس کا ٹکٹ میری جیب میں تھا۔ ایک پریشانی یہ بھی اپنی جگہ پر موجود تھی کہ جالندھر پولیس ریلوے سٹیشن پر بھی موجود ہو گی۔ یہ خدا کا شکر تھا کہ سکھ تھانیدار کے پاس امرتسر سے میری تصویر نہیں پہنچی تھی۔ اگر میری تصویر تھانے میں آگئی ہوتی تو سکھ تھانیدار ضرور میری تصویر ساتھ لاتا اور ہرپال کور کو میری تصویر دکھا کر پوچھتا کہ یہ آدمی تو کوٹھی میں نہیں آیا۔ اس حقیقت نے دوسری طرف مجھے ایک اطمینان بھی دلا دیا۔ اگر تھانے میری تصویر ابھی تک نہیں پہنچی تھی تو ظاہر ہے جالندھر کے اخباروں کے دفتر میں بھی میری تصویر نہیں آئی ہو گی۔ چنانچہ کم از کم جالندھر کے اخباروں میں صبح میری تصویر نہیں چھپے گی۔ لیکن امرتسر کے اخباروں میں میری تصویر کا چھپنا یقینی امر تھا۔ اور امرتسر کے اخبار جالندھر صبح نو دس بجے تک پہنچ سکتے تھے۔ ہرپال کور ابھی تک میرے بیڈ روم میں نہیں آئی تھی۔

اب مجھے یقین ہونے لگا کہ اس کو مجھ پر بالکل شک نہیں پڑا۔ اس کا خیال میری طرف نہیں گیا تھا۔ میں نے غسل خانے کی بتی روشن کر رکھی تھی۔ اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ جسے میں نے راہ داری سے واپس آکر پورا بند کر دیا تھا۔ میں نے بیڈ روم کے

دروازے کی چٹخنی بھی لگا دی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ اگر ہرپال کور نے
باہر ہی سے شور مچانا شروع کر دیا کہ دروازہ کھولو۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم ہی پاکستانی
جاسوس ہو تو میں غسل خانے کی کھڑکی میں سے بھاگ جاؤں گا۔ دروازہ نہیں کھولوں گا
لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ اگر ہرپال کور نے ایسا کرنا ہوتا تو وہ سکھ تھانیدار کو صاف
صاف بتا دیتی کہ ایک آدمی میرے پاس ضرور آیا ہوا ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو ہندو ظاہر
کرتا ہے۔ آپ لوگ اس سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ مگر ہرپال کور نے ایسا نہیں کیا تھا۔

میرا ذہن اس وقت طرح طرح کے پریشان کر دینے والے الٹ پلٹ خیالات کی
آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے ٹائم پیس کا بٹن دبا دیا۔ تا کہ اس کا الارم نہ بجے۔ میں نہیں
چاہتا تھا کہ اس کا شور پیدا ہو۔ اس کی سیکنڈوں کی سوئی بڑی مدھم ٹک ٹک کے ساتھ
گردش کر رہی تھی۔ میں نے غسل خانے میں جا کر اپنے چہرے کو غور سے دیکھا۔ چہرہ
ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں نے جیب سے کنگھی نکال کر بالوں میں پھیری۔ یہاں ایک کھڑکی
تھی۔ وہ بند تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے مجھے اس طرف سے کود کر باہر جانا
پڑے کھولا تو دیکھا کہ اس کی باہر کی جانب لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ اس کا مطلب تھا
کہ اب مجھے ہر حالت میں کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے نکلنا تھا۔ میں اصل میں ہرپال
کور کو بتائے بغیر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا تو سوا تین بج رہے تھے۔ میں آہستہ سے بیڈ روم
دروازہ کھول کر راہ داری میں آ گیا۔ سامنے ڈرائنگ روم والا دروازہ تھا۔ وہ کھلا تھا۔ میں
آہستہ آہستہ چلتا ڈرائنگ روم میں آیا۔ ڈرائنگ روم کا برآمدے کی طرف کھلنے والا
دروازہ بھی بند تھا۔ میں قالین پر چلتا دروازے تک گیا۔ کنڈی کھول کر آہستہ سے باہر کی
جانب دھکیلا۔ وہ کم بخت باہر سے بند تھا۔ شاید خادمہ نے سکھ تھانیدار اور سپاہیوں کے
جانے کے بعد باہر سے چٹخنی لگا دی تھی۔ اب میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں
واپس اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی
اس کی چمکتی ہوئی سوئیاں پونے چار بجا رہی تھیں۔ اگر میں نے اس کا بٹن دبایا نہ ہوتا

اس وقت اس کا الارم بج اٹھنا تھا۔ مجھے اب ریلوے سٹیشن کی طرف چل دینا چاہیے تھا۔
دلی کی طرف جانے والی ٹرین منہ اندھیرے چلتی تھی۔ مگر میرے سارے دروازے بند
تھے۔

اتنے میں مجھے کسی دوسرے کمرے میں گھڑی کے الارم بجنے کی دبی ہوئی آواز سنائی
دی۔ شاید یہ آواز ہرپال کور کے بیڈ روم سے آ رہی تھی۔ ضرور اس نے بھی صبح کا الارم
لگایا ہو گا۔ پھر یہ آواز اچانک بند ہو گئی۔ جیسے کسی نے اس کا بٹن دبا دیا ہو۔ ہرپال کور
جاگ پڑی تھی۔ میں ایک بار پھر غسل خانے میں گھس گیا۔ یہ میری اضطراری غیر شعوری
حرکتیں تھیں۔ میں اس وقت ہرپال کور سے اس طرح بچ رہا تھا جیسے وہ پولیس آفیسر ہو اور
مجھے گرفتار کرنے آ رہی ہو۔ مجھے اس کے بیڈ روم کے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز
آنے لگی۔ پھر اس کے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ
میرے کمرے میں آنے والی تھی۔ میں نے بغیر ارادے کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔
تولیے سے منہ پونچھا اور غسل خانے سے نکل کر کمرے کی بتی روشن کر دی۔ مجھے ہرپال
کور کے بیڈ روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے پلنگ پر بیٹھ
گیا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے جوتے اتار دیئے۔ ایک پاؤں دوبارہ جوتے میں ڈالا
اور اس کے تسمے باندھنے لگا۔ دروازے پر ٹھک ٹھک ہوئی۔

"کون؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں۔ ہرپال"

ہرپال کی آواز پر میں نے غور کیا۔ اس میں وہی اپنائیت تھی جو سکھ تھانیدار کے
آنے سے پہلے تھی۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔

"دروازہ کھلا ہے ہرپال جی"

وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سکھ
تھانیدار اندر آ گیا ہے۔ میرے ہاتھ سے جوتا چھوٹ گیا۔ میں نے جلدی سے جوتا اٹھایا اور
اس میں دوسرا پاؤں ڈالتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا تم نے الارم لگایا ہوا تھا۔ میرا الارم بجا ہی نہیں۔ ویسے میری آنکھ ٹھیک وقت پر کھل گئی تھی"

میں اپنی جانب سے بڑی بے نیازی سے بات کر رہا تھا لیکن میری آنکھیں اس کے چہرے کا مسلسل جائزہ لے رہی تھیں۔ ہرپال کور کے چہرے پر ہلکی تھکی ہوئی نیم خوابیدہ سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور بالوں کو یونہی برش کیا ہوا تھا۔ تھوڑی سی لپ سٹک لگائی تھی۔ میرے پاس آکر اس نے جھک کر میری گردن پر پیار کیا۔ میری جان میں جان آئی۔

"جگدیش! جلدی واپس آنا۔ پہلے کی طرح نہ کرنا کہ واپس آنے کا نام ہی نہ لو"

میں نے اس کی کمر کے گرد بازو حائل کر دیا۔ یہ میری طرف سے انتہائی اطمینان کا اظہار تھا۔ میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا ہرپال کور کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑا تھا۔ اگر اسے مجھ پر شک پڑ گیا ہوتا تو یقین کریں وہ ایسی عورت تھی کہ مجھے صاف صاف کہہ دیتی کہ تم نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی کیوں نہ بتا دیا کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ میں تو پھر تم سے زیادہ پیار کرتی۔ کیونکہ مجھے مسلمان مرد بڑے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ کہنے لگی۔

"اچھا کیا تم تیار ہو کر بیٹھے ہو۔ اب آجاؤ۔ نہیں تو گاڑی نکل جائے گی"

میں نے کمرے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور ہرپال کور کے پیچھے پیچھے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ ہرپال کور نے ڈرائنگ روم کے تالے کو پتلی سی چابی لگا کر کھولا اور ہم برآمدے میں آگئے۔ دروازے کو باہر سے کسی نے چٹخنی نہیں لگائی تھی ہرپال کور نے ہی اسے لاک کیا ہوا تھا۔

باہر پچھلے پہر کی خنک ہوا چل رہی تھی۔

برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ پورچ میں گاڑی کھڑی تھی۔ بوڑھا سکھ ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ ہرپال کور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن غرایا اور پھر گاڑی پورچ میں سے باہر نکل آئی۔ ہرپال کور نے ہلکا سا ہارن دیا۔ چوکیدار نے دوڑ کر کوٹھی کا گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کی دونوں جانب بتیاں روشن تھیں۔ میں نے گہری نگاہوں سے سامنے والے درختوں کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے کچھ انسانوں کے سائے نظر آئے۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے جنہیں سکھ تھانے دار نے وہاں ہرپال کور کی حفاظت کے لئے یا مجھے گرفتار کرنے کے لئے تعینات کیا ہوا تھا۔ گاڑی بڑے آرام سے باہر نکل کر کوٹھیوں کے درمیان والی چھوٹی سڑک سے ہوتی ہوئی بڑی سڑک پر آگئی۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ جالندھر کی اس فیشن ایبل کالونی کی سڑکیں رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں خالی پڑی تھیں۔ میں نے ہرپال سے بالکل نہیں پوچھا تھا کہ رات کو کس نے گھنٹی بجائی تھی۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہرپال کور نے خود ہی کہا۔

"تمہیں معلوم نہیں رات کو تھانیدار آیا تھا؟"

میں نے ان جان بن کر تعجب سے پوچھا۔

"تھانیدار آیا تھا؟ وہ کیوں؟ خیریت تو تھی؟"

ہرپال کور کہنے لگی۔

"کوئی پاکستانی جاسوس امرتسر کی جیل سے بھاگ گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں
تھی۔ یہاں سے ایک مزار شریف ہے۔ پولیس سراغ رسانی کرتی وہاں پہنچی تو وہاں جو
آدمی رہتا ہے اس نے بتایا کہ ایک آدمی میرے سردار خاوند کی کوٹھی کا پتہ پوچھ رہا تھا۔
پولیس کو شک پڑا کہیں یہ پاکستانی جاسوس ہی نہ ہو اور سردار جی کو قتل کرنا چاہتا ہو۔
تھانیدار آدھی رات کو میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا جی یہاں کوئی مشکوک آدمی تو نہیں آیا۔ ہم
آپ کی حفاظت کے لئے بھی آئے ہیں۔ میں نے انہیں بہت گالیاں دیں۔ تم نے کوٹھی
سے باہر نکلتے وقت دیکھا نہیں۔ سامنے پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ یہ میری حفاظت کے
لئے تھانیدار لگا گیا تھا۔

پھر وہ تھانیدار کو گالیاں دینے لگی۔

"میری نیند حرام کر گیا۔ میں تو پھر ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکی۔ بھئی پاکستانی جاسوس
بھاگ گیا ہے تو میں کیا کروں۔ تمہارے انڈین جاسوس بھی تو پاکستان میں جاسوسی کرتے
پھرتے ہیں۔ دھماکے کرتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی جاسوس یہاں آگیا ہے تو پھر کیا ہوا
آنے دو اسے بھی۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ میں سو رہا تھا۔"

"اچھا ہوا کہ تم سو رہے تھے۔ ورنہ میرے ساتھ تمہاری بھی نیند خراب ہوتی۔"

سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ ہرپال کور نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بڑی محبت
بھرے انداز میں بولی۔

"مجھے وچن دو کہ تم بمبئی میں زیادہ دن نہیں ٹھہرو گے اور وہاں سے سیدھے میرے
پاس آؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"میں وچن دیتا ہوں کہ بمبئی سے سیدھا تمہارے پاس آؤں گا اور بڑی جلدی آؤں
گا"

وہ خوش ہو کر کہنے لگی۔

"اب اس وچن پر مردوں کی طرح قائم رہنا۔ سردار کی تم فکر نہ کرو۔ وہ بڈھا
کھوسٹ جالندھر والی کوٹھی میں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ آبھی گیا تو میں اسے بھگا دوں گی۔
اس کی کیا مجال ہے کہ میرے سامنے بولے۔"

گاڑی اب ریلوے سٹیشن کے سامنے آگئی تھی۔ سٹیشن کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔
مسافر گاڑیوں اور تانگوں رکشوں سے اتر کر اپنا اپنا سامان قلیوں سے اٹھوا رہے تھے۔
جالندھر کے سٹیشن میں بارہ برس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ہرپال
کور نے گاڑی ایک طرف اندھیرے میں کھڑی کر دی۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں
لے کر دبایا۔ پھر انہیں چوما اور کہنے لگی۔

"لگتا ہے تم مجھ سے پھر بے وفائی کرو گے اب گئے ہو تو جانے کتنے سالوں بعد ملو
گے۔"

میں نے کہا۔

"ہرپال جی! میں نے تمہیں وچن دیا ہے میں اپنا وچن پورا کروں گا۔ ماتا جی کی سمادھ
پر پھول چڑھانے کے بعد فوراً بمبئی سے جالندھر روانہ ہو جاؤں گا"

اس نے پرس میں سے ایک لفافہ نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور بولی۔

"اسے میرے سامنے مت کھولنا۔ اسے میری محبت کی چھوٹی سی نشانی سمجھ کر سویکار
کر لینا۔"

میں نے لفافہ قمیض کی جیب میں ڈال لیا اور کہا۔

"شکریہ ہرپال جی۔ اب میں جاتا ہوں"

"رب راکھا"

اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ میں گاڑی سے نکل کر تیز تیز
قدموں سے سٹیشن کی لابی کی طرف چل پڑا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی مڑ کر پیچھے نہ
دیکھا کہ ہرپال کور کی گاڑی وہاں کھڑی تھی یا نہیں۔ اب میری ساری توجہ آگے کی جانب

تھی۔ ریلوے پولیس کا کوئی آدمی ابھی تک مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ لابی کے اندر آگے جا کر پلیٹ فارم کا گیٹ تھا جہاں ایک ٹی ٹی کرسی پر بیٹھا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس سے بمبئی ایکسپریس کا ٹائم پوچھا۔

اس نے بے نیازی سے کہا۔

"بس آنے والی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"لیٹ تو نہیں ہے مہاراج؟"

اس شخص نے کہا۔

"ہو سکتا ہے لیٹ ہو۔ امرتسر سے تو ٹھیک وقت پر چلی تھی۔"

میں ٹکٹ دکھا کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ اگر ٹرین امرتسر کے سٹیشن سے چل پڑی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ جالندھر پہنچنے ہی والی تھی۔ بمبئی ایکسپریس رن تھرو گاڑی تھی اور آزادی ملنے اور پاکستان بن جانے کے بعد امرتسر سے تیار ہو کر بمبئی جایا کرتی تھی۔ پہلے یہ گاڑی پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پشاور تک جایا کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر کافی ہجوم تھا۔ بہت مسافر تھے۔ یہ میرے لئے اچھی بات تھی۔ میں سیدھا اخباروں والے سٹال کی طرف گیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ سٹال پر کچھ اخبار اور رسالے پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ قریب آگیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اخبار آگیا ہو گا۔ اس میں اگر میری تصویر چھپی ہوئی ہو گی تو سٹال والے نے بھی ضرور دیکھ لی ہو گی۔ مگر بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ جالندھر کے اخبار ابھی سٹال پر نہیں آئے تھے۔ سٹال والے نے کہا کہ جالندھر کے اخبار ایک گھنٹے بعد چھپ کر آئیں گے۔ میں نے امرتسر کے اخباروں کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"امرتسر کے اخبار جنتا ایکسپریس میں آتے ہیں جو بمبئی ایکسپریس کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد آئے گی۔"

میں نے کہا۔

"امرتسر کے اخبار ہوائی جہاز سے نہیں آتے؟"

سٹال والا ہنس کر بولا۔

"مہاراج! ہوائی جہاز کا خرچہ بہت ہوتا ہے۔ پھر تو اخبار چار پانچ روپے کا بکنا چاہئے۔"

جب کہ اس زمانے میں اخبار کی قیمت انڈیا میں ایک آنہ ہوا کرتی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جب یہاں اخبار آئیں گے تو میں جالندھر سے کافی دور نکل چکا ہوں گا اور جنتا ایکسپریس والے اخبار تو انبالہ اور لدھیانہ دلی وغیرہ کافی دیر بعد پہنچیں گے۔ مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ انبالے سے آگے اخبار بذریعہ ہوائی جہاز پہنچائے جاتے ہیں اور جب میری گاڑی میرٹھ پہنچے گی تو میری تصویر والے اخبار دلی بمبئی اور انبالہ لدھیانہ سب شہروں میں پہنچ چکے ہوں گے اور میں کسی بھی جگہ پہچانا جا سکوں گا۔

مجھے اس خطرے کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کرنی تھیں۔ اور یہ تدابیر یہی ہو سکتی تھیں کہ میں ہر سٹیشن پر ڈبے سے اتر کر جائزہ لوں کہ حالات کیسے ہیں۔ اگر ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو بجائے اس کے کہ میں ڈبے میں بیٹھا بیٹھا پکڑ لیا جاؤں باہر ہی سے فرار ہو جاؤں۔

ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ میں بمبئے ایکسپریس میں سوار ہو گیا۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ یہ دو مسافروں کا کوپے تھا۔ ایک آدمی پہلے سے اپنی سیٹ پر بستر لگائے سو رہا تھا۔ میں دوسری سیٹ پر لیٹ گیا۔ ایکسپریس ٹرین تھی۔ جالندھر سے چلی تو چھوٹے سٹیشنوں کو چھوڑتی چلی گئی۔ لدھیانے میں صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ میں ڈبے سے اتر کر سیدھا کتابوں رسالوں کے سٹال پر گیا۔ معلوم ہوا اس روز کا تازہ اخبار ابھی نہیں آیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر واپس ڈبے میں آگیا۔

ڈبے میں جو دوسرا مسافر سفر کر رہا تھا وہ ایک بوڑھا ہندو کاروباری آدمی تھی۔ وہ بیمار تھا اور بیشتر وقت بستر پر ہی لیٹا رہا۔ اس نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا کہ میں کہاں جا

رہاہوں۔ اس کے بعد نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔ انبالے کافی دن چڑھ آیا تھا۔ گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر اتر کر سیدھا بک سٹال پر گیا۔ ہندی انگریزی اور اردو کے تازہ اخبار آگئے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ وہیں کھڑے خبریں دیکھ رہے تھے۔ امرتسر سے ایک اخبار گورمکھی کا اور ایک ہندی کا چھپتا تھا۔ میں گورمکھی تو نہیں جانتا تھا مگر ہندی پڑھ لیتا تھا۔ میں جلدی سے ہندی کا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میں ایک دم سنبھل گیا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ خبر نہیں تھی۔ چھوٹا سا اشتہار تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ تصویر ایک پاکستانی جاسوس کی ہے جو امرتسر جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ اس نے ایک آدمی کا قتل بھی کیا ہے۔ یہ شخص جس کسی کو جہاں بھی دکھائی دے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

ایک بات کی وضاحت میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اب کوئی عام قسم کا نوآموز جاسوس نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ادھر خود بارڈر کراس کر کے کشمیر کے جہاد میں شرکت کرنے انڈیا آیا تھا۔ مجھے کسی حکومت نے جاسوسی کرنے یا جہاد کشمیر میں حصہ لینے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے انڈیا میں مقیم تھا۔ مجھے یہاں کے شہروں سے اور یہاں کے لوگوں کی ذہنیت سے اور پولیس کے ہتھکنڈوں سے کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ میں نے انڈیا میں ہی ایک مرد مومن سے کمانڈو کی سخت تربیت حاصل کی تھی اور میرے اندر سخت جانی کے علاوہ بہت زیادہ اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ اب تو میں نے عملی طور پر پولیس کا تشدد بھی دیکھ لیا تھا۔ میری وہ حالت نہیں تھی کہ ذرا سی بات پر یا کسی غیر معمولی بات پر گھبرا جاؤں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہوں تو فرار بھی ہو سکتا ہوں۔ یہ الگ بات تھی کہ پولیس کی بھاری نفری مجھے نرغے میں لے کر فائرنگ کر کے ہلاک کر دے۔ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرے دل سے موت کا خوف اس وقت ہی نکل گیا تھا جب میں اپنے باپ کی آخری وصیت پر عمل کرتے ہوئے کشمیر کے جہاد میں شریک ہونے کے لئے انڈیا میں داخل ہوا تھا۔ موت کے خوف کی جگہ میرے دل میں صرف خدا کا خوف پیدا ہو

چکا تھا۔ میرا ایمان تھا اور آج بھی ہے کہ اسلام اور پاکستان کی راہ میں جان قربان کرنے والا شہید ہوتا ہے اور شہید کبھی نہیں مرتا۔ وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں جاتا ہے۔

چنانچہ میں نے جب امرتسر میں چھپنے والے ہندی اخبار میں اپنی تصویر والا اشتہار دیکھا تو مجھ پر گھبراہٹ بالکل طاری نہیں ہوئی تھی۔ میں محتاط ضرور ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں جو لوگ کھڑے تھے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ابھی تک شاید کسی نے میری تصویر والا اشتہار نہیں پڑھا تھا۔ لوگ مشرقی پنجاب کی سیاسی خبریں بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ اشتہار میں میری وہ تصویر چھپی تھی جو امرتسر جیل کے حکام نے اتاری تھی۔ میں میلی قمیض میں تھا اور میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ تصویر اتنی صاف بھی نہیں تھی۔ پھر بھی میں پہچانا جاتا تھا۔ میں نے جالندھر کا ایک اخبار دیکھا۔ اس کے پچھلے صفحے پر بھی میری تصویر والا اشتہار چھپا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اپنے ڈبے میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے لئے ضروری تھا کہ میں دلی پہنچنے تک کسی طرح اپنا حلیہ بدل لوں۔ میرے پاس حلیہ بدلنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اسے اپنے سر پر باندھ لیا اور نیچے والی سیٹ چھوڑ کر اوپر والی سیٹ پر جا کر لیٹ گیا۔

ٹرین انبالے سٹیشن پر دس پندرہ منٹ تک کھڑی رہی۔ یہاں سے چلی تو میرٹھ کینٹ کے سٹیشن پر جا کر رکی۔ میں اوپر والی برتھ سے ایک لمحے کے لئے بھی نیچے نہ اترا۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ دلی تک میں ڈبے کی برتھ پر ہی لیٹا رہا۔ کبھی کبھی اپنے ساتھی ہندو مسافر پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں سو رہا ہوں خراٹے لینے لگتا تھا۔

خدا خدا کر کے دلی کا سٹیشن آیا۔ اگر مشرقی پنجاب کے اخباروں میں میری تصویر چھپی تھی تو یقینی بات تھی کہ کم از کم دلی کے اخباروں میں بھی ضرور چھپی ہو گی۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو کر آہستہ ہو گئی تھی۔ جب رکی تو میں برتھ سے نیچے آیا اور بڑے اطمینان سے ڈبے میں سے اتر کر کسی کی طرف دیکھے بغیر پیچھے کی طرف چل پڑا۔ مسافروں کے ہجوم میں سے جان بوجھ کر گزر رہا تھا۔ ٹرین کے پچھلے ڈبے کے پاس ریلوے پولیس کا آدمی کھڑے سے کوئی بات کر رہا تھا۔ میرے سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ میں نے ایسی اداکاری

شروع کر دی جیسے مجھے کسی آدمی کی تلاش ہے۔ میں ڈبے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ پھر خاموشی سے پولیس کے سپاہی اور گارڈ کے قریب سے آگے نکل گیا۔

یہ ٹرین کا آخری ڈبہ تھا۔ آگے ریلوے لائن خالی تھی۔ میں لائن میں اتر گیا اور دوسری لائن عبور کر کے دوسرے پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں بہت کم لوگ تھے۔ دلی کے ریلوے سٹیشن کے حدود اربعے سے میں واقف تھا۔ میں ریلوے گودام کی طرف چل پڑا۔ پلیٹ فارم کی ڈھلان آگئی۔ دائیں جانب جنگلے کے قریب ریلوے گودام کا پھاٹک تھا جو آدھا کھلا تھا۔ میں گودام کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"ٹکٹ ہے تمہارے پاس؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ریلوے ٹی ٹی کھڑا مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلد سے جیب سے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا۔ اس نے ٹکٹ دیکھ کر کہا۔

"یہ تو بمبئی کا ٹکٹ ہے۔"

سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیکھنے کے بعد ریلوے ٹی ٹی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں بمبئی ہی جا رہا ہوں لیکن یہاں میرا ایک رشتے دار پرشوتم دا گودام میں ملازم ہے۔ سوچا اس سے ملتا چلوں۔"

ٹی ٹی نے مجھے ٹکٹ واپس کرتے ہوئے بڑے اخلاق کے ساتھ کہا۔

"زیادہ دیر نہ لگایئے گا۔ ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گی"

"بس میں ابھی آیا۔"

میں نے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھا اور مال گودام کے احاطے میں اس طرف پڑا جدھر مال گودام کے دفتر تھے۔ ان دفتروں کے عقب میں باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس راستے سے باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی میں نے موٹر رکشا لیا اور سیدھا بستی نظام ال اولیا" پہنچ گیا۔ خطرہ میرے سر پر برابر منڈلا رہا تھا کہ کہیں مجھے کوئی پہچان نہ لے۔ ر میں نے اسی طرح سر پر باندھا ہوا تھا۔ میں مزار شریف کے گیٹ کے پاس پبلک ٹیلی بوتھ پر گیا اور گل خان کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ موجود

دوسری طرف گھنٹی بالکل نہ بجی۔ میں نے دوسری بار تیسری بار ڈائل پر نمبر گھمایا مگر ہر بار دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ پیچھے معاملہ خراب ہو چکا ہے اور گل خان روپوش ہو گیا ہے اور اس کا ٹیلی فون کٹ گیا ہے۔ یا اس نے خود کاٹ دیا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ گل خان کے پرانے مکان میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ پروفیسر جمشید کا میرے پاس فون نمبر نہیں تھا۔ وہ جس دفتر میں کام کرتا تھا اس دفتر کا مجھے علم تھا۔ وہاں ڈائریکٹری پڑی ہوئی تھی۔ ڈائریکٹری میں سے پروفیسر جمشید کے دفتر کا نمبر مل گیا۔ میں نے وہ نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ اس نے انگریزی میں پہلے اپنے آفس کا نام لیا۔ پھر پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔ میں نے کہا۔

"مجھے پروفیسر جمشید سے ملنا ہے۔ کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟"

عورت نے کہا۔

"پلیز ہولڈ آن"

چند لمحوں کے بعد دوسری طرف سے پروفیسر جمشید کی آواز آئی۔

"ہیلو! میں پروفیسر جمشید بول رہا ہوں"

اس قسم کے حالات کے لئے ہم نے پہلے سے ایک منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو ہم ایک خاص جملہ بول کر اپنی شناخت کرائیں گے۔ میں نے کہا۔

"میں غازی آباد سے آپ کے لئے خالص گھی لے کر آیا ہوں۔ میرا نام مکھی داس ہے۔"

یہ دونوں جملے یا جملہ ہمارا کوڈ تھا۔ پروفیسر جمشید فوراً سمجھ گیا کہ میں بول رہا ہوں۔ اس نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

"مکھی داس جی گھی میرے مکان پر پہنچا دیں۔ میں اس وقت آپ سے نہیں مل سکتا۔"

اس کا مطلب تھا کہ میں دفتر ٹائم کے بعد رات کو ملوں گا۔ مکان سے پروفیسر کی مراد گل خان والا ویران مکان تھا۔ میں نے کہا۔

"اچھا جی ادھنواد"

میں نے فون بند کر دیا اور بوتھ سے نکل کر ارد گرد گہری نگاہ ڈالی۔ شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مزار شریف اور بستی کی جانب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ مزار شریف کی طرف سے قوالی کی آواز آ رہی تھی۔ میں چپکے سے اس کچی سڑک پر چل پڑا جو مغل شہزادے کی قبر والے احاطے کے قریب سے ہو کر گل خان کے ویران مکان کو چلی گئی تھی۔ اس مکان پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر خطرہ ہوتا تو پروفیسر جمشید کبھی یہ نہ کہتا کہ گھی میرے مکان پر پہنچا دو۔ خطرے کی صورت میں وہ مجھے صرف اتنا کہتا۔

"گھی واپس لے جاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے مکان کے پاس پہنچ کر خفیہ جگہ سے چابی نکالی۔ دروازے کا تالا کھولا اور سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل والے اکلوتے کمرے میں آگیا۔ میں نے سر پر سے رومال کھول کر جیب میں رکھا اور کھڑکی ذرا سی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر خاموشی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ یہ کوارٹر نما چھوٹا سا مکان گل خان نے کسی زمانے میں خرید لیا تھا مگر وہ خود شہر کے اندر ایک محلے میں رہتا تھا۔ اس مکان میں ہماری خفیہ ملاقاتیں ہی ہوتی تھیں۔

میں نے نیچے جھک کر سگریٹ جلایا اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اسے اس طرح پینے لگا کہ کش لگاتے وقت سگریٹ کے سرے کی سرخ روشنی باہر سے نظر نہ آئے۔ میں سوچنے لگا کہ گل خان کہاں روپوش ہوا ہو گا۔ کہیں پولیس اسے پکڑ کر نہ لے گئی ہو۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ گل خان بڑا دلیر کمانڈو اور اسلام کا فدائی ہے وہ پولیس کے تشدد سے مر جائے گا مگر زبان نہیں کھولے گا۔ یہی وجہ تھی کہ پروفیسر جمشید ابھی تک اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو گل خان کے ساتھ ہی پروفیسر جمشید بھی روپوش ہو چکا ہوتا۔ اب مجھے پروفیسر کا شدت سے انتظار تھا۔ کیونکہ وہی مجھے بتا سکتا تھا کہ دلی میں میری گرفتاری کے بعد حالات کیا صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے چندریکا کی بدروح کا خیال آگیا۔ یہ بدروح میری دشمن بن چکی

تھی اور کسی وقت بھی مجھے کسی مشکل میں پھنسا سکتی تھی۔ پہلے میں اس کا خیال کرتا تھا تو وہ آجایا کرتی تھی۔ لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ میری دشمن نہیں تھی اور اسے یقین تھا کہ میں اس کی بھارت ماتا کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اس وقت وہ مجھ سے محبت بھی کرتی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے جسمانی روپ میں بھی آجائے گی اور شادی کر کے میری موت تک میرے ساتھ زندگی گزارے گی اور میری موت کے بعد بقول اس کے وہ دوسرے جنم میں ہمیشہ کے لئے میرے پاس آجائے گی۔ لیکن دوارکا فورٹ کی تباہی کے بعد وہ میری دشمن بن گئی تھی۔ وہ کسی بھی وقت میری بربادی کا باعث بن سکتی تھی۔ اگرچہ میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ پھر بھی وہ شیطانی مخلوق کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اور میرے لئے ایک مسلسل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ میں اس سے جھوٹ موٹ کی محبت جتا کر اسے اپنا حمایتی بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ میرے دل کا حال معلوم کر لیتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے مغل شہزادے کی پیش گوئی بھی کسی وقت پریشان کرتی تھی۔ مغل شہزادے کی روح نے مجھے کہا تھا کہ مجھ پر ایک بھاری مصیبت نازل ہونے والی ہے مجھے اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ خدا جانے یہ کون سی مصیبت تھی۔ مصیبتوں نے تو مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اگر مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ نہ ہوتا اور خدا کی حاکمیت پر میرا پکا ایمان نہ ہوتا تو میں ہمت ہار سکتا تھا۔ لیکن میرے دل میں اسلام پاکستان اور کشمیر کے لئے جان قربان کر دینے اور دشمنوں سے زندگی کے آخری سانس تک کشمیر کے آزاد ہونے تک جنگ لڑنے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ میرے ارادے چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئے ہوئے تھے۔ بلکہ اب یہ حال ہو گیا تھا کہ ہر مصیبت میرے اندر ایک عزم ایک نئی طاقت پیدا کر دیتی تھی۔

میں چارپائی پر دیر تک لیٹا انہی خیالات میں گم رہا۔ کھڑکی آدھی کھلی تھی۔ اس میں سے شروع سردیوں کی رات کی خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ میری جیب میں ہرپال کور کا دیا لفافہ اسی طرح موجود تھا۔ اس میں ہرپال کور نے سو سو کے سات نوٹ رکھ دیئے تھے۔

سات سو روپے بہت رقم تھی۔ 1960ء تک یہ خاصی رقم ہوا کرتی تھی۔ راستے میں میں
نے صرف انبالے میں کھانا کھایا تھا۔ رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا خدا
جانے پروفیسر جمشید کب آئے گا۔ کہیں میرے ٹیلی فون آنے کے بعد وہ بھی نہ پکڑا گیا ہو۔
طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے گھڑی
پر نگاہ ڈالی۔ رات کے 9 بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکر نیچے دیکھنے لگا۔ مجھے
کچی سڑک پر ایک سایہ آتا دکھائی دیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ سایہ مکان
کی طرف آرہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا آدھا پٹ بھی بند کر دیا اور ذرا سا کھول کر باہر دیکھتا
رہا۔ سایہ مکان کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ پروفیسر جمشید ہی
تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کمرے کی کنڈی کھول کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔
ڈیوڑھی کا دروازہ میں نے بند کر کے چٹخنی لگا دی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہستہ سے دستک
ہوئی۔ میں نے مخصوص کوڈ میں پوچھا۔

"بشیر سہارن پور سے ابھی نہیں آیا"

باہر سے کوڈ الفاظ میں ہی پروفیسر جمشید نے جواب دیا۔

"میں بشیر سے مل کر آرہا ہوں"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ پروفیسر نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دروازہ
بند کر کے چٹخنی لگائی اور مجھ سے کہا۔

"جلدی سے اوپر آجاؤ"

ہم اوپر والے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے احتیاطاً موم بتی
نہیں جلائی تھی۔ میں نے پروفیسر سے آتے ہی پوچھا۔

"گل خان کہاں ہے؟"

اس نے کہا۔

"اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ جب تم راشٹریہ سیوک سنگ کے ٹریننگ سنٹر
امرتسر کی طرف ٹرک میں روانہ ہوئے تھے تو لکشمی دیال اور کالی داس نے اسی وقت

ے پولیس بلوا لی تھی۔ چونکہ اسے تمہاری کہانی پر یقین نہیں آیا تھا کہ سارے ہندو
ب کار بارڈر پر رینجرز کے مقابلے میں مارے گئے اور صرف تم زندہ بچ گئے۔ اس لئے
ن نے تمہیں امرتسر جیل بھجوانے کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا تھا۔ اس نے تمہارے
تھ آدمی بھیجے تھے وہ بھی سفید کپڑوں میں پولیس کے آدمی تھے۔ یہ ساری باتیں ہمیں
ریں معلوم ہوئیں۔ لکشمی دیال نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا کہ تمہیں کس کے ذریعے
ں بھرتی کیا گیا تھا۔ پولیس نے کانگریسی مسلمان سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا کہ گل
ن مرلی پرشاد کو لے کر میرے پاس آیا تھا۔ چنانچہ تمہارے امرتسر روانہ ہونے کے ایک
ٹے بعد ہی پولیس نے گل خان کے مکان پر چھاپہ مارا اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔"

میں نے کہا۔

"پولیس نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

ہمیں ایک دوسرے کے اندھیرے میں دھندلے دھندلے خاکے نظر آرہے تھے۔
وفیسر اس وقت بھی رومال سے عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کیسے فرار ہوئے۔ یہاں سب
باروں میں تمہاری تصویر چھپ چکی ہے۔ تم اس وقت بہت بڑے خطرے کی زد میں
ہ۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم جس طرح بھی ہو کشمیر کی طرف نکل جاؤ۔ اس
ت کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان اور کشمیری حریت پرستوں کو تمہاری ضرورت بھی ہے۔
اں انڈین فوج نے کشمیریوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میں سب سے پہلے اپنے کمانڈو ساتھی گل خان کو بھارتی پولیس کے چنگل سے
ھڑانا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ پولیس نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے۔"

"میں نے اپنے ذرائع سے سارا پتہ کرایا ہے گل خان کو پولیس جموں لے گئی تھی۔
ہاں اسے نہر انٹروگیشن سنٹر میں رکھا گیا ہے۔ تمہارا راز کھل جانے کے بعد کہ تم
سلمان ہو پاکستانی کمانڈو ہو اور تمہاری سرگرمیوں کا مرکز کشمیر بھی ہے اس لئے پولیس

گل خان کو جموں لے گئی کہ وہاں اس پر ٹارچر کر کے اس سے مقبوضہ کشمیر اور جموں میں دوسرے پاکستانی جاسوسوں کی نشان دہی کرائی جائے۔ اگرچہ گل خان کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ وہ ہر قسم کی اذیت برداشت کر سکتا ہے۔ وہ موت کو گلے لگا لے گا۔ لیکن زبان نہیں کھولے گا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں اس کی گرفتاری کے فوراً بعد روپوش ہو گیا ہوتا۔"

نہرانٹروگیشن سنٹر میرے لئے ایک نیا نام تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ یہ انٹروگیشن سنٹر کہاں پر ہے اور اس کا محل وقوع کیا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"یہ ٹارچر سیل بھارت کی تمام خفیہ ایجنسیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں آرمی' بی ایس ایف' سی آر پی' سی آئی کے اور "را" کے اہلکار موجود ہوتے ہیں۔ اس ٹارچر سیل کے بارے میں بڑی خوفناک باتیں مشہور ہیں کہا جاتا ہے کہ یہاں جس حریت پرست کو لے جایا جاتا ہے پھر اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔ جموں میں ایک نہر ہے جو دریا کے پہلو میں سے ہو کر شہر کے جنوب کی طرف جاتی ہے۔ مجھے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ ٹارچر سیل اسی نہر کے کنارے پر کہیں واقع ہے۔ اس کا نام بھی نہرانٹیروگیشن سنٹر اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ جموں کی نہر کے کنارے پر ہے۔ اگر تم کشمیر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو کمانڈو شیروان سے تمہیں اس انٹیروگیشن سنٹر کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں آج رات کو ہی یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ کیونکہ تمہارے فرار کی خبر یہاں کے اخباروں میں تمہاری تصویر کے ساتھ چھپ چکی ہے۔ لوگوں نے بھی تمہاری شکل دیکھ لی ہے۔ تم کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہو۔ کیا تمہارے پاس پیسے ہیں؟ نہیں تو میں تمہیں لا دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"پیسے میرے پاس بہت ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں آج رات کو ہی یہاں سے کشمیر کی طرف نکل جاتا ہوں۔"

پھر میں چارپائی کے سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ پروفیسر نے پوچھا۔

"کیا ڈھونڈھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"گل خان نے دھماکہ خیز محلول کی شیشی جو مجھے دی تھی اس میں سے آدھا محلول میں ن اٹاری کے بارڈر پر ہندو تخریب کاروں کو اڑانے میں استعمال کر لیا تھا۔ باقی میں نے ی جگہ سنبھال کر رکھا تھا۔"

پروفیسر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں نے وہ شیشی یہاں سے اٹھا کر پرانے مٹکے میں ڈال دی تھی۔"

وہ کونے میں گیا۔ وہاں ایک پرانا مٹکا پڑا تھا۔ اس میں ہاتھ ڈال کر پروفیسر نے دھماکہ یز محلول کی شیشی نکالی اور مجھے دے دی۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

"یہ میرے کام آئے گی۔"

"تمہارے پاس کوئی پستول وغیرہ تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں تو بڑی مشکل سے امرتسر جیل سے بھاگا ہوں۔ دو کپڑوں میں تھا۔ پڑے بھی فقیروں کے کپڑوں جیسے ہو رہے تھے۔ یہ تو جالندھر شہر میں ایک سخی دل سکھ ارت نے مجھے نئے کپڑے بھی خرید کر دیئے اور سات سو روپے بھی دیئے تھے۔"

پروفیسر کہنے لگا۔

"کیا وہ تمہیں جانتی تھی؟"

میں نے مختصراً کہا۔

"ایک زمانے میں میں ہندو سٹوڈنٹ بن کر اسے ملا تھا۔ تب سے وہ میری دوست بن لی تھی۔ بہرحال یہ ایک لمبی داستان ہے تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کشمیر جانے کے لئے کون ا روٹ استعمال کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان حالات میں میرا ریلوے سٹیشن پر جانا اپنے آپ کو لیس کے حوالے کرنے کے برابر ہو گا۔"

پروفیسر جمشید نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

"روٹ اتنا اہم نہیں ہے۔ کیونکہ تم اس حلیے میں جس روٹ سے بھی جاؤ گے کسی

نہ کسی جگہ پکڑے جاؤ گے۔ تمہیں اپنا حلیہ تبدیل کرنا ہو گا۔ پھر تم چاہے جس طرف
بھی جاؤ۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

پروفیسر نے مجھے بڑا صحیح مشورہ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تو پھر میں کیا حلیہ بنا کر جاؤں؟ میں اپنی شکل تو نہیں بدل سکتا"

"تمہیں شکل بدلنے کو کون کہہ رہا ہے؟"

ہم دونوں ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ میں بھی سوچنے لگا کہ مجھے کس قسم
حلیہ بنانا چاہئے کہ ایک نظر میں مجھے کوئی پہچان نہ لے۔ ہندوستان میں ایک حلیہ بڑا عا
ہے اور اس حلیے والے شخص کی طرف کوئی آدمی توجہ نہیں دیتا۔ اور یہ حلیہ سادھو
سنیاسیوں کا ہے۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے میں سادھو سنیاسیوں والا حلیہ بنا لیتا ہوں"

"یہی ٹھیک رہے گا۔ تم سادھو جوگیوں والی باتیں بھی کر لیتے ہو اور تمہیں ہندی کے
دوہے اور سنسکرت کے اشلوک بھی یاد ہیں۔ آج رات تمہیں انتظار کرنا ہو گا میں کل
تمہارے واسطے سادھوؤں والا لباس لاؤں گا۔ مگر تم اس مکان سے ہرگز ہرگز باہر مت
نکلنا۔ کھڑکی بھی مت کھولنا۔"

آخر یہی طے پایا کہ میں جوگی بن کر دلی سے جموں کشمیر کی طرف جاؤں گا۔ پروفیسر
اگلے روز شام کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرا دن میں نے مکان کے اندر ہی بیٹھ کر
گزارا۔ آٹا دال چاول وہاں موجود تھا۔ خود ہی چاول پکائے۔ دال پکائی اور کھائی۔ چائے
بھی بنا کر پیتا رہا۔ دھماکہ خیز محلول کی شیشی میں نے سنبھال کر رکھ لی تھی۔

شام کا اندھیرا پوری طرح چھا گیا ہوا تھا کہ پروفیسر جمشید آ گیا۔ وہ میرے لئے کھدر
گیروے رنگ کا لمبا کرتہ اسی رنگ کی دھوتی اور کالے منکوں کی تین چار مالائیں اور ا
لمبے بالوں والی وگ ساتھ لایا تھا۔ پلاسٹک کی ایک تھیلی میں راکھ اور سیندور بھی لایا
میں نے پتلون قمیض اتار کر سادھوؤں والا لباس پہن لیا۔ منہ پر گردن تک راکھ مل
سر پر لمبے بالوں کی وگ لگائی اور ماتھے پر سادھوؤں کی طرح سیندور کی تین چار لکیریں

لیں۔ چھ سو اچھ سو روپے کے انڈین کرنسی والے نوٹ میں نے کپڑے میں لپیٹ کر کمر کے
ساتھ باندھ لئے۔ پاؤں میں کچھ نہ پہنا۔ تین مالائیں گردن میں ڈال لیں۔ ایک موٹے
منکوں والی مالا ہاتھ میں پکڑ لی۔ پروفیسر جمشید نے کونے میں فرش پر موم بتی جلا دی تھی۔
اس نے مجھے چھوٹا سا آئینہ دے کر کہا۔

"اب اپنی شکل دیکھو۔ تم پہلے سے بہت بدل گئے ہو۔"

میں نے آئینے میں دیکھا۔ واقعی میں پہچانا نہیں جا رہا تھا۔
پروفیسر کہنے لگا۔

"اب تم ٹرین میں سفر کرنا۔ ٹرین میں ایک تو راستے میں زیادہ چیکنگ کا خطرہ نہیں
ہوتا۔ دوسرے ٹرین میں ایک بار بیٹھ گئے تو سیدھا جموں پہنچ کر ہی اترو گے لاری بس میں
گئے تو راستے میں چیکنگ کا بھی خطرہ ہے اور تمہیں کئی بسیں بدلنی بھی پڑیں گی۔ رات ہو
گئی ہے۔ اب نکل جاؤ یاد رکھنا۔ جموں پہنچ کر وہاں سے سیدھا سری نگر کی طرف نکل جانا
اور کمانڈو شیروان سے جا کر ملاقات کرنا۔ وہ تمہیں نہر انٹیروگیشن سنٹر کی طرف گائیڈ
کرے گا جہاں گل خان کو کسی ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے۔"

میں نے کھڑکی میں سے ایک نگاہ باہر ڈالی۔ باہر اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ پروفیسر
جمشید نے مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ تم پہلے جاؤ گے۔ میں تمہارے کچھ دیر بعد یہاں سے نکلوں
گا۔"

میں نے پروفیسر کو خدا حافظ کہا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ مکان کے دروازے کی چٹخنی
کھولی اور باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی میں نے بستی نظام الدین" اولیا والے چوک کی طرف
چلنا شروع کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد زمین پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ سڑک کے روڑے
چبھنے لگے۔ مگر میں چلتا گیا۔ کیونکہ سادھو لوگ جوتے وغیرہ نہیں پہنتے۔ چوک والی سڑک پر
کافی روشنی تھی۔ میں نے اپنا رخ ریلوے سٹیشن کی طرف کر لیا۔ پروفیسر جمشید نے مجھے بتا
دیا تھا کہ جموں والی گاڑی شروع رات میں ہی دلی سٹیشن سے چھوٹتی ہے۔ ایک گاڑی صبح

صبح جاتی تھی۔ چوک سے ذرا آگے موڑ پر کچھ خالی رکشے کھڑے تھے۔ یہ موٹر رکشے تھے میں ایک خالی رکشے میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"بچہ سادھو سنتوں کو ریلوے سٹیشن پہنچا دے۔"

سادھو سنتوں کا انڈیا میں ہر جگہ بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ اس احترام میں خوف کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ کہ کہیں سادھو مہاراج کوئی بد دعا نہ دے دیں۔ انڈیا کے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ سادھو کی بد دعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ کوئی سادھو اگر شراپ یعنی بد دعا دے دے تو وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ رکشا ڈرائیور نے فوراً کہا۔

"جو آگیا مہاراج"

اور رکشا دلی ریلوے سٹیشن کی طرف ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے سٹیشن پر پہنچ کر رکشا ڈرائیور سے یونہی پوچھا۔

"کیا کرایہ بنتا ہے بچہ؟"

مجھے معلوم تھا کہ وہ پیسے نہیں لے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ میں سٹیشن کی لابی کی طرف سادھوؤں والی مست چال کے ساتھ چل دیا۔ میرے بائیں ہاتھ میں موٹے منکوں کی مالا تھی جسے میں آہستہ آہستہ پھیر رہا تھا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ اس طرح میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا اور پولیس کی نظروں میں آسکتا تھا۔ بس عام سادھو کی طرح میں قدم قدم چلتا لابی میں آگیا۔ لابی میں مسافروں کی کافی رونق تھی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ انڈیا کی ریلوے ٹرینوں میں جوگی سنیاسیوں اور نابیناؤں کو ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ جہاں چاہیں ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کر سکتے ہیں۔ گیٹ پر ٹکٹ بابو موجود تھا۔ میں چہرے پر سادھوؤں والی مسکراہٹ طاری کئے "جے ماتا شیراں والی کی" کا ہلکی آواز میں نعرہ لگاتا اس کے قریب سے گزر گیا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ مسافر نہیں تھے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر کافی رش تھا مگر کوئی ٹرین کھڑی نہیں تھی۔ میں نے سامنے سے آتے ہوئے ایک قلی کو روک کر پوچھا۔

"بچہ! ماتا شیراں والی کے جموں شہر کو کون سی ریل گاڑی جاتی ہے؟"

قلی نے سامنے والے پلیٹ فارم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"مہاراج اس پلیٹ فارم سے گاڑی چلے گی۔ یہی کوئی ایک آدھ گھنٹے بعد۔"

"تیرا کلیان ہو بچہ!"

دوسرے پلیٹ فارم پر آکر میں نے بھرپور مگر خفیہ نگاہوں سے جائزہ لیا۔ وہاں ریلوے پولیس کے چار پانچ سپاہی ادھر ادھر کھڑے تھے۔ جموں توی جانے والی گاڑی پر سیکورٹی اور چیکنگ زیادہ ہوتی تھی۔ میں لوگوں کی نظروں میں آنے کے خیال سے ایک طرف ہو کر پلیٹ فارم کے فرش پر ہی بیٹھنے لگا تو ایک آدمی نے بنچ پر اپنی سیٹ خالی کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! یہاں بیٹھئے۔ زمین پر کیوں بیٹھنے لگے؟"

میں نے کہا۔

"بچہ! آخر کو اس تن نے مٹی میں ہی سمانا ہے۔ راکھ بن کر اڑ جانا ہے۔"

ساتھ ہی میں بنچ پر بھی بیٹھ گیا۔ میں نے اب ایسی اداکاری شروع کر دی کہ سچ مچ کا سادھو لگوں۔ میں نے اس آدمی سے کہا۔

"جا بچہ سادھو سنت کو سگریٹ تمباکو لا کر پلا"

"مہاراج کون سا سگریٹ لاؤں؟"

"جیسا دل کرے لے آ بچہ۔ سادھوؤں کو سواد سے کیا کام۔ بس ذرا منہ کڑوا کرنا ہے"

مجھے معلوم تھا وہ اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ لائے گا۔ چنانچہ وہ اعلیٰ سگریٹ ہی لایا۔ مگر انڈیا کا اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ پاکستان کے سگرٹوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انڈیا کے سگریٹ پھیکے اور بد مزا ہوتے ہیں۔ انڈیا کے لوگ پاکستان کے سگریٹ بڑے شوق سے زیادہ دام خرچ کر کے خرید لیتے ہیں۔ پاکستان سے یہ سگریٹ آنے جانے والے لوگ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر بھی سگریٹ سگریٹ ہی تھا۔ اس نے خود ماچس سے میرا سگریٹ سلگایا۔ لمبا کش لگا کر کہا۔

"بچہ تو نے سادھو سنتوں کی سیوا کی ہے بھگوان تیرا کلیان کرے گا۔ اب یہ بتا کہ ماتا شیراں والی کے شہر جموں جانے والی گاڑی کب آئے گی"

وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج گاڑی آدھ گھنٹے بعد آئے گی۔ گورو جی میں بھی ماتا شیراں والی کے درشن کو جا رہا ہوں۔"

میں نے اس آدمی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"تو دھن ہے۔ تیرے بھاگ دھن ہیں ماتا شیراں والی سب کا کلیان کرتی ہے۔ اب تو آرام سے بیٹھ جا اور مجھ سے زیادہ بات نہ کر۔ میں ماتا شیراں والی کے دھیان میں جاتا ہوں"۔

اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اس طرح بند کی تھیں کہ پلیٹ فارم کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ کچھ اور سادھو اور جوگی بھی وہاں پھر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں تانبے کے ڈول اور کرمنڈل بھی تھے۔ میرے پاس اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بس یہی ایک کمی رہ گئی تھی۔

اتنے میں گاڑی کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ جس آدمی نے میرے لئے سیٹ خالی کی تھی اور مجھے سگریٹ بھی لا کر دیئے تھے۔ بولا۔

"مہاراج گاڑی آگئی ہے۔"

میں نے بڑے سکون کے ساتھ آنکھیں پوری کھول کر کہا۔

"جے ہو شیراں والی ماتا کی جے ہو"

میں نے سوچا یہ آدمی آگے جا کر بھی میرے کام آسکتا ہے اس کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے میں نے کہا۔

"بچہ کسی ڈبے میں اپنے لئے اور ہمارے لئے کوئی اچھی سی جگہ بنا کر آ۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں۔"

رش اگر زیادہ تھا تو گاڑی کے ڈبے بھی بہت تھے۔ مسافر ڈبوں میں گھسنے لگے

پلیٹ فارم خالی ہوتا گیا۔ وہ آدمی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

"مہاراج چلئے۔ میں نے آپ کی سیٹ پر کپڑا بچھا دیا ہے۔"

"چلو بچہ!"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ٹرین کی سب سے آخری بوگی کے درمیانی ڈبے میں اس نے کھڑکی کے پاس میری جگہ بنائی تھی۔ وہاں اس نے کپڑا بچھا دیا ہوا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ ڈبے میں دوسرے مسافر بھی بیٹھے تھے جو شکل صورت سے ڈوگرے پہاڑیئے لگ رہے تھے۔ ان میں سکھ بھی جو شاید جالندھر وغیرہ جا رہے تھے۔ وہ آدمی میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ڈبے کے دوسرے مسافروں نے مجھے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ بھارت میں سادھو عام پھرتے مل جاتے ہیں۔ سادھو لوگ وہاں کوئی عجوبہ نہیں ہوتے۔

میں نے اس آدمی کے کاندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بچہ تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے کہا۔

"مہاراج میرا نام مکند لال ہے۔ میں جموں میں اپنے بھائی گردھاری لال سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ میرا بڑا بھائی ہے۔ جموں سری نگر جانے والی بس کا ڈرائیور ہے۔"

مکند لال کی عمر بیس پچیس سال کے قریب ہو گی مگر وہ کمزور سا تھا اور عمر سے زیادہ کم عمر لگتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بچہ۔ ہم تم سے خوش ہیں"

"آپ کی کرپا ہے مہاراج"

وہ بڑا خوش ہوا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر دیکھا۔ میرا منہ ریل کے انجن کی طرف تھا۔ پلیٹ فارم پر کہیں کہیں کوئی مسافر نظر آتا تھا۔ پولیس کے سپاہی ٹرین کے آگے گشت لگانے لگے تھے۔ رائفلیں انہوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ ایک سپاہی آہستہ آہستہ گشت لگاتا میرے قریب سے بھی گزرا۔ وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے اسے بظاہر نظر

انداز کر دیا۔ لیکن دل میں خیال کیا کہ کہیں اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا۔ وہ پیچھے چلا گیا تھا۔ انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے دوبارہ وسل دیا اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ میں اس سپاہی کی جانب سے مطمئن ہونا چاہتا تھا جو مجھے گھور کر دیکھتا ہوا گزر گیا تھا۔ وہ ٹرین سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا دوسرے سپاہی سے باتیں کر رہا تھا۔ یونہی مجھے اس کے بارے میں تشویش لگ گئی تھی کہ کہیں اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا۔ وہ پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا تھا۔ مجھے اس قسم کے خطرات میں سے بہرحال گزر کر ہی جموں توی پہنچنا تھا۔

ٹرین رات کے وقت سفر کرتی رہی۔ سٹیشن پر سٹیشن آ کر گزرتے گئے۔ کہیں ٹرین رک جاتی۔ کہیں کسی سٹیشن کو چھوڑ دیتی۔ مکند لال برابر میری خدمت میں لگا ہوا تھا۔ جب رات کافی ہو گئی تو سیٹ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"مہاراج آپ سو جائیں۔ میں ادھر دروازے کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں"

سونا تو بہت دور کی بات تھی میں ایک لمحے کے لئے جاگتے میں بھی غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بچہ! ہم سادھو لوگ جاگ کر بھی سو جاتے ہیں۔ ہمیں دنیا والوں کی نیند سے کوئی کام نہیں۔ تم بے شک یہاں بیٹھے رہو۔"

مجھے نیند پر بھی کنٹرول حاصل تھا۔ یہاں تو ویسے بھی میں سو نہیں سکتا تھا اور اس خیال کے مارے بھی نیند کوسوں دور تھی کہ کسی جگہ میں پہچان نہ لیا جاؤں۔ رات گزر گئی۔ ٹرین کا سفر جاری رہا۔ دوپہر کے بعد گاڑی جموں پہنچی تو مکند لال کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھے بھی ماتا شیراں والی کے درشنوں کو جانا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گا۔ اس وقت آپ ہمارے گھر چلئے۔ آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں"

میں نے سوچا کہ اس کا بھائی جموں سری نگر کی بس چلاتا ہے وہاں سے سری نگر جانے کا محفوظ بندوبست ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا بچہ۔ چلو۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے بھائی کے گھر لے گیا۔ اس کے بھائی کا گھر جموں شہر کے گنجان محلے میں تھا۔ بھائی گھر پر ہی تھا۔ مکند لال نے اپنے بھائی سے کہا۔

"بھیا جی! سادھو مہاراج نے بڑی کرپا کی ہے جو میرے ساتھ تمہارے گھر آ گئے ہیں"

گردھاری لال نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔ اس کی بیوی اور بچوں نے بھی میرے پاؤں چھوئے۔ میری ٹہل سیوا شروع ہو گئی۔ میں نے مکند لال کے بڑے بھائی سے پوچھا۔

"گردھاری لال! ہم ماتا شیراں والی کے درشنوں کے بعد سری نگر جائیں گے۔ یہ بتاؤ وہاں لاری کس کس ٹائم کو جاتی ہے۔"

وہ بولا۔

"مہاراج! میں صبح صبح خود لاری لے کر سری نگر جاتا ہوں۔ شام کے بعد کوئی لاری نہیں جاتی۔"

مجھے ماتا شیراں والی کے درشنوں کو تو جانا ہی نہیں تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح تمہارے ساتھ ہی سری نگر جائیں گے۔ پہلے وہاں اپنے گوردیو کے درشن کریں گے۔ ان کے چرن چھوئیں گے۔ پھر ان کی آگیا لے کر ماتا جی کے درشنوں کو جائیں گے۔"

مکند لال میری طرف منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"مکند لال! ہم سری نگر سے واپسی پر تمہیں بھی ساتھ ماتا شیراں والی کے درشنوں کو لے چلیں گے۔"

وہ اتنے میں ہی خوش ہو گیا۔ رات میں نے ان لوگوں کے ہاں بسر کی۔ وہ مجھے بہت کچھ کھلاتے پلاتے رہے۔ بڑے آرام دہ بستر پر دو کمبل ڈال دیئے گئے۔ جموں میں رات کو سردی ہو جاتی تھی۔ دوسرے دن میں مکند لال اور گردھاری لال لاری اڈے کی طرف چل پڑے۔ جس محلے میں ان لوگوں کا گھر تھا وہ جموں کا ہندو علاقہ تھا۔ مندروں میں آرتی اتارنے کی گھنٹیوں اور کیرتن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک سادھو کو گلی میں سے

گزرتے دیکھ کر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ کی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ گردھاری لال نے مجھے اپنی لاری کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ مکند لال میرے لئے انگور لے آیا۔ انگور جموں سری نگر میں بڑا مہنگا پھل تھا۔

لاری سری نگر کی طرف چل پڑی۔ سفر خیریت سے گزر گیا۔ راستے میں بانہال کے مقام پر رات بھی بسر کرنی پڑی۔ بانہال کی رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ سادھوؤں کے بہروپ نے مجھے کافی فائدہ پہنچایا تھا۔ دوسرے دن کی سہ پہر کو ہم سری نگر میں تھے۔ میں گردھاری لال سے جدا ہو گیا۔ اب مجھے کشمیری حریت پرست مجاہد اور کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچنا تھا۔ یہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جس مقام پر تھی وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ یہی سمجھ لیں کہ میں ان پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ اس وقت سورج گلمرگ کی پہاڑیوں پر جھکنے لگا تھا۔ میں دو ٹیلوں کے درمیان سے گزر کر ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف چشمے کے قریب سے ہوتا ہوا چیڑھ کے درختوں کے جھنڈ میں آ گیا۔ وہ چٹانی ٹیلا میرے سامنے تھا جس کی سرنگ یا غار میں کمانڈو شیروان کا خفیہ ہائیڈ آؤٹ تھا۔ میں ابھی تک سادھوؤں کے بھیس میں ہی تھا۔ اچانک ایک طرف سے دو حریت پرست شین گنیں لئے نکل آئے۔ شین گنوں کا رخ میری طرف تھا۔

"کون ہو؟ کدھر جا رہے ہو؟"

دونوں حریت پرست مجاہدوں نے سیاہ کپڑے سے منہ ڈھانپ رکھے تھے۔ یہ کوئی نئے مجاہد تھے۔ ورنہ کمانڈو شیروان کے گروہ کے سارے مجاہد مجھے جانتے تھے۔ میں نے کہا۔

"مجھے کمانڈو مجاہد شیروان سے ملنا ہے۔ میرا نام۔"

درختوں میں سے تین مزید حریت پرست مجاہد نکل آئے۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر وہیں بٹھا دیا اور کشمیری میں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"دوستو! میں شیروان کا دوست ہوں۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ اگر کمانڈو

شیروان ہائیڈ آؤٹ میں موجود ہے تو اسے جا کر میرا نام بتاؤ۔"

ایک مجاہد چٹانی ٹیلے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس طرح واپس آیا کہ شین گن اس نے سینے سے لگا رکھی تھی اور فوجیوں کی طرح چل رہا تھا۔ پیچھے کمانڈو شیروان اپنی کمانڈو وردی میں ملبوس مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ جن مجاہدوں نے مجھے اپنی حراست میں لے رکھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئے۔ کمانڈو شیروان نے مجھے گلے لگا لیا۔

"مجھے تمہارے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ چلو اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

حریت پرست لیڈر کمانڈو شیروان کی کمیں گاہ جو چٹان کے غار میں تھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ گیا تھا۔ زمین پر صف بچھی تھی۔ دیوار کے ساتھ تکیہ لگا تھا۔ ایک ساوار اور کچھ پیالیاں پڑی تھیں۔ ہم صف پر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان نے ایک مجاہد سے کشمیری چائے لانے کو کہا۔ وہ یس سر کہہ کر باہر نکل گیا۔ شیروان کہنے لگا۔

"تم نے اچھا کیا کہ اس حلیے میں سفر کیا۔ تمہاری تصویر یہاں کے اخباروں میں بھی چھپ گئی ہے۔ پروفیسر جمشید نے مجھے وائرلیس پر تمہارے کشمیر کی طرف آنے اور گل خان کے پکڑے جانے کی خبر دی تھی۔ تم نے دوارکا فورٹ اور بھوپال کے قریب کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال ہونے والے اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیرے کو اڑا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ یہ چیزیں ہماری تحریک آزادی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ مجھے راجستھان والے ایٹمی ریسرچ سنٹر کی تباہی کی خبر بھی مل گئی تھی یہ کام تمہارے ایسا اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو ہی کر سکتا تھا۔"

ہم کشمیر میں بھارتی فوجی یونٹوں کے وحشیانہ مظالم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"آزادی ایک دن میں حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے قوموں کو بڑی قربانیاں

دینی پڑتی ہیں اور ہماری کشمیری قوم بیدار ہو چکی ہے۔ ہماری قوم کا بچہ بچہ جہاد میں شریک ہو گیا ہوا ہے۔ جب قوموں میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی منزل آزادی قریب آجاتی ہے۔"

کشمیری مجاہد چائے لے آیا۔ ساتھ باقرخانیاں بھی تھیں۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"میرا سب سے پہلا مشن اپنے ماسٹر سپائی گل خان کو جموں کے نہرانٹیرو گیشن سنٹر ے نکالنا ہے۔ اس انٹیرو گیشن کے بارے میں مجھے معلومات چاہئیں۔ کیا تم اس سلسلے میں یری مدد کر سکتے ہو؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"یہ اطلاع مجھ کو بھی مل گئی ہے کہ گل خان کو بھارتی انٹیلی جینس جموں کے نہر ٹیرو گیشن سنٹر میں لے آئی ہے۔ مجھے خود اس کے بارے میں تشویش تھی مگر ہم لوگ پنے محاذ پر دشمن کے خلاف جنگ لڑنے میں مصروف ہیں یہ بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے ہو۔ اس انٹیرو گیشن سنٹر کے بارے میں مجھے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے۔ ہمارے مجاہدین جو پڑے جاتے ہیں انہیں سری نگر کے انٹیرو گیشن سنٹر میں ہی رکھا جاتا ہے۔ یا پھر انہیں کشمیر سے باہر بھارت کے کسی دوسرے شہر میں لے جاتے ہیں۔ مگر میں تمہیں معلومات ہیا کر سکتا ہوں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ یہ انڈیا کا سب سے بڑا انٹیرو گیشن سنٹر ہے اور ہاں "را" اور دوسری خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ ملٹری انٹیلی جینس کے تجربہ کار افسر بھی وجود ہوتے ہیں اور یہاں کے ٹارچر سیل میں اذیت دینے اور تشدد کے جدید آلات رکھے گئے ہیں۔ تم یہاں آرام کرو اور میرا خیال ہے اپنا حلیہ تبدیل کر لو۔ میں ایک آدمی کی یوٹی لگاتا ہوں۔ وہ ساری معلومات حاصل کر کے لے آئے گا۔"

میں نے کہا۔

"دوست! آرام تو میں نے اسی وقت اپنے اوپر حرام کر لیا تھا جب میں نے جہاد کشمیر میں شرکت کی غرض سے انڈیا کا بارڈر کراس کیا تھا۔ تم اپنے آدمی کو انٹیروگیشن سنٹر کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ضرور بھیجو لیکن میں اتنی دیر کشمیر کے محاذ پر دشمن سے لڑنا اپنا فرض سمجھتا ہوں"

میں نے اس سے پوچھا کہ آئندہ ان کا کیا پروگرام ہے اور کیا وہ کسی خاص مشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ کمانڈو شیروان بولا۔

"کوئی دن خالی نہیں جاتا جب ہم کسی نہ کسی کمانڈو مشن پر نہیں جاتے۔ ہم تو میدان جنگ میں بیٹھے ہیں۔ بھارتی فوجی ساری وادی کشمیر میں ظلم و بربریت کی ہولی کھیل رہے ہیں اور ہم جہاں موقع ملتا ہے ہر روز انہیں جہنم میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ آج کل ڈوگرہ رجمنٹ کا ایک بریگیڈیئر سری نگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں آیا ہوا ہے۔ یہ شخص بنارس کا بامن ہندو ہے اور مسلمانوں کا جانی دشمن ہے۔ کشمیر کی وادی میں مجاہدین کے خلاف آپریشن کی کمان اس نے سنبھال رکھی ہے۔ ہر روز اس کی ہدایات کے مطابق سری نگر کے آس پاس کے دیہات اور سری نگر شہر میں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ خواتین کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ جہاں ذرا شک پڑتا ہے اس گھر کے مردوں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اس بریگیڈیئر کا نام بریگیڈیئر رام او تار ہے۔ یہ شخص پچھلے ایک ماہ سے کشمیری مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے۔ ہم اس کے یونٹ کے کئی فوجیوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ مگر ان کی جگہ تازہ نفری آجاتی ہے۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مدعا ہی ختم کیا جائے اور بریگیڈیئر رام او تار کو ہلاک کر دیا جائے۔ یہ شخص اتنا ظالم ہے کہ جو مجاہد اس کے شکنجے میں آجاتا ہے اس پر خود تشدد کرتا ہے اور انہیں بجلی کے جھٹکوں سے شہید کر دیتا ہے۔ کئی مجاہدین کے اس بھیڑیئے نے اپنے ہاتھ سے گلے کاٹے ہیں"

میں نے کہا۔

"ایسے درندے کو تو بہت پہلے ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔"

شیروان کہنے لگا۔

"تم تو جانتے ہو کہ ہم کئی محاذوں پر آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں ہم سے دس گنا زیادہ تعداد میں باقاعدہ پیشہ ور فوج ہے۔ دوسرے یہ بریگیڈیئر ہر وقت اپنے آگے پیچھے کمانڈو باڈی گارڈ کی پوری پلاٹون رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اب ہم نے اس کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"

میں نے پوچھا۔

"تم لوگوں نے آپریشن سکیم کس طرح بنائی ہے؟"

کمانڈو شیروان نے چمڑے کے تھیلے میں سے سری نگر شہر کا نقشہ نکال کر صف پر پھیلا دیا۔ دیوار پر سے لالٹین اتار کر قریب رکھ لی۔ ہم دونوں نقشہ کو غور سے دیکھنے لگے۔ کمانڈو شیروان نے ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔

"یہ ڈوگرہ رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اور یہ جہاں سیاہ نشان لگا ہے یہ پارک ہے۔ اس پارک کے اوپر جو ٹیلہ ہے وہاں بریگیڈیئر رام او تار کا بنگلہ ہے۔ بنگلے کے گیٹ پر بھی چوبیس گھنٹے فوجی پہرہ دیتے ہیں اور بنگلے کے اوپر ٹیلے پر تین مشین گن پوسٹیں ہیں۔ یہاں سے ہمارا اٹیک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بریگیڈیئر روز صبح نو بجے فوجی گاڑی کی بجائے اپنی سیاہ رنگ کی کار میں بنگلے سے نکل کر ہیڈ کوارٹر کو جاتا ہے۔ اس کی گاڑی کے شیشے بلٹ پروف ہیں۔ اس کے آگے اور پیچھے ایک ایک جیپ ہوتی ہے جس میں اسلحہ بردار کمانڈو باڈی گارڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس شخص نے اپنی حفاظت کا اتنا بندوبست اس لئے کیا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ کشمیری حریت پرست اسے ہلاک کر کے اپنے شہید مجاہدوں کے خون کا بدلہ بھی لینا چاہتے ہیں اور اس کی بربریت سے وادی کشمیر کو نجات بھی دلانا چاہتے ہیں۔"

میں نے ایک ٹیڑھی لکیر نقشے پر دیکھی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ لکیر کیا ہے؟"

کمانڈو شیروان لکیر پر انگلی چلاتے ہوئے بولا۔

"یہ وہ راستہ ہے جہاں سے گزر کر یہ درندہ بریگیڈیئر اپنے ہیڈ کوارٹر جاتا ہے ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس سڑک پر ہی کسی جگہ سے کر سکتے ہیں۔ نہ اسے اس کے بنگلے میں جہنم رسید کر سکتے ہیں اور نہ اس وقت اس پر وار کر سکتے ہیں جب یہ فوجی ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو جاتا ہے۔"

میں غور سے نقشے پر لگے ہوئے نشانوں کو دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو شیروان نے ایک جگہ انگلی رکھی اور کہا۔

"یہ ایک مشن ہسپتال کی عمارت ہے۔ ہم نے کمانڈو آپریشن کی جو سکیم تیار کی ہے اس کے مطابق ہمارا ایک مجاہد دو روز پہلے جھوٹ موٹ کسی بیماری کا بہانہ بنا کر اس ہسپتال میں داخل ہو جائے گا اور جس وقت بریگیڈیئر رام اوتار کی گاڑی ہسپتال سے گزرنے والی ہو گی تو ہمارا مجاہد وہیل چیئر پر گھٹنوں پر کمبل ڈالے ہسپتال کے باہر بیٹھا ہو گا۔ کمبل کے نیچے بھری ہوئی سٹین گن ہو گی۔ دوسرا مجاہد ہسپتال سے سو دو سو قدم کے فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ مزدور کے بھیس میں بیٹھا درانتی سے گھاس کاٹ رہا ہو گا۔ اس کی سٹین گن پاس ہی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہو گی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس تین ہینڈ گرنیڈ بھی ہوں گے۔ پہلا مجاہد کار ٹائروں اور پٹرول کی ٹینکی کو نشانہ بنائے گا۔ اگر نشانہ چوک جاتا ہے اور گاڑی آگے نکل جاتی ہے تو دوسرا مجاہد جو گھاس کاٹ رہا ہو گا وہ سٹین گن کے برسٹ فائر کرے گا۔ اور ساتھ ہی دستی بم بھی پھینک دے گا۔ ہم صرف دو جگہوں سے ہی اٹیک کر سکتے ہیں۔ ہم وہاں زیادہ نفری بھی نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ اردگرد فوجی یونٹوں کی پوسٹیں پھیلی ہوئی ہیں ہمارے مجاہد گھیرے میں آ کر ہلاک ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اگر فرض کر لیا اس کے باوجود بریگیڈیئر بچ جاتا ہے تو پھر ہم کیا کریں گے؟"

وہ بولا۔

"دو حملوں سے اس کا بچنا مشکل ہو گا گرنیڈ اس کی گاڑی کو اڑا دیں گے۔ لیکن اگر

پھر بھی وہ زندہ رہا یا زخمی ہو گیا تو پھر ہم اسے ہلاک کرنے کی کوئی دوسری سکیم تیار کریں گے۔ یہ بات بھی ہمیں پیش نظر رکھنی ہے کہ بریگیڈیئر رام اوتار جس وقت اپنے بنگلے سے ہیڈ کوارٹر جاتا ہے تو سارے راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسلح بھارتی فوجی تعینات ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کے باڈی گارڈ ذرا سا شک پڑنے پر فائر کھول سکتے ہیں۔"

میں نے کچھ لمحے غور کرنے کے بعد کہا۔

"شیروان دوست! میرے خیال میں اس سکیم میں کئی ایک خامیاں ہیں۔ اس کا کامیاب ہونا یقینی نہیں ہے۔ میرے حساب کے مطابق جہاں اس ہندو بھیڑیئے بریگیڈیئر پر دستی بم پھینکے جائیں گے وہاں سامنے کی جانب ہمارے مزید دو کمانڈو دستی بموں اور سٹین گنوں کے ساتھ موجود ہونے چاہئیں تاکہ ٹھیک اس وقت وہ بھی فائر کھول دیں اور فائر کھول کر سب سے پہلے اگلی جیپ کے باڈی گارڈز کو ختم کر دیں۔"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"سامنے کی جانب ٹیلے کی ڈھلان ہے اور وہاں اوپر مشین گنوں کی پوسٹیں۔ وہاں جانا اپنے آپ کو بے فائدہ موت کے حوالے کرنا ہے۔"

تب میں نے اپنی کمر کے گرد بندھا ہوا رومال کھولا۔ اس میں سے دھماکہ خیز محلول کی شیشی نکال کر کمانڈو شیروان کو دکھائی اور اسے اس کے سارے ہلاکت خیز خواص سمجھائے۔ وہ اس بارے میں پہلے سے جانتا تھا مگر اس نے دھماکہ خیز ٹیبلٹ دیکھی تھیں۔ شیشی کو لالٹین کے سامنے رکھ کر اس نے ہلایا۔ اس کے اندر پانی کی طرح کا دھماکہ خیز مواد آدھا رہ گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کا صرف ایک قطرہ اگر اس مسلم دشمن بریگیڈیئر رام اوتار کے معدے میں کسی طرح پہنچا دیا جائے تو اس کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے چار آدمیوں کو اس محلول کا ایک ایک قطرہ پی لینے کے بعد دھماکے سے اڑتے دیکھا ہے۔"

کمانڈو شیروان نے شیشی صف پر رکھ دی اور بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ساری سکیم بدلنی ہو گی۔ کوئی نیا منصوبہ بنانا ہو گا"

میں نے اس کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"اس منصوبے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ بریگیڈیئر کی موت اور وہ بھی اذیت ناک موت یقینی ہو گی۔ تمہاری جو پہلی سکیم ہے اس میں دو اندیشے ہیں پہلا یہ کہ ہو سکتا ہے سٹین گن کے فائر چلتی گاڑی کے پہیوں یا پٹرول کی ٹینکی پر نہ لگیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بریگیڈیئر کی گاڑی پر پہلے فائر کے ساتھ ہی اس کے باڈی گارڈ اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں گے اور پھر وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے اور گھاس کاٹتے ہوئے ہمارے مجاہدوں میں سے کوئی بھی زندہ سلامت نہیں رہے گا۔ میں نے جو سکیم تجویز کی ہے اس سے ہمارے کسی مجاہد کی جان کو خطرہ نہیں ہو گا اور بریگیڈیئر کی موت بھی یقینی ہو گی"

"بشرطیکہ اس شیشی میں سے محلول کا ایک قطرہ بریگیڈیئر پی لے۔ یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی بات ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"یہ گھنٹی میں باندھوں گا"

کمانڈو شیروان میری طرف کچھ دیر خاموشی سے تکتا رہا۔ پھر شیشی کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم یہ کام کیسے کرو گے؟ کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟"

میں نے اپنے سادھوؤں والے لمبے بالوں کی وگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ حلیہ یہاں بھی کام آسکتا ہے"

"یعنی؟"

کمانڈو شیروان نے استفسار کیا۔

میں نے کہا۔

"مجھے سوچنے کے لئے آج کی رات دے دو ابھی میرے ذہن میں منصوبے کی شکل واضح نہیں ہوئی۔"

کمانڈو شیروان نے مسکراتے ہوئے سری نگر شہر کا نقشہ لپیٹ کر تھیلے میں ڈال دیا او

چائے کی چینک پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"چائے تو بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے"

اس نے اپنے آدمی کو آواز دے کر بلایا اور اسے کہا کہ چائے کو گرم کر کے لے آئے۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس دوران تم اپنے آدمی کو جموں کی طرف روانہ کر دو۔ تاکہ وہ نہرا نٹیروگیشن سنٹر کے بارے میں جتنی بھی تفصیلات میسر آسکتی ہیں لا کر مجھے دے۔"

کمانڈو شیروان پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ جموں شہر میں ہمارا ایک ایسا آدمی موجود ہے جو میرے بھیجے ہوئے آدمی کو پوری تفصیل بتا دے گا۔ اب تم ایسا کرو کہ منہ ہاتھ دھو کر چہرے پر ملی ہوئی راکھ صاف کرو اور وگ بھی بے شک اتار کر دیوار پر لٹکا دو۔ کپڑے بدلنے ہیں تو دوسرے کپڑے مل جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"وگ اتاروں گا۔ منہ ہاتھ دھو لوں گا باقی لباس ابھی یہی رہنے دو۔ ہو سکتا ہے مجھے اس کی آگے چل کر ضرورت پڑ جائے۔ بہرحال میں تمہیں آج رات سوچ کر بتاؤں گا کہ بریگیڈیئر رام اوتار کو موت کے فرشتے کے حوالے کرنے کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے سر پر لگی ہوئی لمبے بالوں کی وگ اتار کر دیوار کی کیل کے ساتھ لٹکا دی۔ ہائیڈ آؤٹ کی سرنگ سے باہر آکر ساتھ ہی بہتے چھوٹے سے چشمے پر منہ ہاتھ دھویا۔ کمانڈو شیروان کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے دو مجاہدین کے پاس کھڑا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس گیا تو شیروان نے میرا ان مجاہدین سے تعارف کرایا۔ ان میں ایک نوجوان اور خوبصورت مجاہد کا نام قمرالدین بٹ تھا۔ میں نے شیروان سے پہلے حریت پسندوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ ان میں سے اکثر کمانڈو آپریشن کے دوران شہید ہو گئے تھے۔ قمرالدین بٹ نے سر پر سبز رومال باندھا ہوا تھا۔ رنگ گورا اور نقش تیکھے تھے۔ آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں ایسی چمک تھی۔

رات کو ہم نے سرنگ کے اندر ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ قمرالدین بٹ بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ کمانڈو شیروان نے کہا کہ قمرالدین بٹ نہرانیرو گیشن سنٹر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جموں جا رہا ہے۔ میں نے قمرالدین بٹ سے کہا۔

"دوست! وہاں سے یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ رات کے وقت انیر گیشن سنٹر کے آس پاس ڈیوٹی پہرے کا کیا انتظام ہوتا ہے"

قمرالدین بٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ! آپ کو ایک ایک تفصیل مل جائے گی۔"

کھانے کے بعد قمرالدین بٹ باہر چلا گیا۔ میں اور کمانڈو شیروان کچھ دیر بیٹھے بریگیڈئیر رام اوتار کو ٹھکانے لگانے کے پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"رات کو تو میں غور کروں گا ہی۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ بریگیڈئیر رام اوتار اپنی شامیں کہاں گزارتا ہے اور کیا وہ پینے پلانے والا فوجی افسر ہے؟"

شیروان کہنے لگا۔

"وہ پینے پلانے والا آدمی ہے۔ اس کی شامیں سری نگر فوجی ہیڈ کوارٹرز کے آفیسر میس (O. Mess) میں ہی گزرتی ہیں۔ اس کے ساتھ روز کے پینے پلانے والے تین چار فوجی افسر ہوتے ہیں۔ اور وہ فوجی میس میں ہی رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے مے نوشی کرتے ہیں اور پھر وہیں کھانا کھا کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔"

"کیا بریگیڈئیر شادی شدہ ہے؟"

"شادی شدہ ہے مگر اس کے بیوی بچے پیچھے بنارس میں ہی ہیں۔ یہاں وہ بنگلے میں اکیلا رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"ضرور اس کی عورتیں بھی دوست ہوں گی۔ اس قسم کا آدمی دوسرے افسروں کی بیویوں سے بھی تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ بھارتی فوجی افسروں میں میں نے یہ بات عام طور

پر دیکھی ہے"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"اس بارے میں میں پتہ کر کے بتا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں سونے جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے میرے سونے کا بندوبست اسی پرانے لکڑی کے ڈبہ نما کمرے میں کیا ہو گا۔"

کمانڈو شیروان نے مسکرا کر کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے"

سرنگ کے دہانے کے بائیں طرف درختوں میں جہاں چشمہ بہتا تھا جھاڑیوں کے پیچھے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ پہلے بھی میں اسی جگہ راتیں بسر کرتا تھا۔ اب بھی میرا بستر وہیں لگا دیا گیا تھا۔ میں رات کو وہاں جا کر لیٹ گیا۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ کشمیر کی وادی میں راتیں بڑی خوشگوار ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر تک بستر پر لیٹا میں بریگیڈئیر رام اوتار کو ٹھکانے لگانے کی ترکیبوں پر غور کرتا رہا۔ ابھی تک کوئی منصوبہ حتمی شکل میں واضح ہو کر میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سو گیا۔

دوسرے دن صبح کی نماز ہم سب مجاہدین نے درختوں کے نیچے اکٹھی پڑھی۔ شیروان کہنے لگا۔

"دوست! ایک بات اپنے ذہن میں ضرور رکھنا کہ جموں کشمیر کے بعض اخباروں میں بھی پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے تمہاری تصویر شائع ہو چکی ہے۔"

ہم سرنگ کے باہر چیڑھ کے درختوں کے نیچے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اس لئے میں نے سر کے اور ڈاڑھی مونچھوں کے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وگ کسی وقت بھی مجھے کسی مصیبت میں پھنسا سکتی ہے۔"

"اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ مگر اس وقت تک تمہیں وگ لگائے بغیر باہر نہیں جانا ہو گا۔"

"میں اگر گیا بھی تو سادھوؤں والے حلیے میں ہی جاؤں گا۔"

سارا دن شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں اپنے نئے کمانڈو مشن کے بارے میں باتیں کرتے گزر گیا۔ قمرالدین بٹ منہ اندھیرے کسی وقت نہر اِنٹیروگیشن سنٹر کے بارے میں سراغ رسانی کرنے جموں کی طرف نکل گیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے ایک اپنے ایک خاص آدمی کو بریگیڈیئر رام اوتار کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی سری نگر شہر کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ یہ آدمی شام کو واپس آیا۔ بریگیڈیئر رام اوتار کے بارے میں وہ جو معلومات فراہم کر کے لایا ان کے مطابق بریگیڈیئر رام اوتار اپنی کوٹھی میں ایک اردلی اور تین ملازموں کے ساتھ بالکل اکیلا رہتا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کا سخت پابند تھا۔ سوائے ہفتے کی رات کے اس کی تمام شامیں فوجی میس میں اپنے دو تین فوجی افسر دوستوں کے ساتھ پینے پلانے میں گزرتی تھیں۔ وہ فوجی میس کی عقبی بالکونی میں شراب کی محفل سجاتے تھے۔ فوجی میس میں ایک بھی ملازم مسلمان نہیں تھا۔ کسی مسلمان کو فوجی میس کے بار روم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ چھوٹا موٹا سامان خورد و نوش سپلائی کرنے والے دیہاتی کشمیری مسلمانوں کو فوجی میس کے گیٹ سے اندر نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ وہ بلانوش نہیں تھا۔ شام کو سکاچ وسکی کے صرف چار ڈبل پیگ پیتا تھا۔ چونکہ کشمیر میں ان کے لئے حالات مخدوش تھے اس لئے صرف ایک سکھ بیرا بھوپندر سنگھ بریگیڈیئر اور اس کے فوجی افسر دوستوں کے لئے شراب لے کر بالکونی میں جاتا تھا۔ یہ سکھ بیرا بریگیڈیئر کا خاص بیرا تھا اور وہ ہمیشہ سروس میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر کی یہ عادت ہے کہ وہ صبح کو اٹھ کر ہینگ اور دور کرنے کے لئے وسکی کا ایک پیگ ضرور پیتا ہے۔ اس کے بعد ناشتہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وسکی کی ایک بوتل اس کے بیڈ روم کی الماری میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ ایک بوتل ختم ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری بوتل آجاتی ہے۔ اپنے آدمی نے یہ بھی معلوم کیا کہ اس کی کوٹھی میں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

میں اور کمانڈو شیروان اپنے آدمی کے پاس ہی بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ میں نے اپنے آدمی سے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پینے پلانے والا فوجی افسر گھر سے دور بھی ہو اور پھر اکیلا بھی ہے۔ کیا اس کے کسی ہندو سکھ عورت سے تعلقات نہیں ہیں؟ کیا وہ خود کبھی کسی عورت کے پاس نہیں جاتا؟"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"یہ میں آپ کو کل پتہ کر کے بتا دوں گا۔"

بات وہیں ختم ہو گئی۔ اپنا آدمی چلا گیا۔ شیروان کہنے لگا۔

"اگر اس کے کسی عورت سے تعلقات بھی ہوں گے تو تمہیں اس سے کیا حاصل ہو جائے گا؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"کمانڈو شیروان! تم ایک پاکباز مجاہد کمانڈو ہو۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں جانتا ہوں کہ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ کہیں مار نہیں کھاتا مگر عورت سے مار کھا جاتا ہے۔ باقی میں تمہیں اپنے آدمی کی رپورٹ مل جانے کے بعد بتاؤں گا۔"

کمانڈو شیروان زیر لب مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔

"شیروان! ایک بات ابھی تک طے ہے کہ ہم فوجی میس میں بریگیڈیئر کی ہلاکت کی کمانڈو کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس کے خاص بیرے بھوپندر سنگھ کو بھی اتنی جلدی اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ وہاں ہم کوئی بم بھی پلانٹ نہیں کر سکتے۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ فوجی میس کے باہر پوری فوجی پلاٹون پہرے پر موجود رہتی ہے۔ اور پھر یہ کوئی اتنا بڑا مشن بھی نہیں ہے۔ اگر یہاں گولہ بارود اور اسلحہ کا ذخیرہ اڑانا ہوتا تو ہم ہر قسم کا خطرہ مول لے کر بھی اسے اڑا سکتے تھے۔ صرف ایک آدمی کو ہلاک کرنا ہے جو ہمارے قابو میں نہیں۔ ویسے میرے دماغ میں ایک منصوبہ آگیا ہے۔ اپنے سراغ رساں کو مطلوبہ سراغ رسانی کر کے آلینے دو۔ دوسری یہ بات بھی ہمیں کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم صرف ایک

آدمی کو ہلاک کرنے کی کوشش میں اپنے مجاہدین کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتے
تم فکر نہ کرو۔ تمہارے اس کمینے بریگیڈئیر اوتار رام یا رام اوتار کے لئے میں اکیلا ہی کافی
ہوں۔"

وہ رات اور دوسرا دن بھی گزر گیا۔ دوسرے دن رات کے دس بجے کے قریب جب میں اور کمانڈو شیروان عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد غار کے اندر بیٹھے سبز چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ ایک مجاہد نے آکر خبر دی کہ اپنا آدمی آگیا ہے۔ کمانڈو شیروان نے اسے اندر بلا لیا۔ وہ السلام علیکم کہہ کر ہمارے پاس صف پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"بریگیڈئیر رام اوتار کو ہفتے کی رات کو ایک عورت ملنے آتی ہے۔ بلکہ لائی جاتی ہے۔ یہ عورت ہفتے کی رات اس کے پاس رہتی ہے اور صبح ہونے سے پہلے اسے گاڑی میں بٹھا کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اس عورت کا نام پدماوتی ہے۔ یہ سری نگر کے شمال میں ایک بستی میں رہتی ہے۔ اس عورت کے خاوند کا لکڑی کا ٹال ہے۔ عورت بڑی فیشن ایبل ہے۔ اس کی شادی کو بارہ سال ہو گئے ہیں مگر اولاد سے محروم ہے وہ مندروں اور مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر بھی جا کر اولاد کے لئے چڑھاوے چڑھاتی ہے اور منتیں مانتی ہے۔ خاوند زیادہ عمر کا ہے عورت جوان ہے اور اسے نئے نئے فیشن کرنے کا شوق ہے۔ اسی وجہ سے بریگیڈئیر رام اوتار سے اس کے تعلقات ہو گئے ہیں بریگیڈئیر کی ایک گاڑی خفیہ طور پر رات کے دس گیارہ بجے قصبے کے باہر جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پدماوتی چادر لپیٹے آتی ہے اور گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ اسی طرح پچھلے پہر بھی گاڑی پدماوتی کو بریگیڈئیر کے بنگلے سے اندھیرے میں لے کر واپس اس کے گھر پر چھوڑ آتی ہے بستی والوں کو اس کی خبر ہے مگر بریگیڈئیر کے ڈر کے مارے کوئی زبان نہیں کھولتا۔ پدماوتی کے بوڑھے خاوند کو بھی پتہ ہے مگر وہ خاموش ہو گیا ہے وہ بھی بھارتی فوجی افسر سے ڈرتا ہے اور کچھ بول نہیں سکتا۔"

میں نے اپنے جاسوس کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم نے پدماوتی کا مکان دیکھا ہے؟"

وہ بولا۔

"ہاں۔ میں اس کا مکان دیکھ کر آیا ہوں"

میں نے شیروان سے کہا۔

"مجھے کاغذ کا ٹکڑا اور بال پوائنٹ پنسل دینا۔"

کمانڈو شیروان نے صندوقچی میں سے بال پوائنٹ پنسل اور کاپی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ ہنس کر بولا۔

"کیا کوئی جادو ٹونا کرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں جادو ٹونے سے ہی کام چلے گا"

میں نے کاپی میں سے سفید کاغذ کا ٹکڑا کاٹا اور اس پر ہندی میں تین بار اوم اوم اوم لکھا۔ پھر نیچے ہندی میں ہی "کالی کالی کالی" کے الفاظ لکھ کر اسے تعویذ کی طرح تہہ کیا اور اپنے جاسوس سے پوچھا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم یہ کاغذ کا ٹکڑا پدماوتی کے مکان کے اندر یا چھت پر کسی جگہ چھپا کر یا دبا کر رکھ دو؟"

اپنے جاسوس نے کاغذ کا ٹکڑا لے کر صدری میں ڈال لیا اور بولا۔

"میں یہ کام کل رات کے وقت ہی کر سکوں گا۔ کیونکہ اس وقت بستی میں اندھیرا ہوتا ہے"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے مجھے آکر بتا دینا کہ تم نے یہ تعویذ پدماوتی کے مکان میں کس جگہ چھپایا ہے۔"

اپنا آدمی سلام کر کے اور تعویذ لے کر واپس چلا گیا۔ کمانڈو شیروان کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"تمہاری سکیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"جہاں طاقت سے کام نہ چل سکے وہاں حکمت عملی سے کام لینا پڑتا ہے۔ مجھے یقیں
ہے کہ ہم اپنا ٹارگٹ مار لیں گے۔"

دوسرا دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ تیسرے روز اپنا جاسوس صبح صبح آگیا۔ کہ
لگا

"میں نے آپ کا دیا ہوا تعویذ پدماوتی کے مکان کی چھت پر مرغیوں کے ڈربے
بائیں جانب پرانی اینٹوں کے نیچے چھپا دیا ہے۔ اس کے اوپر ایک اینٹ بھی رکھ
ہے۔"

میں نے خوش کر کہا۔

"شاباش! اب مجھے اس عورت کے خاوند کا نام اور اس کے ٹال کا پتہ بتا دو۔ باقی کا
میں خود کر لوں گا۔"

اس نے مجھے بتایا کہ پدماوتی کے خاوند کا نام جیا لعل ہے اور اس کا ٹال بستی
کونے پر ہے۔ اب آگے میرا کام شروع ہونے والا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنا
سادھوؤں والا بنا لیا۔ اس دفعہ میں نے لمبی ڈاڑھی بھی لگا لی تا کہ بعد میں پدماوتی اور اس
خاوند بھی میری شناخت نہ کر سکے۔ ابھی دھماکہ خیز دوائی والی شیشی ساتھ لے جانے
ضرورت نہیں تھی۔ میں نے موٹے منکوں کی مالائیں گلے میں ڈالیں۔ ایک مالا اپنے
میں پکڑ لی۔ کمانڈو شیروان نے ایک مجاہد میرے ساتھ کر دیا۔ جو مجھے جنگل کے
راستوں سے گزار کر اس سڑک پر چھوڑ گیا جو شہر کی اس بستی کو جاتی تھی جہاں پدماو
گھر اور اس کے خاوند کا لکڑی کا ٹال تھا۔

یہ بستی زیادہ دور نہیں تھی۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلتا بستی میں پہنچ
میں نے پاؤں میں وان کی بنی ہوئی چپل پہن رکھی تھی جو کشمیری مزدور پہنا کرتے ہیں
آرام دہ بھی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پاؤں میں کنکریں اور پتھر نہیں چبھتے۔ میں

اوم ہری اوم کا جاپ کرتا بستی کے شمال کی طرف آگیا۔ میں نے دور سے ایک ٹال دیکھا
جس کے باہر چھوٹے سے تخت پوش پر ایک دبلا پتلا کمزور سا آدمی بیٹھا کاپی پر کچھ لکھ رہا
تھا۔ ایک کشمیری مزدور چیری ہوئی لکڑیوں کو ایک طرف لگا رہا تھا۔ یہ پدماوتی کا خاوند جیا
لعل ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کے سامنے جا کر ایک بازو اٹھا کر ہری اوم ست کا
نعرہ لگایا اور کہا۔

"بچہ! سادھو سنتوں کی سیوا کر۔ تیرا کلیان ہو گا۔"

مسلمان تو پھر بھی بھیک مانگنے والے فقیروں کو جھڑک دیتے ہیں مگر ہندو انتہائی
ضعیف الاعتقاد قوم ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتے۔ ان کے پاس کوئی فراڈیا سادھو سنت بھی
چلا جائے تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیا لعل نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ہاتھ باندھ
کر بولا۔

"مہاراج! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں"

میں نے کہا۔

"بچہ! ہمیں چائے پلاؤ۔ ساتھ کیک بسکٹ بھی کھلاؤ۔"

جیا لعل نے لوہے کی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"پدھاریئے مہاراج۔ ابھی چائے بسکٹ آجاتے ہیں۔"

میں ہری اوم ہری اوم کا جاپ کرتا کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیا لعل نے کشمیری مزدور سے
کشمیری زبان میں کچھ کہا۔ میں اتنی زیادہ کشمیری زبان نہیں سمجھتا تھا۔ ضرور اس نے گھر
سے چائے منگائی ہو گی۔ مزدور چلا گیا۔

میں نے جیا لعل کی طرف گھور کر دیکھا اور سادھو جس طرح حاکمانہ انداز میں بات
کرتے ہیں اسی انداز میں کہا۔

"جیا لعل! تیرے سکھ کا ستارہ چمکنے والا ہے۔ مجھے اپنا ہاتھ دکھا تو نے ہم سادھو سنتوں
کی عزت کی ہے۔ ہم تمہیں تقدیر کا سچا سچا حال بتائیں گے۔"

جیا لعل نے جلدی سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس کے میلے ہاتھ پر لکیریں بنی ہوئی

تھیں جس طرح ہر ہاتھ پر ہوتی ہیں۔ میری جانے بلا یہ لکیریں اپنے اندر کوئی مفہوم رکھتی تھیں یا نہیں رکھتی تھیں۔ میرے لئے یہ بے کار لکیریں تھیں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں تو اداکاری کر رہا تھا۔ میں نے جھک کر جیا لعل کے میلے کچیلے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر ہاتھ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"رام رام رام رام!"

میرے چہرے پر تفکر کے اثرات دیکھ کر جیا لعل پریشان ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا کوئی خراب بات ہے؟"

میں نے کہا۔

"جیا لعل! تیری قسمت کا ستارہ چمکنے والا ضرور ہے۔ مگر تمہاری قسمت کی ریکھا بد قسمتی کے بادلوں میں چھپ گئی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہاں ایک بیٹا پیدا ہونے والا ہے۔ مگر کیتو اور راہو دونوں ستارے تمہارے دشمن بن گئے ہیں۔"

جیا لعل خوش بھی ہوا اور پریشان بھی زیادہ ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! مجھے کوئی اپائے بتائیے۔ کسی طرح راہو کیتو کو دور کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی سیوا کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"بچہ! تمہیں کچھ بتائیں گے۔ ایسی بات بتائیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ چلو۔ ہمیں اپنے گھر لے کر چلو۔ یہ کام وہیں ہو گا۔"

جیا لعل نے ٹال دوسرے مزدور کے حوالے کیا اور مجھے لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ بستی کی ایک گلی میں اس کا پرانا بوسیدہ سا مکان تھا۔ مگر جس کمرے میں اس نے مجھے بٹھایا اس میں دری بچھی ہوئی تھی اور ایک پرانا صوفہ سیٹ بھی پڑا تھا۔ دیوار پر ایک خوبصورت عورت کی رنگین فوٹو لگی تھی جس میں وہ کسی ہیروئین کی طرح ایک طرف مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ جیا لعل نے آواز دی۔

"پدماوتی! یہاں آؤ۔ دیکھو۔ چیونٹی کے گھر میں نارائن آگئے ہیں۔"

ایک گوری چٹی جوان عورت اندر آگئی۔ ساڑھی کے پلو کو کمر کے گرد باندھتے ہوئے اس نے اپنے خاوند کے ساتھ ایک جٹا دھاری سادھو کو دیکھا تو فوراً جھک کر میرے قدموں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں تو آپ کے لئے چائے بنا کر بھیجنے والی تھی"

جیا لعل نے چارپائی پر سے میلے کپڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بھاگ اچھے ہیں پدماوتی کہ سادھو مہاراج خود چل کر یہاں آگئے ہیں۔ جلدی سے چائے بنا کر لے آؤ"

"ابھی لاتی ہوں جی"

وہ واپس چلی گئی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی کہ یہ کھیلنے کھلانے والی عورت ہے۔ اس نے گھر میں بھی اپنے ہونٹوں پر سرخی لگا رکھی تھی۔ جسم کافی صحت مند تھا۔ بریگیڈیئر رام اوتار یونہی اس پر لٹو نہیں ہو گیا تھا۔

"یہاں بیٹھیے مہاراج"

جیا لعل نے چارپائی پر میرے لئے نئی چادر بچھا دی تھی۔ میں چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جیا لعل نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"مہاراج! میرے ہاں بچہ کب پیدا ہو گا کرپا کر کے یہ بتا دیجئے۔"

میں نے ہاتھ کو دیکھ کر کہا۔

"جیا لعل! جب تک راہو کیتو تیرے راستے میں کھڑے ہیں تب تک تیرے ہاں اولاد نہیں ہو گی۔ جب یہ دونوں دشمن میں نے بھگا دیئے تو تیرے گھر لڑکا پیدا ہو گا۔ اور ن۔"

میں نے اس کی مردانہ جذبات کی تسکین کی خاطر کہا۔

"بچہ تمہاری طرح بڑا خوبصورت اور طاقت ور ہو گا"

جیا لعل خوشی سے جھوم اٹھا اور میرے گھٹنے بار بار چھونے لگا۔ اتنے میں پدماوتی چائے اور بسکٹ لے کر آگئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پدماوتی! یہاں سامنے آکر بیٹھ جا"

وہ ساڑھی لپیٹتی ہوئی میرے سامنے مونڈھے پر خاوند کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ تین چار بار ہری اوم ہری اوم کہا۔ اور پھر آنکھیں کھول کر چھت کی طرف دیکھا۔ اور کہا:

"جیا لعل! تم دونوں پر کسی نے جادو ٹونا کیا ہوا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اوپر مرغیوں کے ڈربے کے پاس اینٹوں کے ڈھیر میں تمہارے دشمن نے ایک تعویذ دبایا ہوا ہے۔ چل میرے ساتھ اوپر چل"

وہ دونوں میرے ساتھ چھت پر آگئے۔ وہاں مرغیوں کے ڈربے کے پاس واقعی ایک طرف اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مرغیاں ڈربے میں شور مچانے لگیں۔ میں نے دل میں انہیں گالی دے کر کہا۔ تم کیوں شور مچانے لگی ہو؟۔ میں نے جیا لعل سے کہا۔

"ان اینٹوں کو ہٹا کر دیکھو۔ تعویذ یہیں کہیں ہو گا۔"

جیا لعل اور پدماوتی اینٹوں کو ادھر ادھر ہٹانے لگے۔ ایک اینٹ کے نیچے سے میرے جاسوس کا دبایا ہوا اور میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تعویذ نکل آیا۔ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ میں نے کہا۔

"اسے کھول کر دیکھو اور پڑھو اس پر کیا لکھا ہے"

جیا لعل نے تعویذ کھول کر پڑھا۔ اور خوف کے مارے کانپنے لگا۔

"مہاراج! یہ تو کالی دیوی کا ٹونا ہے۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا مہاراج!"

میں نے تعویذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"جیا لعل! ہم کس لئے یہاں آئے ہیں؟ ہم تمہیں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ نیچے آجاؤ۔"

پدماوتی بھی پریشان تھی۔ ہم نیچے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے پدماوتی سے کہا۔

"پدماوتی! میرے لئے چائے بناؤ"

فوراً اس نے میری پیالی میں سبز چائے ڈالی اور مجھے پیش کی۔ جیا لعل نے بسکٹوں کی

تھالی آگے کر دی۔ میں نے ایک بسکٹ کھایا۔ چائے کے دو گھونٹ پیئے اور پیالی رکھ دی۔

"جیا لعل! ماچس منگواؤ"

اس نے پدماوتی سے کہا۔

"جلدی سے ماچس لے آؤ"

وہ دوڑ کر گئی اور ماچس لے آئی۔ میں نے ایک ہاتھ میں تعویذ والا کاغذ پکڑ لیا اور جیا لعل سے کہا۔

"اپنے ہاتھ سے ماچس جلا کر اس کاغذ کو آگ لگا دو"

جیا لعل نے تیلی جلا کر کاغذ کے کونے کو آگ لگا دی۔ میں نے جلتا ہوا کاغذ خالی تھالی میں رکھ دیا۔ جب سارا کاغذ جل گیا تو میں نے پدماوتی کی کمر کو تھپتھپا کر کہا

"پدماوتی! خوش ہو جا۔ بھگوان نے تم پر کرپا کر دی۔ تیرے گھر کی ساری بلائیں جل کر راکھ ہو گئی ہیں۔ اب تیرے ہاں ایک چندرماں ایسا بچہ پیدا ہو گا۔"

پدماوتی کے لئے یہ دو خوش خبریاں تھیں۔ وہ تو خوشی سے نہال ہو گئی اور میرے قدموں پر سر رکھ کر فرط مسرت سے رونے لگ پڑی۔ میں نے ایک بار پھر اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہئے پگلی تیرے سارے دکھ دلدر دور ہو گئے ہیں۔"

میں نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس نے بلاؤز کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ ایک بار پھر میرے دل میں خیال آگیا کہ بریگیڈیئر رام اوتار یونہی اس عورت پر لٹو نہیں ہوا۔ میں نے اپنا سکہ ان دونوں پر بٹھا دیا تھا۔ اب مجھے اپنے حقیقی مشن کو آگے بڑھانا تھا۔ میں نے پدماوتی سے کہا۔

"تم تھوڑی دیر کے لئے باہر جاؤ۔ مجھے تمہارے پتی دیو سے کچھ باتیں کرنی ہیں جاؤ۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے جیا لعل سے کہا۔

"جیا لعل! تیری پتنی کا ستارہ چمکنے لگا ہے۔ راہو کیتو راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ اب

ایسا کرنا کہ اپنی پتنی کو گھر سے باہر جانے سے کبھی نہ روکنا۔ وہ جتنا گھر سے باہر رہے گی ستاروں کی کرنیں اس پر پڑیں گی اور اس کے پیٹ میں جو تمہارا بچہ پل رہا ہے اس کو طاقت ملے گی۔ سمجھ گئے؟"

بے چارہ جیا لعل۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! میں نے تو پدما کو کبھی کہیں جانے سے نہیں روکا۔ دن ہو چاہے رات وہ جہاں جانا چاہتی ہے میں اسے کبھی نہیں روکتا"

"بس اس پر عمل کرتے رہنا۔ اب یہ بات پدماوتی کو مت بتانا۔"

"کبھی نہیں بتاؤں گا۔ جی کبھی نہیں۔ ہے بھگوان تیری کرپا ہے۔"

میں نے جیا لعل سے کہا۔

"اب تو دوسرے کمرے میں چلا جا اور اپنی پتنی کو اندر بھیج دے۔ مجھے اس کے ساتھ ایک ضروری بات کرنی ہے۔ جا۔ چلا جا۔"

جیا لعل ہاتھ جوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے لمحے اس کی پتنی پدماوتی اندر آگئی۔ اس نے بھی ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"یہاں میرے پاس آکر بیٹھ جا ناری!"

میں بالکل ہندوؤں کے سادھوؤں کی طرح حاکمانہ انداز میں بول رہا تھا۔ اگر اس طرح نہ بولا جائے تو ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پدماوتی چارپائی پر میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کا گرم گداز جسم بالکل میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں پدماوتی کے اس طرح ساتھ لگ کر بیٹھنے سے سمجھ گیا کہ وہ اس بات کے لئے بالکل تیار ہے جو میرے اصول کے خلاف تھی۔ اور جسے میں پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن میرے جذبات میں ہلچل ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی داستان سناتے وقت کہہ دیا تھا کہ میں جھوٹ کہیں نہیں بولوں گا۔ ہر واقعہ ہر بات اور اپنے دل کی تمام کیفیات آپ کو سچ سچ بیان کرتا جاؤں گا۔ اس وقت میرے اندر ایک زبردست کش مکش شروع ہو گئی۔ میں جوان تھا۔ صحت مند تھا۔ میرے اندر جذباتی ہیجان کا پیدا ہو جانا قدرتی بات تھی۔ مگر میں آپ کو یہاں ایک

بات ضرور بتا دینا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ اس پر یقین کریں چاہے نہ کریں۔ چاہے آپ میری یہ بات سن کر مجھے بیوقوف کہیں چاہے میری بات نہ مانیں۔ مگر میں آپ کو یہ ضرور کہوں گا کہ جب مرد پر ایسا مقام آتا ہے تو اس کی مردانگی یہ نہیں کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ جائے۔ اس کی مردانگی یہ ہے کہ وہ اس وقت چٹان بن جائے۔ جذبات کی طوفانی لہریں میں چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑ دیں مگر مرد پر اس کا اثر نہ ہو اور وہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ آپ میری اس بات پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسا احمق مرد ہے کہ ہمیں ایک قدرتی عمل سے روک رہا ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ یہ قدرتی عمل ضرور ہے مگر قدرت نے اس عمل کا ہمیں اختیار دے کر ہم پر کچھ ذمے داریاں بھی عائد کر دی ہیں۔ انسانوں پر یہ قدرتی عمل اس وقت بنتا ہے جب ہم اس عمل کے بعد پیدا ہونے والے نتیجے کی ذمے داری قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ جانوروں پر یہ بات اس لئے عائد نہیں ہوتی کہ انہیں جنسی جذبات پر عمل کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ ان کو ایک خاص موسم دے دیا گیا ہے جب ان کے اندر جنسی جذبات از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ہم جس وقت چاہیں اپنے اوپر جنسی ہیجان طاری کر سکتے ہیں۔ مرد وہ ہے جو اس اختیار کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور جنسی عمل کو ایک ضابطہ اخلاق کا پابند بنا کر رکھے۔ قدرت نے انسان کو اختیار دے کر اس کو اس اصول اور ضابطے کا پابند بنانے کی کوشش کی ہے جو اس ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ہمیں اختیار دے کر ہمارے جبر کو آزمایا گیا ہے۔ ہمیں امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ جو اس امتحان میں کامیاب رہتا ہے وہی اس کائنات کی مشینری کا ایک اہم پرزہ بنتا ہے اور قدرت کے منشا کو پورا کرنے' اسے آگے بڑھانے میں قدرت کی مدد کرتا ہے۔ یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے جس کا مظاہرہ ہم اپنی زندگی میں روز دیکھتے ہیں مگر ہمیں پتہ نہیں چلتا۔ ہمیں اس کا پتہ لگانا چاہئے۔ ہمیں غافل بن کر زندگی بسر نہیں کرنی چاہئے۔ غفلت اس کائنات میں موت کا دوسرا نام ہے۔

معاف کر دینا۔ میں کبھی کبھی اپنی کہانی بیان کرتے کرتے دوسری طرف نکل جاتا

ہوں۔ یہ مت سمجھیں کہ میں کوئی نصیحتیں کرنے لگتا ہوں یا آپ کو سمجھانے کی غرض سے ایسی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ نہیں ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کوئی کسی کو سمجھا نہیں سکتا کوئی کسی کی بات سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں تو اپنا نشہ پورا کرنے کے لئے ایسی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ یقین کریں۔ مجھے ان باتوں کا نشہ ہو گیا ہے۔ بس ایک کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے اور میں ایسی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ آپ میری باتیں سمجھنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ میری باتیں آپ کی سمجھ میں بھی آگئیں تو آپ انہیں نہیں سمجھیں گے۔ بس خدا سے دعا کریں کہ آپ پر بھی میری طرح ان باتوں کا نشہ چڑھ جائے۔ پھر آپ بھی میری طرح ان باتوں کو سننے کی بجائے انہیں ساری کائنات میں چلتے پھرتے' اپنا کام کرتے' اپنی ڈیوٹی ادا کرتے دیکھیں گے۔

پدماوتی کے گداز بدن نے میرے جذبات میں جو ہیجان پیدا کیا تھا اسے میں نے اپنی طاقت سے فتح کر لیا۔ یاد رکھیں۔ دوسروں کو فتح کرنے والا فاتح ہوتا ہے۔ مگر اپنے آپ کو فتح کرنے والا انسان عظیم ہوتا ہے۔ میں نے پدماوتی کو بالکل نہ کہا کہ پرے ہٹ کر بیٹھو۔ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ پر اس وقت جو حملہ ہوا تھا اس کو میں نے جوابی حملے سے پسپا کر دیا تھا۔ میں نے پدماوتی کا جسم اپنے جسم کے ساتھ لگا رہنے دیا اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ پر اٹیک کیا۔

"پدماوتی! میری بات غور سے سن!"

پدماوتی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے کہا۔

"تیری کوکھ سے بہت جلد ایک چندر اماں ایسا بچہ پیدا ہو گا۔ دیوتاؤں نے تمہیں یہ خوش خبری دینے کے لئے مجھے بھیجا ہے"

پدماوتی یہ سن کر اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"مگر مہاراج! میرا خاوند مرد نہیں رہا"

میں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مورکھ ناری! یہ بچہ تیرے خاوند سے نہیں بلکہ اس مرد سے پیدا ہو گا جس کے پاس تو ہر شنی وار کی رات کو جاتی ہے"

پدماوتی نے شرم کے مارے گردن نیچی کر لی۔ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر کہا۔

"مہاراج مجھے شما کر دیں۔ مجھے شما کر دیں"

میں نے کہا۔

"مورکھ ناری! بھگوان کی مرضی سے ایسا ہو رہا ہے۔ دیوتاؤں کی یہی مرضی ہے کہ تیرا بچہ رام اوتار سے ہو لیکن اس کے لئے تجھے ایک شرط پوری کرنی ہو گی۔ بول! کیا دیوتاؤں کی شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہے؟"

پدماوتی نے کہا۔

"مہاراج آپ حکم کریں۔ کونسی شرط ہے۔ میں اپنے بچے کی خاطر ہر شرط پوری کرنے کے واسطے تیار ہوں"

اب میرا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"تجھے دیوتاؤں کے مان سرودر لایا ہوا جل رام اوتار کو پلانا ہو گا۔ اسے یہ جل پلاؤ گی تو تیرے بطن سے چاند ایسا بچہ جنم لے گا۔ اس کے بغیر چاہے تو ساری عمر دنیا کے سارے مردوں سے ملتی رہو گی تیر کوکھ ہری نہیں ہو گی۔"

پدماوتی بولی۔

"مہاراج مجھے یہ پوتر جل کہاں سے ملے گا؟ میں چاہے کچھ ہو جائے یہ جل لا کر رام اوتار کو پلاؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"تو بڑی خوش قسمت ہے پدماوتی۔ دیوتاؤں کے مان سرودر کا یہ جل میرے پاس موجود ہے۔ میں کل اسی وقت یہ جل لا کر تمہیں دے دوں گا۔ مگر ایک اور شرط بھی ہے۔"

"وہ کیا مہاراج؟"

میں نے کہا۔

"اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اپنے خاوند اور بریگیڈیئر رام اوتار سے بھی نہ کرنا اگر تو نے کسی سے ذکر کر دیا تو گنگا جل کا سارا اثر ختم ہو جائے گا اور تو بانجھ کی بانجھ رہے گی"

اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! میری زبان جل جائے اگر میں کسی سے اس کا ذکر کروں۔ مجھے آج ہی یہ جل لا دیجئے۔ میں ساری عمر کے لئے آپ کی داسی بن کر رہوں گی۔"

میرے پاس اس وقت دھماکہ خیز محلول کی شیشی موجود نہ تھی مگر پھر میں پدماوتی کے اشتیاق کو مزید تیز بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا۔

"اب ہم جاتے ہیں۔ جیا لعل کو کہہ دینا ہم کل اسی وقت آئیں گے۔"

میں نے جیا لعل اس کے خاوند کا بھی انتظار نہ کیا اور سادھوؤں والی اداؤں سے کام لیتے ہوئے اولکھ زنجن کا نعرہ لگا کر مکان سے باہر نکل گیا۔

واپس آکر میں نے کمانڈو شیروان کو سارا قصہ سنایا، وہ کہنے لگا۔

"کیا وہ عورت یہ کام کر سکے گی؟"

میں نے کہا۔

"وہ کہاں کرے گی۔ میں اس سے یہ کام کرواؤں گا جب توپ کے پیچھے توپچی موجود ہو تو توپ چل جاتی ہے۔ توپچی کے بغیر توپ نہیں چلتی۔"

اگلے روز میں نے جس وقت آنے کو کہا تھا اس وقت پدماوتی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ میرا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ آج اس نے نہا دھو کر بال بنائے ہوئے تھے اور سرخی بھی خوب لگائی ہوئی تھی۔ شاید وہ مجھے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس خوشی کا محتاج نہیں تھا جو خوشی وہ مجھے دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کو بھی گھر سے باہر بھیج دیا ہوا تھا۔ ہندوؤں کے گھر میں سادھو داخل ہوتا دیکھ کر کوئی ہندو شک نہیں

کرتا کہ گھر میں اکیلی عورت ہے یہ کیوں گیا ہے۔ ہندو لوگ کسی سادھو کے گھر میں داخل ہونے کو بڑا مبارک سمجھتے ہیں۔ اس نے چارپائی پر نئی چادر بچھائی ہوئی تھی۔ میرے قدم چھو کر وہ نوکروں کی طرح میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں بڑی شان سے چارپائی پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

پدماوتی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جلدی سے میرے قریب آکر میرے قدموں میں زمین پر بچھی ہوئی دری پر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ کر سر بھی میرے گھٹنوں سے لگا دیا۔ میں نے کہا۔

"پدماوتی! سر اوپر اٹھا۔ اور ہم تجھے جو کچھ کہیں اسے غور سے سن اور ہم جس طرح کہیں اسی طرح کرنا۔ کیا تو تیار ہے؟"

اس نے سر اٹھا لیا اور بولی۔

"مہاراج آپ حکم کریں۔ کیا آپ پوتر گنگا جل لائے ہیں؟"

میں نے قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر دھماکہ خیز محلول کی شیشی نکال کر اسے دکھائی۔

"یہ ہے پوتر مان سرودر کا گنگا جل جو دیوتاؤں نے مجھے دیا تھا۔ اب تو ایسا کر کہ کوئی شیشی لا۔"

وہ دوڑ کر اندر گئی اور ایک شیشی لے آئی۔ میں نے دھماکہ خیز محلول والی شیشی کا ڈھکنا کھول کر اس کی شیشی کو غور سے دیکھا۔ اور کہا۔

"پدماوتی! تو بڑی بھاگیہ وان ہے کہ دیوتاؤں کا دیا ہوا پوتر جل تجھے مل رہا ہے۔ یاد رکھ۔ اس جل میں تیرے کوکھ سے جنم لینے والا بچہ موجود ہے۔"

وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ میں نے خالی شیشی میں اپنی شیشی میں سے دھماکہ خیز محلول کے چند قطرے انڈیلے اور شیشی اچھی طرح سے بند کر کے اسے دے دی۔

"اس پوتر جل کو سنبھال کر رکھنا۔ یہ بتا کہ تو رام اوتار بریگیڈیئر سے ملنے کب جا رہی ہے؟"

پدماوتی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"مہاراج کل شنی وار ہے۔ کل رات کو جاؤں گی"

میں نے کہا۔

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"پہلے یہ بتا کہ تو کس وقت رام او تار کی کوٹھی سے واپس آتی ہے؟"

بات اصل میں یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ بریگیڈیئر رام او تار کے ساتھ یہ بے گناہ عورت بھی ماری جائے۔ میں اس ہندو کا دشمن تھا اور وہ ہندو میرا دشمن تھا جو مسلمانوں پر ظلم وستم کر رہا تھا۔ جس نے کئی کشمیری مجاہدین کو اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا تھا۔ یہ ہندو ظلم وستم کر رہا تھا۔ جس نے کئی کشمیری مجاہدین کو اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا تھا۔ یہ ہندو عورت بے گناہ تھی۔ یہ میری دشمن نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جس وقت بریگیڈیئر رام او تار کے معدے میں یہ محلول چلا جائے گا تو اس کے ٹھیک دس منٹ بعد اس کا جسم دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اس کے پاس جو کوئی بھی بیٹھا یا لیٹا ہوا ہو گا وہ بھی دھماکے میں ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے میں نے پدماوتی سے یہ سوال پوچھا تھا کہ وہ کس وقت بریگیڈیئر کی کوٹھی سے واپس آتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ بریگیڈیئر کو یہ محلول پلانے کے دس منٹ کے اندر اندر پدماوتی وہاں سے جا چکی ہو۔

ے آگے پدماوتی کی شرم کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج دن نکلنے سے پہلے پہلے میں بریگیڈیئر صاحب کے بنگلے سے واپس آجاتی
ں"

میں نے جھوٹ موٹ کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بریگیڈیئر کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ تم نے اسے دیوتاؤں کا پوتر جل
ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا تو تیرے حمل نہیں ٹھہرے گا۔ تیرے ہاں بچہ جنم نہیں
گا"

وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج میں اسے بالکل نہیں بتاؤں گی۔ کبھی نہیں بتاؤں گی۔ میں چپکے سے پانی میں
اسے پلا دوں گی"

میں آہستہ آہستہ راستہ صاف کرتا ہوا اپنے ٹارگٹ پر پہنچ رہا تھا۔ اصل میں میں اس
ت کی جان بچانا چاہتا تھا۔ میں نے نفی میں سرہلا کر کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں"

وہ ڈر گئی۔ بولی۔

"کیا ہوا مہاراج! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

میں نے جلال میں آکر کہا۔

"یہ جل پانی میں تم اسے پلاؤ گی تو اس کا اثر آدھا رہ جائے گا۔ یہ بتاؤ کیا بریگیڈیئر

سوم رس پیتا ہے؟ سوم رس جو دیوتا بھی پیتے ہیں"

پدماوتی سوم رس کو نہ سمجھ سکی۔ میں نے فوراً کہا۔

"کیا بریگیڈیئر رام اوتار شراب پیتا ہے؟"

وہ ڈر کر بولی۔

"ہاں مہاراج وہ شراب رات کو بھی پیتا ہے اور صبح اٹھ کر بھی پیتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں صبح اٹھنے کے بعد بھی تھوڑی سی پی لیتا ہوں"

میں نے کڑک کر کہا۔

"بس یہ ٹھیک ہے۔ مورکھ ناری! دیوتا تم سے خوش ہیں۔ بہت خوش ہیں انہوں نے تیرے لئے پہلے سے سارا انتظام کر رکھا ہے۔ اب میری بات غور سے سن۔ رات کو جب شراب پینے کے بعد بریگیڈیئر سو جائے تو تم نے اٹھ کر اس بوتل میں یہ گنگا جل کے قطرے ملا دینے ہیں جس میں سے رام اوتار نے صبح اٹھ کر تھوڑی سی شراب پینی ہے۔ بس وہ صبح اٹھے گا۔ بوتل میں سے شراب کے دو گھونٹ پیئے گا اور دیوتاؤں کی مرضی پوری ہو جائے گی اور اگلے برس تیری گود میں چاند ایسا بچہ کھیل رہا ہو گا۔"

پدماوتی نے میرے زانوؤں پر سر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ سسک سسک کر رونے لگی۔ بے چاری عورت۔ عورت واقعی ماں کے روپ میں اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اپنی تمام محبتوں اور شفقتوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ ماتا کا جوہر اس کے خون میں گردش کرتا ہے۔

میں نے اس کا سر اٹھایا اور کہا۔

"اب رونا دھونا بند کر اور خوش ہو جا تیری گود دیوتاؤں نے ہری کر دی ہے۔ جا شیشی کو سنبھال کر رکھ۔ کل جب تو بریگیڈیئر کے بنگلے پر جائے گی تو اس کو سنبھال کر کر اپنے ساتھ لے جانا اور رات کو جب رام اوتار سو رہا ہو گہری نیند میں تو اٹھ کر اس شراب کی بوتل میں یہ سارا پوتر گنگا جل انڈیل دینا پھر بھگوان کا کرشمہ دیکھنا۔ اب خوش ہو جا۔ بھگوان نے تیری نسل جاری کر دی ہے۔"

خدا جانے پدماوتی کو کیا ہوا کہ وہ میرے قدموں سے چمٹ کر ایسا رونے لگی کہ نہ اس کے آنسو تھمتے تھے۔ نہ وہ میرے پاؤں سے الگ ہوتی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے الگ کیا اور چارپائی سے اٹھ کر کہا۔

"پدماوتی! اگر تو زیادہ رونا دھونا کرے گی تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔"

وہ جلدی سے اپنے آنسوؤں کو پونچھ کر بولی۔

"نہیں نہیں مہاراج! میں اب کبھی نہیں روؤں گی۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میں دروازے پاس رک گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یاد رکھنا۔ اس کا ذکر نہ اپنے پتی سے کرنا نہ رام اوتار سے کرنا۔ اگر تو نے پوری ہوشیاری سے کام لیا تو بہت جلد ایک بیٹے کی ماں بن جائے گی۔"

پدماوتی کہنے لگی۔

"مہاراج ایسا ہی ہو گا۔ ایسا ہی ہو گا۔ ایسا ہی ہو گا میں اس راز کو راز ہی رکھوں گی۔ یہ میرے ہونے والے بچے کا جیون ہے۔"

"شاباش! اب تو آرام کر۔ ہم بھی جاتے ہیں ہم پرسوں تیرے پاس آئیں گے۔ اور دیکھیں گے معلوم کریں گے کہ کیا تم نے ساری شرطیں پوری کرتے ہوئے رام اوتار کو گنگا جل پلا دیا ہے۔ اولکھ نرنجن!"

اور میں پدماوتی کے مکان سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ پرسوں میرے پدماوتی کے گھر میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں دل میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے جس مسلمان کش اور کشمیریوں کا دشمن قصاب بریگیڈیئر رام اوتار کا جسم دھماکے سے پھٹے وقت یہ عورت وہاں موجود نہ ہو۔ ایک بات یقینی تھی کہ اگر یہ عورت بریگیڈیئر رام اوتار کے بنگلے سے واپس آ بھی جاتی ہے تو رام اوتار کی اذیت ناک موت کے بعد انٹلی جنیس والے اسے ضرور پکڑ کر لے جائیں گے اور اس سے زبردست پوچھ گچھ کریں گے کیونکہ رات کو یہی عورت بریگیڈیئر کے بیڈ روم میں موجود تھی اور فوجی گاڑی

اسے لے کر آتی اور واپس لے جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پدماوتی کی جان بچ جائے گی مگر
وہ ملٹری انٹیلی جینس کو یہ ضرور بتادے گی کہ اس کو ایک سادھو نے گنگا جل دیا تھا کہ اس
کو رام اوتار کی شراب کی بوتل میں ملا کر پلا دینا تیرے ہاں بچہ پیدا ہو گا۔ ملٹری انٹیل
جینس والے اس عورت سے ذرا سے تشدد کے بعد یہ راز اگلوا لیں گے۔ اس کے ساتھ
ہی رام اوتار کی بوتل میں پڑی ہوئی شراب کا کیمیکل تجزیہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن گل
خان نے یہ محلول کچھ ایسے فارمولے کی راہ نمائی میں تیار کیا تھا کہ اگر اس کا تجزیہ امریک
کی جدید ترین لیبارٹری میں ہو تو ممکن تھا کہ کچھ سراغ مل جائے لیکن سری نگر کی فو
لیبارٹری میں یہ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ شراب میں دھماکہ خیز مواد شامل ہے۔ یہ گل خا
کا کمال فن تھا۔

میں بستی سے نکل کر کھیتوں کے ساتھ ساتھ اس طرف چل پڑا جدھر پہاڑیاں ا
درخت تھے۔ یہاں گھاٹیوں میں اتر گیا۔ میں ان راستوں پر ہو کر چل رہا تھا جن راستو
سے مجھے اپنا آدمی لے کر باہر آیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے مجھے دیکھا تو تیز تیز قدموں
چلتا میرے پاس آیا۔

"کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔

"بتی کو آگ لگا دی ہے۔ اب دیکھیں دھماکہ ہوتا ہے یا نہیں۔"

ہم وہیں درختوں کی اوٹ میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے سارا واقعہ بیان
وہ کہنے لگا۔

"کل رات کو ہم اپنے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دیں گے۔ وہ بریگیڈیئر کے بنگلے
کچھ فاصلے پر چھپ کر بیٹھ جائے گا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ محلول کام دکھائے گا؟"
میں نے کہا۔

"میں اس کا تجربہ کر کے دیکھ چکا ہوں شرط صرف یہ ہے کہ پدماوتی اس
بریگیڈیئر کی بوتل میں محلول کے قطرے ڈال دے اور بریگیڈیئر اس بوتل میں سے

ی بھی لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ایسا دھماکہ ہو گا کہ آدھا بنگلہ رام اوتار کے ساتھ ہی اڑ
جائے گا۔"

میں خود جانا چاہتا تھا مگر کمانڈو شیروان نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا کہ وہاں آس پاس
لٹری پولیس اور انٹیلی جینس کے آدمی چھپے ہوتے ہیں۔ تم پہاڑی علاقے سے واقف نہیں
و کہیں پھنس نہ جاؤ۔ ہمارا آدمی دھماکے کے بعد نکل آئے گا۔ ہفتے کی رات آ گئی۔
یروان نے اپنے آدمی کو ہدایات دے کر بریگیڈیئر کے بنگلے کے قریب کسی جگہ چھپ کر
ٹھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ میں اور شیروان رات کے بارہ ایک بجے تک اپنے اگلے مشن
نی گل خان کو بھارتی انٹیروگیشن سنٹر سے فرار کروانے کے بارے میں غور کرتے رہے۔
وں سے اپنا جاسوس نہرا انٹیروگیشن کی تفصیلات معلوم کر کے ابھی تک نہیں آیا تھا۔
ں کے آنے کے بعد ہی ہم کوئی منصوبہ تیار کر سکتے تھے۔ رات ایک بجے کے بعد شیروان
ونے کی تیاریاں کرنے لگا۔

"تم بھی سو جاؤ۔ جو ہونا ہے وہ صبح ہی ہو گا۔ ہمارا آدمی آکر خبر کر دے گا۔"

وہ بھی سو گیا۔ کچھ دیر بستر پر پہلو بدلنے کے بعد میں بھی سو گیا۔ صبح کی اذان کے
ت ہمیں اٹھا دیا گیا۔ میں نے اور کمانڈو شیروان اور دوسرے حریت پسند مجاہدوں نے
ٹھے صبح کی نماز پڑھی۔ دھماکے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اولاد کی خاطر
اوتی ویسے ہی کرے گی جس طرح میں نے اسے ہدایت کی ہے۔ وہ چالاک اور تجربہ کار
رت تھی۔ اس نے اب تک ضرور شراب کی بوتل میں دھماکہ خیز محلول جس کو وہ گنگا کا
ز جل سمجھ رہی تھی۔ ملا دیا ہو گا۔ صبح ہو گئی۔ ہم نے ناشتہ کیا اور اپنی اپنی سٹین گنیں
لے کر ان کی صفائی کرنے بیٹھ گئے۔ شیروان کہنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے بریگیڈیئر ابھی تک زندہ ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"میرے حساب کے مطابق تو اس وقت تک وہ ختم ہو گیا ہو گا۔ اس کے جسم کے
ے اڑ گئے ہوں گے۔ آگے جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا۔"

دن کے دس بجے کے قریب اپنا آدمی آگیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے آتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور بتایا کہ بریگیڈیئر رام اوتار ختم ہو گیا ہے۔ کمانڈو شیروان نے مجھے گلے لگا لیا۔ دوسرے حریت پسند مجاہد کمانڈوز بھی وہاں آگئے۔

جو مجاہد یہ خوش خبری لایا تھا وہ کہنے لگا۔

"میں بنگلے سے تھوڑی دور ایک اونچی جگہ پر درختوں میں چھپ کر بیٹھا بنگلہ دیکھ رہا تھا۔ بریگیڈیئر کی فوجی گاڑی برآمدے کے سامنے کھڑی تھی۔ ٹھیک نو بجے اس کی گاڑی کے آگے پیچھے چلنے والی دوسری گاڑیاں بھی آگئیں۔ ان میں فوجی باڈی گارڈ اور کمانڈوز بیٹھے تھے۔ بنگلے پر خاموشی چھائی تھی۔ میں نے سوچا کہ کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے کچھ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا اور میں نے بنگلے کے ایک حصے کی چھت کو اوپر اڑتے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ بنگلے کو آگ لگ گئی تھی۔ آگ کے شعلوں اور دھوئیں نے سارے بنگلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فوجی ایک انتشار کے عالم میں گھبرائے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کشمیری مسلمانوں کے بدترین دشمن رام اوتار کے پرخچے اڑ گئے ہوں گے۔ میں فوراً پہاڑی کی دوسری طرف اترا اور بھاگتا ہوا یہاں تک آپ کو یہ خوش خبری سنانے آیا ہوں۔"

میں نے اس مجاہد کو گلے لگا لیا اور شیروان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ شیروان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے ہمارے مشن کو کامیابی عطا کی ہے دوست! مگر اب ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔ خواہ کچھ وقت کے لئے ہی سہی"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

بریگیڈیئر کی موت کے ساتھ ہی علاقے کی ملٹری پولیس اور خفیہ ایجنسیاں الرٹ ہو گئی ہوں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس علاقے کو بھی گھیرے میں لے لیں۔"

کمانڈو شیروان نے ہاتھ بلند کر کے کشمیری زبان میں مجاہدین سے کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ ضروری سامان باندھا جانے لگا۔ کہیں سے چھ سات خچر آگئے سامان ان پر لادا گیا۔ میں اور کمانڈو شیروان خچروں پر سوار ہو گئے اور دن کی روشنی میں ہمارا یہ مختصر سا قافلہ پہاڑی ڈھلانوں، گہری گھاٹیوں اور درختوں پر گھرے ہوئے پر پیچ راستوں سے ہوتا ہوا اپنے دوسرے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چل پڑا۔ دوسرا ہائیڈ آؤٹ جنوب کی جانب پہاڑیوں کے اندر ایک غار میں تھا۔

دوسری طرف بریگیڈیئر رام اوتار کی عبرت ناک موت پر آزادی کشمیر کی تمام تنظیموں اور مجاہدین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے عزائم اور حوصلے بلند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی فوجی یونٹیں بھی حرکت میں آگئیں۔ انہوں نے تلاشی کے بہانے مسلمان کشمیریوں کے گھروں کو آگ لگائی اور ذرا سی مزاحمت پر کشمیری جوانوں پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ یہ سارا ملٹری آپریشن سری نگر کی ملٹری انٹیلی جینس کے چیف کیپٹن چوپڑہ کی قیادت میں ہو رہا تھا۔ وہ خود کشمیریوں کے گھروں میں گھس جاتا۔ عورتوں کی بے حرمتی کرتا اور جو نوجوان کشمیری سامنے آتا اس کو پستول کے فائر سے شہید کر دیتا۔ کیپٹن چوپڑہ نے مسلم کش بریگیڈیئر رام اوتار کو بھی ظلم و ستم میں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب یہ اطلاعات ہمیں ملیں تو میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"چاہے کچھ ہو جائے میں اس درندے کیپٹن چوپڑہ کو نہیں چھوڑوں گا۔"

کمانڈو شیروان خود انتہائی غیض و غضب کے عالم میں تھا۔ اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی اپنی سٹین گن اتاری اور غار سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

میں نے بھی اپنی سٹین گن اٹھالی تھی۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ہم دونوں کمانڈو وردیوں میں تھے۔ ہم نے ایک کوٹھڑی میں گھس کر کشمیری مزدوروں والا لباس پہنا۔ سٹین گنیں اپنی لمبی عباؤں کے اندر چھپالیں۔ اور خفیہ پہاڑی راستوں میں چل پڑے۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"اس وقت کیپٹن چوپڑہ تمہارے خیال میں کہاں ہو گا؟"

شیروان نے کہا۔

"وہ جہاں بھی ہو گا آج ہم اسے موت کے گھاٹ اتار کر ہی آئیں گے۔"

پہاڑی علاقے سے نکلنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی بستی کی طرف کھیتوں میں چلنے لگے۔ کمانڈو شیروان کو معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بستی کے باہر کھیت میں ایک کشمیری کسان کام کرتا نظر آیا۔ شیروان اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے پہلو میں موجود تھا۔ کشمیری کسان نے کمانڈو شیروان کو پہچان لیا تھا۔ شیروان نے کشمیری زبان میں اس سے کچھ باتیں کیں اور مجھے لے کر بستی سے ہٹ کر ایک طرف چل پڑا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

وہ بولا۔

"اس وقت کیپٹن چوپڑہ شہر کے ایک محلے میں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں لے رہا ہے۔"

کمانڈو شیروان سری نگر شہر کا رہنے والا تھا۔ اسے شہر کی ایک ایک گلی' ایک ایک مکان کا علم تھا۔ ایک جگہ سے ہم نے دریا کا پل عبور کیا۔ اوپر دائیں جانب کچھ فاصلے پر ہمیں فوجی جیپ اور تین فوجی کھڑے نظر آئے۔ شیروان رک گیا۔

"یہاں مولوی اسلام الدین کا گھر ہے۔ مولوی صاحب کشمیری مجاہدین کے زبردست حامی ہیں کیپٹن چوپڑہ ضرور ان کے گھر میں تلاشی لے رہا ہو گا۔ وہ مولوی صاحب کو اور اس اہل خانہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم کشمیری مزدوروں کے بھیس میں تھے۔ ایسے مزدور سری نگر شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ محنت مشقت کرتے نظر آجاتے تھے۔ شیروان اوپر سے ہو کر ایک گلی میں گھس گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ ہم ایک مکان کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ شیروان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بزرگ کشمیری نے دروازہ کھول کر شیروان کو دیکھا تو فوراً پہچان گیا اور ہم دونوں کو

اندر لے گیا۔

شیروان اس بزرگ سے بھی کشمیری زبان میں گفتگو کرنے لگا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد ہم سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی دوسری منزل کی عقبی گیلری میں آگئے۔ یہاں سے دوسرے اور پھر تیسرے مکان کی گیلری میں اتر گئے۔ نیچے برساتی نالہ بہہ رہا تھا۔ ہم لکڑی کے پل پر ایک طرف سے اتر گئے اور نالہ پار کر کے ایک اور تنگ گلی میں پہنچ گئے۔ اسی گلی میں ہیں کچھ بھارتی فوجی ایک مکان کے باہر کھڑے نظر آئے شیروان نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"یہ مولوی اسلام الدین کا مکان ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اسی جگہ کرنا ہے۔ کیا تم مرنے کے لئے تیار ہو؟ کیونکہ مجھے نہیں یقین کہ ہم کشمیریوں کے دشمن بھیڑیئے کیپٹن چوپڑہ کو ہلاک کرنے کے بعد یہاں سے زندہ بچ کر نکل سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"شیروان! شہادت کی موت تو اللہ کسی کسی کو نصیب کرتا ہے۔ ایسی بات پھر نہ کہنا"

ہم نے کوئی سکیم نہیں بنائی تھی۔ کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ کوئی کمانڈو آپریشن تیار نہیں کیا تھا۔ کشمیری مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کے خلاف سینہ تان کر جنگ کرنے کا ایک جذبہ تھا جو ہم دونوں کو خفیہ کیمپ گاہ سے اٹھا کر یہاں کھلے میدان میں لے آیا تھا۔ ہم دشمن کے آمنے سامنے آ گئے تھے۔ کوئی دوسرا کمانڈو اگر اس وقت ہمیں دیکھتا تو یہی کہتا کہ ہم بے عقل لوگ ہیں۔ ہم یقیناً مارے جائیں گے۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ ہر جگہ عقل استعمال نہیں کی جاتی۔ کفار کے خلاف جہاد کرتے وقت عقل نہیں جذبہ کام آتا ہے۔ عقل تو حیران رہ جاتی ہے۔

کمانڈو شیروان نے وہی کیا جو میں چاہتا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے گھر کے سامنے آگیا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ساتھ والے مکان کے باہر تھڑے پر ایک بوڑھا کشمیری بیٹھا تھا۔ شیروان نے اس سے کوئی بات کی تو بوڑھا کشمیری جواب دینے کی بجائے گھر کے اندر چلا گیا۔ وہاں تین بھارتی فوجی رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ مکان کے اندر سے عورتوں اور مردوں کے اونچی اونچی بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اچانک عورتوں کی چیخوں کی

آوازیں بلند ہوئیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ عورتیں محمد بن قاسم کو آواز دے رہی ہیں کہ اے اسلام کے زندہ جاوید مجاہد! کفار تمہاری مسلمان ماں بہنوں کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ کیا تو ہماری مدد کو نہیں پہنچے گا؟ میں نے بڑے دھماکے کئے تھے۔ یہ سارے دھماکے باہر ہوئے تھے۔ میرے اندر کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کشمیری عورتوں کی چیخیں سن کر میرے اندر ایک دھماکہ ہوا۔ ایسا ہی دھماکہ کمانڈو شیروان کے اندر بھی ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عین اس وقت مکان کے آگے جو تین بھارتی فوجی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے مجھے دھکا دے کر کہا۔

"تم ادھر کیوں کھڑا ہے۔"

میں نے اپنے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر سٹین گن نکالی۔ اور برسٹ مار کر بھارتی فوجی کو گرا دیا۔ اس دوران کمانڈو شیروان کی سٹین گن کا برسٹ شعلے اگلتا دوسرے دو بھارتی فوجیوں کے جسموں کو چھلنی کر گیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی آناً فاناً ہو گیا کہ تینوں میں سے کسی ایک انڈین فوجی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔

فائرنگ کی آواز پر اندر سے دو فوجی دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ ہم ایک طرف اوٹ میں ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ مکان کے باہر آئے ہم نے فائرنگ شروع کر دی۔ دونوں فوجی دوہرے ہو کر گر پڑے۔ ہم فائرنگ کرتے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ ہم نے اندر جاتے ہی اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ اندر مکان کے صحن میں ایک فوجی اور ایک کیپٹن ششدر سے ہو کر کھڑے تھے۔ فوجی سپاہی نے ایک عورت کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور کیپٹن پستول ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

یہ مکالمے بولنے، کسی سے کچھ پوچھنے، کسی کو للکارنے، کسی کو موت کی دھمکی دینے کا وقت نہیں تھا۔ ہم فائرنگ کرتے، گولیوں کے برسٹ بارش کی طرح برساتے صحن میں آ گئے۔ صحن میں آتے ہی میں نے چھلانگ لگا کر بھارتی کیپٹن کو جو یقیناً کیپٹن چوپڑہ ہی ہو سکتا تھا، نیچے گرا لیا۔ اس کے پستول سے دو گولیاں فائر ہوئیں۔ اس اثنا میں شیروان کی سٹین گن کا برسٹ اس بھارتی فوجی کے سینے میں سے گزر گیا تھا جس نے کشمیری خاتون کو

بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ خون میں لت پت نیچے گرا پڑا تھا۔ کیپٹن چوپڑہ کے پستول نے میرے ساتھ فرش پر گرتے ہوئے پستول کے جو دو فائر کئے تھے۔ ان میں سے ایک فائر کی گولی میرے بازو کے قریب سے اور دوسری ذرا اوپر سے ہو کر نکل گئی تھی۔ یہ دونوں فائر کیپٹن چوپڑہ کی زندگی کے آخری فائر تھے۔ اس کے بعد اس کی گردن کی ہنسلی ٹوٹ چکی تھی اور وہ بے جان ہو کر صحن میں پڑا تھا۔ عورتیں خوف زدہ بھی تھیں اور آزادی کشمیر کے پرجوش نعرے بھی لگا رہی تھیں۔

کمانڈو شیروان نے مجھ سے کہا۔

"گلی میں جاؤ۔ باہر جیپ کے پاس جو بھارتی فوجی کھڑے تھے وہ ضرور اندر آئیں گے۔"

میں دوڑ کر گلی میں آ گیا۔ سامنے گلی میں مجھے دونوں فوجی بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ میں نے سٹین گن اپنے لمبے کرتے کے اندر چھپا لی تھی اور میرا ہاتھ اپنے کرتے کے گریبان میں سے سٹین گن پر تھا۔ جیسے ہی بھارتی فوجی قریب آئے۔ میں نے سٹین گن باہر نکالی اور ان پر برسٹ فائر کرنے شروع کر دیئے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ انہیں رائفلیں فائر کرنے کی موت نے مہلت نہ دی۔ گھروں سے کشمیری نوجوان باہر نکل آئے۔ کمانڈو شیروان بھی وہاں آ گیا۔ سب نے مل کر بھارتی فوجیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ ان میں کیپٹن چوپڑہ کی لاش بھی تھی۔ کشمیری نوجوان انتہائی جوش کے عالم میں تھے اور اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد، آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ کمانڈو شیروان نے کشمیری زبان میں انہیں کچھ سمجھایا اور ایک کشمیری نوجوان گھر میں سے پٹرول کا ڈبہ لے آیا۔ انہوں نے مرے ہوئے بھارتی فوجیوں کا اسلحہ اور میگزین اپنے قبضے میں کر لیا اور لاشوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ شیروان نے کہا۔

"یہاں سے نکلو چلو۔"

ہم نے سٹین گنیں دوبارہ اپنے لمبے کرتوں کے اندر چھپا لیں اور تیز تیز قدم چلتے گلی

سے باہر آگئے۔ ہم نے کئی آدمیوں اور نوجوان کشمیریوں کو گلی کی طرف جاتے دیکھا۔ گلی کے باہر فوجی جیپ اسی طرح کھڑی تھی۔ شیروان چھلانگ لگا کر جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر آگیا۔ اس نے جیپ سٹارٹ کی۔ اسے تیزی سے گھما کر واپس موڑا اور جیپ بستی کے مکانوں کے ساتھ ساتھ جاتی سڑک پر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستے میں کچھ لوگوں نے ہمیں حیرانی کی نظروں سے دیکھا کہ دو کشمیری مزدور فوجی جیپ چلا رہے ہیں اور وہ بھی اتنی تیز۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"ہمیں یہ جیپ چھوڑ دینی چاہئے؟"

اس نے کہا۔

"ابھی نہیں"

جیپ سری نگر شہر سے جب کافی باہر نکل آئی اور کھیت شروع ہو گئے تو شیروان نے اسے ایک میدان میں ڈال دیا۔ جیپ اچھلتی رہی اور میدان سے نکل گئی۔ آگے ایک کچی سڑک آگئی جس کی دونوں جانب چناروں کے اونچے اونچے درخت تھے۔ کافی دور تک جیپ کچے راستے پر دوڑتی اور گرد اڑاتی بھاگتی گئی۔ ہمارے آس پاس کوئی آبادی کوئی بستی نہیں تھی۔ شیروان نے رفتار آہستہ کر دی اور اسے گھما کر ایک جگہ نشیب میں اتار دیا۔ اس نے جیپ کی پٹرول کی ٹنکی کا ڈھکن کھول کر اپنا رومال اس کے اندر ڈال کر پٹرول سے تر کیا اور اس کا فیتہ بنا کر اس کے سرے کو آگ لگا دی اور بولا۔

"بھاگو"

ہم دوڑ کر گڑھے سے باہر نکل آئے۔ اس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوا اور جیپ آگ کے شعلوں میں دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔

"ہم اس طرف جائیں گے"

شیروان ایک طرف تیز تیز چلنے لگا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم سیبوں کے ایک باغ میں سے گزرے جن کے درختوں پر پھول آرہے تھے۔ اس کے آگے زعفران کے کھیت آگئے۔ ہم ان میں سے بھی گزر گئے۔ ہم کشمیری کسان مزدوروں والے بھیس

میں تھے۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ کچھ دیر میدانوں کھیتوں اور اونچی نیچی گھاٹیوں میں چلتے رہنے کے بعد نیم پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"ان لوگوں نے بھارتی فوجیوں کی لاشوں کو آگ لگا دی تھی۔ انہیں چاہئے تھا کہ لاشوں کو گڑھے کھود کر دبا دیتے۔"

شیروان بولا۔

"دور سے آگ دیکھ کر ادھر سے گزرتے ہوئے بھارتی فوجی یہی سمجھیں گے کہ کشمیریوں کے مکان جل رہے ہیں۔ یہاں اس طرح آگیں لگتی ہی رہتی ہیں"

"میرا خیال ہے ہم اپنے نئے ہائیڈ آؤٹ سے کافی دور آگئے ہوئے ہیں"

"میں جان بوجھ کر لمبے راستے سے آیا ہوں۔"

کمانڈو شیروان نے سامنے والے ٹیلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم اس ٹیلے کے پہلو سے نکل کر جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہمیں کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ہم رک گئے۔ آواز جھاڑیوں کے پیچھے سے آرہی تھی۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"یہ عورت کیوں رو رہی ہے؟"

"ابھی معلوم کرتے ہیں"

ہم جدھر سے رونے کی آواز آرہی تھی اس طرف جھاڑیاں ہٹا کر چلے۔ جھاڑیوں کی دوسری جانب ہم نے ایک آٹھ دس سال کے لڑکے کو ایک جگہ زمین پر بیٹھے روتے دیکھا۔ وہ سسکیاں بھر کر رو رہا تھا۔ ہم اسے عورت سمجھے تھے۔ شیروان اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اس نے کشمیری زبان میں اس سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ لڑکے نے اپنے سامنے دو کشمیری کسانوں کو دیکھا تو روتے ہوئے ایک طرف اشارہ کر کے کشمیری زبان میں کچھ کہنے لگا۔ شیروان اس کو سوال کرتا اور وہ روتے ہوئے اسی جانب اشارہ کرتا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"کیا بات ہے کمانڈر؟ یہ لڑکا رو کیوں رہا ہے؟"

کمانڈو شیروان اٹھ کر مجھ سے بولا۔

"لگتا ہے قدرت آج ہم سے بہت کام لینا چاہتی ہے۔"

اس نے کشمیری لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کشمیری زبان میں کچھ کہا۔ لڑکے نے رونا بند کر دیا اور جس طرف سے ہم آ رہے تھے اس طرف دوڑ کر جھاڑیوں میں ہماری نظروں سے اوجھل گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"بات کیا ہے دوست؟"

اس نے اپنے کرتے کے اندر سے سٹین گن نکال لی اور اس کے میگزین کو چیک کرتے ہوئے بولا۔

"تم گن کو چیک کرو۔ میری گن میں تو شاید ایک ہی راؤنڈ رہ گیا ہے۔"

میں نے اپنی گن کا میگزین چیک کیا۔ میرا میگزین چیمبر خالی ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔

"میری گن تو خالی ہے"

کمانڈو شیروان بولا۔

"میری گن میں ایک راؤنڈ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ہمیں ان درختوں کی طرف جانا ہے"

معلوم ہوا کہ آگے ناشپاتیوں کا ایک باغ تھا۔ یہ لڑکا اپنی جوان بہن کے ساتھ باغ میں سے گزر رہا تھا کہ دو بھارتی فوجی وہاں کسی طرف سے نکل آئے۔ انہوں نے لڑکے کو مار پیٹ کر بھگا دیا اور خود اس کی بہن کو اٹھا کر لے گئے۔ میں نے کہا۔

"وہ لڑکی کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"باغ کے آس پاس ہی کہیں ہوں گے ہمیں جلدی کرنی چاہیے"

ہم نے دوڑنا شروع کر دیا۔ ناشپاتیوں کا باغ آ گیا باغ کی دوسری طرف آئے تو کچھ فاصلے پر ایک کوٹھڑی دکھائی دی۔ یہ لکڑی کی کوٹھڑی تھی جس کی ڈھلواں چھت پر گھاس پھوس ڈال دیا گیا تھا۔ شیروان نے کوٹھڑی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھارتی درندے لڑکی کو ضرور اس کوٹھڑی میں لے گئے ہوں گے۔ میں اس طرف

سے جاتا ہوں۔ تم دوسری طرف سے آؤ۔"

میں دوڑ کر کوٹھڑی کے عقب میں آ گیا۔ یہاں کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ اچانک کوٹھڑی میں سے لڑکی کے چیخنے اور کشمیری زبان میں فریاد کرنے کی آواز آئی۔ وہ بار بار اللہ خدایا کہہ رہی تھی۔ میں گھوم کر کوٹھڑی کے دروازے کی طرف آیا تو میں نے کمانڈو شیروان کو دیکھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ کوٹھڑی کے بند دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں وہیں رک گیا۔ میرے ہاتھوں میں سٹین گن ضرور تھی مگر وہ خالی تھی۔ اندر سے لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو کسی کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اتنے میں ایک مرد نے ڈوگری زبان میں لڑکی کو گالی دی۔

یہ کوئی ڈوگرہ سپاہی تھا۔ کمانڈو شیروان نے زور سے بند دروازے کو لات ماری اور فوجیوں کے لہجے میں ڈوگری زبان میں کہا۔

"دروازہ کھولو جانگلی! نہیں تو ہم گرنیڈ مارے گا"

"کون ہو تم؟"

اندر سے دوسرے ڈوگرہ سپاہی نے چلا کر پوچھا۔ شیروان نے اسی کرخت لہجے میں چلا کر کہا۔

"ہم تمہارا آفیسر کمانڈنگ بول رہا ہے جانگلی تم اپنے اوسی کو بھی نہیں پہچانتا۔ دروازہ کھولو نہیں تو ہم گرنیڈ چلا دے گا"

جلدی سے کسی نے کنڈی اتاری اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک ڈوگرہ فوجی سپاہی کھڑا تھا۔ شیروان نے چیتے کی طرح لپک کر اس کو گردن سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ میں تو آگے بالکل تیار تھا۔ ڈوگرہ سپاہی مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو میں لے کر زور سے اوپر کی طرف جھٹکا دیا۔ وہ بے جان ہو کر نیچے گرا۔ اس دوران کمانڈو شیروان نے کوٹھڑی میں گھس کر دوسرے بھارتی ڈوگرہ سپاہی کے بدن میں سٹین گن کا

برسٹ فائر کر کے میگزین کی آخری چھ سات گولیاں پار کر دی تھیں۔ ہم نے اس روشنی میں ایک کشمیری لڑکی کو دیکھا جو کونے میں دبکی خوف کے مارے کانپتے ہوئے رو رہی تھی۔ شیروان نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کشمیری زبان میں کچھ کہا۔ لڑکی نے رونا بند کر دیا۔ ہم نے دوسرے ڈوگرے کی لاش کو بھی گھسیٹ کر کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ ان دونوں کی رائفلیں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ شیروان مجھ سے کہنے لگا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں اس لڑکی کو اس کے بھائی کے حوالے کر کے آتا ہوں"

لڑکی حیران ہو کر ہم دونوں کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ کمانڈو شیروان لڑکی کو ساتھ لے کر ناشپاتی کے باغ کی طرف چل دیا۔ میں نے دونوں ڈوگرہ فوجیوں کے چہروں کو جھک کر دیکھا۔ دونوں مر چکے تھے۔ جس سپاہی کی گردن کا منکا میں نے جھٹکے سے توڑ دیا تھا اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جس پر شیروان نے سٹین گن کا برسٹ مارا تھا۔ اس کی چھاتی ایک طرف سے کھل گئی تھی اور خون ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کمانڈو شیروان واپس آگیا۔ کہنے لگا۔

"لڑکا اپنی بہن کو لے کر گاؤں کی طرف چلا گیا ہے۔ ہمیں بھی اپنے ہائیڈ آؤٹ پہنچنا چاہئے۔"

ہم نے ڈوگرہ فوجیوں کی لاشوں کو وہیں رہنے دیا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی شام کو وہ آدمی بھی آگیا جس کو کمانڈو شیروان نے نہرانٹیرو گیشن سنٹر کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے جو تفصیلات بتائیں ان کے مطابق یہ انٹیرو گیشن سنٹر جموں شہر میں ایک نہر کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کی چار دیواری پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ دیوار کے اوپر لوہے کی خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ رات کے وقت دیوار کے اوپر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگی ہوئی بجلی کی بتیاں جلتی تھیں۔ اس کا ایک ہی بڑا گیٹ تھا جو دن کے وقت کھلتا تھا۔ رات کو بند رہتا تھا۔ شہر کے جس علاقے میں یہ سنٹر قائم تھا وہ جموں کے ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ چونکہ اس انٹیرو گیشن سنٹر میں صرف مسلمان کشمیری مجاہدین کو پوچھ گچھ اور تشدد کے

لئے پکڑ کر لایا جاتا تھا اس لئے حکومت اس علاقے کو اپنے لئے محفوظ سمجھتی تھی۔ کیونکہ اگر انٹیرو گیشن سنٹر سے کوئی مسلمان کشمیری مجاہد فرار بھی ہو جائے تو اسے اردگرد کے ہندو پکڑ کر پولیس یا فوج کے حوالے کر دیں گے۔ کیونکہ جموں کے ہندو کشمیری مسلمانوں کے دشمن تھے اور کوئی ہندو کسی مسلمان مجاہد کو اپنے ہاں پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ اپنے آدمی نے بتایا۔

"اس انٹیرو گیشن سنٹر میں اس وقت گیارہ کشمیری مسلمان اذیتیں برداشت کر رہے ہیں ان میں دلی سے پکڑ کر لایا گیا گل خان نام کا آدمی بھی ہے جس کو وہاں کے لوگ پاکستان کا جاسوس سمجھتے ہیں۔"

میرے لئے یہ معلومات بہت کافی تھیں۔ اپنا سراغ رساں مجاہد جب چلا گیا تو میں نے شیروان سے پوچھا۔

"جموں شہر میں مجھے کوئی ایسا خفیہ ٹھکانہ چاہئے جس کو میں وہاں اپنا ہائیڈ آؤٹ بناؤں۔ کسی طریقے سے خود انٹیرو گیشن سنٹر کے آس پاس گھوم پھر کر اس کا جائزہ لوں اور کوئی منصوبہ بنا سکوں۔ کیا ہمارا وہاں کوئی ایسا آدمی ہے جس پر ہم اعتماد کر سکیں اور جو مجھے اپنے ہاں ٹھہرا بھی سکے؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"جموں توی کا یوں تو ہر مسلمان ہمارا اپنا آدمی ہے۔ وہ ہماری تحریک آزادی کشمیر کا زبردست حامی ہے اور ہماری خاطر ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے۔ لیکن جس طرح کا تمہیں آدمی چاہئے اس کے بارے میں مجھے غور کرنے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ اپنے آدمی وہاں موجود ہیں جو ہماری تحریک آزادی کے لئے کام کر رہے ہیں لیکن مجھے ان میں سے کسی ایک آدمی کا انتخاب کرنا ہے۔ میں تمہیں کل بتاؤں گا"

رات کو ہم عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد نئے ہائیڈ آؤٹ کے چھوٹے سے غار میں موم بتی روشن کر کے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اپنے ایک مجاہد نے آکر بتایا کہ ملٹری پولیس ہل والے جیا لعل اور اس کی بیوی پدماوتی کو بریگیڈیئر رام اوتار کے قتل کے سلسلے میں

گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ کمانڈو شیروان نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"پدماوتی بڑی چالاک عورت ہے۔ وہ مردوں کے جذبات سے کھیلنا جانتی ہے وہ بچ جائے گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ تفتیش کرنے والے فوجی افسر کو بھی اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لے"

اس مجاہد نے یہ بھی بتایا کہ رام بن والی بستی پر سکون ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے کیپٹن چوپڑہ سمیت سات بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر دیا تھا اور محلے کے مسلمانوں نے ان کی لاشوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ مجاہد کہنے لگا۔

"فوج کیپٹن چوپڑہ اور اس کے ساتھی فوجیوں کو شہر میں اور شہر سے باہر تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ مگر ابھی تک وہ سری نگر کے کسی بھی علاقے پر نشان نہیں لگا سکے کہ کیپٹن چوپڑہ اپنی پارٹی کے ساتھ اس علاقے میں گیا تھا۔"

اب میرا ٹارگٹ جموں شہر کا بدنام ترین انٹیروگیشن سنٹر تھا جہاں گل خان دوسرے کشمیری مجاہدین کے ساتھ بھارتی درندوں کے جبر و تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ مجھے جموں شہر میں اپنے کسی بااعتماد ساتھی کی ضرورت تھی جہاں سے میں ٹیک آف کر کے نہرانٹیروگیشن سنٹر پر اٹیک کر سکوں۔ شیروان نے کسی ایسے بااعتماد ساتھی کی نشان دہی کے لئے مجھے صبح بتانے کا کہا تھا جو اس آپریشن میں میری مدد کر سکتا تھا۔ اگلے دن صبح کی نماز کے بعد کمانڈو شیروان نے مجھے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

ہم غار میں جا کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگا۔

"میں نے ایک آدمی کا سوچا ہے جو جموں میں تمہاری مدد کر سکے گا۔ ہمارے سارے ساتھی بااعتماد ہیں لیکن اس خاص آدمی کے وسائل زیادہ ہیں۔ میں نے رات اسے خفیہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا ہے اور وہ مجھے جموں میں کہاں ملے گا؟"

کمانڈو شیروان نے مجھے اس آدمی کا نام اور ایڈریس بتایا۔ میں اس مجاہد کا نام اور ایڈریس آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ مجاہدین کی جدوجہد جاری ہے۔ میں اس کا ایک فرضی نام رکھ لیتا ہوں۔ جس طرح میں نے گل خان اور پروفیسر جمشید کے فرضی نام رکھے ہوئے ہیں۔ میں اس آدمی کا نام غلام رسول رکھ لیتا ہوں۔ غلام رسول جموں میں کیا کام کرتا تھا؟ میں یہ بھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ بس آپ یوں سمجھ لیں کہ اس کی فرنیچر کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میں اس دکان کا محل وقوع بھی غلط لکھوں گا۔

کمانڈو شیروان نے مجھ سے کہا۔

"تم سادھوؤں والے حلیے میں وہاں نہیں جاؤ گے"

میں نے کہا۔

"اگر میں اپنے اصلی حلیے میں گیا تو امرتسر جیل سے بھاگے ہوئے پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے پکڑ لیا جاؤں گا۔"

شیروان نے کہا۔

"تمہاری اپنی ڈاڑھی مونچھیں تھوڑی تھوڑی بڑھی ہوئی ہیں۔ تم انہیں ایسے ہی رکھو گے۔ کشمیری مزدوروں والے بھیس میں تم اس لئے نہیں جاؤ گے کہ تم کشمیری زبان میں بات چیت نہیں کر سکتے۔ فوراً پکڑ لئے جاؤ گے۔ کیونکہ جموں میں بھارت کی کئی خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں اور انٹیلی جینس کے آدمی سفید کپڑوں میں جگہ جگہ موجود ہیں"

"تو پھر کیا میں عورت بن کر جاؤں گا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے شیروان سے سوال کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عام پتلون قمیض میں جاؤ۔ تمہیں وہاں بازاروں میں آوارہ گردی کرنی نہیں۔ سیدھا اپنے مجاہد کے پاس پہنچنا ہے اور اس کے بعد وہ تمہیں چھپا لے گا۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے تم وہ رنگدار ٹکڑیوں والی ٹوپی پہن لینا جو جموں کے لوگ پہنتے ہیں۔ یہ ٹوپی جموں کے ڈوگرے بھی پہنتے ہیں۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ میرا پروگرام رات کے وقت سری نگر سے جموں کی طرف روانہ ہونے کا طے ہوا۔ میرا لباس یہ تھا۔ معمولی سی گیبرڈین کی پرانی پتلون۔ پرانے بوٹ۔ نائیلون کی میل خورے رنگ کی جیکٹ اور سر پر ڈوگروں والی ٹوپی۔ جسے میں نے اچھی طرح سے کانوں تک کھینچ کر سر پر جما لیا تھا۔ میں نے آئینہ دیکھا تو مجھے اپنی شکل بالکل احمقوں والی لگی۔ مجھے ایسی ہی شکل کی ضرورت تھی۔ کچھ روپے میرے پاس موجود تھے۔ دھماکہ خیز محلول والی شیشی میں نے کاغذ میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کی کہیں بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ شیشی آدھی سے زیادہ ختم ہو چکی تھی لیکن اس میں ابھی اتنا محلول باقی تھا جو بھارتی فوج کی پوری پلاٹون کو دھماکے سے اڑا سکتا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر راستے میں چیکنگ ہوئی اور مجھ سے شیشی کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس میں کیا ہے تو میں کہہ دوں گا کہ میرے سر میں سِکری ہے یہ سِکری کی دوائی ہے جو میں رات کو سونے سے پہلے سر پر لگا لیتا ہوں۔

کمانڈو شیروان نے مجھے جموں والے اپنے مجاہد جس کا فرضی نام میں نے غلام رسول رکھا ہے اس کا پتہ ایک بار پھر سمجھایا اور کہنے لگا۔

"تم کل دن کے وقت جموں پہنچو گے۔ لاری سے اترتے ہی غلام رسول کی دکان کی طرف چل پڑنا۔ لاری اڈے پر زیادہ دیر بالکل نہ ٹھہرنا۔ وہاں سی آئی ڈی کے آدمی چل پھر رہے ہوتے ہیں اور وہ سری نگر جانے والی اور سری نگر سے آنے والی سواریوں کا پورا جائزہ لیتے ہیں۔ ذرا شک پڑ جائے تو اس کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لاری سے اترتے ہی رکشا لے کر چل پڑو۔"

شروع رات کے اندھیرے میں کمانڈو شیروان نے اپنا ایک مجاہد میرے ساتھ کر دیا اور ہم پہاڑی راستوں پر چل پڑے۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد سری نگر سے جموں جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ مجاہد نے کہا۔

"یہاں سے آپ جموں جانے والی لاری میں سوار ہو جائیں گے۔ لاریاں سری نگر سے آتی ہیں۔ ہاتھ دینے سے کوئی نہ کوئی لاری ضرور ٹھہر جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو دوست! بے شک واپس چلے جاؤ۔"

وہ بولا۔

"میں ان درختوں کے پیچھے بیٹھنے لگا ہوں جب تم لاری میں سوار ہو جاؤ گے تو واپس چلا جاؤں گا۔ خدا حافظ!"

اور وہ سڑک سے اتر کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سڑک پر کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے ایک سفری تھیلا اٹھا رکھا تھا جس میں یونہی اپنے فالتو پرانے کپڑے ڈال رکھے تھے۔ ایک لاری کی ہیڈ لائیٹس نظر آئیں۔ میں نے ہاتھ دیا۔ لاری رکے بغیر نکل گئی۔ اس طرح دوسری لاری بھی نکل گئی۔ کوئی پون گھنٹے بعد ایک لاری کی روشنیاں قریب آئیں تو میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ لاری ذرا آگے جا کر سڑک کی ایک جانب رک گئی۔ میں بھاگ کر اس میں سوار ہو گیا۔ لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر جموں کا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"جموں شہر"

اس نے پیسے لے کر مجھے ٹکٹ کاٹ کر دے دیا۔ میں وہیں لاری کے فرش پر بیٹھ گیا کیونکہ ساری نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ میں سری نگر سے جموں تک اپنے سفر کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ جموں کے میدانوں میں جس وقت لاری پہنچی تو دوپہر ہو رہی تھی۔ شہر کے مکانوں اور مضافاتی بستیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں لاری اڈے پر اترنے کی بجائے راستے میں ہی سڑک پر اتر گیا۔ کچھ دور سڑک پر چلنے کے بعد مجھے ایک خالی موٹر رکشا مل گیا۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور شیروان نے مجاہد غلام رسول کا جو ایڈریس مجھے بتایا تھا ڈرائیور سے وہاں چلنے کو کہا۔ رکشا چل پڑا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد رکشا دریائے توی کے پل پر سے گزرنے کے بعد ایک بازار میں داخل ہو گیا۔ بازار میں آگے جا کر چھوٹا سا چوک آ گیا۔ رکشا والے نے

رکشا بجلی کے کھمبے کے پاس روک کر کہا کہ یہی وہ چوک ہے۔ میں اتر گیا۔ میں اس چوک کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔ اگرچہ یہ چوک حقیقت میں وہ نہیں تھا جہاں ہمارے حریت پرست مجاہد کی فرنیچر کی دکان تھی۔ وہ کوئی اور علاقہ تھا۔ اور بازار تھا۔ اور اس کی فرنیچر کی دکان بھی نہیں تھی۔ وہ کوئی اور ہی کام کرتا تھا۔

قصہ مختصر کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اپنے مجاہد غلام رسول کی دکان پر پہنچ گیا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع خفیہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پر کمانڈو شیروان نے پہلے سے دے دی ہوئی تھی اور اسے میرا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک کوڈ جملہ بھی بتا دیا تھا جو مجھے غلام رسول کے آگے بولنا تھا۔ غلام رسول ایک پختہ عمر کا آدمی تھا۔ اس کی مختصر سی دکان تھی۔ جس وقت میں دکان میں داخل ہوا تو وہ ایک مزدور سے کرسی پر پالش کروا رہا تھا۔ دکان میں سپرٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور مزدور سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب اسے سوکھنے کے لئے رہنے دو اور تم جاؤ۔"

مزدور ٹین کا ڈبہ اٹھا کر دکان سے باہر چلا گیا۔ جب وہاں صرف میں اور غلام رسول ہی رہ گئے تو غلام رسول نے پوچھا۔

"جی فرمائیے مہاشہ جی! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ ہمارے پاس زیادہ قیمتی فرنیچر تو نہیں ہے لیکن ہم اپنی نگرانی میں تیار کراتے ہیں اور یہ زیادہ دیر تک چلتا ہے۔"

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے کوڈ جملے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"جموں توی میں آج موسم خوشگوار رہے گا"

غلام رسول نے یہ سنتے ہی مجھے دکان کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ دکان کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی میں ایک صف بچھی ہوئی تھی۔ چھت کے پاس پچھلی دیوار میں ایک روشندان تھا جس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ غلام رسول اندر آیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔

"تم پہلے کبھی جموں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"دو ایک بار آیا ہوں مگر شہر کے گلی محلوں سے زیادہ واقفیت نہیں ہے"

اس نے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے کہا۔

"پھر تمہیں شام کا اندھیرا ہونے تک اسی جگہ بیٹھنا پڑے گا۔ کیا تم انتظار کر لو گے؟"

میں نے کہا۔

"غلام رسول صاحب میں ساری رات یہاں بیٹھ کر آپ کا انتظار کر سکتا ہوں"

غلام رسول کے چہرے کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا۔ کہنے لگا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہیں بھوک پیاس تو نہیں لگی؟"

میں نے کہا۔

"میں نے راستے میں کھا پی لیا تھا۔ کسی قسم کی کوئی حاجت نہیں ہے۔"

غلام رسول بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو"

وہ کوٹھڑی سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے کوٹھڑی بند کر دی اور چٹخنی لگا دی۔ میں لیلا کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر صف پر لیٹ گیا۔ عجیب بات ہے کہ مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ اس تت کھلی جب غلام رسول میرے کندھے کو ہلا کر مجھے جگا رہا تھا۔

"اٹھو بھائی۔ رات ہو گئی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ تم دکان سے پہلے نکل لر بائیں جانب جاؤ گے۔ بازار آگے جا کر دائیں جانب مڑ جاتا ہے۔ وہاں ایک کوڑے لرکٹ کا ڈپو ہے۔ تم اس کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر میرا انتظار کرو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے"

"تو پھر نکل جاؤ"

میں دکان سے نکل کر بازار میں آیا تو رات ہو چکی تھی۔ کئی دکانیں بند ہو چکی

تھیں۔ جو کھلی تھیں ان میں بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ میں بازار میں ایک طرف ہو کر چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بازار بائیں جانب گھوم گیا۔ وہاں کونے میں ایک فلتھ ڈپو کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دو تین منٹ کے بعد دکان بند کر کے غلام رسول بھی آگیا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گیا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"سات قدم کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے چلے آؤ"

میں نے ایسا ہی کیا۔ میری نظریں غلام رسول پر تھیں۔ یہ جموں شہر کا بڑا گنجان علاقہ تھا۔ تنگ بازار تھے۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں داخل ہو گیا۔ کئی گلیوں میں سے ہو کر ایک کھلی جگہ آگئی سامنے کچھ فاصلے پر سڑک پر بجلی کے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ غلام رسول ایک طرف اندھیرے میں کھڑا تھا۔ میں اس کے قریب آیا تو اس نے مجھے رکنے کو کہا۔

"وہ سامنے والی سڑک دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں"

میں نے جواب دیا۔

غلام رسول کہنے لگا۔

"میں یہیں پر کھڑا ہوں۔ تم سڑک کی دوسری طرف چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں آموں کا باغ ملے گا۔ اس باغ میں ایک پرانی بارہ دری کا کھنڈر ہے۔ اس کھنڈر میں میرا انتظار کرو۔ جاؤ"

ہم شاید شہر کی فصیل کے باہر آگئے تھے۔ آگے ڈھلان تھی۔ میں ڈھلان اتر کر سڑک پر آگیا۔ سڑک کو کراس کیا تو سامنے آموں کا ایک باغ تھا۔ بڑے گھنے درخت تھے۔ درختوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں درختوں میں بالکل سیدھ میں چلنے لگا۔ باغ جہاں ختم ہو جاتا تھا وہاں مجھے اک چبوترہ دکھائی دیا جس کے اوپر بارہ دری سی بنی ہوئی تھی۔ میں بارہ دری کی دوسری جانب گرے ہوئے پتھروں پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد غلام رسول

بھی آگیا وہ بھی میرے قریب بیٹھ گیا۔

کہنے لگا۔

"اس شہر میں ہمیں ایک ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑتا ہے۔ جموں میں بھارت کی ساری خفیہ ایجنسیوں کے آدمی موجود ہیں۔ مجھے شیروان نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اپنا جو آدمی یہاں سے نہرا نٹیرو گیشن سنٹر کی معلومات لے کر تمہارے پاس گیا تھا اسے میں نے ہی سب کچھ بتایا تھا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمارا ماسٹر سپائی گل خان اسی انٹیرو گیشن سنٹر میں ہے؟"

ہم اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ مگر ہمیں ایک دوسرے کے چہرے نظر آرہے تھے۔ وہ کہنے لگا۔

"ہماری کوئی معلومات غلط نہیں معلوماتی۔ ہم سانپ کے منہ کے اندر جا کر اس کے پیٹ کا سارا حال معلوم کر آتے ہیں۔ گل خان اسی انٹیرو گیشن سنٹر میں ہے۔ مگر اس کا وہاں سے فرار ہونا میرے حساب سے ایک ناممکن بات ہے بہرحال تم اپنی کوشش کر کے دیکھ لو۔"

میں نے نہرا نٹیرو گیشن سنٹر کے بارے میں مزید پوچھا تو غلام رسول نے کہا۔

"شہر کے جنوب کی جانب ہندو آبادی والے علاقے کے اندر ہی ایک نہر بہتی ہے۔ یہ نہر توی دریا سے نکالی گئی ہے اور شہر کے باغوں اور کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ اس نہر کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سات برج ہیں۔ پتھر کے یہ چھوٹے چھوٹے برج نہر کے پل کے اوپر بنائے گئے ہیں۔ یہ انٹیرو گیشن سنٹر پانچویں برج کی ایک جانب پتھروں کی بنی ہوئی اونچی چار دیواری کے اندر ہے۔ باہر سے یہ کسی پرائمری سکول کی پرانی عمارت لگتی ہے لیکن اس کے نیچے زمین کے اندر تہہ خانے ہیں۔ ان تہہ خانوں میں سارا دن دلدوز انسانی چیخیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ یہ چیخیں ان کشمیری حریت پرستوں کی ہوتی ہیں جن پر ان تہہ خانوں میں تشدد کیا جا رہا ہوتا ہے۔ مگر ان چیخوں کی آوازیں تہہ خانوں سے باہر نہیں

آتیں۔ ان کی پہاڑ ایسی بھاری بھرکم دیواروں سے ٹکرا کر رہ جاتی ہیں گل خان کو بھی انہی تہہ خانوں میں سے ایک تہہ خانے میں رکھا گیا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ میں ان تہہ خانوں میں جا سکوں؟"

غلام رسول خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس جگہ لے چلتا ہوں جہاں تم روپوشی کی حالت میں رہو گے۔ آؤ۔"

وہ اٹھ کر سامنے کی طرف چلا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے دور ایک ٹیلہ سا دکھائی دیا۔ ہم بنجر میدان میں سے گزر رہے تھے۔ میرے جوتوں کے نیچے کنکر اور روڑے کچلے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جھاڑیوں کی طرح قد آدم درخت تھے جن کی ٹہنیاں پھیلی ہوئی تھیں اور چلتے وقت ہمیں منہ کے آگے سے ہاتھوں سے ہٹانی پڑتی تھیں۔ غلام رسول ٹیلے کے پاس آکر اس کی دوسری طرف گھوم گیا۔ یہاں شروع رات کے اندھیرے میں کھلی جگہ نظر آئی جس کی ایک [illegible]۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور لکڑی کے کٹے ہوئے شہتیروں کا انبار لگا تھا۔ کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے یہاں اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا۔ سامنے ایک کمرہ یا کیبن یا کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر سے سرکنڈے نیچے لٹک رہے تھے۔

غلام رسول نے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کے دروازے کا تالا کھولا۔ مجھے باہر رکنے کا اشارہ کر کے اندر گیا۔ اندر روشنی ہو گئی۔ اس نے لالٹین جلا دی تھی۔

"اندر آجاؤ"

غلام رسول کی آواز پر میں بھی اندر چلا آیا۔

غلام رسول نے دروازہ بند کر دیا۔

کوٹھڑی میں لکڑی کا ایک بوسیدہ سا تخت پوش دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ لکڑی کا ایک سٹول اور لکڑی کی ایک کرسی بھی تھی جس پر میں بیٹھا تو اس کی چولیں چرچرائیں۔ غلام رسول تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ یہاں میں ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وضاحت تخت پوش کے لفظ کی ہے۔ اصل میں یہ لفظ صرف تخت ہے یعنی مجھے یہ لکھنا چاہیے تھا کہ دیوار کے ساتھ تخت لگا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر تخت پوش لکھا ہے۔ لغوی معنوں میں تخت پوش اس چادر کو کہتے ہیں جو تخت کے اوپر بچھی ہوئی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں الفاظ کے ذریعے ماحول کی نقشہ کشی کر رہا ہوں۔ الفاظ میرا ایک وسیلہ ہیں جن کی مدد سے میں آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ چیزیں لا کر دکھا رہا ہوں جن چیزوں نے وہاں کا ماحول بنایا ہوا تھا۔ جب میں تخت لکھوں گا تو لامحالہ آپ کا خیال بادشاہ کے تخت کی طرف چلا جائے گا اور آپ کی آنکھوں کے سامنے فوراً بادشاہ کا تخت آجائے گا۔ لیکن جب میں تخت پوش لکھوں گا تو آپ کے تصور میں چار پاؤں والا وہ تختہ آجائے گا جو ہمارے پنجاب میں گھروں کی ڈیوڑھیوں یا مکان کے باہر گلی میں بچھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے میں نے تخت پوش لکھا ہے اور آگے بھی تخت پوش ہی لکھوں گا تا کہ حقیقت نگاری میں کوئی فرق نہ آئے۔

غلام رسول کہنے لگا۔

"تم یہاں رہو گے۔ جتنے دن بھی رہنا ہو گا اس کوٹھڑی میں رہو گے۔ صرف کمانڈو

آپریشن کے لئے باہر نکلو گے۔ تم نے اگرچہ اپنا حلیہ بدلنے کی کوشش کی ہوئی ہے مگر میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ تم وہی کمانڈو ہو جو امرتسر کی جیل توڑ کر مفرور ہوا ہے۔ کیونکہ میں نے جموں کے اخباروں میں چھپی ہوئی تمہاری تصویر دیکھ لی تھی۔ تم بڑے خوش قسمت ہو کہ سری نگر سے جموں تک خیریت سے آگئے ہو اور تمہیں خفیہ ایجنسی کے کسی آدمی نے نہیں پکڑا۔"

میں نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ڈاڑھی رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے پھر میں آسانی سے نہیں پہچانا جاسکوں گا"

"اس لئے تو میں نے تمہیں کہا ہے کہ یہاں سے کم از کم دن کے وقت باہر مت نکلنا۔ تمہیں تمہاری ضرورت کی ہر شے یہاں پہنچ جائے گی۔ اب تم بیٹھو میں تمہارے لئے کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ دوسرا سامان لاتا ہوں۔ یہاں کوئی غسل خانہ وغیرہ نہیں ہے۔ لیکن چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا نالہ بہتا ہے۔ اس کا پانی پاک صاف ہے اور جموں والی نہر میں سے نکل کر آتا ہے۔ تم اندھیرے میں وہاں جاکر منہ ہاتھ دھو سکتے ہو اور اس کا پانی بھی پی سکتے ہو۔ اگر تمہیں سگریٹ پینے کی عادت ہے تو جتنے دن اس کوٹھڑی میں قیام کرو گے تمہیں سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگانا ہوگا۔ کیونکہ تمباکو کی بو چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے جاسوس کسان اور مزدوروں کے حلیے میں ان علاقوں سے اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ پہلے میں تمہیں پہاڑی نالہ دکھا لاؤں"

یہ نالہ کوٹھڑی والے ٹیلے سے بمشکل پچیس تیس قدموں کے فاصلے پر درختوں کے درمیان ذرا نشیب میں بہہ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں مجھے اس کا پانی ایک دھندلی چوڑی لکیر کی طرح نظر آیا۔ غلام رسول بولا۔

"یہاں آتے وقت بھی اور جاتے وقت بھی تمہیں بے حد ہوشیار اور چوکس رہنا ہو گا۔ تم یہی سمجھنا کہ سی آئی ڈی والا کوئی نہ کوئی آدمی تمہاری تلاش میں اردگرد موجود ہے۔ واپس آجاؤ اب۔"

وہ مجھے کوٹھڑی میں لے آیا۔ اس نے لالٹین کی بتی نیچی کر دی اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"میں باہر سے تالا لگا کر نہیں جاؤں گا۔ تالا کنجی سمیت میں نے تمہارے تخت پوش پر رکھ دیا ہے۔ اگر تمہیں پانی پینے کے لئے نالے پر جانا ہو تو کوٹھڑی کو تالا لگا کر جانا۔ بلکہ لالٹین بھی بجھا کر جانا۔ یہ لو ماچس۔ یہ اپنے پاس رکھو۔ اب میں جاتا ہوں۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔"

اس نے ماچس صدری کی جیب میں سے نکال کر مجھے دی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں دروازہ بند کر کے تخت پوش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ واقعی مجھے یہاں کافی مشکل مرحلوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ مگر میں گھبرانے والے دن پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جتنا مشکل کمانڈو آپریشن ہوتا تھا مجھے اتنی ہی لذت ملتی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میرا ہر کمانڈو آپریشن اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کی خوشنودی کے لئے ہوتا تھا۔ اور مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا اور میرا ایمان تب بھی تھا اور اب بھی ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میری موت اللہ نے نہیں لکھی تو دنیا کی بڑی سے بڑی توپ مجھ پر فائر کر دو۔ میرے اوپر دستی بموں کا پورا بکس پھینک دو میں نہیں مروں گا۔ لیکن اگر اللہ کے حکم سے میری موت کا وقت آن پہنچا ہے تو مجھے امریکہ کے بڑے سے بڑے ہسپتال میں لے جاؤ۔ وہاں دس دس ہزار روپے کا انجکشن لگا لو۔ مجھے ہر وقت آکسیجن دیتے رہو مگر میں زندہ نہیں بچوں گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کمانڈو ٹریننگ سے پہلے بھی میری طبیعت خطرات پسند ہوا کرتی تھی۔ اور جس ایڈونچر میں زیادہ رکاوٹیں ہوتی تھیں میں اس ایڈونچر میں بڑا خوش رہتا تھا۔

میری کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی جس کی چمکدار سوئیاں رات کے اندھیرے میں بھی وقت بتا دیتی تھیں۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ غلام رسول کو گئے آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ وہ کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ کوٹھڑی میں چھت کے پاس ایک چوکور سوراخ بنا ہوا تھا جو روشندان تھا۔ لالٹین میں جو مٹی کا تیل جل رہا تھا اس کی بو یا نظر نہ آنے والا

دھواں اس میں سے باہر چلا جاتا تھا جس کی وجہ سے بند کوٹھڑی میں بھی بیٹھے رہنے سے مجھے کوئی پریشانی نہ ہو رہی تھی۔

غلام رسول اپنے ساتھ میرے لئے کھانا۔ چائے سے بھرا ہوا تھرمس اور ایک سرہانہ ایک چادر لایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہی تخت پوش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ لالٹین لی بتی ہم نے اونچی نہیں کی تھی۔ کوٹھڑی میں بڑی نرم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم تھرمس سے چائے گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے۔ غلام رسول نے اپنا گلاس تخت پوش پر رکھ دیا اور ایک تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارے لئے ایک اور چیز بھی لایا ہوں۔"

اس نے تھیلے میں سے مجھے ایک ریوالور نکال کر دکھایا۔ کہنے لگا۔

"یہ ریوالور کشمیر میں ایک کمانڈو ایکشن کے دوران میں نے ایک بھارتی کرنل کو ٹھکانے لگانے کے بعد اپنے پاس رکھ لیا تھا"

ریوالور بہت اعلیٰ قسم کا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کتنے اعشاریہ کتنے نمبر کا تھا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ اس سائی لینسر کی وجہ سے فائر کرتے وقت ریوالور میں سے دھماکے کی آواز نہیں آتی۔ صرف کھٹک کی آواز آتی ہے۔ آپ نے ٹی وی پر انگریزی فلموں میں ہیرو کو اکثر اس قسم کے ریوالور فائر کرتے دیکھا ہو گا۔ یہ ریوالور اس وقت فائر کیا جاتا ہے جہاں پستول کے دھماکے سے دشمن کے خبردار ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

میں نے اس کے چیمبر کو کھول کر دیکھا۔ اس میں بارہ سوراخ تھے۔ یعنی اس میں بارہ گولیاں ڈال کر فائر کی جا سکتی تھیں۔ غلام رسول کہہ رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے تم اسے اپنے پاس رکھو۔"

ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ غلام رسول کہنے لگا۔

"کمانڈو شیروان نے مجھے بتایا ہے کہ تم بڑے اعلیٰ کوالٹی کے بہادر کمانڈو ہو اور تم نے دوارکا فورٹ کا فوجی گولہ بارود کا ذخیرہ بھی اڑایا تھا اور اس گاڑی کو بھی اڑا دیا تھا جو

کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانے والا اسلحہ اور گولہ بارود لے کر دیولالی سے جموں توی آرہی تھی۔ یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔"

میں نے کہا۔

"یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور کشمیر کی آزادی کی خاطر میں اپنے فرائض کو جان پر کھیل کر بھی ادا کرتا رہوں گا۔"

غلام رسول کہنے لگا۔

"اپنے ساتھی گل خان کو ٹارچر سنٹر سے نکالنے کی راہ میں تمہیں کافی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ جان چلے جانے سے کچھ نہیں ہو گا اگر اپنا ٹارگٹ نہ مارا گیا۔ مقصد یہ ہے کہ ٹارگٹ مار لیا جائے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اس ٹارچر سنٹر میں جس کا نام نہرانٹیروگیشن سنٹر ہے پولیس ہوتی ہے یا ملٹری پولیس یا صرف خفیہ ایجنسیوں کے آدمی ہی ہوتے ہیں؟"

غلام رسول بولا۔

"اس ٹارچر سنٹر میں جموں پولیس کے بدنام ترین قصائی افسر بھی ہیں اور بھارت کی پاکستان دشمن خفیہ ایجنسی را کے آدمی بھی ہیں۔ اس انٹیروگیشن سنٹر کا انچارج ایک ہندو کیپٹن بھٹناگر ہے جو پاکستان اور مسلمانوں کا جانی دشمن ہے۔ اس نے باہر کے ملکوں سے بھی اذیتیں دینے کے اوزار منگوا رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں سے کوئی زیر حراست مسلمان زندہ نہیں بچ کر گیا اس کی لاش بھی کبھی کسی نے باہر نکلتی نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا۔

"اس خونی بھیڑیئے کو ابھی تک آپ لوگوں نے ہلاک کیوں نہیں کیا؟"

غلام رسول نے کہا۔

"ہلاک کر دینے سے کیا ہو گا۔ ایک خونی بھیڑیا ہلاک ہو گا تو اس کی جگہ دوسرا خونی بھیڑیا آجائے گا۔ انڈیا کی ساری پولیس ساری فوج مسلمانوں کے دشمن خونی بھیڑیوں سے

بھری ہوئی ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ضرور ہو جاتا ہے کہ اس انٹیروگیشن سنٹر سے اپنے طور پر کوئی حریت پرست مجاہد فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جموں کے مسلمانوں کی کم بختی آجاتی ہے۔"

میں نے بات کا رخ اپنے کمانڈو مشن کی طرف موڑتے ہوئے غلام رسول سے پوچھا۔

"آپ مجھے اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے گل خان کو تو ہر صورت میں یہاں سے فرار کروانا ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں مجھے کس قسم کی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔"

وہ کچھ دیر تک میری بات پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہ میں تمہیں کل اچھی طرح غور کرنے اور اپنے محدود وسائل کا جائزہ لینے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ میں تمہارے واسطے صبح کا ناشتہ لے کر نہیں آسکتا رومال میں جو ایک روٹی بچی ہوئی ہے اور تھرمس میں جو چائے پڑی ہے اس سے صبح ناشتہ کر لینا۔ میں دوپہر کے وقت آؤں گا۔ تم میرے بعد میری ہدایات پر پوری طرح عمل کرنا۔ دن کی روشنی میں کوٹھڑی سے باہر نکلنا بھی پڑے تو درختوں میں یا جھاڑیوں میں تازہ ہوا لینے کے لئے چھپ کر بیٹھ جانا۔ مگر زیادہ دیر کے لئے نہ بیٹھنا۔ رات کے وقت کوٹھڑی کے اندر لالٹین کو بجھا کر سونا۔ میں کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا کر نہیں جا رہا۔ رات کے وقت تم اندر سے کنڈی لگا لیا کرنا۔ اول تو اس طرف کوئی نہیں آتا۔ دن کے وقت کبھی کبھی کوئی پہاڑیا لکڑیاں اٹھائے ادھر سے گزرتا ہے وہ بھی نالے کی دوسری طرف سے ہو کر جاتا ہے۔ قریب جو لوگ رہتے ہیں ان سب کو معلوم ہے کہ میں نے اپنی دکان کا کاٹھ کباڑ اور فالتو لکڑیاں رکھنے کے لئے یہ کوٹھڑی بنوا رکھی ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ کل دوپہر کے وقت آؤں گا۔"

غلام رسول کے جانے کے بعد میں نے پستول کو پتلون کی جیب میں چھپا کر رکھ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا ارادہ باہر تھوڑی دیر کے لئے کھلی فضا میں ٹہلنے کا تھا۔ میں نے

لالٹین بجھا دی۔ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس وقت آسمان پر مشرق کی طرف چاند جھکا ہوا تھا۔ بڑی رومانٹک ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ چاند اس وقت آسمان پر آگیا تھا جب ہم کوٹھڑی کے اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

میں نے دروازے کو بند کیا اور خشک جھاڑیوں میں سے گزر کر اس جگہ آگیا جہاں نیچے نشیب میں پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ چاندنی میں نالے کا پانی شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک طرف سے نیچے اترنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں پتھروں پر پاؤں رکھتا نیچے اتر گیا اور نالے کے پاس بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں دھندلی دھندلی چاندنی میں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رات کے گیارہ سوا گیارہ بجے ہوں گے۔ یہ علاقہ جموں شہر سے کافی باہر نکل کر تھا۔ اس لئے گہری خاموشی تھی۔ نالے میں کہیں کہیں پتھر بھی تھے جن سے پانی ٹکرا کر ہلکی ہلکی سرسراہٹ کی آواز پیدا کر رہا تھا۔ میں نے پانی میں جھک کر ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ نیم پہاڑی علاقوں کی نہروں کا پانی میدانی علاقے کی نہروں کے مقابلے میں بہت سرد ہوتا ہے۔ میں نے پانی پیا۔ واقعی پانی میٹھا تھا۔ اس وقت میرا سگریٹ پینے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ مگر غلام رسول نے بجا طور پر مجھے وہاں سگریٹ پینے سے منع کیا تھا۔ کیونکہ اس کھلی اور صاف فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی بو دور تک جا سکتی تھی۔ ہر قسم کی عادت کو ضبط کرنے بلکہ اس کو فتح کرنے کی مجھے عملی ٹریننگ دی گئی تھی۔ سگریٹ پینے کی خواہش پیدا ہوئی تو دوسرے لمحے میری قوت ارادی نے اسے بھگا دیا۔ میں ایک بار اپنی داستان پڑھنے والے پاکستانی نوجوانوں سے خاص طور پر کہوں گا کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کریں کہ ہر قسم کی بری عادت کو شکست دے سکیں۔ کوئی ایسی عادت نہیں ہے جس کو آدمی اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ترک نہ کر سکے۔ بری عادتیں ہم پر سوار نہیں ہوتیں بلکہ ہم نے اپنی کمزوری کی وجہ سے انہیں سر پر سوار کر رکھا ہوتا ہے۔ یاد رکھیں۔ اس وقت پاکستان چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہمیں اس وقت ایک مضبوط اور طاقتور قوم بننے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک ہم نے اسلام کے نام پر اتنی قربانیاں دے کر بنایا ہے کہ تاریخ انسانی میں اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

میں انہی سوچوں میں گم پہاڑی نالے کے پاس بیٹھا تھا کہ مجھے ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ میرے حواس ایک دم بیدار ہو گئے۔ یہ ہندوؤں کے مندروں سے آنے والی لوبان کی بو تھی۔ یہ بو میری دشمن چندریکا کی بدروح کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے دھندلی چاندنی میں گھور گھور کر چاروں طرف دیکھا۔ بو برابر آرہی تھی مگر چندریکا کی بدروح ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تشویش ہوئی کہ یہ بدروح میری دشمن ہو گئی ہے۔ ممکن ہے یہ جموں پولیس یا ملٹری انٹیلی جینس کے کسی ہندو افسر پر ظاہر ہو کر میرے بارے میں مخبری کر دے۔ لوبان کی بو آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ اب اس کی جگہ چنبیلی کی میٹھی خوشبو آنے لگی۔ میرا دل بھر آیا۔ یہ میری چھوٹی بہن کلثوم کی روح کی خوشبو تھی۔ بہت دیر کے بعد مجھے میری شہید بہن کی روح کی خوشبو آئی تھی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کلثوم! کیا تم ہو؟"

مجھے یقین تھا کہ میری چھوٹی بہن کی روح اس وقت میرے آس پاس موجود تھی۔ مگر روح نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر چنبیلی کی خوشبو بھی آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ چندریکا کی بد روح مجھے نقصان پہنچانے ضرور آئی تھی مگر وہ میری بہن کی روح کی نورانی طاقت کے آگے ٹھہر نہ سکی اور بھاگ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری شہید بہن کلثوم کی روح کو میرا خیال لگا ہوا ہے۔ وہ مجھ کو دیکھنے آگئی تھی۔ کاش! وہ مجھے اپنی صورت بھی دکھا دیتی۔

آہ! میری پیاری بہن! تجھے ایک سکھ نے کرپان مار کر شہید کر دیا۔ تیری لاش ہم کھیتوں میں ہی چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ میری شہید بہن! تجھے پاکستان میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا مگر تیرا خون دوسرے شہیدوں کے خون کی طرح پاکستان کی مقدس امانت ہے۔ ہم اپنے پاکستان کو اپنے شہیدوں کے خون کی امانت کو اپنا خون دے کر محفوظ رکھیں گے۔ میری شہید بہن! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اے پاکستان پر قربان ہو جانے والے شہیدو! یہ ساری قوم کا تم سے وعدہ ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ غم کے آنسو نہیں تھے۔ یہ کردار کی طاقت اور ارادے کی عظمت کے آنسو تھے۔ میں اٹھ کر واپس کوٹھڑی میں آکر لیٹ گیا۔ دروازہ میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ ریوالور جیب سے نکال کر میں نے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ لالٹین میں بجھا کر ہی گیا تھا۔ چھت کے ساتھ جو چھوٹا سا روشندان تھا اس میں سے چاند کی پھیکی روشنی دھندلے غبار کی طرح اندر آرہی تھی۔ اس غبار کو دیکھتے دیکھتے اور اپنے نئے کمانڈو مشن کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت غلام رسول آگیا۔ وہ ایک تھیلے میں دوپہر اور رات کے واسطے میرے لئے جوار کی روٹیاں اور اچار لایا تھا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ میں نے غلام رسول سے اپنے مشن کی پیش رفت کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"میں سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے آؤں گا۔ اس وقت تم میرے ساتھ چلو گے۔ تم یار رہنا۔"

میں نے پوچھا۔

"ہمیں کہاں جانا ہو گا؟"

وہ بولا۔

"تمہیں اپنے آپ پتہ چل جائے گا۔ رات کو کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں آدھی رات کو پہاڑی نالے تک گیا تھا۔ پھر واپس آگیا تھا"

"تمہیں بڑی احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ سہ پہر کے ت آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ یہ شخص بھی دوسرے کشمیری حریت پرست مجاہدوں کی طرح مختصر بات رتا تھا اور وقت پر اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ میں کوٹھڑی کے اندر ہی رہا۔ کبھی کبھی اٹھ کر دازے کی درز میں سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ باہر دھوپ تھی اور خوب روشنی پھیلی ہوئی ہا۔ دور سے کسی وقت کسی ٹرک کے ہارن کی آواز آجاتی تھی۔ یا درختوں کی طرف

سے کسی طوطے کسی کوے کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ سہ پہر کے بعد غلام رسول
آگیا۔ اس نے گلے میں کھدر کا ایک تھیلا لٹکایا ہوا تھا۔ ہندوستان میں سیاسی ورکر وغیرہ
اسی طرح کا تھیلا گلے میں یا کاندھے سے لٹکائے رکھتے ہیں۔ غلام رسول کا لباس بھی جموں
کے ہندوؤں ایسا ہی تھا۔ یعنی تنگ موری کا کھدر کا پاجامہ، بغیر کالر کے کرتہ اور پرانی
صدری۔ سرپر ڈوگرہ کیپ۔ میں نے بھی سرپر ڈوگرہ کیپ پہن رکھی تھی۔ تاکہ اگر میں
کسی وقت کوٹھڑی سے باہر نکلوں اور دور سے کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ کوئی ڈوگرہ مزدور
کام کر رہا ہے۔ غلام رسول میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں دور سے نہرانٹیروگیشن سنٹر دکھاؤں گا۔ میری اطلاع کے مطابق گل
خان کونے والے تہہ خانے میں بند ہے۔ پہلے اسے بیڑیاں ڈالی ہوئی تھیں مگر اب بیڑیاں
کھول دی گئی ہیں۔ میرے آدمی نے بتایا ہے کہ گل خان نے سارے ٹارچر ساری اذیتیں
برداشت کی ہیں مگر اپنی زبان نہیں کھولی۔ انٹیروگیشن سنٹر کے فوجی انچارج کیپٹن بٹھناگر
نے دلی سے ٹارچر کے جدید ترین ماہر ڈاکٹر کو بلا بھیجا ہے۔ اب گل خان کو کوئی خاص
انجکشن لگا کر نیم بے ہوشی کی حالت میں اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی
جائے گی۔ کیونکہ تشدد کے ان کے سارے حربے ناکام ہو چکے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے کہاں اور کسی جگہ سے انٹیروگیشن سنٹر دکھائیں گے؟ اور اس کو محض
دیکھ لینے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے تو اس کے اندر جانا ہو گا۔"

غلام رسول نے جواب دیا۔

"ہر کام اپنے وقت پر کیا جائے گا۔ پہلے اس سنٹر کی عمارت کو اچھی طرح سے دیکھ
بہت ضروری ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں آگے جاؤں گا۔ تم میرے پیچھے پیچھے چھ سا
قدموں کا فاصلہ ڈال کر چلو گے۔"

غلام رسول نے باہر آکر کوٹھڑی پر تالا ڈالا اور ایک طرف چل پڑا۔ میں چھ سا
قدموں کا فاصلہ ڈال کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم پہلے تو نالے کے ساتھ ساتھ چ

رہے۔ نالہ آگے جا کر جب شہر کے گنجان آباد علاقے کی طرف مڑا تو ہم بھی اس طرف مڑ
گئے۔ ایک جگہ کسی مندر کی سیڑھیاں نالے میں اترتی تھیں۔ غلام رسول سیڑھیاں چڑھ
کر مندر کے پہلو سے ہو کر جاتی چھوٹی سڑک پر چل پڑا۔ میں پیچھے پیچھے تھا۔ ہمارے
حلیے ایسے تھے کہ ہم شکل صورت اور لباس سے ڈوگرے معلوم ہو رہے تھے۔ ہمارے
سروں پر ٹوپیاں تھیں جو چمبہ کانگڑا اور جموں کے ڈوگرے عام طور پر پہنتے ہیں۔ غلام
رسول آبادی سے بچ کر جا رہا تھا۔ وہ مجھے بازاروں گلیوں میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ جموں
شہر میں دکانیں کھلی تھیں۔ بازاروں میں ٹریفک جاری تھی۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ
ہماری داہنی جانب ایک بھورے رنگ کا چھوٹا ٹیلہ ہے۔ غلام رسول اس ٹیلے کے قریب
سے ہو کر آگے نکل گیا۔ ٹیلے کے پیچھے ایک اونچے ٹبے پر مجھے مسجد کا گنبد اور پرانے مینار
دکھائی دیئے۔ غلام رسول مسجد کے قریب جا کر رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور
پھر مسجد کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ ایک منٹ بعد میں بھی مسجد کے دروازے میں
سے گزر گیا۔ سامنے مسجد کا چھوٹا سا صحن تھا جہاں ایک مولوی صاحب بچوں کو قرآن مجید
پڑھا رہے تھے۔ میں نے غلام رسول کو دیکھا کہ وہ جوتیاں ہاتھ میں لئے مسجد کے صحن میں
سے ہو کر ایک حجرے میں داخل ہو گیا۔ مولوی صاحب نے نہ غلام رسول کی طرف کوئی
توجہ کی نہ میری طرف غور سے دیکھا۔ میں بھی حجرے میں چلا گیا۔

غلام رسول حجرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میں بھی اس کے پاس پائنتی کی
طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ اتنے
میں باہر سے بچوں کے مولوی صاحب کو سلام کرنے اور بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ مولوی
صاحب نے بچوں کو چھٹی دے دی تھی۔ پھر مولوی صاحب بھی حجرے میں آگئے۔ آتے
ہی غلام رسول سے کہنے لگے۔

"تم لوگ یہاں بیٹھو۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو تم اوپر
چلے جانا۔ اگر آس پاس کوئی شک شبہ ہوا تو میں تمہیں اوپر جا کر اپنا کام کرنے کی اجازت
نہیں دوں گا۔"

غلام رسول نے کہا۔

"مولوی فیض الحسن صاحب! ہم آپ کے مشورے کے مطابق کام کریں گے۔"

مولوی صاحب چلے گئے۔ غلام رسول بھی خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ہمیں اوپر چھت پر مولوی صاحب کے چلنے پھرنے کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی دو تین منٹ کے بعد مولوی صاحب نیچے آگئے۔ حجرے میں داخل ہو کر انہوں نے غلام رسول سے کہا۔

"پچھلی طرف سے چھت پر چڑھ جاؤ۔ لیکن گنبد کی اوٹ میں رہنا۔ سامنے بالکل نہ آنا"

غلام رسول نے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں"

اس دوران غلام رسول نے تھیلا اتار کر چارپائی پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر خاکستری رنگ کی ایک دوربین باہر نکالی۔ یہ فوجی دوربین تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ بڑی طاقتور دوربین ہے۔ غلام رسول نے مجھ سے کہا۔

"آجاؤ"

ہم حجرے کے پچھلے دروازے سے نکلے۔ پیچھے ایک زینہ مسجد کی چھت کو جاتا تھا۔ ہم زینہ چڑھ کر مسجد کی چھت پر آگئے۔ ہم جھک کر چلتے مسجد کے گنبد کی اوٹ میں ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ یہ مسجد آبادی کے مکانوں سے اونچائی پر بنی ہوئی تھی اور یہاں سے دوسرے مکانوں کی چھتیں کافی نیچی تھیں۔

غلام رسول آنکھوں کے آگے دوربین لگا کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے آگے جو ٹیلہ ہے اس پر پولیس کے سپاہی پہرے پر موجود ہیں وہ تمہیں صاف نظر آجائیں گے۔ ٹیلے کی دوسری جانب دو منزلہ عمارت تمہیں نظر آئے گی۔ یہ عمارت نہر انٹیروگیشن سنٹر ہے۔ اب دوربین لگا کر دیکھو"

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ ٹیلہ ویسے مسجد سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ ٹیلہ نہر

انٹیروگیشن سنٹر کے عقب میں واقع تھا اور جیسا کہ کمانڈو شیروان نے بتایا تھا اس ٹیلے پر پولیس کے آدمی دن رات پہرے پر موجو رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرف سے کوئی حریت پرست کشمیر کمانڈو اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لئے سنٹر کی دیوار کود کا اندر نہ چلا جائے۔ انہیں آرڈر تھا کہ اگر کوئی شخص دیوار پھاندتا نظر آئے تو اسے وہیں شوٹ کر دیا جائے۔ دوربین اتنی طاقت ور تھی کہ مجھے وہ ٹیلہ جو مسجد سے کافی دور تھا بالکل قریب دکھائی دینے لگا۔ مجھے تین سپاہی نظر آئے جو ٹیلے کے اوپر چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے دو سکھ تھے۔ مجھے ایک سکھ کی ڈاڑھی کے بال تک نظر آرہے تھے۔ غلام رسول بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"اب انٹیروگیشن سنٹر کی عمارت کی پہلی منزل پر نظریں جماؤ۔"

میں نے دوربین کو ذرا نیچے کیا تو مجھے انٹیروگیشن سنٹر کی پہلی منزل کے کمروں کی کھڑکیاں بڑی واضح ہو کر نظر آنے لگیں غلام رسول آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"اس وقت تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں پہلی منزل کے کمروں کی عقبی کھڑکیاں دیکھ رہا ہوں"

غلام رسول نے آہستہ سے کہا۔

"دوربین کو پہلی منزل کے آخری کمرے کے کونے کی طرف لے جا کر دیکھو۔ تمہیں یہاں ایک چھوٹا دروازہ نظر آئے گا۔"

میں دوربین کو اسی طرف لے گیا۔ وہاں دیوار میں ایک دروازہ تھا جو عام دروازے سے تنگ اور محراب دار تھا۔ دروازہ بند تھا۔ غلام رسول نے پوچھا۔

"کیا تم دروازہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں"

غلام رسول بولا۔

”یہ دروازہ نیچے ان تہہ خانوں میں جاتا ہے جہاں گل خان دوسرے حریت پرست مجاہدوں کے ساتھ قید وبند اور ٹارچر کی اذیتیں برداشت کر رہا ہے۔ یہ دروازہ صرف اس وقت کھلتا ہے جب کسی کو اندر سے جانا یا اندر باہر آنا ہوتا ہے۔ تمہیں اس دروازے کے باہر ایک ڈوگرہ سپاہی گشت کر کے پہرہ دیتا نظر آئے گا۔“

میں ابھی دوربین میں سے تہہ خانے کے دروازے کو دیکھ رہا تھا کہ ایک ڈوگرہ سپاہی رائفل کاندھے پر رکھے دروازے کے آگے سے گزر گیا۔ وہ پہرہ دینے کے انداز میں قدم قدم چل رہا تھا۔ پانچ چھ قدم چلنے کے بعد وہ واپس پلٹ آیا۔ اور ایک بار پھر دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے غلام رسول سے کہا۔

”میں پہرے پر موجود ڈوگرہ سپاہی کو دیکھ رہا ہوں“

غلام رسول نے کہا۔

”اب دوربین کا رخ اس منزل کے کونے کی طرف ذرا نیچے لے جاؤ اور فرش کو دیکھو۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ فرش اینٹیں جوڑ کر بنایا گیا تھا اور دوربین میں مجھے اکھڑی ہوئی اینٹیں صاف نظر آرہی تھیں۔ غلام رسول نے کہا۔

”کیا تم فرش کو دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”ہاں“

غلام رسول بولا۔

”کیا تمہیں فرش پر کوئی اور چیز بھی نظر آئی ہے؟“

میں نے غور سے دیکھا تو عمارت کی پہلی منزل والی دیوار سے دو قدم ہٹ کر زمین پر گول لوہے کا ڈھکن پڑا تھا۔ میں نے کہا۔

”میں لوہے کا ایک گول ڈھکنا دیکھ رہا ہوں“

غلام رسول نے کہا۔

”اس ڈھکن کو اور تہہ خانے کو جانے والے دروازے کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالو۔ کیونکہ یہاں تمہیں رات کے وقت آنا ہوگا۔ جب دن کی روشنی نہیں ہوگی۔ جس ڈھکن کو تم دیکھ رہے ہو یہ انٹیروگیشن سنٹر کے سیوریج کا ڈھکن ہے۔ یہ گٹر زمین کے اندر ساری عمارت کا پانی لے کر زمین کے نیچے سے ہوتا ہوا ایک جگہ اس نہر میں جا کر شامل ہو جاتا ہے جو اس عمارت کی دوسری جانب بہتی ہے اور جس کے نام سے اس عمارت کا نام نہر انٹیروگیشن سنٹر رکھا گیا ہے۔ ایک بار پھر ان تمام مقام کو غور سے دیکھ کر اپنے ذہن میں اس کا نقشہ بٹھالو۔“

میں نے سب جگہوں کو پوری توجہ سے دیکھا اور کہا۔

”میں نے ایک ایک جگہ دیکھ کر نوٹ کر لی ہے۔“

غلام رسول بولا۔

”اب دوربین کو بائیں جانب گھما کر اوپر لے جاؤ۔ تمہیں عمارت کے عقبی ٹیلے کی ڈھلان نظر آئے گی۔ اس ڈھلان پر خاردار تاروں کی دیوار نہیں بنائی گی۔ خاردار تاروں کا جنگلہ اوپر ٹیلے پر مغرب سے مشرق کی طرف لگایا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی ایمرجنسی پیدا ہو جاتی ہے اور حالات الٹا رخ اختیار کر لیتے ہیں تو تمہیں اس ڈھلان پر چڑھ کر خاردار تاروں کے جنگلے کو کاٹ کر اور ڈوگرہ سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ٹیلے کی دوسری طرف نکلنا ہوگا۔ یہ بڑا مشکل کام ہوگا۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟“

غلام رسول نے ہاتھ بڑھا کر میری آنکھوں کے آگے سے دوربین ہٹا دی۔ میں نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

”کوشش ضرور کروں گا۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

غلام رسول نے دوربین کا فیتہ اس کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

”اللہ نے تمہیں بھی کچھ چیزوں کا مالک بنایا ہے۔ نیچے آجاؤ۔“

ہم حجرے میں واپس آئے تو مولوی صاحب نہیں تھے۔ غلام رسول نے دوربین تھیلے میں ڈالی۔ تھیلا اپنے گلے میں لٹکایا کہنے لگا۔

"اسی طرح میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ میں تمہیں وہ جگہ دکھانے چلا ہوں جہاں اس عمارت کے سیوریج کا پانی نہر میں گرتا ہے۔"

وہ پہلے نکل گیا۔ میں اس کے بعد جوتے ہاتھ میں پکڑے مسجد کے صحن میں سے گزرا تو مولوی صاحب مسجد کے دروازے کے باہر ایک طرف کھڑے تھے۔ وہ اس بات کی نگرانی کر رہے تھے کہ اگر کوئی خطرہ ہو تو ہمیں فوراً آ کر بتا دیں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں احتراماً مولوی صاحب کو سلام کیا اور غلام رسول جس طرف گیا تھا اس طرف چل دیا۔

غلام رسول بازار کے آخر میں جا کر اس طرف گھوم گیا جدھر جموں شہر کی یہ نہر انٹیروگیشن سنٹر کے پیچھے سے گزرتی تھی۔ یہ جگہ آبادی سے باہر تھی۔ نہر کی ایک جانب سڑک کے کنارے کنارے لکڑی کے کھوکھے بنے ہوئے تھے۔ ان میں دکانیں تھیں۔ غلام رسول ان کھوکھوں کے پیچھے ہو گیا۔ یہ نہر کا آبادی کی طرف والا کنارا تھا۔ اور مکانوں کی عقبی دیواریں اور کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ مگر یہاں درخت اگے ہوئے تھے جن کی شاخوں کی وجہ سے نہر کے کنارے پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

نہر کے کنارے جگہ جگہ گیلی مٹی کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہر کی صفائی ہوئی تھی اور نہر کی مٹی نکال کر باہر ڈال دی گئی تھی۔ غلام رسول ایک جگہ بھل مٹی کی ڈھیری کے پاس اس طرح بیٹھ گیا جیسے تھک گیا ہو اور آرام کرنا چاہتا ہو۔ اس نے پاؤں سے جوتا اتار دیا تھا اور ہاتھ سے پاؤں دبا رہا تھا۔ میں اس کے قریب آیا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ جو میں کرتا ہوں تم بھی کرو"

میں نے بھی بیٹھتے ہی جوتے اتار دیئے اور ہاتھوں سے اپنے پیر دبانے لگا۔ ہمارا رخ نہر کی طرف تھا۔ یہ نہر چھوٹی تھی۔ اس کا گدلہ پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں گلے سڑے پتے اور کاغذ وغیرہ تیرتے چلے آ رہے تھے۔ غلام رسول نے اپنے والے کنارے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ذرا آگے ہو کر دیکھو۔ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا کہ کسی عمارت کے گٹر کا پائپ نہر میں گرے مگر اس شہر میں یہ واحد مثال ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ تمہیں نیچے سرنگ نظر آئے گی۔ یہ وہ سرنگ ہے جس میں سے انٹیروگیشن سنٹر کے سیوریج کا پانی بڑے پائپ کے ذریعے نہر میں سے گزر کر سامنے والے کنارے کے نیچے سے ہو کر گندے نالے کی طرف نکل جاتا ہے۔"

میں نے پاؤں دباتے دباتے آگے کو جھک کر دیکھا۔ کافی بڑا سیمنٹ کا پائپ سرنگ کے اندر سے نکل کر نہر میں اتر گیا تھا۔ سرنگ میں پائپ کے اوپر کافی کھلی جگہ تھی۔ گٹر کا پانی کھلی صورت میں لانے کی بجائے بڑے پائپ زمین کے نیچے کیوں نہ بچھایا گیا۔ پائپ ایک سرنگ میں کیوں بچھائی گئی ہے۔

غلام رسول نے کہا۔

"تمہیں اس سرنگ میں سے گٹر کے ساتھ ساتھ انٹیروگیشن سنٹر میں داخل ہونا ہو گا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ یہ کام تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ ایک بار پھر اس جگہ کو اچھی طرح سے دیکھ لو اور جو نشانی لگانی ہے لگا لو۔"

میں نے کہا۔

"میں نے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا ہے۔"

وہ بولا۔

"اچھی بات ہے۔ اب ایسا کرو کہ جس طرف سے میں تمہیں لے کر آیا ہوں اسی طرف سے چل کر واپس کوٹھڑی میں پہنچ جاؤ۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟ تمہیں راستہ یاد رہا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بالکل یاد رہا ہے۔"

اس نے کہا۔

"تو پھر فوراً واپس چل پڑو میں رات کو کسی وقت آؤں گا۔ باقی باتیں اس وقت ہوں

گی۔"

میں نہر کے کنارے کنارے واپس روانہ ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر بالکل نہ دیکھا کہ غلام رسول بھی وہاں سے گیا ہے یا نہیں۔ میں جن راستوں سے ہو کر وہاں آیا تھا وہ راستے مجھے پوری طرح یاد تھے۔ ویسے بھی ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں چلتے چلتے واپس اس ویران جگہ پر آ گیا جہاں کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ مگر مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ معلوم ہو گیا تھا۔ مجھے رات کے وقت نہر میں جا کر سیوریج کے پائپ والی سرنگ میں اتر کر زمین کے اندر ہی اندر پائپ کے ساتھ چلتے چلتے اس مین ہول تک پہنچنا تھا جہاں پر سیوریج کا پانی عمارت کی مختلف نالیوں میں سے گزرتا ہوا بڑے پائپ میں آ کر گرتا تھا۔ یہ مین ہول اس جگہ گٹر اور پائپ کی صفائی کے لئے بنایا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سرنگ نہر سے لے کر انٹیروگیشن سنٹر کے اندر تک پانچ چھ سو فٹ لمبی ہو گی۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ سرنگ اندر جا کر کہاں سے تنگ ہو جاتی ہے اور کہیں بند ہی نہ ہو جاتی ہو اور صرف پائپ دیوار میں گھس جاتا ہے۔ میں رات پڑنے تک اس اہم ترین اور خطرناک مشن کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ مجھے غلام رسول کا بے تابی سے انتظار تھا۔ کیونکہ وہی آ کر مجھے اس سرنگ کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

عشاء کا وقت گزر گیا تھا کہ غلام رسول آ گیا۔ وہ ساتھ کچھ بھنا ہوا گوشت اور دوسرے تھرمس میں چائے بھر کر لایا تھا۔ ہم نے صبح کی بچی ہوئی روٹیوں کے ساتھ بھنا ہوا گوشت کھایا۔ چائے پی۔ اس دوران غلام رسول نے مجھے سرنگ کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ میں نے بھی نہ پوچھا۔ جب ہم چائے پینے لگے تو میں نے اس سے پوچھا کہ کہیں یہ سرنگ زمین کے اندر جا کر بند تو نہیں ہو جاتی؟

غلام رسول بولا۔

"نہیں۔ میں نے اس کے بارے میں ایک سینٹری انسپکٹر سے ساری باتیں معلوم کی ہیں۔ یہ سرنگ اتنی اونچی اور چوڑی ہے کہ آدمی پائپ کے اوپر بیٹھ کر آہستہ آہستہ رینگ

کر آگے جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ سرنگ جموں کے کسی راجہ نے اپنی حویلی کے باغ میں نہر کا پانی لانے کے لئے بنائی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ سرنگ مٹی سے بھرتی گئی اور نہر کی سطح سے اونچی ہوتی گئی۔ اب اس حویلی میں بھارتی حکومت نے انٹیروگیشن سنٹر بنا لیا ہے اور یہاں کا گندہ پانی سرنگ میں پائپ بچھا کر نہر کے اندر سے گزار کر شہر کے بڑے بدرو میں ڈالا جاتا ہے۔ پائپ کی صفائی سال میں ایک ہوا کے پریشر کے ساتھ کی جاتی ہے لیکن سال میں ایک بار سرنگ کو بھی صاف کیا جاتا ہے سرنگ میں تازہ ہوا ان ہوا دانوں سے داخل ہوتی ہے جو عمارت کے اندر اور عمارت اور نہر کے درمیان آبادی میں تین جگہوں پر اونچے گول پائپوں کی شکل میں لگائے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کس رات اس مشن پر جانا چاہئے"

غلام رسول بولا۔

"تم کسی بھی رات کو جا سکتے ہو۔ ابھی تو گل خان اسی انٹیروگیشن سنٹر میں ہے۔ کوئی پتہ نہیں دو تین دن کے بعد اسے امرتسر یا جالندھر کے انٹیروگیشن سنٹر میں بھیج دیا جائے۔ پھر تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل رات اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اگر میں گل خان کو اس جہنم سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تو ہمیں کہاں جانا ہو گا؟

غلام رسول بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اکیلا چھوڑوں؟ میں نہر کے کنارے لکڑی کے کھوکھوں کے پاس جہاں گٹر کی سرنگ کا منہ کھلتا ہے تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ ایک بند جیپ میں ساتھ لایا ہوں گا۔ تم دونوں کو جیپ میں بٹھاؤں گا اور تمہیں ایک ایسی خفیہ جگہ پر لے جاؤں گا جہاں جموں کی پولیس تو کیا مقبوضہ کشمیر پر قابض ساری ڈوگرہ ملٹری بھی

نہیں پہنچ سکے گی۔"

یہ میرے لئے تسلی اور اطمینان کی بات تھی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کے خیال میں مجھے کل رات کس وقت جانا چاہئے؟"

غلام رسول تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"رات ایک بجے کے بعد کا وقت ٹھیک رہے گا۔ اس وقت تک نہر والے بازار کے سارے کھوکھوں کی دکانیں بھی بند ہو چکی ہوتی ہیں۔"

"آپ مجھے کل رات کہاں ملیں گے؟"

وہ بولا۔

"میں ٹھیک پونے ایک بجے کل رات یہاں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہم دونوں یہاں سے اکٹھے نکلیں گے کیونکہ رات کے وقت تم راستہ بھول سکتے ہو۔"

وہ دوسری رات آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

وہ رات میں اپنے مشن کے پلان پر کافی دیر غور کرتا رہا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ مشن زیادہ خطرناک تھا۔ کمانڈو کا کوئی مشن آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اگر وہ دشمن کے علاقے میں ہے تو ہر مشن کے لئے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ کمانڈو کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ جان کی بازی بھی لگائے اور مرنے سے پہلے اپنا ٹارگٹ ضرور مارلے۔ ٹارگٹ مارے بغیر مرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میرا مسئلہ بھی یہی تھا کہ میں ہر حالت میں ٹارگٹ مار لینا چاہتا تھا اور گل خان کو ہر صورت وہاں سے نکال لانا چاہتا تھا۔ یہی میرے مشن کا مقصد تھا۔

دوسرا دن بھی اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ دوپہر کو رات کی جو روٹی بچی ہوئی پڑی تھی وہی کھائی۔ تھرمس میں سے چائے نکال کر پی لی۔ پیاس لگی تو کوٹھڑی میں سے نکل کر بڑا محتاط ہو کر چلتا پہاڑی نالے پر گیا اور پانی پی کر واپس آگیا۔ دن کسی طرح گزرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا اور فضا میں شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہونے لگا۔ رات ہو گئی۔ میں نے رومال کھول کر دیکھا۔ صرف ایک روٹی بچی ہوئی

تھی۔ میں نے وہی چائے کے ساتھ کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے تیمم کر کے کوٹھڑی کے اندر ہی عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد خدا کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے خضوع وخشوع سے دعا مانگی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالٹین کی بتی میں نے نیچی کی ہوئی تھی۔ میری پتلون کی جیب میں دھماکہ خیز محلول کی شیشی بھی موجود تھی۔ اسے میں نے اس لئے رکھا ہوا تھا کہ شاید کسی جگہ اس کی ضرورت پڑ جائے۔ اگرچہ اس کا امکان نہیں تھا۔ کیونکہ میرا یہ مشن خالص ایکشن کا مشن تھا۔ یہاں مجھے بہادری اور دلیری سے کام لیتے ہوئے اپنے حواس کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے اپنے ساتھی کو دشمن کے گھیرے سے نکال کر لانا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں بڑا کڑا پہرہ ہو گا۔ سیکورٹی سخت ہو گی۔ ذرا سے شک پڑنے پر مجھ پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ لیکن مجھے اسی قسم کے کمانڈو آپریشنز کی ٹریننگ دی گئی تھی اور بڑی سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ ٹریننگ کے علاوہ میرا جذبہ بھی کام کر رہا تھا۔ جہاں بہترین تربیت کے ساتھ جذبہ بھی شامل ہو جائے وہاں کمانڈو ضرور ٹارگٹ مار لیتا ہے۔ مجھے بھی یقین تھا کہ اگر گل خان انٹیروگیشن سنٹر کے تہہ خانے میں موجود ہے تو میں ناکام واپس نہیں آؤں گا۔

میں نے دوسری جیب میں سے اپنا بارہ بور کا ریوالور نکال لیا اور اس کا چیمبر کھول کر ساری گولیاں نکالیں اور رومال سے اسے صاف کرنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میں گھڑی پر وقت دیکھ لیتا تھا۔ جب رات کے بارہ بجے تو مجھے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے گولیاں ریوالور میں ڈالیں۔ چیمبر کو بند کیا۔ لالٹین کی بتی اور نیچی کی اور اٹھ کر دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ایک سایہ کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت میں پستول کی نالی پر سائی لینسر چڑھا رہا تھا۔ ریوالور پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ کیونکہ میں ابھی تک سائے کو پہچان نہیں سکا تھا۔ جب سایہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ میرا ساتھی کشمیری مجاہد غلام رسول تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

غلام رسول نے اندر آتے ہی سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس طرح دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا"

میں نے کہا۔

"میں نے دور سے آپ کو پہچان لیا تھا"

"کچھ بھی ہو"

وہ بولا۔

"یہ بات کسی بھی کمانڈو کو خطرے میں ڈال سکتی ہے"

اس نے جھک کر لالٹین کی بتی ذرا سی اونچی کر دی۔ کوٹھڑی میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ غلام رسول نے پوچھا۔

"کیا تم کمانڈو آپریشن کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا۔

"بالکل تیار ہوں"

"ماشاء اللہ"

غلام رسول نے میرے کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔

"آدھی رات کے بعد انٹیروگیشن سنٹر کے پیچھے ٹیلے پر گارڈ کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں۔ پہلے تین سپاہی چلے جاتے ہیں۔ دوسرے تین سپاہی آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت بارہ بج چکے ہیں۔ میرا خیال ہے گارڈ ڈیوٹی بدل گئی ہوگی۔ ہمیں نکل چلنا چاہئے۔ کیا آپ جیپ ساتھ لائے ہیں؟"

غلام رسول بولا۔

"ہمارا آدمی جیپ لے کر نہر کنارے والے کھوکھوں کے پاس موجود ہو گا۔ تم اس کی فکر کرو۔ میں بھی تمہیں ٹارگٹ پر پہنچا کر جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ تمہیں سب کچھ تیزی سے کرنا ہو گا۔ جتنی دیر کرو گے خطرہ بڑھتا جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کروں گا"

"تو پھر چلو۔"

اس نے لالٹین بجھا دی۔ ہم کوٹھڑی سے باہر آئے۔ غلام رسول نے اسے تالا لگایا اور ہم رات کے اندھیرے میں شہر کی طرف چل پڑے۔ اب ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سائی لینسر والا ریوالور میری جیب میں تھا۔ دھماکہ خیز مواد والی شیشی بھی میری جیب میں تھی۔ ہم شہر کی بیرونی دیوار کے ساتھ بہنے والی نہر کے پاس پہنچ گئے۔ اب ہم آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ ایک جگہ دو آدمی آپس میں باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ ہم جلدی سے ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب وہ گزر گئے تو اٹھ کر آگے چل پڑے۔ غلام رسول نے نہر کے کنارے پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے سیوریج پائپ کی سرنگ ہے۔ کیا تمہیں نظر آرہی ہے؟"

میں نے غور سے نہر کے کنارے کو تکتے ہوئے کہا۔

"ہاں"

"اب سرنگ کے بالکل سامنے جو دو لکڑی کے کھوکھے ہیں ان کے درمیان دیکھو۔ وہاں میرا آدمی جیپ میں بیٹھا ہے۔"

میں نے ادھر دیکھا تو وہاں اندھیرے میں مجھے ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔

"میں اسے بھی دیکھ رہا ہوں"

"گل خان کو لے کر تم سیدھا اس جیپ میں آجاؤ گے۔ آگے ہمارا کام شروع ہو جائے گا اب اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو۔ ٹارگٹ تمہارے سامنے ہے"

میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور چند قدم چلنے کے بعد رات کے اندھیرے میں نہر میں اتر گیا۔ سرنگ کا پائپ والا دہانہ میرے سامنے تھا۔ میں سرنگ میں داخل ہو گیا۔

سرنگ میں داخل ہوتے ہی میں سیمنٹ کے بڑے پائپ پر اس طرح بیٹھ گیا جس
طرح آدمی گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ آگے کھسکنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے
میں سرنگ میں آگے بڑھ رہا تھا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سرنگ کے اندر ہوا مرطوب اور
بوجھل تھی۔ آکسیجن اتنی نہیں تھی جتنی سرنگ کے باہر تھی۔ چنانچہ میرا سانس اپنے آپ
تھوڑا سا تیز ہو گیا تھا۔ اس وقت میں جموں شہر کی گنجان ہندو آبادی کی زمین کے نیچے تھا۔
مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں آگے جا کر سرنگ بند نہ ہو جائے۔ یعنی سیوریج کا پائپ
دیوار میں گھس کر آگے چلا گیا ہو اور کسی آدمی کے آگے جانے کا راستہ بند ہو گیا ہو۔ میں
دونوں ہاتھ پائپ پر رکھ کر اپنے جسم کو آگے گھسیٹ لیتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر پائپ
بائیں جانب مڑ گیا۔ یہاں میرے چہرے کے ساتھ مکڑیوں کے کتنے ہی جالے چمٹ گئے۔
میں نے ایک مکڑی کو اپنے گال پر تیزی سے اوپر کو جاتے محسوس کیا۔ میں نے جلدی سے
ہاتھ مار کر اسے مسل ڈالا۔ آگے بہت جالے تھے۔ بلکہ جالوں کا جال تنا ہوا تھا۔ مجھے پہلے
ان جالوں کو ہاتھوں سے ہٹانا پڑتا تھا۔

فضا میں آکسیجن مزید کم ہو گئی تھی۔ میں منہ کھول کر سانس لینے لگا۔ سرنگ کچھ دور
جا کر مزید تنگ ہو گئی۔ مٹی گیلی تھی اور پائپ اس میں آدھا ڈوبا ہوا تھا۔ میں پائپ پر بیٹھ
کر آگے چلنے لگا۔ ایک جگہ مجھے تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ یہاں اوپر کسی جگہ ہوادان لگا ہوا
تھا جو اندھیرے میں مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے
ہاتھ نظر نہیں آ رہے تھے۔ دو تین کاک روچ پتلون کے اندر میری پنڈلیوں پر چڑھ گئے۔

یں نے انہیں وہیں کچل دیا۔ میں کافی دور سرنگ کے اندر آ گیا تھا۔ مگر ابھی تک وہ جگہ
نہیں آئی تھی جہاں اوپر سیوریج کا ڈھکنا تھا۔ اور جہاں سے مجھے باہر نکلنا تھا۔ میں آہستہ
آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک دفعہ پائپ پھر گھوم گیا۔ اس کے بعد پائپ سیدھا ہو گیا۔ مجھے
کھائی تو کچھ نہیں دے رہا تھا۔ سیمنٹ کے پائپ سے ہی میں سمت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ لٹکتے
وئے جالے اسی طرح میرے چہرے پر آتے اور میں انہیں ہاتھوں سے ہٹاتا جاتا۔ مجھے
ں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی اندھیری قبر میں چلا جا رہا ہوں۔ اگر مجھے اس قسم کی
شقتوں کی تربیت نہ ملی ہوتی اور میں سخت جان نہ ہو گیا ہوتا تو یقین کریں یا تو میں بے
وش ہو جاتا یا خوف کے مارے چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ مگر میں اپنے حواس کو اپنے قابو
ں رکھ کر پورے حوصلے اور ضبط کے ساتھ پائپ پر آگے کھسک رہا تھا۔

اب پائپ بالکل سیدھ میں جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سرنگ تھوڑی کشادہ ہو گئی
ہے۔ میں نے اندھیرے میں اپنے دائیں بائیں ہاتھ چلائے۔ پہلے میرے ہاتھ سرنگ کی
یواروں سے ٹکرا جاتے تھے۔ اب ایسا نہ ہوا۔ میں نے ایک بازو لمبا کر کے ہاتھ آگے
ھایا تو میرا ہاتھ دیوار کی گیلی مٹی سے ٹکرایا۔ گرمی کی وجہ سے میرا جسم پسینے میں شرابور
گیا تھا۔ میں پائپ پر بیٹھا کھسک رہا تھا کہ اچانک میں ایک دوسرے پائپ سے ٹکرایا۔
یں وہیں رک گیا۔ ہاتھ سے ٹٹول کو دیکھا۔ یہ پائپ اوپر کی طرف چلا گیا تھا۔ ضرور یہ کوئی
ہوادان تھا جس میں سے پائپ کے اندر کی گیس باہر نکل رہی تھی۔ میں پائپ کے پہلو سے
ینگ کر آگے نکل گیا۔ آگے دوبارہ پائپ پر بیٹھ گیا۔ پانچ چھ منٹ چلا ہوں گا کہ آگے
یوار آ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میں ٹارگٹ پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے سامنے والی دیوار کو ہاتھ
ے ٹٹولا۔ میرے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ دیوار کے بالکل ساتھ لگی لوہے کی
یڑھی اوپر جا رہی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اوپر مین ہول کا ڈھکن تھا۔ اس کا مطلب تھا
کہ میں زمین کے اندر ہی اندر رینگتا ہوا انٹیروگیشن سنٹر کی عمارت کے نیچے پہنچ گیا تھا۔
ں نے اوپر منہ اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اوپر کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے اللہ کا نام لیا
ر لوہے کے زینے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ چھ سات زینے چڑھنے کے بعد

میرا سر چھت سے ٹکرایا۔ میں نے ایک ہاتھ چھت پر پھیرا۔ یہ لوہے کا ڈھکن تھا۔ مجھے اس ڈھکن کو اٹھا کر مین ہول سے باہر نکلنا تھا۔

یہ کام خطرناک تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اوپر کیا صورت حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اوپر کوئی سپاہی نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جس سپاہی کو میں نے دوربین سے یہاں گشت لگاتے دیکھا تھا وہ مین ہول کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ اگر میں نے ڈھکن کو اوپر کی جانب اٹھایا اور اس کی آواز پیدا ہوئی تو ڈوگرہ سپاہی ہوشیار ہو جائے گا اور رائفل کا رخ مین ہول کی طرف کر دے گا۔

میں اندر زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وقت اس وقت بڑا قیمتی تھا۔ ابھی میرے سامنے پورا آپریشن پڑا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ڈھکن کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو مجھے کسی کے قدموں کی آواز قریب آتی سنائی دی میں نے ہاتھ نیچے کر لئے۔ اتنا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ڈھکن سختی سے نہیں جما ہوا۔ کیونکہ میرے ذرا سے زور لگانے سے وہ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ یہ بھاری بوٹوں کی آواز تھی یقیناً ڈوگرہ سپاہی گشت کی ڈیوٹی پر تھا۔ بھاری بوٹوں کی چاپ میرے اوپر سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس ڈوگرے کو واپس بھی آنا تھا۔ میں لوہے کے زینے کے ساتھ لگا رہا۔ بوجھل فضا کی وجہ سے مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں سانس روک نہیں سکتا تھا۔ سپاہی کے بوٹوں کی آواز ایک بار پھر قریب آئی اور میرے اوپر سے ہو کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے کان لگا رکھے تھے۔ بوٹوں کی آواز دور جا کر غائب ہو گئی۔ میرے لئے یہی ایک موقع تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے مین ہول کے ڈھکن کو اوپر اٹھایا اور بڑے آرام سے آواز پیدا کئے بغیر ایک طرف رکھ دیا۔ فوراً گردن باہر نکالی اور ماحول کا جائزہ لیا۔ میں عمارت کی پہلی منزل کے باہر اس جگہ پر تھا جو مجھے غلام رسول نے دوربین کے ذریعے دکھائی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں مین ہول سے باہر نکلا اور ڈھکنا دوبارہ سوراخ کے اوپر رکھا اور رینگتا ہوا دیوار کی دوسری طرف اندھیرے میں چلا گیا۔ یہاں پودے اگے ہوئے تھے۔ میں اس طرف دیکھ رہا تھا جس طرف گشت لگانے والا سپاہی گیا تھا۔ وہ خدا

جانے کہاں چلا گیا تھا۔ واپس نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سامنے اس دروازے پر نظریں جما دیں جس کی سیڑھیاں نیچے ٹارچر چیمبرز کے تہہ خانوں میں اترتی تھیں۔ یہ دروازہ چھوٹا تھا اور محراب دار تھا۔ اسے میں نے مسجد کی چھت پر بیٹھ کر دوربین سے بھی دیکھا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ گشت لگانے والا ڈوگرہ سپاہی شاید ادھر کہیں جا کر بیٹھ گیا تھا یا ہو سکتا ہے سو گیا ہو۔ لیکن مجھے یہی خیال کرنا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور تھوڑی دیر بعد گشت لگاتا یہاں پہنچ جائے گا۔ میں نے جیب میں سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرے پیچھے انٹیروگیشن سنٹر کی دیوار تھی اور اس کے پیچھے اس ٹیلے کی ڈھلان تھی جس کے اوپر خاردار تاروں کی دیوار کے ساتھ تین ڈوگرہ سپاہی پہرے کی ڈیوٹی پر تھے۔ ان کی طرف میری پشت تھی۔ ایک بلب کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگا جل رہا تھا۔ اس کی روشنی تہہ خانے کے دروازے پر پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی کسی بڑے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ اگر میں دروازے کی طرف جاتا ہوں اور ٹیلے کے اوپر جو ڈوگرے ڈیوٹی پر ہیں وہ مجھے دیکھ لیتے ہیں تو میرا مشن فیل ہو سکتا تھا۔ لیکن میں وہاں زیادہ دیر بیٹھا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تہہ خانے کو جانے والے دروازے پر اندر سے تالا لگا ہوا ہے یا کھلا ہے۔ یہ میں دروازے کے پاس جا کر اسے دھکیل کر ہی معلوم کر سکتا تھا۔ میں نے آخری بار اس سمت نگاہ ڈالی جدھر ڈوگرہ سپاہی گیا تھا۔ ادھر اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہ دیا۔ سپاہی کہیں نہیں تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور دوڑ کر تہہ خانے والے دروازے پر پہنچا اور اسے اندر کو دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں جلدی سے اندر چلا گیا اور دروازے کو اسی طرح آہستہ سے بند کر دیا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی کہ عمارت کا سب سے بڑا ٹارچر سنٹر تھا اور وہاں ایک ایک قدم پر سیکورٹی کا خیال رکھا گیا تھا مگر خدا جانے دروازہ ان لوگوں نے بند کیوں نہیں کیا تھا۔

میرے سامنے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ محراب دار چھت میرے سر سے کوئی دو فٹ اونچی تھی۔ اوپر ایک کمزور سی روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا سیڑھیاں اترنے لگا۔ پتھروں کو جوڑ کر یہ سیڑھیاں بنائی گئی

تھیں۔ جیسے جیسے میں نیچے اتر رہا تھا چھت بھی نیچی ہوتی جا رہی تھی اور میرے سر اور چھت کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ برقرار تھا۔ نیچے ایک سرنگ نما راہ داری تھی۔ میں نے دیوار میں سے سر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ نیچی چھت والی راہ داری میں چھت کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کمزور روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ راہ داری بالکل ویران پڑی تھی۔ میں آگے قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ دور سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے پیچھے ہو گیا۔ مگر میں وہاں سے گزرنے والے کو نظر آ سکتا تھا۔ کیونکہ زینے میں روشنی ہو رہی تھی۔ پہلے سوچا کہ زینے کے اوپر بھاگ جاؤں۔ پھر سوچا کہ اوپر گیا تو بھی نظر آ جاؤں گا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہیں رہ کر کرنا تھا۔ قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی۔ یہ بھاری جوتوں کی آواز تھی۔ کوئی سنتری وہاں چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ میں دیوار کے بالکل ساتھ پشت لگا کر الرٹ ہو گیا۔ سائی لینسر والا ریوالور میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔

بوٹوں کی آواز تھپ تھپ کر کے قریب آ رہی تھی۔ پھر بہت قریب آ گئی اور اس کے بعد میں نے ایک وردی والے سنتری کو دیکھا جس کے کاندھے کے ساتھ رائفل لٹکی ہوئی تھی اور وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اس ڈیوٹی سے سخت بیزار ہو۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کی گردن توڑ سکتا۔ وہ مجھ سے دو قدم دور ہو گیا تھا اور مزید دور ہو رہا تھا۔ میرا ریوالور والا ہاتھ اپنے آپ اوپر اٹھا۔ میں نے سنتری کے سر کے پچھلے حصے کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور دوسرے لمحے ڈوگرا سنتری منہ کے بل گر پڑا۔ میرے ریوالور کی اتنی آواز نہیں آئی تھی مگر جب وہ فرش پر گرا تو اس کی رائفل بھی فرش سے ٹکرائی اور شور پیدا ہوا۔ میں اپنی جگہ پر اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ کہ ہو سکتا ہے آواز سن کر کوئی دوسرا سنتری وہاں آ جائے۔ ایک منٹ گزر جانے پر بھی جب کوئی نہ آیا تو میں نے دوڑ کر سنتری کی لاش کو ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے بعد میں راہ داری کی دیوار کے ساتھ لگ کر آگے کھسکنے لگا۔ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں تین چار قدم کھسک کر آگے گیا تھا کہ ایک جگہ دیوار سے پھیکی سی روشنی باہر آتی دکھائی دی۔ قریب جا کر دیکھا کہ یہ ایک کوٹھڑی تھی جس کے

آگے لوہے کا دروازہ لگا تھا۔ کراہنے کی آواز اس کوٹھڑی سے آ رہی تھی۔ میں نے سلاخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔

بڑا مدھم سا بلب دیوار کے ساتھ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں مجھے ایک انسانی ہیولا دیوار کے آگے صف پر لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ یہی آدمی کراہ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز دی۔

"گل خان؟"

کراہنے کی آواز ایک دم رک گئی۔ انسانی ہیولا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"اب کیا بات ہے۔ تم لوگ ایک ہی بار مجھے ختم کیوں نہیں کر دیتے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"گل خان یہ میں ہوں"

جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو جیسے اس انسان کے بدن میں بجلی پیدا ہو گئی۔ میں نے گل خان کو اس کی آواز سے پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھ کر ایک پاؤں دبا کر چلتا سلاخوں کے پاس آ گیا۔ گل خان پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گل خان کی جیسے ساری توانائیاں اور طاقتیں واپس آ گئی تھیں۔ کہنے لگا۔

"چابی سنتری کے پاس ہو گی"

میں نے دیکھا کہ سلاخوں والے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں تیزی سے سپاہی کی لاش کے پاس گیا۔ اس کی بیلٹ کو دیکھا۔ ایک جانب چابیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اسے کھینچ کر اتارا اور دروازے پر آ کر چابیاں لگا لگا کر قفل کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ گل خان نے کہا۔

"اگر تم نے سنتری کو ہلاک کر دیا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لئے دوسرا سنتری آنے ہی والا ہو گا۔ وہ چابی لگاؤ۔ وہ"

گل خان نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر گچھے میں سے ایک چابی پر انگلی

رکھی۔ میں نے وہ چابی لگائی تو قفل کھل گیا۔ گل خان نے جو میلی کچیلی سی چادر اوڑھ رکھی تھی وہ وہیں پھینکی اور باہر آگیا۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا اور زینے کی طرف تیز تیز قدموں سے چلا۔ گل خان میرے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم راہ داری کی دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہے تھے۔ پھر زینہ آگیا۔ ہم زینہ چڑھ کر اوپر والے دروازے پر آگئے۔ گل خان کہنے لگا۔

"اوپر بھی سنتری گشت کرتا ہے"

میں نے کہا۔

"جب میں آیا تھا تو میں نے اسے دیکھا مگر وہ گشت لگاتے ہوئے اس طرف گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔"

گل خان نے سرگوشی میں کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ سگریٹ بیڑی پینے کی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ ٹھہرو پہلے میں باہر نکلتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں گل خان پہلے میں باہر جاؤں گا۔ تم اسی جگہ بیٹھ جاؤ۔"

گل خان دروازے کے پاس پتھر کے زینے پر بیٹھ گیا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ڈوگرہ سنتری چھ سے سات آٹھ قدموں کے فاصلے پر میری طرف چلا آرہا تھا۔ میں دروازہ آہستہ سے بند کر کے وہیں اندر کی جانب زینے پر بیٹھ گیا۔ جب سنتری ذرا آگے چلا گیا تو گل خان کہنے لگا۔

"اس کے ہوتے ہوئے ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔ تمہارے پاس سائی لینسر والا ریوالور موجود ہے۔ اس سنتری کو بھی فوراً ٹھکانے لگا دو یہ بہت ضروری ہے۔"

میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی اور سنتری کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تھوڑا آگے جا کر واپس پلٹ گیا تھا۔ اور بھاری قدم رکھتا چلا آرہا تھا۔ میں نے دل میں اللہ پاک کو یاد کیا۔ اور باہر کی آواز پر کان لگا دیئے جیسے ہی سنتری کے قدموں کی آواز دروازے کے قریب آئی میں نے کراہنا شروع کر دیا۔ گل خان گھبرا کر ایک طرف ہٹ

گیا۔

"یہ تم کیا کرنے لگے ہو؟"

میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ چپ رہو۔ میرے کراہنے کی آواز سنتے ہی سنتری دوڑ کر دروازے کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ ایک دم کھول دیا۔

"کون ہو؟"

میں نے وہیں نیچے زینے پر بیٹھے بیٹھے ڈوگرہ سنتری کی گردن کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ ہی میرے ریوالور کی گولی سنتری کے حلق کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ منہ کے بل سیڑھیوں میں گر پڑا۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔ مین ہول ہے۔ ہمیں مین ہول میں اترنا ہے۔"

ہم آگے پیچھے دروازے میں سے نکل آئے۔

مجھے سامنے والے ٹیلے پر جو سنتری پہرہ دے رہے تھے ان کی طرف سے خطرہ تھا۔ اگر ان کی نظر اس طرف پڑ گئی یا انہیں ادھر تھوڑا سا بھی شک پڑا کہ کچھ ہل چل ہو رہی ہے یا انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں جو سنتری پہرہ دیتا تھا وہ نظر نہیں آرہا تو وہ اسے ضرور آواز دیں گے اور جب سنتری کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ میں دروازے میں سے نکلتے ہی بیٹھ گیا۔ گل خان ابھی تک دروازے کے اندر زینے پر ہی تھا۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا۔

"مین ہول سامنے ہے۔ ہم رینگ کر وہاں تک جائیں گے۔ ٹیلے پر پہرہ لگا ہے"

میں زمین پر لیٹ گیا۔ اور آہستہ آہستہ مین ہول کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ گل خان میرے پیچھے رینگتا ہوا چلا آرہا تھا۔ مین ہول کے پاس پہنچ کر میں نے اس کا ڈھکن اٹھا کر ایک طرف رکھا اور ایک طرف ہٹ کر گل خان سے دھیمی آواز میں کہا۔

"نیچے اتر جاؤ۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی سیڑھی لگی ہوئی ہے۔"

گل خان پر نقاہت طاری تھی۔ میں نے اسے ذرا ذرا لنگڑا کر چلتے بھی دیکھا تھا۔ لیکن وہ ہمارا ماسٹر سپائی تھا اور ایک زمانے میں اس نے بھی ہوشنگ آباد میں کمانڈو کی ٹریننگ

حاصل کی تھی۔ اس کا حوصلہ فرار کا راستہ نظر آنے پر بلند ہو گیا ہوا تھا۔ وہ مین ہول میں اتر گیا۔ میں نے اوپر سے کہا۔

"نیچے سیمنٹ کا بڑا پائپ ہے اس پر بیٹھ جاؤ"

اس کے ساتھ ہی میں بھی مین ہول میں اتر گیا۔ ابھی میں مین ہول کا آہنی ڈھکن کھینچ کر اوپر رکھ ہی رہا تھا کہ ٹیلے کی طرف سے کسی سپاہی نے اس سنتری کو آواز دی جو یہاں گارڈ ڈیوٹی پر متعین تھا۔ میں ڈھکن کو اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آہنی ڈھکن شاید کسی جگہ اٹک گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل رہا تھا۔ ٹیلے کی جانب سے دوسری آواز بلند ہوئی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو سٹین گن کا فائر ہوا۔ مجھے سامنے والی دیوار سے گولیوں کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ نیچے سے گل خان نے پوچھا۔

"اوپر کیا ہو رہا ہے نیچے کیوں نہیں آتے؟"

کچھ آدمیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈھکن کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا مگر ڈھکن جیسے زمین سے چمٹ گیا تھا۔ مین ہول کا بند ہونا بہت ضروری تھا۔ اس کے کھلے رہنے کا مطلب تھا کہ سپاہی ہمیں سرنگ کے اندر اتر کر بھون سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

"ڈھکن کہیں پھنس گیا ہے"

ٹیلے کی طرف سے سٹین گنیں فائر ہونے لگیں۔ سپاہیوں کے سیٹیاں بجانے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دل میں اپنے اللہ کو یاد کیا اور کہا اے میرے مولا! میری مدد فرما۔ اس کے بعد میں نے زور لگا کر جھٹکے سے ڈھکن کو کھینچا تو وہ میری طرف آ گیا۔ میں نے اسے مین ہول کے گول سوراخ کے اوپر اچھی طرح جمایا اور لوہے کا زینہ اتر گیا۔ نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ اوپر گولیاں چل رہی تھیں۔ سپاہی ایک دوسرے کو آوازیں دے کر ہوشیار کر رہے تھے۔ گل خان کے فرار کا پتہ چل گیا تھا۔

میں نے گل خان سے کہا۔

"ان لوگوں کو تمہارے بھاگنے کا علم ہو گیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس پائپ

کے اوپر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے آگے آگے چلتا ہوں۔"

نہ میں گل خان کو دیکھ سکتا تھا نہ اسے میری صورت نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے اوپر سے ہو کر سیمنٹ کے پائپ پر بیٹھ گیا اور رینگتے ہوئے ہماری واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ گل خان نے پوچھا۔

"یہ پائپ کس طرف نکلتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ گل خان سب ٹھیک ہو جائے گا"

ہم سرنگ میں نہر والے دہانے کی طرف آہستہ آہستہ روانہ ہو گئے۔ ہم گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے۔ جہاں سرنگ تنگ ہو گئی اور زمین پائپ کے تقریباً برابر ہو گئی تھی وہاں ہم اوندھے ہو کر رینگنے لگے۔ میں گل خان کو اندھیرے میں گائیڈ کرتا جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ فائرنگ کی آواز غلام رسول بھی سن رہا ہو گا۔ کہیں وہ کسی دوسری طرف نہ چلا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہمیں مین ہول میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہو اور جب ہم نہر میں سرنگ سے باہر نکلنے لگیں تو سامنے ڈوگرہ سپاہی ہمارے استقبال کو موجود ہوں اور ہم پر فائر کھول دیں۔ باہر کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

گل خان کا دم پھول گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سرنگ کتنی لمبی ہے؟"

میں نے کہا۔

"زیادہ لمبی نہیں ہے۔ تھک گئے ہو تو رک کر سانس لے لیتے ہیں۔"

وہ سانس درست کرتے ہوئے بولا۔

"سرنگ کے باہر ضرور ڈوگرہ پولیس یا فوجی سپاہی موجود ہوں گے۔ انہوں نے ہمیں مین ہول میں اترتے دیکھ لیا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"اب جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہمیں یہاں سے جتنی جلدی ہو نکل جانا چاہیے۔"

ہم سرنگ میں جتنی تیز رینگ سکتے تھے۔ رینگنے لگے آخر ہمیں ایک جگہ تازہ ہوا آتی محسوس ہوئی۔ گل خان میرے پیچھے آرہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ تازہ ہوا سرنگ کے نہر والے دہانے سے آرہی ہے۔

"ہم باہر نکلنے والے ہیں"

گل خان نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے"

انٹیروگیشن کی اذیتیں برداشت کر کر کے گل خان کی جسمانی حالت پوری طرح صحت مند نہیں تھی۔ وہ جذبے کے زور پر چلا آرہا تھا۔ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم لنگڑا کر کیوں چل رہے تھے؟"

اس نے کہا۔

"ایک ٹانگ پر انہوں نے گرم راڈ لگائے تھے۔"

میں نے پوچھا۔

"وہاں اور کتنے مجاہد ہیں۔"

گل خان نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ رات کو کسی وقت دوسری کوٹھڑیوں سے انسانی چیخوں کی آواز سنائی دیا کرتی تھی۔"

اس کا سانس باتیں کرنے سے پھول گیا۔ میں نے کہا۔

"گل خان! اب کوئی بات نہ کرنا۔"

تازہ ہوا زیادہ آنے لگی تھی۔ آخر ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ پہلے میں نہر میں نکلا۔ میں نے سر اوپر کر کے دائیں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ فائرنگ کی آواز وہاں نہیں آرہی تھی۔ فائرنگ رک گئی تھی۔ گل خان بھی سرنگ سے نکل آیا۔ ہم نہر کے پانی میں کھڑے تھے۔ پانی ہمارے گھٹنوں تک تھا۔ میری نظر سامنے والے کھوکھوں کے درمیان جو

جگہ تھی وہاں جمی ہوئی تھی۔ میں پریشان ہو گیا تھا کیونکہ مجھے اندھیرے میں وہاں غلام رسول کی جیپ کا ہیولا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گل خان کہنے لگا۔

"یہاں سے نکلو۔ ہم یہاں کیوں کھڑے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"سامنے والے کنارے کی طرف نکل آؤ۔"

ہم نہر میں جھک کر چلتے سامنے والے کنارے پر آگئے۔ کنارے پر آتے ہی میں نے گل خان سے کہا۔

"وہاں اندھیرے میں آجاؤ۔"

نہر کے کنارے کی ڈھلان سے اتر کر ہم لکڑی کے کھوکھوں کی جو دکانیں تھیں ان کے پیچھے اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ گل خان بولا۔

"وہ آدمی نہیں آیا کیا؟"

میں نے کہا۔

"میں اسی کو تلاش کر رہا ہوں۔"

اتنے میں ایک کھوکے کے عقب سے انسانی سایہ نکل کر تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ یہ غلام رسول تھا۔ آتے ہی بولا۔

"جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔"

ہم اٹھ کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔ جہاں کھوکھوں کی دکانیں ختم ہو جاتی تھیں وہاں درختوں کے نیچے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ غلام رسول نے ترپال اٹھا کر کہا۔

"اندر بیٹھ جاؤ۔"

ہم دونوں جیپ میں گھس کر بیٹھ گئے۔ غلام رسول نے ترپال گرا دی۔ دوسرے لمحے جیپ کا انجن سٹارٹ ہوا اور جیپ ایک طرف تیزی سے چل پڑی۔ جیپ پہلے ہموار

راستوں پر چلتی رہی پھر وہ بار بار اچھلنے لگی۔ جیسے پتھروں پر چل رہی ہو۔ اس کے بعد پھر کوئی ہموار سڑک آگئی۔ جیپ میں اندھیرا تھا۔ میں نے گل خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"گل خان! تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"ہاں" گل خان نے کمزور آواز میں کہا۔

غلام رسول اپنے ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی۔ جیپ کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ کتنی دیر تک جیپ سیدھی سڑک پر چلتی رہی پھر اس نے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد موڑ مڑنے شروع کر دیئے پھر چڑھائیاں اترائیاں شروع ہو گئیں۔ جیپ نیم پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ ایک جگہ جیپ دیر تک نشیب میں چلتی گئی۔ پھر ایک جانب مڑ گئی۔ جیپ کے ساتھ جھاڑیوں کے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیپ کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ جیپ ایک طرف گھومی اور پھر رک گئی۔ غلام رسول نے پیچھے آکر ترپال کی رسیاں کھول کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ باہر اندھیرا تھا مگر اندھیرے میں ہمیں غلام رسول نظر آرہا تھا۔ وہ بولا۔

"آجاؤ"

میں جیپ سے نیچے کود گیا۔ پھر گل خان کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ غلام رسول نے گل خان سے کہا۔

"تم ہمارے بہادر مجاہد ہو گل خان۔ فکر نہ کرو اب تم اپنے آدمیوں میں ہو۔ ہم تمہیں بہت جلد صحت مند کر دیں گے۔"

میں نے اوپر دیکھا درختوں کے درمیان سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آرہے تھے۔ غلام رسول ہمیں لے کر درختوں میں ایک طرف چلنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ جب میں مین ہول میں داخل ہونے لگا تھا تو وہاں زبردست فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ غلام رسول بولا۔

"فائرنگ کی آواز میں نے بھی سنی تھی۔ اسی لئے میں جیپ وہاں سے نکال کر دوسری

جگہ لے گیا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تمہیں مین ہول میں داخل ہوتے کسی نے نہیں دیکھا۔

"میں نے کہا۔"

"میرا خیال بھی یہی ہے کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔"

غلام رسول کہنے لگا۔

"خیال کیا ہے۔ تمہیں اگر انہوں نے مین ہول میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہوتا تو تم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہوتا۔"

غلام رسول کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"یہ تو طے ہے کہ گل خان کے فرار ہونے کا سب کو پتہ چل گیا ہے اور اسی وقت جموں شہر کی سپیشل پولیس اور ملٹری انٹیلی جنیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہوگا اور گل خان کی تلاش شروع ہو گئی ہوگی۔ مگر یہاں تم لوگ محفوظ ہو گے۔"

میں نے کہا۔

"کیا ہم کسی خاص خفیہ ٹھکانے پر جا رہے ہیں؟"

غلام رسول بولا۔

"یہی سمجھ لو۔"

گل خان میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ ہمارے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے دلی سے میرے نکلنے کے بعد کی باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگا۔

"جب تمہیں ان لوگوں نے اپنے جال میں پھنسا کر امرتسر جیل کی طرف روانہ کیا تو اس کے فوراً بعد کانگریس مسلمان خدا بخش کے گھر پر چھاپہ مارا کہ وہ ایک پاکستانی جاسوس کو کہاں سے لے کر ان کے تربیتی سنٹر میں بھرتی کرانے آگیا تھا؟ کانگریسی مسلمان نے اپنی جان بچانے کے لئے میرا نام لے دیا۔ کہ میرے پاس گل خان اس نوجوان کو لے کر آیا تھا۔ پولیس نے میرے ہاں چھاپہ مارا اور مجھے گرفتار کر کے لال قلعے میں لے گئی۔ بس کچھ نہ پوچھو اس کے بعد جو تشدد اور غیر انسانی اذیتوں کا دور شروع ہوا ہے۔ مگر میں نے بھی

زبان نہیں کھولی۔"

غلام رسول کہنے لگا۔

"ہمارے ہر حریت پسند مجاہد کی یہی شان ہے کہ اگر وہ پکڑا جائے تو موت کو ہنسی خوشی گلے لگالیتا ہے مگر اپنے کسی ساتھی کا نام اور اپنے ہائیڈ آؤٹ کا پتہ نہیں بتائے گا۔"

گل خان نے کہا۔

"مجھے اس انٹیروگیشن سنٹر میں ہی پتہ لگ گیا تھا کہ ایک پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ میں نے جب سنا کہ اس جاسوس کو دلی سے پکڑ کر لایا گیا تھا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ تم ہی ہو مجھے خوشی ہوئی تھی کہ کم از کم تمہیں بھارتی درندوں کے تشدد سے تو نجات ملی"

چاند نکل آیا تھا۔ یہ پورا چاند نہیں تھا۔ اس کی روشنی بھی چودھویں کے چاند ایسی نہیں تھی۔ پھر بھی اتنی چاندنی ضرور ہو گئی تھی کہ ہمیں آس پاس کی جھاڑیاں اور درخت اور ٹیلے نظر آنے لگے تھے۔ میں اور گل خان آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اس نے میرے کندھے کا سہارا لیا ہوا تھا۔ مجاہد غلام رسول ذرا آگے چل رہا تھا۔ ایک ہم نشیب میں اترے۔ یہ ایک گھاٹی تھی۔ آگے تھوڑی سی کھلی زمین آگئی۔ یہاں میں نے اونچی نیچی پتھروں کی ڈھیریاں دیکھیں تو سمجھ گیا کہ یہ کوئی ویران قبرستان ہے۔ آگے آئے تو قبروں پر جھکی ہوئی دو چار جھیلیں نظر آئیں۔ غلام رسول نے بتایا کہ یہ عیسائیوں کا بہت پرانا قبرستان ہے۔ پندرہ بیس قبریں ہی ادھر ادھر بنی ہوئی تھیں۔ کئی قبروں کے اوپر سے پتھر ہٹے ہوئے تھے اور گڑھے پڑ گئے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ اس قبرستان میں اب کوئی اپنے مردے دفنانے نہیں آتا۔ غلام رسول ایک دیوار کے پیچھے ہو گیا۔ دیوار پر میں نے جنگلی بیل چڑھی ہوئی دیکھی۔ وہ دیوار کے پیچھے جا کر رک گیا۔ ہم بھی رک گئے۔ یہاں جھاڑیوں کے درمیان ایک قبر پر صلیب لگی ہوئی تھی۔ آدھی صلیب جنگلی سرکنڈوں میں چھپ گئی تھی۔ غلام رسول نے مجھ سے کہا۔

"میرے ساتھ اس پتھر کی سل کو اٹھاؤ"

قبر کے اوپر پتھر کی ایک چوڑی صلیب پڑی تھی۔ ہم نے مل کر سل کو ہٹا دیا۔ نیچے قبر کا گڑھا تھا۔ غلام رسول گڑھے میں اتر گیا۔ کہنے لگا۔

"تم بھی نیچے آجاؤ"

پھیکی چاندنی میں غلام رسول قبر کے گڑھے میں جیسے غائب ہو گیا۔ پہلے میں قبر میں اترا۔ اس کے بعد میں نے گل خان کو سہارا دے کر گڑھے میں اتار لیا۔ ہم نے دیوار کے نیچے دیکھا۔ وہاں غلام رسول اندھیرے میں بیٹھا درخت کی کٹی ہوئی شاخوں کو ادھر ادھر ہٹا رہا تھا۔ یہاں قبر کے پہلو میں جھاڑیوں کی شاخیں ہٹانے سے ایک شگاف نظر پڑا۔ غلام رسول اس میں داخل ہو گیا۔ میں اور گل خان بھی جھک کر شگاف میں داخل ہو گئے۔ اندر جا کر میں حیران رہ گیا۔ قبر کے پہلو میں یہاں ایک دالان تھا جس میں باقاعدہ ستون لگے ہوئے تھے۔ دالان میں تازہ ہوا بھی آرہی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے موم بتی روشن کر دی۔ کونے میں ایک مٹکا رکھا تھا جس کے ڈھکن کے اوپر پلاسٹک کا ڈونگا پڑا تھا۔ ہم خشک گھاس پر بیٹھ گئے۔ غلام رسول کہنے لگا۔

"یہ جگہ کچھ عرصہ پہلے ہماری خفیہ کمیں گاہ ہوا کرتی تھی۔ کل میں نے اسے صاف وغیرہ کروا کر تازہ پانی کا مٹکا بھی رکھوا دیا تھا۔"

گل خان لیٹ گیا تھا۔ ہم نے اس کی ٹانگ کا زخم دیکھا۔ وہاں سلاخ سرخ کر کے لگائی تھی۔ زخم خراب ہو رہا تھا غلام رسول نے کہا۔

"میں زخم پر لگانے کے لئے دوائی اور پٹیاں لے کر آؤں گا۔ تم لوگ دن کے وقت یہاں چھپے رہو گے۔ باہر نکلنا ہو تو صرف رات کے وقت نکلنا اور وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ۔ گل خان کے فرار کے بعد انٹیلی جینس کے آدمی سارے شہر میں پھیل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی آدمی اس طرف بھی آنکلے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہاں ہم نے ایک طرف تازہ ہوا کا بندوبست کر رکھا ہے۔ میں دن نکلنے کے بعد کسی وقت آؤں گا۔"

غلام رسول چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ قبر کے اوپر پتھر کی سل ڈال گیا۔ میں اور گل خان کچھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ گل خان کی ٹانگ کا زخم درد کر رہا تھا مگر وہ ایک

سرفروش کمانڈو کی طرح درد کو برداشت کئے ہوئے تھا۔ موم بتی آہستہ آہستہ جل رہی تھی۔ غلام ہمارے پاس دو چار فالتو موم بتیاں اور ایک ماچس بھی چھوڑ گیا تھا۔ ہم نے موم بتی جلتے رہنے دی اور سو گئے۔ جب میری آنکھ کھلی تو موم بتی بجھ چکی تھی۔ تہہ خانے میں قبر ایسا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے ایک طرف چھت پر غور سے دیکھا۔ جس جگہ چھت میں تازہ ہوا کے لئے سوراخ رکھا ہوا تھا وہاں سے دن کی پھیکی روشنی آرہی تھی۔ میں نے جھک کر موم بتی کو دیکھا۔ وہ پگھل کر بجھ چکی تھی۔ گل خان گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اسے سویا رہنے دیا اور اٹھ کر قبر کے گڑھے میں آگیا۔ دونوں ہاتھوں سے قبر کے اوپر رکھی ہوئی پتھر کی سل کو ایک طرف ہٹایا۔ اندر دن کی چکا چوند کر دینے والی روشنی آگئی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ ویران قبرستان میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں پر ایک چڑیا بول رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں قبر سے باہر نکل آیا۔ قبروں میں سے گزرتا ہوا پھلاہی کے درختوں میں آگیا۔ غلام رسول نے بتایا تھا کہ یہاں نشیب میں پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ بہتا ہے۔ میں نے نالے میں اتر کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس قبر کے تہہ خانے میں آگیا۔ گل خان جاگ گیا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اگر تم باہر جا سکتے ہو تو باہر جا کر دائیں جانب پھلاہی کے درختوں میں ایک نالہ بہہ رہا ہے۔ وہاں منہ ہاتھ دھو آؤ"

وہ اٹھ کر تھوڑا لنگڑاتا ہوا قبر سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آگیا۔ ہم نے قبر کے اوپر پتھر کی سل دوبارہ رکھ دی تھی۔ وہاں اتنی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ہمیں ایک دوسرے کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ گل خان کہنے لگا۔

"یہاں ہم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ پولیس اور انٹیلی جینس کے آدمی یہاں آسکتے ہیں"

میں نے کہا۔

"یہ تو غلام رسول ہی آکر بتائے گا کہ شہر کی کیا صورت حال ہے اور پولیس ہمیں کہاں کہاں تلاش کر رہی ہے۔"

کچھ دیر گزری ہو گی کہ ہمیں قبر کا پتھر ہٹانے کی آواز آئی۔ میں نے ریوالور سنبھال لیا اور تہہ خانے میں سے نکل کر قبر کے گڑھے میں آکر اوپر دیکھنے لگا۔ قبر کی سل ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے ریوالور کا رخ اوپر کر دیا۔ میں نے غلام رسول کو دیکھا۔ اس نے بڑا سا تھیلا نیچے پھینکا اور پھر خود بھی نیچے اتر آیا۔ ہم نے مل کر قبر کو سل سے ڈھک دیا۔ تہہ خانے کے دالان میں آکر غلام رسول نے تھیلے میں سے ہمارے لئے چار روٹیاں نکال کر ہمیں دیں۔ ان کے اوپر اچار رکھا ہوا تھا۔ پھر سپرٹ کی چھوٹی بوتل نکال کر گل خان کے زخم کو صاف کر کے اس کے اوپر پٹی باندھ دی ہم اچار کے ساتھ روٹی کھانے لگے۔

میں نے غلام رسول سے شہر کی صورت حال پوچھی۔ وہ کہنے لگا۔

"گل خان کی تلاش میں ساری انٹیلی جینس ایجنسیوں کے آدمی کتوں کی طرح بو سونگھتے پھر رہے ہیں انٹیروگیشن سنٹر کے سارے علاقے کو جموں پولیس اور ملٹری پولیس نے اپنے محاصرے میں لے لیا ہے۔ جموں کے مسلمان محلوں میں پولیس گھر گھر تلاشی لے رہی ہے۔ اس انٹیروگیشن سنٹر سے کسی حریت پرست کا فرار کا یہ پہلا واقعہ ہے جس میں سنٹر کے سنتری بھی قتل ہو گئے ہیں۔"

گل خان کہنے لگا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کتنے دن یہاں چھپے رہنا ہو گا۔ مجھے خطرہ ہے کہ میرا زخم مزید خراب نہ ہو جائے اور ٹانگ کٹوانی پڑے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی بھی خطرہ مول لے کر یہاں سے نکل جانے کو ترجیح دوں گا۔"

غلام رسول کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"اگر حالات کو دیکھا جائے تو تم لوگوں کا ابھی یہاں سے نکلنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ لیکن تمہارا زخم واقعی کافی بگڑ چکا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں کسی طرح خطرہ مول لے کر یہاں سے نکال دوں"

غلام رسول نے میری طرف دیکھا۔

"ویسے بھی مجھے تم لوگوں کو ایک ایک کر کے یہاں سے نکالنا ہو گا۔ تمہارا کیا خیال

ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ گل خان کو یہاں سے نکال کر کسی ایسی جگہ لے جایا جائے جہاں اس کے زخم کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔"

غلام رسول اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں سورج غروب ہونے کے بعد آؤں گا۔ ویسے گل خان! میرے بھائی تم تیار رہنا۔ ایک جگہ میرے ذہن میں آتی ہے۔ وہاں ہمارا ایک مجاہد ڈاکٹر تمہارا علاج کر سکے گا تمہیں ویسے بھی طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

گل خان کی آنکھ بھی ایک طرف سے سوجی ہوئی تھی۔ جسم پر بھی تشدد کے اثرات تھے۔ غلام رسول چلا گیا۔ ہم دونوں نے سارا دن قبر کے تہہ خانے میں گزار دیا۔ صرف ایک دفعہ باری باری کر کے قبر سے باہر نکلے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس قبر میں اتر گئے۔ ہم قبر کے تہہ خانے میں گھاس پر لیٹے رہے۔ ہماری آنکھیں چھت والے سوراخ پر لگی رہیں۔ جب اس سوراخ میں آتی دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تو میں نے گل خان سے کہا۔

"گل خان! شام ہو رہی ہے"

کچھ وقفے کے بعد سوراخ کی روشنی غائب ہو گئی۔ باہر سورج غروب ہو گیا تھا۔ ہم غلام رسول کا انتظار کرنے لگے۔ میری گھڑی نے جب رات کے آٹھ بجائے تو قبر کے پتھر ہٹانے کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔

"غلام رسول آ گیا ہے"

پھر بھی میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور قبر کے گڑھے میں آ گیا۔ گل خان نے جلتی ہوئی موم بتی کے آگے ہاتھ اس طرح کر لیا کہ آدھے تہہ خانے میں اندھیرا ہو گیا۔ مگر یہ غلام رسول ہی تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"میں نے گل خان کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کوئی محفوظ جگہ ہے ناں؟"

میرے اس سوال پر غلام رسول بولا۔

"بالکل محفوظ جگہ ہے۔ یہاں سے پندرہ بیس میل دور ہے۔ وہاں ہمارے ایک مجاہد کی گاؤں میں چھوٹی سی ڈسپنسری ہے وہ گل خان کو اپنے گھر میں چھپا کر اس کا علاج کرے گا۔ گل خان! میرے ساتھ آ جاؤ۔"

گل خان گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے گلے ملا۔ کہنے لگا۔

"زندگی رہی تو جہاد کشمیر کے کسی محاذ پر پھر ملیں گے۔ اگر شہید ہو گئے تو اگلے جہاں میں ملاقات ہو گی۔"

غلام رسول نے گل خان کو سہارا دے کر قبر سے باہر نکال دیا۔ وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"ابھی کچھ وقت یہی رہنا ہو گا۔ تھیلے میں تمہارے لئے روٹیاں لے کر آیا ہو۔ دن کے وقت یہاں سے باہر مت نکلنا۔"

گل خان کو لے کر غلام رسول چلا گیا۔ قبر بند ہو گئی۔ میں قبر کے تہہ خانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ موم بتی روشن تھی۔ میں نے تھیلا کھولا۔ اس میں تین روٹیاں تھیں۔ میں نے ایک روٹی کا نوالہ کھایا۔ روٹیاں میٹھی تھیں۔ میں نے ایک روٹی کھا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے خشک گھاس کے بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک مجھے لوبان کی بو محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چندریکا کی بدروح آ گئی تھی۔ یہ اس کی بو تھی۔ موم بتی کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے تہہ خانے کے دالان میں چاروں طرف دیکھا۔ چندریکا کی بدروح نظر نہ آئی۔ میں نے اسے آواز دی۔

"چندریکا! یاد رکھو۔ اگر تم میری دشمن بن چکی ہو تو میں بھی تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ تم بتوں کی پوجا کرنے والی کافر بدروح ہو۔ میں ایک خدا اور رسول ﷺ کو ماننے والا مسلمان ہوں۔ تم انڈیا کے اپنے سارے بتوں کو اپنے سارے دیوتاؤں کو لے کر آ جاؤ۔ تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکو گی مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ میرے اللہ کی طاقت کا تم

تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ نہیں تو تمہیں جہنم میں بھی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔"

لوبان کی بو تیز ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ چندریکا کی بدروح میرے بہت قریب تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اب اس نے مجھ سے بات کرنا بند کر دیا تھا۔ اچانک مجھے چنبیلی کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ میری شہید بہن کی روح کی خوشبو تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"میری پیاری بہن کلثوم! کیا یہ تم ہو؟"

شہید کی روح نے بھی مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اب ایسا ہوا کہ لوبان کی بو ایک دم غائب ہو گئی اور فضا چنبیلی کی پاکیزہ خوشبو سے لبریز ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے اپنی شہید بہن کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"پیاری بہن! مجھ سے بات کرو۔ میں تمہاری آواز سننے کو ترس گیا ہوں۔ کیا شہیدوں کی روحیں بات نہیں کرتیں؟"

چنبیلی کی پاکیزہ خوشبو جیسے میرے بالکل قریب آ گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ خوشبو دور ہونے لگی۔ میں اپنی شہید بہن کی روح کو پکارتا ہی رہ گیا اور وہ اپنی فردوس بریں کی خوشبو لے کر چلی گئی۔

اس کے بعد میں دیر تک اپنی بہن کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہا۔ رات کو میں بالکل نہ سو سکا۔ ساری رات بیٹھا خدا کے حضور اپنی بخشش اور جہاد کشمیر میں مسلمانوں کی کامیابی کی دعائیں مانگتا رہا۔ اس کے بعد چھت والے سوراخ میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ باہر دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ صبح ہو گئی تھی۔ میں تیمم کر کے وہیں نماز پڑھی۔ مجھے باہر جانا تھا۔ اٹھا اور قبر کے پتھر کے سل کو سرکا کر قبر سے باہر آ گیا۔ پہلے میں نے گردن ذرا سی باہر نکال کر قبرستان کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ میں قبروں کے درمیان سے گزر کر بڑی احتیاط سے نشیبی نالے پر آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور اٹھ کر واپس قبر کے تہہ خانے کی طرف چل پڑا۔ میں پھلاہی کے درختوں سے

نکل کر چند قدم چلا ہوں گا کہ میں نے ایک آدمی کو ایک قبر کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس کا لباس سیاہ تھا۔ گھٹنوں تک سیاہ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ حلیے سے کوئی پادری لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔ سوچا دوسری طرف سے ہو کر نکل جاؤں۔ مگر وہ ہماری کمیں گاہ والی قبر سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا اور مجھے قبر میں داخل ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ میں وہیں سرکنڈوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پادری صاحب نے قبر پر گلدستہ رکھا اور ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگے۔ میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دعا مانگنے کے بعد اس نے جھک کر قبر کی ٹیڑھی صلیب کو چوما۔ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور واپس مڑا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا جہاں میں سرکنڈوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ صورت حال ایسی ہو گئی کہ اگر میں سرکنڈوں میں سے نکل کر دوسری طرف جاتا تو وہ پادری مجھے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے پھلاہی کے درختوں میں سے آتا دیکھ چکا تھا۔

میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہ آدمی کون تھا اور میرے ساتھ کیا کچھ ہونے والا تھا۔ پادری سیدھا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں نے یونہی سرکنڈوں کو توڑ توڑ کر جمع کرنا شروع کر دیا۔ پادری منہ ہی منہ میں بائبل کی کوئی مناجات پڑھتا میرے قریب سے گزر گیا۔ اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزر کر قبرستان سے باہر چلا گیا تو میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر میں ابھی اپنی خفیہ کمیں گاہ کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے ایک بار پھر پھلاہی کے درختوں کی طرف چل پڑا۔ درختوں میں پہنچ کر میں ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا پادری صاحب دور چلے گئے تھے۔ پھر وہ ٹیلے کے پیچھے جو سڑک جاتی تھی اس طرف مڑ گئے اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی قبر میرا مطلب ہے اپنی کمیں گاہ والی قبر کی طرف بہت محتاط ہو کر چلنے لگا۔ مجھ سے ایک بے وقوفی یہ بھی ہوئی تھی کہ جب میں قبر سے باہر گیا تھا تو سب سائیلینسر والا ریوالور اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ غلام رسول کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کب آتا ہے۔ وہ گل خان کو محفوظ جگہ چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ دن کے

وقت ویسے بھی وہ نہیں آتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس کے آگے پادری صاحب کا ذکر نہیں کروں گا۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ میں قبر سے باہر نکلا تھا اور ایک پادری کو قبر پر مناجات پڑھتے اور پھول رکھتے دیکھا تھا وہ سخت ناراض ہو گا کہ میں دن کے وقت قبر سے باہر کیوں نکلا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ قبر سے رات کے بعد نکلنا ہو تو منہ اندھیرے نکلنا۔ سورج طلوع ہونے کے بعد بالکل باہر نہ آنا۔

میں قبر کے تہہ خانے میں بیٹھا تھا۔ مگر جب سے میں نے اس پادری کو دیکھا تھا مجھے ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اب میں تہہ خانے میں محفوظ نہیں ہوں۔ وہ پادری ضرور سی آئی ڈی کا آدمی ہو گا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہو گا اور پولیس قبر پر چھاپہ مارنے کے لئے آ رہی ہو گی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پادری واقعی ایک نیک دل پادری تھا اور اپنے کسی عزیز کی قبر پر مناجات کے لئے آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ بھی لیا ہو گا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے کیا معلوم کہ میں کون ہوں۔ میں تو سرکنڈے توڑ رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا ہو گا کہ میں کوئی مزدور ٹائپ آدمی ہوں مگر میرا دل مجھے قبر کے اندر ٹھہرنے نہیں دے رہا تھا۔ میری چھٹی حس بے دار ہو چکی تھی اور وہ مجھے قبر سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ آخر میں نے ریوالور نکال کر چیک کیا۔ اسے دوبارہ پتلون کی جیب میں ڈالا اور تہہ خانے سے نکل کر قبر کے گڑھے میں آ گیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے پتھر کی سل کو ایک طرف اس طرح کھسکایا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ پھر میں نے آہستہ سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ قبرستان بالکل خالی تھا۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔ پتھر کی سل قبر پر دوبارہ رکھی اور جس طرف پہاڑی نالہ تھا اس طرف جانے کی بجائے قبرستان کی دوسری طرف جدھر خدا جانے شیشم کے یا نیم کے اونچے اونچے درخت تھے اس طرف چلا گیا۔ میں قبرستان سے باہر بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ آگے جموں شہر تھا جہاں میری تلاش میں پولیس نے جگہ جگہ ناکہ بندی کر رکھی تھی۔

اصل میں میں تہہ خانے سے باہر آنا چاہتا تھا۔ تہہ خانے میں مجھے سخت خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ وہاں اگر چھاپہ پڑ جاتا تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ریوالور کی گولیوں سے

پولیس یا ملٹری پولیس کی فائرنگ کا کب تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ تہہ خانے سے باہر آ کر میں نے سکون کا سانس ضرور لیا تھا۔ میں درختوں کے نیچے ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ اگر ممکن ہو تو میں سارا دن باہر اسی جگہ بیٹھ کر گزار دوں اور جب رات ہو جائے اور غلام رسول مجاہد کے آنے کا وقت ہو جائے تو تہہ خانے میں چلا جاؤں۔ سورج آسمان پر مشرقی افق سے اوپر آ گیا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ آس پاس نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔ کچھ فاصلے پر بھورے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں ایک کسان ہل چلاتا نظر آیا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ جب پونے آٹھ کا وقت ہوا تو میں نے سوچا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں بیٹھا رہا تو کسی راہ گیر کی نگاہوں میں آ سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تہہ خانے میں ہی چلا جاؤں۔ کم از کم وہاں مجھے کوئی دیکھے گا تو نہیں۔ یہ سوچ کر میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک کی بجائے دو گاڑیاں آ رہی تھیں۔ میں نے ان کا رنگ اور شکل پہچان لی۔ دونوں گاڑیاں پولیس کی تھیں۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اٹھ کر بھاگ سکتا۔ آگے آگے پولیس کی جیپ تھی۔ پیچھے موٹر کار تھی۔ دونوں گاڑیاں جہاں میں چھپ کر بیٹھا تھا وہاں سے سولہ سترہ قدموں کے فاصلے پر قبرستان کے شکستہ دروازے کے آگے آ کر رک گئیں۔ گاڑیوں کے رکتے ہی ان میں سے سات آٹھ سپاہی کود کر باہر نکلے۔ دو وہیں رائفلیں لے کر کھڑے ہو گئے اور باقی قبروں کو الانگتے پھلانگتے اس طرف دوڑے جس طرف تہہ خانے والی قبر تھی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے چار سپاہی پوزیشنیں سنبھال کر تین اطراف کو کھڑے ہو گئے۔ ایک ان میں ہیڈ کانسٹیبل یا تھانیدار تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا وہ دو سپاہیوں کے ساتھ پتھر کی سل والی قبر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں کو قبر کی طرف اشارہ کیا۔ سپاہیوں نے فوراً پتھر کی سل اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور رائفلیں تانے قبر کے گڑھے میں کود گئے۔ میں نے ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جو گاڑیوں کے پاس الرٹ ہو کر کھڑے تھے۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت تھا۔ زیادہ زیادہ

دو منٹ ہوں گے۔ ان دو ایک منٹ کے اندر قبر میں اترے ہوئے سپاہیوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ قبر کے اندر کوئی نہیں لیکن وہاں میری موجودگی کے تمام آثار موجود ہیں روٹیوں والا رومال' چائے کی تھرمس' پانی کا منکا اور جلی ہوئی موم بتیوں کی موم اور تین چار تازہ موم بتیاں دونوں سپاہی اس طرح کھڑے تھے کہ ان کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ یہ بات ایک طے شدہ امر تھا کہ ایک منٹ کے اندر خالی قبر کی طرف سے کانسٹیبل اور سپاہیوں نے سارے قبرستان کو گھیر کر علاقے کی تلاشی لینی شروع کر دینی تھی۔ اور مجھے پکڑ لینا تھا۔

میرا دماغ تیزی سے سوچنے لگا۔ مگر شاید وہاں اب سوچنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ سائی لینسر والا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ اتنی پریشان کر دینے والی صورت حال میں بھی میں نے اپنے حواس کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں میری کمانڈو ٹریننگ کے علاوہ میرے مزاج کا بھی کافی دخل تھا۔ میں نے صرف یہ جائزہ لیا کہ مجھے کس جانب سے حملہ کرنا چاہئے۔ دوسرے لمحے میں جھاڑیوں کے پیچھے سانپ کی طرح رینگتا ہوا پولیس کی گاڑی کے آگے کھڑے ڈوگرہ سپاہیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ آگے کچا راستہ تھا۔ سامنے چند قدموں پر پہلی گاڑی اور آگے جیپ تھی۔ ایک ڈوگرہ سپاہی کی میری جانب پشت تھی۔ اس نے رائفل ہاتھ میں لٹکائی ہوئی تھی۔ دوسرا سپاہی بھی رائفل اسی طرح پکڑے قبرستان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک اس وقت قبرستان کی طرف سے کانسٹیبل کی یا کسی سپاہی کی آواز آئی۔

"وہ۔ یہیں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔ ناکہ بندی کرو"

سپاہی قبرستان میں ادھر ادھر دوڑے۔ دونوں سپاہی جو گاڑیوں کے پاس کھڑے تھے ادھر تکنے لگے۔ بس یہی لمحہ میرے لئے زندگی اور موت کے درمیان کا لمحہ تھا۔ میری زندگی اور موت کے درمیان اسی ایک لمحے کا پل صراط تھا۔ میں زمین پر سے اٹھا اور نشانہ بازی کی اپنی تمام تر مہارت اور تجربے سے کام لیتے ہوئے ریوالور کا رخ سپاہیوں کی طرف کیا اور یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔ ریوالور میں سے دو گولیاں فائر ہوئیں اور مجھے دونوں سپاہی اپنی جگہ سے لڑکھڑا کر گرتے نظر آئے۔ تیسرا فائر میں نے اگلی جیپ کی طرف

دوڑتے ہوئے پچھلی موٹر کے ٹائر پر کیا۔ مگر نشانہ چوک گیا۔ میں نے اس لئے گاڑی کے ٹائر پر فائر کیا تھا کہ پولیس میرا تعاقب نہ کر سکے۔ قبرستان کی خاموش فضا میں سائی لینسر والے دو فائروں کی یکے بعد دیگرے کی ٹھک ٹھک کی آواز اور گرتے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی کی چیخ نے قبرستان والے سپاہیوں کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ اس وقت میں جیپ میں بیٹھ چکا تھا۔ اور سیلف لگا کر جیپ کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کانسٹیبل یا تھانیدار کے علاوہ باقی سپاہیوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ دن کی روشنی میں ایک سویلین کپڑوں والے آدمی کو پولیس کی جیپ سٹارٹ کرتے اور دو سپاہیوں کو زمین پر تڑپتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ میں ہی مفرور گل خان ہوں۔ انہوں نے وہیں سے فائرنگ شروع کر دی۔ اس وقت جیپ سٹارٹ ہو چکی تھی اور میں نے گاڑی کو فسٹ گیئر میں ڈال کر زور سے فل سپیڈ پر جیپ کو سڑک پر ایک طرف گھما دیا تھا۔ گولیاں جیپ کی باڈی سے ٹکرائیں۔ میں نے سر نیچے کر لیا۔ جیپ تیز رفتاری سے کچے راستے پر دوڑنے لگی۔

پیچھے پولیس والوں کی شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے جیپ کے سائیڈ پر لگے آئینے میں پیچھے دیکھا۔ پولیس کی گاڑی میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ مجھ پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ پولیس کے پاس گولیوں کی کمی نہیں ہے۔ پولیس ایسی صورت میں مجھ پر گولیاں چلانے سے رک سکتی تھی کہ میں اپنی جیپ کو آبادی والے علاقے میں لے چلوں۔ دن کی روشنی میں سارا علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ غلام رسول رات کے وقت ہمیں گاڑی میں بٹھا کر ویران علاقوں سے قبرستان میں لایا تھا۔ مجھے بائیں جانب پکی سڑک پر گاڑیاں اور دو تانگے چلتے نظر آئے۔ میں کچی سڑک پر سے جیپ کو نکال کر پکی سڑک پر لے آیا۔ ٹریفک والی سڑک پر آتے ہی پولیس نے مجھ پر اندھا دھند گولیاں چلانی بند کر دیں۔ اب وہ پیچھے سے میری جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹریفک والی سڑک پر آنے سے مجھے ایک فائدہ تو ضرور ہو گیا تھا کہ میری جان محفوظ ہو گئی تھی کیونکہ پولیس مجھ پر بالکل سیدھ میں گولی فائر نہیں کرتی تھی اس طرح مجھ سے آگے کسی تانگے میں بیٹھی ہوئی سواری یا سکوٹر سوار یا کسی دکان پر کھڑے آدمی کو نشانہ چوک

جانے سے گولی لگ سکتی تھی۔ لیکن سب سے بڑا خطرہ یہ پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ میں جموں شہر کی آبادی میں داخل ہو گیا تھا اور یہاں چاروں طرف سے مجھے بڑی آسانی سے قابو میں کیا جا سکتا تھا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ میں ایک چوک میں آیا تو ٹریفک پولیس کے سپاہی نے ہاتھ دے کر میری طرف والی ٹریفک روک رکھی تھی مگر میں پوری رفتار سے چوک میں سے گزر گیا اور دو گاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سارجنٹ سیٹیاں بجانے لگا۔ وہاں سے بھی ٹریفک کا ایک سپاہی اپنے سکوٹر پر میرے پیچھے لگ گیا۔ جس سڑک پر میں جا رہا تھا وہ مجھے جس طرف لے جا رہی تھی میں اسی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ دائیں بائیں اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں جانب مکان اور دکانیں تھیں۔ سڑک پر ہڑبونگ سا مچ گیا تھا۔ ٹریفک درہم برہم ہو رہی تھی۔ دوسرا چوک آیا تو وہاں بھی میں نے ٹریفک کا اشارہ کاٹ دیا۔ اب میرے پیچھے پولیس کی ایک اور گاڑی لگ گئی۔ میں گاڑی زیادہ تیز بھی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ لوگ آگے آ رہے تھے اور آگے آتے ہی ادھر ادھر بھاگنے لگتے تھے۔

میں واقعی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اپنے حواس کو میں نے منتشر نہیں ہونے دیا تھا مگر پریشان ضرور ہو رہا تھا کہ پولیس سے بچ کر کس طرف کو نکلوں؟ میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ میری بدقسمتی کو آگے جا کر بازار تنگ ہو گیا۔ پھر اچانک ایک ٹرک بھی سامنے آ گیا۔ میں نے پوری طاقت سے اسٹیرنگ کو بائیں طرف گھمایا اور جیپ الٹتے الٹتے بچی مگر دوسری بار گھمانے سے وہ ٹرک کے پیچھے سے ہو کر آگے نکل آئی۔ لیکن مزید بدقسمتی وہاں میرا انتظار کر رہی تھی۔ آگے دو بیل سڑک کے عین درمیان میں کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ کسی طرف سے بھی جیپ کے گزرنے کا راستہ نہیں تھا۔ پیچھے سے مجھے پولیس کی گاڑی کے زور سے بریک لگنے کی چیخ اور سپاہیوں کے شور کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جیپ کو بریک لگا چکا تھا۔ میں نے جیپ میں سے چھلانگ لگائی۔ سامنے ایک گلی تھی۔ میں اس گلی کی طرف دوڑ پڑا۔ گلی تنگ تھی۔ پیچھے سپاہیوں کے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں تیزی سے بھاگنے لگا۔ گلی ایک طرف مڑ گئی۔ میں اس طرف مڑا

بھارت کے
فرعون
گوالیار کے ٹارچر سیل
اے حمید
50

اوپر ایک چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا آدمی کھڑا تھا۔
ڈیوڑھی کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ شکل سے وہ جموں کا مسلمان لگتا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ زینے کی چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ اس نے پوچھا۔

"کشمیری مجاہد ہو؟"

میں حیران رہ گیا۔ اس نے خدا جانے کیسے اندازہ لگا لیا تھا۔ پھر بھی میں نے جھوٹ بولا اور کہا۔

"میں کشمیری مجاہد نہیں ہوں۔ مگر پولیس کو مجھ پر شک ہے کہ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ وہ میرے پیچھے آرہی ہے۔"

اس آدمی نے کہا۔

"جلدی سے اوپر آجاؤ"

میں اوپر سیڑھیاں چڑھ کر گیا تو وہ دروازے سے ہٹ گیا اور بولا۔

"سامنے والی کوٹھڑی میں چھپ جاؤ"

سامنے ایک کوٹھڑی تھی۔ اس میں گھس کر پلنگ کر نیچے چھپ گیا۔ پولیس اس دوران مکان کے باہر پہنچ گئی تھی۔ چونکہ گلی آگے بند تھی اور یہ مکان گلی کا آخری مکان تھا اس لئے پولیس کو یقین تھا کہ میں اسی مکان میں گیا ہوں۔ دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ مجھے اس آدمی کی آواز آئی۔

"کون ہے بھئی۔ کیا بات ہے؟"

مجھے خیال آیا کہ یہ آدمی کہیں پولیس کا مخبر ہی نہ ہو۔ کہیں پولیس کو بتا نہ دے کہ میں اوپر چھپا ہوا ہوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں پلنگ کے نیچے سے نکلا اور دبے پاؤں چلتا سیڑھیوں والے دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ پولیس کانسٹیبل کی آواز آئی۔

"ملک صاحب آپ کو تکلیف دی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم ایک پاکستانی کمانڈو کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ اسی گلی میں گھسا تھا"

جس آدمی کا وہ گھر تھا اور جس نے مجھے کوٹھڑی میں چھپ جانے کو کہا تھا اس کو پولیس کانسٹیبل نے ملک صاحب کہہ کر بلایا تھا اور لگتا تھا کہ پولیس اس آدمی کو جانتی تھی۔ میں کان لگائے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ ملک صاحب نے کہا۔

"پاکستانی کمانڈو میرے گھر میں آتا تو بھلا بچ کر کہاں جا سکتا تھا میں تو خود اسے دبوچ لیتا۔"

اب ایک اور پولیس والے کی آواز سنائی دی۔

"مگر وہ گیا کہاں۔ اسی طرف آیا تھا"

ملک صاحب نے کہا۔

"میرا خیال ہے سامنے کنہیا لعل کے مکان کی چھت پر سے دوسری طرف بھاگ گیا ہو گا چلو میں خود تمہارے ساتھ چل کر اسے ڈھونڈتا ہوں۔"

پولیس کانسٹیبل نے کہا۔

"نہیں نہیں ملک جی آپ کہاں تکلیف کریں گے۔ ہم خود اسے پکڑ لیں گے آخر جائے گا کہاں۔ دوسری گلی میں بھی پولیس موجود ہے۔ ہم کنہیا لعل کے مکان پر دیکھتے ہیں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والے کنہیا لعل کے مکان کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ پولیس کو

یقین آگیا کہ میں اسی مکان کی چھت کود کر بھاگا ہوں۔ پولیس اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے مکان میں گھس گئی۔ سامنے والے مکان سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پولیس گلی سے واپس چلی گئی تھی۔ ملک صاحب اوپر آ گئے۔ اس دوران میں کوٹھڑی میں چلا گیا تھا۔

دروازہ کھول کر وہ بھی کوٹھڑی میں آ گئے۔ آتے ہی بولے۔

"تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم میرے مکان میں گھس آئے تھے۔ اگر کنہیا لعل کے مکان میں چلے جاتے تو اس وقت پولیس تمہیں ہتھکڑی لگا کر اپنے ساتھ تھانے لے جا رہی ہوتی۔"

میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا احسان مند ہوں"

ملک صاحب بولے۔

"پولیس نے میری بات کا اس لئے یقین کر لیا تھا کہ اگرچہ میں مسلمان ہوں مگر میں جموں کی کانگریس کمیٹی کا رکن ہوں۔ سب مجھے کانگریسی مسلمان سمجھتے ہیں مگر اندر سے میں پکا مسلمان کشمیری ہوں اور میری ساری ہمدردیاں کشمیری مجاہدین کے ساتھ ہیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں چاہے نہ بتاؤ لیکن میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ پولیس کی زبانی میرے اندازے کی تصدیق ہو چکی ہے کہ تم کشمیری مجاہد نہیں بلکہ پاکستانی کمانڈو ہو۔ پاکستان پر میری جان نثار۔ خدا کا شکر ہے تم پولیس کے درندوں کے ہاتھ لگنے سے بچ گئے۔ اب بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو اور اس محلے میں کیسے آ گئے تھے؟"

میں نے ملک صاحب کو اپنے کمانڈو مشن کے بارے میں تو کچھ نہ بتایا صرف اتنا کہا۔

"میں پاکستانی ضرور ہوں اور کمانڈو بھی ہوں لیکن پاکستان کی طرف سے یہاں نہیں بھیجا گیا۔ میں پاکستانی مسلمان ہونے کے ناطے از خود جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے بارڈر کراس کر کے کشمیر پہنچا ہوں۔"

ملک صاحب مجھے بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے آدمی کی شکل

دیکھ کر اس کے دل کا تھوڑا بہت حال معلوم کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ملک صاحب کے دل میں تحریک آزادی کشمیر اور پاکستان کے واسطے گہری ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"میں ابھی آتا ہوں"

وہ باہر چلے گئے۔ باہر دالان تھا جہاں سے ایک زینہ اوپر چھت پر جاتا تھا۔ وہ زینہ چڑھتے نظر آئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولے۔

"پولیس ساتھ والی گلی میں مکانوں کی تلاشی لے رہی ہے۔ میں اوپر چھت پر سے دیکھ آیا ہوں۔ تمہیں ابھی یہاں سے نہیں نکلنا چاہئے۔ تم فکر نہ کرو۔ پولیس دوبارہ میرے مکان پر نہیں آئے گی۔ خوش قسمتی سے آج میرا ہندو ملازم بھی گھر پر نہیں ہے۔ پولیس نے اسے میرے گھر کی نگرانی کے لئے خاص ذریعے سے میرے گھر میں نوکر کروا دیا ہوا ہے۔ میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ مگر محتاط رہتا ہوں۔ اتفاق سے آج وہ اپنی ماتا سے ملنے کٹھوعہ چلا گیا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو معاملہ بالکل الٹ ہو سکتا تھا۔"

ملک صاحب نے مجھے ایک رات اور ایک دن اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ میں ملک صاحب کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ان کی ذات ملک بھی میں نے اپنے طور پر لکھ دی ہے۔ پولیس نے انہیں کسی دوسری ذات کے نام سے پکارا تھا۔ کیونکہ یہ جہاد کشمیر کا خفیہ کارکن مجاہد آج بھی جموں میں موجود ہے اور کشمیری مجاہدین کی مدد کر رہا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ملک صاحب کو اپنے مشن' جموں کے حریت پرست غلام رسول اور دلی کے ماسٹر سپائی گل خان کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اخبار میں خبر آگئی تھی کہ نہرا نٹیرو گیشن سنٹر سے ایک خطرناک پاکستانی جاسوس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ ملک صاحب نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا وہ خطرناک پاکستانی جاسوس میں ہی ہوں؟ میں نے انہیں کہا تھا۔

"میرا کسی پاکستانی جاسوس سے کوئی تعلق نہیں اور یہاں کشمیر میں کسی پاکستانی کو

جاسوس بن کر یا کمانڈو بن کر آنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ کشمیر کا بچہ بچہ کمانڈو بن کر اپنے وطن کو بھارتی قبضے سے آزاد کرانے کے لئے خون کے نذرانے دے رہا ہے۔ کشمیر کے حریت پرست مجاہد خود اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ میں بھی کشمیری مسلمانوں کے شانہ بشانہ دشمن کے خلاف جنگ کرنے آیا ہوں۔ جاسوسی وغیرہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

ملک صاحب بے اختیار پکار اٹھے۔

"جزاک اللہ! جزاک اللہ! اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہم وادی سے غاصب بھارتی فوج کو بھاگنے پر مجبور کر دیں گے اور کشمیر پر آزادی کا پرچم لہرائے گا۔"

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں سری نگر جانا چاہتا ہوں۔

"میں مجاہدین آزادی کا ایک ضروری پیغام لے کر دلی سے سری نگر ہی جا رہا تھا کہ کسی نے میری مخبری کر دی اور لاری اڈے پر اترتے ہی پولیس نے مجھے گھیر لیا۔ اگر میں ذرا سستی کرتا تو پکڑ لیا جاتا۔ مگر میں موقع پاتے ہی دوڑ پڑا پولیس بھی میرے پیچھے دوڑی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح سری نگر واپس پہنچ جاؤں۔"

میرا ارادہ بھی وہاں سے سری نگر کشمیری حریت پرست کمانڈو شیروان کے پاس جانے کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جموں کے مجاہد غلام رسول نے زخمی گل خان کو کسی نہ کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہو گا۔ میرا واپس دلی جانا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ میرے لئے سری نگر جا کر کمانڈو شیروان سے مل جانا ہی بہتر تھا تا کہ کسی اگلے کمانڈو مشن کی تیاری کی جائے اور بھارت کی فرعونیت اور ظلم واستبداد پر ایک اور کاری ضرب لگائی جائے۔ جموں کے نہرا نٹیرو گیشن سنٹر کے عقوبت خانے سے اپنے آدمی گل خان کو فرار کروانے کا ہمارا مشن کامیاب ہو چکا تھا۔ اب کسی دوسرے کمانڈو مشن کی پلاننگ کی ضرورت تھی۔ ملک

صاحب کہنے لگے۔

"ابھی تمہارا یہاں سے سری نگر روانہ ہونا مناسب نہیں ہو گا۔ پولیس تمہاری شکل صورت سے واقف ہے۔ پولیس نے جموں سری نگر روڈ پر جگہ جگہ ناکہ بندی کر رکھی ہو گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم دو ایک دن یہیں چھپے رہو۔"

میں نے کہا۔

"اس دوران آپ کا ہندو نوکر آگیا تو مشکل پیش آسکتی ہے۔"

ملک صاحب نے کہا۔

"اس کی طرف سے تم بے فکر ہو جاؤ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گیا ہے۔"

میں نے ملک صاحب سے کہا۔

"ہمارے کشمیری مجاہد وادی کشمیر میں بھارتی ظلم واستبداد کے خلاف برسرپیکار ہیں وہ بے بہا قربانیاں دے کر خون کے نذرانے پیش کر کے آزادی کشمیر کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں میں یہاں آرام سے کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ آپ صرف اتنا انتظام کر دیں کہ میں جموں سے کسی طرح نکل جاؤں۔ آگے بانہال کی پہاڑیوں میں پہنچ کر میں خود راستہ تلاش کر لوں گا۔"

تب ملک صاحب کو بھی جہاد کشمیر کی نازک صورت حال کا احساس ہوا۔ کہنے لگا۔

"خدا تمہیں جہاد کشمیر میں کامیابی عطا فرمائے میں کل رات تمہارے یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا۔ تم آج کی رات اور کل کا دن میرے مکان میں ہی چھپے رہنا۔ یہاں سے باہر مت نکلنا۔"

وہ رات اور دوسرا دن بھی میں نے ملک صاحب کے مکان میں چھپ کر گزار دیا۔

دوسری رات کو ملک صاحب جہاں گئے ہوئے تھے وہاں سے واپس آکر کہنے لگے۔

"جموں بانہال روڈ پر پولیس نے جگہ جگہ ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ پولیس کو یقین ہے کہ تم ابھی تک جموں میں ہی ہو۔ دوسری طرف جموں کھٹوعہ روڈ پر بھی پولیس تمہاری تلاش میں ناکوں پر موجود ہے۔ جموں سے جالندھر ہوشیار پور جانے والی لاریوں کی تلاشی لی

جاتی ہے۔ پولیس کے پاس تمہاری اخبار میں چھپی ہوئی تصویر موجود ہے۔"

میں نے کہا۔

"خواہ کچھ بھی ہو۔ میرا کشمیر کے محاذ پر پہنچنا ضروری ہے۔ میرے ساتھی وہاں جنگ کر رہے ہیں۔ میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا۔"

ملک صاحب بولے۔

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے یہاں سے نکلنے کا میں نے بندوبست کر دیا ہے۔ آج آدھی رات کے بعد ایک آدمی یہاں آئے گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ وہ اپنا ہی آدمی ہے۔ وہ تمہیں بانہال تک پہنچا دے گا۔"

"بس میں بانہال پہنچ جاؤں۔ آگے سارا راستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ آگے میں خود چلا جاؤں گا۔"

میں نے ملک صاحب سے جب پوچھا کہ جو آدمی مجھے لینے آدھی رات کو آرہا ہے وہ کس طریقے سے مجھے جموں سے نکالے گا تو وہ کہنے لگے۔

"یہ بات اس نے مجھے بھی نہیں بتائی۔ تم اس کے ساتھ چلے جانا۔ وہ پہلے بھی خطرناک حالت میں یہاں سے کشمیری کمانڈوز کو نکال کر لے جاتا رہا ہے۔ لیکن اس نے اپنے ذریعے کے بارے میں مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ حالات ایسے ہیں کہ ہم سب کو کبھی کبھی ایک دوسرے سے بھی راز داری سے کام لینا پڑتا ہے۔"

رات کو کھانا کھانے کے بعد ملک صاحب نے ساوار میں سبز کشمیری چائے بنائی۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے اس طرح رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ ملک صاحب نے دو تین بار اٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے وہ تھوڑی دیر میں آنے ہی والا ہے۔"

سوا بارہ بجے تو نیچے ڈیوڑھی کے دروازے پر کسی نے تین مرتبہ آہستہ آہستہ دستک دی۔ رات کی خاموشی میں یہ آواز بڑی صاف سنائی دی تھی۔ ملک صاحب جلدی سے اٹھے۔

"اپنا آدمی آگیا ہے۔"

وہ نیچے چلے گئے۔ مجھے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ ملک صاحب اس آدمی کو لے کر اوپر آگئے۔ یہ ایک پتلا دبلا آدمی تھا۔ اس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آنکھیں شہباز کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ آتے ہی مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔

"سری نگر میں کس کے پاس جاؤ گے؟"

میں نے کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ میں بھی انتہائی رازداری سے کام لے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سری نگر میں اپنے ساتھی مجاہدین کے پاس جاؤں گا۔"

سری نگر کے شمال مشرق کی پہاڑیوں میں جہاں کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کا خفیہ ہائیڈ آؤٹ تھا اس کا ایک خاص کوڈ نام تھا جو صرف کمانڈو شیروان اور اس کے تین مجاہد ساتھیوں کو ہی معلوم تھا۔ شیروان نے یہ کوڈ نام مجھے بھی بتا دیا ہوا تھا۔ جب ہمیں کسی جگہ خفیہ کمین گاہ کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا تھا تو ہم اپنی جانب سے کوڈ نام کا آدھا لفظ بولتے تھے۔ اگر دوسرا آدمی باقی کا آدھا لفظ ٹھیک ٹھیک بتا دیتا تھا تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ یہ اپنی کمانڈو فورس کا آدمی ہے۔ میں حیران رہ گیا جب اس آدمی نے کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کا آدھا کوڈ لفظ بول کر کہا۔

"کیا تم اسے مکمل کر سکتے ہو؟"

اب اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ یہ اپنا ہی آدمی ہے۔ میں نے فوراً کوڈ کا باقی لفظ اسے بتا دیا۔ یہ سن کر وہ آدمی مسکرایا اور ملک صاحب سے کہنے لگا۔

"ہمیں قدم قدم پر بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جموں سری نگر پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس نے اپنے مخبر چھوڑ رکھے ہیں۔ ہمیں ان سے بھی خبردار رہنا پڑتا ہے۔"

پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔ میں تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دوں گا۔"

میں نے ملک صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ وہ آدمی بولا۔

"ان فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں والے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی جلدی سے اس کے پیچھے ہو گیا۔ ہم ملک صاحب کے مکان سے نکلے۔ گلی کے باہر بازار بھی خالی اور تاریک تھا۔ وہ آدمی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں تمہیں اپنا اصلی نام نہیں بتاؤں گا تم مجھے شاہ جی کہہ کر بلا سکتے ہو"

جموں شہر کے اس سنسان بازار میں تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ ہمیں دیکھ کر ایک کتا بھونکتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ گلی اونچی نیچی اور تنگ تھی۔ یہ گلی آگے ایک تنگ بازار میں نکلتی تھی۔ شاہ جی اب آگے آگے چل رہے تھے۔ گلی ختم ہوئی تو اس نے مجھے ہاتھ سے پیچھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود بازار میں دائیں بائیں دیکھا۔ تیزی سے میرے پاس آئے اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک مکان کے پاس جہاں اندھیرا تھا لے گئے اور سرگوشی میں کہا۔

"پولیس کی گشتی پارٹی آرہی ہے۔"

جہاں کھڑے تھے وہاں اندھیرا تھا۔ بازار میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر میں نے تین چار پولیس کے سپاہیوں کو ایک دوسرے سے باتیں کرتے گلی کے آگے سے گزرتے دیکھا۔ ایک سپاہی اچانک گلی کے سامنے آکر رک گیا۔ شاہ جی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کر دیا۔ دوسرے سپاہی نے ڈوگری زبان میں اس سے پوچھا۔ کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے گلی میں؟ پہلے والا سپاہی کہنے لگا۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ پاکستانی کمانڈو یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ دوسرے سپاہی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"گوبند رام! آجاؤ۔ پاکستانی کمانڈو اب تک کشمیر پہنچ چکا ہو گا۔"

اور وہ ڈوگرہ سپاہی جس کا نام گوبند رام تھا آگے بڑھ گیا۔ جب ان پولیس والوں کی آوازیں دور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئیں تو شاہ جی مجھے لے کر بازار میں آگئے اور

کہنے لگے۔

"خطرہ بہت قریب آکر ٹل گیا۔ اب ہمیں یہاں سے تیز تیز چل کر نکل جانا ہو گا"

شاہ جی مجھے اپنے ساتھ جموں کی تنگ و تاریک گلیوں اور سنسان بازاروں میں سے گزار کر آخر شہر کے شمال کی جانب ایک میدان میں آگئے۔ یہاں نشیب میں مجھے ایک جگہ بجلی کا بلب جلتا نظر آیا۔ ہم اترائی اتر کر وہاں آگئے۔ یہ لاریوں اور ٹرکوں کا اڈہ لگتا تھا۔ ایک طرف دو لاریاں کھڑی تھیں۔ کچھ خالی ٹرک بھی کھڑے تھے۔ ایک ٹرک میں لکڑی کے شہتیر لدے ہوئے تھے۔ شاہ جی کو دیکھ کر ایک آدمی کوٹھڑی سے نکل کر آگیا۔

شاہ جی نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

وہ آدمی بولا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی"

اس آدمی نے شاہ جی نہیں کہا تھا۔ یہ میں نے راز داری برتنے کے لئے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ شاہ جی ٹرک کی پچھلی طرف آگئے۔ یہ بہت بڑا ٹرک تھا۔ لکڑی کے شہتیر سیدھے بھی کھڑے تھے اور ایک دوسرے کے اوپر بھی لدے ہوئے تھے۔ ایک اور آدمی کوٹھڑی سے نکل کر آگیا۔ انہوں نے ایک طرف سے تین شہتیر ہٹا دیئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ٹرک کے اندر ایک کھلی جگہ بنی ہوئی تھی۔ بانس کے ساتھ جلتے بلب کی روشنی میں یہ جگہ صاف نظر آرہی تھی۔ شاہ جی نے مجھ سے کہا۔

"تمہیں جموں سے بانہال تک یہاں لیٹ کر سفر کرنا ہو گا۔ کیا تم یہ تکلیف برداشت کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

شاہ جی بولے۔

"سفر لمبا ہے۔ لیکن راستے میں ہم تمہاری دیکھ بھال کرتے رہیں گے میں بانہال تک

تمہارے ساتھ جاؤں گا اب اندر جا کر لیٹ جاؤ۔ ہم راتوں رات جموں کے علاقے سے نکل جانا چاہتے ہیں۔"

میں ٹرک پر چڑھ کر لکڑی کی شہتیریوں کے نیچے جو خالی جگہ بنائی گئی تھی وہاں لیٹ گیا۔ شاہ جی کہنے لگے۔

"جموں بانہال روڈ پر پولیس کی چیک پوسٹیں ہیں۔ پولیس چیکنگ کرے گی۔ تم کوئی آواز مت نکالنا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

میرے اوپر اور دائیں بائیں لکڑی کے شہتیر اور چھوٹی گیلیاں اس طرح لگا دی گئیں کہ میں اس میں پوری طرح چھپ گیا۔ مجھے باہر کی روشنی بھی نظر آنا بند ہو گئی مگر جگہ اس طرح بنائی گئی تھی کہ میں پہلو بدل سکتا تھا اور ٹانگیں بھی سمیٹ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرک کا انجن سٹارٹ ہو گیا۔

دوسرے لمحے ٹرک سڑک پر چل رہا تھا۔

میں لکڑی کے شہتیریوں کے اندر اندھیرے میں ایسے پڑا تھا جیسے مردہ قبر میں پڑا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مردہ بے حس و حرکت ہوتا ہے اور میں پہلو بدل سکتا تھا۔ ہاتھ پیر ہلا سکتا تھا۔ ٹرک نے سڑک پر آنے کے بعد ایک خاص رفتار پکڑلی تھی اور اسی رفتار پر چلا جا رہا تھا۔ اگر میں سخت جان نہ ہوتا اور اپنی کمانڈو تربیت کے دوران مجھے اس قسم کی اذیتیں برداشت کرنے کی ٹریننگ نہ ملی ہوتی تو شاید میں تھوڑی دیر بعد ہی گھبرا جاتا۔ مگر میں آنکھیں بند کئے خاموشی سے لیٹا رہا۔ ٹرک چلتا رہا۔ کبھی سڑک کی چڑھائی آجاتی اور کبھی ٹرک نشیب میں اترنے لگتا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اندھیرا اور اندھیرا ہی تھا۔ وقت جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ میدانی علاقہ آگیا ہے۔ ٹرک ہموار سڑک پر چل رہا تھا۔ اس دوران سامنے کی طرف سے آنے والے ٹرک بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد گزرتے رہے۔ مجھے تازہ ہوا برابر آرہی تھی۔ میں نے سو جانے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے جاگتا رہا کہ راستے میں پولیس کی ناکہ بندی ہے۔ پولیس اور فوج بھی موجود ہوگی۔ چیکنگ کے دوران کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میرا خیال ہے ٹرک کو جموں کے اڈے سے چلے کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ٹرک کی رفتار ایک دم سے ہلکی ہونا شروع ہو گئی۔ میں چوکس ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے ٹرک سڑک سے اتر گیا ہے۔ پھر ٹرک رک گیا۔ مجھے شاہ جی کی آواز آئی۔ وہ کسی کو کہہ رہے تھے۔

"رام رام مہاراج!"

کسی نے کہا۔

"ٹرک کی چیکنگ ہو گی۔ تم اس طرف آ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ پولیس یا فوج کے آدمی تھے۔ انہوں نے شاہ جی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے ٹرک پر لدے ہوئے شہتیروں کو ادھر ادھر ہٹا کر دیکھا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ ان کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ فوج کے نہیں بلکہ ڈوگرہ پولیس کے آدمی ہیں۔ یہ لوگ آگے شہتیروں کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھتے میری طرف آ گئے۔ اندھیرے میں شہتیروں کی درزوں میں سے ٹارچ کی روشنی کرنوں کی شکل میں مجھ پر پڑتی اور غائب ہو جاتی۔ میں سانس روکے شہتیروں کے نیچے بالکل سیدھا پڑا رہا۔ شہتیر بڑے بڑے تھے۔ پولیس والے انہیں ہٹا تو نہیں رہے تھے مگر ان کے اندر ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھ رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ زبردست خطرہ میرے اوپر منڈلا رہا تھا۔ پھر ٹارچ کی روشنی درزوں میں سے آنا بند ہو گئی۔ شاہ جی کی آواز آئی۔

"مہاراج! آج کل اتنی زیادہ چیکنگ کیوں ہو رہی ہے؟"

کسی نے جواب میں کہا۔

"تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میری جان میں جان آئی۔ میں نے گہری سانس لی اور اپنے اکڑے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا دوسرے لمحے ٹرک آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ دماغ میں الٹ پلٹ خیال آنے لگے۔ کبھی راجستھان کی بد روح چندریکا کا خیال آتا جو میری دشمن بن کر میرے پیچھے لگی ہوئی تھی اور جس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ

میں تم سے اپنی محبت کی توہین کا ایسا انتقام لوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔ کبھی دلی میں نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے پاس جو مغل شہزادے کی قبر تھی اس کی طرف دھیان چلا جاتا۔ مغل شہزادے کی روح نے بھی مجھے خبردار کیا تھا کہ بہت جلد مجھ پر ایک ناگہانی آفت نازل ہونے والی ہے۔ مجھے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مغل شہزادے کی روح نے ساتھ ہی مجھے اس 'ناگہانی آفت' سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا تھا جو آپ کو پہلے بتا چکا ہوں اور آپ نے پڑھ بھی لیا ہو گا لیکن آپ کی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے میں ایک بار پھر بیان کئے دیتا ہوں۔ مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا۔

"ہندوستان کے شہر نجیب آباد کے باہر پتھر گڑھ کا پرانا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ نواب نجیب الدولہ نے اپنے دور اقتدار میں بنوایا تھا۔ نواب نجیب الدولہ حق و باطل اور کفر و اسلام کی جنگ کے وہ بہادر مجاہد تھے جنہوں نے ہندوؤں کے اسلام دشمن ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور اسلام کے پرچم کو سربلند رکھا۔ پتھر گڑھ کا قلعہ اسی مجاہد کی یادگار ہے۔ اس قلعے کے عقب میں نجیب آباد کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا ہی دشوار گزار اور خطرناک جنگل ہے۔ اس جنگل کا نام کجلی بن ہے۔ کجلی بن کے اندر ایک ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے کو لال پہاڑی بھی کہتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس ٹیلے کی چوٹی پر دو سرخ رنگ کی مخروطی چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی ہیں۔ جب تم پر ناگہانی آفت نازل ہو تو تم کجلی بن کے جنگل کی لال پہاڑی پر جانا۔ وہاں پہاڑی کے دامن میں ایک پرانا کنواں ہے۔ اس کنوئیں کے پاس بانس کے جھنڈ میں ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ اس قبر کا اب ایک نشان ہی باقی رہ گیا ہے۔ قبر کے پتھر زمین سے ابھرے ہوئے ہیں۔ تم وہاں باوضو ہو کر فاتحہ پڑھنا۔ یہ اس مسلمان مجاہدہ کی قبر ہے جو کفر و اسلام کی جنگ میں مرہٹہ سپاہیوں کے ایک دستے سے لڑتی ہوئی شہید ہو گئی تھی۔"

مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا کہ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہاں آدھی رات تک بیٹھے رہنا۔ اگر خدا نے چاہا تو آدھی رات کے وقت شہید خاتون کی روح آ کر تجھ سے ہم کلام ہو گی اور تجھے بتائے گی کہ تم پر جو آفت نازل ہوئی ہے اس کا علاج کیا ہے۔

ٹرک بانہال روڈ پر اپنی خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ پھر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں سو گیا۔ آنکھ ایک دھچکے کے ساتھ کھل گئی۔ ٹرک رک رہا تھا۔ مجھے لکڑی کی شتریوں کی چھوٹی چھوٹی درزوں میں سے دن کی روشنی نظر آئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی صندوق میں بند ہوں۔ ٹانگوں کو دائیں بائیں سکیڑ کر اوپر نیچے کرنے لگا۔ دن چڑھ گیا تھا۔ ٹرک رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی شہتیر ادھر ادھر ہٹائے جانے لگے۔ شاہ جی کی آواز آئی۔

"جاگتے ہو کہ سو رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جاگ رہا ہوں شاہ جی"

شاہ جی کے ساتھ ڈرائیور اور ٹرک کا کلینر دونوں مل کر شہتیر ادھر ادھر ہٹا رہے تھے۔ پھر میں باہر نکل آیا دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ٹرک ایک جگہ پہاڑیوں کے درمیان ویران جنگل میں کھڑا تھا۔ شاہ جی کہنے لگے۔

"آؤ ناشتہ کر لو۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ راستے میں پولیس نے زیادہ چیکنگ نہیں کی۔ پہلے چیک پوائنٹ پر ڈوگرہ فوجی کھڑے تھے۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر چیکنگ کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ تمہیں نہیں دیکھ سکے اس کے بعد پولیس والے زیادہ تر میرے واقف تھے۔ ہم لوگ ہفتے میں دو بار مال لے کر جموں سے بانہال جاتے رہتے ہیں۔"

ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے وہاں منہ ہاتھ دھویا پانی پیا۔ شاہ جی اپنے ساتھ مکئی کی گڑ والی میٹھی روٹیاں، مکھن اور تھرمس میں چائے لائے تھے۔ ہم نے چشمے کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ چائے پی۔ میں نے شاہ جی سے پوچھا۔

"ابھی بانہال کتنی دور ہے؟"

وہ بولے۔

"شام کو پہنچیں گے۔ ٹرک کی رفتار بھی زیادہ نہیں کر سکتے۔"

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں دوبارہ شہتیروں کے اندر بنی ہوئی قبر میں جا کر لیٹ گیا۔ میرے اوپر شہتیر ڈال دیئے گئے۔ اور ٹرک بانہال کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر کے بعد ٹرک کسی جنگل میں ایک بار پھر روک دیا گیا۔ وہاں بھی میں نے شہتیروں کے نیچے سے نکل کر شاہ جی کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑی میٹھی روٹی کھائی۔ چائے پی اور آگے روانہ ہو گئے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور رات کی تاریکی جموں کشمیر کی پہاڑیوں پر اترنے لگی تو ٹرک اپنی منزل پر پہنچ کر رک گیا۔ مجھے شہتیروں کے اندر سے نکالا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ٹرک ایک کچی سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ اس کی بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔ اوپر کوئی سڑک تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بتیاں جل رہی تھیں شاہ جی نے اوپر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہم بانہال سے دو میل آگے نکل آئے ہیں۔ اوپر جو تم روشنیاں دیکھ رہے ہو یہ بانہال سری نگر روڈ کی روشنیاں ہیں۔ یہاں سے تمہیں اکیلے ہی سری نگر تک سفر کرنا ہو گا۔ ہم لوگ یہاں سے ٹرک لے کر واپس بانہال جائیں گے اور مال اتار کر کل صبح واپس جموں روانہ ہو جائیں گے۔"

میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ پہاڑی کے پہلو میں ایک سڑک تھی جس کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ شاہ جی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم سری نگر تک کس طرح جاؤ گے؟ سڑک پر تمہیں لاری بھی مل جائے گی۔ تم جنگلوں میں سے گزر کر جاؤ گے یا لاری میں بیٹھ کر جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے میں خطرے سے کافی دور ہو گیا ہوا ہوں۔ اب سری نگر جانے والی کسی لاری میں بیٹھ جاؤں گا"

"جیسے تمہاری مرضی"

شاہ جی نے کہا۔

"پہلے تم اوپر جاؤ۔ تمہارے جانے کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

میں نے شاہ جی سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور اور کلینر سے بھی ہاتھ ملایا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور جھاڑیوں میں سے اوپر سڑک کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ سڑک پر آکر میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے شام کے بعد شروع رات میں سری نگر جانے والی لاریاں مل جاتی ہیں میرے پاس پیسے موجود تھے۔ اتنے میں نیچے شاہ جی کے ٹرک کے سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ ٹرک کچی سڑک پر سے ہوتا ہوا آگے جا کر بانہال روڈ پر نکل گیا تھا۔ میں سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے پاس پتھر پر بیٹھا بانہال سے آنے والی کسی لاری کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دور سے مجھے لاری کی بتیاں نظر آئیں۔ لاری پہاڑی کے گرد چکر لگا کر آرہی تھی۔ جب روشنیاں قریب آئیں تو میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ کا اشارہ دیا۔ لاری میرے قریب آکر رک گئی۔ یہ لاری سری نگر جا رہی تھی۔ اس میں کافی مسافر بیٹھے تھے۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں نے مسافروں کا جائزہ لیا۔ مجھے اس میں کوئی مشکوک شکل دکھائی نہ دی۔ لاری چل پڑی۔

دوسرے دن سری نگر پہنچتے ہی میں لاری اڈے سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ میرا لباس عام پڑھے لکھے لوگوں ایسا تھا۔ جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ گلے میں گلوبند بھی تھا۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھانا شروع ہو گئے تھے۔ میں چلتے چلتے شہر سے کافی باہر نکل آیا تھا۔ یہاں سے میں شمال مشرق کی جانب کھیتوں میں ہو گیا۔ سڑک پر میں نے بھارتی فوجیوں کے ٹرک دیکھے جو شہر کی طرف جا رہے تھے۔ بازاروں میں اور چوک میں ڈوگرہ اور سکھ فوجی بھی نظر آئے۔ کھیتوں میں دور تک چلتا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کس طرف جانا ہے۔ کھیت ختم ہو گئے۔ آگے میدان آگیا۔ یہ ایک کھلا میدان تھا جس میں کشمیری کسانوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ کشمیری عورتیں چولہوں میں آگ کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں خاموشی سے ان کے قریب سے گزر گیا۔ دور سامنے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر چڑھ اور چنار کے درخت اوپر تک چلے گئے تھے۔ مجھے ان پہاڑیوں میں جانا تھا جہاں کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کی خفیہ کیمپ گاہ تھی۔ میں اوپر

سے ہو کر پہاڑیوں کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ کئی گھاٹیاں اور کھائیاں عبور کرنے کے بعد آخر میں اس مقام پر آگیا جہاں سے کمانڈو شیروان کی خفیہ کیمپ گاہ کی حد شروع ہوتی تھی۔ اب میں محتاط ہو کر چل رہا تھا۔

یہاں چنار کے گھنے جھنڈ تھے۔ کوئی سڑک یا پگ ڈنڈی نہیں تھی۔ میں درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ایک جگہ اچانک دو کشمیری مجاہد درختوں میں سے نکل کر میرے سامنے آگئے۔ انہوں نے شاٹ گنیں تھام رکھی تھیں۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ ان کے چہرے سبز صافوں میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ میں رک گیا۔ ایک کشمیری مجاہد نے اردو میں پوچھا۔

"کون ہو؟"

میں نے کمانڈو شیروان کی کیمپ گاہ کا خاص کوڈ لفظ بولا انہوں نے شاٹ گنیں نیچی کر لیں۔ ایک مجاہد نے ایک اور کوڈ لفظ بول کر پوچھا۔

"اس کا دوسرا لفظ کیا ہے؟"

مجھے معلوم تھا۔ میں نے دوسرا لفظ بول کر کوڈ مکمل کر دیا۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ میں کمانڈو شیروان کا خاص آدمی ہوں۔ کیونکہ شیروان کی کیمپ گاہ کا کوڈ سوائے اس کے چند ایک قریبی مجاہدوں کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھا۔ تب دوسرا کشمیری مجاہد کہنے لگا۔

"آگے دوسرے گارڈ بھی ڈیوٹی پر ہیں۔ ہم تمہیں آج کا پاس ورڈ بتا دیتے ہیں۔"

اس نے مجھے اس روز کا پاس ورڈ بتا دیا۔ وہاں پر روز پاس ورڈ بدل دیا جاتا تھا۔ میں ایک گھاٹی کی چڑھائی چڑھ کر اس پہاڑی کے قریب پہنچا جس کے غار میں کمانڈو شیروان کی خفیہ ہائیڈ آؤٹ تھی تو تین کشمیری مجاہد اچانک سامنے آگئے۔ میں نے پاس ورڈ بتایا تو انہوں نے مجھے راستہ دے دیا لیکن دو قدموں کا فاصلہ ڈال کر شاٹ گنیں اٹھائے میرے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ ٹیلے کا چھوٹا سا موڑ گھوم کر میں پہاڑی کے دامن میں اس جگہ آگیا جو کمانڈو شیروان کی اصل کیمپ گاہ تھی۔ یہاں چاق

وچوبند چار مجاہد کمانڈو کی وردیوں میں شاٹ گنیں اٹھائے کمیں گاہ کے غار کے منہ پر دونوں جانب کھڑے تھے۔ ان میں کمانڈو بٹ بھی تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ دور سے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دے کر کمانڈو شیروان کا پوچھا تو اس نے کہا۔

"اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں کمانڈر کو خبر کرتا ہوں۔"

میں رک گیا۔ کمانڈو بٹ غار کے اندر چلا گیا۔ میرے قریب ہی جو تین کشمیری گارڈ کھڑے تھے ان کے ساکت چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی ایمرجنسی پیدا ہو گئی ہے اور حالات نارمل نہیں ہیں۔

میں کمیں گاہ کے باہر خاموش کھڑا تھا۔

ماحول کی کشیدگی کا احساس مجھے سری نگر شہر میں بھارتی فوجی ٹرکوں کو تیزی سے ادھر ادھر جاتے اور بازاروں میں ڈوگرہ فوجیوں کی ناکہ بندیوں سے ہی ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ اتنے میں کمانڈو بٹ نے آکر کہا۔

"کمانڈر تمہارا انتظار کر رہا ہے"

میں غار کے اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہائیڈ آؤٹ میں گیس کے لیمپ کی روشنی میں کمانڈو شیروان اپنے چار مجاہد ساتھیوں کے ساتھ میز کے گرد کھڑا ایک نقشے کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سرسری طور پر میرے سلیوٹ کا جواب دیا۔ اس کا چہرہ اس کے فکر مند خیالات کا آئینہ دار تھا۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میز پر پھیلے ہوئے جس نقشے کو دیکھ رہے تھے اس پر جگہ جگہ پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک پہاڑی پر لال پنسل سے گول دائرے کا نشان بنا تھا۔

کمانڈو شیروان نے اس جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا ٹارگٹ یہ پہاڑی ہے۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

"بھارتی فوجیوں نے رات سری نگر کے مضافاتی علاقے شاہ میراں میں گھس کر مسلمانوں کے سارے مکانوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ ان مکانوں میں رہنے والوں میں سے کوئی مسلمان عورت بوڑھا جوان اور بچہ زندہ نہیں بچا۔ سب کے سب جل کر شہید ہو گئے ہیں۔"

کمانڈو شیروان میز سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر میرے قریب آگیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگے سٹول پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے سامنے والے سٹول پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا وہاں ہمارے مجاہد بھی تھے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہاں ہمارے پانچ مجاہد وہاں موجود تھے ان میں سے صرف ایک مجاہد جان بچا کر کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ چار مجاہد بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا مقابلہ کرتے شہید ہوگئے۔ ہمیں اپنے مجاہدین کے شہید ہونے کا غم نہیں۔ ہم تو شہید ہونے کے لئے ہی غاصب بھارتی فوجیوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ صدمہ اس بات کا ہے کہ نہ جانے کتنے معصوم بچے جوان عورتیں اور بوڑھے بھارتی فوجیوں کی گولیوں اور ان کی لگائی آگ میں جل کر شہید ہو گئے۔"

میں نے کہا۔

"ہم اس ظلم کا بدلہ لیں گے"

کمانڈو شیروان بولا۔

"ہم بھارتی فوجیوں سے اس ظالمانہ اقدام کا بدلہ لینے کا پروگرام ہی بنا رہے ہیں۔ تم نے نقشے پر ایک پہاڑی پر سرخ نشان لگا ہوا دیکھا ہو گا"

وہ اٹھ کر مجھے میز کے پاس لے گیا۔ ہم دونوں جھک کر نقشے کو دیکھنے لگے۔ کمانڈو شیروان نے سرخ نشان والی پہاڑی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اس پہاڑی پر بھارت کی چودھویں انڈین انفنٹری ڈویژن کی پوری دو رجمنٹیں مقیم ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے اطلاع دی ہے کہ اس ڈویژن کا ایمونیشن ڈپو بھی اس پہاڑی کے نیچے ایک سرنگ کے اندر ہے۔ سری نگر میں اسی رجمنٹ کے فوجی جگہ جگہ کشمیری مجاہدوں کی تلاش میں چھاپے مار کر گھروں کو آگ لگا رہے ہیں اور معصوم کشمیری مسلمانوں کو شہید کر رہے ہیں۔ شاہ میراں میں مسلمانوں کے پورے محلے کے مکانوں کو اسی رجمنٹ کے فوجیوں نے نذر آتش اور نہتے کشمیری مسلمانوں کو شہید کیا ہے۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے استفسار کیا۔

"ہمارا پلان کیا ہو گا؟"

اس نے نقشے پر بنی ہوئی لال نشان والی پہاڑی پر انگلی رکھ کر نیچے ایک لکیر کے انداز میں کھینچی اور بولا۔

"ہمارا کمانڈو آپریشن یہاں سے شروع ہو گا"

"کیا ہم نائٹ اٹیک کریں گے؟"

میرے سوال پر شیروان نے نفی میں سرہلایا۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا ہم دن کے وقت گوریلا ایکشن کریں گے؟"

جب میرے اس سوال پر بھی کمانڈو شیروان نے نفی میں سرہلایا تو میں نے پوچھا۔

"پھر ہمارا پلان کیا ہو گا؟"

کمانڈو شیروان نے پر عزم لہجے میں کہا۔

"ہم زمین کے اندر سے اٹیک کریں گے۔"

میں کمانڈو شیروان کا منہ دیکھنے لگا۔ میں اس کی بات بالکل نہ سمجھ سکا تھا۔ میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر! میں سمجھ نہیں سکا کہ زمین کے اندر سے ہم کس طرح حملہ کریں گے؟"

کمانڈو شیروان نے پہاڑی والے نشان کی ایک جانب انگلی رکھی اور بولا۔

"یہ پہاڑی علاقے کے کہستانی سلسلے کی رج سے سب سے الگ ہے۔ بھارتی فوجی کمانڈ نے اسی لئے اس پہاڑی پر اپنا گریزن بنایا ہے کہ یہاں سے چاروں طرف مشین گن پوسٹیں قائم کرکے پہاڑی کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"اس پہاڑی کی ایک اور خصوصیت بھی تھی جس کے پیش نظر بھارتی فوج نے اسے اپنی چھاؤنی بنانے کے لئے منتخب کیا۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ اس پہاڑی کے نیچے چٹانوں میں ایک قدرتی سرنگ بنی ہوئی ہے۔ یہ سرنگ فوجی ہتھیار' اسلحہ اور گولہ بارود ڈمپ

کرنے کے لئے بڑی موزوں تھی۔ چنانچہ بھارتی فوج کی ان پہاڑی والی دونوں رجمنٹوں نے سرنگ میں اپنا ایمونیشن اسلحہ اور فوجی سازو سامان ذخیرہ کر دیا ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ہمیں اس ایمونیشن ڈپو کو اڑانا ہو گا؟"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"لیکن اس سرنگ میں ایمونیشن کے ذخیرے تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ پہاڑی کے اردگرد بھارتی فوج کا پورا بریگیڈ دن رات پہرے پر موجود ہوتا ہے۔ رات کو ساری رات بجلی کے بڑے بڑے بلب پہاڑی کے اردگرد روشن رہتے ہیں۔ اگر کوئی چیونٹی بھی وہاں سے گزرے تو نظر آجاتی ہے۔ فوج نے پہاڑی کے اردگرد کی ساری جھاڑیاں صاف کر کے ایک ہموار پٹی بنا دی ہے۔ پہاڑی کے اندر ایمونیشن کے ذخیرے تک جو سرنگ جاتی ہے اس کے منہ کو لوہے کے مضبوط دروازے سے بند کر دیا گیا ہے باہر مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی بدل بدل کر موجود رہتے ہیں۔ یہ ساری اطلاعات ہمارے مخبروں نے ہمیں پوری تفصیل سے بتا دی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر ہمارا پلان کیا ہو گا؟ ہم زمین کے اندر سے حملہ کیسے کریں گے"

کمانڈو شیروان نے میرے کندھے پر ہاتھ ر دیا اور اسے دباتے ہوئے بولا۔

"ہم بھارتی اسلحہ ایمونیشن والی سرنگ کے نیچے ایک سرنگ کھودیں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ کمانڈو شیروان کا پلان کیا تھا۔ وہ ایمونیشن والی پہاڑی سرنگ کے نیچے سرنگ کھود کر گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک ہیبت ناک دھماکے سے گولہ بارود کا ذخیرہ پھٹتا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی اور پہاڑی پر موجود انڈین رجمنٹوں کے سارے فوجی بارکوں اور فوجی ٹرکوں سمیت بھک سے اڑ جاتے اور ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہتا۔ ایمونیشن ڈمپ

جب زمین کے اندر پھٹتا ہے تو اس کے دھماکے کی طاقت چار گنا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ محض ایک گولہ بارود کا ڈپو ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح سے ایٹم بم بن جاتا ہے۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہمیں پہاڑی تک بڑی لمبی سرنگ کھودنی پڑے گی۔ یہ کافی لمبی سرنگ ہو گی اور چونکہ یہ انڈین ملٹری ایمونیشن ڈمپ کی سرنگ کے نیچے سرنگ ہو گی اس پر کافی وقت لگ جائے گا۔ اور ہمارے مجاہدوں اور کمانڈوز کو دوسرے محاذوں پر بھی لڑنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اتنی لمبی سرنگ کھودنے کے وسائل بھی نہیں ہیں۔ ہم اپنے بے حد محدود وسائل کے اندر آزادیٔ کشمیر کی جنگ لڑ رہے ہیں یہ حقائق آپ کے پیش نظر ضرور ہوں گے۔"

کمانڈو شیروان بڑے غور سے میری بات سنتا رہا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کر لی تو وہ بڑے پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

"تم نے بالکل درست نتیجہ نکالا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے معلوم تھیں۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمیں اتنی لمبی سرنگ نہیں کھودنی پڑے گی۔ بلکہ ہم کوئی نئی سرنگ نہیں کھودیں گے"

"تو پھر ہم بھارتی ایمونیشن ڈمپ تک کیسے پہنچیں گے؟"

کمانڈو شیروان کی وضاحت میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں آپریشن پلان مزید الجھ گیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے نقشے پر سرخ نشان والی پہاڑی کے بائیں جانب انگلی ر کر کہا۔

"یہ جگہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نقشے پر جھک گیا۔

"دیکھ رہا ہوں"

کمانڈو شیروان اور میرے علاوہ وہاں پر موجود باقی چاروں کمانڈو بھی خاموش تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں شیروان کی سکیم معلوم تھی۔ کمانڈو شیروان نے کہا۔

"اس پہاڑی کی پچھلی جانب ٹھیک اس جگہ چھوٹی سی ایک اور سرنگ بھی ہے جس کا بھارتی فوجیوں کو ابھی تک علم نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں بھارتی فوج کا پہرہ نہیں ہوتا۔ رات کو صرف گشتی پارٹی پٹرول کرتی ہے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں ہے اسے مغل بادشاہوں کے زمانے میں پہاڑی کھود کر بنایا گیا تھا اور معلوم نہیں انہوں نے کس لئے یہ سرنگ بنائی تھی۔ یہ چھوٹی سرنگ آگے جاکر بند ہو جاتی ہے اور ٹھیک اس جگہ جا کر بند ہوتی ہے جہاں اس کے اوپر بھارتی فوج کا گولہ بارود کا ذخیرہ موجود ہے۔ ہم نے اپنے خاص آدمی کے ذریعے اس کا پورا سروے کر لیا ہے۔ گویا یہ چھوٹی سرنگ پہاڑی والی قدرتی سرنگ کے نیچے سے ہو کر گولہ بارود کے ذخیرے تک جاتی ہے۔ ہمیں اس چھوٹی سرنگ میں داخل ہو کر جہاں سرنگ بند ہو جاتی ہے وہاں سے چھت میں سوراخ کر کے اوپر والی سرنگ میں پہنچ کر ایمونیشن ڈمپ میں ٹائم بم لگانا ہو گا۔ بس یہی ہمارا ٹارگٹ ہے اور یہی ہمارا کمانڈو آپریشن ہو گا"

میں نے سوال کیا۔

"کیا اس بات کا ہمارے پاس ٹیکنیکل ثبوت موجود ہے کہ چھوٹی مغلیہ دور کی سرنگ جہاں ختم ہوتی ہے اس کی چھت کے عین اوپر ہی بھارتی فوج کا اسلحہ اور گولہ بارود کا ذخیرہ ہے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم موقع پر جاکر سروے نہیں کر سکتے یہ سارے اندازے ہم نے اور ہمارے انجینئر مجاہدوں نے نقشے بنا کر اور چھوٹی سرنگ کے بارے میں ملی ہوئی اطلاعات کو سامنے رکھ کر لگائے ہیں ان میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے جہاں چھوٹی سرنگ ختم ہوتی ہے اس کی چھت کے عین اوپر ایمونیشن ڈمپ نہ ہو بلکہ تھوڑا آگے یا پیچھے ہو ایسی صورت میں ہمیں چھت میں بڑا سوراخ ڈال کر اوپر والی سرنگ میں خود جاکر ٹائم بم پلانٹ کرنا ہو گا۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ ہمارے چار کمانڈو کل رات اس مشن پر جا رہے ہیں اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ تم بڑے ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ ہمیں تم ایسے تجربہ کار کمانڈو کی اس

مشن کے لئے اشد ضرورت تھی۔ کیا تم اس مشن پر جانے کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں بھارتی غاصب فوجیوں کے خلاف ہر مشن پر جانے کے لئے ہر وقت تیار ہوں کمانڈر؟"

کمانڈو شیروان نے جزاک اللہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"کیا ہمارے کمانڈوز کو وہ راستہ معلوم ہے جو پہاڑی کے عقب میں مغلیہ دور کی پرانی سرنگ کے دہانے تک جاتا ہے؟"

کمانڈو شیروان نے ایک کمانڈو کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"یہ ہمارا مجاہد کمانڈو گڈریئے کے بھیس میں اس علاقے کا سارا نقشہ بنا کر لے آیا ہے۔ بلکہ یہ پرانی سرنگ کے اندر جاکر اس جگہ کی نشان دہی بھی کر آیا ہے جس کے اوپر ہمارے اندازے کے مطابق گولہ بارود کا ذخیرہ ہے۔"

اس کشمیری کمانڈو نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔

"میرا نام اورنگ زیب ہے۔ میں سری نگر یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کا سٹوڈنٹ رہ چکا ہوں۔ میں اس مہم میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا ٹارگٹ غلط ثابت نہیں ہو گا۔"

دوسرے روز سارا دن ہم اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں اپنے کمانڈو آپریشن کی تیاریوں میں لگے رہے۔ میرے سمیت اس مشن کے لئے کل چار کمانڈو چنے گئے تھے۔ ایک میں' دوسرا کمانڈو اورنگ زیب اور دو کمانڈو ہمارے تجربہ کار مجاہد تھے جو آزادی کشمیر کی جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ اب ہم رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ہمیں رات کے ٹھیک سوا بارہ بجے اپنے کمانڈو مشن پر روانہ ہونا تھا۔

ہماری چار کمانڈوز کی پارٹی تھی۔

دوپہر تک ہم ضروری تیاریوں میں مصروف رہے۔ دوپہر کے بعد ہم نے شام تک آرام کیا۔ رات کو نماز عشاء کے بعد ہائیڈ آؤٹ کے غار کے اندر پلاننگ روم میں ایک اور میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں نقشے کی مدد سے ہمیں پورے علاقے اور خاص طور پر بھارتی فوج کے گیریزن والی پہاڑی کی تمام تفصیلات سمجھائی گئیں۔ چار انتہائی دھماکہ خیز ٹائم بم ہمارے پاس موجود تھے۔ یہ ٹائم بم بارود کے چار چھوٹے سلنڈروں کی شکل کے تھے جنہیں آپس میں سٹیل کے تاروں سے باندھا گیا تھا۔ ہر بم کے ساتھ ایک ٹائم ڈیوائیس لگا تھا جس کا ایک بٹن بھی تھا۔ ٹائم بم ایمونیشن ڈمپ میں لگانے کے بعد اس بٹن کو ایک ہی وقت میں دبانا تھا تاکہ چاروں بم ایک ہی وقت میں پھٹیں۔ ان بموں کا وقت صرف پچیس منٹ تھا۔ ان پچیس منٹوں کے اندر بم لگانے کے بعد ہمیں سرنگ سے نکل کر دوسری پہاڑیوں میں اپنی محفوظ جگہ پہنچنا تھا۔ رات کے ٹھیک سوا بارہ بجے ہماری کمانڈو پارٹی اپنے مشن پر روانہ ہو گئی۔ ہم میں سے ہر کمانڈو کے پاس چار چار ہینڈ گرنیڈ' ایک ایک ایمونیشن جیکٹ' سٹین گنیں اور چار چار بھری ہوئی فالتو میگزینیں تھیں۔ رات کے اندھیرے میں ہم اپنے چہروں پر سیاہ نقاب چڑھائے سٹین گنیں ہاتھوں میں لئے فل کمانڈو وردیوں میں اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ رات تاریک تھی۔ ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب آگے آگے ہماری راہ نمائی کر رہا تھا۔ ہم پہاڑی پگ ڈنڈیوں اور کھڈوں اور خشک نالوں میں سے گزرتے ہوئے

منزل کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔ کسی کسی وقت ہم آپس میں کوئی بات کر لیتے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب اس مہم میں ہمارا گائیڈ تھا۔ اسے سارے رستے کا علم تھا۔ وہ ہمیں شارٹ کٹ پہاڑی راستوں سے لے جا رہا تھا۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد ہم ایک کھلی جگہ پر آکر رک گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ پہاڑی کچھ فاصلے پر تھی۔ اس کے اوپر خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"یہی وہ پہاڑی ہے جس پر انڈین انفنٹری ڈویژن کی دو رجمنٹوں کی چھاؤنی ہے۔ یہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔ ہم دوسری طرف سے ہو کر پہاڑی کے عقب میں پہنچیں گے۔ اس میدان کے آگے جا کر حساس ایریا شروع ہو جائے گا۔ گو۔"

اور ہم کھلے میدان میں چل پڑے۔ میدان میں بھی ہلکی ہلکی دھند تھی۔ مگر یہ دھند زمین سے کوئی دو گز تک ہی اونچی تھی۔ ہم خود رو جنگلی جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کچھ دور چلنے کے بعد بائیں جانب ہو گیا۔ میدان آگے جا کر ختم ہو گیا اور اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ چنار کے درخت تھے۔ ہم ان درختوں کے نیچے سے بھی گزر گئے۔ درختوں کے جھنڈوں کے آگے بھارتی چھاؤنی والی پہاڑی کے ارد گرد کا صاف علاقہ شروع ہوتا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ہمیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سب قریب قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ رات خاموش اور تاریک تھی۔ ہمارے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہمیں اندھیرے میں صرف ایک دوسرے کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ پہاڑی کے اوپر فوجی چھاؤنی کی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ چھاؤنی پر بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

"آگے دشمن کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں سے ہمیں درمیان میں چھ چھ قدم کا فاصلہ ڈال کر ایڈوانس کرنا ہو گا۔ مگر ہمیں ایک دوسرے کو دیکھتے رہنا ہو گا۔ جس نے جتنا کھانسنا ہے اب کھانس لے۔ کیونکہ اس کے آگے کھانسنا صرف ہماری ہی نہیں بلکہ

ہمارے مشن کی موت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے صرف اشاروں میں بات کریں گے۔ کمانڈو اشارے آپ سب کو معلوم ہیں۔ کیا آپ لوگ سمجھ گئے ہیں؟"

ہم نے آہستہ سے کہا۔

"سمجھ گئے ہیں"

"کوئی سوال؟"

ہم نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کوئی سوال نہیں"

"آل رائٹ۔ گو"

کمانڈو اورنگ زیب اٹھ کر سب سے پہلے آگے چلا۔ اس کے پیچھے چھ قدم کا فاصلہ ڈال کر میں چل پڑا اور اسی طرح چھ چھ قدموں کا فاصلہ ڈال کر میرے دوسرے دو کمانڈو ساتھی بھی پیچھے پیچھے آنے لگے۔ ہم جھک کر چل رہے تھے۔ زمین کے اوپر گز ڈیڑھ گز تک پھیلی ہوئی سرد دھند کی وجہ سے ہمیں دور سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے ہیولے دھند میں حرکت کرتے کرتے نظر آرہے تھے۔ جس زمین پر ہم چلے جارہے تھے وہ اگرچہ غیر ہموار تھی مگر بھارتی فوج نے تمام جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کو کاٹ دیا ہوا تھا۔ جھک کر چلتے چلتے ہم پہاڑی کے دامن میں اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں اوپر کسی پوسٹ سے سرچ لائیٹ کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی گول دائرے کی شکل میں تھی اور پہاڑی کے دامن میں آہستہ آہستہ ایک جانب سے زمین پر پڑتی اور پھر ایک جگہ رک کر واپس چلی جاتی۔

میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو ایک جگہ رکتے دیکھا۔ کہرے اور دھند میں سے مجھے اس کا سایہ سا نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھے ایک خاص اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ میرے پاس آنے سے پہلے پیچھے آنے والی کمانڈو پارٹی کو بھی خاص اشارہ کرو۔ میں نے اپنے پیچھے اپنے ساتھیوں کو خاص اشارہ کیا اور خود دوڑ کر کمانڈو اورنگ زیب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دو سیکنڈ بعد ہمارے دوسرے دو ساتھی بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے۔ کمانڈو

اورنگ زیب کی نظریں پہاڑی چھاؤنی کے فوجی گیریزن سے آنے والی گھومتی روشنی کے گولے پر جمی ہوئی تھیں۔ سرچ لائیٹ کی روشنی کا گول دائرہ کافی بڑا تھا۔ پھر ایک جگہ رک گیا اور وہاں سے اسی طرح واپس ہونے لگا۔ ہمارا اور پہاڑی کا فاصلہ اب زیادہ نہیں تھا۔ ہمیں پہاڑی کے اوپر وہ کھمبے بھی نظر آنے لگے تھے جن پر بجلی کے بڑے بڑے بلب روشن تھے۔ ان کی روشنی پہاڑی کے نیچے تک آرہی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے سرگوشیوں میں کہا۔

"ہمیں سرچ لائیٹ کی روشنی کو کراس کرنا ہے۔ جہاں روشنی کا دائرہ جا کر رک جاتا ہے ٹھیک اس جگہ پر وہ سرنگ ہے جس میں ہمیں داخل ہونا ہے۔"

اس نے سرگوشی میں حکم دیا۔

"اپنی اپنی سٹین گنیں اور ایمونیشن چیک کرو"

ہم اندھیرے اور دھند میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنی اپنی سٹین گنوں کو اوپر اٹھا کر چیک کیا۔ پھر اپنے اپنے میگزین بیلٹوں کو خاص انداز سے چیک کیا۔ اورنگ زیب نے دوسرا حکم مجھے دیا۔

"چیک یو ئیر ٹائم بم"

میں نے اپنی کمر کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں سے چاروں ٹائم بم نکال کر چیک کئے اور کہا۔

"او کے"

کمانڈو اورنگ زیب نے سرگوشی میں کہا۔

"انڈین فوج کی پٹرول کمپنی گشت پر ہوگی۔ اس سے ہر حالت میں اپنے آپ کو دور رکھنا اور چھپانا ہے۔ فائر ہرگز نہیں کرنا۔ کمانڈو چاقو سے دشمن کی شہ رگ کاٹنی ہے۔ او کے؟"

ہم سب نے آہستہ سے کہا۔

"او کے"

اورنگ زیب نے آخری حکم دیا۔

"چیک یوئیر ہینڈ گرنیڈز"

ہم نے میگزین بیلٹوں میں سے اپنے اپنے ہینڈ گرنیڈوں کے پن چیک کئے اور کہا۔

"اوکے سرا"

کمانڈو اورنگ زیب نے اپنا نقاب پوش چہرہ ہمارے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"فاصلہ چھ چھ قدم۔ میں آگے جاؤں گا مجھ پر نگاہ رکھنا۔ جس طرف میں جاؤں تمہیں بھی ادھر آنا ہو گا۔ میں بیٹھ جاؤں تمہیں بھی بیٹھ جانا ہو گا۔ میرے اشاروں کو غور سے دیکھتے رہنا۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہے۔ گو"

ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے درمیان چھ چھ قدم کا فاصلہ ڈال کر چل پڑے۔ ہم بدستور جھک کر چل رہے تھے۔ کوئی پچاس قدموں کے فاصلے تک ہم اپنے گائیڈ کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے جھک جھک کر چلتے رہے۔ اس کے بعد کمانڈو اورنگ زیب نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ زمین پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے اسی طرح پیچھے اشارہ کر دیا۔ اب ہم چاروں زمین پر اوندھے لیٹے کہنیوں کے سہارے آگے رینگنے لگے۔ میں کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس رات پہاڑی کے نشیب میں دور دور تک دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھند نے ہمیں ایک بڑی اچھی اوٹ مہیا کر دی تھی۔ لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے دھند ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم سرچ لائیٹ کی روشنی کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ ہمیں روشنی میں پہاڑی کی ڈھلان پر کھڑے چیڑھ کے درخت نظر آنے لگے تھے۔ ہمیں دو تین فوجیوں کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ ہم زمین کے ساتھ چمٹ گئے۔ ہم نے ٹریننگ کے مطابق اپنے سانس تقریباً روک لئے تھے اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگے تھے۔ کیونکہ ناک سے سانس لیتے وقت ہلکی آواز ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مگر منہ سے سانس لیتے وقت اتنی آواز بھی نہیں پیدا ہوتی۔ ہم نے اپنے سیاہ نقاب پوش چہرے تھوڑے تھوڑے زمین سے اٹھا رکھے تھے۔ سرچ لائیٹ کی روشنی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس روشنی کے علاوہ وہاں

پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ کھمبے لگے تھے ان پر بھی بجلی کے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی کافی تھی اور پہاڑی کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور لوہے کی خاردار تار دکھائی دے رہے تھے۔ تین بھارتی فوجی جو رات کی گشت پر تھے باتیں کرتے پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں سینگنوں کے ساتھ کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں کرتے ہم سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر سے گزر گئے۔ وہ سرچ لائیٹ کے روشن دائرے میں سے گزرے تو ان کی رائفلوں کی نالیاں اور سٹیل کے ہیلمٹ چمک اٹھے۔

جب وہ پہاڑی کے پہلو میں کچھ دور جا کر اندھیرے اور کہرے میں غائب ہو گئے تو پارٹی کے کمانڈر اورنگ زیب نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دوبارہ کچھوؤں کی طرح کہنیوں کے سہارے رینگنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب رینگتے رینگتے کچھ اور بائیں جانب ہو گیا تھا۔ ہم کہرے اور اندھیرے کی چادر میں چھپ گئے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ہم بیس گز کا فاصلہ طے کر کے پہاڑی کے دامن میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں خاردار تار لگا ہوا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں رینگتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ ہم نے اپنی اپنی میگزین بیلٹ میں سے دو چھوٹے مگر بڑے طاقتور پلاس نکالے اور بری برق رفتاری سے خاردار تار کو دو جگہ سے کاٹنا شروع کر دیا۔ پھر دونوں جگہوں کو ایک دوسرے سے ہلا دیا۔ یوں وہاں ایک دو تین فٹ چوڑا سوراخ بن گیا۔ ہم چاروں کمانڈو باری باری اس سوراخ میں سے دوسری طرف نکل گئے۔ آگے زمین نیچے اترائی میں چلی گئی تھی۔ یہاں گھاس تھی جو شبنم اور کہرے کی وجہ سے گیلی ہو گئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب کے ساتھ ہم نے بھی اپنے آپ کو نشیب میں اس طرح گرا دیا کہ ہم رول کرتے یعنی لڑھکتے ہوئے نیچے جھاڑیوں میں جا لگے۔ اورنگ زیب جلدی سے اٹھا اور جھک کر پہاڑی کی دیوار کی جانب دوڑ پڑا ہم بھی اس کے پیچھے دوڑے۔

پہاڑی کی دیوار میں اونچی اونچی سخت سرکنڈوں والی جھاڑیاں تھیں۔ ہم ان میں

گھس گئے۔ شبنم اور رات کو پڑنے والے کہرے اور دھند نے ان سرکنڈوں کو بھی گیلا کر دیا ہوا تھا۔ اس لئے ان میں سے گھس کر دوسری طرف نکلتے وقت آواز پیدا نہ ہوئی۔ ہم پھر اوندھے لیٹ کر رینگنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب اچانک ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں نے سر تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا۔ وہ اندھیرے اور اونچی اونچی جھاڑیوں میں مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میرے پیچھے دونوں کمانڈو بھی میرے قریب آکر زمین پر اس طرح اوندھے ہو کر رک گئے تھے۔ اچانک ہمیں الو کے بولنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ ہمارا خاص اشارہ تھا کہ سب خیریت ہے آگے بڑھو۔ یہ آواز کمانڈو اورنگ زیب نے نکالی تھی۔ جدھر سے آواز آئی تھی ہم جتنی تیزی سے رینگ سکتے تھے رینگتے ہوئے اس طرف چلے گئے۔ ہم نے کمانڈو اورنگ زیب کو پہاڑی کے عین نیچے جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے چلے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تیزی سے اس کے پاس آگئے۔ اورنگ زیب جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹا رہا تھا۔ پھر ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ جب جھاڑیوں سے باہر نکلے تو ہم ایک خشک جگہ پر آگئے تھے۔ یہاں زمین کی گھاس گیلی نہیں تھی۔ اندھیرا باہر کی نسبت یہاں زیادہ تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے پنسل ٹارچ روشن کر دی اور بولا۔

"کھڑے ہو کر آجاؤ۔"

پنسل ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ہم ایک تنگ غار میں تھے جس کی دیواروں کے باہر کو نکلے ہوئے پتھر نظر آرہے تھے۔ ہم کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ یہ وہی سرنگ تھی جو پہاڑی کے عقب کی جانب سے مغل بادشاہوں کے زمانے میں کسی نہ معلوم مقصد کے لئے کھودی گئی تھی اور اب عرصہ دراز سے بند پڑی تھی اور پہاڑی ٹیلے کے اوپر بھارتی فوجیوں کو اس کی خبر نہیں تھی۔

اب ہم سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے اور کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے قدم قدم چل رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب پنسل ٹارچ کی روشنی ڈال کر ہمیں راستہ دکھا رہا تھا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی اگرچہ معمولی تھی مگر غار کے گھرے اندھیرے میں وہ بہت کافی

تھی۔ اس نے چھت پر روشنی ڈالتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"ہم اوپر بھارتی فوجی چھاؤنی کے نیچے سے گزر رہے ہیں۔"

غار میں نمی تھی اور فضا میں گھٹن کا احساس تھا مگر ہمیں اس قسم کے ماحول میں رہنے اور گزر جانے کی بھرپور ٹریننگ مل چکی تھی۔ سرنگ کی چھت ہمارے سروں سے کوئی ایک فٹ اونچی تھی۔ کئی جگہوں پر چھت پر لٹکتے ہوئے جالے ہمارے چہروں کے آگے آئے۔ سرنگ میں باہر کی نسبت سردی بہت کم تھی۔ بلکہ ہمیں ہلکی ہلکی گرمائش کا احساس ہو رہا تھا۔ سرنگ آگے جا کر ایک طرف کو مڑ گئی۔ یہاں زمین پر جگہ جگہ چھت پر سے اور دیواروں پر سے اکھڑ اکھڑ کر گرے ہوئے پتھر اور مٹی پڑی تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔

ایک جگہ جا کر سرنگ بند ہو گئی اور آگے دیوار آگئی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے وہاں رک کر پنسل ٹارچ کی روشنی چھت پر ڈالی اور کہا۔

"اوزار نکالو"

یہ اوزار جو فولاد کی چھوٹی گینتیاں تھیں ہمارے دو ساتھیوں کے پاس تھیں۔ انہوں نے فوراً فولادی گینتیاں نکالیں اور جہاں اورنگ زیب کھڑا تھا وہاں لپک کر آگئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے چھت پر ایک جگہ ٹارچ کی روشنی ڈالی اور کہا۔

"یہاں سے کھودنا شروع کر دو"

دونوں کمانڈوز نے چھت کے پتھروں میں گینتیاں پھنسا کر انہیں آہستہ آہستہ دھچکے دینے شروع کر دیئے۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"کیا پتھر اکھڑ جائیں گے؟"

وہ میرے قریب کھڑا تھا۔ ہم دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگا۔

"یہ چٹانوں کی پہاڑی نہیں ہے۔ یہ مٹی گارے اور پتھروں کی پہاڑی ہے۔ میں نے اس کا پورا سروے کر رکھا ہے۔ چٹانی ٹیلے میں ہم سوراخ بھی نہیں ڈال سکتے تھے لیکن یہ پتھروں اور گارے سے مل کر پہاڑی بنی ہوئی ہے۔"

اس دوران چھت کے دو تین پتھر اکھڑ کر نیچے گرے۔ ہمارے ساتھی کمانڈو اس طرح گینتیاں چلا رہے تھے کہ ان کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ گینتی کے تیکھے سرے کو چھت کے کسی پتھر کے کونے یا پہلو میں پھنساتے اور پھر پوری طاقت لگا کر اسے اوپر کو اکھاڑ ڈالتے۔ چھت کے چھوٹے بڑے پتھروں کے ساتھ اب مٹی بھی گر رہی تھی۔ میں نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں چھت کی موٹائی کتنی ہو گی؟"

اورنگ زیب نے کہا۔

"میرے حساب سے ہمیں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ فٹ اوپر تک چھت میں سوراخ نکالنا ہو گا۔ یہ پہاڑی تقریباً دو اڑھائی سو فٹ اونچی ہے۔ مگر اس چھت کے اوپر پہاڑی نہیں ہے بلکہ پہاڑی کے اندر جو قدرتی سرنگ بنی ہوئی ہے اس کا فرش ہے۔ ہمیں اس سرنگ کے اوپر جو سرنگ ہے اس میں جانا ہے۔ اسی سرنگ میں ایمونیشن کا ذخیرہ ہے۔"

چھت میں سوراخ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سوراخ کم از کم تین فٹ چوڑائی میں ڈالا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے دونوں کمانڈوز کو آرام کرنے کا موقع دیا اور میں اور کمانڈو اورنگ زیب گینتیاں لے کر چھت میں سوراخ ڈالنے لگے۔ واقعی پہاڑی گارے مٹی اور پتھروں کی آمیزش سے بنی ہوئی تھی۔ مٹی اور پتھر ہمارے اوپر گر رہے تھے مگر ہم بے فکر ہو کر پوری جانفشانی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں ہے جتنا کہ ہم نے اندازہ لگایا تھا۔ جیسے جیسے چھت میں سوراخ اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا پتھروں کی جسامت بڑی ہوتی جا رہی تھی اور انہیں اکھاڑتے ہوئے ہمیں کافی وقت صرف کرنا پڑ رہا تھا پندرہ بیس منٹ تک ہم محنت کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر ہمارے دوسرے ساتھیوں نے یہ کام سنبھال لیا۔

میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"یہ کام اتنی جلدی ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر دن نکل آئے۔"

کمانڈو اورنگ زیب بھی فکر مند تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں پنسل ٹارچ پکڑے اوپر چھت

پر روشنی ڈال رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"چاہے کچھ بھی ہو ہم اپنا مشن مکمل کیے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

چھت میں سے دو تین بڑے پتھر نیچے سرنگ میں گرے تو ان کی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے کہا۔

"اوپر والی سرنگ میں یہ آواز جا سکتی ہے"

کمانڈو اورنگ زیب نے چھت پھاڑنے والے ساتھیوں سے کہا۔

"کوئی بڑا پتھر گرانے سے پہلے بتا دو۔ ہم انہیں نیچے سے کیچ کر لیں گے۔"

وہ مجھ سے متوجہ ہو کر بولا۔

"اوپر فوجی ایمونیشن ڈپو پر جہاں تک میرا خیال ہے کوئی فوجی گارڈ پہرہ نہیں دے رہا ہو گا۔ گارڈ کے سپاہی سرنگ کے باہر جہاں دروازہ لگا ہوا ہے وہاں پہرہ دے رہے ہوں گے۔ انہیں غار کے اندر آ کر پہرہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ اوپر کسی وقت بھی کوئی انڈین فوجی چکر لگاتا آ سکتا ہے۔"

اب اوپر سے کوئی بڑا پتھر اکھڑتا تو ہمیں اشارہ کر دیا جاتا۔ میں دونوں ہاتھ آگے کر لیتا اور جیسے ہی پتھر اوپر سے گرتا میں اسے اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتا اور آرام سے نیچے رکھ دیتا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی گھڑی پر ٹارچ کی روشنی ڈالی کہنے لگا۔

"رات کا ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی دن نکلنے میں کافی وقت ہے"

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"جلدی جلدی کرو"

چھت کا سوراخ فٹ ڈیڑھ فٹ کے قریب اوپر کو کھودا گیا تو ہاتھ پوری طرح سے اوپر نہیں جاتے تھے۔ اس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا۔ چھت کے سوراخ کے اندر پتھروں اور مٹی کی چھت کا فاصلہ سرنگ کے فرش سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا اور گینتی چلانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس کا علاج یہ نکالا گیا کہ فرش پر جو بڑے بڑے پتھر گرے تھے ان کو جوڑ کر چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا گیا۔ ہم اس کے اوپر کھڑے ہو کر کام کرنے

لگے۔ لیکن اس طرح سے ہمارے پاؤں بار بار چبوترے سے ہل جاتے تھے اور کام کی رفتار
میں کافی فرق پڑنے لگا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے پنسل ٹارچ فرش پر پتھروں کے سہارے اس طرح ٹکا دی
تھی کہ اس کا روشنی کا چھوٹا سا دائرہ اوپر چھت کے سوراخ پر پڑ رہا تھا۔ ہم دونوں بیٹھے
ہوئے تھے۔ ہمارے دونوں کمانڈو ساتھی پتھروں پر کھڑے چھت کے سوراخ میں کندھوں
تک گھسے گینتیاں چلا رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اور
کمانڈو اورنگ زیب اپنی اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑیاں دیکھ لیتے تھے۔ رات کے دو بج
گئے اور ابھی تک آدھا کام بھی نہیں ہوا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب بھی پریشان ہو گیا۔ اتنے
میں اوپر چھت کے سوراخ کے اندر سے ہمارے ساتھی نے سرگوشی میں آواز دی

"چھت میں پتھر کی لمبی چوڑی سل آگئی ہے۔ اس پر گینتی چلانے سے آواز پیدا ہو
گی۔"

کمانڈو اورنگ زیب پنسل ٹارچ لے کر اٹھا۔ اور خود سوراخ کے اندر روشنی ڈال کر
دیکھا۔ پھر مجھے ٹارچ دے کر کہا۔

"تم دیکھو۔"

میں نے سوراخ کے اندر روشنی ڈال کر چھت کو دیکھا۔ واقعی وہاں ایک چوڑی پتھر
کی سل دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے تک سربسر چلی گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اوپر
یہاں پہلے کوئی روشندان ہوتا تھا جس پر بھاری سل ڈال کر بند کر دیا گیا ہے۔ میں نے
ساتھی کمانڈو سے کہا۔

"گینتی مجھے دو۔"

میں نے گینتی پکڑ کر سل پر ہلکی سی ضرب لگائی تو آواز پیدا ہوئی۔ میں نے نیچے آکر
اورنگ زیب سے کہا۔

"سل بڑی سخت ہے۔ ہمیں کسی دوسری جگہ سے سوراخ کرنا ہو گا"

اورنگ زیب مجھے دیکھنے لگا۔ ہم نے نقاب الٹ رکھے تھے اور ٹارچ کی دھیمی دھیمی

روشنی میں ہمیں ایک دوسرے کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ وہ دوسری بار سوراخ کے اندر
اوپر گیا اور چند سیکنڈ تک پتھر کی سل کو ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا۔ پھر نیچے آکر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے سل زیادہ چوڑی نہیں ہے ہم ایک کنارے سے اسے اکھاڑنے کی
کوشش کریں گے۔"

اس نے اپنے ساتھی کمانڈو کو اشارہ کیا۔ وہ گینتی لے کر پتھروں کے اوپر کھڑا ہو کر
سل کے کناروں کو اکھاڑنے لگا۔ نیچے صرف مٹی اور کنکریاں گر رہی تھیں۔ اورنگ زیب
نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"اگر صبح ہونے تک ہمارا مشن مکمل نہ ہوا تو ہمیں اگلی رات کے لئے بھی سرنگ
میں بند رہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر ایسی صورت پیدا ہو گئی تو ہم سرنگ میں دن بسر کر لیں گے۔ ہم بھوکے پیاسے
رہ سکتے ہیں۔"

اورنگ زیب اوپر چھت کو تک رہا تھا۔ اتنے میں اوپر سوراخ کے اندر جو کمانڈو کام
کر رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ایک طرف سے سل اکھڑ رہی ہے"

ہمارے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"شاباش! کام جاری رکھو"

تھوڑی دیر بعد میں نے اور اورنگ زیب نے سل کا جائزہ لیا۔ واقعی سل کا ایک
جانب سے سرا باہر نکل آیا تھا۔ اب اس کے آس پاس کی مٹی اور پتھر اکھاڑے جانے
لگے۔ سل نیچے کو جھک آئی۔ ہم زور لگا کر اسے نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ
اوپر سے بھاری قدموں اور کئی ٹریلر کے پہیوں کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم وہیں
ساکت ہو گئے۔ اوپر سے فوجیوں کی باتیں کرنے کی دھیمی آوازیں آنے لگیں۔ کمانڈو
اورنگ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے ہم نے غلط جگہ پر چھت نہیں کھودی۔ مجھے یقین ہے یہاں سے ع
اوپر ایمونیشن ڈمپ ہے۔"

ہم سرگوشیوں میں بول رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے سرنگ کے اندر مزید گولہ بارود وغیرہ رکھا جا رہا ہے۔"

اورنگ زیب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم سب ہمہ تن گوش تھے اور ہمارے کان ا
سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ یہ آوازیں اتنی مدھم تھیں کہ فوجیوں
باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ یہ تین چار بھارتی فوجی تھے۔ پھر ایسے لگا جیسے ٹریلر
اوپر سے بھاری کریٹ اتار کر دیواروں کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک نیا کام ا
شروع ہو گیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ
بتا چکا ہوں کہ کمانڈو پارٹی جب اپنے مشن پر نکلتی ہے تو عام طور پر اسے ٹارگٹ کے بار
میں پوری معلومات بتا دی جاتی ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ٹارگٹ پر پہنچ
کے بعد صورت حال بدل جاتی ہے۔ پھر کمانڈوز کو اپنی عقل کے مطابق فوری طور پر ک
دوسرے پلان پر عمل کرنا پڑ جاتا ہے۔ یہاں ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال
گئی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور چھت کے اوپر دوسری سرنگ کے ایمونیشن ڈم
میں کوئی سامان رکھا جا رہا تھا اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہم سوائے انتظ
کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اوپر دوسری سرنگ میں بھارتی فوجیوں کی موجو
میں چھت کی سل اکھاڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کوئی پتہ نہیں تھا
اوپر فوجی کب سامان رکھ کر واپس جاتے ہیں۔

رات کے تین بجے کا ٹائم ہو گیا اور ہم چاروں کمانڈو سرنگ کے اندر اندھیرے
ایک دوسرے کے پاس خاموش اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب یہ لوگ فوجی ساز و سامان
ڈپو میں رکھ کر واپس جاتے ہیں۔ اوپر سے برابر ٹریلر کے بار بار اندر آنے، سامان رکھنے
بھارتی فوجیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"لگتا ہے آج رات ہم اپنا ٹارگٹ نہیں مار سکیں گے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے اس خیال سے ٹارچ بجھا دی ہوئی تھی کہ اس کے سیل خرچ
نہ ہوں۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"چار بجے باہر صبح کی روشنی پھیلنی شروع ہو جائے گی۔ ہمیں اوپر جا کر ڈائنا مائیٹ بھی
لگانا ہے اور یہاں سے نکلنا بھی ہے۔"

پھر اس نے اوپر سوراخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے جیسے گیریژن سے اسلحہ گولہ بارود کی سپلائی آئی ہے۔ یہ کام لمبا ہو
سکتا ہے۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

میں نے پوچھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم دونوں یہاں ٹھہرتے ہیں۔ باقی ساتھیوں کو واپس بھیج دیتے
ہیں۔ چھت کے سوراخ کا کام بھی تھوڑا رہ گیا ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب کو میرا مشورہ پسند آیا۔ اس نے دونوں کمانڈو سے کہا۔

"تم لوگ واپس چلے جاؤ ہم دونوں یہیں رہیں گے اور ٹارگٹ اڑا کر اور مشن مکمل
کر کے آئیں گے۔ اگر ہم صبح ہونے تک آگئے تو ٹھیک ہے۔ نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم
دوسری رات کو سرنگ میں رہ کر ٹارگٹ ماریں گے۔ پھر تم ایسا کرنا کہ کل شام کا اندھیرا
ہوتے ہی اگر لا سکو تو ہمارے لئے کچھ بنے ہوئے چنے اور پانی کی چھاگل لے آنا۔ یاد
رکھو۔ میں تمہیں جس طرف سے لایا ہوں اسی راستے سے واپس جانا۔ دشمن کی پٹرول
پارٹی سے خبردار رہنا۔ اور ہاں جاتی دفعہ خاردار تار کو جہاں سے ہم نے کاٹا تھا اسے وہاں
اپنی جگہ پر لگا کر جوڑ دینا۔ تاکہ صبح کسی کو شک نہ پڑے۔ او کے۔ گو۔"

دونوں ساتھی کمانڈو نے چہروں پر نقاب کھینچ کر ڈالے اور خاموشی سے سرنگ میں

واپس چلے گئے۔ اب سرنگ میں میں اور کمانڈو اورنگ زیب اکیلے رہ گئے۔ ہمارے کان سرنگ کی چھت پر اوپر کی آوازوں پر لگے تھے۔ عجیب اتفاق سے اوپر کی آوازیں غائب ہو گئیں۔ ٹریلر جس پر فوجی سازوسامان لاد کر سرنگ کے اندر ایمونیشن ڈپو میں لایا جا رہا تھا اس کی آواز بھی دور جا کر ختم ہوگئی۔ اوپر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا۔

"میدان صاف ہے۔ ہمیں چھت کی سل اکھیڑنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میں چاہتا ہوں آج کی رات میں ہی یہ مشن مکمل کر لیا جائے۔"

ہم باری باری سرنگ کی چھت کی سل اکھاڑنے میں لگ گئے۔ کوئی دس منٹ بعد سل ایک طرف سے نیچے جھک گئی۔ ہم نے بڑی احتیاط سے کہ آواز پیدا نہ ہو' سل کو تھام کر اکھاڑ دیا۔ سل کے اکھڑتے ہی اوپر سے بجلی کے بلب کی روشنی نیچے آنے لگی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے"

چاروں دھماکہ خیز بم میری میگزین جیکٹ میں تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں بلکہ سرگوشی میں اورنگ زیب سے کہا

"تم یہیں ٹھہرو گے۔ میں اوپر جا کر بم پلانٹ کروں گا۔"

ہم نے ہاتھوں سے پتھر اور مٹی ہٹا کر چھت میں اتنا سوراخ بنا دیا تھا کہ ایک آدمی اس میں سے نکل سکتا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب بیٹھ گیا۔ میں اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر چھت کے شگاف میں اوپر کو اٹھا اور بڑی احتیاط سے سر باہر نکال کر دیکھا۔

یہ ایک اونچی چھت والی چٹانی سرنگ تھی۔ دیوار پر ایک جانب بجلی کا بلب روشن تھا۔ یہ دیکھ کر میرے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ سرنگ میں ایک جانب زمین سے لے کر چھت تک ایمونیشن کے ے بڑے کریٹ لگے ہوئے تھے۔ لمبی میزوں پر مختلف قسم کا فوجی اسلحہ کے بھی ڈھیر لگے تھے۔ سرنگ خالی تھی۔ میں اوپر چڑھ آیا۔ سب سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سرنگ کا جس کو بھارتی فوج ایمونیشن ڈپو کے طور

استعمال کر رہی ہے دروازہ کس طرف ہے اور کیا وہ بند ہے۔ میں سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھا۔ اس وقت سٹین گن کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا جس کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ سرنگ چند قدم چلنے کے بعد مڑ گئی۔ میں بھی اسی طرف مڑ گیا۔ میرے سامنے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر سرنگ کا دہانہ تھا جس پر لوہے کا دروازہ لگا تھا جو بند تھا اور اندر کی جانب اوپر کر کے ایک بلب روشن تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ آگ بجھانے والے سلنڈر لگے ہوئے تھے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ سرنگ میں کوئی بھارتی فوجی نہیں ہے اور دروازہ بھی بند ہے تو میں واپس ایمونیشن کے ذخیرے کے پاس آگیا۔ یہاں بے پناہ گولہ بارود اور بم اور میزائل اور دیگر فوجی ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی سے جیکٹ کی جیب میں سے چھوٹی ڈبی کے سائز کا پلاسٹک کا ٹائم بم نکالا اور ایک کریٹ کے پیچھے چپکا دیا۔ اس کے سامنے کی جانب دوسرا بم لگا دیا۔ بائیں جانب میری نظر پڑی تو مجھے سرنگ کا ایک شگاف دکھائی دیا۔ میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو اس میں پٹرول کے بڑے بڑے کین فرش سے چھت تک گئے ہوئے تھے۔ یہ بھارتی فوج کا عارضی پٹرول ڈمپ تھا۔ میں نے ایک بم وہاں بھی لگا دیا۔ میرے پاس صرف ایک بم رہ گیا تھا۔ میں نے وہ بھی وہیں لگا دیا۔ اب مجھے ان کے ٹائم ڈیوائس کے بٹن دبا کر سیکنڈوں کی سوئی کو اون کرنا تھا۔ ان بموں کا دورانیہ پچیس منٹ تھا۔ ان پچیس منٹوں کے اندر اندر مجھے اور کمانڈو اورنگ زیب کو اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتے تھے نکل جانا تھا۔

میں نے اپنی گھڑی پر ٹائم دیکھا اور پھر پٹرول ڈمپ کے دونوں بموں کا بٹن دبا کر ٹائم ڈیوائس کی سوئی کو چلا دیا۔ سوئی آہستہ آہستہ ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے آگے حرکت کرنے لگی۔ اس کے فوراً بعد میں نے شگاف سے باہر آکر ایمونیشن کے کریٹوں پر لگائے ہوئے ٹائم بموں کے بٹن دبا کر ان کی سوئی بھی اون کر دی۔ ہمارا آدھا بلکہ آدھے سے زیادہ مشن مکمل ہو گیا تھا۔ اب ہمیں یہاں سے فرار ہونا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی بھارتی

سپاہی صبح تک سرنگ کے اندر نہیں آئے گا۔ کم از کم پچیس منٹ تک کوئی نہیں آئے گا۔ کیونکہ انہوں نے ایمونیشن سپلائی جو اندر رکھنی تھی وہ رکھ چکے تھے۔ میں چھت کے سوراخ میں سے نیچے اتر گیا۔ میرے اترتے ہی کمانڈو اورنگ زیب نے سرگوشی میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ میں نے چاروں بم لگا کر انہیں اون کر دیا ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو"

ہم تیز تیز قدموں کے ساتھ پرانی سرنگ کے دہانے کی طرف چلنے لگے۔ اورنگ زیب پنسل ٹارچ سے روشنی کر رہا تھا۔ سرنگ کے دہانے پر جا کر اس نے ٹارچ بجھا کر جیب میں رکھ لی۔ ہم نے سٹین گنیں ہاتھوں میں پکڑ لیں اور سرنگ کے دہانے میں سے رینگ کر باہر جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں نکل آئے۔ سامنے باہر سرچ لائیٹ کا سفید دائرہ آگے کو جا رہا تھا۔ ہم رک گئے۔ جب روشنی کا دائرہ ہم سے آگے نکل گیا تو ہم دوڑ پڑے۔

بس یہ ہماری غلطی تھی۔ ہمیں خاردار تاروں تک رینگ کر جانا چاہتے تھا۔ لیکن بم لگانے کے بعد ہم چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جائیں۔ دور ہو جائیں۔ جیسے ہی ہم دوڑے ایک طرف سے کسی فوجی نے چلا کر کہا۔

"ہالٹ"

ہم دوڑتے گئے۔ ایک دم کسی مشین گن پوسٹ سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے چیختی ہوئی گزرنے لگیں۔ ساتھ ہی ٹیلے کی کسی پوسٹ پر سے روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے۔ یہ روشنی کی مدد سے آہستہ آہستہ نیچے آتے تھے اور یوں فضا میں دیر تک روشنی پھیلی رہتی۔ سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"جس طرف سے نکل سکتے ہو نکل جاؤ"

میں نے اسے دیکھا کہ اس نے ایک کھائی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ میں دوسری جانب کو دوڑا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اچانک چار بھارتی فوجیوں نے سٹین گنیں تان کر مجھے دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے پہاڑی کے اوپر لے گئے۔ وہ مجھے ساتھ ساتھ ٹھڈے بھی مار رہے تھے۔ کچھ اور فوجی سپاہی بھی ادھر ادھر سے نکل آئے۔ وہاں شور مچ گیا۔ اوپر والی مشین گن پوسٹ سے فائرنگ جاری تھی۔

"کمانڈو ہیں۔"

"ایک پکڑا گیا ہے"

"دوسرے بھی ہوں گے۔"

اس قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے پہاڑی کے پہلو میں ایک گن پوسٹ پر لے جا کر میری تلاشی لی گئی۔ میری سٹین گن۔ ہینڈ گرنیڈ اور میگزین بھارتی فوجیوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ میرے ہاتھ اوپر تھے۔ ایک سکھ فوجی پوسٹ سے نکل کر آگیا۔ اس نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"کتنے کمانڈو تھے؟"

میں نے کہا۔

"میں اکیلا آیا تھا۔ میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔"

اس نے میرے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور گالیاں دینے لگا۔

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے چلو اسے اوپر لے چلو۔"

چار سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا اور مجھے کھینچتے ہوئے پہاڑی کی چڑھائی پر اوپر لے جانے لگے۔ اس وقت آسمان پر پچھلے پہر کے نور کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ میری ایک جانب پہاڑی کی دیوار تھی۔ دوسری جانب میں نے دیکھا کہ کوئی پچاس فٹ نیچے ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ رات کے آخری پہر کی ہلکی روشنی میں مجھے نالے کا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ میری مجبوری تھی۔ اگر میں یہ فیصلہ نہ بھی

کرتا تو میری موت یقینی تھی۔ کیونکہ میں نے ایمونیشن کے ذخیرے اور پٹرول کے ڈمپ میں جو چار طاقتور بم لگائے تھے ان کے پھٹنے میں پندرہ بیس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد اس پہاڑی کو آتش فشاں پہاڑی کی طرح پھٹ پڑنا تھا اور وہاں پر موجود ہر شے کے پرخچے اڑ جانے تھے۔

میری نگاہ نیچے بہتے ہوئے نالے پر تھی۔ دو آدمیوں نے میرے ایک ایک بازو سے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے نیچے نالے میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پہاڑی نالے زیادہ گہرے نہیں ہوتے اور ان میں پتھر بھی ہوتے ہیں۔ اس میں گرنے سے میری موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ لیکن اس میں ایک فی صد جان بچ جانے کا امکان ضرور تھا جب کہ پہاڑی پر موجود رہنے کی صورت میں زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجی مجھے گالیاں دیتے ٹھڈے مارتے کھینچتے ہوئے اوپر لئے جا رہے تھے۔ میں نے آخری بار نیچے پہاڑی نالے کی طرف دیکھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر پہاڑی سڑک مڑ جاتی تھی اور نالے سے دور ہو جاتی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی وقت کرنا تھا۔ میں کوئی عام اناڑی آدمی نہیں تھا۔ تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ میرے لئے اپنے آپ کو ان فوجیوں سے چھڑانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے افراتفری میں میرے ہاتھ پیچھے نہیں باندھے تھے۔ جیسے ہی پہاڑی کا موڑ شروع ہوا میں نے ایک زبردست جھٹکے سے ایک سپاہی سے اپنا بازو چھڑایا۔ ساتھ ہی دوسرے جھٹکے سے دوسرے فوجی کے پیٹ میں لات مار کر اپنے آپ کو چھڑایا اور نیچے نالے میں چھلانگ لگا دی۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا جتنی جلدی ہم آنکھ جھپکتے ہیں۔ میں نالے کے ٹھنڈے پانی میں گرا۔ پانی گہرا تھا۔ اوپر شور مچ گیا اور مجھ پر سٹین گنوں ریوالوروں اور مشین گن کی فائرنگ ہونے لگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بچانا تھا۔ نالے کے پانی کا بہاؤ وہاں اتنا تیز تھا کہ دیکھتے دیکھتے میں پانی میں لڑھکتا ہوا پتھروں کے درمیان آگے نکل گیا۔ آگے نالے میں بڑے بڑے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ اگر میں ذرا پیچھے چھلانگ لگاتا تو ان پتھروں پر گرنے سے میری فوراً موت واقع ہو جاتی۔ دن کا اجالا ابھی پوری طرح سے نہیں ہوا تھا اور

رات کی تاریکی باقی تھی۔ نالے کے اوپر دھند بھی پھیلی ہوئی تھی۔ نالے کا تیز پانی مجھے وہاں سے نکال کر دور لے گیا۔ آگے ایک اور پہاڑی آگئی۔ نالہ اس کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف نشیب میں چلا گیا تھا۔ یہاں پانی کا بہاؤ پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ نالہ گہرا تھا اور میرے پاؤں نیچے نہیں لگ رہے تھے۔ میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا تیرتا چلا جا رہا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان پر بار بار روشنی راؤنڈ فائر کئے جا رہے تھے جن کی روشنی سے آسمان میرے پیچھے روشن ہو رہا تھا۔ مگر میں خطرے کی سرحد پار کر چکا تھا۔ نالہ دو تین ٹیلوں کے پہلو سے چکر کاٹ کر ایک جگہ درختوں کے جھنڈوں میں آگیا۔ میں نے دیکھا۔ نالے کے کنارے مجھ سے کافی دور تھے۔ درخت کناروں پر جھکے ہوئے تھے۔ میں تیرتا ہوا کنارے کی طرح بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں بھارتی چھاؤنی والی پہاڑی سے کافی دور نکل آیا ہوں۔ پہاڑی علاقے میدانی علاقوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ایک دو پہاڑیوں پیچھے نکل جائیں تو نہ صرف یہ کہ کئی کئی میل کا فاصلہ پڑ جاتا ہے بلکہ سمت بھی بدل جاتی ہے۔

کنارے پر آکر میں نالے سے باہر نکل آیا۔ میری میگزین جیکٹ اور پتلون پانی میں شرابور تھی۔ جیکٹ میں سے میگزین بھارتی فوجیوں نے نکال لیا تھا۔ میں درختوں میں ایک طرف تیز تیز چلنے لگا۔ آسمان پر صبح کا اجالا اب نمایاں ہونے لگا تھا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ آگے ایک کھائی آگئی۔ میں اس میں اتر گیا اور دوسرے کنارے پر سے باہر نکل آیا۔ آگے ایک اور گہری کھڈ تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مجھے کھڈ کی تہہ میں درخت اگے ہوئے نظر آئے۔ کھڈ کافی گہری تھی۔ دوسرا آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نشیب میں جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ کھڈ کی تہ میں بھی ایک نالہ بہہ رہا تھا مگر یہ چھوٹا سا پہاڑی نالہ تھا۔ میں اس میں سے گزر گیا۔ سامنے کھڈ کی دوسری دیوار تھی۔ اس میں اوپر جانے کے لئے جھاڑیوں اور درختوں میں ایک پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ میں چڑھائی چڑھ کر کھڈ سے باہر آیا تو میری نظر ایک چھوٹے سے ہموار قطعے پر پڑی۔ یہ کھیت تھے۔ کھیتوں کے پیچھے درختوں میں

ایک لکڑی کا مکان بنا ہوا تھا۔

میں اس طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا وہاں پولیس یا فوج کا کوئی مخبر کسان کے بھیس میں موجود ہو۔ میں جوار کے کھیت کی مینڈھ پر چلنے لگا۔ اب دن نکل آیا تھا اور اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ جوار کی فصل اونچی تھی اور میں اس کی اوٹ میں چل رہا تھا۔ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک جیپ کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یہ فوجی جیپ ہی ہو سکتی تھی۔ میں وہیں فصل میں گھس گیا اور جوار کے ٹانڈوں کو تھوڑا ہٹا کر جس طرف سے جیپ کے انجن کی آواز آ رہی تھی اس طرف دیکھنے لگا۔ کھیتوں کے کنارے دور درختوں کے نیچے جو لکڑی کا مکان مجھے نظر آیا تھا وہاں ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ ایک فوجی جیپ میں بیٹھا تھا۔ دو فوجی لکڑی کے مکان کے باہر ایک کشمیری کسان سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ دونوں فوجی سپاہی بھی جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ دوسری طرف پہاڑی راستے کی جانب نکل گئی۔

اس کا مطلب تھا میں ابھی خطرے سے باہر نہیں تھا۔ پہاڑی نالے سے میں کافی دور نکل آیا تھا۔ مجھے یہاں تک آئے اور نالے کے تیز بہاؤ کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ میں حیران تھا کہ ابھی تک میرے لگائے ہوئے بموں کا دھماکہ کیوں نہیں ہوا۔ میں فصل کے اندر بیٹھ گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے بم لگائے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ بم ابھی تک بلاسٹ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں سر جھکا لیا۔ بموں کے ٹائم ڈیوائس یا ڈی نیٹروں میں ضرور کوئی ٹیکنیکل خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ یہ ناممکن تھا کہ ٹھیک ٹائم پر بم نہ پھٹتے۔ اپنے مشن کی ناکامی پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب ہمیں دوبارہ اس مشن پر نکلنا تھا اور پہاڑی کے ایمونیشن کو اور ساتھ ہی چھاؤنی کی بارکوں اور پوسٹوں میں موجود دو ہزار کے قریب بھارتی فوجیوں کو کسی دوسرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ دن کے وقت ایمونیشن ڈپو میں فوجیوں نے ضرور آنا تھا اور انہیں فوراً سرنگ میں پڑا ہوا شگاف نظر آجاتا اور پھر وہ ڈی ٹیکٹر سے میرے لگائے ہوئے ناکارہ بموں کا بھی

سراغ لگا لیتے۔

میں پریشانی کے عالم میں جوار کے کھیت میں چپ چاپ بیٹھا تھا کہ اچانک زمین اس طرح لرزی جیسے زلزلہ آگیا ہو اس کے ساتھ ہی ایک مہیب دھماکہ ہوا۔ پھر ایک اور اس سے بھی زیادہ ہیبت ناک دھماکہ ہوا۔ پھر دھماکے شروع ہو گئے۔ زمین ہل رہی تھی۔ میں دوڑ کر کھیت سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر فوجی چھاؤنی والی پہاڑی تھی۔ وہاں پہاڑی کی بجائے صرف آگ کے شعلے اور دھواں ہی دھواں تھا۔ آسمان دھوئیں میں سیاہ ہو رہا تھا۔ شعلے آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ہر دھماکے کے بعد یہ شعلے کبھی سرخ اور کبھی نیلی رنگت اختیار کر کے اور زیادہ اوپر کو بلند ہو رہے تھے۔ ہم نے ٹارگٹ مار لیا تھا۔ ہمارا مشن کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کمانڈو اورنگ زیب ضرور ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔

میرا جی چاہا کہ میں دونوں ہاتھ بلند کر کے اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھارتی فوجی جیپ کی آمد اس بات کا ثبوت تھا کہ یہاں آس پاس بھارتی فوجی چوکیاں قائم ہیں میں ایک بار پھر کھیت میں گھس گیا اور سوچنے لگا۔ کس طرف کو جانا چاہئے۔ مجھے سمت کا اندازہ نہیں رہا تھا کہ ہماری خفیہ کمین گاہ کس طرف ہے۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور مشرق کی طرف چل پڑا۔ میں ایک کھیت سے نکل کر دوسرے کھیت میں گھسا ہی تھا کہ مجھے دو کشمیری کسان نظر آئے۔ ان میں ایک وہی کشمیری کسان تھا جو کچھ دیر پہلے لکڑی کے مکان کے باہر بھارتی فوجیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ فصل میں سے دونوں کشمیری مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑی اڑ چکی تھی۔ ساتھ ہی بھارتی فوجیوں اور ساری کی ساری بھارتی چھاؤنی کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکے ہلکے دھماکے اب بھی جاری تھے۔ دونوں کشمیری کسان جن میں سے ایک بوڑھا آدمی تھا اور دوسرا نوجوان تھا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھیت کی مینڈھ پر کھڑے اس طرف دیکھ رہے تھے جس طرف پہاڑی پھٹی تھی اور آسمان پر دھواں پھیلا ہوا تھا۔

بوڑھے کشمیری کسان نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کشمیری زبان میں کہا۔

"دشمن کو مار دیا ہے۔"

میں تھوڑی تھوڑی کشمیری بول لیتا تھا مگر کشمیری زبان سمجھ پوری لیتا تھا۔ نوجوان کشمیری نے کہا۔

"بابا! یہ کام ہمارے مجاہد کمانڈو نے کیا ہے۔ کشمیر آزاد ہو گا۔ بھارتی فوجی یہاں سے بھاگ جائیں گے۔"

کشمیری کسان نے کہا۔

"بھاگیں گے نہیں تو ہمارے مجاہد انہیں جلا کر بھسم کر دیں گے"

ان کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ محب وطن کشمیری ہیں اور ان میں کوئی پولیس یا انڈین فوج کا مخبر نہیں ہے۔ میں ان سے مدد لے کر اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں کھیت سے باہر نکل کر ان سے ہمکلام ہوتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ کمانڈو یونہی کسی کے سامنے اپنا آپ ظاہر نہیں کیا کرتے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے قریب سے ایک خرگوش نکل کر بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے فصل ہلی تو دونوں کشمیریوں نے کھیت کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اونچی فصل نے مجھے چھپا رکھا تھا۔

بوڑھے کشمیری نے کہا

"کون ہو؟"

اور وہ دونوں آگے بڑھ کر جہاں میں چھپا ہوا تھا وہاں آ گئے۔ اب میں انہیں صاف نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری فوجی جیکٹ اور پتلون کو وہ غور سے دیکھنے لگے۔ بوڑھے کشمیری نے کشمیری زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"مجاہد ہو؟"

میں نے کہا۔

"الحمد للہ مجاہد ہوں"

اور میں کھیت میں سے باہر نکل آیا۔ نوجوان کشمیری بولا۔

"بابا! یہ کشمیری نہیں ہے۔"

اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی کشمیری زبان میں بات کی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"میں پاکستانی کمانڈو ہوں۔ اس پہاڑی والی بھارتی چھاؤنی کو ہم نے ہی اڑایا ہے۔"

میرے لئے ان پر اپنا آپ ظاہر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ بوڑھے کشمیری نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بار بار میرا ماتھا چوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"پاکستان۔ اللہ اکبر۔ پاکستان ہماری جان۔ اللہ اکبر۔"

نوجوان کشمیری لڑکے کے سرخ و سپید چہرے پر مسرت کھلی ہوئی تھی اور وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کا ہیرو ہوں۔ بوڑھے کشمیری نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ بیٹا۔ یہاں اس وقت کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔"

درختوں کے نیچے جو لکڑی کا مکان تھا وہ مجھے اس میں لے گیا۔ اندر غریبانہ ماحول تھا۔ لکڑی کے فرش پر میلا سا نمدہ بچھا تھا۔ ایک طرف ساوار اور پیالیاں پڑی تھیں۔ اندر آ کر اس نے نوجوان کشمیری سے کہا وہ دروازہ بند کر کے باہر چوکس کھڑا رہے۔ لڑکا باہر نکل گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ بوڑھا کشمیری مجھ سے اپنے خاص لہجے میں اردو میں باتیں کرنے لگا۔ جب میں نے اسے پوچھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس جو بھارتی فوجی آئے تھے وہ اس سے کیا باتیں کر رہے تھے۔ بوڑھے کشمیری نے کہا۔

"وہ ہمارے مجاہد کمانڈو کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ادھر پاکستانی کمانڈو آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ یہاں میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ ہم غریب کسان مجبور و بے کس ہیں۔ جب تک ہم غلامی کی زنجیریں توڑ کر بھارتی فوجی بھیڑیوں سے نجات حاصل نہیں کر لیتے ہم آزادی کا سانس نہیں لے سکتے۔ وہ جاتی دفعہ کہہ گئے تھے کہ اس طرف کوئی اجنبی آدمی چلتا پھرتا نظر آئے تو ہماری پوسٹ پر آ کر خبر کرنا۔ میں نے کہہ دیا کہ ضرور خبر کر دوں گا۔ اور پھر وہ چلے گئے۔ اب ان کی چھاؤنی برباد ہو گئی ہے۔ وہ

تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تلاش میں اس طرف ضرور آئیں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"بابا! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان بھارتی فوجیوں کی پوسٹ یہاں سے کس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔"

بوڑھے کشمیری نے کہا۔

"ان کی فوجی چوکی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اسی لئے میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ اس طرف ضرور آئیں گے۔"

میں خود بھی ابھی وہاں سے باہر نکلنے اور جنگل میں جانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایمونیشن ڈپو اور پوری فوجی چھاؤنی کے تباہ ہو جانے کے بعد اس علاقے کی پوری فوج الرٹ ہوگئی ہوگی۔ اور بقول کشمیری بوڑھے کے ان کی ایک فوجی چوکی تو قریب ہی تھی۔ میں نے بابا سے کہا۔

"میں ابھی یہاں سے نکل کر اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف نہیں جانا چاہتا کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں آج کا دن چھپ کر گزار دوں۔ میں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

بوڑھا کشمیری کچھ سوچ کر بولا۔

"ایک جگہ ہے۔ ہم وہاں پہاڑی کی کھوہ میں اناج اور سوکھی لکڑیاں رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"دور نہیں ہے۔ مکان کے پیچھے ہی ہے۔ میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے مکان کے پیچھے لے آیا۔ یہاں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا باڑہ تھا جس میں دو تین بکریاں بھی نظر آئیں۔ باڑے کے قریب سے ایک راستہ اوپر پہاڑی کی طرف جاتا تھا۔ اس طرف پہاڑی میں ایک جگہ قدرتی غار سا بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو

چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک حقہ بھی پڑا تھا۔

بوڑھے کشمیری نے کہا۔

"اس غار میں چھپ جاؤ۔ میں تمہیں یہاں کھانا پانی چائے سب کچھ پہنچاتا رہوں گا۔"

میں شگاف میں گھس گیا جو غار کی طرح تھی مگر چھ سات گز لمبی ہی تھی۔ اس میں ایک طرف دھان کے خشک پولے اور دوسری طرف جلانے والی لکڑیوں اور درختوں کی سوکھی شاخوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں ان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ محب الوطن کشمیری بولا۔

"میں تمہارے لئے ناشتہ لاتا ہوں"

جاتے ہوئے وہ شگاف کے منہ کے آگے دونوں چارپائیاں ایک دوسری کے اوپر کھڑی کر گیا۔ میری جیکٹ اور پتلون اتنی دیر میں باہر کی ہوا اور جسم کی گرمی کے باعث کافی سوکھ چکی تھی۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کمانڈو اورنگ زیب کیس گاہ میں ضرور زندہ سلامت پہنچ گیا ہو گا۔ اور پہاڑی کے دھماکے اور ایمونیشن پھٹنے کی مہیب آوازیں اس نے اور کمانڈو شیروان نے بھی سنی ہوں گی اور وہ اپنے مشن کی کامیابی پر ضرور خوش ہو رہے ہوں گے۔ لیکن انہیں میری فکر ضرور ہو گی۔ کیونکہ کمانڈو اورنگ زیب نے میری طرف بھارتی فوجیوں کو بڑھتے اور بلند آواز میں مجھے ہالٹ کہتے ضرور سن لیا ہو گا۔ تاہم انہیں اس بات کا بھی یقین ہو گا کہ میں ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کمانڈو ہوں اور اگر مجھے آناً فاناً شوٹ نہ کر دیا گیا تو میں بھارتی فوجیوں کی قید سے نکل کر ان کے پاس ضرور پہنچ جاؤں گا۔

@تنے میں بوڑھا کشمیری میرے لئے ناشتہ لے کر آگیا۔

سبز چائے کے ساتھ روٹی اور مکھن تھا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے ناشتہ کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کی بیوی کو فوت ہوئے چھ سال بیت گئے ہیں۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین ہے۔ اس پر گزر بسر ہوتی ہے۔ کہنے لگا۔

”میں نے شیر علی کو یہ دیکھنے کے لئے بھارتی فوج کی چوکیوں کی طرف بھیجا ہے کہ وہاں کیا صورت حال ہے ابھی تک ادھر کوئی نہیں آیا۔ تم فکر نہ کرو۔ یہاں کوئی تمہیں دیکھنے نہیں آئے گا۔ میں سارا دن ہی گھر پر رہوں گا۔“

کچھ دیر وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شیر علی کے آنے کے بعد مجھے صورت حال سے باخبر کرنے کے لئے پھر آئے گا۔ شیر علی اس کے بیٹے کا نام تھا۔ میں نے سوچا کہ موقع ملا ہے تو کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کیں اور اس کے بعد سو گیا۔

باہر کچھ شور ہوا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دو تین آدمی اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے سے نکل کر شگاف کے منہ کے پاس آکر باہر دیکھنے لگا۔ یہاں سے بوڑھے کشمیری کے مکان کا آدھا صحن ذرا نشیب میں صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے تین ہری وردیوں والے بھارتی فوجیوں کو دیکھا جنہوں نے سٹین گنیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ بوڑھا کشمیری ان کے درمیان زمین پر بیٹھا تھا۔

باہر مکان کے دروازے پر فوجی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ میں مشین گن لگی تھی اور دو فوجی بیٹھے تھے۔ ایک فوجی نے بوڑھے کشمیری کے سر کے ساتھ سٹین گن کی نالی لگا کر غصے میں کہا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس نے نالے میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اسی طرف سے گزرا ہے بتاؤ وہ یہاں سے کس طرف گیا ہے؟“

بوڑھا کشمیری دھیمی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ ظاہر ہے وہ یہی کہہ رہا ہو گا کہ جس کمانڈو کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں وہ ادھر نہیں آیا۔ خدا جانے وہ کب سے اسے زدوکوب کر رہے تھے۔ فوجی نے سٹین گن اوپر کرتی اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

”چلو اسے آگے تلاش کرتے ہیں“

پھر اس بھارتی فوجی نے بوڑھے کشمیری کو پاؤں سے پیچھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ کمانڈو ادھر آیا تو ہمیں اسی وقت اطلاع دینا نہیں تو ہم تمہیں اور تمہارے بیٹے کو شوٹ کر دیں گے۔“

وہاں بوڑھے کا بیٹا شیر علی مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ تینوں فوجی صحن سے نکل کر جیپ میں سوار ہوئے اور جیپ آگے نکل گئی۔ مجھے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے اس نیک دل محب الوطن بوڑھے کشمیری کو تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن میں اگر وہاں نہ بھی آتا تو بھارتی فوجی اس سے پوچھ گچھ کرنے وہاں ضرور آتے۔ فوجیوں کے جانے کے بعد بوڑھا کشمیری اٹھ کر مکان کے اندر چلا گیا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ دن کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ میں کافی دیر سوتا رہا تھا۔ ان بھارتی فوجیوں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ علاقے میں فوج نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ لیکن بوڑھے کشمیری پر آئی ہوئی بلا ٹل گئی تھی اس کے لئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ درندہ صفت بھارتی فوجی بوڑھے کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔

میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے کس طرف سے ہو کر واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں جانا چاہئے۔ آدھا گھنٹہ گزرنے

کے بعد بوڑھا کشمیری میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"انڈین ملٹری کے آدمی آئے تھے مگر میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ چاہے مجھے شوٹ کر دیتے مگر میں انہیں کبھی نہ بتاتا کہ مجاہد کمانڈو پہاڑی والے غار میں ہے۔"

میں نے کہا۔

"بابا! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے"

بوڑھے کشمیری نے اللہ اکبر اللہ اکبر پکار کر کہا۔

"بیٹے تم مجاہدوں پر میری ہزار بار جان قربان۔ میں نے تو اپنے بیٹے شیر علی کو کشمیر کے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ کب سے مجھ سے اجازت مانگ ر تھا۔ تمہیں دیکھ کر اس کے دل کا جذبہ زیادہ ہو گیا تھا۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ اس خیال سے میر نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اب میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ جاؤ وطن کی آزادی ک خاطر دشمنوں سے جہاد کرو۔"

میں نے بوڑھے کشمیری کو نہیں بتایا تھا کہ میں یہ سارا واقعہ یہاں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"تمہارا بیٹا شیر علی کیا خبر لایا تھا؟ وہ کہاں ہے؟"

بابا نے کہا۔

"یہی میں تمہیں بتانے آیا تھا۔ شیر علی نے بتایا ہے کہ آس پاس کے سارے علا میں انڈین ملٹری پھیلی ہوئی ہے۔ قصبے میں گھر گھر کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ فوج چھ سات جوانوں کو پکڑ کر بھی لے گئی ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں کشمیری مجاہدین انہیں شب خون مار کر چھڑا کر لے جائیں گے۔ ایسا یہاں کشمیر میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے کشمیری مجاہدوں نے بھارتی فوجیوں کو اس قدر خوف زدہ کر دیا ہوا ہے کہ وہ کبھی شہر یا گاؤں میں اکیلے نہیں نکلتے۔ ہمیشہ دو دو یا تین تین کی ٹولیوں میں نکلتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے مجاہد گھات لگا کر انہیں بھون ڈالتے ہیں۔"

میں بوڑھے کشمیری کو اپنے ہائیڈ آؤٹ کا محل وقوع کسی حالت میں بھی نہیں بتا سکتا

تھا۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ جہاں سے ہم ایک پہاڑی نالے کے چھوٹے سے لکڑی کے پل کی طرف مڑتے ہیں وہاں ایک طرف خوبانیوں کا بہت بڑا باغ ہے۔ میں نے بابا کو اس باغ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"اگر میں اس باغ تک پہنچ جاؤں تو میں اپنے ساتھی مجاہدوں سے جا کر مل سکتا ہوں۔ کیونکہ وہاں قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میرا کوئی نہ کوئی کمانڈو ساتھی اس گاؤں میں میرا ضرور انتظار کر رہا ہو گا"

بوڑھا کشمیری کہنے لگا۔

"میں خوبانیوں کے باغ سے واقف ہوں۔ میں شیر علی کو تمہارے ساتھ کر دوں گا وہ تمہیں بڑے خفیہ راستے سے وہاں تک رات کو لے جائے گا۔"

اس کے بعد بوڑھا کشمیری میرے لئے کچھ کھانے کو لینے کے لئے چلا گیا۔ کھانا لے کر شیر علی اس کا بیٹا آیا۔ کہنے لگا۔

"بابا! گاؤں ایک کام سے گئے ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے شک سا پڑا۔ شک پڑنا ہمارے لئے بڑا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن بوڑھے کشمیری کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تو میں نے اپنے دل سے شک نکال کر باہر پھینک دیا۔ ہمیں کسی نہ کسی پر اعتبار بھی ضرور کرنا پڑتا ہے۔ شیر علی میرے سامنے بیٹھا رہا۔ میں نے تھوڑا بہت کھانا کھا لیا اور اس سے پوچھا۔

"کیا تمہارے بابا نے تم سے خوبانیوں کے باغ کا ذکر کیا تھا؟"

وہ بولا۔

"ہاں! بابا نے کہا تھا کہ تم اس باغ کی دوسری طرف پہاڑی ٹیلے کے پاس جو گاؤں ہے وہاں جانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اس گاؤں میں لے جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ تم مجھے بس خوبانیوں کے باغ میں پہنچا دینا۔ اس کے بعد میں خود ہی گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے اس سے بھارتی فوج کی چوکیوں کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"فوج کی یہاں صرف دو چوکیاں ہیں ایک یہاں سے نیچے خراس کے پاس ہے اور دوسری اوپر بائیں جانب پہاڑی ٹیلے پر ہے۔ میں سارا علاقہ پھر کر آیا ہوں۔ انڈین فوج میں نے درختوں اور ٹیلوں کے درمیان کئی جگہ گشت لگاتے دیکھے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"شیر علی! رات کو تم مجھے کس خفیہ راستے سے یہاں سے نکالو گے؟ کیا اس طرف فوجی گشت پر نہیں ہوں گے؟"

وہ کہنے لگا۔

"ضرور ہوں گے۔ مگر مجھے ان کی فکر نہیں۔ کشمیر کی پہاڑیوں میں ایسے ایسے خفیہ راستے ہیں کہ بھارتی فوج کی پوری پلٹن بھی آجائیں تو وہاں نہیں پہنچ سکتیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں رات کو کس وقت یہاں سے نکلنا چاہئے؟"

شیر علی نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔

"عشاء کی نماز کے بعد نکل چلیں گے"

وہ برتن لے کر جانے لگا تو میں نے کہا۔

"بابا کس وقت تک آجائیں گے؟"

وہ بولا۔

"تھوڑی دیر میں آجائیں گے تمہارے لئے کشمیری چائے لاؤں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں ہے"

وہ چلا گیا۔ میں رات کو وہاں سے نکلنے کے پلان کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر علی مجھے کسی محفوظ راستے ہی سے یہاں سے باہر نکالے گا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کشمیری دیہاتی پہاڑیوں کے تمام راستوں سے واقف ہوتے ہیں۔ شام ہو گئی تو بوڑھا

کشمیری میرے لئے کچھ کھانے کو اور سبز چائے لے آیا۔ کہنے لگا۔

"شیر علی کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد تمہیں لے کر یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔"

پھر وہ کہنے لگا۔

"بیٹا ہم غریب لوگ ہیں۔ تمہاری اچھی طرح سے خاطر تواضع نہیں کر سکے"

میں نے کہا۔

"بابا! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔"

عشاء کی نماز کے بعد شیر علی اور بوڑھا کشمیری دونوں میرے پاس پہاڑی کے غار میں آگئے۔ میں پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم غار میں سے نکل کر مکان کے عقب میں آئے تو بوڑھے کشمیری نے مجھے گلے لگا کر میرا ماتھا چوما اور کہا

"خدا تمہارا نگہبان ہو۔"

میں نے بوڑھے کشمیری سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور شیر علی کے پیچھے پیچھے مکان کے عقبی صحن کے نشیب میں اتر گیا۔ یہاں سے ایک گہری گھاٹی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم گھاٹی میں اتر گئے۔ شیر علی آگے آگے چل رہا تھا۔ گھاٹی میں اندھیرا تھا مگر اس اندھیرے میں ہمیں جھاڑیاں اور بڑے بڑے پتھر نظر آ رہے تھے۔ ہم گھاٹی کے اندر جھاڑیوں اور پتھروں کے درمیان راستہ بناتے۔ اندھیرے میں غور سے دیکھتے چلتے گئے۔ ہم کافی دور تک نکل گئے تھے۔ ایک جگہ کھائی بہت زیادہ نشیب میں اتر گئی تھی۔ شیر علی یہاں رک گیا۔ اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ ایک جگہ سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم سرکنڈوں اور جھاڑیوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ آخر ہم کھائی سے باہر آگئے۔ سامنے دو پہاڑی ٹیلوں کے درمیان ایک راستہ نظر آ رہا تھا۔ شیر علی اس راستے پر چلنے لگا۔ ٹیلوں کی دوسری طرف درختوں کے کافی جھنڈ تھے۔ شیر علی نے کہا۔

"یہاں سے بائیں طرف بھارتی فوج کی ایک چوکی ہے۔ ہم اب کوئی بات نہیں کریں

گے۔ ہو سکتا ہے کوئی گشتی پارٹی پھر رہی ہو۔"

ہم درختوں کے پیچھے سے ہو کر گزرنے لگے۔ ہم بڑی احتیاط سے چاروں طرف اندھیرے میں غور سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ ختم ہوئے تو ہمیں ایک پہاڑی نالے میں سے گزرنا پڑا۔ یہاں نالے کا پانی ہمارے ٹخنوں سے بھی نیچا تھا۔ نالے میں سے گزرنے کے بعد میں نے کچھ فاصلے پر اونچی پہاڑی کو دیکھا۔ شیر علی اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا۔

"اس پہاڑی کے پاس خوبانیوں والا باغ ہے جہاں آپ کو جانا ہے۔"

ہم خودرو جھاڑیوں' چھوٹے بڑے درختوں اور اونچی نیچی پگ ڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ راستہ تھوڑی دور چلنے کے بعد کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف مڑ جاتا تھا۔ ہم ایک چھوٹی سی وادی میں داخل ہو گئے۔ اندھیرے میں نیچے کچھ کھیت اور درخت نظر آ رہے تھے۔ پگ ڈنڈی ایک ٹیلے کا موڑ کاٹ کر دوسری جانب درختوں کے ہموار قطعے میں نکل آئی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ یہ اندھیرا ایسا نہیں تھا کہ جیسا کمرے میں بتی بجھ جائے تو ہوتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقے کی رات کا اندھیرا تھا جس میں ہر شے کا سلیٹی رنگ کا ہیولا ضرور نظر آ جاتا تھا۔ آسمان کبھی نظر آتا اور کبھی اوپر پھیلی ہوئی درختوں کی شاخوں کی اوٹ میں ہو جاتا۔ اچانک ہمیں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی جھاڑیوں میں چل رہا ہو۔ شیر علی نے اشارہ کیا اور ہم دونوں چلتے چلتے وہیں بیٹھ گئے۔ آواز تھوڑے فاصلے سے آ رہی تھی۔ پھر کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ عورت نے کشمیری زبان میں روتے ہوئے کہا۔

"خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ میری شادی ہونے والی ہے۔"

شیر علی نے اندھیرے میں میری طرف اور میں نے شیر علی کی طرف دیکھا۔ ایک سیکنڈ میں ہم معاملے کی نوعیت کو سمجھ گئے تھے۔ اتنے میں کسی نے عورت کو گالی دے کر ڈوگرہ لہجے میں کہا۔

"پہلے ہم دونوں تم سے شادی کریں گے"

یہ آوازیں ہم سے چند قدموں کے فاصلے سے آگے نکل گئی تھیں۔ عورت مسلسل آہ وزاری اور منت سماجت کر رہی تھی۔ شیر علی نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا۔

"یہ ڈوگرہ سپاہی ہیں۔ کسی کشمیری عورت کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔"

میں جھاڑیوں میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے آگے درختوں کی طرف دیکھا جدھر سے عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں دو فوجی ہیٹ والے آدمی نظر آئے جو ایک عورت کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے شیر علی کے کان میں کہا

"تم یہیں ٹھہرو"

اس کے ساتھ ہی میں اس چالاک چیتے کی مانند جس نے اپنے شکار کو دیکھ لیا ہو جست لگا کر جھاڑیوں کی دوسری جانب نکل گیا۔ میں ڈوگرہ فوجیوں سے پہلو بچاتا ہوا اوپر کے درختوں میں سے تیز تیز مگر جھک کر چلتا ان سے کوئی پچاس گز آگے نکل آیا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دور سے دونوں ڈوگرہ فوجی عورت کو کھینچتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ انہیں جھاڑیوں کے درمیان اسی پگ ڈنڈی پر سے گزرنا تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ میں بالکل نہتا تھا۔ مگر کمانڈو نہتا بھی ہو تو عام آدمی اور عام سپاہی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میرے اندر ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح کھولتا ابلتا ہوا جوش اور جذبہ بھی تھا۔ کافر ڈوگرہ فوجی ایک معصوم مسلمان عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میری موجودگی میں وہ زندہ بچ کر نکل جائیں۔

ڈوگرہ فوجیوں کے سائے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اتنا دیکھ لیا تھا کہ ان کی سٹین گنیں ان کے کاندھوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ میرے کمانڈو اٹیک کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ جب وہ اور قریب آ گئے تو میں جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ عورت سسکیاں بھرتے ہوئے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ ایک ڈوگرے نے عورت کا ایک بازو اور دوسرے ڈوگرے سپاہی نے عورت کو دوسرے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ عورت کو تیز تیز چلا رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ میں ڈوگرہ فوجیوں میں سے کسی ایک کو بھی اتنی

مہلت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ کندھے سے سٹین گن اتار کر مجھ پر فائر کر سکتا۔ بس ی
میری سب سے اہم حکمت عملی تھی۔ دونوں فوجی کشمیری عورت کو کھینچتے ہوئے ا
جھاڑی کے قریب سے گزر رہے تھے جس کے اندر میں چیتے کی طرح گھات لگائے بیٹھا تھ
جیسے ہی وہ میرے سامنے سے ایک قدم آگے ہوئے میں نے ان میں سے ایک فوجی پر ح
کر دیا۔ میرا حملہ کسی ناتجربہ کار جذباتی آدمی کا حملہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے ایک
ہی ضرب سے دشمن کو موت کی نیند سلانا ہو گا۔ اور اس کے ساتھ ہی بجلی ایسی تیزی سے
دوسرے فوجی پر اٹیک کرنا ہو گا۔

میں نے جھاڑیوں میں سے نکلتے ہی اپنی طرف والے ڈوگرہ فوجی کی گردن میں باز
ڈالا اور اسے پوری طاقت سے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ میں نے اسکی گردن کی ہڈی ٹوٹنے
کی آواز سن لی تھی۔ یہ ایک خاص آواز ہوتی ہے جس سے ہم کمانڈوز کے کان بخوبی آشنا
ہیں۔ اس آواز کے بعد دشمن کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پہلے ڈوگرہ فوجی کو چھوڑنے
کے ساتھ ہی میں نے دوسرے فوجی کو دبوچ لیا جو اپنے ساتھی پر حملہ ہوتے دیکھ کر اپنی
سٹین گن سیدھی کر رہا تھا۔ میں نے اسے سٹین گن کا ٹریگر دبانے کی مہلت نہ دی اور
نیچے سے ہاتھ مار کر اس کی سٹین گن کو اوپر کو اچھالا اور دوسرے بازو سے اس کی گردن کو
نیچے کر کے اپنی گھٹنوں کو زور سے اوپر اٹھا کر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ڈوگرہ سپاہی بوکھلا
کر نیچے گرا۔ مگر وہ ابھی زندہ تھا۔ میں فوراً اس پر گرا اور اس کی گردن دبوچ لی۔
دوسرے لمحے میرے ایک جھٹکے کے بعد وہ بھی مر چکا تھا۔

اس دوران کشمیری عورت سہم کر بیٹھ گئی تھی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے
اس خونیں ڈرامے کو دیکھ رہی تھی۔ جب میں دوسرے ڈوگرہ فوجی کو ٹھکانے لگا رہا تھا تو
کشمیری عورت اٹھ کر بھاگنے لگی۔ میں نے اسے شکستہ کشمیری زبان میں کہا۔

"بہن! بھاگو نہیں۔ میں مجاہد ہوں"

وہ وہیں رک گئی۔ دونوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں اندھیرے میں زمین پر جھاڑیوں
کے پاس پڑی تھیں۔ اب مجھے ان لاشوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ میں انہیں اسی طرح وہاں

نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے عورت کا دوپٹہ اس کے سر پر دیا اور آہستہ سے کہا۔

"میرا ایک کشمیری مجاہد ساتھی پیچھے ہے میرے ساتھ آؤ۔ وہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا
دے گا۔"

عورت نے میرا بازو تھام لیا۔ وہ خدا اور رسول ﷺ پاک کا نام لے کر مجھے
دعائیں دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"خاموش رہو"

وہ چپ ہو گئی۔ میں اسے لے کر وہاں آگیا جہاں شیر علی چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔
میرے ساتھ کشمیری عورت کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے کہا۔

"شیر علی! میں اس عورت کو ڈوگرہ فوجیوں سے بچا کر لے آیا ہوں"

شیر علی نے فرط مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دونوں ڈوگرے کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ان کی لاشیں جھاڑیوں کے پاس پڑی ہیں۔ ہمیں انہیں کسی ایسی جگہ پھینکنا ہو گا
جہاں سے ان کی لاشیں کسی کو نہ مل سکیں۔ کیا آگے کوئی کھڈ یا کھائی ہے؟"

شیر علی بولا۔

"ضرور ہو گی۔ آؤ وہاں چلتے ہیں"

اس نے کشمیری عورت کو تسلی دی اور اپنی زبان میں سمجھایا کہ ہم کشمیری کمانڈو
ہیں۔ اس طرف سے گزر رہے تھے کہ تمہاری آواز سن کر تمہاری مدد کے لئے رک
گئے۔ کشمیری عورت کا چہرہ مجھے اندھیرے میں مسکراتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہمیں دعائیں دینے
لگی۔ میں نے اسے کہا۔

"بہن! تم بھی ہمارے ساتھ آؤ۔"

شیر علی نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا گاؤں کہاں ہے؟"

کشمیری عورت نے گاؤں کا نام بتایا۔ تو شیر علی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"یہ اسی خوبانیوں کے باغ والا گاؤں ہے جس طرف ہم جا رہے تھے"
اس نے عورت سے کہا۔
"بہن! بے فکر ہو کر ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ میں تمہیں خود تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا"

ہم تینوں وہاں سے چل کر جھاڑیوں میں اس جگہ پر آ گئے جہاں دونوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں پگ ڈنڈی کے پاس پڑی تھیں۔ شیر علی نے ایک طرف دیکھ کر کہا۔
"اس طرف ایک کھڈ ہے۔ ہم اس کھڈ میں لاشوں کو گرا دیں گے۔ وہاں قیامت تک ان کی لاشوں کا پتہ نہ چل سکے گا"
میں نے ایک فوجی کی سٹین گن اور میگزین بیلٹ اتار کر اپنے کندھے سے لٹکالی۔ پھر ہم دونوں لاشوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں اس طرف لے گئے جس طرف شیر علی نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں درختوں کے نیچے ایک جگہ گہری کھڈ تھی۔ ہم دونوں لاشوں کو کھڈ میں گرا دیا۔ اس کے بعد شیر علی اور میں کشمیری عورت کو لے کر واپس چل پڑے۔ شیر علی آگے آگے چل رہا تھا اس کے پیچھے کشمیری عورت چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ شیر علی خاص راستوں سے لے کر چل رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد ہم ایک نشیبی میدان میں اترے تو کشمیری عورت نے سامنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"وہ ہمارا گاؤں ہے"
ہم اسی طرف روانہ ہو گئے۔ میں اب سب سے پہلے کشمیری عورت کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچانا چاہتا تھا۔ جب ہم گاؤں کے قریب آئے تو میں نے شیر علی سے کہا۔
"شیر علی! تم اس عورت کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔ میں یہاں تمہارا انتظار کرتا ہوں"
شیر علی جانے لگا تو کشمیری عورت نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے دعا دی اور شیر علی کے ساتھ گاؤں کی طرف چل پڑی۔ گاؤں کے چند ایک پہاڑی ٹائپ کے مکانوں کے ہیولے

دور سے سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ڈوگرہ فوجی کی سٹین گن کا جائزہ لینے لگا۔
کچھ دیر بعد شیر علی واپس آیا۔ وہ بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا۔
"جب میں اس عورت کو اس کے بوڑھے ماں باپ کے پاس لے کر گیا تو انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بیٹی ڈوگرہ فوجیوں کے قبضے سے نکل کر ان کے پاس باعزت واپس آ گئی ہے۔ دونوں بے چارے مصلیٰ پر بیٹھے دعائیں مانگ رہے تھے۔"
"تم نے انہیں بتا دیا تھا ناں کہ اگر فوج کے آدمی اپنے سپاہیوں کی تلاش میں گاؤں میں آئیں تو ان سے کوئی بات نہ کریں؟"
میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ آپ بے فکر رہیں"
میں نے شیر علی سے کہا۔
"چلو اب مجھے خوبانیوں والے باغ میں چھوڑ آؤ"
شیر علی مجھے لے کر ایک طرف چل پڑا۔ کہنے لگا۔
"آپ جہاں جانا چاہتے ہیں میں آپ کو وہاں بھی چھوڑ سکتا ہوں"
میں شیر علی کو کمانڈو شیروان کی خفیہ کیمپ گاہ کا ٹھکانہ کسی صورت میں بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔
"شیر علی! بس تم یہ سمجھو کہ مجھے خوبانیوں والے باغ تک ہی جانا ہے۔ بس تم مجھے وہاں پہنچا دو۔"
ایک وادی اور ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف اترنے کے بعد ہم خوبانیوں والے باغ میں پہنچ گئے۔ یہاں مجھے درختوں کے جھنڈ اور ٹیلوں کے نشیب شناسا لگ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے وہاں سے کس طرف جانا ہے۔ باغ میں آ کر میں نے شیر علی سے کہا۔
"دوست! تمہارا شکریہ! میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ اب تم واپس جا سکتے ہو"
شیر علی نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔

"جناب! کیا آپ مجھے بھی کمانڈو بنا کر اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتے؟ میں بھی کشمیر کے جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے رائفل چلانی آتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"شیر علی! تمہارا یہ جذبہ قابل قدر ہے مگر تمہیں میرے ساتھ جانے کی بجائے اپنے علاقے کے مجاہدین سے رابطہ پیدا کرنا چاہئے۔ وہ تمہیں کمانڈو کی ٹریننگ بھی دیں گے۔"

شیر علی مجھے السلام علیکم کہہ کر جس طرف سے مجھے لے کر آیا تھا اس طرف چل دیا۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جب شیر علی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں اٹھا اور نیچے جھاڑیوں میں سے گزر کر سامنے والے ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔ جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا مجھے راستے کی ساری نشانیاں ملتی جا رہی تھیں۔ آخر میں ایک گھاٹی کو پار کر کے ٹیلے کے درختوں میں پہنچ گیا۔ کمانڈو شیروان کا ہائیڈ آؤٹ یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ کمانڈو شیروان نے بڑی گرمجوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

"ہم نے پہاڑی کے گیریزن کو اڑا کر بھارتی فوج سے بدلہ لے لیا ہے۔"

میں نے کمانڈو اورنگ زیب کا پوچھا تو وہ بولا۔

"اورنگ زیب پہنچ گیا تھا۔ ہمیں تمہاری بہت فکر تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی زندہ سلامت واپس آگئے۔ اورنگ زیب سو رہا ہے۔ تم بھی آرام کرو۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"

کمانڈو شیروان نے میرے کندھے پر سٹین گن دیکھی تو اس نے پوچھا۔

"یہ سٹین گن تو کسی ڈوگرہ سپاہی کی ہے؟"

پھر میں نے اسے کشمیری عورت اور دونوں ڈوگرہ فوجیوں کو ٹھکانے لگانے کا سارا واقعہ سنا دیا۔ کمانڈو شیروان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولا۔

"تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟"

میں نے کہا۔

"بوڑھے کشمیری نے مجھے رات کو بہت کچھ کھلا پلا کر روانہ کیا تھا"

کمانڈو شیروان نے پر عزم لہجے میں کہا۔

"انشاء اللہ! وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب کشمیر میں ہماری آزادی اور خود مختاری کا سورج طلوع ہو گا۔"

میں اپنے چھوٹے سے لکڑی کے کھوکے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس قدر تھک گیا تھا کہ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

دوسرے روز دن چڑھے اورنگ زیب کمانڈو سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بھی اپنی گرفتاری اور پھر نالے میں چھلانگ لگا کر فرار ہونے اور شیر علی کے ساتھ کشمیری عورت کو بحفاظت اس کے ماں باپ کے پاس پہنچانے اور ڈوگرہ سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کی کارگزاری سنا دی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"میں تو کسی طرح وہاں سے نکل آیا تھا مگر مجھے تمہاری فکر تھی۔ ہم سب اس بات پر پریشان تھے کہ ہمارے ٹائم بم وقت پر نہیں پھٹے تھے۔ ہمیں ان بموں کے ٹائم ڈیوائس پھر سے چیک کرنے پڑیں گے۔ کمانڈر شیروان نے اپنے دو آدمیوں کی ان کی چیکنگ کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔"

میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے پوچھا۔

"اس دھماکے کے بعد تو بھارتی فوجیوں نے شہر میں اپنی ظالمانہ کارروائیاں تیز کر دی ہوں گی۔"

وہ بولا۔

"کمانڈر شیروان کے پاس ساری رپورٹیں پہنچ چکی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بھارتی فوج نے مجاہدین کے ایک ٹھکانے پر حملہ بھی کیا ہے مگر خوش قسمتی سے اس وقت وہاں کوئی مجاہد نہیں تھا۔ ویسے فوج نے کئی لوگوں کو گرفتار کیا ہے۔"

چلو کمانڈر شیروان کے پاس چلتے ہیں وہ تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا"

ہم دونوں غار کے اندر کمانڈو شیروان کے خفیہ ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ کمانڈو شیروان گیس کی روشنی میں میز پر بچھے ہوئے نقشے کو جھک کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر سبز رومال بندھا ہوا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر اس نے کہا۔

"پہاڑی گیریزن کی تباہی پر بھارتی فوج میں زبردست اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ فوج بوکھلا کر اندھا دھند پکڑ دھکڑ کر رہی ہے۔ فوجی ہائی کمانڈ کی یہ سب سے بڑی شکست ہے۔"

میں اور کمانڈو اورنگ زیب میز کے پاس سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔

"اس آپریشن میں کتنے بھارتی سپاہی مرے ہوں گے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم تک جو خبریں پہنچی ہیں ان کے مطابق انفنٹری رجمنٹ کے کم از کم ڈیڑھ ہزار فوجی اس وقت پہاڑی والے گیریزن میں موجود تھے اور ظاہر ہے اتنی بڑی تباہی کے بعد ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا ہو گا۔"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"سر! مجھے لگتا ہے بھارتی فوج اس کے جواب میں کوئی زبردست جوابی کارروائی کرے گی۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہمارے کشمیری مجاہد غافل نہیں ہیں۔ وہ ان کی ہر جوابی کارروائی کا اسی شدت سے مقابلہ کریں گے۔ ہم بھی تیار بیٹھے ہیں۔ اصل میں انڈیا کی حکومت اپنی فوج کشمیر میں بھیج کر سخت پریشان ہے۔ اس نے فوج کے ذریعے آزادی کشمیر کی تحریک کو دبا کر، کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو کچل کر کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہا تھا جس میں وہ پوری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ اگر ہمارے مجاہد شہید ہو رہے ہیں تو بھارتی فوجی بھی ہلاک ہو رہے ہیں۔ بلکہ بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کی رفتار زیادہ تیز ہے"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ کمانڈو شیروان کا خاص باڈی گارڈ اندر آیا۔ اس نے ایڑیاں جوڑ

کر سلیوٹ کیا اور کہا۔

"کمانڈو بابر علی شہر سے کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"اسے فوراً اندر بھیج دو"

وہاں خاموشی چھا گئی۔ اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے خیر کی خبر نہیں لگتی"

مجاہد بابر علی نے اندر آ کر کمانڈو شیروان کو سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ شیروان نے کہا۔

"کیا خبر لائے ہو؟"

بابر علی نے کہا۔

"کمانڈر! ابھی تھوڑی دیر پہلے بھارتی فوجیوں کے ایک دستے نے سری نگر کے شمالی محلے میں آ کر پندرہ مکانوں کو آگ لگا دی اور تحریک حریت کے بزرگ کارکن اور محلے کی جامع مسجد کے امام حاجی ثناء اللہ ڈار کی نوجوان بیٹی پروین ڈار کو اٹھا کر لے گئی ہے۔"

کمانڈر شیروان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ سٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

"فوج پروین ڈار کو کہاں لے گئی ہے؟"

بابر علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ معلوم نہیں۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ انہوں نے لڑکی کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔ پروین کی ماں اور چھوٹی بہن کو زدوکوب بھی کیا۔ اس وقت گھر پر پروین کا والد حاجی صاحب موجود نہیں تھے"۔

شیروان سٹول پر بیٹھ گیا۔ غصے میں اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے میز پر زور سے مکا مارتے ہوئے کہا۔

"ہم اس بزدلانہ کارروائی کا بدلہ لیں گے لیکن ہمیں سب سے پہلے حاجی صاحب کی

بیٹی پروین کو انڈین فوج کے قبضے سے چھڑانا ہو گا۔ ہم اس ظلم کو برداشت نہیں کر سکتے۔"

پھر اس نے بابر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بابر علی! یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ شام ہونے سے پہلے پہلے حاجی صاحب کی بیٹی کا پتہ لگاؤ کہ فوج نے اسے کہاں رکھا ہے اور اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک تو نہیں کیا گیا۔ ابھی جاؤ"

بابر علی نے سینے پر زور سے ہاتھ مار کر سلام کیا اور واپس چلا گیا۔ کمانڈو شیروان کے علاوہ ہم دونوں پر بھی ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے کہا۔

"ہم اس کے جواب میں ایریا کمانڈر کی بیٹی یا بیوی کو اغوا کریں گے"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"ہم بھارتی ایریا کمانڈر سمیت اس کے سارے خاندان کو ہلاک کریں گے"

شیروان کی اضطرابی کیفیت آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ بعد میں ہو گا۔ سب سے پہلے ہمیں پروین کو درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے چنگل سے نکال کر لانا ہو گا۔ پروین ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی سنجیدہ مزاج محب الوطن لڑکی ہے۔ میں اس فیملی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ حاجی صاحب اگلے سال بیٹی کی شادی کرنے والے تھے۔ یہ حادثہ نہ صرف پروین بلکہ اس کے سارے خاندان کو برباد کر سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"اس علاقے میں انڈین ملٹری کمانڈ ہیڈ کوارٹر کس جگہ پر ہے؟"

شیروان نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"ان کا ڈویژنل کمانڈ آفس سری نگر کے شمال میں ہے۔ مگر سب سے پہلے ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حاجی صاحب کی بیٹی کو فوج نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ یقیناً فوج نے اسے یرغمال بنایا ہو گا اور وہ اس کے بدلے حاجی صاحب سے ان مجاہدوں کا نام پوچھنا چاہتے

ہوں گے جنہوں نے بھارتی فوج کے خیال کے مطابق پہاڑی والی فوجی چھاؤنی کو اڑایا تھا۔"

سارا دن انتہائی بدمزگی میں گزرا۔ اس دوران کمانڈو شیروان نے اپنے ایک خاص آدمی کو حاجی ثنا اللہ ڈار کے گھر یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ بھارتی درندوں نے ان کی بیٹی کو نہیں ہماری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ ہم ایک ایک کر کے اپنی جانیں قربان کر دیں گے اور بیٹی پروین کو ظالم بھارتی فوج کی قید سے ضرور رہا کرائیں گے۔

ابھی شام کا اندھیرا پوری طرح سے نہیں چھایا تھا کہ مجاہد بابر علی آگیا۔ ہم لوگ غار کے اندر خاص تہہ خانے میں آگئے۔

"کیا معلومات لائے ہو؟"

کمانڈو شیروان نے پوچھا۔ بابر علی نے کہا۔

"کمانڈر! ایریا کمانڈر کرنل بھگت رام نے حاجی صاحب کو پیغام بھجوایا ہے کہ ہم تمہیں دو دن کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر دو دن کے اندر اندر ہمیں ان کشمیریوں کے نام اور ٹھکانوں کا پتہ نہ بتایا گیا جنہوں نے انڈین انفنٹری کی چودھویں رجمنٹ کی چھاؤنی کو تباہ کیا ہے تو تمہاری بیٹی کا سر کاٹ کر تمہارے گھر روانہ کر دیا جائے گا۔"

بابر علی چپ ہو گیا۔ شیروان نے کہا۔

"آگے کہو"

بابر علی بولا۔

"ہم نے اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا ہے۔ ان میں ہمارے وہ آدمی بھی شامل ہیں جو فوج کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں چھوٹے چھوٹے مختلف کام کرتے ہیں"

"اس کا مطلب ہے ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پروین ڈار کس جگہ پر قید ہے"

کمانڈو شیروان کے اس استفسار پر بابر علی بولا۔

"سر! صبح تک اس کا بھی سراغ مل جائے گا۔"

کمانڈو شیروان نے بابر علی کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے

لئے کہا۔ مجاہد بابر علی سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کر کے تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

شیروان بے چین تھا۔ ہم بھی پریشان تھے۔ شیروان پندرہ فٹ چوڑے اور اتنے ہی لمبے غار کے تہہ خانے اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا۔ کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"سر! ہمیں خود فوجی ایریا کمانڈ میں جا کر پروین کا سراغ لگانا چاہئیے۔"

شیروان سٹول پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"نہیں اورنگ زیب۔ ہم جذبات میں آ کر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ ہم سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ہمارے آدمی کل تک پروین کا پتہ لگا لیں گے۔ اس کے بعد کوئی پلان بنایا جائے گا۔ ایریا کمانڈو پوسٹ پر جا کر محض کمانڈو اٹیک کرنے اور پندرہ بیس بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ بلکہ اس سے صورت حال مزید بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔"

وہ رات ہم نے بے چینی کی حالت میں گزاری آدھی رات تک میں کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب تہہ خانے میں بیٹھے مختلف سکیموں پر غور کرتے رہے۔ آدھی رات کے بعد ہم بادل نخواستہ سونے کے لئے اٹھ کر اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔

دوسرے روز فجر کی نماز ہم تینوں نے اکٹھے پڑھی۔ ہم میں سے ہر کوئی خاموش تھا۔ رات کو ہی ہمیں یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ سری نگر شہر میں مسلمان کشمیری حاجی صاحب کی بیٹی کے اغواء کے خلاف گھروں سے باہر نکل آئے ہیں اور ان کا کئی جگہوں پر فوج اور پولیس سے ٹکراؤ بھی ہوا ہے اور کئی جوان فوج کی فائرنگ سے زخمی ہوئے ہیں۔ شہر میں جگہ جگہ ڈوگرہ فوج گشت لگا رہی تھی۔

دوپہر بھی گزر گئی۔ دن کے تین بجے کے قریب بابر علی واپس آ گیا۔ اس وقت بھی ہم اپنے تہہ خانے میں بیٹھے غور و فکر کر رہے تھے۔ ہم زیادہ غور و فکر کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ ہم عمل کرنے والے مجاہد تھے۔ ہم کمانڈو تھے۔ ہمارا کام ایکشن تھا۔ ہم صرف ایکشن سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے پلان کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے اور پھر میدان

عمل میں مرد مجاہد کی طرح کود پڑتے تھے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ کل دوپہر سے ہم بے عملی کی حالت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے اور سوائے غور و فکر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بابر علی آیا تو کمانڈو شیروان نے فوراً پوچھا۔

"کیا پتہ چلا پروین کا؟"

مجاہد بابر علی نے کہا۔

"کمانڈر! ہمارے آدمی پوری سراغ رسانی کرنے کے بعد جو خبر لائے ہیں وہ یہ ہے کہ پروین کو فوج راتوں رات وادی کشمیر سے نکال کر بذریعہ ہیلی کاپٹر جموں لے گئی جموں سے اسے اسی رات دوسرے فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعے شملے پہنچا دیا گیا ہے۔ اس وقت پروین شملے کے آٹھویں جاٹ رجمنٹ کے فوجی گیریزن میں قید ہے۔"

یہ خبر میرے لئے اس واسطے حیران کن نہیں تھی کہ بھارتی فوج کا کمانڈر کرنل بھگت رام پروین کو بطور مہرے کے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ سری نگر گیریزن کی عبرت ناک تباہی اور سینکڑوں بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کے باعث کرنل بھگت رام کا پورا کیریئر خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس کا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن خدا جانے کس وجہ سے وہ اپنی پوسٹ پر قائم رہا۔ لیکن اس نے تحریک آزادی کے سرگرم بزرگ کارکن اور سری نگر کی باعزت شخصیت حاجی ثناء اللہ کی صاحبزادی کو اغوا کر کے یرغمال بنایا اور اب اس کے بدلے وہ حاجی صاحب سے گیریزن اڑانے والے کشمیری مجاہدوں یا کمانڈوز کے نام اور ٹھکانے معلوم کر کے انڈین فوجی ہائی کمانڈ کے آگے اشک شوئی کرنا چاہتا تھا۔ اس حقیقت سے ہم سب پوری طرح باخبر تھے۔

بابر علی کا بیان سننے کے بعد کمانڈو شیروان نے اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کرنل بھگت رام نے حاجی صاحب کو تین دن کی مہلت دی ہے۔ ظاہر ہے حاجی صاحب اسے اپنے کسی مجاہد کا نام اور ٹھکانہ نہیں بتائیں گے۔ اور پھر یہ کام کشمیری

مجاہدوں نے نہیں۔ ہم نے کیا تھا۔ ایسی صورت حال میں تین دن گزر جائیں گے ا
بھارتی فوج کی شرط پوری نہیں ہو گی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا کرنل بھگت رام تین د
کے بعد پروین کو قتل کر کے اس کا سر جیسا کہ اس نے خبردار کیا ہے حاجی صاحب کے پا
بھجوا دے گا؟"

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"میرا نہیں خیال وہ ایسا کرے گا۔ اس کے پاس پروین ڈار کی شکل میں ایک ا
ترپ کا پتا ہے۔ وہ اس کو زندہ رکھ کر اور یرغمالی بنا کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر
کی کوشش کرے گا۔ خاص کر کے ایسی حالت میں جب کہ کرنل بھگت رام کے فوجی کیری
کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے۔ میرے خیال میں وہ حاجی صاحب کو مزید مہلت دے گا۔ ا
مہلت میں اضافہ کر دے گا۔"

کمانڈو شیروان نے مجھ سے رائے طلب کی تو میں نے کہا۔

"کمانڈر! تم جو فیصلہ کرو گے میں اس پر جان کی بازی لگا کر عمل کروں گا۔"

شیروان نے بابر علی سے پوچھا۔

"بابر علی! میرے بھائی! مجھے یقین ہے کہ تمہارے آدمیوں کی رپورٹ معتبر ہو گی۔"

بابر علی نے جواب میں کہا۔

"سر! پروین کے جموں اور جموں سے شملہ لے جانے کی رپورٹ میرے ایک ایـ
خاص آدمی نے دی ہے جس نے جموں سے خود پروین کو ایک کیپٹن اور دو بھارتی فوجیو
کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں ٹیک آف کرتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد میرے اس آدمی ۔
اپنے خفیہ وائرلیس کی مدد سے جموں کے اپنے ساتھی سے بھی اس کی تصدیق کر لی ہے
جموں ائیر پورٹ پر پروین کو ایک بڑے فوجی ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کر شملے کی طرف ۔
جایا گیا ہے جہاں اسے جاٹ رجمنٹ کے فوجی گیریزن میں رکھا جائے گا۔"

ان لوگوں کی خبریں بالکل صحیح ہوتی تھیں۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کے آد
جگہ جگہ فوجی رجمنٹوں پوسٹوں وغیرہ میں معمولی کاریگروں کی حیثیت سے اپنے اپنے کا

میں لگے رہتے تھے اور بڑی اہم معلومات مہیا کرتے رہتے تھے۔ یہ کوئی کمانڈو نہیں تھے۔
یہ عام محب وطن کشمیری تھے۔ ان میں نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ وہ جب پکڑے
جاتے تھے تو اپنے منہ بند کر لیتے تھے۔ بھارتی فوجی ان پر اس قدر تشدد کرتے کہ ان کے
پیٹ پھاڑ دیئے جاتے۔ ان کی آنکھیں نکال دی جاتیں۔ وہ اسی حالت میں شہید ہو جاتے
مگر اپنے کسی ساتھی کا نام زبان پر نہیں لاتے تھے۔ یہ بڑے بہادر اور آزادی کشمیر کے نام
پر اپنے وطن کی آزادی کے نام پر جان نچھاور کر دینے والے نڈر مسلمان کشمیری تھے۔ ان
کو کسی نے کوئی ٹریننگ نہیں دی تھی۔ انہوں نے سگنل کور کا کوئی کورس پاس نہیں کیا تھا۔
ان کے دل میں جہاد کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اسلام اور کشمیر کی آزادی کی خاطر جان قربان کر
دینے کا ناقابل شکست جذبہ تھا۔ اسی جذبے نے انہیں سب کچھ سکھا دیا تھا۔ یہ گمنام
کشمیری مجاہد تھے جو اپنے گھروں سے اپنے ماں باپ اور بچوں سے دور بیٹھے اپنے وطن کی
خاطر اپنی جان کے نذرانے پیش کر رہے تھے اور آزادی کشمیر کی خاطر کام کر رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ کمانڈو شیروان کو مجاہد بابر علی کی حاصل کردہ رپورٹوں پر پورا یقین
تھا۔ اس نے بابر علی کو واپس بھیج دیا۔ اب ہمارے سامنے ایک راستہ متعین ہو گیا تھا۔ ہم
اس پر غور کرنے لگے۔

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"تم دونوں کو آج ہی یہاں سے شملے کی طرف نکل جانا ہو گا۔"

اس نے اورنگ زیب کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا۔

"اورنگ زیب! تم شملے کئی بار جا چکے ہو۔ تم اس شہر سے اچھی طرح واقف ہو اور
تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ایک خاص آدمی وہاں موجود ہے۔ وہ اس سلسلے میں
تمہاری مدد کرے گا۔ تم دونوں کو میرے خفیہ سگنل کوڈ کا علم ہے۔ تم وائرلیس ٹرانسمیٹر پر
مجھ سے رابطہ قائم رکھو گے۔ شملے میں ہمارے خاص آدمی کے پاس وائرلیس سیٹ موجود
ہے۔ اگر یہاں کرنل بھگت رام نے پروین کی مہلت کی مدت میں اضافہ کیا تو ہم تمہیں
وائرلیس پر خبر کر دیں گے۔ کوئی سوال؟"

ہم نے بیک زبان ہو کر کہا۔

"کوئی سوال نہیں سر!"

"او کے۔ تم کو پندرہ منٹ ضروری تیاریوں کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد تم دونوں یہاں سے اپنے مشن پر نکل جاؤ گے۔ خدا حافظ!"

میں نے اور کمانڈو اورنگ زیب نے شیروان سے مصافحہ کیا۔ اس نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم نے دونوں تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔ ایک کمانڈو کو ہی وقت کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں پندرہ منٹ کے اندر اندر سب تیاریاں کرنی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے حاجی ثناء اللہ ڈار کی صاحبزادی کی شکل دیکھی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی تصویر دکھا دی گئی۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے حاجی صاحب کا نام بھی اپنی طرف سے فرضی لکھا ہے۔ ان کی بیٹی کا نام بھی کچھ اور تھا۔ چونکہ وہ لوگ زندہ ہیں اور کشمیر کی آزادی کی جنگ اپنے اپنے محاذوں پر پورے جذبے اور جوش سے لڑ رہے ہیں اس لئے ان کے صحیح نام اور کوائف لکھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ کمانڈو شیروان نے شملے میں خفیہ کام کرنے والے کشمیری مجاہد کا جو اصلی نام بتایا تھا وہ کچھ اور تھا۔ میں آپ کو اس کا فرضی نام بتاؤں گا۔ یہ فرضی نام شمس الدین ہو گا اور شملے کے جس بازار میں اس کی دکان تھی۔ اس بازار کا نام بھی نہیں لکھوں گا اور اصل میں وہ جو کاروبار کرتا ہے وہ بھی نہیں لکھوں گا۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میں اور کمانڈو اورنگ زیب اپنے ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر ایک خاص سمت کو پہاڑیوں کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ ہمارے لباس عام شہریوں والے تھے۔ ہمارے پاس کوئی سفری تھیلے وغیرہ بھی نہیں تھے۔ ہم ایسے جا رہے تھے جیسے یونہی سیر سپاٹے کے لئے نکلے ہوں۔ کمانڈو اسی طرح سفر پر نکلا کرتے ہیں۔ اورنگ زیب کشمیر کا رہنے والا خوش شکل غیور نوجوان تھا۔ اسے انگریزی اور کشمیری کے علاوہ اردو زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ ہماچل پردیش میں بولی جانے والی ڈوگری زبان بھی بڑی مہارت سے بول لیتا تھا۔ میں انگریزی، گجراتی اور تھوڑی کشمیری زبان بھی سیکھ گیا تھا۔

ہندی، زبان بول بھی لیتا تھا اور پڑھ بھی لیتا تھا۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ میں نے سنسکرت زبان بھی تھوڑی سیکھ لی تھی۔ سنسکرت بڑی مشکل زبان ہے۔ میں اسے نہ لکھ سکتا تھا نہ پوری روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ سمجھ ضرور لیتا تھا۔ سنسکرت میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس زبان کا سمجھ لینا ہی میرے لئے کافی مفید ثابت ہوا تھا اور ہو سکتا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب کشمیر جموں اور ہماچل پردیش کے سارے علاقے سے واقف تھا۔ شملے میں جو ہماچل پردیش کی حکومت کا صدر مقام تھا کافی عرصہ رہ چکا تھا۔ شملے کے بازاروں اور محلوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم کس علاقے سے گزر کر سری نگر سے بیس میل اوپر بانہال روڈ پر پہنچے وہاں سے ہم نے ایک بس پکڑی اور جموں شہر میں آگئے، جموں سے بس پکڑی اور جالندھر پہنچ گئے۔ یہ سارا سفر ہم نے ایک دوسرے سے الگ مگر ایک دوسرے کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے طے کیا۔ جالندھر سے ہمیں اسی روز انبالے جانے والی لاری مل گئی۔ انبالے سے ہم کالکا اور سولن سے ہوتے ہوئے چھوٹی لائن کی ٹرین میں سفر کرتے ہوئے شملے پہنچ گئے۔ شملے میں کافی سردی تھی۔ ابھی برفباری کا موسم شروع نہیں ہوا تھا مگر سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں اور درختوں کے پتے گر رہے تھے۔ شملہ شہر کی مقامی آبادی بہت ہے۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ نیچے میدانی شہروں کی طرف جا چکے تھے۔ پھر شملے کی سڑکوں پر کافی چہل پہل تھی۔ مال روڈ کی دکانوں پر کافی رونق تھی۔ شملے کے چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر اترنے کے بعد میں اور اورنگ زیب اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں شملہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے چمڑے کی جیکٹ کا زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں اس طرح چلو گے جیسے یہ جگہ تمہارے لئے نئی نہیں ہے۔ یہاں خفیہ پولیس کے آدمی ہر طرف موجود رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ تم شہر میں اجنبی ہو۔"

کمانڈو اورنگ زیب کی ہدایت کے مطابق میں اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا چل رہا تھا۔ اپنے رویے اور چال ڈھال سے میں یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم

اسی پہاڑی سٹیشن کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے گرم اونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ گر،
جیکٹوں کے زپ چڑھائے ہوئے تھے۔ میری طرح کمانڈو اورنگ زیب بھی کبھی کبھار
سگریٹ پیتا تھا مگر شملے کی مال روڈ پر سے گزرتے ہوئے ہم نے سگریٹ سلگا رکھے تھے او
بڑی بے تکلفی سے چل رہے تھے۔

کوئی آدمی سامنے سے آکر یا پیچھے سے آکر ہمارے قریب سے گزرتا تو ہم وہاں ک
مقامی ڈوگری زبان میں بولنے لگتے۔

جب ہم شملے کے بڑے پوسٹ آفس کی پرانی انگریزوں کے زمانے کی شاندار عمارت
کے پاس پہنچے تو کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”سامنے جو چھوٹی سڑکیں اوپر پہاڑی کی طرف جاتی ہیں ہم ان میں سے بائیں طرف
والی سڑک پر جائیں گے۔“

ہم بالکل ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سامنے دو راستے آگئے۔ یہ دو چھوٹی پختہ
سڑکیں تھیں۔ ہم بائیں طرف والی سڑک پر ہو گئے۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد
آگے ایک خوبصورت سر سبز گراؤنڈ آگئی جس کے جنگلے کے ساتھ درختوں کی قطار دور
تک چلی گئی تھی۔ ایک طرف چھوٹا سا خوبصورت گرجا تھا۔ گرجے کے بڑے گیٹ کے
سامنے پارک تھا۔ پارک میں بنچ بچھے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب بولا۔

”ہم تھوڑی دیر یہاں رکیں گے۔“

اور ہم ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

اس وقت سورج شملہ کی پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا۔

شملے کی پہاڑیوں کے نشیبی مکانوں اور شہر کی عمارتوں پر شام کے سرمئی سائے اترنا
شروع ہو گئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی مگر ہم اپنی جیکٹوں میں خوب گرم ہو کر بیٹھے
تھے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم یہاں کتنی دیر تک بیٹھیں
گے۔ وہ اس وقت میرا گائیڈ تھا اور خود ہی بہتر جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا
ہے۔ وہ بڑی گہری نگاہوں سے سر گھمائے بغیر تینوں جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر خود ہی کہنے لگا۔

”ابھی تک خفیہ پولیس کا کوئی آدمی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ یہاں سٹیشن پر خفیہ
پولیس اجنبی لوگوں کا ضرور پیچھا کرتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”ہمارا ہائیڈ آوٹ کہاں ہو گا؟“

کمانڈو اورنگ زیب ان درختوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا جہاں شام کا اندھیرا گہرا
ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”ابھی کچھ معلوم نہیں۔ اس کا فیصلہ اپنے آدمی شمس الدین سے ملنے کے بعد ہی ہو
گا۔ اب میرے ساتھ آؤ۔ ہم ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔“

ہم اٹھ کر گراؤنڈ والے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے شملے کے اس بازار میں آگئے۔
جہاں ہر قسم کی دکانیں تھیں اور آبادی گنجان تھی۔ یہاں ویشنو ہوٹل کا ایک جگہ بورڈ لگا
تھا۔ یہ ہوٹل ایک دکان کی طرح کا تھا۔ اندر کچھ لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ہم

بھی اندر جا کر بیٹھ گئے۔

اورنگ زیب نے لڑکے کو دو چائے لانے کا کہا اور اپنے جوتوں کے تسمے درست کرتے ہوئے مجھے آہستہ سے کہا۔

"یہاں ہم اپنے آپ کو ہندو ظاہر کریں گے۔ جو چاہے اپنا ہندوانہ نام رکھ لینا۔ ہمیں رات کا اندھیرا ہونے تک کچھ وقت گزارنا ہے۔"

ہوٹل میں مزدور پیشہ قسم کے پہاڑی لوگ بیٹھے چائے اور سگریٹ پیتے ہوئے اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ دکانوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ بازار میں سے ہندو سکھ مرد اور عورتیں گزر رہی تھیں۔ کوئی شلوار قمیض پہنے ہوئی تھی ماتھے پر تلک لگا تھا۔ کوئی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں اور کاندھوں پر گرم شالیں رکھی ہوئی تھیں۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد اورنگ زیب نے گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا۔

"اب چلنا چاہئے"

ہم ہوٹل سے نکل کر بازار میں آگئے۔ دو تین بازاروں سے گزر گئے۔ تھوڑی چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک چوک آگیا یہاں سے ایک سڑک نیچے بڑے بازار میں جاتی تھی۔ اس بازار میں بڑی عالی شان دکانیں تھیں۔ خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک دکان کے باہر کشمیر امپوریم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ کشمیری شالوں اور لکڑی کے کام کے کشمیری نوادرات کی دکان تھی۔ کافی بڑی دکان تھی۔ ایک جانب دیوار پر پنڈت نہرو کی تصویر لگی تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ گاہک کاؤنٹر کے پاس کھڑے نوادرات دیکھ رہے تھے۔ دکان کے آخر میں ایک کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا کشمیری گرم سویٹر کوٹ اور گلوبند پہنے نظر کی عینک لگائے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب چھوٹی میز پر کچھ رجسٹر اور فائلیں پڑی تھیں۔ اورنگ زیب یونہی شوکیسوں میں نوادرات کو دیکھتا ہوا اس ادھیڑ عمر آدمی کے پاس آگیا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ یہ شخص دکان کا مالک لگتا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"ہمیں چنار کی لکڑی کا قلمدان چاہئے کیا آپ کے پاس ہو گا؟"

اس آدمی نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر پہلے اورنگ زیب کو اور پھر میری طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔

"اس وقت تو نہیں ہے۔ دو ایک روز میں مال آنے والا ہے شاید اس میں آجائے۔ آپ یہ قلمدان دیکھیں یہ دیار کی لکڑی کا ہے"

اور اس نے شوکیس میں سے ایک قلمدان نکال کر ہمارے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

اورنگ زیب اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے قلمدان مجھے دکھا کر کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے شرما؟"

ہم دونوں قلمدان دیکھنے لگے۔ اس دوران اس ادھیڑ عمر کشمیری نے جو دکان کا مالک ہی تھا ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور بڑی راز داری سے کاغذ کا ٹکڑا کمانڈو اورنگ زیب کے آگے کر دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو پڑھے بغیر جیب میں رکھا اور قلمدان کو کاؤنٹر پر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں چنار کی لکڑی کا قلمدان ہی چاہئے ہم پھر آجائیں گے۔"

ادھیڑ عمر آدمی نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا اور بڑی لاتعلقی سے کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ اخبار پڑھنے لگا۔

ہم دکان سے باہر آگئے۔ کمانڈو اورنگ زیب مجھے ایک اور ریستوران میں لے گیا۔ یہ ذرا بہتر قسم کا ریستوران تھا اور پڑھے لکھے گاہک بیٹھے خاموشی سے چائے کافی پی رہے تھے۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب کونے والی میز پر بیٹھے تھے۔ اس نے جیب سے دکاندار کا دیا ہوا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر میز کے نیچے ساتھ لے جا کر پڑھا اور کاغذ کو مروڑ کر اس کی گولی بنا کر جیب میں رکھ لیا اور کہنے لگا۔

"یہ دکاندار ہمارا آدمی شمس الدین تھا۔ اس نے مجھے رات دس بجے کے بعد خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں آنے کی ہدایت کی ہے۔"

"یہ خفیہ ہائیڈ آؤٹ کہاں پر ہے؟"

میں نے پوچھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیرا ہمارے لئے چائے لے کر آرہا تھا۔ میں نے چائے بنائی اور نگ زیب نے سگریٹ سلگا لیا۔

"ہمیں رات کے دس بجے تک وقت گزارنا ہے اور ابھی صرف سات ہی بجے ہیں۔ اس ریستوران میں زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

میں نے پوچھا۔

اورنگ زیب کچھ سوچ کر بولا۔

"ہم کسی سینما ہاؤس میں وقت گزاریں گے"

ہم نے جلدی جلدی چائے پی اور ریستوران سے باہر آکر ایک جانب چل پڑے۔ دوسرے بڑے چوک کے کونے میں ایک سینما ہاؤس تھا جہاں کوئی انگریزی فلم لگی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی مگر ٹکٹ والی کھڑکی کھلی تھی۔ ہم نے گیلری کے دو ٹکٹ لئے اور گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ سکرین پر فلم کا سین چل رہا تھا۔ گیلری تقریباً خالی تھی۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں ہمارے آس پاس دوسرا کوئی نہیں تھا۔

اورنگ زیب کہنے لگا۔

"شمس الدین یہاں ایک طرح سے ہمارا ماسٹر سپائی ہے۔ اس نے ہائیڈ آؤٹ میں ایک چھوٹا ٹرانسمیٹر سیٹ بھی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ہم وہاں سے کمانڈو شیروان سے بات کر سکیں گے"

"ہمارا مشن ذرا مشکل ہے۔ یہ ایکشن کا کم اور سراغ رسانی اور جاسوسی کا مشن زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شمس الدین کے آدمی جاٹ رجمنٹ کے گیریزن سے پروین کا سراغ لگا لیں گے۔ اس کے بعد ہمارا ایکشن کمانڈو مشن شروع ہو گا۔"

انٹرول کے وقت ہم نے وہیں سینما ہال میں ہی کچھ کھانے کے لئے منگوا لیا۔ انٹرول کے بعد فلم شروع ہوئی تو اورنگ زیب نے کلائی پر جھک کر وقت دیکھا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں پورے دس بجے یہاں سے نکل پڑنا ہے۔ ہائیڈ آؤٹ تک جاتے ہوئے بھی پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے"

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وقت دیکھ لیتا تھا۔ فلم کافی لمبی تھی۔ آخری بار وقت دیکھ کر کمانڈو اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمیں چلنا چاہئے"

ہم گیلری کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ سردی کی وجہ سے سینما ہال کی لابی خالی پڑی تھی۔ ہم خاموشی سے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے تیز تیز قدموں سے چلتے بازار میں ایک جانب مڑ گئے۔ اب اورنگ زیب میرا گائیڈ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ شملے کی مال روڈ پر آگیا۔ مال روڈ کی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں اور بازار تقریباً سنسان تھا۔ یہاں سے ایک راستہ نیچے شملے کے تنگ بازار میں اترتا تھا۔ ہم اس بازار میں اتر گئے۔ یہاں اترائی تھی۔ دونوں جانب ڈھلانی چھتوں اور لکڑی کے چھجوں والے مکان ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے۔ یہ مقامی آبادی والا بازار تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جو کچھ کھلی تھیں۔ کچھ بند تھیں۔

ہم بازار میں کافی نیچے اتر گئے تو ایک پہاڑی ٹیلے کے پاس سے ہوتے ہوئے ہموار جگہ پر آگئے۔ یہ ایک ٹیرس تھا اس کے آگے پتھر کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے آگے ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہاں سڑک کی بتیوں کی تھوڑی تھوڑی روشنی آرہی تھی۔ ہم اس روشنی میں نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اب ہم غیر آباد پہاڑی علاقے میں سے گزر رہے تھے۔ اورنگ زیب ایک جگہ نالے سے ہٹ کر دو ٹیلوں کے درمیان والے راستے پر آگیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ اس نے رک کر ایک ٹیلے کا جائزہ لیا پھر اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں نیچے کچھ فاصلے پر کسی گاؤں کی روشنیاں جھلملاتی نظر آرہی تھیں۔ ذرا چڑھائی چڑھ کر ایک جگہ درختوں میں مجھے اندھیرے میں ایک مکان دکھائی دیا۔ قریب گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ لکڑی کا ایک کیبن تھا۔ اندھیرے میں اس کی ڈھلانی چھت ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر

آ رہی تھی۔ اس کے احاطے میں لکڑی کے دو تین بڑے بڑے بالے پڑے تھے۔

کمانڈو اورنگ زیب وہاں رک گیا۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ پھر مجھے وہیں ایک جانب اندھیرے میں رکنے کا کہہ کر آگے بڑھا۔ اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے پستول نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ بھی پتلون کی جیب میں تھا۔ لکڑی کے کیبن کا دروازہ بند تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے دروازے پر ہاتھ سے تین بار خاص اشارے کے انداز میں دستک دی۔ اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ فوراً بند ہو گیا۔ میں لکڑیوں کے شہتیروں کے پاس ایک طرف ہو کر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ میری نگاہیں کیبن کے دروازے پر لگی تھیں۔ اتنے میں دروازے کی درزوں میں سے مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ اندر کسی نے شاید لیمپ وغیرہ روشن کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ دوبارہ کھلا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں کیبن میں چلا آیا۔

کیبن لکڑی کا بوسیدہ مگر کافی لمبا کھوکھا تھا جس کی دیواروں پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ چھت لکڑی کی تھی۔ دیواریوں کے ساتھ لکڑی کے کٹے ہوئے تختے لگے تھے۔ بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ لکڑی کے لمبوترے صندوق ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھا تو وہ تابوت تھے جس میں مسیحی لوگ اپنی میتوں کو لٹا کر اپنے قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔ اسی طرح کے دو تین تابوت فرش پر بھی پڑے تھے۔ ایک تابوت پر وہی کشمیر کے نوادرات کی دکان والا ادھیڑ عمر کشمیری یعنی شمس الدین بیٹھا تھا۔ فرش پر پتھر رکھا ہوا تھا جس پر موم بتی ابھی ابھی روشن کی گئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے ماسٹر سپائی شمس الدین سے میرا تعارف کرایا۔ شمس الدین نے نہ مجھ سے ہاتھ ملایا نہ میرے سلام کا جواب دیا۔ بس غور سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کمانڈو اورنگ زیب سے کہنے لگا۔

"مجھے کمانڈر شیروان نے وائرلیس پر ساری بات بتا دی ہے۔ یہ کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں لگتا۔ پھر بھی میں پوری کوشش کروں گا کہ جتنی جلدی ہو سکے حاجی صاحب کی

بیٹی پروین کا سراغ مل سکے کہ اگر وہ جاٹ رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر یا گیریژن میں ہے تو اسے اسے کس مقام پر رکھا گیا ہے"

اورنگ زیب شمس الدین کی ساری بات غور سے سنتا رہا کہنے لگا۔

"خواجہ صاحب! ہمیں صرف اتنا معلوم ہو جانا چاہئے کہ پروین کو رجمنٹل گیریژن میں اگر وہ وہاں پر ہے تو اسے کس بارک میں یا کس کمرے میں بند کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہاں سے اسے نکالنا ہمارا کام ہے۔"

ماسٹر سپائی شمس الدین کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"کیا شملے کے اس گیریژن یا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جو پروین کے بارے میں درست معلومات فراہم کر سکے؟"

شمس الدین بولا۔

"اپنا آدمی بھی ہے اور وہ درست معلومات بھی فراہم کر کے لے آئے گا لیکن وہی بات کہ اس میں ہو سکتا ہے تھوڑا وقت لگ جائے لیکن کمانڈر شیروان نے بتایا ہے کہ کرنل بھگت رام نے حاجی صاحب کو صرف تین دن کی مہلت دی ہے۔"

اورنگ زیب نے کہا۔

"یہ مہلت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔"

اس پر شمس الدین بولا۔

"اور اگر کرنل بھگت رام نے مہلت نہ بڑھائی اور پروین کو ہلاک کر ڈالا تو یہ تو بڑی ہزیمت کی بات ہو گی۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ کشمیری کمانڈوز میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اتنے بڑے کشمیری بزرگ اور لیڈر کی بیٹی کو چھڑا سکتے؟"

کمانڈو اورنگ زیب بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آپ کے خیال میں پروین کا پتہ چلانے میں ہمارے آدمی کو اندازاً کتنا وقت درکار ہو گا؟"

شمس الدین بولا۔

"میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو اپنے آدمیوں سے مشورہ کرنے اور ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کچھ پتہ چلے گا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ کل شام تک آکر پروین ٹھکانہ بتا دیں۔ ہو سکتا ہے اس میں دو ایک دن لگ جائیں۔ حقیقت یہ ہے جیسا کہ تم خو جانتے ہو اس قسم کے حالات میں سیکورٹی اتنی سخت کر دی جاتی ہے کہ سراغ لگانے کا کا ست ہو جاتا ہے۔ پھر تمہارے سری نگر والی چھاؤنی کو نیست و نابود کرنے کے بعد بھار فوج میں سخت بے چینی پھیل گئی ہے۔ وہاں کے کمانڈر کرنل بھگت رام کے لئے یہ اس کی ساکھ ہی نہیں بلکہ فوجی کیریئر کا مسئلہ بن چکا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں پروین اس کے ہاتھ میں آیا ہوا ایک مہرہ ہے جس سے وہ بازی جیت بھی سکتا ہے اور بساط الٹ بھی سکتا ہے لازمی طور پر یہاں ملٹری کی سیکورٹی بہت زبردست کر دی گئی ہوگی۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ کام میں جتنی جلدی ہو سکا کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں صبح صبح رحیم کے پاس جاؤں وہ پہلے رات کو بھی یہیں سوتا تھا مگر اب لوئر بازار والے اپنے مکان میں چلا جاتا ہے۔ ایسا کرنا۔ کل دن کے دس گیارہ بجے کے دوران میرے پاس دکان پر آجانا۔ میں تمہیں ساری صورت حال بتا دوں گا۔"

میں اس دوران لکڑی کے تابوت پر بیٹھا خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ شمس الدین نے پوچھا۔

"تم لوگوں کا کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"مجھے یقین ہے ہمارے پیچھے کوئی انٹیلی جینس والا نہیں تھا"

شمس الدین نے کہا۔

"تم لوگوں کو ساتھ ساتھ نہیں پھرنا چاہئے۔ میری دکان پر تم اکیلے ہی آنا۔ اپنے ساتھی کمانڈو کو بے شک اس کوٹھڑی میں ہی چھوڑ آنا۔ یہ تالے کی ایک چابی اپنے پاس رکھ لو۔"

اس نے جیب میں سے ایک چابی نکال کر کمانڈو اورنگ زیب کو دی اور کہا۔

"کل دن کے دس ساڑھے دس بجے تم اکیلے میری دکان پر آنا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد اوپر گیلری میں چلے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا۔ اب تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ خیال رکھنا۔ اگر کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہو تو اسے اپنے پیچھے پیچھے نہ آنے دینا۔ راستے میں ہی موقع پا کر اسے ختم کر دینا۔ اب جاؤ۔"

ماسٹر سپائی شمس الدین نے موم بتی پھونک مار کر بجھا دی۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب بوسیدہ تابوتوں والے کیبن سے باہر نکل کر اندھیرے میں جس طرف سے آئے تھے اس طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ جلدی سے ایک طرف اندھیرے میں کیا اور عقاب ایسی چمکدار آنکھوں سے پیچھے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ آہستہ سے بولا۔

"ہو سکتا ہے ہمارے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا لگا ہو۔ اگر ہوا تو ابھی سامنے آجائے گا۔"

ہم کوئی دو منٹ تک پہاڑی پگ ڈنڈی کے اس موڑ پر اندھیرے میں خاموش کھڑے رہے۔ مگر پیچھے سے کوئی آدمی نہ آیا۔ جب اورنگ زیب کو اطمینان ہو گیا تو مجھے لے کر آگے چل پڑا۔ میں نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

"رات گزارنے کے لئے ہمارا ٹھکانہ کون سا ہوگا؟"

وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔

"شملے کے اوپر بازار میں ہمارا ایک آدمی رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس ٹھہریں گے"

رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے جب ہم اوپر بازار کی ایک اونچی نیچی پہاڑی گلی میں اپنے آدمی کے مکان پر پہنچے۔ یہ چالیس بیالیس برس کا ایک مضبوط جسم والا مزدور ٹائپ کا آدمی تھا وہ ہمیں اوپر لے گیا۔ اس نے کوٹھڑی کھول دی۔ اندر زمین پر بستر بچھا ہوا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اس آدمی سے کہا۔

"صمد! مجھے دس بجے کے بعد شمس الدین کی دکان پر جانا ہے۔ نو بجے جگا دینا"

اس آدمی کا نام صمد تھا۔ کہنے لگا۔

"جگا دوں گا۔ اس وقت سو جاؤ"

اس نے دو لحاف لا کر رکھ دیئے اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"بازار میں اس کی تیل اور گیس کے چولہے مرمت کرنے کی دکان ہے۔ یہ کشمیری مجاہدوں کا بڑا با اعتماد ساتھی ہے۔ اس کا کام صرف ضرورت پڑنے پر ہمارے رات بسر کرنے کا انتظام کرنا ہے۔"

اس کے بعد سو گئے۔

صبح ٹھیک نو بجے صمد نے ہمیں جگا دیا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ اور سوا دس بجے تو اورنگ زیب نے مجھے کہا۔

"تم یہاں رہو گے۔ میں شمس الدین سے مل کر حالات کا پتہ کر کے آتا ہوں"

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگیا اور بولا۔

"جس آدمی کی شمس الدین نے ڈیوٹی لگائی ہے وہ ابھی پروین کے بارے میں پو معلومات لے کر واپس نہیں آیا۔ شمس الدین نے کہا ہے کہ ہم لوگ صمد کے مکان پر ٹھہریں۔ وہ خود آکر ہمیں ملے گا۔"

صمد مکان کو باہر سے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا تھا۔ ہمارے لئے اس نے کھانے پینے سامان رکھ دیا تھا۔ ہم اس کے مکان کی دوسری منزل کی کوٹھڑی میں سارا دن بیٹھے ر اس کی مکان کی پچھلی کھڑکی ایک وادی کی طرف کھلتی تھی۔ اس طرف سے دھوپ ا آرہی تھی۔ صمد نے ہمیں بازار والی کھڑکیاں کھولنے سے منع کیا تھا۔ دوپہر گزر گئی۔ گزر گئی۔ رات ہوئی تو شمس الدین آیا۔ کہنے لگا۔

"حاجی صاحب کی یرغمالی بیٹی پروین کا سراغ مل گیا ہے۔"

ہم خوش ہوئے۔ شمس الدین کوٹھڑی میں ہمارے پاس ہی زمین پر بچھی ہوئی در بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

"پروین کو فوجی گیریزن کی کوارٹر گارڈ کے اوپر والے کمرے میں بند کیا ہوا

وہاں ہر وقت تین مسلح سپاہی پہرے پر ہوتے ہیں۔ گیریزن کے اندر دن کے وقت باہر سے جانے والے ہر سویلین کی پوری تلاشی لی جاتی ہے۔ رات کے وقت کسی سویلین کو گیریزن میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ گیریزن کے آس پاس کی پہاڑیوں پر بھی فوجی گشت لگاتے رہتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد دوربینوں سے کوارٹر گارڈ کی دوسری منزل کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کا شدید خطرہ لگا ہوا ہے کہ کشمیری کمانڈوز پروین کو چھڑانے کے لئے ضرور اٹیک کریں گے۔"

میں نے شمس الدین سے پوچھا۔

"کوارٹر گارڈ کی دوسری طرف کیا ہے؟"

"تمہارا مطلب اس کے عقب سے ہے؟"

"ہاں"

شمس الدین نے کہا۔

"میں دوپہر کے بعد خود یہ جگہ دور ایک پہاڑی سے دیکھ کر آیا ہوں۔ کوارٹر گارڈ کی پیچھے کی جانب گہری کھڈ ہے پتھر کی دیوار کھڈ کی تہہ سے کوارٹر گارڈ کی دوسری منزل تک بالکل سیدھی چلی گئی ہے۔ رات کے وقت اب وہاں خاص طور پر ایک سرچ لائیٹ لگا دی گئی ہے جو ساری رات روشن رہتی ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب گہری سوچ میں تھا۔ شمس الدین کہنے لگا۔

"مہلت کی مدت میں صرف کل اور پرسوں کا دن رہ گیا ہے۔ میں کوارٹر گارڈ کا جو نقشہ دیکھ کر آیا ہوں میں نہیں سمجھتا کہ وہاں ہمارا کوئی کمانڈو پہنچ سکے گا۔ اور پھر صرف وہاں پہنچنا ہی نہیں ہے وہاں مسلح فوجیوں کی موجودگی میں پروین کو نکال کر بھی لانا ہے۔ پیچھے سے اوپر جانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ گیریزن میں سیکورٹی اس قدر سخت کر دی گئی ہے کہ اپنے مسلمان کشمیری ساتھیوں کو بھی جو گیریزن کے اندر باغبانی اور رسوئی وغیرہ میں کام کرتے ہیں سخت چیکنگ کے بعد اندر جانے دیا جاتا ہے۔"

میں نے شمس الدین سے کہا۔

"لیکن کچھ بھی ہو ہمیں پروین کو ہر حال میں وہاں سے نکالنا ہے۔"

شمس الدین کہنے لگا۔

"وہ تو تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تم لوگ جان کی پر
کئے بغیر اس مشن پر چل پڑو گے۔ لیکن اس سے کیا حاصل کہ مشن بھی مکمل نہ ہوا
جان بھی چلی گئی؟"

اس دوران کمانڈو اورنگ زیب خاموش تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ شمس الدین
بات ختم کی تو اس نے سوال کیا۔

"گیریزن کمانڈر کون ہے؟"

شمس الدین نے کہا۔

"اس کا نام بریگیڈیئر شیاما پرشاد مکرجی ہے وہ جاٹ رجمنٹ کا بریگیڈیئر ہے
گیریزن کا آفیسر کمانڈنٹ ہے۔ مگر تم اس کا کیوں پوچھ رہے ہو؟"

کمانڈو اورنگ زیب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی دوسری ہی سکیم
کوئی دوسرا ہی مشن ہے۔ اس نے کہا۔

"تم یہ بات چھوڑ دو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ بریگیڈیئر گیریزن کے اندر رہتا ہے یا گ
سے باہر؟"

شمس الدین نے کہا۔

"وہ گیریزن کے پیچھے ایک خوبصورت باغیچے والی چار کنال کی کوٹھی میں رہتا
کوٹھی کے اندر سوئمنگ پول بھی ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ جیسے اسے اپنا کوئی نیا
کامیاب ہوتا نظر آ رہا ہو اس نے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"وہ اکیلا رہتا ہے یا فیملی بھی اس کے ساتھ ہے؟"

"پوری فیملی اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی موٹی بنگالن بیوی اپنی جوان لڑکی
ساتھ ہماری دکان میں چیزیں خریدنے آتی رہتی ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر
میرا نام لے کر بولا۔

"ہم اپنے ٹارگٹ تک پہنچ گئے ہیں لیکن ٹارگٹ تک پہنچنے کا صرف ٹریک بدل دیا
ہے"

میں نے اس وقت اورنگ زیب سے کوئی تفصیل نہ پوچھی۔ وہ شمس الدین کی
طرف متوجہ ہو گیا۔

"شمس الدین خواجہ! بریگیڈیئر شیاما پرشاد مکرجی کی جوان بیٹی کہیں پڑھتی ہے؟"

شمس الدین موضوع کے اچانک بدل جانے پر کچھ تعجب میں تھا۔ کہنے لگا۔

"ہاں وہ کوئین الزبتھ کالج میں پڑھتی ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ ہم گیریزن کے کوارٹر گارڈ کی دوسری منزل میں
پروین تک پہنچنے کی کوئی سکیم تیار کریں۔ اس کے لئے باقاعدہ منصوبے کی ضرورت ہے
اور مہلت کی مدت پرسوں تک ختم ہو جائے گی۔ بہت ممکن ہے کہ کرنل بھگت رام انتقام
کے جذبے میں آکر پروین کو ہلاک کرنے کی حماقت کر بیٹھے اس لئے ہم ایک فوری
منصوبے پر عمل کریں جس کی کامیابی کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

شمس الدین نے کسی قدر حیرانی کے ساتھ پوچھا۔ میں کمانڈو اورنگ زیب کے
منصوبے کو سمجھ چکا تھا۔ اورنگ زیب نے بڑے پختہ عزم مگر دھیمی آواز میں کہا۔

"ہم بریگیڈیئر شیاما پرشاد مکرجی کی بیٹی کو اغوا کر کے یرغمالی بنائیں گے"

شمس الدین اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔

"یہ بڑا خطرناک کام ہو گا۔ دشمن کے گھر میں بیٹھ کر اس کی بیٹی کو اغوا کرنا اتنا آسان
کام نہیں ہے میرے نزدیک۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"کمانڈو کا کام ہی دشمن کے گھر میں جا کر اٹیک کرنا ہوتا ہے۔ تم صرف ہمیں یہ پتہ کرا دو کہ گیریزن کمانڈر بریگیڈیئر شیاما پرشاد کی بیٹی کا نام کیا ہے اور وہ کالج کس وقت جاتی ہے اور اسے کون کالج لے جاتا ہے"

شمس الدین بولا۔

"پتہ کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ اس کی بیٹی کا نام ارملا مکرج ہے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کالج لگتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں جاتی ہے۔ اپنی گاڑی میں و ہماری دکان پر بھی آتی جاتی رہتی ہے۔ نیلے رنگ کی فیئٹ گاڑی ہے مجھے اس کا نمبر بھی یا ہے ایس ایم ۲۱۶ ہے۔"

"کیا تم ہمیں اس کی شکل دکھا سکتے ہو؟"

شمس الدین اب ہمارے نئے منصوبے کے ساتھ برابر تعاون کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس کے لئے صبح آٹھ بجے بڑے ڈاک خانے کے پیچھے جہاں مال روڈ گھوم کر کوئی الزبتھ کالج کی طرف جاتی ہے وہاں کرشنائی سٹال کے کھوکے کے پاس آجانا۔ ٹی سٹال اس وقت بند ہوتا ہے۔ میں وہاں پہلے سے موجود ہوں گا۔ بریگیڈیئر کی بیٹی کالج جاتے ہو روزانہ وہیں سے گزرتی ہے۔ موڑ کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی ہلکی ہو جاتی ہے تم ا اچھی طرح سے دیکھ سکو گے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم دونوں صبح آٹھ بجے کرشنائی سٹال کے پیچھے آجائیں گے۔"

شمس الدین اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے کہنے لگا۔

"اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے پیچھے کوئی خفیہ پولیس کا آدمی نہ لگ جائے"

"شمس الدین تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم خفیہ پولیس والوں کو اس کی چال سے پہچا لیتے ہیں"

جب شمس جا چکا تو میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"مجھے تمہاری سکیم سے پورا اتفاق ہے قدرت نے یہ ہمیں بڑا اچھا موقع دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم بریگیڈیئر کی بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد رکھیں گے کہاں؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"خواجہ صاحب! اس طرف سے تم بے فکر رہو میرے پاس یہاں شملے میں بڑے خفیہ ہائیڈ آؤٹ ہیں۔ ہم یونہی کشمیر کی جنگ میں بھارتی فوجیوں کو ناکوں چنے نہیں چبوا رہے۔"

رات ہم نے اپنے مجاہد صمد کے ٹھکانے پر ہی گزاری۔ دوسرے روز صبح پورے آٹھ بجے میں اور کمانڈو اورنگ زیب شملہ کے بڑے ڈاک خانے کے پیچھے کرشنائی سٹال کے بند کھوکھے کی اوٹ میں موجود تھے۔ اتنے میں شمس الدین بھی آگیا۔ اس نے لوئی کی بکل ماری ہوئی تھی۔ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ سورج اگرچہ شملے کے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا لیکن دن کی کافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

شمس الدین ہمیں لے کر سڑک کے کنارے ایک ایسی جگہ درختوں کی اوٹ میں آگیا جہاں سے سڑک موڑ کاٹتی تھی اس نے کہا۔

"تھوڑی دیر میں ارملا مکرجی کی گاڑی آنے ہی والی ہے۔ اس کے کالج کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

ایک فوجی گاڑی گزر گئی۔ اس کے بعد ایک بڑا چار نشستوں والا رکشا گزر گیا۔ اس میں سٹوڈنٹ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ پھر موڑ کے پیچھے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ شمس الدین نے کہا۔

"ارملا کی گاڑی آرہی ہے۔ میں اس کے ہارن کی آواز پہچانتا ہوں"

ایک فیئٹ گاڑی پوسٹ آفس کی عمارت کا موڑ کاٹ کر ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

شمس الدین اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ ارملا کی گاڑی ہے۔"

جب گاڑی قریب آئی تو جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

"گاڑی میں فوجی سپاہی بھی بیٹھا ہے۔"

میری اور کمانڈو اورنگ زیب کی نگاہیں گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ گاڑی ایک سانولے رنگ کی نوجوان لڑکی چلا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ایک فوجی سپاہی سٹین گن لئے بیٹھا چاروں طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ میں نے شمس الدین سے کہا۔

"اس کے ساتھ فوجی گارڈ کیوں تھا؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے پوچھا۔

"کیا فوجی گارڈ روز اس لڑکی کے ساتھ آتی ہے؟"

ہم درختوں کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ شمس الدین نے کہا

"پہلے کبھی گارڈ اس لڑکی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے سری نگر میں چھاؤنی پر کمانڈو اٹیک اور حاجی صاحب کی بیٹی کو یرغمال بنانے کے بعد بریگیڈیئر شیاما پرشاد نے اپنی بیٹی کی سیکورٹی کے لئے گارڈ ساتھ لگا دیا ہے۔"

میں اور کمانڈو اورنگ زیب خاموش تھے۔ شمس الدین بولا۔

"تم لوگوں نے بریگیڈیئر کی بیٹی کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے ناں؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"ہاں دیکھ لیا ہے خواجہ۔"

شمس الدین پوچھنے لگا۔

"فوجی باڈی گارڈ کی موجودگی میں تمہارا منصوبہ مشکل نہیں ہو گیا؟"

اگرچہ باڈی گارڈ ایک ہی تھا اور ہمارا منصوبہ مشکل نہیں ہو گیا تھا لیکن اس پر ایک بار پھر غور کرنے کی ضرورت ضرور پڑ گئی تھی۔ سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ شملے میں ہمارے کمانڈو اٹیک کے وسائل اتنے کارگر نہیں تھے کہ ہم ارملا کو اغوا کرتے وقت تربیت یافتہ مسلح فوجی باڈی گارڈ کا مسئلہ بھی حل کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ ہم سب سے پہلے اسے گولی مارتے۔ مگر اس سے علاقے میں شور مچ جاتا اور چوک میں تعینات فوجی چوکی کے سپاہی بھی آ کر فائر کھول سکتے تھے۔ ہم بڑی خاموشی سے بریگیڈیئر کی

بیٹی کو اغوا کر کے اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ پر لے جانا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے ہمیں کم از کم پندرہ بیس منٹ کی خاموش مہلت چاہیے تھی۔ لیکن گاڑی میں مسلح گارڈ کی موجودگی نے ہمیں اپنے مشن پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب بھی بالکل میری طرح سوچ رہا تھا۔ اس نے شمس خواجہ کے آگے انہی خیالات کا اظہار کیا۔ شمس خواجہ کہنے لگا۔

"پھر تم لوگوں نے کیا سوچا ہے؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے شمس خواجہ سے پوچھا۔

"بریگیڈیئر کی لڑکی ارملا مکرجی اور کہاں کہاں جاتی ہے؟ میرا مطلب ہے شام کے وقت کسی کلب یا آفیسر میس وغیرہ میں ضرور جاتی ہو گی"

شمس خواجہ غور کرنے کے انداز میں بولا۔

"یہ تو معلوم کرنا پڑے گا"

میں نے کہا۔

"خواجہ! ہمارے پاس تم جانتے ہو کہ وقت بالکل نہیں ہے۔ کل پروین کی مدت مہلت ختم ہونے والی ہے۔ یہ معلومات تم کتنی دیر میں حاصل کر سکتے ہو؟"

شمس خواجہ بولا۔

"آج کا سارا دن تو ضرور لگ جائے گا اس کے لئے مجھے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگانی پڑے گی جو ساری رپورٹ حاصل کر کے مجھے شام یا رات کے وقت ہی کچھ بتا سکے گا۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"دوست! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں یہ بات طے ہے کہ ہم اپنے محدود وسائل میں کالج جاتی ہوئی ارملا مکرجی کو اغوا نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسے کسی دوسری جگہ سے اٹھانا ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ ارملا جہاں جہاں جاتی ہے اس کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم کی جائیں"

کمانڈو اورنگ زیب شمس خواجہ سے کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے خواجہ۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ مگر تم جتنی جلدی معلومات حاصل کر
ہو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس دوران ہم آج رات کمانڈو شیروان سے وا
سیٹ پر رابطہ پیدا کر کے معلوم کریں گے کہ کرنل بھگت رام نے مہلت کی مدت
ہے یا وہاں کیا صورت حال ہے۔"

شمس خواجہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ تابوت والے کیبن میں رات کو آجانا۔ میں بھی رات
بجے کے بعد پہنچوں گا۔"

پھر اس نے کمانڈو اورنگ زیب سے خاص طور پر کہا۔

"وہاں جس خفیہ جگہ پر ٹرانسمیٹر سیٹ چھپایا ہوا ہے وہ جگہ تمہیں معلوم ہ
مجھے آنے میں اگر دیر ہو گئی تو تم کمانڈو شیروان سے وائرلیس پر رابطہ قائم کر لینا۔
خفیہ سگنل کا کوڈ معلوم ہی ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ہم جاتے ہیں۔ رات کو تم سے تابوتوں والے کیبن میں
ہو گی۔ کیا رحیم اس وقت وہاں موجود ہو گا؟"

شمس خواجہ بولا۔

"نہیں۔ اس کی وہاں موجودگی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے منع کروں گا۔
میں تم دونوں اکیلے ہو گے۔ خدا حافظ!"

یہ کہہ کر شمس خواجہ نے لوئی کی بکل ماری اور نشیب کی جھاڑیوں میں اتر
بھی وہاں سے سڑک پر آئے۔ ہم واپس صمد کے مکان میں نہ گئے۔ بلکہ وہیں سے
لوئر بازار کی طرف سے گزر کر نیچے ایک چھوٹے سے باغیچے میں آگئے جہاں چھوٹی
گاہ بنی ہوئی تھی۔ سردی اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سیر گاہ
تھی۔ ایک جانب چھوٹا سا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر دو ایک غیر ملکی سیاح
وغیرہ پی رہے تھے۔ یہ ہوٹل لکڑی کے کیبن میں بنا ہوا تھا۔ باہر دو چار کرسیاں او

پڑی تھیں۔ سردی ہو گئی تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہم وہاں سے دور جا کر ایک جگہ
درختوں میں بیٹھ گئے۔ ہم نے ارملا کو اغوا کرنے کے لئے جو حکمت عملی تبدیل کی تھی اس
کی تفصیلات پر اور اس کے خطرات پر گفتگو کرنے لگے۔ ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ پھر
اٹھ کر ہوٹل کے کیبن میں آگئے۔ وہاں ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ کچھ کھانا ساتھ
بندھوا لیا اور ایک طرف چل پڑے۔ کمانڈو اورنگ زیب ان تمام راستوں سے واقف
تھا۔ کھڈ نالوں اور چھوٹی کھائیوں والے پہاڑی راستوں پر سے ہوتے ہوئے ہم اس مقام
پر آگئے جہاں سے تابوتوں والا لکڑی کا بوسیدہ کیبن دور درختوں میں نظر آنے لگا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"شملے میں ادھر ادھر پھرنے سے بہتر ہے کہ ہم اس جگہ دن کا باقی وقت گزاریں۔"

چابی اورنگ زیب کے پاس ہی تھی۔ کیبن میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے
چاروں طرف ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا کہ کوئی شخص ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ ابھی
تک شملہ میں کوئی خفیہ پولیس والا ہمارے پیچھے نہیں لگا تھا۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا۔ کیبن
میں آکر ہم نے دروازہ بند کر کے اندر کنڈی لگا دی۔ ایک چھوٹے سے روشندان میں سے
ابر آلود دن کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم نے لکڑی کے تابوتوں کے درمیان
تھوڑی سی جگہ بنائی اور تابوتوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں سارا دن وہاں بسر کرنا تھا۔
اورنگ زیب اپنا پستول نکال کر رومال سے اسے چمکانے اور اس کے میگزین کو چیک کرنے
لگا۔ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ جب میں نے اورنگ زیب سے پوچھا کہ ہمیں اس
مشن میں خود کار اسلحہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ کہاں سے آئے گا؟ تو کمانڈو اورنگ زیب
نے کہا۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ بلکہ سمجھو کہ اس کا انتظام پہلے سے ہو چکا ہے۔
ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ بریگیڈیئر کی بیٹی ارملا کو ہمیں اغوا کہاں سے
کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں اس قسم کے حالات ہوں کہ ہمیں اسلحہ کی ضرورت ہی نہ
پڑے۔ بہرحال ہم ایک ایک پستول اور دستی بم ضرور اپنے پاس رکھیں گے۔"

اس کے بعد اورنگ زیب اٹھا اور کہنے لگا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں نیچے تہہ خانے میں جا کر ٹرانسمیٹر سیٹ کو چیک کرنا چا
ہوں"

اس کیبن کے نیچے ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا۔ اس تہہ خانے میں جانے کا را
دیوار کے ساتھ جہاں لکڑی کے بڑے بڑے تختے کھڑے کئے ہوئے تھے ان کے پیچھے لک
کے فرش میں سے جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے تختوں کے پیچھے آکر ایک جگہ سے فرش
تختے کو اوپر اٹھایا تو ایک تنگ زینہ نیچے جاتا نظر آیا۔ ہم زینہ اتر کر تہہ خانے میں آگ
اورنگ زیب نے ماچس جلا کر وہاں رکھی ہوئی موم بتی روشن کر دی۔ موم بتی کی رو
میں چھوٹی سی میز پر ایک وائرلیس ٹرانسمیٹر سیٹ پڑا نظر آیا۔ یہ بیٹری سیٹ تھا۔ کما
اورنگ زیب نے اس کے دو تین بٹن دبا کر اسے اون کیا۔ اس میں سے ٹون کی آواز
تو اس نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ بولا۔

"کمانڈر شیروان کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا ہمارا وقت رات نو بجے کے بعد شر
ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں ہے۔ رات کو اس سے بات ک
گے۔ خدا کرے کہ اس بدبخت کرنل بھگت رام نے مہلت کی مدت بڑھا دی ہو۔ کیو
ہمارا کام لمبا ہے۔ اس میں ہو سکتا ہے دو دن لگ جائیں۔"

ہم تہہ خانے سے نکل کر واپس تابوتوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں نے او
زیب سے کہا۔

"شمس خواجہ رات گیارہ بجے سے پہلے نہیں آئے گا۔"

وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے پہلے آ جائے۔ اگر اس کا آدمی ارملا مکرجی کی مصروفیات کی رپورٹ
کر پہلے آئے گا تو وہ رات کا اندھیرا ہوتے ہی آ جائے گا۔ معاملے کی نزاکت کا اسے
احساس ہے۔"

دوپہر کے بعد ہم نے سیر گاہ کے ریستوران سے لایا ہوا کھانا کھایا باہر جا کر چشمے

پانی پیا۔ چشمے پر ہم بڑی احتیاط سے چاروں طرف سے چوکس ہو کر باری باری گئے۔ اس
کے بعد واپس آکر تابوتوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر بند
کر دیا تھا۔ آخر دن گزر گیا۔ شام ہو گئی۔ پھر رات ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ ہم نے ایک
تابوت کی اوٹ میں پتلی سی موم بتی روشن کر دی تھی۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی
گھڑیوں پر وقت دیکھ لیتے تھے۔ جب رات کے پورے دس بج گئے تو باہر ہمیں کسی کے
قدموں کی آواز آئی۔ اورنگ زیب نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی اور پستول لے کر
دروازے کے پاس چلا گیا۔ میں بھی ہوشیار ہو کر دروازے کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔
اتنے میں دروازے پر خاص انداز میں دستک ہوئی۔ یہ شمس خواجہ تھا۔ اورنگ زیب نے
کنڈی اتار کر دروازے کو ذرا سا کھول کر اندھیرے میں شمس خواجہ کو پہچان کر دروازہ
کھول دیا۔ شمس خواجہ نے اسی طرح لوئی اوڑھی ہوئی تھی۔ میں نے موم بتی روشن کر
دی۔ شمس خواجہ ہمارے قریب آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے آدمی نے جو معلومات لا کر مجھے دی ہیں وہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔"

ہم پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"جو کچھ رپورٹ ملی ہے اسے بیان کرو۔ بعد میں ہم سوچ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا
ہے"

شمس خواجہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر شیاما پرشاد کی بیٹی ارملا پہلے شام کے بعد
اپنے باپ کے ساتھ آفیسر میس میں ضرور جایا کرتی تھی مگر جب سے سری نگر میں کشمیری
مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئی ہیں اور سری نگر کے گیریژن کو تباہ کیا گیا اور حاجی صاحب
کی بیٹی کو فوج نے یرغمال بنایا تھا اس کے بعد سے ارملا نے باپ کے ساتھ آفیسر میس میں
جانا بند کر دیا ہے۔ وہ ہفتے میں تین بار رات کے وقت تھوڑی دیر کے لئے شملہ کی لیڈیز
کلب بھی جاتی تھی لیکن اب اس کا وہاں جانا بھی موقوف ہو گیا ہے۔ جب شمس خواجہ نے
اپنی بات ختم کی تو اورنگ زیب بولا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ ہم ارملا کو سوائے اس کے گھر کے اور کسی جگہ سے اغوا نہیں

کر سکتے۔"

شمس خواجہ کچھ حیران سا ہو کر کہنے لگا۔

"یہ کام تو زیادہ مشکل ہو گا۔ بریگیڈیئر مکرجی کی کوٹھی پر تو مسلح ڈوگرہ فوجیوں کا دن رات پہرہ لگا ہوتا ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے بڑے پر سکون لہجے میں کہا۔

"خواجہ تم یہ بات ہم پر چھوڑ دو۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیں کسی ذریعے سے بریگیڈیئر مکرجی کے گھر کا پورا نقشہ لا کر دے سکتے ہو؟ خاص طور پر کیا ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے بیڈ روم کہاں کہاں پر ہیں اور ارملا کا بیڈ روم کوٹھی میں کس سمت ہے اور اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟"

شمس خواجہ خاموش ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے ہمارے ایک مجاہد کی ایک رشتے دار عورت بریگیڈیئر کی کوٹھی میں گھر کا کام کاج کرنے پر ملازم ہے۔ یہ مجھے صبح معلوم کرنا ہو گا۔ اگر وہ عورت اب بھی بریگیڈیئر کے گھر پر کام کرتی ہے تو پھر ہمیں اس کی کوٹھی کے تمام کمروں اور خاص طور پر ارملا کے بیڈ روم کی پوری تفصیل مل جائے گی۔"

"یہ کام کل دوپہر تک ہو جانا چاہئے کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

اورنگ زیب نے پوچھا۔

شمس خواجہ بولا۔

"میں پوری کوشش کروں گا"

اورنگ زیب کہنے لگا۔

"اگر کل دوپہر تک ہمیں بریگیڈیئر شیاما پرشاد کے بنگلے کی ساری اور خاص طور پر ارملا کے بیڈ روم کے محل وقوع کے بارے میں پوری رپورٹ مل گئی تو اس کے بعد تمہیں ہمارے مشن کے لئے ہمیں کچھ ضروری چیزیں فراہم کرنی ہوں گی جن میں کلوروفارم سب سے اہم ہے۔"

شمس خواجہ نے کہا۔

"مجھے سب معلوم ہے تمہیں اپنے مشن کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہو گی۔ تم اس طرف سے بے فکر رہو۔ مجھے جس وقت کہو گے تمہیں یہ ساری چیزیں فراہم کر دی جائیں گے۔"

اورنگ زیب نے کہا۔

"یہ مجھے معلوم ہے۔ سب سے پہلے میں سری نگر کے ہائیڈ آؤٹ میں کمانڈر شیروان سے رابطہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کرنل بھگت رام کی جانب سے مہلت کی مدت بڑھائی گئی ہے یا نہیں۔ اگر ہمیں مزید دو دن مل جائیں تو ہم پوری تیاری اور سکیم بنانے کے بعد ٹارگٹ پر اٹیک کریں گے۔"

یہ کہہ کر اورنگ زیب اکیلا ہی نیچے تہہ خانے میں چلا گیا جہاں ٹرانسمیٹر رکھا ہوا تھا۔

وہ پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"کرنل بھگت رام نے مہلت کی مدت میں صرف دو دن کا اضافہ کر دیا ہے۔ کمانڈر شیروان نے بتایا ہے کہ کرنل بھگت رام نے حاجی ثناء اللہ ڈار کو اپنے پیغام میں کہا ہے کہ یہ آخری مہلت ہے۔ اس دوران اگر گیریزن کی چھاؤنی تباہ کرنے والے کمانڈوز کا نام اور ٹھکانہ نہ بتایا گیا تو اس کی بیٹی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔"

ٹرانسمیٹر پر کمانڈو اورنگ زیب نے شیروان سے ساری گفتگو خفیہ کوڈ میں کی تھی۔

میں نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہوئی ہے۔ اگر کل تک ہمیں شملے میں بریگیڈیئر مکرجی کے بنگلے کی پوری تفصیلات مل جاتی ہیں تو ہم کل رات کو ہی اٹیک کر سکتے ہیں۔"

"بالکل"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"اور شمس خواجہ مشن کی کامیابی کی صورت میں ہمیں بریگیڈیئر کی بیٹی کو انتہائی خفیہ اور محفوظ جگہ پر اس وقت تک چھپائے رکھنا ہو گا جب تک کہ پروین کو شملہ کے فوجی

کیمپ سے رہا کر کے سری نگر اس کے ماں باپ کے پاس نہیں پہنچا دیا جاتا۔"

شمس خواجہ بولا۔

"اس کے لئے قبرستان والا تہہ خانہ بڑا مناسب رہے گا۔"

کمانڈو اورنگ زیب جو اس تہہ خانے سے واقف تھا کہنے لگا۔

"ہاں! میرے خیال میں وہ تہہ خانہ ٹھیک رہے گا۔ وہاں ساتھ چھوٹا باتھ روم بھی ہے۔ ہم اگر اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو بریگیڈیئر کی بیٹی کو تو ہم وہیں لے جائیں گے۔ اس وقت وہاں کمانڈو رحیم تابوت ساز کو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ موجود ہونا چاہئے اور ان تینوں کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے ہوں گے۔ ہمیں اپنے چہرے چھپانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

شمس خواجہ نے کہا۔

"مشن پر جانے سے پہلے تم لوگ مجھے خبر کر دو گے۔ اس کے بعد کامیابی کی صورت میں تم بریگیڈیئر کے بنگلے سے نکل کر اس کچی سڑک پر آؤ گے جو ڈگی کو جاتی ہے۔ وہاں کمانڈو رحیم ویگن لے کر پہلے سے تمہارے انتظار میں موجود ہو گا۔ اگر تمہارا مشن ناکام ہو گیا تو وہ تمہیں وہاں نہیں ملے گا۔ مشن کی ناکامی کی صورت میں کوٹھی میں شور ضرور مچے گا اور فائرنگ بھی ہو سکتی ہے ان آوازوں کو سنتے ہی رحیم وہاں سے ویگن بھگا کر لے جائے گا۔ پھر اگر تم لوگ زندہ بچ گئے تو تمہیں خود وہاں سے فرار ہونا ہو گا"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ تم کوشش کرنا کہ کل شام تک بریگیڈیئر کے بنگلے کا اندرونی سارا نقشہ ہمیں مل جائے۔ اس دوران ہم یہاں اس کیبن میں نہیں ہوں گے۔ ہم کل سورج غروب ہونے کے بعد یہاں آئیں گے۔ پھر جیسی صورت حال ہوئی اس کے مطابق اپنے کمانڈو مشن کے وقت کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

شمس خواجہ بولا۔

"بہتر ہے۔ اب میں جاتا ہوں"

جب وہ چلا گیا تو میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"یہ لوگ ہمارے لئے خود کار اسلحہ وغیرہ کا انتظام کر دیں گے؟"

اس نے کہا۔

"ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو گی وہ مل جائے گی۔ بے فکر رہو"

ہم نے رات اسی کیبن میں مردوں کے خالی تابوتوں کے پاس گزارنے کا فیصلہ کیا اور وہیں جگہ بنا کر لیٹ گئے۔ کمانڈو جہاں چاہے سو سکتا ہے۔

شملے میں بھی اپنے کشمیری مجاہدین کی سراغ رسانی کا نظام حیرت انگیز اور حوصلہ افزا تھا۔ اپنے محدود اور مخدوش حالات کے باوجود وہاں جتنے بھی کشمیری مجاہد خفیہ طور پر کام کر رہے تھے انہوں نے ہر قسم کا چھوٹا اسلحہ اور دوسرا کمانڈو مشن میں کام آنے والا سامان اپنی خفیہ کمیں گاہوں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا دن بھی میں نے اور کمانڈو اورنگ زیب نے شملے کے غیر آباد پہاڑی علاقے میں گھوم پھر کر گزار دیا۔ ہم شملے کے شہر کی آبادی سے دور رہنا چاہتے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی ہم واپس قبرستان والے کیبن میں آکر شمس خواجہ کا انتظار کرنے لگے۔ وہ رات کے پہلے پہر آیا۔ ہم نے تابوتوں کے پاس موم بتی روشن کر رکھی تھی۔ وہ آکر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکال کر کھولا اور اسے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کاغذ پر پنسل سے ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"اورنگ زیب! یہ بریگیڈیئر شیاما پرشاد کے بنگلے کا اندرونی نقشہ ہے۔ ہمارے خاص آدمی کی جو رشتے دار عورت بریگیڈیئر کے گھر میں کام کرتی ہے۔ میں خود اس کے گھر میں جا کر اسے ملا ہوں اور اس کی بتائی ہوئی معلومات کی روشنی میں میں نے خود یہ نقشہ تیار کیا ہے۔ یہ دیکھو۔ یہ بنگلے کے عقب کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ بنگلے کے گرد کوئی بارہ فٹ اونچی پتھریلی دیوار ہے۔ یہاں باغ کا لان ہے۔ یہ تین کمرے جو تم دیکھ رہے ہو یہ تینوں بیڈ روم ہیں۔ ایک بیڈ روم میں بریگیڈیئر مکرجی اور اس کی بیوی سوتے ہیں۔

یہ ساتھ والا بیڈ روم جو ہے اس میں بریگیڈیئر کی دونوں چھوٹی بیٹیاں سوتی ہیں اور یہ جو کونے والا بیڈ روم ہے یہ بریگیڈیئر کی بڑی بیٹی ارملا کا ہے۔ اس کے بارے میں اس عورت نے بتایا ہے کہ وہ رات کو دس بجے اپنے بیڈ روم میں آجاتی ہے۔ بیڈ روم میں وہ رات کے گیارہ بجے تک کتابیں پڑھتی ہے۔ اس کے بعد سو جاتی ہے مگر اس کے سرہانے کی تپائی پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ ساری رات روشن رہتا ہے۔ اس کی روشنی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ باغیچے سے ارملا کے بیڈ روم میں جانے کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ صرف اس کے باتھ روم کی کھڑکی جو اندر سے بند رکھی جاتی ہے وہاں کام کرنے والی اپنے گروہ کی عورت نے وعدہ کیا ہے کہ جس رات تمہیں اپنے مشن پر جانا ہو گا وہ لڑکی کے باتھ روم کی کھڑکی کی چٹخنی اندر سے کھول دے گی۔"

"کیا وہ ایسا کر سکے گی؟"

اورنگ زیب نے پوچھا۔

شمس خواجہ نے کہا۔

"اس نے مجھے یقین دلایا ہے۔ اگر تم کل رات اس مشن پر روانہ ہونے والے ہو تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں صبح اسے اپنے جاسوس کے ہاتھ پیغام بھجوا دوں گا۔ تمہیں باتھ روم کی کھڑکی کھلی ہوئی ملے گی۔"

میں نے نقشے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں رات کو فوجی گارڈ کہاں کہاں ڈیوٹی پر ہوتے ہیں؟"

شمس نے کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق پہلے صرف ایک فوجی سپاہی بریگیڈیئر کی کوٹھی کے باہر پہرہ دیتا تھا لیکن اب اس کے علاوہ رات کو بھی اور دن کے وقت بھی دو مسلح فوجی کوٹھی کی دیوار کے گرد گشت لگاتے رہتے ہیں۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"میں اس علاقے سے تو واقف ہوں جہاں بریگیڈیئر کی کوٹھی ہے مگر میں نے یہ

کوٹھی کبھی دیکھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں دن کے وقت اسے ایک نظر دور سے ہی دیکھ لوں"

شمس خواجہ بولا۔

"میں کوٹھی دکھانے نہیں جا سکتا۔ یہ کام کمانڈو رحیم کرے گا۔ وہ صبح کسی وقت تمہیں اپنے ساتھ لے جاکر کوٹھی دکھادے گا۔ تم بتاؤ۔ تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہم کل رات اٹیک کریں گے۔ کمانڈو رحیم سے کہو کہ ہمیں دن میں کسی وقت بریگیڈئیر کی کوٹھی دکھادے۔ وہ کس وقت یہاں آسکتا ہے؟"

شمس کہنے لگا۔

"یہ اس کا چھوٹا سا گودام ہے۔ یہاں وہ تابوت بنا کر رکھتا ہے۔ میں اسے صبح ہی بھیج دوں گا۔"

"ٹھیک ہے"

اورنگ زیب بولا۔

"اور کل شام تک ہمیں ہماری کمانڈو ایکشن کی دوسری چیزیں بھی پہنچ جانی چاہئیں۔ جن میں کلوروفارم کی شیشی بہت ضروری ہے"

شمس بولا۔

"یہ ڈیوٹی کمانڈو رحیم کی ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں شام ہونے سے پہلے پہلے یہاں لے آئے گا۔ رات کو کمانڈو رحیم ویگن کے ساتھ اپنے دو مجاہد کمانڈو ساتھیوں کے ساتھ بھی ڈگی والے موڑ پر موجود ہو گا۔"

اس کے بعد ہماری میٹنگ ختم ہو گئی۔ شمس خواجہ چلا گیا۔ رات گئے تک ہم اپنے مشن کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ ہمیں اس مشن کے سلسلے میں کافی حد تک اس علاقے میں مقیم خفیہ کمانڈو مجاہدوں کی کارکردگی پر بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا۔ میرے استفسار پر کہ کیا یہ لوگ پوری مہارت سے یہ فرض پورا کر سکیں گے' کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"یہ لوگ وادی میں پوری کمانڈو ٹریننگ لینے کے بعد عام کاری گروں اور مزدوروں کے بھیس میں یہاں آکر کام کر رہے ہیں۔ تم کو ان کے بارے میں تشویش نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بڑے ٹرینڈ کمانڈو ہیں"

وہ رات بھی ہم نے تابوتوں کی کوٹھڑی یا کیبن میں ہی بسر کی۔ دوسرے دن رحیم کمانڈو صبح صبح پہنچ گیا۔ گٹھے ہوئے جسم کا سرخ و سپید کشمیری نوجوان تھا۔ ہم سے مصافحہ کیا تو میں نے اس کی گرفت کی سختی سے معلوم کر لیا کہ سخت جان ہے وہ اپنے ساتھ لکڑی کا ایک صندوق سر پر اٹھا کر لایا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! اس میں کمانڈو مشن کے لئے جس سازو سامان کی ضرورت ہے موجود ہے۔"

ہم نے بکس کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کالے رنگ کی دو جرسیاں تھیں جن کے ساتھ اونی نقاب لگے ہوئے تھے۔ یہ نقاب منہ پر چڑھانے کے بعد صرف آنکھوں اور ناک کی جگہ کے سوراخ ہی نظر آتے تھے۔ باقی سارا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رہتا تھا۔ دو آٹو میٹک چھوٹی سٹین گنیں تھیں۔ ایک ایک میگزین بیلٹ تھی۔ سٹین گنوں کی نالیوں پر سائی لینسر چڑھے ہوئے تھے۔ دو سیاہ رنگ کے جاگر شوز تھے۔ آٹھ ہینڈ گرنیڈ اور ایک ایک سائی لینسر والا پستول بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم نے سٹین گنوں کو چیک کیا۔ پستول دیکھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"ہمیں ہینڈ گرنیڈوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے تو پستول بھی کام نہیں آئیں گے صرف سٹین گنیں ہی کافی ہوں گی لیکن انہیں بھی بیلٹ میں لگا لیں گے ہو سکتا ہے ان کی ضرورت پڑ جائے۔"

پھر اورنگ زیب نے کمانڈو رحیم سے پوچھا۔

"کمانڈو کا جو اصلی نشان یعنی ٹریڈ مارک ہوتا ہے وہ کہاں ہے؟"

کمانڈو رحیم نے مسکراتے ہوئے بکس میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلا نکال کر ہمیں دیا۔ اس تھیلے میں دو کمانڈو چاقو تھے۔ اورنگ زیب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کمانڈو چاقوؤں کو باری باری چوم کر کہا۔

"انشاء اللہ! ہم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔"

پھر اس نے کلوروفارم کے بارے میں پوچھا۔ کمانڈو رحیم نے اپنی جیب میں سے
رومال میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دی اور کہا۔

"سر! اس میں اتنا کلوروفارم ہے کہ اس سے بریگیڈیئر شیاما پرشاد مکرجی کے سار
خاندان کو بے ہوش کرنے کے بعد بھی بچ جائے گا۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے شیشی کو موم بتی کی روشنی میں کر کے غور سے دیکھا۔ پ
اسے ناک سے تھوڑی دور رکھ کر تھوڑا سا سونگھا اور ناک سکیڑ کر بولا۔

"بالکل صحیح ہے۔"

میں نے کمانڈو رحیم سے کہا۔

"دوست! ہم آج رات اپنے مشن پر روانہ ہوں گے۔ تمہیں اپنے دو کمان
ساتھیوں کے ہمراہ ڈگی والی سڑک کے موڑ پر ویگن لے کر ہر حالت میں موجود ہ
چاہیئے۔"

کمانڈو رحیم بولا۔

"سر! آپ ہمیں وہاں موجود پائیں گے۔ لیکن اگر وہاں کوئی ناخوشگوار ایمرجنسی پ
ہو گئی اور فائرنگ ہونے لگی اور شور مچ گیا تو ہم وہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ پھر آپ
اپنے طور پر وہاں سے نکلنا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کر بھا
جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کے ساتھ فوج نے ہمیں بھی پکڑ
تو وہ ہمارے چہرے دیکھ لیں گے اور اس طرح شملے کے علاقے میں مقیم اور آزادی ک
کے مقصد کے لئے خفیہ کام کرنے والے سارے مجاہدین کو ایک دم روپوش ہونا پڑ
اور اس سے ہمارے دور رس مقاصد کو شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا اور سارا کام ر
جائے گا۔ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"تمہیں صرف فائرنگ کی آوازوں پر وہاں سے نہیں جانا ہو گا۔ ہاں اگر شور مچ

اور بریگیڈیئر کے بنگلے کی طرف سے تمہیں فوجی اسلحے اور مشین گنوں کی فائرنگ سنائی دی
تو تم بے شک چلے جانا ہم اپنا بچاؤ کرنا جانتے ہیں۔"

"او کے سر!"

"اس بکس کو میں کونے میں رکھ دیتا ہوں۔ اب آپ دونوں میں سے کوئی ایک
میرے ساتھ چلے تاکہ میں بریگیڈیئر شیاما پرشاد کی کوٹھی دکھا دوں کوٹھی کے گرد دن رات
دو فوجی گشت لگا کر پہرے پر موجود ہوتے ہیں۔ آپ کو کوٹھی دور سے دیکھنی ہو گی۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو گے۔"

میں نے کہا۔

"نو پرابلم!"

کمانڈو اورنگ زیب کمانڈو رحیم کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر
کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ لکڑی کے خالی تابوت پر بیٹھ گیا۔ موم بتی فرش پر رکھے پتھر
پر جل رہی تھی۔ ابھی دن کے آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ باہر دھند پھیلی ہوئی تھی اور
آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ رات کو بارش شروع ہو جائے۔ بارش
ہمارے کمانڈو مشن کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ بلکہ سردیوں کی بارش کمانڈو ایکشن کے
لئے مفید ہوتی ہے۔ سردی اور بارش کی وجہ سے راستہ عام طور پر صاف ملتا ہے اور یہاں
بھی ممکن تھا کہ اگر رات کو بارش ہونے لگی تو انڈین فوجی جو رات کو بریگیڈیئر کی کوٹھی
کی دیوار کے گرد چل پھر کر پہرے پر ہوتے ہیں بارش کی وجہ سے کسی جگہ بارش سے
بچنے کے لئے بیٹھ جائیں۔ ان کی یہ غفلت ہمارے حق میں فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔
میں نے کونے میں جا کر لکڑی کے بکس کو کھولا اور ایک بار پھر سٹین گنوں کو چیک کیا۔ یہ
فوجی سٹین گنیں تھیں جو ہمارے کشمیری مجاہدوں نے کسی بھارتی فوجی کانوائے پر کامیاب

اٹیک کرنے کے بعد ان سے چھینی تھیں۔ پستول بھی جدید قسم کے تھے۔ میں نے انہیں موم بتی کی روشنی میں لا کر غور سے دیکھا۔ ان پر دستے کے پاس دو حرف اسرائیلی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو مسلمانوں کا اول دشمن اسرائیل بھارت کو کشمیر میں مجاہدوں کی آزادی کی تحریک کو کچلنے کی خاطر سپلائی کر رہا تھا۔ یہ پستول بھی ملٹری کے تھے اور انڈین فوجیوں سے چھینے ہوئے تھے۔ میں نے میگزین کی بیلٹیں بھی چیک کیں۔ یہ کافی اسلحہ تھا۔ اگرچہ میرے خیال کے مطابق ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑنے والی تھی۔ ہمارے لئے کافی تھے۔ کمانڈو کے پاس اس کا چاقو ہو اور وہ پوری طرح تربیت یافتہ ہو تو وہ موافق ماحول میں پوری پلٹن کا اس ایک چاقو سے صفایا کر سکتا ہے۔ میں نے بکس بند کیا اور تابوت کے اوپر لیٹ کر اورنگ زیب کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد باہر چھوٹے پتھروں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ درز میں سے دیکھا۔ اورنگ زیب اکیلا چلا آرہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آکر بولا۔

"کوٹھی کی ساری لوکیشن دیکھ آیا ہوں کوٹھی کے اردگرد اونچی دیوار ہے۔ گیارہ بارہ فٹ ہو گی۔ دور سے دیکھی ہے۔ یہ دیوار پرابلم بن سکتی تھی۔ مگر اس کا بھی انتظام کر لیا ہے"

اس نے جیکٹ کی جیب میں سے نائیلون کی باریک مگر بڑی مضبوط رسی نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے اسے کھینچ کر دیکھا۔ بہت مضبوط تھی۔ اس میں دو دو فٹ کے فاصلے پر گانٹھیں لگی تھیں۔ کہنے لگا۔

"ہم دیوار میں رات کو کیل نہیں ٹھونک سکتے۔ اس سے آواز پیدا ہو گی گارڈ چوکنی ہو جائے گی۔ اس رسی کے ذریعے ہم دیوار پھاند لیں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کوٹھی کے عقبی دیوار سے ارملا کے بیڈ روم کا غسل خانہ کتنی دور ہو گا؟"

اورنگ زیب بیٹھ گیا اور رسی کو جوڑ کر تہہ کرنے لگا۔

بولا۔

"ایک کنال کا آدھا کر لو۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ ایک بار ہم کوٹھی کے اندر کود گئے تو پھر چاہے جتنا فاصلہ ہو۔ ہم ٹارگٹ پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں بے ہوش لڑکی کو بھی واپسی پر دیوار کے اوپر سے دوسری طرف لانا ہو گا۔"

"سب ہو جائے گا۔ بس تم تیار ہو جاؤ آج رات ہم اٹیک کریں گے۔ ہماری یہی کوشش ہو گی کہ ہمارا مشن کامیاب ہو۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

دوپہر کے وقت کمانڈو رحیم ہمارے لئے کچھ روٹیاں اور بھنا ہوا گوشت لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ قبرستان والے تہہ خانے میں چارپائی ڈال کر لڑکی کے لئے سونے کا سارا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب بولا۔

"اگر اسے نیند آگئی تو۔"

کمانڈو رحیم بولا۔

"سر! نیند تو کہتے ہیں سولی پر بھی آجاتی ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے ویگن کے بارے میں پوچھا۔

"ویگن کے انجن کو اچھی طرح چیک کر لینا۔ اسے سیلف سٹارٹ ہونا چاہئے۔ اگر عین موقع پر وہ سٹارٹ نہ ہوئی تو ہم مصیبت میں پھنس سکتے ہیں"

کمانڈو رحیم نے کہا۔

"سر! میرے دونوں کمانڈو ساتھی صبح سے ویگن کی صفائی میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو بریگیڈیئر مکرجی کے بنگلے سے جو پہاڑی اترائی ڈگی والی سڑک پر آتی ہے اس کا راستہ معلوم ہے ناں؟"

"معلوم ہے۔ فکر نہیں۔"

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کمانڈو رحیم یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ رات دس بجے کے بعد ہی ویگن سمیت ڈگی والے موڑ کے درختوں میں پہنچ جائے گا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔

اور کمانڈو بکس کھول کر اسلحہ نکالا اور اس کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کے
تین بج رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے کہا۔

"تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ ہمیں کم از کم دو دو گھنٹے ضرور آرام کرنا چاہیے۔"

آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں مجاہد کمانڈر کی سخت کمانڈ
ٹریننگ نے مجھے نیند پر قابو پانا بھی سکھا دیا تھا اور میں کم از کم دو راتیں بغیر آنکھیں جھپکے
گزار سکتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے کہنے پر میں ایک تابوت کے اوپر لیٹ کر سو گیا۔
ٹھیک دو گھنٹے کے بعد اس نے مجھے جگا دیا اور خود وہیں لیٹ کر سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میں نے
اسے جگا دیا۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے تابوتوں والی کوٹھڑی سے باہر نکل آئے۔ رات کا پہلا
پہر شروع ہو گیا تھا۔ درختوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے۔ ہم
اخروٹ کے ایک بہت بڑے درخت کے پیچھے کھڑے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"سردی بڑھ گئی ہے۔ اگر رات کو بارش ہونے لگے تو ہمیں ٹارگٹ مارنے میں
آسانی ہو گی۔ بارش اور سردی میں گشت لگانے والے انڈین فوجی غافل ہو سکتے ہیں"

کچھ دیر تک ہم کھلی فضا میں اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں
کرتے رہے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"اگر وہاں معاملہ الٹ گیا اور ہم میں سے کوئی دشمن کی فائرنگ سے مر گیا تو ہمیں
لاش کو نہیں اٹھانا ہو گا۔ بلکہ لاش کو وہیں چھوڑ کر اپنے مشن کو کامیاب بنانے کی کوشش
کرنی ہو گی لاش ہم میں سے کسی کے لئے بھی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔"

ہمیں رات کے ٹھیک گیارہ بجے تابوتوں والے کیبن سے اپنے مشن پر روانہ ہو
تھا۔ دس بجے ہم کیبن میں بیٹھے اسلحہ وغیرہ کو آخری بار چیک کر رہے تھے۔

پورے ساڑھے دس بجے ہم نے اپنے کمانڈو آپریشن کی تیاریاں شروع کر دیں
سب سے پہلے ہم نے اپنی گھڑیاں ملائیں۔ اس کے بعد کالے جوگر شوز پہنے۔ نیلی جینز ہم
نے پہلے ہی پہن رکھی تھیں۔ جیکٹیں اتار کر نیچے کالی جرسیاں پہنیں۔ اوپر دوبارہ جیکٹیں
پہن کر ان کے زپ گردن تک لگا لئے۔ جرسیوں کے ہڈ آدھے سروں پر اس طرح او

ڑھا لئے کہ ہمارے صرف چہرے نظر آ رہے تھے۔ کمانڈو چاقو اپنی اپنی بیلٹ میں لگا لئے۔
آٹو میٹک پستولوں کے سائی لینسر کھول کر دوبارہ فٹ کئے۔ چھوٹی خود کار سٹین گنیں
سلنگوں کے ساتھ کمر کے پیچھے کر لیں۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"سٹین گن کا استعمال ہم انتہائی ضرورت کے وقت کریں گے۔ کمانڈو چاقو کو ترجیح
دیں گے۔ اس کے بعد موقع دیکھ کر پستول استعمال کریں گے۔"

ہم نے دو دو ہینڈ گرنیڈ اپنی جیکٹوں کی جیبوں میں رکھ لئے۔ کلورو فارم کی چھوٹی
شیشی اور رومال اورنگ زیب نے اپنے پاس ہی رکھا۔ دیوار پھلانگنے والی نائیلون کی
باریک رسی بھی اس کے پاس تھی۔ جب ہم پوری طرح کمانڈو بن گئے تو اورنگ زیب نے
موم بتی کی روشنی میں اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر مجھ سے کہا۔

"اپنی گھڑی کا وقت بولو"

میں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

دس بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں"

اس نے کہا۔

"چیک۔ ٹھیک ہے"

وہ دروازے کے پاس گیا۔ اس نے چٹخنی ہٹا کر دروازے کو کھولا اور باہر جھانک کر
دیکھا۔ پستول اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے ہوئے
تھے۔ وہ گردن دروازے سے باہر نکالے دیکھ رہا تھا اور کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر
میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اوکے۔ بکس کونے میں چھپا دو اور موم بتی بجھا کر آجاؤ"

میں نے کمانڈو کے سامان والا بکس کونے میں لے جا کر رکھ دیا۔ وہ بالکل خالی تھا۔
موم بتی پھونک مار کر بجھائی تو کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا چھاتے ہی دروازے کے
باہر ابر آلود رات کی پھیکی پھیکی دھندلی سی روشنی میں مجھے کمانڈو اورنگ زیب دروازے

کے پاس کھڑا نظر آیا۔ میں نے بھی آٹو میٹک پستول اپنے دونوں ہاتھوں میں اس طرح مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے باہر دشمن گھات لگائے بیٹھا ہو اور ہمیں اس کے درمیان سے چھپ کر گزرنا ہو۔ کمانڈو ایکشن جب شروع ہوتا ہے تو ایک تربیت یافتہ کمانڈو یہی سمجھتا ہے کہ اسے دشمنوں کے درمیان سے اس طرح گزرنا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

باہر آتے ہی اورنگ زیب نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ سرگوشی میں بولا۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ"

ہم نے پستول جیکٹ کی جیب میں ڈال لئے تھے۔ کیبن سے نکلتے ہی اورنگ زیب پیچھے نشیب کی اترائی اترنے لگا میں اس کے پیچھے تھا۔ نشیب ختم ہونے کے ساتھ ہی ہم دوسری طرف والی چڑھائی چڑھ کر درختوں میں سے گزرنے لگے۔ میں نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ پیچھے پہاڑیوں کے اوپر اور نشیب میں شملے کی عمارتوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم درختوں میں کافی دور تک ادھر ادھر دوڑتے چلے گئے۔ اورنگ زیب شارٹ کٹ راستے سے بریگیڈیئر شیاما پرشاد کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ان سارے رستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر چلتے رہنے کے ہم ایک اونچی جگہ پر آکر رک گئے۔

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"وہ کونے والی کوٹھی بریگیڈیئر مکرجی کی ہے۔"

نیچے ڈھلان تھی۔ آگے کچھ فاصلے پر ایک کوٹھی میں کہیں کہیں روشنی نظر آرہی تھی۔ اورنگ زیب نے ایک روشنی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ کوٹھی کے گیٹ کی بتی ہے۔ وہاں فوجی گارڈز ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ تمہیں کوٹھی کی دیوار نظر آرہی ہے نا؟"

"ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں"

کوٹھی کی دیوار کہیں کہیں درختوں میں چھپی ہوئی تھی۔ دیوار پر کہیں کہیں کھمبوں

کے ساتھ بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"ہم اس وقت کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف کھڑے ہیں۔ وہ روشندان کی روشنی ارملا مکرجی کے باتھ روم کے بلب کی ہے۔ ہم اس طرف سے دیوار پھاند کر اندر جائیں گے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو درخت ہیں۔ ان کی شاخیں دیوار کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ بریگیڈیئر نے سیکورٹی کے پیش نظر انہیں کٹوا دیا ہے۔ ہم درختوں کے قریب سے دیوار پھاندیں گے او کے؟"

میں نے کہا۔

"او کے!"

"کم اون"

ہم ڈھلان اتر گئے۔ تیس چالیس قدموں کے فاصلے پر سامنے بریگیڈیئر کی کوٹھی کی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ ہم ایک جگہ جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اورنگ زیب بولا۔

"گارڈ ڈیوٹی کے فوجیوں کو ختم کرنا ہو گا۔ ان کی موجودگی میں ہمارا مشن کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ فوجی پوری دیوار کے گرد چل کر پہرہ دیتے ہیں۔ اگر ہم نے انہیں ختم کر دیا تو گیٹ پر موجود گارڈ کو شک پڑ سکتا ہے کہ دونوں فوجی ابھی تک چکر پورا کرنے کے بعد واپس کیوں نہیں آئے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے کمانڈو رحیم سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہ دونوں فوجی ڈوگرہ ہیں۔ وہ پوری دیوار کا چکر نہیں لگاتے۔ وہ صرف دیوار کے اس طرف نصف دائرے میں گشت لگاتے ہیں دیوار کے دوسرے نصف حصے کو گیٹ کی پوسٹ پر جو فوجی ہیں وہ چیک کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں فوجیوں کو ختم کر دیں گے تو گیٹ کی پوسٹ پر فوجیوں کو ان کے انجام کی صبح تک خبر نہیں ہو گی۔"

اورنگ زیب نے آہستہ سے شی کہہ کر مجھے آگے سے نہ بولنے کی ہدایت کی اور دھیمی سرگوشی میں بولا۔

"گارڈز آرہے ہیں"

ہمیں دیوار جہاں خم کھاتی تھی ادھر سے اندھیرے سے دو انسانی سائے نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ آتے دکھائی دیئے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک سپاہی سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں اس نے کش لگایا تو اس کے سگریٹ کا گل نقطے کی طرح روشن ہو گیا۔ ہم گھات میں بیٹھے بڑے غور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جرسی کے سیاہ نقاب اپنے چہروں پر کھینچ لئے تھے۔ اب صرف ہماری آنکھیں اور ناک ہی قریب سے دیکھے جاسکتے تھے۔ دونوں فوجی دیوار کے قریب سے آہستہ آہستہ گزر گئے۔ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کی ہلکی ہلکی آواز ہمیں آئی تھی۔ ذرا آگے دیوار پر ایک بلب روشن تھا۔ وہ اس کی روشنی میں سے گزرے تو ہمیں ان کے کندھوں سے لٹکی ہوئی سٹین گنیں نظر آئیں۔ جب وہ دیوار کے خم کے ساتھ آگے نکل گئے جہاں وہ اندھیرے میں گم ہو گئے تو کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

"ان دونوں کو ختم کرنا ضروری ہے اس وقت تو یہ ہمیں نظر آرہے ہیں لیکن واپسی پر جب ہم بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر دیوار کی دوسری طرف ہوں گے تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو گا کہ یہ دیوار کے نیچے سے گزر رہے ہیں یا نہیں' تب یہ دونوں ہمارے لئے مصیبت بن سکتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم جھاڑیوں اور اونچی گھاس والی ڈھلان تیزی سے اتر کر کوٹھی کی دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک درخت کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنے اپنے کمانڈو چاقو نکال کر اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"تم سامنے دیوار کے نیچے والی جھاڑی میں جا کر چھپ جاؤ۔ تم اپنی طرف والے ڈوگرے کو ختم کرو گے۔ میں اس طرف والے کو ختم کروں گا۔ خبردار۔ وار گردن پر کرنا

ہو گا۔ پہلا وار ہی کاری ہونا چاہئے۔ اس کی ہلکی سی آواز بھی نہ نکلے۔"

میں نے اورنگ زیب کو کوئی جواب نہ دیا اور اندھیرے میں جھک کر دوڑتا ہوا سامنے دیوار کے قریب والی جھاڑیوں میں گھس کر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ رات خاموش تھی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں ایک وقت پر بجلی کی طرح دونوں فوجیوں پر اٹیک کرنا ہو گا۔ یہ بڑی مہارت کا کام تھا۔ بڑی تجربہ کاری کا کام تھا اور مجھے خاص طور پر اس وقت کے لئے کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی۔ اور اس وقت مجھے اپنے آپ پر بھوکے شیر کا گمان ہو رہا تھا جس نے اپنے شکار پر مکمل راز داری اور خاموشی کے ساتھ بے آواز جست لگا کر اس کی گردن کو اس طرح دبوچ لینا تھا کہ آواز تک پیدا نہ ہو۔ مجھے یقین تھا کہ کمانڈو اورنگ زیب پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری تھی اور وہ بھی اسی طرح محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑا اچھا تربیت یافتہ پورے ڈسپلن والا کشمیری کمانڈو تھا۔

سب سے پہلے مجھے اس طرف سے باتیں کرنے اور کسی کے آہستہ سے ہنسنے کی آواز آئی جس طرف دونوں ڈوگرے فوجی گئے تھے۔ وہ آگے جا کر دیوار کی گشت کا نصف دائرہ مکمل کرنے کے بعد واپس آرہے تھے۔ ادھر دیوار پر کچھ دور بلب روشن تھا۔ دونوں فوجی روشنی میں نظر آگئے۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے آہستہ آہستہ بڑی بے فکری سے چلے آرہے تھے۔ ان کے درمیان بمشکل آدھے گز کا فاصلہ تھا۔ دیوار والی روشنی سے نکل کر وہ آہستہ آہستہ میری جانب اندھیرے میں آتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف والے فوجی کو اپنی رینج میں لے لیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ کس وقت اور کس زاویئے پر مجھے اس پر اٹیک کرنا ہے۔ اسی طرح یقیناً کمانڈو اورنگ زیب نے بھی اپنے والی فوجی کو شست میں لے لیا تھا۔

یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ یہ وقت ایک تجربہ کار کمانڈو کی ساری تربیت اور سارے تجربے کے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ ذرا سی کمزوری ذرا سی بھول چوک اسے نہ صرف اپنے اہم مشن کی ناکامی بلکہ اسے موت سے ہمکنار کرا سکتی ہے۔ اس لمحے میری حالت یہ

تھی کہ مجھے سوائے اپنی طرف والے ڈوگرہ فوجی کی گردن کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔
یہ گردن مجھے اندھیرے میں بھی نظر آرہی تھی۔ گردن اندھیرے میں میرے قریب آتی
رہی تھی۔ جب وہ اس جھاڑی کے قریب آئی جہاں میں پنجوں کے بل بالکل تیار بیٹھا تھا۔
مجھے معلوم تھا کہ جس وقت میں حملہ آور ہوں گا اس وقت کمانڈو اورنگ زیب کا بڑا چا
دوسرے فوجی کی گردن میں اتر چکا ہو گا۔ دونوں فوجی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی
باتیں کرتے جب میری جھاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک قدم آگے نکلے تو میں
نے چیتے کی طرح اپنے والے فوجی پر چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگانا اور بڑے کمانڈو چاقو
پورا پھل ڈوگرے فوجی کی گردن میں اتارنا یہ دو عمل، دو فعل نہیں تھے۔ یہ ایک ہی عمل
اور ایک ہی فعل تھا۔ جب میں نے نیچے گرے ہوئے فوجی کی گردن سے چاقو کھینچ کر باہر
نکالا تو دیکھا کہ کمانڈو اورنگ زیب دوسرے فوجی کے اوپر بیٹھا اس کی جیکٹ سے اپ
چاقو پر لگے ہوئے خون کو صاف کر رہا تھا۔ اس نے اندھیرے میں مجھے اشارہ کیا۔ ہم نے
دونوں فوجیوں کی لاشوں کو ٹانگوں سے پکڑا اور انہیں گھسیٹتے ہوئے اوپر جھاڑیوں کے پیچھے
ڈال دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے جیب سے نائیلون کی رسی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی
وہ مجھے اشارہ دے کر دوڑ کر دیوار کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے دیوار کے ساتھ بیٹھنے
اشارہ کیا۔ سارا پروگرام سارا عمل، سارا ایکشن پہلے سے طے شدہ تھا۔ میں دیوار کے
ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب میرے کندھے پر چڑھ گیا۔ میں آہستہ سے اٹھ کھڑا
ہوا۔ کمانڈو اورنگ زیب دیوار کے اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس نے نائیلون کی رسی دیوار پر اس
طرح ڈال دی کہ وہ آدھی میری جانب اور آدھی دیوار کی دوسری جانب لٹکنے لگی۔ میں
نے اپنی طرف والی رسی کا سرا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کمانڈو اورنگ زیب رسی کو پکڑ کر دیوا
کی دوسری طرف اتر گیا۔ دوسری طرف جاتے ہی اس نے رسی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس
اس نے دوسری طرف سے رسی کو پکڑ رکھا تھا۔ میں رسی کی مدد سے دیوار کے اوپر آیا اور
دوسری طرف کود گیا۔ رسی کو ہم نے اسی طرح دیوار پر ہی رہنے دیا۔ ہم اندھیرے میں
دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔ کمانڈو چاقو ہمارے ہاتھوں میں ہی تھے۔ اس وقت

آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ ساری باتیں اشاروں میں ہی ہو رہی تھیں،
اورنگ زیب نے سامنے کچھ فاصلے پر کوٹھی کے ایک کمرے کے روشندان کی روشنی کی
طرف اشارہ کیا۔ یہ بریگیڈیئر شیاما پرشاد مکرجی کی بیٹی ارملا مکرجی کے بیڈ روم کے غسل
خانے کی روشنی تھی۔ ہم جھک کر جتنی تیز دوڑ سکتے تھے دوڑ کر اس روشنی کے نیچے آتے
ہی بیٹھ گئے۔

اورنگ زیب نے انگلی سے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ وہ ارملا کے باتھ روم کی کھڑکی
کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جس کے بارے میں کمانڈو رحیم نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ان
کی خاص نوکرانی رات کو جاتی دفعہ اس کھڑکی کی چٹخنی اندر سے کھول جائے گی۔ یہ بڑی
نازک اور سسپنس کی گھڑی تھی۔ خدانخواستہ اگر نوکرانی چٹخنی کھولنا بھول گئی ہو تو پھر ہمیں
اپنی ساری حکمت عملی کو بدل کر کسی دوسرے فوری منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ جو اس قسم
کے حالات میں ساز گار بھی ہو سکتا تھا اور انتہائی خطرناک نتائج کا حامل بھی ہو سکتا تھا۔ میں
نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ کھڑکی کے ایک پٹ پر ڈالا۔ کھڑکی کا پٹ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل
گیا۔ اس آواز پر اورنگ زیب نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ہم تین
سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اورنگ زیب نے اشارہ کیا۔ اور وہ کھڑکی میں
سے باتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی کھڑکی کے راستے باتھ روم میں
گھس گیا۔ یہ بڑا ماڈرن قسم کا غسل خانہ تھا۔ ہینگروں پر رنگین تولئے لٹکے ہوئے تھے۔
ایک شیشے کی الماری میں زنانہ لباس اور ساڑھیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ سنک کے اوپر بیضوی
آئینہ لگا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ سرسری نظر سے دیکھ لیا تھا۔ اس دوران کمانڈو اورنگ
زیب باتھ روم کے دروازے کے پاس جا کر اس کی گول ہتھی کو بڑے آرام سے گھما رہا
تھا۔ دروازہ بے آواز تھا۔ دروازے کا ایک ہی پٹ تھا۔ اورنگ زیب نے غسل خانے کی
بتی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے اس کا سوئچ آف کر دیا۔ باتھ روم میں اندھیرا
چھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے دروازہ تھوڑا سا کھولا تو بیڈ
روم کی روشنی کی لکیر اندر آنے لگی۔ تھوڑے سے کھلے دروازے میں سے اورنگ زیب

نے دوسری طرف ایک نگاہ ڈالی۔ پھر پیچھے ہٹ کر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے آگے ہو کر دروازے کی لمبی درز میں سے جھانک کر دیکھا۔

ایک بڑے قیمتی سازو سامان سے سجا ہوا بیڈ روم تھا۔ پلنگ پر ایک لڑکی اپنے سیاہ بالوں کو ریشمی تکیوں پر پیچھے کی طرف ڈالے گہری نیند سو رہی تھی۔ قریب ہی تپائی پر ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ دو چار کتابیں اور پلیٹ میں ایک شیشے کا خالی گلاس پڑا تھا۔ ہم نے بیڈ روم میں جا کر جو کچھ کرنا تھا وہ سب کچھ پہلے سے آپس میں طے کر رکھا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ذرا سا پیچھے کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سیدھے ہاتھ میں کلوروفارم کی شیشی اور رومال تھا۔ اس نے شیشی میں سے کلوروفارم کے دس بارہ قطرے رومال میں ڈال کر اسے بھگو کر اپنے ہاتھ کی مٹھی میں تھام کر شیشی جیب میں رکھی اور میرے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی میں کہا۔

"ایکشن صرف دس سیکنڈ کا ہے"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔ سب سے پہلے کمانڈو اورنگ زیب بیڈروم میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں اندر چلا آیا۔ دروازہ بے آواز تھا۔ میں نے پروگرام کے مطابق دروازے کو آدھے سے زیادہ کھول دیا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں اس طرح بریگیڈیئر شیاما پرشاد کی بیٹی ارملا مکرجی کے پلنگ کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے نیاگرا آبشار کے اوپر لوہے کا تار تنا ہوا ہو اور ہم اس کے اوپر چل رہے ہوں۔ ارملا کا جسم گردن تک زرد اور سبز دھاریوں والے ریشمی کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ کمرے کی فضا گرم تھی۔ لگتا تھا کہ بیڈ روم میں کافی دیر تک بجلی کا ہیٹر چلتا رہا ہے جو سونے سے پہلے اوف کر دیا گیا ہے۔ ہم اوپر سے ہو کر ارملا کے پلنگ کے سرہانے کی جانب آگئے سانولے رنگ کی بنگالی لڑکی ارملا بے فکر ہو کر سو رہی تھی۔

کمانڈو اورنگ زیب نے اپنا کلوروفارم والا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے آناً فاناً لڑکی کو گردن پر سے اس طرح دبوچ لیا کہ میرا ایک ہاتھ اس کی گردن پر اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔ ارملا ہڑبڑا کر جاگ پڑی تھی۔ اس نے ایک چیخ ضرور

ماری تھی جو اس کے حلق کے اندر رہی تھی۔ باہر نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے اس چیخ کی لرزش اور سنسناہٹ اپنے ہاتھوں میں محسوس کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب نے کلوروفارم کے رومال والا ہاتھ ارملا کے ناک پر رکھ کر دبایا۔ میں نے ارملا کے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کا دباؤ تھوڑا سا کم کر دیا۔ ارملا نے تڑپ کر دو تین گہرے سانس لئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی اور اس کے بعد اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی سے جیب میں سے سکاچ ٹیپ نکال کر ارملا کے منہ پر چسپاں کر دی۔ یہ سکاچ ٹیپ کافی چوڑی اور مضبوط تھی اور ارملا ہوش میں آنے کے بعد بھی منہ سے کوئی آواز نہیں نکال سکتی تھی۔ ہم نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اس کی کلائیاں ریشمی رومال سے اچھی طرح باندھ دیں۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب نے بے ہوش لڑکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور ہم تیز تیز قدم اٹھاتے باتھ روم میں آگئے۔ میں باتھ روم کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے بے ہوش ارملا کو کھڑکی سے باہر میرے حوالے کیا اور خود بھی کھڑکی میں سے باہر آگیا۔

ارملا بڑی نازک اندام دبلی پتلی سی بنگالی لڑکی تھی اس کا کوئی خاص وزن نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنے کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب جھک کر کوٹھی کی دیوار کی طرف دوڑ کر گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جتنی تیز چل سکتا تھا چلتا ہوا دیوار کے نیچے آگیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے خاص اشارہ کیا۔ میں نے بے ہوش لڑکی کو وہیں دیوار کے ساتھ گھاس پر ڈال دیا۔ دیوار پر لگی ہوئی رسی کا ایک سرا اورنگ زیب کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں اس کے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا۔ میں دیوار کے اوپر پہنچتے ہی لیٹ گیا اور اندھیرے میں چہرہ اٹھا کر دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جن فوجیوں کو وہاں سے گزرنا تھا اور جن کے گزرنے کا اندیشہ تھا ان کی لاشیں دور جھاڑیوں کے پاس پڑی تھیں۔ میں دیوار کی دوسری جانب اتر گیا۔ اس دوران اورنگ زیب نے رسی کو پکڑے رکھا۔ اب میں نے رسی کو مضبوطی سے اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اس طرح پکڑ لیا جس طرح رسہ کشی کے

مقابلے میں سب سے آخری والے کھلاڑی نے رسے کو اپنے جسم کے گرد لپیٹا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے رسی کا تناؤ کافی ہو گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب بے ہوش لڑکی کو کاندھے پر ڈالے رسی کی گانٹھوں کو پکڑ کر دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کا آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے رسی کے تناؤ سے لگا لیا تھا۔

یاد رکھیں۔ تربیت اور ٹریننگ بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر ایک پروفیشنل کمانڈو کو جو ٹریننگ اور تربیت دی جاتی ہے وہ اسے عام زندگی میں بھی ہر کام کو پورے سلیقے اور ڈھب سے کرنے کا انداز سکھا دیتی ہے اپنے کمانڈو آپریشن میں تو وہ اس ٹریننگ کی وجہ سے انتہائی مہارت سے کام لیتا ہے۔ عام آدمی جس کام میں اناڑی کی طرح ہاتھ ڈالتا ہے ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی نگاہ میں اس کام کا اہم ترین اور مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ اور اس کا پہلا ہاتھ اسی اہم ترین مرکز پر پڑتا ہے۔ ایک عام سی مثال ہے۔ ہم دو آدمی مل کر بھی کسی بے ہوش یا زخمی آدمی کو صحیح طریقے سے اٹھا کر سڑک سے گاڑی میں یا گاڑی سے نکال کر ہسپتال کے سٹریچر پر نہیں ڈال سکتے۔ ہم کبھی اسے گردن سے پکڑیں گے۔ کبھی بازوؤں سے پکڑیں گے اور کبھی ٹانگوں سے پکڑیں گے۔ لیکن ایک کمانڈو کسی ایک ایسے آدمی کا سب سے پہلے بازو پکڑے گا اور پھر ایک ہی معمولی سی حرکت کے ساتھ اسے اپنے کاندھے پر ڈال لے گا۔ میری طرح کمانڈو اورنگ زیب بھی ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ چنانچہ جب وہ بے ہوش لڑکی ارملا کو لے کر دیوار کے اوپر آیا تو سب سے پہلے ارملا کے دونوں بازو اور سر دیوار کے اوپر نمودار ہوا۔ اس کے بعد وہ خود دیوار پر چڑھا اور اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے رسی چھوڑ دی اور دیوار کے ساتھ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میری پشت دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اوپر سے بے ہوش لڑکی کو نیچے لٹکایا۔ لڑکی بالکل اسی طرح اوپر سے میرے سامنے آ گئی جیسے ہوا میں معلق ہو۔ میں نے اسے کمر سے پکڑا اور زمین پر لٹا دیا۔ میں دوبارہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب میرا منہ دیوار کی طرف تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب میرے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر نیچے کود گیا۔

آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ یہ سارا کام بمشکل پندرہ سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ اورنگ

زیب نے رسی دیوار کے اوپر سے کھینچ کر جیکٹ کی جیب میں ڈالی۔ بے ہوش لڑکی کا بازو پکڑ کر اپنی گردن کے گرد ڈالا اور پھر ایک ہلکے سے جھٹکے سے اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور ہم تیزی سے اوپر جھاڑیوں اور درختوں کی طرف دوڑ پڑے۔ تھوڑی سی چڑھائی تھی۔ آگے ہموار جگہ تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب آگے آگے تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم رات کے اندھیرے میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے جس قدر تیزی سے گزر سکتے تھے گزر رہے تھے۔ آگے ایک چھوٹی سی گھاٹی آ گئی۔ اورنگ زیب گھاٹی میں اتر گیا۔ اس گھاٹی میں بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے بے ہوش لڑکی کو ایک بڑے پتھر پر لٹا دیا۔ اندھیرے میں اس کی شکل کے نقش دھندلے نظر آ رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب کا سانس پھول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہم اوپر والے ٹیلے سے ہو کر دوسری طرف جائیں گے۔ ابھی ہمارا مشن مکمل نہیں ہوا۔ چلو"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"لڑکی کو میں اٹھاؤں گا"

اور میں نے اسی طرح لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اس کے بازو کو اپنی گردن میں ڈالا اور پھر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا۔ سامنے والی پہاڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک پتھریلی پگ ڈنڈی پہاڑی کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف جا رہی تھی۔ ہم اس پر چلتے گئے۔ لڑکی کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑی علاقے میں کہیں چڑھائی آ جاتی ہے اور کہیں اترائی آ جاتی ہے۔ آدمی نے وزن اٹھایا ہوا ہو تو پہاڑوں کی اترائی پر بھی وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہم چلتے گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب مجھ سے تین قدم آگے چل رہا تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف آ کر اس نے دو قدم دائیں جانب ہٹ کر نیچے دیکھا۔ بولا۔

"درختوں کے نیچے مجھے ویگن کی چھت نظر آ رہی ہے۔ کمانڈو رحیم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ڈگی کے موڑ پر موجود ہے۔ آ جاؤ۔"

ہم نیچے اترنے لگے۔ میں نے اپنا پہلو بدلنے کی خاطر بے ہوش لڑکی کو دوسرے

کندھے پر ڈال لیا تھا۔ نیچے اندھیرے میں ایک تھوڑا چوڑا راستہ تھا جس کے سامنے
والے کنارے پر درختوں کے نیچے ایک ویگن کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی تین آدمی ویگن
کے قریب سے تیزی سے نکل کر ہماری طرف آئے۔ صرف کمانڈو رحیم نے اپنے چہرے
سے نقاب ہٹایا ہوا تھا۔ باقی دونوں کمانڈوز کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں
اپنے چہرے نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوراً بے ہوش لڑکی کو مجھ سے لے لیا اور
کمانڈو اورنگ زیب سے دھیمی آواز میں کہا۔

"ویگن میں آجاؤ سر!"

تینوں کمانڈو بے ہوش لڑکی کو لے کر ویگن کے عقبی حصے سے اندر چلے گئے۔
اورنگ نے مجھ سے کہا۔

"کمانڈو رحیم خود گاڑی ڈرائیو کرے گا تم اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھو گے میں
لڑکی کے پاس ویگن کے اندر رہوں گا۔ گو"

میں تیزی سے ویگن کی طرف گیا اور اس کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور
کھڑکی بند کر لی۔ دوسرے لمحے کمانڈو رحیم دوڑ کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس
نے سیلف لگا کر انجن سٹارٹ کیا اور دوسرے لمحے گاڑی پہاڑی کچے راستے پر تیزی سے
نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ کمانڈو رحیم چونکہ اس
علاقے سے واقف تھا اس لئے وہ بے خوفی سے گاڑی بھگائے لئے جا رہا تھا۔ گاڑی کچے
راستے کے سنگریزوں کو گولیوں کی طرح ادھر ادھر اڑا رہی تھی۔ ہماری ایک جانب ٹیلے کی
جھاڑیاں رات کے اندھیرے میں اوپر تک چلی گئی تھیں اور دوسری جانب نشیب میں کوئی
گھاٹی تھی۔ گاڑی دو تین ٹیلوں کا چکر کاٹنے کے بعد ایک کھلی جگہ پر آکر رک گئی۔ کمانڈو
رحیم نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

"سر! یہاں اتریں گے"

میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آیا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھل گیا۔ کمانڈو اورنگ
زیب نے ایک اور نقاب پوش کمانڈو سے مل کر لڑکی کو باہر نکالا۔ اورنگ زیب نے لڑکی

اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ صرف میں نے کمانڈو رحیم اور
کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے اپنے سیاہ نقاب اٹھا رکھے تھے۔ باقی دونوں کمانڈو نے اپنے
چہرے نقاب میں چھپائے ہوئے تھے۔ یہ راز داری تھی جس سے کام لینا ضروری تھا۔
ہمیں ان کے چہرے دیکھنے کی حاجت بھی نہیں تھی۔ کمانڈو رحیم اس دوران دوڑ کر ایک
چٹان کی طرف گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو خچر تھے۔

اورنگ زیب نے لڑکی کو ایک خچر کے اوپر ڈالا اور خود بھی اس خچر پر بیٹھ گیا۔ اس
نے مجھے اشارہ کیا میں دوسرے خچر پر بیٹھ گیا۔ کمانڈو رحیم بولا۔

"سر! آپ ہائیڈ آؤٹ پر جائیں ہم گاڑی چھوڑ کر آتے ہیں۔"

ہم خچروں کو لے کر آگے چل پڑے۔ اب ہم کچے راستے سے ہٹ کر جا رہے تھے۔
میرا خچر کمانڈو اورنگ زیب کے خچر کے پیچھے تھا۔ پہاڑی راستہ اونچا نیچا غیر ہموار تھا۔ یہاں
کوئی پگ ڈنڈی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ ہم درختوں جھاڑیوں میں خود ہی راستہ بناتے چلے جا
رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کو معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اس وقت آسمان پر
چھائے ہوئے بادلوں میں تھوڑی سی بجلی چمکی۔ دور سے آتی بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سنائی
دی اور پھر میرا خچر جن درختوں کے نیچے چل رہا تھا ان درختوں کی شاخوں اور پتوں پر مجھے
بارش کی بوندیں گرنے کی آواز سنائی دی۔ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ خچر پر بیٹھنے سے
پہلے اورنگ زیب نے بے ہوش لڑکی کی کلائیوں کو پھر سے ریشمی رومال سے باندھ دیا تھا۔
یہ رومال اس نے لڑکی کے بیڈ روم سے نکلتے ہوئے اس کی کلائیوں پر باندھا تھا۔ صرف
دیوار سے اسے نیچے لاتے وقت اس نے رومال کھول دیا تھا اور جب ہم اسے دیوار سے
اتار چکے تھے تو لڑکی کی کلائیاں اسی رومال سے دوبارہ باندھ دی گئی تھیں۔ صرف اس
خیال کے پیش نظر کہ اگر لڑکی کو راستے میں ہوش آگیا تو وہ ہاتھ پاؤں چلائے گی اور ہمیں
اسے سنبھالنے میں مزید وقت لگ جائے گا اور وقت کا ایک سیکنڈ بھی ہم ضائع کرنے کی
پوزیشن میں نہیں تھے۔

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کمانڈو اورنگ زیب کن کن پہاڑی راستوں پر سے ہوتا ہوا

آخر ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ مجھے اندھیرے میں ایک اونچا سا گرجے کی طرز کا دروازہ دکھائی دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب دروازے کے اندر جانے کی بجائے اس کی دیوار کے ساتھ ہو گیا۔ میں خچر ذرا تیز چلا کر اس کے پہلو میں آگیا۔ اس وقت بوندا باندی برابر جاری تھی لڑکی کمانڈو اورنگ زیب کے آگے اس طرح اوندھی پڑی تھی کہ اس کے بازو اور سر خچر کی ایک جانب اور دونوں ٹانگیں دوسری جانب لٹک رہی تھیں۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

"کلوروفارم کی ڈوز شاید زیادہ دے دی گئی ہے۔ ابھی تک یہ ہوش میں نہیں آئی۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ دروازہ کس جگہ کا تھا؟"

اورنگ زیب نے کہا۔

"یہ گوروں کا پرانا قبرستان ہے۔ ہم قبرستان کی دیوار کے ساتھ چل رہے ہیں۔"

قبرستان کے پیچھے آکر ہم دیوار سے ہٹ کر سامنے کی جانب آگئے جہاں اندھیرے میں بڑے بڑے پتھر نظر آئے۔ ان پتھروں کے درمیان سے گزرنے کے بعد اورنگ زیب کا خچر ایک طرف کو مڑ گیا۔ سامنے ایک ٹبہ سا بنا ہوا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ مٹی اور پتھروں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگ رہا تھا۔ ہم خچروں سے اتر رہے تھے کہ ٹبے کے پیچھے سے کمانڈو رحیم نکل کر ہماری طرف آیا اور بولا۔

"سر آجائیں"

مٹی اور پتھروں کے ٹبے کے اندر ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کمانڈو رحیم نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اندر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پرانی چارپائی پر بستر بچھا تھا۔ ایک پرانا لحاف بھی تھا۔ اورنگ زیب نے لڑکی کو چارپائی پر لٹا کر لحاف اوپر ڈال دیا۔ ہم نے جھک کر لڑکی کو دیکھا۔ اس کا سانس چل رہا تھا مگر وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اس نے لڑکی کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی ٹیپ کھینچ کر اتار دی۔ لڑکی کے ہونٹ لیمپ کی روشنی میں سفید سفید سے نظر آئے۔ اورنگ زیب نے کمانڈو رحیم سے پوچھا۔

"تہہ خانے میں کوئی اچھا سا بستر بچھانا تھا اور وہاں لحاف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

رحیم بولا۔

"میں نے نیا بستر لگایا ہے اور دو کمبل رکھ دیئے ہیں۔ اسے نیچے لے آئیں"

کوٹھڑی کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے آگے چارپائی کھڑی کر کے رکھی ہوئی تھی۔ رحیم نے دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ رحیم پہلے نیچے اتر گیا۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب اوپر کھڑے اندھیرے میں زینے کو دیکھ رہے تھے۔ زینے میں ہلکی سی روشنی ہوئی۔ رحیم نے تہہ خانے میں دیا جلا دیا تھا۔ اس نے نیچے سے آواز دی۔

"سر! اسے لے آئیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر بے ہوش لڑکی کو کندھے پر اٹھا لیا۔ اور کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے زینہ اتر کر نیچے آیا تو دیکھا کہ نیچے جو تہہ خانہ تھا وہ اوپر والی کوٹھڑی سے

دوگنا بڑا اور کشادہ تھا۔ اس کی چھت بھی اونچی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اصل مقصد اس تہہ خانے کی تعمیر تھی۔ اوپر والی کوٹھڑی محض دکھاوے کے لئے بنائی گئی ہے۔ تہہ خانے میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کچھ رائفلیں نظر آئیں۔ ایک بڑا سا پلنگ تھا جس پر صاف بستر بچھا تھا اور دو کمبل پڑے تھے۔ میں نے لڑکی کو پلنگ پر لٹا دیا۔ کمانڈو رحیم نے جلدی سے دونوں کمبل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے اور لڑکی کے اوپر ڈال دیئے۔

میں نے کمانڈو رحیم سے کہا۔

"کلوروفام کچھ زیادہ ہی سنگھا دیا گیا ہے"

وہ بولا۔

"کچھ لڑکی کا جسم بھی کمزور ہے۔ کوئی بات نہیں ابھی ہوش آجائے گا۔"

وہاں دو تین مونڈھے پڑے تھے۔ ہم مونڈھے کھینچ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا۔"

میں نے کہا۔

"مجھے نہیں امید کہ ابھی تک وہاں کسی کو لڑکی کی گمشدگی کا علم ہوا ہو"

"علم ہو بھی گیا ہو گا تو اب ہمیں ان کی فکر نہیں۔ ہم ان کی پہنچ سے نکل آ ہیں۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے رحیم سے پوچھا۔

"تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ یہاں ہمارے جانے کے بعد کیا تم اکیلے پہرہ د گے؟"

کمانڈو رحیم نے کہا۔

"ان دونوں کی اتنی ہی ڈیوٹی تھی سر۔ وہ چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ یہاں صبح ہما ایک بوڑھا ساتھی اپنی بیوی کے ساتھ آئے گا۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلا جائے گا

عورت بڑی ہوشیار اور سمجھدار ہے۔ وہ لڑکی کے پاس تہہ خانے میں رہے گی۔ میں اوپر پہرہ دوں گا۔ ویسے بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہ ویران جگہ ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا۔ کوئی آیا بھی تو شک پڑنے پر یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔ یہاں قبرستان میں بہت سی پرانی قبروں کے گڑھے ہیں ہم اسے وہاں دبا کر اوپر قبر بنا دیں گے"

کمانڈو رحیم ہنسنے لگا۔ اورنگ زیب بڑے سنجیدہ چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو رحیم کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ہم نے اپنی سٹین گنیں ایک طرف رکھ دیں۔ پستول اپنی اپنی بیلٹوں کے ساتھ لگے رہنے دیئے۔ چاروں ہینڈ گرنیڈ نکال کر کمانڈو رحیم کو دیئے۔ کلوروفام کی شیشی بھی اورنگ زیب نے نائلون کی رسی کے ساتھ اس کے حوالے کر دی۔ ہم نے اپنی جیکٹوں کے زپ آگے سے کھول دیئے تھے۔ اور نقاب والی ٹوپیاں سر سے نیچے کر رکھی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ابھی رات کا ایک بھی نہیں بجا"

کمانڈو اورنگ زیب ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہمارا یہ کمانڈو آپریشن اپنے مقررہ وقت کے اندر ختم ہوا ہے۔"

بے ہوش لڑکی کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ ہم جلدی سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسے ابھی پوری طرح ہوش نہیں آیا تھا۔ اس پر کلوروفام کے بعد کی نقاہت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہم لڑکی کو تہہ خانے میں چھوڑ کر اوپر والی کوٹھڑی میں آگئے۔ کمانڈو رحیم کہنے لگا۔

"سر! آپ آرام کریں میں باہر پہرہ دوں گا۔ وہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سٹین گن اس کے پاس ہی تھی۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔"

"کل کا کیا پروگرام ہو گا؟"

وہ بولا۔

"ہمیں کچھ دیر کے لئے اسی جگہ روپوش ہو کر رہنا ہو گا۔ یہ محفوظ جگہ ہے۔ لیکن

کل کسی وقت میں بریگیڈیئر کو گھر پر فون کرنے کے لئے یہاں سے نکلوں گا۔ ہمیں فون پر اس کو بتانا ہوگا کہ اس کی بیٹی ارملا ہمارے پاس ہے اور اس کی عزت وناموس کے ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر اس سے ارملا کے بدلے حاجی صاحب کی بیٹی پروین کی رہائی کے بارے میں سودا کرنا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے وہ ضرور مان جائے گا۔"

"اسے ماننا ہی پڑے گا۔ بات ہی ایسی ہے"

"کیا پروین کو ہم یہاں وصول کر کے خود سری نگر لے جائیں گے؟"

میرے پوچھنے پر اورنگ زیب نے کہا۔

"ہم یہ غلطی کبھی نہیں کریں گے۔ پروین کو بریگیڈیئر مکرجی خود اپنی حفاظت میں سری نگر پہنچائے گا۔ جب ہمیں اطلاع مل جائے گی کہ پروین اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی ہے تب ہم بریگیڈیئر مکرجی کی بیٹی کو اس کے حوالے کریں گے۔ ہم اس ترپ کے پتے کو یونہی ضائع نہیں کر سکتے۔"

اس موضوع پر کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہم وہیں ادھر ادھر پڑ کر سو گئے۔ اس وقت باہر دن نکل آیا تھا جب کمانڈو رحیم نے ہمیں آکر جگایا اور کہا۔

"سر! ہمارا بوڑھا کشمیری ساتھی اپنی بیوی کو لے کر آگیا ہے۔"

وہ دونوں کوٹھڑی میں ایک طرف بیٹھے تھے۔ دونوں کی عمریں بڑھاپے کی سرحد کو چھو رہی تھیں۔ عورت بھاری بدن کی صحت مند کشمیرن تھی۔ اس نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ اس کا نام صغراں تھا۔ ہم نے صغراں کے خاوند کو وہیں سے واپس بھیج دیا۔ صغراں مونڈھے پر چادر اوڑھے بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ میں نے رحیم سے پوچھا۔

"نیچے ارملا کو ہوش آگیا ہے کیا"؟

وہ بولا۔

"سر! دو گھنٹے پہلے میں نیچے جا کر دیکھ آیا تھا۔ وہ سو رہی تھی۔"

اورنگ زیب بولا۔

"تم اس کے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ ہم نیچے جا کر اسے دیکھتے ہیں۔"

میں اور کمانڈو اورنگ زیب تہہ خانے میں آگئے۔ تہہ خانے میں دیا روشن تھا۔ ارملا ہوش میں آچکی تھی اور پلنگ پر بیٹھی پھٹی پھٹی نظروں سے فضا میں تک رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی اور بولی۔

"تم لوگ مجھے کہاں لائے ہو۔ تم ضرور کشمیری اگروادی ہو۔ بھگوان کے لئے مجھے قتل نہ کرنا"

وہ روئے جا رہی تھی۔ ہم مونڈھے کھینچ کر اس کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"مس ارملا! ہم کشمیری دہشت گرد نہیں ہیں ہم کشمیری مجاہد ہیں۔ تمہیں ہم تمہارے بیڈ روم سے اس لئے اغوا کر کے لے آئے ہیں کہ تمہارے پتا جی نے ہمارے ایک شریف آدمی کی بیٹی کو اغوا کیا ہوا ہے۔ ہم تمہارے فادر کو فون کرنے والے ہیں۔ ہم تمہارے بدلے اپنے بزرگ مجاہد کی معصوم بیٹی پروین کو واپس لینا چاہتے ہیں۔"

ارملا کا اردو بولنے کا لہجہ بنگالی تھا۔ وہ بولی۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو پلیز۔ میرے پرسوں امتحان شروع ہونے والے ہیں پلیز!"

وہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"تمہارے رونے کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جس طرح تم کسی باپ کی بیٹی ہو اسی طرح پروین بھی کسی باپ کی بیٹی ہے۔ تمہارے پتا جی نے پروین کو اپنے فوجیوں کی مدد سے اغوا کر کے فوجی چھاؤنی میں قید کر رکھا ہے۔ وہ کالج میں پروفیسر ہے۔ کیا پروین کے باپ کو بیٹی کے اغوا کا دکھ نہیں ہوگا؟"

ارملا نے ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے چھوڑ دو۔ میں پتا جی سے کہہ کر پروین کو رہا کرادوں گی۔ میں تم سے پرامس کرتی ہوں۔ پتا جی میری بات ضرور مان جائیں گے"

کمانڈو اورنگ زیب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"مائی ڈیئر لیڈی! ایک بات کو یاد رکھو جب تک ہمارے مجاہد کی بیٹی پروین ہمیں واپس نہیں ملے گی ہم تمہیں تمہارے باپ کے حوالے نہیں کریں گے۔"

ارملا پڑھی لکھی سمجھدار بنگالی لڑکی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"اور اگر پتاجی نہ مانے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"یہ ہم اس وقت سوچیں گے۔ ابھی تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ یہ سامنے غسل خانہ ہے تمہاری مدد کے لئے ایک عورت تمہارے پاس آرہی ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گی۔ تمہیں دوسرے کپڑے بھی مل جائیں گے۔ اس بات کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں تمہاری عزت آبرو اسی طرح محفوظ رہے گی جس طرح تمہارے اپنے گھر میں محفوظ تھی۔ ہم مسلمان کشمیری مجاہد ہیں۔ اسلام ہمیں عورتوں سے چاہے وہ کافر عورتیں ہوں عزت واحترام کے ساتھ پیش آنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں سے کبھی فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ تم قیامت تک باہر نہیں نکل سکو گی۔ ہمارے کمانڈو چاروں طرف پہرہ دے رہے ہیں۔" ہم اٹھ کر اوپر آگئے۔ اورنگ زیب نے صغراں سے کہا۔

"بی بی! کمانڈو رحیم نے اس لڑکی کے بارے میں تمہیں ساری بات سمجھا دی ہوگی۔"

صغراں بولی۔

"ہاں بیٹا۔ مجھے سب معلوم ہوگیا ہے تم فکر نہ کرو۔ میں لڑکی کی پوری حفاظت کروں گی۔ یہ دیکھو۔"

اس نے اپنے لمبے فرن کی جیب میں سے ایک چھوٹا پستول نکال کر دکھایا۔

"یہ بھرا ہوا پستول میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اس پستول کے ہوتے ہوئے لڑکی فرار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

میں نے کہا۔

"لڑکی بنگالن ہے اور کمزور جسم کی بزدل ہے۔ وہ ایسی کوشش نہیں کرے گی۔ بہرحال تمہیں ہر طرح سے چوکس رہنا ہوگا۔ تہہ خانے کا دروازہ ہروقت بند رکھنا ہوگا۔ وہ کہے بھی تو اسے اوپر ہرگز نہیں آنے دینا۔ رحیم اور ہمارے ساتھی اوپر پہرے پر موجود رہیں گے۔"

صغراں نیچے تہہ خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد رحیم ناشتہ لے آیا۔ چائے تھی۔ ساتھ بند تھے۔ ہم نے نیچے ارملا کے لئے بھی ناشتہ بھجوا دیا۔ اور خود بھی کوٹھڑی میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ چائے کی ایک ایک پیالی پینے کے بعد ہم کوٹھڑی سے باہر کھلی فضا میں آگئے۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ زمین اور بڑے بڑے پتھر گیلے تھے۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا۔ معمولی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہم ٹیلے کی ایک طرف ہو کر درخت کے نیچے بیٹھ کر سگریٹ پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ہمارا اگلا آپریشن نہایت اہم تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اب تک بریگیڈیئر کو اپنی بیٹی کے اغوا کا پتہ چل چکا ہوگا اور شملے کی فوجی چھاؤنی اور گیریزن میں فوج الرٹ ہوگئی ہوگی۔

"تمہارا کیا خیال ہے بریگیڈیئر نے اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ ملٹری پولیس کو دے دی ہوگی"

اورنگ زیب نے کہا۔

"معاملہ بہت سنگین ہے۔ اس نے شملے میں تعینات پوری فوج کو الرٹ کر دیا ہوگا۔ ملٹری پولیس نے جہاں تک میرا خیال ہے شملے کی پوری ناکہ بندی کرلی ہوگی۔"

ہمیں دور گوروں کے قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ ہم جلدی سے کوٹھڑی میں چلے آئے۔ کمانڈو رحیم کوٹھڑی کے دروازے کی اندر کی جانب موجود تھا۔ اس نے ہمیں آتا دیکھ لیا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے اسے کہا۔

"ایک آدمی ادھر آرہا ہے۔ معلوم کرو"

کمانڈو رحیم جلدی سے سٹین گن لے کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسی آدمی کو ساتھ لے کر اندر آگیا۔ کہنے لگا۔

"سر! یہ اپنا آدمی ہے۔ شہر کی خبر لایا ہے۔"

اس آدمی نے بتایا کہ شہر میں سب کو معلوم ہوگیا ہے کہ کشمیری مجاہدوں نے بریگیڈیئر مکرجی کی بیٹی کو اغوا کرلیا ہے اور وہ اس کے بدلے اپنے مجاہد کی بیٹی کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ شملے کے مسلمان بڑے خوش ہیں۔ ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی سفید کپڑوں میں سارے شہر اور اردگرد کے دیہات میں پھیل گئے ہیں۔ پولیس اور فوج نے شملے سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرلی ہے۔ سولن سے ایک بٹالین فوج بھی شملے میں آگئی ہے۔

"لوگ کہتے ہیں کہ انبالے سے انڈین کمانڈو فورس بھی شملے کے لئے چل پڑی ہے۔"

ہم اس صورت حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اس آدمی سے پوچھا۔

"اس علاقے کی طرف تم نے کسی مشکوک آدمی کو تو چلتے پھرتے نہیں دیکھا؟"

وہ بولا۔

"سر! ہمارے آدمی اس علاقے میں موجود ہیں۔ اگر ایسی بات ہوئی تو ہم آپ کو فوراً خبر کردیں گے۔"

وہ آدمی چلا گیا۔ کمانڈو رحیم کہنے لگا۔

"ہمارے دو آدمی قبرستان کے گیٹ کے پاس چھپ کر پہرے پر موجود ہیں۔ وہ کسی مشکوک آدمی کو اس طرف نہیں آنے دیں گے۔ اول تو فوج کا کوئی سپاہی اس طرف نہیں آئے گا اگر کوئی آبھی گیا تو ہمارے آدمی انہیں وہیں ختم کردیں گے۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے رحیم سے کہا۔

"تم فوراً شہر میں جا کر شمس خواجہ سے کسی طرح ملو۔ اسے کہو کہ ہم بریگیڈیئر مکرجی

سے فون پر رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو ہمیں بریگیڈیئر کے گھر کا فون نمبر لادے۔ دوسرے ہمیں یہ بتائے کہ کس جگہ سے اسے فون کرنا مناسب رہے گا۔ جاؤ۔"

کمانڈو رحیم نے سٹین گن اتار کر دیوار سے لٹکائی۔ کمبل کی بکل ماری اور کوٹھڑی سے نکل گیا۔ میں نے اورنگ زیب سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ بریگیڈیئر اگر گھر پر نہ مل سکا اور ہم نے گھر والوں سے کہا کہ بریگیڈیئر سے کہو کہ فوراً گھر پہنچے ہم اس کی بیٹی کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتے ہیں تو اسی دوران ملٹری انٹیلی جینس ایسا انتظام ضرور کرلے گی کہ بریگیڈیئر سے فون پر بات کرنے کے دوران وہ معلوم کرلیں گے کہ یہ فون کہاں سے کیا جارہا ہے۔ بریگیڈیئر جان بوجھ کر فون پر گفتگو کو طول دے گا تاکہ ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی جہاں سے ہم فون کر رہے ہیں وہاں پہنچ کر ہمیں پکڑ لے تو کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"یہ بات میرے ذہن میں ہے۔ لیکن ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ ہم وائرلیس پر اس سے بات نہیں کرسکتے۔ مجبوراً ہمیں ٹیلی فون کا ہی سہارا لینا ہوگا۔ یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ مگر ہم مختصر بات کریں گے اور ہر بار کسی نئی جگہ سے ٹیلی فون کریں گے۔ شملہ ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں اتنی جلدی ٹیلی فون سپاٹ چیک نہیں کیا جاسکے گا۔"

اتنے میں صغراں تہہ خانے سے اوپر آئی اور کہنے لگی۔

"میں نے لڑکی کو کھلا پلا دیا ہے۔ وہ بے چاری تو بے حد ڈری ہوئی ہے۔ بس روئے جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس کے رونے پر ترس مت کھانا۔ بس جس طرح بھی ہوسکے دو تین دن تک تہہ خانے میں ہی رکھنا اور زندہ رکھنا۔"

صغراں چارپائی پر سے ایک چادر اٹھا کر زینے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے وہ نہ یہاں سے باہر قدم نکال سکتی ہے نہ مرسکتی ہے۔"

ہمارے لئے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ قدرتی طور پر ہم اس لئے بے چین تھے کہ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے ارملا کے باپ بریگیڈیئر مکرجی سے رابطہ پیدا کرنا تھا تاکہ بات آگے بڑھ سکے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد کمانڈو رحیم واپس آیا۔ وہ شملے میں اپنے ماسٹر سپائی شمس خواجہ سے مذاکرات کر کے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"شمس خواجہ نے مجھے بریگیڈیئر کے گھر کا ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں شملے کے بڑے پوسٹ آفس سے پہلا فون کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ضروری ہوا تو ہمیں بڑے گرجا گھر کے پاس جو پبلک ٹیلی فون بوتھ ہے وہاں سے فون کرنا ہو گا۔ اس نے تاکید کی ہے کہ ہمیں اسی طرح جگہ بدل بدل کر فون کرنا چاہئے۔ مگر اس نے ایک بات کی سختی سے ہدایت کی ہے کہ بریگیڈیئر سے کسی صورت بھی بات لمبی نہیں کرنی ہو گی اور معاملہ ایک دو ٹیلی فون کال میں طے کر لینا ہو گا۔"

کمانڈو رحیم نے صدری کی جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر دیا۔ اس پر بریگیڈیئر کے گھر کا ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے کاغذ کو سنبھال کر رکھ لیا اور کمانڈو رحیم سے کہا۔

"ہم جنرل پوسٹ آفس بریگیڈیئر کے گھر فون کرنے جاتے ہیں۔ تم یہاں کا خیال رکھنا۔"

ہم نے کمانڈو والی جرسیاں جو صبح پہن لی تھیں اتار دیں۔ سیاہ جوگر شوز کی جگہ عام جوتے پہن لئے۔ جیکٹس بھی اتار دیں۔ ان کی جگہ ایک ایک پرانی گرم چادر کی بکل ماری۔ اتنا ضرور کیا تھا کہ ہم نے ایک ایک سائی لینسر والا آٹو میٹک پستول اپنی پتلون کی جیب میں چھپا کر ضرور رکھ لیا تھا۔ میں نے سر پر مفلر لپیٹ لیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اون کی بنی ہوئی ٹوپی پہن لی۔ اس طرح ہم تہہ خانے والی کوٹھڑی سے نکل کر اس کے پیچھے سے چکر کاٹ کر قبرستان کے سامنے والی سڑک پر نکل آئے۔

بوندا باندی رک گئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہم بڑے سکون کے ساتھ آپس میں شملے میں بولی جانے والی ڈوگری ہندی میں باتیں کرتے یوں چلے جا رہے تھے جیسے

بارش رکنے کے بعد شہر کے بازار میں کچھ خرید و فروخت کرنے جا رہے ہوں۔ قبرستان سے ہم ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر چھوٹی سی پختہ سڑک پر آ گئے جو شملے کے چھوٹے سے ریلوے سٹیشن کے عقب سے ہوتی ہوئی مال روڈ کے چوک کی طرف نکل جاتی تھی۔ ہم ویسے خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ کوئی شخص ہمارے سامنے سے آ رہا ہوتا یا پیچھے سے آگے گزر جاتا تو ہم ڈوگرہ ہندی میں باتیں کرنے لگتے۔ ہمیں دیکھ کر کسی کو خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ہم دو انتہائی خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈو ہیں اور بریگیڈیئر کی بیٹی کو ہم نے ہی اغوا کیا ہے۔ شملے کی مال روڈ کے چوک میں ایک طرف بڑے ڈاک خانے کی انگریزی طرز کی شاندار عمارت تھی۔ مال پر کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ ہم ایک مندر کے قریب سے گزرے جس کی دیوار پر کتنے ہی بندر بیٹھے مزے سے کچھ کھا رہے تھے۔ شملے میں بندر بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ہندو لوگ ان بندروں کو مقدس جانور سمجھتے ہیں اور ان کو مٹھائیاں اور پھل کھلاتے ہیں۔ اس کی تاریخی وجہ یہ ہے کہ جب رام اور لکشمن سیتا کے ساتھ بن باس میں تھے تو لنکا کا راجہ راون، رام چندر راجہ کی بیوی سیتا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ رام چندر نے اپنی بیوی کو چھڑانے کے لئے لنکا پر چڑھائی کی تو ہنومان نام کے ایک شخص نے اپنے پورے قبیلے کی فوج کے ساتھ راجہ رام چندر کی مدد کی تھی۔ کہتے ہیں ہنومان کا تعلق جس قبیلے سے تھا اس کے لوگوں کی شکلیں بندروں سے ملتی جلتی تھیں۔ اس وجہ سے ہندو لوگ بندروں کی عزت کرتے ہیں۔ اور انہیں کبھی کچھ نہیں کہتے۔ شملے کے آس پاس کے علاقے میں بندر گھروں میں بڑی آزادی سے داخل ہوتے ہیں اور جو چیز چاہے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔

بہرحال ہم بڑے ڈاک خانے میں پہنچ گئے۔

ڈاک خانے کے اندر چار پانچ شیشے کے بند ٹیلی فون بوتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک ٹیلی فون بوتھ خالی تھا۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب بوتھ میں داخل ہو گئے۔ ہم نے شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔ اورنگ زیب نے جیب سے وہ کاغذ نکال کر سامنے رکھ لیا جس پر بریگیڈیئر مکرجی کے گھر کا ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے نمبر ڈائل کر دیا میں اسی کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے کہا۔

"ہیلو! میں بریگیڈیئر مکرجی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اورنگ زیب نے پوچھا۔

"اگر آپ ہی بریگیڈیئر مکرجی بول رہے ہیں تو میں آپ کو ایک ضروری پیغام دینا چاہتا ہوں۔ غور سے سنئے۔ آپ کی بیٹی ارملا مکرجی ہماری تحویل میں ہے۔ اس کی عزت آبرو محفوظ ہے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ سری نگر کے کمانڈنگ آفیسر کرنل بھگت رام نے بزرگ کشمیری مجاہد حاجی ثناء اللہ کی بیٹی پروین کو اغوا کر کے شملے کے فوجی گیریزن میں پہنچا دیا ہوا ہے۔ نہیں نہیں نہیں۔ خاموش رہیں۔ صرف میری بات سنیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی بیٹی کو زندہ حالت میں واپس لینا چاہتے ہیں تو پروین کو ہمارے حوالے کر دیں۔ اس سلسلے میں جگہ اور وقت کا تعین بعد میں کر لیا جائے گا۔ لیکن ایک بات کو غور سے سن لیں۔ اس معاملے میں دونوں طرف سے انتہائی رازداری سے کام لیا جائے گا۔ اگر آپ نے ملٹری پولیس یا ملٹری کمانڈو فورس یا شملہ پولیس کی مدد لینے کی کوشش کی تو ہمارا آدمی تو ضرور پکڑا جائے گا لیکن پھر آپ کی بیٹی ارملا بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اس کا کٹا ہوا سر آپ کے گھر بڑی جلدی پہنچا دیا جائے گا۔ میرے دوسری فون کال کا انتظار کریں۔"

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے فون بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔

"یہاں سے نکل چلو"

ہم ٹیلی فون بوتھ میں سے بظاہر بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے باہر نکلے۔ اس طرح باتیں کرتے پوسٹ آفس کی لابی میں موجود لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے جنرل پوسٹ آفس کی عمارت سے نکل کر سیڑھیاں اترتے مال روڈ کے چوک میں آ گئے اور پھر بائیں جانب والی چھوٹی سڑک پر ہو گئے۔ چھوٹی سڑک پر آتے ہی ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہاں سے ایک پگ ڈنڈی نیچے پہاڑی ڈھلان پر اترتی تھی۔ ہم اس پگ ڈنڈی پر اتر گئے۔

واپس اپنی قبرستان کے پچھواڑے والی کوٹھڑی میں آ کر اورنگ زیب نے کمانڈو رحیم کو ٹیلی فون پر بریگیڈیئر مکرجی سے کی گئی گفتگو کے بارے میں بتایا اور کہا۔

"بریگیڈیئر کے گھر میں ہماری رازدار نوکرانی کو فوری طور پر پیغام پہنچا دو کہ وہ گھر میں آنے جانے والے لوگوں اور فوجی افسروں سے ٹیلی فون پر کی جانے والی بات چیت غور سے سنتی رہے۔ ہمیں ہر رات کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ بریگیڈیئر مکرجی اپنی بیٹی کو واپس لانے کے سلسلے میں کیا حکمت عملی اختیار کر رہا ہے۔"

کمانڈو رحیم نے کہا۔

"یہ کام ہو جائے گا۔"

ہم نے سارا دن ٹبے والی کوٹھڑی میں گزار دیا۔ اس دوران ارملا کو جا کر بتا دیا کہ اس کے پتاجی سے بات ہو گئی ہے۔ جس وقت پروین سری نگر پہنچا دی جائے گی اسے اس کے باپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

جب رات کا پہلا پہر شروع ہوا تو میں اور کمانڈو اورنگ زیب بریگیڈیئر مکرجی کو دوبارہ فون کرنے قبرستان کے ویران علاقے سے نکل کر شملے کے بڑے گرجا کے عقب میں جو پبلک ٹیلی فون بوتھ بنا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مکرجی کو فون کیا تو وہ گھر پر ہی تھا۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو شروع ہو گئی۔ کوئی ایک منٹ تک بات ہوتی رہی بات ہو رہی تھی کہ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"مسٹر مکرجی! میں آپ کو کل شام تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر کل شام تک آپ نے حاجی ثناء اللہ صاحب کی بیٹی پروین کو اپنے خاص حفاظتی سکواڈ کے ساتھ سری نگر روانہ نہ کیا تو اس کا جو افسوسناک نتیجہ نکلے گا وہ شاید آپ سے برداشت نہ ہو۔"

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے فون بند کر دیا۔ کہنے لگا۔

"بریگیڈیئر اپنی مجبوریاں بیان کر رہا تھا کہ پروین اس کی کسٹڈی میں نہیں ہے اسے نکالنا اس کے اختیار میں نہیں ہے راستے میں کئی مشکلات حائل ہیں۔ آپ میری بیٹی کو چھوڑ دیں۔ آپ جتنی رقم کہتے ہیں میں آپ کو دے دوں گا۔ اور کسی سے ذکر بھی نہیں

کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"یہ بات میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے کہ ایک ذمہ دار بریگیڈیئر رینک کا افسر دوسری رجمنٹ کے ہاؤس ارسٹ میں رکھی گئی لڑکی کو کیسے نکال کر سری نگر پہنچائے گا۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ ہماری درد سر نہیں ہے۔ یہ اس کی درد سر ہے۔ وہ ایک غیر شادی شدہ نوجوان بیٹی کا باپ ہے جو اغوا کی جا چکی ہے۔ اس کی زندگی اور عزت آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کے اوپر لٹک رہی ہے۔ میں نے اسے کل شام تک کا الٹی میٹم دے دیا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ آؤٹ آف دی وے جا کر بھی اپنی بیٹی کی زندگی اور آبرو بچائے گا۔"

ہم جلدی جلدی ایک ٹیلے کی اترائی اتر رہے تھے۔ رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھی ذہنی کش مکش کی حالت میں گزر گیا۔ ہم قبرستان والی کوٹھڑی میں ہی چھپے بیٹھے رہے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور شام کے سائے پھیلنے لگے تو میں اور کمانڈو اورنگ زیب ایک بار پھر بریگیڈیئر کو فون کرنے کے لئے کوٹھڑی سے نکل پڑے۔

اس دفعہ ہم نے شملے کے ایک دوسرے علاقے میں جا کر پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کیا۔ بریگیڈیئر گھر پر موجود تھا۔ میں بوتھ کے باہر کھڑا ہو گیا۔ اورنگ زیب بوتھ میں جا کر فون کرنے لگا۔ وہ ایک منٹ سے زیادہ فون پر بات نہیں کرتا تھا۔ اس بار وہ آدھے منٹ کے اندر اندر فون بند کر کے باہر آگیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے کہنے لگا۔

"بریگیڈیئر پروین کو ہمارے حوالے کرنے پر تیار ہے۔"

میں نے اورنگ زیب کا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے ہمارا مشن ناکام نہیں ہوا"

ہم رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں پہاڑی ٹیلے کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ

اب ہمیں کل کا دن یعنی دوسرا اور تیسرا دن تجسس اور تذبذب کی حالت میں گزارنا تھا۔ ہم نے ارملا مکرجی کو کچھ نہ بتایا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ دوسری رات بھی گزر گئی۔ تیسرے دن صبح کے وقت ہم نے کمانڈو شیروان سے اپنے خفیہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ پیدا کیا تو اس نے انتہائی مسرت کے ساتھ ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ حاجی ثناء اللہ ڈار کی بیٹی پروین آج صبح ٹھیک چھ بج کر دس منٹ پر اپنے گھر خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ کمانڈو شیروان نے مزید بتایا کہ اسے دو عورتیں ٹیکسی میں گھر چھوڑ گئی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب ٹرانسمیٹر پر شیروان سے بات کر رہا تھا۔ اس سے میں نے بھی بات کی۔ اس نے مجھے بھی مشن کی کامیابی پر مبارک باد دی اور کہا۔

"بریگیڈیئر کی بیٹی کو انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اس کے گھر کے قریب چھوڑ دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملٹری انٹیلی جینس نے تم لوگوں کی گرفتاری کے لئے جال بچھا رکھا ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہم محتاط رہیں گے۔"

"اور تم واپس میرے پاس آجانا۔ ایک اور مشن کے سلسلے میں تم سے گفتگو کرنی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں پہنچ جاؤں گا سر!"

ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سگنل بند ہو گئے۔ میں نے کمانڈو شیروان کی ہدایت کمانڈو اورنگ زیب کو بھی بتا دی وہ کہنے لگا۔

"ہم ارملا کو اپنی خفیہ کمیں گاہ کے آس پاس نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سے ہماری کمیں گاہ کا سراغ لگ سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟"

اورنگ زیب بولا۔

"ہم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر رات کے وقت کوٹھڑی سے نکالیں گے اور شملہ سولن روڈ پر جا کر چھوڑ آئیں گے۔ وہاں سے شملے کا پہاڑی ریلوے سٹیشن قریب ہی ہے۔ ارملا وہاں سے گھر فون کر دے گی۔ اور اس کے گھر والے اسے آ کر وہاں سے لے جائیں گے۔"

اپنی کمیں گاہ یعنی قبرستان والے ٹیبے کی کوٹھڑی میں آ کر ہم نے کمانڈو رحیم کو بتا دیا کہ ارملا کو ہم آج رات آزاد کر رہے ہیں۔ پروین اپنے گھر سری نگر پہنچ گئی ہے۔ کمانڈو رحیم نے بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ مجاہدین کشمیر اور کشمیری کمانڈوز کی بہت بڑی فتح اور بھارتی غاصب فوج کی شکست تھی۔

میں اور کمانڈو اورنگ زیب نیچے تہہ خانے میں گئے اور ارملا کو بتایا کہ آج رات اپنے گھر پہنچا دی جائے گی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"تمہارے بدکردار درندہ فوجی کشمیر میں مسلمان کشمیری خواتین کے ساتھ جو بدترین سلوک کر رہے ہیں ہم نے تمہارے ساتھ ویسا سلوک نہیں کیا۔ اپنے باپ کو جا کر بتا دینا کہ تم گھر سے جس طرح اٹھائی گئی تھیں اسی طرح عزت آبرو کے ساتھ واپس آئی ہو اور کشمیری کمانڈو نے تمہارے ساتھ شریف اور بااخلاق انسانوں ایسا سلوک کیا ہے۔"

بنگالی لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"میں ایسے ہی جا کر کہوں گی۔ تم لوگوں نے جس شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گی۔ تم لوگوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے اعلیٰ ترین مذہب ہے۔"

ہم نے بریگیڈیئر کی بیٹی ارملا سے کہا کہ وہ تیار رہے ہم رات کے شروع ہوتے ہی اسے یہاں سے لے کر چل دیں گے۔ وہ سارا دن بھی میں نے اورنگ زیب کے ساتھ کمانڈو رحیم کی کمیں گاہ میں گزارا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم نے تیاری شروع کر دی کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"کچھ پتہ نہیں راستے میں کس قسم کے حالات پیش آ جائیں۔ ہمیں اپنی طرف سے تھوڑی بہت تیاری کر کے نکلنا ہو گا۔"

کمانڈو رحیم بولا۔

"ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

اورنگ زیب نے کہا۔

"نہیں۔ زیادہ آدمی ہوں گے تو شک پڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں ہی کافی ہیں۔"

نقاب والی سیاہ کمانڈو جرسیاں پہننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے صرف پتلونیں اور جیکٹیں پہن لیں۔ احتیاط کے طور پر ساتھ کمانڈو چاقو اور آٹو میٹک پستولیں میگزین بھر کر رکھ لیں۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے جب میں اور کمانڈو اورنگ زیب ہم بریگیڈیئر کی بیٹی ارملا مکرجی کو لے کر اپنی خفیہ کمیں گاہ سے نکلے۔ ہم نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے ایک چادر اس طرح اوڑھا دی تھی کہ صرف اس کا تھوڑا سا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا کیونکہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب میرے ذرا آگے آگے چل رہا تھا۔

ہم غیر آباد پہاڑی علاقوں سے گزرتے ہوئے ایک خالی سڑک پر اوپر نکل آئے۔ ہماری ایک جانب ذرا نیچے شملے کی مال روڈ کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب وہاں آ کر ایک چھوٹے سے رستے پر مڑ گیا یہاں کچھ فاصلے پر کوٹھیاں تھیں جن میں روشنی ہو رہی تھیں۔ ارملا نے کہا۔

"میری آنکھوں کو کھول دیں پلیز!"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"تھوڑی دیر انتظار کرو۔"

ہم تنگ پہاڑی رستوں سے نکل کر ایک اور سڑک پر چڑھ آئے۔ یہ تھوڑی کشادہ اور پختہ سڑک تھی۔ اورنگ زیب نے مجھ سے کہا۔

"ہم اسے وہاں وہ جو سگنل کی روشنی ہے اس کے قریب چھوڑ دیں گے۔"

پھر اس نے ارملا سے کہا۔

"ہم اس وقت شملہ سولن روڈ پر سٹیشن کے قریب آ گئے ہیں۔ آگے سٹیشن کے سگنل کی بتی ہے۔ ہم تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔ تم اپنے گھر سٹیشن پر سے فون کر دینا۔ وہ لوگ تمہیں آ کر لے جائیں گے۔"

ہم سگنل کی بتی کی طرف چلنے لگے۔ ذرا آگے گئے تھے کہ ایک سادھو سامنے سے آ کر ہمیں گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ کس کی دھرم پتنی ہے بالک؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"جاؤ بابا اپنا راستہ لو۔"

سادھو مسکراتا ہوا آگے چل دیا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ جس وقت ہم اپنے ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر پکی سڑک پر آئے تھے تو میں نے اس سادھو کو وہاں سے بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک طرف بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھا جاپ کر رہا تھا۔ مگر اس نے ہماری طرف بڑے غور سے دیکھا تھا۔ میں نے جب اس بات کا ذکر اورنگ زیب سے کیا تو وہ رک گیا۔ اس نے پلٹ کر سادھو جس طرف گیا تھا اس طرف دیکھا۔ مگر وہاں سادھو نہیں تھا۔ سڑک بالکل سیدھی تھی اور بجلی کے کھمبوں پر بلب بھی روشن تھے مگر سادھو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"دوست! مجھے کسی آنے والے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ لڑکی کو یہیں چھوڑ کر واپس چلتے ہیں۔"

مگر کمانڈو اورنگ زیب کو ابھی اتنا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جتنا تجربہ میں اپنی کمانڈو زندگی میں حاصل کر چکا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے ابھی بیدار ہونا شروع نہیں کیا تھا۔ کہنے لگا۔

"کوئی عام سادھو ہو گا۔ یہاں اس قسم کے سادھو لوگ راستے میں عام مل جایا کرتے ہیں۔"

لیکن میری چھٹی حس یونہی بیدار نہیں ہوا کرتی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ اب کمانڈو اورنگ زیب میرے آگے آگے ارملا کو ساتھ لئے چل رہا تھا۔ ہم اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ یہ سادھو کوئی عام سادھو نہیں تھا بلکہ ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی تھا اور اس نے جب پہلی بار ہمیں شملے کی اوپر والی سڑک پر بجلی کے کھمبے کے قریب سے گزرتے دیکھا تھا تو ملٹری ہیڈ کوارٹر کو اسی وقت وائرلیس کے ذریعے اطلاع کر دی تھی کہ دو مشکوک آدمی ایک عورت کو لے کر شملہ سولن روڈ کی طرف جا رہے ہیں اور اسی لمحے ملٹری کمانڈو فورس کا مسلح دستہ جیپ میں سوار ہو کر شملہ سولن روڈ پر پہنچ گیا تھا اور انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا اور گھیرے میں لئے سڑک کی دونوں جانب اندھیرے میں ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں صرف اس بات کا انتظار تھا کہ کب ہم بریگیڈیئر کی بیٹی کو اپنے سے الگ کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دینی تھی۔ لڑکی کی موجودگی میں وہ ہم پر اٹیک کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہم کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں بلکہ کمانڈوز ہیں اور ہم اس وقت لڑکی کو ہلاک کر دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ کیونکہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ ہر قدم پر ہمارے قریب آ رہا ہے۔ میں نہ رہ سکا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"لڑکی کو چھوڑ کر واپس بھاگ چلو۔"

اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہم ریلوے سگنل کی بتی کے قریب آ گئے تھے اور ایک جانب اوپر ریلوے لائن والی سرنگ کی بتی بھی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے اپنی دائیں جانب سڑک کے نیچے جھاڑیوں میں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی دبے پاؤں جھاڑیوں میں چل رہا ہو۔ میں رک گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب مجھ سے چار پانچ قدم آگے ہو گیا تھا۔ وہ بھی رک گیا۔ اس نے لڑکی کو کچھ کہا اور جیسے ہی اسے چھوڑ کر واپس ہوا ہم پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں سڑک پر لیٹ گیا۔ میں نے جیب سے پستول نکال کر

دونوں ہاتھوں میں لیا اور دائیں بائیں فائر کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کمانڈو اورنگ زیب نے بھی پستول نکال لیا تھا اور دوڑ کر لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لڑکی کو آڑ بنا کر وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر اس دوران سامنے سے ایک فوجی جیپ مشین گن کا فائر کرتی تیزی سے نمودار ہوئی۔ دو فوجی چھلانگ لگا کر نیچے کودے۔ انہوں نے لڑکی کو پکڑ کر جیپ میں ڈالا اور جیپ ہم پر فائر کرتی الٹی چل پڑی۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو سڑک پر گرتے دیکھا۔ شاید اسے گولی لگ گئی تھی۔ مجھ پر دونوں طرف سے فائر آ رہا تھا۔ میں نے سڑک پر لیٹے لیٹے پستول میں نیا میگزین بھرا اور جتنی تیزی سے ہاتھوں کو گھما سکتا تھا گھما گھما کر سڑک کی دونوں جانب اندھیرے میں فائر کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں اٹھا کر سڑک پر جھک کر پیچھے کی طرف دوڑ پڑا۔

کسی فوجی نے چلا کر کہا۔

"تم ہمارے گھیرے میں آ چکے ہو۔ ہتھیار پھینک کر ہاتھ کھڑے کر دو"۔

میرے پستول کے میگزین میں ابھی کافی گولیاں تھیں۔ میں فائر کرتا گیا اور سڑک پر دائیں بائیں ہو کر بھاگتا چلا گیا۔ سڑک کے نیچے جھاڑیوں کے اندھیرے میں اس لئے نہیں جا رہا تھا کہ فائر اسی طرف سے آ رہا تھا۔ اوپر جھاڑیوں میں سے مشین گن کا برسٹ میرے بالکل قریب سڑک پر پڑا۔ میں سمجھ گیا یہ لوگ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ ورنہ بھارتی فوجی جو یقینی طور پر کمانڈو فورس تھی' اتنے اناڑی نہیں تھے کہ ٹارگٹ دس قدموں کے فاصلے پر ہو اور وہ نشانہ نہ لگا سکیں۔ گولیاں میرے دائیں بائیں اوپر اور پیچھے پڑ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ میگافون پر مجھے ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ کمانڈو دشمن کی زد میں آ جائے تو عام طور پر اسے ہلاک کرنے کی بجائے زندہ پکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک کمانڈو سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ میں نے بھی دشمن کے ہاتھ نہ آنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مجھے مارنا نہیں چاہتے تو میں نے سڑک پر پیچھے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ اب سامنے سے ایک برسٹ آیا جو میرے بالکل آگے آ کر پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ میری ٹانگوں پر برسٹ مار کر مجھے زخمی کر کے

گرانا چاہتے ہیں۔ پہاڑی سڑک بالکل ایسی تھی جیسی ہمارے کوہ مری میں سنی بینک کے قریب ہے۔ سڑک ایک طرف کو مڑ گئی۔ میں دوڑ کر آگے گیا تو اچانک سامنے سے ایک فوجی جیپ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی اور جیپ اتنی تیزی سے آئی جیسے میرے اوپر چڑھ کر مجھے کچل دے گی۔ جیپ کے اگلے ٹائر کا بمپر لگا اور میں گر پڑا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ چار فوجی جوان سٹین گنیں تانے میرے اوپر کھڑے تھے۔

میں اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا پستول چھین کر اسی وقت میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ میری تلاشی لی گئی میرے پاس جو کچھ تھا سب نکال لیا گیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ڈال دیا گیا۔ دو فوجی میرے دائیں بائیں مجھے دبوچ کر بیٹھ گئے۔ جیپ اوپر شملہ کے مین بازار کی طرف تیزی سے بڑھی۔ اس دوران پہلو کی جانب جھاڑیوں سے دوسرے فوجی بھی باہر نکل آئے تھے۔ ان کی جیپ ذرا آگے کھڑی تھی۔ یہ جیپ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

میں بھارتی فوجیوں کا قیدی بن چکا تھا

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اب مجھے غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا اور مجھ سے میرے دوسرے ساتھی مجاہدوں اور کشمیری کمانڈوز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مجھے اذیتیں دے کر خاص طور پر مجھ سے اس خفیہ کیمپ گاہ کے متعلق پوچھا جائے گا جہاں ہم نے بریگیڈیئر کی بیٹی کو یرغمال بنا کر چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر بھارتی فوج کی اذیتوں اور تشدد کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور آپ بھی پڑھ چکے ہیں۔ مجھے ہوشنگ آباد کے جنگل کے ٹریننگ سپاٹ پر مجاہد نے جو کمانڈو ٹریننگ دی تھی اس میں مجھے دشمن کی قید میں ہر طرح کا تشدد برداشت کرنے کی بھی زبردست اور انتہائی تکلیف دہ ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تشدد کے دوران میں نے کس طرح اپنے جسم کو پتھر بنا لینا ہے۔ پھر کس طرح اپنے اوپر نیم بے ہوشی اور جسم پر بے حسی طاری کرنی ہے۔ اس سے اذیت کم نہیں ہوتی تھی لیکن ایک کمانڈو کے اندر اسے برداشت کرنے کی طاقت دوگنی ہو جاتی تھی۔ ہماری فوجی جیپ جس میں

میرے ہاتھ پیچھے باندھ کر بٹھایا گیا تھا آگے جا رہی تھی۔ دوسری فوجی جیپ ہمارے پیچھے تھی۔ ان فوجیوں کی چال ڈھال اور باتیں کرنے کا انداز اور جس طرح انہوں نے دو سیکنڈ میں میرے ہاتھ پیچھے کر کے رسی باندھی تھی' اس سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ بھارتی کمانڈو فورس کے جوان ہیں۔

میرا خیال تھا کہ شاید مجھے بریگیڈیئر مکرجی کے پاس چہرہ شناسی کے لئے لے جایا جائے گا۔ لیکن جیپیں اس کے بنگلے کو جانے والی سڑک کے آگے سے گزر گئیں۔ یہ لوگ مجھے جاٹ رجمنٹ کے گیریزن میں لے گئے۔ مجھے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر چاق وچوبند ملٹری پولیس کا مسلح فوجی اٹن شن ہو کر کھڑا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ تلاشی کے بعد نکال لیا گیا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے لمبے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ سوچنے لگا یہاں سے فرار کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ دشمن کی قید سے فرار ہر فوجی اور ہر کمانڈو کا حق ہوتا ہے۔ عام جنگی قیدی ایسے بھی ہوتے ہیں جو فرار کا خطرہ مول لینے کی بجائے دشمن کی قید میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر قید کی ساری مدت گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کمانڈو ایسا کبھی نہیں سوچتا۔ کمانڈو کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ کمانڈو کسی بھی ملک کی فوج کا وہ جوان ہوتا ہے جس کی تربیت پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ جس کے پاس اپنی رجمنٹ اور پورے ڈویژن کی اور جہاں جہاں اپنی فوج ڈپلائے ہوتی ہے اس کے بارے میں پوری معلومات ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ بعض ایسے فوجی راز بھی ہوتے ہیں۔ جو ایک عام فوجی کو معلوم نہیں ہوتے۔ کمانڈو اول تو دشمن کے قابو نہیں آتا۔ اگر کسی اپنی غلطی یا بدقسمتی کے باعث دشمن کے ہتھے چڑھ بھی جائے تو وہ دشمن کی قید میں آتے ہی فرار کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔ عام جنگی قیدی کی نسبت کمانڈو کی سیکورٹی زیادہ سخت ہوتی ہے اور دشمن اس پر ہر طرح تشدد کرتا ہے تاکہ اس سے جس قدر اہم فوجی راز معلوم کئے جا سکتے ہیں کئے جائیں۔

مجھے کوارٹر گارڈ میں بند کرنے کے بعد ایک گھنٹہ تک کوئی نہ آیا۔ میری کلائی پر جو گھڑی بندھی ہوئی تھی وہ انہوں نے ابھی تک نہیں اتاری تھی۔ میرا کمانڈو چاقو بھی وہ لے گئے تھے۔ کوارٹر گارڈ کے باہر کوئی تین منٹ میں ایک اور مسلح فوجی آکر پہرے کی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ فوجی تھوڑی تھوڑی دیر بعد سلاخوں میں جھانک کر مجھے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں میں خودکشی کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ کوارٹر گارڈ میں ڈالنے سے پہلے ایک بھارتی کیپٹن نے جو یقیناً میڈیکل کور کا ڈاکٹر تھا میرا منہ کھلوا کر میرے سارے دانتوں کا بھی معائنہ کیا تھا کہ کہیں میں نے دانتوں میں زہریلی ٹیوب تو چھپا کر نہیں رکھی ہوئی۔

دو گھنٹے کے بعد مجھے کوارٹر گارڈ میں سے نکال کر مسلح دستے کی حفاظت میں ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں لوہے کے پلنگ پر ایک گدا ایک موٹا کمبل اور ایک سرہانہ پڑا تھا۔ باقی سارا کمرہ خالی تھا۔ اس کے ساتھ ہی باتھ روم تھا۔ اس کمرے کے باہر بھی سلاخوں والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ باہر دو فوجی گارڈ کھڑے ہو گئے تھے۔ جو مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ چونکہ میں نے ہر اذیت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا اس لئے پلنگ پر کمبل اوپر لے کر لیٹ گیا۔ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ میں جلتے بلب کی روشنی میں دروازے کی سلاخوں اور باہر پہرے پر کھڑے بھارتی سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے مستقل طور پر اسی جگہ رکھا گیا اور اسی جگہ مجھے ٹارچر کر کے مجھ سے وہ راز معلوم کرنے کی کوشش کی گئی جو میں انہیں کبھی نہیں بتاؤں گا تو یہاں سے فرار ہونے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ساتھی کمانڈو اورنگ زیب کی طرف خیال چلا گیا۔ میں نے اسے زخمی ہو کر سڑک پر گرتے دیکھا تھا۔ خدا کرے کہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ مجھے اس بات کی تسلی بھی تھی اور خوشی بھی تھی کہ ہم نے جہاد کشمیر کے بزرگ مجاہد حاجی ثناء اللہ ڈار کی بیٹی کو اس کے گھر پہنچا دیا ہے۔ آگے میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا اس کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ تو ہر کمانڈو کے ساتھ ہوا ہی کرتا ہے۔ اور اس کے لئے کمانڈو کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

ساری رات گزر گئی۔

شملے کی اس فوجی چھاؤنی کے جس کمرے میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کی سلاخوں میں سے دن کی روشنی اندر آنے لگی تھی۔ رات کسی وقت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ باہر گارڈ بدل چکی تھی۔ کوئی دوسرے سپاہی باہر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک گورکھا تھا۔ فوجی پہرے میں مجھے باتھ روم لے جایا گیا۔ واپس آیا تو ایک بھارتی فوجی میرے لئے چائے کا مگ اور ڈبل روٹی لے کر آ گیا۔ اس نے مجھ پر ایک قہر آلود نظر ڈالی اور پلنگ پر ایک طرف چائے کا مگ اور ڈبل روٹی رکھ کر چلا گیا۔ آہنی سلاخوں والا دروازہ لاک کر دیا گیا۔ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ چائے پی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ اپنے حسن سلوک کے ساتھ مجھے متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ تشدد کا یہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے کمانڈو کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے ہر طرح کا لالچ دیا جاتا ہے۔ یہ کام پیشہ ور چالاک عورتوں سے بھی کروایا جاتا ہے۔ میں اس قسم کے تمام حربوں سے واقف تھا۔ مجھے کوئی فکر تھا تو صرف اس بات کا کہ اگر انہوں نے میری فائل کھولی یا انہیں میرا پچھلا ریکارڈ معلوم ہو گیا تو ان کو میرے سارے پچھلے کمانڈو ایکشن کی تباہی کا علم ہو جائے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ہی دوارکا کا فوجی ایمونیشن ڈمپ اڑایا تھا۔ میں نے ہی بھوپال بمبئی لائن پر فوجی گاڑی کو دھماکے سے اڑا دیا تھا اور میں نے ہی لل ٹریننگ سنٹر کے تجربہ کار کافر دہشت گردوں کو ہلاک کیا تھا جو پاکستان دہشت گردی کے لئے جا رہے تھے۔ اور میں نے ہی ارجن سنگھ سوڈھی کے بھیس میں راجستھان میں را

گڑھ والا بھارتی ایٹمی سنٹر تباہ کیا تھا اور وہ میں ہی تھا جو احمد آباد میں را کے چیف کے گھر ہندو جین جوگی بن کر رہ رہا تھا اور اس کی بیٹی میناکشی پر اپنا اثر ڈال کر میں نے بھارت کی تخریب کار پاکستان دشمن ایجنسی را کے خفیہ راز معلوم کئے تھے۔ ان کے علاوہ میرے گزشتہ کئی نامہ اعمال میں ملٹری انٹیلی جینس کو چونکا دینے کے لئے اور بھی بہت کچھ تھا۔ مجھے یہ پروا نہیں تھی کہ بھارت کی ملٹری انٹیلی جینس کو میرا سارا کچا چٹھا معلوم ہو جائے گا۔ فکر صرف یہ تھی کہ ان تمام رازوں کے فاش ہو جانے کے بعد ان پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ میں ایک انتہائی قیمتی اور خطرناک کمانڈو ہوں جس کی سرگرمیاں صرف کشمیر تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ سارے بھارت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور کسی ایسے اندھے کنوئیں میں ڈال دیں گے جہاں سے میری کمانڈو ٹریننگ اور تجربہ بھی باہر نہ نکال سکے گا۔

دو ملٹری پولیس کے جوان آئے اور مجھے ایک فوجی افسر کے پاس لے گئے۔ چھوٹے سے کمرے میں یہ فوجی افسر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر بھارت کے وزیراعظم شاستری کی فوٹو لگی تھی۔ جموں کشمیر کے نقشے کا ایک چارٹ لگا تھا۔ کمرے کے آتشدان میں دھیمی دھیمی آگ روشن تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ قید خانے کے ٹھنڈے کمرے سے یہاں آ کر مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ میرے ہاتھ کھلے تھے۔ مسلح فوجی جوانوں نے کمرے میں آ کر سلیوٹ کیا اور اٹن شن کھڑے ہو گئے۔ فوجی افسر کے کاندھے پر ایک کراؤن لگا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میجر رینک کا افسر ہے۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر فوجیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلے گئے تو یہ بھارتی میجر مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور سمجھ گیا کہ مجھ پر پیار محبت کی پالیسی اختیار کی جا رہی ہے۔

انڈین میجر نے دراز میں سے سگریٹ کیس نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔ میں نے کہا۔

"شکریہ"

"کیا تم سگریٹ نہیں پیتے؟"

میں نے کہا۔

"پیتا ہوں۔ مگر اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

بھارتی میجر کے آگے ایک فائل کھلی پڑی تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک جوان چائے کی دو پیالیاں ٹرے میں رکھے داخل ہوا۔

"چائے تو تم ضرور پیو گے۔"

میں نے ایک پیالی اٹھالی۔ بھارتی میجر نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا اور بولا۔

"سنا ہے اب پاکستان میں بھی اچھی چائے ملنے لگی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ بھارتی میجر کہنے لگا۔

"پاکستان کے سگریٹ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ میں حیدر آباد دکن کے بنے ہوئے چار مینار سگریٹ پیتا ہوں۔ تم پاکستان سے آئے تھے تو ہمارے لئے سگریٹ کے دو چار پیکٹ ہی لیتے آتے۔"

میں سب کچھ سمجھ رہا تھا کہ یہ بھارتی میجر ایسی باتیں کس لئے کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"میرا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے میں کشمیری مجاہد ہوں۔ میرا تعلق کشمیر کے حریت پرستوں سے ہے۔ اور یہ بات آپ کو بھی معلوم ہو چکی ہوگی۔"

بھارتی میجر آگے کو ہو کر فائل پر جھک گیا اور فائل پر نظریں جماتے بولا۔

"مگر یہاں تو لکھا ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو اور بڑے خطرناک جاسوس ہو۔ نمبر ایک تم نے بھوپال بمبئے لائن پر فوجی اسلحے کی گاڑی کو دھماکے سے اڑایا۔ نمبر ۲ تم نے دوارکا کے ملٹری ایمونیشن ڈپو کو تباہ کیا۔ نمبر تین تم نے راجستھان میں ہمارے زیر زمین پرامن ایٹمی پروگرام کے ری ایکٹر کو اڑا دیا۔ اور نمبر ۴ تم نے ہمارے سری نگر والے فوجی کیمپ کے ایمونیشن ڈمپ میں دھماکہ کیا جس سے ہمارا کیمپ تباہ ہوا اور ہمارے سینکڑوں

فوجی ہلاک ہو گئے۔"

وہ فائل پر اپنا ہاتھ رکھ کر میری طرف گھور کر دیکھنے لگا۔

"کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ رپورٹ جھوٹی ہے۔ میرا ان کارروائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

بھارتی میجر نے فائل کا ایک صفحہ الٹ کر اسے میرے سامنے رکھ دیا۔ فائل میں میری تصویر لگی تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جو امرتسر کی جیل میں اتاری گئی تھی۔ میں نے تصویر کو دیکھا اور کہا۔

"یہ تصویر میری ضرور ہے مگر ان تخریبی کارروائیوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں یہ تصویر مجھے نہیں معلوم آپ نے کہاں سے لے کر لگا دی ہے۔"

بھارتی میجر کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے فائل کے دو تین صفحے الٹے اور ایک صفحہ میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"اس تصویر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

فائل کے صفحے کے کونے میں میری ایک ایسی پاسپورٹ سائز کی تصویر لگی ہوئی تھی جس پر میرا حلیہ ہندو سادھوؤں ایسا تھا۔ ماتھے پر تلک کی تین لکیریں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ گلے میں موٹے منکوں کی مالا تھی۔ مجھے یاد آگیا۔ یہ اس زمانے کی تصویر تھی جب میں جین دھرم کے سادھو کے بہروپ میں احمد آباد میں را کے انچارج کے بنگلے میں مقیم تھا اور اس کی بیٹی میناکشی کے ذریعے بھارتی خفیہ ایجنسی را کے پاکستان دشمن راز حاصل کر رہا تھا اور جہاں سے مجھے میرا راز کھل جانے پر فرار ہونا پڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"یہ تصویر میری نہیں ہے۔ کسی میری جیسی شکل کے سادھو کی تصویر لگا دی گئی ہے۔"

بھارتی میجر نے فائل بند کر دی اور فائل پر دونوں ہاتھ رکھ کر میری طرف جھک کر بولا۔

"تم جانتے ہو کہ یہ تمہاری ہی تصویریں ہیں۔ تم یہ بھی جان چکے ہو کہ ہماری انٹیلی جنس کو تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ کسی چیز کو چھپانے سے تمہیں سوائے ٹارچر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں ایک ملٹری انٹیلی جنس آفیسر کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا تمہیں ایک کمانڈو سپاہی کی حیثیت سے یہی کرنا چاہئے تھا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس عہدے پر میں میجر دیوان چند تعینات ہوں میری جگہ اگر کوئی دوسرا فوجی افسر ہوتا تو وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تم پر گھونسوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دیتا اور تم اس وقت لہولہان ہو کر فرش پر پڑے ہوتے۔ لیکن میں انصاف پسند فوجی افسر ہوں۔ میں نے تم سے بہتر سلوک کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے تعاون کرو۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟"

میجر دیوان چند کرسی چھوڑ کر آتشدان کے پاس چلا گیا۔ اس کی پشت آتشدان کی طرف تھی۔ سگریٹ اس کے منہ میں سلگ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ منہ سے نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور میرے قریب آکر میز پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب آگیا تھا۔ بڑی دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"میں تم سے تمہاری پچھلی تخریبی کارروائیوں کا حساب نہیں مانگوں گا۔ میں تم سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ راجستھان، احمد آباد اور دلی میں تم کن لوگوں کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ شملے میں تمہارا ہائیڈ آؤٹ کہاں تھا؟ تم نے بریگیڈیئر صاحب کی بیٹی کو کہاں رکھا تھا اور شملے میں تمہارے کون کون سے ساتھی کن جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔ میں تمہیں اپنے طور پر یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے ہمیں اپنے کمانڈو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دیئے اور وہ ہماری تحویل میں آگئے تو میں خود تمہیں اپنی حفاظت میں انڈیا کا بارڈر کراس کرا کر پاکستان پہنچا دوں گا۔"

میں دل میں ہنس رہا تھا۔ اس بھارتی ملٹری انٹیلی جنس افسر کو یہ تو سب کچھ معلوم ہو

گیا تھا کہ میں نے پاکستانی کمانڈو کی حیثیت سے کمانڈو ایکشن کے ذریعے کہاں کہاں ان ؤں کو شدید نقصان پہنچایا ہے لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ جس کمانڈو سے وہ یہ ساری باتیں کر رہا ہے وہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے اور وہ قوت یلغار یعنی اٹیک اور قوت مدافعت کی کس قدر حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔

میں نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے اپنے حریت پرست ساتھیوں کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے شملے میں اس خفیہ ہائیڈ آؤٹ سے واقفیت نہیں۔ جہاں ہم نے بریگیڈیئر مکرجی کی بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد چھپایا تھا۔ میں آپ کو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں میری زبان بند ہے۔ میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اور میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے میرے ساتھی حریت پرستوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کرنے کے سلسلے میں آپ کے سارے حربے ناکام ہو جائیں گے۔"

میجر دیوان چند میز کے کنارے پر سے اٹھا اور اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں جو تم سے یہ سارے راز اگلوانے میں شاید پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگائیں گے۔"

اس نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔ ملٹری پولیس کے وہی دو فوجی جوان اندر آگئے۔ میجر نے کہا۔

"اسے واپس لے جاؤ۔"

انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور لا کر پھر اسی ٹھنڈے بند کمرے میں ڈال دیا۔ میں لوہے کے پلنگ پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ میں نے کمبل گھٹنوں پر کر لیا اور سوچنے لگا کہ مجھ پر ٹارچر اور غیر انسانی اذیتوں کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ مجھے ابھی سے اس کی تیاری شروع کر لینی چاہئے اس کے لئے سانس کی کچھ مشقیں تھیں جو مجھے میرے ہوشنگ آباد ٹریننگ سنٹر والے کمانڈو استاد نے بتائی تھیں۔ ان ورزشوں سے ٹارچر کی تکلیف غائب

نہیں ہوتی تھی صرف اتنا ہوتا تھا کہ تربیت یافتہ کمانڈو اس کو مردانہ وار برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ ان میں سے سب سے اہم ورزش سانس کو اندر کھینچ کر زیادہ سے زیادہ روکنے اور پھر منہ کے راستے سانس کو آہستہ آہستہ باہر نکالنے کی تھی۔ آپ کو پڑھنے سننے میں یہ ورزش بڑی آسان لگے گی لیکن یہ ورزش سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کبھی آپ اسے کر کے دیکھیں۔ آپ زور سے بھرپور سانس اندر کو کھینچ کر ناک منہ بند کر لیں۔ کوشش کریں کہ جو ہوا آپ کے پھیپھڑوں میں گئی ہے اسے زیادہ سے زیادہ اندر رکھیں۔ اس ہوا میں جو آکسیجن ہوگی اسے آپ کے پھیپھڑے جذب کر کے خون کے حوالے کر دیں گے۔ ایک منٹ کے بعد آپ کو دم گھٹتا محسوس ہوگا۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگے گا۔ آپ جلدی سے منہ کھول دیں گے تازہ سانس لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا سانس تیز ہو گیا ہے۔ آپ اس طرح ہانپنے لگیں گے جیسے آپ دوڑ لگا کر آئے ہیں۔ آپ جلدی جلدی سانس لینے لگیں گے۔ بس یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جس کے لئے ایک کمانڈو کو تربیت دی جاتی ہے۔ اس وقت کمانڈو کو اپنے سانس پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اس وقت تیز تیز سانس لینے کی بجائے اسے فوراً سانس اندر کھینچ کر تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں بھر کر منہ ناک بند کر لینے ہوتے ہیں۔ اس لمحے سانس باہر کو آنے کے لئے سخت جدوجہد کرے گا۔ لیکن ہمیں سانس کو زیادہ سے زیادہ دیر اپنے سینے میں بند رکھنا ہوگا۔ جب آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگیں تو سانس کو آہستہ آہستہ باہر نکالنا ہوگا۔ جو آپ تجربہ کر کے دیکھیں بہت مشکل کام ہوگا۔ اسی طرح ہر بار یہ مشق کرنی ہوگی۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس سے کیا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے سانس پر غور ہی نہیں کیا کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں اور اس سانس کے ذریعے جو آکسیجن ہمارے اندر جاتی ہے وہ اندر جا کر کیا کرتی ہے۔ یقین کریں ہم میں سے ننانوے فی صد لوگ ایسے ہیں جو ٹھیک طرح سے سانس لینا نہیں جانتے۔ سانس لیتے وقت ہمارے پھیپھڑوں میں پوری ہوا نہیں جاتی۔ ہمارے پھیپھڑوں کا زیادہ حصہ سکڑا ہوا رہ جاتا ہے اور وہاں تک آکسیجن بالکل نہیں پہنچتی۔ ہم پھیپھڑوں کے اوپر اوپر سانس

کھینچ کر باہر نکال دیتے ہیں۔ یوں ہم اپنے پھیپھڑوں اور اپنے جسم کو اس آکسیجن سے محروم کر دیتے ہیں۔ جس کا ہر سانس کے ساتھ ہمارے جسم کے کونے کونے تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ ہندو جوگیوں نے اس فن میں بڑی مہارت حاصل کی ہے۔ یاد رکھیں جو ہوا ہم سگریٹ سگار یا پائپ کے تمباکو کے ساتھ کش لگاتے وقت اپنے پھیپھڑوں میں داخل کرتے ہیں اس ہوا کی آکسیجن میں نکوٹین اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا زیادہ سے زیادہ حصہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی آکسیجن بھی صحت کے لئے مضر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمانڈو ٹریننگ کے آغاز میں اگر کسی کمانڈو کیڈٹ کو سگریٹ کی عادت ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کے سگریٹ چھڑوائے جاتے ہیں۔ کیونکہ سگریٹ پائپ یا سگار کے کش کے ساتھ ہوا پھیپھڑوں میں داخل کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ دودھ میں تھوڑا تھوڑا زہر ملا کر پی رہے ہوں۔ یہاں میں اپنے پاکستانی نوجوانوں کو خاص طور پر ہدایت کروں گا بلکہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو انسٹرکٹر کی حیثیت سے حکم دوں گا کہ وہ اپنے آپ کو سگریٹ اور شراب ایسی قاتل چیزوں سے ہمیشہ دور رکھیں۔ ایسی جگہوں پر بھی نہ بیٹھیں جہاں لوگ سگریٹ یا شراب پی رہے ہوں۔ کیونکہ وہ میرے وطن پاکستان کے محافظ ہیں۔ پاکستان کے سپاہی ہیں۔ ان پر وطن پاک کے تحفظ کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پاکستان ہمارا وہ وطن ہے جس کی خاطر ہمارے بزرگوں نے ایسی ایسی قربانیاں دی ہیں کہ ان کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے نوجوانوں کو ان قربانیوں کی مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا ہے۔ اور ایک پاکستانی ذمہ دار شہری بہادر وطن پرست سپاہی اور دلیر اور جاں باز کمانڈو بن کر دشمن کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہونا ہے اور اپنے وطن پاک کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ کوئی نصیحت نہیں ہے کہ چاہے ہماری نئی نسل کا نوجوان مانے چاہے نہ مانے۔ نہیں یہ ان کا ایک محب وطن پاکستانی اور مسلمان ہونے کے ناطے فرض ہے۔ اور انہیں اپنا فرض اسی طرح نبھانا ہے جس طرح زندہ اور آزاد قومیں اپنا قومی فرض نبھایا کرتی ہیں۔ یاد رکھیں۔ قوموں کی عالمی تاریخ گواہ ہے۔ صرف وہی قومیں عزت و آبرو سے زندہ و پائندہ رہ کر ترقی کرتی ہیں جو اپنے قومی فرائض کو دیانت داری اور سرفروشی سے نبھاتی ہیں۔ جو

ایسا نہیں کرتیں' تاریخ شاہد ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلاتی ہیں اور ان کا نام ونشان
بھی باقی نہیں رہتا۔ ہم مسلمان ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن
پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھیں۔ قرآن پاک ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ خدا صرف اس
قوم کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتی ہیں۔

میں اپنی داستان کمانڈو بیان کرتے کرتے کبھی کبھی اپنے موضوع سے ہٹ جاتا ہوں۔
کچھ لوگ شاید یہ کہیں کہ میں جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہوں۔ نہیں میں یہ کہوں گا کہ
میں عقل وفراست کی زد میں بہہ جاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس حقیقت کا
شدید احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مسلمان پیدا کر کے مجھے کتنا بڑا افتخار عطا کیا ہے۔
ہمیں اس افتخار کو اپنی جان دے کر بھی ہر حالت میں قائم رکھنا ہے۔ ہمیں ہر کلمہ گو کو اپنا
بھائی سمجھنا ہے۔ خواہ وہ انگریزی بولتا ہو۔ سندھی بولتا ہو' اردو بولتا ہو' پشتو بولتا ہو یا
بلوچی بولتا ہو۔ یاد رکھیں۔ زبان صرف حلق تک ہی ہوتی ہے اس کے نیچے کوئی زبان
نہیں ہوتی۔ کبھی اپنے سندھی پٹھان بلوچی پنجابی مسلمان بھائی کو السلام علیکم کہہ کر کھلے
اور غیر منافق دل سے گلے لگا کر دیکھیں۔ آپ کے سینے میں روشنی کے دھارے بہنے لگیں
گے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ آپ اپنے راستے میں
آئے ہوئے باطل کے بڑے سے بڑے پہاڑ کو اپنی ایک ضرب سے پاش پاش کر سکتے ہیں۔
میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ میں کوئی تقریر نہیں کر رہا۔ یہ کوئی جذباتی الفاظ نہیں
ہیں۔ میں آپ کو ایک ایسی طاقت سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جو آپ کے اندر موجود
ہے۔ میں آپ ہی کا بیش قیمت خزانہ کھول کر آپ کو دکھا رہا ہوں۔ کیسی ستم ظریفی کی
بات ہے کہ ہم اس دولت سے محروم ہیں جو ہماری جیب میں ہے۔

اب میں اپنی داستان کمانڈو آگے بیان کرنی شروع کرتا ہوں۔ بعض اردو کے عالم
فاضل لوگ اس پر ضرور اعتراض کریں گے کہ میں نے فارسی کے لفظ داستان کے آگے
انگریزی کا جو لفظ کمانڈو ہے اس کے درمیان اضافت کی زیر کیوں لگائی ہے۔ میں ان کی
خدمت میں ادب سے گزارش کروں گا کہ اس قسم کی اضافتوں کو دیکھ کر ناحق پریشان نہ

ہوں اور ہماری قومی زبان اردو کا دامن مالا مال ہونے دیں۔ قوموں کی طرح زبانوں کو بھی
اپنی ترقی اور عروج حاصل کرنے کے لئے زیر و زبر ہونا پڑتا ہے۔ مجھے ملٹری پولیس واپس
کمرے میں بند کر گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے وہاں سے کہیں نہ لے جایا گیا۔ میں انتظار کر
رہا تھا کہ ابھی مجھے کسی ٹارچر سیل میں لے جا کر ٹارچر کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔ مگر
ایسا نہ ہوا۔ دوپہر کو مجھے دو چپاتیاں اور تھوڑی سی دال کھانے کو دی گئی۔ شام ہو گئی۔
کسی نے مجھ سے آکر کچھ نہ پوچھا۔ میرا تجربہ یہی کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے کسی بڑے
ٹارچنگ سنٹر پر لے جانے والے ہیں۔ رات کو بھی مجھے دو روٹیاں اور دال کھانے کو مل
گئی۔ میں خاموشی سے کمرے میں کبھی پلنگ پر بیٹھا اور کبھی ٹہلتا رہا۔ باہر سے فوجی گاڑیوں
کے آنے جانے کی آوازیں آجاتی تھیں۔ میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے دس بج
چکے تھے۔ میں پلنگ پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ مجھے لیٹے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے
فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز میرے کمرے کی طرف آرہی تھی۔ پھر میں نے
تین فوجی جوانوں کو دیکھا جنہوں نے سٹین گنیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ اندر آگئے۔ انہوں نے
مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے پلنگ پر سے اٹھا کر کھڑا کیا۔ میری آنکھوں پر سیاہ پٹی اس
طریقے سے باندھی کہ میری آنکھوں کے آگے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ مجھے بازوؤں سے
پکڑ کر باہر لے گئے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک جگہ دو تین سیڑھیاں اترنے
کے بعد رک گئے۔ مجھے فوجی گاڑی میں بٹھا کر دروازہ زور سے بند کر دیا گیا۔ میرے
دائیں بائیں دو فوجی بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد گاڑی چل پڑی۔ گاڑی دیر تک چلتی رہی۔
وہ کئی اونچی نیچی سڑکوں پر سے گزری۔ پھر ایسی جگہ پر چلتی ہوئی محسوس ہوئی جہاں سڑک
بڑی ہموار تھی۔ پھر رک گئی۔

مجھے پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ کچھ فوجیوں کی دور سے ایک دوسرے کو پکارنے
کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں فوجی مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے ساتھ تیز تیز چلا رہے
تھے۔ مجھے ایک سیڑھی کے ذریعے کسی جگہ چڑھایا گیا۔ جب میں اس جگہ کے اندر آکر
سیٹ پر بیٹھا تو مجھے فوراً خیال آیا کہ میں ہوائی جہاز میں ہوں۔ لیکن جہاں تک میری

معلومات کا تعلق تھا شملے میں کوئی ہوائی اڈہ نہیں تھا۔ جب ایک خاص آواز کا شور بلند
ہونے لگا تو میں سمجھ گیا کہ مجھے کسی فوجی ہیلی کاپٹر میں سوار کرایا گیا ہے۔ دوسرے لمحے
مجھے اپنا آپ ہوا میں بلند ہوتا محسوس ہوا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے
ایک خاص بلندی پر جا کر دائیں جانب غوطہ سا لگایا اور پھر ایک چکر کاٹ کر بالکل سیدھا
ہو گیا۔ ہیلی کاپٹر اب بالکل سیدھ میں جا رہا تھا۔

جانے کیوں مجھے راجستھان کی پرانی مڑھیوں میں ملنے والی چندریکا کی بدروح کا خیال
آ گیا۔ اس نے آخری ملاقات میں مجھے دھمکی دی تھی کہ چونکہ میں نے اس کی بھارت ما
کے دیش کے فوجی ٹھکانوں اور میزائل کے اڈوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے اس لئے و
مجھ سے ایسا بدلہ لے گی کہ جسے میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔ آپ نے پیچھے میری
داستان میں پڑھا بھی ہو گا میں نے اس بدروح چندریکا کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس
کے ساتھ ہی مجھے دلی میں نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ شریف کے قریبی قبرستان میں دفن
کسی گمنام مگر پارسا اور نیک دل مغل شہزادے کی روح کا خیال بھی آیا جس نے عالم رو
میں میرے سامنے آ کر مجھے خبردار کیا تھا کہ عنقریب مجھ پر ایک بہت بڑی آفت نازل ہونے
والی ہے۔ میں قدرتی طور پر سوچنے لگا کہ کہیں یہی تو وہ آفت نہیں ہے کہ میرا سارا بھید
فاش ہو چکا ہے اور میں بھارتی ملٹری انٹیلی جینس کی قید میں ہوں اور مجھے کسی نامعلوم منزل
کی طرف ٹارچر کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے؟

طرح طرح کے خیال مجھے آنے لگے تھے۔ بدروح چندریکا کی بددعا کا دھمکی کا مجھ
اس لئے بھی زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ میرے اندر ایمان کی اتنی طاقت تھی اور میں اپ
اندر خدا اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والے ایک مسلمان کی حیثیت سے ا
توانائی محسوس کر رہا تھا کہ چندریکا ایسی ہزار بدروحیں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں
لیکن مغل شہزادے کی نیک روح کی پیش گوئی سے میں ضرور کسی وقت پریشان ہو جاتا
اگرچہ شہزادے کی نیک روح نے مجھے اس آفت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بھی
دیا تھا کہ مجھے نجیب آباد کے قلعہ پتھر گڑھ کے مشرق میں شہید خاتون کے مزار پر جا

دعائے فاتحہ پڑھنا تھی۔ لیکن آخر میں بھی ایک عام انسان تھا۔ کوئی ولی اللہ نہیں تھا۔ دل
میں کسی کمزوری کے لمحے پریشان کر دینے والے خیال بھی آنے لگتے تھے۔ بس میری اگر
کوئی خوبی تھی تو صرف اتنی کہ میں خدا کی وحدانیت اور اس کے مالک ارض وسماء ہونے
کے تصور سے ان کمزور اور پریشان کر دینے والے خیالات کو پسپا کر دیتا تھا۔ بھگا دیتا تھا۔
اور میں آپ کو اپنے دل کی بات بتاتا ہوں کہ یہ خوبی بھی میرے اندر خدائے بزرگ و برتر
کے فضل و کمال کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ورنہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ فوجی
ہیلی کاپٹر اڑا جا رہا تھا۔ اس کی آواز کا شور کافی تھا۔ اور اندر جو چار پانچ انڈین فوجی بیٹھے
تھے انہیں ایک دوسرے سے اونچی آوازوں میں بات کرنی پڑتی تھی۔ ان فوجیوں کے لہجے
ڈوگری اور گڑھوالی زبان کے تھے۔ صرف آگے کی طرف کوئی فوجی ماجھے کی پنجابی زبان میں
بات کرتا تھا۔

ابھی تک مجھ پر ذرا سا بھی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن بہت جلد قیامت خیز وحشیانہ
تشدد کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ لیکن یقین کریں کہ مجھے ان کے وحشیانہ تشدد کی کوئی پروا
نہیں تھی۔ صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ جب ٹارچر کے باوجود وہ مجھ سے کوئی معلومات
حاصل نہ کر سکیں گے تو مجھے شوٹ کر دیں گے۔ ڈر موت کا نہیں تھا۔ بلکہ اس بات کا
خیال آتا تھا کہ مرنے کے بعد میں پاکستان دشمن بھارتی فوجیوں کے خلاف بھارت اور کشمیر
میں اپنی مجاہدانہ کارروائیاں جاری نہ رکھ سکوں گا۔ جب کہ میں پاکستان اور کشمیریوں کے
ازلی دشمن کے خلاف اپنی فتح تک جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا اور اپنی کمانڈو سرگرمیوں سے
اس کے پاکستان اور آزادی کشمیر کے خلاف مذموم عزائم کو ہر محاذ پر شکست دینا چاہتا تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک دم نیچے کو جھکنے لگا۔

پھر اس نے ایک غوطہ لگایا اور کسی مقام پر اتر گیا۔ مجھے دور سے فوجی گاڑیوں اور
لوگوں کے ایک دوسرے سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے پکڑ کر ہیلی کاپٹر سے اتارا
گیا۔ کسی گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی چل پڑی۔ گاڑی بڑی ہموار سڑک پر چل رہی
تھی اور اس کی آواز بڑے ٹرک کے انجن کی آواز تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں کسی

ایئر پورٹ کے رن وے پر ہوں۔ ایک جہاز کے انجنوں کی آواز آئی۔ وہ گرجتا ہوا ٹیک آف کر رہا تھا۔ جہاز کے اترتے اور چڑھتے وقت انجنوں کی آواز کے فرق کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ میں کسی ایئر پورٹ کے اندر تھا اور مجھے ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے انڈیا کے کسی دوسرے شہر لے جایا جا رہا تھا۔ جب مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے جایا جا رہا تھا تو میرے قریب بیٹھے ہوئے (وہ فوجی وہ فوجی ہی ہو سکتے تھے) آپس میں انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ یہ انبالے کا فوجی ہوائی اڈہ ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے شملے سے فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ انبالے لایا گیا تھا اور اب وہاں سے کسی فوجی طیارے میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

میری آنکھوں کی پٹی ابھی تک نہیں اتاری گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے کسی فوجی ایئر پورٹ کو دیکھوں میرا خیال ہے اس معاملے میں وہ حق بجانب تھے۔ یہاں مجھے کسی طیارے میں سوار کرا دیا گیا۔ طیارہ ٹیک آف کر گیا۔ طیارے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ زیادہ بڑا طیارہ نہیں ہے اور کوئی درمیانی قسم کا فوجی طیارہ ہے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے فوجی سے کہا کہ میں باتھ روم جانا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور چند قدم پیچھے کی جانب چلا کر ایک دروازے کے اندر دھکیل دیا۔ میں نے اندر آنے کے بعد دیواروں کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا کہ باتھ روم بہت ہی چھوٹا ہے۔ فوجی نے مجھے اندر دھکیلنے سے پہلے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"آنکھوں کی پٹی مت کھولنا۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں گا۔"

میں نے بڑی مشکل سے باتھ روم میں تھوڑا سا وقت گزارا اور باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی بلکہ دروازہ کھولتے ہی فوجی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجھے میری سیٹ پر لا کر بٹھا دیا۔ یہاں مجھے کچھ کھانے پینے کو دیا گیا۔ یہ طیارہ کچھ نہیں تو میرے اندازے کے مطابق دو ڈھائی گھنٹے تک فضا میں اڑتا رہا۔ پھر اس نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جہاز لینڈ کر گیا۔ یہاں سے اسی طرح ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی کسی نہ معلوم منزل کی طرف

روانہ ہو گئی۔ پٹی کی وجہ سے میری آنکھیں درد کرنے لگی تھیں۔ میں نے اپنے گارڈ سے کہا کہ میری آنکھوں کی پٹی ذرا نرم کر دی جائے۔ اس کے جواب میں اس نے زور سے کہنی میری پسلیوں میں ماری اور کہا۔

"چپ بیٹھے رہو"

یہ کسی بڑے شہر کا ایئر پورٹ تھا۔ اس کا قیاس میں نے یوں لگایا کہ جب ہماری گاڑی ایئر پورٹ سے نکل رہی تھی تو گاڑیوں کی ادھر ادھر سے آنے جانے کی کافی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کسی گاڑی کے قریب سے نکل جانے کی آواز آ جاتی۔ معلوم ہوا کہ ہم کسی بڑے شہر کی سڑک پر جا رہے ہیں۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ انڈیا کا یہ کونسا شہر ہے۔ انبالے سے دو ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد دلی کے اردگرد کوئی بھی شہر ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا۔ یہ دلی کا شہر ہی ہو۔ لیکن میں بھارت کے تمام شہروں اور ان کے درمیانی فاصلوں سے تقریباً واقف ہو چکا تھا۔ انبالے سے دلی اتنا دور نہیں تھا کہ ایک کم رفتار والا فوجی طیارہ بھی دو اڑھائی گھنٹے تک سفر کرتا رہے۔ اگر مجھے شملے سے انبالے لایا گیا ہے تو ظاہر ہے بھارتی فوجی مجھے جنوبی بھارت کے کسی شہر میں لے جا رہے ہیں۔ جنوبی بھارت اتنے فضائی فاصلے پر کان پور مشرق کی طرف' امرتسر مغرب کی طرف اور جنوب کی طرف بھوپال جھانسی کی کوئی فوجی چھاؤنی ہی ہو سکتی تھی۔ میں دل میں قیاس آرائیاں کر رہا تھا اور گاڑی اب جن سڑکوں پر گزر رہی تھی وہاں کسی دوسری گاڑی کے گزرنے کی باہر سے آواز نہیں آ رہی تھی۔ یہ کوئی سنسان اور غیر آباد علاقہ تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ گاڑی ایک نشیب میں سے گزر کر دائیں طرف مڑی تو اس کی رفتار کم ہو گئی۔ کسی بڑے گیٹ کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔

گاڑی جیسے گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ مجھے گاڑی سے نکال کر فوجی گارڈ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ اس کے بعد ایک کمرے میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے کہا۔

"بیٹھ جاؤ"

میں بیٹھ گیا۔ نیچے بوریا یا کوئی کمبل تھا۔ اس کے بعد میری آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس مصیبت سے تو جان چھوٹی۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو آہستہ آہستہ ملتے ہوئے میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں ایک کمرے میں تھا۔ جس کے سامنے ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے پاس بلب کی دھیمی روشنی میں مجھے دو فوجی کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے ملٹری پولیس کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ باہر نکل گئے۔ میں نے سب سے پہلے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے تین بج کر ۲۰ منٹ ہو رہے تھے۔ کمرے میں صرف دو سٹول کونے میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ دروازہ سلاخ دار نہیں تھا۔ کمبل کا رنگ سرخ تھا جو بے حد میلا ہو رہا تھا۔ فضا میں وہ سردی نہیں تھی جو شملے یا انبالے میں تھی۔ اس سے میں اس نتیجے میں پہنچا کہ مجھے جنوبی بھارت کے کسی شہر میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ جب شمالی بھارت میں سردیوں کا موسم ہوتا ہے تو نیچے جنوب میں سردی نہیں ہوتی۔ بھوپال جھانسی اور جبل پور تک رات کو ضرور ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ جب کہ ان شہروں کے جنوب میں ناگ پور بیج واڑہ کے علاقوں میں رات کو بھی سردیوں کے موسم میں ٹھنڈ نہیں ہوتی۔

یہ کون سا شہر ہو گا؟ میں سوچنے لگا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ضرور کوئی فوجی کیمپ تھا اور میں ملٹری انٹیلی جینس پولیس کے ٹارچر کا نشانہ بننے والا تھا۔ میں نے دل میں کہا ابھی تو آرام کرنا چاہئے۔ صبح جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں کمبل پر دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ دن نکلنے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں بہرحال سو گیا۔ بمشکل ایک گھنٹہ سویا ہوں گا کہ کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا کر بٹھا دیا۔

"چلو اٹھو"

ایک فوجی میرے سر پر کھڑا تھا۔ اس کا اردو بولنے کا لہجہ دلی کے علاقے کا نہیں تھا۔ وہ مجھے لے کر کمرے کے باہر برآمدے میں آگیا۔ یہاں دو اور باوردی فوجی کھڑے تھے۔ دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر دھوپ نہیں تھی۔ برآمدہ زمین سے اونچا تھا۔ سامنے درختوں کے نیچے کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک طرف کچھ فوجی ہاتھوں میں گن لئے

جا رہے تھے۔ میرے آگے پیچھے دو دو فوجی چل رہے تھے۔ چاروں فوجی مسلح تھے۔ برآمدے کے کونے میں چھوٹا سا دروازہ تھا۔ ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ زینے میں اندھیرا تھا اور ڈیٹول کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے مجھے کسی آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا ہے۔ نیچے ایک تہہ خانے کا چھوٹا کمرہ تھا جس میں لوہے کا سٹریچر پڑا تھا۔ دو آدمی ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہنے کھڑے تھے۔ ان کے قریب دو فوجی افسر بھی کھڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ چھوٹی ٹیبل پر مجھے ٹارچر کرنے والے کچھ اوزار نظر آئے۔

یہ ٹارچر سیل تھا۔

میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھ کر اللہ سے دعا مانگی کہ یا پاک پروردگار مجھے ہمت عطا کرنا کہ میں اس آزمائش میں سرخ رو ہو کر نکلوں۔ مجھے لوہے کے سٹریچر پر بٹھا دیا گیا۔ فوجی افسر میرے قریب آگئے۔ چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے ان کے کندھوں پر رینک کے نشانوں کو دیکھا۔ ان میں ایک کیپٹن اور ایک صوبیدار میجر تھا۔ وہ سٹول کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور انہوں نے وہی باتیں شروع کر دیں جو ایسے موقعوں پر اکثر کی جاتی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں انہیں اپنے کمانڈو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا اور پاکستان کے بارڈر پر پہنچا دیا جائے گا۔ وہ اسی قسم کی باتیں بڑے ہمدردانہ لہجے میں مجھ سے کرتے رہے۔ میرا یہ کہنا بے کار تھا کہ میں پاکستانی جاسوس یا کشمیری مجاہد نہیں ہوں۔ کیونکہ ان لوگوں کو میرا سارا اگلا پچھلا ریکارڈ مل چکا تھا اور وہ میری ساری کمانڈو وارداتوں سے واقف تھے۔ میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ جتنا چاہے مجھ پر تشدد کر لیں۔ مجھے ٹارچر کر لیں۔ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے سول عدالت میں پیش کیا جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ سول عدالت میں مجھ پر غیر ملکی جاسوس ہونے کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا اور مجھے زیادہ سے زیادہ دس گیارہ سال کی قید کی سزا ہو جائے گی۔ اس طرح مجھے سول جیل سے فرار ہونے کا آسانی سے موقع مل سکے گا۔ میری باتوں پر دونوں فوجی خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر وہ اٹھ کر پیچھے ہو گئے۔ کیپٹن نے

سفید کپڑے والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے سٹریچر پر لٹا دیا۔ سٹریچر کی دونوں جانب لوہے کی زنجیریں تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں ان زنجیروں سے سٹریچر کے ساتھ جکڑ دیئے گئے پھر میری پتلون اتار دی گئی۔ اور ٹارچر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں ٹارچر کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ انہوں نے مجھے جس طرح ٹارچر کیا اور جیسی جیسی اذیتیں دیں اس کا آپ شاید تصور بھی نہ کر سکیں۔ میں نے اپنے اوپر ٹریننگ کے مطابق کسی حد تک بے حسی کی حالت طاری کر لی تھی مگر جب نشتر آپ کے جسم کے نازک حصوں میں چبھویا جائے اور بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں تو یہ بے حسی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری ٹریننگ بھی مجھے اذیت کی تکلیف سے نہ بچا سکی تھی۔ سٹریچر کا ہینڈل گھما کر اسے ٹانگوں کی جانب سے اونچا کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے سائنٹیفک طریقوں سے ٹارچر کر رہے تھے۔ جب درد ناقابل برداشت ہو جاتا تو یقین کریں میری چیخ نکل جاتی۔ درد اس سے بھی آگے گزر جاتا تو میں بے ہوش ہو جاتا۔ مجھے کوئی دوا سنگھا کر فوراً ہوش میں لایا جاتا۔ ہر بار ہوش میں لائے جانے کے بعد مجھ سے کہا جاتا۔

"اگر اب بھی تم اپنے ساتھیوں کے نام ٹھکانے بتا دو گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے زبان بند رکھی تو یہاں سے زندہ باہر نہ جا سکو گے۔"

مگر میں ہر بار درد سے کراہتے ہوئے یہی کہتا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں میں اکیلا ہوں۔"

خدا جانے کب تک ٹارچر کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے دو فوجیوں نے اٹھایا اور اسی پہلے والے کمرے میں لا کر ڈال دیا۔ میں خدا جانے کتنی دیر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ پھر ذرا ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا بدن اکڑ گیا ہے۔ پیٹ پر ناف کے نیچے درد ہو رہا تھا۔ میں لیٹے لیٹے ہاتھ نیچے لے گیا۔ جہاں مجھے نشتر چبھوئے گئے تھے۔ وہاں ایک لمبی ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ سر پتھر بن گیا تھا۔ ہاتھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے کلائی اٹھا کر وقت دیکھنا

چاہا۔ میری کلائی کی گھڑی غائب تھی۔ چھت پر بلب جل رہا تھا۔ میری رانوں پر بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے۔ ٹانگیں سن ہو رہی تھیں۔ میں نے پاؤں ذرا سے ہلائے۔ پاؤں ہلنے لگے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ میری ٹانگوں میں جان باقی تھی۔

پھر دو آدمی اندر آئے۔ میں نے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ دونوں نے ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ مگر یہ وہ آدمی نہیں تھے جنہوں نے مجھ پر تشدد کے درندہ صفت حربے آزمائے تھے۔ انہوں نے مجھے کوئی انجکشن لگایا اور چلے گئے۔ انجکشن لگنے کے بعد میرے جسم میں طاقت سی آ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ میرے بدن پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ صرف ناف کے نیچے جہاں نشتر زنی کی گئی تھی دوائی والی ٹیپ لگی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو دبایا۔ ٹانگوں میں زندگی کی حرارت آہستہ آہستہ واپس آ رہی تھی۔ اس کے بعد مجھے کھانا دیا گیا۔ ٹین کے مگ میں سبزیوں کا سوپ تھا۔ ساتھ دو روٹیاں تھیں۔ میں نے کھانا زہر مار کیا اور لیٹ کر خدا کو یاد کرنے لگا۔ وقت کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ دن کتنا گزر گیا ہے۔ کمرہ بند تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی روشندان نہیں تھا۔ دیواریں خالی تھیں۔ صرف چھت والا بلب جل رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو مجھے باہر برآمدے میں بھی بلب کی روشنی دکھائی دی۔ جس سے معلوم ہوا کہ باہر رات ہو گئی ہے۔

ایک فوجی میرے لئے کھانا لایا تھا۔ مگ میں پانی تھا۔ تھالی میں دو روٹیاں تھیں جس پر دال رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس فوجی سے وقت پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور تھالی مگ میرے آگے رکھ کر چلا گیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن جب مجھے چائے کے ساتھ ایک مکھن بند لا کر دیا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ دوسرا دن چڑھ آیا ہے۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ مجھے صبح شام کھانا پانی دیا جاتا تھا۔ میرے پیٹ پر جو زخم لگے تھے ان کی درد کم ہو گئی تھی۔ بدن میں بھی توانائی واپس آ گئی تھی۔ دو دن کے بعد مجھے ایک بار پھر اسی ٹارچر چیمبر میں لے جایا گیا اور ٹارچر کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اذیت کا یہ مرحلہ پہلے سے زیادہ بھیانک اور انتہائی تکلیف دہ تھا۔ میں آپ

کو نہیں بتانا چاہتا کہ انہوں نے مجھ پر تشدد اور ٹارچر کے کیسے کیسے حربے استعمال کئے۔ مگر میں نے اپنے آپ کو مضبوط بنائے رکھا۔ ہر تکلیف ہر اذیت برداشت کرتا رہا۔ اگر درد کی شدت حد سے گزر جاتی تو بے ہوش ہو جاتا۔ مجھے فوراً کوئی تیز دوائی سنگھا کر ہوش میں لایا جاتا اور ہر بار مجھ سے میرے کمانڈو ساتھیوں کے نام پوچھے جاتے۔ میں ہر بار شدید تکلیف کے عالم میں یہی کہتا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ جب ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے مزید ٹارچر کیا گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گا تو مجھے واپس کمرے میں لا کر ڈال دیا گیا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کتنی دیر تک کتنے دنوں تک جاری رہا۔ میں بھول گیا کہ مجھے کتنی بار قید خانے سے نکال کر ٹارچر چیمبر میں لے جایا گیا ہے۔ ہر بار مجھے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اور جب میں موت کے قریب پہنچ جاتا تو مجھے لا کر قید خانے کے کمرے میں پھینک دیا جاتا۔ وہاں دو تین دن تک مجھے کچھ نہ کہا جاتا۔ مجھے اچھا کھانا دیا جاتا۔ مجھے انجکشن لگائے جاتے۔ جب میرا جسم ذرا طاقت پکڑتا تو ٹارچر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔

ایک بار مجھے ٹارچر چیمبر سے لا کر قید خانے کے کمرے میں ڈالا گیا تو میری حالت بہت خراب تھی۔ جسم میں جیسے بالکل جان نہیں رہی تھی۔ زخم کوئی نہیں تھا مگر سارا بدن پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا۔ اب مجھے یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ مجھے کس قسم کا ٹارچر کیا جا رہا ہے۔ میں نے بے بسی کے عالم میں گویا اپنا جسم ان درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جو اس پر اذیت رسانی کے ہر قسم کے تجربات کر رہے تھے۔ ایک وقت ایسا آگیا کہ مجھ پر کسی اذیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران میں نے اپنی زبان بند رکھی اور وہ لوگ مجھ سے ذرا سا راز بھی حاصل نہ کر سکے۔ جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں مر جاؤں گا مگر انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا تو ایک روز دن کے وقت مجھے کمرے سے باہر نکال کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔ نقاہت سے میرا سر اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتا تھا۔ ادھر ادھر ڈولنے لگتا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی قوت ارادی سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ شاید یہ مجھے کسی دوسرے ٹارچر

سیل میں لے جا رہے تھے۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا مجھے کہاں کہاں سے گزار کر کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی تک مجھے یہ بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ بھارت کا کونسا شہر ہے۔ کون سے شہر کی چھاؤنی کا فوجی کیمپ ہے۔ میں ویسے بھی ان باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے یہ ساری زندگی مجھے ٹارچر کرتے رہیں میں ان کا تشدد برداشت کرتا رہوں گا۔ مگر اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔

باہر کی خوشگوار تازہ ہوا نے میرے جسم کو تھوڑا سا سکون دیا تھا۔ میں نے ایک دو بار آنکھیں کھول کر جیپ کی ترپال میں بنے ہوئے چوکور روشندان کی طرف دیکھا۔ درخت ہی درخت پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر ترپال کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فوجی جیپ کافی دیر تک چلتی رہی۔ پھر ایک جگہ رک گئی۔ جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا۔ وہاں پہلے سے دو مسلح فوجی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ میں نے نیلی وردی والے ایک آدمی کو بھی دیکھا۔ اس کی وردی سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ضرور انڈین ایئر فورس کا آدمی ہے۔ مجھے کھینچ کر جیپ سے باہر نکالا گیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹے سے ایئر پورٹ کے کنٹرول ٹاور کے پاس کھڑا ہوں۔ دور کچھ فاصلے پر انڈین ایئر فورس کا ایک طیارہ کھڑا تھا۔ سفید اور نیلے رنگ کی ایک دوسری جیپ تیزی سے آکر ہمارے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کو ایئر فورس کا ایک آدمی چلا رہا تھا۔ میرے ساتھ تین انڈین آرمی کے مسلح فوجی تھے۔ انہوں نے مجھے دوسری جیپ میں دھکیلا اور میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ جب جیپ اس طیارے کی طرف چل پڑی جو دور رن وے پر کھڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے یہاں سے کسی دوسرے شہر انڈین ایئر فورس کے کسی ٹارچر سنٹر پر لے جایا جا رہا ہے۔ اب میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں فرار ہونے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے موت کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ کیونکہ میں ٹارچر کے سلسلے کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر مجھے مرنا ہی تھا تو میں دشمن کی اذیتیں برداشت کرتے رہنے کی بجائے فرار کی کوشش کرتے ہوئے مرنا چاہتا تھا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ اگر مجھے ذرا سا بھی موقع مل گیا تو میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

میں نے ایک فوجی سے پوچھا۔

"یہ کونسا شہر ہے"

اس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"اب پوچھ کر کیا کر لے گا کہ یہ کونسا شہر ہے خاموش بیٹھا رہ۔"

میں نے اس کے فقرے کی حقیقت کو اس وقت سمجھنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ یہ حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ جیپ فوجی طیارے کے پاس جا کر رک گئی۔ کھلی جیپ تھی طیارہ دن کی روشنی اور دھوپ میں صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک پنکھے والا ایئر فورس کا چھوٹا طیارہ تھا۔ جس کی تین کھڑکیاں تھیں۔ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ مجھے آرمی کے تینوں فوجیوں نے پکڑ کر چلاتے ہوئے طیارے کے اندر لا کر ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہاں پہلے سے ایئر فورس کی وردی میں ملبوس دو آدمی کھڑے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مجھے ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دکھائی دیئے۔ جیسے کہہ رہے ہوں اس کے بعد نہ تم ہمیں دیکھ سکو گے نہ ہم تمہیں دیکھ سکیں گے۔ میں نے ان تاثرات کو جذبہ ترحم سمجھا اور سر جھکا کر طیارے کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ سیڑھی ہٹا دی گئی۔ طیارے کا انجن سٹارٹ ہوا۔ طیارہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر رن وے پر اپنے خاص مقام پر آ کر طیارے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کے بعد وہ فضا میں بلند ہو گیا۔ طیارے نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور پھر آہستہ آہستہ بلندی پر جا کر ایک طرف پرواز کرنے لگا۔ مجھے ایسی جگہ پر بٹھایا گیا تھا جہاں سے میں باہر اور نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ طیارے کو سیدھا پرواز کرتے دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ آرمی کے دو فوجی میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میری ہتھکڑی طیارے میں سوار کراتے وقت کھول دی گئی تھی۔ میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ وہ اچانک کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے جہاز کے دروازے کے پاس لے آئے جہاں سیڑھی لگا کر مجھے جہاز میں سوار کیا گیا تھا۔ وہاں طیارے کے عملے کا ایک آدمی پہلے سے جیسے تیار کھڑا تھا۔ دہشت اور خوف سے میرا جسم ایک دم سرد پڑ گیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنے

والے ہیں۔ جیسے ہی فوجی مجھے دروازے کے پاس لائے وہاں جو ایئر فورس کا آدمی کھڑا تھا اس نے ہک نیچے کر کے دروازہ اوپر کو اٹھا دیا۔ ہوا کا زبردست تھپیڑا مجھے لگا اور میں وہیں فرش پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دونوں فوجیوں نے فوراً مجھے پیچھے سے دھکیلا اور میں طیارے کے دروازے سے باہر گر گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ گرنے سے پہلے اس طرح پھیلا دیئے تھے۔ جیسے ڈوبنے سے پہلے آدمی تنکے کو بھی پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا ہاتھ بائیں جانب دروازے کے ساتھ جو سیٹ تھی اس پر پڑ گیا۔ اس سیٹ کے پیچھے چمڑے کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ اوپر سے فوجیوں نے میرے بازو پر زور سے ٹھڈے مارے تو سیٹ پر سے میرا ہاتھ چھوٹ کر چمڑے کی بیلٹ پر آیا تو میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اب میں طیارے کے باہر چمڑے کی بیلٹ کے ساتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ ہوا کے شدید تھپیڑے مجھے ادھر سے ادھر جھلا رہے تھے۔ میں نے بیلٹ کو اب دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ طیارہ چھوٹا تھا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ہوا کے دباؤ سے ڈولنے لگا۔ مجھے اوپر سے کسی کے انگریزی میں چلانے کی آواز آئی۔

"اسے شوٹ کیوں نہیں کرتے"

اس کے ساتھ ہی جہاز نیچے کو غوطہ لگا گیا۔ اس سے جہاز کی بلندی کم ہونا شروع ہو گئی۔ موت سامنے نظر آ رہی ہو تو آدمی کے جسم کی چھپی ہوئی طاقتیں بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔ میرے جسم میں بھی خدا جانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی۔ میں نے چمڑے کی بیلٹ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور ہوا کے تھپیڑے مجھے جھولا جھلا رہے تھے۔ اچانک اوپر سے فائر ہوا۔ گولی میرے سر کے قریب سے ہو کر نکل گئی۔ میں نے نیچے دیکھا۔ طیارے کی بلندی اس کے ڈولنے کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ میرے نیچے پہاڑیاں اور جنگلوں کے درخت نظر آ رہے تھے۔ اوپر سے ایک اور گولی چلی یہ گولی بھی میرے ادھر ادھر ڈولنے کی وجہ سے نشانے پر نہ لگی۔ اوپر سے سٹین گن کا برسٹ فائر ہوا تو میں نے بیلٹ کو ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ بیلٹ کو چھوڑتے ہی میں فضا میں قلابازیاں کھاتا نیچے گرنے لگا۔ ہوا میرے جسم کو میرے کانوں اور چہرے کو جیسے چھیلتی ہوا نیچے سے اوپر کو جا رہی تھی۔ میں نے فوراً

اپنی دونوں ٹانگیں اور بازو کھول کر پھیلا دیئے۔ اس سے اتنا ہوا کہ میں پتھر کی طرح نیچے گرنے کی بجائے ہوا میں گلائیڈ کرنے لگا۔ لیکن زمین تیزی سے اوپر آرہی تھی۔ درخت مجھے چکنا چور کرنے کے لئے میری طرف بڑی تیزی سے اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک طرف سے تیز ہوا کا زبردست تھپیڑا مجھے لگا اور میں بائیں جانب کو سوکھی شاخ کی طرح فضا میں اڑتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کے بعد پھر نیچے گرنے لگا۔ میں نے دل میں کلمہ پڑھا خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنی جان اس کے سپرد کرنے کو تیار ہو گیا۔ میری موت یقینی تھی۔ ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے کے اندر اندر میری ساری زندگی کی فلم میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔ مجھے اپنی چھوٹی شہید بہن کلثوم کا خیال آیا جس کو پاکستان بنتے وقت سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکہ مجھے سنائی دیا میرے جسم کو زبردست دھچکا لگا اور میں نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا۔ آہ! موت کتنی آسان تھی۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ صرف ایک دھچکا لگا تھا اور میں موت کی گودی میں اترتا جا رہا تھا۔ اچانک میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ مرنے کے بعد میرا دم کیوں گھٹ رہا ہے۔ کیا میں ابھی تک مرا نہیں؟ تب مجھے اپنے اردگرد پانی کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور دھچکا لگا اور میرا جسم گرتے گرتے کسی جگہ لگ کر رک گیا۔

اب مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔ اور طیارے سے گرائے جانے اور چمڑے کی بیلٹ کو چھوڑنے کے بعد میں کسی درخت یا پہاڑی چٹان پر نہیں گرا بلکہ کسی تالاب یا جھیل یا دریا میں گرا ہوں۔ فوجی طیارے سے گرتے وقت میرا سیٹ بیلٹ کو پکڑ کر کچھ دیر تک ہوا میں لٹکتے رہنا اور پھر بیلٹ کو چھوڑ دینے کے بعد ہوا کے تیز تھپیڑے کا مجھے اٹھا کر کچھ دور آگے لے جانا میرے لئے نئی زندگی کا پیغام ثابت ہوا اور یوں میں عین گہرے پانی کے اوپر آکر گرا۔ ورنہ اگر میں وہاں گرتا جہاں بھارتی فوجیوں نے مجھے طیارے سے دھکا دے کر گرایا تھا تو اس وقت تک میں زندہ نہ ہوتا۔ میں نے تیزی سے اپنے آپ کو پانی کی تہہ کے کیچڑ سے اوپر کو اٹھایا۔ پانی کی تہہ میں کیچڑ کی موٹی

تہہ تھی جس کے اندر میں آدھے سے زیادہ دھنس گیا تھا۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں بہت اچھا تیراک بھی تھا اور مجھے پانی کے اندر سانس روک کر زیادہ سے زیادہ دیر تک چھپے رہنے کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس وقت میرا جسم ذرا بھی درد نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں پانی کی سطح سے باہر نکل آیا۔ اور تیرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ تالاب نہیں تھا۔ اگر میں کسی تالاب میں گرتا تو زندہ نہ بچتا۔ کیونکہ تالاب کتنا بڑا کیوں نہ ہو جھیل جتنا گہرا نہیں ہوتا اور ہندوستان کے وسطی جنگلوں میں گہری اور کشادہ جھیلیں عام پائی جاتی ہیں۔ برما کے جنگلوں میں تو بعض جھیلیں سمندر کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ جھیل بھی چھوٹا سا سمندر ہی ہوتا ہے۔ اس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا۔ آس پاس کی پہاڑیوں کے علاوہ جھیلوں کی تہہ سے بھی پانی نکل نکل کر جمع ہوتا رہتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جھیل بھی سمندر ہی ہوتا ہے جو خشکی کے بیچ میں آگیا ہوتا ہے۔ تیرتا تیرتا میں کنارے کے سرکنڈوں میں سے نکل کر کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ اب مجھے شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہیں کنارے پر لیٹ گیا۔ میرے اوپر گھنے درختوں کا سایہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں دیر تک لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ جب مجھے ذرا سکون نصیب ہوا تو میں نے لیٹے لیٹے اپنے جسم کو ہاتھ لگا کر ٹانگوں، گھٹنوں کا جائزہ لیا۔ میری ہڈیاں سلامت تھیں۔ جسم کے کسی حصے میں درد بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ صرف طیارے سے گرنے کا خوف تھا جس کا جسم پر ابھی تک اثر تھا اور اگر میں مضبوط اور کسرتی اور تربیت یافتہ جسم کا مالک نہ ہوتا تو شاید اتنی جلدی میرے بدن کی توانائی واپس نہ آتی۔ میں دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جوتے اتار دیئے۔ میری جیکٹ ٹارچر چیمبر میں ہی اتار لی گئی تھی۔ میں نے پتلون کو اتار کر تھوڑا سا نچوڑا اور اسے پھر پہن کر اسی جگہ بیٹھا۔ سامنے اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

یہ جھیل جس کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وسطی ہندوستان کے کسی پہاڑی سلسلے میں واقع تھی۔ میرے سامنے اور دائیں بائیں دور مجھے اونچی نیچی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ جھیل کے کنارے کنارے اونچی چھتریوں والے درخت تاحد نظر تک چلے گئے تھے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بھی پہاڑ کھڑے تھے۔ ہوا جیسے بند تھی۔ فضا میں حبس سا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی درخت پر کوئی پرندہ بول کر چپ ہو جاتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ بھارتی فوجی میری تلاش میں وہاں آجائیں گے۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے مجھے طیارے سے نیچے پھینک کر ہلاک کر چکے تھے۔ وہ لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اتنی بلندی سے نیچے پہاڑیوں میں گرنے کے بعد زندہ بچ گیا ہوں گا۔ میں نے سوچا [illegible] اٹھ کر چلا جائے اور معلوم کرنا چاہئے کہ میں کہاں ہوں۔ یہ جنگل کہاں تک چلا گیا ہے اور اس جنگل کے قریب ہندوستان کا کونسا شہر ہے۔ میرے پاس سوائے میرے چمڑے کے جوتوں' پتلون اور قمیض کے اور کچھ نہیں تھا۔ اونچے اونچے درختوں کی شاخوں میں سے پھیکی پھیکی دھوپ نیچے آرہی تھی۔ یہاں درخت اتنے گنجان نہیں تھے۔

جب میں چلنے لگا تو مجھے میری بائیں ٹانگ میں درد محسوس ہوا۔ پھر بھی میں چلتا رہا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد درد میں اضافہ ہوگیا۔ ٹانگ پر زور دیتا تو درد کی ٹیس اٹھتی۔ میں نے زمین پر سے ایک درخت کی موٹی ٹہنی اٹھا کر اس کے پتے صاف کئے اور اس کے سہارے چلنے لگا۔ اس طرح چلنے سے مجھے کچھ آرام مل گیا۔ میں نے جس طرف منہ اٹھایا

تھا اسی طرف چل رہا تھا۔ میں جنگل میں درختوں کے درمیان تھوڑی دور تک چلا ہوں گا کہ مجھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے بڑے رعب سے دیہاتی زبان میں پوچھا۔

"کونو ہو۔ تہاڑے رہو۔"

میں وہیں رک گیا۔ وسطی ہند کے جنگل اور یہاں کے جنگلی اور دیہاتی لوگ میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ ان جنگلوں کی میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اور اس کے بعد بھی کمانڈو کارروائیوں کے سلسلے میں بھی کافی خاک چھانی تھی۔ میں نے بولنے والے کی آواز اور اس کے رعب دار لہجے سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی سیدھا سادا دیہاتی نہیں ہے۔ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔

اتنے میں تین آدمی درختوں کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آگئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے پوچھتے کہ میں کون ہوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ چنانچہ میں کھڑے کھڑے لاٹھی کے سہارے کانپنے لگا۔ ساتھ ساتھ کراہتا بھی جا رہا تھا۔ پھر میں نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی مجھے بچالو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

اور اس کے ساتھ ہی میں اداکاری کرتے ہوئے گر پڑا اور ظاہر کیا کہ میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ میں نے ان تینوں آدمیوں کے کاندھوں پر لگی ہوئی رائفلیں دیکھ لی تھیں۔ ان کے تنگ پاجامے اور کمر تک آئے ہوئے گھیردار کرتے تھے۔ سروں پر پگڑیاں تھیں جن کے شملے اوپر اٹھا کر انہوں نے ٹھوڑیوں سے اوپر سروں پر باندھے ہوئے تھے۔ یہ حلیے بھوپت ڈاکو کے ساتھیوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہ میرے قریب ہو کر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی ساری باتیں میں اس علاقے کی ٹھیٹھ دیہاتی ہندی زبان میں نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ اب وہ زبان مجھے اتنی روانی سے یاد نہیں رہی۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے یاد ہے۔ چنانچہ میں ان کے الفاظ اپنی زبان میں لکھوں گا۔ ایک نے کہا۔

"ارے لکھو! یہ کسی ٹھاکر کا بیٹا لگتا ہے جس کے پیچھے اس کے دشمن لگے ہیں"

دوسرے نے کہا۔

"تم کیسے کہہ رہے ہو؟"

پہلے نے کہا۔

"تو پھر کسی کو اسے مارنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ ارے لکھو لڑکا جوان ہے خوش شکل ہے۔ ضرور اس کو جائیداد کی خاطر دولت کی خاطر اس کے تائے چاچا مارنا چاہتے ہوں گے۔"

تیسرا بولا۔

"تو پھر ہمیں اس بک بک سے کیا لینا ہے بھیا! اس کو یہاں ہی چھوڑو اور ڈیرے پر چلو۔ کہیں اس کے پیچھے پولیس ہی نہ لگی ہو۔ خوامخواہ ہم بھی پھنس جائیں گے۔"

میں سب کچھ سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ اتنا میں ضرور چاہتا تھا کہ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ اگر کسی کے دوست بن جائیں تو پھر بڑے رخادار اور جانثار دوست ثابت ہوتے ہیں۔ میری جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ایک ایسے جنگل میں غیر معلوم مدت تک چلتا چلا جاؤں۔ مجھے آرام اور تھوڑی بہت خوراک کی بھی ضرورت تھی تاکہ اپنی طاقت بحال کرنے کے بعد واپس اپنے کمانڈو مجاہد ساتھیوں کے پاس کشمیر جاؤں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک ان لوگوں کو مجھ سے کوئی لالچ نہیں ہوگا۔ یہ کبھی اٹھا کر مجھے اپنے ڈیرے پر نہیں لے جائیں گے اور ان کے ڈیرے پر جا کر ہی مجھے خوراک کے علاوہ کچھ دیر کے لئے آرام مل سکتا تھا۔ میں اگر ان سے کسی طرح پیچھا چھڑا کر کسی قریبی قصبے یا شہر کی طرف بھی نکل جاتا تو وہاں اول تو مجھے کوئی کچھ دنوں کے لئے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے مشکوک سمجھ کر کوئی شخص پولیس کو مخبری بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں پوری سکیم تیار کر کے کراہنا شروع کیا۔ جیسے ہوش میں آرہا ہوں۔ میں بڑبڑانے لگا۔

"جگو چاچا مجھے نہ مارو۔ میں تمہارا بھتیجا ہوں۔ ہائے مجھے نہ مارو۔ میری ساری دولت لے لو۔ مجھے نہ مارو۔"

میں نے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول رکھی تھیں۔ دولت کا سن کر میں نے دیکھا کہ تینوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نے جس کا نام لکھو لیا گیا تھا مجھ سے کہا۔

"ہوش کرو بھیا! تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔ ہم تمہارے پاس موجود ہیں۔ ہمیں بتاؤ بات کیا ہوئی تھی۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے کہا۔

"مجھے اٹھا کر بٹھا دو"

انہوں نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا۔ وہ خود بھی چوکڑیاں مار کر میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"بھائی۔ میرا نام دھرم ویر ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر جو بڑا قصبہ ہے۔ وہ وہ"

اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں سے قریب بڑا قصبہ کونسا ہے۔ اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہاں قریب یا دور کوئی نہ کوئی بڑا قصبہ ضرور ہوگا۔ میں نے اپنے اوپر نقاہت طاری کر لی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"بولو بولو۔ کونسا قصبہ؟ کیا تم امرالی قصبے کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ ہاں۔ امرالی میں امرالی کے ٹھاکر دیوان ویر سنگھ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میرے ماتا پتا سورگباش ہو گئے ہیں۔ پتاجی کی میں ساری جائیداد کا اکلوتا مالک ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پتاجی نے سونے چاندی کی دو سو ڈلیاں اور کچھ ہیرے جواہرات ایک ہانڈی میں بند کر کے حویلی کے اندر میرے سامنے ایک خفیہ جگہ پر زمین میں دبا دیئے تھے اور کہا تھا جب تم کو زندگی میں کبھی کاروبار میں گھاٹا پڑ جائے اور دولت کی ضرورت پڑے تو یہ ہانڈی یہاں سے نکال کر اس کی دولت سے کوئی نیا کاروبار شروع کر دینا۔ میرے چاچا لال جگت سنگھ کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ حویلی میں کسی جگہ سونے کی ڈلیوں اور جواہرات والی ہانڈی میرے پتاجی نے دفن کر رکھی ہے اور اس کا راز صرف مجھے ہی معلوم ہے۔ اس نے مجھ سے پہلے تو محبت پیار سے یہ راز حاصل کرنے کی کوشش کی جب میں نے بتانے

سے صاف انکار کر دیا تو کل رات کو وہ مجھے اپنے غنڈوں کی مدد سے باندھ کر جنگل میں لے آیا۔ اور مجھے اس قدر مارا کہ میں نیم بے ہوش ہو گیا اس کے بعد ان غنڈوں نے مجھے جھیل میں پھینک دیا اور چلے گئے۔ میری قسمت اچھی تھی کہ جھیل میں گرتے ہی مجھے ہوش آ گیا۔ میں کسی نہ کسی طرح جھیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر مار کھانے کی وجہ سے میرا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ میں باہر نکلتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ دن کے وقت ہوش آیا۔ اب وہاں سے درخت کی شاخ پکڑ کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ کسی طرح تھانے پہنچ کر چچا کے خلاف رپورٹ درج کراؤں۔"

تینوں جرائم پیشہ آدمیوں کی جو یقیناً چھوٹے موٹے چور ڈاکو لگ رہے تھے۔ میری کہانی سن کر باچھیں کھل گئیں۔ میری سکیم کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔

"ارے بھیا جی! تمہیں پولیس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس تو تمہارا سارا مال ہڑپ کر جائے گی اور تمہارے چچا کو بھی نہیں پکڑے گی۔ ہم تمہیں تمہارا مال دلوائیں گے۔ ہم تمہارے ظالم چچا سے تمہارا بدلہ لیں گے۔"

لکھو بولا۔

"ارے ٹھاکر! ہم تمہارے چچا کو یہاں بلا کر اس کی مرمت کریں گے۔ اس کی کیا مجال ہے کہ تمہاری دولت تم سے چھین سکے۔"

دوسرا کہنے لگا۔

"ارے ہم تمہارے ظالم چچا کو ختم ہی کر دیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ پھر تم ساری دولت کے مالک ہو گے۔ بے شک اپنی مرضی کا کاروبار کرنا۔ کوئی زمینداری خرید لینا۔ چلو ہمارے ساتھ ڈیرے پر چلو۔ ہم تمہارے دوا دارو کا بندوبست کرتے ہیں۔ بس اب تم بے فکر ہو جاؤ۔"

تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ انہوں نے مجھے اس قدر احتیاط کے ساتھ زمین پر سے سہارا دے کر اٹھایا جیسے میں کوئی انتہائی نازک اور قیمتی چیز ہوں۔ لکھو بولا۔

"ارے بابو صاحب کو کاندھے پر بٹھا لو رامو"

دوسرے آدمی کا نام رامو تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ بھیا اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چل سکتا ہوں۔"

رامو نے مجھے بازو سے تھام لیا اور میں لاٹھی کے سہارے ان کے ساتھ جنگل میں چل پڑا پہلے تو درخت دور دور تھے۔ پھر قریب قریب آتے گئے۔ اور جنگل بہت گھنا ہو گیا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی ندی بھی آئی۔ وہ آپس میں اشاروں کنایوں میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان میں سے دو سگریٹ پی رہے تھے۔ ایک بیڑی پی رہا تھا۔ لگتا تھا کہ میری موجودگی میں وہ کسی موضوع پر کھل کر بات نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن میں کوئی اناڑی نہیں تھا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی جگہ ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ندی پار کر کے چند قدم چلے تو ایک طرف چھوٹا سا ٹیلہ نظر آیا۔ ٹیلے کے پاس درختوں کے نیچے چھ سات گھوڑے کھڑے تھے۔ ایک آدمی ان کے آگے چارہ وغیرہ رکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ لکھو بولا۔

"ارے گھور کے کیا دیکھتا ہے یہ اپنے ٹھاکر صاحب ہیں۔ ہاں۔ چل جلدی سے چل کر چائے پانی کا بندوبست کر۔"

ٹیلے کے اوپر ایک جگہ ان لوگوں نے اپنا ڈیرہ بنایا ہوا تھا۔ تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ دو چولہوں میں آگ جل رہی تھی۔ ایک چولہے پر ایک آدمی روٹیاں پکا رہا تھا۔ دوسرے چولہے پر بڑا سا پتیلا دھرا تھا۔ جس میں کچھ پک رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا پیاز کاٹ رہا تھا۔ ان آدمیوں نے بھی میری طرف غور سے دیکھا۔ لکھو اور رامو نے انہیں بھی یہی کہا کہ یہ اپنے بابو صاحب ہیں۔ ٹھاکر دیوان ویر کے پتر ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ روز مہمان رہیں گے۔ ٹیلے کی دیوار میں ایک غار کا منہ نظر آ رہا تھا اس کے آگے سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ پاس ہی درختوں کی شاخوں کو کاٹ کر بنائی گئی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کے باہر بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ مجھے چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے لئے چائے کا گلاس آ گیا۔ میں خاموشی سے چائے پینے لگا۔ چائے نے میرے جسم میں ایک چستی سی پیدا کر دی۔ ٹانگ میں تھوڑا تھوڑا درد ضرور ہو رہا تھا۔ رامو بولا۔

"ارے بابو جی! تمہارے کپڑے گیلے ہو رہے ہیں۔ یہ اتار کر دوسرے پہن لو۔ ہم اسے سکھائی دیتے ہیں۔"

ایک آدمی میرے لئے دھوتی کرتا لے آیا۔ میں نے پتلون قمیض اتار کر دھوتی کرتہ پہن لیا۔ لکھو نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔

"چل بے۔ ندی پر جا کر ان کو دھو کر لے آ اور سکھانے کے لئے ڈال دے۔"

میرے بدن پر ٹارچر سیل میں مجھ پر کئے گئے تشدد کے نشان سوائے میرے پیٹ پر کی گئی نشتر زنی کے زخم کے اور کہیں بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ لیکن ایک آنکھ ایک طرف سے سوجی ہوئی تھی۔ چوٹیں زیادہ تر جسم کے اندر لگی تھیں۔ طیارے سے گرنے کی وجہ سے بائیں ٹانگ میں بھی درد کی ٹیسیں پڑ رہی تھیں۔ لکھو کوئی خاص قسم کا تیل لے آیا۔ کہنے لگا۔

"اس کی مالش سے درد ختم ہو جائے گا۔ وہ میری ٹانگ اور جسم کے دوسرے حصوں پر تیل کی مالش کرنے لگا۔ اس آؤ بھگت کی وجہ ہیرے جواہرات اور سونے کی ڈلیوں والی وہ فرضی ہانڈی تھی جو امرالی قصبے کی میری آبائی حویلی میں کسی جگہ دفن تھی اور جس کا سوائے میرے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ یہ لوگ مجھ سے وہ جگہ معلوم کرنا چاہتے تھے جہاں وہ خزانہ دفن تھا۔"

لکھو میری ٹانگ پر مالش کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھاکر بابو! امرالی کا قصبہ تو یہاں سے بہت دور گوالیار کے پاس ہے۔ تمہارا چچا تمہیں قتل کرنے کے لئے اتنی دور کیوں لے آیا تھا۔ کیا راستے میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی؟"

پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں ہندوستان کی وسطی ریاست گوالیار کے آس پاس ہوں۔ یقیناً جس ٹارچر سیل میں مجھے اذیت کا نشانہ بنایا گیا وہ گوالیار کی فوجی چھاؤنی میں ہی تھی۔ میں نے کہا۔

"چچا بگو چاہتا ہو گا کہ کسی دور دراز علاقے میں لے جا کر مجھے ٹھکانے لگائے تا کہ

پولیس کو اس پر شک نہ پڑے۔"

تین دن گزر گئے۔ ان ڈاکوؤں نے میری خوب خبر گیری کی۔ اچھا کھلاتے پلاتے۔ دوا دارو بھی کرتے رہے۔ ایک ڈاکو کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ روزانہ صبح شام میری ٹانگ کی مالش کرے۔ میری آنکھ کی سوجن بہت کم ہو گئی تھی۔ مگر بائیں ٹانگ پر ابھی میں دباؤ ڈالتا تو درد اٹھتا تھا۔ میں یہاں کچھ روز مزید قیام کر کے مکمل صحت یاب ہو کر کشمیر جانا چاہتا تھا۔ جب تک میں صحیح طور پر چل نہیں سکتا تھا میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس دوران لکھو ایک رات میرے پاس آیا اور چارپائی پر بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ وہ مجھ سے بڑی پیار محبت کی باتیں کرنے لگا۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد بولا۔

"ٹھاکر بابو! تم اپنے خاندان کی ایک ہی اولاد ہو۔ تمہارے پتاجی نے جو تمہارے لئے دولت چھپا کر زمین میں دبائی ہوئی ہے اس پر تمہارا ہی حق ہے۔ تمہارے بدمعاش چچا کا حق نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ دولت صرف تم ہی کو ملے۔ لیکن ہماری مدد کے بغیر تم اپنی دولت حاصل نہیں کر سکتے۔ تمہارا چچا تمہیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔ تم واپس جاؤ گے تو وہ تمہیں ایک بار پھر اپنے غنڈوں کی مدد سے قتل کروانے کی کوشش کرے گا۔"

میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"لکھو کاکا۔ پھر تم جس طرح کہتے ہو میں اسی طرح کروں گا۔"

لکھو کا چہرہ کھل گیا۔ بیڑی ایک طرف پھینک کر بولا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ تم ہمیں بتا دو کہ حویلی میں تمہارے پتاجی نے ہیرے جواہرات والی ہنڈیا کس جگہ دبائی ہے۔ ہم اسے نکال کر یہاں لے آئیں گے اور تمہارے حوالے کر دیں گے۔"

یہ ڈاکو خوب ترکیب بتا رہا تھا۔ مگر مجھے ابھی ان لوگوں کے ڈیرے پر کچھ دن رہ کر اپنی صحت کو بحال کرنا تھا۔ میں نے کہا۔

"لکھو کاکا! آج چاند کی کتنی تاریخ ہے؟"

میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی تھی۔ وہ بولا۔

"پہلی یا دوسری ہوگی۔ کیوں تم کس لئے پوچھ رہے ہو؟"
میں نے کہا۔

"میرے پتاجی نے سورگباش ہوتے ہوئے کہا تھا کہ ہانڈی کو چاند کی اکیس تاریخ کو زمین سے نکالنا اگر پہلے نکالو گے تو ہانڈی تمہیں خالی ملے گی۔ اس میں دولت نہیں ہوگی۔"

یہ لوگ اس قسم کی باتوں پر بہت اعتقاد رکھتے ہیں یہ مجھے معلوم تھا لکھو بولا۔

"تب تو ہمیں بیس ایک روز کے لئے ٹھہرنا ہوگا۔"

پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگا۔

"ارے بابو کوئی بات نہیں۔ تم بھی ہمارے پاس ہو۔ ہم بھی یہیں ہیں۔ بیس روز بعد چل کر ہنڈیا نکال لیں گے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حالانکہ مجھے اتنے دن وہاں ٹھہرنا نہیں تھا۔ میری ٹانگ کا درد زیادہ سے زیادہ تین چار دنوں میں ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ اس کے فوراً بعد مجھے وہاں سے چپکے سے روپوش ہو جانا تھا۔ ان لوگوں نے ایک گائے بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے روزانہ اس کا دودھ پلاتے۔ مکھن بھی کھلاتے۔ میں کچھ ہی دنوں میں پوری طرح صحت مند ہوگیا۔ ایک ہفتے بعد ٹانگ کا درد بھی جاتا رہا۔ اب میں وہاں سے کشمیر کی طرف نکل جانے کا پروگرام بنانے لگا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ کشمیر تک جانے کے لئے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ کسی طرح ایک ریوالور ہی مل جائے۔ ان ڈاکوؤں کے پاس رائفلیں اور پرانے فیشن کی دونالی بندوقیں تو تھیں مگر پستول وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ پستول کی بھی ضرورت نہیں میں کسی بہانے لکھو کا سے کچھ روپے بطور قرض لے لیتا ہوں۔ مصیبت یہ تھی کہ اب کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میں ان کی مرضی کے بغیر وہاں سے پاؤں باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ میری خفیہ طور پر نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں اگر ندی پر منہ ہاتھ دھونے کے لئے جاتا تو دو رائفل بردار ڈاکو میرے ساتھ ہوتے تھے۔ لکھو نے یہ بہانہ بنایا تھا کہ میری حفاظت

اس لئے کی جا رہی ہے کہ کہیں میرے چچا کے غنڈے یہاں آکر مجھے قتل نہ کر دیں۔

اس اثناء میں ایسا ہوا کہ رات کو باہر کچھ شور سا ہوا۔ میں جھونپڑی میں لیٹا فرار کے منصوبے بنا رہا تھا۔ پہلے دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ پھر آدمیوں کی باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اٹھ کر جھونپڑی کے باہر سر نکال کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر لیمپ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے لکھو وغیرہ کو دیکھا۔ کچھ اجنبی لوگ اپنے گھوڑوں کے پاس کھڑے لکھو اور رامو سے باتیں کر رہے تھے۔ لکھو کہہ رہا تھا۔

"دادا سکھ دیال تم نے بڑا زبردست کام کیا ہے۔ ہم کچھ نہیں تو ایک لاکھ روپیہ لے لڑکی کو چھوڑیں گے۔ ارے ہمارے پاس تو سونے کی چڑیا آکر پھنس گئی ہے۔"

اس کے پاس جو آدمی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے کہا۔

"بس اب تم اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھو۔ ہم اس کے گھر والوں سے بات کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اس کے ساتھی بھی گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ درختوں کے اندھیرے میں چل پڑے۔ لکھو نے بلند قہقہہ لگا کر رامو سے کہا۔

"ارے رامو! ہماری تو قسمت پھر جائے گی۔ لڑکی راجے مہاراجوں کے خاندان سے راج کماری ہے راجکماری۔ بس چوبیس گھنٹے اس کی پہرے داری کرنا۔"

رامو بولا۔

"دادا تم بے فکر رہو۔ سمجھو میں نے لڑکی کو صندوق میں بند کر کے چابی اپنی جیب میں رکھ لی ہے۔"

سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ ان لوگوں کے دوسرے ساتھی کسی امیر کبیر گھرانے کی عورت کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ اب اسے یرغمال بنا کر اس کے ماں باپ سے سودا کرنے والے تھے۔ اس قسم کی وارداتیں ایسے لوگ اکثر کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی اور چارپائی پر لیٹ کر

فرار کے اپنے منصوبوں پر غور کرنے لگا۔ دوسرے دن لکھو میرے پاس آیا۔ میں درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آج کسی بہانے لکھو سے میں کچھ روپے بطور قرض ضرور لے لوں گا تاکہ آج ہی رات کو میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں۔ لکھو میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور بڑی رازداری سے بولا۔

"ٹھاکر بابو! تم سے ایک بات کرنی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ لکھو یہی کہنے آیا ہے کہ میں چاند کی بیس اکیس تاریخ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ آج ہی رات کو حویلی میں چلو اور وہ جگہ دکھاؤ جہاں سونے کی ڈلیوں والی ہنڈیا دفن ہے۔ ہم اسے نکال کر یہاں لے آئیں گے۔ میں نے کہا۔

"کہو دادا! کیا بات ہے؟"

اس نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں ساری کہانی سنا دی جس کو اس کے ساتھی اغوا کر کے لائے تھے اور جس کا مجھے رات کو علم ہو چکا تھا۔ لکھو ساری کہانی سنانے کے بعد بولا۔

"ہمارے آدمی لڑکی کے باپ سے بات چیت کرنے والے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ لڑکی کے ہاتھ سے ایک خط لکھوا کر اس کے باپ کو دیا جائے جس میں وہ لکھے کہ میں یہاں سخت مشکل میں ہوں۔ اگر تم نے ایک لاکھ روپے نہ دیئے تو یہ لوگ نہ صرف میری عزت لوٹ لیں گے بلکہ مجھے قتل بھی کر دیں گے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ تم بھی پڑھے لکھے ہو۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔ اسے سمجھا سکتے ہو۔ ہم جٹ بوٹ ان پڑھ لوگ ہیں۔ تمہاری بات کا اس پر اثر ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے لڑکی کے پاس لے چلو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں"

لکھو بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"

ٹیلے کی دوسری جانب ایک جگہ چٹانوں میں ایک قدرتی سرنگ بنی ہوئی تھی۔ اس

سرنگ کے دہانے پر ایک ڈاکو رائفل لئے بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ لکھو بولا۔

"لڑکی اندر بیٹھی ہے۔ تم جا کر اسے سمجھاؤ۔ ہمیں اس سے ایک خط ضرور لکھوانا ہے۔ ہماری بات وہ نہیں مانے گی۔ تم اسے سمجھاؤ کہ ایک لاکھ روپے لئے بغیر ہم لوگ اسے یہاں سے کبھی نہیں جانے دیں گے۔"

میں سرنگ کے اندر چلا گیا۔

سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ پانچ چھ قدموں کے بعد میں نے ایک لڑکی کو دیکھا زمین پر صف بچھی تھی۔ لڑکی زانوؤں پر سر رکھے گم سم سی صف پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ ایک تھالی اور پیتل کا گلاس بھی پڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یقین کریں میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ زرد رنگ کی اس لڑکی کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ بڑی مدت کے بعد میں نے ایک انتہائی خوبصورت لڑکی دیکھی تھی۔ اس کے سیاہ بال شانوں سے بھی نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ میں پتلون قمیض میں تھا اور ڈاکوؤں سے مختلف آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بڑی شائستہ ہندی آمیز اردو زبان میں پوچھا۔

"کیا تم بھی ان ڈاکوؤں کے ساتھی ہو؟ مگر تم مجھے پڑھے لکھے آدمی لگتے ہو۔ پلیز مجھے اس سرنگ سے نکال دو۔ ان لوگوں نے مجھے بے عزت کر دیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

میں اس کے قریب ہی صف پر بیٹھ گیا۔ لڑکی کے معصوم اور پرجلال حسن نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ لڑکی کا چہرہ اس کے نقش اور اس کے گفتگو کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جہاں عزت و وقار کی خاطر جان قربان کر دینا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے۔ میں نے اسی لمحے سوچے سمجھے بغیر یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس لڑکی کو یہاں سے نکال کر اس کے ماں باپ کے گھر پہنچاؤں گا۔ میں اس کی عزت برباد نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرے دل کا فیصلہ تھا اور دل کے فیصلے بڑے صحیح ہوتے ہیں۔ میرے دماغ نے سوچنا شروع کر دیا تھا اور وہ مجھے دوسرے راستے پر ڈالنے لگا تھا کہ میں نے سوچنا بند کر دیا۔ اپنے دل کے فیصلے پر قائم ہو گیا اور لڑکی کو آہستہ سے کہا۔

"میں تمہیں اس نرگ سے نکال کر لے جاؤں گا فکر نہ کرو۔"

لڑکی کے چہرے پر ایک نور سا پھیل گیا۔ اس نے پوچھا۔

"تم ان کے ساتھی نہیں ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے تمہارے پاس کس مقصد کے لئے بھیجا ہے؟ یہ بھی تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ آج رات نہیں تو کل رات میں تمہیں یہاں سے لے چلوں گا۔"

میں اس سے بڑی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بھی دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے نارنجی کلر کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ کانوں میں سونے کے بندے تھے۔ ناخنوں پر نیل پالش لگی تھی۔ اس کے لباس سے کسی نہایت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی پرفیوم کی بڑی مدھم مدھم سی خوشبو آ رہی تھی۔ لگتا تھا یہ پرفیوم دو روز پہلے اس نے لگایا ہوگا۔ تب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کے ماتا پتا کہاں ہوتے ہیں۔ اس کا گھر کہاں ہے۔

لڑکی نے بتایا کہ اس کا نام شکنتلا دیوی ہے۔ اس کے پتاجی سورگباش ہو چکے ہیں۔ اس کی ماتا زندہ ہیں۔ ایک بڑا بھائی ہے۔ ان کی حویلی وہاں سے پچاس کوس کے فاصلے پر گوالیار جھانسی ریلوے ٹریک کے درمیان ریاست چھند واڑہ میں ہے۔ اس کا باپ ریاست کے راجہ کا دیوان تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اپنی ماں اور بڑے بھائی کے ساتھ اپنی آبائی حویلی میں رہتی ہے۔ اس نے گوالیار کے ایک کالج سے انگریزی میں ایم اے کیا ہوا ہے اور وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتی ہے۔ وہ کالی داس پر ایک کتاب بھی لکھ رہی ہے۔ ریاست سے کچھ وظیفہ ملتا ہے۔ تھوڑی سی جاگیر ہے جس پر حویلی کے ملازموں کے علاوہ دوسرے اخراجات آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ حویلی سے تھوڑی دور ایک تالاب والا چھوٹا مندر ہے۔ وہ صبح کے وقت اشنان کرنے اور پوجا کرنے اکیلی تالاب پر گئی تھی کہ کچھ ڈاکو اچانک گھوڑوں پر سوار آ گئے۔ انہوں نے

اسے وہیں دبوچ کر گھوڑے پر ڈالا اور لے گئے۔

اپنی داستان مختصراً سنانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور ان ڈاکوؤں کے پاس کیوں رہتا ہوں۔ میں نے کہا۔

"میرا نام دھرم ویر ہے۔ میرا ان ڈاکوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی ان میں پھنس گیا ہوں۔ میں خود یہاں سے فرار ہونے والا تھا۔ اب تم کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

شکنتلا نے پوچھا۔

"ان ڈاکوؤں نے تمہیں میرے پاس کس لئے بھیجا تھا؟"

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ اس نے سر گھٹنوں پر ٹکا دیا اور گہری سانس لے کر کہنے لگی۔

"کیا میں اپنی ماتاجی اپنے بھیا جی کے پاس پہنچ سکوں گی؟"

اور میں نے چراغ کی روشنی میں اس کی غزال ایسی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے میں نے کہا۔

"جب میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا تو مجھ پر یقین رکھو۔ میں تمہیں یہاں سے ضرور لے جاؤں گا۔ آگے جو ہوگا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

وہ ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ میں نے سرنگ کے دہانے کی طرف دیکھا۔ سرنگ کے باہر دن کی روشنی میں ڈاکو بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے شکنتلا سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یہاں سے اپنی حویلی کا راستہ معلوم ہے؟"

وہ بولی۔

"یہ لوگ مجھے کئی جنگلوں سے گزار کر یہاں لائے تھے۔ اس وقت رات ہو گئی تھی۔ مجھے اغوا کرنے کے بعد ایک جگہ چھپا کر رکھا گیا تھا۔ پھر جب رات کا اندھیرا ہو گیا تو یہ مجھے

وہاں سے لے کر چلے تھے۔ اتنا یاد ہے راستے میں ایک دریا کا پل آیا تھا اور اس پل پر سے ریل گاڑی گزری تھی۔ اتنا مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنی حویلی سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر ہی ہوں۔ دریا کے ریلوے پل پر پہنچ جاؤں تو وہاں سے اپنی ریاست میں پہنچ سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم خاموشی سے بیٹھی رہو۔ اتنا تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری عزت پر کوئی شخص حملہ نہیں کرے گا۔ میں آج یا کل رات کو کسی بھی وقت آؤں گا۔ اور یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور سرنگ میں باہر کی طرف چل پڑا۔ اب مجھے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ میرے پاس پیسے ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ میں اس پڑھی لکھی شریف لڑکی کی عزت ان ڈاکوؤں سے ہر حالت میں بچانا چاہتا تھا۔ لڑکی نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کے بھائی کے پاس ایک لاکھ روپیہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی ساری جائیداد اور زمینیں ساہوکار کے پاس پہلے ہی گروی پڑی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکو اور ان کے وہ ساتھی جو شکنتلا کو اغوا کر کے لائے تھے اس کی عزت برباد کر دیں گے اور وہ جیسا کہ اس نے کہا ہے خودکشی کر لے گی۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک لڑکی کی عزت درندوں کے ہاتھوں برباد ہو رہی ہو اور میں خاموش تماشائی بنا رہوں۔

میں باہر درختوں کے پاس آیا تو لکھو چارپائی پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"کیا کہتی ہے لڑکی؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا میں نے کہا۔

"لکھو کاکا! لڑکی پڑھی لکھی ضرور ہے۔ مگر بڑی ضدی ہے۔ ابھی اپنے گھر خط لکھنے پر راضی نہیں ہو رہی۔ پر تم فکر نہ کرو۔ یہ بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے راضی کر لوں گا۔"

لکھو ہنسنے لگا۔

"ارے سنا ہے ان کی بڑی حویلی ہے زمینداری ہے۔ زمین بیچ کر بھی وہ لوگ لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں۔ کیا انہیں اپنی لڑکی کی عزت نہیں چاہیئے؟"

میں نے کہا۔

"دادا! مجھے دو ایک دن کی مہلت دے دو۔ اس درمیان میں تم لوگ اپنے طور پر بھی لڑکی کے گھر والوں سے بات کرتے رہو۔"

لکھو سگریٹ کا کش لگا کر کہنے لگا۔

"چلو ہمیں کیا روپیہ نہیں دیتے تو نہ دیں ہمارا کیا ہے۔ ہم پہلے تو خود لڑکی سے عیش کریں گے۔ پھر بمبئی لے جا کر بیچ دیں گے اسے۔"

رامو چولہے کے پاس کچھ دور بیٹھا تھا۔ لکھو نے رامو سے اونچی آواز میں کہا۔

"او رامو! دارو کا بندوبست کر رکھنا رے آج رات کو سبھا جمے گی۔"

لکھو نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بابو! تم دارو ضرور پیتے ہوگے۔ آج رات تمہیں خالص برگد کی چھال کا دارو پلائیں گے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں لکھو دادا! میری طبیعت پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی۔ دارو پی لیا تو طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔"

"چلو تمہاری مرضی"

وہ اٹھ کر رامو کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ آج رات یہ ڈاکو لوگ شراب و کباب کی محفل گرم کرنے والے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ آج کی رات فرار ہونے کے لئے بڑی موزوں تھی۔ اس کے بعد خدا جانے یہ موقع ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ لوگ اپنے گھوڑے نیچے درختوں کے سائے میں باندھتے تھے۔ نیچے اس طرف سے بھی راستہ جاتا تھا اور اس جانب

سے بھی راستہ جاتا تھا۔ جس جانب وہ سرنگ تھی جس میں شکنتلا کو قید کیا گیا تھا۔ مجھے اسی طرف سے رات کو شکنتلا کو نکالنا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں گھوڑے پہلے اس طرف والے درختوں سے کھولوں اور پھر انہیں دوسری طرف لے جاؤں۔ گھوڑوں کا خیال مجھے اس لئے آگیا تھا کہ اس جنگل کو میں دیکھ چکا تھا۔ یہ بڑا گھنا اور دشوار گزار جنگل تھا۔ جھاڑیاں درختوں میں اور درخت جھاڑیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ آتی دفعہ مجھے لکھو اور اس کے ساتھی جس راستے سے لائے تھے وہ کوئی خاص شارٹ کٹ راستہ تھا۔ وہاں سے بھی گھوڑوں پر بیٹھ کر ہی آسانی سے گزرا جا سکتا تھا۔ یہ گوالیار جھانسی رینج کے وسط ہند کے جنگل تھے جو جنگلی درندوں اور دلدلوں' برساتی نالوں' گھاٹیوں اور حشرات الارض سے بھرے ہوئے تھے۔ اگر میں شکنتلا کو لے کر چلتا ہوں اور کچھ دیر بعد یہاں کسی کو ہمارے فرار کا علم ہو جاتا ہے تو یہ لوگ جنگل کے بھیدی ہونے کی وجہ سے ہمیں راستے میں ہی پکڑ سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ یہاں سے فرار ہونے کے بعد جتنی جلدی جتنی دور نکل سکیں نکل جائیں۔ اس کے لئے گھوڑے بہترین سواری تھے۔ وہ گھنی جھاڑیوں سے بھی انسانوں کی نسبت زیادہ تیزی سے نکل سکتے تھے اور کھلی جگہ پر ہم انہیں دوڑا بھی سکتے تھے۔ خطرہ اگر تھا تو یہ تھا کہ گھوڑوں کو پکڑتے اور سرنگ کی دوسری طرف لاتے وقت وہ زور سے ہنہنانا اور ٹاپیں مارنا نہ شروع کر دیں۔ کیونکہ میں ان کے لئے اجنبی تھا۔

شام ہو گئی تو ڈیرے میں درختوں کے نیچے شراب و کباب کی محفل کا اہتمام شروع ہو گیا۔ دونوں چولہوں پر جنگل سے مار کر لائے ہوئے ہرن کا گوشت پکنے لگا۔ رامو دوپہر کو ہی کسی قریبی گاؤں سے برگد کے چھال کی شراب لینے چلا گیا تھا۔ شام کو آیا تو کپڑے میں چھ بوتلیں باندھ کر گھوڑے کے آگے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ہمیں آج رات ہی نکلنا ہے تو کیوں نہ شکنتلا کو جا کر خبردار کر دوں کہ وہ تیار رہے ہم آج رات بھاگ رہے ہیں۔ میں آسانی کے ساتھ اس سے مل بھی سکتا تھا۔ میں نے لکھو دادا سے کہا کہ میں لڑکی کے پاس جا کر ایک بار پھر دباؤ ڈال کر کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے گھروالوں کے نام خط لکھ دے لکھو خوش ہو کر بولا۔

"ٹھاکر بابو! یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ اس میں لڑکی کا ہی بھلا ہے۔ ورنہ اس کی بوٹی بھی اسکے گھر والوں کے ہاتھ نہ آئے گی۔ ساری عمر اپنی بیٹی کے لئے روتے رہیں گے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ میرے خدا نے چاہا تو ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میں سرنگ کی طرف جانے لگا تو لکھو بولا۔

"اسے بتا دینا کہ کل اگر اس نے خط لکھ کر نہ دیا تو پھر اس کے ساتھ وہ سلوک شروع ہو جائے گا جو تماش بین بدمعاش عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہاں۔ جاؤ صبح میں گاؤں سے بڑے کاغذ اور پنسل بھی منگوا لوں گا۔ یہاں ہمارے پاس کاغذ نہیں ہے۔ کوئی پنسل قلم بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ کل تمہیں لڑکی کا خط مل جائے گا"

لکھو خوش خوش اس طرف چل دیا جدھر درختوں کے نیچے دری بچھ گئی تھی۔ شراب کی بوتلیں رکھ دی گئی تھیں اور کانسی کے چھوٹے گلاس بھی آ گئے تھے۔ تقریباً سارے آدمی وہاں جمع ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے اور گوشت پکتا دیکھ رہے تھے۔

میں خاموش خاموش جیسے بادل نخواستہ چلتا سرنگ کی طرف ہو گیا۔ سرنگ کے باہر ایک ڈاکو برابر پہرے پر موجود تھا۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ اسے میں بڑی آسانی سے رات کے وقت قابو کر سکتا تھا۔ اگر مجھے کمانڈو آپریشن کرنا ہوتا تو یہ سارے لوگ میرے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھے۔ لیکن ان لوگوں نے میرے ساتھ بڑا ایثار کیا تھا۔ خواہ اپنے لالچ کے لئے ہی سہی لیکن میں ان کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کا بدلہ ان لوگوں کی گردنیں توڑ کر نہیں دینا چاہتا تھا۔

سرنگ کے باہر پہرہ دینے والے نے مجھے دیکھا اور خاموش رہا۔ میں سرنگ میں چلا گیا۔ شکنتلا صف پر دیوار کی طرف منہ کئے پڑی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ چراغ جل رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو چہرے کی پریشانی قدرے دور ہو گئی۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آج رات کسی وقت یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

وہ چہرے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ ہاتھ سے پرے ہٹاتی ہوئی بولی۔

"کیا سچ؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ لوگ رات کو شراب کی محفل گرم کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آدھی رات تک شراب کے نشے میں دھت ہو جائیں گے۔ بس اسی لمحے ہم یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ ہم ان کے دو گھوڑے بھی ساتھ لے لیں گے تو وہ کہنے لگی۔

"گھوڑے شور تو نہیں مچائیں گے؟"

میں نے کہا۔

"میں انہیں قابو کر لوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہاں سے ہمیں کس طرف کو جانا ہوگا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

پھر میں نے اسے ہاتھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ اس طرف نارتھ یعنی شمال ہے اس طرف ساؤتھ ہے اور اس طرف ایسٹ اور اس طرف ویسٹ ہے۔ وہ ویسٹ کی طرف ہاتھ کر کے بولی۔

"ہم اس طرف جائیں گے۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ جس رات یہ لوگ مجھے اغوا کرنے کے بعد لے کر نکلے تھے تو آسمان پر ستاروں کو میں نے دیکھا تھا۔ میری سمجھ کے مطابق یہ لوگ مجھے ایسٹ کی طرف لے کر چلے تھے۔"

"اوکے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اب آدھی رات کے بعد کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ تم تیار رہنا۔"

"اوکے" شکنتلا نے کہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے میرا شکریہ ادا کرنے

لگی۔ میں سرنگ سے نکل کر واپس آگیا۔ ابھی شام کا اندھیرا نہیں چھایا تھا۔ میں رات ہونے سے پہلے اس پگ ڈنڈی کا جائزہ لینا چاہتا تھا جہاں سے گھوڑوں کو لے کر مجھے سرنگ کی دوسری طرف جانا تھا۔ جب میں صحن کی پتھریلی سیڑھی اتر کر نیچے جدھر گھوڑے بندھے ہوتے تھے جانے لگا تو لکھو نے مجھے دیکھ لیا۔ بولا۔

"بابو کہاں جا رہے ہو؟ ادھر تو آؤ میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

میں بھول ہی گیا تھا کہ میں لکھو کو یہ کہہ کر شکنتلا کے پاس گیا تھا کہ میں اسے خط لکھنے کے بارے میں دباؤ ڈالنے جا رہا ہوں۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"دادا! میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔ تمہیں مصروف دیکھا تو سوچا پہلے ذرا ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھو لوں۔"

اس وقت لکھو دری پر اپنے ڈاکو ساتھیوں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کے پاس چلا گیا۔

"کیا کہتی ہے راج کماری؟"

میں نے کہا۔

"دادا! تمہیں خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔ لڑکی خط لکھنے پر راضی ہو گئی ہے۔ کل ایک دو کاغذ اور پنسل کہیں سے منگوا لینا"۔

لکھو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔

"بابو! آخر پڑھے لکھے ہو تمہاری پڑھائی کا جادو چل ہی گیا۔ رے رامو رے۔ کل بنجریا کو گاؤں بھیج کر کاپی پنسل منگوائے لینا"۔

رامو چولہے کے پاس بیٹھا ہنڈیا میں ڈوئی ہلاتے ہوئے بولا۔

"منگوا لوں گا دادا۔ تم دارو کی بوتل کھول دو۔ گوشت تیار ہو گیا ہے۔"

لکھو نے کہا۔

"ذرا سورج تو چھپ جانے دو۔ اس نے دیکھ لیا تو بھگوان کے آگے جا کر ساری شکایت کرے گا کہ ہم دارو پیتے تھے۔"

پھر میری طرف پلٹ کر بولا۔

"بابو! نیچے ندی پر جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں دادا۔ ذرا منہ ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔"

اس نے ایک آدمی کو آواز دے کر کہا۔

"ارے بھگوارے۔ جا رے بابو کا نیچے جا کر ندی پر منہ دھلا دے"

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ برابر میری نگرانی کرتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک میں بھی سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ کیونکہ ان کے خیال میں میرے پاس سونے کی ڈلیوں والی ہنڈیا کا راز تھا۔ ایک ڈاکو میرے ساتھ ہو گیا۔ اس نے کاندھے پر بندوق ڈال رکھی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ نیچے ایک کھلی جگہ پر درختوں کے نیچے چھ سات گھوڑے بندھے گھاس وغیرہ کھا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں سے ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ٹیلے کے نیچے بل کھاتی ہوئی سرنگ کے دوسرے راستے کی جانب نکل گئی تھی۔ مجھے رات کو گھوڑے لے کر اس پگ ڈنڈی سے گزرنا تھا۔ میں نے نیچے ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ ٹھنڈا پانی پیا اور واپس ہو لیا۔ واپسی پر بھی میں نے جائے واردات کا سرسری جائزہ لے لیا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ جب رات ہو گئی تو ان لوگوں کی دھما چوکڑی شروع ہو گئی۔ شراب کی بوتلیں کھل گئیں۔ شور شرابا مچنے لگا۔ میں اس خیال سے جھونپڑی کے اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گیا کہ باہر ہوں گا تو لکھو ضرور مجھے شراب پینے پر مجبور کرے گا اور میں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔

باہر شرابی ڈاکوؤں کی منڈلی جم گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے ہاؤ ہو کی آوازیں بلند سے بلند تر ہونا شروع ہو گئیں۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے وقت معلوم کرنے کی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو ان لوگوں کے شراب میں دھت ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ باہر سے ڈھولک بجنے اور گانے کی آواز آنے لگی۔ یہ دھما چوکڑی کافی دیر تک جاری رہی۔ اتنے میں ایک آدمی میرے لئے روٹی اور

ہرن کا بھنا ہوا گوشت لے کر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سرنگ میں جو لڑکی قید ہے اس کو بھی کھانا دیا ہے یا نہیں؟"

وہ بولا۔

"اس کو تو میں دو گھنٹے پہلے ہی دے آیا تھا۔ سردار نے کہا ہے۔ اگر شراب پینی ہو تو آجاؤ"

میں نے کہا۔

"سردار سے کہو شکریہ۔ مجھے نیند آ رہی ہے اور صبح اٹھ کر مجھے لڑکی سے خط بھی لکھوانا ہے۔"

خط لکھوانے کی بات میں نے اس لئے کی تھی کہ یہ سن کر لکھو مجھے شراب پینے پر مجبور نہیں کرے گا۔ تا کہ میں صبح ہوش مندی کی حالت میں لڑکی سے ٹھیک ٹھیک خط لکھوا سکوں۔ وہ آدمی چلا گیا۔ میں نے چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ مرچیں بہت تھیں۔ پانی پیا اور سگریٹ سلگا کر لیٹ گیا۔ یہ سگریٹ مجھے لکھو نے دیئے تھے۔ بھارتی سگریٹ تھے۔ بڑے سخت اور گھٹیا تھے مگر مجھے سب کچھ کھا پی کر ہضم کر لینے کی تربیت دی گئی تھی۔ میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پی سکتا تھا اور میرا گلا خراب نہیں ہوتا تھا۔ آدمی کو سخت جانی کی عادت ڈالنی چاہئے۔ نازک مزاج بنے رہنے سے آدمی کی مدافعت کی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آدمی کو حلال حرام کا فرق ضرور کر لینا چاہئے۔

میں چارپائی پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا مگر میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے۔ شرابیوں نے خوب شور مچا رکھا تھا۔ شاید وہ کسی آدمی سے ننگا ڈانس کروا رہے تھے۔ جیسے جیسے رات گزرتی گئی ان کی آوازیں ختم ہونا شروع ہو گئیں۔ اب باہر سے کسی کسی وقت کسی کی آواز آ جاتی تھی کہ فلاں کہاں ہے فلاں نے بوتل کہاں چھپائی ہے۔ مجھے اور دارو دو رامو رے۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ پھر باہر گہری خاموشی چھا گئی۔ میں آہستہ سے اٹھ کر جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔ میں نے دیکھا درخت کی شاخ کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین جل رہی

تھی۔ نیچے دری پر شراب میں دھت سارے آدمی بے ہوش پڑے تھے۔ کوئی ادھر پڑا تھا۔ کوئی ادھر پڑا تھا۔ میں نے غور سے ماحول کا جائزہ لیا وہاں نہ کوئی آواز تھی اور نہ کوئی پہرے دار کسی جگہ بیٹھا یا چلتا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں دبے پاؤں بڑی احتیاط کے ساتھ باہر نکلنے کی بجائے یوں بے نیازی سے جھونپڑی سے نکل کر پتھر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا جیسے معمول کے مطابق نیچے ندی پر پانی وغیرہ پینے جا رہا ہوں۔ مگر میری آنکھیں چوکس تھیں اور میں چاروں طرف نظریں گھما کر ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے دور دری پر دھت پڑے تھے۔ ان میں لکھو بھی ہوگا۔ اس خیال سے کہ اگر وہ تھوڑی ہوش میں ہوگا تو مجھے نیچے جاتا دیکھ کر ضرور آواز دے گا میں سیڑھیوں کے پاس جا کر رک گیا اور پھر یونہی ٹہلنے لگا۔

ٹہلتا ٹہلتا میں لالٹین کے پاس آگیا۔ مجھے ایک طرف سے کٹ کٹ کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ چولہے کے پاس ایک بلی بیٹھی ہڈیاں چبا رہی تھی۔ سب لوگ بے ہوش پڑے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ان میں رامو اور لکھو بھی تھے۔ ان کی بندوقیں اور رائفلیں ایک طرف درخت کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک رائفل یا بندوق بھی ساتھ لے چلنی چاہئے۔ راستے میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اب میں دبے دبے پاؤں اٹھاتا اس درخت کی طرف گیا جہاں بندوقیں اور رائفلیں رکھی ہوئی تھیں۔ گولیوں کی بیلٹیں بھی درخت کی شاخوں کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک رائفل اٹھالی۔ میگزین کی بیلٹ اس کے ساتھ ہی لٹک رہی تھی۔ رائفل تھری ناٹ تھری کی تھی۔ اس زمانے میں اس رائفل کا شکاریوں اور ڈاکوؤں کے ہاں بڑا رواج تھا۔ میں نے جلدی سے رائفل اٹھائی۔ میگزین کی بیلٹ کاندھے پر ڈالی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے اس جگہ پر آگیا جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں پر زینیں پڑی تھیں اور وہ خاموش کھڑے تھے۔ جیسے کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔ پہلے خیال آیا کہ دو گھوڑے لے چلوں۔ پھر سوچا کہ دو گھوڑے شور نہ مچا دیں۔ ایک گھوڑا ہی کافی ہوگا۔ میں لڑکی کو پیچھے بٹھالوں گا۔ ہمیں گھوڑ دوڑ کی ریس میں تو حصہ نہیں لینا۔ بس جنگل ہی پار کرنا ہے۔

خطرہ تھا کہ گھوڑے کو اجنبی آدمی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تو وہ کہیں بدک نہ جائے۔ اس کے لئے میں بڑے آرام سے ایک گھوڑے کے پاس گیا اور بڑی محبت سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گھوڑے نے ذرا سا گردن کو جھاڑا۔ خرخر کیا اور پھر خاموش ہو گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ کوئی لالٹین وغیرہ نہیں جل رہی تھی۔ مگر مجھے جھاڑیوں کے پیچھے ٹیلے کے نیچے جاتی پگ ڈنڈی کی دھندلی بل کھاتی لکیر نظر آرہی تھی۔ میں نے آہستہ سے گھوڑے کی باگ درخت کی شاخ سے کھولی اور بڑے آرام سے گھوڑے کو لے کر جھاڑیوں میں سے گزرنے لگا۔ میں اسے اس خیال سے پگ ڈنڈی پر نہ لایا کہ اس کے ٹاپوں کی آواز پیدا ہو گی اور ممکن ہے آس پاس کوئی ڈاکو سو رہا ہو اور وہ بیدار ہو جائے۔ یہ میری انتہائی احتیاط تھی۔ کچھ دور گھوڑے کو جھاڑیوں اور گھاس میں چلانے کے بعد میں آگے جا کر اسے اوپر چڑھا کر پگ ڈنڈی پر لے آیا۔

یہاں ٹیلے کے پیچھے جو سرنگ تھی اس کی ایک پتلی سی پگ ڈنڈی اوپر سے نیچے آرہی تھی۔ میں نے گھوڑے کو اسی جگہ ایک جھاڑی میں باندھا۔ اپنی رائفل اتار کر گھوڑے پر ڈالی اور چڑھائی چڑھ کر ٹیلے کی سرنگ کے دہانے کی دائیں جانب آکر رک گیا۔ جو ڈاکو رات کو سرنگ کے باہر پہرہ دیتا تھا وہ اندھیرے میں مجھے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھا دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ معلوم نہیں وہ سو رہا تھا کہ جاگ رہا تھا۔ مگر وہاں موجود تھا اور مجھے اسے وہاں سے اس طرح ہٹانا تھا کہ وہ شور بھی نہ مچا سکے اور میرے ہاتھوں ہلاک بھی نہ ہو۔ ایک باشعور تربیت یافتہ کمانڈو کبھی کسی انسان کو یونہی ہلاک نہیں کرتا۔ وہ صرف دشمن پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کی وہ حفاظت کرتا ہے۔ میں دبے پاؤں شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس میں چلتا اندھیرے میں سرنگ کی ایک طرف ہو کر رک گیا۔ میں نے ایک پتھر قریب ہی پھینکا۔

پتھر کی آواز پر ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ جس طرف سے آواز آئی تھی وہ اس طرف چلا۔ وہ میری طرف آرہا تھا۔ میں اپنے حساب سے ایک طرف ہو گیا اب وہ میرے بالکل قریب سے ہو کر جھک کر ادھر ادھر دیکھتا ذرا آگے ہوا۔ تو میں نے اپنا بایاں

بازو سامنے کی جانب سے اس کی ٹھوڑی کے اوپر اس کی گردن میں ڈال دیا۔ اگر میں اسے زور سے جھٹکا دیتا تو اس کی گردن فوراً ٹوٹ جاتی۔ مگر میں اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے پکڑنا اور قانون کے مطابق سزا دینا اس علاقے کی پولیس کا کام تھا۔ وہ میرا دشمن نہیں تھا۔ وہ میرے مقابلے پر نہیں اترا تھا۔ وہ میرے راستے میں حائل ہوا تھا اور میں اسے ہلاک کئے بغیر اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر صرف اتنی دیر کے لئے اس کے پھیپھڑوں میں جانے والی آکسیجن بند کر دی جتنی دیر میں وہ صرف بے ہوش ہو سکتا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ بے ہوش ہوگیا ہے تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس کی بندوق دور جھاڑیوں میں پھینک دی پھر اس کے سر پر بندھا ہوا صافہ اتار کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا کہ اگر اسے ہوش آبھی جائے تو وہ فوری طور پر شور نہ مچا سکے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں دوڑ کر سرنگ میں داخل ہوگیا۔ شکنتلا جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا

"میرے ساتھ آجاؤ"

وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ہم ٹیلے کے نشیب سے اتر کر گھوڑے کے پاس آئے۔ میں نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا۔ رائفل کاندھے پر ڈالی۔ خود اس کے آگے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور گھوڑے کو چلاتا ہوا جنوب کی جانب اترائی پر ڈال دیا۔

شکنتلا میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گھوڑے پر بیٹھنے کی عادی ہے۔ ٹیلے کی اترائی نیچے دور تک چلی گئی تھی۔ پھر ہموار میدانی جنگل شروع ہوگیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا میں نے شکنتلا سے پوچھا۔

"ہم ٹھیک سمت پر جا رہے ہیں ناں؟"

اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے ٹھیک جا رہے ہیں"

راستے میں ایک بار میں نے اس سے انگریزی میں بات کی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ان ڈاکوؤں میں کیسے آگئے؟"

میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

"یہ تمہیں پھر کبھی بتادوں گا"

گھوڑا اندھیرے میں درختوں اور جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس میں سے اس طرح گزر رہا تھا۔ جیسے وہ اس قسم کے دشوار گزار راستوں کا عادی ہو۔ وہ کسی جگہ رکا نہیں تھا۔ میں اسے دوڑا نہیں سکتا تھا۔ اسے دوڑانے کے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن گھوڑے کو میں جتنی تیز تیز چلا سکتا تھا چلا رہا تھا۔ اپنے قیاس کے مطابق میں اپنی سمت کو مغرب کی طرف برقرار رکھے ہوئے تھا۔ درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں پتھر زمین سے باہر نکل آئے تھے جن پر چلنے سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ مگر اب ہم ڈاکوؤں کی کمیں گاہ سے دور نکل آئے تھے۔

گھنے درختوں کی وجہ سے رات کی تاریکی زیادہ گہری تھی۔ گھوڑے کو چلاتے ہم ڈاکوؤں کی سرنگ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ گھنا جنگل تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ آسمان پر جھلملاتے ستارے نظر آنے لگے تھے۔ ان کی پھیکی پھیکی روشنی میں منظر بھی تھوڑا تھوڑا نظر آرہا تھا۔ یہ ایک کھلا میدان تھا۔ میں نے شکنتلا سے اس میدان کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں نے اس جگہ کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ دریا آئے گا تو میں تمہیں اپنے قصبے کا راستہ بتا سکوں گی“

میں گھوڑے کو دوڑانے لگا۔ میدان ختم ہوا تو ایک اور جنگل شروع ہو گیا۔ مگر اس جنگل میں درخت اتنے گنجان اور ساتھ ساتھ اگے ہوئے نہیں تھے۔ اندھیرے میں ان کے اونچے اونچے تنے سیاہ ستونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں سیاہ کالی چٹانیں بھی تھیں۔ ایک پہاڑی نالہ آگیا۔ ہم اس میں گھوڑا گزار کر لے گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ ہم اس جنگل میں گھوڑا چلاتے رہے۔ سامنے سے ہوا کا جھونکا آیا تو اس میں نمی محسوس ہوئی۔ میں نے شکنتلا سے کہا۔

”شاید آگے دریا آرہا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ درختوں سے باہر آئے۔ تو سامنے دریا کا پاٹ دکھائی دینے لگا۔ کافی بڑا دریا تھا۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی پھیکی روشنی میں خاموشی سے بہتے ہوئے دریا میں ایک عجیب سی دہشت اور جلال ہوتا ہے۔ شکنتلا بولی۔

”یہی دریا ہے۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔

”اگر تھک گئی ہو تو ہم گھوڑے سے اتر آتے ہیں۔“

شکنتلا بولی۔

”نہیں میں گھوڑ سواری کی عادی ہوں۔ جب پتا جی زندہ تھے تو میں ان کے ساتھ روز صبح صبح گھوڑ سواری کے لئے جایا کرتی تھی۔ اب تو ہمارے پاس صرف بگھی کے دو گھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔“

ہم دریا کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے دور نظر جما کر دیکھا۔ مجھے دریا کے اوپر ایک سیاہ لکیر سی نظر آئی۔ میں نے شکنتلا سے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ سامنے ریل کا پل ہے“

شکنتلا نے میرے پیچھے سے گردن نکال کر سامنے کی جانب دیکھا اور کہا۔

”ہاں۔ یہ ریلوے برج ہی ہے۔ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ اس پل کی دوسری طرف راجواڑے کا جنگل شروع ہوتا ہے“

میں گھوڑے کو دلکی چلانے لگا۔ ریلوے پل اندھیرے میں واضح ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ریلوے پل کے پاس آکر ہم گھوڑے سے اتر آئے۔ اس پل پر ایک طرف ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پیدل چلنے کا راستہ تھا۔ درمیان میں کافی اونچا لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ہم گھوڑے کو لے کر پیدل چلنے والے راستے پر چلنے لگے۔ ہماری بائیں جانب نیچے دریا نظر آرہا تھا۔ پل کے ستونوں کے پاس سے گزرتے تو دریا کی موجوں کا ستونوں سے ٹکرانے کا شور سنائی دیتا۔ رات کی خاموشی اور تاریکی میں دریا کی موجوں کا شور میرے دل میں خدائے ذوالجلال کی عظمت وہیبت کا احساس پیدا کر رہا تھا۔

ہم پل پار کر کے دوسری طرف اتر گئے۔

شکنتلا یہاں رک گئی۔ وہ سامنے اور دائیں جانب دیکھنے لگی۔ اس نے ایک

طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہم اس طرف جائیں گے"

رائفل میرے کاندھے سے لٹک رہی تھی۔ اسے چلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور یہ اچھی بات ہوئی تھی۔ ہمیں راستے میں کوئی جنگلی درندہ بھی نہیں ملا تھا۔ کچھ دور تک ہم گھاس اور جھاڑیوں کے میدان میں چلتے گئے۔ اس کے بعد پھر جنگل شروع ہو گیا۔ شکنتلا نے کہا۔

"یہ ہمارے راجواڑے کا جنگل ہے"

ہم دوبارہ گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ یہ جنگل ایسا تھا کہ اس میں انسانی آبادی کے آثار بھی مل رہے تھے۔ ایک تالاب کے قریب سے گزرے۔ ایک جگہ کچھ جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ ایک پرانے مندر کے چبوترے کے قریب سے گزرے۔ ایک جگہ کٹے ہوئے درختوں کے شہتیر پڑے تھے۔ یہاں دن کے وقت درختوں کی کٹائی اور لکڑیوں کی چرائی کا کام ہوتا ہو گا۔ شکنتلا بڑی خوش خوش دکھائی دے رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں سے ہمارے قصبے کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک برساتی ندی آئے گی پھر ایک مندر کا تالاب آئے گا۔ اس کے بعد ہماری حویلی آجائے گی۔"

اس نے جس طرح کہا تھا ویسے ہی ہوا۔ ایک برساتی ندی آئی۔ اس کے بعد ایک تالاب آیا جس کی ایک جانب مندر کا بڑا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ شکنتلا نے کہا

"وہ سامنے آم کے درختوں کے پیچھے ہماری حویلی ہے۔"

ہم گھوڑے سے اتر آئے۔ ہم گھوڑے کو لے کر خود پیدل چلتے جب آم کے باغ میں سے گزر گئے تو مجھے اندھیرے میں ایک عمارت کا خاکہ نظر آیا۔ شکنتلا وفور مسرت سے بولی۔

"یہ ہماری حویلی ہے۔ ماتا جی ضرور جاگ رہی ہوں گی۔ بھیا بھی جاگ رہے ہوں گے۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر انہیں کس قدر خوشی ہو گی۔"

ہم حویلی کی چاردیواری کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ہم

گھوڑے کو لے کر احاطے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ سامنے سے ایک کتا بھونکتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میں رک گیا۔ شکنتلا دوڑ کر کتے کے پاس گئی۔

"نومی! نومی! میں ہوں۔ تمہاری شکن"

کتا شکنتلا کے اردگرد چکر لگانے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹنے لگا۔ کتے کی آواز سن کر ایک چوکیدار اونچی آواز میں بولا۔

"کون ہے ادھر؟ کون ہے؟"

شکنتلا نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں ہوں بنسی بابا۔ میں ہوں شکنتلا"

ایک بوڑھا چوکیدار ڈنڈا ہاتھ میں لئے دوڑتا ہوا حویلی کے برآمدے میں سے نکل کر ہماری طرف بڑھا۔

"میری بٹیا! ہماری بٹیا ہے رام ہے رام! بٹیا بھگوان کی کرپا ہو گئی۔ میں رانی ماں کو جگاتا ہوں۔ ہے بھگوان ہے بھگوان"

چوکیدار نے میری طرف بھی توجہ نہ دی اور رانی ماں جی رانی ماں بٹیا آگئی ہے۔ پکارتا حویلی کے برآمدے والے دروازے کی طرف بھاگا۔ اندر ایک دم روشنی ہو گئی جو کمرے کے برآمدے میں کھلنے والے روشندانوں اور کھڑکی پر گرے ہوئے پردوں کے پیچھے سے نظر آنے لگی۔ دروازہ ایک دم کھل گیا۔ دو عورتیں باہر آئیں۔ انہوں نے جھک کر شکنتلا کے پاؤں چھوئے۔ وفور مسرت سے ان سے بات نہیں ہو رہی تھی۔"

"ماتا جی سو رہی ہیں کیا؟"

یہ دونوں نوکرانیاں لگتی تھیں۔ ایک نے کہا۔

"رانی ماں بیمار ہیں"

شکنتلا دوڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں گھوڑے کو لئے برآمدے کے باہر ہی کھڑا رہا۔ چوکیدار بنسی نے مجھ سے گھوڑے کی باگ لیتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! گھوڑا مجھے دے دیں۔ میں اسے طویلے میں لے جاتا ہوں"

میں نے گھوڑا اسے دے دیا۔ وہ گھوڑے کو لے کر تیز تیز چلاتا احاطے کے کونے کی طرف چلا گیا۔ دونوں نوکرانیاں بھی شکنتلا کے پیچھے پیچھے حویلی کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ میں برآمدے میں ستون کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں شکنتلا باہر آئی۔ کہنے لگی۔

"اندر آجاؤ پلیز۔ ماتاجی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ خود باہر آکر تمہارا سواگت نہیں کر سکتیں۔ اندر آجاؤ وہ تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہیں"

شکنتلا کے ساتھ میں ایک کمرے میں داخل ہوا جس کی چھت اونچی تھی۔ اونچی اونچی کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ بجلی کے دو سٹینڈ والے پرانے ٹیبل لیمپ روشن تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے بھدے اور بھاری صوفے پڑے تھے۔ دیواروں پر راجے مہاراجوں کی آرٹسٹوں کی بنائی ہوئی رنگین لمبی لمبی تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرے کی فضا میں ٹھنڈک اور پرانی لکڑی کی خوشبو تھی۔

ہم اس کمرے سے گزر کر پیچھے ایک اور بڑے کمرے میں آگئے۔ یہ بیڈ روم تھا۔ لکڑی کی منقش پشت والے ایک بہت بڑے پلنگ پر ایک بوڑھی مگر باوقار چہرے والی عورت ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا آدھا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ سیاہ بالوں میں سفید بالوں کی لٹیں صاف نظر آرہی تھیں۔ بیڈ روم میں پلنگ کی دونوں جانب لکڑی کے سٹینڈ والے پرانی وضع کے پھولدار ٹیبل لیمپ روشن تھے۔ فضا میں کسی بڑے شائستہ اور مہذب قسم کے پرفیوم کی ہلکی ہلکی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ شکنتلا کے آگے میں نے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتے ہوئے اپنا نام دھرم ویر بتایا تھا۔ ظاہر ہے اس نے اپنی ماتا جی یعنی رانی ماں سے میرا اسی نام سے تعارف کرایا ہوگا۔ چنانچہ میں نے پلنگ کے قریب جاتے ہی بوڑھی عورت کو نمسکار کیا۔ اس باوقار چہرے والی عورت نے احسان مند نظروں سے مجھے دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر میرے نمسکار کا جواب دیا اور کمزور مگر بھاری آواز میں کہا۔

"دھرم ویر بیٹا! تم نے ہمارے خاندان پر جو احسان کیا ہے ہم اس کا بدلہ شاید ساری زندگی نہیں چکا سکیں گے"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"رانی ماں جی! میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کی بیٹی کو عزت آبرو کے ساتھ گھر میں واپس لے آیا ہوں"

شکنتلا اپنی ماں کے پاس اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا سر ماں کے سینے سے لگا تھا اور ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ رانی ماں نے کہا۔

"بیٹا دھرم ویر! تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ"

میں قریب پڑی منقش کرسی پر بیٹھنے لگا تو رانی ماں نے کہا۔

"وہاں نہیں بیٹا۔ یہاں پلنگ پر میرے پاس بیٹھو۔"

میں پلنگ کی پٹی پر آہستہ سے بیٹھ گیا۔ رانی ماں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرے قریب آؤ بیٹا۔ میرے پاس آؤ"

میں رانی ماں کے قریب ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے سر پر اور چہرے پر بڑی محبت سے پھیرے اور آگے ہو کر میرا ماتھا چوم لیا۔ یقین کریں مجھے ایسے لگا جیسے میری حقیقی والدہ نے میرا ماتھا چوما ہے۔ ماں بہن بھائی، بہنوں کی محبتیں ایک جیسی ہوتی ہیں جس طرح پنجابی میں کہتے ہیں سانجھی ہوتی ہیں۔ یہ قدرتی محبتیں ہیں اور یہ رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود اور زبانوں سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ ان سب میں ماں کی محبت سب سے افضل ہوتی ہے۔

دونوں نوکرانیاں پلنگ کے ایک طرف ادب سے ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ رانی ماں نے انہیں کہا۔

"دھرم ویر کے لئے کچھ کھانے کو لاؤ"

میں نے کہا۔

"ماتاجی اس کی ضرورت نہیں ہے"

شکنتلا ماں سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

"نہیں دھرم ویر جی! اس کی ضرورت ہے"

یہ بات اس نے انگریزی میں کہی تھی۔ رانی ماں نے شکنتلا کو انگریزی میں کہا۔

"بیٹی! تم خود جا کر مٹھائی لاؤ"

شکنتلا دونوں نوکرانیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اب رانی ماں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم نے سٹیٹ پولیس میں شکنتلا کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی تھی سٹیٹ کے علاوہ شکنتلا کے بھائی نے گوالیار پولیس کو بھی رپورٹ کر دی تھی۔ میرا بیٹا تو ملٹری پولیس انٹیلی جینس کو بھی رپورٹ کرنے والا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ اس طرح سے ہمارے خاندان کی فوج تک بدنامی پہنچ سکتی تھی اور شاید شکنتلا نے تمہیں بتایا ہو میرا بیٹا اور شکنتلا کا بڑا بھائی انڈین فوج میں میجر ہے"

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں گوالیار کے فوجی ٹارچر سیل میں رہ چکا تھا۔ اور گوالیار وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شکنتلا کا بھائی بھی فوج میں تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر ممکن ہے گوالیار میں ہی ہو۔ اس کے آگے میرا راز کھل سکتا تھا۔ لیکن مجھے صرف اس بات کا اطمینان تھا کہ گوالیار چھاؤنی کی فوج اپنی طرف سے مجھے طیارے سے نیچے گرا کر ہلاک کر چکی تھی۔ اب انہیں میرے بارے میں مزید تفتیش کرنے مجھے تلاش کرنے اور میری جاسوسی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اگر ڈر تھا تو صرف اس بات کا کہ کہیں اس شکنتلا کے فوجی بھائی نے مجھے گوالیار کے فوجی کیمپ میں دیکھ نہ لیا ہو۔ اگر ایسی بات ہوئی تو وہ ایک سیکنڈ میں مجھے پہچان لے گا کہ میں پاکستانی کمانڈو ہوں۔ اور بڑا خطرناک کمانڈو ہوں اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے ایک فوجی طیارے سے گرا دیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آگیا کہ میں نے اس خاندان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ لوگ میرے زیر بار احسان ہیں۔ ان کو میرا اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہے۔ اس لحاظ سے شکنتلا کا میجر بھائی بھی میری عزت کرے گا۔ مجھے اس کا اعتماد بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ انڈین فوج میں افسر ہے۔ اگر وہ فوج کے کسی حساس محکمے میں ہے تو مجھے اس خاندان پر اپنے احسان اور مجھ پر ان کے اعتماد کی وجہ سے اس فوجی افسر سے مجھے بہت سی

فوجی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ مجھے ایسے راز بھی مل سکتے ہیں جو کشمیر کے محاذ پر جنگ کرتے کشمیری مجاہدوں اور پاکستان کی سلامتی کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں۔ سب سے پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شکنتلا کا فوجی بھائی اس وقت کہاں ہے اور وہ فوج کے کس محکمے میں ہے۔ شکنتلا کی ماں ایک پڑھی لکھی خاتون تھی اور اس نے انگریزی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی ہوئی تھی وہ بڑی روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کے فوجی محکمے کا ضرور علم ہو گا میں نے رانی ماں سے کہا۔

"ماتا جی! آپ نے بڑا اچھا فیصلہ کیا کہ ملٹری انٹیلی جینس کو شکنتلا کے بارے میں رپورٹ نہیں کی۔ اس سے خاندان کی نیک نامی پر حرف آسکتا تھا۔ اب دیکھئے ناں آپ کی بیٹی عزت و آبرو کے ساتھ گھر واپس پہنچ گئی ہے۔ آپ کو بھگوان کا شکر ادا کرنا چاہئے۔"

میں نے جان بوجھ کر یہ جملے انگریزی میں بولے تھے۔ رانی ماں نے بھی انگریزی میں کہا۔

"ہم بھگوان کا بھی شکر ادا کرتے ہیں اور تمہارا بھی بہت شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تم ہماری عزت کو محفوظ کی محفوظ ہمارے پاس لے آئے۔"

رانی ماں مجھ سے کوئی سوال کرنے والی تھیں کہ میں نے انگریزی میں پوچھا۔

"رانی ماں جی! آپ کا بیٹا اور شکنتلا کا بھائی فوج کے کس محکمے میں ہے؟"

رانی ماں نے کہا۔

" شکنتلا نے تمہیں نہیں بتایا؟ اسے ضرور بتانا چاہئے تھا میرا بیٹا فوج کے انٹیلی جینس کے محکمے میں ہے۔ اس نے لندن میں فوجی ٹریننگ بھی لی تھی۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ وہ شکنتلا کے گم ہو جانے پر سخت پریشان رہا ہے۔ اس روز سے یہاں رہ کر جگہ جگہ ٹیلی فون کرتا رہتا تھا۔ مگر سٹیٹ کی پولیس بھی گوالیار پولیس ہی کی طرح نکمی ہے۔ میرا بیٹا آج صبح ہی اپنے ہیڈ کوارٹر ناگ پور واپس آگیا ہے۔ میں ابھی اسے فون کر کے بتاتی ہوں کہ شکنتلا گھر واپس آگئی ہے"

شکنتلا کا بھائی ملٹری انٹیلی جینس کا میجر تھا۔ اس کا مطلب ہے اگر اس نے میری

شکل گوالیار کے فوجی کیمپ میں نہیں دیکھ رکھی تو میں اسے اعتماد میں لے کر اس سے بڑی اہم فوجی معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ اس دوران رانی ماں نے تپائی پر سے کالے رنگ کا پرانا ٹیلی فون اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور آپریٹر کو ناگ پور اپنے بیٹے کا فوجی نمبر بتا کر کہہ رہی تھی۔

"میں چھندواڑہ سٹیٹ کی رانی ماں بول رہی ہوں۔ اس نمبر پر مجھے میرے بیٹے میجر شرت دیوان سے بات کراؤ"

اتنی دیر میں شکنتلا میرے لئے مٹھائی لے کر آ گئی۔ اس نے ساڑھی بدل لی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر بال بھی تھوڑے سے ٹھیک کر لئے تھے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ سٹک بھی لگا لی تھی۔ چاندی ایسی تھالی میں کچھ لڈو اور برفی رکھی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ مٹھائی کی تھالی اس نے میری طرف بڑھا کر کہا۔

"پلیز دھرم ویرا!"

میں نے شکریہ کہہ کر ایک لڈو اٹھا لیا

"تم بھی کھاؤ"

میں نے ایک لڈو شکنتلا کو دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے لے لیا۔

رانی ماں ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ریسیور اس کے کان کے ساتھ لگا تھا۔ کہنے لگی۔

"تمہارے بھیا شرت کو فون کر رہی ہوں"

اس کے ساتھ وہ ذرا بلند آواز میں بولی

"ہیلو! شرت؟ تم بول رہے ہو۔ تمہیں گڈ نیوز دینی تھی۔ شکنتلا گھر آ گئی ہے"

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے میرے پاس ہی بیٹھی ہے۔ لو بات کر لو"

رانی ماں نے فون شکنتلا کو دیا۔ شکنتلا نے انگریزی میں کہا۔

"ہیلو بھیا! میں شکنتلا بول رہی ہوں۔ ہاں بھگوان کی بڑی کرپا ہوئی ہے۔ بس تم آؤ گے تو تمہیں سارا قصہ سناؤں گی۔ اور ان سے بھی ملاؤں گی۔ دھرم ویر ان کا نام دھرم

ویر ہے۔ بڑے نوبل انسان ہیں۔ بس تم آ جاؤ"

شکنتلا اپنے بھائی سے بات کرتے وقت میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ فون بند ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ شکنتلا کا بھائی میجر شرت دیوان ناگ پور سے کل صبح پہلی ٹرین میں چھندواڑہ پہنچ رہا ہے۔ چھندواڑہ ریاست کا سٹیشن چھوٹا تھا مگر وہاں ہر گاڑی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرتی تھی۔ شکنتلا نے بتایا کہ وہاں سے ناگ پور ٹرین کے ذریعے دو اڑھائی گھنٹے کا راستہ ہے۔

میرے لئے شکنتلا نے حویلی میں ایک مہمان خانہ کھلوا دیا جو خاص خاص مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ شکنتلا کہنے لگی۔

"ہمارے ہاں پتاجی کے سورگباش ہو جانے کے بعد خاص مہمان سال دو سال میں ہی کوئی آتا ہے۔ اس کمرے میں آسائش کی ہر شے موجود تھی۔ بڑا اعلیٰ قسم کا پلنگ بچھا تھا۔ چھت پر لکڑی کے پروں والا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں گرمی زیادہ نہیں پڑتی۔ ایک نوکرانی اور ایک نوکر کمرے کی چیزوں کو ٹھیک کر رہے تھے۔ اس وقت رات کافی گزر چکی تھی۔ میرے لئے استری کیا ہوا سلیپنگ سوٹ آ گیا۔ شکنتلا جاتے ہوئے بولی۔

"صبح بیڈ ٹی کتنے بجے چاہئے؟"

میں نے کہا۔

"نو شکنتلا تھینک یو۔ میں بیڈ ٹی نہیں پیا کرتا"

"او کے۔ گڈ نائٹ"

وہ کمرے کا پردہ ہٹا کر دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے کی فضا میں کچھ دیر تک شکنتلا نے آتے ہی جس قیمتی پرفیوم کی سپرے اپنی ساڑھی پر کی تھی اس کی خوشبو پھیلی رہی۔ بیڈ روم میں سرہانے کی جانب ایک کھڑکی تھی۔ میں نے اٹھ کر پردہ ہٹایا۔ کھڑکی کھولی اس کے پٹ بڑی قیمتی لکڑی کے تھے اور کافی پرانے ہو رہے تھے۔ چوکھٹ میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ باہر سے سبزے کی مہک والی تازہ ہوا

اندر آنے لگی۔ باہر رات کا گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے احاطے میں کچھ دور حویلی کی اونچی دیوار نظر آئی۔ میں نے کھڑکی بند کر کے پردہ گرادیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ باتھ روم میں بتی جل رہی تھی۔ میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ آنکھ کی سوجن جاتی رہی تھی۔ مگر چہرے پر سخت تھکاوٹ کے اثرات تھے۔ میں نے وہیں پڑی ہوئی کنگھی اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیری۔ داڑھی کے بال بھی بڑھ آئے تھے۔ باتھ روم میں شیونگ کا سامان بھی شکنتلا نے رکھوا دیا تھا۔ میں نے اسی وقت شیو بنائی۔ منہ صاف کیا پتلون قمیض اتار کر سلیپنگ سوٹ پہنا اور پلنگ پر آکر ٹیبل لیمپ کی بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ عجیب بات ہے بالکل غائب تھی۔ میں شکنتلا کے بڑے بھائی میجر شرت دیوان کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ انڈین ملٹری انٹیلی جینس کا میجر تھا۔ اگر اس نے مجھے گوالیار کے ٹارچر سیل میں دیکھا ہوگا تو یقینی طور پر مجھے پہچان لے گا۔ اگر نہیں دیکھا ہوگا تو یہ شخص میرے لئے دشمن کے فوجی رازوں کا خزانہ ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچانے گا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کا ہیڈ کوارٹر ناگ پور میں ہے اور وہ اسی سٹیشن پر ایک عرصے سے تعینات ہے۔ اس سے ظاہر تھا کہ اس کا گوالیار کے ملٹری کیمپ سے کوئی اس قسم کا تعلق نہیں تھا کہ وہ وہاں پر موجود ہوتا۔ بہرحال مجھے اس کے سامنے آنے کا خطرہ مول لینا ہی تھا۔ یہ خطرہ میں صرف اس لئے مول لے رہا تھا کہ مجھے اس آدمی کے ذریعے بھارتی فوج کے پاکستان اور کشمیر کے خلاف جارحانہ عزائم کا مکمل سراغ مل سکتا تھا۔ اور اگر میں شکنتلا اور اس کے بھائی سے اپنے تعلقات کو مزید مستحکم کرتا رہوں تو انڈین ملٹری ہائی کمانڈ کے پاکستان کے خلاف تمام فوجی عزائم کی میں برابر سراغ رسانی کر کے سری نگر میں حریت پسند مجاہد کمانڈو لیڈر شیروان کو اور شیروان کے ذریعے پاکستان کی حکومت کو بھارت کے جارحانہ ناپاک عزائم سے باخبر رکھ سکتا تھا۔ یہ ایک نیشنل کاز تھی۔ یہ میرے وطن پاکستان کی سلامتی اور اس کے استحکام کا معاملہ تھا۔ اس کے لئے میں اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا تھا اور لگاتا ؛ تھا۔ اگر بفرض محال شکنتلا کے بھائی میجر شرت دیوان نے مجھے پہچان بھی لیا تو میں صاف مکر جاؤں گا اور کہوں گا کہ میں وہ آدمی نہیں

ہوں۔ بہرحال پھر مجھ سے جو کچھ ہو سکا کروں گا اور یہ طے تھا کہ میں میجر شرت دیوان کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ وہ لاکھ انڈین ملٹری کا تربیت یافتہ فوجی سہی مگر میری کمانڈو صلاحیتوں کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

رات کے کسی پہر مجھے نیند آگئی۔

صبح اٹھا تو صبح کی روشن دھوپ کھڑکی کے اوپر جو روشندان تھا اس میں سے کمرے میں آرہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ نوکرانی کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر جھک کر ریاستی ملازموں کی طرح نمسکار کیا اور بولی۔

"راجکماری جی نے کہا ہے ناشتہ تیار ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں"

میں باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر دانت صاف کر کے باہر نکلا تو نوکرانی میرا بستر ٹھیک کر چکی تھی اور تپائی کا میز پوش بدل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر رک گئی اور جھک کر بولی۔

"سر! آپ کو میں لئے چلتی ہوں۔ ناشتے کی میز راجکماری جی نے اوپر والی گیلری میں لگوائی ہے۔"

وہ مجھے پرانے قلعے ایسی حویلی کی سیڑھیوں میں سے دوسری منزل کی گیلری پر لے گئی۔ ناشتے کی میز پر شکنتلا نئی ساڑھی میں ملبوس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی گڈ مارننگ کہا اور بتایا کہ اس کا بھائی ناگ پور سے پہنچنے ہی والا ہے۔

"بنسی بگھی لے کر اسے لینے سٹیشن پر چلا گیا ہے"

میرے امتحان کی گھڑی قریب آرہی تھی۔ میں بالکل نہتا تھا۔ شکنتلا کا فوجی بھائی شاید فل وردی میں ہو۔ اس نے پستول بھی لگایا ہوگا۔ اگر اس نے مجھے پہچان لیا کہ میں وہی پاکستانی جاسوس ہوں یا کشمیری کمانڈو ہوں جس کو گوالیار کے ٹارچر سیل میں لایا گیا تھا اور جس کو بعد میں ایک فوجی طیارے سے نیچے گرا دیا گیا تھا تو وہ یقیناً اسی وقت پستول نکال

لے گا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے شکنتلا کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"دھرم ویر! تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں نے تمہارے لئے چائے بھی بنا دی ہے"

میں نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور شکنتلا کے سامنے والی بید کی کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ ناشتے میں حلوہ پوریاں مٹھائیاں اور ڈبل روٹی مکھن بھی تھا۔ میں ایک سلائس پر تھوڑا سا مکھن لگا کر کھانے لگا تو شکنتلا نے کہا۔

"یہ گلاب جامن بھی لو۔ یہ چھندواڑہ کے مشہور گلاب جامن ہیں"

میں نے ایک گلاب جامن بھی اٹھا لیا۔ گیلری سے نیچے ایک کچا راستہ درختوں میں دور تک جاتا نظر آ رہا تھا۔ ضرور یہی راستہ چھندواڑہ کے ریلوے سٹیشن کو جاتا تھا اور شکنتلا کا بھائی اسی راستے سے آنے والا تھا۔ میری نگاہیں اس راستے پر لگی تھیں۔ شکنتلا کہنے لگی۔

"بھیا شرت کو مجھے دیکھ کر جتنی خوشی ہو گی تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ تم سے مل کر بھی بڑا خوش ہو گا۔ بھیا مجھ سے بڑا پیار کرتا ہے۔ میں اس کی اکلوتی بہن ہوں اور وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ تم رات ٹھیک سے سوئے تھے ناں؟"

"ہاں ہاں۔ خوب سوتا رہا؟"

میں نے غیر حاضر دماغی کی حالت میں کہا۔ میرا دھیان اس کے فوجی بھائی کی طرف لگا ہوا تھا۔ شکنتلا بھی مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کسی وقت درختوں کے درمیان سے جانے والے راستے کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ کہنے لگی۔

"بھیا سٹیشن سے چل پڑا ہو گا۔ ناگ پور سے اس وقت آنے والی گاڑی ٹھیک نو بجے چھندواڑے پہنچ جاتی ہے۔ اب نو بج کر پندرہ منٹ ہو گئے ہیں"

ایک منٹ بعد مجھ سے باتیں کرتے کرتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی۔

"بھیا آ گئے۔ تم بھی نیچے آ جاؤ"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا! ایک بگھی درختوں کے نیچے سے گزرتی پرانی حویلی کی طرف آ رہی تھی۔ میں شکنتلا کے پیچھے نیچے اتر آیا۔ شکنتلا دوڑتی ہوئی حویلی

کے احاطے میں سے گزر کر گیٹ کے باہر جا کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں نوکرانیاں ایک نوکر شکنتلا کی رانی ماں کو وہیل چیئر پر بٹھائے ہوئے لے کر برآمدے میں آ گئے۔ میں نے رانی ماں کو نمسکار کیا وہ بولیں۔

"میرا بیٹا آ رہا ہے۔ اپنی بہن کو دیکھ کر وہ خوشی سے نہال ہو جائے گا۔"

پھر کہنے لگیں۔

"بیٹا دھرم ویر! ہمیں یہ ساری خوشیاں صرف تمہاری وجہ سے ملی ہیں۔ میں تو جنم جنم میں تمہاری ابھاری رہوں گی"

میں نے کہا۔

"ماتا جی! آپ ایسا نہ کہیں۔ شکنتلا جی کو گھر پہنچانا میرا انسانی فرض تھا۔"

اس دوران بگھی حویلی کے گیٹ کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ دن کی روشنی اور کھلی ہوئی دھوپ میں میں نے ایک درمیانے قد کے ذرا بھاری جسم والے فوجی کو بگھی سے اتر کر شکنتلا کو گلے لگاتے دیکھا۔ وہ شکنتلا کے گلے میں بازو ڈالے اسے اپنے ساتھ چلاتا اور بار بار اس کے سر کو چومتا ہوا برآمدے کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ اس فوجی جوان کی عمر تیس پینتیس سال کے قریب تھی۔ سر کے بال درمیان سے تھوڑے تھوڑے اڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں خضاب لگا ہوا لگتا تھا۔ کاندھے پر میجر کے عہدے کا کراؤن لگا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی رانی ماں کے پاؤں چھوئے اور میری طرف دیکھا۔ رانی ماں نے کہا۔

"شرت بیٹا! اس کے بھی پاؤں چھوؤ یہ دھرم ویر ہے۔ یہی تمہاری بہن کو ڈاکوؤں کے غار سے نکال کر لایا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو شاید ہم اپنی بچی کا منہ کبھی نہ دیکھ سکتے۔"

اور رانی ماں کی آواز بھرا گئی۔ میجر شرت دیوان نے میری طرف غور سے دیکھا۔ یہ بڑا قیامت کا لمحہ تھا۔ میں بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔ اور وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ اس نے احسان مندانہ انداز میں جھک کر میرے پاؤں چھونے چاہے میں نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔

"نہیں نہیں بھیا! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں"

میجر شرت دیوان نے مجھے گلے لگالیا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارا احسان مند ہوں۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔"

میں نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا نہ کہیں۔ شکنتلا جی کو وہاں سے نکال کر اس کے گھر پہنچانا میرا فرض تھا۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میجر شرت دیوان مجھے نہیں جانتا تھا۔ اس کے لئے میں ایک اجنبی شخص تھا۔ میرے سامنے نئے نئے کمانڈو ایکشن کے دروازے کھل رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس شخص کے ذریعے مجھے بھارتی فوج کے انتہائی خفیہ راز معلوم ہو سکتے تھے۔ اور میں انڈین ملٹری کے انتہائی حساس اداروں تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ صرف ہوش مندی احتیاط اور عقل سے کام لینے کی ضرورت تھی اور میں ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ہم سب رانی ماں کے بیڈ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ چائے اور مٹھائی آگئی۔ شکنتلا کا بھائی میجر شرت دیوان مجھ سے ڈاکوؤں کی کمین گاہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ انہیں فوری طور پر گرفتار کروانا چاہتا ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ان ڈاکوؤں کے پاس میرا ایسا کوئی راز نہیں تھا جو میرے اگلے مشن پر اثر انداز ہو سکتا۔ میں نے اسے لکھو اور رامو کے خفیہ ڈیرے کی پوری تفصیلات بتا دیں"

بولا۔

"میں آج ہی ملٹری فورس بھیج کران سب کو پکڑواتا ہوں"

میں نے کہا۔

"شرت بھیا! آپ کو اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ وہاں سے کسی دوسری طرف نکل جائیں۔"

"ڈونٹ وری! اردلی کے پاس میرا موبائل چھوٹا ٹرانسمیٹر موجود ہے، میں ابھی ملٹری پولیس کو اپنے ہیڈ کوارٹر اطلاع کرتا ہوں۔"

اس نے نوکرانی سے کہا۔

"میرے اردلی سے کہو صاحب نے ٹرانسمیٹر مانگا ہے"

نوکرانی چلی گئی۔ میجر اپنی بہن شکنتلا سے کہنے لگا۔

"شکن! تم بے فکر رہو۔ جن لوگوں نے تمہیں اغوا کیا تھا میں ان میں سے کسی ایک کو نہیں چھوڑوں گا۔ انہیں ایسی سزا دلواؤں گا کہ ساری زندگی جیل میں سڑتے رہیں گے۔"

رانی ماں کہنے لگیں۔

"ہماری ریاست کی پولیس تو کسی کام کی نہیں رہی۔ اتنے دنوں میں کسی ایک ڈاکو کو بھی نہیں پکڑ سکی۔"

میجر شرت نے کہا۔

"ماتا جی! اب نہ وہ ریاست رہی ہے۔ نہ ریاست کا راج دربار رہا ہے۔ راجہ جی اپنے پورے خاندان کو لے کر ولایت جا بسے ریاست جاتی رہی۔ ہمارے پتاجی کے ہوتے ہوئے پھر بھی پولیس کا انتظام اچھی طرح سے چلتا تھا۔ ان کے سورگباش ہونے کے بعد تو پھر یہی حالت ہونی تھی۔"

جب میں نے میجر شرت کو بتایا کہ ڈاکو کس طرح شکنتلا سے اس کے نام خط لکھوانا چاہتے تھے کہ ایک لاکھ روپیہ دے کر لڑکی کو لے جاؤ۔ روپیہ نہیں دو گے تو ہم اس کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے اور اسے بمبئی لے جا کر بیچ دیں گے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ بات شکنتلا کے بھائی کے گوش گزار کی تھی تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ میں نے ان کے خاندان پر کس قدر احسان کیا ہے۔ اس طرح سے مجھے اس فوجی افسر کا جس کا تعلق انڈیا کی ملٹری پولیس کے حساس ادارے سے تھا۔ بھرپور اعتماد حاصل ہو سکتا ہے اور اس پر میرے احسانات کا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔

شکنتلا نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! تم نہیں جانتے وہ لوگ کس قدر وحشی درندے تھے۔ بھگوان نے تو دھرم

ویر جی کو ایک دیوتا سمان میری مدد کو وہاں بھیج دیا۔ اگر یہ میری مدد نہ کرتے تو آج میں آپ لوگوں کے پاس نہ بیٹھی ہوتی۔"

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ میں اگر شکنتلا کی مدد کو محض اتفاق سے وہاں نہ پہنچ جاتا تو اس لڑکی کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہیں کہاں سے تاوان کے ایک لاکھ روپے ملنے تھے۔ بس یہی انجام ہوتا کہ پہلے وہ سارے ڈاکو شکنتلا کے ساتھ درندگی کا سلوک کرتے اور اس کے بعد اسے بمبئی کے طوائفوں کے بازار میں لے جاکر بیچ ڈالتے۔ میں نے صرف انسانی ہمدردی اور ایک لڑکی کی عزت بچانے کے لئے ایسا کیا تھا۔

میجر شرت دیوان نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے دبایا اور بولا۔

"دھرم ویر جی! مجھے بتایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میں آپ کی خاطر اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں۔"

وہ جذباتی ہوگیا تھا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ میں نے اپنی منصوبہ بندی پر عمل شروع کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"شرت بھیا! آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

وہاں بڑا جذباتی ماحول پیدا ہوگیا۔ شکنتلا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ رانی ماں بھی اشکبار ہوگئیں۔ میں نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"اوکے۔ بہت ہوچکا۔ شکنتلا جی! ہم سب کو اس خوشی کے موقع پر اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائیں"

میں انگریزی بول کر میجر شرت پر یہ اثر بھی ڈالنا چاہتا تھا کہ میں پڑھا لکھا نوجوان ہوں۔ میجر شرت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ اوکے۔"

نوکرانی میجر کا ٹرانسمیٹر سیٹ لے کر آگئی۔ اس نے فوراً سیٹ اون کر کے وائرلیس پر

اپنے سٹیشن ہیڈ کوارٹر سے رابطہ پیدا کیا۔ کوڈ میں کوئی الفاظ اور نمبر بولے اور انگریزی میں کہا۔

"کیپٹن شرما سے بات کراؤ۔"

پھر بولا۔

"کیپٹن شرما! میری بات غور سے سنو"

اس کے بعد میجر شرت دیوان نے وائرلیس پر ہی کیپٹن شرما کو ڈاکوؤں کی خفیہ کمیں گاہ کا پورا حدود اربعہ جو میں نے اسے بتایا تھا اور جنگل کی پوری تفصیل اور دریا پار والا راستہ جو وہ جانتا تھا میں نہیں جانتا تھا اسے بتایا اور آرڈر دیا کہ ابھی ملٹری فورس بھیج کر ان سب کو گرفتار کر کے کوارٹر گارڈ میں بند کرو۔ میں رات کو پہنچ رہا ہوں۔ آؤٹ۔"

دوپہر کا کھانا میں نے ان سب کے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد کافی پی گئی۔ شکنتلا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میجر شرت مجھے ساتھ لے کر حویلی کے پچھلے باغیچے میں آگیا۔ لیموں کے درخت کے نیچے بید کی کرسیاں اور میز بچھی تھی۔ میجر شرت نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا کہ میں ان ڈاکوؤں کی کمیں گاہ میں کیسے پہنچ گیا۔ میں نے پہلے سے ایک کہانی سوچ رکھی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں امرتسر کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوا۔ امرتسر کے سکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی۔ میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا۔ مگر میرے پتاجی اچانک سورگباش ہو گئے۔ ان کے غم میں ماتا جی بھی کچھ دنوں بعد چل بسی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میرا کوئی بھائی بہن نہ تھا۔ ہم امیر لوگ بھی نہیں تھے۔ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ دلی جا کر کہیں نوکری تلاش کرتا ہوں۔ میں اپنے رشتے داروں کے شہر میں نہیں رہنا چاہتا تھا ان کا رویہ پتاجی کی موت کے بعد مجھ سے اچھا نہیں رہا تھا۔ میں دلی آگیا۔ دلی میں کئی دنوں تک نوکری کی تلاش میں دربدر پھرتا رہا۔ کہیں نوکری نہ ملی تو سوچا بمبئی جا کر قسمت آزمائی کرتا ہوں۔ میں ٹرین میں بیٹھ کر بمبئی کی طرف چل پڑا۔ گوالیار کے سٹیشن پر ٹرین کا انجن خراب ہوگیا۔ دوسرے انجن کے آنے میں کافی دیر لگی۔ میں نے گوالیار شہر اور اس کے اردگرد کے پہاڑی جنگلوں کی بڑی تعریف

سن ر[illegible] تھی۔ یونہی میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ گوالیار شہر کی سیر کی جائے۔ چنانچہ میں سٹیشن کی عمارت سے نکل کر شہر میں آگیا۔ گوالیار کا شہر مجھے بڑا اچھا لگا۔ خوش قسمتی سے مجھے وہاں ایک ڈرگ سٹور میں نوکری بھی مل گئی۔ میں بڑا خوش تھا۔ نوکری کرتے مجھے ایک مہینہ گزر چکا تھا کہ ایک روز گوالیار کے آس پاس کے جنگل کی سیر کرنے نکل پڑا۔ بس یہی میری غلطی تھی۔ میں جنگل میں راستہ بھول گیا اور ان ڈاکوؤں کے قابو آگیا۔ ڈاکوؤں نے مجھے یرغمال بنا لیا۔ وہ مجھ سے میرے ماں باپ کا پوچھتے کہ ان کا پتہ بتاؤ۔ وہ میرے ماں باپ سے تاوان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بہت کہا کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں گوالیار میں اکیلا رہتا ہوں مگر انہوں نے میری بات پر یقین نہ کیا اور کہا کہ ہمارا آدمی جہاں تم شہر میں نوکری کرتے ہو وہاں جا کر معلوم کرے گا کہ تمہارے ماتا پتا زندہ ہیں کہ مر چکے ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے ایک آدمی گوالیار شہر کی طرف روانہ کر دیا۔ اس دوران مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکو کسی لڑکی کو اغوا کر کے لائے ہیں اور اسے یرغمال بنا کر رکھا ہوا ہے کہ اس کے گھر والوں کو پیغام بھجوا کر اس کے تاوان کی رقم وصول کی جائے۔ چونکہ میں پڑھا لکھا تھا ڈاکوؤں کے سردار نے مجھے کہا کہ لڑکی سے اس کے ماں باپ کے نام خط لکھوا کر دو۔ میں غار میں لڑکی کے پاس آگیا۔ یہ لڑکی شکنتلا تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں شکنتلا کو ان وحشی ڈاکوؤں کی قید سے نکال کر اس کے گھر پہنچاؤں گا چاہے اس کے لئے مجھے کچھ ہی کرنا پڑے۔

"اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں آپ کو پہلے ہی سنا چکا ہوں"

میجر شرت دیوان غور سے میری فرضی من گھڑت کہانی سنتا رہا۔ جب میں نے اپنی کہانی ختم کی تو وہ بولا۔

"دھرم ویر! آج سے تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں"

میں اسی جملے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میری بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں تو بھارت کی فوج میں کمیشن حاصل کر

اپنی بھارتی فوج کی خدمت کروں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ بی اے کے بعد اپنی تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکا۔ بھگوان نے مجھے آپ سے ملا کر ایک بار پھر یہ موقع دیا ہے کہ میں اپنی فوج کی خدمت کروں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مجھے آپ کی رجمنٹ میں کوئی چھوٹی موٹی سویلین نوکری مل سکے۔ انگریزی زبان پر مجھے کافی عبور حاصل ہے"

میجر شرت نے میری طرف بڑی شفقت اور محبت کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا تعلق فوج کی ملٹری انٹیلی جینس سے ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں میرے ہیڈ کوارٹر میں ہی کوئی ملازمت مل جائے۔ میں آج شام واپس جا رہا ہوں دو دن بعد واپس آؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو کچھ نہ کچھ تمہارے لئے ضرور ہو جائے گا۔"

میجر شرت دیوان نے اسی روز تیسرے پہر واپس ناگ پور چلا گیا۔ میں حویلی میں رہ کر اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ شکنتلا میری بڑی خدمت کرتی رہی۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتی۔ دو دن گزر گئے۔ تیسرے روز میجر شرت واپس آیا تو اس نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ اس نے میرے لئے اپنے رجمنٹل کوارٹر میں ہی کام تلاش کر لیا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ جب میں نے پوچھا کہ میری نوکری کی نوعیت کیا ہوگی تو وہ بولا۔

"ہمارے ناگ پور کے رجمنٹل ہیڈ کوارٹر کی فوجی کنٹین ہے جسے نانی کہتے ہیں۔"

یہ گروسری کا سٹور ہے۔ جہاں سے فوجیوں کو سگریٹ' چائے' شراب' صابن' آٹا چاول اور ہر قسم کی دوسری ضروریات زندگی کی چیزیں سستے نرخوں پر ملتی ہیں۔ اس کنٹین کا ٹھیکے دار ایک سویلین مسٹر مہتہ ہے جو میرا جاننے والا ہے۔ یہ ٹھیکہ میں نے ہی اسے دلوایا تھا۔ اس سے میں نے تمہارے لئے ساری بات طے کر لی ہے۔ تمہیں اس فوجی کنٹین میں بطور منیجر رکھ لیا گیا ہے۔ تم اب میرے ساتھ ہی ناگ پور چلو گے اور نئی نوکری پر کام شروع کرو گے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ مجھے بھارتی فوجی ہیڈ کوارٹر میں کسی طرح

کا موقع مل جائے۔ یہ موقع مجھے شکنتلا کے بھائی میجر شرت نے فراہم کر دیا تھا۔

جب میجر شرت کی چھٹی ختم ہوئی تو وہ مجھے اپنے ساتھ ہی ناگ پور لے گیا۔

ناگ پور شہر سے میں تھوڑا بہت واقف تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک بار اپنی کمانڈو سرگرمیوں کے سلسلے میں اس شہر میں آچکا تھا۔ میجر شرت فوجی آفیسرز میس کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہ رہا تھا۔ اس نے مجھے فوجی ہیڈ کوارٹر کی فوجی کنٹین کے ٹھیکیدار سے ملایا۔ یہ ادھیڑ عمر کا سانولا کمزور سا آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

”کام اتنا مشکل نہیں ہے۔ بس ڈیوٹی صبح سے شام تک دینی ہوگی۔ میجر شرت جی میرے بڑے بھائی کے سمان ہیں۔ ان کی بات میں نہیں ٹال سکتا۔ میرا ملازم جگدیش تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔“

میں نے ناگ پور کے اس فوجی رجمنٹل ہیڈ کوارٹر کی فوجی کنٹین میں نوکری شروع کر دی۔ کنٹین کے ساتھ ہی عقب میں ایک چھوٹا سا کمرہ مجھے رہائش کے لئے مل گیا۔ میجر شرت نے مجھے نیا بستر اور استعمال کی تمام ضروری چیزیں لا کر دے دیں۔ کنٹین کے ٹھیکے دار سے دو سو روپے ایڈوانس بھی دلوا دیئے۔ کنٹین فوجی ہیڈ کوارٹر کے اندر ہی تھی۔ مجھے ہیڈ کوارٹر کے گیٹ سے اندر آنے اور باہر جانے کے لئے ایک فوجی پاس مل گیا تھا۔ میں نے کنٹین میں کام شروع کر دیا۔ دن میں ایک آدھ بار میجر شرت میرے پاس آکر میرا حال چال معلوم کر جاتے تھے۔ کھانا وغیرہ مجھے فوجی لنگر سے مل جاتا تھا جس کے لئے مجھے بڑی معمولی سی رقم تنخواہ میں سے کٹوانی ہوتی تھی۔ کنٹین کے ملازم جگدیش نے مجھے سارا کام سمجھا دیا تھا۔

کنٹین پر ہر رینک کے بھارتی فوجی راشن وغیرہ لینے آتے تھے۔ میں ان کی مطلوبہ اشیاء کی لسٹ بنا کر جگدیش کو دے دیتا۔ وہ ساری چیزیں لفافوں میں ڈال کر فوجی کے حوالے کرتا۔ میں اس فوجی کا آئی ڈی کارڈ لے کر بل پر اس کا آئی ڈی نمبر نام اور رینک لکھ کر اس کے دستخط لے لیتا۔ اس طرح سے مجھے ہر عہدے کے فوجی سے ملنے کا موقع

مل گیا۔ میں نے ایک ہفتے کے بعد اپنے مطلب کے دو تین فوجی افسروں سے تعلقات پیدا کر لئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے مجھے میرے مطلب کی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ ان میں ملٹری انٹیلی جنیس کا ایک صوبیدار میجر بھی تھا جس کا نام چندرا کانت تھا۔ لیکن میرا اصل ٹارگٹ شکنتلا کا بھائی میجر شرت دیوان تھا۔ اس آدمی سے مجھے بڑی آسانی سے بھارتی ہائی کمانڈ کے اہم راز معلوم ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میں ایک دن چھوڑ کر ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد میجر شرت کے پاس چلا جاتا اور اس کے ساتھ بڑا بھولا بھالا بن کر پیار محبت کی باتیں کرتا بھارتی فوج کے ڈسپلن اور فوجی جوانوں کی چستی اور بہادری کی تعریفیں کرتا۔ اور کہتا کہ ہماری بھارتی سینا کا مقابلہ دنیا کی کوئی فوج نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ ہی جان بوجھ کر پاکستان کی فوج کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہتا۔

”شرت جی! پاکستان کی فوج تو ہماری انڈین سینا کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کبھی جنگ ہو گئی تو ہماری بھارتی فوج ایک گھنٹے کے اندر اندر سارے پاکستان پر قبضہ کر لے گی۔“

یہ بات میں دل پر جبر کر کے کہتا تھا۔ ساتھ ہی دل میں یہ جملہ ضرور دہراتا کہ ایسا موقع کبھی نہیں آئے گا۔ اگر آیا تو پاک فوج کے شیر دل جوان بھارت کو وہ سبق سکھائیں گے کہ جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ شرت دیوان کہتا۔

”ارے دھرم ویر بھیا! پاک فوج کی نفری ویسے بھی ہم سے بہت کم ہے۔“

ہم نے ٹیکنیکل میدان میں جو ترقی کی ہے اور جس قسم کے نئے نئے ہتھیار ہماری اسلحہ کی فیکٹریوں میں بن رہے ہیں۔ اس کا مقابلہ پاکستان کی فوج نہیں کر سکے گی۔“

ایک دفعہ اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے بھارت کا دیش بھگت بن کر پوچھا۔

”شرت جی! ہماری فوج نے میزائل بھی ضرور بنائے ہوں گے۔ سنا ہے پاکستان میں اس قسم کے میزائل تیار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔“

شرت دیوان آخر انٹیلی جنیس کا افسر تھا۔ ایسے افسر بات کرنے میں بڑی احتیاط سے

کام لیتے ہیں۔ کہنے لگا۔

"بس کچھ نہ کچھ ہم بھی کر رہے ہیں"

اس کے بعد اس نے موضوع بدل کر دوسری باتیں شروع کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس آدمی سے راز معلوم کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں بھارتی فوج کے پیٹ کے اندر پہنچ چکا تھا۔ میں صبر سے کام لے سکتا تھا۔

میجر شرت دیوان کے ہوسٹل میں کبھی کبھی شام کے وقت اس کے فوجی دوست بھی آ کر بیٹھتے تھے۔ شراب کا دور بھی چلتا تھا۔ ان فوجیوں کا تعلق زیادہ تر ملٹری انٹیلی جینس سے ہوتا تھا۔ یہ لوگ شراب پی کر بھی فوجی معاملات پر گفتگو کرتے وقت مجھے دیکھ کر محتاط انداز اختیار کر لیتے تھے۔ مگر میں نے اپنے رویے اور پاکستان کے خلاف باتیں کرتے رہنے سے ان کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ یہ فوجی کچھ اس وجہ سے بھی مجھے بڑا دلچسپ اور ایڈونچرس نوجوان سمجھتے تھے کہ میں میجر شرت کی بہن کو ڈاکوؤں کی کمیں گاہ سے نکال کر لے آیا تھا۔

مجھے ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر کی کنٹین پر کام کرتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا اور ابھی تک میں سری نگر میں اپنے کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں پہنچا سکا تھا۔ میں نے یہ دیکھا تھا کہ میجر شرت اپنا موبائل ریڈیو ٹرانسمیٹر اپنے کمرے کے کلوزٹ میں رکھتا تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کر لی تھی۔ میں اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے موقع پا کر کمانڈر شیروان کو اپنے خاص خفیہ کوڈ میں سری نگر پر پیغام بھجوا سکتا تھا کہ میں ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں پہنچ چکا ہوں۔ لیکن یہ کوئی اتنا ضروری پیغام نہیں تھا جس کے لئے میں کوئی خطرہ مول لیتا۔ کیونکہ یہ مجھے معلوم تھا کہ فوجی ہیڈ کوارٹر سے کوئی سگنل نشر ہوا تو خواہ وہ خفیہ کوڈ میں ہی ہو ہیڈ کوارٹر کے سگنل کور کی مانیٹرنگ ٹیم کو اس کا علم ضرور ہو جائے گا۔ میں یہ خطرہ صرف اس صورت میں مول لے سکتا تھا جب مجھے کوئی انتہائی اہم فوجی راز معلوم ہو جاتا۔

اور قدرت نے بہت جلد مجھے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ ایک روز شام کے وقت میجر

شرت دیوان کے کمرے میں شراب و کباب کی محفل گرم تھی۔ وہاں انٹیلی جینس کور کا ایک سکھ کیپٹن بھی بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ یہ لوگ کافی شراب پی گئے تھے اور زبان پر انہیں قابو نہیں رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر دوسری طرف ہو کر لکڑی کے کریٹ میں میجر شرت کی وردی تہہ کر کے رکھنے لگا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ مجھے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کچھ وہ لوگ بھی غافل ہو چکے تھے۔ اتنے میں انٹیلی جینس کور کے سکھ کیپٹن کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا تھا۔

"اس بار ہم پاکستان کا نام نقشے پر سے ہٹا دیں گے اور بھارت ماتا کے بچھڑے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر اس غلطی کا ازالہ کر دیں گے جو پنڈت نہرو نے انڈیا کو تقسیم کر کے کی تھی۔"

وہاں ایک لیفٹیننٹ، ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ اور میجر شرت دیوان بھی بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ یہ لوگ نشے میں بہت زیادہ بہک جانے کے باوجود محتاط تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے چہرہ نیچے کر لیا اور کریٹ میں وردی جمانے لگا۔ اسی لیفٹیننٹ نے سکھ کیپٹن سے پوچھا۔

"سر! کیا کوئی ڈیڈ لائن مقرر ہوئی ہے۔"

سکھ کیپٹن نے شراب کا ہلکا سا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"اس کا فیصلہ تو ہماری منسٹری آف ڈیفنس ہی کرے گی۔ لیکن ہماری انٹیلی جینس کو پاکستان کی ڈیفنس لائن کی پوری رپورٹ جلد سے جلد مہیا کرنے کے آرڈر مل گئے ہیں۔"

میجر شرت دیوان نے اپنا گلاس میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"ہم یہ رپورٹ ہائی کمانڈ کو ایک ہفتے کے اندر اندر پہنچا رہے ہیں"

اس کے ساتھ ہی جیسے سکھ کیپٹن اپنے ہوش میں آگیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"نو سیکرٹ ٹاک پلیز۔ فارگٹ اٹ"

اور انہوں نے موضوع بدل دیا۔ وہ فلم ایکٹرسوں اور دوسری عورتوں کی باتیں کرنے لگے۔ اس دوران سیکنڈ لیفٹیننٹ نے کوئی فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔ یہ محفل رات کے گیارہ بجے تک جاری رہی۔ اس کے بعد سب چلے گئے۔ میں بھی میجر شرت سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں آکر میں اپنی فوجی کیمپ کارٹ پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سکھ کیپٹن نے جو بات کی تھی یا اس کی زبان سے نکل گئی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ بھارت کی فوجی ہائی کمانڈ نے پاکستان پر کسی حملے کا منصوبہ بنا لیا ہے اور اسے انڈین ڈیفنس منسٹری کی منظوری بھی حاصل ہے۔ یہ بڑا اہم فوجی راز تھا جو مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ یہ راز مجھے ان فوجی افسروں سے ہی حاصل ہو سکتا تھا جن کا تعلق ملٹری کی انٹیلی جینس کور سے تھا۔ دوسری کسی جگہ سے میں یہ راز حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ راز کمانڈو لیڈر شیروان کو اس وقت تک نہیں بتانا چاہتا تھا جب تک مجھے انڈین ملٹری ہائی کمانڈ کے

اس اہم فیصلے کی کچھ تفصیلات معلوم نہیں ہو جاتیں۔ میرے لئے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا کہ بھارت اگر پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو یہ حملہ کس مہینے کرے گا اور کونسی تاریخ کو کرے گا اور حملے کی حکمت عملی کیا ہوگی۔ یہ فوجی معلومات انتہائی راز والی تھیں اور اگر کوئی شخص اس سلسلے میں مجھے کچھ بتا سکتا تھا تو وہ شکنتلا کا بھائی میجر شرت دیوان ہی تھا۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ فوجی راز میں اس سے معلوم کر کے رہوں گا۔ مجھے اس کا اعتماد حاصل تھا۔ میں اپنی باتوں سے اس پر یہ ثابت کر چکا تھا کہ میں بھارت ماتا کا سچا پجاری ہوں اور پاکستان کو بھارت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ میجر شرت کو اگر پاکستان پر فوجی حملے کی تاریخ کا علم ہو گا تو وہ مجھے اتنی آسانی سے یہ راز بتا دے گا۔ اس کے لئے مجھے انتہائی دانشمندی' احتیاط' چالاکی اور کسی خاص حکمت عملی سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ میں یہ دیکھ چکا تھا کہ میجر شرت دیوان کو اعلیٰ سے اعلیٰ شراب پینے کا شوق ہے اور وہ ہر روز شام کو قیمتی شراب کے تین چار جام ضرور پیتا ہے۔ اس نے ایک دن مجھے کہا تھا۔

"دھرم ویر! جس رات کو شراب نہ پیوں اچھی طرح سے نیند نہیں آتی۔ ہماری رجمنٹ کے میڈیکل آفیسر نے بھی مجھے کہا ہے کہ میں رات کو سونے سے پہلے اچھی سکاچ وسکی کے دو تین پیگ ضرور پی لیا کروں۔ مگر یہاں سوائے وائٹ ہارس اور واٹ ۶۹ کے دوسری کوئی اعلیٰ سکاچ نہیں ملتی۔"

یہ بات میرے ذہن میں تھی۔

ہفتے کے دن ہماری ملٹری کنٹین میں راشن کی سپلائی آئی تو اس میں سکاچ وہسکی ڈمپل سکاٹ کے دو کریٹ بھی تھے۔ ڈمپل سکاٹ کا شمار بہت اونچے درجے کی سکاچ وہسکی میں ہوتا ہے۔ میں نے فوراً اس میں سے ڈمپل سکاٹ کی ایک بوتل کا ڈبہ نکال کر الگ رکھ لیا۔ شام کو جب میں ڈیوٹی سے فارغ ہوا تو میں نے ڈبہ لفافے میں ڈالا اور میجر شرت کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میجر شرت جس آفیسرز

ہوسٹل کے کمرے میں رہتا تھا وہ ناگ پور کے اس فوجی ہیڈ کوارٹر کے احاطے کے اندر ہی تھا۔ شام کے وقت میجر شرت دیوان کے پینے پلانے کا پروگرام ہوتا ہے چنانچہ وہ مجھے اپنے کمرے میں ہی مل گیا۔ میں نے نمسکار کیا اور کہا۔

"بڑے بھیا! آپ کے لئے میں ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جس کو دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گے"

میجر شرت اس وقت الماری کے پاس کھڑا تھا اس میں سے گلاس اور شراب کی بوتل نکال رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"اچھا۔ ایسی کونسی شے لائے ہو؟"

میں نے ڈمپل سکاٹ کی بوتل کا ڈبہ اس کے آگے کر دیا۔ اسے دیکھتے ہی میجر شرت کا چہرہ کھل اٹھا۔ جلدی سے شراب کی بوتل کا ڈبہ میرے ہاتھ سے لے لیا کہنے لگا۔

"یہ تمہیں کہاں سے مل گئی دھرم ویر؟"

میں نے کہا۔

"بھیا! سپلائی میں اس کا تھوڑا سا سٹاک آیا ہے۔ دو کریٹ ہیں۔ کہیں تو میں آپ کے لئے الگ رکھ لوں؟"

میجر شرت خوش ہو کر بولا۔

"الگ کیوں رکھتے ہیں۔ میرے کمرے میں بھجوا دو۔ میں نقد پے منٹ کروں گا۔"

"او کے بھیا! سمجھو وہ آپ کے کمرے میں پہنچ گئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے ڈبہ واپس لیتے ہوئے کہا۔

"بھیا! میری ایک خواہش ہے"

"وہ کیا؟ وہ بھی بتادو"

میں نے کہا۔

"میں نے دل میں بھگوان سے کہا ہوا تھا کہ ہے بھگوان میرے بڑے بھیا کو بڑھیا سکاچ کا بڑا شوق ہے۔ کہیں سے اعلیٰ کوالٹی کی شراب دلادے۔ میں اپنے پیارے بھیا کو

اپنے ہاتھ سے پلاؤں گا"

میجر شرت قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"تم جب چاہو مجھے اپنے ہاتھ سے پلا سکتے ہو۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نہیں پیتے۔"

میں نے ڈبے میں سے بوتل نکال کر میز پر سجاتے ہوئے کہا۔

"بھیا! بات یہ ہے کہ میں نے اپنی سورگباشی ماتاجی کو وچن دے رکھا ہے کہ میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ بس اسی وچن کا پالن کر رہا ہوں۔ ورنہ تمہارے ساتھ پینے سے تو مجھے بڑا آنند ملتا۔ تم تو میرے بہت ہی پیارے بھیا ہو۔"

"تو پھر فریج میں سے برف نکال کر لے آؤ۔ میں گلاس دھو کر لاتا ہوں۔ آج میرا اردلی چھٹی پر ہے۔ سارا کام خود ہی کرنا ہوگا۔"

میں نے بڑی عاجزی کا لہجہ بناتے ہوئے ہندوؤں کی طرح ہاتھ باندھ کر کہا۔

"شرت بھیاجی! آپ مجھے بھی اپنا اردلی ہی سمجھیں۔ آپ کی سیوا کروں گا تو اگلے جنم میں سپھل ہوں گا۔"

میجر شرت نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور کہا۔

"دھرم ویر! پھر کبھی ایسا نہ کہنا۔ تم نے ہمارے خاندان پر ایک ایسا احسان کیا ہے کہ ہماری سات پشتیں بھی اسے فراموش نہیں کریں گی۔ میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتا ہوں"

تھوڑی دیر بعد میں میجر شرت کے گلاس میں ڈمپل سکاٹ کی بوتل کھول کر اس میں پیگ بنا رہا تھا۔ پاکستان کے خلاف بھارت کی ڈیفنس منسٹری اور فوجی ہائی کمانڈ نے جارحیت کا جو خفیہ پروگرام بنایا تھا میں میجر شرت سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی پوری سکیم ذہن میں تیار کر کے آیا تھا۔ چنانچہ میں نے پہلا پیگ بناتے ہی پاکستان کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ میجر شرت نے اعلیٰ وہسکی کا گھونٹ بھر کر میری طرف دیکھا اور خوش ہو کر بولا۔

"ونڈر فل! بڑی دیر بعد ڈمپل سکاٹ پی ہے۔ بس اب دونوں کریٹ میرے کمرے میں بھجوا دینا۔"

میں نے کہا۔

"میں کل ہی بھجوا دوں گا"۔

"دوسرے پیگ پر میجر شرت ہلکے ہلکے سرور میں آگیا۔ کہنے لگا

"بس دھرم ویر اب تم شادی کر لو۔"

میں نے کہا۔

"بھیا! پہلے آپ کا بیاہ ہوگا۔ پھر شکنتلا جی کا بیاہ ہوگا۔ اس کے بعد میں اپنا بیاہ کروں گا"۔

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"پھر تمہارا بیاہ کبھی نہیں ہوگا۔"

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے پھر پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے کہا۔

"کل میں ناگ پور شہر کی بڑی مارکیٹ میں کچھ چیزیں خریدنے گیا تھا۔ وہاں ایک لالہ جی کہہ رہے تھے کہ کشمیر میں ہماری فوج کی ہار ہو رہی ہے۔"

میجر شرت نے اس لالہ جی کو انگریزی میں گالی دے کر کہا۔

"اسے کیا معلوم وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔ لیکن ہمارے سپاہی بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں نے بھی اس لالہ جی سے یہی کہا تھا بھیا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری بھارتی سینا ایک دن پاکستان کو بھی فتح کر لے گی۔ کشمیر تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔"

میجر شرت دیوان کو اس وقت میں تیسرا ڈبل پیگ بنا کر دے چکا تھا اور وہ سرور کی حد پار کر کے نشے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ یعنی جہاں سرور ختم ہو جاتا ہے اور شراب

کا نشہ دماغ کو اپنے پنجوں میں جکڑنے لگتا ہے۔ تین ڈبل پیگ بڑے ہوتے ہیں یقین کے ساتھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کسی زمانے میں میں خود ان مراحل سے گزر چکا تھا۔ میجر شرت نے میز پر ہلکا سا ہاتھ مارا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"دھرم ویر! تم نے اس احمق لالہ جی کو بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ہم بہت جلد پاکستان کا قصہ ہی ختم کرنے والے ہیں"

میں نے بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا سچ کہہ رہے ہو بھیا؟ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ بھگوان ہماری سینا کو اور طاقتور بنائے بس ایک ایسا حملہ کرو کہ پاکستان سارے کا سارا بھارت میں دوبارہ واپس آجائے۔"

میجر شرت نے تیسرا پیگ ختم کر دیا تھا اور اب وہ خود اپنے لئے چوتھا ڈبل پیگ بنا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سرہلاتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا اور جیسے اپنے آپ سے ہمکلام تھا۔

"ایسا ہی ہوگا۔"

پھر انگریزی میں بولنے لگا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ اس دفعہ ہم کچھ ایسی ہی سٹریجی تیار کر رہے ہیں"

میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ایک سوال کر ڈالا۔

"لیکن شرت بھیا! سنا ہے پاکستان کو عربوں نے بڑا اسلحہ دیا ہوا ہے۔ کیا ہمارے پاس بھی کافی گولہ بارود ہے ناں؟ مجھے تو کبھی کبھی یہی فکر لگ جاتا ہے۔"

میجر شرت نے چوتھے ڈبل پیگ کا آدھا گلاس حلق میں انڈیلا اور سگار سلگاتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا۔

"تم کو کیا معلوم۔ جو ہمیں معلوم ہے وہ بھارت کے کسی شہری کو معلوم نہیں"

میں نے اس کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بھیا! آپ تو انٹیلی جینس کے بہت بڑے افسر ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں تو بھارت ورش کی نبض ہے۔"

میں بھی اب انگریزی میں بول رہا تھا۔ میجر شرت نے سگار کا کش لگا کر دھواں

چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہم پاکستان کو اس طرح اڑا دیں گے۔"

اور اس نے زور سے پھونک مار کر سگار کے دھوئیں کو ادھر ادھر اڑا دیا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! مگر ہمارا تو کوئی ملک دوست نہیں ہے۔ پاکستان کی تو سارے مسلمان ملک مدد کریں گے۔ ہماری کون مدد کرے گا؟"

اصل بات یہ تھی کہ میجر شرت دیوان کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کے سامنے جو آدمی بیٹھا ہوا ہے وہ دھرم ویر نام کا کوئی بے ضرر سا ہندو نہیں ہے بلکہ ایک تربیت یافتہ مسلمان کمانڈو اور تحریک آزادی کشمیر کا مجاہد ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا اور میں نے ان کے خاندان کے ساتھ جو ایثار کیا تھا اس کے بعد اسے ایسا سمجھنا ہی چاہئے تھا۔ پھر میرا ان لوگوں کے ساتھ رویہ ایسا رہا تھا کہ کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر شرت دیوان میرے ساتھ کھل کر بات کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی قریب ترین دوست کے آگے بھی یہ باتیں نہ کرتا۔ میرے سامنے اس لئے کر رہا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ میری یہاں کسی سے دوستی وغیرہ ہی نہیں ہے اور میں اس کے سوا اور کسی سے ناگ پور میں ملتا جلتا بھی نہیں ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھا۔ جب میں نے سوچی سمجھی سکیم کے مطابق یہ کہا کہ جنگ کی صورت میں ہماری مدد کو کونسا ملک آئے گا تو اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ پھر ہوا میں ایک ہاتھ کو دور سے لہرا کر انگریزی میں کہنے لگا۔

"امریکہ آئے گا۔ اسرائیل آئے گا' اسرائیل کے پاس اس وقت ملٹری کی جدید ترین ٹیکنالوجی موجود ہے۔ وہ ہمارا کھلا دوست ہے۔ امریکہ نے پردے کے پیچھے ہمارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے رکھا ہے۔ اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ تم پاکستان پر اٹیک کرو۔ ہم تمہیں اسرائیل کے ذریعے ہر قسم کا اسلحہ کی سپلائی کبھی ختم نہ ہونے دیں گے۔"

میں نے اٹھ کر میجر شرت کا ماتھا چوم لیا اور بے انتہا خوش ہو جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ تم نے میرا دل شیر جتنا بڑا کر دیا ہے۔ بس اب مجھے کوئی فکر نہیں رہا"

پھر جیسے ایک دم پریشان ہو کر کہا۔

"لیکن بھیا! اسرائیل کے جہاز ہمارے لئے گولہ بارود اور دوسرا جنگی سامان لے کر آئیں گے تو دوسرے ملکوں کے سفارت کاروں کو خاص طور پر پاکستان کے سفارت خانے والوں کو پتہ چل جائے گا۔"

میجر شرت دیوان نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات کہہ ڈالی جو ملٹری انٹیلی جنیس کا ایک ذمہ دار افسر ہونے کی حیثیت سے اسے کبھی اور کسی حالت میں نہیں کہنی چاہئے تھی۔ اس نے کہا۔

"دھرم ویر! اس وقت امریکی اسلحہ سے لدے ہوئے اسرائیل کے دومال بردار بحری جہاز ہماری ترچنا پلی پورٹ سے دس میل دور جیا گام کی کھاڑی میں کھڑے ہیں۔ ان میں اسرائیل کا دیا ہوا جدید ترین خطرناک میزائل' مارٹر گنیں اور ایسے ہائی ٹیک ریڈار بھی ہیں جو دشمن کے نیچے سے نیچی پرواز کرتے بمبار اور فائٹر طیاروں کا بھی سراغ لگا لیتے ہیں۔ اور یہ ابھی پہلی کھیپ ہے دوسری کھیپ اگلے مہینے پہنچنے والی ہے۔"

میں نے مصنوعی جوش میں آ کر کہا۔

"بھیا شرت جی! ہمیں پاکستان پر ایٹم بم چلا دینا چاہئے۔"

میجر شرت نے اپنی انگلی اٹھا کر ہونٹوں کے پاس لے جا کر انگریزی میں کہا۔

"بس دھرم ویر! اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ بھی تم میرے بھائیوں سے بھی زیادہ مجھے عزیز ہو اس لئے تمہیں اتنا بتا دیا۔ بس اب بے خوف ہو کر اپنا کام کرو۔ بہت جلد ہم دونوں لاہور کی انارکلی میں چل پھر رہے ہوں گے۔"

میں نے بھی مصلحتاً اس کے آگے کچھ نہ پوچھا۔ اس شخص نے مجھے جتنا بتا دیا تھا وہ کافی سے زیادہ تھا اور مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایک ملٹری انٹیلی جنیس آفیسر سے اتنی

چھوٹی سے چھوٹی ترین معلومات فراہم ہو جائیں گی۔ اگرچہ مجھے یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت تھی کہ اسرائیل کے جو جہاز مال بردار جہازوں کے بھیس میں پاکستان کے خلاف استعمال ہونے والا اسلحہ وغیرہ لے کر آئے ہیں ان کے اردگرد سیکورٹی کا انتظام کس طرح کا ہے اور جیا گام کی کھاڑی ترچنا پلی کی بندرگاہ سے کس جانب ہے۔ لیکن میں نے اس وقت مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ اور میجر کے لئے کباب گرم کرنے کچن میں چلا گیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں میجر شرت دیوان کے ہوسٹل سے واپس اپنے کمرے میں آیا تو میرا ذہن بھرا ہوا تھا۔ طرح طرح کی سکیمیں ذہن میں آرہی تھیں۔ مجھے ان جہازوں کو جو پاکستان کے خلاف جنگ میں استعمال ہونے والا خطرناک ترین اسلحہ اور دوسرا جدید ترین ٹیکنالوجی کا حامل فوجی سازوسامان لے کر بھارت کی ترچنا پلی کی بندرگاہ کے قریب لنگر انداز ہوئے تھے۔ ہر حالت میں غرق کرنا اور دھماکے سے اڑا دینا تھا۔ اس کے لئے مجھے ایک ساتھی کمانڈو کی ضرورت تھی اور یہ ساتھی کمانڈو کشمیر کا مجاہد سرفروش کمانڈو اورنگ زیب ہی ہو سکتا تھا۔ اورنگ زیب واقعی ایک تربیت یافتہ انتہائی ڈسپلن کا پابند اور نڈر کشمیری کمانڈو تھا۔

میں سگریٹ اس قسم کے لمحات میں ہی عام طور پر پیتا تھا۔ میں نے سرہانے کے نیچے سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگالیا۔ پہلے خیال آیا کہ موقع دیکھ کر میجر شرت کے ٹرانسمیٹر سے کمانڈر شیروان کو یہ ساری باتیں خفیہ کوڈ میں بتادوں اور اسے کہوں کہ وہ کمانڈو اورنگ زیب کو ناگ پور روانہ کردے۔ پھر خیال آیا کہ معلومات اتنی اہم' نازک اور زیادہ تھیں کہ ٹرانسمیٹر پر یہ ساری باتیں میں تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ ٹرانسمیٹر پر کمانڈو ہمیشہ انتہائی ضرورت کے وقت اور انتہائی مختصر الفاظ میں بات کرتے ہیں۔ دشمن کے ملک میں رہ کر ٹرانسمیٹر پر زیادہ لمبی گفتگو کی جائے تو سگنلز کے پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے خود سری نگر جا کر کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب سے ملنا چاہئے تاکہ تمام باتیں میں انہیں تفصیل کے ساتھ زبانی بیان کرسکوں اور کمانڈو اورنگ زیب کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آؤں۔ پھر ہم دونوں اپنے نئے کمانڈو مشن پر روانہ ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے اپنی مونچھیں بڑھانی شروع کر دی تھیں۔ میجر شرت نے ایک بار مجھ سے مونچھوں کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"بھیا! میں اپنے چہرے پر راجپوت بہادروں والی شان پیدا کرنا چاہتا ہوں"

اس فیصلے کے بعد میں نے ایک دن گزار دیا۔ فوجی کنٹین سے ڈمپل سکاٹ کی بوتلوں کے دونوں کریٹ میں نے وعدے کے مطابق اٹھوا کر میجر شرت دیوان کے کمرے میں پہنچا دیئے۔ دوسرے دن رات کو میں اس سے ملاقات کرنے گیا تو وہ ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ڈمپل سکاٹ پی رہا تھا۔ اس نے میرا اس عورت سے تعارف کروایا۔ اس پرکشش جسم والی اس عورت نے فالسے رنگ کی باریک ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس میں سے اس کا بلاؤز اور جسم جگہ جگہ سے جھانک رہا تھا۔ یہ عورت انڈیا کی ایئر کمپنی میں کام کرتی تھی۔

ابھی ان لوگوں نے شراب شروع ہی کی تھی۔ میجر شرت نے ڈمپل سکاٹ کے کریٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! یہ تو میری ڈیوٹی تھی"

عورت ایک پیگ پینے کے بعد بیڈ روم میں چلی گئی۔

تو میں نے میجر شرت سے کہا۔

"بھیا! ماتاجی کی سمادھ پر جانے کو بڑا دل چاہتا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں کچھ روز کے لئے امرتسر چلا جاؤں"

میجر شرت نے ڈبے میں سے سگار نکالتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں دھرم ویر ضرور جاؤ۔ میں تمہاری چھٹی منظور کراؤں گا۔ میں ٹھیکیدار مہتہ سے خود بول دوں گا۔ کتنے دن کے لئے امرتسر جانا چاہتے ہو؟"

میں ذہن میں اندازہ لگانے لگا کہ سری نگر جانے' وہاں سے کمانڈو اورنگ زیب کو ساتھ لے کر ترچنا پلی تک پہنچنے اور کمانڈو ایکشن مکمل کرنے میں کتنے دن لگ سکتے ہیں۔

میں نے میجر سے کہا۔

"بس ایک مہینے کی چھٹی مل جائے تو میں گورداسپور اپنی موسی سے بھی مل آؤں گا۔ کچھ دن ان کے پاس بھی گزار لوں گا۔ ان کی شکل میری ماتاجی سے بہت ملتی جلتی ہے۔"

میجر شرت اپنے گلاس کی شراب کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے۔ تم بے شک صبح کی گاڑی میں امرتسر روانہ ہوجاؤ۔ پیچھے میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ اور تمہیں پیسوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ نوپرابلم"

کلوزٹ کے پاس جا کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے بٹوہ نکال کر مجھے سوسو روپے کے دونوٹ دیئے اور بولا۔

"اگر زیادہ چاہئیں تو بتادو"

میں نے کہا۔

"تھینک یو بھیا! یہ کافی ہیں"

میں نے نوٹ لے کر جیب میں ڈالے۔ میجر شرت نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

"اپنی ماتاجی کی سادھ پر میری طرف سے بھی پھول چڑھانا۔ اوکے؟"

میں نے کہا۔ "ضرور چڑھاؤں گا"

میں نے باہر آکر آفیسرز میس کے ٹیلی فون سے ریلوے سٹیشن فون کیا تو معلوم ہوا کہ پنجاب ایکسپریس صبح ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ مجھے کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ صبح اٹھ کر نہا دھو کر پتلون قمیض پہنی۔ جیکٹ ساتھ رکھ لی۔ کیونکہ پنجاب میں سردی کا موسم تھا۔ میں نے کنٹین کے لڑکے جگدیش کو بھی نہ بتایا اور فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکل کر ٹیکسی پکڑی اور ناگ پور کے ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔

پلیٹ فارم پر بہت سارے مسافر تھے۔ ان میں جنوب کے ہر صوبے کے آدمی عورتیں تھیں۔ شمالی بھارت کے کچھ لوگ بھی تھے۔ جنوبی بھارت کے لوگوں کے رنگ کالے، گہرے سانولے تھے جب کہ شمالی بھارت کے مسافر اپنے کھلتے ہوئے رنگ اور

اونچے قد کاٹھ سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ ایک ہلکا سا خطرہ مجھے ضرور تھا کہ کہیں یہاں کوئی ایسا فوجی نہ مل جائے جس نے مجھے گوالیار کے ٹارچر سیل میں دیکھا ہو۔ مگر ایسی توقع کم ہی تھی۔ اتنے میں گاڑی آگئی۔ میں نے انٹر کلاس کا ٹکٹ لے رکھا تھا۔ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ شیطان کی آنت کی طرح لمبا سفر تھا۔ جن لوگوں نے یہ سفر کیا ہے وہی جانتے ہیں کہ آدمی ٹرین میں بیٹھے بیٹھے کس قدر تنگ آجاتا ہے۔ اس زمانے میں ناگ پور ابھی مہاراشٹر میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ گاڑی چلتی رہی اور میں ہر سٹیشن پر جائزہ لے لیتا تھا کہ کوئی ملٹری پولیس کا آدمی تو نہیں ہے۔ ایک طویل سفر کے بعد گاڑی خدا خدا کر کے دلی پہنچی۔ یہاں سے میں گاڑی تبدیل کر کے پنجاب کو جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ مجھے امرتسر نہیں جانا تھا۔ امرتسر مجھے کیا کرنے جانا تھا۔ میں جالندھر کے سٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں سے جموں کی طرف جانے والی ایک لاری پکڑی۔ جموں پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ یہاں میں بڑا محتاط ہوگیا تھا اور سر پر گلوبند لپیٹ لیا تھا تاکہ پہلی نظر دیکھنے پر پہچانا نہ جاسکوں۔ دوسرے روز میں سری نگر پہنچ گیا۔ میں شہر سے تین چار میل پیچھے ایک پہاڑی علاقے میں لاری سے اتر گیا۔ یہاں سے میں پہاڑی گھاٹیوں میں سے گزرتا ہوا کمانڈو شیروان کے ہائیڈ آؤٹ میں آگیا۔ کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب وہاں موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کو دائیں بازو پر شملے کی فوجی جھڑپ میں گولی لگی تھی جس کا زخم اب ٹھیک ہوگیا تھا۔

کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

"اتنے دن کہاں کہاں پھرتے رہے؟ بھارتی فوجی قید سے فرار کیسے ہوئے؟"

میں انہیں اندر تہہ خانے میں لے آیا۔ یہاں آکر میں نے انہیں اپنی ساری داستان سنائی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ملٹری انٹیلی جینس کی رپورٹ کے مطابق بھارت پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے والا ہے اور اسرائیل اور امریکہ کی طرف سے اسے بھاری تعداد میں اسلحہ اور فوجی سازو سامان پہنچنا شروع ہوگیا ہے تو وہ میری اس خفیہ انفارمیشن پر میرا منہ دیکھتے رہ گئے۔ لیکن میں انہیں بتا چکا تھا کہ میں دھرم ویر کے نام سے انڈین ملٹری انٹیلی

جینس کور کے میجر شرت دیوان کے زیر سایہ ناگ پور کے فوجی ہیڈکوارٹر کی کنٹین پر کام کر رہا ہوں میں نے کہا۔

"یہ بات خود مجھے میجر شرت دیوان نے بتائی ہے جو ایک ذمے دار افسر ہے۔ اس کی تائید ملٹری انٹیلی جینس کا ایک سکھ کیپٹن بھی کر چکا ہے۔"

اس کے بعد میں نے انہیں اسرائیل کے ان دو ٹرانسپورٹ بحری جہازوں کے بارے میں بتایا جو بھاری تعداد میں امریکی اور اسرائیلی اسلحہ لے کر آئے تھے میں نے کہا۔

"یہ دونوں مال بردار جہاز اس وقت انڈیا کے مشرقی ساحل کی بندرگاہ ترچنا پلی کی ایک سمندری کھاڑی سے چند میل کے فاصلے پر چٹانوں کی اوٹ میں لنگر انداز ہیں۔ ملٹری انٹیلی جینس کی خفیہ اطلاعات کے مطابق ان میں دور مار میزائلوں اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل فضا میں مار کرنے والے راکٹوں کے علاوہ ایسے امریکی ریڈار بھی ہیں جو نیچی سے نیچی پرواز کرنے والے فائٹر اور بمبار جہازوں کی بھی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ یہ سارا اسلحہ پاکستان اور کشمیر میں ہماری تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے استعمال ہو گا۔ ہمیں ان دونوں جہازوں کو وہیں سمندر میں تباہ کر کے ڈبو دینا ہے۔ یہ اسلحہ کی پہلی امریکی اور اسرائیلی کھیپ ہے۔ جب دوسری کھیپ آئے گی تو اسے بھی نیست و نابود کرنے کی کوشش کریں گے۔"

کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب میری بات بڑے غور سے سن رہے تھے۔ شیروان نے کہا۔

"یہ مشن بہت ضروری ہے۔ ہمیں ہر حالت میں ان جہازوں کو تباہ کرنا ہو گا۔ ان سے ہماری تحریک آزادی اور خاص طور پر پاکستان کو شدید خطرہ لاحق ہے"

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کیا یہ رپورٹ صحیح ہے کہ بھارت پاکستان پر حملے کا منصوبہ تیار کر چکا ہے"

میں نے کہا۔

"یہ انڈین ملٹری انٹیلی جینس کی خفیہ رپورٹ ہے جو میں نے آپ کو بیان کی ہے۔

اور غلط نہیں ہو سکتی۔ اور میرا خیال ہے کہ ہماری انٹیلی جینس نے یہ رپورٹ پاکستان پہنچا دی ہو گی۔"

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"تم نے ان اسرائیلی جہازوں کو ڈبونے کی کوئی سٹریٹیجی تیار کی ہے؟"

میں نے کہا۔

"سٹریٹیجی وہاں چل کر تیار کر لیں گے۔ اس وقت میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ کیونکہ یہ اکیلے کمانڈو کا مشن نہیں ہے۔ اس کے لئے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

کمانڈو اورنگ زیب نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔

"ضرور چلوں گا۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"لیکن ہمیں اس مشن کا یہاں سے پورا انتظام کر کے چلنا ہو گا۔ کیونکہ ترچنا پلی ہمارے لئے ایک نیا شہر ہے۔ وہاں ہم کسی کو نہیں جانتے اور ان کی تامل زبان سے بھی ناواقف ہیں۔"

کمانڈو شیروان بولا۔

"تم لوگوں کو جس چیز کی ضرورت ہو بتاؤ۔ وہ تمہیں مہیا کر دی جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"سب سے اہم چیز جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور زیادہ سے زیادہ دھماکہ خیز ڈیوائس ہے۔ یہ اتنی طاقتور ہونی چاہئے کہ فولاد کی مضبوط چادر کو بھی پھاڑ ڈالے۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"باقی جس قسم کے اسلحہ مثلاً آٹو میٹک پستول' گرنیڈ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے میں ناگ پور ہیڈ کوارٹر کے ایمونیشن ڈپو سے اڑانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہاں سے نہ اڑا سکا تو میجر شرت کا آٹو میٹک پستول تو میں کسی بھی وقت اپنے قبضے میں کر سکتا ہوں۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے سوال کیا۔

"ترچنا پلی میں کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم اپنی خفیہ کمین گاہ بنا سکیں؟"

میں نے کہا۔

"اسکا بندوبست ہمیں وہاں جا کر وہاں کے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد کرنا پڑے گا۔ یہ شہر میرے لئے بھی نیا ہے۔ مگر میں تامل ناڈو کے صوبے کے لوگوں کے مزاج سے واقف ہوں۔"

کمانڈو شیروان بولا۔

"ہمیں کب اپنے کمانڈو مشن پر روانہ ہونا چاہئے؟"

میں نے کہا۔

"میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق پاکستان اور کشمیر کے خلاف استعمال ہونے والا اسلحہ اور خطرناک فوجی ساز وسامان ابھی تک اسرائیلی بحری جہازوں پر ہی لدا ہوا ہے۔ انہیں اتار کر ایمونیشن میں بھی ڈمپ کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسلحہ تباہ کرنا ہمارے لئے مزید مشکل ہو جائے گا۔"

شیروان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے صرف کل کی مہلت دے دو تاکہ میں اپنے خاص آدمی کے پاس جا کر تمہارے لئے دھماکہ خیز ڈیوائس وغیرہ کا انتظام کر سکوں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم پرسوں روانہ ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد میں نے حاجی ثناء اللہ ڈار کی بیٹی پروین کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ خیریت سے پہنچ گئی تھی اور اس کے جواب میں بھارتی فوج نے یہاں کیا کیا ظالمانہ کارروائیاں کی ہیں۔

شیروان نے کہا۔

"بھارتی فوج کی غاصبانہ کارروائیاں تو جاری ہی رہتی ہیں اور ہم ان کا منہ توڑ جواب بھی دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے دو آدمی شہید ہوتے ہیں تو ہم بھارتی فوج کے تین سپاہی ہلاک کر دیتے ہیں۔ حاجی صاحب کی بیٹی خیریت سے پہنچ گئی تھی۔ تم لوگوں کا کمانڈو آپریشن بڑا کامیاب رہا۔"

شام کو کمانڈو شیروان اپنے خاص آدمی سے ملنے چلا گیا جو دھماکہ خیز اسلحہ وغیرہ بنانے کا ماہر تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا۔ صبح اس نے مجھے دیا سلائی کی ماچس کی ڈبیا کے سائز کے بارہ ڈیوائس دیئے اور کہا۔

"ان میں سے ہر بم میں اتنی طاقت ہے کہ پھٹنے کے بعد یہ بارہ انچ موٹی فولاد کی چادر کو بھی پھاڑ سکتا ہے۔ ان میں میگنٹ بھی ہے۔ یہ لوہے کی کسی بھی شے سے چپک جائے گا۔"

میں ماچس کے سائز کے ان بموں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو شیروان بولا۔

"ہر بم میں ایک چھوٹا سا ہک باہر نکلا ہوا ہے۔ اس بم کو ٹارگٹ پر لگانے کے بعد تمہیں صرف اس ہک کو نیچے کر دینا ہوگا۔ ہک نیچے ہو جانے کے آدھے گھنٹے بعد یہ بم پھٹ جائے گا۔"

کمانڈو اورنگ زیب بھی ان ماچس بموں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میرے خیال میں آدھے گھنٹے کا وقفہ مناسب رہے گا۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس لئے کہ یہ بم ہمیں سمندر کے اندر ہی اندر تیر کر جہازوں کے نیچے جا کر ان کے پیندوں سے چپکانے ہوں گے۔ میری سکیم تو یہی ہے آگے جو خدا کو منظور جس

قسم کی صورت حال پیدا ہوگی اس کے مطابق منصوبہ تیار کر لیں گے۔ ہمیں اپنے کمانڈو لباس کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ ہم اپنے ساتھ اتنی دور نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ ہمیں بھیس بدل کر یہاں سے نکلنا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے کمانڈو چاقو ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ باقی سارے معاملات ٹارگٹ کے پاس پہنچ کر طے ہوں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں آج ہی شام کو سری نگر سے ناگ پور کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔"

کمانڈو شیروان نے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں تیار ہوں۔"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کس قسم کا بھیس بدل کر نکلیں گے؟

میں نے کہا۔

"ہم یہاں سے عام مزدوروں کے لباس میں نکلیں گے۔ لیکن اپنی پتلونیں اور ٹھنڈے جیکٹ ساتھ رکھ لیں گے۔ یہ کپڑے ہم دوران سفر موقع دیکھ کر پہن لیں گے۔"

تیسرے پہر ہم نے چائے پی۔ اپنے مشن کی ایک ایک تفصیل کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے بعد ایسا لباس یعنی پرانے کرتے اور پاجامے پہن لئے جو دلی تک محنت مزدوری کرنے والے لوگ عام طور پر پہنتے ہیں۔ اوپر ہم نے چادریں لے لیں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے سر پر اونی ٹوپی اوڑھ لی۔ میں نے گلوبند لپیٹ لیا۔ چھ ماچس بم کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے پاس رکھ لئے۔ اور چھ میں نے اپنے پاس سنبھال کر رکھ لئے۔ ایک ایک کمانڈو چاقو بھی ہم نے اپنے لباس کے اندر چھپالئے۔ کمانڈو شیروان نے ہمیں اتنی رقم دے دی جو ہم دونوں کے لئے ناگ پور اور وہاں سے ترچنا پلی تک کے سفر کے لئے کافی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہم اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ سے چل پڑے۔ کمانڈو شیروان ہمیں چھوڑنے اپنے علاقے کے آخری ٹیلے تک آیا۔ وہاں اس نے ہم دونوں کو گلے لگا کر ہمارے مشن کی کامیابی کی دعا کی اور ہم اللہ کا نام لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم دونوں تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ مزدوروں کے بھیس میں تھے۔ ہماری نگاہیں دائیں

بائیں سامنے کی طرف بھی دیکھتی تھیں اور اپنے عقب سے بھی ہم ہوشیار رہتے تھے۔ میں نے مونچھیں بڑھا رکھی تھیں۔ یوں میری شکل تھوڑی بہت تبدیل ہو گئی تھی اور دور سے ایک نظر دیکھنے پر مجھے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ میں یہاں اپنے خفیہ سفر کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم جموں اور جالندھر کی خفیہ پولیس کی نگاہوں سے بچتے ہوئے دلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم دلی کے سٹیشن سے باہر نہ نکلے۔ یہاں سے باہر نکلنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ دلی پولیس میری تلاش میں تھی۔ ممکن تھا گوالیار کی ملٹری پولیس نے دلی والوں کو خبر نہ کی ہو کہ انہوں نے نام نہاد پاکستانی جاسوس کو طیارے سے گرا کر ہلاک کر دیا ہے۔ یہاں خفیہ پولیس کے پاس میری تصویر موجود تھی۔ دلی بہت بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ جہاں ہم مسافروں میں مزدور مسافر بنے بیٹھے رہے۔ دو تین گھنٹے کے انتظار کے بعد ہمیں ناگ پور جانے والی گاڑی ملی یہاں سے آگے ہمارا لمبا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ٹرین آگرہ گوالیار اور جھانسی سے ہوتی ہوئی بھوپال جاتی تھی اور بھوپال سے آگے ناگ پور سے ہوتی ہوئی آگے ورنگل اور حیدر آباد دکن کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس کا روٹ بڑا طویل تھا اور ایکسپریس ٹرین تھی۔ دوسرے دن جب گوالیار کا سٹیشن قریب آیا تو میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"یہاں ملٹری پولیس کے آدمی ضرور ہوں گے میں ان کی نظروں سے بچنا چاہتا ہوں۔"

جب گوالیار کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں باتھ روم میں گھس گیا اور اس وقت باہر نکلا جب ٹرین گوالیار سے چل پڑی تھی۔ جھانسی پہنچ کر ہم نے مزدوروں کا لباس اتار کر پتلونیں اور جیکٹیں پہن لیں۔ ہم نے باری باری باتھ روم میں جا کر اپنا لباس بدلا۔ ڈبے میں اتنا رش تھا کہ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ رات کو بھوپال کا شہر آیا۔ پھر ساری رات گاڑی چلتی رہی تھی۔ یہاں سے ٹرین نے اپنا بمبئی والا روٹ بدل لیا تھا اور بھوپال بمبئی لائن کی بجائے ناگ پور ورنگل ٹریک پر سفر شروع کر دیا گیا۔

ناگ پور جس وقت ٹرین پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو

شکنتلا کے بھائی میجر شرت دیوان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کا ہندو نام بہاری لال بھی رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ میں میجر شرت دیوان سے اس کا تعارف اپنے تایا زاد بھائی کی حیثیت سے کراؤں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ناگ پور سے سیدھا ترچنا پلی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے کم از کم ایک روز ناگ پور میں رہ کر اپنے ٹارگٹ کے بارے میں کچھ ضروری خفیہ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ جو میں سری نگر جاتے ہوئے حاصل نہ کر سکا تھا۔ میجر شرت دیوان سے میں نے جو کچھ کہنا سننا تھا وہ میں نے سب سوچ رکھا تھا۔

چنانچہ سٹیشن سے نکلتے ہی میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو ساتھ لیا اور فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر میں نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ سیکورٹی گارڈ نے کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ کچھ روز میرے پاس ٹھہرے گا۔ سیکورٹی گارڈ نے کمانڈو اورنگ زیب کو اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے وہیں ملٹری ٹیلی فون سے میجر شرت کو فون کیا اور کہا کہ میں آگیا ہوں اور میرے ساتھ میرا تایا زاد بھائی بہاری لال بھی ہے جو ورنگل کی ماچس فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ یہ چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اب ڈیوٹی پر جا رہا ہے اور دو ایک روز میرے پاس رہے گا۔

میجر شرت دیوان نے فوراً سیکورٹی گارڈ سے کہا کہ انہیں آنے دو۔ میں وہاں سے اورنگ زیب کو ساتھ لے کر سیدھا میجر شرت کے ہوسٹل میں آگیا۔ میجر شرت حسب معمول شراب و کباب میں مصروف تھا۔ میں نے اس کا کمانڈو اورنگ زیب سے مزید تعارف کرایا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ میجر شرت بولا۔

"دھرم ویر! تم بڑی جلدی واپس آگئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"بھیا! گورداسپور والی مدسی جی تیرتھ یاترا کو جموں گئی ہوئی تھیں۔ میں کس کے پاس ٹھہرتا۔ بس دو دن امرتسر میں رہا اور بہاری لال کے ساتھ واپس چل پڑا"

میجر شرت نے بڑی عقیدت سے پوچھا۔

"اپنی ماتا جی کے سمادھ پر میری طرف سے پھول چڑھانا تو نہیں بھول گئے تھے؟"

میں نے فوراً کہا۔

"بھیا! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے آپ کی طرف سے گیندے کے چار ہار ماتا جی کی سمادھ پر چڑھائے تھے۔"

"بھگوان تمہیں خوش رکھے۔ اچھا اب ہمارے بھائی بہاری لال کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ یہ بھی ہمیں تمہاری طرح پیارا ہے۔"

میں نے کہا۔

"بس بھیا! سٹیشن سے سیدھا آپ کے درشن کو آگیا تھا۔ اب کمرے میں جا کر بھوجن پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میجر شرت نے گلاس اٹھاتے ہوئے کمانڈو اورنگ زیب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تمہارا بھائی اگر پیتا پلاتا ہے تو اسے میرے پاس ہی چھوڑ جاؤ۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"ارے نہیں بھیا جی! یہ تو پورا ویشنو ہے ویشنو۔ گوشت ماس کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔"

میجر شرت قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہم اسے نمستے کہہ کر وہاں سے نکل آئے۔ باہر آکر کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"تم نے بڑی دانشمندی سے ملٹری انٹیلی جنیس کے اس میجر کو اپنے قابو میں کیا ہوا ہے"

میں نے کہا۔

"دوست! خدا کارساز ہے۔ لیکن ابھی میں اس سے ایک اور ملٹری سیکرٹ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اسی واسطے میں سیدھا ترچنا پلی جانے کی بجائے یہاں آگیا ہوں"

"وہ کیا سیکرٹ ہے؟" کمانڈو اورنگ زیب نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ترچناپلی کی کھاڑی میں اسرائیل کے مرکنٹائل جہاز جن چٹانوں کی اوٹ میں لنگر انداز ہیں ان چٹانوں پر سیکورٹی کے کیا انتظامات ہیں۔ اگر وہاں مشین گن پوسٹیں ہیں تو کہاں کہاں ہیں اور کتنی ہیں۔ یہ راز معلوم کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ہمیں ان چٹانوں کے نیچے سے ہو کر جہازوں تک پہنچنا ہوگا۔"

اورنگ زیب نے پوچھا۔

"یہ راز تو شاید وہ تمہیں کبھی نہ بتائے"

میں نے کہا۔

"مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر کس طریقے سے یہ انتہائی سیکرٹ راز معلوم کرو گے۔"

میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے چلتے چلتے کہا۔

"میجر شرت دیوان کے پاس ایک ٹاپ سیکرٹ فائل ہے جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس الماری کے ایک خانے میں تالا لگا کر رکھتا ہے۔ میں اس فائل کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ راز اس فائل سے ہمیں ضرور معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ کام تمہیں بڑی ہوشیاری سے کرنا پڑے گا۔"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میری کمانڈو ٹریننگ میں انتہائی ٹاپ سیکرٹ فائلوں کے راز معلوم کرنا بھی شامل تھا۔ اس کام میں میں پورا تربیت یافتہ ہوں۔"

دوسرے روز مجھے میجر شرت دیوان نے فوجی کنٹین میں دوپہر کے بعد آ کر بتایا کہ میں ایک دن کے لئے ماتا جی کے پاس چھندواڑے جا رہا ہوں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر اس نے مجھے کمرے کی چابی دے کر کہا۔

"تم میرے بھائی ہو۔ تمہارا بھائی آیا ہوا ہے۔ اگر چاہو تو میرے کمرے میں جا کر آرام کر سکتے ہو"

میں نے جھوٹے دل سے کہا۔

"ماتا جی کی خبر لینے میں بھی جاؤں گا۔"

وہ بولا۔

"نہیں دھرم ویر! تم اپنی ڈیوٹی پر رہو میں تمہاری طرف سے پوچھ لوں گا۔"

جس ٹارگٹ تک پہنچنے کے لئے میں طرح طرح کی سکیمیں بنا رہا تھا۔ اس ٹارگٹ کی چابی مجھے میجر شرت دیوان نے خود ہی پکڑا دی تھی۔ اس روز رات کی گاڑی میں وہ ناگ پور سے چھندواڑے کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو کہا۔

"میں آج رات میجر شرت کے کمرے میں جا کر سیکرٹ فائل والی الماری کھول کر مطلوبہ راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چنانچہ رات کے دوسرے پہر میں آفیسرز میس کے ہوسٹلز کی طرف چلا۔ وہاں فوجی جگہ جگہ موجود تھے۔ سیکورٹی گارڈز بھی تھے مگر وہ مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے قریب سے گزرتا گیا۔ میجر شرت کے کمرے کا تالا کھولا۔ بتی روشن کی۔ دروازے کو بند کر کے کنڈی لگائی اور میجر کے بیڈ روم میں آ کر ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ ٹاپ سیکرٹ فائل میجر شرت اپنے بیڈ روم والی الماری میں مقفل کر کے رکھتا تھا۔ میرے لئے ان الماریوں کے تالے کھولنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اپنے ساتھ لوہے کی آگے سے ہک کی طرح مڑی ہوئی ایک تار لے کر گیا تھا۔ الماری کا تالا بڑی آسانی سے کھل گیا۔ اس کے اندر ایک اور مقفل خانہ تھا۔ سیکرٹ فائل اس خانے میں تھی۔ اس تالے کو کھولنے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ پھر بھی پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد میں تالا کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے خانہ کھولا۔ اس میں زرد رنگ کی صرف ایک ہی فائل پڑی تھی۔ جس کے اوپر انگریزی کے سرخ حروف میں "ٹاپ سیکرٹ" لکھا تھا۔ میں فائل کو لے کر میجر شرت کے پلنگ پر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں بیٹھ گیا۔ اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ اس میں انگریزی میں ٹائپ کئے ہوئے دس پندرہ صفحات تھے۔ ان میں زیادہ تر انڈین

ہائی کمانڈ کے ٹاپ رینک کے فوجی افسروں کے بارے میں خفیہ رپورٹیں تھیں۔ ایک صفحے پر اوپر پراجیکٹ "نیام پلے" انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو گوہر مقصود میرے ہاتھ آگیا۔ یہ ترچناپلی میں اسرائیل اور امریکی اسلحہ کی کھیپ کے بارے میں اہم نکات پر مشتمل تھا۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک بڑے غور سے پڑھا۔ اس خفیہ رپورٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ان خطرناک اسلحہ والے دونوں بحری جہازوں کی سیکورٹی پر خاص توجہ دی گئی ہے اور جہاں یہ جہاز کھاڑی میں لنگر انداز ہیں اس کے پاس چٹانوں پر چار مشین گن پوسٹیں ہیں۔ جن میں مارٹر توپیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان جہازوں کو دشمن کمانڈوز کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے جہازوں کے اردگرد فولادی تار کا جال بچھا دیا گیا ہے اور جہازوں کے اوپر سمندر کے اندر جا کر پھٹنے والے گولوں کی توپیں بھی نصب ہیں جو ذرا سے شک پڑنے پر اردگرد کے سمندر میں گولہ باری شروع کر سکتی ہیں۔ اس رپورٹ میں دونوں جہازوں کے کوڈ نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ میں نے یہ ساری ضروری معلومات ایک الگ کاغذ پر اتار لیں فائل بند کر کے الماری کے خانے میں رکھ کر خانے کا تالا دوبارہ بند کیا۔ پھر الماری کو تالا لگا رہا تھا کہ دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔

یقین کریں میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ لگتا تھا جیسے فوج نے اچانک حملہ کر دیا ہے۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز واقعات کے لئے بھارت کے فرعون حصہ ششم "فوجی کیمپ سے فرار" میں ملاحظہ فرمائیں

بھارت کے
فرعون
فوجی کیمپ سے فرار
اے حمید
50

دروازے پر زور زور سے دستک ہو رہی تھی۔

باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔

"اردلی! دروازہ کھولو۔ جلدی کرو"

سیکرٹ فائل میں نے الماری میں بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایک سکھ صوبیدار اور دو گورکھا فوجی کھڑے تھے۔ سکھ صوبیدار کو معلوم تھا کہ میں میجر شرت کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اس نے کہا۔

"سر! آپ کے باتھ روم سے دھواں نکل رہا ہے"

اور تینوں فوجی بڑی تیزی سے باتھ روم کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک گورکھا فوجی کے ہاتھ میں آگ بجھانے والا سپرے سلنڈر بھی تھا۔ میں بھی ان کے پیچھے دوڑا۔ معلوم ہوا باتھ روم کی بتی میجر شرت جلتی چھوڑ گیا تھا اور کسی وجہ سے بجلی کے تار شارٹ ہو گئے اور انہیں آگ لگ گئی تھی۔ ابھی صرف دھواں ہی نکل رہا تھا۔ فوراً آگ بجھا دی گئی۔ سکھ صوبیدار بولا۔

"سر! ہمارے لانس نائیک نے باہر سے دھواں نکلتا دیکھا تو رپورٹ کی۔ صبح الیکٹریشن آکر نئی تاریں لگا دے گا۔"

جب تینوں بھارتی فوجی چلے گئے تو میں کچھ دیر وہیں کمرے میں رہا۔ اس کے بعد خاموشی سے باہر نکل کر کمرے کو تالا لگایا اور ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دے کر اپنے فوجی کینٹین والے کمرے کی طرف چل پڑا۔

کمانڈو اورنگ زیب بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے جا کر ٹاپ سیکرٹ فائل سے نقل کئے ہوئے پوائنٹس دکھائے تو وہ بولا۔

"یہ بڑی کار آمد معلومات ہیں ۔ خاص طور پر کھاڑی کے چٹان پر مارٹر توپوں اور جہازوں کے گرد لگے فولادی تاروں کا معلوم ہو جانا ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہو گا"

میں نے کہا۔

"ایک جہاز پر ایسی گنیں بھی لگی ہیں جو خطرے کے وقت سمندر میں پھٹنے والی بارودی سرنگیں فائر کرتی ہیں"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان جہازوں کے اردگرد جن فولادی تاروں کا جال پھیلایا گیا ہے ان کی نوعیت کیسی ہے۔"

میں نے کہا۔

"چاہے جیسی بھی ہو۔ ہمیں بہرحال سمندر کے اندر جا کر ان تاروں کو کٹروں سے کاٹنا ہو گا۔"

"وہاں انڈین نیوی کی کوسٹ گارڈز بھی ہو گی۔ اس کمانڈو مشن پر ہمیں کسی اندھیری رات کو جانا ہو گا۔ لیکن آکسیجن ماسک کے بغیر ہم اپنے ٹارگٹ پر نہیں پہنچ سکیں گے کیا اس کے بارے میں بھی تم نے غور کیا ہے؟"

میں غور کر چکا تھا۔ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت سے اپنے مشن پر روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں پانڈی چری کی کھاڑی جیا گامی میں کھڑے اسرائیل کے ان دو بحری جہازوں کو سمندر میں ڈبونا ہے جو امریکہ اور اسرائیل کی حکومت کی طرف سے پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھارت کو دیا گیا بھاری مقدار اور تعداد میں خطرناک اسلحہ لے کر آئے ہیں ۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"اس کا انتظام ہمیں ترچناپلی کی بندرگاہ پر جا کر خود کرنا ہو گا"

کمانڈو اورنگ زیب کو اتنے بڑے کمانڈو مشن کا پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اگرچہ اس

میں جذبہ موجود تھا اور وہ پاکستان' آزادی کشمیر اور اسلام کی خاطر ہر وقت جان قربان کرنے کو تیار تھا مگر اتنا بڑا بحری کمانڈو مشن اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ میں اس سے پہلے دوارکا کا فوجی قلعہ بھوپال ریلوے لائن پر بھارتی ملٹری کی ایمونیشن ٹرین کو اڑا چکا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہاں سے نکلنے کا ہمارا کیا پروگرام ہے؟"

یہ پروگرام بھی میں نے سوچ لیا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب پانڈی چری کی بندرگاہ پر اسلحہ سے لدے ہوئے جہاز سمندر کی تہہ میں غرق ہو جائیں گے تو بھارتی فوجی ہائی کمانڈ میں بھونچال آجائے گا اور اس کی رپورٹ اسی وقت ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ملٹری انٹیلی جینس کے میجر شرت دیوان کو مل جائے گی اور میری اس وقت عدم موجودگی اس کو شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ اگرچہ اس کا امکان بہت ہی کم تھا۔ کیونکہ میجر شرت کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں جو کہ ایک عام سا سویلین نوجوان ہوں انڈیا کے نیول سیکورٹی کو تہس نہس کرتا ہوا دو اتنے بڑے جہازوں کو سمندر میں غرق کر سکتا ہوں لیکن مجھے اسی طرح سوچنا چاہئے تھا۔ اس کی پیش بندی مین نے یوں کر لی تھی کہ میجر شرت کو کہہ دیا تھا کہ میرا بھائی ورنگل کی کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اور میں اسے چھوڑنے اس کے ساتھ ہی ورنگل جا رہا ہوں اور کچھ دن ورنگل کی سیر کرنے کے بعد واپس آؤں گا۔ چنانچہ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"ہم کل صبح یہاں سے چل پڑیں گے۔"

کمانڈو اورنگ زیب کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ اس اہم ترین کمانڈو مشن کے انتظامات سے مطمئن نہیں ہے۔ اسے مطمئن ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف بارہ بارہ چھوٹے مگر انتہائی طاقتور چاکلیٹ سائیز کے میگنٹ بم تھے جنہیں ہم نے سمندر کے اندر سے ہو کر بحری جہازوں تک جا کر ان کے پیندے کی فولادی چادروں سے چپکانا تھا۔ کہنے کو تو یہ بڑا سیدھا سا کام تھا مگر جہاں سمندر میں آس پاس بھارتی نیوی کے جنگی جہاز کھڑے ہوں ۔ کوسٹ گارڈز کی مشین گنوں سے

لیس بوٹیں چکر لگا رہی ہوں ۔ جہازوں کے اوپر گارڈز دن رات پہرہ دے رہے ہوں جہازوں پر بارودی سرنگیں فائر کرنے والی گنیں لگی ہوں اور جہازوں کی حفاظت کے لئے چٹانوں پر مارٹر گنوں اور مشین گنوں کی پوسٹیں ہوں اور جہازوں کے اردگرد فولادی تاروں کا جال بچھا ہو اور ہمارے پاس معمولی استعمال کے آکسیجن ماسک بھی نہ ہوں تو یہ ٹارگٹ نا ممکن لگتا تھا۔ لیکن وہی بات میں پھر دہراؤں گا کہ اگر دل میں جذبہ ہو اور ٹارگٹ مارنے کا یقین ہو تو قدرت سارے وسائل پیدا کر دیتی ہے۔

جب کمانڈو اورنگ زیب نے وسائل کی کمی کا اظہار کیا تو میں نے اس سے کہا۔

"وسائل صفر ہیں ۔ یہاں سے ہم کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس میگنٹ بم اور کمانڈو چاقو کے سوا اور کچھ نہیں ۔ اس کے باوجود ہمیں اس مشن کو ہر حالت میں اور اپنی جان کی بازی لگا کر کامیاب بنانا ہے۔ ہم کل صبح ناگ پور سے جو ٹرین بھی ملی اس میں سوار ہو کر پانڈی چری کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ اب تم بھی سو جاؤ میں بھی سوتا ہوں۔"

صبح ہم جلدی اٹھے۔ میں نے کیپٹن کے اسسٹنٹ جگدیش کو شام کو ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ ورنگل جا رہا ہوں ۔ میجر شرت دیوان کو پہلے ہی میں بتا چکا تھا۔ چنانچہ ہم فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکل کر سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ ایک جگہ سے ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ہمیں سٹیشن پر پہنچا دیا۔ ناگ پور وسطی بھارت کا بہت بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ وہاں سے کئی طرف کو گاڑیاں جاتی رہتی ہیں ۔ معلوم ہوا کہ پانڈی چری کی گاڑی دن کے نو بجے روانہ ہو گی۔ اتنی دیر ہم پلیٹ فارم پر ہی ایک طرف بیٹھے اپنے مشن کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے دو ٹکٹ ہم نے لے لئے تھے۔ کمانڈو چاقو اور خطرناک میگنٹ بم چھ میری پتلون کی پچھلی جیب میں تھے اور چھ بم کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی جیکٹ میں چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔

گاڑی ساڑھے نو بجے پانڈی چری کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ بڑا طویل سفر تھا۔ آپ

بھارت کا نقشہ اٹھا کر دیکھیں ۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ناگ پور انڈیا کے بالکل وسط میں ہے اور وہاں سے نیچے پانڈی چری طویل فاصلے پر انڈیا کی مشرقی گھاٹ پر مدراس سے بھی نیچے ایک بندر گاہ ہے۔ یہ سفر دو دن اور دو راتوں میں طے ہوا۔ ہم پہلے بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش سے گزرے۔ پھر تامل ناڈو کے صوبے میں داخل ہو گئے۔ ناگ پور سے آگے جو بڑے بڑے شہر آئے وہ اس طرح تھے۔ ناگ پور سے چلے تو بڑا شہر چندرا پور آیا۔ وہاں سے ورنگل شہر آیا۔ یہ آندھرا پردیش کا مشہور شہر ہے۔ ورنگل سے نکلے تو آندھرا پردیش کا شہر گنٹور آیا۔ یہاں سے ٹرین نیلور پہنچی یہ بھی تامل ناڈو کا مشہور شہر ہے۔ نیلور کے آگے تامل ناڈو صوبے کا صدر مقام مدراس آگیا۔

مدراس اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا۔ ہم سٹیشن پر ہی رہے۔ مدراس سے دوسری ٹرین پکڑی اور کانچی پورم شہر سے ہوتے ہوئے پانڈی چری پہنچ گئے۔ پانڈی چری جس وقت ٹرین پہنچی تو دن کے چار بجے کا ٹائم تھا۔ یہاں موسم گرم تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہماری جیکٹیں ٹھنڈے کپڑے کی تھیں ۔ پھر بھی ہم نے اس کے بٹن کھول دیئے تھے۔ ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب بھارت کے دور جنوبی علاقے میں پہلی بار آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے کشمیر میں تو سخت سردی پڑ رہی ہے اور یہاں لوگ گلے میں صرف بنیانیں پہن کر پھر رہے ہیں"

میں نے کہا۔

"یہ جنوبی بھارت کا علاقہ ہے۔ یہاں دسمبر کے مہینے میں بھی دن کو موسم گرم رہتا ہے۔ صرف رات کو ہلکی سی خنکی ہو جاتی ہے وہ بھی برائے نام"

"اسی لئے یہاں کے لوگوں کے رنگ کالے ہیں"

جنوبی بھارت میں آپ کو کوئی آدمی کوئی عورت گورے رنگ کی نہیں ملے گی۔ سب کے رنگ کالے ہوتے ہیں ۔ یا پھر گہرے سانولے رنگ ہوتے ہیں ۔ گورا رنگ ناگ پور سے اوپر ہی رہ جاتا ہے۔ یہاں کا موسم گرم مرطوب ہوتا ہے۔ بارشیں خوب ہوتی ہیں ۔

لوگوں کی خوراک چاول ہے۔ روٹی بھی چاول کے آٹے کی کھاتے ہیں ۔ اس روٹی کو وہ چلہ کہتے ہیں ۔ سرخ مرچیں بہت زیادہ کھاتے ہیں ۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں چاول کے ساتھ سرخ مرچیں پانی میں گھول کر ساتھ رکھ دی جاتی ہیں ۔ چھوٹے ریستورانوں میں چاول پلیٹوں کی بجائے کیلے کے پتوں پر ڈال کر رکھ دیئے جاتے ہیں ۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔

ہوٹل کا کالا کالا لڑکا ہمارے لئے چاول کا برتن لے کر آگیا۔ اس نے پہلے کیلے کے پتے ہمارے سامنے میز پر بچھائے۔ پھر اس کے اوپر ایک طرف چاول ڈالے۔ ایک طرف سبزی دال اور ایک چھوٹی پیالی میں گھلی ہوئی سرخ مرچوں کی لا کر رکھ دی۔ ہم نے سرخ مرچوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور سبزی کے ساتھ چاول کھا کر ہوٹل سے باہر آگئے۔ ہوٹل میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور ویشنوں اور گنپتی دیوتا کی تصویروں کے آگے لوبان بھی سلگ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے فضا بہت بوجھل تھی۔ جنوبی ہند کے شہروں میں مسلمانوں کی بھی بھاری تعداد آباد ہے اور یہ مدراسی مسلمان ہیں جن کو موپلے بھی کہا جاتا ہے۔ ان شہروں میں بڑی بڑی مسجدیں ہیں ۔ ان بزرگان دین کے مزار بھی ہیں جو ابتدائی ایام میں مسلمان عرب تاجروں کے ساتھ یہاں آئے اور انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور بتوں کی پوجا کرنے والے ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ابتدائی دور کے عرب تاجروں کی آمدورفت کی وجہ سے یہاں پر مسلمانوں کی کلچر کی نشانیاں بھی عام ملتی ہیں ۔ ان کی زبان میں عربی کے الفاظ بھی ہیں اور یہ لوگ بریانی بالکل شمالی ہند کے مسلمانوں کی طرح بناتے ہیں ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جنوبی ہند میں شمالی بھارت کی نسبت تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ انگریزی ہر سکول میں پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی ہے۔ تامل تلگو زبانوں کے ساتھ ہندوستانی اور اردو بھی بولی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ انگریزی عام بول لیتے ہیں ۔ اگر کوئی مدراسی اردو نہیں جانتا تو وہ آپ سے انگریزی میں بات کرے گا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم پانڈی چری کے بازاروں میں ادھر ادھر پھرتے رہے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"ہمیں ٹھہرنے کے لئے یہاں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہو گی جو بندرگاہ کے قریب ہو اور جہاں ہمیں دیکھنے والے زیادہ لوگ نہ ہوں"

کمانڈو اورنگ زیب نے پوچھا۔

"ایسی کونسی جگہ ہو سکتی ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ مدراس میں مدراسی مسلمانوں کی تین چار سرائیں ہیں جہاں مسافر آکر ٹھہرتے ہیں ۔ ان علاقوں میں ابھی تک سراؤں کا وجود باقی تھا۔ شاید یہ قدیم عرب تاجروں کی وجہ سے تھا جو بصرہ بغداد سے آکر یہاں سراؤں میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ مدراس میں ایک سرائے تھی جس کا نام سراج سرائے تھا۔ میں نے اس سرائے میں تین دن گزارے تھے۔ یہ سستی بھی ہوتی ہیں اور یہاں عام طور پر مزدور پیشہ مسافر لوگ آکر دو تین دن ٹھہرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں ۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے جب سرائے کا ذکر کیا تو وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔

"یہ شہر تو بڑا ماڈرن شہر لگ رہا ہے یہاں سرائے ہمیں کہاں ملے گی"

میں نے اسے ساری بات سمجھائی تو وہ کہنے لگا۔

"کیا یہاں ہمیں کوئی ایسی سرائے مل جائے گی جو شہر سے باہر بھی ہو اور بندرگاہ کے قریب بھی ہو؟"

میں نے کہا۔

"اگر مل گئی تو بہتر ہے۔ تلاش کر لیتے ہیں ۔ اگر نہ ملی تو دو ایک دنوں کے لئے شہر کے اندر کسی سرائے میں ٹھہر جائیں گے"

سرائے پر میں اس لئے زور دے رہا تھا کہ وہاں کرایہ سستا ہوتا ہے۔ ہوٹل ان شہروں میں بڑے مہنگے ہوتے ہیں اور ہوٹلوں میں عام طور پر خفیہ پولیس کے آدمی ضرور منڈلا رہے ہوتے ہیں ۔ پانڈی چری شہر ہمارے لئے بالکل اجنبی تھا۔ جنوبی ہند کی فضا اور لوگ ان کی زبان میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ بازار اجنبی تھے۔ ہم چلتے چلتے ایک چوک میں آکر کھڑے ہو گئے۔ بازاروں میں رکشا ٹیکسیوں کے علاوہ بیل گاڑیاں بھی چل رہی

تھیں ۔ ان بیل گاڑیوں میں رکشا ٹیکسی کی طرح سواریاں بیٹھتی تھیں ۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"تم یہیں ایک منٹ ٹھہرو"

سامنے پان سگریٹ کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہاں کھمبے کے پاس ایک دبلا پتلا نوجوان سفید قمیض پتلون پہنے کھڑا شاید کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر یونہی السلام وعلیکم کہہ دیا کہ اگر مسلمان نکل آیا تو اچھا ہے۔ اتفاق سے وہ مسلمان تھا۔ اس نے وعلیکم السلام کہہ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

"یہاں کوئی سرائے مل جائے گی جہاں رات گزار سکوں ؟"

اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پنجاب سے پانڈی چری شہر کی سیروسیاحت کرنے آیا ہوں ۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کسی ہوٹل میں ٹھہر سکوں ۔ مجھے جالندھر میں کسی نے بتایا تھا کہ مدراس اور پانڈی چری میں ایسی سرائیں مل جاتی ہیں جن کا کرایہ سستا ہوتا ہے۔"

وہ لڑکا بولا۔

"پانڈی چری میں تین سرائے ہیں ۔ ان تینوں کو مسلمان چلاتے ہیں ۔"

میں نے کہا۔

"اگر کوئی سرائے سمندر کے قریب مل جائے تو بڑا اچھا ہے۔ سمندر کی سیر بھی ہو جائے گی"

وہ لڑکا کہنے لگا۔

"اچھا۔ تو پھر ایسا ہے کہ یہاں سے تم پانڈی چری جیٹی کو جانے والی بس میں سوار ہو جاؤ۔ کنڈکٹر سے کہنا تمہیں رائل سینما کے سٹاپ پر اتار دے رائل سینما کے پیچھے ناریل کے درختوں والا ایک بازار ہے۔ وہاں اشرفیہ سرائے ہے۔ یہ سرائے سمندر کے قریب

بھی ہے اور وہاں کرایہ بھی بہت کم لیتے ہیں ۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ساری بات کمانڈو اورنگ زیب کو جا کر بتائی اور ہم وہیں سے ایک بس میں سوار ہو گئے۔ میں نے بس کنڈکٹر کو بتا دیا کہ ہمیں رائل سینما والے سٹاپ پر اتار دے۔ ہم رائل سینما کے بس سٹاپ پر اتر گئے۔ اس کے پیچھے آئے تو ایک کشادہ بازار تھا جس کے فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی چھتریوں والے ناریل کے درخت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ یہ شام کی ہوا تھی جو سمندر کی طرف سے چل رہی تھی۔ ہوا میں سمندر کی نمی خاص طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"ہم سمندر کے قریب آگئے ہیں ۔ اب اشرفیہ سرائے تلاش کرتے ہیں"

بازار میں دکانیں کھلی تھیں ۔ شاپنگ سٹور بھی۔ بید اور بانس کے فرنیچر کی بڑی بڑی دکانیں بھی تھیں ۔ ریستوران بھی تھے جن میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور تامل فلموں کے گانوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ سانولی' گہری سانولی' کالی لڑکیاں اور عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس آجا رہی تھیں ۔ پتلون قمیض والے آدمی بھی تھے۔ اور ایسے مزدور ٹائپ آدمی بھی تھے جنہوں نے صرف بنیان پہنے ہوئے تھے اور دھوتیاں جنہیں یہاں لنگی کہا جاتا ہے۔ نیچے سے اٹھا کر گھٹنوں پر کر رکھی تھیں ۔ کافی آگے جا کر میں نے ایک ویڈیو کی دکان سے اشرفیہ سرائے کا پوچھا۔ یہ سرائے وہاں سے قریب ایک گلی میں تھی۔ گلی کافی کشادہ تھی۔ ایک بوسیدہ سی پرانی بلڈنگ کے باہر اردو اور تامل زبان میں اشرفیہ سرائے کا چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں تخت پوش پر ایک سفید خشخشی ڈاڑھی والا گہرے سانولے رنگ کا بوڑھا دھوتی اور بنیان پہنے چھوٹی سی صندوقچی کے پاس بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے جا کر سلام کیا تو اس نے خوش ہو کر وعلیکم السلام کہا اور تامل زبان میں کچھ پوچھا۔ میں نے شکستہ ہندوستانی میں کہا کہ میں تامل زبان نہیں جانتا۔ وہ مسکرا کر اردو میں بولا۔

"تو پھر اردو میں بات کرو۔ ہم اردو زبان بھی جانتا ہے بابا۔"

میں نے کہا۔

"جی ہم دو دوست پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ سے آئے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ پانڈی چری کی سیر کرنے کا ارادہ لے کر نکلے تھے۔ آپ کی سرائے میں کوئی سستا سا کمرہ مل جائے گا؟"

بوڑھا مدراسی کہنے لگا۔

"بابا! یہاں سب کمروں کا ایک ہی کرایہ ہے۔ تم بولو۔ ایک کمرہ لو گے یا دو کمرے لو گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ایک کمرہ ہی کافی رہے گا۔ صرف اس میں ایک فالتو چارپائی کی ضرورت پڑے گی۔"

وہ بولا۔

"وہ ہم ڈال دیں گے۔"

پھر اس نے صندوقچی میں سے ایک کاپی پنسل نکالی اور بولا۔

"نام بتاؤ۔"

میں نے اپنے اور کمانڈو اورنگ زیب کے مسلمانوں والے فرضی نام بتائے۔ اس نے کاپی پر لکھ لئے اور کاپی بند کر کے کہنے لگا۔

"ایک کمرے کا دن رات کا کرایہ پانچ روپے ہو گا۔ تم کتنے روز ٹھہرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ایک ہفتہ ضرور ٹھہریں گے۔ پانڈی چری بڑا شہر ہے۔ اس کی سیر کرنے میں اتنے دن تو ضرور لگ جائیں گے۔"

"تو پھر ایسا کرو کہ ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر دو۔ میں تمہیں صاف ستھرا بستر بھی دوں گا اور نہانے کے لئے اچھا صابن تولیہ بھی دوں گا۔"

وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے جیب سے تیس روپے نکال کر اسے دیئے اور کہا۔

"یہ تیس روپے آپ اپنے پاس رکھیں۔ اگر ہم اس سے پہلے بھی چلے گئے تو آپ سے کچھ واپس نہیں لیں گے۔"

بوڑھے نے روپے صندوقچی میں ڈال کر اسے تالا لگایا اور اٹھ کر ہمارے ساتھ ہو گیا۔ وہ ہمیں بلڈنگ کی دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا جس کی دیوار کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ وہاں پہلے سے ایک چارپائی پڑی تھی۔ بوڑھا جو سرائے کا مالک ہی تھا اور بعد میں جس نے اپنا نام حاجی عبدالرزاق بتایا کہنے لگا۔

"میں ابھی دوسری چارپائی ڈلوا دیتا ہوں غسل خانہ نیچے اندر والے صحن میں ہے میں تمہیں الگ تولیہ صابن بھی بھجوا دیتا ہوں۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

سرائے کا مالک حاجی رزاق جب چلا گیا تو کمانڈو اورنگ زیب نے کھڑکی میں سے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ کہنے لگا۔

"ادھر تو گلی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ کچرا گلی ہو گی۔ لوگ مکانوں کا کوڑا کچرا کھڑکیوں میں سے گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ کارپوریشن کا ٹرک آ کر لے جاتا ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب اور میں اس کھڑکی پر آ گئے جو سرائے کے دروازے کی جانب کھلی تھی۔ نیچے کشادہ گلی میں لڑکے بانس کے بنے ہوئے بال سے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ حاجی صاحب کی ہدایت پر ملازم چارپائی لے کر اوپر آ گیا۔ اس کے ساتھ صاف ستھرے دو بستر بھی تھے۔ ہم نے چارپائیوں پر بستر بچھا دیئے۔ اس دوران رات ہو گئی۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

"ٹھکانہ تو ہمیں مناسب مل گیا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ بندرگاہ کہاں ہے اور بندرگاہ سے جیا گامی کی وہ کھاڑی کتنی دور ہے جہاں جہاز کھڑے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ کام اگر ہم دن کی روشنی کے وقت کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ رات کو ہم کسی بھ
پوزیشن کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکیں گے۔"

چنانچہ ہم نے صبح سورج نکلنے کے وقت اپنے ٹارگٹ کا سروے کرنے کا پروگرام بنا
اور اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھ کر اپنے مشن کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے
کھانا ہم نے بازار کے ریستوران سے کھا لیا تھا۔ دس بجے رات تک ہم اپنے مشن کے
امکانات اور اندیشوں پر غور و فکر کرتے رہے۔ اس کے بعد سو گئے۔

صبح اس وقت بیدار ہوئے جب گلی میں سے ایک ٹرک شور مچاتا ہوا گزرا۔ پہلے
میری آنکھ کھلی۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ ٹرک تھا؟"

"ہاں"

میں نے کہا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ شاید کچرا اٹھانے والا ٹرک تھا۔ گل
میں کھمبوں کی بتیاں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں مجھے ٹرک کا پچھلا حصہ بازار ک
طرف گھومتے نظر آیا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے سمندر پر پہنچ جانا چاہئے۔"

رات کو ہم نے پانڈی چری کی بندرگاہ کی سمت معلوم کر لی تھی۔ پانچ منٹ بعد میں
اور کمانڈو اورنگ زیب رات کے لمحہ بہ لمحہ غائب ہوتے اندھیرے اور دم بدم بڑھتی ہوئی
دن کی روشنی میں سرائے کی ڈیوڑھی میں سے نکل کر بندرگاہ کو جاتی سڑک پر روانہ ہو
گئے۔

کوئی تین ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہمیں کچھ فاصلے پر پانی کی سیاہ چادر دور تک پھیلی
ہوئی دکھائی دی۔ اس کی ایک جانب کنارے پر دور تک روشنیاں چلی گئی تھیں۔ ان
روشنیوں کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"ہمیں یہاں رک کر دن نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ اندھیرے میں ہم کسی غلط جگہ

بھی جا سکتے ہیں۔ فوجی اسلحہ سے لدے ہوئے جہازوں کی وجہ سے سیکورٹی کے انتظامات
کافی سخت ہوں گے۔"

ہم ایک جگہ ناریل کے درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان پر روشنی
کے دھارے پھوٹنے لگے۔ یہ سورج طلوع ہونے کے پہلے کی روشنی تھی۔ سمندر میں
اس سنہری روشنی نے آگ سی لگا دی۔ آہستہ آہستہ یہ ملگجی روشنی سورج کے طلوع
ہونے کے بعد دن کے اجالے میں تبدیل ہو گئی۔ اب ہمارے سامنے سارا منظر واضح تھا۔

ہم نے دیکھا کہ جس طرف رات کو روشنیاں نظر آ رہی تھیں اس طرف دس بارہ
بڑے بڑے سمندری جہاز کھڑے تھے۔ ان کے آگے سمندر کا کنارا ناریل کے جھنڈوں
کے ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ دائیں جانب بھی چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے جن کے
قریب سے ہو کر سٹیمر گزر رہے تھے۔ ایک جگہ چھوٹی سی عمارت تھی جس کے اوپر کوئی
جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ بندرگاہ کی عمارت ہے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ جیاگامی کی
کھاڑی کس طرف ہے"

"وہاں دو چٹانیں سب سے بڑی نشانی ہے یہاں سے اٹھ کر اس طرف چلتے ہیں۔"

جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ ذرا آگے سمندر کے ریتلے کنارے پر
چلتے چلے گئے تو کچھ جھونپڑے نظر آئے۔ ان کے سامنے سمندر کے پانیوں میں چھوٹی
چھوٹی کشتیاں بلیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ کالے کالے چند ایک ماہی گیر بھی بیٹھے آپس
میں بیڑیاں پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ ملاح ہیں۔ ان سے ایک کشتی لے کر سمندر کی سیر کرتے ہیں۔
اس طرح ہمیں زیادہ دور تک جانے کا موقع مل سکے گا۔"

ہم نے ملاحوں سے ایک کشتی کرائے پر لے لی۔ ملاح نے کہا کہ وہ کشتی خود چلائے
گا۔ ہم نے کوئی اعتراض نہ کیا ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ تامل ملاح جس نے صرف گھٹنوں پر

لنگی پہن رکھی تھی کشتی میں بیٹھ کر چپو چلاتے ہوئے کشتی کو کنارے سے نکال کر سمندر میں لے آیا وہ کنارے سے کچھ فاصلے پر کشتی کو آہستہ آہستہ ایک جانب چلانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ جو لوگ سمندر کی سیر کو وہاں آتے ہیں انہیں کس طرف لے جانا ہوتا ہے ہم آپس میں پنجابی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ تاکہ یہ تامل مدراسی ملاح ہماری گفتگو سمجھ سکے۔ میں نے ملاح سے ہندوستانی اردو میں کہا۔

"ادھر والا جو جہاز باجو میں کھڑے ہیں اس طرف جانے کو مانگتا۔"

مجھے یاد ہے میں نے اس سے بھی زیادہ غلط سلط اردو میں تامل ملاح سے بات تھی۔ وہ بولا۔ اس کی اردو مجھے یاد نہیں رہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس طرف نہیں جا سکتا۔ اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ سیکورٹی کا ایریا ہے۔ میں نے ملاح سے کہا۔

"اچھا تو پھر تم ان درختوں کی طرف ہی ہمیں لے جاؤ۔ ہم ذرا دور تک سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بنگلور سے یہاں سیر کرنے ہی آئے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے دے دیا۔ پانچ روپے نوٹ لے کر وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے صاحب ہم تم کو ادھر کی سیر کرا دے گا۔"

معلوم ہوا کہ اس طرف جانے کی بھی ممانعت تھی مگر ملاح ہمیں سمندر میں ایک چکر کاٹ کر کنارے کے ناریل کے جھنڈوں کے پاس لے آیا۔ یہاں ہم کنارے پر اتر کر بیٹھ گئے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ ایک سگریٹ تامل ملاح کو بھی دیا۔ چھ سات بڑے بڑے سمندری جہاز ہماری دائیں جانب کچھ فاصلے پر سمندر میں لنگر انداز تھے۔ ان کے مستولوں پر اپنے اپنے ملکوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ کئی جہازوں پر وائرلیس کے انٹینے بھی نصب تھے۔ ان میں سے ایک جہاز آئل ٹینکر تھا جس پر بڑی بڑی کرینوں کی طرح کے دو اونچے آہنی دروازے سے بنے ہوئے تھے۔ ان جہازوں کے پیچھے پانڈی چری کی بندرگاہ کی عمارت کا اوپر والا حصہ نظر آرہا تھا جس پر بھارت کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"وہ جہاز کہاں ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے؟"

میں نے اپنے عقب کی طرف دیکھا۔ ادھر سمندر کا کنارہ کچھ دور آگے جا کر بائیں جانب گھوم گیا تھا۔ میں نے پنجابی میں اسے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ جہاز اس طرف ہوں گے۔"

اورنگ زیب بھی ادھر دیکھنے لگا۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے اور ملاح سے دوسری طرف چلنے کو کہا۔ وہ بولا۔

"صاحب! ادھر کو جانا نہیں مانگتا"

اس کا مطلب تھا کہ اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے تامل ملاح کو جیب سے پانچ روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا کہ وہ ہمیں دور دور رہ کر ہی اس طرف سمندر کی سیر کرا دے وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کشتی کو سمندر میں اس طرف موڑ دیا جس طرف سمندر ناریل کے جھنڈوں کے عقب کی طرف مڑ جاتا تھا۔

جیسے ہی ہماری کشتی ذرا آگے سمندر میں آکر ایک جانب مڑی تو ہمیں کچھ دور سمندر میں دو بڑی بڑی چٹانیں نکلی ہوئی نظر آئیں۔ ان چٹانوں کی دوسری جانب دو بحری جہاز کھڑے تھے جن کے کچھ حصے ہمیں نظر آرہے تھے۔ میں نے اورنگ زیب سے پنجابی میں کہا۔

"مجھے یقین ہے اورنگ زیب یہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔"

کمانڈو اورنگ زیب بھی ان چٹانوں اور ان کے عقب میں کھڑے جہازوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب اس کی تصدیق کیسے ہو کہ یہی اسرائیلی جہاز ہیں۔ اس سے پوچھو کہ اس طرف جیاگامی کی کھاڑی کہاں ہے؟"

جب میں نے ملاح سے جیاگامی کی کھاڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ جیاگامی کی کھاڑی اس چٹان کے پیچھے ہے۔ میں نے اس

سے پوچھا۔

"یہ جہاز کس ملک کے ہیں ؟"

وہ بولا۔

"معلوم نہیں صاحب۔ پر ہمیں اس طرف جانا نہیں مانگتا۔ بس آگے ہم نہیں جائے گا۔ ہم واپس جانا مانگتا۔"

اور اس نے کشتی موڑ دی۔ اس اثنا میں ہم نے ایک سٹیمر کو دیکھا جو چٹانوں کے عقب سے نکل کر دوسری طرف تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ اورنگ زیب نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ کوسٹ گارڈز کی بوٹ ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئیے۔ اگر یہ لوگ ادھر آگئے اور ہماری چیکنگ ہوئی تو تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس کمانڈو ثابت ہونے کے سارے ثبوت موجود ہیں"

اورنگ زیب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کی جیکٹوں کی جیبوں میں چھ چھ انتہائی طاقتور بم اور ایک ایک کمانڈو چاقو موجود تھا۔ ہم یہ چیزیں اس لئے اپنے ساتھ لے آئے تھے کہ سرائے کے کمرے میں انہیں چھپانے کی کوئی قابل اعتبار جگہ نہیں تھی۔ کمرے کی ایک چابی سرائے کے مالک کے پاس بھی تھی اور ممکن تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ کمرے کی تلاشی لیتا۔ ان قیمتی چیزوں کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انہیں جیب میں رکھ کر سمندر میں جہازوں کے قریب جانا بھی بے حد خطرناک بات تھی۔ چنانچہ ہم وہیں سے واپس آگئے۔

سرائے میں آکر ہم غور و فکر میں ڈوب گئے۔ یہ غور و فکر میں ڈوبنے والی بات ہی تھی۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا ٹارگٹ تھا جس تک پہنچنے کے واسطے ہمارے پاس اگرچہ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو کوئی سامان نہیں تھا۔ بظاہر کوئی وسیلہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سب سے اہم چیز جس کی ہمیں ضرورت تھی وہ دو آکسیجن ماسک تھے جنہیں منہ پر چڑھائے بغیر ہم سمندر کی تہہ میں نہیں اتر سکتے تھے۔ ہمارے سانس اتنے لمبے کبھی بھی نہیں ہو سکتے تھے کہ ہم سمندر کے نیچے ہی نیچے تیرتے ہوئے جہازوں کے گرد لگی

فولادی تار کو کاٹیں اور پھر ان تاروں میں سے نکل کر سمندر کے اندر ہی اندر تیرتے ہوئے جہازوں تک پہنچیں اور باری باری جہازوں کے پیندوں کے ساتھ میگنٹ بم چسپاں کریں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہمارے پاس اگر آکسیجن سلنڈر نہیں تو کم از کم پندرہ بیس منٹ تک سمندر کے اندر رہنے کے لئے آکسیجن موجود ہو اور جدید آکسیجن ماسک میں اتنی گنجائش ہوتی ہے۔ ہم اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ کمانڈو اورنگ زیب کو ایک بڑا اچھا خیال سوجھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں سمندر ہے تو ایسی بیچ یعنی ایسا ساحل سمندر بھی ضرور ہو گا جہاں ملکی اور غیر ملکی لوگ آکر سمندر میں تیراکی کرتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہاں کوئی ایسی جگہ ہے تو وہاں کوئی نہ کوئی سوئمنگ یا ڈائیونگ کلب بھی ضرور ہو گی۔ اگر کوئی ڈائیونگ کلب ہو گی تو اس کلب میں آکسیجن ماسک بھی ضرور ہوں گے تمہارا کیا خیال ہے؟"

مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آگئی تھی۔ میں نے کہا۔

"اگر کوئی ڈائیونگ کلب ہوئی تو یقین کرو وہاں سے آکسیجن ماسک حاصل کرنا ہمارے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ یہ معلومات میں اکیلا جا کر حاصل کرتا ہوں"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"تم اس مشن پر جاؤ۔ میں کسی مارکیٹ میں جا کر ایسا پلاس یا کٹر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو فولادی تار کو بھی کاٹ دے۔"

اس کے فوراً بعد کمانڈو اورنگ زیب اپنے مشن پر اور میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں پانڈی چری کی بندرگاہ پر گیا۔ خاصی بڑی بندرگاہ تھی۔ انگریزوں کے زمانے کی بڑی شاندار عمارت تھی۔ بڑے بڑے محرابی ستون تھے۔ باہر ایک طرف کاریں ٹرک اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک جانب چھوٹا سا ریسٹوران بنا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا جس قسم کی معلومات مجھے چاہئیں وہ کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ میں ریسٹوران میں آکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ دن کا وقت تھا۔ ریسٹوران میں کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک غیر ملکی جوڑا بھی بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ آدمی کی عمر زیادہ تھی۔

عورت نوجوان تھی ۔ اس کے بال سنہری گھنگھریالے تھے۔ برطانیہ کی عورت لگ رہی تھی۔ ڈائیونگ اور سوئمنگ کا شوق ان لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے چنانچہ یہ لوگ جس ملک کے ساحل سمندر کی سیر کو جاتے ہیں تو اس قسم کی سوئمنگ کلبوں یا ڈائیونگ کلبوں کے بارے میں ضرور پوچھتے ہیں۔

میں اٹھ کر ان لوگوں کے پاس آگیا۔ میں نے جاتے ہی انگریزی میں کہا۔

"آپ لوگ مجھے برطانیہ سے آئے ہوئے لگتے ہو۔"

بوڑھا انگریز مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ۔ ہم یارک شائر کے رہنے والے ہیں انڈیا کی سیاحت کو آئے ہیں ۔"

میں ان سے اجازت لے کر ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور انڈیا کے مشرقی گھاٹ کے سمندر اور سمندری طوفانوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ بوڑھے انگریز نے پوچھا۔

"کیا تم گائیڈ ہو؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں جناب۔ میں بھی آپ کی طرح کا ایک سیاح ہی ہوں ۔ انڈیا کا رہنے والا ہوں مگر شمال میں ہمالیہ کے دامن میں رہتا ہوں ۔ پہلی بار پانڈی چری کی سیاحت کرنے آیا ہوں ۔ مصیبت یہ ہے کہ مجھے سوئمنگ اور خاص طور پر سمندر میں غوطہ خوری کا بڑا شوق ہے۔ لیکن یہاں مجھے کوئی گائیڈ نہیں کر رہا کہ میں اپنا غوطہ خوری کا شوق کیسے اور کہاں پورا کر سکتا ہوں"

بوڑھا انگریز ہنسنے اور جیب سے پائپ نکال کر سلگانے لگا۔ ساتھ ہی انگریز لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"الزبتھ تم اس مقامی سیاح کو سمجھاؤ"

انگریز لڑکی کا نام الزبتھ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے خود غوطہ خوری کا شوق ہے۔ بلکہ میں تو کل سارا دن سمندر میں ڈائیونگ

کرتی رہی ہوں۔"

مجھے گوہر مراد مل گیا تھا۔ میں نے بڑی منت کرنے کے انداز میں لڑکی سے کہا۔

"پلیز! مجھے بتاؤ کہ یہاں ایسی کون سی کلب ہے جہاں میں اپنا غوطہ خوری کا شوق پورا کر سکتا ہوں ۔ میں اس کی خاطر ایک سو روپے تک فیس بھی ادا کروں گا۔"

وہ انگریز باپ بیٹی بڑے اچھے لوگ تھے اور پھر سیاح تھے اور سیاح عام طور پر اپنے ملک سے باہر جانے کے بعد بڑے خوش اخلاق ہو جاتے ہیں ۔ بوڑھا انگریز پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"نو نو ینگ مین! تمہیں فیس دینے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ہم نے پانڈی چری ڈائیونگ کلب کی ایک ماہ کی ممبر شپ لے رکھی ہے اور ہمیں اختیار ہے کہ ہم اپنے ایک مہمان کو غوطہ خوری کے لئے ساتھ لے جا سکتے ہیں تم کہاں رہتے ہو؟"

میں نے یونہی ایک ہوٹل کا نام لے دیا۔ بوڑھا انگریز بولا۔

"او کے۔ ابھی ہمیں پانڈی چری کا قلعہ دیکھنے جانا ہے۔ تم ایسا کرو اب دن کے دس بجے ہیں ۔ تم ٹھیک ایک بجے یہاں اسی ریستوران میں آجانا۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ ڈائیونگ کلب میں لے چلے گا۔ تم اپنا شوق پورا کر لینا۔"

مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ان لوگوں کے پاس آکسیجن ماسک ہیں یا نہیں ۔ کیونکہ آکسیجن ماسک کے بغیر ڈائیونگ یا غوطہ خوری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور ٹھیک ایک بجے وہاں آنے کا کہہ کر چلا آیا۔

سرائے میں پہنچا تو کمانڈو اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"میں تو اپنا مشن مکمل کر آیا ہوں ۔ تم سناؤ کچھ سراغ ملا؟"

میں نے اسے ساری کہانی بیان کر دی۔ وہ کہنے لگا۔

"آکسیجن ماسک تو ڈائیونگ کلب والوں کے پاس ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"بالکل ان کے پاس ہوں گے اور وہاں سے انہیں اڑا کر لانا بھی میرا ہی کام ہے۔ تم

بتاؤ۔ اس لفافے میں کیا ہے؟؟"

اورنگ زیب نے لفافے میں سے مجھے دو پلاس نکال کر دکھائے۔ یہ فولاد کے بڑے مضبوط پلاس تھے۔ وہ بولا۔

"میں نے انہیں استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ یہ فولاد کی موٹی سے موٹی تار کو کاٹنے کی طاقت رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ایسا ہے کہ ان کو چارپائی پر بستر کے نیچے رکھ دو۔ میگنٹ بم اور کمانڈو چاقو ہم اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ اس شہر میں ہمیں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ پولیس بازار میں روک کر ہماری تلاشی لے۔"

اورنگ زیب نے دونوں پلاس اپنے بستر کے نیچے اچھی طرح سے چھپا دیئے۔ جب بارہ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تو میں نے اورنگ زیب کو سرائے میں ہی چھوڑا اور خود بس میں بیٹھ کر بندرگاہ کی طرف چل دیا۔ ٹھیک ایک بجے میں بندرگاہ والے ریستوران میں تھا۔ کوئی دس منٹ بعد بوڑھا انگریز اور اس کی بیٹی الزبتھ بھی آگئی۔ ہم نے وہیں تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ کھانے کا بل آیا تو میں نے بوڑھے انگریز کو ادا نہ کرنے دیا اور خود ادا کیا۔ وہ میری اس بات سے بڑا متاثر ہوا۔ ان لوگوں کو متاثر کرنا ہی میرا کام تھا۔ وہ مجھے اپنی کھٹارا سی گاڑی میں ڈائیونگ کلب لے گئے جو ساحل سمندر پر ناریل اور تاڑ کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک لمبے کیبن کی طرح بنی ہوئی تھی۔ یہ ایک ریٹائرڈ مدراسی نیول آفیسر نے بنائی تھی جسے ڈائیونگ کا وسیع تجربہ تھا۔ بوڑھے انگریز نے میرا اس سے اپنے مہمان کی حیثیت سے تعارف کرایا اور کہا یہ ہمارا دوست بھی آج ہمارے ساتھ غوطہ خوری کرے گا۔

ڈائیونگ کلب کے مدراسی مالک کا نام راما کٹی تھا۔ راما کٹی نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ضرور ضرور۔ آف کورس۔ آف کورس"

میں بڑا اچھا تیراک اور غوطہ خور ضرور تھا مگر ماسک لگا کر غوطہ خوری کبھی نہیں کی تھی۔ میں اس کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ ہم تینوں نے ڈائیونگ سوٹ پہنے اور آکسیجن ماسک لے کر ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ تیراکی تو سمندر کے کنارے پر بھی ہوتی ہے مگر غوطہ خوری کے لئے ذرا کھلے سمندر میں جانا پڑتا ہے۔ کشتی سمندر میں جا رہی تھی اور میں آکسیجن ماسک کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے مجھے اس کی تکنیک کا علم ہے۔ میں نے کہا۔

"میں نے کاٹھیاواڑ کے ساحل پر بھی بہت غوطہ خوری کی ہے۔ مگر وہاں جو کلب تھی اس کے پاس ذرا مختلف آکسیجن ماسک تھے۔ اس ماسک کی ڈیوریشن کتنی ہو گی؟"

اصل میں میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا جو مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے پہن کر آدمی سمندر کے اندر کتنی دیر تک رہ سکتا ہے۔ بوڑھے انگریز نے بتایا کہ اس کی ڈیوریشن صرف پندرہ منٹ ہے۔ اس کی بیٹی الزبتھ نے کہا۔

"لیکن اس کلب میں دوسرے قسم کے آکسیجن ماسک بھی ہیں۔ ان کی ڈیوریشن آدھ گھنٹہ ہے۔ اس میں آکسیجن کا ایک فالتو چھوٹا سلنڈر ساتھ لگا ہوتا ہے"

مجھے اسی آکسیجن ماسک کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ واپسی پر اس آکسیجن ماسک کا معائنہ بھی کروں گا اور یہ بھی دیکھوں گا کہ اسے کلب میں کس جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ سمندر میں کچھ دور جا کر کشتی روک دی گئی۔ یہ موٹر بوٹ تھی۔ ہم نے آکسیجن ماسک پہنے۔ پاؤں میں مچھلی کی دم کی طرح کے فلیپر بھی چڑھا لئے اور میں اس انتظار میں یونہی اپنے پاؤں کے فلیپرز کو درست کرنے لگ گیا کہ یہ لوگ سمندر میں کیسے اترتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ پہلے لڑکی موٹر بوٹ کے کنارے پر ہماری طرف منہ کر کے بیٹھ گئی پھر اس نے پیچھے کی طرف قلابازی لگا کر اپنے آپ کو سمندر میں گرا دیا۔ بوڑھے انگریز نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ غوطہ خور اسی طرح سمندر میں اترتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اسی طرح الٹی قلابازی لگا کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ الٹی قلابازی لگانے سے یہ ہوا کہ جب میں سمندر میں اترا تو اپنے آپ میرا رخ سیدھا ہو گیا۔ سمندر کے اوپر

لہروں میں ہوا کی وجہ سے تموج تھا مگر سمندر کے نیچے بڑا سکون تھا۔ میری آنکھوں پر آکسیجن ماسک کا گول شیشہ چڑھا ہوا تھا۔ منہ میں نالی تھی جس میں سے میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن داخل ہوتی اور اسی نالی کے ذریعے میرے پھیپھڑوں کی کاربن ڈائی آکسائیڈ بلبلوں کی شکل میں خارج ہو رہی تھی۔ سمندر میں تیرتے ہوئے مجھے دباؤ محسوس ہو رہا تھا مگر آکسیجن کی وجہ سے میں بڑے آرام کے ساتھ پاؤں کے فلیپر ہلاتا بوڑھے انگریز اور اس کی بیٹی کے پیچھے پیچھے مچھلی کی طرح تیرتا چلا جا رہا تھا۔ دس منٹ تک ہم سمندر کے اندر ادھر ادھر تیرتے رہے پھر باہر نکل آئے۔

دو تین بار غوطہ خوری کرنے کے بعد ہم موٹر بوٹ لے کر واپس کلب میں آگئے۔ وہاں ہم نے ربڑ کے بنے ہوئے اور جسم کے بالکل ساتھ چمٹ جانے والے ڈائیونگ سوٹ اور آکسیجن ماسک اتار کر لوہے کی الماری میں رکھ دیئے جہاں دوسرے ڈائیونگ سوٹ اور آکسیجن ماسک بھی لٹک رہے تھے۔ یہاں مجھے الزبتھ نے وہ آکسیجن ماسک دکھایا جسے پہن کر غوطہ خور سمندر کے نیچے آدھے گھنٹے تک رہ سکتا تھا۔ اس آکسیجن ماسک کے پیچھے کی جانب ایک پلاسٹک کی چھوٹی ٹیوب کی شکل کا فالتو آکسیجن سلنڈر بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس قسم کے سات آٹھ آکسیجن ماسک ہی الماری کے دوسرے خانے میں لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے اس لوکیشن کو ذہن میں بٹھا لیا۔

ہم نے شاور میں غسل کیا۔ اپنے اپنے کپڑے پہنے اور ساحل سمندر پر ایک کینوپی کے نیچے بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ میں نے وہیں معلوم کر لیا تھا کہ کلب شام ہوتے ہی بند کر دی جاتی ہے۔ شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد وہاں کوئی تیراکی اور سمندری غوطہ خوری نہیں ہوتی۔ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے کہا۔

"اب میں اجازت چاہوں گا۔ مجھے مارکیٹ میں ایک دوست سے ملنا ہے۔"

بوڑھے انگریز نے کہا۔

"ہم تمہیں وہاں ڈراپ کر دیں گے۔ ہم بھی اب جا رہے ہیں۔"

انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور میں انہیں ان سڑکوں پر سے گزارتا ہوا اپنی

سرائے والے چوک میں لے آیا۔ یہ راستہ میں نے اپنے ذہن میں پکا کر لیا تھا۔ کیونکہ آدھی رات کے بعد مجھے کمانڈو اورنگ زیب کو لے کر اسی راستے سے ڈائیونگ کلب کی طرف جانا تھا۔ میں چوک میں اتر گیا۔ بوڑھے انگریز نے کہا۔

"ینگ مین! ہم کل بھی دوپہر کے بعد کلب آئیں گے۔ اگر تم بھی آجاؤ تو ہمیں خوشی ہوگی۔"

میں نے دونوں باپ بیٹی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

گاڑی آگے نکل گئی۔ میں سرائے میں آگیا۔ کمرے میں اورنگ زیب موجود تھا۔ میں نے اسے سارے واقعات سنائے اور کہا۔

"ہمیں آج رات کلب کا تالا توڑ کر آکسیجن ماسک اور ڈائیونگ سوٹ اڑا کر لانے ہوں گے۔"

وہ کہنے لگا۔

"تم نے راستہ دیکھ لیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"راستہ بھی یاد کر لیا ہے اور کلب کی لوکیشن بھی دیکھ لی ہے۔"

ہم شام تک اپنے میں ہی رہے۔ رات کو تھوڑا سا کھانا کھایا۔ میگنٹ بم اپنے پاس ہی رکھے۔ کمانڈو چاقو نکال کر چیک کئے۔ اگرچہ ہمیں کسی کا خون نہیں کرنا تھا۔ وہاں چوکیدار کی مزاحمت کی ہمیں پوری توقع تھی۔ ایسی صورت میں ہمیں چوکیدار وہاں جو کوئی گارڈز وغیرہ بھی تھے انہیں کمانڈو ایکشن کے بعد صرف اتنی ضرب لگانی تھی کہ کچھ وقت کے لئے بے ہوش ہو جائیں۔ یاد رکھیں۔ کمانڈو کبھی ناحق خون نہیں بہاتا وہ صرف اپنے دشمن پر کاری وار کرتا ہے اور ایک کمانڈو کے وار سے کوئی زندہ نہیں بچ سکتا۔ ہمارے پاس کمانڈو کا خاص سیاہ لباس نہیں تھا۔ ہمیں اس لباس کی وہاں ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس صرف ہمیں رات کا گہرا اندھیرا ہونے کا انتظار تھا۔

ہم رات کے ٹھیک ایک بجے سرائے سے نکلے۔ اس وقت سب لوگ سو رہے تھے۔
وہاں سے ساحل سمندر والی ڈائیونگ کلب زیادہ دور نہیں تھی۔ راستہ مجھے یاد تھا۔ ہم
سڑک کے کنارے کنارے جہاں اندھیرا تھا چلے جا رہے تھے۔ سڑک خالی تھی۔ کسی کسی
وقت کوئی گاڑی ہم پر اپنی ہیڈ لائیٹس کی روشنیاں ڈالتی گزر جاتی۔ یہ سمندر کے قریب کا
علاقہ تھا اور گنجان نہیں تھا۔ دو تین سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد ہم اس بڑی سڑک پر
آگئے جو سیدھی ساحل سمندر کو جاتی تھی۔ وہیں کلب کا کیبن بھی تھا۔ میں نے دن کے
وقت سارا محل وقوع دیکھ رکھا تھا۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں کوئی آدھا گھنٹہ لگا۔ سیدھے
راستے کی طرف جانے کی بجائے میں اورنگ زیب کو لے کر اوپر کی طرف والے درختوں
کے جھنڈ کی طرف سے ہوتا ہوا ڈائیونگ کلب ک عقب میں آگیا۔ یہاں آکر ہم
اندھیرے میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کلب کا کیبن ہم سے کوئی دو سو گز دور ہو گا۔ کلب کی
عقبی دیوار پر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ اردگرد بھی اندھیرا تھا۔
سمندر کی جانب سے ہوا چل رہی تھی اور کسی کسی وقت سمندر کی ان لہروں کی ہلکی ہلکی
آواز آجاتی تھی جو ساحل سمندر پر آکر واپس پلٹ جاتی تھیں۔

اورنگ زیب نے پوچھا۔

"کلب کا کوئی بیک ڈور بھی ہے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں اس کا ایک ہی دروازہ ہے ہمیں اس دروازے سے اندر داخل ہونا ہو گا۔
میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

میں آگے آگے چل پڑا۔ کلب کا کیبن جب ہم سے کوئی بیس پچیس گز دور رہ گیا تو
میں رک گیا۔ یہاں لوہے کا ایک بڑا ٹریش کین پڑا تھا۔ ہم اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ
گئے۔ میں نے کہا۔

"اگر یہاں کوئی چوکیدار ہوا تو وہ دوسری طرف دروازے کے باہر کہیں بیٹھا ہو گا"

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"میں جا کر معلوم کرتا ہوں۔"

میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم۔ یہیں بیٹھو۔ میں جاتا ہوں۔ میں نے کلب کا دروازہ دیکھا ہوا ہے۔
راستہ صاف ہوا تو میں تمہیں کوئل کی ہلکی آواز میں سگنل دوں گا"

اور اس کے ساتھ ہی میں اٹھا اور ٹریش کین کے پیچھے سے نکل کر جھک کر کلب کی
عمارت کی بائیں جانب چلنے لگا۔ زمین پر گھاس بھی تھی اور سنگ ریزے بھی بکھرے
ہوئے تھے۔ ان سنگ ریزوں پر چلنے سے آو پیدا ہو رہی تھی جس کو دبانے کی میں ہر
ممکن کوشش کر رہا تھا۔ میں کلب کی دیوار کے پاس پہنچ کر اس کے ساتھ سیدھا ہو کر لگ
گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں دبے پاؤں دیوار کے ساتھ لگ کر آگے بڑھنے لگا۔ دیوار ختم
ہوئی تو میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ سر ذرا سا آگے نکال کر دیکھا۔ کلب کے دروازے
کے آگے کوئی آدمی بنچ پر پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔ وہ جس طرح بے حس و حرکت تھا علوم
ہوتا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ مگر مجھے اسے ہر حالت میں بے ہوش کرنا تھا۔ میں نے ایک لمحے
ک لئے تینوں جانب دیکھا۔ وہاں سناٹا اور اندھیرا تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کوئی
دوسرا پہرے دار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے کمانڈو چاقو نہیں نکالا تھا۔ اس کی ضرورت
نہیں تھی۔ میرے بائیں بازو کے پٹھے ضرور پھڑکنے لگے تھے اسی بازو سے میں نے سارا
کام لینا تھا۔

میں پہلو والی دیوار سے نکل کر کلب کی سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ
آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اب میں روشنی میں تھا۔ کلب کے دروازے کے اوپر جو بلب جل
رہا تھا اس کی روشنی باقاعدہ مجھ پر پڑ رہی تھی۔ مگر اب میں اس روشنی سے بے نیاز تھا۔
اب میری نظریں اپنے ٹارگٹ پر تھیں۔ اس وقت میرا ٹارگٹ دروازے کے آگے بنچ پر
سویا ہوا آدمی تھا۔ یہ آدمی یقیناً چوکیدار تھا جس کو سمندر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی
ہوا نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ میں پاؤں سکیڑ سکیڑ کر چل رہا تھا۔ بڑی آہستگی کے ساتھ
میں چوکیدار کے سر کی جانب آگیا۔ اب مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا تھا۔ یہ دبلا پتلا سا کالا

مدراسی چوکیدار تھا جو دنیا مافیا سے بے خبر ہو کر سو رہا تھا۔ یہ میرے لئے بڑا ہی آسان شکار تھا۔ بس صرف اتنی احتیاط کی ضرورت تھی کہ اس کے حلق سے کوئی اونچی آواز نہ نکلے۔ چوکیدار کے سر کی طرف پہنچ کر میں نے زیادہ دیر نہ لگائی۔ یہ دیر لگانے کا موقع بھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے صرف دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کمزور سا مدراسی آدمی تھا۔ میں نے ایک ہی جنبش میں اپنا سیدھا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر سر کو ذرا سا اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پتلی سی گردن میرے بائیں بازو کے آہنی شکنجے میں تھی۔ میں نے اسے جھٹکا بالکل نہیں دیا۔ اس طرح اس کی گردن ٹوٹ سکتی تھی اور میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ بس اتنی دیر اسے بازو کے شکنجے میں رکھا جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گیا۔

میں نے منہ سے کوئل کی ہلکی آواز نکالی

دوسرے لمحے کمانڈو اورنگ زیب میرے پاس موجود تھا۔ ہم نے چوکیدار کی آدھی دھوتی پھاڑی۔ پھر اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور دوسرے ٹکڑے سے اسے بنچ پر اس طرح جکڑ دیا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد نہ تو کوئی آواز نکال سکتا تھا اور نہ اٹھ کر بھاگ سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے جیب سے لوہے کی ہک نکالی اور کلب کے دروازے کا تالا کھول ڈالا۔ ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ماچس جلائی۔ میں سیدھا لوہے کی الماری کے پاس آ گیا۔ اس کو کھولا۔ اس کے اندر سے آدھے آدھے گھنٹے کی ڈیوریشن والے دو آکسیجن ماسک نکالے۔ مزید ایک ایک فالتو آکسیجن سلنڈر دوسرے ماسکوں پر سے اتار لیا۔ ربڑ کے دو ڈائیونگ سوٹ نکال لئے۔ انہیں اچھی طرح سے تہہ کر کے وہیں سے چمڑے کا ایک تھیلا اٹھا کر انہیں اس میں ڈالا اور جس خاموشی سے اندر آئے تھے اسی خاموشی سے باہر نکل کر درختوں کے اندھیرے کی طرف دوڑ پڑے۔ سارا کام مختصر وقت میں کامیابی کے ساتھ ہو گیا تھا۔

ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف سے واپس سرائے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ ہم درمیان میں پندرہ سولہ قدموں کا فاصلہ ڈال کر چل رہے تھے۔ میں آگے آگے تھا۔ تھیلا کمانڈو اورنگ زیب کے پاس تھا جو میرے پیچھے آ رہا تھا۔ جب ہم اس چوک میں آئے جہاں سے ہمیں سرائے والی

گلی کی طرف مڑتا تھا تو سامنے سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ میں سگریٹ پیتا بڑے سکو
کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ جب آدمی میرے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی بھکار
ٹائپ کا آدمی تھا۔ اس نے تامل زبان میں ہاتھ جوڑ کر مجھے کچھ کہا۔ پھر اس نے ہاتھ م
کے پاس لے جا کر ایسا اشارہ کیا جیسے سگریٹ پی رہا ہو۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال ک
سلگایا اور اسے دے دیا۔ وہ سگریٹ لے کر بہت خوش ہوا اور سگریٹ کے کش لگاتا پیچھ
نکل گیا جدھر سے کمانڈو اورنگ زیب آ رہا تھا۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ بھکاری نے
کمانڈو اورنگ زیب سے کوئی بات نہ کی اور اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔

ہم سرائے میں آ گئے۔ ڈیوڑھی کے تخت پر چوکیدار سو رہا تھا۔ ہم احتیاط سے قد
اٹھاتے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کی بتی جلا کر گئے تھے۔ چارپائی پر تھیلا رکھ ک
اسے کھولا اور ہم آکسیجن ماسکوں کا معائنہ کرنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے فالتو سلنڈ
کو چیک کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم نے اچھا کیا جو اسے لے
آئے"

ہم نے ریہرسل کی غرض سے اسی وقت ربڑ کے ڈائیونگ سوٹ پہنے اور چہروں
آکسیجن ماسک چڑھا کر دیکھے۔ سب کچھ مناسب اور ٹھیک تھا۔ ہم نے سوٹ اتار دیئے
گیس ماسک بھی اتار دیئے اور دونوں چیزیں چمڑے کے تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیں
کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"اب ہماری حکمت عملی کیا ہو گی؟"

میں نے کہا۔

"لوکیشن ہم نے دیکھ لی ہے۔ ہم جنوب مشرق جو ملاحوں کی جھونپڑیاں ہیں ا
طرف سے سمندر میں داخل ہوں گے اور چٹانوں کے عقب میں جہازوں تک پہنچ
گے۔"

"مگر یہ فاصلہ کافی طویل ہے۔ ہماری آکسیجن تو راستے میں ہی ختم ہو جائے گی"

اورنگ زیب کے اس اعتراض پر میں نے کہا۔

"ہم سمندر میں دور تک ماسک پہنے بغیر تیرتے ہوئے جائیں گے۔ آکسیجن ماسک صرف وہاں پہنیں گے جہاں اس کی ضرورت محسوس کریں گے۔ تم سمندر میں تیر لو گے ناں؟"

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

"کیوں نہیں۔ میں نے اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔ تم فکر نہ کرو"

"ٹھیک ہے۔ ہم کل رات کو اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوں گے۔"

دوسرے روز ہم ایک مرتبہ پھر اپنے ٹارگٹ کو دیکھنے کے لئے گئے۔ ہم نے اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لی۔ اسے مزدوری دس روپے دیئے اور سمندر میں دور سے ایک چکر کاٹ کر چٹانوں کی اوٹ میں کھڑے جہازوں کو غور سے دیکھا۔ ان کی پوزیشن کو نوٹ کیا۔ جس زاویے سے اور جس مقام سے ہمیں سمندر میں غوطہ لگانا تھا اس کا اندازہ لگایا، مقام طے کیا۔ اور پھر واپس آ گئے۔ دن کا باقی کا وقت ہم نے اپنے سرائے والے کمرے میں گزارا اور اپنے کمانڈو ایکشن کی تفصیلات پر غور و فکر کرتے رہے۔

کمانڈو اورنگ زیب کا خیال تھا کہ ہمیں سمندر میں دور تک تیرتے جانے کی بجائے کشتی پر یہ فاصلہ طے کرنا چاہئے۔

"رات کے وقت ماہی گیروں کی کشتیاں ساحل سمندر پر ہی ہوتی ہوں گی۔ ہم بڑی آسانی سے ایک کشتی حاصل کر سکتے ہیں"

کمانڈو اورنگ زیب کی تجویز قابل عمل تھی۔ اس طرح ہم سمندر میں دور تک تیرتے جانے کی مشقت سے بچ سکتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ماہی گیروں کی کسی ایک کشتی کو اڑا کر لے جانا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ یہ لوگ رات کو عام طور پر تاڑی شراب میں دھت ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔"

اسی رات ہمارا اصل اور خطرناک کمانڈو مشن شروع ہونے والا تھا۔ یہ کمانڈو مشن

اہم بھی تھا اور اس میں ہر قسم کے جان لیوا خطرات بھی تھے۔ لیکن ہمیں ان خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے' ان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ کو مارنا تھا۔ یہی ہمارا عزم اور یہی ہمارا نصب العین تھا اور اس کام میں ہم پوری طرح تربیت یافتہ تھے۔ ایک ماہر کمانڈو کو تربیت تو ضرور ملی ہوتی ہے اور وہ پورے جذبے اور مورال کے ساتھ ٹارگٹ پر حملہ کرتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بالکل نئے قسم کے حالات سامنے آجاتے ہیں جن کے بارے میں کچھ قیاس اور گمان بھی نہیں ہوتا۔ ایک تجربہ کار کمانڈو ان حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارتا اور اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اس اہم ترین اور خطرناک کمانڈو مشن کے بارے میں مجھے بھی اندیشہ تھا کہ صورت حال ہمیں ویسی نہیں ملے گی جیسی کہ ہم نے سوچ رکھی ہے اور جس کا ہم پورا انتظام کر کے اور سوچ سمجھ کر چلے ہیں۔ لیکن میں نے دل میں یہ عہد بھی کر رکھا تھا کہ چاہے میری جان چلی جائے لیکن میں پاکستان اور نہتے کشمیریوں کے خلاف استعمال ہونے والا اسلحہ اور فوجی سازو سامان سے بھرے ہوئے بحری جہازوں کو سمندر میں غرق کر کے ہی رہیں گے۔ چاہے ان جہازوں کے ساتھ میرے اپنے پرخچے کیوں نہ اڑ جائیں۔

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ کمانڈو جس مشن پر بھی جاتا ہے وہ واپس آنے کا خیال دل سے نکال کر جاتا ہے۔ دن آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ دوپہر گزر گئی۔ پھر شام اور پھر رات کا پہلا پہر شروع ہو گیا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور کمرے میں ہی دروازہ بند کر کے بیٹھے اپنی کمانڈو حکمت عملی کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ ہم نے رات کے پورے ایک بجے نکلنے کا پروگرام طے کیا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ اس وقت نیول کوسٹ گارڈ کے آدمی غافل ہوں گے یا سو رہے ہوں گے۔ نہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ جہازوں کے اردگرد سیکورٹی گارڈز اور جہازوں کے اوپر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے بحریہ کے جوان پوری طرح چوکس ہوں گے۔ ہمیں ان سب خطرات میں سے انتہائی ہوشیاری اور چالاکی سے گزر کر جہازوں تک پہنچنا تھا۔

ہم نے اپنی اپنی گھڑیاں ملالیں۔ جب ہماری گھڑیوں نے رات کا ٹھیک پونا ایک بجایا

تو ہم نے آخری بار چمڑے کے تھیلے میں رکھے ہوئے غوطہ خوری کے لباس آکسیجن ماسک وغیرہ چیک کئے۔ اپنے اپنے میگنٹ بم نکال کر انہیں چیک کیا۔ ان کے وہ بٹن دیکھے جنہیں نیچے کرنے سے بموں نے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد قیامت خیز دھماکے سے پھٹ کر جہازوں کو سمندر میں غرق کر دینا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے کمانڈو چاقو بھی ساتھ رکھ لئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی پستول نہیں تھا۔ ایمرجنسی کی حالت میں ہمیں ان چاقوؤں سے ہی کام لینا تھا۔ ٹھیک ایک بجے ہم سرائے سے نکلے اور ساحل سمندر کی جانب چل پڑے۔ چمڑے کا تھیلا میرے پاس تھا۔ میں آگے آگے جا رہا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب چھ سات قدموں کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ مجھے کور دے رہا تھا۔ اگر راستے میں کوئی پولیس کا آدمی مجھے چیک کرتا ہے تو اورنگ زیب میری مدد کر سکتا تھا۔

میں اس طرف جا رہا تھا جدھر ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ یہ جگہ میں دو بار دن کی روشنی میں دیکھ چکا تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہمیں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب ہم سمندر کے پاس آئے اور جھونپڑیاں رات کے اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹبوں کی طرح نظر آنے لگیں تو کمانڈو اورنگ زیب دوڑ کر میرے قریب آگیا۔ اب ہم دونوں چاروں طرف سے چوکس ہو کر ماہی گیروں کی کشتیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جھونپڑیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سمندر کے ساحل پر چھوٹی بڑی کشتیاں زمین میں گڑھے ہوئے بانسوں سے بندھی تھیں۔ ہم نے ایک چھوٹی کشتی کو کھولا اور اسے ریت پر گھسیٹتے ہوئے سمندر میں لے آئے۔ سمندر پر سکون تھا۔ اس کی لمبی لمبی لہریں بڑے سکون کے ساتھ دور سے آکر ساحل کی ریت پر چڑھ جاتیں اور پھر آہستگی سے واپس چلی جاتیں۔ جب ہماری کشتی سمندر میں پہنچ گئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ میں نے چپو تھام لئے۔ میں جھک کر کشتی کو سمندر میں آگے لے جانے لگا۔ اورنگ زیب بھی سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ سمندر پر اندھیرا چھایا تھا۔ آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے ستاروں کی پھیکی روشنی بھی سمندر پر نہیں پڑ رہی تھی۔ ہمارے کمانڈو ایکشن کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔

میں کشتی کو سمندر میں کچھ دور تک چلاتا گیا۔ اس کے بعد میں بائیں جانب ہونے لگا۔ میرا مقصد دور درختوں کے جھنڈوں والے ساحل تک پہنچنا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"تم ٹھیک سمت کو جا رہے ہو کیا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک جا رہا ہوں۔ تم خاموشی سے بیٹھے رہو"

میں کشتی کو درختوں کی طرف لے جا رہا تھا۔ درختوں کے سیاہ جھنڈوں والا کنارا نزدیک آ رہا تھا۔ اس دوران ہمیں کچھ فاصلے پر چٹان اور اس کی اوٹ میں کھڑے بحری جہازوں کی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس سمندر میں بھی پڑ رہا تھا۔ یہ بات ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر ہم جہازوں کے قریب جا کر سر پانی سے باہر نکالتے ہیں تو ہمیں بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی اور مجھے حیرت بھی تھی کہ وہاں کوئی سرچ لائٹ نصب نہیں تھی۔ چٹان کے اوپر بھی بتیاں روشن تھیں۔ درختوں کے جھنڈوں والا ساحل ریتلا نہیں تھا۔ پانی کنارے تک چڑھا ہوا تھا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری کشتی جیا گامی نامی سمندری کھاڑی میں داخل ہو چکی ہے۔ میں بے آواز چپو چلا رہا تھا۔ کشتی کو ہم نے ساحل کے بالکل ساتھ لگا دیا اور اوپر کنارے پر چڑھ گئے۔ کشتی رسی سے ہم نے ایک جھاڑی کی شاخوں سے باندھ دی۔ سمندر کا پانی یہاں رات کے اندھیرے میں اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

ہم چمڑے کا تھیلا لے کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ ہماری نظر دور چٹانوں کے سائے میں کھڑے سمندری جہازوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ فاصلہ میرے اندازے کے مطابق ہم سمندر میں غوطہ لگا کر پانچ منٹ میں طے کر سکتے تھے۔ ہم نے فوراً کپڑے اتار کر غوطہ خوری کے سوٹ پہن لئے۔ پاؤں میں ربڑ کے مچھلی کی دم کی طرح کے فلیپر چڑھائے۔ چہرے پر آکسیجن ماسک پہنے اور کنارے پر آ گئے۔ چھ میگنٹ بم کمانڈو اورنگ زیب نے کپڑے میں لپیٹ کر اپنی کمر کے گرد باندھ رکھے تھے اور چھ بم اسی طرح میں نے

کپڑے میں ڈال کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ ایک پلاس میرے ڈائیونگ سوٹ کی بیلٹ میں اور ایک پلاس کمانڈو اورنگ زیب کے ڈائیونگ سوٹ کی بیلٹ میں لگا ہوا تھا۔ کمانڈو چاقو ہم نے اپنی پنڈلیوں کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ ہر طرح سے تیار ہونے کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا۔ اللہ سے فتح کی دعا مانگی اور سمندر میں اتر گئے۔

سمندر میں اترنے کے بعد ہم آہستہ آہستہ سر پانی کی سطح سے باہر نکالے تیرنے لگے۔ ہم چاہتے تھے کہ جہاں تک خطرے سے بچ کر سمندر میں تیر سکتے ہیں تیرتے چلے جائیں اس طرح سے ہم اپنے آکسیجن ماسک کی آکسیجن بچا کر اسے ٹارگٹ پر جا کر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمیں سمندر کے اندر کتنی دیر لگے گی۔ دور ہمیں ایک بوٹ جہازوں کی طرف جاتی نظر آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹ روشن تھی اور جہازوں کے قریب سمندر پر پڑ رہی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب میرے پہلو میں تیرتا ہوا میرے ساتھ ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کوسٹ گارڈز کی بوٹ ہو گی میرا خیال ہے ہمیں غوطہ لگا دینا چاہئے۔

اس وقت آکسیجن ماسک ہم نے چہروں سے اوپر کئے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں بھی بوٹ کی روشنی کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"جتنی دیر تیر سکتے ہیں ہمیں تیرتے جانا چاہئے۔ یہاں تک کوسٹ گارڈ کے بوٹ کی روشنی نہیں آ رہی"

ہم سمندر میں آہستہ آہستہ تیرتے تیرتے جہازوں کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ ہمیں ایک جہاز کے ڈیک پر جنگلے کے پاس کھڑا سپاہی کا ہیولا نظر آنے لگا۔ میں نے تیرتے تیرتے اورنگ زیب کو اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے چہروں پر آکسیجن ماسک چڑھائے اور سمندر میں غوطہ لگا گئے۔ ہمارے سر نیچے تھے اور ٹانگیں اوپر تھیں اور پاؤں کے فلیپر اوپر نیچے حرکت کر رہے تھے۔ کافی نیچے گہرائی میں جانے کے بعد ہم سیدھے ہو گئے اور ہم نے اپنا رخ جہازوں کی طرف کر لیا۔ ہمارے پاس جتنی آکسیجن تھی اس کی الٹی گنتی شروع ہو

گئی تھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک سمندر کے اندر رہ سکتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں آکسیجن کا دوسرا سلنڈر تبدیل کرنا تھا۔ پلاس کٹر ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ ہمیں جہازوں کے اردگرد فولادی جال کی تلاش تھی۔ ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ سمندر کے اندر اندھیرا ضرور تھا مگر جہازوں اور چٹانوں کی روشنیوں کا جو عکس پانی میں پڑ رہا تھا ان کی وجہ سے سمندر کے اندر ہمیں تھوڑا تھوڑا نظر آرہا تھا۔ کئی مچھلیوں کے قافلے ہمیں دیکھ کر جلدی سے دوسری طرف مڑ گئے تھے۔

آخر وہ فولادی جال آگیا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ ہم نے ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر پلاس کے تاروں کو کاٹنے کی کوشش شروع کر دی۔ تار بہت مضبوط تھے۔ انہیں کاٹنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ آخر ہم نے تاروں کو کاٹ کر جال میں ایک جگہ اتنا سوراخ بنالیا کہ ہم اس میں سے گزر گئے۔ یہاں بحریہ کی سیکورٹی فورس کی جانب سے سمندری آبدوز سرنگیں اس لئے نہیں بچھائی گئی تھیں کہ ان کے پھٹنے سے جہازوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ یہ بات ہمارے حق میں بے حد فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ہم پانی کے اندر ہی اندر آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ دور تیرنے کے بعد ہمیں سامنے ایک بہت بڑی دیوار نظر پڑی۔ یہ ایک جہاز کا پیندا تھا۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو اشارہ کر کے بتایا کہ تم اس جہاز کو سنبھالو۔ میں دوسرے جہاز کی طرف جاتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں جہاز کے پیندے کے ساتھ ساتھ تیرتا آگے نکل گیا۔ آگے بہت موٹا آہنی سنگل سمندر میں اترتا چلا گیا تھا۔ یہ جہاز کا لنگر تھا۔ کچھ فاصلے پر دوسرے جہاز کا سامنے والا تکونی سرا آگیا۔ میں اس کے پہلو کی طرف نکل گیا۔ یہاں میں نے سب سے پہلا میگنٹ بم پیندے سے لگا دیا۔ یہ کام بے حد احتیاط کے ساتھ کیا گیا تھا کہ بم کے پیندے کے ساتھ چپکنے کی کم سے کم آواز پیدا ہو۔ اس طرح پانی کی گہرائی میں اس جہاز کے دونوں طرف تیر کر میں نے چھ کے چھ بم چپکا دیئے۔ مگر ان کے بٹن اون نہ کئے۔ میں تیزی سے تیرتا ہوا کمانڈو اورنگ زیب والے جہاز کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ جہاز کی عقبی دیوار کے ساتھ میگنٹ بم چپکا رہا تھا۔ میں نے اس کے

قریب جا کر اس کے کندھے پر دو بار آہستہ سے ہاتھ مارا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اپنا کام مکمل کر آیا ہوں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے میرے کندھے پر بھی اسی طرح دو بار ہاتھ لگایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بھی چھ کے چھ بم لگا دیئے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنا اپنا ہاتھ ماتھوں پر لے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہمیں فوراً اپنے لگائے ہوئے میگنٹ بموں کے بٹن اون کر دینے ہیں۔ چنانچہ ہم تیزی سے اپنے اپنے جہازوں کی طرف گھوم گئے۔ میں نے اپنے اور کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے لگائے ہوئے بموں کے بٹن دبا دیئے۔ اب ہمیں جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے واپس فرار ہونا تھا۔ قدرت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ سارا کام وقت سے چھ سات منٹ پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے مچھلیوں کی طرح جتنی تیز سمندر کے اندر تیر سکتے تھے تیرتے ہوئے فولادی جال کے سوراخ میں سے نکل گئے۔

کچھ دور جا کر مجھے محسوس ہوا کہ مجھے سانس لینے میں دقت پیش آرہی ہے۔ میں نے گھوم کر اورنگ زیب کو دیکھا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے بھی اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں کے آکسیجن سلنڈروں کی آکسیجن آخری مرحلوں پر تھی اور ختم ہونے والی تھی۔ ہم پانی کے اندر بالکل سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر پاؤں پر چڑھے ہوئے فلیپر اور اپنے بازوؤں کو چلاتے اوپر اٹھنے لگے۔ ہمارے سر پانی سے باہر آگئے۔ ہم نے فوراً آکسیجن ماسک چہروں سے ہٹا کر اوپر چڑھا لئے۔ ہم نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ہم جہازوں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اوپر ڈیک پر سے کسی فوجی کے کسی دوسرے فوجی کو آواز دینے اور پھر دوسرے فوجی کے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے آواز پیدا کئے بغیر واپس تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ہم بڑے خوش تھے کہ ہمارے مشن کا سب سے اہم اور خطرناک مرحلہ بغیر کسی دشواری کے آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ جب ہم جہازوں سے کافی فاصلے پر آگئے تو ہم جلدی جلدی تیرنے لگے۔

کیونکہ جہازوں کے غرق ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی۔ اگر ہمارے لگائے ہوئے بم پھٹ جاتے ہیں تو اوپر تلے دھماکے ہونے تھے۔ جہازوں کے پیندوں میں بموں کے پھٹنے

کے بعد بڑے بڑے سوراخ بلکہ شگاف پڑ جاتے تھے جن میں سے سمندر کا پانی قیامت خیز ریلوں کی طرح جہازوں میں بھرنا شروع ہو جاتا تھا اور پھر جہازوں کو تمام اسلحہ اور فوجی سازو سامان کے ساتھ سمندر میں غرق ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہم سمندر میں ٹھیک اس جگہ آکر کنارے پر آگئے جہاں ہماری کشتی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی ڈائیونگ سوٹ اتار کر چمڑے کے تھیلے میں رکھے ہوئے اپنے کپڑے پہنے۔ آکسیجن ماسک اور ربڑ کے ڈائیونگ سوٹ اور پلاس چمڑے کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کو وہیں سمندر میں پھینکا۔ اور کشتی کو تیزی سے چلاتے ہوئے جہازوں سے جس قدر دور ہو سکتے تھے سمندر میں دور ہوتے چلے گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی چمکیلی سوئیوں کو دیکھ کر مجھے کہا۔

"بموں کے پھٹنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ہمیں ماہی گیروں کی جھونپڑیوں کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ جہازوں کے دھماکوں اور ان کے غرق ہونے کے ساتھ ہی اس سارے علاقے کو بحریہ کی سیکورٹی گارڈ اور فوجی گھیرے میں لے سکتے ہیں۔"

کمانڈو اورنگ زیب کا خیال درست تھا۔ میں نے وہیں سے کشتی کو دوسری طرف ڈال دیا۔ اب ہماری کشتی تیزی سے ان درختوں کے عقب میں ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں سے ہم کشتی کو لے کر چلے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر ہم نے کشتی کو سمندر میں ہی چھوڑ دیا اور خود دوڑتے ہوئے سامنے درختوں کے اندھیرے میں گھس گئے۔ ہماری بائیں جانب سمندری کھاڑی میں کھڑے جہازوں کی روشنیاں ہمیں درختوں کے درمیان سے دور جھلملاتی نظر آجاتی تھیں۔ ایک جگہ آگے ندی آگئی۔ یہ سمندر ہی کی کوئی شاخ تھی۔ ہم وہاں رک گئے۔

اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"بموں کے بلاسٹ ہونے میں بمشکل پندرہ منٹ رہ گئے ہیں ہمیں اتنی دیر میں اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جانا چاہیے۔"

ہم ندی کے کنارے کنارے جہازوں کے مخالف رخ کو تیز تیز چلنے لگے۔ یہاں کوئی جنگل تو تھا نہیں۔ کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور کہیں جھونپڑی نما کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہم جتنی تیز چل سکتے تھے چل رہے تھے۔ آخر ہم ایک چھوٹی سی سڑک پر نکل آئے۔ یہ سڑک پانڈی چری کی بندرگاہ کی طرف ہی جاتی ہو گی۔ ہم سڑک پار کر کے سامنے والے کوارٹروں کی قطاروں میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے ایک راستہ ایک چھوٹے سے میدان میں نکل گیا تھا۔ یہاں میدان کی طرف کنارے پر کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ ہم ان بتیوں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف چلنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

"صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں"

ہمیں اس بات کی خوشی بھی بہت تھی کہ ہمارا مشن آدھے سے زیادہ مکمل ہو گیا تھا اور ہم نے بڑی کامیابی سے دونوں جہازوں کے نیچے طاقتور بم لگا دیئے تھے۔ ان بموں کا سراغ لگا کر انہیں ناکارہ کرنا اب تقریباً ناممکن تھا۔ اول تو ان کا سراغ ہی نہیں لگ سکتا تھا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"آگے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی ایسی سڑک مل جائے جو ہمارے علاقے کی طرف جاتی ہو۔"

وہ کہنے لگا۔

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کون سی سڑک کس طرف جاتی ہے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں اور سڑکوں راستوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں تو صرف بندرگاہ والے علاقے سے دور ہو جانا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم چلو تو سہی"

کوارٹروں پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ ہم ان کے پیچھے سے ہو کر جا رہے تھے۔ کوارٹروں کا علاقہ ختم ہوا تو آبادی شروع ہو گئی۔ یہاں رات کے وقت بھی کافی روشنی

کے بعد بڑے بڑے سوراخ بلکہ شگاف پڑ جاتے تھے جن میں سے سمندر کا پانی قیامت خیز ریلوں کی طرح جہازوں میں بھرنا شروع ہو جاتا تھا اور پھر جہازوں کو تمام اسلحہ اور فوجی سازو سامان کے ساتھ سمندر میں غرق ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہم سمندر میں ٹھیک اس جگہ آکر کنارے پر آگئے جہاں ہماری کشتی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی ڈائیونگ سوٹ اتار کر چمڑے کے تھیلے میں رکھے ہوئے اپنے کپڑے پہنے۔ آکسیجن ماسک اور ربڑ کے ڈائیونگ سوٹ اور پلاس چمڑے کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کو وہیں سمندر میں پھینکا۔ اور کشتی کو تیزی سے چلاتے ہوئے جہازوں سے جس قدر دور ہو سکتے تھے سمندر میں دور ہوتے چلے گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی چمکیلی سوئیوں کو دیکھ کر مجھے کہا۔

”بموں کے پھٹنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ہمیں ماہی گیروں کی جھونپڑیوں کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ جہازوں کے دھماکوں اور ان کے غرق ہونے کے ساتھ ہی اس سارے علاقے کو بحریہ کی سیکورٹی گارڈ اور فوجی گھیرے میں لے سکتے ہیں۔“

کمانڈو اورنگ زیب کا خیال درست تھا۔ میں نے وہیں سے کشتی کو دوسری طرف ڈال دیا۔ اب ہماری کشتی تیزی سے ان درختوں کے عقب میں ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں سے ہم کشتی کو لے کر چلے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر ہم نے کشتی کو سمندر میں ہی چھوڑ دیا اور خود دوڑتے ہوئے سامنے درختوں کے اندھیرے میں گھس گئے۔ ہماری بائیں جانب سمندری کھاڑی میں کھڑے جہازوں کی روشنیاں ہمیں درختوں کے درمیان سے دور جھلملاتی نظر آجاتی تھیں۔ ایک جگہ آگے ندی آگئی۔ یہ سمندر ہی کی کوئی شاخ تھی۔ ہم وہاں رک گئے۔

اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

”بموں کے بلاسٹ ہونے میں بمشکل پندرہ منٹ رہ گئے ہیں ہمیں اتنی دیر میں اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جانا چاہئے۔“

ہم ندی کے کنارے کنارے جہازوں کے مخالف رخ کو تیز تیز چلنے لگے۔ یہاں کوئی جنگل تو تھا نہیں۔ کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور کہیں جھونپڑی نما کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہم جتنی تیز چل سکتے تھے چل رہے تھے۔ آخر ہم ایک چھوٹی سی سڑک پر نکل آئے۔ یہ سڑک پانڈی چری کی بندرگاہ کی طرف ہی جاتی ہو گی۔ ہم سڑک پار کر کے سامنے والے کوارٹروں کی قطاروں میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے ایک راستہ ایک چھوٹے سے میدان میں نکل گیا تھا۔ یہاں میدان کی طرف کنارے پر کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ ہم ان بتیوں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف چلنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

”صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں“

ہمیں اس بات کی خوشی بھی بہت تھی کہ ہمارا مشن آدھے سے زیادہ مکمل ہو گیا تھا اور ہم نے بڑی کامیابی سے دونوں جہازوں کے نیچے طاقتور بم لگا دیئے تھے۔ ان بموں کا سراغ لگا کر انہیں ناکارہ کرنا اب تقریباً ناممکن تھا۔ اول تو ان کا سراغ ہی نہیں لگ سکتا تھا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”آگے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی ایسی سڑک مل جائے جو ہمارے علاقے کی طرف جاتی ہو۔“

وہ کہنے لگا۔

”ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کون سی سڑک کس طرف جاتی ہے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں اور سڑکوں راستوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں تو صرف بندرگاہ والے علاقے سے دور ہو جانا ہے۔“

میں نے کہا۔

”تم چلو تو سہی“

کوارٹروں پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ ہم ان کے پیچھے سے ہو کر جا رہے تھے۔ کوارٹروں کا علاقہ ختم ہوا تو آبادی شروع ہو گئی۔ یہاں رات کے وقت بھی کافی روشنی

تھی۔ ہم ان سے بچتے بچاتے مزید آگے چلے گئے۔ آگے ایک بڑی سڑک تھی۔ یہاں سے ایک فوجی ٹرک فراٹے بھرتے گزر گیا۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ہم خطرے کے مقام سے نکل آئے ہیں۔ اب ہمیں کسی جگہ رک کر بموں کے دھماکوں کا انتظار کرنا چاہئے۔ اگر دونوں جہازوں میں بارود کا ذخیرہ بھی ہوا تو دھماکے قیامت خیز ہوں گے اگر بارود کا ذخیرہ نہ بھی ہوا تب بھی ان میگنٹ بموں کی اس قدر طاقت ہے کہ ان کے دھماکے سارے شہر میں سنے جائیں گے۔"

ہم وہیں سڑک پر سے اتر کر ایک جگہ درختوں کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے کان دھماکوں پر لگے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کی نگاہ گھڑی کی سوئیوں پر تھی۔ پھر میں بھی اپنی گھڑی کو دیکھنے لگا۔ ہماری گھڑیاں ملی ہوئی تھیں۔ ہمارے اندازے اور حساب کے مطابق بموں کے پھٹنے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے شک کا اظہار کرتے ہوئے اورنگ زیب سے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ بم کسی ماہر نے تیار کئے تھے اور وقت پر دغا نہیں دیں گے؟"

وہ کہنے لگا۔

"تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ بم جس نے تیار کئے تھے دھماکہ خیز مواد تیار کرنے میں کس قدر ماہر ہے"

جب میگنٹ بموں کی ڈیوریشن ختم ہونے میں صرف پچاس سیکنڈ رہ گئے تو ہم بالکل خاموش ہو گئے۔ ہماری نظریں اپنی اپنی گھڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"صرف دس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ ہم نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے بموں کے فیوز اون کئے تھے۔ وہ سکتا ہے دھماکے یکے بعد دیگرے نہ ہوں۔"

ابھی یہ جملہ اس نے ختم ہی کیا تھا کہ رات کا سناٹا ایک خوفناک دھماکے کی گونج سے

لرز اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا دھماکہ ہوا۔ پھر تیسرا' پھر چوتھا اور دھماکوں کا سلسلہ بارہ میگنٹ بموں کے دو دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد پھٹنے تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں دور سے فائر بریگیڈ کے انجنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

کمانڈو اورنگ زیب نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

"اب ہمارے تیار کئے ہوئے بموں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے مجاہدوں کی کیمیکل انجینئرنگ کا قائل ہو گیا ہوں۔ اب یہاں سے بھاگو۔"

ہم سڑک پر جلدی جلدی چلنے لگے۔ جس طرف ہم جا رہے تھے اس طرف شہر کی عمارتوں اور مکانوں' کوٹھیوں کی جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم شہر پانڈی چری کے کون سے علاقے میں آ گئے تھے اور یہاں سے کون سا راستہ ہمیں ہماری سرائے والے چوک کی طرف لے جائے گا۔ اس چوک کا نام مجھے یاد تھا۔ وہاں کوئی ٹیکسی رکشا بھی نہیں تھا۔ ہم ایک چوراہے میں آئے تو سامنے سے ایک ٹیکسی چلی آ رہی تھی۔ وہ خالی تھی۔ اس کی سرخ بتی روشن تھی۔ میں نے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر اسے ہاتھ دے دیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ میں نے چوک کا نام لے کر کہا کہ ہمیں وہاں جانا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور مدراسی تھا۔ بولا۔

"بیٹھو"

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اس نے ٹیکسی وہیں سے واپس موڑی اور خالی سڑک پر مخالف سمت کو ڈال دی۔ معلوم ہوا کہ ہم اپنی سرائے والے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"ہمیں چوک سے ذرا پہلے ہی اتر جانا چاہئے"

وہ بولا۔

"ٹھیک ہے"

ٹیکسی نہ جانے کون کون سے علاقے سے گزرتی ہوئی ایک کشادہ سڑک پر آئی تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"ابھی ہمارا چوک کتنی دور ہے؟"

وہ بولا۔

"اگلے بازار میں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں یہیں اتار دو"

ہم نے وہیں ٹیکسی چھوڑ دی اور فٹ پاتھ پر پیدل چلنے لگے۔ ایک بازار ختم ہو گیا دوسرے بازار میں آئے تو میں نے اپنے بازار کو پہچان لیا۔ سامنے اس چوک کی ٹریفک لائیٹس روشن تھیں جس کے قریب ہی ہماری سرائے تھی۔ ہم چوک میں سے گزر کر اس بازار کی طرف مڑ گئے جہاں سے ایک گلی ہماری سرائے کی طرف جاتی تھی تو اچانک وہ تامل مدراسی نہ جانے کہاں سے نکل آیا جسے ہم نے ایک رات پہلے دیکھا تھا جب ہم ڈائیونگ کلب سے واپس آرہے تھے اور اس بھکاری نے مجھ سے سگریٹ مانگا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی بھکاری تھا۔ اس نے قریب آکر ہنس کر تامل زبان میں کچھ کہا اور پہلے کی طرح ہاتھ منہ پر رکھ کر اندر کی طرف سانس کھینچا جیسے سگریٹ کا کش لگا رہا ہو۔

"صاحب سگریٹ!"

اس نے سگریٹ مانگا۔ میرے پاس سگریٹ تھا مگر میں نے کہا۔

"نو سگریٹ"

اور ہم دونوں آگے نکل کر اپنے بازار میں داخل ہو گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ آدمی مجھے مشکوک لگتا ہے۔ یہ اس روز بھی ہمیں اسی جگہ رات کو ملا تھا۔ آج بھی اسی جگہ ملا ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ اس علاقے کا کوئی نیم پاگل بھکاری ہے۔ ایسی شک شبے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں اس قسم کے بھکاری اکثر سڑکوں پر مل جاتے ہیں"

کمانڈو اورنگ زیب خاموش ہو گیا۔ ہم گلی میں آگئے۔ گلی خالی تھی اور سنسان تھی۔ سرائے کی ڈیوڑھی میں چوکیدار تخت پر اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ ہم دبے دبے قدم اٹھاتے اس کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ کمرے میں آتے ہی ہم نے دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی اور اپنی اپنی چارپائی پر یوں بیٹھ گئے جیسے کسی نے ہمارے سروں پر سے تین تین من کا بوجھ اٹھا دیا ہو۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ابھی یہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ جانا چاہئے اور دلی کی طرف جاتی جو بھی گاڑی ملے اس میں سوار ہو کر نکل جانا چاہئے۔"

کمانڈو اورنگ زیب ایک دلیر کمانڈو ضرور تھا مگر ابھی اسے کمانڈو آپریشنز کا اتنا وسیع تجربہ نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اس وقت ریلوے سٹیشن پر جانا اپنے آپ کو خود ہی دشمن کے حوالے کرنے کے برابر ہو گا۔ تم جانتے ہو ہم بھارتی بحریہ کی ہائی کمانڈ کو کس قدر تباہ کن نقصان پہنچا کر آرہے ہیں۔ ہم نے ان کے اسلحہ اور فوجی ساز وسامان سے لدے ہوئے دو بہت بڑے بڑے جہاز سمندر میں غرق کر دیئے ہیں۔ اب تک تو پانڈی چری کی سول اور ملٹری کی انٹیلی جنیس شہر کے کونے کونے میں پہنچ چکی ہو گی اور اس کے علاوہ پولیس نے بھی سارے شہر کی ناکہ بندی کر دی ہو گی۔ شہر سے باہر نکلنے والے چوہے کی بھی تلاشی لی جا رہی ہو گی۔"

"تو پھر تم کیا رائے دیتے ہو؟ کیا اسی جگہ پڑے رہیں؟ یہ جگہ بھی تو محفوظ نہیں ہے۔ یہاں باہر سے آکر مسافر ٹھہرتے ہیں۔ پولیس یہاں بھی چھاپا مار سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ سرائے ایک غیر معروف جگہ ہے۔ یہاں مزدور پیشہ لوگ آکر ٹھہرتے ہیں۔ پولیس شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کی تو ضرور چیکنگ کرے گی مگر یہاں تک نہیں آئے گی۔"

کاش اس وقت میں کمانڈو اورنگ زیب کی بات مان لیتا اور اسے ناتجربہ کاری کا طعنہ دے کر اس کی تجویز کو رد نہ کرتا بعد میں جس قسم کے سنگین حالات پیش آئے انہوں نے ثابت کر دیا کہ انسان کو اپنے تجربے اور علم پر کبھی ناز نہیں کرنا چاہئیے اور دوسرے کی رائے پر ضرور غور کر لینا چاہئیے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم کم از کم دو تین روز تک اسی سرائے میں رہیں گے۔ جب شہر میں پولیس کی چیکنگ نرم پڑ جائے گی۔ پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔

اس کے بعد ہم بتی بجھا کر سو گئے۔

دوسرے دن دیر تک ہم سوئے رہے۔ کافی دن چڑھے اٹھے نیچے گلی میں جا کر چائے کی دکان پر ناشتہ کیا۔ وہاں ہر کوئی اپنی اپنی زبان پر اسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے چائے کی دکان والے سے پوچھا کہ کیا بات ہو گئی ہے؟ یہ دکان دار ہمارا واقف بن گیا تھا اور بمبئی کا رہنے والا تھا۔ اردو اچھی طرح سے بول لیتا تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ بابو رات کو بندرگاہ پر پاکستانی دہشت گردوں نے ہمارے دو جہازوں کو بموں سے اڑا دیا۔ کہتے ہیں دونوں جہازوں میں ہماری فوج کے لئے اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ ادھر بندرگاہ کی طرف تو کرفیو لگا ہوا ہے۔ کسی کو وہاں جانے اور وہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

شام کے اخباروں میں یہ خبر جلی سرخیوں کے ساتھ چھپ کر بازاروں میں آگئی۔ پانڈی چری میں دو تین اخبار انگریزی زبان میں بھی چھپتے تھے۔ ہم نے انگریزی کا ایک اخبار خرید لیا اور کمرے میں آکر اسے غور سے پڑھنے لگے۔ پہلے صفحے پر جہازوں کی تباہی کی خبر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ خبر میں لکھا تھا کہ بھارتی بحریہ کے دو جہاز جن میں بھارتی مقدار میں گولہ بارود اور فوجی سازو سامان لدا ہوا تھا کشمیری کمانڈو نے

سمندر میں غرق کر دیئے ہیں۔ جہازوں میں باری باری دھماکے ہوئے۔ جہازوں کے ٹکڑے اڑ گئے اور چند سیکنڈ میں دونوں جہاز سمندر میں ڈوب گئے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بھارتی بحریہ کے پندرہ جوان اور دونوں جہازوں کے عملے کے گیارہ آدمی اس حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا کہ فوج اور شہری پولیس نے شہر کی ناکہ بندی کر دی ہے۔ بندرگاہ کے سارے علاقے میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور پولیس کشمیری کمانڈوز کو گرفتار کرنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"اب تم کیا رائے دیتے ہو؟ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہئیے یا نہیں؟ میرا خیال ہے اگر ہم اس وقت سٹیشن پر چلے جاتے تو اس شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ اب معاملہ مشکل لگتا ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"کوئی مشکل نہیں ہے۔"

ہم چائے کی دکان کے کونے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے دبی آواز میں پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس کوئی گاہک نہیں بیٹھا تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اورنگ زیب سے کہا۔

"چلو کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں"

ہم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے۔ سرائے کی ڈیوڑھی میں سرائے کے مالک حاجی صاحب بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔

"تم نے کچھ سنا بھائی؟"

انہوں نے بڑی راز داری سے ہمیں اپنے پاس بلا کر کہا۔

"رات انڈیا کے دو جہاز کشمیری کمانڈو نے تباہ کر دیئے ہیں۔ بھائی جب تک بھارت مظلوم کشمیریوں کی آزادی کا حق دبا کر وہاں بیٹھا رہے گا اور کشمیریوں پر ظلم کرتا رہے گا اور پھر تو یہی کچھ ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"حاجی صاحب ہم نے ابھی ابھی یہ خبر سنی ہے افسوس ہوا ہے ہمیں تو۔ آخر ہمارے اپنے دیش ہی کا نقصان ہوا ہے"

حاجی صاحب چپ ہو گئے۔ دبی زبان میں صرف اتنا کہا۔

"لیکن ہماری حکومت کو بھی تو کچھ سوچنا چاہئے بھائی۔"

ہم ہوں ہاں کرتے اوپر اپنے کمرے میں آگئے۔ ہمارے پاس ہمارے کمانڈو ہونے کا ثبوت ایک ایک کمانڈو چاقو ہی تھا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

"کچھ پتہ نہیں آگے چل کر حالات کیا صورت اختیار کر لیں۔ اس لئے ہمیں کچھ باتیں ابھی سے طے کر لینی چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کل سے ہم یہاں اکٹھے نہیں رہیں گے۔ یا میں یہاں رہوں گا یا تم یہاں رہنا اور میں شہر کی کسی دوسری سرائے میں چلا جاؤں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب ہمیں موقع ملتے ہی الگ الگ اس شہر سے فرار ہونا ہو گا۔ تم ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ تم خفیہ پولیس والوں کو پہچان لینے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ تم اکیلے موقع محل دیکھ کر ریلوے سٹیشن پر جاؤ گے اور وہاں سے دلی اور دلی سے سری نگر پہنچنے کی کوشش کرو گے۔ میں اپنے طور پر اس شہر سے کسی نہ کسی طرح نکلوں گا اور واپس ناگ پور میجر شرت دیوان کے ہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میں ابھی کچھ دیر میجر شرت کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ وہ ملٹری انٹیلی جنیس کی ڈیفنس برانچ کا میجر ہے۔ حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں بھارت نے پاکستان پر بھرپور حملے کا ناپاک منصوبہ تیار کر لیا ہوا ہے۔ میں اس فوجی منصوبے کے مزید خفیہ راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ راز مجھے میجر شرت دیوان کے ساتھ رہ کر ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے اپنے کمانڈو چاقو کہیں پھینک دینے چاہئیں۔ اگر کسی جگہ ہماری تلاشی لی گئی یا ہماری چیکنگ ہوئی تو یہ چاقو ہمارا کمانڈو ہونا ثابت کر دیں گے تمہارا کیا خیال ہے؟"

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم ایسا ہی کریں گے میں اسی سرائے میں رہوں گا۔ تم کسی

دوسری سرائے میں چلے جانا۔ میں حالات کے معمول پر آتے ہی سری نگر کی طرف نکل جاؤں گا۔ تم ناگ پور چلے جانا۔ باقی کمانڈو چاقو ہم آج ہی کہیں غائب کر دیتے ہیں۔ ذرا شام ہو جانے دو۔ میں انہیں لے جا کر کسی نالے میں پھینک آؤں گا۔"

میں نے اپنا چاقو نکال کر کمانڈو اورنگ زیب کو دے دیا۔ اس نے اپنا چاقو بھی نکالا اور دونوں کو اخبار میں اچھی طرح سے لپیٹ کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ دوپہر کو ہم بازار میں کھانا کھانے گئے تو ہمیں فوج اور پولیس کی دو تین گاڑیاں چوک میں کھڑی نظر آئیں۔ کچھ فوجی بھی وہاں کھڑے تھے۔ ہم خاموشی سے اس چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے ہم اکثر کھانا کھایا کرتے تھے۔ یہ مدراسی ہوٹل تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور وہاں بیٹھے رہنے کی بجائے واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ آتی دفعہ ہم نے چوک کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ فوجی اور پولیس کی گاڑیاں ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

"کہیں فوج اور پولیس اس علاقے کی ناکہ بندی تو نہیں کر رہی؟"

میں نے کہا۔

"اس علاقے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ بھی نہیں۔ صرف یہی ایک سرائے ہے۔ پولیس اور فوج ویسے ہی اپنی سرگرمیاں دکھا رہی ہے۔"

ہم کمرے میں آکر چارپائیوں پر لیٹ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہونے لگا تو اورنگ زیب بولا۔

"میرا خیال ہے ہم چاقوؤں کو یہاں سے کہیں باہر لے جانے کی بجائے کیوں نہ پیچھے جو کوڑا کرکٹ والی گلی ہے وہاں پھینک دیں؟"

میں نے کہا۔

"چونکہ میرے جانے کے بعد تمہیں اسی سرائے میں رہنا ہے۔ اگر کوڑا اٹھانے والے نے چاقو دیکھ لئے تو تم پر کوئی آفت نازل ہو سکتی ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے یہاں سے دور کسی گندے نالے میں پھینک آؤ۔ اگر تمہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے تو

میں انہیں لے جا کر پھینک آتا ہوں۔"

کمانڈو اورنگ زیب نے بڑے پختہ عزم کے ساتھ کہا۔

"میں ہر خطرے سے نمٹنا جانتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی انہیں پھینک آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے چارپائی کے نیچے چاقوؤں والا بنڈل اٹھا کر بغل میں دبا لیا۔ میں نے کہا۔

"کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ شام کا اندھیرا ہو جانے دو"

وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم کنڈی لگا لو۔ میں ابھی گیا۔ ابھی آیا۔"

وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اٹھ کر کنڈی لگا دی۔ گلی کی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی اس میں سے جھانک کر دیکھا۔ اورنگ زیب بغل میں اخبار کا بنڈل دبائے سر جھکائے باہر نکلا اور گلی میں خاموشی سے شریفانہ چال چلتا چوک میں جا کر ایک طرف مڑ گیا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کل کمانڈو اورنگ زیب تو اسی سرائے میں رہے گا۔ میں شہر کی کسی دوسری سرائے میں چلا جاؤں گا۔ سرائے کے مالک حاجی صاحب سے کہہ دوں گا کہ میں ایک ضروری کام سے مدراس جا رہا ہوں۔ میرا ساتھی یہیں رہے گا۔ دو ایک دن میں میں بھی واپس آجاؤں گا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ خدا کا شکر ہے ہم نے بڑی کامیابی سے اپنے مشن کو انجام تک پہنچا دیا۔ اور یوں اس اسلحہ کو سمندر کی تہہ میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جو کشمیر کے محاذ پر اور پاکستان کے خلاف استعمال کیا جانے والا تھا۔ اب مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی لگی تھی کہ کسی طرح مجھے یہ فوجی راز معلوم ہو جائے کہ بھارت پاکستان پر کب حملہ کرنے والا ہے تاکہ میں اپنے پاکستانی بھائیوں کو خبردار کر دوں کہ دشمن فلاں تاریخ کو حملہ کر رہا ہے۔ یہ ٹاپ سیکرٹ فوجی راز تھا۔ عام طور پر اس کی خبر فوجی ہائی کمانڈ کے دو ایک ٹاپ رینک کے افسروں کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی۔ میرا نہیں خیال

تھا کہ ملٹری انٹیلی جنیس کے میجر شرت دیوان کو اس راز کا علم ہو۔ پھر بھی مجھے اگر کہیں کوئی سراغ مل سکتا تھا تو میجر شرت دیوان سے ہی مل سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بھارتی فوج کی ڈیفنس برانچ کی ملٹری انٹیلی جنیس کا آفیسر تھا۔ اسے ضرور معلوم ہو گا کہ بھارت نے کس مہینے کی کون سی تاریخ کو پاکستان پر حملہ کرنے کا پروگرام طے کیا ہے۔ یہ تو یقینی بات تھی اور میں نے خود اسے سیکرٹ فائل میں بھی دیکھ لیا تھا اور میجر شرت دیوان اور اس کے سکھ فوجی افسر کی زبان سے بھی سن لیا تھا کہ بھارت پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے والا ہے اور یہ حملہ پاکستان کی کئی ایک سرحدوں پر بیک وقت کیا جائے گا۔

جب سے یہ راز مجھے معلوم ہوا تھا۔ میرے اندر ایک بے چینی سی لگی ہوئی تھی۔ یہ میرے وطن پاکستان کی سلامتی کا سوال تھا۔ میں ہر قیمت پر اور ہر حالت میں اس ٹاپ سیکرٹ جارحانہ منصوبے کی تفصیلات اور خاص طور پر پاکستان پر حملے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتا تھا اور یہ معلومات مجھے میجر شرت دیوان کے پاس رہ کر ہی معلوم ہو سکتی تھیں یہی کچھ سوچتے سوچتے میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ میں نے سگریٹ نیچے فرش پر پھینک دیا۔ اس دوران نیچے گلی سے کسی نے چائے والے کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا۔ میرا دل چائے پینے کو چاہا۔ کمانڈو اورنگ زیب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا اتنی دیر کیوں نہ سامنے والے ہوٹل یعنی چائے کی دکان میں بیٹھ کر چائے پی جائے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا۔ کمرے کو باہر سے بند کیا۔ تالا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اب کمرے میں کوئی قابل اعتراض شے نہیں رہ گئی تھی۔ میں سیڑھیاں اتر کر سرائے کی ڈیوڑھی میں سے نکل کر جیسے ہی گلی میں آیا ایک بند گاڑی ایک دم سے سٹارٹ ہو کر چیختی ہوئی تیزی سے میرے آگے آکر رک گئی۔ اس سے پہلے میں سنبھلتا اور کچھ سوچ سکتا گاڑی میں سے چار فوجی جوان چھلانگیں لگا کر نکلے اور انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔

یہ سب کچھ ایک یا دو سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا۔ میرے ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی اور گن پوائنٹ پر یہ لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے گاڑی کے اندر لے گئے۔ چاروں فوجی بھی گاڑی کے اندر آگئے اور اس کے ساتھ ہی گاڑی جس کا انجن چل رہا تھا چل

بڑی۔ یہ فوجی گاڑی تھی۔ سٹیشن ویگن کی طرز کی تھی۔ اندر چھت کے ساتھ چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میری مخبری ہوئی ہے۔ مجھے فوراً اس مدراسی بھکاری کا خیال آگیا جو رات کے وقت ہمیں دو بار ملا تھا اور جس نے مجھ سے سگریٹ لئے تھے۔ وہ یقیناً پولیس کا مخبر تھا۔ میں نے دو باتوں کے لئے خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک تو یہ کہ کمانڈو اورنگ زیب اس وقت میرے ساتھ نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ میرے پاس کمانڈو چاقو نہیں تھا جسے میں ہمیشہ اپنی پتلون کے اندر چھپائے رکھتا تھا۔

میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک بات بالکل واضح تھی کہ ان لوگوں نے مجھے محض شک شبے کی بناء پر پکڑا ہے۔ مخبر نے انہیں خبر کر دی تھی کہ دو آدمی جو کسی دوسرے شہر کے رہنے والے ہیں سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور رات کو انہیں دو بار بندرگاہ کے علاقے سے آتے دیکھا گیا ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب مجھے فوجی گاڑی میں دھکیلا جا رہا تھا تو تین فوجی جوان سرائے کے اندر گھس گئے تھے۔ وہ یقیناً مخبر کی اطلاع کے مطابق کمانڈو اورنگ زیب کو پکڑنے اوپر گئے ہوں گے۔ مگر انہیں وہاں اورنگ زیب نہیں مل سکتا تھا اور کمرے میں میرے کشمیری کمانڈو یا دہشت گرد ہونے کا کوئی ثبوت بھی موجود نہیں تھا۔ اس اعتبار سے وہ مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انہی حقائق کی روشنی میں ایک کہانی دماغ میں بنالی کہ پوچھ گچھ کے وقت میں یہی کہانی بیان کروں گا۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ ملٹری انٹیلی جینس والے مجھے اپنے وحشیانہ تشدد کا نشانہ ضرور بنائیں گے۔ میں دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کمانڈو اورنگ زیب چاقو نالے میں پھینکنے کے بعد جلدی واپس نہ آجائے۔

میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے فوجیوں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔

"تم لوگوں نے مجھے کس لئے پکڑا ہے؟"

یہ چار فوجی تھے۔ ان کے پاس سٹین گنیں بھی تھیں۔ یہ معمولی قد کاٹھ کے مدراسی فوجی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے گردن سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور ہندوستانی میں مدراسی لہجے میں کہا کہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کیوں پکڑا گیا ہے۔ ابھی

تمہارا دوسرا ساتھی بھی پکڑا گیا ہو گا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو ایک فوجی نے زور سے اپنی کہنی میری پسلیوں میں ماری اور کہا۔

"بولے گا نہیں۔"

اور اس نے انگریزی میں مجھے گالی بھی دی۔ میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا۔ گاڑی خدا جانے کہاں کہاں سے گزرتی رہی شام گہری ہو گئی تھی۔ گاڑی کی اگلی کھڑکی میں سے فوجی ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا فوجی مجھے نظر آرہے تھے۔ باہر اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ گاڑی ایک گیٹ کے سامنے آکر آہستہ ہو گئی۔ میں نے کنکھیوں سے اگلی سیٹ کے شیشے میں سے دیکھا۔ گیٹ کے باہر ایک مسلح فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ یہ کوئی فوجی ہیڈ کوارٹر وغیرہ تھا۔ گاڑی گیٹ کے اندر جا کر ایک طرف رک گئی۔ مجھے کھینچ کر باہر نکالا گیا اور دو فوجی مجھے لے کر سامنے والی بارک کی طرف چلے۔ ایک بارک کے باہر فوجی گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے سلیوٹ مار کر سلاخوں والا دروازہ کھول دیا۔ یہ ظاہر ہے فوجی حوالات یعنی کوارٹر گارڈ تھی۔ مجھے اس میں بند کر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ جو فوجی مجھے لائے تھے وہ چلے گئے۔ باہر ایک کالے رنگ کا فوجی سٹین گن لئے پہرہ دے رہا تھا۔ میں حوالات کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ پوچھ گچھ کے وقت مجھے جو کہانی بیان کرنی تھی وہ میں نے شروع سے آخر تک سوچ لی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے وہاں سے نکال کر ایک دوسرے بارک کے کمرے میں لے جایا گیا۔

وہاں دیوار کے ساتھ ایک طرف تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک سٹریچر بھی بچھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اذیت گاہ ہے۔ ٹارچر سیل ہے۔ یہاں مجھ پر تشدد کیا جائے گا اور مجھے وہ راز معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی جو میں کبھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔ مجھے اس بات میں اپنی شکست محسوس ہو رہی تھی کہ میں اتنی آسانی سے پکڑ لیا گیا تھا۔ کمانڈو اتنی آسانی سے نہیں پکڑا جاتا۔ لیکن ہماری مخبری ہو گئی تھی اور جو بھکاری ہمیں رات کے وقت ملا تھا وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ اس نے ہماری اطلاع سول پولیس کو کر دی تھی اور سول پولیس نے ملٹری انٹیلی جینس کو اطلاع دے دی تھی۔ کیونکہ یہ کیس فوجی تھا۔ اور

یقیناً ملٹری انٹیلی جینس نے بھی شہری پولیس کو ہدایت کر دی ہو گی کہ کہیں کسی مشکوک شخص کی خبر ملے فوراً ہمیں اطلاع کی جائے۔

سٹریچر کے آگے ایک لکڑی کا سٹول پڑا تھا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ تین فوجی افسر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کیپٹن کی وردی میں تھا اور اس کا رنگ دوسرے فوجیوں کے مقابلے میں گورا تھا۔ وہ پنجابی یا شمالی بھارت کے کسی شہر کا لگتا تھا۔ دوسرے فوجی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کیپٹن کرسی کھینچ کر میرے سامنے لے آیا اور میری طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے بڑی صاف اردو میں کہا۔

"تم پاکستان کے کس شہر کے رہنے والے ہو؟ تمہارا رنگ روپ بتا رہا ہے کہ تم پنجابی ہو اور لاہور یا گوجرانوالہ کے ہو"

میں نے اس فوجی کیپٹن کی انٹیروگیشن کا جس طرح سے جواب دینا تھا وہ میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے بغیر کسی گھبراہٹ کے کہا۔

"سر! میں پنجابی ضرور ہوں اور مسلمان بھی ہوں۔ لیکن میرا تعلق پاکستان سے نہیں ہے میں مالیر کوٹلہ کا رہنے والا ہوں اور اپنے ایک دوست کے ساتھ یہاں روزگار کی تلاش میں آیا تھا"

فوجی کیپٹن نے آنکھیں سکیڑ رکھی تھیں اور ہونٹوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بولا۔

"ہندوستان آزاد ہونے کے بعد تو مشرقی پنجاب کے سارے مسلمان پاکستان چلے گئے تھے۔ تم مالیر کوٹلہ میں کیسے رہ گئے؟"

اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ اس فوجی کیپٹن کو معلوم نہیں کہ سکھوں نے مشرقی پنجاب کے تمام شہروں اور دیہات کے مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا یا انہیں پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر صرف مالیر کوٹلہ ایک ایسی ریاست تھی جہاں کے مسلمانوں کو کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اس کی وجہ ایک خاص تاریخی واقعہ تھا۔ جو میں پہلے کہیں بیان کر چکا ہوں۔ میں نے فوجی کیپٹن کو یہ تاریخی واقعہ بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا اور کہا کہ مالیر

کوٹلہ کے سارے پنجابی مسلمان محفوظ رہے تھے۔

"میرے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میں چچا کے ہاں رہ رہا تھا خراد کا تھوڑا بہت کام سیکھا تھا۔ مگر چچا مجھ سے نوکروں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ آخر میں نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ جنوبی بھارت چل کر کام تلاش کرتے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ جنوبی بھارت میں روزگار عام مل جاتا ہے"

فوجی کیپٹن مجھے مسلسل طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"تم سے کل باتیں ہوں گی۔"

اس نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی اور دوسرے فوجیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سلاخوں والا دروازہ بند کر کے باہر سے اسے تالا لگا دیا گیا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے کھانے کو تھوڑے سے چاول اور دال دی گئی۔ یہ دونوں چیزیں کیلے کے پتے پر ڈال کر سلاخوں میں سے مجھے اندر پکڑا دی گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یا تو اس شمالی بھارت کے فوجی کیپٹن نے میری بات کا یقین کر لیا ہے یا پھر یہ انتہائی عیار شخص ہے اور مجھے کشمیری کمانڈو ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی حتمی ثبوت موجود ہے۔

وہ رات گزر گئی۔

دوسرے دن مجھے چائے کا ایک گلاس اور ایک بند دیا گیا۔ دوپہر کو پھر تھوڑے سے چاول اور دال کیلے کے پتے پر ڈال کر سلاخوں کے نیچے سے مجھے پکڑا دی گئی۔ باہر ہر چار گھنٹے کے بعد گارڈ کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی اور پہلے فوجی کی جگہ دوسرا فوجی آجاتا تھا۔ دوپہر بھی گزر گئی۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کوئی نہ آیا۔ شام ہو گئی۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر سے اس فوجی گیریزن یا چھاؤنی جو کچھ بھی وہ جگہ تھی مجھے احاطے کی سامنے والی فوجی بارکیں نظر آرہی تھیں۔ فوجی گاڑیاں اور فوجی آتے جاتے رہتے تھے۔ شام کے وقت بارکوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ مجھ سے ابھی تک انٹیروگیشن کیوں نہیں کی گئی۔ جب رات ہو گئی تو وہی انڈین فوجی کیپٹن دو فوجی سپاہیوں کے ساتھ اندر آگیا۔ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگار نکال کر سلگایا۔ ایک سگار مجھے بھی پیش کیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ کہا۔

"میں سگار نہیں پیتا"

اس نے سگار کیس جیب میں رکھ لیا اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا اور میری طرف مسلسل گھورتے ہوئے بولا۔

"تو تم یہاں روزگار کی تلاش میں اپنے دوست کے ساتھ آئے تھے؟"

"جی ہاں سر!"

میں نے بڑے بھولے بھالے انداز میں جواب دیا۔ اس نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تم پانڈی چری میں کہاں کہاں پھرتے رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"دن کے وقت شہر میں گھوم پھر کر کام تلاش کرتے تھے ہم دونوں۔ مگر خراد کی دکان یہاں کہیں نظر نہ آئی۔ اب یہی سوچا تھا کہ کسی دوسرے شہر جا کر کام تلاش کرتے ہیں"

"تم بندرگاہ کی طرف تو کبھی نہیں گئے ہو گے؟"

فوجی کیپٹن نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"سر! ہم نے تو بندرگاہ دیکھی تک نہیں۔ ادھر جانے کی ہمیں کیا ضرورت تھی سر!"

فوجی کیپٹن نے ایک فوجی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گیا۔ دوسرے لمحے واپس آیا تو ایک بار تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے ساتھ وہی بوڑھا انگریز سیاح اور اس کی بیٹی الزبتھ تھی جو مجھے پانڈی چری کی ڈائیونگ کلب میں ملے تھے۔ دونوں باپ بیٹی اندر آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فوجی کیپٹن نے مجھ سے پوچھا۔

"ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ سوائے انکار کرنے کے میں کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔

فوجی کیپٹن نے بوڑھے انگریز سے ہندوستانی میں پوچھا۔

"کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

بوڑھے انگریز نے انگریزوں والی اردو بولتے ہوئے کہا۔

"میں اسے پہچانتا ہوں۔ یہی وہ نوجوان ہے جو ڈائیونگ کلب کے ریستوران میں مجھے اور میری بیٹی کو ملا تھا اور اس نے ہمارے ساتھ سمندر میں غوطہ خوری بھی کی تھی۔ یہ بڑا ماہر غوطہ خور ہے اور اس نے ہم سے آکسیجن ماسک کی ڈیوریشن کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ کیا کوئی ایسا آکسیجن ماسک بھی ہے جس کو پہن کر آدمی سمندر کے اندر زیادہ سے زیادہ دیر تک رہ سکے؟"

"پھر تم لوگوں نے اسے کیا بتایا تھا؟"

فوجی کیپٹن نے بوڑھے انگریز سے پوچھا۔

بوڑھے انگریز کی بیٹی الزبتھ نے اس کے جواب میں کہا۔

"میں نے خود اسے کلب کی الماری میں رکھے ہوئے وہ آکسیجن ماسک دکھائے تھے جن کی سمندر کے نیچے ڈیوریشن آدھ گھنٹہ ہوتی ہے"

فوجی کیپٹن نے الزبتھ سے پوچھا۔

"پھراس نے کیا کہا تھا؟"

الزبتھ بھی ہندوستانی میں بول رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"پھراس نے پوچھا تھا کیا کوئی فالتو آکسیجن سلنڈر بھی ہوتا ہے جو اس ماسک کے ساتھ لگا کر آدمی سمندر کے نیچے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزار سکتا ہے؟"

فوجی کیپٹن نے الزبتھ سے پوچھا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

الزبتھ کہنے لگی۔

"میں نے اسے فالتو آکسیجن سلنڈر دکھا کر کہا تھا کہ اگر غوطہ خور یہ سلنڈر بھی رکھ لے تو سمندر کے نیچے کافی دیر تک غوطہ خوری کر سکتا ہے؟"

فوجی کیپٹن نے بوڑھے انگریز سے سوال کیا۔

"اس کے بعد ڈائیونگ کلب سے جو آکسیجن ماسک اور آکسیجن سلنڈر رات کو ہو گئے تھے وہ کون کون سے تھے؟"

بوڑھے انگریز نے کہا۔

"کلب کے مالک کے بیان کے مطابق وہ آدھ گھنٹے ڈیوریشن والے آکسیجن ماسک دو گیس کے فالتو سلنڈر تھے"

فوجی کیپٹن نے ایک بار پھر الزبتھ اور بوڑھے انگریز سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہی وہ نوجوان تھا؟"

دونوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ میں ہی وہ نوجوان ہوں جو غوطہ خوری کے میں انہیں ملا تھا اور جس نے کلب کے آکسیجن ماسک کے بارے میں طرح طرح کے

گئے تھے اور یہ کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑنے اس کی سرائے والے چوک تک بھی

فوجی کیپٹن نے دونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اب آپ لوگ جا سکتے ہیں"

بوڑھا انگریز سیاح اور اس کی بیٹی اٹھ کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد فوجی کیپٹن سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے میری طرف جھک کر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ تم پاکستانی کمانڈو ہو اور تم نے ہی اپنے ساتھی سے مل کر ہمارے بحری جہازوں کے نیچے ٹائم بم لگا کر انہیں تباہ کیا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہ بالکل غلط بات ہے۔ اس انگریز اور اس کی بیٹی نے میرے بارے میں غلط بیانی کی ہے۔ میرا کسی پاکستانی کمانڈو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں کبھی کسی کلب میں نہیں گیا۔ میں تو معمولی مڈل جماعت پاس ہوں۔ روزگار کی تلاش میں یہاں در بدر پھرتا رہا ہوں آپ لوگ مجھے جان بوجھ کر پھنسا رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی فوجی کیپٹن نے میرے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ میرا چہرہ دوسری طرف ہو گیا اور ساتھ ہی مجھے اپنے ہونٹوں پر خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ یقین طرح میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ کیپٹن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے زور سے ٹھڈا میرے پیٹ میں مارا۔ میں سٹول پر سے گر پڑا۔ وہ مجھے مار رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو اس نے ایک فوجی سے انگریزی میں کہا۔

"اس کو ٹارچر سیل میں لے چلو"

میرا جسم اگرچہ کافی مضبوط تھا مگر اس فوجی کیپٹن کی بے تحاشا مار پیٹ سے میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ دو فوجی مجھے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ٹارچر سیل قریب ہی ایک تنگ سے نیم روشن کمرے میں بنایا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں دھکیل دیا دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ یہ دروازہ لوہے کا تھا اور سلاخ دار تھا۔ میں فرش پر اپنے جسم کی چوٹوں کو سہلانے لگا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی

چاہئے۔ ملٹری انٹیلی جینس پولیس نے ہمارے بارے میں سارے کوائف بالکل صحیح صحیح اکٹھے کر لئے تھے۔ جس رات بحری جہازوں کو غرق کیا گیا تھا اس سے ایک رات پہلے ڈائیونگ کلب میں سے دو آکسیجن ماسکوں اور فالتو گیس سلنڈروں کا چوری ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ چیزیں ان ہی کمانڈوز نے چرائی ہیں جنہوں نے بعد میں جہازوں کے پیندوں میں سمندر کے اندر غوطہ خوری کر کے ٹائم بم لگائے تھے۔ بحریہ کی انٹیلی جینس کو ڈوبے ہوئے جہازوں کے معائنے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جہازوں کے پیندوں میں بم لگا کر تباہ کیا گیا ہے اور کمانڈوز فولادی تار کاٹ کر جہازوں کے پاس آئے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی موقف اختیار کر سکتا تھا کہ بوڑھے انگریز اور اس کی بیٹی کو جان بوجھ کر گواہ بنایا گیا ہے اور ان سے غلط بیان میرے نام منسوب کیا گیا ہے۔ مگر یہ بڑا کمزور موقف تھا۔ اس کو رد کرنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ بس میں انکار ہی کر سکتا تھا کہ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ جیسا کہ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ بحریہ اور ملٹری کی انٹیلی جینس کو میرے بارے میں پورے ثبوت مل گئے تھے۔

ٹارچر سیل میں مجھ پر وحشیانہ تشدد شروع ہو گیا۔ جیسی جیسی اذیت مجھے دی جا سکتی تھی دی گئی۔ یہ ٹارچر مجھے اس بھارتی فوجی کیپٹن کی نگرانی میں دی جا رہی تھی۔ جب درد حد سے گزر جاتا تو کیپٹن میرے قریب ہو کر مجھ سے کہتا۔

”اگر اب بھی تم بتا دو کہ تمہارا دوسرا کمانڈو ساتھی کہاں ہے اور پانڈی چری میں تمہارے اور ساتھی کہاں کہاں روپوش ہیں تو تمہیں مزید کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ہم تمہیں ہسپتال میں بھجوا دیں گے اور پھر آزاد کر دیں گے۔“

یہ کام وہ زندگی میں کبھی بھول کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں ہر بار یہی کہتا۔

”میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ میرا کوئی کمانڈو ساتھی نہیں ہے۔“

وہ ساری رات مجھ پر شدید وحشیانہ تشدد ہوتا رہا۔ کبھی میری کمانڈو ٹریننگ مجھے تشدد کی اذیت سے کچھ دیر کے لئے نجات دلا دیتی اور کبھی تشدد کی تکلیف میری ٹریننگ کی حدود سے آگے گزر جاتی اور مجھ پر واقعی نیم بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ مجھ پر جس قسم کا

تشدد کیا گیا اور جیسی اذیت دی گئی میں ان کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ایک مردہ بے جان جسم اناٹمی کے ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا تھا اور وہ اس کی چیر پھاڑ کر رہے تھے۔ اگر کچھ خیال رکھا جا رہا تھا تو صرف اس بات کا کہ میں مر نہ جاؤں اور میری سانس کی آمد و رفت بحال رہے۔ یہ رعایت بھی مجھے اس لئے دی گئی تھی کہ وہ مجھ سے اپنے مطلب کی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے جس میں وہ ابھی تک ناکام رہے تھے۔

دوسرے روز مجھ پر کوئی تشدد نہ کیا گیا۔ مجھے اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں ڈال گیا جہاں ایک ڈاکٹر نے مجھے تھوڑی سی طبی امداد دی۔ میرے زخموں پر دوائی لگائی۔ مجھے دو انجکشن بھی دیئے جس کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ نیند کیا آئی تھی بس میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک سٹریچر پر لیٹا ہوا ہوں۔ چھوٹا سا تنگ کمرہ ہے۔ دروازہ سلاخوں والا ہے۔ اس کے باہر بھی ایک بڑا کمرہ ہے جس میں میز کرسیاں لگی ہیں۔ اس کی کھڑکیوں میں سے دن کی روشنی آ رہی ہے۔ بڑی میز پر وہی فوجی کیپٹن بیٹھا کسی سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ میرے والے چھوٹے کمرے کے ساتھ ہی کیپٹن کا بڑا کمرہ بنایا گیا تھا۔ یا کیپٹن کے بڑے آفس کے ساتھ یہ چھوٹی سی حوالات بنا دی گئی تھی۔ میں پوری طرح سے اب ہوش میں تھا۔ انجکشن اور طبی امداد کی وجہ سے میرا جسم کا درد کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ میں نے سٹریچر پر لیٹے لیٹے اپنے کان کیپٹن کی باتوں پر لگا دیئے۔ وہ انگریزی میں کسی سے کہہ رہا تھا۔

”تم لوگ بالکل نکمے ہو۔ تم اس لائق نہیں ہو کہ تمہیں ملٹری انٹیلی جینس میں رکھا جائے۔ جب پولیس اور فوج نے سارے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی ہے تو اس پاکستانی کمانڈو کا دوسرا ساتھی کیوں نہیں پکڑ سکے؟ وہ اتنی جلدی شہر سے کیسے بھاگ سکتا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ ملٹری انٹیلی جینس کی ڈیفنس برانچ کا سینئر آفیسر میجر شرت دیوان دو ایک روز میں خود یہاں معاملے کی تفتیش کے لئے پہنچ رہا ہے۔ میں اس کا کیا جواب دوں گا کہ دوسرا کمانڈو کیوں نہیں پکڑا گیا۔ وہ تو میرا کورٹ مارشل کرا دے گا۔“

میجر شرت دیوان کا نام سنتے ہی میرا سارا بدن ایک بار تو خوف کے مارے بالکل سن

سا ہو گیا۔ اگر وہ یہاں آگیا تو مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ بس ایک دھماکہ ہی ہو گا اور میرے سارے راز طشت از بام ہو جائیں گے۔ پاکستان اور کشمیر کے خلاف بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کے ناپاک منصوبوں کا ایک بھی راز مجھے معلوم نہ ہو سکے گا اور اس کے بعد میرے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کچھ نہیں ہو گا اور یہ لوگ میرا کورٹ مارشل کرنے کے بعد فوراً مجھے شوٹ کر دیں گے۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہیجان سا برپا ہو گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میجر شرت دیوان کے پانڈی چری پہنچنے سے پہلے پہلے کسی طرح میں یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں ؟ بظاہر یہ بات ناممکن لگتی تھی۔

میں نے دوبارہ اپنے کان بھارتی کیپٹن کی ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو پر لگا دیئے۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کو صرف کل کے دن کی مہلت دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ناگ پور سے میجر شرت دیوان پرسوں شام کو ہیڈ کوارٹر پہنچ جائے۔ اگر کل تک تم لوگوں نے دوسرے مفرور کمانڈو کو نہ پکڑا تو میں تم دونوں کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دوں گا۔"

اور اس نے ٹیلی فون بند کر دیا اور بڑبڑاتے ہوئے انگریزی میں گالیاں دینے لگا۔ ایک اور بات کا بھی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میں انڈیا کی ملٹری انٹیلی جنیس کی حراست میں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ ناگ پور سے میجر شرت خود پکڑے گئے کمانڈو سے پوچھ گچھ کرنے آرہا تھا۔ میری سمجھ میں وہاں سے فرار کی کوئی ترکیب نہیں آرہی تھی۔ دروازہ ہروقت مقفل رہتا تھا۔ ایک فوجی ہروقت دروازے کے باہر کھڑا رہتا تھا۔ اگر کسی طرح سے میں اس فوجی حوالات سے نکل بھی جاؤں تو آگے کیپٹن کا کمرہ تھا۔ اس کمرے کے باہر بھی گارڈ ہروقت ہوتی تھی۔ اس کے بعد ملٹری کے 'گیریزن' چھاؤنی یا ہیڈ کوارٹر کا علاقہ تھا جہاں سے میرے ایسے خطرناک کمانڈو کا فرار ہو جانا ناممکن تھا۔ لیکن میرا وہاں سے فرار ہونا انتہائی ضروری ہو گیا تھا۔ صرف میرے لئے ہی نہیں بلکہ کشمیر کی کاز اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر میرا وہاں سے فرار ضروری تھا۔ میں نے سٹریچر پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر

لیں اور سوچنے لگا کہ یہاں سے کس طرح فرار ہو سکتا ہوں۔

ان انڈین فوجیوں نے میری تلاشی لیتے وقت میرے پاس جتنے روپے تھے وہ نکال لئے تھے اور میری گھڑی بھی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اب میرے پاس سوائے تین کپڑوں یعنی پتلون قمیض اور پرانی جیکٹ کے اور کچھ نہیں تھا۔ اتنے میں فوجی کیپٹن میرے پاس آگیا۔ فوجی گارڈ نے جلدی سے کرسی لا کر میرے سٹریچر کے پاس رکھ دی۔ کیپٹن کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگار اس کے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔ اس نے مجھے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"آنکھیں کھولو"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں پہلے ہی نیم وا آنکھوں سے اسے وہاں آتا دیکھ رہا تھا۔ کیپٹن مجھے اعتماد میں لینے کے انداز میں کہنے لگا۔

"یاد رکھو۔ ہم نے تمہارے ساتھ ابھی تک بڑی نرمی کا سلوک کیا ہے لیکن ناگ پور سے جو ملٹری انٹیلی جنیس کا میجر آرہا ہے وہ بوچر یعنی قصائی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ تمہارا پیٹ پھاڑ ڈالے گا اور تمہارے پیٹ میں جتنے راز تم نے چھپائے ہوئے ہیں وہ سارے باہر نکال لے گا۔ اس لئے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہارا دوسرا مفرور ساتھی کہاں چھپا ہوا ہے اور بھارت میں تم لوگ کہاں کہاں پر یہ کام کر رہے ہو۔ میں تم سے ایک بار پھر وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری جان بچا لوں گا اور تمہیں یہاں سے برما کے شہر رنگون بھجوا دوں گا۔ وہاں سے تم بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان جا سکو گے"

میں نے کہا۔

"سر! میں بے گناہ ہوں۔ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے"

کیپٹن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو کہ تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی الگ کی جائے تو پھر میجر شرت اس کام میں ماہر ہے۔ کل نہیں تو پرسوں یہاں آجائے گا۔"

یہ کہہ کر کیپٹن میرے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں میز پر جا کر بیٹھ گیا اور
کرنے لگا۔ ڈیوٹی گارڈ نے میرے دروازے کو زور سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس
مطلب تھا کہ ناگ پور سے میجر شرت کل نہیں پرسوں وہاں پہنچ رہا تھا۔ جب میں اس
کا تصور کرتا جب میجر شرت مجھے اپنے سامنے ایک پاکستانی کمانڈو کے روپ میں دیکھے گا
میرے کانوں میں آندھیاں سی چلنا شروع ہو جاتیں۔ میجر شرت تو مجھے دھرم ویر کی حیثیت
سے جانتا تھا جس نے اس کی بہن کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالا تھا اور جو ہر وقت دیش
بھگتی کے راگ الاپتا رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس حیرت انگیز انکشاف کے بعد وہی
شرت دیوان جو مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا میری جان کا دشمن بن جائے گا اور مجھے
نہیں چھوڑے گا۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی۔ لیکن سب سے زیادہ صدمہ اس بات
کا تھا کہ میں دشمن کی قید میں مارا جاؤں گا اور ایک ایسا وسیلہ میرے ہاتھ سے ہمیشہ
لئے نکل جائے گا جس کی مدد سے میں بھارت کے پاکستان دشمن عزائم کے ٹاپ سیکرٹ
خفیہ رازوں سے واقف ہوتا رہتا تھا۔

اتنے میں دو فوجی ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے بھارتی کیپٹن کو
سلیوٹ کیا۔ بھارتی کیپٹن انہیں ساتھ لے کر میرے کمرے میں آگیا۔ دونوں فوجیوں
سے ایک سکھ تھا اور دوسرا گورکھا۔ انہوں نے میری نبض دیکھی۔ سکھ فوجی جو کیپٹن
رینک کا تھا کہنے لگا۔

"یہ اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اسے چیمبر فائیو میں پہنچا دو کیپٹن۔"

بھارتی کیپٹن نے کہا۔

"یس! میرا بھی یہی خیال تھا۔ ٹھیک ہے۔ میں اسے آج رات چیمبر فائیو میں
دوں گا۔"

سکھ کیپٹن کہنے لگا۔

"ناگ پور سے سپیشل برانچ انٹیلی جنس کے میجر شرت دیوان کا پیغام بھی آگیا۔
وہ پرسوں صبح کی گاڑی پر ناگ پور سے پانڈی چری پہنچ رہا ہے۔ وہ پورا بوچڑ ہے۔ وہ

پاکستانی کمانڈو سے سب کچھ معلوم کر لے گا۔ اتنی دیر تک چیمبر فائیو کا کیپٹن جوشی اس سے
انٹروگیٹ کرے گا۔"

پھر اس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"تم لوگوں نے ہماری نیوی کا اتنا بڑا نقصان کیا ہے کہ تم ایسے ایک ہزار کمانڈوز کو
پھانسی پر لٹکا دینے سے بھی یہ نقصان پورا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے دل میں کہا۔ اگر خدا نے میری زندگی لکھی ہے تو تمہیں اس سے بھی ہزار
گنا زیادہ تباہی کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا ہو گا۔ دونوں فوجی چلے گئے۔ کچھ وقت گزر
گیا۔ اس کے بعد مجھے ہتھکڑی لگا کر دو فوجی گارڈز کی نگرانی میں ایک عمارت کی دوسری
منزل کے ایک کمرے میں لے جا کر ڈال دیا گیا۔ یہاں فرش پر صرف ناریل کی چٹائی بچھی
ہوئی تھی۔ وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں مجھے ٹین کے ڈبے میں باسی سبزیوں کا شوربہ اور
باسی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے کھانے کو دیئے گئے۔ مٹی کے پیالے میں پانی پینے کو ملا۔ یہ
چیمبر فائیو تھا۔ دیوار کے ساتھ بلب جل رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ بھی حوالات کی طرح تھا
جس کا دروازہ لوہے کی سلاخوں والا تھا۔ دروازے کے آگے ایک تنگ سی راہ داری
تھی۔ یہاں کسی جانب ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی دروازے کے آگے پڑ رہی
تھی۔

یہ کوئی خاص قسم کا عقوبت خانہ تھا جہاں مجھ سے کسی کیپٹن جوشی نے پوچھ گچھ کرنی
تھی اور مجھ پر کوئی نئی قسم کا تشدد کرنا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کا تھا کہ پرسوں
صبح کسی وقت میجر شرت دیوان ناگ پور سے یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس کے آنے سے پہلے
پہلے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا لیکن فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جس عمارت
کی دوسری منزل کے تارچر چیمبر فائیو میں مجھے قید کیا گیا تھا اس کے پیچھے کوئی ریلوے لائن
تھی۔ وہاں سے کسی کسی وقت کوئی انجن ریل گاڑی کے ڈبوں کو لے کر شنٹ کرتا' سیٹی
بجاتا آہستہ آہستہ گزر جاتا تھا۔ اس کمرے میں نہ تو کوئی روشندان تھا اور نہ ہی کوئی کھڑکی
تھی۔

اتنے میں ایک کالے رنگ کا خوفناک چہرے والا آدمی جس نے کیپٹن کی وردی پہنی ہوئی تھی اور جس کے گال پر لمبا سا کسی زخم کا نشان تھا ہاتھ میں ایک بریف کیس لئے میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک سپاہی نے فوراً کرسی لا کر رکھ دی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سب سے پہلے میری نبض دیکھی۔ پھر بے رحمانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ تو تم نہیں بتاؤ گے کہ تمہارا ساتھی کمانڈو کہاں روپوش ہے اور انڈیا میں تم پاکستانی کمانڈوز کا ہائیڈ آؤٹ کہاں ہے؟"

میں نے بڑی بے زاری سے کہا۔

"میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ مجھے ناحق گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بحری جہازوں کی تباہی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے"

وہ بولا۔

"میرا نام کیپٹن جوشی ہے۔ میں کان پور کا رہنے والا ہوں۔ قیدی کی چمڑی اتارنے کا ماہر ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بریف کیس میں سے ایک لمبا نشتر نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

"اس نشتر سے پہلے تمہارے گال پر ایک لمبا کاٹ لگاؤں گا۔ پھر زخم کے اندر اپنی دو انگلیاں ڈال کر صرف ایک جھٹکا دوں گا اور تمہارے گال کی کھال الگ ہو جائے گی"

وہ مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔ نشتر اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیپٹن جوشی نے مجھے گردن سے دبوچ کر میرے گال پر نشتر چلا دیا۔ میری چیخ نکل گئی میں نے اپنی گردن اس کے شکنجے سے چھڑالی۔ کیپٹن جوشی نے چلا کر ڈیوٹی گارڈ پر موجود سپاہی کو آواز دی۔

لانس نائیک! اسے آکر پکڑو"

لانس نائیک جو دروازے کے باہر ڈیوٹی پر کھڑا تھا دوڑ کر اندر آگیا۔ اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ میری ہتھکڑی یہاں لاتے وقت اتار دی گئی تھی۔ بوچڑ کیپٹن جوشی نے

نشتر میری گال پر لگایا ہی تھا کہ ایک فوجی نے آکر سلیوٹ کیا اور اونچی آواز میں بولا۔

"سر! سوامی گورکھ ناتھ جی آئے ہیں"

کیپٹن جوشی کا نشتر والا ہاتھ وہیں رک گیا۔ وہ جلدی سے میرے ٹارچر چیمبر سے نکل کر راہ داری میں آگیا۔ اس دوران ایک اونچا لمبا سادھو نمودار ہوا جس کے لمبے بال تھے۔ ڈاڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ گلے میں منکوں کی مالائیں تھیں۔ ہاتھوں میں کڑے تھے۔ ماتھے پر سیندھور کا ٹیکا لگا تھا۔ وہ دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ کیپٹن جوشی نے جھک کر سادھو کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے بولا۔

"مہاراج! میرے دھن بھاگ کہ آپ میرے آفس میں پدھارے"

سادھو نے ایک نظر سلاخوں میں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"یہ ملیچھ پاکستانی جاسوس ہے کیا؟"

کیپٹن جوشی بولا۔

"جی مہاراج! ان لوگوں نے ہمارے دو جہاز برباد کر دیئے ہیں۔ ایک ہی پکڑا گیا ہے۔ دوسرے کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

سادھو نے جس کا نام سوامی گورکھ ناتھ تھا مجھے بہت برے لفظوں سے پکارا اور اندر آگیا۔ کیپٹن جوشی بھی اس کے ساتھ ہی اندر آگیا۔ سوامی گورکھ ناتھ نے جھک کر مجھے دیکھا۔ میرے گال سے خون رس رہا تھا۔ اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

"بتا دے تیرے دوسرے ملیچھ ساتھی کہاں ہیں۔ نہیں تو تیری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔"

پھر سوامی نے کیپٹن جوشی سے پوچھا۔

"ابھی تک اس نے اپنے ساتھیوں کا نام پتہ نہیں بتایا؟"

کیپٹن جوشی ہاتھ باندھے پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! ابھی بتا دے گا۔ میں نے اپنا آپریشن ابھی شروع نہیں کیا۔"

سوامی گورکھ ناتھ نے اپنا ہاتھ آگے کر کے کیپٹن جوشی کے سر پر رکھا اور کہا۔

"بالک! ہم گورو گورکھ ناتھ کا ایک منتر پڑھ کر اس ملیچھ پر پھونکیں گے اس منتر کے
ثر سے یہ فوراً اپنے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دے گا۔"

کیپٹن جوشی خوش ہو کر بولا۔

"مہاراج! آپ منتر پڑھ کر ضرور پھونکیں۔ مجھے پورا وشواش ہے کہ آپ کے منتر
سے ہمیں اپنا مقصد حاصل ہو جائے گا۔"

سوامی وہیں فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے بازو بلند کیا اور نعرہ لگایا۔

"اولکھ نرنجن!"

اس کے بعد کیپٹن جوشی سے کہا۔

"بچہ! تم ہمارے خاص بالکے ہو۔"

کیپٹن جوشی بولا۔

"مہاراج! یہ آپ کی کرپا ہے۔"

سوامی نے کہا۔

"فوراً جاؤ اور اپنے ہاتھ سے چائے کا ایک گلاس بنا کر لاؤ۔ ہم اس چائے پر منتر
پڑھیں گے اور وہ چائے اس ملیچھ کو پلا دیں گے۔ پھر دیکھنا یہ کیسے بولتا ہے۔"

کیپٹن جوشی نے کہا۔

"ابھی لاتا ہوں مہاراج!"

سوامی نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھنا۔ چائے خود بنانا۔ کسی دوسرے سے نہ بنوانا۔ نہیں تو منتر کا اثر جاتا رہے
گا۔"

کیپٹن جوشی بولا۔

"مہاراج! میں خود بنا کر لاؤں گا۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں"

یہ کہہ کر وہ اس چیمبر فائیو سے باہر چلا گیا۔ ڈیوٹی گارڈ نے دروازہ بند کر دیا او
چوکس ہو کر پہرہ دینے لگا۔ سوامی گورکھ ناتھ مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ

جاہل سادھو مجھ پر کیا منتر پھونکے گا۔ میرے دل پر اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کا
نام لکھا ہوا ہے۔ اس کا منتر سارے کا سارا بھسم ہو کر رہ جائے گا۔ مجھے صرف یہ خوشی
تھی کہ میں کچھ دیر کے لئے انتہائی درندہ صفت اذیت سے بچ گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ
کوئی فراڈ یا سادھو تھا جس نے بھارت کے فوجی کیپٹن کو الو بنا رکھا تھا۔ سوامی گورکھ ناتھ
نے اپنے چھوٹے سے کھدر کے تھیلے کو جو اس کی بغل میں لٹک رہا تھا کھولا اور ایک نظر
دروازے کے باہر کھڑے فوجی کی طرف دیکھا۔ پھر تھیلے میں سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی
شے بڑی تیزی سے نکالی اور اسے میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"اسے فوراً کہیں چھپا لو"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ سادھو کیا کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوامی گورکھ
ناتھ نے انتہائی درشت مگر دبی آواز میں کہا۔

"آدمی ہو کہ جانور؟ اسے چھپا لو۔ جلدی"

میں نے رومال میں لپٹی ہوئی شے جلدی سے اپنی پتلون کی جیب میں چھپا لی۔ اسے
پکڑتے ہوئے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ایک چھوٹا پستول ہے۔ صورت حال ایک دم
تبدیل ہو گئی تھی۔ سوامی گورکھ ناتھ اونچی آواز میں منتر پڑھنے لگا۔ ایک بار منتر پڑھ کر
اس نے میرے قریب آکر میرے سر پر پھونک ماری اور آہستہ سے کہا۔

"اس میں ایک خط بھی ہے۔ اسے پڑھ لینا۔"

اور وہ منتر پڑھنے لگ گیا۔ دروازے کے باہر جو انڈین لانس نائیک ڈیوٹی پر کھڑا تھا
اس کا منہ سامنے کی طرف تھا۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ اتنے میں کیپٹن جوشی
چائے کا پیالہ ہاتھ میں لئے آگیا۔ سوامی جی نے خوش ہو کر کہا۔

"شاباش! لا پیالی ادھر لا کر رکھ دے۔ بس سمجھ لے کہ تیرا کام ہو گیا جوشی۔"

کیپٹن جوشی سوامی جی کے آگے چائے کی پیالی رکھ کر وہیں بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔
سوامی گورکھ ناتھ بڑے لمبے لمبے منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔ جب اس نے منتر پڑھنا ختم کئے
تو چائے کی پیالی میں پھونک مار کر کیپٹن جوشی کو حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"اب یہ چائے اس ملیچھ کو پلا دے۔ اگر یہ نہ پئے تو اسے زبردستی پلا دے"

اس کے ساتھ ہی سوامی جی نے مجھے آنکھ سے ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ کیپٹن جوشی نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی اور کرخت آواز میں کہا۔

"یہ میرے گورو جی کی خاص چائے ہے۔ اگر تو نے اسے نہ پیا تو میں تیری آنکھیں نکال دوں گا۔"

میں نے ذرا سے ہچکچانے کی اداکاری کی اور پھر سوامی جی کا اشارہ پا کر آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ کیپٹن جوشی بڑا خوش ہوا سوامی جی نے مسکرا کر کہا۔

"جوشی جی! دیکھا ہمارے گورو گورکھ ناتھ کے منتر کا اثر؟ یہ چائے پینے کے بعد کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو جائے گا۔ ہم اسے یہاں اکیلا چھوڑ دیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہم باہر راہداری میں ایک طرف کھڑے ہو کر پانچ منٹ انتظار کریں گے۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اسے ہوش آجائے گا۔ پھر جب تم اس سے پوچھو گے تو یہ اپنے سارے کمانڈو ساتھیوں کے نام اور پتے بتا دے گا"

"دھن ہو مہاراج"

وہ دونوں میرے کمرے سے چلے گئے۔ سوامی جی نے کہا۔

"ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی کو بھی تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے ہٹا دو"

ڈیوٹی پر کھڑا سپاہی بھی کیپٹن جوشی کے حکم سے ان کے ساتھ ہی ایک طرف کو چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سوامی جی کا اس ڈرامے سے کیا مقصد ہے۔ وہ یقیناً مجھے خط پڑھنے کا موقع دینا چاہتے تھے جو پستول والے بنڈل میں ساتھ ہی تھا۔ ان کے جاتے ہی میں نے جیب سے کپڑے میں لپٹا ہوا بنڈل نکال کر کھولا۔ یہ ایک بڑا ماڈرن قسم کا چھوٹا سا پستول تھا جس کے آگے چھوٹا سا سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ ساتھ ایک کاغذ تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ کھول کر پڑھا۔ اس پر اردو کی عبارت میں لکھا تھا۔

"اس پستول کی مدد سے اگر تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو اس کاغذ کی پشت پر جو ایڈریس لکھا ہے وہاں پہنچ کر گنگو نام کے بیرے سے مل لینا۔ کوڈ ورڈ ہے

سیتا رام ہے۔ اگر پکڑے گئے تو پستول غائب کر کے اس خط کو منہ میں ڈال کر نگل جانا۔"

میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رقعے کی گولی سی بنا کر اسے پتلون کی جیب میں ڈال لی اور پستول دوسری جیب میں چھپا لیا۔ مگر میں پریشان بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ پستول زیادہ دیر تک چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ کیپٹن جوشی واپس آتے ہی جب مجھ پر تشدد شروع کرے گا تو یقینی طور پر پستول اسے نظر آجائے گا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سوامی گورکھ ناتھ کے روپ میں ہمارے آدمی نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہوا تھا۔

باہر سے جے گورکھ ناتھ کا نعرہ بلند ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے اشارہ دیا گیا تھا کہ ہم آرہے ہیں۔ اس کے بعد سوامی جی کیپٹن جوشی کے ساتھ کمرے میں آگئے۔ میں اس دوران جلدی سے زمین پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے خود پر مصنوعی بے ہوشی طاری کر لی تھی۔ سوامی جی نے آتے ہی کیپٹن جوشی سے کہا۔

"ملیچھ بے ہوش ہے۔ ابھی اسے ہوش میں لاتا ہوں۔ پھر دیکھنا کیسے فر فر بولتا ہے۔"

اس نے کوئی منتر پڑھ کر میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیپٹن جوشی نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بتا تیرے دوسرے کمانڈو ساتھی کہاں کہاں پر ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں؟"

میں نے یونہی سوچے سمجھے بغیر ایک چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے زمین پر پڑ گیا۔ سوامی جی نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں نے ٹھیک کیا تھا۔ سوامی جی نے مجھ پر منتر پڑھ کر پھونکنے شروع کر دیئے۔ جب دیر تک وہ منتر پڑھتے رہے اور میں بے ہوش ہی رہا تو انہوں نے کیپٹن جوشی سے کہا۔

"بالکے! منتر ضرورت سے زیادہ چڑھ گیا ہے۔ یہ ابھی ہوش میں نہیں آئے گا۔ ابھی اسے پڑا رہنے دو۔ صبح آکر اس سے تمام راز معلوم کریں گے۔ صبح تک اسے ہوش آگیا ہو گا۔"

"جو حکم مہاراج"

کیپٹن جوشی نے ہاتھ باندھ کر کہا اور سوامی جی کے ساتھ ہی کمرے یعنی چیمبر فائیو سے

باہر نکل گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ ہندو قوم سر سے پاؤں تک تواہمات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان کے پڑھے لکھے لوگ بھی اس معاملے میں انتہائی ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں اور سادھو جوگی سنیاسی لوگ انہیں خوب الو بناتے ہیں۔ کیونکہ سادھوؤں کی ہندو لوگ صرف عزت ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر کسی جوگی یا سادھو نے انہیں بد دعا دے دی تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر لیٹے لیٹے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے باہر لانس نائیک پہرے پر کھڑا تھا۔ کبھی وہ ٹہلنے لگتا اور کبھی مجھے ایک نظر دیکھ کر میری طرف پشت کر کے سلاخوں والے دروازے کے آگے کھڑا ہو جاتا۔ سوامی گورکھ ناتھ ہمارا کوئی خاص آدمی تھا جو سادھو کے روپ میں جنوبی ہند میں کام کر رہا تھا۔ اس نے خط میں جو کچھ مختصر سا لکھ دیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ میں آج رات کو ہی وہاں سے فرار ہونے کی پوری کوشش کروں۔ اس نے مجھے پستول اس مقصد کے لئے دیا تھا۔ یہ گویا ایک طرح سے خدا کی مدد تھی جو اپنے آدمی کی شکل میں مجھے پہنچی تھی۔ ایک دن چھوڑ کر میجر شرت دیوان مجھ سے انٹروگیشن کرنے کے لئے آرہا تھا۔ میرا وہاں سے فرار ہونا بہت ضروری تھا۔

میں نے اب پہرے پر کھڑے لانس نائیک کو اس نگاہ سے دیکھا کہ میں اسے کس طرح قابو کر سکتا ہوں۔ اس فوجی پر قابو پانا بہت ضروری تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ باہر سے اندر جاتے ہوئے جب اس نے سلاخوں والے دروازے کو تالا لگایا تھا تو اس چابی سے لگایا تھا جو اس کی بیلٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے اس بھارتی لانس نائیک پر صرف قابو ہی نہیں پانا تھا بلکہ اس کو اس طرح سے قریب لانا تھا کہ اس کی بیلٹ میں سے چابی نکال کر میں دروازے کے باہر لگا ہوا تالا کھول سکوں۔ بظاہر یہ بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن اس وقت میں ٹارچر کی ساری اذیت بھول کر سر سے پاؤں تک کمانڈو بن چکا تھا۔ میرے اندر شیر کی دلیری اور لومڑی کی عیاری بیدار ہو چکی تھی۔ میں نے فوراً ایک حکمت عملی اپنے ذہن میں تیار کر لی۔ سب سے پہلے میں ہمہ تن گوش ہو گیا کہ باہر سے کوئی آوازیں وغیرہ تو

نہیں آرہیں۔ باہر راہ داری میں اور نیچے احاطے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات ابھی آدھی نہیں گزری تھی۔ لیکن میں مزید انتظار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے قدرت نے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب مجھے اس سنہری موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ اگر یہ موقع میں نے ہاتھ سے گنوا دیا تو پھر میری موت یقینی ہے اور میں دشمن کی قید میں نہیں مرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کراہنا شروع کر دیا۔

میرے کراہنے کی آواز پر لانس نائیک نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"مجھے پانی لاؤ۔ پانی پلاؤ۔ میں مر رہا ہوں۔ پانی۔ پانی۔"

لانس نائیک یہ دیکھ چکا تھا کہ مجھ پر سوامی جی نے بڑے منتر پھونکے ہیں۔ سوامی جی اور کیپٹن جوشی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ اسے بھی سن چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھ سے کیپٹن صاحب نے بڑے قیمتی راز معلوم کرنے ہیں اور مجھے ہر حالت میں زندہ رکھنا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"لاتا ہوں پانی"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ کر راہ داری میں ایک طرف چلا گیا۔ میں نے اس کے قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ چھ قدم چلا گیا۔ وہاں پانی کی کوئی بالٹی وغیرہ رکھی ہوئی ہو گی۔ جب واپس آتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز آنے لگی تو میں اٹھ کر دروازے کی سلاخوں کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ لانس نائیک ٹین کے ڈونگے میں میرے لئے پانی لے کر آیا تھا۔ مجھے سلاخوں کے پاس کھڑے دیکھ کر بولا۔

"پیچھے ہٹو۔ پیچھے ہٹو"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن میں نے ایسا زاویہ بنا لیا تھا کہ جہاں سے کمانڈو ایکشن میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اب سارا کام پھرتی کا تھا۔ لومڑی کی عیاری سے میں نے کام لیا تھا۔ اب چیتے کی تیزی اور پھرتی کی ضرورت تھی۔ سارا کام ایک سیکنڈ کا تھا۔

اس ایک سیکنڈ میں اگر میرا وار پڑ گیا تو بیڑا پار نہیں پڑا تو میری موت سامنے کھڑی تھی۔
بھارتی لانس نائیک نے ڈونگے والا ہاتھ سلاخوں کے اندر سے میری طرف بڑھایا
اس کے ساتھ ہی ایک بجلی چمکی۔ اس بجلی میں کڑک بالکل نہیں تھی۔ صرف آنکھوں کو
چندھیا دینے والی چمک تھی۔ مجھے یقین ہے بھارتی لانس نائیک کو یہی محسوس ہوا ہو گا
جیسے اس کے سامنے ایک بجلی سی چمک گئی ہے۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا۔
میں نے اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اتنی زور سے اندر کی طرف کھینچ کر جھٹکا
دیا کہ اس کا ماتھا لوہے کی سلاخوں کے ساتھ زور سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑا
نہیں تھا۔ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے لمحے میرا ایک بازو سلاخوں سے باہر جا کر اس
کی گردن کے گرد لوہے کے شکنجے کی طرح جکڑا گیا۔ گردن کو جکڑنے کے ساتھ ہی میں نے
اس کی گردن کو دوسرا جھٹکا دیا۔ وہ کوئی اتنا طاقتور فوجی بھی نہیں تھا۔ جنوبی بھارت کے
فوجی بھی دبلے پتلے مریل سے ہوتے ہیں۔ اس کے لئے میرا ایک جھٹکا بہت تھا۔ اس کی
گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ میں نے فوراً اس کی بیلٹ میں لٹکی ہوئی چابی کو زنجیر
پکڑ کر زور سے کھینچا۔ زنجیر ٹوٹ گئی اور چابی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے بڑے آرام
سے لانس نائیک کے بے حس جسم کو نیچے فرش پر ڈال دیا اور ہاتھ باہر نکال کر تالے
چابی لگائی تالا کھل گیا۔

ساتھ ہی میری خوش قسمتی کا دروازہ بھی کھل گیا۔
میں نے جیب سے پستول نکال کر مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اب مجھے
صرف اتنا احساس تھا کہ اس عمارت کے پیچھے کوئی ریلوے لائن ہے جہاں سے دن کے
وقت اور رات کے وقت بھی کبھی کبھی شنٹ کرتے ریل کے ڈبے گزرا کرتے ہیں۔ ادھر
طرف سے کبھی کوئی ریل گاڑی شور مچاتی نہیں گزری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس
طرف کوئی کارخانہ تھا جس کے احاطے کے اندر تک ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ ہو سکتا
تھا یہ ریلوے کا ہی کوئی کارخانہ ہو۔ مجھے اسی جانب اتر کر فرار ہونا تھا۔ میں دبے پاؤں
داری میں آ گیا۔ راہ داری میں ایک بلب دیوار کے ساتھ روشن تھا۔ اس کی روشنی زرد رنگ

دور تک نہیں جاتی تھی۔ میں اس طرف جھک کر چلنے لگا جدھر سے مجھے ریلوے انجن کے
شنٹ کرنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔
راہ داری آگے بند ہو گئی۔ یہاں تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ میں نے بائیں جانب
گردن ذرا سی اٹھا کر دیکھا۔ یہ فوجی کیمپ یا رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر کا احاطہ تھا۔ احاطے میں
تین چار فوجی گاڑیاں ایک جانب دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ٹین کی چھت کے آگے
کھمبے پر بلب جل رہا تھا۔ یہاں ایک جیپ کھڑی تھی۔ کچھ دور مجھے ایک فوجی پہرہ دیتا
دکھائی دیا۔ میں جلدی سے نیچے ہو گیا اور دیوار پر سے سر نکال کر دوسری طرف جھانک کر
دیکھا۔ ایک منزل نیچے مجھے دور جلتے کسی بلب کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں نظر آئیں۔
میں دوسری منزل پر تھا۔ نیچے چھلانگ لگانے سے آواز بھی پیدا ہوتی اور میں ریلوے
لائنوں پر گر کر زخمی بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے جھک کر دیوار کو دور تک دیکھا۔ مجھ سے چند
گز کے فاصلے پر چھت کے پرنالے کا لوہے کا پائپ دیوار کے ساتھ نیچے تک گیا ہوا تھا۔
میرے وہاں سے نکلنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں
نے اللہ کا نام لیا اور سانپ کی طرح رینگتے ہوئے اپنے آپ کو راہ داری کی دیوار کی
دوسری طرف لے آیا۔ میں نے پاؤں باہر کو نکلی ہوئی اینٹوں پر جما کر دیوار کی منڈھیر کو
ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔

دوسرے ہاتھ کو میں نے آگے بڑھایا۔ پائپ ابھی ایک دو گز آگے تھا۔ میں کوشش کر
کے کھسکتا ہوا کچھ اور آگے ہو گیا۔ میرا ہاتھ پرنالے کے پائپ پر پڑ گیا۔ میں نے ایک ہاتھ
سے دیوار کی منڈھیر کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے پرنالے کے پائپ کو
پکڑا اور اپنا بایاں پاؤں آگے کر کے پائپ کے گرد لگے ہوئے لوہے کے رنگ پر ٹکا دیا۔
اس کے ساتھ ہی میں نے دیوار والا ہاتھ چھوڑ کر جلدی سے پائپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ
لیا۔ اب میرا دایاں پاؤں پائپ کے رنگ پر تھا اور میں چھپکلی کی طرح پائپ کے ساتھ چمٹا
ہوا تھا۔ وہاں زیادہ دیر تک چمٹے رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے دونوں پاؤں لوہے
کے رنگ پر سے ہٹا لئے اور اوپر والے ہاتھوں سے پائپ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ نیچے کھسکنا

شروع کر دیا۔ میں ایک منزل نیچے کھسک گیا۔ دوسری یعنی نیچے والی منزل کے درمیان
پہنچ کر میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ میں نیچے ریلوے لائن کے پاس دیوار کے ساتھ اگی
جھاڑی پر گرا۔

گرنے کے ساتھ ہی میں وہیں سمٹ کر بیٹھا رہا۔ میرے کان خرگوش کے کان بن
تھے۔ میں کارخانے کی طرف سے آتی ایک آواز کو سن رہا تھا۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے
کسی بند جگہ پر کوئی کسی شے کو ہتھوڑے سے کوٹ رہا ہو۔ میں نے جھاڑیوں میں سے
باہر نکال کر دائیں اور بائیں طرف دیکھا۔ دائیں طرف ریل کی تین پٹڑیاں کسی کا
کے اندر چلی گئی تھیں۔ وہاں کھمبے پر بلب روشن تھا۔ بائیں جانب ریل کی پٹڑیاں
علاقے میں جاتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ضرور اس طرف یا تو ریلوے کا کوئی چھوٹا سا
سٹیشن تھا یا پھر مال لادنے اور اتارنے والے پلیٹ فارم تھے۔ میں جلدی سے ا
ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بائیں جانب تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ ریل کی پٹڑ
پہلو میں جگہ تھوڑی سی تھی۔ اس پر جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں زیادہ تیز
چل سکتا تھا۔ مگر میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ آگے جا کر ر
لائنوں کا جال پھیلنا شروع ہو گیا۔ دور ادھر ادھر ریلوے شیڈ کی چھتوں پر روشنیاں بھ
نظر آنے لگیں۔ میں ان سے بچتا ریلوے لائنوں کے اوپر سے گزر کر مشرق کی جا
دیوار تھی اس طرف آ گیا۔ اس دیوار کے اوپر اندھیرے میں کہیں کہیں روشنی ہ
تھی۔ اس روشنی میں مجھے دیوار کے اوپر خاردار تار لگی نظر آئی۔ دیوار دور تک
تھی۔ سامنے سے ایک انجن شنٹ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے آگے کی دو بتیاں
تھیں۔ میں جلدی سے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ انجن بھاپ چھوڑتا چھک چ
مجھ سے تھوڑے فاصلے پر سے گزر گیا۔ اس کے جاتے ہی میں اٹھا اور دیوار کے
ساتھ چلنے لگا۔ مجھے صرف یہی ایک ڈر تھا کہ کہیں میں کسی فوجی شیڈ میں نہ نکل
پستول میں نے جیب میں ہی رکھا ہوا تھا۔ میرے گال پر کیپٹن جوشی نے نشتر سے جو
لگایا تھا وہاں زخم میں سے خون بہنا تو بند ہو چکا تھا مگر گال درد کر رہا تھا۔

میں اب تیز چلنے کی بجائے نارمل چال چلنے لگا تھا کہیں اندھیرا آجاتا اور کہیں میں
دیوار کے اوپر جلنے والے بلب کی روشنی میں آجاتا۔ روشنی آتی تو میں جھک کر تیزی سے
آگے نکل جاتا۔ دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ
دکھا دے۔ آگے ایک اونچا سگنل کیبن آگیا۔ اس میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے
ایک دو آدمیوں کے سائے سے بھی نظر آئے۔ میں رک گیا۔ مجھے اس کیبن کے قریب
سے گزرنا تھا اور وہاں روشنی تھی۔ دو تین سیکنڈ رک کر سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں
زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے جلدی سے جلدی اس علاقے سے نکل جانا چاہئے
تھا۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ انجان بن کر خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ اوپر سے کسی نے دیکھ
بھی لیا تو میرے پھٹے پرانے کپڑوں سے وہ یہی سمجھے گا کہ میں ریلوے کا کوئی مزدور ہوں۔
میں چل پڑا۔ چھ سات قدم چلا ہوں گا کہ دیوار میں ایک جگہ چھوٹا سا دروازہ نظر پڑا۔ یہ
کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دیوار میں شگاف ڈال کر آنے جانے کے لئے راستہ بنا لیا گیا تھا۔
میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور شگاف میں سے گزر کر دیوار کی دوسری طرف نکل آیا۔

میں نے دیکھا کہ میں ایک پتلی سی کچی سڑک پر ہوں جس کی ایک جانب ٹین کی
ڈھلواں چھتوں والی چھوٹی چھوٹی کوارٹر نما کوٹھیاں بالکل ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں ان میں
کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کچا راستہ خالی تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ مجھے
محسوس ہو گیا تھا کہ میں ریلوے کی حدود سے باہر نکل آیا ہوں۔ کوارٹروں کی دوسری
جانب سے کبھی کبھی کسی ٹرک کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد
ان کوارٹر نما کوٹھیوں کے درمیان سے ایک تنگ راستہ نظر پڑا جو یقیناً دوسری طرف والی
سڑک کو جاتا تھا۔ میں اس راستے میں سے گزرنے لگا۔ یہاں اندھیرا تھا اور کوٹھیوں کے
پہلو کی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ یہ راستہ ختم ہوا تو سامنے بڑی سڑک تھی۔ سڑک کی
بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک بس سٹاپ کا کھوکھا خالی پڑا تھا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں
شہر کے کس علاقے کی طرف نکل آیا ہوں۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پانڈی چری کا ساحل
سمندر شہر کے مشرق کی جانب ہے۔ اس طرف جانا موت کے منہ میں جانا تھا۔ میں نے

آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے۔ ان کے درمیان ستارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے مغرب کی طرف رخ کیا اور سڑک پار کر کے دوسری طرف آکر سمندر کے الٹے رخ چل پڑا۔

دو تین بھاری ٹرک ایک دوسرے کے پیچھے سڑک پر سے گزر گئے۔ یہ شہر پانڈی چری کی کوئی بڑی شاہراہ معلوم ہوتی تھی جو کسی دوسرے شہر کو جاتی تھی۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ میری قمیض اور پتلون بوسیدہ ہو رہی تھی۔ قمیض پر خون کے دھبے بھی کہیں کہیں جمے ہوئے تھے۔ میرے بائیں رخسار پر زخم کا لمبا نشان تھا۔ جیب مں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ رات کا کیا بجا ہے۔ رات کتنی گزر چکی ہے۔ سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑیاں گزر جاتی تھیں۔ جب ایک بس بھی گزری جس کی چھت پر بھی مسافر بیٹھے تھے۔ یہ دیہاتی کسان معلوم ہو رہے تھے۔ سڑک پر دونوں طرف بتیاں جل رہی تھیں۔ ان گاڑیوں سے اندازہ ہوا کہ رات ابھی زیادہ نہیں گزری۔ مجھے بہت جلد کسی جگہ چھپ جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ فوجی ٹارچر چیمبر فائیو سے میرے فرار کا کسی وقت بھی راز فاش ہو سکتا تھا اور اس کے بعد شہری پولیس اور فوجی پولیس کو میری تلاش میں نکل پڑنا تھا۔ مجھے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے پتلون کی جیب سے کاغذ کی وہ گولی نکالی جسے میں نے ٹارچر سیل میں ہی جیب میں ڈال لیا تھا جو مجھے سوامی جی نے دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس پر وہ پتہ لکھا ہوا ہے جہاں پہنچ کر تم نے گنگو نام کے بیرے سے ملنا ہے اور اس کے واسطے کوڈ ورڈ سوامی جی نے جے جے سیتا رام بتایا تھا۔ میں نے ایک جگہ سڑک پر روشنی میں کھڑے ہو کر کاغذ کی گولی کو کھول کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا

"جے بھارتی بنڈار

رمیہ جی سٹریٹ۔ گول کر۔

پانڈی چری"

اس کے نیچے گنگو بیرا لکھا تھا۔ میں نے کاغذ دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ میری پتلون کی

پچھلی جیب میں سوامی جی کا دیا ہوا چھوٹا پستول اسی طرح پڑا تھا۔ اسے چلانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ اس میں میگزین بھرا ہوا تھا۔ میرے فرار کا علم ہو جانے کے بعد کسی بھی چوک یا ناکے پر پولیس تلاشی کے دوران یہ پستول میرے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ میں اسے پھینکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ مجھے کسی ناگہانی آفت سے نجات بھی دلا سکتا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا شہر میں گول کر کا علاقہ کون سا ہے۔ کیونکہ اسی علاقے میں کوئی جے بھارتی بھنڈار تھا جو یقیناً کوئی ریستوران تھا اور وہاں مجھے گنگو نام کے بیرے یا ویٹر یا ریستوران کے ملازم سے رابطہ پیدا کرنا تھا جو یقیناً اپنا ہی آدمی تھا۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا سڑک پر کچھ رونق نظر آنے لگی تھی۔ میں اس رونق سے بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر ہو کر چلنے لگا۔ یہاں کہیں کہیں سٹور نما دکانیں تھیں۔ ایک جگہ فٹ پاتھ پر چائے اور پان سگریٹ کا کھوکھا تھا۔ اس کے سامنے فٹ پاتھ پر دو مدراسی صرف دھوتیاں پہنے چائے کے گلاس ہاتھوں میں لئے بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ عام قسم کے آدمی ہیں۔ ان سے پتہ پوچھنا چاہئے۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں نے وہاں کی عام ہندوستانی بول چال میں پوچھا کہ گول کر کہاں ہے۔ مجھے گول کر جانا ہے۔ ان میں سے ایک نے بازو سے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"ادھر کو جائے گا۔ ادھر ایک روڈ کراس کر لے گا۔ سامنے والا باجو گول کر کو جائے گا۔"

میں نے ان سے زیادہ باتیں کرنی مناسب نہ سمجھیں اور خاموشی سے جس طرف مدراسی نے اشارہ کیا تھا اس طرف چلنے لگا۔ سامنے شاہراہ میں سے ایک سڑک نکل کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ مجھے اسی سڑک کو کراس کرنا تھا۔

میں سڑک کراس کر گیا۔

یہاں دونوں جانب اونچے اونچے فلیٹوں والی بلڈنگیں تھیں۔ میں سامنے والی سڑک پر آگیا۔ یہ پتلی سڑک سے چھوٹی تھی اور اس میں اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ میں دکانوں کے بورڈ پڑھنے کی کوشش کرتا آگے چلا جا رہا تھا۔ اکثر بورڈ تامل زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں انگریزی کے بورڈ بھی تھے مگر ان میں جے بھارتی بھنڈار کا بورڈ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں آگے چلتا گیا۔ ایک دکان کے اندر سے روشنی باہر سڑک پر آرہی تھی اور تامل گانوں کی آواز بھی آرہی تھی۔ یہ ضرور کوئی ہوٹل یعنی ریستوران ہو گا۔ یہ سوچ کر میرے قدم ذرا تیز ہو گئے۔ پولیس کا ایک سپاہی جو سائیکل پر سوار تھا میرے سامنے سے آکر گزر گیا۔ اس نے مدراس کی پولیس کی وردی یعنی نیکر اور خاکی رنگ کی دو پلی ٹوپی سر پر پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں بید کا ڈنڈا بھی تھا۔ میں اپنے دھیان میں چلتا رہا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور گزر گیا۔

جس دکان کے اندر سے روشنی اور تامل گانے کی آوازیں آرہی تھیں وہ جے بھارتی بھنڈار نام کا ریستوران ہی تھا۔ ایک لمبی دکان تھی جہاں کرسیاں میز بچھے تھے۔ سپیکر پر مدراسی گانے والی کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ دکان میں کافی گاہک بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ یہاں بھی کافی کا زیادہ دور تھا۔ میں پہلے تو باہر کھڑا رہا کہ کوئی بیرا باہر نکلے تو اس سے گنگو کا پوچھوں۔ جب اندر سے کوئی ملازم ٹائپ کا آدمی باہر نہ نکلا تو میں ہمت کر کے ریستوران میں داخل ہو گیا اور جاتے ہی جہاں خالی کرسی دیکھی وہیں بیٹھ گیا۔ ایک کالا کلوٹا مدراسی لڑکا

میری میز پر آکر میز پر کپڑا مارتے ہوئے تامل زبان میں کچھ بولا۔

میں نے کہا۔

"ایک گلاس کافی لے گا۔"

وہ جانے لگا تو میں نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلا کر ہندوستانی میں پوچھا کہ کیا گنگو آج چھٹی پر ہے؟ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں اسے جانتا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے وہیں سے آواز دی اور تامل زبان میں کچھ کہا۔ اس میں گنگو کا نام بھی تھا۔ اس نے گنگو کو ہی آواز دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک پچاس پچپن سال کی عمر کا گہرے سانولے رنگ کا آدمی جس نے گھٹنوں تک میلی سی لنگی اور میلی سی ہی بنیان پہن رکھی تھی اپنے بالوں کو ایک ہاتھ سے کھجاتا میری طرف چلا آرہا ہے۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہو سکتا جس سے ملنے کو مجھے سوامی جی نے کہا تھا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ہمارے آدمی اسی طرح کام کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس آکر تامل میں کچھ بولا۔ میں نے کہا۔

"تمہارا ہی نام گنگو ہے؟"

اس نے کان کے پیچھے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"پھوکٹ بات نہیں کرے گا۔ کیا پینا مانگتا"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے سوامی جی نے بھیجا ہے۔"

اس نے یہ سنا تو اس کے چہرے کی کیفیت میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ بیڑی کا دھواں اڑاتے ہوئے وہ کپڑے سے میری میز صاف کرنے لگا اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا پئے گا بابو؟"

میں نے کہا۔

"کافی۔ پئے گا"

وہ چلا گیا۔ مجھے الجھن میں چھوڑ گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اصلی گنگو ہے یا

کوئی اور گنگو ہے۔ مگر سوامی نے اسی ریستوران کا پتہ لکھا تھا اور اس ریستوران میں ایک
ہی گنگو ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ پھر خیال آیا کہ وہ مجھ سے کوڈ ورڈ سنے بغیر ہرگز کسی رد
عمل کا اظہار نہیں کرے گا۔ جب وہ کافی کا گلاس لے کر میرے پاس آیا تو میں نے آہستہ
سے کہا۔

"جے سیتا رام"

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا رومال جس سے وہ میزیں صاف کرتا تھا نیچے گرا دیا۔
اسے اٹھانے کے لئے جھکا اور رومال اٹھانے کے ساتھ ہی کہنے لگا۔

"بھنڈار کے پیچھے چلے جاؤ۔ میں آتا ہوں"

یہ جملہ اس نے ہندوستانی میں نہیں بلکہ بڑی صاف اردو میں بولا تھا۔ میری جان میں
جان آئی کہ اس پریشانی کے عالم میں کوئی تو اپنا ساتھی ملا۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں
تھا کہ کافی کا بل ادا کر سکتا۔ میں نے پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے کافی کا
گلاس منہ کے قریب لا کر سونگھا اور لڑکے کو آواز دی۔ لڑکے کی بجائے گنگو آ گیا۔ اس
نے تیز آواز میں پوچھا۔

"کیا بولے گا اب؟"

میں نے کہا۔

"کافی میں سے صابن کی بو آ رہی ہے۔ میں نہیں پی سکتا۔ اسے لے جاؤ"

گنگو نے ترش ہو کر کہا۔

"تو پھر دوسرے بھنڈار میں جاؤ۔ سالا آ جاتا ہے کہیں سے"

وہ سمجھ گیا تھا کہ میں خستہ حالت میں ہوں اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں جلدی
سے ریستوران سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک راستہ بائیں طرف جاتا
تھا۔ میں اس پر سے ہوتا ہوا ریستوران کے عقب میں آ گیا جہاں ایک بدرو بہہ رہا تھا۔
یہاں اندھیرا تھا اور گندے پانی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر مجھے اسی جگہ ٹھہر کر گنگو کا
انتظار کرنا تھا۔ ایک جگہ کچرے کا بہت بڑا ڈرم پڑا تھا۔ میں ڈرم کی اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو

گیا۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ آخر مجھے ایک طرف سے اندھیرے میں انسانی سایہ اپنی
طرف آتا نظر پڑا۔ یہ گنگو ہی تھا۔ وہ میرے قریب آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ بولا

"تم پیچھے کدھر سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جہاں سے ہمارے سب لوگ آتے ہیں"

وہ بولا۔

"کسی کا نام لو"

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ گنگو یہی ہے اور یہ اپنا ہی آدمی ہے۔ اب وہ اس بات کی
تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا میں بھی اس کا آدمی ہوں۔ میں نے کمانڈر شیروان کا نام لیا تو
اس نے پوچھا۔

"وہ کہاں ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"سری نگر کی پہاڑیوں میں"

"تمہیں سوامی جی کہاں ملے تھے؟"

میں نے کہا۔

"فوجی ہیڈ کوارٹر کے ٹارچر چیمبر فائیو میں بھارتی فوجی کیپٹن جوشی کے پاس وہ مجھے
ملے تھے۔ جب مجھے سخت ٹارچر کیا جا رہا تھا۔"

گنگو نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ساتھ والی عمارتوں کی ہلکی ہلکی روشنی
وہاں پڑ رہی تھی۔ ہم نے ایک جگہ سے بدرو کا ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا پل عبور کیا اور اتر کر نیچے
درختوں میں آ گئے۔ یہ تاڑ اور ناریل کے درخت تھے۔ ہم ان درختوں میں ادھر ادھر سے
گزرتے کافی دور تک چلتے گئے۔ اندھیرے میں کچھ جھونپڑیاں نظر آئیں۔ وہاں سے آگے

ایک طرف چھوٹا سا کھوکھا کھڑا تھا۔ گنگو وہاں جا کر رک گیا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ پھر اس نے دھوتی کے ڈھب میں سے چابی نکال کر کھوکھے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا اور ناریل کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ گنگو نے دروازہ بند کر دیا اور ماچس جلا کر ایک موم بتی روشن کر دی۔ کھوکھا ایک تنگ سی جگہ تھی جہاں فرش پر چٹائی بچھی تھی اور کونے میں ٹین کا صندوق پڑا تھا اور رسی کے ساتھ پرانی دھوتی لٹک رہی تھی۔ گنگو چٹائی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

"جس روز جیا گامی کھاڑی میں انڈین نیوی کے دو جہاز دھماکے کے بعد غرق ہو گئے تھے میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اپنے کشمیری کمانڈو پانڈی چری میں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی اور ساتھی تو نہیں پکڑا گیا؟"

میں نے کہا۔

"میرے ساتھ صرف ایک ہی کمانڈو تھا وہ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے پانچ منٹ پہلے ہی نکل گیا تھا۔"

گنگو نے پوچھا۔

"تم صرف دو ہی تھے؟"

میں نے کہا۔

"ہم تو صرف دو ہی آئے تھے باقی اگر یہاں ہوں تو ان کا مجھے معلوم نہیں ہے۔"

گنگو نے مجھے بیڑی دیتے ہوئے کہا۔

"بیڑی پیو گے؟"

میں نے بیڑی لے لی۔ اس نے ماچس جلا کر میری بیڑی سلگائی۔ ایک بیڑی خود بھی سلگائی اور بولا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ اس فوجی کیمپ میں تمہیں لے جایا گیا جہاں ہمارے لیڈر سوامی گورکھ ناتھ کے بھیس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں یقیناً پتہ چل گیا ہو گا کہ

کشمیری کمانڈو کو پکڑ کر وہاں لایا گیا ہے۔ وہ اچانک کیپٹن جوشی کے پاس نہیں گئے ہوں گے وہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہاں آئے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ جب میں اور وہ ٹارچر چیمبر میں اکیلے رہ گئے تھے تو انہوں نے کاغذ میں لپٹا ہوا پستول تھیلے میں سے نکال کر مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ اس میں ایک پرچہ بھی ہے جس پر ایڈریس لکھا ہے۔ اس ایڈریس پر جا کر گنگو بیرے سے ملو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے سے جانتے تھے کہ میں وہاں موجود ہوں اور انہوں نے مجھے وہاں سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ وہ پرچہ لکھ کر اور پستول لے کر میرے پاس آئے تھے۔"

"وہ پستول کہاں ہے؟"

گنگو نے پوچھا۔

میں نے پتلون کی پچھلی جیب میں سے پستول نکال کر اس کو دیا۔ وہ موم بتی کی روشنی میں پستول کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"یہ پستول ہمارے ایک ساتھی نے پانڈی چری کے ائیر فورس ڈپو سے اڑایا تھا۔ یہ تم اپنے پاس ہی رکھو"

میں نے اسے کہا کہ اب تک ممکن ہے میرے فرار کا فوج کو علم ہو گیا ہو۔ فوج اور پولیس ضرور میری تلاش میں شہر میں نکل آئی ہو گی۔ میں یہاں سے گیا تو میری چیکنگ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ پستول مجھے دوبارہ گرفتار کروا دے گا۔ گنگو بولا۔

"تم ابھی میرے پاس ہی رہو گے۔"

گنگو نے میرا پستول لے کر وہیں کونے میں صندوق کے پیچھے کپڑے میں لپیٹ کر چھپا دیا۔ اس نے اپنا اصلی مسلمان نام مجھے بتایا تھا مگر میں اس کا اصلی نام آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ میں نے پانڈی چری کے جس ریسٹوران کا نام یہاں جے بھارتی بھنڈار لکھا ہے یہ بھی فرضی نام ہے۔ سوامی گورکھ ناتھ نے مجھے گنگو سے ملنے کے لئے

کسی اور جگہ کا ایڈریس دیا تھا۔ میں ان سب جگہوں کا اصلی نام نہیں لکھ سکتا اس لئے کہ
ہمارے یہ محب وطن مجاہد آج بھی بھارت کے ان شہروں میں اپنی جانیں خطرے میں
ڈالے کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اگر میں نے یہاں
ان کے اصلی نام اور پتے لکھ دیئے تو بھارت کی خفیہ پولیس انہیں بڑی آسانی سے پکڑ سکتی
ہے۔

اس لئے میں گنگو کو گنگو ہی لکھوں گا۔ سوامی جی بھی مسلمان تھے اور سنسکرت اور
ہندی کے بڑے عالم یعنی وردان تھے۔ اور وہ ایک عالم فاضل ہندو سادھو کے بھیس میں
دشمن کے گھر میں بیٹھ کر کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کے لئے خفیہ خدمات انجام دے رہے
تھے۔ ان لوگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ موت ہر وقت ان کے سر پر
منڈلاتی رہتی تھی۔ ان کی ذرا سی غلطی انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا سکتی تھی۔ سوامی جی ک
بھی میں اسلامی نام نہیں لکھوں گا اور یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں کے رہنے وال
تھے۔ اتنا ضرور بتائے دیتا ہوں کہ وہ پاکستانی نہیں تھے۔ وہ ہندوستان کے ہی شہری مسلما
تھے اور کشمیر میں بھارتی قابض فوج کشمیری مسلمانوں پر جو ظلم کر رہی تھی اس کے خلاف
وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کشمیر کے محاذ پر جا کر دشمن سے جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ مگ
وہ ایک دوسرے محاذ پر آزادی کشمیر کی کاز کے لئے کام کر رہے تھے۔ اگر ان کو سنسکرت
اور ہندی زبانوں پر عبور نہ ہوتا تو وہ بھارتی فوج اور بھارتی بیورو کریٹس کو کبھی متاثر نہیں
کر سکتے تھے۔

گنگو جانے لگا تو بولا۔

"میں ہوٹل بند ہونے کے بعد آؤں گا۔ تم یہیں رہنا۔ باہر مت نکلنا۔"

وہ چلا گیا۔ میں جھونپڑے میں ہی چٹائی پر کچھ دیر بیٹھ کر آئندہ کیا کرنا ہو گا۔ کیسے کر
ہو گا۔ ان باتوں پر غور کرتا رہا گنگو کافی دیر بعد آیا۔ وہ میرے لئے کچھ کھانے کو بھی لا
تھا۔ میں نے کھانا وغیرہ کھایا۔ اس نے کہا۔

"میں نے سوامی جی کو پیغام بھجوا دیا ہے کہ تم میرے پاس پہنچ گئے ہو۔ وہ کل رات

تم سے ملاقات کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"گنگو بھائی! میرا ناگ پور واپس پہنچنا بڑا ضروری ہے۔"

وہ بولا۔

"سوامی جی ہی اس کا انتظام کریں گے تم اکیلے یہاں سے نکلے تو پکڑے جاؤ گے سب
سے پہلے تو صبح تمہارے لئے نئے کپڑے لاؤں گا۔ یہ بڑے گندے ہو رہے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"سوامی جی کیا مجھ سے ملنے یہاں آئیں گے؟"

گنگو نے کہا۔

"نہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہو گا یہ میں تمہیں کل شام کو ہی بتا سکوں گا کہ سوامی
جی سے کہاں ملاقات ہو گی۔"

اس کے بعد گنگو سو گیا۔ میں بھی سو گیا۔ دوسرے روز کافی دیر تک سویا رہا۔ گنگو جا
چکا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ گنگو میرے لئے چائے وغیرہ لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"اس کھوکھے کے پیچھے نلکا لگا ہوا ہے تم وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ۔"

میں باہر نکل کر نلکے پر گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ اور واپس کھوکھے کے اندر بیٹھ
کر ناشتہ کیا۔ گنگو بولا۔

"میں دوپہر کو تمہارے لئے کچھ کھانے کو بھی لاؤں گا اور تمہارے لئے دوسرے
کپڑے بھی لاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"میرے لئے کہیں سے کوئی پرانی پتلون اور قمیض ہی لے آنا۔ دھوتی کرتہ نہ لانا۔
میں پتلون قمیض میں واپس ناگ پور پہنچنا چاہتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ دوپہر کو میرے لئے چاول اور سبزی لے کر آ گیا۔ ایک بنڈل میں پرانی
پتلون اور دھلی ہوئی قمیض تھی۔ میری جیکٹ تو فوجی ٹارچر سنٹر میں ہی رہ گئی تھی۔ میں

نے گندے کپڑے اتار کر وہ پہن لئے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوج کو میرے فرار کا علم
ہو گیا ہو گا۔ کیا اس بارے میں تمہیں کوئی خبر ہے؟ وہ بولا۔

"ایسی خبریں باہر نہیں نکلا کرتیں۔ فوج اور پولیس ان خبروں کو خفیہ رکھتی ہے۔ ایک
تو ان کی بدنامی ہوتی ہے کہ اتنا خطرناک کمانڈو ان کی حراست سے بھاگ نکلنے
میں کامیاب ہو گیا دوسرے وہ اپنی سرگرمیوں سے مفرور کمانڈو کو بے خبر بھی رکھنا چاہتے
ہیں۔ ویسے یہ بات یقینی ہے کہ اب تک خفیہ طور پر پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کے
آدمیوں نے سفید کپڑوں میں شہر کی ناکہ بندی کر دی ہو گی۔"

گنگو جے بھارتی بھنڈار میں معمولی بیرے کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اسے صبح سے
لے کر رات تک وہاں کام کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کو گیا تو رات کے نو بجے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں سوامی جی سے ملنے ان کے مندر چلنا ہو گا وہ رات کے دس بجے تک مندر
میں گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم یہاں سے پورے دس بجے نکلیں گے۔ وہاں
تم پتلون اور قمیض کی بجائے دھوتی کرتا پہن کر جاؤ گے۔"

اس نے صندوق میں سے ایک گہرے رنگ کی چارخانہ لنگی اور اسی رنگ کا کرتہ
نکال کر مجھے دیا۔ میں نے پتلون قمیض اتار کر لنگی اور کرتہ پہن لیا۔ پاؤں میں گنگو کی چپل
پہن لی۔ جب رات کے دس بج گئے تو گنگو مجھے لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ وہ خدا
جانے کہاں کہاں سے گزرتا رہا۔ کبھی جھاڑیاں اور ویران علاقہ آجاتا۔ کبھی آبادی شروع
ہو جاتی۔ آخر مجھے ایک جگہ ڈھلواں چھتوں والے اک منزلہ مکانوں سے کچھ فاصلے پر ایک
مندر نظر آیا جس کا سٹائل جنوبی ہند کے مندروں والا تھا۔ یہ کوئی بڑا مندر نہیں تھا۔ ہم
مندر کے اندر جانے کی بجائے اس کے عقب میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی
وہاں اندھیرا اور خاموشی تھی۔ مجھے کوٹھڑی میں بٹھانے کے بعد گنگو نے اندر طاق میں رکھا
ہوا تانبے کا ایک دیا جلا دیا تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دیواروں پر کہیں کہیں
جالے لگے ہوئے تھے۔ میں پٹ سن کی چٹائی پر بیٹھا تھا۔ گنگو بولا۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں جاتا ہوں۔ سوامی جی تم سے ملنے آ

آجائیں گے۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد تم مندر کے گیٹ کے پاس آجانا۔ میں وہاں
سے تمہیں لے لوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے بند کوٹھڑی میں اکیلا بیٹھا رہا۔ تانبے کا پرانا دیا جل رہا تھا۔ تھوڑی
دیر بعد باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کو میں
نے اندر سے چٹخنی لگا دی تھی۔ قدموں کی چاپ دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ مجھے
سوامی جی کی آواز سنائی دی۔

"جے سیتا رام۔ دروازہ کھولو"

میں سوامی جی کی آواز پہچانتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ سوامی جی اندر آگئے۔
انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ وہ اسی گیروے لباس میں تھے۔ میرے قریب
چٹائی پر بیٹھتے ہی بڑی صاف اردو میں کہنے لگے۔

"اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے گنگو کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے تمہارا فکر تھا۔"

میں نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں فوج کے ٹارچر چیمبر میں ہوں؟"

سوامی جی نے جو مسلمان تھے اور ہمارے اپنے غازی اور مجاہد تھے مسکرا کر کہا۔

"یہ معلوم کرنا میری ڈیوٹی میں شامل ہے کیپٹن جوشی میرا مرید ہے۔ میں نے اسے
کچھ ایسی شعبدہ بازی دکھائی ہوئی ہے کہ وہ میرا گرویدہ ہو چکا ہے۔ مجھے اسی کی زبانی پتہ
چلا تھا کہ فوج نے ان پاکستانی کمانڈوز میں سے ایک کمانڈو کو پکڑ لیا ہے جنہوں نے جیا گامی
کی کھاڑی میں انڈین نیوی کے دو اسلحہ بردار جہازوں کو تباہ کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے
ایک منصوبہ بنایا اور تمہارے تک پہنچ گیا۔"

میں نے سوامی جی سے پوچھا۔

"ٹارچر چیمبر سے میرے فرار کے بعد آپ پر تو کسی کو شک نہیں پڑا کہ آپ نے
کمانڈو کو فرار ہونے میں مدد دی ہے؟"

سوامی جی بولے۔

"میں نے یہاں کی فوج کے سینئر آفیسر میں اپنا جو مقام بنایا ہے اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑا۔ بلکہ الٹا کیپٹن جوشی نے پہرے پر جو لانس نائیک موجود تھا اور جسے تم نے بے ہوش کر دیا تھا اس کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا بہرحال ان باتوں کو چھوڑو۔ تم نے ہندو بن کر دھرم ویر کے نام سے ملٹری انٹیلی جینس کی ڈیفنس برانچ کے میجر شرت دیوان کے گھر میں جو مقام بنایا ہے اسے بنا رہنا چاہئے۔ خدا نے بڑا کرم کیا کہ عین وقت پر تم فرار ہو گئے۔ ورنہ میجر شرت کل صبح پہنچنے والا تھا۔ وہ تمہیں دیکھ لیتا تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا اور یہ بات ہمارے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوتی۔ کیونکہ تم دھرم ویر کے روپ میں میجر شرت کے قریب رہ کر بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کے پاکستان دشمن راز معلوم کر سکتے ہو۔ تم نے جو جگہ بنائی ہے یہاں تک ہمارے آدمی نہیں پہنچ سکتے۔ اب تمہارا واپس ناگ پور جانا بہت ضروری ہے۔ میجر شرت دیوان آنے والا تھا مگر اسے آج صبح ہی تمہارے فرار کی اطلاع کر دی گئی۔ اور وہ پانڈی چری نہیں آرہا۔ لیکن اس نے ناگ پور سے ہی کیپٹن جوشی کے خلاف غفلت برتنے کے جرم میں سخت ایکشن لینے کا حکم جاری کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ کے خیال میں میرے ناگ پور جانے کا محفوظ طریقہ کون سا ہو سکتا ہے؟"

سوامی جی کچھ سوچ کر بولے۔

"میں کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لوں گا۔ تم اس معاملے میں فکر نہ کرو۔ تمہیں کل اطلاع پہنچ جائے گی کہ تمہیں یہاں سے کس طرح نکلنا ہے اور کیسے ناگ پور پہنچنا ہے۔ کیونکہ اس وقت ریلوے سٹیشن کے علاوہ شہر کے ہر بس شاپ اور لاریوں کے اڈوں پر پولیس اور ملٹری پولیس کے آدمی موجود ہیں۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوئی ہے کہ فوجی حراست میں تمہاری کوئی تصویر نہیں اتاری گئی۔ اگر تصویر اتار لی جاتی تو تمہارے لئے پانڈی چری سے باہر قدم نکالنا ناممکن تھا۔"

میں نے سوامی جی سے کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں پوچھا۔

"کیا آپ کو میرے ساتھی کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں کوئی خبر ہے؟ وہ پانڈی چری کی اشرفیہ سرائے میں میری گرفتاری سے چند منٹ پہلے جدا ہو گیا تھا۔"

سوامی جی کہنے لگے۔

"کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں مجھے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔ وہ پکڑا بھی نہیں گیا۔ اگر پکڑا گیا ہوتا تو مجھے لازمی طور پر اس کا علم ہو جاتا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ پانڈی چری سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب تک کمانڈر شیروان کے پاس سری نگر پہنچ چکا ہو گا۔"

اس کے بعد سوامی جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پہلے میں جاتا ہوں۔ تم میرے جانے کے پانچ منٹ بعد یہاں سے نکلنا۔ اور جاتے ہوئے یہ دیا بجھا دینا۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟ اس بارے میں کل کسی وقت تمہیں بتا دیا جائے گا۔"

سوامی جی دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے پانچ چھ منٹ بعد میں نے دیا بجھایا اور کوٹھڑی سے نکل گیا۔ میں نے مندر کا گیٹ آتی دفعہ دیکھ لیا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا گیٹ پر آگیا۔ وہاں گنگو ایک طرف اندھیرے میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے آگے چلنے لگا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے گزرتے ہوئے واپس گنگو کی جھونپڑی یا کھوکھے میں پہنچ گئے۔ میں گنگو کو سوامی جی کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں بتانے لگا تو اس نے کہا۔

"ان باتوں کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے اب تم سو جاؤ۔ میں ہوٹل جا رہا ہوں دروازے کو اندر سے کنڈی نہ لگانا۔ میں رات کو آکر سو جاؤں گا۔ کل صبح ملاقات ہو گی۔"

وہ چلا گیا۔ اس کا ہوٹل رات کو بارہ بجے کے بعد بند ہوتا تھا۔ دوسرے روز بھی میں نے آدھا دن گنگو کے جھونپڑے میں ہی گزارا۔ دوپہر کے بعد گنگو آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کی گٹھڑی تھی۔ وہ میرے لئے کھانا بھی لایا تھا۔ جھونپڑے میں آکر اس نے کہا۔

"پہلے کھانا کھا لو۔ پھر بات کریں گے۔"

میں نے چاول وغیرہ جو کچھ وہ لایا تھا کھانے لگا۔ میں ابھی تک لنگی کرتہ کے لباس میں ہی تھا۔ میری پتلون قمیض جو گنگو میرے لئے لایا تھا صندوق میں بند تھی۔ میرا پستول بھی صندوق کے پیچھے ہی خفیہ جگہ پر چھپایا ہوا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد گنگو نے گٹھڑی کھول کے اس میں سے گیروے رنگ کا ایک لمبا چولا۔ گیروے رنگ کی ایک دھوتی اور لمبے لمبے بالوں کی ایک وگ اور بڑے بڑے منکوں کی مالا نکال کر مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ لباس پہن لو۔ تمہاری پتلون اور قمیض الگ تھیلے میں بند کر دیتا ہوں۔ یہ کپڑے تم ناگ پور پہنچنے کے بعد پہن لو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا مجھے سادھو بن کر ناگ پور جانا ہو گا؟"

وہ بولا۔

"ہاں مگر تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ اکیلے اگر تم کسی ریاست کے راجہ بن کر بھی جاؤ گے تو پکڑ لئے جاؤ گے۔ ملٹری پولیس اور سول پولیس کے خفیہ لوگ تمہاری تلاش میں ٹڈی دل کی طرح شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا؟"

گنگو بولا۔

"سوامی جی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ انہوں نے صرف تمہیں حفاظت کے ساتھ ناگ پور پہنچانے کا یہ انتظام کیا ہے کہ وہ ہندو شردھالوؤں کی پوری ایک منڈلی لے کر ناگ پور کے بڑے مندر کی یاترا پر جا رہے ہیں۔ تم بھی ان شردھالوؤں میں شامل ہو گے۔ اس طرح تم پر کسی کو شک نہیں پڑے گا اور سوامی جی کی وجہ سے تمہاری چیکنگ بھی نہیں ہو گی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد پانڈی چری سے ورنگل جانے والی گاڑی چل پڑے گی۔"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے پانڈی چری کے ریلوے سٹیشن تک مجھے اکیلے جانا ہو گا؟"

گنگو بولا۔

"نہیں۔ ایک گھنٹے بعد سوامی جی اپنی منڈلی کے سادھوؤں اور دوسرے شردھالوؤں کو لے کر ہمارے ہوٹل کے سامنے سے گزریں گے۔ تم اس وقت تک ہمارے ہوٹل کے باہر بیٹھو گے۔ وہاں تم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ یہاں سادھو لوگ عام چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ جب سوامی جی اپنی منڈلی کو لے کر وہاں سے گزریں گے تو تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ گے۔ یہ سارا ڈرامہ صرف تمہیں محفوظ طریقے سے ناگ پور پہنچانے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ اب جلدی سے یہ کپڑے پہن کر اپنا حلیہ سادھوؤں والا بنا لو اور میرے جانے کے کچھ دیر بعد یہاں سے نکل کر ہمارے ہوٹل پہنچ جانا۔ اور وہاں باہر ایک کرسی پڑی ہو گی اس کرسی پر بیٹھ جانا۔ میں خود آ کر تمہیں بڑی عقیدت سے کافی کا گلاس پیش کروں گا۔"

گنگو کے جانے کے بعد میں نے دھوتی کرتہ اتار کر گیروے رنگ کا لمبا چولا اور دھوتی پہن لی۔ گلے میں منکوں والی مالائیں ڈالیں۔ سر پر لمبے لمبے بالوں والی وگ جمائی اور بالکل سادھو بن گیا۔ اس حلیے میں مجھے مشکل ہی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے صندوق میں سے پتلون قمیض اور بوٹ نکال کر تھیلے میں ڈالے اور تھیلا کندھے پر لٹکا لیا۔ پستول میں نے صندوق کے پیچھے ہی پڑا رہنے دیا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں سر سے پاؤں تک سادھو بن کر جھونپڑے سے نکل کر گنگو کے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک دو آدمی ملے مگر انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ہوٹل کے پاس آیا تو دیکھا کہ باہر ایک لوہے کی کرسی پڑی تھی۔ میں جاتے ہی گنگو کی ہدایت کے مطابق اس پر بیٹھ گیا۔ کوئی ایک منٹ بعد گنگو میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا گلاس تھا۔

کہنے لگا۔

"مہاراج کافی لایا ہوں۔"

میں نے سادھوؤں کی طرح ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"جے ویشنو بھگوان کی۔ سپھل رہو"

میں خاموشی سے کافی پینے لگا۔ دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ سامنے بازار میں سادھوؤں کی ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ آگے آگے سوامی جی اپنے مخصوص جوگیوں والے بھیس میں تھے۔ ہاتھ میں ترشول تھا۔ شردھالو اور سادھو ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان میں کچھ لوگ سویلین کپڑوں یعنی دھوتی کرتوں اور پتلون قمیص میں بھی تھے۔ اس شخص نے ہر طبقہ خیال کے لوگوں کو اپنے زیر اثر کر رکھا تھا۔ یہ پندرہ بیس کے قریب لوگ تھے۔ سوامی جی آگے آگے چلتے کبھی کبھی جے گورو گورکھ ناتھ اور اولکھ نرنجن کا نع لگا رہے تھے۔ وہ میرے قریب سے گزرے تو انہوں نے کنکھیوں سے میری طرف دیک اور آگے نکل گئے۔ میں کرسی سے اٹھا اور جلوس میں شامل ہو گیا۔

چوک میں چار پانچ ویگنیں کھڑی تھیں۔ سب لوگ ویگنوں میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ ریلوے سٹیشن پر لوگ آکر سوامی جی کے ہاتھ چومتے اور ایک طرف ہٹ جاتے۔ ان لوگوں کو ریل گاڑی کا ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ انڈیا میں نابیناؤں اور جوگیوں سادھوؤں کو ریل کا ٹکٹ معاف ہوتا ہے۔ سب لوگ پلیٹ فارم آکر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ مجھے سوامی جی نے اپنے ڈبے میں اپنے بالکل ساتھ بٹھا لیا وہ گردن ہلا ہلا کر رام نام کا جاپ کر رہے تھے۔

گاڑی چل پڑی۔ اس گاڑی کو ورنگل شہر تک جانا تھا۔ وہاں سے ہمیں ناگ جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ یہ لمبا سفر تھا۔ ہمارے اردگرد دوسرے سادھو بیٹھے تھے۔ سٹیشن پر سوامی جی اور باقی سادھوؤں کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ لوگ مٹھائیاں اور پوریاں کر دیتے۔ سارا دن گزر گیا۔ اس دوران سوامی جی مجھ سے مطلب کی کوئی بات نہ سکے۔ رات ہو گئی۔ سوامی جی نے اپنے مرید سادھوؤں سے کہا۔

"تم سب لوگ اب سو جاؤ۔ ہم جاگ کر رام نام کا جاپ کریں گے۔ یہ ہمار ہمارے ساتھ جاگے گا"

سب سادھو اور دوسرے لوگ سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ پانڈی چری کے ریلوے سٹیشن پر مجھے پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین کے اردگرد کچھ ایسے چہرے نظر آئے تھے جو مشکوک چہرے تھے اور یقیناً یہ سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جینس کے خفیہ اہل کار تھے۔ جوگی سادھوؤں کی منڈلی کا وہ بڑے غور سے جائزہ بھی لے رہے تھے مگر خاموش تھے۔ پولیس دوسرے مسافروں کی چیکنگ وغیرہ بھی کر رہی تھی لیکن ہمیں کسی نے نہ پوچھا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ یہ سادھوؤں کی منڈلی ہے اور سوامی گورکھ ناتھ کی قیادت میں یاترا پر کسی تیرتھ استھان کو جا رہی ہے۔

رات کو جب سب سادھو لوگ گہری نیند سو رہے تھے تو سوامی جی نے جو میرے بالکل قریب بیٹھے تھے آہستہ سے میری طرف جھک کر کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنگل میں سی آئی ڈی زیادہ ہو گی۔ وہاں تم اوپر برتھ پر جا کر سو جانا"

ٹرین فراٹے بھرتی رات کی تاریکی میں بھاگی جا رہی تھی۔ سوامی جی نے ایک نظر سے قریب سوئے ہوئے سادھوؤں کا جائزہ لیا۔ پھر میرے قریب ہو کر آہستہ سے کہا۔

"ناگ پور پہنچنے کے بعد تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مجھ سے ملے بغیر سٹیشن سے باہر نہ جانا"

ورنگل کا سٹیشن آیا تو میں برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ میں پہلو کے بل لیٹا تھا اور میرا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔ میں اوپر والی برتھ پر لیٹا نیم وا آنکھوں سے کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے مجھے پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے لوگ نظر آرہے تھے۔ ٹرین رکی ہوئی تھی۔ اتنے میں پولیس کے دو سپاہی سوامی جی کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سوامی جی سے اس علاقے کی زبان میں جو بعد میں سوامی جی نے بتایا کہ تلگو زبان تھی۔ حیدر آباد دکن اور آج کے آندھیرا پردیش میں زیادہ تر تلنگو زبان بولی جاتی ہے۔ سوامی جی کو میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد اور بے نیازی کے ساتھ پولیس والوں سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سپاہی چلے گئے۔ سوامی جی نے نہایت دور

اندیشی سے کام لیتے ہوئے مجھے ورنگل کے سٹیشن پر برتھ پر جا کر لیٹ جانے کا مشورہ دیا
تھا۔ پولیس کے سپاہی ضرور میرے بارے میں ہی کچھ پوچھ رہے تھے۔ گاڑی آگے روانہ
ہوگئی تو سوامی جی نے چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور
سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین راتوں سے تقریباً جاگ رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی
نیند آگئی۔ جب بیدار ہوا تو گاڑی کے ڈبے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی
پوری سپیڈ سے جا رہی تھی۔ سوامی جی کے چیلے ان کے آمنے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے
تامل زبان میں ان سے باتیں کر رہے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ہمارے خاص آدمی کو جو
سوامی کے بھیس میں تھا تامل اور تلگو زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس شخص نے اپنے
بارے میں اور اس علاقے میں اپنی پوزیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن معلوم
ہوتا تھا کہ اس مجاہد کو اس علاقے میں بڑی خاص یعنی ماسٹر سپائی کی حیثیت حاصل ہے۔

میں بھی برتھ پر سے اتر کر سوامی جی کے پاس بیٹھ گیا اور ان کا پاٹھ بڑی عقیدت سے
سننے لگا۔ تیسرے پہر چندرا پور کا بڑا شہر آیا اور گزر گیا۔ سورج ناگ پور کے کارخانوں کی
اونچی اونچی چمنیوں کے پیچھے جھک رہا تھا کہ ٹرین ناگ پور پہنچ گئی۔ ہمارے سوامی جی نے
اپنے تمام عقیدت مند سادھوؤں اور منڈلی کے دوسرے لوگوں سے کہا کہ وہ پلیٹ فارم پر
ایک طرف بیٹھ جائیں ہم منہ ہاتھ دھو کر آتے ہیں۔ سوامی جی یہ کہہ کر فسٹ کلاس کے
ویٹنگ روم کی طرف بڑھے۔ مجھے انہوں نے پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ سٹیشن پر
اترتے ہی میں فسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں چلا جاؤں۔ چنانچہ میں ٹرین کے رکتے ہی
ڈبے سے اتر کر جہاں انہوں نے کہا تھا وہاں پہنچ گیا تھا۔ فسٹ کلاس کا ویٹنگ روم خالی
تھا۔ ایک طرف لکڑی کی جالی دار سکرین کھڑی تھی۔ میں نے وہاں جا کر اپنا حلیہ تبدیل
کیا اور سکرین سے باہر آگیا۔ سوامی جی مجھے اس سکرین کے پیچھے لے گئے اور دھیمی آواز
میں کہنے لگے۔

"یہ اطلاع مجھے بھی مل چکی ہے کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا رکھا
ہے۔ میجر شرت دیوان کے قریب رہ کر تھوڑی سی کوشش سے تمہیں اس بارے میں

معلومات مل سکتی ہیں۔ اس منصوبے کی جو بھی خبر ملے اسے فوراً جس طرح بھی ہو سکے
سری نگر میں کمانڈو شیروان کو پہنچا دینا۔ مجھ سے شاید تمہاری ملاقات نہ ہو۔ لیکن ناگ پور
میں بھی ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔"

پھر سوامی جی نے مجھے تھیلے میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر دیا اور کہا۔

"اس میں اس آدمی کا ایڈریس اور وہ ہندوانہ نام جس طرح وہ ناگ پور میں رہ رہا
ہے لکھا ہوا ہے۔ خفیہ کوڈ ورڈ بھی لکھا ہوا ہے۔ ضرورت پڑنے پر تم اس سے مل سکتے
ہو۔ وہ دھماکہ خیز ڈیوائسز بنانے کا ماہر ہے۔ اب تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ اللہ حافظ!"

یہ کہہ کر سوامی جی جے گورو گورکھ ناتھ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ویٹنگ روم کے باتھ
روم کی طرف چل دیئے۔ میں چپکے سے باہر آگیا۔ اب مجھے وہاں سے سیدھا ناگ پور فوجی
ہیڈ کوارٹر کی ملٹری کینٹین کی طرف جانا تھا۔ میرے چہرے پر کیپٹن جوشی کے نشتر کا لگایا ہوا
ایک لکیر ایسا نشان باقی تھا۔ زخم ٹھیک ہو گیا تھا مگر نشان موجود تھا۔ میں نے سٹیشن سے نکلتے
ہی بس پکڑی اور ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ گیٹ پر دو فوجی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک
میری صورت سے واقف تھا۔ پھر بھی اس نے فوجی کینٹین میں فون کر کے میرے بارے
تصدیق کرنے کے بعد مجھے گیٹ کے اندر جانے دیا۔ فوجی کینٹین پر کینٹین کا مالک مہتہ
نہیں تھا۔ اسسٹنٹ جگدیش موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور

"شری دھرم ویر جی! ورنگل سے کب واپس آئے؟"

میں نے کہا۔

"بھیا جی! ابھی آرہا ہوں۔ مہتہ جی کہاں ہیں؟"

جگدیش ایک مدراسی فوجی کے سامان کو لفافے میں ڈال رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہتہ جی مارکیٹ گئے ہیں۔ اب شاید کل ہی آئیں گے صبح کو"

میں نے کہا۔

"میں اپنے بڑے بھیا میجر صاحب سے مل کر ابھی آتا ہو"

جگدیش مسکراتا رہا۔ میں آفیسرز کوارٹرز کی طرف بڑھ گیا۔ سورج غروب ہونے
تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ وقت میجر شرت دیوان کے شراب کی محفل سجانے کے ہوتا ہے
وہ ضرور اپنے کمرے میں ہی ہو گا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میجر شرت ڈرائنگ روم
سامان شراب ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اس کا اردلی پاس کھڑا صاف کپڑے سے شیشے
گلاس کو چمکا رہا تھا۔ میجر نے جیسے ہی مجھے دیکھا مسکرانے لگا۔

"ارے دھرم ویر جی! کب آئے؟ تم جلدی نہیں آگئے؟"

میں نے میجر شرت دیوان سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ میجر نے مجھے گلے لگا لیا۔
نے کہا۔

"بھیا جی! ورنگل میں میرا جی نہیں لگا۔ خیال تھا کچھ نہیں تو دس پندرہ دن
رہوں گا مگر آپ کی یاد آنے لگی۔ ورنگل میں بھی کوئی دلکشی نہیں تھی۔ بس
آگیا۔"

میجر شرت نے میرے رخسار پر زخم کا نشان دیکھ کر پوچھا۔

"یہ زخم کہاں سے لگا؟"

میں نے کہا۔

"ورنگل کے ایک مندر میں پوجا پاٹھ کرنے گیا تھا۔ ایک بندر نے حملہ کر دیا پنجہ
اور میرا گال زخمی ہو گیا۔ میجر شرت نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہنومان جی کو تم پر پیار آگیا ہو گا"

اس دوران اردلی نے میجر کے گلاس میں شراب کا پہلا پیگ بنا دیا تھا۔ نہ میں
پانڈی چری کے جہازوں کی تباہی کا پوچھا۔ نہ میجر شرت نے ان کا کوئی ذکر کیا۔ وہ واقع
ذمے دار بھارتی فوجی افسر تھا۔ فوج میں انٹیلی جینس کور والے عہدے دار ویسے بھی
قسم کی باتوں کو اپنوں سے بھی چھپا کر رکھتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو گول مول
دے دیتے ہیں۔ ناگ پور شہر پانڈی چری سے بہت دور تھا۔ اگرچہ پانڈی چری کی
انتظامیہ نے ناگ پور سے میجر شرت کو بلوایا تھا کہ وہ گرفتار شدہ پاکستانی یا کشمیری

سے پوچھ گچھ کرے لیکن میجر شرت کا پانڈی چری کے انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر سے براہ
راست ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس وجہ سے میں کسی حد تک مطمئن تھا کہ پانڈی چری
میں بھی جن فوجی افسروں نے ٹارچر کیا ہے خاص طور پر کیپٹن جوشی یہ لوگ ناگ پور نہیں
آئیں گے۔ میں میجر شرت کے پاس بیٹھا ماتا جی اور شکنتلا جی کا احوال پوچھ رہا تھا کہ
ایک سکھ کیپٹن اندر آگیا۔ یہ شراب نوشی میں میجر کا ساتھی تھا۔ میں نمستے کہہ کر اٹھا اور
وہاں سے نکل آیا۔

یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ ابھی جولائی کی دو تین تاریخ ہی تھی۔ جنوبی ہند میں بارشوں کا
سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جس دن میں ناگ پور پہنچا اسی رات بڑی موسلا دھار بارش
ہوئی۔ صبح اٹھا تو درخت دھلے دھلائے سرسبز ہو رہے تھے۔ آسمان پر گھٹائیں جھکی ہوئی
تھیں رات کو اپنے کمرے میں آکر دروازے کو چٹخنی لگا کر سوامی جی کا دیا ہوا رقعہ غور سے
پڑھ لیا تھا۔ اس میں ناگ پور میں اپنے خاص جاسوس کا ہندوانہ نام اور اس کا ایڈریس لکھا
ہوا تھا۔ خفیہ کوڈ ورڈ یہ تھا۔

"میں مالا پورم کا شکاری ہوں"

یہ جملہ مجھے اپنے جاسوس ساتھی کو جا کر کہنا تھا۔ اس نے پوچھنا تھا۔

"مالا پورم میں برکھا تو نہیں ہوئی؟"

اس کے جواب میں مجھے کہنا تھا۔

"مالا پورم میں برف باری ہوئی ہے"

سوامی جی نے کہا تھا کہ میں ضرورت کے وقت اس آدمی سے ملوں۔ لیکن میں نے
سوچا کہ کیوں نہ پہلے اپنے جاسوس سے ایک سرسری ملاقات کر لی جائے اور جگہ بھی دیکھ
لی جائے۔ ضرورت کے وقت جگہ تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا۔

چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اپنے اسسٹنٹ جگدیش سے کہا۔

"جگدیش جی! میں گنپتی راگھو جی کے مندر میں ماتھا ٹیکنے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں
آجاؤں گا"

جگدیش بولا۔

"دھرم ویر جی! میرے لئے پرشاد ضرور لیتے آنا۔"

میں نے کہا۔

"ضرور لیتا آؤں گا۔"

میں فوجی ہیڈ کوارٹر کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ سوامی جی نے اپنے جا
کا جو ایڈریس دیا تھا میں ٹیکسی لے کر وہاں پہنچ گیا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ ناگ پ
کون سا علاقہ تھا۔ اپنے جس جاسوس کے پاس جانا تھا اس کی دکان بازار کے شروع
تھی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کی دکان کس چیز کی تھی۔ بس یوں سمجھ لیں
ایک دکان تھی اور وہاں روز مرہ ضروریات کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ میں دکان
داخل ہو گیا اور الماری اور شیلف کے خانوں میں لگی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ ساتھ
کنکھیوں سے میں نے دیکھ لیا کہ ایک دبلا پتلا سانولے رنگ کا آدمی کونے میں کاؤنٹر
پیچھے کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ یقیناً یہی دکان کا مالک تھا اور اپنا خاص جاسوس ت
اس وقت اس کے پاس کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چیزوں کو دیکھتا ا
کے پاس آکر رک گیا۔ میں اس کا ہندوانہ نام بھی نہیں بتاؤں گا۔ آپ فرضی نام رکھ لیں
چلئے گھنشام رکھ لیں۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مہاراج! مجھے گھنشام جی سے ملنا ہے"

اس آدمی نے اخبار کے اوپر سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا۔

"میں ہی گھنشام ہوں۔ کیا کام ہے تمہیں؟"

میں نے کاؤنٹر پر اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر کہا۔

"میں مالا پورم کا شکاری ہوں"

گھنشام پر میرے اس خفیہ کوڈ جملے کا بظاہر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے نظریں اخبار
جمالیں اور آہستہ سے پوچھا۔

"مالا پورم میں برکھا تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"مالا پورم میں برفباری ہوئی ہے"

اس نے اخبار پڑھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تمہارے پیچھے لکڑی کا زینہ اوپر کوٹھڑی میں جاتا ہے۔ اوپر جا کر میرا انتظار کرو۔"

میں پیچھے ہٹ گیا اور الماریوں میں رکھی چیزوں کو دیکھتا ہوا پیچھے مڑا۔ سامنے لکڑی کا
تنگ زینہ اوپر جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے زینہ چڑھنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ اوپر
کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا میں نے اسے کھولا اور اندر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ کوٹھڑی کی
سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو کھلی تھی۔ اس پر سفید پردہ گرا ہوا تھا۔ وہاں سے
دن کی ابر آلود دھندلی روشنی کوٹھڑی میں آ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا تخت بچھا ہوا
تھا۔ ادھر ادھر دکان سے متعلق اشیائے ضرورت کونے میں پڑی تھیں۔ بانس کی دو پرانی
کرسیاں بھی تھیں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کوئی پانچ سات منٹ کے بعد گھنشام اوپر آگیا۔
میرے سامنے تخت پوش پر بیٹھتے ہی بولا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہاں آتے ہوئے تمہیں کسی نے نہیں دیکھا؟ کوئی
مشکوک شخص تمہارا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟"

میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی آدمی میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا"

"ہوں۔"

پھر اس نے میرا نام دھرم ویر لیا اور بولا۔

"کچھ روز پہلے سوامی جی نے ایک آدمی کے ہاتھ مجھے تمہارے بارے میں
سب کچھ بتا کر بھیج دیا تھا۔ وہ کل اچانک ناگ پور یاترا پر کیوں آئے ہیں؟ کیا
تمہیں معلوم ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ وہ صرف مجھے حفاظت سے ناگ پور تک پہنچانے
آئے تھے"

گھنشام کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ عمر ساٹھ کے قریب ہو گی۔ چہرے پر ذہانت کی چمک تھی۔ کہنے لگا۔

"یہ انہوں نے بڑا اچھا کیا۔ تم لوگوں نے پانڈی چری میں دشمن کے جہازوں کو غرق کر کے بڑا کارنامہ کیا ہے۔ اس کے بعد تمہارا اکیلے ناگ پور آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔"

مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص کو میرے اور کمانڈو اورنگ زیب کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ سوامی جی کو عین وقت پر تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے کیپٹن جوشی کے ٹارچر چیمبر سے فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ ورنہ کیپٹن جوشی ایسے قصاب کے ہاتھوں تمہارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمارے دو کشمیری کمانڈوز کو ٹارچر کر کے ہلاک کر چکا ہے۔"

میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ اپنے اس خاص جاسوس کو ناگ پور کی ایک معمولی سی دکان میں بیٹھے بیٹھے دشمن کی تمام سرگرمیوں کا علم تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"تم میجر شرت دیوان کے پاس ہوتے ہو۔ وہاں سے تمہیں بھارتی فوج کے ٹاپ سیکرٹ منصوبوں کا پتہ چل سکتا ہے۔ راجدھانی دلی سے ہمارے آدمی نے ایک ہفتہ پہلے ہمیں اطلاع دی تھی کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کرنے کا پروگرام تیار کر لیا ہے۔ وہ پاکستان کو مظلوم کشمیریوں کی سیاسی اور اخلاقی مدد دینے کے جرم میں سزا دینا چاہتا ہے۔ کیا اس بارے میں تمہیں کچھ خبر ہے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے ملٹری انٹیلی جینس کی ٹاپ سیکرٹ فائل میں خود پڑھا ہے کہ انڈیا نے پاکستان پر سرحد کی تین چار طرف سے اچانک حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہوا ہے۔ مگر مجھے ابھی تک پاکستان پر بھارت کے حملے کی تاریخ اور وقت

معلوم نہیں ہو سکا۔"

گھنشام نے کہا۔

"اس کا معلوم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے اگر انڈیا نے پاکستان پر حملہ کیا تو یہ کھلی جنگ ہو گی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے کشمیری مجاہدین کے خلاف بھی کھلی جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا اور ان کے ٹھکانوں پر فوج کے پورے پورے بریگیڈ حملہ کریں گے اور ان کے ساتھ مارٹر توپیں بھی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں اسی لئے میجر شرت کے ساتھ دھرم ویر بن کر رہ رہا ہوں۔ مجھے جیسے ہی پاکستان پر بھارتی حملے کی تاریخ کا سراغ ملا میں فوراً ہی کمانڈو شیروان کو وائرلیس پر سری نگر اطلاع کر دوں گا۔"

گھنشام نے کہا۔

"تمہیں اگر کسی وقت میری ضرورت پڑے تو میری دکان پر آنے کی بجائے مجھے ٹیلی فون کر دینا۔ اپنا فون نمبر میں تمہیں لکھ کر دیئے دیتا ہوں۔ دن کے وقت ٹیلی فون میرے پاس نیچے دکان میں ہوتا ہے رات کو میں اسی کوٹھڑی میں سوتا ہوں اس وقت میں ٹیلی فون اوپر کوٹھڑی میں لے آتا ہوں۔"

گھنشام نے ایک کاغذ پر مجھے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا اور کہنے لگا۔

"میں تمہیں ہر قسم کی دھماکہ خیز چیزیں تیار کر کے دے سکتا ہوں۔ میں اس کام کا ماہر ہوں۔"

میں نے کہا۔

"سوامی جی نے مجھے بتا دیا تھا"

گھنشام کہنے لگا۔

"اب تم جاؤ اور اشد ضرورت کے وقت ہی مجھے فون کرنا۔ اور فون پر

کہنا کہ میں بالا جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب میں کہوں کہ میں ہی بالا جی بول رہا ہوں تو تم کہنا کہ میں ملا پورم کا شکاری ہوں۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ پھر تمہیں جو بات کرنی ہو گی وہ فون پر نہیں کرو گے۔ فون پر صرف ہماری فوری ملاقات کا وقت طے ہو گا۔ سمجھ گئے ہو!"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ سمجھ گیا ہوں"

"اب تم خاموشی سے نیچے اترو اور دکان سے نکل جاؤ۔"

میں اٹھا۔ دروازہ کھول کر زینے پر سے ہوتا ہوا دکان میں آگیا۔ دکان میں ایک ملازم ٹائپ کا لڑکا ایک گاہک عورت کو کوئی شے دکھا رہا تھا۔ میں سر جھکائے خاموشی سے اس کے قریب سے گزرتا ہوا بازار میں اتر گیا۔ بازار میں آیا تو دیکھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے ایک رکشا لے لیا اور فوجی کینٹین پر واپس آگیا۔ راستہ میں میں نے ایک حلوائی کی دکان پر رکشا کھڑا کیا اور میٹھی بوندیوں کے دو دونے لے کر رکھ لئے۔ میں نہیں بھولا تھا کہ جگدیش مجھ سے گنپتی رگھو جی کے مندر کا پرشاد ضرور مانگے گا۔ کینٹین میں جا کر میں نے بوندیوں کا ایک ڈونا دے کر کہا۔

"یہ لو جگدیش رگھو جی کے مندر کا پرشاد۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی عقیدت سے پرشاد لیا اور بوندیاں کھاتا ہوا اپنے کام میں لگ گیا۔ اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شام کو زور کی بارش شروع ہو گئی۔ میں کینٹین کے کام سے فارغ ہو کر دوسرے کپڑے بدل کر میجر شرت کے آفیسرز ہوسٹل کی طرف چل پڑا۔ بوندیوں کا ڈونا میں نے لفافے میں ڈال کر ساتھ رکھ لیا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔ کینٹین سے میجر شرت کا کمرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ راستے میں صرف کوارٹر گارڈ کا کمرہ ہی آتا تھا۔ میجر شرت کے کمرے میں

شراب و کباب کی محفل لگی ہوئی تھی۔ مگر صرف دو آدمی تھے۔ میجر شرت اور ملٹری انٹیلی جینس کور کا سکھ کیپٹن دونوں ایک ایک پیگ پی چکے تھے اور ہلکے ہلکے سرور میں تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور لفافے میں سے ڈونا نکال کر میجر شرت کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! میں آج گنپتی رگھو جی کے مندر میں ماتھا ٹیکنے گیا تھا۔ آپ کے لئے پرشاد لایا ہوں۔"

میجر شرت نے بڑی عقیدت سے ڈونا لے کر اپنے ماتھے سے لگایا اور اردلی سے کہا۔

"اسے سنبھال کر رکھ لو۔ ہمیں ڈنر کے ساتھ دینا نہ بھولنا۔"

اردلی ڈونا لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سکھ کیپٹن مجھے گھور کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے بظاہر اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ سکھ کیپٹن بولا۔

"دھرم ویر! یہ تمہاری گال پر زخم کا لمبا نشان کہاں سے آگیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میجر شرت دیوان نے ہنس کر کہا۔

"دھرم دیر ورنگل کے مندر میں ماتھا ٹیکنے گیا تھا۔ وہاں ہنومان جی کو اس پر پیار آگیا۔ انہوں نے پنجہ مار دیا۔"

سکھ کیپٹن گلاس منہ کے ساتھ لگا کر ہلکے ہلکے گھونٹ بھر رہا تھا۔ میں نے گال سہلاتے ہوئے کہا۔

"میرا بھائی بھی ساتھ تھا۔ ان کی طرف کوئی بندر نہیں گیا تھا۔"

میجر شرت بولا۔

"ارے تمہارے چچا کا پتر ہنومان جی کو برا لگا ہو گا۔"

میں اس سکھ کیپٹن کی طرف سے محتاط ہو گیا۔ حالانکہ ایسی کسی بات کا امکان نہیں تھ
کہ ملٹری انٹیلی جینس کے سکھ کیپٹن کو پتہ چل گیا ہو کہ میرے گال پر جو زخم کا لمبا نشان ہے وہ پانڈی چری کے ٹارچر چیمبر میں کیپٹن جوشی کے نشتر لگانے سے پڑا ہے۔ پھر بھی ایک کمانڈو سپاہی کی حیثیت سے میرا محتاط ہونا لازمی تھا۔ وہاں بیٹھے رہنے کا بہانہ میں نے ڈھونڈ رکھا تھا کہ میں گلاس میں موقع پا کر تھوڑی شراب ڈال دیتا تھا۔ کسی کا گلاس
ہوتا تو میں جلدی سے اس میں برف کے دو چار ٹکڑے ڈال کر دوسرا پیگ تیار کر دیتا
اس رات بھی میں دیر تک شرت دیوان کے کمرے میں شراب کی محفل میں بیٹھا رہا
شاید وہ کوئی فوجی سیکرٹ کی بات کریں۔ کیونکہ شراب کے نشے میں چاہے کتنا محتاط کیوں
ہو اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی بات ضرور نکل جاتی ہے۔ مگر اس رات دونوں عورتوں

باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے پانڈی چری کے جہازوں کی تباہی اور پاکستان پر بھارت کے متوقع حملے کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ کھلی کھڑکیوں میں سے بارش کی آواز بھی آ رہی تھی اور بارش میں بھیگی ہوئی جنوبی ہند کی ٹھنڈی ہوا بھی آ رہی تھی۔ میں میجر شرت کے لئے تیسرا پیگ بنا رہا تھا کہ سکھ کیپٹن نے بھنے ہوئے مرغ کی ٹانگ چباتے ہوئے اس سے کہا۔

"پانڈی چری کی نیول انٹیلی جینس کے سب افسروں کا کورٹ مارشل ہونا چاہئے کہ اتنا خطرناک کمانڈو ان کی قید سے فرار ہو گیا اور وہ سوئے پڑے رہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میجر شرت دیوان سگار سلگا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ اس قدر نا اہل لوگ ہیں کہ ابھی تک وہ مفرور کمانڈو کو پکڑ بھی نہیں سکے۔ پانڈی چری کی پولیس میں بھی سب گدھے بھرتی ہوئے ہیں۔"

سکھ کیپٹن بولا۔

"ہمارا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ان جہازوں میں اسرائیل کی طرف سے ہمیں دیئے گئے جدید قسم کے اعلیٰ ترین راڈار بھی تھے۔ کانگریس کی حکومت بھی منہ دیکھ رہی ہے۔ کچھ نہیں کرتی۔ ہماری اسرائیلی حکومت کے آگے بھی سخت بدنامی ہوئی ہے۔"

میجر شرت کو میں نے دوسرا گلاس بنا کر دے دیا تھا۔ وہ اس کے گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس میز پر رکھ کر کہنے لگا۔

"تم دیکھ لینا ہفتے کی رات کو اسرائیل کے جرنیلوں کو ہم ڈنر دے رہے ہیں وہ سب سے پہلے ہمارے جنرل گھماپا سے یہی سوال کریں گے کہ ہمارے جہازوں کا سکیورٹی کا انتظام اتنا کمزور کیوں رکھا گیا تھا کہ کمانڈوز آ کر بڑی آسانی سے دونوں جہاز غرق کر گئے۔ میں تو ڈنر میں نہیں ہوں گا مگر میں اپنے جنرل صاحب کے سیکرٹری کو ضرور سمجھا دوں گا کہ وہ ہماری آرمی کی انٹیلی جینس کے نام پر حرف نہ آنے دے اور اسرائیلی جرنیلوں کو ڈنر میں کسی طرح یہ بات بتا دے کہ یہ حادثہ نیول انٹیلی جینس کی غفلت سے ہوا ہے۔"

سکھ کیپٹن کہنے لگا۔

"نہ یار یہ نہ سمجھانا اسے۔ اس سے ہماری ہی فوج کی بدنامی ہو گی۔"

میجر شرت نے سگار کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"ایک بات ہے۔ اسرائیل ہمارا بہترین دوست ہے اس وقت۔ چاہے وہ اس وجہ سے ہی کیوں نہ ہو کہ وہ پاکستان کا دشمن ہے۔"

سکھ کیپٹن نے کہا۔

"سر! ہمیں تو اس وقت زیادہ سے زیادہ اسلحہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے سیکرٹ آپریشن اب زیادہ دور نہیں ہیں"

میجر شرت نے کہا۔

"ڈونٹ وری امریک سنگھ! اسرائیل ہمارے نقصان کو پورا کر دے گا۔ اس کے تین اہم ترین جرنیل اسی مقصد کے لئے بھارت آ رہے ہیں اور ہفتے کی میٹنگ میں وہ ہمیں یہی بتانے والے ہیں کہ بھارت کو مزید اسلحہ بھیجا جائے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ کی ایمونیشن سپلائی بھی نیویارک کی بندرگاہ سے چل پڑی ہے۔"

سکھ کیپٹن کا نام امریک سنگھ تھا۔ وہ جھلا کر بولا۔

"یہ ہماری ہائی کمانڈ پاکستان پر حملے کا ٹائم اور ڈیٹ ہمیں کیوں نہیں بتا رہی؟"

میجر شرت نے کہا۔

"اصل میں ہائی کمانڈ نے تاریخ اور وقت مقرر کر لیا ہوا ہے۔ ہمیں آخری وقت پر بتایا جائے گا۔"

سکھ کیپٹن نے پاکستان کے خلاف دو چار باتیں کیں اور تیسرا پیگ غٹا غٹ ختم کر دیا۔ میں اس کے لئے چوتھا پیگ بنا رہا تھا کہ میجر شرت نے اردلی کو آواز دے کر کہا کہ کھانا لگا دیا جائے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"دھرم ویر تم بھی کھانا کھا کر ہی جانا"

اب ان دونوں کو نشہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا اور انہوں نے عورتوں کے بارے میں بڑی فحش باتیں شروع کر دی تھیں۔ مجھے یہاں سے ایک بڑی اہم خبر مل گئی تھی جو ایک

سیکرٹ خبر تھی۔ اب میرا رکنا بے کار تھا۔ چنانچہ میں نے میجر شرت سے کہا۔

"بھیا! ورنگل سے شاید بڑے بھائی کا ٹیلی فون آجائے۔ اس لئے جاتا ہوں"

وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کھانا اردلی تمہیں کمرے میں پہنچا دے گا۔ جاؤ میرے دھرم ویر۔ تم سچ مچ میرے دھرم کے ویر ہو۔"

پھر اس نے سکھ کیپٹن کی طرف متوجہ ہو کر نشے میں سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے کہا۔

"امریک سنگھ! اس لڑکے دھرم ویر نے ہم پر احسان کیا ہے کہ ہم اس کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ یہ میری بہن کو ڈاکوؤں کے غار سے نکال کر لے آیا۔ یہ بڑا بہادر لڑکا ہے۔ اسے تو فوج میں کیپٹن ہونا چاہئے تھا۔"

سکھ کیپٹن صرف میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ میں تھوڑی دیر بعد وہاں سے نکل آیا۔ کیونکہ اب انہوں نے فوجی امور سے ہٹ کر عورتوں کے بارے میں اور خاص طور پر دوسرے آفیسرز کی بیویوں کے بارے میں باتیں کرنی شروع کر دی تھیں اور تجربے نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ اس وقت تک عورتوں ہی کی باتیں کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ نشے میں دھت نہیں ہو جاتے۔ سکھ کیپٹن کے ساتھ میجر شرت بھی زیادہ پی جاتا تھا۔

میں آفیسر ہوسٹل سے نکلا تو باہر بارش ہو رہی تھی۔ اگرچہ بارش موسلا دھار نہیں تھی مگر برابر ہو رہی تھی۔ جنوبی اور وسطی ہند کی بارشیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میں بارش میں بھیگتا دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس وقت میرے دماغ میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اسرائیلی فوج کے تین ٹاپ کے جرنیل بھارت کو مزید اسلحہ فراہم کرنے کے موضوع پر بات چیت کرنے اور بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کو پاکستان کے خلاف حملے کی سٹریٹجی بتانے ناگ پور پہنچ رہے تھے۔ ہفتے کی رات کو انہیں کسی جگہ ڈنر دیا جا رہا تھا جہاں یہ ساری باتیں طے ہونی تھیں۔ میجر شرت دیوان کی گفتگو سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اسرائیل کے یہ تینوں جرنیل پاکستان پر حملہ کرنے کے وقت بھارت میں موجود ہوں

گے پاکستان پر حملے کے سلسلے میں بھارتی جرنیلوں کی مدد کریں گے۔ اس ڈنر میں بھارتی فوج کے بھی تین ٹاپ کے جرنیل شرکت کر رہے تھے۔ میں نے اس مقام کو طاقتور دھماکے سے اڑانے کا ارادہ کر لیا تھا جہاں پاکستان کے چھ دشمن جرنیل جمع ہو کر پاکستان کی سلامتی کے خلاف منصوبہ بندی کرنے والے تھے۔

ابھی ہفتے کے دن میں دو دن باقی تھے۔ مجھے جو کچھ بھی تیاریاں کرنی تھیں ان دو دنوں کے اندر اندر ہی کرنی تھیں۔ مجھے اس وقت اپنے خاص آدمی کا خیال آگیا جو گھنشام کے نام سے ناگ پور شہر میں مقیم تھا اور جس سے میں اسی روز ملاقات کر چکا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن میں وقت نکال کر فوجی کینٹین سے نکلا اور گھنشام کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک میڈیکل سٹور سے اسے فون پر بتایا کہ میں آ رہا ہوں۔ بڑی ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے فوجی کینٹین سے فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اس خیال سے کہ کینٹین فوجی ہیڈ کوارٹر کے اندر ہی ہے ہو سکتا ہے یہاں سے باہر جانے والی فون کال چیک ہوتی ہو۔ گھنشام نے فون پر کہا۔

"آجاؤ میں انتظار کر رہا ہوں"

میں اس کی دکان میں پہنچا تو وہ حسب معمول اخبار پڑھ رہا تھا مگر اس نے مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس کا ملازم دو تین گاہکوں کو کچھ چیزیں دکھا رہا تھا۔ اس نے اخبار کے اوپر سے نظریں میری طرف اٹھائیں اور اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ میں لکڑی کا زینہ طے کر کے اوپر والی کوٹھڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں گھنشام بھی آگیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور کہا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"

وہ بولا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہفتے کی رات کو ناگ پور کی ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے اسرائیلی جرنیلوں کو

ڈنر دیا جا رہا ہے اس ڈنر میں بھارت کو اسرائیل اور امریکہ سے ملنے والے اسلحہ کی بھاری کھیپ کی بات بھی طے ہو گی اور بھارتی فوج کے تین ٹاپ کے جرنیلوں کو اسرائیلی فوجی جرنیل پاکستان کے خلاف حملہ کرنے کی حکمت عملی بھی بتائیں گے اس ڈنر میں پاکستان کے دشمن چھ ایسے فوجی جرنیل ایک جگہ جمع ہوں گے جو پاکستان کو شدید ترین میں نقصان پہنچا سکتے ہیں میں ان چھ کے چھ پاکستان دشمن جرنیلوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں اور انہیں ایک ساتھ ہلاک کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ جہاں وہ میٹنگ کر رہے ہوں میں اس جگہ کو دھماکے سے اڑا دوں۔ دھماکہ اس قدر طاقتور اور ہلاکت خیز ہونا چاہیے کہ وہاں بیٹھے ہوئے اسرائیل اور بھارت کے جرنیلوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟"

گھنشام خاموش تھا۔ وہ سر جھکائے کسی سوچ میں تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جس کمرے میں یہ خفیہ فوجی میٹنگ ہونے والی ہے تم اس کمرے کا جائزہ لے کر مجھے بتا سکو کہ اس کمرے کی کھڑکیاں کتنی ہیں۔ اس میں دروازے کتنے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے یہ میٹنگ شہر کے سب سے ماڈرن ہوٹل میں ہو رہی ہے۔ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں پہلے اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی میٹنگ ہوگی۔ اس کے بعد بڑے ہال میں ڈنر دیا جائے گا۔"

گھنشام نے کہا۔

"یہ بہت ضروری ہے کہ جس کمرے میں ان جرنیلوں کی میٹنگ ہونے والی ہے تم مجھے ایک دن کے اندر اندر اس کمرے کی ساری کھڑکیوں دروازوں کے بارے میں پوری رپورٹ دو۔"

میں نے پوچھا۔

"کھڑکیوں اور دروازوں کے بارے میں تم کیوں زیادہ پوچھ رہے ہو؟ ہمیں تو بم لگانا ہے۔ کہیں بھی لگا سکتے ہیں کمرے میں۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ چھ کے چھ دشمن جرنیلوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے تو مجھے کل شام تک اس کمرے کی پوری تفصیل سے آگاہ کرو جہاں یہ لوگ بیٹھ کر پاکستان کے خلاف فوجی منصوبہ بندی کرنے والے ہیں۔ اب تم جاؤ۔ میں تمہارے بعد نیچے اتروں گا۔"

میں اٹھ کر نیچے اتر آیا۔ سارا راستہ سوچتا رہا کہ یہ کیسے پتہ چلایا جائے کہ جرنیلوں کی میٹنگ کس ہوٹل کے کس کمرے میں ہو گی۔ ابھی تک مجھے یہ بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ میٹنگ کس ہوٹل میں ہو رہی ہے۔ اس کے اس کمرے کا سراغ لگانا تھا جہاں ان جرنیلوں کی میٹنگ ہو گی۔ ظاہر ہے وہاں سیکورٹی کے انتہائی سخت انتظامات ہوں گے اور بات بے حد خفیہ رکھی جائے گی کہ میٹنگ ہوٹل کے کس کمرے میں ہونے والی ہے۔

لیکن مجھے ہر حالت میں دونوں کا سراغ لگانا تھا۔

اور میرے پاس اس کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور یہ میجر شرت دیوان تھا۔ میجر شرت دیوان ملٹری انٹیلی جینس کی سپیشل ڈیفنس برانچ کا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر کا سینئر آفیسر تھا۔ اسے ضرور معلوم ہو گا کہ اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی مجوزہ میٹنگ کس ہوٹل میں اور ہوٹل کے کس کمرے میں ہونے والی ہے۔ کیونکہ اس کی سیکورٹی کے انتظامات کی ذمے داری اسی پر ہو گی۔

میں دوپہر تک فوجی کینٹین میں اپنی ڈیوٹی بھی دیتا رہا اور ذہن میں منصوبہ بندی بھی کرتا رہا۔ دوپہر کو کھانے کے ٹائم پر میں میجر شرت کے پاس آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے کمرے میں آ کر کرتا ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اور وردی میں ہی تھا۔ صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"دھرم ویر! تم نے بڑا اچھا کیا جو آ گئے آج میں نے خاص ویشنو کھانا بنوایا ہے تم اسے پسند کرو گے۔"

میں نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھیا جی! آج میرا بھی کینٹین پر کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سوچا آج بھیا کے پاس جا کر کھانا کھاؤں گا۔"

"ونڈر فل!"

اس نے اردلی کو آواز دی کہ دو آدمیوں کا کھانا لگا دے۔ اس نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم اخبار پڑھو۔ اتنی دیر میں ذرا ایک فائل دیکھ لوں۔"

میں اخبار کھول کر پڑھنے لگا۔ میں اخبار کے کنارے سے میجر شرت دیوان کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بریف کیس میں سے ایک سیاہ رنگ کی فائل نکالی اور اسے کھول کر فائل کے اندر لگے ہوئے کاغذوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک کاغذ پر نظریں جما دیں۔

اخبار انگریزی کا تھا۔ میجر شرت بڑے انہماک سے فائل پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی وردی کی اوپر والی جیب سے پنسل نکال کر کاغذ پر کچھ لکھا اور ورق الٹ دیا۔ میں نے اخبار نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا! لگتا ہے دفتر میں آج کل کام زیادہ ہے جو آپ فائل ساتھ لے آئے ہیں"

میجر شرت مسکرانے لگا۔ بولا۔

"کیا بتاؤں بھیا دھرم ویر! فوج کے انٹیلی جینس کے محکمے میں گدھے کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے ملک سے فوج کا کوئی معمولی سا افسر بھی آ جائے تو ہمیں مصیبت پڑ جاتی ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر جمائی لیتے ہوئے بظاہر بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

"کیا باہر سے کوئی فوجی افسر آ رہا ہے؟"

وہ فائل پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"ارے دھرم ویر کوئی معمولی افسر ہوتا تو میں یہ کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کر دیتا
پورے تین جرنیل آ رہے ہیں باہر سے۔ بھگوان کرے سارا کام خیر خیریت سے ہو جائے"

میں نے یونہی بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! تم بہت کام کرتے ہو۔ بھارت کو تم ایسے سپوتوں پر واقعی ناز ہے۔ لیکن ان
جرنیلوں کو نئی دلی راجدھانی میں جانا چاہیے تھا۔ راجدھانی کی مصیبت ہم پر کیوں ڈالی جا
رہی ہے بھیا؟"

میجر شرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم سویلین ہو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔"

میں نے میجر شرت سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! ان لوگوں کی سیکورٹی دیکھ بھال کر کرنا۔ مجھے تو ہر وقت تمہاری فکر رہتی ہے۔
تم میرے بڑے بھائی ہی ہو۔"

میجر شرت نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بڑی محبت سے کہا۔

"دھرم ویر! تو کیا میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی نہیں سمجھتا۔ تم فکر مت کرو۔ جس ہوٹل
میں ان جرنیلوں کو ڈنر دیا جائے گا وہاں سیکورٹی کے ایسے سخت انتظامات ہوں گے کہ کوئی
پرندہ بھی اپنا شناختی کارڈ دکھائے بغیر ہوٹل کے اوپر سے نہیں گزر سکے گا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔ آخر باہر سے آئے ہوئے فوجی ہمارے مہمان ہیں۔ اور بھارت
ورش تو اپنے مہمانوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ مگر بھیا اس شہر ناگ پور میں تو چھوٹے
چھوٹے ہوٹل ہیں۔ ان جرنیلوں کو ڈنر اپنے آفیسرز میس میں ہی دینا چاہیے تھا۔"

میجر شرت دیوان نے فائل بند کر کے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھیا! ہم یہ ڈنر ناگ پور شہر کے سب سے اعلیٰ اور ماڈرن ہوٹل اشوکا میں
دے رہے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔

"گڈ! واقعی یہ ہوٹل بہت شاندار ہے میں بھول ہی گیا تھا۔ میں اس کے قریب سے
دو تین بار گاڑی میں گزرا ہوں۔"

اتنے میں اردلی نے آ کر کہا۔

"کھانا لگا دیا ہے صاحب!"

ہم کھانے کی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے بڑے طریقے سے اشوکا ہوٹل کے
موضوع کو جاری رکھا اور میجر شرت سے کہا۔

"بھیا! ہوٹل کے سٹاف کی کڑی جانچ پڑتال کرنا۔ ان میں دشمن کا کوئی جاسوس بھی
ہو سکتا ہے"

میجر شرت نے اپنی پلیٹ میں دہی ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھیا دھرم ویر! مجھے ان باتوں کا بڑا تجربہ ہے۔ ہم نے اپنے آدمیوں کا انتظام کیا
ہے۔ اس روز ہوٹل کے ملازموں کی جگہ انٹیلی جینس کے فوجی بیروں اور دوسرے سروس
کرنے والوں کے لباس میں ہوں گے۔"

میں نے میجر شرت کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

"بھیا! یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔ سچ کہتا ہوں مجھے اپنے بھیا پر بڑا ناز ہے۔ میرا
بھائی واقعی بھارت کا لائق فوجی افسر ہے۔"

پھر میں نے جس طرح چھوٹے بھائی بڑے بھائی کے آگے ضد کرتے ہیں اس طرح
ضد کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! میں نے اندر سے اشوکا ہوٹل کبھی نہیں دیکھا۔ کیا اس روز مجھے بھی ساتھ
نہیں لے چلو گے؟ میں اشوکا ہوٹل اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں"

میجر شرت بولا۔

"نہیں دھرم ویر! اس روز میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ وہاں بڑی سخت
سیکورٹی ہو گی۔ ہاں۔ کل صبح میں ہوٹل کے ان کمروں کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں جہاں
ہمارے مہمان جرنیل ڈنر کھائیں گے اور بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ کل تم میرے ساتھ چلے

چلنا"

قدرت نے میری مدد کر دی تھی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ بہ
مشکل مسئلہ تھا جسے میجر شرت دیوان نے خود ہی حل کر دیا تھا۔ میں نے اب فوراً موضو
بدل دیا اور میجر شرت کی والدہ کی علالت کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

"ماتا جی کو دیکھنے کو بڑا من چاہتا ہے بھیا! سوچتا ہوں اگلے ہفتے ماتا کی خبر لی
چھنڈواڑی جاؤں"

میجر شرت نے کہا۔

"ضرور چلنا۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ ماتا جی اب بہت بوڑھی ہو گ
ہیں۔ لیکن شکنتلا ان کا بڑا خیال رکھتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"شکنتلا ایسی بیٹی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے بھیا۔ بھگوان اس کی رکھشا کرے۔

اپنے کمرے میں آکر میں بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔ میجر شر
نے کہا تھا کہ صبح ٹھیک آٹھ بجے وہ مجھے فوجی کینٹین سے لے لے گا۔

دوسرے روز میں جلدی فوجی کینٹین پر آگیا۔ ٹھیک آٹھ بجے میجر شرت کی فو
گاڑی آگئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور گاڑی شہر کے بڑے ہوٹل اشوکا کی جانب روانہ
گئی۔ اشوکا ہوٹل ناگ پور میں نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ یہ تین منزلہ بڑی جدید قسم کی خوبصور
عمارت تھی۔ سامنے ایک خوبصورت کشادہ سرسبز لان تھا۔ ہماری گاڑی پارکنگ میں کھڑ
ہو گئی۔ میجر شرت دیوان اپنی فوجی وردی میں تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹے رینک کے
فوجی افسر بھی اپنی وردیوں میں تھے۔ ہوٹل کی لابی میں اشوکا ہوٹل کا مینجر ہمارا انتظار کر
تھا۔ وہ ہمیں لے کر ڈنر ہال میں آگیا۔ میجر شرت اور دوسرے فوجی افسروں نے پور
ہال کا معائنہ کیا۔ پردوں کو ہٹا کر دیکھا۔ کھانے کی لمبی میز کا جائزہ لیا۔ پھر ہوٹل کے مینج
کچھ ضروری ہدایات دیں اور وہاں سے ہم ہوٹل کی دوسری منزل میں بذریعہ لفٹ آ
جہاں ڈنر سے پہلے اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی خاص میٹنگ ہونی تھی۔ میجر شرت ا

اس کے ساتھی فوجی افسر اس کمرے کا بھی معائنہ کرنے میں لگ گئے۔ لیکن سب سے
زیادہ میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے کھڑکیوں کو دیکھا۔ کمرے کی کل تین کھڑکیاں
تھیں جو نیچے لان کی جانب کھلتی تھیں۔ کمرے کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازے سے
ہم داخل ہوئے تھے۔ دوسرا دروازہ بند تھا جو کسی دوسرے کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ میجر
شرت نے ہوٹل مینجر سے کہا۔

"یہ تینوں کھڑکیاں بند رہیں گی اور یہ دوسرا دروازہ بھی بند رہے گا۔ مین دروازے
پر ہمارے آدمی تعینات ہوں گے۔"

ہوٹل کے مینجر نے بڑے ادب سے انگریزی میں کہا۔

"ایسا ہی ہو گا سر! ہم ان کھڑکیوں کو اور اس دروازے کو لاک کر دیتے ہیں۔"

میجر شرت نے انگریزی میں کہا۔

"ابھی لاک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی فنکشن میں دو دن باقی ہیں۔ فنکشن
والے دن ہمارے آدمی خود آکر سارا بندوبست کریں گے۔"

اس کے بعد ہم نیچے آگئے۔ میں میجر شرت کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے
بڑے فخر سے پوچھا۔

"کیوں دھرم ویر؟ کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"بھیا! میں بہت مطمئن ہوا ہوں۔ ہماری انٹیلی جینس دنیا کی سب سے بہترین ملٹری
انٹیلی جینس ہے۔"

میجر شرت دیوان خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے جو دو فوجی افسر چل
رہے تھے وہ بھی میری یہ بات سن کر مسکرائے۔ یہاں سے ہم واپس رجمنٹل ہیڈ کوارٹر میں
آگئے۔ میجر شرت نے مجھے فوجی کینٹین کے باہر اتار دیا۔

کوئی ایک گھنٹہ میں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ جگدیش
سے کہا۔

"جگدیش بھیا! کل سے میرے پیٹ میں گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ میں وید جی سے دوائی لینے شہر جا رہا ہوں تم پیچھے خیال رکھنا"

جگدیش بولا۔

"بھیا تم اپنے میڈیکل سٹور سے دوائی کیوں نہیں لے لیتے۔ مفت مل جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بھیا! مجھے وید جی کی آیور ویدک دوائی سے ہی آرام آتا ہے۔ ابھی آجاؤں گا۔"

فوجی رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے نکل کر میں سیدھا دوسرے بازار والے شاپنگ سنٹر میں گیا۔ وہاں سے میں نے خفیہ کوڈ میں گھنشام کو فون کر کے بتایا کہ میں نے ضروری معلومات حاصل کرلی ہیں۔ میں آرہا ہوں۔ اس نے کہا۔

"آجاؤ۔ اسی طرح سیدھا اوپر چلے جانا"

تھوڑی دیر بعد میرا رکشا اپنے خاص مجاہد جاسوس گھنشام کی دکان کے باہر پہنچ گیا۔ میں دکان کے اندر داخل ہو کر زینہ چڑھ کر اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت گھنشام ایک خاتون گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وا بھی اوپر آگیا۔ میں نے اسے اس کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ کہنے لگا۔

"کھڑکیوں اور دروازوں کا رنگ کیسا تھا؟"

میں نے یاد کیا اور کہا۔

"کھڑکیوں اور دروازوں کا رنگ نسواری تھا۔"

وہ بولا

"ٹھیک ہے۔ یہ میٹنگ کس روز ہو رہی ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میٹنگ ہفتے کی رات کو ہوگی۔ وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی دو دن باقی ہیں۔ لیکن ایک کام تمہیں ایک روز پہلے جا کر وہار

رنا ہو گا۔"

میں نے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ۔ میں وہ کام ایک روز پہلے جا کر کروں گا۔"

گھنشام چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔

"وقت تھوڑا ہے۔ تمہارا کام مشکل ہو گا۔ مجھے بھی کچھ ضروری چیزیں تیار کرنی ہیں ر میں آج رات انہیں تیار کرلوں گا۔ تم ایسا کرو۔ آج رات کے پچھلے پہر بلکہ صبح صبح یری دکان پر آجاؤ میں جاگ رہا ہوں گا اور دکان کا دروازہ اندر سے کھلا ہو گا۔ باقی باتیں ں اسی وقت کروں گا۔ اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

میں اس آگیا۔ رات کو بستر پر لیٹنے سے پہلے پچھلے پہر کا الارم لگا دیا۔ گھڑی نے منہ دھیرے ٹھیک چار بجے مجھے جگا دیا۔ میں نے بنیان قمیض پتلون اور ربڑ کے فلیٹ شوز نے اور آہستہ آہستہ جوگنگ کرتا سیر کرنے کے بہانے فوجی ہیڈ کوارٹر کے گیٹ سے نکل یا۔ گیٹ پر پہرے دینے والے سارے گارڈ مجھ کو پہچانتے تھے۔ اب کوئی مجھے آنے انے سے نہیں روکتا تھا۔ میں سڑک پر کچھ دور تک جوگنگ کرتا گیا۔ جب دوسری سڑک ر گھومتے ہی میں نے دوڑنا بند کر کے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ سے مجھے خالی یکسی مل گئی۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ سڑکوں کی بتیاں روشن تھیں۔ ٹیکسی لے کر میں گھنشام ی دکان والے بازار کی نکڑ پر ہی اتر گیا۔

بازار بند تھا۔ ایک دو آدمی سیر کرتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔ میں نے ھنشام کی دکان کا دروازہ آہستہ سے اندر کو دھکیلا۔ وہ کھلا تھا۔ اندر جا کر میں نے دروازہ ند کر کے کنڈی لگا دی۔ اوپر سیڑھیوں پر سے گھنشام کی آواز آئی۔

"آجاؤ"

میں کمرے میں گیا تو بجلی کے بلب کی روشنی میں میز پر کچھ چیزیں پڑی دیکھیں۔ ان یں تین چوڑے سائز کی سکاچ ٹیپیں بھی تھیں۔ لکڑی کا ایک چوکور ڈبہ پڑا تھا۔ گھنشام پائی پر میز کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے

نسواری رنگ کی سکاچ ٹیپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اسے تم عام سکاچ ٹیپ سمجھ رہے ہو گے"

میں نے کہا۔

"لگتی تو یہ عام سکاچ ٹیپ ہے"

گھنشام بولا۔

"شاید تمہیں یقین نہ آئے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس پچیس گز لمبی سکاچ ٹیپ میں اتنی طاقت ہے کہ یہ تمہارے اشوکا ہوٹل کا پورا بلاک دھماکے سے اڑا سکتی ہے۔"

میں حیران سا ہو کر سکاچ ٹیپ کو دیکھنے لگا جو گھنشام نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"یہ دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ میں نے پہلے سے تیار کر کے رکھی ہوئی تھی۔ ہمارے مجاہدوں کو کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لیکن آج رات میں نے اسے ایک خاص کیمیکل میں ڈال کر اس کی طاقت کو تین گنا زیادہ کر دیا ہے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ ہوٹل کے جس کمرے میں اسرائیلی اور بھارتی جرنیل میٹنگ کرنے بیٹھیں گے اس کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کی چوکھٹوں پر اوپر سے لے کر نیچے تک یہ سکاچ ٹیپ چپکا دینا۔ جیسا کہ تم نے بتایا تھا اگر کھڑکیاں اور دروازوں کا رنگ نسواری ہے تو یہ سکاچ ٹیپ چوکھٹوں کے ساتھ چپکی ہوئی کسی کو نظر نہیں آئے گی اور اس میں ایسے کیمیکل ملا دیئے گئے ہیں ڈی ٹیکٹر اسے ڈی ٹیکٹ نہیں کر سکتا۔ بظاہر یہ بالکل عام سکاچ ٹیپ ہے لیکن جب اس کا دھماکہ ہو گا تو ہو سکتا ہے ہوٹل کے کمرے سمیت پورا بلاک اڑ جائے کمرے میں اتنی شدید آگ بھڑک اٹھے گی کہ اسے بجھانا مشکل ہو جائے گا۔ اس آگ میں کمرے میں بیٹھا ہوا ہر شخص آن کی آن میں جل کر کوئلہ بن جائے گا۔"

میں نے گھنشام سے سوال کیا۔

"لیکن یہ سکاچ ٹیپ بم پھٹے گا کیسے اور کس وقت؟ میرا مطلب ہے اس کو کا ڈیٹو کہاں ہو گا؟"

گھنشام نے لکڑی کا ڈبہ کھولا۔ اس میں سے پلاسٹک کا ایک لفافہ رکھا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر اس میں سے شیشے کی ایک نلکی نکالی جس کے گرد نسواری رنگ کی باریک تار لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے تار تھوڑی سی کھول کر مجھے دکھائی۔ یہ تار ریشم کے ریشے سے بھی زیادہ باریک تھی۔ گھنشام نے کہا۔

"اسے کھینچ کر دیکھو"

میں نے اسے تھوڑا سا کھینچا۔ اس نے کہا۔

"اور زور سے کھینچو"

میں نے زیادہ زور سے کھینچا مگر تار بالکل نہ ٹوٹی۔ گھنشام بولا۔

"یہ تار فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ تار مجھے کہاں لگانی ہو گی؟"

گھنشام نے کہا۔

"یہی وہ تار ہے جس کے ذریعے کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں سے چپکی ہوئی طاقتور سکاچ ٹیپ دھماکے سے پھٹ کر وہاں قیامت مچائے گی۔ اس تار کو تمہیں کسی ایک کھڑکی کی چوکھٹ سے چسپاں کرنا ہو گا کہ نظر نہ آئے ویسے میں نے اسی لئے اس تار کا رنگ بھی ٹیپ اور کھڑکیوں کے رنگ کے ایسا نسواری رکھا ہے۔ کھڑکی کی سکاچ ٹیپ کے ساتھ اسے چپکا کر اس کا ایک سرا تم نیچے کسی ایسی جگہ لٹکا دو گے جہاں نیچے سے تمہارا ہاتھ تار تک پہنچ جائے۔ جس وقت کمرے میں دشمن کے جرنیلوں کی میٹنگ جاری ہو گی تو تم کسی بھی طریقے سے اس تار کو نیچے لٹکتے ہوئے سرے کو پکڑ کر زور سے کھینچو گے۔ بس تمہارا صرف اتنا ہی کام ہو گا۔ تار کے کھینچنے سے اوپر سکاچ ٹیپ پر لگے ہوئے دھماکہ خیز کیمیکلز کو ہلکا سا جھٹکا لگے گا اور ان کیمیکلز کے عمل روم عمل ایکشن ری ایکشن کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس چین ری ایکشن کو ایک خاص پوائنٹ تک پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگیں گے اور تمہارے تار کھینچنے کے صرف پندرہ منٹ بعد سکاچ ٹیپ مواد دھماکے

سے پھٹ جائے گا۔ اس کے دھماکے دوسری کھڑکیوں اور دروازوں پر لگی ہوئی سکاچ ٹیپ
کا مواد بھی دھماکوں سے پھٹ جائے گا۔ یوں وہ کمرہ سارے کا سارا ہوا میں بکھر جائے گا
اور وہاں سوائے آگ کے شعلوں کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے تم اس کی
تکنیک کو سمجھ گئے ہو گے۔"

تکنیک مشکل نہیں تھی مگر اس دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کا کمرے کی کھڑکیوں اور
دروازوں کی چوکھٹوں کے ساتھ چسپاں کر کے اس کے ایک سرے کو کھڑکی کے باہر لٹکانا
اور پھر میٹنگ شروع ہو جانے کے بعد وہاں آکر تار کو نیچے سے جھٹکے کے ساتھ کھینچنا' یہ
سارا عمل میرے لئے ایک آزمائش طلب کام تھا۔ اس میں میرے ہوٹل کے اردگرد اور
ہوٹل کے اندر دیکھے جانے کا سو فیصد امکان تھا اور دھماکے سے پہلے میرا وہاں دیکھا جانا
میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے سکاچ ٹیپ اور نسواری تار کی ٹکی لے کر ایک کپڑے میں لپیٹی اور کپڑے کو
اپنی بنیان کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا اور گھنشام سے کہا۔

"میں اپنی جان پر کھیل کر بھی یہ کام کروں گا۔ اب میں جاتا ہوں اگر زندہ رہا تو
واپس آکر تم سے ضرور ملوں گا۔ اگر پکڑا گیا تو پھر میرا کہا سنا معاف کر دینا۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے اترا اور دکان سے باہر آکر سڑک پر دونوں ہاتھ ورزش
کرنے کے انداز میں ہلاتے ہوئے تیز تیز چل پڑا۔ جیسے میں صبح کی سیر کر رہا تھا۔ اس وقت
صبح ہو گئی تھی اور چوک میں کچھ اور لوگ بھی سیر کرتے نظر آئے۔ میں نے چوک میں جا
کر رکشا لیا اور فوجی ہیڈ کوارٹر سے ایک چوک پیچھے ہی اتر گیا۔ یہاں سے میں آہستہ آہستہ
جوگنگ کرتا' بازو ورزش کرنے کے انداز میں ہلاتا فٹ پاتھ پر سے ہوتا ہوا فوجی ہیڈ کوارٹر
کے گیٹ میں سے گزر گیا۔

اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر گیٹ پر موجود ڈیوٹی گارڈ کو کسی طرح
معلوم ہو جائے کہ میری کمر کے گرد اس قدر دھماکہ خیز مواد بندھا ہوا ہے کہ اگر وہ پھٹ
جائے تو سارے فوجی ہیڈ کوارٹر کے پرخچے اڑا سکتا ہے تو وہ لوگ مجھے وہیں گولیوں سے

بھون ڈالیں میں چپکے سے اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے کمر کے گرد لپٹے ہوئے رومال کو
کھولا اور دھماکہ خیز ٹیپ اور نسواری تار کی چھوٹی سی ٹکی کو اسی رومال میں لپیٹ کر کمرے
میں میز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا۔

اب میرے سامنے اس کمانڈو آپریشن کا سب سے اہم اور سب سے خطرناک مرحلہ
تھا یعنی اس سکاچ ٹیپ بم کو ہوٹل کے اس کمرے میں جا کر کھڑکیوں دروازوں کی چوکھٹوں
سے چپکانا جہاں ہفتے کی رات کو اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی میٹنگ ہونے والی تھی اور
پھر کسی ایک کھڑکی کی چوکھٹ سے چپکائی ہوئی دھماکہ خیز ٹیپ کے ساتھ نسواری تار کو لگانا
اور اس کے سرے کو کھڑکی سے باہر کسی ایسی جگہ پر لٹکا دینا جہاں نیچے سے میں میٹنگ
شروع ہونے کے بعد تار کے سرے کو کھینچ سکوں۔ یہ ان حالات میں بظاہر ایک ناممکن کام
نظر آتا تھا کہ جب میرے پاس کسی قسم کا بھیس بدلنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ اور میں
یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل کا کوئی ملازم مجھے وہاں وقوعہ سے پہلے چلتا پھرتا دیکھے۔

شام تک میرا ذہن اسی ادھیڑبن میں لگا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ شام
ہو گئی۔ میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ دوسرے
دن رات کو ہوٹل میں جرنیلوں کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی رات کو
کرنا تھا۔ کیونکہ ایک بات طے تھی کہ میں یہ کام اپنے محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر
وسائل کے باعث دن کی روشنی میں نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ مجھے
رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح ہوٹل کے کمرے میں جا کر یہ ساری کارروائی
کرنی ہو گی۔ اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار نظر نہیں آرہا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔
میرے پاس صرف ایک رات باقی رہ گئی تھی اور یہ آخری رات ہی تھی۔

میں نے رات کا کھانا کمرے میں ہی کھایا۔ جگدیش کینٹین میں ہی تھا۔ میں اسے
ضرور بتا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ میں فلم کا آخری شو دیکھنے جا رہا
ہوں۔ اگر بھیا شرت جی میرا پوچھیں تو انہیں کہہ دینا کہ میں فلم دیکھنے گیا ہوا ہوں۔ وہ

"میں بھی چلتا ہوں۔ دونوں اکٹھے فلم دیکھیں گے۔ میرا کام بس ختم ہی ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے میری ایک گرل فرینڈ میرے ساتھ جا رہی ہے"

جگدیش قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"پھر تو تمہیں اکیلے ہی جانا چاہیے۔"

جگدیش کو یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تارے کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور تھوڑی دیر پہلے ہلکی سی بارش ہو کر رکی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ مجھے اسی لمحے ہیڈ کوارٹر کے احاطے سے نکل کر رات بارہ بجے تک واپس آجانا تھا تاکہ گیٹ پر موجود ڈیوٹی گارڈ کو یقین ہو جائے کہ میں واقعی فلم کا آخری شو دیکھنے ہی گیا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ صندوق میں سے ایک پرانی سی نسواری رنگ کی قمیض اور ہلکے گرے رنگ کی ٹی شرٹ پہن لی تاکہ رات کو میں دور سے نمایاں طور پر نظر نہ آسکوں۔ پاؤں میں ربڑ کے فلیٹ شو تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی پستول میں اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ نہ چاقو ساتھ لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے کام پستول کی گولی فائر کئے اور چاقو سے کسی کی گردن کاٹے بغیر خاموشی اور پر امن طریقے سے کرنا تھا۔ سکاچ ٹیپ اور نسواری تار کی نلکی میں نے رومال میں لپیٹ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لی تھی۔ پتلون کی پچھلی جیب میں کمرے کی چابی کا چھلا اور پچیس تیس روپے کی انڈین کرنسی تھی۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور کمرے کو تالا لگا کر سر جھکائے بڑے مزے مزے سے کوارٹر کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ گیٹ پر ملٹری پولیس کے دو سپاہی پہرے پر کھڑے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر انہیں نمسکار کیا اور کہا۔

"میں فلم کا سیکنڈ شو دیکھنے جا رہا ہوں۔ بارہ ایک بجے آؤں گا۔"

ان میں سے ایک فوجی نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب"

وہ سب جانتے تھے کہ میں میجر شرت دیوان کا بھائی دھرم ویر ہوں۔ یہ فوجی ویسے بھی میرے پاس فوجی کینٹین میں راشن وغیرہ لینے آتے جاتے رہتے تھے۔

میں گیٹ کے باہر آکر فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ مجھے اتنی جلدی نہیں تھی۔ اپنا کام یعنی کمانڈو ایکشن بلکہ کمانڈو آپریشن مجھے رات ذرا گہری ہو جانے کے بعد شروع کرنا تھا اور اس دوران اشوکا ہوٹل سے دور دور ہی رہنا تھا۔ ناگ پور کے بازاروں میں ابھی خوب رونق تھی۔ میں زیادہ ہجوم والی جگہوں پر جا کر خوامخواہ لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ایک پارک میں آکر بیٹھ گیا۔ رات بڑی خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ پارک میں دور دور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ بوندا باندی بھی نہیں ہو رہی تھی مگر لگتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دو گھنٹے بعد بارش شروع ہو جائے۔ بارش میں میں اپنا اشوکا ہوٹل والا کمانڈو آپریشن زیادہ محفوظ ہو کر کر سکتا تھا۔ کیونکہ بارش میں لوگ کمروں سے باہر نہیں نکلتے۔

کافی دیر تک میں پارک کے بنچ پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اٹھا اور اشوکا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا یہ ہوٹل کہاں پر واقع ہے۔ میں آرام آرام سے چل رہا تھا۔ مجھے کوئی اتنی جلدی نہیں تھی۔ ایک دو بارونق چوراہوں پر سے گزرنے کے بعد میں ایک نسبتاً خالی سڑک پر آگیا۔ اس سڑک کی ایک جانب جھیلوں والا باغ تھا۔ یہ جھیلیں قدرتی تھیں۔ اس کے اردگرد ناگ پور کی سٹی کارپوریشن نے ماڈرن قسم کا باغ بنا دیا تھا جہاں بچوں کا بڑا پارک بھی تھا۔ اس باغ کی دوسری جانب اشوکا ہوٹل کی بلڈنگ تھی۔ چلتے چلتے میں باغ کی دوسری جانب نکل آیا۔ میں نے ایک جگہ رک بائیں جانب دیکھا۔ درختوں کے پیچھے مجھے اشوکا ہوٹل کی تین منزلہ عمارت تھوڑی تھوڑی نظر آرہی تھی۔ اشوکا ہوٹل کے تین بلاک تھے جو ایک دوسرے سے الگ الگ بنے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ

ماڈرن ہوٹل تھا اس لئے یہاں عام ہوٹلوں کی طرح زیادہ روشنیاں نہیں لگی تھیں۔ کمروں
کے اندر پھر دھیمی روشنیاں ہوتی تھیں۔ بلاک کے آگے کھمبوں پر ڈیکوریشن لائیٹس ضرور
لگی ہوئی تھیں۔ مگر چونکہ برسات کے موسم میں روشنی کے بلب پر پروانے وغیرہ بہت
زیادہ آتے ہیں اس لئے ہر بلاک کے آگے ایک کھمبا چھوڑ کر دوسرے کھمبے کی روشنی بجھا
دی جاتی تھی۔ ایسا برسات کے موسم میں رات کو ناگ پور شہر کی بڑی سڑکوں پر ایک کھمبا
چھوڑ کر مرکری لائیٹ بجھا دی جاتی تھی۔ بھارت کے وسطی علاقوں میں جنگلوں پہاڑوں اور
ندی نالوں کا ایک طویل اور پیچ دار سلسلہ پھیلا ہوا تھا چنانچہ ایک تو یہاں بارشیں دیر تک
ہوتی رہتی تھیں اور دوسرے یہاں برسات کے موسم میں مچھر پروانے اور دوسرے
حشرات الارض بے شمار ہوتے تھے۔

میں اشوکا ہوٹل کے پیچھے جو سڑک جاتی تھی وہاں پر آکر ایک جگہ اندھیرے میں
کھڑے ہو کر ہوٹل کے اس بلاک کا دور سے جائزہ لینے لگا جس کی دوسری منزل کے
کمرے میں مجھے کمانڈو آپریشن کے لئے جانا تھا۔ یہ ہوٹل کا نمبر تین بلاک تھا۔ دوسری
منزل کا کمرہ جو میرا ٹارگٹ تھا کونے والا کمرہ تھا۔ اسی طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس
میں ایک فوارہ لگا تھا۔ فوارے کا پانی لڑیوں کی شکل میں اچھل کر نیچے گرتا مجھے دور سے
چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں کونے میں ہوٹل کی دیوار کے ساتھ کوئی بلب روشن نہیں
تھا۔ کیونکہ اس کی روشنی کمروں کی کھڑکیوں پر پڑ کر کمروں میں رہائش پذیر لوگوں کی نیند
میں خلل ڈال سکتی تھی اس لئے ہوٹل کے کسی بلاک کی دیوار پر باہر کی جانب کوئی لائٹ
نہیں لگائی گئی تھی۔ صرف سامنے کچھ فاصلے پر کھمبوں پر مرکری لائٹیں لگی تھیں جن کی
روشنی بلاک کے کمروں تک آتی آتی مدھم پڑ جاتی تھی۔

جہاں میں چھپ کر کھڑا تھا وہاں سے مجھے اپنا ٹارگٹ صاف نظر نہیں آرہا تھا مگر مجھے
معلوم تھا کہ مجھے کس طرف سے ہوٹل کی گارڈینا کی باڑ پھلانگ کر ہوٹل کے احاطے میں
داخل ہونا ہے۔ اتنی دیر میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں دل میں دعا کرنے
لگا کہ یا اللہ بارش تیز ہو جائے گی۔ اس طرح جس کو باہر نکلنا بھی ہو گا وہ باہر نہیں نکلے

اور مجھے اپنے مشن کی تکمیل میں آسانی ہو جائے گی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب
ہوٹل کے مطلوبہ بلاک کی طرف گہری خاموشی چھا گئی ہے اور اب شاید ہی اس طرف کسی
کا آنا ہو تو میں اندھیرے سے نکل کر اپنے ہدف کی طرف چل پڑا۔ ہوٹل کے احاطے کی
دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ ماڈرن قسم کی فیشن ایبل ڈیزائن کی دیوار تھی جس پر
تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہندوؤں کے مندروں کی طرح کی چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی
تھیں۔ ایک جگہ سے میں نے دیوار پھلانگی اور آگے گارڈینا کی جھاڑیوں والی دیوار کی
اوٹ میں آکر جھک کر ہوٹل کے بلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ آگے چھوٹا سا باغیچہ تھا جس
کے وسط میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ فوارے کے گول چبوترے کے اردگرد تین چار
روشنیاں لگی تھیں اس کے سوا وہاں اور کہیں بجلی کا بلب یا ٹیوب لائٹ نہیں جل رہی
تھی۔ میں جھاڑیوں کی دیوار کے پیچھے جھک کر چلتا اندھیرے میں بلاک سے کوئی بیس فٹ
کے فاصلے پر آکر وہیں بیٹھ گیا۔

میں نے گہری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا۔ دوسرے یعنی درمیانے بلاک کی طرف لابی
میں روشنی ہو رہی تھی اور سامنے ایک دو کاریں کھڑی تھیں۔ لابی میں ایک دو آدمی ادھر
ادھر حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ سامنے والا باغیچہ بھی خالی تھا اور جس جگہ میں چھپا ہوا
تھا وہ باغیچہ بھی خالی پڑا تھا۔ میں نے اوپر نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گرمیوں کا موسم ہونے کی
وجہ سے تقریباً ہر سویٹ یا کمروں میں ائیر کنڈیشنر چل رہے تھے جس کی وجہ سے کمروں کی
تمام کھڑکیاں بند تھیں کسی کسی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی جس کی دھیمی چمک کھڑکی
کے شیشوں اور پردوں کے پیچھے سے دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری منزل والے جس
کمرے میں مجھے جانا تھا اس کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی اور کھڑکی پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔
یہ بات میرے حق میں بڑی اچھی تھی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کمرے کی دیوار کو
بڑے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ دیوار کے ساتھ دو کمروں کی کھڑکیوں کے درمیان مجھے
اوپر تک دیوار پر ایک بیل چمٹی ہوئی نظر آئی۔ مجھے اس بیل کے پاس پہنچنا تھا۔ بوندا باندی
اب ہلکی بارش میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور دور

دور تک علاقہ خالی پڑا تھا۔ میں جھک کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا بلاک کی طرف تیزی سے دوڑا اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے آہستہ آہستہ آگے کی جانب کھسکنا شروع کر دیا۔ سات آٹھ قدم چلنے کے بعد میں اس جگہ پہنچ کر رک گیا جہاں ایک پھولدار بیل نیچے سے اوپر تک دیوار کے ساتھ چمٹی ہوئی چلی گئی تھی۔ یہ بیل اوپر میرے مطلوبہ کمرے کے قریب سے ہو کر اوپر والی تیسری منزل کی جانب چلی گئی تھی۔

میں نے بیل میں ہاتھ ڈال کر اس کی شاخوں کو ٹٹولا۔ اچانک میرا ہاتھ لوہے کے پائپ پر پڑا۔ یہ لوہے کا پائپ تھا جو اوپر چھت پر سے بارش کا پانی نیچے گٹر میں پہنچانے کے لئے لگایا گیا تھا۔ شاید یہ بیل اس پائپ کو چھپانے کے لئے ہی لگائی گئی تھی۔ مجھے اپنا راستہ صاف ہوتا نظر آیا۔ بیل کی شاخیں نازک تھیں مگر پائپ مضبوط تھا۔ بیل کی شاخیں مجھ پر صرف اتنی مہربانی کر سکتی تھیں کہ جب اوپر چڑھنے لگوں تو مجھے اپنے اندر چھپا لیں۔ ایک بار پھر میں نے دائیں بائیں تیز نگاہوں سے دیکھا۔ جب وہاں کوئی آدمی نظر نہ آیا تو میں بیل میں گھس گیا۔ پائپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ بیل کی شاخوں پر بارش کے جو قطرے گر رہے تھے وہ سر پر اور کبھی کبھی آنکھوں پر بھی پڑ رہے تھے۔ میں سنبھل سنبھل کر پائپ کے گرد لگے گول کلمپوں کو اوپر سے پکڑتا اور نیچے ان پر پاؤں جماتا آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی منزل اوپر جانا تھا۔ میں نے دوسری منزل والی مطلوبہ کھڑکی کے پاس پہنچ کر بائیں ہاتھ سے اسے اندر کو دھکیلا۔

کھڑکی اندر سے بند تھی۔

میں نے پریشان سا ہو کر دائیں جانب دیکھا۔ دائیں جانب کی کھڑکی ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔ اس کمرے کی صرف دو ہی کھڑکیاں تھیں اسے اندر کو دھکیلا تو وہ بھی اندر سے بند کی گئی تھی۔ اچانک میری نگاہ کھڑکی سے ذرا آگے پڑی۔ یہاں روشنی بہت دھندلی دھندلی تھی۔ اور یہ روشنی نیچے کچھ فاصلے پر باغیچے کی باڑہ کے ساتھ کھمبے پر لگی ٹیوب کی روشنی کی تھی۔ میں نے بیل کی شاخوں کو ایک طرف تھوڑا سا ہٹا کر غور سے دیکھا۔ یہاں دیوار پر ایک کھلی جگہ تھی۔ شاید یہاں آکر کمروں کے ساتھ ساتھ جانے والی راہ داری

کوریڈار ختم ہوتی تھی۔ میں نے بیل کے اندر سے ایک پاؤں نکال کر دیوار سے ذرا سی باہر نکلی ہوئی گھر یعنی بنی پر رکھا۔ ہاتھ سے کھڑکی کی چوکھٹ کو پکڑا اور پھر دوسرا پاؤں بھی دیوار کی گھر یعنی باہر نکلی ہوئی بنی پر رکھا اور کھڑکی کے ساتھ چمٹ گیا۔ یہاں میں نیچے سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہاں زیادہ دیر تک میں کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ چمٹا راہ داری کے خلا کی طرف کھسکنے لگا۔ جہاں راہ داری کا چوکور شگاف تھا اس کے قریب آتے ہی میں نے اچھل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ میرے ہاتھ راہ داری کی دیوار کی منڈیر پر جم گئے۔ دوسرے لمحے میں نے ٹانگیں دیوار کے اوپر ڈالیں اور میں راہ داری میں اترتے ہی وہیں بیٹھ گیا۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنی آسانی سے میں نے لکھا ہے۔ اس کے پیچھے میری انتہائی سخت کمانڈو ٹریننگ بھی کام کر رہی تھی۔ راہ داری میں دور تک وال ٹو وال کارپٹ بچھا تھا اور چھت میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ چھوڑ کر دھیمے دھیمے بلب روشن تھے۔ یہ کوریڈار میں دن کے وقت بھی دیکھ چکا تھا جب میں میجر شرت دیوان کے ساتھ اس کمرے کی سیکورٹی کا جائزہ لینے آیا تھا۔ میں اپنے مطلوبہ کمرے یعنی ٹارگٹ کے دروازے کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ یہاں ہوٹل کا کوئی بھی ملازم کسی بھی وقت آ سکتا تھا یا کسی کمرے کے اندر سے نمودار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جیب سے لوہے کی تار نکال کر کمرے کے دروازے پر لگے تالے کے سوراخ میں ڈالی اور اسے خاص طریقے سے تین چار مرتبہ دائیں بائیں گھمایا۔ یہ ایسا طریقہ تھا کہ اس پر عمل کرنے سے دروازے کے اندر لگا ہوا کوئی بھی تالا کھل جاتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی سی کوشش کے بعد دروازے کا تالا کھل گیا۔ میں جلدی سے کمرے میں گھس گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے ہی تالا اپنے آپ لگ گیا۔

کمرے میں پہلے تو اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر کمرے کی بند کھڑکیوں کے آگے پڑے سفید ریشمی پردوں میں سے باہر کی ہلکی ہلکی دھندلی روشنی اندر آنے لگی۔ میں نے کمرے کو غور سے دیکھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں مجھے میجر شرت دیوان دن کے وقت اپنے

ساتھ لایا تھا اور جہاں دوسرے دن رات کو اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی۔ میجر شرت نے مجھے بتایا تھا کہ یہ میٹنگ فوجی ہیڈ کوارٹر کے آفیسر میس میں اس لئے نہیں رکھی گئی کہ فوج کی ہائی کمانڈ اس میٹنگ میں طے ہونے والے امور کے بارے میں سوائے چند ایک ملٹری انٹیلی جینس کے افسروں کے سوا اور کسی فوجی افسر کو کچھ معلوم نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ ان امور کو جو ظاہر ہے پاکستان کے خلاف کئے جانے والے جارحانہ حملے کے بارے میں ہی تھے انتہائی خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ اہم ترین سیکرٹ میٹنگ کسی ہوٹل کے کمرے میں ہو۔ کمرے میں لمبی میز پڑی تھی۔ اسی طرح میز کے گرد منقش چمکیلی کرسیاں لگی تھیں۔ جب مجھے اپنی پوری تسلی ہو گئی کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں اگلی رات کو فوجی افسروں کی خفیہ میٹنگ ہونے والا ہے تو میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

میں نے کمر کے گرد لپٹی ہوئی دھماکہ خیز ٹیپ نکالی۔ سب سے پہلی کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹا دیا۔ میں نے دیکھا کہ ٹیپ کا نسواری رنگ کھڑکی کے گہرے براؤن رنگ جیسا ہی تھا۔ دونوں میں رنگ کا ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔ میں نے چوکھٹ کو ٹٹول کر بھی او نظروں سے بھی غور سے دیکھا اور ٹیپ کھول کر ایک طرف اوپر سے لے کر کھڑکی کے نیچے والی چوکھٹ تک چپکا دی۔ ٹیپ ایسی تھی کہ چوکھٹ سے چپکنے کے بعد بالکل چوکھٹ کے ساتھ مل گئی۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی ٹیپ لگ ہوئی ہے۔ اسی طرح میں نے کھڑکی کی دونوں جانب دھماکہ خیز ٹیپ چپکا دی۔ پھر سفید ریشمی پردے کو کھول کر برابر کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسری کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ اسی طرح دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ چپکا دی۔ اب میں عقبی دروازے کی طرف بڑھا دروازے پر چنٹ والا سفید ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کو ہٹانے کی بجائے میں پردے کے اندر چلا گیا اور سکاچ ٹیپ کو کھول کر تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ٹیپ ختم نہ ہو جائے مگر ابھی کافی ٹیپ پڑی تھی۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ اوپر سے لے کر نیچے تک دھماکہ خیز ٹیپ چپکا دی۔ اس کے بعد میں کمرے کے صد

دروازے کی طرف آ گیا۔ یہاں دروازے پر کوئی پردہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے دروازے کی دونوں جانب چولوں کے ساتھ اوپر سے نیچے تک سکاچ ٹیپ بڑی مہارت سے چپکا دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے نیم اندھیرے میں چہرہ قریب کر کے اور ٹیپ کو اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ٹیپ بالکل لکڑی کی چوکھٹ اور چولوں کے ساتھ ایک جان ہو گئی تھی اور رنگ بھی دروازے کے رنگ کے ساتھ مل گیا تھا۔

دھماکہ خیز ٹیپ صرف آدھی انچ کے قریب بچ گئی تھی۔ میں نے اسے بھی مین دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ہی اندر کی طرف چپکا دیا۔ کیونکہ ہمارے مجاہد اور خاص آدمی جس کا فرضی نام میں نے گھنشام آپ کو بتایا ہے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس ٹیپ پر چاقو یا قینچی مت لگانا۔ اس کو ہاتھ سے کھینچ کر توڑنے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ ایسا کرو گے تو تباہ کن دھماکہ بعد میں ہونا ہو گا وہ اسی وقت ہو جائے گا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کھڑکی کی طرف آ گیا جس کی چوکھٹ پر لگی ٹیپ کے ساتھ مجھے باریک تار چپکا کر تار کو کھڑکی کے باہر لے جانا تھا۔ یہ کھڑکی اندر سے چٹخنی چڑھا کر بند کی گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کی چٹخنی اتاری اور اس کا ایک پٹ ذرا سا اندر کی جانب کھول دیا۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ ساتھ ہی مجھے ہلکی بارش کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کی چوکھٹ کے کونے میں وہ چپکی دھماکہ خیز نسواری ٹیپ کے اوپر باریک تار کو رکھا اور جیب سے دوسری عام سکاچ ٹیپ نکال کر اس کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑا اور تار کے اوپر اچھی طرح سے چپکا دیا۔ یہ فالتو عام ٹیپ کا چھوٹا رنگ میں اپنے ساتھ لایا تھا اور اس ٹیپ کا رنگ بھی دھماکہ خیز ٹیپ جیسا یعنی نسواری تھا۔ میں نے باقی تار نلکی پر سے کھولی اور اسے بیل کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف پھینک دیا۔ یہ کام ختم ہو گیا تھا اور اب مجھے وہاں سے واپس دیوار والے پائپ کے ذریعے نہیں بلکہ ہوٹل کے اندر سے ہو کر جانا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پٹ بند کر کے چٹخنی دوبارہ لگا دی۔ دونوں کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کا معائنہ کیا۔ عقبی دروازے کی ٹیپ کو بھی غور سے دیکھا۔ یہ ٹیپ چوکھٹوں کے ساتھ اس طرح چپک گئی تھی کہ روشنی میں بھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ کمرے

کے بڑے دروازے کی طرف آکر میں نے لوہے کے تار سے دروازے کے تالے کو آہ
سے کھولا۔ پھر دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر راہ داری میں جھانک کر دیکھا۔ ر
داری دور تک خالی تھی۔ میں جلدی سے باہر آگیا اور دروازے کو اپنی طرف تھوڑا زور
کر کھینچا۔ دروازہ بند ہوا اور ساتھ ہی اس کا قفل بھی لگ گیا۔

میں نے راہ داری پر نگاہ ڈالی۔

راہ داری خالی تھی۔ لیکن ہوٹل کا کوئی بھی ملازم وہاں کسی طرف سے نمودار ہو سکتا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک کمرے کے باہر دیوار کے ساتھ ایک ٹرالی لگی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ٹرالی کے پاس آگیا۔ ٹرالی پر کچھ برتن پڑے تھے۔ شاید بیرا برتن وہاں رکھ کر کمرے میں دوسرے برتن لینے یا کسی دوسری طرف گیا ہوا تھا۔ میں ٹرالی کو پکڑ کر راہ داری میں چل پڑا۔ ٹرالی کو میں چلائے لئے جا رہا تھا۔ میں نے سر نیچے کو ڈال رکھا تھا کہ اگر سامنے سے کوئی آئے بھی تو ایک تو مجھے بیرا سمجھے اور دوسرے میری شکل کو نہ دیکھے۔ میں اپنا چہرہ ہوٹل والوں سے ہر حالت میں چھپانا چاہتا تھا۔ میں راہ داری کے دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ فائر سٹیر کیس تھا۔ یعنی آگ لگنے کی صورت میں ہنگامی طور پر نیچے اترنے کا راستہ تھا۔ میں نے ٹرالی وہیں چھوڑی اور دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ یہ سیڑھیاں نیچے جس دروازے تک لی گئی تھیں وہ پیچھے اسی باغیچے میں جا کر کھلتا تھا جہاں سے میں گزر کر آگے گیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر کھلی فضا میں نکل آیا۔ اب بارش باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔

مجھے ابھی ایک ضروری کام کرنا تھا۔ مجھے اس تار کو دیکھنا تھا جو میں نے اوپر والے کمرے سے نیچے لٹکائی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری منزل کے اس کمرے کے نیچے آکر دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا جس کی کھڑکی میں سے میں نے باریک تار نیچے لٹکائی تھی۔ یہاں نیم اندھیرا تھا۔ تار مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دیوار والے پائپ کے

ساتھ چمٹی بیل میں ہاتھ ادھر ادھر مار کر دیکھا۔ تار میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ سے تار کو بیل کے اندر اس طرح چھپا دیا کہ وہ دن کی روشنی میں بھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ میرا کمانڈو مشن آدھے سے زیادہ مکمل ہو گیا تھا۔ اب میں وہاں ایک سیکنڈ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ میں دوڑ کر گارڈینیا کی جھاڑیوں کی دیوار کے پاس گیا اور جس طرح وہاں آیا تھا اسی طرح جھک کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوٹل کی عقبی دیوار کے پاس آیا اور وہاں سے دوسری طرف سڑک پھلانگ گیا۔

دوسری طرف اترتے ہی میں وہیں بیٹھا رہا۔ تیز نگاہوں سے چھوٹی سڑک کے دونوں طرف دیکھا۔ سڑک پر کھمبوں پر لگی ٹیوب لائیٹس کی روشنی میں بارش گرتی نظر آ رہی تھی۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میں جس رومال میں دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ لپیٹ کر لایا تھا اسے کمر کے گرد سے کھول کر منہ صاف کیا۔ رومال کو پتلون کی جیب میں ڈالا اور سڑک پر ناریل کے درختوں کے نیچے نیچے واپس چل پڑا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بہت ہی محدود وسائل کے باوجود میں سارا کام اتنی خوش اسلوبی اور تیزی سے بغیر کسی رکاوٹ کے سرانجام دے کر آ گیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اشوکا ہوٹل کی عقبی سڑک پر سے ہوتا ہوا میں بڑی سڑک پر آ گیا۔ سڑک بارش میں بھیگ رہی تھی۔ کسی کسی وقت سڑک پر سے کوئی گاڑی سڑک پر ٹھہرا ہوا پانی ادھر ادھر چھینکتی گزر جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا ٹائم ہو گا۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ چوک میں ایک جگہ بس سٹاپ کا شیڈ بنا ہوا تھا۔ میں بارش سے بچنے کے لئے اس شیڈ میں آ کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ دور پیچھے اشوکا ہوٹل کی تھوڑی تھوڑی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اب مجھے کل رات اس وقت یہاں آنا تھا جب ہوٹل کے تیسرے بلاک کی دوسری منزل والے خاص کمرے میں اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی خفیہ میٹنگ ہو رہی ہو گی۔ اس وقت مجھے کسی طریقے سے چھپ کر میٹنگ والے کمرے کے نیچے پہنچ کر بیل کی شاخوں میں چھپائی گئی باریک تار کو جھٹکے سے کھینچنا تھا۔ اس کے بیس منٹ بعد قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ دوسری منزل کے کمرے کو اڑ جانا تھا۔ مجھے پیچھے سے ایک موٹر رکشے کی آواز آئی۔ میں

بس شیڈ سے باہر نکل آیا۔ ایک رکشا چلا آ رہا تھا۔ اس کی لائیٹ جل رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ خالی تھا یا نہیں۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ رکشا میرے قریب آ کر رک گیا۔ میں رکشے میں بیٹھ گیا اور اسے اس چوراہے میں چلنے کو کہا جو فوجی ہیڈ کوارٹر سے دو تین بلاک چھوڑ کر تھا۔ رکشا چل پڑا۔ تین چار لمبی سڑکوں پر سے ہوتا ہوا رکشا چوک میں پہنچا تو میں نے اسے پیسے دیئے اور اتر کر پیدل ہی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چلنے لگا۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ یہ موسلا دھار بارش نہیں تھی مگر جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر پہنچا تو دیکھا کہ گیٹ پر جو لوہے کے لمبے پائپ لگا کر بنایا گیا تھا بند تھا۔ اس کی ایک جانب سیکورٹی گارڈ کا فوجی لمبی برساتی پہنے رائفل کندھے سے لگائے اٹن شن کھڑا تھا۔ گیٹ کے اوپر کافی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ میں گیٹ کے قریب گیا تو سیکورٹی گارڈ نے مجھے ہالٹ کہا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! میں دھرم ویر ہوں۔ میجر شرت جی کا چھوٹا بھائی۔ فلم کا آخری شو دیکھنے گیا تھا۔ کوئی ٹیکسی رکشا ہی نہیں ملا۔"

سیکورٹی گارڈ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے لوہے کا پائپ اوپر اٹھا دیا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے پائپ دوبارہ نیچے کر دیا اور بارش میں اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ میں جلدی جلدی اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ کمرے کے دروازے پر آ کر چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کیا اور پلنگ پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے میں انتہائی خطرناک علاقے سے جان بچا کر نکل آنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

فوراً گیلے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنے۔ کمرے میں حبس تھا۔ کھڑکی کھول دی۔ بتی میں جلتی چھوڑ گیا تھا۔ بتی بجھائی اور چھت کا پنکھا چلا کر پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بس اب میں سو جانا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو بالکل بند کر دیا اور نیند کی طرف خیال لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ صبح عین وقت پر میری آنکھ کھلی گئی۔ ناشتہ میں نے کچن میں بنا کر کیا۔ اور فوجی کینٹین میں اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ جگدیش وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میری طرف دیکھ کر شرارت سے

مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"دھرم ویر جی! رات کیسی گزری؟ فلم دیکھنے میں تو بڑا مزا آیا ہو گا۔ فلم کیا دیکھی گی بس شریمتی جی سے پریم ہوتا رہا ہو گا"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"نہیں یار۔ ابھی میری اس لڑکی سے اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی۔ بس باتیں ہی کر رہے ساری فلم میں۔ باہر نکلے تو بارش ہو رہی تھی۔ پہلے لڑکی کو اس کے گھر چھو واپس آیا تو چوک میں رکشا خراب ہو گیا۔ بارش میں بھیگتا ہوا ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔"

میں جگدیش کو بھی یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ میں رات بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔ ا کے بعد ہم اپنے کام میں لگ گئے۔ اس روز سپلائی میں فرانس کی بڑی مشہور وائین کر ڈی مون بھی آئی تھی۔ میں نے سبز رنگ کی اس مشہور فرنچ وائین کی بوتل اپنے حسا میں خرید کر لفافے میں ڈال کر رکھ لی۔ جگدیش کہنے لگا۔

"یہ کس کے لئے لے جا رہے ہو۔ تم تو پیتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔

"یار! اپنے بھیا شرت جی کے لئے لے جا رہا ہوں۔ انہیں یہ وائین بڑی پسند ہے۔"

دوپہر کو لنچ کے وقت میں وائین کی بوتل لے کر میجر شرت دیوان کے پاس چلا آ فرنچ وائین ایک بہانہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ میں اس کے پاس جانا چاہتا تھا کہ شاید ا سے اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی ملاقات کے بارے میں کچھ مزید معلومات مل جائی اس وقت میجر شرت دیوان کے پاس ایک کالے رنگ کا بھاری جسم والا فوجی بیٹھا تھا۔ کے کندھے پر لگا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کرنل رینک کا ہے۔ میں نے جاتے ہی دونو نمسکار کیا۔ میجر شرت نے کرنل سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"کرنل صاحب! یہ میرا چھوٹا بھائی دھرم ویر ہے۔ اور دھرم ویر یہ ہمارے بڑے لا اور سینئر انٹیلی جینس آفیسر کرنل گول والکر صاحب ہیں۔"

کرنل گول والکر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر ذرا سا سر

میجر شرت نے میرے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کیا لائے ہو دھرم ویر؟"

میں نے آنکھوں سے انہیں ایک طرف آجانے کا اشارہ کیا میں کرنل کے سامنے اسے شراب کی بوتل نہیں دینا چاہتا تھا۔ میجر شرت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے کرنل صاحب ہمارے بڑے مہربان ہیں ہمارے آفیسر بھی ہیں اور دوست بھی ہیں۔ دکھاؤ کیا لائے ہو"

میں نے لفافہ میجر شرت کو دیتے ہوئے کہا۔

"سر کنٹین میں آپ کی پسند کی چیز آئی تھی۔ سوچا آپ کے لئے لیتا چلو"

میجر شرت نے لفافے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"دھرم ویر! تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ مجھے سر نہ کہا کرو۔ بھیا کہا کرو۔ تم مجھے بھیا کہتے ہو تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

اس نے لفافے میں سے بوتل نکال کر دیکھی اور خوش ہو کر کہا۔

"ونڈر فل! کریم ڈی مون تو مجھے بہت پسند ہے۔ اور کرنل صاحب کو بھی یقیناً پسند ہو گی۔"

میجر شرت دیوان نے وائین کی بوتل لفافے میں دوبارہ ڈالی اور مرہٹہ کرنل گول والکر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ میں آپ کو پریذنٹ کرتا ہوں۔"

کرنل گول والکر خوش ہو کر بولا۔

"تھینک یو۔ میجر! تھینک یو۔"

اور میجر شرت نے وائین کی بوتل والا لفافہ کرنل کو پکڑا دیا۔ مرہٹہ کرنل نے لفافہ اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ میں کچن کی طرف چل دیا جہاں اردلی کھانا تیار کرنے میں لگا تھا۔ میں نے اردلی سے کہا۔

"اردلی! مجھے ایک کپ چائے بنا دو گے؟"

وہ بولا۔
”صاحب! پانچ منٹ کا ٹائم لگے گا“
میں نے کہا۔
”کوئی بات نہیں۔ میں خود ہی بنا لیتا ہوں“
میں نے دوسرے چولہے پر پانی گرم کرنے کے لئے رکھ دیا اور شیلف میں سے ب
نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ میں جان بوجھ کر کچن میں آگیا تھا۔ میرے کان میجر شر
اور کرنل گول والکر کی باتوں کی طرف لگے تھے۔ ان کی باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آواز مجھ
پہنچ رہی تھی۔ مگر ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ میں نے کپ میں چائے
اور کپ لے کر باہر آکر جہاں میجر شرت اور مرہٹہ کرنل بیٹھے باتیں کر رہے تھے ان۔
تھوڑی دور چھوٹے ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میجر شرت نے کہا۔
”دھرم ویر لنچ کے وقت چائے کیوں پینے لگے؟“
میں نے کہا۔
”بھیا جی! آج میں بھوجن دیر سے کروں گا دن کو ناشتہ دیر سے کیا تھا۔ بس یہ دو
اخبار رسالے پڑھ کر چلا جاؤں گا۔ جگدیش کو کاؤنٹر پر چھوڑ آیا ہوں۔“
میجر اور مرہٹہ کرنل اپنی باتیں کرنے لگے۔ وہ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔
نے یہ ظاہر کیا جیسے میں بڑی دلچسپی سے اخبار رسالے دیکھ رہا ہوں اور مجھے ان کی گ
سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی خاص طور پر میجر شرت مجھے بے ضرر سمجھتا
اسے مجھ پر ابھی تک ذرا سا بھی شک شبہ نہیں ہوا تھا۔ میری نظریں اخبار پر تھیں مگر
ان کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اسرائیلی
بھارتی فوجی جرنیلوں کی جو میٹنگ ہونے والی تھی کہیں وہ منسوخ تو نہیں ہوگئی۔ لیکن
کی باتوں سے ثابت ہوگیا کہ میٹنگ منسوخ نہیں ہوئی بلکہ اسرائیل کے تینوں جرنیل
ابیب سے دو دن پہلے بھارت کی راج دھانی دلی پہنچ گئے تھے اور کل دن کے گیارہ بجے
ناگ پور کے ہیڈ کوارٹر پہنچ رہے تھے۔ ناگ پور کے ملٹری انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر کو

اہمیت دی جا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھارت کی فوجی کمانڈ کا ناگ پور کے اس سپیشل
ملٹری ڈیفنس انٹیلی جینس کے ہیڈ کوارٹر سے براہ راست اور گہرا رشتہ ہے۔ اسی لئے
دونوں پاکستان دشمن ملکوں کی خفیہ میٹنگ کو ناگ پور میں منعقد کیا جا رہا تھا۔ مرہٹہ کرنل
نے سگار سلگاتے ہوئے میجر شرت سے کہا۔
”سیکورٹی انتظامات کو میں کل خود جا کر چیک کروں گا۔ میٹنگ کے وقت وہاں صرف
کیپٹن تک کے رینک کے دو عہدے دار ہوں گے تم بھی میرے ساتھ ہوٹل کی لابی میں
رہو گے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دشمن کے جاسوس بھی وہاں ضرور ہوں گے ہماری
لابی میں موجودگی سے انہیں یہی تاثر ملے گا کہ اوپر جو میٹنگ ہو رہی ہے وہ اتنی ٹاپ
سیکرٹ میٹنگ نہیں ہے۔ ہم انہیں یہی تاثر دینا چاہتے ہیں۔“
میجر نے کہا۔
”سر! ہم اس پر سختی سے عمل کریں گے۔ اوپر ہمارے دو کیپٹن کمرے کے باہر
کوریڈور میں ہوں گے ایک کیپٹن مونگا اور دوسرا کیپٹن امریک سنگھ۔ باقی میٹنگ کے
دوران اپنے جرنیلوں کی مدد کے لئے نئی دلی سے انٹیلی جینس کی مرکزی ڈیفنس برانچ کے
تین میجر کمرے میں موجود ہوں گے۔“
”بالکل ٹھیک ہے۔“
یہ کہہ کر مرہٹہ کرنل گول والکر اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔
”اب میں جاتا ہوں۔ کل دس بجے سیکورٹی کی چیکنگ کے لئے تم بھی اشوکا ہوٹل
پہنچ جانا۔“
”اوکے سر!“
میجر شرت دیوان مرہٹہ کرنل کو باہر تک چھوڑنے گیا۔ واپس آیا تو میرے کندھوں پر
بڑے پیار سے ہاتھ رکھ کر بولا۔
”دھرم ویر! تمہیں ماتا جی اور شکنتلا بڑی یاد کرتی ہیں۔ اگلے ہفتے میرے ساتھ
تمہیں چھندواڑے چلنا ہوگا“

میں نے رسالہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا مجھے بھی شکنتلا اور ماتا جی کی بڑی یاد آتی ہے۔ ضرور چلوں گا۔ اب ماتا جی کی طبیعت کیسی ہے؟"

میجر شرت دوسری میز کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"بس۔ بھگوان انہیں ٹھیک ٹھاک رکھے جوڑوں کا درد نہیں جاتا۔ دوائی باقاعدہ کھا رہی رہیں۔"

میں اٹھ کے اس کے پاس چلا آیا۔ میں نے کہا۔

"اگلے ہفتے مجھے ماتا جی کے درشن کو اپنے ساتھ ضرور لیتے جائیں۔"

میجر نے کہا۔

"ضرور ضرور۔"

مجھے معلوم تھا اگر کل اشوکا ہوٹل میں دھماکہ ہو گیا تو شاید انٹیلی جینس کا محکمہ اسے ہمیشہ کے لئے چھنداڑے بھیج دے۔ کیونکہ اس خفیہ میٹنگ کی سیکورٹی کی ساری ذمے داری میجر شرت اور کرنل گول والکر کے ذمے تھی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد واپس فوجی کینٹین پر آگیا۔ مجھے جس انفارمیشن کی ضرورت تھی وہ مجھے مل گئی تھی۔ صرف ایک دھڑکا لگا تھا کہ کل دس بجے ملٹری انٹیلی جینس کے دو ہائی رینکنگ آفیسر سیکورٹی چیک کرنے جا رہے ہیں کہیں کمرے میں کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ چپکی ہوئی دھماکہ خیز ٹیپ کا راز فاش نہ ہو جائے۔ لیکن مجھے اپنے آدمی گھنشام نے یقین دلایا تھا کہ اس ٹیپ میں ایک ایسا کیمیکل ملایا گیا ہے جس سے دھماکہ خیز مواد کی نشانیاں دنیا کے کسی جدید ترین آلے سے بھی نہیں پکڑی جا سکتیں۔ پھر بھی میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ ملٹری انٹیلی جینس کی سیکورٹی ٹیم کو دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کا علم نہ ہونے پائے۔ وہ دن گزر گیا۔ پھر وہ رات آگئی جس رات اشوکا ہوٹل میں پاکستان کے دو دشمن ملکوں یعنی اسرائیل اور بھارت کے تین تین ٹاپ کے فوجی جرنیلوں کی پاکستان پر حملہ کرنے کے بارے میں خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجھے اسی روز شام کو معلوم ہو گیا تھا کہ سیکورٹی ٹیم نے چیکنگ کر لی تھی اور وہاں

ی قابل اعتراض بات انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ یہ بات بھی میں نے حتمی طور پر معلوم لی تھی کہ رات کے آٹھ بجے اشوکا ہوٹل میں بھارت کے جرنیل اسرائیل کے نیلوں کا خیر مقدم کریں گے۔ اس کے بعد وہ خاص کافی روم میں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ نو بجے وہ ہوٹل کے خاص کمرے میں چلے جائیں گے جہاں دس بجے تک ان کی گ چلے گی اور ٹھیک گیارہ بجے نیچے ہال میں آکر وہ ڈنر کریں گے۔ جو میرے حساب وہ کبھی نہ کر سکیں گے اور وہ کافی روم میں جو کافی پئیں گے وہ ان چھ کے چھ جرنیلوں ان کے مددگار سٹاف کی زندگیوں کی آخری کافی ہو گی۔ اس حساب سے مجھے رات کے آٹھ بجے کے بعد اشوکا ہوٹل کے آس پاس منڈلاتے رہنا ہو گا تاکہ جس وقت مجھے م ہو جائے کہ چھ کے چھ جرنیل خفیہ میٹنگ کے واسطے اس کمرے میں چلے گئے ہیں ان کے لئے مخصوص ہے اور جہاں میں نے دھماکہ خیز مواد لگایا ہوا ہے تو میں اس کے منٹ بعد جس طریقے سے بھی ہو اس کمرے کے نیچے جہاں دیوار کے ساتھ بیل چمٹی ہے جا کر اس بیل میں چھپائی گئی تار کو جھٹکا دے کر ہلا دوں۔

"جگدیش بھیا! اب میں جاتا ہوں۔ پہلے مجھے شہر اپنے وید جی کے پاس دوائی لینے جانا گا۔ اس کے بعد کمرے میں آکر لیٹ جاؤں گا۔ اگر میری ضرورت پڑے تو مجھے بلا ۔"

دراصل ایک روز پہلے نئی سپلائی کا مال آیا تھا اور ان کا اندراج کرتے ہوئے ہمیں دیر تک وہاں رکنا پڑتا تھا۔ جگدیش بولا۔

"بھایا جی آپ بے شک جائیں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ میں سنبھال لوں گا۔"

میں اس کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں آٹھ بجے فوجی ہیڈ کوارٹر سے شہر وید جی سے دوائی گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔

"میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک واپس اپنے کمرے میں آجاؤں گا میری ورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔"

وہاں سے میں اپنے کمرے میں آیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ چمڑے کی کولہا پوری چپل اتار کر

ربڑ کے فلیٹ شوز پہنے تا کہ اگر وہاں کسی قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو میں آ
سے بھاگ سکوں۔ اور کمرے کا دروازہ بند کر کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکل گیا۔ مجھے ر
ٹیکسی لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ موسم خراب نہیں تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھ
میرے پاس ایک گھنٹے کا وقت تھا۔ راستہ مجھے آتا تھا۔ چنانچہ میں پیدل ہی اشوکا ہوٹل
طرف چل پڑا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے سڑک پر کچھ د
کھڑے ہو کر ایک نگاہ اشوکا ہوٹل پر ڈالی۔ وہاں ایسی کوئی غیر معمولی بات مجھے نظر نہ آ
سوائے اس کے کہ باہر ایک جانب ملٹری پولیس کی تین گاڑیاں کھڑی تھیں میرے د
دیکھتے دو فوجی سٹیشن ویگنیں تیزی سے ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔

میں اوپر سے ہو کر ہوٹل کے عقب میں آ گیا۔ یہاں ہوٹل کے ملازمین کے چھو
چھوٹے ڈھلواں چھتوں والے کوارٹر تھے جہاں کہیں کہیں بتیاں جل رہی تھیں۔ ہ
کے تیسرے بلاک کی طرف سے ایک وردی پوش بوڑھا بیرا مجھے کوارٹروں کی طرف
نظر آیا۔ میں اس کے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں کرنل گول والکر کے اردلی کا بھائی ہوں۔ کیا فوجی لوگ ہوٹل میں آ گئے ؟
مجھے اپنے بھائی سے ملنا ہے۔"

اس دوران میں جان بوجھ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا تھا جہاں اندھیرا تھا اور بوڑھ
میری شکل اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر سر پر ایک ر
بھی باندھ لیا تھا۔ بوڑھے بیرے نے چلتے چلتے پیچھے اشارہ کر کے کہا۔

"ادھر جا کر معلوم کرو۔"

اور وہ رکے بغیر کوارٹروں کی طرف چل دیا۔

میں ہوٹل کے پہلے بلاک کے عقب کے قریب پہنچا تو مجھے وہاں دو فوجی کھڑے
آئے۔ ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ میں وہیں سے واپس مڑ گیا۔ اب مجھے فکر پڑ گئی
کہیں اس جگہ بھی فوجی پہرہ نہ لگا ہوا ہو جہاں مجھے جا کر تار کو کھینچنا تھا۔ میں واپس
سڑک پر آ گیا۔ یہاں سے مجھے باغیچے کے پار دوسری منزل اور اس کے نیچے پہلی منزل

جگہ صاف نظر آ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ چمٹی بیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہاں
کوئی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کام خطرناک تھا۔ اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر مجھے
کمانڈو ایکشن کرنا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے میں پکڑ لیا جاؤں اور چاہے دھماکے کے
ساتھ میں بھی اڑ جاؤں لیکن میں بیل کے پیچھے چھپی ہوئی تار کو ایک بار ضرور کھینچ دوں
گا۔ آگے جو ہو سو ہو۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت تک رات کے نو بج گئے تھے
اور یہی ٹائم جرنیلوں کا میٹنگ روم میں داخل ہونے کا تھا۔ اتنے میں دو آدمی ہوٹل کے
گیٹ کی طرف سے آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے صرف دھوتی بنیانیں پہن رکھی تھیں
اور ہاتھوں میں بانس کے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں ہندوستانی میں باتیں بھی کر
رہے تھے۔ میں درخت کے پاس یوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی کے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔
وہ میرے قریب سے گزرے تو ان میں سے ایک بولا۔

"فوجی لوگ ابھی میٹنگ کرنے گیا ہے۔ ایک گھنٹہ لگے گا ان کو۔ اس کے بعد گیارہ
بجے کہیں کھانا لگے گا۔ تب تک ہم اچار چٹنی لے آئے گا یار"

قدرت میری مدد کر رہی تھی۔ وہ لوگ شاید مجھے یہی خبر دینے کے لئے عین وقت پر
ادھر سے گزرے تھے کہ فوجی جرنیل میٹنگ روم میں پہنچ گئے ہیں اور میٹنگ شروع ہو
چکی ہے۔ اب مجھے دیر نہیں کرنی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ میٹنگ جلدی ختم ہو جائے۔
میں نے ایک نظر سامنے والے باغیچے پر ڈالی۔ وہاں اندھیرا بھی تھا اور فوارے کے پاس
روشنی بھی ہو رہی تھی۔ دوسری منزل کے جس کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی اس کے
نیچے کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے ہوٹل کی دیوار پھلانگی اور جھاڑیوں کی دیوار
کے ساتھ ساتھ چلتا ہوٹل کے اس آخری بلاک کی دیوار کے پاس آ کر اندھیرے میں بیٹھ
گیا۔

ایک بار پھر میں نے عقابی نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک نلکے
کے نیچے بالٹی پڑی ہوئی دکھائی دی۔ فوراً ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں جلدی سے
اٹھ کر نلکے کے پاس گیا۔ بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی اور اس میں ایک ڈونگا بھی تھا۔ میں

نے بالٹی اٹھائی اور اپنے آپ کو ہوٹل کا ملازم ظاہر کرتے ہوئے بالٹی لے کر بڑے سکون سے چلتا ہوا ٹارگٹ والے کمرے کے نیچے بیل کے پاس آکر بالٹی زمین پر رکھی اور ڈونگے میں سے پانی نکال نکال کر بیل کو دینے لگا۔ تیسری بار بیل کو پانی دیتے ہوئے میں نے ہاتھ آگے کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تار کہاں پر لٹک رہی ہے۔ تار میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور تار کو جتنی زور سے ہمارے آدمی نے کہا تھا اتنے ہی زور سے نیچے کو کھینچ دیا۔ اس کے بعد بالٹی کا پانی بیل پر انڈیلا اور خالی بالٹی اور ڈونگا لے کر نلکے کی طرف چل پڑا۔ کہ اگر کوئی دور سے مجھے دیکھے تو یہی سمجھے کہ میں بیل کو پانی دینے گیا تھا۔

نلکے کے نیچے بالٹی رکھ کر میں جدھر سے آیا تھا اسی طرف چل پڑا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں اندھیرے میں آتے ہی میرے قدم تیز ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں ہوٹل کی دیوار پھاند کر عقبی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ میں دوسری طرف چلنے لگا۔ میں ایک چکر کاٹ کر ہوٹل کے سامنے والی سڑک کے عقب میں جو پارک تھا اس میں داخل ہو کر اپنے ٹھکانے یعنی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ میں جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ایک جگہ خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے اسے روکا اور فوجی ہیڈ کوارٹر سے پہلے جو چوک تھا ڈرائیور کو وہاں چلنے کو کہا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد دھماکہ ہونا تھا۔ اگر ہر شے اپنی جگہ پر ٹھیک لگائی گئی تھی تو دھماکہ پندرہ منٹ بعد ضرور ہو جانا تھا۔ چار منٹ مجھے دھماکے والی جگہ سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھنے تک لگے ہوں گے۔ ٹیکسی نے مجھے کوئی سات منٹ میں چوک میں پہنچا دیا۔ وہاں سے میں تین منٹ میں پیدل چل کر فوجی ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس حساب سے دھماکہ ہونے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھا فوجی کینٹین پر چلا گیا۔ میں جگدیش کو ایک طرح سے گواہ بنانا چاہتا تھا کہ جس وقت دھماکہ ہوا میں اس کے پاس موجود تھا۔ خوش قسمتی سے کینٹین میں جگدیش اس وقت موجود تھا اور رجسٹروں کو الماری میں بند کر کے تالا لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"تم نے ویدجی کے پاس اتنی دیر لگا دی؟"

میں نے کہا۔

"نہیں میں تو آدھے گھنٹے بعد ہی دوائی لے کر آگیا تھا۔ کمرے میں اکیلا لیٹے لیٹے تنگ آگیا۔ نیند نہیں آرہی تھی سوچا دیکھتا ہوں شاید تم کینٹین پر مل جاؤ۔ دو چار باتیں ہی کر لیں گے"

وہ بولا۔

"بس میں کینٹین بند کرنے ہی والا ہوں چلو میرے کمرے میں آجاؤ۔ کافی بنا کر پئیں گے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ کافی پی لی تو نیند بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے میں کمرے میں جا کر---"

ابھی یہ جملہ میرے منہ میں ہی تھا کہ اچانک زمین ہلی جیسے ہلکا سا بھونچال آگیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک دھماکے کی گونج سنائی دی۔ آسمان پر پرندوں نے درختوں پر سے اڑ کر شور مچا دیا۔ جگدیش کا حیرت سے منہ کھلا تھا اور وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ دھماکہ کیسا ہوا ہے دھرم ویر؟"

دھماکے کی آواز سے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے بھی اپنے آپ کو انتہائی پریشان ظاہر کیا اور کہا۔

"بھگوان ہماری رکھشا کرے۔ میرا خیال ہے کسی فیکٹری کا بوائلر پھٹ گیا ہے"

اس کے ساتھ ہی ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ پہلے دھماکے سے زیادہ شدید تھا اور اس کی گونج پہلے سے زیادہ تھی اور زمین کو زلزلے کا جھٹکا لگا تھا۔ جگدیش نے جلدی سے کینٹین کا ٹیلی فون اٹھا کر گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ سے دھماکوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ دھماکے ہم نے بھی سنے ہیں مگر ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ جگدیش نے فون بند کر کے کہا۔

"دھرم ویر! یہ دھماکے مجھے ایمونیشن پھٹنے کے دھماکے لگتے ہیں۔"

میرا کمانڈو مشن کامیاب رہا تھا۔ پہلا دھماکہ دونوں کھڑکیوں کے ساتھ چپکائی گئی دھماکہ خیز ٹیپ کے پھٹنے کا تھا۔ اس دھماکے کے رد عمل کے بعد سامنے والے دونوں دروازوں پر چپکائی گئی دھماکہ خیز ٹیپ کا بیک وقت دھماکہ ہوا تھا۔ گھنشام نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان دھماکوں کے ساتھ ہی کمرے میں آگ بھڑک اٹھی ہو گی کمرے کے پرخچے اڑ گئے ہوں گے اور اسرائیلی اور بھارتی جرنیل اپنے اپنے سٹاف کے ساتھ بھسم ہو چکے ہوں گے۔ اتنے میں ایک فوجی گاڑی بڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی ہمارے سامنے سے گیٹ کی طرف نکل گئی۔ جگدیش بولا۔

"مجھے معاملہ خراب لگتا ہے"

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟"

جگدیش نے کہا۔

"کہیں اشوکا ہوٹل میں کشمیری کمانڈوز نے دھماکہ نہ کیا ہو۔ میں تو کینٹین بند کر کے اشوکا ہوٹل جاتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو"

میں اپنے آپ کو جائے واردات سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں جگدیش بھیا! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ تم جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھتا ہوں۔ مجھے آکر ضرور بتانا کہ یہ دھماکے کہاں ہوئے تھے"

جگدیش کینٹین بند کر کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ میں اپنے کمرے میں آکر بتی بجھا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ اگر حالات خطرناک صورت اختیار نہیں کر جاتے تو میں زیادہ سے زیادہ میجر شرت دیوان کے ساتھ ہی لگا رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ابھی پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے کی خفیہ طور پر منصوبہ بندیاں ہو رہی تھیں اور میں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ پتہ نہیں تھا کہ حالات کیا شکل اختیار کرتے ہیں اسرائیل کے تین ٹاپ رینک کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ بھارت کے سینئر اور تجربہ کار تین جرنیلوں کی ہلاکت کوئی معمولی بات

نہیں تھی۔ ایک بار تو بھارتی فوجی ہائی کمانڈ میں بھونچال آجائے گا۔ بلکہ بھونچال آگیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس اہم ترین فوجی مذاکرات سیکورٹی کے انچارج کا کورٹ مارشل ہو جائے۔ انچارج مرہٹہ کرنل گول والکر تھا۔ مگر میجر شرت دیوان پر بھی اس تقریب کی سیکورٹی کی تھوڑی بہت ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ ممکن تھا کہ میجر شرت دیوان کو حاضر سروس سے معطل کر کے فوجی تحقیقات شروع ہو جائے۔ رات کی خاموشی میں دور اشوکا ہوٹل کی جانب سے ایمبولینس گاڑیوں کے ہوٹروں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ہیڈ کوارٹر کے گیٹ کی طرف سے بھی کوئی گاڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی ذرا سی کھول کر نیچے دیکھا۔ یہ دو فوجی گاڑیاں تھیں۔ جو بڑی تیزی سے گزر گئیں۔ میں نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا اور کمرے کی بتی روشن کر دی تاکہ اگر جگدیش واپس آئے تو میرے کمرے کی کھڑکیوں پر اندھیرا دیکھ کر آگے نہ چل دے۔

اس دوران ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ایک افراتفری سی مچی ہوئی ہے۔ مجھے بند کمرے میں فوجی گاڑیوں کے تیزی سے ہارن دے کر گزرنے اور فوجیوں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے اور ادھر ادھر تیز تیز دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ہمارے ایک عام قسم کے مجاہد ساتھی کی تیار کی ہوئی سکاچ ٹیپ اتنی دھماکہ خیز اور بروقت پھٹ جانے والی ثابت ہو گی۔ واقعی ہمارا یہ مجاہد جو گھنشام کے ہندوانہ نام سے ناگ پور کے ایک بازار میں دکان داری کر رہا تھا دھماکہ خیز اشیاء بنانے میں بے حد ماہر تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد جگدیش آگیا۔ میرے کمرے میں روشنی دیکھ کر وہ سیدھا اوپر میرے پاس آگیا۔ وہ سخت حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ میرے پلنگ پر آتے ہی بیٹھ گیا اور بولا۔

"پانی پلاؤ مجھے پلیز"

میں نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا اور خود بھی انتہائی حواس باختگی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرلی اور جگدیش سے پوچھا۔

"کیا ہوا جگدیش؟"

جگدیش نے پانی پی کر گلاس پلنگ پر لڑھکایا اور بولا۔

"دھرم ویر بڑی تباہی ہوئی ہے۔ اشوکا ہوٹل کا ایک پورے کا پورا بلاک اڑ گیا ہے۔ وہاں آگ ہی آگ تھی۔ آسمان پر دھواں ہی دھواں تھا"

میں نے سخت گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہے بھگوان! جگدیش بھیا کیا وہاں کسی نے بم لگا دیا تھا؟"

جگدیش اب کچھ کچھ اپنے حواس میں آگیا تھا۔ کہنے لگا۔

"کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔ سارے کا سارا بلا دھماکوں سے اڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ ان کا شاف بھی ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ کیپٹن امریک سنگھ کی لاش بھی نہیں ملی۔ بہت برا ہوا ہے دھرم ویر۔ بہت برا ہوا ہے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہے رام! میرے بھیا کو بچالینا"

پھر جگدیش سے پوچھا۔

"میرا بھیا شرت دیوان تو بچ گیا ہے ناں؟"

جگدیش نے کہا۔

"تمہارے بھیا میجر شرت اور مرہٹہ کرنل کو میں نے زخمیوں کو فوجی ایمبولینس میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سخت پریشان تھے۔"

مجھے معلوم تھا کہ میجر شرت اور مرہٹہ کرنل زندہ بچ گئے ہوں گے۔ انہوں نے میرے سامنے کہا تھا کہ وہ دونوں جرنیلوں کے ساتھ میٹنگ میں شریک نہیں ہوں گے اور سیکورٹی کی خاطر ہوٹل کی لابی میں ہی رہیں گے۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"ہے بھگوان تیری بڑی کرپا ہے میرا بھائی بچ گیا۔ مگر مجھے اپنی فوج کے جرنیلوں اور دوست ملک اسرائیل کے فوجی جرنیلوں اور اپنے افسروں کے مرنے کا سخت صدمہ ہے

ہے جگدیش۔ اب کیا ہو گا؟"

جگدیش بولا۔

"بھگوان ہی جانے کیا ہو گا۔ یہاں کے انٹیلی جنس شاف پر مصیبت آجائے گی۔ پتہ نہیں کس کس کا کورٹ مارشل ہو۔ اچھا بھیا میں چلتا ہوں۔ اب صبح ہی کچھ پتہ چل سکے گا کہ ہمارے کتنے فوجی مارے گئے ہیں۔"

جگدیش چلا گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بتی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے دشمن کے خلاف ایک بڑی فتح حاصل کی ہے۔ چھت کے ساتھ لگا پنکھا چل رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر سے فوجی گاڑیوں کے تیزی سے گزرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر اب مجھے ان آوازوں کی کوئی پروانہ نہیں تھی۔ جو کچھ میں نے کرنا تھا کامیابی سے کر چکا تھا۔ آگے جو ہونے والا تھا میں ذہنی طور پر اس کے لئے بھی تیار تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ پانڈی چری کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے کوئی ایسا افسر تفتیش کے لئے یہاں نہ آجائے جس نے مجھے وہاں دیکھ رکھا ہو۔ مجھے ان بھارتی فوجی افسروں کا زیادہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا جنہوں نے مجھے پانڈی چری کے ٹارچر سنٹروں میں ٹارچر کیا تھا۔ وہ میری شکل پہچانتے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے پانڈی چری میں ہم بہت تباہ کن دھماکہ کر کے بھارتی بحریہ کے دو جہاز ڈبو چکے تھے اس لئے اس بات کا امکان تھا کہ وہاں سے دو تین فوجی افسر تحقیقات کرنے ناگ پور کے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں بھی آجائیں۔ میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیا ہوا تھا۔

اگلے روز میں صبح صبح میجر شرت کے ہوسٹل کی طرف چل پڑا فوجی کینٹین ابھی نہیں کھلی تھی۔ ہیڈ کوارٹر کی فضا پر ایک گہری سوگوار خاموشی طاری تھی۔ میں میجر شرت کے کمرے میں چہرے کو اداس بنا کر آہستہ سے داخل ہوا تو دیکھا کہ میجر شرت دیوان اور مرہٹہ کرنل گول والکر اخبار سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی فل وردیوں میں تھے اور لگتا تھا کہ ابھی ابھی باہر سے آئے ہیں۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی آواز

کو غم ناک بناتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور دوڑ کر میجر شرت کے گلے لگ گیا اور روہانسی آواز میں کہا۔

"بھیا! یہ کیا ہو گیا ہے۔"

میجر شرت نے بیٹھے بیٹھے میرے کندھے پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے مجھے الگ کیا اور آہستہ سے کہا۔

"تم ابھی کینٹین پر جاؤ۔"

میں نے وہاں بیٹھنا مناسب بھی نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ ان لوگوں پر ملٹری ایڈمنسٹریشن کی طرف سے کوئی بھاری مصیبت نازل ہو چکی ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ناشتہ بنایا۔ ناشتہ کیا۔ پھر کینٹین پر آ گیا۔ فوجی کینٹین کھل چکی تھی۔ جگدیش انگریزی کا تازہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے اخبار میرے آگے کر دیا اور بولا۔

"یہ دیکھو کتنی تباہی ہوئی ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ کشمیری کمانڈوز کی اس کارروائی میں ملکی اور غیر ملکی جرنیلوں کے ساتھ دس فوجی افسر اور ہوٹل کے سات آدمی بھی مارے گئے ہیں۔"

اخبار میں اشوکا ہوٹل کی تصویر بھی چھپی تھی۔ تصویر میں وہ بلاک جس کے کمرے میں میں نے دھماکہ خیز ٹیپ لگائی تھی اس کے سامنے والے تین کمرے پورے کے پورے اڑ گئے تھے۔ میں جگدیش کے ساتھ افسوس کا اظہار کرتا رہا۔ پھر اس سے کہا۔

"میں شرت بھیا سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ چپ چپ تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جگدیش! کہیں میرے بھیا پر فوج کوئی مقدمہ تو نہیں چلائے گی؟"

جگدیش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا میرے خیال میں نہیں ہو گا ویسے تھوڑی دیر پہلے ایک لانس نائیک چینی کا پیکٹ لینے آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ دلی اور پانڈی چری کی انٹیلی جنیس ٹیمیں یہاں پہنچ رہی ہیں۔"

پانڈی چری کا نام سنتے ہی میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پانڈی چری کی انٹیلی جنیس کور کے چار پانچ اعلیٰ رینک کے افسر مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ میں نے کئی روز تک ان کے ٹارچر برداشت کئے تھے۔ خاص طور پر بوچڑوں جیسے چہرے والا کیپٹن جوشی تو مجھے دور ہی سے پہچان سکتا تھا۔ اور خطرہ تھا کہ وہ تحقیقاتی ٹیم کے ساتھ ضرور آئے گا۔ وہ پانڈی چری کی ملٹری انٹیلی جنیس کا بڑا تجربہ کار افسر تھا۔ میں نے جگدیش سے کہا۔

"مجھے پورا وشواش ہے کہ اشوکا ہوٹل میں تباہی مچانے والے کشمیری اگروادی ضرور پکڑ لئے جائیں گے۔ ویسے تمہارے خیال میں دلی اور پانڈی چری کی انٹیلی جنیس کے یہ افسر کب تک یہاں پہنچ جائیں گے۔"

جگدیش نے کاؤنٹر پر سے چائے کے ڈبے اٹھا کر شیلف میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ ہوائی جہاز سے آئیں گے۔ میرا خیال ہے آج شام تک پہنچ جائیں گے۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ پانڈی چری کی انٹیلی جنیس ٹیم میں ایسے فوجی افسر ضرور ہوں گے جو مجھ سے پانڈی چری ٹارچر سنٹر میں انٹروگیشن کرتے رہے ہیں اور میں یہاں گرفتار کر لیا جاؤں گا اور پھر میرا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ شاید آپ نہیں لگا سکتے۔ لیکن کمانڈو اپنے ٹارگٹ کو اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں بھاگتا۔ میں یہ چانس لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایک فیصد ہی سہی لیکن اس بات کا بھی امکان تھا کہ تحقیقاتی ٹیم میں میری جان پہچان کا کوئی بھارتی فوجی نہ ہو۔ اصل بات یہ تھی کہ میں ابھی کچھ وقت میجر شرت دیوان کے ساتھ منسلک رہنا چاہتا تھا تاکہ میں مزید فوجی راز حاصل کر سکوں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں دوبارہ میجر شرت کے پاس گیا۔ وہ اس وقت بھی فوجی وردی میں تھا اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بڑی محویت کے عالم میں آنکھیں بند کئے سر کرسی کی پشت سے ٹکائے بیٹھا تھا۔ سگار اس کے ایک ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔ اردلی میز پر سے کھانے کے برتن اٹھا رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے میجر شرت نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر گہرا سانس بھر کر بولا۔

"تم نے کھانا کھالیا؟"

میرے دل میں میجر شرت کے لئے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ واقعی مجھ
اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرنے لگا تھا۔ اس وقت بھی جب کہ اس کا پورا فوجی کیر
خطرے میں پڑا ہوا تھا اسے میرا اتنا خیال تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں بھیا!"

وہ بھی خاموشی سے سگار پیتا رہا۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔
نے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا! یہ جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ سے تم پر تو کوئی برا اثر نہیں پڑے گا ناں؟"

میجر شرت کے ہونٹوں پر ایک اداس تبسم نمودار ہوا۔ سگار کو ایش ٹرے میں بجھا
ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں اثر پڑے گا۔ آخر ان جرنیلوں کی سیکورٹی کی ذمے داری مجھ پر ہی
آتی تھی۔"

جیسا کہ مجھے اس وقت کہنا چاہئے تھا میں نے کہا۔

"بھیا! تم چنتا نہ کرو۔ بھگوان سب جانتا ہے۔ تم دوشی نہیں ہو۔ تمہارا کوئی قص
نہیں ہے۔"

اس کے بعد میجر شرت اٹھا اور بولا۔

"مجھے آج رات اشوکا ہوٹل میں تفتیش کے سلسلہ میں گزارنی ہو گی۔ تم اگر چاہ
یہاں میرے کمرے میں رات سو جانا۔ اردلی تمہیں کھانا بنا دے گا۔"

میجر شرت چلا گیا۔ میں نے سوچا اچھا ہے مجھے آج رات میجر کی الماری کی تلاشی
کا ایک اور موقع مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے الماری میں اس کا بریف کیس بھی ہو اور
کوئی نئی معلومات مل جائیں۔ میں نے اردلی سے کہا۔

"ابھی میں کینٹین پر جاتا ہوں۔ شام کو آجاؤں گا۔ تم میرے لئے سبزی بنا دینا۔"

اردلی نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب"

مجھے پانڈی چری سے آنے والی فوجی تحقیقاتی ٹیم کی فکر لگی تھی۔ میں نے کوئی چار
بجے جگدیش سے پوچھا۔

"کیا پانڈی چری والی فوجی ٹیم آگئی ہے جگدیش؟"

جگدیش بولا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ یہاں کینٹین کے سامنے سے ان کی سٹاف کار گزری تھی۔ چھ
سات اونچے رینک کے افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کس کس کی جان مصیبت میں
پھنسے گی۔ میرا خیال ہے ہمارے ہیڈ کوارٹر کے کچھ افسروں کا ضرور کورٹ مارشل ہو گا"

شام ہوتے ہی میں کینٹین میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے سیدھا میجر شرت دیوان کے
ہوسٹل میں چلا گیا۔ چائے بھی اردلی سے بنوا کر پی اور رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ اردلی
رات دس بجے چیزیں وغیرہ سمیٹنے کے بعد چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا تو سوچا میجر کی
الماری کی تلاشی لی جائے۔ میں الماری کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے میجر شرت کی بوجھل سی آواز آئی۔

"دھرم ویر!"

میں نے کہا۔

"جی بھیا جی!"

اس نے کہا۔

"اچھا کیا تم آگئے ہو۔ پانڈی چری سے تحقیقاتی ٹیم ہیڈ کوارٹر میں آئی ہوئی ہے۔ ہو
سکتا ہے اس ٹیم کا کوئی فوجی افسر میری عدم موجودگی میں کمرے کی تلاشی لینے آئے۔ اسے
تلاشی لے لینے دینا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھیا!"

اور میجر شرت نے فون بند کر دیا۔ میں نے لوہے کے تار سے الماری کو کھول کر

دیکھا۔ وہاں میجر کا بریف کیس نہیں تھا۔ عام طور پر ٹاپ سیکرٹ فائلیں وہ اپنے بریف
کیس میں ہی رکھتا تھا۔ الماری کی ایک جانب میجر کے سویلین کپڑے اور استری کی ہوئی
فوجی وردی ٹنگی تھی۔ دوسری طرف خانوں میں الابلا سامان بھرا ہوا تھا۔ اس سامان کے
نیچے مجھے ایک فائل نظر پڑی۔ میں نے اسے باہر نکال کر کھولا اور ورق الٹنے لگا۔ ایک
ورق پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ فل سکیپ ٹائپ شدہ کاغذ کے اوپر ٹاپ سیکرٹ سرخ
لفظوں میں ٹائپ کیا ہوا تھا۔ میں نے الماری بند کی فائل لے کر میز پر بیٹھ کر اسے غور سے
پڑھنے لگا۔

مجھے وہ خفیہ راز مل گیا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس میں انڈیا کے ڈیفنس
ڈیپارٹمنٹ کے چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک خط ملٹری ہائی کمانڈ کے چیف آف سٹاف
کو لکھ کر اس سے پاکستان پر بھارت کے حملے کے مہینے کا تعین کرنے کہا گیا تھا۔ دوسرا خط
انڈیا کی فوجی ہائی کمانڈ کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ اس خط میں یہ واضح طور پر کہا گیا تھا کہ
پاکستان پر حملہ ستمبر کے مہینے کے شروع میں کیا جائے گا۔ وہ ستمبر 1965ء کا مہینہ نکلتا تھا۔
میں فائل میں نے لگے ہوئے دوسرے کاغذات کو بھی سرسری نظر سے دیکھا۔ ان میں
انٹیلی جینس کے بعض افسروں کی پرسنل فائلوں میں سے کچھ واقعات لے کر ان کی تربیت
کے سلسلے میں بحث کی گئی تھی۔ میں نے فائل اسی طرح الماری کے خانے میں رکھ دی۔
الماری کو بند کر کے تالا لگایا اور کچن میں آکر کافی بنانے کے لئے پانی گرم کرنا رکھ دیا۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور کچن کی کھڑکی میں سے باہر چھوٹے سے باغیچے میں لگی ہوئی
بتیوں اور ان بتیوں کی روشنی میں نظر آنے والی جھاڑیوں اور کیلے کے درختوں کو دیکھتے
ہوئے سوچنے لگا کہ مجھے یہ خبر فوراً سری نگر کمانڈو شیروان کو پہنچا دینی چاہئے۔ الماری میں
میجر شرت کا ٹرانسمیٹر سیٹ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو میں اسی وقت خفیہ کوڈ میں کمانڈو شیروان
کو اطلاع کر دیتا کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے ستمبر کے مہینے کا پہلا ہفتہ طے
کیا ہے۔ پھر سوچا کہ کل یا پرسوں کسی وقت الماری کی دوبارہ تلاشی لوں گا ہو سکتا ہے میجر
شرت وہاں ٹرانسمیٹر سیٹ لا کر رکھ دے۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ اردلی گیا ہے تو میں اٹھ

کر کمرے کے دروازے کو چٹخنی لگا دوں۔ کافی کے لئے پانی ابلنے لگا تو میں نے کافی بنا کر پیالی
میں ڈالی۔ ریفریجریٹر کھول کر انگریزی چیز کا ایک ٹکڑا نکال کر کاؤنٹر پر رکھ کر چھری سے اس
کا ٹکڑا کاٹ رہا تھا کہ باہر کمرے میں کسی کے فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ ساتھ کسی نے
بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ میجر شرت جی۔ ہیلو۔"

مجھے ایسا لگا جیسے یہ آواز میرے کانوں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ میں نے چھری
ہاتھ سے رکھ دی اور یہ دیکھنے کے لئے کھلے دروازے میں سے ڈرائنگ روم میں کون آگیا
ہے کچن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں کچن کے دروازے میں نہیں پہنچا تھا کہ
اچانک ایک فوجی وردی والا آدمی کچن کے دروازے میں میرے سامنے آگیا۔ وہ مسکرا رہا
تھا۔

"ہیلو! میجر شرت جی کہاں ----"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ
ہانڈی چری کے ٹارچر چیمبر کا وہی کیپٹن جوشی تھا جس نے میرے گال پر نشتر سے لمبا زخم
لگایا تھا ہم دونوں اپنی اپنی جگہوں پر ٹھٹھک کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے اور پھٹی پھٹی
آنکھوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

یہ میرے لئے زندگی اور موت کا لمحہ تھا۔

یہ کیپٹن جوشی کے لئے بھی زندگی اور موت کا لمحہ تھا۔ مجھے پہچان لینے کے بعد وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ میں ہی وہ کمانڈو ہوں جس نے پانڈی چری میں بھارتی جہازوں کو تباہ کرنے کے بعد اب اشوکا ہوٹل کے ایک کمرے کو چھ منزلوں سمیت دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ ایک سیکنڈ کے لئے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پہچانا اور اس کے ساتھ ہی کیپٹن جوشی کے منہ سے نکلا۔

"تم؟"

اور اس کا ہاتھ بیلٹ کے ساتھ لگے پستول کے ہولسٹر کی طرف گیا۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو شاید وہ کیپٹن جوشی کے پستول کے فائر سے زخمی ہو کر گر پڑتا اور وہ اسے اپنی حراست میں لے لیتا۔ کیونکہ ایسے آدمیوں کو جان سے نہیں مارا کرتے۔ ان سے ملٹری پوچھ گچھ کرنی ہوتی ہے۔ لیکن کیپٹن جوشی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔ جب مجھے پانڈی چری میں اس کے پاس لایا گیا تھا تو میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وحشیانہ تشدد کی وجہ سے میں ادھموا ہو رہا تھا لیکن اب میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے اور میرے ایک ہاتھ میں چھری بھی تھی جس سے میں چیز کاٹ رہا تھا۔

میں نے کیپٹن جوشی کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اس کا ہاتھ ہولسٹر میں سے پستول نکال سکتا۔ میں چھری سے اس پر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کا خون میرے کپڑوں پر لگ جاتا۔ میں نے اس کے بازو کو نیچے پکڑ کر زور سے اوپر کو ایک جھٹکا دیا۔

کیپٹن جوشی کوئی جوان افسر نہیں تھا۔ ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا۔ صرف اس کے تشدد کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی وجہ سے اسے فوج سے ریلیز نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرا بازو میں نے آگے کھینچ کر اس کے گلے میں ڈالا اور اس کی گردن اپنی بغل میں لے کر اتنی زور سے اوپر کو جھٹکا دیا کہ کیپٹن جوشی کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی مجھے صاف آواز آئی۔ میں نے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی لٹکتی ہوئی گردن کو ٹٹولا اس کی ہنسلی ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کچن کے فرش پر منہ کے بل گر پڑا۔ وہ مر چکا تھا۔ میں کیپٹن جوشی کی لاش کو میجر شرت کے کمرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا زینے میں سے ہو کر اوپر چھوٹے سے سٹور میں آ گیا۔ اس کی کھڑکی دوسری جانب ہیڈ کوارٹر کی دیوار کے ساتھ بہتے ہوئے گندے نالے کی طرف کھلتی تھی۔ میں نے کیپٹن جوشی کی لاش کو کھڑکی میں سے گندے نالے میں پھینک دیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور سویلین آبادی وہاں سے دور تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے نیچے آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ اور کافی کی پیالی لے کر کچن والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس جگہ کو غور سے دیکھنے لگا جہاں کیپٹن جوشی کو مرنے کے بعد میں نے فرش پر گرایا تھا۔ فرش پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا کمرے میں بھی ہر شے اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ کیپٹن جوشی کی لاش کو عقبی نالے میں پھینکنا میری مجبوری تھی۔ میں اس کی لاش کو فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکال کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ کہ اسے دور کسی ویرانے میں یا دریا میں پھینک دیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ جوشی کی لاش گندے نالے میں گرتے ہی ڈوب جائے گی اور گندے کیچڑ کے ساتھ بہتے بہتے صبح تک وہاں سے کہیں کی کہیں نکل جائے گی۔

لیکن لاش وہیں ایک جگہ کیچڑ میں پھنس کر رکی رہی اور دوسرے دن صبح صبح ہی کیپٹن جوشی کی لاش گندے نالے سے ملٹری پولیس کے آدمی نکال کر لے آئے۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے کوئی پروانہ کی کیونکہ کیپٹن جوشی بول کر میرا نام نہیں لے سکتا تھا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر میں ایک اور باہر سے آئے ہوئے ملٹری آفیسر کے قتل سے ایک بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ مگر مجھے انڈین فوجیوں کی بے چینی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جو فوجی کیپٹن

میرے قیمتی اور پاکستان اور کشمیر کی سلامتی کے مشن کو ایک لمحے میں تباہ و برباد کر سکتا تھا۔ میں نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ ایک بار پھر میجر شرت کی سیکرٹ فائل تک میرا راستہ صاف ہو گیا تھا۔

رات کو میں میجر شرت کے کمرے میں ہی سویا۔ صبح وہاں سے ہی نہا دھو کر کپڑے پہن کر سیدھا کنٹین پر آگیا۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب فوج کے دو سپاہی کنٹین پر آئے ان کے پاس سٹامپ پیڈ اور ایک کاپی تھی ۔ ان میں ایک صوبیدار میجر تھا اس نے آتے ہی کہا۔

"لاؤ بھئی اپنی انگلیوں کے نشان یہاں دو۔ یہاں کے سب سویلین ملازموں کے نئے شناختی کارڈ بن رہے ہیں جن پر ہر ایک کی انگلیوں کے نشان بھی ہوں گے۔"

میں نے اور جگدیش نے اپنی اپنی انگلیوں کے نشان ان کی سفید کاپی پر لگا دیئے۔ جگدیش نے پوچھا۔

"یہ کس لئے ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس تو پہلے ہی شناختی کارڈ موجود ہیں۔"

صوبیدار میجر بولا۔

"سیکورٹی کے نئے رولز ریگولیشنز نافذ کئے جا رہے ہیں۔ اب یہاں ہیڈ کوارٹر میں جو سویلین کام کرتا ہے اس کو اس کے انگلیوں کے نشان والا شناختی کارڈ دیا جائے گا۔ پرانے شناختی کارڈ کنڈم ہو جائیں گے۔"

اور وہ سٹامپ پیڈ اور ہماری انگلیوں کے نشان والی کاپی سنبھال کر چلے گئے۔ جگدیش کہنے لگا۔

"شہر میں کشمیری کمانڈوز کی دہشت گردی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ اچھا ہے اب کوئی دشمن کا جاسوس ہمارے ہیڈ کوارٹر میں نہیں گھس سکے گا۔ گیٹ پر اس کے شناختی کارڈ پر اس کی انگلیوں کے نشان بھی چیک کئے جائیں گے۔ تمہیں معلوم ہے دنیا میں کسی ایک آدمی کی انگلیوں کے نشان دوسرے آدمی کی انگلیوں کے نشان سے نہیں ملتے۔"

میں نے بھی یہی سمجھا۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور تھا۔ اصل معاملہ اگلے روز کھلا

جب میجر شرت دیوان نے مجھے اردلی بھیج کر اپنے کمرے میں بلایا۔ میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ ایک کاغذ سامنے رکھے بیٹھا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا تو اس نے کاغذ پرے ہٹا دیا اور مجھ سے بیٹھنے کو کہا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ کاغذ پر کسی کی انگلیوں اور انگوٹھے کے نشان تھے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

میجر شرت نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کل رات نو دس بجے کے بعد تم کہاں تھے؟"

اس کی نظروں میں پہلی بار میں اجنبیت کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے میں کسی ٹارچر سنٹر میں فوجی افسر کے سامنے بیٹھا ہوں اور مجھ سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے اثرات نہ آنے دیئے اور جس طرح اپنائیت کے ساتھ میں میجر شرت سے بات کرنے کا عادی تھا اسی انداز میں کہا۔

"بھیا! کل رات نو بجے کے بعد میں اسی کمرے میں تھا۔ اردلی چلا گیا تھا۔ میں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر تک رسالے دیکھتا رہا پھر سو گیا۔ کیوں؟ کیا بات ہے بھیا؟"

میجر شرت کے چہرے سے بھی اجنبیت کے اثرات جو تھوڑی دیر پہلے نمودار ہوئے تھے غائب ہو گئے۔ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"ان لوگوں سے کچھ غلطی ہو گئی ہے"

میں نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا بات کیا ہے؟"

اس نے انگلیوں کے نشانات والا کاغذ آگے کر لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بات یہ ہے کہ پانڈی چری سے ایک فوجی ٹیم دھماکے کی تحقیقات کرنے یہاں آئی تھی۔ ان میں ایک کیپٹن جوشی بھی تھا۔ کسی نے کیپٹن جوشی کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش ہیڈ کوارٹر کے گندے نالے سے ملی ہے۔"

میں نے مصنوعی حیرت و رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہے بھگوان! مگر یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قاتل پکڑا گیا ہے؟"

میجر شرت بولا۔

"اسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ کیپٹن کی لاش اپنے ہیڈ کوارٹر کے
نالے سے ملی ہے خیال یہی ہے کہ اسے اپنے ہیڈ کوارٹر کے کسی آدمی نے قتل کر کے لاش
نالے میں پھینک دی ہے۔ پوسٹ مارٹم کرتے وقت دیکھا گیا ہے کہ کیپٹن جوشی کی گردن
پر کسی کی انگلیوں کے نشان تھے۔ یہ نشان قاتل کے ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لاش کی گردن
پر انگلیوں کے نشان ہم نے لے لئے اور ہیڈ کوارٹر کے تمام ملازمین کی انگلیوں کے نشان
بھی دو گھنٹے کے اندر اندر اکٹھے کر لئے۔"

"پھر کیا قاتل مل گیا بھیا؟"

میجر شرت غور سے سامنے پڑے کاغذ کو دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔

"حیرانی کی بات ہے کہ لاش کی گردن پر انگلیوں کے جو نشان تھے وہ ہو بہو تمہاری
انگلیوں کے نشان سے ملتے ہیں۔ یہ دیکھو"

اس نے کاغذ میرے آگے کر دیا۔ مجھے یاد آگیا کہ جب میں کیپٹن جوشی کی لاش
ٹھکانے لگانے لگا تھا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ اس
کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے یا نہیں۔ کیونکہ میں کسی حالت میں اسے زندہ نہیں رکھنا
چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے وہاں دیکھ لیا تھا۔ میں نے کاغذ کو دیکھا۔ ایک طرف کیپٹن
جوشی کی گردن پر سے لئے گئے انگلیوں کے نشان تھے اور دوسری طرف میری انگلیوں کے
نشان تھے۔ یہ وہ نشان تھے جو دو فوجی نئے شناختی کارڈ بنوانے کے بہانے کنٹین پر آکر میری
انگلیوں پر سیاہی لگا کر کاپی پر چپکا کر لے گئے تھے۔ ڈرامہ اپنے خطرناک موڑ پر پہنچ گیا تھا۔
اب مجھے انتہائی ہوشیاری اور عیاری سے کام لینے کی ضرورت تھی کہ میجر شرت ایسا ملٹری
انٹیلی جنیس کا تجربہ کار افسر بھی میرے چہرے پر فکر و تردد کا کوئی نشان نہ دیکھ سکے۔ مگر
بہت بڑا ثبوت میرے سامنے تھا جو مجھے کیپٹن جوشی کا قاتل ثابت کر رہا تھا۔ میں نے حیرانی
سے کہا۔

"بھیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا خیال ہے یہ کسی نے تمہارے اور میرے خلاف
سازش کی ہے"

"کیسی سازش؟" میجر شرت کے لہجے میں سرد پن تھا میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے میری انگلیوں کے پرنٹ لے کر ہمارے کسی دشمن نے یہی نشان لاش
کی گردن پر ڈال دیئے ہوں بھیا! یہاں کچھ لوگ ہم دونوں بھائیوں کے پیار محبت کو حسد
کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔"

میجر شرت کہنے لگا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی کاغذ پر سے انگلیوں کے نشان اٹھا کر لاش کی گردن پر
پرنٹ نہیں کئے جا سکتے۔"

میں نے کہا۔

"تو بھیا کیا میں نے کیپٹن صاحب کو قتل کیا ہے؟ کیا تم ایسا سمجھتے ہو؟"

میجر نے انگلیوں کے پرنٹ والا کاغذ ایک طرف کرتے ہوئے سگار کا کش لگاتے ہوئے
کہا۔

"میں تو ایسا نہیں سمجھنا چاہتا۔ مگر وہ بڑے بڑے افسر جو کیپٹن جوشی کے قتل کی
انکوائری کر رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ قاتل یہی شخص ہے جس کی انگلیوں کے نشان کاغذ
پر لئے گئے ہیں۔"

میرے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھ سے لاش کی گردن کو ٹٹولنے کی وجہ سے جو
غلطی ہو گئی تھی اس نے میرے لئے پھندا تیار کر دیا تھا اور میں اس موت کے پھندے
کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن میں آخری لمحے تک مقابلہ کرنے والا' لڑنے والا کمانڈو تھا۔
میں نے کہا۔

"بھیا! کیا تم بھی ایسا سمجھتے ہو کہ کیپٹن کو میں نے قتل کیا ہے؟ بھیا! مجھے کسی کو قتل
کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میری کیپٹن صاحب سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میں نے تو آج
تک ان کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

میجر شرت نے سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"میں خود اسی الجھن میں پڑا ہوں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ملٹری پولیس تو تمہیں گرفتار کرنے کے لئے میرے ساتھ یہاں آ رہی تھی مگر میں نے اپنے اثر و رسوخ سے انہیں روک لیا اور کہا کہ پہلے مجھے اپنے طور پر معلوم کر لینے دو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا اور اپنی طرف سے بے حد معصوم اور بے گناہ بنتے ہوئے کہا۔

"ہے بھگوان! تو ہی انترامی ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں دوشی نہیں ہوں"

میجر شرت نے انگلیوں کے پرنٹ والا کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور مجھ سے کہا۔

"دھرم ویر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک بار پھر جا کر انکوائری کمیٹی کو لاش کی گردن پر پڑے ہوئے انگلیوں کے نشانوں کے دوبارہ معائنے کے لئے کہتا ہوں۔ بہرحال تم یہیں رہنا۔"

کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس شخص کے دل میں بھائیوں والا پیار بیدار ہو گیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں دھرم! میں جانتا ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ کہیں کوئی غلطی ضرور لگ گئی ہے۔ میں سارا کیس دوبارہ چیک کراؤں گا۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ مگر چٹخنی نہ لگائی۔ اب میرے سامنے ایک ہی کام تھا کہ جیسے اور جس طرح سے بھی ہو سکے میں اس فوجی ہیڈ کوارٹر سے فوراً نکل جاؤں۔ موت کا پھندا میری آنکھوں کے سامنے لٹکنے لگا تھا۔ میں بچ نہیں سکتا تھا۔ تفتیش کرنے والی فوجی ٹیم اصولی طور پر مجھے کیپٹن جوشی کا قاتل قرار دے چکی تھی۔ اگر میجر شرت دیوان نہ ہوتا تو میں اب تک ملٹری پولیس کی حراست میں آ چکا ہوتا۔ ہیڈ کوارٹر کے مین گیٹ سے میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ انہیں میرے بارے میں اطلاع مل چکی ہو اور وہیں پکڑ لیا جاتا۔ میرا دماغ انتہائی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ فوجی

ہیڈ کوارٹر کا ایک چھوٹا راستہ بھی تھا۔ جو عقب میں تھا مگر وہاں بھی ہر وقت ملٹری پولیس کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ اس طرف سے جانا بھی خطرناک تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔ سوچا کہ کھڑکی میں سے پیچھے گندے نالے میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔ میں نے بیڈ روم میں جا کر کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ گندا نالہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا اور یہ کیچڑ بھرا بوجھل پانی بڑے بے معلوم انداز میں بہہ رہا تھا۔ اگر اس میں چھلانگ لگاتا ہوں تو کیچڑ کی دلدل میں دھنسنے کے بعد وہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی نالے کے دوسرے کنارے پر لوگ آ جا رہے تھے۔ وہاں شور مچ جاتا۔ لوگ جمع ہو جاتے اور گیٹ چونکہ تھوڑا آگے ہی تھا۔ قدرتی بات تھی کہ وہاں سے ملٹری پولیس کے سپاہی بھی آ جاتے اور میں پکڑا جاتا۔ میں تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا ایک دو منٹ کے اندر اندر کرنا تھا کیونکہ میجر شرت دیوان کیپٹن جوشی کے قاتل کی تحقیقات کرنے والی ٹیم کو یہ کہہ کر قائل نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نشان میرے بھائی کی انگلیوں کے نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے باقاعدہ گرفتار کرنے کے واسطے ملٹری پولیس کے آدمی کسی بھی لمحے وہاں آ سکتے تھے۔

دروازے کے باہر دیکھا تو مجھے تھوڑے فاصلے پر ایک سویلین ٹرک دیوار کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔ میں اس ٹرک کو بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ میں آپ کو اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ ہماری فوجی کنٹین میجر شرت دیوان کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ فاصلہ یہی کوئی ایک بلاک کا تھا۔ جو سویلین ٹرک فوجی کنٹین کے باہر دیوار کے ساتھ کھڑا تھا وہ فوجی کنٹین کے سویلین ٹھیکیدار مہتہ جی کا تھا۔ مہتہ جی کی ناگ پور شہر کے اندر غلہ منڈی میں اجناس خوردنی کی ہول سیل کی دکان تھی۔ یہ ٹرک وہاں سے ہر ہفتے آٹا' چاول' گھی' چائے' چینی' کا سٹاک لے کر کنٹین پر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج سپلائی لے کر ٹرک آنے والا ہے۔ چنانچہ یہ وہی ٹرک تھا۔ بس میرے فرار کی یہی ایک صورت تھی جو اس وقت میرے ذہن نے مجھے پیش کر دی۔

میں نے غور سے ٹرک کو دوبارہ دیکھا۔ ٹرک میں سے سپلائی اتاری جا چکی تھی اور اب اس میں خالی ڈرم اور لکڑی اور گتے کے خالی کھوکھے رکھے جا رہے تھے۔ ٹرک کا دروازہ پیچھے تھا جو کھلا تھا۔ اس دروازے کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ ٹرک کا کلینر اور ڈرائیور مجھے جانتا تھا۔ مگر میں ان پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا میں نے سوچ لیا تھا۔

بس اللہ کا نام لے کر سر جھکائے خاموشی سے میجر شرت کے ڈرائنگ روم سے نکلا اور برآمدے میں سے اتر کر گملوں اور کیاریوں کے قریب سے ہوتا ہوا ٹرک کی طرف چلنے لگا۔ میں نے چور نظروں سے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ فاصلہ زیادہ بالکل نہیں تھا جیسے ہی میں ٹرک کے عقب میں آیا۔ میں کھلے دروازے میں سے اس کے اندر گھس گیا۔ ٹرک میں خالی ڈرم ڈبے اور لکڑی کے خالی کریٹ تقریباً بھرے ہوئے تھے۔ کفایت شعار بلکہ کنجوس ٹھیکیدار مہتہ جی کا آرڈر تھا کہ کنٹین کو سپلائی پہنچانے کے بعد وہاں سے خالی کریٹ ڈرم وغیرہ واپس دکان پر پہنچا دیئے جائیں۔ میں لکڑی کے ڈبوں اور خالی ڈرموں کے پیچھے چھپ گیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن واقعی کچھ تیز ہو رہی تھی۔ یہ کوئی عام قسم کی سویلین جیل نہیں تھی۔ ایک فوجی ہیڈ کوارٹر سے بھاگنا تھا جہاں ہر کسی کے پاس اسلحہ تھا۔

اتنے میں مجھے ٹرک کے کلینر شمبھو ناتھ کی آواز آئی اس نے ڈرائیور ہری رام کو اونچی آواز میں کہا۔

"ہریا! چلو"

کلینر شمبھو ناتھ نے ٹرک کے پیچھے آ کر زور سے دروازے کے پٹ بند کئے اور پھر مجھے اس کے کھڑکی کھول کر ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے اور ڈرائیور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ٹرک کا انجن سٹارٹ ہوا۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا۔ انجن کو گیس دی اور ٹرک فوجی کنٹین کی دیوار سے نکل کر گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ چل پڑا۔ آگے کا مرحلہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ گیٹ پر اس ٹرک کی چیکنگ ہو سکتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ

کنٹین کی سپلائی لانے لے جانے والے ٹرک کی چیکنگ نہیں ہوا کرتی مگر یہاں معاملہ مختلف شکل اختیار کر چکا تھا۔ ممکن تھا گیٹ پر ڈیوٹی گارڈ کو آرڈر کر دیا گیا ہو کہ باہر نکلنے والی گاڑیوں کی چیکنگ کی جائے۔ اتنی دیر میں ٹرک گیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مجھے اس کا احساس اس وجہ سے ہوا کہ ڈرائیور ہری رام نے گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ کو نمسکار کیا تھا اور کہا تھا۔

"رام رام بھیا جی!"

اس کے ساتھ ہی ٹرک گیٹ کی معمولی سی ڈھلان اترنے کے بعد بائیں جانب ٹرن لے کر سڑک پر سیدھا ہو گیا اور اس کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہونا شروع ہو گئی۔ پھانسی کا وہ پھندا جو تھوڑی دیر پہلے میری آنکھوں کے بالکل سامنے لٹک رہا تھا اب مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ ٹرک سڑک پر اپنی معمول کی رفتار کے ساتھ چل پڑا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ یہ خیال بھی آیا کہ چند لمحوں کے بعد ملٹری پولیس میجر شرت کے ہوسٹل پر مجھے گرفتار کرنے کے لئے پہنچنے والی تھی۔ اگر وہاں آ کر اسے معلوم ہوا ہو گا کہ میں وہاں نہیں ہوں تو مجھے میرے کمرے میں دیکھا جائے گا۔ وہاں بھی نہ ہوا تو جب انہیں پتہ چلے گا کہ تھوڑی دیر پہلے سپلائی والا سویلین ٹرک وہاں سے نکلا تھا تو ملٹری پولیس کی جیپ تیزی سے تعاقب کرتی ٹرک تک پہنچ جائے گی اور ٹرک کھڑا کر کے تلاشی لے گی اور میں پکڑ لیا جاؤں گا۔

تو کیا مجھے راستے میں ہی کسی جگہ اتر جانا چاہئے؟ میں ٹرک راستے میں کسی جگہ رکوا سکتا تھا۔ ڈرائیور اور کلینر مجھے جانتے تھے۔ میں انہیں کہہ سکتا تھا کہ یار میں خالی ڈبے ٹرک میں رکھنے گیا تو تم لوگوں نے ٹرک چلا دیا۔ میں نے سوچا کہ چلو شہر کی تھوڑی سیر ہی کر لیتے ہیں۔ اگرچہ انہیں میری بات پر یقین نہیں آ سکتا تھا مگر مجھے انہیں یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا تھا۔ آخر غلہ منڈی پہنچنے کے بعد بھی جب ٹرک رک جاتا تو مجھے یہی ڈرامہ کرنا تھا۔ میں نے راستے میں اتر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ٹرک مختلف سڑکوں پر سے گزر چکا تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں فوجی ہیڈ کوارٹر سے کافی دور نکل آیا ہوں تو میں ڈرموں اور ڈبوں کے پیچھے سے نکل کر ٹرک کے پچھلے دروازے کے پاس آیا۔ اس کو باہر سے کنڈا لگا کر بند کیا گیا تھا جسے میں اندر سے نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ بھی ایک مسئلہ تھا میں نے درزوں میں سے سڑک پر پیچھے کی جانب دیکھا۔ مجھے دور تک کوئی فوجی گاڑی نظر نہ آئی۔ اس کے فوراً بعد میں نے ٹرک کی اس لوہے کی چادر والی دیوار پر زور زور سے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے جس کی دوسری جانب ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ ساتھ ہی میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"ارے ہری رام! ٹرک روکو۔ ٹرک روکو"

ٹرک کی رفتار ایک دم ہلکی ہو گئی اور وہ سڑک کے کنارے کی طرف ہونے لگا۔ ڈرائیور کی آواز آئی۔

"اندر کون ہے بے؟"

میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں ہوں دھرم ویر۔ کنٹین کا منیجر"

ٹرک کو فوراً بریک لگی۔ ٹرک رک گیا۔ ڈرائیور ہری رام اور شمبھو ناتھ جلدی سے پیچھے آئے۔ انہوں نے ٹرک کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھا تو حیران ہوئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یارا میں ٹرک میں یہ دیکھنے کے لئے گیا تھا کہ سپلائی کی کوئی چیز تو نہیں رہ گئی کہ تم لوگوں نے ٹرک چلا دیا میں نے سوچا کہ چلو تھوڑی سیر ہی کر لیتے ہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ لیکن وہ حیران اسی طرح تھے انہیں میری وضاحت پر یقین نہیں آیا تھا۔ مجھے انہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پتلون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ قمیض کی آستین کو ذرا سا جھاڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"اب تم لوگ جاؤ۔ میں ادھر مارکیٹ سے ہوتا ہوا واپس کنٹین پر چلا جاؤں گا۔"

"اچھا بابو۔ چلو شمبھو"

ڈرائیور یہ کہہ کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کلینر نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور ٹرک کی دیوار پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

"چلو ہریا جی"

اور ٹرک جس کا انجن چل رہا تھا سڑک پر آ کر آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک نگاہ سڑک پر پیچھے کی جانب ڈالی۔ سڑک پر دوسری گاڑیاں وغیرہ آ رہی تھیں۔ مگر مجھے کوئی فوجی گاڑی آتی دکھائی نہ دی۔ میں جلدی سے سڑک پار کر کے دوسری طرف آیا اور فٹ پاتھ پر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز چلنے لگا۔ ایک چوک آیا تو میں وہاں سے دوسرے بازار میں داخل ہو گیا۔ یہاں کافی ٹریفک تھا۔ میں نے اس دوران اپنی جیبوں کو ٹٹول کو دیکھ لیا تھا۔ میرے پاس نقدی کی شکل میں صرف پندرہ بیس روپے ہی تھے۔ ایک رومال تھا اور کچھ نہیں تھا۔ میں سب سے پہلے اپنے ساتھی جاسوس گھنشام کو فون پر اپنے آنے کی اطلاع کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف وہیں چھپ سکتا تھا۔ کیونکہ اس شہر میں ملٹری پولیس بہت جلد میری تلاش میں نکلنے والی تھی۔ جب ملٹری پولیس کو پتہ چلے گا کہ میں فرار ہو چکا ہوں تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ کیپٹن جوشی کا قاتل میں ہی ہوں۔ اس کے بعد میجر شرٹ پر جو مصیبت آنی تھی مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لیکن شہر میں میری تلاش بھی تیزی سے شروع ہو جانی تھی۔ ملٹری پولیس نے سول پولیس کو خبردار کر دینا تھا۔ اور میری تلاش اور مجھے پکڑنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے پڑنے شروع ہو جانے تھے۔ مجھے اس کارروائی کے شروع ہونے سے پہلے پہلے اپنے جاسوس کے پاس روپوش ہو جانا تھا۔ وہاں مجھے کسی جگہ کوئی پبلک ٹیلی فون بوتھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک بڑے سٹور میں داخل ہو گیا۔ میں نے وہاں سے اپنے جاسوس گھنشام کو فون کیا۔ وہ دکان پر ہی تھا میں نے خفیہ الفاظ میں اسے کہا کہ خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور میں آ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

"آجاؤ"

میں نے سٹور سے باہر آ کر ایک موٹر رکشا پکڑا اور اس علاقے کی طرف روانہ ہو گیا

جہاں ایک بازار میں گھنشام کی دکان تھی۔ وہ اسی طرح دکان کے اندر اپنے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس کا نوکر چیزوں کو ادھر ادھر سنبھال کر لگا رہا تھا۔ یاد رہے کہ میں نے جان بوجھ کر آپ کو یہ نہیں بتایا کہ ہمارے جاسوس کی دکان پر کیا چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ ان باتوں کا میری کہانی سے کوئی براہ راست تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ بھی یاد کراتا چلوں کہ ہمارے مجاہد کا نام گھنشام نہیں تھا۔ وہ مسلمان کشمیری نژاد تھا اور اس کا نام کچھ اور تھا مگر وہ وہاں ہندوانہ نام سے کئی سال سے دکان کر رہا تھا۔ اس کا ہندوانہ نام بھی کچھ اور تھا میں نے گھنشام اس کا فرضی نام رکھا ہوا ہے۔ گھنشام نے مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور لکڑی کا تنگ زینہ چڑھ کر اوپر والی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آگیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا اور مجھے گلے لگالیا۔ میں نے کہا۔

"تمہارے ایکسپلوسیوز نے کمال کر دکھایا"

اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"تم نے جو کارنامہ کر دکھایا ہے اس نے دلی کی حکومت کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اسرائیلی جرنیلوں کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس سے دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ہم یہی چاہتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اسرائیلی حکومت یہ سوچ کر محتاط ضرور ہو جائے گی کہ بھارت میں ان کے فوجی افسروں کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا"۔

گھنشام بولا۔

"میں نے اخبار میں ساری خبر پڑھ لی تھی۔ مجھے یہ بتانے کی تمہیں ضرورت نہیں کہ تم نے دھماکہ خیز سکاچ ٹیپ کس طرح جا کر وہاں لگائی تھی۔ لیکن میں تمہاری ہوشیاری اور جرات کی داد ضرور دوں گا۔ ہمیں کشمیر کی جدوجہد آزادی میں کامیاب

ہونے کے لئے تم ایسے مجاہد کمانڈوز کی ہی ضرورت ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ اس دھماکے کے بعد کیا ہوا اور تم نے جو فون پر کہا تھا کہ حالات خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں تو اصل بات کیا ہوئی ہے۔"

میں نے گھنشام کو سارے واقعات شروع سے آخر تک سنا دیئے اور کہا۔

"اگر میں ذرا دیر کر دیتا یا اس وقت اتفاق سے کنٹین کا ٹرک وہاں موجود نہ ہوتا تو میرا فوجی ہیڈ کوارٹر سے بچ کر نکل آنا ناممکن تھا۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہوا ہے۔ اب ایسا ہے کہ تمہیں کچھ دنوں کے لئے باہر نہیں نکلنا ہوگا۔ ان لوگوں کے پاس تمہارے شناختی کارڈ کی تصویر ضرور ہوگی۔ یہ تصویر ملٹری پولیس کے علاوہ شہر کی پولیس کو بھی سپلائی کر دی جائے گی۔ ہو سکتا ہے تمہاری تصویر اخباروں میں پولیس کی جانب سے دیئے گئے کسی اشتہار میں بھی چھپ جائے۔ لیکن میرا خیال ہے چونکہ تمہارے فوجی ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے میں فوج کی بدنامی کا پہلو نکلتا ہے اس لئے ممکن ہے تمہاری تصویر اخباروں میں نہ چھپے اور اشتہار بھی نہ چھپے پھر بھی تمہیں یہی سمجھنا چاہئے کہ شہر کا ہر سپاہی اور ملٹری پولیس کا ہر فوجی تمہاری شکل کو پہچانتا ہے اور تمہیں ان کے سامنے ہرگز نہیں جانا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میں اس کوٹھڑی میں بھی زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکتا۔ اس میں بھی خطرے کا پہلو نکلتا ہے۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"میں تمہیں یہاں نہیں رکھوں گا۔ میرے پاس ایک اور جگہ ہے۔ میں تمہیں رات کو وہاں لے جاؤں گا۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا اگلا پروگرام کیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں یہاں سے سیدھا کمانڈو شیروان کے پاس سری نگر جانا چاہتا ہوں تا کہ کشمیر اور

پاکستان پر انڈیا کے چار ماہ بعد متوقع حملے کے بارے میں گفتگو کروں"

پھر میں نے گھنشام کو بتایا کہ بھارت پاکستان پر اگست کے اواخر میں یا ستمبر کے شروع میں پاکستان پر حملہ کر دے گا۔

"یہ بھی میجر شرت کی ٹاپ سیکرٹ فائل میں خود پڑھ چکا ہوں۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"اس میں دیر سویر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن تمہارا فوری طور پر سری نگر پہنچنا ضروری ہے۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ ابھی تم یہیں بیٹھو۔ سونا چاہتے ہو تو بے شک سو جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تمہارے پاس آؤں گا۔"

گھنشام نیچے چلا گیا۔ کافی دیر تک میں اسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں لیٹا اگلے پروگرام کے خدشات اور امکانات پر غور و فکر کرتا رہا۔ اس وقت تک ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں میرے فرار کا علم سب کو ہو چکا تھا۔ شہر کے ہر چوک پر بس سٹینڈ اور ریلوے سٹیشن میرے لئے خطرناک شکل اختیار کر چکا تھا۔ فوجی حکام کو اب تک یہ بھی علم ہو گیا ہو گا کہ میں نے ہی اشوکا ہوٹل میں دھماکہ کیا ہے اور کیپٹن جوشی کا قاتل بھی میں ہی ہوں اور پانڈی چری والے جہازوں کی تباہی میں بھی میرا ہی ہاتھ تھا۔ اور میں دھرم ویر نہیں ہوں بلکہ انتہائی دلیر اور خطرناک کشمیری کمانڈو ہوں۔

گھنشام میرے لئے چائے کا گلاس لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے ایک آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس نے شہر کی سڑکوں پر ملٹری پولیس اور سول پولیس کی گاڑیاں گزرتی دیکھی ہیں۔ ظاہر ہے انہیں تمہاری تلاش ہے۔ وہ میرے لئے سگریٹ بھی لایا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور چائے پینے لگا۔ وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ شام کو آئے گا۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ میں شام تک کوٹھڑی میں ہی چھپا رہا۔ شام کو وہ میرے لئے کھانا لایا۔

"تم کھانا کھاؤ۔ میں تمہارے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہتا۔ دکان کے باہر میں نے پولیس کے دو سپاہی منڈلاتے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں پولیس نہیں آتی تھی۔ بہرحال تم فکر

نہ کرو ہم رات میں کسی وقت یہاں سے نکلیں گے۔"

جب رات کے نو بجے تو مجھے نیچے سے گھنشام کی آواز سنائی دی۔ وہ دکان کے ملازم سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں گھر جانا ہے تو چلے جاؤ۔ میں دکان خود ہی بند کر لوں گا۔ اس کے بعد پھر نیچے خاموشی چھا گئی۔ کوٹھڑی میں کمزور سی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ایک تپائی پر ٹائم پیس رکھا ہوا تھا۔ میں اسی ٹائم پیس سے وقت کا اندازہ کر لیتا تھا۔ کافی دیر بعد مجھے دکان کا دروازہ بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں یہی سمجھا کہ گھنشام دکان بند کر کے چلا گیا ہے اور اس وقت مجھے لے جانے کے لئے آئے گا جب رات کافی گہری ہو گئی ہو گی۔ مگر وہ دکان کے اندر ہی تھا۔ مجھے لکڑی کے زینے پر قدموں کی آہٹ آئی گھنشام کوٹھڑی میں آکر میرے پاس بیٹھ گیا اور تپائی پر رکھی گھڑی کو دیکھ کر بولا۔

"ہم رات کے ایک بجے کے بعد یہاں سے نکلیں گے"

میں نے پوچھا۔

"کیا اس وقت بازار میں پہرے دار یا پولیس کا کوئی آدمی تو نہیں ہو گا"۔

وہ سر کو اثبات میں آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ دن کے وقت یا رات کے وقت لوگوں کی موجودگی میں یہاں سے نکلو گے تو پکڑے جا سکتے ہو۔ تمہاری شکل سے واقف کوئی نہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی بازار میں ضرور ہو گا۔ رات ایک بجے کے بعد بازار بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ ایک چوکیدار ضرور پھرتا ہے مگر اس کا چکر کافی لمبا ہوتا ہے۔ باقی رہا خفیہ پولیس کا خطرہ تو اس سلسلے میں میں اپنی تسلی کرنے کے بعد تمہیں یہاں سے نکالوں گا۔"

میں نے اس سے کہا کہ میرے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ بھی نہیں ہے۔

"میں چاہتا تھا کہ سری نگر تک جانا ہے راستے میں جگہ جگہ خطرہ ہے۔ کسی طرح کے بھی حالات پیش آ سکتے ہیں۔ اگر کہیں سے مجھے کمانڈو چاقو ہی مل جاتا تو میں اپنا دفاع کر سکتا تھا۔"

گھنشام کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک ایسی نایاب شے دوں گا کہ پھر تمہیں کمانڈو چاقو یا پستول وغیرہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔"

میں جان گیا تھا کہ یہ شخص اسلحہ اور دھماکہ خیز اشیاء تیار کرنے کا بے حد ماہر اور تجربہ کار ہے۔ میں نے پوچھا۔ وہ کونسی چیز ہے؟"

گھنشام نے کہا۔

"یہ تمہیں بتاؤں گا نہیں۔ دکھاؤں گا اور جب دکھاؤں گا تو اس وقت بتاؤں گا کہ جو چیز تم دیکھ رہے ہو اصل میں وہ کیا ہے"

ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران ہم نے ایک ایک پیالی چائے بھی پی جو گھنشام نے وہیں بجلی کے چولہے پر بنائی تھی۔ اس دوران گھنشام نے اپنی اس حیرت انگیز ایجاد کے بارے میں کوئی بات نہ کی جو اس نے تیار کر رکھی تھی اور جو وہ مجھے اپنی حفاظت کے لئے دینے والا تھا۔ جب رات کا پورا ایک بج گیا تو وہ یہ کہہ کر نیچے دکان میں گیا کہ میں دیکھ کر آتا ہوں بازار میں چوکیدار تو نہیں پھر رہا۔ جب واپس آیا تو بولا۔

"آجاؤ۔ میدان بظاہر خالی ہے"

اس نے مجھے نسواری رنگ کی چادر دے کر کہا۔

"اسے اپنے سر منہ پر لپیٹ لو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ گھنشام نے خود وہاں کا ہندوانہ لباس یعنی لنگی کرتا چپل پہن رکھی تھی۔ دکان سے باہر نکلتے وقت اس نے چھتری بھی لے لی تھی۔ بازار سنسان پڑا تھا ساری دکانیں بند تھیں۔ بازار میں تھوڑی دور تک چلنے کے بعد ہم ایک بغلی گلی میں داخل ہو گئے۔ پھر ایک گلی سے دوسری گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک غیر آباد جگہ پر نکل آئے۔ سامنے دور کسی آبادی کی بتیاں جلتی نظر آ رہی تھیں۔ گھنشام کہنے لگا۔

"وہ سامنے والی آبادی ریلوے کالونی ہے۔ یہاں ناگ پور ریلوے کے دوسرے درجے کے سٹاف کے مکانات ہیں۔"

ہم ایک کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے گھنشام سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ مجھے کسی ایسی جگہ لے جا رہا تھا جہاں اس نے کوئی خفیہ کمین گاہ بنا رکھی تھی۔ دشمن ملک میں جو کمانڈو سپاہی یا جاسوس اپنے ملک کے لئے کام کرتے ہیں ان کے لئے اس قسم کی کوئی خفیہ کمین گاہ بڑی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں وہ اپنے جاسوسی کے مشن میں کام آنے والی ضروری اشیاء جن میں دھماکہ خیز چیزیں' فالتو کرنسی' بھیس بدلنے والا سامان اور ریڈیو ٹرانسمیٹر وغیرہ شامل ہوتے ہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ ایسی ہی خفیہ جگہوں سے جاسوس اپنے ملک کو ٹرانسمیٹر کے ذریعے یا دشمن ملک میں ہی اپنے دوسرے ساتھیوں کو خفیہ کوڈ میں ضروری پیغام پہنچاتے ہیں۔

چلتے چلتے ہم ایک ریلوے لائن پر آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں مجھے ادھر ادھر چھوٹے بڑے ٹیلوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گھنشام نے کہا۔

"یہ ناگ پور ورنگل کی مین لائن ہے۔ یہ سیدھی مدراس تک چلی جاتی ہے۔"

ہم جنوب کے رخ یعنی مدراس کی جانب ہی جا رہے تھے۔ ایک جگہ سے ایک لائن ایک طرف گھوم گئی۔ ہم اسی لائن پر آ گئے وہ کہنے لگا۔

"یہ لائن یہاں سے صوبہ کرناٹک کی طرف جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

گھنشام اندھیرے میں ہنس پڑا۔ بولا۔

"اتنی جلدی تھک گئے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

ایک چھوٹی پہاڑی کا خاکہ قریب آتا جا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر ریلوے لائن پہاڑی کی سرنگ میں داخل ہو جاتی تھی۔ سرنگ کے باہر سگنل کا کھمبا لگا تھا جس کی بتی سرخ تھی۔ میں گھنشام کے پیچھے سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ میں بہت آگے جا کر ایک جگہ روشنی

ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں لائن کی پٹڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ سرنگ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے راستہ بنا ہوا تھا۔ ہم اس راستے پر سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہے تھے۔ سرنگ ختم ہوئی تو گھنشام نے جو آگے آگے چل رہا تھا۔ پہلی بار جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی ڈالی۔ لوہے کے جنگلے والی سیڑھی نیچے گھاٹی میں اترتی تھی۔ گھنشام بولا۔

"احتیاط سے سیڑھی اترنا"

یہاں گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ چونکہ فضا کشادہ اور جنگل کی تھی اس لئے بادلوں بھرے آسمان کے باوجود چیزوں کے دھندلے دھندلے خاکے دکھائی دے رہے تھے۔ لوہے کی سیڑھی اترنے کے بعد گھنشام نے پہاڑی کی دیوار کی طرف روشنی ڈالی تو مجھے ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم دکھائی دیا جس کے سامنے کوئی ریلوے لائن نہیں تھی۔ پہاڑی کی دیوار میں ساتھ ساتھ دو کوٹھڑی سی بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کا دروازہ غائب تھا۔ دوسری کوٹھڑی کے آگے لکڑی کا تختہ لگا دیا گیا تھا۔ گھنشام اس کوٹھڑی کی طرف بڑھا کہنے لگا۔

"کبھی یہاں ایک پہاڑی ریلوے سٹیشن ہوا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ اردگرد کے جنگلوں میں آدم خور شیروں کا ایک جوڑا کہیں سے آگیا۔ انہوں نے ریلوے کوارٹروں میں آکر لوگوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ شکاری بلوایا گیا۔ ایک شیر مارا گیا۔ پھر ویسا ہی ایک اور آدم خور شیر کہیں سے آگیا۔ یہاں دن کے وقت بھی ٹرین رکتی تو شیر حملہ کر دیتے۔ رفتہ رفتہ اس سٹیشن کو یہاں سے اٹھا کر دس پندرہ میل آگے لے جایا گیا۔ تب سے یہ جگہ ویران ہے۔ میں نے اپنی خفیہ کمین گاہ کے لئے اس جگہ کو چنا کیونکہ اس طرف سے اب دن کے وقت بھی کوئی نہیں گزرتا۔"

اس نے کوٹھڑی کے آگے سے تختہ تھوڑا سا ہٹا دیا۔ یہ کوٹھڑی پہاڑی کے اندر دیوار کو کھود کر بنائی گئی تھی۔ اس نے ٹارچ اور چھتری مجھے پکڑا دی۔ ایک موم بتی کہیں سے نکال کر روشن کی۔ کوٹھڑی چھوٹی سی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف چٹائی بچھی ہوئی

تھی۔ گھنشام نے موم بتی دیوار کے طاق میں لگا دی۔ چٹائی کو ایک طرف ہٹا دیا۔ اس کے نیچے لکڑی کا تختہ تھا۔ تختے کو ہٹایا اور ایک تنگ زینہ نیچے جاتا نظر آیا۔ ہم زینہ اتر گئے۔ نیچے ایک کوٹھڑی سے چھوٹا تہہ خانہ تھا۔ ٹارچ گھنشام کے ہاتھ میں تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے ایک طرف لکڑی کے تخت پر ایک صندوق دیکھا۔ صندوق کا ڈھکنا کھول کر گھنشام نے اندر سے ایک چھوٹا ٹرانسمیٹر نکال کر دکھایا۔ کہنے لگا۔

"یہ بڑا طاقتور ٹرانسمیٹر ہے"

اس کے علاوہ صندوق میں بھیس بدلنے کا مختلف سامان کپڑے اور دھماکہ خیز آلات بنانے کی چیزیں بھی تھیں۔ گھنشام نے مجھے ایک پوائنٹ فائیو کا آٹو میٹک پستول دکھایا۔ جس کے آگے سائی لینسر لگا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم اگر چاہو تو کمانڈو شیروان کو ٹرانسمیٹر پر پیغام پہنچا سکتے ہو۔"

مجھے اس کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے فوراً ٹرانسمیٹر اون کیا سگنل کوڈ مجھے معلوم تھا۔ اس وقت رات بھی آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کمانڈو شیروان سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ پیدا کرنے کا یہی وقت تھا۔ میں نے فریکوئنسی ملا کر خفیہ سگنل دینے شروع کر دیئے۔ فوراً دوسری طرف سے بھی خفیہ سگنل موصول ہو گیا۔ میرا اور شیروان کا رابطہ قائم ہو گیا۔ میں نے اسے خفیہ کوڈ میں مختصر الفاظ میں اشوکا ہوٹل کی تباہی اور اسرائیلی اور بھارتی جرنیلوں کی ہلاکت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ باقی کی تفصیلات میں خود سری نگر آکر بیان کروں گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کمانڈو اورنگ زیب میرے پاس سری نگر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی مجھے خوشی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر کے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ اپنا آدمی گھنشام بولا۔

"یہاں باہر کوئی فوجی انسٹلائزیشن وغیرہ نہیں ہے۔ اس لئے کوئی ہمارے سگنل ڈی ٹیکٹ نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد ہم اوپر کوٹھڑی میں آکر چٹائی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ گھنشام نے کہا۔

"یہاں دن کے وقت بھی کوئی نہیں آتا۔ یہ بالکل ویران علاقہ ہے۔"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیا آدم خور شیر بھی نہیں آتے؟"
وہ ہنس کر کہنے لگا۔
"جب ریلوے والے یہاں سے سٹیشن اٹھا کر آگے لے گئے تھے تو اس کے ساتھ آدم خور شیر بھی آگے چلے گئے تھے۔ لیکن پھر ایک انگریز شکاری کہیں سے آگیا۔ اس نے ان آدم خوروں کو ہلاک کر دیا۔ اب یہاں کبھی کوئی شیر نہیں دیکھا گیا۔"
میں نے گھنشام سے کہا۔
"میں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جتنی جلدی ہو سکے کوئی ایسا بندوبست کر دو کہ میں ناگ پور کے علاقے سے نکل جاؤں۔ ایک بار اس خطرے والے علاقے سے نکل گیا تو آگے سری نگر میں اپنے آپ چلا جاؤں گا۔"
گھنشام بولا۔
"جس قسم کے حالات یہاں پیدا ہو گئے ہیں ان کے مطابق میرے خیال میں تمہیں کم از کم تین چار دن تک یہاں چھپے رہنا ہو گا۔ اس کے بعد میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ ابھی خطرہ ہے۔"
میں نے کہا۔
"میں تین چار دن گزار لوں گا۔"
گھنشام کہنے لگا۔
"میں منہ اندھیرے یہاں آکر تمہیں کھانے پینے کو دے جایا کروں گا۔ تم کوشش کرنا کہ دن کے وقت باہر مت نکلو۔ رات کو بے شک باہر نکل کر چہل قدمی کر لیا کرنا۔"
گھنشام آتی دفعہ تہہ خانے سے آٹو میٹک پستول لیتا آیا تھا۔ اس نے پستول حفاظت کے لئے مجھے دے دیا اور کچھ دیر میرے پاس بیٹھے رہنے کے بعد صبح منہ اندھیرے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ کوٹھڑی میں موم بتی کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چٹائی پر بیٹھا آٹو میٹک

پستول کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک بات میں نے اپنے ان مجاہد کمانڈوز اور جاسوسوں میں دیکھی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ کمانڈو شیروان نے مجھ سے وائرلیس پر بالکل نہیں پوچھا تھا کہ میں ناگ پور میں اپنے کس آدمی کے پاس روپوش ہوں۔ اسی طرح گھنشام نے مجھ سے سوامی گورکھ ناتھ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہر مجاہد دشمن کے پیٹ میں گھس کر اپنی جان خطرے میں ڈال کر وطن کی آزادی کے لئے خاموشی سے اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا تھا۔ یہ کمانڈو اور جاسوس کا ڈسپلن ہوتا ہے اس ڈسپلن کا ہر کمانڈو، ہر جاسوس بے حد خیال رکھتا ہے اور اسے خیال رکھنا پڑتا ہے ورنہ اس کی اپنی سلامتی اور اس کے مشن کی کامیابی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔
میں نے اٹھ کر کوٹھڑی کا تختہ ذرا سا ہٹایا اور باہر نکل آیا۔ بارش کی باریک سی پھوار پڑ رہی تھی۔ یہ وسطی ہند کی برسات کی جھڑی تھی۔ فضا میں خنکی ہو گئی تھی۔ سامنے ایک طرف اونچی پہاڑیوں کے ہیبت ناک ہیولے کھڑے تھے۔ دوسری جانب دور کسی جگہ روشنی جھلملا رہی تھی۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ کھلی فضا میں چند لمحے ٹھہرنے کے بعد میں کوٹھڑی میں واپس آکر چٹائی پر لیٹ گیا۔ مجھے ایک عجیب سی مگر مانوس بو کا احساس ہوا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے اس بو کو پہچان لیا تھا۔ یہ سیندور کی بو تھی اور میری دشمن چندر ریکا کی بد روح کی بو تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔
"چندر ریکا! کیا تم ہو؟"
کوٹھڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ میں نے ایک بار پھر یہی سوال دہرایا۔ اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔ مگر بد روح کی بو تیز ہو گئی تھی۔ ضاف ظاہر تھا کہ چندر ریکا وہاں موجود ہے۔ یہ خیال میرے تحت الشعور میں ہر وقت رہتا تھا کہ نظام الدین اولیاء" کے علاقے میں جو مغل شہزادے کی خانقاہ تھی وہاں مغل شہزادے کی نیک روح نے عالم رویا میں مجھ سے ہم کلام ہو کر مجھے خبردار کیا تھا کہ آئندہ کسی بھی وقت مجھ پر ایک ایسی ناگہانی آفت نازل ہو گی جس کا علاج میرے پاس نہیں ہو گا۔ اور اس کے لئے مجھے نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے کے جنگل میں شہید مسلمان خاتون کے گمنام مزار پر جانا ہو گا۔

جب کوٹھڑی میں چندریکا کی بدروح کی بو آئی تو میں سمجھ گیا کہ میری ناگہانی آفت کا وقت آن پہنچا ہے۔ چندریکا کی بدروح نے ناگ پور کی ملٹری انٹیلی جینس کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے سرنگ میں انڈین فوج کی پوری کمپنی مجھے پکڑنے کے لئے موجود ہو۔ میں نے چندریکا کی نظر نہ آنے والی بدروح کو مخاطب کر کے کہا۔

"چندریکا! میں جانتا ہوں تم میری جان کی دشمن بن چکی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھے کسی بھی وقت میرے دشمنوں کے حوالے کر سکتی ہو۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ بت پرست نہیں ہوں' بت شکن ہوں۔ ایک خدا ایک رسول پاک ﷺ کا ماننے والا مجاہد ہوں تمہارا کوئی ناپاک حربہ مجھ پر کامیاب نہیں ہوگا۔ اسلام نے ہمیشہ کفر کو ہر میدان میں شکست دی ہے۔ میں بھی تمہیں ہر جگہ شکست دوں گا۔"

میں چپ ہوگیا۔ خیال تھا کہ چندریکا کی بدروح آگے سے کچھ بولے گی۔ مگر وہ بالکل خاموش رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی تیز بو کم ہونے لگی۔ پھر کم ہوتے ہوئے بالکل غائب ہوگئی۔ میری دشمن چندریکا کی بدروح جا چکی تھی۔ میں نے موم بتی کو اسی طرح جلتے رہنے دیا اور کلمہ شریف پڑھ کر سو گیا۔

میں تھوڑی دیر تک ہی سویا ہوں گا۔

گھنشام وعدے کے مطابق منہ اندھیرے میرے لئے کھانا لے کر آگیا۔ وہ ایک تھرمس میں پانی اور ایک تھرمس میں چائے لایا تھا۔ کہنے لگا۔

"شہر میں پولیس جگہ جگہ تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ میں تمہیں ٹھیک وقت پر یہاں لے آیا"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں میری تلاش کا یہ سلسلہ کتنی دیر تک جاری رہے گا۔"

وہ بولا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال جیسے ہی حالات ذرا نارمل ہوئے میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی جگہ پہنچنا ضروری ہے۔"

"وہ چلا گیا۔ موم بتی اس نے آتے ہی نئی روشن کر دی تھی۔ میں نے برتن میں سے تھوڑے سے چاول نکال کر کھائے۔ پانی پیا' پھر گرم گرم چائے تھرمس میں سے نکال کر پی۔ برتنوں کو رومال میں باندھ کر کونے میں ایک طرف رکھ دیا اور موم بتی بجھا کر تختہ ذرا سا ہٹا کر باہر کھلی فضا میں نکل آیا۔ باہر دن کی روشنی ابھی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں سے پو پھٹنے کے وقت جو دھندلی سی سفیدی نمودار ہوتی ہے وہ ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ میں تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اتنے میں مجھے دور سے بھاپ سے چلنے والے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی

دی۔ ناگ پور شہر کی جانب سے کوئی ٹرین آرہی تھی۔ میں ایک طرف باہر کو نکلی ہوئی چٹان کی اوٹ میں ہو گیا ریلوے لائن ہماری کوٹھڑی کے اوپر تھوڑے سے فاصلے پر سے گزرتی تھی۔ مجھے سرنگ کا دہانہ یعنی وہ جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں سے ٹرین نے سرنگ میں داخل ہونا تھا۔ اوپر سرنگ کا وہ منہ نظر آرہا تھا جہاں سے ٹرین نے باہر نکلنا تھا۔ سرنگ میں داخل ہونے سے پہلے ٹرین کا انجن مسلسل سیٹیاں بجا رہا تھا۔ پھر اس کی گڑگڑاہٹ کی گونج مدھم ہو گئی۔ ٹرین سرنگ میں داخل ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں پچھلے پہر کے نیم اندھیرے میں سرنگ کے دوسرے دہانے پر لگی تھیں۔ وہاں سے ٹرین کے انجن کی سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر روشنی باہر نکلنے لگی۔ روشنی تیز ہوتی گئی۔ اس کے بعد ایک بہت بڑی ریل گاڑی کا انجن چیختا چنگھاڑتا' دھڑدھڑاتا ہوا ٹرین کے ڈبوں کو لے کر تیز رفتاری سے سرنگ میں سے نکل آیا۔ زمین ہلنے لگی۔ ٹرین کے ڈبوں کی روشنیاں تیزی سے آگے کو جا رہی تھیں۔

میرے دل میں خیال آیا۔ کاش میں بھی اس ٹرین میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہوتا اور اس شہر سے دور ہوتا چلا جاتا۔ لیکن مقدر نے میرے نامہ اعمال میں کچھ ایسی باتیں لکھ دی تھیں۔ جن کا پورا ہونا ضروری تھا۔ ٹرین گزرنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک اسی جگہ ان ہی خیالات میں گم بیٹھا رہا۔ پھر صبح ہو گئی ابر آلود صبح کی روشنی میں میں نے آس پاس کے ماحول کو دیکھا۔ یہ شہر سے باہر کا نیم سطح مرتفع کا علاقہ تھا۔ سامنے کی جانب دو تین بلند پہاڑیاں تھیں۔ آگے میدان دور تک چلے گئے تھے۔ اس خیال سے کہ کوئی مجھے وہاں بیٹھا دیکھ نہ لے۔ میں کوٹھڑی میں آگیا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ رات کے پچھلے پہر گھنشام نے آکر بتایا کہ حالات کچھ بہتر ہو گئے ہیں اور اب تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ میں نے اسے کہا۔

"تم نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھے اپنی ایک ایسی ایجاد دکھانا چاہتے ہو جس کو دیکھ کر میں حیران رہ جاؤں گا۔"

گھنشام بولا۔

"مجھے یاد ہے۔ اپنی یہ خاص ایجاد میں تمہیں یہاں سے رخصت ہوتے وقت دینا چاہتا تھا۔ میں کل صبح منہ اندھیرے آؤں گا۔ اس وقت تم سے بات ہو گئی۔"

"کیا کل صبح میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا؟"

وہ بولا۔

"یہ میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ اگلے روز منہ اندھیرے سے کچھ پہلے آگیا۔ اس وقت میں کوٹھڑی میں سو رہا تھا۔ اس نے آکر مجھے جگایا اور کہنے لگا۔

"آج تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا"

پھر اس نے چٹائی ہٹائی۔ تختہ ایک طرف کر کے نیچے تہہ خانے میں گیا اور ایک چھوٹا سا ڈبہ اٹھا کر لے آیا۔ ڈبے میں سے اس نے ایک سیاہ رنگ کا بال پوائنٹ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بال پوائنٹ ہے"

میں نے اسے کھولا اور گتے کے باہر انگریزی میں شہر ناگ پور کا نام لکھا۔ وہ بولا۔

"تم ہی نہیں جو کوئی بھی اسے دیکھے گا یہی کہے گا کہ یہ ایک بال پوائنٹ پین ہے"

میں نے کہا۔

"تو کیا یہ بال پوائنٹ پن نہیں ہے؟"

وہ بولا۔

"یہ بال پوائنٹ پن ہی ہے۔ مگر ایک عام بال پوائنٹ پن اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرا بال پوائنٹ پین صرف لکھ سکتا ہے مگر یہ بال پوائنٹ لکھ بھی سکتا ہے اور دشمن کی جان بھی لے سکتا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

گھنشام نے بال پوائنٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے اسے تھوڑا سا گھما کر اس کا سرے والا حصہ الگ کر دیا۔ پھر اس نے مجھے سرے والی لمبی سلاخ کے نیچے لگی ہوئی ایک اور پتلی سی نالی دکھائی۔ کہنے لگا۔

"اس نالی کو غور سے دیکھو۔"

موم بتی جل رہی تھی۔ گھنشام نے ٹارچ کی روشنی بھی ڈالی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے بال پوائنٹ کے سرے والی نالی کے نیچے چپکی ہوئی دوسری پتلی سی نالی میں چاول کے دانوں کے برابر آگے پیچھے لگی ہوئی سوئیاں سی نظر آئیں۔ گھنشام کہنے لگا۔

"اب بال پوائنٹ کو پہلے کی طرح بند کر دو۔"

میں نے اسے بند کر دیا۔ گھنشام نے دیوار کے ساتھ گتے کے ڈبے کو سیدھا کھڑا کر کے لگا دیا اور بولا۔

"بال پوائنٹ کا رخ اس گتے کی طرف کر دو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس نے کہا۔

"بال پوائنٹ کے اوپر کی جانب اس کی کیپ کے نیچے تمہیں ایک دانے کی طرح کا بٹن ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ اسے دبا دو۔"

میں نے بال پوائنٹ کی کیپ کے نیچے انگلی پھیری۔ وہاں ایک دال کے دانے کے برابر بٹن ابھرا ہوا تھا۔ جس کا رنگ بال پوائنٹ کے رنگ ایسا ہی تھا اور دیکھنے سے بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے بال پوائنٹ کا رخ دیوار کے ساتھ لگے گتے کے ڈبے کی طرف پہلے ہی سے کیا ہوا تھا۔ اب اس کا بٹن دبایا تو بڑی معمولی سی ایسی آواز آئی جیسے کوئی شے بال پوائنٹ کے اندر سے نکل گئی ہو۔ گھنشام نے دیوار کے ساتھ لگے گتے کے ڈبے کو اٹھایا اور اسے میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو۔ یہاں ایک سوراخ ہو گیا ہے۔ یہ سوراخ پہلے نہیں تھا۔ جانتے ہو یہ سوراخ کس کا ہے؟"

تب اس نے مجھے بتایا کہ بال پوائنٹ کا بٹن دبانے سے اس کے اندر سے چاول کے دانے کے سائز کی سوئی نکل کر اس گتے کے اندر جا چکی ہے۔ اس نے گتے کے ڈھکن کو الگ کیا۔ اندر ایک سوئی پڑی تھی۔ یہ وہی سوئی تھی جو میں نے بال پوائنٹ کی سرے والی سلاخ کے نیچے لگی ہوئی فالتو نالی کے اندر دوسری سوئیوں کے ساتھ چپکی ہوئی دیکھی تھی۔ گھنشام نے کہا۔

"یہ بال پوائنٹ ایک بڑا خطرناک پستول ہے۔ جب تم اسے دشمن کے قریب لے جا کر بٹن دباؤ گے تو اس میں سے یہ زہریلی سوئی نکل کر دشمن کے جسم میں داخل ہوتے ہی اسے ہلاک کر دے گی۔ اس وقت اس بال پوائنٹ پستول کے اندر پچاس زہریلی سوئیاں بھری ہوئی ہیں۔ یہ ساری کی ساری سوئیاں سائی نائیڈ زہر میں بجھی ہوئی ہیں۔ سائی نائیڈ سب سے زیادہ ہلاکت خیز زہر ہے۔ انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہی یہ اسے موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ زہریلی سوئی اس قدر رفتار کے ساتھ بال پوائنٹ کے سوراخ میں سے نکلتی ہے کہ دشمن نے اگر اوور کوٹ بھی پہن رکھا ہو تو یہ اس کو چیرتی ہوئی دشمن کے جسم میں اتر جائے گی۔ اس کی رینج پچاس فٹ تک کی ہے اگر آدمی کا نشانہ درست ہو تو یہ پچاس فٹ کی دوری سے دشمن کے جسم کو ہٹ کر کے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دے گی۔"

اس نے بال پوائنٹ مجھے دے کر کہا۔

"یہ اب تم اپنے پاس رکھو گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں راستے میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ میں تمہیں کچھ فالتو سوئیاں بھی دے سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں ان کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پچاس زہریلی سوئیاں بال پوائنٹ میں بھری ہوئی ہیں میرے اندازے کے مطابق یہ ایک مدت تک تمہارے کام آئیں گی۔ اس کے بعد اگر ضرورت پڑی تو تمہیں جہاں تم ہو گے پہنچا دی جائیں گی۔"

میں نے بال پوائنٹ کو کھول کر دوبارہ اس کا معائنہ کیا۔ اسے کیپ لگائی۔ اور پتلون کی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ گھنشام نے جیب سے ریلوے کا ایک ٹکٹ نکال کر مجھے دیا۔ یہ زرد رنگ کا گتے کا چھوٹا سا ٹکٹ تھا۔ اس پر انگریزی اور ہندی میں لکھا تھا۔

"ساؤتھ انڈیا ریلوے ناگ پور سے دلی تک"

گھنشام بولا۔

"یہ تمہارا دلی تک کا ریلوے کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ یہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو گے"

اس نے آٹومیٹک پستول مجھ سے لے لیا۔ کہنے لگا۔

"بال پوائنٹ پستول کے ہوتے ہوئے تمہیں اس پستول کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں سے آگے ایک سٹیشن ہے جس کا نام جھریالی ہے۔ جھریالی سٹیشن پر گاڑی رکتی ہے۔ ابھی ناگ پور سے گاڑی کے آنے میں ایک گھنٹہ ہے۔ اتنی دیر میں ہم جھریالی پہنچ جائیں گے۔ اب اللہ کا نام لے کر یہاں سے نکل چلو۔"

ہم پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ریلوے لائن پر آ گئے۔ وقت وہی رات کا پچھلا پہر تھا اور مجھے اسی گاڑی کو پکڑنا تھا جسے میں نے پچھلی رات سرنگ میں سے نکل کر آگے جاتے دیکھا تھا۔ گھنشام کچھ دور تک ریلوے لائن کے ساتھ چلنے کے بعد ایک جگہ پر دوسری طرف سے نیچے اتر گیا۔ یہاں سے ہم رات کے اندھیرے میں ٹیلوں کے درمیان آ گئے۔ یہ ریلوے لائن پہاڑیوں اور میدانوں میں چکر لگانے کے بعد آگے جا کر ایک برساتی نالے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ جھریالی کا ریلوے سٹیشن اس برساتی نالے کے پل کے آگے تھا۔ ہم کوئی پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ اس دوران ہمیں دو ایک بار اپنے عقب میں ٹیلوں کے پیچھے سے ریلوے انجن کی سیٹیوں کی آواز سنائی دی۔ گھنشام بولا۔

"ریل ہماری کمین گاہ کی سرنگ میں سے نکل آئی ہے۔"

جھریالی سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے صبح ہو گئی تھی۔

آسمان پر بادل کل کی طرح جھکے ہوئے تھے۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا۔ ٹکٹ میری جیب میں تھا۔ بارش میں بھیگا ہوا پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ صرف ریلوے کا ایک آدمی ہاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں لپیٹے کھڑا تھا۔ گھنشام نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"دوست! اب میں جاتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب خدا کرے کہ تم بھی اپنا فرض پورا کر سکو۔ خدا حافظ!"

یہ کہہ کر وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ اس دوران دور سے ریل گاڑی نظر آنے لگی تھی۔ سٹیشن کے چھوٹے سے کمرے میں سے ایک قلی ٹرالی میں کچھ تھیلے لادے باہر نکل آیا اور پہلے سے کھڑے ریلوے افسر کے پاس آ کر رک گیا۔ یہ تھیلے اس ٹرین میں لادے جانے والے تھے۔ میں ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ٹرین آ کر رک گئی۔ میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کوئی دو منٹ بعد انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے بھی سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ اس ٹرین نے مجھے اگلے روز رات کے دو بجے دلی پہنچا دیا۔

یہاں سے مجھے دوسری گاڑی پکڑ کر پنجاب اور وہاں سے جموں کی طرف روانہ ہونا تھا۔ معلوم ہوا کہ پنجاب کی طرف گاڑی صبح سوا سات بجے چھوٹے گی۔ یہ وقت میں نے دلی کے سٹیشن پر ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹی سٹال سے چائے پی اور پلیٹ فارم پر ایک ویران سی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرا حلیہ یہ تھا کہ مونچھیں پہلے ہی میں نے رکھ لی ہوئی تھیں۔ کئی روز سے شیو نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے ڈاڑھی بڑھ آئی تھی۔ وہی پتلون قمیض پہن رکھی تھی جو اب میلی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب سری نگر پہنچ کر ایک بار ہی کپڑے بدلوں گا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ میں پلیٹ فارم کے آخر میں ایک جگہ سامان کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ سامنے ریلوے لائن پر سگنل کی سرخ اور سبز بتیاں روشن تھیں۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک ساری روشنیاں بجھ گئیں۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ بتیاں کیسے بجھ گئیں۔ میں نے آنکھیں پوری طرح سے کھول کر دیکھا۔ سارے سٹیشن پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بجلی کا بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ جیسے ہی میں نے اپنی آنکھیں نیچی کیں تو مجھے اپنا جسم بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ مجھے اپنا ہاتھ نظر نہ آیا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس پڑی تھی۔ میں نے ماچس نکال کر جلائی۔

مجھے ماچس کا شعلہ نظر نہ آیا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا۔ مجھے شعلے کی گرمی محسوس ہوئی۔ ماچس کی تیلی جل رہی تھی مگر مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے تیلی ایک طرف پھینکی اور وہیں بیٹھ کر سوچنے لگا میری بینائی تو نہیں جاتی رہی۔ میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری بینائی جاتی رہی ہے اور میں اندھا ہو گیا ہوں۔ ان حالات میں اس سے بڑی مصیبت مجھ پر نازل نہیں ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے مغل شہزادے کی روح کی پیشین گوئی یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ عنقریب مجھ پر ایک بھاری آفت نازل ہونے والی ہے۔ یا اللہ! کیا یہ وہی آفت ہے جس کی پیشین گوئی مغل شہزادے کی نیک روح نے کی تھی؟ اچانک مجھے چندریکا کی بدروح کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ آفت چندریکا کی بدروح کی طرف سے مجھ پر نازل ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ میں نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔

"چندریکا! بدروح چندریکا! تم نے آخر مجھ پر وار کر دیا ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ میرا خدا مجھے اس آفت سے نکال لے گا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایسے جہنم کی آگ میں پہنچا دوں گا کہ جہاں سے تم کبھی بھی نہ نکل سکو گی۔"

مجھے چندریکا کے ہلکے سے فاتحانہ قہقہے کی آواز سنائی دی۔ اور یہ آواز دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی چندریکا بدروح کی بو بھی غائب ہو گئی۔ میں نے زور زور سے آنکھیں جھپک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر میں بالکل اندھا ہو چکا تھا۔ مجھے مغل شہزادے کی ہدایت فوراً یاد آ گئی تھی۔ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مجھے نجیب آباد میں پتھر گڑھ کے قلعے کے قریبی جنگل میں شہید مسلمان خاتون کی قبر پر جا کر اس کی روح کے لئے مغفرت کی دعا کرنی تھی۔ اس کے بعد مغل شہزادے کے کہنے کے مطابق شہید خاتون کی روح نے مجھے اس ناگہانی آفت سے نکلنے کا راستہ بتانا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اور میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے میں کیسے پہنچوں گا۔

اتنے میں میری آنکھوں کے آگے روشنیاں سی ابھرنے لگیں۔ میں نے زور سے آنکھیں ملیں۔ اب آنکھوں کو جھپکا تو ریلوے سگنلوں اور دلی سٹیشن کی روشنیاں پھر سے نظر آنا شروع ہو گئیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چندریکا کی بدروح کی بددعا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ اب میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میری بینائی واپس آ چکی تھی۔ میں جلدی سے سٹیشن کے باہر گیا۔ نجیب آباد کا ریل کا ٹکٹ خریدا اور معلوم کیا کہ دلی سے نجیب آباد گاڑی کون سے پلیٹ فارم سے کس وقت روانہ ہو گی۔ یہ ساری معلومات لے کر میں مطلوبہ پلیٹ فارم پر آ کر ایک جگہ اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ نجیب آباد میں اس لئے جانا چاہتا تھا کہ مجھے معلوم تھا چندریکا کی بدروح دوبارہ حملہ کرے گی اس لئے بہتر یہی ہے کہ مجھے سری نگر سے جو نجیب آباد جانا پڑے گا۔ ابھی کیوں نہ وہاں جا کر اس آفت کا توڑ معلوم کروں اور چندریکا کی بدروح کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کر دوں۔

میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک بار پھر میری بینائی نے جواب دے دیا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یا اللہ! میری مدد فرما۔ یہ کیسی مصیبت مجھ پر نازل ہو رہی ہے۔ یہ اندھے پن کی حالت مجھ پر کوئی پندرہ بیس منٹ تک طاری رہی۔ اس کے بعد مجھے پھر سے دکھائی دینا شروع ہو گیا۔ اب میرا نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے کی طرف جانا ضروری ہو گیا تھا۔ دن نکلنے کے بعد مجھے نجیب آباد والی گاڑی ملی۔

اس وقت مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں ڈبے میں باتھ روم کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا کہ اگر راستے میں میری بینائی جاتی رہی تو کم از کم باتھ روم میں تو پکڑ پکڑ کر داخل ہو سکوں گا۔ ٹرین چل پڑی۔ آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر میری آنکھوں کی روشنی بجھ گئی۔ پریشانی کی حالت میں سیٹ پر منہ باہر کئے بیٹھا رہا۔ دن کا وقت تھا۔ ٹرین تیزی سے جا رہی تھی۔ مگر مجھے کھڑکی کے باہر سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ حالت آدھ گھنٹے تک رہی۔ اس کے بعد ایک بار پھر میری بینائی واپس آ گئی۔ اب یہ ہوتا

کہ کبھی آدھے گھنٹے بعد اور کبھی ایک گھنٹے بعد میں اندھا ہو جاتا۔ یہ حالت کبھی پندرہ منٹ کبھی آدھا گھنٹہ طاری رہتی۔ اس کے بعد پھر مجھے سب کچھ دکھائی دینے لگ جاتا۔ اسی اندھیرے اجالے' بینائی اور نابینائی کی حالت میں میں آخر نجیب آباد پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس دوران کسی کو مجھ پر شک نہ ہوا۔ کوئی سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی بھی مجھے نہ ملا۔ نجیب آباد میں بھی آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ ابھی شام ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں چپکے سے سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ یہ سٹیشن اور اس کے آس پاس کا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا۔

"پتھر گڑھ قلعے کے عقب میں نجیب آباد کے گھنے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا گھنا دشوار گزار جنگل ہے جس کو کجلی بن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کجلی بن کے جنگل میں ایک ٹیلہ ہے جس کو لال پہاڑی کہتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کی چوٹی پر دو سرخ رنگ کی مخروطی چٹانیں ایک دوسری کے پہلو میں کھڑی ہیں۔ جب تم پر ناگہانی آفت نازل ہو تو تم کجلی بن کی اس لال پہاڑی کے دامن میں پہنچ جانا۔ یہاں ایک پرانا کنواں ہے۔ اس کنوئیں کے پاس بانس اور ہوا درختوں کے درمیان ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ اس قبر کا نشان زمین سے ابھرے ہوئے دو تین پتھر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ اس بہادر مسلمان خاتون کی قبر ہے جو اس جنگل میں کفر و اسلام کی جنگ میں ہندو مرہٹوں کا مقابلہ کرتی شہید ہو گئی تھی۔ تم وہاں دعائے مغفرت کرنا۔ اس کے بعد وہاں کچھ دیر بیٹھے رہنا۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو اللہ کے حکم سے شہید خاتون کی روح وہاں آکر تمہیں بتائے گی کہ تم پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس سے تم کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہو۔"

مجھے مغل شہزادے کی ساری باتیں یاد تھیں۔ چنانچہ نجیب آباد کے ریلوے سٹیشن سے نکلتے ہی میں نے تانگہ پکڑا اور سیدھا پتھر گڑھ کے قلعے میں آگیا۔ یہاں تانگے سے اترا اور قلعے کے پیچھے کجلی بن کا جو جنگل مجھے بتایا گیا تھا اس طرف چل پڑا۔ قلعہ پتھر گڑھ کے پیچھے گھنے جنگل شروع ہو گئے۔ میں وہیں ایک طرف درختوں کے نیچے چھوٹی سی پلی بنی ہوئی تھی وہاں بیٹھ گیا۔ میں یونہی اتنے خطرناک اور گھنے جنگلوں میں داخل نہیں ہونا چاہتا

تھا۔ وہاں بھٹکے جانے کا ڈر تھا۔ ایک پوربی کسان سر پر درختوں کی ٹہنیاں لادے میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس سے کجلی بن کے بارے میں پوچھا تو وہ رک گیا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ادھر کو جاؤ گے تو ایک ندیا آئے گی ندیا کے پار کجلی بن شروع ہو جاتا ہے۔"

میں اٹھ کر اسی طرف چلنے لگا۔ اس جنگل کی دہشت کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آپ نے بھی ضرور سنا ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اماوس کی رات کو یعنی جو مہینے کی سب سے زیادہ اندھیری رات ہوتی ہے اس رات کو جب کجلی بن پر بھیانک خاموشی طاری ہوتی ہے تو کوئی بلا ڈراؤنی آوازیں دیتی جنگل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کی آواز سے ڈر کر درختوں پر پرندے اور کچھاروں میں شیر تک سہم جاتے ہیں۔ یہ بلا سارے جنگل میں آوازیں دیتی پھرتی ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا انجان مسافر اس کی آواز پر جواب دے دے تو یہ اسی وقت وہاں پہنچ کر اس انسان کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بلا کو دنیا کے سارے انسانوں کے نام معلوم ہیں اور وہ ان کے نام لے لے کر ان کی جانی پہچانی آوازوں میں اپنی طرف بلاتی ہے۔

مگر مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ میرا ایمان چٹان کی طرح مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ دنیا کی کوئی بلا مجھے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں کجلی بن میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ تمام توہمات میرے ذہن میں تھے اور میں اس بلا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ مگر نہ تو وہ رات کا وقت تھا اور نہ اماوس کی رات تھی۔ وہ دن کا تیسرا پہر تھا اور کجلی بن کی بلا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف اماوس کی تاریک رات کو ہی نمودار ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کجلی بن کا جنگل واقعی بڑا ڈراؤنا تھا۔ ایسے ایسے درخت تھے کہ جن کو دیکھ کر جن بھوتوں کا خیال آتا تھا۔ ان درختوں پر کانٹے دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ دن کا وقت تھا مگر ان درختوں کا گھنا پن اتنا شدید تھا کہ ان کی شاخوں پر آکر دن کی روشنی رک جاتی تھی اور درختوں کے نیچے سارے جنگل میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

بہر حال میں کسی نہ کسی طرح راستہ بناتا کجلی بن کے جنگل میں کافی دور نکل گیا۔ مجھے

اس پہاڑی کی تلاش تھی جس کی چوٹی پر دو سرخ چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ اور جسے لال پہاڑی کہا جاتا تھا۔ مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک جگہ شہید خاتون کی قبر ہے۔ اس قبر پر جا کر مجھے فاتحہ پڑھنا تھا اس دوران دوبار میری آنکھوں کی بینائی پر چندریکا کی بدروح کا حملہ ہوا اور مجھے نظر آنا بند ہو گیا۔ میں کچھ دیر کے لئے وہیں بیٹھ جاتا اور جب بینائی واپس آتی تو اٹھ کر چلنے لگتا۔ یہ ایسی آفت تھی کہ اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا اور یہ ناگہانی آفت میرے کمانڈو مشن کو تباہ و برباد کر سکتی تھی۔

جب میں کجلی بن کے گھنے درختوں میں سے باہر نکلا تو مجھے ایک طرف چھوٹی سی پہاڑی نظر آئی جس کے اوپر دو مخروطی چٹانیں بالکل ساتھ ساتھ کھڑی تھیں میں ٹھیک منزل پر پہنچ گیا تھا۔ اس پہاڑی کے پیچھے کسی جگہ شہید خاتون کی قبر کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا مجھے اس کی تلاش تھی۔ میں چلتے چلتے پہاڑی کے پیچھے آگیا۔ یہاں زمین اونچی نیچی تھی اونچی اونچی گھاس جگہ جگہ اگی ہوئی تھی۔ میں نے نسواری رنگ کی بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان ایک چشمہ بہتے دیکھا۔ چشمے پر آکر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ وضو کیا کیونکہ مجھے شہید خاتون کی قبر تلاش کر کے فاتحہ پڑھنا تھا۔ یہاں درخت دور دور تھے اور زمین خالی تھی۔ سوائے گھاس اور بکھرے ہوئے پتھروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں بڑے غور سے چاروں طرف دیکھتا شہید خاتون کی قبر کو تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے ایک جگہ بانس اور مہوا کے درختوں کے نیچے زمین میں سے دو تین ابھرے ہوئے پتھر نظر آئے۔ میں قریب گیا۔ یہ پتھر اس ترتیب سے لگے تھے جیسے یہاں کسی کو دفن کر کے مرقد بنا دیا گیا ہو۔ سب نشانیاں مجھے مل گئی تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی شہید خاتون کی قبر ہے۔

میں قبر کے پہلو میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور دعائے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے فاتحہ پڑھ کر شہیدؒ کی روح کے درجات کی بلندی کے لئے دعا مانگی اور اسی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ مغل شہزادے کی روح نے ہدایت کی تھی کہ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر بیٹھنا

دن کی روشنی بادلوں کے پیچھے آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ کجلی بن کی طرف سے درختوں پر پرندوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ میں اٹھ کر درخت کے نیچے آگیا۔ یہاں بارش سے بچاؤ ہو سکتا تھا۔ درخت کی شاخوں اور پتوں پر بارش کی بوندیں گرنے سے ٹپ ٹپا ٹپ کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں تیز ہو گئیں۔ اب بارش کے قطرے مجھ پر بھی گرنے لگے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں تھوڑی دیر کے لئے بارش سے بچاؤ کیا جا سکے۔ دائیں جانب کوئی چھ قدموں کے فاصلے پر مجھے درختوں کے نیچے ایک جھونپڑی سی نظر آئی۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ جھونپڑی ناریل اور بانس کی شاخوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور بالکل خالی پڑی تھی۔ میں جھونپڑی میں زمین پر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کی بانس اور ناریل کی شاخوں والی چھت پر بارش کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ بارش زیادہ تیز نہیں تھی۔ یعنی موسلادھار نہیں ہو رہی تھی۔ پرندوں کی آوازیں اب خاموش ہو گئی تھیں۔ جھونپڑی کا دروازہ نہیں تھا۔ یہاں سے مجھے شہید خاتون کی قبر کے ابھرے ہوئے پتھر دکھائی دے رہے تھے۔

میں ان پتھروں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہ شہید خاتون کی قبر ہے تو یہاں سے اس کی روح ضرور اٹھے گی۔ مگر یہ میرا خیال غلط تھا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں شہید ہونے والے شہداء کی ارواح کے مقام بہت بلند ہوتے ہیں۔ ان کے درجات بہت بلند ہوتے ہیں۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کی روحیں سیدھی جنت میں چلی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ میں کفار کے خلاف جہاد میں شریک تھا اور مجھ پر جو ناگہانی آفت آئی تھی اس سے میں صرف اپنے لئے نجات حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس لئے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میں صحت مند ہو کر دوبارہ تحریک آزادی کشمیر کے جہاد میں شریک ہو سکوں اور بھارتی غاصب فوج مظلوم کشمیریوں کا حق خود اختیاری دبا کر ان پر جو ظلم و ستم توڑ رہی ہے اس کے خلاف بطور ایک کمانڈو کے جنگ کر سکوں۔

اس میں میری ذاتی غرض نہیں تھی۔ اس لئے خیال تھا کہ شاید شہید خاتون کی روح اسلام اور مظلوم کشمیریوں کے خیال سے مجھ سے ہم کلام ہونے جنت سے نیچے ہماری دنیا میں تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ میں جھونپڑی کے دروازے میں سے قبر کے پتھر کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے آگے ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ چندریکا کی بدروح نے ایک بار پھر حملہ کر دیا تھا۔ مجھے نظر آنا بند ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بار بار جھپکا کر دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر سوائے اندھیرے کے میری آنکھوں میں اور کچھ نہیں تھا۔ میں بے بس و مجبور ہو کر سر جھکا کر بیٹھا خدا کو یاد کرنے اور اپنی مغفرت کے لئے اس کے حضور دعائیں مانگنے لگا۔ مجھے صرف بارش کی آواز آرہی تھی۔ میں بارش کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے لئے چاروں طرف تاریک رات ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی جنگل میں دن کی صاف شفاف روشنی باقی تھی۔

مجھ پر اندھے پن کی یہ حالت کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک رہی پھر اچانک مجھے نظر آنا شروع ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ جنگل میں دن کی روشنی شام کے سرمئی اندھیروں میں گھل مل گئی ہے۔ بارش ہو رہی تھی۔ قریب ہی کوئی تالاب وغیرہ ہو گا۔ وہاں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی جنگلی جانور وہاں پانی پی رہا ہو۔ اب مجھے قبر کے پتھر بالکل نظر نہیں آرہے ۔تھے کیونکہ درختوں کے نیچے قبر پر اندھیرا چھا گیا ہوا تھا۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا اگر بارش اسی طرح موسلا دھار ہوتی رہی اور خاتون شہید کی روح کی جانب سے مجھے کوئی راہ نمائی بھی نہ ملی تو مجھے ساری رات اس جھونپڑی میں ہی گزارنی ہو گی۔ اتنی موسلادھار بارش میں اور بارش کے بعد بھی میں کجلی بن کے دہشت ناک اور خطرناک اندھیروں میں سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے شام اور پھر رات ہو گئی۔ میں جھونپڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ بارش آہستہ آہستہ ہلکی ہونے لگی۔ پھر رک گئی۔ اب صرف درختوں پر سے بارش کے رکے ہوئے قطروں کے ٹپکنے کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھیں۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد یہ آواز بھی رک گئی۔ جنگل پر ایک

بھیانک خاموشی چھا گئی۔ میں شہید خاتون کی راہنمائی کی جانب سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن میری نظریں قبر کی جانب لگی تھیں۔ مجھے رات کے اندھیرے میں صرف درختوں کے سائے سے ہی نظر آرہے تھے۔ اچانک چندریکا کی بدروح کی لائی ہوئی آفت نے پھر حملہ کر دیا اور مجھے درختوں کے سائے سے نظر آنا بھی بند ہو گئے۔ میری آنکھوں کی بینائی ایک بار پھر معطل ہو گئی تھی۔ میں قدرتی طور پر پریشان ہو کر جھونپڑی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سر باہر نکال کر دیکھنے کی کوشش کی مگر گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ اب میری بینائی کے معطل ہو جانے کا وقفہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے پندرہ بیس منٹ بعد بینائی واپس آجاتی تھی۔ ایک گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک وقت وہ بھی آجائے گا کہ میری بینائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ دراصل چندریکا کی بدروح اس طرح میری تمام کمانڈو سرگرمیوں کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ جو مجھے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں تھا۔

میں مایوس سا ہو کر جھونپڑی میں بیٹھ گیا اور خدا کے حضور اس آفت سے نجات کی دعائیں مانگنے لگا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ مجھے اندھیرے میں درختوں کے دھبے نظر آنا شروع ہو گئے۔ میری بینائی ایک بار پھر واپس آنا شروع ہو گئی تھی۔ اس دفعہ میرے قیاس کے مطابق بینائی کو واپس آنے میں کچھ نہیں تو دو گھنٹے ضرور لگے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سوچنے لگا کہ شہید خاتون کی روح کی جانب سے مجھے کوئی راہ نمائی نہیں ملی۔ اس لئے اب مجھے یہاں سے واپس سری نگر جا کر اپنی آنکھوں کا ڈاکٹری علاج کروانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹری علاج سے میں ٹھیک ہو جاؤں۔ نیند بالکل غائب تھی۔ پھر بھی محض تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے میں نے جھونپڑی کی بانس کی دیوار سے ٹیک لگا دی۔ جنگل خاموش تھا۔ کسی پرندے جھینگر مینڈک یا درندے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ میں بانس کی دیوار سے ٹیک لگائے جھونپڑے کے کھلے دروازے میں سے باہر اندھیرے میں درختوں اور چٹانوں کے ہیولوں کو تک رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک خوشبو کا

احساس ہوا۔ میں نے دیوار سے ٹیک ہٹالی۔ یہ خوشبو چنبیلی کے پھولوں ایسی خوشبو تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ میری شہید بہن کلثوم کی روح کی خوشبو تھی جیسے سن 47ء کے فسادات میں سکھوں نے میری آنکھوں کے سامنے گردن پر تلوار مار کر شہید کر دیا تھا۔ میری بہن کلثوم سر میں چنبیلی کا تیل لگایا کرتی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس کی روح جب کبھی میرے پاس آتی تو پہلے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ اگرچہ میری شہید بہن کی روح نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی مگر جب وہ آتی تو اس کی روح کی خوشبو سے میرے دل کو بڑی تسکین ہوتی تھی۔ مگر اپنی شہید بہن کی کھیتوں میں پڑی کٹی ہوئی گردن والی لاش کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے تھے۔ میں نے کلثوم سے کہا۔

"میری پیاری شہید بہن! تیرا بھائی تجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں تیری روح کے درجات بلند کرے۔"

چنبیلی کی خوشبو تیز ہو کر آہستہ آہستہ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ اجنبی خوشبو تھی اور اس سے پہلے میں نے اسے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس خوشبو کے آنے کے ساتھ ہی جھونپڑی میں گلاب ایسے رنگ کی مدھم مدھم نورانی روشنی سی پھیل گئی۔ یہ روشنی نہیں تھی بلکہ روشنی کا غبار تھا۔ یا پھر روشنی کا عکس تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شہید خاتون کی روح کی خوشبو اور روشنی ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔ جھونپڑی ایک نورانی روشنی میں منور ہو رہی تھی۔ فضا جنت کی خوشبو سے لبریز تھی۔ مگر مجھے شہید خاتون کی روح کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ میں شہید خاتون کی روح کو مخاطب کر سکوں۔ ایک عجیب سا جلال جھونپڑی کی نورانی فضا میں طاری تھا۔ میں ہونٹ بند کئے ادب سے بیٹھا اپنے دل میں برابر کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے کانوں میں ایک آواز محسوس ہوئی۔ یہ بڑی پر سکون اور دل میں نور بن کر اتر جانے والی آواز تھی۔ آواز جیسے بڑی دور سے آ رہی تھی مگر مجھے یہ آواز اور اس

کا ایک ایک لفظ بڑا صاف سنائی دے رہا تھا۔ یہ یقیناً شہید خاتون کی روح کی آواز تھی۔

"تم اللہ کی راہ میں جہاد کرنے گھر سے نکلے ہو۔ تم اسلام کی سربلندی کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے نیک مقاصد دل میں لے کر یہاں آئے ہو۔ اللہ کی جانب سے مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہاری راہنمائی کروں۔"

میری آنکھیں شدت جذبات سے بھر آئیں۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"میری جان اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ہزار بار قربان۔ لاکھ بار قربان میں اس قابل کہاں تھا کہ ایک شہید کی مقدس روح اللہ کے حکم سے میری راہنمائی کو آتی۔ مگر یہ توفیق بھی میرے رب نے مجھے عطا کی ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر جس قدر ناز کروں کم ہے۔ اے مقدس اور برگزیدہ روح! مجھ پر دشمن اسلام چندریکا نے ایک آفت نازل کر دی ہے"

شہید خاتون کی روح نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ میں تمہاری راہنمائی کے لئے ہی یہاں بھیجی گئی ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔ تم پر جو آفت نازل ہو چکی ہے اس کا علاج اللہ کا ایک برگزیدہ پیغمبر کرے گا۔"

میں یہ سن کر حیران ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"اے مقدس روح! زمین پر نبی آخر الزماں ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ اللہ کی طرف سے بند ہو گیا ہے۔ یہ برگزیدہ پیغمبر مجھے کہاں ملے گا؟"

شہید خاتون کی آواز آئی۔

"بے شک حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر بھیجے گئے آخری نبی تھے۔ ان کے بعد زمین پر کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ جس برگزیدہ پیغمبر کا میں نے ذکر کیا ہے اس سے ملنے کے لئے تمہیں ماضی کے زمانے میں آج سے چار ہزار سال پیچھے جانا ہو گا۔"

میری زبان پر جیسے خاموشی کی مہر سی لگ گئی۔ یہ بات میری سمجھ میں بھی آ ہی نہیں سکتی تھی کہ کوئی انسان ماضی کے زمانے میں بھی جا سکتا ہے۔ اور پھر کوئی سال دو سال ماضی کے زمانے میں نہیں بلکہ چار ہزار سال پیچھے۔ شہید خاتون نے کہا۔

"حضور اکرم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے اللہ کی طرف سے زمین پر کئی پیغمبر بھیجے گئے تاکہ وہ انسانوں کو برائیوں سے بچنے اور اللہ کے راستے پر چلنے کی تلقین کریں۔ یہ پیغمبر بھی ماضی کے زمانے میں اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر تھے۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنی امت کو حضور پاک ﷺ نبی آخر الزماں کے دنیا میں تشریف لانے کی بشارت بھی دی تھی۔ اور کہا تھا کہ حضور پاک ﷺ کے تشریف لانے کے ساتھ ہی اللہ کا دین دنیا پر مکمل ہو جائے گا۔ تمہاری آفت کا علاج انہی برگزیدہ پیغمبر کے پاس ہے"

میں نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔

"لیکن اے مقدس روح! میں آج سے چار ہزار سال ماضی کے زمانے میں کیسے جاؤں گا؟ یہ بات میری عقل سے باہر ہے"

مقدس روح نے کہا۔

"اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ تم اللہ کے حکم سے ماضی کے زمانے میں جاؤ گے۔ سنو۔ یہاں سے تم شہید اسلام نجیب الدولہ کے بنائے ہوئے پتھر گڑھ کے قلعے میں جاؤ گے۔ وہاں تم سارا دن گزارو گے۔ قلعے کی چوتھی برجی کے نیچے ایک پرانا دروازہ ہے جو ہمیشہ بند رہتا ہے۔ تم رات کے وقت اس دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو جانا اور دل میں پانچ بار اللہ تعالیٰ کا کلمہ پاک دہرانا۔ وہاں تمہیں ایک بزرگ ملیں گے۔ تمہارے ماضی کے سفر کا انتظام ان ہی بزرگ کو سونپا گیا ہے۔ تم پر اللہ کی رحمت ہو"

اس کے ساتھ ہی جھونپڑی میں پھیلی ہوئی روشنی کا غبار ہلکا ہوتے ہوئے غائب ہو گیا۔ جنت کی خوشبوئیں بھی رخصت ہو گئیں۔ جھونپڑی میں ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ شہید خاتون کی روح کی ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ لیکن ہزار بار سوچنے

کے بعد بھی میں اس معمے کو حل نہ کر سکا کہ میں ماڈرن اور سائنسی دور میں سے نکل کر ماضی کے زمانے میں کیسے پہنچوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ جو بزرگ مجھے قلعہ پتھر گڑھ کی تیسری برجی کے دروازے پر ملے گا وہی مجھے میرے مصیبت کا علاج بتادے گا۔ مگر شہید کی روح کبھی غلط بیانی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے رات کا باقی حصہ وہیں جھونپڑی میں ہی گزارا اور جب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور درختوں پر پرندے اللہ پاک کی حمد وثناء کرنے لگے تو میں جھونپڑی سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے ایک بار پھر کجلی بن میں سے گزر کر نجیب آباد کے مشہور تاریخی قلعہ پتھر گڑھ میں جانا تھا۔ کجلی بن میں جس راستے سے آیا تھا اسی راستے پر چل کر میں واپس اس سڑک پر آ گیا جس کی ایک جانب پتھر گڑھ کے دیو پیکر عظیم الشان قلعے کی عقبی دیوار تھی۔ یہ دیوار ایک پہاڑی کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی گئی تھی۔ دیوار اور سڑک کے درمیان ایک کھائی تھی جس میں پانی کی بجائے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ سڑک رات بھر کی بارش سے بھیگی ہوئی تھی۔ دو رکشے اور ایک موٹر گاڑی میرے قریب سے گزر گئی۔ میں سڑک کے کنارے کنارے قلعے کے بڑے گیٹ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے چائے سگریٹ کی چھوٹی سی دکان تھی جس کے باہر پولیس کا ایک سپاہی جو وردی میں تھا سٹول پر بیٹھا گلاس میں چائے پی رہا تھا۔

اس کا منہ میری طرف تھا۔ میرا رخ بھی اس کی طرف تھا۔ مجھے لامحالہ اس کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا۔ میں نے اس کا زیادہ خیال نہ کیا۔ کیونکہ میرے سارے کمانڈو آپریشنز نجیب آباد شہر سے دور دور ہوئے تھے۔ میں نے یہی سوچا کہ یہاں کی پولیس کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری تصویر نجیب آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں بھی پہنچ چکی ہے۔ دن کا وقت تھا۔ میں پولیس کانسٹیبل کے قریب سے گزرا تو اس نے چائے پیتے ہوئے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ بال اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ پھر بھی ایک تجربہ کار پولیس کانسٹیبل جس نے میری ڈاڑھی کے بغیر تصو

دیکھ رکھی ہو مجھے پہچان سکتا تھا۔

میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ قلعہ پتھر گڑھ کا اونچا محرابی دروازہ میری بائیں جانب تھوڑے فاصلے پر ہی تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس قلعے کے دروازے کے باہر پولیس اور ملٹری پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ خدا جانے یہاں کیا ہو رہا تھا۔ لیکن میں محتاط ہوگیا۔ چنانچہ میں قلعے کے دروازے کی طرف جانے کی بجائے نجیب آباد شہر کی آبادی کی طرف جاتی سڑک پر ہوگیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی میری چھٹی حس نے مجھے بتادیا کہ میں نگاہوں میں آگیا ہوں اور میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا تعاقب کرنے والے کے شک شبے کو یقین میں بدلنے کے برابر تھا۔ میں سڑک کے کنارے چلتا گیا۔ کچھ فاصلے پر شہر کی آبادی نظر آرہی تھی۔ یہ نجیب آباد کے قدیم تاریخی شہر کی آبادی تھی۔ جسے اسلام کے سرفروش شہید اور مجاہد نواب نجیب الدولہ نے آباد کیا تھا۔ میں ایک بڑی سڑک پر آگیا۔ یہ شہر کے باہر کا سول ایریا تھا۔ یہاں انگریزوں کے زمانے کی پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جن کے آگے چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے اور کچھ نئی طرز کی کمرشل اور رہائشی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔

اس سڑک پر آتے ہوئے میں نے سڑک پار کرنے کے بہانے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے وہی کانسٹیبل دکھائی دیا جسے میں نے چائے کی دکان کے باہر سٹول پر بیٹھے چائے پیتے دیکھا تھا۔ میری تیز نگاہوں نے کانسٹیبل کے عقب میں سڑک پر پولیس کی گاڑی کو دیکھا جو آہستہ آہستہ چلی آرہی تھی۔ گویا مجھے پکڑنے کے لئے سارا انتظام کر لیا گیا تھا۔ اب صرف مجھے موقع پا کر دبوچنا ہی باقی تھا۔ ادھر مجھے یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ اگر اس حالت میں اچانک مجھ پر بدروح کا حملہ ہوگیا اور میری بینائی معطل ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟ اس کے بعد تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔ میں کسی طرف فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک میری بینائی کام کر رہی تھی۔ لیکن یہ کسی بھی وقت میری آنکھوں کے آگے گھپ اندھیرا کر کے میرا ساتھ چھوڑ سکتی تھی۔ میرا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اسی جیب میں بال پوائنٹ پستول بھی تھا۔ میں نے بال پوائنٹ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

اس کی سائی نائیڈ زہر میں بجھی ایک سوئی بال پوائنٹ کے منہ میں آچکی تھی۔ اب صرف مجھے بال پوائنٹ کے خفیہ بٹن کو ہی دبانا تھا۔

میں سڑک کراس کر کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر آگیا۔ یہاں بس سٹاپ پر کچھ لوگ کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہوگیا۔ دراصل میں پیچھے ایک نظر دیکھنے کی خاطر رکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کانسٹیبل بھی مجھے رکتے دیکھ کر رک گیا تھا۔ پیچھے جو پولیس کی گاڑی آرہی تھی وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلی آرہی تھی۔ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے روپوش ہوجانا اب ضروری ہوگیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں رہ گیا تھا۔ میری بینائی بھی اب کسی وقت مجھ سے جدا ہوسکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک کمرشل ایریا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر کمرشل عمارتیں تھیں جن کے باہر سکوٹر اور گاڑیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔ لوگ بھی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔

میں بس سٹاپ کو چھوڑ کر ان عمارتوں کی طرف ہوگیا۔ یہاں لوگوں کے ہجوم اور شاپنگ سنٹر اور سٹورز وغیرہ کے درمیان سے گزرتی راہ داریوں میں میں روپوش ہو سکتا تھا۔ اچانک میری آنکھوں پر کچھ بوجھ سا پڑنے لگا۔ اب ایسا ہوتا تھا کہ اندھا ہونے سے پہلے میری آنکھوں پر ہلکا ہلکا دباؤ پڑنا شروع ہوجاتا تھا۔ میں پریشان ہوگیا۔ میرے اندھے ہونے کا وقت ایک بار پھر آن پہنچا تھا۔ میں نے سامنے والی عمارتوں کا جائزہ لیا تاکہ اندھا ہونے سے پہلے پہلے یہ تعین کرلوں کہ مجھے اندازے سے کس طرف کو بھاگنا ہوگا۔ سامنے سٹوروں کے درمیان ایک چھتا ہوا راستہ اس کمرشل بلڈنگ کے اندر جاتا تھا۔ میں دوڑ کر وہاں آگیا۔ راہ داری میں دونوں جانب دکانیں تھیں۔ میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا۔ پولیس کانسٹیبل بھی دوڑ کر عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ یہاں کچھ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے ان میں عورتیں بھی تھیں۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ میری بینائی رخصت ہونے ہی والی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں دوسری طرف کسی بلڈنگ میں نکل جاؤں گا مگر آگے راستہ بند تھا۔ اور ایک ڈور تھا جس کے باہر آنکھوں کا ہسپتال کا بورڈ لگا تھا۔ میں اس کے اندر گھس گیا اب مجھے

بہت دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ یہ نظر کی عینکوں کا سٹور تھا۔ کاؤنٹر پر ایک آدمی کھڑا کسی عورت کی نظر ٹیسٹ کر رہا تھا۔ اس میں سے ایک راستہ باہر کو جاتا تھا۔ میں تیز تیز قدم چلتا باہر نکل گیا۔ باہر ایک جانب ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ میں دوڑ کر اس میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور تھوڑی دیر کے لئے شاید کہیں گیا تھا اور گاڑی کی چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے چابی گھمائی۔ انجن سٹارٹ کیا اور گیئر لگا کر تیزی سے گاڑی کو کمرشل بلڈنگ کے عقبی احاطے سے باہر جاتی سڑک پر ڈال دیا۔ جیسے ہی میں گاڑی لے کر سڑک پر آیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

اس سے پہلے میں نے سڑک کا جائزہ لے لیا تھا۔ آخری منظر جو میری آنکھوں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ سڑک پر سامنے کی طرف سے ایک ٹرک آرہا تھا۔ یہ بڑا خوفناک منظر تھا میں اندھا ہو چکا تھا اور جب اندھا گاڑی چلا رہا ہو اور سامنے سے ایک ٹرک آرہا ہو تو اس کا جو انجام ہوتا ہے اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی دوران مجھے پیچھے سے پولیس کی گاڑی کے ہوٹر کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ میں اندازے سے گاڑی سڑک کی ایک طرف لے گیا اور بریک لگادی۔ بریکیں لگاتے لگاتے میری ایمبولینس گاڑی ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ یہ زیادہ زور سے نہیں ٹکرائی تھی۔ میں نے صرف اتنا کام کیا کہ جیب سے بال پوائنٹ پستول نکال کر اپنے جوتے کے اندر چھپا دی تا کہ تلاشی لیتے وقت کوئی پولیس والا بال پوائنٹ مال غنیمت سمجھ کر اسے اپنی جیب میں نہ لگا لے۔ پولیس کی گاڑی کی چیخیں میری گاڑی کے قریب آکر رک گئیں۔ سپاہیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر کسی نے ایمبولینس کا دروازہ کھول کر مجھے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی تک نجیب آباد کے ان پولیس والوں کو بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں اندھا ہوں۔ کسی نے بارعب آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا ہندوانہ فرضی نام بتا دیا۔ ایک آدمی دونوں ہاتھوں سے میری تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے میری جیب سے روپے وغیرہ نکال لئے تھے۔ پہلی والی بارعب آواز نے

کہا۔

"چلو آگے چلو"

میں ایک طرف چلا تو کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر سیدھا کر کے کہا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو۔ ادھر چلو"

تب میں نے کہا۔

"بھائیو! مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو۔ میں تو اندھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنکھوں کے علاج کے لئے آیا تھا۔

وہاں ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"اندھے ہو تو گاڑی کیسے چلا رہے تھے؟"

"یہ جھوٹ بکتا ہے۔ اسے سب کچھ نظر آرہا ہے"

"اسے پولیس ہیڈ کوارٹر لے چلو"

مجھے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ابھی تک کسی نے میرے جوتے میں سے بال پوائنٹ پستول نہیں نکالا تھا۔ خدا جانے کہاں کہاں سے ہو کر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ یہ پولیس سٹیشن یا پولیس ہیڈ کوارٹر ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دوسرے لوگوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ تین چار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے ایک جگہ دھکیل کر کہا گیا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا کہ یہ مجھے کس جگہ بیٹھنے کو کہہ رہے ہیں۔ پھر کسی نے زور سے میری گردن پر مکا مارا۔ مجھے یہ ضرب ہر حالت میں برداشت کرنی تھی۔ میں اسے برداشت کر گیا۔

"یہاں بیٹھو نقلی اندھے"

انہوں نے مجھے دھکا دے کر ایک بنچ پر بٹھا دیا۔

"انسپکٹر صاحب کو رپورٹ کرو کیلاش"

کوئی بھاری قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم مسلمان ہو اور پاکستانی کمانڈو ہو۔ ہمارے پاس تمہاری فل رپورٹ تمہاری تصویر کے ساتھ موجود ہے۔ انسپکٹر بدری پرشاد آرہے ہیں ان کے سامنے مردہ بھی بول پڑتا ہے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ تم سے جو پوچھیں وہ سب سچ سچ بتادو۔ انسپکٹر بدری پرشاد تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں اندھا ہوں۔ دلی سے آنکھوں کا علاج کرانے نجیب آباد آیا تھا۔"

"تمہیں راستے میں کوئی آنکھوں کا ہسپتال نہیں ملا؟"

میرے پاس حقیقت یہ تھی کہ کوئی معقول جواب یا اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ہی مار سکتا تھا اور میں یہی کچھ کر رہا تھا۔ کچھ آدمی بھاری قدموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے کسی کے ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کرنے کی آواز آئی۔

"سر! یہ ہے پاکستانی کمانڈو"

یہ انسپکٹر بدری پرشاد ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کی کرخت لہجے والی آواز آئی۔

"حلیہ بدلا ہوا ہے مگر تصویر سے ملتا ہے"

اس آدمی نے مجھے بازو سے پکڑا اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم نجیب آباد کہاں دھماکہ کرنے آرہے تھے؟ تمہارے دوسرے پاکستانی ساتھی کمانڈو یہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

میں نے بے دلی سے وہی عذر پیش کیا کہ میں بے قصور ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ دلی کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ایک ڈاکٹر کی بڑی تعریف سنی تھی۔ اس کے پاس علاج کرانے کے لئے آیا تھا۔ سب سے پہلے تو میری پتلون اتار کر میرا معائنہ کیا گیا۔ میرا مسلمان ہونا ثابت ہوگیا۔ انسپکٹر بدری پرشاد نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"اب تم انکار نہیں کر سکتے کہ تم مسلمان ہو اور پاکستان سے بھارت میں تخریب کاری کے لئے آئے ہو۔ تم نے اشوکا ہوٹل میں دھماکہ کر کے ہمارے اور ہمارے دوست

ملک اسرائیل کے چھ اعلیٰ ترین جرنیل ہلاک کئے ہیں۔ تم نے ہی اپنے ساتھی کمانڈوز سے مل کر پانڈی چری کی کھاڑی میں ہماری بحریہ کے دو جہاز غرق کئے تھے۔ ہمارے پاس تمہاری فل رپورٹ پہنچ چکی ہے۔ تم دھرم ویر کے جعلی ہندو نام سے میجر شرت دیوان کے پاس ناگپور ہیڈ کوارٹر میں رہ رہے تھے۔ تمہارے لئے یہی اچھا ہے کہ سچ بول دو اور ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام اور نجیب آباد میں اپنے ٹارگٹ کے بارے میں بتادو۔"

میں نے کہا کہ میں مسلمان ضرور ہوں مگر میرا پاکستانی کمانڈوز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں مجھ سے اس قسم کے جواب کی توقع تھی۔ لیکن جس چیز نے انہیں مخمصے میں ڈال رکھا تھا وہ یہ تھا کہ میں اگر اندھا ہوں تو پھر کمانڈو سرگرمیاں میں نے کس طرح کیں؟ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کسی نے کہا۔

"سر! ڈاکٹر میجر شرما سے اس کی آنکھوں کا معائنہ کراتے ہیں۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ یہ سچ مچ کا اندھا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

انسپکٹر نے فون پر کسی ڈاکٹر شرما سے بات کی۔ اسی وقت مجھے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ باہر نکال کر ایک گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی شاید کسی فوجی ہسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔

ابھی تک میری آنکھوں کی بینائی واپس نہیں آئی تھی۔

اب آنکھوں کی نظر واپس آنے کا وقفہ طویل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے آنکھوں کے سپیشلسٹ میجر شرما کے سامنے لے جایا گیا۔ اس نے میری آنکھوں کا دس پندرہ منٹ تک اچھی طرح سے معائنہ کیا پھر انسپکٹر بدری پرشاد سے کہا۔

"انسپکٹر! یہ شخص بالکل اندھا ہے"

ایک دو سیکنڈ کے لئے وہاں پھر خاموشی چھا گئی۔ انسپکٹر نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! سر! یہ شخص کب سے اندھا ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے تو پیدائشی اندھا لگتا ہے"

انسپکٹر بدری پرشاد کی آواز آئی۔

"کانسٹیبل کیلاش! اسے پولیس ہیڈ کوارٹر واپس لے چلو۔ وہاں اس کا سارا پتہ چلا لیں گے۔"

مجھے ایک بار پھر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ انسپکٹر میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

"ڈاکٹر کو بھی پتہ نہیں چل سکا یہ کمانڈو بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں میں کوئی ایسی دوائی ڈال رکھی ہے جس نے وقتی طور پر اسے اندھا کر دیا ہے۔ اس کو تھرڈ ڈگری ٹارچر دیا گیا تو سب کچھ بتا دے گا۔"

ایک بار پھر مجھے کسی کمرے میں لا کر ایک سٹول پر بٹھا دیا گیا۔ اس کمرے میں سے ڈی ٹول اور دوسری دوائیوں کی بو آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں مجھ پر آپریشن کے مختلف نشتروں اور قینچیوں سے تشدد کیا جائے گا۔ میں نے ذہنی طور پر اس تشدد کے لئے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا۔ جیسے ہی میں سٹول پر بیٹھا میری آنکھوں کے آگے جو اندھیرا تھا وہ آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ میری بینائی واپس آ رہی تھی۔ تین چار سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آواز سے میں نے پولیس انسپکٹر بدری پرشاد کو پہچان لیا جو میرے بالکل سامنے دوسرے سٹول پر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں آپریشن کرنے والا چھوٹا چاقو تھا جس کی نوک کو وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے کانسٹیبل سے کہا۔

"اس کی ہتھکڑی کھول کر اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر دوبارہ ہتھکڑی لگا دو"

میرے ہاتھ پیچھے لے جا کر دوبارہ ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اب میں ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ مگر انہیں یہی معلوم تھا کہ میں اندھا ہوں۔ میں نے کنکھیوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ چھوٹی سی ڈسپنسری کا کمرہ لگتا تھا۔ دیوار کے ساتھ الماریوں میں دوائی کی شیشیاں اور بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر نے چاقو کی نوک میری گردن میں ذرا سی چبھوتے ہوئے کہا۔

"ابھی بھی وقت ہے اگر تم مجھے سب کچھ بتا دو تو اذیت ناک موت سے بچ سکتے ہو"

آدمی نابینا نہ ہو اور نابینا ہونے کی اداکاری کر رہا ہو تو یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ وہ چونکہ سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے اس لئے اپنے چہرے پر نابینا آدمی والے تاثرات کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ کوئی زیرک آدمی کسی بھی لمحے پہچان سکتا ہے کہ یہ شخص اصل میں نابینا نہیں ہے۔ مگر میں نے بڑی تجربہ کاری سے کام لیتے ہوئے اپنے چہرے پر ایک نابینا شخص کے تاثرات کو ابھی تک قائم رکھا ہوا تھا۔ میں کسی کی طرف نظر لگا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ ہوا میں دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر پرشاد میرے سامنے بیٹھا تھا مگر میں اس کے چہرے کو نہیں بلکہ اس کے چہرے کے اوپر پیچھے نظر آنے والی الماری کو دیکھ رہا

تھا۔ میں نے نابیناؤں کی طرح اب تھوڑی تھوڑی گردن بھی ادھر ادھر ہلانی شروع کر دی تھی۔ میں نے کہا۔

"انسپکٹر جی! آپ خود ہی خیال کریں کیا کبھی ایک نابینا آدمی بھی کمانڈو یا جاسوس بن سکتا ہے؟"

"تو پھر تم گاڑی کیسے چلا رہے تھے؟ تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ بھی تمہاری ایک چال ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں میں کوئی دوائی ڈال رکھی ہے جس نے تمہیں کچھ وقت کے لئے نابینا بنا دیا ہے۔ فکر نہ کرو میرا نام بھی انسپکٹر بدری پرشاد ہے میں ابھی سب کچھ بکوا لوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو کی نوک میری گردن کی ایک جانب چبھو دی۔ درد سے میری ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اگرچہ یہ درد میں برداشت کر سکتا تھا مگر اپنے آپ کو عام شہری ظاہر کرنے کے لئے میں نے ذرا سی تکلیف پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شخص تھوڑا ٹارچر ہی کرے گا۔ جسے میں برداشت کر جاؤں گا۔ مگر جب میں نے اسے ایک انجکشن تیار کرتے دیکھا تو میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اب میں تمہارے جسم میں ایک ایسی دوائی داخل کرنے والا ہوں جس سے تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ لیکن تمہاری زبان چلتی رہے گی اور میں تم سے جو پوچھوں گا تم اس کا سچ سچ جواب دیتے جاؤ گے۔"

اس قسم کا انجکشن میرے مشن کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب بن سکتا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں اسے انجکشن لگنے کے بعد بتا بھی دیتا کہ میں کشمیری کمانڈو ہوں اور میں نے ہی پانڈی چری کے سمندر میں بھارتی بحریہ کے جہاز ڈبوئے تھے اور میں ہی دھرم ویر بن کر میجر شرت دیوان کے ساتھ رہ رہا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ یہ ساری باتیں انہیں پہلے ہی سے معلوم تھیں۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ میرے ایسے کمانڈو کو اس وقت تک ہلاک نہیں کیا کرتے جب تک انہیں اپنے مطلب کی ساری معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں۔ فرق صرف مجھے پڑتا تھا کہ مجھے اپنے اوپر آئی ہوئی آفت

سے نجات حاصل کرنے کے لئے قلعہ پتھر گڑھ میں رات کو جانا تھا اور وہاں سے ماضی کے زمانے میں جا کر خدا کی ایک برگزیدہ ہستی سے ملنا تھا۔ میرے پاس ان لوگوں کی انٹیروگیشن اور ٹارچر کے لئے اب کوئی وقت نہیں تھا اور میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی وقعت بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ نہ میں نے انہیں کچھ بتانا تھا اور نہ انہوں نے مجھے ہلاک کرنا تھا۔ بس ٹارچر تھا وہ جتنا ٹارچر کرتے مجھے برداشت کرتے جانا تھا۔ یہ میرے ایسے اہم ترین کمانڈو کے لئے وقت کو برباد کرنے کے برابر تھا۔ کیونکہ میرے سامنے بڑے اہم ترین مشن تھے۔ جنہیں میں نے پورا کرنا تھا۔ اور بڑے فاسٹ ایکشن اور فاسٹ کمانڈو آپریشن کے ساتھ ایک ایک کر کے پورا کرتے جانا تھا۔ اوپر سے مجھے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ بھارت عنقریب میرے پاک وطن پاکستان پر جارحانہ حملے کا مذموم منصوبہ بنا چکا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بھی اپنے وطن پاک کی سلامتی کے لئے نمایاں فرائض ادا کرنے تھے۔ دشمن سے حملے کی تاریخ اور وقت اور فوجی تیاریوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی تھی۔ چنانچہ جب پولیس انسپکٹر مجھے انجکشن لگانے لگا تو میں نے کہا۔

"انسپکٹر رک جاؤ"

اس نے انجکشن والا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اسے بالکل نہیں دیکھ رہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

بولا۔

"شاباش! مجھے معلوم تھا تم صحیح راستہ پر آجاؤ گے۔ اب میں تمہیں کاغذ پنسل دیتا ہوں۔ اس کاغذ پر اپنے ساتھی کمانڈوز کے نام اور جہاں جہاں وہ چھپے ہوئے ہیں ان جگہوں کے نام لکھ دو۔ اگر تم خود نہیں لکھنا چاہتے تو بولتے جاؤ میں لکھتا جاؤں گا۔"

مجھے وہاں سے فرار کی منصوبہ بندی کے لئے تھوڑا وقت درکار تھا۔ میں نے نابینا بھکاریوں کی طرح گردن ذرا سی ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں کمانڈو ہوں۔ مگر میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ میں پیدائشی نابینا نہیں ہوں۔ مجھ پر اندھے پن کا یہاں

نجیب آباد میں آکر اچانک حملہ ہوا ہے۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میری آنکھوں کی بینائی کیسے جاتی رہی ہے۔"

انسپکٹر کے چہرے پر مسرت کھل رہی تھی کہنے لگا۔

"شاباش! اب یہ بتادو کہ نجیب آباد میں تمہارا ٹارگٹ کونسا ہے اور تمہارے دوسرے ساتھی یہاں کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"نجیب آباد میں ہمارا کوئی ٹارگٹ نہیں ہے۔ مگر ہم یہاں ایک دوسرے کمانڈو مشن کی منصوبہ بندی کے لئے ضرور آئے ہیں۔ لیکن میرے دوسرے ساتھی ابھی نجیب آباد نہیں پہنچے۔ انہیں کل شام کی گاڑی سے یہاں پہنچنا ہے اور ہمیں ریلوے سٹیشن کے عقب میں ایک جگہ ملنا ہے۔"

پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے بیان پر اعتبار کرلیتا ہوں ہم کل صبح صبح ہی ریلوے سٹیشن کے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیں گے۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے اور ہمیں اپنے ساتھی کمانڈو پکڑواؤ گے۔ اگر وہاں تمہارا کوئی ساتھی نہ آیا تو تمہارے بیان کو جھوٹ تسلیم کیا جائے گا اور پھر میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں ٹارچر کر کے ہلاک کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے سچ سچ کہا ہے۔ میں آج سے کمانڈو کی زندگی سے توبہ کرتا ہوں۔ آپ لوگ کل بے شک مجھے ساتھ لے چلیں۔ میں آپ کو بتادوں گا کہ وہ ہمارے کمانڈو ساتھی آرہے ہیں۔ پھر آپ انہیں گرفتار کرلینا۔ اتنا بتادیتا ہوں کہ دونوں کمانڈو سادھوؤں کے بھیس میں ہوں گے۔"

انسپکٹر نے انجکشن واپس رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"ابھی تمہارے ساتھ قیدیوں والا ہی سلوک کیا جائے گا۔ کل جب تم اپنے دونوں ساتھی ہمیں پکڑوا دوگے تو نہ صرف یہ کہ ہم تمہیں انعام دیں گے بلکہ تم جہاں جانا چاہو

گے تمہیں پولیس کی حفاظت میں وہاں پہنچا دیں گے۔"

میں نے فرمائشی لہجے میں کہا۔

"میں صرف ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں بالکل اندھا ہو چکا ہوں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پلیز مجھے کسی ایسی جگہ قید میں ڈال دیں جہاں میں بستر پر لیٹ سکوں اور ٹٹول ٹٹول کر باتھ روم کے دروازے تک جاسکوں۔ بس مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے ہتھکڑی لگائے رکھنے کی بھی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک نابینا قیدی کہاں فرار ہو کر جائے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پولیس انسپکٹر بدری پرشاد کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے خیال میں اسے بہت بڑی کامیابی ملنے والی تھی۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ٹھیک ہے تمہیں یہ سہولتیں مل جائیں گی۔"

دوسرے لمحے مجھے وہاں سے نکال کر باہر لے جایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ بہت بڑا پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ آمنے سامنے تین چار بلاک تھے۔ جگہ جگہ پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے اسی بلاک کے کونے والے ایک کمرے میں لاکر میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور کانسٹیبل نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دیوار سے لگی اس کھاٹ پر بٹھا دیا جو مجھے صاف نظر آرہی تھی مگر میں اس طرح ہاتھ آگے کر کے ہوا کو ٹٹول ٹٹول کر وہاں تک گیا جیسے مجھے چارپائی نظر نہیں آرہی۔ انسپکٹر بدری پرشاد میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"باتھ روم دیوار کے ساتھ تین چار قدموں پر ہی ہے۔"

اس کے بعد دونوں پولیس افسر چلے گئے۔ میں انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاتے ہوئے دروازہ بند کرتے جائیں گے اور دروازے کو باہر سے تالا لگا دیں گے۔ مگر انہوں نے دروازہ بند نہ کیا۔ ابھی میں کھلے دروازے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل رائفل کاندھے پر رکھے آیا اور دروازے کے باہر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر چوکس ہو کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اسی طرف سے لایا گیا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے آگے ایک تنگ راستہ ہے جس کی دونوں جانب پولیس ایڈمنسٹریشن

کے دفاتر ہیں مجھے ایک کمرے سے ٹائپ مشین کی ٹک ٹک کی آواز بھی آرہی تھی۔

میں نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی روشندان نہیں تھا۔ وہاں صرف ایک چارپائی ہی بچھی ہوئی تھی۔ دوسری کوئی شے نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ باتھ روم کا جائزہ لینا چاہئے۔ چنانچہ میں اندھوں کی طرح چارپائی سے اٹھ کر دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر باتھ روم کے دروازے تک آیا جو مجھے برابر نظر آرہا تھا۔ میں نے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ بڑا گندا چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ میں نے ٹونٹی کھول کر پانی پیا۔ بوٹ کے اندر سے بال پوائنٹ پنسل پستول نکال کر اسے غور سے دیکھا کہ کہیں ٹوٹ تو نہیں گئی۔ بال پوائنٹ پنسل بالکل درست حالت میں تھی۔ میرے پاس صرف یہی ایک ہتھیار تھا جو مجھے وہاں سے فرار ہونے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ باتھ روم میں بھی کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ شاید یہ کمرہ پولیس نے وی آئی پی قیدیوں سے پوچھ گچھ کے لئے رکھا ہوا تھا۔ منہ دھونے والے واشنگ بیسن کے اوپر کوئی شیشہ بھی نہیں لگا ہوا تھا کہ میں اس میں اپنی شکل ہی دیکھ لیتا۔ میں نے پانی پینے کے بعد بالوں میں انگلیاں پھیریں اور باہر نکل کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

میں وہاں سے فرار ہونے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ میرے پاس صرف آج کا دن اور آج کی رات تھی۔ اس کے بعد کل صبح مجھے پولیس کو لے کر نجیب آباد کے سٹیشن پر جا کر کمانڈو ساتھیوں کو پکڑوانے کا جھوٹا ڈرامہ کھیلنا تھا۔ میرا پول کھل جانے کے بعد ظاہر ہے کہ مجھ پر بے پناہ تشدد کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا آج رات کے اندر اندر کر گزرنا تھا۔ خواہ اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے۔ جب آدمی زندگی کا آخری داؤ لگا رہا ہو۔ زندگی کی آخری بازی کھیل رہا ہو تو پھر وہ فتح شکست سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے۔ اسے پانسہ پھینکنا ہی پڑتا ہے۔ یا تخت یا تختہ۔

میرے لئے ایک ملازم کھانا لے کر آیا۔ کھانے میں دو روٹیاں اور دال تھی۔ ساتھ آم کی چٹنی بھی تھی۔ یہ اس وقت بہت بڑی نعمت تھی۔ میں نے مزے سے دونوں روٹیاں کھالیں۔ چارپائی پر لیٹ گیا دماغ بڑی تیزی سے فرار کے منصوبے پیش کرنے لگا۔

ہی خیال آتا کہ یہ کرلوں۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ یہ کرنا چاہئے۔ سہ پہر ہوئی۔ وہی ملازم میرے لئے چائے کا ایک گلاس لے آیا۔ چائے خوب گرم تھی۔ پھر شام ہوئی۔ میرے کمرے کی بتی صبح ہی سے جل رہی تھی۔ دروازے میں پہرہ دینے والے سنتری کی جگہ دوسرا سنتری آگیا تھا۔ اسے رات کو پہرہ دینا تھا۔ اس وقت تک میرے ذہن نے ایک منصوبہ سوچ لیا تھا۔ یہ کوئی بڑا یقینی فرار کا منصوبہ نہیں تھا۔ بس ایک آخری ہلہ ہی تھا۔ ہلہ بولنا تھا۔ نکل گیا تو نکل گیا نہیں تو پھر جو ہو سو ہو۔

سب سے پہلے تو مجھے اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ اس کے بعد میرے پاس جو دنیاوی وسیلہ تھا وہ بال پوائنٹ پنسل کی شکل میں ہلاکت خیز پستول تھا۔ جو ابھی تک میرے ایک جوتے کے اندر موجود تھا۔ میں ابھی تک اندھے پن کی اداکاری کر رہا تھا۔ ابھی تک میری بینائی بالکل صحیح تھی۔ اور دوسری بار چندریکا کی بد روح کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ حملہ کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔ مجھے ایک دھڑکا یہ بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہاں سے فرار ہو کر نکلوں اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کی بینائی غائب ہو جائے اور میں اندھا ہو جاؤں۔ ایسی صورت میں میرا دوبارہ پکڑا جانا یا کسی کھائی، کھڈ یا نالے میں یا گٹر میں گر کر ہلاک ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن ان خدشوں پر غور کرتے ہوئے بھی میں نے انہیں پس منظر میں رکھا تھا اور فرار کے منصوبے پر اس اعتماد کے ساتھ عمل کرنے والا تھا کہ مجھے اللہ کے فضل سے کچھ نہیں ہوگا اور میں دشمن کی قید سے نکل جاؤں گا۔ میں نے دروازے کے آگے پہرہ دیتے سپاہی سے وقت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ شام کے سات بجنے والے ہیں۔ اس اثناء میں میں نے محسوس کیا تھا کہ ہیڈ کوارٹر کے اس ونگ کے سارے دفتروں کے لوگ چھٹی کر کے جا چکے ہیں۔ وہاں خاموشی چھا گئی تھی۔ رات کے نو بجے تو میں نے دیکھا کہ پولیس انسپکٹر بدری پرشاد اور کانسٹیبل کیلاش آرہے ہیں۔

میں نے اندھے آدمی کی طرح حرکتیں کرنی شروع کر دیں۔ کبھی چارپائی کے بستر کو ہاتھ سے ٹٹولتا، کبھی سرہانے کو ٹٹولتا انسپکٹر نے قریب آکر پوچھا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

میں نے سامنے والی دیوار پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب آئے ہیں"

"ہاں۔ میں آیا ہوں۔ تمہاری کوئی چیز گم ہو گئی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"چارپائی میں کھٹمل بہت ہیں"

انسپکٹر نے ترش لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمہارے واسطے ہم یہاں پھولوں کی سیج بچھا کر رکھتے؟"

میں خاموش رہا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر یاد دلانے کے لئے آیا ہوں کہ کل اگر تم نے اپنے ساتھی نہ پکڑوائے تو کل کا دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ یہ بات اپنے دماغ میں رکھنا کیا سمجھے؟"

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میرے ساتھی کمانڈو کون ہیں"

پولیس انسپکٹر بولا۔

"تم ہمارے پاس بیٹھے ہو گے۔ تم ہمیں ان کے حلیے بتاؤ گے اور یہ بتاؤ گے کہ وہ کس طرف سے آ رہے ہیں۔ باقی ہم انہیں خود پکڑ لیں گے۔ ہم جاتے ہیں کل ہمارے ساتھ سٹیشن پر چلنے کے لئے تیار رہنا۔"

وہ چلا گیا۔ میں اندھوں کی طرح چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر فرار کی منصوبہ بندی پر غور شروع کر دیا۔ بال پوائنٹ پستول اس وقت بھی میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میری بینائی واپس آئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ یہ دھڑکا الگ لگا تھا کہ مجھ پر اندھے پن کا حملہ نہ جانے کس وقت ہو جائے۔ میں اس حملے سے پہلے پہلے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اگر باقاعدہ غور و فکر کر کے منصوبہ بنایا جائے اور اس پر

بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ گھبرائے بغیر عمل کیا جائے تو آدمی دشمنوں کے درمیان سے بھی فرار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر منصوبہ بندی اناڑی پن سے کی گئی ہو اور آدمی گھبرایا ہوا بھی ہو تو وہ محفوظ مقام پر بھی پکڑا جا سکتا ہے۔

وہاں سے فرار ہونے کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی منصوبہ تھا۔ صرف ایک ہی راستہ تھا اور مجھے اسی منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ چھت والا پنکھا بھی آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھلے دروازے کے باہر سٹول پر بیٹھے ہوئے مسلح سپاہی کو دیکھ لیتا تھا۔ وہ کبھی اٹھ کر دروازے کے سامنے ٹہلنے بھی لگتا تھا۔ اس کو قابو میں کرنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ دروازے کے باہر دفاتر کے کمروں کے درمیان جو چھوٹا سا راستہ ہے وہاں بھی تو کوئی مسلح سپاہی پہرہ نہیں دے رہا۔ مجھے آدھی رات کے بعد پتھر گڑھ قلعے کی تیسری برجی والے دروازے پر بھی پہنچنا تھا۔ میں نے سپاہی سے پوچھا۔

"بھائی رات کا کیا ہوا ہو گا؟"

پہلے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سٹول پر بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ جب میں نے دوسری بار پوچھا تو بڑی ناگواری کے ساتھ بولا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے جو ٹائم پوچھ رہے ہو؟"

پھر اس نے کلائی پر نظر ڈال کر کہا۔

"پونے گیارہ بجے ہیں رات کے"

میرے کمانڈو ایکشن کا ٹائم ہو گیا تھا۔ مجھے اس لئے بھی جلدی تھی کہ کوئی پتہ نہیں تھا کہ میرے نابینا ہونے کا بھی ٹائم ہو گیا ہو۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ذرا سا کھانس کر میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور سنتری سے کہا۔

"بھائی مجھے تھوڑا پانی پلا دو۔ گلے میں کچھ پھنس گیا ہے۔ میں تو اندھا ہوں خود اٹھ کر پانی نہیں پی سکتا۔"

سنتری کچھ بڑبڑایا۔ ضرور اس نے مجھے دو تین گالیاں دی ہوں گی۔ میں بظاہر سامنے

والی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میری نظریں سنتری پر لگی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے اسی کو قابو کرنا تھا۔ سنتری بادل نخواستہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر ٹین کے گلاس میں پانی ڈال کر لایا۔ میں نے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میں یہ ظاہر کرنے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا کہ مجھے گلاس نظر نہیں آرہا۔ اس نے غصے میں کہا۔

"ادھر سے پکڑو۔ ادھر سے"

میں اسے بھی دیکھ رہا تھا اور گلاس کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اس پر بال پوائنٹ پنسل والی سائی نائیڈ زہر والی سوئی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے پانی والا گلاس میرے چہرے کے آگے کیا میں نے اس کے بازو کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ مدد کے لئے کسی کو پکارتا اس کی گردن میرے بائیں بازو کے آہنی شکنجے میں تھی۔ وہ اپنی رائفل دروازے کے باہر ہی رکھ آیا تھا۔ میرے بائیں بازو کے آہنی شکنجے سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور پھر میں نے اسے اتنا موقع بھی نہ دیا۔ دوسرے جھٹکے سے اس کی گردن دوسری طرف زور سے گھما دی۔ وہ مرچکا تھا۔ میں نے اسے وہیں چارپائی پر ڈالا۔ جیب سے بال پوائنٹ پنسل پستول نکال کر اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں چھپایا اور دروازے میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی دوسرا سنتری نہیں تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا بڑے برآمدے میں نکل آیا۔ یہاں ایک بتی جل رہی تھی۔ دور کچھ فاصلے پر مجھے گیٹ دکھائی دیا جہاں روشنی میں ایک سنتری بنچ یا سٹول پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ میں گیٹ کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔ کمروں کے باہر کونوں پر ایک ایک بلب روشن تھا۔ میں روشنی سے اپنے آپ کو بچاتا اس پولیس ہیڈ کوارٹر کی دیوار کے پاس آکر اندھیرے میں ہوگیا۔

میں دیوار پھاند کر دوسری طرف جانا چاہتا تھا۔ مگر دیوار دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ چند قدم آگے دیوار ایک طرف گھوم گئی تھی۔ وہاں موڑ پر دیوار کے اوپر ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے دیوار کے ساتھ لگا ہوا ڈھیر سا نظر آیا۔ شاید یہ اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ یہاں سے میں دیوار پھاند سکتا تھا۔ میں جھک کر اس ڈھیر کی طرف چلنے لگا۔ جیسے ہی

دیوار کے موڑ پر پہنچ کر روشنی میں آیا سامنے سے ایک آدمی بھی اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"ہالٹ! ہاتھ اوپر اٹھالو"

یہ ایک پولیس والا تھا جو شاید رات کو گشت لگا رہا تھا۔ اس نے رائفل تان لی۔ رائفل کا رخ میری طرف تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کرلو"

صاف لگ رہا تھا کہ اس نے مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا اور وہ مجھے کوئی چور وغیرہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں پولیس کوارٹروں میں رہتا ہوں"

سنتری نے چیخ کر کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ نہیں تو گولی ماردوں گا"

بال پوائنٹ پنسل میں نے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ چپکا رکھی تھی۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی آواز سن کر دوسرے پولیس والے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ اس کو ہلاک کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس کی موت اسے میرے سامنے لے آئی تھی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ لیکن سیدھا ہاتھ اوپر لے جاتے ہوئے میں نے بال پوائنٹ پنسل میں سے زہریلی سوئی فائر کر دی تھی۔ سنتری مجھ سے کوئی پانچ قدموں کے فاصلے پر رائفل میری طرف تانے کھڑا تھا۔ میں نے بال پوائنٹ میں سے زہریلی سوئی کو نکلتے نہیں دیکھا۔ اس سنتری نے بھی سوئی کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر زہریلی سوئی میرے بال پوائنٹ کا ننھا سا بٹن دباتے ہی نکل چکی تھی۔ اس کا پتہ مجھے فوراً ہی چل گیا۔ سنتری نے رائفل اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے رائفل اس کے ہاتھوں سے گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی گر پڑا۔ بال پوائنٹ پستول کا یہ پہلا شکار تھا۔ میں لپک کر اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ بال پوائنٹ پنسل مین نے پتلون کی جیب میں رکھی۔ اچھل کر دیوار کی منڈھیر کو پکڑا۔ اور دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ میں

اندھیرے میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر گرا۔ گرتے ہی اٹھا۔ سامنے خالی سڑک تھی۔ جلدی سے سڑک کراس کی اور سڑک سے ہٹ کر اندھیرے میں ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ ابھی مجھے یہ پتہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے جتنی دور نکل سکتا تھا نکل جانا چاہتا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میں کھیتوں میں آ گیا۔ رک کر سانس ٹھیک کیا۔ دیکھا کہ اردگرد آبادیوں کی روشنیاں تھیں۔ جس طرف روشنیاں نہیں تھیں میں نے اس طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑ لگانے کی مجھے کافی پریکٹس تھی۔ اپنے سانس پر بھی مجھے پورا کنٹرول تھا مگر گوالیار اور پانڈی چری کے ٹارچر سنٹروں میں بے پناہ وحشیانہ تشدد برداشت کرنے کے بعد میری قوت مدافعت کافی کمزور ہو چکی تھی۔ مگر چونکہ یہ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا اور میرا جسم بھی مضبوط تھا اس لئے مجھے کمزوری زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک جوہڑ کے پاس آ کر میں رک گیا۔

اب میں سمت کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پتھر گڑھ کے قلعے میں جانا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک مجھ پر اندھے پن کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک طرف شہر کی آبادی کی روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ دوسری طرف کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی کہ ستاروں کو دیکھ کر اندازہ لگاؤں کہ مجھے کس طرف جانا چاہئے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پتھر گڑھ کا قلعہ نجیب آباد شہر کی مغربی سمت ہے۔ میں نے سوچا کہ جس طرف روشنیاں اکا دکا ہیں اس طرف ضرور جنگل شروع ہو جاتا ہو گا اور پتھر گڑھ کا قلعہ بھی جنگل کے شروع میں ہی واقع ہے۔ چنانچہ میں اسی طرف چلنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ بہت جلد مجھے ایک پختہ سڑک مل گئی۔ سڑک پر کہیں اندھیرا تھا۔ کہیں روشنی تھی۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ میں درختوں کے اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ آگے جا کر سڑک شہر کی آبادی کی طرف مڑ جاتی تھی۔ میں سڑک سے اتر کر ویران میدان میں سے گزرنے لگا۔ کچھ فاصلے پر تین چار روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ کسی ٹیلے پر بنی ہوئی کسی

عمارت کی روشنیاں ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ قلعہ پتھر گڑھ کی روشنیاں ہیں۔ میں نے اس طرف رخ کر کے اپنی رفتار تیز کر دی۔ روشنیاں آہستہ آہستہ قریب آنے لگیں۔ میں ایک اونچے نیچے میدان میں سے گزر رہا تھا۔ جہاں اندھیرے میں کہیں جھاڑیاں آ جاتیں اور کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر آ جاتے۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد تھوڑی سی چڑھائی آ گئی۔ چڑھائی چڑھ کر اوپر آیا تو بائیں طرف کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر مجھے ایک قلعے کی دیو قامت دیوار اندھیرے میں آسمان کی طرف بلند ہوتی نظر پڑی۔ یہ پتھر گڑھ قلعے کی ہی دیوار ہو سکتی تھی۔ میں اوپر سے ہو کر قلعے کے بڑے گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ قلعے کے بلند وبالا پر جلال دروازے کے اوپر ایک بلب روشن تھا مگر وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ قلعہ بالکل ویران تھا اور یہاں دن کے وقت بھی کبھی کبھار ہی کوئی غیر ملکی سیاح آتا تھا۔ اس قلعے میں سیاحوں کی دلچسپی کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ اونچی اونچی کھنڈر بنی دیواریں تھیں۔ قلعے کے اندر کشادہ صحن میں بکھرے ہوئے پتھروں کے ڈھیر تھے۔ جگہ جگہ گھاس اگ آئی تھی۔ جہاں تک میرا خیال تھا وہاں رات کو کوئی چوکیدار بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں قلعے میں داخل ہونے سے پہلے یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں نے قلعے کے دروازے کے اوپر چمکتی روشنی کو غور سے دیکھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری بینائی ختم تو نہیں ہو رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک مجھ پر بدروح کے اندھے پن کا حملہ نہیں ہوا تھا اور میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ قلعے کی ڈیوڑھی کی چھت اتنی اونچی تھی کہ مجھے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ نجیب آباد کے بہادر مجاہد اور اسلام کے شہید نواب نجیب الدولہ نے واقعی یہ ایک بہت عظیم الشان اور پرشکوہ قلعہ بنوایا تھا۔ مجھے قلعے کی تیسری برجی کے نیچے جو دروازہ تھا وہاں جانا تھا۔ میں نے یہ دروازہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہید خاتون کی روح نے کہا تھا کہ یہ دروازہ قلعے کی تیسری برجی کے سائے میں ہے اور بند ہو گا۔ وہاں

تمہیں ایک بزرگ ملے گا جو تمہارے ماضی کے سفر میں تمہاری راہنمائی کرے گا۔ میں قلعے کے وسیع وکشادہ صحن میں آکر رک گیا۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ ان کے پیچھے ستارے تھے جن کی چمک کی وجہ سے بادلوں میں بہت دھندلی دھندلی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں میں نے قلعے کی دیوار کے اوپر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے دائیں سے بائیں جانب دیوار کے اوپر بنی ہوئی چھتری نما چار برجیوں کے خاکے نظر آئے۔ میں تیسری برجی کی طرف بڑھا ابھی تک میری آنکھوں کی بینائی قائم تھی اور میں دیکھ سکتا تھا۔ تیسری برجی کے نیچے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

میں اندھیرے میں غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تیسری برجی کی زیریں دیوار کے پاس آیا۔ یہاں مجھے ایک دروازے کے سیاہ نقوش سے دکھائی دیئے۔ یہی وہ دروازہ تھا جس کی نسبت کجلی بن کی شہید خاتون نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ کہ وہاں جاکر ایک طرف خاموش کھڑے ہوجانا۔ میں نے بند دروازے کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔ دروازہ لوہے کی طرح سخت لکڑی کا تھا جس کے تختوں میں سے کیل باہر نکلے ہوئے تھے۔ دروازہ اتنی مضبوطی سے بند تھا کہ لگتا تھا اب کبھی نہیں کھلے گا۔ میں شہید خاتون کی ہدایت کے مطابق ایک طرف ہو کر خاموش کھڑا ہوگیا۔ رات کی تاریکی اور سکوت میں ایک عجیب سی دہشت تھی۔ لگتا تھا جیسے ابھی یہ تاریکی اور خاموشی ایک عفریت بن کر مجھے نگل لے گی۔ اس سے قبل مجھے اتنی ہیبت ناک رات کا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے دل میں کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں ساکت کھڑا رہا ہوں گا کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے بالکل قریب کھڑا سانس لے رہا ہے۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی اور اسی طرح چپ چاپ نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ تاریکی میں ویسے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک ایک چرچراہٹ کے ساتھ دروازے کا پٹ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ ادھ کھلے دروازے مین سے گلابی رنگت کی ملائم روشنی باہر نکل رہی ہے۔ پھر اس روشنی میں سفید وبراق لباس والے ایک بزرگ نمودار ہوئے۔ انہوں نے بڑی شیریں آواز میں کہا۔

"اندر چلے آؤ"

اور وہ بزرگ دروازے میں سے ایک طرف ہٹ گئے۔ میں نے دل میں اللہ تعالیٰ سے اپنی عافیت کی دعا مانگی اور دروازے میں داخل ہوگیا۔ میرے داخل ہونے کے ساتھ ہی دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دوبارہ بند ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کشادہ سرنگ میں ہوں جس میں گلابی روشنی ہی روشنی ہے۔ وہی بزرگ میرے دائیں جانب کھڑے میری طرف پرشفقت نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں انہیں کچھ کہنے لگا تو وہ اسی پرسکون لہجے میں بولے۔

"تم جو پوچھنا چاہتے ہو مجھے معلوم ہے۔ شہید خاتون نے مجھے تمہاری راہنمائی کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ"

میں روشن اور کشادہ سرنگ میں بزرگ کے ساتھ چل پڑا۔ روشنی سے فضا لبریز تھی۔ مجھے سرنگ کی دیواروں کا ایک ایک پتھر صاف نظر آرہا تھا۔ چلتے چلتے میری آنکھوں پر ایک دباؤ سا پڑا اور میری آنکھوں کے آگے ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ مجھ پر بدروح چندریکا کا حملہ ہو چکا تھا اور میری بینائی ایک بار پھر جاتی رہی تھی۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں رک گیا۔

"بزرگ محترم! مجھ پر اس بیماری نے حملہ کر دیا ہے جس کے علاج کی خاطر مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ میری بینائی جاتی رہی ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے"

مجھے اپنے کندھے پر محترم بزرگ کے شفیق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ بزرگ نے کہا۔

"اللہ کے حکم سے تمہیں بہت جلد اس بیماری سے نجات مل جائے گی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے رہو"

میں نے بزرگ کا ہاتھ تھام لیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ چلانے لگے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"محترم بزرگ! کیا سچ مچ مجھے اس منحوس بیماری کے علاج کے لئے ماضی کے زمانے میں آج سے سینکڑوں برس پیچھے جانا ہوگا؟ کیا آج کی دنیا میں رہ کر اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟"

محترم بزرگ نے کہا۔

"ماضی حال اور مستقبل یہ سب ہم نے وقت کو تین حصوں میں بانٹ کر ان کے نام رکھ لئے ہیں۔ حقیقت میں وقت کا نہ کوئی ماضی ہے۔ نہ کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل ہے"

محترم بزرگ کی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش بھی نہ کی۔ جب میں نے سوال کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی آج کے زمانے سے نکل کر آج سے سینکڑوں برس بلکہ ہزاروں برس پرانے ماضی کے زمانے میں پہنچ جائے تو محترم بزرگ نے جواب میں فرمایا۔

"یہ بات نہ میں تمہیں سمجھا سکوں گا۔ نہ تم سمجھ سکو گے۔ لیکن میں اتنا ضرور تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مشیت خداوندی کے اشارے سے ماضی کے زمانے میں جا رہے ہو۔ تم اسلام کے شیر ہو۔ تم اپنی زندگی پاکستان کی سلامتی' جہاد کشمیر اور اسلام کی سربلندی کے لئے وقف کر دی ہوئی ہے۔ تم نے اس عمر میں اپنا وطن' اپنے گھر کی آسائش و آرام کو چھوڑ کر جہاد کشمیر میں کفار کے خلاف جنگ کرنے اسلام کی سربلندی اور پاکستان کو دشمنوں کے مذموم حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے نکلے ہو۔ جب تمہاری عمر کے نوجوان دولت' شہرت اور اپنا کیریئر بنانے کے لئے امریکہ اور یورپ کے ملکوں کے ویزے حاصل کرنے کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن تمہارے دل میں اسلام کی شمع روشن تھی۔ تمہارا دل مظلوم کشمیریوں پر بھارتی فوج کے مظالم دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ اور پھر تم نے اپنا ماضی' حال اور مستقبل اور پورا کیریئر ایک نیک اور اعلیٰ مقصد کی خاطر قربان کر دیا اور اپنے طور پر اکیلے گھر سے نکل کر دشمن کافروں کی سرزمین میں جا پہنچے۔ شب و روز کمانڈو کی سخت تربیت حاصل کی اور جان کی بازی لگا کر جہاد کشمیر میں نعرہ حق بلند کیا۔ مشیت

ایزدی تمہارے کردار کے اس پہلو پر راضی ہے اور وہ تمہیں ایک خاص طاقت عطا کرنے کے واسطے ماضی کے زمانے میں پہنچانا چاہتی ہے۔ جہاں تمہیں اپنی آنکھوں پر اچانک حملہ کرنے والی بدروح سے بھی ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمہارے اندر ایک ایسی روحانی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ جب تم واپس اس دنیا میں آؤ گے تو تم اسلام کے سچے کمانڈو بن چکے ہوگے۔ یہی مشیئت ایزدی کی مرضی ہے"

میں محترم بزرگ کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے بھی جا رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے جس سرنگ میں ہم چلے جا رہے ہیں وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ میں نے محترم بزرگ سے کہا۔

"لیکن محترم بزرگ! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کشمیر میں غاصب بھارتی فوجوں نے کشمیری مسلمانوں کے خلاف اپنی ظالمانہ سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ بھارت نے پاکستان پر حملے کا ناپاک منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے۔ میں اگر ماضی میں چلا گیا تو ہو سکتا ہے وہاں مجھے بہت وقت گزر جائے۔ میں کربلا کا میدان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔"

انہوں نے فرمایا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ ماضی اور مستقبل میں وقت کی رفتار وہ نہیں ہے جو حال کے زمانے میں ہے۔ اگر تم ماضی کے زمانے میں ایک سو سال بلکہ ایک ہزار برس بھی رہ کر جب واپس آؤ گے تو اس دنیا کا صرف ایک دن ہی گزرا ہوگا"

میں نے کہا۔

"مگر محترم بزرگ مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھے چار ہزار برس ماضی میں پیچھے کی طرف جانا ہوگا جہاں اللہ کا ایک برگزیدہ پیغمبر میری بیماری کا علاج کرے گا۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ چار ہزار سال پرانے زمانے میں میں کس کے پاس جاؤں گا۔ کون مجھے اللہ کے بزرگ پیغمبر کے پاس لے جائے گا۔ ان کی زبان تو کچھ اور ہی ہوگی۔ میں ان کی زبان کیسے سمجھوں گا وہ میری زبان کیسے سمجھیں گے۔"

انہوں نے کہا۔

"آج سے چار ہزار سال پہلے کے زمانے میں پہنچتے ہی تمہیں ایک لڑکی ملے گی جو تمہاری راہنمائی کرے گی۔ اس زمانے کی فضا میں پہنچتے ہی وہاں کے لوگوں کی زبان تمہیں اپنے آپ سمجھ میں آجائے گی۔ اور تم بھی وہ زبان بولنے لگو گے۔"

میں نے کہا۔

"کیا ماضی کے زمانے میں جانے کے بعد بھی مجھ پر چندریکا کی بدروح کا حملہ ہوتا رہے گا؟ کیا وہاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہے گی؟"

محترم بزرگ نے کہا۔

"نہیں وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ یہ صرف تمہاری دنیا میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب تم ماضی کے زمانے میں اسلام کے مجاہد محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد اور شیر اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے بعد اسلام کے شیر دل کمانڈو بن کر اور ایک نئی طاقت حاصل کر کے واپس انڈیا میں آؤ گے تم اس بیماری سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر چکے ہوگے۔ پھر چندریکا تو کیا بھارت کی کوئی طاقتور سے طاقتور بدروح بھی تمہارے نزدیک نہیں پھٹک سکے گی۔ اب ماضی کے زمانے میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا"

محترم بزرگ نے کہا۔

"جب ماضی کے زمانے کا پراسرار دروازہ کھلے گا تو تم سب کچھ دیکھ سکو گے"

بزرگ نے مجھے بازو سے تھاما ہوا تھا اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔ ایک جگہ وہ رک گئے میں بھی رک گیا۔ انہوں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھوں کی بینائی واپس آرہی ہے۔"

میں نے بھی اپنی آنکھوں کے آگے ستارے سے چمکتے دیکھے۔ اس کے فوراً بعد میری بینائی معمول کے مطابق واپس آگئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہم اسی سرنگ میں ایک ایسے مقام پر

کھڑے ہیں جہاں دس فٹ کے فاصلے پر سرنگ کی دیوار ہے۔ یہاں سرنگ بند ہو گئی تھی۔ سرنگ میں اب وہ گلابی روشنی نہیں تھی جو میں نے سرنگ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھی تھی۔ ہمارے چاروں طرف نیم اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں سرنگ کی سامنے والی دیوار پر نیلے رنگ کی بڑی پھیکی سی روشنی جھلملا رہی تھی۔ اس روشنی میں ننھے ننھے لاکھوں ستارے چمک رہے تھے۔ محترم بزرگ نے کہا۔

"یہ ماضی کا دروازہ ہے۔ تم اس دروازے سے گزر کر آج سے چار ہزار سال پہلے کے زمانے میں پہنچ جاؤ گے۔"

میری عقل میں یہ بات بالکل نہیں آرہی تھی۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور جیسے ہی میں ماضی کے دروازے کی طرف قدم بڑھاؤں گا میری آنکھ کھل جائے گی اور میں نجیب آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر کے ٹارچر سیل میں قید میں پڑا ہوں گا۔ اور مجھ پر یہ انکشاف ہوگا کہ میں نے ٹارچر سیل کی چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک خواب دیکھا تھا۔ میں کوئی سائنس دان نہیں تھا۔ میں کوئی آئن سٹائن نہیں تھا کہ ماضی حال اور مستقبل کے وقت کی رفتار کو سمجھ سکتا۔ میرا ذہن اسے تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا کہ میں سن 1965ء کے زمانے سے نکل کر تین ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں داخل ہو جاؤں گا۔ بزرگ نے میرے بازو کو چھوڑ دیا میرا دل تجسس کے مارے زور سے دھڑکنے لگا۔ بزرگ نے فرمایا۔

"اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ اپنا دھیان اللہ کی طرف لگالو۔ اور یاد رکھو اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ وہ قادر مطلق ہے"

ایک لمحہ کے لئے وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ بزرگ بھی چپ تھے۔ میں بھی خاموش تھا اور سامنے دیوار پر چمکتی دھندلی دھندلی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ بزرگ کی آواز آئی۔

"جو لڑکی تمہیں ماضی کے دروازے میں سے گزرنے کے بعد ملے گی اور تمہاری راہ نمائی کرے گی اس کا نام سوسن ہوگا۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں میں سوسن کے نیلے پھول لگائے ہوں گے۔ وہ تمہیں پہچان لے گی۔ وہ خود تمہارے پاس آئے گی۔ اس کے بعد وہ

تمہیں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کے پاس لے جائے گی جو تمہارے سر پر سے بدروح کا سایہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا اور تمہیں بتائے گا کہ کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے تمہیں کس جگہ سے اسلام کی ناقابل شکست طاقت ملے گی۔"

میں سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تک میری آنکھوں کی بینائی واپس آچکی تھی اور اب اسے معمول کے مطابق کچھ وقت کے بعد دوبارہ میری آنکھوں سے جدا ہو جانا تھا۔ دیوار پر روشنی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔ روشنی پہلے سلیٹی رنگ کی تھی پھر وہ سفید ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی دیوار میں ایک محراب دار دروازہ نمودار ہو گیا۔ اس دروازے کے باہر میں نے دن کی روشنی میں ایک منظر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دور تک صحرا ہے۔ ریت کے ٹیلے پھیلتے چلے گئے ہیں۔ دروازے کے قریب ہی کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ یہ کوئی نخلستان ہے۔ نیلے آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔ کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا۔ محترم بزرگ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ تاریخ کے حیرت انگیز منظر' قوموں کے عروج و زوال کے انقلاب اور اللہ کا وہ بزرگ پیغمبر تمہارا انتظار کر رہا ہے جو اللہ کے حکم سے تمہاری بیماری کا علاج کرے گا اور جو لوگوں کو حضور پاک ﷺ سید المرسلین ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کی خوش خبری سنا رہا ہو گا"

یقین کریں اس وقت میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔ آج بھی جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو ایک لمحے کے لئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ میں دل میں کلمہ پاک کا ورد کر رہا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا۔ پھر میں دیوار میں نمودار ہونے والے محرابی دروازے میں داخل ہو گیا اس لمحے مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ایک گہرے سکون کی لہر میرے جسم کے اندر سے گزر گئی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن معمول پر آگئی۔ میرے اعصاب ایک دم پر سکون ہو گئے۔ میں نے پلٹ کر محترم بزرگ کو یہ بتانا چاہا کہ میں خیریت سے ماضی کے زمانے میں داخل ہو گیا ہوں جیسے ہی میں

نے پیچھے دیکھا پیچھے نہ وہ غار تھا نہ غار کا محرابی دروازہ تھا اور نہ وہ محترم بزرگ ہی تھے۔

پیچھے جہاں غار کا دروازہ تھا وہاں دور حد نگاہ تک صحرا ہی صحرا تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور گرم دھوپ کی تپش سے فضا لبریز تھی۔ یہ صحرا کی تپش تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے وہ گرمی' وہ تپش محسوس نہیں ہو رہی تھی جو صحراؤں میں دن کے وقت محسوس ہوتی ہے جب سورج آگ برسا رہا ہوتا ہے۔ میں پتلون قمیض میں تھا۔ اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں وقت کی سرحد عبور کر کے ماضی میں پہنچ چکا ہوں۔ لیکن میں تاریخ کے کس دور میں پہنچا ہوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے وہ لڑکی کہیں نظر نہ آئی جس کے بارے میں محترم بزرگ نے فرمایا تھا کہ وہ میری راہ نمائی کرے گی اور اس کا نام سوسن ہو گا اور اس نے اپنے سیاہ بالوں میں سوسن کے نیلے پھول سجائے ہوں گے۔ میں نخلستان میں آکر کھجور کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ٹھنڈے شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے چلو میں چشمے کا پانی بھر کر پیا۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ مجھے لاہور کراچی کا پانی یاد آگیا۔ اپنے وطن پاکستان کا پانی یاد آگیا جو نہ جانے کیسی کیسی مشینوں کے ذریعے صاف کر کے پینے والوں تک پہنچایا جاتا تھا۔

کھجور کے درختوں پر کوئی پرندہ بھی نہیں تھا۔ ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ میرے ساتھ کوئی کرامت ہو گئی ہے۔ میں ماضی کے زمانے میں بالکل نہیں پہنچا بلکہ یہ دوبئی یا سعودی عرب کا کوئی صحرائی علاقہ ہے۔ ابھی آسمان پر سے عرب امارات یا پی آئی اے یا برٹش ایئرویز کا کوئی جمبو جیٹ ضرور گزرے گا۔ میرے پاس کوئی گھڑی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ صرف جیب میں زہریلی سوئیوں والی بال پوائنٹ پنسل ہی تھی۔ میں نے ایک اونٹ کو دیکھا جو ریت کے ایک ٹیلے میں سے نکل کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس پر ایک سوار بیٹھا تھا۔ میری نگاہیں اس پر جم گئیں یہ کون ہو سکتا ہے۔ ضرور صحرا کا کوئی مسافر ہو گا جو نخلستان میں تھوڑی دیر آرام کرنے آرہا ہو گا۔ جب یہ سوار قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اونٹ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ تب اچانک مجھے اس لڑکی کا خیال آگیا جس نے مجھے یہاں ملنا تھا اور سفر میں میری راہ نمائی کرنی تھی۔

اونٹ جب آکر رک گیا لڑکی نے اونٹ کو بٹھایا اور خود کجاوے میں سے اتر کر میرے پاس آگئی۔ اس کے سیاہ بالوں میں سوسن کے نیلے پھول لگے تھے۔ اس نے سرخ سبز اور سیاہ دھاری دار لمبا کرتہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک پہنچا ہوا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ دونوں رخساروں اور ٹھوڑی کے درمیان خال کے سبز نقطے بنے ہوئے تھے۔ سیاہ بالوں کی ایک لٹ چہرے پر لٹک رہی تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے میرا نام لیا اور کہا۔

"میرا نام سوسن ہے۔ مجھے تمہاری راہ نمائی کے لئے بھیجا گیا ہے۔"

یہ جملہ اس نے ایک ایسی زبان میں بولا تھا جو میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ جسے میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ میں اس زبان کا ایک ایک لفظ سمجھ گیا تھا اور پھر میں نے اسی زبان میں اس سے کہا۔

"سوسن! تمہارا شکریہ کہ تم میری راہ نمائی کے لئے یہاں آئی ہو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ کیا واقعی میں ماضی کے زمانے میں آگیا ہوں یا یہ محض نظر کا فریب ہے؟"

سوسن میرے سامنے چشمے کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے چشمے کے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ سر کو ذرا سا جھٹک کر چہرے پر آئی ہوئی سیاہ بالوں کی لٹ پیچھے کی اور بولی۔

"نہیں یہ نظر کا فریب نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ تم ماضی میں بہت پیچھے کے زمانے میں آگئے ہو"

میں اس بات پر بھی سخت حیران تھا کہ میں ایک اجنبی اور بالکل ہی غیر مانوس زبان اتنی روانی سے کیسے بول لیتا ہوں۔ میں بس اس کی طرف حیرت زدہ آنکھوں سے تک رہا تھا۔ ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں حقیقی دنیا میں ہوں کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی تک میں تذبذب اور غیر یقینی کی حالت میں تھا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ میں سچ مچ تاریخ کے کسی پرانے دور میں آگیا ہوں۔ کبھی محسوس ہوتا کہ نہیں میں سعودی عرب یا دبئی کے کسی صحرا میں ہوں۔ میری راہ نما لڑکی سوسن شاید میری ان کیفیات کو بھانپ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم وہ زبان سمجھ رہے ہو اور روانی سے بولنے بھی لگے ہو جو تم نے آج تک نہیں سنی تھی۔ آج تک نہیں بولی تھی تو پھر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ تم بیسویں صدی عیسوی سے نکل کر بہت پیچھے ماضی کے زمانے میں آگئے ہو؟"

میں سوسن کو خالی خالی نظروں سے تک رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں کمپیوٹر جمبو جیٹ طیاروں ایٹمی ٹیکنالوجی اور نیوکلر فزکس کے زمانے کا آدمی ہوں۔ کیسے یقین کرلوں کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا؟"

سوسن نے کہا۔

"اپنے دل سے حیرت اور بے یقینی کی کیفیت کو نکال ڈالو۔ یہ سچ ہے کہ جو تجربہ تم اس وقت کر رہے ہو ایسا تجربہ کرنے کی کسی عام انسان کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن تم پر یہ خاص عنایت اس لئے کی گئی ہے کہ تمہارے دل میں ایک سچے مومن' ایک سچے مسلمان کی تڑپ موجود ہے۔ تمہاری جوانی بے داغ رہی ہے۔ تم نے قرآن پاک کی حرمت اور اسلام کی سربلندی کی خاطر صرف اپنا گھربار اور جوانی کا عیش و آرام ہی قربان نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے دشمن ملک میں آکر اپنی جان کو قدم قدم پر خطروں میں ڈالا ہے۔ دشمنوں کی وحشیانہ اذیتیں برداشت کی ہیں۔ ان کے جان لیوا ٹارچر برداشت کئے ہیں۔ اسی لئے قدرت نے تمہیں اسلام کی ترویج پاکستان کی سلامتی اور کشمیری مسلمانوں کے جائز حقوق کی خاطر جہاد کرنے کے لئے چنا ہے۔ تم ضرور حیران ہو رہے ہوگے کہ مجھے ان باتوں کا کیسے علم ہوگیا ہے۔ جب مجھے تمہاری راہ نمائی کے لئے منتخب کیا گیا تھا تو محترم بزرگ نے مجھے طلوع اسلام سے لے کر تشکیل پاکستان تک کی ساری تاریخ سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب میرے سامنے اسلام کی تاریخ کے تمام درخشاں باب کھلے ہیں۔ یاد رکھو۔ پاکستان کا قیام قدرت خداوندی کے حکم سے عمل میں آیا ہے۔ ہمارا رب' رب العالمین ہے اور اسلام تمام جہانوں کا مذہب ہے۔ اس کا نور تمام جہانوں' تمام عالموں میں پھیلا ہوا ہے۔ برصغیر ہندوستان بھی ایک روز اسلام کی روشنی سے جگمگا اٹھے گا۔ پاکستان اسلام کے نور کی وہ شمع ہے جہاں سے رشد وہدایت کا یہ نور ہمالیہ کی چوٹیوں سے لے کر جنوبی ہند

کے خطوں کوایک دن روشن کرنے والا ہے۔ پاکستان کے ہر دور میں اسلام کے مجاہدوں' غازیوں اور شہیدوں نے دین کی سربلندی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ہندوستان میں سلطان ٹیپو' سراج الدولہ' شاہ ولی اللہؒ' سید احمد شہیدؒ' نواب نجیب الدولہ سے لے کر قائداعظم محمد علی جناح تک یہ سب ایک ہی نصب العین کا عمل مسلسل ہے۔ تمہیں بھی اسلام کی روشنی کو پھیلانے اور اس کی عظمت رفتہ کو برصغیر میں پھر سے بحال کرنے کے مشن پر تعینات کیا گیا ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل کے وسوسوں کو دل سے نکال کر باہر پھینک دو۔ تمہیں بہت جلد ایک ایسی طاقت عطا کی جانے والی ہے جو اس وقت مادی دنیا میں تمہاری مدد کرے گی جب تم ماضی کے زمانے سے نکل کر اپنے 1965ء عیسوی کے زمانے میں واپس جاؤ گے۔"

سوسن خاموش ہو گئی۔ اس کی گفتگو نے مجھے بے حد طاقت دی تھی۔ میرے دل سے تمام وسوسوں اور اندیشوں کو دور کر دیا تھا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کلمہ پڑھا اور کہا۔

"سوسن بہن! تم نے میرے دل سے شک شبے کے اندھیروں کو بھگا دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں کہ مجھے اسلام کی خدمت اور دین کی سربلندی کے کام کے لئے چنا گیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب میں کبھی اپنے دل میں بے یقینی کے خیالات کو داخل نہیں ہونے دوں گا۔ میری جان اللہ کے پاک نام پر' اس کے کلام پاک پر' اس کے رسول پاک ﷺ پر ایک بار ہی نہیں ہزار بار لاکھ بار قربان"

مجھے یاد ہے اس وقت میرے ہونٹ شدت جذبات سے کپکپا رہے تھے اور میرے سارے بدن پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ سوسن کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ اس نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی ہی توفیق عطا کرے۔ اب سنو! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم تاریخ کے کون سے دور میں آگئے ہو اور کونسی زبان میں مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔"

سوسن نے مجھے بتایا کہ میں تین ہزار سال قبل مسیحؑ کے زمانے میں پہنچ چکا تھا۔ یعنی آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پیچھے چلا گیا تھا اور جس زبان میں وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی

اور میں اس سے باتیں کر رہا تھا وہ سمیری زبان تھی اور میں بصرہ کے قریب تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر شہر لگاش کے ایک صحرائی نخلستان میں تھا۔ اب میں حیران نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں واقعی 1965ء کے بھارت کے شہر نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے سے نکل کر پانچ ہزار سال پرانے زمانے میں آگیا ہوں۔

میں اور سوسن وہیں نخلستان میں چشمے کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اتنی زیادہ گرمی محسوس نہیں ہو رہی جتنی ایک عام آدمی کو اس تپتے صحرا میں لگنی چاہئے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے ہیں۔ لیکن مجھے اتنی گرمی نہیں لگ رہی۔ کیا ماضی کے زمانے میں آنے سے میرے جسم اور مزاج پر بھی اثر پڑا ہے؟"

سوسن نے کہا۔

"صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ تمہیں موسم کی گرمی سردی کا شدت سے احساس نہیں ہوگا۔"

ایک سوال قدرتی طور پر میرے ذہن میں پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میں بہت آگے کے زمانے سے ماضی میں آیا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہاں حق وباطل کی کسی جنگ میں میں قتل ہو گیا تو کیا میں واقعی مرجاؤں گا؟"

سوسن مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"تم نے بڑا اچھا سوال پوچھا ہے۔ تم مروگے نہیں۔ کیونکہ تمہاری موت ماضی میں نہیں ہو سکتی۔ تم جب بھی مرو گے اپنے حال یعنی سن 1965ء عیسوی کے آگے کے کسی زمانے میں مرو گے۔"

میں نے سوسن کو اپنی جیب سے زہریلی سوئیوں والی بال پوائنٹ پنسل نکال کر دکھائی

اور جب اس ہلاکت خیز بال پوائنٹ کی خصوصیات بیان کرنے لگا تو وہ بولی۔

"تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ایک ایک بات، تمہارا ایک ایک راز مجھ پر کھول دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں اس بال پوائنٹ پنسل میں انتہائی مہلک زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں ہیں۔ اسے اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھو۔ یہ ماضی کے سفر میں تمہیں تمہارے دشمنوں سے محفوظ رکھے گی۔"

میں نے سوسن سے ایک اور بڑا ضروری سوال پوچھا۔ میں نے کہا۔

"میں ایک اور بات کی بھی وضاحت چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کسی وقت میں اپنے 1965ء عیسوی کے زمانے میں واپس جانا چاہوں تو کیا میں جا سکوں گا؟ کیونکہ پاکستان کا دشمن بھارت اس وقت پاکستان پر فوجی حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں وہاں کے حالات سے بھی باخبر رہنا چاہتا ہوں تاکہ ضرورت کے وقت میں واپس جا کر وطن پاک پر حملہ کرنے والے دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لے سکوں۔"

سوسن کہنے لگی۔

"تم اگر محسوس کرو کہ تمہارا واپس اپنے زمانے میں جانا ضروری ہے تو تم اپنے دل میں پانچ بار کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک مارنا۔ تم تاریخ کے قدیم دور سے غائب ہو کر اپنے زمانے میں اسی نجیب آباد والے قلعہ پتھر گڑھ کی سرنگ میں واپس پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے دوسرا سوال کیا۔

"اور کیا میں دوبارہ ماضی کے زمانے میں واپس آسکوں گا؟"

سوسن نے کہا۔

"ماضی کے زمانے میں واپس آنے کے لئے بھی تمہیں کلمہ طیبہ والا عمل دہرانا ہوگا۔ لیکن اس میں ایک شرط ہوگی۔ شرط یہ ہوگی کہ ماضی کے زمانے میں واپس آنے کے لئے تمہیں کلمہ طیبہ کے ورد کے بعد قلعہ پتھر گڑھ کی سرنگ میں آنا ہوگا۔ اگر سرنگ کی دیوار میں محرابی دروازہ کھلا ہوا مل گیا تو تم ماضی میں واپس جا سکو گے۔ اگر محرابی دروازہ نمودار

نہ ہوا تو تم واپس نہ آسکو گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مجھے ماضی کے زمانے میں آئے کافی وقت گزر گیا ہے۔ لیکن مجھ پر چندریکا کی بدروح کا حملہ نہیں ہوا اور میری بینائی ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ محترم بزرگ نے مجھے بتا دیا تھا کہ عہد ماضی میں مجھ پر بدروح کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس کا اثر صرف میرے زمانے یعنی 1965ء کے زمانے تک ہی محدود ہے لیکن میں سوسن سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس سے یہ سوال پوچھا تو وہ بولی۔

"محترم بزرگ نے تمہیں جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ جس دور میں اس وقت تم آچکے ہو یہاں چندریکا کی بدروح کا اثر بیکار ہو چکا ہے۔ لیکن اگر تم اپنی اس ناگہانی آفت کا علاج کرائے بغیر اپنے زمانے میں واپس جاؤ گے تو پھر اسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے اور وقفے وقفے کے بعد تمہاری بینائی معطل ہوتی رہے گی۔"

اس کے بعد سوسن نے کہا۔

"اب ہم سب سے پہلے اللہ کے اس بزرگ بندے کی خدمت میں حاضر ہوں گے جو تمہاری اس بیماری کا علاج کرے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"اللہ کا یہ بزرگ بندہ ہمیں کہاں ملے گا؟"

سوسن بولی۔

"اس صحرا میں شہر لگاش کے جنوب میں پتھریلی ریت کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ وہ بزرگ پیغمبر اور اللہ کا نیک بندہ ہمیں ان پہاڑیوں میں ملے گا۔ مگر سب سے پہلے تم اپنا یہ کمانڈو کا لباس بدل کر ہمارے زمانے کا لباس پہنو گے۔ جو میں تمہارے لئے اپنے ساتھ لائی ہوں۔"

سوسن اٹھ کر اونٹ کے پاس گئی اور وہاں سے چمڑے کا ایک تھیلا لے آئی۔ تھیلے کو کھول کر اس نے مجھے ایک لمبا کرتہ' سیاہ رنگ کی موٹے کپڑے کی کھلی شلوار' سر پر باندھنے کے لئے سیاہ اور نیلی دھاریوں والا پٹکا اور چمڑے کی تسموں والی چپل پہننے کو دی۔

میں یہ سب کچھ لے کر درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اپنا ماڈرن زمانے کا لباس یعنی تنگ جینز اور قمیض اتار کر سمیری عہد کے لوگوں کا لباس پہن لیا۔ میں نے زہریلی سوئیوں والی بال پوائنٹ پنسل اپنے موٹے اور لمبے سیاہ کرتے کی جیب میں سنبھال کر رکھ لی تھی۔ جب میں سوسن کے پاس آیا تو اس نے گردن ٹیڑھی کر کے مسکراتے ہوئے میرا جائزہ لیا اور بولی۔

"میرا بھائی کمانڈو سے سمیری شہزادہ بن گیا ہے۔"

میں نے سوسن کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک اور پیاس اسی طرح لگ رہی ہے جس طرح اپنے 1965ء کے زمانے میں لگا کرتی تھی۔"

وہ بولی۔

"اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لیکن وقت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یعنی تمہاری عمر کا ایک پل بھی نہیں بڑھے گا۔ تم جس عمر میں ماضی کے زمانے میں داخل ہوئے تھے اس عمر کے رہو گے۔ تمہاری ڈاڑھی مونچھوں کے بال اور ناخن بھی نہیں بڑھیں گے۔ ہاں جب تم اپنے زمانے میں واپس جاؤ گے تو عمر کے بڑھنے کا عمل دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔"

ہم اٹھ کر اونٹ کے پاس آگئے۔ اونٹ نے جی بھر کر چشمے کا پانی پی لیا تھا اور اب مزے سے بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اس اونٹ کی کمر پر دو کوہان تھے۔ اور اس پر دو کجاوے بنے ہوئے تھے۔ اگلے کجاوے پر سوسن بیٹھ گئی۔ پچھلے کجاوے پر میں بیٹھ گیا۔ سوسن نے اونٹ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ پھر باگ اوپر کو کھینچی۔ اونٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ سوسن نے اسے نخلستان سے نکال کر صحرائی راستے پر ڈال دیا۔ میں نے سوسن سے کہا۔

"صرف ایک سوال پوچھنا باقی رہ گیا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جب میں ماضی کے زمانے سے نکل کر اپنے زمانے میں جاؤں گا تو کیا وہاں بہت وقت گزر چکا ہوگا۔ یا اتنا ہی وقت گزرا ہوگا جتنا وقت میں نے ماضی کے زمانے میں گزارا ہوگا؟

سوسن کہنے لگی۔

"یہ بات تمہیں محترم بزرگ نے بھی بتائی تھی۔ میں ایک بار پھر تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ اگر تم ماضی کے زمانے میں سال دو سال یا تین سال گزارنے کے بعد اپنی دنیا میں واپس جاؤ گے تو وہاں زیادہ سے زیادہ ایک دن گزرا ہوگا۔ اگر ایک سال کے عرصے کے اندر اندر واپس جاؤ گے تو تمہاری دنیا کا صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ منٹ گزرا ہوگا۔"

اونٹ ایک نپی تلی ست رفتار سے صحرا میں چلا جا رہا تھا۔ اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی بڑے شیریں ترنم کے ساتھ بج رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں دن کے وقت کھلی آنکھوں سے کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ ساری دوپہر صحرا میں سفر کرتے گزر گئی۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت کم ہونے لگی تھی کہ دور کسی شہر کی فصیل نظر آئی۔ سوسن نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سمیریوں کے بادشاہ الحانا کا آباد کیا ہوا شہر لگاش ہے۔ ہم رات اس شہر کی کارواں سرائے میں گزاریں گے اور صبح اپنی منزل کو روانہ ہوں گے۔"

شہر لگاش کی فصیل پختہ اینٹوں کی تھی اور بہت بلند تھی شہر کے صدر دروازے کی دونوں جانب مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے جانوروں اور دیوی دیوتاؤں کے بت نصب تھے۔ ڈیوڑھی کی دیواروں پر چونے اور گچ سے گائے بھینسوں اور بیلوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ لوگوں کا لباس ویسا ہی تھا جیسا میں نے اور سوسن نے پہن رکھا تھا۔ یعنی لمبے چغے۔ ہم شہر کے اندر داخل ہوئے تو میں نے اونچے اونچے مکانوں کے درمیان ایک سب سے اونچا مینار دیکھا۔ سوسن کہنے لگی۔

"یہ سمیریوں کا معبد ہے۔ یہاں دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے۔ سمیری ہر شہر میں ایک اونچا مینار ضرور بناتے ہیں۔ جو ان کا معبد ہوتا ہے"

رات ہم نے ایک سرائے میں بسر کی۔ یہ سرائے ایک وسیع احاطے میں واقع تھی۔ احاطے کے تین اطراف چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ عورتوں کی رہائش کی کوٹھڑیاں

الگ تھیں۔ دوسرے دن ہم دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہاں سوسن نے میرے لئے ایک دوسرا اونٹ لے لیا تھا۔ اب میں ایک الگ اونٹ پر بیٹھا سفر کر رہا تھا۔ وہ دن بھی صحرا کی ریتلی پتھریلی وادیوں اور ریت کے میدانوں میں سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج غروب ہو رہا تھا تو سوسن نے کہا۔

"ہم ان پہاڑیوں کے پاس آگئے ہیں۔ جہاں ہمیں اللہ کے برگزیدہ بزرگ سے ملاقات کرنی ہے اور جس کے پاس تمہاری ناگہانی آفت اور بیماری کا علاج ہے۔ جب ہم بھوری اور سیاہ رنگ کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے تو سورج غروب ہو گیا تھا اور صحرا میں غروب آفتاب کی نارنجی روشنی ریت کے ذروں کو چمکا رہی تھی۔ یہ عجیب منظر تھا۔ ایسا غروب آفتاب میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کے بعد ایک چٹان کے سامنے آکر رک گئے۔ سوسن نے کہا۔

"اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں یہیں ملے گا۔"

ہم اونٹوں سے اتر پڑے سوسن آگے آگے تھی۔ ایک جگہ چٹان میں قدرتی غار تھا۔ غار کے دہانے پر سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ سوسن نے وہاں کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

"اے اللہ کے نیک بندے! ہماری طرف سے تمہیں سلام پہنچے۔ ہم بڑی دور سے تیری زیارت کو آئے ہیں۔ ہمیں اجازت دے کہ ہم تیری خدمت میں حاضر ہو سکیں"؟

سوسن نے تین بار یہ جملے بلند آواز سے دہرائے مگر غار میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ کہنے لگی۔

"وہ بزرگ غار میں نہیں ہے شاید"

میں نے کہا۔

"اندر چل کر دیکھتے ہیں"

وہ بولی۔

"نہیں یہ بات ادب کے خلاف ہے۔ کسی کے گھر اس کی اجازت کے بغیر داخل

نہیں ہونا چاہئے۔ ہم یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کریں گے۔"

ہم وہیں اپنے اونٹوں کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک طرف سے روشنی ہمیں اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ ایک نوجوان سمیری ہاتھ میں مشعل روشن کئے ہمارے پاس آکر بولا۔

"کیا آپ لوگ روشن بزرگ سے ملنے آئے ہیں"

سوسن نے کہا۔

"ہاں بھائی۔ ہم ان روشن بزرگ ہی کی زیارت کو آئے ہیں۔"

نوجوان کہنے لگا۔

"وہ تمہیں نیپور شہر کی فصیل کے باہر ملیں گے"

یہ کہہ کر وہ جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔ میں نے سوسن سے کہا۔

"یہ نیپور شہر کہاں پر ہے؟"

وہ بولی۔

"قریب ہی ہے۔ یہ سمیریوں کے بادشاہ کا پہلا پائے تخت ہے۔ یہاں بھی بادشاہ کا ایک محل ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں"

اس وقت رات ہو چکی تھی۔ ہم اونٹوں پر سوار ہو کر پہاڑی سلسلے سے نکل کر صحرا کی کھلی فضا میں آئے تو صحرا میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ روشنی آسمان پر چمکتے ستاروں کی روشنی تھی جو صحرائی ریت کے ذروں میں منعکس ہو رہی تھی۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ صحرا میں رات کو کبھی اتنا اندھیرا نہیں ہوتا کہ آدمی سفر نہ کر سکے۔

ہم نے صحرا میں تھوڑی دور ہی سفر کیا تھا کہ دور سے ایک شہر کی فصیل کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ سوسن نے کہا۔

"یہ سمیریوں کے شہر نیپور کی روشنیاں ہیں۔"

جیسے جیسے ہم شہر کے قریب ہو رہے تھے۔ روشنیاں زیادہ صاف ہو رہی تھیں۔ شہر کی فصیل کے پاس ایک جگہ آگ کا الاؤ روشن تھا۔ وہاں کئی لوگ کھڑے تھے۔ ادھر سے کسی

انسان کے اونچی آواز میں بولنے کی بارعب آواز آرہی تھی۔ سوسن نے کہا۔

"ادھر چلو۔ روشن بزرگ لوگوں کو برائیوں سے توبہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں"

ہم بھی لوگوں کے ہجوم میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ اونچے چبوترے پر ایک انتہائی خوبصورت انسان سیاہ چغہ پہنے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ الاؤ کی روشنی میں طلوع ہوتے سورج کی طرح چمک رہا ہے اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا رکھا ہے۔ اور وہ آج سے چار ہزار برس قدیم سمیری زبان میں کہہ رہا ہے۔

"میں تمہیں ایک عظیم جلال و جمال والے پیغمبر کی دنیا میں تشریف لانے کی خوشخبری دیتا ہوں۔ وہ دنیا کا آخری نبی ﷺ ہوگا۔ اس کے بعد کوئی نبی کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ اس عظیم المرتبت نبی ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی دنیا میں نبیوں' پیغمبروں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ یہ نبی آخر الزمان ہوگا۔ وہ اپنے ساتھ ایک مقدس کتاب قرآن پاک لائے گا۔ اس کتاب میں اللہ کا پاک کلام ہوگا۔ اس کتاب میں انسان کے واسطے ایک مکمل ضابطہ حیات ہوگا۔ اس روز اللہ کا دین مکمل ہو جائے گا۔ تم نہیں ہوگے مگر تمہاری اولادوں کی اولادیں اور ان کی نسلیں قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کر کے فلاح پائیں گی۔ یاد رکھو میں تمہیں اسی نبی آخر الزمان کی بشارت دینے آیا ہوں۔ جو سارے عالموں' ساری دنیاؤں کے لئے رحمت بن کر آئے گا۔ اے لوگو! برائیوں سے توبہ کرو۔ جو گناہ کرتا ہے اگر وہ دل سے توبہ کر لے تو اللہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اے اہل سمیر! میں اس نور کی روشنی دیکھ رہا ہوں جو رحمت اللعالمین بن کر ساری کائنات میں پھیلنے والی ہے۔ بتوں کی پوجا نہ کرو۔ ایک اللہ کی پرستش کرو۔ اپنے آپ کو گناہوں کی دلدل سے نکالو۔

اے سمیریوں کے بادشاہ! تو بھی سن۔ تو سب سے بڑا بت پرست ہے۔ تو نے اللہ کی توحید کو نہیں پہچانا۔ تو غریبوں پر ظلم کرتا ہے۔ بہت جلد تجھ پر اللہ کا عتاب نازل ہوگا۔

اس روشن بزرگ کی آواز میں ایسا جلال تھا کہ سننے والوں میں سے کوئی شخص ذرا سی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جب روشن بزرگ نے اپنا وعظ ختم کیا تو اس کی نظر ہم پر

پڑی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اور سوسن اس کے قریب چلے آئے۔ روشن بزرگ کی آنکھوں میں نورانی چمک تھی۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

"تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو کہ تم نے اللہ کا پاک کلام پڑھا ہے۔ تم نے مسجدوں سے بلند ہونے والی اذان کی آوازیں سنی ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر تم اپنی غلطیوں کی وجہ سے ایک آفت میں پھنس چکے ہو۔ جاؤ یہاں سے جنوب میں دو پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان ایک ندی بہتی ہے۔ اس ندی کے کنارے تمہیں ایک جھونپڑے میں ایک بزرگ ملے گا۔ وہی تمہاری بیماری کا علاج کرے گا۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو"

سوسن نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کر لیا۔ اتنے میں شہر کے صدر دروازے کی جانب سے گھوڑ سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ یہ بادشاہ کے سپاہی تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگ ادھر ادھر دوڑ پڑے مگر روشن بزرگ اپنی جگہ پر چٹان کی طرح کھڑا رہا۔ سپاہیوں نے آتے ہی روشن بزرگ کو زنجیریں ڈال دیں اور اپنے ساتھ لے کر شہر پناہ کے دروازے کی طرف چل دیئے۔ میں نے سوسن سے کہا۔

"سوسن! میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کو بادشاہ کے سپاہیوں سے چھڑانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس بال پوائنٹ پنسل کا مہلک ہتھیار موجود ہے۔ میں ان سارے سپاہیوں کو ڈھیر کر سکتا ہوں"

سوسن نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ روشن بزرگ بھی تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ روشن بزرگ اگر چاہے تو ان سپاہیوں کو پتھر کے بت بنا کر فرار ہو سکتا ہے مگر اللہ کے برگزیدہ بندے اللہ کی مشیت میں کبھی دخل نہیں دیتے۔ یہ سب کچھ مشیت الٰہی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ اور اللہ کے نیک بندے مشیت الٰہی کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ چلو ہم اس بزرگ کے پاس چلتے ہیں جس کے پاس جانے کی ہمیں ہدایت کی گئی

ہے۔"

ہم اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور جنوب کی طرف چل دیئے۔ ہم ویران پہاڑیوں اور صحرا میں آدھی رات تک سفر کرتے رہے۔ آخر ہمیں ایک صحرا میں دو پہاڑیاں دکھائی دیں۔ ان کے قریب جا کر دیکھا کہ ان کے درمیان ایک ندی بہہ رہی تھی۔ یہ کوئی صحرائی چشمہ تھا جو پہاڑیوں سے نکل کر ایک طرف بہہ رہا تھا۔ صحرائی رات ستاروں کی روشنی میں نیم روشن تھی۔ مجھے ندی کا شفاف پانی بہتا نظر آ رہا تھا۔ سوسن نے کہا۔

"ندی کے ساتھ ساتھ ہم آگے جائیں گے۔"

ذرا آگے گئے تو ہمیں ایک چٹان کے سائے میں جھونپڑا دکھائی دیا۔ ہم اونٹوں سے اتر پڑے۔ قریب گئے تو جھونپڑے کا دروازہ بند پایا۔ یہ جھونپڑا کھجور اور زیتون کی شاخوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی درزوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرنیں باہر آ رہی تھیں۔ میں ان درزوں میں سے جھونپڑی میں جھانکنا چاہتا تھا مگر سوسن نے مجھے منع کیا۔ ہم جھونپڑی کے دروازے کے پاس ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ رات پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں جانب پہاڑیاں خاموش سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ آسمان پر لاکھوں کروڑوں ستارے جھلملا رہے تھے۔ ندی کا پانی سکون سے بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جھونپڑی کے اندر سے بزرگ کی آواز آئی۔

"تمہیں میرے بھائی نے میرے پاس بھیجا ہے اندر آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔"

ہم جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ ہم نے ایک پرسکون روشن چہرے والے بزرگ کو دیکھا جو شیر کی کھال کی چٹائی پر مراقبے کی حالت میں بیٹھے تھے۔ دیا روشن تھا۔ ہم نے اس بزرگ کی تعظیم کی اور ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے مجھے روشنی کی کرنیں پھوٹتی معلوم ہوئیں۔ انہوں نے میرا نام لے کر کہا۔

"تم پر جو آفت نازل ہوئی ہے وہ تمہاری اپنی کوتاہیوں اور گناہ کے خیالات کی وجہ

سے نازل ہوئی ہے۔ چونکہ تم نے اللہ کے حضور سر جھکا کر اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے اور آئندہ کبھی گناہ نہ کرنے کا عہد کیا ہے اس لئے اللہ نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اور تمہیں میرے پاس بھیجا ہے کہ میں اللہ کے حکم سے تمہاری بیماری کا علاج کروں۔ میرے قریب آؤ۔"

میں اٹھ کر بزرگ کے قدموں میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے میرے سر پر پانچ بار ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے تمہیں شفا عطا کر دی ہے۔ اب تم پر کسی بد روح کا اثر نہیں ہو گا۔ لیکن اگر تم اپنے دل میں گناہ کا خیال بھی لائے تو ایک بار پھر اس مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ سوسن بھی خاموش مودب ہو کر بیٹھی تھی۔ بزرگ نے فرمایا۔

"تم اس زمانے سے نکل کر آرہے ہو۔ جہاں اسلام کا نور دنیا کے کونے کونے کو منور کر رہا ہے۔ اسلام کے دشمن بھی اپنی سازشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ اس قلعے کی حفاظت کرنا اور اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا تم لوگوں کا فرض ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کا دشمن ملک پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ تمہارا واپس جانا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ تم لشکر اسلام کے مجاہد ہو۔"

ہم خاموش بیٹھے رہے۔ سوسن نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ بزرگ کو کوئی سوال نہ کرنا۔ تمہارے دل میں جو سوال پیدا ہو گا اس کا جواب خود ہی بزرگ تمہیں دے دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو چکا تھا کہ بزرگ نے فرمایا۔

"تمہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہاں سے واپس جاؤ گے تو تمہیں ایک زبردست طاقت مل چکی ہو گی۔ جس سے تم دشمنان اسلام کا مقابلہ کر سکو گے۔ میں وہ طاقت تمہیں دیتا ہوں۔ سنو! یہ طاقت کسی جادو یا طلسم کی طاقت نہیں ہے۔ یہ طاقت ایمان کی طاقت ہے۔ اپنے اللہ پر یقین رکھنے کی طاقت ہے۔ اپنے دل سے اللہ کے سوا سب کا خیال نکال دو تمہارا ہر کام ہر فعل اللہ اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہئے۔ تمہارا اٹھنا' بیٹھنا' کھانا

پینا' کاروبار کرنا' بھائی بہنوں اپنے بچوں سے محبت کرنا صرف اللہ اور اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ جب تم اس راستے پر چل پڑو گے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو گے تو پھر تمہارے اندر ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے گی جو تمہیں ہر میدان میں دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب و سرخ رو کرے گی۔ پھر تم اللہ کے لئے زندہ رہو گے اور اللہ کے لئے جان دو گے۔ پھر تم زندہ رہو گے تو غازی ہو گے' مرو گے تو شہادت کا رتبہ پاؤ گے اور جنت میں داخل ہو گے۔ یہی وہ طاقت ہے یہی وہ قوت ہے جو میں تمہارے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسی طاقت کو اپنی ابتدائی شکل میں تمہارے سینے میں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ ابھی ٹمٹماتے چراغ کی روشنی کی مانند ہے۔ میں اسے کڑکتی گرجتی بجلی میں بدل دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ بجلی دشمنان اسلام کے سروں پر خدائی قہر بن کر ٹوٹے"۔

یہ کہہ کر اس بزرگ نے میری کمر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"یہ تمہاری ہی طاقت ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ میں اپنی طرف سے تمہیں کچھ نہیں دے رہا۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ تمہارے سینے میں ایمان کی جو حرارت تھی اسے تڑپتی ہوئی کڑکتی ہوئی بجلیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب تمہیں واپس جانا ہو گا۔ یہ کڑکتی بجلیاں تمہارے جذبہ ایمانی کی صورت میں ظاہر ہو کر تمہیں دشمن کے آگے سیسہ پلائی دیوار بنا دیں گی۔ میرے پاس ایسا کوئی جادو نہیں ہے جو دشمن کی گولی کو تمہارے سینے پر لگنے سے روک دے۔ میں تمہیں وہ جذبہ ایمانی دے رہا ہوں جو تمہیں اللہ کی راہ میں اللہ کے دشمنوں سے غازی بن کر جنگ کرنا اور ان پر فتح حاصل کرنا اور اللہ کی راہ میں شہید ہو کر اسلام کے پرچم کو سربلند رکھنا سکھائے گا۔ بس یہی تمہاری سب سے بڑی طاقت سب سے بڑی قوت ہو گی۔"

بزرگ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر سے اٹھا لیا اور کہا۔

"جاؤ۔ تمہارے ملک کی سرحدوں پر میدان کارزار گرم ہونے والا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اسلام کے قلعے پاکستان پر حملے کی سب تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ جاؤ تم بھی ان غازیوں مجاہدوں کی صفوں میں جا کر شامل ہو جاؤ جو وطن پاک کی سرحدوں پر سیسہ پلائی

چٹانیں بن کر دشمن کے مذموم ارادوں کو خاک و خون میں ملانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔"

بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ سوسن نے آہستہ سے مجھے پیچھے کھینچا۔ ہم دونوں بڑے ادب سے اٹھے اور بزرگ کو سلام کر کے جھونپڑی سے باہر آ گئے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سینے میں ایک زبردست طاقت پیدا ہو چکی ہے۔ ایک ایسی طاقت جو پہاڑوں سے ٹکرا سکتی تھی۔ سمندروں کا سینہ چیر سکتی تھی۔ اور کفار کے ہر حملے کو تہ تیغ کر سکتی تھی۔ میں نے بلند آواز سے کلمہ شریف پڑھا اور سوسن سے کہا۔

"میری بہن! میں یہیں سے اپنے دشمنوں کے ملک میں واپس جا رہا ہوں تا کہ وطن پاک پر حملے کی تیاریاں کرنے والے دشمن کی منصوبہ بندیوں پر اللہ کے شیر دل کمانڈو کی طرح حملہ آور ہو سکوں۔"

سوسن نے کہا۔

"اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو میرے بھائی"

میں نے چمڑے کے تھیلے میں سے اپنی پتلون اور قمیض اور بوٹ نکالے۔ سمیریوں کے زمانے کے کپڑے اتار کر پتلون قمیض بوٹ پہنے اور سوسن سے کہا۔

"سوسن بہن! حق و باطل کے اس معرکے میں اگر زندہ رہا تو ایک بار تمہیں ملنے ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھا آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا۔ اور کلمہ پاک کو پانچ مرتبہ پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک ماری۔

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرا جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا ہے۔ یہ احساس ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم عرصے تک رہا۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنے آپ کو نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے کی سرنگ میں پایا۔ میں سرنگ کی دیوار کے پاس کھڑا تھا میری پشت دیوار کی طرف تھی جہاں ہلکی ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس روشنی میں اس

دروازے کی محراب نظر آ رہی تھی جس میں سے گزر کر میں ماضی کے زمانے میں داخل ہوا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دروازے کی محراب غائب ہو گئی اور دیوار پر جو ہلکی روشنی نمایاں تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اب سرنگ میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں دیوار پر ہاتھ رکھ کر واپس چل پڑا۔ سرنگ کے راستے کا مجھے اندازہ تھا۔ میں یہیں سے محترم بزرگ کے ساتھ گزر کر محرابی دروازے تک آیا تھا۔ مگر اب محترم بزرگ وہاں پر موجود نہیں تھے۔

مجھے احساس تھا کہ اگرچہ میں ماضی کے زمانے میں دو راتیں گزار چکا ہوں لیکن ہندوستان کے شہر نجیب آباد میں وہی وقت ہو گا جس وقت میں سرنگ میں داخل ہوا تھا۔ یعنی وہاں ابھی آدھی رات ہی ہو گی۔ میں سرنگ سے باہر نکل آیا۔ اب میں نجیب الدولہ شہید کے بنائے ہوئے تاریخی پتھر گڑھ قلعے کی تیسری برجی کے نیچے بند دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا تھا جب میں سرنگ سے باہر نکلا تھا۔ اب یہ دوبارہ بند ہو گیا تھا۔ رات اسی طرح تاریک اور دہشت ناک تھی جس طرح میں اسے چھوڑ کر ماضی کے زمانے میں گیا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اب میرا کمانڈو مشن بھارت کی پاکستان کے خلاف جنگی تیاریوں کی سراغ رسانی کرنا اور اس کی پوری پوری رپورٹیں سری نگر کمانڈو شیروان کو پہنچانا تھا تا کہ دشمن کی تیاریوں سے پوری طرح باخبر رہا جائے۔ یہ تمام رپورٹیں حاصل کرنے کا اب میرے پاس کوئی خفیہ ذریعہ نہیں رہا تھا۔ اگر میں ملٹری انٹیلی جینس کے میجر شرت دیوان کے ساتھ ہوتا تو یہ ساری سیکرٹ رپورٹیں بڑی آسانی سے حاصل کر کے کمانڈو شیروان کو پہنچا سکتا تھا۔ مگر یہ ذریعہ مجھ سے چھن گیا تھا۔

میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ بال پوائنٹ پنسل والا مہلک ہتھیار میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس وقت یہی ایک کام کی چیز میرے پاس تھی۔ میں وہیں قلعہ کی برجی کے نیچے اندھیرے میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ شہر نجیب آباد میں میرے پکڑے جانے کا شدید خطرہ تھا۔ میں ایک خطرناک کشمیری کمانڈو تھا۔ میں نہ

صرف یہ کہ نجیب آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر سے فرار ہی ہوا تھا بلکہ میں نے وہاں دو سپاہیوں کو ہلاک بھی کر دیا تھا۔ دن کی روشنی میں اس شہر سے نکلنا ناممکن تھا۔ اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا کہ میں کہیں زیادہ دیر تک چھپا رہ سکتا۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کسی وقت بھی پاکستان اور آزاد کشمیر پر حملہ کر سکتا تھا۔ مجھے اس حملے کے خفیہ پلان کی زیادہ سے زیادہ معلومات چاہئے تھیں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں کمانڈو شیروان کے پاس جاتا ہوں۔ اس سے اس مسئلے پر مشورہ کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسا ذریعہ بتا دے جس کی مدد سے میں بھارت کے پاکستان دشمن فوجی پلان کا کچھ سراغ لگا سکوں۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔

آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے نجیب آباد سے صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے دلی کی طرف نکل جانا چاہئے۔ اس کے دو ہی طریقے تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں ریلوے سٹیشن پر جا کر دلی کی طرف جانے والی جو بھی گاڑی ملے اس میں بیٹھ جاؤں۔ اس میں ہر لمحہ میرے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ ریلوے سٹیشن کو پولیس نے ضرور محاصرے میں لے رکھا ہوگا اور زبردست چیکنگ ہو رہی ہوگی۔ نجیب آباد کی پولیس میری شکل سے واقف ہو چکی تھی۔ میں ایک سیکنڈ میں پہچانا جا سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ شہر سے جو سڑک شمال کی طرف جاتی ہو اس سے کچھ فاصلے پر کھیتوں وغیرہ میں چلنا شروع کر دوں۔ دن نکلنے تک میں شہر سے کافی دور جا چکا ہوں گا۔ سڑک پر تو پولیس کے چیک پوائنٹ ضرور ہوں گے مگر سڑک کے دائیں بائیں کھیتوں میں مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں نے دوسری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور اٹھ کر قلعے کے تاریک صحن میں سے گزرتا ہوا قلعے کے عقبی بڑے اور ویران دروازے پر سے باہر چھوٹی سڑک پر آگیا۔

ستاروں کو دیکھ کر میں نے شمال کی سمت کا اندازہ لگایا اور چھوٹی سڑک سے اتر کر درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر چلنا شروع کر دیا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ سڑکیں اور راستے خالی تھے۔ کبھی کبھی دور شہر کو جانے والی سڑک پر سے کسی تانگے یا ٹرک کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ میں صبح ہونے تک اسی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر کو

ملانے والی بڑی شاہراہ سے کافی ہٹ کر کھیتوں میں چلتا رہا۔ نجیب آباد سے سری نگر تک پہنچنے کی روئیداد بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ ڈاڑھی بڑھ آئی تھی۔ یعنی میری ٹھوڑی سے دو انچ نیچے تک آگئی ہوئی تھی۔ اس طرح مونچھیں بھی بڑھ چکی تھیں۔ گردن پر بھی بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں امریکہ اور یورپ سے ہپی لوگ بہت آیا کرتے تھے۔ ان کے بال بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ میں بھی ایک ہپی ہی لگتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں سری نگر کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچ گیا۔

میں نے کمانڈو شیروان کو اپنی گزشتہ کمانڈو سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتایا مگر اپنے ماضی کے سفر کے بارے میں ایک بات بھی نہ کی۔ کیونکہ سوسن نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس سلسلے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کروں۔ وہاں مجھے کمانڈو اورنگ زیب نہ ملا۔ شیروان نے بتایا کہ بھارت نے اپنی ایک ڈویژن فوج آزاد کشمیر کی سرحد پر ڈیپلائے کر دی ہے۔

"تمہاری جو رپورٹیں ہمیں ملی ہیں وہ صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ بھارت پاکستان کے علاوہ آزاد کشمیر پر بھی حملہ کرنے والا ہے۔ کمانڈو اورنگ زیب اسی محاذ پر دوسرے کشمیری مجاہدین کے ساتھ گیا ہوا ہے۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اب میجر شرت دیوان کا ذریعہ مجھ سے چھن گیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بھارت آزاد کشمیر اور پاکستان پر کس تاریخ کو اور کتنی طاقت کے ساتھ حملے کرنے والا ہے۔ کیا راجدھانی دلی یا کسی دوسرے شہر میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جو یہ سیکرٹ رپورٹ حاصل کرنے میں میری مدد کر سکے؟"

کمانڈو شیروان کچھ سوچ کر بولا۔

"ہاں۔ اپنا ایک آدمی ہے۔ مگر وہ تمہیں راجدھانی دلی میں نہیں بلکہ..... میں ملے گا۔"

کمانڈو شیروان نے مجھے شہر کا جو نام بتایا تھا وہ میں یہاں نہیں لکھوں گا۔ میں اپنے اس مجاہد جاسوس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا جس کے پاس مجھے کمانڈو شیروان نے بھیجا تھا۔ یہ کشمیری مجاہد بھارت کے جس شہر میں اپنی سراغ رسانی کی ڈیوٹی دے رہا تھا اس شہر کا نام کچھ اور تھا۔ وہاں اس آدمی کا پیشہ بھی کچھ اور تھا۔ میں اس کی بجائے امرتسر شہر کا نام لکھوں گا۔ کشمیری مجاہد کا نام بھی فرضی بتاؤں گا۔ باقی سارے واقعات سارے کمانڈو آپریشن سچے اور اصلی ہوں گے۔ یوں سمجھ لیں کہ کمانڈو شیروان نے مجھے اپنے کشمیری مجاہد کا نام جہانگیر بتایا۔ شیروان نے رات کے وقت خفیہ ٹرانسمیٹر پر اپنے کشمیری مجاہد جاسوس جہانگیر سے کوڈ الفاظ میں بات کر کے میرے بارے میں بتایا اور کہا کہ جو خفیہ فوجی معلومات ہمیں درکار ہیں وہ ہر حالت میں مہیا کی جائیں۔ ٹرانسمیٹر آف کرنے کے بعد شیروان کہنے لگا۔

"اب تمہیں جہانگیر کے پاس امرتسر جانا ہوگا۔"

یہاں اُس نے امرتسر شہر کی بجائے ایک دوسرے شہر کا نام لیا تھا وہ بھی یوں سمجھ لیں کہ بھارت کا ایک سرحدی شہر ہی تھا اور اپنے کشمیری مجاہد نے پاکستان کی طرف جانے والی سڑک پر ایک لاری اڈے کے پاس سٹیشنری اور پرانی کتابوں کی دکان کھول رکھی تھی۔ میں صرف ایک دن کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں رہا۔ یہاں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں بھی بھارت نے اپنی فوجوں میں اضافہ کر دیا ہے آزاد کشمیر کی سرحد پر بھی بھارتی فوجوں کا اجتماع دیکھا گیا تھا۔ میں نے شیروان کی کمین گاہ میں ہی نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ یہ اگست کے مہینے کا وسط تھا۔ کشمیر میں بارشیں ہو رہی تھیں۔ شیروان نے مجھے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

"بال پوائنٹ پنسل پستول کی خاص حفاظت کرنا اسے اپنی جیبوں میں ہرگز نہ رکھنا۔ بلکہ بوٹ میں جرابوں کے اندر چھپا کر رکھنا۔"

اس نے مجھے کچھ بھارتی کرنسی بھی دی۔ میرے سر اور ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بال دیکھ کر بولا۔

"تمہارا یہ حلیہ ٹھیک ہے۔ بال نہ ترشوانا۔ اس حلیے میں تمہیں اتنی جلدی نہیں پہچانا جا سکتا۔ باقی تم خود بھی جانتے ہو کہ تمہیں ہر حالت میں دشمن کی نظروں سے محتاط ہو کر رہنا ہوگا۔"

جب رات ذرا گہری ہوئی تو میں خفیہ کمین گاہ سے نکل کر امرتسر کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں بھی میں اپنے سفر کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں امرتسر پہنچ گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اپنا کشمیری مجاہد جہانگیر دکان پر موجود تھا۔ میری اطلاع اسے مل چکی تھی۔ شیروان نے اسے میرا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے آپس میں چند ایک خفیہ جملوں کا تبادلہ کیا جب ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ ہم وہی آدمی ہیں جن کو ایک دوسرے سے ملنا تھا تو جہانگیر نے الماری میں سے کتابیں نکال کر مجھے دکھانی شروع کر دیں۔ اس وقت دکان میں صرف ایک ہندو یا سکھ عورت ہی موجود تھی جو اپنی بچی کو کاپیاں دکھا رہی تھی۔ جب تک وہ عورت دکان میں موجود رہی میں ایک گاہک بن کر کتابوں کو دیکھتا رہا۔ جب وہ چلی گئی تو جہانگیر نے آہستہ سے کہا۔

"اسی سڑک پر کچھ دور آگے جگت سنیما ہے۔ فلم کا شو شروع ہونے والا ہے۔ گیلری کی ٹکٹ لے کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"

میں یہ سن کر خاموشی سے دکان سے نکل گیا۔ سڑک پر دونوں جانب کھمبوں پر بتیاں روشن تھیں۔ دکانیں کھلی تھیں۔ یہاں دو روز پہلے بارش ہوئی ہوگی۔ سڑک کے کنارے کیچڑ تھا۔ کہیں تانگے کھڑے تھے۔ سائیکل رکشا والے بھی آجا رہے تھے۔ زیادہ تر دکانیں سکھوں کی تھیں۔ ایک گوردوارہ بھی تھا جس کے باہر ایک سکھ پھولوں کی چھابڑی لگائے بیٹھا تھا۔ گوردوارے کے اندر سے شبد کیرتن کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ فضا میں حبس تھا۔ سڑک کی دوسری طرف جگت سنیما ہاؤس کی عمارت تھی۔ شو شروع ہونے والا تھا۔ ایک جگہ انگریزی اور گورمکھی میں گیلری لکھا تھا۔ یہ ٹکٹ والی کھڑکی تھی۔ میں بھی سکھوں ہندوؤں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ ٹکٹ لیا اور اوپر گیلری میں آکر دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ہال میں روشنی ہو رہی تھی۔ کافی لوگ بیٹھے تھے۔ میں دیوار

کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے اوپر وہ چوکور سوراخ تھے جن میں سے فلم کی روشنی نے سکرین پر پڑنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی۔ ہال کی بتیاں بجھ گئیں اور فلم شروع ہو گئی۔ میری توجہ فلم کی طرف بالکل نہیں تھی۔ میں گیلری کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک آدھ بار سکرین پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ہندی کی فلم ہے اور اس میں ہیما مالنی بھی ہے۔ میں خاص طور پر ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں میرے آس پاس کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ فلم شروع ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ تب گیلری کا پردہ ایک طرف ہٹا اور فلم کی ہلکی ہلکی سفید روشنی میں میں نے اپنے کشمیری مجاہد جہانگیر کو داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور گیلری کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے مجھے دیوار کے پاس بیٹھا دیکھ لیا اور میرے پاس آکر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں پورا یقین ہے کہ امرتسر میں داخل ہوتے وقت تمہارے پیچھے خفیہ پولیس والا نہیں تھا؟"

ہماری نگاہیں پردہ سکرین پر تھیں۔ میں نے کہا۔

"مجھے پورا یقین ہے"

جہانگیر نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں نے اپنے خفیہ ذریعوں سے ایک دن پہلے وہ معلومات حاصل کر لی تھیں جن کے بارے میں کمانڈو شیروان نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں یہ تمام خفیہ فوجی معلومات لے کر خود شیروان کے پاس جانے والا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ معلومات کیا ہیں؟"

جہانگیر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"بھارت نے آزاد کشمیر اور پاکستان پر حملہ کرنے کا پورا پلان بنا لیا ہے۔ سب سے پہلے آزاد کشمیر پر حملہ کیا جائے گا۔ بھارت کے ناپاک عزائم یہ ہیں کہ زبردست فوجی سازو سامان اور زیادہ نفری کے ذریعے آزاد کشمیر پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس کے فوراً بعد پاکستان پر

واہگہ اور برکی کی جانب سے بیک وقت یلغار کر دی جائے اور لاہور قبضے میں لے لیا جائے۔"

میں نے جہانگیر سے پوچھا۔

"حملے کی تاریخ اور وقت کونسا مقرر ہوا ہے؟"

وہ بولا۔

"یہ سیکرٹ ہمارے آدمیوں کو معلوم نہیں ہو سکا۔ بھارتی فوجی ہائی کمانڈ نے حملے کی تاریخ اور وقت کو بے حد خفیہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق جہاں تک میری اطلاعات کا تعلق ہے سوائے دو ایک بھارتی جرنیلوں کی اور کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس وقت واہگہ اٹاری سیکٹر میں بھارت کی ایک ڈویژن (15 انفنٹری) پوری ٹینک رجمنٹ کے ساتھ موجود ہے۔ ایک ڈویژن فوج بمع ٹینک رجمنٹ امرتسر سے ذرا پیچھے پہنچ چکی ہے۔ ان کی مدد اور کمک کے لئے پیچھے ایک مونٹین ڈویژن نمبر 23 تین ٹینک رجمنٹوں کے ساتھ امرتسر کے آس پاس ریزرو میں پابرکاب ہے۔ ان ڈویژنوں کے ساتھ توپ خانہ بھی ہے۔"

ایک آدمی ہم سے آگے تین قطاریں چھوڑ کر کرسیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر چپ ہو گیا۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو جہانگیر کہنے لگا۔

"دشمن تین گنا زیادہ طاقت اور نفری سے پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اللہ پاکستان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ پاکستان ہماری امیدوں کا مرکز ہی نہیں عالم اسلام کا قلعہ بھی ہے۔ اسے ہر حالت میں قائم ودائم رہنا چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں جہانگیر۔ پاکستان قائم ودائم رہنے کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ سلامت رہے گا۔ ہماری پاک فوج کے شیر دل جوان اور افسر سیسہ پلائی دیوار بن کر دشمن کا سر توڑ دیں گے۔ یقینی طور پر یہ فوجی رپورٹیں ان تک بھی پہنچ گئی ہوں گی اور پاکستان کی ڈیفنس لائن پر ایک ایک جوان دشمن کے ناپاک عزائم خاک میں ملانے کے لئے سینہ سپر ہو کر الرٹ ہو چکا ہوگا۔ یہ کفر واسلام کا معرکہ ہے اور انشاء اللہ

فتح اسلام کی ہوگی۔"

"انشاء اللہ" جہانگیر نے میری تائید کی۔

میں نے جہانگیر سے کہا۔

"امرتسر میں بھارت جو ایک ڈویژن فوج ٹینک رجمنٹ کے ساتھ لایا ہے وہ یہاں پر کس جگہ مقیم ہے۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے؟"

جہانگیر کہنے لگا۔

"یہ کوئی ایسی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ ایک ڈویژن فوج بہت بڑی فوج ہوتی ہے۔ اس فوج نے امرتسر سے ذرا پیچھے ریلوے لائن کے پاس ایک میدان میں عارضی چھاؤنی ڈال رکھی ہے۔ مگر اس طرف جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت ایک محب وطن کمانڈو کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ دشمن کی فوجی طاقت کو جتنا نقصان پہنچا سکتا ہوں پہنچاؤں۔ میں دشمن کے اس فوجی مرکز میں شب خون مار کر اس کی ٹینک فورس کو برباد کرنا چاہتا ہوں۔"

جہانگیر بولا۔

"میں تمہیں اس جگہ کا پورا نقشہ سمجھا دوں گا۔ جہاں اس وقت بھارت نے اپنی انفنٹری ڈویژن ٹینک رجمنٹ کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔"

فلم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جہانگیر مجھے سنیما ہال سے نکال کر اندھیرے غیر آباد علاقے میں سے گزار کر اپنے مکان پر لے گیا۔ یہ آبادی کے کونے پر ایک کوٹھڑی ایک چھوٹے سے صحن والا مکان تھا جہاں جہانگیر جموں کے ایک عام محنت کش مسلمان دکاندار کی حیثیت سے عرصہ آٹھ سال سے مقیم تھا۔ اس نے مجھے بھارتی فوجی کیمپ کا پورا محل وقوع سمجھا دیا۔ میں دوسرے دن جہانگیر کے گھر میں ہی چھپ کر کمانڈو ایکشن کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ اس دوران جہانگیر نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ بھارتی فوجی ڈویژن کے اس عارضی کیمپ میں ٹینک رجمنٹ کے ٹینک کس طرف کیمو فلاج کر کے رکھے گئے ہیں۔

نقشے کی مدد سے اس نے مجھے ساری لوکیشن اور جگہ سمجھا دی بال پوائنٹ پستول تو پہلے ہی سے میرے پاس تھا۔ جہانگیر کی مدد سے میں نے چاکلیٹ کی چھ ٹکیوں کی شکل میں انتہائی طاقتور اور زبردست دھماکہ خیز ٹائم بم بھی تیار کر لئے۔ یہ بم ہینڈ گرنیڈ کی طرح کے تھے مگر چھوٹی چوکور ٹکیوں کی طرح تھے۔ ان میں ایک کیل دبائی گئی تھی۔ اس کیل کو کھینچ کر ٹارگٹ پر پھینکنا تھا۔ یہ چھ کے چھ بم ٹینکوں کے جھمگھٹے میں مجھے دس پندرہ گز کے فاصلے سے پھینکنے تھے۔ اگر میں زبردست سیکورٹی میں سے نکل کر کسی طرح اس جگہ پہنچ جاتا ہوں جہاں بھارتی ٹینک رجمنٹ کے ٹینک کیمو فلاج کئے ہوئے تھے تو ان کو تباہ کرنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سب سے مشکل مرحلہ ان ٹینکوں کے قریب پہنچنا تھا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہاں اتنی زبردست سیکورٹی ہوگی کہ کوئی پرندہ بھی ادھر سے نہیں گزر سکتا ہوگا۔ لیکن مجھے بہرحال یہ ٹارگٹ مارنا تھا خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان کا نذرانہ کیوں نہ پیش کرنا پڑتا۔

سہ پہر کے وقت جہانگیر مجھے ٹارگٹ دکھانے کے لئے لے گیا۔ ہم ایک خاص سکیم پر عمل کرتے ہوئے ٹارگٹ تک پہنچے جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ ریلوے لائن سے کوئی چھ سات سو گز کے فاصلے پر ایک جگہ کھیتوں میں بہت بڑا فوجی کیمپ لگا تھا۔ ہم ریلوے لائن کے اس طرف دھریک کے ایک درخت کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ کیمپ کے اردگرد کانٹے دار تار کے گچھے پھیلا دیئے گئے تھے۔ چونکہ یہ عارضی کیمپ تھا اس لئے وہاں خاردار تاروں والی دیوار بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ٹینک چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں خاردار تاروں سے کافی پیچھے ہٹا کر درختوں کے نیچے کھڑے کئے گئے تھے۔ جہانگیر کہنے لگا۔

"تمہیں تار کاٹنے کے لئے پلاس ساتھ لے جانا ہوگا۔ اس کا انتظام ہو جائے گا"

میں نے سارا نقشہ ذہن میں اچھی طرح بٹھا لیا اور یہ بھی درخت پر اوپی کرتے ہوئے طے کر لیا کہ مجھے جنوب کی جانب کھیتوں میں سے رینگ کر خاردار تاروں تک پہنچنا ہوگا۔ اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ ہم درخت سے اتر کر الگ الگ ہو گئے۔ اور الگ

الگ راستوں سے گھر پہنچے۔ اس رات مجھے اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا۔ میں نے جہانگیر کو بتادیا تھا کہ اگر میں ٹارگٹ مارنے میں کامیاب ہوگیا تو واپس اس کے پاس نہیں آؤں گا بلکہ ادھر ہی سے کسی دوسرے شہر نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر خدانخواستہ پکڑا گیا تو میری زبان پر جہانگیر کا نام نہیں آئے گا۔

میں نے اپنے کمانڈو مشن کے لئے رات کے دو بجے کے بعد کا وقت طے کیا۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے سپاہیوں پر بھی نیند کا غلبہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان سے تھوڑی بہت غفلت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ ویسے کسی بھی ملک کا فوجی کیوں نہ ہو اس کی ٹریننگ اس طرح ہوئی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر کبھی غافل نہیں ہوتا۔ جہانگیر نے ایک چھوٹے سائز کا مگر بڑا مضبوط پلاس لاکر مجھے دے دیا تھا۔ میں نے دو تین لوہے کے تار کاٹ کر اس کا تجربہ بھی کرلیا تھا۔ جب رات کے ٹھیک دو بجے تو میں نے جہانگیر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”دوست! اللہ کے حوالے۔ زندہ رہا تو کسی نہ کسی جگہ پھر ملاقات ہوگی۔ مرگیا تو میرا کہا سنا معاف کر دینا۔“

میں رات کی خاموشی اور تاریکی میں جہانگیر کے گھر سے نکل کر امرتسر کی اس آبادی کی طرف چل پڑا جس کا نام پہلے شریف پورہ ہوا کرتا تھا لیکن ہندوستان آزاد ہو جانے کے بعد وہاں ہندو سکھ شرنارتھی آگئے تھے اور انہوں نے اس کا نام سنگھ پورہ رکھ دیا تھا۔ راستے کا مجھے پتہ تھا۔ رات کے وقت بڑی سڑک پر چلنے کی بجائے میں ایک جگہ کھیتوں میں ہوتا ہوا ریلوے لائن پر آگیا۔ یہ ریلوے لائن امرتسر سے جالندھر انبالے دلی کی طرف جاتی تھی۔ رات تاریک تھی۔ ریلوے سٹیشن کی روشنیاں میرے پیچھے رہ گئی تھیں۔ بڑی سڑک پر جو جی ٹی روڈ تھی واہگہ بارڈر کی طرف جاتے مجھے دو تین فوجی ٹرک ملے تھے مگر ریلوے لائن پر کسی قسم کی ٹریفک نہیں تھی۔ آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ کھیتوں پر اندھیرا اور رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی اور اطمینان تھا کہ جب سے میں ماضی کے زمانے میں روشن بزرگ کی زیارت کرکے آیا تھا میرے سر پر

سے چندریکا کی بدروح کا سایہ دور ہو چکا تھا۔ اس دوران کئی راتیں اور دن گزر گئے تھے مگر مجھ پر اندھے پن کا حملہ نہیں ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میری آنکھوں کی بینائی نہیں گئی تھی۔ ایسی خطرناک اور ناگہانی بیماری سے نجات حاصل کرلینے کے بعد میرے حوصلے مزید بلند ہو گئے تھے۔

میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ راستے میں سگنل کے کھمبوں کے نیچے سے بھی گزرا جن کی سرخ بتیاں روشن تھیں۔ دو ریلوے پھاٹک عبور کئے راستے میں مجھے کوئی چوکیدار یا پولیس کا آدمی نہ ملا۔ آخر میں اس مقام کے قریب آگیا جہاں ریلوے لائن کی ایک جانب کچھ فاصلے پر پاکستان پر حملہ کرنے والی بھارتی انفنٹری ڈویژن پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں۔ یہ بہت بڑا عارضی فوجی کیمپ تھا جہاں اتنی زیادہ نہیں لیکن کافی روشنی تھی۔ خاص طور پر کیمپ کے اردگرد جو کانٹے دار تار لگی تھی وہاں تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لکڑی کے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ میں کیمپ کے پہلو سے ہوتا ہوا ریلوے لائن پر آگے نکل گیا۔ کافی دور آگے جاکر میں ریلوے لائن سے اتر آیا۔ اب میں کھیتوں میں گھس گیا۔ جہاں سے مجھے فوجی کیمپ کی خاردار تاروں کے پاس جانا تھا۔ اس راستے کا تعین میں دن کے وقت کرچکا تھا۔ میں کوئی اناڑی آدمی نہیں تھا۔ ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اس سے پہلے کمانڈو ایکشن کرکے ایسے کئی ٹارگٹ اڑا چکا تھا۔ کھیت میں فصل زیادہ اونچی نہیں تھی میں جھک کر چل رہا تھا۔ ٹارگٹ کے قریب پہنچ کر میں بیٹھ گیا میں ایسی جگہ پر آیا تھا جو روشنی کے دو کھمبوں کے درمیان تھی۔ لیکن یہاں زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ تاروں کے گچھے صاف نظر آرہے تھے اور اگر کسی گشتی پارٹی کے سپاہی ادھر آگئے تو میں انہیں دکھائی دے سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ تار کاٹنے والا پلاس میرے ہاتھ میں تھا۔ خاردار باڑھ سے کچھ فاصلے پر مجھے درختوں کے نیچے چھ سات ٹینک بھی کیمو فلاج کی حالت میں نظر آرہے تھے۔ میرا اور میرے ٹارگٹ یعنی بھارتی ٹینکوں کا فاصلہ میرے حساب سے زیادہ تھا اور اس بات کا کافی امکان تھا کہ اگر میں نے کیل کھینچ کر باری باری ان پر چاکلیٹ سائز کے گرنیڈ پھینکے تو وہ

راستے میں ہی پھٹ جائیں گے۔ چنانچہ مجھے تار کاٹ کر کم از کم پندرہ بیس قدم اندر کیمپ کے احاطے میں جانا تھا۔ میں کھیت کی مینڈھ کے پاس فصل میں چھپ کر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ اگر کوئی فوجی پٹرول پارٹی یا کوئی گشت کرتا فوجی وہاں پر تعینات ہے تو وہ گزر جائے۔ جب مجھے وہاں بیٹھے چھ سات منٹ گزر گئے اور کوئی فوجی گشت لگاتا وہاں نہ آیا تو میں نے خاردار باڑھ کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ پلاس میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ آہستہ آہستہ زمین پر رینگتا میں خاردار تاروں کے گچھے کے پاس پہنچ گیا۔ اب مجھے دیر نہیں کرنی تھی۔ میں لیٹے لیٹے تار کاٹنے لگا۔ میں تیسرا تار کاٹ رہا تھا کہ اچانک مجھے رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کرنے کی آواز آئی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا ایک سکھ فوجی رائفل کی نالی کا رخ میرے سر کی طرف کئے فائر کرنے کی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ اس نے مجھے زور سے ٹھڈا مار کر کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھالو اوئے"

خدا جانے یہ سکھ فوجی کب وہاں پہنچ گیا تھا۔ مجھے اس کی آہٹ تک نہیں آئی تھی۔ میں نے پلاس پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔

اس کے بعد سنسنی خیز واقعات بھارت کے فرعون حصہ ہفتم

"کمانڈو اٹیک" میں پڑھیئے

بھارت کے
فرعون
کمانڈو اٹیک
اے حمید
50
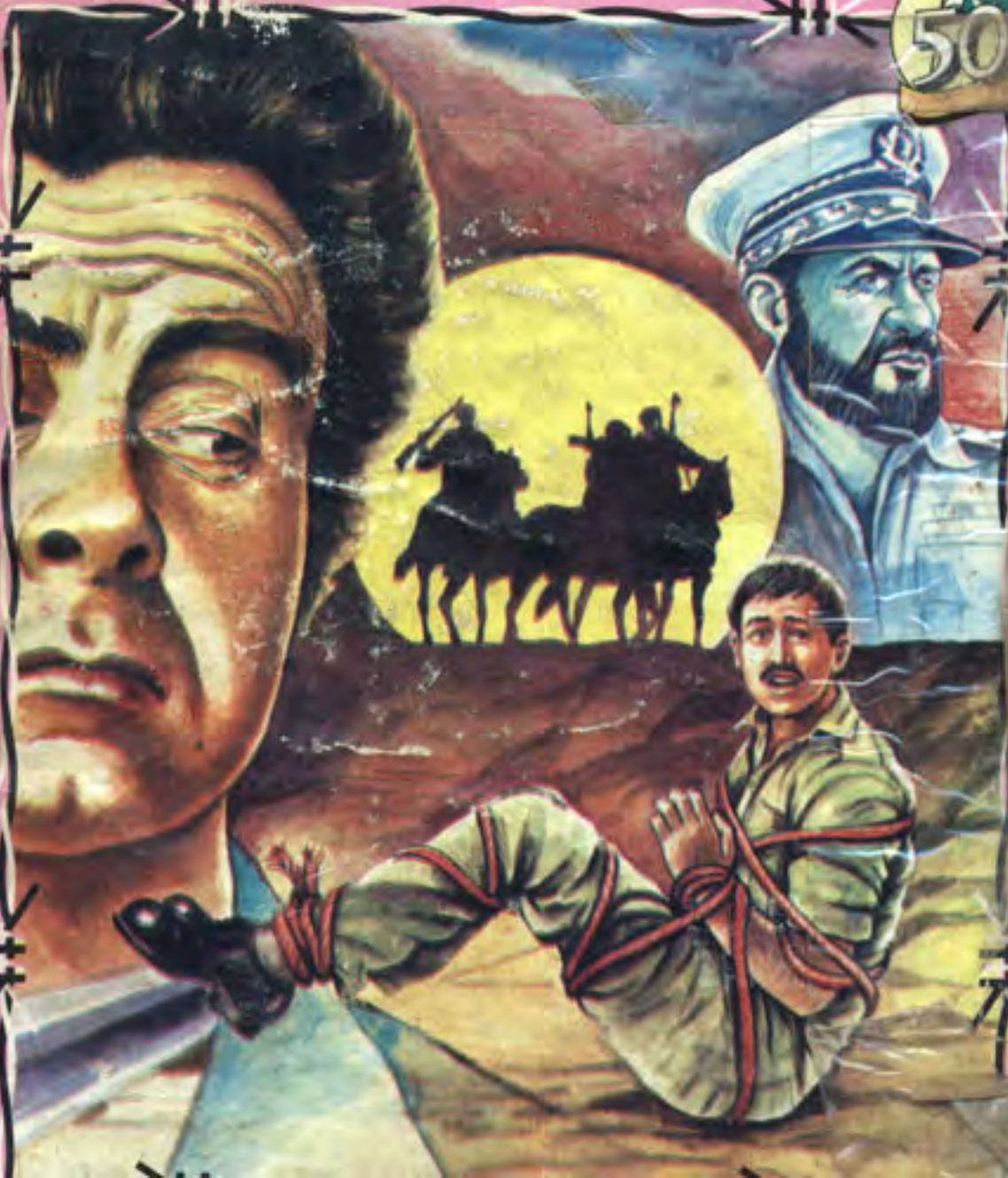
سکھ فوجی کی رائفل کا رخ میری طرف تھا۔

میں فوجی کیمپ کی خاردار باڑھ کے آگے زمین پر پیٹ کے بل لیٹا تھا اور میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ جس پلاس سے میں خاردار باڑھ کے تار کاٹ رہا تھا وہ پلاس میرے پاس ہی زمین پر پڑا تھا۔ میری پتلون کی جیب میں چھ انتہائی طاقتور دھماکہ خیز گرنیڈ تھے۔ باڑھ کے دو تار میں کاٹ چکا تھا۔ میرے پاس کوئی عذر بہانہ نہیں تھا۔ میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو گیا تھا کہ مجھے زمین سے اٹھنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ یہ سکھ فوجی خدا جانے کہاں سے اچانک میرے سر پر آن موجود ہوا تھا۔ اس نے ایک اور ٹھڈا میری پسلیوں میں مارا اور پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"کھڑا ہو جا"

میں رائفل کے سیفٹی کیچ آگے کرنے کی آواز سن چکا تھا۔ اب صرف ٹریگر پر انگلی کے ہلکے سے دباؤ کی ضرورت تھی کہ رائفل میں سے گولی نے فائر ہو کر میرے سر کے پرخچے اڑا دینے تھے۔ میرے پاس اپنے بچاؤ کے لئے صرف ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ زہریلی سوئی والی بال پوائنٹ پنسل تھی۔ لیکن یہ ہتھیار میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میری پتلون کی دائیں طرف والی جیب میں تھا۔ سکھ فوجی کے حکم پر میں اٹھنے لگا تو منہ کے بل لیٹے ہوئے اٹھتے وقت لامحالہ مجھے اپنے ہاتھ زمین پر لگانے تھے۔

مجھے جو کمانڈو ایکشن کرنا تھا وہ میں نے سوچ لیا تھا۔ یہ ایکشن میری زندگی کا آخری ایکشن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کسی بھی ملک کے تربیت یافتہ فوجی کو ایسی حالت میں زیر کرنا

کہ اس کے ہاتھ میں رائفل بھی ہو اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے یہ کام ہر حالت میں کرنا تھا اور اپنی جان کی بازی لگا کر کرنا تھا۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس سکھ فوجی پر مجھے ایک بات کی برتری ضرور حاصل تھی کہ وہ اگر ٹرینڈ فوجی تھا تو میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور مجھے میرے انسٹرکٹر نے ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران ایسے ایسے گر سکھائے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک گر پوری مہارت اور ٹھیک وقت پر میں استعمال کرتا تو سکھ فوجی بچ نہیں سکتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر زہریلی سوئی والا بال پوائنٹ نکال کر اس پر فائر کر سکتا۔ لہٰذا مجھے ایک دوسرا گر استعمال کرنا تھا۔ اس کا موقع مجھے زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے سے مل سکتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ اس ایکشن کے دوران ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہ ہو۔

میں نے ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہ کیا۔ زمین پر ہتھیلیاں ٹکا کر میں نے گھٹنے ٹیکے۔ دونوں ہاتھ دوبارہ کھڑے کر لئے اور جیسے ہی اٹھا اس کے ساتھ ہی سیدھی ٹانگ کا ٹھڈا پوری قوت کے ساتھ سکھ فوجی کی ٹانگوں کے درمیان اس کے جسم کے نازک حصے پر مارا۔ یہ ضرب ایک کمانڈو کی ضرب تھی۔ سب سے پہلے تو فوجی کے ہاتھ سے رائفل نیچے گر پڑی اور پھر وہ دہرا ہو گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اسے اوپر اٹھنے کا موقع دیتا۔ میں نے بجلی کی تیزی کے ساتھ اس کی گردن پر بھرپور طاقت سے بازو کی ضرب لگائی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سکھ فوجی کے حلق سے کوئی آواز نکلے۔ ایک آواز اس کے حلق سے ضرور نکلی مگر یہ خرخراہٹ کی آواز تھی وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر ایک اور جھٹکا دیا۔ مگر وہ میری پہلی ضرب ہی سے مر چکا تھا۔ میں نے اسے وہیں زمین پر ڈال دیا اور خود اوندھا لیٹ کر دائیں بائیں خاردار تاروں کے گچھوں کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں کوئی دوسرا فوجی نظر نہ آیا۔ وہاں زیادہ اندھیرا بھی نہیں تھا۔ امرتسر کے نواح میں پڑی انڈین انفنٹری ڈویژن کی اس ٹینک رجمنٹ کے سارے کیمپ کے گرد خاردار تار کے گچھے پھیلائے ہوئے تھے۔ مجھے ان کو کاٹ کر ان

ٹینکوں کے قریب جانا تھا جو ستمبر کی جنگ میں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے وہاں کیموفلاج کر کے رکھے گئے تھے۔ میں جلدی جلدی پلاس کی مدد سے تار کاٹنے لگا۔ میں نے باڑھ میں اتنا راستہ بنا لیا کہ جہاں سے میں رینگ کر کیمپ کے اندر جا سکتا تھا۔ میں نے پلاس وہیں چھوڑا اور تاروں کے درمیان جو راستہ بن چکا تھا اس میں سے رینگتا ہوا گزر گیا۔ اب میں فوجی کیمپ کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں پیٹ کے بل آہستہ آہستہ رینگ کر ٹینکوں کی طرف چلا۔ جب میرا اور ٹینکوں کا فاصلہ بیس قدم رہ گیا تو میں نے پتلون کی جیب سے خود بنائے ہوئے چھ طاقتور گرنیڈ نکال لئے۔ مجھے ٹینکوں کے پیچھے دوسری طرف سے کسی فوجی کی آواز سنائی دی وہ پنجابی میں کسی دوسرے فوجی کو آواز دے رہا تھا۔

میں نے پہلے گرنیڈ کا کیل نکالا اور اسے ٹینکوں کے اوپر اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے پھر تیسرے اور پھر چوتھے گرنیڈ کے کیل نکال کر انہیں ٹینکوں پر پھینک دیا۔ پہلے گرنیڈ کا زور دار دھماکہ ہوا۔ پھر دوسرا گرنیڈ پھٹا۔ پھر تیسرا پھٹا۔ وہاں چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ لوہے کے ٹکڑے میرے دائیں بائیں آ کر گرے۔ میں نے دوسرے دو گرنیڈ بھی پھٹتے ہوئے ٹینکوں پر اچھال دیئے۔ اس کے ساتھ ہی لیٹے لیٹے پیچھے کو مڑا اور تیزی سے خار دار باڑھ کے سوراخ کی طرف رینگنے لگا۔ وہاں دھماکے ہو رہے تھے۔ ٹینک پھٹ رہے تھے اور ان کے پٹرول کی ٹینکیاں بھی پھٹ رہی تھیں۔ کیمپ میں ایک شور مچ گیا تھا۔ بلند ہوتے شعلوں نے سارا احاطہ روشن کر دیا تھا۔ میں اٹھ کر دوڑتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا اور پیچھے سے مجھ پر فائر آ سکتا تھا۔ میں جتنی تیز رینگ سکتا تھا رینگ کر خاردار تاروں کے پاس پہنچا اور سوراخ میں سے دوسری طرف آتے ہی کھیتوں میں گھس گیا اور جالندھر ریلوے لائن کی طرف دوڑنے لگا۔ کیمپ کی طرف مشین گن کی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ دو تین برسٹ میرے سر کے اوپر سے بھی گزرے۔ معلوم ہوتا تھا کیمپ کے چاروں طرف اندھا دھند برسٹ مارے جا رہے ہیں۔

میں اب اندھیرے میں تھا اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑ رہا تھا۔ کیمپ میں روشنی کا گولا فائر ہوا اور دوسرے لمحے سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ میں فصل کے اندر

چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ پیرا شوٹ والا ویری لائیٹ گولا تھا جو روشن ہو کر آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ جب وہ نیچے آکر بجھ گیا تو میں اٹھ کر پھر دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے جب میں کافی آگے نکل گیا تو دو کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ ذرا سانس درست ہوا تو میں اٹھ کر تیز تیز ریلوے لائن کی طرف چلتا گیا۔ ریلوے لائن پار کر کے میں دوسری طرف والے کھیتوں میں گھس گیا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ کیمپ میں ابھی تک تھوڑے تھوڑے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دھماکے نہیں ہو رہے تھے۔ کم از کم میں نے دشمن کے چھ سات ٹینک ضرور تباہ کر دیئے تھے۔ جس سمت میں جا رہا تھا اس کے بارے میں مجھے بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ادھر گورداسپور اور بٹالے کا علاقہ ہے۔ اسکول کے زمانے میں ہم ان میدانوں میں آکر دوڑیں لگایا کرتے تھے اور گڈیاں پتنگیں اڑایا کرتے تھے۔ اب میں یہ چاہتا تھا کہ جنوب مشرق کی جانب جتنی دور جا سکتا ہوں چلا جاؤں۔ پھر بٹالہ گورداسپور کی ریلوے لائن عبور کر کے مجیٹھہ قصبے کے اوپر سے ہوتا ہوا امرتسر کے کمپنی باغ کے شمال میں نکل آؤں۔ وہاں سے میں اپنے مجاہد ساتھی جہانگیر کے گھر پہنچ سکتا تھا۔ یہ سارا فاصلہ مجھے دن کی روشنی نکلنے سے پہلے پہلے طے کرنا تھا۔ صبح ہونے کے بعد میرے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ بھارت کی پوری ریزرو انفنٹری ڈویژن اپنی ایک ٹینک رجمنٹ کے ساتھ امرتسر کے نواح میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ اور کمانڈو اتنی زبردست سیکورٹی کے باوجود کیمپ میں گھس کر ٹینکوں کو ہٹ کر گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شہر میں پولیس اور سی آئی ڈی چاروں طرف گشت کر رہی ہو گی۔ میں شہر میں اجنبی تھا۔ وہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پولیس مجھے شبہ میں پکڑ سکتی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔

میں کھیتوں کھیت چلتا گیا۔ اندازے سے اپنا رخ قصبہ مجیٹھہ کی طرف کر لیا تھا۔ رات کا اندھیرا مجھے چھپائے ہوئے تھا۔ آخر مجھے امرتسر سے گورداسپور جانے والی ریلوے لائن کا سگنل دکھائی دیا۔ میں ریلوے لائن پار کر کے ایک میدان میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک گاؤں کے قریب سے گزرا جہاں مکانوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کوئی کتا دور سے بھونکا اور

پھر چپ ہو گیا۔ جس وقت میں اپنے کشمیری مجاہد جہانگیر کے مکان پر پہنچا تو پو پھٹ چکی تھی اور بڑی سڑک پر گرمیوں کی رات کو لاری اڈے کے باہر سوئے ہوئے اٹھ رہے تھے۔ ایک بوڑھا سکھ گورو نانک جی کی بانی پڑھتا گردوارے کو جا رہا تھا۔ شہر کے مندروں سے پوجا پاٹھ کی گردواروں سے شبد کیرتن کی آوازیں آرہی تھیں۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جہانگیر کے مکان کا دروازہ بند تھا مگر وہ میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے چٹخنی نہیں لگائی ہوئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ چارپائی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"خدا کا شکر ہے تم آگئے۔ میں نے دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں۔"

میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور اسے ساری روداد سنائی۔ وہ کہنے لگا۔

"ابھی تمہیں یہاں سے باہر نہیں نکلنا ہو گا"

ہم باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔ میں مکان کے صحن کے غسل خانے میں نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہایا۔ کپڑے بدلے۔ کھیتوں میں رات کے وقت رینگنے سے قمیض پر گیلی مٹی کے داغ پڑ گئے تھے۔ جہانگیر ناشتے کے لئے ہوٹل سے چائے وغیرہ لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سری نگر کمانڈو شیروان کے ساتھ ٹرانسمیٹر پر کس جگہ سے بات کرتا ہے۔

میں اس سے بات کر کے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آزاد کشمیر کی سرحد پر بھارتی فوج کی پوزیشن کیا ہے

"ٹرانسمیٹر یہاں سے دور ایک خفیہ جگہ پر ہے۔ اس وقت تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ آزاد کشمیر کی سرحد پر بھارت نے اپنی فوج بڑی تعداد میں جمع کر رکھی ہے۔ اس سے زیادہ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔"

میں سارا دن جہانگیر کے مکان میں چھپا رہا۔ اس کا مکان واہگہ اٹاری بارڈر کو جانے والی بڑی سڑک سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ جہانگیر مکان کو باہر سے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا تھا۔ سڑک پر سے بھاری ٹرکوں کے گزرنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ آوازیں دوپہر

تک مسلسل آتی رہیں۔ جہانگیر اپنے اور میرے لئے کچھ کھانے کو لے کر آیا تو اس نے بتایا کہ جی ٹی روڈ پر واہگہ کی طرف ملٹری کے کانوائے جا رہے ہیں۔

"ان میں انفنٹری کے ٹرک بھی ہیں اور فوجی سامان سے لدے ہوئے ٹرک بھی ہیں۔ لگتا ہے آج رات کچھ ہونے والا ہے۔"

وہ 25 اگست 1965ء کی رات تھی۔

اس رات بھارتی توپ خانے نے آزاد کشمیر کے علاقے درہ حاجی پیر پر شدید گولہ باری شروع کر دی۔ 26 اگست کو انڈین آرمی کے پورے بریگیڈ نے آزاد کشمیر کی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ بھارت نے بے پناہ فوجی طاقت کے ساتھ ان چوکیوں پر حملہ کیا تھا۔ ان چوکیوں پر آزاد کشمیر کی صرف ایک ایک کمپنی مورچہ بند تھی۔ مجاہدوں نے آخری گولی تک دشمن کا مقابلہ کیا۔ معرکہ خوں ریز تھا۔ درہ حاجی پیر اور بیڈوری کی چوکیوں پر انڈین آرمی نے پورے بریگیڈ اور ڈویژن کے توپخانے کی آٹھ دنوں کی گولہ باری کے بعد قبضہ کر لیا۔

اس دوران میں امرتسر سے نکل کر سری نگر پہنچ گیا تھا اور کمانڈو شیروان کے ساتھ مل کر آزاد کشمیر پر حملہ آور فوج کی سپلائی لائن کو پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں شب خون مار کر جتنا نقصان پہنچا سکتا تھا پہنچا رہا تھا۔ مگر بھارت نے بے پناہ فوجی نفری اور سازو سامان کے ساتھ حملے کا آغاز کیا تھا۔ ہماری اطلاعات بالکل درست نکلیں۔ بھارت نے پاکستان پر جارحانہ حملے کا آغاز آزاد کشمیر سے کیا تھا۔ حریت پرست کشمیری مجاہدین نے مقبوضہ کشمیر کو انڈین آرمی کے لئے جہنم بنا دیا تھا۔ میں بھی حریت پرست مجاہدوں سے مل گیا تھا۔ ہم انڈین آرمی کے گولہ بارود اور پٹرول کے ذخیرے دن دہاڑے اڑانے لگے۔ ہم انڈین آرمی کے فوجی کانواؤں پر حملے کرتے۔ پلوں کو بارود لگا کر اڑا دیتے۔ اب ہم چھپ کر کمانڈو ایکشن نہیں کرتے تھے۔ بھارت نے آزاد کشمیر پر کھلا حملہ کر دیا تھا اور وہ پاکستان پر بھی حملہ کرنے والا تھا۔ کشمیری مجاہد بھی میدان جنگ میں کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ انڈین آرمی کے دستوں سے ہماری کئی کھلی جھڑپیں ہوئیں۔ ہم سٹین گنیں ہر وقت اپنے

ساتھ رکھتے تھے۔ 29 اگست 1965ء کو جب بھارتی فوج راولا کوٹ کی طرف بڑھی تو اس وقت پاک فوج میدان میں آ گئی تھی۔ کیونکہ بھارتی توپ خانے کے گولے سیدھے پاکستان کی سرحد کے اندر آ رہے تھے۔

30 اگست کو بھارتی توپ خانے نے پونچھ کی پہاڑیوں پر گولہ باری کی۔ جس کے جواب میں آزاد کشمیر کے بریگیڈ کے توپ خانے نے جوابی گولہ باری کر کے چھمب کے لوہے اور سیمنٹ کے بنکروں کو بنیادوں تک سے ہلا ڈالا۔ پاک فوج بریگیڈ برق رفتاری سے پیش قدمی کر گئے۔ یکم ستمبر کو دن کے دس بجے تک انڈین آرمی کی چک پنڈت' مناور' جھنڈا' ملکوئیاں' پھورا اور برسالا چوکیاں پاک فوج کے غازیوں کے پاؤں تلے روندی جا چکی تھیں۔ بھارت فرانس سے خریدے ہوئے اسلحے اور ٹینکوں سے ہمارے دستوں کو روکنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا مگر شام تک پاک فوج نے دیوا پر بھی قبضہ کر لیا۔ آسمان پر بھارت کے چار لڑاکا طیارے نمودار ہوئے۔ وہ ایڈوانس کرتے پاکستانی دستوں پر آگ برسانے لگے۔ عین اس وقت پاک فضائیہ کے دو شہباز پاکستان کی تاریخ کا پہلا فضائی معرکہ لڑنے کے لئے چھمب کے آسمان پر پہنچ گئے۔ پاکستان کے دو طیارے تھے جن کا مقابلہ دشمن کے چار ویمپائروں اور دو کینبرا طیاروں سے تھا جو برتر طیارے تھے۔ مگر پاکستان کے شاہباز قہر بن کر دشمن کے طیاروں پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے چاروں ویمپائروں کے فضا میں پرخچے اڑ گئے۔ کینبرا طیارے بھاگ گئے۔

2 ستمبر کو پاک فوج کے دستے دریائے توی پر پہنچ چکے تھے۔ شام تک دریائے توی پار کر لیا گیا۔ 5 ستمبر کو پاک فوج نے فائر بندی لائن سے اٹھارہ میل اندر بھارت کے اہم جنگی مقام جوڑیاں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب پاک فوج کے توپ خانے کے گولے اکھنور میں گر رہے تھے۔ بھارتی ہائی کمانڈ میں واویلا مچ گیا۔ آزاد کشمیر کے محاذ پر بھارتیوں کو شکست فاش کا سامنا ہی نہ کرنا پڑا تھا بلکہ ان کے ہاتھ سے مقبوضہ کشمیر نکلا جا رہا تھا۔ چنانچہ 6 ستمبر کی صبح ابھی نہیں ہوئی تھی کہ بھارت نے اعلان جنگ کئے بغیر پاکستان پر حملہ کر دیا' رقبے کے اعتبار سے بھارت کے مقابلے میں تین گنا چھوٹے ملک پاکستان پر یہ بہت بڑا حملہ تھا یہ

حملہ تین طرف سے تین ڈویژنوں سے کیا گیا۔ ان تین ڈویژنوں کی مدد کے لئے بھارت کا نمبر 23 ماؤنٹین ڈویژن ساتھ تھا اور ایک انفنٹری ڈویژن پوری ٹینک رجمنٹ کے ساتھ امرتسر کے قریب پا برکاب موجود تھا۔ یہ وہی ڈویژن تھا جس کے ٹینکوں کو میں نے کمانڈو اٹیک سے اڑایا تھا۔

پاکستانی فوج کے شیر دل جوان غافل نہیں بیٹھے تھے۔ اگرچہ ان کی نفری تین کے مقابلے میں ایک کی تھی اور بھارت کے مقابلے میں فوجی سازو سامان بھی بہت ہی کم تھا لیکن پاک فوج کے جوانوں کے سینوں میں ایمان کی حرارت بجلی کی کڑک بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑی اور پہلی ہی جھڑپ میں میدان بھارتی فوجیوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔ بھارتی افسروں اور سپاہیوں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں۔ دشمن کے ٹینک جل رہے تھے۔ پاکستان کے توپ خانے نے واہگہ سے اٹاری اور امرتسر تک قیامت برپا کر دی تھی۔ اور بھارتی ہائی کمانڈ کے لاہور پر دن کے نو بجے تک قبضہ کرنے کے ناپاک عزائم خاک میں مل چکے تھے۔ لاہور جنگی ترانوں سے گونج رہا تھا۔

ساری دنیا کے جنگی وقائع نگار چشم حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ پاکستان کی چھوٹی سی فوج نے بھارت کی اتنی بڑی فوج کو کس طرح شکست فاش دی ہے کہ پہلے روز انڈین آرمی نے جہاں حملہ کیا تھا جنگ کے آخری روز وہ اس سے بھی پیچھے بھاگ چکے تھے اور پاک فوج نے دشمن کے اہم ترین قصبے کھیم کرن پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ہمیں مقبوضہ کشمیر میں جنگ کی ایک ایک رپورٹ پہنچ رہی تھی۔ پوری وادی کشمیر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ بھارت کے سرحدی شہروں سے ہندو سکھ مکان خالی کر کے دلی اور بمبئی کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے اقوام متحدہ کو ہاتھ جوڑ کر کہا کہ کسی طرح جنگ بندی کرائی جائے۔ چنانچہ ۲۳ ستمبر کی صبح تین بجے فائر بندی ہو گئی۔

بھارتی ہائی کمانڈ نے پاکستان سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے واسطے کھسیانی بلی کھمبا نوچے پر عمل کرتے ہوئے کشمیری مسلمانوں پر اپنے وحشیانہ مظالم تیز تر کر دیے۔ کشمیری

مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے۔ نہتے دیہاتیوں کو بے دریغ شہید کرنا شروع کر دیا۔ حریت پسند مجاہدوں نے بھی بھارتی فوجیوں پر دلیرانہ حملے شروع کر دیئے اور اگر ایک کشمیری مسلمان شہید کیا جاتا تو اس کے مقابلے میں ہم کم از کم چھ بھارتی فوجی ہلاک کر ڈالتے تھے۔ ہم گھات لگا کر بھی انڈین آرمی کے دستوں اور کانوائوں پر حملے کرتے اور اگر کوئی ایسا موقع آجاتا تو سامنے آکر بھی مقابلہ کرتے اور مورچے سنبھال کر اندھا دھند فائرنگ کرتے۔ ان معرکوں میں میرے ساتھ کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب بھی شریک ہوتے تھے۔ ہم درختوں یا ٹیلوں کے پیچھے سے فائرنگ کرتے نکلتے اور ڈوگرہ، سکھ یا گورکھا فوجی دستوں پر سٹین گنوں کے برسٹ فائر کرتے۔ انہیں موت کی نیند سلا دیتے۔ یا زخمی کر کے روپوش ہو جاتے۔

بقول محترم عنایت اللہ بھارت نے پاکستان پر اکیس ڈویژنوں سے حملہ کیا تھا۔ پاکستان کے پاس پانچ ڈویژن بھی پورے نہیں تھے۔ دشمن کے تقریباً پانچ سو جدید لڑاکا بمبار طیاروں کے مقابلے میں پاکستان کے پاس صرف 133 طیارے تھے۔ پاک بحریہ کے جنگی جہازوں کی تعداد بھی بھارت کی نیوی کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ انڈین نیوی کے پاس طیارہ بردار بحری جہاز بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھارت کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تین دنوں میں پورے پاکستان پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے والے بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے تیسرے ہی دن اپنی فوجوں پر پاکستان کی فوج کا قہر برستا دیکھا تو بلبلا اٹھا اور اس کی دہائی اقوام متحدہ میں پہنچی کہ ہم اس وقت فائر بندی کے لئے تیار ہیں۔ یہ معجزہ ملت پاکستان کے جذبے کا تھا۔ یہ مومنین کے ایمان کا کرشمہ تھا۔ یہ فوج اور قوم کے اتحاد اور یگانگت کا ثمر تھا۔

جموں کشمیر کے کونے کونے میں پاکستان کی فتح اور بھارت کی عبرت ناک شکست پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حریت پرستوں کی تحریک آزادی میں ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ بیدار ہو گیا۔ لیکن بھارت نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے وادی کشمیر میں نئی فوج جھونک دی اور کشمیریوں پر ظلم و ستم کی کارروائیوں میں اضافہ کر دیا۔ کشمیری نہتے تھے۔ ان کے

پاس کچھ نہیں تھا۔ بھارتی فوج جدید اسلحہ اور فوجی ٹریننگ کے ساتھ کشمیریوں پر ظلم و ستم توڑ رہی تھی لیکن حریت پرست کشمیریوں کا جذبہ ایمانی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ وہ ہر محاذ پر، ہر گلی، ہر گھاٹی، ہر وادی اور ہر گلی کوچے میں بھارتی غاصب فوجیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ اپنی زندگیوں کے نذرانے بھی دے رہے تھے اور دشمن کے بھی پرخچے اڑا رہے تھے۔ میں کمانڈو اورنگ زیب اور کمانڈو شیروان بھارتی فوجیوں کے کانوائوں پر گھات لگا کر حملے کرنے، ان کے مورچوں اور چوکیوں پر شب خون مارنے، ان کے گولہ بارود اور پیٹرول کے ذخیرے اڑانے میں مصروف تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارے حریت پسند کشمیری مجاہد اور دوسرے کمانڈوز بھی تھے۔ دوسری طرف وادی کے علاقے میں بھارتی فوجی نہتے کشمیریوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔ عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے اور بچوں بوڑھوں کو بے دریغ قتل کر رہے تھے۔ ہمیں خبر ملتی کہ فوجی کسی گاؤں کو نذر آتش کرر رہے ہیں تو ہم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ کر ان پر فائرنگ کھول دیتے اور جتنے بھارتی فوجی مار سکتے تھے مار ڈالتے۔ مگر ہم ہر گاؤں میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دوسرے گاؤں میں کشمیری حریت پرست ضرور مقابلہ کرتے لیکن بھارتی طیارے آکر ان پر بم باری شروع کر دیتے۔

وادی میں سکھ رجمنٹ کے ساتھ ایک رجمنٹ ڈوگروں کی بھی تھی ۔ ہم ان کے رجمنٹل ہیڈ کوارٹر میں کمانڈو آپریشن کر کے انہیں کافی نقصان پہنچا آتے تھے۔ لیکن ہماری کوئی باقاعدہ تربیت یافتہ جدید اسلحہ سے لیس فوج نہیں تھی۔ ہم بھارتیوں کے چھینے ہوئے اسلحہ سے لڑ رہے تھے۔ ہمارا انحصار زیادہ تر گوریلا اور کمانڈو ایکشن پر تھا۔ جب کہ انڈین آرمی کے پاس بکتر بند گاڑیوں، بمبار طیاروں کے علاوہ ٹینک بھی تھے۔ انڈین آرمی کے رجمنٹل ہیڈ کوارٹر کا ایک کمپنی کمانڈر صوبیدار درگا داس تمام مسلمانوں اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ وہ اپنی رجمنٹ میں مسلمانوں کا قصائی مشہور تھا۔ وہ فوج سے ریٹائر ہو چکا تھا مگر اس کی اسلام دشمنی اور کشمیری مسلمانوں سے نفرت کے باعث اسے فوج میں دوبارہ بھرتی کر کے کشمیر کے محاذ پر صرف اس لئے بھیج دیا گیا تھا کہ وہ جی بھر

کر کشمیری مسلمانوں کا قتل عام کرے۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ جب تک دن میں دس بارہ مسلمان کشمیریوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگ لے وہ چوکی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ کٹر اور انتہائی متعصب ہندو تھا۔ بارہ مولا اور وادی کے دوسرے دیہات کو اسی بے رحم متعصب ہندو صوبیدار درگا داس کی قیادت میں اس کی کمپنی کشمیریوں کا قتل عام کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا رہی تھی۔

حریت پرستوں اور ہمارے کمانڈوز نے اس مسلم کش قصائی کو ہلاک کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی مگر وہ ہر بار بچ نکلتا تھا۔ دوسرے اس کے گرد سیکورٹی بے حد سخت ہوتی تھی۔ جنگ ستمبر کی شکست کے بعد صوبیدار درگا داس کے ظلم و ستم میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک روز ہماری خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس مسلم کش کافر کو جہنم واصل کیا جائے۔ ابھی ہم پلان تیار کر رہے تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ صوبیدار درگاداس نے اپنی ڈوگرہ کمپنی کے ساتھ سری نگر سے پندرہ میل دور کشمیریوں کے ایک گاؤں پر حملہ کر کے گاؤں کو نذر آتش کر دیا ہے اور ایک مسجد کو بھی آگ لگا دی ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو گاؤں کے سارے مکان جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ جگہ جگہ مسلمان کشمیریوں کی لاشیں پڑی تھیں جن میں بچے عورتیں اور بوڑھے کشمیریوں کی لاشیں بھی تھیں۔ مسجد آدھی سے زیادہ جل کر شہید ہو چکی تھی۔ ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

”سر! میں اس شہید مسجد کی حرمت کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک صوبیدار درگاداس کو ہلاک نہیں کر لوں گا۔ چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

کمانڈو شیروان نے مجھے اپنے ساتھ چلے آنے کا اشارہ کیا۔ کمانڈو اورنگ زیب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ میں آ گئے۔ ہم نے اسی وقت اپنے ایک خاص آدمی کو رجمنٹل ہیڈ کوارٹر یہ پتہ کرنے کے لئے بھیجا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ صوبیدار درگاداس رات کو جس بارک میں سوتا ہے اس کا محل وقوع کیا ہے۔ ہمارا آدمی اسی وقت روانہ ہو گیا۔ اس نے دو گھنٹے بعد آکر ہمیں اطلاع دی کہ صوبیدار درگاداس حریت

پرست مجاہدوں سے ایک جھڑپ میں زخمی ہو گیا ہے۔ اس کے شانے میں گولی لگی ہے اور اسے اس کی خواہش کے مطابق اس کے شہر امرتسر بھیج دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسے صبح صبح انڈین میڈیکل کور کا ایک ہیلی کاپٹر امرتسر لے گیا۔

کمانڈو شیروان نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں نے اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھائی ہے کہ جب تک اس درندہ صفت متعصب صوبیدار درگا داس سے سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کے خون کا بدلہ نہیں لے لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اس لئے مجھے اجازت دی جائے کہ میں امرتسر جا کر مسلمانوں کے اس ازلی دشمن سے اپنے مسلمان بھائیوں کے خون کا بدلہ چکا دوں"

کمانڈو شیروان نے کمانڈو اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں تم بھی اس کے ساتھ جاؤ"

میں نے فوراً کہا۔

"کمانڈو شیروان! میں اس مہم پر اکیلا ہی جانا پسند کروں گا۔ اور پھر کمانڈو اورنگ زیب کی یہاں بھی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ کشمیر کا محاذ چھوڑ کر میرے ساتھ امرتسر جائے۔ درگاداس کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ صرف مجھے اس کی تصویر اگر کہیں سے مل جائے تو دکھا دی جائے۔"

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کشمیر میں ہمارے آدمی جگہ جگہ آزادی کشمیر کے کاز کے لئے کام کر رہے تھے۔ حریت پرست اور کشمیری کمانڈو اگر انڈین آرمی کی توپوں اور بمبار طیاروں کے خلاف برسرپیکار تھے تو ہمارے جاسوس دشمن کے پیٹ میں گھس کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمیں ان کی پل پل کی خبریں لا کر دے رہے تھے۔ کمانڈو شیروان نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ جیسے بھی ممکن ہو صوبیدار درگا داس کی ایک تصویر مہیا کر کے دے۔ اس آدمی نے دو دن لگا دیئے۔ تیسرے دن شام کو وہ صوبیدار درگا داس کی

پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر لے آیا۔ یہ بلیک اینڈ وائیٹ تصویر تھی اور کسی فوجی محکمے کے رجسٹر یا فائیل سے پھاڑ کر اتاری گئی تھی۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ یہ صوبیدار کی وردی والے پختہ عمر کے آدمی کی تصویر تھی جس کی راجپوتوں ایسی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ڈاڑھی صفاچٹ تھی۔ چہرہ بھرا بھرا تھا۔ آنکھوں سے سنگدلی اور بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ میں نے تصویر اپنے پاس رکھ لی اور کمانڈو شیروان سے کہا۔

"میں آج رات کو ہی امرتسر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کا یہ جلاد اور سینکڑوں بے گناہ کشمیری مسلمان بچوں بوڑھوں اور عورتوں کا قاتل امرتسر میں جہاں کہیں بھی ہو گا میں اپنے ہاتھ سے اس کو ذبح کروں گا اور واپس آجاؤں گا۔"

ڈوگرہ رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے صوبیدار درگا داس کے گھر کا صرف اتنا ہی ایڈریس مل سکا تھا کہ امرتسر کے بازار مائی سیواں کی ایک گلی میں اس کا آبائی مکان ہے۔

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"صوبیدار درگاداس زخمی ہے۔ اور ابھی تک وہ فوجی سروس میں ہی ہے۔ امرتسر میں وہ ضرور فوجی یا سول ہسپتال میں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ اسے تلاش کرنے میں مجھے آسانی ہو گی۔ امرتسر میرے لئے کوئی نیا شہر نہیں ہے۔ میں اس شہر کی ایک ایک گلی سے واقف ہوں"

اسلام کے اس ازلی دشمن اور کشمیری مسلمانوں کے قاتل نمبر ایک کو ہلاک کرنے اور اس سے بے گناہ کشمیری مسلمانوں کے خون کا بدلہ لینے کا میرا عزم دیکھ کر کمانڈو شیروان نے مجھے اس آپریشن پر جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی کہا۔

"تم ہمارے بڑے قیمتی کمانڈو ہو۔ تم صرف ایک آدمی کو ہلاک کرنے کا مشن لے کر جا رہے ہو جو تمہارے ایسے تجربہ کار اور بے مثال کمانڈو کے لئے ایک معمولی مشن ہے۔ لیکن اس میں تمہاری جان کا بھی خطرہ ہے۔ اس لئے تمہاری فکر رہے گی۔ اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد جتنی جلدی واپس آ سکو واپس ہمارے پاس پہنچ جانا۔ یہاں ہمیں تمہاری

زیادہ ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا کمانڈر"

اس نے کہا۔

"امرتسر میں جاتے ہی تم اپنے مجاہد جہانگیر سے رابطہ قائم کرنا اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے وائرلیس پر خبر کر دینا۔"

ستمبر کا مہینہ گزر چکا تھا۔ اکتوبر کے مہینے کا خوشگوار موسم شروع ہو گیا تھا۔ دھوپ میں وہ تیزی باقی نہیں رہی تھی اور راتوں کو خنکی ہونے لگی تھی۔ میں نے اورنگ زیب کی ایک بھورے رنگ کی پرانی جیکٹ پہن لی تھی۔ پتلون میں نے اپنی پرانی ہی پہنی ہوئی تھی۔ ہم نیا لباس کبھی کبھار ہی پہنتے تھے۔ اکثر پرانی جیکٹیں اور پتلونیں پہنتے تھے تاکہ خوامخواہ کسی کی ہم پر نظر نہ پڑے۔ میں نے زہریلی سوئیوں والا بال پوائنٹ پستول اور کچھ انڈین کرنسی اپنے پاس رکھی لی تھی۔ زہریلی بال پوائنٹ میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے رات کے وقت کس طرف سے نکلنا ہے اور کس جگہ بڑی سڑک پر پہنچ کر جموں جانے والی بس پکڑنی ہے۔ شروع رات میں میں کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب سے رخصت ہو کر خفیہ کیمپ گاہ سے نکل گیا۔ رات کے اندھیرے میں گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے گزرتا بڑی سڑک پر پہنچا۔ وہاں سے لاری پکڑی اور جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔

جموں سے ریل گاڑی میں سفر کرنے کی بجائے لاری میں سوار ہو کر جالندھر آیا۔ جالندھر سے ٹرین پکڑی اور امرتسر پہنچ گیا۔ میری ڈاڑھی اور مونچھیں کافی بڑی ہوئی تھیں۔ مونچھیں میں نے ہونٹوں کے اوپر سے ترشوالی تھیں۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو میں نے گردن پر کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اگر کسی وقت ضرورت پڑے تو فوراً سکھ بن سکوں۔ میں اس حلیے میں بھی نوجوان لگتا تھا۔ میں امرتسر دن ڈھل رہا تھا جب پہنچا۔ اپنے آدمی جہانگیر کی دکان پر جانے کے لئے مجھے شام کا اندھیرا پھیل جانے کا انتظار کرنا تھا۔ چنانچہ میں

امرتسر کے سیڑھیوں والے ریلوے پل کے قریب ایک ہندو کی چائے کی دکان میں چائے منگوا کر بیٹھ گیا۔ دکان میں کچھ ہندو اور دو تین سکھ بھی بیٹھے تھے۔ وہ جنگ ستمبر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس جنگ میں پاکستان نے بھارت کو شکست دی ہے اور بھارتی حکومت نے اپنے عوام سے اصل حقائق چھپائے ہیں۔ ایک سکھ کہنے لگا۔

"مہاراج! اگر لاہور کی اومنی بس ہمارے فوجی امرتسر لے آئے تھے تو لاہور پر قبضہ کیوں نہیں کیا؟"

دوسرا سکھ بولا۔

"ہماری فوج بزدل نکلی ہے۔ ورنہ پاکستان کبھی کھیم کرن پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ میری چاچی چاچا کھیم کرن سے بھاگ کر امرتسر آگئے تھے۔ انہوں نے خود پاکستانی فوج کو کھیم کرن میں داخل ہوتے دیکھا تھا"

ایک ہندو بولا۔

"مہاراج! ہم اس وقت اسی دکان پر تھے جب ہمارے فوجیوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے ٹرک ادھر سے گزرے تھے۔"

دوسرا ہندو کہنے لگا۔

"مہاراج اتنی زیادہ فوج کے ساتھ بھی ہم لاہور کے ایک محلے پر قبضہ نہیں کر سکے یہ تو بڑی حیران کر دینے والی بات ہے۔ ہم تو اپنا کاروبار امرتسر سے جالندھر لے جا رہے ہیں۔"

سکھ نے اسے غصیلی آواز میں کہا۔

"لالہ جی! تم بزدل ہو۔ سکھ فوجی بزدل نہیں ہے۔ ہماری سکھ فوج کو تمہارے ہندو جرنیلوں نے مروایا ہے۔"

وہاں گرمی سردی ہونے لگی تو دکان کے مالک نے بیچ میں پڑ کر معاملہ ختم کر دیا۔ جب باہر شام کا اندھیرا پھیل گیا اور دکان کی بتیاں روشن ہو گئیں تو میں دکان سے نکل آیا اور

جہانگیر کی دکان کی طرف چلنے لگا۔

وہ اپنی دکان پر ہی تھا۔ مجھے اس نے دکان میں داخل ہو کر کاؤنٹر پر رکھی ہوئی ٹیکسٹ کی ہندی انگریزی اور گورمکھی کی کتابوں پر نظریں جھکائے کھڑے دیکھا تو میرے قریب آگیا۔ دکان میں ایک ہندو اپنے بچے کے ساتھ کتابیں دیکھ رہا تھا۔ جہانگیر نے مجھ سے وہاں کی ہندی گورمکھی آمیز پنجابی میں پوچھا کہ مجھے کونسی کتاب چاہئے؟ میں بھی وہاں کی گورمکھی اور ہندی آمیز پنجابی میں ہی بات کیا کرتا تھا۔ چونکہ اب مجھے ہندی گورمکھی کے وہ الفاظ یاد کرنے پڑتے ہیں اس لئے اپنی داستان بیان کرتے ہوئے میں اردو زبان میں ہی مکالمے لکھ جاتا ہوں۔ میں نے ایک کتاب اٹھا کر کہا۔

"مجھے ایسی دو کتابیں چاہئیں"

جہانگیر نے کہا۔

"آپ یہاں ٹھہریں میں دوسری کتاب بھی لا کر دیتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ اپنی گدی کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے وہ اسی طرح کی ایک اور کتاب اٹھا کر لایا۔ اور میرے آگے رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ لیجئے۔ قیمت اس کے اندر لکھی ہوئی ہے۔"

میں نے ورق الٹ کر دیکھا۔ اندر کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا تھا۔

"سینما کی گیلری میں پہنچ جاؤ"

میں نے کتاب وہیں رہنے دی۔ کاغذ کا ٹکڑا اٹھا لیا اور دکان سے باہر نکل کر سیدھا اسی سڑک پر کچھ دور جا کر جو سینما ہاؤس تھا وہاں چلا گیا۔ پہلا شو شروع ہونے والا تھا۔ میں نے گیلری کا ٹکٹ لیا اور گیلری میں آکر بیٹھ گیا۔

جہانگیر انٹرول کے بعد دکان بند کر کے آیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ کہنے لگا۔

"میں ابھی گھر جاتا ہوں۔ تم فلم ختم ہونے کے بعد آجانا"

فلم نو بجے رات ختم ہوئی۔ جہانگیر کے گھر کا مجھے پتہ تھا۔ میں اس کے گھر آگیا۔ اس نے خود ہی چاول اور سبزی وغیرہ پکائی ہوئی تھی۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر چائے پی اور

باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگا۔

"اگر تم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے اور صوبیدار درگا داس کو تم نے ہلاک کر دیا تو ادھر سے سیدھا واپس جموں سری نگر کی طرف نکل جانا۔ اس طرف مت آنا۔"

میں نے کہا۔

"یہ بات میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھی ہے۔"

اس نے کہا۔

"اگر تمہارے بیان کے مطابق صوبیدار درگا داس زخمی ہو گیا تھا تو وہ سول ہسپتال میں ہو گا۔ تمہیں پہلے ہسپتال جا کر دیکھنا چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"میں پہلے اس کے محلے سے پتہ کرنا چاہتا ہوں۔ بازار مائی سیواں کی ساری گلیوں سے میں واقف ہوں"

"جیسے تمہاری مرضی"

دوسرے روز میں دن نکلنے کے تھوڑی دیر بعد بازار مائی سیواں کی طرف چل پڑا۔ جن لوگوں نے امرتسر دیکھا ہوا ہے یا جو امرتسر کے رہنے والے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ بازار مائی سیواں شہر کے اندر گنجان علاقے میں شری دربار صاحب کے قریب واقع ہے اور یہ سارا علاقہ ہندو سکھوں کا ہے۔ یہاں پاکستان کے قیام سے پہلے بھی شاید ہی کسی مسلمان کا مکان ہو۔ یہ ہندو سکھ اکثریت کا علاقہ تھا۔ ہم مجیٹھہ سے جب امرتسر آتے تھے تو دربار صاحب کو دیکھنے ضرور جاتے اور جب میں امرتسر کے سکول میں پڑھتا تھا تو میرا ایک سکھ کلاس فیلو بازار مائی سیواں میں رہا کرتا تھا جس کے گھر میں گڈیاں اڑانے آیا کرتا تھا۔ اب یہ بازار زیادہ گنجان اور گندا ہو گیا تھا۔ دکانوں کے تھڑوں پر بھی دکانیں کھل گئی تھیں۔ زیادہ دکانیں سکھوں کی تھیں۔ ہندو سکھ لوگ صبح دکان بڑی جلدی کھول لیتے ہیں یہاں زیادہ دکانیں منیاری کی تھیں۔ کتابوں اور کاپیوں کی دکانیں بھی تھیں۔ ایک دکان پر سکھوں کی کرپانیں اور تلوار لٹک رہی تھیں۔ ایک بوڑھا ہندو پنساری دکان پر بیٹھا کھرل

میں کچھ رگڑ رہا تھا۔ میں نے اسے جاتے ہی نمسکار کیا اور کہا۔

"مہاراج! مجھے صوبیدار درگاداس جی کو ملنا ہے۔ اس کا مکان کہاں ہے۔ میں جموں سے آیا ہوں۔"

ہندو پنساری کہنے لگا۔

"صوبیدار کا مکان تین گلیاں چھوڑ کر چھوٹی گلی میں پہلا مکان ہے۔ مگر وہ امرتسر میں نہیں ہے۔ سنا ہے کہیں باہر چلا گیا ہے۔ تم اس کے مکان پر جا کر پتہ کر لو۔ وہاں اس کا بیٹا کالی داس رہ رہا ہے۔"

میں اس گلی میں آگیا جہاں پہلا مکان مجھے صوبیدار درگاداس کا بتایا گیا تھا۔ مکانوں میں پھنسا ہوا تین چار منزلہ بوسیدہ مکان تھا جس کے تھڑے کے باہر ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی بجائی۔ اوپر سے ایک عورت نے جھانک کر پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"بہن جی ذرا کالی داس جی کو نیچے بھیجنا۔ میں جموں سے آیا ہوں"

تھوڑی دیر بعد ایک پلپلے بدن والا زرد رو نوجوان سیڑھیاں اتر کر میرے سامنے آگیا۔ اس نے دھوتی پہنی ہوئی تھی بدن پر صرف ایک پرنا لپیٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج جی! میں جموں سے آیا ہوں۔ میرا نام کلدیپ چند ہے۔ صوبیدار جی کے نام ان کے ایک فوجی دوست کا پیغام لایا ہوں۔ صوبیدار جی گھر پر ہوں تو ان سے ملا دیجئے۔"

یہ نوجوان کالی داس ہی تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! پتا جی تو لدھیانے کوشلیا بہن جی کے پاس چلے گئے ہیں۔"

میں نے ایک سیکنڈ کے لئے کچھ سوچ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے یہاں سے آگے انبالے ہی جانا ہے۔ میں راستے میں لدھیانے اتر کر صوبیدار جی سے مل لوں گا۔ مجھے ان کا لدھیانے کا پتہ لکھ دیجئے۔"

کالی داس بولا۔

"ابھی لکھ کر لاتا ہوں"

وہ اوپر گیا۔ اوپر کسی کاغذ پر لدھیانے کا ایڈریس لکھ کر لایا۔ مجھے کاغذ کا پرزہ دیتے ہوئے بولا۔

"کوشلیا بہن ہماری چھوٹی بہن ہے۔ اس کا گھر لدھیانے کے چوڑے بازار میں ہے۔ وہاں کسی سے امرت لال بجلی والے کے گھر کا پتہ پوچھ لیں۔ کوشلیا بہن کا خاوند بجلی کے دفتر میں الیکٹریشن ہے۔ میں نے پتہ بھی کاغذ پر لکھ دیا ہے۔"

"بڑی کرپا ہے آپ کی۔ رام رام"

میں واپس مڑا تو کالی داس نے کہا۔

"کوئی چائے پانی نہیں پیا آپ نے؟"

میں نے کہا۔

"بڑی کرپا ہے۔ بڑی کرپا ہے۔"

اور میں گلی سے نکل کر بازار مائی سیواں میں آگیا۔ اور وہاں سے واپس جہانگیر کی دکان پر جا کر اسے ساری بات بتائی۔ اس وقت دکان میں کوئی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"لدھیانے میں ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔ تم اس سے جا کر ملو اور صوبیدار درگاداس کا سراغ لگاؤ اور اسے ٹھکانے لگانے کے بعد وہیں سے جموں کی طرف نکل جانا"

جہانگیر نے مجھے لدھیانے میں اپنے مجاہد کا نام پتہ بتا دیا۔ یہ نام پتہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ اگرچہ اب وہ مجاہد وہاں نہیں ہے۔ پھر بھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس کا نام اور پیشہ یہاں فرضی لکھوں گا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ اس کا اسلامی نام گل ریز تھا اور وہ ہندو نام بابو رام کے نام سے لدھیانے کے ریل بازار میں فوٹو گرافی کی دکان کرتا تھا۔

میں اسی دن ٹرین کے ذریعے لدھیانے روانہ ہو گیا۔ یاد رکھیں۔ ذمے دار کمانڈو وقت کی قیمت کو پہچانتا ہے۔ وہ کبھی وقت ضائع نہیں کرتا۔ لدھیانے پہنچ کر میں سیدھا بابو رام فوٹو گرافر کی دکان پر گیا۔ جہانگیر نے کسی طریقے سے اسے میرے آنے کی اطلاع کر

دی تھی۔ میرا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ایک کوڈ لفظ بھی دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فوٹو گرافی کی ایک چھوٹی سی دکان میں ایک درمیانی عمر کا آدمی کھدر کا کرتا' کھدر کا پاجامہ اور نہرو واسکٹ پہنے ایک فوٹو کو فریم میں جڑ رہا ہے۔ ایک عورت اس کے پاس کھڑی تھی۔ میں دکان میں داخل ہوا تو اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔

تصویر فریم میں لگا کر اس نے عورت کو دی اور کہا۔

"یہ لو بہن جی! اب یہ اپنی جگہ پر فٹ ہو گئی ہے"

ہندو عورت تصویر لے کر دکان سے چلی گئی تو بابو رام نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کیا چاہئے مہاشہ جی؟"

میں نے کوڈ لفظ بولا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

"اندر سٹوڈیو میں چلو۔ ابھی فوٹو کھینچ دیتا ہوں"

دکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا سٹوڈیو بنا ہوا تھا جہاں تین پاؤں والا ایک کیمرہ اور سامنے دیوار پر سبزی والا پردہ لگا تھا پردے کے آگے لکڑی کی منقش کرسی رکھی ہوئی تھی۔ یہاں ہمارا آدمی گاہکوں کے فوٹو بناتا تھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ بنچ بچھا ہوا تھا۔ میں بنچ پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اپنا آدمی جس کا نام میں نے بابو رام بتایا ہے آ گیا۔ کہنے لگا۔

"جہانگیر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوا ہے۔ تم جس مسلم کش کافر کی تلاش میں یہاں آئے ہو وہ لدھیانے میں نہیں ہے"

میں نے پوچھا۔

"پھر وہ کہاں ملے گا؟"

بابو رام بولا۔

"اس کو جان کا دھڑکا لگا ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہے کہ کشمیری مجاہد اس سے مسلمانوں کے خون کا بدلہ لینے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور وہ کسی جگہ بھی قتل ہو سکتا ہے۔ فوج سے وہ ایک بار پھر سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ یہاں اور

امرتسر میں اس کا علاج ہوتا رہا ہے۔ یہاں تمہارے آنے سے ایک دن پہلے ہمارے ایک حریت پرست نے اس پر حملہ کیا تھا مگر وہ جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ لدھیانے سے بھی فرار ہو کر کسی نامعلوم مقام پر چلا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس شہر میں ہے اور کہاں چھپا ہوا ہے۔ کوئی دوسرا حریت پرست اسے ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن میں اسے ہر حالت میں قتل کر کے اس سے ہزاروں بے گناہ نہتے کشمیریوں کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہوں"

بابو رام نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ مجھے کم از کم آج کے دن اور رات کی مہلت دے دو۔ میرے آدمی یہ سیکرٹ معلوم کر لیں گے۔"

بابو رام اپنی دکان کے اوپر ہی ایک چوبارے میں رہتا تھا۔ میں نے بھی رات وہیں گزاری۔ بابو رام نے اسی وقت اپنے جاسوس صوبیدار درگا داس کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے واسطے روانہ کر دیئے تھے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت بابو رام کھانے کے ٹائم پر دکان بند کر کے اوپر چوبارے میں میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"صوبیدار درگا داس لدھیانے سے کلکتے جا کر کسی جگہ روپوش ہو گیا ہے کلکتے میں اپنا ایک آدمی بہو بازار میں چائے کا ہوٹل چلاتا ہے۔ مسلمانوں کے اس خونی قاتل کو تلاش کرنے میں وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

بابو رام نے مجھے کلکتے میں اپنے آدمی کا نام اور اس کی دکان کا ایڈریس اور اس سے مل کر جو کوڈ لفظ مجھے بولنا تھا وہ بتایا اور کہنے لگا۔

"اپنا یہ آدمی بہت ہوشیار ہے اور وہ کلکتے میں ایک قوم پرست مسلمان کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ وہ تمہاری ہر طرح سے مدد کرے گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ مسلمانوں کا خونی درگا داس جہاں بھی ہو گا وہ اس کا سراغ لگا لے گا۔ میں اسے خفیہ طریقے سے تمہارے آنے کی اطلاع بھی کر دوں گا"

میں اسی رات کو ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔
آدمی بابو رام نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں کلکتے میں اپنے آپ کو پنجاب کا
کانگریسی مسلمان ظاہر کروں اور اپنا کوئی ہندوانہ نام بھی رکھ لوں لدھیانہ سٹیشن پر روا
ہونے سے پہلے اس نے میرے ماتھے پر ہندوؤں والا لال تلک بھی لگا دیا تھا۔
میرے لئے ہندو بننا بڑا آسان تھا۔ میں ہندی گجراتی زبانوں پر کافی عبور رکھتا تھا۔ ہن
دیو مالا میں نے ساری کی ساری پڑھ رکھی تھی۔ سنسکرت زبان بھی تھوڑی بہت سمجھ ل
تھا۔ ویدوں کا بھی میں نے مطالعہ کر رکھا تھا۔ بنگلہ زبان بھی تھوڑی تھوڑی سمجھ لیتا
اگرچہ بول نہیں سکتا تھا۔ اور کلکتے کے ایک دو پھیرے پہلے بھی لگا چکا تھا۔ کلکتہ ش
میرے لئے کوئی نیا شہر نہیں تھا۔ ٹرین کلکتہ شہر کے ہوڑہ سٹیشن پر پہنچی تو میں رکشے
سوار ہو کر سیدھا بہو بازار پہنچ گیا۔ بہو بازار کلکتے کا ایک کاروباری بازار ہے۔
بازار میں دنیا کی ہر شے کی دکان موجود ہے۔ بابو رام نے مجھے لدھیانے میں ہی اپنے
بازار والے مجاہد کی تصویر دکھا دی تھی۔ بہو بازار میں کافی رونق تھی۔ بنگالی مرد ا
ساڑھیوں میں ملبوس بنگالی عورتیں خرید و فروخت میں مصروف تھیں۔ بازار میں سے
رکشا اور ہاتھوں سے کھینچی جانی والی لمبی لمبی ریڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے اپنے آد
کی چائے کی دکان کی تلاش تھی۔ بھارت کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں چائے کافی بہ
پی جاتی ہے۔ یہ مرطوب علاقے ہیں۔ سال میں بارشیں بہت ہوتی ہیں یہاں دودھ گھی ا
لسی کا وہ رواج نہیں ہے جو ہمیں پاکستان میں خاص طور پر پنجاب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔
بابو رام نے مجھے اپنے مجاہد کا نام بتا دیا تھا۔ مگر میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گ
آپ فرض کر لیں کہ اس کا نام شاہ دین تھا۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا شاہ دین کلکتے میں کٹ
قوم پرست بھارتی مسلمان کی حیثیت سے کافی جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس کی چائے کی دکا
میں نے تلاش کر لی۔ لمبی دکان تھی۔ اندر کرسیاں میزیں لگی تھیں۔ لوگ چائے کافی وغ
پینے میں مصروف تھے۔ باہر ایک جانب بنگالی پنواڑی کا کھوکھا تھا جہاں درگا دیوی کی شی
میں جڑی ہوئی تصویر کے آگے لوبان سلگ رہا تھا۔ میں نے اپنے آدمی شاہ دین کو شکل س

اسے پہچان لیا۔ وہ کاؤنٹر کے قریب لوہے کی کرسی پر بیٹھا بنگلہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے قریب
جا کر آہستہ سے کہا۔
"کافی مل جائے گی؟"
اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔
"اندر بیٹھو۔ مل جائے گی"
میں نے دوبارہ کہا۔
"میں مدراسی کافی پسند کرتا ہوں"
تب شاہ دین نے اخبار سے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ مجھے پہچاننے کی
کوشش کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے دھیمی آواز
ایں کہا۔
"مجھے شاہ دین سے ملنا ہے۔"
میری نظریں بازار پر لگی تھیں۔ اب اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس نے دوبارہ
اخبار پر نظریں جما لی تھیں۔ اس نے اخبار کا ورق الٹتے ہوئے پنجابی میں کہا۔
"تمہیں جس نے بھیجا ہے اس کا نام کیا ہے؟"
میں نے بابو رام کا اصلی اسلامی نام لیا۔ شاہ دین نے اخبار اپنے گھٹنوں پر رکھ دیا اور
جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ خود سلگایا۔ ایک مجھے پیش کیا اور میرے
سگریٹ کو سلگاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔
"تمہارا کوڈ ورڈ کیا ہے؟"
میں نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے آہستہ سے وہ کوڈ لفظ بولا جو بابو رام نے مجھے
لدھیانے میں بتایا تھا شاہ دین نے پیچھے کسی نوکر کی طرف گردن موڑ کر دیکھا اور بنگلہ زبان
غل چیخ کر کہا۔
"اچھا والا کافی دو صاحب کو"
وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اندر بیٹھو"

میں دکان میں جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکا کافی کا پیالہ آگے رکھ گیا۔ میں کافی کی چسکیاں لے
لگا۔ میری نگاہیں شاہ دین پر لگی تھیں۔ وہ دکان سے اتر کر بازار میں پان سگریٹ کے
کھوکھے کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ بازار میں پہلے اس نے دائیں جانب دیکھا۔ پھ
بظاہر بڑی بے نیازی سے دوسری جانب دیکھا۔ یقینی طور پر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش ک
رہا تھا کہ میرے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا تو نہیں لگا ہوا۔ جو آدمی دشمن ملک میں کم
جگہ ٹک کر اپنے ملک کے لئے جاسوسی کرتے ہیں وہ خفیہ پولیس والوں کے چہروں سے
بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے ملک میں جا کر اپنے ملک کے مفادات کے لئے جاسو
کرنے کا ہر ملک کو حق ہوتا ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں ایک خاص بین الاقوا
قانون کے تحت جاسوس کو سزا ملتی ہے۔ مگر بھارت میں اس بین الاقوامی قانون کا کوئی خیا
نہیں رکھا جاتا۔ بھارت میں پاکستان کا کوئی باقاعدہ جاسوس میں نے اپنے قیام کے دورا
نہیں دیکھا۔ اگر کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوئی بھی ہے تو وہ یا تو بھارتی مسلمان ہی تھا
جو محض پاکستان سے محبت اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر رضاکارانہ طور پر یہ کام کر رہا تھا
یا پھر اس کا تعلق جموں کشمیر کی حریت پرست تحریک سے تھا جو کشمیر میں مسلمانوں پر بھار
ظلم وستم اور جارحانہ قبضے کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ اس کے بعد میں تھا۔ مجھے
پاکستان نے بھارت میں جاسوسی کرنے نہیں بھیجا تھا۔ پاکستان کی حکومت کو تو معلوم
نہیں تھا کہ میں بھارت میں اپنے وطن کی سلامتی کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگائے ہو
ہوں۔ میں اپنے طور پر یہ فرض ادا کر رہا تھا اور میری کمانڈو سرگرمیوں کا زیادہ تعلق جہ
کشمیر سے تھا۔

شاہ دین کا تعلق بھی کشمیر کی حریت پرست تحریک سے تھا۔ کلکتے میں وہ کئی برسو
سے ایک قوم پرست بھارتی مسلمان کی حیثیت سے چائے کا ہوٹل چلا رہا تھا۔ حقیقت میں
وہ سچا کشمیری مسلمان تھا اور پاکستان کی سلامتی اور استحکام بھی اس کے خفیہ مشن میں
شامل تھا۔ وادی کشمیر سے اتنی دور بیٹھ کر وہ براہ راست جہاد کشمیر میں حصہ نہیں لے سک

تھا مگر وہ بھارتی حکومت اور بھارتی ملٹری ہائی کمانڈ کی سرگرمیوں پر ضرور کڑی نگاہ رکھے
ہوئے تھا۔ اس کے آدمی اسے سرکاری حلقے کی ہر نئی خبر لا کر دیتے تھے جسے وہ لدھیانے
بابو رام کو پہنچا دیتا تھا اور بابو رام اسے سری نگر میں حریت پرستوں تک پہنچا دیتا تھا۔ جنگ
ستمبر میں ہزیمت اٹھانے کے بعد بھارتی حکومت اور بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کی خفیہ سرگرمیوں
میں بے حد اضافہ ہو گیا ہوا تھا اور ظاہر یہی ہوتا تھا کہ بھارتی حکومت پاکستان سے 65ء کی
جنگ کی اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتی ہے اور اس نے ہر قسم کی فوجی تیاریاں ابھی سے
شروع کر دی ہیں۔ ان حقائق کی تصدیق بعد میں شاہ دین نے بھی کی۔

میں دکان کے اندر بیٹھا خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ شاہ دین اب دکان میں آکر کرسی پر
بیٹھ گیا تھا اور ایک بنگالی گاہک سے بنگلہ زبان میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ دکان میں
گاہک کم ہو گئے تھے۔ میرے آس پاس کی میزوں پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ شاہ دین شاید اسی
لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے اردگرد کوئی گاہک نہیں ہے تو وہ
سگریٹ کے کش لگاتا میرے قریب آکر بنگلہ زبان میں بولا کہ کافی مجھے پسند آئی؟ میں نے
بنگلہ زبان میں ہی بھالو کہہ دیا۔ وہ میز پر دونوں ہتھیلیاں جما کر جھک گیا اور آہستہ سے اردو
میں بولا۔

"ہوڑہ سٹیشن کے نمبر تین پلیٹ فارم پر میرا انتظار کرو"

اس کے ساتھ ہی وہ میز سے پیچھے ہٹ گیا اور سگریٹ کا کش لگا کر ملازم کو بنگلہ میں
کچھ ہدایت دینے لگا۔ جو پیغام اس نے مجھے دینا تھا دے دیا تھا۔ میں چائے کی دکان میں کچھ
دیر بیٹھنے کے بعد اٹھا اور بازار میں آکر اس طرف چلنے لگا جدھر سے میں بازار میں داخل ہوا
تھا۔ بازار میں ہی میں نے ایک رکشا لیا اور اسے ہوڑہ سٹیشن چلنے کو کہا۔

اگر آپ کلکتے گئے ہیں اور ہوڑہ سٹیشن پر ٹرین سے اتریں ہیں تو آپ کو یاد ہو گا کہ
کلکتے کے دو بڑے ریلوے سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام سیالدہ ہے۔ دوسرے کا نام ہوڑہ ہے۔
پنجاب اور بھارت کے دوسرے صوبوں سے آنے والی ٹرینیں ان دونوں سٹیشنوں پر ہی
آکر ٹھہرتی ہیں۔ ہوڑہ کا ریلوے سٹیشن لمبے لمبے پلیٹ فارموں والا ہے۔ لوہے کی چھت

بہت اونچی ہے۔ میں پلیٹ فارم نمبر تین پر آ کر ایک بنچ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ مجھے کس جگہ اطمینان سے بیٹھ کر شاہ دین کا انتظار کرنا چاہیئے؟ وہاں کوئی ریفرشمنٹ روم بھی نہیں تھا۔ کتابوں اور چائے کے سٹال ضرور تھے۔ میں لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہ بھی چاہتا تھا کہ شاہ دین مجھے دور سے دیکھ لے۔ چنانچہ میں ایک بک سٹال کے کونے کی جانب لوہے کے بہت بڑے صندوق پر بیٹھ گیا جو ریلوے والوں کا ہی لگتا تھا۔ شکل اور حلیے سے میں پنجاب کا کوئی ہندو نوجوان لگتا تھا۔ میری ڈاڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے بالوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ میں مذہبی ٹائپ کا ہندو ہوں۔ زہریلی سوئیوں والا بال پوائنٹ اس وقت بھی میری جیکٹ کی اندر والی جیب میں محفوظ تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انڈین کرنسی بھی تھی۔ ماتھے پر لال تلک لگا تھا۔ کلکتے کے آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ پلیٹ فارم پر کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ شاید اسی ٹرین کو وہاں سے واپس بھی جانا تھا۔ مسافر آنے لگے تھے۔ قلی سروں پر اور ٹرالیوں میں سامان لادے آ رہے تھے۔ یہ بنگالی مسافر تھے۔ ان میں ہر عمر کی دبلی موٹی نوجوان اور بوڑھی بنگلہ عورتیں اور مرد تھے۔ کسی کو میری طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہر طرف بنگلہ زبان بولی جا رہی تھی۔ ایک سکھ بچہ گود میں اٹھائے اپنی بیوی کے ساتھ میرے قریب سے پنجابی بولتا گزر گیا۔ پنجابی زبان سن کر میرے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آ گیا۔ دوسرے ملک میں اپنی مادری زبان سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا ہے۔ میری نگاہیں اپنے آدمی شاہ دین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ وہاں شور مچ گیا۔ اسی دوران مجھے شاہ دین دکھائی دیا۔ وہ ایک طرف سے میری جانب ہی چلا آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دور سے دیکھ لیا تھا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ بھی میرے پاس آ کر لوہے کے صندوق پر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے ٹرین کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پنجابی میں مجھے کہا۔

"چھ سات قدم کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

ہم ہوڑہ سٹیشن سے نکل گئے۔

شاہ دین ہوڑہ برج کی طرف مڑ گیا۔ دریائے ہگلی کلکتے شہر کے درمیان سے نہیں تو اس کے پہلو سے ضرور گزرتا ہے۔ پہلے اس دریا پر کشتیوں کا پل ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد لوہے کا بہت بڑا پل بنا دیا گیا اسے ہوڑہ برج کہا جاتا تھا۔ ہگلی دریا اصل میں دریائے جمنا ہے جس کا نام کلکتے سے گزرتے ہوئے ہگلی پڑ گیا ہے۔ یہ دریا کلکتے کی بندرگاہ خضرپور جیٹی سے ہو کر آگے خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ شاہ دین سڑک پر ایک جگہ رک گیا۔ وہاں ایک بنگالی داب یعنی کچے ناریل کی ریڑھی لگائے بیٹھا تھا۔ شاہ دین نے ٹیکسی لی اور وہاں سے کچھ دور جا کر ٹیکسی کو رکوا دیا۔ میں تیز تیز چل کر ٹیکسی کے قریب گیا اور اس میں سوار ہو گیا۔ ہوڑہ برج وہاں سے دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری ٹیکسی ہوڑہ برج یعنی دریائے ہگلی کے پل پر سے گذر رہی تھی۔ جب ہم پل پر سے گزر گئے تو وہ کلکتے میں بولی جانے والی عام اردو میں کہنے لگا۔

"آج کل یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں"

میں نے کہا۔

"مگر برسات کا موسم تو گزر چکا ہے"

وہ بولا۔

"یہاں برسات کے آخیر میں بھی خوب بارشیں ہوتی ہیں۔ دیکھ لو صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ وہ محض باتیں کرنے کے لئے باتیں کر رہا تھا۔ تاکہ ٹیکسی ڈرائیور
حیرت نہ ہو کہ یہ دو آدمی اتنی دیر سے خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ دریائے ہگلی کے پار
علاقہ فیکٹری ایریا بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ہر قسم کے کارخانے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کارخا
بھی ہیں اور اونچی اونچی چمنیوں والے بڑے کارخانے بھی ہیں۔ اس علاقے میں
مزدوروں کے کوارٹروں کے علاوہ فیکٹریوں کے مالکوں کی بڑی بڑی کوٹھیوں بھی ہیں جو در
کے کنارے دور تک چلی گئی ہیں۔ ہماری ٹیکسی کارخانوں کے قریب ایک سڑک پر
گزر رہی تھی۔ شاہ دین کہنے لگا۔

"سیٹھ صاحب کا کارخانہ بھی اسی جگہ پر ہے وہ مجھے جانتے ہیں۔ بھگوان نے چاہا
تمہیں ان کے کارخانے میں ضرور نوکری مل جائے گی۔"

میں نے شاہ دین کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھ سے ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اشار
کیا۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں صرف اس ٹیکسی ڈرائیور کے لئے یہ باتیں کر رہا ہو
کہ اسے ہم پر کسی طرح کا کوئی شک نہ گزرے۔

اس نے ایک کارخانے کے بڑے گیٹ کے پاس ٹیکسی رکوائی اور ہم کارخانے کے
گیٹ کے پہلو میں ایک کھیت میں سے گزرنے کے بعد دریا کے کنارے پر آگئے۔ یہاں
کہیں کہیں مزدوروں کی جھونپڑیاں اور ٹین کی ڈھلانی چھتوں والے کوارٹر نظر آرہے
تھے۔ شاہ دین نے یہاں سے تھوڑی دور ایک کوارٹر اپنے رہنے کے لئے بنوا رکھا تھا۔
کہنے لگا۔

"میں کبھی کبھی یہاں پر آتا ہوں۔ لوگوں پر میں نے یہ ظاہر کیا ہوا ہے کہ یہ میرا
گودام ہے جہاں میں چائے چینی کا شاک رکھتا ہوں جو میرے ہوٹل میں کام آتا ہے۔
لیکن اصل میں میں اس کوارٹر سے اپنے آدمیوں کے ساتھ رابطہ رکھتا ہوں۔ وہ لوگ اسی
جگہ آکر مجھے ضرور رپورٹیں مہیا کرتے ہیں اور مجھ سے ہدایات وصول کرتے ہیں۔"

پٹ سن کے کھیتوں سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے سرکنڈوں اور ناریل کے
جھنڈوں کے نیچے یہ لکڑی کی چھت اور پتھر کی دیواروں والا کوارٹر چھوٹا سا تھا۔ باہر پانی کا

ایک پمپ لگا تھا۔ ناریل کے کٹے ہوئے درختوں کے دو چار تنے اور سوکھی شاخوں کا ڈھیرا
پڑا تھا۔ کوارٹر کے اندر بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ صحن میں پانی کے پمپ کے پیچھے ٹین
کی چھت والا ایک بوسیدہ کچن تھا۔ ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔

شاہ دین نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے سگریٹ دیا کہنے لگا۔

"اب تم ساری بات مجھے تفصیل سے بتاؤ لدھیانے والے اپنے آدمی نے مجھے صرف
ایک اشارہ دیا تھا کہ تم کسی آدمی کی تلاش میں ہو"

میں نے شاہ دین کو شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بیان کر دی اور اسے بتایا
کہ میں نے سری نگر کی شہید مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھائی ہے کہ میں سینکڑوں
مظلوم کشمیری مسلمانوں کا خون بہانے والے اس قصائی اور ظالم صوبیدار در داس سے
شہیدوں کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔

"مجھے لدھیانے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کلکتے آگیا ہوا ہے اور شانے پر کسی حریت
پرست مجاہد کی گولی لگنے سے زخمی بھی ہے۔ میں اس کی شکل پہچانتا ہوں۔ اس کی بڑی
بڑی مونچھیں ہیں اور درمیانی عمر کا آدمی ہے۔"

شاہ دین میری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ سوچتا بھی جا رہا
تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ کہنے لگا۔

"صوبیدار درگاداس تمہارے کہنے کے مطابق اب فوج میں نہیں ہے۔ وہ زخمی بھی
ہے۔ اس لئے یقیناً یہاں وہ کسی ایسے ہسپتال میں پڑا ہو گا جس کا تعلق انڈین آرمی سے
ہو۔ اگرچہ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے اور یہاں کسی ایک آدمی کا پتہ لگانا اتنا آسان کام نہیں
ہے۔ لیکن ہمارے آدمی بہت ہوشیار اور ذہین ہیں۔ وہ یہاں ہر جگہ اپنا اثر ورسوخ رکھتے
ہیں۔ مجھے کچھ وقت دو۔ میرے آدمی درگاداس کا پتہ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

میں شاہ دین کی جھونپڑی میں پڑ گیا۔ مجھے اس نے شہر اپنے ہوٹل یعنی چائے کی دکان
پر آنے سے منع کر دیا تھا۔ ایک لڑکا مجھے صبح شام کوارٹر میں کھانا وغیرہ دے جاتا تھا۔ مجھے
وہاں رہتے تین دن گزر گئے۔ اس دوران شاہ دین مجھ سے ملنے بالکل نہیں آیا تھا۔ چوتھے

دن شام کو وہ آ گیا۔ کہنے لگا۔

"میرے آدمیوں نے کشمیریوں کے قاتل درگاداس کا پتہ لگا لیا ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا وہ کسی ہسپتال میں ہے؟"

شاہ دین بولا۔

"اس کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ کلکتہ کی بندرگاہ کے پیچھے جو آبادی ہے وہاں کسی جگہ روپوش ہے۔ اسے خوف لگا ہوا ہے کہ کوئی نہ کوئی کشمیری کمانڈو اسے ضرور ہلاک کر دے گا۔ اس وجہ سے وہ کسی خفیہ جگہ پر چھپ کر رہ رہا ہے۔۔ ہمارا کوئی بھی آدمی سر توڑ کوشش کے باوجود اس کے ٹھکانے کا سراغ نہیں لگا سکا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نے کچھ ریٹائرڈ فوجی اپنے اردگرد بطور باڈی گارڈ رکھے ہوئے ہیں جو ہروقت مسلح اور چوکس رہتے ہیں اور صوبیدار درگاداس کی حفاظت کرتے ہیں۔"

کلکتے کی بندرگاہ کے پیچھے جو نئی اور پرانی کالونیاں تھیں میں ان کالونیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے شاہ دین سے پوچھا۔

"وہاں وہ کس کالونی میں روپوش ہو سکتا ہے؟"

شاہ دین نے کہا۔

"مجھے کچھ اور مہلت دو۔ میرے آدمی یہ بھی پتہ کر لیں گے۔"

اس کے بعد مزید دو تین دن گزر گئے لیکن شاہ دین کے آدمی درگاداس کا اتا پتا معلوم نہ کر سکے۔ آخر میں نے شاہ دین سے کہا۔

"بھائی! اب میں خود اس کا پتہ لگانے جاؤں گا۔ میں بندرگاہ والی آبادیوں میں آتا جاتا رہا ہوں۔"

شاہ دین بولا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ اس کوارٹر کی ایک چابی تمہارے پاس رہے گی۔ تم جب اور

جس وقت چاہو یہاں آ سکتے ہو۔ تمہیں کشمیری مسلمانوں کے اس موذی قاتل کی تلاش کے سلسلے میں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو"

میں نے اسے اپنی زہریلی بال پوائنٹ پنسل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بعض چیزیں اور بعض راز ایسے ہوتے ہیں کہ عقلمند کمانڈو وہ راز اپنے آدمیوں سے بھی چھپا کر رکھتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے صرف ایک چاقو لا دو جس سے میں درگاداس کا کام تمام کر سکوں"

یہ بھی میں نے محض اس لئے شاہ دین سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہ نہ سوچے کہ میں نہتا اس پیشہ ور فوجی کو کیسے ہلاک کروں گا۔ شاہ دین کو میرے بارے میں یہ علم نہیں تھا کہ میں حریت پرست ہونے کے علاوہ ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کمانڈو بھی ہوں۔ ج شاہ دین نے اسی وقت ایک صندوق میں سے چاقو نکال کر مجھے دیا۔ یہ عام چاقو سے ذرا بڑا چاقو تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ شاہ دین کے مخبروں نے صرف یہ اشارہ دیا تھا کہ صوبیدار درگاداس کو ایک بار ساونت کالونی کے درگا مندر میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ساونت کالونی میں یا اس کے آس پاس ہی کہیں روپوش ہو گا۔ ساونت کالونی بندرگاہ پر کام کرنے والے مزدوروں کی کالونی تھی۔ یہاں ان کے جھونپڑا نما بوسیدہ کوارٹر تھے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ درگا داس ان گندے کوارٹروں میں نہیں چھپ سکتا۔ وہ ضرور اردگرد کی کسی کالونی میں چھپا ہوا ہو گا اور اپنے پیچھے لگے ہوئے حریت پسندوں کے مخبروں کو دھوکا دینے کے لئے وہ ساونت کالونی کے درگا مندر میں پوجا وغیرہ کو گیا ہو گا۔

اس روز سارا دن وقفے وقفے سے کلکتے میں بارش ہوتی رہی۔ میں شاہ دین کے کوارٹر میں ہی رہا۔ شام کو بارش بالکل رک گئی اور ذرا اندھیرا ہوا تو میں دریا پار کر کے بس میں سوار ہو کر بندرگاہ پہنچ گیا۔ ساونت کالونی وہاں تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ میں سیدھا اس کالونی کے درگاہ مندر میں پہنچ گیا۔ مندروں کا ماحول میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ درگادیوی کی پوجا کس طرح کی جاتی ہے اور ہنومان اور ویشو اور شیو جی کے مندر میں پوجا کے وقت کیا رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ میں نے کبھی کسی مورتی کے

آگے سر نہیں جھکایا تھا۔ بس ہاتھ سے گھنٹی بجا دیا کرتا تھا یا ہاتھ جوڑ کر مورتی کے آگے کھڑا ہو جاتا اور دل میں کہتا۔

"میں جانتا ہوں تو پتھر کا بت ہے۔ میرے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میرا سر صرف ایک خدا کے آگے جھکتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور سارے جہانوں کا رب ہے۔"

درگا دیوی کے مندر میں پوجا کرنے والوں کا کافی رش تھا۔ میں مندر کے دروازے میں داخل ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو مجھے درگا داس کے بارے میں کوئی سراغ بتا سکے۔ ایسا آدمی مندر کا بڑا پجاری ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ پجاری ہمیشہ مندر میں رہتا ہے اور وہ پوجا کرنے آنے جانے والوں سے واقف ہوتا ہے۔ میں نے دور سے پجاری کو دیکھا۔ وہ مورتی کے آگے ایک طرف ہو کر بیٹھا پجاریوں سے پیسے وصول کرنے اور انہیں پھول دینے میں مصروف تھا۔ میں ایک چبوترے کے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کافی دیر بعد جب پوجا کرنے والوں کا رش ختم ہو گیا اور وہاں اکا دکا لوگ ہی رہ گئے تو میں پجاری کی طرف بڑھا۔ اسے دس روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ وہ دس روپے دیکھ بڑا خوش ہوا۔ سمجھ گیا کہ میں کوئی موٹی آسامی ہوں اور نیا نیا اس علاقے میں آیا ہوں۔ اس نے مجھے پھولوں کے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی بھی دی۔ میں نے سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھا اور کہا۔

"مہاراج! ہم بڑی دور سے دیوی کے درشنوں کو آئے ہیں۔ آج رات مندر میں ٹھہرنے کا خیال ہے۔ کیا یہاں کوئی ٹھکانہ مل جائے گا۔ ہم اس کا کرایہ ادا کر دیں گے۔"

پجاری کو مجھ سے مال ملنے کی توقع تھی۔ کہنے لگا۔

"کیوں نہیں مہاراج کیوں نہیں۔ آپ کو ضرور کوٹھڑی مل جائے گی۔ آپ تھوڑی دیر بیٹھیں۔ میں خود آپ کو لے جا کر کوٹھڑی دکھاتا ہوں۔"

میں کچھ دیر مندر کے احاطے میں ہی ٹہلتا رہا۔ جب دیکھا کہ پجاری اپنی پوجا پاٹھ کی

دکان بڑھا رہا ہے تو میں اس کے پاس آگیا۔ وہ مجھے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں لے گیا جہاں کھاٹ پر بستر لگا تھا اور مچھردانی بھی لگی ہوئی تھی۔ اوپر چھت کے ساتھ پنکھا بھی چل رہا تھا۔ یہ جگہ اچھی تھی۔ میں نے اسے جیب سے بیس روپے نکال کر دیئے اور کہا۔

"مہاراج! جاتی دفعہ بھی آپ کی خدمت کروں گا۔ میں ویشنو ہوں۔ میرے لئے اگر دال سبزی کا انتظام ہو جائے تو ٹھیک رہے گا۔"

پجاری بولا۔

"مہاراج آپ کوئی فکر ہی نہ کریں۔ آپ جو کہیں گے آپ کو مل جائے گا۔"

رات کو وہ خود میرے لئے سبزی ترکاری اور چاول لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ ماتا شیراں والی کے دیس سے آئے ہیں کیا؟"

میں نے یونہی کہہ دیا کہ ہاں میں وہیں سے آیا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اسے سنسکرت کے کچھ اشلوک سنائے جو میں نے ایسے موقعوں کے لئے زبانی یاد رکھے تھے اور اسے گیتا کا تھوڑا سا پاٹھ بھی سنایا۔ وہ مجھ سے بڑا متاثر ہوا۔ ساتھ ہی میں نے مزید جیب سے بیس روپے نکال کر اسے دیئے۔ وہ تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس وقت رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا۔

"بات یہ ہے پجاری جی! ہمارا ایک بڑا بھائی ہے۔ وہ فوج میں صوبیدار تھا۔ کشمیر کے محاذ پر اس نے بڑے اتنک وادی مسلمان کشمیریوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اب فوج نے اسے ریٹائر کر دیا ہے۔ اس کو خطرہ تھا کہ کشمیری مسلمان اس کو جان سے مارنے کے لئے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے بھائی جی کو بڑا سمجھایا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے مگر اس پر خوف بیٹھ گیا تھا۔ بس وہ ایک روز گھر سے نکل بھاگا۔ ہماری ماتا جی اور بھائی کے بچے سخت پریشان ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ وہ کلکتے کے ساونت کالونی میں رہ رہا ہے۔ بس اسی کی تلاش میں آیا ہوں۔ ماتا جی تو ویر جی کے غم میں سورگباش ہونے والی ہیں۔"

پجاری بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ اس نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا ہے ؟"

میں نے کہا۔

"صوبیدار درگاداس اس کا نام ہے۔ کشمیر میں اسے کاندھے پر گولی بھی لگی تھی"

پجاری جھٹ بولا۔

"اس کی مونچھیں تو نہیں ہیں ؟"

مجھے خبر مل چکی تھی کہ درگاداس نے پہچانے جانے کے خوف سے اپنی بڑی بڑی مونچھیں منڈوا ڈالی ہیں۔ میں نے کہا۔

"پہلے تھیں۔ مگر میرا خیال ہے اب ویر جی نے مونچھیں کٹوا دی ہوں گی"

پھر پجاری نے مجھے اس شخص کا جو حلیہ بتایا وہ ہو بہو صوبیدار درگاداس کا تھا۔ پجاری بولا۔

"مہاراج! اس شکل صورت کے آدمی کو میں نے تین چار بار مندر میں آتے دیکھا ہے۔ اس کے کندھے پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"بس یہی میرے ویر جی ہیں۔ آپ مجھے ان کا پتا بتا دیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی"

پجاری کہنے لگا۔

"یہ میں آپ کو کل پتہ کر کے بتا دوں گا۔ جو آدمی اس کے ساتھ آتا ہے میں اسے جانتا ہوں۔ وہ اسی ساؤتھ کالونی کا ہی رہنے والا ہے"

رات میں نے کوٹھڑی میں بسر کی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد پجاری میری کوٹھڑی میں آیا اور کہنے لگا۔

"آپ کے ویر جی صوبیدار درگاداس کل تک اسی کالونی میں تھے مگر آج صبح وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ پجاری اسی شخص کی بات کر رہا ہے جس کی

مجھے تلاش تھی یا وہ کوئی اور آدمی ہے۔ جب میں نے تصدیق کرنی چاہی تو پجاری نے کہا۔

"ہاں جی! میں آپ کے ویر جی کی ہی بات کر رہا ہوں۔ وہ صوبیدار تھا ڈوگرہ رجمنٹ میں۔ اس کا نام درگاداس ہے۔ وہ پہلے بھی فوج سے ریٹائر ہوا تھا۔ پھر اسے دوبارہ فوج میں رکھ لیا گیا اور کشمیر بھیج دیا۔ وہاں اسے کاندھے پر گولی لگی تھی۔ اس نے بہت سے اننک وادی کشمیریوں کو مارا ہے۔ وہ تو بڑا مشہور فوجی ہے۔ کشمیری تو اسے مسلمانوں کا قصائی کہتے تھے مگر وہ تو امرتسر کا رہنے والا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ میں ماتا شیراں والی کے شہر کا ہوں"

پجاری نے ٹھیک آدمی پہچانا تھا۔ وہ صوبیدار درگاداس کی ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اصل میں ہم امرتسر کے ہی رہنے والے ہیں مگر میں نے کانگڑہ میں جا کر منیاری کی دکان کر لی تھی۔ یہ بتائیں کہ ہمارے ویر جی کہاں چلے گئے ہیں ؟"

پجاری بولا۔

"جس آدمی کی میں نے یہ ساری باتیں معلوم کرنے کی ڈیوٹی لگائی تھی اس کا کہنا ہے کہ صوبیدار درگاداس بہت ڈرا ہوا ہے۔ دو تین باڈی گارڈ ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہاں کلکتے میں کسی جگہ درگاداس نے تھوڑی سی زمین کبھی خریدی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ وہیں چلا گیا ہو۔"

میں نے پجاری کو جیب سے پچاس روپے نکال کر دیئے اور کہا۔

"مہاراج! اگر آپ مجھے پتہ کرا دیں کہ میرا بھائی کہاں پر ہے اور اس کی زمین یہاں کس جگہ پر ہے تو میں آپ کا بڑا ابھاری ہوں گا"

پجاری نے روپے فوراً اپنی صدری کی جیب میں رکھ لئے اور بولا۔

"آپ چنتا نہ کریں۔ بس مجھے ایک دن کی مہلت اور دو۔ میں سب کچھ معلوم کر کے بتاؤں گا۔"

وہ رات بھی میں نے مندر میں ہی گزار دی۔ اس سے اگلے روز رات کو پجاری

میری کوٹھڑی میں آیا۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ کے ویری جی کا پورا پتہ چل گیا ہے۔"

اس پجاری کے بیان کے مطابق صوبیدار درگاداس نے کلکتہ کے جنوب میں واقع چائے کے ایک چھوٹے سے باغ میں اپنا حصہ ڈالا ہوا تھا۔ مگر وہ وہاں رہتا نہیں تھا۔ چائے کے باغ کے پیچھے کاکس بازار کو جانے والی سڑک کے کنارے ریٹائرڈ فوجیوں کی فلاح وبہبود کا ایک ادارہ تھا۔ یہ سرکاری ادارہ تھا۔ صوبیدار درگاداس اسی ادارے کے آفس میں ملازم ہو گیا ہوا تھا۔ اسی مکان میں وہ اکیلا رہ رہا تھا۔ رات کو تین باڈی گارڈ مکان کے اردگرد پہرہ دیتے تھے۔ دن کو یہی باڈی گارڈ اسے اپنی حفاظت میں لے کر ایک بس میں سوار ہوتے اور فوجی دفتر تک لاتے تھے۔ پھر جب دفتر سے چھٹی ہوتی تھی تو صوبیدار درگا داس کو اپنی حفاظت میں واپس بس میں سوار کروا کر گھر لے آتے تھے۔

اب میرا اس پجاری کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ میں اسی روز واپس اپنے کلکتے کے جاسوس مجاہد کے پاس اس کے دریائے ہگلی والے کوارٹر میں پہنچ گیا۔ رات کو اپنا جاسوس مجاہد شاہ دین آیا تو میں نے اسے ساری بات سنائی۔ وہ بولا۔

"ہاں دھرم چالی میں ایک فوجی فاؤنڈیشن کا بہت بڑا آفس ہے۔ میں نے دیکھا ہوا ہے مگر وہاں آنے جانے کی بڑی پابندی ہے۔ جنگ کے بعد تو یہ پابندی زیادہ سخت ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو میں خود وہاں جا کر یہ تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ جس آدمی کی مجھے تلاش ہے یہ وہی آدمی ہے۔ اس کے بعد صورت حال کا جائزہ لے کر سوچوں گا کہ مجھے اس دشمن اسلام کو کس طریقے سے موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔"

شاہ دین بولا۔

"میں تمہارے ساتھ دھرم چالی نہیں جا سکتا مگر میں تمہیں اس کا سارا حدود اربعہ سمجھا دوں گا۔"

میں کلکتے میں رہا ضرور تھا لیکن اس علاقے کی طرف کبھی میرا جانا نہیں ہوا تھا۔ یسے بھی کلکتہ اتنا بڑا شہر ہے کہ آدمی دو ایک بار یہاں رہنے سے سارا شہر نہیں دیکھ سکتا۔ ہ دین کے بتانے کے مطابق میں دھرم چالی کی کالونی میں پہنچ گیا۔ میں نے بھارت کے ابق فوجیوں کی فاؤنڈیشن کی عمارت کا بھی جائزہ لیا۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا میرا ٹارگٹ کشمیری مسلمانوں کا قاتل صوبیدار درگاداس اسی دفتر میں کام کرتا تھا اور وہ اپنے تین ی گارڈز کے ساتھ آفس آتا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے مکان سے بس میں ار ہو کر دفتر آتا ہے اور اس کے باڈی گارڈ اس کے ار:گرد ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہ فاؤنڈیشن کے گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر بس سٹاپ تھا۔ اس وقت صبح کے آٹھ ڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں اسی لئے آفس کے ٹائم پر وہاں گیا تھا تا کہ اگر درگا داس ں فاؤنڈیشن میں کام کرتا ہے تو اسے دفتر آتے ہوئے دیکھ سکوں میں بس سٹاپ سے چند موں کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے ایک کٹے ہوئے درخت پر بیٹھ گیا۔

آفس ٹائم ہو چکا تھا۔ مگر یہ کوئی اتنا بڑا آفس بھی نہیں تھا کہ اس کے کام کرنے والوں ں تعداد زیادہ ہو۔ ایک بس آکر کھڑی ہوئی۔ اس میں سے دبلے پتلے سانولے رنگ کے الی بابو چھتریاں ہاتھوں میں لئے نکلے اور فوجی فاؤنڈیشن کے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ ں ایک ایک آدمی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پندرہ سولہ مسافر بس سے اترے تھے۔ ن میں صوبیدار درگاداس نہیں تھا۔ اس کے پندرہ منٹ بعد ایک اور بس آکر سٹاپ پر ی۔

اس میں سے پہلے دو بنگالی عورتیں اور دو بنگالی کلرک قسم کے آدمی اترے۔ اس ے بعد دو ذرا تنومند جسم والے آدمی اترے اور اترتے ہی انہوں نے دائیں بائیں بھا۔ پھر ایسے کھڑے ہو گئے جیسے ماحول پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں۔ میں اٹھ کھڑا ا۔ اس کے بعد بس میں سے وہ آدمی باہر نکلا جس کی مجھے تلاش سری نگر سے کھینچ کر ں لائی تھی اور جو میرا ٹارگٹ تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اگرچہ اس کی مونچھیں ں تھیں اور اس نے بنگالیوں والا لباس یعنی دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا مگر اس کی شکل ہو

ہو اس تصویر سے ملتی تھی جو مجھے دکھائی گئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی
اس کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے پیچھے سے اس کی حفاظت کر رہا ہو۔ اس دوران
والے باڈی گارڈ بھی اس کے دائیں بائیں اسے اپنی حفاظت میں لے کر فاؤنڈیشن کے
کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ تین باڈی گارڈ تھے اور ان کے درمیان بنگالی حلیے میں
والا آدمی سینکڑوں معصوم کشمیری عورتوں بچوں بوڑھوں کا قاتل صوبیدار درگاداس تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اب میں اسے قریب سے بھی دیکھنا چاہتا
مگر اتنا وقت نہ ملا۔ درگاداس اپنے باڈی گارڈز کی حفاظت میں فوجی فاؤنڈیشن کے گیٹ
داخل ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر ایک ناریل پانی بیچنے والے کی ریڑھی کے
آ گیا۔ اس سے ایک ناریل یا دھاب لی اور وہیں کھڑے کھڑے پینے لگا۔ میں نے ریڑھی
والے بنگالی سے کلکتے کی اردو زبان میں پوچھا کہ دفتر میں چھٹی کس وقت ہوتی ہے۔
نے بتایا کہ چھٹی چار ساڑھے چار بجے ہوتی ہے۔ سارا دن پڑا تھا۔ میں وہاں اتنی دیر
نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ وہاں سے واپس چل پڑا۔ واپس اپنے مجاہد شاہ دین کے کوارٹر
جانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس علاقے میں یا کسی قریبی علاقے
میں دن کا باقی وقت گزارتا ہوں۔ چار بجے کے قریب یہاں دوبارہ آ جاؤں گا اور بس سٹاپ
پر کھڑا ہو کر صوبیدار درگاداس کو قریب سے دیکھوں گا۔

میں سب سے پہلے دھرم چالی کی کالونی میں آیا۔ یہ درمیانے درجے کی آبادی تھی۔
کوارٹر بھی تھے۔ پرانی کوٹھیاں بھی تھیں۔ ایک مارکیٹ بھی تھی۔ ایک مسئلہ میرے سامنے
بھی تھا کہ مجھے لوگوں کی نظروں سے اپنے آپ کو چھپانا تھا۔ یا کم از کم زیادہ لوگوں کے
سامنے نہیں جانا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں بھارت کے تقریباً ہر بڑے اور
شہر میں میں کمانڈو ایکشن سے فوجی تنصیبات کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اور وسطی
یعنی گوالیار اور پانڈی چری کے سول تھانوں اور ملٹری پولیس کے پاس میری تصویر بھی
اور ایک دو بار میری تصویر مفرور پاکستانی جاسوس کے الزام کے ساتھ جالندھر اور
ہوشنگ آباد کے اخباروں میں چھپ بھی چکی تھی۔ چنانچہ مجھے بھارت کے کسی بھی شہر

اہمر عام چلتے ہوئے بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا مگر میرا ناک
نقشہ وہی تھا۔ میں نے اپنے چہرے کی کوئی پلاسٹک سرجری نہیں کروائی ہوئی تھی۔ خفیہ
پولیس کے آدمیوں کی تیز نگاہیں مجھے پہچان سکتی تھیں۔

چنانچہ میں نے دھرم چالی کالونی کی مارکیٹ کی طرف جانے سے گریز کیا اور کچھ فاصلے
پر تین چار ماڈرن عمارتیں نظر پڑیں تو میں اس طرف چل دیا کہ یہاں کوئی ماڈرن قسم کا
ریستوران ضرور ہو گا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھ کر وقت گزار لوں گا۔ ماڈرن ریستورانوں میں
زیادہ لوگ نہیں ہوتے اور وہاں روشنیاں بھی دھیمی ہوتی ہیں۔ یہ جدید عمارتیں کلکتے کے
شمال مشرقی علاقے میں واقع سبھاش چندر بوس نگر کی تھیں۔ یہ ماڈرن کالونی آزادی ملنے
کے بعد بنائی گئی تھی۔ کشادہ سڑکیں تھیں۔ درمیان میں خم دار کھمبوں پر نیون لائیٹ کی
ٹیوبیں لگی تھیں۔ گرین بیلٹ پر پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک بہت بڑا سینما ہاؤس بھی تھا
جہاں بنگلہ فلم کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ سڑک پر دو رویہ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ بلڈنگوں
کے درمیان کشادہ جگہ چھوڑ دی گئی تھی جہاں ماڈرن بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ان بنگلوں میں
کثرت سے ناریل پام اور کیلے کے درخت اگے ہوئے تھے۔ آگے فٹ پاتھ تھا۔ میں فٹ
پاتھ پر چلتا گیا۔ میری بائیں جانب بڑی ماڈرن دکانیں تھیں۔ ایک جگہ ایک ریستوران نظر
آیا تو میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ کافی شاپ تھی۔ میں کافی منگوا کر خاموشی سے کونے میں
بیٹھ گیا۔ حلیہ میرا یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ لباس
میرا ضرور ماڈرن تھا۔ یعنی میں نے سرمئی ٹمیالے رنگ کی جیکٹ اور گہرے کلر کی پتلون
پہنی ہوئی تھی۔ شکل صورت سے میں بھارت کا کوئی ماڈرن جوگی سنیاسی یا جوتشی لگتا تھا۔
اس قسم کے لوگ بھارت کے بڑے شہروں میں عام نظر آ جاتے ہیں۔

ریستوران میں میرے علاوہ چھ سات گاہک ہی بیٹھے تھے۔ ان میں ایک بنگالی فیملی بھی
تھی۔ ایک پختہ عمر کی بنگالی عورت تھی اور اس کی عمر کا ایک آدمی جو اس کا خاوند لگتا تھا
ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ دونوں خاموشی سے کافی پی رہے تھے۔ عورت نے ایک دو بار
میری طرف دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے خاوند سے کوئی بات کی تھی۔ اس کے بعد اس کے

خاوند نے بھی مجھے نظر بھر کر دیکھا تھا۔ یہ لوگ مجھے کسی طرح بھی خفیہ پولیس کے آ نہیں لگ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرے جوگی جوتشیوں والے حلیے کی وجہ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں سگریٹ سلگا رہا تھا کہ ادھیڑ عمر کا بنگالی اٹھ کر میرے آیا اور بڑی عاجزی اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا۔ میں نے بھی ہاتھ کر نمسکار کیا۔ اس نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا جس سے میں یہی معنی اخذ کر سکا کہ وہ اپنی میز پر آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کلکتے کی اردو زبان کہا۔

"میں بنگلہ زبان زیادہ نہیں جانتا"

میں ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں جس شکستہ اردو میں بھارت کے مخ شہروں میں دوسرے صوبوں کے آدمیوں سے گفتگو کرتا تھا میں یہاں وہ زبان نہیں لک بلکہ اس کا مفہوم صاف اردو میں لکھ دیتا ہوں تا کہ آپ بخوبی سمجھ جائیں۔ اس بنگال ویسے ہی ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ عاجزی کے ساتھ وہ بنگلہ اردو میں کہنے لگا۔

"میری اور میری بیوی کی زبردست خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کاف ایک پیالی پئیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

مجھے بھی وہاں کچھ وقت گزارنا تھا اور یہ بے ضرر قسم کے لوگ تھے۔ میں اٹھ کر ا کی میز پر جا بیٹھا۔ بنگالی نے اپنا اور اپنی بیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام پنکج کمار ہے۔ یہ میری دھرم پتنی سروجنی کمار ہے۔ میں ریٹائرڈ انج ہوں۔ ہمارا مکان دھرم چالی میں ہے۔"

وہ اپنی ادھیڑ عمر بنگالی بیوی کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس کی بیوی بڑی عقیدت مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"کہیں ایسی بات تو نہیں ہے کہ آپ نے مجھے کسی اور آدمی کے شبے میں اپنے بلا لیا ہے؟"

پنکج کمار نے کہا۔

"نہیں نہیں بیٹا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی صورت میں ہمیں بھگوان کی صورت نظر آئی تھی۔ میری پتنی نے کہا کہ اس رشی جی کو ضرور بلاؤ۔ ہم رشی جی کے درشن کریں گے۔ بس میں نے گستاخی کر کے آپ کو یہاں بلا لیا۔ اگر آپ کو برا لگا ہو تو ہمیں شما کر دیجئے گا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں پنکج بابو ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔"

اتنا میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ اپنے کسی گھریلو مسئلے کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں یہ وبا بڑی عام ہے۔ جہاں کسی محلے یا ہوٹل میں کوئی میرے ایسے حلیے والا آدمی نظر پڑے لوگ فوراً اس سے اپنے گھریلو مسئلے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عورتیں تو خاص طور پر اس معاملے میں انتہائی ضعیف الاعتقاد ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف دن کے چار بجانا چاہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ بنگالی عورت اپنے خاوند کو اشاروں میں مجھ سے کچھ پوچھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں بظاہر بے نیازی سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ انہوں نے میرے لئے مزید کافی اور رس گلے منگوا لئے تھے۔

آخر پنکج بابو سے نہ رہا گیا۔ اس نے بڑی جھجک کے ساتھ کہا۔

"مہاراج! آپ شکل سے مہان رشی لگتے ہیں۔ آپ کو جوتش کا گیان بھی ضرور ہو گا"

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ ان کا کوئی گھریلو مسئلہ تھا جس کی وجہ سے وہ پریشان تھے اور مجھ سے علم جوتش کے ذریعے اس کا حل پوچھنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا۔

"جوتش کا پورا گیان تو نہیں ہے۔ مگر کچھ کچھ جانتا ضرور ہوں۔ کیا آپ کی کوئی پرابلم ہے؟"

بنگالی پنکج بابو کی بیوی خاموش تھی اور اس کا کام مجھے عقیدت بھری نظروں سے دیکھنا

تھا۔ پنکج بابو نے میری پیالی میں کافی بناتے ہوئے بڑی سنجیدہ اور دھیمی آواز میں کہا۔

"مہاراج! ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ اوما کماری اس کا نام ہے۔ اس نے باٹنی میں ایس سی کیا ہوا ہے۔ وہ کالج میں لیکچرار ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تو پھر آپ کو پرابلم کیا ہے؟"

پنکج بابو رس گلوں کی پلیٹ میرے آگے کھسکاتے ہوئے بولا۔

"مہاراج! پرابلم یہ ہے کہ ہماری اکلوتی بیٹی اوما کماری کو پچھلے ایک ماہ سے ای بیماری لگ گئی ہے۔ اس کو آدھے سر کی درد کا دورہ پڑتا ہے اور وہ دو دو دن تک ب ہوش پڑی رہتی ہے۔ ہم نے کلکتے کے سارے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے مگر اس کی بیمار ٹھیک نہیں ہوئی۔ رات بھی اسے دورہ پڑا تھا اور وہ رات سے بے ہوش پڑی ہے۔ ت ڈاکٹر آ کر اسے انجکشن لگا چکے ہیں مگر اوما بیٹی کو ہوش نہیں آیا۔ ایک بار ہوش آیا بھی تو درد کی شدت سے وہ چیخنے لگی اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ ہم یہاں میڈیکل سٹور سے ا کے لئے دوائی لینے آئے تھے۔ سٹور بند تھا یہاں کافی پینے بیٹھ گئے۔ آپ کو دیکھا تو میر پتنی نے کہا کہ یہ رشی بڑے مہان لگتے ہیں ان سے بیٹی کا علاج پوچھو۔ بس مہاراج ہماری پرابلم ہے۔ آپ جوتش کے گیان سے پتہ کریں کہ ہماری بیٹی کی بیماری کب دور گی۔ ہمیں اس کی شادی بھی کرنی ہے۔ ہم بڑے پریشان ہیں مہاراج۔"

غم زدہ بنگالی باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پتنی سرو کماری کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ مجھے جوتش وغیرہ کا خاک بھی علم نہیں تھ میں محض وقت گزارنا چاہتا تھا۔ البتہ دل میں اللہ کے حضور دعا ضرور مانگی تھی کہ ا پاک پروردگار اس غم زدہ ماں باپ کی بچی کو صحت عطا کر دے۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"یہ تو لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ ابھی دن کے ساڑھے نو بجے کا وقت ہے۔ باقی کا وقت ان لوگوں گھر میں بیٹھ کر گزار دوں گا اس طرح سے لوگوں کی نگاہوں میں بھی نہیں آؤں گا اور ا

کا مکان بھی دھرم چالی کی کالونی میں ہی تھا جہاں سے میرا ٹارگٹ یعنی درگا داس کا دفتر قریب ہی تھا۔ میں وہاں سے تین ساڑھے تین بجے کے قریب اٹھ کر فوجی فاؤنڈیشن کے بس شاپ پر جا کر صوبیدار درگا داس کی واپسی کا انتظار کر سکتا تھا اور اسے اچھی طرح سے دیکھ بھی سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اسی روز اسے ہلاک کرنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا مگر زہریلی بال پوائنٹ پنسل میری جیکٹ کی جیب میں موجود تھی اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر یہ شخص کشمیری مسلمانوں کا قاتل صوبیدار درگا داس ہی نکلا اور مجھے موقع بھی مل گیا تو میں آج ہی اس کا کام تمام کر دوں گا۔

پنکج بابو نے خوش ہو کر ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔

"مہاراج! ہمارے دھن بھاگ کہ آپ ہمارے گھر چل کر بچی کا ہاتھ دیکھیں گے۔"

اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"سروجنی جی! تم جا کر دوائی لے آؤ۔ میڈیکل سٹور کھل گیا ہو گا۔"

اس کی بیوی بھی میرے جواب سے بڑی خوش ہوئی تھی۔ فوراً اٹھی اور ریستوران سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد پنکج بابو مجھ سے اپنی بیمار بیٹی اوما کماری کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کی صحت ضرور چاہتا تھا اور اس کے لئے میں نے خدا کے حضور بڑے سچے دل کے ساتھ دعا کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اولاد جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ خدا کسی کو اولاد کا دکھ نہ دکھائے۔ اولاد خواہ سکھ کی ہو' خواہ ہندو کی ہو خواہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کی ہو۔ خدا اسے اپنے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے سلامت رکھے۔

تھوڑی دیر میں پنکج بابو کی بنگالی بیوی دوائی لے کر آ گئی۔ ہم ریستوران سے نکل آئے۔ میں نے گہری نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی خطرے والی بات نظر نہ آئی۔ اتنی دیر میں پنکج بابو نے ایک خالی ٹیکسی رکوا لی تھی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی مختلف سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی دھرم چالی کالونی میں داخل ہو گئی۔ ٹیکسی ایک منزلہ مکان کے آگے چھوٹی سی ویران سڑک پر رک گئی۔ مکان کے برآمدے پر

کھپریلوں کی ڈھلواں چھت پڑی تھی۔ سامنے چھوٹی سی جگہ تھی جہاں کیلے اور ناریل
دو چار درخت کھڑے تھے۔ مکان کی دیواریں کلکتے کی بارشوں اور دھوپ کی مار کھا
کالی ہو رہی تھیں۔ ایک بوڑھے بنگالی نوکر نے جو برآمدے میں بیٹھا ناریل پی رہا تھا جلد
سے اٹھ کر برآمدے والے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ چھو
کمرہ تھا۔ کونے میں مسہری والا پلنگ لگا تھا۔ دیواروں پر مہاتما گاندھی' پنڈت نہرو' سبھا
چندر بوس اور درگا دیوی کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ کارنس پر پھولوں کا باس
پڑا تھا۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پلنگ پر ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ پا
کے پاس ہی کرسی پر ایک بوڑھی بنگالی عورت چپ چاپ بیٹھی تھی۔ میرے لئے فوراً پلنگ
کے پاس کرسی ڈال دی گئی۔

پلنگ کی مسہری یا مچھر دانی جو کچھ بھی وہ تھی اٹھی ہوئی تھی۔ ایک طرف کھڑکی
تھی آگے سفید پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لڑ
کو دیکھا۔ لڑکی عام بنگالی لڑکیوں کی طرح دبلی پتلی تھی مگر اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ ماتھے
بندیا لگی تھی۔ اس کے آدھے جسم پر سفید چادر تھی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی ساڑ
پہن رکھی تھی اور بلاؤز کا رنگ گہرا کاسنی تھا۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں
چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ کرسی کھینچ کر اس کا باپ بھی میرے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ ا
بیٹی کو دیکھتے ہوئے غم زدہ آواز میں کہنے لگا۔

”ہے بھگوان! میری بچی کو اچھا کر دے۔“

اس کی بیوی ذرا پیچھے دوسری چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے دل میں ا
تعالیٰ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

”یا اللہ! تو جانتا ہے کہ مجھے ان لوگوں سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ یہ لوگ اس خیا
سے مجھے یہاں لے آئے ہیں کہ میں ان کی بیٹی کا علاج کر دوں گا۔ میں نہ تو کوئی ڈاکٹر
ہوں نہ مجھے جوتش کا علم آتا ہے۔ میری یہ دعا ضرور ہے کہ اے پاک پروردگار اس
کے گناہ معاف فرما دے اور اسے اچھا کر دے۔“

اس دوران لڑکی کے باپ نے چادر کے نیچے سے اس کا ایک ہاتھ نکال کر آگے کر دیا
اور بولا۔

”مہاراج! دیکھیں۔ آپ کو بھگوان نے بڑا گیان دیا ہوا ہے۔ بھگوان کے واسطے میری
بچی کی ریکھائیں دیکھ کر اس کی بیماری کا کوئی اپائے بتا دیں۔ میری بچی کو اچھا کر دیں۔“

اس غم زدہ بنگالی باپ نے مجھے خواہ مخواہ امتحان میں ڈال دیا تھا۔ میں لڑکی کی ہتھیلی کی
لکیریں دیکھ رہا تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان لکیروں کا کیا مطلب نکل سکتا ہے۔
غم نصیب ماں اور باپ کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ ماضی
کے عہد میں روشن بزرگ کے سامنے میں عہد کر چکا تھا کہ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں
بولوں گا اور میرا ہر فعل اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو گا۔

جب میں لڑکی کی ہتھیلی کی لکیریں دیکھ رہا تھا تو میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ بے
ہوش لڑکی کا باپ' اس کی ماں میری طرف انتہائی رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
جیسے انہیں یقین ہو کہ میرے پاس ان کی بیمار بیٹی کا علاج موجود ہے۔ میں نے ہاتھ کی
لکیریں دیکھ کر کہہ دیا۔

”اس کی ریکھائیں بتا رہی ہیں کہ یہ جلد اچھی ہو جائے گی۔ آپ ڈاکٹروں کا علاج
جاری رکھیں۔“

بچی کے باپ اور ماں کے چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔ ان کو یقین تھا کہ میں لڑکی کا
ہندو جوتشیوں کی طرح الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر زائچہ بنا دوں گا اور پھر کافی دیر کی سوچ
بچار کے بعد انہیں لڑکی کا حال اور اس کی بیماری کا کوئی علاج بتاؤں گا۔

میں نے دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھا۔ ابھی چار بجنے میں بہت وقت تھا۔ میں
مزید کچھ وقت گزارنے کے لئے ان سے لڑکی کی بیماری کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں
کرتا رہا۔ مگر میں نے دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ کے چہروں پر چھائی ہوئی افسردگی بڑھتی جا
رہی تھی۔ اس دوران لڑکی کی ماں نے دو تین بار اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو
ساڑھی کے پلو سے پونچھے۔ میرے دل پر اس عورت کی غم نصیب ماں کا بڑا اثر ہوا۔ مگر

میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بس دل میں دعا کرتا رہا کہ اے رب العالمین
سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ تو بے شک وشبہ قادر مطلق ہے۔ اس بچی کو شفا عطا
دے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں بڑی غم ناک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکی کا باپ
طرف ہاتھ جوڑے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ اس نے میری طرف سے مایوس
چادر کے اندر کر دیا تھا۔ ذرا پیچھے لڑکی کی بنگالی ماں بھی سر جھکائے سوگوار بیٹھی
بوڑھی بنگالن جو غالباً نوکرانی تھی چٹائی پر خاموش بیٹھی تھی۔ کمرے کی فضا میں
خاموشی کے ساتھ ایسی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جیسے صبح کے وقت کسی نے
کمرے میں قنوج کی تیز خوشبو والی اگربتیاں سلگائی ہوں۔ ان اگربتیوں کی خوشبو ابھی
فضا میں موجود تھی۔ میں نے گہرا سانس لیا تو مجھے فضا میں ایک اور خوشبو بھی محسو
ہوئی۔ میری چھٹی حس ایک دم بیدار ہو گئی۔ میرا خیال فوراً چندریکا کی بدروح کی طر
چلا گیا کہ کہیں یہ اس کی بو تو نہیں؟ کہیں وہ پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لئے تو نہیں آگ
لیکن یہ وہ خوشبو نہیں تھی۔ اس کی بدروح جب آتی تھی تو لوبان کی بو آنے لگتی تھی۔
کوئی خوشبو تھی۔ پھر میرا خیال اپنی شہید بہن کی طرف چلا گیا۔ کہیں اس کی روح تو نہ
آگئی۔ میری شہید بہن کی روح جب بھی آتی تھی تو اس کے آنے سے چنبیلی کے پھول
کی مہک پھیل جاتی تھی۔ یہ چنبیلی کے پھولوں کی بھی خوشبو نہیں تھی۔ یہ کوئی او
خوشبو تھی۔ بڑی کلاسیکل' قدیم اور گہری مگر انتہائی لطیف۔ پھر اچانک مجھے کسی لڑکی
جانی پہچانی آواز آئی۔ اس نے مجھے میرا نام لے کر بلایا تھا۔ میں نے چونک کر بے
لڑکی کی طرف دیکھا کہ کہیں اسے ہوش تو نہیں آگیا۔ مگر اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟

جیسے ہی میری نظریں اوپر اٹھیں میں نے بے ہوش لڑکی کے پلنگ کے پاس سرہا
کی طرف ماضی کے زمانے میں مجھے گائیڈ کرنے والی لڑکی سوسن کو دیکھا کہ اس کا
پرانے زمانے والا سیاہ لباس ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے وادی بابل میں مقیم سمی
قوم کی کنواری لڑکیاں پہنا کرتی تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں میں اسی طرح سوسن کے

سجے ہوئے تھے۔ اس کے پرکشش نقوش والے سانولے چہرے پر معصوم مسکراہٹ
میں نے فوراً بنگالی بابو اور اس کی بیوی کی طرف دیکھا کہ ان لوگوں نے تو سوسن کو
یکھا۔ سوسن بالکل ویسی ہی تھی جیسے میں اسے ماضی کے زمانے میں چھوڑ کر آیا تھا۔
نے اپنی سمیری زبان میں کہا۔

''ان لوگوں کی طرف سے بے فکر رہو۔ یہ نہ مجھے دیکھ سکتے ہیں نہ میری آواز سن
سکتے ہیں تم بھی اپنی آواز میں مجھ سے بات نہ کرنا۔ جو کہنا چاہو اپنے دل میں کہہ لینا میں
لوں گی۔''

میں نے کہا۔

''سوسن بہن! تم کیسے آگئیں؟ خیریت تو ہے؟''

یہ جملہ میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ سوسن تک میرا جملہ پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی
آواز میں اور قدیم سمیری زبان میں کہا۔

''میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارے دل میں انسانی ہمدردی' خاص طور
اولاد سے ماں باپ کی محبت کا جو جذبہ بیدار ہوا ہے قدرت نے اسے پسند کیا ہے۔ اور
تمہیں یہ خوش خبری سنانے آئی ہوں کہ تمہاری وجہ سے اس لڑکی کی بیماری ہمیشہ کے
لئے ختم ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ قدرت خداوندی کی مرضی سے ہو گا لیکن اس کا وسیلہ
اور تم بنو گے''

میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے کہا۔

''سوسن بہن! جلدی سے بتاؤ قدرت خداوندی کی طرف سے یہ لڑکی کیسے اچھی ہو گی
اور اس کے غم نصیب ماں باپ کی خوشیاں کیسے واپس لوٹیں گی؟''

سوسن کہنے لگی۔

''تم اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالو گے تو تمہیں وہاں ایک پڑیا ملے گی۔ اس پڑیا
سوسن کا ایک خشک پھول ہو گا۔ یہ پھول بے ہوش لڑکی کو سنگھاؤ وہ ہوش میں آجائے
اور پھر کبھی اس کے سر میں درد نہیں ہو گی۔ خدا کی طرف سے اسے شفا مل جائے

گی۔"

میں نے کہا۔

"سوسن بہن! میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں؟"

سوسن نے کہا۔

"ہر حال میں صرف اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ کیونکہ بیمار انسان اپنی غلطیوں کی وجہ
ہوتا ہے۔ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور شفا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہ
ہے۔"

اتنا کہہ کر سوسن میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

یہ سب کچھ یوں سمجھ لیں کہ ایک دو سیکنڈ کے اندر اندر ہی ہو گیا تھا۔ میں نے ا
جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں کاغذ کی ایک پڑیا ملی۔ میں نے اسے باہر نکال کر کھولا
اس میں سوسن کا خشک نیلا پھول تھا جو مرجھانے اور خشک ہونے کے بعد سیاہ ہو رہا تھ
مجھے جیب سے پڑیا نکالتے ہوئے لڑکی کا غم زدہ باپ اور ماں بڑی پر اشتیاق نظروں
دیکھنے لگے تھے۔ انہوں نے نہ تو سوسن کو دیکھا تھا نہ اس کی باتیں ہی سنی تھیں۔ وہ صر
مجھے جیکٹ کی جیب سے پڑیا نکال کر اسے کھولتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور قدرتی طو
یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ان کی بیمار زدہ بے ہوش لڑکی کے لئے کوئی خاص دوائی نکال ر
ہوں۔ میں نے دل میں کہا۔

"یا اللہ! یہ سب کچھ تیری رضا اور تیری مرضی سے اگر ہو رہا ہے تو پھر اس خشک
مردہ پھول میں اثر ڈال دے کہ لڑکی کو ہوش آجائے۔"

میں نے لڑکی کے باپ پنکج بابو سے کہا۔

"ایک آخری کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ یہ خشک پھول مجھے ایک بزرگ نے دیا تھا
وہ مسلمان بزرگ تھا۔ اس پھول کو لڑکی کے ناک کے آگے رکھ کر سنگھاؤ۔ دیکھو۔ پھر
ہوتا ہے۔"

لڑکی کی ماں اور بنگالی نوکرانی بھی اٹھ کر پلنگ کے پاس آگئیں۔ پنکج بابو نے

سمیت خشک پھول میرے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ اپنی بیٹی کے چہرے کے قریب گیا اور پڑیا
والے کاغذ پر سے خشک پھول بڑی احتیاط کے اٹھایا اور بے ہوش اوما کماری کے ناک کے
قریب لے جا کر اسے سنگھایا۔ چار پانچ سیکنڈ کے بعد بے ہوش لڑکی نے آنکھیں کھول
دیں۔ غم زدہ ماں باپ کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ میں نے سوسن کا خشک پھول پنکج
بابو کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔

"پنکج بابو! تمہاری لڑکی اچھی ہو گئی ہے"

وہ تو میرے قدموں پر گر پڑا۔ اوما کماری بالکل ہوش میں آچکی تھی۔ اس نے مسکرا
کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ماتا جی!"

ماں اس سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے اپنے باپ کو پتا جی کہہ کر پکارا۔

"پتا جی! میں بالکل اچھی ہو گئی ہوں میرے سر میں ذرا بھی درد نہیں ہوتا"

گھر کی سوگوار فضا ایک دم مسرتوں کے گہوارے میں جیسے تبدیل ہو گئی۔ ماں باپ اپنی
بیٹی کی بلائیں لے رہے تھے۔ بار بار میرے ہاتھ چوم رہے تھے۔ پنکج بابو نے لڑکی سے
کہا۔

"بیٹی یہ سب کچھ ان رشی مہاراج کی دوا سے ہوا ہے۔ ہے بھگوان!"

میں نے دل میں خداوند کریم کا شکر ادا کیا کہ اس کی نظر کرم سے نہ صرف یہ کہ غم
زدہ گھر کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں اور ماں باپ کے سینوں میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی بلکہ میری
عزت بھی رہ گئی تھی۔ اب جناب میری وہاں پیر مرشدوں والی آؤ بھگت شروع ہو گئی۔
اوما کماری یعنی پنکج بابو کی اکلوتی بیمار بیٹی صحت مند ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پہلے وہ ہوش
میں آتی تھی تو سر درد کی شدت کی وجہ سے چیخیں مارتی اور دوبارہ بے ہوش ہو جاتی
تھی۔ اب وہ بالکل تندرست تھی اور مسکراتے ہوئے اپنے ماں باپ سے باتیں کر رہی
تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر میرا بھی شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"مہاراج! آپ بڑے مہان ہیں کہ آپ کی وجہ سے میرا روگ ہمیشہ کے لئے جاتا

رہا۔"

میں اب وہاں سے کھسکنے کا سوچ رہا تھا۔ میں نے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ سوچا باہر کہاں سڑکوں پر پھروں گا۔ خوامخواہ کسی خفیہ پولیس والے نگاہوں میں نہ آجاؤ۔ یہ جگہ ٹارگٹ کے قریب بھی ہے۔ بہتر ہے کہ کم از کم تین ساڑھے تین بجنے تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ یہاں تو کسی خفیہ پولیس والے کا خطرہ نہیں تھا۔ جگہ بڑی محفوظ تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں کھانا لگا دیا گیا۔ بڑا پر تکلف کھانا تھا۔ اوما کمار اگرچہ ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتی تھی مگر اس کے باپ نے کہا۔

"نہیں بیٹی ابھی پلنگ پر ہی آرام کرو۔"

میری تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔ میں بھی چپ تھا۔ دیوار والے کلاک دیکھ لیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پورے ساڑھے تین بجے مجھے وہاں سے اپنے ٹارگٹ کی طرف نکل جانا ہے۔ پھر شاید ساری زندگی ان لوگوں سے ملاقات نہیں ہوگی۔ میں ان لوگوں کی تعریفیں ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔

پنکج بابو کے گھر کھانا وغیرہ کھانے اور باتیں کرنے میں وقت تیزی سے گزر گیا۔ جب کلاک نے ٹھیک ساڑھے تین بجائے تو میں چلنے کے لئے اٹھا۔ پنکج بابو کہنے لگے۔

"مہاراج! آپ جب تک کلکتے میں ہیں ہمارے ہاں ہی ٹھہریں۔ یہ ہمارے بڑے سوبھاگ ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ ہاں۔ میں کبھی کبھی موقع نکال کر آپ کے پاس آجایا کروں گا۔ ابھی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

وہ لوگ مجھے چھوڑنے مکان کے برآمدے سے بھی باہر تک آئے۔ آخر میں نے انہیں نمسکار کیا اور سڑک پر اس طرف چلنے لگا جہاں سے بڑی سڑک فوجی فاؤنڈیشن کی طرف مڑ جاتی تھی۔

کلکتے کے ابر آلود آسمان پر دن کی روشنی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ راستہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ بڑی سڑک پر آکر مجھے ایک آدمی سے فوجی فاؤنڈیشن کا دفتر پوچھنا پڑا۔ میں بائیں جانب ایک سڑک پر مڑ گیا۔ وہاں سے دور مجھے فوجی فاؤنڈیشن کی عمارت نظر آنے لگی۔ میں فٹ پاتھ پر بڑے آرام سے چل رہا تھا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ دفاتر میں چار بجے چھٹی ہوتی تھی اور میرے اندازے کے مطابق ابھی چار بجنے میں دس پندرہ منٹ باقی تھی۔ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ کشمیری مسلمانوں کا قاتل درگاداس مجھے

شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ اس لئے میں فوجی فاؤنڈیشن کی عمارت کے پاس جو بس سٹاپ تھا اس کے شیڈ کے نیچے جا کر خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔

اس دوران ایک دو بسیں آئیں اور مسافروں کو اتار کر دو تین مسافر لے کر آ[گے] نکل گئیں۔ اتنے میں فوجی فاؤنڈیشن سے گیٹ میں لوگ باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ دفاتر م[یں] چھٹی ہو گئی تھی۔ میں بنچ پر سے اٹھ کر شیڈ کے کونے میں ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ جہا[ں] سے میں صوبیدار درگاداس کو بس میں داخل ہوتے ہوئے آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ آ[ج] میرا خیال محض اس کی چہرہ شناسی کرنی تھی۔ لیکن میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ اگ[ر] موقع مل گیا تو اس کا کام تمام کر ڈالوں گا۔ اس معاملے کو دوسرے دن پر نہیں اٹھاؤں گا۔ دفتر کے لوگ چھٹی کے بعد سائیکلوں موٹر سائیکلوں وغیرہ پر نکل کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ کچھ کلرک ٹائپ کے بابو بس سٹاپ کے شیڈ میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میری نگاہیں درگاداس کو تلاش کر رہی تھیں۔

وہ مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک بس آئی۔ مسافر اس میں سوار ہوئے اور وہ چل دی۔ کچھ اور لوگ آکر سٹاپ پر کھڑے ہو گئے۔ دوسری بس آئی وہ لوگ بھی بس میں سوار ہوئے اور بس چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ درگاداس شاید سب سے آخر میں دفتر سے نکلتا ہو گا۔ میں شیڈ کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں فاؤنڈیشن کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے احتیاطاً زہریلی بال پوائنٹ پنسل کو اپنے سیدھے ہاتھ والی جیب میں رکھ لیا تھا۔ تاکہ اگر حملہ کرنا پڑ جائے تو پنسل نکالنے میں آسانی ہو۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ فاؤنڈیشن کے گیٹ کو بند کر دیا گیا۔ اب کوئی کوئی ملازم چھوٹے گیٹ میں سے نکلتا دکھائی دے جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ درگاداس شاید آج دفتر نہیں آیا۔ ورنہ اب تک اسے باہر آ جانا چاہیے تھا۔ پھر سوچا کہ اس پر موت کا خوف سوار ہے۔ وہ ضرور اندھیرا ہو جانے کے بعد دفتر سے نکلتا ہو گا۔

تھوڑی دیر بعد شام کا اندھیرا چھانے لگا۔

اس دوران میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو فاؤنڈیشن کے گیٹ کے قریب ہی ایک

سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھ سے اس کا فاصلہ کوئی بیس پچیس قدم کا ہو گا۔ اس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں کھدر کا تھیلا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ زیادہ عمر کا لگتا تھا۔ میں اس کی طرف توجہ نہ دیتا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی نظروں میں ہوں۔ اس نے دو تین بار مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تو میں نے سوچا کہ مجھے یہاں سے چل دینا چاہئے۔ آج درگاداس یقیناً دفتر نہیں آیا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں الٹا کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ یہ سوچ کر میں بنچ سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ میں نے فاؤنڈیشن کے چھوٹے گیٹ میں سے یکے بعد دیگرے چار آدمیوں کو نکلتے دیکھا۔ دو آدمی آگے آگے تھے۔ ان کے درمیان ایک درمیانے قد کاٹھ کا گول مٹول سا آدمی تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ گیٹ سے باہر آتے ہی دو درمیان والے آدمی کے دائیں بائیں ہو گئے اور تیسرا آدمی درمیان والے آدمی کے عقب میں ہو کر چلنے لگا۔ ان تینوں کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ تینوں آدمی درمیان والے آدمی کی حفاظت پر مامور ہیں اور باڈی گارڈ ہیں۔ میرے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی۔

یہ لوگ سیدھے بس سٹاپ کی طرف آ رہے تھے۔ جب ذرا قریب آئے تو میں نے صوبیدار درگاداس کو صاف پہچان لیا۔ اس کی مونچھیں اگرچہ غائب تھیں مگر چہرہ بالکل وہی تھا جو میں نے اس کی تصویر میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے باڈی گارڈز کے درمیان بڑا محتاط ہو کر دائیں بائیں دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو مسافر ظاہر کرتے ہوئے بنچ کے کونے میں بیٹھا رہا۔ یہ لوگ شیڈ میں آکر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ تینوں باڈی گارڈز نے درگاداس کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان محافظوں کے ہاتھوں میں کوئی پستول وغیرہ نہیں تھا لیکن یہ یقینی بات تھی کہ ان کی جیبوں میں پستول ضرور تھے۔

بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اتنے میں وہ آدمی جو گیٹ کے پاس کھڑے سکوٹر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا شیڈ میں آ گیا۔ وہ میرے بالکل ساتھ بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا اور بنگلہ میں کوئی سوال کیا۔ میں بنگلہ زبان نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے اردو میں کہا۔

"مجھے بنگلہ نہیں آتی"

اس نے اردو میں پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

اس کا مطلب تھا کہ میں کس شہر سے آیا ہوں۔ میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"امرتسر سے آیا ہوں۔ کلکتے کی سیر کرنے"

وہ بولا۔

"یہ کوئی سیر کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں تم ڈیڑھ گھنٹے سے بیٹھے کس کا انتظار کر رہے ہو؟"

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا

"تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟"

ہماری گفتگو سن کر صوبیدار درگاداس اور اس کے باڈی گارڈز بھی ہماری طرف دیکھنے لگے۔ صوبیدار درگاداس کو تو پہلے ہی اپنے پیچھے لگے ہوئے حریت پرستوں کا خوف رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے سختی سے پنجابی میں کہا۔

"تم امرتسر میں کہاں رہتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔ میں خود امرتسر کا رہنے والا ہوں"

میں نے کہا۔

"چوک پراگ داس میں رہتا ہوں۔ اور کیا پوچھنا چاہتے ہو"

اتنے میں بس آگئی۔ وہاں ہمارے سوا اور کوئی مسافر نہیں تھا۔

درگاداس نے حکم دینے کے انداز میں مجھ سے کہا۔

"ہمارے ساتھ چلو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا تم کون ہو اور یہاں کس لئے بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ کشمیری مسلمانوں کے درندہ صفت قاتل درگاداس کی موت کا وقت آگیا ہے۔ جو آدمی میری نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے درگاداس کو بتایا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔ درگاداس کے باڈی گارڈز نے اسی وقت

مجھے قابو کر لیا اور گھسیٹ کر بس میں لے گئے۔ بس کے دروازے والی پچھلی سیٹ ساری خالی تھی۔ انہوں نے وہاں مجھے اپنے درمیان پکڑ کر بٹھا لیا۔ درگاداس میرے بالکل ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو باڈی گارڈ تھے۔ دوسری جانب ایک باڈی گارڈ تھا اور خفیہ پولیس والا اس کے بعد سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بس چل پڑی تو میں نے کہا۔

"تم لوگ خوا مخواہ مجھے پریشان کر رہے ہو۔ میں اخبار کا آدمی ہوں۔ تمہاری خبر کل اخبار میں آجائے گی"

صوبیدار درگاداس پر میری اس دھمکی کا اثر نہ ہوا۔ اس نے میری پسلیوں میں کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"آرام سے بیٹھے رہو۔ تھانے چل کر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم کس اخبار کے آدمی ہو"

بس شام کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے صوبیدار درگاداس کو ہلاک کر کے بس سے فرار ہونے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ میرا مقابلہ زیادہ آدمیوں سے تھا۔ تین اس کے باڈی گارڈ تھے جن کے پاس ضرور پستول بھی تھے۔ ایک خفیہ پولیس والا آدمی تھا اور ایک خود صوبیدار درگاداس تھا جو فوج کا تربیت یافتہ فوجی تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ پولیس سٹیشن پہنچنے سے پہلے پہلے میں ان لوگوں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور کشمیری مسلمانوں کے قاتل سے بھی بے گناہ کشمیریوں کا خون کا بدلہ لے لوں گا۔ مگر مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ اس علاقے کا پولیس سٹیشن کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ ایک باڈی گارڈ نے میرا دایاں بازو پکڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اب میرا بازو پکڑنے کی کیا ضرورت ہے میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔"

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ درگاداس نے مجھے بے رحم گہری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

"مجھے تم پاکستانی جاسوس لگتے ہو۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے اس دوران اپنا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا اور ہلاکت خیز
زہریلا بال پوائنٹ میری گرفت میں تھا۔ درگاداس نے ایک اور حکم دیا

"تمہاری جیب میں کیا ہے۔ باہر نکالو"

باڈی گارڈ میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جیب سے بال
پوائنٹ پنسل نکال کر انہیں دکھائی اور کہا۔

"یہ بال پوائنٹ پنسل ہے۔ میرے پاس کوئی پستول نہیں ہے۔ میں اخبار نویس
ہوں۔ کوئی اٹنک وادی نہیں ہوں"

"مجھے دکھاؤ"

درگا داس نے بال پوائنٹ لے کر اسے اوپر نیچے غور سے دیکھا۔ میں نے اس کے
ہاتھ سے پنسل پکڑ لی اور کہا۔

"قلم اخبار نویس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ یہ مجھے دے دو"

اس وقت کوئی بس سٹاپ آرہا تھا۔ بس کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ میں نے جو کچھ کرنا
تھا۔ اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ مجھے فوراً کمانڈو اٹیک کرنا تھا۔ اب مجھے یا تو
ٹارگٹ مارنا تھا اور یا ٹارگٹ مارنے کے بعد خود بھی مرنا تھا۔ بال پوائنٹ پنسل میرے
سیدھے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ہاتھ بغلوں میں دے دیئے۔ اس طرح میرے سیدھے
ہاتھ میں پکڑی ہوئی بال پوائنٹ پنسل کی نوک میرے بائیں جانب بیٹھے ہوئے صوبیدار
درگاداس کی پسلیوں کے بالکل قریب تھی۔ سب سے پہلے مجھے کشمیری مسلمانوں کے اس
قاتل کو ہی ہلاک کرنا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بال پوائنٹ کی خفیہ ٹیوب میں
چھوٹی چھوٹی سوئیاں میگزین کی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے لگی ہوئی ہیں وہ دنیا کے
سب سے زیادہ ہلاکت خیز زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور بٹن دباتے ہی سوئی بال پوائنٹ سے
گولی کی طرح فائر ہو کر صوبیدار درگا داس کی پسلیوں میں اتر جائے گی اور اس کی اسی
وقت موت واقع ہو جائے گی۔

جیسے ہی بس اپنے سٹاپ پر ایک دھچکے سے رکی میں نے بال پوائنٹ کا بٹن دبا دیا۔ اس

سوئی فائر ہو کر درگا داس کی پسلیوں میں اتر چکی تھی۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد درگا
داس آگے کو گر پڑا۔ سب یہی سمجھے کہ وہ بس کے دھچکے سے توازن برقرار نہیں رکھ سکا
اور گر پڑا ہے۔ فوراً باڈی گارڈ اسے اٹھانے کے لئے جھکا بال پوائنٹ میرے ہاتھ میں
تھی۔ میں نے بھی یہ ظاہر کیا کہ جیسے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور ایک طرف کو
لڑھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی دائیں جانب والے باڈی گارڈ پر دوسرا فائر کر
دیا۔ اس بال پوائنٹ سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے تک فائر ہو سکتا تھا۔ دوسرا باڈی گارڈ
بھی منہ کے بل گرا تو وہاں افراتفری سی مچ گئی۔ میں بھی درگاداس کو سنبھالنے لگا۔
تیسرے باڈی گارڈ نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور جیب سے پستول نکال لیا۔ اس
دوران یہ معلوم ہو چکا تھا کہ صوبیدار مرگیا ہے۔ جیسے ہی پہلے باڈی گارڈ نے چلا کر کہا۔

"صوبیدار مرگیا ہے"

میں نے تیسرے باڈی گارڈ پر فائر کر دیا۔ خدا جانے سائی نائیڈ زہر کس نے ایجاد کیا
تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ زہریلی سوئی جسم کے اندر جاتے ہی آدمی کس طرح کٹے
ہوئے درخت کی طرح گر پڑتا ہے۔ تیسرے باڈی گارڈ کے گرتے ہی میں نے بس میں سے
باہر چھلانگ لگا۔ صرف وہ باڈی گارڈ جو سب سے پہلے درگا داس کو اٹھانے کے لئے جھکا تھا
اور خفیہ پولیس والا آدمی ہی زندہ بچے تھے۔ میں اندھیرے میں فٹ پاتھ پر بھاگا۔ پیچھے سے
مجھ پر پستول کا فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں پکڑو پکڑو کا شور مچ گیا۔ مجھے اپنے پیچھے
دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ سڑک پر
بتیاں روشن تھیں جس کی وجہ سے میں دوڑتے ہوئے نظر آرہا تھا۔ پیچھے سے ایک اور فائر
ہوا۔ گولی تیز سیٹی کی آواز کے ساتھ میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ اب روشنی میں
دوڑنا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ میری ایک جانب کشادہ سڑک تھی جس پر ٹریفک جاری
تھی۔ دوسری جانب درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ میں فٹ پاتھ پر سے جھاڑیوں میں کود
گیا۔ گرتے ہی اٹھا اور جدھر میرا منہ تھا اسی طرف دوڑ لگا دی۔ جھاڑیاں درخت اندھیرا
پھر روشنی پھر اندھیرا۔ پیچھے پکڑ لو پاکستانی جاسوس پکڑ لو۔ قاتل ہے۔ پکڑو۔ یہ سب کچھ

دیکھتا اور سنتا میں دوڑتا جا رہا تھا۔ آگے پھر جھاڑیاں آگئیں میں ان میں گھس کر دو
طرف ایک چھوٹی سڑک تھی اس پر نکل آیا۔ مجھے دور نزدیک مکانوں کی روشنیاں
آئیں۔ میرے پیچھے شور کچھ دور ہو گیا تھا مگر خطرہ برابر میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔
ہوائی فائر ہوئے اور آوازیں ایک بار پھر میرے قریب آنے لگیں۔ میں نے اپنے حوا
درست کرتے ہوئے سڑک کو غور سے دیکھا۔ میں نے فوراً اس سڑک کو پہچان
یہ وہی سڑک تھی جس پر اوماکماری کے باپ پنکج بابو کا گھر تھا۔ لوگوں کی آوازیں بہت
تھیں۔ میں سڑک کے کنارے کنارے اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگا۔ پنکج بابو کا گھر میں
پہچان لیا تھا۔ میں فوراً مکان کے چھوٹے سے احاطے میں گھس گیا۔ گھبراہٹ میں
لوگوں کے پاس جانے سے انہیں بھی شک پڑ سکتا تھا اور لوگ مجھے تلاش کرتے کرتے
مکان میں بھی آ سکتے تھے۔

پنکج بابو کے مکان کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ میں اندھیرے میں ناریل
درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ میرے پیچھے جو لوگ لگے ہوئے
اگر وہ میری تلاش میں پنکج بابو کے مکان میں آئے تو میں موقع پا کر باہر ہی باہر سے فرار
جاؤں گا۔ اس دوران میں نے گہرے گہرے سانس لینے شروع کر دیئے تا کہ میرا سا
نارمل ہو جائے اور اگر مجھے گھر میں داخل ہونا پڑے تو کسی کو میرا پھولا ہوا سانس دیکھ
شک نہ پڑے۔ پنکج بابو کے مکان کے آگے جو کچی سڑک گزرتی تھی اس پر کافی دور
کے کھمبے لگے تھے اور سڑک ویران ویران تھی۔ ایک مکان میں سے بنگلہ میوزک کی
ہلکی آواز آ رہی تھی۔ پنکج بابو کے گھر میں بھی خاموشی چھائی تھی۔ سڑک پر ایک طر
سے لوگوں کے تیز تیز بنگلہ اور اردو میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔
اندھیرے میں درخت کے پیچھے اور سمٹ گیا۔ احاطے کی تین فٹ اونچی دیوار کے اوپر
سامنے والے مکانوں کی مدھم روشنیوں میں سڑک پر آتا جاتا آدمی مجھے نظر آ سکتا تھا۔

آوازیں قریب آتی گئیں۔ کسی نے اردو میں کہا۔

"وہ یہیں کہیں چھپا ہو گا۔"

پھر کسی نے اونچی آواز میں بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ میں نے آواز پہچان لی۔ یہ
صوبیدار درگاداس کے ایک باڈی گارڈ کی آواز تھی۔ کسی نے کہا۔

"ہم نے سارا علاقہ گھیرے میں لے لیا ہے۔ پولیس گارڈ پہنچ رہی ہے۔"

اب میرا وہاں سے نکل کر کسی طرف بھاگنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں پکڑا جا سکتا تھا۔ اب
میں صرف ایک کشمیری یا ان لوگوں کے بقول پاکستانی جاسوس ہی نہیں تھا بلکہ ایک ریٹائرڈ
انڈین آرمی صوبیدار اور اس کے باڈی گارڈ کا قاتل بھی تھا۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے
سڑک پر سے گزر گئے۔ پیچھے سے بھی لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی خیال تھا
کہ باہر کی آوازیں سن کر اگر پنکج بابو مکان سے نکل آیا اور اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو
معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میں اب کسی طریقے سے پنکج بابو
کے مکان کے اندر چلا جاؤں۔

میرا سانس بالکل نارمل ہو چکا تھا۔ میں نے درخت کے پیچھے اندھیرے میں چھپے چھپے
اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست کیا۔ ڈاڑھی پر بھی ہاتھ پھیرا اور سڑک پر نگاہ ڈالی۔
مکان کے آگے سڑک خالی تھی۔ لوگوں کی آوازیں یا تو آگے سے آ رہی تھیں اور یا پیچھے
سے آ رہی تھیں۔ بڑا مناسب موقع تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ اگر برآمدے والے
کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوا تو مجھے دستک دے کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنا پڑے گا
جو میرے لئے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی
نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ دروازے پر دستک دے کر دوڑ کر درخت کے پیچھے آ کر
چھپ جاؤں گا اور جب اندر سے کوئی دروازہ کھولے گا تو اندھیرے میں سے نکل کر
سامنے آ جاؤں گا۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ پولیس گارڈ بھی پہنچنے والی ہے اور جو لوگ اس
سڑک پر آگے پیچھے موجود ہیں ان میں سے کوئی اچانک سامنے نہ آ جائے۔

ان تمام خطرات کے باوجود میں درخت کے پیچھے سے اٹھ کر برآمدے میں آیا اور
آتے ہی سب سے پہلے بند دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ
دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند

کر دیا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ جس پلنگ پر میں پنکج بابو کی بیٹی اوماکماری کو
مند حالت میں لیٹا چھوڑ گیا تھا وہ پلنگ خالی تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے
کام یہ کیا کہ کمرے کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر میں نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔
"پنکج بابو؟ اوما جی؟"
ساتھ والے کمرے کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا۔ پردہ ایک طرف ہٹا اور
کماری اپنے بالوں میں کنگھی کرتی نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر
عقیدت سے نمسکار کیا اور کرسی پر سے تولیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔
"بیٹھئے مہاراج! بابو جی میرے لئے کافی کاٹن لینے گئے ہیں۔ ماتا جی رسوئی میں ہیں
میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اوماکماری نے کنگھی کارنس پر رکھ کر سر کر ساڑھی کے پلو
ڈھانپا اور مسکراتے ہوئے بولی
"مجھے انگلش کافی بہت پسند ہے۔ نوکر گھر پر نہیں تھا۔ پتا جی خود لینے چلے گئے
آپ بیٹھئے میں ماتا جی کو بلاتی ہوں۔"
اس دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے لئے اب اس علاقے
صرف یہی ایک گھر ایسا تھا جہاں مجھے پناہ مل سکتی تھی لیکن اس کے واسطے ایک خا
حکمت عملی کی ضرورت تھی جو اسی وقت میرے ذہن میں آگئی تھی۔ میں نے اوماکمار
روکتے ہوئے کہا
"نہیں اوما جی! ماتا جی کو نہ بلاؤ یہاں کسی کو سوائے تمہارے نہیں آنا چاہیے۔
شبھ شگن ہوا ہے کہ گھر میں آتے ہی مجھے تم مل گئی ہو۔ اب تمہاری رہی سہی بیماری
ختم ہو جائے گی میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہارا زائچہ بنایا تھا۔ میں نے دیکھا ہے
تمہارے گرہ پر برہسپتی کا منحوس سایہ پھر پڑنے لگا ہے۔ میں بھاگ کر تمہارے گھر
اس وقت مجھے ایک الگ کمرے کی ضرورت ہے جہاں بیٹھ کر میں ایسے منتروں کا
کروں گا کہ تمہارے اوپر سے برہسپتی کا منحوس سایہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔
اس کی شرط یہ ہے کہ تمہارے سوا اس گھر میں کوئی دوسرا نہ ۔۔ی شکل دیکھے اور

م از کم آدھی رات تک کسی کو معلوم ہو کہ میں اس گھر میں خفیہ منتروں کا جاپ کر رہا
ہوں۔ تمہارے ماتا پتا اور نوکروں کو بھی پتہ نہ لگے کہ میں اس گھر میں کسی جگہ سمادھی لگا
کر بیٹھا ہوں"
اوماکماری میری پہلے ہی زبردست عقیدت مند تھی۔ اب اس نے سنا کہ میں اس کی
بیماری کو ہمیشہ کے لئے دور کرنے کے واسطے کچھ دیر کے واسطے روپوشی کی حالت میں
منتروں کا جاپ کرنے والا ہوں تو وہ جلدی سے مجھے مکان کے ایک سٹور روم میں لے
گئی۔ اس کمرے میں الابلا چیزیں پڑی تھیں۔ ایک جگہ میں نے وہیں سے دری اٹھا کر
بچھائی اور کہا۔
"بس اوما جی! اب تم جاؤ اور خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میں یہاں بیٹھا چلا
کاٹ رہا ہوں"
وہ بولی۔
"مہاراج آپ فکر نہ کریں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"
جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔
"اگر مجھے جانے کی ضرورت پڑی تو صبح ہوتے ہی خاموشی سے چلا جاؤں گا۔ تم باہر
سے تالا کنڈی نہ لگانا۔"
"اچھا مہاراج!"
وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔
میرے کان باہر گھر کی آوازوں پر لگے تھے۔ مجھے خطرہ تھا کہ ابھی باہر سے پولیس
دروازہ کھٹکھٹائے گی اور میرے بارے میں پوچھے گی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ باڈی گارڈوں اور
خفیہ پولیس والے نے میرا چہرہ دیکھا ہوا تھا اگر اس نے میرا حلیہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس
شکل صورت کا آدمی دو قتل کر کے ادھر کہیں چھپا ہوا ہے تو اوماکماری خوف کے مارے
پولیس کو میرے بارے میں نہ بتا دے۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ یہ اوماکماری کی
بیماری کا معاملہ ہے وہ ایسی غلطی ہرگز نہیں کرے گی۔ لیکن خدا نے بڑا کرم کیا۔ وہاں

پولیس ضرور آئی مگر پنکج کمار کے گھر پر کسی نے دستک نہ دی اور نہ میرے بارے
پوچھا۔ آدھی رات کے وقت سٹور روم کے دروازے پر بڑی ہی آہستہ دستک ہوئی۔ میں
جاگ رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ باہر سے اوما کماری کی دھیمی آواز آئی

"مہاراج! میں ہوں اوما"

میں نے کہا۔

"آجاؤ"

اوما کماری دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں پیالی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے آپ کی تپسیا خراب تو نہیں کر دی؟"

میں نے کہا۔

"نہیں اوما جی! میں منتروں کا جاپ ختم کر چکا ہوں۔ تمہیں بدھائی ہو۔ تمہارے
پر سے منحوس ستارے کا سایہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے۔"

وہ بڑی خوش ہوئی۔ پیالی میرے قریب رکھ کر جھکی اور میرے قدموں کو ہاتھ لگا
اپنے چہرے پر پھیرا اور بولی۔

"مہاراج! میں آپ کے لئے کافی بنا کر لائی ہوں"

میں نے پوچھا۔

"گھر میں کسی کو میرا پتہ تو نہیں چلا؟"

اس نے کہا۔

"بالکل نہیں مہاراج! میں نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ باہر پتا جی کہتے تھے
پولیس پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں کوئی قیدی جیل سے بھاگ گیا ہے شاید"

میں نے کہا۔

"ہو گا"

میں نے فوراً موضوع بدلا اور کہا۔

"اوما کماری! تم بڑی بھاگیہ وان ہوں۔ میں نے ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے کہ

تمہیں ساری زندگی کبھی سر میں درد نہیں ہو گا"

وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں تو آپ کی داسی ہوں۔"

میں نے سوچا کہ میرا یہاں سے منہ اندھیرے نکلنا بھی درست نہیں ہے۔ پولیس نے
ضرور چاروں طرف ناکہ بندی کر رکھی ہو گی۔ باہر نکلنے کی کوشش کی تو بہت ممکن ہے کہ
پکڑ لیا جاؤں۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی پنکج بابو کے مکان پر ہی ٹھہرا جائے۔ یہاں رک کر
حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ اگر حالات موافق ہوئے تو نکل جاؤں گا۔ میں نے اپنا مشن تو
مکمل کر ہی لیا تھا۔ اب مجھے واپس یا سری نگر کی طرف نکل جانا تھا یا ہنگلی دریا کے کنارے
اپنے کشمیری مجاہد شاہ دین کے خفیہ کیمپ گاہ میں جا کر اسے اپنے مشن کی کامیابی کی خبر کرنی
تھی اور اگر ہو سکے تو وہیں سے سری نگر کمانڈر شیروان کو بھی یہ اطلاع پہنچانی تھی میں نے
یہ سوچ کر اوما کماری سے کہا۔

"اوما جی! میں صبح کے وقت ناشتہ تمہارے گھر پر ہی کروں گا۔ لیکن میں یہ ظاہر کرنا
چاہتا ہوں کہ جیسے میں باہر سے آیا ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

اوما کماری پڑھی لکھی خاتون تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! سٹور کے پیچھے ایک دروازہ مکان کے پچھواڑے کھلتا ہے۔ آپ اس
طرف سے گزر کر مکان کے برآمدے والے دروازے سے گھر میں آسکتے ہیں۔ سب یہی
سمجھیں گے کہ آپ ابھی باہر سے آئے ہیں"

میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ میں دن نکلنے کے بعد گھر میں آؤں گا"

وہ میرے قدموں کو چھو کر چلی گئی۔ کافی نے میرے جسم میں چستی پیدا کر دی۔ نیند
پہلے بھی نہیں آرہی تھی۔ صبح تک میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اپنے اگلے مشن کے
بارے میں سوچتا رہا۔ آخر صبح ہو گئی۔ سٹور روم کے روشندان میں سے دن کی روشنی
اندر آنے لگی۔ باہر سڑک پر سے اخبار والے کی آواز بھی آئی۔ ایک سکوٹر تیزی سے گزر

گیا۔ درختوں پر بولتے پرندوں کی آوازیں بھی شروع ہو گئیں۔ جب ذرا دن نکل آ
میں خاموشی سے اٹھا۔ دروازہ کھولا اور باہر دیکھا۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جو بند
میں سٹور روم کے پیچھے آگیا۔ میں دبے پاؤں چل رہا تھا۔ مکان کے اندر سے اوماکما
اور اس کی ماتا جی کی باتیں کرنے اور نوکر کو بلانے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ
واقعی ایک دروازہ تھا۔ کنڈی کھول کر میں نے دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھولا۔ یہ م
کا پچھواڑا تھا جہاں مرغیوں کے ڈربے اور کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ مرغیاں ادھر ادھر دانہ
رہی تھیں۔ یہاں سے میں انتہائی احتیاط سے چلتا مکان کے برآمدے کی طرف آگیا۔
سے پہلے میں نے سڑک کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی پولیس کانسٹیبل نظر نہ آیا۔ میں
برآمدے میں آکر دروازے پر دستک دی۔ اوماکماری شاید میرا انتظار ہی کر رہی تھی۔
نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اونچی آواز میں بنگلہ زبان
اس نے ماتا جی اور پتا جی سے کہا کہ مہاراج آئے ہیں۔

میں جلدی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اوماکماری نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا
دی۔ دوسرے کمرے میں سے پنکج بابو اور رسوئی میں سے اوماکماری کی ماں نکل کر وہا
آگئی۔ انہوں نے مجھے عقیدت مندانہ نمسکار کیا۔ پنکج بابو نے میرے پاؤں چھوئے
اوماکماری جی نے بھی میرے پاؤں چھوئے۔ اس کی ماتا جی میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگیں
تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ یہ بزرگ عورت تھی۔ ایک شفیق ماں تھی۔ مجھے یہ گوارہ نہیں تھا
کہ وہ مجھ گناہ گار کے پاؤں کو ہاتھ لگائے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں اوماکماری کی خبر پوچھنے آیا ہوں کہ اب اس کا کیا حال ہے
پنکج بابو بولے۔

"مہاراج! آپ کی مہربانی سے بھگوان نے اسے بالکل اچھا کر دیا ہے۔ دیکھ لیں یہ
سے کتنی اچھی لگ رہی ہے"

اوماکماری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کبھی سر درد ہوئی ہی نہیں"

میں نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"بس۔ اب کبھی نہیں ہو گی سر درد۔"

پنکج بابو نے اوماکماری کی ماں سے کہا۔

"سروجنی جی! مہاراج کے لئے ناشتہ تیار کرو۔ رامو کو بھیج کر چوک میں سے کچوریاں
رس گلے بھی منگوا لو"

میں نے کہا۔

"پنکج بابو! تکلف بالکل نہ کریں۔ میں اس وقت کچوریاں اور رس گلے نہیں کھاؤں
معمولی ناشتہ کروں گا۔"

اوماکماری اور اس کی ماتا جی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔ پنکج بابو میرے پاس بیٹھ گیا۔
اس سے باہر کے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہمارا محلہ یہاں سے دور نہیں ہے۔ رات وہاں پولیس پھر رہی تھی۔ بھگوان جانے
کیا بات ہو گئی تھی۔ کیا یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی؟"

پنکج بابو کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھے تو معلوم نہیں۔ میں رات دیر سے گھر آیا تھا۔ سنیل جی کے ہاں شطرنج
کھیلتا رہا۔ صبح بازار گیا تو لوگوں نے بتایا کہ رات ملٹری فاؤنڈیشن کے پاس دو آدمیوں کا
خون ہو گیا ہے۔ پولیس علاقے میں قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔ میں نے اپنی سڑک کے
ناکے پر پولیس کی گاڑی بھی دیکھی ہے۔"

میں نے انجان بن کر کہا۔

"جب ہی میں بھی کہوں یہ پولیس رات کے وقت ہمارے علاقے میں کیا کر رہی
ہے۔ کیا کسی فوجی کا خون ہوا ہے؟"

پنکج بابو بولا۔

"کچھ نہیں پتہ چلا مہاراج۔ تھوڑی دیر میں بازار جا کر سارے حالات معلوم کروں
گا۔"

اتنے میں اوماکماری اور بنگالن نوکرانی ناشتہ لے کر آگئیں۔ ناشتے پر جنگ کی با
شروع ہوگئیں۔ میں نے کہا۔

"ہماری بھارتی حکومت نے سوچ سمجھ کر پاکستان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ آج لا
پر ہمارا قبضہ ہوتا"

پنکج بابو کہنے لگا۔

"مہاراج! ہمارے لیڈروں کے دماغ ہی نہیں ہیں۔ فوجی کیا کریں۔ مگر اب س
کہ ہماری فوج نے پاکستان پر ایک اور حملہ کرنے کی زبردست تیاریاں شروع کر
ہیں۔"

اوماکماری بولی۔

"اب تیاریاں کرنے سے کیا ہوگا پتا جی جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ ساری دنیا میں بھار
کی بدنامی ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں پاکستان تو بڑا چھوٹا سا ملک تھا۔ ہندوستان کے پاس
زیادہ فوج تھی۔ اتنے ہوائی جہاز تھے۔ اتنے ٹینک تھے۔ پھر ہماری فوج سے اتنا بھی
سکا کہ لاہور کے شالامار باغ پر ہی قبضہ کرلیتی۔"

پنکج بابو بولا۔

"بیٹی! ایک اور بات بھی ہے۔ اس بات کو چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں۔ اور و
ہے کہ پاکستان کے لوگ بڑے بہادر لوگ ہیں۔ جہلم گجرات میرپور پوٹھوہار سرہ
میانوالی کے سارے علاقے بہادر فوجیوں کے علاقے ہیں۔ ان پنجابیوں نے تو سکندر
کی فوج کو نانی یاد کرادی تھی۔ پورس کے ہاتھی نہ بدکتے تو سکندر قیدی بن کر پور
دربار میں حاضر ہوتا۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اب ہماری بھارتی سینا کس قسم کی تیاریاں کر رہی ہے؟ کیا وہ کوئی ایٹم بم ب
ہے؟"

پنکج بابو بولا۔

"مہاراج! ایٹم بم اگر ہم بنائیں گے تو پاکستان بھی بنالے گا"

اوماکماری نے اپنے والد سے پوچھا۔

"پتا جی! کیپٹن سانیال بابو کیا کہتے ہیں۔ وہ تو میجر جنرل کے اے ڈی سی ہیں۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے یونہی پوچھا۔

"یہ کیپٹن سانیال کون ہیں؟"

پنکج بابو نے کہا۔

"میری بہن کا بیٹا ہے مہاراج! بڑا اچھا بچہ ہے۔ کبھی کبھی ملنے آجاتا ہے ویسے چندر
ر میں ہی اس کی آج کل ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ لاہور سیالکوٹ کے محاذ پر
ستان کی جن رانی توپوں نے بھارتی فوج کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اس کے بارے میں
یں بڑی معلومات حاصل ہوئی ہیں اور اب ہم بھی ویسی ہی دور مار توپیں سویڈن سے
خرید رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"رانی توپوں کے بارے میں یہ معلومات کیپٹن سانیال کو کہاں سے حاصل ہوئی
ہیں؟"

پنکج بابو کہنے لگا۔

"اس نے بتایا تھا کہ ستمبر کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاکستان کا ایک حوالدار پکڑا گیا
تھا۔ جو بہت زیادہ زخمی تھا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"پنکج بابو! یہ تو ہماری بھارتی جنتا بھی جانتی ہے کہ ستمبر کی جنگ میں ہماری سینا کے
بے شمار فوجی پاکستان کے قیدی بن گئے تھے۔ اور یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان کا
اگر کوئی فوجی ہم نے قید کیا بھی ہے تو اس نے تشدد کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی۔ پھر
اس قیدی نے کیپٹن سانیال کو رانی توپوں کے بارے میں سب کچھ کیسے بتادیا؟"

پنکج بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بیماری کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ ان کی بیٹی کو بیماری سے ہمیشہ کے لئے نجات مل چکی ہے۔ اس طرح میں ان کے دل میں اپنی عقیدت کو مزید ابھارنا چاہتا تھا۔ پھر میں چندر نگر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔

"میرا ارادہ ابھی واپس پنجاب جانے کا نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کچھ روز چندر نگر میں قیام کروں اور اس شہر کو دیکھو جو آزادی ملنے تک فرانس کے قبضے میں تھا۔"

پنکج بابو نے فوراً کہا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے مہاراج! آپ چندر نگر کی سیر ضرور کریں۔ آج کل اپنا بھانجہ کیپٹن سانیال وہیں ہے۔ میں اسے فون کر دوں گا۔ آپ جتنے دن چاہیں اس کے پاس جا کر ٹھہریں۔ وہ خود آپ کو چندر نگر کی سیر کرائے گا۔"

میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"آپ سانیال بابو کو فون کر کے میرے بارے میں بتا دیں۔ میں سوچتا ہوں کہ آج رات کو ہی چندر نگر چلا جاؤں۔ کیونکہ پھر مجھے واپس پنجاب بھی جانا ہے۔"

"میں اسے ابھی فون کئے دیتا ہوں"

یہ کہہ کر پنکج بابو نے اپنی بیٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے کارنس پر رکھا ہوا ٹیلی فون لا کر پنکج بابو کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ پنکج بابو نمبر ڈائیل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے چندر نگر کا ملٹری ایکسچینج مل گیا اور کیپٹن سانیال سے بھی رابطہ قائم ہو گیا پنکج بابو نے کیپٹن سانیال کے آگے ایسے عقیدت بھرے الفاظ میں میرا غائبانہ تعارف کرایا جیسے میں نے ان کے اجڑے ہوئے گھر کو پھر سے آباد کر دیا ہے۔ یہ تعارف میرے حق میں بڑا مفید تھا۔ پنکج بابو نے فون پر کیپٹن سانیال سے بات بھی کرا دی۔ وہ بڑی عقیدت اور عاجزی کے ساتھ بولا۔

"مہاراج جی! آپ جس وقت چاہیں آجائیں۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

جب یہ سارا معاملہ طے ہو گیا تو مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ اس علاقے میں پولیس کی ناکہ بندی اور چیکنگ کی کیا پوزیشن ہے۔ کیونکہ اب مجھے واپس بھی جانا تھا۔ میں نے

"نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں؟ مہاراج پاکستانی فوج کے اس قیدی نے رانی توپوں کی جنگی پوزیشنوں کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہ پاکستانی فوجی جو پاکستانی توپ خانے کا گنر تھا اب بھی بھارتی فوج کی قید میں ہے اور چندر نگر میں ہی ہے۔ اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ کیپٹن سانیال کہہ رہا تھا کہ ہم اس قیدی سے رانی توپوں کے بارے میں سب کچھ معلوم کرلیں گے۔"

یہ میرے لئے بڑی اہم خبر تھی۔ میں نے پنکج بابو کو مزید کریدنا چاہا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا چندر نگر میں کوئی فوجی چھاؤنی ہے؟"

وہ بولا۔

"فوجی چھاؤنی نہیں ہے مہاراج! وہاں انڈین آرمی کی ایک آرٹلری رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ میرا بھانجہ کیپٹن سانیال چونکہ آرٹلری رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کا اے ڈی سی ہے اس لئے اسے پاکستانی فوج کی آرٹلری رجمنٹ کے قیدی سے انٹروگیشن کے لئے چندر نگر بھیجا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس سے پوری انفارمیشن لے کر اس کی فل رپورٹ تیار کر کے کمانڈنگ آفیسر کو پیش کرے۔"

میں خدا کی قدرت پر حیران ہو رہا تھا کہ کس طرح پاک فوج کے ایک زخمی جنگی قیدی کے بارے میں مجھے فل رپورٹ پوری تفصیل کے ساتھ مل رہی تھی۔ اگر میری ملاقات پنکج بابو سے نہ ہوتی اور میں اسی رات کشمیری مسلمانوں کے قاتل کو جہنم میں پہنچانے کے بعد پنکج بابو کے گھر نہ جاتا تو مجھے کبھی بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ پاک فوج کا ایک زخمی فوجی اس وقت کلکتہ کے قریب ایک شہر چندر نگر میں قید ہے اور بھارتی فوج کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ میرا اگلا کمانڈو مشن پاک فوج کے اس غیور جوان کو انڈین آرمی کے ٹارچر سیل میں سے نکال کر پاکستان پہنچانا ہوگا۔

اس مشن کی کامیابی کے لئے چندر نگر میں کیپٹن سانیال سے میل ملاقات اور اس کا اعتماد حاصل کرنا ضروری تھا۔ اور یہ سب قدرت نے پنکج بابو کی فیملی سے میرے تعلقات کی شکل میں پیدا کر دیا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر گفتگو کا موضوع بدل دیا اور ادھر

بڑے طریقے سے معلوم کیا کہ پولیس علاقے میں ضرور موجود ہے مگر چیکنگ نہیں ہو رہی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا دن کی روشنی میں میرا باہر نکلنا اور اپنے جاسوس شاہ دین کی کمیں گاہ تک جانا مناسب رہے گا یا نہیں؟ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ دن یہیں گزارا جائے اور جب رات کا اندھیرا چھانے لگے تو اس وقت باہر نکلا جائے۔

میں نے اوما کماری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اوما جی! ہم آج تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی بھجیا کھائیں گے۔"

اوما کماری بولی۔

"مہاراج! یہ میرے دھن بھاگ ہیں"

سارے گھر والے میرے اس فیصلے سے بے حد خوش ہوئے کہ میں سارا دن ان کے پاس گزاروں گا۔ اوما کماری نے بڑی عقیدت کے ساتھ مختلف سبزیوں کی بھجیا بنائی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ ساری رات کا جاگا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔ پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں پنکج بابو کے گھر پر ہی تھا۔ اصل میں کمانڈو اپنے مشن کے دوران کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ ایک لمحے کی غفلت اس کے مشن کو ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ اور میں اپنی کمیں گاہ میں نہیں تھا۔ کلکتے کے ہندو بنگالی گھر میں تھا۔ باہر پولیس کی پکٹ لگی تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر میں غافل ہو کر سو گیا تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ میں جس گھر میں سویا تھا اسی گھر میں ہوں تو خدا کا شکر ادا کیا۔ اوما کماری میرے لئے چائے لے کر آ گئی۔ جب شام ہو گئی تو میں نے ایک بار پھر چندر نگر میں کیپٹن سانیال کا پورا ایڈریس پنکج بابو سے پوچھ کر کاغذ پر نوٹ کر لیا اور ان سے اجازت لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر رات کا اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے سر جھکائے ہوئے لیکن بڑی عیاری سے ماحول کا جائزہ لیتا سڑک پر سے گزرنے لگا۔ سڑک پر آتے ہی مجھے ایک موٹر رکشا مل گیا۔ میں اس میں بیٹھا اور ہوڑہ پل کی طرف

روانہ ہو گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا اور اطمینان کر لیا تھا کہ میرے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا نہیں لگا تھا۔ دریا پار جاتے ہی میں نے رکشا چھوڑ دیا۔ کھیتوں اور اجاڑ جگہوں سے ہوتا ہوا میں شاہ دین کی خفیہ کمیں گاہ جس کو وہ گودام کہتا تھا پہنچ گیا۔ میں نے اسے پنکج بابو کے گھر سے ہی خفیہ کوڈ میں فون پر بتا دیا تھا کہ میں اندھیرا ہوتے ہی خفیہ کمیں گاہ میں پہنچ جاؤں گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رات کے دس بجے آئے گا۔

میں اکیلا گودام کے کمرے میں چارپائی پر بیٹھا شاہ دین کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کشمیری مسلمانوں کے قاتل کو میں نے ختم کر دیا ہے۔ وہ بولا۔

"مجھے شام کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کے دفتر کے باہر ایک ریٹائرڈ فوجی اور اس کے باڈی گارڈ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ہم نے بے گناہ نہتے کشمیری مسلمانوں کے خون کا بدلہ چکا دیا ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ چندر نگر میں پاک فوج کا ایک زخمی سپاہی قید ہے اور اس پر تشدد کر کے اس سے پاک آرٹلری کی رانی توپوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے تو وہ کہنے لگا۔

"ستمبر کی جنگ میں تو بھارتی فوج کے بے شمار فوجی پاکستان نے قیدی بنا لئے تھے۔ پاکستان کا تو کوئی بھی فوجی انڈین آرمی کا قیدی نہیں بنا۔ یہاں کلکتے میں تو سبھی یہی کہتے تھے۔"

میں نے کہا۔

"یہ جوان پاک فوج کی توپ خانے کا جوان ہے اور چونڈہ کے محاذ پر دونوں طرف کی اندھا دھند گولہ باری میں زخمی ہو گیا تھا اور ہندوستانی فوج کے آدمی اسے اٹھا کر پیچھے لے آئے تھے۔ یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی پتہ چل سکے گا کہ وہ زخمی ہونے کے بعد اپنی پوزیشنوں میں واپس کیوں نہیں چلا گیا۔"

شاہ دین کہنے لگا۔

"اس جوان کو ہندو وحشیانہ ٹارچر سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ جس طرح بھی ہو ا
چندر نگر سے اپنے ساتھ بھگا کر یہاں لے آؤ۔ کیا تم پہلے کبھی چندر نگر گئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں چندر نگر پہلے کبھی نہیں گیا۔ مگر میں نے اس چھوٹے سے شہر کی تعریف ض
سن رکھی ہے۔"

شاہ دین بولا۔

"چندر نگر پر بھارت کے آزاد ہونے کے بعد بھی کچھ عرصہ فرانس کی حکومت کا ق
رہا تھا۔ یہ فرانس کی واحد نو آبادی تھی جو ہندوستان میں ابھی تک قائم تھی۔ پھر بھا
حکومت نے فرانس کی حکومت کے ساتھ گفت و شنید سے طے کیا کہ فرانس کو بھارت
شہر پر اپنا قبضہ ختم کر کے واپس چلے جانا چاہئے۔ فرانس کی حکومت نے اسے تسلیم کر لیا
چندر نگر سے اپنا جھنڈا اور بوریا بستر لپیٹ کر واپس چلی گئی۔ اب چندر نگر آزاد ہ
بھارت کا حصہ ہے۔ تم ہوڑہ سے نہیں بلکہ کلکتے کے سیالدہ سٹیشن سے چندر نگر کے ل
گاڑی پکڑو گے۔ یہاں سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے میں تم چندر نگر پہنچ
گے۔"

میں نے کہا۔

"میں صبح منہ اندھیرے چلے جانا چاہتا ہوں"

شاہ دین بولا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت کوئی گاڑی چندر نگر جاتی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔

"اگر تھوڑی دیر بعد جاتی ہو گی تو میں وہاں انتظار کر لوں گا۔"

شاہ دین نے بڑی عقل کی بات مجھے سمجھائی۔ اس طرف میرا خیال نہیں گیا تھا۔
لگا۔

"تم کلکتے میں دو آدمی قتل کر چکے ہو اور تمہارے بیان کے مطابق خفیہ پو

والے نے اور صوبیدار درگاداس کے باڈی گارڈز نے تمہاری شکل دیکھی ہوئی ہے اور
چندر نگر کلکتے سے کوئی دور پار کا علاقہ نہیں ہے وہاں بھی کلکتے کی ہی پولیس ہے۔ اگر تم
پہچانے گئے تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ میرا خیال ہے تم حلیہ بدل کر وہاں جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میں ڈاڑھی مونچھیں نہیں منڈوا سکتا۔ پنکج بابو نے کیپٹن سانیال کو میرے
بارے میں بتایا ہے کہ"

شاہ دین نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اس نے ٹیلی فون پر کیپٹن سانیال کو یہ تو نہیں بتایا کہ تمہاری لمبی ڈاڑھی بھی ہے۔
تم ڈاڑھی صاف کر ڈالو۔ اس طرح تمہاری شکل میں کافی فرق پڑ جائے گا"

شاہ دین کا مشورہ بڑا مناسب تھا۔ میں نے وہیں قینچی لے کر اپنی ڈاڑھی مونچھوں
کے بال کافی حد تک کاٹ دیئے شاہ دین نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"زیادہ فرق نہیں پڑا۔ اسے اور کاٹو"

میں نے ڈاڑھی مونچھوں کے بال کاٹ کر بڑے چھوٹے چھوٹے کر لئے اور سر کے
بال بھی پیچھے سے کافی کاٹ ڈالے۔ جیکٹ پتلون کی جگہ کھدر کا لمبا کرتہ اور پاجامہ پہن
لیا۔ گلے میں کھدر کا تھیلا لٹکا لیا۔ زہریلی سوئیوں والا بال پوائنٹ میں نے کرتے کی بغلی
جیب میں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ کھدر کے تھیلے میں رومال ٹوتھ پیسٹ برش وغیرہ ڈال لیا۔
شاہ دین کہنے لگا۔

"اب تم کو پہچاننا آسان نہیں رہا۔ ڈاڑھی والے حلیے کے ساتھ تو پولیس تمہیں
فوراً پہچان سکتی تھی۔"

شاہ دین اس رات خفیہ کمیں گاہ میں ہی رہا۔ صبح صبح ہم وہاں سے چل پڑے۔ شاہ
دین نے مجھے کلکتے کے دوسرے بڑے سٹیشن سیالدہ پر اتار دیا اور خود آگے چل دیا۔
سیالدہ سٹیشن بھی کلکتے کے ہوڑہ سٹیشن کی طرح ہی تھا۔ لمبے لمبے کشادہ پلیٹ فارم۔ اونچی
آہنی چھت۔ ہر پلیٹ فارم پر گول بڑی گھڑی لگی تھی۔ ایک دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

اگرچہ ابھی صبح نہیں ہوئی مگر سٹیشن پر کافی مسافر نظر آ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ چندر نگر
گاڑی رات سات بجے جاتی ہے۔ یہ وقت میں نے وہیں پلیٹ فارم پر گزار دیا۔ میرا
بدل چکا تھا۔ اس لئے مجھے پولیس کی نظروں میں آنے کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس
باوجود میں غافل نہیں تھا۔ انگریزی کا ایک اخبار میں نے خرید لیا تھا اور پلیٹ فارم پر
کر اس کو پڑھنے میں مصروف تھا اور دس دس سیکنڈ بعد نظریں گھما کر ارد گرد کا جائزہ
لیتا تھا۔

نو بجے گاڑی چلی۔ اس نے ایک گھنٹے سے بھی پہلے مجھے چندر نگر پہنچا دیا۔ میں سٹیشن
سے باہر نکلا تو مجھے انگریزی طرز کے کاٹج نما مکان اور چھتے ہوئے فٹ پاتھوں والی دکا
نظر پڑیں۔ کئی دکانوں کے باہر ابھی تک ہندی بنگلہ کے ساتھ فرانسیسی میں لکھے ہوئے
بھی لگے تھے۔ شہر پر فرانسیسی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر نظر آ رہا تھا۔ پنکج بابو نے مجھے کیپٹن
سانیال کا جو ایڈریس دیا تھا وہ کاغذ پر لکھا ہوا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی
والے کو ایڈریس دکھا کر کہا۔

"تم انگریزی پڑھ لیتے ہو؟"

معلوم ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور صرف انگریزی ہی نہیں فرانسیسی زبان بھی لکھ پڑھ
بول لیتا ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق ایک طرف
چل پڑی۔ بازاروں میں پیرس کی طرز کی چھوٹی چھوٹی پیلے رنگ کی ٹیکسیاں ابھی تک
نظر آ رہی تھیں۔ ڈرائیور بھی وردی پوش تھے۔ راستے میں دو تین وائین کی دکا
گزریں۔ شراب کی دکانیں تو بھارت کے ہر شہر میں تھیں مگر خاص طور پر وائین
دکانیں میں نے چندر نگر میں ہی دیکھیں۔ اس کی وجہ بھی فرانسیسی تہذیب و تمدن کا اثر
فرانس میں یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح تقریبات میں وائین کو بڑی اہمیت دی
ہے۔

میرے پاس کیپٹن سانیال کے مکان کا ایڈریس تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے
میں جا چکا ہو گا مگر وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ نوجوان دبلا پتلا سمارٹ قسم کا بنگالی نوجوان

ردی پہن کر گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔ اس کا مکان دریا کے کنارے ایک مختصر سا
خوبصورت کاٹج تھا۔ آگے پیچھے باغیچہ تھا جس میں ہر طرح کے پیڑ پودے لگے تھے۔
برآمدے میں بھی پھولدار گملے لٹک رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے جھک کر
میرے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج آپ کے آنے سے میرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر
سمجھیں۔ میں ابھی آفس جا رہا ہوں۔ مگر میں جلدی آ جاؤں گا۔ نوکر وغیرہ یہاں آپ کی
سیوا کے لئے موجود ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو انہیں آرڈر کر دیجئے گا۔"

اس کی ملٹری سٹاف کار باہر کھڑی تھی۔ اردلی بھی اٹن شن کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"شکریہ کیپٹن صاحب!"

کیپٹن سانیال میرے پاؤں چھو کر چلا گیا۔ میں نے ڈرائنگ روم کے باتھ روم میں
جا کر سب سے پہلے اپنا حلیہ دیکھا۔ کل جو میرا حلیہ تھا آج اس کے مقابلے میں کافی بدلا ہوا
تھا۔ میری کچھ تسلی ہو گئی۔ ایک نظر دیکھنے سے میں آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ میں
نے بالوں میں کنگھی پھیری اور ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔

بنگالی نوکر نے آ کر چائے کافی کا پوچھا۔ میں نے کافی منگوائی اور ڈرائنگ روم کی کھڑکی
کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر کافی پینے اور سوچنے لگا کہ پاک فوج کا قیدی یہاں کس جگہ پر
ہو سکتا ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون میرے پاس ہی تپائی پر پڑا تھا۔ میں
نے اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کسی لڑکی کی شیریں آواز آئی۔ اس نے پوچھا۔

"کیپٹن صاحب ہیں؟"

یہ جملہ اس نے بنگلہ زبان میں بولا تھا۔ اتنی بنگلہ میں سمجھ لیتا تھا۔ میں نے انگریزی
میں کہا۔

"وہ ابھی آفس گئے ہیں"

لڑکی کو میری آواز اجنبی لگی اور انگریزی نے بھی اس پر اثر ڈالا۔ بڑے محتاط لہجے
میں انگریزی میں ہی اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے جواب دیا۔

"میں ان کا ایک دوست بول رہا ہوں"

لڑکی نے شکریہ کہا اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں ایک جگہ دیوار پر مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی تصویریں تھیں۔ میں ٹہلتے ٹہلتے کیپٹن کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ بڑا عیش عشرت والا بیڈ روم ڈبل بیڈ بچھا تھا حالانکہ پنکج بابو کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ کیپٹن سانیال کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ دیوار پر آمنے سامنے نیم عریاں عورتوں کی پینٹ کی ہوئی تصویریں سجی تھیں۔ میں واپس آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا اور وہاں پڑے ہوئے اخبار دیکھنے لگا۔ انگریزی ایک اخبار کے آخری صفحے پر ملٹری فاؤنڈیشن کے باہر صوبیدار درگاداس اور اس کے گارڈ کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ کسی کی تصویر ساتھ نہیں تھی۔ میں نے اس خبر کو غور سے پڑھا۔ خبر میں یہی لکھا تھا کہ فوج کے ریٹائرڈ صوبیدار درگاداس کو کشمیری کمانڈوز نے قتل کیا ہے۔ ابھی تک کشمیری حریت پرستوں نے اس قتل کی ذمے داری قبول نہیں کی۔ پولیس اور ملٹری پولیس سرگرمی سے قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔ یہ اسی روز کا اخبار تھا۔ دوسرے اخبار بنگلہ زبان کے تھے۔ ظاہر تھا ان میں بھی یہ خبر ضرور چھپی ہو گی۔

گیارہ بجے کے بعد کیپٹن سانیال آگیا۔ آتے ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"ارے نہیں سانیال جی! میں تو بڑے مزے سے رہا ہوں یہاں۔ بس اب وقت نکال کر مجھے چندر نگر کی سیر کرا دیں۔ اسی غرض سے میں یہاں آیا ہوں"

کیپٹن سانیال میرے سامنے ادب سے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج آپ نے اوما کماری کو اچھا کر کے ہماری فیملی پر جو احسان کیا ہے ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"وہ تو میرا فرض تھا کیپٹن صاحب۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ ایک لڑکی کا فون آیا تھا

"اس نے نام بتایا تھا مہاراج؟"

میں نے کہا۔

"نہیں نام نہیں بتایا تھا۔ تمہارا پوچھا تھا میں نے کہا کیپٹن صاحب آفس گئے ہوئے ہیں"

بنگالی کیپٹن کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ پھیل گئی بولا۔

"کانتا ہو گی"

پھر یہ کہہ کر دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا کہ مہاراج میں کپڑے بدل لوں۔ پھر شہر کی سیر کو چلتے ہیں۔ میں نے گاڑی اسی لئے واپس نہیں جانے دی۔

تھوڑی دیر بعد میں کیپٹن سانیال کے ساتھ شاف کار میں بیٹھا چندر نگر کے
علاقوں سے گزر رہا تھا۔ دریائے ہگلی چندر نگر شہر کے پہلو میں بہتا ہے۔ گھاٹ پر
نے ایک کشتی لی اور دریا کی سیر کرنے لگے۔ کیپٹن سانیال نے کہا۔

"مہاراج! پنکج بابو نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ آپ وید بھی ہیں اور جوتش کا گیان رکھتے ہیں۔"

میں اس بنگالی کیپٹن کو کسی لالچ میں پھانسا چاہتا تھا۔ اس نے خود ہی مجھے اس کا
مہیا کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"سانیال جی! اصل میں تو میں جوتشی ہی ہوں۔ آئیور وید کا علم تو میں نے اپنے
کے واسطے حاصل کیا تھا۔ ذرا ہاتھ دکھاؤ اپنا"

اس نے فوراً اپنا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ کسی بھی جوتشی کو ہاتھ دکھانا اور قسمت
حال معلوم کرنا انسان کی بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ میں اس کی ہتھیلی کی لکیروں کو یونہی
سے دیکھنے لگا۔ حالانکہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان آڑھی ترچھی لکیروں کا کوئی مط
بھی نکلتا ہے یا نہیں۔ میں نے اداکاری کرتے ہوئے اپنے چہرے پر حیرت اور تعجب
تاثرات لاتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن سانیال! تمہارا ہاتھ بہت کچھ بتا رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت
تمہاری زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہونے والا ہے جو تمہاری زندگی میں زبردست انق
لائے گا۔ فکر نہ کرو۔ یہ انقلاب بڑا خوشگوار ہو گا۔"

"اچھا مہاراج؟"

بنگالی کیپٹن بہت خوش ہوا۔

"مہاراج! یہ حادثہ کب ہو گا؟"

میں نے اس کی ہتھیلی کو ادھر ادھر سے دباتے ہوئے کہا۔

"مگر تمہاری راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بھی ہے۔ جب تک یہ رکاوٹ دور نہیں ہو گی تم زندگی کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکو گے۔"

بنگالی کیپٹن فکر مند ہو گیا۔ بولا۔

"مہاراج! یہ رکاوٹ کیسے دور ہو گی؟"

میں نے اس کی ہتھیلی کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی تم چنتا نہ کرو۔ یہ رکاوٹ ہم دور کر دیں گے۔ مگر ابھی نہیں۔ آج چندر ماں کی کتنی تاریخ ہے؟"

اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"شاید چھٹی تاریخ ہے"

میں نے کہا۔

"ہمارے گورو جی نے ہمیں تاکید کی ہوئی ہے کہ چندر ماں کی پندرہ تاریخ تک ایسا زائچہ نہیں بنانا جیسا زائچہ تمہارا بنے گا۔"

کیپٹن سانیال نے عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! پلیز آپ اتنے دن میرے پاس ہی ٹھہریں"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو جب تک ہم تمہارا زائچہ بنا کر تمہاری جنم ریکھا کے آگے آئی ہوئی خطرناک رکاوٹ کو دور نہیں کر دیں گے واپس نہیں جائیں گے"

کیپٹن سانیال نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"مہاراج! آپ کی یہ مجھ پر بڑی کرپا ہو گی۔ جس طرح آپ نے اوما کماری کی بیماری

ختم کر دی ہے اسی طرح میری ترقی کی راہ میں جو رکاوٹ کھڑی ہے اسے بھی ہمیشہ کے لئے
دور کر دیجئے گا"

میں نے کہا۔

"بھگوان نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔"

کیپٹن سانیال میرے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ اب مجھے اس سے یہ معلوم کرنا تھا کہ پاک
فوج کا قیدی کس جگہ پر قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے موضوع بدلتے ہوئے جنگ
ستمبر کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے انڈین آرمی کی بڑی تعریف کی۔ کیپٹن سانیال بھی
انڈین آرمی کی بہادری کی جھوٹی سچی باتیں سنانے لگا۔ میں نے کہا۔

"مگر پنجاب میں لوگ کہتے تھے کہ ہماری بھارتی فوج کی پلٹنوں کو پاکستانی فوج نے بھی
قیدی بنایا تھا مگر پاکستانی فوج کے سپاہیوں کو ہم قیدی نہیں بنا سکے"

میں نے بنگالی ہندو کیپٹن کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ مہاراج! یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے فوجی زیادہ تعداد میں پاکستان
نے قید کئے لیکن ہم نے بھی پاکستانی فوجیوں کو قیدی بنایا تھا۔ ایک قیدی تو اس وقت بھی
ہماری قید میں ہے"

میں نے کہا۔

"لیکن جنگ کے بعد جب دونوں فوجوں کے قیدیوں کا تبادلہ ہوا تھا تو سارے قیدی
اپنے اپنے ملک میں واپس چلے گئے تھے۔ پھر یہ پاکستانی قیدی ابھی تک ہماری قید میں کیوں
ہے؟"

کیپٹن سانیال کہنے لگا۔

"مہاراج! یہ پاک فوج کی ایک آرٹلری بٹالین کا سپاہی ہے۔ وہ بتاتا نہیں لیکن ہمیں
یقین ہے کہ وہ پاکستانی آرٹلری کی مشہور رانی توپ کا گنر (توپچی) ہے ہم اس سے رانی
توپوں کے بارے میں خاص معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے تبادلے کے
وقت ہم نے اس پاکستانی فوجی قیدی کو جان بوجھ کر واپس نہیں کیا تھا اور پنجاب سے اٹھا

چندر نگر لے آئے تھے۔"

میں نے مصنوعی اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن سانیال جی! اس ملیچھ مسلمان فوجی کو جتنا ٹارچر کر سکتے ہو کرنا۔ میں تو پاکستانی
ی کا جانی دشمن ہوں۔ کیا اس نے ابھی تک آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

کیپٹن سانیال نے نفی میں سرہلا کر کہا۔

"مہاراج! یہ مسلمان بھگوان جانے کس مٹی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں ان پر کوئی
اثر نہیں کرتا۔ یہ پاکستانی قیدی بھی کچھ نہیں بتاتا۔ اس پر ہم نے بڑا ٹارچر کیا ہے مگر
اپنے خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور اونچی اونچی آواز میں نعرے لگاتا ہے لیکن بتاتا کچھ

میں نے کہا۔

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میرے پاس میرے گوروجی کا دیا ہوا ایسا منتر ہے کہ
میں اسے پانی پر پھونک کر اسے اپنے ہاتھ سے پلاؤں تو وہ سب کچھ اپنے آپ بتا دے

کیپٹن سانیال میرے جال میں آگیا۔ اسے آنا ہی تھا۔ اسے پنکج بابو اس کے ماموں نے
یا تھا کہ میری دوائی سے اوما کماری کی لاعلاج بیماری جاتی رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے
چپ ہو گیا۔ کشتی اس وقت دریا کے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھے اس کی اجازت نہیں ہے مگر میں اپنے آفیسر کمانڈنگ سے بات کر کے
پ کو بتاؤں گا۔"

میں نے اپنی طرف سے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میں اپنی بھارتی فوج کی بھلائی کے لئے کروں گا ورنہ مجھے کسی پاکستانی قیدی سے
کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر تمہارا کمانڈنگ آفیسر نہ مانا تو اسے ہرگز مجبور نہ کرنا"

اس کے بعد کیپٹن سانیال نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی شام کو وہ مجھے چندر نگر
ایک کلب میں لے گیا۔ جہاں شہر کی اعلیٰ سوسائٹی کے سول اور فوجی افسر اپنی بیگمات

کے ساتھ موجود تھے۔ کئی دوسری خوش لباس خوش ادا حسین لڑکیاں بھی تتلیوں کی
منڈلاتی پھر رہی تھیں۔ کافی بھی پی جا رہی تھی اور شراب کے جام بھی لنڈھائے جا
تھے۔ کلب کی نیم روشن فضا شراب' تمباکو اور طرح طرح کے پرفیومز کی خوشبوؤں
بوجھل ہو رہی تھی۔ میں بہت محتاط ہو گیا۔ کیونکہ وہاں پولیس کے افسروں کی موجودگی
یقینی تھی اور اس اعتبار سے انٹیلی جینس کے آدمیوں کا ہونا بھی لازمی تھا۔

کیپٹن سانیال نے میرا کچھ فوجی اور سول افسروں سے تعارف بھی کرایا۔ جب
لوگوں کو پتہ چلا کہ میں جوتشی بھی ہوں تو ہر افسر مجھے ہاتھ دکھانے لگا۔ میں نے سر
تھوڑا تھوڑا جو جی میں آیا بتا دیا اور کیپٹن سانیال سے کہا۔

"سانیال بابو! یہاں ہمارا جی گھبراتا ہے ہم سنیاسی لوگ ہیں۔ ہمیں تو گھر پہنچا دو۔"
دراصل میں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ افسر قسم کے پرانے خرانٹ چہروں والے
مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ میں وہاں سے نو دو گیا
جاؤ۔ کیپٹن سانیال نے اپنے اردلی سے کہا کہ ڈرائیور سے کہو گورو جی کو گھر چھوڑ آ
پھر میری طرف متوجہ ہو کر بڑے معذرت خواہ لہجے میں ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔

"مہاراج مجھے شما کر دیں۔ میں خود آپ کو لے کر جاتا لیکن یہاں کچھ دیر بیٹھ
سمجھ لیں کہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔"

ڈرائیور مجھے کیپٹن کے مکان پر چھوڑ کر چلا گیا۔ رات کو کیپٹن سانیال دیر سے
میرے لئے ایک کمرے میں بستر لگا دیا گیا تھا۔ میں اپنے بستر پر نیم دراز انگریزی کی
کتاب پڑھ رہا تھا کہ کیپٹن سانیال اندر آ کر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"آپ کے جانے کے بعد ہمارے اوسی صاحب کلب میں آ گئے۔ میں نے ان
پاکستانی قیدی سے آپ کی ملاقات کی بات کی تو انہوں نے پہلے تو میری بات نہ سنی
بھی تو کوئی توجہ نہ دی۔ جب میں نے کہا کہ گورو جی کے منتروں اور دوائی کا چمتکار
فیلی کے لوگ دیکھ چکے ہیں تو انہوں نے اجازت دے دی۔ مگر یہ ملاقات تھوڑی د
لئے ہو گی اس سے زیادہ کی مجھے اجازت نہیں مل سکی۔"

مجھے تو صرف وہ جگہ دیکھنی تھی جہاں پاک فوج کا غازی قید و بند کی اذیتیں برداشت
کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں خود دشمن کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہتا۔ بس اپنے ہاتھ سے اسے پانی میں
گھول کر سفوف پلاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ اور
پھر مجھے یقین ہے کہ تم اس سے جو پوچھو گے وہ سب کچھ اپنے آپ بتانا شروع کر دے گا۔"
حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ کیپٹن سانیال بولا۔

"بس صبح آپ میرے ساتھ بٹالین ہیڈ کوارٹر چلیں گے۔ میں خود آپ کی ملاقات
پاکستانی فوج کے توپچی سے کراؤں گا۔"

میں دل میں حیران بھی تھا کہ رانی توپ کا توپچی ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آ گیا۔ رانی
توپیں دور مار توپیں تھیں اور جنگ ستمبر میں انہیں محاذ سے بہت پیچھے رکھا گیا تھا۔ بہرحال
میں اگلے دن کے انتظار میں تھا۔

دوسرے دن کیپٹن سانیال نے میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا اور مجھے اپنے ساتھ فوجی
گاڑی میں بٹھا کر اپنے بٹالین یا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر لے گیا۔ یہاں اس کا آفس تھا۔ کچھ دیر
میں اس کے آفس میں بیٹھا کافی پیتا رہا۔ اس دوران کیپٹن سانیال شاید پاک فوج کے جنگی
قیدی سے میری ملاقات کے کچھ انتظامات میں لگا رہا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد آیا اور
مسکراتے ہوئے بولا۔

"چلئے مہاراج! آپ کو دشمن کے جنگی قیدی سے ملاتے ہیں۔ بھگوان کرے کہ آپ
کے منتروں کا اس پر اثر ہو جائے اور وہ ہمیں وہ تمام معلومات حاصل ہو جائیں جو ہم اس
سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ قیدی کو وہیں ہیڈ کوارٹر کے کسی تہہ خانے میں رکھا گیا ہو گا۔ مگر وہ
وہاں نہیں تھا۔ کیپٹن سانیال نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی ہیڈ کوارٹر سے نکل کر دریا
کے ساتھ ساتھ جانے والی سڑک پر چل پڑی۔ چندر نگر کوئی ایسا شہر نہیں ہے کہ جہاں کوئی
جنگل وغیرہ یا پہاڑ ہوں۔ یہ میدانی علاقے کا ایک شہر ہے جو کلکتے سے شمال مغرب کی

جانب جہاں تک مجھے یاد ہے تیس بتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریائے ہگلی شہر کے بالکل ساتھ بہتا ہے۔ آس پاس کھیت بھی ہیں گھاس کے میدان بھی ہیں۔ آموں کے باغ بھی ہیں۔ چائے کے باغ تو نہیں مگر چائے پیک کرنے کے دو تین کارخانے ضرور تھے۔ وائین بنانے کی فیکٹری بھی تھی۔ چونکہ اس شہر کی کاروباری اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں تھی اس لئے وہاں ماڈرن قسم کی اونچی عمارتیں اور شاپنگ سنٹر نہیں تھے۔ پرانی وضع کی کوٹھیاں اور مارکیٹیں تھیں۔ ہماری گاڑی شہر سے باہر نکل آئی تھی۔ کیپٹن سانیال گاڑی خود چلا رہا تھا۔ اردلی اور ڈرائیور ساتھ نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ لوگوں نے قیدی کو کسی دوسرے شہر میں رکھا ہوا ہے؟"

سانیال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں سوامی جی! بس تھوڑی دور ہی جانا ہے۔ اصل میں جہاں ہم اس قسم کے جنگی قیدیوں سے پوچھ گچھ کرتے ہیں وہ جگہ ہم نے شہر سے باہر ایک پرانے محل کے کھنڈر میں بنائی ہوئی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک اونچے ٹیبے پر ایک پرانی تاریخی عمارت دکھائی دی۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ تاریخی عمارت کا کھنڈر ہی باقی رہ گیا تھا۔ احاطے میں بانس کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ دریائے ہگلی عمارت کے ٹیبے کے پیچھے سے ہو کر گزر رہا تھا۔ یہ بنگال کے مسلمان نوابوں کے زمانے کی کوئی تاریخی عمارت تھی جو اب ویران پڑی تھی اور فوج نے اس پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں اوپر عمارت کے دروازے تک جاتی تھیں۔ یہاں ایک فوجی سپاہی پہرے پر کھڑا تھا۔ کیپٹن سانیال مجھے ساتھ لے کر عمارت کے ویران برآمدے سے ہوتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ فوجی دفتر تھا۔ یہاں کیپٹن نے ایک رجسٹر پر کچھ لکھ کر اپنے دستخط کئے۔ یہاں سے ایک فوجی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا۔

اس جگہ آتے ہی میں نے ایک ایک چیز کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم تاریخی عمارت کے کھنڈر کے عقب کی طرف آ گئے تھے۔ یہاں سے نیچے دریا صاف نظر

آ رہا تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دریا پر ایک بادبانی کشتی چلی جا رہی تھی۔ اس جگہ بوسیدہ اور نیم روشن زینہ نیچے جاتا تھا۔ نیچے تہہ خانے کا دروازہ تھا۔ فوجی جو ساتھ آیا تھا اس نے چابی لگا کر دروازہ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں سے ہلکی ہلکی بیمار سی روشنی نکل رہی تھی۔ یہ بجلی کے کمزور بلب کی روشنی تھی۔ کیپٹن سانیال نے فوجی سے کہا کہ وہ پانی کا گلاس لے کر آئے۔ ہم تہہ خانے میں داخل ہو گئے۔ اس تہہ خانے میں فرش پر ٹاٹ بچھا تھا۔ ٹاٹ پر میں نے دیوار کا سہارا لئے ایک سانولے سے نوجوان کو دیکھا جس کی خاکی فوجی وردی میلی چکٹ ہو رہی تھی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر خراشوں اور زخم کے نشان تھے۔ ہم اس کے قریب ہی ٹاٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ پاک فوج کا غازی تھا جو بدقسمتی سے بھارتی فوج کی قید میں پھنس گیا تھا اور خدا جانے اس پر کس قدر وحشیانہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ کیپٹن سانیال نے پاکستانی قیدی سے کہا۔

"یہ حکیم جی ہیں۔ تمہیں اپنے ہاتھ سے دوائی پلائیں گے۔ تم اچھے ہو جاؤ گے"

پاکستانی جوان نے سر دیوار سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایمان کی وہ چمک تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے بجلیاں چمک رہی ہوں۔ اس نے مجھے پنجابی میں گالی دی اور کہا۔

"میں کافر کی دوائی نہیں پیئوں گا۔ میں پاک فوج کا غازی ہوں۔ مرجاؤں گا پر کافر کے ہاتھ سے دوائی نہیں پیئوں گا۔"

اس دوران انڈین فوجی پانی کا گلاس لے کر آ گیا تھا۔ میں نے پانی کا گلاس اپنے سامنے رکھ لیا اور کیپٹن سانیال سے کہا۔

"سانیال بابو! آپ لوگ مجھے اور اس قیدی کو تھوڑی دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دیں۔"

ساتھ ہی میں نے کیپٹن سانیال کو آنکھ ماری۔ مطلب یہ تھا کہ میں سارا معاملہ ٹھیک کر لوں گا۔ وہ فوجی سپاہی کو لے کر تہہ خانے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس خیال سے کہ وہ بند دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر ہماری گفتگو نہ سن لے۔ میں

نے یہ اطمینان ضرور کر لیا تھا کہ کیپٹن سانیال تہہ خانے کی سیڑھیوں میں بھی نہیں تھا۔
اوپر کسی جگہ کھڑا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے جنگی قیدی سے کہا۔

"میں کوئی سوامی جی نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ہوں اور تمہیں ی
سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں"

پاکستانی فوجی قیدی بڑی خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر
قسم کی مسرت یا خوشی کا تاثر نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"تم کافر ہو۔ بھیس بدل کر آئے ہو۔ تم چاہے کچھ کر لو۔ یاد رکھو۔ میں مر جاؤں گا
اپنی فوج کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ اس شخص سے اس قسم کی باتیں میرے حق میں ا
خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسے یہ بتانے کی بجائے کہ میں تمہیں یہاں سے نکالنے
ہوں یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں اسے نکال کر لے جاؤں۔ میں نے اسے پنجابی زبان میں ک

"مجھے اس کی پرواہ نہیں جوان کہ تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ بس ایک بات یاد
کیپٹن سانیال کو میں بلا رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے تمہیں کہا ہے اس کا ایک لفظ بھی
ہندو کپتان کو نہ بتانا۔"

میں فوراً اٹھا۔ دروازے کے پاس جا کر اوپر زینے کی طرف منہ کر کے کیپٹن
کو آواز دے کر نیچے آنے کو کہا۔ کیپٹن سانیال فوراً نیچے آ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

"سانیال بابو! یہ شخص پانی پینے پر رضامند نہیں ہو رہا"

اس نے کہا۔

"مہاراج! ہم اسے زبردستی پلا دیں گے۔ میں ابھی سپاہی کو بلاتا ہوں"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جب تک یہ ملیچھ قیدی اپنی مرضی
نہیں پئے گا اس پر دوائی کا اثر نہیں ہو گا میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے اسے دروازے کے پاس زینے میں لے جا کر سمجھایا کہ میرے منتروں

ی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کو آدمی اپنی مرضی سے پئے۔ اگر اسے زبردستی پلایا گیا تو
ی اور منتروں کا اثر ضائع ہو جائے گا۔ میں نے اسے کہا۔

"میں کوئی اور طریقہ تلاش کروں گا۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔"

کیپٹن سانیال خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں وہاں زیادہ دیر ٹھہروں۔ اس کی ایک ہی
تھی کہ یہ بات فوجی قوانین وضوابط کے خلاف تھی اور اس نے صرف اس خیال سے
زت لے لی تھی کہ شاید اس طرح پاکستانی قیدی وہ سب کچھ بتا دے جس کی انہیں
ورت تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو وہ مجھے ساتھ لے کر تہہ خانے
ے نکل آیا۔ فوجی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ میں
اس دوران دیکھ لیا تھا کہ دروازے کے اندر تالا نہیں ہے بلکہ دروازے کے باہر تالا
ا ہے اور تالا کافی مضبوط تھا۔

میں جان بوجھ کر پرانی عمارت کے کھنڈر کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے دریا بہہ
تھا۔ میں کیپٹن سانیال کو بتا رہا تھا کہ میرے پاس قیدی سے فوجی راز اگلوانے کا ایک اور
یقہ بھی ہے۔ میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ میں وہاں اس لئے کھڑا تھا کہ عقبی
ے کا پوری طرح سے جائزہ لے سکوں کیونکہ مجھے اسی جگہ سے پاکستانی جنگی قیدی کو رات
ے اندھیرے میں نکال کر لے جانا تھا۔ وہاں سے گھاٹی نیچے دریا کے کنارے تک جاتی
ں۔ گھاٹی کی اترائی اتنی خطرناک نہیں تھی۔ کہیں کہیں ڈھلان پر جھاڑیاں اگی ہوئی
یں۔ دن کی روشنی میں میں نے ایک ایک جھاڑی کو اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ دریا کا
ٹ یہاں زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت صاف صاف نظر آ رہے
ے۔ ہم تیر کر دریا پار کر سکتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پاک فوج کے جوان کو تیرنا ضرور آتا
گا۔ یہ فوجی ٹریننگ کا حصہ ہوتا ہے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو میں نے کیپٹن سانیال
ے کہا۔

"آپ لوگوں کو یہاں رات کے وقت بھی پہرے کا کڑا بندوبست کرنا چاہئے تاکہ
ستانی قیدی فرار نہ ہو سکے"

کیپٹن سانیال اور میں پتھر کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"مہاراج رات کو اوپر ہمارے سیکورٹی فورس کے دو جوان پہرے پر موجود ہوتے ہیں۔ ایک جوان تہہ خانے کی سیڑھیوں کے اوپر موجود ہوتا ہے۔ تہہ خانے کے دروازے کو تالا لگا ہوتا ہے۔ قیدی کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یہ ساری باتیں اور سیکورٹی کے سارے انتظامات میں نے ذہن نشین کر لئے۔ سے اپنے جوان کو نکالنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے مجھے جان کی بازی لگانی پڑے' میں اپنی بہادر فوج کے غیور فوجی کو دشمن کی قید سے نکال کر جاؤں گا۔ اس وقت اگرچہ آسمان پر بادل جھکے ہوئے لیکن دن کی روشنی چاروں پھیلی ہوئی تھی اور میں نے اس روشنی میں پرانی عمارت کے اردگرد کا سارا علاقہ طرح سے دیکھ لیا تھا۔ مجھے دریا کی طرف سے ادھر آنا تھا۔

وہ رات میں نے کیپٹن سانیال کے مکان پر ہی بسر کی۔ دوسرے دن میں نے ضروری کام کا بہانہ بنایا اور کیپٹن سانیال سے کہا کہ مجھے ایک جگہ اپنے دوست سے جانا ہے۔ میں آج شام واپس کلکتے چلا جاؤں گا۔ دو ایک دن بعد چندر نگر کی سیر دوبارہ آؤں گا۔ کیپٹن سانیال نے تھوڑا اصرار کیا۔ پھر میرے جانے پر راضی ہو گیا۔ کی روشنی میں میں وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ جب دن ڈھل گیا تو میں چندر نگر واپس کلکتے روانہ ہو گیا۔ اس وقت کلکتہ شہر پر شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ عمارتوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں نے ریلوے سٹیشن کے باہر ایک پبلک بوتھ شاہ دین کو دکان پر فون کیا اور خفیہ کوڈ میں صرف اتنا ہی کہا کہ میں دریا کنارے والی گاہ میں پہنچ رہا ہوں وہ رات کو آ جائے۔

فون کرنے کے بعد میں نے ایک لوکل بس میں بیٹھ کر ہوڑہ برج پار کیا اور وہاں پیدل ہی کھیتوں اور تالابوں کے قریب سے گزرتا اپنے آدمی شاہ دین کے ہائیڈ آؤٹ پہنچ گیا۔ اس وقت ہلکی ہلکی رم جھم شروع ہو گئی تھی۔ رات کو شاہ دین بھی آ گیا۔ نے اسے تمام واقعات سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔

"کیا تم پاکستانی جنگی قیدی کو وہاں سے نکال سکو گے؟ مجھے یہ کام مشکل لگتا ہے۔"

شاہ دین کو میرے بارے میں پورا علم نہیں تھا کہ میں کس قسم کا ٹرینڈ کمانڈو ہوں۔ میں نے کہا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف ایسا کرو کہ میرے لئے ایک لمبے پھل والا چاقو لا دو۔"

شاہ دین بولا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا لیکن فرض کر لیا تم قیدی کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر اسے لے کر رات کے اندھیرے میں کس طرف جاؤ گے۔ میرے گودام سے تم دریا کے راستے کم از کم پچیس میل کے فاصلے پر ہو گے اور یہ فاصلہ تم دریا کے اوپر کی جانب کشتی چلاتے ہوئے بھی صبح تک طے نہیں کر سکو گے۔"

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس نے مجھے بھی تھوڑی سی الجھن میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ شاہ دین ٹھیک کہہ رہا تھا۔ قیدی جوان کو نکالنے کے بعد ہمارے سامنے فرار کا ایک ہی ذریعہ تھا جو محفوظ بھی تھا اور یہ ذریعہ دریا تھا۔ وہاں سے دریائے ہگلی آگے کی طرف بہتا تھا اور ہم دریا کے اوپر کے رخ زیادہ دور تک نہیں تیر سکتے تھے۔ میں نے شاہ دین سے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ اگر ہم وہاں سے دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر چلے جاتے ہیں تو وہاں سے تمہارے اس گودام تک کس طرف سے راستہ آتا ہے!"

شاہ دین نے کہا۔

"چندر نگر کے دریا پار کا علاقہ غیر آباد ہے۔ وہاں ناریل کے درختوں کے ذخیرے ہیں۔ ان ذخیروں سے نکلنے کے بعد تمہیں دائیں طرف کو ہو جانا ہو گا۔ آگے اگر تمہیں کوئی پگڈنڈی یا سڑک مل گئی تو اسی رخ پر دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب چلتے آنا۔ ہو سکتا ہے راستے میں کسانوں' ملاحوں کی جھونپڑیوں کی بستیاں ملیں۔ ایک دو فیکٹریاں بھی آئیں گی۔ راستے میں کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ یہ پچیس میل کا فاصلہ ہو گا۔ تم لوگ پیدل چل کر یہ راستہ ایک رات میں طے نہیں کر سکو گے تمہیں راستے میں ہی صبح ہو جائے

گی۔ دن کے وقت تمہیں کسی جگہ چھپ جانا ہو گا۔ پھر جب رات کا اندھیرا ہونے ل بعد سفر شروع کرنا ہو گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ دریا کے ساتھ ساتھ چلنا۔ دریا ک کنارے کو اپنے سے دور نہ ہونے دینا۔ پھر تم میرے اس گودام کے پاس پہنچ جاؤ گ یہاں کی نشانی تمہیں معلوم ہی ہے۔ رات کے وقت یہاں سے کچھ فاصلے پر جو کھاد فیکٹری ہے اس کی روشنیاں دور سے نظر آجاتی ہیں۔"

منصوبہ بندی کاغذی طور پر بالکل درست تھی۔ اس پر عمل کرتے ہوئے مشکلا پیش آنے والی تھیں جن کے لئے میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ دوسرا آدھا دن بھی گزر گیا دوپہر کے بعد شاہ دین نے مجھے ایک لمبے پھل والا چاقو لاکر دیا۔ کمانڈو چاقو کی طرح اس ایک جانب دندانے نہیں تھے۔ صرف پھل ہی تھا مگر یہ ضرورت کے وقت میرے آسکتا تھا۔ میں نے اسی رات کمانڈو اٹیک کا پروگرام طے کر لیا تھا۔ ابھی سورج غرو نہیں ہوا تھا کہ میں نے اپنی چیزوں کو چیک کیا۔ زہریلا بال پوائنٹ میرے پاس ہی تھا۔ م نے کھدر کے کپڑے اتار کر اپنی پرانی پتلون اور قمیص پہن لی۔ پاؤں میں بوٹ بھی پ لئے۔ زہریلا بال پوائنٹ پتلون کی عقبی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ چاقو میں نے پتلون عام جیب میں بند کر کے رکھ لیا۔ میرے پاس انڈین کرنسی نوٹ تھے۔ انہیں میں پلاسٹک کے لفافے میں تہہ کر کے رکھ لیا۔ شاہ دین کہنے لگا۔

"یہاں سے تھوڑی دور آگے دریا کنارے ایک گھاٹ ہے۔ وہاں سے دیہاتی فیکٹری کے مزدور لوگ کشتی کے ذریعے دریا پار کر کے شہر جاتے ہیں۔ ابھی شام ہوئی۔ تمہیں کشتی مل جائے گی۔ اندھیرا ہونے کے بعد گھاٹ بند ہو جاتی ہے۔"

میں نے شاہ دین سے ہاتھ ملا کر اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اندر ہی بیٹھا رہا اور میں سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑا۔ بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ رات کو بوندا باند ضرور ہوئی تھی مگر اب بوندا باندی رکی ہوئی تھی۔ میں کھیتوں میں سے ہو کر دریا کنارے پر آگیا۔ پھر دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر گھاٹ دکھائی دیا۔ وہاں ایک بڑی کشتی کھڑی تھی۔ اس میں مسافر سوار تھے۔ عورتیں

نہیں جو گٹھڑیاں تھیلے لئے بیٹھی تھیں یہ سب بنگالی مزدور اور دیہاتی لوگ تھے۔ جو کلکتے یہاں فیکٹریوں میں کام کرنے آتے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ کشتی صرف دریا پار جا رہی ہے۔ آگے چندر نگر کو جانے والی کشتی تھوڑی دیر بعد آئے گی۔ میں گھاٹ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اپنی وضع قطع سے میں کسی فیکٹری میں کام کرنے والا کلرک لگتا تھا۔ میرا رنگ کھلتا ہوا تھا اور بنگالیوں جیسا سانولا اور کالا نہیں تھا۔ لیکن کلکتے میں کھلتے ہوئے رنگ والے بنگالی مرد اور عورتیں بھی دیکھنے میں آئی تھیں۔ اس لئے وہاں میں اجنبی نہیں لگتا تھا۔ دریا پار کرانے والی کشتی میں جب تمام مسافر بیٹھ گئے تو وہ دریا میں چل پڑی۔ اتنے میں اوپر سے ایک اور کشتی آکر گھاٹ پر رکی۔ یہ پہلی کشتی سے زیادہ بڑی تھی۔ دونوں کناروں پر بنگالی ملاح لمبے لمبے بانس ہاتھوں میں لئے کشتی کو کنارے کی طرف لا رہے تھے۔ یہ کشتی مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کشتی چندر نگر کو جائے گی۔

پہلے مسافر اتر گئے۔ دوسرے مسافر بیٹھنے لگے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ ملاح نے مجھ سے دو روپے کرایہ لیا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا جب کشتی گھاٹ سے دریا کے بہاؤ کی جانب چل پڑی۔ چونکہ یہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ چل رہی تھی اس لئے اس کی رفتار قدرتی طور پر زیادہ تھی۔ پھر بھی کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ملاح ڈانڈ چلا رہے تھے اور کشتی کے وزن کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک کشتی دریا میں بہتی رہی۔ دونوں جانب کلکتہ شہر کی روشنیاں کچھ دور تک نظر آتی رہیں۔ پھر درختوں کے پیچھے چھپ گئیں۔ کناروں پر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ایک بنگالی سے پوچھا کہ چندر نگر ابھی کتنی دور ہے۔ اس نے بتایا کہ ابھی دو گھنٹے لگیں گے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں خود چاہتا تھا کہ رات گہری ہو گئی ہو تو چندر نگر پہنچوں۔ لیکن رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے کہ کشتی چندر نگر کے گھاٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی کشتی سے اتر پڑا اور جس طرف چندر نگر شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں اس طرف چل پڑا۔ میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اسی رخ پر کوئی سات آٹھ میل کے فاصلے پر میرا ٹارگٹ تھا۔

یعنی وہ اونچا ٹبہ جس پر پرانی تاریخی عمارت کے تہہ خانے میں پاک فوج کا جوان قید تھا۔

راستہ سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے درمیان ایک پگ ڈنڈی کی شکل میں تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ شروع میں تھوڑی دقت محسوس ہوئی۔ پھر اندھیرے میں بھی پگ ڈنڈی نظر آنے لگی کہ میں اس پر چل سکتا تھا۔ اس وقت مجھے صرف دو باتوں کا خطرہ محسوس رہا تھا۔ پہلا خطرہ تو یہ تھا کہ کہیں ادھر ادھر کسی جھاڑی سے کوئی سانپ نہ نکل آئے دوسرا خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں بارش نہ شروع ہو جائے۔ کلکتے میں یہ برسات کے تھی لیکن ان دنوں بھی وہاں خوب بارشیں ہو جاتی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ میری بائیں جانب چندر نگر شہر کی کچھ فاصلے پر روشنیاں تھیں۔ چلتے چلتے میں چندر نگر شہر کی روشنیوں سے آگے نکل آیا۔ پگ ڈنڈی کہیں ختم جاتی یا دوسری طرف مڑ جاتی تو میں اپنی سمت کو برقرار رکھتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں سے گزرنے لگتا۔ کچھ دور چلنے کے بعد پھر کوئی پگ ڈنڈی جاتی۔ جہاں جہاں سے لوگ دریا پار کرتے تھے وہاں وہاں پگ ڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔

اندھیری رات تھی۔ میں آنکھیں کھول کر دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اندازے کے مطابق میں چندر نگر سے چھ سات میل دریا کے کنارے کنارے آگے نکل آیا تھا۔ کیپٹن سانیال کی گاڑی میں میں تقریباً اتنا ہی فاصلہ طے کر کے پرانی عمارت کے ٹبے پہنچا تھا۔ آخر مجھے دریا کے کنارے دور ایک اونچی جگہ پر دور روشنیاں جھلملاتی دکھائی دیں۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا روشنیاں صاف ہوتی گئیں۔ میں نے ان روشنیوں پرانی عمارت والے اونچے ٹیلے یا ٹبے کو پہچان لیا۔ اندھیرے میں ٹبے کے اوپر عمارت کے کھنڈر کا خاکہ سا نظر آرہا تھا۔ اس کی ایک جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے کے دو بلب روشن تھے جن کی کافی روشنی تھی۔ میں ایک طرف جھاڑیوں میں بیٹھ اس روشنی میں مجھے دو انسانی سائے چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔ یہ سیکورٹی فورس کے فوجی ہی ہو سکتے تھے جو رات کی ڈیوٹی پر تھے۔ میں ٹبے کے مزید قریب چلا گیا۔ یہاں

میں نے صاف طور پر دو فوجیوں کو دیکھا جو کاندھوں پر پر رائفلیں لٹکائے آہستہ آہستہ ایک طرف سے دوسری جانب چل کر پہرہ دے رہے تھے۔ وہاں سے مجھے وہ سپاہی نظر نہیں آرہا تھا جس کے بارے میں کیپٹن سانیال نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تہہ خانے کے زینے کے باہر پہرے پر موجود ہوتا ہے اس سپاہی کے پاس تہہ خانے کے آہنی دروازے کی چابی ہوتی تھی۔

میں نے جس حساب سے کمانڈو آپریشن کی منصوبہ بندی کی تھی اس پر عمل کرتے ہوئے میں وہاں سے ہٹ کر دائیں جانب جھک کر چلتے ہوئے دریا کے کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ وہاں گہری خاموشی تھی۔ دریا کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ ہمارے شہروں کی کسی بڑی نہر جتنا تھا۔ دوسرے کنارے کے درختوں کے ہیولے اندھیرے میں بھوتوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ مجھے رات کا کچھ وقت یہاں گزارنا تھا۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ میں ساڑھے نو بجے چندر نگر کے گھاٹ پر اترا تھا۔ سات آٹھ میل کا فاصلہ پیدل چل کر طے کیا تھا۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ رات کے گیارہ بجے پونے گیارہ بجے کا وقت ہو سکتا تھا۔ میں آدھی رات کے بعد اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں آپ زیادہ دیر تک رہیں تو تھوڑا بہت ضرور نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے بھی اپنے ہاتھ پاؤں اور جھاڑیاں اندھیرے میں نظر آرہی تھیں۔ میری نظریں پرانی عمارت والے ٹبے کی دریا کی طرف والی گھاٹی پر لگی تھیں۔ مجھے اسی جانب سے اوپر ٹبے پر چڑھنا تھا۔

اوپر ٹبے پر بھی خاموشی تھی۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ یہ علاقہ ویسے بھی چندر نگر شہر سے دور تھا۔ اردگرد کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ ساری باتیں میرے پلان کے حق میں جاتی تھیں۔ میں دریا کنارے سرکنڈوں کے پاس بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ٹبے پر جلتے دونوں بلب دیکھ لیتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے ٹیلے کے اوپر چڑھنا تھا۔ اوپر پہنچنے کے بعد مجھے تہہ خانے کے زینے تک پہنچنے کی حکمت عملی طے کرنی تھی۔ جہاں میں بیٹھا وہاں سے مجھے سیکورٹی فورس کے فوجی نظر نہیں آرہے تھے۔ ان کی کسی قسم کی کوئی

آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ آخر جب میں نے محسوس کیا کہ کمانڈو اٹیک کا وقت آگیا ہے تو میں نے اللہ کا نام لیا۔ اللہ سے مدد کی دعا مانگی اور اٹھ کر دریا سے ہٹ کر ٹیبے کی گھ کی طرف اندھیرے میں چلنے لگا۔ میں انتہائی چوکس ہو کر چل رہا تھا۔ یہاں بھی کسی سپا کی موجودگی کا خطرہ تھا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سارا علاقہ خالی تھا۔ ٹیبے کی گھاٹی ک دامن میں آکر میں نے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ڈھلان کی مشکل نہیں تھی۔ یہ گھاٹی میں د کی روشنی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ڈھلان اوپر تک صاف تھی۔ کہیں کہیں کوئی جھاڑ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور جھک کر گھاٹی چڑھنے لگا۔ مجھے چڑھ چڑھنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ گھاٹی کی ڈھلان سیدھی نہیں تھ میں دونوں ہاتھوں سے گیلی گھاس کو پکڑ کر اور نیچے پاؤں جما جما کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ فا کافی تھا۔ ایک جگہ جھاڑی سامنے آگئی۔ میں اس کی ٹہنیوں کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا۔ اوپر پرانی عمارت کے کھنڈر کا پچھلا حصہ اندھیرے میں کسی قلعے کی دیوا طرح نظر آرہا تھا۔ وہاں روشنی بالکل نہیں تھی۔ یہ بات میرے لئے مفید تھی۔ ت سانس لے کر میں دوبارہ اوپر چڑھنے لگا۔ آخر میں اوپر پہنچ گیا۔ میں نے سر ذرا سا اٹ بائیں طرف دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تہہ خانے کا راستہ اسی طرف ہے۔ اس طرف ک کی دیوار کافی آگے کو آئی ہوئی تھی۔

کوئی انسان نہیں تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں اوپر ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر جھک آہستہ آہستہ چلتا پرانی عمارت کی دیوار کے پاس اس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں دیوار دو طرف گھوم جاتی تھی۔ یہاں مجھے سارا منظر صاف نظر آگیا۔ مجھ سے کوئی دس قدموں کے فاصلے پر دو فوجی سامنے والی دیوار کے آگے بے دلی سے سست قدمو ساتھ چل کر پہرہ دے رہے تھے۔ تہہ خانے کے زینے والا حصہ یہاں سے دائیں تھوڑا ہٹ کر تھا جو بلب کی روشنیوں میں بھی میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ دونوں آرمی کی سیکورٹی فورس کے باوردی فوجی تھے۔ رائفلیں ان کے کاندھوں پر لگی تھیں کوئی گبھرو جوان فوجی نہیں تھے۔ قد کاٹھ سے بنگالی یا مدراسی لگ رہے تھے۔ ٹہلتے

ں میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ بنگلہ میں بات کر رہے ہیں یا سی زبان میں۔ میں صرف ان کی آواز ہی سن رہا تھا۔ پھر ان میں سے ایک فوجی وہیں چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا یہاں دو کھمبوں پر بجلی کے دو بلب جل رہے تھے جن کی کافی روشنی تھی۔ میں سانس کے دیوار کی اوٹ میں بیٹھا بڑے غور سے ان فوجیوں کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا یہ کوئی عام سویلین آدمی نہیں تھے۔ فوج کے تربیت یافتہ فوجی تھے۔ ان کو قابو کرنا اتنا ان کام نہیں تھا۔ لیکن میں بھی کوئی عام دکان دار یا مزدور ٹائپ کا آدمی نہیں تھا۔ میں تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ بلکہ تربیت اور ٹریننگ میں میں ان سے دس قدم آگے تھا۔ جو نگ ایک کمانڈو کو دی جاتی ہے وہ اس ٹریننگ سے بڑی مختلف ہوتی ہے جو ایک عام ہی کو فوج میں ملتی ہے۔ میں اس طرح اندھیرے میں بیٹھا ان فوجیوں کو گہری نظروں ے دیکھ رہا تھا جس طرح کوئی عیار چیتا اپنے شکار کے بالکل قریب پہنچ کر اسے اپنی زد میں لے کر اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب بجلی کی طرح لپک کر شکار کو اپنے قبضے میں کر لے۔ میں اور ایک چیتے میں اس وقت صرف یہی فرق تھا کہ مجھے اپنے شکار پر جھپٹنا بالکل یں تھا بلکہ مجھے عیاری اور عقل سے کام لیتے ہوئے شکار کو اس جگہ بلانا تھا جہاں مجھے ے آناً فاناً دبوچ لینا تھا۔

سارا پلان میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا ہوا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب زید انتظار خطرناک ہو سکتا ہے تو میں دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اندھیرے میں تین چار دم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پتلون کی جیب سے زہریلا بال پوائنٹ نکال کر پنے سیدھے ہاتھ میں اس طرح مضبوطی سے پکڑ لیا جس طرح پستول پکڑا جاتا ہے۔ میں یہاں زہریلے بال پوائنٹ سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم سے دشمن کو دبوچ کر اس کی گردن توڑنے میں خطرہ تھا کہ کہیں تھوڑی بہت آواز پیدا نہ ہو جائے۔ اس طرح دوسرا فوجی دوڑ کر وہاں آسکتا تھا۔

اس وقت خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ بال پوائنٹ کہیں دھوکہ نہ دے جائے۔

اس میں سے زہریلی سوئی فائر ہو جائے۔ فائر نہ ہونے کی صورت میں بھی میں پکڑا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ایک تو مجھے اندھیرے میں لیٹ کر فائر کرنا تھا دوسرے فائر نہ ہونے صورت میں دوسرا اور تیسرا فائر بھی کر سکتا تھا۔ کیونکہ بال پوائنٹ پنسل سے جب زہر سوئی شوٹ ہوتی تھی تو معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ یہاں یہی ہتھیار کارگر سکتا تھا۔ کیونکہ دشمن دو بلکہ تین تھے۔ ایک ہوتا تو میں بڑی آسانی سے اسے دبوچ گردن توڑ سکتا تھا۔ جب میں نے زہریلا بال پوائنٹ خاص زاویے سے اپنے ہاتھ میں لیا تو وہیں اندھیرے میں لیٹ گیا اور کہنیوں کے بل رینگ کر تھوڑا آگے جھاڑیوں پاس ہو گیا۔ پھر میں نے وہی حربہ استعمال کیا کہ عام طور پر ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے میں نے ہاتھ سے زمین کو ٹٹول کو ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور ذرا آگے کر کے اچھال دیا۔ بچ زمین پر گرا تو اس کی آواز پیدا ہوئی۔ مگر دونوں فوجیوں میں سے کسی نے اس آواز طرف توجہ نہ دی۔ میں نے دوسرا پتھر اچھالا۔ یہ ذرا بڑا پتھر تھا۔ اس کی زیادہ آواز پی ہوئی۔

دونوں میں سے کسی ایک فوجی نے بلند آواز میں کہا۔

”دیکھو ادھر کیا ہے“

یہ ہندوستانی زبان میں جملہ ادا کیا گیا تھا۔ دوسرے فوجی نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا پھر مجھے اس کے بھاری جوتوں کی آواز اپنی طرف آتی سنائی دی۔ میں اندھیرے میں زم کے بالکل ساتھ لگ گیا۔ میرا ایک رخسار زمین پر اگی ہوئی گیلی گھاس کے ساتھ لگا تھا۔ نے دیکھا کہ ایک فوجی میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ اپنی فوجی ٹریننگ پر غیر شعوری ط پر عمل کرتے ہوئے رائفل اس نے کاندھے سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑلی تھی مگر اس ہو کر نہیں آرہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں آرہا تھا۔ وہ جھک کر اندھیرے میں کچھ دیکھ کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں اپنے دیوار کی اس جانب بیٹھ کر سگریٹ پ ہوئے ساتھی سے بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ میں نے بلے کا لفظ سنا۔ غالباً اس نے کہا تھا کوئی بلی وغیرہ تھی چلی گئی ہے۔ یہ بنگالی ہندو فوجی تھا۔ وہ جھک کر چلتا میرے بالکل قریب

آکر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کوئی بات کی اور واپس جانے کے لئے مڑا۔ جیسے ہی وہ مڑا اس کی ایک ٹانگ کی پنڈلی میرے بالکل سامنے آگئی۔ میں نے زہریلے بال پوائنٹ والا ہاتھ اٹھایا اور فائر کر دیا۔ بال پوائنٹ کی نوک اور فوجی کی پنڈلی کا فاصلہ اس وقت زیادہ سے زیادہ دو انچ کا ہو گا۔ میری ہتھیلی کو محسوس ہوا کہ خفیہ بٹن دبانے سے زہریلی سوئی بال پوائنٹ سے ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ فائر ہو گئی تھی۔ اس کا ثبوت مجھے فوراً ہی مل گیا۔ یہ بھارتی فوجی میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ میں زمین پر منہ کے بل لیٹا ہوا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ میرے اوپر نہیں گرا۔ اسی لمحے وہ پہلو کی جانب اس طرح گرا جس طرح کوئی آدمی لکڑی کے لٹھ کو پکڑ کر کھڑا ہو۔ پھر وہ اسے چھوڑ دے اور لٹھ دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ اس فوجی کے گرنے سے کافی آواز پیدا ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ آواز پیدا ہو۔ میں بجلی ایسی تیزی کے ساتھ اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ آواز سن کر دوسرے فوجی نے اس کا نام لے کر پکارا اب میں بھول گیا ہوں کہ اس نے کیا نام لیا تھا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو مجھے اس کے فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ وہ میری طرف آرہا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ کھسک کر اس مقام پر اندھیرے میں آکر کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے دیوار دوسری طرف گھوم جاتی تھی۔

فوجی جوتوں کی آواز بالکل قریب آگئی اور پھر میں نے دوسرے فوجی کو دیکھا۔ اس نے بھی رائفل کاندھے سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لی تھی اور تشویش کے لہجے میں اپنے ساتھی کا نام لے کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب سے گزر کر آگے جانے لگا۔ میں نے بال پوائنٹ پنسل کی نوک اس کی گردن پر لگا کر فائر کر دیا۔ وہ کچھ بولا تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے ایک ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھایا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ کسی چیونٹی نے اس کی گردن پر کاٹا ہے اور وہ ہاتھ سے چیونٹی کو مسلنے لگا تھا مگر سائی نائیڈ زہر نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی۔ وہ منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ میں اندھیرے میں ساکت ہو کر کھڑا رہا۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ انڈین سیکورٹی فورس کے یہ دونوں فوجی مر چکے ہیں۔ دوسری طرف سے روشنی کا عکس ان پر پڑ رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت زمین پر

پڑے تھے۔ میں نے بال پوائنٹ جیب میں ڈالی اور جھک کر دونوں لاشوں کی گردنوں پر
ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دونوں کے دل بند ہو چکے تھے۔ گردن کے قریب دھڑکنے والی رگیں
ساکت ہو چکی تھیں۔ احتیاط کے طور پر میں نے دونوں کی رائفلیں اٹھا کر جھاڑیوں میں
چھپا دیں اور اپنے دوسرے اور اصلی ٹارگٹ کی طرف بڑھا۔ یہ ٹارگٹ پہلے سے زیادہ
مشکل تھا۔ لیکن ایک آسانی ضرور تھی کہ ٹارگٹ تک پہنچنے کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ ا
مجھے کھمبوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جلتے ہوئے بلبوں کی تیز روشنی میں سے ہو کر
خانے کے زینے کی طرف جانا تھا جہاں پہلے سے ایک فوجی پہرے پر موجود تھا اور جسے
ٹیبے کی گھاٹی کی طرف آتے ہوئے دور سے دیکھ چکا تھا۔ خطرہ صرف ایک ہی تھا کہ
غلط ہاتھ پڑ جانے سے فوجی رائفل کا فائر نہ کر دے۔ فائر کی آواز سے ارد گرد کے وہ ف
جو یقیناً وہاں عمارت کے کسی نہ کسی کمرے میں موجود تھے الرٹ ہو کر وہاں آ سکتے تھے
ان کے آنے سے میرا سارا منصوبہ خاک میں مل سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ رات
پہرہ دیتے ہوئے گارڈوں نے اپنی رائفلوں کے سیفٹی کیچ آگے نہیں کئے ہوتے۔ کیو
عام طور پر ایسا ایمرجنسی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ پتہ نہیں تھا کہ رات کی ڈ
پر موجود سپاہیوں کو آرڈر ملا ہو کہ رائفلوں کے سیفٹی کیچ آگے کر کے پہرہ دو۔
ایمرجنسی کی حالت میں وہ فوراً فائر جھونک سکیں۔ رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کر کے میگ
چیمبر میں ڈالنے سے دو تین سیکنڈ ضرور لگتے ہیں۔ لیکن اگر رائفل پہلے سے تیار
حالت میں ہو تو فائر کرنے کے لئے سپاہی کو صرف ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ہی ڈالنا ہوتا ہے۔
تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے حملہ کرنا تھا۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے سر آگے کر کے دیکھا۔ سامنے روشنی میں کھلی جگہ
صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ چبوترہ خالی تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے سیکورٹی فورس
سپاہی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے اس چبوترے کے قریب سے گزر کر دوسری
طرف جانا تھا۔ کیونکہ تہہ خانے کا زینہ دوسری جانب تھا۔ اب وقت ضائع
کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں دیوار کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر تیز تیز قدموں

سے دوڑتا ہوا چبوترے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ میں اس طرح دوڑ کر آیا تھا
کہ میرے قدموں کی آواز وہاں سے زیادہ دور تک نہیں جا سکتی تھی۔ ایک
لمحے کے لئے جیسے بیٹھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ میرے کان فضا پر چھائی ہوئی خاموشی
پر لگے تھے۔ میرے دوڑنے کی آواز پر وہاں جب کوئی نہ آیا تو میں کھسک کر
آگے ہو گیا۔ میں نے سر نکال کر چبوترے کی دوسری جانب دیکھا۔

میں نے اس فوجی کو پہچان لیا۔ یہ وہی فوجی تھا جو ایک دن پہلے میرے اور
کیپٹن سانیال کے ساتھ تہہ خانے کے دروازے تک آیا تھا اور اس نے تہہ
خانے کا آہنی دروازہ کھولا تھا۔ وہ اس جگہ دیوار کے پاس کسی چیز پر بیٹھا تھا
جہاں سے تہہ خانے کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں اس کے سر کے اوپر دیوار میں
سے نکلی ہوئی سلاخ پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ وہاں بڑی روشنی تھی اور مجھے
اس بھارتی فوجی کی ٹوپی پر لگا ہوا پر بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس سپاہی کو ختم کر
کے نیچے جانا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس سپاہی نے مجھے کیپٹن سانیال کے
ساتھ وہاں آتے دیکھا ہوا ہے۔ وہ میری شکل پہچانتا ہے۔ اگرچہ اس میں خطرہ
بھی تھا لیکن ایسا خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے سامنے دیکھتے ہی گولی چلا دے یا مدد کے
لئے شور مچا دے۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے چبوترے کے پیچھے بیٹھے بیٹھے ہاتھ پھیر کر
اپنے بال درست کئے۔ قمیض کا کالر صحیح کیا اور اٹھ کر بڑے اطمینان سے فوجی
کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ
کھڑا ہوا اور رائفل کی نالی میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہالٹ! رک جاؤ نہیں تو ہم فائر کر دے گا۔"

اتنی دیر میں میں اس کے قریب آ چکا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ
باندھ کر ہندوؤں کی طرح نمسکار کیا اور کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں کل کیپٹن سانیال کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

میں کیپٹن صاحب کا دوست ہوں۔ یاد نہیں؟ وہ مجھے ساتھ لے کر نیچے پاکستانی
قیدی کے پاس گئے تھے اور میں نے تم سے پانی کا گلاس منگوایا تھا"

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ مگر فوجی آخر فوجی ہوتا ہے۔ وہ اتنی جلدی
ہتھیار نہیں پھینکتا۔ بندوق کی نالی کا رخ اس نے میری طرف ہی کئے رکھا اور
بولا۔

"ٹھیک ہے سر! ہم تم کو پہچان گیا ہے۔ پر تم رات کو ادھر کیا کرنے آیا
ہے؟"

میں نے کہا۔

"یار میں اکیلا نہیں آیا۔ کیپٹن صاحب بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں وہ
بس آتے ہیں ہوں گے۔ بھگوان کے لئے یہ بندوق تو نیچے کر لو۔"

میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کی رائفل کی نالی کو نیچے کر دیا۔ اس
کے ساتھ ہی میں نے اتنی زور سے اس کی ٹانگوں کے درمیان اپنے بوٹ کا
ٹھڈا مارا کہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ دہرا ہو گیا اور اس نے
حلق سے آواز نکالی ہی تھی کہ میرے سیدھے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے
گرد فولاد کی طرح جکڑا ہوا تھا اور پھر صرف ایک جھٹکے کی ہی دیر تھی۔ اصل
میں یہ دونوں حرکتیں ایک ساتھ ہوتی تھیں۔ دشمن کو جب مجھے ہلاک کرنا ہوتا
تھا تو میں اس کی گردن اپنے فولادی بازو کے شکنجے میں لیتے ہی جھٹکے سے توڑ دیا
کرتا تھا۔ مجھے خود پتہ نہیں چلتا تھا کہ میں نے دشمن کی گردن میں شکنجہ پہلے
ڈالا تھا یا جھٹکے سے اس کی گردن پہلے توڑی تھی۔ میرا کام صرف اتنا تھا اور یہی
میرا کمال فن تھا کہ دشمن کو اتنی مہلت نہ ملے کہ وہ اپنے بازو اوپر اٹھا سکے
اور جوابی حملہ کر سکے۔ اس داؤ کو میں بڑی مہارت سے استعمال کرتا تھا اور
میرے اس داؤ سے دشمن کا بچنا تقریباً ناممکن تھا۔ جب بھارتی فوجی نے اپنے
جسم کا سارا بوجھ میرے بازو پر ڈال دیا اور اس کے دونوں بازو نیچے لٹک گئے تو

میں سمجھ گیا کہ اس کا کام تمام ہو گیا ہے۔ میں اسے اسی طرح گردن اپنے بازو
کے شکنجے میں لئے گھسیٹ کر دیوار کے پیچھے اندھیرے میں لے گیا۔ وہاں اسے
زمین پر ڈال کر اس کی بیلٹ سے لگا ہوا چابیوں کا چھلا نکال لیا۔ اس میں تین
چار ہی چابیاں تھیں۔ اس کی رائفل میں نے دور پھینکنے کی بجائے اپنے
کاندھے پر ڈال لی تھی۔ میں دوڑ کر سیڑھیوں میں آیا اور جلدی جلدی
سیڑھیاں اترنے لگا۔

اوپر جو بلب لگا تھا اس کی روشنی نیچے تک آرہی تھی۔

میں چھلے میں سے ایک ایک کر کے چابی آہنی دروازے کے تالے کو لگانے لگا۔ چابی لگ گئی۔ تالا کھل گیا۔ میں نے دروازے کے ایک پٹ کو الگ کیا اور اندر گھس اندر وہی کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ٹاٹ پر ہمارا غازی جوان دیوار کی طرف م کے کسمپرسی کے عالم میں پڑا شاید سو رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کا کندھا ہلایا تو وہ پڑا۔ وہ ایک ایسے شیر کی طرح لگ رہا تھا جسے پنجرے میں بند کر کے بھوکا پیاسا رکھا گ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”جلدی سے میرے ساتھ نکل چلو۔“

وہ اپنے اسی اکھڑے لہجے میں بولا۔

”آخر تم ہو کون؟“

اس نے مجھے پہچان لیا تھا کہ میں وہی ہوں جو ایک دن پہلے کیپٹن سانیال کے اس کے پاس آیا تھا اور اسے کوئی دوائی پینے کے لئے کہا تھا۔ میں نے بھی خالص فو میں جواب دیا۔

”بکو مت جانگلی۔ اٹھو۔ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈ تمہاری جان بچانے آیا ہوں۔ اٹھو۔ ڈبل سے چلو“

میں نے اسے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اب معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگیا تھ سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ وہ بھی میرے پیچھے آگیا۔ میں نے اسے سیڑھیوں

اشارے سے روک دیا۔ خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا اور گردن اٹھا کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ ایک جانب دیوار کے پاس بھارتی فوجی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی رائفل میرے کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے فوجی کو اشارہ کیا اور میں باہر نکل آیا۔ اپنا فوجی جوان بھی باہر آگیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کی وردی چیتھڑوں کی طرح لگ رہی تھی۔ میں گھاٹی والی دیوار کی طرف بھاگا۔ وہ بھی میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوڑتے وقت وہ کمزوری محسوس کر رہا ہے۔ یہ مسلسل فاقوں اور وحشیانہ اذیت کی وجہ سے تھا۔ جہاں پرانی عمارت کی دیوار کے پاس گھاٹی کی ڈھلان نیچے جاتی تھی میں وہاں بیٹھ گیا اور اپنے فوجی جوان کو بھی بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں نیچے اترنا ہے۔ ڈھلان زیادہ نہیں ہے۔ مگر سنبھل کر اترنا ہو گا اور منہ گھاٹی کی طرف کر کے اترنا ہو گا۔ جلدی کرو۔ گو۔ گو۔“

میں نے گو کہا تو اندھیرے میں اس کی آنکھیں مجھے اپنی طرف دیکھتی نظر آئیں۔ وہ گھاٹی کی دیوار پر ہاتھ جمائے ہوئے پاؤں نیچے کر کے اترتے ہوئے بولا۔

”کیا تم فوجی ہو؟“

میں نے کہا۔

”چپ رہو جوان۔ بولو گے تو ہم دونوں رگڑے جائیں گے“

ہم گھاٹی کی ڈھلان پر اوندھے پڑ کر آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔ سیدھے ہو کر گھاٹی اترنے میں منہ کے بل گرنے اور نیچے تک لڑھکنے کا ڈر تھا۔ سیدھی اترائی نیچے کوئی پچاس ساٹھ فٹ تک تھی۔ اس کے بعد ہم نے اپنے جسم سیدھے کر لئے اور گھاس کو اور جھاڑیوں کو پکڑ کر بیٹھ کر اترتے چلے گئے۔ ہم جتنی جلدی اتر سکتے تھے اتر رہے تھے۔ میں نے اندھیرے میں پاک فوج کے جوان کو دیکھا کہ اس میں بھی جیسے ایک نئی طاقت آگئی تھی۔

نیچے آتے ہی میں نے اسے کہا۔

"سامنے دریا ہے۔ ہمیں دریا پر تیر کے دوسرے کنارے پر جانا ہے۔ تمہیں تیرنا
ہے؟"

وہ بولا۔

"آتا ہے۔ تم آگے چلو"

میں اسے ساتھ لے کر دریا کی طرف چلا۔ ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ یہاں درخ
بھی تھے اور اونچی اونچی جھاڑیاں اور سرکنڈوں کے جھنڈ بھی تھے۔ اندھیرا ہونے کی
سے میں تھوڑی دور چل کر پیچھے دیکھ لیتا۔ پاک فوج کا جوان برابر چلا آرہا تھا۔ میرے پا
آکر اس نے کہا۔

"میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ رکو مت۔ چلتے جاؤ"

ہم دریا پر پہنچ گئے۔ آسمان پر کوئی ستارہ نہیں تھا۔ تمام ستارے بادلوں میں چ
چکے تھے۔ بارش بھی رکی ہوئی تھی۔ دریا کا پاٹ اندھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی د
رہا تھا۔ ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ فضا حبس آلود تھی۔ فوجی جوان میرے قریب
جھک کر دریا کو دیکھنے لگا۔ میں نے اسے دریا میں اپنے پیچھے کودنے کا اشارہ کیا اور دریا
چھلانگ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے اس کے چھلانگ لگانے کی بھی آواز آئی۔ پانی ٹھنڈا تھا
اس کا بہاؤ زیادہ تیز نہیں تھا۔ میں نے سامنے والے کنارے کی جانب تیرنا شروع کر
کچھ دور جا کر پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ اپنا فوجی جوان بھی مجھے اندھیرے کے دھندلکے
تیرتا نظر آیا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اور بڑی مہارت سے تیر رہا تھا۔ دریا کے وسط
پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ مگر ہم اس کو پار کر گئے اور دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ دریا سے
نکلتے ہی میں نے اور فوجی جوان نے اپنی قمیضیں اتار کر نچوڑیں اور وہیں بیٹھ کر س
درست کرنے لگے۔ دریا کا پاٹ اگرچہ زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر وسط میں آکر ہمیں دریا کی
لہروں سے نکلنے کے لئے کافی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ دریا آخر دریا ہوتا ہے۔ نہر خواہ
چوڑی کیوں نہ ہو دریا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم نے فوراً گیلی قمیضیں دوبارہ پہن لیں
فوجی جوان نے کہا۔

"ہمیں اب کس طرف جانا ہو گا؟"

یں نے کہا۔

"یہاں سے ہم دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب جائیں گے۔ لیکن دریا سے ہٹ کر
گے۔ یہاں سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ایک خفیہ جگہ ہے۔ ہمیں وہاں پہنچنا
"

فوجی جوان بولا۔

"اتنی دور تک پیدل چلنے سے ہمیں صبح ہو جائے گی۔ میں اپنی فوجی وردی سے پہچان
ں گا۔ اتنی دیر میں میرے فرار کا بھی پتہ چل چکا ہو گا۔ فوج سارے علاقے کو
ے میں لے لے گی۔ کسی اور طرف نکل چلتے ہیں"

میں نے کہا۔

"ہم جس طرف بھی گئے جب صبح ہو گی تو ہم یہاں سے بیس بائیس میل آگے نہیں
وں گے۔ بہتر ہے کہ جس طرح میں کہتا ہوں اسی طرح کرو۔ یہاں سے نکلو۔ صبح
والی ہو گی تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کر لیں گے۔"

وہ کہنے لگا۔

"فکر نہیں۔ چلو"

اور ہم دریا سے ہٹ کر درختوں میں چلنے لگے۔ میں نے اس سے اس کا نام اور عہدہ
ا۔ اس نے کہا۔

"میں تمہیں اپنا صرف نام اور عہدہ ہی بتاؤں گا۔ اپنی رجمنٹ کا نام نہیں بتاؤں گا۔
ابھی تک پورا یقین نہیں ہے کہ تم پاکستانی ہو"

ہم اندھیرے میں جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم نام اور رینک بتا دو۔ مجھے کچھ اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں
تمہارا نام اور عہدہ بھی اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں بلانے میں مجھے آسانی ہو۔"

اس نے اپنا نام محمد شریف اور عہدہ نائیک بتایا۔ میں نے اس کے بعد اس سے کوئی

سوال نہ کیا۔ میری ساری توجہ اس علاقے پر مرکوز تھی جس میں سے ہم گزر رہے
شاہ دین نے کہا تھا کہ چندر نگر سے دریا پار کرو گے تو ناریل کے درختوں کا ذخیرہ شرو
جائے گا۔ اس کے آگے کھیت اور میدان آئیں گے۔ ہم اس وقت ناریل کے در
کے ذخیرے میں سے گزر رہے تھے۔ ذخیرہ ختم ہوا تو سامنے کھیتوں اور کہیں کہیں در
کے سیاہ جھنڈوں کا سلسلہ دکھائی دیا۔ ان کے پیچھے دور آبادی کی روشنی نظر آ رہی
نائیک شریف نے پوچھا۔

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں کیا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ فکر نہ کرو۔ آجاؤ"

اس طرح ہم نے باقی رات چلتے چلتے گزار دی۔ میں دریا کے ساتھ ساتھ
اگرچہ اس سے کچھ فاصلے پر چل رہا تھا۔ کیونکہ اسی دریا نے ہمیں شاہ دین کی کمیں گاہ
پہنچانا تھا۔ اب وہ جگہ آگئی تھی جس کے بارے میں شاہ دین نے کہا تھا کہ وہاں تمہیں
راستہ تلاش کر کے آگے چلنا ہو گا۔ راستے میں صبح ہو جائے تو کوئی مناسب جگہ دیکھ
چھپ جانا۔ اور جب تک دوبارہ رات کا اندھیرا نہ پھیلے اسی جگہ چھپے رہنا۔ چنانچہ میں
اپنی عقل سے کام لے کر چل رہا تھا اور راستہ دیکھتا جا رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہ
بادلوں میں سے صبح کا نور جھلکنے لگا تو میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! اب ہمیں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنی ہے جہاں ہم چھپ کر دن گزار دیں۔

اس وقت ہم دریا سے کافی ہٹ کر ایک جگہ کھیتوں کے پاس بیٹھے تھے۔ نا
شریف بولا۔

"تم لگتا ہے اس علاقے سے واقف ہو میں تو پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ تم کوئی
تلاش کر لو۔ میرا خیال ہے اب تک میرے فرار کا علم ہو چکا ہو گا اور انڈین فوجیو
لاشیں بھی ان لوگوں نے دیکھ لی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"تم پیچھے کی بات نہ کرو۔ یہاں بیٹھے رہو۔ میں کوئی جگہ دیکھ کر آتا ہوں۔"

میں نے پاک فوج کے جوان نائیک شریف کو وہیں بٹھایا اور خود کھیتوں میں سے ہو کر
ے نکل گیا۔ دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ کھیت' کھیتوں میں بنے ہوئے مچان' درخت اور
ا کے ساتھ اگے ہوئے درختوں کا سلسلہ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ بنگال اور جنوبی
دوستان میں ناریل کے درخت بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ان علاقوں میں ناریل کی چھال
ے بنی ہوئی مصنوعات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ناریل کی چھال کو بٹ کر ان کی چٹائیاں
ریاں اور رسے رسیاں بنائی جاتی ہیں۔ ناریل کے ذخیروں میں اکثر جگہوں پر لوہے کے
ے بڑے چرخے لگے ہوئے ہیں جہاں مزدور عورتیں اور مرد دن بھر ناریل کے ریشوں
و بٹ کر ان کی چھوٹی بڑی رسیاں اور باریک دھاگے بناتے ہیں۔ ان جگہوں پر انہوں نے
اپنے لئے دو ایک جھونپڑیاں ڈالی ہوتی ہیں جہاں وہ اپنی روزمرہ استعمال کی چیزیں بھی رکھتے
ں اور بعض مزدور رات کو ان جھونپڑیوں میں ہی سو جاتے ہیں۔ جب رسیاں بٹنے کا
ن کچھ دنوں کے لئے ختم ہو جاتا ہے تو یہ جھونپڑیاں خالی پڑی رہتی ہیں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے ایسی ہی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی بالکل خالی
ی۔ وہاں ناریل کے کافی درخت تھے اور دریا کی جانب اونچے سرکنڈوں نے ایک دیوار
بنا رکھی تھی۔ دن کو چھپنے کے لئے یہ جگہ بڑی مناسب تھی۔ آس پاس کوئی ذی روح
ھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نائیک شریف کو جھونپڑی میں لے آیا۔ ہم نے جھونپڑی کے
روازے کے آگے جھاڑیوں کی شاخیں کاٹ کر اس طرح لگا دیں کہ آڑ بن گئی اور باہر
ے ہم دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو جوان۔ میں کہیں سے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔ خبردار جھونپڑی
ے باہر مت نکلنا۔"

میں دریا کی طرف جانے کی بجائے اس کی سامنے کی جانب جہاں دھان کے ہرے
ہرے کھیت ابر آلود صبح کی ٹھنڈی ہوا میں لہرا رہے تھے نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں
کوئی نہ کوئی گاؤں ضرور ہو گا۔ ایک جگہ کھیتوں میں اونچی مچان کے قریب جھونپڑی کے

باہر مجھے دھواں اٹھتا نظر پڑا۔ میں قریب چلا گیا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت چولہے میں جلائے اس پر سلور کی کالی سیاہ دیگچی رکھے بیٹھی چولہے میں سوکھی شاخیں ڈال دی میں نے پاس جا کر اسے نمسکار کیا اور وہاں کی عام بول چال والی ہندوستانی میں کہا کہ بیوی بیمار ہے۔ ہم دریا پار جانے کے لئے ناؤ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں کچھ کھا مل جائے گا؟ بوڑھی بنگالی عورت پر میری فرضی بیوی کی بیماری کا سن کر بڑا اثر جلدی سے جھونپڑی میں گئی۔ اندر سے کیلے کا بڑا سا پتہ لے آئی۔ پھر دیگچی میں جو گرم کر رہی تھی وہ نکال کر پتے پر ڈالی اور مجھے دے کر بولی۔

"یہ لو بیٹا۔ میرے پاس یہی کچھ ہے۔"

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اس نے پیسے لینے سے انکا دیا۔ مگر میں نے زبردستی نوٹ اس کے پاؤں کے پاس رکھ دیا اور کھچڑی کیلے کے پ لپیٹ کر دوسری طرف کھیتوں سے ہوتا ہوا نائیک شریف کے پاس آ گیا۔ ہم نے ل کھچڑی کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے نائیک شریف سے کہا وہ اگر زخمی ہو گیا دشمن کے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ واپس اپنی پوزیشنوں میں چلا جاتا یا وہیں پڑا رہتا تو اپنی میڈیکل کور کے آدمی اسے اٹھا کر واپس لے جا سکتے تھے۔ نائیک بولا

"چونڈہ کے محاذ پر بھارت نے بہت بڑی طاقت سے حملہ کیا تھا۔ لیکن ہمارے جوا نے اس کے ہر حملے کو ناکام بنایا۔ اپنے توپ خانے نے بھی بڑی آگے آ کر گولہ باری میرا تعلق انفنٹری رجمنٹ سے تھا۔ دشمن کی توپیں اور ٹینک اور مارٹر گنیں اندھا گولہ باری کر رہی تھیں مگر ہم اپنی پوزیشنوں میں ڈٹے رہے۔ جب گولہ باری رکی نے ایڈوانس کیا۔ دشمن نے دوبارہ گولہ باری شروع کر دی۔ تین طرف سے اس ٹینک ہماری طرف بڑھے۔ وہاں گرد و غبار اور بارود کا دھواں اس قدر زیادہ تھا کہ کچھ نہیں چل رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور دشمن کہاں پر ہے میں اپنی کمپنی سے بچھڑ گیا تھا مجھے علم نہیں تھا۔ راکٹ لانچر میرے پاس تھا۔ میں نے دشمن کے ایک ٹینک کو دیکھا تو راکٹ فائر کر دیا۔ ٹینک کو آگ لگ گئی اور دھماکے سے پھٹ گیا لیکن کسی

ے مشین گن کا برسٹ آیا اور اس کی ایک گولی میری ٹانگ کے پٹھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ یہ کوئی ایسا زخم نہیں تھا۔ میں اپنے مورچوں کی طرف ہٹنے لگا لیکن میں دشمن کے مورچے کے پاس جا نکلا۔ ایسی صورت بن گئی کہ میری ٹانگ نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میں وہیں بیٹھ کر زخم پر فیلڈ پٹی باندھ رہا تھا کہ دشمن کے تین سپاہی سٹین گنیں تان کر میرے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ یوں میں دشمن کی قید میں آ گیا۔ ان لوگوں نے کئی روز تک مجھے امرتسر کی جیل میں رکھا اور مجھ پر وحشیانہ تشدد کیا۔ دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ میں رانی توپ کا توپچی ہوں۔ وہ مجھ سے رانی توپوں کے بارے میں اور ان کی پوزیشنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی رانی توپیں کہاں کہاں ڈپلائے ہیں۔ لیکن دشمن کو اس بارے میں ایک لفظ بھی بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ امرتسر سے مجھے دلی لایا گیا۔ وہاں بھی مجھے ٹارچر کیا گیا۔ میں نے اپنی زبان بند رکھی دشمن کو سوائے اپنے نام اور نمبر کے کچھ نہ بتایا۔ جب دشمن مایوس ہو گیا تو وہ مجھے کلکتے کے اس ٹارچر سیل میں لے آئے جہاں تم نے پہلی بار مجھے دیکھا تھا۔"

میں بڑے غور سے نائیک شریف کی بات سن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ کیا میرا تعلق کمانڈو فورس سے ہے یا میں کشمیری مجاہد ہوں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کشمیری مجاہد ہوں"

وہ بولا۔

"مگر تم پنجابی جس طرح بولتے ہو بالکل پنجابی لگتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں پنجابی ہی ہوں لیکن کشمیر کے محاذ پر کشمیری حریت پرستوں کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہوں۔"

مجھے باہر جھاڑیوں میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی گزر رہا ہے۔ میں نے جھونپڑی کی عقبی دیوار کے سوراخ میں سے دیکھا۔ ایک بنگالی دیہاتی سر پر سوکھی شاخوں کا گٹھا

رکھے جھاڑیوں میں سے دریا کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جھونپڑی کے قریب سے گزرا تو
نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نائیک شریف کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا جب دیہاتی کافی
نکل گیا تو ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ مجھے اندر سے ایک دھڑکا ضرور لگا ہوا تھا کہ آرمی کی
سے کسی پاکستانی فوجی قیدی کا فرار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اور فرار ہوتے وا
ہم تین بھارتی فوجیوں کو ہلاک بھی کر آئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ دریا پار کے سار
علاقے کا آرمی کی انٹیلی جینس نے محاصرہ کر لیا ہو گا۔ دن کی روشنی میں ہم سفر کرنے
خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ کسی بھی جگہ ملٹری انٹیلی جینس یا فوجیوں سے آمنا سا
ہو سکتا تھا۔ نائیک شریف کی وردی کا رنگ پاکستانی تھا۔ اگرچہ وہ کافی پھٹ چکی تھی لیکن
خاکی قمیض پتلون اور بوٹوں سے وہ صاف پہچانا جاتا تھا کہ یہ پاکستانی فوج کا جوان ہے۔ اس
دوران انٹیلی جینس والوں کو موقع مل رہا تھا کہ وہ علاقے میں چاروں طرف پھیل
پورے پلان کے مطابق ہماری تلاش جاری رکھ سکیں۔ وہ اس جھونپڑی میں بھی آ سکتے تھے
جہاں ہم چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم جو بھارتی فوجی کی رائفل اپنے ساتھ لے کر
ہوئے تھے میں نے صبح ہوتے ہی وہ رائفل بھی جھاڑیوں میں ایک جگہ پھینک دی تھ
یہ رائفل اب ہمیں گرفتار کروا سکتی تھی۔ میں بڑی سخت بے چینی کے ساتھ دن
گزرنے اور شام کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ لمحات آج بھی مجھے یاد آتے ہیں
میں بے چین سا ہو جاتا ہوں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح دن گزر گیا۔ جیسے ہی شام ہوئی
درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا ہم جھونپڑی سے نکل آئے اور کلکتے کی طرف رخ
لیا۔

ابھی کلکتہ بہت دور تھا اور ہم ساری رات پیدل چلتے رہنے کے باوجود صبح ہونے
پہلے کلکتے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ایک تو مجھے اندازے سے سمت کا تعین کرنا پڑتا
دوسرے ہم کسی سڑک پر نہیں چل رہے تھے۔ ہمیں جھاڑیاں سرکنڈوں میں راستہ
پڑتا تھا۔ اور بعض جگہ جہاں کوئی گاؤں آ جاتا تھا تو ہمیں اس گاؤں کے اوپر سے ہو
چکر کاٹ کر آگے نکلنا پڑتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ہمیں اگر کہیں سے کوئی بیل گاڑی

جائے تو سفر جلدی کٹ سکتا ہے۔ مگر وہاں اندھیرے میں ہم کہاں بیل گاڑی تلاش کرتے
پھرتے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ رات کے اندھیرے میں اندازے سے کبھی چلتے اور کبھی
تھوڑی دیر رک کر سستاتے، رات گزر گئی مگر کلکتہ اب بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ہم چندر
نگر کے خطرے والے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چنانچہ ہم دن کے وقت بھی
آبادی سے دور دور رہ کر دریا کے کنارے سے ہٹ کر چلتے رہے۔

وہ دن بھی اسی طرح چھپ چھپ کر پیدل سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج غروب ہو
گیا اور ہر طرف ہلکا ہلکا نیم تاریک دھندلکا چھانے لگا تو دور سے جھلملاتی روشنیاں نظر آنے
لگیں۔ یہ کلکتہ شہر کے مضافات کے کارخانوں اور فیکٹریوں کی روشنیاں تھیں۔ دریا کی
جانب بھی ہمیں دو بادبانی کشتیاں بہتی دکھائی دیں۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! ہم کلکتے پہنچ گئے ہیں"

ایک فیکٹری کی روشنیاں ہماری بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھیں۔ اس کے قریب سے
گزرتے ہوئے میں نے اس فیکٹری کی ایک چھوٹی اور ایک بڑی چمنی کو پہچان لیا۔ اپنے
شاہ دین کا گودام اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میں دریا کے کنارے کی جانب آ گیا۔ نائیک
شریف میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم نے سارا دن کیلے کے پتے میں بچی ہوئی کھچڑی
ہی کھائی تھی۔ اور جہاں کہیں کوئی تالاب وغیرہ نظر آیا وہاں سے پانی پی لیا تھا۔ آخر ہم
منزل پر پہنچ گئے۔

شاہ دین کی جھونپڑی یا کوارٹر یا خفیہ ہائیڈ آؤٹ آپ جو بھی اسے کہہ لیں خالی تھی۔
جیسا کہ اس نے طے کیا تھا اس نے کوٹھڑی کو تالا نہیں لگایا تھا۔ کوٹھڑی میں آ کر میں نے
دروازہ بند کر کے اندازے سے ٹٹول کر ایک جگہ سے موم بتی اور ماچس نکال لی۔ موم بتی
کو روشن کر کے ایک جگہ لگا دیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ شاہ دین کو چونکہ کوئی
اطلاع نہیں تھی اس لئے رات کے وقت اس کے وہاں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں
نے نائیک شریف کو بتایا کہ میں صبح دن نکلنے کے بعد اپنے آدمی شاہ دین کے سٹوڈیو میں
جاؤں گا اور اسے اپنے کامیاب فرار کی خبر دوں گا اور واپسی پر کچھ کھانے کو بھی لیتا آؤں

جائے تو سفر جلدی کٹ سکتا ہے۔ مگر وہاں اندھیرے میں ہم کہاں بیل گاڑی تلاش کر
پھرتے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ رات کے اندھیرے میں اندازے سے کبھی چلتے اور کبھ
تھوڑی دیر رک کر سستاتے' رات گزر گئی مگر کلکتہ اب بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ہم چھ
نگر کے خطرے والے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چنانچہ ہم دن کے وقت ب
آبادی سے دور دور رہ کر دریا کے کنارے سے ہٹ کر چلتے رہے۔

وہ دن بھی اسی طرح چھپ چھپ کر پیدل سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج غروب
گیا اور ہر طرف ہلکا ہلکا نیم تاریک دھندلکا چھانے لگا تو دور سے جھلملاتی روشنیاں نظر آ
لگیں۔ یہ کلکتہ شہر کے مضافات کے کارخانوں اور فیکٹریوں کی روشنیاں تھیں۔ دریا
جانب بھی ہمیں دو بادبانی کشتیاں بہتی دکھائیں دیں۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! ہم کلکتے پہنچ گئے ہیں"

ایک فیکٹری کی روشنیاں ہماری بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھیں۔ اس کے قریب
گزرتے ہوئے میں نے اس فیکٹری کی ایک چھوٹی اور ایک بڑی چمنی کو پہچان لیا۔ ا
شاہ دین کا گودام اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میں دریا کے کنارے کی جانب آگیا۔ نائ
شریف میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم نے سارا دن کیلے کے پتے میں بچی ہوئی کچھ
ہی کھائی تھی۔ اور جہاں کہیں کوئی تالاب وغیرہ نظر آیا وہاں سے پانی پی لیا تھا۔ آخر
منزل پر پہنچ گئے۔

شاہ دین کی جھونپڑی یا کوارٹر یا خفیہ ہائیڈ آؤٹ آپ جو بھی اسے کہہ لیں خالی تھ
جیسا کہ اس نے طے کیا تھا اس نے کوٹھڑی کو تالا نہیں لگایا تھا۔ کوٹھڑی میں آکر میں
دروازہ بند کر کے اندازے سے ٹٹول کر ایک جگہ سے موم بتی اور ماچس نکال لی۔ موم
کو روشن کر کے ایک جگہ لگا دیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ شاہ دین کو چونکہ
اطلاع نہیں تھی اس لئے رات کے وقت اس کے وہاں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔
نے نائیک شریف کو بتایا کہ میں صبح دن نکلنے کے بعد اپنے آدمی شاہ دین کے سٹوڈیو
جاؤں گا اور اسے اپنے کامیاب فرار کی خبر دوں گا اور واپسی پر کچھ کھانے کو بھی لیتا آ

رات ہم نے کبھی سو کر اور کبھی سن پینسٹھ کی جنگ پر باتیں کرتے گزار دی جب دن
ۂمیں نے نائیک شریف کو وہیں چھپے رہنے کی ہدایت کی اور خود کھیتوں اور ویران
ے سے گزرتا فیکٹری ایریا میں آکر اس مارکیٹ کی طرف چل پڑا جہاں سے میں پبلک
ے شاہ دین کو فون کر سکتا تھا۔ مارکیٹ کی دکانیں ابھی نہیں کھلی تھیں۔ صرف
ے کی ایک دکان کھلی تھی جہاں فیکٹریوں کے مزدور لوگ بیٹھے ناشتہ وغیرہ کر رہے تھے۔
فون بوتھ کھلا تھا۔ میں نے سکہ ڈال کر شاہ دین کے سٹوڈیو کا نمبر گھمایا مجھے معلوم تھا
وہ ٹیلی فون رات کو اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہے کیونکہ کسی بھی وقت میرا فون آسکتا

گھنٹی بجتے ہی دوسری طرف سے شاہ دین کی آواز آئی۔ اس نے اپنے سٹوڈیو کی دکان
م لیا اور پوچھا کہ میں کون بول رہا ہوں۔ میں نے خفیہ کوڈ میں اسے بتایا کہ میں جو شے
گیا تھا وہ لے کر مکان پر پہنچ چکا ہوں۔ شاہ دین نے بھی خفیہ زبان میں جواب دیا کہ
وہ چیز لینے آرہا ہوں۔ فون بند کر کے میں نے چائے کی دکان سے دو تین مکھن والے
لئے۔ مٹی کے کٹورے میں گرم گرم چائے کی پوری چینک ڈلوائی۔ سگریٹ کا پیکٹ
یدا اور بڑے سکون سے شاہ دین کے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چل پڑا۔ جاتے ہی نائیک
یف کو بتایا کہ اپنا کشمیری مجاہد جاسوس ابھی پہنچ جائے گا۔

"دیکھو۔ میں چائے اور بند مکھن لایا ہوں۔"

ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہم سارے بند مکھن کھا گئے۔ وہاں سے دو گلاس
گئے۔ گلاسوں میں چائے ڈال کر ہم ساری چائے پی گئے۔ نائیک شریف نے سگریٹ کا
ش لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔

"بڑی مدت بعد سگریٹ کا سوٹا لگایا ہے۔ مگر یہاں کے سگریٹ بڑے پھیکے ہیں۔ ان
ہ پاکستانی سگریٹوں والا زور اور طاقت نہیں ہے۔"

میں بھی بڑے سکون سے سگریٹ پی رہا تھا۔ نائیک شریف نے مجھ سے کہا۔

"میں ہر حالت میں پاکستان اپنی رجمنٹ میں واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم

میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"شاہ دین آجائے تو اس سے بھی مشورہ کرتے ہیں"

نائیک شریف کہنے لگا۔

"اگرچہ دونوں ملکوں میں جنگ بندی ہو چکی ہے مگر بارڈر پر دونوں طرف فو
بیٹھی ہوں گی۔ بارڈر کراس کرنے کی صورت میں مجھے بھارتی پوزیشنوں کے درمیان
ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اگر بارڈر پر عام بارڈر فورس ہوتی تو یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا
باقاعدہ فوج کے مورچوں کی موجودگی میں بارڈر کراس کرنا آسان نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تمہیں بمبئی سے دوبئی جانے والے کسی جہاز
سوار کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح دوبئی سے پاکستان تم بڑی آسانی سے پہنچ
گے۔"

"اگر ایسا ہو سکے تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"دونوں ملکوں کے سفارت خانے بھی بند ہو چکے ہیں۔ ورنہ ہم تمہیں کلکتے
پاکستانی سفارت خانے کے حوالے کر سکتے تھے۔"

ہم اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں شاہ دین بھی آگیا۔ میں نے نا
شریف سے اس کا تعارف کرایا۔ شاہ دین نے شریف کو گلے لگا لیا اور بولا۔

"پاک فوج کے شیر جوان کو دیکھ کر روح تازہ ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ت
دشمن کی قید سے نجات ملی۔"

وہ بھی اپنے ساتھ کچھ کھانے کو لایا تھا اور تھرمس میں چائے بھر کر لے آیا تھا
نے اس کا لایا ہوا ناشتہ بھی کیا اور ایک بار پھر چائے گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے۔ میر
شاہ دین سے کہا۔

"سب سے پہلے تو نائیک شریف کے لئے دوسرے کپڑوں کی ضرورت ہے"

شاہ دین بولا۔

"وہ میں لے آؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"اس کے بعد ہمیں پاک فوج کے جوان کو واپس پاکستان پہنچانا ہے۔ تم اس سلسلے میں
یا مشورہ دیتے ہو کہ ہمیں نائیک شریف کو کس طرف سے انڈیا کا بارڈر کراس کرانا
اہئے۔"

شاہ دین عقل رکھنے والا آدمی تھا۔ اس نے بھی وہی بات کی جس کا اظہار میں نے
ر نائیک شریف نے کیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں اپنے جوان کو مشرقی پنجاب سے انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کا ہرگز مشورہ نہیں
وں گا۔ اس میں اس کے دوبارہ پکڑے جانے کا سو فیصد خطرہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم بمبئی کی بندرگاہ سے یا انڈیا کی دوسری بندرگاہ سے
پنے جوان کو دوبئی یا عرب امارات کی طرف جانے والے کسی مسافر بردار بحری جہاز میں
وار کرا دیں؟"

شاہ دین سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"یہ کام مشکل ضرور ہے مگر اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے شاہ دین سے کہا۔

"کلکتے سے سمندری جہاز رنگون بھی جاتے ہیں کیا ایسا بندوبست ہو سکتا ہے کہ ہم
ائیک شریف کو رنگون جانے والے جہاز میں بٹھا دیں۔ رنگون میں پاکستانی سفارت خانہ
موجود ہے۔ شریف اپنے سفارت خانے پہنچ گیا تو وہاں سے وہ لوگ اسے پاکستان بھجوا دیں
گے"

شاہ دین نے کہا۔

"آج کل انڈیا میں ایمرجنسی لگی ہوئی ہے اور چندر نگر کے ملٹری سنٹر سے پاک فو
کا قیدی تین بھارتی فوجیوں کو قتل کر کے فرار ہو چکا ہے۔ آج کے اخباروں میں اس کی خ
چھپ گئی ہے رات کو کلکتے کا ریڈیو بھی یہ خبر نشر کر رہا تھا۔ ایسی صورت حال م
بندرگاہوں پر نہ صرف یہ کہ خفیہ پولیس پھیلی ہوئی ہو گی بلکہ مسافروں کے کاغذات ا
پاسپورٹ وغیرہ کی چیکنگ بھی بہت سخت ہوتی ہو گی۔ نقلی پاسپورٹ وغیرہ بنوایا جا
ہے۔ لیکن اس میں شدید خطرہ ہے کہ نائیک شریف بندرگاہ پر پکڑ لیا جائے گا۔ ایک ت
بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ دوسرے شکل اور رنگ روپ سے ہی پنجابی لگتا ہے۔"

میں نے شاہ دین سے کہا۔

"چیکنگ وغیرہ کی سختی کلکتے کی بندرگاہ اور ریلوے سٹیشنوں پر ضرور ہو گی مگر بم
یہاں سے بہت دور ہے۔ میرا خیال ہے وہاں حالات معمول کے مطابق ہوں گے۔ کیا بم
میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جو ہمارے جوان کو بصرہ یا دوبئی یا کسی بھی دوسرے ملک کو جا
والے سمندری جہاز میں سوار کرانے کا انتظام کر سکے؟"

شاہ دین کچھ سوچ کر بولا۔

"تمہارا یہ مشورہ مناسب لگتا ہے۔ بمبئی میں اپنا ایک آدمی ہے۔ وہ نائیک شریف ک
اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہے۔ مگر اس مشن پر تمہیں نائیک شریف کے ساتھ بمبئی جانا ہ
گا۔"

میں نے کہا۔

"میں تیار ہوں۔"

شاہ دین کہنے لگا۔

"میں آج شام فون پر اس سے بات کرتا ہوں۔"

شاہ دین کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ تاکید کر گیا کہ ہ
میں سے کوئی بھی اشد ضرورت کے بغیر مکان سے باہر نہ نکلے۔ ہم نے سارا دن ا
چھوٹے سے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں گزار دیا۔ شام ہو چکی تھی کہ شاہ دین آ گیا۔

ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس بھی ساتھ لایا تھا۔ میں
نے اس کے آتے ہی پوچھا۔

"کیا تمہاری بمبئی میں اپنے آدمی سے بات ہو گئی ہے؟"

شاہ دین بولا۔

"دوست! پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر بات کر لیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ بات ہو گئی ہے۔"

ہم نے کھانا کھایا۔ پھر گلاسوں میں چائے ڈالی اور اپنا اپنا گلاس لے کر بیٹھ گئے۔
کمرے کے اندر موم بتی روشن تھی اس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ شاہ دین نے گفتگو کا
سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے آدمی کو خفیہ کوڈ میں ساری بات بتا دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں
فوج کے جوان کو اپنے کسی خاص اعتباری آدمی کے ساتھ بمبئی بھیج دوں۔ میں نے اسے
تمہارا بتا دیا ہے۔ تمہیں ایک خفیہ کوڈ جملہ جا کر اسے بتانا ہو گا۔ بمبئی والے آدمی کی میں
تمہیں تصویر دکھا دیتا ہوں"

اس نے واسکٹ کی جیب میں سے بمبئی والے آدمی کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔
تصویر مجھے دکھا کر اس نے واپس اپنی جیب میں رکھ لی۔ شاہ دین کہنے لگا۔

"میں کل کسی بھی وقت نائیک شریف اور تمہارے واسطے دوسرے کپڑے لاؤں گا۔
تم وہی کپڑے پہن کر یہاں سے روانہ ہو گے بمبئی میں اگر مجھ سے کوئی مشورہ کرنے کی
تمہیں ضرورت محسوس ہوئی تو میرے آدمی کے پاس میرا خفیہ فون نمبر موجود ہے۔ تم اس
نمبر پر مجھ سے رابطہ پیدا کر سکتے ہو۔"

دوسرے دن شاہ دین دوپہر کے بعد ہمارے لئے کھانا اور کچھ کپڑے لے کر آ گیا۔
نائیک شریف کی ایک مٹیالے رنگ کی پتلون اور اسی کلر کی پرانی سی بش شرٹ تھی۔ اسی
طرح میرے لئے بھی پتلون قمیض کا ایک جوڑا تھا۔ جیکٹ پہلے سے میرے پاس ہی تھی جو
گرم نہیں تھی اور اسے برسات کے موسم میں بھی پہنا جا سکتا تھا۔ اس نے ہمیں کلکتے
سے بمبئی سنٹرل تک کے ریل کے دو ٹکٹ بھی دیئے جو تھرڈ کلاس کے تھے۔ کہنے لگا۔

"میں تمہارے لئے نئے کپڑے اس لئے نہیں لایا کہ نئے کپڑوں پر خوامخواہ دوسر
کی نظر پڑ جاتی ہے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ بھی اسی لئے خریدے ہیں کہ تھرڈ کلاس
رش ہوتا ہے اور تم لوگوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو چھپا سکو گے۔ گاڑی رات آٹھ
کر چالیس منٹ پر ہوڑہ ریلوے سٹیشن سے چھوٹے گی۔ تم لوگوں کو وقت پر وہاں پہنچ
ہو گا۔"

اس کے بعد اس نے مجھ سے علیحدگی میں کچھ ضروری باتیں کیں جو آپ کو بتانے
ضرورت مجھے محسوس نہیں ہو رہی۔ پھر وہ چلا گیا۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے
لئے۔ نائیک شریف کی ڈاڑھی بڑھ آئی تھی اس نے شیو کر لی تاکہ آسانی سے پہچانا
سکے۔ ہم وقت سے پہلے شاہ دین کے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر کلکتے کے ہوڑہ سٹیشن
پہنچ گئے۔

کلکتے میں ہمیں خطرہ تھا۔ ہوڑہ سٹیشن پر اگرچہ ریلوے پولیس کے دو چار سپاہ
نظر آ رہے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ خفیہ پولیس کے آدمی سفید کپڑوں میں ضرور موجود
گے اور وہ مسافروں کا بغور جائزہ لے رہے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے پلیٹ فارم پر
سے پہلے نائیک شریف کو ہدایت کر دی کہ وہ مجھ سے الگ ہو کر چلے اور پلیٹ فار
آخری سرے پر جا کر کسی ایسی جگہ بیٹھ جائے جہاں اس پر عام لوگوں کی زیادہ نظر نہ
ہو۔ میں خود بھی اس سے کچھ فاصلے پر اخباروں رسالوں کے سٹال پر کونے میں کھڑا
سگریٹ پینے اور عقابی نگاہوں سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ ہم ٹھیک و
سٹیشن پہنچے تھے۔ پھر بھی ٹرین نے وہیں سے تیار ہونا تھا۔ اس نے پندرہ بیس منٹ
دیئے۔ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر لگی میں نے آنکھوں سے نائیک شریف کو اشارہ
ہم کونے والی بوگی کے ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ منصو
مطابق ہم ڈبے میں بھی ایک دوسرے سے دور ہو کر بیٹھے تھے لیکن ایک دوسرے
رہے تھے۔ میں نے اپنے خفیہ ہتھیار زہریلے بال پوائنٹ کے بارے میں نائیک ش
بالکل نہیں بتایا تھا۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

یاد رکھیں۔ ایک اچھا کمانڈو اپنے راز اپنے ساتھیوں پر بھی ضرورت کے بغیر کبھی
ر نہیں کرتا۔

ٹرین ہوڑہ سٹیشن سے روانہ ہو گئی۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ ہندوستان کے ایک سرے
دوسرے سرے تک جانا تھا۔ یہ دو راتوں اور ڈیڑھ دن کا سفر تھا۔ جب تک ٹرین
تے سے کافی دور نہیں نکل گئی مجھے اپنے اور خاص طور پر پاک فوج کے جوان نائیک
یف کے بارے میں بڑی فکر لگی رہی۔ خدا کا شکر تھا کہ یہ خطرناک زون یعنی علاقہ
یت سے نکل گیا اور ٹرین جمشید پور کی طرف تیزی سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اگر
پ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کلکتے سے بمبئی کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں کون کون
بڑے شہر آئے تو سن لیجئے۔ ویسے تو کلکتے سے بمبئی تک ریلوے کا ایک دوسرا روٹ
ا ہے۔ مگر جس روٹ پر ہماری ٹرین جا رہی تھی اس ریلوے لائن پر جو بڑے بڑے اور
م شہر آئے ان کے نام یہ ہیں۔ کلکتے سے نکلنے کے بعد پہلے کھڑگ پور آیا اس کے بعد بڑا
جمشید پور آیا جہاں بنگال کی مشہور لوہے کی کانیں ہیں۔ جمشید پور کے بعد جو بڑے شہر
استے میں آئے وہ اس ترتیب سے تھے۔ سندر گڑھ، بلاس پور، رائے پور، ناگ پور،
ردھا، اکولا، بھوساول، جل گاؤں، ناسک، دیولالی، کلیان اور بمبئی۔ یہ دو راتوں اور ڈیڑھ
ن کا سفر تھا۔ ہم بمبئی دن کے ایک بجے پہنچے اس وقت بمبئی میں بارش ہو رہی تھی۔ یہ
ں کی برسات کی آخری بارشیں تھیں۔ پنجاب میں اس وقت سردی شروع ہو چکی تھی۔
ی کے سٹیشن پر اترتے ہی مجھے بمبئی میں گزارے ہوئے دن اور احمد آباد میں میناکشی
ال سوامی جی کے بھیس میں بسر کئے ہوئے دلچسپ رومانوی مگر انتہائی خطرناک دن یاد
نے لگے۔ پھر یاد آ گیا کہ کس طرح میں نے احمد آباد میں مقیم اپنے آدمی کی مدد سے احمد
اد سے کچھ فاصلے پر انڈین آرمی کا دوارکا کا ایمونیشن اور فوجی ساز و سامان سے بھرا ہوا
تباہ کیا تھا۔ مگر میں احمد آباد سے کافی دور تھا اور میرا حلیہ بھی کافی بدل چکا تھا۔ نائیک
یف کو میں نے اپنے ساتھ کر لیا تھا۔

اس نے پوچھا۔

"یہاں ہمیں رات گزارنے کا ابھی سے بندوبست کرلینا چاہئے۔"
اس کا خیال تھا کہ ہم سٹیشن کے پاس ہی کسی چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لے
ہیں۔ مگر میں اس کے خلاف تھا۔ ایسی جگہوں پر سی آئی ڈی کے لوگ اکثر منڈلاتے ر
ہیں۔ میں نے اسے کہا۔

"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہاں اپنے جاسوس سے
ہے۔ کسی جگہ کا انتظام ہم اس سے مشورہ کر کے کریں گے۔"

بمبئی شہر کے علاقوں سے میں واقف تھا۔ اگرچہ اس شہر کے سارے بازار اور عا
میرے دیکھے ہوئے نہیں تھے۔ بمبئی بھی بہت بڑا شہر ہے اور اسے کئی علاقوں میں تق
گیا ہے۔ کسی کا نام دادر ہے۔ کسی کا نام پریل ہے تو کسی کا موتنگا اور اندھیری ہے
کل بھارت کے زی چینل پر ایک پروگرام ہوتا ہے جس میں حصہ لینے کے لئے بھا
کے لوگوں کو اس کا ایڈریس بتایا جاتا ہے۔ اس ایڈریس میں اندھیری کا علاقہ بتایا جاتا
میں یہ نام سنتا ہوں تو مجھے اپنی کمانڈو لائف کا ہنگامہ خیز اور ایمان کے جذبے سے
زمانہ یاد آجاتا ہے جب میں اپنے طور پر محض پاکستان سے محبت یا پاکستان کی سلامتی
کشمیری مسلمانوں کی جنگ آزادی میں اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ
کرنے کے جذبے میں سرشار ہو کر ہندوستان کا بارڈر کراس کر گیا تھا۔ بہر حال
یادیں میری زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور میں اس سرمائے اور وراثت کو اپنی دا
سناتے ہوئے پاکستان کی نئی نسل کے سینے میں منتقل کرنا چاہتا ہوں تا کہ پاکستان کی نئ
پاکستان کی خاطر ان کے آباؤ اجداد نے جو خون کی قربانیاں دی تھیں ان سے آگاہ
اور اسے پاکستان کی قدرو قیمت کا اندازہ ہو۔

بمبئی میں اپنا جو خاص آدمی خفیہ طور پر کام کر رہا تھا میں اس کا اصلی نام اور
پیشہ نہیں بتاؤں گا اور وہ جگہ بھی نہیں بتاؤں گا جہاں وہ رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔ آ
کا کوئی بھی فرضی نام رکھ لیں۔ چلئے نادر خان رکھ لیں اور یہ سمجھ لیں کہ وہ
محلے میں پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام کرتا تھا۔ مجھے شاہ دین نے اس کا پورا پتہ بتا دیا

ر نائیک شریف نے بمبئی کے سنٹرل سٹیشن سے نکلتے ہی بارش میں بھیگتی ہوئی ایک ٹیکسی
پکڑی اور اپنے آدمی نادر خان کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ایک گنجان بازار کی چھوٹی سی گلی میں
یک تنگ سی دکان کے اندر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے نائیک شریف کو باہر ہی کھڑے
ہنے دیا اور نادر خان کے پاس جا کر سلام کیا اور کہا کہ مجھے بمبئی میں کرائے کی کوئی کوٹھی
چاہئے۔ وہ کرائے پر عمارتیں' فلیٹ اور کوٹھیاں بھی دلوانے کا کام بھی کرتا تھا۔ اس نے
خبار پر سے نظریں اٹھائے بغیر آہستہ سے کہا۔

"کتنا کرایہ دے سکتے ہیں آپ؟"

میں نے اس کے جواب میں خفیہ کوڈ کا وہ جملہ بول دیا جو شاہ دین نے مجھے بتایا تھا۔
در خان نے خفیہ کوڈ کا جملہ سنتے ہی نگاہیں اخبار سے ہٹا کر میری طرف گھور کر دیکھا۔ وہ
یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہ دین نے فون پر اسے میرا جو حلیہ بتایا تھا کیا میرا وہی
لیہ ہے؟ جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے مزید تصدیق کے لئے خفیہ کوڈ کا ایک لفظ بولا۔
شاہ دین نے مجھے اس کے جواب میں بولنے والا لفظ بھی بتا دیا تھا۔ میں نے تو نادر خان کو
کان میں داخل ہوتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس کی تصویر میں نے شاہ دین کے پاس اچھی طرح
یکھی ہوئی تھی۔ جب میں اس کے کوڈ کے جواب میں خفیہ کوڈ کا لفظ بولا تو اس نے اخبار
کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا اور میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے پوچھا۔

"نائیک شریف تمہارے ساتھ ہی ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ دکان کے باہر کھڑا ہے"

نادر خان نے اخبار میز پر رکھا۔ میز کا دراز کھول کر کاپی باہر نکالی۔ اس کے ایک صفحے
پر کچھ لکھا اور کاغذ کاپی سے الگ کر کے مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اس جگہ پہنچ کر میرا انتظار کرو۔ مجھے دیر ہو جائے تو تم لوگ نے وہاں سے کہیں
نہیں جانا۔ اب جاؤ"

میں نے کاغذ کو پڑھا بھی نہیں تھا اور اسے تہہ کر جیب میں رکھا اور دکان سے اتر کر

گلی میں آگیا۔ نائیک شریف ایک طرف بلڈنگ کی دیوار کے ساتھ کھڑا میرا انتظار کر
تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گلی سے نکل کر ہم بازار ب
سے گزرنے لگے۔ نائیک شریف مجھ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ بازار جہاں ختم
تھا وہاں سے جو سڑکیں دائیں بائیں نکلتی تھیں۔ یہاں ایک طرف جانوروں کے پانی پی
حوض بنا ہوا تھا۔ ایک وکٹوریہ یعنی بمبئی شہر کی بگھی کھڑی تھی جس کا گھوڑا حوض میں
ڈالے پانی پی رہا تھا۔ اس وقت بارش رکی ہوئی تھی اور فضا میں تھوڑا تھوڑا حبس
تھا۔ ایک ٹیکسی قریب سے گزری ٹیکسی خالی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا۔
دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"گیٹ وے آف انڈیا چلو"

نادر خان نے مجھے اسی جگہ جانے کو کہا تھا۔ کاغذ کے پرزے کو میں نے ٹیکسی
بیٹھنے سے پہلے ہی جیب سے نکال کر پڑھ لیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا کی میں اس سے
بھی سیریں کر چکا تھا۔ یہ ایک چار دروازوں والی بارہ دری سی ہے جو انگریزوں کے
میں سمندر کے کنارے بمبئی کے شمال مغرب میں بنائی گئی تھی۔ یہ بمبئی کی بندرگ
قریب ہی واقع ہے۔ شام کو بمبئی کے لوگ یہاں تفریح کرنے کو آتے ہیں اور کش
بیٹھ کر سمندر کی سیر بھی کرتے ہیں۔ گیٹ وے آف انڈیا کی عمارت کے عقب
سیڑھیاں نیچے سمندر میں جاتی ہیں جہاں کشتیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں ملا
سواری کا ایک روپیہ کرایہ لیتے تھے۔ کشتی سمندر میں تھوڑی دور تک لوگوں کو س
سیر کراتی ہے اور پھر واپس آجاتی ہے۔ چونکہ ابھی شام نہیں ہوئی تھی اس لئے گیٹ
آف انڈیا پر سیر و تفریح کرنے والے موجود نہیں تھے۔ دو تین کشتیاں عقب میں
کھڑی تھیں۔

ہم گیٹ وے آف انڈیا کی چار دیواری کے اندر ہو کر پتھر کے بنچ پر دیوار او
کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ سامنے بہت کشادہ چوک تھا۔ جس کی ایک جانب بمبئی ۔
ہوٹل تاج محل کی مشرقی طرز کی برجیوں والی عمارت نظر آرہی تھی۔ اس کے پاس

ہائی رائز عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی آکر رکی۔
ی میں سے نادر خان باہر نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے اسے
ن لیا تھا۔ مگر میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں نے نائیک شریف کو دکھا دیا کہ یہ نادر خان
۔ نادر خان گیٹ وے آف انڈیا کی محراب کے نیچے سے ہو کر چار دیواری کے اندر
یا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمارے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"ہم کشتی کی سیر کریں گے"

میں نے کہا۔

"کشتی کا ملاح ہماری باتیں سن لے گا۔"

نادر خان بولا۔

"کشتی میں ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ تم چپ رہنا"

ہم نے سیڑھیاں اتر کر ایک کشتی لی۔ نادر خان نے اسے سمندر میں کسی جگہ چلنے کو
ا۔ اس جگہ کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کشتی میں چھوٹا سا انجن لگا ہوا تھا۔ انجن شور مچاتا
ارٹ ہوا اور کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں چل پڑی۔ دور ایک جانب بڑے بڑے
ندری جہاز کھڑے تھے۔ سٹیمر بھی چل رہے تھے۔ جہازوں کے اوپر آبی پرندے منڈلا
ہے تھے۔ ہماری کشتی سمندر میں ایک طرف چلی جا رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد
انے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دینے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں پبلک کے لئے سیر
ائی ہوئی تھی۔ ریستوران بھی تھے۔ لوگ یہاں بھی اپنی فیملی کے ساتھ سیر کے لئے
ئے تھے۔ میں اس جگہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ہم اس جزیرے میں اتر گئے۔ نادر خان
ں ایک اوپن ائیر ریستوران میں لے آیا۔ ریستوران کے پیچھے چھوٹے سے باغیچے میں
ں کی کرسیاں میز لگے تھے۔ اس وقت صرف ایک فیملی دور بیٹھی تھی۔ ہم ایک الگ
ہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ نادر خان نے بیرے کو چائے لانے کے لئے کہا۔ لڑکا چلا گیا تو میں نے
ادر خان سے نائیک شریف کا تعارف کرایا۔ نادر خان نے ایک نظر نائیک شریف پر ڈالی
ی کی قسم کے رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اس نے نہرو کٹ واسکٹ کی جیب سے بیڑی نکال

کر سلگائی اور ماچس کی تیلی دور پھینکتے ہوئے بولا۔

میں نے کچھ ابتدائی معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق بمبئی کی بندرگاہ سے ہ
میں تین مسافر بردار جہاز عرب امارات کو جاتے ہیں۔ لیکن پاک بھارت جنگ کی وجہ
مسافروں کی چیکنگ بہت سخت ہو گئی ہے۔ ہمیں سارے کاغذات جعلی بنوانے پڑیں گے
عام حالات میں کسٹم کا عملہ ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا مگر اب ایک ایک کاغذ
پاسپورٹ کی پوری پوری جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔"

میں نے اپنے تجربے کی بنا پر اس سے پوچھا۔

"کیا ہم اپنے آدمی کو کسی مال بردار یا تیل بردار جہاز پر نہیں بٹھا سکتے؟ وہا
پاسپورٹ وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی"

نادر خان بولا۔

"ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے ایسا بڑی آسانی سے ہو جایا کرتا تھا مگر اب ایسا ن
ہے۔ دوسرے ملکوں کے آئل ٹینکر یا مال بردار جہاز جیسے ہی بمبئی کی بندرگاہ میں د
ہوتے ہیں ان کے گرد انڈین نیوی کے جوانوں کا پہرہ لگ جاتا ہے۔ جہاز کے عملے کو
پرمٹ ایشو کئے جاتے ہیں۔ وہ یہ پرمٹ دکھا کر بندرگاہ کی گودی سے باہر جاتے ہیں
پرمٹ دکھا کر اپنے جہاز پر واپس آتے ہیں۔ کوئی فالتو آدمی نہ جہاز سے نکل سکتا ہے
نہ جہاز میں داخل ہی ہو سکتا ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ نائیک شریف بھی خاموش تھا۔ چائے آ گئی۔ نادر خان کہنے لگا۔

"مجھے تھوڑی مہلت دو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالوں گا۔"

میں نے کہا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کہاں رہائش اختیار کرنی چاہیے؟"

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"پچھلے دنوں یہاں بندرگاہ کے ایک گودام میں کچھ دھماکے ہوئے تھے۔
گورنمنٹ کا خیال ہے کہ یہ دھماکے کشمیری کمانڈو نے کئے تھے۔ اس کی وجہ سے

گاہ کے اردگرد اور شہر میں بھی خفیہ پولیس کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ میں تمہیں کسی
میں ٹھہرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ہوٹل میں آنے جانے والوں پر خفیہ پولیس کے
کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ میں تمہارے ٹھہرنے کا ایک جگہ بندوبست کر دیتا ہوں۔"

اس نے بیڑی کا کش لگا کر اسے دور پھینک دیا اور چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد

"گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے تاج محل ہوٹل کی جہازی عمارت ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے دیکھی ہوئی ہے۔"

پھر میں نے نادر خان کو بتایا کہ میں پہلے بھی دو ایک بار بمبئی آ چکا ہوں اور اس شہر کی
اور بازاروں سے تھوڑا بہت واقف ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"یہ اچھی بات ہے۔ تاج محل ہوٹل کے پیچھے ایک بازار ہے۔ اس بازار میں لکشمی
کے نام سے ایک سینما ہاؤس ہے۔ اس سینما ہاؤس میں اپنا ایک آدمی اسسٹنٹ فلم
بڑ ہے یہاں اس نے اپنا نام جعفر بھائی رکھا ہوا ہے۔ وہ سینما ہاؤس کی بلڈنگ کے ایک
میں ہی رہتا ہے۔ میں یہاں سے سیدھا اس کے پاس جاؤں گا اور تم دونوں کے
میں اس سے بات کر کے واپس اپنی دکان پر چلا جاؤں گا۔ تم میرے جانے کے ایک
بعد لکشمی سینما پہنچ کر جعفر بھائی سے مل لینا۔ وہ تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دے
"

میں نے کہا۔

"اگر جعفر بھائی تمہیں اس وقت وہاں نہ ملا تو پھر ہمیں کہاں جانا ہو گا؟"

نادر خان بولا۔

"ہمارے آپس میں دن کے کچھ اوقات طے ہیں۔ ان اوقات میں جعفر بھائی ہر
تک سینما ہاؤس میں ہی رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس وقت وہ سینما ہاؤس میں ہی ہو
"

اس نے گھڑی دیکھی اور جیب سے دو اڑھائی سو روپے کے انڈین کرنسی کے نو
نکال کر آہستہ سے میری طرف بڑھائے۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو اور یہاں سے اکٹھے مت نکلنا۔ آگے پیچھے ہو کر جانا۔ میر
تمہاری ملاقات اگر ضروری ہوئی تو میں تمہیں جعفر بھائی کے ہاں ہی ملوں گا۔ اب میں ج
ہوں۔ تم میرے جانے کے بعد الگ الگ ہو کر موٹر بوٹوں میں آنا۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نائیک شریف کہنے لگا۔

"لگتا ہے اس طرف سے نکلنا مشکل ہے۔ اس سے اچھا تھا کہ میں آزاد کشمیر
طرف سے نکلنے کی کوشش کرتا"

میں نے کہا۔

"تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ وہاں دونوں طرف فوجیں پوزیشنوں میں بیٹھی ہیں
ایک ایک گھاٹی میں دن رات پٹرول پارٹیاں گشت لگاتی ہیں۔ بارڈر پوری طرح سیل
دیئے گئے ہیں۔"

نائیک شریف نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جوان! فکر نہیں۔ ہم تمہیں پاکستان ضرور پہنچائیں گے۔ پاکستان کو اگر یہاں ہمار
ضرورت ہے تو پاکستان کی سلامتی کے لئے وہاں تمہاری ضرورت ہے۔ یہاں جو لوگ ا
زندگیاں خطرے میں ڈال کر پاکستان اور کشمیر کی آزادی کی کاز کے لئے کام کر رہے ہ
ان کے رابطے ایسی ایسی جگہوں پر ہیں کہ جن کا ہم تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے ا
کے کارنامے دیکھے ہوئے ہیں۔ تمہارا ادھر ہی سے پاکستان جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ ا
پہلے میں جاتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تم دوسری کشتی یا موٹر بوٹ میں روانہ ہو جا
میں گیٹ وے آف انڈیا میں اسی جگہ بنچ پر بیٹھا تمہارا انتظار کروں گا۔ جب تم آؤ گے
میں وہاں سے تاج محل ہوٹل کی طرف چل پڑوں گا۔ تم تھوڑا وقفہ ڈال کر میرے پ
پیچھے آجانا۔ اللہ مالک ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے چائے کے بل کی رقم وہیں میز پر رکھ دی اور اٹھ کر سمندر

طرف چلنے لگا۔ چھوٹی کشتیاں اور موٹر بوٹیں وہاں سے چلتی ہی رہتی تھیں۔ ایک موٹر
بوٹ مجھے لے کر روانہ ہو گئی۔ گیٹ وے آف انڈیا کی سیڑھیوں کے پاس ہی میں کشتی
سے اترا اور اوپر چار دیواری کے اندر بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں سے سمندر صاف نظر آرہا
تھا۔ کچھ دیر بعد ایک دوسری موٹر بوٹ آکر وہاں ٹھہر گئی۔ اس میں تین چار سواریاں
تھیں۔ ان میں ہمارا جوان نائیک شریف بھی تھا۔ جب وہ اوپر آیا اور اس نے مجھے دیکھ لیا
تو میں اٹھ کر گیٹ وے آف انڈیا کی عمارت سے نکل کر تاج محل ہوٹل کی طرف چل
پڑا۔ چوک بہت بڑا تھا۔ اس میں کئی سڑکیں چلتی تھیں جن پر ٹریفک جاری تھا۔ ایک جگہ
سگنل کی بتی پر میں رک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نائیک شریف آہستہ آہستہ چلا آرہا
تھا۔ میں سڑک کراس کر گیا۔ سامنے تاج محل ہوٹل کی عظیم الشان مغل طرز تعمیر کی
عمارت تھی۔

تاج محل ہوٹل کے پیچھے ایک لمبا بازار تھا۔

اسی بازار میں آگے جا کر لکشمی سینما ہاؤس تھا۔ نائیک شریف بڑا عقل مند جوان تھا۔ سینما کی لابی میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور دیوار پر لگی ہوئی فلم کی تصویریں دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے سینما کے ایک ملازم سے جعفر بھائی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس باجو میں آگے گلی میں اس کا چالی ہے۔"

یعنی بغل میں ایک گلی ہے جہاں جعفر بھائی کا کمرہ تھا۔ میں نے ایک نگاہ نائیک شریف پر ڈالی اور سینما ہاؤس کی بغلی گلی میں مڑ گیا۔ یہاں سینما کے کسی پرانی فلم کے بڑے بڑے بورڈ دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک طرف دو تین کوٹھڑیوں کے دروازے تھے جو بند تھے۔ ایک کوٹھڑی کے باہر ایک آدمی سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر نوجوان بھی نہیں تھا۔ پرانی سی پتلون اور میلی سی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ ماتھے کے آگے سے سر کے بال اڑنے شروع ہو گئے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ وہ میری طرف اور مجھ سے تین قدم پیچھے آتے ہوئے نائیک شریف کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"جعفر بھائی کہاں ملے گا؟"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر سگریٹ نالی میں پھینکا اور بولا۔

"اندر آجاؤ"

اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ میں اور میرے پیچھے پیچھے نائیک شریف کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک طرف چارپائی پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ آدھے فرش کو پتلی چٹائی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ خدا جانے کیا کیا الا بلا وہاں پڑی تھی۔ میں نے کہا۔

"ہمیں جعفر بھائی سے ملنا ہے۔ ہم دلی سے آئے ہیں۔"

اس نے ہمیں چارپائی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں ہی جعفر بھائی ہوں"

وہاں کے لئے ایک خاص کوڈ ورڈ تھا۔ جو مجھے نادر خان نے کشتی میں بیٹھتے ہوئے اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ کوڈ ورڈ ہمارے ساتھی نائیک شریف کو بھی معلوم ہو۔ میں نے جعفر بھائی سے کہا۔

"پنسل کاغذ مل جائے گا؟"

جعفر بھائی خاموش نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اصل موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ یقیناً وہ تصدیق چاہتا تھا کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جس کے بارے میں نادر خان اسے بہت کچھ بتا گیا ہوا تھا۔ جب میں نے پنسل کاغذ مانگا تو جعفر بھائی نے ایک صندوق کے اوپر سے پرانی سی کاپی اور جیب سے پنسل نکال کر مجھے دی۔ میں نے نائیک شریف کی نظریں بچاتے ہوئے کاپی پر خاص کوڈ ورڈ لکھ کر کاپی جعفر بھائی کے آگے کر دی۔ اس نے غور سے کوڈ لفظ پڑھا۔ پھر اپنی طرف سے اس کے نیچے ایک اور خفیہ لفظ لکھ دیا۔ جب ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ ہم اصلی آدمی ہیں تو وہ کہنے لگا۔

"نادر خان ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ لوگوں کو اس کوٹھڑی میں ہی رات گزارنی ہو گی مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ بہتر جگہ میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں جعفر بھائی! ہم بڑے سخت جان ہیں۔ ہم یہاں بڑے آرام سے رہ

لیں گے۔"

نادر خان نے اشارہ دیا تھا کہ یہی شخص جعفر بھائی نائیک شریف کو کسی سمندری جہ
کے ذریعے ہندوستان سے فرار ہونے میں مدد دے گا اور اس کے فرار کا انتظام کرے گا
مگر اس نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں جہ
اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے بے نیازی سے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔ ابھی تم لوگ آرام کرو"

دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں جعفر بھائی کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر کھایا۔ جع
بھائی کی شخصیت نے ہمیں کوئی زیادہ متاثر نہ کیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ شخ
نائیک شریف کے فرار کا کوئی بندوبست کر سکے گا جو بہت مشکل کام تھا۔ نائیک شریف۔
بھی اس شخص کی طرف سے کس قدر مایوسی کا اظہار کیا۔ مگر میں نے اسے کہا کہ یہ لو
بظاہر ایسے ہی نظر آتے ہیں مگر ان کے رابطے بڑی دور دور تک اور زود اثر ہوتے ہیں
لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔

رات کو ہم وہیں کوٹھڑی میں پڑ کر سو گئے۔ وہ آدمی رات کے بعد جب شو ختم ہوا
کسی وقت آکر وہیں ایک طرف سو گیا۔ صبح ہم اٹھے تو وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ پھر وہ
جاگ پڑا۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ اس نے یعنی جعفر بھائی نے کہا۔

"میں تم لوگوں کے کام کے لئے جا رہا ہوں تم لوگ اس کمرے میں ہی رہنا بغیر ا
ضرورت کے باہر نہ نکلنا"

وہ چلا گیا۔ کوٹھڑی کو اس نے باہر سے تالا نہیں لگایا تھا۔ ہم نے اندر سے کنڈی
نہیں لگائی تھی۔ بس دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ شاید اپنی ڈیوٹی سے چھٹی لے کر گیا تھا۔ دن
کا شو شروع ہو گیا تھا مگر جعفر بھائی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دوپہر کا شو بھی ختم ہو گیا۔
کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گئے تھے۔ مگر جعفر نے ہمیں اشد ضرورت کے بغیر باہر جا
سے منع کر رکھا تھا۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

میں نے نائیک شریف کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ ہم میں سے

بھی دروازہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ جب تیسری چوتھی بار دستک ہوئی تو میں نے نائیک
شریف کو چارپائی پر چادر میں منہ سر لپیٹ کر لیٹ جانے کے لئے کہا۔ وہ جلدی سے
چارپائی پر لیٹ گیا اور اس نے سارے جسم کو چادر میں لپیٹ لیا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی چادر
میں چھپا لیا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور اسے کھولے بغیر پوچھا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔

"جعفر بھائی اندر ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"وہ نہیں ہے۔"

باہر سے آواز آئی۔

"یہ لڈو رکھ لیں۔ نیاز کے ہیں قاسم بھائی نے بھیجے ہیں۔"

میں نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر دیکھا۔ گلی میں ایک دبلا پتلا زرد چہرے والا
آدمی ہاتھ میں پلیٹ لئے کھڑا تھا۔ پلیٹ میں تین لڈو تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے
پلیٹ پکڑ لی اور کہا۔

"یہیں ٹھہریں۔ میں پلیٹ واپس لاتا ہوں"

اس شخص کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ سر
درمیان سے گنجا تھا۔ وہ بڑی دیدہ دلیری سے میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گیا۔ میں اسے
روک نہ سکا کہ شاید جعفر بھائی کا کوئی بے تکلف دوست ہے۔

"یہ جعفر بھائی سو رہا ہے کیا؟"

اس نے چارپائی پر چادر تان کر لیٹے ہوئے نائیک شریف کی طرف دیکھتے ہوئے
پوچھا۔

میں نے جلدی سے لڈو وہیں ایک تھالی میں رکھے اور خالی پلیٹ اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ جعفر بھائی باہر گیا ہوا ہے۔"

اور میں اسے دروازے کے پاس لے آیا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھ
پوچھا۔

"تم جعفر بھائی کے کون لگتے ہو؟ میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں"

میں نے کہا۔

"میں اس کا دوست ہوں۔ شکریہ"

وہ دروازے سے باہر نکلا تو میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ نائیک شریف
اپنے منہ پر سے چادر ہٹا دی اور کہا۔

"یہ آدمی مجھے مشکوک لگتا ہے"

میں نے کہا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں سے باہر بھی نہیں جا سکتے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جعفر
ہی ہو گا۔ ممکن ہے اس کا دوست ہو اور نیاز کے لڈو دینے ہی آیا ہو"

میں حیران ہوں کہ نائیک شریف کو اس پر کیسے شک پڑ گیا تھا جب کہ مجھے اس آد
میں کوئی شک شبہے والی بات نظر نہیں آئی تھی۔ اس وقت شروع رات کے سا
ساڑھے سات بجے کا ٹائم ہو گا۔ نائیک شریف کے شک کرنے کی وجہ سے مجھے اس آد
کے بارے میں کچھ بے چینی سی لگ گئی۔ میں پتہ کرنا چاہتا تھا کہ یہ آدمی کون تھا۔ مج
یونہی وہم ہونے لگا کہ یہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں اس آدمی کا پتہ کر کے آتا ہوں کہ یہ کہاں گیا ہے"

میں تیزی سے کوٹھڑی سے نکل کر سینما ہاؤس کی لابی میں آگیا۔ دوسرا شو شرع ہو
ہوا تھا اور لابی تقریباً خالی پڑی تھی۔ وہ آدمی لابی میں نہیں تھا۔ میں لابی سے نکل کر ف
پاتھ پر آکر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ آدمی کہیں نہیں تھا۔ میں واپس آگیا اور نائیک شریف
بتایا کہ وہ آدمی باہر کہیں نہیں تھا۔ شریف کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئیے۔ مجھے کچھ خطرہ لگ رہا ہے"

میں نے کہا۔

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟ جعفر بھائی ہمارے ہی کام گیا ہوا ہے۔ آتا ہی ہو گا ہمیں
یہاں نہ پا کر وہ پریشان ہو گا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے جانتے بوجھتے ہوئے خطرے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر میں
جعفر بھائی بھی آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک آدمی آیا تھا۔ یہ لڈو دے گیا ہے۔ کہہ رہا
تھا کہ قاسم بھائی نے بھجوائے ہیں۔ جعفر جیسا کھڑا تھا ویسے ہی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ بولا۔

"اس کا حلیہ کیا تھا؟"

میں نے اسے حلیہ بتایا تو وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"قاسم بھائی کون ہے جس نے لڈو بھجوائے ہیں"

جعفر بولا۔

"میں کسی قاسم بھائی کو نہیں جانتا"

اس کے ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھا اور بولا۔

"جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ۔ جلدی کرو"

میں سمجھ گیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے۔ ہمارے پاس تھا ہی کیا جو وہاں سے اٹھاتے۔ تین
کپڑوں میں تھے۔ جیسے ہی وہ دروازے سے نکلا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل پڑے وہ
سینما کی لابی کی طرف آنے کی بجائے سینما کی اس چھوٹی سی گلی میں آگے کی طرف چلنے
لگا۔ آگے دیوار کی وجہ سے گلی بند ہو جاتی تھی۔ مگر دیوار کے کونے میں ایک چھوٹا سا
دروازہ بنا ہوا تھا جس میں سے جھک کر ہم دوسری طرف نکل گئے۔ دوسری طرف کوئی
ایک اور تنگ گلی آگئی جہاں اندھیرا تھا۔ اوپر کسی جگہ سے ہلکی روشنی گلی میں پڑ رہی تھی۔
یہاں آتے ہی جعفر بھائی تیز تیز چلنے اور ہمیں بھی تیز تیز چلانے لگا۔ اس گلی میں سے ایک
اور تنگ سی بغلی گلی تھی۔ اس تنگ گلی میں جعفر بھائی ایک مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو
گیا۔ کہنے لگا۔

"اوپر آجاؤ"

اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی اور ہمیں لے کر ا
والے چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں آگیا۔ یہاں زمین پر صرف ایک چٹائی بچھی تھی
کونے میں فلموں کے پرانے گول گول ڈبوں کا ڈھیر لگا تھا۔ دیوار کے ساتھ بجلی کا کمزو
بلب جل رہا تھا۔ گلی کی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی وہ بند تھی۔ کہنے لگا۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ اسی لئے میں تم لوگوں کو و
سے نکال کر یہاں لے آیا ہوں۔ تم لوگ یہاں نیچے بالکل نہ آنا۔ میرے جانے کے
کمرے کی بتی بند کر کے چٹخنی اندر سے لگا لینا۔ کوئی لاکھ دروازہ کھٹکھٹائے۔ دروازہ با
نہ کھولنا۔ میں باہر حالات کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا اور کافی دیر بعد واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"اس آدمی کا مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا جو میری کوٹھڑی میں لڈو لے کر آیا ت
اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ اب تمہیں جتنے دن
شہر میں لگیں گے تمہیں اسی جگہ رہنا ہو گا۔ اور تم ایک منٹ کے لئے بھی یہاں سے با
نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں کھانا پہنچا دیا کروں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"نائیک شریف کا کوئی انتظام ہوا ہے کیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لینا۔ میں نیچے ڈیوڑ
میں تالا لگاتا جاؤں گا۔"

میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے خوفناک جنگلوں میں کئی کئی دن اور راتیں گزا
ہیں مگر جو تین راتیں مجھے بمبئی کی اس اندھیری گلی کے تنگ کمرے میں قید کی حالت
رہ کر گزارنی پڑیں وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ چوتھے دن جعفر بھائی نے آکر نائ
شریف سے کہا

"تمہارا بندوبست ہو گیا ہے۔"

ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"آج رات کو تم دونوں کو یہاں سے میرے ساتھ ایک اور جگہ چلنا ہو گا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا کسی مسافر بردار جہاز میں انتظام ہوا ہے؟"

جعفر نے کہا۔

"اس کو تم چھوڑو۔ ایک سمندری مال بردار جہاز آج رات تین بجے بمبئی کی بندرگاہ سے بصرے کی جانب روانہ ہونے والا ہے۔ اپنے جوان کو اس جہاز میں سوار کرا دیا جائے گا"

یہ ہمارے لئے واقعی بہت بڑی خوش خبری تھی۔ نائیک شریف کے چہرے پر بھی پہلی بار رونق دیکھ رہا تھا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ جعفر بھائی دوسرا شو ختم ہونے کے بعد کوئی بارہ سوا بارہ بجے ہمارے پاس آیا اور آتے ہی بولا۔

"نکل چلو"

ہم پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ اس قید خانے سے نکل کر ہم اندھیری گلی میں سے گزر کر ایک بازار میں آگئے۔ یہاں ایک ٹیکسی پہلے سے کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیکسی کی ہیڈ لائیٹس بجھی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی والا بھی کوئی اپنا آدمی لگتا تھا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو جعفر بھائی نے اسے کہا۔

"چلو بابو"

ٹیکسی چل پڑی۔ ہم بمبئی کی روشن اور ماڈرن سڑکوں سے ہٹ کر ویران اور خالی خالی سڑکوں پر جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سمندر کی نم دار ہوا مجھے محسوس ہوئی۔ پھر دور سمندر میں سمندری جہازوں کی روشنیاں اور پانی میں ان روشنیوں کے عکس نظر آنے لگے۔ ٹیکسی ایک بہت بڑے اور اونچی اونچی دیواروں والے مال گودام کے پیچھے دیوار کے پاس آکر رک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور جس کو جعفر بھائی نے بابو کہہ کر بلایا تھا ہمارے ساتھ ہی ٹیکسی سے نکل آیا۔ مال گودام کے آس پاس گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مال

گودام کا بڑا دروازہ بند تھا۔ ہم ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اند
لکڑی اور لوہے کے بڑے بڑے کریٹ ایک دوسرے کے اوپر دیوار کے ساتھ چھت تک
لگے ہوئے تھے۔ یہ بندرگاہ کا مال گودام تھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ سوائے ہمارے اور
کوئی شخص وہاں موجود نہ تھا۔

اندر جاتے ہی جعفر بھائی اور ٹیکسی ڈرائیور بابو نے مل کر ایک جگہ سے لکڑی کا خالی
بکس اٹھایا اور کونے میں دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ اس بکس کی شکل تابوت ایسی تھی جس
میں مردے کو لٹا کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ تابوت کے اندر گدا بچھا ہوا تھا۔ پہلو کی
دیواروں کے ساتھ گدیاں لگی تھیں۔ دیواروں میں جگہ جگہ اندر ہوا کے آنے جانے کے
واسطے سوراخ بنائے گئے تھے۔ میں نے جعفر بھائی سے پوچھا۔

"یہ کس لئے ہے؟"

اس نے نائیک شریف کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"یہ اپنے جوان کے لئے ہے"

جو ڈرامہ بمبئی کی مال بردار گودی سے اس تابوت کو جہاز پر پہنچانے کے لئے تیار کیا
گیا تھا وہ یہ تھا کہ پرتگال کا ایک جہاز مال لے کر براستہ بمبئی بصرے جا رہا تھا۔ اس کے
کپتان سے اپنے آدمی جعفر بھائی کے پہلے ہی سے تعلقات تھے۔ ایک خاص رقم کے عوض
مال بردار جہاز کا کپتان نائیک شریف کو بمبئی سے اٹھا کر بصرے لے جانے کے لئے راضی
ہو گیا تھا۔ کپتان نے بندرگاہ کے عملے کے ایک کسٹم افسر کو ایک خاص رقم دے کر راضی
کر لیا تھا کہ وہ بمبئی سے ولائتی شراب کی دو سو بوتلیں سمگل کر کے بصرے اور دوبئی لے
جا رہا ہے جو ایک تابوت میں بند ہوں گی اور مشہور یہ کیا جائے گا کہ جہاز کے عملے کا ایک
آدمی متعدی بیماری کا شکار ہو کر مر گیا ہے۔ اس خیال سے کہ بمبئی کی بندرگاہ بیماری کے
جراثیم سے محفوظ رہے مردے کو تابوت میں بند کر دیا گیا ہے اور اسے اسی حالت میں
جہاز پر لوڈ کر دیا جائے گا اور خلیج کے سمندر میں تابوت سمیت پھینک دیا جائے گا۔ کسٹم
افسر چونکہ ساتھ ملا ہوا تھا اس لئے اس بارے میں زیادہ چھان بین نہ کی گئی اور کپتان کو

ے عملے کے فرد کی تابوت میں بند لاش جہاز پر لوڈ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب تابوت
شراب کی بوتلوں کی جگہ نائیک شریف کو لٹایا جانا تھا۔ اور مجھے، جعفر بھائی اور ٹیکسی
رائیور کو جو اپنا ہی آدمی تھا پادریوں کا لباس پہن کر تابوت کے ساتھ ہی جہاز پر جانا تھا اور
بوت وہاں رکھوا کر واپس آ جانا تھا۔

نائیک شریف نے جھک کر تابوت کے سوراخوں کو دیکھا۔ جعفر بولا۔

"فکر نہ کرو۔ اس میں سے تمہیں تازہ ہوا آتی رہے گی اور تمہیں تابوت میں زیادہ
ے زیادہ آدھے گھنٹے کے لئے لیٹنا ہو گا۔ جہاز کے کیبن میں پہنچتے ہی تمہیں تابوت سے
ال لیا جائے گا۔"

ڈرائیور بابو نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"جعفر بھائی! وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں آدھے گھنٹے میں گودی پر پہنچ جانا چاہئے۔
پتان کو ہم وہاں زیادہ دیر انتظار نہیں کرا سکتے۔"

جعفر نے ایک دوسرا بکس کھلوایا۔ اس میں سے ہم تین آدمیوں کے لئے پادریوں کا
س تھا۔ سیاہ لمبے چغے۔ سیاہ بوٹ، گلے میں ڈالنے والے سیاہ مفلر اور چاندی کی چھوٹی
صلیبیں، ہم نے فوراً اپنے اتار کر بکس میں رکھے اور پادریوں کا لباس پہن لیا۔

اور ہاتھوں میں چاندی کی چھوٹی صلیبیں تھام لیں۔

جعفر بھائی نے مجھے کہا۔

"تم بالکل خاموش رہ کر ہمارے ساتھ چلو گے"

نائیک شریف تابوت میں لیٹ گیا۔ تابوت کو بند کر کے چھوٹے چھ سات کیل لگا
یئے گئے۔ ہم نے تابوت اٹھایا اور اسے ٹیکسی کے اوپر رکھ کر رسیوں سے باندھ دیا اور
رُی گاڑی رات کی تاریکی میں اس ویران گودام سے نکل کر بندرگاہ کی اس گودی کی
رف چل پڑی جہاں دوسرے ملکوں کے مال بردار جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ فاصلہ
ڑی نے پندرہ بیس منٹ میں طے کر لیا۔ ٹیکسی ایک گیٹ میں سے گزر کر دوسرے گیٹ
ے پاس آئی تو اسے روک دیا گیا۔ گارڈ نے ٹیکسی کے اوپر تابوت کو اور اندر تین پادریوں

کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ جعفر بھائی نے میرے
میں کہا۔

"پرتگالی کپتان نے ان لوگوں کو بتا دیا ہوگا"

ہماری گاڑی کافی بڑے پلیٹ فارم سے گزرتی ہوئی ایک گودی میں داخل ہوئی تو
نے ایک بہت بڑے جہاز کو دیکھا جو گودی کے ساتھ لگا ہوا تھا اور ایک جانب سے اس
کچھ مال اوپر چڑھایا جا رہا تھا۔ ایک سرخ ڈاڑھی والا وردی پوش مضبوط ڈیل ڈول
آدمی جو کپتان ہی تھا اپنے عملے کے چار پانچ آدمیوں کے ساتھ ہماری طرف آگیا۔ کس
کے عملے کا ایک افسر بھی وہاں موجود تھا۔ تابوت ٹیکسی کے اوپر سے اتارا گیا۔ کسٹم
انڈین افسر نے کپتان کی طرف ایک کاغذ جو تختی پر لگا ہوا تھا بڑھایا۔ کپتان نے اس
دستخط کر دیئے۔ ہم تینوں پادریوں کے بھیس میں چہرے سوگوار بنائے ہاتھ باندھے خامو
کھڑے تھے۔ تابوت اوپر لے جایا جانے لگا۔ ہم بھی تابوت کے پیچھے پیچھے جہاز پر چ
گئے۔ تابوت کو جہاز کے ایک کیبن میں رکھوا دیا گیا۔ کیپٹن نے عملے کے آدمیوں کو وہا
سے چلے جانے کا حکم دیا۔

جب کیبن میں ہم لوگ ہی رہ گئے تو جعفر بھائی نے ڈرائیور بابو سے کہا۔

"اسے کھول دو"

کپتان بھی ڈرائیور بابو کے ساتھ لگ گیا۔ انہوں نے چند لمحوں میں تابوت کا ڈھک
اٹھایا تو اندر نائیک شریف بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری طرف
دیکھ کر بولا۔

"مرنے سے پہلے قبر میں بند ہونے کا تجربہ ہو گیا ہے۔ کیا ہم جہاز پر آگئے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں جوان! اب سمجھو کہ تم پاکستان پہنچ گئے"

کپتان سگار سلگاتے ہوئے بولا۔

"تم لوگوں کو تین منٹ میں جہاز سے اتر جانا ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ کیبن سے نکل گیا۔

میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! یہ جہاز سب سے پہلے بصرے جا رہا ہے۔ بصرے کی بندرگاہ سے باہر تک
ہیں کپتان کا آدمی خود لے جائے گا۔ بصرے پہنچتے ہی تمہیں وہاں پاکستانی سفارت خانے
پنچنا ہوگا اور انہیں بتا دینا کہ تم پاکستان کے جنگی قیدی ہو اور انڈیا کی قید سے فرار ہو کر
ئے ہو۔ ہمارے بارے میں وہاں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہنا کہ بمبئی کے
ب پاکستان سے محبت کرنے والے تاجر نے تمہیں ایک مال بردار جہاز پر سوار کرا دیا
ا۔"

جعفر بھائی نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر نائیک شریف کو دیا اور کہا۔

"اس میں بصرے کی کرنسی کے کچھ نوٹ ہیں۔ پاکستانی سفارت خانے تک پہنچنے میں
تمہارے کام آئیں گے۔ خدا حافظ!"

اس وقت نائیک شریف تابوت سے نکل کر کیبن کے برتھ پر بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر ہم
ں سے باری باری گلے لگ کر ملا۔ میں نے اس سے کہا۔

"پاکستان کی فضاؤں میں پہنچ کر وہاں کی ہواؤں کو وہاں کے شہروں کو وہاں کے پیارے
ں کو میرا سلام کہنا۔ پاکستان زندہ باد!"

نائیک شریف کی آنکھوں میں بھی شدت جذبات سے آنسو آگئے۔ جعفر بھائی بولا۔

"اب چلو بھائی۔"

ہم کیبن سے نکلے اور جہاز کی تنگ راہ داری سے گزرتے ہوئے جہاز پر لگی ہوئی
ی پر سے نیچے اتر گئے۔ اس وقت جہاز کے چلنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور
ے کی طرف جو تختہ جہاز پر لگایا گیا تھا وہ اٹھایا جا رہا تھا۔ ہم پادریوں کے بھیس میں
ار چہرے بنائے آہستہ آہستہ چلتے ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئے۔ بابو نے ٹیکسی وہاں سے باہر
اور جب ہم بندرگاہ کے علاقے سے نکل کر بمبئی کی کھلی اور ویران سڑک پر آئے تو
نے جعفر سے کہا۔

"جعفر بھائی! تم نے یہ بڑا کام کیا ہے میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

جعفر بھائی بولا۔

"ہم تو یہاں اپنی ڈیوٹیاں ادا کر رہے ہیں۔ اور جہاد کشمیر اور پاکستان کے فوجی جوانوں کے لئے تو ہماری ایک جان کیا ہزار جان حاضر ہے۔ پاک فوج کے جوان اور افسر اسلام کے شیر ہیں۔"

گودام میں واپس آکر ہم نے پادریوں والا لباس اتار کر اپنے اپنے کپڑے پہنے اور ایک بار پھر ٹیکسی میں سوار ہو کر رات کے اندھیرے میں بمبئی کی سڑکوں پر روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور بابو ہمیں جعفر بھائی کے گھر والی تنگ و تاریک گلی کے باہر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس وقت رات کا آخری پہر گزر رہا تھا۔ جعفر کہنے لگا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں اب واپس سری نگر اپنے کمانڈر شیرواں کے پاس جاؤں گا انہیں میری ضرورت ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ بمبئی سنٹرل سے دلی کی طرف ایک گاڑی دن کے سوا نو بجے چھوٹتی ہے۔ ایک گاڑی رات کے نو بجے بمبئی سنٹرل ہی سے دلی کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں رات کی گاڑی پکڑنے کا مشورہ دوں گا۔"

میں نے کہا۔

"جیسے تم کہتے ہو میں ویسے ہی کروں گا۔"

جعفر بولا۔

"پھر تم آج رات کی گاڑی سے چلے جانا میں تمہارے لئے بمبئی سنٹرل سے دلی تک کا ٹکٹ شام کو لیتا آؤں گا۔ میں دن کے وقت نہیں آسکوں گا۔ تمہارا کھانا یہاں پڑا ہے۔ اسے گرم کر کے کھا لینا۔ تھرمس میں چائے بھی پڑی ہے خدا حافظ!"

جعفر بھائی چلا گیا۔ میں چٹائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ میں نادر بھائی کو اپنے مشن

کامیابی کی رپورٹ کیسے دوں۔ پھر خیال آیا کہ جعفر بھائی اسے خود ہی بتا دے گا۔ میرا جانا ٹھیک نہیں۔ اور پھر مجھے جعفر نے مکان سے باہر نکلنے سے منع کیا تھا۔

دن کسی نہ کسی طرح اس چھوٹے سے کمرے کے قید خانے میں گزر گیا۔ حیرانی کی تھی کہ گلی میں دو تین اور مکان بھی تھے مگر کبھی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ لگتا کہ سارے مکان خالی ہیں۔ شام کے وقت جعفر بھائی آیا۔ وہ میرے لئے ریل کا ٹکٹ کھانے پینے کو لایا تھا۔ یہ بمبئی سے دلی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ کہنے لگا۔

"مزید پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے سکتے ہو"

میں نے کہا۔

"نادر خان نے مجھے جو پیسے دیئے تھے وہ سری نگر پہنچنے کے لئے کافی ہوں گے۔"

جب میں نے اسے کہا کہ وہ ہمارے کامیاب مشن کی خبر نادر خان کو پہنچا دے تو جعفر ئی بولا۔

"یہ خبر میں نے کل رات ہی اسے پہنچا دی تھی۔"

جعفر بھائی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور کش لگا کر کہنے لگا۔

"تم یہاں سے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب نکل جانا۔ تم اکیلے ہی جاؤ گے میں ارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ راستے میں کسی جگہ مت رکنا۔ ٹیکسی موٹر رکشا جو بھی ملے لے کر نکل جانا۔ بس میں نہ بیٹھنا۔ باقی تم خود جانتے ہو کہ تمہیں کیا کیا احتیاط کرنی ہے۔ جاتی دفعہ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر جانا۔ اچھا۔ خدا حافظ!"

میں جعفر بھائی کو گلے ملنا چاہتا تھا مگر اس آدمی نے صرف مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلا یہ ٹھیک ہے۔ باعمل آدمی تکلفات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے گھنٹہ ڈیڑھ اس قید تنہائی میں گزارا اور باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے ... سیدھے ہاتھ کی جیب میں رکھی ہوئی زہریلی بال پوائنٹ پنسل کو نکال کر چیک ... بال پوائنٹ کا رخ دیوار کی طرف کر کے اس کا خشخاش کے برابر خفیہ بٹن ...

دبایا۔ سن کی معمولی سی آواز آئی اور بال پوائنٹ میں سے زہریلی سوئی فائر ہو کر دیوار پر
جا گھسی۔ مجھے بال پوائنٹ کی نوک میں سے زہریلی سوئی نکلتی نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے
آگے بڑھ کر جھک کر دیوار کو دیکھا۔ دیوار کی سفیدی ایک جگہ سے نقطے کے برابر اکھڑی
تھی۔ میں نے مزید غور سے دیکھا۔ وہاں دیوار میں بلب کی روشنی میں نقطہ چمکتا نظر آیا۔
یہ زہریلی سوئی ہی تھی۔ میں نے بال پوائنٹ جیب میں اچھی طرح سے سنبھال کر رکھ لیا۔
دوسری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تھی۔ پچھلی جیب میں کچھ نقدی کرنسی نوٹوں
اور سکوں کی شکل میں موجود تھی۔ یہ آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ میں نے اپنی لمبی ڈاڑھی
مونچھیں کاٹ کر بڑی چھوٹی چھوٹی کر لی تھیں۔ سر کے بال بھی گردن سے نیچے کاٹ دیئے
تھے تاکہ پہچانا نہ جا سکوں۔

مجھے بمبئے جھانسی بھوپال لائن سے دلی پہنچنا تھا۔ اس لائن پر کلکتے والا تازہ خطرہ نہیں
تھا۔ لیکن راستے میں گوالیار کا سٹیشن پڑتا تھا۔ یہاں کے فوجی ٹارچر سینٹر سے بھی میں
دشمن کے دو ایک فوجیوں کا خون کر کے بھاگا تھا۔ اگرچہ اس بات کو مہینہ گزر گیا تھا لیکن
ملٹری اور سول پولیس میری تلاش میں ضرور ہو گی۔ چنانچہ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب
گوالیار کا سٹیشن قریب آ رہا ہو گا تو میں ریل کے ڈبے کے ٹائیلٹ میں گھس جاؤں گا اور
کوشش کروں گا کہ جب تک گاڑی وہاں کھڑی رہے اندر ہی چھپا رہوں۔ میرا لباس اس
وقت یہ تھا کہ پتلون کے اوپر قمیض تھی۔ قمیض کے اوپر ٹھنڈی جیکٹ تھی جس کے
سارے بٹن کھلے تھے۔ زہریلی بال پوائنٹ میں پتلون کی جیب میں اس لئے رکھتا تھا کہ
جیکٹ کی نسبت پتلون سے بال پوائنٹ نکال کر فائر کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ اور پھر
خطرے کے علاقے میں آدمی پتلون میں ہاتھ ڈال کر بھی چل پھر سکتا تھا۔ جیکٹ کی اندرونی
جیب میں ہاتھ ڈال کر نہیں چل پھر سکتا تھا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں چلنے کے لئے بالکل تیار ہوں تو اللہ کا نام لیا اور
کمرے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے ڈیوڑھی میں آیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر
دیکھا۔ نیم اندھیرے میں گلی خالی پڑی تھی۔ میں نے باہر آ کر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دیا

اور سر جھکا کر خاموشی سے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گلی میں سے گزرتا ہوا اس گلی
میں آگیا جو سینما ہاؤس والی گلی تھی۔ یہاں سے سینما ہاؤس کی لابی میں آگیا لابی میں سے بھی
بڑی بے نیازی سے ٹہلتا ہوا نکل کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ سوا چھ بجے والا شام کا شو ابھی ختم
نہیں ہوا تھا۔ چوک میں شو ٹوٹنے پر سواریاں لینے کے لئے دو چار خالی ٹیکسیاں اور موٹر
رکشا کھڑے تھے۔ مجھے سب سے پہلے ایک رکشا ہی ملا۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور
سے کہا۔

"بمبئے سنٹرل چلو"

رکشا ڈرائیور نے کہا۔

"بابو ہم اپنی سواری کے لئے کھڑا ہے۔ تم دوسرا رکشا لے لو"

میں چپکے سے رکشے میں سے نکل آیا۔ ساتھ ہی دوسرا رکشا کھڑا تھا۔ اس کا ڈرائیور
میری طرف بڑھا۔

"کہاں جائے گا بابو؟"

میں اسے وہاں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن پہلے رکشے والے نے اسے کہا۔

"بابو بمبئے سنٹرل جائے گا"

دوسرے رکشے والے نے بیڑی کا کش لگا کر اسے سڑک پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"بیٹھے گا بابو۔"

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں رکشے میں بیٹھنے سے پہلے نگاہ ڈال کر ارد گرد کا جائزہ
لے لوں۔ کیونکہ وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ میں نے جیسے ہی نظر ڈالی تو مجھے وہی گنجا آدمی
نظر آیا جو جعفر بھائی کی کوٹھڑی میں نیاز کے لڈو لے کر آیا تھا اور جس کے بارے میں جعفر
خالی نے کہا تھا کہ وہ یقیناً خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ میں رکشے
میں بیٹھ چکا تھا۔ اور میرے بیٹھتے ہی رکشا بھی چل پڑا تھا۔

جیسے ہی رکشا گھوم کر سڑک پر آیا میں نے رکشے کی عقبی کھڑکی میں سے پیچھے دیکھا۔
خفیہ پولیس والا ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ یہ مصیبت میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ اب مجھے

بے حد محتاط ہو کر رہنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اس آدمی کو مجھ پر شک ضرور پڑا ہے کہ
کے پاس میرے کسی کمانڈو ایکشن سے ہونے والی تباہی کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ یعنی
یہ نہیں معلوم کہ میں کس قدر خطرناک کشمیری حریت پسند کمانڈو ہوں اور میں دش
کیسا کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکا ہوں۔ اس کو میں وہاں ایک بالکل اجنبی شخص نظر
ہوں اور وہ محض اپنی ڈیوٹی پوری کرنے اور روزنامچہ بھرنے کی خاطر میرے پیچھے لگا
ہے۔ جب میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی شہر سے نکل جاؤں گا تو وہ بھی میرا پیچھا
دے گا۔

رکشا بمبئی کے روشن اور بارونق بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے
ہوشیاری سے پیچھے سڑک پر نگاہ ڈالی۔ ایک ٹیکسی تھوڑے فاصلے پر رکشے کے پیچھے
آرہی تھی۔ دوسری ٹیکسیاں اور گاڑیاں میرے رکشے کو اوورٹیک کر کے آگے نکل
تھیں مگر یہ ٹیکسی میرے آگے نہیں نکل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ٹیکسی میں خفیہ پ
والا گنجا آدمی بیٹھا ہے اور برابر میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ
یہ میری غلطی تھی۔ میں اس لئے مطمئن تھا کہ ایک تو میں نے بمبئی کے علاقے میں
کمانڈو ایکشن والی واردات نہیں کی ہے۔ دوسرے یہ خفیہ پولیس والا محض خانہ پری
لئے میرا پیچھا کر رہا ہے اور مجھے بمبئی شہر سے باہر جاتا دیکھ کر یہ اپنے آپ واپس چلا
گا۔ چنانچہ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور خاموشی سے کش لگانے لگا۔
چوک سے گھوم کر دوسری سڑک پر آیا تو میں بڑی احتیاط سے پیچھے نگاہ ڈال لیتا۔ کم
خفیہ پولیس والے کی ٹیکسی برابر میرا پیچھا کر رہی تھی۔ کسی وقت مجھے کچھ بے چینی سی
لگ جاتی کہ یہ آدمی میرے لئے کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن
ہو جاتا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تو میں اسے آسانی سے ہلاک کر سکتا ہوں۔
نے رکشے والے سے کہا۔

"تیز تیز چلو بھائی"

بمبئی کا بوری بندر کے بعد دوسرا بڑا ریلوے سٹیشن بمبئے سنٹرل آگیا۔ میں

ے اترا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں ایک عام شہری ہوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے سٹیشن
میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ میرے پاس ہی تھا۔ وہاں کوئی ایسا گیٹ نہیں تھا جس طرح
دوسرے شہروں کے ریلوے سٹیشنوں پر گیٹ بنے ہوتے ہیں جہاں مسافر ٹکٹ بابو کو ٹکٹ
دکھا کر پلیٹ فارم پر آتے ہیں۔ پلیٹ فارم سامنے ہی تھا۔ کتنے ہی پلیٹ فارم ساتھ ساتھ
بنے ہوئے تھے جہاں کہیں کہیں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ان میں بمبئی کے مضافات میں
چلنے والی لوکل ٹرینیں بھی تھیں۔ لوکل ٹرین آکر کھڑی ہوتی۔ پہلے مسافر اترتے'
دوسرے مسافر سوار ہوتے اور ٹرین آگے جانے کی بجائے پیچھے کی جانب روانہ ہو جاتی۔
کیونکہ بمبئے سنٹرل کے کچھ پلیٹ فارم ایسے تھے جہاں سے ریلوے لائن بند ہو جاتی تھی۔
یعنی ٹرمینل سٹیشن تھے۔ جس پلیٹ فارم پر میں آیا تھا وہاں کوئی ٹرین نہیں کھڑی تھی۔ اس
زمانے میں وہاں میں نے یہ رواج دیکھا تھا کہ ٹکٹ ٹرین کے بمبئی شہر سے نکلتے ہی ڈبوں
میں چیک کیا جاتا تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں وہاں کیا رواج ہو گا۔ اسی طرح جب میں بمبئی
آیا تھا تو سٹیشن آنے سے کوئی دس پندرہ منٹ پہلے ہمارے ڈبے میں ایک ٹی ٹی آگیا تھا اور
اس نے سب مسافروں کے ٹکٹ چیک کئے تھے۔ جب ٹرین بمبئی کے سٹیشن پر پہنچی تھی
تو وہاں کسی نے ہمارے ٹکٹ نہیں دیکھے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری جانب پارکنگ لاٹ
میں رکشے اور کاریں کھڑی تھیں۔

میں ایک بک سٹال پر کھڑے ہو کر اخبار رسالے وغیرہ دیکھنے لگا۔ اصل میں میں پلیٹ
فارم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی یہاں تک
آیا ہے کہ نہیں۔ پلیٹ فارم پر ابھی مسافروں کا رش نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں مسافر
کھڑے تھے۔ کچھ لوگ سامان ایک جگہ رکھے اپنی عورتوں بچوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ
آدمی ان میں نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ چونکہ میں شہر سے نکل کر جا رہا ہوں اس لئے اس
نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے پلیٹ فارم کی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ٹرین کے چلنے میں
ابھی پون گھنٹہ رہتا تھا۔ میں سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں چلا گیا۔ یہاں ایک سکھ فوجی
اپنے سامان کے پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ شام کو چھپنے والا انگریزی کا اخبار تھا۔ اس

کے قریب ایک فیملی بیٹھی تھی۔ موٹی عورت نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور اپنی چھوٹی
کو فراک پہنا رہی تھی۔ میں خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ پر پانی کے
مارے۔ وہاں تولئے لٹک رہے تھے۔ منہ صاف کر کے وہیں سے کنگھی اٹھا کر بالوں
پھیری۔ پھر باہر پلیٹ فارم پر آکر ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر چائے کا گلاس لے کر چائے
لگا۔

اس دوران بھی میں نے پلیٹ فارم کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ گنجا سی آئی ڈی والا
نہیں تھا۔ اس کی طرف سے مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ اب وہ یہاں نہیں آ
گا۔ اس نے روزنامچے میں درج کر لیا ہو گا کہ مشتبہ شخص شہر سے چلا گیا ہے اور ڈا
صدری کی جیب میں ڈال کر اپنے گھر چلا گیا ہو گا۔ چائے کا گلاس بھی ختم ہو گیا۔ ا
طرف بنچ پر بیٹھ گیا۔ تب کہیں جا کر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ریل کی بوگیاں آئیں
ایک دھچکے کے ساتھ پلیٹ فارم پر آکر رک گئیں۔ اس وقت تک مسافروں کا کافی رش
گیا ہوا تھا۔ ٹرین کے لگتے ہی مسافروں نے ڈبوں پر ہلہ بول دیا۔ میں بھی پیچھے جا کر
کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ میں ایسی سیٹ پر بیٹھا تھا جہاں ڈبے کا دروازہ قریب
تھا۔ میری سیٹ بھی کھڑکی والی تھی۔ آخر ٹرین چل پڑی۔ اس ٹرین کا نام مجھے یاد نہ
آرہا۔ راجدھانی ایکسپریس تھا یا کچھ اور تھا۔ بڑی فاسٹ ٹرین تھی۔ بمبئی کے مضافات
نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا مشن مکمل ہو گیا تھا
پاک فوج کا جوان دشمن کی قید میں نہیں رہا تھا۔ اس ٹرین کا روٹ بمبئے بھوپال گوالیار
جھانسی والا تھا۔ اسے دو راتوں اور ایک دن کے سفر کے بعد دلی پہنچنا تھا۔ میں نے س
رکھا تھا کہ دلی پہنچ کر میرٹھ تک بس میں سفر کروں گا اور میرٹھ سے آگے پھر ٹرین پکڑو
گا۔ اس طرح میں لوگوں کی مسلسل نظر میں رہنے سے محفوظ رہوں گا۔

میں نے ڈبے میں سوار سبھی مسافروں کو غور سے دیکھا' یونہی اپنا شک دور کر
کے لئے۔ خفیہ پولیس والا آدمی ان میں نہیں تھا۔ اس بلا سے میرا ہمیشہ کے پیچھا چھو
چکا تھا۔ میں نے ہلکی سی جمائی لی اور کھڑکی کے ساتھ سر لگا دیا۔ نیند بالکل نہیں آر

تھی۔ ٹرین شور مچاتی کھیتوں اور نیم جنگلی علاقوں سے گزرتی جا رہی تھی۔ باہر سے ٹھنڈی
اور سبزے کی مہک والی ہوا کے تیز جھونکے اندر آرہے تھے۔ جو بڑے خوشگوار لگ رہے
تھے۔ ایکسپریس گاڑی تھی۔ اس کے سٹاپ صرف بڑے بڑے سٹیشنوں کے ہی تھے۔
"پوری" کے سٹیشن پر ذرا دیر کے لئے رکی اور پھر چل پڑی۔ اگلا بڑا شہر دیولالی تھا جو ایک
گھنٹے بعد آیا۔ یہاں ٹرین رکی تو میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے تھے۔
سٹال پر سے سگریٹوں کا پیکٹ خریدا اور ایک سگریٹ سلگا کر پلیٹ فارم پر ہی اس وقت
تک ٹہلتا رہا جب تک کہ انجن نے سیٹی نہ دی۔ سیٹی کی آواز پر میں آہستہ آہستہ اپنے
ڈبے کی طرف بڑھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا ڈبے
میں کچھ نئے مسافر آگئے تھے۔ کچھ پرانے مسافر اتر گئے تھے۔ میں نے ان مسافروں کی
طرف کوئی توجہ نہ دی اور چلتی ٹرین میں سے پلیٹ فارم کی روشنیاں دیکھنے لگا۔ جب ٹرین
آؤٹر سگنل سے بھی نکل گئی اور اس کی سپیڈ بھی تیز ہو گئی اور باہر بھی رات کا اندھیرا چھا
گیا تو میں کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے میں کافی روشنی تھی۔ کچھ مسافر سو گئے تھے کچھ
سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہی
خفیہ پولیس والا ڈبے کے دروازے کے پاس ایک صندوق کے پاس بیٹھا باہر دیکھ رہا ہے
اور بیڑی پی رہا ہے۔ یقین کریں اس وقت ایک لمحے کے لئے میرے سارے جسم میں ڈر
خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگرچہ دوسرے لمحے میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ لیکن
اس خفیہ پولیس والے کی ڈبے میں موجودگی نے ایک بات ثابت کر دی تھی کہ اس کی نظر
میں میں بڑا اہم مجرم یا غیر ملکی جاسوس ہوں اور وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں
ہے۔ میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔
اچانک اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے نگاہیں دوسری طرف
کر لیں۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب میں اس سے بچ نکلنے کی
ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ یہ شخص میرے لئے انتہائی خطرناک نشان بن چکا تھا۔ میری
سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ میرا مسلسل تعاقب کس لئے کر رہا ہے؟ اگر وہ مجھے

تھی۔ ٹرین شور مچاتی کھیتوں اور نیم جنگلی علاقوں سے گزرتی جا رہی تھی۔ باہر سے ٹھ
اور سبزے کی مہک والی ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ جو بڑے خوشگوار لگ ر
تھے۔ ایکسپریس گاڑی تھی۔ اس کے سٹاپ صرف بڑے بڑے سٹیشنوں کے ہی تھ
"پوری" کے سٹیشن پر ذرا دیر کے لئے رکی اور پھر چل پڑی۔ اگلا بڑا شہر دیولالی تھا جو
گھنٹے بعد آیا۔ یہاں ٹرین رکی تو میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے تھ
سٹال پر سے سگریٹوں کا پیکٹ خریدا اور ایک سگریٹ سلگا کر پلیٹ فارم پر ہی اس وق
تک ٹہلتا رہا جب تک کہ انجن نے سیٹی نہ دی۔ سیٹی کی آواز پر میں آہستہ آہستہ اپ
ڈبے کی طرف بڑھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ڈ
میں کچھ نئے مسافر آ گئے تھے۔ کچھ پرانے مسافر اتر گئے تھے۔ میں نے ان مسافروں
طرف کوئی توجہ نہ دی اور چلتی ٹرین میں سے پلیٹ فارم کی روشنیاں دیکھنے لگا۔ جب ٹر
آؤٹر سگنل سے بھی نکل گئی اور اس کی سپیڈ بھی تیز ہو گئی اور باہر بھی رات کا اندھیرا
گیا تو میں کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے میں کافی روشنی تھی۔ کچھ مسافر سو گئے تھے
سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ
خفیہ پولیس والا ڈبے کے دروازے کے پاس ایک صندوق کے پاس بیٹھا باہر دیکھ رہا
اور بیڑی پی رہا ہے۔ یقین کریں اس وقت ایک لمحے کے لئے میرے سارے جسم میں
خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگرچہ دوسرے لمحے میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ لیک
اس خفیہ پولیس والے کی ڈبے میں موجودگی نے ایک بات ثابت کر دی تھی کہ اس کی نظ
میں میں بڑا اہم مجرم یا غیر ملکی جاسوس ہوں اور وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہ
ہے۔ میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھ
اچانک اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے نگاہیں دوسری طر
کر لیں۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب میں اس سے بچ نکلنے
ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ یہ شخص میرے لئے انتہائی خطرناک نشان بن چکا تھا۔ میر
ں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرا مسلسل تعاقب کس لئے کر رہا ہے؟ اگر وہ مجھ

کشمیری حریت پسند یا پاکستانی جاسوس سمجھتا ہے تو اس نے مجھے بمبئی میں ہی گرفتار کیوں نہیں کروا دیا۔ آخر اسے میرے ساتھ ڈبے میں بیٹھ کر سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن میں نے اس گاڑی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ٹکٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں اس کے بعد کوئی دوسری گاڑی پکڑ سکتا تھا۔ ٹرین چھوڑنے کا طریقہ میں نے یہ سوچا کہ اب کوئی سٹیشن آئے گا اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گی تو میں سامنے جو سٹال بھی نظر آیا اس طرف منہ کر کے اونچی آواز میں کہوں گا۔

"کریم بھائی! کیا حال ہے؟ نہیں نہیں تم وہیں بیٹھے رہو۔ میں خود تم سے ملنے آتا ہوں"

لوگ اور خفیہ پولیس والا یہی سمجھے گا کہ میں سامنے سٹال والے سے مخاطب ہوں۔ پھر میں اتر کر سامنے سٹال پر جاؤں گا اور سٹال والے سے یونہی باتیں شروع کر دوں گا موقع پا کر سٹال کے پیچھے اس طرح جاؤں گا جیسے میں کسی چیز کی تلاش میں ہوں اور وہاں سے مسافروں کے ہجوم میں گھس کر گم ہو جاؤں گا اور پھر سٹیشن سے باہر نکل جاؤں گا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میری تقدیر کچھ اور ہی سوچ رہی ہے۔ اگلا سٹیشن ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک مسافر سے وقت پوچھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ٹرین بڑی تیز رفتاری سے خدا جانے کیسے کیسے جنگلوں میں سے گزرتی دوڑی جا رہی تھی۔ میری کھڑکی کے سامنے جھکے ہوئے درختوں کے ہیولے تیزی سے پیچھے گزرتے تو شائیں شائیں کی آوازیں آتیں۔

دلی بمبئی کے اس ریلوے روٹ سے میں خوب واقف تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اگلا سٹیشن تو جل گاؤں ہے جو دو گھنٹے بعد آئے گا۔ شاید اسی لئے خفیہ پولیس والا بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کم از کم جل گاؤں تک میں اس کی نظروں سے غائب نہیں ہو سکتا۔ اس شخص نے میرے اردگرد جو خطرناک جالا بن رکھا تھا وہ میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ اور مجھے چلتی ٹرین میں ہی آنے والے خطرے کا سدباب کر لینا چاہیے تھا اور میں ایسا کر سکتا تھا۔ میرے پاس

اس شخص کو ہلاک کرنے کے واسطے ایسا ہتھیار تھا کہ جس کے فائر کی معمولی سی آواز بھ
نہیں آتی تھی اور آدمی اچانک یوں مرجاتا تھا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔ لیک
انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے جہاں سوچ سمجھ اور عقل رکھ
ہوئے بھی آدمی دھوکہ کھا جاتا ہے اور غافل ہو جاتا ہے۔

میں نے نظریں بچا کر دروازے کے پاس صندوق پر بیٹھے ہوئے خفیہ پولیس والے
دیکھا۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کئے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کے رویے سے یہ ظاہر ہو
تھا کہ وہ میرے لئے ٹرین میں سوار نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے طور پر کسی دوسرے شہر جا
کے واسطے سفر کر رہا ہے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے بھی یہی خیال آیا کہ اگر اس شخص
مجھے پکڑوانا ہی ہوتا تو اسے میرے ساتھ ٹرین میں سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بمب
میں ہی مجھے گرفتار کروا سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت تھی کہ وہ لکشمی سیٹ
گھر کے باہر مجھے رکشا میں سوار ہوتا دیکھ کر میرے پیچھے لگا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھ
کہ یہ شخص آخر مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ میں اسی پر پیچ الجھن میں الجھا ہوا تھا کہ ٹرین کی
رفتار ہلکی ہونے لگی۔ کوئی بڑا سٹیشن آرہا تھا۔ بڑے بڑے کارخانوں کی روشنیاں گزرنے
لگیں۔ پھر ایک بہت کشادہ ریلوے یارڈ آگیا۔ اور ٹرین جل گاؤں کے سٹیشن میں داخل
ہو گئی۔ میرا ڈرامہ ٹرین کے پلیٹ فارم پر رکنے کے بعد شروع ہونا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر
پہنچ گئی تھی۔ یہاں مسافر زیادہ نہیں تھے۔

اچانک میری نگاہ پلیٹ فارم پر گیٹ کے پاس پڑی اور میرے اندر سے جیسے آوا
آئی۔ پھنس گئے ہو۔ پلیٹ فارم پر مسلح پولیس کی بھاری نفری کھڑی تھی۔ ان میں دو
پولیس انسپکٹر بھی تھے۔ وہ سب ٹرین کے ڈبوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ
گزر رہے تھے۔ اس دوران خفیہ پولیس والا دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے
پولیس کی طرف ہاتھ ہلایا۔ اب میرے لئے فرار ہونے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کیونکہ
اپنے آدمی کو دیکھ کر سپاہی رائفلیں لئے میرے والے ڈبے کی طرف دوڑ پڑے تھے اور
جیسے ہی ٹرین رکی سپاہی ڈبے میں گھس آئے۔ خفیہ پولیس والے نے میری طرف اشارہ

۔ ایک سپاہی وہیں رائفل میری طرف تان کر کھڑا ہو گیا اور دو سپاہی میری طرف لپکے
انہوں نے آتے ہی مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے ڈبے سے باہر لے آئے۔
ں پولیس انسپکٹر بھی وہاں آگئے تھے۔ انہوں نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ خفیہ
ں والا ان کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا تھا اور ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک کالے
ں انسپکٹر کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

"اسے ہتھکڑی لگا کر لے چلو"

اسی وقت میرے ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا دی گئی۔ میں نے شدید احتجاج کرتے ہوئے
ی آواز میں ان سے پوچھا۔

"تم نے ایک شریف شہری کو کس لئے پکڑا ہے۔ میرا جرم کیا ہے؟"

بڑی بڑی مونچھوں والے پولیس انسپکٹر کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا اپنی
ا پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ تمہیں ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔"

لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ مونچھوں والے کالے پولیس انسپکٹر کے
ے ایک سپاہی نے میری جیبوں کی تلاشی لی۔ میری پتلون کی جیب سے بال پوائنٹ
ا اور عقبی جیب سے کچھ روپے اور سکے نکلے۔ انسپکٹر نے کہا۔

"ان چیزوں کو ابھی اس کی جیب میں ہی رہنے دو۔ اس کے جوتے دیکھو۔

میرے جوتے اتروا کر دیکھے گئے۔ ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے لے
اسٹیشن سے باہر آگئے باہر پولیس کی دو گاڑیاں اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ مجھے ایک
ی میں بٹھا دیا گیا۔ چار سپاہی میرے اردگرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور پولیس کی گاڑیاں
شہر کے کسی تھانے کی طرف چل پڑیں۔ میرا خیال ہے کہ آدھی رات گزر چکی تھی
ا وقت۔ جل گاؤں شہر کی سڑکیں خالی خالی تھیں۔ کہیں روشنی ہو رہی تھی اور کہیں
ہرا تھا۔ یہ میرے لئے بالکل نیا شہر تھا۔ دور دور آبادیاں بھی تھیں جن کی روشنیاں
لا رہی تھیں۔ سڑک کی ایک جانب اونچی عمارتیں بھی تھیں۔ بمبئی دلی جتنا بڑا شہر

نہیں تھا لیکن بڑا گنجان آباد لگتا تھا۔ جیپ چونکہ کھلی تھی اس لئے یہ سارا منظر میں دیکھ رہا تھا۔

ہماری جیپ آگے جا رہی تھی۔ پولیس کی دونوں گاڑیاں ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ میری گرفتاری کے لئے جل گاؤں کی پولیس نے جو اہتمام کیا تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ ان کے نزدیک میں کوئی بڑا خطرناک اور اہم جاسوس ہوں اور ان کے پاس میری ساری نہیں تو گوالیار سے فرار کی رپورٹیں ضرور پہنچ چکی ہیں۔ تھانے میں پہنچ کر مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ مجھے پولیس سٹیشن کے ایک کمرے میں لے جا کر فرش پر بٹھا دیا گیا۔ جس کانسٹیبل کی زنجیر میری ہتھکڑی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی وہ میرے سر پر بندوق لئے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بڑی بڑی مونچھوں والا پولیس انسپکٹر اپنی ہتھیلی پر بید کی سوٹی آہستہ آہستہ مارتا اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو پولیس کے مسلح سپاہی بھی تھے۔ ایک سپاہی نے فائل اٹھا رکھی تھی۔ انسپکٹر کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے سپاہی سے فائل لے کر کھولی اور ورق گردانی کرتے ہوئے ایک جگہ نظریں جما کر پڑھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ ان لوگوں کے پاس ممکن ہے میری کمانڈو سرگرمیوں کا پورا ریکارڈ موجود ہو۔ کیونکہ کئی شہروں کے پولیس سٹیشنوں پر میری فوٹو موجود تھی اور بہت ممکن ہے کہ مجھے شکل سے پہچانا گیا تھا۔

خفیہ پولیس والوں کی نظریں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ آپ چاہے اپنا حلیہ کتنا تبدیل کر لیں۔ خفیہ پولیس کی نظریں اپنے ایک خاص حساب سے آپ کو پہچان لیں گی۔ ان کی نگاہوں سے محفوظ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروا لے۔

پولیس انسپکٹر نے فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس آدمی کو پہچانتے ہو؟“

میں نے کھلی فائل پر نگاہ ڈالی۔ کونے میں میری تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر میں میری داڑھی مونچھیں نہیں تھیں۔ اس وقت بھی میری داڑھی مونچھیں بہت معمولی

ں۔ اس خفیہ پولیس والے کو اسی لئے مجھے پہچاننے میں آسانی ہوئی تھی کہ اس نے ں بغیر داڑھی مونچھوں والی تصویر دیکھ رکھی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ ری طرف کر لیا۔ پولیس انسپکٹر نے بید سے میری ٹھوڑی کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔

”ایک بار پر غور سے دیکھو اور جواب دو یہ کس کی تصویر ہے؟“

میں نے کہا۔

”میری تصویر ہے؟“

پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”تو پھر یقین کر لو کہ ہمیں تمہارے متعلق ایک ایک بات معلوم ہو چکی ہے۔“

میں نے کہا۔

”اگر آپ کو سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں“

پولیس انسپکٹر مسکرایا۔

”آدمی تم تجربہ کار لگتے ہو“۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے وہی سوال کرنے شروع کر دیئے جو اس سے پہلے ل اور ملٹری انٹیلی جینس مجھ سے کئی بار کر چکی تھی۔ یعنی میرے دوسرے کمانڈو ں کہاں روپوش ہیں اور میں کس مشن پر بمبئی آیا تھا اور اب کس مشن پر دلی جا رہا میری جیب سے بمبئی سے دلی تک کا ریل ٹکٹ انہوں نے برآمد کر لیا ہوا تھا۔ میں لہا۔

”مجھے نہیں معلوم آپ کو میرے بارے میں کیا کیا رپورٹیں مل چکی ہیں۔ میں اتنا ا صاف صاف بتانا چاہتا ہوں کہ میں اکیلا ہوں۔ مسلمان ہوں۔ اور صرف اپنے ا مسلمان کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا ہوں میرا کوئی ا مجاہد میرے ساتھ نہیں ہے۔“

”ناگ پور کے اشوکا ہوٹل میں دھماکہ کر کے چھ جرنیلوں سمیت پورے بلاک کو اڑا بانڈی چری کی کھاڑی میں ہماری نیوی کے دو جہازوں کو غرق کر دینا اور بھوپال جیسے

لائن پر انڈین آرمی کی ایمونیشن ٹرین کو بھک سے اڑا دینا۔ تم انہیں چھوٹے چھوٹے کا
کہتے ہو۔"

میرے خدا! ان لوگوں کے پاس میری کارکردگی کی فل رپورٹ موجود تھی۔ اس
حساب سے میں نے بھی اپنی خاص حکمت عملی تیار کرلی۔ اس حکمت عملی پر عمل کرتے
ہوئے مجھے پولیس انسپکٹر کے سامنے انکار بھی نہیں کرنا تھا اور پوری بات بھی نہیں بتانی
تھی۔ غیراہم اور سامنے آچکی باتیں اور واقعات بتا دینے تھے اور اہم اور راز داری کی
باتیں گول کر جانی تھیں۔ ایک بات یاد رکھیں۔ جو پولیس افسر بھارت میں ہمارے ایسے
خطرناک اور تربیت یافتہ حریت پسندوں اور کمانڈوز سے پوچھ گچھ کرتے ہیں وہ بڑے سمجھ
دار اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ انہیں بھی پتہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جاسوس آدھی بات
اس لئے بتا دیتا ہے کہ اسے آدھی بات کو چھپانا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم بھی ہمت
نہیں ہارتے۔ ٹارچر تو انہیں کرنا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں طرح طرح کی اذیتیں تو دینی ہی ہوتی
ہیں لیکن ایک محب وطن کمانڈو اور حریت پسند زندگی ہار جاتا ہے مگر ایسی کوئی بات دشمن کو
نہیں بتاتا جس سے اس کی تحریک آزادی یا ملکی مفاد کو خطرہ لاحق ہوتا ہو۔

ں حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے میں نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔

"اب جب کہ آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو میں بھی آپ
ے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب دشمن کسی قوم کی مذہبی شہری
راس کے حق آزادی کو کچل رہا ہو تو اس قوم کا فرض ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرے۔
ں کشمیری مسلمان ہوں آپ کی فوج نے کشمیر پر وہاں کی اکثریتی مسلمان آبادی پر زبردستی
نہ کر رکھا ہے اور کشمیریوں کو ان کے حق رائے دہی سے محروم کرنے کی کوشش کر
ہے ہیں۔ آپ وہاں ہماری مسجدوں کو نظر آتش کرتے ہیں۔ نہتے کشمیریوں کا قتل عام کر
ہے ہیں۔ گھروں کو جلا رہے ہیں۔ ایسی صورت اگر آپ کے ساتھ پیش آجائے تو کیا
پ وہی کچھ نہیں کریں گے جو ہم کر رہے ہیں؟"

پولیس انسپکٹر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر میرے ان دلائل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ زیر
ب مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم ایک بات چھپا گئے ہو اور وہ بات یہ ہے کہ تم کشمیری حریت پسند نہیں ہو تم
ستانی کمانڈو ہو۔ پنجابی بھی ہو اور بھارت میں ہماری فوجی تنصیبات کو ناقابل تلافی نقصان
نچا رہے ہو۔ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے دوسرے ساتھی دلی اور بمبئی میں کہاں پر
ں تو میں تم سے----"

آگے اس نے وہی کہا جو اس سے پہلے کئی بار پولیس اور ملٹری انٹیلی جنیس والے مجھ
ے کہہ چکے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم پھر تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور تمہیں جہاں تم کہو گے

وہاں اپنی حفاظت میں پہنچا دیں گے۔ یہ جھوٹا وعدہ ہوتا ہے۔ مجھے یہ فکر بھی پڑ گئی تھی
اگر ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ہے تو پیچھے بمبئی میں ہمارے آدمی کو بھی پکڑ لیا ہو گا جس
فرضی نام میں نے آپ کو جعفر بھائی بتایا تھا اور جس کی رہائش کی فرضی جگہ میں نے بمبئی
کا لکشمی سینما گھر بتایا تھا۔

میں نے پولیس انسپکٹر کو وہی جواب دیا جو اس سے پہلے میں کئی بار پولیس والوں
دے چکا تھا۔ میں نے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ میں پنجابی ضرور ہوں مگر
پاکستان کے پنجاب سے میرا تعلق نہیں ہے۔ ہم لوگ جالندھر سے ہجرت کر کے جموں چلے
گئے تھے۔ میں اس وقت سکول میں پڑھتا تھا۔"

پولیس انسپکٹر نے مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں زمین پر بیٹھا تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہو
گیا۔ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ انسپکٹر خود میری تلاشی لینے لگا۔ میری پچھلی جیب میں کچھ
نقدی تھی۔ وہ اس نے نکال کر غور سے دیکھی اور دوبارہ میری جیب میں ڈال دی۔ میری
پتلون کی دائیں بائیں جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں زہریلی بال پوائنٹ پنسل تھی
مجھ سے بس یہی غلطی ہو گئی کہ میں نے اسے اپنی جراب کے اندر جوتے میں نہیں چھپایا
تھا۔ لیکن ان لوگوں نے وہاں سے بھی پنسل نکال لینی تھی۔ انسپکٹر بال پوائنٹ پنسل کو
دیکھنے لگا۔ خدا کا شکر ہے اس کی انگلی پنسل کی کیپ کے قریب ہی جو خشخاش جتنا چھوٹا سا
نقطہ تھا اس پر نہیں پڑا۔ ورنہ اگر اتفاق سے وہ نقطہ دب جاتا تو بال پوائنٹ میں سے
زہریلی سوئی نکل کر سیدھی میرے پیٹ میں اتر جاتی۔ کیونکہ اس وقت بال پوائنٹ کا رخ
میرے پیٹ کی جانب تھا۔ میں نے کہا۔

"میں نے یہ بال پوائنٹ بمبئی سے خریدی تھی۔ کبھی کبھی کچھ لکھ کر یاد رکھنا پڑ جاتا
ہے۔"

پولیس انسپکٹر نے فائل کے کاغذ کے نیچے بال پوائنٹ سے دو تین لکیریں ڈالیں اور
پھر اسے اپنی وردی کی سامنے والی جیب میں لگا لیا۔ میں نے کہا۔

"سر! یہ بال پوائنٹ لے کر آپ کیا کریں گے۔ میرے پاس ہی رہنے دیں۔"
اس نے اچانک غصے میں آ کر انگریزی میں مجھے گالی دی اور کہا۔
"زیادہ بکواس سننے کا میں عادی نہیں ہوں۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میرا نام
جگو ٹنڈولکر ہے مجھے جگو بوچڑ بھی کہتے ہیں میں نے بڑے بڑوں کی زبان کھلوا لی ہے تم
میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فائل کانسٹیبل کو پکڑائی اور اسے اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد وہ لوگ مجھے تھانے کی دوسری منزل میں لے گئے اور وہاں بند کر
دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی حوالات ہی تھی۔ زمین پر ٹاٹ کا بوریا بچھا تھا۔ دروازہ لوہے کی
سلاخوں والا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں سے فرار کس طرح ممکن
ہے۔ میری ہتھکڑی اتار دی گئی تھی۔ لیکن دروازے کی سلاخوں کے پیچھے رائفل اٹھائے
کانسٹیبل پہرہ دے رہا تھا۔ حوالات میں نہ کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ لیکن مجھے سب
سے زیادہ پریشانی اپنی بال پوائنٹ پنسل کی تھی جو میرا سب سے مہلک ہتھیار تھا۔ اس کے
بغیر وہاں سے فرار ہونا بے کار تھا۔ یہ بال پوائنٹ اس کم بخت جگو ٹنڈولکر نے اپنے پاس
رکھ لی تھی۔ خدا جانے اس نے کیا سوچ کر بال پوائنٹ اپنی وردی کی جیب میں لگا لی تھی۔
یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور میری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آ رہی تھی
کہ میں اپنی زہریلی بال پوائنٹ پنسل پولیس انسپکٹر سے کیسے واپس لے سکوں گا۔

رات اسی تنگ حوالات میں گزر گئی۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر دن کی
روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو پہرہ دینے والا کانسٹیبل چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا
کانسٹیبل آ گیا تھا۔ میں نے ایک دو بار اس سے وقت پوچھا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
تیسری بار پوچھا تو وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ وقت اس نے پھر بھی نہ بتایا۔ دن کے وقت مجھے
وہی پتلی دال اور ایک باسی روٹی کھانے کو دی گئی۔ میں حوالات کے ٹاٹ پر بیٹھا اس سوچ
میں گم تھا کہ پولیس انسپکٹر سے اپنا ہتھیار بال پوائنٹ پنسل کیسے واپس لی جا سکتی ہے۔ شام
کے وقت ایک مسلمان مولوی صاحب مجھے ملنے آ گئے۔ انہوں نے پہلے تو بڑے پکے

مسلمانوں والی باتیں کیں پھر مجھے یہ بتانا شروع کر دیا کہ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے اور اہنسا کا قائل ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اصلی مسلمان مولوی نہیں ہے بلکہ پولیس کا خریدا ہوا مولوی ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا۔

"مولوی صاحب! آپ مجھے کیا سمجھانے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے تو پولیس انسپکٹر کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے کہ میں کشمیری مسلمان حریت پسند ہوں۔ پھر اس نے آپ کو میرے پاس کس لئے بھیج دیا ہے۔ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

مولوی صاحب کہنے لگے۔

"بیٹا! بات یہ ہے کہ اگر تم اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں بھی بتا دو کہ وہ کہاں کہاں روپوش ہیں تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں جہاں تم کہو گے تمہیں حفاظت سے پہنچا دیا جائے گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"مولوی صاحب! یہ باتیں میں کئی بار سن چکا ہوں۔ اپنے بارے میں تو میں نے سب کچھ بتا دیا ہے مگر جس چیز کا مجھے علم ہی نہیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں کشمیر سے اکیلا حریت پسند یہاں آیا تھا میرے ساتھ کوئی مجاہد نہیں آیا۔"

مولوی صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا۔ میں ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک منصوبے پر غور کر رہا تھا جو پولیس انسپکٹر جگو بوچڑ سے اپنی بال پوائنٹ پنسل واپس لینے کے سلسلے میں میرے دماغ میں اس وقت آیا تھا۔ میں نے مولوی صاحب کی گفتگو کو کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں"

مولوی صاحب تو خوشی سے چمک اٹھے۔ میں نے کہا "اپنے کمانڈو ساتھیوں کے نام پتے جس وقت انسپکٹر کو بتاؤں گا تو اس وقت ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں ہو گا۔ دوسرے یہ کہ اس حوالات میں یہ ملاقات نہیں ہو گی۔"

مولوی صاحب نے کہا۔

"اس کا انتظام فوراً کر دیا جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں ابھی جا کر انسپکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں"

مولوی صاحب چلے گئے۔ اس وقت دن کا تیسرا پہر ہو گا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس انسپکٹر ابھی اپنے آفس میں ہی ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کی بجائے پولیس انسپکٹر جگو ٹنڈولکر خود آ گیا۔ وہ اکیلا آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ایسی بات تھی تو تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔ یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ہم الگ کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

وہ مجھے حوالات سے نکال کر دو تین کمرے چھوڑ کر ایک سجے سجائے کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر آویزاں تھی۔ کارنس پر پولیس سٹیشن کو ملے ہوئے میڈل اور شیلڈیں سجی ہوئی تھیں۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے اپنے سامنے والے صوفے پر بٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"یہاں ہم دونوں اکیلے ہیں۔ ہماری باتیں کوئی دوسرا نہیں سن رہا۔"

میں نے اپنے پلان کے مطابق اسے کہا۔

"مجھ سے ایک اور وعدہ کریں"

"بتاؤ"

میں نے کہا۔

"مجھے اپنے بھگوان کو سامنے رکھ کر وچن دو کہ تم کسی کے آگے ذکر نہیں کرو گے کہ اپنے ساتھی کمانڈوز کے نام میں نے تمہیں بتائے تھے۔"

پولیس انسپکٹر بہت خوش تھا۔ اسے اپنا مشن مکمل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں بھگوان کو سامنے رکھ کر تمہیں وچن دیتا ہوں کہ تمہارا نام راز میں رکھوں گا اور کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

اس دوران مجھے ایک بات کی بڑی تسلی ہو گئی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ پولیس انسپکٹر نے کل والی وردی ہی پہنی ہوئی تھی اور اس کی قمیض کی جیب میں میری زہریلی بال

پوائنٹ پنسل لگی ہوئی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ میں نے اسی وقت دیکھ لی تھی جب وہ حوالات میں مجھے ساتھ لے جانے کے لئے داخل ہوا تھا۔ اگر بال پوائنٹ اس کی جیب میں نہ ہوتی تو میں کبھی اس کے ساتھ حوالات سے باہر نہ آتا۔ پھر مجھے کسی اور منصوبے پر غور کرنا پڑتا۔ میں نے کہا۔

"میں اپنی زبان سے اپنے ساتھی حریت پسند کمانڈوز کے نام نہیں لوں گا۔"

"تو پھر تم مجھے ان کے نام کیسے بتاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"میں ایک کاغذ پر ان کے نام اور ان کے مکمل پتے جہاں جہاں وہ روپوش ہیں لکھ دوں گا۔ یہ کاغذ میں اپنے ہاتھ میں رکھ کر تمہیں دکھاؤں گا تم بے شک اسے اپنی ڈائری پر نوٹ کر لینا۔ اس کے بعد میں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ خود پھاڑ کر پرزے پرزے کر دوں گا۔"

اس قسم کے ڈرامے کا ماحول میں جان بوجھ کر پیدا کر رہا تھا تاکہ مجھے جو کچھ کرنا ہے اس کا جواز بھی پیدا ہو جائے۔ پولیس انسپکٹر نے فوراً جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر کھولی اور خالی صفحہ میرے آگے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لو۔ اس پر روپوش حریت پسندوں کے نام اور ایڈریس لکھ دو۔ نوٹ بک تم اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا میرے پاس دوسری نوٹ بک بھی ہے۔ میں ان کے نام پتے دوسری نوٹ بک پر اتار لوں گا۔ اس کے بعد تم اپنے ہاتھ سے اس نوٹ بک کا صفحہ پھاڑ کر پرزے پرزے کر دینا۔"

اس نے بش شرٹ کی جیب میں سے دوسری نوٹ بک نکال لی۔ میں نے چھوٹی نوٹ بک ہاتھ میں لے لی اور کہا۔

"مجھے پنسل دو"

وہ اپنی جیبیں تلاش کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"تمہاری جیب میں میری بال پوائنٹ پنسل لگی ہوئی ہے یہی دے دو۔"

اس نے بال پوائنٹ پنسل جیب سے اتار کر مجھے دے دی۔ بال پوائنٹ پنسل میرے ھ میں آئی تو مجھے یوں اطمینان ہوا جیسے میرے ہاتھ میں سائی لینسر لگا پستول آ گیا ہو۔ بلکہ ہتھیار سائی لینسر والے پستول سے بھی زیادہ بے آواز اور ہلاکت خیز تھا۔ پستول کی گولی ھا کر تو انسپکٹر زخمی ہونے کے بعد ایک آدھ آواز نکال کر سپاہیوں کو وہاں بلا سکتا تھا لیکن ل پوائنٹ پنسل سے فائر ہونے والی سوئی کے مہلک زہر نے اس کے خون میں شامل تے ہی بلکہ اس کے جسم کی کھال میں اترتے ہی اس کے جسم کو پتھر کی طرح ساکت کر نا تھا۔ میں نے بال پوائنٹ پنسل ہاتھ میں لے کر اس کی کیپ الگ کی۔ کیپ کو دوسری رف لگایا۔ اب پنسل کی نوک فائر کے لئے بالکل تیار تھی۔ بس یہی ایک خطرہ تھا کہ کسی رابی کی وجہ سے ایسا نہ ہو کہ فائر نہ ہو سکے۔ میں پنسل ہاتھ میں سیدھی کر کے نوٹ بک ے خالی صفحے پر لکھنے لگا تو رک گیا۔ پھر پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ ایک سیکنڈ کے لئے منہ دوسری طرف کر لیں۔ میرے ضمیر کو بات گوارا نہیں کہ دشمن کے سامنے میں اپنے ساتھیوں کے نام پتے لکھوں"

پولیس انسپکٹر مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"تم مسلمانوں کو اپنے ضمیر کا بڑا خیال رہتا ہے۔ یہ لو۔ میں منہ دوسری طرف کر لیتا ں"

اس نے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھے بیٹھے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں اس ے صوفے پر آگے کو ہو کر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان بڑا تھوڑا فاصلہ تھا۔ درمیان میں کوئی بل نہیں تھا۔ وہ بھی آگے کو ہو کر صوفے کے کنارے پر میری طرف جھک کر بیٹھا تھا۔ مرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اب میرے پاس یہ سوچنے کے لئے وقت یں تھا اور نہ مجھے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ میں بھارت کے شہر جل گاؤں کے لیس سٹیشن کے اندر ہوں۔ یہاں چاروں طرف مسلح پولیس موجود ہے۔ یہاں سے میں یسے باہر نکل سکوں گا۔ یہ ساری باتیں اس وقت میں نے اپنے دماغ سے نکال دی تھیں۔ وقت دشمن میرے نشانے میں تھا۔ اور مجھے اسے ہلاک کرنا تھا۔

جیسے ہی پولیس انسپکٹر جگو ٹنڈولکر نے منہ دوسری طرف کیا' میں بال پوائنٹ پنسل کی نوک ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن کے پاس لے گیا اور فائر کر دیا۔ میں اپنے اس مجاہد کو بھی داد دیتا ہوں جس نے یہ حیرت انگیز ہتھیار بنایا تھا۔ بال پوائنٹ کا خفیہ بٹن ذرا دباتے ہی زہریلی سوئی اس کی خفیہ نالی سے نکل کر انسپکٹر ٹنڈولکر کی گردن میں گھس گ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ شاید وہ اسے اپنی گردن تک لے جانا چاہتا تھا جہاں اسے س چبھنے کا احساس ہوا تھا۔ سائی نائیڈ زہر اتنی مہلت نہیں دیا کرتا۔ میں حیران ہوا کہ ا پولیس انسپکٹر کو اتنی مہلت کیسے مل گئی کہ وہ اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا۔ اس کا ہاتھ گردن ت نہیں پہنچ سکا۔ اور نہ وہ گردن میری طرف موڑ سکا۔ ہاتھ ذرا سا اوپر آکر گر پڑا اور کندھے کے بل صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے جلدی سے بال پوائنٹ کو کیپ لگائی۔ ا پتلون کی پچھلی جیب میں ڈالا اور صوفے پر سے اچھل کر دروازے کی طرف گ دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا۔ میں نے پردہ ذرا سا ہٹایا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے درواز کا پٹ ہلکے سے دباؤ کے ساتھ کھولا۔ دروازہ اندر کو کھلتا تھا۔ مجھے تین چار قدموں ک فاصلے پر آمنے سامنے دو پولیس کانسٹیبل رائفلیں اٹھائے پہرہ دیتے نظر آئے۔ میں ۔ دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ یقینی طور پر پولیس انسپکٹر نے اندر آتے ہوئے ان س سپاہیوں کو ہدایت کر دی ہو گی کہ وہ باہر کھڑے رہ کر پہرہ دیں اور جب تک میں نہ بلاؤ وہ اندر نہ آئیں۔ میرے منصوبے کا مقصد بھی یہی تھا۔ میں نے یہ کام کیا کہ بڑے آرا سے دروازے کی اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اس لئے کہ میں نے اس کمرے میں دوسری دیوا میں ایک اور دروازہ آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ضرور غسل خانہ ہو گا ا غسل خانوں میں عام طور پر باہر نکلنے کا ایک دروازہ اس قسم کے سرکاری دفتروں میں رکھ جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک بلائنڈ چال تھی۔ میں نے پولیس انسپکٹر پر ایک نگاہ ڈالی۔ و صوفے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی پیٹی کے ہولسٹر میں پستول بھی لگا ہوا تھا مگر میں نے اسے نہ نکالا۔ میں دبے پاؤں مگر بڑی تیزی سے غسل خانے والے دروازے کے پاس گیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا گندہ غسل خانہ ہی تھا۔ مگر اس میں دوسرا

دروازہ کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر دیکھا۔ کھڑکی میں نہ جالی لگی تھی نہ سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چونکہ یہ تھانے کے اندر بنا ہوا وی آئی پی روم تھا اس لئے اس کے غسل خانے کی کھڑکی کو جالی یا سلاخیں لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ باہر سامنے پولیس سٹیشن کی دیوار نظر آئی جو غسل خانے کی کھڑکی سے دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر تھی۔ دیوار کے پاس ہی ایک درخت تھا جس کی ٹہنیاں دیوار پر جھکی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی سپاہی نہیں تھا۔

میں جلدی سے غسل خانے کی کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا اور ایک لمحے کے لئے وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ دن کا وقت تھا۔ چاروں طرف دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ یہ پولیس سٹیشن کے دفاتر اور وی آئی پی کمرے کا عقبی حصہ تھا اور میری دونوں جانب دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ سامنے جو دس پندرہ گز تک خالی جگہ تھی وہاں ایک طرف ٹوٹی پھوٹی کرسیوں اور میزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف ایک پرانی کھٹارا جیپ کھڑی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہاں کوئی سپاہی وغیرہ نہیں ہے تو میں اٹھا اور بڑے آرام سے چلتا کھٹارا جیپ کے پیچھے جا کر جیپ کے پہیوں کو جھک کر یوں دیکھنے لگا کہ اگر دور سے کسی کی مجھ پر نظر پڑ بھی جائے تو وہ یہی سمجھے کہ میں کوئی پرانی گاڑیوں کی مرمت کرنے والا مستری ہوں جو جیپ کا معائنہ کر رہا ہے۔ وہاں ایک طرف مجھے بنچ پر پولیس کے دو سپاہی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کی پیٹھ میری جانب تھی۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ تھانے کے احاطے کی دیوار میرے قریب ہی تھی۔ بس تین چار گز دور ہو گی۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ زمین پر لوہے کے تاروں کا ایک گچھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور تار کھول کر ہاتھوں میں پکڑی اور آہستہ آہستہ گچھے کو کھولتا ہوا دیوار کی طرف بڑھا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنا ہی آدمی ہوں۔ جیسے ہی میں دیوار کے پاس آیا۔ میں نے تار کا گچھا وہیں پھینکا۔ اچھل کر دیوار کی منڈیر کو پکڑا اور تیزی سے دوسری طرف کود گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کیا ہے۔ میں ناریلوں کی چھال کے ڈھیر پر گرا جو وہاں سکھانے کے لئے ڈالی ہوئی تھی۔ میں ایک دم

نہیں اٹھا بلکہ وہیں ناریل کی چھال کے ڈھیر کے پاس ہی بیٹھ گیا اور دائیں بائیں دیکھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سورج بادلوں کے پیچھے تھا دن کی روشنی پھیکی ہونے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ڈھلان میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ تھانے کی دیوار کے ساتھ چلنا خطرناک تھا۔ میں اٹھ کر ڈھلان میں اتر گیا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے قریب سے نکل کر سامنے چھوٹی سی سڑک پر آگیا جہاں ناریل پانی بیچنے والے کا کھوکھا تھا۔ دو آدمی کھوکھے کی طرف منہ کئے وہاں کھڑے کچے ناریل پی رہے تھے۔

میں خاموشی سے ان کے قریب سے گزر گیا۔

جتنا وقت مجھے تھانے کے وی آئی پی روم سے نکل کر یہاں تک آنے میں لگا تھا اتنی دیر میں میرا خیال تھا کہ تھانے کے سپاہیوں نے دروازے کے پاس آکر یہ معلوم کرنے کی ضرور کوشش کی ہو گی کہ اندر سب خیریت ہے اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اور جب انہوں نے اندر سے دروازہ بند پایا ہو گا تو اسے ضرور کھٹکھٹایا ہو گا اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا ہو گا تو وہاں کھلبلی مچ گئی ہو گی۔

مطلب یہ کہ اب تک تھانے میں میرے فرار اور پولیس انسپکٹر کے قتل کا راز فاش ہو چکا ہو گا اور خدا جانے شہر کے کس کس تھانے کی پولیس مجھے پکڑنے کے لئے نکل آئی ہو گی اگر میرے اندازے کے مطابق ابھی تک پولیس کو علم نہیں ہوا ہو گا تو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ تک علم ہو جائے گا اور جل گاؤں شہر کے سٹیشن لاری اڈوں اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں کی پولیس ناکہ بندی کر لے گی۔ میرے لئے ضروری تھا کہ میں جتنی جلدی شہر سے دور ہو سکتا ہوں دور ہو جاؤں اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر اس شہر کے کھیتوں اور اجاڑ علاقے میں کوئی ایسی جگہ تلاش کروں جہاں چھپ کر میں رات گذار سکوں۔

جل گاؤں شہر میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کونسا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ پولیس سٹیشن کی مخالف سمت کو اپنا رخ کر لیا تھا اور جتنی تیز چل سکتا تھا چھوٹی سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ سامنے

ے ایک کھٹارا سی ویگن آرہی تھی جس کی چھت پر بھی لوگ بیٹھے تھے۔ ویگن میرے
یب سے گزر گئی۔ جس سڑک پر میں چلا جا رہا تھا اس کی ایک جانب کچھ کھیت تھے اور
چھے اونچی نیچی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ دوسری جانب شہر کی عمارت تھیں جو آہستہ
ہستہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ میں کھیتوں میں اتر گیا۔ یہ دھان کے کھیت
تھے۔ فصل زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ان میں چلتے ہوئے میں دور سے نظر آسکتا تھا۔

میں نے ایک جگہ رک کر پیچھے دیکھا کہ پولیس میرے پیچھے تو نہیں آرہی۔ ابھی تک
ں محفوظ تھا۔ میں کھیتوں میں سے نکل کر ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ یہ جگہ اونچی نیچی تھی۔
چھ درخت بھی تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ بارشوں کی وجہ سے ہر طرف سبزہ اگا ہوا تھا۔
ن علاقوں میں برسات کے موسم میں موسلادھار بارشیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہر
رف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جلدی شام کا اندھیرا پھیل جائے اور
ں دور نظر آنے والی پہاڑیوں میں کسی جگہ جا کر چھپ جاؤں مگر دن کی روشنی بڑی آہستہ
ستہ ماند پڑ رہی تھی۔ اب میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تھانے میں
لیس انسپکٹر کی لاش مل چکی ہو گی اور پولیس ایک قیامت خیز طوفان کی طرح میری تلاش
ں شہر میں پھیل گئی ہو گی۔ میں کوئی عام دنیا دار یا دشمن ملک میں آکر پھنسا ہوا عام قسم کا
ح نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات میں مجھ پر ہیجانی کیفیت یا گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔
ں ایک تجربہ کار تربیت یافتہ انتہائی سخت جان اور پکا مسلمان کمانڈو تھا۔ میرا مقصد صرف
ی جان بچانا نہیں تھا۔ بلکہ مجھے دشمن کے کسی ناپاک منصوبے کو تباہ کرنے کے بعد اپنے
ے اڈے پر پہنچ کر دوسرے کمانڈو مشن کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ ایک میدان میں
ے جیت کر میں نکل آیا تھا۔ اب مجھے دوسرے میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے
لئے اترنا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حالات کی سنگینی کے باوجود میں صورت حال پر بڑی ہوش مندی سے
ر بچار بھی کر رہا تھا اور پولیس سٹیشن سے زیادہ سے زیادہ دور ہو جانے کے لئے تیز تیز
چل رہا تھا۔ سامنے ایک ندی آگئی۔ ندی پر ایک جگہ چھوٹی سی پلیا بنی ہوئی تھی۔ میں

نے پلیا پر سے ندی پار کی اور سامنے درختوں کے جو جھنڈ نظر آرہے تھے ان میں داخل ہو
گیا۔ ان درختوں کے جھنڈوں کے آگے کیا ہے؟ دور جو اونچی نیچی پہاڑیاں مجھے نظر آرہی
ہیں ان کے آگے کیا ہے؟ میں آگے کس طرف نکل جاؤں گا یہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔
بس میں یہی چاہ رہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے شام کا اندھیرا ہو جائے اور میں پہاڑیوں میں
جا کر کسی جگہ چھپ جاؤں اور آدھی رات کے سناٹے میں شہر سے نکل جانے کی کوشش
کروں۔ چلتے چلتے آخر میں دور سے دکھائی دینے والی پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ یہ چھوٹی چھو
پہاڑیاں تھیں۔ ان پر کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ اکثر پہاڑیاں بنجر او
سیاہ رنگ کی تھیں۔ میں ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ یہاں زمین کا رنگ گہ
سرخی مائل تھا اور اتنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں کہ پیدل چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ پہاڑی خ
ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرف پولیس میری تلاش میں
شاید ہی آئے۔ وہ زیادہ تر مجھے شہر کے لاری اڈوں' سینما گھروں کے باہر' ریلوے سٹیشن
اور شہر سے باہر نکلنے والی سڑکوں پر ہی ڈھونڈے گی۔ لیکن میں نے پولیس کے ان پہاڑیو
کی طرف آنے کے امکان کو رد نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں کوئی معمولی قیدی نہیں تھا۔
پولیس افسر کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہو۔ پولیس افسران کو معلوم تھا کہ میں ایک تربیت
یافتہ کمانڈو ہوں اور بھارت میں بڑی تباہی مچا چکا ہوں۔ اور اپنی سخت جانی کی وجہ سے م
ویران پہاڑیوں میں روپوش ہو سکتا ہوں۔

مجھے کسی جانور کی خر خر کی آواز آئی۔ میں رک کر ایک طرف ہو گیا۔ دوسرے ل
ایک کالے رنگ کا انتہائی بدشکل جنگلی سور دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں سے گزر گیا۔ جنگلی س
بڑا خطرناک ہوتا ہے اور سامنے سے حملہ کرتا ہے۔ مجھے جنگلی سوروں سے بچنے اور ان
ہلاک کرنے کے سارے گر معلوم تھے۔ مگر وہاں ضرورت پیش نہ آئی۔ سور غائب ہو
تھا۔ رات آرہی تھی۔ مجھے جنگل کے دوسرے درندوں کا بھی خیال آنے لگا۔ رات ہو
ہی شیر چیتے وغیرہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ وہ کسی
پہاڑی کے اوپر سے مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پہاڑی ٹیلے کی ڈھلا

یادہ سیدھی تھی اور اس طرف سے پہاڑی پر نہیں چڑھا جا سکتا تھا۔ میں پہاڑی پر چڑھنا
ہتا تھا تا کہ وہاں چھپ کر رات گزارنے کے لئے کوئی غار وغیرہ ہو تو وہاں رات گزار
ں اور اس کے بعد جیسے حالات ہوں ویسے کوئی اگلا قدم اٹھاؤں۔ اب دن کی روشنی جیسے
ھنے لگی تھی۔ بادل اس طرح آسمان پر جھکے ہوئے تھے۔ ان بادلوں کی وجہ سے کچھ زیادہ
اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں رات پڑنے سے پہلے پہلے کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کر لینا چاہتا تھا
اں میں بارش سے بھی محفوظ رہ سکوں۔ کیونکہ مجھے بادلوں میں ایک بار ہلکی گرج سنائی
تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کس وقت بارش شروع ہو جائے۔

چلتے چلتے وہ پہاڑی ایک طرف کو مڑ گئی جس کے ساتھ ساتھ میں چل رہا تھا۔ یہاں
ایک خاص قسم کی سیٹی کی آواز آئی میں نے آواز پہچان لی۔ یہ سانپ کی آواز تھی۔
علاقوں میں بارشوں کے موسم میں سانپ بلوں سے باہر نکل آتے ہیں اور جنگلی کیڑوں
ڑوں اور چوہوں کا شکار کرتے ہیں۔ یہ اتنے گھنے جنگل نہیں تھے کہ یہاں کوئی شیر بھی
ود ہوتا۔ ویسے شیر کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے وسطی جنگلوں میں رات کو شیر
متے پھرتے دور دور تک نکل جاتے ہیں۔ دوسری پہاڑی سامنے ہی تھی۔ میں نے
ھا کہ اس کی چڑھائی سیدھی نہیں تھی۔ جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایک پتلی سی
نڈی کی جھلک بھی نظر آکر شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ قریب جا
یں نے اس پگ ڈنڈی کو ڈھونڈ لیا اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ چڑھائی تو اتنی مشکل نہیں
لیکن جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ مجھے ادھر ادھر سے ہو کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ کافی دیر بعد
پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اوپر پہنچتے پہنچتے شام کا دھندلکا اور گہرا ہو گیا تھا۔ پہاڑی کے
کافی جگہ تھی۔ درخت کھلے کھلے اگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف پہاڑی کی چوٹی کے
ایک چھوٹی سی پہاڑی کھڑی تھی۔

میں نے اس پہاڑی کا جائزہ لیا۔ یہ کالے رنگ کی بہت بڑی چٹان تھی جس کے آگے
ئی ٹن بڑے بڑے پتھر ایسے پڑے تھے جیسے کبھی وہاں زبردست زلزلہ آیا ہو اور چٹان
اوپر کا حصہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا ہو۔ میں ان پتھروں میں ادھر ادھر چل کر چھپنے کے لئے

کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ پتھر اتنے بڑے بڑے تھے کہ ان میں چلتے وقت وہ میرے
سے کئی فٹ اونچے اونچے تھے۔ یہ بالکل صاف پتھریا چٹانیں تھیں۔ ان پر نہ مٹی جمی ہو
تھی اور نہ کوئی گھاس ہی اگی ہوئی تھی۔ میں ان پتھروں میں سے گزرتا ہوا اس ٹیلے یا
چٹان کے دامن میں آگیا جس کے یہ پتھر بکھرے ہوئے ٹکڑے تھے۔ یہاں مجھے ایک
سے پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ ذرا آگے جا کر دیکھا کہ دو پتھروں کے درمیان
پانی کی ایک دھار نیچے پتھروں کے درمیان گر رہی تھی جہاں ایک چھوٹا سا تالاب بن
تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ نیچے اتر کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پی کر پیاس بجھائی اور واپ
اوپر آگیا۔ خدا جانے یہ پانی کہاں سے آرہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکی
کہ پہاڑیوں کے اوپر اور بڑی بڑی چٹانوں کے اندر پانی کہاں سے پیدا ہو کر نیچے چشمو
اور جھرنوں کی شکل میں بہنے لگتا ہے۔ آپ اسے کچھ کہیں۔ لیکن میں اسے خدا کی شا
ہی کہوں گا۔ میں نے اتنے جنگلوں کی دربدری کی ہے کہ آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے
میں نے اس دربدری میں ایسی ایسی پہاڑیوں کے اندر سے غاروں میں اور چٹانوں کے ا
سے پانی کی دھاریں نکلتی دیکھی ہیں کہ جہاں پانی کی موجودگی کا کبھی یقین نہیں آسکتا۔
پانی نیچے جا کر آبشاریں بن جاتا ہے اور میدانی علاقوں میں جا کر جب ادھر ادھر کی ندیا
اس میں شامل ہو جاتی ہیں دریاؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ سب اللہ کی شان ہے
کبھی ان کی وضاحتیں جغرافیہ کی کتابوں میں نہ ڈھونڈتے پھریں۔ بس دل میں یقین کر
کہ یہ سب اللہ کی شان ہے جو ہر شے کا مالک ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔ آپ دنیا
کسی شے کی وضاحت تلاش نہیں کر سکیں گے۔ عقل جواب دے جائے گی۔ کتابیں خامو
ہو جائیں گی۔ یاد رکھیں آج کی جدید ترین سائنس اور سائنسدان بھی ادھر ادھر سے گھ
پھر کر اس قادر مطلق کے قدموں میں پہنچ رہے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ماڈرن ٹیکنالو
اور ماڈرن طبیعات وارضیات کی جدید ترین کتابیں پڑھ کر دیکھ لیں۔ آپ یہ کتابیں نہ
پڑھتے۔ میں پڑھتا تھا۔ مگر اب میں بھی یہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ا
پاک کلام میں ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا ہے تو ہمیں کسی آئین سٹائین یا برٹینڈ رسل

پیچھے مارے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اپنی داستان سناتے سناتے بیچ میں کبھی کبھی جذباتی ہو کر آپ کے ساتھ اپنے دل
ی باتیں کرنے لگ جاتا ہوں۔ آپ بھی دل کھول کر میری ایسی باتیں سن لیا کریں آپ
ے بہت کام آئیں گی۔

بڑی والی چٹان کی بالکل سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی دیوار کے ساتھ چند گز تک چلنے کے
د مجھے ایک جگہ سے دیوار میں خم پڑا ہوا نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا یہ ایک قدرتی غار کا
ہانہ تھا جس کے آگے اتنی گھاس اور سرکنڈے اگے ہوئے تھے کہ غار کا دہانہ اس میں
ھپ گیا تھا۔ میرے جنگلوں پہاڑوں کے تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں کوئی شگاف
جود ہے ورنہ میں بھی آگے نکل گیا تھا۔ یہ ایک قدرتی غار تھا۔ اندر ابھی اتنا زیادہ
ندھیرا نہیں تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ اس کی چھت کافی اونچی تھی اور کٹی پھٹی تھی۔ کئی
گہوں پر بڑی بڑی پتھریلی نوکیں نیچے کو نکلی ہوئی تھیں۔ غار کے اندر بھی چھوٹے بڑے
ول گول پتھر بہت زیادہ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک عجیب قسم کی نامانوس سی بو غار میں پھیلی
ئی تھی۔ یہ سیلن اور جلی ہوئی جھاڑیوں کی بو تھی۔ میں نے غار میں زیادہ آگے جانا
اسب نہ سمجھا۔ کیونکہ رات کی تاریکی چھانے لگی تھی اور مجھے آگے جانے کی ضرورت
ی نہیں تھی۔ وہاں میں بڑے آرام سے رات گزار سکتا تھا۔ اگر وہاں میری تلاش میں
لیس والے آ بھی جاتے تو پتھروں پر چلنے سے مجھے ان کے جوتوں کی آواز دور ہی سے
کتی تھی اور میں وہاں سے نکل کر کسی دوسری طرف فرار ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ
رے پاس میرا ہتھیار زہریلی بال پوائنٹ پنسل موجود تھی جس سے میں اپنا بچاؤ کر سکتا
ا اگرچہ اتنی دور پہاڑیوں میں اتنی جلدی پولیس کے آنے کی توقع نہیں تھی۔

میں نے وہیں پتھروں کو ادھر ادھر ہٹا کر جگہ صاف کی اور غار کی دیوار سے لگ کر بیٹھ
ا۔ مجھے بیٹھنے کے بعد جو سکون محسوس ہوا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں کافی دور
ے چل کر پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر وہاں آیا ہوں۔ غار کے باہر چٹانی پتھروں کے کافی آگے
ر جو چند ایک اونچے اونچے درخت تھے ان میں کسی کسی درخت میں دو ایک پرندے

تھوڑی تھوڑی دیر بعد بول لیتے تھے۔ جب رات گہری ہو گئی تو وہ بھی خاموش ہو گئے۔
ایک تو میں زمین سے کافی بلندی پر تھا دوسرے یہ جگہ شہر کے شور وغل سے کافی دور تھی۔
رات پڑتے ہی ایک تو وہاں ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے اتنی زیادہ خاموشی چھا
گئی کہ مجھے اپنے سانس کے چلنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ مجھے ایسی ہی دور دراز اور
خاموش جگہ چاہیے تھی۔ سوچا یہاں رات کو آرام کرتا ہوں۔ دن نکلے گا تو پہاڑیوں کی
دوسری جانب نکل جاؤں گا اور جل گاؤں شہر سے آگے بھوساول اور برہان پور کے شہروں
کی طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ دلی کی طرف جانے کے لئے یہی روٹ
تھا۔ میں کافی تھک چکا تھا۔ جیسے ہی تھوڑا آرام ملا مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

مجھے اندازہ نہیں میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ ایک آواز سے میری آنکھ کھل
گئی۔ یہ بادلوں کے گرجنے کی آواز تھی۔ غار کے دہانے کے باہر سرکنڈوں کے پیچھے بجلی
چمکی۔ اور دوسرے لمحے بادل زور سے گرجا۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع
ہو گئی۔ یہ موسلا دھار بارش میرے حق میں بڑی اچھی تھی۔ اب اس طرف کسی پولیس
پارٹی کے آنے کا امکان یا خطرہ نہیں رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا ان علاقوں میں بارش دیر تک ہوتی
رہتی ہے اگر دو گھنٹے بھی بارش ہوئی تو جل گاؤں شہر سے یہاں تک راستے میں جتنے ندی
نالے اور تالاب ہیں سب بھر جائیں گے اور پولیس اس طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ غار
کے اندر مچھر ضرور آ گئے تھے۔ خدا جانے یہ بارش کے ساتھ ہی کہاں سے نکل آئے تھے۔
میری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اسی طرح پڑی تھی۔ میری نقدی کے ساتھ یہ
چیزیں بھی پولیس انسپکٹر نے میرے پاس ہی رہنے دی تھیں۔ میں نے اٹھ کر اندھیرے میں
ادھر ادھر سے سوکھی گھاس اور جھاڑیاں اکٹھی کر کے ان میں آگ لگا دی اور پھر آگ
کو اس طرح بجھا دیا کہ اس میں سے صرف دھواں ہی نکلتا رہے۔ ہمیں اس کی بھی باقاعدہ
ٹریننگ دی گئی تھی۔ آگ میں نے صرف اتنی جلائی تھی کہ دھواں غار میں بھرے نہیں
بلکہ پتلی لکیر کی شکل میں غار کی چھت کی طرف جا کر وہاں جمع ہوتا رہے اور پھر غار کے
دہانے سے آہستہ آہستہ باہر نکلتا رہے۔

اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ مچھروں سے جان بچ گئی اور کوئی کیڑا مکوڑہ یا سانپ
بنولی بھی میرے قریب نہیں آ سکتا تھا۔ جانور اور کیڑے مکوڑے آگ سے بڑا ڈرتے ہیں
ر انہیں دور ہی سے اس کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ میں دوبارہ
نے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں واقعی سو گیا۔ میرا خیال ہے میں کافی دیر
تا رہا تھا۔ کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو باہر بارش رک چکی تھی۔ میں اٹھ کر غار سے
ہر آ گیا۔ باہر دیکھا کہ آسمان بادلوں کی وجہ سے گہرے سلیٹی رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔
ی رات ہی تھی۔ اگر پو پھٹ رہی ہوتی تو بادلوں کے پیچھے سے پھیکی پھیکی سفیدی ضرور
لک رہی ہوتی۔ میں غار میں واپس آ کر بیٹھ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ایک
دھ مچھر میرے کان کے گرد منڈلاتا اور میرے ہاتھ مارنے پر بھاگ جاتا تھا۔ پہلے میں نے
چا کہ میں کیوں نہ دن کی روشنی ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جاؤں۔ پھر یہ سوچ کر
ارادہ ملتوی کر دیا کہ جنگل ان جانا ہے۔ ندی نالے بھرے ہوئے ہوں گے۔ کہیں راستے
ے نہ بھٹک جاؤں۔

میں پو پھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا تھا۔ اس وقت سگریٹ پینے کا اتنا مزا آیا کہ میں بیان
یں کر سکتا۔ مجھے اچانک ماضی کے زمانے میں ملی ہوئی اپنی محسن سمیری قوم کی لڑکی سوسن
ا خیال آ گیا۔ ساتھ ہی میں بے اختیار ہو کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے اپنے فضل
رم سے مجھے چندریکا بدروح کی دی ہوئی بیماری سے ہمیشہ کے لئے شفا عطا کر دی تھی۔
ے نجیب آباد والے پتھر گڑھ قلعے کی شہید خاتون کا بھی خیال آ گیا جس نے مجھے ماضی کے
مانے میں سوسن کے پاس بھیجا تھا اور سوسن مجھے روشن بزرگ کے پاس لے گئی تھی جس
نے اللہ کے حکم سے میری بیماری دور کر دی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ان سب کا
کریہ ادا کیا۔ سوسن کا خیال آتے ہی یہ بھی خیال آنے لگا کہ وہ میرے اس ماڈرن زمانے
ں واپس آنے کے بعد صرف ایک بار ہی مجھے ملی تھی اس کے بعد اس سے ملاقات نہیں
ئی۔ حالانکہ وہ جس وقت چاہے ماضی کے زمانے سے نکل کر ہمارے زمانے میں آ سکتی

تھی۔ پھر خیال آیا کہ یہ ماورائی لوگ بغیر کسی صالح مقصد کے یونہی کسی سے نہیں ملا
کرتے۔ اگرچہ مجھے ماضی کے زمانے میں واپس جانے کی ترکیب بتا دی گئی تھی مگر مجھے بھی
بلا ضرورت اپنا زمانہ اور وہ حالات چھوڑ کر جن کا میں مقابلہ کر رہا تھا ماضی کے زمانے میں
واپس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی دل میں یہ آرزو ضرور پیدا ہوتی تھی
کہ میں ماضی کے زمانے میں سوسن کے پاس جاؤں اور اس سے درخواست کروں کہ وہ
مجھے سمیری تہذیب کے زمانے سے لے کر پاکستان کے قیام تک کی تاریخ اور خاص طور پر
اسلامی تاریخ کی سیر کرائے تا کہ میں اپنی آنکھوں سے اسلام کے نامور مجاہدوں طارق بن
زیاد' محمد بن قاسم' سلطان صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی بت شکن کو کفر کے خلاف
جہاد کرتے دیکھوں۔ لیکن میں اس وقت خود کشمیر میں کفر کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ میں
پاکستان کی سلامتی اور کشمیر کے محاذ کو چھوڑ کر ماضی کی دنیا میں نہیں جا سکتا تھا۔

بارش رک جانے کے بعد بادلوں نے بھی گرجنا بند کر دیا تھا۔ پہاڑی کے اردگرد
رات ایک بار پھر خاموش اور ساکت ہو گئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا اور پو پھٹنے کے انتظار
میں تھا۔ اتنے میں مجھے ٹرین کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دور سے آئی
تھی۔ ضرور اس پہاڑی کے پیچھے ریلوے لائن تھی۔ دوسری بار انجن کی سیٹی کی آواز ذرا
قریب سے آئی تو میں غار سے نکل کر چٹانوں کے پیچھے آگیا۔ یہاں پہاڑی کی پچھلی ڈھلان
شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے مغرب کی طرف جو ایک پہاڑی رات کے اندھیرے میں
بھوت کی طرح نظر آ رہی تھی اس طرف مجھے ریل کے انجن کی روشنی نظر آئی جو آہستہ
آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر انجن کی چھک چھک سنائی دینے لگی۔ اس آواز سے صاف
پتہ چل رہا تھا کہ ٹرین چڑھائی چڑھ رہی ہے اور بہت آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ انجن کی
روشنی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اس کی روشنی میں مجھے ڈھلان کے نیچے ریل کی
پٹڑی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ یہاں اترائی بہت آسان تھی۔ میں ریل کو قریب سے دیکھنے
کے لئے نیچے اترنے لگا۔ ریل گاڑی سانپ کی طرح بل کھاتی میرے والی پہاڑی کی طرف
بڑھ رہی تھی۔ اس کے ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں بہت نیچے نہ گیا۔ آدھی

ملان پر ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا تا کہ اگر مجھ پر انجن کی روشنی پڑے تو میں دور
ی کو نظر نہ آسکوں۔ یہاں پہاڑی چڑھائی کافی اونچی تھی۔ بہت جلد میں نے دیکھ لیا کہ
ین کو دو انجن لگے تھے۔ ایک انجن آگے تھا دوسرا انجن پیچھے لگا ہوا تھا۔ دونوں انجن
ہواں چھوڑ رہے تھے اور ٹرین اتنی سست رفتار سے چل رہی تھی کہ آدمی اتر کر اس میں
بارہ سوار ہو سکتا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اس ٹرین میں بیٹھ کر یہاں
ے نکل جانا چاہیے۔ لیکن خیال کے دل میں پیدا ہونے اس کو ارادے میں تبدیل کرنے
ر پھر اس ارادے پر عمل کرنے میں مجھے دیر لگ گئی۔ اتنی دیر میں ٹرین نیچے پہاڑی کے
یب سے ہو کر گزرنے لگی تھی۔ اس وقت اگر میں نیچے چلا بھی جاتا تو ٹرین کو نہیں پکڑ
لتا تھا۔

ٹرین گزر گئی لیکن مجھے ایک ترکیب بتا گئی تھی۔

یہاں پہاڑ کی چڑھائی تھی اور پیچھے سے جو بھی گاڑی آتی تھی یہاں پہنچ کر اس کی
فتار بہت آہستہ ہو جاتی تھی۔ دن میں یہاں سے چار پانچ ریل گاڑیاں ضرور گزرتی ہوں
ل۔ اور ان سب کی رفتار یہاں پہنچ کر آہستہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر میں
باڑی سے اتر کر ریلوے لائن کے قریب کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤں تو اس کے بعد آنے
الی گاڑی پر میں سوار ہو کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔

قدرت نے خود ہی ایک وسیلہ میرے لئے پیدا کر دیا تھا۔ اب مجھے واپس غار میں
بانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا اور زیادہ نہیں تو گھنٹے ڈیڑھ دو گھنٹے
ند دوسری کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور آنے والی تھی۔ یہ مین لائن تھی کوئی برانچ لائن نہیں
ٹی۔ اتنا میں جانتا تھا کہ یہ ٹرینیں پیچھے جل گاؤں سے آتی ہیں اور آگے بھوساول برہان
پور کی طرف جاتی ہیں یہ سب سٹیشن بمبئے دلی مین لائن پر واقع تھے۔ میں نے ریلوے
ئن پر جا کر دوسری گاڑی کے انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آہستہ آہستہ پہاڑی کی اترائی
ترنا شروع کر دی۔

ڈھلان پر ایک برساتی نالہ بن گیا ہوا تھا جہاں سے بارش کا پانی اوپر سے نیچے بہتا تھا۔

میں نالے کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اندھیرے میں بڑی احتیاط سے نیچے اتر
لگا۔ جب نیچے ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو ایک طرف ہٹ کر ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہ
سے مجھے پیچھے بل کھاتی گاڑی کے انجن کی بڑی روشنی نظر آسکتی تھی۔ گاڑی کے گ
جانے کے بعد ریلوے لائن کے آس پاس گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ مجھے اگر کوئی خطرہ
تو صرف اس بات کا تھا کہ کوئی جنگلی درندہ ریلوے لائن پر نہ نکل آئے۔ اگرچہ میر
پاس کسی بھی جنگلی درندے کو ہلاک کرنے کے لئے زہریلی سوئی والا بال پوائنٹ موجود
لیکن اگر درندہ پیچھے سے مجھ پر اچانک حملہ کرتا ہے تو میں بے بس ہو سکتا تھا۔ میں
اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا۔ ریلوے لائن کے قریب کوئی اونچا درخت نہیں تھ
جھاڑیاں تھیں یا چھوٹے چھوٹے زمین سے پانچ پانچ فٹ اونچے درخت تھے۔

جہاں پہاڑی کی دیوار نیچے آکر زمین کے ساتھ لگ جاتی تھی وہاں سے کوئی پندرہ بی
فٹ کے فاصلے پر ریلوے لائن تھی۔ ریل کی پٹڑی زمین سے اونچی تھی۔ میں پہاڑی
دیوار کے ساتھ جو جھاڑیاں تھیں ان کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات کی موسلا دھ
بارش کی وجہ سے جھاڑیاں اور گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو اٹھ کر ریلو
لائن کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دور تک ٹہلتا ہوا گیا پھر واپس آکر بیٹھ گیا۔ اب
تک کسی ریل گاڑی کی آمد کے آثار نہیں تھے۔ رات گزرتی چلی گئی۔ پھر بادلوں کے پیچ
سے صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دن کا اجالا ہو گیا۔ اس اجالے میں
مجھے ریل کی پٹڑی اور اس کے اوپر جھکی ہوئی پہاڑی ڈھلانیں اور ڈھلانوں پر اگی ہوا
جھاڑیاں بھی نظر آنے لگیں۔ اتنے میں مجھے دور سے ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی کی آوا
سنائی دی۔ یہاں پہاڑی موڑ تھا اس لئے انجن یہاں پہنچ کر سیٹی ضرور دیتا تھا۔ میں جلد
سے جھاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔ میں ٹرین کے کسی پچھلے ڈبے میں سوار ہونا چاہتا تھا اور
نہیں چاہتا تھا کہ اگلے ڈبوں کے مسافر مجھے دیکھیں۔ کیونکہ دن کی روشنی چاروں طرف
پھیلی ہوئی تھی۔ میں جل گاؤں کے انسپکٹر کا خون کر کے بھاگا تھا اور یہ گاڑی پیچھے جل
گاؤں کے سٹیشن ہی سے آرہی تھی۔ مجھے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ گاڑی چونک

ھائی چڑھ رہی تھی اس لئے اس کا انجن کافی دیر بعد مجھے نظر آیا۔ انجن تھوڑی
ر بعد سیٹی دے رہا تھا۔ انجن چھک چھک کرتا بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ لائن پر میری
رف بڑھ رہا تھا۔ انجن کو چڑھائی پر چونکہ پوری طاقت خرچ کرنی پڑ رہی تھی اس لئے
ں کی چمنی میں سے سیاہ کالے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ٹرین پہاڑی کے موڑ
ے نکل کر سامنے آئی تو مجھے ٹرین کے پیچھے لگے ہوئے دوسرے انجن کا دھواں بھی نظر
انے لگا۔

مجھے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں بڑی آسانی سے ٹرین پکڑ سکتا تھا۔
نانچہ میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ انجن آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر
ہ میرے قریب سے شور مچاتا بھاپ اور دھوئیں کے مرغولے اڑاتا آہستہ آہستہ گزر گیا۔
نجن ڈرائیور اور فائر مین مجھے صاف نظر آئے۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ کہیں مال گاڑی نہ
و۔ مگر یہ مسافر گاڑی تھی۔ مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے گزرنے لگے۔ ٹرین واقعی
بڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ میں پچھلی بوگی کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ جب آخری
وگی میرے سامنے سے گزرنے لگی تو میں باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اب مجھے پیچھے لگا
ہوا انجن صاف نظر آیا تھا۔ میں خاموشی سے جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل آیا اور ٹرین کے
ساتھ ساتھ آگے کی طرف چلنے لگا۔

جب آخری ڈبہ آیا تو میں دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر پائیدان پر چڑھ گیا۔ دروازہ
بند تھا۔ مجھے اوپر آتا دیکھ کر ایک مسافر نے دروازہ کھول دیا۔ میں خاموشی سے ڈبے میں
داخل ہو کر وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلی جارہی تھی۔ پچھلے
انجن کا وہاں پورا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں نظریں اٹھا کر ڈبے
میں بیٹھی ہوئی سواریوں کا جائزہ لیا۔ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا اور اس میں کافی سواریاں بیٹھی
تھیں۔ ان میں مخصوص ٹوپیوں والے گجراتی بھی تھے اور دھوتی کرتوں والے ہندو بھی
سوار تھے۔ دو چار ساڑھی والی عورتیں بھی اپنے بچوں کو لئے بیٹھی تھیں۔ سواریاں ایک
دوسرے سے باتیں کرنے اور اپنے اپنے کام میں لگی تھیں۔ زیادہ تر لوگ کھڑکیوں میں

سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ یہ بڑی اچھی بات تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ جلدی سے ٹرین کی رفتار تیز ہو تا کہ میں اس علاقے سے جتنی جلدی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔

پہاڑ کی چڑھائی ختم ہوئی تو ہموار جگہ آ گئی۔ اس کے آگے پھر اترائی تھی۔ اترائی پر ٹرین نے رفتار پکڑی اور کھٹا کھٹ کرتی بڑی تیزی سے ڈھلان اترنے لگی۔ ٹرین پہاڑیوں سے نکل آئی اور میدان شروع ہو گئے۔ کہیں کہیں ہرے بھرے کھیت بھی تھے۔ کسی کسی وقت کوئی ٹیلہ آجاتا اور ٹرین تیزی سے آگے نکل جاتی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں جل گاؤں سے دور سے دور تر ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادل اسی طرح جھکے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں بارش ہو رہی تھی کہ نہیں۔ ڈبے میں بیٹھ کر اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ باہر سے ہوا کے تھپیڑے ڈبے میں آ رہے تھے۔ ایک بار مجھے اپنے چہرے پر پانی کی بوندیں گرتی محسوس ہوئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکالا۔ بارش موسلا دھار نہیں تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ میں دوبارہ دروازے کے پاس ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ بھوساول وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق گھنٹے سوا گھنٹے میں ٹرین کو بھوساول پہنچ جانا تھا۔ میں نے یہی پروگرام بنایا کہ جیسے ہی ٹرین بھوساول شہر میں داخل ہو گی میں ڈبے کے ٹائیلٹ میں چھپ کر بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے یقین تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ بھوساول پولیس کو میرے فرار اور پولیس انسپکٹر کے قتل کے بارے میں الرٹ کر دیا ہو گا اور سٹیشن پر پولیس اور خفیہ پولیس کی بھاری نفری موجود ہو گی اور ٹرین کی تلاشی لی جائے گی۔

گاڑی ہرے بھرے کھیتوں اور میدانوں میں دوڑتی جا رہی تھی۔ ٹیلے اور پہاڑیاں دور دور ہٹ گئی تھیں۔ تقریباً سوا گھنٹے کے سفر کے بعد ریلوے لائن کے آس پاس آبادیاں نظر آنے لگیں۔ گاڑی شہر کے ایک بڑے پل پر سے گزری جس کے نیچے سے موٹر کار اور رکشے اور دو بیل گاڑیاں گزرتی میں نے دیکھیں۔ میں اٹھ کر ٹائیلٹ میں جانے کے

بارے میں سوچ رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار ایک دم سے کم ہو گئی اور پھر ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی کو اچانک سرخ سگنل دے کر روک لیا گیا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر اگلے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے ریلوے لائن کے پاس باوردی پولیس کی بھاری تعداد دکھائی دی۔ اب ٹائیلٹ میں چھپنا اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کے برابر تھا۔ کیونکہ پولیس کی زیادہ تعداد بتا رہی تھی کہ ایک ایک ڈبے کی تلاشی لی جانے والی تھی۔ گاڑی کو اسی مقصد کے لئے سٹیشن سے کافی پیچھے روک لیا گیا تھا کہ مفرور قاتل اور جاسوس مسافروں کے ہجوم میں گم نہ ہو جائے۔ میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا۔ ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے بھی مسافر جھانک کر باہر دیکھ رہے تھے کہ ٹرین کیوں کھڑی ہو گئی ہے۔ میں بھی دوسرے دروازے پر آ کر باہر دیکھنے لگا۔ ٹرین کی اس طرف بھی پولیس موجود تھی اور ڈبوں کے آگے پھیل کر ٹرین کو گھیرے میں لے رہی تھی۔ اگلے ڈبوں کی جانب سے ایک دیہاتی آ رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کیا ہوا ہے بھیا؟ پولیس کیوں آئی ہے؟ اس نے کہا۔

"کوئی قیدی بھاگ گیا ہے۔ پولیس اسے ڈھونڈ رہی ہے۔"

میں چپکے سے دروازے میں سے پیچھے کھسک گیا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یہ وقت ٹرین سے نکل کر جس طرف منہ اٹھے اسی طرف بھاگ جانے کا وقت تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ یہ آخری بوگی کا آخری ڈبہ تھا اور اس کے پیچھے بھی ایک انجن لگا ہوا تھا۔ ڈبے کے کچھ مسافر حالات معلوم کرنے کے لئے ڈبے سے اتر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی نیچے اتر گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا انجن کے پیچھے خالی ریلوے لائن پر آ گیا پیچھے ریلوے لائن خالی پڑی تھی اور ریلوے لائن کی دونوں جانب بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریلوے لائن کے درمیان پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہاں پیچھے سے مجھے کچھ دور تک کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں آگے ٹرین کی دونوں جانب موجود پولیس کو نظر آ سکتا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میں محفوظ رینج سے نکلنے والا ہوں اور پیچھے سے مجھ پر پولیس والوں کی نظر پڑ سکتی ہے تو میں ریلوے لائن پر بیٹھ گیا۔ میں نے سر آگے نکال کر

گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ مجھے پولیس کے سپاہی ڈبوں میں گھستے اور ڈبوں سے نکلے نظر آئے۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس کی دوسری جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ اس کے آگے کیا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں اٹھ کر کھڑے ہونے کی بجائے بیٹھے بیٹھے آگے کھسک کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں میں گھستے ہی میں جھک کر جس طرف منہ تھا اس طرف جلدی جلدی چلنے لگا۔ یہ کوئی جنگل نہیں تھا۔ گاڑی بھوساول شہر کے مضافات میں کھڑی تھی۔ مجھے سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے اور ہارن دینے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریلوے لائن زمین سے اونچی تھی۔ آگے دیوار تھی جس کی دوسری طرف نیچے سڑک پر ٹریفک چل رہی تھی۔ دیوار دس بارہ فٹ سے زیادہ اونچی تھی۔ میں دیوار سے نیچے اترنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرتے ہوئے پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ آگے ایک جگہ سے ریلوے کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں ڈھلوان بنی ہوئی تھی جہاں سے ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ نیچے سڑک پر اتر رہی تھی۔ میں بھی وہاں سے اتر کر سڑک پر آگیا۔ سڑک کے پار مکانوں کی قطار تھی جن کے درمیان ایک تنگ سی گلی نظر آئی تو میں سڑک کراس کر کے اس گلی میں داخل ہو گیا۔ اب میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا تا کہ اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔

گلی کے آگے پھر بازار تھا۔ یہاں چند ایک کھوکھا نما دکانیں ہی تھیں۔ ایک طرف مندر تھا۔ مندر کے آگے چھوٹا سا تالاب تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک گیلی تھی۔ میں سڑک کراس کرنے لگا کہ پیچھے ایک لاری آکر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ کلینر نے دروازے میں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"برہان پور۔ برہان پور لالہ جی۔"

بھوساول سے اگلا شہر برہان پور ہی تھا۔ میں نے سوچا اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا اس خطرے والے علاقے سے تو نکلو۔ میں دوڑ کر

لاری میں گھس گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آگے جا کر لاری کی بھی چیکنگ ہو سکتی ہے۔ لاری میں کافی سواریاں بیٹھی تھیں۔ میں بھی ایک جگہ سواریوں میں گھس کر بیٹھ گیا۔ کلینر نے لاری کا دروازہ بند کرتے ہوئے زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"چلو دادا"

اور لاری روانہ ہو گئی۔

میں لاری کے دروازے کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

سوچ رکھا تھا کہ اگر آگے پولیس کی کوئی چیک پوسٹ ہوئی تو لاری سے اتر کر فرار ہ
جاؤں گا۔ لاری بھوساول شہر کی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی برہان پور جانے والی سڑک پر نکل
پیچھے ۔ شہر میں کسی جگہ پولیس کی چیک پوسٹ نہیں تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔
ڈھلوان بڑ شدہ تھی کہ مجھے دلی نہیں تو کم از کم بھوپال سے آگے تک اسی طرح قسطوں میں
تھی۔ میں ے گا۔ میں کوئی جیل سے بھاگا ہوا کوئی عام قیدی ہوتا تو پولیس کو میرے بار
درمیان تردد اور بک بک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں عام قیدی نہیں تھا۔ ایک
ں نے پولیس کے اعلیٰ افسر کو قتل کیا تھا دوسرے بقول پولیس کے میں پاکستانی جاسوس
تھا جس نے بھارت کے مختلف علاقوں میں اپنی کمانڈو سرگرمیوں سے زبردست تباہی مچا
تھی۔ ظاہر ہے جل گاؤں سے لے کر بھوپال تک کی پولیس کو میرا حلیہ بتا کر خبردار کر دیا
گا اور پولیس ہر شہر کے ریلوے سٹیشن اور لاری اڈوں پر مجھے پکڑنے کے لئے موجود
گی۔

بھوساول سے برہان پور تک کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا لاہور سے گجرات تک کا فاصلہ
ہے۔ لاری بڑی شکستہ حال تھی اور آہستہ چل رہی تھی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ
سڑک پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ راستے میں لاری سواریاں بھی اٹھا رہی تھی۔ یوں رک رک
چل رہی تھی۔ بھوساول کا شہر آج کل کے بھارت کے صوبہ مہاراشٹر میں واقع ہے۔ برہان
پور سے بھارت کی صوبہ مدھیہ پردیش یعنی وسطی ہندوستان کے گھنے جنگلوں والے علا

کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ برہان پور سے کچھ کلومیٹر پیچھے مدھیہ پردیش کے گھنے جنگل اور چھوٹی بڑی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں ۔ میں ان جنگلوں سے واقف تھا۔ سارے کے سارے جنگل تو میں نے نہیں دیکھے تھے مگر یہاں چونکہ ایک مرد مومن نے مجھے کمانڈو ٹریننگ دی تھی اس لئے اس کے ہوشنگ آباد والے جنگل میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ مگر ہوشنگ آباد برہان پور سے کافی فاصلے پر تھا۔ موسم کی صورت حال یہ تھی کہ صبح سے ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی تھی۔ کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے رک جاتی اور اس کے بعد پھر شروع ہو جاتی۔ موسلا دھار بارش بس رات کو ہی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک قصبہ آیا تو لاری رک گئی۔ دکانیں ٹین کی ڈھلانی چھتوں والی تھیں ۔ ایک آدمی سنتروں کا ٹوکرا اٹھائے لاری کے پاس آگیا۔ یہ ناگ پوری سنترے تھے۔ ناگ پوری سنترے باہر سے سبز اور اندر سے کیسری رنگ کے ہوتے ہیں ۔ کسی زمانے میں ناگ پوری سنترے بڑے مشہور تھے مگر ان سنتروں کو پاکستان کے کنوؤں نے چاروں شانے چت گرا دیا۔ 65ء کی جنگ سے پہلے پاکستان سے جو پاکستانی ویزا لے کر انڈیا جاتا تھا بھارت کے لوگ اس سے پہلا سوال یہ کرتے تھے۔

"پاکستانی کنو لائے ہو تو ہمیں دے دو ہم منہ مانگے پیسے دیں گے۔"

بھارت سے جو لوگ ویزا لے کر پاکستان آتے تھے وہ پاکستان سے واپس انڈیا جاتے ہوئے کنوؤں کا ٹوکرا بھر کر ضرور لے جاتے تھے۔ ناگ پور کے سنترے دیکھ کر مجھے پاکستان کے کنو یاد آگئے۔ پھر اپنا وطن پاکستان بہت یاد آیا۔ یہی دل چاہنے لگا کہ فوراً پاکستان واپس پہنچ جاؤں اور اپنے والد صاحب کی قبر پر جا کر کہوں ۔ ابا جی! میاں جی! میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا اسے جان کی بازی لگا کر پورا کر رہا ہوں ۔

لاری آگے چل پڑی۔ کافی دیر بعد لاری پھر ایک قصبے کے باہر سڑک پر رک گئی۔ یہاں جنگل میں سے کوئی سڑک نکالی جا رہی تھی۔ بڑے مزدور مرد اور عورتیں کام کر رہی تھیں ۔ میں نے یہاں اتر کر چائے اور ساتھ ڈبل روٹی کے دو چار سلائیس کھا لئے۔ یہ ناشتہ میرے لئے سارے دن کے لئے کافی تھا۔ آگے کے حالات کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ مجھے

کہاں جانا پڑے اور کیا صورت حال پیدا ہو جائے۔

برہان پور کا شہر قریب آ رہا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب شہر کی گاڑیاں کبھی کبھی آجاتی تھیں۔ یہاں دور دور پہاڑیاں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ لاری ایک بار پھر جنگل والے علاقے سے گزرنے لگی۔ بوندا باندی رک گئی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب کہیں دیودار اور کہیں سال کے گھنے درخت آجاتے تھے۔ یہ وسطی ہندوستان کے گھنے جنگلوں کے درخت تھے۔ سامنے سے فوجی گاڑیوں کا کانوائے آنے لگا۔ ہماری لاری سڑک کی ایک جانب ہو گئی اور اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ لاری سڑک کا موڑ گھومی تو کچھ فاصلے پر ایک اونچے پہاڑ کی ڈھلان پر بنے ہوئے مکان نظر آئے۔ لاری ریلوے پھاٹک سے گزر گئی۔

ریلوے پھاٹک سے کچھ دور جا کر لاری کی رفتار بہت ہلکی ہونے لگی۔ پھر لاری سڑک سے اتر کر رک گئی۔ میں سمجھا کوئی اور قصبہ آیا ہو گا۔ یہاں سے ڈرائیور سواریاں لے کر آگے چلے گا۔ مگر کسی قصبے کے وہاں کوئی آثار نہیں تھے۔ لاری جنگل کے علاقے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کلینر سے پوچھا کہ گاڑی یہاں کیوں رکی ہے۔ اس نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"ابھی معلوم کرتا ہوں"

وہ لاری سے اتر کر آگے چلا تو میں نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ ہماری لاری کے آگے بھی دو تین لاریاں کھڑی تھیں۔ میرے دل میں کچھ شک پیدا ہوا۔ مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ ڈرائیور بھی نیچے اتر آیا تھا۔ کلینر جلدی واپس آگیا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

"کیوں رے۔ کیا بات ہے آگے؟"

وہ بولا۔

"دادا آگے پولیس ہی پولیس ہے چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے رے؟ کیا ادھر بھوپت ڈاکو آیا ہوا ہے؟"

جب ڈرائیور کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا تو میں لاری سے اتر کر پیچھے جا چکا تھا

سامنے سے فوجی گاڑیاں ابھی تک چلی آ رہی تھیں۔ یہ کوئی ملٹری کانوائے تھا۔ بڑے بڑے فوجی ٹرک تھے جو ترپالوں کی چھتوں والے تھے۔ ایک ٹرک کے بعد دوسرا ٹرک گزر جاتا تھا۔ ان کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ملتا تھا۔ میں اسی وقفے میں جلدی سڑک پار کر کے دوسری طرف درختوں میں اتر گیا۔

میری تلاش میں برہان پور کی پولیس نے سڑک کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اگر آگے دو ایک لاریاں کھڑی نہ ہوتیں تو مجھے یہ مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ ہماری لاری سیدھی پولیس والوں کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی اور میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ جس جگہ میں سڑک سے دوڑ کر اترا تھا وہاں درخت اتنے گھنے نہیں تھے لیکن جنگلی جھاڑ جھنکار نے بہت جلد مجھے اپنے اندر چھپا لیا۔ پھر بھی میں نے اپنی رفتار آہستہ نہ کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلتا گیا۔ وہاں کوئی پگ ڈنڈی یا راستہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی باہر نکلی ہوئی جڑیں اور گھاس ہی تھی۔ مجھے ان میں چلنے پھرنے کی عادت ہو گئی تھی۔

میں ان درختوں اور جھاڑیوں میں کافی دور نکل گیا تھا۔ راستے میں کئی ندی نالے آئے۔ یہ نیم پہاڑی ندی نالے تھے اور ان میں بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر ندی نالے پار کئے تھے۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ میں خطرے سے بہت دور نکل گیا تھا لیکن ایک خطرہ یہاں بھی تھا کہ کہیں میں اس جنگل میں بھٹک نہ جاؤں۔ بس اندازے سے میں نے اپنا رخ شمال کی طرف کیا ہوا تھا۔ بلکہ شمال کی طرف چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے دلی کی طرف جانا تھا اور دلی شمال کی طرف ہی چل کر پہنچ سکتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ گھنے جنگل میں آدمی اپنی سمت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہاں کوئی سڑک یا پگ ڈنڈی وغیرہ تو ہوتی نہیں۔ جنگل کے شروع میں تو اس قسم کی چھوٹی سڑک یا پگ ڈنڈی کہیں کہیں مل جاتی ہے مگر مدھیہ پردیش کے گھنے جنگلوں میں راستہ تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جہاں کہیں آدی باسی یعنی جنگلی قبیلے کے لوگ رہتے ہوں وہاں کوئی پگ ڈنڈی ضرور نظر آجاتی ہے جو ان جنگلی لوگوں کے چلنے پھرنے سے بن گئی ہوئی ہے۔ ابھی تک مجھے ایسی کوئی پگ

ڈنڈی نظر نہیں آئی تھی۔

دوسرا خطرہ شیر چیتے اور ہاتھی وغیرہ کا بھی تھا۔ یہ ایسے درندے ہیں کہ ان جنگلوں میں کسی بھی جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ میں بے حد محتاط ہو کر چل رہا تھا اور اپنا رخ شمال کی طرف ہی رکھا ہوا تھا۔ کسی جگہ چٹانوں یا کسی ندی نالے یا کھڈ کی وجہ سے مجھے دائیں بائیں ہو جانا پڑتا تو میں آگے جا کر پھر شمال کی جانب رخ کر لیتا تھا۔ یہ سب کچھ اندازے ہی سے ہو رہا تھا۔ میرے پاس کوئی کمپاس تو تھا نہیں۔ بس دل میں خدا سے یہی دعا مانگتا کہ یا اللہ میں جنگل میں بھٹک نہ جاؤں۔ صحرا میں آدمی بھٹک جائے تو کم از کم ریت کے کسی ٹیلے پر چڑھ کر اور سورج کی مدد سے اپنی سمت ضرور معلوم کر سکتا ہے لیکن گھنے جنگلوں میں آپ درخت پر بھی چڑھ جائیں تو آگے سوائے درختوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ویسے بھی درخت کی سب سے اوپر والی شاخ تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

ایک جگہ تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ سورج ان کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ایک دھندلی سی سپیدی پھیلی ہوئی تھی۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ چلتے چلتے جب میں تھک گیا تو میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں کافی دور آگیا ہوں اور وقت بھی کافی گزر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے آدھا دن گزر گیا ہو۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جنگل میں سناٹا تھا۔ کسی کسی درخت پر سے ایک آدھ پرندے کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ برسات کے سبزے اور دلدل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں جنگلی کیلوں کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ یہاں سے میں نے چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے کچھ کیلے توڑ کر کھائے۔ ایک چھوٹی سی ندی قریب ہی بہہ رہی تھی۔ وہاں پانی پی کر پیاس بجھائی اور ندی کے ساتھ شمال کی طرف چلنے لگا۔ آگے جا کر ندی مغرب کی طرف مڑ گئی۔ مجھے اس طرف نہیں جانا تھا۔ اس علاقے سے میں فرار ہو کر آیا تھا۔ چنانچہ میں نے ندی کے کنارے کو چھوڑ دیا اور سامنے کی سمت والے درختوں میں گھس گیا۔ یہاں ایک جگہ مجھے

عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ چلتے چلتے میں اونچی اونچی نرکل کی جھاڑیوں کے قریب سے گزرا تو وہاں مجھے ادھ کھائے ہوئے ہرن کی لاش نظر آئی۔ میں نے فوراً رستہ تبدیل کر لیا اور جلدی جلدی وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

یہاں ہرن کی لاش کسی شیر نے آدھی کھانے کے بعد چھپا دی ہوئی تھی اور کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس وقت یہاں آجائے۔ میں دور ہٹتا ہٹتا ایک ٹیلے کے پاس آگیا۔ اس ٹیلے نے شمال کی طرف جانے والا راستہ روک رکھا تھا۔ میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس کی چوٹی پر بانس کے درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ تھے۔ ان کے پیچھے دوسری طرف ٹیلے کی ڈھلان اترتی تھی۔ میں دوسری طرف اترا تو دیکھا کہ وہاں جھاڑیوں کے درمیان پتلی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی جو ادھر کو ہی جاتی تھی جدھر میں جا رہا تھا۔ میں پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ پیچھے سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ میری نظریں پگ ڈنڈی پر تھیں۔ کوئی آدمی بات کر رہا تھا۔ آواز قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی چلا آرہا ہے جس نے کندھے پر چھوٹی سی گٹھڑی لٹکا رکھی ہے اس کے ساتھ ایک نوجوان عورت ہے۔ عورت نے ساڑھی پہنی ہوئی ہے۔ اس نے بھی بغل میں ایک گٹھڑی دبا رکھی ہے۔ جب وہ دونوں میرے قریب سے گزرے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ بوڑھے آدمی کی سفید ڈاڑھی مونچھیں اس علاقے کے مسلمانوں کی طرح تھیں۔ عورت نے بھی ماتھے پر تلک یا بندیا نہیں لگائی ہوئی تھی۔ دونوں یقیناً مسلمان تھے۔ میں نے انہیں آگے نکل جانے دیا۔ جب وہ دو چار قدم آگے نکل گئے تو میں بھی جھاڑیوں سے باہر آگیا یہ اس علاقے کے لوگ لگتے تھے اور جنگل میں میری راہ نمائی کر سکتے تھے۔ ان کے مسلمان ہونے سے بھی مجھے تسلی ہو گئی تھی۔ میں نے پیچھے سے آواز دی تو دونوں وہیں رکے اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں جلدی سے ان کے پاس آگیا اور بوڑھے کو السلام علیکم کہا۔ میں نے کہا۔

”میاں جی! میں جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے آگے کون سا

شہر ہے؟"

بوڑھے نے نوجوان عورت کو اپنے پیچھے کر لیا تھا اور مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا
بولا۔

"تم اس علاقے کے نہیں لگتے۔ اس جنگل میں کیسے آ گئے ہو؟"

میں نے یونہی ایک کہانی گھڑ کر سنا دی کہ ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا
شیر نے حملہ کر دیا۔ میرا دوست دوسری طرف جان بچا کر بھاگ گیا۔ میں جان بچا کر ا
طرف نکل آیا ہوں"۔

بوڑھے نے پوچھا۔

"تم کون سے شہر سے یہاں آئے تھے؟"

میں نے برہان پور شہر کا نام لے دیا کیونکہ پیچھے وہی شہر تھا۔ نوجوان عورت بوڑھے
کے پیچھے کس قدر سہمی ہوئی سی کھڑی تھی اور مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے
فوراً کہا۔

"میاں جی! میں مسلمان ہوں ۔ میرے ماں باپ پنجاب کے رہنے والے تھے۔
پنجاب سے بمبئی آ کر آباد ہو گئے ان کا بمبئی میں سلائی مشینوں کا کاروبار تھا۔ وہ اس دنیا میں
نہیں رہے اب میں دکان پر بیٹھتا ہوں ۔ ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے یہاں چلا آیا او
مصیبت میں پھنس گیا ہوں"

اپنے آپ کو پنجابی میں نے اس لئے بتا دیا تھا کہ میرا پنجابی لہجہ اردو بولتے وقت فوراً
ظاہر ہو جاتا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

"بیٹا آگے دریا پار بھنڈارا کا بڑا قصبہ ہے۔ وہاں سے تمہیں برہان پور جانے والی ریل
گاڑی مل جائے گی۔ ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ ہم ادھر ہی جا رہے ہیں ۔ یہ میری بہو ہے۔
یہاں قریب ہی ایک گاؤں میں آئے تھے۔ اب واپس بھنڈارا جا رہے ہیں ۔"

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ بھنڈارا قصبے کے ریلوے سٹیشن سے
اگر برہان پور کی طرف ٹرین جاتی ہے تو لازمی طور پر آگے دلی وغیرہ کی طرف بھی جاتی

ی۔ میں وہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی پکڑ لوں گا۔ اتنی دور نکل آیا ہوں آگے پولیس کہاں
ری تلاش میں آئی ہو گی بوڑھے آدمی نے بتایا کہ اس کا بیٹا دیو لالی شہر میں کسی کارخانے
ملازم ہے۔ مہینے میں ایک بار گھر آتا ہے۔

"میں اپنی بہو کو اس کے ماں باپ سے ملانے لایا تھا۔ پیچھے ان کا گاؤں ہے۔"

ہم چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ بوڑھا آگے آگے چل رہا تھا۔ پیچھے اس
بہو چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے میں چلا آ رہا تھا۔ بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ وہ بھنڈارا
میں اپنے محلے کی مسجد کا امام ہے اور بچوں کو قرآن مجید پڑھاتا ہے۔ میں خاموشی سے
کی باتیں سنتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"میاں جی! یہاں سے دریا کتنی دور ہے؟

وہ بولا۔

"زیادہ دور نہیں ہے بیٹا۔ وہاں گھاٹ ہے۔ ہمیں سواریوں والی کشتی مل جائے گی۔"

مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس جنگل سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملا تھا بلکہ میں ایک
ے سٹیشن پر بھی پہنچ جاؤں گا۔ جہاں سے رات کے وقت دلی کی طرف جانے والی کوئی
وئی گاڑی پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ پگ ڈنڈی اب جنگل کے ایسے علاقے میں داخل
ئی تھی جہاں اردگرد بڑے گنجان درخت تھے۔ میں اپنی سوچ میں گم پیچھے چلا جا رہا تھا
اچانک مجھے ایک مرد کی رعب دار آواز سنائی دی۔

"کھڑے ہو جاؤ یہیں"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ سامنے پگ ڈنڈی پر ایک بھاری جسم والا آدمی کھڑا تھا۔
کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ اس کے دائیں جانب دو قدم پر ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ اس
ہاتھ میں بھی چھرا تھا۔ انہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور ان کے چہرے پورے
نہیں آتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو یا ٹھگ لٹیرے ہیں ۔ بوڑھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔
ان لڑکی چیخ مار کر اپنے سسر سے لپٹ گئی۔ میں اپنی جگہ پر خاموش کھڑا ان دونوں
وں کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں ڈاکو آگے بڑھے۔ خاموش تماشائی بنے رہنے کا وقت

نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا آناً فاناً کر گزرنا تھا۔ کیونکہ اگر ان میں سے کوئی ڈاکو بوڑھے یا
اس کی بہو کو قابو کر لیتا تو پھر میرے لئے ان پر حملہ بھی کرنا اور ان کی قاتلانہ گرفت سے
لڑکی یا بوڑھے کو بچانا مشکل ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی ڈاکو اس لڑکی اور بوڑھے کی طرف بڑھے
میں دوڑ کر ان کے سامنے آگیا اور ایسی اداکاری کرنے لگا جیسے میں بھی ان سے خوف زدہ
ہوں۔ میں نے کہا۔

"بھائیو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیں جانے دو۔"

جو ڈاکو بھاری بدن والا تھا اس نے کہا۔

"ہمیں تمہارے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو اس لڑکی کو ساتھ لے جانے کے
لئے آئے ہیں۔ کیوں بے رامو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

دوسرے ڈاکو نے ہنس کر کہا۔

"ہاں مکھو دادا تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

مکھو ڈاکو کے ہاتھ میں جو چھرا تھا وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بمشکل تین چار
فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میرے پیچھے بوڑھا اپنی بہو کو ساتھ لگا کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکو
نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"ایک طرف ہٹ جاؤ نہیں تو مارے جاؤ گے۔ بابو۔"

اس نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور نیچے جھکا کہ بوڑھے کے ساتھ چمٹی ہوئی نوجوان
لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے۔ لڑکی اونچی آواز میں رونے لگی۔ بوڑھا اس
ڈاکو کی منتیں کرنے لگا۔ جیسے ہی ڈاکو نیچے جھکا میں نے اس کا چھرے والا ہاتھ پکڑ کر زور
سے نیچے کو جھٹکا دیا۔ یہ کسی اناڑی آدمی کا اٹیک نہیں تھا ایک تربیت یافتہ کمانڈو کا اٹیک
تھا۔ ڈاکو سنبھل نہ سکا۔ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے پوری طاقت سے ٹھڈا اس کے
منہ پر مارا وہ الٹا ہو گیا چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اتنے میں دوسرے ڈاکو نے مجھ پر
حملہ کر دیا۔ اگر وہ دور سے مجھ پر چھرا نشانہ لگا کر پھینکتا تو میں زخمی ہو سکتا تھا مگر اس نے
ایسا نہ کیا۔ اپنے ساتھی ڈاکو کو بچانے کے لئے وہ دوڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ جیسے ہی دا

ے قریب آیا تو میں نے اس کے چھرے کا وار بچاتے ہوئے اس کے چھرے والے
و کو پکڑ کر اس کی ٹانگوں میں لات ماری۔ یہ بڑا خطرناک داؤ ہوتا ہے۔ اگر لات ٹھیک
وں کے درمیان پڑ جائے اور لات بھی کسی مارشل آرٹ کے ماہر یا کمانڈو کی ہو تو آدمی
را ہو جاتا ہے۔ اتنی شدید درد ہوتی ہے کہ آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ دوسرا ڈاکو
یں دہرا ہو گیا۔ اس دوران پہلے والا ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا ڈاٹھا کھل گیا تھا۔ چھرا
ر پڑا تھا۔ وہ مجھ سے جسمانی اعتبار سے زیادہ موٹا اور بھاری بدن کا تھا۔ وہ گالی دیتا ہوا
ضبناک ہو کر میری طرف بڑھا اور اس نے میری گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لینے کی
وشش کی مگر میں بجلی کی تیزی سے ایک طرف ہو گیا اور وہیں سے بجلی ایسی تیزی کے
اتھ میرے بازو نے اس کی گردن کو اپنے فولادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ میں نے اس کو دو
ھٹکے دیئے۔ کیونکہ اس کی گردن موٹی تھی مجھے شک تھا کہ ایک جھٹکے میں اس کی گردن
یں ٹوٹے گی۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ ہی اس کا جسم ڈھلک گیا۔ دوسرا ڈاکو اپنے پیٹ
و پکڑے وہیں بیٹھا ہائے ہائے کر رہا تھا اور یہ منظر بھی دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے
اتھی کا انجام دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر وہیں بیٹھے بیٹھے بولا۔

"دادا رحم کرو۔ مجھے نہ مارنا۔"

مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھ پر اس وقت کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔
ی خیال دماغ میں سما گیا تھا کہ اگر اسے زندہ چھوڑا تو یہ کسی دوسری مسلمان عورت کو
غوا کر لے گا اور اس کی عزت برباد کر دے گا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔

"فکر نہ کرو۔ روتے کیوں ہو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑی اور دوسرے
ے وہ بھی بے جان ہو کر نیچے گر پڑا۔ یہ سارا خونی ڈرامہ بوڑھا اور اس کی بہو پگ ڈنڈی
یٹھے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے دونوں ڈاکوؤں کا کام تمام کر
ا تو بوڑھے نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ اس سے خوف اور خوشی کے مارے بات نہیں ہو
ی تھی۔ اس کی بہو گٹھڑی سینے سے لگائے حیرت کے عالم میں مجھے اور ڈاکوؤں کی لاشوں

کو تک رہی تھی۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔

"میاں جی! یہاں سے نکل چلو۔ ہو سکتا ہے ان ڈاکوؤں کے ساتھی کہیں قریب ہی ہوں۔"

میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن تم بھی چلو۔ چلو شاباش!"

ان دونوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ میں نے وہاں جو کام کر دکھایا تھا اس کی انہیں مجھ سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ لڑکی اور بوڑھے کو میں نے آگے کر دیا تھا اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا کہ وہاں ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی کسی طرف سے نکل کر حملہ نہ کر دے۔ ہم جلدی جلدی چلتے درختوں کے جھنڈوں سے نکل آئے۔ سامنے مجھے دریا نظر آنے لگا۔ ہم گھاٹ پر آگئے۔ ایک بہت بڑی کشتی گھاٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ دیہاتی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے گھاٹ والے کو دو دو روپے فی کس کرایہ ادا کیا اور بوڑھے اور اس کی بہو کو لے کر کشتی میں سوار ہو گیا۔

بوڑھا سخت ڈرا ہوا تھا۔ ہم کشتی کے پچھلے سرے کے پاس بیٹھے تھے۔ بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹا! دو آدمی قتل ہو گئے ہیں پولیس کو پتہ چل جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"میاں جی! وہ آدمی نہیں تھے۔ ڈاکو تھے۔ آپ کی بہو کی عزت لوٹنے آئے تھے انہیں جہنم میں پہنچا کر میں نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ ان جنگلوں میں ڈاکو لوگ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

بوڑھا خاموش ہو کر بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر میں کشتی دریا روانہ ہوئی۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا اگر نہیں تھا تو اتنا مختصر بھی نہیں تھا۔ دوسرے

کنارے کے درخت وغیرہ پہلے تو صاف نظر آرہے تھے کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو دوسرا کنارا صاف دکھائی دینے لگا۔ میں نے یونہی دریا کے دوسرے کنارے کی طرف نگاہ ڈالی تو میری آنکھیں وہیں ساکت ہو گئیں۔ مجھے دوسرے کنارے کے گھاٹ پر پولیس کی وردیوں والے کچھ آدمی نظر آئے۔ کشتی کو دو ملاح لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے کنارے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ کشتی تھوڑی اور قریب گئی تو مجھے درختوں کے نیچے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ اس علاقے کی پولیس کی وردیوں اور ان کی گاڑیوں کو میں بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ پولیس کے سپاہی کافی تعداد میں تھے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں اور وہ سب کشتی کے گھاٹ پر لگنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ وہ میرے انتظار میں وہاں کھڑے ہیں یا کسی دوسرے مفرور مجرم کو پکڑنے کے لئے وہاں آئے ہیں۔ کشتی لحہ بہ لحہ کنارے کے قریب ہو رہی تھی۔ اب کشتی میں بیٹھے ہوئے مسافر بھی پولیس والوں کو ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ کشتی کو قریب آتا دیکھ کر وہ دریا کے کنارے پر پھیل گئے۔ میں نے انہیں پوزیشنیں لیتے دیکھا تو اللہ کا نام لیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس طرح اچانک دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھ کر بوڑھے میاں جی اور ان کی بہو اور دوسرے مسافروں نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا اور ان کے چہروں پر کیسی حیرت طاری ہو گئی ہو گی۔ مجھے دریا میں چھلانگ لگاتے گھاٹ پر موجود پولیس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کا ثبوت مجھے فائرنگ کے دھماکوں سے ملا جو دریا میں چھلانگ لگانے کے فوراً بعد مجھے سنائی دینے لگے۔ میں جتنی تیز تیر سکتا تھا دریا کے بہاؤ کی طرف تیرنے لگا۔ کچھ گولیاں چیختی ہوئی میرے آگے پیچھے اور دائیں جانب پانی میں گریں۔ میں نے ڈبکی لگا لی اور پانی کے اندر ہی اندر بازو اور ٹانگیں چلاتا دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکلتا چلا گیا۔ پانی کے اندر آدمی زیادہ تیزی سے نہیں تیر سکتا۔ پانی کے اندر اس پر پانی کا دباؤ بھی ہوتا ہے۔ لیکن میری مجبوری تھی۔ پانی کی سطح پر میں پولیس والوں کے لئے کھلا ٹارگٹ تھا۔ پانی کے نیچے پھر بھی میرا بچاؤ ہو سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ

دوسرے کنارے کی طرف اپنے آپ کو دھکیلنے لگا۔ مجھے صرف ٹخ ٹخ کی آواز ہی پانی کے اندر آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ آواز بھی بند ہوگئی۔

میں دشمن کی فائرنگ سے محفوظ ہوچکا تھا۔

مجھے پانی کے اندر غوطہ لگاکر دیر تک رہنے کی بڑی پریکٹس تھی اور میں کافی دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ اس پریکٹس نے مجھے بڑا فائدہ دیا اور میں نے جہاں سانس لینے کے لئے سر دریا کی سطح سے باہر نکالا تو دوسرا کنارا بہت قریب آچکا تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں دریا کے اندر پانی کے بہاؤ نے بھی میری بڑی مدد کی تھی۔ میں تیرتے ہوئے کنارے پر اگے ہوئے اونچے سرکنڈوں کی اوٹ میں ہوگیا اور جب میرے پاؤں زمین کو لگنے لگے تو لمبے ڈگ بھرتا دریا سے نکل کر کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔

میں نے ابھی سانس ہی لیا تھا کہ میری نگاہ دریا کے پاٹ کی طرف گئی۔ دوسرے کنارے پر سے وہی کشتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں پولیس کی وردیوں والے سپاہی کھڑے تھے اور کشتی کو دو ملاحوں کی بجائے چار ملاح لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے چلا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے کشتی بڑی تیزی سے کنارے پر اس طرف بڑھ رہی تھی جہاں میں سرکنڈوں کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ میں فوراً اٹھا اور میں نے درختوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پولیس نے مجھے دوڑتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ مجھ پر پیچھے رائفلوں کے فائر آنے لگے۔ فائرنگ کے دھماکے ہو رہے تھے۔ اور یہ دھماکے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں رکے بغیر دوڑتا گیا اور اسی جنگل میں دوبارہ داخل ہوگیا جہاں سے نکل کر میں نے دریا پار کرنے کی کوشش کی تھی۔

میرا رخ اب شمال کی بجائے مشرق کی طرف تھا۔ شمال کی طرف سے پولیس میرے پیچھے لگی تھی۔ پولیس کی پارٹی اسی طرف آرہی تھی جس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ کیونکہ فائرنگ کی آواز میرے بالکل عقب سے آرہی تھی۔ یہ میں ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ جنگل میں زیادہ دور تک دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پولیس کی نفری یعنی سپاہی زیادہ تھے۔ وہ جنگل میں دونوں پہلوؤں کی طرف سے مجھے

ہرے میں لے سکتے تھے۔ جنگل میں چھپنے کی جگہ جھاڑیاں اور درخت ہی ہو سکتے تھے مگر لیس کی یہاں نظر پڑ سکتی تھی اور ایک بار پولیس کی نظر پڑ جانے کے بعد میں وہاں سے اگ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں کسی جھاڑی کے پیچھے یا درخت کے اوپر چھپنے کا خطرہ ول نہیں لے رہا تھا۔ دوسری مشکل یہ پیش آگئی کہ جنگل کا گھنا پن یہاں آکر ختم ہوگیا ا اور جھاڑیوں اور خشک اور چھوٹی چھوٹی گھاس والی اونچی نیچی زمین شروع ہوگئی تھی۔ رختوں کے جھنڈ کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ یہ میری موت تھی۔

میں درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف دوڑنے لگا۔ جگہ کھلی تھی۔ مجھے پیچھے سے دیکھا سکتا تھا اور مجھ پر فائر بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید پولیس ابھی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ جیسے میں درختوں کے جھنڈ میں گھسا پیچھے سے فائر کے تین دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں نے دیا کہ پولیس بھی گھنے جنگل سے نکل آئی ہے۔ میں درختوں میں آکر چھپنے کی جگہ تلاش رنے لگا۔ کیونکہ ان درختوں کے آگے بھی کھلی زمین تھی اور دور تک چلی گئی تھی۔ اگر وہاں دوڑتا ہوں تو پولیس کو صاف نظر آسکتا تھا۔ کیونکہ ابھی دن کی روشنی کافی تھی۔ رخت ایسے تھے کہ ان کے تنے اوپر تک بغیر ٹہنیوں کے چلے گئے تھے۔ کافی اوپر جاکر اخیں ایک دوسری میں پیوست ہوگئی تھیں درختوں کے ستون ایسے تنوں پر میں چڑھ یں سکتا تھا۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ یہ رائفلوں کے فائر تھے۔ یقین کریں ایک ر تو میں بھی گھبرا گیا۔ جلدی سے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے۔ رختوں کے نیچے ایک طرف مجھے اینٹوں کا ڈھیر نظر پڑا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ یہ ینٹوں کا ڈھیر نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کی بہت سی اینٹیں اکھڑ چکی تھیں۔ بوترے کے اوپر لکڑی کی ایک صلیب نصب تھی جو ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ بوترے کی دوسری طرف اونچی گھاس نے چبوترے کی دیوار کو چھپا رکھا تھا۔ میں نے لدی میں یہی فیصلہ کیا کہ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس گھاس کی دیوار کے پیچھے چھپ نا چاہئے۔ میں جلدی سے گھاس کی دیوار کے پیچھے گھس گیا۔ جیسے ہی میں دیوار کے پیچھے ھسا میں لڑھکتا ہوا نیچے ایک گڑھے میں گر گیا۔

یہ ایک اندھا گڑھا تھا۔ اوپر گھاس کی دیوار اتنی گھنی تھی کہ اندر دن کی روشنی بھی نہیں آتی تھی۔ قسمت اچھی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس وقت قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی اور مجھے عین موقع پر چھپنے کے لئے یہ گڑھا مل گیا۔ بلکہ قسمت نے مجھے اس گڑھے میں دھکیل دیا جو باہر سے مجھے کبھی نظر نہیں آسکتا تھا۔ اور جس پر پولیس کی اس وقت تک نظر نہیں پڑسکتی تھی جب تک کہ کوئی گھاس کی دیوار کو ہٹا کر نہ دیکھے۔ گھاس کی یہ دیوار چبوترے کی دوسری طرف تھی اور کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کے پیچھے ایک گڑھا ہے جہاں میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہوں۔

میں گڑھے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ میرے کان باہر لگے ہوئے تھے۔ رائفلوں کا فائر اب رک گیا تھا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی مجھے لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے۔ ان میں ایک افسر بھی تھا جو کہہ رہا تھا۔

"وہ کہیں دور نہیں گیا۔ یہیں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔ اچھی طرح سے دیکھو۔"

آدمیوں کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ سات آٹھ پولیس کے سپاہی ہیں۔ وہ وہیں درختوں کے جھنڈ میں آکر رک گئے تھے۔ ان کے ادھر سے ادھر دوڑتے قدموں کی آواز بھی آرہی تھی۔ کسی نے کہا۔

"سر وہ کسی درخت میں چھپا ہوا نہ ہو۔"

اسی افسر کی آوز آئی۔

"گوپی چند عقل سے کام لو۔ دیکھتے نہیں درخت بالکل سیدھے ہیں ان پر تو کوئی بندر بھی مشکل سے چڑھے گا۔ جھاڑیوں میں دیکھو۔"

بس یوں سمجھ لیں کہ میں ایک طرح سے سانس روکے بیٹھا تھا۔ باہر کی ایک ایک آہٹ ایک ایک آواز پر میرے کان لگے ہوئے تھے۔ یہی ڈر تھا کہ کہیں کوئی سپاہی گھاس کی دیوار کو ہٹا کر نہ دیکھ لے۔ یہ لوگ کچھ دیر تک درختوں کے جھنڈ میں مجھے تلاش کرتے رہے جب انہیں میں نہ ملا تو اسی افسر کی آواز آئی۔

"بھاگ کر آخر کہاں جائے گا۔ اراوتی ضلع کی پولیس نے جنگل کو دوسری طرف سے

ے میں لے لیا ہے۔ پولیس افسر کو قتل کر کے بھاگا ہے یہ پاکستانی جاسوس۔ ہمیں ہر ں میں اسے پکڑنا ہے۔ چلو آگے چلو۔ وہ اس جگہ نہیں ہے۔"

سپاہیوں کے بھاری جوتوں کی اور ان کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آہستہ نہ دور ہوتی گئیں۔ جب یہ آوازیں ختم ہو گئیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن باہر نہیں نکل رہا تھا۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ پولیس افسر اپنے کسی خفیہ آدمی کو وہاں نہ چھوڑ گیا ہو۔ مجھے اندھیرے گڑھے میں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو میں نے گڑھے شگاف کے آگے آئی ہوئی گھاس کو ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھا۔ اس طرف کوئی سپاہی نہیں میں دبے پاؤں اپنے آپ کو سمیٹ کر باہر آگیا۔ میں نے سر اٹھا کر چبوترے کی ری طرف دیکھا۔ وہاں بھی مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میں چبوترے کے پاس ہی بیٹھ ۔ دوسری طرف جو کھلی جگہ تھی وہاں سے پولیس کے سپاہی گزر کر آگے جو گھنا جنگل ں جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ مجھے اس طرف نہیں جانا تھا جدھر پولیس گئی تھی۔ چھ دیر وہاں بیٹھا رہا کہ پولیس جنگل میں کافی آگے نکل جائے تو میں چلوں۔ میں اٹھا۔ نے اپنا رخ شمال کی طرف کیا اور درختوں کے اونچے اونچے تنوں کی آڑ لیتا چلنے لگا۔ ی صاحب کے ساتھ دریا پار کرتے ہوئے میرے ذہن میں راستے کا تعین ہو چکا تھا۔ دریا کی طرف واپس جانا تھا تاکہ کسی گھاٹ پر سے دریا پار کروں اور آگے اس ریلوے ر پہنچوں جو برہان پور سے آگے دلی کی طرف جاتی تھی۔

دن گزرتا جا رہا تھا۔ میں رات ہونے سے پہلے پہلے دریا پار کر جانا چاہتا تھا۔ خواہ مجھے رہی دریا پر کیوں نہ کرنا پڑے۔ مجھے بھوک اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر علاقے سے میں گزر رہا تھا۔ وہاں نہ کوئی ناریل کا درخت تھا نہ کیلے کے جنگلی درخت تھے۔ جنوبی ہند کے جنگلوں میں یہ درخت عام مل جاتے ہیں مگر میں مدھیہ پردیش کے ں میں سے گزر رہا تھا۔ یہاں تاڑ کے درخت تو ضرور تھے مگر ناریل کے درخت کہیں ں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی عادت ۔ اس لئے چلا جا رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد دریا آگیا۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا

نظر آرہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں دریا کے ساتھ ساتھ چلتا گیا تو کوئی نہ کوئی گھا
ضرور آئے گا جہاں سے میں کشتی کے ذریعے دریا پار کر سکوں گا۔ اور اگر رات ہونے
اور گھاٹ نہ آیا تو میں دریا کو تیر کر پار کر لوں گا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دریا آہ
آہستہ اس طرف کا رخ اختیار کر رہا ہے جس طرف جنگل میں پولیس گئی تھی۔ کافی آ
جا کر دریا کے کنارے دلدل شروع ہو گئی۔

میں دلدل سے اپنے آپ کو بچاتا بائیں جانب ہوتا گیا۔ خدا جانے یہاں اتنی دلد
کیوں تھی اور کہاں سے آ گئی تھی۔ یہ دریا کے ڈیلٹے کا علاقہ بھی نہیں تھا۔ اس طرح
دریا سے دور ہونے لگا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں دریا کے ساتھ ساتھ
تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے دریا پر ایک نظر ڈالی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر درخت
کے جھنڈ چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ میں دوبارہ چلنے لگا۔ آگے ایک جگہ د
سے نہر نکل کر جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ اور نہر کا پاٹ بھی وہاں کافی چوڑا تھا اور پا
بہاؤ بھی کافی تیز تھا۔ میرے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں تھا کہ نہر کے ساتھ سا
چلوں اور کسی جگہ سے نہر پار کر کے دوبارہ دریا کے قریب آجاؤ۔ خطرناک بات یہ تھی
نہر کا رخ اسی جنگل کی طرف تھا جہاں پولیس میری تلاش میں گئی تھی۔ یہاں دو چار ہ
نہر میں پانی پیتے نظر آئے۔ میں قریب گیا تو وہ بدک کر بھاگ گئے۔ نہر کا پانی بڑا تیز تھ
دریا کے بہاؤ سے بھی زیادہ تیز محسوس ہو رہا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ پانی مجھے بہا
خطرے والے علاقے میں نہیں لے جائے۔ میں چل بھی رہا تھا اور ماحول کا جائزہ بھی
رہا تھا کہ کس جگہ سے نہر پار کروں۔ وہاں کوئی پل وغیرہ بھی نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ای
پہاڑی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو وہاں سے نہر دوسری طرف گھوم جاتی تھی۔ یہا
پانی کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں پہاڑی کے عقب میں آگیا۔ یہاں نیچے مجھے ای
خشک نالہ نظر آیا جو پہاڑی کے پہلو میں نہر کے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ
سکتا ہے یہ نالہ نہر کے نیچے سے دوسری طرف نکل جاتا ہو۔ میں خشک نالے میں اتر گیا
نالے کے دونوں طرف اونچی ڈھلان تھی۔ نالے میں پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ م

ں اس میں چلنا شروع کر دیا۔ نالہ نہر کے نیچے سے گزرتا محسوس ہوتا تھا۔ آگے جا کر
لے نے ایک سرنگ کی شکل اختیار کر لی۔ میرا خیال تھا کہ نہر کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں
۔ یہ سرنگ دوسری طرف نکل جائے گی مگر سرنگ آگے جا کر اس طرف کو گھوم گئی
ں طرف میں اپنا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں سرنگ میں چلتا
ا۔ سرنگ میں پیچھے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ یہ سرنگ پہاڑی کے ساتھ ساتھ دوسری
ف جاتی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو نہر کے نیچے سے تو گزر آیا ہوں اب آگے جا کر باہر
ل آؤں گا۔ آخر یہ سرنگ کہاں تک جائے گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سرنگ پہاڑی
، نیچے ایک اور سرنگ سے جا کر مل جاتی تھی جو قدرتی سرنگ تھی۔ یہ مجھے اس وقت
لوم ہوا جب میں نے چھت کی طرف دیکھا تو وہاں بڑے بڑے پتھروں کی نوکیں نیچے کو
ی ہوئی تھیں۔ دل میں خیال آیا کہ یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔ پھر سوچا کہ اتنی دور
یا ہوں۔ آخر یہ سرنگ کسی نہ کسی جگہ ضرور نکلے گی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ سرنگ کبھی
ں طرف گھوم جاتی۔ کبھی دائیں طرف مڑ جاتی۔ اندھیرا بھی ہو گیا تھا۔ میں دیوار کو پکڑ
آگے بڑھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس ایسے موقعوں پر مجھے ضرور خبردار کر دیا کرتی تھی۔
وقت بھی میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھے آگے جانے سے روکا۔ مگر میں نے اس
ف دھیان نہ دیا۔ آخر سرنگ میں آگے روشنی نظر آئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
نگ کی مصیبت ختم ہو رہی ہے۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ اصل مصیبت اب شروع ہونے والی ہے۔

میں روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ سرنگ کے دوسرے طرف والے دہانے کی
ئنی تھی۔ وہاں جا کر سرنگ ختم ہو جاتی تھی۔ میں سرنگ سے باہر نکل آیا۔ سرنگ سے
نکلتے ہی میں نے اپنا رخ بائیں جانب شمال مشرق کی طرف کر لیا۔ بادل اسی طرح
ئے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی پھیکی پھیکی تھی۔ سامنے درخت ہی درخت تھے۔ کسی
ا درخت پر کسی پرندے کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ آگے اونچی زمین آ گئی۔ میں
ا پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔ دوسری طرف درختوں کے کٹے ہوئے تنوں اور

لکڑیوں کے جگہ جگہ ڈھیر لگے تھے۔ ایک پگ ڈنڈی ان درختوں کے درمیان ہو کر جار
تھی۔ میں اس پر چل پڑا۔ کٹے ہوئے درختوں کے ڈھیر اس بات کی علامت تھے کہ یہا
قریب ہی جنگل کی کٹائی ہو رہی ہے اور وہاں مزدور لوگ موجود ہوں گے۔ میں ان سے
کر آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

کٹائی کے ذخیرے سے باہر نکلتے ہی میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو درخت کے پاس بی
سگریٹ پی رہا تھا اور لگتا تھا کہ وہ پہلے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میر
قریب آکر کہنے لگا۔

"بابو! اس طرف مت جانا۔ جنگل میں ایک آدم خور شیرنی کہیں سے آگئی ہوئی ہے
میں اسی لئے یہاں بیٹھا ہوں کہ اس طرف سے کوئی گزرے تو اسے آگے جانے
روک لوں"

اس آدمی کا لباس اور لب ولہجہ اس علاقے کے دیہاتیوں والا نہیں تھا۔ میں
بڑے اعتماد سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں ٹھیکیدار کا آدمی ہوں۔ ٹھیکیدار نے ہی مجھے یہاں بٹھایا ہے۔ کل کٹائی کا کا
شروع ہونے والا ہے۔ مزدور لوگ شہر سے آرہے ہیں۔ تم یہاں کیسے آگئے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میں اپنے شکاری دوست کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ وہ مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔"

وہ آدمی بولا۔

"تمہیں آگے نہیں جانا چاہیے۔ آگے آدم خور شیرنی کا خطرہ ہے۔ میرے ساتھ
آؤ۔ میں تمہیں جنگل کا دوسرا راستہ دکھاتا ہوں"

میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہو۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ
مجھے دوسری طرف لے گیا۔ ادھر بڑے گنجان درخت تھے۔ کہنے لگا۔

"ان درختوں کے پیچھے تمہیں کچی سڑک ملے گی وہ تمہیں گھاٹ پر پہنچا دے گی"

میں بڑے اطمینان کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم گنجان درختوں میں
گئے۔ مجھے درختوں کی دوسری طرف کچھ آدمیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں
نے یہی خیال کیا کہ درختوں کی کٹائی کرنے والے آدمی ہوں گے۔ جیسے ہی میں اس آدمی
کے ساتھ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آیا تو میرے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی اور
ایک لمحے کے لئے میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے پولیس کی گاڑی کھڑی تھی اور
ں بارہ پولیس کے سپاہی رائفلیں لئے زمین پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس آدمی نے
تے ہی کہا۔

"انسپکٹر صاحب اسے میں یہاں تک تو لے آیا ہوں۔ اب تم دیکھ لو کہ یہ وہی آدمی
ہے یا کوئی اور ہے۔"

میں اس قدر حیرت زدہ ہو گیا تھا کہ بھاگنے کا خیال آیا بھی لیکن زمین نے جیسے میرے
ں جکڑ لئے تھے۔ جب بھاگنے لگا تو اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ اور پولیس کے
ہیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ دو کانسٹیبلوں نے اپنی رائفلیں میری طرف سیدھی کر لی تھیں
ان میں ایک پولیس انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے بھی پستول نکال لیا تھا۔ وہ دوڑ کر میرے
ں آیا مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ملکی رام تم نے بڑا کام کیا ہے۔ یہ وہی پاکستانی جاسوس ہے جو ہمارے آفیسر کو قتل
کے بھاگا تھا۔ مجھے اس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ اسے زمین پر لٹا دو۔ لٹا دو۔ یہ بڑا
رناک کمانڈو ہے"

مجھے پہلے ہی سے چار سپاہیوں نے اس طرح بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا کہ میں نے
پنے بازو نہیں ہلا سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے منہ کے بل زمین پر گرا دیا اور اسی وقت میرے
پیچھے کر کے مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع
ل سکا۔ دراصل اس کی خاص وجہ میرا حیرت زدہ ہونا تھا۔ جب میں مٹی کا اونچا بند اتر
نیچے آیا تھا تو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے سامنے مسلح پولیس کی بھاری

تعداد موجود ہو گی۔ جو آدمی مجھے میرا راہ نما بن کر مجھے وہاں تک لایا تھا وہ پولیس ہی کا
آدمی تھا اور اسے پیچھے اس لئے بٹھایا ہوا تھا کہ وہ آتے جاتے آدمیوں پر نگاہ رکھے اور
کوئی قمیض پتلون والا کھلتی رنگت والا نوجوان وہاں سے گزرے تو اسے اپنے ساتھ پولیس
کے پاس لے آئے۔ میں اچانک اپنے سامنے پولیس کی پوری گارڈ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو
کر رہ گیا تھا۔ اور پولیس کو مجھے قابو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

ایسا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اب میرے ساتھ ایسا ہو گیا تھا اور میں پھنس گیا تھا۔ کچھ مجھے نہر کے نیچے سے
گزرنے والے خشک نالے کی سرنگ نے مروا دیا تھا۔ اس میں گزرتے ہوئے میں جنگل
کے جنوب کی جانب پولیس پارٹی کے قریب آگیا تھا۔ پولیس سارا جنگل چھاننے کے بعد
وہاں بیٹھی آرام کر رہی تھی کہ شکار خود بخود ان کے جال میں آکر پھنس گیا۔ پولیس نے
مجھے پکڑ کر گاڑی میں ڈالا جو درختوں کے پیچھے ایک جگہ کھڑی تھی اور مجھے لے کر کسی
نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

جس گاڑی میں مجھے ٹھونسا گیا تھا اس کی صرف سامنے اور پیچھے والی کھڑکی ہی کھلی
تھی۔ ان میں بھی سلاخیں لگی ہوئی تھیں ۔ یہ قیدی لے جانے والی گاڑی تھی۔ پولیس
مجھے گرفتار کرنے کا سارا بندوبست کر کے آئی تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ پولیس کی گاڑی
ایک دریا کے پل پر سے گزری تھی۔ یہ وہی دریا تھا جس کو میں پار کرنے والا تھا مگر میری
قسمت میں ایسا کرنا نہیں لکھا تھا۔ اب میں نے اپنے انجام پر پچھتانا اور افسوس کرنا چھوڑ
دیا تھا اور اپنے آپ کو پولیس ٹارچر اور پولیس کی قید سے فرار ہونے کے لئے تیار کرنا
شروع کر دیا تھا۔ اتنا میں جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھے نہ تو گولی ماریں گے نہ پھانسی پر لٹکائیں
گے۔ کم از کم اس وقت تک مجھے ہلاک نہیں کیا جائے گا اور زندہ رکھا جائے گا جب تک
کہ میں ان کی خواہش کے مطابق انہیں اپنے ساتھی کشمیری حریت پسندوں اور کشمیری
کمانڈوز کے بارے میں نہیں بتا دیتا کہ وہ بھارت میں کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں اور جو میں
انہیں کبھی نہیں بتا سکتا تھا۔ مجھے جسمانی اذیتیں انہوں نے بہت دی تھیں اور اب بھی

ے والے تھے لیکن یہ امر باعث اطمینان تھا کہ میں موقع ملنے پر فرار ہونے کے لئے
ہ رہوں گا۔ اگر انہیں مجھے مارنا ہوتا تو اب تک مار چکے ہوتے مگر انہیں میری
ردست سرگرمیوں اور ہیبت ناک کمانڈو ایکشن سے معلوم ہو چکا تھا کہ میں کوئی معمولی
نڈو نہیں ہوں بلکہ وہ تو مجھے پاکستانی جاسوس اور پاکستانی کمانڈو سمجھ رہے تھے اور ہر
ت میں میرے ساتھیوں کے بارے میں مجھ سے معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

دریا کے پار جاتے ہی میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی۔ اب مجھے کچھ نظر نہیں
ا تھا۔ پولیس کی گاڑی کافی دیر تک چلتی رہی۔ سیدھی سڑک پر سے بھی گزری اور
وں کے موڑ بھی کاٹے۔ ٹریفک کی آوازوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم کسی شہر
آگئے ہیں ۔ یہ شہر برہان پور ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہی ایک شہر اس جنگل کے قریب
ع تھا۔ گاڑی ایک جگہ گھومی اور پھر رک گئی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔
ازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کسی دفتر کا احاطہ ہے۔ مجھے گاڑی سے اتار کر چلاتے
ئے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ یہاں میری پٹی کھول دی۔ پولیس سٹیشن کا
ہ لگتا ہے دو پولیس آفیسر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ اب مجھ
پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ ان کی گفتگو سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے بارے میں
ب کچھ جانتے ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں پیچھے ایک پولیس انسپکٹر کو قتل کر
فرار ہوا تھا۔

سوال وہی تھے کہ میں اپنے ساتھیوں کا بتاؤں کہ وہ بھارت میں کہاں کہاں روپوش
۔ ان کے خفیہ اڈے کہاں کہاں پر ہیں ۔ میں نے چپ سادھ لی۔ وہاں سے مجھے
رے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں مجھ پر ٹارچر شروع ہو گیا۔ میں زیادہ تفصیل میں
ں جاؤں گا۔ اب تک آپ بھی جان گئے ہوں گے کہ بھارت میں جب کوئی کمانڈو یا
ت پسند مجاہد پکڑا جاتا ہے تو اس کو کس کس طرح اذیتیں دی جاتی ہیں ۔ اکثر مجاہد ان
وں کی وجہ سے شہید ہو جاتے ہیں مگر کچھ نہیں بتاتے۔ میں سخت جان تھا۔ اور مجھے
یں برداشت کرنے کی تربیت بھی ملی ہوئی تھی۔ میں ہر قسم کا ٹارچر برداشت کرتا رہا اور

زبان نہ کھولی۔ وہ برہان پور شہر ہی تھا۔ وہاں سے مجھے پولیس کی قیدیوں والی بند گاڑی میں بٹھا کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے شہر لے جایا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شمال کی جانب نرسنگ پور شہر تھا۔ یہاں خفیہ پولیس کا ایک بدنام زمانہ ٹارچر سیل تھا۔ مجھے اس سیل میں تین دن تک طرح طرح کی وحشیانہ اذیتیں دی گئیں۔ مجھے نیم بے ہوشی کے انجکشن بھی لگائے گئے لیکن میں نے اپنے ساتھی حریت پسندوں اور بھارت کے مختلف شہروں میں وطن کی آزادی کے لئے زیر زمین کام کرنے والے کشمیری مجاہدوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتایا۔

اگر آپ بھارت کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو وہاں کے صوبہ مدھیہ پردیش کے شمال مشرق میں نرسنگ پور لکھا ہوا نظر آئے گا۔ یہ شہر بھارت کے وسطی علاقے میں واقع ہے۔ اس کے تھوڑا اوپر کی طرف جبل پور کا شہر ہے۔ یہ تفصیل میں آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ میں بھارت کے کس حصے میں تھا جہاں سے مجھے واپس مقبوضہ کشمیر جانا تھا۔ پولیس نے انٹیروگیشن کے دوران مجھ سے میری نقدی اور زہریلی بال پوائنٹ پنسل بھی چھین لی تھی۔ اب میں بالکل نہتا ہو گیا تھا۔ وحشیانہ جسمانی اذیتیں سہہ سہہ کر میری جسمانی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جب پولیس کو یقین ہو گیا کہ میں مر جاؤں گا مگر انہیں اپنے حریت پسند ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا تو مجھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

یہ بالکل پھانسی کی کوٹھڑی کی طرح تھی۔ نہ کوئی روشندان تھا نہ اندر روشنی تھی۔ لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا جہاں ایک مسلح سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ تین دن میں اس پھانسی کی کوٹھڑی میں قید میں پڑا رہا۔ اس دوران مجھے بالکل ٹارچر نہ کیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ خفیہ پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کے درمیان میرے بارے میں کسی آخری فیصلے کے سلسلے میں گفت و شنید ہو رہی ہے۔ آخر انہوں نے میرے بارے میں فیصلہ کر لیا۔ چوتھے دن پولیس کمشنر دو تین پولیس افسروں کے ساتھ میری کوٹھڑی میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ میں ٹاٹ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھ پر سخت نقاہت طاری تھی۔ پولیس

شنر نے اپنا تعارف کروایا اور کہا۔

”میں اس علاقے کا پولیس کمشنر ہوں۔ پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس نے تمہارے ے میں جو فیصلہ کیا ہے میں اس فیصلے سے تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں۔ لیکن فیصلہ نے سے پہلے میں تمہیں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم اپنے ساتھی کمانڈوز کے خفیہ انوں کے بارے میں ہمیں صحیح بتا دو کہ وہ کہاں ہیں۔ انڈیا کے کس کس شہر میں یہ کام کر رہے ہیں تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم جہاں کہو گے میں خود پولیس کی ظت میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا اور یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا نام کسی پر بھی ظاہر ں کیا جائے گا۔“

اتنا کہہ کر پولیس کمشنر جو نوجوان سا آدمی تھا اور اسی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا چپ گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میرا دل جواب دینے کو نہیں چاہتا تھا۔ واقعی مجھ پر سخت زوری طاری تھی مگر اسے جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان ھرتے ہوئے کہا۔

”میں اپنے کسی ایک ساتھی کا بھی نام اور خفیہ ٹھکانہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ جو ہے میرے ساتھ سلوک کریں۔“

پولیس کمشنر نے ایک بار پھر مجھ سے پہلے والا سوال کیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ تب نے فائل کھولی اور صرف اتنا لکھا ہوا پڑھا۔

”تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے“

فائل بند کی اور اپنے ساتھی پولیس افسروں کے ساتھ کوٹھڑی سے نکل گیا۔ اسی ت مجھے ہتھکڑی لگا دی گئی۔

پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ بھی ایک ڈرامہ کیا جا رہا ہے اور اس کا مقصد محض یہی ہے میں موت کے ڈر سے ہتھیار ڈال دوں گا۔ لیکن جب کافی دیر تک میری کوٹھڑی میں نہ آیا۔ اور اس کے بعد تین پولیس کے سپاہی آ کر مجھے ہتھکڑی سمیت باہر لے گئے تو مجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی بھی نہیں باندھی گئی تھی۔ رات کا

وقت تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ مجھے قیدیوں والی گاڑی میں چا
سپاہیوں کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ ہتھکڑی میرے ہاتھ پیچھے کر کے لگائی گئی تھی۔ پولیس ک
مسلح گارڈ میرے اردگرد بیٹھی تھی۔ میں پوری طرح سے ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔

گاڑی کسی طرف روانہ ہو گئی۔

قیدیوں والی گاڑی چاروں طرف سے بند تھی۔

چھت کے پاس دو چار سلاخیں لگی تھیں جن میں سے شہر کی روشنیوں کی ایک جھلک نظر آجاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ یہ مجھے کسی دوسرے شہر کے ٹارچر سیل میں مجھ پر وحشیانہ اذیت کا کوئی نیا طریقہ آزمانے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ مجھے مارنے کے لئے لے جا رہے ہیں اور جنگل میں کسی جگہ مجھے شوٹ کر کے میری لاش کسی گڑھے میں دبا دیں گے یا جنگلی درندوں کے کھانے کے لئے وہیں چھوڑ دیں گے۔

گاڑی شہر سے باہر نکل گئی تھی۔ شہر کی عمارتوں اور سڑک کنارے کی روشنیوں کی جو جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی اب غائب ہو گئی تھی۔ گاڑی ناہموار راستے پر چل رہی تھی۔ جب گاڑی کو سفر کرتے گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مزید انٹیروگیشن اور مجھ پر ٹارچر کا کوئی جدید طریقہ آزمانے کے لئے مجھے کسی دوسرے شہر لے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اگر انہیں مجھے مارنا ہوتا تو راستے میں کسی بھی جگہ مجھے گولی مار سکتے تھے۔ مجھے زندگی کی تھوڑی سی امید ہو گئی اور میں فرار کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔ پولیس کی مسلح گارڈ نے ویگن کے اندر مجھے اس طرح اپنے گھیراؤں میں لے رکھا تھا کہ وہاں فرار کی کوشش ناممکن تھی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دوسرے شہر کے ٹارچر سیل پہنچنے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔

گاڑی کی سپیڈ ہلکی ہونے لگی۔

پھر ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ مجھے نیچے اتار گیا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان پر بادل غائب ہو چکے ہیں۔ ایک طرف سے چاند نکل آیا ہے اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جنگل کا علاقہ تھا۔ اردگرد بہت درخت تھے۔ پولیس کی اور کوئی گاڑی ساتھ نہیں آئی تھی۔ پولیس کی نفری سات آٹھ سپاہیوں کی تھی۔ سارے مسلح تھے اور سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ میں نے دل میں اللہ سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔ ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا کہ شاید ماضی کے زمانے سے سوسن میری مدد کو وہاں پہنچ جائے۔ لیکن ایسی امید بہت کم تھی۔ سپاہی مجھے کھینچتے ہوئے ایک طرف کو چل پڑے۔ دو سپاہیوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ دو سپاہی رائفلیں اٹھائے آگے آگے چل رہے تھے۔ چار سپاہی رائفلیں تانے میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ ابھی کسی درخت کے ساتھ باندھ کر مجھے شوٹ کر دیں۔ شاید وہ کسی کھلی جگہ کی تلاش میں تھے۔ چاندنی اتنی زیادہ تھی کہ ایک ایک درخت صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ چاند کی چودھویں یا پندرھویں تاریخ تھی۔

چلتے چلتے آگے ایک اونچی جگہ آ گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے بند باندھا ہوا ہے۔ مجھے کھینچتے ہوئے بند کے اوپر چڑھایا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ریلوے لائن تھی۔ میں ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ میرے پیچھے جو سپاہی تھے انہوں نے مجھے دھکا دے کر ریل کی پٹڑی پر گرایا اور میری دونوں ٹانگوں کے گرد رسی لپیٹ کر باندھ دی۔

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں نے اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت کو جمع کیا اور زور سے اچھل کر سامنے والے سپاہی کو ٹکر ماری۔ وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی گر پڑا۔ ایک تو میرے ہاتھ ہتھکڑی میں پیچھے جکڑے ہوئے تھے۔ دوسرے میرے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے تھے۔ چھ سات سپاہی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے ریلوے لائن پر گرا دیا تھا۔ میں نے ان کی گرفت سے نکلنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر تارچر سہہ کر میرے بدن کی آدھی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے چھ سات آدمیوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں بے بس ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ریلوے لائن کے ساتھ باندھ دیا۔ ریل کی پٹڑی

کے ساتھ ایک طرف میرے دونوں پاؤں جکڑ دیئے اور دوسری طرف میرا سر ریل کی پٹڑی پر رکھ کر میری گردن رسی سے لائن کے ساتھ اس طرح باندھ دی کہ گردن ہلاتے ہوئے میرا سانس رکنے لگتا تھا۔ مجھے ریلوے لائن کے ساتھ باندھ کر سپاہی ریل کی پٹڑی سے نیچے اتر گئے۔ میرا سر ریلوے لائن پر تھا اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں وہ مجھے درختوں میں اس جگہ واپس جاتے نظر آئے جہاں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے بعد وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

میری موت بظاہر یقینی تھی۔

اب خدا ہی میری زندگی بچا سکتا تھا۔ پولیس نے مجھے ہلاک کرنے کے لئے بڑا بھیانک طریقہ اختیار کیا تھا۔ کسی نہ کسی جانب سے ریل گاڑی آئے گی اور میرے جسم کے پرخچے اڑاتی ہوئی گزر جائے گی اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ پولیس کی گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس گارڈ وہیں درختوں میں بیٹھی میری موت کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے جانا چاہتی تھی کہ ٹرین نے میرے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں اور میں مر چکا ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت میرے ذہن کی کیا حالت تھی۔ بس دماغ کے پردے پر فلم چلنے لگی تھی۔ بچپن کے جوانی کے تمام سین سامنے آ رہے تھے۔ دوسروں کے ساتھ کی ہوئی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میں نے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی بخشش کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ ابھی تک کسی طرف سے ریلوے انجن کی سیٹی یا اس کی چھک چھک کی دور سے آتی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہ آواز اب میرے واسطے موت کی آواز بن گئی تھی۔

آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ایک طرف پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ گہری خاموشی طاری تھی۔ میں نے ایک دو بار اپنے پاؤں رسی میں سے چھڑانے کی کوشش کی مگر میرے پاؤں پولیس نے اس طرح ریل کی پٹڑی سے باندھے ہوئے تھے کہ میں صرف اپنے پاؤں کے پنجے ہی ہلا سکتا تھا۔ یہی حال میری گردن کا تھا۔ رسی میری گردن میں ڈال

کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ تین چار بل دے کر اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ دائیں بائیں گردن ہلانے سے مجھے اپنا سانس رکتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور ہتھکڑی میری کمر میں بری طرح چبھ رہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے سانس لینے پر مجبور تھا۔ کبھی آسمان کو دیکھتا اور کبھی آنکھیں بند کر لیتا۔

اتنے میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔

یہ آواز ریل گاڑی کی آواز نہیں تھی۔ یہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز تھی۔ یہ آواز میری بائیں جانب سے آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ گھوڑے ہلکی رفتار سے چلتے ریلوے لائن کی پگ ڈنڈی پر میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے گردن بائیں طرف موڑ کر دیکھا۔ چاندنی رات میں مجھے کچھ گھوڑ سواروں کے ہیولے دکھائی دیئے جو گھوڑوں پر سوار اوپر نیچے ہوتے چلے آ رہے تھے۔ یہ گھوڑ سوار ذرا قریب آئے تو معلوم ہوا کہ گھوڑ سواروں کا پورا ایک گروہ ہے۔ سب سے آگے آگے جو گھوڑ سوار چلا آ رہا تھا اس نے کھلی ہوئی چاندنی میں مجھے دیکھا تو گھوڑے کو فوراً روکا اور اونچی آواز میں کہا۔

"لکھو دادا! ادھر آ کر دیکھو یہ کیا معاملہ ہے۔"

ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا آگے آیا اور ریلوے لائن پر جہاں میں بندھا ہوا تھا وہاں آ کر رک گیا۔ اس نے تھوڑا آگے کو جھک کر میری طرف دیکھا اور رعب سے پوچھا۔

"کیوں بے کون ہے تو؟"

میں نے اسے خدائی مدد سمجھا اور کہا۔

"دادا! مجھے پولیس گاڑی تلے کچل کر مارنا چاہتی ہے۔ مجھے پولیس نے باندھا ہے۔"

"ابے پولیس تو یہاں کہیں نہیں دکھائی دیتی"

ان لوگوں کی چال ڈھال اور لب و لہجے سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور ڈاکو لوگ پولیس کے جانی دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے فوراً کہا۔

"دادا! پولیس وہاں درختوں کے نیچے بیٹھی میری موت کا انتظار کر رہی ہے۔"

یہ لکھو دادا ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سردار تھا۔ اس نے پولیس کو گالی دے کر بندوق بھالی اور جن درختوں کی طرف میں نے بتایا تھا اس طرف منہ کر کے اندھا دھند دو فائر ردیئے۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ اس طرف سے بھی رائفل کا فائر آنے لگا۔ لکھو دادا ردوسرے ڈاکو گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر پڑے اور لائن کے پاس بیٹھ کر جدھر ے پولیس کا فائر آ رہا تھا اس طرف گولیاں چلانے لگے۔ میں نے کہا۔

"دادا! بھگوان کے لئے مجھے کھولو۔ گاڑی آ گئی تو میں مارا جاؤں گا۔"

لکھو دادا میرے قریب ہی زمین پر اوندھا لیٹا درختوں کی طرف فائر کر رہا تھا۔ کہنے ا۔

"ابے چھلیا۔ اس سسرے کو کھول دے"

ڈاکو ریل کی پٹڑی کے ساتھ لیٹے درختوں کی طرف فائرنگ بھی کر رہے تھے اور یک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایک ڈاکو بالکل میری گردن کے ریب ریلوے لائن کو آڑ بنائے' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے سر کو آڑ بنائے بندوق ہلاتے مسلسل دھماکے کر رہا تھا۔ اس نے فوراً بندوق ایک طرف رکھی اور میری رسیاں کھولنے لگا۔ جب میری رسیاں کھل گئیں اور میں اٹھ بیٹھا تو وہ میری ہتھکڑی دیکھ کر بولا۔

"دادا! اس کو ہتھکڑی بھی لگی ہے۔ کھول دوں یا رہنے دوں؟"

ان کا سردار جس کو یہ لکھو دادا کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ذرا آگے ریل کی پٹڑی کے پاس لیٹا گولیاں چلا رہا تھا۔ فائرنگ کے دھماکوں میں اس نے چلا کر کہا۔ ہتھکڑی رہنے دے بے چھلیا ابھی"

اس ڈاکو نے جس کا نام چھلیا تھا اور جس نے میری رسیاں کھولی تھیں مجھے بازو سے پکڑ کر وہیں لائن کے قریب اپنے پاس کھینچ کر بٹھا لیا اور بولا۔

"یہاں بیٹھ جا بے۔ نہیں تو مارا جائے گا"

میں وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ پولیس کے آٹھ سپاہی جو مجھے ریلوے لائن پر باندھنے کے بعد خود درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ٹرین کے

نیچے میرے نکلے جانے کا انتظار کر رہے تھے ڈاکوؤں کی فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دے
رہے تھے مگر ڈاکوؤں کی تعداد کافی تھی جبکہ پولیس کے سپاہی محدود میگزین ساتھ لائے
تھے۔ بہت جلد ان کی جانب سے فائرنگ سست پڑ گئی۔ ڈاکوؤں کی طرف سے مسلسل
فائرنگ ہو رہی تھی۔ پولیس کی طرف سے اکا دکا فائر آرہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس
کے پاس اسلحہ ختم ہو رہا ہے۔

اس علاقے میں اکثر ڈاکوؤں کے گروہ لوٹ مار میں مصروف رہتے تھے۔ ان ڈاکوؤں
کا پولیس سے مقابلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ پولیس ان ڈاکوؤں سے گھبراتی تھی۔ پھولن دیوی،
بھوپت ڈاکو اور سلطانہ ڈاکوؤں کا نام آپ نے بھی ضرور سنا ہو گا۔ ان مشہور زمانہ بلکہ
بدنام زمانہ ڈاکوؤں کا تعلق بھی انہی جنگلوں سے کچھ نہ کچھ ضرور رہا تھا۔ اگرچہ بھوپت ڈاکو
وہاں سے کچھ فاصلے پر مغرب کی جانب کوہ ست پڑا کی پہاڑیوں اور ضلع گجرات کاٹھیاواڑ
کے علاقے میں زیادہ سرگرم کار رہا تھا۔ مدھیہ پردیش کے گھنے اور دشوار گزار جنگل
ڈاکوؤں کو اپنے اندر چھپا لیتے تھے اور پولیس ان کی تلاش میں ان جنگلوں میں جاتے
ہوئے گھبرایا کرتی تھی۔ تجربہ کار ڈاکو گھات لگا کر پولیس پر حملہ کرتے اور انہیں بھون کر
رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ جب لکھو ڈاکو نے فائرنگ رکوا کر اونچی آواز میں پولیس کو للکارا۔

"ابے کیوں چند روپلی کے لئے لکھو کے ہاتھوں جان گنوا رہے ہو بھاگ جاؤ سسرو۔
میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔"

تو پولیس کی طرف سے فائرنگ رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے اسٹارٹ
ہونے کی آواز سنائی دی۔ لکھو ڈاکو نے ہنس کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اب ان سالوں کا پیچھا نہ کرنا۔ سسروں کو نکل جانے دو۔"

میں چھلیا ڈاکو کے پاس نیچے ہو کر بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر اسی طرح ہتھکڑی میں
جکڑے ہوئے تھے۔ میں اگر چاہتا اور یہ بات ضروری ہوتی تو میں وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔
صرف ریلوے لائن کے پیچھے جھاڑیوں میں چھلانگ لگانے کی ہی ضرورت تھی مگر میں ان
ڈاکوؤں کے درمیان آکر بہت خوش ہوا تھا۔ ڈاکوؤں کا مجھے پہلے بھی دو ایک بار تجربہ ہو چکا

تھا۔ ایک تو یہ لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے تھے دوسرے ان کے ساتھ رہ کر میں پولیس
سے محفوظ رہ سکتا تھا اور اس دوران مناسب موقع دیکھ کر میں دلی کی طرف نکل سکتا تھا۔

جب گاڑی کے انجن کی آواز ذرا دور چلی گئی تو ڈاکو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے
گھوڑے ایسے سدھائے ہوئے تھے کہ جیسے ہی فائرنگ کرتے ہوئے ڈاکو گھوڑوں سے اتر
کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ لیٹے گھوڑے بھی ادھر ادھر جھاڑیوں درختوں میں چلے گئے۔

جب فائرنگ رک گئی تو ڈاکوؤں نے منہ سے سیٹیاں بجا کر گھوڑوں کو واپس بلا لیا۔

ان کا سردار لکھو دادا یا لکھو ڈاکو ہاتھ میں بندوق لئے میرے پاس آکر بولا۔

"کیوں بے! کون ہے تو؟"

ڈاکوؤں کا سردار مجھے پورے چاند کی روشنی میں سامنے کھڑا صاف نظر آرہا تھا۔ اس
کا شہد کی مکھیوں کی چھتے ایسی گھنی اور چہرے کے ساتھ چمٹی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں تھیں۔
سر پر بھاری پگڑ بندھا ہوا تھا۔ کاندھے کے ساتھ میگزین کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ واسکٹ
رنگ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چھلیا ڈاکو نے مجھے بازو سے پکڑا ہوا تھا۔
میں نے کہا۔

"دادا! میرا نام بھیکم داس ہے میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ وہاں چھوٹی موٹی
چوریاں کیا کرتا تھا۔ ایک بار پکڑا گیا۔ مجھے قید ہو گئی۔ جیل توڑ کر بھاگا اور بھوساول برہان
پور کی طرف آگیا یہاں ایک چور میرے ساتھ مل گیا۔ ہم ایک سال تک ڈکیتیاں کرتے
رہے۔ تین دن پہلے ہم نے شہر کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا تو پولیس آگئی۔ ہم نے مقابلہ
کیا مگر ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا۔ میرا ساتھی بھاگ گیا۔ میں پکڑا گیا۔ پولیس نے مجھے بڑا مارا۔
میں نے پولیس انسپکٹر کو گالی دی تو اس نے مجھے ٹھڈوں سے مار مار کر میرا برا حال کر دیا۔"

لکھو ڈاکو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ارے تو نے پولیس انسپکٹر کو گالی دی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں دادا!"

"کیا پنجابی میں گالی دی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں دادا"

"وہ بڑا خوش ہوا۔ بولا۔

"ارے بھیکم داس ہمیں وہ پنجابی کی گالی سناؤ۔ پنجابی کی گالیاں ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ بولا۔ کون سی گالی دی تھی تم نے پولیس انسپکٹر کو؟"

میں نے پولیس انسپکٹر کا فرضی نام لے کر اسے پنجابی کی ایک بڑی اعلیٰ درجے کی گالی دی۔ لکھو ڈاکو کے ساتھ سبھی ڈاکو قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

"ارے پھر کیا ہوا رے؟"

میں نے کہا۔

"پولیس انسپکٹر نے گالی سن کر حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور ریلوے لائن کے ساتھ باندھ کر اس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دو۔ جب تک گاڑی اسے کچل کر گزر نہ جائے وہاں سے مت ہلنا۔ بس دادا! پولیس مجھے پکڑ کر یہاں لے آئی۔ انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ پھر یہاں ریل کی پٹڑی کے ساتھ باندھ دیا اور خود درختوں کے نیچے میری موت کا تماشہ دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ دادا! بھگوان کی کرپا ہوئی کہ تم آ گئے۔ نہیں تو آج میری موت آ گئی تھی۔"

لکھو ڈاکو نے چھلیا ڈاکو کو حکم دیا۔

"ابے چھلیا رے۔ چابی لگا کر بھیکم کی ہتھکڑی کھول دے۔ آج سے یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

ان لوگوں کے پاس پولیس ہتھکڑی کی چابیوں کا موجود ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس قسم کی چابیوں کی ان ڈاکوؤں کو کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ چھلیا نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک چابی نکال کر لگائی اور میری ہتھکڑی کھول کر پھینک دی۔ لکھو ڈاکو نے بندوق والا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے ڈاکو ساتھیوں سے کہا۔

"چلو اب اپنے کام پر چلتے ہیں۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"چل بھیکم داس! تو بھی چھلیا کے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ جا۔"

چھلیا نے مجھے اپنی گھوڑی کے پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور یہ سارے ڈاکو جن کی د دس بارہ سے کم نہیں ہو گی ریل کی پٹڑی کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے ایک طرف پڑے۔ اتنے میں پیچھے سے ریل گاڑی کی آواز سنائی دی۔ گاڑی کے انجن نے سیٹی ڈاکو ریل کی پٹڑی سے اتر کر نیچے جھاڑیوں میں گھوڑے دوڑانے لگے۔

میں چھلیا ڈاکو کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ٹرین انجن کی روشنی قریب آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ریل گاڑی شور مچاتی زمین کو ہوئی آگے کو گزر گئی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ وہ ریل گاڑی تھی کہ ڈاکو نہ آتے تو اس نے میرے جسم کے پرخچے اڑا دیئے ہوتے۔ اللہ کی شان ہے۔ کو اللہ میاں نے بچانا ہوتا ہے اس کو بچانے کے سو وسیلے پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے تو برہان پولیس نے ریل کے نیچے کچلنے کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔

ڈاکوؤں کا یہ گروہ چاندنی رات میں گھوڑے دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ سے نے ریلوے لائن پار کی اور دوسری طرف آ کر اپنا رخ مشرق کی طرف کر لیا۔ اب ہان پور کی مخالف سمت کو جا رہے تھے۔ یہ بات میرے لئے بڑی خوش آئند تھی۔ نکھری ہوئی تھی۔ دور سے جنگل کے گھنے درختوں کی ایک دیوار سی قریب آ رہی کچھ دیر کے بعد ہم اس جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگ پیچھے کسی گاؤں میں ڈاکہ کر آئے تھے۔ میں نے دو تین ڈاکوؤں کے پاس دو تین بڑی بڑی گٹھڑیاں اور تھیلے تھے جو انہوں نے گھوڑوں کے آگے پیچھے لٹکا رکھے تھے۔ ان میں لوٹا ہوا مال ہی ہو تھا۔ ورنہ یہ ڈاکو کسی شاپنگ سنٹر میں شاپنگ کر کے نہیں آ رہے تھے۔ جنگل میں ہونے کے بعد گھوڑے آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ یہاں چاندنی درختوں کی شاخوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ راستے میں ایک چشمہ آ گیا۔ یہاں گھوڑوں سے اتر کر

ڈاکوؤں نے منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا۔ گھوڑوں کو بھی پانی پلایا۔ چھلیا ڈاکو مجھے کہنے لگا۔

"بھیکم جی! اب تم شہروں کو بھول جاؤ ہمارے ساتھ رہو۔ عیش کرو گے"

میں نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چھلیا بھیا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں"

چشمے کے پانی کی چھوٹی سی آبشار پتھروں میں سے نیچے گر رہی تھی۔ چاندنی مر
آبشار خواب ایسا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ڈاکو آگے ب
بڑے۔ ان کی خفیہ کمیں گاہ جنگل میں کافی آگے جا کر ایک دشوار گزار جگہ پر تھی۔ ی
ان لوگوں نے ایک جگہ درختوں کے نیچے تین چار جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ بلکہ لگ
کہ یہ جھونپڑے پہلے ہی سے بنے ہوئے تھے ان ڈاکوؤں نے ان پر قبضہ کر لیا
جھونپڑوں کے باہر کہیں کہیں مٹی کے تیل کی لالٹینیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی
مدھم تھی۔ کچھ ڈاکو وہاں پہلے سے موجود تھے اور آگ پر گوشت بھون رہے تھے۔ گو
کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ لکھو ڈاکو نے جو اس گروہ کا سردار تھا مال کی گٹھڑ
اور تھیلے ایک جھونپڑی میں رکھوا دیئے اور کہا۔

"مال صبح کھولا جائے گا۔ ابھی کچھ کھا پی کر سو جاؤ۔"

میں نے چھلیا کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت کھایا۔ یہ ہرن کا گوشت
اس کے بعد ہم ایک جھونپڑے کے باہر آگ کے الاؤ سے تھوڑا ہٹ کر وہیں گھا
چادریں بچھا کر سو گئے۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ اونچے اونچے درختوں میں سے روشنی آبشار کی
طرح نیچے گر رہی تھی۔ ڈاکو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ قریب ہی ایک ندی
تھی۔ میں نے وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ کر بجھے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھ
ایک بڑے دیگچے پر چاول پک رہے تھے۔ سردار لکھو دادا وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔
منہ پونچھتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی بندوق کو صاف کرنے لگا۔

"کہو بھیکم داس! رات کیسے گزری؟"

میں نے کہا۔

"میں تو جی بھر کر سویا دادا"

چھلیا بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نے کس کس شہر میں ڈاکے ڈالے تھے۔ کبھی کوئی عورت بھی اٹھا کر
تھے؟"

میں نے یونہی ڈاکے اور چوریوں کے من گھڑت ایک دو قصے اسے سنا دیئے اور کہا۔

"میں نے کبھی کسی عورت کو نہیں اٹھایا"

چھلیا ہنس پڑا۔

"بھیکم داس! ابھی تم چور ہو۔ ڈاکو نہیں بنے۔ ارے عورت کو اٹھاؤ گے تو پورے
ن جاؤ گے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کبھی اس نے کسی عورت کو اغوا کیا ہے۔ اس نے
ی کی نالی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کئی دفعہ اٹھایا ہے۔ مگر میں دو چار دن اسے اپنے پاس رکھ کر جنگل میں کسی جگہ
آتا تھا۔ ہمارا لکھو دادا تو عورتوں کا بڑا شوقین ہے۔ ہمیشہ ایک عورت اپنے پاس رکھتا

ں نے بات کا موضوع بدل دیا اور چھلیا سے پوچھا۔

"دادا! یہ علاقہ کون سا ہے؟ لگتا ہے ہم نرسنگ پور سے بہت دور آ گئے ہیں"

چھلیا نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ کش لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ارے ہم نرسنگ پور بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہ تو منڈالا رینج کے جنگل ہیں۔
ں پور ہے اور اوپر کی طرف چلے جائیں تو گھوڑوں پر ایک دن ایک رات کے سفر
جبل پور کا شہر آ جائے گا۔"

ں ڈاکو نے مجھے علاقے کا پورا حدود اربعہ بتا دیا تھا۔ مجھے جبل پور کے بارے میں
لم کرنا تھا کہ شہر وہاں سے کس طرف ہے اور یہ مجھے چھلیا ڈاکو نے بتا دیا تھا۔ اب

میرا مشن وہاں سے جبل پور کی طرف فرار ہونا تھا۔ ظاہر ہے میں ان ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مجھے دو فائدے حاصل ہو گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ میری جان بچ گئی تھی۔ دوسرے میں نرسنگ پور اور برہان پور کی پولیس کی رینج سے نکل آیا تھا۔ سب ڈاکو ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ان کا سردار بھی اپنے خیمے سے نکل کر آگیا۔ سب نے مل کر چاول کھائے اور مٹی کے پیالوں میں گرم گرم چائے پی۔ اس کے بعد لوٹے ہوئے مال کی گٹھڑیاں اور تھیلے کھولے گئے۔ ان میں سونے چاندی کے زیور اور کرنسی نوٹ تھے۔ لکھو دادا نے سونے کے زیور اپنے پاس ہی رکھے اور کرنسی نوٹ کا کچھ حصہ ڈاکوؤں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بھیکم داس! ارے تو کیوں خالی ہاتھ بیٹھا ہے رے۔ یہ لے تو بھی کچھ مال اپنے پاس رکھ لے۔"

اس نے نوٹوں میں سے کچھ کرنسی نوٹ اٹھا کر مجھے دے دیئے۔ یہ دس دس اور پچاس پچاس کے نوٹ تھے۔ مجھے ان کی آگے سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں نے لکھو دادا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نوٹ اپنے پاس رکھ لئے۔

لکھو دادا نے چھلیا کو کہا۔

"ابے چھلیا اندر ہماری رانی کو بھی جا کر چائے دے آ۔"

چھلیا میرے پاس بیٹھا تھا۔

"تم یہیں بیٹھنا۔ میں رانی کو چائے دے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں وہیں بیٹھ کر سگریٹ پیتا اور دوسرے ڈاکوؤں کو اپنے اپنے نوٹ گنتے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے دیکھتا رہا۔ لکھو دادا اپنے خاص ساتھی کو پاس بٹھائے اسے سونے کے زیور دکھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چھلیا واپس آگیا۔ مجھے چھلیا سے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ جنگل سے کس طرف سے ہو کر جبل پور شہر کی طرف جانا پڑتا ہے۔ یہ معلومات مجھے بڑے طریقے سے حاصل کرنی تھی کہ چھلیا کو یہ شک نہ پڑے کہ میں وہاں سے فرار ہو

پروگرام بنا رہا ہوں۔ میں نے ڈاکوؤں کے سردار کی رانی کے بارے میں شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ یہ رانی کون ہے؟ کہنے لگا۔

"لکھو دادا کی رکھیل ہے۔ اور کون ہو گی۔ گاؤں میں شادی تھی۔ مجرا کرنے وہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم نے گاؤں میں ڈاکہ ڈالا اور لکھو دادا کو رانی پسند آگئی۔ بس اسے اٹھا کر لے آیا۔"

میں نے جنگل کے درختوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھلیا بھیا! مجھے یہ جگہ محفوظ نہیں لگ رہی"

"وہ کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ چونکہ میں شہر میں چوریاں کرتا رہا ہوں اس لئے شہر کی پولیس کو خوب جانتا ہوں۔ کل رات ہمارا پولیس مقابلہ بھی ہوا تھا۔ میرا دماغ کہتا ہے کہ پولیس نے اپنے خفیہ آدمی ضرور چھوڑ رکھے ہوں گے۔"

"ارے ان کی کیا مجال کہ ہمارے ڈیرے کی طرف آئیں۔ اور پھر ہم نرسنگ پور پولیس کی رینج سے بہت دور ہیں۔"

میں نے سگریٹ بجھے ہوئے الاؤ کی راکھ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کہ میں اس جنگل میں پہلے بھی آچکا ہوں۔ ایک بار مجھے چھ ماہ کی قید ہو گئی تھی اور مجھے جبل پور کی جیل میں لایا گیا تھا۔ میں وہاں سے دوسرے مہینے ہی جیل توڑ کر بھاگ نکلا۔ مجھے جان پڑتا ہے کہ میں انہیں جنگلوں میں پھرتا رہا تھا"

چھلیا کہنے لگا۔

"ارے بھیکم بھیا! یہاں سے جبل پور بہت دور ہے۔ راستے میں ایک دریا بھی پڑتا ہے۔ دو بڑے خطرناک جنگل آتے ہیں۔"

ایک پگ ڈنڈی میری بائیں جانب درختوں میں بنی ہوئی تھی۔ میں نے چھلیا سے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ پگ ڈنڈی کس طرف جاتی ہے؟"

چھلیا نے اس پگ ڈنڈی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ ڈنڈی؟ یہ منڈالا کے چاندر کو جاتی ہے جو یہاں سے ایک رات کے سفر کے بعد آتا ہے۔ وہاں ایک سمادھ ہے۔ کہتے ہیں رات کے وقت وہاں کسی سادھنی کی بد روح آتی ہے۔ اکا دکا مسافر نظر آجائے تو اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔"

میں نے اپنے موضوع پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے چاندر کے آگے دریا آتا ہو گا۔ شاید میں اسی دریا کو پار کر کے ادھر آیا تھا"

چھلیا نے مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"ارے دریا تو منڈالا کے چاندر سے دس کوس پر ہے۔ دریا پار آدمی کو دو دن کا گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا ہے تب جا کر جبل پور کی ریلوے لائن آتی ہے"

چھلیا نے مجھے وہاں سے جبل پور تک کا راستہ بتا دیا تھا۔ میں اس راستے کی وہ ساری نشانیاں جو اس نے مجھے بتائی تھیں اپنے ذہن نشین کر لیں۔ اب میں وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ میں نے اس مقصد کے لئے رات کے پچھلے پہر کا وقت طے کر لیا۔ میں اپنے ساتھ ایک بندوق ضرور لے جانا چاہتا تھا۔ چھلیا کی بندوق دو نالی تھی اور وہ مجھے پسند تھی۔ وہ اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ رات کو بھی بندوق اس کے پہلو میں پڑی ہوتی تھی۔ میں نے سارا پروگرام ذہن میں بنا لیا اور رات کے پچھلے پہر کا انتظار شروع کر دیا۔ شام کے وقت وہاں آگ کا الاؤ روشن ہو گیا اور جیسا کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں وہاں دیسی شراب کا پیپا کھل گیا۔ دیسی شراب کا یہ پیپا ڈاکو کسی گاؤں سے اٹھا کر لائے تھے۔

سب ڈاکوؤں کو بڑی جلدی نشہ چڑھ گیا۔ اس دوران لکھو دادا کی رکھیل رانی نے وہاں مجرا بھی کیا۔ میں الاؤ سے ہٹ کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ چھلیا دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر شراب پی رہا تھا۔ اس نے مجھے بھی پلانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے گورو جی نے مجھے سوم رس پینے سے منع کیا ہوا

۔ ہندو لوگوں میں اپنے گورو سے کئے ہوئے وعدے کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی اور جو کسی کو یہ وعدہ توڑنے کے لئے مجبور کرے ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگلے جنم وہ بھیڑیئے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ چھلیا نے مجھے شراب پینے پر بالکل مجبور ں کیا تھا۔ سارے ڈاکو مدہوش ہو رہے تھے۔ لکھو دادا بھی خوب پی رہا تھا اور مدہوشی عالم میں تھا۔

رانی سگریٹ پیتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ ں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ طوائف ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اس پر بڑا ظلم ہوا ہے ڈاکو اسے اٹھا کر لے آئے ہیں کہنے لگی۔

"تم شہر کے لگتے ہو۔ ان ڈاکوؤں میں زیادہ دیر نہ رہ سکو گے۔ لکھو دادا نے مجھے ارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"رانی بائی! اگر تم یہاں ان لوگوں کے ساتھ رہ سکتی ہو تو میں بھی رہ لوں گا۔ تم بھی ہر کی رہنے والی ہو۔"

رانی نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے میں اور تیرے میں فرق ہے۔ میں نے بڑے بڑے مگرمچھوں کو بھگتایا ہے۔ ایک بن مانس تو میرے لئے کچھ بھی نہیں۔ ویسے بھی مجھے ڈاکو لوگ شہری بابوؤں اور ؤں کے مقابلے میں اچھے لگتے ہیں۔ میں تو یہاں بڑی خوش ہوں اگر تم یہاں رہے تو لینا ایک دن میں ان ڈاکوؤں کی سردارنی بن جاؤں گی۔"

یہ اور ہی طرح کی طوائف تھی۔ اس کا اندر باہر ایک تھا۔ وہ ہر طرف سے طوائف ۔ جب اس کا سگریٹ ختم ہو گیا تو وہ انگڑائی لے کر اٹھی اور بولی۔

"یہ بن مانس لکھو تو ساری رات پیئے گا میں چل کر سوتی ہوں۔ نیند آ رہی ہے۔"

وہ چلی گئی اور میں ان درختوں کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے ہو کر مجھے جبل پور کی طرف جانا تھا۔ ہلکی چاندنی درختوں میں سے چھن کر پگ ڈنڈی پر پڑ رہی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا ڈاکوؤں کو شور شرابا مچاتے دیکھتا رہا۔

میں اسی رات ڈاکوؤں کے خفیہ اڈے سے نکل گیا۔

جاتے ہوئے میں نے چھلیا کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی اٹھا لی تھی۔ وہ جھونپڑی کے باہر دھت ہو کر سویا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر پگ ڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔ چھلیا نے کہا تھا کہ جبل پور تک یہ راستہ گھوڑوں پر سوار ہو کر سفر کرو تو دو راتوں دو دنوں میں طے ہوتا ہے۔ میں پیدل چل رہا تھا۔ ظاہر ہے بڑا لمبا سفر تھا۔ مگر یہ خیال بھی تھا کہ شاید رستے میں کوئی سواری مل جائے۔ سب سے پہلے منڈالا کا چاندر آنے والا تھا۔ یہ چاندر بقول چھلیا منڈالا کے جنگل کے عین وسط میں تھا۔ اس کے آگے دریا پار کرنا تھا۔ پھر اس نے ایک سمادھ کا بھی ذکر کیا تھا جہاں رات کو کسی سادھو کی بدروح آتی تھی اور وہاں پر جو بھی انسان موجود ہو اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی تھی۔ مجھے اس بدروح کا کوئی خوف نہیں تھا۔ میں نے بڑی بڑی بدروحیں دیکھی تھیں۔ رات بڑی حبس آلود تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ جنگلی جانوروں کا ڈر بھی تھا۔ مگر بندوق میرے پاس تھی جس میں دو کارتوس میں نے بھر لئے تھے۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی تھی تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان ڈاکوؤں سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ گھوڑا میں اس لئے حاصل نہیں کر سکا تھا کہ سارے گھوڑے اس طرف بندھے تھے جس طرف ڈاکو سو رہے تھے۔ وہ گھوڑوں کے گرد دائرہ بنا کر سوئے تھے۔ معلوم نہیں ایسا انہوں نے کیا سوچ کر کیا تھا۔ میں ان کے اوپر سے گھوڑے کو نہیں نکال سکتا تھا۔ ویسے بھی دو ڈاکو گھوڑوں کی رکھوالی کر رہے تھے۔ میں جنگلوں میں راتوں کو اس قسم کا سفر کرنے کا عادی تھا۔ اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا لہٰذا اللہ کا نام لے کر پیدل ہی چل پڑا تھا۔ کہ خدا مسبب الاسباب ہے آدمی کی نیت نیک ہو تو قدرت کوئی نہ کوئی اچھا سبب بنا دیتی ہے۔

آپ یوں سمجھ لیں کہ میں قریباً آدھی رات تک جنگل میں چلتا رہا۔ کبھی آہستہ

آہستہ کبھی تیز تیز۔ تھک جاتا تو تھوڑی دیر کے لئے کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ جنگل شکل بدلتا چلا گیا۔ کبھی گھنے درختوں کے جھنڈ آجاتے۔ کہیں کوئی کھائی آجاتی۔ کہیں گھاٹی نیچے اتر جاتی۔ ایک جگہ پانی کا چھوٹا سا تالاب چاندنی میں نظر پڑا تو اس کے کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ تھوڑا سا پانی بھی پیا۔ تازہ دم ہو گیا اتنے میں مجھے ایک جانب سے غراہٹ کی آواز آئی۔ اس آواز کو میں بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ یہ جنگل کے بادشاہ شیر کی آواز تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر اگر آدم خور نہ ہو تو کبھی کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ جنگل میں انسان کو دیکھ کر اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے۔ اگر اسے اس راستے سے ضرور گزرنا ہو تو غرا کر انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ تالاب پر شیر پانی پینے آرہا تھا۔ اس نے چاندنی میں ایک انسان کو بیٹھے دیکھا تو غرا کر مجھے وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔

میں جلدی سے اٹھ کر ایک جانب درختوں میں چلا گیا۔ احتیاط کے طور پر میں درخت کی ٹہنی پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور بندوق ہاتھ میں سیدھی کر لی۔ میری نظریں تالاب پر لگی تھیں۔ اتنے میں ایک بہت بڑا شیر جھاڑیوں سے نکل کر تالاب پر آیا اور پانی پینے لگا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ شیرنی تھی۔ اس کی گردن پر شیروں والے گھنے بال نہیں تھے۔ دیر تک شیرنی پانی پیتی تھی۔ جب خوب سیر ہو گئی تو اس نے منہ اوپر کر کے جبڑے کھول کر سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیئے۔ ایک بار پھر غرائی۔ یہ اس لئے کہ اسے قریب ہی سے انسان کی بو آرہی تھی۔ پھر پلٹ کر دوڑتی ہوئی درختوں میں غائب ہو گئی۔

میں درخت سے اترا اور پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ جو اب جھاڑیوں میں بڑی مشکل سے چاندنی رات میں نظر آتی تھی۔ میں اندازے سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا رخ اسی طرف رکھا ہوا تھا جس رخ پر میں ڈاکوؤں کے ڈیرے سے چلا تھا۔ آدھی رات کو میں چلا تھا۔ پو پھٹنے لگی تو میں ابھی تک آہستہ آہستہ جنگل میں چل رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ کالے ناگوں کا جوڑا بھی دیکھا جو چاندنی میں بڑے مزے سے کھیل رہا تھا۔ میں پرے ہٹ کر گزر گیا تھا۔ چاندنی راتوں میں ایک دوسرے سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہوا سانپوں کا

جوڑا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ان کے قریب کبھی نہیں جانا چاہئے۔ جب آسمان پر صبح کی سفیدی پھیلنے لگی اور درختوں پر پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تو مجھے کچھ جھگیاں نظر آئیں۔ یہ مدھیہ پردیش کے جنگلی لوگ تھے جنہیں وہاں کی زبان میں آدھی واس کہتے ہیں۔ یہ وحشی جنگلی قسم کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ دیہاتی ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں جو جنگلوں میں رہ کر تھوڑی بہت کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بانس کی ٹوکریاں وغیرہ بناتے ہیں یا شکاریوں کی راہ نمائی کرتے ہیں۔

جھگیوں کے پاس ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر نمسکار کیا تو اس نے ناریل منہ کے آگے سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ کالے رنگ کا بڑی بڑی سفید مونچھوں والا دبلا پتلا کمزور سا بوڑھا تھا اس نے اس علاقے کی دیہاتی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں شکاری ہوں؟ میرے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر بھی اسے مجھ پر شکاری ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ ان لوگوں کی زبان سے مجھے کافی واقفیت ہو گئی ہوئی تھی اور میں ان جنگل میں رہنے والوں کی زبان بول نہیں سکتا تھا۔ مگر سمجھ پوری طرح سے لیتا تھا اور اپنا مطلب بھی سمجھا سکتا تھا۔ یہ شکستہ اردو ہی بولتے تھے مگر اس میں وہاں کی قدیم جنگلی بولی کے الفاظ زیادہ ہوتے تھے۔ میں نے بوڑھے کو سمجھایا کہ میں شکاری ہی ہوں۔ جنگل میں بھٹک گیا ہوں۔ منڈالا کے چاندر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ مگر بہت تھکا ہوا ہوں۔ بھوک بھی لگی ہے۔ بوڑھے نے کسی کو آواز دی۔ دوسری جھونپڑی میں سے ایک نوجوان لڑکا دوڑتا ہوا آگیا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ بوڑھے نے اسے کہا کہ شکاری بابو کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ یہ چاندر کو جائے گا۔

مجھے دیکھ کر کچھ جنگلی عورتیں اور بچے بھی وہاں آگئے۔ وہ بڑے شوق سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہاں جو شکاری آتا تھا ان لوگوں کو بسکٹ' چائے کی پتی اور نمک وغیرہ ضرور دے جاتا تھا۔ میرے لئے ایک آدمی کچھ روٹیاں لے آیا جن پر بینگن کی بھجیا ڈال دی گئی تھی۔ میں نے بڑے مزے سے روٹی کھائی۔ پانی پیا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بوڑھے سے چاندر کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جو لڑکا میرے لئے روٹی لایا تھا

وہ بھی ہمارے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کر بوڑھے کو اور کچھ روپے لڑکے کو دیئے۔ وہ روپے لے کر بڑے خوش ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ منڈالا کا چاندر وہاں سے ابھی کافی دور ہے۔ چاندر کے آگے منڈالا کا قصبہ ہے۔ جس کے آگے دریائے کاویری بہتا ہے۔ میں نے اس سے سادھو کی بدروح والے سمادھ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کانوں کا ہاتھ لگا کر بولا۔

"بھگوان اس سے بچائے۔ خبردار! اس طرف مت جانا۔"

مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے بوڑھے کو بتایا کہ میں ساری رات چلتا رہا ہوں۔ اب کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک جھونپڑی خالی کر دی۔ میں جھونپڑی میں جا کر سو گیا۔ کافی دیر تک سویا رہا۔ جب اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ جھونپڑی کے باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے پتلون کی جیب میں سے نوٹ نکال کر گنے۔ کل دو ہزار بتیس روپے تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار لکھو کے پاس لوٹ کا مال تھا۔ اس نے بڑی فراخدلی سے میری طرف نوٹ اچھالے تھے۔ یہ سارے کے سارے نوٹ میرے پاس ہی تھے۔ جنگل کے ان باسیوں نے میری جیب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ان کے ہاں اکثر رجواڑوں کے افسر اور باہر کے انگریز شکاری شکار کھیلنے آتے رہتے تھے۔

یہ لوگ اپنی ساکھ اور اپنے کاروبار کے خیال سے چوری چکاری بالکل نہیں کرتے تھے اور شکاریوں کی کسی قیمتی چیز کو ہاتھ بھی لگانا پاپ سمجھتے تھے۔

میرے پاس سری نگر تک پہنچنے کے لئے کافی رقم موجود تھی۔ میں نے دوپہر کو ان لوگوں کے ساتھ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور انہیں دو سو روپے دے کر ان سے ایک ٹٹو بھی لے لیا۔ بوڑھے نے کہا۔

"دریا کے گھاٹ پر جا کر ٹٹو کو چھوڑ دینا۔ یہ اپنے آپ ہمارے پاس آ جائے گا۔ دریا کے پار تمہیں ٹٹو کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آگے تمہیں ریل گاڑی مل جائے گی۔"

ان لوگوں کو اس علاقے کا چھلیا ڈاکو سے زیادہ پتہ تھا۔ میں ٹٹو پر سوار ہو کر جنگل میں منڈالا چاندر کی جانب روانہ ہو گیا۔ سفر کرتے کرتے شام ہو گئی۔ ایک جگہ تھوڑی دیر

آرام کیا اور پھر چل پڑا۔ آدھی رات کو جنگل زیادہ گھنا اور خوفناک نظر آنے لگا تو وہیں ایک درخت کے ساتھ ٹٹو کو باندھا۔ اور ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ دوسرے روز دھوپ نکلی ہوئی تھی کہ اٹھا اور دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد منڈلا کا جنگل شروع ہو گیا۔ یہ جنگل بالکل مختلف تھا۔ اس میں جو درخت اگے ہوئے تھے ان کے تنے بہت اونچے اونچے تھے ان پر جنگلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ زمین کے اندر سے بڑے بڑے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ شام کے وقت چاندر آ گیا۔ اس کی نشانی مجھے یہ بتائی گئی تھی جب چاندر شروع ہو گا تو زمین پر جلی ہوئی جھاڑیوں اور جلے ہوئے درختوں کی راکھ اور جلے ہوئے سوختہ درخت ملیں گے۔ میرا ٹٹو ان کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔ چاندر میں کہتے ہیں دن کے وقت چلچلاتی دھوپ میں اپنے آپ آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ درختوں اور جھاڑیوں کو جلا ڈالتی ہے۔ اور پھر اپنے آپ ہی بجھ جاتی ہے۔ سردیوں کے بعد برسات میں جب بارشیں ہوتی ہیں تو اس راکھ میں سے نئے درختوں اور جھاڑیوں کی کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔

آسمان پر تارے نکل آئے۔ رات ہو گئی تھی۔ چاند بھی کچھ دیر کے بعد نکل آیا۔ اب مجھے سادھو کی بدروح والے سادھ کے قریب سے گزرنا تھا۔ اس لئے کہ دریا کے گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے یہی ایک نشانی تھی جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا ہوں۔ میں جلے ہوئے چاندر سے گزر گیا۔ آگے کوئی تین چار میل چلا ہوں گا کہ ایک جگہ چاندنی میں چبوترہ دکھائی دیا جس پر ایک چھوٹی سی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ ہندو لوگ اپنے بعض بزرگوں یا زیادہ تر سادھو سنتوں کی ہڈیاں چتا میں سے نکال کر ہنڈیا میں ڈال لیتے ہیں اور پھر انہیں کسی جگہ دفن کر کے اوپر چھوٹی سی بارہ دری بنا دیتے ہیں۔ اسے وہ لوگ سادھ کہتے ہیں پنجابی میں اسے مڑھی بھی کہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہی سادھو کی سادھ ہے اور یہاں سادھو کی بدروح رات کو آتی ہے۔

میں سادھ کے قریب سے گزرنے لگا تو ٹٹو ایک دم رک گیا۔ وہ ڈرا ہوا لگتا تھا اور بار بار اپنی ٹانگیں پیچھے لے جا رہا تھا۔ میں نے اسے آگے چلانے کی بڑی کوشش کی مگر ٹٹو پیچھے

جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ بدروح نظر نہیں آیا کرتی۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں آ گئی ہو اور مجھ پر حملہ کرنے کا سوچ رہی ہو۔ مجھے بدروح کا کوئی ڈر خوف تو تھا نہیں۔ اس سے پہلے کئی بدروحوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ دوسرے سب سے طاقتور اور اہم بات یہ تھی کہ میرا خدائے واحد وشاہد پر ایمان بے حد پختہ تھا۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ دنیا کی کوئی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ چندریکا کی روح نے مجھے جو نقصان پہنچانا تھا وہ پہنچا چکی تھی۔ اب وہ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی کیونکہ میرا اپنے خدائے واحد پر جو قادر مطلق ہے ایمان اور زیادہ پختہ ہو گیا ہوا تھا۔

میں سادھ کے پاس آ گیا اور چبوترے پر بیٹھ گیا۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"اگر تو واقعی کوئی بدروح ہے تو میرے ٹٹو کو ضرور ڈرا سکتی ہے مگر مجھے نہیں ڈرا سکتی۔ تجھ میں اگر ہمت ہے تو میرے سامنے آ۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی کے منہ سے تکلیف کی وجہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ہو۔ اس کے بعد وہاں کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں اٹھ کر ٹٹو کے پاس گیا۔ وہ بڑے مزے سے گھاس چر رہا تھا۔ میں نے اسے باگ سے پکڑ کر چلایا تو وہ چل پڑا۔ بدروح کلمہ طیبہ کو سن کر دفعہ ہو گئی تھی۔ میں ٹٹو پر بیٹھ گیا اور اسے لے کر وہاں سے آگے چل پڑا۔

ساری رات جنگل میں چلتا رہا۔ صبح کاذب کی جھلکیاں آسمان پر نمودار ہوئیں تو دور سے مجھے دریا کی مرطوب ہوا آتی محسوس ہوئی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد دریا میرے سامنے تھا۔ دور ایک طرف مجھے دریا کے کنارے کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیئے۔ دریا کا گھاٹ تھا۔ میں نے ٹٹو کو وہاں چھوڑ دیا اور گھاٹ پر آ گیا۔ ایک بہت بڑی کشتی جسے بیڑا کہتے ہیں مسافروں سے بھری ہوئی دریا کے پار جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں بھی سوار ہو گیا۔ کشتی چل پڑی۔ کشتی میں کچھ دیہاتی گوالے بھی دودھ کے بڑے بڑے برتن رکھے بیٹھے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ دریا پار منڈلا کمالی کا بڑا قصبہ ہے جہاں یہ لوگ دودھ لے کر جا رہے ہیں اور روز صبح جاتے ہیں۔ ان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ

منڈالا کمالی نام کا ریلوے سٹیشن بھی ہے جہاں سے جبل پور کو گاڑی جاتی ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بندوق میرے پاس ہی تھی اور کارتوسوں کی پیٹی بھی میں نے گلے میں لٹکائی ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ مجھے شکاری ہی سمجھ رہے تھے۔ میں نے بھی ان لوگوں کو یہی بتایا کہ چاندر میں ہرن کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ ہرن نہیں ملا۔ اب منڈالا جا رہا ہوں جہاں سے آگے جبل پور چلا جاؤں گا۔

منڈالا کمالی کا قصبہ کافی بڑا تھا اور چھوٹے سے شہر کی طرح تھا۔ میں نے ایک بازار میں چائے کی دکان کے اندر بیٹھ کر ناشتہ کیا اور ایک یکے میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ جبل پور جانے والی گاڑی شام کو آئے گی۔ یہ کوئی مین لائن نہیں تھی۔ برانچ لائن تھی۔ جبل پور کی جانب صرف ایک پسنجر ٹرین جاتی تھی جو پیچھے ناگ پور سے آتی تھی۔ مجھے بہرحال شام گزارنی تھی۔ قصبے میں کوئی ہوٹل نظر نہیں آیا تھا۔ سٹیشن مجھے محفوظ جگہ لگی۔ فیصلہ کیا کہ یہیں پلیٹ فارم پر دن گزارا جائے۔ چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا۔ تقریباً خالی پڑا تھا۔ جہاں سٹیشن کا چھوٹا گیٹ پلیٹ فارم سے باہر سٹیشن کی ڈیوڑھی کو جاتا تھا وہاں قریب ہی ایک چائے کا سٹال تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر چائے پی اور پھر پلیٹ فارم پر ذرا دور جا کر خالی بنچ پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ سامنے پلیٹ فارم کی دوسری جانب ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ اس کی دوسری طرف ریل کی ایک اور پٹڑی تھی جس پر مال گاڑی کے دو ڈبے کھڑے تھے۔ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر شام تک پڑے رہنا دوسروں کو شک میں مبتلا کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ قصبے میں چلتے ہیں۔ چل کر کسی ڈھابے یا ہوٹل میں کھانا وغیرہ بھی کھا لوں گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔

چنانچہ میں سٹیشن سے نکل کر قصبے کی طرف چل پڑا۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت دن کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ فضا نہ گرم تھی نہ سرد۔ کچھ فاصلے پر قصبے کے مکان اور عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ پرانا قصبہ تھا۔ اکثر مکان پرانے تھے اور بارشوں کی وجہ سے ان کے در و دیوار سانولے پڑ گئے تھے۔ میں ایک بازار میں سے گزر رہا تھا۔ زیادہ تر

لوگ دیہاتی لباس میں تھے۔ عورتوں نے گھگھریاں بھی پہنی ہوئی تھیں اور ساڑھیاں بھی۔ بازار کے وسط میں ایک بیل کھڑا تھا۔ ایک ہندو اسے کچھ کھلا رہا تھا۔ ہندو بیل کو بھی مقدس سمجھتے ہیں۔ نندی بیل کو تو وہ دیوتا مانتے ہیں۔ بازار میں پیپل کا درخت تھا درخت کے تنے میں ہنومان کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ ایک پجاری قریب بیٹھا اس کی آرتی اتار رہا تھا۔ تین خواتین اور ایک مرد سامنے ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔

مجھے ایک دکان میں کچھ لوگ بیٹھے چائے پیتے اور کھانا کھاتے نظر آئے تو میں بھی اندر جا کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ویشنو ہوٹل تھا اور یہاں صرف سبزیاں ہی بنائی جاتی تھیں۔ میں نے تھوڑا بہت کھایا اور چائے کا گلاس سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے وقت کاٹنا تھا۔ آتے جاتے لوگوں پر میں نے نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اگرچہ اتنی ایمرجنسی والی بات نہیں تھی لیکن مجھے ہر حالت میں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ایک تو میں جائے وقوعہ سے ابھی بہت زیادہ دور نہیں نکلا تھا۔ دوسرے میں کشمیری مجاہد اور مفرور کمانڈو ہی نہیں تھا بلکہ میں کئی دشمنوں کا خون بھی کر چکا تھا جن میں انڈیا کے پولیس اور فوجی افسر بھی شامل تھے۔

اتنے میں ایک سکھ نوجوان دکان میں داخل ہوا اور ہوٹل والے ہندو لالے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”لالہ! اوئے آج تو کہیں سے جھٹکا لا کر کھلا دو۔“

پھر خود ہی ہنستا اور اپنی پگڑی کو دباتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم کہاں سے لاؤ گے جھٹکا۔ یہاں سبھی ڈھابے ویشنو ہیں۔ مجھے آپ ہی کسی روز جھٹکا کرنا پڑے گا۔“

میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ آگے لمبی میز تھی۔ دوسرے گاہک بھی میز کے آگے بنچوں پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ سکھ نوجوان میرے ساتھ ہی بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ایک تو میرا رنگ گورا تھا۔ دوسرے میں وہاں کے دیہاتی لباس میں نہیں تھا۔ میں نے پتلون پہنی ہوئی تھی۔ سکھ نوجوان نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"بھاپا جی! آپ مجھے پنجابی لگتے ہیں"

میں نے تھوڑا سا مسکرا کر اردو میں کہا۔

"جی نہیں میں پنجابی نہیں ہوں۔"

سکھ نوجوان بولا۔

"بھاپا جی آپ کی اردو پنجابیوں والی ہے مجھ سے کیوں چھپا رہے ہیں۔ میں بھی پنجابی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میرے ماتا پتا پنجاب سے آکر بمبئی میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے میری اردو پنجابیوں والی ہے۔"

سکھ نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور کہا۔

"یہ کہو ناں بھاپا جی۔ تسی پنجابی ہی ہوئے ناں بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

وہ اب پنجابی میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے والے بنچ پر بیٹھا ایک آدمی چائے پی رہا تھا۔ پہلے اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں پنجابی ہوں وہ میری طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہاں سے نکل جانا چاہئے یہ سکھ نوجوان کہیں مجھے کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سکھ نوجوان نے دکاندار سے کہا۔

"لالہ جی! اپنے پنجابی بھاپے سے پیسے مت لینا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں سردار جی یہ تکلیف نہ کریں"

وہ بولا۔

"بھاپا جی! ہم دونوں نے پنج دریاؤں کا پانی پیا ہوا ہے۔ ہم دونوں بھرا بھرا ہیں۔"

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اس سکھ کی شکل آگئی جس نے تلوار مار کر میری چھوٹی بہن کلثوم کی گردن کاٹ دی تھی اور وہ کھیتوں میں شہید ہو گئی تھی۔

ں خاموشی سے دکان سے نکل گیا۔

دل میں اس شخص کا خیال بار بار آتا تھا جس نے میری طرف گھور کر دیکھا تھا۔ اگر یہ پولیس والے مفرور مجرموں کو پہچان لیتے تھے تو اب مجھے اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ میں بھی یہ پولیس والوں کے چہرے پہچان لیتا تھا۔ مجھے وہ شخص خفیہ پولیس والا ہی لگا تھا۔ چنانچہ ں بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ میں ایک بازار سے نکل کر دوسرے بازار میں داخل ہو گیا تھا۔ را قصبہ' سارے بازار میرے لئے نئے اور اجنبی تھے۔ وہاں کوئی سینما ہاؤس بھی نظر یں آ رہا تھا کہ جہاں کچھ دیر کے لئے چھپ کر بیٹھ جاتا۔ ایک بازار کا موڑ گھومتے ہوئے ں رک گیا۔ پیچھے دیکھا۔ بازار میں کافی لوگ آجا رہے تھے۔ مجھے ان میں خفیہ پولیس لے کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔

اصل خطرہ مجھے اس بات کا تھا کہ اس قصبے میں پولیس سٹیشن ضرور ہو گا۔ اگر خفیہ لیس والے نے تھانے میں جا کر میری خبر پہنچا دی تو پولیس فوراً جائے گی اور یہ کوئی شہر یں تھا کہ جہاں میں ادھر ادھر بھاگ کر چھپ جاتا۔ آخر قصبہ ہی تھا۔ پولیس مجھے آسانی ے پکڑ سکتی تھی۔ میرے پاس جو بندوق اور کارتوس تھے وہ میں نے سٹیشن پر ہی چائے ے سٹال والے کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ بندوق ساتھ لے کر میں قصبے میں نہیں پھرنا ہتا تھا۔ اور پھر میرے پاس بندوق کا لائسنس بھی نہیں تھا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو یہی سوچا ہ سٹیشن پر ہی واپس چلا جائے۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ میں جس طرف سے ا تھا اسی راستے سے ہوتا ہوا ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ چونکہ میرے دل میں یہ

خیال لگا ہوا تھا کہ ممکن ہے خفیہ پولیس والا پولیس کو لے کر وہاں آجائے اس واسطے میں
نے بندوق اور کارتوس کی پٹی سٹیشن کے ٹی سٹال والے کے پاس ہی رہنے دی۔ ک
پولیس نے بندوق میرے پاس دیکھ کر اس کا لائسنس مانگا تو وہ مجھے بلا لائسنس بندوق
رکھنے کے جرم میں ہی پکڑ کر تھانے میں لے جائے گی۔ چنانچہ میں ٹی سٹال کے سامنے کی
بجائے پیچھے سے ہو کر نکل گیا اور پلیٹ فارم کے بنچ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی دیر
بعد پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف دیکھ لیتا تھا کہ کہیں خفیہ ایجنسی کا اہلکار پولیس لے کر تو
نہیں آگیا۔ گیٹ کے پاس ریلوے پولیس کا ایک دبلا پتلا سا سپاہی ہاتھ میں لاٹھی لئے ضرور
موجود تھا۔ یہ پہلے سے وہاں پر تھا۔ اس لئے اس کی مجھے فکر نہیں تھی۔

جبل پور کا ریلوے ٹکٹ میں نے پہلے ہی لے کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ ایک بے چینی
سی مجھے ضرور لگی تھی۔ اتنے میں ایک وردی پوش آدمی سرخ اور سبز جھنڈیاں بغل میں
دبائے پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ پھر مجھے دور سے ریل کے انجن کی آواز سنائی دی۔ کوئی گاڑی
آرہی تھی۔ ایک پسنجر ٹرین تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہو گئی۔ مسافر اترے
چڑھنے لگے۔ میں نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ یہ گاڑی جبل پور جائے گی کیا؟ وہ بولا۔

”موڑ واڑہ جا رہی ہے۔ وہاں سے جبل پور کی گاڑی مل جائے گی“

میں ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔

جب تک گاڑی نہیں چلی میری آنکھیں پلیٹ فارم کے گیٹ پر ہی لگی رہیں۔ پولیس
نہیں آئی تھی اور ٹرین چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پسنجر ٹرین تھی۔ پھر سٹیشن
آگیا۔ یہاں سب مسافر اتر گئے۔ میں بھی اتر گیا۔ معلوم ہوا کہ سری پور کی طرف سے
ایک گاڑی آئے گی وہ جبل پور جاتی ہے۔ ایک گھنٹے بعد یہ گاڑی آئی۔ یہ بھی پسنجر ٹرین
تھی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ اس گاڑی نے مجھے شام کے وقت جبل پور پہنچایا۔ جبل
پور انڈیا کے بڑے صنعتی شہروں میں ایک شہر ہے۔ دلی بمبئی جیسا تو نہیں ہے مگر اس
زمانے میں یہ کافی مشہور اور وسیع و عریض تھا۔ یہاں سے میں نے بھوپال جھانسی روٹ کی
بجائے کان پور لکھنؤ اور سہارن پور کی طرف سے جالندھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دلی سے

تے ہوئے جالندھر جموں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس طرف مجھے خطرہ محسوس ہو
ہا تھا۔ اب میرا روٹ یہ تھا۔ جبل پور سے الہ آباد‘ کانپور‘ لکھنؤ‘ اور لکھنؤ سے بریلی‘
اد آباد اور سہارن پور اور وہاں سے انبالہ‘ لدھیانہ اور جالندھر پہنچنا تھا جہاں سے جموں
نے والی ریل گاڑی یا بس پکڑنی تھی۔ اگرچہ یہ لمبا روٹ تھا مگر نسبتاً محفوظ تھا۔
جبل پور بہت بڑا جنکشن تھا۔ کئی طرف سے گاڑیاں آتی تھیں اور جاتی تھیں‘ انکوائری
ے معلوم ہوا کہ پنجاب میل رات کے دو بجے کلکتے سے آتی ہے وہ امرتسر کو جائے گی۔
ل پور پر مجھے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ گاڑی آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ ابھی
ام بھی پوری طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ میرے پاس روپے بھی تھے۔ سوچا شہر میں چل
ر سب سے پہلے نئی پتلون وغیرہ خریدنی چاہئے۔ میرے کپڑے بہت خراب اور بوسیدہ ہو
ہے تھے۔ جوتا بھی جنگل میں چلنے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔ میں سٹیشن سے نکل کر ایک
کیٹ میں آگیا۔ یہاں ایک دکان ریڈی میڈ کپڑوں کی تھی۔ وہاں میں نے ایک مٹیالے
گ کی نئی پتلون۔ اسی کلر کی قمیض اور ایک جیکٹ خریدی۔ جیکٹ گرم تھی۔ کیونکہ
گے پنجاب میں سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا۔ ربڑ کے نئے
تے خریدے۔ پرانے کپڑے لفافے میں ڈالے اور ایک جگہ چوک میں کوڑے کے ڈرم
ں پھینک دیئے۔ ایک جگہ ہیر کٹنگ سیلون تھا۔ میری ڈاڑھی خشخشی تھی۔ مگر اب اس
بال کافی بڑھ آئے تھے۔ سر کے بال بھی گردن کے نیچے تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے
ہ نہ کروائی۔ ڈاڑھی مونچھوں کے بال ویسے ہی چھوٹے چھوٹے رہنے دیئے۔ سر کے
گردن کے نیچے تھوڑے تھوڑے کٹوا دیئے۔ وہیں منہ ہاتھ اور سر دھویا۔ پوری طرح
ہ دم ہو کر سیلون سے باہر نکلا۔
اسی بازار میں ایک ریسٹوران میں بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔ سگریٹ کا نیا پیکٹ خریدا اور
گریٹ سلگا کر جبل پور کے بارونق بازاروں کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ دکانوں اور بازاروں کی
ں روشن ہو گئی تھیں۔ چلتے چلتے میں ایک ایسے بازار میں آگیا جہاں داخل ہوتے ہی
احساس ہو گیا کہ یہ شہر کا بازار حسن ہے۔ ایک دو بنی سنوری عورتیں ایک دوسرے

سے چھلیں کرتی میرے قریب سے بھی گزریں۔ ذرا آگے گیا تو مکانوں سے طبلے گھنگھروؤں کی آواز بھی آئی۔ یہاں پولیس کے سپاہی بھی لاٹھیاں ہاتھ میں لئے گشت لگاتے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ یہ ابھی میں نے سوچا ہی تھا کہ ایک دم سے کسی کوٹھے پر پستول کے دو فائر ہوئے اور عورتوں کی چیخوں کی آوازیں آئیں۔ اس مکان پر سے دو آدمی دوڑتے ہوئے نیچے اترے۔ شور مچ گیا۔

"پکڑو پکڑو۔ بائی جی کا قتل ہو گیا"

دونوں آدمی میری طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا دوسرے کے ہاتھ میں چاقو تھا جسے وہ لہرا رہا تھا۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ میں بھی دوڑ پڑا۔ پولیس بھی پیچھے دوڑ پڑی۔ میں ایک گلی میں گھس گیا۔ میں نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا کہ پولیس بھی میرے پیچھے اس گلی میں آگئی تھی۔

جس مصیبت سے میں ڈر رہا تھا وہ مصیبت مجھ پر نازل ہو گئی تھی۔ اب میرے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا کہ جیسے بھی ہو پولیس کی گرفت میں نہ آؤں۔ ورنہ میرا پولیس سے بچنا ناممکن تھا۔ گلی ایک طرف کو مڑی تو میں مڑتے ہی بائیں جانب جو پہلا کوٹھا نظر آیا اس کی ڈیوڑھی میں گھس گیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔

دوسرے لمحے پولیس بھی گلی میں پہنچ گئی۔ شاید کسی سپاہی نے مجھے اس مکان میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ چونکہ میں بھی قاتل کے ساتھ یا ذرا آگے بھاگ اٹھا تھا اس لئے پولیس مجھے بھی قاتل ہی سمجھ رہی تھی۔ میں اگر پکڑا جاتا تو اپنی بے گناہی ثابت کر بھی دیتا تو میری ضمانت دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا اور پولیس نے اس وقت تک مجھے نہیں چھوڑنا تھا جب تک دونوں قاتل گرفتار نہیں ہو جاتے تھے اور کچھ پتہ نہیں کہ اس وقت تک پولیس کو میرے بارے میں یہ علم ہو جاتا کہ میں تو کشمیری کمانڈو ہوں جس کے پیچھے بھارت کے تقریباً ہر شہر کی پولیس لگی ہے اور جس کا تقریباً ہر پولیس سٹیشن میں ریکارڈ اور تصویر موجود

ہے۔ باہر سے سپاہیوں نے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارے اور چلا کر کہا۔

"دروازہ کھولو۔ تم بچ کر نہیں جا سکتے اپنے آپ باہر نکل آؤ۔"

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اوپر ایک چھوٹا سا دالان تھا [illegible] تھڑے کے پاس تانبے کا حمام رکھا ہوا تھا۔ چوبارے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر چاندنی بچھی تھی۔ گاؤ تکئے لگے تھے اور ایک بنی سنوری عورت کھڑکی میں سے نیچے گلی میں جھانک کر کہہ رہی تھی۔

"کیوں دروازہ توڑ رہے ہو۔ دروازہ کھلا ہے۔"

کسی سپاہی نے کہا۔

"دروازہ اندر سے بند ہے بائی۔ اندر قاتل گھسا ہوا ہے۔"

اس عورت نے جو یقیناً طوائف تھی اور وہ کسی طوائف ہی کا کوٹھا تھا وہیں سے بڑے رعب سے کہا۔

"یہاں کوئی قاتل واتل نہیں ہے۔ میں ابھی تمہارے بڑے تھانیدار کو بلا کر پوچھتی ہوں کہ تمہارے آدمی ہمیں دھندے کے وقت کیوں پریشان کرتے ہیں۔"

گلی میں سے ہی کسی سپاہی نے اونچی آواز میں کہا۔

"جائے گا کہاں۔ ہم بھی یہیں ہیں"

اس دوران میں دالان کی ایک طرف چھپ کر کھڑا تھا جہاں تھوڑا تھوڑا اندھیرا تھا۔ اندر چوبارے میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ کیونکہ بائی کے مجرے کا ٹائم شروع ہونے والا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے مجھے بنی سنوری عورت گلی والی کھڑکی پر جھکی نظر آرہی تھی وہ پیچھے ہٹ گئی اور اس نے کسی کو آواز دی۔

"کلو! ارے کلو! تو کہاں مر گیا ہے۔ نیچے جا کر دیکھ کوئی بدمعاش تو ڈیوڑھی میں نہیں چھپا ہوا؟"

جس آدمی کو بائی نے آواز دی تھی وہ غالباً اوپر والے چوبارے میں یا کسی دوسری کوٹھڑی میں ہو گا مگر اس کی آواز پر کوئی نہ آیا بائی جی خود باہر دالان میں آگئی۔ سامنے ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ زینے کی طرف چلنے لگی اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ

وہیں رک گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے چیخ کی آواز نکلتی یا وہ شور مچاتی میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ میں نے ہاتھ جان بوجھ کر نرم رکھا تھا۔ کیونکہ میری اس عورت سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ الٹا مجھے اس وقت اس کی امداد کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اب تک بازار حسن میں پولیس کی مزید نفری کا پہنچ جانا یقینی تھا اور ہو سکتا تھا تھانیدار خود سپاہیوں کو ساتھ لے کر بائی جی کے کوٹھے کی طرف آ رہا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ قرائن سے معلوم ہو رہا تھا کسی سپاہی نے مجھے بائی کے کوٹھے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا بائی جی بڑی دبنگ قسم کی طوائف تھی اور چونکہ کسی خونی وغیرہ کے اس کے کوٹھے پر آ جانے سے اس کی بدنامی ہوتی تھی اور اس کے دھندے پر برا اثر پڑتا تھا اس لئے اس نے پولیس کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ وہ تھانیدار کو ماہانہ یا روزانہ رات کو کچھ رقم بھی بطور رشوت ادا کرتی ہو۔ اسی وجہ سے اس نے پولیس کو کھری کھری سنا دی تھیں۔

ابھی تک وہ آدمی جس کو بائی جی نے کلو کہہ کر آواز دی تھی کسی طرف سے بھی نکل کر وہاں نہیں آیا تھا۔ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے بائی جی کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا مضبوط ہاتھ بائی جی کے منہ پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ بائی جی میری گرفت سے نکلنے اور کسی کو آواز دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"میں خونی نہیں ہوں۔ اگر تم مسلمان ہو تو یقین کرو کہ میں بھی مسلمان ہوں اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ خون کرنے والے دو آدمی تھے جن کو بھاگتا دیکھ کر میں بھی بھاگا اور پولیس میرے پیچھے لگ گئی"

میں نے اس کے منہ پر دبایا ہوا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا کر دیا۔ بائی جی نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر ہلاتے ہوئے بند بند آواز میں کہا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی"

میں اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا کہ یہ طوائف عورت ہے۔ اس قسم کے

حالات میں اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ میری جیب میں بھرا ہوا پستول موجود ہے۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔ میں صرف یہاں تھوڑی دیر ٹھہروں گا۔ پھر نکل جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے عورت کو اپنے سے الگ کر دیا۔

دالان میں کمرے کی روشنی آ رہی تھی۔ عورت نے سب سے پہلا کام مجھ سے الگ ہوتے ہی یہ کیا کہ ساڑھی کے پلو سے ہونٹوں کی سرخی کو ٹھیک کرنے لگی اور میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم کون ہو؟ پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا"

اتنے میں اوپر سے ایک بدمعاش ٹائپ کا آدمی بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو بائی سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟؟"

میں نے فوراً اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ بائی کو یہ بتانے کے لئے کہ اگر اس نے کوئی غلط بات کی تو میں جیب سے پستول نکال کر دونوں کو بھون ڈالوں گا۔ اس نے اس آدمی سے کہا۔

"کوئی نہیں ہے۔ ایک پرانا ملنے والا ہے تم اوپر جا کر اس لڑکی سے رنگ رلیاں منا رہے تھے کیا؟ تمہیں معلوم نہیں دھندے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ وہ تیار ہوئی ہے یا نہیں؟؟"

کلو نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور یہ کہہ کر نیچے اتر گیا

"ہاں تیار ہو گئی ہے۔ میں ٹھیکے پر جا رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا۔"

جب وہ چلا گیا تو بائی جی نے جس کی جوانی گزر چکی تھی مگر بناؤ سنگھار کی وجہ سے ابھی تک اس میں تھوڑی بہت دلکشی نظر آ رہی تھی زینے کے قریب جا کر اوپر آواز دی۔

"چھمیا جان! بہت ہو چکا بناؤ سنگھار اب نیچے اتر آؤ۔ ٹائم ہو چکا ہے"

بائی نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ۔ یہیں سے اٹھ کر چلے جانا۔ زیادہ دیر مت بیٹھنا۔"

میں مجرے والے کمرے میں کونے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں کلو بھی آگیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بائی سے کہا۔

"یہ یہاں کس لئے بیٹھا ہے؟"

بائی نے کہا۔

"اسے بیٹھا رہنے دو۔ تھوڑی دیر میں چلا جائے گا۔"

سارنگی طبلے بجانے والے بھی آگئے اور ساز وغیرہ سر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چھمیا جان بھی آگئی۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے طوائف نہ لگی۔ میں نے بڑی بڑی گانے بجانے والیاں دیکھی تھیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر طوائفوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ ایک حیرانی سی تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی سانولی سی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ خوب بنی سنوری تھی۔ وہ بائی جی کے پاس گاؤں تکیے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ بائی نے اس کی بلائیں لیں اور کہا۔

"میں قربان جاؤں"

ایک نوکر پان دان اور تھالی لے کر آیا اور بائی جی کے آگے رکھ کر چلا گیا۔ بائی جی پان بنانے لگی۔ بائی جی نے گھنگھروؤں کی جوڑی چھمیا جان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"لو بیٹی اسے پہن لو"

چھمیا جان نے کوئی حرکت نہ کی۔ بائی جی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور ذرا سختی سے کہا۔

"پہن لو ناں"

چھمیا جانا یان بادل نخواستہ پاؤں میں گھنگھرو باندھنے لگی۔ ایک بوڑھا پھولوں کے ہار بانس کی ڈنڈی پر لٹکائے آگیا اور چھمیا جان اور بائی جی کی تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔ بائی جی نے کہا۔

"ادھر ہو کر بیٹھ جا سائیں"

اتنے میں ایک موٹی توند والا آدمی اپنے خوشامدیوں کے ساتھ آگیا۔ بائی جی نے اسے

جھک کر سلام کیا اور کہنی مار کر چھمیا جان کو بھی سلام ادب پیش کرنے کا اشارہ کیا۔

"سیٹھ جی! کیا پئیں گے؟ آپ کی مرضی کی ہر چیز موجود ہے۔"

کلو شراب کی بوتل اور کچھ گلاس لے آیا۔ وہاں شراب کا دور چلنے لگا۔ پھر مجرا شروع ہو گیا۔ چھمیا جان نے گانا شروع کیا۔ اس کی آواز سپاٹ تھی اور گانے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے گانا نہیں آتا اور وہ زبردستی گا رہی ہے۔ سیٹھ پانچ پانچ روپے کے نوٹ لٹانے لگا۔ اسی دوران بائی جی نے دو ایک بار میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مگر میں ابھی وہاں مزید کچھ دیر ٹھہرنا چاہتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ بازار میں خون ہو گیا ہے اور قاتل کو پولیس نے اس کوٹھے پر آتے دیکھا ہے پولیس ضرور نیچے موجود ہو گی۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میری گاڑی کے جبل پور ریلوے سٹیشن سے چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے بائی جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پتلون کی جیب میں جو ہاتھ ڈالا ہوا تھا اسے ذرا ہلایا۔ جیسے اسے کہا کہ ریوالور میری جیب میں ہی ہے۔ ابھی میں یہاں کچھ دیر بیٹھوں گا۔ بائی جی نے منہ دوسری طرف کر لیا اور تماش بین سیٹھ کو پان لپیٹ کر پیش کیا۔ اتنے میں نیچے سے ایک اور تماش بین آگیا۔ سیٹھ نے اس کی طرف دیکھ کر بازو لہرا کر کہا۔

"آؤ آؤ دھرم چند۔ ارے تم کہاں رہ گئے تھے؟"

معلوم ہوا کہ وہ بھی سیٹھ کے حواریوں میں سے تھا۔ دھرم چند تماش بین سیٹھ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بائی جی! گلی میں بازار میں پولیس ہی پولیس ہے۔ کہتے ہیں کسی کا خون ہو گیا ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بائی جی نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور دھرم چند سے کہا۔

"سنا ہے شام کو بازار میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ ہمیں کیا۔ فکر نہ کریں سیٹھ جی پولیس ہمارے کوٹھے کا رخ نہیں کر سکتی"

مجرا ہوتا رہا۔ اب میرے لئے اس کوٹھے سے نیچے اترنا خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بائی جی علاقے کے تھانیدار کو ہر ماہ بھاری رقم ادا کرتی ہے جس کی وجہ

سے پولیس اس کے کوٹھے پر قاتل کی تلاش میں نہیں آئی تھی۔ اس اعتبار سے میں وہاں محفوظ تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں کوئی دوسری گاڑی پکڑلوں گا لیکن ابھی کوٹھے سے نہیں اتروں گا۔ میرا پکڑا جانا یقینی تھا مجھے ایک دو سپاہیوں نے گلی میں گھستے دیکھ لیا تھا وہ مجھ ہی کو قاتل سمجھ رہے تھے۔ ظاہر خون کرنے والا یا والے تو پولیس کی گرفت میں نہیں آئے ہوں گے وہ تو فرار ہو چکے ہوں گے۔ ایک میں ہی رہ گیا تھا۔ پولیس مجھ ہی کو پکڑ کر اپنی خانہ پری کرنا چاہتی تھی۔ میری یہ پوزیشن تھی کہ خون میں نے نہیں کیا تھا لیکن ایک بار تھانے پہنچ گیا تو میری پرانی فائلیں کھل سکتی تھیں اور یہ مجھے کسی حال میں بھی گوارا نہیں تھا۔

چھمیا جان بیٹھے بیٹھے نرت کرنے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہوئے گا رہی تھی اور کبھی کبھی سب کی نظریں بچا کر میری طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس کی نظروں میں مجھے رحم طلبی اور حسرت انگیزی نظر آرہی تھی۔ خدا جانے وہ مجھے کیا کہنا چاہتی تھی۔ ساری محفل میں اسے میں ہی ایک ایسا شخص نظر آرہا تھا جو اس کے مجرے اور گانے سے بالکل بے تعلق کونے میں بیٹھا تھا۔ اور میں اس کے لئے اجنبی بھی تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد تماش بین سیٹھ نشے میں لہراتا ہوا اپنے خوشامدیوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

بائی جی! اب منی جان کے کوٹھے پر جائیں گے۔"

سیٹھ نے چھمیا جان کے گال کی چٹکی لی۔ چھمیا جان نے منہ نفرت سے دوسری طرف کرلیا۔ سیٹھ نے بہکی ہوئی آواز میں بائی جی سے کہا۔

"بائی جی! بات آج ہی پکی کرلو میں ایک ہزار اور دے دوں گا"

بائی جی نے کہا۔

"سیٹھ جی! آپ سلامت رہیں۔ مجھے پیسوں کا لالچ نہیں ہے۔ لڑکی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ دو چار دن اور صبر کرلیں"

سیٹھ بولا۔

"ہائے ہائے۔ کہاں تک صبر کروں بائی جی چلو دھرم چند منی کے پاس چلتے ہیں منی

جان۔ منی جان کے پاس۔۔۔"

جب سارے تماش بین چلے گئے تو بائی جی جلدی جلدی دری پر بکھرے ہوئے نوٹ اکٹھے کرنے لگی۔ کلو اور سازندے بھی نوٹ اٹھا اٹھا کر بائی جی کو دینے لگے۔ میں خاموش بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ چھمیا جان بالکل معصوم سی گھریلو لڑکی لگ رہی تھی سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ جیسے اسے وہاں کے ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میرے بارے میں چونکہ بائی جی کلو کو یہ کہہ چکی تھی کہ یہ میرے ملنے والوں میں سے ہے اس لئے کلو بھی مجھے وہاں سے جانے کے لئے نہیں کہہ رہا تھا۔

بائی جی نوٹوں کو ابھی گن ہی رہی تھی کہ اچانک دو آدمی اندر آگئے۔ انہوں نے اندر آتے ہی خنجر نکال لئے۔ ایک پیچھے کھڑا رہا۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر کلو کو جو بائی جی کا بدمعاش اور باڈی گارڈ تھا دبوچ لیا اور اس کی گردن پر خنجر رکھ کر بائی جی سے کہا۔

"بائی جی سارے نوٹ ادھر رکھ دو"

بائی جی زیادہ نہیں گھبرائی تھی۔ شاید اس قسم کی وارداتیں اس بازار کا معمول تھیں یا وہاں کے ماحول کا حصہ تھیں لیکن وہ نوٹوں سے بھرا ہوا رومال ڈاکوؤں کو پکڑاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ دوسرے ڈاکو نے آگے بڑھ کر بائی جی کو ایک طرف دھکا دے کر گرا دیا اور نوٹوں سے بھرا ہوا رومال اٹھا لیا۔ دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"منگو! ارے اس چھمیا جان کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔ نئی نویلی بازار میں آئی ہے۔ ابھی اس کی نتھ بھی نہیں اتری۔"

کمال کی بات یہ تھی کہ ابھی تک ان ڈاکوؤں میں سے کسی نے بھی میری طرف توجہ نہیں کی تھی۔ شاید وہ مجھے کوئی نشئی نوجوان سمجھ رہے تھے جو چرس پی کر کونے میں گھٹ ہو کر بیٹھا تھا۔ کلو بدمعاش بھی کوئی مدافعت نہیں کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ڈاکو چاہے سب کچھ لے جائیں مگر مجھے اپنی جان بچانی ہے۔ میں اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالوں۔

جب دوسرے ڈاکو نے چھمیا جان کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچا تو لڑکی

کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تجھے اللہ کا واسطہ ہے۔ مجھے کچھ نہ کہنا۔ میں کسی کی امانت ہوں۔"

خدا جانے یہ لڑکی کی رحم طلبی کا اثر تھا یا اس نے جس طرح سے اللہ کا نام لیا تھا اس کا اثر تھا۔ بس میرے اندر ایک بجلی سی لہرا گئی۔ ویسے بھی میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہونے کی حیثیت سے ان سب پر بھاری تھا مگر اللہ کا نام سن کر میرے رگ وپے میں جیسے آسانی بجلی چارج ہو گئی۔ میرا جسم فولاد کی طرح سخت ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی اور سب سے پہلے اس ڈاکو پر جھپٹ کر پیچھے گرا دیا جس نے کلو کو خنجر کی نوک گردن پر رکھ کر پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ڈاکو نے چھمیا کو چھوڑ دیا اور پوری طاقت سے مجھ پر خنجر کا وار کیا۔ میرے لئے وہ اناڑی ہی تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جب دشمن پر وار کیا جاتا ہے تو خنجر کو اوپر سے نہیں نیچے سے اوپر کی طرف لایا جاتا ہے۔ میں نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ اس کا سر زمین کے ساتھ بڑی زور سے ٹکرایا اور وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے ڈاکو کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ میں نے اسے جھٹکا نہ دیا۔ میں اسے خوامخواہ ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی گردن پر ایک جانب دباؤ ڈال دیا۔ ڈاکو کے جسم میں آکسیجن داخل ہونا بند ہو گئی۔ اور وہ چند سیکنڈ بعد بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اسے بھی نیچے گرا دیا۔

بائی' اس کا باڈی گارڈ کلو اور چھمیا جان مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی جلدی اور اتنی مہارت کے ساتھ دو خنجر سے مسلح ڈاکوؤں پر قابو ہی نہیں پالوں گا بلکہ انہیں بے ہوش کر کے پھینک دوں گا۔ بائی جی نے کلو سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کلو رے۔ ان کو کسی طرح کوٹھے پر لے جا۔ پولیس کو پتہ چل گیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔ یہاں کوئی تماش بین نہیں آئے گا۔"

کلو بولا۔

"بائی جی! ان کو میں کہاں لے جاؤں؟"

بائی جی بولیں۔

"ارے! یہ کہیں مر تو نہیں گئے دیکھو تو کلو!"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"نہیں۔ یہ مرے نہیں۔ صرف بے ہوش ہیں۔"

"ارے تمہیں کیا پتہ۔ ہائے ہائے۔ بازار میں پہلے ہی ایک خون ہو گیا ہوا ہے۔"

کلو نے جھک کر دونوں بے ہوش ڈاکوؤں کی نبضیں دیکھیں اور بولا۔

"بائی یہ زندہ ہیں"

"خدا کا واسطہ ان کو یہاں سے اٹھا۔ ایسا کرو۔ پچھلے دروازے سے لے جا کر انہیں گلی میں پھینک آؤ۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں ہو گا۔"

پھر میری طرف ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بھیا! تو نے ہمیں ڈاکوؤں سے تو بچا لیا ہے مگر دوسری مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اب کلو کے ساتھ انہیں اٹھا کر گلی میں لے جاؤ۔"

میں نے بائی جی سے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا چلو کلو۔ تم اسے اٹھاؤ۔"

ایک بے ہوش ڈاکو کو میں نے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ دوسرے ڈاکو کو کلو نے اٹھا لیا۔ دالان میں سے ایک زینہ پچھلی گلی کو جاتا تھا۔ ہم زینے پر سے اتر کر عقبی گلی میں آگئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ یہ بڑی تنگ سی گلی تھی اور اس طرف طوائفوں کے کوٹھوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔ ہم نے دونوں بے ہوش ڈاکوؤں کو دو تین مکان آگے لے جا کر گلی میں ڈال دیا اور واپس آگئے۔

بائی جی پریشانی کے عالم میں زینے کے اوپر دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ ہمیں آتا دیکھا تو پیچھے ہٹ گئی۔ ہم کمرے میں آگئے۔ بائی جی نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ چھمیا جان وہاں نہیں تھی۔ بائی جی نے اسے اوپر والے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ ہمیں

آتا دیکھ کر بائی جی نے اوپر والے کمرے کو جو زینہ جاتا تھا اس طرف منہ کر کے آواز دی۔

"چھمیا! اندر سے کنڈی لگا کر سو جاؤ اب دھندا نہیں ہو گا"

سازندے اس لڑائی مار کٹائی میں طبلے سارنگیاں وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ بائی جی نے کلو سے کہا۔

"میرے ساتھ آ۔ اس سے پہلے کہ ہم پر کوئی مصیبت آجائے میں تھانیدار کپور سے ابھی ملنا چاہتی ہوں"

کلو بولا۔

"بائی جی اس کے پاس کیوں جا رہی ہو۔ کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے"

بائی جی نے خدا جانے کیا سکیم سوچ رکھی تھی۔ اس نے کلو کو گالی دے کر کہا۔

"تو چلتا ہے کہ نہیں۔ آ میرے ساتھ"

پھر مجھ سے کہا۔

"بھیا! تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میں جانتی ہوں تم خود بھی یہاں کچھ دیر تک رہنا چاہتے ہو۔ بس تھوڑی دیر کے لئے جاؤں گی۔ تم اتنی دیر یہاں رکھوالی کرنا۔ مجھے تم ایسا بہادر رکھوالا کہیں نہیں مل سکتا"

میں نے دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی رات کے سوا دس ہی بجے تھے۔ میری گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے کہا۔

"میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ مگر تم لوگ زیادہ دیر مت لگانا"

بائی جی نے ساڑھی کے اوپر شال اوڑھی اور کہا۔

"تم بھی ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر لینا کوئی تماش بین آئے تو دروازہ بالکل نہ کھولنا۔ خود ہی واپس چلا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کی بتیاں بجھا دیں۔ صرف دالان والا بلب جلتا رہنے دیا۔ وہ یہ کہتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

"جو مصیبت مجھ پر کل نازل ہونے والی ہے میں اس کو آج ہی ختم کرنا چاہتی ہوں۔

تھانیدار کو میں اتنی رقم آخر کس لئے دیتی ہوں۔"

ڈیوڑھی والے دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھے کہا۔

"بھیا! دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لینا چاہے کوئی آجائے دروازہ مت کھولنا"

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور اوپر دالان میں آگیا۔ دالان میں بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ میں مجرے والے کمرے میں آکر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے وقت گزارنے کے لئے اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جن دو بدمعاشوں کو ہم بے ہوشی کی حالت میں پچھلی اندھیری گلی میں پھینک آئے تھے ان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ انہیں کم از کم دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ ہوش آ بھی گیا تو وہ کم از کم بائی جی کے کوٹھے کا رخ نہیں کریں گے اور پولیس کے پاس بھی رپورٹ درج کرانے نہیں جائیں گے۔ اس قسم کی وارداتیں کرنے والے کسی واردات میں مار کھانے کے بعد تھانے شکائت لے کر نہیں جایا کرتے بلکہ دوسری واردات کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا اور سوچنے لگا کہ مجھے زیادہ نہیں تو ایک گھنٹے تک وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اس علاقے میں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی اب مناسب نہیں تھا۔ مجرے والے کمرے کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اندر اندھیرا تھا۔ دالان میں جو بلب جل رہا تھا صرف اس کی تھوڑی سی روشنی اندر آرہی تھی۔ نیچے گلی میں سے کبھی کبھی کوئی آدمی گزر جاتا تھا۔ گلی کے کسی دوسرے مکان سے گانے بجانے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ کھڑکیاں بند کر کے اندر مجرا ہو رہا ہے۔ بائی جی کو گئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں تکئے سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے باہر دالان میں جھانک کر دیکھا۔ دالان کے کونے میں اوپر جانے والے زینے کا دروازہ صاف نظر آرہا تھا۔ یہ دروازہ کھلا تھا۔ میں ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ چھمیا جان یعنی وہی شرمیلی اور حیرت زدہ مظلوم چہرے والی لڑکی دروازے پر نمودار ہوئی اور دوڑ کر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے معمولی

شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور چادر بھی اوڑھی ہوئی تھی۔ چہرے کا میک اپ بھی صاف کر دیا تھا۔ وہ آتے ہی بولی۔

"کیا تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ مسلمان ہوں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ اور تم نیچے کس لئے آئی ہو؟"

اس نے چادر کی بکل میں سے ہاتھ باہر نکالا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پاکٹ بک سائز کی کوئی کاپی تھی۔ کہنے لگی۔

"اس میں اللہ پاک کا کلام آیت الکرسی چھپی ہوئی ہے۔"

اور اس نے چھوٹے سائز کی کتاب کھول کر میری آنکھوں کے سامنے کر دی۔ صفحات پر آیات قرآنی چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا۔

"یہ تم کس لئے لے آئی ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں اللہ کے پاک کلام کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں ایک شریف گھر کی بیٹی ہوں اور ابھی تک میری عزت محفوظ ہے۔ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ اس وقت اگر تم نے میری مدد نہ کی تو میری عزت' میرے ماں باپ کی عزت بازار میں نیلام ہو جائے گی۔ رات جب میں نیچے آئی تھی تو اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگ کر آئی تھی کہ اے اللہ پاک تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ مجھے یہاں سے نکال دے۔ اللہ نے میری دعا قبول کی اور تمہیں یہاں بھیج دیا۔"

میں نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگی۔

"اگر تم سچے مسلمان ہو تو تمہیں اللہ کے پاک کلام کا واسطہ دیتی ہوں کہ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے نکال کر لے چلو اگر تم نے میری مدد نہ کی تو حشر کے دن میں تمہارا

دامن پکڑ کر خدا سے کہوں گی کہ یہ وہ شخص ہے جس کی بزدلی کی وجہ سے میری اور میرے خاندان کی عزت اور ناموس برباد ہوئی۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور سیدھے ہاتھ میں آیت الکرسی والی کاپی یا کتاب تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے آیت الکرسی لے کر اسے چوم کر آنکھوں سے لگایا اور اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔

"اسے اوپر والے کمرے میں جہاں سے اٹھا کر لائی ہو وہیں رکھ کر نیچے آجاؤ۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے چلوں گا۔"

اس کے مظلوم چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اٹھی اور دوڑ کر دالان پار کیا۔ اوپر جا کر کتاب کسی محفوظ جگہ پر رکھی اور الٹے قدموں واپس آگئی۔ میں نے سوچا وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے جانا کہاں ہے۔ بس میرے دل نے کہا کہ اس مظلوم لڑکی کی مدد کروں۔ اسے گناہ کی دلدل سے نکال کر لے جاؤں۔ اور میں نے اسے نکال لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر میں وہاں سوچنا شروع کرتا تو میرا دماغ سو طرح سے مجھے دلیلیں دے دے کر اس کام سے روک لیتا۔ فیصلہ میرے دل نے کیا تھا۔ میں دماغ کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دماغ مجھے یہ کام نہیں کرنے دے گا۔ اور یہ کام میں اللہ کے بھروسے کر گزرنا چاہتا تھا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اس سے کہا۔

"میں ڈیوڑھی والی گلی کی طرف سے نہیں نکلنا چاہتا۔ کیا کوئی دوسرا راستہ ہے؟"

وہ بولی۔

"میرے ساتھ آؤ"

دالان کے کونے میں ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ وہ غسل خانہ تھا۔ وہ مجھے اس غسل خانے میں لے گئی۔ غسل خانے میں ایک اور چھوٹا دروازہ تھا وہ آگے آگے تھی۔ دروازے کی دوسری طرف چھوٹا سا زینہ نیچے جاتا تھا۔ ہم زینہ اتر کر ایک ایسی گلی میں آگئے جو بہت ہی تنگ اور اندھیری تھی۔ وہ بولی۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

اس گلی میں سے ایک اور تنگ و تاریک راستہ دوسری گلی کو جاتا تھا۔ اس گلی میں بھی اندھیرا تھا۔ یہاں سے ہم ایک اور تنگ گلی میں سے ہوتے ہوئے باہر نکلے تو سامنے چوک آگیا۔ لڑکی میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ مجھے ان بازاروں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اتنا ضرور معلوم تھا کہ یہ علاقہ جبل پور کے ریلوے سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لڑکی نے ایک خالی موٹر رکشا رکوایا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ لڑکی نے رکشے والے کو ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے کو کہا۔ سٹیشن تک ہم نے کوئی بات نہ کی۔ میرے دل میں یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ بائی جی اور کلو کو جب لڑکی کے فرار کا پتہ چلا تو ان کے آدمی لاریوں کے اڈے اور ریلوے سٹیشن کی طرف نکل پڑیں گے۔ ریلوے سٹیشن پر رکشے سے اترنے کے بعد میں نے لڑکی سے کہا۔

"وہ لوگ ہماری تلاش میں سٹیشن پر ضرور آئیں گے۔"

لڑکی بولی۔

"ہمیں انبالے کی طرف جانے والی جو گاڑی ملے گی اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائیں گے۔ لاری اڈے پر بائی جی کے آدمی پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔"

میں نے لڑکی کو سٹیشن کے اندر ایک طرف بٹھا دیا اور خود انکوائری والی کھڑکی پر آکر معلوم کیا کہ پنجاب کو اس وقت کون سی گاڑی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ پنجاب کو رات ایک بجے کے بعد ٹرین جائے گی۔ مگر اس وقت کانپور کو ایک گاڑی جانے والی تھی۔ میں نے فوراً کانپور کے دو ٹکٹ لئے اور جلدی جلدی خود بھی چلتا اور لڑکی کو بھی چلاتا اس پلیٹ فارم پر آگیا جہاں کانپور جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں گاڑی تیار مل گئی۔ یوں ہم چند لمحوں کے بعد جبل پور سے نکل گئے۔ ہم تھرڈ کلاس کے مردانہ ڈبے میں بیٹھے تھے۔ لڑکی نے چادر سے سر اور آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ڈبے میں زیادہ تر یوپی کے دیہات کے لوگ سوار تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ان کے بچے بھی تھے۔ ٹرین جبل پور سے دور نکل گئی تو میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں انبالے جانا ہے؟"

اس نے کہا۔

"کسی سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہو گی تو بتاؤں گی"

چلتی ٹرین کے شور میں ویسے بھی ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح اور راز داری سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں تھوڑا اونچا بولنا پڑتا تھا۔ میں نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ایک سٹیشن پر گاڑی رکی۔ کوئی بڑا سٹیشن تھا۔ نام یاد نہیں رہا۔ ہمارے ڈبے میں سے کافی سواریاں اتر گئیں۔ رات کا وقت تھا۔ وہاں سے دو ایک سواریاں ہی چڑھیں۔ ڈبے میں رش بہت کم ہو گیا تھا۔ ہم کھڑکی والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ ہمارے دائیں بائیں کوئی مسافر نہیں تھا۔ لڑکی کہنے لگی۔

"ہاں۔ میں انبالے جاؤں گی۔ انبالے میں ہی ہمارا گھر ہے۔"

میں نے کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر دیکھ رہا تھا۔ بلکہ ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ کہیں میرے پیچھے تو کوئی خفیہ پولیس والا نہیں لگا ہوا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے لڑکی سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس کو بائی جی کے آدمیوں نے کیسے اور کہاں سے اغوا کر لیا تھا اور یہ کہ اس کے کتنے بہن بھائی ہیں۔ والد صاحب کیا کرتے ہیں۔ وہ کیسے ان لوگوں کے پھندے میں پھنس گئی۔ اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی شریف گھرانے کی ہے اور اسے اس کے ماں باپ تک پہنچانا میرا فرض ہے۔ اس نے خود ہی کہا۔

"میرے ابو کی انبالے چھاؤنی میں کریانے کی دکان ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن چھاؤنی کے ایک سکول میں استانی ہے۔ اس کی اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے۔ پندرہ بیس روز پہلے کی بات ہے۔ میں انبالے شہر میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں مہندی کی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں رات ہو گئی تو اس ڈر سے کہ امی ابو ناراض ہوں گے کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگا دی رات کے وقت اکیلی ہی مہندی والے گھر سے نکل پڑی۔ میں اس شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ میرے لئے کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ بازار میں آکر ایک خالی رکشا لینے لگی تو اچانک پیچھے سے ایک کار آکر میرے قریب رکی

اس میں سے تین آدمی نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر اور پستول تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے دبوچ کر گاڑی میں ڈالا اور میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نیچے ڈال دیا۔ ایک آدمی نے میری ناک پر گیلا رومال رکھ کر زور سے دبا دیا۔ اس میں بے ہوشی کی دوائی تھی۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو میں اسی گاڑی میں تھی اور گاڑی کسی میدان میں دوڑی جا رہی تھی۔ بہرحال اس طرح میں بائی جی کے کوٹھے پر پہنچ گئی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہی ہے بائی جی نے میری ناک میں جو چھید تھا اس میں نتھنی ڈال دی۔ اب وہ کسی موٹی آسامی کے پاس میرا سودا کرنا چاہتی تھی میں آیت الکرسی والی چھوٹی سی کاپی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتی تھی۔ اس وقت بھی یہ کاپی میرے ساتھ ہی تھی۔ میں راتوں کو خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر آیت الکرسی پڑھتی اور خدا سے دعائیں مانگتی کہ وہ میری عزت بچا لے اور مجھے یہاں سے نکال کر میرے گھر پہنچا دے۔ خدا نے میری فریاد سن لی اور تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گی۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا

لڑکی نے کہا۔

"میرا نام نور جہاں ہے"

جبل پور سے کانپور تک بڑا لمبا سفر تھا۔ دوسرے دن رات کے وقت گاڑی الہ آباد سے ہوتی ہوئی کانپور پہنچی۔ یہاں سے میں نے دو ٹکٹ انبالے کے لئے اور دوسری گاڑی پکڑی جو لکھنؤ کی طرف نہیں جاتی تھی بلکہ کانپور سے فتح گڑھ' بدایو' بریلی' مراد آباد' نگینہ اور سہارن پور سے ہوتی ہوئی انبالے اور اس سے آگے مشرقی پنجاب کو جاتی تھی۔ مجھے نور جہاں کو انبالے کینٹ میں اس کے گھر پہنچا کر آگے جالندھر اور جالندھر سے جموں کی طرف نکل جانا تھا۔ یہ بھی بڑا لمبا روٹ تھا۔ ٹرین کانپور سے آدھی رات کے بعد روانہ ہوئی۔ دوسرا دن بھی سفر میں گزر گیا۔ رات آ گئی۔ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کہیں انبالہ کینٹ کا سٹیشن آیا۔ ہم ٹرین سے اتر کر سٹیشن کے باہر آ گئے۔ رات کے

وقت ہر طرف خاموشی تھی۔ دو تین موٹر رکشا کھڑے تھے۔ نور جہاں نے رکشا والے کو اپنے محلے کا نام بتایا اور ہمارا رکشا روانہ ہو گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آدھی رات کو اچانک اپنی بیٹی کو سامنے دیکھ کر اس کے ماں باپ اور بڑی بہن کس قدر حیران اور خوش ہو گی۔ انبالہ چھاؤنی کے ایک محلے کے باہر نور جہاں نے رکشا رکوا دیا۔ کہنے لگی۔

"اس گلی میں ہمارا گھر ہے"

اور اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ معمولی بوسیدہ سا مکان تھا۔ نور جہاں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تین چار بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اوپر والی منزل کی کھڑکی میں سے کسی مرد نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہے بھائی"

نور جہاں نے روتے ہوئے کہا۔

"ابا میں ہوں نور جہاں"

اور نور جہاں کی ہچکی بندھ گئی۔ اوپر سے اس کے والد نے منہ پیچھے کر کے کہا۔

"نفیسہ بانو۔ ارے بیٹی آ گئی ہے۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہاں ایک کہرام سا مچ گیا۔ یہ غم کا نہیں خوشی کا کہرام تھا۔ سب رو رہے تھے۔ نور جہاں کو گلے لگا لگا کر رو رہے تھے۔ میں چھوٹے سے کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بچی کو میں گناہ کے جہنم سے نکال کر لایا ہوں تو اس کے والد نے مجھے گلے لگا لیا۔ ماں میرا ماتھا چومنے اور دعائیں دینے لگی۔ میرے آرام کے لئے مکان کی بیٹھک کھول دی گئی۔ یہاں ایک پرانا پلنگ بچھا تھا۔ یہ شمالی ہند یعنی آج کے بھارتی اتر پردیش کا علاقہ تھا اور یہاں رات کو سردی پڑتی تھی۔ میں انہی کپڑوں میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سوچنے لگا مجھے صبح ہونے سے پہلے جالندھر جانے والی گاڑی یا کوئی لاری پکڑنی چاہیے میں دن کی روشنی میں وہاں سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن جب ایک بار سو گیا تو آنکھ اس وقت کھلی جب دن کے دس بج رہے تھے۔

نور جہاں کا والد میرے لئے ناشتہ لے کر آگیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جالندھر کی طرف وہاں سے گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہوڑہ ایکسپریس دن کے سوا ایک بجے انبالے کینٹ پہنچتی ہے۔ اور وہی ٹرین آگے جالندھر امرتسر کو جاتی ہے۔ نور جہاں کے والد نے مجھ سے پوچھا کہ میں جالندھر کس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"بیٹا! تم پنجابی مسلمان ہو۔ جالندھر میں شاید ہی کوئی پنجابی مسلمان رہتا ہو کیا تمہارا جبل پور میں کوئی کاروبار ہے"؟

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"بس چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں"

"ارے بیٹا! ابھی تو گاڑی کے آنے میں بہت وقت ہے۔ سٹیشن پر کہاں جا کر بیٹھو گے"

میں نے کہا۔

"شکریہ! مجھے انبالے چھاؤنی میں ضرورت کی دو چار چیزیں بھی خریدنی ہیں۔"

میرے جانے کا سن کر نور جہاں۔ اس کی بڑی بہن نفیسہ اور اس کی والدہ بھی بیٹھک میں آگئی۔ سب میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ نور جہاں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"بھیا! ہم لوگ تمہارے احسان کو ساری زندگی یاد رکھیں گے۔"

بہرحال میں وہاں سے نکل کر انبالہ چھاؤنی کے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ بازار میں آکر ٹیکسی پکڑی اور ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ سٹیشن پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں نے جالندھر کا ٹکٹ خرید کر جیب میں رکھ لیا اور پلیٹ فارم پر بیٹھنے کی بجائے سیکنڈ کلاس کے ریفرشمنٹ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ بڑا خاموش خاموش ماحول تھا۔ بیرے کو چائے کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگا کر سرسری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا۔ دو تین میزوں پر کچھ خوش پوش لوگ بیٹھے کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کونے میں ایک سکھ فیملی بیٹھی تھی۔ سکھ کوئی فوجی تھا اور یونی فارم میں تھا۔ ساتھ اس کی بیوی اور ایک چھوٹی بچی تھی۔

ہی سکھ اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے کئی روز سے بھارت کا کوئی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ سوچا ہئے پی لوں پلیٹ فارم کے سٹال سے اخبار لے کر پڑھوں گا۔ اخبار میں کشمیر کے محاذ کے رے میں خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ ان سے کشمیری حریت پسند مجاہدوں کی سرگرمیوں سے تعلق تازہ صورت حال معلوم ہو جاتی تھی۔ میرا حلیہ یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی یں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال تھے ڈاڑھی مونچھوں کے۔ سر کے بال لمبے یں تھے گردن سے ذرا نیچے تک آتے تھے۔ قمیض جیکٹ اور پتلون صحیح حالت میں ھی۔ برہان پور اور نرسنگ پور کے علاقے سے جب میں پولیس انسپکٹر کو موت کی نیند سلا کر فرار ہوا تھا تو میرا حلیہ تقریباً یہی تھا۔ اس سے پہلے کے کمانڈو ایکشن میں میری ڈاڑھی ونچھیں اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے جبل پور آکر بال بھی چھوٹے کروا لئے ھے اور کپڑے بھی بدل لئے تھے۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے کھانا بھی ریفرشمنٹ روم میں ہی منگوا لیا۔ طرح وہاں بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔ اس دوران سکھ فوجی اپنی فیملی کے ساتھ اٹھ کر جا چکا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تھا تو میں نے ہاتھ سے چمچ نیچے گرا دی تھی ر اسے اٹھانے کے لئے جھک گیا تھا۔ اس طرح میں نے اپنا چہرہ اس سے چھپا لیا تھا۔ کوئی طرے والی بات نہیں تھی لیکن احتیاط کے طور پر نے ایسا کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارت کے اور خاص طور پر مشرقی پنجاب کے پولیس سٹیشنوں پر یقیناً میری تصویر بطور ب پاکستانی مفرور جاسوس کے موجود تھی اور اس علاقے میں سے گزرتے ہوئے میں اص طور پر احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

اتنے میں باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کی نقل و حرکت کچھ تیز ہو گئی اور آوازیں بھی نے لگیں۔ معلوم ہوا کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ میں نے بیرے کو بلا کر پوچھا کہ کون سی ڑی آ رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ کلکتہ سے امرتسر جانے والی ہوڑہ میل آ رہی ہے۔ میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ اس وقت مجھے سٹال سے اخبار خریدنا ل یاد نہ رہا۔ اگر یاد رہتا اور میں سٹال پر سے انگریزی یا ہندی کا کوئی اخبار خرید کر دیکھ

لیتا تو اس بھیانک مصیبت سے بچ سکتا تھا جو مجھ پر آگے جا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی سکھ اخبار پڑھ رہا تھا۔ مین نے کئی روز سے بھارت کا کوئی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ سوچا
ہونے والی تھی۔ ٹرین جلدی آگئی تھی۔ نور جہاں کے والد کو ہوڑہ میل کے صحیح ٹائم کا علم جائے پی لوں پلیٹ فارم کے سٹال سے اخبار لے کر پڑھوں گا۔ اخبار میں کشمیر کے محاذ کے
نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی جب میں ریفرشمنٹ روم سے نکل کر بارے میں خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ ان سے کشمیری حریت پسند مجاہدوں کی سرگرمیوں سے
باہر آیا تھا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ سکھ مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹرین آکر رکی تو متعلق تازہ صورت حال معلوم ہو جاتی تھی۔ میرا حلیہ یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی
مجھے بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ کسی نہ کسی طرح مجھے جالندھر پہنچنا تھا نہیں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال تھے ڈاڑھی مونچھوں کے۔ سر کے بال لمبے
تاکہ رات ہونے سے پہلے پہلے جالندھر سے جموں جانے والی لاری پکڑ سکوں۔ ہوڑہ میل نہیں تھے گردن سے ذرا نیچے تک آتے تھے۔ قمیض جیکٹ اور پتلون صحیح حالت میں
کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد چل پڑی۔ تھی۔ برہان پور اور نرسنگ پور کے علاقے سے جب میں پولیس انسپکٹر کو موت کی نیند سلا
انبالے کے بعد لدھیانے کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں ڈبے سے اتر پڑا۔ ڈبے میں کر فرار ہوا تھا تو میرا حلیہ تقریباً یہی تھا۔ اس سے پہلے کے کمانڈو ایکشن میں میری ڈاڑھی
بے حد رش تھا اور میں ان مسافروں میں بالکل پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی مونچھیں اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے جبل پور آکر بال بھی چھوٹے کروا لئے
دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھنا چاہیے اس طرح بیٹھے بیٹھے تو میری ٹانگیں اکڑ جائیں گی۔ تھے اور کپڑے بھی بدل لئے تھے۔
پلیٹ فارم پر اترا تو دیکھا کہ ٹرین کے ایک ڈبے میں ڈاک کے بڑے بڑے تھیلے لادے گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے کھانا بھی ریفرشمنٹ روم میں ہی منگوا لیا۔
رہے تھے۔ سامنے اخبار کا سٹال تھا۔ سوچا کوئی اخبار لے کر مقبوضہ کشمیر کے بارے [illegible] طرح وہاں بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔ اس دوران سکھ فوجی اپنی فیملی کے ساتھ اٹھ
تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی چاہیے۔ سٹال پر دلی سے شائع ہونے والے اردو کے کر جا چکا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تھا تو میں نے ہاتھ سے چمچ نیچے گرا دی تھی
دو ایک اخبار اور ہندی گورمکھی اور انگریزی کے اخبار پڑے تھے۔ میں نے انگریزی کا ایک اور اسے اٹھانے کے لئے جھک گیا تھا۔ اس طرح میں نے اپنا چہرہ اس سے چھپا لیا تھا۔ کوئی
اخبار اٹھا کر اس کا ورق الٹا تو میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اخبار میں میری تصویر کے ساتھ خطرے والی بات نہیں تھی لیکن احتیاط کے طور پر نے ایسا کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ
اشتہار چھپا ہوا تھا جس میں میری گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی تھا۔ میں نے اخبار بھارت کے اور خاص طور پر مشرقی پنجاب کے پولیس سٹیشنوں پر یقیناً میری تصویر بطور
وہیں تہہ کر کے رکھ دیا۔ دوسرا ہندی کا اخبار کھول کر دیکھا۔ اس میں بھی میری تصویر ایک پاکستانی مفرور جاسوس کے موجود تھی اور اس علاقے میں سے گزرتے ہوئے میں
چھپی ہوئی تھی۔ یہ تصویر میرے بالکل موجودہ حلیے کی تھی اور مجھے فوراً پہچانا جا سکتا تھا خاص طور پر احتیاط سے کام لے رہا تھا۔
میں چپکے سے وہاں سے کھسک کر ٹرین کی طرف بڑھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔ اتنے میں باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کی نقل و حرکت کچھ تیز ہو گئی اور آوازیں بھی
”او بابو۔ ذرا ادھر دیکھو“ آنے لگیں۔ معلوم ہوا کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ میں نے بیرے کو بلا کر پوچھا کہ کون سی
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سکھ فوجی مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گاڑی آ رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ کلکتہ سے امرتسر جانے والی ہوڑہ میل آ رہی ہے۔ میں
اخبار تھا۔ اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھ لی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ اپنی نے جلدی سے بل ادا کیا اور پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ اس وقت مجھے سٹال سے اخبار خریدنا
میں لگے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا۔ بالکل یاد نہ رہا۔ اگر یاد رہتا اور میں سٹال پر سے انگریزی یا ہندی کا کوئی اخبار خرید کر دیکھ

لیتا تو اس بھیانک مصیبت سے بچ سکتا تھا جو مجھ پر آگے جا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والی تھی۔ ٹرین جلدی آگئی تھی۔ نور جہاں کے والد کو ہوڑہ میل کے صحیح ٹائم کا علم نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی جب میں ریفرشمنٹ روم سے نکل کر باہر آیا تھا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ سکھ مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹرین آکر رکی تو مجھے بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ کسی نہ کسی طرح مجھے جالندھر پہنچنا تھا تاکہ رات ہونے سے پہلے پہلے جالندھر سے جموں جانے والی لاری پکڑ سکوں۔ ہوڑہ میل کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد چل پڑی۔

انبالے کے بعد لدھیانے کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں ڈبے سے اتر پڑا۔ ڈبے میں بے حد رش تھا اور میں ان مسافروں میں بالکل پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھنا چاہیے اس طرح بیٹھے بیٹھے تو میری ٹانگیں اکڑ جائیں گی۔ پلیٹ فارم پر اترا تو دیکھا کہ ٹرین کے ایک ڈبے میں ڈاک کے بڑے بڑے تھیلے لادے جا رہے تھے۔ سامنے اخبار کا سٹال تھا۔ سوچا کوئی اخبار لے کر مقبوضہ کشمیر کے بارے میں تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی چاہیے۔ سٹال پر دلی سے شائع ہونے والے اردو کے دو ایک اخبار اور ہندی گورمکھی اور انگریزی کے اخبار پڑے تھے۔ میں نے انگریزی کا ایک اخبار اٹھا کر اس کا ورق الٹا تو میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اخبار میں میری تصویر کے ساتھ اشتہار چھپا ہوا تھا جس میں میری گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی تھا۔ میں نے اخبار وہیں تہہ کر کے رکھ دیا۔ دوسرا ہندی کا اخبار کھول کر دیکھا۔ اس میں بھی میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ تصویر میرے بالکل موجوں حلیے کی تھی اور مجھے فوراً پہچانا جا سکتا تھا۔ میں چپکے سے وہاں سے کھسک کر ٹرین کی طرف بڑھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

"او بابو۔ ذرا ادھر دیکھو"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سکھ فوجی مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھ لی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ اپنی پیٹی میں لگے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا۔

"خبردار! یہیں کھڑے رہو۔ بھاگے تو گولی مار دوں گا۔"

لیکن میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے وہاں سے بھاگنا تھا اور جس طرف منہ اٹھے اسی طرف بھاگنا تھا اور بھاگتے چلے جانا تھا۔ ابھی سکھ فوجی جو کیپٹن کے عہدے کا فوجی تھا' ہولسٹر میں ریوالور نکال ہی رہا تھا کہ میں ٹرین کے ڈبے میں گھس گیا اور مسافروں کے اوپر سے چھلانگیں لگاتا ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے نیچے چھلانگ لگا کر ریلوے لائن کے جنگلے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ پیچھے سے ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جیسے کچھ لوگ مجھے پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑتے آرہے ہیں۔ مگر مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

اس کے بعد کیا ہوا' بھارت کے فرعون حصہ ہشتم

"بھارتی دہشت گرد" میں پڑھیئے

بھارت کے
فرعون
بھارتی دہشت گرد
اے حمید
50

میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔

اس دوران میں دو تین آدمیوں سے ٹکرایا۔ سکھ فوجی میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ مجھے ان کی "پکڑ لو۔ پاکستانی جاسوس ہے" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سکھ فوجی مجھ پر پیچھے سے فائر نہیں کر سکتا تھا۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر تھے۔ پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔ سامنے ریلوے یارڈ آگیا جہاں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میں جس رفتار سے بھاگ رہا تھا میرا دماغ اس سے دوگنی رفتار سے سوچ رہا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے اپنے آپ کو کیسے بچانا ہے۔ ریل کی پٹڑیوں میں میں آسانی سے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ وہاں لوگ بھی نہیں تھے۔ سکھ فوجی تربیت یافتہ کیپٹن تھا۔ وہ بڑی آسانی سے پستول کا فائر کر کے مجھے گرا سکتا تھا۔ جہاں پلیٹ فارم ختم ہوا وہاں مجھے بائیں جانب مال گاڑی کا ڈبہ کھڑا نظر آیا۔ میں تیزی سے اس ڈبے کے پیچھے ہو گیا۔ سامنے ریلوے گودام کا صحن تھا جہاں ٹرک پر سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ "پکڑ لو۔ پاکستانی جاسوس ہے" کی آوازوں نے میرے لئے بے حد مشکل پیدا کر دی تھی۔ جیسے ہی میں گودام کے صحن میں داخل ہوا۔ مزدوروں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مجھے پکڑنے کے لئے بازو پھیلا دیئے۔ عین اسی لمحے پستول کے دو تین فائر ہوئے۔ یہ ہوائی فائر ہی ہو سکتے تھے۔ سکھ فوجی مزدوروں کے ہوتے ہوئے مجھ پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔

میں مزدوروں کو دھکے دے کر نکل گیا۔ ایک سکھ مزدور میرے پیچھے دوڑا۔ میں گودام کے پیچھے نکل آیا۔ یہاں چار پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ میں نے دیوار پر چڑھ کر

دوسری طرف چھلانگ لگادی۔ میں اسٹیشن کے باہر سڑک پر آگیا تھا۔ مجھے بہت سے تانگے اور رکشے کھڑے نظر آئے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں رکشے میں گھس کر ڈرائیور سے کہتا کہ چلو۔ لوگوں کا شور میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ میں سڑک پار کرنے کے لئے دوڑا تو اچانک ایک سکھ سکوٹر سوار میرے سامنے آگیا۔ اس نے ایک دم بریک لگائی۔ میں نے اسے دھکا دے کر سکوٹر سے گرادیا۔ سکوٹر بھی ایک طرف گر پڑا سکوٹر کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے انتہائی تیزی سے سکوٹر کو اٹھایا اچھل کر اس پر بیٹھا اور ایک دم سے اس کی رفتار تیز کر کے جس طرف سکوٹر کا منہ تھا اسی طرف نکل گیا۔ ایک تانگے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں پوری رفتار سے سکوٹر بھگائے لئے جا رہا تھا۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ سڑک کی ایک جانب ریلوے لائن کی دیوار تھی جہاں سگنل کے کھمبے نظر آرہے تھے۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے کنارے کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ سڑک آگے کس طرف جاتی ہے۔ میں سکوٹر کو فل سپیڈ پر بھگائے لئے جا رہا تھا۔ سکوٹر میرا ساتھ دے رہا تھا۔

آگے ریلوے کا پل آگیا۔ میں نے سکوٹر کو پل پر ڈالنے سے پہلے ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک رکشا بڑی تیز رفتاری سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ یقیناً سکھ فوجی اس میں بیٹھا تھا اور اس نے رکشا میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ ریلوے پل پر کافی ٹریفک تھا اور دونوں طرف سے سواریاں آجا رہی تھیں۔ میں جتنی تیز وہاں سکوٹر چلا سکتا تھا۔ چلاتے ہوئے پل عبور کر گیا دوسری طرف سڑک کی دونوں جانب ہمارے لاہور کے گلبرگ کی طرز کی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں وہاں سے بھی نکل گیا۔ میں کسی ایسی چھوٹی سڑک یا تنگ راستے کی تلاش میں تھا جہاں سے میرے پیچھے لگا ہوا رکشا نہ گزر سکے۔ ایک جگہ کوٹھیوں کے عقب میں چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ اس کی ایک جانب درخت ہی درخت تھے اور دوسری جانب یعنی نہر کے کنارے اور کوٹھیوں کے پچھواڑوں کے درمیان بڑا تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ میرا سکوٹر وہاں سے گزر سکتا تھا مگر رکشا نہیں گزر سکتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ راستہ آگے کس طرف جاتا ہے میں نے سکوٹر ادھر موڑ دیا۔ یہ غیر ہموار

راستہ تھا۔ سکوٹر اچھل اچھل کر چل رہا تھا۔ یہ تنگ راستہ ختم ہوا تو آگے پھر ایک سڑک آگئی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ واقعی ایک رکشا تنگ راستے کے پاس آکر رکا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لئے میں خطرے سے باہر ہو گیا تھا۔ لیکن میں دشمنوں کے شہر میں تھا۔ اس شہر کے نشیب و فراز سے واقف بھی نہیں تھا۔ میرے پاکستانی جاسوس ہونے کا اعلان ہو چکا تھا۔ پولیس کو بھی اطلاع مل چکی ہوگی۔ کوئی تعجب نہیں تھا کہ اگلے چوک میں پولیس گھیرا ڈالے موجود ہو۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے اس شہر سے باہر نکل جانا چاہئے تھا۔ میرا رخ مشرق کی طرف تھا۔

کسی زمانے میں لدھیانہ شہر میں مسلمانوں کی بڑی زبردست آبادی تھی۔ اس شہر کے سیاسی' علمی اور دینی بصیرت رکھنے والے عالم فاضل مسلمانوں کی سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ کیسے کیسے ادیب' شاعر' سیاسی راہ نما اور علماء کرام لدھیانے میں رہا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے کلچر اور ثقافت کی لدھیانے شہر کے تمدن پر گہری چھاپ تھی۔ قیام پاکستان کے بعد لدھیانے کے مسلمانوں پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اور لدھیانے کی سرزمین زندہ مسلمانوں کے وجود سے محروم ہو گئی۔ اگر لدھیانے میں مسلمان رہ رہے ہوتے تو مجھے کسی نہ کسی مسلمان گھرانے میں پناہ مل سکتی تھی۔ لیکن تاریخ بدل چکی تھی۔ لدھیانے میں ایک بھی مسلمان کا گھر نہیں بچا تھا۔ ان کے گھروں کو لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا تھا اور باہر سے ہندو سکھ آکر آباد ہو گئے تھے۔ میرا سکوٹر سڑک پر بھاگا جا رہا تھا اور میرا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس وقت مجھے کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں کچھ دیر کے لئے چھپ جاؤں۔ کیونکہ شہر کی پولیس نے یقینی طور پر سٹیشن کے اردگرد کے علاقے کی ناکہ بندی کر لی تھی اور سڑک پر کسی بھی جگہ لدھیانہ پولیس مجھے پکڑ سکتی تھی۔ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ میں نہتا تھا۔ میرے پاس کوئی پستول وغیرہ بھی نہیں تھا۔ اگر پستول ہوتا بھی تو میں نکل کر سامنے آئی ہوئی شہر کی مسلح پولیس کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

دور سڑک پر مجھے کچھ ٹرک قسم کی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے پولیس نے سڑک روک رکھی ہو۔ میں نے سکوٹر سڑک سے اتار لیا اور درختوں کے پیچھے آکر سکوٹر کو روکا۔ اسے وہیں چھوڑا اور ایک کھیت میں گھس گیا۔ یہ آبادی کے اندر شہر کے دو چار کھیت تھے جن کے آگے پھر آبادی کے مکان شروع ہو گئے تھے۔ میں دوڑنے کی بجائے کھیت میں تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ فصل زیادہ اونچی نہیں تھی اور میری کمر تک آتی تھی۔ میں دو کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پتلی پگ ڈنڈی پر چل رہا تھا۔ کھیت ختم ہو گئے۔

رات کا وقت ہوتا تو اندھیرا مجھے چھپا لیتا۔ مگر یہ دن کا وقت تھا۔ شروع نومبر کا آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میری تصویر اخباروں میں چھپ چکی تھی۔ کوئی بھی پولیس والا مجھے پہچان سکتا تھا۔ یہ بات بھی تھی کہ جو سکھ میرے پیچھے لگا ہوا تھا وہ فوجی تھا اس نے لدھیانے کی ملٹری پولیس کو بھی ضرور خبر کر دی ہوگی اور ملٹری پولیس بھی اس علاقے میں میری طرف بڑھ رہی ہوگی۔ میرے لئے کسی جگہ چھپ جانا بے حد ضروری تھا اور چھپنے کے لئے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کوئی میری مخبری نہ کر سکے اور پولیس مجھے پکڑ نہ سکے۔ میں کھیتوں سے نکل کر ٹاہلی کے درختوں کے نیچے سے ہو کر گزر رہا تھا کہ اچانک سامنے ایک چھوٹا سا چرچ یعنی گرجا گھر نظر پڑا۔ گرجے کا چھوٹا کچا احاطہ تھا۔ احاطے کے اندر گرجا گھر کی پرانی عمارت تھی۔ اس کا بڑا دروازہ بند تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے گرجا گھر کے پادری صاحب یعنی فادر کے پاس پناہ مل سکتی ہے۔ عیسائی ہونے کے ناطے فادر میں ہندو سکھوں والا تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کا شدید جذبہ نہیں ہوگا۔ اس کا مجھے بھارت کے فرعونوں کے درمیان اپنے قیام کے دوران تجربہ بھی ہو چکا تھا۔

میں جلدی سے چرچ کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے بھینس بندھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی اس کے آگے چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے میری طرف بالکل نہ دیکھا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ میں گرجا گھر کے ہال کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ چھوٹا سا ہال کمرہ تھا۔ دو رویہ بنچ بچھے تھے سامنے قربان گاہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور

حضرت بی بی مریم علیہ السلام کے مجسموں کے سامنے تین چار موم بتیاں روشن تھیں۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں نے دروازے میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ مجھے دو آدمی باہر سڑک پر ایک طرف کو دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ جن لوگوں سے مجھے خطرہ تھا وہ میرا پیچھا کرتے یہاں تک آ گئے تھے۔ میں خالی بنچوں کے درمیان سے جلدی جلدی چلتا قربان گاہ کی ایک جانب آکر رک گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں سے کس طرف چلا جاؤں؟

قربان گاہ اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھی اور اس کے کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک پادری صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

پادری صاحب کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ دبلا جسم تھا۔ رنگ سانولا تھا۔ لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی۔ سر کے خشخشی بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ چہرے پر بڑی شفیق مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔

"فادر! کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے کہیں چھپا لیجئے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں کوئی چور ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں"

پادری صاحب ایک لمحے کے لئے مسکراتے ہوئے شفیق چہرے سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"میرے ساتھ آجاؤ بیٹا"

میں ان کے پیچھے ہو گیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ جس میں زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ ایک جانب تہہ کیا ہوا کمبل پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ دھیمی روشنی والا بلب لٹک رہا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ بیٹا اور مجھے بتاؤ کہ لوگ تمہارے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گرجے کے ہال کمرے کی جانب سے بھاری بھاری قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے پادری صاحب کا نام لے کر انہیں بلایا۔ پادری صاحب

نے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو میں دیکھتا ہوں کون ہیں"

میں نے کہا۔

"فادر! پولیس ہوگی۔ پلیز انہیں میرے بارے میں کچھ نہ بتائیے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں چور ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں"

پادری صاحب نے ہاتھ اوپر اٹھا کر مجھے بڑی نرم آواز میں کہا۔

"مت گھبراؤ بیٹا۔ مت گھبراؤ۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی میں جلدی سے دروازے کے پاس آکر دروازے کی باریک درز میں سے ہال کمرے میں دیکھنے لگا میرا خدشہ درست تھا۔ گرجا گھر کے چھوٹے سے ہال کمرے میں پولیس کے آدمی کھڑے تھے۔ ان میں تین سکھ سپاہی تھے اور ایک ان کے ساتھ ہندو انسپکٹر یا تھانیدار تھا۔ وہ ہال کمرے کے دروازے سے کافی آگے آکر بنچوں کے درمیان کھڑے تھے۔

پادری صاحب قربان گاہ کی سیڑھیاں اتر کو پولیس کے سپاہیوں کے پاس جا کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کی صرف ہلکی ہلکی آوازیں ہی آرہی تھیں۔ لفظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن اس وقت ضرور تیز ہوگئی تھی یہ بات صاف ظاہر تھی کہ پولیس پادری صاحب سے میرے بارے میں ہی پوچھ رہی تھی اور اگر پادری صاحب پولیس کو بتا دیتے ہیں کہ جس پاکستانی کمانڈو کی انہیں تلاش ہے وہ اندر کوٹھڑی میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے تو اس کوٹھڑی میں سے فرار ہونے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا اور میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ میں جذبات کی ہیجانی کیفیت کے ساتھ دروازے کے ساتھ لگا باریک درز میں سے پادری صاحب کو پولیس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ پادری صاحب باتیں کرتے ہوئے تھانیدار کے کسی سوال کے جواب میں نفی میں سر ہلایا تو میں سمجھ گیا انہوں نے پولیس کو میرے بارے میں نہیں بتایا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ تھانیدار پادری صاحب سے زور دے کر کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے پادری صاحب سے ہاتھ ملایا

سپاہیوں کو لے کر ہال کمرے سے نکل گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں دروازے سے ہٹ کر دری پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں پادری صاحب بھی اندر آگئے۔ وہ دروازہ بند کر کے وہیں کھڑے ہو کر مجھے گہری نگاہوں سے تکنے لگے۔ میں بھی انہیں تکنے لگا۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ پھر وہ میرے قریب آکر دری پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"بیٹا! مجھے پولیس کی زبانی معلوم ہو گیا ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ یہ بات میرے ضمیر کو ہرگز گوارا نہیں کہ میں اپنے ملک کے دشمن کی مدد کروں اور اسے پولیس کے حوالے نہ کروں۔ لیکن میں تمہیں پناہ دے چکا ہوں۔ یہ بات بھی میرے مسلک کے خلاف ہے کہ تمہیں پناہ دینے کے بعد پولیس کے حوالے کردوں۔ ہم ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہماری وفاداریاں اپنے ملک کے ساتھ ہیں۔"

پادری صاحب اپنے طور پر بالکل درست کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے اور اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"فادر! میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ ہم لوگ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کشمیر پر بھارت نے اپنی فوج کے ذریعے وہاں کی مسلمان اکثریت کی مرضی کے خلاف قبضہ کر رکھا ہے۔ کیا ہم حق بجانب نہیں ہیں؟ آپ کے بزرگوں نے بھی ملک ملک سے آکر صلیبی جنگوں میں شرکت کی تھی۔ میں بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ آزادی کشمیر کے لئے جہاد کر رہا ہوں"

پادری صاحب کہنے لگے۔

"میں تمہاری بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہیں ایک رات سے زیادہ پناہ نہیں دے سکتا۔ تمہیں آدھی رات کے بعد یہاں سے نکل جانا ہوگا۔ میں تمہارے لئے بس اتنا ہی کر سکتا ہوں"

پادری صاحب کا میری نظروں میں احترام بڑھ گیا تھا۔ اپنے طور پر انہیں ایسا ہی کہنا

چاہئے تھا۔ میرے لئے یہی بہت غنیمت تھا کہ انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا
تھا۔ اور ایک رات کے لئے چرچ میں پناہ دے دی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ میں
جالندھر جانا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے۔
"رات کو یہاں سے جالندھر کی طرف گاڑیاں جاتی ہی رہتی ہیں۔ مگر پولیس تمہاری
تلاش میں ہے۔ ان کے پاس تمہارا فوٹو بھی ہے۔ جو اخبار میں چھپا ہوا ہے۔ سٹیشن پر جاؤ
گے تو پکڑے جاؤ گے رات کو جالندھر کی طرف لاریاں نہیں چلتیں مگر ٹرکوں کے اڈے
سے ٹرک مال لے کر ضرور جاتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ یہاں سے
رات کے وقت نکل کر ٹرکوں کے اڈے پر چلے جاؤ اور کسی ٹرک میں بیٹھ کر جالندھر جانے
کی کوشش کرو۔ اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو میں تمہیں پچاس روپے دے دوں
گا۔"
پادری صاحب نے اپنے لمبے چغے کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی صدری میں سے پچاس
روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا۔ میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے پادری صاحب کا
شکریہ ادا کرتے ہوئے پچاس کا نوٹ نہ لیا اور ان سے ٹرکوں کے اڈے کے بارے میں
پوچھا کہ وہ وہاں سے کتنی دور اور کس طرف۔ پادری صاحب نے کہا۔
"چرچ کے پیچھے جو سڑک جاتی ہے اس پر چلتے جاؤ گے تو ایک چوک آئے گا۔ وہاں
سے دائیں طرف مڑ جانا۔ وہاں کنک منڈی ہے ٹرکوں کا اڈہ بھی وہیں ہے۔ ایک بات میں
تمہیں ضرور کہنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ اگر تم پکڑے گئے تو پولیس کو یہ نہ بتانا کہ میں نے
تمہیں پناہ دی تھی۔"
میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"محترم! میں محسن کش نہیں ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ پولیس چاہے مجھے
اذیت کیوں نہ دے۔ میری زبان پر آپ کا نام کبھی نہیں آئے گا۔"
پادری صاحب نے صلیب کا نشان بنا کر مجھے دعا دی اور کہا۔
"میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے گرجا گھر کے اندر ہی ایک اور چھوٹے سے کمرے میں لے آئے جہاں ایک
چارپائی بھی پڑی تھی۔ انہوں نے مجھے کمبل لا کر دیا اور کہا۔
"یہاں تمہارے پاس سوائے میرے اور کوئی نہیں آئے گا۔ تم بھی اس کمرے سے
باہر مت نکلنا۔"
میں نے سارا دن اس کمرے میں گزار دیا۔ پادری صاحب نے مجھے کھانا بھی کھلایا۔
شام کو چائے بھی پلائی۔ پھر رات کو بھی کھانا دیا جب رات گہری ہو گئی تو میں وہاں سے
نکلنے کا پروگرام بنانے لگا۔ پادری صاحب رات کے دو بجے میرے پاس آ کر کہنے لگے۔
"اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ سڑکیں خالی پڑی ہیں۔ تمہارے لئے یہاں سے
نکلنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہے۔"
میں نے اٹھ کر پادری صاحب سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر
پر ہاتھ رکھا اور کہا۔
"تمہیں خداوند کے سپرد کیا"
انہوں نے مجھے گرجا گھر کی عمارت کے پچھواڑے سے باہر نکال دیا۔ نومبر کی رات
سرد تھی۔ ابھی اتنی سردی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی لوگ مکانوں کے اندر سوتے
تھے۔ بازار میں کہیں کسی کی چارپائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پادری صاحب نے مجھے جس
طرح بتایا تھا میں اسی حساب سے گرجا گھر سے نکل کر عقبی سڑک پر آ گیا۔ لدھیانہ شہر پر
خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی جانب سے کسی موٹر رکشا کی دور سے آواز آ جاتی
تھی۔ میں سڑک پر چلتے چلتے چوک میں آ گیا۔ یہاں سے بائیں جانب ہوا تو کچھ فاصلے پر
ایک ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ ٹرکوں کا اڈہ تھا۔ ایک ٹرک چلنے کے لئے تیار
کھڑا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا مجھے ڈرائیور سے بات کرنی چاہئے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے
اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھ رکھی ہو اور وہ مجھے دیکھتے ہی وہیں پکڑ کر شور مچا دے۔
معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ میں ٹرک اڈے سے ذرا فاصلے پر ایک طرف کھڑے ہو کر سوچنے
لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ٹرک مجھ سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور دو

آدمیوں کے ایک دوسرے سے اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ ٹرک روشنی میں کھڑا تھا۔ اس پر لدی ہوئی بوریاں مجھے نظر آرہی تھیں۔ ٹرک کے پیچھے دو ڈھائی فٹ چوڑا تختہ لگا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سکھ لڑکا ایک طرف سے نکل کر ٹرک کے پیچھے آیا۔ اس نے نیچے لٹکتا ہوا رسہ اٹھا کر اوپر بوریوں پر ڈالا اور لدھیانے کے پنجابی لہجے میں اپنے ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہا۔ لڑکا دوڑ کر ٹرک کی اگلی سیٹ کی کھڑکی کھول کر ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ٹرک کا انجن پہلے سے چل رہا تھا۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا اور ٹرک آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی ٹرک اڈے سے تھوڑا آگے گیا جہاں ذرا اندھیرا تھا تو میں دوڑ کر ٹرک کے پاس آیا اور عقبی تختے کو پکڑ کر ٹرک میں اچھل کر بوریوں کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ میں سر نیچے کر کے بیٹھ سکتا تھا اور باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ٹرک لدھیانہ شہر کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کا رخ چونکہ جالندھر کی طرف تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ یہ ٹرک جالندھر کی طرف ہی جا رہا ہے۔ یہ خطرہ ضرور لگا تھا کہ راستے میں کہیں پولیس کی چیک پوسٹ نہ ہو اور پولیس چیکنگ نہ کرے۔ میں کبھی کبھی سر اونچا کر کے سڑک کو دیکھ لیتا تھا۔ سڑک پر بتیاں ساتھ ساتھ روشن تھیں۔ آبادی کے مکان بھی نظر آجاتے تھے۔ آخر ٹرک ایک ایسی سڑک پر آگیا جو مجھے جی ٹی روڈ معلوم ہو رہی تھی۔ پیچھے دور تک سڑک خالی پڑی تھی۔ دونوں جانب درخت بھی تھے اور بجلی کے کھمبے بھی دور دور لگے ہوئے تھے۔ ٹرک کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ ٹرک یقینی طور پر لدھیانہ شہر سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ مجھے صرف اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ راستے میں اگر کسی جگہ ٹرک کھڑا ہو جائے تو مجھے ٹرک سے اتر کر ادھر ادھر چھپ جانا تھا اور ٹرک کے دوبارہ چلنے پر دوڑ کر اس میں سوار ہو جانا تھا۔ ٹرک پر بوریاں کچھ اس طرح اوپر نیچے لدی ہوئی تھیں کہ ان کے اندر چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ ٹرک کافی رفتار سے جا رہا تھا۔ لدھیانے سے جالندھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا لاہور سے گوجرانوالہ کا

ہے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ راستے میں پھگواڑہ ریلوے اسٹیشن ضرور آتا ہے۔ اس کے بعد جالندھر آجاتا ہے۔ ایک تو سڑک خالی ہونے کی وجہ سے ٹرک کی رفتار تیز تھی۔ دوسرے میں ٹرک کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ سرد ہوا کے تھپیڑے میرے اوپر آرہے تھے۔ اور مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن میں اس قسم کی سخت جانی کا عادی تھا۔ جیکٹ کے بٹن میں نے گردن تک بند کر لئے تھے اور بوریوں کی اوٹ میں جتنا سرد ہواؤں سے بچ سکتا تھا بچ کر بیٹھا ہوا تھا۔

ٹرک کافی دیر تک ایک سان چلتا رہا۔ راستے میں کسی جگہ نہ رکا۔ پولیس کی کوئی چیک پوسٹ بھی نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ جالندھر شہر میں داخل ہوتے ہی میں ٹرک سے چھلانگ لگا دوں گا اور ریلوے لائن تلاش کر کے اس پر چلتا ہوا اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا اور وہاں سے ہوشیار پور جانے والی گاڑی میں بیٹھ کر جموں کی طرف نکل جاؤں گا۔ سڑک پر دائیں بائیں آبادی کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ پھگواڑہ شہر آرہا تھا۔ ٹرک وہاں نہ رکا۔ اور شہر کے درمیان سے ہو کر نکل گیا۔ یہ اچھا ہوا تھا ورنہ مجھے ٹرک سے نکل کر کسی طرف چھپنا پڑتا۔ پھگواڑہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ٹرک جی ٹی روڈ پر بھاگا جا رہا تھا۔ آخر جالندھر شہر کے مضافات کی روشنیاں شروع ہو گئیں۔ میں دائیں بائیں دور ریلوے سگنل کی بتی تلاش کر رہا تھا۔ تاکہ میں ٹرک سے اترتے ہی اس طرف کا رخ کر لوں۔ یہ جالندھر شہر ہی تھا۔ سڑک کشادہ ہو گئی تھی۔ دور دور کوٹھیوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ٹرک شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک ریلوے پل آگیا۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا کہ پل کے نیچے لائنیں بچھی ہوئی تھیں اور خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک انجن بھی شنٹ کرتا جا رہا تھا۔ یہی اس وقت میرا ٹارگٹ تھا۔ اب میں یہ انتظار کرنے لگا کہ کہاں ٹرک کی رفتار ذرا کم ہو اور میں سڑک پر چھلانگ لگا دوں۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد ویسے ہی ٹرک کی سپیڈ کم ہو گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد ریلوے سگنل کی سبز اور سرخ روشنی کو دیکھ لیتا تھا۔ میں ریلوے لائن کے قریب ہی کسی جگہ اترنا چاہتا تھا۔ ایک جگہ سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے ٹرک کی رفتار مزید کم ہو گئی۔ میں نے ٹرک میں سے سڑک

پر چھلانگ لگا دی۔

کمانڈو ٹریننگ میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ چلتی گاڑی یا ٹرک میں سے چھلانگ لگائی ہو تو اپنا رخ ہمیشہ اس طرف ہونا چاہئے جس طرف گاڑی جا رہی ہو۔ اور چھلانگ لگاتے ہی اس طرف دوڑ پڑنا چاہئے۔ اس طرح سے کچھ بچت ہو جاتی ہے اور آدمی کو زیادہ چوٹیں نہیں لگتیں۔ میں نے بھی اپنا منہ ٹرک کی اگلی جانب کر کے ٹرک سے چھلانگ لگائی تھی۔ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی اس لئے میں آسانی سے اتر گیا تھا۔ ٹرک سے اترتے ہی میں اس طرف چل پڑا جس طرف مجھے ریلوے سگنل کی بتی نظر آ رہی تھی۔ ریلوے لائن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ صرف ایک دو کھیتوں میں سے مجھے گزرنا پڑا۔ رات کے تین ساڑھے تین بجے کا وقت ہوگا۔ سردی بھی تھی۔ کھیتوں پر اندھیرا تھا۔ ریلوے لائن پر چڑھتے ہی میں نے شمال کی جانب دیکھا تو مجھے کچھ فاصلے پر ریلوے سٹیشن کی جگمگاتی ہوئی کافی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ جالندھر کا ریلوے اسٹیشن ہی ہو سکتا تھا۔

لدھیانے سے امرتسر تک راستے میں ایک ہی بڑا شہر جالندھر آتا ہے۔ یہ بہت بڑا شہر تھا اور جالندھر ہی تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ جب سٹیشن قریب آیا تو لائن کے ساتھ ساتھ اونچی دیوار شروع ہو گئی۔ اب میں ریلوے لائن کی پٹڑی سے اتر کر دیوار کے ساتھ ساتھ ہو گیا۔ کافی بڑا ریلوے یارڈ تھا۔ کہیں خالی ڈبے کھڑے تھے۔ کہیں انجن شنٹ کر رہا تھا۔ آخر میں اس جگہ آ گیا جہاں سے سٹیشن کا ایک پلیٹ فارم شروع ہوتا تھا۔ یہاں بورڈ لگا تھا جس پر انگریزی اور ہندی میں جالندھر سٹی لکھا ہوا تھا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ اب مجھے ایک تو جالندھر سے جموں توی شہر تک کا ٹکٹ خریدنا تھا اور دوسرے یہ معلوم کرنا تھا کہ جموں شہر کی جانب ٹرین کس وقت جائے گی۔ جس بات کا مجھ پر خوف سا طاری تھا وہ یہ تھی کہ صبح کے اخباروں میں میری تصویر چھپ چکی ہو گی جس میں مجھے پاکستانی جاسوس قرار دیا تھا۔ اور میری گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی تھا۔ اس وقت میرا جو حلیہ تھا تصویر اسی حلیے میں تھی اور میں بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنی تبدیلی کی کہ جیب سے رومال نکال کر سر پر باندھ لیا اور

جیکٹ کے کالر اوپر اٹھا لئے۔

پلیٹ فارم پر کوئی رش نہیں تھا۔ میں پھر بھی احتیاط کے طور پر اپنے آپ کو پلیٹ فارم کی روشنی سے بچاتا ہوا جس طرف اندھیرا تھا اس طرف سے ہوتا ہوا چل رہا تھا۔ اس پلیٹ فارم پر کوئی گاڑی کھڑی نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے وہ خالی خالی تھا۔ ایک جگہ ایک سکھ قلی ریلوے لائن سے اوپر پلیٹ فارم پر چڑھ کر آیا تو میں نے اس سے جموں جانے والی گاڑی کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر بعد اسی پلیٹ فارم پر جموں سے گاڑی آئے گی۔ وہی گاڑی واپس جموں توی جائے گی۔ اب مجھے جموں کا ٹکٹ خریدنا تھا۔ سکھ قلی یہ کہہ کر آگے چل پڑا تھا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔

"سردار جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی مجھے جموں کا ایک ٹکٹ لا دیں۔ میرے پاؤں میں درد ہے۔ زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔"

اور میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا سکھ قلی نے نوٹ لے لیا اور بولا۔

"یہیں سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ"

وہ چلا گیا۔ مجھے یہ چانس لینا ہی تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سوچا اگر قلی ٹکٹ لے آیا تو بہت اچھا ہوگا۔ اگر نہ لایا تو میں کوئی دوسری ترکیب سوچوں گا۔ کیونکہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے میں خطرہ تھا کہ اگر پکڑا گیا تو مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ پلیٹ فارم کے درمیان میں خالی بنچ تھا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ سکھ قلی کچھ دور تک مجھے نظر آتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب مجھے یہ خیال آنے لگا کہ کہیں یہ قلی پولیس کو خبر نہ کر دے۔ یونہی مجھے وہم لگنے لگا کہ اس نے مجھے گھور کر بھی دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہونے لگے۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ ایک لمحے کے لئے اس نے میری طرف واقعی غور سے دیکھا تھا۔ کیونکہ جب میں اسے پچاس روپے کا نوٹ دینے کے لئے ایک قدم آگے ہوا تھا تو سامنے والے پلیٹ فارم کی روشنی میرے چہرے پر پڑی تھی۔ یہ یاد آتے ہی میں بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران پلیٹ

فارم پر مسافر آنا شروع ہو گئے۔ میں اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور جدھر قلی گیا تھا ادھر دیکھنے لگا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں یا قلی کا انتظار کروں۔ اتنے میں سامنے کی جانب سے ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی۔ ٹرین رکی تو ڈبوں میں سے مسافر اترنے لگے۔ پلیٹ فارم پر ہل چل سی مچ گئی۔ معلوم ہوا ٹرین جموں سے آئی ہے۔ یہی ٹرین کچھ دیر بعد واپس جموں جانے والی ہے۔

اچانک میری نظر سکھ قلی پر پڑی۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا میری طرف چلا آرہا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے پولیس کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ سکھ قلی نے آتے ہی مجھے جالندھر سے جموں توی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ اور باقی پیسے دیئے اور کہا۔

"یہ لیجئے مہاراج میری گاڑی آگئی ہے"

اور وہ ایک ڈبے کی طرف کسی مسافر کا سامان اٹھانے کے لئے دوڑ گیا۔ ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھا اور میں دل میں ہنس رہا تھا کہ میں نے خوامخواہ طرح طرح کے وسوسوں سے اپنے آپ کو پریشان کیا۔ کسی نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ جموں والی گاڑی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اب میں اس میں سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف اطمینان سے روانہ ہو سکتا تھا۔ منزل اب مجھے سامنے نظر آرہی تھی۔

جموں کی طرف جو گاڑی جاتی ہے وہ جالندھر سے امرتسر کی بجائے ہوشیار پور والی لائن پر ہو جاتی ہے۔ اس لائن پر میں کئی بار سفر کر چکا تھا۔ اس وقت آسمان پر صبح کاذب کا نور نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں ٹرین کے سب سے آخری ڈبے میں بیٹھ گیا اور بے چینی سے ٹرین کے چلنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ لمحات بڑے صبر آزما تھے۔ اگر دلی اور مشرقی پنجاب کے اخباروں میں پولیس کی جانب سے میری تصویر نہ چھپی ہوئی ہوتی تو میرے لئے کوئی اتنی زیادہ پریشانی نہ تھی۔ میں کئی بار پولیس کے تھانوں جیلوں اور ٹارچر سیلوں سے فرار ہو چکا تھا اور فرار ہونے کے بعد کمانڈر شیروان کے پاس خفیہ کیمپ گاہ میں پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ جالندھر سے تیس پینتیس میل پیچھے مجھے ایک سکھ کیپٹن نے پہچان لیا تھا اور اب صرف ملٹری پولیس ہی نہیں مشرقی پنجاب کی پولیس بھی میرے

تعاقب میں تھی اور میں بہت حد تک ان کے محاصرے میں تھا۔

اتنے میں ٹرین کے گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سٹیشن سے نکلنے کے بعد ٹرین امرتسر والی لائن چھوڑ کر ہوشیار پور والے ٹریک پر آگئی۔ ابھی ریلوے یارڈ کی بتیاں روشن تھیں۔ آسمان پر صبح کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ٹرین جالندھر شہر کے مضافات میں سے نکل کر کھیتوں میں چلی جا رہی تھی۔ کھیتوں میں نومبر کی صبح کی ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ اب صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ مگر سردیوں کی صبح کی وجہ سے فضا دھندلی دھندلی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ کوئی چھوٹا سٹیشن آرہا تھا۔ اس طرف چلنے والی ریل گاڑیاں سبھی دیہاتی سٹیشنوں پر ٹھہرتی ہیں۔ میں نے کھڑکی میں سے سر آگے کر کے سامنے کی جانب دیکھا۔ دور کسی چھوٹے سٹیشن کے درخت نظر آرہے تھے۔ میں نے ڈبے میں مسافروں کا جائزہ لیا۔ سبھی دیہاتی ٹائپ کے مسافر تھے۔ کئی ایک نے گلابی رنگ کی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور ڈوگری زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ سکھ بھی تھے۔ اوپر برتھ پر بھی کچھ مسافر سو رہے تھے۔ ٹرین کو ایک دم بریکیں لگیں اور چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ کسی مسافر نے کہا۔

"سگنل ڈاؤن نہیں ہوا ہے"

ٹرین سٹیشن آنے سے پہلے ہی کھیتوں میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ مجھے اگلے ڈبوں کی جانب وردیوں والے فوجی یا پولیس کے سپاہی نظر آئے۔ جس مصیبت کا خدشہ لگا ہوا تھا وہ نازل ہو گئی تھی۔ دوسرے ڈبے کے کچھ مسافر نیچے اتر گئے تھے۔ میں پیچھے ہٹ کر بیٹھا تھا اور کمپارٹمنٹ کے دوسرے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باہر سے کسی مسافر نے ڈوگری زبان میں کسی کو بلند آواز میں کہا۔ کہ پولیس کسی مجرم کو تلاش کر رہی ہے۔ میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور بڑے اطمینان سے اٹھا اور دوسرے دروازے میں آکر انجن والے ڈبوں کی طرف دیکھا اس طرف پولیس کے تین

چار سپاہی کھڑے تھے مگر وہ میرے ڈبے سے ابھی کافی دور تھے۔ میں خاموشی سے نیچے اتر گیا۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ پیچھے کی جانب چلتا دوسرے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ اس ڈبے کے مسافر بھی کھڑکیوں پر جھکے باہر دیکھ رہے تھے۔ میں ڈبے میں چڑھ گیا اور دوسرے دروازے میں سے دوسری طرف اتر گیا۔ اس طرف مسافر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف چلتا مسافروں سے دور ہوتا گیا۔ میں تیز تیز چل کر مسافروں کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ٹرین کا آخری ڈبہ آگیا۔ یہاں بھی کچھ مسافر ڈبے سے اتر کر کھڑے دور پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"ماراج جی کوئی قاتل جیل توڑ کر بھاگا ہوگا"

"مجھے تو کوئی پاکستانی جاسوس لگتا ہے ماراج"

میں ان لوگوں کے قریب سے بہت آہستہ آہستہ چلتا گزر گیا۔ ریلوے لائن اونچی تھی۔ نیچے ڈھلان میں جھاڑیاں تھیں۔ آگے ٹاہلی کے درختوں کے نیچے دور تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ میں وہاں رک گیا۔ اگلے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ پولیس کی پوری گارڈ تھی۔ سپاہی تیز تیز چلتے ہمارے ڈبوں کی طرف آ رہے تھے۔ اب میں وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں آہستہ سے ریلوے لائن کی ڈھلان اتر کر جھاڑیوں کے پیچھے ہو گیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں درختوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چل پڑا۔ یہ سارا علاقہ میرے لئے بے حد خطرناک تھا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی پولیس والا مجھے کھیتوں میں تیز تیز چلتا نہ دیکھ لے۔ درختوں کے پیچھے چلتے ہوئے مجھے ریل گاڑی کے ڈبے اور پولیس کے آدمی دور سے نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی مجھے دیکھ سکتے تھے۔ لیکن میں رک نہیں سکتا تھا۔ درختوں کی آڑ لیتا میں ٹرین سے دور ہوتا گیا۔ ایک جگہ کھیتوں میں اونچی فصل اگی ہوئی تھی۔ میں ان کھیتوں میں گھس گیا۔ یہ جوار کی فصل تھی۔ میں کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ جوار کے کھیت ختم ہو گئے۔ سبزی ترکاریوں کے کھیت شروع ہو گئے۔ یہاں میں چھپ نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں ٹرین سے کافی دور نکل آیا تھا۔

کھیت میں ایک جگہ دو سکھ بیٹھے سبزیاں توڑ رہے تھے۔ میں فاصلے پر رہ کر آگے گزر

گیا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں کچے مکان تھے۔ یہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تالاب میں بھینسیں بیٹھی تھیں۔ ایک کھیت میں سکھ کسان ہل چلا رہا تھا۔ چلتے چلتے جب میں گاؤں سے کچھ فاصلے پر نکل گیا تو میں نے پیچھے مڑ کر ریل گاڑی کی طرف دیکھا۔ دور ریل گاڑی ابھی تک کھڑی تھی۔ پولیس کو کسی مخبر نے بڑی پکی اطلاع دی تھی کہ میں اسی ٹرین میں جموں کی طرف فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں گاؤں سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ یہ مشرقی پنجاب میں جالندھر کے ضلع کا دیہاتی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز شاداب تھا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ کھیتوں میں زیادہ تر سکھ کسان ہی کام کرتے نظر آتے تھے۔ میں گاؤں کی آبادی سے دور رہ کر چل رہا تھا۔ ایک دو جگہ پر تھوڑی دیر بیٹھ بھی گیا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہوشیار پور تک پیدل ہی سفر کروں گا۔ خواہ اس میں دو دن ہی لگ جائیں۔ ہوشیار پور سے نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں سے کسی لاری یا ٹرک میں بیٹھ کر کٹھوعہ پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ایک بار کٹھوعہ پہنچ گیا تو پھر جموں پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے میں جالندھر سے دور ہو رہا تھا میں آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ مجھے کم از کم دو دن تک پیدل سفر کرنا ہوگا۔ میں نے بڑے بڑے دشوار گزار جنگلوں میں پیدل سفر کیا تھا۔ ان آباد میدانی علاقوں میں سفر کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے کسی بھی جگہ سے کھانے کو کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ ابھی مجھے بھوک بھی نہیں لگی تھی۔ سورج کافی اوپر آچکا تھا۔ سردی کی رات والی شدت کم ہو گئی تھی۔ مجھے ریل گاڑی سے الگ ہوئے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے جب میں سکول میں پڑھا کرتا تھا تو ہم اپنے میاں جی کے ساتھ جب کبھی کسی دوسرے شہر لاری میں بیٹھ کر جایا کرتے تھے تو راستے میں جو کوئی گاؤں آتا اس میں ایک نہ ایک مسجد ضرور ہوتی تھی جس کے دو سفید مینار دور سے نظر آجاتے تھے۔ اب تک میں چار گاؤں کے قریب سے گزرا تھا مگر کسی گاؤں میں مجھے کوئی مسجد نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی سنتالیس 1947ء میں جب پاکستان بنا تھا تو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا ہندو سکھوں نے وحشیانہ قتل عام کیا تھا۔ بچے

کچھ مسلمان پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ اب مشرقی پنجاب کے ان دیہات میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ یہاں مسلمانوں کی جو مسجدیں تھیں انہیں ہندو سکھوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ آگ لگا کر نذر آتش کر دیا تھا۔ ان دیہات کے باہر مجھے یا مندر نظر آئے تھے یا گوردوارے جہاں سکھ عبادت کرتے ہیں۔ مسجد ایک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

دیہاتی کسان بھی ہندو تھے یا سکھ۔ کوئی مسلمان نہیں تھا۔ سکھ زیادہ نظر آئے تھے۔

چلتے چلتے میں ایک اینٹوں کے بھٹے کے پاس پہنچا۔ یہاں آوے کے اوپر بہت بڑی چمنی لگی ہوئی تھی جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایک طرف پختہ اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک سکھ تخت پر بیٹھا تھا۔ ایک بوڑھی عورت زمین پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ میں تھوڑے فاصلے پر سے آگے گزر گیا۔ آگے ایک سیم نالہ تھا۔ اس کا پل تھا پل کی دوسری جانب گاؤں تھا جہاں کچی گراؤنڈ میں سکھ اور ہندو لڑکے کھیل رہے تھے۔ میں یہاں سے بھی آگے گزر گیا۔ درختوں کے پیچھے بہت دور اونچے نیچے ٹیلوں کے دھندلے سے خاکے نظر آنے لگے تھے۔ یہ ہوشیار پور کی ترائی کا علاقہ تھا مگر ابھی یہ ٹیلے بہت دور تھے۔ میں گاؤں سے کچھ فاصلے پر جا کر ایک کھیت کے کنارے کیکر کے درخت کے نیچے تھکاوٹ دور کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہاں کوئی کنواں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی ندی آ گئی۔ میں نے ندی پر منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا۔ جوتے اتار کر پاؤں دھوئے۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اب مجھے کسی سے یہ پوچھنے کی ضرورت تھی کہ کیا میں ہوشیار پور کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ کیونکہ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ ہوشیار پور تک ٹرین میں بیٹھ کر دو ایک بار ضرور سفر کر چکا تھا مگر ادھر ریلوے لائن کہیں نظر نہ آئی تھی۔ یہ ریلوے لائن سے کافی ہٹا ہوا علاقہ تھا۔ ندی پر کچھ دور جانے کے بعد ایک پل آ گیا۔ پل پر سے ایک سکھ لڑکا گائیوں اور بھینسوں کو لے کر جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہوشیار پور جانے والی سڑک کس طرف ہے وہ رک گیا۔ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کچھ دوابے اور کچھ

ہوشیار پوری پنجابی لہجے میں اس نے مجھے بتایا کہ میں جس طرف جا رہا ہوں آگے دو کوس پر امرتسر بٹالے والی سڑک آ جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بٹالے امرتسر کی طرف نہیں جانا۔ میں ہوشیار پور جانا چاہتا ہوں۔ سکھ لڑکے کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس نے ندی کے دوسرے کنارے کی طرف چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تم اس طرف جاؤ"

یہ کہہ کر وہ مویشیوں کے پیچھے دوڑ پڑا جو اس دوران کافی آگے نکل گئے تھے۔ میں ندی کے دوسری کنارے پر ہو گیا۔ پل کے قریب ہی سے ایک کچا راستہ اس طرف جاتا تھا۔ جس طرف سکھ لڑکے نے اشارہ کیا تھا۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ کچی سڑک پر مٹی ہی مٹی تھی۔ یہ ٹوٹا پھوٹا کچا راستہ تھا۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں طرف تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ میں چلتا چلا گیا۔ آدھا گھنٹہ اس کچی سڑک پر بڑی مشکل سے چلنے کے بعد ایک کھال آ گیا۔ یہاں بوہڑ کا بڑا گھنا درخت تھا جس کے نیچے ایک کٹیا بنی ہوئی تھی۔ درخت کے تنے میں رام اور سیتا کی دو مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے آگے چاول سیندور اور رتن جو کے پھول پڑے تھے۔ وہاں نہ کوئی پجاری تھا نہ پوجا کرنے والا تھا۔ اس گھنے درخت کی دوسری طرف کچھ فاصلے پر مجھے ایک اونچے ٹیبے پر بنا ہوا گاؤں نظر پڑا۔ یہ کچا راستہ اس گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ مجھے گاؤں سے بچ کر نکلنا تھا۔ میں راستے سے ہٹ کر کھیتوں میں چلنے لگا۔ گاؤں جب پیچھے رہ گیا تو ایک جگہ ایک عورت دانے بھون رہی تھی۔ دو تین بچے اس کے سامنے بیٹھے کڑاہی میں جوار کو بھنتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بھنی ہوئی جوار کی خوشبو آئی تو میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر بچوں کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب بچے اپنی اپنی جھولیوں میں بھنی ہوئی جوار کے دانے ڈلوا کر چلے گئے تو میں دانے بھوننے والی عورت کے پاس آ گیا۔

میں نے پنجابی میں کہا۔

"بہن جی چار آنے کی جوار بھون دو"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جھولے میں سے جوار کے دانوں کی تین مٹھیاں

کڑاہی میں ڈالیں اور بھٹی میں سرکنڈے ڈال کر آگ کو تھوڑا تیز کر دیا۔ عورت نہ بوڑھی تھی نہ جوان۔ میں اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کڑاہی کی ریت میں سرکنڈوں کا بنا ہوا جھاڑو چلانے لگی۔

"تم کہاں جا رہے ہو پتر؟"

میں نے کہا۔

"بہن جی اگلے گاؤں جا رہا ہوں"

میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ اسے میں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں ہوشیار پور جا رہا ہوں۔ سکھ لڑکے کو میں نے بتا دیا تھا کیونکہ وہ خود ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ مگر یہ عورت مستقل طور پر وہاں بیٹھ کر دانے بھونتی تھی۔ پیچھے سے آ کر کوئی اس سے میرے بارے میں پوچھ سکتا تھا کہ اس حلیے کا نوجوان تو ادھر سے نہیں گزرا۔ اتنی احتیاط میں غیر ارادی طور پر کر لیا کرتا تھا۔ وہ دانے بھون رہی تھی اور میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے معلوم کر لیا کہ اس طرف کو جو سڑک ہوشیار پور کو جاتی ہے وہ وہاں سے پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر ہے یہ کل فاصلہ پچیس میل بنتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ضلع جالندھر کے شمال مشرقی علاقے میں کافی اندر کی طرف نکل آیا تھا۔ اس سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ آگے سوڈھی سکھوں کا ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ جہاں ایک گوردوارہ بھی ہے۔ اس کے آگے مصلیوں کے دو گاؤں ہیں۔ اس کے آگے بڑی نہر آ جاتی ہے اور نہر کی دوسری طرف بیروالی کا قصبہ ہے جہاں پولیس کا تھانہ بھی ہے۔ میں تھانے کا سن کر محتاط ہو گیا۔ مجھے اس طرف سے بچ کر آگے جانا تھا۔ میں نے بھنی ہوئی جوار پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں ڈالی اور آگے چل پڑا۔

اب کھیتوں کی جگہ رڑا میدان تھا جہاں کلر والی زمین تھی۔ جو کلر سے سفیدی مائل ہو رہی تھی۔ تھوہر کی جھاڑیاں جگہ جگہ اگی ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر دو تین درخت ایک ساتھ اگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں ان درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ بھنی ہوئی جوار نے میری بھوک ختم کر دی تھی۔ اب پھر پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میں پانی کی تلاش

میں ادھر ادھر نہیں جانا چاہتا تھا میں وہیں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ جب دوپہر ڈھلنا شروع ہو گئی تو میں اٹھ کر پھر چلنے لگا۔ تین ایک میل چلنے کے بعد ایک کافی بڑا گاؤں نظر پڑا۔ یہ بھی اونچے ٹبے پر واقع تھا۔ اس کے ایک گوردوارے کا گنبد اور زرد رنگ کا اونچا جھنڈا دور سے نظر آ رہا تھا۔ یہ ضرور سوڈھی سکھوں کا گاؤں تھا۔ میں اس گاؤں سے بچ کر جلدی جلدی آگے نکل گیا۔ دانے بھوننے والی کے کہنے کے مطابق سوڈھی سکھوں کے گاؤں کے آگے مصلیوں کے گاؤں تھے۔ چلتے چلتے دن ڈھل گیا۔ سورج مغرب میں چھپنے لگا۔ میں واقعی چلتے چلتے اب تھک گیا تھا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنا چاہتا تھا جہاں میں شام اور رات کا کچھ حصہ گزار سکوں۔ میرا ارادہ آدھی رات تک آرام کرنے اور اس کے بعد دوبارہ سفر پر نکل پڑنے کا تھا۔ آدھی رات کے بعد میں زیادہ محفوظ رہ کر ہوشیار پور جانے والی سڑک تک سفر کر سکتا تھا۔

جب سوڈھی سکھوں کا گاؤں پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دن کی روشنی سردیوں کی شام کے دھندلکوں میں گم ہونے لگی۔ مجھے ابھی تک کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دی تھی جہاں میں رات بسر کر سکتا۔ میری نگاہیں ادھر ادھر ایسی کوئی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک جگہ ٹھہر گئی۔ دور سے ہلکے ہلکے دھندلکے میں یہ کوئی مکان نظر آ رہا تھا۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی مسجد تھی جس کے مینار ڈھے چکے ہیں۔ صرف محراب باقی ہے جس کے اوپر کی تین برجیاں سلامت تھیں۔ محراب کے اوپر چھت بھی آدھی ڈھے چکی تھی۔ فرش پر ٹوٹی ہوئی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ یقیناً کوئی مسجد تھی۔ میں حیران تھا کہ اس مسجد کو شہید کر دیا گیا تھا تو اس کا آدھا حصہ کیسے بچا رہ گیا۔ بہرحال جب مجھے اس کھنڈر کے مسجد ہونے کا یقین ہو گیا تو میں اس کے عقب میں آ گیا۔ یہاں ایک کنواں تھا۔ جس کا چبوترہ بھی ڈھے چکا تھا۔ اس میں جھانک کر دیکھا۔ یہ اندھا اور ویران کنواں تھا۔ کبھی اس کے پاس بیٹھ کر نمازی وضو کرتے ہوں گے مگر اب وہاں نہ کنواں تھا۔ نہ مسجد تھی اور نہ وہ نمازی ہی باقی رہے تھے۔ ذرا پیچھے گیا تو یہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ کیکر

اور دھریک کے پتلے پتلے درختوں کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی جو نالے کی شکل کی تھی بہہ رہی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ پانی چلو میں بھر کر پیا۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ آگے کچھ کھیت تھے۔ شاید پیچھے کہیں رہٹ لگا ہوا تھا اور کھیتوں کو سیراب کرنے والا یہ پانی اسی رہٹ والے کنوئیں کی طرف سے آرہا تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اسی جگہ بیٹھا رہا۔ اندھیرا دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تین چار کھیت چھوڑ کر کوئی گاؤں تھا۔ وہاں دو تین جگہوں پر روشنی جھلملانے لگی تھی۔ میں نے مسجد میں رات بسر کرنے کا سوچ لیا تھا۔ میں نے نالے کے پانی سے وضو کیا اور شہید مسجد کے کھنڈر میں آکر دو نفل پڑھے۔ خدا کے حضور اسلام کی سربلندی اور پاکستان کی سلامتی کی دعا مانگی اور جیکٹ کے بٹن بند کر کے آدھی ٹوٹی چھت کے نیچے محراب کی ایک طرف ہو کر اندھیرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بٹن اس لئے بند کر لئے تھے کہ جیسے جیسے رات ہو رہی تھی سردی بڑھنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چاروں طرف رات کا اندھیرا چھا گیا۔ گاؤں کی جانب سے کسی بھینس کے ڈکرانے کی آواز آرہی تھی۔ جو تھوڑی دیر بعد بند ہو گئی۔ میں وہیں زمین کو صاف کر کے لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ بہت پیدل چلا تھا کچھ دیر بعد ہی مجھے نیند آ گئی۔

میں بڑی گہری نیند سو چکا تھا۔ خدا جانے میں کب تک سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ قریب ہی کوئی شور ہوا تھا جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ شور ایسا لگا تھا جیسے کوئی چیز زمین پر گر پڑی ہو۔ میں جلدی سے اٹھ کر مسجد کی چھت سے باہر نکلنے کے لئے دیوار کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ اس خیال سے میں کونے میں ہو گیا کہ دیکھتا ہوں کون ہے۔ میں ایک کمانڈو کی حیثیت سے پوری طرح ہوشیار ہو چکا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں اندر آنے والے کے سامنے جاؤں میں چاہتا تھا کہ وہ اندر آجائے تاکہ مجھے معلوم ہو کہ وہ کون ہے؟ اگر وہ پولیس کا سپاہی ہوا اور مسلح بھی ہوا تو میں اندھیرے میں تھا اور بڑی آسانی سے پولیس کے آدمی کی گردن توڑ سکتا تھا۔ اس وقت میں بالکل بے

خوفی کی حالت میں تھا۔ قدموں کی آہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی مسجد کے آگے بکھری ہوئی اینٹوں کے درمیان اندھیرے میں بڑی احتیاط سے چل رہا ہے۔ میں اندھیرے کونے میں سانس روکے حملہ کرنے کے لئے بالکل تیار کھڑا تھا۔ جہاں سے مسجد کی چھت آدھی ڈھے چکی تھی اور جہاں دیوار ختم ہو جاتی تھی۔ وہاں رات کی نیلی نیلی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ایک انسانی ہیولا اس روشنی کے غبار میں مسجد کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

یہ انسانی ہیولا کسی اونچے لمبے آدمی کا نہیں تھا۔ مجھے یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ کوئی عورت تھی۔ اس نے سر پر چادر لی ہوئی تھی۔ اس نے سر پر چادر کو ٹھیک کیا تو مجھے اس کی چوڑیوں کی آواز سنائی دی۔ اب اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا کہ یہ کوئی عورت ہے مگر سوال یہ تھا کہ یہ عورت آدھی رات کو اس ٹوٹی پھوٹی مسجد میں کیا کرنے آئی ہے۔ میں وہیں آہستہ سے اندھیرے کونے میں بیٹھ گیا۔ میں ہولے ہولے سانس لے رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عورت کو وہاں میری موجودگی کا علم ہو۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عورت وہاں کیا کرنے آئی ہے۔ مسجد کی آدھی چھت ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے عورت کے آس پاس ستاروں کی رات کی ہلکی نیلی روشنی پڑ رہی تھی۔ وہ عورت اندر آچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے جھک کر پاؤں کی جوتیاں اتار کر ایک طرف رکھ دیں اور خود مسجد کی پرانی اور شکستہ محراب کے آگے دوزانو ہو کر اس طرح بیٹھ گئی جس طرح آدمی نماز پڑھتے وقت بیٹھتا ہے۔ اس عورت نے دونوں ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں اٹھا دیئے۔ میں حیرت کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کیونکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ پاکستان کے قیام کو سترہ اٹھارہ سال گزر چکے تھے اور مشرقی پنجاب میں ایک بھی مسلمان گھر نہیں تھا۔ یہ عورت مسلمان لگتی تھی۔ پھر یہ مسلمان عورت کہاں سے آگئی تھی۔ مشرقی پنجاب کے اکثر شہروں میں مسلمان بزرگوں کی خانقاہیں اور مزار ہیں جہاں کے مسلمان گدی نشین ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اور ان مسلمان بزرگوں کے مزاروں کو ہندوؤں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور وہاں اب ہندو سکھ مرد اور عورتیں آکر

چڑھاوے چڑھاتی تھیں اور منتیں مانگتی تھیں۔ ان مزاروں پر تو میں نے ہندو سکھ عورتوں
کو جاتے امرتسر جالندھر اور مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں میں دیکھا تھا مگر وہاں جو
مسجدیں باقی رہ گئی تھیں اور ویران پڑی تھیں وہاں کسی ہندو یا سکھ عورتوں کو اس طرح
رات کے وقت جا کر دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا تھا۔

اتنے میں مجھے اس پراسرار عورت کی سسکی بھرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ
آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

"اے اللہ میاں! میری ماتا جی نے مجھے بتایا تھا کہ تو ہم مسلمانوں کا خدا ہے اور جو
تیرے دربار میں آکر فریاد کرے تو اس کی فریاد سنتا ہے۔ اللہ میاں! میں کئی سالوں سے
جب بھی مجھے رات کو موقع ملتا ہے تیرے دربار میں آکر فریاد کرتی ہوں۔ تو میری فریاد
کیوں نہیں سنتا۔ اللہ میاں! میری فریاد سن لے۔ مجھے کسی طرح میرے مسلمان بھائیوں
کے ملک پاکستان پہنچادے۔ میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ صرف اتنا مانگتی ہوں کہ مجھے
میری ماتا جی میری اماں جی کے دیس پاکستان پہنچادے۔ میری ماں تو پاکستان کو یاد کرتے
کرتے سورگباش ہو گئیں۔ مجھے ان کافروں میں سے اٹھا کر پاکستان پہنچادے۔ اللہ میاں
میں تجھے اپنی سورگباشی ماتا جی! اپنی اماں جی کا واسطہ دیتی ہوں مجھے پاکستان پہنچادے"

اور وہ عورت سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

اس نے خدا کے حضور جو دعا مانگی تھی اس کو سن کر ایک لمحے کے لئے میں سکتے میں
آگیا۔ میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھنے لگا تو پتھر کی جس سل پر میں بیٹھا تھا اس کے ہلنے سے آواز
پیدا ہوئی۔ لڑکی نے چونک کر کونے کی جانب دیکھا۔ میں اسے نظر آگیا اس نے کچھ ڈرتے
ہوئے کچھ پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"کون ہے؟"

میں کونے میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ ڈر کر باہر کو دوڑنے لگی تو میں
نے اس کو کلائی سے پکڑ لیا۔

"ڈرو نہیں بہن۔ میں بھی تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔"

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بت بن کر اندھیرے میں مجھے تکنے لگی۔ میں نے اس کی
کلائی چھوڑ دی۔

"بیٹھ جاؤ میری بہن! میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔ میں صرف یہ پوچھنا
چاہتا ہوں کہ یہاں تو کوئی مسلمان گھر نہیں ہے۔ پھر تم یہاں کہاں سے آگئی ہو؟"

حالانکہ میں ساری بات سمجھ چکا تھا۔ مگر میں اس لڑکی کی زبان سے بھی سننا چاہتا تھا۔
وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی کہنے لگی۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارا ایک مسلمان بھائی ہوں اور پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ اس سے زیادہ میں
تمہیں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہاری والدہ کون تھی؟

اس لڑکی نے مجھے جو اپنی غم انگیز داستان سنائی وہ یہ تھی کہ اس کی والدہ کے ماں
باپ بہن بھائی ضلع جالندھر کی کسی تحصیل کے رہنے والے تھے۔ پاکستان بنا تو ہندو سکھوں
نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑکی کی والدہ کے ماں باپ بھی مہاجرین کے
ایک قافلے میں شامل ہو کر پاکستان کی طرف پیدل چل پڑے۔ راستے میں ہندو سکھوں کے
ایک جتھے نے حملہ کر دیا۔ سکھوں نے اس لڑکی کی ماں کے بہن بھائیوں اور باپ کو وہیں
شہید کر دیا۔ اس لڑکی کی ماں جوان تھی اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سکھ اسے
اٹھا کر لے گئے۔ یہ ساری باتیں اس لڑکی کی ماں نے اسے بتائی تھیں۔ اس سکھ نے لڑکی
کی والدہ سے بیاہ کر کے اسے گھر میں ڈال دیا۔ اس کے بطن سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا
نام سکھ باپ نے ہرنام کور رکھا۔ لیکن اس کی مسلمان ماں نے خفیہ طور پر اس کا نام رضیہ
بیگم رکھ دیا۔ لڑکی نے بتایا کہ اسے یاد ہے وہ چھوٹی سی تھی کہ اس کی والدہ اس کے کان
کے قریب منہ لا کر اسے کلمہ شریف سنایا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔"

"تمہارا نام رضیہ بیگم ہے۔ تم مسلمان ماں کی بیٹی ہو۔ تم سکھنی نہیں ہو۔"

لڑکی کہہ رہی تھی۔

"میں چار پانچ سال کی ہوئی تو مجھے گاؤں کے سکول میں بٹھا دیا گیا۔ میرا سکھ باپ مجھے خاص طور پر گوردوارے ساتھ لے جا کر شبد کیرتن سنوایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا۔ تمہارا نام ہرنام کور ہے تم سکھنی ہو شاید اسے شک پڑ گیا تھا کہ میری ماں مجھے اسلامی تعلیم دیتی ہے۔ گھر میں سب سکھ تھے۔ سارا گاؤں سکھوں کا تھا۔ میری سہیلیاں بھی سکھنی تھیں۔ میری کلائی میں لوہے کا کڑا ہوتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے لوہے کا کڑا پہن رکھا ہے۔"

اس نے مجھے اپنا بازو دکھایا۔ اس کے ایک بازو میں لوہے کا کڑا تھا اور دوسری بانہہ میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے میرا سکھ باپ گرنتھ صاحب کے اشلوک بھی یاد کرایا کرتا تھا۔ مگر میری مسلمان ماں میری تعلیم سے غافل نہیں تھی۔ جب میں اور میری ماں گھر میں اکیلی ہوتیں تو وہ مجھے کلمہ شریف پڑھاتی۔ اس نے مجھے نماز بھی سکھا دی تھی ہم ماں بیٹی چھپ کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔ میری ماں نے مجھے سن سنتالیس کا سارا واقعہ سنا دیا تھا۔ میں بڑی ہوئی تو میرے سکھ باپ نے میری منگنی اپنے بھائی کے بیٹے گرنام سنگھ سے کر دی۔ میری ماں اس غم میں گھلنے لگی کہ اس کی بیٹی کا بیاہ بھی ایک سکھ سے ہو جائے گا اور وہ سکھ نسل پیدا کرے گی۔ میری ماں نے ایک روز مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ بیمار تھی اور چارپائی پر کھیس اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کہا۔ بیٹی! میری زندگی کا اب کچھ پتہ نہیں کہ آج مرجاؤں یا کل مرجاؤں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم سکھ سے شادی کر کے سکھوں میں رہو۔ یہاں سے پاکستان زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا تو اب جینا مرنا یہیں ہے۔ مگر تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جس طرح ہو سکے یہاں سے بھاگ کر اسلامی ملک پاکستان پہنچ جاؤ اور مسلمان بن کر زندہ رہو۔ میری ماں اس کے دوسرے روز مرگئی۔ میں اپنی ماں کو قبر میں دفن ہوتے دیکھنا چاہتی تھی مگر اسے چتا میں جلا دیا گیا۔ اس بات کو بھی دو سال ہوگئے ہیں۔ میں نے اس دوران بڑی کوشش کی مگر پاکستان نہ جا سکی۔ میرے سکھ باپ کو مجھ پر شک پڑ گیا تھا کہ میں اندر سے مسلمان ہوں اور پاکستان بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ وہ ہر سال جتھے کے ساتھ ننکانہ صاحب کی یاترا کو پاکستان جاتا ہے۔ مگر مجھے ساتھ نہیں لے جاتا۔ مجھ پر کڑی نگاہ رکھی جاتی

ہے۔ اب میرا سکھ باپ اپنے بھتیجے گرنام سنگھ سے میری بہت جلد شادی کر دینا چاہتا ہے۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اس قید خانے کی سلاخیں توڑ کر پاکستان کی طرف نکل جاؤں گی۔ اگر میں ایسا نہ کر سکی تو دریا میں ڈوب کر مرجاؤں گی۔"

رضیہ بیگم عرف ہرنام کور چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے پاکستان پہنچا سکتا۔ مگر میں اسے سکھوں کے پاس بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ کیونکہ لڑکی دل سے مسلمان تھی اور اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر وہ پاکستان نہ پہنچ سکی تو خودکشی کر لے گی۔ لڑکی نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اگر تم مسلمان ہو اور تم واقعی مجھے اپنی بہن سمجھتے ہو تو میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ مجھے کسی طرح پاکستان کا بارڈر کراس کرادو۔ مجھے کسی طرح پاکستان کی سرحد میں داخل کرادو۔ میں ساری زندگی تمہارے حق میں دعائیں مانگتی رہوں گی میرا ایمان ہے کہ خدا نے میری کئی برسوں کی دعا آج سن لی ہے۔ اسی واسطے اس نے تمہیں یہاں اس ٹوٹی ہوئی مسجد میں بھیجا ہے۔ یہاں میں کبھی کبھی رات کو جب گھر میں سب سکھ مرد عورتیں سو رہی ہوتی ہیں تو خدا کے حضور دعا مانگنے آجاتی ہوں۔ آج خدا نے میری دعا قبول کرلی ہے۔ خدا کے لئے میری مدد کرو مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور پاکستان پہنچا دو"

میں عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں خود اس وقت پولیس سے چھپا پھر رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیسے اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ مگر میرا دل اسے وہاں چھوڑنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے بھی یقین سا ہونے لگا کہ خدا کی مرضی یہی تھی کہ میں عین اس مسجد میں رات بسر کرنے کے لئے چھپ جاؤں جہاں اس مسلمان لڑکی نے رات کو دعا مانگنے آنا تھا۔ اور اب مجھ پر خدا کی طرف سے یہ ذمے داری عائد ہو گئی تھی کہ اس لڑکی کی مدد کروں جو سکھ کی اولاد تھی مگر مسلمان ماں کی مسلمان بیٹی تھی۔

میں نے کچھ نہ سوچا۔ لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"فکر نہ کرو بہن۔ میں تمہیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کروں گا"

لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر مسجد کی شکستہ محراب کے آگے سجدے میں گر کر روتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ میں نے باہر کی جانب دیکھا کہ اس لڑکی کے پیچھے اس کے گھر سے کوئی وہاں تو نہیں پہنچ گیا۔ مگر باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تم اس وقت میرے ساتھ چل سکتی ہو؟"

لڑکی نے فوراً کہا۔

"ہم خدا کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ مجھے میری مسلمان ماں نے بتایا تھا کہ کوئی مسلمان خدا کے گھر میں بیٹھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیا تم واقعی مسلمان ہو اور مجھے پاکستان لے جاؤ گے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ میں واقعی مسلمان ہوں اور تمہیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔"

لڑکی بولی۔

"تو پھر چلو۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلتی ہوں"

میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر اس مسلمان لڑکی کو سکھوں کے عذاب سے چھٹکارا دلانا ہی ہے تو پھر کل کا انتظار کیا کرنا۔ اسی وقت اسے بھی ساتھ لے کر چل پڑتا ہوں۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر کل کا انتظار کیا تو دن کہاں گزاروں گا؟ کہیں پکڑا ہی نہ جاؤں۔ ارادہ یہی تھا کہ اس لڑکی کو مجاہدین کے پاس پہنچادوں گا وہاں سے اس کے پاکستان پہنچانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے ہوشیارپور کی جانب کونسا راستہ جاتا ہے۔ کیونکہ مجھے جموں کی طرف سے کشمیر جانا ہے۔ وہاں میرے بہت سے مسلمان مجاہد ساتھی ہیں۔ وہ لوگ تمہیں پاکستان پہنچادیں گے۔"

لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔

"میں اپنے کشمیری بھائیوں کی بہادری کی داستانیں سنتی رہی ہوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کاش میں مرد ہوتی تو کشمیر میں بھارتی فوج جو ظلم و ستم کر رہی ہے اس کے خلاف مسلمان کشمیری بھائیوں کے ساتھ مل کر لڑتی۔"

پھر اس نے مجھے بتایا کہ ہوشیارپور وہاں سے بہت دور ہے اور ہمیں تین گاؤں چھوڑ کر ایک سڑک پر سے لاری پکڑنی ہوگی۔ لڑکی اس سارے علاقے سے واقف تھی۔ میں نے کہا۔

"تو پھر اللہ کا نام لے کر میرے ساتھ چل پڑو"

میں اسے ساتھ لے کر مسجد کے کھنڈر سے نکل آیا۔ اس نے چادر اچھی طرح سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دبلی

چلی تھی مسجد سے باہر نکلتے ہی ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے آہستہ سے بولی۔

"بھائی اس طرف آجاؤ۔ یہ راستہ گاؤں کے باہر والے کھال کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے ہم بڑی جلدی گاؤں سے دور نکل جائیں گے۔"

میرے خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس شکستہ مسجد سے جب میں رات کے اندھیرے میں باہر نکلوں گا تو ایک مسلمان لڑکی میرے ساتھ ہوگی جس کو مجھے سکھوں میں سے نکال کر مسلمان مجاہدین کی حفاظت میں دینا ہوگا۔ ہم رات کے اندھیرے میں ایک کھیت کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ لڑکی آگے آگے تھی۔ کھیت میں سے مڑتے ہوئے اس نے ہاتھ سے دور ایک گاؤں کی طرف اشارہ کیا جہاں گھپ اندھیرے میں ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔

"وہ ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں میری ماں فوت ہوئی تھی۔"

اور اس کی آواز بھرا گئی۔ مگر لڑکی بڑی بہادر تھی۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ایک کھال آگیا۔ ہم اس کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد ہم کھال کے ساتھ ہی ایک طرف کو مڑے تو دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ لڑکی نے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ یہ مصلیوں کے گاؤں ہیں۔ تم یہاں اجنبی ہو۔ کتے تمہاری بو سونگھ کر بھونکنے لگے ہیں۔ ہم دوسری طرف سے نکل جائیں گے۔"

وہ کھال سے اتر گئی۔ نیچے کھیت شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کتوں کے بھونکنے کی آواز کافی پیچھے رہ گئی۔ کھیت ختم ہو گئے تو درختوں کے ذخیرے شروع ہو گئے۔ لڑکی نے بتایا کہ یہ آموں کے باغ ہیں۔ چونکہ آموں کا موسم نہیں تھا اس لئے باغ ویران پڑے تھے اور وہاں کوئی رکھوالا نہیں تھا۔ ہم بغیر رکے چلتے جا رہے تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"سڑک کتنی دور رہ گئی ہے؟"

وہ بولی۔

"ابھی کافی دور ہے۔ تم تھک تو نہیں گئے؟"

میں نے کہا۔

"میں تو نہیں تھکا۔ مجھے تمہارا ڈر ہے کہ کہیں تم نہ تھک جاؤ"

وہ کہنے لگی۔

"میں گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ سخت جان ہوں۔ اتنی جلدی نہیں تھکوں گی۔"

رات کے صحیح وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ ہم ایک نہر پر پہنچ گئے۔ نہر کافی بڑی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

"اس طرف ریل کا پل ہے۔ ہم اس پل پر سے نہر پار کر کے دوسری طرف جائیں گے۔"

نہر کے کنارے بڑی ہموار کچی پٹڑی بنی ہوئی تھی۔ کنارے پر دور تک اونچے اونچے درخت دور تک چلے گئے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد ریل کا پل آگیا۔ ہم پل پر لگے ہوئے جنگلے کے بالکل ساتھ ساتھ چل کر دوسری طرف آگئے۔ لڑکی کہنے لگی۔

"یہاں سے گاڑیاں ہوشیارپور امرتسر کو آتی جاتی ہیں۔"

لڑکی آخر عورت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تھک گئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر یہاں تھکان اتار لیتے ہیں۔ ہم کچے راستے سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ اب لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم میرے بڑے سچے مسلمان بھائی ہو۔ لیکن تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ تم کہاں سے آرہے تھے اور رات کے وقت مسجد میں کیوں چھپے ہوئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"بات یہ ہے بہن کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں کشمیری مجاہد ہوں کشمیر کے محاذ پر اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے ساتھ مل کر بھارتی فوجیوں کے خلاف جنگ کر رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے جالندھر آیا تھا۔ واپس جانے لگا تو پولیس کو میرے بارے میں خبر ہو گئی۔ پولیس مجھے گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن میں کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب

ہو گیا۔ رات آئی تو یہاں مسجد میں چھپ گیا کہ رات کے پچھلے پہر آگے چلوں گا۔"

لڑکی کہنے لگی۔

"میں جلدی سے نکل آئی ہوں۔ میں نے کچھ پیسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے کہ کبھی پاکستان بھاگنا پڑے گا تو کام آئیں گے۔ مگر جلدی میں مجھے اس کا خیال نہیں رہا۔ کیا تمہارے پاس لاری کا کرایہ ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔"

پھر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی کہنے لگی۔

"جلدی جلدی یہاں سے نکل چلو۔ میرا باپ صبح صبح کھیتوں میں پانی لگانے کے لئے اٹھے گا۔ اس نے میری چارپائی خالی دیکھی تو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں بھاگ گئی ہوں۔ وہ گرنام سنگھ اور چوہڑ سنگھ کو لے کر میری تلاش میں یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ بڑے خونی قاتل لوگ ہیں۔"

میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی"

اور ہم نے پھر چلنا شروع کر دیا۔

یہ لڑکی زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی۔ اور اب اس پر تھکن کے آثار بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ اگرچہ وہ اسے ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی ہم ہوشیار پور کٹھوعہ روڈ پر بھی نہیں پہنچے تھے کہ ہمیں راستے میں ہی صبح ہو گئی۔ جس وقت سورج نکلا تو لڑکی نے رک کر پیچھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی نظر آئی۔ میں بھی رک گیا۔ میں خطرے کے مقام سے کافی دور آ چکا تھا۔ اب آگے کوئی خطرہ پیدا ہو جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ مگر پچھلا خطرہ کافی دور تک ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

میں نے طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کا رنگ صاف

تھا۔ نقش تیکھے تھے اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی ہو گی۔ اس نے ناک کے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے دشمنوں کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور کہا۔

"اچھی بہن! وقت ضائع نہ کرو اور مجھے آگے دیکھ کر یہ بتاؤ کہ ہوشیار پور کٹھوعہ روڈ یہاں سے کتنی دور ہو گی۔ کیا یہ سڑک رات کو آئے گی۔"

اس نے اپنی نسواری رنگ کی کھیس نما چادر جسم پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ یہ سڑک اس طرف ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ ابھی کتنی دور ہے۔"

دن کی روشنی میں ہمیں کھیت اور دور دور کچھ گاؤں بھی نظر آنے لگے تھے۔ یہ سارا علاقہ زرخیز اور آباد تھا۔ بہت دور کچھ ٹیلوں کے خاکے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم کھیتوں اور جھاڑیوں والی زمین پر جا رہے تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کسان ہل چلاتے اور سبزیاں وغیرہ کاٹتے نظر آ رہے تھے۔ ہم ایک کچے راستے پر آ گئے۔ یہاں پیچھے سے ایک یکہ آ رہا تھا۔ لڑکی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"اس طرف ہو جاؤ۔ کہیں میرا باپو نہ آ رہا ہو۔"

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور ہم کیکروں کے درختوں کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے۔ یکے میں عورتیں اور مرد بیٹھے تھے۔ یکہ گزر گیا تو لڑکی نے سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"کس بات کا؟"

میں نے پوچھا۔

"میرا باپو گرنام اور چوہڑ سنگھ کو لے کر ادھر نہ آ جائے۔ وہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ آبھی گئے تو جب تک میں زندہ ہوں وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

لڑکی نے میرے اس دلیرانہ جملے کا ذرا سا بھی اثر نہ لیا۔ اسے لینا بھی نہیں چاہئے تھا۔ کیونکہ ایک نہتا نوجوان تین خونی قاتل پیشہ ور سکھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے بالکل صحیح کہا تھا۔ ہم ایک گاؤں کے قریب سے گزر گئے۔ چھوٹی سی ندی آئی۔ لڑکی رکنا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے پیاس لگی تھی۔ میری جیب میں بھنی ہوئی جوار موجود تھی۔ میں نے ندی کے پاس درختوں کے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"رضیہ بی بی فکر نہ کرو۔ تمہارا باپو یہاں نہیں آئے گا۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میرے پاس بھنی ہوئی جوار ہے۔ اسے تھوڑا کھاتے ہیں۔ پانی پیتے ہیں۔ ذرا آرام کرتے ہیں پھر آگے روانہ ہو جائیں گے۔"

لڑکی بیٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے اصرار پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی سی جوار میں نے کھائی۔ اسے بھی کھانے کو دی نہر کا پانی پیا منہ ہاتھ دھویا اور نہر کا چھوٹا سا پل پار کر کے آگے چل پڑے۔ اب نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ وہاں پہاڑیاں نہیں تھیں۔ زمین کہیں اونچی ہو جاتی تھی اور کہیں کوئی گھاٹی یا کھائی آجاتی تھی۔ کچھ چھوٹے چھوٹے ٹیلے بہت فاصلے پر ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں کی زمین بھی نیم پتھریلی تھی۔ کہیں کھیتیاں آجاتیں اور کہیں سنگلاخ زمین شروع ہو جاتی۔ کیکر اور پھلاہی کے درخت زیادہ تھے۔ کہیں کہیں ٹاہلی کے درخت بھی تھے۔ ہم ایک برساتی نالے کے پاس پہنچے تو مجھے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ یہ آواز سن کر لڑکی نے پیچھے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"باپو آگیا"

میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے تین گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ لڑکی کا تو رنگ اڑ گیا۔ ایسے لگا جیسے اس کے جسم میں

جان نہیں رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ گھوڑ سوار بڑی تیز آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں لڑکی کو اٹھا کر کھائی میں اتار کر لے جاتا گھوڑ سوار ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ یہ تین سکھ تھے۔ ان میں ایک نوجوان تھا۔ دو ادھیڑ عمر کے تھے۔

وہ تیزی سے گھوڑوں پر سے چھلانگیں لگاتے ہوئے اترے اور ہماری طرف بڑھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر سکھ کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر گرج دار آواز میں کہا۔

"ہرنامو! پتر تو ادھر آجا"

لڑکی ایک دم پھٹ پڑی۔ چیخ کر بولی۔

"میں تیری دھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں تو سکھ ہے۔ تو میری ماں کو اٹھا کر لایا تھا۔ میں تیری بیٹی نہیں ہوں"۔

دوسرے جو دو سکھ تھے وہ میرے دائیں بائیں چار پانچ قدموں کے فاصلے پر تلوار لئے کھڑے تھے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے جو نوجوان سکھ تھا اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہرنامو! تو میری منگ ہے۔ تو ایک غیر آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگی ہے۔ تو نے ہماری عزت ڈبو دی ہے۔"

لڑکی کے باپ نے نوجوان سکھ کو چپ کراتے ہوئے کہا۔

"تو چپ کر گرنام سنگھا! پہلے مجھے اپنی دھی سے بات کرنے دے"

اب میں نے ان سے کہا۔

"میں کسی کو بھگا کر نہیں لے جا رہا۔ لڑکی خود پاکستان جانا چاہتی ہے۔"

اس پر لڑکی کے باپ نے بھڑک ماری اور مجھے گالی دے کر کہا۔

"اوئے میں دیکھتا ہوں تم کس طرح لے جاتے ہو میری دھی کو پاکستان"

پھر اس نے دونوں سکھوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"گرنام سیاں چوہڑ سیاں! منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ختم کردو اس ملیچھ کو یہ مجھے مسلمان

لگتا ہے۔"

اس دوران میں نے اپنے حساب سے ساری منصوبہ بندی کر لی تھی کہ حملے کی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ان سکھوں سے مجھے کسی رو رعایت کی ہرگز امید نہیں تھی۔ ایسی باتوں پر پنجاب کے دیہات میں عام قتل ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ لڑکی کو شاید کچھ نہ کہیں بکر مجھے ضرور قتل کر دیں گے۔ چنانچہ میں ان حالات میں جیسی منصوبہ بندی کر سکتا تھا وہ میں نے ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت سے کر لی تھی۔ بس تلوار کے پہلے وار سے مجھے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ اس کے بعد ان میں سے کوئی مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ لڑکی کے باپو کے منہ سے جیسے ہی یہ جملہ نکلا کہ "منہ کیا دیکھ رہے ہو ختم کر دو اس ملیچھ کو" میرے دائیں بائیں کھڑے دونوں سکھوں نے وحشی آدمیوں کی طرح منہ اوپر کر کے بھڑک ماری۔ مجھے اتنی ہی مہلت چاہئے تھی۔ اس نے بھڑک ماری تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا تھا۔ پنجابی میں ہم اسے ہلارا مارنا کہتے ہیں۔ دیہات میں دشمن پر وار کرتے ہوئے ایسا ہی ہلارا مارا جاتا ہے۔ میری بائیں جانب ہٹا کٹا سکھ چوہڑ سنگھ کھڑا تھا۔ اس کا تلوار والا ہاتھ نیچے ہی تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ الٹا کر کے منہ کے آگے رکھ کر زور سے ہلارا مارا تھا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ جس دشمن پر وار کرنے کے لئے ہلارا مار رہا ہے وہ کون ہے۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کر منہ اوپر کو کیا میں چیتے کی طرح اچھلا اور میں نے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ میرے ہاتھ کی ضرب اس کی کلائی پر پڑی تھی۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہ ذرا سا خطرہ مول لینے کا بھی وقت نہیں تھا۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ چوہڑ سنگھ سنبھلتا میری تلوار اس کے پیٹ میں آدھی سے زیادہ گھس چکی تھی۔ یہ سارا عمل ایک سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔ چوہڑ سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے تلوار اس کے پیٹ میں سے کھینچ لی تھی۔ لڑکی کا باپو اور اس کا منگیتر گرنام سنگھ مجھ پر جھپٹے مجھے گرنام سنگھ سے خطرہ تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی

دوسرے سکھ کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ اس کی مجھے فکر نہیں تھی۔ گرنام سنگھ بھی اناڑی تھا۔ اسے تلوار چلانی تو آتی تھی مگر تلوار کے وار سے اپنے آپ کو بچانا نہیں آتا تھا۔ اس احمق نے دونوں ہاتھوں سے تلوار کے دستے کو پکڑا اور اسے اوپر اٹھا کر میرے سر پر وار کرنے کی کوشش کی مگر ابھی اس کی تلوار اسی کے سر کے اوپر ہی تھی کہ میری تلوار اس کے پیٹ کے آر پار ہو چکی تھی۔

میں نے چلا کر لڑکی کے سکھ باپو سے کہا۔

"میں کسی کو مارنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر تم بھی مجھے قتل کرنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

مگر لڑکی کا باپو ایک تو سکھ تھا دوسرے یہ اس کی عزت آبرو کا معاملہ تھا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔ اس نے ایسی چیخ اپنے حلق سے نکالی کہ ایک بار تو میں بھی گھبرا گیا۔ اس نے مجھے بڑی گندی گالی دی اور گرنام سنگھ کی تلوار پکڑ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اب ہم دونوں میں تلواریں چلنے لگیں۔ میں بھی کوئی تلوار باز نہیں تھا۔ مگر مجھے کمانڈوز کے داؤ پیچ سارے آتے تھے۔ سکھ وحشیوں کی طرح منہ سے غضبناک آوازیں نکالتا ہوا مجھ پر دھڑا دھڑ وار کر رہا تھا۔ مجھے اس کے وار بچانے مشکل ہو رہے تھے۔ مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ میں تلوار سے اس کے وار زیادہ دیر تک نہ روک سکوں گا اور بہت ممکن ہے کہ اس کی تلوار کا وار مجھے شدید زخمی کر دے۔ کیونکہ سکھ بپھرا ہوا تھا۔ وہ غیرت کے جوش میں تھا اور میں عقل سے کام لے رہا تھا۔ غیرت کے سامنے میری عقل میرا ساتھ چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے بس اتنا ہی کیا کہ سکھ نے تلوار کا وار کیا تو اس کے وار کو اپنی تلوار پر روکنے کی بجائے میں بجلی کی طرح نیچے سے نکل کر اس کی دائیں جانب آگیا اور وہاں آتے ہی میں نے اپنا بایاں بازو اس کی گردن میں ڈال کر اپنے فولادی شکنجے میں لیا اور صرف اتنا جھٹکا دیا کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ نہ جانے کیوں میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن سے نکالا تو وہ نیچے گر پڑا۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے پاؤں کے بل بیٹھی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں

منہ میں دبائے کانپ رہی تھی۔ اور منہ سے عجیب قسم کی سہمی ہوئی آوازیں نکال رہی تھیں۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہوش کرو۔ ہوش میں آؤ"

میں نے اسے دو تین جھٹکے دیئے اور گھوڑوں کی طرف دیکھا جو اس قتل کے مناظر سے بالکل بے تعلق ہو کر قریب ہی جھاڑیوں میں منہ مار رہے تھے۔ میں لڑکی کو کھینچتا ہوا گھوڑوں کے پاس لے آیا۔ میں خود ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا اور لڑکی سے کہا اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو دوسرے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔

لڑکی اپنے ہوش وحواس میں آ گئی تھی۔ جلدی سے اس نے گھوڑے کی کاٹھی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اچھل کر اس پر بیٹھ گئی۔ دوسرے لمحے ہمارے گھوڑے ہوشیار پور کٹھوعہ کی ترائی کے نیم پہاڑی علاقے میں دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

مجھ سے دو آدمی قتل بھی ہو گئے تھے۔ اگرچہ میں نے سیلف ڈیفنس یعنی اپنی جان بچانے کے لئے انہیں قتل کیا تھا۔ مگر مجھے دشمن ملک میں قانون کا تحفظ کیسے مل سکتا تھا۔ مجھ پر تو قتل کا جرم ہی عائد ہوتا اور پھانسی کی سزا ہو جاتی۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں اور میں لڑکی کو لے کر جتنی جلدی ہو سکے سری نگر کمانڈر شیروان کی کیمپ گاہ میں پہنچنا چاہتا تھا۔ گھوڑے کافی تیز دوڑ رہے تھے۔ فاصلہ تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ ہم ایک پکی سڑک پر آ گئے۔

لڑکی نے کہا۔

"یہاں سے ہمیں ہوشیار پور کی لاری مل جائے گی۔"

میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہی سڑک ہوشیار پور کو جاتی ہے؟"

اس نے کہا۔

"ہاں میں کئی بار یہاں سے لاری میں بیٹھ کر ہوشیار پور گئی ہوں"

ہم نے گھوڑے وہیں چھوڑ دیئے اور سڑک پر کافی آگے جا کر بیٹھ گئے اور پیچھے سے

آنے والی لاری کا انتظار کرنے لگے۔ دور سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے ہاتھ دیا۔ لاری رک گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ لاری جموں جا رہی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور لاری میں بیٹھ گیا۔ کٹھوعہ لاری رکی تو میں نے لڑکی سے کہا۔

"ہرنام کور! کچھ کھانے کو لاؤں؟"

یہ جملہ میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا تھا کہ دوسرے ہندو سکھ مسافر جو لاری میں ہمارے قریب بیٹھے تھے انہیں یقین ہو جائے کہ ہم بھی ہندو سکھ ہی ہیں۔ لڑکی سمجھ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"نہیں ویر جی!"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ لاری سے نیچے نہ اتروں۔ تھوڑی دیر تک اڈے پر رکنے کے بعد لاری جموں کی طرف چل پڑی۔ یہ سارا علاقہ پہاڑی بھی تھا اور کہیں کہیں میدان بھی آ جاتے تھے۔ سردی زیادہ نہیں تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لاری آہستہ آہستہ چل رہی تھی جس کی وجہ سے جب ہم جموں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔

جموں کا شہر میرے لئے جالندھر سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہاں مجھے محتاط رہنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ کشمیر کی جنگ کی وجہ سے یہاں سی آئی ڈی بہت پھر رہی تھی۔ میں نے لاری اڈے سے ہی معلوم کر لیا کہ سری نگر جانے والی لاری اب صبح کے چار بجے چلے گی۔ شام کو سری نگر کوئی لاری نہیں جاتی تھی۔ اب میرے سامنے رات گزارنے کا مسئلہ تھا۔ جموں میں اپنا ایک مجاہد ضرور عام شہری کے بھیس میں موجود تھا مگر میں لڑکی کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اتنے پیسے میرے پاس تھے کہ ہم کسی ہوٹل میں رات بسر کر سکتے تھے۔ لیکن ہوٹل میں رات بسر کرنے سے ہم سی آئی ڈی والوں کی نظر میں آ سکتے تھے۔ جموں کے ہوٹلوں کے باہر تو سی آئی ڈی تو ضرور موجود ہوتی تھی۔ بلکہ ہوٹل والے خود سی آئی ڈی والوں کو بتا دیتے تھے کہ رات ٹھہرنے کے لئے ان کے ہوٹل میں کون کون آیا ہے۔ ہم لاری اڈے کی چھت کے نیچے ایک طرف ہو کر بیٹھے تھے۔ لڑکی

نے چادر سے جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔"

لاری اڈے کے اندر ہی ایک دکان تھی۔ جس کے باہر کانگڑا ہوٹل لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سے دو تین روٹیاں اور چاول بھاجی لی اور لڑکی کے پاس آگیا۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ وہ کہنے لگی۔

"رات کہاں رہیں گے ویرا؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا"

لاری اڈے میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ پہاڑی علاقے میں شام جلدی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ذرا اندھیرا ہو جائے تو لڑکی کو لے کر کسی دور افتادہ معمولی سے ہوٹل کی تلاش میں نکلوں جموں شہر کے بازاروں سے میں تھوڑا بہت واقف ہو چکا تھا۔ مگر یہاں بھی وہی خطرہ لاحق تھا کہ یہ بڑا شہر ہے اور کشمیر کی وادی کے قریب ہے۔ یہاں انڈیا کے سبھی اخبار آتے ہوں گے اور وہ اخبار بھی لوگوں نے دیکھے ہوں گے جن میں میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اسی واسطے میں بے حد احتیاط سے کام لے رہا تھا اور لوگوں کی نظروں سے اپنے چہرے کو چھپا رہا تھا۔ شام ہوگئی تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ اب میں لاری اڈے سے باہر نکل سکتا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم کس ہوٹل میں جائیں۔ ہوٹل کے سوا دوسری کوئی ایسی جگہ ذہن میں نہیں آرہی تھی جہاں میں لڑکی کے ساتھ رات گزار سکوں۔

اچانک میرے ذہن میں گوردوارے کا خیال آگیا۔ جموں شہر میں بڑے مندر گوردوارے تھے۔ ہم کسی گوردوارے میں محفوظ رہ کر رات گزار سکتے تھے۔ ایک زمانے میں میں نے جموں شہر کے باہر ایک بستی میں ایک گوردوارہ دیکھا تھا۔ میں نے وہیں چلنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس بستی کا نام یاد نہیں رہا جس بستی میں یہ گوردوارہ تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"ہم کسی گوردوارے میں رات گزاریں گے۔ ہوٹل میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں پولیس ہمارے پیچھے آسکتی ہے۔ مجھ سے دو خون بھی ہو چکے ہیں۔"

لڑکی کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی بھائی جان!"

لڑکی کبھی مجھے ویرجی کہتی اور کبھی بھائی جان کہتی۔ وہ سکھوں کے ماحول میں پلی بڑھی تھی مگر اس کو مسلمان ماں نے پالا تھا اور اس کو کلمہ پڑھایا تھا۔ نماز سکھائی تھی اور مسلمانوں کے تمدن سے بھی روشناس کردیا تھا۔ اسی لئے وہ کبھی کبھی بالکل مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح مجھے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

ہم لاری اڈے سے نکل کر بڑی سڑک پر آکر کھڑے ہوگئے۔ ایک خالی تانگہ قریب ہی کھڑا تھا۔ اس وقت مجھے جموں کی اس بستی کا نام معلوم تھا جہاں گوردوارہ تھا۔ یہ بستی شہر کے مضافات میں تھی۔ اسی لئے میں نے اس بستی کے گوردوارے کو منتخب کیا تھا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگہ اس مضافاتی بستی کی طرف چل پڑا۔ میں اور لڑکی تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جموں شہر کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ تانگہ ایک گھاٹی اتر کر ایک ٹیلے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی ٹیلے کے دامن میں گوردوارہ تھا۔ ٹیلے کی ڈھلان پر اور نیچے مکانات تھے جہاں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے تانگہ گوردوارے سے کچھ فاصلے پر رکوا دیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"میں بات کروں گا۔ تم خاموش رہنا"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ گوردوارے کے دروازے پر بلب جل رہا تھا۔ اندر سے گوربانی کی آواز آرہی تھی۔ سکھ مرد عورتیں گرنتھ صاحب کے درشنوں کو گوردوارے میں جا رہے تھے۔ ہم گوردوارے کے اندر جا کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے ماحول کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں کوئی مشکوک آدمی نظر نہ آیا تو میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو میں گرنتھی سے بات کر کے آتا ہوں۔"

میں گوردوارے کے اس کمرے میں آگیا جہاں گوربانی کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ میں نے سر

پر رومال باندھ لیا تھا۔ یہ گوردوارے کے احترام کے لئے ضروری تھا۔ میں نے دیکھا کہ گرنتھی اس وقت بے حد مصروف تھا۔ اس سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی دیر وہاں احترام سے بیٹھے رہنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ ایک طرف ایک نیلے کپڑوں والا اکالی سیوادار لمبے جھاڑو سے گوردوارے کا صحن صاف کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر ست سری اکال کہا اور اس سے پوچھا کہ وہاں پردیسی مسافروں کے رات بسر کرنے کو کوئی جگہ مل جائے گی۔ سیوادار نے کہا۔

"گوردوارے کے پیچھے سرائے ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔"

میں لڑکی کو لے کر سرائے میں آگیا۔ یہ سرائے ایک لمبی سی بارک کی شکل کی تھی۔ بارک کے برآمدے میں کچھ عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ یہاں بھی ایک سیوادار مل گیا میں نے اسے کہا۔

"صاحب جی! میرا نام شام سنگھ ہے۔ میرے ساتھ میری بہن بھی ہے۔ ہم سری نگر جا رہے تھے کہ معلوم ہوا لاری صبح کو جائے گی۔ ہمیں رات گزارنے کو کمرہ مل جائے گا؟"

دس روپے ادا کرنے پر ہمیں ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا۔ جس میں ایک چارپائی تھی۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ہمیں دو موٹے کمبل بھی مل گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم چارپائی پر سو جانا۔ میں دری پر سو جاؤں گا"

لڑکی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نیچے دری پر کمبل گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں رات کو خاصی سردی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں اپنے باپو کے مرنے کا افسوس نہیں ہے؟"

وہ بولی۔

"وہ میرا باپو نہیں تھا۔ وہ میرا اور میری ماں کا دشمن تھا۔ اس نے میری ماں کے بہن بھائیوں ماں باپ کو شہید کر کے اس کو اغوا کیا تھا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا۔ میں اسے اپنا باپ نہیں سمجھتی مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے۔"

میں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں نے اس کے باپ کی گردن کو صرف اتنا جھٹکا دیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم پاکستانی فوجی ہو؟"

میں نے کہا۔

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

وہ بولی۔

"جس طرح تم نے اکیلے اور نہتے ہو کر تین تلواروں کرپانوں والے سکھوں کو ٹھکانے لگایا ہے یہ پاکستان کا بہادر فوجی ہی کر سکتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پاکستان کا ہر مسلمان فوجی ہے اور وہ اپنے ملک پر حملہ کرنے والے دشمن کو اسی طرح ٹھکانے لگائے گا"

کھانا ہم نے لاری اڈے پر ہی کھا لیا تھا۔ تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد لڑکی چارپائی پر اور میں دری پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ کمرے میں کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ سرائے کے سیوادار نے کمرہ دیتے وقت مجھے دو باتوں کی خاص طور پر ہدایت کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"رات کو کمرے کا بلب جلتا رکھا جائے گا۔ تم لوگوں نے منہ اندھیرے سری نگر جانے والی لاری پکڑنی ہے۔ اس وقت میں گوربانی پاٹھ سن رہا ہوں گا تم کمرے کو تالا لگا کر چابی یہاں سے صندوقچی میں ڈال جانا۔"

میں نے کمرے کا تالا اس میں لگی ہوئی چابی سمیت اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر چارپائی پر لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دستک کی آواز سن کر اٹھ بیٹھی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر دروازے کے پاس آگیا۔

"کون ہے بھئی؟"

میں نے پوچھا۔

باہر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

"سنگتو! پرشاد لے لو"

پرشاد کا معاملہ تھا۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گوردوارے کا کوئی سیوادار ہو گا جو سرائے کے مسافروں میں گوردوارے کا پرشاد بانٹ رہا ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک درمیانے قد کا بھاری بدن والا آدمی ہاتھ میں حلوے کا ڈونا لئے کھڑا تھا۔ وہ بڑی دیدہ دلیری سے اندر آگیا اور لڑکی کو پرنام کرتے ہوئے بولا۔

"شما کر دینا بہن جی! آپ کو تکلیف دی ہم نے ایک سکھیا سکھی تھی یہ اس کا پرشاد ہے۔"

میں نے پرشاد کا ڈونا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔

"شکریہ ماراج۔ ہم بڑے تھکے ہوئے ہیں"۔

میرا مطلب تھا کہ ہم سونا چاہتے ہیں اور تم چلے جاؤ۔ مگر وہ کھڑا رہا اور میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ باریک تھے اوپر مونچھوں کا چھجہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے بڑی خطرناک لگی۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب آپ جالندھر سے آرہے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں جی! میرا نام شام سنگھ ہے یہ میری بہن ہرنام کور ہے۔"

اس وقت جلدی میں میرے منہ سے لڑکی کا اصلی نام نکل گیا جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ پھر اپنی گرم صدری میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ کہنے لگا۔

"میں جموں پولیس کا سی آئی ڈی انسپکٹر بنسی دھر ہوں۔ تمہارے بارے میں ہمیں ساری رپورٹ مل چکی ہے۔ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ پیچھے دو سکھوں کا خون کر کے آرہے

ہو۔ اور اس عورت کو بھگا کر سری نگر لے جا رہے ہو۔ یہ عورت اس کمرے میں رہے گی۔ تم کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔"

میں نے اپنے آپ کو بالکل پریشان نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ واقعہ مجھے پہلی بار پیش نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے میں کئی بار اس قسم کے حالات سے گزر چکا تھا۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ باہر پولیس تو نہیں آئی۔ میں نے کہا۔

"مہاراج آپ کو غلطی لگ گئی ہے۔ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ پاکستانی جاسوس سرائے کے کسی دوسرے کمرے میں ہی ہو گا۔ میں ضلع جالندھر کے گاؤں بیروالی کا رہنے والا ہوں اور یہ میری بہن ہے۔"

اس آدمی کا چہرہ مزید کرخت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ پستول پر اس کے ہاتھ کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی تھی اور اس کا رخ میرے سینے کی جانب تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے مخبر گدھے نہیں ہیں۔ تھانے چل کر تم خود مان جاؤ گے کہ تم ہی پاکستانی جاسوس ہو اور تم نے دو سکھوں کو قتل کیا ہے اور ایک سکھ سردار کو بے ہوش کر کے اس کی بیٹی ہرنام کور کو اغوا کر کے لے جا رہے ہو"

میں نے ہرنام کور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! آپ ہرنام کور سے پوچھ لو اگر میں اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہوتا تو وہ شور نہ مچاتی۔"

سی آئی ڈی انسپکٹر اس کے جواب میں ایک ایسی حرکت کر بیٹھا جو پولیس اور سی آئی ڈی کے لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ پستول اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا اور وہ مجھ سے دو قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بڑی غلیظ گالی دیتے ہوئے ایک دم بائیں ہاتھ سے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔ کمانڈو اور ایک میرے ایسا تربیت یافتہ کمانڈو بڑا متحمل مزاج ہوتا ہے۔ اور کبھی گرمی نہیں کھاتا۔ وہ ہر قدم ٹھنڈے دل سے پوری طرح سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے مگر خدا جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا کہ گالی سنتے اور تھپڑ کھاتے ہی میرا سر پھر گیا۔ شاید اس کی وجہ وہ لڑکی بھی ہو جس پر پہلے ہی سے میری دلیری کی دھاک

بیٹھ چکی تھی اور جو چارپائی پر حیران پریشان بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوند گئی۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کیسے اس کی ناف کے نیچے زور سے اپنا ٹھڈا مارا اور کیسے وہ دہرا ہو کر گر پڑا۔ پھر کیسے میں نے سب سے پہلے اس کا پستول پاؤں کی ٹھوکر سے دور پھینکا اور کب میرے فولادی بازو نے اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب بنسی دھرنامی جموں پولیس کا سی آئی ڈی انسپکٹر میرے قریب ہی دری پر مرا ہوا پڑا تھا۔ میں نے پستول اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالا اور کھونٹی سے جیکٹ اتار کر پہنتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی چلنا ہوگا۔"

لڑکی جلدی سے چارپائی سے اٹھی اور سرہانے کے پاس پڑی چادر جسم پر لپیٹنے لگی۔ میں نے اپنے سرہانے کے نیچے سے کنجی لگا ہوا تالا نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور لڑکی کو ایک سیکنڈ رکنے کا اشارہ کیا۔ دروازہ اگرچہ بند تھا مگر اسے اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ آدمی اپنے ساتھ باوردی یا سویلین کپڑوں والی پولیس کے آدمی تو نہیں لایا۔ برآمدے کا بلب کونے میں جل رہا تھا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ گوردوارے کے بڑے کمرے کی جانب سے گوربانی کے پاٹھ کی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ جو راستہ برآمدے سے گوردوارے کے گیٹ کی طرف جاتا تھا رات ہو جانے اور سردی بڑھ جانے کی وجہ سے وہ بھی خالی پڑا تھا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔

"آجاؤ"

لڑکی چھ سات گھنٹوں میں میرے ہاتھ سے تین چار آدمی قتل ہوتے دیکھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ وہ چادر اپنے جسم پر ٹھیک کرنے لگی۔ میں نے اسے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے نکل چلو"

کمرے سے باہر آکر میں نے دروازے کو تالا لگایا اور چابی اپنی جیب میں ہی رکھ لی۔ تاکہ اگر سیوادار نے صبح کے وقت کمرے کو کھول کر لاش دیکھنی ہے تو اسے مزید دیر لگ

جائے۔ ہمارے پاس کوئی سامان وغیرہ تو تھا نہیں۔ تین کپڑوں میں تھے۔ اسی طرح بڑے سکون سے چلتے ہوئے برآمدے سے اتر کر گوردوارے کے گیٹ میں سے باہر نکل گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سی آئی ڈی انسپکٹر معاملے کی تحقیقات کے لئے اکیلا ہی آیا تھا۔ ایسے موقعوں پر یہ لوگ اکیلے ہی جاتے ہیں مگر سنگین حالات میں اسلحہ ضرور ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ کامیاب کارروائی پولیس کی بجائے اپنے نام ڈالنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور یقین کریں اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو سی آئی ڈی انسپکٹر اسے تھانے لے گیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا واسطہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے پڑ گیا ہے۔

جموں شہر کی اس بستی کی سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ دریا پار شہر کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ لڑکی کہنے لگی۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں ویر جی؟"

یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"اب ہمارا اس شہر میں رکنا ٹھیک نہیں ہمیں یہاں سے کسی طرف نکل جانا چاہئے"

"ہم آگے پہاڑیوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں"

لڑکی نے کمانڈو عورتوں والی بات کی تھی۔ میں نے کہا۔

"صبح پولیس کو گوردوارے میں اپنے انسپکٹر کی لاش مل جائے گی اور جموں سے لے کر سری نگر تک پولیس سڑک کی ناکہ بندی کر لے گی۔ وہ آس پاس کی پہاڑیوں میں بھی ضرور جائے گی۔"

"تو کیا پھر ہم واپس کٹھوعہ چلے جائیں؟"

میرا ذہن بڑی تیزی سے کوئی ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت سری نگر کی طرف کوئی لاری یا ٹرین بھی نہیں جاتی تھی۔ اگر جاتی بھی تو راستے میں ہم پکڑے جا سکتے تھے۔ میں لڑکی کی تجویز پر غور کرنے لگا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم پہاڑیوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ یہ تجویز مجھے محفوظ محسوس ہو رہی تھی۔ اگر ہم جموں سے آگے نکل کر آس

پاس کے ویرانے علاقے میں کسی جگہ چھپ جاتے ہیں۔ اور وہاں ایک رات اور ایک دن گزار لیتے ہیں تو دوسرے دن کسی لاری یا ٹرک کے ذریعے جموں سے سری نگر تک جانے میں اتنا زیادہ خطرہ نہیں ہو گا۔

جموں شہر کے شمال مغرب کی طرف جو خشک کہیں کہیں جنگلی جھاڑیوں والی پہاڑیاں تھیں وہ میری جانی پہچانی تھیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار میں بھارتی دہشت گردوں کو ٹھکانے لگانے کے آپریشن کے سلسلے میں ان پہاڑیوں میں دور پاکستانی سرحد کے قریب تک جا چکا تھا اور وہاں ان بھارتی تخریب کاروں کو گولیوں سے بھون کر واپس آ گیا تھا جو پاکستان میں جا کر دہشت گردی کرنے والے تھے۔ اگرچہ صحیح طور پر مجھے ان پہاڑیوں کا حدود اربعہ یاد نہیں تھا مگر اتنا مجھے معلوم تھا کہ ان پہاڑیوں میں بے شمار قدرتی غار گھاٹیاں برساتی نالے اور کھڈ ہیں جہاں ہم جب تک چاہیں بغیر کسی خطرے کے روپوش رہ سکتے تھے۔ اس وقت مجھے کسی جگہ کچھ دیر کے لئے روپوش ہونے کی سخت ضرورت تھی۔ ورنہ جموں اور سری نگر کے راستے میں میرا اور لڑکی کا پولیس کے قابو میں آ جانا یقینی تھا۔ میرے ساتھ تو پولیس نے جو سلوک کرنا تھا اس کا مجھے علم تھا مگر اس لڑکی کی زندگی تباہ ہو جاتی۔ وہ پھر نہ پاکستان جا سکتی تھی اور نہ واپس اپنے گھر میں جا سکتی تھی۔

اس لڑکی کو پاکستان پہنچانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی بدنصیب مسلمان ماں نے اسے پکا مسلمان بنا دیا تھا اور اس کے دل میں اسلام سے اور پاکستان سے اتنی شدید محبت پیدا ہو چکی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ پاکستان نہ پہنچ سکی تو واقعی خودکشی کر لے گی۔ ہمیں ایک خالی رکشا مل گیا۔ یہ موٹر رکشا تھا اور جموں میں یہ رکشے نئے نئے چلنا شروع ہوئے تھے۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ میں نے ڈرائیور سے ایک خاص جگہ کا نام لے کر کہا کہ ادھر چلو۔ رکشا چل پڑا۔ جس خاص جگہ کا میں نے نام لیا تھا وہ جموں شہر کے شمال میں جموں سری نگر روڈ پر دریا کے پار واقع تھی۔ یہاں ایک بہت بڑا برساتی نالے کا پل بنا ہوا تھا۔ اس پل پر آ کر ہم رکشے سے اتر گئے۔ رات کا اندھیرا یہاں زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ آس پاس کوئی بجلی کا کھمبا نہیں تھا۔ پھر بھی چونکہ آسمان صاف تھا اور تارے

چمک رہے تھے اس لئے ان کی دھندلی دھندلی چمک میں زمین اور کہیں کہیں درختوں کے ہیولے ضرور نظر آ رہے تھے۔ جب رکشا ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا تو لڑکی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"میں نے تمہاری تجویز پر عمل کیا ہے ہم ایک رات اور ایک دن یہاں سے دور جو پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں وہاں چھپے رہیں گے۔ کیونکہ صبح ہوتے ہی پولیس کو سی آئی ڈی انسپکٹر کی لاش مل جائے گی اور وہ کم از کم جموں سری نگر روڈ پر ضرور چیکنگ شروع کر دے گی۔"

میں نے اسے یہ بالکل نہ بتایا کہ اخباروں میں میری تصویر بھی چھپ چکی ہے اور پولیس پہلے ہی سے میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ لڑکی دلیر تھی۔ کہنے لگی۔

"تم مجھے جہاں لے چلو گے میں چلی جاؤں گی۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے پاکستان ضرور پہنچا دینا۔ مرنے کے بعد میری روح بھی تمہیں دعائیں دیتی رہے گی"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمک گیا۔ اس لڑکی کو اگر پاکستان ہی پہنچانا ہے تو مجھے سری نگر جا کر اس کو مجاہدین کے ذریعے بارڈر کراس کرانے کی بجائے میں اسے یہاں جموں کی پہاڑیوں سے بارڈر کراس کرا کے پاکستان لے جا سکتا ہوں۔ اگرچہ میں ایسا غیر قانونی اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ ایک مسلمان لڑکی کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

اس خیال کے ساتھ ہی جیسے میرا آدھا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ بجائے پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے میں ان پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر پاکستان کے بارڈر تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد میرا وہ فرض پورا ہو جائے گا جو مجھ پر اس لڑکی کی طرف سے عائد ہوتا ہے اور جس کی اس لڑکی کی بدنصیب مغویہ مسلمان ماں نے اس کو قسم دلائی تھی۔ میں نے لڑکی کو اپنا فیصلہ نہ بتایا اور اس کو ساتھ لے کر برساتی نالے کے ساتھ ساتھ دور نظر آنے والی پہاڑیوں کے ہیولوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

نالے کی دیوار اونچی تھی اور اس میں پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی ایک میل تک

نالے پر چلنے کے بعد چھوٹے چھوٹے چھتری نما درختوں کے جھنڈ آگئے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ تھک تو نہیں گئی۔ لڑکی نے کہا۔

"بالکل نہیں تھکی بھائی جان"

جب وہ مجھے بھائی جان کہتی تو مجھے اچھی بھی لگتی اور مجھے اپنی شہید بہن کلثوم یاد آجاتی اور میرے اندر یہ جذبہ زیادہ شدت اختیار کرلیتا کہ مجھے اس لڑکی کو پاکستان ضرور پہنچانا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم پاکستان تو جا رہی ہو مگر وہاں تمہارا کون ہے جس کے پاس جاؤ گی؟"

یہ سوال میرے ذہن میں کئی بار پیدا ہوا تھا۔ لڑکی کہنے لگی۔

"میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان میں گجرات شہر کے قریب ایک گاؤں ہے۔"

لڑکی نے مجھے گاؤں کا نام بتایا جو میں یہاں قصداً نہیں لکھ رہا۔

"ماں نے کہا تھا کہ اس گاؤں میں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ تم پاکستان پہنچ کر سیدھے ان کے پاس چلی جانا۔ وہ لوگ تمہیں اپنے پاس رکھ لیں گے اور تمہاری اپنا عزیزوں میں شادی کر دیں گے۔"

لڑکی نے مجھے اپنی والدہ کے رشتے داروں کے نام بھی بتائے۔ میں سوچنے لگا کیا وہ لوگ اس لڑکی کو قبول کرلیں گے؟ یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کردیں۔ ایسی صورت میں لڑکی کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گی؟

رات گہری ہو گئی تھی۔ ہم جموں شہر سے بہت دور نکل آئے تھے۔ جموں شہر کی روشنیاں اب پیچھے دیکھنے سے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ میدان ختم ہوا تو اونچا نیچا نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ آس پاس چھوٹے چھوٹے ٹیلے ٹبے تھے جن پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی تھک گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں رک گیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنی چاہیے۔"

لڑکی بیٹھ گئی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر کا پستول میری جیب میں تھا۔ قریب ہی ایک ٹیلہ تھا میں نے لڑکی سے کہا۔

"وہاں چل کر کوئی جگہ دیکھتے ہیں"

ٹیلے کے دامن میں جھاڑیاں نہیں اگی ہوئی تھیں۔ ان کی بجائے وہاں بڑی بڑی پتھریلی سلیں آڑھی ترچھی پڑی تھیں۔ چلنے سے سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ مگر ان سلوں پر کچھ دیر بیٹھنے سے سردی محسوس ہونے لگی۔ شبنم بھی گر رہی تھی۔ مجھے لڑکی کا زیادہ خیال تھا۔ میں تو سرد گرم کا عادی تھا۔ میں اٹھ کر ٹیلے کے پیچھے گیا تو وہاں درختوں کے نیچے ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ خدا جانے یہ کس مقصد کے لئے اس ویرانے میں بنایا گیا تھا۔ میں نے لڑکی کو وہاں بلایا اور کہا۔

"اس سے اچھی جگہ یہاں نہیں مل سکتی یہیں سو جاتے ہیں"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور چبوترے کے فرش پر اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ کر لیٹ گئی۔ میں دوسری طرف بازو کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا۔ لڑکی بے حد تھکی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آئی۔ وہ سو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔ لیکن مجھ پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر میں بھی سو گیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو درختوں میں سے دھوپ چھن چھن کر میرے اوپر آرہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا کہ لڑکی اسی طرح چادر لپیٹے سو رہی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا یہ علاقہ میدانی بھی تھا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی نظر آرہے تھے۔ ٹیلوں پر زیادہ درخت نہیں تھے۔ میں چبوترے سے اتر کر کچھ دور گیا تو مجھے ایک چھوٹی سی نہر بہتی نظر آئی۔ اس کا پانی پنجاب کے میدانی علاقوں کی نہروں ایسا گدلا نہیں تھا بلکہ صاف تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور واپس چبوترے پر آیا تو لڑکی جاگ چکی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"یہاں پیچھے ندی بہتی ہے تم بھی وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ۔ میری جیبوں میں ابھی بھنے ہوئے دانے پڑے ہوئے ہیں۔ اسی کا ناشتہ کریں گے۔"

لڑکی ندی کی طرف چلی گئی۔ میں نے جیب سے ساری بھنی ہوئی جوار نکال کر رومال میں ڈالی اور اسے فرش پر رکھ دیا۔ پھر پستول نکال کر اس کو غور سے دیکھا۔ یہ پولیس والوں کا مخصوص پرانی ٹائپ کا پستول تھا۔ جس کا ٹریگر کھٹکا دبانے سے بند ہو جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پستول کا کھٹکا نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ ہندو سی آئی ڈی انسپکٹر واقعی مجھے گولی مار کر ہلاک کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ خدا کا شکر ہے میں جیب میں ہاتھ ڈال کر جب چل رہا تھا کہ میرا ہاتھ یونہی ٹریگر پر نہیں پڑ گیا تھا ورنہ پستول میری جیب کے اندر ہی چل جاتا۔ میں نے فوراً ٹریگر کا کھٹکا لگا دیا۔ اس کے چیمبر میں سات گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے پستول دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ میری نگاہیں مغرب کی جانب نظر آنے والی

پہاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پہاڑیاں مجھے یاد تھیں۔ ہندو تخریب کاروں کا لیڈر پاکستان کے بارڈر پر جانے کے لئے ہمیں انہی پہاڑیوں میں سے لے کر گزرا تھا۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے پاکستان کی سرزمین تھی۔ اتنی دیر میں لڑکی منہ ہاتھ دھو کر آگئی۔ ہم نے چبوترے پر بیٹھ کر بھنی ہوئی جوار کھا کر بھوک مٹائی لڑکی پوچھنے لگی۔

"یہاں سے پاکستان کتنی دور ہے بھائی؟"

میں نے مغرب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یوں سمجھ لو کہ ان پہاڑیوں کے پیچھے پاکستان ہے"

لڑکی نے پر اشتیاق نگاہوں سے دور پہاڑیوں کی طرف دیکھا اور گہرا سانس بھر کر بولی۔

"ویرجی! کیا سچ مچ میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ملک پاکستان پہنچ جاؤں گی؟"

میں نے کہا۔

"اللہ کو منظور ہوا تو ضرور پہنچ جاؤں گی"

وہ بولی۔

"آپ بے شک مجھے پاکستان کا بارڈر پار کرا کر واپس آجانا۔ پاکستان پہنچ کر میں اپنی ماں کے رشتے داروں کے گاؤں میں پہنچ جاؤں گی۔ وہاں کوئی نہ کوئی میرا مسلمان بھائی مجھے وہاں پہنچا دے گا۔"

مگر میں لڑکی کو پاکستان میں داخل ہو کر اس کے رشتے داروں کے پاس خود لے کر جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ لڑکی پاکستان میں غلط قسم کے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ لڑکی نے مجھے بھائی کہا تھا کہ اب میری ذمے داری بنتی تھی کہ میں اس کی عزت آبرو کی حفاظت کروں اور اسے خود ان کے عزیزوں کے پاس چھوڑ کر آؤں۔ میں نے سوچا تھا کہ اسی بہانے میں اپنے والد صاحب کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھ لوں گا اور ان کی روح کو مخاطب کر کے کہوں گا کہ میں نے ان کی وصیت پر پورا عمل کیا ہے۔ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ بھارتی فوج اور بھارتی حکومت کشمیریوں پر ظلم کر رہی ہے مگر ہمارا جہاد

بھی جاری ہے اور یہ جنگ یہ مقدس جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب کہ کشمیر کا بچہ بچہ حق خود ارادیت حاصل کر کے بھارتی غلامی کی زنجیروں کو توڑ نہیں دیتا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم پہلی بار پاکستان جا رہی ہو۔ تمہیں وہاں کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ میں خود تمہارے ساتھ بارڈر کراس کر کے پاکستان جاؤں گا اور تمہیں تمہارے رشتے داروں کے حوالے کر کے واپس کشمیر آجاؤں گا۔"

لڑکی کہنے لگی۔

"بارڈر پر تو فوج ہوگی۔ ہم بارڈر کے پار کیسے جائیں گے۔ میرا چاچا چوہڑ سنگھ بارڈر پر سمگلنگ کا دھندا کرتا تھا۔ وہ میرے باپو کو کہا کرتا تھا کہ انڈیا کا بارڈر تو ہم دے دلا کر پار کر لیتے ہیں مگر پاکستان کا بارڈر پار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ وہاں کوئی رشوت نہیں چلتی اور ہمیں آدھی آدھی راتوں کو اندھیرے میں دریا پار جانا پڑتا ہے اور بارڈر فورس کی فائرنگ سے ہمارے کئی آدمی مارے بھی جا چکے ہیں۔ پھر ہم کیسے بارڈر پار کریں گے۔"

لڑکی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پاکستان کا بارڈر غیر قانونی طور پر کراس کرنا بہن مشکل تھا۔ مگر میرے سامنے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مجھے ہر حالت میں غیر قانونی طو پر ہی بارڈر کراس کرنا تھا اور لڑکی کو بھی ساتھ ہی بارڈر کراس کرانا تھا۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں تھی۔ اگرچہ اس میں بھی جان کا خطرہ تھا مگر اور کوئی ترکیب نظر نہیں آ تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بارڈر پر پہنچیں گے تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ تمہیں اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں نے گھر میں کسی کو کہتے سنا تھا کہ پاکستان سے کمانڈو بارڈر پار کر کے کشمیر آتے ہیں اور کشمیری مجاہد بھی پاکستان چلے جاتے ہیں۔ کیا ہم کسی ایسی ہی جگہ سے بارڈر کراس نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے بالکل غلط سنا ہے۔ پاکستان سے کبھی کوئی کمانڈو سرحد پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل نہیں ہوا۔ کشمیری مجاہدوں کو بھی پاکستان آنے کی کیا ضرورت ہے۔ کشمیر کا بچہ بچہ کمانڈو بن کر اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ کشمیر کا ہر مسلمان اپنی جگہ پر حریت پسند کمانڈو ہے پاکستان مسلمان ملک ہونے کے ناطے اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کی اخلاقی اور سفارتی سطح پر مدد ضرور کرتا ہے۔ مگر پاکستان سے کوئی کمانڈو کشمیر نہیں جاتا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کشمیری مجاہد بھارتی فوجیوں سے چھینے ہوئے اسلحہ سے لڑتے ہیں۔ وہ دشمن کے کانواؤں پر حملہ کر کے اسلحہ حاصل کرتے ہیں اور دشمن کا اسلحہ دشمن کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔"

لڑکی کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی۔ پھر کہنے لگی۔

"دونوں طرف سمگلر بھی تو بارڈر کراس کرتے ہیں۔ ہم کسی سمگلر کی مدد سے بارڈر کراس نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا۔

"پاکستان کی بارڈر فورس نے سیکورٹی کے بے حد سخت انتظامات کر رکھے ہیں اب کوئی سمگلر بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

وہ مایوس سی ہو کر کہنے لگی۔

"تو کیا میں پاکستان نہیں پہنچ سکوں گی؟"

میں نے کہا۔

"جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔ تم فکر نہ کرو"

میرے دل میں یہ تجویز بھی آئی تھی کہ انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کے بعد میں اپنے آپ کو لڑکی سمیت پاکستانی بارڈر فورس یعنی پاکستانی رینجرز کے حوالے کر دوں گا اور ان سے کہوں گا کہ میں ویزا لے کر انڈیا گیا تھا۔ وہاں ایک دو دن زیادہ ٹھہر گیا۔ پولیس نے مجھے جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا۔ میرا پاسپورٹ بھی چھین کر غائب کر دیا۔ مجھ پر بے پناہ تشدد کیا

اور جیل میں ڈال دیا۔ میں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور پنجاب کی طرف انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کے لئے آگیا۔ وہاں یہ لڑکی مل گئی جس کی ماں کو قیام پاکستان کے وقت سکھوں نے اغوا کرلیا تھا۔ یہ لڑکی اس بدنصیب مسلمان مغویہ خاتون کی بیٹی ہے جو اب پاکستان میں جینا مرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس میں ایک قباحت تھی جو لازمی بھی تھی۔ یعنی ہمیں غیر قانونی طور پر پاکستان کا بارڈر کراس کرنے کے جرم میں جیل میں ڈال د جاتا۔ ہم پر مقدمہ چلتا ضابطے کی ساری کارروائی پوری کی جاتی اور ہم دونوں کو قید ہو جاتی۔ اس کی وجہ سے میں کشمیر کی جنگ سے دور ہو جاتا تھا اور خدا جانے ہمیں کتنی قید سنائی جاتی۔ چنانچہ میں نے اس منصوبے کو ذہن سے نکال دیا اور یہی فیصلہ کیا کہ دریا پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ قسمت اچھی ہوئی تو لڑکی کو لے کر پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ اگر رینجرز کی گولیوں سے ہلاک ہوگیا تو پھر مرجاؤں گا۔ اور کیا کر سکتا تھا۔

میں نے لڑکی کو اس منصوبے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور اس سے پوچھا۔

"کیا تم پاکستان پہنچنے کے لئے جان کی بازی لگا سکو گی؟"

وہ بولی۔

"میں ایک بار نہیں سو بار پاکستان پر جان قربان کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"یہ پاکستان پر جان قربان کرنے والی بات نہیں ہے۔ یہ غیر قانونی طور پر پاکستان پہنچنے کی خاطر جان قربان کرنے کا معاملہ ہے۔ اگر تم اس کے لئے تیار ہو تو میں تمہیں لے کر آگے چلتا ہوں۔ اگر نہیں تو یہیں سے واپس ہو جاتے ہیں۔"

لڑکی کی آنکھوں میں تو آنسو آگئے کہنے لگی۔

"خدا کے لئے مجھے واپس نہ لے جانا۔ میں کنوئیں میں کود کر مرجاؤں گی۔ مجھے اگر مرنا ہی ہے تو پاکستان کے ملک میں داخل ہونے کی کوشش میں مروں گی پھر میری روح کو مرنے کا کوئی غم نہیں ہوگا۔"

میں آپ کے آگے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے اپنی کہانی بیان کرنے سے پہلے آپ سے عہد کیا تھا کہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا اور اپنے دل کا حال بھی پوری سچائی کے ساتھ آپ کو بتادوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں غیر قانونی طور پر پاکستان کا بارڈر کراس نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ بات بھی تھی کہ پاکستان کا بارڈر کراس کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ سن 65ء کی جنگ کے بعد پاکستانی سرحد پر سیکورٹی انتہائی سخت ہوگئی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں طرف بارڈر فورس کی بجائے فوجوں نے مورچے سنبھال رکھے ہوں۔ لیکن اس بدنصیب لڑکی کو جو مسلمان ماں اور سکھ باپ کی بیٹی تھی میں ہندوستان میں ایسی حالت میں اکیلی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ اس پر اپنے منگیتر اور چچا دونوں کو قتل کرنے اور سکھ باپ کو قتل کرنے کی کوشش کرنے کا الزام عائد ہو۔ اب وہ اپنے سکھوں کے گھر میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر میں اسے ہندوستان میں اکیلی چھوڑتا ہوں وہ یا تو خودکشی کرتی یا پھر اس کی باقی زندگی بھارت کے شہروں کے قحبہ خانوں میں بدترین حالات میں بسر ہوتی۔

یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں نے یہی طے کیا کہ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یا تو دونوں پاکستان پہنچ جائیں گے یا پکڑے جائیں گے اور یا دونوں کی لاشیں سرحد پر پڑی ہوں گی۔ میں اس لڑکی کو کافر دشمنوں کے درمیان اکیلی نہیں چھوڑ سکتا تھا جس کے سینے میں اسلام کی شمع روشن ہو کر اس کی روح کو منور کر رہی تھی۔ میں ایک نئے جذبے کے ساتھ وہاں سے اٹھا اور لڑکی کو ساتھ لے کر آگے چل پڑا۔ راستے میں ایک گاؤں آیا۔ میں نے لڑکی کو درختوں کی اوٹ میں ایک جگہ بٹھا دیا اور خود گاؤں میں آگیا۔ گاؤں کے مکانوں میں ایک مندر کا زرد جھنڈا لہراتا نظر آرہا تھا۔ گاؤں کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہوئی تھی۔ مسجد محض ایک چبوترہ تھی۔ قبلہ رخ اینٹوں کی محراب تھی اور دو چار صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھا دیہاتی صفیں صاف کر رہا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں نے کہا۔

"جناب میں مسلمان ہوں۔ بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو مل جائے گا۔"

وہ بولا۔

"گاؤں کے پیچھے جاؤ۔ وہاں مسلمان کا تنور ہے۔ وہاں دال روٹی مل جائے گی"۔

میں پیچھے چلا آیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کے باہر تنور لگا تھا۔ ایک بوڑھی عورت روٹیاں لگا رہی تھی۔ دو مزدور قسم کے آدمی ایک طرف بیٹھے دال روٹی کھا رہے تھے۔ میں نے عورت سے چھ روٹیاں لیں۔ دال ماش کی تھی جو سخت تھی۔ میں نے ہر روٹی پر تھوڑی تھوڑی دال ڈلوائی۔ اسے پیسے دیئے اور روٹیاں لے کر لڑکی کے پاس آ گیا۔

میں نے کہا۔

"دال روٹی مل گئی ہے۔ کچھ کھا لیتے ہیں۔ کچھ ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ آگے کام آئیں گی۔"

تنور کی روٹی اور دال بڑے مزے سے ہم دونوں نے کھائی۔ اور وہاں سے چل پڑے۔ آگے ایک پہاڑی نالہ مل گیا۔ وہاں سے پانی پیا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ ہم اب تھوڑا تھوڑا چلتے تھے۔ اور آرام بھی کر لیتے تھے۔ رات ہو گئی۔ یہ رات ہم نے ایک پہاڑی کے نیچے بنے ہوئے چھوٹے سے غار میں گزار دی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد پہاڑی علاقہ تقریباً ختم ہو گیا اور میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ انڈیا پاکستان کی سرحد قریب آ رہی ہے۔ مجھے یاد تھا کہ اس میدانی علاقے کے بعد دوبارہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آ جاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان دریائے راوی بہتا تھا جو آگے جا کر پاکستان میں داخل ہو جاتا تھا۔ مجھے لڑکی کو ساتھ لے کر اسی دریا کے ذریعے بارڈر کراس کرنا تھا جو انتہائی خطرناک ایکشن تھا۔ دریا کی دونوں جانب پاکستان سرحد پر رینجرز کے جوانوں کے مورچے تھے اور رینجرز کی جیپیں بھی گشت کرتی رہتی تھیں اور دریا میں بھی اپنے علاقے میں رینجرز کی کشتیاں دیکھ بھال کے لئے چکر لگاتی رہتی تھیں۔ سمگلر کو دیکھتے ہی گولی مار دی جاتی تھی۔ اس قسم کی سیکورٹی کے انتظامات سے بچ نکلنا بڑا مشکل کام تھا۔ خاص طور پر جب کہ ایک عورت بھی ساتھ ہو جو نہ تیر سکتی تھی نہ میری طرح اپنا بچاؤ کر سکتی تھی۔

میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم پاکستان کیسے پہنچے۔ بس اتنا ہی بتانا کافی ہے کہ میں لڑکی کو لے کر پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے لڑکی کو بتایا کہ ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں تو وہ فوراً رک گئی مجھ سے پوچھا۔

"کعبہ کس طرف ہے؟"

میں نے اسے کعبے کی سمت بتائی تو وہ وہیں سجدے میں گر پڑی اور سجدے میں گری ہوئی رونے لگی۔ میں نے اسے بالکل نہ اٹھایا۔ وہ رو رو کر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور اپنی ماں کو یاد کر کے کہہ رہی تھی۔ ماں! میں اسلام کے ملک پاکستان میں آ گئی ہوں۔ ماں! میں پاکستان پہنچ گئی ہوں۔ رونے سے جب اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کبھی آسمان کو اور کبھی اردگرد پھیلے ہوئے اور نومبر کے دن کی دھوپ میں چمکتے ہوئے کھیتوں اور درختوں کو دیکھتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ آنکھوں سے لگایا اور بولی۔

"میرے پیارے بھائی! تم نے میرے لئے وہ کام کیا ہے جو شاید میرا سگا بھائی ہوتا تو وہ بھی نہ کر سکتا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میری بہن! میں نے جو کچھ کیا ہے ایک مسلمان بھائی کا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ چلو اب میں تمہیں تمہارے عزیزوں کے گھر لے چلوں۔"

وہ آنسو پونچھتی خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑی۔ میرے دل کو ایک ہی دھڑکا لگا تھا کہ اگر اس لڑکی کے رشتے داروں نے جو اصل میں اس کی بدنصیب ماں کے رشتے دار تھے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ اس لڑکی کا تو پھر کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔ اسے واپس انڈیا لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان میں خود میرا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا کہ جن کے پاس میں اسے چھوڑ کر کشمیر کے جہاد میں شریک ہونے کے

لئے واپس چلا جاتا۔ ایک ہی چھوٹی بہن تھی جو مشرقی پنجاب میں فسادات کے وقت شہید کر دی گئی تھی۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ باپ مجھے آخری وصیت کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ پاکستان میں کوئی دوست یار بھی نہیں تھا ایسی صورت میں میں اسے پاکستان کے کسی یتیم خانے یا کسی زنانہ ویلفیئر ادارے کے حوالے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں بھی یہ زندہ نہیں رہے گی۔ یہ لڑکی اپنے ساتھ اتنا بڑا المیہ لے کر پاکستان میں داخل ہوئی تھی کہ اگر اسے اس کے رشتے داروں نے قبول نہ کیا تو یہ خودکشی کر لے گی۔

خیالات میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے اور ہم کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ایک پکی سڑک پر آ گئے جو ایک قریبی شہر کو جاتی تھی۔ میں اس شہر کا نام بھی نہیں لکھوں گا۔ ہم نے اس شہر سے گجرات جانے والی ٹرین پکڑی اور گجرات پہنچ گئے۔ یہاں سے لا گاؤں جہاں اس کی والدہ کے رشتے دار رہتے تھے کوئی پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم نے گجرات کے ریلوے سٹیشن کے باہر ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور لاری میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ لڑکی پاکستان کی فضاؤں میں آ کر بے حد خوش نظر آنے لگی تھی۔ رستے میں اس نے جتنی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں ان کا ذرا بھر بھی اس کے چہرے پر اثر باقی نہیں رہا تھا۔ مجھے یاد ہے پاکستان میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک گاؤں کی سفید میناروں والی مسجد دیکھی تو سکھوں کی طرح اس کی طرف ہاتھ جوڑ کر سلام کیا تھا۔ میں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان مسجد کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر سلام نہیں کرتے۔ اس کے بعد اس نے ایسا تو نہیں کیا تھا مگر جب کسی مسجد کو دیکھتی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا۔

"اللہ میاں، اللہ میاں!"

گجرات سے لاری چھوٹی سڑک پر پڑ گئی تھی۔ دونوں جانب ہرے بھرے کھیت لہ

رہے تھے۔ فصلوں کو دیکھ کر لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ کہنے لگی۔

"پاکستان کتنا سوہنا وطن ہے۔ یہ اب میرا وطن ہے۔ یا اللہ! اللہ میاں! میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں"

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ویرجی! اس وقت میری ماں کی روح جنت میں بڑی خوش ہو رہی ہو گی۔"

ڈیڑھ گھنٹے میں ہم لڑکی کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ چھوٹا سا بڑا خوش حال گاؤں تھا۔ اس کا نام لڑکی نے مجھے بتا دیا ہوا تھا جو میں یہاں ظاہر نہیں کروں گا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا ہم نے کھیتوں کے باہر ایک آدمی سے لڑکی کی والدہ کے رشتے داروں کا نام لے کر ان کے مکان کا پتہ پوچھا اور کچھ دیر کے بعد ہم ایک صاف ستھرے صحن والے کچے مکان کے باہر کھڑے تھے۔ صحن میں ایک عورت زمین پر دری بچھا کر بیٹھی لحاف کو نگندے لگا رہی تھی۔ ایک جوان آدمی کونے میں بھینس کے لئے گتاوا بنا رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی مکان کے برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں لحاف کے نگندے لگانے والی عورت نے سب سے پہلے دیکھا اور ہماری طرف دیکھ کر ذرا اونچی آواز میں پوچھا۔

"پترا! کس کو ملنا ہے تم نے؟"

میں نے لڑکی کی والدہ کے مرد رشتے دار کا نام لے کر پوچھا۔

"بہن جی! ان کا گھر یہی ہے"

وہ بولی۔

"گھر تو یہی ہے۔ اندر آ جاؤ پترا!"

جوان آدمی جو بھینس کے لئے گتاوا بنا رہا تھا وہ دھوتی سے ہاتھ صاف کرتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ برآمدے میں جو بوڑھا حقہ پی رہا تھا وہ بھی ہمیں دیکھنے لگا۔ عورت نے جوان مرد سے کہا۔

"سراج پتر ان کے لئے چارپائی ڈال تمہارے تایا جی کے ملنے والے ہیں۔"

ہمارے لئے چارپائی ڈال دی گئی۔ ہم اس پر بیٹھ گئے۔ مکان کی کوٹھڑی سے بھی ایک

جوان لڑکا نکل کر آ گیا۔ بوڑھا بھی حقہ وہیں چھوڑ کر ہمارے قریب آ کر دری پر بیٹھ گیا۔

"تم کون ہو پتر؟"

بوڑھے نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔ یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے کہا۔

"ذرا سانس لے لوں چاچا جی! ابھی بتاتا ہوں۔"

انہوں نے ہمیں دودھ پلایا۔ لڑکی میرے پاس بیٹھی اس گھر کی درودیوار کو اور ان لوگوں کو اسی طرح خوش ہو کر دیکھ رہی تھی جیسے جیل سے چھوٹ کر قیدی اپنے گھر میں آ جاتا ہے۔ دونوں جوان لڑکے بھی اپنی ماں کے پاس جو لحاف نگند رہی تھی دری پر بیٹھ گئے تھے۔ عورت نے پوچھا۔

"بیٹا! تم کہاں سے آئے ہو اور مہردین تمہارا کیا لگتا تھا؟"

مہردین میں نے فرضی نام لکھ دیا ہے۔ جس آدمی کے گھر میں ہم آئے تھے اس کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں نے ان لوگوں کی طرف ایک نگاہ ڈال کر آہستہ سے لڑکی کی ماں کا نام لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ زینا بی بی کو جانتے ہیں؟"

اس کا نام سن کر سب کے چہرے ایک دم خاموش ہو گئے۔ لڑکی ان لوگوں کو بڑی اشتیاق کی نظروں سے تک رہی تھی جیسے وہ ابھی یہ کہہ کر لڑکی کو گلے لگا لیں گے کہ یہ ہماری بہن زینا کی بیٹی ہے۔ عورت نے اپنے بوڑھے خاوند کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارے بھائی کی بیٹی کا پوچھ رہے ہیں۔"

پھر اسی عورت نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹا! میرے خاوند کے بھائی کی ایک بیٹی زینا ضرور تھی مگر وہ تو اپنے سارے کنبے کے ساتھ فسادات میں سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو گئی تھی۔ اس بات کو اتنے برس گزر گئے ہیں۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"ہم نے مہاجروں کے سارے کیمپوں میں انہیں تلاش کیا تھا مگر کہیں نہیں ملے تھے۔ پھر ان کے گاؤں کے ایک آدمی نے ہمیں بتایا تھا کہ زینا بی بی اپنے گھر والوں کے ساتھ جس قافلے میں پاکستان آ رہی تھی اس پر ہندو سکھوں کے جتھے نے حملہ کر کے ان سب کو شہید کر دیا تھا۔"

میں نے کہا

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔ سکھوں نے قافلے پر حملہ بھی کیا تھا اور زینا بی بی کے گھر کے سارے لوگ مارے گئے تھے مگر زینا بی بی بچ گئی تھی۔"

"بچ گئی تھی؟"

جوان آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں"

میں نے کہا۔

"اس کو ایک سکھ اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس سکھ نے زینا سے شادی کر لی تھی اور یہ لڑکی زینا کی اولاد ہے۔ اس لڑکی کی والدہ زینا بی بی نے اسے تم لوگوں کا پتہ بتایا تھا اور میں اسے لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور شدت جذبات سے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ پھر وہ بولنے لگی۔ اس نے اپنی والدہ کا سارا حلیہ اس کی عادتیں اور اس کا رنگ روپ بیان کیا اور کہا کہ میری ماں نے کہا تھا کہ جب بڑی ہو جاؤ تو سکھوں میں نہ رہنا۔ یہاں سے بھاگ کر پاکستان مہردین اپنے تایا کے گھر چلی جانا۔

اس گھر کے سارے فرد حیرت سے منہ کھولے لڑکی کی کہانی سن رہے تھے۔ جب لڑکی نے اپنی المناک کہانی ختم کی اور کہا۔

"یہ میرا بھائی مسلمان ہے۔ جب میں سکھوں کے گھر سے پاکستان جانے کے لئے بھاگی تو یہ مجھے مل گیا۔ اس نے میری بپتا سن کر کہا کہ تم میری بہن۔ میں بھی پاکستان جا رہا

ہوں۔ تمہیں بھی پاکستان لے چلوں گا۔ اور اب میں آپ کے پاس آگئی ہوں۔ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے دیجئے تاکہ میں ساری زندگی آپ کی سیوا کرتی رہوں"

لڑکی کے منہ سے چرنوں اور سیوا کے الفاظ بے اختیار نکل گئے تھے۔ آخر وہ سکھوں کے ماحول میں جمی پلی تھی۔ سب گھر والے لڑکی کو ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی اجنبی لڑکی ہو۔ صرف بوڑھے آدمی نے اٹھ کر لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا تو جوان لڑکے نے اسے جھڑک کر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"ابا تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ہمیں کیا پتہ یہ لڑکی کون ہے"

پھر اس لڑکے نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"بھائی صاحب آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ لڑکی ہمارے تایا کی بیٹی ہے"

میں نے کہا۔

"میرے پاس کوئی تحریری ثبوت تو نہیں ہے اور میں اس کی شہید ماں کی روح کو بھی گواہی دینے کے لئے یہاں نہیں بلا سکتا یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس لڑکی کو اپنا خون سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے"

دوسرے جوان آدمی نے بھڑک کر کہا۔

"یہ ہمارا خون نہیں ہے۔ پتہ نہیں کس سکھڑے کی اولاد ہے۔ تم بھی مجھے کوئی فراڈیئے لگتے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں پولیس والوں کو بلاؤں بہتر ہے کہ تم اس لڑکی کو لے کر ہمارے گھر سے نکل جاؤ۔"

یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ ایک بار تو میرا بھی خون کھول گیا۔ لڑکی کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اسے اپنی والدہ کے سگے رشتے داروں سے اس غیروں سے بھی بد تر سلوک کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اس جوان آدمی کو بڑے تحمل کے ساتھ کہا۔

"بھائی صاحب! آپ لوگ اتنی جلدی یہ فیصلہ نہ کریں۔ اگر آپ نے اس لڑکی کو قبول نہ کیا تو پھر اس کے لئے کوئی ٹھکانہ ---"

دوسرا جوان آدمی پھٹ پڑا۔

"ہم اندھے کانے بہرے نہیں ہیں کہ یونہی کسی ایری غیری لڑکی کو اپنی تایا زاد بہن کی بیٹی سمجھ کر گھر میں بٹھالیں۔ تم ابھی اسی وقت اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ہماری گاؤں میں عزت آبرو ہے۔ ہم کسی سکھ کی اولاد کو نہیں پال سکتے۔ جاؤ۔ لے جاؤ اسے۔"

لڑکی اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر اس گھر پر جوان لڑکوں کی حکومت تھی۔ بوڑھا مجبور تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! میرے ساتھ واپس چلو۔ تمہارے رشتے داروں نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔"

"ہم اس کے رشتے دار نہیں ہیں۔"

پہلے جوان لڑکے نے اونچی آواز میں کہا۔ میں اسے سبق سکھانے کے لئے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنا منہ بند رکھا۔ وہ میرے بولنے کا مقام نہیں تھا۔ لڑکی زار وقطار روئے جا رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اٹھو میری بہن! اللہ مالک ہے۔"

اس نے اٹھنے کے بعد اپنا سر میرے بازو کے ساتھ لگا دیا اور زار وقطار روتی ہوئی مکان سے باہر نکل آئی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! تمہارا رونا اب یہاں کون دیکھے گا۔ کسی پر اثر نہیں ہو گا۔ یہ لوگ تمہاری والدہ کے رشتے دار بڑے سنگدل لوگ ہیں۔"

لڑکی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"میرے ویر جی! اب تو میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔"

اور ایک بار پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"بہن! یہ مت کہو کہ تمہارا کوئی نہیں رہا میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

لیکن لڑکیوں نے ساری عمر بھائیوں کے پاس نہیں رہنا ہوتا۔ انہیں اپنا ایک الگ گھر

بسانا ہوتا ہے۔ ایک نئی انسانی نسل چلانی ہوتی ہے۔ ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنی ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں ہرلڑکی کے تحت الشعور میں ہوتی ہیں اور وہ غیرشعوری طور پر اسی اپنی منزل کوحاصل کرنے کے لئے ساری زندگی جدوجہد کرتی رہتی ہے۔

لڑکی بے چاری پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا وہ اپنی جگہ پر تھا مگر میں بھی سخت الجھن میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میں اس لڑکی کو کہاں لے جاؤں؟ اس کا حال کس طرح باعزت طریقے سے گزر سکے گا۔ اس کا مستقبل کیسے محفوظ ہو گا۔ آخر ایک ہی طریق کار میری سمجھ میں آیا۔ اس زمانے میں لاہور میں بے آسرا خواتین کا ادارہ اپوا قائم ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں یہ لڑکی عافیت اور عزت آبرو کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ یہ ادارہ ایسی بچیوں کی شادیاں بھی کرا دیتا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس وقت اس بارے میں کوئی ذکر نہ کیا۔ گاؤں سے نکل کر ہم کھیتوں میں چلے جا رہے تھے۔ میں نے لڑکی کو حوصلہ دینے کی کوشش کی اور کہا۔

"سب رشتے دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے سلوک پر تم دل چھوٹا نہ کرنا۔"

پھرمیں نے اسے اپوا کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور کہا کہ وہاں دوسری عورتیں بھی رہتی ہیں اور سلائی کڑھائی کا کام بھی سیکھ لیتی ہیں۔ پھر کہیں نہ کہیں ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ لڑکی خاموش تھی۔ رشتے داروں کے گھر سے مایوس ہو کر نکلنے کے بعد اس کے ہونٹوں کو خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سرد آہ بھرتی اور آسمان کی طرف دیکھ کر سر جھکا کر خاموشی سے چلتی رہتی۔ میں نے سوچا کہ ساری کی ساری امیدیں چکنا چور ہو گئی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ چپ تھی۔ لاہور چل کر جب میں اسے اپوا کے ادارے میں لے جاؤں گا تو وہاں کا ماحول اور دوسری خواتین کو کام کرتے دیکھ کر اس کا مایوسی کا موڈ تبدیل ہو جائے گا۔ ہم سڑک پر اس جگہ آ گئے جہاں ہم لاری میں سے اترے تھے۔ میں اس کے دل سے مایوسیوں کے اندھیرے دور کرنے کے لئے اپوا کے خوشگوار ماحول کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ لڑکی کو چپ سی لگ گئی تھی۔ سوائے ہوں ہاں کے زبان سے کچھ نہیں

بولتی تھی۔

ہمیں سڑک کے کنارے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ کوئی لاری نہ آئی۔ ایک کسان ادھر سے گزرا تو میں نے اس سے پوچھا کہ گجرات جانے والی لاری کب آتی ہے۔ اس نے کہا۔

"لاری کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ آپ لوگ سٹیشن پر جا کر گاڑی کیوں نہیں پکڑ لیتے وہ سامنے ہی سٹیشن ہے۔"

میں نے سوچا کہ یہ ٹھیک ہے۔ یہاں فضول انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"چلو ٹرین پکڑ لیتے ہیں۔ شاید گاڑی گجرات سے ہو کر سیدھی لاہور جا رہی ہو۔"

ہم اس طرف چلے جس طرف کسان نے اشارہ کیا تھا۔ ادھر درختوں کے پیچھے ریلوے لائن تھی۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ فاصلے پر کوئی چھوٹا سٹیشن تھا جس کا سگنل کا کھمبا دور سے نظر آ رہا تھا۔ ایک ٹرین بھی سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ہم لائن کے ساتھ جو پٹڑی تھی اس پر چلے جا رہے تھے۔ ٹرین کے انجن نے دو تین بار سیٹی دی اور ٹرین سٹیشن سے چل پڑی۔ ٹرین ہماری طرف آ رہی تھی۔ شاید یہ راولپنڈی جا رہی تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"پٹڑی سے نیچے آ جاؤ۔ ٹرین آ رہی ہے۔"

اس نے چہرہ اٹھا کر دور سے آہستہ آہستہ آتی ٹرین کو دیکھا اور میرے پیچھے پیچھے پٹڑی سے نیچے آ گئی۔ نیچے جھاڑیوں میں ایک جگہ پگ ڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ہم اس پگ ڈنڈی پر چلنے لگے۔ ٹرین قریب آ رہی تھی۔ لڑکی ٹرین کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے بالکل محسوس نہ کیا کہ لڑکی مجھ سے ذرا پرے ہونے لگی ہے۔ یعنی وہ ان جھاڑیوں کی طرف ہو کر چل رہی تھی جن کے اوپر ذرا سی چڑھائی پر ریلوے لائن تھی۔ میرا دھیان بھی ٹرین کی طرف تھا۔ یہ ڈیزل انجن والی ٹرین تھی اور اس کی رفتار سٹیشن سے نکلنے کے بعد ابھی ہلکی تھی۔ انجن بہت بڑا تھا۔ جیسے ہی انجن ہم سے تھوڑے فاصلے پر آیا تو قدرتی

طور پر میں پگ ڈنڈی پر ذرا پرے ہٹ گیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

اس طرف آجاؤ"

لیکن لڑکی ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ ایک طرف ہونے کی بجائے تیزی سے ڈھلان چڑھ کر ریلوے لائن کے پاس گئی۔ انجن اب سر پر آگیا تھا۔ لڑکی نے ایک چیخ ماری اور اپنے آپ کو انجن کے آگے گرا دیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوگیا کہ میں لڑکی کو دوڑ کر پکڑ نہ سکا۔

ٹرین کو ایک دم بریکیں لگیں اور ٹرین رکنے لگی۔ میں دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں پتہ انجن نے لڑکی کے جسم کے کتنے ٹکڑے کئے تھے۔ وہاں شور مچ گیا۔

"عورت ٹرین کے نیچے آگئی ہے۔"

ایک دم جیسے میں ہوش میں آگیا۔ میں دوڑ کر انجن کے پاس گیا۔ انجن لڑکی کے جسم کے ٹکڑے اڑاتا ہوا کچھ دور آگے جا کر رک گیا۔ میں نے ٹرین کے ایک ڈبے کے نیچے ریلوے لائن پر خون اور انسانی جسم کے اعضاء بکھرے ہوئے دیکھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ میں اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ انجن میں سے ڈرائیور اور اسسٹنٹ ڈرائیو نکل کر میری طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ انہوں نے لڑکی کو میرے ساتھ جا۔ ہوئے دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری کون تھی؟"

"اس نے خودکشی کیوں کی؟"

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ پیچھے جاؤ۔"

ڈبوں میں سے اتر اتر کر مسافر وہاں جمع ہو رہے تھے۔ میں بے حس وحرکت زمیں سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ ٹرین میں پولیس کے چار پانچ سپاہی بھی سفر کر رہے تھے۔ انجن ڈرائیور نے پولیس کانسٹیبل کو بتایا کہ عورت نے خودکشی کی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو انجن کے آگے گرا دیا تھا۔ یہ عورت اس آدمی کے ساتھ آرہی تھی۔ پولیس کے حوالدار نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پوچھا۔

"یہ عورت تمہاری کون تھی؟"

میں نے کہا۔

"میری بہن تھی"

"کیا تم نے اسے دھکا دیا تھا؟"

حوالدار کے اس سوال پر میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"نہیں۔ وہ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف ہٹنے کے لئے کہا مگر اس نے انجن کے آگے چھلانگ لگا دی"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں تھانے چل کر بیان قلمبند کرانا ہو گا۔"

پولیس مجھے دوسری گاڑی میں بٹھا کر گجرات لے آئی۔ یہاں تھانے میں مجھے ایک ے میں بٹھا دیا گیا۔ تھانیدار نے مجھے پانی پینے کو دیا اور سوالات پوچھنے لگا کہ میں کون ؟ اپنی بہن کو لے کر کہاں سے آرہا تھا۔ کہاں جا رہا تھا۔ کیا میں نے اسے دھکا دیا تھا؟ نے انہیں اپنا اصلی نام بتا دیا۔ مگر اس کے آگے بالکل نہ بتایا کہ میں انڈیا سے لڑکی کو کر آرہا تھا۔ میں تھانیدار کو یہ بھی نہ بتا سکا میں کس گاؤں کا رہنے والا ہوں لڑکی کو لے کر میں کہاں سے آرہا تھا۔ اگر پولیس کو سچ بتاتا تو معاملہ بڑی نازک شکل اختیار جاتا۔ میں ان پر کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ میں کشمیر کے محاذ سے آرہا اور لڑکی کی اصل کہانی کیا تھی اور یہ کہ میں کمانڈو ہوں اور ہم غیر قانونی طور پر انڈیا پاکستان کا بارڈر کراس کر کے آئے تھے۔ یہ معاملہ الجھ سکتا تھا۔ مگر میں دوسری طرح بھی جب پولیس کو مطمئن نہ کر سکا کہ میں لاہور میں کہاں رہتا ہوں اور لڑکی کو لے کر سے آرہا تھا تو تھانیدار کو مجھ پر شک پڑ گیا کہ میں کوئی پراسرار اور مشتبہ آدمی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ سنگین شکل اختیار کرتا جا رہا ہے تو میں نے تھانیدار کو کہانی تو نہ بتائی صرف اتنا بتا دیا کہ میں کشمیر کے محاذ پر اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں ساتھ مل کر بھارتی ظلم واستبداد کے خلاف جہاد میں مصروف تھا کہ یہ لڑکی مجھے مل کہنے لگی کہ میں سکھوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہوں لیکن میں نے اسلام قبول کر لیا

ہے۔ میری ایک مسلمان سہیلی پاکستان میں گجرات کے پاس ایک گاؤں میں رہتی ہے۔
کے لئے مجھے میری مسلمان سہیلی کے پاس پہنچا دو۔ نہیں تو میرا سکھ باپ مجھے قتل کر
گا۔ پس میں اسے ساتھ لے کر پاکستان آگیا۔ مگر معلوم ہوا کہ اس کی مسلمان سہیلی گا
سے چلی گئی ہے۔

"اب میں اسے اپوا کے ادارے میں لے جا رہا تھا کہ لڑکی نے ٹرین آتے دیکھ
مایوسی کے عالم میں ٹرین کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔"

تھانیدار کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے میرا بیان جھوٹا لگا ہے اور وہ مجھے شاید انڈیا کا جاس
سمجھنے لگا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے تھوڑی دیر بعد ہی مل گیا جب تھانیدار کے اشارے
مجھے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میری پریشانیوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔
معلوم تھا کہ آگے ان پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہی چلا جائے گا۔ میں یہ بیان دے چکا تھا
میں غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہوا ہوں اور میرے ساتھ ا
سکھ لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔ کیس مزید سنگین ہو گیا تھا۔ میں
بھی طرح یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ ایک تو میری زبان
تھی۔ پولیس کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن بھارت سے ایک مسلمان
جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے پاکستان آسکتا تھا۔

دوسرے دن مجھے پولیس کی حفاظت میں لاہور کے بڑے پولیس سٹیشن منتقل کر
گیا۔ میں اس پولیس سٹیشن کا یہاں نام نہیں لوں گا۔ پولیس نے مجھ سے پوچھ گچھ شر
کر دی۔ مجھ پر تشدد بھی کیا گیا۔ میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں بھارت
جاسوس یا تخریب کار نہیں ہوں۔ میں نے پولیس کو لڑکی کے بارے میں اصل حقیقت
بیان کر دی لیکن پولیس کو مجھ پر بھارت کے جاسوس ہونے کا جو شک تھا۔ وہ پختہ ہو
گیا۔

میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

مجھ سے بار بار پوچھا جاتا کہ میرے ساتھ اور کون کون بھارتی جاسوس اور تخریب

آیا تھا اور وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ میں کیا بتاتا۔ میرے خلاف دو مقدمے درج کر لئے گئے۔
آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ باقی باتیں سب جھوٹ ہیں اور کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے پولیس
کے قبضے سے فرار ہو جانا چاہئے۔ جب میں نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کیا
مجھے بڑی جلدی احساس ہو گیا کہ پاکستانی پولیس کی حراست سے فرار ہونا اتنا آسان کام
ہیں ہے۔ لیکن میں بھی ایک تجربہ کار کمانڈو تھا۔ ایک سکیم میں نے بھی ذہن میں تیار کر
اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ایک روز پولیس مجھے عدالت میں پیشی کے لئے ضلع کچہری
لے گئی۔ میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا مجھے ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔ مگر پولیس اس
یقت سے بے خبر تھی کہ میں نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں کی ہڈیوں کو مشق کر کے اتنا
یلا بنا لیا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ ہتھکڑی سے آزاد ہو سکتے تھے۔ مجھے قیدیوں کی گاڑی میں
ابا کر کچہری لایا گیا تھا۔ دو کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ میری ہتھکڑی کی زنجیر کا ایک سرا
نسٹیبل کی پیٹی سے بندھا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی سے اتار کر جج صاحب کی عدالت کے باہر
لے برآمدے میں بٹھا دیا گیا۔ جس کانسٹیبل کی پیٹی سے میری ہتھکڑی کی زنجیر بندھی ہوئی
اس نے یہ غلطی کی کہ زنجیر پیٹی میں سے کھول کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ شاید عدالت میں
کو اسی طرح پیش کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہ بات میرے لئے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔
لت میں کسی کیس کی سماعت ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دوسرے لوگ اور دو تین
س والے بھی موجود تھے۔ جو حوالدار مجھے ساتھ لے کر آیا تھا وہ عدالت کے کمرے
چلا گیا تھا۔ اس وقت میرے پاس صرف وہی ایک کانسٹیبل کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں
ہتھکڑی والی زنجیر تھی۔

یہی میرے فرار کا لمحہ تھا۔

میں نے عدالتوں کے برآمدے کا جائزہ لیا۔ برآمدے کے آگے سامنے درختوں کے
وٹر سائیکل سٹینڈ تھا۔ میرے کانسٹیبل کے پاس رائفل ضرور تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ
پر فرار ہونے کے بعد گولی نہیں چلائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہوائی فائر کر دے اور مجھے
نے کے لئے میرے پیچھے دوڑ پڑے۔ ایک سپاہی حوالدار کے ساتھ ہی میری فائیل

لے کر جج صاحب کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ اگر وہ دونوں باہر آجاتے ہیں تو میرا فرار
مشکل تھا۔

میں نے اس دوران ہاتھوں کو چھپا کر انگوٹھوں کی ہڈیوں کو ملنا شروع کر دیا۔ چند
کے بعد میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی سے باہر نکل آئے۔ میں نے ہتھکڑی کو اس طرح
رکھا کہ معلوم ہو کہ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی ہے۔ برآمدے میں جہاں میں بیٹھا ہوا تھا
کچہری کا وہ دروازہ نظر آرہا تھا جہاں سے رکشے وغیرہ اندر آرہے تھے۔ میں نے ایک
کو دیکھا وہ سکوٹر پر سوار تھا۔ اس نے سکوٹر سٹینڈ کے پاس آکر سکوٹر کو کھڑا کیا۔ سکوٹر
انجن کو چلتا چھوڑ کر وہ سٹینڈ کے آدمی کے پاس آکر باتیں کرنے لگا۔ میرے لئے یہ
موقع تھا۔ اپنے ہاتھ میں ہتھکڑی سے باہر نکال چکا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا۔ اور پھر ایک
سے ہتھکڑی پھینک کر سکوٹر کی طرف بھاگا۔ پیچھے شور سا مچا لیکن میں نے اس طرف
توجہ نہ دی۔ میرا ٹارگٹ سکوٹر تھا جس کا انجن چل رہا تھا اور جو اپنے سٹینڈ پر کھڑا تھا۔
چشم زدن میں سکوٹر پر بیٹھا اسے آگے کو دھکا دیا۔ گیئر لگایا اور طوفان کی طرح اسے چا
ہوئے گیٹ کی طرف رخ کر لیا۔

پیچھے رائفل کے دو فائر ہوئے۔ یہ ہوائی فائر تھے۔ کیونکہ کوئی بھی گولی نہ مجھے
تھی نہ میرے قریب سے ہو کر گزری تھی۔ لوگوں کا شور ضرور مچا ہوا تھا۔ مگر اتنی دیر
میرا سکوٹر کچہری کی حدود سے نکل کر لاہور کی ایک بڑی سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ سڑک
کافی ٹریفک تھی مگر میں سکوٹر کو ادھر ادھر سے گھماتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔ آگے
آگیا۔ یہاں سے میں نے سکوٹر کو بادامی باغ ریلوے سٹیشن جانے والی سڑک پر ڈال
لاہور شہر میرا اپنا شہر تھا۔ اس شہر میں جم پل کر میں جوان ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ
کہاں جا رہا ہوں اور یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس زمانے میں ابھی
کے پاس موبائیل ٹیلی فون نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آگے پولیس میری
بندی اتنی جلدی نہیں کر سکتی تھی۔ اور پولیس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں
علاقے کی طرف گیا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے حالات کی نزاکت کا احساس تھا اور

معلوم تھا کہ میرے پیچھے انڈیا کی نہیں پاکستان کی پولیس لگی ہے جو اپنی قابلیت اور
کارکردگی میں انڈیا کی پولیس سے دس قدم آگے ہے۔ مگر لاہور شہر بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں
میرے ایسے تربیت یافتہ کمانڈو کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ جس سکوٹر پر میں جا رہا تھا
اس کا رجسٹریشن نمبر پولیس نے اس کے مالک سے سکوٹر سٹینڈ پر سے اگر معلوم کر لیا ہو گا
تو اس بات کا امکان تھا کہ کسی بھی جگہ میرا سکوٹر چیک ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے سکوٹر سے
پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اقبال پارک کے قریب ایک جگہ درخت کے نیچے
جھاڑیوں میں اس طرح کھڑا کر دیا کہ دور سے اس پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ میں نے اپنی
جیبوں کو ٹٹولا۔ جب ہم پاکستان میں داخل ہوئے تھے تو میرے پاس کچھ انڈین کرنسی تھی
جو ایک خاص جگہ پر میں نے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروالی تھی۔ میرے پاس کل ایک
سو چالیس پاکستانی روپے تھے جن میں سے اس وقت میری جیب میں صرف چالیس روپے
ہی رہ گئے تھے۔ باقی پولیس نے نکال لئے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ روپے بطور امانت پولیس
کے ریکارڈ میں موجود ہوں مگر اب وہ میرے کسی کام کے نہیں تھے۔

میں نے چھوٹی کنگھی سے اپنے گردن تک آئے ہوئے بال درست کئے اور اقبال
پارک میں سے ہوتا ہوا بادامی باغ سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اس طرف میں اس لئے آیا
تھا کہ یہاں ایک قبرستان تھا جہاں میرے والد صاحب آسودہ خاک تھے اور جہاں میں فاتحہ
پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا قبرستان ریلوے سٹیشن کے قریب ہی دوسری طرف واقع تھا۔
میں قبرستان میں داخل ہو کر والد صاحب کی قبر پر آگیا۔ میں نے سر پر رومال باندھ لیا اور
قبر کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی اور والد صاحب کی روح کی مغفرت کی دعا کے بعد
کہا۔

"میاں جی! میں نے آپ کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا ہے۔ اور جہاد کشمیر میں شامل
ہو کر کافروں سے لڑا ہوں اور لڑ رہا ہوں کشمیر جب تک بھارتی قبضے سے آزاد نہیں ہو جاتا
میری جنگ جاری رہے گی۔ مجھے عجیب حالات میں پاکستان آنا پڑ گیا ہے۔ کشمیر میں بھارتی
فوجیں مسلمان کشمیریوں پر وحشیانہ مظالم کر رہی ہیں لیکن کشمیر کا بچہ بچہ اسلام اور آزادی

کشمیر کے واسطے مرنے مارنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ کشمیر میں بہت جلد ظلم کا اندھیرا چھٹ جائے گا اور انشاء اللہ کشمیری غاصب بھارتی حکومت سے اپنا حق خود ارادیت چھین کر رہیں گے۔ میں واپس جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر زندہ واپس آگیا تو آپ کی قبر پر ضرور فاتحہ خوانی کے لئے آؤں گا۔ اگر شہید ہو گیا تو آپ سے خدا کے دربار میں ملاقات ہو گی۔"

بادامی باغ کا سٹیشن قبرستان کے قریب ہی تھا۔ یہاں سے سٹیشن پر کھڑی ایک گاڑی نظر آ رہی تھی۔ میں سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی راولپنڈی کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے آزاد کشمیر کا بارڈر کراس کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ سٹیشن پر آ کر میں نے پنڈی کا ٹکٹ لیا اور ٹرین کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ یہ خیال بھی تھا کہ لاہور سے جتنی جلدی نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ یہ پسنجر ٹرین تھی۔ جب جہلم پہنچی تو شام ہو رہی تھی۔ راستے میں خیریت ہی رہی۔ پولیس کے سپاہی ایک دو سٹیشنوں پر نظر آئے مگر میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ گوجر خان کا سٹیشن آیا تو میں نے پلیٹ فارم پر اتر کر دال روٹی کھائی اور دوبارہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ رات کے دو تین بجے کے قریب ریل گاڑی راولپنڈی پہنچی۔ اس وقت پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد میں منتقل ہو چکا تھا۔ مگر ابھی اسلام آباد اتنا گنجان آباد اور خوبصورت نہیں تھا جتنا آج کل ہے۔ میں پنڈی سے مظفر آباد کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس وقت کوئی بس نہیں جا رہی تھی۔ باقی رات پنڈی کے مسافر خانے میں گزاری صبح ہوئی تو سٹیشن کے سامنے ایک گلی کے تنور پر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ چائے پی اور مظفر آباد جانے والی بسوں کے اڈے پر آگیا۔

معلوم ہوا کہ ایک لاری ابھی ابھی گئی ہے۔ اب دس بجے دوسری لاری چلے گی۔ ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ تھا۔ سوچا لاری اڈے پر ٹھہرنا مناسب نہیں۔ کیوں نہ راولپنڈی شہر کی سیر کی جائے۔ مجھے پنڈی دیکھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اسلام آباد کے دارالحکومت بن جانے کی وجہ سے پنڈی کی رونق اور آبادی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک نالے کے پل پر آیا تو

یہاں سے اسلام آباد کو ویگنیں جا رہی تھیں۔ آٹھ آنے فی سواری کرایہ تھا۔ میں ایک ویگن میں بیٹھ کر اسلام آباد آگیا۔ کشادہ سڑکیں سرسبز باغ اور عمارتیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ یا اللہ یہ ملک پاکستان تیرے نام پر شہید ہو جانے والوں کی نشانی ہے اس کو تا ابد قائم و دائم رکھنا۔ میں ایک مارکیٹ میں آ کر سجی ہوئی خوبصورت دکانوں کو دیکھتا گھوم پھر رہا تھا کہ میں نے کتابوں کی ایک دکان کے باہر کونے میں ایک تھیلا پڑا ہوا دیکھا۔ مجھے تھیلے پر کچھ شک ہوا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ تھیلا کپڑے کا میلا کچیلا سا تھا جس طرح گھروں کے نلکے وغیرہ مرمت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ تھیلے کو کھولا تو اس کے اندر کوئی چیز سیاہ کپڑے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کپڑا کھول کر دیکھا تو میرا شک درست نکلا۔ یہ دیسی ساخت کا بے حد طاقتور بم تھا جس میں ٹائمر بھی لگا ہوا تھا اور ٹائمر کے ہندسے سیکنڈ کی رفتار سے چل رہے تھے۔ اس بم کو پانچ منٹ کے بعد دھماکے سے پھٹ جانا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بھارت کی پاکستان دشمن خفیہ ایجنسی را کے تخریب کار پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر رہے تھے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ پھر بڑے آرام سے کپڑے میں لپٹے ہوئے بم کو اٹھایا اور مارکیٹ سے باہر نکل کر ایک سٹور کی دیوار کے پیچھے آ کر بم کو ناکارہ کر دیا۔ میں اس کام میں ماہر تھا۔ مجھے بم کو ناکارہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ ٹائمر کی گھڑی رک گئی۔ میں نے بم کو ایک قریبی نالے میں پھینک دیا اور اوپر سے ہو کر مارکیٹ کے سامنے ایک ہوٹل کے باہر بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے چائے کی پیالی کا آرڈر دیا اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد سامنے والی مارکیٹ میں کتابوں کی دکان کی طرف دیکھ لیتا تھا جہاں بم والا تھیلا وہیں پڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ را کے ایجنٹوں کی واردات کا طریق کار کیا ہوتا ہے۔ جب بم مقررہ وقت پر نہیں پھٹے گا تو ان کا خاص آدمی یہاں آ کر تھیلے کو اٹھا کر لے جائے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ بم میں جو خرابی واقع ہو گئی تھی۔ وہ خرابی دوبارہ کسی بم میں واقع نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ را کے ایجنٹوں نے جس آدمی کو بم کسی خاص جگہ پر رکھنے کے لئے خریدا ہوتا ہے اس کو رقم صرف اسی صورت میں

ادا کی جاتی ہے کہ جب بم پھٹ کر تباہی مچادے۔ جب پانچ منٹ گزر گئے اور بم نہ پھ
اور جس نالے میں میں نے بم کو ناکارہ کر کے پھینک دیا تھا اس طرف بھی کوئی دھماکہ
ہوا تو میری آنکھیں عقاب کی طرح جائزہ لینے لگیں۔ کوئی دس منٹ کے بعد میں نے ایک
آدمی کو دیکھا کہ ایک طرف سے آیا اور برآمدے میں کتابوں کی دکان کے قریب آکر
ہو گیا۔ اس نے شلوار قمیض کے اوپر پرانا نسواری کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر گلوبند لپی
رکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے ادھر ادھر ماحول کا جائزہ لیا اور پھر دکان کے شوکیس
کے پاس جا کر وہ تھیلا اٹھالیا جس میں اب بم نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدمی حیران
کر تھیلے کو کھول کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے تھیلا وہیں پھینکا اور تیز قدموں سے سڑک
کر کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر چلا گیا۔ مجھے اس آدمی کا انتظار تھا۔

میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ چوک میں جا کر ایک اور آدمی اس کے سا
مل گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات کی اور پھر ایک تھری سٹار ہوٹل کے عق
میں آگئے جہاں ایک پرانی ٹیوٹا گاڑی کھڑی تھی۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی
سڑک سے ہو کر ہوٹل کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھی۔ میں ان لوگوں کے تعاقب
تھا۔ میں گیٹ کی طرف دوڑا۔ وہاں خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں ایک ٹیکسی میں گھس
اور ڈرائیور سے کہا۔

"میں پولیس انٹیلی جینس کا آدمی ہوں اس ٹیوٹا گاڑی کا پیچھا کرو۔ خیال رکھنا
نظروں سے اوجھل نہ ہو۔"

ٹیکسی ڈرائیور بھی کوئی ایڈونچرس نوجوان تھا۔ کہنے لگا۔

"فکر نہ کریں صاحب۔"

اور اس نے ٹیکسی ٹیوٹا کار کے پیچھے لگا دی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی سڑکوں پر اتنا
نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور پر پنڈی اسلام آباد والی کشادہ سڑک تقریباً خالی خالی ہوتی
ڈرائیور نے ٹیوٹا کار اور ٹیکسی کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ ٹیوٹا کار پنڈ
طرف جا رہی تھی۔ کار میں دونوں تخریب کار ہی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کار

تھا۔ مری روڈ پر آکر ٹیوٹا کار پکی سڑک پر سے اتر کر ایک کچی سڑک پر ہو گئی۔ یہاں آگے
ایک پرانی بستی کے مکانات اور دکانیں تھیں۔ کار ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے ٹیکسی
ڈرائیور سے کہا۔

"گاڑی روک لو"

اس نے ٹیکسی ایک مکان کی اوٹ میں کر کے کھڑی کر دی۔ میں ٹیکسی سے اتر گیا۔
میں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور اسے کہا۔

"یہاں دو منٹ تک میرا انتظار کرنا۔ اگر میں دو منٹ تک نہ آیا تو چلے جانا"

ٹیکسی ڈرائیور فلمی ہیرو کی طرح بولا۔

"اوکے صاحب۔ فکر نہیں"

میں نے دیکھا کہ ٹیوٹا گاڑی میں سے دونوں تخریب کار نکل کر بستی کی ایک گلی میں
داخل ہو گئے ہیں۔ تھوڑا فاصلہ رکھ کر میں بھی ان کے پیچھے گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں
دو چار دکانیں اور چائے کا ایک ہوٹل تھا۔ دو تین آدمی آجا رہے تھے۔ دونوں تخریب کار
گلی میں سے گزرتے ہوئے بائیں طرف گھوم گئے۔ میں گلی کے موڑ پر آیا تو دیکھا کہ جہاں
گلی ختم ہوتی تھی وہاں آگے دو تین کھیت تھے۔ کھیت کے پیچھے مٹی کا اونچا ٹبہ تھا۔ دونوں
آدمی کھیتوں میں جا رہے تھے۔ پھر وہ مٹی کے اونچے ٹبے کے عقب میں میری نظروں سے
اوجھل ہو گئے۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ٹبے کی اوٹ میں آگیا۔ ٹبے کی دوسری
طرف ایک بوسیدہ چار دیواری تھی۔ دونوں اس چار دیواری کے اندر چلے گئے۔

میں ٹبے کی دوسری طرف سے نکل کر چار دیواری کے پیچھے آگیا۔ چار دیواری کے
اندر جو ایک کوارٹر نما خستہ سا مکان تھا جس کی پچھلی دیوار کی کھڑکی ایک گہری کھائی کی
جانب بنی ہوئی تھی۔ کھڑکی بند تھی۔ یہاں کھڑکی کے نیچے مکان کی عقبی دیوار کے ساتھ
گہری کھائی کا کنارا ایک پتلی سی پگ ڈنڈی کی شکل میں دوسری طرف نکل گیا تھا۔ اسی پگ
ڈنڈی پر مکانوں کا کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ میں پگ ڈنڈی پر چلتا ہوا مکان کی بند کھڑکی کے
نیچے آکر بیٹھ گیا۔ میرے نیچے گہری کھائی تھی جس میں جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور

کوڑا کرکٹ ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس مکان کا یہی ایک کمرہ ہے دونوں تخریب کار اسی کمرے میں گئے ہیں۔ میں نے گردن اٹھا کر بند کھڑکی کو غور سے دیکھا۔ کھڑکی کے پٹ بند تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی اب میرے برابر تھی۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تھیلے میں سے بم کون نکال کر لے جا سکتا ہے؟ تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

دوسرے آدمی نے تلخ لہجے میں کہا

"میں وہاں زیادہ دیر کیسے رک سکتا تھا؟ کسی کو شک پڑ جاتا تو میں وہیں پکڑ لیا جاتا۔"

پہلے آدمی کی آواز آئی۔

"چیف کو بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ مارکیٹ میں دھماکہ نہیں ہوا۔ جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہمیں امرتسر واپس بھیج دیا جائے گا اور نہ صرف یہ کہ ہمیں ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا بلکہ ہمیں نوکری سے بھی جواب مل جائے گا۔ ساری سکیم کا بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھیلے میں سے بم کون نکال کر لے گیا۔ آخر تم نے وہاں دور کھڑے ہو کر تھیلے کی نگرانی کیوں نہیں کی۔ یہ تمہاری ڈیوٹی تھی۔"

دوسرے آدمی نے جواب میں کہا۔

"میں سامنے والے سینما گھر کے پاس کھڑا تھا بس دو تین منٹ کے لئے سینما کے بیت الخلا میں چلا گیا تھا۔"

پہلے آدمی نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ اب جو ہو گا اسے ہم دونوں کو بھگتنا پڑے گا۔ چیف سے رات کو ملاقات ہونی ہی ہے۔ بھگوان ہم دونوں کی رکھشا کرے۔ مجھے تو بیڑا غرق ہوتا نظر آ رہا ہے۔"

وہ دونوں جس زبان میں باتیں کر رہے تھے وہ پوٹھوہار کی پنجابی نہیں تھی۔ وہ امرتسر کے ہندوؤں کی پنجابی زبان بول رہے تھے۔ میں اس زبان کے لہجے سے واقف تھا۔

"چیف کتنے بجے ہوٹل میں آئے گا؟"
پہلے آدمی نے جھلاتے ہوئے کہا۔
"نیکم داس تم آدمی ہو کہ جانور؟ تمہیں کس نے پاس کر کے امرتسر ٹریننگ سنٹر میں بھیجا تھا؟ تمہیں اتنا بھی یاد نہیں کہ چیف ہمیشہ رات کے بارہ بجے کے بعد اپنے ہوٹل میں ملاقات کرتا ہے۔ اب تمہیں ہوٹل کا نام بھی یاد نہیں ہوگا؟"
دوسرے آدمی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔
"یاد ہے بھایا جی یاد ہے۔ مارگلہ ہوٹل ہے۔ راولپنڈی میں ہے۔ اور کمرہ نمبر سات ہے۔"
"بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ تم یہ سب کچھ نہیں بھولے۔ اب یہاں سے نکلو۔ شہر میں جا کر کچھ ضروری چیزیں بھی خریدنی ہیں۔"
اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر کمرے کا دروازہ بند کرنے اور تالہ لگانے کی آواز سنائی دی۔ میں کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتا ہوا اس جگہ آ گیا جہاں دیوار ختم ہو جاتی تھی۔ میں نے سر ذرا سا نکال کر دیکھا۔ دونوں تخریب کار کھیت میں سے گزر کر واپس جا رہے تھے۔ مجھے ان کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب مجھے رات کو راولپنڈی کے مارگلہ ہوٹل میں پہنچنا تھا۔ میں پولیس کو اس لئے اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس طرح سے صرف تین تخریب کار ہی پکڑے جاتے۔ میں اپنے طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بھارت کے ان دہشت گردوں کے دوسرے ساتھی پاکستان میں کس کس شہر میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ ان سب کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔ یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ یہ دونوں ہندو ہیں۔ ان کا تعلق بھارت کے ان تخریب کاروں سے ہے جنہیں بھارت حکومت پاکستان میں دہشت گردی کرنے کے لئے بھیجتی ہے اور ان کا ٹریننگ سنٹر امرتسر میں ہے جہاں ان لوگوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دے کر پاکستان میں بھیجا جاتا ہے۔ میں پاکستان میں بھی ان وطن دشمن تخریب کاروں کے اصل ٹھکانے کا چلانا چاہتا تھا اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ امرتسر میں کس جگہ ان لوگوں کو پاکستان میں

دھماکے کرنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ واپس مقبوضہ کشمیر جاتے ہوئے میں اس تخریب کاری کے مرکز کو ہی دھماکے سے اڑا دوں۔ اور اس کا پتہ مجھے ان کے چیف باس کی گفتگو سن کر لگ سکتا تھا۔ جب دونوں ہندو تخریب کار بستی میں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں بھی وہاں سے واپس چل پڑا۔ دن کا باقی حصہ میں نے پنڈی میں ہی ایک جگہ روپوش ہو کر گزار دیا۔ رات کو پہلا شو دیکھنے ایک سینما ہاؤس میں گھس گیا۔ رات کے سوا نو بجے شو ختم ہوا تو کچھ وقت راجہ بازار کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے اور چائے پیتے ہوئے گزار دیا۔ مارگلہ ہوٹل میں بھارتی دہشت گردوں کی اپنے چیف سے ملاقات رات بارہ بجے کے بعد کمرہ نمبر سات میں ہونی تھی۔ جب رات کے گیارہ سوا گیارہ بجے کا ٹائم ہو گیا تو میں راجہ بازار سے نکل کر مارگلہ ہوٹل کا پتہ پوچھ کر اس طرف روانہ ہو گیا۔ مارگلہ ہوٹل میں نے اس ہوٹل کا فرضی نام لکھا ہے۔ اگر آپ کو صحیح نام بتا دوں گا تو اس ہوٹل کی بدنامی ہوگی۔ کیونکہ اس میں اس ہوٹل والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہاں تو مسافر آتے جاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی بھارتی ہندو مسلمان کا بھیس بدل کر وہاں آ کر رات دو رات کے لئے ٹھہرتا ہے تو ہوٹل والوں کو کیا معلوم کہ وہ حقیقت میں بھارتی تخریب کار ہے۔
مجھے یقین تھا کہ ان دونوں تخریب کاروں کا چیف باس بھی بھارتی ہندو ہوگا جس کا تعلق مشرقی پنجاب کی انٹیلی جینس پولیس کی خصوصی برانچ سے ہوگا۔ کوئی مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال تھا۔ باقی چیف باس کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سننے کے بعد ہی صحیح بات کا علم ہو سکتا تھا۔ جس مشن پر میں جا رہا تھا وہ مجھے بے حد مشکل اور دشوار لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چیف ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ دونوں تخریب کار اس کے کمرے میں ہی ملاقات کرنے والے تھے۔ میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ جس کی مدد سے میں اس کمرے کے اندر چھپ کر یا کسی دوسرے طریقے سے ان لوگوں کی گفتگو سن سکوں جس کو سننا بے حد ضروری تھا اور یہی میرا مشن بھی تھا۔ ان کی باتیں سن کر ہی مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا پاکستان میں خفیہ اڈہ کہاں پر ہے اور ان کے گروہ کے لوگ کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں اور اب یہ کس جگہ دھماکہ کرنے کا پروگرام بنا

رہے ہیں۔ میرے پاس پیسے بھی تھوڑے سے رہ گئے تھے۔ میں اس ہوٹل میں کوئی کمر
کرائے پر لے کر بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

اس کش مکش اور پریشان خیالات کے ساتھ میں مارگلہ ہوٹل کی دو منزلہ عمارت کے
سامنے پہنچ گیا یہ انگریزوں کے زمانے کا ایک پرانی وضع کا ہوٹل تھا جو کسی دو منزلہ کوٹھی کو
تبدیل کر کے بنایا گیا تھا۔ ہوٹل کی عمارت کی دونوں جانب کشادہ لان تھا جس میں پودے
اور درخت اگے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں ایک جانب کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔
میں نے ان گاڑیوں کو قریب جا کر دیکھا۔ ان میں تخریب کاروں کی ٹیوٹا گاڑی نہیں تھی۔
اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی ہوٹل میں نہیں پہنچے تھے۔ پنڈی اسلام آباد میں موسم سر
تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کئے ہوئے تھے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی
مونچھوں اور گردن تک بڑھے ہوئے بالوں سے میں فلاسفر یا شاعر ٹائپ آدمی لگ رہا تھا۔
میں نے ہوٹل کے ایک ملازم سے پوچھا کہ یہاں کمرہ نمبر سات کہاں ہے؟ اس نے بتایا ک
پیچھے پہلی منزل میں کونے والا کمرہ ہے۔ رات کا وقت تھا۔ ہوٹل کے کمروں میں اور لا
میں ضرور روشنیاں ہو رہی تھیں مگر ہوٹل کے لان میں اور ہوٹل کی بلڈنگ کے ارد گر
کہیں کہیں ہی بلب روشن تھا۔ میں ہوٹل کی کوٹھی کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں ایک چھ
سا برآمدہ تھا جو سردی اور رات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بالکل خالی پڑا تھا۔ یہاں ت
کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ میں نے قریب جا کر ان کے نمبر پڑھے۔ ایک کمرے پر نمبر سا
لکھا ہوا تھا۔ سات نمبر کمرے کو تالا لگا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ اندر سے کوئی آ
نہیں آ رہی تھی۔ دونوں تخریب کار اور ان کا بھارتی چیف ابھی نہیں آئے تھے۔

ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے کے دروازے کی نا
کو گھمایا۔ وہ کھل گیا یہ کمرہ خالی تھا۔ پلنگ فرنیچر لگا ہوا تھا مگر کوئی آدمی وہاں نہیں
شاید یہ کمرہ ابھی کرائے پر نہیں چڑھا تھا۔ میں نے دروازہ آہستہ سے بند کر کے کمرے
جائزہ لیا۔ کمرے کی بتی روشن تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ کمرے لکڑی کی دیوارو
پارٹیشن کر کے بنائے گئے ہیں۔ یہ اس پرانی کوٹھی کا کوئی ہال روم تھا جس کی پارٹیشن

کے تین کمرے بنا دیئے گئے تھے۔ میں نے اس دیوار کو انگلی سے بجایا جس کی دوسری
جانب سات نمبر کمرہ تھا۔ دیوار میں سے کھوکھلی آواز آئی۔ یہ لکڑی کی بھی نہیں بلکہ چپ
بورڈ کی دیوار تھی جس پر ہلکا سبز روغن کیا ہوا تھا۔ اتنے میں باہر سے کچھ آدمیوں کے باتیں
کرنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے کمرے کی بتی بجھا دی اور دروازے کی ایک جانب
دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوچا کہ اگر کوئی اس کمرے میں آ رہا ہے تو میں دروازہ
کھلتے ہی اندھیرے میں باہر نکل جاؤں گا۔ میں باتھ روم میں بھی چھپ سکتا تھا مگر پھر وہاں
سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ آوازیں اور قدموں کی آہٹیں برآمدے میں آ کر رک گئیں۔ کسی
نے تالے میں چابی لگائی۔ میں سمجھ گیا یہ لوگ ساتھ والے نمبر سات کمرے کے آدمی
تھے۔ یہ وہی بھارتی تخریب کار اور ان کا چیف ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے تین آدمیوں کی
مختلف آوازیں آئی تھیں۔ یہ لوگ کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازے کو بند کر کے چٹخنی
لگا دی گئی۔

میں دروازے سے ہٹ کر دبے پاؤں چپ بورڈ کی اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا
ہو گیا جو دونوں کمروں کی مشترکہ دیوار تھی۔ دوسرے کمرے میں سے آدمیوں کے بولنے
کی آوازیں آنے لگیں۔ ان کے الفاظ بالکل صاف سمجھ میں آ رہے تھے۔ میں دونوں
بھارتی تخریب کاروں کی آوازوں اور ان کے امرتسری ہندوؤں کے لہجے کو پہچانتا تھا ان
میں ایک تیسری آواز بھی تھی جو ان کے بھارتی چیف کی آواز تھی۔ تیسری آواز نے
کمرے میں آتے ہی دونوں تخریب کاروں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”تم لوگوں کو امرتسر جاتے ہی نہ صرف نوکری سے الگ کر دیا جائے گا بلکہ تمہارے
خلاف کیس بھی چلے گا۔ تم بالکل نااہل ہو۔ تمہاری نااہلی کی وجہ سے پاکستان میں ہمارے
اگرواد کا سارا پروگرام خطرے میں پڑ گیا ہے۔ وہ بم ضرور پاکستانی پولیس انٹیلی جنس کے
ہاتھ آ گیا ہے۔ اس سے ہمیں بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

ایک تخریب کار نے کہا۔

”سر! میں تو تھیلا رکھ کر چلا آیا تھا اور سنیما ہاؤس کی ایک طرف کھڑا اس کی نگرانی

بھی کر رہا تھا"

چیف نے اسے گالی دے کر کہا۔

"پھر تمہارا باپ وہاں سے تھیلا اٹھا کر لے گیا؟"

بھارتی دہشت گرد نے وہی جواز پیش کیا کہ اس کے پیٹ میں صبح سے درد ہو رہا تھا اسے دو منٹ کے لئے لیٹرین میں جانا پڑ گیا۔ اسی دوران کوئی تھیلے میں سے بم نکال کر لے گیا۔

"سر! مجھے معاف کر دیں۔ آگے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

چیف کہنے لگا۔

"یہ بات اب میرے اختیار میں نہیں ہے۔ سارا معاملہ کرنل چڈھ کے ہاتھ میں ہے وہ اس معاملے کی تفتیش کے لئے یہاں پہنچ رہا ہے۔ ایک گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔ وہی اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ تمہیں واپس امرتسر بھجوانا ہے یا کیا کرنا ہے؟"

دوسرے دہشت گردی نے کہا۔

"سر! کیا یہ کرنل چڈھ صاحب ضلع روہتک کے رہنے والے ہیں؟"

چیف نے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ انڈین ملٹری انٹیلی جینس کا بڑا افسر ہے۔ اور پاکستان میں ہماری اگرواد کی تخریبی کارروائیوں کا انچارج ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہم میں سے اکثر ایک دوسرے کی شکل صورت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف کام دے دیا جاتا ہے۔ صرف آرڈر ملتے ہیں۔ مگر یہ خاص واقعہ ہوا تھا اس لئے مجھے کرنل چڈھ کو فون پر خفیہ لفظوں میں خبر دینی پڑی کہ مارکیٹ والا بم نہیں پھٹا۔ اس نے کہا کہ وہ آج رات ایک بجے تک ہمارے پاس پہنچ رہا ہے"

پہلے بھارتی تخریب کار نے کہا۔

"سر! ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ جو آدمی ہمارے پاس آیا ہے وہی کرنل چڈھ صاحب ہیں"

چیف نے کہا۔

"ہمارا ایک خاص پاس ورڈ ہے۔ اسے تم بھی سن لو۔ اگر میں اس وقت باتھ روم میں ہوا تو تم آنے والے سے پاس ورڈ پوچھنا۔ پاس ورڈ تاج محل ہے۔ اس کے بعد وہ تم سے پوچھے گا۔ کیا مہارانی صاحبہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ تم آگے سے کہو گے کہ رانی صاحبہ صبح مر گئی ہیں۔ اس کے جواب میں وہ کہے گا۔ ٹھیک ہے۔ مجھے مہارانی صاحبہ کی ارتھی کے پاس لے چلیں۔ اس کے بعد ثابت ہو جائے گا کہ یہی کرنل صاحب ہیں سمجھ گئے ہو یا نہیں؟"

بھارتی تخریب کاروں نے آہستہ سے بیک آواز کہا۔

"سمجھ گئے ہیں سر!"

جس کمرے میں میں دیوار کے ساتھ کان لگائے بھارتی تخریب کاروں کی باتیں سن رہا تھا اس کمرے میں دیوار کے ساتھ ایک کلاک لگا ہوا تھا۔ مگر میں نے چونکہ بتی بجھا دی تھی اس لئے دور سے مجھے اس کی سوئیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اور مجھے وقت معلوم کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ میں نے آہستہ سے کلاک کے نیچے کرسی رکھی اور اس پر کھڑے ہو کر ذرا قریب سے کلاک کو دیکھا۔ اس کی سوئیاں چمک رہی تھیں اور معلوم ہوا کہ رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ گویا ابھی کرنل چڈھ کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے اپنا ایکشن جلدی شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا بھارتی انٹیلی جینس کے کرنل چڈھ کے وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے کر دینا تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ دوسرے کمرے میں تینوں تخریب کار اپنے اگلے تخریبی پروگرام کے بارے میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔

میں اپنی جگہ پر کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ میں ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ صرف تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد میں اس خالی اور اندھیرے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرہ نمبر سات کے بند دروازے کے سامنے آگیا اور دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

اندر باتیں کرنے کی دھیمی آواز آنا بند ہو گئی۔ پھر کسی نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔

"کون ہے؟"

یہ تیسرے بھارتی تخریب کار یعنی چیف کی آواز تھی۔ میں نے بڑے پرسکون اور بارعب آواز میں کہا۔

"کیا چیف اندر ہے؟"

دوسری طرف ایک سیکنڈ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر چیف نے کہا۔

میں چیف بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں کرنل چڈھ ہوں۔ دروازہ کھولو"

چیف نے کہا۔

"تمہارا پاس ورڈ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"کیا مہارانی صاحبہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں؟"

چیف کی آواز آئی۔

"مہارانی صاحبہ صبح مر گئی ہیں۔"

مجھے سارا کوڈ زبانی یاد تھا۔ میں نے کہا۔

"مجھے مہارانی صاحبہ کی ارتھی کے پاس لے چلو"

اس کے فوراً بعد دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے ایک دبلا پتلا پختہ عمر کا آدمی کھڑا تھا جس نے شلوار قمیض کے اوپر گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کی عینک لگی تھی۔ اس کے پیچھے وہی دونوں بھارتی ہندو تخریب کار ایک طرف ہو کر کھڑے تھے۔ جنہیں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جن میں سے ایک وہ تھا جس نے اسلام آباد مارکیٹ کی کتابوں کی دکان کے باہر سے بم والا خالی تھیلا اٹھایا تھا اور دوسرا وہ تھا جو اسے راولپنڈی

کی پرانی بستی والے مکان میں ملا تھا اور جس کو میں نے پہلے تخریب کار کے ساتھ مکان سے باہر نکل کر کھیتوں میں اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ میں جلدی سے اندر داخل ہو گیا اور بڑے رعب سے کہا۔

"دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دو۔ تم لوگوں نے کمرے میں اتنی روشنی کیوں کر رکھی ہے؟"

چیف نے جلدی سے صوفے پر سے اخبار ہٹاتے ہوئے ایک تخریب کار سے کہا۔

"رام چند! ایک بتی بجھا دو"

ایک بتی بجھا دی گئی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور ان تینوں کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد چیف سے پوچھا۔

"بم کا تھیلا کس نے رکھا تھا؟"

چیف کی شکل چونکہ نئی تھی اور اس کی آواز سے بھی میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہی چیف ہے۔ اس نے ایک تخریب کار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس نے رکھا تھا سر!"

"اس کا نام کیا ہے؟"

چیف نے بتایا۔

"شری ناتھ سر!"

تخریب کار شری ناتھ کا رنگ اڑ گیا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور غضبناک آواز میں کہا۔

"میں دیکھوں گا تمہیں کس نے امرتسر سنٹر سے پاس کر کے اس مشن پر بھیجا تھا۔ میں تمہارے ساتھ اسے بھی امرتسر جاتے ہی ڈس مس کر دوں گا۔"

شری ناتھ گڑگڑاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"سر! میں بے گناہ ہوں۔ میں ایک منٹ کے لئے لیٹرین میں چلا گیا تھا سر۔ میرے پیٹ میں سخت درد تھا۔"

"شٹ اپ!" میں نے اسے جھاڑ دیا۔

"پھر چیف کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"امرتسر سنٹر کو میں نے تمہارے مشن کی ناکامی کی اطلاع دی ہے۔ مجھے ان کے اگلے فیصلے کا انتظار ہے۔ مجھے بتاؤ ہمارا اگلا مشن نمبر کیا تھا اور ہمارے باقی آدمی اس وقت کہاں ہیں تاکہ اس مشن کی ناکامی کے بعد میں انہیں نئی ڈاریکشن دے سکوں۔ امرتسر سنٹر سے مجھے وائرلیس پیغام میں بتایا ہے کہ باقی آدمیوں کی بابت چیف کو معلوم ہے۔"

چیف نے جلدی سے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

"لیس سر! میں ابھی بتاتا ہوں"

پھر اس نے ڈائری میں سے ایک کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر اسے پڑھتے ہوئے کہا۔

"سر! اس وقت ہمارے صرف دو اگروادی (تخریب کار) پاکستان میں ہمارے علاو ہیں۔ دونوں اس وقت کراچی میں ہیں سر۔ ان کی ڈیوٹی اگلے ہفتے کراچی ریلوے اسٹیشن پ دو دھماکے کرنے اور ایک مسجد کے نمازیوں پر فائرنگ کر کے انہیں ہلاک کرنے کی ہے۔ اس کاغذ پر ان کے نام اور ایڈریس لکھے ہوئے ہیں سر!"

میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا۔

"یہ مجھے دے دو"

کاغذ کے پرزے پر دو آدمیوں کے ہندو نام اور نیچے کراچی کا کوئی ایڈریس لکھا ہوا تھا جو میں نے اس وقت نہ پڑھا اور کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے چیف کو ڈانٹ کر کہا۔

"سنٹرل انٹیلی جینس تمہارے خلاف بھی ایکشن لے گی۔ آخر تم لوگوں کو ہماری بھارتی حکومت نے اس لئے یہاں بھیجا ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر جنتا کی کمائی سے عیش اڑاؤ؟"

چیف کچھ کہنے لگا تو میں نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ! تم سب بیکار آدمی ہو۔ میں نے امرتسر سنٹر کو وائرلیس پر بریف کر دیا

ہے کہ تم تینوں کو واپس بلا لیا جائے۔ اب میں جاتا ہوں۔ تم لوگ اس وقت تک یہیں رہو گے جب تک مجھے امرتسر سنٹر سے کوئی ایڈوائس نہیں ملتی۔ اوکے؟"

"لیس سر!"

چیف نے مردہ سی آواز میں کہا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں امرتسر سنٹر وائرلیس میسج کا جواب لینے جاتا ہوں۔ دروازے کو اندر سے بولٹ کر کے رکھنا اور خبردار کمرے میں زیادہ روشنی نہیں ہونی چاہئے۔"

"لیس سر!"

چیف یہ کہہ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دروازے کے پاس جا کر پلٹ کر کہا۔

"تمہارے پاس پاکستانی کرنسی میں ایک ہزار روپیہ ہوگا؟"

چیف نے جلدی سے اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے میں سے سو سو کے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔

"سر! یہ سات سو پاکستانی روپے ہیں سر"

"ٹھیک ہے" میں نے روپے لے کر کہا۔ "میرے پاس دس ہزار کی انڈین کرنسی ہے۔ مجھے تمہارے پاس جلدی آنا پڑا۔ پاکستانی کرنسی میں اس رقم کو تبدیل نہیں کرا سکا۔"

"نو پرابلم سر!"

میں نے چیف کی طرف گھور کر دیکھا۔

"زیادہ انگریزی مت بولا کرو۔ پاکستان میں رہتے ہو تو اردو میں بات کیا کرو"

یہ کہہ کر میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر میں رک گیا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ چیف نے دروازہ بند کیا اور اندر سے بولٹ کر دیا۔ میں وہاں سے سیدھا ہوٹل کی لابی میں آگیا۔ یہاں ایک جانب کونے میں چھوٹا سا ٹیلی فون بوتھ بنا ہوا تھا۔ بوتھ میں داخل ہوتے ہی ساتھ لگی ہوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ایمرجنسی پولیس کا نمبر تلاش

کرنے لگا۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے میں نے ایمرجنسی پولیس کا نمبر اس لئے نہ پوچھا کہ وہاں خواہ مخواہ کا خوف وہراس نہ پھیل جائے اور تینوں تخریب کار کمرے سے فرار نہ ہو جائیں۔

مجھے بڑی جلدی ایمرجنسی پولیس فورس کا نمبر مل گیا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ایمرجنسی پولیس فورس سر! کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔

"میری بات غور سے سنو! میں تمہیں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔"

میں پنڈی کے مارگلہ ہوٹل کی لابی سے بول رہا ہوں۔ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں اس وقت انڈیا کے تین ہندو تخریب کار موجود ہیں۔ انہیں فوراً پولیس سکواڈ بھیج کر گرفتار کیا جائے۔ دیر نہیں ہونی چاہئے ہو سکتا ہے وہ آدھے گھنٹے کے اندر یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

دوسری طرف سے پولیس اہلکار نے کہا۔

"فکر نہیں کریں سر۔ ہم ابھی پولیس گارڈ بھیج رہے ہیں۔"

میں نے فوراً فون بند کر دیا۔ میں ہوٹل کی عمارت سے نکل کر سامنے والی سڑک کی دوسری جانب رات کے اندھیرے میں درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں ان لوگوں کا سرغنہ اصلی کرنل چڈہ پولیس گارڈ پہنچنے سے پہلے ہی وہاں نہ پہنچ جائے۔ پھر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان لوگوں پر ساری بات کھل جاتی اور وہ ہوٹل کی دوسری طرف سے رات کے اندھیرے میں فرار ہو سکتے تھے۔ میں تخریب کاروں کے سرغنہ کرنل چڈہ کو بھی پکڑنا چاہتا تھا لیکن ان تخریب کاروں کی گرفتاری کے بعد پہلے وہاں ایسا موقع نہیں بن رہا تھا۔

پنڈی ایمرجنسی پولیس نے انتہائی مستعدی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا اور دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ پولیس کی دو گاڑیاں ہوٹل میں داخل ہوتی نظر آئیں بڑی

خاموشی سے دونوں گاڑیاں لان کی ایک جانب درختوں کے نیچے اندھیرے میں کھڑی ہوئیں۔ میں نے ان میں سے پندرہ سولہ پولیس کے مسلح سپاہیوں کو چھلانگیں لگا کر نکلتے دیکھا۔ چھ سات سپاہی ہوٹل کی دونوں جانب دوڑ پڑے تاکہ ہوٹل کا محاصرہ کیا جائے چار سپاہی وہیں بندوقیں لئے کھڑے ہو گئے۔ کچھ سپاہی ایک تھانیدار کی جمعیت میں ہوٹل کی لابی میں گھس گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کے عقب میں کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ فائر کی آواز بھی آئی۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ شاید کسی تخریب کار نے فائر کیا تھا۔ یا پولیس انسپکٹر نے فائر کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ پولیس کے آدمی تینوں تخریب کاروں کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ انہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں پولیس کی بھاری نفری نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ تینوں تخریب کاروں کو پولیس نے گاڑی میں دھکیلا اور گاڑیاں ہوٹل کی عمارت سے نکل کر سڑک پر ایک طرف روانہ ہو گئیں۔

میری تسلی ہو گئی۔ میں اس لئے بھی خوش تھا کہ یہ کارروائی بڑی جلدی ہو گئی تھی اور تینوں بھارتی تخریب کاروں کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ چیف تخریب کار نے بتایا تھا کہ کرنل چڈہ ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچنے والا ہے۔ ابھی اس بات کو میرے اندازے کے مطابق ایک گھنٹہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کرنل چڈہ ابھی تک وہاں نہیں آیا ہو گا۔ میں درختوں کے پیچھے سے نکل کر ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ وہاں دو تین آدمی کھڑے اس واقعے پر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ایک ملازم سے ہوٹل کے فلور منیجر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کاؤنٹر کے پاس ایک سوٹ بوٹ والے نوجوان آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جی ملک صاحب وہ سامنے کھڑے ہیں"

میں اس کے پاس چلا آیا۔ میں نے اسے سلام علیکم کہا اس نے چونک کر میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا آپ ہی فلور منیجر ہیں؟"

اس نے بے دلی سے کہا۔

"جی ہاں۔ فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

ہوٹل پر چھاپہ پڑنے کی وجہ سے وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"میرا نام راجہ غلام سرحد ہے۔ میں پنڈی انٹیلی جینس کا پولیس انسپکٹر ہوں۔ ہمیں یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ جس کمرے میں انڈین تخریب کار ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں ان کا ایک چیف بھی تھوڑی دیر میں آنے والا ہے"

فلور منیجر نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"سر! ہماری پہلے ہی بڑی بدنامی ہو چکی ہے۔ آپ کی پولیس تین آدمیوں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔"

"میں نے کہا"۔

"لیکن ان کا چیف باہر سے آنے والا ہے اور کمرہ نمبر سات میں ہی ان سے آکر ملے گا۔ اس کا نام کرنل چڈہ ہے۔ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی کا آدمی ہے۔ اور اس کا پکڑا جانا نہایت ضروری ہے۔ میرے ساتھ پولیس کے چار مسلح سپاہی بھی ہیں جو درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں اور میرے خاص اشارے کے منتظر ہیں۔"

فلور منیجر نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔ آپ جو کہتے ہیں ہم ویسے ہی کریں گے۔"

"میں نے کہا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں آپ کے سوا کسی دوسرے کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں کمرہ نمبر سات میں چھپ کر بیٹھوں گا۔ کیونکہ بھارتی کرنل چڈہ ہماری اطلاع کے مطابق اسی کمرے میں اپنے ساتھیوں سے ملنے آرہا ہے۔ اس کے بعد ہم اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے"

فلور منیجر نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"سر! میں ایک ہی گزارش کروں گا۔ کہ اب کوئی فائرنگ وغیرہ نہیں ہونی چاہئے

آپ خاموشی سے اس تخریب کار کو پکڑ کر لے جائیں"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ مجھے جلدی سے کمرہ نمبر سات کھول دیں۔"

فلور منیجر نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ کاؤنٹر پر جاکر کمرہ نمبر سات کی چابی لی جسے تخریب کاروں کی گرفتاری کے بعد مقفل کر دیا گیا تھا اور مجھے ساتھ لے کر پیچھے سے ہوتا ہوا کمرہ نمبر سات میں لے آیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور کہا۔

"سر! ایک مہربانی کریں کہ یہ جو تخریب کار باقی رہ گیا ہے اسے گرفتار کر کے بس یہاں سے لے جائیے گا۔ کوئی فائرنگ وغیرہ نہ ہو"

میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ اب چلے جائیں اور ہرگز ہرگز کسی سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں۔"

فلور منیجر چلا گیا۔ میں نے کمرے کی بتی جلا کر دروازہ بند کر لیا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ تخریب کاروں کے سرغنہ لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ اگر اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اس کے آدمی پکڑے گئے ہیں تو وہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ کرنل چڈہ کو یہاں جو کارروائی ہو چکی تھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے میں نے کمرے کی چیزوں کو درست کیا اور جیکٹ کا اوپر والا بٹن کھول کر بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے کسی نے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں چیف ہوں"

باہر سے آواز آئی۔

"میں تمہارا افسر ہوں"

میں نے کہا۔

"اپنا پاس ورڈ بتاؤ"

اس نے کہا۔

"کیا مہارانی صاحبہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جس بدبخت بھارتی دہشت گرد کا مجھے انتظار تھا وہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"مہارانی صاحبہ صبح مر گئی ہیں"

دوسری طرف سے آواز آئی

"مجھے مہارانی صاحبہ کی ارتھی کے پاس لے چلو"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک دراز قد کا مگر دبلے بدن کا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے بھورے رنگ کا گرم سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر قراقلی ٹوپی تھی۔ میں نے اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اندر آتے ہی جیب سے سگار نکال کر سلگایا اور پوچھا۔

"باقی دونوں کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"سر! آپ کرنل چڈہ صاحب ہے ناں؟"

اس نے کھڑے کھڑے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"ہاں۔ مگر تمہارے دونوں اگروادی کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"سر! ایک ایمرجنسی پیدا ہو گئی ہے۔ میں ساری بات آپ کو ابھی بتاتا ہوں۔ آ۔ یہاں بیٹھ جائیں؟"

اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"سر! میں چیف ہوں۔ ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اس لئے آپ مجھے پہچان نہیں رہے۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا پولیس کو پتہ چل گیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں سر! ہم اگروادی اتنے کچے نہیں ہیں سر۔ بس ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ پولیس کسی دوسری واردات کی تفتیش کرنے یہاں ایک کمرے میں آئی ہوئی ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تب تو ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا میں نے اپنا الٹا بازو پوری طاقت سے اس کی گردن کے پیچھے مارا۔ میرے فولادی بازو کی ضرب ایک ہتھوڑے کی طرح اس کی گردن پر پڑی وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اس کے گرتے ہی اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر زور سے اوپر کو جھٹکا دیا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے پوری طاقت سے ایک اور جھٹکا دیا۔ مگر میرے پہلے جھٹکے نے ہی اس کی گردن کا منکا توڑ کر اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک رومال سگاروں کا پیکٹ' لائٹر اور ایک بٹوہ نکلا جس میں دوہزار روپے کی پاکستانی کرنسی تھی۔ سات سو روپے میرے پاس پہلے تھے۔ یہ دوہزار روپے کے نوٹ بھی میں نے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اس کے بٹوے میں اور کچھ نہ نکلا۔ یہ لوگ ایسی کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھتے جس سے ان کے گروہ کے دوسرے لوگوں کا سراغ مل سکے۔ اس کے پاس کوئی چاقو پستول وغیرہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کی لاش کو

وہیں پڑا رہنے دیا اور خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ اب مجھے کراچی کے ان دو بھارتی تخریب کاروں کو ٹھکانے لگانا تھا جن کے نام اور کراچی کا ایڈریس والا کاغذ میری جیب میں تھا۔ میں ہوٹل کی پچھلی طرف سے ہوکر باہر سڑک پر آگیا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ سڑک دور تک خالی پڑی تھی۔ رات سرد تھی۔ راولپنڈی کی راتیں نومبر میں بھی کافی سرد ہو جاتی ہیں۔ میں نے جیکٹ کے اوپر والا بٹن بند کرلیا اور جیبوں میں ہاتھ دے کر سڑک پر چل پڑا۔

اس بات کا امکان تھا کہ چونکہ اس علاقے میں بھارتی تخریب کار پکڑے گئے تھے ہو سکتا تھا کہ سی آئی ڈی کے آدمی اس طرف چھپے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو بھی پولیس سے بچانا تھا۔ کیونکہ پنجاب کی پولیس کو میری بھی تلاش تھی۔ میں سڑک پر چلتے چلتے چوک میں آیا تو ایک طرف سے ٹیکسی آرہی تھی۔ اس کی سرخ بتی روشن تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹیکسی خالی ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اور ڈرائیور سے ایئرپورٹ چلنے کو کہا۔ اس وقت تک اسلام آباد کے ایئرپورٹ سے صرف اندرون ملک ہی پروازیں آتی جاتی تھیں۔ بیرون ملک کی پروازیں کراچی ایئرپورٹ سے روانہ ہوتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ ایئرپورٹ میرے لئے محفوظ جگہ ہے۔ میرے پاس کافی رقم موجود تھی۔ اس زمانے میں ڈھائی تین ہزار کی رقم بہت زیادہ رقم ہوتی تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ شاید وہاں سے کراچی جانے والی کوئی نائٹ کوچ کی فلائٹ مل جائے۔ ایئرپورٹ پر آکر معلوم ہوا کہ کراچی جانے والی نائٹ کوچ رات ایک بجے چلی گئی تھی اب صبح چھ بج کر پینتالیس منٹ پر ایک فلائٹ کراچی جائے گی۔ میں ایئرپورٹ کی عمارت میں ایک طرف ہوکر بیٹھ گیا۔ مجھے چار پانچ گھنٹے وہاں بیٹھنا تھا۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیند پر قابو پانا میری ٹریننگ میں شامل تھا۔ صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ کسی پولیس والے کی نگاہ میں نہ آجاؤں۔ مگر وہاں مجھے ایک بھی پولیس کا سپاہی نظر نہ آیا۔

کسی نہ کسی طرح میں نے رات ایئرپورٹ پر گزار دی۔ دن نکل آیا۔ نومبر کی صبح اسلام آباد میں سرد اور دھندلی تھی۔ ایئرپورٹ کے باہر ایک ٹریولنگ ایجنسی کے آفس سے

مجھے کراچی کا ٹکٹ مل گیا۔ ابھی جہازوں میں لوگوں کا اتنا رش نہیں ہوتا تھا۔ لوگوں کے پاس ابھی نہ تو اتنا پیسہ آیا تھا اور نہ دولت کا زیادہ لالچ ہی تھا۔ مجھے جہاز میں بڑی آسانی سے جگہ مل گئی۔ اپنے وقت پر جہاز کراچی کی طرف پرواز کرگیا۔ کراچی پہنچنے پر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لئے نئی پتلون قمیض اور جوتے خریدے انہیں ایک لفافے میں ڈال کر شہر کے ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ ڈاڑھی مونچھوں اور سر کے بال ہلکے کروائے۔ نہا دھو کر پرانے کپڑے سوائے جیکٹ کے پھینک دیئے اور نئے کپڑے پہن لئے۔ اس دوران میں نے کاغذ پر لکھے ہوئے دونوں بھارتی تخریب کاروں کے نام اور ان کا ایڈریس پڑھ لیا ہوا تھا۔ یہ وہاں مسلمانوں کے نام سے رہ رہے تھے۔ لیکن کاغذ پر ان کے ہندوانہ نام بھی بریکٹ میں لکھے ہوئے تھے۔ اس طرح ان لوگوں کو اعتماد میں لینے کے لئے میرے لئے آسانی پیدا ہوگئی تھی۔ راولپنڈی کے تخریب کار گرفتار ہو چکے تھے۔ وہاں سے اب انہیں وائرلیس یا ٹیلی فون پر کوئی میرے بارے میں خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے ملنا اور ان سے پاکستان میں مقیم دوسرے بھارتی دہشت گردوں کا کے سراغ لگا کر ان سب کو پولیس کے حوالے کرنا تھا۔

دن کے نو بجے کے قریب میں رکشے میں بیٹھ کر اس علاقے کی طرف روانہ ہوا جہاں یہ بھارتی تخریب کار مسلمان بن کر رہ رہے تھے۔ ان کے مکان کا ایڈریس کاغذ پر لکھا تھا۔ معلوم نہیں تھا وہ دونوں اکٹھے وہاں رہتے تھے یا ان میں سے ایک تخریب کار وہاں رہتا تھا۔ یہ مجھے وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ جس علاقے کا ایڈریس کاغذ پر لکھا ہوا تھا وہ کراچی شہر کے شمال میں سمندر کے قریب ایک چھوٹی سی مزدور بستی تھی۔ کوارٹر نما غریبانہ مکان ادھر ادھر نظر آرہے تھے۔ ایک مختصر سا بازار تھا جہاں دکانیں کھلی تھیں۔ میں ایک چائے کی دکان پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوائی اور خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہوگیا۔ مکان کا نمبر مجھے یاد تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے چائے کی دکان کے مالک کو مکان کا نمبر بتا کر پوچھا کہ یہ مکان کس طرف ہے۔ اس نے ذرا آگے کو ہوکر بائیں طرف کوارٹروں کے درمیان سے گزرتی کچی سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جہاں سڑک دائیں طرف مڑتی ہے یہ مکان اس طرف تیسرا ہے۔ آپ کو کس
سے ملنا ہے بابو؟"

میں نے ایک بھارتی تخریب کار کا مسلمانوں والا نام بتایا تو دکاندار بولا۔

"اچھا تو آپ کو ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے؟"

ایڈریس جو کاغذ پر لکھا تھا وہاں اس تخریب کار کے اسلامی فرضی نام کے ساتھ ڈاکٹر
نہیں لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب سے ہی ملنا ہے"

دکاندار نے لڑکے کو بلا کر کہا۔

"جا بے صاحب کو ڈاکٹر اللہ یار کی دکان پر چھوڑ آ"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں بھائی اس تکلیف کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا"

میں نے چائے کے پیسے دیئے اور کوارٹر نما ایک منزلہ شکستہ سے مکانوں کے درمیان
جو کچی سڑک بنی ہوئی تھی اس پر چلنے لگا۔ آگے جا کر سڑک ایک طرف کو مڑ گئی۔ ادھر
تیسرے مکان کے باہر میں نے دو عورتوں کو جو لباس سے مزدور لگتی تھیں زمین پر بچوں کو
لئے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا دکان کے قریب آگیا۔ دیکھا کہ دکان کی پیشانی
پر بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا۔

ڈاکٹر اللہ یار ہومیو پیتھک یہاں ہر مرض کا علاج کیا جاتا ہے۔

دکان کے اندر ایک چھوٹی سی ڈاڑھی والا آدمی میز کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک
مریض اس کے پاس سٹول پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے سینے پر سٹیتھو سکوپ لگائی ہوئی
تھی۔ پرانی بوسیدہ سی دکان تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ الماری میں ہومیو پیتھی
دوائیوں کی شیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر ایک چارٹ بھی لگا تھا جس پر انسانی جسم
ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ دو تین مریض سامنے دیوار کے ساتھ بنچ پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کی عمر چالیس
کے قریب ہوگی۔ بوڑھا آدمی نہیں تھا۔ بدن اکہرا تھا۔ آنکھوں پر سفید شیشوں والی عینک

لگی تھی۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ بھورے رنگ کی پرانی اچکن پہن رکھی تھی۔
میں بھی دکان کے اندر جا کر مریض بن کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے میری طرف آنکھ اٹھا کر
بھی نہ دیکھا۔ مریض کے سینے سے اس نے سٹیتھو سکوپ ہٹا کر میز پر رکھ دی اور اس کے
لئے پڑیاں بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اس کو ہدایات بھی دیتا جاتا تھا۔ یہ شخص شکل
وصورت سے کسی طرح بھی بھارتی تخریب کار نہیں لگ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے بھی اس کو
دیکھ کر شک ہونے لگا کہ کہیں میں کسی دوسرے آدمی کے پاس تو نہیں آگیا۔ لیکن پنڈی
کے مارگلہ ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں بھارتی تخریب کاروں کے چیف نے مجھے جو کاغذ دیا
تھا اس پر اس شخص کے ہندوانہ نام بھگت رام کے آگے بریکٹ میں اللہ یار ہی لکھا ہوا
تھا۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ کاغذ پر اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھا گیا تھا۔ دوسرے
تخریب کار کا ہندوانہ نام میلا رام تھا اور اس کے نام کے آگے مسلمانوں والا نام بریکٹ میں
عبدالستار لکھا ہوا تھا۔

دو تین مریض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر اللہ یار میری طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کیسے آئے ہو بھائی؟"

اس کا اردو بولنے کا لہجہ بڑا عامیانہ اور مزدوروں والا تھا۔ شاید اس مزدور بستی میں
رہنے کی وجہ سے ایسا تھا۔ میں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بخار میرا پیچھا نہیں چھوڑتا میں راولپنڈی سے آپ کی شہرت سن کر
آیا ہوں۔"

میں نے ہاتھ آگے کیا کہ وہ شاید نبض دیکھے گا مگر اس نے سٹیتھو سکوپ میرے سینے
پر لگائی۔ تین چار سیکنڈ خاموشی سے آنکھیں بند کئے جیسے غور کرتا رہا۔ پھر سٹیتھو سکوپ میز
پر رکھ دی اور بولا۔

"بھائی تمہیں اس وقت کوئی بخار نہیں ہے"

میں نے کہا۔

"اسی طرح ہوتا ہے جی۔ ایک دن چڑھتا ہے۔ پھر دو دن نہیں چڑھتا۔ اس کے بعد

رات کو پھر بدن پھکنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ پچھلے دو مہینوں سے چل رہا ہے۔ پنڈی‘ پشاور‘ لاہور میں بھی ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کسی کی دوائی سے آرام نہیں آیا۔ آخر ایک ریٹائرڈ فوجی چڈہ صاحب نے آپ کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ اب آپ کے پاس آگیا ہوں۔“

چڈہ کا نام سنتے ہی میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ٹھٹھک سا گیا تھا۔ وہ کوئی کتاب کھول کر میرے مرض کے بارے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ چڈہ کا نام میری زبان سے سننے کے بعد اس نے کتاب بند کردی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بھائی تمہاری بیماری کی وجہ معلوم نہیں ہو رہی تم پیچھے کمرے میں چل کر بیٹھو تمہارا پورا چیک اپ کرنا پڑے گا۔“

میں اٹھ کر دکان کے پیچھے چھوٹے سے کمرے بلکہ کوٹھڑی میں آکر مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ یہاں زمین سے کوئی دو فٹ اونچا میلا کچیلا سٹریچر پڑا تھا۔ دیواریں خالی تھیں۔ پچھلی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی اس کی سلاخوں میں سے تازہ ہوا اور دن کی روشنی آرہی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر یعنی بھارتی تخریب کار کوٹھڑی میں آگیا۔ آتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

سٹریچر پر لیٹ جاؤ۔ تمہارا پورا چیک اپ کرنا ہوگا۔

صاف لگ رہا تھا کہ میرے بارے میں اس کو پوری تسلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ چڈہ کوئی اور فوجی بھی ہو سکتا تھا۔ یہ شخص بڑا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

”بھگت رام! میں کرنل چڈہ سے راولپنڈی میں مل کر آرہا ہوں۔ تمہارے واسطے ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔“

وہ میرے سامنے سٹریچر پر بیٹھ گیا اور مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ وہ مزید تصدیق چاہتا تھا کہنے لگا۔

”کرنل چڈہ تمہیں کس جگہ ملا تھا؟“

مجھے ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں اخبار میں پنڈی مارگلہ ہوٹل سے پکڑے جانے والے بھارتی تخریب کاروں کی خبر اخباروں میں نہ آگئی ہو۔ لیکن پنڈی پولیس نے عقلمندی

ثبوت دیا تھا۔ اس نے اخبارات کو یہ خبر ابھی نہیں بتائی تھی۔ کیونکہ اس طرح سے دوسرے تخریب کاروں کے روپوش ہو جانے کا امکان تھا اور پنڈی پولیس گرفتار شدہ تینوں تخریب کاروں سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

”وہ مجھے مارگلہ ہوٹل میں ملا تھا۔ میں وہاں اپنے تین دوسرے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ ہمارا چیف بھی وہیں پر تھا۔“

میں نے اسے مارگلہ ہوٹل والے اور تخریب کاروں کے ہندو نام بتائے۔ اس کے باوجود اس شخص نے مجھے ہاتھ نہ پکڑایا کہنے لگا۔

”مارگلہ ہوٹل میں کل رات کا پاس ورڈ کیا تھا؟“

میں نے اسے وہ سارا مکالمہ زبانی سنادیا جس میں تھا کہ کیا مہارانی اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے؟ اور یہ کہ مجھے مہارانی کی ارتھی کے پاس لے چلو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جیب سے کاغذ کا وہ پرزہ نکال کر اس کو دکھایا۔ جس پر چیف کے ہاتھ سے اس کے اور کراچی میں مقیم دوسرے ہندو تخریب کار کا نام اور ان کا ایڈریس درج تھا۔ وہ کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر غور سے پڑھنے لگا۔ اب اسے یقین آگیا تھا کہ میں ان کا ساتھی ہی ہوں کہنے لگا۔

”کرنل نے کیا پیغام دے کر تمہیں یہاں بھیجا ہے؟ کوئی چنتا والی بات تو نہیں ہے؟“

میں نے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کرنل چڈہ نے مجھے جو پیغام دیا ہے وہ میں میلا رام کے بھی سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا دوسرا ساتھی میلا رام کہاں رہتا ہے؟“

بھگت رام عرف اللہ یار کہنے لگا۔

”وہ شپ یارڈ میں مزدوروں کا میٹ لگا ہوا ہے۔ رات کو میرے مکان میں آکر سوتا ہے۔“

”تمہارا مکان کہاں ہے؟“

”میری دکان کے اوپر ہے۔“

اس بھارتی تخریب کار نے مجھے بتایا کہ اس کا ساتھی جس کا اصلی نام میلارام تھا اور عبدالستار کے نام سے کراچی شپ یارڈ میں کام کر رہا تھا رات کو آئے گا۔ میں نے کہا۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کے بارے میں امرتسر سنٹر کی طرف سے یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہ کہاں کہاں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ ہمیں چیف کی طرف سے جب کسی سے رابطہ پیدا کرنے کا آرڈر ملتا ہے ت ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں۔ کرنل چڈہ صاحب نے مجھے زبانی آرڈر دیا تھا کہ ا کا خاص پیغام کراچی میں کام کرنے والے اپنے تمام آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک بار سنا دیا جائے اس لئے اگر کراچی میں میلارام کے علاوہ اپنے جو آدمی ہیں ان کو بھی یہ رات کو بلوا لینا۔ میں سب کے سامنے کرنل صاحب کا آرڈر سناؤں گا جو امرتسر کے سنٹ طرف سے انہیں ملا ہے۔"

بھگت رام عرف اللہ یار کو اب یقین ہو گیا تھا کہ میں بھی ان کا ساتھی ہوں۔ میر اسے اپنا نام پرکاش چند بتایا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ معلومات ح کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایک بار ہمارا ایک دوسرے کو پاس ورڈ اور اشارے بتا دینا ہی کافی تھا۔ یہ باتیں مجھے مارگلہ ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں بھارتی کی زبانی معلوم ہو چکی تھیں۔

بھگت رام کہنے لگا۔

"ہم دو آدمی ہی کراچی شہر کی ڈیوٹی پر ہیں۔ ہم چار دھماکے کر چکے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔

"تم لوگوں کو کراچی کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے والوں پر بھی فائرنگ کرنی ہے اور کراچی ریلوے سٹیشن پر بھی دھماکہ کرنا ہے۔"

یہ خاص خفیہ رپورٹ تھی جو مجھے ان کے چیف کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ میری اس خفیہ رپورٹ نے اس بات پر تصدیق کی مہر لگا دی کہ میں ان کا ساتھی ہوں اور کرنل چڈہ کا خاص آدمی ہوں۔ بھگت رام بولا۔

"یہ دونوں گھٹنائیں ہم اگلے ہفتے کرنے والے ہیں۔"

بھگت رام نے اپنی گفتگو میں اب ہندی کے الفاظ بولنے شروع کر دیئے تھے۔ میں نے اسے ٹوک کر کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ پاکستان میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی یہاں کی زبان میں بات کرتے ہیں؟ ہندی کے الفاظ مت استعمال کرو"

بھگت رام نے فوراً معذرت پیش کی اور کہا۔

"غلطی ہو گئی سر۔"

وہ مجھے اپنے بھارتی تخریب کاروں کے گینگ کا کوئی افسر سمجھنے لگا تھا۔ میں ان کے پورے گینگ کا' پورے گروہ کا سراغ لگا کر انہیں ختم کرنا چاہتا تھا جو بھارتی حکومت کی اسلام دشمن ایجنسی را کے اشارے پر پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر کے مسلمانوں کے مذہبی فرقوں میں نفرت کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔ یہ لوگ سنیوں کی مسجد میں بم مار کر نمازیوں کو شہید کرتے تھے تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کام شیعوں نے کیا ہے۔ اس طرح اگر کسی شیعہ مسجد میں بم کا دھماکہ ہوتا تھا تو وہ لوگ اس کا الزام سنیوں پر دھرتے تھے۔ حالانکہ یہ کام بھارتی دہشت گرد کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا اتنے بڑے شہر میں تم صرف دو آدمی یہ کام کر رہے ہو؟"

بھگت رام بولا۔

"ایک ہندو عورت مایاوتی ہمارے گینگ میں ضرور شامل ہے مگر وہ اگر واد کارروائیوں

میں ہمارے ساتھ نہیں جاتی"

میں نے اسے ہلکا سا ڈانٹ دیا۔

"تم نے پھر ہندی لفظ اگر واد بولا۔ دہشت گردی کی کارروائیاں کہو"

"سوری سر! سوری"

"تو پھر یہ ہندو عورت مایاوتی کس کام کے پیسے لیتی ہے؟ بھارتی حکومت کیا اسے مف
کی تنخواہ دیتی ہے؟"

بھگت رام نے فوراً کہا۔

"نہیں سر ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل مایاوتی وہ کام کرتی ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔
کراچی کے بہت بڑے ہوٹل میں ویٹریس ہے۔ اس ہوٹل میں غیر ملکی اور ملکی سیا
شخصیات آکر ٹھہرتی ہیں۔ مایاوتی نوجوان بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ وہ اپنے طر
سے ان لوگوں سے خفیہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو ہم بھارت ا
امرتسر سنٹر کو پہنچا دیتے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔ میرے خدایا! دشمن ملک بھارت نے پاکستان میں کیسا خط
جال پھیلایا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ مایاوتی کیا یہاں کی مقامی ہندو لڑکی ہے؟"

بھگت رام نے کہا۔

"نہیں جناب۔ اس لڑکی کو خاص طور پر راجستھان کے بارڈر سے پاکستان میں سمگ
گیا تھا۔ اس کو یہاں رہتے ہوئے ابھی صرف چھ سات مہینے ہی ہوئے ہیں۔"

"اس دوران مایاوتی نے کیا کارکردگی کی ہے؟"

میں نے اس انداز سے پوچھا جیسے مجھے سچ مچ اوپر سے ان لوگوں کی کارکردگی کا
لینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ بھگت رام کہنے لگا۔

"ابھی تک تو سر اس نے ایسی کوئی خفیہ معلومات حاصل نہیں کی جو ہماری
حکومت کے لئے کار آمد ہو۔ لیکن امید ہے کہ آگے چل کر یہ لڑکی مایاوتی بڑ

دکھائے گی۔ اس نے بڑی اہم شخصیات سے رابطہ قائم کرلیا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا تم اسے اطلاع کر سکتے ہو کہ آج رات کی اہم میٹنگ میں وہ بھی آجائے؟"

بھگت رام کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"سر! یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ ہمیں صرف ایمرجنسی میں ایک دوسرے سے فون پر بات کرنے کی اجازت ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ایمرجنسی ہے تو میں اسے بھی ٹیلی فون کر کے اطلاع دے دیتا ہوں۔ ورنہ کلینک بند کرنے کے بعد میں خود اس کے پاس ہوٹل جاؤں گا۔"

میں اس بھارتی جاسوس لڑکی مایاوتی کو ہوٹل کے ماحول میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح سے مجھے کسی دوسرے تخریب کار یا مایاوتی کی تخریبی کارروائیوں میں شریک کسی دوسرے مقامی آدمی کا سراغ لگانے کا بھی موقع مل سکتا تھا۔ میں نے بھگت رام سے کہا۔

"تم مت جانا۔ میں خود اس کے پاس جا کر اسے خبر کروں گا۔ میں اس کی بے خبری میں اس کی کارکردگی کا جائزہ بھی لینا چاہتا ہوں تم مجھے اس کا حلیہ بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کا آج کا پاس ورڈ کیا ہے"

یہ تخریب کار ایک دوسرے کو شکل سے بہت کم جانتے ہیں۔ ایک دو کے صورت شناس ہوتے ہیں۔ اس کے آگے اگر کسی سے ملنا پڑ جائے تو پاس ورڈ سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ ہر روز ایک خاص خفیہ پاس ورڈ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے شہر سے اگر کوئی تخریب کار ملنے آئے تو اسے وہیں سے وہ پاس ورڈ بتا دیا جاتا ہے۔ یہ باتیں بھی مجھے راولپنڈی کے مارگلہ ہوٹل میں بھارتی تخریب کاروں کے چیف کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔

بھگت رام نے الماری کھولی۔ اس میں سے ایک ڈبہ نکالا۔ ڈبے میں سے ایک پرانی ڈائری نکالی۔ اس میں سے ایک لفافہ نکال کر کھولا۔ اور ایک تصویر نکال کر مجھے دی اور کہا۔

"یہ مایاوتی کی تصویر ہے سر!"

یہ ہندو لڑکی راجستھان کی معلوم ہوتی تھی۔ جبڑا چوڑا تھا۔ ہونٹ بھی فراخ تھے۔ ناک اونچا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں کی مانگ درمیان میں سے نکلی ہوئی تھی اور آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ میں نے یہ شکل اپنے ذہن میں بٹھالی اور تصویر بھگت رام کو واپس کر کے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے ڈھونڈھ لوں گا۔ مگر یہ بتاؤ کہ آج کا پاس ورڈ کیا ہے۔"

بھگت رام بولا۔

"سر! آج کا پاس ورڈ راجہ اشوک کی لاٹھ ہے۔ جب آپ مایاوتی سے کہیں گے کہ کیا تم نے اشوک راجہ کی لاٹھ دیکھی ہے تو وہ کہے گی۔ نہیں۔ آپ کہیں گے کہ کل راجہ رنجیت سنگھ مجھے کراچی کی بندرگاہ پر ملا تھا۔ بس اس کے بعد آپ کو اپنی شناخت کروانے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ مایاوتی سمجھ جائے گی کہ آپ ان کے اپنے گروہ کے آدمی ہیں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے ابھی شہر میں دو ایک ضروری کام کرنے ہیں۔ میں دوپہر کے بعد مایاوتی کے ہوٹل میں جاؤں گا۔ اور ہو سکا تو اسے اپنے ساتھ ہی یہاں لیتا آؤں گا۔"

بھگت رام نے کہا۔

"سر! آپ اندھیرا ہونے کے بعد آئیں۔ مکان کے پیچھے بھی ایک دروازہ ہے۔ کھلا ہوا ہو گا۔ مایاوتی کو معلوم ہے۔"

میں نے کوٹھڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اندھیرا ہوتے ہی مایاوتی کو لے کر یہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم میلا را کو خبر کر دینا کہ وہ بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جائے۔"

"وہ آجائے گا سر! اس کی فکر نہ کریں۔"

میں اس بھارتی تخریب کار کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا اس کی ایک

یہ بھی تھی کہ بہت ممکن تھا کراچی کی انٹیلی جینس ان لوگوں کی نگرانی کر رہی ہو۔ کیونکہ پاکستان کی انٹیلی جینس پولیس کا شمار دنیا کی صف اول کے انٹیلی جینس اداروں میں ہوتا ہے۔ میرے میاں جی تو بتایا کرتے تھے کہ انگریزوں کے زمانے میں جس قتل کا سراغ انگلستان کی سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس لگانے میں ناکام ہو جاتی تھی تو اس قتل کی سراغ رسانی کے لئے پنجاب کی پولیس کو لندن بلایا جاتا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ راولپنڈی میں میری مخبری پر بھارتی تخریب کاروں کا ایک گروہ پکڑا جا چکا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ یہ ڈاکٹر بھی پولیس کی نظروں میں آگیا ہو اور پولیس اس کے ساتھ کہیں مجھے بھی نہ پکڑ لے۔ مجھ پر پہلے ہی لاہور پولیس نے بھارتی جاسوس ہونے کا الزام لگا دیا ہوا تھا۔ جہاں سے میں بھاگ چکا تھا۔

میں بھگت رام عرف اللہ یار ہومیو پیتھ ڈاکٹر کے کلینک سے نکلا تو رکشا پکڑ کر سیدھا کراچی کے اس ہوٹل میں آگیا جہاں بھگت رام بھارتی تخریب کار کے بقول بھارت سے سمگل کی ہوئی نوجوان خوبصورت ہندو لڑکی مایاوتی کسی کرسچین نام سے بطور ہوٹل ویٹرس یا ہوٹل مسٹریس کے کام کر رہی تھی مگر حقیقت میں وہ بھارتی تخریب کاروں کی ساتھی اور انڈین سپائی تھی۔

اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ کوڈ الفاظ اور پاس ورڈ بھی مجھے زبانی یاد تھا۔ میں اس بھارتی لڑکی کو دیکھنا اور اس کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے بھارتی تخریب کاروں بھگت رام اور میلارام کو بتائے بغیر وہاں کسی تیسرے بھارتی جاسوس سے رابطہ بنا رکھا ہو۔ میں جہاد کشمیر میں دوبارہ حصہ لینے کی خاطر وادی کشمیر میں جانے سے پہلے ان پاکستان دشمن عناصر کا جس قدر ممکن ہو سکتا تھا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا۔

میں کراچی کے عالی شان ہوٹل کا نام نہیں لکھوں گا۔

میری جیب میں پیسے بھی تھے۔ کپڑے بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ میں ہوٹل کی لابی میں جا کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کافی منگوالی اور آتے جاتے خوش پوش آدمیوں اور

ملکی اور غیر ملکی عورتوں کو دیکھنے لگا۔ بیرا کچھ دیر کے بعد مجھ سے یہ پوچھنے کے لئے آیا کہ مجھے کچھ اور تو نہیں چاہئے۔ کافی کا بل پندرہ روپے بنتا تھا۔ میں نے دس دس کے تین نوٹ نکال کر نوجوان ویٹر کو دیئے اور اس سے مایاوتی کے بارے میں پوچھا کہ اس وقت اس ڈیوٹی کہاں پر ہو گی۔ نوجوان ویٹر نے میز پر سے کافی کی پیالی اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"سر! وہ تیسرے فلور پر ہو گی"

میں نے کہا۔

"میرا ایک پیغام اس تک پہنچا دو گے؟"

"کیوں نہیں سر!"

میں نے کہا۔

"اس سے کہنا کہ دوبئی سے اس کا کزن جوزف اس سے ملنے کے لئے آیا ہوا ہے اور لابی میں بیٹھا ہے۔"

"او کے سر!۔"

ویٹر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ لابی کے بڑے کاؤنٹر پر جا کر اس نے کونے میں رکھا ہو فون اٹھا کر ڈائیل پر کوئی نمبر گھمایا اور پھر کسی سے بات کر کے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اوپر والی کشادہ سیڑھیوں پر سے ایک سرو قد ایسی گندمی رنگت والی لڑکی کو اترتے دیکھا جس نے ہوٹل کی نیلی اور سفید وردی پہنی ہوئی تھی۔ بالوں کی مانگ درمیان سے نکلی ہوئی تھی اور ان کا پیچھے جوڑا بندھا تھا۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے لابی کے وسط میں ستونوں کے درمیان لگی ہوئی میزوں کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں کچھ عورتیں اور مر بیٹھے چائے کافی پینے میں مشغول تھے۔ وہیں ایک طرف میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں چونکہ ایک جانب بالکل اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور خود بھی اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کو میں۔ پہچان لیا تھا کہ یہی مایاوتی ہے' اس لئے وہ بھی مجھے دیکھتے ہوئے لابی میں آ کر ایک میز۔ پاس رک گئی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھی۔ درمیان میں تین چار میزیں لگی تھیں۔

اتنے میں وہی ویٹر جس کو میں نے پندرہ روپے ٹپ دیئے تھے ایک طرف سے تیز تیز چلتا مایاوتی کے پاس آیا اور بڑے شائستہ انداز میں اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ مایاوتی بڑی بے باکی سے میری طرف بڑھی اور آتے ہی انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میرا نام ہی جوزف ہے؟ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"ہاں۔ میں ہی جوزف ہوں۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ یہاں بیٹھ جاؤ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

مایاوتی کی سیاہ آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی مگر چہرے سے وہ بڑی تجربہ کار اور ایسی عورت لگتی تھی کہ جس نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہو۔ اس کے چہرے پر ذرا سا بھی تبسم نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر تم میرے کزن کہاں سے ہو گئے میرا نام ہی مایاوتی ہے"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے کزن کا بھی باپ ہوں"

اس کا سانولا چہرہ غصے سے دمک اٹھا۔

"کون ہو تم؟ میں ایسی گفتگو سننے کی عادی نہیں ہوں"

تب میں نے کوڈ ورڈ میں کہا۔

"کیا تم نے راجہ اشوک کی لاٹھ دیکھی ہے؟"

تو اس کے غصے کی آگ پر جیسے کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ ایک دم سے اس کا لہجہ نرم اور پراسرار ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے اردگرد کی میزوں کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی۔

"نہیں"

میں نے کہا۔

"کل راجہ رنجیت سنگھ مجھے کراچی کی بندرگاہ پر ملا تھا"
اس پر مایاوتی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی۔
"میرا کمرہ دوسرے فلور کے کونے میں ہے۔ اس کا نمبر 15A ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد وہاں آجانا۔ وہاں باتیں ہوں گی۔"
وہ اٹھی اور لوگوں کو یہ دکھانے کے لئے کہ واقعی میں اس کا کزن ہوں مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملانے کے بعد واپس چلی گئی۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اٹھ کر ہوٹل کے اندر بنی ہوئی نوادرات کی دکانوں کی سیر کرنے لگا۔ اس طرح جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو میں لفٹ میں سوار ہو کر ہوٹل کے دوسرے فلور پر آگیا۔ کونے میں 15A نمبر کمرہ بڑی آسانی سے نظر آگیا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے مایاوتی کی آواز آئی۔
"کم ان مسٹر جوزف"
میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔
بہت ہی مختلف سا کمرہ تھا جس میں صرف ایک بیڈ لگا تھا اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ مایاوتی پلنگ پر لیٹی انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے انگریزی میں ہی گفتگو شروع کر دی۔ کہنے لگی۔
"کیا تم پنڈی سے آئے ہو یا امرتسر سے؟"
میں نے کہا۔
"میں امرتسر سنٹر سے پنڈی کرنل چڈھ کے پاس آیا تھا۔ وہاں سے کراچی بھگت رام اور میلا رام اور تم سے ضروری میٹنگ کرنے آیا ہوں۔ آج رات بھگت رام کے کلینک کے اوپر والے مکان میں ضروری میٹنگ ہے۔ تمہیں وہاں ضرور پہنچنا پہنچنا ہو گا۔"
اسے میری باتوں سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ میں انڈیا کی سنٹرل انٹیلی جنیس ایجنسی کا کوئی بڑا افسر ہوں اور ان لوگوں کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے یہاں آیا ہوں۔ کہنے لگی۔

"سر! کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟"
میں نے کہا۔
"یہ میں تم لوگوں کو آج رات کی میٹنگ میں ہی بتاؤں گا۔ لیکن ایک بات میں تم سے ان لوگوں کو بتائے بغیر کہنا چاہتا ہوں۔ پچھلے دو مہینوں میں تمہاری یہاں کی سرگرمیوں کے بارے میں جو خفیہ رپورٹیں امرتسر سنٹر سے ہوتی ہوئی دلی کے فیڈرل سیکریٹریٹ سیکریٹریٹ کو پہنچی ہیں وہ بالکل بے کار رپورٹیں ہیں۔"
میں نے دیکھا کہ مایاوتی کا چہرہ ذرا سا اتر گیا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ اسے پاکستان میں رہ کر بھارت کے لئے جاسوسی کرنے کے عوض اچھا خاصا معاوضہ ملتا ہے جو میرے اس ریمارک کی وجہ سے اسے ختم ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ کہنے لگی۔
"سر! میں تو ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ دلی کو بہتر سے بہتر رپورٹ بھجواؤں۔"
میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"دلی گورنمنٹ کو پاکستان میں آئے ہوئے غیر ملکی وفود کی سرگرمیوں سے اتنی دلچسپی نہیں ہمیں تو یہاں کے سیاسی حالات کی تازہ ترین اور اندرونی رپورٹ چاہئے۔ آخر تمہیں اتنی تنخواہ کس بات کی دی جا رہی ہے۔
"مایاوتی تو ایک دم بجھ سی گئی۔ کہنے لگی۔
"سر! آپ جیسی رپورٹیں کہیں گے میں ویسی ہی بھجواؤں گی۔ پلیز مجھے ایک چانس ضرور دیں"
میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ خفیہ طور پر کوئی اور آدمی تو کام نہیں کر رہا جس کو اس نے دوسرے بھارتی تخریب کاروں کو بتائے بغیر اپنے ساتھ لگا رکھا ہو۔ کیونکہ ایک عورت اتنی زیادہ جاسوسی نہیں کر سکتی جتنی کارکردگی مجھے بھگت رام نے اس لڑکی کی بتائی تھی۔ میں نے کہا۔
"دلی کی فیڈرل ایجنسی کا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ کسی مرد کو بھی یہاں لگا دیا جائے اور تمہاری تنخواہ میں سے آدھی رقم کاٹ کر اسے دی جائے"

مایاوتی نے میرے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ کہنے لگی۔

"پلیز! سر! یہ نہ کریں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ سے یہاں کی سیاسی سرگرمیوں کی پوری خفیہ رپورٹ بھیجوں گی۔"

میں نے اس سے براہ راست سوال پوچھ لیا۔

"مایاوتی! مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا تمہارے ساتھ یہاں کا کوئی مقامی یا باہر سے آیا ہوا آدمی تو کام نہیں کر رہا؟"

مایاوتی نے اس کے جواب میں جو وضاحت پیش کی اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے اور وہ اکیلی ہی اس ہوٹل میں بیٹھی پاکستان دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ جب میری تسلی ہو گئی تو میں نے کہا۔

"او کے۔ رات ہوتے ہی بھگت رام کے کلینک پر پہنچ جانا۔ باقی باتیں وہاں پر ہوں گی۔"

مایاوتی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بڑی ادائے خاص سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"سر! کیا مجھے آپ اپنی خدمت کرنے کا موقع نہیں دیں گے؟"

وہ کیا خدمت کرنا چاہتی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا لیکن اسے معلوم نہیں کہ میں کس مٹی کا بنا ہوا ہوں اور میں حقیقت میں کون ہوں۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور میں اس کے کمرے سے نکل گیا۔

میرے لئے وقت گزارنے کا یہی ایک بہترین ذریعہ تھا کہ کسی سینما ہاؤس میں بیٹھ فلم دیکھوں۔ چنانچہ میں صدر کے ایک سینما ہاؤس میں آ گیا۔ یاد نہیں رہا وہاں کون پاکستانی فلم لگی ہوئی تھی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ سارا وقت سینما ہال میں سویا رہا۔ شو ہوا تو ایک آدمی نے مجھے جگا کر کہا کہ شو ختم ہو گیا ہے۔ یہ میٹنی شو تھا۔ شام کے وقت ہوا تھا۔ میں نے ایک ہوٹل میں آ کر چائے پی۔ منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کی اور تازہ دم ہو

اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں رکشا پکڑ کر اللہ یار یعنی بھگت رام کے ہومیو پیتھی کے کلینک پر آ گیا۔ میں اس کے کلینک میں ہی بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بھگت رام نے مجھے آنکھوں کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہا۔ ٹھیک رات کے آٹھ بجے وہ کلینک بند کرنے کے لئے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"سر! میلارام اور مایاوتی بھی آنے ہی والے ہوں گے۔ آپ اوپر چل کر بیٹھیں کیا آپ کی ہوٹل میں مایاوتی سے ملاقات ہو گئی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں ہو گئی تھی۔"

میں کلینک سے نکلنے لگا تو اس نے کہا۔

"پیچھے گلی میں مکان کا دروازہ ہے سر! اوپر والا کمرہ کھلا ہی ہے۔"

میں پچھلی گلی کے دروازے میں سے ہو کر مکان کی دوسری منزل والے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ بھی بھگت رام کی دکان کی طرح بوسیدہ اور خستہ حال تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور مایاوتی اندر آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور میں نے اسے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کو کس نے کہا ہے؟ یہاں تم انڈیا کی سپائی ہو۔ تمہیں یہاں کے مسلمانوں کی طرح سلام کرنا چاہیے۔"

وہ آئی ایم سوری سر کہتی ہوئی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور بڑے لگاوٹ سے بولی۔

"سر! اگر آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ ہوٹل میں کھائیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ سر! میں آپ کو ایک بڑی خفیہ بات بتانا چاہتی ہوں۔ یہ ایسی راز کی بات ہے کہ بھگت رام اور میلارام جی کو بھی معلوم نہیں ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اس کی دعوت قبول کر لینی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے پاکستان میں سمگل کیے گئے کچھ اور بھارتی تخریب کاروں کا سراغ مل جائے۔ میں

نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

"مایاوتی! میں تمہاری ڈنر کی دعوت قبول کرتا ہوں۔"

وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس نے میرا ہاتھ بے اختیار ہو کر اپنے ہونٹوں سے چوم لیا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ نہ کھینچا۔ میں اس سے خفیہ راز معلوم کرنے کی خاطر اس سے بھرپور تعاون کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"میٹنگ ختم ہو گئی تو میں تمہیں کہوں گا کہ تم اپنے ہوٹل واپس چلی جاؤ۔ تم اسی وقت چلی جانا اور اپنے کمرے میں میرا انتظار کرنا۔ مجھے خواہ رات کے گیارہ بج جائیں مگر میں تمہارے پاس ڈنر کرنے اور تم سے خفیہ راز معلوم کرنے ہر حالت میں پہنچوں گا۔"

مایاوتی نے اپنا چہرہ میرے کندھے کے ساتھ لگایا۔ باہر سے آدمیوں کے سیڑھیاں چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ مایاوتی جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ بھگت رام کے ساتھ میلا رام بھی تھا۔ کمرے کی جلتی بتی کی روشنی میں میں نے میلا رام کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ یہ بھارتی ہندو کسرتی بدن والا بدمعاش ٹائپ آدمی لگتا تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی مگر چہرا بڑا پختہ تھا۔ مجھے سلام کر کے وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ بھگت رام نے دروازہ بند کر دیا اور کہنے لگا۔

"سر! میں نے میلا رام کو بھی بتا دیا ہے کہ امرتسر ہیڈ کوارٹر ہمارے کام سے مطمئن نہیں ہے اور ہمیں اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ کارکردگی دکھانی ہوگی۔ سر! مجھے یقین ہے آپ نے یہ باتیں مایاوتی کو بھی بتا دی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں نے اسے بھی بتا دیا ہے اور اب آپ کو بھی مزید بتانا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی کارکردگی سے دلی فیڈرل حکومت کی انٹیریئر منسٹری اور سنٹرل خفیہ ایجنسی کو سخت مایوسی ہوئی ہے۔"

میں نے ان کے چہروں پر اس بات کا ردعمل دیکھا۔ سب کے چہرے لٹک گئے تھے میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"لیکن دلی گورنمنٹ آپ لوگوں کو ایک چانس ضرور دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ بہرحال آپ ہمارے بااعتماد اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ لیکن مجھے بھارت کی حکومت نے خاص طور پر یہ ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کو دیا جانے والا یہ آخری موقع ہو گا۔ اس میں بھی اگر آپ نے اپنی بہتر کارکردگی نہ دکھائی تو پھر آپ سب کو واپس دلی بلا کر نوکریوں سے برخاست کر دیا جائے گا۔"

تینوں نے باری باری مجھے یقین دلایا کہ وہ اب بہتر سے بہتر کام کریں گے۔ میلا رام کہنے لگا۔

"سر! اس جمعے کی نماز کے وقت میں جس مسجد میں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کلاشنکوف سے فائر کروں گا بھگوان نے چاہا تو اس فائرنگ سے ایک بھی نمازی مسلمان زندہ نہیں بچے گا۔"

بھگت رام کہنے لگا۔

"سر! ہم کراچی کے سٹی سٹیشن پر اس بار زبردست طاقت والا بم بلاسٹ کریں گے۔ آپ دیکھ لیں گے۔ اتنا زبردست دھماکہ ہو گا اور اتنی تباہی پھیلے گی کہ کراچی والوں نے ایسی تباہی کبھی نہ دیکھی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"شاباش! ایسے دو چار کام کرو گے تو تمہارا ریکارڈ بالکل صاف ہو جائے گا اور میں بھی تمہاری سفارش کر سکوں گا۔"

پھر میں نے بھگت رام سے کہا۔

"تم لوگوں کے پاس اسلحہ بھی ناقص ہوتا ہے اور تمہارے بم بھی ٹھیک وقت پر نہیں پھٹتے۔ ہمیں اس قسم کی رپورٹیں بھی پہنچی ہیں۔ مجھے ابھی چل کر وہ بم اور اسلحہ دکھاؤ جو تم لوگ آئندہ چند دنوں میں استعمال کرنے والے ہو"

بھگت رام بولا۔

"او کے سر! آپ ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم نے تو شہر سے باہر یہ سارا اسلحہ ایک

خفیہ مقام پر چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ہمارے ساتھ چلیں۔"

میں نے مایاوتی سے کہا۔

"مایاوتی! تم بے شک واپس اپنے ہوٹل چلی جاؤ۔ تم سے کل ملاقات ہو گی۔"

مایاوتی لیس سر کہہ کر اٹھی اور خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد بھگت رام نے میلارام تخریب کار سے کہا۔

"جاؤ جا کر پرانے گیراج سے اپنی گاڑی نکال کر لے آؤ"

وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ بھگت رام کہنے لگا۔

"سر! ہم نے اس قسم کے کاموں کے لئے ایک پرانی گاڑی رکھی ہوئی ہے۔ وارداتیں ہم عام طور پر موٹر سائیکل پر کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمارے پاس دو بالکل نئے موٹر سائیکل موجود ہیں"

پندرہ بیس منٹ کے بعد میلا رام گاڑی لے کر آگیا۔ ہم مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر اندھیرے میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی ایک طرف روانہ ہو گئی۔ یہ لوگ مجھے اس جگہ پر لے گئے جہاں سارا علاقہ اجاڑ اور ویران تھا۔ اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی خشک پہاڑیاں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے بڑے بڑے ہیبت ناک ڈائنا سورس بیٹھے ہوں۔ ان خشک بنجر ٹیلوں میں ایک جگہ ٹیلے کے پیچھے انہوں نے ایک کچی کوٹھڑی بنائی ہوئی تھی۔ بھگت رام نے کوٹھڑی کا تالا کھولا۔ اندر جا کر اس نے بیٹری سے روشن ہونے والا چھوٹا سا لیمپ جلا دیا۔ کوٹھڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے دس بارہ بکس پڑے تھے۔ ایک میز پر پندرہ بیس کلاشنکوفیں، دستی بم، پستول، گولیاں اور ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ میلا رام کہنے لگا۔

"سر! یہ گرنیڈ بڑے زبردست ہیں۔ اس بار ہم مسجد میں کلاشنکوف کی فائرنگ کے ساتھ چار گرنیڈ بھی ماریں گے۔"

میں نے ایک گرنیڈ اٹھا لیا اور اس کا جیسے معائنہ کرنے لگا۔ پھر ان لوگوں کی

دوسری طرف کرنے کے لئے میں نے لکڑی کے بکسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان بکسوں میں کیا ہے؟"

بھگت رام اور میلارام دونوں بھارتی دہشت گرد لکڑی کے بکسوں کے پاس چلے گئے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرنیڈ جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ان کے پاس جا کر بکسوں کا معائنہ کرنے لگا۔ میلا رام کہنے لگا۔

"سر! ان بکسوں میں دھماکہ خیز بارود ہے ہم اس سے خود بھی بم تیار کرتے ہیں۔"

میں نے سخت مزاج انسپکٹر کی اداکاری کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"تم لوگ ناقص بم تیار کرتے ہو۔ مجھے ایک بم تیار کر کے دکھاؤ"

بھگت رام نے جلدی سے ایک بکس کو کھول دیا۔ اس میں بارود کی چھڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی نسواری رنگ کی بڑی سکاچ ٹیپ اور ٹائمر بھی پڑے تھے۔ بھگت رام اور میلارام بارود کی چھڑیوں کو جوڑ کر ٹائم بم تیار کرنے میں لگ گئے۔ میں نے گوشہ چشم سے میز کے کونے کی جانب دیکھا۔ وہاں وہ تالا پڑا تھا جس کو کھولنے کے بعد بھگت رام اندر لے آیا تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔

"میں باہر جا کر اس علاقے کا جائزہ لیتا ہوں کہ یہ جگہ کس حد تک محفوظ ہے اتنی دیر میں تم کم از کم دو ٹائم بم تیار کر کے مجھے دکھاؤ۔ میں اس کام کا ماہر ہوں۔ اگر کوئی کمی رہ گئی تو مجھے فوراً پتہ چل جائے گا۔ اس کے بعد تم دونوں کو واپس بھیج دیا جائے گا۔"

بھگت رام کہنے لگا۔

"سر! ایسا نہیں ہو گا۔ ابھی دس منٹ میں بم تیار کر کے دکھاتا ہوں۔ آپ بے شک اسے چلا کر دیکھ لیں۔ یہاں پندرہ میل تک آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ کے بعد اندر آکر دیکھتا ہوں"

دروازے کی طرف جاتے ہوئے میں نے میز کے کونے پر پڑا ہوا تالا بھی اٹھا لیا۔ کوٹھڑی سے باہر آکر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے جیب سے دستی بم نکال کر اس کا پن علیحدہ کر کے اسے وہیں میز پر جہاں دوسرے دستی

بموں کا ڈھیر پڑا تھا رکھ دیا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ مگر یہ اتنی احتیاط سے کیا کہ تالہ لگانے اور کنڈی لگانے کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ دستی بم پھٹنے میں دس پندرہ سیکنڈ کا ہی وقفہ تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر جہاں گاڑی کھڑی تھی وہاں آگیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اسے سٹارٹ کیا اور گاڑی کا گیئر لگا کر اسے جتنی تیز چلا سکتا تھا چلاتا ہوا اس کوٹھڑی سے دور نکل گیا۔ میں دوسرے ٹیلے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ کوٹھڑی میں ایک دھماکہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دو یا تین سیکنڈ کے بعد ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ جیسے پہاڑی پھٹ گئی ہو۔ زمین اوپر نیچے ہو گئی۔ میں نے گاڑی کو بالکل نہ روکا۔ پیچھے دیکھا تو جس پہاڑی کے دامن میں اسلحہ اور گولہ بارود والی کوٹھڑی تھی وہاں ایسے آگ لگی ہوئی تھی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ کر آگ اگل رہا ہو۔

دونوں بھارتی تخریب کار اپنے تمام گولہ بارود سمیت اڑ گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو کراچی کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ ہم جس طرف سے گاڑی لے کر آئے تھے میں اسی راستے سے گاڑی واپس لے جا رہا تھا۔ دور سے کراچی کی ستاروں کی طرح جھلملاتی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کراچی شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ کراچی کی سڑکوں پر بڑی رونق تھی۔ گاڑیاں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ اس کی سڑکوں پر ساری رات ٹریفک جاری رہتی ہے۔ میں نے اس سڑک کو پہچان لیا جو مایاوتی کے عالی شان ہوٹل کی طرف جاتی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد میں ہوٹل پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔ سامنے لگے آئینے میں دیکھ کر اپنے بالوں میں کنگھی پھیری اور بڑے آرام اور سکون کے ساتھ گاڑی کی چابی والی زنجیر گھماتا ہوٹل کی لابی میں آکر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

مایاوتی کا کمرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اس سے وہ خفیہ راز معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا جس کو بتانے کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ مایاوتی کی مدد سے پاکستان میں بھارتی تخریب کاروں

کے کسی دوسرے گروہ کا پتہ چل جائے گا اور میں مایاوتی کے ساتھ اس گروہ کو بھی جہنم میں پہنچانے کے بعد ہی سری نگر کا رخ کروں گا۔ مایاوتی نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں مجھے خوش کرنے کا سارا بندوبست کیا ہوا تھا۔ کمرے میں صرف بہت دھیمی روشنی والا ٹیبل لیمپ ہی پلنگ کے سرہانے کی جانب روشن تھا۔ فضا میں کسی غیر ملکی پرفیوم کی بڑی رومانوی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ مایاوتی نے گلابی رنگ کا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا جس میں سے اس کے جسم کے خطوط نمایاں تھے۔ میرے لئے یہ خطوط بے معنی ہو چکے تھے۔ اس لئے کہ میں ان خطوط کی اصل حقیقت کو جان چکا تھا کہ یہ وہ پتھر ہیں جو منزل کی طرف جانے والے راستے میں محض اس لئے پڑے ہوتے ہیں کہ مسافر کو اس کی منزل تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ مایاوتی نے پلنگ سے اٹھ کر میرا خیر مقدم کیا اور دروازہ بند کر کے پلنگ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے تخریب کاروں کے اسلحہ بارود کے بارے میں پوچھا جس کا میں معائنہ کرنے گیا تھا۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے مگر ان لوگوں کو ٹائم بم بنانے نہیں آتے۔ اسی لئے وہ دھماکے کے بعد زیادہ نقصان نہیں کرتے۔“

مایاوتی کہنے لگی۔

”سر! آپ کو چاہیے کہ امرتسر سے کوئی اس کام کا ماہر بلا لیں۔ بھگت رام اور ییلارام کو ایمونیشن کی اتنی سمجھ نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ رپورٹ بھی میں امرتسر جا کر پیش کرنے والا ہوں۔ وہاں جو فیصلہ ہو گا اس پر فوراً عمل کیا جائے گا۔“

میں نے مایاوتی سے براہ راست سوال کر دیا۔

”تم مجھے کوئی راز بتانے والی تھیں۔ وہ کون سا راز ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ یہ راز تم نے مجھے بتایا تھا“

مایاوتی اٹھ کر دیوار میں لگی ہوئی الماری کے پاس گئی۔ اس میں سے دو گلاس اور

بوتل نکال کر اس نے میز پر رکھ دی اور انگریزی میں بولی۔

"سر! پہلے تو آپ فریش ہو جائیں پھر راز کی بات بتاؤں گی"

میں نے کہا۔

"مایاوتی! میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور جب میں ڈیوٹی پر ہوتا ہوں تو شراب وغیرہ بالکل نہیں پیتا۔"

میں نے مایاوتی کے گلاس میں شراب کا ایک پیگ بنا دیا۔

"ہاں تم بے شک پی سکتی ہو۔ کیونکہ تم ڈیوٹی پر نہیں ہو۔"

مایاوتی مجھ سے لاڈ پیار کے موڈ میں تھی۔ میں نے اپنے رویے سے اس پر واضح کر دیا کہ میں اس موڈ میں نہیں ہوں۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اس سے کہا۔

"تم بے فکر ہو کر مجھے راز بتا دو۔ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔"

مایاوتی نے شراب کے دو تین گھونٹ پئے اور سگریٹ سلگانے کے بعد بولی۔

"سر! آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ اس علاقے میں ہمارے بھارت ورش کا ایک سندھی ہندو مرچنڈانی بھی موجود ہے جس کو دلی کی حکومت نے بڑے وسیع اختیارات دے رکھے ہیں۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ سگریٹ کا کش لگا رہی تھی۔ اس نے دھواں چھوڑ ہوئے کہا۔

"سر! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے بے ہوتے ہیں مرچنڈانی کے بارے میں بھگت رام اور میلارام کو بھی علم نہیں کہ وہ ہما بھارت ورش کا کتنا بڑا سپائی اس علاقے میں کام کر رہا ہے۔ پہلے مجھے بھی معلوم نہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ میں ہوٹل میڈیا میں ہوں۔ یہاں ہر قسم کے لوگوں سے وا ہے۔ ایک بار کراچی کے ایک بازار میں دو تخریب کاروں نے اندھا دھند فائرنگ دس پندرہ آدمیوں کو مار ڈالا۔ میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تو خوش ہوئی کہ ہمار

پاکستان میں دہشت گردی کا کام بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔ لیکن اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ ایک دہشت گرد موقع پر پکڑا گیا تھا مگر دوسرے دہشت گرد نے موٹر سائیکل پر سے اس پر کلاشنکوف کا برسٹ مار کر اسے بھی ہلاک کر ڈالا اور بھاگ گیا۔"

مایاوتی نے یہ کہہ کر گلاس میں سے ایک دو گھونٹ پئے اور خاموشی سے سگریٹ کے کش لگانے لگی۔ میں نے کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ اس میں راز کی کون سی بات ہے؟"

مایاوتی میرے قریب ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"سر! مجھے کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا کہ یہ واردات بھگت رام اور میلارام کی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مرچنڈانی نام کا ایک بھارتی دہشت گرد ہے جو کراچی کی مچھلی مارکیٹ سے کچھ فاصلے پر بظاہر کمشن ایجنٹ کا کام کرتا ہے اور اس کے پاس دو موٹر لانچیں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک لانچ میں وہ اسلحہ وغیرہ چھپائے رکھتا ہے کسی کو اس پر اس لئے شک نہیں پڑتا کہ وہ علاقے میں غریبوں اور بیواؤں اور یتیم بچوں کی مدد کرتا رہتا ہے اور اس نے ان کے وظیفے لگا رکھے ہیں۔"

"لیکن تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ مجھ سے اصل بات بیان کرو"

مایاوتی نے کہا۔

"سر! میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں اور صرف آپ ہی سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ مرچنڈانی ہماری کاز کو نقصان پہنچا رہا ہے"

"وہ کیسے؟"

مایاوتی ہلکے ہلکے سرور میں تھی۔ کہنے لگی۔

"سر! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمیں پاکستان میں بم دھماکوں اور مختلف جگہوں پر فائرنگ کرنے کی اگرواد کی وارداتوں کے لئے بعض اوقات مقامی لوگوں کو ہائر کرنا پڑتا ہے۔ ہم انہیں الگ الگ واردات کے عوض بھاری رقم ادا کرتے ہیں اور یہ رقم ہماری نا کی حکومت کے خزانے سے ادا کی جاتی ہے۔"

میں نے اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"ان مقامی لوگوں میں یہاں کے مسلمان بھی ضرور ہوتے ہوں گے۔"

مایاوتی نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"نو سر۔ کوئی مسلمان خواہ وہ اپنی حکومت کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو وہ اپنے مسلمان بھائی کا خون بہانے پر کبھی تیار نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کوئی مسلمان کسی مسجد میں بم گرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا"

"تو پھر تم لوگ ایسے آدمی کہاں سے لاتے ہو؟"

مایاوتی کہنے لگی۔

"سر! یہاں سندھ میں ہمارے ہندو بھائی بہت رہتے ہیں۔ ان میں سے ہمیں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو معقول معاوضہ لے کر ایسی وارداتیں کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ سر! اصل راز کی بات میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مرچنڈانی اس کام کے لئے بہت کم روپے دے کر اناڑی ہندو نوجوانوں کو ہائر کر لیتا ہے۔ وہ دلی حکومت سے ایک واردات کے دس ہزار روپے وصول کرتا ہے مگر واردات کرنے والے کو صرف دو ہزار روپے دیتا ہے چونکہ وہ آدمی اناڑی ہوتا ہے اس لئے راضی ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکثر وارداتیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ جہاں فائرنگ کرنے اور بم کے دھماکے سے آدمیوں نے ہلاک ہونا ہوتا ہے ہاں صرف دس پانچ آدمی ہی ہلاک ہوتے ہیں۔"

مایاوتی نے بھارتی دہشت گردوں کے ماسٹر سپائی مرچنڈانی کے خلاف کافی زہر اگلا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ مایاوتی کو ہندو ماسٹر سپائی مرچنڈا سے کوئی ذاتی دشمنی ہے۔ مگر مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ ایک اور بھارتی دہشت گرد کا سرا مل گیا تھا۔ اور یہ دہشت گرد بڑا اہم اور ماسٹر سپائی تھا۔ اس کو ختم کرنا بھی بہت ضرو تھا۔

میں نے مایاوتی سے کہا۔

"میں تمہاری ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ مجھے مرچنڈانی کا پورا پتہ بتاؤ۔ میں سب

پہلے خود وہاں جا کر اس پر اپنا آپ ظاہر کئے بغیر اس کا سروے کرنا چاہتا ہوں مجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کے بعد میں اس کی فل رپورٹ بنا کر دلی سیکریٹریٹ کو روانہ کر دوں گا اور یقین کرو کہ اسے فوراً واپس انڈیا بلا لیا جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیج دیا جائے گا۔"

مایاوتی بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"لیکن سر! پلیز اس ساری کارروائی میں میرا کہیں نام نہیں آنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"تم مرچنڈانی سے ڈرتی کیوں ہو؟ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ دلی آفس تمہاری کارکردگی پر خوش ہو گا کہ تم نے ایک نااہل شخص کی نااہلیت کو بے نقاب کیا۔"

مایاوتی بولی۔

"پھر بھی سر! پلیز میرا نام ظاہر نہ کریں۔ مجھے مرچنڈانی سے سچ مچ ڈر لگتا ہے۔ اس نے بڑے بدمعاش پال رکھے ہیں۔"

مجھے مایاوتی کی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اس سے مرچنڈانی کے گھر کا پورا پتہ حاصل کر لیا اور جب اٹھ کر جانے لگا تو مایاوتی نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"سر! آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ میں نے آپ کے لئے ماش کی دال خاص طور پر بنوائی ہوئی ہے۔ آپ پلیز یہاں بیٹھیں میں کھانا منگواتی ہوں۔ ابھی ایک سیکنڈ میں۔ پلیز!"

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ اس عورت نے مجھے بھی ہندو سمجھتے ہوئے مرغ مسلم کی جگہ دال کا بندوبست کر رکھا تھا۔ بہرحال میں بیٹھ گیا۔ مایاوتی نے پلنگ سے اترنے کے بعد ریشمی گاؤن کی ڈوری کمر پر باندھی۔ ایک شال کندھوں پر اوڑھی اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کے کمرے کے باہر ہی راہ داری میں ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کے فون پر بات کرنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے کسی سے فون پر کہا کہ کھانا جلدی لے آئے۔ وہ کمرے میں واپس آئی تو اس کے قدم ذرا سے ڈگمگائے۔ میں نے

سے سہارا دیا تو وہ میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اسے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"مایاوتی! تمہیں شراب زیادہ نہیں پینی چاہیے۔"

وہ اس نے میری طرف ہاتھ جوڑ کر دیکھا اور عاجزی سے کہا۔

"سر! بھگوان کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں روز نہیں پیتی۔ کبھی کبھی رات کو تھکان دور کرنے کے لئے پی لیتی ہوں اور وہ بھی ایک ڈبل پیگ سے زیادہ نہیں پیتی۔ لیکن آج آپ کے آنے کی خوشی میں تین پیگ پی گئی ہوں۔ سر! مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میری رپورٹ میں یہ نہ لکھئے گا کہ میں رات کو شراب پیتی ہوں۔"

میں نے اس کو تسلی دی کہ میں اس کی شراب کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا اور اس کی بڑی اچھی رپورٹ دلی سیکریٹریٹ کو بھجواؤں گا۔ وہ تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس مایاوتی کا کیا کروں۔ مرچنڈانی کو ختم کرنے سے پہلے مایاوتی کو بھی ختم کرنا تھا۔ آخر یہ بھی پاکستان کی نہ صرف دشمن تھی بلکہ پاکستان کی سلامتی کے خلاف تخریب کاریوں میں مصروف تھی۔ اس کی ان کارروائیوں سے اب تک نہ جانے پاکستان کو کس قدر نقصان پہنچ چکا تھا اور نہ جانے کراچی کے کتنے بے گناہ لوگ شہید ہو چکے تھے۔ پاکستان کی سرزمین کو مایاوتی اور مرچنڈانی ایسے لوگوں کے وجود سے ہمیشہ کے لئے پاک کرنا بے حد ضروری اور قومی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ مایاوتی کو میں اس وقت بڑی آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ لیکن میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے میں کچھ جھجک رہا تھا۔ حالانکہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ میں اسے خود ہلاک کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا تھا۔

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پولیس کو اطلاع کر کے اسے پولیس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اس سے پوچھ گچھ کے دوران ہو سکتا ہے پولیس کو کچھ مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔ اور پولیس کی حراست سے اس لڑکی کا فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ اس میں ایک بات کا خطرہ ضرور تھا کہ مایاوتی کے ساتھ پولیس کے تشدد کی کارروائی کے پہلے مرحلے میں ہی وہ پولیس کو بھگت رام اور میلارام کے علاوہ میرا پورا حلیہ بھی بتا دیتی باقی دونوں بھارتی

تخریب کاروں کو تو پولیس تلاش نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان کے جسموں کے ٹکڑے اڑ چکے تھے لیکن پولیس کو میرا حلیہ ضرور معلوم ہو جاتا اور پہلے لاہور کی پولیس میرے پیچھے تھی اور اب کراچی سندھ کی پولیس بھی میرے پیچھے پڑ جاتی۔ اس کا میں نے ایک ہی حل سوچا کہ پہلے پاکستان دشمن مرچنڈانی کا قصہ پاک کیا جائے اس کے بعد مایاوتی کو گرفتار کروا دیا جائے۔ تاکہ اگر وہ پولیس کو میرا حلیہ بتا بھی دیتی ہے تو جب تک کراچی کی پولیس مجھے تلاش کرنے نکلتی میں وہاں سے بہت دور سری نگر کی پہاڑیوں میں پہنچ چکا ہوتا۔

وہ رات میں نے کھانا کھانے کے بعد مایاوتی کے کمرے میں نہیں بلکہ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں بسر کی اور صبح مرچنڈانی سے دو دو ہاتھ کرنے ساحل سمندر کی اس بستی کی طرف نکل کھڑا ہوا جہاں پاکستان دشمن بھارتی دہشت گرد مرچنڈانی رہتا تھا۔ مایاوتی سے میں نے اس کا پورا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ لیکن سب سے ضروری بات جو میں مایاوتی سے معلوم کرنا نہیں بھولا تھا وہ اس روز کا پاس ورڈ تھا۔ مایاوتی نے ایک خفیہ کاپی میں سے مجھے اس روز کا پاس ورڈ پڑھ کر بتا دیا۔ وہاں پورے پندرہ دنوں کے الگ الگ پاس ورڈ لکھے تھے جو ان تخریب کاروں کے باہمی مشورے سے طے ہوئے تھے میں نے مایاوتی سے کہا۔

"میں شام تک واپس آجاؤں گا اور مرچنڈانی کے کام کا پورا جائزہ لے کر آؤں گا۔ تاکہ اس کے بارے میں تمہاری خفیہ رپورٹوں کی روشنی میں امرتسر سنٹر اور دلی کی حکومت کو بریف کر سکوں"

مایاوتی کی واقعی مرچنڈانی سے کوئی ذاتی دشمنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے میں اس کے دشمن کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ ہوٹل سے نکلتے ہی میں نے ایک بس پکڑی جس نے پون گھنٹے کی مسافت کے بعد کراچی شہر سے دور ساحل سمندر کے ایک بس سٹاپ پر پہنچا دیا۔ مایاوتی نے اس بس سٹاپ کی جو نشانیاں بتائی تھیں وہ یہاں موجود تھیں۔ ایک طرف سمندر کی کھاڑی تھی اور دوسری طرف مچھواروں کی جھونپڑیاں دور تک چلی گئی تھیں آگے جا کر بستی کے مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ سمندر میں ماہی گیروں کی کشتیاں تیرتی پھرتی تھیں۔

ماہی گیروں کی بستی میں ایک چھوٹی سی مچھلی مارکیٹ تھی۔

صبح کے وقت یہاں کافی رونق تھی۔ مچھلیوں کے ڈھیر اور بڑے بڑے ٹوکروں کی نیلامی بولی جا رہی تھی۔ بہت شور مچا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے مرچنڈانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ مرچنڈانی کے آدمی مارکیٹ میں موجود ہیں وہ خود اس وقت گھر پر ہی ہو گا۔ اس کا مکان وہاں سے تھوڑے فاصلے پر کھاڑی سے ذرا ہٹ کر ناریل کے درختوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ اونچی چار دیواری تھی۔ لوہے کا گیٹ لگا تھا۔ چار دیواری کے اندر اک منزلہ مکان تھا جس کی لوہے کی گیلری پر ایک سندھی اجرک سکھانے کے لئے ڈال رکھی تھی۔ گیٹ کی ایک جانب تین گدھا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گاڑیاں خالی تھیں۔ گاڑیوں کے پاس ہی درخت کے نیچے دو آدمی چائے کی چینک درمیان میں رکھے گلاسوں میں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ لباس اور شکل صورت سے وہ مزدور یا مچھوارے لگتے تھے۔ میں ان کے قریب گیا تو وہ باتیں کرتے رک گئے اور مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان سے مرچنڈانی کے بارے میں پوچھا تو ایک نے لوہے والے گیٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"یہ سیٹھ کا گھر ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"سیٹھ مرچنڈانی گھر پر ہے یا کہیں گیا ہوا ہے۔"

دوسرے آدمی نے کہا۔

"بابا گھنٹی بجا کر معلوم کر لو۔ سیٹھ اس وقت گھر پر ہی ہوتا ہے۔"

میں نے گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر گھنٹی والا بٹن دبایا۔ تین چار بار بٹن دبانے سے اندر کسی کی آواز سنائی دی

"اری دیکھ کون ہے باہر"

لوہے کا گیٹ بڑا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ چھوٹا دروازہ کھلا تو ایک نوکرانی نے مجھ سے پوچھا

"کیا بات ہے جی۔ کس سے ملو گے؟"

میں نے سیٹھ مرچنڈانی کا نام لیا تو وہ دروازہ بند کرتے ہوئے یہ کہہ کر چلی گئی کہ پتہ کرتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آگئی۔ کہنے لگی۔

"کیا کام ہے سیٹھ جی سے؟"

میں نے کہا۔

"میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ ان کو ایک ضروری پیغام دینا ہے۔"

نوکرانی ایک بار پھر دروازہ بند کر کے اور مجھے رکنے کا کہہ کر چلی گئی۔ اس بار ایک سیاہ گھنگھریالے بالوں والے مکرانی نے دروازہ کھولا۔ وہ اپنی انگارہ ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کیوں جی۔ کس سے ملو گے؟"

میں نے کہا۔

"بابا مجھے سیٹھ مرچنڈانی سے ملنا ہے۔ اس سے کہو کہ میں راولپنڈی سے اس ایک دوست کا خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے بابا؟"

میں نے کہا۔

"میرا نام بلاول ہے۔"

"ابھی ٹھہرو یہاں"

وہ بھی چلا گیا۔ اس مرچنڈانی نے اپنی سیکورٹی کا معلوم ہوتا ہے بڑا سخت انتظام کر رکھا تھا۔ اور کوئی اجنبی شخص کافی چھان پھٹک کے بعد اس سے مل سکتا تھا۔ مکرانی واپس آکر مجھے اپنے ساتھ مکان کے اندر لے گیا۔ سارے مکان میں مچھلیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف کچھ عورتیں بیٹھیں مچھلیوں کے ٹوکرے دھو رہی تھیں۔ مکان کے برآمدے میں آکر مکرانی مجھ سے اجازت لئے بغیر میرے جسم پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مکرانی بولا۔

"تلاشی لے رہا ہوں بابا اور کیا کر رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہیں تمہارے پاس اسلحہ وغیرہ تو نہیں ہے۔ ہمارے سیٹھ جی کے یہاں سجن بھی ہیں تو دشمن بھی بہت ہیں۔ آجاؤ"

اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ جس کی دیوار پر قائداعظم کی تصویر والا کیلنڈر بھی لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی رام لچھمن کی تصویر بھی لگی تھی۔

"تم بیٹھو۔ سیٹھ صاحب ابھی آکر تم سے ملتے ہیں۔"

وہ چلا گیا۔ میں کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے پٹ کھلے تھے۔ اور سلاخوں میں سے کھاڑی کی جانب سے سمندر کی مرطوب ہوا اندر آرہی تھی۔ میں پاس ورڈ کے وہ فقرے ذہن میں دہرانے لگا جو مایاوتی نے مجھے اپنی ڈائری میں سے پڑھ کر بتائے تھے اور جو ان تخریب کاروں کا اس روز کا خفیہ پاس ورڈ تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک ناٹے قد کا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے چار خانے والا تہہ باندھا ہوا تھا۔ ایک صدری جسم پر تھی۔ کاندھے پر حاجیوں والا رومال تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ سر منڈا ہوا تھا۔ توند تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ ماتھے پر ہندوؤں والا تلک اس نے نہیں لگایا تھا۔ وہ ہندو تھا اور ہندو کے اصلی روپ میں ہی وہاں کاروبار کرتا تھا مگر اس نے اپنا حلیہ مسلمانوں والا بنایا ہوا تھا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"کہاں سے آئے ہو جی؟ کس کا پیغام لائے ہو؟"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مرچنڈانی آپ ہی کا شبھ نام ہے؟"

کہنے لگا۔

"ہاں جی۔ میں ہی سیٹھ مرچنڈانی ہوں۔ فرمائیے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟ آپ کا شبھ نام کیا ہے؟"

وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں بھی ہندو ہوں۔ میں نے کہا۔

"میرا نام موہن چندر ہے۔ میں راولپنڈی سے آیا ہوں۔"

وہ میرے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"جی مہاراج! کس نے بھیجا ہے آپ کو؟"

تب میں نے اس روز کے خفیہ پاس ورڈ میں کہا۔

"یہ بتائیں کہ کیا گاندھی نہرو ملاقات آج ہی ہونے والی ہے؟"

یہ جملہ سننے کے ساتھ ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اٹھ کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور بولا۔

"آپ شیوا جی مرہٹہ کے بڑے بھائی ہیں؟"

میں نے خفیہ کوڈ کا آخری جملہ دہرا دیا۔

"بڑے بھائی کا دیہانت ہو گیا ہے"

یہ تین مکالمے ان تخریب کاروں کے اس روز کے پاس ورڈ یا خفیہ کوڈ کے جملے تھے۔ ان جملوں سے انہیں اس روز ایک دوسرے کی شناخت کرنی تھی۔ مرچنڈانی نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے امرتسر سنٹر کی طرف سے پاکستان میں آپ لوگوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ہمیں ایسی رپورٹیں ملی ہیں کہ یہاں کام ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہا۔

"اور آپ لوگ انڈین گورنمنٹ کا پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔"

پھر میں نے اسے کرنل چڈھ بھگت رام میلارام اور مایاوتی کے ضمن میں ساری
تفصیلات سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ کراچی میں تخریب کاری کا کام انتہائی غیر تسلی بخش
ہے اور انڈیا کی سنٹرل سیکرٹ ایجنسی آپ لوگوں کو چھٹی دینے کے بارے میں سوچ رہی
ہے۔ سیٹھ مرچنڈانی کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"سر! ہم تو بڑی ذمے داری سے کام کر رہے ہیں۔ پچھلے ماہ ہم نے حیدر آباد میں بھر
فائرنگ کروا دی تھی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس سب رپورٹیں موجود ہیں اور
میں یہ رپورٹیں پڑھ کر دلی سے چلا تھا۔"

وہ میری خاطر تواضع میں لگ گیا اور میری خوشامدیں شروع کر دیں۔ میں یہ معلوم
کرنا چاہتا تھا کہ یہاں اس کے دوسرے ساتھی کون کون ہیں اور اس نے اسلحہ وغیرہ جمع
لانچ میں چھپا رکھا ہے وہ کہاں پر ہے۔ میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے اسلحہ کو بھی چیک کرنا ہے۔ ہمیں یہ بھی رپورٹیں ملی ہیں کہ تم
بچاتے ہو اور گھٹیا اسلحہ خرید لیتے ہو جو عین وقت پر دھوکا دے جاتا ہے۔"

مرچنڈانی نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولا۔

"سر! یہ بالکل غلط ہے۔ ہم اعلیٰ کوالٹی کا اسلحہ خریدتے ہیں"

میں نے کہا۔

"یہاں تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی کام کر رہے ہیں۔ ان میں یہاں کے
کتنے ہیں اور ہندو کتنے ہیں۔"

یہ میں نے بلف چال چلی تھی۔ وہ بولا۔

"سر! مسلمان تو نہیں ہیں۔ دو ہندو ضرور ہیں۔ وہی کراچی حیدر آباد اور
میں وارداتیں کرتے ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

"ان لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر بلاؤ۔ میں دوپہر کا کھانا تمہاری لانچ میں ان لوگوں
کے ساتھ ہی کھاؤں گا اور وہیں تمہیں وہ حکم سناؤں گا جو تمہارے بارے میں دلی آفس
نے مجھے دے کر یہاں بھیجا ہے۔"

مرچنڈانی کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ کہنے لگا۔

"سر! ہم سے اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اسے شما کروا دیجئے۔ آئندہ سے سارا کام
بالکل ٹھیک ہو گا۔"

مایاوتی نے اس شخص کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا کہ یہ انڈیا حکومت کے پیسے
کھاتا ہے اور ناقص اسلحہ خریدتا ہے میں اسے اب تسلی بھی دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس
کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مرچنڈانی! تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے تم اپنی خاص لانچ
پر ہمارے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرو اور دونوں اپنے ہندو بھائیوں کو بھی وہاں پہنچنے کی
خبر کر دو۔ وہاں تم سے بات ہو گی۔"

"آپ یہ مٹھائی کھائیں سر! میں ابھی ان دونوں کو خبر کر دیتا ہوں"

اس دوران وہی مکرانی نوکر کمرے میں مٹھائی کی تھالی رکھ گیا تھا۔ مرچنڈانی چلا گیا تو
میں نے جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ مجھے ان لوگوں کو ہلاک
کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت میرے سامنے ایک ہی طریقہ تھا کہ ان لوگوں کو
اس لانچ میں جمع کروں جس کے نیچے اسلحہ کا ذخیرہ رکھا ہوتا ہے اور پھر کسی طریقے سے
اس کو دھماکے سے اڑا دوں۔

مرچنڈانی کے پاس تخریب کاروں کو اطلاع دینے کے لئے ضرور وائرلیس وغیرہ تھا یا
فون پر وہ خفیہ الفاظ میں انہیں اطلاع دیتا تھا۔ واپس آ کر مجھے کہنے لگا۔

"سر! میں نے اپنے دونوں آدمیوں کو اطلاع کر دی ہے وہ دوپہر کے وقت لانچ پر
آ جائیں گے۔"

میں نے یہاں بھی وہی ترکیب استعمال کی جو پہلے دو تخریب کاروں کے ساتھ استعمال
کی تھی۔ میں نے مرچنڈانی سے کہا۔

"تم میرے ساتھ لانچ پر چلو۔ میں تم لوگوں کا اسلحہ وغیرہ چیک کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور سر ضرور۔ ابھی چلے چلتے ہیں میں گاڑی منگوالوں۔"

اس نے ایک کھٹارا قسم کی جیپ رکھی ہوئی تھی جس کی سیٹیں اکھڑ چکی تھیں اور
چھت غائب تھی۔ ہم جیپ میں بیٹھ کر سمندری کھاڑی کے دوسرے کنارے کی طرف
پہنچے تو وہاں کنارے پر ایک گھاٹ بنا ہوا جس کے ساتھ لگ کر ایک پرانی لانچ پانی کی لہروں
پر اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ کچھ مزدور اس میں سے مچھلیوں کے ٹوکرے اتار رہے تھے
مرچنڈانی کو دیکھ کر انہوں نے اسے سلام کی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں
نے مرچنڈانی سے پوچھا۔

"کیا یہی لانچ ہے؟"

وہ بولا۔

"نہیں سر۔ وہ لانچ دوسری ہے اس طرف کھڑی ہے"

اس نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں کھاڑی کا سمندر اندر کی
طرف چلا گیا تھا۔ یہاں تک ہم ایک کشتی میں سوار ہو کر گئے۔ ان درختوں کے پیچھے ایک
دوسری لانچ کھڑی تھی۔ اس لانچ پر رنگ روغن کیا ہوا تھا۔ پہلے والی لانچ سے یہ ذرا بڑی
تھی۔ کشتی لانچ کے ساتھ لگ گئی۔ مرچنڈانی کے کچھ ملازم وہاں پر موجود تھے۔ چھو
سے ڈیک پر دو ماہی گیر بیٹھے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ وہ مجھے لانچ کے نیچے لے گیا
یہاں ہم ایک تنگ راہ داری میں سے گزر کر ایک کیبن کے دروازے پر آ گئے۔

دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔

مرچنڈانی نے صدری کی جیب سے چابی نکالتے ہوئے کہا۔

"سر! ہم اس کیبن میں اپنا اسلحہ وغیرہ اور دوسری چیزیں رکھتے ہیں۔"

میں نے مصنوعی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہاں تو چھاپہ پڑنے کا ڈر ہے۔ تم کسی دوسری جگہ کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

وہ تالا کھول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! ویسے تو ہم نے اس کی حفاظت کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ لیکن اگر آپ کا
حکم ہے تو میں اسے کسی دوسری جگہ چھپا دوں گا۔"

کیبن میں کافی اسلحہ تھا۔ کلاشنکوفیں' رائفلیں' دستی بم' چار پانچ ریوالور اور ٹائم بم کی
سٹکیں بھی تھیں۔ چھ سات ٹائم بم مکمل تیاری کی حالت میں تھے۔ کونے میں ایک طرف
لکڑی کا بکس پڑا تھا۔ معلوم ہوا اس میں ڈائنامائیٹ کی سٹکیں ہیں۔ ان سٹکوں کو جوڑ کر ٹائم
بم بنایا جاتا تھا جس کے ساتھ ٹائمر کی ڈیوائیس لگا دی جاتی تھی۔ میں بڑے غور سے اسلحہ کا
معائنہ کر رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ اس لانچ کو کس طرح دھماکے سے اڑایا جائے۔
دھماکے سے پہلے میں خود وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس وقت تک کوئی منصوبہ میرے
ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ہم لانچ کے اوپر ڈیک پر آ کر آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مرچنڈانی
نے جال مرمت کرتے مزدوروں کو نیچے بھیج دیا۔ میں اس کے ساتھ امرتسر انٹیلی جینس
سنٹر اور دلی سیکریٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر کی باتیں کر کے اس پر مزید اثر ڈالنے کی کوشش
کرتا رہا۔ پاس ورڈ کے خفیہ مکالمے نے مرچنڈانی کو یقین دلا دیا تھا کہ میں امرتسر سنٹر کا
خاص آدمی ہوں جسے وہاں ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ وہ بولا۔

"سر! میرے پاس بڑی اعلیٰ قسم کی سکاچ موجود ہے۔ اگر حکم کریں تو میں لے
آؤں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈیوٹی پر نہیں پیا کرتا۔"

وہ خاموش ہو گیا اس نے اس قسم کی باتیں شروع کر دیں کہ جن ہندوؤں کو ہم پیسے
دے کر دھماکے وغیرہ کرواتے ہیں وہ اب زیادہ پیسے مانگنے لگے ہیں۔

"ہیڈ کوارٹر سے کہیے کہ ہمارے فنڈ کی رقم بڑھا دی جائے۔ اس رقم سے گزارہ
نہیں ہوتا اور کام بھی تسلی بخش طریقے سے نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔

"میں اس سلسلے میں دلی جا کر خود سیکرٹ سروس کے انچارج سے بات کروں گا۔

تم اسی تنخواہ میں گزارہ کرو"

کھانے کا انتظام اسی لانچ میں کیا گیا تھا۔ دوپہر ایک بجے دونوں ہندو تخریب کا
آ گئے۔ دونوں پکی عمر کے تھے۔ آتے ہی انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور
ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ دونوں مرچنڈانی کے خاص تخریب کار آدمی

میں نے اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھا۔

"اگر اپنے گروہ کے اور آدمی بھی ہوں تو انہیں بھی فوراً بلوا لو۔ ان س
کوارٹر کی ضروری ہدایات پہنچانا ضروری ہے۔"

مرچنڈانی بولا۔

"نہیں سر اور کوئی نہیں ہے۔ ابھی تک تو یہی دو آدمی ٹھیک ٹھاک کام کر
حیدر آباد کے بازار میں انہوں نے ہی فائرنگ کی تھی اور کراچی میں بھی تین جا
کر چکے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔ فکر نہ کرو بدبختو! تم سے ایک ایک پاکستانی کے خون کا
حساب لوں گا۔ میں نے اس کے بعد یونہی ان کو ہدایات دینی شروع کر دیں
کرتے ہوئے کہ یہ خاص ہدایات مجھے براہ راست دلی سیکرٹ سروس کے ہیڈ
موصول ہوئی ہیں۔ یہ میٹنگ کوئی آدھے گھنٹے تک جاری۔

اس اثناء میں میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے ان لوگوں کو لانچ کے گولہ بارو
ہی کیسے اڑانا ہے۔ کھانا شروع ہو گیا۔ کھانے کے بعد میں نے مرچنڈانی اور دو
دشمن ہندو تخریب کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات تم تینوں اسی لانچ میں میرے ساتھ رہو گے۔ میرا ا
وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ہو سکتا ہے رات بارہ بجے کے مجھے امرتسر سے کوئی

مرچنڈانی نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے سر! ہم لوگ اسی لانچ پر سو جائیں گے۔ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ
یہاں آپ کے لائق سونے کا انتظام شاید نہ ہو"

میں نے کہا۔

"میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اور جب ہم بھارت ماتا کے لئے ڈیوٹی دے رہے ہوتے ہیں تو
ہم کشٹ اٹھانے کو تیار رہتے ہیں۔"

مرچنڈانی اور دوسرے دونوں ہندو تخریب کار میری اس بات پر بڑے خوش ہوئے۔
سارا دن میں نے لانچ پر ان لوگوں کے درمیان ہی گزارا۔ میں نے انہیں ایک لمحے
لئے بھی ادھر ادھر نہ ہونے دیا۔ شام کو میں نے خاص طور پر ان لوگوں کو اپنے پاس بلا
بیٹھے چائے پی اور رات کا کھانا بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا
میں نے مرچنڈانی سے کہا۔

"تم لوگ کہاں سوؤ گے؟"

وہ بولا۔

"سر ہم نیچے کیبن میں سوئیں گے۔ اوپر کھلے میں مچھر بہت ہوتے ہیں۔ آپ کا بستر
ہم نے ساتھ والے کیبن میں لگا دیا ہے۔ آئیے آپ کو دکھا دوں"

تینوں میرے ساتھ نیچے آ گئے۔ لانچ میں عرشے کے نیچے نیچے دو کیبن تھے۔ ایک
میں مرچنڈانی نے اپنے اور اپنے دونوں آدمیوں کے لئے برتھ پر بستر بچھا دیئے
تھے۔ جالی دار پنکھا گھوم رہا تھا۔ ساتھ والے کیبن میں میرا بستر لگا تھا۔ یہاں بھی
کے ساتھ گھومنے والا جالی دار پنکھا چل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اب تم لوگ جا کر سو جاؤ۔ مجھے بارہ بجے تک جاگنا ہو گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے امرتسر
وائرلیس پر کوئی پیغام آ جائے۔"

میں نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چھوٹا وائرلیس ٹرانسمیٹر میری جیب میں موجود ہے۔ اگر کوئی خاص ہدایت موصول

ہوئی تو میں تم لوگوں کو صبح بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر"

تینوں تخریب کار مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد ساتھ والے کیبن میں چلے گئے۔ میں اپنے کیبن کے برتھ پر لیٹ گیا۔ میرا اصل کام اب شروع ہونے والا تھا۔ سب سے پہلے مجھے ان لوگوں کے سو جانے کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے بعد اسلحہ والے کیبن کا تالا کسی طریقے سے کھولنا تھا۔ میں نے اس خیال سے مرچنڈانی سے اسلحہ والے کیبن کی چابی نہیں لی تھی کہ میرے پاس چابی لینے کا کوئی معقول جواز نہیں تھا اور تالا کھولنے میں میں بڑا ماہر تھا۔ مجھے صرف ایک پتلی سی لوہے کی تار کی ضرورت تھی۔ جو مجھے لانچ پر ایک جگہ سے مل گئی تھی اور میں نے اسے اس وقت اپنی جیب میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔ مجھے ساتھ والے کیبن سے تینوں تخریب کاروں کی باتیں کرنے کی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ انتظار کی یہ گھڑیاں کافی کٹھن تھیں۔ مگر میں اس قسم کی سخت جانی کا عادی تھا اور یہ سخت جانی میری ٹریننگ اور میری ڈیوٹی کا حصہ تھی۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ پھر بھی میں مزید انتظار کرتا رہا۔ جب میرے اندازے کے مطابق رات آدھی گزر چکی تھی تو میں آہستہ سے کیبن سے باہر نکلا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیبن کس طرف ہے جس میں اسلحہ اور گولہ بارود کا بکس رکھا ہوا ہے۔ چھوٹی سی لانچ تھی۔ اسلحہ والا کیبن میرے کیبن سے چند قدموں کے فاصلے پر کونے میں ہی تھا۔

میں سب سے پہلے تخریب کاروں کے کیبن کے پاس آیا۔ میں نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر ان میں سے کسی کے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ تینوں سو گئے ہیں تو میں وہاں سے ہٹ کر اسلحہ والے کیبن کے پاس آگیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں نے جیب سے لوہے کی تار نکالی اور ٹٹول کر تالے کے سوراخ میں تار ڈال کر اسے خاص طریقے سے تین چار بار دائیں بائیں اور ایک مرتبہ اوپر نیچے گھمایا۔ تالا کھل گیا۔ میں دروازے کو بڑی آہستگی سے ذرا سا کھول کر کیبن میں آگیا کیبن میں بھی اندھیرا تھا۔ لیکن میں دن کے وقت اس کیبن میں رکھی ہوئی ہر

لے چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے اور چھوٹی میز کے کونے کو ٹٹول کر جگہ چلا گیا جہاں پہلے سے تیار کئے ہوئے چھ سات ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔

اس وقت اچانک مجھے خیال آگیا کہ میرے پاس دیا سلائی والی ڈبیا موجود ہے۔ میں اپنی یاد داشت پر نفرین بھیجی۔ ایک کمانڈو کو ایسی باتیں ہر وقت اور خاص طور پر یشن کے وقت یاد رکھنی چاہئیں۔ یہ نااہلی تھی کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ جیب میں س پڑی ہے۔ میں نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلائی اس کی روشنی میں ایک بم اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ٹائمر بھی لگا ہوا تھا مگر سیکنڈ کے ہندسے جود نہیں تھے۔ میں نے ٹائمر کی سوئی کو ایک منٹ پر لا کر ٹائمر کا بٹن دبا دیا۔ دوسری دیا ائی جلائی تو دیکھا کہ ٹائمر نے چلنا شروع کر دیا تھا اور فریم میں شیشے کے پیچھے سیکنڈ کے ے ساتھ سے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ٹائم بم کو اس بکس کے اوپر رکھ دیا ں بارود کی چھڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں کیبن سے یا۔ دروازے کو بند کر کے تالا یونہی لٹکایا اور دبے پاؤں چلتا تخریب کاروں کے کیبن گے سے گزر گیا۔ پھر لانچ کے اس زینے کی طرف آگیا جو نیچے کھاڑی میں کھڑی کشتی ف جاتا تھا۔

ہاں لانچ کے ڈیک پر جلتے بلب کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میرے پاس پچاس پینتالیس تھے۔ اس دوران مجھے وہاں سے دور نکل جانا تھا۔ نیچے سمندر میں کشتی نہیں تھی۔ ستہ سے کھاڑی کے پانی میں اتر گیا اور اندھیرے میں ساحل کی طرف تیرنے لگا۔ ی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ صرف ایک دھڑکا لگا تھا کہ کہیں ان لوگوں کا بنایا دھوکا نہ دے جائے اور لانچ میں دھماکہ نہ ہو۔ کھاڑی کا کنارا زیادہ دور نہیں تھا۔ ارے پر نکلنے کے بعد ایک طرف درختوں کے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا اور لانچ کی طرف لگا۔ ایک منٹ ہو چکا تھا مگر لانچ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ اس وقت مجھے افسوس لگا کہ مجھے گھڑی خریدنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ میرے پاس گھڑی کا ہونا بہت ری تھا۔

ابھی یہ سوچ میرے ذہن سے جدا نہیں ہوئی تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے بجلی
چمک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھماکہ ہوا اور زمین ایک دفعہ اوپر ہو کر نیچے آگئی اور
سمندر کی کھاڑی میں جہاں لانچ کھڑی تھی وہاں دھواں اور آگ کے سرخ شعلے بلند ہو
رہے تھے۔ لانچ کے پرخچے اڑ چکے تھے اور میرے دیکھتے دیکھتے اس کے دونوں ٹکڑے
سمندر میں ڈوب گئے۔ اب کھاڑی کے سمندر کی سطح پر صرف لکڑی کے جلتے دھواں
دیتے ٹکڑے ہی کہیں کہیں تیر رہے تھے۔ گھاٹ پر جو لوگ جھونپڑیوں میں سوئے ہوئے
تھے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور آگ میں لپٹی ہوئی لانچ کے ٹکڑوں کو ڈوبتے دیکھ رہے تھے
اور شور مچا رہے تھے۔ دو ایک نے پانی میں چھلانگیں بھی لگا دیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ
تینوں تخریب کاروں میں سے کوئی زندہ تو نہیں بچا۔ مگر دھماکہ اتنا شدید تھا اور لانچ کے
ٹکڑے جس طرح اڑ کر بکھر گئے تھے اس کو دیکھ کر یہ سوچنا بے کار تھا کہ لانچ میں کوئی
انسان زندہ بچ گیا ہو گا۔

اس کے باوجود میں مرچنڈانی اور اس کے دونوں ہندو تخریب کاروں کی موت کی
تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے نکل کر کھاڑی سے دور
بستی کی طرف چل دیا۔ وہاں کچھ دیر ادھر ادھر چل پھر کر وقت گزارا اور واپس بستی کے
قریب ماہی گیروں کے جو جھونپڑے تھے اس طرف آگیا۔ وہاں جھونپڑوں کے باہر کچھ ماہی
گیر لالٹین جلائے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور پوچھا۔

"یہ ادھر دھماکہ کیسا ہوا تھا؟"

پہلے تو ماہی گیر خاموش رہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں اخبار کے دفتر سے آ
ہوں تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"لانچ پھٹ گئی ہے جی۔ تیل کی ٹینکی میں آگ لگ گئی ہو گی۔"

میں نے پوچھا۔

"لانچ میں کتنے مسافر سوار تھے؟"

"کوئی مسافر نہیں تھا جی۔ یہ ہمارے مالک سیٹھ مرچنڈانی کی اپنی لانچ تھی۔"

"کیا سیٹھ صاحب لانچ میں تھے؟"

"بڑا برا ہوا جی۔ پر آدمی کی جب آئی ہوتی ہے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ سیٹھ
صاحب کبھی رات کو لانچ میں نہیں سوتے۔ آج سنا ہے شہر سے ان کے دو تین مہمان
آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دوپہر کا اور پھر رات کا کھانا بھی لانچ پر ہی کھایا اور لانچ پر ہی
اپنے دوستوں کے ساتھ سو گئے تھے۔"

دوسرا ماہی گیر افسوس کرنے لگا۔

"بڑا دکھ ہوا ہے"

میں نے کہا۔

"آپ لوگوں کو کیسے پتہ چلا کہ سیٹھ مرچنڈانی اور اس کے دوستوں کی موت ہو گئی
ہے؟ ہو سکتا ہے وہ زندہ بچ گئے ہوں"

"سیٹھ جی اور اس کے دوستوں کی جلی ہوئی لاشیں کھاڑی میں مل گئی تھیں مگر کسی
ی ٹانگیں نہیں تھیں تو کسی کے بازو اور نچلا دھڑ غائب تھا۔"

جب میری تسلی ہو گئی کہ تینوں بھارتی تخریب کار ہلاک ہو چکے ہیں تو میں وہاں سے
اپس مایاوتی کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر تھا۔ مگر کراچی
یا خوش قسمت اور رونق والا شہر ہے کہ وہاں رات کے وقت بھی دن کا سماں رہتا ہے۔
ہر سڑک پر ساری رات کوئی نہ کوئی ٹیکسی رکشا ضرور مل جاتا ہے۔ مجھے بھی ایک ٹیکسی
ل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے وقت میں نے سوچا کہ اس وقت میرا مایاوتی کے ہوٹل میں جانا
ھیک نہیں رہے گا۔ مجھے رات ریلوے سٹیشن پر گزارنی چاہیے چنانچہ میں نے ٹیکسی
رائیور سے کہا۔

"سٹی سٹیشن چلو بھائی"

کراچی کے سٹی سٹیشن پر آدھی رات کے بعد بھی بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ صبح
ہونے تک میں سٹیشن پر ہی رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ سٹیشن سے نکلتے
ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ سیدھا پی آئی اے کے دفتر پہنچ کر رات کے بارہ بجے والی

اسلام آباد کی فلائٹ کا ایک ٹکٹ خریدا اور اس میں اپنی سیٹ کنفرم کروالی۔ اس کے بعد میں کلفٹن کی سیر کرنے نکل گیا۔ کلفٹن پر دن کے وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اسی لئے میں یہاں آگیا۔ دوپہر کا کھانا میں نے کلفٹن پر ہی ایک کھوکھا ہوٹل میں کھایا۔ اس کے بعد سمندر کے کنارے کنارے سیر کرتا دور نکل گیا۔ وہاں پر بڑے بڑے پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا اور مایاوتی کو ٹھکانے لگانے کے منصوبے پر غور شروع کر دیا۔ ایک منصوبہ میرے ذہن میں خاکے کی شکل میں آگیا ہوا تھا۔ اس پر مزید غور کیا۔ آخر یہی منصوبہ محفوظ اور قابل عمل محسوس ہوا اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر کے کلفٹن سے ٹیکسی لے کر شہر کے ایک ریسٹوران میں آکر بیٹھ گیا۔

مجھے شام تک کا وقت گزارنا تھا۔

جب شام ہو گئی تو ریسٹوران سے نکل کر مایاوتی کے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ مجھے وہاں سے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سیدھا ہوٹل کی دوسری منزا میں مایاوتی کے کمرے کی طرف آگیا۔ کمرہ بند تھا۔ ایک باوردی ویٹر قریب سے گزرا تو میں نے اس سے مایاوتی کا پوچھا۔ اس نے کہا۔

"وہ نیچے کچن میں گئی تھی۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ اگر وہاں ہوئی تو اسے اوپر بھیج دوں گا۔"

میں وہیں نیم روشن راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں مایاوتی آگئی۔ وہ ہوٹل کی وردی میں تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس روز کے اخباروں میں کھاڑی میں ایک لانچ میں دھماکے کی خبر شائع ہو چکی تھی۔ وہ جو سوال قدرتی طور پر مجھ سے کرنے والی تھی میں نے اس جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

اس نے آتے ہی خاموشی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

"سر! آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

میں نے بے نیازی سے پوچھا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا؟"

اس نے کہا۔

"سر! مرچنڈانی کی لانچ میں دھماکہ ہوا ہے رات کو۔ اس کا کچھ پتہ نہیں وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔"

میں نے بھی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ ان لوگوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی۔"

مایاوتی کہنے لگی۔

"مرچنڈانی اسلحہ وغیرہ اپنی لانچ میں ہی رکھا کرتا تھا۔ کسی کی غلطی سے اس میں آگ بھڑک اٹھی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ سارے نااہل لوگ ہیں۔ ان لوگوں کو ان حماقتوں کی وجہ سے بھارت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچ رہا ہے۔"

مایاوتی کہنے لگی۔

"سر! کل آپ کس وقت مرچنڈانی سے ملے تھے؟"

"دن کے وقت ملا تھا۔ مجھے تو شکل سے ہی وہ غیر ذمے دار آدمی لگا تھا۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اگر مرچنڈانی لانچ میں موجود تھا تو اس کا بچنا مشکل ہے۔ لانچ میں بارود کا دھماکہ ہو تو کوئی نہیں بچ سکتا۔"

مایاوتی نے کہا۔

"میں شام کو معلوم کرلوں گی کہ مرچنڈانی زندہ ہے یا نہیں۔"

اس نے جلدی سے بستر ٹھیک کیا اور بولی۔

"سر! آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ یہاں لیٹ کر آرام کریں۔ میں آپ کے لئے کافی لے کر آتی ہوں۔"

میں بستر پر لیٹ گیا اور کہا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی آج تھک گیا ہوں۔ کئی ایک ضروری کام نمٹانے تھے۔"

"میں ابھی کافی لے کر آتی ہوں"

وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

اس عورت کو ٹھکانے لگانا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ایک بار دل میں خیال ضرور آیا کہ اس عورت کو چھوڑ دوں۔ اسے ہلاک نہ کروں۔ لیکن جب اس نقطے پر غور کیا کہ اگرچہ اس کے سارے تخریب کار ساتھی ہلاک ہو چکے ہیں لیکن انڈیا سے دوسرے تخریب کار آجائیں گے اور آتے ہی اس سے رابطہ قائم کریں گے اور یہ عورت پھر سے پاکستان کے خلاف اپنی تخریبی سرگرمیاں شروع کر دے گی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس عورت کو ٹھکانے لگانا بہت ضروری ہے۔ یہ کام میں رات کے وقت کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے کراچی سے اسلام آباد کی رات کی فلائٹ میں سیٹ بک کرائی تھی۔ تاکہ جس وقت ہوٹل کے کمرے سے مایاوتی کی لاش برآمد ہو گی تو میں کراچی سے اسلام آباد پہنچ چکا ہوں گا۔

مایاوتی میرے لئے کافی لے آئی۔

کافی پی کر میری طبیعت میں واقعی فرحت سی پیدا ہو گئی۔ میں نے مایاوتی سے کہا۔

"مایاوتی! میں آج رات کا کھانا بھی تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ میرا پروگرام کل صبح اسلام آباد راولپنڈی جانے کا ہے"

مایاوتی مسکرانے لگی۔

"سر! آپ مالک ہیں۔ ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مایاوتی! تم نوکر نہیں ہو۔ تم بھارت ماتا کی دلیر پتری ہو۔ تم بھارت ورش کے لئے بڑا کام کر رہی ہو"

وہ میرے قریب ہو گئی اور کہنے لگی۔

"سر! تو پھر امرتسر سنٹر والوں سے میری سفارش کر دیں کہ جو فنڈ مرچنڈانی کو دیا جاتا ہے اس سے کم از کم آدھا مجھے دیا جائے۔ مجھے بعض خفیہ رپورٹیں حاصل کرنے کے لئے کافی رقم خرچ کرنی پڑ جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ یہ کام ہو جائے گا"

اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

"بس سر! اگر آپ یہ کام کر دیں تو میری زندگی سپھل ہو جائے گی۔"

اس عورت کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی زندگی یہی بس ایک رات ہی باقی رہ گئی ہے۔ اصل میں کسی کو بھی اس دنیا میں علم نہیں ہوتا کہ جس زندگی کے لئے وہ اتنی تگ ودو کر رہا ہے۔ اتنا لالچ کر رہا ہے۔ اتنا جھوٹ بول رہا ہے۔ اتنے لوگوں کا حق مار رہا ہے۔ اتنی ناجائز دولت بینک میں جمع کر رہا ہے وہ زندگی کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔ آدمی کہتا تو ضرور ہے کہ جی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں لیکن حقیقت میں اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ کبھی نہیں مرے گا اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اگر مایاوتی کو کسی طریقے سے معلوم ہو جاتا کہ میں اسے رات کے وقت قتل کرنے والا ہوں تو وہ کبھی مجھ سے اپنی زندگی کے لئے اور خوش حال پروگرام کا ذکر نہ کرتی اور مجھ سے امداد کی کبھی طالب نہ ہوتی۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ زندگی کی رونق اسی وجہ سے قائم ہے کہ انسان نے موت کو بھلا رکھا ہے۔ اسے موت یاد نہیں۔ اسے ہر وقت یہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ مریں گے وہ نہیں مرے گا۔ جو لوگ اپنی موت کو اپنے سامنے دیکھ لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنی موت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں وہ لوگ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ کبھی رشوت نہیں لیتے۔ کبھی کسی کا حق نہیں مارتے۔ وہ کبھی کسی چیز کا لالچ نہیں کرتے۔ یہ لوگ صرف اس لئے زندہ ہوتے ہیں کہ اللہ نے ان کے ذمے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو آگے بڑھانے کا جو کام لگایا ہے اسے زندگی کے آخری لمحات تک ادا کرتے رہیں۔ یہ لوگ

صرف اللہ کا حکم بجا لانے کے لئے زندہ ہوتے ہیں۔ ان کا چلنا پھرنا' سونا جاگنا کاروبار کرنا دنیا داری کرنا صرف اللہ اور اللہ کے واسطے ہوتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کے سب سے زیادہ خوش و خرم لوگ ہوتے ہیں اور یقین کریں اس دنیا کی حقیقی رونقیں ان ہی لوگوں کی وجہ سے لگی ہوئی ہیں میں نے مایاوتی سے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور کہنے لگی۔

"میری ڈیوٹی تھوڑی دیر میں آف ہونے والی ہے۔ میں ابھی آجاؤں گی آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا کر سروس والوں کو کہہ دیجئے گا۔"

وہ چلی گئی تو مجھے اس پر ترس سا آنے لگا۔ دراصل میں نے کسی عورت کو ٹھکانے لگانے کے لئے کبھی اتنی لمبی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ بلکہ شاید یہ میرے ہاتھوں ہلاک ہونے والی پہلی عورت تھی۔ جو لوگ میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ ہنگامی حالات میں آناً فاناً ہلاک ہو گئے تھے اور یہ سب کچھ میں نے اپنے وطن پاکستان کی سلامتی اور قومی مفاد میں کیا تھا اور اکثر ایسے حالات میں ایسا اقدام کیا تھا کہ اگر میں انہیں ہلاک نہ کرتا تو وہ مجھے مار ڈالتے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ بہت غور کیا۔ کوئی دوسرا طریقہ نظر نہ آیا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی کہ یہ عورت میرے وطن کی دشمن تھی۔ بھارت کی جاسوس تھی اور اب تک اپنی تخریبی سرگرمیوں سے نہ جانے پاکستان کو کتنا نقصان پہنچا چکی تھی اور زندہ رہنے کی صورت میں نہ جانے اس نے ابھی مزید کتنا نقصان پہنچانا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی کہ باقی بھارتی تخریب کاروں کی ہلاکت کے بعد اس عورت کی تخریبی سرگرمیاں معطل ہو جاتیں تو مجھے اس سے دوسری بار ملاقات کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ لازمی امر تھا کہ بھارت کی خفیہ ایجنسی مرنے والوں کی جگہ دوسرے تخریب کار بھیج دیتی۔ وہ لوگ مایاوتی سے آکر رابطہ پیدا کرتے اور یہ عورت دوبارہ تخریبی عمل شروع کر دیتی۔ اب میرا فرض بن گیا تھا کہ پاکستان کی سرزمین کو اس دشمن کے وجود سے پاک

کروں۔

مایاوتی واپس آئی تو آتے ہی بولی۔

"سر! میں نے آپ کے لئے خاص طور پر چینی سوپ بنوانے کا آرڈر دیا ہے۔"

اس زمانے میں چینی کھانوں کا نیا نیا رواج چلا تھا اور لوگ ریستورانوں میں چینی سوپ اور کھانے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکالے اور کہا۔

"سر! میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں"

وہ شاید ساتھ والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہاں سے وہ وردی اتار کر دوسرے کپڑے پہن کر آگئی۔ اس نے میک اپ بھی کر لیا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور مرچنڈانی کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

کہنے لگی۔

"سر! ابھی تک مرچنڈانی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ زندہ نہیں بچا۔ اگر زندہ ہوتا تو اس وقت وہ ٹیلی فون پر ضرور مجھ سے رابطہ قائم کرتا۔"

میں نے کہا۔

"شاید تھوڑی دیر تک اس کا فون آجائے۔"

وہ بولی۔

"سر! بھگت رام اور میلا رام جی کا بھی اس سلسلے میں کوئی فون نہیں آیا۔ ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو یہ لوگ مجھ سے خفیہ کوڈ میں ضرور فون پر بات کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ لوگ بھی مرچنڈانی کے ساتھ اسی لانچ میں ہوں اور یہ بھی ختم ہو گئے ہوں۔"

مایاوتی نے کہا۔

"نہیں سر! وہ لوگ مرچنڈانی سے ملنے نہیں جاتے۔ یہ مجھے معلوم ہے۔"

کچھ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر ہوٹل کا ملازم کھانا لے کر آگیا۔ مایاوتی نے بڑے اہتمام سے چینی سوپ کا پیالہ میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"سر! مجھے یقین ہے آپ اسے پسند کریں گے۔"

اب میں اس کی مہمان نوازی اور دل جوئی کی باتوں پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کراچی سے آخری فلائٹ پکڑ کر میں اسلام آباد جاؤں گا تو وہاں سے صبح کے وقت ہی مجھے آزاد کشمیر جانے والی کوئی بس مل سکے گی۔ میرا ارادہ اسی جانب سے کسی نہ کسی طرح مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کا تھا۔ دوسرا کوئی راستہ اس وقت میرے سامنے نہیں تھا۔ ویسے بھی مجھے پاکستان سے اب نکل جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ پر مجاہدین کو میری ضرورت تھی۔ میں اخباروں میں کشمیر کی خبریں پڑھتا تھا تو میرا خون کھول اٹھتا تھا۔ وہاں بھارتی فوجی کشمیریوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہے تھے اور انہوں نے اپنی وحشیانہ سرگرمیاں تیز کردی تھیں۔ اگرچہ مجاہدین بھی گھات لگا کر بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر رہے تھے مگر بھارتی سپاہی کشمیریوں کے گھروں کے گھر نذر آتش کر رہے تھے۔

مایاوتی نے الماری میں سے سکاچ کی باقی بچی ہوئی بوتل نکال لی اور بڑی محبت سے اصرار کرنے لگی کہ میں بھی اس کا ساتھ دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے زیادہ اصرار نہ کیا اور اپنے لئے گلاس میں شراب انڈیل لی۔ ہم کھانا کھانے لگے۔ مایاوتی حسب سابق تین ڈبل پیگ پی گئی تھی۔ وہ سرور میں آگئی۔ میں برابر وقت دیکھتا جا رہا تھا۔ میری فلائٹ میں ابھی دو گھنٹے باقی تھی۔ میں عین وقت پر ایئرپورٹ پہنچنا چاہتا تھا۔ مایاوتی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی۔ اس نے مزید شراب اپنے گلاس میں انڈیلی تو میں نے اسے منع نہ کیا۔ اس خیال سے کہ شاید اس کی وجہ سے اس کی موت آسان ہو جائے گی اور اسے مرنے کی تکلیف نہیں ہوگی۔

چوتھا پیگ پینے کے بعد اسے چڑھ گئی اور وہ اوٹ پٹانگ بولنے اور یونہی ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ میں نے کہا۔

"مایاوتی اب تم سو جاؤ۔ میں جاتا ہوں۔"

اس نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"سر! آئی ایم سوری! سر! پلیز آئی ایم سوری!"

اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔

میں کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سب سے پہلے دروازہ کھول کر باہر راہ داری میں نگاہ ڈالی۔ راہ داری خالی پڑی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ میں نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگادی اور مایاوتی کو جھک کر دیکھا۔ وہ نشے میں دھت پڑی تھی۔ اس کا دوپٹہ صوفے پر پڑا تھا۔ میں نے دوپٹہ اس کے گلے میں اچھی طرح سے لپٹ دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو گرفت میں لیا اور دونوں انگوٹھوں سے اس کے نرخرے کو دبا دیا۔ مایاوتی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے پورا دباؤ ڈال دیا۔ گھٹنے اس کے سینے پر رکھ دیئے۔ میرے شکنجے میں آیا ہوا اس کا بدن بری طرح ہچکولے کھانے لگا۔ پھر اس میں لرزش پیدا ہو گئی اور پھر جسم بے حرکت ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ گردن سے الگ نہ کئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا کام تمام ہو گیا ہے تو میں نے ہاتھ اٹھا لئے۔

گردن پر دوپٹہ اس لئے ڈال دیا تھا کہ وہاں میری انگلیوں کے نشان نہ بن جائیں۔ بس یونہی یہ احتیاط کرلی تھی۔ ورنہ اس کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض خاموش تھی۔ پھر اس کی گردن کی بائیں جانب ذرا نیچے کر کے ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ یہاں جو رگ دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکا کرتی ہے وہ بھی خاموش تھی۔ پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اس کی الماری کی تلاشی۔ اس کی وہ کاپی دیکھی جس میں سے اس نے مجھے آج کے پاس ورڈ کے الفاظ پڑھ کر بتائے تھے۔ یہ عام قسم کی ڈائری نما کاپی تھی۔ اس میں کچھ مردوں کچھ عورتوں کے نام اور ان کے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں ورق گردانی کرتا چلا گیا۔ ایک جگہ انڈیا کی کسی فلم کے گیت بھی لکھے ہوئے تھے۔ ایک

ورق کو پلٹتے ہوئے میری نظریں رک گئیں۔ اس ورق پر لکھا ہوا تھا۔

پیارے ساجن کیلاش جی! تم مجھے اتنا کیوں تڑپاتے ہو۔ رات میں تمہیں یاد کرکے بہت روتی رہی۔ تم مجھ سے پریم نہیں کرتے۔ اگر پریم کرتے ہو تو کرنل چڈھہ سے کہہ کر پنڈی سے اپنی ڈیوٹی کراچی میں کیوں نہیں لگوا لیتے؟ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے رہا کریں گے۔ میں کل رات کو تمہیں ٹیلی فون کروں گی۔ تمہاری بجنی

مایاوتی"

اس کے نیچے ایک ٹیلی فون نمبر لکھا تھا اور ٹیلی فون نمبر کے ساتھ کیلاش چندر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کاپی میں سے وہ کاغذ پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر کاپی کا وہ صفحہ نکالا جس پر ایک ہفتے کے سات دنوں کے پاس ورڈ لکھے تھے۔ ہر پاس ورڈ کے آگے دن اور تاریخ ڈالی گئی تھی۔ میں نے کاپی کے اس صفحے پر سے اگلے چار دنوں کے پاس ورڈ الگ کاغذ پر لکھ کر اپنی جیب میں سنبھال کر رکھ لئے۔ کاپی کو الماری کے خانے میں رکھ دیا۔ الماری بند کی اور الماری پر جہاں جہاں میں نے ہاتھ لگایا تھا اس جگہ کو کپڑے سے رگڑ کر صاف کر دیا۔ اسی طرح میں نے شیشے کے اپنے گلاس اور اپنے چمچ اور پلیٹ کے کناروں کو بھی کپڑے سے رگڑ کر صاف کر دیا۔ ٹیبل لیمپ بجھا دیا۔ دروازے کی کنڈی اتار کر دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ راہ داری خالی تھی۔

میں خاموشی سے کمرے سے نکلا۔ راہ داری میں سے سر جھکائے گزر گیا۔ ہوٹل زینہ اتر کر اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے ہوٹل کے گیٹ سے گزر کر سڑک پر آگیا یہاں تین چار خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ایک ٹیکسی پکڑی اور اسے ایئر پورٹ چلنے کو کہا ٹیکسی چل پڑی۔ جو کام مجھے کرنا تھا وہ خوش اسلوبی سے ہو گیا تھا۔ ایئر پورٹ پر کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد رات بارہ بجے والی فلائٹ پکڑی اور اسلام آباد پہنچ گیا۔ یہ اب مجھے ایک اور بھارتی جاسوس یا تخریب کار کیلاش چندر سے نمٹنا تھا۔ مایاوتی نے ڈائری میں اس کا یہی نام لکھا تھا۔ ڈائری کا یہ ورق میں نے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا اس پر کیلاش چندر کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ میرے پاس ان بھارتی تخریب کا

ے ٹولے کے سات دن کے پاس ورڈ بھی موجود تھے جو میں نے مایاوتی کی ڈائری سے نوٹ کئے تھے۔ اور پاس ورڈ سے مجھے بڑی آسانی سے کیلاش چندر کا اعتماد حاصل ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ پاس ورڈ ان تخریب کاروں کے سوا کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھے۔

میرے پاس اب اتنے پیسے باقی نہیں رہ گئے تھے کہ میں کسی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کمرہ لیتا۔ اعلیٰ درجے کے ہوٹل کو میں اس لئے ترجیح دیا کرتا تھا کہ ان ہوٹلوں میں آدمی کا ایک رعب سا قائم ہو جاتا ہے اور اگر وہاں پر خفیہ پولیس کا آدمی موجود بھی ہو تو وہ اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب کہ درمیانے درجے کے ہوٹلوں میں خفیہ پولیس ذرا سے شک شبے پر فوراً حراست میں لے لیتی ہے۔ ایئر پورٹ سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور راولپنڈی صدر میں آگیا۔ صدر میں ایک انگریزوں کے زمانے کا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل میں جدید ہوٹلوں والی سہولتیں تو نہیں تھیں مگر پرانے ہوٹلوں والا ایک خاص قسم کا مزاج اور فضا ضرور قائم تھی۔ عام طور پر یہاں انگریزوں کے زمانے کے ریٹائرڈ سی ایس پی افسران اور جاگیردار قسم کے وضع دار لوگ آکر ٹھہرتے تھے۔ اس ہوٹل کے اکثر کمرے خالی رہتے تھے۔ یہ ہوٹل اس زمانے میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ اب یہ ہوٹل باقی نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک شاپنگ پلازہ بن چکا ہے۔ دو سو روپے میں چوبیس گھنٹے کے لئے وہاں کمرہ مل جاتا تھا۔

میں نے اس ہوٹل میں آکر ایک کمرہ لے لیا اور سو گیا۔

دوسرے روز کافی دن نکل آیا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں ہی منگوا کر ناشتہ لیا۔ پھر کیلاش چندر کا ٹیلی فون نمبر نکال کر سامنے رکھ لیا اور ٹیلی فون کرنے سے پہلے سوچنے لگا کہ اس بھارتی تخریب کار کو یہاں سے فون کرنا مناسب رہے گا یا کسی دوسری جگہ بنی کسی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کروں۔ کیونکہ اس بات کا خدشہ تھا کہ ہوٹل کی ایکسچینج والے میری باتیں سن لیں۔ میں نے ہوٹل کے کمرے سے فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی شکل تھوڑی سی بدل لینی چاہیے۔ میں نے کمرے میں ہی حجام کو بلوا لیا۔ اس سے اپنی

چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی پوری صاف کرائی۔ سر کے لمبے بال چھوٹے کروا لئے اور مونچھیں ذرا ذرا رہنے دیں۔ میری شکل اب اتنی آسانی سے پہچانی نہیں جا سکتی تھی۔ اپنی پاکستانی پولیس کو بھی میں اپنے ناکردہ گناہوں کے الزام میں مطلوب تھا۔

میں پنڈی صدر میں آگیا۔ ایک بازار میں پرانے گرم کپڑے فروخت ہو رہے تھے۔ یہاں سے میں نے اپنے لئے ایک امریکی گرم جیکٹ اور میل خورے رنگ کی پرانی پتلون خریدی میں اپنا لباس بھی بدل ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ کپڑے لفافے میں ڈالے اور صدر کے پوسٹ آفس میں آگیا۔ یہاں ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ تھا۔ میں نے وہاں سے کیلاش چندر کا نمبر ڈائیل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں براہ راست کیلاش چندر کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص کسی مسلمان کے نام سے یہاں رہ رہا ہو۔ میں نے عورت کو نمبر بتایا اور پوچھا۔

"یہ آپ ہی کا نمبر ہے بیگم صاحب؟"

عورت نے کہا۔

"ہاں جی۔ یہ ہمارا ہی نمبر ہے۔ مگر گھر پر اس وقت کوئی نہیں ہے"

یہ نوکرانی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"صاحب کس وقت آئیں گے۔ میں ان کا بھائی بول رہا ہوں"

عورت بولی۔

"اچھا جی۔ صاحب اپنے دفتر گئے ہوئے ہیں۔ وہاں فون کر لیں"

میں نے اس سے فون نمبر پوچھا تو اس نے مجھے فون نمبر بھی کہیں سے دیکھ کر لکھا دیا۔ میں نے اس سے اس شخص کے دفتر کا ایڈریس بھی لکھوا لیا اور فون بند کر دیا۔ یہ دفتر صدر میں ہی ایک جگہ پر واقع تھا۔ میں وہ جگہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ ا فائدہ بھی نہیں ہے کیونکہ اب نہ وہاں کیلاش چندر ہے نہ اس کا آفس ہی ہے۔ آ میری ایڈونچرس کہانی سے دلچسپی ہے۔ بس میری کہانی سنتے جائیے۔ میں پوچھتا پوچھ

ڑک پر پہنچ گیا جہاں کیلاش چندر کا دفتر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نمبر پر بات کرنے والی گھر ں نوکرانی نے اپنے جس صاحب کا ذکر کیا ہے وہ کیلاش چندر ہی ہے۔ مجھے اس کے منے جانے کے بعد سب سے پہلے اس امر کی تصدیق کرنی تھی کہ کیا یہ کیلاش چندر ہی ہے۔ یہ کام بے حد مشکل تھا مگر اس روز کا پاس ورڈ میری مشکل کو آسان بنا سکتا تھا۔ یہ بپورٹ امپورٹ کا دفتر تھا۔ باہر چھوٹا سا بورڈ لگا تھا۔ دفتر ایک دکان کے اندر بنایا گیا ا۔ آدھے دروازے پر شیشے لگے تھے۔ ایک چپڑاسی باہر سٹول پر بیٹھا تھا۔ ایک آدمی دفتر ے دروازے سے باہر نکلا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا کاریڈور تھا۔ ایک جانب ڑی کی پارٹیشن والی دیوار تھی۔ دوسری دیوار پر سرجری کے آلات کی تصویریں لگی یں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دفتر پاکستان میں تیار ہونے والے سرجری کے آلات باہر کے وں کو ایکسپورٹ کرتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ا کہ کیا کیلاش چندر ہی اس دفتر کا مالک ہے یا وہ یہاں پر ہیڈ کلرک قسم کی کوئی چیز ہے۔ معلوم کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ کیونکہ مجھے کیلاش چندر کے اسلامی نام کا علم نہیں تھا جو ں نے یہاں رکھا ہوا ہو گا۔ میں کسی سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کیلاش چندر کا لامی نام کا آدمی یہاں کہاں مل سکتا ہے۔ اتنے میں ایک چپڑاسی کونے کے سٹول پر سے ٹھ کر میرے پاس آیا اور پوچھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے جناب؟"

مجھے نوکرانی نے اس علاقے کا نام بھی بتا دیا تھا جہاں میں نے فون کیا تھا۔ میں نے ں سے اس علاقے کا نام لے کر پوچھا۔

"بھائی تمہارے صاحب اسی جگہ رہتے ہیں نا؟"

وہ بولا۔

"ہاں جی۔ مگر آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے صاحب ہی سے ملنا ہے۔"

اس نے کہا۔

"یہ کہیں ناں پھر۔ میرے ساتھ آئیں"

وہ مجھے پارٹیشن والے آخری کمرے کے پاس لے گیا۔ مجھے باہر رکنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔ پارٹیشن کی دیوار چھ سات فٹ اونچی تھی۔ لکڑی کی دیوار تھی۔ اندر سے چپڑاسی کی آواز آئی۔

"سر! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں"

"بھائی پھر انہیں اندر بلاؤ ناں"

چپڑاسی مجھے آکر اندر لے گیا۔

ڈبہ نما کمرے میں سنہری فریم کی عینک لگائے ایک خوش شکل مگر ڈھلتی عمر والا آدمی انگریزی سوٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کاروبار خندہ پیشانی کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ میں کافی پسند کروں گا یا چائے اس شخص کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی ہوگی مگر چہرے کے نقش پرکشش تھے اور گ بالوں میں سفید بالوں کی لکریں اس کی شخصیت کو مزید پرکشش بنا رہی تھیں۔ میں نے کہ مایاوتی سچی تھی۔ اسے اس آدمی سے ضرور محبت کرنی چاہیے تھی۔ کمرے میں دا ہوتے وقت میں نے اس شخص کے نام کی باہر لگی ہوئی تختی پڑھ لی تھی۔ اس پر غلام احمد لکھا ہوا تھا۔

مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ شخص اصل میں راجہ غلام احمد ہے یا کیلاش چندر ہے۔ میں نے کہا۔

"صرف چائے منگوا لیجئے۔ ساتھ کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

اس نے چپڑاسی سے چائے لانے کو کہا۔ دفتر درمیانے درجے کا تھا۔ زیادہ آن بان ھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل بند کرتے ہوئے مجھے ریٹ پیش کیا۔ میں نے شکریہ کہتے ہوئے سگریٹ لے لیا۔ ایک سگریٹ اس نے لے ا۔ لائٹر سے پہلے میرا سگریٹ سلگایا پھر اپنا سگریٹ سلگانے کے بعد پوچھا۔

"فرمایئے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

اپنے سبھاؤ اور اردو کے الفاظ جو اس نے بولے تھے اس سے وہ کسی طرف سے بھی ندو نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شبہ بھی ہوا کہ شاید میں کسی غلط آدمی کے س آگیا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"بات یہ ہے جناب کہ میں نے شارجہ میں اپنا ایک چھوٹا سا دفتر بنایا ہے۔ میں وہاں الکوٹ کے آلات سرجری اور سلوروئیر امپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کام زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اس لئے میں خود مارکیٹ کا جائزہ لینے شارجہ سے یہاں آیا ہوں۔ اور اس سلسلے میں پ کا تعاون چاہتا ہوں"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

پھر اس نے مجھے ایک لسٹ نکال کر دی جس پر ہر قسم کے آلات سرجری اور سلور ویئر کی تصویریں تھیں اور نیچے ان کے نام اور نمبر لکھے ہوئے تھے۔ کہنے لگا۔

"ہم یہ مال آپ کو سپلائی کر سکتے ہیں۔ ہماری کمشن بھی معمولی ہو گی۔ آپ ہمیں اپنی پسند کے مال کا آرڈر دے دیجئے آپ کو ٹھیک وقت پر مال شارجہ پہنچا دیا جائے گا۔"

میں بات کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ کاروباری بات کرنی مجھے بالکل نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے ترپ کا پتا پھینک دینا چاہیے۔ میں نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ شارجہ میں میرے کاروبار میں ایک خاتون بھی شریک ہے۔ مجھے اسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو اپنی طے شدہ کمشن پر آپ کو مال سپلائی کرنے کے پابند ہوں گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس خاتون کو جانتے ہیں"

وہ ذرا چونکا۔ پھر کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہو سکتا ہے۔ شارجہ میں ہمارے بہت سے جاننے والے رہتے ہیں۔ کیا نام ہے اُ خاتون کا؟"

میں نے اس سے کاغذ پنسل لے کر کاغذ پر مایاوتی کا نام لکھا اور کاغذ اس کے آگے دیا۔

"میرا خیال ہے آپ اس خاتون کو بہت زیادہ جانتے ہیں۔"

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مایاوتی کا نام پڑھتے ہی ایک سیکنڈ لئے اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ پھر فوراً ہی وہ مسکراہٹ واپس آگئی نے کاغذ کا پرزہ میری طرف بڑھاتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"آئی ایم سوری سر! میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا۔ آپ کو غلط فہمی

ہے۔"

میں نے ترپ کا دوسرا پتا پھینکا۔ جیب سے مایاوتی کی ڈائری سے پھاڑا ہوا وہ کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے کیلاش چندر کو محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اس شخص نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اسے پڑھا مگر پھر بھی مجھے ہاتھ نہ پکڑایا۔ نفی سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"جناب! یہ آپ مجھے کیا پڑھا رہے ہیں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔"

اب پاس ورڈ کا اعلان ضروری تھا۔ میں نے ڈائری والا کاغذ اٹھا کر جیب میں رکھا اور سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے پاس ورڈ کا پہلا جملہ بولا۔

"میں نے کرشن جی مہاراج کو گوپیوں کے ساتھ داس رچاتے دیکھا ہے۔"

اب وہ شخص ٹھٹھک سا گیا۔ مگر پھر بھی اس نے زبان نہ کھولی۔ آدمی بڑا پکا لگتا تھا۔ ں نے ایک اور قدم بڑھایا۔

"مسٹر کیلاش چندر! میں امرتسر سنٹر سے آیا ہوں۔ میرا نام موہن داس ہے جب ک تم آج کے پاس ورڈ کا اس سے اگلا جملہ نہیں بولو گے مجھے کیسے یقین آئے گا کہ تم ہی رے آدمی کیلاش چندر ہو۔"

اس نے آہستہ سے پاس ورڈ کا اگلا جملہ بول دیا۔

"کرشن جی تو بندرا بن میں ہوتے ہیں۔"

میں نے پاس ورڈ کا تیسرا جملہ بولا۔

"میں نے کرشن کنہیا کی فلم دیکھی تھی"

تب اس نے میری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"سر! آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ہمیں یہاں پاکستان میں بڑا محتاط ہو کر رہنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں ابھی کرنل چڈھ سے نہیں ملا۔"

وہ کہنے لگا۔

"سر! آپ کو مایاوتی کا یہ خط کہاں سے ملا؟"

میں نے کہا۔

"بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ مایاوتی کو رات قتل کر دیا گیا ہے۔ میں کل کراچی میں اس کے ہوٹل میں ہی تھا۔ اس وقت تک وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ کیونکہ مجھے یہاں پاکستان کے دارالحکومت میں اپنے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو زیادہ ہوشیاری اور عقل مندی سے ہمارے مشن کو آگے بڑھا سکے۔ یہاں پہلے جو لوگ کام کر رہے ہیں امرتسر سنٹر اور دلی ہیڈ کوارٹر والے ان کی کارگزاری سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں یہی مشن لے کر پاکستان آیا تھا۔ مایاوتی نے مجھے اپنی ڈائری میں سے تمہارا نام اور فون نمبر بتایا تو مجھے یہ محبت بھرا خط لکھا ہوا نظر آ گیا میں نے آج کا پاس ورڈ بھی مایاوتی سے لیا اور یہ خط بھی لے لیا تا کہ تم سے رابطہ قائم ہو سکے۔ مجھے رات کی فلائٹ سے اسلام آباد آنا تھا۔ میں کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے مایاوتی سے ملنے اس کے ہوٹل میں گیا۔ اس کا کمرہ کھلا تھا۔ اندر گیا تو مایاوتی کی لاش پلنگ پر پڑی تھی۔ میں وہاں سے فوراً نکل کر سیدھا ایئرپورٹ پر آ گیا۔"

کیلاش چندر مایاوتی کی موت پر اداس ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کو ذرا سخت بناتے ہوئے کہا۔

"تم سب لوگ جو پاکستان میں کام کر رہے ہو ایک دوسرے سے عشق محبت کی پینگیں بڑھانے میں لگے ہو اور بھارت کا پیسہ ضائع کر رہے ہو۔"

کیلاش چندر جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"سر! ایسی بات نہیں ہے۔ مایاوتی خود ہی مجھ سے محبت کا اظہار کرتی تھی۔ میں نے تو کبھی اس کو ان کرج نہیں کیا تھا۔"

میں اب بڑے رعب سے بولنے لگا تھا۔ اس کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے کہا۔

"بہرحال ہمیں تم لوگوں کے بارے میں اچھی رپورٹیں نہیں مل رہیں۔ یہ ہمارے

کراچی کے مرچنڈانی کی غفلت کا نتیجہ ہے کہ مایاوتی کو دشمنوں نے قتل کر دیا۔ میں مرچنڈانی کو بھی یہاں سے واپس بھجوا دوں گا۔"

میں نے کیلاش چندر کو بالکل نہ بتایا کہ اس کی لانچ میں پرسوں دھماکہ ہوا تھا اور وہ اس میں ہلاک ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کیلاش چندر اس خبر سے بے خبر ہے۔ شاید پنڈی کے اخبار میں یہ خبر نہیں چھپی تھی۔ ویسے بھی ان تخریب کاروں کا آپس میں صرف اس وقت رابطہ ہوتا تھا جب انہیں کوئی تخریبی کارروائی کرنی ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے بے خبر رہتے تھے۔ بھارت کی خفیہ ایجنسی بھی انہیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھی۔ صرف ان کے چیف کے ہاتھ میں ان کی ڈور ہوتی تھی اور وہ ان لوگوں کی ساری کارگزاریوں سے واقف رہتا تھا۔

کیلاش چندر بولا۔

"سر! میں تو اپنی ڈیوٹی پوری ذمے داری سے ادا کر رہا ہوں۔ پنڈی اور اسلام آباد کی تمام سرکاری اور سیاسی سرگرمیوں کی پوری رپورٹ بنا کر ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس پر خفیہ کوڈ میں ہر ہفتے روانہ کرتا ہوں۔"

اچھا تو یہ دشمن دیں یہاں بیٹھا یہ تخریبی کام کر رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ چپڑاسی چائے لے کر آ گیا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ چپڑاسی چائے کی پیالیاں رکھ کر چلا گیا تو میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"تمہاری پرفارمنس سے امرتسر سنٹر اور دلی ہیڈ کوارٹر بھی بہت حد تک مطمئن ہے۔ لیکن تم یہاں جس آدمی کے ذریعے سیاسی اور سرکاری سرگرمیوں کی خفیہ رپورٹیں حاصل کرتے ہو وہ تمہیں اپ ٹو ڈیٹ رپورٹیں فراہم نہیں کرتا۔ تمہاری اکثر رپورٹیں ایسی ہوتی ہیں جو یہاں ہمارا بھارتی سفارت خانہ پہلے سے ہی روانہ کر چکا ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو یہاں اس لئے رکھا گیا ہے کہ تم ہمیں وہ معلومات مہیا کرو جو ہمارا انڈین سفارت خانہ حاصل نہیں کر سکتا۔"

کیلاش چندر کو اب اپنی پڑ گئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس جاسوسی کے

عوض انڈین سفارت خانے کے یا کسی دوسرے ذریعے سے بھاری رقم ملتی ہے۔ یہ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام تو محض ایک دکھاوا تھا۔ ایک ڈرامہ تھا۔ میں اس سے اس خاص آدمی کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس وطن دشمن کیلاش چندر کو حکومت کے تعمیری کاموں کی خفیہ رپورٹیں فراہم کرتا تھا۔ اس کام میں کوئی دشواری پیش نہ آئی اور کیلاش چندر نے مجھے اس شخص کا اصلی نام اور ایڈریس وغیرہ بتا دیا اور کہا۔

"سر! یہ آدمی اصل میں ہریانے کا ہندو ہے۔ پہلے انڈین ایمبیسی کے لئے کام کرتا تھا۔ اب کرسچین نام جیکب رکھ کر ہمارے لئے کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں آج ہی اس شخص کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ اسے فوراً یہاں بلواؤ"

کیلاش چندر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سر! اس کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم خود اس کے پاس چلے جائیں گے۔ ہمیں یہاں کی سی آئی ڈی سے بہت خبردار ہو کر رہنا پڑتا ہے سر!"

میں نے کہا۔

"وہ کہاں ملے گا؟"

کیلاش چندر نے کہا۔

"وہ شہر سے چھ سات میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہے۔ میں اسے فون پر پیغام پہنچا دوں گا کہ وہ آج شام کہیں نہ جائے اور گھر پر ہی رہے۔ وہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا سر۔ ہم شام کو یہاں سے چلے چلیں گے۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سورج غروب ہونے کے بعد یہاں تمہارے دفتر میں آجاؤں گا یہیں سے جیکب کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اب میں جاتا ہوں۔ مجھے کچھ اور ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"

کیلاش چندر مجھے چھوڑنے دفتر کے دروازے تک آیا۔ میں شام کو آنے کا کہہ

وہاں سے اپاس چل پڑا۔ میری یہ مہم بھی مکمل طور پر بخیر وخوبی انجام کو پہنچ گئی تھی۔

وہاں سے میں نے ایک ویگن پکڑی اور اسلام آباد پہنچ گیا۔ میں راولپنڈی میں رہ کر پولیس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسلام آباد کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں چائے پی۔ کچھ وقت وہاں گزارا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ کچھ وقت وہاں بیٹھا رہا۔ دوپہر کو اسی ریستوران میں کھانا کھایا۔ شام تک اسی ریستوران میں رہا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو ویگن میں سوار ہوا اور سیدھا کیلاش چندر کے آفس میں آگیا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

کہنے لگا۔

"سر! میں نے جیکب کو اطلاع پہنچا دی تھی۔ وہ گھر پر ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"تو پھر چلو"

کیلاش چندر کے پاس پرانے ماڈل کی ایک فیئٹ کار تھی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ راولپنڈی شہر سے نکلے تو شام کا اندھیرا ہو چکا تھا۔ جیکب کا مکان ایک دور افتادہ بستی میں تھا۔ وہ اپنے مکان کی بیٹھک میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے گہری نگاہ سے جیکب کو دیکھا۔ دبلا پتلا سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ شکل ہی سے بڑا عیار لگ رہا تھا۔ کیلاش چندر نے میرا تعارف کرایا تو اس نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا۔ ہم مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے یونہی سوال جواب شروع کر دیئے۔ پہلے تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ پھر ذرا اس نے اپنے اندر اعتماد پیدا کیا اور میرے سوالوں کا جواب سوچ سمجھ کر دینے لگا۔ میں نے اس کی خوب سرزنش کی کہ وہ پرانی اور غلط رپورٹیں فراہم کرتا ہے۔ اس نے بہت سی وضاحتیں کیں کہ اس کے ذرائع محدود ہیں۔ اسے زیادہ فنڈ مہیا کئے جائیں۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں یہ معلوم کر لیا کہ وہ اکیلا ہی یہ کام کرتا ہے۔ اس جاسوسی میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شامل نہیں ہے۔ میں نے پوچھ گچھ میں کافی دیر لگا دی۔ میں چاہتا تھا کہ رات جتنی گزر سکتی ہے گزر جائے رات کے دس بجے ہم نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد

میں نے جیکب سے کہا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ پنڈی چلنا ہو گا۔ میں تمہارا اور کیلاش کا تعارف کرنل چڈہ سے کرانا چاہتا ہوں تاکہ تمہارے فنڈ میں اضافے کی بات کی جا سکے۔"

کیلاش اور جیکب دونوں فنڈ میں اضافے کا سن کر خوش ہوئے۔ کوئی گیارہ بجے رات ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس پنڈی کی طرف چل پڑے۔ میں نے ساری سکیم پہلے ہی سوچ لی تھی۔ میرے پاس کوئی پستول وغیرہ نہیں تھا۔ جب گاڑی راولپنڈی شہر کے قریب ایک پرانے نالے کے پل کے پاس پہنچی تو میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"یہاں ایک طرف اندھیرے میں گاڑی روکو"

اس نے کچی سڑک پر سے گاڑی اتار کر اندھیرے میں درختوں کے پاس کھڑی کر دی۔ میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"تم میرے ساتھ آؤ"

وہ گاڑی سے نکل کر میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے اسے کہا۔

"یہاں ہماری ایک خفیہ جگہ ہے جہاں ہم نے ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے ریڈیو ٹرانسمیٹر چھپایا ہوا ہے۔ میں کرنل چڈہ کو وائرلیس پر اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس کے پاس آ رہے ہیں۔"

یہاں زمین اونچی نیچی اور سنگلاخ تھی۔ ہم برساتی نالے کے چھوٹے سے پل پر سے گزر کر دوسری طرف آ گئے۔ یہاں اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کیلاش چندر سے کہا۔

"وہ سامنے کوٹھڑی ہے۔ میں وہاں جا کر وائرلیس پیغام کرنل چڈہ کو دے کر ابھی آتا ہوں۔ تمہیں اس لئے ساتھ لایا ہوں کہ اگر کرنل چڈہ نے تم سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں تمہیں بلا لوں۔ تم یہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے کیلاش چندر کو خاص طور پر ایسی جگہ بیٹھنے کو کہا تھا جہاں اس کے پیچھے نالے کی ڈھلان تھی اب میں نے دیکھا کہ وہ بیٹھ گیا ہے تو میں رات کے اندھیرے میں اس

کوٹھڑی کی طرف چلا گیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کچھ دور تک اندھیرے میں چلنے کے بعد میں رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کیلاش چندر مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں وہاں سے ایک طرف ہٹ کر دس پندرہ قدم چلا اور اوپر سے ہوتا ہوا واپس اس طرف چل پڑا جہاں میں نے کیلاش چندر کو بٹھایا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں اس کا ہیولا دکھائی دیا۔ میں اور دوسری طرف ہٹ گیا۔ یوں ایک جگہ سے میں پل کی جانب ہو کر برساتی نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں کیلاش چندر کی پشت پر نکل آیا۔ اب میں بڑی احتیاط سے اس طرح قدم اٹھانے لگا کہ میرے قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کیلاش چندر بھی کوئی آواز نکال سکے۔ میرا یہ دشمن بلکہ میرے وطن پاکستان کا دشمن اس وقت مجھے ایک چھوٹا سا ممنہ معلوم ہو رہا تھا۔ جس کو ٹھکانے لگانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ صرف اس بات کی احتیاط کر رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے حملہ آور ہوتا دیکھ کر شور نہ مچا دے یا کوئی ایسی آواز حلق سے نہ نکال دے کہ جس کو سن کر دوسرا آدمی یعنی پاکستان کا دشمن جیکب وہاں سے گاڑی لے کر فرار نہ ہو جائے۔ اگر وہ فرار ہو جاتا ہے تو پھر اس کا دوبارہ ہاتھ آنا تقریباً ناممکن تھا۔

میں جھک کر دبے پاؤں چلتا کیلاش چندر کے پیچھے سے اس کی جانب برابر بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے ایک قدم کے فاصلے پر پہنچا اس نے شاید میری آہٹ سن لی تھی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس نے شاید مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ منہ سے کچھ بولنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کی گردن اپنی گرفت میں لے لی اور بائیں بازو کے شکنجے میں کس کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ پہلے تو مجھے لگا کہ اس کی گردن الگ ہو گئی ہے۔ مگر گردن الگ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے وہیں زمین پر لٹا کر اس کی گردن کو ہاتھ سے ٹٹول کو دیکھا۔ مجھے اس کی گردن کی ہڈی کہیں نہ ملی۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ کر نیچے چلی گئی تھی یا اس کی گردن کی کھال کافی اوپر کو کھنچ گئی تھی۔

مجھے لاش ٹھکانے لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس دشمن پاکستان کی لاش وہیں پڑی رہنے دی اور اندھیرے میں غور سے دیکھتا ہوا نالے کے پل پر سے ہو کر اس

جگہ پر آگیا جہاں جیپ گاڑی میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اکیلے آتے دیکھا تو گاڑی کی کھڑکی میں سے سر باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

"سر! کیلاش بابو کہاں ہیں؟"

میں نے اسے کہا۔

"وہ کرنل صاحب کے پاس ہے۔ تم بھی آجاؤ کرنل چڈھ نے تمہیں بھی بلایا ہے۔"

میں نے جیپ کو زیادہ دور چلنے کی تکلیف نہ دی۔ جیسے ہی وہ گاڑی میں سے نکل کر دو قدم آگے بڑھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن میں اپنا بازو ڈال کر اوپر کو کھینچتے ہوئے یکے بعد دیگرے تین جھٹکے دیئے۔ وہ بھی میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اس کی لاش بھی وہیں زمین پر اندھیرے میں ڈال دی اور خود فیٹ گاڑی میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ کر کے واپس موڑا اور راولپنڈی شہر کی طرف سڑک پر ڈال دیا۔

ابھی راولپنڈی کی روشنیاں کچھ فاصلے پر تھیں اور بڑی سڑک بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے فیٹ گاڑی کو وہیں ایک طرف چھوڑا اور خود بڑی سڑک پر آکر پنڈی شہر کی طرف چلنے لگا۔ پیچھے ایک لاری شاید لاہور سے آرہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ بس کی روشنی مجھ پر پڑی تو ڈرائیور نے ذرا آگے جا کر بس روک لی۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور راولپنڈی کے پہلے بس شاپ پر اتر گیا۔ یہاں سے میں ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ریلوے سٹیشن کے قریب ہی ایک لاری اڈہ ہے جہاں سے لاریاں آزاد کشمیر کی طرف جاتی ہیں۔ مگر یہ لاریاں دن کے وقت چلتی تھیں۔ مجھے رات گزارنی تھی۔ میں وہاں سے اپنے ہوٹل والے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہیں سٹیشن کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ دو تین مسافر پہلے سے وہاں آرام کر رہے تھے۔ ایک بید کا دیوان خالی پڑا تھا۔ میں اس پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تو میں اٹھ کر باہر پلیٹ فارم پر آگیا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس حالت میں میرا غافل ہو کر سو جانا میرے حق میں خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر چائے کا سٹال کھلا ہوا تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر چائے کا ایک گرم

کپ پیا۔ نیند غائب ہو گئی۔ وہیں ایک طرف ہو کر سگریٹ پیتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ مجھے آزاد کشمیر کی پہاڑیوں سے سیز فائر لائن کراس کر کے مقبوضہ کشمیر پہنچنا تھا۔ اس سے پہلے میں اس طرف سے کبھی مقبوضہ کشمیر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ خیال تھا کہ میں اندازے سے نکل جاؤں گا۔ پہاڑیوں میں سے نکلنا میدانی علاقے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔ یہی ایک راستہ میرے سامنے تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے کافی وقت وہاں گزار لیا۔ صبح چار بجے باہر آکر معلوم کیا تو دیکھا کہ ایک لاری آزاد کشمیر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور لاری میں بیٹھ گیا۔

آگے کی روداد میں آپ کو نہیں سناؤں گا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں کسی نہ کسی طرح پہاڑیوں گھاٹیوں اور کھائیوں میں سے ہوتا ہوا پورے ایک دن اور ایک رات میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک کشمیری کسان نے مجھے کشمیری زبان میں بتایا کہ میں مقبوضہ کشمیر میں ہوں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہاں سے سری نگر پہنچنا آسان تھا۔ میں اس علاقے کا نام نہیں بتاؤں گا جہاں میں سیز فائر لائن کراس کرنے کے بعد پہنچا تھا۔ اس مقام سے سری نگر پہنچنے میں مجھے مزید دو دن لگ گئے۔ کوئی لاری بس وغیرہ وہاں نہیں تھی۔ مجھے پیدل ہی سفر کرنا پڑا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا جب میں سری نگر کے مضافات میں پہنچ گیا۔ میں اندھیرا ہونے کے بعد کمانڈر شیروان کے خفیہ ٹھکانے پر جانا چاہتا تھا۔ سارا علاقہ میرا جانا پہچانا تھا۔ میں سری نگر شہر کے پہلو سے گزرتا ہوا شمال مشرق کی جانب جو پہاڑیاں تھیں ان کی دامن میں آکر ایک جگہ بیٹھ گیا اور اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سورج گلمرگ کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وادیوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ جب شام گہری ہو گئی تو میں خفیہ ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ راستہ مجھے معلوم تھا۔ دو تین گھاٹیوں میں سے نکلنے کے بعد جب خفیہ ٹھکانے والی پہاڑی کا موڑ آیا تو میں ایک چٹان کی اوٹ میں ہو کر اندھیرے میں ان درختوں کی طرف غور سے دیکھنے لگا جن کے پیچھے مجاہدین کا ہائیڈ آؤٹ تھا۔ ایسا میں نے احتیاط کے پیش نظر کیا تھا۔ کیونکہ کشمیر میں جنگ لڑی جا

رہی تھی اور حالات کوئی بھی شکل اختیار کر سکتے تھے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ حالات پر سکون ہیں تو میں ہائیڈ آؤٹ کی طرف چلنے لگا۔ ابھی میں درختوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے ایک نوجوان نظر آیا جس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اور منہ سر سیاہ رومال میں چھپا رکھا تھا۔ یہ سوائے اپنے حریت پسند مجاہد کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر یہ کہتا ہوا ایک طرف لے گیا کہ جلدی سے اس طرف آجاؤ۔ وہ تیز تیز چلاتا چٹانوں کے پیچھے لے گیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی زمین پر بٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں میرا نام لے کر بولا۔

"یہاں معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ کسی نے مخبری کر دی تھی۔ بھارتی فوج کی ایک پلاٹون نے اچانک حملہ کر دیا۔ ہم نے بھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ مگر ہماری نفری بہت کم تھی۔ ہمارے چھ ساتھی شہید ہو گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب بھی شہید ہو گیا۔ بھارتی مارٹر فائر کر رہے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بھارتی ایک دم سے ہمارے اوپر آگئے تھے۔ ہم نے کمانڈر شیروان کے گرد حفاظ گھیرا ڈال لیا اور چاروں طرف فائرنگ شروع کر دی مگر بھارتی سپاہیوں کی دو ایک پلاٹوا وہاں پہنچ گئیں۔ کمانڈر شیروان سامنے نکل کر فائرنگ کرنے لگے۔ ہم نے انہیں بہت کو کیا مگر ہم پر مشین گنوں کے علاوہ مارٹر کا فائر بھی آرہا تھا۔ کمانڈر شیروان زخمی ہو کرً پڑے۔ ان کے باڈی گارڈ پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔ میں ایک چٹان کی آڑ لے کر مسل فائر کر رہا تھا مگر میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔"

"کمانڈر شیروان کہاں ہیں اب؟"

میں نے پوچھا۔ مجاہد نے کہا۔

"افسوس! کمانڈر کو بھارتی فوجیوں نے زخمی حالت میں اٹھا لیا اور گرفتار کر کے

گئے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"بیس دن ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے خفیہ ٹھکانے میں چلے گئے ہیں۔ میں یہاں ہر روز رات کو ڈیوٹی دیتا ہوں تاکہ اگر آپ اس طرف آئیں تو میں آپ کو یہیں روک لوں۔ کیونکہ آگے بھارتی فوج نے اپنے آدمی بٹھا دیئے ہیں کہ اگر کوئی مجاہد ان جانے میں اس طرف آجائے تو اسے بھی پکڑ لیا جائے۔ میرے ساتھ آجائیں۔ اچھا ہوا کہ آپ دن کے وقت ادھر نہیں آئے۔ میرے ساتھ چلیں۔"

ہم دوسری طرف گھاٹی اترنے لگے۔ میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"کچھ معلوم ہے کمانڈر شیروان کو فوج کس جگہ لے گئی ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"ہم نے اپنے آدمی دوڑا دیئے ہیں۔ مگر ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ بھارتی ملٹری انٹیلی جینس نے کمانڈر کو کہاں رکھا ہوا ہے۔"

پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتے ہم وادی کی دوسری جانب ایک بہت اونچے پہاڑ کے پاس آکر رک گئے۔ یہاں اندھیرے میں سے کچھ مسلح مجاہد نکل کر ہماری طرف بڑھیں۔ میرے ساتھی مجاہد نے ان سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔"

پہاڑ کے اندر ایک قدرتی غار تھا۔ اس غار میں مجاہدین نے اپنا نیا خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا تھا۔ یہ مجاہدین کشمیری کمانڈو تھے جن کا کام گھات لگا کر بھارتی فوجیوں کے سپلائی لے جانے والے ٹرکوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنا' بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنا اور رات کو بھارتی فوجیوں کے اسلحہ خانوں اور پٹرول کے ذخیروں کو اڑانا تھا۔ کمانڈو شیروان ہمارا کمانڈر تھا۔ مجھے کمانڈو اورنگ زیب کی شہادت سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہاں جتنے کمانڈو مجاہد تھے وہ سارے میرے پاس آگئے۔ میں نے ان سے کمانڈر شیروان کے بارے میں دریافت کیا۔ کمانڈر منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"ہمارے تین آدمی کمانڈر کا سراغ معلوم کرنے کے لئے جموں گلمرگ اور کٹھوعہ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ خیال ہے کہ صبح تک ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آکر خبر دے گا۔"

رات کو میں وہیں دوسرے مجاہدین کے ساتھ سو گیا۔ صبح صبح ہم اٹھ بیٹھے۔ سب مجاہدین نے نماز فجر ادا کی۔ میں اور کمانڈو منصور احمد بٹ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہمیں کمانڈر شیروان کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ بھارتیوں نے اسے زخمی حالت میں کس جگہ پر رکھا ہوا ہے۔ ابھی تک ہمارا کوئی آدمی بھی نہیں آیا تھا۔ کمانڈر منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے کمانڈر کو یہ لوگ جموں انٹیروگیشن سنٹر میں لے گئے ہیں اس علاقے میں سب سے بڑا یہی انٹیروگیشن سنٹر ہے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر شیروان زخمی ہے۔ بھارتی اس پر مزید تشدد کر رہے ہوں گے۔ ہمیں پتہ چل جائے تو ہم کمانڈر کو اپنی جان کی بازی لگا کر وہاں سے نکال لائیں گے"

کمانڈر منصور احمد بٹ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کئی کامیاب کمانڈو آپریشن کر چکا ہے اور اس نے اب تک سینکڑوں بھارتی فوجیوں کو جہنم واصل کیا ہے۔ ہم نے سبز چائے کے ساتھ نمکین قلچوں کا ناشتہ کیا۔ دن کے دس بجے کے قریب اپنا ایک آدمی آگیا۔ اس نے بتایا کہ کمانڈر کو بھارتی فوجی امرتسر جیل میں لے گئے ہیں۔

"تمہاری اطلاع کہاں تک درست ہے"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے اس سے پوچھا۔ مجاہد نے کہا۔

"جس آدمی نے مجھے بتایا ہے اس نے اپنی آنکھوں سے کمانڈر کو امرتسر جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی میں دیکھا ہے۔ کمانڈر کو جیل کے ہسپتال میں بھی رکھا گیا تھا۔ جب گولی کا زخم ٹھیک ہو گیا تو اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔"

"امرتسر جیل کے ٹارچر سیل تو بڑے بدنام ہیں وہاں سے کوئی مجاہد زندہ باہر نہیں

آتا"

ایک مجاہد نے کہا۔

"ہمیں ابھی امرتسر جیل کی طرف چل پڑنا چاہیے۔ چاہے ہماری جانیں چلی جائیں ہم رات کو اٹیک کر کے کمانڈر کو چھڑا لے لائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر ہمیں اس وقت جذبات سے نہیں عقلمندی اور دور اندیشی سے کوئی منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اپنے کمانڈر کو بچانے کی کوشش میں الٹا ہم بھی وہاں پھنس سکتے ہیں۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"تم ہم سب میں زیادہ تجربہ کار ہو۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔"

یہ میں نے ان لوگوں کے لئے کہہ دیا تھا ورنہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے خود کمانڈر شیروان کی مدد کے لئے امرتسر جانا تھا۔ یہ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا جب مجھے پتہ چلا تھا کہ کمانڈر شیروان کو بھارتی فوجی امرتسر لے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ کمانڈر شیروان کو بھارتی فوج نے پکڑا ہے اور وہی اس سے پوچھ گچھ بھی کرے گی پھر اسے امرتسر چھاؤنی کی بجائے امرتسر جیل میں کیوں لے گئے ہیں۔ یہ بات امرتسر کے رہنے والوں اچھی طرح معلوم ہو گی کہ امرتسر شہر میں ایک چھاؤنی بھی تھی۔ اگرچہ اس نام کا کوئی ریلوے سٹیشن نہیں تھا۔ جیسا کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں فوجی چھاؤنیوں کے الگ ریلوے سٹیشن ہوتے ہیں جس طرح انبالہ شہر اور انبالہ چھاؤنی' میرٹھ شہر اور میرٹھ چھاؤنی وغیرہ۔ امرتسر میں چھاؤنی ضرور تھی مگر اس کا کوئی ریلوے سٹیشن نہیں تھا۔ یہ چھاؤنی شہر سے مغرب کی جانب واقع تھی اور شہر کے بہت قریب بلکہ شہر میں ہی تھی۔ دوسرے شہروں کی چھاؤنیوں کا کوئی قلعہ شاید ہی ہو مگر امرتسر

چھاؤنی کا ایک قلعہ بھی تھا اور چھاؤنی قلعے کے اندر ہی تھی۔ اس قلعے کے باہر ایک رستا بغیر گھاس کے میدان تھا جس کو قلعے کی پریڈ کہتے تھے۔ بچپن میں ہم مجیٹھے سے امرتسر شہر میں جب آئے تھے تو اس میدان میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال اور گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے اس قلعے میں گوروں کی پلٹنیں رہا کرتی تھیں۔ یہ قلعہ امرتسر کے ہاتھی دروازے کے آگے لاہوری دروازے کے باہر جو سڑک ریلوے کے پل ریگو برج کی طرف جاتی تھی اس کی ایک طرف تھا۔ آگے جی ٹی روڈ تھی جو لاہور کو جاتی تھی۔ یہاں قلعے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے پار ایک چھوٹا سا سینما گھر تھا جو گورے فوجیوں کے لئے بنایا گیا تھا اور جہاں انگریزی فلمیں چلا کرتی تھیں۔ انگریزوں کے جانے کے بعد یہاں انڈیا کی فوج رہنے لگی تھی اور اس سینما گھر میں انگریزی کے علاوہ بھارتی فلمیں بھی چلنے لگی تھیں۔ اس سینما ہاؤس کے پیچھے کھیت تھے اور ان کھیتوں میں سکھوں کے خالصہ کالج کی پرانی طرز کی شاندار عمارت تھی۔ امرتسر میں اپنا ایک مجاہد پہلے سے لاہور کی جانب جاتی سڑک یعنی جی ٹی روڈ پر ایک انڈین سینما ہاؤس کے قریب دائم گنج کی بستی میں دکان کرتا تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ دائم گنج میں قیام پاکستان سے پہلے مسلمان رہا کرتے تھے مگر پاکستان بنا تو ان میں سے اکثر مسلمان گھرانوں کو سکھوں ہندوؤں نے شہید کر دیا جو باقی بچے تھے وہ جانیں بچا کر پاکستان چلے گئے تھے۔ اب اس بستی کے مکانوں میں زیادہ تر سکھ شرنارتھی آباد تھے۔ اس بستی میں ہمارا آدمی ہندو بن کر دکان کرتا تھا۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ یہ مجاہد فوٹوگرافی کی دکان کرتا تھا۔ یہ میں نے فرضی طور پر کہہ دیا تھا۔ حقیقت میں وہ کوئی اور کام کرتا تھا۔ اگرچہ اب وہ مجاہد دائم گنج میں نہیں رہتا اور اپنے مشن کی مدت پوری کرنے کے بعد جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے واپس مقبوضہ کشمیر چلا گیا ہے لیکن جس زمانے کی میں یہ داستان بیان کر رہا ہوں اس زمانے میں وہ دائم گنج میں ہی تھا۔ میں کمانڈر شیروان کو جیل سے فرار کروانے میں اپنے اس مجاہد سے مدد لے سکتا تھا۔ اس قسم کے مشن کے لئے ایسے ایک آدمی کا موجود ہونا بڑا مفید ہو

چنانچہ کچھ دیر بعد جب میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ کو بتایا کہ کمانڈر شیروان کو بھارتی قید سے آزاد کرانے کے لئے میں خود امرتسر جاؤں گا تو وہ بولا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا"

میں نے ایک لمحے کے لئے غور کرنے کے بعد کہا۔

"کمانڈو منصور! اس مشن کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ تمہارے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری یہاں زیادہ ضرورت ہے۔"

مگر وہ ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دوست! تم بہت جوشیلے آدمی ہو۔ یہ جوش جنگ کے محاذ کے لئے تو بڑا کارآمد ہے مگر کمانڈو مشن میں یہ جوش آدمی کو الٹا مروا بھی دیتا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"خدا کی قسم میں جتنا جوشیلا کشمیری مسلمان ہوں اتنا ہی متحمل مزاج بھی ہوں۔ اگر تم مجھے ساتھ نہ لے گئے تو میں اپنے طور پر اکیلا ہی اپنے کمانڈر کو بھارتیوں کی قید سے رہا کروانے کے لئے چلا جاؤں گا"

میں نے سوچا کہ اس آدمی سے کوئی بعید نہیں کہ ادھر میں اس مشن پر روانہ ہو جاؤں اور میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد یہ بھی اس مشن پر چل پڑے۔ یوں ہم دونوں کا کام خراب ہو سکتا تھا۔ بلکہ بہت ممکن تھا کہ ہم دونوں ہی وہاں کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ میں نے بھی بہتر سمجھا کہ چلو اس کو ساتھ لئے چلتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے دوست! اگر تم اس مشن پر ضرور جانا چاہتے ہو تو پھر اکیلے جانے سے بہتر ہے کہ میرے ساتھ چلو"

کمانڈو منصور بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں اپنے ساتھ کیا کیا چیزیں لے جانی ہوں گی؟"

میں نے اسے کہا۔

"یہ اگر کوئی فوجی آپریشن ہوتا اور ہم دشمن کا کوئی پٹرول یا ایمونیشن کا ذخیرہ یا پل اڑانے جا رہے ہوتے تو ہمیں دستی بموں ٹائم بموں اور دوسرے چھوٹے اسلحہ کی ضرورت ہوتی مگر یہ ایک دوسری قسم کا کمانڈو آپریشن ہے۔ اس میں اسلحہ کی بجائے دماغ کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ ہاں ایک دو آٹومیٹک پستول اور کچھ میگزین ساتھ لے چلیں گے۔ باقی جس چیز کی ضرورت ہوگی امرتسر میں اپنا ایک آدمی بیٹھا ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"تو تم ہمارے مجاہد سے مل چکے ہو۔ میرا خیال تھا شاید تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔ وہ ہمارا بڑا جانباز حریت پرست ساتھی ہے اور امرتسر میں کئی برسوں سے اپنے لئے کام کر رہا ہے اور اس کے ذریعے ہمیں بھارتی فوجوں کی تازہ نقل و حرکت اور ان کی کشمیر کے فوجی منصوبوں کے بارے میں بڑی مفید رپورٹیں ملتی رہتی ہیں۔"

میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ کو زیادہ بتانا ضروری نہ سمجھا۔ بس یہی کہا کہ ہاں میں دو ایک بار اس مجاہد کے پاس تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا تھا اور اس کے بارے میں مجھے کمانڈر شیروان نے ہی بتایا تھا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ نے کہا۔

"میرے ذہن میں بھی اپنے امرتسر والے مجاہد کا ہی خیال تھا۔ وہ اس مشن میں ہمارے کام آسکتا ہے۔ باقی ہم یہاں سے دو آٹومیٹک پستول ساتھ لیتے چلیں گے۔ بھارتی فوج کا ہم نے کافی اسلحہ چھین کر رکھا ہوا ہے۔"

ہم نے اپنے کمانڈو مشن پر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کسی زیادہ تیاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے کپڑے کشمیر کی پہاڑیوں میں پیدل سفر کرنے سے کافی پھٹ گئے تھے۔ میری گرم جیکٹ بھی خراب ہو رہی تھی۔ میں نے ایک گرم جیکٹ اور پرانی مگر صاف ستھری میل خورے رنگ کی پتلون پہن لی۔ کمانڈو کبھی بھڑکیلے اور شوخ رنگوں والے کپڑے نہیں پہنتا۔ خاص طور پر جب وہ کسی مشن پر جاتا ہے تو گہرے اور میل خورے رنگ کی پتلون جیکٹ پہن لیتا ہے۔ اندھیرے میں یہ لباس نمایاں ہو کر دکھائی

نہیں دیتا۔ جب کہ شوخ رنگوں پر دن کے وقت بھی لوگوں کی ضرور نظر پڑتی ہے۔ ہم نے کچھ انڈین کرنسی اور ایک ایک آٹومیٹک پستول اور کچھ میگزین ساتھ رکھ لیے۔ ہر میگزین میں بارہ بارہ گولیاں تھیں جس کو پستول کے اندر خالی میگزین نکال کر چڑھا دیا جاتا تھا۔ یہ آٹومیٹک پستول نئے نئے بھارتی فوج کے پاس آئے تھے جو کشمیری مجاہدین نے ایک اسلحہ ڈپو پر شب خون مار کر دوسرے اسلحے کے ساتھ حاصل کئے تھے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ درمیانے مگر ورزشی جسم والا نوجوان تھا اور کئی معرکے مار چکا تھا۔ اسے کمانڈو ایکشن کا کافی تجربہ تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اردو اور پنجابی کشمیری لہجے کے بغیر بول لیتا تھا۔ یوں اسے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ کوئی نوجوان کشمیری ہے۔ رنگ اس کا میری طرح صاف ضرور تھا۔ مگر یہ کوئی تشویش والی بات نہیں تھی۔

ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ سے منہ اندھیرے روانہ ہوئے۔

خاص پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم جس وقت شہر سے کافی آگے کی جانب جموں بانہال جانے والی سڑک پر آئے تو دن نکل چکا تھا۔ ہم اپنی شکل صورت اور لباس سے دفتر میں کام کرنے والے بابو لگتے تھے۔ سری نگر شہر کے بڑے پل پر چیکنگ کا خطرہ تھا۔ وہاں سے ہم آگے نکل آئے تھے۔ اب خطرہ جموں شہر میں داخل ہوتے وقت تھا۔ مگر وہاں بھی چیکنگ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سی آئی ڈی والے ضرور ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ باہر سے آتے وقت لاری اڈے اور ریلوے سٹیشن پر مشکوک افراد کی اسی وقت تلاشی لے لی جاتی تھی۔ مگر جموں سے نکلتے ہوئے اتنی سختی نہیں ہوتی تھی۔

سری نگر کی طرف سے ایک لاری آئی۔

ہم نے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ معلوم ہوا لاری صرف بانہال تک جائے گی۔ ہم بیٹھ گئے کہ بانہال میں رات گزاریں گے اور وہاں سے صبح کے وقت جموں کی لاری پکڑ لیں گے۔ لاری نے ہمیں بانہال پہنچا دیا۔ یہاں تک بالکل خیریت رہی۔ رات ہم نے لاری اڈے کے ایک ہوٹل کی کوٹھڑی میں بسر کی۔ یہاں سردی زیادہ تھی۔ صبح صبح جموں والی لاری میں سوار ہو گئے۔ جموں قریب آنے لگا تو ہم محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم الگ الگ

سیٹوں پر فاصلہ ڈال کر بیٹھے تھے اور راستے میں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ لاری جموں کے اڈے پر پہنچ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے کمانڈو منصور احمد ڈار کو ہوشیار رہنے کے لئے کہا۔ کیونکہ مجھے وہاں ایک مشکوک صورت آدمی نظر آگیا تھا جو یقیناً سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ ہم لاری میں سے اتر کر الگ الگ ہو کر اڈے سے نکل پڑے۔ یہ ہم نے پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ ہمیں اڈے سے نکل کر کہاں جانا ہے۔

کمانڈو منصور پہلے گیا۔ اس کے پیچھے تھوڑا فاصلہ ڈال کر میں بھی چل پڑا۔ چوک آیا تو یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے پیچھے کوئی سی آئی ڈی والا لگا ہے یا نہیں میں سگریٹ پان والی دکان پر رک گیا۔ میں نے سگریٹ خریدنے کے بہانے پیچھے نگاہ ڈالی۔ شام ہو رہی تھی۔ بازار میں لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ مجھے سی آئی ڈی والے کی شکل کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ میرے پیچھے نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اسے مجھ پر شک شبہ نہیں ہوا تھا۔ جو بازار ریلوے سٹیشن کی طرف جاتا تھا اس کے شروع میں ایک ہوٹل تھا جس کا نام شاید شردھا نند ہوٹل تھا۔ ہم نے یہیں آکر ملنے کا طے کیا ہوا تھا۔ میں ہوٹل کے اندر داخل ہوا تو کونے میں کمانڈر منصور احمد ڈار بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ امرتسر جانے والی گاڑی شام کے سوا سات بجے جموں سے روانہ ہونے والی تھی۔ ابھی کافی وقت تھا۔ ہم وہیں ہوٹل میں کونے والی میز کے پاس بیٹھے رہے۔ ہم نے وہیں کھانا منگوا کر کھایا۔ پھر چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ پیتے اور وقت گزارتے رہے۔

جموں توی کا سٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پندرہ منٹ پہلے سٹیشن پر آگئے۔ کمانڈر منصور احمد بٹ جا کر دو ٹکٹ لے آیا۔ ٹرین اتنے میں پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔ مسافر سوار ہونے لگے۔ ہم بھی ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی موجود تھے مگر کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ مسافروں کا رش بھی کافی تھا۔ ٹرین چل پڑی۔ راستے میں اس کا انجن خراب ہو گیا۔ وہاں اس نے کافی دیر لگا دی۔ جالندھر پہنچتے پہنچتے کافی رات ہو گئی۔ جالندھر ریلوے سٹیشن پر سکھ پولیس کافی تعداد میں موجود تھی۔ میں نے کمانڈر منصور احمد بٹ کی طرف دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر بڑی

جلدی ہمیں معلوم ہو گیا کہ پولیس کی گارڈ جالندھر سے انبالے جا رہی ہے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی جالندھر سٹیشن پر کافی دیر تک رکی رہی۔ ہم اپنے ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ پولیس کی پارٹی کو امرتسر سے دلی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ چنانچہ سکھ سپاہی بیزاری کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کچھ ٹی سٹال کے پاس بنچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آخر ٹرین نے وسل دیا اور امرتسر کی طرف کھسکنے لگی۔ جالندھر سے امرتسر کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ٹرین کی رفتار سست تھی۔ اس نے دو گھنٹوں میں ہمیں امرتسر پہنچایا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ امرتسر سٹیشن پر بھی پولیس موجود تھی مگر تین چار سپاہی ہی تھے جو دور کھڑے مسافروں کو ٹرین سے اترتے دیکھ رہے تھے۔ ہم یہاں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر سٹیشن سے باہر نکلے۔ ہم دونوں کو امرتسر میں مقیم اپنے مجاہد کے مکان کا پتہ معلوم تھا۔ خطرہ ہمیں صرف اس بات کا تھا کہ ہمارے پاس پستول تھے۔ مگر ہم خیریت سے سٹیشن کی حدود سے نکل گئے۔ واہگہ بارڈر کو جانے والی سڑک سردی کی وجہ سے سنسان پڑی تھی۔ میں گرمی کے موسم میں ایک بار رات کو یہاں سے گزرا تھا تو دکانوں کے آگے چارپائیوں پر لوگ سو رہے تھے۔ اب وہاں کوئی چارپائی نہیں تھی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی ہم ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ ڈال کر آگے پیچھے ہو گئے تھے۔ میں آگے آگے چل رہا تھا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ میرے پیچھے کوئی دس بارہ قدم کے فاصلے پر سڑک کی ایک طرف ہو کر آرہا تھا۔

دائم گنج کی آبادی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی تو قریب بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب کھیتوں میں ہو گیا۔ کمانڈو منصور بھی میرے پیچھے پیچھے کھیتوں میں آگیا۔ یہاں اندھیرا تھا مگر پولیس کے کسی سپاہی کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ اس علاقے میں رات کو پولیس ضرور گشت پر ہوتی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ آگے چھاؤنی تھی۔ دائم گنج کے مکانوں کی روشنی دور سے نظر آرہی تھی۔ اب ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے اور ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ہم اپنے مجاہد کے مکان پر آگئے۔ دروازہ اندر سے بند

تھا۔ میں نے آہستہ سے مخصوص دستک دی۔ دوسری بار دستک دینے پر اوپر والے کمرے کی کھڑکی کھلی اور اپنے مجاہد نے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کون ہے بھئی؟"

حالانکہ وہ میرے دستک دینے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ کوئی حریت پرست مجاہد ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے اوپر منہ کر کے کہا۔

"مہاراج! پٹیالے سے آپ کے تایا جی آئے ہیں۔"

یہ میں نے اس لئے بلند آواز میں کہا تھا کہ اگر آس پاس کے گھروں میں کوئی سن رہا ہو تو اسے شک نہ پڑ جائے کہ آدھی رات کو کون ملنے آیا ہے۔ مجاہد نے نیچے آکر دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ سے اور مجھ سے وہ بغل گیر ہو کر ملا اور پہلا سوال اس نے یہ کیا۔

"تمہارے پیچھے کوئی سی آئی ڈی والا تو نہیں لگا ہوا تھا؟"

میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے"

مجاہد کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے اس وقت تم لوگ آرام کرو کل صبح بات ہو گی۔"

بیٹھک میں زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ مجاہد اوپر سے دو لحاف لے آیا۔ ہم وہیں لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ اگلے روز دن چڑھے اٹھے۔ مجاہد کہنے لگا۔

"میں کام پر جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کا ناشتہ کچن میں تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ جب تک میں نہ آؤں مکان سے باہر مت جانا"

وہ چلا گیا۔ ہم نے کچن میں جا کر چولہے کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کیا اور واپس بیٹھک میں آکر لحاف گھٹنوں تک اوڑھ کر دری پر بیٹھ گئے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ کمانڈر شیروان اگر امرتسر جیل میں ہے تو کونسی پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہے کیونکہ امرتسر جیل کافی بڑی جیل ہے اور اس

کئی چکیاں ہوں گی"

میں نے کہا۔

"اپنا مجاہد یہ سب معلوم کر لے گا۔ اس نے سراغ رسانی کے لئے کچھ خاص آدمی رکھے ہوئے ہیں جو وادی کے کشمیری مسلمان ہی ہیں اور اس شہر میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔"

• ایک گھنٹے بعد مجاہد آگیا۔

وہ ہمارے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ یہاں کیسے آنا ہوا ہے؟"

جب ہم نے اسے بتایا کہ بھارتی فوج نے ہماری کیمپ گاہ پر حملہ کر کے کمانڈر شیروان کو گرفتار کر لیا ہے اور ہماری اطلاع کے مطابق اسے امرتسر جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے تو وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ہماری طرف چہرہ اٹھا کر بولا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔ کمانڈر شیروان کا پکڑا جانا ہماری تحریک آزادی کے لئے برا شگون ہے۔ لیکن خیر۔ کوئی بات نہیں۔ اس وقت کشمیر کا بچہ بچہ کمانڈر شیروان ہے۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے کہا۔

"ہمارا خیال تھا کہ کمانڈر کو انڈین ملٹری انٹیلی جینس جموں کے انٹیروگیشن سنٹر میں لے گئی ہو گی۔ لیکن ہمیں اطلاع ملی کہ کمانڈر کو امرتسر جیل میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ تحریک آزادی کشمیر کی بڑی اہم شخصیت ہے اور بھارتی فوج اور کشمیر کی ہندو پولیس ایک مدت سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی"

میں نے کہا۔

"ہم اپنے کمانڈر کو امرتسر جیل سے نکالنے آئے ہیں"

مجاہد نے سگریٹ سلگا لیا تھا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ منصور احمد بٹ نے کہا۔

"سب سے پہلے تو اس بات کی تصدیق ہونی چاہیے کہ کمانڈر شیروان امرتسر جیل

میں ہی ہے۔ اس کے بعد پھر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے جس پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کیا گیا ہے اس کا رخ جیل کی کس جانب ہے اور وہاں سے جیل کی بڑی دیوار کتنی دور ہے۔"

اپنے مجاہد نے ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اتنی لمبی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ساری معلومات کل تک حاصل ہو جائیں گی۔"

وہ سارا دن ہم نے مجاہد کے مکان کے اندر رہ کر ہی گزار دیا۔ رات کو باری باری نکل کر کھیتوں میں تھوڑی دیر کے لئے ٹہلنے گئے اور پھر واپس مکان میں آ گئے۔ رات کو اپنا مجاہد دکان بند کر کے آیا تو اس نے سب سے پہلا انکشاف یہ کیا کہ کمانڈر شیروان امرتسر جیل میں نہیں ہے۔ ہم اس کا منہ تکنے لگے۔

"تو پھر فوج اسے کون سے شہر میں لے گئی ہے؟"

کمانڈو منصور احمد بٹ کے اس سوال پر مجاہد نے ہمارے پاس اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر اسی شہر میں ہے۔ مگر امرتسر جیل میں نہیں ہے۔ اسے امرتسر چھاؤنی کے قلعے میں رکھا گیا ہے۔ مجھے جو اطلاع ملی ہے اس کے مطابق کمانڈر شیروان پر شدید تشدد کیا جا رہا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے وہاں خاموشی چھا گئی۔

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ کمانڈر بھارتی انٹیلی جینس کی تحویل میں ہے"

مجاہد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ پنجاب کی خفیہ پولیس کی حراست میں ہے اور پنجاب پولیس ہی اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

"مگر امرتسر چھاؤنی کے قلعے میں تو فوج مقیم ہے"

کمانڈو منصور احمد بٹ کی اس بات کے جواب میں مجاہد نے کہا۔

"کسی زمانے میں یہاں قلعے میں رہا کرتی تھی مگر اب ایک عرصے سے یہ قلعہ پنجاب کی خفیہ پولیس کا ہیڈ کوارٹر بن چکا ہے۔ یہاں بڑے خطرناک مجرموں کو لایا جاتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ کرنے والے بے حد ظالم سنگدل اور تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"کمانڈر شیروان کبھی زبان نہیں کھولے گا لیکن یہ لوگ قلعے میں اس پر بہت تشدد کریں گے۔ مجھے خطرہ ہے کہ تشدد سے کہیں کمانڈر شہید نہ ہو جائے۔"

مجاہد نے کہا۔

"اس بات کا امکان موجود ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے قلعے میں ہماری رپورٹ کے مطابق ایسے کئی مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تھا اور انہیں پنجاب پولیس نے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور وہ شہید ہو گئے۔"

میں نے مجاہد سے کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں جتنی جلدی ہو سکے کمانڈر شیروان کو قلعے سے نکالنا ہو گا۔ اس سلسلے میں تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

مجاہد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"صرف کمانڈر کو قلعے سے باہر نہیں نکال سکتا باقی تمہاری ہر قسم کی مدد کی کوشش کرنے کو تیار ہوں"

میں نے مجاہد سے کہا۔

"کیا کسی طرح ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کمانڈر کو قلعے میں کس جگہ پر رکھا گیا ہے اور جس جگہ پر رکھا گیا ہے اس کا رخ قلعے کی چار دیواری کی کس جانب ہے؟"

مجاہد نے آہستہ آہستہ سرہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ معلوم ہو جائے گا۔"

کمانڈو منصور احمد بٹ نے سوال کیا۔

"کیا ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ قلعے کے اندر خفیہ پولیس کے دفاتر شام کو کس وقت بند ہو جاتے ہیں اور بند ہو جانے کے بعد وہاں کہاں کہاں پہرہ ہوتا ہے اور دفتروں کی صفائی کرنے والے خاکروب کس وقت قلعے میں داخل ہوتے ہیں کتنی دیر تک قلعے کے اندر جھاڑو وغیرہ دیتے رہتے ہیں؟"

مجاہد اسی طرح بے نیازی سے سگریٹ پیتے ہوئے آہستہ آہستہ سرہلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سب معلومات آپ کو مل جائیں گی مگر وقت لگے گا۔"

"زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے"

میں نے کہا۔ مجاہد بولا۔

"صرف آج اور کل کا دن دے دو۔ کل رات کو مجھے جس قدر معلومات مل سکیں تمہیں آکر بتا دوں گا۔"

وہ دن اور اس سے اگلا دن ہم نے اپنے مجاہد کے مکان کے اندر ہی بڑی بے چینی سے گزارا۔ دوسرے روز رات کو مجاہد دکان بند کرنے کے بعد سیدھا گھر پر آگیا۔ ہم بے تابی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مجاہد ہمیں اوپر والی منزل کی بیٹھک میں لے گیا۔ وہاں ہمارے سامنے زمین پر بچھی ہوئی جازم پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کمانڈر شیروان کو قلعے کے اندر زمین دوز تہہ خانے میں رکھا گیا ہے۔ اس کا رخ قلعے کی مشرقی جانب ہے۔ یعنی جس طرف ریلوے کا ریگو برج ہے۔ تہہ خانے سے باہر قلعے کی پرانی سیڑھیاں ہیں جو اوپر قلعے کی چھت کو جاتی ہیں۔ قلعے کے اس رخ سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ قلعے کے اس رخ پر قلعے کی چھت پر ایک مورچہ سا بنا ہوا ہے۔ یہ سیمنٹ کا مورچہ ہے اور اس میں تین چار چوڑے سوراخ ہیں۔ جب فوج قلعے میں رہتی تھی تو یہاں مشین گن پوسٹ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب یہ مورچہ بالکل خالی پڑا ہے۔"

میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"رات کو قلعے کی چھت پر پولیس کے کتنے سپاہی پہرے پر ہوتے ہیں؟"

مجاہد نے جواب دیا۔

"مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق قلعے کی چھت پر رات کو کوئی سپاہی پہرے پر نہیں ہوتا۔ مگر جس تہہ خانے میں کمانڈر قید ہے اس کے دروازے پر ہر وقت ایک مسلح سپاہی موجود ہوتا ہے۔ ہر چار گھنٹے کے بعد اس کی جگہ نیا سپاہی پہرے پر آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ قلعے کے اندر دفتر پانچ بجے شام کو بند ہو جاتے ہیں۔ سٹاف اپنے اپنے گھروں کو چلا جاتا ہے۔ لیکن پولیس وہاں جگہ جگہ پہرے پر موجود ہوتی ہے۔ ایک دو خفیہ پولیس کے افسر بھی رات کی ڈیوٹی پر ضرور رہتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے کمانڈر شیروان سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ قلعے کے اندر دو چھوٹی سڑکیں جو خفیہ پولیس کے دفاتر کے آگے سے ہوتی ہوئی ایک دوسرے کو کاٹتی شمالاً جنوباً قلعے کی دیوار تک چلی جاتی ہیں۔ ان پر جھاڑو دینے والا عملہ صبح منہ اندھیرے آجاتا ہے اور دفتر کھلنے سے پہلے واپس چلا جاتا ہے۔ دفتروں کی جھاڑ پونچھ چپڑاسی کرتے ہیں۔"

اپنے مجاہد نے ہمیں قلعے کے اندر کی جس قدر تفصیل بتا دی تھی مجھے اس کی امید نہیں تھی۔ ایک طرح سے قلعے کے اندر کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔

میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"قلعے کے دروازے کی کیا صورت حال ہے؟ میرا مطلب ہے رات کے وقت کیا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے؟"

مجاہد نے کہا۔

"دروازہ لوہے کا ہے۔ وہ شام ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا دروازہ ہے۔ وہ کھلا رہتا ہے۔ اس کو تالا نہیں لگایا جاتا۔ دروازے کے اندر باہر دونوں جانب مسلح پولیس کے دو دو سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر ہروقت موجود رہتے ہیں۔ ان کی ڈیوٹیاں بھی چار چار گھنٹے کے بعد بدل جاتی ہیں اور پہلے سپاہیوں کی جگہ دوسرے سپاہی آجاتے ہیں۔ دن کے وقت بھی بغیر شناختی کارڈ دکھائے کوئی دفتر کا آدمی بھی قلعے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

اپنے مجاہد نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اب ہمارا کام شروع ہونا تھا۔ میں اور کمانڈو منصور احمد بٹ اپنے مجاہد کی فراہم کی ہوئی معلومات کی روشنی میں کمانڈر شیروان تک قلعے کے اندر پہنچنے اور وہاں سے اسے باہر نکالنے کی منصوبہ بندی پر کافی دیر تک غور و فکر کرتے رہے۔ ہمارے پاس دو آٹو میٹک پستول تھے۔ ہمیں اس پر لگانے کے لئے سائی لینسروں کی اشد ضرورت تھی۔ قلعے کے اندر پہنچ جانے کی صورت میں اگر کوئی ایمرجنسی پیدا ہو جاتی ہے تو ہم ایسا فائر نہیں کر سکتے تھے جس کا دھماکہ پیدا ہو۔ یہ دھماکہ قلعے میں پولیس کی ساری نفری کو بیدار کر کے ہمارا منصوبہ خاک میں ملا سکتا تھا۔ ہم نے ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس وقت رات کے تین بج چکے تھے۔ کمانڈو منصور احمد ڈار نے کہا۔

"کیا اپنا مجاہد پستولوں کے لئے سائی لینسر مہیا کر سکے گا؟"

میں نے کہا۔

"یہ تو صبح اس سے بات کرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔"

اس کے بعد ہم سو گئے۔ صبح اٹھے تو دن کے نو بج رہے تھے اور مجاہد خود ناشتہ کر چکا تھا اور ہمارے لئے ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ مجاہد دکان پر جانے کے لئے تیار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم سے دو چار ضروری باتیں کرنی ہیں۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس بیٹھ سکو گے؟"

وہ ہمارے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔

"کیوں نہیں۔ بتاؤ کیا بات ہے"

میں نے اسے اپنا سارا منصوبہ بتا دیا اور کہا۔

"ہمیں دو جوڑے ایسے کپڑوں کے چاہئیں جس قسم کے کپڑے یہاں کے ہندو مزدور عام طور پر پہنتے ہیں۔ مگر سب سے ضروری چیز جو ہمیں درکار ہے وہ ہمارے آٹو میٹک پستولوں کے لئے دو سائی لینسر ہیں۔ کیا تم ہمارے پستولوں پر فٹ آجانے والے دو سائی لینسر پیدا کر سکو گے؟"

مجاہد نے اپنی مخصوص بے نیازی سے جواب دیا۔

"مجھے دونوں پستول خالی کر کے دے دو۔ میں کوشش کروں گا۔"

میں نے اسی وقت دونوں پستولوں کے میگزین نکالے اور انہیں مجاہد کے حوالے کر دیا۔ اس نے دونوں پستول اپنی قمیض کے اندر چھپا لئے اور بولا۔

"دروازے کو اندر سے اچھی طرح بند کر لینا اور باہر بالکل نہ نکلنا"

وہ چلا گیا۔ وہ ہمیں رات کے وقت بھی مکان سے نکلنے کی بڑی مشکل سے اجازت دیتا تھا۔ یہ بات ضروری بھی تھی۔ اس لئے کہ ہم بڑے اہم مشن پر آئے ہوئے تھے اور اس مشن کے لئے ضروری تھا کہ ہم لوگوں کی نظروں میں نہ آئیں۔ وہ دوپہر کو کھانا کھانے بھی نہ آیا۔ ہم دونوں نے رات کا بنا ہوا کھانا کھا لیا۔ وہ رات کو آیا۔ کہنے لگا۔

"مجھے شہر سے دور ایک گاؤں میں جانا پڑ گیا تھا۔ جس آدمی کے پاس تمہارے پستولوں کے سائز کے سائی لینسر تھے وہ بارڈر کے پاس ایک گاؤں میں رہتا ہے۔"

اس نے قمیض کے اندر سے دونوں پستول نکال کر ہمارے حوالے کئے۔ دونوں کی نالیوں پر سائی لینسر چڑھے ہوئے تھے۔

"اپنی تسلی کر کے دیکھ لو۔ اگر انیس بیس کا فرق ہے تو یہ تبدیل بھی کئے جا سکتے ہیں"

میں نے سائی لینسر کو کھول کر دوبارہ لگایا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ نے بھی اپنے پستول کے سائی لینسر کو کھول کر دوبارہ فٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ بالکل صحیح ہیں"

"ہاں"

میں نے کہا۔

مجاہد کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وہ صبح بتا دینا صبح تمہارے لئے پرانے کپڑے بھی لے آؤں گا"

میں نے کہا۔

"ہمیں دو زمین کھودنے والی کھرپیاں اور ایک پیائش کرنے والا فیتہ بھی چاہئے"

مجاہد نے کچن میں سے جواب دیا۔

"صبح یہ دونوں چیزیں تمہیں مل جائیں گی"

دوسرے دن وہ نو بجے گھر سے نکل گیا اور گیارہ بجے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پٹ سن کا تھیلا تھا۔ تھیلے میں ہمارے لئے ہندو پہناوے کے دو پرانے گرم کوٹ اور دو میلی سی پگڑیاں تھیں جنہیں پنجاب کے ہندو مالی باغبان سر پر باندھا کرتے ہیں۔ سارا منصوبہ ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے تیاری شروع کر دی۔ جب ہم نے پاجامے کرتے پہن کر سروں پر الٹی سیدھی پگڑیاں باندھیں تو مجاہد ہنس کر بولا۔

"تم دونوں کسی سرکاری دفتر کے باغیچے کے مالی لگتے ہو"

میں نے کہا۔

"بس میں یہی چاہتا تھا۔ اب تم ایسا کرو کہ ہمارے ماتھوں پر سرخ پنسل یا سرخ

روشنائی سے ہندوؤں والے تلک لگا دو"

اس کے پاس نہ سرخ روشنائی تھی نہ سرخ پنسل تھی۔ کہنے لگا۔

"یہ ہندو سکھوں کا شہر ہے۔ میں بازار سے ابھی تلک لگانے والا بنا بنایا رنگ لے آتا ہوں۔"

وہ دائم گنج کی دکان سے ایک چھوٹی سی ڈبی خرید کر لے آیا جس میں سرخ رنگ گھلا ہوا تھا۔ اس نے میرے اور کمانڈر منصور احمد بٹ کے ماتھوں پر ابروؤں کے درمیان جس طرح ہندو تلک لگاتے ہیں دو تلک لگا دیئے۔ اب ہم پورے ہندو لگنے لگے تھے۔ ہم نے کھرپیاں ہاتھوں میں پکڑ لیں اور خاموشی سے مکان سے نکل کر گلی میں سے ہوتے ہوئے پیچھے کھیتوں میں آکر ریگو برج کی طرف چل پڑے۔ کیونکہ میں اس سارے علاقے سے واقف تھا اس لئے میں ذرا آگے آگے چل رہا تھا۔ ہمیں وہاں جا کر جو کچھ کرنا تھا وہ مجھے بھی معلوم تھا اور منصور احمد بٹ کمانڈو کو بھی معلوم تھا۔

ریگو برج والی سڑک کو پار کر کے ہم بائیں جانب قلعے کی پریڈ میں داخل ہو گئے۔ قلعے کا یہ میدان جیسا میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا اس طرح سنگلاخ اور ریتلا تھا۔ صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ بدرو کی جانب کھوکھوں کی ایک قطار نظر آرہی تھی جہاں نئی میوہ منڈی بن گئی ہوئی تھی۔ قلعے کی اونچی اور قدیم دیوار والی عمارت قریب آرہی تھی۔ ہم قلعے کی دیوار کی مشرق کی سمت آگئے۔ ہم ہاتھوں میں کھرپے لئے بڑے مزے مزے سے چل رہے تھے۔ کوئی دیکھتا تو یہی لگتا کہ ہم کمیٹی کے مالی ہیں۔ قلعے کی مشرقی جانب والی دیوار سے کوئی تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر آکر ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے سگریٹ سلگا لئے اور سگریٹ پیتے ہوئے قلعے کی دیوار کی چھت کی طرف دیکھا قلعے کی دیوار ساٹھ ستر فٹ اونچی ہو گی۔ اوپر ایک سیمنٹ اور اینٹوں سے بنا ہوا چھجہ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کے نیچے دیوار میں چار چوکور سوراخ بنے ہوئے تھے۔

میں نے وہ سوراخ کمانڈو منصور احمد بٹ کو دکھایا اور کہا۔

"یہیں وہ مورچہ ہے جہاں فوج کے زمانے میں مشین گن کی پوسٹ ہوا کرتی تھی۔

اب اٹھ کر اپنا کام بھی ساتھ ساتھ شروع کرتے ہیں تاکہ اگر قلعے کی جانب سے ہمیں کوئی دیکھ رہا ہو تو اسے ہم پر شک نہ ہو"

میں نے جیب سے پیائش کرنے والا فیتہ نکال کر اس کا ایک سرا کمانڈو منصور کو پکڑایا اور خود یہ فیتہ کھول کر کوئی دس فٹ کے فاصلے پر زمین پر کھرپی سے نشان لگا دیا اس طرح ہم نشان لگاتے لگاتے قلعے کی دیوار کے مزید قریب ہوتے چلے گئے۔ دس جگہوں پر نشان لگانے کے بعد ہم نے اپنے لگائے ہوئے نشانوں کی جگہوں پر کھرپی سے زمین میں سوراخ ڈالنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ ہم دیوار کی اونچائی اور اس کے اوپر چھجے کے اندر بنے ہوئے سوراخوں کا بھی جائزہ لے رہے تھے۔

کمانڈو منصور احمد بٹ کہنے لگا۔

"جگہ تو یہی ہے۔ اور اسی مورچے کے قریب چھت پر سے نیچے زینہ دوسری منزل پر اس تہہ خانے کے دروازے کے قریب جاتا ہے جہاں کمانڈر شیروان قید ہے۔ مگر اس دیوار پر چڑھا کیسے جائے گا؟"

میں نے کہا۔

"اگر ہم اس دیوار پر نہیں چڑھ سکتے تو پھر کمانڈو کی تربیت ہم نے کس لئے لی تھی۔ ہم میں اور ایک ٹرینڈ کمانڈو میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے"

اس وقت پستول ہمارے پاس نہیں تھے۔ پستولوں کی ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم دونوں پستول اپنے مجاہد کے مکان پر ہی چھوڑ آئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھے زمین میں کھرپی سے سوراخ ڈال رہے تھے۔ یہ کام ہم بڑے آرام سے کر رہے تھے۔ ہماری ساری توجہ قلعے کی دیوار کی طرف تھی۔ میں بڑے غور سے دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ قلعے کی دیوار کے نیچے ایک کھائی تھی جس میں جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا اور کہیں کہیں کوڑے کا ڈھیر بھی لگا ہوا دور سے نظر آ رہا تھا۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس دیوار کو پھلانگنے اور اوپر مورچے کے چھجے تک پہنچنے کے لئے ہمیں کم از کم ستر فٹ لمبے رسے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ ذرا مشکل کام تھا۔

مشکل ان معنوں میں کہ ہمیں ستر فٹ لمبا رسا اٹھا کر یہاں تک لانا تھا اور پھر رسے کے آگے آنکڑا لگا کر اسے مورچے کے سوراخ کی جانب ستر فٹ سے زیادہ اوپر کی طرف اچھالنا تھا جو اس سے زیادہ مشکل کام تھا۔ ابھی ہم نے تین سوراخ ہی کھودے تھے کہ ایک طرف سے ہمیں پولیس کا سپاہی ہماری طرف آتا نظر پڑا۔ میں نے کمانڈو منصور بٹ کو ہوشیار کر دیا۔ ہم خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے۔ سپاہی سکھ تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے رعب سے بولا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو؟ کون ہو تم؟"

میں کھرپے والا ہاتھ روک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سکھ سپاہی کو نمسکار کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج ہم کمیٹی کے مالی ہیں۔ کمیٹی یہاں پریڈ کے کنارے کنارے نئے درخت لگا ی ہے۔ ہم کو سیکرٹری صاحب نے درختوں کے واسطے سوراخ بنانے کو بھیجا ہے کل اس ا ڈی سی صاحب آکر درخت لگائیں گے جی۔"

سکھ سپاہی جھک کر ہمارے بنائے ہوئے سوراخوں کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اپنا کام ختم کر کے پل کی طرف سے چلے جانا۔ پریڈ والے بٹ کی طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"جو حکم مہاراج۔ ہم آئے بھی اسی طرف سے ہیں سرکار"

"بس بس کام کرو اور یہ تم سگریٹ کیوں پی رہے ہو؟"

میں نے جلدی سے سگریٹ زمین پر پھینک دیا اور کہا۔

"غلطی ہو گئی مہاراج۔"

سکھ سپاہی بڑبڑاتا ہوا۔ شاید ہم دونوں کو دل میں گالیاں دیتا جدھر سے آیا تھا اسی ف چلا گیا۔ کمانڈو منصور احمد بٹ نے آہستہ سے کہا۔

"مصیبت آئی تھی ٹل گئی"

میں نے کھرپی چلاتے ہوئے کہا۔

"منصور ابھی اس سے بھی بڑی بڑی مصیبتیں آئیں گی۔"

اتنی دیر میں قلعے کی دیوار کی اونچائی اور اس کی اوپر سے نیچے تک ہموار سطح کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم رسے کی مدد سے اس دیوار کے اوپر نہیں چڑھ سکتے اور اس کے لئے ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ دوسرا راستہ یہی تھا کہ قلعے کے اندر جا کر چھت پر سے رسہ نیچے لٹکا دیا جائے۔ یہ کام دشوار اور بظاہر ناممکن لگتا تھا۔ لیکن کمانڈو اگر کسی مشن کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ ناممکن ہے تو اسے کمانڈو کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فوراً میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے یہ ترکیب کمانڈو منصور کو بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"دیکھ لو۔ کیا ہم ایسا کر سکیں گے؟ یہ مجھے مشکل بات نظر آتی ہے"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ یہ کام میں مکمل کروں گا۔ آؤ اب واپس چلتے ہیں۔ اب ہمارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

ہم اسی طرح کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے الگ الگ ہو کر اپنے مجاہد کے مکان میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ دوپہر کو آیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہماری کارگزاری معلوم کرنے دوپہر کو کھانے کے وقت آئے گا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"پھر کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"دوست! نیچے سے قلعے کی دیوار پر اوپر مورچے کی چھت تک چڑھنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم چھت کے اوپر سے رسہ نیچے لٹکانے کی کوشش کریں۔"

مجاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب تم لوگ قلعے کی چھت پر پہنچ ہی جاؤ گے تو پھر اوپر سے رسہ لٹکانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہمیں اپنے کمانڈر کو بھی تو قلعے سے باہر نکالنا ہے اور اس کو قلعے سے باہر نکالنے کے لئے سب سے آسان راستہ یہی ہے۔ کیونکہ ہم اسے لے کر قلعے کے آہنی گیٹ سے نہیں نکل سکیں گے"

اس نے پوچھا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم لوگ قلعے کے اندر کیسے جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"یہی سوچنا ہے۔ تم ہمیں کیا مشورہ دیتے ہو۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ ہم میں سے جو کوئی بھی قلعے کے اندر جائے گا اسے اپنے ساتھ کم از کم ستر فٹ لمبی رسی لے جانی ہو گی جو ہم قمیض کے اندر نہیں چھپا سکیں گے۔"

میں نے ایک طریقہ سوچ رکھا تھا مگر میں مجاہد کی رائے بھی لینا چاہتا تھا کہ دیکھیں وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں مجھ سے کوئی بہتر ترکیب ہو۔ مگر اپنے مجاہد اور کمانڈو منصور احمد بٹ کے ذہن میں بھی کوئی قابل عمل ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ تب میں نے انہیں اپنی ترکیب بتاتے ہوئے کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ جو خاکروب قلعے کے اندر جھاڑو وغیرہ دیتے ہیں وہ صبح منہ اندھیرے آتے ہیں۔"

"ہاں"

مجاہد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کمانڈو منصور احمد بٹ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کے سوائے اور کوئی ترکیب قلعے کے اندر جانے کی نہیں ہو سکتی کہ ہم دونوں یعنی میں اور کمانڈو منصور احمد بٹ خاکروبوں کا بھیس بنا کر منہ اندھیرے قلعے کے اندر جائیں۔ ظاہر ہے جو خاکروب صفائی وغیرہ کرنے آتے ہیں ان کے ساتھ کوئی چھوٹی سی ہتھ ریڑھی بھی ہو گی ہم اس ریڑھی میں رسی چھپا کر اندر لے جا سکتے ہیں۔"

مجاہد نے کہا۔

"لیکن جو خاکروب روزانہ قلعے کے اندر صفائی کرنے آتے ہیں ان کو تو قلعے کے گارڈ پہچانتے ہیں اور ان کے پاس شناختی کارڈ بھی ہوتے ہیں۔ تم کیسے ان کی جگہ اندر داخل ہو سکو گے؟ تم تو وہیں پکڑ لئے جاؤ گے"

میں نے کہا۔

"ہمیں ان دونوں صفائی کرنے والوں کو راستے میں ہی کسی جگہ غائب کرنا ہو گا اور ان کے کپڑے پہن کر ان کی جگہ قلعے میں داخل ہونا ہو گا گارڈ ڈیوٹی والے سنتری نے پوچھا تو ہم کہہ دیں گے کہ وہ دونوں دوسرے گاؤں شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ ہم صفائی کرنے آئے ہیں۔ بہرحال یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا۔ اول تو کوئی سنتری اس بارے میں تفتیش نہیں شروع کر دے گا کہ ہم ان کی جگہ پر کیوں آئے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیدا ہو بھی گئی تو پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم پستول ساتھ لے کر جائیں گے۔"

مجاہد کو ہمارے اس منصوبے کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ایک بات ابھی سے یاد کر لو کہ اگر کوئی ایمرجنسی والی صورت پیدا ہو گئی اور تم پکڑے گئے تو اپنی زبانیں بند رکھنا۔"

میں نے کہا۔

"دوست! یہ بات تمہیں کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ تو ہم مجاہدوں کا پہلا اصول ہے کہ مر جائیں گے مگر زبان نہیں کھولیں گے۔ اب تم ہمیں صرف یہ معلوم کر کے بتا دو کہ قلعے میں جو خاکروب منہ اندھیرے صفائی کے لئے آتے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں اور گھر سے قلعے تک ان کا راستہ کون سا ہے۔ باقی ہم جانیں ہمارا کام"

مجاہد نے وعدہ کیا وہ آج شام کو یہ بھی پتہ کرا دے گا۔ ہمارا مجاہد چلا گیا۔ رات کے پہلے پہر میں آیا۔ اور بولا۔

"تم میں سے ایک میرے ساتھ چلے"

میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے دائم گنج کی آبادی سے تھوڑے فاصلے پر مصلیوں کی

بستی کے پاس لے گیا۔ کہنے لگا۔

"اس بستی کے ایک مکان میں سے منہ اندھیرے دو خاکروب بوٹا مسیح اور منشی مسیح ڑھی لے کر نکلتے ہیں۔ ان کی ریڑھی کے آگے گدھا جتا ہوا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کس راستے سے ہو کر قلعے میں جاتے ہیں۔"

مصلیوں کی اس بستی سے ایک کچی سڑک نکل کر کھیتوں میں سے ہو کر قلعے کی طرف ئی تھی۔ یہ چھوٹی سی سڑک تھی اور قلعے تک تین چار موڑ مڑتی تھی۔ قلعہ وہاں سے ہ سے زیادہ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہم واپس آگئے۔ مکان پر میں نے کمانڈو ر احمد بٹ کو سب کچھ سمجھا دیا۔ ہم جلدی سو گئے۔ رات کے تین بجے گھڑی کے م نے ہمیں جگا دیا۔ ہمارا لباس وہی عام ہندو مالیوں والا تھا۔ ماتھے پر سرخ تلک بھی ہم رہنے دیا تھا۔ موقع دیکھنے کے بعد میں نے اپنے مجاہد کی مدد سے ستر فٹ لمبی ایک پتلی بڑی مضبوط رسی منگوا کر رکھ لی تھی۔ رسی میں کہیں کہیں ہم نے گانٹھیں ڈال دی ں۔ رسی ہم نے سیاہ رنگ کی منگوائی تھی تاکہ دن کے وقت وہ قلعے کی عقبی دیوار کے ھ لٹک رہی ہو تو اس کا رنگ دیوار کے میلے رنگ میں گھل مل جائے اور دور سے نظر آئے۔ اس سے زیادہ احتیاط ہمارے اختیار میں نہیں تھی۔ ہم نے اٹھتے ہی اپنے اپنے ٹیک پستول اور ان کا میگزین چیک کیا۔ رسی کا گول گچھا بنا کر میں نے اپنے کاندھے پر لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔

رات کے تین بجے ساری آبادی گہری نیند سو رہی تھی۔ ہم خالی اندھیری گلیوں میں ہو کر جلدی سے کھیتوں میں آگئے۔ یہاں ہم محفوظ تھے۔ جس راستے سے مجاہد مجھے کر مصلیوں کی بستی کی طرف گیا تھا۔ ہم اسی راستے سے چلتے بستی کے باہر آ کر رک ۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا۔

"ہمیں ایک جگہ چھپ کر دونوں خاکروبوں کا انتظار کرنا ہو گا۔"

کچی سڑک کے تیسرے موڑ پر ٹاہلی کے اونچے اونچے درخت ساتھ ساتھ کھڑے ۔ ہم اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں سڑک کی ایک طرف اور کمانڈو منصور احمد

بٹ دوسری طرف اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمیں گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا۔

"خبردار ہو جاؤ۔ دونوں آرہے ہیں"

یہ گھنگھرو ریڑھی کے آگے جتے ہوئے گدھے کی گردن میں بندھے ہوئے تھے۔ ستاروں کی ہلکی نیلی روشنی میں ہمیں بستی کی طرف سے ایک ریڑھی آتی نظر آئی۔ ذرا قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ دونوں خاکروب ریڑھی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا جس کے گل کی چمک دور سے دکھائی دی۔ جب ریڑھی ہمارے سامنے سے گزرنے لگی تو ہم پستولیں نکال کر سامنے آگئے۔ ہم نے جو میلی کچیلی پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں ان میں اپنا چہرہ بھی چھپالیا ہوا تھا۔ میں نے رعب دار آواز میں کہا۔

"دونوں ریڑھی سے نیچے اتر آؤ۔ خبردار اگر کوئی حرکت کی تو ہمارے پستولوں کی گولیاں تم دونوں کو اڑا دیں گی۔"

دونوں خاکروب جن میں ایک بوڑھا تھا ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈر کر ریڑھی سے نیچے اتر آئے۔ ہم نے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لئے رسی کے کچھ ٹکڑے کاٹ کر پہلے ہی سے الگ رکھ لئے تھے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ ان کے سامنے پستول نکالے کھڑا تھا۔ میں نے فوراً دونوں کے ہاتھ رسی سے کس کر پیچھے باندھ دیئے۔ ان بے چاروں کی خوف کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ان میں جو ذرا نوجوان مگر دبلا پتلا تھا بڑی مشکل سے بولا۔

"ماراج ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے ہم تو چوڑے ہیں۔"

بوڑھے نے عاجزی سے کہا۔

"ماراج ہماری گاڑی لے جائیں ہمیں نہ ماریں۔"

میں نے دونوں کے منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیئے اور انہیں کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا جہاں ایک گڑھا تھا۔ یہ گڑھا میں نے شام کو ہی دیکھ لیا ہوا تھا۔ اس میں درختوں کی شاخیں اور بڑے بڑے مڈھ پڑے تھے۔ ہم نے دونوں کے منہ کے آگے کپڑ

کر اتنی زور سے کپڑا باندھا کہ وہ ذرا سا بھی منہ نہ ہلا سکتے تھے۔ صرف سانس لے سکتے ۔ پھر انہیں درختوں کے دو الگ الگ مڈھوں کے ساتھ لٹا کر اس طرح جکڑ دیا کہ وہ رف اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے پنجے ہی ہلا سکتے تھے۔ یہ کام ہم نے دو منٹ کے اندر اندر ر لیا۔ میں نے ان دونوں کے اوپر وہاں پڑی ہوئی درختوں کی سوکھی شاخیں ڈال دیں۔ ب وہ گڑھے میں پڑے ہوئے باہر سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بعد ہم ریڑھی یا دھا گاڑی پر بیٹھ گئے اور گاڑی کو قلعے کی طرف ڈال دیا۔

گاڑی میں دو لمبے لمبے جھاڑو پڑے تھے۔ دو ٹوکرے تھے جن میں وہ قلعے کا کوڑا رکٹ ڈال کر باہر لاتے ہوں گے۔ کچھ فاصلے پر قلعے کے دروازے کی روشنی نظر آرہی ھی۔ ہم گدھا گاڑی تیز تیز چلا رہے تھے۔ رات اندھیری تھی اور اس کے سکوت کو ۔ گدھے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کی آواز ہی توڑ رہی تھی۔ کمانڈو منصور بٹ کہنے لگا۔

"ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے"

"کیا؟"

میں نے پوچھا۔

گدھا گاڑی کی باگیں میرے ہاتھ میں تھیں۔ کمانڈو منصور احمد بٹ بولا۔

"جن دو آدمیوں کو ہم باندھ کر پھینک آئے ہیں میرا نہیں خیال کہ وہ آج سارا دن وہاں پڑے رہیں اور ان کو کوئی نہ دیکھے یا وہ کوئی آواز نہ نکالیں۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ نوجوان معلی دو تین گھنٹوں کی کوشش کے بعد آزاد ہو جائے گا اور وہ فوراً قلعے کی لیس کو جا کر ساری بات بتا دے گا۔ اس کے بعد عین ممکن ہے کہ پولیس قلعے کی تلاشی لے اور اوپر چھت پر آکر نیچے لٹکی ہوئی رسی بھی دیکھ لے۔ اگر پولیس کو رسی نظر نہ بھی ئی جب بھی وہاں کمانڈر شیروان والی کوٹھڑی کے اوپر پولیس کی نفری دوگنی کر دی جائے ی۔ یہ پولیس سی آئی ڈی کی ہے۔ اسے فوراً شک پڑ جائے گا کہ کشمیری کمانڈو خاکروبوں کے بھیس میں قلعے میں آئے تھے اور کمانڈر شیروان کو فرار کرانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست

کر گئے ہیں۔"

کمانڈو منصور احمد ڈار کی بات کافی وزنی تھی۔ ہم نے آج قلعے کے باہر رسی لٹکانے کے بعد اسی دن آدھی رات کو وہاں آنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے پوچھا۔

"تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

وہ بولا۔

"دوست! ہمیں جو کچھ کرنا ہے ابھی کر گزرنا چاہیے۔ ابھی دن نکلنے میں کافی وقت ہے۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہم ابھی کمانڈو ایکشن کر کے کمانڈر شیروان کو نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آج کا سارا دن ان معلیوں کو دے دیا تو وہ گھنٹے دو گھنٹے کی جدو جہد کے بعد اس قابل ضرور ہو جائیں گے کہ رسیوں سے جکڑے ہوئے حلق سے آوازیں نکالنے لگیں اس طرح لوگ وہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

مجھے کمانڈو منصور احمد بٹ کا مشورہ بہت صحیح معلوم ہوا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈو دوست! ٹھیک ہے۔ ہم اسی وقت کمانڈو ایکشن شروع کرتے ہیں۔"

ستر فٹ پتلی رسی کے گچھے کو ہم نے ٹوکری میں چھپا دیا تھا۔ ایک غلطی ہم سے ضرور ہوگئی تھی کہ ہم نے دونوں معلیوں کے شناختی کارڈ ان کی جیبوں سے نہیں نکالے تھے۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب میں نے اس کا ذکر کمانڈو منصور احمد بٹ سے کیا تو وہ بولا۔

"اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ سیکورٹی گارڈ نے پوچھا تو کہہ دیں کہ ہمیں بوٹا اور منشی سے شناختی کارڈ لینے یاد نہیں رہے۔"

قلعے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے گدھا گاڑی روک لی۔ اس وقت قلعے کے آہنی گیٹ کا ایک بڑا پٹ آدھا کھلا ہوا تھا اور باہر دو سپاہی پہرے پر موجود تھے جن میں سے ایک سکھ تھا۔ میں اتر کر گدھے کو کھینچ کر قدم قدم چلاتا قلعے کے دروازے میں سے گزرنے لگا تو سکھ سپاہی نے بلب کی روشنی میں ہمیں دیکھ کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ اوئے۔ تم کون ہو؟ وہ بوٹا اور منشی کہاں ہیں"

ہمارے حلیے اس وقت خاکروبوں والے ہی تھے۔ اوپر سے کمانڈو منصور احمد بٹ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی ہاتھ باندھ لئے اور بڑی عاجزی سے کہا۔

"ماراج! بوٹا اور منشی شادی بیاہ پر ساتھ والے گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنی جگہ ڈیوٹی پر بھیجا ہے ماراج! میرا نام کندن مسیح ہے اور ماراج یہ میرا ماما ہے جی اس کا نام مرلی رام ہے جی۔"

دوسرا سپاہی بھی ہمارے قریب آگیا۔ کہنے لگا۔

"بوٹا اور منشی کب واپس آئیں گے؟"

میں نے ہاتھ باندھ کر بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

ماراج آج شام کو آجائیں گے جی۔ کل وہی ڈیوٹی پر آئیں گے۔ سرکارا قلعے کے اندر صفائی ستھرائی ضروری تھی۔ اس لئے ہم ان کی جگہ حاضر ہو گئے ہیں جی۔"

"چلو چلو اوئے۔ چلو اندر اور اسی طرح صفائی کرنا جس طرح بوٹا اور منشی کرتے ہیں۔"

میں نے ہاتھ باندھے ہوئے کہا۔

"ماراج آپ چنتا نہ کریں۔"

اور ہم گدھا گاڑی کو چلاتے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی پیدل چلتے ہوئے قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ٹوکری اٹھا کر نہیں دیکھی تھی۔ کیونکہ ٹوکری کے نیچے ستر فٹ لمبی رسی کا گچھا پڑا تھا۔ بہرحال اس کے جواز کے لئے بھی میں نے ایک معقول جواب ذہن میں سوچ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ سپاہیوں نے گدھا گاڑی کے نیچے جو جھولا سا لٹکا ہوا تھا اسے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں ہمارے دونوں آٹومیٹک پستول اور میگزین تھے۔

چونکہ ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے اپنا کمانڈو آپریشن مکمل کر لینا تھا اس لئے بڑے تیز ایکشن کی ضرورت تھی۔ ہم ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ قلعے کے اندر ایک

پتلی سی سڑک تھی جس کی دونوں جانب سی آئی ڈی کے دفاتر تھے جو بند پڑے تھے۔ ہم گدھا گاڑی پر بیٹھ گئے اور اسے چلاتے سڑک کی مشرقی سمت چلے آئے۔ یہاں آکر ہم گدھا گاڑی سے اتر پڑے اور یونہی ادھر ادھر سڑک پر جھاڑو پھیرنے شروع کر دیئے۔ مشرق کی جانب قلعے کی پرانی سیڑھیاں اوپر والی منزل کو جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر بلب روشن تھا اس کی روشنی میں دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک سٹول پر بیٹھا تھا۔ رائفل اس نے گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھی۔ دوسرا سپاہی بڑی بیزاری سے رائفل کے سہارے کھڑا تھا۔ یہاں دیوار میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں جھاڑو دیتا کمانڈو منصور احمد بٹ کے قریب گیا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

”یہی دروازہ نیچے کمانڈر شیروان کے تہہ خانے میں جاتا ہوگا“

ہم ذرا اندھیرے میں تھے۔ اس نے دروازے کو غور سے دیکھا اور بولا۔

”میرا خیال ہے یہی تہہ خانے کا دروازہ ہے مجاہد نے یہی بتایا تھا۔ مگر ہمیں پہلے کسی طرح تصدیق کر لینی چاہئے۔“

میں نے کہا۔

”تصدیق کرنے کا وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمیں ایکشن شروع کر دینا چاہئے۔ آگے جو ہو سو ہو“

ہم نے گدھا گاڑی ایک طرف کھڑی کرتے ہوئے اس کے نیچے لٹکتے جھولے میں سے اپنے اپنے آٹومیٹک پستول نکال کر اپنے پرانے کوٹوں کے اندر چھپا لئے تھے۔ میں نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا۔

”میں ان دونوں سپاہیوں کو ٹھکانے لگانے جا رہا ہوں۔ جیسے ہی میں یہ کام ختم کروں تم ٹوکری کے نیچے سے رسی نکال کر سیڑھیوں میں آجانا۔ رسی سیڑھیوں میں چھپا کر مجھے کور دینا۔ اوکے؟“

زیادہ باتیں کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب ہمیں اشاروں میں اور زبان سے بڑی مختصر اور شارٹ ہینڈ ٹائپ کی گفتگو کرنی تھی۔ کمانڈو منصور وہیں سڑک کے کنارے جھاڑو

پھیرنے لگا۔ میں بھی جھاڑو پھیرتے ہوئے سپاہیوں کی طرف کھسکتا چلا گیا۔ ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”اوئے تم کون ہو؟ بوٹا مسیح کہاں ہے؟“

میں ہاتھ باندھ کر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”ماراج! بوٹا اور منشی شادی پر گاؤں گئے ہوئے ہیں ان کی جگہ میں اور میرا بھائی مرلی آئے ہیں“

دوسرے سکھ نے ہنس کر کہا۔

”تو پھر بجاؤ مرلی“

میں جھاڑو دیتا ہوا ان سپاہیوں کے تھوڑا پیچھے آگیا۔ پیچھے آتے ہی میں نے دائیں بائیں سڑک پر نگاہ ڈالی۔ وہاں اس وقت ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے جھکے جھکے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر آٹومیٹک پستول نکالا اور نکالنے کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے دونوں سپاہیوں کی پیٹھ پر تین تین فائر کر دیئے۔ سائی لینسروں کی وجہ سے پستول کے دھماکے نہیں ہوئے تھے۔ تین تین گولیاں کھاتے ہی دونوں سپاہی منہ کے بل گر پڑے۔ اس دوران کمانڈو منصور احمد بٹ رسی کا گچھا اٹھائے دوڑتا ہوا میرے پاس آگیا ہم نے دونوں سپاہیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ایک طرف اندھیرے میں ڈال دیا۔ میں نے کمانڈو منصور سے کہا۔

”سیڑھیوں میں چھپ جاؤ چوکس رہو۔ میں تہہ خانے میں جا رہا ہوں۔“

سیڑھیوں کے پاس ہی جو دروازہ تھا اس پر تالا پڑا ہوا تھا مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ یہ دروازہ تہہ خانے کو ہی جاتا ہے۔ اس میں اسلحہ کا ذخیرہ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اب اس قسم کی سوچ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے تالے پر فائر کیا۔ گولی نے تالے کو اڑا دیا۔ میں تھوڑا سا دروازہ کھول کر دوسری طرف گیا تو نیچے زینہ جاتا تھا۔ چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ نیچے آخری سیڑھی کے اوپر بھی ہلکی روشنی والا بلب روشن تھا۔ یہاں بھی ایک دروازہ تھا جس پر تالا پڑا تھا۔ میں نے اسے بھی پستول کے فائر سے اڑا دیا۔ دروازہ

کھولا اور دوسری طرف آگیا۔

سب سے پہلے میں نے جس شے کو دیکھا وہ ایک آدمی تھا جو ننگے فرش پر اوندھا ہو کر پڑا تھا۔ فائر کی آواز سے اس نے گردن ذرا سی اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کمانڈر شیروان کو اس زخمی اور نقاہت کی حالت میں بھی پہچان لیا۔ میں نے جاتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر آہستہ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر! ہم آپ کو لے جانے آئے ہیں۔ کیا آپ چل سکتے ہیں؟"

کمانڈر شیروان نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر جس پر زخموں کے نشان تھے اور جو کمزور ہو رہا تھا اس پر رونق سی آگئی کہنے لگا

"میں چل سکتا ہوں"

میں کمانڈر شیروان کو اپنے پیچھے پیچھے چلاتا سیڑھیاں چڑھ کر تہ خانے کے دوسرے دروازے سے باہر آیا تو کمانڈو منصور احمد بٹ کو پستول ہاتھ میں لئے ایک طرف گھات میں بیٹھے دیکھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمانڈر شیروان کو گلے لگالیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"جلدی سے اوپر چھت پر چلو۔ منصور احمد بٹ! میں آگے جاؤں گا۔ اوپر دو آدمی پہرے پر ہوتے ہیں۔"

میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت والے دروازے کی آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ میں۔ گردن ذرا باہر نکال کر چھت پر نگاہ ڈالی۔ اپنے مجاہد کے جاسوس نے جو نقشہ بتایا تھا بالکل وہی نقشہ تھا۔ ہم قلعے کی چھت کی مشرقی سمت نکلے تھے۔ سامنے کافی کشادہ پرانی چھت تھی جس کے کنارے پر سیمنٹ اور اینٹوں کی بنی ہوئی پرانی مچان تھی جہاں فوج کے زمانے میں مشین گن کی پوسٹ ہوا کرتی تھی۔ میں نے دور سے ایک سپاہی کو آتے دیکھا۔ اس نے رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی اور بڑی آہستہ آہستہ دیوار کی دوسری جانب دیکھتا چلا آرہا تھا۔ میں نے سیڑھیوں میں نیچے منہ کر کے ہلکی سی سیٹی بجا کر کمانڈو منصور احمد بٹ کو اشارہ دیا کہ ہوشیار رہے۔

سپاہی میری طرف ہی آرہا تھا۔ شاید وہ نیچے جانے والا تھا۔ میں سیڑھیوں میں ایک طرف ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میری ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اس سپاہی کو حلق سے آواز نکالنے یا رائفل کا فائر کرنے کی مہلت نہیں ملنی چاہئے۔ یہ سپاہی ہندو ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ سکھ نہیں تھا۔ وہ واقعی سیڑھیاں اتر کر نیچے جارہا تھا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیوں کی چوکھٹ کے سامنے آیا میرے ہاتھ میں جو آٹومیٹک پستول تھا اس میں سے ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ دو فائر ہوئے اور دونوں گولیاں سپاہی کے سینے میں اتر گئیں اور وہ دھڑام سے سیڑھیوں میں منہ کے بل گر پڑا۔ میں اسے کھینچ کر چھت پر لے گیا۔ وہ ابھی زندہ تھا میں نے ایک فائر اس کے سر میں کیا۔ وہ بے حس ہو گیا۔ میں نے اس کی رائفل پاؤں سے دور کردی۔ نیچے سے کمانڈو منصور احمد بٹ اور کمانڈر شیروان اوپر آگئے۔ کمانڈو منصور احمد بٹ کے کاندھے پر رسی کا گچھا تھا۔ ہم دوڑ کر سیمنٹ کی مچان کے اندر گھس گئے۔ وہاں دو سوراخوں میں رسی کو کس کر باندھا اور رسی کو قلعے کی دیوار کی دوسری طرف نیچے پھینک دیا۔

کمانڈو منصور احمد بٹ چھت پر مچان کے کونے میں پستول لئے اس طرح بیٹھا رہا کہ اگر کوئی دوسرا سپاہی اس طرف آرہا ہو تو اسے بھی وہیں ختم کر دیا جائے۔ مگر وہاں اس وقت صرف ایک ہی سپاہی گشت لگا رہا تھا جس کی لاش سیڑھیوں والے دروازے کی ایک طرف پڑی تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان سے پوچھا۔

"آپ رسی کو پکڑ کر نیچے اتر سکیں گے؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"شیر زخمی ہوا ہے مرا نہیں"

میرا خیال تھا کہ میں پہلے کمانڈو منصور احمد بٹ کو نیچے اتاروں گا۔ کیونکہ اس کے پاس اسلحہ تھا مگر میرے دیکھتے دیکھتے کمانڈر شیروان نے رسی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنا چہرہ دیوار کی طرف کیا اور دونوں پاؤں دیوار کے ساتھ لگا کر آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کردیا۔ میں نے کمانڈو منصور کو اشارہ کیا۔ وہ بھی نیچے اترنے لگا۔ میں پستول لئے اوپر

دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ کبھی چھت پر سیڑھیوں کی طرف دیکھتا اور کبھی سر جھکا کر نیچے ان دونوں مجاہدوں کو قلعے کی دیوار کے ساتھ لگ کر نیچے اترتا دیکھ لیتا۔ جب دونوں نیچے اتر گئے تو میں بھی نیچے اتر گیا۔

نیچے قلعے کی دیوار کے ساتھ چھوٹی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ چونکہ اس کمانڈو ایکشن کا پروگرام ہنگامی حالت میں اچانک بن گیا تھا اس لئے ہم یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ کمانڈر شیروان کو قلعے سے نکال کر کس طرف لے جانا چاہئے اگر دوسری رات کو اس منصوبے پر عمل کیا جاتا تو ہم نے کمانڈر شیروان کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کا پہلے سے انتظام کر لیا ہوتا۔ مگر ہمیں اچانک یہ کمانڈو آپریشن کرنا پڑ گیا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب جیسے بھی ہو ہمیں اپنے مجاہد کے گھر کا ہی رخ کرنا چاہئے اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں دن کا اجالا ہونے والا تھا۔ اور قلعے کے اندر پنجاب پولیس کے تین سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور نیچے والی دونوں لاشوں کا تو فوراً ہی پتہ چل جانا تھا اور پھر پولیس کو کمانڈر شیروان کے فرار کا بھی علم ہو جانا تھا اور اس کے بعد امرتسر شہر میں ایک طرح سے ہنگامی صورت حال پیدا ہو جانی تھی اور پولیس کے ساتھ ملٹری انٹیلی جنیس اور ملٹری پولیس نے بھی جگہ جگہ ہماری تلاش شروع کر دینی تھی۔ میں نے منصور احمد بٹ سے کہا۔

"واپس اپنے ساتھی کے مکان پر چلتے ہیں"

اس نے کہا۔

"اوکے"

اور ہم کمانڈر شیروان کو لے کر ریگو برج کی طرف تیز تیز چلنے لگے۔ کمانڈر شیروان کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن وہ بھی اس وقت ہمارے ساتھ تیز تیز چل رہا تھا۔ جس وقت ہم دائم گنج کی بستی میں داخل ہوئے اس وقت آسمان پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی۔ سردی کی وجہ سے گلیوں میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں نے مجاہد کے مکان پر آکر دستک دینے کی بجائے دروازے کو اندر کو دھکیلا۔

دروازہ کھلا تھا۔ مجاہد نے ہمیں کہہ دیا تھا کہ میں دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگاؤں گا۔ ہم تینوں مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ اوپر مجاہد جاگ رہا تھا اس نے آواز دی۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہم ہیں"

اوپر آکر مجاہد نے ہمارے ساتھ کمانڈر شیروان کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ کمانڈر شیروان کو اور کمانڈر شیروان اس کو جانتا تھا۔ اس نے کچھ پوچھے بغیر جلدی سے چارپائی پر بستر ٹھیک کیا۔ ہم نے کمانڈر شیروان کو لٹا دیا اور اوپر کمبل ڈال دیا۔ کمانڈر کے چہرے پر انتہائی نقاہت طاری تھی۔ اس کی بائیں گال پر سگریٹ سے جلنے کے کتنے ہی نشان تھے۔ نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجاہد سے کہا۔

"تم سب نے بڑا کام کیا ہے۔ اللہ تمہیں اس کی جزا دے"

اس کے بعد کمانڈر پر غشی سی طاری ہو گئی۔ مجاہد کو ہم نے سارا قصہ سنایا تو وہ بولا۔

"تم لوگوں نے ٹھیک وقت پر سب کچھ کیا"

ہم نے کمانڈر کی طرف دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس پر بڑا گھناؤنا تشدد کیا گیا تھا۔ اس کی گردن پر بھی زخم کے لمبے لمبے نشان تھے۔ ایک آنکھ کے نیچے سیاہ داغ ابھرا ہوا تھا۔ مجاہد نے کہا۔

"تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں گرم پانی لاتا ہوں"

وہ پانی گرم کر کے لے آیا۔ ہم اس میں کپڑا گیلا کر کے کمانڈر کے چہرے کے زخموں کو لگانے لگے۔ تھوڑی دیر میں کمانڈر کو ہوش آگیا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ اس کے بعد دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

ہم لوگوں کو اس مکان میں بند ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران کمانڈر کی کھوئی ہوئی طاقت کافی حد تک واپس آچکی تھی۔ مجاہد ہمیں باہر کی ایک ایک پل کی خبر لا کر دیتا تھا۔ پنجاب پولیس خاص طور پر امرتسر کی خفیہ اور سول پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس پورے علاقے کو اپنے محاصرے میں لے چکی تھی اور شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ کمانڈر شیروان کے فرار اور قلعے کے تین سپاہیوں کے قتل کے سنگین واقعے کو مشرقی پنجاب کی پولیس نے خفیہ رکھا تھا اور اخباروں میں خبر شائع نہیں ہونے دی تھی مگر شہر کے لوگوں نے پولیس کی سرگرمیوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔ ہمارا پروگرام وہاں سے کسی طرح جموں کشمیر کی طرف نکل جانے کا تھا مگر اپنے مجاہد کے آدمی جو رپورٹیں لا رہے تھے ان کے مطابق شہر سے باہر نکلنے والی چڑیا کی بھی پولیس تلاشی لے رہی تھی۔ مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجاہد نے ہمیں اوپر والی بیٹھک دے رکھی تھی۔ ہم سارا دن ساری رات اسی بیٹھک میں رہتے۔ رات کو بجلی کی روشنی نہیں کرتے تھے۔ موم بتی جلا لیتے تھے۔ ہم کمرے کی کھڑکیاں بھی نہیں کھولتے تھے۔ چونکہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے گزارا ہو رہا تھا۔ صرف رات کو کسی وقت ہم ایک ایک کر کے مکان کی چھت پر ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ مگر اس وقت بھی ہم چھت کی منڈیروں کے قریب نہیں آتے تھے کہ باہر سے ہم پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

ہم چاہے کوئی بھی سکیم کیوں نہ بناتے۔ اس سکیم پر عمل کرنے کے لئے اس مکان

سے نکلنا ضروری تھا۔ اور اس مکان سے نکلنا اور پھر شہر سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا یہ ایک خطرناک عمل تھا اور ہمارے پکڑے جانے کا خدشہ بلکہ یقین تھا۔ کیونکہ پولیس شہر یں جگہ جگہ اجنبی آدمیوں کو روک کر ان کی تلاشی لے رہی تھی۔ مجاہد نے ہمیں بتایا کہ پولیس شک شبے میں امرتسر کے کئی کشمیری مسلمانوں کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ یہ کشمیری وہاں برس ہا برس سے محنت مزدوری کر رہے تھے۔ رات کے وقت بھی بقول اپنے مجاہد کے شہر کے بازاروں' ریل کے پلوں اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر پولیس گشت لگاتی رہتی تھی اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر تو پولیس نے خاص طور پر ناکہ بندی کی ہوئی تھی اور شہر سے باہر کوئی بس' کوئی رکشا' تانگہ گاڑی اور پیدل سوار تلاشی یئے بغیر وہاں سے نہیں گزر سکتا تھا۔

لیکن ہم وہاں زیادہ دیر ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں وہاں بند ہو کر پڑے ہوئے ندرہ دن گزر گئے تھے۔ خطرہ تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ یہ علاقہ یسے بھی اس قلعے کے قریب تھا۔ جہاں سے ہم کمانڈر شیروان کو نکال کر لے آئے تھے ر تین پولیس کانسٹیبلوں کا خون بھی کر کے آئے تھے۔ اس علاقے میں خفیہ پولیس برساتی ڈکوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے مجاہد نے بھی ہمیں کہا کہ اس نے یہ پولیس کے دو آدمیوں کو دائم گنج کی بستی میں چلتے پھرتے اور لوگوں کا جائزہ لیتے دیکھا ے۔ ہم اپنے مجاہد کو بھی کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ ہماری تحریک کے ے بے مثال کام کر رہا تھا۔ اس کا اپنے محاذ پر محفوظ رہنا بڑا ضروری تھا۔ لیکن ہمیں بھی ں سے جموں کشمیر کی طرف نکل جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں' کمانڈو منصور ر کمانڈر شیروان دن میں کتنی بار سر جوڑ کر بیٹھتے اور وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں چتے مگر کوئی ترکیب قابل عمل دکھائی نہیں دیتی تھی۔

آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔

میں نے کمانڈر شیروان اور کمانڈو منصور احمد بٹ کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔

"یہاں سے فرار کی ایک سکیم میرے دماغ میں آئی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس

ترکیب پر عمل نہ کیا تو پھر عین ممکن ہے کہ ہمیں اپنی باقی کی عمر اسی مکان کے اندر گزار دینی پڑے“

جب میں نے انہیں اپنی سکیم بتائی تو کمانڈر شیروان نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں اس طرح ہمارا یہاں سے فرار ہو جانے کا چانس ہے“

کمانڈو منصور بٹ سے مشورہ لیا گیا تو اس نے بھی میری سکیم کی حمایت کی۔ سکیم کوئی اتنی آسان نہیں تھی۔ اس میں ہر قدم پر پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ لیکن ہم کسی منصوبے پر بھی عمل کرتے اس میں پکڑے جانے کا ڈر تو موجود ہی ہوتا میری سکیم کی اچھی بات یہ تھی کہ ہم بڑی تیزی سے خطرے والے علاقے سے نکل سکتے تھے۔

میرا منصوبہ کیا تھا؟ یہ آپ کو تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گا۔ اس منصوبے کے لئے خود اعتمادی اور جرات انداز کی ضرورت سب سے زیادہ تھی اور یہ دونوں خصوصیات مجھ میں اور کمانڈر شیروان میں موجود تھیں۔ ہمیں کمانڈو منصور احمد بٹ پر زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ایک نو آموز کشمیری کمانڈو تھا اور اسے نہ صرف یہ کہ ابھی اس قسم کے دلیرانہ کمانڈو آپریشن کا تجربہ نہیں تھا بلکہ اس کی تربیت بھی پورے ڈھنگ سے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اور کمانڈر شیروان نے آپس میں الگ ہو کر جب مشورہ کیا تو ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ کمانڈو منصور احمد بٹ کو الگ روانہ کرنا ہوگا۔ منصور احمد بٹ کشمیری تھا۔ بڑی روانی سے کشمیری اور ڈوگری زبان بول لیتا تھا۔ ویسے بھی ایک آدمی وہاں سے کسی بھی طرف نکل سکتا تھا۔ اور منصور احمد بٹ کشمیری النسل ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو کشمیری محنت کش ظاہر کر کے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ کمانڈر شیروان اور میں اس لئے الگ الگ نہیں نکل سکتے تھے کہ پنجاب پولیس میری شکل صورت سے تو پہلے ہی آشنا تھی اب کمانڈر شیروان کی صورت بھی پہچانتی تھی۔

جب ہم نے کمانڈو منصور احمد بٹ سے کہا کہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ وہ یہاں سے اپنے طور پر جموں کشمیر کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کمانڈر شیروان نے اسے یہ تو نہ بتایا کہ یہ فیصلہ اس کی کم تجربہ کاری کی وجہ سے کیا

گیا ہے بلکہ اسے یہی کہا کہ تین آدمیوں کا بیک وقت ایک جگہ سے اکٹھے ہو کر فرار ہونا اور ایک ساتھ رہنا زیادہ خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

”منصور احمد بٹ! تم جموں کشمیر کے چپے چپے سے اور ہماچل پردیش کے سارے پہاڑی علاقے سے واقف ہو۔ ایک بار تم پنجاب سے نکل گئے تو تمہارے لئے جموں کشمیر پہنچنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ جب کہ ہم دونوں کی صورت شکل سے پولیس واقف ہے۔ ہمیں فرار کے لئے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر ہم پکڑ لئے گئے تو تم بھی ہمارے ساتھ پکڑے جاؤ“

منصور احمد بٹ بولا۔

”کمانڈو! مجھے آپ نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ میں آج رات کو ہی امرتسر میں اپنے کشمیری محنت کش بھائیوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ وہ مجھے یہاں سے نکالنے میں میری مدد کریں گے“

ہم نے اپنے مجاہد ساتھی کو یہ سکیم بتائی تو وہ کہنے لگا۔

”آپ کو اپنے فرار کے سلسلے میں جس جس چیز کی ضرورت ہے وہ مجھے ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں۔ ساری چیزیں آپ کو مہیا ہو جائیں گی۔“

میں نے کاغذ پر ساری چیزیں جن کی ہمیں ضرورت تھی لکھ کر اپنے مجاہد کے حوالے کر دیں۔ اس زمانے میں امرتسر میں ایک ایئرپورٹ بن چکا تھا۔ انڈین ایئر لائنز کی اندرون ملک کی تین پروازیں جموں کشمیر کو آتے جاتے امرتسر رکتی تھیں۔ ہماری سکیم انڈین ایئر لائنز کے کسی ہوائی جہاز میں سوار ہو کر سری نگر پہنچنے کی تھی۔ یہ سکیم خطرناک اور مشکل ضرور تھی مگر اس میں ایک بات تھی کہ اگر ہمارا راز نہیں کھلتا تو ہم گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ کمانڈر شیروان نے میری سکیم کی تائید بھی اسی واسطے کی تھی کہ اگر خطرہ ہر منصوبے میں موجود ہے تو پھر ایسا خطرہ کیوں نہ مول لیا جائے جس میں صرف گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا ہی خطرہ ہو۔

دلی سے سری نگر براستہ امرتسر انڈین ایئر لائنز کے جو جہاز آتے جاتے تھے اس میں

پینتالیس مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی۔ یہ ٹرائیڈنٹ جہاز تھے جن کو پنکھوں والے دو یا میرا خیال ہے تین انجن لگے ہوتے تھے۔ اپنے مجاہد کے ذریعے ہم نے ایک دن بعد کی رات کے سات بجے والی امرتسر سری نگر فلائٹ میں دو سیٹیں بک کروالیں اور کنفرم بھی کروالیں۔ ہمارے پاس تیاری کرنے کے واسطے پورا ایک دن تھا۔ کمانڈو غنی ڈار تو رات کو ہی وہاں سے نکل چکا تھا اور صبح اپنے مجاہد نے آکر ہمیں بتادیا تھا کہ غنی ڈار امرتسر میں مقیم محنت کش کشمیریوں کے اڈے پر پہنچ گیا ہے۔ اب ہم نے تیاری شروع کردی۔ مجاہد کو ہم نے جو چیزیں لکھ کردیں تھیں وہ اس نے ہمیں لاکردے دی تھیں۔ وہ چیزیں کیا تھیں۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ انڈین آرمی کی ہرے رنگ کی دو وردیاں تھیں۔ ایک وردی میجر کی تھی اور دوسری وردی صوبیدار میجر کی تھی۔ آرمی کی پرانی استری کی ہوائی وردیاں اور ان کے عہدوں کے نشان شہر کی ایک دکان پر مل جاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ انڈیا کے ہر بڑے شہر میں اور خاص طور پر فوجی چھاؤنیوں والے شہروں میں ایسی دکانیں ضرور ہوتی ہیں جہاں سے فوجی وردیاں' عہدوں کے نشان وغیرہ سیکنڈ ریٹ پر مل جاتے تھے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ان وردیوں کو دکانوں پر کھلے عام فروخت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بمبئی کا ایک لنڈا بازار ہے جس کو چور بازار کہا جاتا ہے۔ وہاں تو پرانی فوجی وردیاں تین چار دکانوں پر فروخت ہوتی ہیں۔ بہرحال ہم نے اپنی اپنی وردیاں پہن لیں۔ میں نے صوبیدار میجر کی اور کمانڈر شیروان نے میجر کی وردی پہن لی۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس آئی ڈی کارڈ اور پے بکیں نہیں تھیں۔ ان چیزوں کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہمیں ان کے بغیر ہی انڈین ایئر لائنز کے جہاز میں سفر کرنا تھا۔ خیال تھا کہ جہاز میں کون ہماری چیکنگ کرے گا۔ ہوائی اڈوں پر عام حالات میں ملٹری پولیس بھی نہیں ہوتی۔ اور ملٹری پولیس کسی میجر یا صوبیدار میجر کو روک کر یہ کبھی نہیں پوچھتی کہ پے بک اور شناختی کارڈ دکھاؤ جہاز میں ہم نے اپنے مجاہد کے ذریعے شام کی فلائٹ میں امرتسر سے سری نگر تک کی دو سیٹیں بک کرانے کے بعد کنفرم بھی کروالی تھیں۔ ایک سیٹ میجر ایم کشور ورما کے نام کی اور دوسری سیٹ صوبیدار میجر پیارے لال

کے نام کی تھی۔ ہماری وردیوں پر عہدوں کے نشان کے نیچے ڈوگرہ رائفلز کے الفاظ بھی موجود تھے۔ آٹومیٹک پستول پہلے سے ہی ہمارے پاس تھے۔ ہم نے انہیں اپنی بیلٹ کے ہولسٹر میں لگالیا تھا۔ تھوڑی انڈین کرنسی ہم نے آپس میں بانٹ کر اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لی تھی۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے کیا ہو اور کہاں ہمیں ان پیسوں کی ضرورت پڑ جائے۔

سردیوں کے موسم کی وجہ سے تیسرے پہر چھ بجے ہی شام ہوگئی۔ ہم نے اپنے مجاہد سے لائن کلیئر مانگا۔ وہ نیچے گلی میں چلا گیا۔ دو منٹ کے بعد آیا کہنے لگا۔

"راستہ صاف ہے۔ آپ لوگ آبادی کے عقب سے ہو کر خالصہ کالج کی طرف سڑک پر نکل آئیں۔ وہاں سے آپ کو ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ مجاہد کے مکان سے نکل کر ہم اندھیری گلیوں میں سے گزر کر پیچھے کھیتوں کی طرف آگئے وہاں سے خالصہ کالج کی طرف چلنے لگے۔ خالصہ کالج سے ہم بڑی سڑک یعنی جی ٹی روڈ پر آگئے۔ یہاں ہمیں ٹیکسی کا انتظار کرنا تھا مگر کوئی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ فلائٹ کی روانگی کا ٹائم بھی ہورہا تھا۔ ہم نے ایک موٹر رکشا لے لیا اور پندرہ منٹ میں ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ٹکٹ ہماری جیبوں میں تھے۔ ایئر پورٹ پر کوئی زیادہ رش نہیں تھا۔ لابی میں کچھ سکھ اور ہندو سیٹھ اور ایک دو فیملیاں ہی تھیں۔ فلائٹ نمبر کے کاؤنٹر پر چارپانچ ہندو سکھ قطار میں بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ ہم بھی فوجی انداز میں گردن اٹھائے چلتے ہوئے آکر قطار میں کھڑے ہوگئے۔ کاؤنٹر پر جو عورت کمپیوٹر کے سامنے کھڑی سیٹوں کی ریزرویشن دیکھ کر بورڈنگ کارڈ ایشوع کر رہی تھی اس نے دو فوجی افسروں کو دیکھا تو ساتھ والے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔

ساتھ والا کاؤنٹر خالی تھا اور وہاں بھی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ یہ کاؤنٹر شاید فوجیوں کی سہولت کے لئے تھا۔ ہم اس کاؤنٹر پر آگئے۔ میں نے اپنا اور کمانڈر شیروان کا ٹکٹ لڑکی کو دیا۔ اس نے کمپیوٹر پر ٹک ٹک شروع کردی۔ ہمارے ناموں کے ساتھ سیٹیں ریزرو ہوچکی تھیں۔ اس نے ہمیں بورڈنگ کارڈ دے دیئے۔ ہم کارڈ لے کر ڈیپارچر لاؤنج کی

طرف چل پڑے۔ کمانڈر شیروان فوجی میجر کی شان سے آگے آگے چل رہا تھا۔ میں جونیئر افسر کی حیثیت سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ ڈر ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں سے کوئی ملٹری پولیس یا امرتسر پولیس کا کوئی آدمی اچانک نکل کر سامنے نہ آجائے اور کمانڈر شیروان کو اور مجھے پہچان نہ لے۔ جہاں ہم نے بورڈنگ کارڈ دکھائے وہاں ڈی ٹیکٹر راڈ سے ایک اہل کار نے ہماری برائے نام چیکنگ کی اور آگے جانے کی اجازت دے دی۔ ہم ڈیپارچر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ ہم خاموش تھے اور آپس میں کوئی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ لیکن اپنی اپنی جگہ پر ہم دونوں چوکس تھے اور نظریں بچاکر ماحول کا برابر جائزہ لے رہے تھے۔ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ کام تو بڑا آسان ہے۔ بازار سے فوجی وردی لے کر پہنی اور دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئے۔ نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ اس کام کے لئے ایک تو تجربہ چاہئے اور دوسرے کمانڈو ٹریننگ کے ساتھ ساتھ دل گردہ بھی چاہئے۔ یہ سب صلاحیتیں ہم دونوں میں موجود تھیں۔ میں خود کئی بار مختلف بھیس بدل کر دشمن کی آنکھوں کے سامنے اس کے درمیان سے ہو کر فرار ہوا تھا۔ کمانڈر شیروان بھی ایک اعلیٰ تربیت یافتہ اور تجربہ کار کشمیری کمانڈو تھا اور مختلف بھیس بدل کر دشمن کے مورچوں کے پیچھے جاکر کئی دھماکے کر کے دشمن کو شدید نقصان پہنچا چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں انگریزی بول اور سمجھ لیتے تھے۔ مجھے تو گجراتی اور ہندی زبان بھی اچھی طرح آتی تھی اور سنسکرت کے اشلوک بھی زبانی یاد تھے۔ ہندو دیو مالا کا بھی میں ماہر تھا۔ فوجی رولز اور ریگولیشنز سے بھی ہم دونوں بخوبی واقف تھے۔ بھرے ہوئے سائی لینسر والے آٹومیٹک پستول ہماری پیٹی میں لگے تھے۔ ہم نے اس خیال سے ہولسٹروں کے بٹن بند نہیں کئے تھے کہ کچھ پتہ نہیں کب اچانک پستول استعمال کرنا پڑ جائے۔

لاؤنج میں بتیاں روشن تھیں۔ ہم خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ہمارے آس پاس کی سیٹیں خالی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے گھڑی دیکھی اور کہا۔

"فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے"

پھر اس نے دائیں جانب سر گھما کر دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا آہستہ سے کہنے لگا۔

"ایک ملٹری پولیس کا آدمی کونے میں آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ اگر کوئی ایمرجنسی بن گئی تو ڈھا دھند فائرنگ شروع کرنی ہوگی مگر سب سے پہلے ملٹری پولیس کے جوان کو ختم کرنا وگا۔"

میں نے بڑے بہانے سے گردن ذرا سی موڑ کر پیچھے دیکھا تو جہاں چائے کا کاؤنٹر تھا ہاں ایک ملٹری پولیس کا جوان مستعد ہو کر کھڑا تھا۔ یہ جوان ہمیں پہلے وہاں نظر نہیں آیا ا۔ مجھے فکر لگا کہ کہیں معاملہ خراب تو نہیں ہوگیا۔ کسی نے ہماری مخبری تو نہیں کردی۔ انے کمانڈر شیروان سے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہاں سے چونکہ اکثر فلائٹیں مقبوضہ جموں کشمیر کی طرف جاتی ہیں اور یہاں فوج ی نقل وحرکت جاری رہتی ہے۔ اس لئے یہ ایم پی کا جوان ڈیوٹی دینے آگیا ہوگا۔"

اتنے میں اعلان ہوا کہ سری نگر جانے والی فلائٹ پرواز کے لئے تیار ہے مسافروں ے انرودھ ہے کہ وہ کرپا کر کے جہاز میں سوار ہو جائیں۔

ہم بھی اٹھے اور دوسرے مسافروں کے ساتھ گیٹ سے نکل کر جہاز کی طرف بڑھے وہاں سے تھوڑے فاصلے پر رن وے کی ایک طرف کھڑا تھا۔ اسے سیڑھی لگی ہوئی تھی یہ جیٹ جہاز نہیں تھا۔ بڑا بھی نہیں تھا۔ تھوڑے مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ز کی سیڑھی کی دونوں جانب ایئرپورٹ کے دو آدمی کھڑے بورڈنگ کارڈ چیک کر رہے ے۔ ہم سیڑھی چڑھ کر جہاز کے دروازے پر آئے تو وہاں دو انڈین ایئر ہوسٹس کھڑی ں۔ دبلی پتلی اور خوبصورت تھیں۔ دونوں نے ایئر ہوسٹسوں کی وردی والی ساڑھیاں ا رکھی تھیں۔ ایک ایئر ہوسٹس نے ہم سے کارڈ کا بقایا لے لیا۔ سیٹوں کے نمبر پڑھتے ہمیں ساتھ لے کر ہماری سیٹوں تک آئی۔ ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ جہاز آدھا ا تھا۔ اپنے وقت پر جہاز ٹیکسی کرتا' ٹیک آف کے پوائنٹ پر آکر رک گیا۔ پھر اس نکھے پوری سپیڈ سے گھومنے لگے اور ایک دھچکے سے جہاز آگے کو بڑھا اور اس کی ر تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

اس کے بعد وہ ٹیک آف کر گیا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ امرتسر

شہر کی روشنیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاز ایک خاص بلندی پر آکر اپنی خاص رفتار پر سیٹ ہوگیا۔ میں نے سر کھڑکی والے شیشے کے قریب لاتے ہوئے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے"

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سری نگر ایئرپورٹ پر ہمیں چوکس رہنا ہوگا"

میں اثبات میں سرہلا کر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ جہاز کو پرواز کرتے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ جہاز کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ مسافروں کے رنگ اڑ گئے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا پہلے سے زیادہ شدید تھا اور جہاز نے ایک طرف جھکولا بھی کھایا۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ایئر ہوسٹس مسافروں کو مطمئن رہنے کی تلقین کرنے لگیں۔ لیکن جہاز کو تھوڑی دیر کے بعد برابر ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اب مرد مسافر بھی گھبرا گئے تھے۔ ہندو رام نام کا جاپ کرنے لگے۔ سکھوں نے گربانی پڑھنی شروع کردی۔

چند جھٹکوں کے بعد جہاز جیسے ایک طرف کو جھک گیا۔ پھر سیدھا ہوگیا۔ مسافروں پر سخت گھبراہٹ طاری تھی۔ میں اور کمانڈر شیروان بھی کچھ گھبرا گئے تھے کہ کہیں جہاز کنٹرول سے باہر نہ ہو جائے۔ اتنے میں جہاز کے کیپٹن کی آواز سپیکر پر سنائی دی۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین"

جہاز کے کیپٹن نے بتایا کہ جہاز کے دو انجنوں میں کوئی ٹیکنیکل خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے ہمیں کچھ دیر کے لئے مجبوراً انبالے کے ایئرپورٹ پر اترنا پڑ رہا ہے۔ اس تکلیف کے لئے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ میں نے اور کمانڈر شیروان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کمانڈو کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے میں نے کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا"

کیونکہ انبالے میں انڈین آرمی کی بہت بڑی چھاؤنی تھی اور وہاں ایئرپورٹ پر ملٹری پولیس ہروقت موجود رہتی تھی۔ کشمیر کے محاذ پر حریت پسند مجاہدین بھارتی غاصب فوجیوں

پر گھات لگا کر حملے کر رہے تھے اور ان کے اسلحہ سے لدے ہوئے فوجی ٹرک اور فوجیوں کو اڑا رہے تھے اس لئے اس سارے علاقے میں اور خاص طور پر انبالے اور جالندھر چھاؤنی کے علاقے میں ملٹری پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کی سرگرمیاں بہت تیز تھیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں ملٹری انٹیلی جینس اور ملٹری پولیس والے کسی بھی فوجی کے کاغذات چیک کر سکتے ہیں خواہ فوجی افسر کتنے بڑے عہدے والا کیوں نہ ہو۔ یہ ساری باتیں ہمارے ذہن میں تھیں۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"ہم انبالہ ایئرپورٹ پر ہی رہیں گے۔ اگر ایئرلائن والوں نے دوسرے مسافروں کے ساتھ ہمیں بھی کسی ہوٹل میں چلنے کے لئے کہا تو ہم نہیں جائیں گے اور ایئرپورٹ ہی کے کسی کونے میں بیٹھ جائیں گے۔"

کمانڈو بولا۔

"ایسا ہی کریں گے"

اگرچہ ہماری اگلی پچھلی سیٹیں خالی تھیں۔ پھر بھی ہم دھیمی آواز میں انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ جہاز انبالہ ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ مسافروں کو ارائیول لاؤنج میں لاکر بٹھا دیا گیا۔ وہاں بتایا گیا کہ جہاز میں کچھ زیادہ ہی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ اب یہ جہاز سری نگر نہیں جائے گا۔ سری نگر جانے والی فلائٹ صبح آٹھ بجے دلی سے انبالے پہنچے گی اور مسافروں کو اس میں سوار کرا کر سری نگر پہنچایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ تمام مسافروں کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام ایئرپورٹ کے ہوٹل میں کر دیا گیا ہے۔ مسافروں پر بیزاری طاری ہوگئی۔ مسافروں کو ایئرپورٹ کے ہوٹل کی طرف لے جایا جانے لگا تو ہم بھی ساتھ ہوگئے۔ جب ایئرپورٹ کے باہر پہنچے تو ہوائی جہاز کے برسر نے ہمارے پاس آکر کہا۔

"سر! آپ میرے ساتھ تشریف لے آئیں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام ہوٹل کے ملٹری ونگ میں ہے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہم بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی رات گزار لیں گے۔"

کیونکہ ملٹری ونگ کے نام سے ہم محتاط ہو گئے تھے۔ برسر نے کہا۔

"سر! ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی فوجی افسر سویلین کے ساتھ رات نہیں گزار سکتا۔ سر! آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ یہاں سیکورٹی کا کتنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

جب کمانڈر شیروان نے دوسرے مسافروں کے ساتھ ٹھہرنے پر زیادہ اصرار کیا تو برسر کہنے لگا۔

"سر! اس کے لئے آپ کو ملٹری پولیس کے کیمپ میں چل کر وہاں کے فوجی افسر سے بات کرنی ہوگی۔"

اب مجبوری تھی۔ ہم کسی فوجی افسر کے پاس نہیں جانا چاہتے تھے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کمانڈر شیروان کو اشارہ کیا کہ ملٹری ونگ کی طرف ہی چلے چلتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ ہوٹل ٹائپ کے دوچار کمرے ہوں گے۔ وہیں رات گزار لیں گے۔ کمانڈو نے برسر سے کہا۔

"اوکے! ایسی بات ہے تو ہم ڈسپلن کی پابندی کریں گے۔ چلو ہمیں ملٹری ونگ میں ہی لے چلو"

ایئرپورٹ کے ہوٹل کی عمارت کے پہلو میں ایک بارک سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ احاطے کے اردگرد خاردار تار کی باڑھ لگی تھی۔ گیٹ پر چھوٹا سا بوتھ بنا ہوا تھا۔ ملٹری پولیس کے دوجوان سٹین گنیں کاندھے سے لٹکائے گیٹ کی دونوں جانب کھڑے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ برسر ہمیں ان کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ ملٹری پولیس کے جوانوں نے ہمیں دیکھ کر زور سے سلیوٹ مارا اور ایک جوان نے بڑے ادب سے کہا۔

"سر! آپ کا آئی ڈی اور پے بک نمبر ہمیں رجسٹر میں درج کرنا ہوگا۔ پلیز اپنا آئی ڈی کارڈ اور بک دے دیجئے۔"

اس وقت محسوس ہوا کہ ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ مگر کمانڈر شیروان نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ وہ میجر کی وردی میں تھا۔ اس نے رعب سے کہا۔

"تم کون ہوتے ہو ہمارا آئی ڈی کارڈ اور پے بک دیکھنے والے ہم انڈین آرمی کے افسر ہیں۔ کوئی چور ڈاکو نہیں ہیں۔ چلو ہمیں ہمارا کمرہ دکھاؤ۔"

ملٹری پولیس نے ایک بار پھر ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ کیا اور کہا۔

"سر! ہمیں کمانڈنگ آفیسر صاحب کا آرڈر ہے کہ ملٹری ونگ میں ہر فوجی کے آئی ڈی کارڈ اور پے بک کا اندراج ضرور کیا جائے۔ صاحب! یہ ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ پلیز؟؟"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر ہم اسے اپنا اپنا آئی ڈی کارڈ اور پے بک اس لئے نہیں دکھا سکتے تھے کہ یہ دونوں چیزیں ہم میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھیں۔ اب میں سامنے آگیا میں نے ملٹری پولیس کے سارجنٹ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم کیسا جنگلی آدمی ہے کہ میجر صاحب کو ڈسپلن کی ٹریننگ سکھاتا ہے؟ پیچھے ہٹ جاؤ نہیں تو ہم تمہاری رپورٹ کرے گا۔"

سارجنٹ میری فوجی انسٹرکٹروں والی اونچی آواز اور جھاڑ سے ڈر گیا۔ جلدی سے سلیوٹ مار کر بولا۔

"یس سر! اوکے سر!"

دوسرے سارجنٹ نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں اور کمانڈر شیروان بڑی شان سے ماطے میں داخل ہو گئے۔ سامنے برآمدے میں بھی ایک فوجی سپاہی کھڑا تھا جس نے رف وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سپاہی رینک کا جوان تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر سلیوٹ ا اور چابی لگا کر کمرہ کھول دیا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ اس نے بتی جلادی اور ا۔

"سر! کسی چیز کی ضرورت ہو تو آرڈر کریں"

پلنگوں پر بستر بچھے تھے۔ کمبل تہہ کئے ہوئے پڑے تھے۔ تین کرسیاں دیوار کے ساتھ ا ہوئی تھیں۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔

"پانی وانی سب ٹھیک ہے جوان؟"

"یس سر! گرم پانی کی ٹونٹی الگ ہے سر!"

میں نے کہا۔

"فکر نہیں۔ اب تم جائے گا۔"

سپاہی سیلوٹ کر کے کہنے لگا۔

"کھانا لاؤں سر؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"نہیں جوان۔ کھانا ہم نے کھالیا ہے۔"

سپاہی چلا گیا تو میں نے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹادیا۔ کھڑکی کے شیشے میں سے مجھے ملٹری ونگ کا گیٹ نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ باہر جو دو فوجی سارجنٹ پہرے پر کھڑے تھے اور جن کو ہم ڈانٹ ڈپٹ کر اپنا آئی ڈی کارڈ اور پے بک دکھائے بغیر آگئے تھے ان میں سے ایک سارجنٹ تو گیٹ کے آگے کھڑا تھا اور دوسرا گیٹ کے چھوٹے سے بوتھ کے اندر کسی کو ٹیلی فون کر رہا تھا۔

میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھ کو خبردار کردیا۔ میں نے کمانڈر شیروان کو وہ منظر دکھاتے ہوئے کہا۔

"معاملہ گڑبڑ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سارجنٹ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ کر رہا ہے کہ ہم لوگ ڈسپلن کی خلاف ورزی کر کے اندر آگئے ہیں"

اپنے سی او کو رپورٹ کرنا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ فوج میں ڈسپلن چلتا ہے۔ ڈسپلن کو توڑنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔

کمانڈر شیروان بوتھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ شاید ایئرپورٹ والوں کو فون کر رہا ہے۔"

کمانڈر شیروان معاملے کی سنگینی کو نہ سمجھ سکا تھا۔ اس نے مجھے بھی اس طرف سے

بے فکر ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ اور اگر سارجنٹ اپنے سی او کو ہمارے بارے میں بتا بھی رہا ہے تو سی او میرے میجر رینک کی وجہ سے کبھی ہمارا آئی ڈی کارڈ وغیرہ دیکھنے کے لئے یہاں نہیں آئے گا"

اور کمانڈو پلنگ پر وردی سمیت لیٹتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کچھ دیر سو جانا چاہئے۔"

کمانڈر شیروان نے اپنی فوجی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی تھی میں نے بھی اپنی صوبیدار میجر والی کلغی دار ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی۔ ہم نے کھڑکی کے آگے پردہ کردیا تھا۔ میں بستر پر لیٹ تو گیا لیکن میرے دل کو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے کسی خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو شیروان آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ باہر چاروں طرف خاموشی تھی۔ میں لیٹا ہوا ضرور تھا مگر میری آنکھیں کھلی تھیں۔ ٹیلی فون کرنے والا ملٹری پولیس کا سارجنٹ میری نیند اڑا کر لے گیا تھا۔ میں نے کمانڈو سے کہا۔

"میرا خیال ہے اگر ہم یہاں آنے کی بجائے انبالے کینٹ کے کسی ہوٹل میں چلے جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔"

کمانڈر شیروان آنکھیں اسی طرح بند کئے ہوئے بولا۔

"دوست! اب ان باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہوگا۔ بتی بجھا کر تم بھی سو جاؤ۔ صبح کی فلائٹ میں بڑے آرام سے سری نگر پہنچ جائیں گے۔"

لیکن میری بے چینی دور نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی بتی بجھادی کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ایک طرف کردیا۔ شیشوں میں سے گیٹ کی روشنی کا عکس کمرے میں پڑنے سے کمرے کی تاریک فضا بے معلوم انداز میں روشن سی ہوگئی تھی۔ لیکن باہر سے دیکھنے والے کو اندر کچھ نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گیٹ کی طرف نگاہ ڈالی۔ دونوں ملٹری سارجنٹ گیٹ کے آگے چاق وچوبند کھڑے تھے۔

تب مجھے بھی خیال آیا کہ میں یونہی پریشان ہو رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ سارجنٹ نے کسی اور کو فون کیا ہو۔ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو فون کر کے ہمارے ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے کے بارے میں نہ بتایا ہو۔ کمانڈو شیروان نے پہلو بدلتے ہوئے نیند بھری آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ صبح صبح میری آنکھ کھل جایا کرتی ہے۔ شب بخیر"

میں نے آہستہ سے شب بخیر کہا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر یقین کریں نیند میری آنکھوں سے ایسی غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔ میں جتنا سونے کی کوشش کر رہا تھا نیند اتنی ہی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو دل ایک بار تو دھک سے رہ گیا۔

ایک فوجی جیپ گیٹ کے اندر داخل ہو کر ایک طرف رک گئی تھی۔ اندر سے دو فوجی باہر نکلے تو ملٹری پولیس کا سارجنٹ دوڑ کر ان کے پاس آگیا اور سلیوٹ کر کے دونوں بھارتی فوجیوں سے باتیں کرنے لگا۔ جب اس نے ہمارے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو میں نے فوراً پیچھے ہٹ کر کمانڈر شیروان کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"کمانڈو! کوئی فوجی افسر ادھر آ رہا ہے۔ شاید یہ انڈین کمانڈنگ افسر ہے"

کمانڈر شیروان جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے ٹوپیاں پہن لیں۔ کمانڈو بولا۔

"دوسری کھڑکی میں سے باہر نکل جاتے ہیں"

مگر اس کمرے کی دوسری کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ ایک ہی کھڑکی تھی جو برآمدے میں کھلتی تھی۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ دونوں فوجی ہمارے کمرے کی طرف چلے آ رہے تھے۔ آگے آگے جو فوجی آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں چھوٹا بید تھا۔ وہ کیپٹن رینک کا افسر لگتا تھا۔ اس کے پیچھے جو ہری وردی والا بھارتی فوجی آ رہا تھا اس کا اردلی لگتا تھا۔ دونوں سارجنٹ دور گیٹ پر ہی کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے کہا۔

"باتھ روم! شاید باتھ روم میں کوئی کھڑکی ہو۔"

ہم باتھ روم کی طرف دوڑے۔ باتھ روم کی بتی جل رہی تھی۔ باتھ روم میں ایک چھوٹا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اندر سے کنڈی لگی تھی۔ میں نے کنڈی کھول کر دروازے کو دھکا دیا تو وہ دوسری طرف کھل گیا۔ اس دوران دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ انڈین فوجی افسر اپنے اردلی کے ساتھ ہمارے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگائی۔ بتی بجھائی اور ہم دونوں دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ باہر کیا ہے۔ اندھیرے میں پہلے تو ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر جھاڑیاں اور درختوں کے خاکے ابھر آئے۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے درختوں میں سے گزر گئے۔ آگے کانٹے دار تار کی باڑ آگئی۔ ہم اس کے ساتھ دوڑ کر تھوڑی دور گئے۔ باڑ واپس گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ ہمیں دور سے اپنے کمرے کے بند دروازے پر ہاتھ مارنے کی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ایک درخت خاردار باڑ کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ہم اس پر چڑھے اور ٹہنیوں کو پکڑ کر دوسری طرف کود گئے۔ ہم جھاڑیوں اور لمبی لمبی سوکھی گھاس میں گرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک جانب انبالہ چھاؤنی کے مکانوں اور بنگلوں اور سڑک کی روشنیاں تھیں۔ دوسری جانب اندھیرا تھا۔ ہم اندھیرے کی جانب دوڑنے لگے۔ دوڑتے دوڑتے میدان ختم ہو گیا۔ ایک چھوٹی پختہ سڑک کو عبور کر کے ہم دوسری جانب ویران علاقے میں داخل ہو گئے۔ ہم سخت جان کمانڈو تھے۔ کئی میل تک سانس لئے بغیر دوڑ سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے بات کئے بغیر مسلسل دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے اوپر آسمان پر ستارے بجھے بجھے سے لگتے تھے۔ اندھیرے میں درختوں اور جھاڑیوں کے خاکے سے ہی نظر آ رہے تھے۔ آگے ایک نہر آگئی یہ کافی چوڑی نہر تھی۔ ہم وہاں پر جا کر رک گئے نہر کنارے بیٹھ گئے۔ ذرا دم میں دم آیا تو کمانڈر شیروان کہنے۔

"دوست! تمہارا خدشہ درست تھا۔ پھر بھی ہم عین وقت پر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ورنہ ہمارا پکڑا جانا یقینی تھا۔"

میں نے کہا۔

"اگر باتھ روم کا دروازہ نہ ہوتا تو ہمارا نکلنا ناممکن تھا۔ پھر ہمیں اس بھارتی فوجی افسر کو ہی نہیں کسی بہانے اس کے اردلی کو بھی ختم کرنا پڑتا جو ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا؟"

کمانڈو نے پیچھے دیکھا۔ کہنے لگا۔

"میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ اس طرف ہمارے پیچھے آئیں گے"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے وہ انڈین ملٹری آفیسر اپنے اردلی کے ساتھ اس وقت تک دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکا ہوگا اور انہیں یقین ہوگیا ہوگا کہ ہم جعلی فوجی افسر تھے اور یقیناً دشمن ملک کے جاسوس تھے۔ اس اعتبار سے یقین کرو اس وقت تک انبالے چھاؤنی کی ساری ملٹری پولیس ہوشیار ہوچکی ہوگی اور ہماری تلاش میں اس طرف آرہی ہوگی۔ اس لئے یہاں سے جتنی جلدی بھاگ سکیں ہمیں بھاگ جانا چاہئے۔"

ہم نے نہر میں جھک کر تھوڑا سا پانی پیا اور نہر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ ایک جگہ نہر کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پار کر کے نہر کی دوسری طرف آگئے۔ پھر نہر کے کنارے سے اتر کر ان روشنیوں کی طرف رخ کرلیا جو دور سے ایک قطار میں جھلملا رہی تھیں۔ میں نے کمانڈو سے کہا۔

"شاید یہ جی ٹی روڈ کی بتیاں ہیں۔ اس سڑک پر ہمیں جنوب کی طرف جانے والی کوئی لاری وغیرہ مل سکے گی"

کمانڈو دوڑتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں جالندھر امرتسر کی طرف نہیں جانا چاہئے۔ یہاں سے اگر ہم کسی طرح دلی پہنچ جائیں تو ہم کافی محفوظ ہو جائیں گے۔"

سڑک کی بتیاں قریب آئیں تو ہم دوڑنے کی بجائے چلنے لگے۔ سڑک پر ایک جانب کچھ کھوکھا نما دکانیں سی بنی ہوئی تھیں۔ شروع رات کا وقت تھا اور انبالہ کینٹ کوئی غیر

آباد جگہ نہیں تھی۔ ہم سڑک پر آگئے۔ سڑک کی ساخت اور اس پر دو رویہ درختوں کی قطار کو دیکھ کر ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ جی ٹی روڈ ہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سڑک پر سے کوئی ٹرک وغیرہ بھی گزر جاتا تھا۔ ہم ایک طرف ذرا اندھیرے میں ہو کر کھڑے ہوگئے۔ سوچنے لگے کہ یہاں سے میرٹھ کی طرف جانے والی کوئی لاری وغیرہ پکڑلیں گے۔ میں نے دیکھا کہ جالندھر لدھیانہ کی طرف سے ایک فوجی ویگن آئی اور سڑک کے پار کھوکھے والی دکان کے قریب کھڑی ہوگئی۔ ویگن کی بتیاں بجھیں اور اگلی سیٹ پر سے ایک فوجی جو سپاہی لگتا تھا نکل کر کھوکھے کے پاس جاکر کچھ خریدنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے کمانڈو سے کہا۔

"ہم اس فوجی ویگن میں سوار ہو کر آگے جائیں گے۔"

پھر میں نے کمانڈر شیروان کو بتایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ دوسرے لمحے کمانڈو شیروان ایک فوجی میجر کی طرح چلتا ہوا فوجی ویگن کی طرف بڑھا میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ویگن کے پاس جاکر کمانڈر شیروان نے ویگن کے بونٹ پر ہاتھ مار کر فوجی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ادھر کیا کر رہا ہے۔ واپس آؤ"

دبلا پتلا سپاہی دوڑ کر قریب آیا۔ اپنے سامنے بھارتی وردی میں ملبوس ایک میجر اور ایک صوبیدار میجر کو دیکھ کر اس نے زور سے سلیوٹ مارا اور بولا۔

"سر! سگریٹ لینے کو رک گیا تھا۔"

کمانڈر شیروان نے اسے آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"پیچھے بیٹھو۔ ہمیں میرٹھ چھاؤنی تک جانا ہے۔ ہماری شاف کار خراب ہوگئی ہے گو"

بھارتی سپاہی نے جو واقعی سپاہی رینک کا تھا جلدی سے جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر کمانڈو کو دی اور خود سگریٹ کا پیکٹ پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے ویگن کے پیچھے سوار ہوگیا۔ میں اور کمانڈر شیروان اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کمانڈو شیروان بیٹھا تھا۔ اس نے انجن سٹارٹ کر کے بتیاں روشن کیں اور فوجی ویگن جی ٹی روڈ

پر میرٹھ کی طرف دوڑنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سڑک انبالہ چھاؤنی سے سہارنپور‘ دیوبند اور مظفر نگر سے ہوتی ہوئی میرٹھ کی طرف جاتی ہے۔ اس کے بعد ہاپڑ‘ پھر غازی آباد اور دلی آتا تھا۔ انبالے ہی سے جی ٹی روڈ کی ایک شاخ کرنال پانی پت‘ سونی پت اور روہتک سے ہو کر دلی پہنچتی تھی۔ لیکن ہم سہارنپور والی سڑک پر پڑ چکے تھے۔ اس راستے سے میں کئی بار گزر چکا تھا۔ ہم کسی بڑے شہر میں جا کر ہی گم ہو سکتے تھے۔ چھوٹے شہر میں ہمارا پہچان لیا جانا اور پکڑے جانا یقینی تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں اپنا فوجی لباس بدل کر کوئی دوسرا لباس پہننے کی ضرورت تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان سے پوچھا کہ میرٹھ میں اپنا کوئی خاص آدمی موجود ہے یا نہیں۔

کمانڈو نے کہا۔

”دلی میں تو اپنے دو آدمی ہیں۔ جن میں ایک گل خان ہے۔ تم اسے مل بھی چکے ہو۔ مگر میرٹھ میں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اپنا کوئی آدمی نہیں ہے۔“

جیسے جیسے ہماری فوجی سٹیشن ویگن آگے بڑھ رہی تھی رات گہری ہو رہی تھی۔ بھارتی سپاہی پیچھے بیٹھا تھا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ یہ ہم نے پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا کہ انبالے چھاؤنی سے نکلنے کے بعد اس بھارتی سپاہی کو اتار دیا جائے گا۔

جب ہم انبالے سے کافی دور نکل آئے تو کمانڈر شیروان نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ بھارتی سپاہی جلدی سے باہر نکل آیا۔

”سر! کیا بات ہے؟“

اس نے پوچھا۔

”کمانڈو نے بونٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”انجن گرم ہو گیا ہے۔ ادھر دیکھو کہیں سے پانی مل جائے تو ڈبہ بھر کر لے آؤ“

”یس سر!“

بھارتی سپاہی نے ویگن کے اندر سے ٹین کا ڈبہ نکالا اور کھیتوں میں پانی کی تلاش میں

چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو تین منٹ بعد ہم ویگن میں بیٹھ گئے۔ ویگن سٹارٹ ہوئی اور ہم اسے وہاں سے تیزی سے نکال کر آگے لے گئے۔ ہم سہارنپور دیو بند اور مظفر نگر سے بھی آگے نکل گئے۔ جس وقت ہم میرٹھ پہنچے تو پو پھٹ رہی تھی۔ شہر میں داخل ہونے کی بجائے ہم نے ویگن شہر سے باہر ایک ماڈرن علاقے میں ایک گراؤنڈ کے پاس کھڑی کر دی۔ ہم ویگن سے اتر آئے۔ کمانڈو نے کہا۔

”میرا خیال ہے یہاں ہمیں ویگن چھوڑ دینی چاہئے اور دن کسی ہوٹل میں گزارنے کے بعد رات کو دلی کی کوئی گاڑی پکڑنی چاہئے“

کمانڈو کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ کیونکہ اس وقت صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ ہم نہ تو بذریعہ لاری اور نہ ہی بذریعہ ٹرین یا بذریعہ ہوائی جہاز میرٹھ سے واپس سری نگر کی طرف جا سکتے تھے۔ انبالے کی ملٹری پولیس نے انٹیلی جینس کو خبر کر دی ہو گی کہ دو آدمی فوجی وردی میں مفرور ہیں اور ان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ کشمیری جاسوس ہیں۔ ملٹری انٹیلی جینس کو پہلے ہی سے کمانڈر شیروان کی تلاش تھی۔ ملٹری انٹیلی جینس کو یقین ہو گیا ہو گا کہ دونوں جعلی فوجی افسروں میں سے ایک مفرور کشمیری کمانڈو ہی ہو سکتا ہے اور یہ اطلاع میرٹھ اور آگے دلی کے فوجی ہیڈ کوارٹر کو بھی مل گئی ہو گی۔ دلی پہنچنے کے بعد ہم بہت حد تک محفوظ ہو سکتے تھے۔ لیکن میرٹھ میں ہمارے لئے زیادہ خطرہ تھا۔ میں نے کہا۔

”ہم اگر ویگن کو لے کر اس وقت دلی کی طرف چل پڑتے ہیں تو راستے میں ہی صبح ہو جائے گی اور اگر کسی جگہ کوئی فوجی چیک پوسٹ ہوئی جس کا ہونا یقینی نظر آ رہا ہے تو ہم پکڑ لئے جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ سارا دن میرٹھ کے کسی ہوٹل میں گزارا جائے اور اسی جگہ اپنی فوجی وردیاں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔“

ہم نے فوجی سٹیشن ویگن وہیں ایک طرف درختوں میں کھڑی کر دی اور جس طرف کافی روشنیاں تھیں اس طرف چل پڑے۔ وہاں گراؤنڈ میں کوئی نمائش لگی ہوئی تھی۔ نمائش میں لوگ نہیں تھے مگر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ یہ میرٹھ شہر کا ماڈرن علاقہ تھا۔

ہمیں کسی ہوٹل کی تلاش تھی۔ صبح کا ہلکا ہلکا اجالا آسمان پر نمودار ہونے لگا تھا۔ ایک چوک میں سے گزرے تو ایک سپاہی نے ہمیں دیکھا اور سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ رات کی ڈیوٹی پر ہو گا۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے ہمیں سلیوٹ کیا۔ ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اوپر کر کے سلیوٹ کا جواب دیا۔ اگلے چوک میں ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ہاتھ دیا تو ٹیکسی رک گئی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"فلیٹی ہوٹل چلو"

مجھے اتنا معلوم تھا کہ فلیٹی ہوٹل قریب قریب انڈیا کے ہر بڑے شہر میں ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے کہا۔

"سر! فلیٹی ہوٹل تو بند ہو چکا ہے۔ آپ انڈیا میں دیر بعد آئے ہیں شاید؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم فوجی ٹریننگ کے واسطے ماسکو گئے ہوئے تھے۔ چلو کسی اور اچھے سے ہوٹل میں لے چلو۔"

وہ ہمیں رائل ہوٹل میں لے آیا۔ یہ ہوٹل بھی فلیٹی ہوٹل کی طرح کا تھا۔ میں نے لابی کے کاؤنٹر پر اپنا اور کمانڈر شیروان کا ہندو نام لکھوایا اور ناگ پور چھاؤنی کا غلط سلط پتہ لکھوا دیا۔ نہ پیشگی رقم ہوٹل والے نے ہم سے طلب کی نہ میں نے اس سے ایڈوانس ادائیگی کے بارے میں کوئی بات کی۔ ملازم ہمیں ایک کمرے میں لے آیا جب وہ چلا گیا تو میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں اس فوجی وردی سے نجات حاصل کرنی ہے۔ میرٹھ شہر میں پرانے کپڑوں کا لنڈا بازار ضرور ہو گا۔ میں وہاں سے سویلین کپڑے خرید کر لے آؤں گا"

ہم نے ہوٹل میں اپنے وہ ہندو نام نہیں لکھوائے تھے۔ جو انبالہ ایئرپورٹ والے ملٹری ونگ کی ملٹری پولیس کو لکھوائے تھے اور جن ناموں سے ہوائی جہاز میں ہماری سیٹیں بک ہوئی تھیں۔ دن نکل آیا تھا ہم نے باری باری غسل کیا۔ پھر ناشتہ منگوا کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد میں میرٹھ کے لنڈے بازار کی تلاش میں نکل گیا۔ میں بھارتی فوج کے

صوبیدار میجر کی وردی میں تھا۔ پوچھتا پوچھتا میں ایک بازار میں آ گیا۔ جہاں پرانے گرم کپڑے فروخت ہو رہے تھے۔ یہاں سے میں نے اپنے اور کمانڈر شیروان کے ناپ کی دو پتلونیں دو پرانی گرم جرسیاں اور گرم مفلر خریدے اور ہوٹل واپس آ گیا۔ ہم نے وردیاں اتار دیں اور سویلین کپڑے پہن لئے اس کے بعد ریلوے سٹیشن پر فون کر کے دلی جانے والی گاڑی کا پتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک گاڑی رات کے سوا بارہ بجے دلی جائے گی۔ ہم نے اسی گاڑی میں دلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں نے کمانڈر شیروان سے کہا کہ وہ آرام کر لے۔ وہ سو گیا میں جاگتا رہا۔ تین گھنٹے کی نیند کے بعد کمانڈو جاگا تو پھر میں سو گیا۔ اس طرح دن گزر گیا شام آ گئی۔ ہم ہوٹل کے کمرے میں ہی رہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم رات کے گیارہ بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہم ہوٹل سے نکل پڑے۔ سٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹیکسی نے ہمیں دس پندرہ منٹ میں سٹیشن پر پہنچا دیا۔ ہم نے پرانے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے۔ گلے میں مفلر ڈال رکھے تھے۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ میرٹھ کے ریلوے سٹیشن پر ملٹری پولیس تو نظر نہ آئی لیکن ریلوے پولیس موجود تھی۔ مگر انہوں نے بھی ہمیں کوئی اہمیت نہ دی۔

یہ کوئی میل ٹرین تھی اور امرتسر سے آ رہی تھی۔ پورے بارہ بجے رات ٹرین آ گئی۔ ہم نے دلی تک کے دو سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لے لئے تھے۔ سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ اس لئے لئے تھے کہ فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں رات کے وقت کوئی ٹی ٹی وغیرہ نہیں آتا۔ پولیس سے آمنا سامنا ہونے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں کچھ دوسرے مسافر بھی تھے جن میں تین سو رہے تھے۔ ایک سکھ مسافر میرٹھ ہی سے سوار ہوا تھا اور برتھ پر قلی کی مدد سے اپنا بستر لگوا رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹرین دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ میرٹھ سے دلی زیادہ دور نہیں ہے۔ درمیان میں غازی آباد کا بڑا سٹیشن آیا جو دلی کے مضافات میں ہی واقع ہے۔

ابھی رات کافی گہری تھی کہ ہم دلی پہنچ گئے۔

اپنے آدمی گل خان کے گھر کا مجھے پتہ معلوم تھا۔ کمانڈر شیروان بھی دو ایک بار بھیس بدل کر اپنی کسی کمانڈو مہم کے سلسلے میں گل خان کے گھر آ چکا تھا۔ ہم ایک رکشے میں سوار ہو کر گل خان کے محلے میں پہنچ گئے۔ گل خان کا نام آپ کو یاد ہو گا میں نے فرضی رکھا ہوا ہے۔ اس کشمیری مجاہد کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ گل خان کا مکان علاقے کی ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ اس وقت وہ سو رہا تھا۔ گل خان کی بڑے بازار میں دکان تھی۔ وہ اکیلا مجرد زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر اکیلے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بال بچہ ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ انہیں کسی وقت ہنگامی حالت میں فرار بھی ہونا پڑ جاتا ہے۔ گل خان نے ہمیں دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ باری باری ہم سے گلے ملا اور بیٹھک میں لے گیا کہنے لگا۔

"کمانڈر شیروان تمہاری گرفتاری کی خبر ہمیں یہاں مل گئی تھی۔ میں سخت پریشان تھا۔ پیچھے کئی بار رات کو وائرلیس پر رابطہ پیدا کر چکا ہوں۔ وہاں سے یہی خبر ملتی کہ کمانڈر شیروان کو ملٹری پولیس جموں لے گئی ہے۔ پھر یہ خبر ملی کہ کمانڈو امرتسر جیل میں ہے اور اپنے دو کمانڈو لیڈر کو فرار کروانے جا چکے ہیں۔ اب تم دونوں کو دیکھ کر بے حد تسلی ہوئی ہے۔ مجھے ویسے بھی ایک ضروری مشن کے سلسلے میں آپ لوگوں سے ملاقات کرنی تھی۔
میں خود سری نگر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"آخر وہ مشن کیا ہے؟"

گل خان بولا۔

"ابھی آپ لوگ آرام کریں۔ صبح بات کریں گے۔"

ہم وہیں دری پر لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ کیونکہ دلی میں پنجاب کی طرح کافی سردی تھی۔ صبح گل خانے نے ہمیں اٹھایا اور کمانڈر شیروان کے چہرے پر زخم کے کھرنڈ دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ ٹارچر کے نشان ہیں۔ مجھے معلوم ہے میں اس کے لئے دوائی لاتا ہوں ناشتہ میں نے باورچی خانے میں ہی لگا دیا ہے۔ اتنی دیر میں آپ لوگ ناشتہ کر لیں"

ہم باورچی خانے میں آ گئے اور گل خان مکان سے نکل گیا۔ جب واپس آیا تو ہم ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھک میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گل خان کچھ اینٹی بائیٹک گولیاں اور زخموں پر لگانے کے واسطے مرہم لایا تھا۔ اس نے کمانڈر شیروان کے زخموں کے کھرنڈوں پر مرہم لگائی اینٹی بائیٹک کی دو گولیاں کھلائیں اور کہنے لگا۔

"آپ لوگوں کو بتانا بیکار ہے مگر پھر بھی میں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ لوگ دن کے وقت یہاں سے باہر نہ نکلیں رات کے وقت مجھے بتا کر باہر جا سکتے ہیں۔"

کمانڈر شیروان نے اس سے پوچھا۔

"تم کسی مشن کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ کیا مشن ہے؟"

گل خان نے کہا۔

"میں چائے بنا کر لے آؤں۔ چائے پیتے ہوئے بات کروں گا۔ ویسے یہ مشن بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ جس مشن کی گل خان بات کرنے والا ہے وہ کون سا مشن ہو سکتا ہے۔ گل خان اپنے لئے اور ہمارے لئے بھی چائے کی چینک بھر کے لے آیا۔ اس نے تین پیالیوں میں چائے ڈالی اور بولا۔

"اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ مشن کیا ہے جس کی خاطر میں آپ کے پاس سری نگر کے ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنے والا تھا۔"

ہم دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

گل خان نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے خاص خفیہ ذرائع سے خبر ملی ہے کہ بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش میں اپنا کوئی حریت پرست مجاہد پولیس کی حراست میں ایلورا جیل کے ٹارچر سیل میں گزشتہ ایک مہینے سے پولیس کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ مجاہد وہاں کیسے پہنچ گیا۔ اسے وہاں پاکستانی کمانڈو کا الزام لگا کر رکھا گیا ہے اور اس پر وحشیانہ تشدد کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کا نام بھی معلوم نہیں ہوسکا۔ ہم اس کی شکل وصورت سے بھی واقف نہیں ہیں۔ صرف اتنا ہی سراغ ملا ہے کہ جب اس پاکستانی کمانڈو یا کشمیری مجاہد کو آندھرا پردیش کی پولیس نے گرفتار کیا تو وہ سادھو کے بھیس میں تھا۔ اگر یہ شخص واقعی کشمیری مجاہد یا پاکستانی کمانڈو ہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اسے بھارتی درندہ صفت پولیس کے تشدد سے بچائیں۔ کہتے ہیں کہ جب اس مجاہد پر تشدد کی انتہا ہو جاتی ہے تو وہ درد سے چیخنے کی بجائے پاکستان زندہ باد آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیتا ہے اور نعرے لگاتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

میں اور کمانڈر شیروان بڑے غور سے سن رہے تھے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہماری کمانڈو پارٹی کا کوئی مجاہد نہ تو آندھرا پردیش کی طرف کبھی گیا ہے اور نہ وہاں قید میں ہے۔"

گل خان بولا۔

"تو پھر یہ آزادی کشمیر' پاکستان اور اسلام کا غازی کون ہو سکتا ہے بہرحال وہ جو کوئی

بھی ہے مسلمان ہے مجاہد ہے۔ اس پر پاکستانی کمانڈو ہونے کا الزام لگا کر آندھرا پردیش کی پولیس اس کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنا رہی ہے۔ ہماری خفیہ اطلاع کے مطابق اس مرد مومن نے اپنے نام کے سوا بھارتی پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ افسوس کہ ہمیں اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ بڑی مصدقہ رپورٹ ہے کہ ایلورا کے ساحلی شہر سے تین چار میل دور سمندری جزیرے میں جو خطرناک اور عمر قید بھگتنے والوں قیدیوں کے لئے جیل بنائی گئی ہے وہاں ایک کال کوٹھڑی میں یہ مجاہد بند ہے اور گزشتہ ایک ماہ سے سخت اذیتیں برداشت کر رہا ہے اور اسلام زندہ باد پاکستان زندہ باد اور آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہا ہے۔"

میں نے گل خان سے پوچھا۔

"کیا یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کشمیری ہے' پنجابی ہے یا پاکستانی ہے؟"

گل خان نے جواب میں کہا۔

"اس بارے میں بھی ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ ایلورا کے ساحلی شہر سے چار میل دور سمندر کے اندر ایک چھوٹے سے جزیرے میں جو جیل خانہ ہے وہاں کسی شہری کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ قیدیوں سے ان کے رشتے دار بھی ملاقات نہیں کر سکتے۔ جزیرے کے اردگرد ساحلی پولیس کے سٹیمر ہروقت چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ذرا سے شک پر وہ مشین گنوں کی فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ اس جیل خانے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں سے آج تک کوئی قیدی فرار نہیں ہوسکا۔ جس سمندر میں یہ جیل خانہ ہے اس میں پولیس نے سینکڑوں کی تعداد میں شارک مچھلیاں چھوڑ رکھی ہیں۔ اگر کوئی انسان سمندر میں اترے تو شارک مچھلیاں اس کی بو پر فوراً وہاں پہنچ کر اس بدقسمت کی تکا بوٹی کر دیتی ہیں۔ یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے آپ لوگ یہ بتائیے کہ کیا آپ اس مشن پر جانے کے لئے تیار ہیں؟"

میں نے کمانڈر شیروان کی طرف دیکھا۔ اس نے گل خان سے کہا۔

"گل خان! آزادی کشمیر کے مجاہد' پاکستان کے شیدائی اور اسلام کے غازی اس شیر

دل مجاہد کو وہاں سے نکالنا ہمارا فرض ہے۔ ہم اس مشن کو اپنا دینی فرض سمجھ کر پورا کریں گے۔"

گل خان نے میری طرف دیکھا۔

"کیا تم بھی تیار ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں دل وجان سے تیار ہوں۔ لیکن میں اس مشن پر اکیلا جانا زیادہ پسند کروں گا۔ کمانڈر شیروان کو آرام کی بھی ضرورت ہے اور پیچھے کشمیر کے محاذ پر بھی اس کی ضرورت ہے"

کمانڈر شیروان نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک کشمیر بھارتی تسلط سے آزاد نہیں ہو جاتا اور کشمیری عوام اپنا حق خود ارادیت حاصل نہیں کر لیتے' آرام ہم پر حرام ہے میں اس مشن پر ضرور جاؤں گا"۔

حقیقت یہ ہے کہ میں کمانڈر شیروان کو اس خطرناک مشن پر ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ انڈیا کی ملٹری انٹیلی جینس نے امرتسر کے قلعے میں اس پر اس قدر تشدد کیا تھا کہ کمانڈر شیروان کو کم ازکم ایک ماہ تک علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک اور طرح سے کمانڈر شیروان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کمانڈو شیروان! اس مشن پر ویسے بھی دو کمانڈوز کا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ ایک آدمی تو ہنگامی صورت میں کسی بھی طرح اپنا بچاؤ کر سکتا ہے لیکن دو آدمیوں کے لئے مشکل پڑ سکتی ہے۔ آپ ہمارے کمانڈو ہیں۔ ہم آپ کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ یہاں سے واپس سری نگر پہنچ کر حریت پرست کمانڈوز کی قیادت سنبھالیں۔ وہاں آپ کی اشد ضرورت ہے۔"

کمانڈر شیروان کسی طرح نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب گل خان نے بھی اسے سمجھایا تو وہ بادل نخواستہ سری نگر واپس جانے پر راضی ہو گیا۔

ہمارا اب سب سے پہلا مشن کمانڈر شیروان کو دلی سے نکال کر سری نگر پہنچانا تھا۔

گل خان نے اپنے ایک خاص آدمی کو تیار کر لیا۔ ایک رات کمانڈر شیروان کا سادھوؤں والا حلیہ بنا کر اس خاص آدمی کے ساتھ دلی سے بذریعہ ٹرین جموں توی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد میں اور گل خان سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے گل خان سے پوچھا۔

"اب مجھے بتاؤ کہ آندھرا پردیش کا یہ شہر جہاں مجھے جانا ہے کس طرف واقع ہے"

گل خان کہنے لگا۔

"یہ سارا علاقہ حیدر آباد دکن کا علاقہ ہے جہاں نظام حیدر آباد کی حکومت تھی اور جو ہندوستان کی سب سے بڑی مسلمان ریاست تھی۔ نظام حیدر آباد نے قیام پاکستان کے وقت پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تھا۔ مگر قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی بھارتی فوج نے حیدر آباد دکن کی مسلم ریاست پر چڑھائی کر دی۔ دکن کے بہادر اور سر فروش رضاکاروں نے ہر محاذ پر بھارتی فوج کا بے جگری سے مقابلہ کیا مگر ان کے وسائل محدود تھے۔ ان کے پاس وافر اسلحہ اور توپ خانہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ بھارت نے حیدر آباد کی ریاست پر قبضہ کر لیا اور ہزاروں مسلمانوں نے دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ بہرحال اب اس صوبے کا نام آندھرا پردیش ہے۔ یہاں کے لوگ بڑی خوبصورت اردو زبان کے ساتھ ساتھ تلگو زبان بھی بولتے ہیں۔ تمہیں دلی سے حیدر آباد (دکن) جانا ہو گا۔ وہاں سے تم وجے واڑہ جاؤ گے۔ وجے واڑہ سے نیلور شہر کے سٹیشن پر اتر جاؤ گے۔ یہاں ایک دریا سمندر میں گرتا ہے۔ دریا کے ڈیلٹے پر ایلورا نام کا چھوٹا سا شہر آباد ہے۔ اس شہر کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے جہاں سے مسافر بردار اور سامان سے لدے ہوئے سمندری جہاز اوپر ماشولی پٹم' کاکی ناڈا اور وشاگاپٹنم کی طرف اور نیچے مدراس کی جانب جاتے ہیں۔ یہ خلیج بنگال کا سمندر ہے۔ ایلورا کی چھوٹی سی بندرگاہ سے مشرق کی طرف سمندر میں چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک مختصر سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرے میں صرف ایک ہی بلند پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی کے اوپر وہ جیل خانہ ہے جس کی ایک کال کوٹھڑی میں ہمارا گمنام مجاہد یا کمانڈو قید وبند میں رہ کر تشدد کی اذیتیں برداشت کر رہا ہے۔

مجھ تک جتنی خفیہ اطلاعات پہنچی ہیں وہ میں نے تمہیں بیان کر دی ہیں۔ باقی آگے ہمارا ایک آدمی تمہاری راہ نمائی کرے گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ اپنا آدمی کیا دلی سے میرے ساتھ جائے گا؟"

گل خان نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ آدمی تمہیں حیدر آباد دکن میں ملے گا۔ تمہیں اس کا ایڈریس دے دیا جائے گا اور اپنی شناخت کے لئے کوڈ الفاظ بھی بتا دیئے جائیں گے۔ ٹھہرو میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔"

گل خان ایک ٹرنک میں سے کاپی نکال کر لے آیا۔ کاپی میں پاسپورٹ سائز کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ گل خان نے تصویر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا وہ خفیہ آدمی ہے جو تمہیں حیدر آباد کے ایک محلے میں ملے گا۔ تمہیں اس محلے کا پورا پتہ بتادیا جائے گا۔ میں تمہیں اس آدمی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ وہ بھی تمہیں اپنا نام نہیں بتائے گا۔ وہ تم سے زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہوگا۔ مگر تمہاری پوری پوری راہ نمائی کرے گا اور تمہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت پڑے وہ تمہیں مہیا کر دے گا۔ اس شخص کے بارے میں مجھے اس سے زیادہ تمہیں کچھ بتانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اس خاص آدمی کا اصلی نام میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ وہ نام بتاؤں گا جس نام سے وہ شہر حیدر آباد دکن میں رہ رہا ہے۔ وہ تم سے بھی تمہارا نام نہیں پوچھے گا۔ اس شخص تک اپنے خفیہ وسائل کے ذریعے تمہارا حلیہ اور تمہارے بارے میں ساری معلومات پہنچا دی جائیں گی۔"

میرے ہاتھ میں اس شخص کی تصویر تھی جس سے حیدر آباد دکن میں جا کر مجھے ملاقات کرنی تھی اور اس کے ذریعے آگے ایلورا کے جزیرے والی بھارت کی خطرناک ترین جیل اور اپنے گمنام کمانڈو مجاہد کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے اسے بھارتی قبضے سے آزاد کرانا تھا۔ تصویر ایک درمیانی عمر کے آدمی کی تھی جس کی گھنی

مونچھیں تھیں۔ ڈاڑھی نہیں تھی۔ اچکن پہنی ہوئی تھی۔ چہرے کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ سر پر کانگرسی ٹوپی تھی۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"کیا یہ ہندو کانگرسی بن کر وہاں رہتا ہے؟"

"ہاں" گل خان نے جواب دیا۔ "یہ وہاں اپنے محلے کی کانگرس کمیٹی کا ممبر بھی ہے"

پھر اس نے مجھے اس کا ہندو نام اور اس کے محلے کا ایڈریس زبانی بھی بتایا اور لکھ کر بھی دے دیا۔ میں نے یہ ایڈریس والا کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔

اس کے بعد میں نے آندھرا پردیش میں کسی سنگین جیل میں قید اور بھارتی خفیہ انٹیلی جنیس کے تشدد اور ٹارچر کا نشانہ بنتے ہوئے اسلام کے غازی' پاکستان کے شیدائی اور آزادی کشمیر کے مجاہد اس گمنام کمانڈو کو وہاں سے فرار کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آندھرا پردیش میں ان دنوں گرمیوں کا موسم تھا۔ وہاں نومبر دسمبر میں بھی سردی برائے نام صرف رات کو پڑتی تھی۔ میں نے ایک مٹیالے رنگ کی موٹے کھدر کی جیکٹ بنوائی۔ پتلون بھی اسی کلر کی خریدلی۔ جوتے میرے ٹھیک ٹھاک تھے۔ ایک کھدر کا تھیلا لے لیا۔ اس قسم کا تھیلا سیاسی کارکن عام طور پر اپنے کاندھے سے لٹکائے رکھتے تھے۔ اس میں میں نے ایک جوڑا کھدر کا کرتا پاجامہ اور تولیہ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ رکھ لیا۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی مگر اپنے آپ کو ایک نارمل مسافر ظاہر کرنے کی خاطر یہ چیزیں ضروری تھیں۔ گل خان نے مجھے کچھ انڈین کرنسی دے دی۔ دلی سے نیلور تک کا تھرڈ کلاس کا ریلوے ٹکٹ بھی لا کر دے دیا۔

میرے اور کمانڈر شیروان کے پاس جو دو آٹومیٹک پستول تھے ان میں سے ایک کمانڈو شیروان چھپا کر اپنے ساتھ ہی سری نگر لے گیا تھا۔ ایک میرے پاس تھا۔ میگزین بھی تھا۔ گل خان نے کہا۔

"یہ پستول ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں۔ یہ تم یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ حیدر آباد میں ہمارا آدمی تمہیں جس قسم کے اسلحے کی ضرورت ہوگی تمہیں مہیا کر دے گا۔ حیدر آباد میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے اور وہ آج بھی پاکستان سے والہانہ پیار کرتے ہیں اور

کشمیریوں کو حق خود ارادی دلانے کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں مگر بھارتی حکومت نے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی طرح دکن کے مسلمانوں کے پاؤں میں بھی غلامی اور جبرو استبداد کی زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔ بہرحال وہاں پہنچ کر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کا رشتہ کس قدر مضبوط اور ناقابل شکست رشتہ ہوتا ہے اور یہ رنگ نسل اور قومیت سے بلند تر ہوتا ہے۔"

میں نے اپنا آٹومیٹک پستول گل خان کو دے دیا۔ اس وقت تک میرے ڈاڑھی مونچھ نہیں تھی۔ میں نے شیو کروادی ہوئی تھی۔ صرف سر کے بال تھوڑے تھوڑے لمبے تھے۔ میں نے یہی حلیہ رہنے دیا۔

گل خان رات کے وقت میرا دلی سے نیلور تک کا ریل کا ٹکٹ لایا تھا۔ گاڑی منہ اندھیرے چھوٹتی تھی۔ گل خان نے مجھے ایک گھنٹہ پہلے جگادیا۔ میں نے غسل کرنے کے بعد وضو کیا۔ نماز فجر ادا کی اور خدا کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا مانگی موٹے کھدر کی جیکٹ اور پتلون پہن کر کھدر کا تھیلا اپنے کاندھے سے لٹکالیا۔ میرے پاس ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ گل خان نے مجھے چاقو ساتھ رکھنے سے منع کیا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم اس وقت کانگرسی ورکر لگتے ہو۔ یہاں سے تم کانگرسی ہندو بن کر اپنا سفر شروع کرو گے۔ اپنا کوئی ہندو نام سوچ کر رکھ لینا۔ اور کوڈ کے الفاظ اچھی طرح یاد رکھنا۔ ان الفاظ کے بغیر اپنا آدمی تم کو پہچاننے سے انکار کر دے گا۔"

میں نے کوڈ کے الفاظ گل خان کو دہرا کر سنائے۔ یہ دو جملے تھے۔ ایک جملہ مجھے بولنا تھا۔ جس کے جواب میں ایک جملہ اپنے حیدر آباد والے جاسوس مجاہد نے بولنا تھا۔ اس کے جواب میں پھر مجھے ایک کوڈ کا جملہ ادا کرنا تھا۔ میں نے گل خان سے پوچھا۔

"سر پر کانگرسی ٹوپی اور ماتھے پر تلک لگانے کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

وہ بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ کانگرسی ورکر تلک نہیں بھی لگاتے۔ اگر کہیں ضرورت

محسوس ہوئی تو اپنے آپ کو کمیونسٹ بھی ظاہر کر دینا۔ آندھرا پردیش میں کمیونسٹ پارٹی کا بھی زور ہے اور بھارت میں کمیونسٹ پارٹی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

میں نے گل خان سے ہاتھ ملایا۔ اس نے میرے مشن کی کامیابی کے لئے دعا کی اور کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم ایلورا جزیرے کی سنگین جیل میں قید وبند اور تشدد کی اذیتیں برداشت کرنے والے گمنام کمانڈو اور اسلام کے اس مجاہد کو ضرور رہا کرالو گے جس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون مسلمان مجاہد ہے اور بھارتیوں کی قید میں کیسے پھنس گیا۔"

میں نے کہا۔

"میں انشاء اللہ پوری کوشش کروں گا کہ اس مرد غازی کو کافروں کی قید سے نکال کر جہاں وہ جانا چاہے اسے وہاں پہنچادوں۔ خدا حافظ!"

دلی میں ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔

رات کے پچھلے پہر ستارے آسمان پر جھلملا رہے تھے۔ مگر دلی بہت بڑا شہر تھا۔ گل خان کے اندرون شہر والے محلے سے نکلا تو کشادہ بازاروں میں بتیاں خوب روشن تھیں۔ میں نے پیدل چلنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ رات کو گشت کرنے والی پولیس سے کہیں بھی آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ جو پہلا خالی رکشا ملا اسی میں بیٹھ کر دلی کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ پلیٹ فارم مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ دلی سے نیلورا وایا حیدر آباد ایسا روٹ تھا کہ جس روٹ پر بھارت کے بڑے بڑے اہم شہر تھے اور ان شہروں کے مسافر پلیٹ فارم پر اپنے کنبوں کے ساتھ بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ جو لکھنؤ کانپور سے آرہی تھی۔ میں نے ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر چائے کا ایک کپ پیا۔ ناشتہ میں گل خان کے ہاں سے کر کے آیا تھا۔ دلی میں سردی تھی۔ مگر موٹے کھدر کی جیکٹ سے سردی کا کافی بچاؤ ہو گیا ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا اور سگریٹ سلگا کر ایک طرف بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ٹرین آئی مسافروں نے اس کے ڈبوں پر بلہ بول دیا۔ میں اکیلا تھا۔ کوئی سامان بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ ایک ڈبے میں مجھے بھی جگہ مل گئی۔ مسافروں میں پنجابی ہندو سکھ بھی تھے جنوبی ہند کے کالے کالے مدراسی تامل بھی تھے۔ طرح طرح کی زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ میں کونے میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھا باہر پلیٹ فارم کی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر ٹرین چل پڑی۔ دلی سے نیلور تک کا سفر بھی شیطان کی آنت کی طرح طویل تھا۔ خدا جانے کتنے سٹیشن آئے۔ کتنے شہر آئے۔ آب وہوا بدل گئی۔ زبان بدل گئی۔ بڑے بڑے چند ایک شہر یاد رہ گئے ہیں۔ وہی آپ کو بتاتا ہوں یہ ٹرین دلی سے وایا جھانسی نیلور جا رہی تھی۔ جھانسی سے وہ دلی بمبئی لائن کو چھوڑ کر وہ نرسیما پور اور ناگ پور والی لائن پر ہو گئی۔ نرسیما پور سے ناگ پور ناگ پور سے وادھا سے چندرا پور' وہاں سے ورنگل اور ورنگل سے حیدر آباد پہنچ گئی۔ یہ سفر پورے ایک دن اور ایک رات اور پھر ایک دن میں طے ہوا۔ حیدر آباد ٹرین پہنچی تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ اس مسلم ریاست کے آثار سٹیشن کی طرز تعمیر اور وہاں کے لوگوں کے پہناوے سے نمایاں تھے یہاں اچکنیں اور ترکی ٹوپیاں نظر آئیں تو دل کو خوشی ہوئی۔ مگر جب یہ خیال آیا کہ برصغیر کی اس سب سے بڑی مسلمان ریاست پر انڈیا کی حکومت نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور یہاں مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا گیا تھا تو دل اداس پڑ گیا۔ مجھے یہاں اترنا تھا اور اپنے آدمی سے ملاقات کرنی تھی۔

میرا ٹکٹ نیلور تک کا تھا۔ میں حیدر آباد دکن کے سٹیشن پر اتر گیا۔ سٹیشن سے باہر نکل کر ایک موٹر رکشا والے کو اس علاقے کا نام بتایا جہاں مجھے اپنے آدمی سے ملنا تھا۔ رکشا شہر کے خوبصورت کشادہ بازاروں میں سے گزرنے لگا۔ دور سے میں نے چار مینار کی عمارت دیکھی۔ رکشا دوسری طرف سے ہو کر آگے نکل گیا۔ اب میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کہ رکشا کس طرف گیا۔ رکشا ایک خاص جگہ پر جا کر رک گیا۔ یہی وہ علاقہ تھا جس کا پتہ مجھے گل خان نے لکھوایا اور یاد بھی کرایا تھا۔ اتنا سمجھ لیں کہ یہ کوئی ماڈرن علاقہ نہیں تھا۔ درمیانے درجے کی آبادی تھی۔ خوشنما مکان بھی تھے اور ٹین کی چھتوں والے مکان

بھی تھے۔ املی تاڑ اور ناریل کے درخت جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ مسلمان اپنی اچکن اور چوڑے چوڑے پاجاموں سے صاف پہچانے جاتے تھے جب کہ ہندو صرف بنیان اور تہمد باندھے ہوئے تھے۔ تہمد بھی انہوں نے نیچے سے اٹھا کر گھٹنوں تک باندھا ہوا تھا۔ ان کی اکثریت پاؤں سے ننگی تھی۔ شلوار قمیض اور برقعوں والی مسلمان عورتیں بھی دکانوں پر نظر آ رہی تھیں اور ساڑھیوں والی ہندو عورتیں بھی چل پھر رہی تھیں۔ یہاں کی زبان اردو بھی تھی اور تلیگو زبان بھی بولی جا رہی تھی۔ تامل لوگ بھی تھے مگر اکثریت تلیگو بولنے والوں کی تھی۔ ایک مسجد کے اونچے مینار دکھائی دیئے یہ ایک نشانی تھی جو مجھے بتائی گئی تھی۔ اس مسجد کے آگے ایک بازار تھا جس کی ایک دکان میں باہر ایک بورڈ لگا تھا۔ بورڈ پر کیا لکھا تھا؟ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

دکان کے اندر وہی گھنی مونچھوں والا آدمی جس کی گل خان نے مجھے دلی میں تصویر دکھائی تھی تخت پوش پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے حیدر آبادی اچکن پہنی ہوئی تھی جس کے بٹن گرمی کے موسم میں بھی گلے تک بند کئے ہوئے تھے۔ سر پر کانگریسی ٹوپی تھی۔ تین آدمی تخت پوش پر اس کے سامنے بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی آداب کہہ کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ گل خان نے اپنے خفیہ پیغام کے ذریعے اسے بھی میرا حلیہ بتا دیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے مگر اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اتنا ضرور اس نے کیا کہ مجھ سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے آدمیوں کو مختصر سی بات کرنے کے بعد ایک ایک کر کے رخصت کر دیا۔ جب سب لوگ چلے گئے اور دکان میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ رہا تو اس نے صندوقچی میں سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ مجھے بیڑی پیش کی۔

"آپ شوق کریں گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں شکریہ"

"آپ تمباکو نہیں پیتے؟؟"

میں نے کہا۔

"میں سگریٹ ضرور پیتا ہوں مگر بیڑی بڑی سخت ہوتی ہے"

اس نے خود ایک بیڑی سلگالی اور مجھ سے پوچھا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ کیسے تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کوڈ کا جملہ بولا۔

"دکن میں اسلام کے نام پر مسلمانوں کا بہت خون بہا ہے"

اس نے جواب میں کہا۔

"دکن میں بارش بہت ہوتی ہے۔"

میں نے اس کے جواب میں خفیہ کوڈ کا جملہ بولا۔

"رات دریائے کاویری میں سیلاب کا منظر تھا"

ہم دونوں کی شناخت ہو چکی تھی۔ اس نے صندوقچی میں سے ایک کاپی نکالی۔ قلم سے کاپی کے ایک صفحے پر کچھ لکھا۔ ورق پھاڑ کر تہہ کیا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ لے جائیں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کا کام ہو جائے گا"

میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ جیب میں ڈالا اور آداب بجالا کر دکان سے نکل گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے کاغذ پر کوئی خاص پیغام لکھا ہے۔ میں بازار میں سے گزر کر ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ یہاں ایک درخت کے نیچے کاندھے سے تھیلا اتار کر یوں بیٹھ گیا جیسے ذرا آرام لینے کے لئے بیٹھا ہوں۔ وہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ میں نے جیب سے کاغذ نکال کر پڑھا اس میں لکھا تھا۔

"چار مینار سے سات نمبر بس پکڑو اور پرانے قبرستان کے سٹاپ پر اتر جاؤ۔ قبرستان کے شمال میں بیگم کا مقبرہ ہے وہاں میرا انتظار کرو"

ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ سورج مغرب میں غروب نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک رکشا لیا اور چار مینار کے بس سٹاپ پر اتر گیا۔ دو تین بسیں آکر نکل گئیں۔ آخر سات نمبر

کی بس آئی تو میں اس میں سوار ہو گیا اور کنڈیکٹر سے کہا کہ پرانے قبرستان کا سٹاپ آئے تو بتا دینا۔ بس شہر کے مختلف بازاروں میں سے گزرتی ہوئی ایک کم آبادی والے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں کھیت' اور درختوں کے ذخیرے تھے۔ بس کی رفتار کم ہونے لگی۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

"پرانا قبرستان"

میں بس سے اتر گیا۔ بس چلی گئی میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی ایک طرف چھوٹی سی مسجد کے مینار دکھائی دیئے۔ میں اس طرف چل پڑا۔ یہ پرانے قبرستان کی جنازگاہ تھی۔ قبرستان میں کچی پکی قبریں تھیں۔ میں دل ہی دل میں فاتحہ پڑھتا قبروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ میری نگاہیں مقبرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ قبرستان کی حدود ختم ہو گئی۔ ایک طرف گھنے درختوں میں چھوٹی سی بارہ دری نظر پڑی۔ میں وہاں آگیا۔ بارہ دری میں ایک قبر بنی ہوئی تھی جس پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ کتبے پر آیات شریفہ کندہ تھیں اور جس بیگم صاحبہ کی یہ قبر تھی اس کا نام لکھا ہوا تھا۔

میں مقبرے کی بارہ دری میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دوزانو ہو کر فاتحہ پڑھ کر مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچایا اور پھر اپنے خاص آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران سورج غروب ہو گیا اور شام کی سیاہی پھیلنا شروع ہو گئی۔ فضا حبس آلود تھی۔ ہوا جیسے بند تھی۔ میں بارہ دری سے اتر کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے سے کچھ ہوا لگنے لگی۔ اتنے میں مجھے قبرستان کی طرف سے ایک آدمی بارہ دری کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں بارہ دری کی اوٹ میں ہو گیا۔ آدمی قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ اپنا آدمی تھا۔ یعنی وہی آدمی جس نے مجھے رقعہ لکھ کر یہاں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ میرے پاس آکر بولا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ"

وہ درختوں کے ایک ذخیرے میں داخل ہو گیا۔ ہم درختوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ذخیرے کے آخری کنارے پر ٹین کی چھت والا ایک کیبن سا بنا ہوا تھا۔ دیواریں پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھیں پتھروں پر جنگلی بیلیں چڑھی

ہوئی تھیں۔ وہ کیبن کے اندر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کیبن میں داخل ہو گیا۔ اس نے موم بتی روشن کردی اور کیبن کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ اندر حبس تھا فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس نے چٹائی پر مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور جیب سے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔

"گل خان نے مجھے تمہارے مشن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہمیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ ایلور کے سمندری جزیرے کی جیل میں ایک مسلمان مجاہد قید وبند کی صعوبتیں اور خفیہ پولیس کی اذیتیں سہہ رہا ہے اور اس پر پاکستانی کمانڈو ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس مجاہد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا۔

"پہلے یہ بتائیں کہ اس جزیرے کا نام ایلورا ہے یا ایلور"

وہ بولا۔

"اس کا نام ایلور ہے۔ صرف ایلور۔ ایلورا اور اجنٹا دو غار ہیں جو اورنگ آباد کے ضلع میں واقع ہیں۔ ان کا ایلور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایلور نیلور سے کچھ فاصلے پر آندھرا پردیش کا وہ ساحلی شہر ہے جہاں دریا سمندر میں گرتا ہے۔ وہاں سے سمندر میں چار میل کے فاصلے پر وہ چھوٹا سا ویران جزیرہ ہے جہاں جیل خانہ ہے۔ اس جزیرے میں اور کوئی آبادی نہیں ہے۔ صرف جیل کے عملے کے لوگ چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ جیل کے وارڈن اور افسر وغیرہ رات کو سٹیمر کے ذریعے ایلور شہر میں آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کیا ایلور میں اپنا کوئی ایسا آدمی مجھے مل سکے گا جو میرے مشن کے سلسلے میں تھوڑا سا گائیڈ کر سکے اور ضرورت پڑنے پر میری تھوڑی بہت مدد بھی کر سکے؟"

اس آدمی نے کہا۔

"وہاں اپنا ایک آدمی موجود ہے میں نے تمہیں اس آدمی کے بارے میں بتانے کے

واسطے ہی یہاں بلایا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا یہ آدمی کشمیری مجاہد ہے؟"

اس نے کہا۔

"کشمیری مجاہد اپنے محاذ پر بھارتی فوجیوں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں انہیں اتنی فرصت نہیں ہے کہ یہاں آکر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ ایلور میں تم جس آدمی سے ملو گے وہ آندھرا پردیش کا مسلمان ہے۔ جیسے میں یہاں کا رہنے والا مسلمان ہوں لیکن حیدر آباد میں ہندو کے نام سے اسلام کی سربلندی کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے کام کر رہا ہوں۔ ہمارے درمیان اسلام کا رشتہ ہی سب سے بڑا رشتہ ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ اور مسلمان دنیا کے جس کونے میں بھی ہو گا وہ اپنے مسلمان بھائی کی ضرور مدد کرے گا۔ اور یہ تو جہاد کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کا معاملہ ہے جس کے لئے ہماری جان بھی حاضر ہے۔"

اس آدمی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ اسلام کا رشتہ ہمارا سب سے بڑا رشتہ ہے۔ اگر دنیا کے تمام مسلمان چھوٹے چھوٹے فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر اسلام اور صرف اسلام کے پرچم تلے متحد ہو جائیں تو یقین کریں امت مسلمہ کی طاقت کا مقابلہ پھر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی نہیں کر سکیں گی۔

اپنے اس حیدر آبادی مجاہد نے مجھے اس خاص آدمی کا نام اور حلیہ بتایا جو ایلور کے ساحلی شہر میں رہ رہا تھا اور جس کے پاس مجھے جانا تھا۔ حیدر آبادی مجاہد نے کہا۔

"اپنا یہ غازی مسلمان کے نام سے یعنی اپنی اصلی حیثیت سے رہتا ہے۔ میری طرح وہاں اسے ہندو اور کانگرس کمیٹی کا رکن بن کر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنے خفیہ ذریعے سے اس کو تمہارے مشن کے بارے میں اطلاع پہنچا دوں گا۔"

اس کے بعد حیدر آبادی مجاہد نے مجھے اس شخص کا ایلور شہر میں پورا ایڈریس زبانی

بھی بتایا اور لکھ کر بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

میں نے کہا۔

"میرے پاس نیلور شہر تک ریل کا ٹکٹ موجود ہے۔ آگے ایلور کے بارے میں سنا ہے کہ وہ نیلور سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہاں پہنچ سکوں"

حیدر آبادی مجاہد کہنے لگا۔

"پھر بھی تم مجھ سے کچھ پیسے لے کر رکھ لو۔ ویسے تو ایلور شہر والا اپنا غازی تمہاری ہر طرح مدد کرے گا۔"

اس نے مجھے اچکن کی جیب میں سے انڈین کرنسی کے دس دس روپے کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے جو میں نے شکریے کے ساتھ اپنے پاس رکھ لئے۔

"اب تم یہاں سے سیدھا حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر جاؤ گے۔ نیلور جانے والی مدراس میل تمہیں رات کے آٹھ بجے ملے گی۔ میں اب جاتا ہوں۔ میرے جانے کے پانچ منٹ بعد تم بھی یہاں سے نکل جانا۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتادو"

میں نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ"

حیدر آبادی مجاہد مجھ سے گلے لگ کر ملا اور بولا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے مشن میں کامیابی عطا فرمائے۔ ویسے ایلور کے جزیرے والی جیل سے آج تک کوئی قیدی فرار نہیں ہو سکا۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنے مسلمان بھائی کو جیل کی سلاخوں اور بھارتی درندوں کی ظالمانہ اذیتوں سے نجات دلا کر رہوں گا خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان کی بازی کیوں نہ لگانی پڑے۔"

حیدر آبادی مجاہد نے میری پیشانی چوم لی۔

"جزاک اللہ! جزاک اللہ"

اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی جوشیلی آواز میں کہا۔

"پاکستان زندہ باد۔ آزادی کشمیر زندہ باد"

اور وہ تیزی سے کیبن میں سے نکل گیا۔ اس حیدر آبادی مجاہد کے سینے میں جذبہ اسلام اور جوش اسلام کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ یہی وہ جذبہ اور جوش ہے جس کی طاقت سے مسلمانوں نے روم کی طاقتور ترین سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور ان کے گھوڑے کفر کے بتوں کو روندتے ہوئے ہسپانیہ اور اس کے آگے جنوبی فرانس اور وی آنا کی سرحدوں تک پہنچ گئے تھے۔ یہ حیدر آبادی مجاہد میرے سینے میں موجزن جذبہ اسلام کو پھر سے تابندہ کر گیا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو اس کے پانچ منٹ بعد میں بھی کیبن سے باہر نکل آیا۔ اس وقت باہر رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ انڈیا کے جنوبی علاقے میں راتیں جنگلات اور سبزے کی وجہ سے بڑی تاریک ہوتی ہیں اور رات بڑی جلدی چھا جاتی ہے۔ میں قبرستان میں چلنے لگا۔ کسی طرف سے مینڈک کے بولنے کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ شاید ادھر کوئی تالاب تھا۔ سڑک پر بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں پرانے قبرستان والے بس سٹاپ پر آکر بس کا انتظار کرنے لگا۔ کافی انتظار کے بعد ایک بس آئی۔ میں نے کنڈیکٹر سے کہا کہ مجھے ریلوے سٹیشن کا ٹکٹ دے دے۔ اس نے بتایا کہ ریلوے سٹیشن جانے والی بس مجھے چار مینار سے ملے گی۔ میں نے چار مینار تک کا ٹکٹ لے لیا۔ چار مینار کے سٹاپ پر اتر گیا۔ یہاں سڑک پر خوب ٹریفک اور روشنی تھی۔ چار مینار کی چوکور اور اونچے اونچے میناروں والی عمارت کے نیچے سے سڑک گزرتی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر مجھے سٹیشن جانے والی بس مل گئی اور میں ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ابھی گاڑی آنے میں کافی وقت تھا۔ ٹکٹ میری جیب میں تھا جسے ٹی ٹی نے حیدر آباد سے نکلتے ہوئے چیک کر لیا تھا۔ اس ٹکٹ میں ایک طرف سوراخ کیا گیا تھا۔ میں ٹکٹ دکھا کر اس پلیٹ فارم پر آگیا جہاں سے مجھے نیلور کی طرف جانے والی مدراس میل ملنی تھی۔ جب تک گاڑی نہیں آئی میں ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرتا رہا آخر ٹرین آگئی۔ اور دوسرے

مسافروں کے ساتھ مجھے بھی لے کر مدراس کی طرف روانہ ہو گئی۔

اگر آپ کو کبھی اس طرف سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ ضرور جانتے ہوں گے کہ حیدر آباد (دکن) سے نیلور تک کا سفر بھی کافی لمبا سفر ہے۔ حیدر آباد کے سٹیشن سے ریلوے کا ایک روٹ محبوب نگر کرنول اور اننت پور سے بنگلور تک کا ہے۔ ایک ریلوے لائن حیدر آباد سے گلبرگہ' شولا پور اور پونا سے ہوتی ہوئی بمبئی کو جاتی ہے۔ میں جس روٹ پر سفر کر رہا تھا وہ حیدر آباد سے وجے واڑہ یا بیجواڑہ' گنٹور اور آگے نیلور سے مدراس تک کا روٹ تھا۔ یہ ٹرین یعنی مدراس میل ساری رات اور دوسرا پورا دن چلتی رہی۔ دوسرے دن تیسرے پہر اس نے مجھے نیلور پہنچایا۔ نیلور سے میں ایک لاری میں بیٹھ کر ایلور نام کے ساحلی شہر پہنچ گیا۔ ایلور کا شہر یا بندر گاہ خلیج بنگال کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ ایلور سے ذرا نیچے کی جانب کسی دریا کا ڈیلٹا ہے۔ اس دریا کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ دریا یہاں سمندر میں گرتا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑوں کا رنگ گہرا قرمزی ہو رہا تھا۔ ساحلی شہر ایلور زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ بازاروں میں دکانیں کھلی تھیں۔ رکشوں کے علاوہ کہیں کہیں موٹر کاریں بھی چلتی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف تھوڑی بلندی پر کوئی بہت بڑی عمارت تھی جس کے اوپر تلیگو زبان میں لکھا ہوا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ لوگوں کے رنگ یہاں زیادہ کالے ہو گئے تھے۔ عورتیں بھی کالی کالی تھیں۔ فضا ایسی تھی جیسے ہمارے پنجاب میں اگست کے مہینے میں ہوتی ہے۔ اپنے غازی کا ایڈریس میرے پاس تھا۔ شہر مختصر سا مگر بڑا صاف ستھرا اور کسی حد تک ماڈرن تھا۔ ایک آدمی سے میں نے پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اپنے غازی کا ٹھکانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں دو سنیما گھر آئے جہاں ایک سنیما ہاؤس میں ہندی کی اور دوسرے میں تلیگو کی فلم لگی ہوئی تھی۔ لوگوں کی اکثریت نے وہی مدراسی انداز میں دھوتیاں گھٹنوں سے اوپر تک اٹھا کر باندھی ہوئی تھیں اور جسم پر صرف بنیان ہی تھی۔ عورتوں نے جوڑوں میں سفید پھولوں کے گجرے ضرور سجائے ہوئے تھے۔ کوئی ہوٹل یا کافی کی دکان راستے میں آتی تو اندر سے تامل تلیگو اور کرناٹک سنگیت کے گانوں کی ریکارڈنگ سنائی دیتی کسی ریستوران سے ہندی فلموں کے گیت بھی سنائی دیتے تھے۔ میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ہمارا غازی رہتا تھا۔ یعنی جو ایڈریس مجھے حیدر آبادی مجاہد نے دیا ہوا تھا۔

میرے سامنے شام کے بڑھتے پھیلتے ملگجی اندھیرے میں ایک مچان کے اوپر بنا ہوا بانس کا مکان تھا جس کی سیڑھیوں میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ میں نے اپنے غازی کا نام لے کر اس سے کہا کہ مجھے اس سے ملنا ہے۔ وہ کھانستے ہوئے بولا۔

"ادھر جھومرے پٹی میں ملے گا"

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے پوچھا۔

"جھومرے پٹی میں کہاں ملے گا؟"

بوڑھے نے بڑے اطمینان سے ناریل کے حقے کے دو تین کش لگائے اور ایک بار پھر کھانسنے کے بعد بولا۔

"اس باجو کو جائے گا۔"

اس نے تین چار جملوں میں مجھے سمجھایا کہ جھومرے پٹی کہاں پر ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوڑا بہت مطلب نکالا اور جیسا اس نے بتایا تھا ویسے ہی ایک طرف چل پڑا۔ جس طرف بوڑھے نے مجھے جانے کے لئے کہا تھا اس طرف ایک کچا راستہ تھا جس کی دونوں جانب ناریل کے درخت کھڑے شام کی ہوا میں اپنی شاخوں کو ہلا رہے تھے۔ یہ جگہ چونکہ سمندر کے قریب تھی اس لئے اپنے کراچی شہر کی طرح یہاں بھی شام کے وقت سمندر کی طرف سے ہوا چلنے لگی تھی۔ یہ کچا راستہ ایک طرف کو مڑ گیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد سامنے سڑک بند ہو گئی اور ایک انگریزی فلموں کی طرز کا کاٹیج نظر آیا جس کے آگے سبزے کا لان تھا۔ لان بالکل خالی پڑا تھا۔ کاٹیج بانس اور لکڑی کا پرانی طرز کا تھا۔ اس کی تکونی چھت کی پیشانی پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ ایک چھوٹا سا رستہ کاٹیج کے برآمدے تک جاتا تھا۔ اس کا کوئی گیٹ نہیں تھا۔ لان کے پیچھے میں نے دو موٹر کاریں کھڑی دیکھیں ایک ستون کے چوکور پتھر پر تلیگو اور انگریزی زبانوں میں جھومرے پٹی لکھا ہوا تھا۔ میری

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کوئی ہوٹل ہے یا کیا ہے۔ اتنے میں ایک عورت اندر سے آتی نظر آئی۔ وہ اپنی ساڑھی سے گھروں میں کام کرنے والی لگتی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"جھومرے پٹی یہی ہے؟"

اس نے تلیگو زبان میں کچھ کہا اور چلی گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ چونکہ میں نے چوکور ستون پر مٹے ہوئے انگریزی حروف میں جھومرے پٹی لکھا ہوا پڑھ لیا تھا اس لئے میں کاٹج کے برآمدے میں آگیا۔ یہاں مجھے اندر سے انگریزی میوزک کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔ میں برآمدے میں رک گیا۔ کاٹج کے دروازے لکڑی کے تھے۔ کھڑکیاں بھی لکڑی کی تھیں اور بند تھیں۔ کہیں کہیں سے روشنی کی کرنیں باہر نکل رہی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا پراسرار لگا۔ آخر میں نے ہمت کر کے دروازے کے باہر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ تین چار مرتبہ بیل دینے پر دروازہ کھل گیا۔ اندر دھندلی دھندلی روشنی میں ایک درمیانے قد کی صحت مند جسم والی کالی عورت کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے جسم پر بغیر آستینوں کے ایک فراک ہی تھا۔ جس کا گریبان کافی نیچے تک گیا ہوا تھا۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔ اس علاقے میں جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں انگریزی زبان عام بولی جاتی ہے۔ میں نے اپنے غازی کا نام لیا عورت مسکراتے ہوئے ذرا ذرا ہل بھی رہی تھی۔ لگتا تھا اس نے کوئی نشہ کر رکھا ہے کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آجاؤ"

میں اندر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے بولٹ کر دیا اور میرے آگے آگے ذرا ذرا جھومتی اور منہ ہی منہ میں انگریزی کے کسی گانے کی دھن گنگناتی ہوئی چلنے لگی۔ ہم ایک سجے سجائے مگر خالی پڑے ہوئے کمرے میں سے گزر کر دوسرے کمرے میں آئے تو وہاں انگریزی میوزک کی دھن پر بڑی دھیمی پر اسرار روشنیوں میں کالے کالے مرد عورتوں کے جوڑے انگریزی ڈانس کر رہے تھے۔ یہ ہال کمرہ تھا جس میں تین طرف

میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر بھی عورتیں اور مرد بیٹھے گلفام کے جام لنڈھا رہے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے اکثریت ریٹائرڈ قسم کے ادھیڑ عمر اور بوڑھے آدمیوں اور عورتوں کی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی زیادہ اونچی آواز میں گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ خوبصورت جسم والی کالی عورت مجھے ہال کمرے کے کونے میں ایک کاؤنٹر کے پاس لے گئی جہاں سفید اور سرخ وردیوں والے تین چار بیروں کے درمیان ایک گہری سانولے رنگت والا کسرتی بدن کا ایک جوان عنابی رنگ کی ٹی شرٹ اور سیاہ رنگ کی پتلون میں ملبوس کھڑا انہیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

کالی عورت جو مجھے وہاں تک لائی تھی اس نے تلیگو زبان میں اس جوان آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ کہا اور پھر میری طرف اشارہ کر کے واپس چلی گئی۔ اس شخص نے میری طرف ایک سرسری نظر سے دیکھا اور بیروں کو ضروری ہدایات دے کر رخصت کیا اور میرے قریب آکر انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟ میں نے بھی انگریزی میں اس کا نام لے کر کہا کہ مجھے اس نام کے آدمی سے ملنا ہے۔ وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں ہی ہوں تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے کاؤنٹر سے ہٹا کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں دیوار کے ساتھ شیشے کی الماریاں شراب اور بیئر کی بوتلوں سے بھری ہوئی لگی تھیں۔ درمیان میں لوہے کی ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم بیٹھ گئے۔ وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے حیدر آبادی مجاہد نے اس کے پاس بھیجا ہے تو اپنی جیب سے سگار نما سگریٹ نکال کر سلگایا اور لائٹر بجھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے انگریزی میں کہنے

لگا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب کوڈ ورڈز کا تبادلہ کرلینا چاہئے۔ تاکہ ہمیں ایک دوسرے پر کوئی شک شبہ باقی نہ رہے۔"

حیدر آبادی مجاہد نے مجھے کوڈ کے دونوں جملے بتا دیئے تھے۔ ایک جملہ مجھے بولنا تھا۔ جس کے جواب میں دوسرا جملہ اس غازی کو بولنا تھا۔ میں نے اپنا خفیہ کوڈ کا جملہ بولا۔ اس کے جواب میں اس شخص نے جس کو میں اب غازی ہی کہوں گا بول دیا۔ تصدیق ہو گئی کہ ہم دونوں صحیح آدمی سے مل رہے ہیں۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور کہنے لگا۔

"حیدر آباد سے مجھے اپنے ساتھی نے تمہارے مشن کے بارے میں ساری تفصیل بتادی تھی۔ میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اب ایسا ہے کہ یہاں ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ تم پہلے کبھی اس شہر میں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ میرا پہلا موقع ہے"

اس نے کچھ سوچ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"تم بیئر وغیرہ پیتے ہو؟"

میں نے نفی میں سرہلایا تو اس نے کہا۔

"پھر تم ایسا کرو کہ اس کلب کے پیچھے بھی ایک لان ہے۔ وہاں موسم خوشگوار ہو گا۔ یہاں تم شراب اور بیئر کی بو میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکو گے۔ پیچھے لان میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ تم وہاں جاکر میرا انتظار کرو مجھے یہاں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ اور لگے گا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد میں تمہیں وہاں سے ساتھ لے لوں گا اور ہم اپنے کوارٹر میں جاکر تفصیلی بات چیت کریں گے۔ اوکے؟"

میں نے کہا۔

"اوکے"

اس نے دروازہ کھول کر عقبی لان میں جاتا راستہ دکھایا اور خود کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ میں ایک تنگ راہداری سے گزر کر عقبی لان میں آکر بیٹھ گیا۔ مجھے مچھر تنگ کرنے لگے۔ میں اٹھ کر لان میں ٹہلنے لگا۔ گھاس گیلی تھی جس سے میرے جوتے گیلے ہونے لگے تو میں لان کی دوسری طرف چھوٹی سی سڑک پر آگیا۔ یہاں کچھ فاصلے پر ایک مندر سے کرناٹک شیلی میں وائلن اور مردنگم پر جنوبی ہند کے کلاسیکی رقص کی دھن کی آواز آرہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ مندر میں جاکر دیوداسی کو رقص کرتے دیکھوں۔ مندر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے اس کی روشنیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ میں نے سوچا ابھی اپنے غازی کے آنے میں آدھا گھنٹہ پڑا ہے۔ میں مندر میں رقص کرتی دیوداسی کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہوں۔ اس مندر کو ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ناریل کے درختوں میں سے ہو کر جاتی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا مندر کے احاطے میں آگیا۔ یہاں پجاری لوگ مندر میں آجارہے تھے۔ رقص کی دھن یہاں قریب سے سنائی دینے لگی تھی۔ میں اس دھن کی آواز پر اسے تلاش کرتا مندر کے پہلو میں ایک تنگ راستے سے گزر کر بے شمار ستونوں والے ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک سرخ ریشمی ساڑھی والی لڑکی' بالوں میں پھول سجائے' زبردست میک اپ کئے پورے کلاسیکی رقص کے لباس میں مردنگم کی دھن پر شعلے کی طرح رقص کر رہی تھی۔

میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اس شعلہ جوالہ کا رقص دیکھنے لگا۔ جن لوگوں نے جنوبی بھارت کے مندروں میں ان کا کلاسیکی رقص دیکھا ہے اور ان کی تیز دھن والی موسیقی سنی ہے انہیں معلوم ہو گا کہ جنوبی ہند کی موسیقی کا انگ بڑا تیز ہوتا ہے۔ ردھم بھی تیز ہوتی ہے اس موسیقی کا ٹیکنیکل نام کرناٹک شیلی ہے۔ شیلی ان کی زبان میں صنف کو کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بولتے بھی تیز تیز ہیں۔ گاتے بھی تیز تیز ہیں۔ سبھا لکشمی یہاں کی مشہور کلاسیکل گانے والی ہے۔ یہ لوگ موسیقی کے بے حد شائق ہیں اور گانے والے کے ساتھ کبھی کبھی پنڈال میں بیٹھے سارے لوگ بھی گانے لگتے ہیں۔ مندر کی فضا لوبان اور اگربتیوں کی خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ یہ بوجھل فضا مجھے پریشان کر

رہی تھی۔

ویسے بھی مجھے اپنے غازی کا خیال لگا ہوا تھا۔ چنانچہ میں مندر سے نکل آیا۔ واپسی پر اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر سے گزر کر جب جھومرے پٹی کی عمارت کے لان میں داخل ہونے لگا تو اچانک ایک طرف سے تین آدمی نکل کر میرے سامنے آگئے۔ ان میں دو وہاں کی پولیس کی وردی میں تھے اور ایک سویلین لباس میں تھا۔ پولیس کے سپاہیوں میں سے ایک کے پاس رائفل تھی۔ دوسرے نے پستول میری طرف تان رکھا تھا۔ یہ پولیس انسپکٹر لگتا تھا۔ میں حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگا۔ پولیس انسپکٹر نے سامنے آتے ہی پستول کا رخ میری طرف کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ اگر ذرا حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔"

اس کے بعد کے لرزہ خیز واقعات بھارت کے فرعون کی آخری جلد

"سرفروش مجاہد" میں ملاحظہ فرمائیے

بھارت کے فرعون
سرفروش مجاہد
اے حمید
50
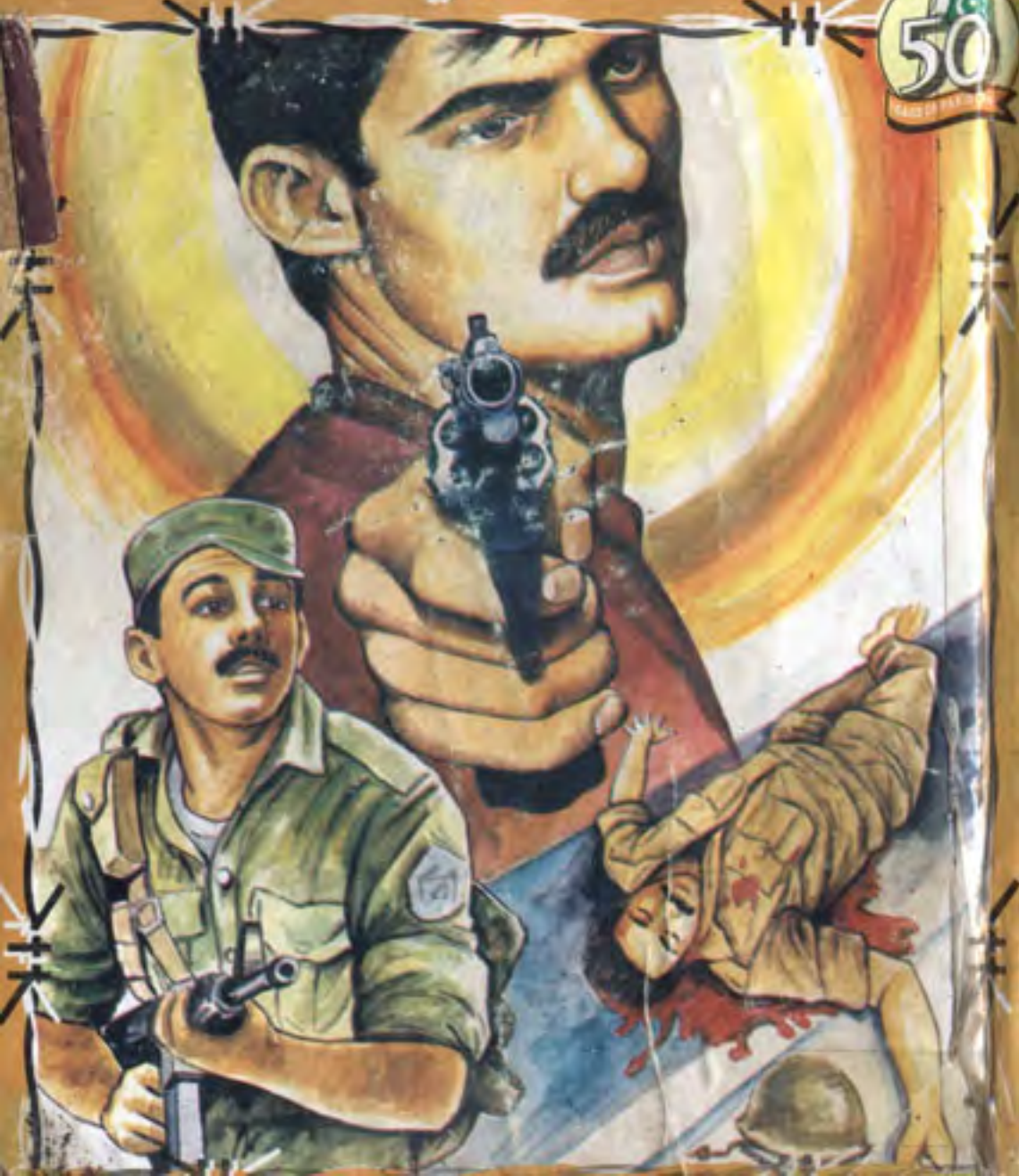
میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

یہ تینوں بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش کی پولیس کے اہلکار تھے۔ ان کی وردیاں میں پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔ دوسرا سب انسپکٹر ہوگا تیسرا جس نے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے یقیناً خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ سب انسپکٹر یا انسپکٹر پولیس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ میری طرف تھا۔ دوسرے کے پاس رائفل تھی۔ میں نہتا تھا۔ فاصلہ ہمارے درمیان اتنا تھا کہ میں کمانڈو ایک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ان پر جھپٹتا وہ بڑی آسانی سے مجھ پر فائر کر سکتے تھے۔ دوسرے موقع ایسا نہیں تھا کہ میں پولیس مقابلہ کرتا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان لوگوں نے مجھے ہاتھ کھڑے کرنے کے لئے کس لئے کہا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ادھر کسی جگہ چھاپہ مارنے آئے ہوں۔ میں نے سب انسپکٹر کو انگریزی میں کہا۔

"معاملہ کیا ہے سر؟ میں تو یہاں اجنبی ہوں۔ اپنے کزن سے ملنے حیدر آباد سے آج ہی آیا ہوں"

سب انسپکٹر نے تلیگو زبان میں سویلین کپڑے والے ساتھی سے کچھ کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر میری تلاشی لینی شروع کر دی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس کوئی پستول وغیرہ تو کیا ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ ان علاقوں میں لوگ لائسنس یافتہ اسلحہ بھی ساتھ نہیں رکھتے۔ جب میرے پاس سے کچھ بھی نہ نکلا تو سب انسپکٹر نے پستول نیچے کر لیا اور بولا۔

"تمہارا کزن کہاں ہے جس سے تم ملنے آئے ہو؟"

میں نے جھومرے پٹی میں ملازم اپنے غازی کا نام لیا اور کہا۔

"وہ جھومرے پٹی میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے اس جگہ انتظار کرنے کو کہا تھا"

سب انسپکٹر نے کہا۔

"چلو جھومرے پٹی کلب میں چلو"۔

یہ لوگ مجھے لان میں لے آئے۔ ٹھیک اس وقت اپنا غازی لان کے برآمدے سے نکل رہا تھا۔ اس نے لان کی دھیمی روشنی میں مجھے پولیس کے ساتھ دیکھا تو اس نے سب انسپکٹر سے تلیگو زبان میں کوئی بات کی۔ اس نے بھی تلیگو زبان میں کوئی جواب دیا۔ پھر سب انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے پستول ہولسٹر میں ڈال لیا اور انگریزی میں کہنے لگا۔

"غلطی ہو گئی۔ تم کو معلوم ہے ادھر کل ایک ریٹائرڈ میجر کا قتل ہو گیا تھا۔ ہم نے علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

تینوں پولیس والے چلے گئے۔

غازی نے انگریزی میں زیرلب پولیس والوں کو گالی دی اور مجھ سے کہا۔

"تم لان سے نکل کر سڑک پر چلے گئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"یہاں مچھروں نے تنگ کیا تو سڑک پر جا کر ٹہلنے لگا تھا کہ اچانک یہ لوگ جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آگئے"

غازی بولا۔

"تمہیں سڑک پر نہیں جانا چاہئے تھا۔ سب انسپکٹر میرا واقف تھا۔ معاملہ خراب بھی ہو سکتا تھا۔ آجاؤ ہم دوسری طرف سے ہو کر نکلیں گے"

وہ مجھے جھومرے پٹی کلب کے ایک اور راستے سے لے کر ایک طرف آگیا۔ یہ چھوٹا سا راستہ تھا جہاں دونوں جانب جھاڑیاں تھیں اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

ہم پیدل چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں اپنے غازی کا بوسیدہ سا اک منزلہ ڈھلوان چھت والا مکان تھا۔ کمرے میں سامان بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ اس نے

چارپائی اور بانس کے پرانے صوفے پر سے کپڑے اٹھا کر کونے میں پھینکے اور بولا۔

"تم یہاں بیٹھو میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔ تم کافی پیو گے یا چائے۔ یہاں کافی کا بہت رواج ہے۔ مگر مجھے چائے پسند ہے"

میں نے کہا۔

"مجھے بھی چائے پسند ہے"

تھوڑی دیر میں وہ چائے کی دو پیالیاں بنا کر لے آیا۔ ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اس نے مجھ سے میرے سفر کے بارے میں پوچھا کہ راستے میں اور خاص طور پر ایلور شہر میں داخل ہونے کے بعد کوئی خفیہ پولیس کا آدمی تو میرے پیچھے نہیں لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ بظاہر تو مجھے کوئی مشتبہ آدمی اپنا تعاقب کرتا دکھائی نہیں دیا۔ وہ کہنے لگا۔

"یہاں کی خفیہ پولیس بہت زیادہ خفیہ ہوتی ہے۔ وہ اس طرح پیچھا کرتی ہے کہ دوسرے کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ بہرحال تمہیں یہاں بڑا محتاط رہنا ہوگا۔"

اس کے بعد اس نے میرے مشن کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جو ایلور کی جزیرائی جیل میں پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام میں اذیتیں جھیل رہا ہے تو وہ کہنے لگا۔

"یہ دلیر جوان پاکستان کی جانباز فورس کا مجاہد ہے۔ 65ء کی جنگ میں اس کی ڈیوٹی رات کے وقت فائٹنگ پٹرول پارٹی کو لے کر دشمن کے مورچوں کے پیچھے اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیروں کو اڑانے کی لگی تو یہ اندھیرے میں اپنی پارٹی کے گوریلا جوانوں سے بچھڑ گیا۔ جانباز فورس پاک فوج کی تربیت یافتہ فوج نہیں تھی۔ ان کے جذبہ حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے انہیں تھوڑی سی ٹریننگ دی گئی تھی کیونکہ جنگ زوروں پر تھی اور پوری ٹریننگ کے لئے وقت نہیں تھا۔ یہ جوان راستہ بھول کر دشمن کے مورچوں میں چلا گیا اور پکڑا گیا۔ دشمن نے اسے پاک فوج کا کمانڈو سمجھ کر اسے پوچھ گچھ کے لئے پیچھے امرتسر ٹارچر سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس پر وحشیانہ تشدد کیا گیا مگر اس جوان نے سوائے اپنے

نام اور نمبر کے کچھ نہ بتایا۔ امرتسر سے اسے گوالیار کے ٹارچر سنٹر میں لے جایا گیا۔ وہاں بھی یہ جوان ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرتا رہا مگر اس نے پاک آرمی اور پاکستانی کمانڈو اور جانباز فورس کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اس کے بعد اسے آندھرا پردیش کی اس بدنام زمانہ جزیرائی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ آج اسے جیل میں پڑے سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ اس سے آج بھی پوچھ گچھ وقفے وقفے کے بعد ہوتی رہتی ہے۔ اسے ٹارچر کیا جاتا ہے۔ مگر پھانسی کی کوٹھڑی میں اس جوان کے اللہ اکبر اور یا علی نعرے گونجتے رہتے ہیں۔ اس جوان کا نام کیپٹن جمشید ہے۔ وہ جانباز فورس میں اعزازی کیپٹن تھا۔"

میں نے غازی سے پوچھا کہ اس کو کیپٹن جمشید کے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں تو وہ بولا۔

"ایلور جیل میں ایک عورت جیل کے وارڈن کی سیکرٹری ہے۔ اس عورت کا نام مادھوی ہے۔ یہ عورت کرسچن ہے اور کیپٹن جمشید سے اس کو محبت ہو گئی ہے۔ مگر یہ بات اس نے سوائے میرے اور کسی کو نہیں بتائی۔ مجھے اس لئے بتائی ہے کہ وہ میری پرانی دوست ہے۔ مگر اسے میری کشمیری مجاہد کی حیثیت کا علم نہیں ہے۔ اپنی محبت کا اظہار اس نے کبھی پاکستانی مجاہد کیپٹن جمشید سے بھی نہیں کیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک سال سے کیپٹن جمشید ایلور جیل میں بند ہے لیکن اس کے گرد جیل کے اندر بھی اس قدر سخت پہرہ لگایا گیا ہے کہ یہ عورت وارڈن کی سیکرٹری ہونے کے باوجود کبھی کیپٹن جمشید کے قریب نہیں جا سکی۔ بس دور دور سے اس کی جھلک دیکھ لیتی ہے۔"

میں نے غازی سے کہا۔

"یہ ساری معلومات تمہیں اس لڑکی مادھوی کی زبانی معلوم ہوئی ہیں کیا؟"

"ہاں" مجاہد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مادھوی نے ہی آج سے چھ سات ماہ پہلے مجھے بتایا تھا کہ ہماری جیل میں ایک پاکستانی کمانڈو قید ہے جس کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے مگر وہ اس قدر بہادر اور دلیر جوان ہے کہ ہر قسم کا تشدد برداشت کر رہا ہے۔ لیکن سوائے اپنے نام عہدے اور نمبر کے

اور کچھ نہیں بتاتا۔" میں نے اس کے بعد کیپٹن جمشید کو وہاں سے فرار کرانے کے سلسلے میں مادھوی سے بات کی تو اس نے کہا کہ اس جیل میں اگر کوئی مکھی بھی چلی جاتی ہے تو وہ بھی باہر نہیں نکل سکتی اور اسے وہیں مرنا ہوتا ہے۔"

میں اپنے غازی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ کیپٹن جمشید کے فرار کے بارے میں بھی سوچنے لگا تھا۔ میں نے غازی سے کہا۔

"کیا تم کسی طرح مجھے مادھوی سے ملا سکتے ہو؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسا راستہ ہمیں بتا دے کہ جس سے ہم کیپٹن جمشید کو بھارتی درندوں کی درندگی سے نجات دلا سکیں"

غازی نے کہا۔

"میں مادھوی کل صبح فون کروں گا۔ اس سے کہوں گا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کل کا کوئی وقت دے دے۔ پھر ہم دونوں اس سے مل کر بات کریں گے"

"تم میرا اس سے کیسے تعارف کراؤ گے؟"

"میں کہہ دوں گا کہ تم میرے کزن ہو۔ اور حیدر آباد سے مجھے ملنے آئے ہو اور کیپٹن جمشید کو اس لئے فرار کرانا چاہتے ہو کہ تم بھی مسلمان ہو اور وہ بھی مسلمان ہے اور خوامخواہ اسے بھارتیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا وہ یہاں تمہارے گھر میں آئے گی؟"

غازی بولا۔

"یہاں میں لوگوں سے کم ہی ملتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی ریستوران وغیرہ میں بلائے۔ ہماری ملاقاتیں کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں اور ہم ریستوران میں بیٹھ کر تھوڑا وقت گزار لیتے ہیں۔ مادھوی کی شادی نہیں ہوئی۔ اس کے ماں باپ بھی نہیں ہیں اور وہ ایک گرلز کالج کے ہوسٹل میں رہتی ہے"

رات میں نے اپنے غازی کے کمرے میں ہی بسر کی۔ دوسرے دن وہ ناشتے کے بعد

مادھوی کو ٹیلی فون کرنے چلا گیا۔ جھومرے پٹی میں اس کی ڈیوٹی شام کے وقت شروع ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد غازی نے واپس آکر بتایا کہ مادھوی نے شام سات بجے کا ٹائم دیا ہے۔ میں نے کہا۔

"اس وقت تو تم جھومرے پٹی کلب میں اپنی ڈیوٹی پر ہوگے"

وہ بولا۔

"میں آج کلب نہیں جاؤں گا۔ یہ کام زیادہ ضروری ہے۔"

میں دوپہر تک غازی کے پرانے مکان میں ہی رہا۔ غازی تھوڑی دیر کے لئے چلا گیا۔ دوپہر کو واپس آگیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ میں نے سگریٹ اور غازی نے بیڑی سلگائی اور ہم باتیں کرنے لگے وہ کہنے لگا۔

"ویسے تو تمہیں یہاں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ایک اجنبی ہونے کی حیثیت سے بھی تم خفیہ پولیس کی نگاہوں میں آسکتے ہو۔ اس لئے میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ دن کے وقت تم زیادہ وقت مکان میں ہی رہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں خود بھی یہاں لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتا۔"

"تم اندھیرا ہونے کے بعد چہل قدمی کے لئے سمندر کی طرف بے شک نکل جایا کرو۔ اول تو تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ اگر کسی نے پوچھ بھی لیا تو یہی کہنا کہ تم میرے کزن ہو اور حیدر آباد سے مجھے ملنے آئے ہو"

غازی نے اپنے کلب میں بھی ٹیلی فون کر دیا تھا کہ اس کا بھائی حیدر آباد سے اسے ملنے آیا ہے۔ اس لئے آج وہ کلب نہیں آئے گا۔ مادھوی نے سات بجے شام کا وقت دیا تھا۔ ہم ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل پڑے۔ جس ریستوران میں مادھوی نے ملنے کے لئے کہا تھا وہ ایلور شہر کے جنوب میں ایک کرسچن آبادی میں ایک چھوٹے سے خوبصورت گرجے کے عقب میں واقع تھا۔ میں اور غازی وہاں پیدل ہی گئے۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ریستوران کے اندر بھی کچھ لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ریستوران کے آگے

ایک چھوٹا سا سرسبز لان تھا۔ وہاں بھی کرسیاں اور میز لگے ہوئے تھے۔ پیڈسٹل فین چل رہے تھے۔ ہم ایک طرف ہو کر کونے والی میز کے گرد بیٹھ کر مادھوی کا انتظار کرنے لگے۔ لان میں تین چار کھمبوں پر ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ پیڈسٹل فین کی وجہ سے ہم مچھروں سے بھی محفوظ تھے اور ہوا بھی خوب آرہی تھی۔ ٹھیک سات بجے ایک رکشا آکر ریستوران کے سامنے رکا۔

غازی نے کہا۔

"یہ مادھوی ہی ہوگی۔ وہ وقت کی بہت پابند ہے۔"

رکشے میں سے ایک درمیانے قد کی متناسب جسم والی عورت باہر نکلی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے لان میں ایک نظر ڈالی اور غازی کو بیٹھے دیکھ کر وہ ہماری طرف آئی۔ ہم نے کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔ غازی نے مادھوی سے میرا تعارف کرایا اور کہا۔

"یہ میرا کزن ہے۔ مجھ سے ملنے حیدر آباد سے آیا ہے۔ یہاں اس نے کیپٹن جمشید کے بارے میں مجھ سے سنا تو کہنے لگا اس بہادر جوان کو قید سے فرار کروانا اب میرا فرض بن گیا ہے۔"

مادھوی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بڑا اچھا خیال ہے مگر یہ ایسا خیال ہے جس کا حقیقت میں تبدیل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔"

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہوگیا۔ غازی نے مادھوی سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اتنے میں وہاں میرے اور غازی کے لئے چائے اور مادھوی کے لئے کافی آگئی۔ ساتھ کھانے کے لئے بھی سنیکس وغیرہ تھے۔ دس پندرہ منٹ کی غیر اہم گفتگو کے بعد غازی نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے مادھوی سے کہا۔

"مادھوی! ویسے کبھی کبھی میں بھی سوچتا ہوں کہ کیپٹن جمشید کو ایلور جیل کی کوٹھڑی سے نجات دلانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ میں اسے حق بجانب سمجھتا ہوں۔ کوئی بھی وطن

پرست آدمی دشمن کی قید میں جا کر اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔ بھارتی پولیس اور انٹیلی جنس کیپٹن جمشید پر کافی سے زیادہ تشدد کر چکی ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ تشدد مزید کچھ روز جاری رہا تو کیپٹن جمشید کی موت یقینی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

غازی نے بڑی دانشمندی سے مادھوی کے اس جذبہ محبت کو ابھارا تھا جو اس کے دل میں پاکستانی جوان کیپٹن جمشید کے لئے موجزن تھا۔ مادھوی کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اپنے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ کیپٹن جمشید کو کسی طرح وہاں سے فرار کروا دوں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' یہ کام ناممکن ہے۔ ایلور جیل میں سے تو عام قیدی بھی فرار نہیں ہو سکتا اور کیپٹن جمشید تو ایسا قیدی ہے کہ جس کو نہ صرف یہ کہ پھانسی کی کوٹھڑی میں بند رکھا جاتا ہے بلکہ اس کی اردگرد کڑا پہرہ بھی ہوتا ہے۔ اور پھر ایلور کی جیل سمندر کے عین بیچ میں واقع ہے۔ جزیرے کے اردگرد چاروں طرف سمندر ہے اور اس سمندر میں حکومت کی طرف سے آدم خور شارکیں چھوڑی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی قیدی کسی طرح جیل توڑ کر سمندر میں چھلانگ بھی لگاتا ہے تو خونخوار شارکیں اسے وہیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ ایسے دو تین واقعات ہو چکے ہیں۔ اب کوئی قیدی فرار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

میں خاموش تھا۔ غازی بھی خاموشی سے مادھوی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی کیپٹن جمشید سے ہمدردی ہے۔ میں اس کی بہادری اور حب الوطنی سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ جب کیپٹن پر بہت زیادہ تشدد کیا جاتا ہے تو وہ اللہ اکبر اور یا علیؓ کے نعرے لگاتا ہے۔ پھر نعرے لگاتے لگاتے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے شیر ببر ایسے نعروں کی گونج ہمارے دفتر تک سنائی دیتی ہے۔"

میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"رات کے وقت جیل خانے پر چوکی پہرے کی کیا پوزیشن ہوتی ہے؟"

مادھوی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"رات کو دن سے زیادہ نگرانی ہوتی ہے۔ جیل خانے کے چاروں کونوں پر واچ ٹاور بنے ہوئے ہیں۔ ان پر مشین گنوں کے مورچے بھی ہیں۔ اور بڑی بڑی سرچ لائٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ساری رات ان کی روشنی کے دائرے اردگرد کے سمندر کو روشن رکھتے ہیں۔ کہیں سمندر پر کوئی چھوٹا سا تختہ بھی لہروں پر اچھلتا نظر آجائے تو اس پر مشین گنوں کی بوچھاڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ جیل کے اندر دو ہیلی کاپٹر بھی ہیں جو ذرا سے اشارے پر اڑتے ہیں اور سمندر پر نیچی پروازیں کرتے ہوئے فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ جیل کے ریکارڈ کے مطابق جیل خانے سے آخری قیدی دو سال پہلے فرار ہوا تھا جس کی لاش صبح کے وقت جیل خانے کی چٹانوں کے پاس سمندر نے اگل دی تھی۔ اس کا آدھا دھڑ شارکیں ہڑپ کر چکی تھیں اور باقی بچا ہوا آدھا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔"

مادھوی کی زبانی جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں ان کے مطابق جانباز فورس کے کیپٹن جمشید کا جیل سے فرار ناممکن تھا۔ لیکن میں اپنے جانباز کو کفار کی قید سے آزاد کرانے کا عزم لے کر آیا تھا اور مجھے اس وطن پرست پاکستانی جوان کو ہر حالت میں ہندوؤں کی اذیت ناک جیل سے فرار کروا کر پاکستان پہنچانا تھا۔

میں نے مادھوی سے کہا۔

"میڈم! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ کیپٹن جمشید کو پھانسی کی جس کوٹھڑی میں رکھا ہوا ہے اس کا حدود اربعہ کیا ہے اور اس کا رخ سمندر کی کس جانب ہے؟"

میڈم مادھوی نے اپنی پیالی میں تازہ کافی ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس کوٹھڑی کے پاس کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جس مجرم کو پھانسی پر چڑھانا ہوتا ہے اس کو بھی وہاں سے دور آخری کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے۔ میں اپنے وارڈن صاحب کے ہمراہ صرف ایک بار کیپٹن جمشید کی کوٹھڑی تک گئی ہوں۔ یہ کوٹھڑی جیل کے اندر بنی ہوئی ایک اور جیل میں ہے۔ مجھے میرے باس نے دوسری جیل کے باہر ہی کھڑے رہنے کو کہا تھا۔ میں تمہیں اتنا بتا سکتی ہوں کہ یہ کال کوٹھڑی سمندر کے

مشرق کے رخ پر ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جیل کی چار دیواری بہت اونچی ہے۔ اور پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ اس چار دیواری کے اندر اور باہر چوبیس گھنٹے پولیس ڈیوٹی بدل بدل کر گشت لگاتی رہتی ہے۔ اپنے غازی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔"

"اب تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"اگر مجھے اس کال کوٹھڑی کے اردگرد کے ماحول کا چھوٹا سا نقشہ مل جائے تو میں کسی فیصلے پر پہنچ سکتا ہوں"

میڈم مادھوی نے کہا۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سارا حدود اربعہ میری نگاہوں میں ہے۔ میں تمہیں ابھی اس کا نقشہ بنائے دیتی ہوں۔"

غازی نے ریستوران کے بیرے سے کاغذ اور پنسل منگوائی اور میڈم مادھوی نے اس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر ایک رف سا نقشہ بنا کر میرے آگے رکھ دیا اور بولی۔

"یہ پھانسی کی کال کوٹھڑیاں ہیں"

اس نے پنسل ایک جگہ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ کونے والی کال کوٹھڑی وہ ہے جس میں کیپٹن جمشید قید ہے۔ یہ دو لکیریں جو تم دیکھ رہے ہو یہ کال کوٹھڑی کے آگے جو بغیر چھت کے برامدہ ہے اس کی دیوار اور ایک جانب کا لوہے کے جنگلے والا دروازہ ہے۔ اس کے پیچھے گہری خندق ہے جس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ یہ کوڑا کرکٹ شام کے وقت دو ٹرک اٹھا کر گھاٹ پر لے جاتے ہیں اور اسے سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔"

میں نقشے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نقشے سے معمولی سا اندازہ ہو گیا تھا مگر پوری تصویر سامنے نہیں آرہی تھی۔ میں نے مادھوی سے پوچھا کہ قید خانے میں سپلائی کی چیزیں کیسے اور کیا آتی ہیں۔ اس نے کہا۔

"جیل کے باہر گوالوں کے کوارٹر ہیں۔ گائیوں کے باڑے ہیں۔ دودھ یہی گوالے جیل میں سپلائی کرتے ہیں۔ سبزی آٹا اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں ہفتے میں ایک بار ایک سٹیمر شہر سے لے کر آتا ہے۔ جیل کے ٹرک گھاٹ پر سے یہ سپلائی لے کر جیل خانے میں آجاتے ہیں۔ باہر کے کسی آدمی کو ان ٹرکوں کے ساتھ اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جیل کے دفاتر بڑے گیٹ کے قریب ہی آمنے سامنے بارکوں کی شکل میں بنے ہوئے ہیں۔ جیل کے دفاتر اور جیل کی بارکوں میں کام کرنے والا عملہ اور خاص سٹیمر میں بیٹھ کر صبح نو بجے جیل میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر یہی سٹیمر انہیں لے کر شام کے پانچ بجے واپس ایلور چلا جاتا ہے۔ جیل کے عملے کا کوئی آدمی سوائے ان وارڈوں اور داروغوں کے جن کی رات کو ڈیوٹی ہوتی ہے جیل کے اندر چھٹی ہو جانے کے بعد نہیں ٹھہر سکتا۔"

میں نے مادھوی سے سوال کیا۔

"کیا جیل میں عمر قید اور دوسری معیاد کی قید بھگتنے والوں کے رشتے دار ان سے ملاقات کرنے نہیں آتے؟"

میڈم مادھوی نے کہا۔

"اس جیل میں لمبی قید کے قیدی ہیں۔ زیادہ تعداد عمر قید کی سزا کاٹنے والوں کی ہے۔ اس وقت چار ایسے قیدی بھی کال کوٹھڑی میں بند ہیں جن کی رحم کی درخواستیں انڈیا کے صدر کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ اگر یہ درخواستیں مسترد ہو گئیں تو انہیں جیل کے اندر ہی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ باقی رشتے داروں کو مہینے میں صرف ایک بار اپنے قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ ملاقات بڑی مختصر ہوتی ہے اور مسلح پولیس والوں کی سخت نگرانی میں کرائی جاتی ہے۔ جتنی دیر یہ ملاقات ہوتی ہے اتنی دیر تک مسلح گارڈ سر پر کھڑے رہتے ہیں۔ کسی رشتے دار کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ قیدی کو کوئی چیز دے۔ درمیان میں ویسے بھی لوہے کا جنگلہ ہوتا ہے جس پر لوہے کی جالی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ جیل میں ملاقات کے واسطے جانے سے پہلے رشتے دار کا پورا ایکس رے کیا جاتا ہے کہ یہ کوئی فالتو چیز تو ساتھ لے کر نہیں جا رہا----"

مادام مادھوی ہمارے پاس ایک گھنٹے تک ریستوران کے لان میں بیٹھی رہی۔ میں نے
اس سے جس قدر جیل کے گردو نواح کی تفصیلات درکار تھیں اور جتنی اسے معلوم تھیں
وہ مجھے بتاتی رہی۔ میرے سامنے کیپٹن جمشید تک پہنچنے کے لئے دو مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ
ایلور گھاٹ سے چار پانچ میل کا سمندر پار کرنا تھا۔ میں اس سمندر کو تیر کر یا کسی بوٹ
کشتی میں بیٹھ کر پار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میری کشتی کو سمندری شارکیں الٹ نہیں دیتیں
اور میں ان سے بچ کر نکل جاتا ہوں تو ایلور جیل کے واچ ٹاور کے گارڈز اپنی دور بینوں کی
مدد سے مجھے دور ہی سے دیکھ سکتے تھے اور پھر مجھ پر مشین گنوں کی بوچھاڑیں آنی شروع ہو
جاتیں۔ مادھوی نے یہ بھی بتایا تھا کہ دن میں ایک دوبار جیل کا ایک ہیلی کاپٹر بھی دیکھ بھال
کے لئے جیل کے گرد سمندر کے اوپر چکر لگاتا ہے۔ میں اس ہیلی کاپٹر کی مشین گن کی زد
میں آسکتا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ میں تیر کر یا کسی کشتی میں بیٹھ کر سمندر عبور نہیں کر
سکتا۔ دوسرا مرحلہ جزیرے میں پہنچ کر جیل کی کئی فٹ اونچی مضبوط دیوار کو پار کرنا تھا۔ یہ
بات بھی بظاہر ناممکن دکھائی دیتی تھی۔ لیکن سب سے مشکل مرحلہ سمندر کو عبور کرنا تھا۔

میں اور غازی اس رات کافی دیر تک بیٹھے اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ لیکن ہم
کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ میں نے غازی سے کہا۔

"صرف ایک طریقے سے میں جیل کے جزیرے میں پہنچ سکتا ہوں۔ دوسرا کوئی ذریعہ
مجھے نظر نہیں آتا"

"وہ کونسا طریقہ؟"

غازی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"ہفتے میں ایک بار جو سٹیمر سپلائی لے کر جزیرے پر جاتا ہے کسی طرح اس سٹیمر میں
سوار ہونے کی کوشش کی جائے اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ مجھے نظر نہیں آتا۔"

غازی بھی غور کرنے لگا۔ اس نے بیڑی سلگا رکھی تھی۔ اس کا ہلکا سا کش لگانے کے
بعد میری طرف دیکھنے لگا۔

"مگر اس سٹیمر پر تم کس طرح سوار ہو گے؟"

"جہاں تک میرا خیال ہے سٹیمر پر سوائے روزمرہ کے عملے کے آدمیوں کے دوسرے
کسی آدمی کو سوار ہونے کی اجازت نہیں ہوگی اور تم تو یہاں بالکل اجنبی ہو۔ تم اس پر
کیسے سوار ہو گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی ایک نقطہ غور طلب ہے۔ اگر یہ نقطہ حل ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ میں کیپٹن
جمشید کو قید سے نکال کر لے آؤں گا۔"

غازی کہنے لگا۔

"فرض کر لیا تم جزیرے پر پہنچ جاتے ہو۔ تم کیپٹن جمشید کو بھی جیل کی کال کوٹھڑی
سے نکال کر جیل کی چاردیواری سے باہر لے آتے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے لے کر
سمندر کو عبور کیسے کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"اسی سٹیمر میں واپس آئیں گے جو سپلائی لے کر آتا ہے"

"مگر وہ سٹیمر تو اسی رات واپس آجاتا ہے۔ اگر تمہیں کیپٹن جمشید کو کال کوٹھڑی سے
نکالنے میں دیر ہو گئی تو سٹیمر تو چلا جائے گا۔ پھر تم کیا کرو گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم جزیرے میں چھپ کر دوسرے ہفتے سپلائی سٹیمر کے دوبارہ جزیرے پر آنے کا
انتظار کریں گے۔"

اب غازی بھی ہنسنے لگا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں۔ یہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے والی بات ہے۔ میں تمہیں
ایسا کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تو پھر مجھے کوئی دوسرا راستہ بتا دو"

غازی بولا۔

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔ اسی موضوع پر کل پھر بات کریں گے۔"

وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن غازی مجھے گھر کے اندر ہی چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے باہر چلا گیا۔ وہ کافی دیر بعد واپس آیا۔ اس کی ڈیوٹی شام کو شروع ہوتی تھی۔ آتے ہی وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں مادھوی کے پاس گیا تھا۔ آج اس کی دفتر سے چھٹی تھی۔ میں اس سے کیپٹن جمشید کے فرار کے بارے میں مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہی ایک عورت ایسی ہے جو اس مشن میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

میں نے پوچھا۔

غازی بولا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے ذہن میں فرار کا کوئی پلان ہے۔ اس کے متعلق وہ صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو"

وہ بولا۔

"تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں خود یہاں پہنچ رہی ہے۔ میں شہر ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم خود اس سے بات کر لینا۔ مادھوی اپنے کیپٹن جمشید سے واقعی دل سے محبت کرتی ہے وہ اسے وہاں قید و بند کی مصیبتیں اور اذیتیں اٹھاتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"وہ تمہارے سامنے بات کیوں نہیں کرنا چاہتی؟"

غازی نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔

"بس وہ صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ ویسے اس نے کہا ہے کہ بعد میں وہ مجھے

بھی اس مشن میں شامل کرے گی۔ لیکن ابھی وہ صرف تم سے بات کرنے کی خواہشمند ہے۔"

یہ میں بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ عورت صرف مجھ سے ہی اس بارے میں بات کیوں کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال میرا مقصد کیپٹن جمشید کو قید سے آزاد کرانا تھا۔ خواہ کسی طرح سے بھی ممکن ہو۔ غازی چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد مادھوی آ گئی۔ اس نے ساڑھی کی بجائے جامنی رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا۔ وہ رکشے میں آئی تھی۔ مکان کے چھوٹے سے کمرے میں ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"میڈم! اپنے غازی نے مجھے بتایا ہے کہ تم کیپٹن جمشید کے فرار کے بارے میں مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہو"

اس نے اپنا پرس اپنی گود میں رکھ لیا۔ سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہنے لگی۔

"ہاں۔ میں صرف تم سے اس لئے بات کرنا چاہتی ہوں کہ تم یہی مشن لے کر اس شہر میں آئے ہو"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی چپ تھا اور اسے تک رہا تھا۔ میں اسے موقع دینا چاہتا تھا کہ اگر اس کے ذہن میں فرار کی کوئی سکیم ہے تو وہ خود بتائے۔ اپنے غازی نے اسے یہ بتایا تھا کہ میں کیپٹن جمشید کا مداح ہوں اور صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس بہادر آدمی کو بھارت کی قید سے آزاد کرانے کا مشن لے کر وہاں آیا ہوں۔ اس کے علاوہ غازی نے میرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بات مادھوی نے بھی بتا دی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"جس طرح تمہیں کیپٹن جمشید سے ہمدردی ہو گئی ہے اسی طرح میں بھی اس بہادر انسان سے ہمدردی رکھتی ہوں۔ بلکہ میں صاف صاف کہوں گی کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں خود اسے بھارتی پولیس کی درندگی سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔ مگر میں یہ کام اکیلی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے اس کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ ایسے ساتھی کی جو اس کام کو ایک مشن سمجھ کر سرانجام دے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"اپنا دوست غازی بھی ہمارے اس مشن میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

میڈم مادھوی نے کہا۔

"وہ ضرور ہماری مدد کرے گا اور اگر ضرورت پڑی تو ہم اس سے بھی کام لیں گے۔ لیکن شہر کے لوگ جانتے ہیں۔ گھاٹ کے لوگ بھی جہاں سے سپلائی کا سٹیمر قید خانے کی طرف سپلائی لے کر ہفتے میں ایک بار جاتا ہے وہاں کے لوگ بھی غازی کی شکل صورت سے واقف ہیں۔ جب کہ تمہارا چہرہ ان سب کے لئے اجنبی ہے۔ تمہیں یہاں کوئی نہیں جانتا۔"

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"کیا تمہاری سکیم یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی سپلائی سٹیمر کے ذریعے ایلور جیل کی چاردیواری تک جائے؟"

وہ کہنے لگی۔

"اس کے سوائے سمندر عبور کر کے ایلور جیل تک جانے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم نے تو خود کہا تھا کہ جو سٹیمر سپلائی لے کر جیل کے جزیرے تک جاتا ہے اس پر کوئی اجنبی شخص سوار نہیں ہو سکتا اور سٹیمر کے عملے کے ہر آدمی کے پاس اس کا شناختی کارڈ موجود ہوتا ہے جو اس نے اپنی قمیض پر لگایا ہوا ہوتا ہے۔"

میڈم مادھوی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں یہی کہا تھا اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ایسا انتظام کر رہی ہوں کہ تمہارے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہوگا اور تم سٹیمر کے ذریعے سمندر پار کر کے جیل کی چاردیواری کے اندر پہنچ جاؤ گے۔"

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"میں کل رات گئے تک اکیلی بستر پر لیٹی سوچتی رہی کہ تمہیں کس طرح جزیرے کی جیل کے اندر پہنچایا جائے؟ ظاہر ہے تم شناختی کارڈ کے ساتھ بھی سپلائی لے جانے والے سٹیمر پر سوار ہو کر سمندر عبور نہیں کر سکتے۔ ایک اجنبی آدمی کو سٹیمر پر دیکھ کر سٹیمر کا کیپٹن ضرور تم سے پوچھے گا کہ تم کون ہو اور تم نے شناختی کارڈ کہاں سے حاصل کیا ہے۔ آخر میں نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا۔ یہ ایسی ترکیب ہے کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ تمہیں آدھے پونے گھنٹے کی تکلیف ضرور اٹھانی پڑے گی۔"

"میں اس کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا پلان کیا ہے؟"

میرے اس سوال پر میڈم مادھوی کہنے لگی۔

"ہر ہفتے کی شام کو جب یہ سٹیمر ایلور کی گودی سے سپلائی لے کر جزیرے پر پہنچتا ہے تو چیف وارڈن کی طرف سے میری یہ ڈیوٹی لگی ہوتی ہے کہ میں سٹیمر پر جا کر سپلائی کے سامان کو چیک کروں۔ میں سپلائی کے سارے سامان کو چیک بھی کرتی ہوں اور اسے اپنی نگرانی میں جیل کے اندر سٹور روم تک بھی پہنچاتی ہوں۔ اس روز میری ڈیوٹی دوپہر دو بجے سے رات دس بجے تک ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی امید افزا بات تم نے بتائی ہے میڈم۔ مگر سٹیمر پر سفر کس طرح کروں گا؟"

میڈم مادھوی نے دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"ہمیں اپنے دفتر میں ضروری فائلیں رکھنے کے واسطے ایک فالتو بڑی الماری کی ضرورت ہے۔ یہ الماری لکڑی کی ہوگی اس لئے کہ اس سمندری علاقے میں لوہے کی الماری کو بہت جلد زنگ لگ جاتا ہے۔ چیف وارڈن نے مجھے بطور اپنے سیکرٹری کے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ میں خود شہر کی مارکیٹ سے الماری پسند کر کے خریدوں اور اسے سپلائی سٹیمر کے ذریعے دفتر میں پہنچاؤں۔ بس تم اس الماری میں چھپ کر سمندر عبور کرو گے۔ اور جیل کے اندر بھی پہنچ جاؤ گے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

یہ پلان جیسے قدرت نے خود ہمیں مہیا کر دیا تھا۔ جیل کی چار دیواری کے اندر پ
اور خطرناک سمندر عبور کرنے کا اس سے کارگر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں
میڈم مادھوی سے کہا۔

"میں تیار ہوں۔ لیکن اگر سمندری سفر کے دوران کسی نے الماری کو کھول کر دیکھ
کی کوشش کی تو پھر کیا ہو گا؟"

میڈم مادھوی کہنے لگی۔

"میں اس الماری کے ساتھ سٹیمر پر سفر کر رہی ہوں گی۔ اسی روز میں خود مارک
سے الماری خرید کر اپنے سامنے سٹیمر پر رکھوا دوں گی اور خود بھی اسی سٹیمر میں بیٹھ
جزیرے پر جاؤں گی۔"

پلان انتہائی تر بہدف قسم کا تھا۔ میں نے کہا۔

"پھر ٹھیک ہے اس طرح میں بڑی آسانی سے جیل کے اندر چیف وارڈن کے آف
تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر اس کے بعد کیا ہو گا؟"

میڈم مادھوی نے آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ میں تمہیں وہاں پہنچ کر بتاؤں گی ابھی تم صرف اتنا کرو کہ غازی سے کہہ کر اپ
لئے ایسا پستول یا ریوالور حاصل کر لو جس کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا ہو اور جس کے فائر
دھماکہ نہ ہو کیپٹن جمشید کو جیل سے فرار کراتے وقت تمہیں اس کی ضرورت پڑ سک
ہے"

میں نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ مجھے کس روز سٹیمر پر میرا مطلب ہے الماری کے اند
سفر کرنا ہو گا؟"

مادھوی بولی۔

"صرف کل کا دن باقی ہے۔ پرسوں شام کو سٹیمر جیل کی سپلائی لے کر جزیرے ک
طرف روانہ ہو گا۔ میں پرسوں دو بجے کے بعد مارکیٹ سے الماری خرید کر اسے ساتھ ل

کر سٹیمر پر سوار ہوں گی۔ ایلور کی گودی کے قریب ہی میری ایک سہیلی کی کوٹھی ہے۔
کوٹھی کا ایک گیراج ہے جو خالی رہتا ہے کیونکہ میری سہیلی کے خاوند کے پاس ابھی گاڑی
نہیں ہے۔ لکڑی کی یہ الماری کوٹھی کے گیراج میں شام تک پڑی رہے گی۔ شام ہونے
سے ذرا پہلے تم میرے ساتھ اس گیراج میں جاؤ گے اور وہیں تم الماری کے اندر چھپ کر
بیٹھ جاؤ گے۔ وہاں سے الماری ایلور گھاٹ پر پہنچانے کے بعد سٹیمر پر رکھوا دی جائے گی۔
میں اس دوران الماری کے ساتھ ہوں گی۔"

"میں اتنی دیر کہاں رہوں گا؟"

وہ بولی۔

"تم ابھی میرے ساتھ چلو گے۔ میں تمہیں دور سے اپنی سہیلی کی کوٹھی کا گیراج
دکھاؤں گی۔ تم کل دوپہر کے بعد پورے چار بجے وہاں آجاؤ گے میں تمہیں گیراج کے باہر
ملوں گی۔ مگر میرے اشارے کے بغیر کوٹھی میں ہرگز داخل نہ ہونا۔ تم سمجھ گئے ہو ناں؟"

میں نے کہا۔

"بالکل سمجھ گیا ہوں"

"تو پھر میرے ساتھ آؤ"

ہم دونوں غازی کے مکان سے نکل کر بازار میں آگئے۔ وہاں سے ہم نے ایک رکشا
لیا۔ اسی سڑک پر آگے جا کر تیسرے چوک میں سے دائیں طرف ایک چھوٹی سی سڑک
مڑتی تھی۔ اس سڑک پر درختوں کے درمیان ایک پرانی سی شکستہ کوٹھی بنی ہوئی تھی۔
مادھوی اور میں رکشے سے اتر کر کچھ فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مادھوی نے دور
سے مجھے کوٹھی کا گیراج دکھایا اور بولی۔

"کل ٹھیک چار بجے جب تم یہاں آؤ گے تو میں پہلے سے گیراج کے پاس کھڑی ہوں
گی۔ رکشے میں آنا اور رکشا چوک میں ہی چھوڑ دینا۔ آؤ اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم اسی رکشے میں بیٹھ کر غازی کے مکان پر آگئے وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں اور
مادھوی اپنے پلان کی تفصیلات پر غور کرتے رہے۔ وہ کہنے لگی۔

"تم زیادہ دیر تک الماری میں نہیں رہو گے۔ اس کے باوجود میں لکڑی کی ایک الماری خریدوں گی جس کے اوپر کی جانب دو چھوٹے چھوٹے جالی دار روشندان بنے ہوتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی الماریاں اکثر تیار ہوتی ہیں تاکہ الماری میں تازہ ہوا آتی رہے۔ کیونکہ یہاں لوگ اس قسم کی الماریوں میں کپڑوں کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھتے ہیں۔"

اتنے میں غازی بھی آگیا۔ میڈم مادھوی نے اسے سارا پلان بتادیا۔ غازی کو پلان پسند آیا۔ کہنے لگا۔

"مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا دوست تمہاری مدد سے کیپٹن جمشید کو کال کوٹھڑی سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اسے اس جہنمی جزیرے سے کیسے باہر نکالے گا؟"

مادھوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کام بھی ہو جائے گا۔ اسے تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو"

پھر اس نڈر عورت نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اب میں جاتی ہوں۔ کل ٹھیک چار بجے سہ پہر تم میری سہیلی کی کوٹھی پر پہنچ جانا۔ میں گیراج کے باہر تمہارا انتظار کروں گی۔"

جب مادھوی چلی گئی تو میں نے اپنے غازی سے کہا۔

"یہ عورت بڑی دلیر ہے۔ اس کی مدد سے میں کم از کم جیل کی چاردیواری کے اندر تو پہنچ جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

غازی بولا۔

"یہ اپنے کیپٹن جمشید سے دل وجان سے پیار کرتی ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو اس سے بہادری کے کام کروا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ یہ عورت کتنی بہادر کیوں نہ ہو بہرحال نا تجربہ کار ہے۔ ذرا سی بھول چوک اس کے ساتھ تمہیں بھی کسی خوفناک مصیبت میں پھنسا سکتی ہے"

میں نے کہا۔

"مادھوی نے کہا ہے کہ مجھے اپنے ساتھ ایک پستول یا ریوالور بھی لے جانا ہو گا جس پر سائی لینسر لگا ہوا ہو۔ کیا اس کا انتظام ہو سکے گا؟"

غازی بولا۔

"تم جو کہو گے تمہیں مہیا کر دیا جائے گا۔ میں رات کو کلب سے واپسی پر ریوالور لیتا آؤں گا"

غازی دوپہر کے بعد اپنی ڈیوٹی پر جھومرے پٹی کلب چلا گیا۔ میں اگلے روز شروع ہونے والے مشن پر غور کرنے لگا۔ لکڑی کی الماری میں بند ہو کر تین چار میل کا سمندر عبور کرنا میرے لئے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ تشویش اگر مجھے تھی تو اس بات کی تھی کہ جب میں الماری میں بند ہو کر جیل کے اندر چیف وارڈن کے دفتر میں پہنچ جاؤں گا تو اس کے بعد حالات کوئی سنگین صورت اختیار نہ کرلیں۔ مادھوی بہادر عورت ضرور تھی مگر یہاں بہادری کے ساتھ ساتھ عقل مندی اور سوچ سمجھ کی بھی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا اصل مشن چیف وارڈن کے آفس میں پہنچنے کے بعد ہی شروع ہونے والا تھا۔ میں دیر تک اکیلا چارپائی پر لیٹا یہی کچھ سوچتا رہا۔ رات کے دس گیارہ بجے کے قریب اپنا جاسوس غازی بھی کلب سے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا تھیلا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے ایک ریوالور نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اس سے تمہارا کام چل جائے گا؟"

ریوالور کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کا میگزین کھول کر دیکھا۔ اس میں بارہ گولیوں کا میگزین بھرا ہوا تھا اور لاک لگا ہوا تھا۔ میں نے غازی سے کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم کچھ دیر اپنے مشن کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ غازی کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے مادھوی نے تمہارے اور کیپٹن جمشید کے کامیابی سے جزیرے سے نکل آنے کے بعد تم دونوں کے لئے کسی نہ کسی خفیہ جگہ کا ضرور بندوبست کر رکھا ہو گا۔

اگر ایسی بات نہ ہوئی تو تم کیپٹن جمشید کو لے کر سیدھا میرے مکان پر آجانا۔ مکان کی ایک چابی تمہارے پاس ہی ہوگی۔ میں نہ بھی ہوا تو تم کیپٹن کو یہاں چھپا دینا اور میری واپسی ا انتظار کرنا۔ میں کل رات جلدی واپس آجاؤں گا۔ اس کے بعد تم دونوں کے یہاں سے نکل جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی کروں گا"

میرا ذہن ابھی تک اس بات سے مطمئن نہیں تھا کہ مادھوی کیپٹن جمشید کو کامیا سے جیل کی حدود سے باہر نکال سکے گی۔ پھر خیال آتا کہ ہو سکتا ہے وہ ایسا کرنے می کامیاب ہو جائے۔ کل اس کی رات کی ڈیوٹی ہوگی اور وہ شام سے لے کر رات دس گیار بجے تک جیل کے اندر ہی رہے گی۔ ممکن ہے اس نے کوئی انتظام کر رکھا ہو۔ مادھوی نے اس بارے میں زیادہ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنے طور پر سوچ رکھا تھا کہ ایک بار میں نے کیپٹن جمشید کو دشمن کی قید سے نکال لیا تو اس کے بعد میں کسی نہ کسی طرح اسے جزیرے سے بھی فرار کروا لوں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے ریوالور کی بارہ گولیوں سے جیل کے بارہ آدمی کیوں نہ ہلاک کرنے پڑیں۔ دوسرے دن میں دیر تک سویا رہا۔

غازی نے بھی مجھے نہ جگایا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ اس کو چار بجے کلب اپنی ڈیوٹی پر جانا تھا اور مجھے پورے چار بجے مادھوی کی سہیلی کے گیراج میں پہنچنا تھا۔ میں ساڑھے تین بجے غازی سے اجازت لے کر چل پڑا۔ سڑک پر ایک رکشے میں سوار ہوگیا اور ایک چوک پہلے اتر گیا۔ وہاں سے پیدل ہی فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے چلنے لگا۔ ٹھیک چار بجے میں مادھوی کی کوٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے ایک طرف درختوں کی اوٹ میں سے کوٹھی کے گیراج کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے مادھوی نظر نہ آئی میں وہیں درختوں کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے مادھوی نظر آئی۔ وہ اپنی سہیلی کی کوٹھی کے برآمدے میں سے گزرتی ہوئی گیراج کی طرف آرہی تھی۔ میں بھی اس کی طرف چل پڑا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ

کیا۔

وہ گیراج کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے گیراج میں داخل ہوگیا۔ گیراج میں دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں میری نظر دیوار کے ساتھ لگی لکڑی کی قد آدم الماری پر پڑی۔ مادھوی نے گیراج کا دروازہ بند کر دیا۔ میں الماری کے سامنے کھڑا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ مادھوی میرے قریب آئی۔ اس نے الماری کا دروازہ کھول دیا۔ یہ الماری اس طرح کی تھی کہ اس کا آدھا حصہ اوپر سے لے کر نیچے تک بالکل خالی تھا۔ دوسرے آدھے حصے میں شیلف بنے ہوئے تھے۔ مادھوی نے کہا۔

"اس کے اندر کھڑے ہو کر دیکھو"

میں الماری کے اندر کھڑا ہوگیا۔ میرا سر الماری کی چھت سے چھ سات انچ نیچے تھا الماری میں اتنی جگہ تھی کہ میں وہاں بیٹھ بھی سکتا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا مادھوی کہنے لگی۔

"تمہیں تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن یہ تکلیف تمہیں کیپٹن جمشید کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی۔ میں نے تازہ ہوا کا خاص طور پر اس میں انتظام کیا ہوا ہے۔ اوپر چھت کی طرف دیکھو۔"

میں نے الماری کی چھت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ چھت کی لکڑی میں تین گول گول سوراخ بنے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔

"یہ سوراخ صرف تازہ ہوا کے لئے میں نے رکھوائے ہیں۔ چیف وارڈن کے آفس میں پہنچنے کے بعد ان سوراخوں پر کپڑا ڈال کر انہیں بند کر دیا جائے گا۔ میں الماری کا دروازہ بند کرتی ہوں"۔

اس نے الماری کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ الماری میں ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ الماری کی چھت کے سوراخوں میں بلب کی دھیمی روشنی اندر آنے لگی۔ مادھوی نے باہر سے پوچھا۔

"اندر دم گھٹنے کا احساس تو نہیں ہو رہا؟"

میں نے کہا۔

"اس قسم کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تازہ ہوا اوپر والے سوراخوں سے آ رہی ہے۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں الماری سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

اس نے کہا۔

"ٹھیک چھ بجے شام اس الماری کو لینے ایک ٹرک آئے گا۔ تم الماری میں بند ہو کر ٹرک پر پہنچ جاؤ گے۔ میں الماری کے ساتھ ہوں گی۔ یہاں سے ٹرک الماری لے کر گودی پر جائے گا جہاں اسے سپلائی لے کر جانے والے سٹیمر پر رکھوا دیا جائے گا۔ میں جب بھی الماری کے پاس ہی رہوں گی۔ اگر تمہیں کسی قسم کی کوئی دقت پیش آئے تو الماری کے تالے والے سوراخ میں سے باہر مجھے دیکھنے کے بعد دوبار دروازے پر ٹھک ٹھک کرنا میں موقع پا کر دروازہ تھوڑا سا کھول کر تم سے بات کرلوں گی۔ ویسے تم ایسا نہ ہی کرو تو بہتر ہے"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں یہ سفر خاموشی سے طے کرلوں گا۔"

اس کے بعد وہ یہ کہہ کر گیراج سے نکل گئی کہ میں کچھ دیر بعد آؤں گی۔ میں گیراج میں الماری کے پاس اکیلا رہ گیا۔ وہاں کونے میں ایک سٹول پڑا تھا۔ میں سٹول پر بیٹھ گیا اور الماری کی طرف دیکھنے لگا۔ بھرا ہوا ریوالور میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میں نے صرف پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ کافی دیر بعد مادھوی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی چینک اور شیشے کے دو گلاس تھے۔ کہنے لگی۔

"میں کافی لائی ہوں۔ پئیوں گے؟"

میں نے کہا۔

"ضرور پئیوں گا"

ہم کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"جیل کی چاردیواری کے اندر پہنچنے کے بعد ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ سپلائی والا سٹیمر تو بقول تمہارے آج رات کے پچھلے پہر جزیرے سے واپس چل پڑے گا۔ کیا اس دوران ہم کیپٹن جمشید کو کال کوٹھڑی سے نکالنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ اور فرض کر لیا کہ ہم اسے نکال بھی لیتے ہیں تو کیا ہم دوسروں کی نظروں سے چھپ کر سٹیمر میں سوار ہو کر سمندر عبور کر سکیں گے؟"

مادھوی کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا۔ کافی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ سب کچھ میں تمہیں جیل کے اندر پہنچنے کے بعد بتاؤں گی۔ ابھی ہمارا مقصد صرف تمہیں جیل کے اندر چیف وارڈن کے دفتر میں پہنچانا ہے۔ آگے کا بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ لیکن یہ میں تمہیں وہاں پہنچنے کے بعد بتاؤں گی۔"

وہ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ پھر چلی گئی۔ چھ بجنے میں ابھی دس ایک منٹ رہتے تھے کہ وہ آ گئی۔ کہنے لگی

"تیاری پکڑ لو۔ پورے چھ بجے گودی کا ٹرک الماری لینے آ جائے گا"

میں نے الماری کا دروازہ کھولا اور اس کے اندر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بیٹھ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا میں بند الماری کے خانے میں آسانی سے بیٹھ سکتا ہوں؟ میں بیٹھ گیا تھا۔ مجھے زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مادھوی نے کہا۔

"یہ الماری ٹرک میں کھڑی کر کے رکھی جائے گی۔ تم اگر بیٹھنا چاہو اور بیٹھنے میں تمہیں اگر تکلیف محسوس نہیں ہوتی تو تم بے شک بیٹھ جانا۔ جس طرح تمہیں سہولت ہو ویسے ہی کرنا۔"

وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی جو اس کی کلائی پر بندھی ہوئی تھی۔ میں الماری سے باہر آ گیا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں الماری میں بیٹھ کر جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

چھ بج کر دس منٹ پر باہر کسی ٹرک نے ہارن دیا۔ مادھوی نے کہا۔

"الماری میں بیٹھ جاؤ۔ ٹرک آ گیا ہے۔"

میں الماری میں داخل ہو کر بیٹھ گیا۔ مادھوی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور الماری کے دونوں پٹ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب میں الماری میں قید ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سلنڈر کے اندر بیٹھا ہوں۔ چھت کے سوراخوں میں سے بلب کی دھیمی روشنی الماری کے اندر آ رہی تھی۔ مجھے مادھوی کے قدموں کی آواز باہر جاتے سنائی دی۔ پھر اس نے انگریزی میں کسی سے کہا۔

"ٹرک ادھر لے آؤ۔ الماری گیراج میں ہے۔"

ٹرک کا انجن چل رہا تھا۔ ٹرک کی گھوں گھوں کی آواز قریب آنے لگی۔ پھر ایسے لگا جیسے ٹرک گیراج کے سامنے آ کر رک گیا ہے۔ مجھے مادھوی کی آواز سنائی دی۔

"الماری کو احتیاط سے اٹھا کر رکھنا۔ یہ بڑی قیمتی الماری ہے۔ کہیں کوئی رگڑ نہ لگ جائے۔"

کسی نے بلند آواز میں جواب دیا۔

"ڈونٹ وری میڈم"

پھر میری الماری نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے الماری زمین سے بلند ہو گئی۔ الماری کو اس طرح اٹھائے ہوئے گیراج سے نکال کر ٹرک میں بڑے آرام سے رکھ دیا گیا۔ مادھوی کی آواز آئی۔

"اسے رسی سے باندھ دو"

مجھے ایسی آوازیں آئیں جیسے الماری کے گرد رسی ڈال کر اسے ٹرک کی دیوار کے ساتھ باندھا جا رہا ہے۔ پھر ٹرک کے انجن کو گیئر لگایا گیا اور وہ چل پڑا۔ اس وقت شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ میں الماری کے خانے میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے

اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ الماری کی چھت کے سوراخ باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آرہے تھے مگر ان میں سے تازہ ہوا ضرور اندر آرہی تھی۔ مجھے گھٹن کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ ٹرک سڑک پر ہلکے ہلکے دھچکے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایلور کی گودی وہاں سے چھ سات میل کے فاصلے پر تھی۔ ٹرک کئی سڑکوں پر مڑا۔ پھر الماری کے سوراخوں میں سے سمندر کی مرطوب ہوا آتی محسوس ہوئی۔ ٹرک ایلور کی گودی پر پہنچنے والا تھا۔ ٹرک کی رفتار ہلکی ہوگئی اور ایک طرف کو گھوم کر وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ باہر سے مختلف آدمیوں کی ایک دوسرے کو آواز دینے کی صدائیں آرہی تھیں۔ کسی سٹیمر کے وسل کی آواز بھی سنائی دی۔ مادھوی ٹرک میں آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر الماری کے پاس ہوتی تو ضرور مجھ سے ایک آدھ بات کر لیتی۔ مزدور لوگ بھی شاید ٹرک کے عقب میں دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔ مجھے ان کی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ الماری کو ٹرک میں سے اتارا جانے لگا۔

مجھے لگا کہ الماری کو مزدور لوگ اٹھا کر لئے جا رہے ہیں کسی مزدور نے دوسرے سے کہا۔

"سالی الماری بڑی بھاری ہے"

اب جو الماری کو نیچے رکھا گیا تو الماری بڑے بے معلوم انداز میں مجھے اوپر نیچے ہوتی محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ الماری کو سپلائی والے سٹیمر پر لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ مادھوی کسی کے ساتھ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ شاید وہ سٹیمر کا کیپٹن یا انجینئر تھا۔ کچھ وقت گزر گیا پھر سٹیمر کے ہارن کی تین بار آواز بلند ہوئی اور اس کے فوراً بعد سٹیمر کا انجن سٹارٹ ہو گیا اور مجھے الماری کے اندر بیٹھے بیٹھے ہلکا سا دھچکا لگا۔ سٹیمر سمندر پر چل پڑا تھا۔

یہ وہ سمندر تھا جس کو میں الماری میں بند رہ کر ہی عبور کر سکتا تھا۔ یہ سمندر میرے لئے آگ کا دریا تھا۔ اب میں اس سمندر کو ایک طرح سے محفوظ حالت میں عبور کر رہا تھا۔ سٹیمر کے انجن کی گڑگڑاہٹ زیادہ تھی اور لگتا تھا کہ اس کی رفتار بہت ہلکی ہے۔ اس

ی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ سٹیمر پر سپلائی کا کافی سامان لدا ہوا تھا۔ سمندر کا تین چار میل کا فاصلہ سٹیمر نے کافی وقت لگا کر طے کیا۔ مجھے الماری میں بیٹھے بیٹھے سخت گرمی لگنے لگی تھی اور جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مگر مجھے یہ گرمی برداشت کرنی تھی۔ آخر سٹیمر نے بار بار وسل دینا شروع کر دیا۔ لگتا تھا کہ جیل والے جزیرے کا گھاٹ قریب آگیا ہے۔ اتنے میں الماری کی دیوار پر کسی نے بڑی آہستہ سے ٹھک ٹھک کی۔ ساتھ ہی مادھوی کی دھیمی آواز آئی۔

"ہم پہنچ گئے ہیں۔ بس تھوڑی سی اور تکلیف برداشت کرلو۔ بولنا بالکل مت۔"

میں خاموش رہا۔ سٹیمر گھاٹ کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ پھر اسی طرح مزدوروں نے میری الماری کو اٹھا کر سٹیمر سے نکالا اور ایک جگہ رکھ دیا۔ مادھوی کی آواز آئی۔ وہ انگریزی میں بول رہی تھی۔

"آفس کا ٹرک اس طرف کھڑا ہے۔ الماری کو ادھر لے چلو۔"

وہاں سے پھر میری الماری کو اٹھا لیا گیا۔ اور کسی دوسرے ٹرک میں لے جا کر رکھ دیا گیا۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور منہ اوپر والے سوراخوں کی طرف کر کے زور زور سے سانس لینے لگا۔ تازہ سمندری ہوا مجھے بڑے قریب سے آتی لگی اور طبیعت کی گھبراہٹ کافی حد تک جاتی رہی۔ اب میں الماری میں سیدھا کھڑے کا کھڑا ہی رہا۔ ٹرک جزیرے کی سڑک پر جا رہا تھا۔ سڑک اونچی نیچی تھی۔ ٹرک کو ہلکے ہلکے دھچکے لگ رہے تھے۔ ٹرک کی رفتار ہلکی تھی۔ کبھی ٹرک ایک طرف گھوم جاتا کبھی دوسری طرف مڑ جاتا۔ پھر وہ ایک جگہ پہنچ کر رک گیا۔ کسی آدمی کی آواز آئی۔

"اس میں کیا ہے؟ بولے گا"

مادھوی کی آواز پھر بلند ہوئی۔

"اوکے پٹیل بھائی۔ اوکے۔ آفس کے واسطے المارا لایا ہے"

اس مرد کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے۔ آگے جاؤ"

ٹرک پھر چل پڑا۔ مگر بہت دھیمی رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔ کسی نے ٹرک کی سا
پر ہاتھ مارا۔ ٹرک چلتا رہا۔ ٹرک ایک طرف مڑا اور رک گیا۔ ٹرک کی اگلی سیٹوں
کھڑکیاں کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

"الماری آفس کے اندر لے جائے گا آہستہ آہستہ۔ اوکے"

کچھ لوگوں نے الماری کو اٹھا کر ٹرک میں سے اتارا اور اسی طرح اٹھائے ہوئے ک
دور لے جانے کے بعد ایک جگہ رکھ دیا۔ مادھوی نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ جاؤ گے اوکے۔"

مزدوروں کے آپس میں تلیگو زبان میں باتیں کرنے کی آواز آئی پھر یہ آوازیں دو
ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ کوئی دو منٹ بعد فرش پر کسی ک
قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ٹک ٹک ٹک۔ آواز میری الماری کے پاس آ کر رک گئی۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟"

مادھوی نے میرا نام لے کر کہا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے اندر سے نکالو۔ بڑی سخت گرمی لگ رہی ہے۔"

الماری میں چابی گھمائی گئی۔ الماری کا دروازہ کھل گیا۔ تازہ ٹھنڈی ہوا کا جھو
میرے جسم سے ٹکرایا۔ میرے سامنے کمرے کی دھیمی روشنی میں مادھوی کھڑی تھی
کمرے میں ایک بڑی میز تھی۔ دیوار کے ساتھ کرسیاں لگی تھیں۔ دیوار پر انڈیا کا بہت بڑ
نقشہ لگا تھا۔ بڑی میز کے پیچھے دیوار پر گاندھی اور پنڈت نہرو کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔
میں جلدی سے باہر نکل کر قریبی کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

مادھوی نے کہا۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟"

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا ہم جزیرے کی جیل کے اندر آ گئے ہیں؟"

مادھوی الماری بند کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"شی! اونچی آواز میں بات نہ کرو۔"

تم اس وقت جزیرے کی جیل کے اندر چیف وارڈن کے آفس میں ہو۔

چھت کے ساتھ لگا پنکھا چل رہا تھا۔ میرے پسینے میں شرابور بدن کو یہ ہوا بڑی
خوشگوار لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہاں سے ہمیں کہاں جانا ہو گا؟"

یہ بات میں نے سرگوشی میں مادھوی سے پوچھی تھی۔ اس نے ہاتھ سے مجھے خاموش
رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اصل میں دروازے کی طرف سے کسی
کے بھاری بوٹوں کی چاپ آ رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ مادھوی نے مجھے میز کی دوسری
طرف چھپ جانے کا اشارہ کیا۔ میں جلدی سے بڑی میز کے پیچھے جا کر اس کے نیچے بیٹھ
گیا۔

یہاں سے مجھے دروازے کا نچلا آدھا حصہ نظر آ رہا تھا۔ مادھوی نے دروازہ کھول
دیا۔ باہر سے کوئی آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے بھاری سیاہ فوجی انداز کے بوٹ' ٹانگوں پر
چڑھی ہوئی خاکی جرابیں اور نیکر کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی نے کہا۔

"میڈم ابھی ادھر کام کرے گا یا سٹور میں جائے گا؟"

یہ کوئی گارڈ تھا جس کی وہاں رات کو پہرہ دینے کی ڈیوٹی تھی۔ مادھوی نے بڑے
پر سکون لہجے میں بے نیازی سے کہا۔

"ابھی تھوری دیر کو آفس میں کام کرے گا۔ پھر سٹور میں چیکنگ کے واسطے جائے
گا۔ تم گیٹ پر ڈیوٹی پر جائے گا"

"یس میڈم"

اور اس آدمی کی ٹانگیں پیچھے کو گھوم کر دروازے میں سے باہر نکل گئیں۔ میں میز
کے نیچے ہی چھپا رہا۔ مادھوی نے دروازہ بند کر دیا مگر چٹخنی نہ لگائی۔ میز کے پاس آ کر اس
نے مجھے باہر نکل آنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ فائلیں کھول

کر اپنے سامنے رکھ لیں اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم اس کرسی پر سے اٹھ کر الماری کی ساتھ والی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ"

الماری کی اوٹ میں ایک کرسی پڑی تھی میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے فائ
نظریں جمائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی۔

"سپلائی والی رات کو میں یہاں رات کی ڈیوٹی پر ہوتی ہوں۔ یہاں کوئی نہیں ا
جیل کے سارے دفتر بند ہوتے ہیں۔ پھر بھی احتیاط ضروری ہے یہ چوکیدار اندر کسی
میں آکر جھانک سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں الماری کی اوٹ میں بٹھایا ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ہمیں کتنی دیر تک یہاں بیٹھے رہنا ہوگا۔"

مادھوی نے اپنی کلائی والی گھڑی دیکھی اور بولی۔

"ابھی آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے جیل کے قید
میں کھانا تقسیم ہوتا ہے یہاں قیدیوں کو کھانا سلاخوں کے اندر ہی کھلایا جاتا ہے۔ اس وق
میں تھوڑی دیر کے لئے جاؤں گی۔ واپس آکر بتاؤں گی کہ تمہیں آگے کیا کرنا ہوگا۔"

میں الماری کی اوٹ میں کرسی پر خاموش بیٹھا رہا۔ مادھوی دھیمی آواز میں کسی ک
وقت مجھ سے کوئی بات کر لیتی تھی۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ کرسی چھوڑ کر اٹھی ا
میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں جاتی ہوں۔ جلدی واپس آجاؤں گی۔ میں کمرے کو باہر سے تالا لگا کر جاؤں گی۔
تم خاموش بیٹھے رہنا۔ کھانسی بھی آئے تو روک لینا۔ کیونکہ باہر سیکورٹی گارڈ ٹہلتا رہ
ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ دیوار پر کلاک لگا ہوا تھا۔
میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلاک کو دیکھ لیتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مادھوی واپس آئی۔
دروازہ بند کر کے وہ الماری کے قریب آکر کہنے لگی۔

"یہ لو اسے اپنی قمیض پر سامنے کی طرف لگا لو۔"

اس نے پرس میں سے ایک شناختی کارڈ نکال کر مجھے دیا جس کے ساتھ بکسوا لگا ہو
اتھا۔ اس پر انگریزی اور تلیگو زبانوں میں کسی آدمی کا نام لکھا ہوا تھا اور مہر بھی لگی تھی۔
کہنے لگی۔

"یہ جیل کے ایک ایسے کچن میٹ کا آئی ڈی کارڈ ہے جو ایک ماہ کی چھٹی پر گیا ہوا
ہے۔"

میں نے اپنی قمیض کے سامنے کی طرف آئی ڈی کارڈ چپکاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کچن کے لوگ میرے اجنبی چہرے کو دیکھ کر ضرور پوچھیں گے کہ میں کون
ہوں اور میں نے اس شخص کا آئی ڈی کارڈ کہاں سے لیا ہے جو ایک ماہ کی چھٹی پر گیا ہوا
ہے۔"

مادھوی پرس کو بند کر رہی تھی کہنے لگی۔

"تم کچن کی طرف نہیں جاؤ گے۔ میں بتاتی ہوں تمہیں کہاں جانا ہوگا۔ سنو میں ابھی
سٹور میں سپلائی کی چیکنگ کے لئے جاؤں گی وہاں مجھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ اس
دوران قیدیوں کو کھانا دے دیا گیا ہوگا ان کی رات کی آخری گنتی بھی ہو چکی ہوگی رات کو
ٹھیک گیارہ بجے قیدیوں کی بارکوں اور کوٹھڑیوں کی روشنی بجھا دی جاتی ہے۔ صرف
کوٹھڑیوں کے سامنے والی بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ میں اب تمہارے پاس واپس نہیں آؤں
گی۔ دیوار پر کلاک لگا ہوا ہے۔ اس کلاک پر جب ٹھیک رات کے سوا گیارہ بجیں تو تم
اس کمرے کی بتی بجھا دینا پنکھا بھی بند کر دینا اور بڑی احتیاط سے کمرے میں سے نکل کر
بائیں جانب کوریڈور میں چلتے جانا۔ بیس قدم چلنے کے بعد ایک دروازہ آئے گا۔ دروازہ
میں نے کھلا رکھا ہوگا۔ اس دروازے میں سے گزر کر تم آگے جاؤ گے تو تمہیں ایک نیم
روشن برآمدہ ملے گا۔ اس کی ایک جانب اونچی دیوار ہوگی۔ دوسری جانب چھوٹی چھوٹی
پانچ کوٹھڑیاں ہوں گی۔ برآمدے کے پہلے دروازے پر اور آخری دروازے پر دو سنتری
پہرہ دے رہے ہوں گے برآمدے کے دروازے کے باہر ایک بالٹی پڑی ہوگی تم وہ بالٹی اٹھا
کر برآمدے میں داخل ہو جاؤ گے۔ سنتری تمہاری طرف سرسری نظروں سے دیکھے گا۔

پہلی کوٹھڑی میں جو قیدی بند ہوگا اس کے برتن دروازے کی سلاخوں کے باہر پڑے ہو
گے۔ تم ان کو اٹھا کر بالٹی میں رکھ لو گے۔ اس کے بعد دو کوٹھڑیاں خالی ہوں گی۔ چو
کوٹھری کے خالی برتن بھی دروازے کی سلاخوں کے باہر پڑے ہوں گے۔ اس کوٹھڑی
تمہارا کیپٹن جمشید قید ہے۔ دروازے پر جو تالا لگا ہوا ہے اس کی چابی دوسرے درواز
والے سنتری کی بیلٹ میں لگی ہوگی۔ یہاں جو کچھ کرنا ہوگا وہ صرف تم ہی کو کرنا ہوگا
تم نے دونوں سنتریوں پر قابو پالیا اور ان کو اس طرح قابو کیا کہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکی
اور دیوار کے ساتھ لگے الارم کا بٹن نہ دبا سکیں تو تم دوسرے سنتری کی بیلٹ سے چا
نکال کر کوٹھڑی کا دروازہ کھولو گے اور کیپٹن جمشید کو نکال کر دوسرے دروازے
برآمدے سے باہر نکلتے ہی دائیں جانب مڑ جاؤ گے۔ یہ کوٹھڑیوں کا عقبی حصہ ہوگا۔ وہا
ایک پرانا ٹرک کھڑا ہے اس ٹرک کی ایک جانب مین ہول ہے۔ اس مین ہول میں
جیل کا سارا پانی ایک سرنگ میں سے ہو کر سمندر میں گرتا ہے۔ تم دونوں اس سرنگ
سے ہو کر جیل کی چار دیواری سے باہر نکل جاؤ گے۔ باہر سمندر میں چھوٹی بڑی چٹانیں نظ
آئیں گی۔ ان میں ایک سب سے اونچی چٹان ہے۔ اس اونچی چٹان کے عقب میں ایک
جگہ زمین پر پتھر کی سل ملے گی۔ اس پر میں نے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ڈال رکھی ہیں
پتھر کی سل کو ہٹاؤ گے تو نیچے ایک سرنگ ملے گی۔ بس تم دونوں اس سرنگ میں چھپ
گے اور میرا انتظار کرو گے خبردار۔ جب تک میں نہ آؤں۔ ہرگز ہرگز وہاں سے باہر
نکلنا۔ اب میں سپلائی کا سامان چیک کرنے سٹور میں جاتی ہوں تمہیں ٹھیک سوا گیارہ
اپنے مشن پر نکل پڑنا ہے۔"

مادھوی یہ کہہ کر چلی گئی۔ میں چیف وارڈن کے کمرے میں الماری کی اوٹ میں
بیٹھ گیا۔ جب دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے رات کے ٹھیک سوا گیارہ بجائے تو میں
اللہ کو یاد کیا اور پہلے کمرے میں چلتا ہوا پنکھا آف کیا۔ پھر کمرے کی بتی بجھادی اور دروا
کھول کر باہر نکل آیا اور کوریڈور میں بائیں طرف دبے پاؤں چلنے لگا۔ بیس قدم چلنے
بعد ایک دروازہ آگیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دروازے میں سے نکل کر دیکھا تو آگے ایک
روشن برآمدہ تھا۔ میں نے رک کر غور سے دیکھا۔ برآمدے کی ایک جانب اونچی دیوار
تھی۔ دوسری جانب کوٹھڑیاں تھیں۔ ان کوٹھڑیوں کے وسط میں ایک کھمبے کے ساتھ بلب
جل رہا تھا۔ اس کی روشنی دھیمی تھی اور مجھے کوٹھڑی کی سلاخیں نظر آرہی تھیں۔
برآمدے کے شروع میں ہی ایک بالٹی پڑی تھی۔ میں نے بالٹی اٹھالی۔ ایک سنتری پہلی
کوٹھڑی کے آگے ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے بندوق کاندھے پر لگا رکھی تھی۔ میں
نے برآمدے کے آخر میں نگاہ ڈالی۔ وہ چوتھی کوٹھڑی تھی۔ ہمارا بہادر پاکستانی جانباز اسی
کوٹھڑی میں قید تھا۔ اس کوٹھڑی کے آگے ایک سنتری سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے ان
دونوں سنتریوں کو قابو کرنا تھا۔ میں انہیں صرف کچھ دیر کے لئے بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔
مگر صورت حال اتنی نازک تھی کہ وہ میرے ہاتھوں مر بھی سکتے تھے۔ میری نیت انہیں
مارنے کی نہیں تھی۔ سب سے پہلے مجھے پہلی کوٹھڑی کے آگے جو سنتری ٹہل رہا تھا اسے
قابو کرنا تھا۔ میں نے بالٹی ایک طرف اندھیرے میں رکھ دی اور خود بھی دیوار کی اوٹ
میں ہو گیا۔ سنتری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اس سے
کوئی بات کروں۔

میں نے بالٹی اٹھالی اور وہیں سے سنتری کو آواز دی۔

"صاب ادھر سانپ ہے"

سنتری نے مجھے بالٹی ہاتھ میں لئے کھڑے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کچن کا ملازم قیدیوں کے
برتن اکٹھے کر کے لے جانے آیا ہے۔ وہ برآمدے میں سے اتر کر میری طرف بڑھا۔ اس
نے تلنگو یا تامل زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے ایک
طرف اندھیرے میں اشارہ کر کے کہا۔

"صاحب سنیک ہے۔ سنیک کوبرا"

سنتری نے بندوق سیدھی کر لی اور جھک کر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ میں نے بالٹی
زمین پر رکھ دی اور اس کے پہلو میں آکر پوری طاقت سے اپنا بازو اس کی گردن کے پیچھے
مارا۔ اس خاص داؤ کی ہمیں خاص طور پر ٹریننگ دی گئی تھی۔ گردن کے وسط میں ہاتھ کی

بھرپور ضرب سے گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اس بات کا بڑا خیال رکھا تھا کہ ضرب صرف اتنی ہو کہ سنتری بے ہوش ہو جائے۔ لیکن جب سنتری منہ کے بل گرا تو میں نے اس کے کان کے نیچے الٹا ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

سنتری کے گرنے سے ذرا سا شور بلند ہوا تھا۔ اس شور کو سن کر برآمدے کے دوسرے سرے پر چوتھی کوٹھڑی کے باہر جو سنتری سٹول پر بیٹھا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے وہیں سے پہلے والے سنتری کو آواز دے کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں برآمدے میں آگیا اور اسے کہا۔

"صاب! سنتری جی بے ہوش ہو گیا ہے۔"

دوسرا سنتری گھبرا کر میری طرف دوڑا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسرے لمحے دوسرا سنتری بھی پہلے سنتری کے اوپر منہ کے بل گر کر بے ہوش ہو گیا تھا یا مر گیا تھا۔ اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کے دل کی دھڑکن پرکھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ضرور ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی بیلٹ میں لگا ہوا چابیوں کا گچھا نکال لیا اور برآمدے میں چوتھی کوٹھری کی طرف دوڑا۔ چوتھی کوٹھڑی میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں میں نے ایک انسان کو زمین پر اوندھے منہ پڑے دیکھا۔

میں نے چابیوں کے گچھے میں سے تالے پر چابیاں لگانی شروع کر دیں۔ زبوں حال قیدی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور جلدی جلدی چابیاں لگانے لگا۔ آخر ایک چابی لگ گئی۔ میں سلاخوں والا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور قیدی سے پوچھا۔

"کیا تم پاکستانی جانباز فورس کے کیپٹن ہو؟"

"ہاں" نوجوان نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔

"جلدی سے اپنا نام بتا دو"

"میرا نام جمشید ہے"

ٹھیک ہے فوراً میرے ساتھ نکل چلو۔

"جلدی کرو"

کیپٹن جمشید جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ وہ بوریئے پر سے اٹھا اور میرے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ میں برآمدے سے نکل کر جلدی سے دائیں مڑ گیا۔ یہ جیل کی کال کوٹھڑیوں کا پچھواڑا تھا۔ کیپٹن جمشید کو میں نے اپنے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"جیل کی دیوار پر کیسے چڑھیں گے؟"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"پلیز! خاموش رہو"

وہاں اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ جیل کی چاردیواری پر جو واچ ٹاور بنے ہوئے تھے ان کی سرچ لائٹ کا دائرہ دیوار کی دوسری جانب چل رہا تھا۔ اس روشنی کا عکس جیل کی چاردیواری کے اندر کی فضا کو بھی اجال رہا تھا۔ مجھے ایک جانب ٹرک کھڑا نظر آیا۔ میں نے کیپٹن جمشید کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ٹرک کی طرف بڑھا میں بھی جھک کر چل رہا تھا۔ کیپٹن جمشید بھی جھک کر چل رہا تھا۔ ٹرک کے پاس جا کر میں مین ہول کے ڈھکن کو تلاش کرنے لگا۔ کیپٹن جمشید وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے مین ہول نظر آگیا۔ میں نے کیپٹن کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے مین ہول کا ڈھکن کسی نہ کسی طرح اٹھا لیا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں کہا۔

"ہمیں اس کے اندر اترنا ہے۔"

ڈھکن الگ ہوتے ہی نیچے گٹر کی سرنگ میں سے ناخوشگوار بو کے بھبکے باہر نکلے۔ میں پہلے نیچے اتر گیا۔ نیچے اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹول کر محسوس کیا کہ یہ کوئی پائپ نہیں تھا بلکہ زمین کے اندر واقعی ایک کافی کشادہ سرنگ بنی ہوئی تھی۔ اس دوران کیپٹن جمشید بھی نیچے اتر آیا تھا۔ ہم نے دوبارہ ڈھکن لگا کر مین ہول کا منہ بند کر دیا۔ اندر

کی فضا میں بو اور گرمی اور حبس تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ میں نے جیب سے ماچس نکال کر جلانی چاہی۔ مگر اس خیال سے رک گیا کہ اندر ہلکی ہلکی گیس کی بو بھی ہے کہیں آگ نہ بھڑک اٹھے۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

”یہ سرنگ جیل کی چاردیواری کے باہر سمندری چٹانوں میں جا نکلتی ہے۔ ہمیں یہاں سے تیز تیز چلنا ہوگا۔“

سرنگ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم جھک کر آگے کی طرف چلنے لگے۔ سرنگ کے درمیان میں پانی کی نالی بنی ہوئی تھی۔ دونوں جانب چلنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ بجلی کے موٹے تار جڑے ہوئے) تھے۔ مجھے پسینے آنے لگے۔ سرنگ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے گرمی حبس بڑھتا جا رہا تھا۔ کیپٹن جمشید میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ ایک جگہ ہمیں تازہ ہوا محسوس ہوئی۔ یہاں شاید سرنگ کی چھت میں کوئی ہوا دان لگا ہوا تھا۔ تازہ ہوا نے ہمیں تھوڑا سکون سا دیا۔ خدا کا شکر تھا کہ سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ ہم سرنگ میں سے باہر کھلی فضا میں نکل آئے۔ یہاں سمندر ہمارے سامنے تھا اور چٹانوں سے اس کی لہریں دور دور سے آکر ٹکرا رہی تھیں۔

کیپٹن جمشید لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”کیا تم اپنے بارے میں مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم اللہ کے فرشتے کون ہو؟“

میں نے پنجابی میں کہا۔

”کیا تم پنجابی ہو؟“

کیپٹن جمشید بولا۔

”ہاں۔ مسلمان ہوں اور پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ لاہور میں ہمارا گھر ہے۔“

میں نے کہا۔

”میں بھی پنجابی ہوں۔ مسلمان ہوں پاکستانی ہوں اور میرا مشن تمہیں یہاں سے فرا کروانا اور پاکستان پہنچانا ہے۔ آگے کوئی سوال نہ کرنا۔ یہ سب باتیں بعد میں کی جا ہیں۔ ابھی تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“

میں نے اندھیرے میں چٹانوں کی طرف دیکھا۔ رات کی تاریکی میں چٹانوں کے خاکے ہی نظر آرہے تھے۔ اتنے میں ایک جانب سے واچ ٹاور کی سرچ لائٹ کی روشنی کا دائرہ دیوار کے ساتھ ساتھ ہماری طرف بڑھتا نظر آیا۔ ہم جلدی سے دوڑ کر چٹان کے پیچھے ہو گئے۔ روشنی کا دائرہ آگے نکل کر ایک جگہ رک گیا۔ پھر یہی دائرہ جیل کی چاردیواری کے اندر ہو کر واپس آنے لگا۔ اس دوران میں نے سمندر کنارے کی چٹانوں میں سے بڑی چٹان کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔

”ہم اس چٹان کی طرف جائیں گے۔“

بڑی چٹان سمندر کے پانیوں میں تھی اور سمندر کی موجیں اس سے ٹکرا ٹکرا کر جھاگ اڑاتی واپس چلی جاتی تھیں۔ بڑی چٹان کی ایک جانب مجھے زمین پر جھاڑیاں سی نظر آئیں۔ میں نے انہیں ایک طرف ہٹایا تو نیچے پتھر کی چوکور سل پڑی تھی۔ ہم نے مل کر سل کو ایک طرف سرکا دیا۔ نیچے گڑھا بنا ہوا تھا۔ میں نے جمشید سے کہا۔

”ہمیں یہاں چھپ کر کسی کا انتظار کرنا ہے۔“

ہم گڑھے میں اتر گئے۔ باہر کی دھیمی دھیمی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گڑھے کی دیوار میں ایک جانب غار کا منہ تھا میں نے جھانک کر دیکھا۔ یہ کوئی قدرتی غار تھا۔ اور غار میں دوسری جانب سے ہوا آرہی تھی۔ ہم نے پتھر کی سل کو دوبارہ گڑھے کے اوپر اس طرح رکھ دیا کہ وہ بالکل فٹ ہوگئی اور زمین کے ساتھ زمین ہوگئی۔ ہم قدرتی غار میں داخل ہوگئے۔ دس بارہ گز چلنے کے بعد غار کے آگے دیوار آگئی۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

”تمہیں گھبراہٹ تو محسوس نہیں ہو رہی؟“

کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

”نہیں ایک تو میں پہلے ہی سخت جان فوجی ہوں۔ اوپر سے ان لوگوں نے مجھ پر اتنا ٹارچر کیا ہے کہ اب اس قسم کی تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا۔“

کیپٹن جمشید مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کون ہوں اور اسے بھارتی جیل سے فرار

کروانے کا خیال مجھے کیسے آیا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا کہ میرا تعلق کشمیری حریت پسندوں کے ایک ایسے گروہ سے ہے جو کشمیر کے محاذ پر بھارتی فوجیوں سے بھی برسرپیکار رہتا ہے اور بھارت کے دوسرے شہروں میں قید اپنے مجاہدوں کی بھی خبر رکھتا ہے اور انہیں بھارتی جیلوں سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیپٹن جمشید نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن دوست! اس جیل کے چاروں طرف خطرناک سمندر ہے جس میں آدم خور شارکیں چھوڑی گئی ہیں۔ یہ سمندر تین چار میل کے پھیلاؤ میں ہے۔ تم نے مجھے جیل کی کال کوٹھری سے تو آزاد کروا لیا ہے لیکن یہاں سے باہر نکل کر خطرناک سمندر کیسے عبور کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"جس شخص نے مجھے تم تک پہنچنے میں میری مدد کی ہے وہ ہمیں سمندر پار کرنے کی بھی کوئی ترکیب بتا دے گا۔"

"یہ فرشتہ کون ہے جس نے تمہاری مجھ تک پہنچانے میں مدد کی ہے"

میں نے کیپٹن جمشید کو میڈم مادھوی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا مگر یہ نہ بتایا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اور اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے یہ سارا خطرہ مول لیا ہے۔ میری جیب میں ریوالور اسی طرح محفوظ پڑا تھا۔ ہم اندھیرے میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کیپٹن نے پوچھا یہ نیک دل خاتون یہاں کس وقت آئے گی؟ کیونکہ میرے فرار کا کسی بھی وقت جیل کے عملے کو علم ہو سکتا ہے"

میں نے کہا۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔ اگر میڈم مادھوی کو مناسب موقع مل گیا تو وہ ابھی کسی وقت آ جائے گی۔ اگر نہ ملا تو ہو سکتا ہے ہمیں کل کا دن بھی اسی اندھیرے غار میں بسر کرنا پڑے۔ ویسے میڈم مادھوی کا پروگرام یہی تھا کہ وہ جزیرے سے واپس جانے والے سپلائی سٹیمر کے ذریعے یہاں سے نکال دے گی۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"یہ کام مجھے مشکل نظر آتا ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اتنے میں ہمیں غار میں ایسی مسلسل آواز سنائی دینے لگی جیسے باہر جیل میں خطرے کا الارم چیخ اٹھا ہو۔ کیپٹن جمشید نے کہا۔

"یہ جیل کا الارم ہے۔ انہیں میرے فرار کا علم ہو گیا ہے۔ اور یقینی طور پر جیل والوں کو دونوں سنتریوں کی لاشیں بھی مل گئی ہوں گی۔ اب ہمارا یہاں سے نکلنا مزید مشکل ہو گیا ہے۔"

میں نے کان لگا کر غور سے سنا۔ یہ جیل کا الارم ہی چیخ رہا تھا۔ جس کی آواز غار کے اندر دبی ہوئی آ رہی تھی۔ میں بھی سوچنے لگا کہ اب میڈم مادھوی ان چٹانوں کی طرف آنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ اور رات والے سپلائی سٹیمر میں سوار ہو کر ہمارے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا کہ اب ہمیں بڑے صبر اور استقلال سے کام لینا ہو گا۔

"کوئی پتہ نہیں ہمیں کب تک اس اندھیرے غار میں بند رہنا پڑے"

کیپٹن جمشید بولا۔

"کوئی بات نہیں مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔"

وقت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ جیل کا خطرے کا الارم بند ہو چکا تھا۔ موٹر گاڑیوں کی کبھی کبھی ہلکی آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں کسی طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ خدا جانے یہ کس خفیہ سوراخ میں سے آ رہی تھی۔ جب وہاں بند ہو کر بیٹھے بیٹھے میرے اندازے کے مطابق ہمیں ڈھائی تین گھنٹے گزر گئے تو میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"میں باہر جا کر صورت حال کا پتہ کرتا ہوں۔"

وہ بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ مگر میں نے اسے وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود پتھر کی سل سرکا کر سر باہر نکال کر دیکھا۔ سب سے پہلے تو باہر کی تازہ ہوا نے جیسے

کی وجہ سے مجھے بھی کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ تیسرا پہر گزر رہا تھا کہ ہمیں اوپر ز
کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کیپٹن جمشید نے خشک آواز میں کہا۔

"کوئی آرہا ہے۔"

چاپ کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آرہا ہو۔ یہ آواز ہما
سروں کے بالکل اوپر زمین پر آکر رک گئی۔ پھر جیسے کوئی دو قدم پیچھے کی طرف چلا۔ ا
پھر رک گئی۔ ایک دو سیکنڈ کی خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد کسی نے پتھر کی سل پر ا
ٹھک کی۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا میں نے کیپٹن سے کہا۔

"یہ مادھوی ہی ہو سکتی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

میں تیزی سے گڑھے میں گیا اور اوپر سل کو تکنے لگا۔ سل آہستہ سے ایک ط
کھسکی اور اندر دن کی روشنی کی کرنیں آنے لگیں۔ پھر مجھے مادھوی کی سرگوشی نما
آئی۔ اس نے میرا نام لے کر مجھ کو آواز دی تھی۔

میں نے جلدی سے منہ اوپر کر کے کہا۔

"میں اندر ہوں۔ کیپٹن بھی میرے ساتھ ہی ہے۔"

پتھر کی سل ایک طرف کو تھوڑا سا اور سرکی اور مادھوی نے ایک تھیلا اندر لڑھ
اور کہا۔

"میں پھر آؤں گی۔ ابھی باہر نہ نکلنا۔"

اور وہ سل شگاف کے منہ پر رکھ کر چلی گئی۔ میں تھیلا لے کر اندھیرے میں ک
جمشید کے پاس آگیا۔ میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک ایک کر کے چیزیں باہر نکا
لگا۔ سب سے پہلے ایک لمبی تھرمس نکلی جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں
تھرمس کھول کر کیپٹن کو دی اور کہا۔

"پانی کے صرف تین گھونٹ پینا۔"

کیپٹن نے تین گھونٹ ہی پیے۔ مجھے اس کے گھونٹ بھرنے کی آواز آتی رہی۔ ا
گھونٹ پانی میں نے پی لیا۔ پانی نے جسم میں جا کر اسے سیراب کر دیا۔ دوسری چیز

تھیلے میں سے نکلیں وہ یہ تھیں ایک پلاسٹک کا گول ڈبہ۔ ایک ٹارچ، ایک ماچس اور موم
بتیوں کا ایک پیکٹ میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ غار میں ہمارے درمیان روشنی ہو گئی۔
میں نے پلاسٹک کا ڈبہ کھولا۔ وہ چاولوں کی گرم کھچڑی سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے تھوڑی
تھوڑی کھچڑی کھالی۔ کیپٹن نے کہا۔

"ٹارچ بجھا دو۔ موم بتی روشن کر لیتے ہیں۔"

ہم نے ٹارچ کی جگہ موم بتی روشن کر لی۔ پٹ سن کا تھیلا سامنے پڑا تھا۔ کیپٹن نے
کہا۔

"اس میں کوئی اور چیز نہیں ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"بس یہی چیزیں تھیں۔"

میں نے یونہی تسلی کے لئے تھیلے کے اندر ہاتھ ڈالا تو مجھے اندر تہہ کیا ہوا کاغذ ملا۔
میں نے جلدی سے کاغذ نکال کر کھولا۔ یہ مادھوی کا انگریزی میں لکھا ہوا خط تھا۔ اس نے
لکھا تھا۔

"یہاں کیپٹن کے فرار اور دو سنتریوں کے قتل کے بعد سیکورٹی اس قدر سخت کر دی
گئی ہے کہ کوئی پرندہ بھی اڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔ تمہارے یہاں سے نکلنے کی ایک ہی
صورت ہے جو میں تمہیں لکھ رہی ہوں۔ جہاں تم چھپے ہوئے ہو یہاں سے سمندری
چٹانوں کے ساتھ ساتھ اگر تم بائیں جانب جاؤ گے تو تمہیں جیل کے گھاٹ کی روشنیاں
نظر آئیں گی۔ اس گھاٹ پر کوسٹل گارڈ کی سات بوٹیں جو لمبی کشتیوں کی شکل میں ہیں۔
کنارے پر کھڑی ملیں گی۔ یہ خاص قسم کی کشتیاں ہیں۔ ان میں موٹریں بھی لگی ہیں۔ مگر
تم موٹر سٹارٹ نہیں کرنا۔ آدھی رات کے بعد تم غار میں سے نکل کر ان کشتیوں میں سے
ایک کشتی کو قبضے میں لے کر اس کے ذریعے سمندر پار کر کے ساحل پر پہنچ سکتے ہو۔ اس
کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان موٹر کشتیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس
کے پیندے اور دونوں پہلوؤں میں فولادی کانٹے باہر کو نکلے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے

سمندری شارکیں ان پر حملہ نہیں کرتیں۔ اگر تم یہ خطرہ مول لے سکتے ہو تو تمہارا جز
کے جزیرے سے فرار ممکن ہے۔ ورنہ تمہارا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ اگر تم آج رات
کسی طرح ساحلی گارڈز کی کشتی لے کر سمندر پار کر جاؤ تو کیپٹن کو ساتھ لے کر میرا
اپنے ساتھی کے گھر پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔"

یہ خط کیپٹن جمشید نے بھی پڑھا۔ خط کے نیچے مادھوی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ کیپٹن
جمشید خط پڑھ کر کہنے لگا۔

"اس عورت نے ہمیں راستہ دکھا دیا ہے اب یہ ہماری ہمت پر منحصر ہے کہ ہم اس
راستے پر چل سکتے ہیں یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"کسی دوسرے خیال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں ہر حالت میں اس سکیم
عمل کرنا ہوگا اور آج ہی رات کو عمل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ کیا
یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو؟"

یہ کیپٹن جمشید واقعی دلیر جوان تھا۔ کہنے لگا۔

"تم مجھے اپنے سے دو قدم آگے پاؤ گے"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں دوست۔ آگے نہیں۔ تم مجھ سے دو قدم پیچھے رہو گے۔"

میں نے مادھوی کے خط کو اس طریقے سے پھاڑا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے
بن گئے۔ میں نے ان پرزوں کو مٹی میں دبا دیا۔ اب ہم آدھی رات کا انتظار کرنے لگے
میں نے شام کا اندھیرا ہوتے ہی سل کو تھوڑا سا ایک طرف ہٹا دیا تھا۔ ہم سل کے نیچے
گڑھے میں آکر بیٹھ گئے تھرمس کا سارا پانی ہم نے ختم کر دیا تھا۔ ڈبے کے چاول بھی ختم
ہو گئے تھے۔ ہم نے موم بتیوں کا پیکٹ خالی ڈبہ اور تھرمس وہیں غار میں چھوٹا سا گڑھا
کھود کر انہیں زمین میں دبا دیا۔ جب ہمارے خیال اور اندازے کے مطابق آدھی رات
گزر گئی تو ہم گڑھے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی ہم سمندر میں چٹانوں کی طرف چل

گئے۔ سمندر کا پانی ہمارے گھٹنوں تک تھا۔ موجیں ہمارے گھٹنوں کو چھو کر ہمیں ڈگمگاتی
ہوئی ساحلی چٹانوں کی طرف نکل رہی تھیں۔ ہم نے مادھوی کی ہدایت کے مطابق دور
سے جیل کے گھاٹ کی روشنیاں دیکھ کر اسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ واچ ٹاورز کی سرچ
لائٹوں کی روشنیاں جیل کی دیوار کے اندر اور باہر پڑ کر آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔
لیکن وہ ہم سے کافی دور تھیں اور ہم رات کے اندھیرے میں چل رہے تھے۔ گھاٹ کی
روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ کچھ کشتیاں ساحل سمندر پر ایک قطار میں لگی تھیں۔

اب ہم بڑے محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔

کشتیوں کے قریب ایک انسان ٹہل رہا تھا۔ کیپٹن جمشید نے کہا۔

"یہ کوسٹ گارڈ کا سنتری ہے۔"

وہاں کوئی آڑ نہیں تھا۔ قریب جانے پر ہم سنتری کو نظر آسکتے تھے۔ میں نے کیپٹن کو
بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ساحل کی ریت پر بیٹھ گیا۔ میں گارڈ سنتری کی نقل و حرکت کو
بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند قدم چل کر آخری کشتی کے قریب آتا۔ وہاں دو تین
سیکنڈ کے لئے رکتا اور پھر واپس چل پڑتا۔ میں نے سرگوشی میں کیپٹن جمشید سے کہا۔

"یہاں صرف ایک ہی سنتری پہرے پر ہے۔ دوسرا سنتری نظر نہیں آرہا۔ تم اسی
جگہ بیٹھے رہو۔ میں اسے جا کر قابو کرتا ہوں۔"

کیپٹن نے کہا

"ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لو"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اور میں ریت پر لیٹ کر رینگنے لگا۔

میں کہنیوں کے بل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ بڑا نازک مقام تھا۔ ذرا سی غلط
حرکت گارڈ کو ہوشیار کر سکتی تھی اور ہمارے فرار کے منصوبے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ اور
ہم دونوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔

آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ستاروں کی جو دھندلی روشنی نا۔
سمندر پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھی غائب ہو گئی اور اندھیرا گہرا ہو گیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا پھر
بھی میں بے حد محتاط ہو کر رینگ رہا تھا۔ میں سنتری کے اتنا قریب پہنچ گیا کہ مجھے اس کے
کاندھے پر رکھی ہوئی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ گارڈ سنتری اوپر سے ٹہلتا ہوا آخری
کشتی کی طرف آ رہا تھا۔ ہمیں اسی آخری کشتی کی ضرورت تھی۔ سنتری آخری کشتی کے
قریب آیا تو میں نے اپنا سر نیچے کر کے رتیلی زمین کے ساتھ لگا دیا۔ گارڈ آخری کشتی کے
قریب آ کر رک گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی روٹین کے مطابق وہاں دو تین سیکنڈ رک کر
واپس چلا جائے گا۔ لیکن وہ واپس مڑنے کی بجائے کشتی کے باہر نکلے ہوئے تختے پر بیٹھ گیا۔
پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ میں زمین کے ساتھ لگا اوندھا پڑا تھا اور
گردن کو اٹھائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیب مشکل صورت حال بن گئی تھی۔
کوئی پتہ نہیں تھا کہ یہ شخص وہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ
اگر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی تو سارا کام چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ یقیناً رائفل کا فائر کر دے گا۔
اور دوسرے گارڈ اور پولیس فوراً وہاں پہنچ جائے گی۔ سنتری پتھر کا بت بن کر کشتی کے
تختے پر بیٹھا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کیپٹن جمشید
مجھے نظر نہ آیا۔ مجھے بہرحال اس گارڈ سنتری کے وہاں سے واپس جانے کا انتظار کرنا تھا۔
آخر خدا خدا کر کے سنتری نے سگریٹ پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سمندر کی
طرف ایک نگاہ ڈالی اور سست قدم اٹھاتا واپس چل پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جتنی

تیزی سے رینگ سکتا تھا۔ رینگتا ہوا آخری کشتی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میں
اندھیرے میں تھا۔ گارڈ سنتری دس بارہ قدم چلنے کے بعد واپس مڑا اور میری طرف آنے
گا۔ میں نے احتیاطاً جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ
ریوالور پر سائی لینسر لگا ہوا ہے اور میں بڑی آسانی کے ساتھ گارڈ کو ہلاک کر سکتا ہوں۔
لیکن جیسا کہ آپ میری طبیعت سے واقف ہو چکے ہیں میں بلا ضرورت کسی کو ہلاک کرنے
کے خلاف تھا۔ جہاں پستول کا فائر کئے بغیر کام نکل سکتا ہو وہاں میں فائر کرنے سے گریز کرتا
یہ مقام بھی ایسا ہی تھا۔ گارڈ سنتری آخری کشتی کے پاس پہنچ کر ایک دو سیکنڈ کے لئے
کا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ سمندر میں اور سمندر کے ساحل پر اندھیرا اور خاموشی
نی۔ اس خاموشی میں صرف سمندر کی لہروں کا ہلکا ہلکا شور مخل ہو رہا تھا۔ سنتری گارڈ مجھ
سے تین چار قدموں کے فاصلے پر تھا۔ وہ مڑ کر واپس چلنے لگا۔ اب میں اسے زیادہ مہلت
یں دینا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے واپس مڑنے کے بعد ایک قدم اٹھایا میں نے کشتی کی
ٹ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی بندوق ہاتھ سے چھٹ کر دور جا گری۔
ی میں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی گردن میں بازو ڈالنا چاہا لیکن وہ تڑپ کر میری گرفت
سے نکل گیا اور بندوق کی طرف دوڑا۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری بار اس کو قابو میں
لرتا اس نے میرے دیکھتے دیکھتے بندوق اٹھا لی۔ میں نے ریوالور سے اس پر دو فائر کر
یئے۔
دونوں گولیاں اس کے پیٹ میں لگیں۔ وہ گر پڑا میں نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے
ندوق چھین کر پرے پھینک دی اور جھک کر اسے دیکھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی
آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔
یٹ میں گولی لگے تو اس کا پہلا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ جسم سن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد
ندید درد ہونے لگتا ہے۔ پیٹ میں گولی یا چاقو کا زخم آدمی کو ماہی بے آب کی طرح تڑپاتا
ہے۔ سنتری گارڈ کا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ پہلے تو اس کا بدن بالکل بے حس ہو گیا۔ اس
کے بعد وہ پیٹ کو پکڑ کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے ایک دو آوازیں نکلیں تو میں نے

تیسرا فائر اس کے دل پر کیا۔ اس فائر نے اسے بے جان کر دیا۔

میں دوڑ کر کیپٹن جمشید کے پاس گیا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم آخری کشتی کے پاس آ گئے۔ میں نے کشتی کو کھولا۔ کیپٹن کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کے پیچھے موٹر لگی تھی۔ مگر میں نے اس کو بالکل نہ چھیڑا۔ اس میں دو لمبے لمبے چپو پڑے تھے۔ میں نے چپو سنبھالے اور انہیں آہستہ آہستہ چلاتا کشتی کو کنارے کی طرف سے کھلے سمندر کی طرف لے جانے لگا۔ ایک موج دور سے آ کر کشتی سے ٹکرائی۔ کشتی موج کے اوپر چڑھ گئی اور پھسل کر دوسری طرف نکل گئی۔ یہ لمبوتری کشتی تھی۔ میں نے کیپٹن کو ایک چپو دیتے ہوئے کہا۔ اس طرف سے تم چلاؤ۔ ہم چپو چلاتے ہوئے کشتی کو سمندر میں اس طرف لے جانے لگے جدھر دور ایلور گھاٹ کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ساحل کی طرف سے ایک لہر واپس آتے ہوئے ہماری کشتی کو دھکیلتی ہوئی سمندر میں اور آگے لے گئی۔ میں نے چپو چلاتے ہوئے ہاتھ روک کر کشتی کے پہلو پر ہاتھ پھیرا۔ مادھوی نے ٹھیک کہا تھا۔ کشتی کی دونوں سائیڈوں میں بڑے بڑے کانٹے باہر نکلے ہوئے تھے۔ یہ شارک مچھلیوں کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے لگائے گئے تھے۔

ہم جتنی تیز کشتی چلا سکتے تھے چلاتے ہوئے سمندر میں کافی دور نکل گئے۔ ایلور جیل کے واچ ٹاور کی روشنی ہم سے دور ہوتی جا رہی تھی اور ایلور گھاٹ کی جھلملاتی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"ہمیں کشتی ایلور گھاٹ کی گودی سے دور رکھنی ہوگی۔ اس گھاٹ کے سیکورٹی گارڈ کو میرے فرار کی خبر مل چکی ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

اور میں نے کشتی کا رخ ایلور گھاٹ کی روشنیوں سے ہٹ کر دوسری طرف کر لیا۔ رات کے اندھیرے میں سمندر ایسے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جیسے سانس لے رہا ہو۔ تین چار میل کا فاصلہ ہم نے کشتی کے ذریعے کوئی ایک گھنٹے میں طے کیا اور کشتی کو ہم اس طرف

ساحل پر لے آئے۔ جہاں سے ایلور کا گھاٹ بائیں جانب کافی فاصلے پر رہ گیا تھا۔ یہ ریتلا ساحل دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے کشتی کو سمندر میں ہی چھوڑ دیا اور پانی میں چلتے ہوئے ساحل پر آ گئے۔ یہاں کہیں کہیں ناریل کے درخت کھڑے تھے۔ سامنے کی جانب دور شہر کی آبادی کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم ان کی طرف دوڑنے لگے۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔

"یہ سارا علاقہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

ہم دوڑتے دوڑتے سمندر سے کافی دور نکل گئے۔ جب ایک پتلی سی ریتلی سڑک پر پہنچے تو کیپٹن جمشید بیٹھ گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ بھارتی پولیس نے اس پر بڑا تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک دوڑ سکتا۔ میں اس کے قریب کھڑا ہو گیا اور ارد گرد دیکھنے لگا۔ یہ سڑک ایک پٹی کی طرح ایلور شہر کی طرف جاتی نظر آ رہی تھی۔ گھاٹ کی روشنیاں بائیں جانب کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہئے۔"

کیپٹن جمشید اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ چلو"

ہم دوڑنے کی بجائے پتلی سڑک پر تیز تیز چلنے لگے۔ ہم ایک ایسی آبادی میں سے گزرے جس کی ایک طرف جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں اور دوسری طرف مکان تھے۔ کیپٹن جمشید نے پوچھا۔

"اپنے آدمی کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"ہمیں کسی ایسے راستے سے جانا چاہئے جہاں رات کو گشت کرتی پولیس اور چوکیدار

وغیرہ کے ملنے کا امکان نہ ہو"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم ایسے ہی راستے پر چل رہے ہیں۔"

حقیقت یہ تھی کہ خود مجھے بھی اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ اپنے غازی کا مکان وہاں سے کس طرف کو ہے اور کتنی دور ہے۔ اس وقت سب سے ضروری بات یہی تھی کہ اس علاقے سے جس قدر اور جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جائیں۔ لیکن مجھے ایک اندازہ ضرور تھا کہ غازی کا مکان وہاں سے شمال مغرب کی جانب ہے اور ہمارا رخ اسی طرف تھا۔ ایک تو اجنبی علاقہ تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ اس شہر کی جیل سے ایک خطرناک مبینہ طور پر پاکستانی کمانڈو دو آدمیوں کا خون کر کے فرار ہو چکا ہے جس کی تلاش میں شہر کی پولیس اور ممکن ہے یہاں کی ملٹری انٹیلی جینس بھی الرٹ ہو گئی ہو۔ شہر میں کسی بھی جگہ کسی بھی سڑک پر ہماری چیکنگ ہو سکتی تھی۔ لیکن ہم رک بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں ہر حالت میں اپنے آدمی غازی کی کمیں گاہ میں پہنچنا تھا۔

چھوٹی سڑک شہر کی ایک بڑی سڑک پر نکل آئی۔ یہاں دونوں جانب آبادی کے مکان اور دکانیں تھیں جو اگرچہ بند تھیں مگر ان کے باہر بتیاں روشن تھیں۔ ایک جگہ ہمیں چوکیدار بھی نظر آیا جو ایک بند دکان کے آگے سٹول پر لاٹھی گھٹنوں پر رکھے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ہم بڑے اعتماد سے انگریزی میں باتیں کرتے اس کے قریب سے گزر گئے۔ مجھے غازی کے علاقے کا نام یاد تھا۔ ایک رکشا تیزی سے گزر گیا۔ ایک اور رکشا سامنے سے آتا نظر آیا تو میں نے اسے ہاتھ دے دیا۔ رکشا رک گیا۔ میں اور کیپٹن جمشید جلدی سے اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے رکشا ڈرائیور کو غازی کی علاقے کا نام بتا کر کہا کہ ہمیں وہاں پہنچادو۔ رکشا چل پڑا۔ پھر ایک بہت بڑے مندر کے قریب سے گزرا تو میں نے اس مندر کو پہچان لیا اس مندر کو میں نے دن کے وقت میڈم مادھوی کی سہیلی کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ رکشا ایک سڑک کو کاٹ کر دوسری سڑک پر آیا تو اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ آخر وہ رک گیا۔ معلوم ہوا کہ جس علاقے کا میں نے نام لیا تھا یہ وہی علاقہ تھا۔

میں نے جمشید سے پنجابی میں کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اتر جانا چاہئے۔"

ہم دونوں رکشے سے اتر آئے اور اس کو دس روپے دے کر رخصت کردیا۔ اس ہوک کو بھی میں نے پہچان لیا۔ وہاں سے ایک چھوٹی سڑک جھومرے پٹی کلب کی طرف باتی تھی۔ اس سڑک پر وہ کوارٹر تھے جن میں سے ایک بوسیدہ مکان میں اپنا غازی رہتا ھا۔ ذرا آگے جاکر مجھے پرانے شکستہ کوارٹروں کی قطار نظر آگئی۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

غازی کے مکان کا دروازہ بند تھا۔ آس پاس اندھیرا اور گہری خاموشی تھی۔ آخری کوارٹروں کی جانب سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا اور اپنے جاسوس غازی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے تلیگو میں کچھ پوچھا۔ یہی پوچھا ہو گا کہ کون ہے۔ پھر اس نے مجھے اور میرے ساتھ ایک اجنبی چہرے کو دیکھا تو جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

ہم لپک کر اندر داخل ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ساتھ کیپٹن جمشید کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ کمرے میں پنکھا چل رہا تھا۔ غازی نے بتی روشن کردی میں نے کیپٹن جمشید سے اس کا تعارف کرایا تو وہ خوش ہو کر کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے۔ خدا کا شکر ہے۔"

میں نے اسے اپنے فرار کی پوری داستان مختصر الفاظ میں بیان کی اور کہا کہ اگر اس ُن میں مادام مادھوی ہماری مدد نہ کرتی تو کیپٹن جمشید کو ایلور جیل کی کال کوٹھڑی سے ل کر لے آنا ناممکن تھا۔ وہ بولا۔

"محبت انسان کو بڑا نڈر بنا دیتی ہے۔"

کیپٹن جمشید نے میری طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کس کی محبت کی بات ہو ی ہے۔ تب میں نے اور اپنے غازی نے اسے ساری حقیقت بیان کردی اور بتا دیا کہ

مادھوی اس سے محبت کرتی ہے اور یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ اس فرار میں مادھوی نے ہماری بھرپور مدد کی ورنہ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ ایک اجنبی قیدی کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیتی۔

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"لیکن میں تو جیل میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ میں نے تو اسے آج تک دیکھا بھی نہیں۔"

غازی بولا۔

"کیپٹن صاحب! آپ نے اسے نہیں دیکھا لیکن مادھوی نے کئی بار آپ کو دیکھا تھا۔ وہ آپ کی بہادری اور وطن پرست اور حب الوطنی کے جذبے سے بے حد متاثر تھی اور اس وجہ سے اسے آپ سے محبت ہو گئی۔ بس اب آپ بھی اس کا دل مت توڑیئے گا۔"

کیپٹن جمشید نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں اسے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے جب کہ ایسی کوئی بات، کوئی خیال میرے دل میں نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"بھائی اس عورت کا دل رکھنے کے لئے کہہ دینا کہ آئی لو یو۔ وہ کون سا تمہارے ساتھ شادی کرنے والی ہے۔"

کیپٹن جمشید ہنسنے لگا۔

"اوکے۔"

اس کے بعد ہم اسی کمرے میں فرش پر سو گئے۔

دوسرے روز ہم کافی دیر تک سوئے رہے۔ غازی ہم سے پہلے اٹھ چکا تھا اور اس نے ناشتہ تیار کر کے رکھ دیا تھا۔ ناشتہ ہم نے اکٹھے کیا۔ اس کے بعد غازی ہمیں مکان میں بند کر کے باہر تالا لگا کر شہر میں حالات کا جائزہ لینے چلا گیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تو اس نے بتایا کہ پولیس نے شک شبے میں شہر کے کئی مشکوک آدمیوں کو پکڑ لیا ہے اور شہر

کے تمام ناکوں اور بندرگاہ اور ریلوے سٹیشن کے آس پاس پولیس بیٹھ گئی ہے۔ اور خفیہ پولیس کے آدمی جگہ جگہ پھرنے لگے ہیں تاکہ کسی طرح شام ہونے سے پہلے پہلے مفرور پاکستانی کمانڈو کیپٹن جمشید کو گرفتار کر لیا جائے۔

"تم لوگ خوش قسمت ہو کہ رات کو تمہیں یہاں تک آتے ہوئے کوئی پولیس والا نہیں ملا۔ شہر میں ہر کوئی پاکستانی کمانڈو کے فرار کی باتیں کر رہا ہے اور سنا ہے کہ مدراس سے چوٹی کے پولیس افسر اور سراغ رساں ایلور پہنچ رہے ہیں۔"

کیپٹن نے غازی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے شام ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے بھی فرار ہو جانا چاہئے۔"

میں نے اسے کہا۔

"بھائی تم اکیلے فرار نہیں ہو گے میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ لیکن جب تک ہمیں لائن کلیئر نہیں ملتا ہم یہاں سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"اور یہ لائن کلیئر کون دے گا؟"

کیپٹن جمشید نے پوچھا۔ ہمارے غازی نے جواب دیا۔

"اس سلسلے میں بھی ہمیں میڈم مادھوی کی مدد لینی ہوگی۔ کیونکہ پولیس اس چھوٹے سے شہر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔"

ہم شام تک غازی کے مکان میں ہی بند رہے۔ اس روز وہ جھومرے پٹی کلب بھی نہ گیا۔ جب رات پڑ گئی تو میڈم مادھوی بھی وہاں آ گئی۔ کیپٹن جمشید نے مادھوی کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جب غازی نے اس کا تعارف کرایا تو کیپٹن شرما سا گیا۔ بہادر آدمی شرمیلے ہوتے ہیں۔ مادھوی نے کیپٹن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیپٹن! میں یہ کہتے ہوئے بالکل نہیں شرماؤں گی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ صرف تمہاری محبت کی وجہ سے کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ جیل سے نکل کر خونی سمندر کو عبور کر کے یہاں پہنچ گئے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن اب ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ یہ علاقہ ایلور جیل کے سمندر کے قریب کا علاقہ ہے۔ بہت ممکن ہے پولیس یہاں گھر گھر تلاشی لینی شروع کردے۔"

غازی خاموش بیٹھا تھا کہنے لگا۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم لوگوں کو آج رات موقع پا کر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

مادھوی نے کہا۔

"یہ کس طرف سے جائیں گے؟ ریلوے سٹیشن اور بندرگاہ پر تو ہر طرف پولیس پولیس ہے۔"

غازی نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے انہیں دریا کے راستے پیچھے جنگلوں میں سے ہو کر فرار ہو چاہئے۔"

مادھوی نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے پولیس دریا پر نہیں ہوگی؟ میری رپورٹ کے مطابق دریا دونوں جانب پولیس موجود ہے اور کوسٹل گارڈ کے دو موٹر بوٹ دریا میں صبح سے چکر رہے ہیں۔"

میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"پھر تم ہمیں کیا مشورہ دیتی ہو؟"

مادھوی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تمہیں اس وقت تک اسی جگہ چھپ کر بیٹھے رہنا چاہئے جب تک کہ پولیس تھک ہار کر کیپٹن جمشید کی تلاش سے ہاتھ نہیں اٹھالیتی۔"

غازی نے کہا۔

"لیکن مدراس سے تو پولیس کی مزید نفری یہاں پہنچ رہی ہے۔"

مادھوی بولی۔

"جب کیپٹن جمشید نہیں ملے گا تو مدراس کی پولیس کیا کرے گی؟ وہ کب تک یہاں پڑی رہے گی۔ ایک دن وہ بھی مایوس ہو کر واپس چلی جائے گی۔"

غازی کہنے لگا۔

"اس سارے عمل میں کئی روز لگ سکتے ہیں اور اس مکان میں کیپٹن جمشید کا اتنے دن قیام خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔"

مادھوی نے کہا۔

"اس کے چھپنے کے لئے میری نگاہ میں ایک مناسب جگہ ہے۔ میں اسے وہاں لے جاؤں گی۔ جب حالات ذرا نارمل ہوں گے تو میں خود اسے یہاں سے فرار کرادوں گی۔"

میں نے غازی کی طرف دیکھا۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے مادھوی اس طرح سے کیپٹن جمشید کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔

اس کے بات کرنے کے انداز سے مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس نے اپنے ذہن میں کوئی دوسرا پروگرام بنا رکھا ہے پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایک مفرور قیدی کو اپنے پاس کتنی دیر تک رکھ سکتی ہے۔ میں نے مادھوی سے اس خفیہ جگہ کے بارے میں پوچھا جو اس کے ذہن میں تھی تو وہ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں میں تم دونوں کو لے جاؤں گی۔ وہاں پولیس نہیں پہنچ سکے گی۔"

غازی نے کہا۔

اگر ایسی بات ہے تو پھر ان دونوں کو یہاں دیر نہیں کرنی چاہئے۔

مادھوی بولی۔

دیر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں سارا بندوبست کر کے آئی ہوں۔ میں دس بجے آؤں گی اور دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے غازی سے کہا۔

"کیا ہمیں مادھوی کے ساتھ چلے جانا چاہئے؟"

تم ہمیں کیا مشورہ دیتے ہو؟

غازی نے کہا۔

"ظاہر ہے وہ تمہیں پولیس کے حوالے تو نہیں کرے گی۔ کسی محفوظ جگہ پر ہی لے جائے گی۔ تمہیں اس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔"

کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"

رات کے سوا دس بجے غازی کے مکان کے باہر ایک گاڑی آکر رکی۔ ہم نے کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ یہ ایک ویگن تھی جس کی چھت پر سبز اور سرخ بلب باری باری روشن ہو رہے تھے۔ میں نے بجلی کی روشنی میں پڑھا اس کی ایک سائیڈ پر ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا اور نیچے تلیگو زبان اور انگریزی میں ایمبولینس لکھا تھا۔ مادھوی خود گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر مکان کے دروازے پر آئی تو غازی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر آکر اس نے کہا۔

"میں گاڑی لے آئی ہوں۔ آپ لوگ خاموشی سے ویگن کے پیچھے جا کر بیٹھ جائیں۔ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال کی ایمبولینس ہے جہاں میری ایک سہیلی ڈاکٹر ہے۔ ایمبولینس میں اس لئے لائی ہوں کہ اس کو راستے میں کوئی چیک نہیں کرے گا۔"

میں اور کیپٹن جمشید مکان سے نکل کر ایمبولینس کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ مادھوی ہمارے ساتھ تھی۔ اس نے ایمبولینس کا دروازہ بند کرنے سے پہلے ہمیں مخاطب کر کے کہا۔

"تم لوگ الگ الگ سٹریچروں پر لیٹ جاؤ۔ اگر کسی وجہ سے راستے میں پولیس نے چیکنگ کر بھی لی تو تم اپنے آپ کو بے ہوش ظاہر کرنا۔ میں تمہیں نقلی ڈرپ لگائے دیتی ہوں۔"

ایمبولینس کے اندر آمنے سامنے دو سٹریچر پڑے تھے۔ ہم ان پر لیٹ گئے۔ مادھوی نے ہمیں گلوکوز کا ڈرپ اس طرح لگا دیا کہ سوئی بازو میں چبھونے کی بجائے ہمارے

بازوؤں سے لگا کر ٹیپ سے چپکا دی۔

"بس جب تک میں اندر نہ آؤں تم لوگ اسی طرح سٹریچر پر لیٹے رہنا۔"

وہ دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ ایمبولینس سٹارٹ ہوئی اور ہم وہاں سے نکل پڑے اپنے غازی سے میں نے سائی لینسر والا ریوالور اور کچھ فالتو گولیاں لے کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ ایمبولینس جھومرے پٹی کی آبادی سے نکل کر بڑی سڑک پر آئی تو اس کا سائرن بجنے لگا۔ اس سائرن کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اسے راستے میں کوئی روکتا نہیں۔ اس خیال سے کہ اس میں ایمرجنسی کا مریض ہسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ ایمبولینس ایلور شہر کی سڑکوں پر رات کے اندھیرے میں کافی دیر تک دوڑتی رہی۔ ایمبولینس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ عقبی دروازے میں جو دو گول شیشوں والے سوراخ تھے ان میں سے سڑکوں کی روشنیاں نظر آجاتی تھیں۔ کافی دیر تک سڑکوں پر دوڑنے کے بعد ایمبولینس کا سائرن خاموش ہو گیا۔ ایمبولینس کے اندر کوئی بتی نہیں جل رہی تھی اور اندھیرا تھا سڑک کی روشنیاں اندر آجاتی تھیں۔ اب یہ روشنیاں بھی نہیں آرہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ایمبولینس شہری آبادی سے باہر نکل کر غیر آباد علاقے میں آگئی تھی۔ ایمبولینس نے ایک جگہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دو تین موڑ کاٹے اور پھر اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایمبولینس رک گئی۔ مادھوی نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا اور کہا۔

"او کے۔ آجاؤ۔ سب ٹھیک ہے"

ہم نے نقلی ڈرپ اپنے بازوؤں سے الگ کئے اور گاڑی سے نکل آئے۔ رات کے اندھیرے میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک کاٹیج کا خاکہ نظر آیا جس کے نہ اندر روشنی تھی نہ باہر کوئی بتی جل رہی تھی۔ مادھوی ہمیں ساتھ لے کر کاٹیج کے دروازے پر آئی اور بولی۔

"اس سے زیادہ محفوظ علاقہ سارے شہر میں تمہارے لئے اور کوئی نہیں ہے۔ میری سہیلی کا جو پرائیویٹ ہسپتال ہے اس کا یہ سٹور ہے۔ یہاں پہلے دوائیوں وغیرہ کا سٹاک رکھا

جاتا تھا مگر اب یہ خالی پڑا ہے۔ سٹور ہسپتال کے ساتھ ہی بن گیا ہے۔"

اس نے چابی لگا کر دروازے کا تالا کھول دیا۔ اندر لکڑی کے پرانے کھوکھو
دوائیوں کی ہلکی بو آرہی تھی۔ میں اور کیپٹن جمشید اندر چلے گئے۔ اندر اندھیرا
مادھوی نے بٹن دبایا۔ دیوار کے ساتھ لگا ایک چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا۔ اس کی
روشنی میں کمرے میں ادھر ادھر پڑے خالی کھوکھے اور گتے کے ڈبے بکھرے ہوئے
دیئے۔ وہ ہمیں دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہاں بھی اس نے بتی جلا دی۔ یہ کمرہ
تھا۔ مگر اس میں لوہے کے دو پلنگ آمنے سامنے بچھے تھے جس پر ہسپتالوں والے بستر
ہوئے تھے۔ مادھوی نے چھت کا پنکھا چلا دیا۔ کہنے لگی۔

"باتھ روم اور کچن اس کمرے کے پیچھے ساتھ ہی ہیں۔ کچن میں میں نے کھانے
کا تمام سامان رکھوا دیا ہے۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔"

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"لیکن میڈم ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہو
اس شہر سے نکل جائیں۔"

مادھوی کہنے لگی۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لیکن ابھی شہر میں پولیس جگہ جگہ تمہاری تلاش
چھاپے مار رہی ہے۔ تمہیں حالات کے نارمل ہونے تک تو یہاں رہنا ہی ہوگا"

میں نے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم ویسا ہی کریں گے جیسا تم کہو گی۔"

مادھوی نے کہا۔

"اب تم لوگ یہاں آرام کرو۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ میں کل کسی وقت آ
گی۔"

جب وہ ایمبولینس لے کر وہاں سے چلی گئی تو کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"مجھے اس عورت کی سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیا چاہتی ہے۔ کہیں یہ مجھ سے اپنی

کی وجہ سے میرے قیام کو یہاں لمبا تو نہیں کرنا چاہتی؟"

شک مجھے بھی تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہ کیا اور کیپٹن سے کہا۔

"اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں اپنی بات پھر دہراؤں گا کہ اگر اسے تم سے
محبت بھی ہے تو وہ ایک مفرور محبوب کے ساتھ اپنا سارا کیریئر خطرے میں ڈال کر زیادہ دیر
تک نہیں رہ سکتی۔"

کیپٹن جمشید نے لوہے کے پلنگ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں اپنے طور پر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ شہر کی حدود سے تو
ہم نکل ہی آئے ہیں۔ تمہارے پاس ریوالور بھی ہے۔ راستے میں کوئی خطرہ ہوا تو ہم اس
کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں خوامخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس
جائیں۔ اس علاقے کے بارے میں بھی ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ کون سا راستہ کس
طرف جاتا ہے۔ ہمیں اس عورت کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ اگر ہمیں اتنی خطرناک جیل
سے نکال لائی ہے تو یہاں بھی ہماری راہ نمائی کرے گی۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ ہمیں
صبر سے کام لینا چاہئے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم کمروں کی بتیاں بجھا کر اور اندر سے دروازوں کو چٹخنیاں لگا کر
سو گئے۔ صبح اٹھ کر دن کی روشنی میں باہر ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ چھوٹا سا کاٹیج نما سٹور غیر
آباد جنگلی علاقے میں واقع تھا۔ چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تاڑ اور ناریل
کے درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کہیں کوئی کھیت نہیں تھا۔ کوئی جھونپڑا تک نظر نہیں
آ رہا تھا۔ سوائے درختوں پر کبھی کبھی بولنے والے پرندوں کی آواز کے دوسری کوئی آواز
سنائی نہیں دیتی تھی۔

کیپٹن جمشید بولا۔

"دیکھنا چاہئے کہ یہاں دریا بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ دریا ہی یہاں سے فرار کا ایک

محفوظ ذریعہ ہے۔ اگر ہم اس کے اوپر کی طرف یعنی اپ سٹریم جائیں تو اس شہر کے علاقے سے باہر نکل سکتے ہیں۔ دریا میں پولیس وغیرہ کا بھی خطرہ نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"پہلے چل کر ناشتہ بناتے ہیں۔ یہ باتیں بعد میں کریں گے۔"

کمرے کے پیچھے درختوں میں ساتھ ساتھ بنے ہوئے باتھ روم اور کچن تھے۔ باتھ روم میں پانی بھی آرہا تھا۔ کچن میں گیس کا سلنڈر بھی پڑا تھا۔ ایک ریفریجریٹر بھی تھا جس میں دودھ کے ڈبوں کے علاوہ کھانے پینے کی تقریباً ساری چیزیں موجود تھیں۔ کچھ ضروری برتن بھی گیس کے چولہے کے پاس میز پر پڑے تھے۔ ہم نے مل کر ناشتہ بنایا۔ کافی بنائی اور وہیں کچن میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ وہاں کھانے پینے کا سامان دیکھ کر مجھے ایسے لگا تھا کہ جیسے اس عورت نے یہاں ہمارے دیر تک رہنے کا انتظام کر رکھا ہے۔

مادھوی نے جاتے وقت ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم بلا ضرورت مکان سے باہر نہ نکلیں اور اگر نکلنا ضروری بھی ہو تو مکان کے قریب قریب ہی رہیں۔ ہمیں کہاں جانا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد کاٹیج کے عقب میں اونچی جھاڑیوں کی اوٹ میں لوہے کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور وہاں سے فرار کے منصوبوں پر غور کرنے لگے۔ دوپہر کو ہم نے کچن میں انڈے وغیرہ بنا کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد ہم کمرے میں ہی پڑے رہے۔ تیسرے پہر چائے بنا کر پی اور پانچ دس منٹ کاٹیج کے پیچھے درختوں میں ٹہلتے اور باتیں کرتے رہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ کہ مادھوی ایمبولینس لے کر آگئی۔ اس وقت ہم کمرے کے اندر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مادھوی نے آتے ہی پہلی بات یہ پوچھی کہ تم لوگ کاٹیج سے باہر تو نہیں نکلے تھے؟ میں نے کہا۔

"ایک گھنٹہ پہلے تھوڑی دیر کے درختوں میں ضرور ٹہلتے رہے تھے"

مادھوی نے کمرے کی کھڑکی کا پردہ گراتے ہوئے کہا۔

"اب یہ غلطی دوبارہ نہ کرنا۔ پولیس کے ساتھ اب ملٹری انٹیلی جینس بھی تمہاری تلاش میں نکل آئی ہے۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ میں نے بڑا اچھا کیا جو

رات تمہیں وہاں سے نکال کر لے آئی۔ میری ایمبولینس کی پولیس نے تین جگہوں پر تلاشی لی ہے۔"

میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔"

مادھوی نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ وہ کیپٹن جمشید کے پاس ہی لوہے کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے تو یہی سوچا تھا کہ تمہیں دریا کے ذریعے یہاں سے نکال دوں گی۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ دریا بھی محفوظ نہیں رہا۔ کوسٹ گارڈ کی کشتیاں دریا میں بھی گشت لگاتی رتی ہیں۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"لیکن ان حالات میں یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

مادھوی نے کہا۔

"اس سے بہتر دوسری کوئی جگہ میری نظروں میں نہیں ہے۔ تمہیں صرف اتنی نیاط کرنی ہوگی کہ دن کے وقت کمرے سے ہرگز باہر نہ نکلو۔ رات کو بھی چوکس ہو کر ر نکلنا ہوگا۔ خفیہ پولیس کے آدمی کسی بھی بھیس میں یہاں نمودار ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کیپٹن جمشید کی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

"میڈم! میری رائے میں ہمیں یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہیے۔"

مادھوی نے کہا۔

"تمہیں کم از کم دو دن تو یہاں ضرور رکنا پڑے گا۔ اس دوران مجھے یقین ہے کہ ں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لوں گی۔"

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد مادھوی ایمبولینس لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد لیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"بھائی اس عورت کے بارے میں ہم نے غلط سوچا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ نیک

نیت عورت ہے اور واقعی یہاں سے فرار ہونے میں ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔"
میں بھی اب اسی لائن پر سوچنے لگا تھا۔ مادھوی کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ اے یہ
سب سے زیادہ جو فکر ہے وہ یہی ہے کہ ہمیں کس طرح وہاں سے نکال کر حیدر آباد ک
طرف روانہ کردیا جائے۔

رات کو ہم نے مادھوی کی ہدایت کے مطابق کسی کمرے کی بتی روشن نہ کی۔ جر
کمرے میں ہم سوتے تھے۔ اس میں ایک موم بتی روشن کرکے زمین پر کونے میں لگاد
تھی۔ کھانا بھی ہم نے موم بتی کی روشنی میں ہی پکا کر کچن میں بیٹھ کر کھایا اور پھر کمرے
میں آکر بستروں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کاٹیج کے سامنے والے دروازے پر مادھوی تا
ڈال گئی تھی۔ اگر اس طرف سے کوئی آدمی آکر دیکھے تو اسے یہی لگتا کہ کاٹیج خالی پڑا ہ
اور یہاں کوئی نہیں رہتا۔ رات کو اگر ہمیں باہر جانے کی ضرورت پڑتی تو ہم کمرے ک
عقبی کھڑکی میں سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور اسی کھڑکی سے اندر آجاتے تھے۔

ہمیں اس ویران کاٹیج میں یہ دوسری رات تھی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔
جب رات گہری ہوگئی اور ہمیں بھی نیند آنے لگی تو موم بتی بجھا کر ہم اپنے اپنے بستروں پ
لیٹ گئے۔ کمرے میں پنکھا چل رہا تھا۔ جس کی وجہ سے مچھر بھی نہیں کاٹتے تھے او
کمرے میں گرمی اور حبس بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میرا ذہن ہر قسم کے خیالات کی
آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے کیپٹن جمشید کو وہاں سے نکال کر انڈیا کا بارڈر کراس کرا کر پاکستان
میں داخل کرنا تھا۔ اور خود واپس کشمیر کے محاذ پر بھی جانا تھا۔ وہاں سے انڈیا کا بارڈر بہت
دور تھا۔ راستے میں کسی بھی جگہ پولیس اور خفیہ پولیس ذرا سا شبہ ہونے پر ہمیں دبوچ
سکتی تھی۔ میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ میری نیند غائب تھی۔ مجھے کیپٹن جمشید کے
ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آئی تو مجھے خوشی ہوئی کہ پاکستان کا یہ غازی مجاہد آرام کی نیند سو
رہا ہے۔ بھارتی فرعونوں نے نہ جانے کتنی راتیں اسے ٹارچر کرکے جگائے رکھا تھا۔ باہر
کی فضا پر گہری خاموشی طاری تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش
کرنے لگا۔

مجھ پر ابھی ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے ہی لگی تھی کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔
سی آدمی کی آواز تھی جو کچھ فاصلے پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر دو تین آدمیوں کے
بولنے کی آوازیں آئیں۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ باتیں کرتے کاٹیج کی طرف آ رہے ہیں۔ میں
نے پہلا کام یہ کیا کہ سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ کیپٹن جمشید کو
میٹھی نیند سے جگانے کو میرا دل نہ چاہا۔ میرے کان باہر سے آتی آوازوں پر لگے تھے۔ یہ
آوازیں ہمارے کاٹیج کے پاس آکر رک گئیں۔ پھر کسی کے دروازے کو اپنی طرف کھینچنے کی
آواز آئی میں بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں ساتھ والے کمرے میں آگیا۔ جس کے دروازے
کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ باہر کوئی آدمی اسی دروازے کو اندر کی طرف دھکیل رہا تھا۔
یہ دو آدمی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی زبان میں دوسرے کو کچھ کہا۔ یہ
زبان شاید تلیگو تھی۔ کیونکہ آندھرا پردیش میں تلیگو زبان ہی بولی جاتی ہے۔ تامل زبان
صوبہ تامل ناڈو میں بولی جاتی ہے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ یہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے
ہیں۔ اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ وہ دروازے پر لگے ہوئے تالے کو کھولنے کی کوشش کر رہے
ہیں۔ میں نے کیپٹن جمشید کو جگا دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور کچھ بولنے لگا تھا کہ میں نے
اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ باہر والے آدمی تالے میں
مختلف چابیاں لگا رہے تھے مگر تالا نہیں کھل رہا تھا۔ میں نے اپنے سرہانے کے نیچے سے
ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور ہم تیزی سے دروازے کی دونوں جانب اسی طرح
کھڑے ہو گئے کہ اگر تالا کھل گیا اور جیسے ہی کوئی اندر داخل ہو اس کو وہیں دبوچ لیا
جائے۔

باہر خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے آپس میں کچھ بات کی اور پھر ان کے قدموں کے
واپس جانے کی آواز آئی۔ وہ واپس چلے گئے تھے۔ جب قدموں کی آواز دور چلی گئی تو
کیپٹن جمشید نے آہستہ سے کہا۔

”یہ خفیہ پولیس کے آدمی ہی ہو سکتے ہیں اس کا مطلب ہے انہیں ہمارے ٹھکانے کا
علم ہوگیا ہے۔“

میں نے کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی چور ڈاکو ہوں اور گھر کو خالی دیکھ کر چ
کرنے آئے ہوں۔ کیپٹن نے کہا۔"

"چور ہوتے تو تالا توڑ دیتے۔ یہ چور نہیں تھے۔ یقیناً خفیہ پولیس کے آدمی تھے۔"
میں نے کہا۔

"خفیہ پولیس والے بھی تالا توڑ سکتے تھے۔ یہ واپس کیوں چلے گئے ہیں؟"
کیپٹن جمشید بولا۔

"بھائی جی! یہ جگہ ہمیں بدل دینی چاہئے۔ کوئی پتہ نہیں یہاں کب پولیس
مارنے آجائے۔"

کیپٹن کا خیال درست تھا۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا میں نے اسے کہا۔

"یہاں سے اسی وقت باہر نکل کر درختوں میں چھپ جاتے ہیں۔ یہاں خطرہ ہے۔"

ہم اس وقت کمرے کی کھڑکی میں سے دوسری طرف نکل گئے۔ اندھیری رات تھی
ہم درختوں میں ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ جہاں سے اگر کوئی آدمی مکان کے
دروازے کی طرف جاتا تو ہمیں نظر آسکتا تھا۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ کیپٹن جمشید
کچن میں سے ایک عام چاقو لے لیا تھا۔ درختوں کے نیچے ہمیں مچھروں نے تنگ
شروع کردیا۔ مگر ہم وہیں بیٹھے رہے اور مچھروں کو بھی مارتے رہے۔ جب وہاں
ہوئے کافی وقت گزر گیا اور کاٹج کی طرف کوئی نہ آیا تو جمشید کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ اب نہیں آئیں گے ہمیں کمرے میں چلے جانا چاہئے۔"

میں نے بھی سوچا کہ اگر یہ خفیہ پولیس کے آدمی ہوتے تو اب تک پولیس کو وا
پہنچ جانا چاہئے تھا۔ یہ کوئی چور اچکے تھے۔ مکان کا تالا نہ کھل سکا تو انہوں نے چوری کر
کا ارادہ بدل لیا اور چلے گئے۔

میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کچھ دیر اور یہاں بیٹھے رہنا چاہئے۔"

کیپٹن جمشید نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہم درختوں کی اوٹ میں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں ہمیں کچھ فاصلے پر انسانوں کے سائے مکان کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ میں نے کیپٹن جمشید کو وہ انسانی سائے دکھائے۔ وہ بھی غور سے دیکھنے لگا۔ یہ تین انسان تھے جو جھک کر بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے مکان کی طرف آرہے تھے۔ ان کا اور ہمارا فاصلہ بیس پچیس قدموں کا ہوگا۔ تینوں آدمی دروازے کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ ساتھ ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ ہتھوڑی سے تالا توڑ رہے ہوں۔ تالا ٹوٹ گیا تو دو آدمی اندر داخل ہوگئے۔ اور ایک آدمی باہر ہی کھڑا رہا۔

کیپٹن جمشید آہستہ سے بولا۔

"مجھے تو یہ چور لگتے ہیں۔"

میں نے ان لوگوں کو اندھیرے میں بڑے غور سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے ان کی پولیس کی وردی نظر نہیں آئی تھی اور ان میں سے کسی کے پاس بندوق یا رائفل بھی نہیں تھی۔ میں نے جمشید کو مشورہ دیا کہ ہمیں ان لوگوں کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔

"اگر تو یہ کچھ سامان وغیرہ لے کر باہر آئے تو ان کا چور ہونا ثابت ہو جائے گا۔"

باہر جو آدمی پہرے پر کھڑا تھا اس کے پاس بھی اندھیرے میں کوئی بندوق وغیرہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بندوق یا رائفل ہوتی تو اندھیرے میں بھی اس کا دھندلا سا خاکہ نظر آسکتا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد جو آدمی اندر گئے تھے وہ بھی باہر آگئے۔ انہوں نے ایک ایک گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ باہر آتے ہی تینوں آدمی دوڑ پڑے اور دیکھتے دیکھتے رات کے اندھیرے میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہم بھی اٹھے اور تیز تیز چلتے مکان میں داخل ہو گئے۔ میں نے ماچس جلا کر دیکھا۔ پہلے کمرہ میں پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔ لکڑی کے خالی کھوکھے وغیرہ تھے جو ویسے کے ویسے فرش پر ادھر ادھر پڑے تھے۔ ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ میں نے یہاں موم بتی روشن کی تو دیکھا کہ دونوں پلنگوں کے بستر غائب تھے۔ وہاں بستروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم

کچن میں گئے۔ وہاں موم بتی جلا کر دیکھا۔ کچن کا تقریباً سارا سامان غائب تھا۔ صرف مٹی کی ایک ہانڈی ایک صراحی ایک پرانی کیتلی اور ایک گلاس ہی باقی رہ گیا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ یہ چور نکلے۔ خفیہ پولیس کے آدمی نہیں تھے۔"

ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور لوہے کے بغیر بستر کے پلنگوں پر ہی لیٹ گئے۔ پنکھا اسی طرح چل رہا تھا۔ ان چوروں نے چھت کا پنکھا نہیں اتارا تھا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔ صبح اٹھ کر دروازے کو دیکھا تالا زمین پر ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میڈم مادھوی آگئی۔ اسے صورت حال کا علم ہوا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کبھی کوئی چور نہیں آیا۔ ان چوروں کا آنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو اب یہاں نہیں رہنا چاہئے۔"

میں نے مادھوی سے کہا۔

"میڈم! ہمارا ویسے بھی اس شہر میں زیادہ دیر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم کسی طرح ہمیں اس شہر سے باہر نکلنے کی کوئی محفوظ ترکیب بتادو پھر تمہیں بھی اس پریشانی سے نجات مل جائے گی۔"

مادھوی کہنے لگی۔

"میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔ لیکن حالات ابھی نارمل نہیں ہوئے۔ تامل ناڈو کی پولیس بھی یہاں پہنچ گئی ہے۔ ان میں انٹیلی جینس کے آدمی بھی ہیں۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"ان حالات میں تو ہمارا اس شہر میں ٹھہرنا اور بھی خطرناک ہے۔ کیا دریا کے علاوہ کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو جنگل اور پہاڑیوں میں سے ہوتا ہوا دوسرے شہروں کی طرف نکل گیا ہو؟"

مادھوی کچھ غور کر رہی تھی کہنے لگے۔

"آپ لوگ آج کا دن یہاں گزاریں۔ میں آج آفس نہیں جاؤں گی۔ اور کوئی دوسرا

راستہ تلاش کروں گی۔ مگر تم لوگ اس مکان میں نہیں رہو گے۔ پیچھے درختوں کے ذخیروں میں کسی جگہ چھپ کر دن گزارو گے میں شام کا اندھیرا ہوتے ہی آجاؤں گی۔ مجھے یقین ہے میں کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈھ لوں گی۔"

مادھوی تھیلے میں ہمارے لئے کھانے کے لئے چاول وغیرہ لائی تھی۔ وہ ایمبولینس میں بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ ہم نے کچن میں بیٹھ کر تھوڑے بہت چاول کھائے۔ صراحی میں سے پانی پیا اور کچن سے نکل کر پیچھے کچھ فاصلے پر املی اور سنبل کے گھنے درختوں کا جو ذخیرہ تھا وہاں جھاڑیوں میں تھوڑی سی جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں سارا دن بیٹھنا تھا۔ وقت بڑی ست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ کسی کسی وقت دھوپ بھی نکل آتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ہم نے سارا دن گھنے درختوں میں بیٹھ کر کبھی لیٹ کر اور کبھی ادھر ادھر ٹہل کر گزار دیا۔ جب سورج غروب ہو گیا اور شام کے سائے آہستہ آہستہ اترنے لگے تو ہم پچھلی طرف سے ہو کر سب سے پہلے کچن میں گئے۔ وہاں ہانڈی میں ہم نے کچھ چاول بچا کر رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے چاول کھائے اور کچن میں ہی بیٹھ کر مادھوی کا انتظار کرنے لگے۔

جب شام کا ملگجی اندھیرا رات کے سرمئی سایوں میں ڈھل گیا تو دور سے ویگن کی آواز سنائی دی۔ مادھوی اسی ایمبولینس میں آئی تھی۔ ایمبولینس کی چھت والی سرخ اور زرد روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس کا سائرن بھی خاموش تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ایمبولینس مکان کی ایک جانب کھڑی ہوئی تو اس کی ہیڈ لائٹس بھی بجھ گئیں۔ مادھوی ویگن کی فرنٹ سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھی تو ہم بھی کچن سے نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ مادھوی کہنے لگی۔

"اندر آجاؤ"

ہم دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ مادھوی کے ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے چائے سے بھری ہوئی تھرمس نکالی اور تھرمس کے پیالہ نما ڈھکن میں ڈال کر سب سے پہلے کیپٹن جمشید کو دی۔ پھر بولی۔

"چائے پینے کے بعد آپ لوگ میرے ساتھ جائیں گے۔ میں نے ایک اور جگہ کا انتظام کر لیا ہے۔ دن کے وقت تو یہاں کوئی نہیں آیا؟"

میں نے کہا۔

"کوئی نہیں آیا۔ وہ لوگ چور ہی تھے بستر اور برتن اٹھا کر لے گئے"

"ہاں" مادھوی نے کہا۔

"اگر پولیس کے آدمی ہوتے تو اب تک یہاں چھاپہ پڑ چکا ہوتا۔"

ہم نے باری باری گرم چائے پی۔ پھر ایمبولینس میں اسی طرح سٹریچروں پر لیٹ گئے۔ مادھوی نے ہمیں نقلی ڈرپ لگا دیئے۔ ایمبولینس وہاں سے چل پڑی۔ ایک بار پھر وہ مختلف سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ ایمبولینس آدھ گھنٹے تک چلتی رہی۔ اس کے بعد ایک طرف کو گھوم کر رک گئی۔ مادھوی نے آکر دروازہ کھولا۔ ہم نے ڈرپ اتار دیئے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"آجاؤ"

یہ جگہ ایک ایسا جنگل تھا جہاں قریب ہی دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ مادھوی نے بتایا کہ ہم لوگ دریا کے اوپر کی جانب بدروائی گھاٹ سے چھ سات میل آگے نکل آئے ہیں۔

"اس طرف دریا تھوڑے فاصلے پر بہہ رہا ہے۔"

ایک جگہ اندھیرے میں دو تین جھونپڑے تھے۔ مادھوی نے کہا۔

"یہ جھونپڑے ویران ہیں۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ تم لوگ یہاں رہو گے میں تمہیں صبح شام کھانا وغیرہ پہنچا دیا کروں گی۔"

ہم واقعی اس بک بک جھک جھک سے تنگ آگئے تھے۔ میں نہ رہ سکا میں نے مادھوی سے کہا۔

"میڈم اس چوہے بلی کے کھیل سے تو بہتر ہے کہ ہم دریا کے ساتھ ساتھ جنگل میں نکل پڑتے ہیں۔ میرے پاس ریوالور ہے کیپٹن کے پاس چاقو ہے۔ ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔"

ہے۔"

مادھوی نے جھونپڑے میں موم بتی روشن کر کے ایک اینٹ پر جما دی تھی۔ کہنے لگی۔

"میری طرف سے بے شک ابھی نکل پڑو۔ میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گی۔ آخر مجھے کیا ضرورت ہے کہ تمہارے لئے ایمبولینس لے کر ماری ماری پھرتی رہوں؟ ٹھیک ہے مجھے کیپٹن جمشید اچھا لگتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ دوبارہ بھارتی پولیس کے ٹارچر سنٹر میں جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں نے جان بوجھ کر تم لوگوں کو روکا ہوا ہے"

میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"میڈم! پلیز ایسا نہ سمجھو۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم نے جان بوجھ کر ہمیں روکا ہوا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم بار بار جگہ بدلی کرنے سے بور ہو گئے تھے۔"

کیپٹن جمشید نے بھی مادھوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میڈم! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں تم نے ہمارے لئے خاص طور پر میرے لئے جس طرح اپنا کریئر اور اپنی جان تک خطرے میں ڈالی ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

مادھوی کی کافی دل جوئی ہو گئی وہ مسکرانے لگی۔

"کیپٹن جمشید میں بڑی صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ یقین کرو مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ اگر محبت نہ ہوتی تو میں کبھی یہ قدم نہ اٹھاتی۔"

مادھوی اٹھ کر جھونپڑی سے باہر چلی گئی۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"تم خوش قسمت ہو کیپٹن کہ یہ عورت تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ ورنہ تمہیں جیل کے جزیرے سے فرار کروانے میں کافی مشکلات پیش آسکتی تھیں اور ہم پکڑے بھی جا سکتے تھے۔"

مادھوی جھونپڑے میں آئی تو اس نے اخبار میں لپٹا ہوا ایک پارسل اٹھا رکھا تھا۔ کہ
گئی۔

"اس میں بریانی ہے۔ یہ میں نے تمہارے لئے خاص طور پر خریدی ہے۔ تھرم
میں چائے بھی موجود ہے۔ تمہاری رات آرام سے گزر جائے گی۔ میں کل شام کے وق
آؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں کے یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر
ہی آؤں گی۔ مادھوی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ ہم نے کاغذ کا پارسل کھولا اخبار
کاغذوں کے اندر کیلے کے پتوں میں گرم گرم بریانی تھی۔ آپ ضرور سوچیں گے کہ ا
علاقے میں بریانی کہاں سے آ گئی۔ میں اس علاقے میں رہا ہوں اور میری داستان پڑ
والوں میں سے جو حضرات جنوبی ہند کے شہروں میں رہ چکے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ جنو
ہند میں بریانی بہت عام پکائی جاتی ہے۔ ہوٹلوں ریستورانوں یہاں تک کہ چھوٹے چھو
ریلوے سٹیشنوں پر بھی بریانی کے پارسل مل جاتے ہیں۔ گاڑی کھڑی ہوتی ہے تو پھیر
والے لڑکے پارسل پارسل کی آوازیں لگاتے پلیٹ فارم پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ انہو
نے کیلے کے پتوں میں لپٹی ہوئی بریانی کے پارسل ٹوکری میں رکھے ہوتے ہیں۔ آپ ک
کے پتے ہٹائیں تو اس کے نیچے گرم گرم بریانی نکل آتی ہے جس میں گوشت کے چھو
چھوٹے ٹکڑوں کے علاوہ خوب مصالحے ڈالے ہوتے ہیں یہ کھانا وہ عرب تاجر اپنے سا
لائے تھے جو قدیم زمانے میں بصرے کی بندرگاہ سے مال لے کر جہازوں کے ذریعے
تھے اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی شہروں سے ہوتے ہوئے ملایا اور انڈونیشیا اور فلپا
تک تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد ان تاجروں کے ساتھ مسلما
بزرگ علماء حضرات بھی ضرور آتے تھے۔ ان علاقوں میں ان مسلمان بزرگوں کے ذر
اسلام کی شمعیں روشن ہوئیں۔ مالدیپ اور سنگل دیپ اور جنوبی ہندوستان کے سا
علاقوں میں آج بھی اس زمانے کی قدیم مسجدیں آباد ہیں اور ان مسجدوں سے پانچ و
اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

وہ رات ہم نے ایک جھونپڑے میں بڑی مشکل سے گزاری۔

مچھروں نے جھونپڑے کی اندر اور باہر یلغار کر رکھی تھی۔ اتنے مچھر میں نے آج تک کسی جنگل میں نہیں دیکھے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ہم مچھروں کے کارخانے میں آ گئے ہیں جہاں ایک سیکنڈ میں ایک ہزار مچھر پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم ان خونی مچھروں سے بچنے کے لئے وہاں آگ بھی نہیں جلا سکتے تھے۔ خطرہ تھا کہ آگ دیکھ کر کوئی ادھر نہ آجائے۔ خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی اور مچھروں سے پیچھا چھوٹا۔ صبح ہم نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا چہرے مچھروں کے کاٹے سے سوجے ہوئے تھے۔ دن کے دس بجے کے قریب مادھوی آئی۔ ہم اس وقت جھونپڑے کے اندر چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لئے کھانا وغیرہ لائی تھی۔ ہمارے چہرے دیکھ کر اور مچھروں کے حملے کا سن کر کہنے لگی۔

"تم لوگوں نے بڑی عقلمندی سے کام لیا کہ آگ روشن نہیں کی۔ یہ جگہ بدروائی سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے اور آگ کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی ضرور ادھر آجاتا۔ سٹیشن پر ایلور پولیس نے ناکہ بندی کی ہوئی ہے۔"

اس نے ہمیں اتنا ڈرا دیا کہ دوسری رات بھی ہم نے آگ نہ جلائی اور مچھروں سے ہاتھا پائی کرتے رہے۔ دوسری رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔ دوسرے دن مادھوی دن کے بارہ بجے آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی کہنے لگی۔

"بدروائی گھاٹ سٹیشن پر رات پولیس ایک ٹرین کو روک کر دو گھنٹے تلاشی لیتی رہی۔"

اس نے کیپٹن جمشید کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مائی ڈیئر کیپٹن جمشید! مجھے معلوم ہی نہیں تھا پولیس کے پاس تمہاری تصویر موجود ہے۔ یہ تصویر جیل میں لی گئی تھی۔ اب تم لوگوں کا یہاں سے فوری طور پر نکلنا اور مشکل ہو گیا ہے۔"

کیپٹن جمشید یہ سن کر ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا کہ جیل کے حکام نے اس کی تصویر پولیس کو دے دی ہے۔ کہنے لگا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جیل میں میری کبھی کوئی تصویر نہیں اتاری گئی۔"

مادھوی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ تمہیں وہاں اتنا ٹارچر کیا گیا تھا کہ تمہیں تو اپنی ہوش نہیں تھی۔ تم کئی بار بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جیل کے لوگ تمہاری تصویر کسی وقت بھی اتار سکتے تھے۔"

ہم پر مادھوی کی باتوں نے مایوسی طاری کر دی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس جہنم کے جھونپڑے میں ہمیں اور کتنی راتیں گزارنی ہوں گی تو وہ بولی۔

"میں ابھی اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ پولیس چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ پیچھے بدروائی گھاٹ سٹیشن پر تو پولیس نے چھاؤنی ڈال دی ہے اور میری اطلاع کے مطابق پولیس کے گشتی دستے دریا کی دونوں جانب تمہاری تلاش میں گشت لگا رہے ہیں۔"

یہ سن کر ہم پر مزید مایوسی چھا گئی۔ مادھوی اگلے روز آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ دن ہم نے جھونپڑی کے اندر اور کبھی جھونپڑی سے باہر نکل کر ادھر ادھر جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے چھپ کر گزار دیا۔ تیسری رات کو آسمان پر بادل چھا گئے۔ بجلی چمکنے لگی۔ بادل گرجنے لگے اور موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ ہم جھونپڑی میں بیٹھے تھے۔ بارش کی وجہ سے مچھروں سے تھوڑی سی نجات مل گئی تھی مگر ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ جھونپڑے کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی۔ پہلے ٹپکتی رہی۔ پھر پرنالوں کی طرح با

جھونپڑی کے اندر ہمارے اوپر گرنے لگا۔ ہم کبھی ایک طرف ہو جاتے کبھی دوسری طرف ہو جاتے۔ جھونپڑی نشیبی جگہ پر تھی۔ اس کے اندر بھی پانی آگیا۔ ہم جھونپڑی سے نکل کر بارش میں بھیگتے ہوئے ذرا اوپر ایک اونچی جگہ پر درختوں کے نیچے چلے گئے۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ درخت بری طرح ٹپک رہے تھے۔ مگر ہمارے سامنے دوسری کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہیں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے رہے۔ اور رات گزر گئی۔

بارش پچھلے پہر رک گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے درخت سے ٹیک لگا کر بارش میں ٹپکتے درختوں کے نیچے کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے سو بھی گئے تھے۔ دن کی روشنی میں دیکھا کہ نیچے جھونپڑے بارش کے پانی میں تیر رہے تھے۔ ناچار اسی اونچی جگہ پر بیٹھے رہے۔ آدھا دن گزر گیا۔ مادھوی کی گاڑی کہیں نظر نہ آئی۔ بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے پچھلی شروع رات کو تھوڑے سے چاول کھائے تھے اور پانی پیا تھا اور اب دن آدھا گزر گیا تھا۔ میں تو اس سے بھی زیادہ دیر تک بھوک اور پیاس برداشت کر سکتا تھا مگر کیپٹن جمشید کے ہونٹ پیاس سے خشک ہو رہے تھے۔ کہنے لگا۔

"میں بارش کا پانی پینے لگا ہوں"

میں نے اسے کہا۔

"جسے تم بارش کا پانی کہتے ہو اس میں گندا پانی بھی شامل ہے۔ یہ پینے سے بیمار پڑ جاؤ گے۔"

تیسرے پہر جا کر کہیں بارش کا پانی اترا اور ہم کیچڑ میں سے گزرتے ہوئے جھونپڑی میں آگئے۔ ٹھیک اس وقت مادھوی کی ایمبولینس آگئی۔ اس وقت مجھے مادھوی پر سخت غصہ آرہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس عورت نے جان بوجھ کر ہمیں روک رکھا ہے اور ہمیں پولیس کا خوف دلا کر آگے نہیں جانے دے رہی۔ وہ ہمارے لئے کھانا اور گرم کافی سے بھرا ہوا تھرمس لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"رات کی بارش نے ہر طرف جل تھل ایک کر دیا ہے۔ میں تمہارے لئے قیمے کی

کھچڑی پکوا کر لائی ہوں۔ یہ حیدر آباد کی خاص سوغات ہے۔"

میں نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

"مس مادھوی! پلیز ہمیں واضح طور پر بتادو کہ آخر ہم کب تک یہاں پڑے رہیں گے۔"

مادھوی سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ڈرامہ کر رہی ہوں؟ ٹھیک ہے اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا تو بے شک یہاں سے چلے جاؤ۔ لیکن اگر پولیس نے تمہیں یہاں سے نکلتے ہی پکڑ لیا تو ہرگز ہرگز میرا نام کسی کے آگے نہ لینا"

کیپٹن جمشید نے نرم لہجے میں معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں میڈم۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں یہاں مچھروں نے پریشان کر رکھا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

مادھوی کا چہرہ ابھی تک سنجیدہ تھا۔ ہم کافی پی رہے تھے کہنے لگے۔

"میں جو کچھ کر رہی ہوں تمہارے بھلے کے لئے ہی کر رہی ہوں۔ اپنے شوق لئے نہیں کر رہی۔"

میں نے مایوسی کے ساتھ پوچھا۔

"ہمیں تمہارے اندازے کے مطابق یہاں مزید کتنے دن رکنا ہو گا؟"

وہ پہلے تو کچھ نہ بولی پھر کہنے لگی۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہاں سے میں سیدھی بدروائی گھاٹ کے سٹیشن کر حالات کا جائزہ لوں گی۔ کل کسی وقت آ کر تمہیں بتاؤں گی۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"کیپٹن! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں میڈم مادھوی کی باتوں پر نہیں جانا چاہئے۔ یہاں سے اپنے طور پر نکل جانا چاہئے۔"

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"میں تو پہلے بھی تمہیں یہی کہتا تھا اور اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ ہمیں اس عورت پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے"

میں نے کہا۔

"یہ عورت تمہاری محبت میں ایک عجیب کھیل کھیل رہی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ عورت تمہیں اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتی۔ یہ محبت کا منفی کھیل کھیل رہی ہے۔"

کیپٹن جمشید کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھرنے لگیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے تو پھر تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے جواب میں کہا۔

"کل کا دن دیکھ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کل یہ عورت آ کر ہمیں کیا بتاتی ہے۔"

وہ دن اور رات بھی ہم نے جھونپڑے میں اور کبھی جھونپڑے سے باہر درختوں میں گزار دی۔ دوسرے دن بارش نہ ہوئی جس کے لئے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت مادھوی آئی۔

وہ گھبرائی ہوئی تھی یا گھبراہٹ کی اداکاری کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"بدروائی گھاٹ پر تو پولیس کی بھاری نفری موجود ہے۔ پولیس کے پاس کیپٹن جمشید کی تصویروں کی کاپیاں موجود ہیں اور پولیس ہر مسافر کو غور سے دیکھنے کے بعد سٹیشن سے باہر جانے کی اجازت دیتی ہے۔"

اس کے بیان کے مطابق حالات زیادہ سنگین تھے۔ اس نے ہمیں خاص طور پر تاکید کی کہ ہم رات کے وقت بھی جھونپڑی سے باہر نہ نکلیں۔ وہ ہمارے لئے جو تھوڑا بہت کھانا لائی تھی وہ ہم نے کھایا۔ ہمارے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مادھوی دوسرے روز آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ جب وہ چلی گئی تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ہمارے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے ہیں میں نے کیپٹن سے پوچھا۔

"کیا خیال ہے؟"

اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک خیال ہے۔ ہمیں آج رات یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

میں نے اپنی پتلون کی جیبوں کی تلاشی لی۔ میرے پاس انڈین کرنسی کے چالیس پینتالیس روپے تھے۔ ریوالور بھی تھا اور کچھ فالتو گولیاں بھی تھیں جو میں نے پتلون کی عقبی جیب میں ڈال رکھی تھیں۔

ہمیں مادھوی کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بدروائی گھاٹ کا سٹیشن وہاں سے پیچھے کی جانب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہاں سے برانچ لائن پر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"بدروائی سٹیشن پر پولیس موجود ہے۔ ہمیں یہاں سے آگے جا کر کسی سٹیشن پر سے گاڑی پکڑنی چاہئے۔"

میں نے بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا۔

"کیپٹن جمشید! مادھوی جھوٹ بولتی ہے۔ مجھے یقین ہے بدروائی سٹیشن پر پولیس نے کوئی ناکہ بندی نہیں کر رکھی اور پولیس کے پاس تمہاری کوئی تصویر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر ہم بدروائی گھاٹ سٹیشن کی بجائے یہاں سے لائنوں لائن آگے کی جانب جا کر کسی چھوٹے سٹیشن سے گاڑی پکڑیں گے۔"

"تو پھر ابھی یہاں سے نکل پڑتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی دن کی روشنی باقی ہے شام ہونے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔"

اس وقت سورج غروب ہونے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سورج بادلوں کے پیچھے غروب ہو گیا اور شام کا اندھیرا بادلوں کی وجہ سے جلدی چھا گیا۔ ہمارے پاس کوئی سامان وغیرہ تو تھا نہیں۔ تین کپڑوں میں تھے۔ کیپٹن جمشید کے کپڑے بوسیدہ ہو رہے تھے۔ اس نے آدھے بازوؤں والی قمیض اور پرانی پتلون پہن رکھی تھی۔ جیل میں بھی اس کا یہی لباس

رہا تھا۔ یہاں آ کر اس نے ایک بار دونوں کپڑے دھو کر تھوڑے بہت صاف کر لئے تھے۔ میں نے قمیض کے اوپر ٹھنڈی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اگرچہ دھوپ میں مجھے گرمی لگتی تھی مگر میں اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے آگے کشمیر جانا تھا جہاں جنوبی ہند کے مقابلے میں موسم زیادہ ٹھنڈا تھا۔

ہم اللہ کا نام لے کر جھونپڑے سے نکل کر اس طرف روانہ ہو گئے جس طرف مادھوی نے کہا تھا کہ بدروائی گھاٹ کا سٹیشن ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ ریلوے لائن پر کسی طرح پہنچ جائیں۔ دریا بائیں جانب تھا۔ اندھیرا ابھی اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ جھونپڑے کے آس پاس جو درختوں کے ذخیرے تھے ہم بہت جلد ان میں سے نکل گئے۔ آگے ایک پگ ڈنڈی مل گئی۔ یہاں کھیت تھے کچھ فاصلے پر ہمیں ریل کے سگنل کی سرخ بتی نظر آ گئی میں نے کیپٹن جمشید کو بتی دکھا کر کہا۔

"اچھا ہوا۔ ریلوے لائن ہمیں مل گئی ہے۔"

کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد ہم ریلوے لائن پر چڑھ گئے۔ پیچھے کی جانب دیکھا تو بدروائی گھاٹ ریلوے اسٹیشن کی بتیاں جھلملا رہی تھیں ہم نے آگے کی طرف ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آگے جو سٹیشن ہے وہ کتنی دور ہو گا۔ اتنا ضرور اندازہ تھا کہ اس علاقے میں ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن کا فاصلہ تین چار میل سے زیادہ نہیں رہتا۔ کیپٹن جمشید نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اگلا سٹیشن کوئی معمولی سا سٹیشن ہو اور گاڑی وہاں نہ رکتی ہو"

میں نے اسے جواب دیا۔

"بھائی جی! ریلوے والوں نے اگر وہاں کوئی سٹیشن بنایا ہے تو کوئی نہ کوئی گاڑی تو وہاں ضرور رکتی ہو گی۔ ہم کسی ایسی ہی گاڑی کا وہاں انتظار کریں گے۔"

میرا خیال ہے ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کوئی تین چار میل تک چلتے گئے۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ اس دوران پیچھے سے ایک گاڑی آ گئی۔ ہم ریلوے لائن سے نیچے اتر آئے۔ گاڑی

شور مچاتی زمین ہلاتی گزر گئی۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ مسافروں کے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ ٹرین گزر گئی جمشید نے کہا۔

"یہ کوئی میل ٹرین لگتی تھی۔"

میں نے کہا۔

"پسنجر ٹرین بھی ہوتی تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں تھا"

ٹرین کے پچھلے ڈبے کی سرخ بتی دور تک نظر آتی رہی۔ پھر اسے رات کے اندھیرے نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ ہم بہت دیر تک چلتے رہے۔ ہمارے جسم پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ بارش نہیں شروع ہو گئی تھی۔ ورنہ وہاں بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ راستے میں ندی نالوں کے تین چار چھوٹے چھوٹے بھی آئے۔ ایک جگہ ہم نے تھوڑی دیر بیٹھ کر ذرا آرام بھی کیا۔ اس کے بعد پھر لگے۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ہمیں دور سے سرخ بتی دکھائی دی۔ میں نے ک جمشید سے کہا۔

"یہ سٹیشن کے سگنل کی بتی ہے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

اس کے باوجود ہمیں سگنل تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا جس کا ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی اور ایک آدمی بیٹھا بڑے سے رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا گیٹ بھی کھلا تھا۔ ہم لائن پر چلتے ہوئے آئے تھے۔ چنانچہ سیدھا پلیٹ فارم پر چڑھ گئے تھے۔ گیٹ کے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جہاں ایک قلی کونے میں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"تم پلیٹ فارم پر ہی رہو۔ میں قلی سے گاڑی وغیرہ کا پتہ کرتا ہوں"

مجھے اس علاقے کے لوگوں کا کافی تجربہ تھا۔ میں نے قلی کے پاس جا کر پوچھا بدروائی گھاٹ سے اگلی گاڑی کب آئے گی۔ چونکہ یہ علاقہ حیدر آباد دکن کی ریاست

لاقہ تھا اس لئے یہاں کے لوگ تلیگو زبان کے علاوہ خاص طور پر مسلمان بڑی اچھی اردو ل لیتے تھے۔ اگرچہ وہ قاف کو خاف بولتے تھے۔ یا ہمیں ایسا لگتا تھا کہ قاف کو خاف بول ہے ہیں۔ میں نے قلی سے اردو میں ہی پوچھا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے بابو؟"

مجھے تو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس لائن پر آگے کون کون سے شہر آتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"بھائی مجھے حیدر آباد جاتا ہے۔ یہاں ایک دوست کے پاس آیا تھا۔ وہ نہیں ملا۔ سوچا بدروائی گھاٹ پر جا کر گاڑی پکڑنے کی بجائے یہاں سے کوئی گاڑی پکڑ لیتا ہوں۔"

قلی مسلمان تھا کہنے لگا۔

"بابو! یہاں کوئی میل ٹرین نہیں ٹھہرتی اور حیدر آباد تو یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی نہیں جاتی۔"

میں نے کہا۔

"بھائی صاحب کوئی پسنجر ٹرین بھی نہیں جاتی؟"

قلی نے کہا۔

"میاں جی! رات گیارہ بجے ایک پسنجر ٹرین بدروائی سے آئے گی اس میں بیٹھ جائیں۔ وہ آپ کو گدوپا سٹیشن پر پہنچا دے گی۔ وہاں سے آپ کو کرنول جانے والی دوسری گاڑی پکڑنی پڑے گی۔ وہ گاڑی آپ کو حیدر آباد لے جائے گی۔ سمجھ گئے؟"

میں نے کہا۔

"شکریہ بھائی صاحب یہ بتائیں کہ حیدر آباد کا ٹکٹ کہاں سے لیں؟"

"اسی سٹیشن سے لے لیجئے۔ جی ہاں"

"اندر بابو بیٹھا ہے۔"

سٹیشن کے آفس کا ایک ہی کمرہ تھا جہاں ایک آدمی بڑا سا رجسٹر کھولے اس میں کچھ اندراج کر رہا تھا۔ میں نے جا کر آداب عرض کیا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ کیا

بات ہے؟

میں نے کہا۔

"حیدر آباد کے دو ٹکٹ چاہئیں"

"سیکنڈ کے فسٹ کے یا تھرڈ کے"

میں نے کہا۔

"تھرڈ کلاس کے"

وہ میری طرف دیکھے بغیر اٹھ کر ایک الماری کے پاس گیا۔ اس میں سے زرد رنگ
کے دو ٹکٹ نکال کر ایک مشین میں ڈال کر اس پر تاریخ ڈالی اور میری طرف بڑھا
ہوئے جتنے پیسے بنتے تھے وہ بتائے۔ اس وقت اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر میرے لبا
اور میرے حلیئے نے اس پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ میں نے پوری رقم گن کر اس کے حوالے
اور ٹکٹ جیب میں ڈال کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ پلیٹ فارم بالکل خالی پڑا تھا۔ میں کیپ
جمشید کو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ فاصلے پر اندھیرے میں سے نکل کر بجلی کے کھمبے
روشنی میں گیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔

میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"ٹکٹ تو میں لے آیا ہوں۔ گاڑی رات گیارہ بجے کے بعد آئے گی۔ پسنجر
ہوگی۔ اس میں بیٹھ کر ہم گڈو پاسٹیشن تک جائیں گے۔"

"وہاں سے ہم کرنول جانے والی گاڑی پکڑیں گے۔ وہی گاڑی ہمیں حیدر آباد
لے جائے گی۔"

"اور حیدر آباد سے آگے کہاں جانا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"بھائی جی پہلے حیدر آباد تو پہنچ جائیں اس کے بعد ظاہر ہے وہاں سے دلی اور دلی
جموں کشمیر کی طرف ہی جانا ہوگا"

کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کشمیر کے محاذ پر جا کر اپنے حریت پرست کشمیری جانبازوں
کے ساتھ مل کر بھارتی قابض فوج کے خلاف لڑوں۔ لیکن میری ایک مجبوری ہے۔"

"مجبوری کون سی ہے؟" میں نے پوچھا۔

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"میں پاکستان کی جانباز فورس کا کیپٹن ہوں۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بھارت کی
قید میں چلا گیا تھا۔ اب قید سے فرار ہوا ہوں تو فوجی ڈسپلن کا تقاضا ہے کہ میں سب سے
پہلے اپنے یونٹ میں جا کر یونٹ کمانڈر کو رپورٹ کروں۔"

میں نے کہا۔

"پھر تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم پہلے پاکستان جا کر یونٹ کمانڈر کو رپورٹ کرو۔"

"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ میرے خیال میں مجھے راجستھان کے علاقے سے
بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونا چاہئے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے پوچھا۔

"کیا تم اس بارڈر سے واقف ہو؟"

"پینسٹھ کی جنگ میں میں راجستھان کے محاذ پر لڑ چکا ہوں۔ یہ بڑا وسیع بارڈر ہے۔
وہاں سے میں پاکستان میں داخل ہو جاؤں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ پھر ایسا ہے کہ ہم حیدر آباد سے سیدھا جے پور کی طرف نکل
چلیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں انڈیا کا بارڈر کراس کرانے کے بعد میں کشمیر کے محاذ پر
جاؤں۔"

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"یہ تمہاری مجھ پر خاص عنایت ہوگی۔ کیونکہ تم راجستھان کے بھارت والے علاقے
سے بہت زیادہ واقف ہو۔"

"عنایت کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔"

ہم اس چھوٹے سے مضافاتی سٹیشن پر رات کی خاموشی میں ایک خالی بنچ پر بیٹھے

باتیں کر رہے تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد پسنجر ٹرین آ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ آ کر سٹیشن پر کھڑی ہو گئی کچھ مسافر ٹرین سے اترے۔ ٹرین پر چڑھنے والے مسافروں میں ہم صرف دو ہی تھے۔ گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ پھر انجن نے سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کافی مسافر تھے۔ تقریباً سبھی مسافر اپنی اپنی جگہ پر یا سو رہے تھے اور یا اونگھ رہے تھے۔ میں اور کیپٹن جمشید ڈبے کے کونے میں بیٹھے تھے۔ ٹرین کی رفتار تیز نہیں تھی۔ بس ایک خاص رفتار سے چل جا رہی تھی۔ راستے میں کوئی بھی سٹیشن آتا تو کھڑی ہو جاتی۔

ساری رات گزر گئی۔ دن نکلا تو ٹرین نیم پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ یہ دکن کی سطح مرتفع کا علاقہ تھا۔ زمین پتھریلی تھی سرمئی اور سرخ رنگ کی پہاڑیاں تھیں۔ پہاڑیاں ختم ہوتیں تو میدان شروع ہو جاتے۔ کہیں جنگل آ جاتا۔ دریا بھی آئے ندی نالے بھی آئے۔ برانچ لائن تھی۔ کئی سٹیشن آئے جن کے نام مجھے کبھی یاد نہیں رہ سکتے تھے۔ سارا دن ٹرین چلتی رہی۔ پھر شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ کرنول ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رات کے گیارہ بجے جا کر کہیں کرنول کا سٹیشن آیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ کافی بڑا جنکشن تھا۔ یہاں سے ہمیں حیدر آباد جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ یہ ٹر ہمیں ڈیڑھ گھنٹے بعد ملی۔ وہاں سے حیدر آباد کافی دور تھا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ باقی پوری رات اور دوسرے روز کا آدھا دن گزر گیا۔ تب کہیں جا کر حیدر آباد کا سٹیشن آیا۔

حیدر آباد کا سٹیشن بڑا بارونق اور خوبصورت تھا۔ چونکہ ہمارے سفر کا پروگرام تبد ہو گیا تھا اور اب ہمیں کشمیر کی طرف نہیں بلکہ راجستھان کی طرف جانا تھا۔ اس لئے نے سٹیشن کے باہر نکل کر حیدر آباد سے اجمیر شریف کے دو ٹکٹ خریدے اور واپس آ ایک ٹکٹ کیپٹن جمشید کو دیا اور ایک ٹکٹ اپنے پاس رکھ لیا۔ حیدر آباد سے اجمیر شری تک کا ریل کا سفر بڑا لمبا سفر تھا۔ سارے وسطی ہندوستان میں سے گزر کر انڈیا کے مغربی علاقے میں جانا تھا۔ راستے میں بھوپال کے علاوہ اور بھی کئی بڑے بڑے شہر آئے۔ اجمیر تک پہنچنے میں ہمیں ایک رات اور دو دن لگ گئے۔ اجمیر شریف راجستھان میں

ہے اور انڈیا کا مشہور شہر ہے۔ یہ چونکہ انڈیا کے بارڈر کا شہر تھا اس لئے ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ اجمیر شریف میں میں اس سے پہلے دو تین مرتبہ آ چکا تھا۔ ہم جس وقت یہاں پہنچے دن ڈھل رہا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"ہمیں یہاں رکنا نہیں ہو گا۔ یہاں سے ہمیں بیکانیر جانا ہو گا۔ بیکانیر سے بارڈر کا قصبہ گنگا نگر اوپر کی جانب زیادہ دور نہیں ہے۔"

میرے پاس پیسے بہت کم رہ گئے تھے۔ میں نے اجمیر شریف سے بیکانیر کے تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لے لئے اس کے بعد میرے پاس دس بارہ روپے ہی باقی رہ گئے۔ اجمیر سے ہمیں کافی دیر بعد بیکانیر جانے والی گاڑی ملی یہ صحرا کا سفر تھا۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ نظر آ جاتے تھے۔ ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ صبح کے وقت ہم بیکانیر پہنچے۔ بیکانیر کے سٹیشن سے ہم باہر نکل آئے۔ کیپٹن جمشید نے مجھ سے کہا۔

"گنگا نگر یہاں سے کتنی دور ہے اور کیا ہمیں اسی وقت گنگا نگر کی طرف روانہ ہو جانا ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ ہم یہاں کسی ہوٹل میں ٹھہر کر تھوڑی دیر آرام کر سکیں۔ اس لئے ہمیں اسی وقت آگے چلنا ہو گا۔"

گنگا نگر کے لئے بیکانیر سے اوپر کی جانب کوئی سو میل کے فاصلے پر مہاجن نام کا ایک سٹیشن ہے۔ وہاں سے ہمیں گنگا نگر کے بارڈر کے قصبے تک اونٹوں پر سفر کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نے بیکانیر سے دوپہر کے وقت ایک ٹرین پکڑی اور دو گھنٹوں کے سفر کے بعد مہاجن نام کے ریلوے سٹیشن پر اتر گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ سٹیشن کے باہر ایک جانب چھوٹی سی آبادی تھی۔ دائیں بائیں دور دور تک ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ ان ٹیلوں پر سورج غروب ہوتے ہوئے جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسی قصبے سے مغرب کی جانب دو کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سرائے ہے جہاں سے اونٹوں پر سوار ہو کر لوگ گنگا نگر کو جاتے ہیں۔ میں نے کیپٹن جمشید کو ساری بات سمجھائی اور ہم سرائے

تک جانے کے لئے ریت کے ٹیلوں کی طرف چل پڑے۔ صحرا میں چھوٹی سی کچی سڑک تھی جس پر ہم آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ سورج ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا اور ٹیلوں کے سائے شام کے سایوں میں گھل مل رہے تھے۔ صحرائی شام کی خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ گرمی کی شدت ختم ہو رہی تھی ۔ اس وقت مجھے چندریکا کی بدروح کا خیال آگیا۔

ایک مدت ہوئی اس سے میرا پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ اب اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اس کے خیال کو دل سے نکال دیا اور سوچنے لگا کہ میرے پاس صرف تین چار روپے ہی باقی بچے ہیں۔ ان پیسوں میں میں سری نگر تک تو کیا دلی میں اپنے آدمی گل خان تک بھی نہیں پہنچ سکوں گا۔ میں نے اس خیال کو بھی اپنے ذہن سے نکال دیا۔ کمانڈو اگر اپنے مشن کے دوران اس قسم کی باتیں سوچنے لگے تو وہ اپنے مشن میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ کمانڈو ہر حالت میں اپنے مشن کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں ہی سوچتا ہے اور وہ جہاں جاتا ہے وہاں ضروری وسیلے پیدا کر لیتا ہے۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح سے نہیں چھایا تھا کہ ہم ایک ٹیلے کے پاس چھوٹی سی سرائے میں آگئے۔

یہاں کچھ اونٹ کھڑے تھے جن پر تیل کے کپے اور دوسرا سامان لادا جا رہا تھا۔ دو تین اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ میں شکل وصورت اور پہناوے سے راجستھان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو پہچان لیتا تھا۔ راجستھان کے مسلمانوں کی ڈاڑھیاں اور مونچھیں ایک خاص وضع کی ہوتی ہیں۔ میں کیپٹن جمشید کو لے کر کچھ فاصلے پر کیکر کے چھوٹے سے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ایک طرف پانی سے بھرا ہوا مٹکا رکھا ہوا تھا ہم نے اس میں سے نکال کر پیا۔ تاہم سٹیشن سے کھا کر چلے تھے۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"ہمارے لباس یہاں کے لوگوں ایسے نہیں ہیں۔ کہیں انہیں شک تو نہیں ہو گا کہ بارڈر کراس کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں لوگ بارڈر کراس کرتے ہی رہتے ہیں۔ خطرہ صرف اس بات کا ہے کہ یہاں کوئی بارڈر سیکورٹی فورس کا خفیہ آدمی نہ بیٹھا ہو۔ اسے اگر شک پڑ گیا تو وہ ہمیں پکڑوا سکتا ہے۔ لیکن میرے پاس ریوالور موجود ہے۔ اتنی آسانی سے ہم پکڑے جانے والے نہیں ہیں۔"

تین چار دیہاتی آدمی اونٹوں پر سامان وغیرہ لاد کر اسے رسیوں سے باندھ رہے تھے۔ سرائے ایک کچا کوٹھا سا تھا۔ اس کے باہر بانس کے ساتھ ایک لالٹین روشن کر دی گئی تھی۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں"

میں اٹھ کر سرائے کے پاس آگیا سرائے کے باہر دوسری جانب دیہاتی عورتیں بچے اور مرد بیٹھے تھے۔ شاید یہ مسافر تھے اور آگے بارڈر کے کسی گاؤں جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا قریب ہی ریت پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مزے سے چلم پیتا رہا۔ میں نے کہا۔

"بابا! یہاں سے راج گڑھ کو قافلہ کب جائے گا؟"

مجھے معلوم تھا کہ گنگا نگر جانے کی بجائے وہاں سے اگر ہم راج گڑھ کی طرف نکل جائیں تو راج گڑھ سے ایک راستہ بارڈر کی طرف جاتا ہے۔ یہ بارڈر بڑا وسیع تھا اور انڈیا کی سیکورٹی فورس کی جیپیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بارڈر کے ساتھ ساتھ گشت کرتی رہتی تھیں۔ اس بوڑھے نے کہا۔

"تھوڑی دیر میں تین چار اونٹ اس طرف جانے والے ہیں۔ یہ مسافر بھی راج گڑھ جانے کے لئے ہی بیٹھے ہیں۔ تم بابو ہو۔ راج گڑھ چونگی میں نوکر ہو کیا؟"

میں نے کہا۔

"میرا بھائی چونگی میں ملازم ہے میں اور میرا ایک دوست اس کے پاس ضروری کام سے جا رہے ہیں۔"

"بیٹھے رہو۔ گھڑی پل میں تین اونٹ جانے والے ہیں۔"

میں نے ساری بات کیپٹن جمشید کو جا کر بتائی اور پھر ہم دونوں سرائے کی دوسری جانب آکر پہلے جو مسافر وہاں بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ جب سامان بردار اونٹ تیار ہو گئے تو دوسرے تین چار اونٹوں پر عورتوں اور بچوں کو پہلے بٹھایا جانے لگا۔ اس کے بعد تین اور اونٹ وہاں آگئے۔ وہاں سے راج گڑھ کا کرایہ دو روپے فی سواری تھا۔ میرے پاس چھ روپے تھے۔ میں نے چار روپے اونٹوں والے کو دے دیئے۔ ہمیں ایک اونٹ کے اوپر تین بچوں اور ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ پھر چھ سات اونٹو کا یہ قافلہ راج گڑھ کی طرف چل پڑا۔ اس علاقے میں قافلے عام طور پر رات کو ہی سف کرتے ہیں۔ کیونکہ رات کے وقت صحرا میں گرمی کی وہ قیامت خیز شدت نہیں ہوتی دن کے وقت ہوتی ہے۔ دن کے وقت تو دھوپ میں صحرا آگ برسا رہا ہوتا ہے۔ او بڑے مزے مزے سے ریت کے ٹیلوں کے درمیان اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے۔

ہمارا قافلہ آدھی رات کے بعد راج گڑھ پہنچا۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں ایک محصول چونگی بھی تھی۔ بارڈر سے جو ما سرکاری طور پر ادھر آتا تھا یہاں اس کا محصول ادا کیا جاتا تھا۔ چونگی کے سٹاف کے یہاں ایک طرف چار پانچ چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ یہ کوارٹر میں پہلے د چکا تھا۔ ان کوارٹروں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دوسرے مسافر اونٹوں پر سے اتر کر گاؤں طرف چل دیئے۔ اونٹوں کو اس کا مالک ہانک کر دوسری طرف لے گیا۔ جدھر ان کے پانی اور چارے کا بندوبست پہلے سے کیا ہوتا تھا۔

میں نے کیپٹن جمشید کو ساتھ لیا اور کوارٹروں کے پیچھے آگیا۔ یہاں ایک ٹیلے عقب میں ایک جگہ کھجوروں کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس جھنڈ میں میں پہلے بھی رات بسر کر چکا تھا۔ یہاں آکر میں نے کیپٹن سے کہا۔

"ہمیں رات یہیں گزارنی ہوگی۔"

ہم ٹھنڈی ریت پر لیٹ گئے۔ کیپٹن کہنے لگا۔

"یہاں سے بارڈر میرا خیال ہے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"تین چار میل اندر کی طرف جانے کے بعد بارڈر کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہم اس وقت ادھر نہیں جائیں گے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ ہم آج کی رات اور کل کا دن یہاں کسی جگہ چھپے رہیں گے کل رات کو تمہیں بارڈر کراس کرادوں گا۔ جب تم بارڈر کراس کر کے دوسری طرف پہنچ جاؤ گے تو میں واپس جاؤں گا۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"تمہیں اتنا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ بارڈر پر ہر طرف خطرہ ہوگا۔ تم صرف انڈیا کے بارڈر کے قریب پہنچا کر واپس چلے جانا۔ آگے میں خود ہی پاکستان پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

وہ رات اور دوسرا دن ہم نے وہیں کھجوروں کے درختوں کے نیچے ہی گزار دیا۔ میرے پاس جتنے پیسے تھے ان میں سے دو ڈھائی روپے کی میں گاؤں میں جا کر روٹیاں اور دال وغیرہ لے آیا۔ جو ہم نے کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ پانی کوارٹروں کے باہر لگے ہوئے نلکے پر جا کر پی لیتے تھے۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"اب ہمیں چل پڑنا چاہیئے۔"

اس راستے سے میں ایک بار بارڈر کراس کر چکا تھا۔ کیپٹن جمشید کو بھی تھوڑی بہت علاقے کی شناخت ہو گئی تھی۔ کہنے لگا۔

"پینسٹھ کی جنگ میں ہم نے اس سارے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا"

ہم ریت کے ٹیلوں کے درمیان چل رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں کسی ٹیلے پر چڑھ کر راستے کا تعین کر لیتا تھا کہ ہم ٹھیک راستے پر ہی جا رہے ہیں۔ کیونکہ صحرا میں آدمی ریت کے ٹیلوں میں اگر بھٹک جائے تو پھر اس کا وہاں سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ریت کے ٹیلے ختم ہو گئے اور سامنے کھلا صحرا آگیا۔ دور ہمیں کچھ بتیاں جھلملاتی نظر آئیں

تو ہم نے انہیں پہچان لیا۔ یہ انڈیا کے بارڈر کی روشنیاں تھیں۔ وہاں سے ہم دائیں جانب
ہو گئے۔ کوئی ایک میل چلنے کے بعد ہمیں زمین میں سے ابھرے ہوئے پتھر دکھائی دیئے
جن پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ یہ انڈیا کے بارڈر کے نشان تھے۔ اس کے آگے دونوں
سرحدوں کے درمیان کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ریتلی زمین میں جگہ جگہ گڑھے
پڑے ہوئے تھے۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"ہم انڈیا کے بارڈر پر آگئے ہیں۔ یہاں محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ دور سے کسی ٹرک کی بتیاں نظر آئیں ساتھ ہی
ٹرک کے انجن کی آواز بھی آنے لگی۔ ہم جلدی سے ایک گڑھے میں اتر کر چھپ گئے۔
تھوڑی دیر بعد ایک ٹرک ہمارے قریب سے گزر گیا۔ یہ بارڈر سیکورٹی فورس کا بھاری
ٹرک تھا۔ کیپٹن جمشید نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔

"دوست! تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اب تم واپس
جا سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے آگے کس طرف کو جانا ہے۔ یہ ساری جگہ میری جانی پہچانی
ہے۔"

میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے میں نے جو کچھ کیا ہے اپنا فرض ادا کیا ہے
لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہاں سے بارڈر کراس کر کے نکل سکو گے؟"

کیپٹن جمشید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دوست! مجھے پورا یقین ہے تم بس یوں سمجھ لو کہ تم نے مجھے پاکستان پہنچا دیا ہے
خدا حافظ!"

میں گڑھے میں ہی رہا اور کیپٹن جمشید گڑھے میں سے باہر نکل آیا۔ اس نے باہر
ہی دونوں جانب دیکھا۔ وہاں بارڈر فورس کی کسی گاڑی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ با
فورس کی جیپیں اور ٹرک وقفے وقفے کے بعد گزرتے تھے۔ آسمان پر تارے نہیں
ہوئے تھے۔ آسمان کو ہلکے ہلکے بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کیپٹن جمشید نے جھک

نے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ جب تک صحرا کی دھندلی رات میں نظر آتا رہا۔ میں
دیکھتا رہا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر بھی میں اسی گڑھے میں سر باہر
ے دور پاکستان کے بارڈر کی طرف دیکھتا رہا۔ جس طرف پہلے انڈین بارڈر سیکورٹی
س کا ٹرک گیا تھا۔ اس طرف سے کسی گاڑی کے انجن کی آواز اور روشنیاں دکھائی
نے لگیں۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں کیپٹن ان کی نظروں میں نہ آجائے۔ مگر بارڈر
س کی گشتی جیپ تیزی سے میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں اس کے بعد بھی کچھ دیر
گڑھے کے اندر بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ کیپٹن بارڈر کراس کر گیا ہو گا اور
دوران مجھے فائرنگ کی بھی کوئی آواز نہ آئی تو میں گڑھے میں سے نکل آیا اور واپس
انہ ہو گیا۔

اس وقت میری جیب میں ایک روپیہ اور کچھ پیسے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس حساب
ے میرے پاس سرائے والے راج گڑھ سے آگے مجھے مہاجن نام کے ریلوے اسٹیشن
پنا تھا جہاں سے بیکانیر جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ اس کے لئے میرے پاس ریل کا کوئی
ایہ نہیں تھا۔ لیکن میں چلتا رہا۔ جب سرائے والے قصبے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں
ے اب منہ اندھیرے ہی کوئی اونٹ راج گڑھ کے واسطے مل سکے گا۔ رات میں نے وہیں
رائے کے باہر ریت پر لیٹ کر کھلے آسمان تلے گزاری۔ صبح صبح تین باربردار اونٹوں کا
فلہ راج گڑھ سے آگے بیکانیر کو جا رہا تھا۔ میں نے اونٹوں کے مالک کو ایک کہانی گھڑ کر
ادی کہ راج گڑھ میں کسی نے میری جیب سے پیسے نکال لئے ہیں اب مجھے بیکانیر پہنچنا
ہے اور میرے پاس صرف ایک روپیہ ہی ہے۔ راجستھان کے لوگوں کو میں نے بڑا فراخ
ل پایا ہے۔ وہ آدمی ہنس کر بولا۔

"بابو اس اونٹ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ روپیہ اپنے پاس ہی رکھو۔ تمہارے کام آئے گا"

تیسرے اونٹ پر بڑے بڑے گٹھڑے لدے ہوئے تھے۔ اونٹ ابھی بیٹھا ہوا تھا۔
ں اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تینوں اونٹ صحرا کی خوشگوار صبح کی فضا میں
انیر کی طرف سفر کر رہے تھے۔

بس کسی نہ کسی طرح میں بیکانیر پہنچ گیا مگر اس وقت رات گہری ہو چکی تھی۔ او
ریل گاڑی اجمیر بھوپال کی طرف نہیں جاتی تھی۔ میں نے ٹرین میں دلی تک بغیر ٹکر
کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح کے وقت مجھے ایک ٹرین مل گئی۔ بیکانیر سے دلی تک کا
طویل سفر تھا۔ میں نے یہ سفر دو دن اور ایک رات میں مختلف گاڑیاں بدل بدل ک
ٹکٹ کے طے کیا۔ راستے میں کھانا وغیرہ کہاں سے کھایا؟ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤ
بہرحال میں دلی گل خان کے پاس پہنچ گیا۔

اسے ساری داستان سنائی۔ اس کے گھر دو دن آرام کیا۔ پتلون قمیض وغیرہ د
اور گرم جیکٹ خرید کر پہنی۔ ریوالور ابھی تک میرے پاس ہی تھا۔ تیسرے دن شا
وقت میں گل خان سے رخصت ہوا اور دلی کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ پنجاب میل
ابھی نہیں ہوا تھا۔ یہ گاڑی دلی سے امرتسر جاتی تھی۔ اور اس روز دو گھنٹے لیٹ تھی
سٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے بعد گاڑی آئی تو اس کے ایسے ڈبے میر
ہو گیا جو مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں ہم لوگ
آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ وہاں خفیہ پولیس والے کم ہی آتے ہیں۔ اگر آ بھی
تو ہمیں ادھر ادھر چھپنے میں آسانی ہوتی ہے۔

دلی سے جالندھر تک کا سفر اطمینان سے گزر گیا۔ جالندھر سے میں جموں جا
ٹرین میں سوار ہو گیا اور خیریت سے جموں پہنچ گیا۔ جموں میں رات ایک ہوٹل میر
پڑا۔ کیونکہ رات کو وہاں سے کوئی بس سری نگر نہیں جاتی تھی۔ دوسرے روز
ایک لاری میں بیٹھ گیا اور جموں کے نیم پہاڑی علاقے سے نکل کر وادی بانہال اور
کی دلکشا پہاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے سری نگر پہنچ گیا۔ سری نگر پہنچنے کے ایک
میں کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ میں اس کے سامنے بیٹھا اسے اپنی طویل روداد
تھا۔

کمانڈو شیروان کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میں نے جانباز فورس کے کیپٹن کو بھا
کی قید سے نکال کر پاکستان کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد کمانڈو شیروان نے

ارتی فوجیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ کشمیری مجاہدوں نے کمانڈوز کے ساتھ مل
ر کپواڑہ کے جنگل میں پندرہ بھارتی فوجی ہلاک کر دیئے تھے اور ان کے گولہ بارود کے
یرے کو آگ لگا دی تھی۔ میں نے شیروان سے پوچھا کہ بھارتی فوج کی سپلائی لائن کی کیا
زیشن ہے۔

کمانڈو شیروان نے جیب سے تہہ کیا ہوا مومی کاغذ نکالا اور اسے کھول کر سامنے رکھتے
ئے بولا۔

"بھارتی فوجیوں کی یہاں صرف دو سپلائی لائنیں ہیں۔ یہ دونوں سڑکیں پہاڑیوں میں
ے گزرتی ہوئی کشمیر کی وادی میں داخل ہوتی ہیں۔ یہاں ہمارے مجاہد گھات لگا کر بھارتی
پلائی کی گاڑیوں پر حملے کر کے انہیں تباہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بھارت ان کی جگہ فوراً
سری گاڑیاں اور دوسرے فوجی لے آتا ہے۔ اس کے پاس کٹوانے کے لئے بہت فوجی
ں۔"

کاغذ پر نیلی اور سرخ لکیروں کے ساتھ پہاڑی علاقے کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ کمانڈو
یروان نے ایک جگہ پنسل کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔

"اس پہاڑی سڑک پر یہاں ایک پل ہے ان پہاڑیوں میں بانہال سے سری نگر کی
ادی تک صرف دو سڑکیں بھارتی فوجیوں کے لئے گولہ بارود کی سپلائی لے کر آتی ہیں
لی سڑک پہاڑی کے پہلو سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔ وہاں ہمارے مجاہد کمانڈو گھات لگا کر
نڈین فوج کی سپلائی کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس دوسری سڑک پر جو یہ پل ہے یہ
ی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پل کے ذریعے بھارت کی سپلائی بھاری تعداد میں وادی میں
تی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انڈین فوج نے یہاں سیکورٹی کا زبردست انتظام کر
کھا ہے۔"

میں نے کمانڈو سے پوچھا۔

"کیا یہ پل لکڑی کا ہے؟"

اس نے کہا۔

"نہیں یہ لوہے کا پل ہے اور بے حد مضبوط ہے۔ اس کی دونوں جانب ایک
ٹینک ہروقت موجود رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پل کی دونوں جانب مشین گنو
مورچے بھی ہیں اور پل کے آس پاس ڈھلان کی جھاڑیوں میں بھی بھارتی فوجیو
مورچے ہیں جہاں مارٹر گنیں بھی ہیں۔ ہمارے مجاہدوں نے کئی بار اس پل کو تباہ کر
کوشش کی ہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارے کئی مجاہد یہاں شہید ہو چکے ہیں۔ اگ
طرح یہ پل مکمل طور پر تباہ ہو جاتا ہے تو سری نگر میں ڈمپلائے انڈین فوج کو ا
سپلائی آدھی رہ جائے گی۔"

میں نے نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے کمانڈو سے پوچھا۔

"یہ پل پہاڑیوں میں کس مقام پر ہے"

اس نے مجھے پل کا پورا حدود اربعہ سمجھایا اور کہا۔

"اس پل کے نیچے کوئی دریا وغیرہ نہیں ہے۔ کافی گہرائی میں ایک برساتی نالہ
صرف برسات کے موسم میں بارش کے پانی سے بھر جاتا ہے۔ آج کل یہ نالہ خشک
پل کے نیچے بھی بھارتی فوج کی چوکیاں ہیں۔ اس نالے میں سے کوئی پرندہ بھی اُ
جائے تو بھارتی فوجی مشین گنوں کا فائر کھول دیتے ہیں۔ یہ پل وادی میں انڈین فو
اسلحہ اور فوجیوں کی کھیپ پہنچانے میں بے حد اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اگر ہم کس
اس پل کو مکمل طور پر تباہ کر دیتے ہیں تو یہ ہماری بہت بڑی فتح ہوگی اور بھارتی فو
کمانڈ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ کیونکہ یہاں نیا پل بنانا بڑا دقت طلب
کام ہے"

میں نے کمانڈو شیروان کی طرف پر اعتماد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمانڈو! اگر میں یہ پل تباہ نہ کر سکوں تو پھر میرا جینا کسی کام کا نہیں اور پھر
کمانڈو کی ٹریننگ کس دن کے لئے لی تھی؟"

کشمیر کی پہاڑیوں کا یہ اہم ترین پل ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں صرف ایک ہی
ڑی سڑک تھی۔ یہ سڑک پیچھے کی طرف سے ایک اونچی پہاڑی کے سانپ کی طرح چکر
تی ہوئی اوپر سے ہو کر دوسری پہاڑی کی طرف آتی تھی۔ یہ پل دونوں پہاڑیوں کے
میان بنا ہوا تھا۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چل کر اس پل کو دیکھو۔ اس کا اچھی طرح سے
زہ لو۔ اس کے بعد ہم اس پل کو اڑانے کا کوئی قابل عمل اور موثر پلان بنا سکیں گے۔"

ہماری خفیہ کیمپ گاہ سے یہ پل خچروں پر آدھے دن کی مسافت پر تھا۔ ہم نے
سرے دن کشمیری کسانوں والا لباس پہنا اور خچروں پر بیٹھ کر منہ اندھیرے پل کی طرف
ل پڑے۔ سارا رستہ پہاڑی تھا۔ ہم کئی گھاٹیوں اور برساتی نالوں میں سے گزرے۔
پہر کے بعد ایک ٹیلے کی اترائی اترے تو کمانڈو شیروان نے تھیلے میں سے دوربین نکال کر
ے دی اور دور ایک جانب اشارہ کیا۔

"وہ پل ہے۔"

میں نے دوربین کے بغیر اس طرف دیکھا۔ دور دو پہاڑیوں کے درمیان کافی بلندی پر
یک اونچی گھاٹی کے درمیان ایک پل کا دھندلا خاکہ نظر آرہا تھا۔ میں نے دوربین آنکھوں
سے لگائی۔ دوربین میں سے پل تھوڑا صاف مگر دھندلا نظر آرہا تھا۔ یہ لوہے کا پل تھا اور
بڑی بڑی قینچیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ کمانڈو شیروان کہہ رہا تھا۔

"پہلے یہاں ایک لکڑی اور رسوں کا پل ہوا کرتا تھا مگر بھارتی فوج نے جب کشمیر پر

قبضہ کیا تو یہاں فوج نے بڑا مضبوط لوہے کا پل بنا دیا اس پل کو اڑانے کی کوشش
ہمارے کئی مجاہد اب تک شہید ہو چکے ہیں۔ مگر پل کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکے
میں نے کہا۔

"ہمیں پل کو قریب سے جا کر دیکھنا ہو گا۔"

"ہم اس طرف والی پہاڑی کی گھاٹی میں جائیں گے۔ آگے تک نہیں جا سکتے۔ بھارتی فوج کے مورچے ہیں جہاں ابزروز دور بینیں لگائے چوبیس گھنٹے علاقے پر رکھتے ہیں۔"

ہم خچروں پر بیٹھ گئے اور خچروں کو ایک ٹیلے کی چڑھائی پر ڈال دیا۔ یہ خاص کشمیر کی پہاڑیاں تھیں۔ چیڑھ اور چنار کے درختوں کی قطاریں پہاڑیوں کی ڈھلانوں چوٹیوں تک چلی گئی تھیں۔ بہار کا موسم تھا۔ مگر بھارتی غاصب فوج نے کشمیر کی بہ حسن کو خاک و خون میں رلا دیا تھا۔ جس پہاڑی پر ہماری خچریں جا رہی تھیں وہاں چنا درختوں کے علاوہ اخروٹ اور خوبانیوں کے گھنے درخت بھی تھے۔ ہم عام کشمیری کر کے بھیس میں تھے۔ ہم نے لمبے لمبے پھٹے پرانے فرن پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں میں سوٹیاں تھیں۔ خچر بھی مریل سے تھے۔ کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کشمیری کسان ہیں۔

کمانڈو شیروان ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا۔ ہم اسی دو پہاڑیوں پر سے گزر کر اس پہاڑی پر آ گئے جہاں پل بنا ہوا تھا۔ کمانڈو شیروان ایک خچر سے اتر گیا کہنے لگا۔

"یہاں خچر باندھیں گے"

میں بھی خچر سے اتر پڑا۔ ہم نے دونوں خچر ایک درخت کے ساتھ باندھ د کمانڈو نے دوربین اپنے لمبے کرتے کے پیچھے چھپا رکھی تھی۔ اس لمبی آستینوں او دامن والے کرتے کو کشمیری میں فرن کہتے ہیں۔ وہ ایک جگہ درختوں کے پیچھے سامنے دیکھنے لگا۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ کر سامنے دیکھنے لگا۔ یہاں سے لوہے کا بھر کم پل کچھ فاصلے پر دن کی روشنی میں بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ کمانڈو شیروا

ربین مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"پل کو غور سے دیکھو۔"

میں نے دوربین لگا کر دیکھا۔ یہاں سے پل کا منظر دوربین میں بے حد قریب دکھائی ا۔ یہ بڑی بڑی آہنی قینچیوں والا بڑا زبردست اور مضبوط پل تھا جو دو پہاڑیوں کو ایک سرے سے ملاتا تھا۔ نیچے گہرائی میں برساتی نالہ تھا جو بالکل خشک تھا اور جھاڑیاں اگی ی تھیں۔ پل کی دونوں جانب لوہے کے بہت بڑے بڑے گارڈروں نے اسے سہارا دیا ا تھا۔ یہ چار چار گارڈر تھے جو بالکل ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے اور نیچے پہاڑی کے لو میں دیوار کے اندر دھنسے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان کہہ رہا تھا۔

"اس پل کو جس شے نے اٹھا رکھا ہے وہ دونوں طرف کے لوہے کے چار چار بڑے رڈر ہیں جو پہلو کی پہاڑی کی دیواروں کے اندر دھنسے ہوئے ہیں۔ دیواروں کے اندر ں کے گول بہت بڑے ستون ہیں جن کے اندر یہ گارڈر بنیادوں تک چلے گئے ہیں۔ ستونوں میں ایک روایت کے مطابق سیمنٹ میں لوہے کے ٹکڑے جلا کر ڈالے گئے جس کی وجہ سے پل کی بنیادیں فولاد کی مانند ہو گئی ہیں۔ اگر اوپر سے ہم پل پر امیٹ لگا کر دھماکے بھی کریں تو پل کا جنگلہ اڑ جائے گا مگر پل اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ وجہ سے ہمارے مجاہد اس پل کو ابھی تک تباہ نہیں کر سکے۔"

میں دوربین لگائے پل کی ایک ایک جزئیات کو غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پل کو تباہ کرنے کے لئے کس قسم کی حکمت عملی تیار کرنی چاہئے۔ اس وقت تک ے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دوربین کمانڈو شیروان کو دے دی کہا۔

"پل کی صرف ایک جانب ٹینک کھڑا ہے۔ دوسرا ٹینک مجھے نظر نہیں آیا۔"
کمانڈو شیروان نے دوربین آنکھوں پر لگا کر کہا۔

"دوسرا ٹینک ابھی آ جائے گا"

ہم باری باری دوربین لگا کر پل کا جائزہ لیتے رہے۔ پل کے نیچے مجھے آمنے سامنے دو

مشین گن کے مورچے بھی دکھائی دیئے تھے۔ کچھ دیر بعد دوسرا ٹینک آکر پل
سرے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ پل پر سے ایک فوجی کنوائے گزرنے لگا۔ کمانڈو شیروان بولا
"یہ کنوائے یقیناً کپواڑہ گیریژن کے لئے اسلحہ وغیرہ لا رہا ہے۔ کیونکہ کچھ
ہمارے مجاہدوں نے شب خون مار کر اس گیریژن کا ایمونیشن ڈپو اڑا دیا تھا۔ اگر
ہوتا تو کپواڑہ گیریژن کو ایمونیشن کی سپلائی دوسری سڑک پر سے آتی جو تین پہاڑوں
کاٹ کر وادی میں داخل ہوتی ہے اور وہاں ہمارے مجاہد گھات لگا کر اسے اڑ
کوشش کر سکتے تھے۔ لیکن اس پل پر سے جو کنوائے سپلائی لے کر آتے ہیں ا
اس پل کی وجہ سے بڑی جلدی کشمیر پہنچ جاتے ہیں دوسرے اس علاقے میں پہاڑ
اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ ہمارے مجاہد وہاں زیادہ دیر تک گھات لگا کر چھپے رہ
ہروقت بھارتی فوج کے گشتی دستے پٹرول کرتے رہتے ہیں۔"

میں دوربین کی مدد سے پل پر سے گزرتے فوجی ٹرکوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑ
بڑے فوجی ٹرک تھے جو ترپالوں سے چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ٹرک
مسلسل گزر رہے تھے۔ بعض ٹرکوں کے سامنے کی جانب فوجی مشین گنیں لگائے
کی دوسری جانب پہاڑی ڈھلان پر مجھے کچھ بکریاں نظر آئیں جو جھاڑیوں کے بیچ
تھیں۔ ان کے درمیان ایک چرواہا ہاتھ میں لمبی سوٹی پکڑے کھڑا انہیں دیکھ ر
ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اوپر بھی چڑھتا جاتا تھا۔ میں نے دوربین کمانڈر کو دی اور

"یہ چرواہا وہاں کیسے آگیا؟ ذرا دیکھو"

کمانڈو شیروان نے دوربین لگا کر چرواہے کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ کشمیری چرواہا یہاں اکثر دیکھا گیا ہے۔ بکریاں چرانے آجاتا ہے۔ بھارتی
کو کچھ نہیں کہتے۔ یقیناً انہوں نے اسے بے ضرر سمجھ کر یہاں بکریاں چرانے کی
دے رکھی ہو گی۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے پوچھا۔

"کیا ہم اس طرف جا سکتے ہیں جہاں یہ چرواہا بکریاں چرا رہا ہے؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"جا تو سکتے ہیں مگر اس میں خطرہ ہے کیونکہ وہاں دو بھارتی فوجی مورچوں میں بیٹھے
ہیں وہ اس چرواہے کو جانتے ہوں گے ہمیں دیکھ کر ضرور پکڑ لیں گے کہ ہم ادھر کہاں
سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہم خاص اس جگہ پر نہیں جائیں گے۔ جہاں یہ چرواہا بکریاں چرا رہا ہے۔ ہم اس
سے دور اوپر ہی رہیں گے۔ دراصل میں اس جگہ کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میرے ذہن میں ایک سکیم کا خاکہ تیار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جس کے متعلق میں نے
کمانڈو کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا کمانڈو بولا۔

"چلے چلتے ہیں"

ہم خچروں پر بیٹھ کر دوسری پہاڑی کی طرف چل پڑے جہاں پل کا دوسرا سرا تھا۔
ہمیں دوسری پہاڑی تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ہمیں کافی فاصلہ ڈال کر دو پہاڑیوں
کے درمیان میں جو خشک برساتی نالہ تھا اس میں سے گزرنا پڑا۔ آخر ہم دوسری پہاڑی پر
اس مقام پر آگئے جہاں سے ہمیں نیچے فوجی پل اور ڈھلان پر چرواہا بکریاں چراتا نظر آرہا
تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے درخت تھے جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں اور ایک جانب سے
پہاڑی پگڈنڈی پہاڑی کے پہلو کی جانب چلی گئی تھی۔ ہم خچروں سے اتر کر جھاڑیوں کے
پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نے پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کمانڈو سے پوچھا کہ یہ
پگڈنڈی اوپر چوٹی پر جاتی ہے کیا؟ اس نے کہا۔

"نہیں یہ آگے پہاڑی کے اندر چھوٹی سی قدرتی سرنگ ہے اس طرف جاتی ہے۔
وہاں پہلے چرواہوں نے بکریوں کے لئے باڑا بنا رکھا تھا مگر بھارتی فوجیوں نے اسے وہاں سے
ہٹا دیا ہے۔ اب اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیا وہاں فوجی پہرہ لگا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ وہاں فوجی گارڈ نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قدرتی

غار اندر تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتی ہے۔ اور فوجیوں کے مورچے وہاں سے کافی آگے جا کراوپر کی جانب ہیں۔"

میں نے کمانڈو شیروان کو اپنی سکیم کی تفصیل بتادی۔ اس وقت پہاڑی غار کا سن کر میرے ذہن میں جو منصوبہ بن رہا تھا وہ مکمل ہو گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پل کے اس سرے کے جو فولادی گارڈ پہاڑی دیوار کے اندر سے ہوتے ہوئے پختہ ستونوں کی بنیادوں میں دھنسے ہوئے ہیں وہ یقینی طور پر اس غار کے اندر ہوں گے یا ان کا ایک حصہ ضرور غار کے اندر نظر آتا ہوگا۔ جب میں نے کمانڈو کو اپنا پلان بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہنے لگا۔

"تمہارا منصوبہ قابل عمل نہیں لگتا۔ کیونکہ غار کے اندر جا کر سارا کام کرنا آسان نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں مستقل طور پر کوئی فوجی گارڈ ڈیوٹی پر نہیں ہوتا لیکن فوجی ادھر گشت لگاتے رہتے ہیں۔ انہیں غار کے اندر ذرا سی بھی آواز آئی تو وہ غار میں فائرنگ کرتے داخل ہو جائیں گے۔"

میں نے کمانڈو سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوشش کر کے دیکھ لینے دو۔ آگے جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہوگا۔"

کمانڈو غور کر رہا تھا پھر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے میں آج شام کو ہی اس کشمیری چرواہے کے گھر جا کر اس سے ملتا ہوں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا ہوا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم حریت پسند مجاہد ہیں۔ اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔"

ہم خچروں پر سوار ہو کر پہاڑی کی دوسری طرف سے ہو کر نیچے اترنے لگا۔ اسی طرح کھڈوں نالوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتے ہوئے ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ میں واپس آگئے۔ شام کے وقت کمانڈو شیروان اس چرواہے کے گھر کی طرف چل دیا جس کو ہم نے فوجی پل کی دوسری جانب ڈھلان پر بکریاں چراتے دیکھا تھا۔ کمانڈو رات کے دس بجے واپس آیا۔ ہم کمیں گاہ کے اندر تہہ خانے میں بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"میں نے صمدو سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہر طرح سے تعاون کرے گا۔ لیکن ایک بار تمہیں بھی اس سے مل لینا چاہئے۔ میں کل رات کا وقت دے آیا ہوں۔ کل رات پڑتے ہی ہم اس کے گاؤں کی طرف چل پڑیں گے۔ رات کا وقت ہمارے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔"

صمدو اس چرواہے کا نام تھا۔ دوسری رات ہم نے دوبارہ کسانوں والا حلیہ بنایا اور خچروں پر بیٹھ کر صمدو چرواہے کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ یہ کافی لمبا راستہ تھا۔ کوئی دو گھنٹے میں ہم وہاں پہنچے۔ اس کا مکان اسی پہاڑی کے عقب میں ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں واقع تھا جس پر بھارتی فوجیوں نے پل بنا رکھا تھا۔ صمدو ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے ہمارے لئے ساگ چاول پکا رکھے تھے۔ چھوٹا سا لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ جس میں دونوں میاں بیوی رہتے تھے۔ ایک لالٹین جل رہی تھی۔ کمانڈو نے صمدو سے میرا تعارف کرایا۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر ملا۔ ہم نے کھانا کھایا اس کے بعد اس کی بیوی ساوار میں گرم کشمیری چائے لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے اپنے اصل موضوع پر گفتگو شروع کردی۔ کمانڈو شیروان نے ساری بات اسے پہلے سے بیان کر رکھی تھی۔ میں نے صمدو سے کہا۔

"مجھے تمہاری صرف اتنی مدد کی ضرورت ہے کہ تم اس وقت باہر نگرانی کرتے رہو جب میں غار کے اندر جاؤں اور اگر کوئی خطرہ ہو تو مجھے خبردار کر سکو۔"

صمدو کشمیری لہجے میں ملی جلی پنجابی اردو میں بات کرتا تھا۔ اس کی زبان میں نہیں لکھوں گا۔ اس کی باتوں کو میں اپنی اردو زبان میں بیان کرتا جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں آپ کو اپنے منہ سے فاختہ کی آواز نکال کر خبردار کروں گا۔"

اس نے مجھے منہ سے فاختہ کی آاز بول کر سنائی۔ بالکل فاختہ کی آواز لگتی تھی۔ میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ اب ایسا ہے کہ کل سے مجھے تقریباً ہر روز دوپہر کے وقت وہاں آنا ہوگا۔ تم مجھے اپنی دو تین بکریاں دے دوگے جنہیں میں چراتے ہوئے وہاں تک آؤں

گا۔ اگر مجھے کوئی بھارتی فوجی گشت کرتا ہوا مل گیا تو میں اسے یہی کہوں گا کہ میں صمدو
چرواہے کا بھائی ہوں اور اگر میرے بارے میں تم سے کسی فوجی نے پوچھا تو تم بھی اسے
یہی بتانا۔"

صمدو کہنے لگا۔

"لیکن آپ کشمیری زبان ہماری طرح نہیں بول سکتے۔ کہیں بھارتی فوجی کو شک نہ پڑ
جائے۔"

یہ نقطہ بڑا اہم تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کمانڈو شیروان نے بھی اس
نقطے پر قدرے تشویش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا۔

"ظاہر ہے بھارتی فوجی مجھ سے کشمیری زبان میں تو بات نہیں کرے گا۔ وہ اپنی فوجی
اردو میں بات کرے گا۔ میں بھی اسی زبان میں کچھ ملی جلی پنجابی اور کشمیری میں جواب
دے لوں گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ لیکن اس بات کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہو
چاہئے کہ جس وقت میں پہاڑی غار کے اندر اپنے کام میں لگا ہوں گا اور اگر باہر کوئی خطر
ہو تو مجھے تم وقت پر خبردار کردو گے۔"

صمدو بولا۔

"یہ بات تم یقینی سمجھو۔ جس وقت تم غار کے اندر جاؤ گے تو میں اس کے آس پا
ہی منڈلاتا رہوں گا۔ اول تو دن کے وقت ادھر کوئی بھارتی فوجی نہیں آتا۔ اگر آ بھی گ
وہ غار کی طرف کیا لینے جائے گا۔ اس کو کچھ شک ہوگا تو جائے گا۔ بفرض محال اگر اس
غار کی طرف رخ کر بھی لیا تو میں فاختہ کی آواز نکال کر تمہیں خبردار کرلوں گا۔"

کمانڈو شیروان نے یہاں مجھ سے سوال کیا۔

"اگر فوجی غار میں آگیا اور اس نے تمہیں دیکھ لیا تو تم کیا کرو گے؟ وہ تو تم پر فورا
جھونک دے گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر ایسی صورت پیدا ہوگئی تو میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آپ لوگ اس کی

نہ کریں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

دوسرے روز دوپہر کے بعد کا وقت طے کرکے میں اور کمانڈو شیروان صمدو کے گاؤں
سے اسی طرح خچروں پر سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے۔ پہاڑی جنگل میں رات گہری
اندھیری تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ پہاڑوں پر رات کے وقت میدانی جنگلوں کی راتوں کا
گھپ اندھیرا نہیں ہوتا۔ پہاڑوں پر بغیر چاند کی راتوں میں بھی ہلکی ہلکی سلیٹی رنگ کی
روشنی ضرور رہتی ہے۔ کمانڈو شیروان مجھے ساتھ ساتھ راستے کے نشان بتاتا جا رہا تھا۔
مجھے یہ راستہ اچھی طرح یاد ہوگیا تھا۔ پھر بھی کمانڈو شیروان نے کہا۔

"کل میں ایک بار تمہارے ساتھ ضرور آؤں گا۔ اس کے بعد تمہیں اکیلے وہاں تک
جانا ہوگا۔ کیونکہ ہم دونوں کو بھیس بدل کر پل کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لینا
چاہئے۔"

کمانڈو کا خیال بالکل درست تھا۔ میں نے کہا۔

"تم بے شک کل بھی میرے ساتھ نہ آؤ۔ مگر کل میرا پہلا دن ہوگا اور راستے کے
نشان میں نے رات کو دیکھے ہیں۔ اس لئے کل تو میرے ساتھ رہو گے تو مجھے آسانی
ہوگی۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"کل میں ضرور تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

ابھی میں صرف موقع کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ابھی میرے ایکشن شروع کرنے کا وقت
نہیں آیا تھا۔ میری سکیم اور پلان کیا تھا؟ یہ جیسے جیسے میرا مشن آگے بڑھے گا آپ کو اس
کا علم ہوتا جائے گا۔ اگلے روز دوپہر کے بعد میں اور کمانڈو شیروان ایک بار پھر اپنے
ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت ہمیں صمدو کے مکان کی طرف نہیں جانا تھا۔ بلکہ پل والی پہاڑی کے عقبی
علاقے میں جانا تھا۔ جہاں صمدو پہلے سے وہاں بکریاں چرا رہا تھا۔ وہ ہمیں پہاڑی پر ہی ایک
جگہ درختوں کے نیچے بیٹھا مل گیا۔ کمانڈو شیروان وہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ وہ اسی

وقت واپس چلا گیا۔ میں نے اپنا خچر وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے باندھ دیا۔ صمد و چرواہے نے تین بکریاں میرے حوالے کر دیں اور ایک درخت کی لمبی چھڑی بھی میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا۔

"نیچے گھاٹی کی طرف مت آنا۔ میں اسی جگہ نگرانی کروں گا۔"

میں نے بکریوں کو ساتھ لیا اور اسے منہ سے آواز نکال کر ہانکتا ہوا اس پگڈنڈی پر چلنے لگا جو پل کی پہاڑی والے قدرتی غار کی طرف جاتی تھی۔ میں نے صرف ایک بکری کی رسی تھام رکھی تھی۔ باقی دو بکریاں اپنے آپ ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ پگڈنڈی پر درختوں کے گرے ہوئے پتے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں رک رک کر اور بکریوں کو چراتا ہوا آگے چل رہا تھا۔ تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔ میری تیز نگاہیں پہاڑی پگڈنڈی کے سامنے کی جانب تھیں۔ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی پہاڑی کے دامن میں جا کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھیں۔ میں بکریوں کو ساتھ لئے رک رک کر جا رہا تھا۔ جہاں پگڈنڈی جھاڑیوں میں غائب ہو جاتی تھیں۔ وہاں آ کر میں رک گیا اور گردن کو کھجانے کے بہانے ارد گرد گردن گھما کر جائزہ لیا۔ وہاں مجھے آس پاس اوپر پہاڑی کی چوٹی پر کوئی فوجی وغیرہ نظر نہ آیا۔ میں نے رسی والی بکری کو وہیں ایک جھاڑی کی شاخوں سے باندھا اور خاموشی سے قدم اٹھاتا جھاڑیوں کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں مجھے اونچے سرکنڈوں کے پیچھے ایک غار کا چھوٹا سا دہانہ دکھائی دیا۔

میں سرکنڈوں کو پیچھے ہٹاتا غار کے اندر چلا گیا۔ یہ غار دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ راستے کی طرح تھا جس کے اوپر چھت پڑی ہوئی ہو۔ دیواروں میں سے درختوں کی جڑیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ فضا میں مٹی کی مرطوب بو تھی باہر سے دن کی روشنی چند قدم تک ساتھ رہی۔ پھر میں اندھیرے میں آ گیا۔ غار کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ گیا۔ اچانک میرے پاؤں ایک تودے سے ٹکرائے۔ میں نے جھک کر ہاتھ لگا کر دیکھا آگے مٹی کے ڈھیر نے غار کو آدھے سے زیادہ بند کر دیا ہوا تھا۔ میں اس کے اوپر سے کر دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں بہت گہرا اندھیرا تھا۔ میں نے جیب سے ماچس نکال کر

جلائی۔ موم بتی میرے پاس ضرور تھی مگر میں اسے ابھی روشن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماچس کی روشنی میں تین چار قدموں کے فاصلے پر دیوار تھی یہاں غار بند ہو جاتی تھی۔ میں نے بائیں جانب دیوار پر نگاہ ڈالی۔ وہاں محراب کی شکل میں اور گولائی میں دیوار ایک جگہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب آیا تو دیا سلائی بجھ گئی۔

اب میں نے موم بتی روشن کر کے زمین پر ایک جگہ لگا دی اور بیٹھ کر باہر کو نکلی ہوئی گول دیوار کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ یہ سیمنٹ کی گول دیوار کا ایک حصہ تھا جو غار سے باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ اس بہت بڑے ستون یا کنوئیں کی گول دیوار کا ایک حصہ تھا جس میں پہاڑی کے پل کی ایک طرف کے ترچھے فولادی گارڈر دھنسے ہوئے تھے اور جس میں سیمنٹ پتھر اور لوہے کے ٹکڑے ڈال کر بھر دیا گیا تھا۔ یہ پہاڑی والے پل کی بنیاد کا ایک ستون تھا۔ دوسرا ستون سامنے والی پہاڑی کی دیوار کے اندر ہو گا۔ ان دونوں ستونوں میں سے ہر ایک ستون پل کی بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر یہ ستون آگے کی جانب گر جاتا ہے یا نیچے بیٹھ جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی فولادی گارڈز بھی نیچے بیٹھ جاتے اور پل ایک طرف سے نیچے برساتی نالے میں گر جاتا تھا۔ مگر یہ کوئی عام قسم کا ستون نہیں تھا کہ جس کے ساتھ بم باندھ کر اسے اڑا دیا جاتا۔ یہ ستون ایک قسم کا لوہے اور سیمنٹ سے منہ تک پلستر کیا ہوا کنواں تھا جس کے اندر لوہے کے چار گارڈر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے کم از کم پچاس فٹ تک دھنسے ہوئے تھے۔

میں نے ایک پتھر اٹھا کر اسے ستون کی محرابی دیوار پر آہستہ سے مارا۔ ایسی آواز آئی جس نے مجھے بتا دیا کہ ستون اندر سے خالی نہیں ہے بلکہ پتھر کی طرح سخت اور اندر سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ستون کا یہ گھیرا نیم گولائی شکل میں کم از کم بیس فٹ کا ہو گا۔ اس ستون میں شگاف ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس میں شگاف ڈال کر اندر دھنسے ہوئے لوہے کے گارڈروں تک پہنچنے کے لئے اس الیکٹریکل برمے کی ضرورت تھی جس سے یورپ اور امریکہ میں پہاڑوں کی چٹانوں کو توڑا جاتا ہے اور اس کی اتنی آواز ہوتی ہے کہ کم از کم ایک میل کے اندر کوئی شخص بات نہیں کر سکتا اور سونا چاہے تو

سو نہیں سکتا۔ یہاں تو میں ہتھوڑی اور چھینی کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اوپر
پل کا پہلا سرا تھا اور وہاں فوجی چھاؤنی بنا کر بیٹھے ہوئے تھے جو بڑی آسانی سے یہ آواز سن
سکتے تھے اور غار میں آسکتے تھے۔

میں نے اس جگہ کو کریدا جہاں ستون کے سیمنٹ کی گولائی پہاڑی غار کی دیوار میں
دھنسی ہوئی تھی۔ یہ پہاڑ مٹی کے تھے اور وہاں میرے کریدنے سے مٹی باہر گرنے لگی
اچانک باہر سے فاختہ کے بولنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے پھونک مار کر موم بتی
بجھادی اور وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں غار کے دہانے کی طرف جمی
ہوئی تھیں۔ غار کا دہانہ راستے میں مٹی کے تودے کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔
صرف اس میں سے داخل ہونے والی دن کی روشنی تھوڑی تھوڑی نظر آرہی تھی۔ باہر
گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فاختہ کی یہ آواز یقینی طور پر صمدو چرواہے کی تھی جس نے
خطرے کی بو سونگھ کر مجھے اپنے منہ سے فاختہ کی آواز نکال کر خبردار کیا تھا۔ جب پانچ منٹ
گزر گئے اور باہر سے دوبارہ کوئی آواز نہ آئی تو میں نے موم بتی اٹھا کر جیب میں ڈالی اور
آہستہ آہستہ غار کے منہ کی طرف چلنے لگا۔ غار کے دہانے کے قریب آکر میں ایک بار پھر
رک گیا۔ کان لگا کر باہر کی آوازوں کو سننے کی کوشش کی۔ باہر کسی کسی وقت درخت
کسی پرندے کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ مگر یہ فاختہ کی آواز نہیں تھی۔ میں بڑی
احتیاط کے ساتھ غار کے اندر سے نکل کر سرکنڈوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور سرکنڈوں میں
سے دوسری طرف دیکھا۔ میری تینوں بکریاں جھاڑیوں کے پاس موجود تھیں۔ ایک بکری
بندھی ہوئی اپنی جگہ پر کھڑی کھڑی جھاڑیوں پر منہ چلا رہی تھی اور دوسری دو بکریاں
فاصلے پر درختوں کے نیچے ادھر ادھر منہ مار رہی تھیں۔ صمدو چرواہا مجھے کہیں نظر نہیں آ
تھا۔ میری سوئی جھاڑیوں کے پاس ہی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھ کر سرکنڈوں سے نکل
جھاڑیوں کے پاس آگیا اور منہ سے ہا ہا او کی آواز نکالتا بندھی ہوئی بکری کو کھولا۔
اٹھائی اور پگ ڈنڈی پر واپس چل پڑا۔ ذرا آگے گیا تو صمدو کو دیکھا جو ایک پتھر پر بیٹھا
اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے پیچھے جانے کا کہہ رہا تھا میں تیزی سے الٹے پاؤں واپس

جھاڑیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد صمدو چلتا ہوا میری طرف آیا اور مجھے ایسا اشارہ کیا کہ میں بکریوں کو لے
کر دوسری طرف پہاڑی کے اوپر ہموار تختے پر آجاؤں۔ وہ خود بھی بکریوں کو ہانکتا ہوا اوپر
کی طرف لے گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اپنی تینوں بکریوں کو ساتھ چلاتا لے کر اوپر
کی طرف چل پڑا۔ اوپر درختوں کے درمیان ایک ہموار جگہ تھی جہاں صمدو زمین پر بیٹھا
ہوا تھا۔ میں بھی اس کے پاس جا کر چرواہوں کی طرح زمین پر بیٹھ گیا۔ صمدو کہنے لگا۔

"جس وقت میں نے تمہیں فاختہ کی آواز نکال کر خبردار کیا تھا اس وقت اوپر سے
ایک ڈوگرہ فوجی نیچے اتر کر غار کے قریب سے گزرا تھا۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ غار کے
اندر تو نہیں جا رہا۔ وہ اندر تو نہیں آیا تھا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں اندر نہیں آیا تھا۔ ویسے میں نے تمہاری آواز سنتے ہی موم بتی بجھا دی تھی
اور چوکس ہو گیا تھا۔"

"صمدو کہنے لگا۔"

"اب تم ایسا کرو کہ میرے پیچھے پیچھے تھوڑا فاصلہ ڈال کر چلے آؤ۔ ہمیں اب یہاں
نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ مجھے ڈر ہے کہیں کسی فوجی کو تم پر شک نہ پڑ گیا ہو۔"

وہ بکریوں کو لے کر آگے آگے چل پڑا۔ میں نے بھی اپنی تینوں بکریوں کو اپنے ساتھ
لگایا اور صمدو کے پیچھے چلنے لگا۔ دوسری طرف تھوڑی سی اترائی اترنے کے بعد دوسرے
ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ درختوں میں چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہم وہاں آگئے بکریاں چشمے میں
پانی پینے لگیں۔ ہم نے بھی تھوڑا تھوڑا پانی پیا اور پتھروں کے پاس بیٹھ گئے۔

صمدو نے کہا۔

"تھوری دیر میں ان کا تیسرا پہر ہو جائے گا۔ یہاں پہاڑیوں میں بڑی جلدی شام ہو
جاتی ہے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے جاتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے میں اسی وقت بکریاں لے
کر گھر واپس جاتا ہوں تم بھی اب واپس چلے جاؤ۔ کیا تمہیں واپسی کا راستہ معلوم ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے سارے راستے یاد ہو گئے ہیں۔"

صمدو نے پوچھا۔

"کوئی مطلب کی بات معلوم ہوئی غار کے اندر سے؟"

میں نے اسے کچھ نہ بتایا صرف اتنا ہی کہا۔

"ابھی تو میں غار کو اندر سے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا۔ مجھے کچھ روز تک یہا
آنا پڑے گا۔ پھر کچھ فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔"

ہم نے ایک بڑی عقلمندی کی بات کی تھی اور یہ ہمیں کرنی ہی چاہئے تھی اور ہم ا
ایسا ہی کیا کرتے تھے کہ اپنا راز کسی دوسرے پر اس وقت تک ظاہر نہیں کرتے تھے ج
تک کہ ہم مجبور نہ ہو جائیں اور دوسرے آدمی کے بارے میں ہمیں یقین ہو جائے
اس کو راز بتانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم نے صمدو چرواہے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ
اوپر پہاڑی پل کو اڑانا چاہتے ہیں۔ کمانڈو شیروان نے اسے یہی کہا تھا کہ ہم لوگ کش
حریت پرست مجاہدوں کے لئے وہاں ایک خفیہ ٹھکانہ بنانا چاہتے ہیں جہاں ہم بھارتی فو
سے چھینا ہوا اسلحہ وغیرہ بھی رکھ سکیں اور موقع ملنے پر اوپر جا کر گھات لگا کر پل پ
گزرتے بھارتی فوجی سپلائی کے ٹرکوں پر حملہ بھی کر سکیں اور انہیں نقصان پہنچا
صمدو چرواہے کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ ہم نے بھارتی فوج کے اتنے اہم
اور مضبوط ترین پل کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ صمدو اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا۔

"ابھی دن کی روشنی باقی ہے تمہیں دور جانا ہے۔ راستے میں اندھیرا نہ ہو جا
وقت نکل جاؤ۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں کل اسی وقت پھر آؤں گا۔ اس نے کہا۔

"اسی چشمے پر آ کر میرا انتظار کرنا میں تمہاری بکریاں لے کر اس جگہ آ جاؤں
نے بکریاں اس کے حوالے کیں اور واپس روانہ ہو گیا۔ شام کا اندھیرا چاروں طر
ہو چکا تھا جب میں کمانڈو شیروان کی پہاڑی کمین گاہ میں پہنچا۔ وہ بے چینی سے می

کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمانڈو مجاہدوں سے الگ ہو کر وہ مجھے نیچے تہہ خانے
میں لے گیا اور اندر داخل ہوتے ہی بولا۔

"کوئی امید نظر آئی؟"

میں نے اسے غار کے اندر کی ساری تفصیل بتائی اور کہا۔

"وقت ضرور لگے گا لیکن ٹارگٹ مارنے کی پوری امید ہے۔"

کمانڈو نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں جس جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتادو۔ ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں گی۔
یا خیال ہے تم اکیلے یہ کام کر لوگے؟ تمہارے ساتھ کسی دوسرے مجاہد کو نہ بھیج دوں؟"

میں نے کہا۔

"ابھی کسی دوسرے مجاہد کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی وہاں دو آدمیوں کا جانا
طرے سے خالی نہیں ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پھر تمہیں میرے ساتھ جانا
وگا۔"

"میں ہر وقت تیار ہوں"

کمانڈو شیروان نے مسکرا کر جواب دیا۔

دوسرے دن میں جس خچر پر سوار ہو کر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوا اس خچر پر
یک گٹھڑی بھی لدی ہوئی تھی۔ اس گٹھڑی میں چار روٹیوں کے علاوہ لوہے کی بڑی مضبوط
کھرپیاں اور ایک آہنی موٹی سلاخ بھی تھی۔ صمدو کو میں نے دوپہر کا وقت دیا ہوا تھا میں
ٹھیک وقت پر پہاڑی کے چشمے پر پہنچ کر خچر ایک طرف باندھ کر چشمے کے پاس بیٹھ گیا اور
گٹھڑی میں سے ایک روٹی نکال کر کھانے لگا۔ تاکہ اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ چرواہے
کو بھوک لگی تھی اور چشمے پر روٹی کھانے کے لئے بیٹھ گیا ہے۔ اتنے میں مجھے بکریوں کے
گھنگروں کی ٹک ٹک اور ان کے ممیانے کی آوازیں آئیں۔ پھر صمدو ایک طرف سے
نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ چھ سات بکریاں تھیں۔ ان میں سے تین بکریاں میری تھیں۔
یعنی میرے لئے تھیں۔ میں نے اپنی بکریاں اپنے ساتھ کر لیں اور اوپر غار کی طرف چڑھائی

چڑھنے لگے۔ جہاں سے پگڈنڈی غار کی طرف جاتی تھی وہاں میں اپنی تینوں بکریاں
صمدو سے الگ ہوگیا صمدو اپنی بکریاں لے کر پہاڑی کی اس ڈھلان کی طرف چلا گیا
فوجی پل نظر آتا تھا۔ اور جہاں وہ ہر روز بکریاں چرانے جاتا تھا۔

غار کے قریب آکر میں نے کل کی طرح بکریوں کو ایک طرف چرنے کے لئے چھو
اور خود اچھی طرح سے چاروں طرف دیکھ بھال کر غار میں داخل ہوگیا۔ میں نے
والی گٹھڑی جھاڑیوں میں ہی چھپادی تھیں۔ میں لوہے کی موٹی سلاخ اور دونوں کو
اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ میں غار کے اندر سے واقف تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ا
آگیا جہاں مٹی کا ڈھیر پڑا تھا۔ ڈھیر پر سے گزر کر میں غار میں اس مقام پر آکر رک
جہاں پل کے ستون کی محرابی دیوار باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ میں نے موم بتی روشن
دیوار کے ساتھ اس طرح لگادی کہ اس کی روشنی صرف دیوار کے ایک خاص حصے تک
پہنچ رہی تھی۔ میں نے کھرپی ہاتھ میں لے کر اس جگہ سے دیوار کو کریدنا شروع
جہاں ستون کی سیمنٹ والی دیوار پہاڑی غار کی مٹی اور پتھر کی دیوار کے ساتھ آکر ل
تھی۔ میں کھرپی اس طرح سے چلانے لگا کہ اس کی آواز پیدا نہ ہو۔ پہاڑ چونکہ مٹی
اس لئے کھرپی چلاتے ہوئے ویسے بھی کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ستون کے
دیوار کی مٹی آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھی۔ درمیان میں کسی جگہ کوئی پتھر آجاتا
لوہے کی موٹی سلاخ کو اندر ڈال کر اسے اکھیڑ کر باہر نکال لیتا اور دوبارہ کھرپی چلانی
کر دیتا۔ میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور کان باہر بھی لگے ہوئے تھے کہ ک
آواز نہ آجائے۔

ابھی تک سب خیریت تھی۔ باہر سے کسی کسی وقت بکری کے ممیانے کی ہلکی
آجاتی تھی۔

مٹی میں پتھر ملے ہوئے تھے۔ جب کوئی پتھر آجاتا تھا تو مجھے کھرپی کی جگہ لو
سلاخ استعمال کرنی پڑتی تھی۔ میں کافی دیر تک اپنے کام میں لگا رہا۔ اس دوران د
کنوئیں کی محرابی دیوار کے ساتھ شگاف پڑگیا تھا جو آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔

طرح کھرپی چلا رہا تھا کہ اس کی کم سے کم آواز پیدا ہوتی تھی۔ اچانک باہر سے فاختہ کی
آواز آئی۔ میرے ہاتھ وہیں رک گئے۔ میں دبے پاؤں چلتا غار میں جو مٹی کا تودہ تھا اس کی
اوٹ میں بیٹھ کر غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ غار کے دہانے سے دن کی روشنی اندر
آرہی تھی۔ مجھے باہر دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ ان میں ایک آواز
صمدو چرواہے کی تھی لفظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ میں تودے کی دوسری طرف سے ہو
کر غار کے دہانے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے سر تھوڑا آگے کر کے دیکھا۔ جہاں میں
اپنی تین بکریاں کھلی چھوڑ آیا تھا وہاں صمدو چرواہے کے پاس ایک بھارتی فوجی کھڑا اس سے
باتیں کر رہا تھا وہ صمدو سے کہہ رہا تھا۔

"تم نے ان بکریوں کو ادھر کیوں چھوڑ رکھا ہے تمہیں معلوم نہیں یہ آؤٹ آف باؤنڈ
ریا ہے؟"

صمدو چرواہے نے کہا۔

"صوبیدار جی جانور اپنے آپ ادھر آگئے ہیں۔ میں ابھی انہیں یہاں سے لے جاتا
وں میں تو خود ادھر نہیں آتا جی"

"ٹھیک ہے۔ ادھر سے بکریاں لے جاؤ اور خبردار اس طرف مت آنا"

"اچھا جی ٹھیک ہے سر!"

اور میں نے دیکھا کہ صمدو بکریوں کو ہانک کر پگڈنڈی پر دوسری طرف لے گیا مگر
ھارتی فوجی کا صوبیدار جس نے ڈوگرہ ہیٹ پہن رکھا تھا اور کاندھے پر سلینگ کے ساتھ
رائفل لٹک رہی تھی وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا مجھے ایسے لگا جیسے اسے کچھ شک پڑ گیا
ہے۔ غار کے دہانے کے آگے اونچی سرکنڈے تھے۔ مجھے بھارتی صوبیدار سرکنڈوں کے
درمیان سے نظر آرہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر ٹہلتا ٹہلتا سرکنڈوں کی طرف آیا۔ میں
دوڑ کر مٹی کے تودے کے پیچھے ہوگیا۔ میری نظریں غار کے دہانے پر لگی تھیں میرا خیال
تھا کہ وہ غار کے اندر آئے گا میرے پاس ریوالور ضرور تھا جس پر سائی لینسر لگا ہوا تھا اور
ریوالور نہ بھی ہوتا تو میں اس بھارتی فوجی کو آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا مگر میں ایسا نہیں کر

سکتا تھا۔ یہ بھارتی فوجی پٹرول ڈیوٹی پر تھا اور اگر یہ واپس اپنی یونٹ میں نہیں جاتا تو
کی تلاش میں دوسرے فوجی سارے علاقے کو کھنگال ڈالتے اور اگر اس کی لاش نہ بھی
تب بھی وہ صمدو چرواہے کو ضرور پکڑ کر لے جاتے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ صمدو
برداشت نہ کرتے ہوئے میرا بھید کھول دیتا۔

چنانچہ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ صوبیدار دور ہی رہے اور غار کے اند
آئے۔ خدا نے میری دعا سن لی اور صوبیدار وہیں سے واپس مڑ گیا۔ جب میں نے
کہ وہ اوپر کی طرف پہاڑی پر چڑھ گیا ہے تو میں نے دوبارہ دیوار کھودنی شروع کر
میں دن ڈھلے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ جب غار میں آتی دن کی روشنی مدھم
لگی تو میں نے کھرپی اور لوہے کی سلاخ اور بڑی کھرپی کو وہیں مٹی کے ڈھیر میں چھپا
بڑی احتیاط سے چلتا ہوا غار سے باہر آگیا۔ باہر میری بکریاں نہیں تھیں۔ بکریاں صمدو
لے گیا ہوا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی اپنی لمبی سوٹی اٹھائی اور چرواہو
طرح درختوں اور جھاڑیوں کی طرف دیکھتا پگ ڈنڈی پر سے گزر کر نیچے چشمے پر آ
گیا۔ چشمے کا پانی پیا۔ منہ دھویا اور وہیں بیٹھ کر صمدو کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد
کو ہانکتا ہوا صمدو بھی آگیا۔ وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ فوجیوں کو کچھ شک پڑ گیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم کچھ دن یہاں
میں نے کہا۔"

"صمدو بھائی یہ تمہارا خیال ہے۔ میں نے تمہیں بھارتی فوجی سے باتیں کر
بھی لیا تھا اور تم دونوں کی باتیں بھی سنی تھیں میرے خیال میں تشویش کی کوئی با
ہے۔ اگر خطرے کی بات ہوئی تو میں اپنے آپ یہاں سے غائب ہو جاؤں گا۔"

صمدو خاموش رہا۔

میں سورج غروب ہونے کے بعد کمانڈو شیروان کی کمیں گاہ میں واپس آگیا۔
ساری بات بتائی۔ وہ بولا۔

"صمدو بے چارے کو ڈر لگا ہے کہ کہیں اس پر کوئی مصیبت نہ آجائے۔ میرا

ہے تم اس کو بتائے بغیر غار میں جانا شروع کر دو۔"

کمانڈو شیروان نے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ اب صمدو چرواہے کی مدد کی مجھے ضرورت
نہیں رہی تھی۔ اگر خطرے والی صورت حال پیدا ہو بھی جاتی ہے تو میں اسے سنبھال سکتا
تھا۔ کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ابھی وہاں کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ جس رفتار سے دیوار میں سوراخ کیا جا رہا ہے اس کے مطابق
ابھی مزید تین چار دن مجھے اکیلے ہی یہ کام کرتے رہنا ہو گا۔

"پہاڑی کی دیوار میں جیسے جیسے اندر کی جانب سوراخ ہو رہا ہے پتھر زیادہ آنے لگے
ہیں۔"

کمانڈو شیروان بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں صمدو چرواہے کو پھر بھی اپنے اعتماد میں لئے رکھنا ضروری ہے
میں اسے خود مل کر سمجھادوں گا کہ اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں غار میں کام کرتا رہا۔ چوتھے دن دیوار میں کنوئیں کی گول دیوار کے ساتھ کافی بڑا
شگاف پڑ چکا تھا۔ پانچویں دن ٹارگٹ کا معائنہ کرنے کے لئے کمانڈو شیروان بھی چرواہے
کے بھیس میں میرے ساتھ غار میں آیا۔ ہم موم بتی کی روشنی میں دیوار کے شگاف میں
رینگ کر اندر تک گئے۔ پہلے میں نے اندر جا کر کنوئیں کی دیوار کی گولائی کو ٹٹول کر
دیکھا۔ پھر کمانڈو شیروان نے اندر جا کر دیکھا۔ وہ باہر آکر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے پل کے گارڈر اسی کنوئیں کے اندر گئے ہوئے ہیں۔ باہر کوئی گارڈر
نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"انجینئرنگ کے نقطہ نظر سے اس کنوئیں کے ساتھ نیچے کی جانب دوسرے کنوئیں کا
ہونا لازمی ہے۔ ہمارا ٹارگٹ دوسرے کنوئیں کے گارڈر ہیں"

کمانڈو شیروان کچھ مایوس نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"تم مجھے صرف تین دن اور دے دو۔ مجھے یقین ہے کہ چوتھے روز میں اپنے ٹارگر پر پہنچ جاؤں گا۔"

کمانڈو شیروان خاموش رہا۔ اگلے روز میں اکیلا ہی غار میں آیا۔ صمد چرواہے کو مر نے تھوڑا بہت حوصلہ ضرور دیا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔ لیکن وہ فکرمند لگ رہا تھا۔ مر نے اپنے کام کی رفتار تیز کر دی۔ پانچویں دن میں نے دیوار میں اتنا شگاف ڈال لیا تھا کہ میں رینگنے کی بجائے گھٹنوں کے بل شگاف کے اندر جا سکتا تھا۔ پانچویں ہی دن تیسرے پہر میں دیوار میں کھرپی سے مٹی کھرچ رہا تھا کہ کھرپی دیوار میں لوہے سے ٹکرائی پہلے تو م سمجھا کہ یہ پتھر کی کوئی سل ہے۔ جب مٹی ہٹائی تو موم بتی کی روشنی میں مجھے گارڈر کا ایک پاؤں نظر آ گیا۔ یہ لوہے کا اینگل تھا جو اوپر سے آتا ہوا نیچے چلا گیا تھا۔ میں نے جلد جلدی نیچے سے مٹی ہٹانی شروع کر دی۔ نیچے سے دوسرے کنوئیں کا گول تھوڑا نمو ہو گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس کنوئیں میں پل کے دوسرے پا دھنسے ہوئے تھے۔ یہ چار چار گارڈروں کا ایک ایک آہنی ستون تھا جو ترچھا ہو کر کنوئیں میں اتر گیا تھا۔ مجھے انہی گارڈروں کی تلاش تھی۔

اس روز جب میں نے کمیں گاہ میں واپس جا کر کمانڈو شیروان کو یہ خوشخبری سنائی اس کے چہرے پر اس مشن کے سلسلے میں جو مایوسی چھانے لگی تھی وہ ایک دم دور ہو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم ٹارگٹ مار لیں گے"

"انشاء اللہ! اب ہمارے مشن کا دوسرا ایکشن شروع ہو گا۔"

دوسرے روز کمانڈو شیروان میرے ساتھ غار میں گیا۔ موم بتی کی روشنی میں نے بھی شگاف کے اندر جا کر لوہے کے گارڈروں کو دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

"یہ پل کا دوسرا پاؤں ہے۔ اصل میں یہی پل کے اس سرے کی بنیاد ہے۔ اگر ہوتا ہے تو پل ایک طرف سے نیچے نالے میں گر پڑے گا۔ اور ہم یہی چاہتے ہیں۔"

میں نے کمانڈو سے کہا۔

"ہمیں ڈائنامیٹ کی سٹکیں اور دوسرا ضروری سامان غار میں لا کر رکھ دینا چاہئے۔"

"یہ کام آج رات کو ہی ہم شروع کر دیں گے۔"

اس رات آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔

آدھی رات کو جب میں اور کمانڈو شیروان بارود کی سٹکیں' ڈیٹی نوٹر اور بجلی کے تاروں کی گٹھڑی خچر پر لاد کر ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوئے تو بجلی چمکنے لگی تھی اور ہلکی بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔ ہم حسب معمول چرواہوں کے بھیس میں تھے اور ہم نے سروں کے اوپر بوریاں ڈال رکھی تھیں۔ ایک لمبا کمانڈو چاقو کمانڈو شیروان کے پاس تھا۔ ایک ریوالور میرے پاس تھا۔

پہاڑی رستہ ہمیں زبانی یاد ہو گیا ہوا تھا۔ ہم ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے پل والی پہاڑی کے عقب میں چشمے پر پہنچ گئے۔ اندھیرے میں چنار اور چیڑھ کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ بونداباندی رک گئی تھی۔ بادلوں میں ہلکی ہلکی بجلی بار بار چمک رہی تھی اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دے جاتی تھی۔ ہم نے خچر کو چشمے پر ہی ایک درخت سے باندھا اور خود اوپر غار کی طرف آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگے۔ یہ چڑھائی زیادہ نہیں تھی۔ ہم جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتے اس جگہ آ گئے جہاں سے پگ ڈنڈی غار کی طرف جاتی تھی۔ ہم وہاں جھاڑیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے اور اندھیرے میں اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔

اوپر پہاڑی کی چوٹی زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں پل کی جانب روشنی ہو رہی تھی۔ ایک دو دفعہ اوپر سے کسی فوجی کے دوسرے فوجی کو بلانے یا کچھ کہنے کی آواز بھی آئی۔ ہم اندھیرے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں نے کمانڈو شیروان کو اشارہ کیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ اوکے۔ اور میں اٹھ کر غار کی طرف چل پڑا۔ چھوٹی سی گٹھڑی میرے ہاتھ میں تھی۔ شیروان میرے پیچھے آ رہا تھا۔ غار کے قریب آ کر میں رک گیا۔ شیروان بھی رک گیا۔ مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ یہ چاپ ایسی تھی جیسے کوئی فوجی جھاڑیوں میں پاؤں رکھتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے شیروان کو اشارہ کیا اور ہم دونوں وہیں بیٹھ

گئے۔

قدموں کی چاپ قریب آرہی تھی۔

میں نے جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ یہ وقت کوئی خطرہ مول لینے کا نہیں تھا۔ درختوں میں گہرا اندھیرا تھا۔ میں آنکھیں پوری کھول کر اس طرف دیکھ رہا تھا مجھے درختوں کے اندھیرے میں ایک انسانی ہیولا آگے بڑھتا نظر آیا۔ یہ ہیولا شیروان نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے میرے بازو کو دبایا۔ ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں تھے۔ ہماری نگاہیں انسانی ہیولے پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بھارتی فوجی تھا جو رات کو پٹرول ڈیوٹی پر تھا وہ ہم سے کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر ہمارے آگے سے گزر گیا۔ اس وقت ہم نے سانس روک رکھے تھے۔ جب بھارتی فوجی اندھیرے میں غائب ہو گیا اور اس کے بوٹوں کی آواز بھی گم ہو گئی تو میں ذرا سا اٹھا اور جھک کر غار کے آگے جو سرکنڈے اگے ہوئے تھے ان کی طرف دبے پاؤں بڑھا کمانڈو شیروان بھی اسی پوزیشن میں میرے پیچھے آرہا تھا۔ سرکنڈوں کے پیچھے آتے ہی میں اور میرے پیچھے کمانڈو شیروان غار کے اندر چلے گئے۔

شیروان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں دیوار کے ساتھ ہاتھ لگائے آہستہ آہستہ اندھیرے میں غار میں بڑھنے لگا۔ جہاں مٹی کا تودہ تھا وہاں ہم آہستہ سے اس کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف چلے گئے۔ کچھ فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں میں نے دیوار میں شگاف ڈال رکھا تھا۔ یہاں مٹی میں نے زمین پر بکھیر دی تھی تاکہ اس کا ڈھیر نہ بننے پائے۔

میں موم بتی جلانے لگا تو کمانڈو شیروان نے سرگوشی میں کہا۔

"یہاں موم بتی نہ جلاؤ۔ شگاف کے اندر جا کر آگے کر کے موم بتی روشن کرو۔"

اس نے صحیح مشورہ دیا تھا شگاف کے باہر موم بتی جلانے سے اس کی روشنی غار میں باہر سے دیکھی جا سکتی تھی۔ میں نے گٹھڑی باہر رکھ دی اور گھٹنوں کے بل دیوار کے شگاف میں داخل ہو گیا۔ چند قدموں کے بعد وہ جگہ آگئی جہاں پل کی بنیادوں کے آہنی گارڈر دوسرے کنوئیں کے فرش میں گڑے ہوئے تھے۔ میں نے وہیں موم بتی روشن کر کے ایک طرف لگا دی اور اسی طرح پیچھے ہٹتا ہوا باہر آیا اور شیروان سے کہا۔

"تم جا کر دیکھ آؤ"

وہ بھی گھٹنوں کے بل شگاف کے اندر تک گیا اور اسی طرح الٹا چلتا ہوا واپس آ کر سرگوشی میں کہنے لگا۔

"آہنی گارڈر کی قینچیاں صاف نظر آرہی ہیں۔ تم جا کر اپنا کام شروع کر دو میں غار کے دہانے کے پاس بیٹھتا ہوں اگر کوئی بھارتی فوجی اس طرف آیا تو میں تمہیں خبردار نہیں کروں گا۔ خود ہی اس فوجی سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کہا۔

"خدا کے لئے شیروان ایسا نہ کرنا۔ جو فوجی پٹرول ڈیوٹی پر ہوتا ہے اگر وہ وقت پر واپس نہ پہنچے تو اس کے ساتھی اس کی تلاشی میں نکل پڑتے ہیں۔ اگر تم نے اسے ہلاک کر ڈالا تو صورت حال زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"تو پھر دعا کرو کہ اس طرف کوئی بھارتی فوجی نہ آئے۔"

یہ کہہ کر کمانڈو شیروان خنجر ہاتھ میں لئے غار کے دہانے کی طرف چلا گیا۔

میں نے ڈائنا مائیٹ کی چوبیس سٹیکس اور ریموٹ ڈیوائس اور بجلی کے باریک تار
گٹھڑی میں سے نکالے اور گھٹنوں کے بل چلتا شگاف کے اندر پل کی بنیادوں کے آہنی
گارڈروں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ موم بتی کی روشنی میں مجھے گارڈروں کی تینوں قینچیاں
صاف نظر آرہی تھیں۔ میں نے بارود کی انتہائی طاقتور سٹکوں اور ڈیٹی نویٹروں کو بڑے
حساب سے گارڈروں کی قینچیوں کے ساتھ تاروں سے باندھنا شروع کردیا۔ یہ کام کرتے
ہوئے میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ شگاف کے اندر گرمی اور حبس تھا۔ بارودی سٹکیں
باندھنے کے بعد میں نے ان کے ساتھ ریموٹ ڈیوائس لگا کر اس کے اندر سے نکلی ہوئی
ایریل کی تار کے ساتھ دوسری تار کو جوڑ کر ٹیپ لگادی۔ یہ ایریل کی تار میرے پاس ایک
گچھے کی شکل میں تھی۔ میں اسے شگاف میں لٹاتا ہوا شگاف سے باہر آگیا۔ باہر آکر میں نے
منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکالی۔ کمانڈو شیروان جو غار کے منہ کے قریب بیٹھا تھا۔
جلدی سے میرے پاس آگیا میں نے اسے کہا۔

"کام مکمل ہو گیا ہے"

ہم نے دونوں کھرپیاں لوہے کی سلاخ کپڑے میں باندھیں اور بموں کے ساتھ لگے
ریموٹ کی تار کے گچھے کو غار کی دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور مٹی اور پتھروں سے دیوار
کے شگاف کو بھرنا شروع کردیا۔ آدھے گھنٹے میں ہم نے دیوار کے شگاف کو صرف اوپر
سے پُر کردیا۔ اب دیوار میں دیکھنے سے کوئی شگاف وغیرہ نظر نہیں آتا تھا۔ کمانڈو شیروان
نے کپڑے کی گٹھڑی اٹھالی اور میں ایریل کی تار کو غار کی دیوار کے ساتھ لگاتا ہوا غار کے

دہانے سے باہر آگیا۔ باہر آکر ہم نے ایریل کے تار کو غار کے اس طرف موڑ دیا جدھر پل کا
رخ تھا۔ ایریل کے تار کو جھاڑیوں میں چھپا کر اس کے سرے کو جھاڑیوں میں سے ذرا سا
باہر نکال دیا۔ اور اس کا رخ بھی پل کی جانب موڑ دیا۔ اس ایریل کے تار نے ہمارے
ریموٹ کنٹرول کے سگنل پکڑ کر شگاف کے اندر پل کی بنیادوں میں آہنی گارڈروں کے
ساتھ لگے بموں میں قیامت خیز دھماکہ کرنا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ایک بار پھر جھاڑیوں کا جائزہ لیا۔ تار ہم
نے سبز رنگ کا خریدا تھا تاکہ وہ جھاڑیوں کا ہم رنگ ہو اور قریب سے بھی نظر نہ آئے۔
اور یہی معلوم ہو کہ جھاڑیوں کی شاخ ہے۔ ہم نے ادھر ادھر سے مٹی اور گھاس وغیرہ توڑ
کر اس تار پر ڈال دیا جو غار کے باہر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی جھاڑیوں میں آئی ہوئی
تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اس طرف کو بھارتی فوجی نہیں آتا۔ صمدو نے بھی ہمیں بتایا تھا کہ
یہ غار ویران پڑا ہے اور یہاں کبھی کسی بھارتی فوجی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے باہر
سے صرف رات کے وقت روزانہ پٹرول پارٹی کا ایک آدھ فوجی گشت لگاتا تھا اور دن کے
وقت بھی کبھار ہی کوئی سپاہی ادھر آنکلتا تھا۔ ورنہ یہ علاقہ خالی پڑا رہتا تھا۔

ہم نے اندھیرے میں ایک دوسرے کے ہاتھوں کو دبا کر وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا اور
اندھیرے میں درختوں اور جھاڑیوں کے عقب سے ہو کر ہم جھک کر چلتے پگڈنڈی کے
آخری موڑ پر آکر نیچے ڈھلان پر آگئے۔ ڈھلان پر ہم آہستہ آہستہ کھسک کر اتر رہے
تھے۔ نیچے چشمے پر پہنچ کر شیروان نے چھوٹی سی گٹھڑی جس میں دونوں کھرپیاں اور لوہے
کی موٹی سلاخ تھی خچر پر رکھی خچر کی باگ تھامی اور اسے لے کر پہاڑی کی دوسری طرف
سے گھاٹی اترتے چلے گئے۔ اب آسمان پر بجلی نہیں چمک رہی تھی مگر بادلوں میں دھیمی
دھیمی گرج سنائی دینے لگی تھی۔ ہم گھاٹی اتر کر نیچے وادی میں آئے تو پہلے موٹی موٹی
بوندھیں گریں پھر مسلسل بارش شروع ہوگئی۔ شیروان نے خچر کو اس پہاڑی پگ ڈنڈی پر
ڈال رکھا تھا جو دوسرے پہاڑی کی طرف جاتی تھی۔ ہمیں اس پہاڑی کے دامن سے گزر
کر اس سے اگلی وادی میں پہنچ کر اس راستے پر پہنچنا تھا جو ہماری کیمپ گاہ کے پہاڑوں کی

طرف جاتا تھا۔ یہ کافی لمبا سفر تھا۔

بارش شروع ہوئی تو کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہمیں خچر پر بیٹھ جانا چاہئے۔"

ہم احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ ایک ہی خچر لائے تھے کہ دو خچروں کا شور نہ ہو۔ ہم خچر پر آگے پیچھے بیٹھ گئے۔ گٹھڑی کھول کر کھرپیاں اور آہنی سلاخ وہیں جھاڑیوں میں پھینکی اور چادر کو اپنے اوپر کر لیا۔ اس سے بارش سے تھوڑا بہت بچاؤ ہو گیا مگر وقتی طور پر کیونکہ سفر لمبا تھا اور بارش ہمارے اوپر برابر برس رہی تھی۔ ہم کسی جگہ رکنا نہیں چاہتے تھے۔ خچر اندھیرے میں سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ مگر ان خچروں کو پہاڑی راستوں پر اور بارشوں میں اور اندھیرے میں بھی چلنے کی عادت ہوتی ہے۔ رات کے وقت وہ آہستہ آہستہ اور راستہ دیکھ دیکھ کر یا محسوس کر کے ضرور چلتے ہیں۔ رات کے تین بج چکے تھے جب ہم واپس اپنی کیمپ گاہ میں پہنچے ہم دونوں بارش میں شرابور تھے۔ کپڑے بدل کر ہم اپنی اپنی جگہوں پر پڑتے ہی سو گئے۔ صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی میں اپنی جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا کہ اپنا ایک مجاہد برین گن اٹھائے میری طرف آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کمانڈو نے بلایا ہے تہہ خانے میں"

میں سیدھا کمانڈو شیروان کے پاس تہہ خانے میں آگیا۔ کمانڈو سبز چائے کا ساوار قریب رکھے چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے میز پر رکھے نقشے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"

اس نے پہلے ہی سے دوسری پیالی میں ساوار میں سے سبز چائے ڈال رکھی تھی۔ نے سبز چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کے پاس سٹول پر بیٹھ گیا۔ لالٹین جل رہی تھی نقشہ وہی پہاڑی پل کا تھا۔

میں نے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات دیکھ رہے ہو کمانڈو؟"

کمانڈو شیروان نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نہیں خیال کہ صرف ایک طرف کی بنیادوں کے اڑانے سے سارا پل گرے گا۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ بارودی سلیں بے حد طاقتور اور انتہائی دھماکہ خیز ہیں اور پھر انہیں پل کی بنیادوں میں گارڈروں سے لگایا گیا ہے۔ ریموٹ کنٹرول کے بٹن دباتے ہی دھماکہ ہو گا اور پہاڑی پل ایک طرف سے نیچے گر جائے گا اور اس کے جھٹکے اور دباؤ سے پل کا دوسری طرف کا حصہ بھی نیچے آن پڑے گا۔ کمانڈو شیروان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم اس پل کی مضبوطی سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ایک سائیڈ کا دھماکہ پل کو اس طرف سے نیچے ضرور جھکا دے گا مگر گرائے گا نہیں اور اگر گر بھی گیا تو دوسری طرف سے پل کو کچھ نہیں ہو گا۔ ادھر سے پل اپنے گارڈروں پر کھڑا رہے گا اور بھارتی انجینیئرنگ کور کے افسر اسے ایک ہی دن میں پھر سے ٹھیک کر دیں گے اور ہماری ساری محنت بھی ضائع ہو گی اور نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلے گا۔"

کمانڈو شیروان کی گفتگو سے میں بھی سوچ میں پڑ گیا کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"تم یہ سمجھ لو کہ اگر اس دوران بھارتی فوجیوں کو ہماری لگائی ہوئی تاروں کا سراغ نہ ملا تو آدھے پل کو ہم نے تباہ کر دیا ہے۔ اب باقی کا آدھا پل تباہ ہونا باقی ہے اور جب تک باقی کا آدھا پل تباہ نہیں ہو گا پورا پل نہیں گرے گا"

میں نے شیروان سے پوچھا۔

"پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

"ہمیں دوسری طرف سے بھی پل کو اڑانا ہو گا۔"

یہ ایک دوسرا اور بالکل نیا مشن تھا جس کے لئے ہمیں پل کی دوسری طرف کی پہاڑی کا پورا سروے کرنا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہاں پر کوئی ایسا غار نہ ہو جس کی دیوار کھود

کر ہم پل کی بنیادوں میں بم لگا سکیں۔ اس کام میں وقت بھی لگ سکتا تھا اور جو بم ہم لگا
چکے تھے اس کے بارے میں خطرہ تھا کہ اس کے ایریل کے تار پر کسی وقت بھی بھارتی
فوجیوں کی نظر پڑ سکتی ہے۔ میں نے جب ان خدشات کا اظہار کیا تو کمانڈو شیروان نے
بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ کہا۔

"دوست ٹارگٹ کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لئے ہمیں یہ خطرات تو مول لینے ہی
پڑیں گے۔ اب تم یہاں بیٹھو گے میں پل کے دوسرے سرے کے سروے خود کروں گا۔"

اسی روز ناشتے کے بعد کمانڈو شیروان بکروان کے بھیس میں خچر پر سوار ہوا' ایک بکری
کا بچہ گود میں اٹھایا اور پہاڑی والے پل کے دوسرے سرے کا جائزہ لینے نکل پڑا۔ بارش
رات بھر ہوتی رہی تھی اور صبح کے وقت رک گئی تھی۔ کمانڈو شیروان دن ڈھلے واپس
آیا۔

اس نے بتایا کہ پل کے دوسرے سرے پر بھارتی فوج کی دو مشین گن پوسٹیں ہیں
اور ایک ٹینک پل کے شروع میں ایک طرف ہر وقت پوزیشن میں کھڑا رہتا ہے۔ شیروان
نے کہا۔

"پل کے دوسرے سرے پر گارڈروں کی قینچیاں محراب کی شکل میں پہاڑی چٹان
کے اندر تک گئی ہوئی ہیں۔ ان کے نیچے فوج کی مشین گن پوسٹیں ہیں۔ وہاں کوئی ایسی
سرنگ بھی نہیں ہے کہ جس کی دیوار میں شگاف ڈال کر ہم پل کے گارڈروں تک پہنچ
سکیں"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اسی طرف سے پل کو تباہ کرنے کے لئے ہمیں کوئی دوسرا
منصوبہ سوچنا پڑے گا۔"

شیروان بولا۔

"ابھی تک ایسا کوئی منصوبہ میرے ذہن میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں ہر حال میں
جانب سے پل کو دھماکے سے اڑانا ہوگا۔ ورنہ پورا پل کبھی تباہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈو شیروان! یہ تم بھی بخوبی جانتے ہو کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہم
نے پل کے ایک سرے میں ڈائنا مائیٹ لگا دیا ہوا ہے اور ریموٹ کی تار بھی جھاڑیوں میں
باہر نکال رکھی ہے۔ یہ صورت حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت بھارتی فوج کو اس کا علم ہو
سکتا ہے۔ اور ایریل کی تار کی مدد سے وہ بڑی آسانی سے غار کے اندر دیوار کے شگاف میں
پہنچ کر گارڈروں سے ڈائنا میٹ کی سٹکیں اتار سکتے ہیں۔"

کمانڈو شیروان گہری سوچ میں تھا کہنے لگا۔

"میں اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوں۔ مجھے تم صرف آج کی رات اور کل کا
دن دے دو اس دوران تم چرواہے کے بھیس میں غار کے باہر جھاڑیوں کا ایک بار معائنہ
کر آؤ کہ ایریل کی تار وہاں محفوظ ہے یا نہیں"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آج رات ہی وہاں جا کر پوزیشن چیک کروں گا۔"

"میں پل کی دوسری جانب جا کر وہاں کے علاقے کا تفصیل سے جائزہ لوں گا۔"

اسی دن رات کو جب کشمیر کی پہاڑیوں میں اندھیرا چھا گیا تو کمانڈو شیروان اپنے مشن
پر اور میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ ہم دونوں اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف الگ الگ خچر
پر سوار ہو کر گئے تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ بادلوں کے باوجود بارش رکی ہوئی تھی۔
میں دو گھنٹے کی پہاڑی مسافت طے کرنے کے بعد پہاڑی غار کے نیچے چشمے پر پہنچا۔ خچر میں
نے وہیں باندھ دیا اور خود اندھیرے میں جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر غار کے سرکنڈوں
کے قریب پہنچ کر زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ پہاڑی کے اوپر فوجی چوکی پر حسب معمول
رات کو روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ خطرہ صرف رات کو گشت لگانے والی پٹرول پارٹی کا تھا۔
میں دیر تک جھاڑیوں کے پیچھے زمین پر لیٹا فضا کا اندھیرے میں جائزہ لیتا رہا۔ جب مجھے
یقین ہو گیا کہ اس طرف کوئی پٹرول پارٹی نہیں آرہی تو میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا اس
جھاڑی کی طرف بڑھا جس میں ہم نے انتہائی طاقتور دھماکہ خیز بموں کا ریموٹ کا تار غار

کے اندر سے لا کر جھاڑیوں کی ایک شاخ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ زمین گھاس
جھاڑیاں گزشتہ روز کی بارش کی وجہ سے گیلی اور مرطوب تھیں جس کے باعث یہ
رینگنے سے سرسراہٹ کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میں مطلوبہ جھاڑی کے پاس
اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ایریل کے تار والی جھاڑی کو نیچے جھک کر
سبز رنگ کا باریک تار آگے سے چھپلا ہوا تھا اور جس طرح ہم اسے باندھ گئے تھے
طرح بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور نیچے کر کے جھاڑی کی شاخوں میں چھ
مجھے معلوم تھا کہ ریموٹ کنٹرول کے سگنل یہ تار پکڑ لے گا۔

جب مجھے تسلی ہو گئی کہ ایریل کا تار محفوظ ہے اور دن کی روشنی میں بھی نظر نہ
آسکتا تو میں پیچھے کو گھوم کر کہنیوں کے بل رینگتا ہوا پگڈنڈی کے درختوں کے پیچھے
اور وہاں سے جھک کر چلتا ہوا ڈھلان اتر کر چشمے پر آگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ خچر اسی
خاموش تھا اور اندھیرے میں گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ میں نے اس کی باگ پکڑی اور
گھاٹی کی جنگلی جھاڑیوں میں سے گزار کر اس جگہ پر لے آیا جہاں چنار کے گھنے درخت
کے درمیان میں سے نیچے وادی کو راستہ جاتا تھا۔ اس وادی میں سے نکل کر مجھے
پہاڑی کے اوپر سے ہو کر اس جگہ پہنچنا تھا جو ہماری خفیہ کمیں گاہ کا خاص نشان تھا۔
میں خچر پر بیٹھ گیا تھا۔

خچر اندھیری رات میں پہاڑی گھاٹی پر بڑی احتیاط سے نیچے اترائی اتر رہا تھا۔ وادی میں
بھی گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں چاول اور جوار کے دو چار کھیت تھے۔ ان کی فصل
تھی۔ میں کھیتوں میں کھڑی فصل کو اوٹ بنا کر دو کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی مینڈھ
رہا تھا کہ خچر نے منہ سے خرخرانے کی عجیب سی آواز نکالی۔ جانور کو قدرت نے
خاص حس عطا کی ہوئی ہے جس کی مدد سے وہ اردگرد کسی انسان کی موجودگی کو محسوس
لیتا ہے۔ مجھے ان جانوروں کا اپنے کمانڈو آپریشنز کے دوران کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ میں
گیا کہ کوئی انسان آس پاس موجود ہے۔ میں خچر سے نیچے اتر آیا۔ میں نے چرواہا
جو لمبا کرتہ یعنی فرن پہنا ہوا تھا اس کے نیچے میں نے صدری بھی پہن رکھی تھی

صدری کی جیب میں سائی لینسر والا بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ وادی کشمیر کی رات خنک
تھی۔ اندھیرا ضرور تھا مگر اونچی فصل دکھائی دے رہی تھی۔ فضا میں فصل کی مرطوب
خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے خچر کو ایک جگہ فصلوں کی اوٹ میں کھڑا کر دیا اور یہ دیکھنے
کے لئے دبے پاؤں آگے بڑھا کہ اگر خچر نے کسی انسان کی موجودگی کا احساس کیا ہے تو کیا
یہ صحیح ہے؟

جوار کی فصل تھی یا باجرے کی یہ مجھے اچھی طرح معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال اونچی
ضرور تھی۔ کھیت چند قدم چلنے کے بعد ختم ہو گیا۔ ابھی میں فصل کی اوٹ میں ہی تھا کہ
مجھے عورت کے رونے بلکہ سسکیاں بھرنے کی دبی دبی سی آواز آئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔
میں نے ذرا آگے ہو کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے انسانی سایوں کا جو منظر نظر
پڑا وہ یہ تھا کہ یہ دو آدمی تھے دونوں فصل کی مینڈھ پر کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک
عورت زمین پر بیٹھی بین کرنے کے انداز میں دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اتنے میں جو
دونوں آدمی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے خاص ڈوگرہ فوجی زبان میں کہا۔

"اس کا منہ کیا دیکھ رہے ہو حوالدار مرلی رام تیری چاچی نہیں لگتی۔"

اس جملے کو سن کر دوسرے آدمی نے زمین پر بیٹھی ہوئی عورت کے دونوں ہاتھ پکڑ
کر اسے کھینچنا بلکہ گھسیٹنا شروع کر دیا۔ عورت گھسٹتے ہوئے بھی روئے جا رہی تھی۔ مجھے
سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ دونوں آدمی ڈوگرہ فوج کے جوان تھے۔ ان میں
ایک حوالدار تھا جس کا نام مرلی رام تھا۔ دوسرا بھی سپاہی یا نائیک یا لانس نائیک ہو گا اور
دونوں ہندو ڈوگرے تھے اور عورت یقینی طور پر مسلمان مظلوم کشمیری خاتون تھی جس کو
یہ لوگ پکڑ کر اپنی چوکی پر لے جا رہے تھے۔ حوالدار مرلی رام نے غصے میں اپنے ساتھی
سے کہا۔

"اوئے گیان چند تمہیں فوج میں کس نے بھرتی کر لیا تھا؟ اس کو اٹھا کر کاندھے پر
ڈالو۔ یہ گن مجھے دے دو"

ان دونوں کے پاس میں نے اندھیرے میں دو رائفلیں دیکھ لی تھیں۔ میں نے

صدری کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ گیان چند سپاہی نے واقعی کشمیری عورت کو اٹھالیا۔
عورت تڑپ کراس کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

اس دوران معلوم نہیں کیسے ان دونوں ڈوگروں کو میری موجودگی کا پتہ چل گیا۔
حوالدار مرلی رام نے رائفل سیدھی کرلی۔ اس کا رخ اندھیرے میں میری طرف تھا۔ میں
پیچھے ہٹ گیا وہ بولا۔

"دگیانے شاہ ادھر کوئی آدمی ہے۔"

دوسرے فوجی نے بھی رائفل سیدھی کرلی۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں حوالدار مرلی رام چھلانگ لگا کر میرے سامنے
آگیا۔

"کون ہو اوئے تم؟"

میں نے بیٹھے بیٹھے پہلا کام یہ کیا کہ ریوالور کو لمبے کرتے کی سائیڈ والی جیب میں ڈال
دیا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے ڈوگرے کو پتہ نہ چل سکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہاتھ
کھڑے کر دیئے اور دہائی دینے لگا۔

"صوبیدار جی میں کسان ہوں کھیت میں پانی لگانے آیا تھا حضور! مجھے گولی نہ مارنا۔"

میں نے ایک ڈرے ہوئے کسان کی پوری پوری اداکاری کی۔ دوسرا ڈوگرہ بھی اس
دوران کشمیری لڑکی کو گھسیٹتا ہوا میرے پاس آگیا۔

"یہ جھوٹ بکتا ہے حوالدار۔ یہ کشمیری کمانڈو ہے اس کی تلاشی لو۔"

اب میرے فل ایکشن کا وقت آگیا تھا۔ بلکہ دونوں ڈوگرے خود اپنی موت کو بلا کر
وہاں لے آئے تھے۔ ظاہر ہے میرے لمبے کرتے کی پہلو والی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا
اور میری تلاشی لینے کی صورت میں وہ یہ ریوالور نکال لیتے اور پھر انہیں یقین ہو جاتا کہ
میں کشمیری کسان نہیں ہوں بلکہ کمانڈو ہوں۔ میرے پاس تین چار سیکنڈ ہی تھے۔

حوالدار میری تلاشی لینے کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"صوبیدار جی! میری جیب میں چار روپے ہیں۔ وہ لے لیں بے شک تلاشی لے کر

دیکھ لیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس طرح لمبے فرن کی پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالے
جیسے جیب میں سے چار روپے نکال کر انہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے
تھے کہ میری جیب میں سائی لینسر والا بھرا ہوا ریوالور ہوگا۔ میں نے ان کی منتیں کرتے
اور عاجزی سے گڑگڑاتے ہوئے جیب میں سے ریوالور نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر
کئے۔ میں نے کوئی خاص نشانہ نہیں باندھا تھا۔ ایسا کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ بس ایک
فائر حوالدار مرلی رام کے جسم کو ٹارگٹ بنا کر اور دوسرا فائر دوسرے ڈوگرے کے جسم کو
ٹارگٹ سمجھ کر فائر کر دیا۔ اتنا خیال میں نے ضرور رکھا تھا کہ گولی ان کے سینے میں دل کی
طرف لگے۔ میں حیران رہ گیا۔ دونوں ڈوگرے گولیاں کھانے کے بعد اپنی جگہوں پر کھڑے
رہے لیکن ان کے ہاتھوں سے رائفلیں نیچے کو ہو گئی تھیں۔ میں نے ایک سیکنڈ ضائع کئے
بغیران پر ایک ایک فائر اور کردیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تو آگے کو گر پڑا اور دوسرا پہلو
کے بل فصل میں گر گیا۔ کشمیری عورت پر جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ وہ زمین پر جہاں
بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ میں نے دونوں ڈوگروں کی رائفلیں اٹھا کر کھیت کی طرف
اچھال دیں اور عورت سے کہا۔

"بہن! فکر نہ کرو۔ میں تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔ تمہیں جہاں جانا ہے مجھے بتاؤ۔
میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

کشمیری عورت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے اس کے کانوں میں
پھولوں کے گچھے سے نظر آئے۔ یہ پھولوں کے گچھے نہیں تھے۔ چاندی کی ڈنڈیاں تھیں
جو اس نے اپنے کانوں میں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر عورت نے
کشمیری زبان میں خدا سے کچھ کہا۔ شاید وہ خدائے عزوجل کا شکر ادا کر رہی تھی کہ جس
نے عین وقت پر ایک مسلمان کو بھیج کراس کی عزت کو داغ دار ہونے سے بچالیا میں نے
کہا۔

"مجھے جلدی سے بتاؤ تمہیں کہاں چھوڑنا ہے۔ میرے پاس ایک خچر ہے۔"

میں پیچھے جا کر خچر کو آگے لے آیا۔ کشمیری دیہاتی عورت نے ٹوٹی پھوٹی اردو پنجابی اور کشمیری میں بتایا کہ اس کا گھر پیچھے گاؤں میں ہے۔ یہ ڈوگرے اسے گاؤں سے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میں نے اس کشمیری عورت کو خچر پر بٹھایا اور اسے اس کے ماں باپ کے پاس گاؤں میں پہنچانے کے بعد وہیں سے کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کی طرف چل پڑا۔

وہاں تک پہنچتے پہنچتے آسمان پر صبح کا نور پھیلنے لگا تھا۔ کمانڈو شیروان بھی ابھی تک اپنے مشن سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ دن چڑھے آیا میں نے اسے رات والا واقعہ سنانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے کہا کہ میں پل کے غار کا پورا جائزہ لے آیا ہوں اور سب کچھ ٹھیک حالت میں ہے اور ابھی تک اس طرف کسی انڈین فوجی کی نظر نہیں گئی کمانڈو شیروان نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر اس نے اپنے مشن کی روئیداد سناتے ہوئے کہا۔

"پل کے دوسرے سرے پر سیکورٹی کا انتظام بے حد سخت ہے۔ رات کے وقت پل پر بڑی سرچ لائٹ روشن رہتی ہے اور فوجی کانوائے کی گاڑیاں رات کے وقت بھی پل پر سے گزرتی رہتی ہیں۔"

میں نے ساری تفصیل سننے کے بعد کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس طرف سے تمہارا پل کو اڑانے کا جو منصوبہ تھا اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔"

کمانڈو نے کہا۔

"میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اگر اس طرف سے ہم نے پل کو بارود لگا کر نہ اڑایا تو صرف ایک طرف کے دھماکے سے پل پوری طرح تباہ نہیں ہو گا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہو گا؟"

میرے اس سوال پر کمانڈو شیروان نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا اور میری طرف تھوڑا سا جھک کر کہنے لگا۔

"صرف ایک طریقہ رہ گیا ہے جس پر اگر ہمارا کمانڈو آپریشن کامیاب ہو گیا تو پل کا

نام و نشان باقی نہ رہے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ طریقہ کون سا ہے؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"میں نے اپنے اس کمانڈو مشن میں بہت سی مفید اور خفیہ معلومات حاصل کی ہیں۔ پل کی اس جانب درختوں کے درمیان فوجی لنگر ہے جہاں اس پل پر تعینات ڈوگرہ فوجیوں کے لئے کھانا وغیرہ پکتا ہے اور چائے کا بڑا پتیلا ہر وقت چڑھا رہتا ہے۔ مجھے اپنے خفیہ ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہفتے میں دوبار آدھی رات کے بعد پل پر سے گولہ بارود اور اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرک گزرتے ہیں۔ یہ ٹرک رات کے وقت اس لئے گزارے جاتے ہیں کہ کشمیری حریت پرستوں کو ان کی خبر نہ ہو سکے۔ کیونکہ پیچھے کانواؤں پر ہمارے مجاہد دن کے وقت ہی گھات لگا کر اٹیک کرتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان ٹرکوں پر ٹینکوں اور مارٹر گنوں کے گولوں کی بھاری تعداد لدی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے آگے پیچھے ہر دوسرے ٹرک کے درمیان حفاظت کے طور پر ایک آرمرڈ گاڑی بھی ہوتی ہے۔"

جب کمانڈو ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہمیں ان ٹرکوں کو اڑانا ہو گا؟ یہ کیسے ممکن ہے تم خود کہتے ہو کہ اس کانوائے پر سیکورٹی بے حد سخت ہوتی ہے اور کوئی پرندہ بھی ان کے نزدیک نہیں آ سکتا۔"

کمانڈو شیروان بولا۔

"میں نے تم سے ایک رات اور ایک دن کی مہلت مانگی تھی۔ رات گزر گئی ہے ابھی دن کی مہلت کا ٹائم باقی ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد اس قریبی گاؤں میں جا رہا ہوں۔ جہاں کے گوالے اس فوجی لنگر کو دودھ اور مکھن وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔"

کمانڈو شیروان ایک گھنٹے بعد دوبارہ کمیں گاہ سے نکل گیا۔ اس نے سارا دن لگا دیا۔

جب شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے تو وہ واپس آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا
تھا۔ کہنے لگا۔

"آج رات تم میرے ساتھ گوالوں کے گاؤں میں جاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں
تمہارے سامنے ساری باتیں ہوں۔"

ہم نے رات کا کھانا کھایا اور خچروں پر بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں پل والی پہا
کے قریب گوالوں کا جو گاؤں تھا اس طرف چل پڑے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں
باہر باڑے میں مویشی بندھے ہوئے تھے۔ کمانڈو مجھے ایک مکان میں لے گیا جہاں ا
تنگ سا لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا کمرہ تھا۔ ایک نوجوان کشمیری گوالے نے دروازہ کھول کر ہمارا
مقدم کیا۔ کوٹھڑی میں لالٹین روشن تھی۔ گوالے نے اپنی بیوی کو دوسری کوٹھڑی م
جانے کے لئے کہا۔ ہمیں سبز چائے پیالوں میں ڈال کر پیش کی اور باتیں شروع ہو گئیں
کمانڈو شیروان اس گوالے سے ساری بات کر چکا تھا۔ یہ کشمیری گوالا ہماری مدد کرنے
لئے تیار ہو گیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ہفتے میں ہر بدھوار اور ہفتے کی رات کو پل پر سے گولہ بارود اور اسلحہ سے بھ
ہوئے ٹرکوں کا کانوائے گزرتا ہے یہ سارا ایمونیشن جموں چھاؤنی سے آتا ہے اور وا
میں مقیم بھارتی فوج کو سپلائی ہوتا ہے جسے وہ مسلمان کشمیریوں کے خلاف استعمال کر
ہیں اور ان کا بے دریغ خون بہاتے ہیں۔"

کمانڈو شیروان نے گوالے سے کہا۔

"کیا یہ کانوائے پل کے پیچھے کسی جگہ ٹھہرتا بھی ہے؟"

یہ سوال کرتے ہوئے کمانڈو شیروان نیم متبسم چہرے کو میری طرف کئے ہوئے تھ
ایسے لگتا تھا کہ اس کا جواب وہ مسلمان کشمیری گوالے سے پہلے سن چکا ہے اور ا
میرے سامنے اس جواب کو دہرانا چاہتا ہے۔ گوالے نے کہا۔

"یہ کانوائے پل سے تھوڑا پیچھے آکر پہاڑی سڑک پر ایک طرف ہو کر رک
ہے۔ ساری گاڑیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے پہاڑ کی دیوار کے ساتھ لگی ہوتی ہیں

فوجی ٹرکوں سے اتر کر اس کے سامنے رائفلیں اور برین گنیں لے کر پہرے پر کھڑے ہو
جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ کانوائے یہاں کس لئے رکتا ہے؟"

گوالا کہنے لگا۔

"یہاں چونکہ فوجی کینٹین یعنی لنگر ہے اس لئے پیچھے بانہال اور بٹوت سے مسلسل
چلے آرہے کانوائے کے فوجیوں کو چائے اور ایک ایک پراٹھا دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ
تازہ دم ہو جاتے ہیں"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"کانوائے پہاڑی سڑک پر کتنی دیر تک رکا رہتا ہے اور کانوائے میں گولہ بارود کے
کتنے فوجی ٹرک ہوتے ہیں؟"

کشمیری گوالے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک طرح سے تو نہیں بتا سکتا۔ ایک بار ہفتے کی رات کو میں دودھ کے ولٹوہے لے
کر فوجی لنگر خانے گیا تھا تو بارش بڑی تیز شروع ہو گئی تھی اور مجھے رات فوجی لنگر کے چھپر
تلے ہی گزارنی پڑی تھی۔ اس رات میں نے اس فوجی کانوائے کی گاڑیوں کو آکر پیچھے
سڑک پر رکتے دیکھا تھا۔ لنگر کے ڈانگریوں نے مجھے بھی کانوائے کے ڈوگرہ اور سکھ
فوجیوں کو چائے پراٹھے سپلائی کرنے پر لگا یا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ کانوائے کے ٹرک
کتنے ہی تھے۔ میں نے گنے تو نہیں تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ پندرہ بیس ٹرک تو ضرور
ہوں گے۔"

کشمیری گوالے نے ہمیں مزید بتایا کہ یہ فوجی ٹرک پل سے آدھا فرلانگ پیچھے کوئی
آدھے گھنٹے تک کھڑے رہتے ہیں۔ اس دوران کانوائے کے ڈرائیور اور دوسرے فوجی
گاڑیوں سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے کے ساتھ گرم پراٹھے
کھاتے ہیں۔ سگریٹ اڑاتے ہیں اور آپس میں بڑا فحش مذاق کرتے رہتے ہیں۔ آدھے

گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور کانوائے پل پر سے گزرنا
شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟"

"میرا پلان یہ ہے کہ جب ان دھماکہ خیز اسلحہ بارود سے لدے ہوئے ٹرکوں کا
کانوائے ٹھیک پہاڑی والے پل کے اوپر سے گزر رہا ہو تو ان ٹرکوں کے گولہ بارود کو آگ
لگ جائے اور سارے ٹرکوں کا ایمونیشن پھٹ جائے۔ اس کے ساتھ ہی بم ریموٹ
کنٹرول سے پل کے دوسرے سرے کی بنیادوں کے گارڈروں سے لگائے ہوئے بم بلاسٹ
کردیں گے۔ ایک طرف سے زبردست دھماکے کے بعد پل کا ایک حصہ نیچے بیٹھ جائے گا
جب کہ دوسری جانب پل پر لاکھوں ٹن ایمونیشن کے دھماکوں کے ساتھ ہی پل کے جلتے
اور پھٹتے ہوئے فوجی ٹرکوں کے ساتھ ہی پرخچے اڑ جائیں گے۔"

کمانڈو شیروان کی ان حالات میں یہی ایک قابل عمل سکیم تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"اس کے سوائے مجھے کوئی منصوبہ ایسا نظر نہیں آتا کہ جس پر عمل کرنے سے
پورے کا پورا پل اڑ سکے۔ ہم انگریزی میں اس لئے باتیں کرنے لگے تھے کہ منصوبے کی
تفصیلات اس کشمیری گوالے سے بھی خفیہ رہیں۔ اگرچہ وہ کشمیری مجاہدوں کے ساتھ تھا
اور حریت پسند کشمیریوں کے ساتھ مل کر دوچار کمانڈو آپریشنز میں بھی حصہ لے چکا تھا۔
لیکن منصوبے کے اصل متن کی رازداری بہرحال ضروری تھی۔ اس خیال سے کہ اسے
یہ محسوس نہ ہو کہ ہم انگریزی میں اس لئے باتیں کر رہے ہیں کہ کچھ باتیں اس سے چھپا
چاہتے ہیں میں نے اردو میں گفتگو کرتے ہوئے گوالے سے کہا۔"

"معاف کرنا بھائی! ہمیں کچھ عادت سی پڑ گئی ہے کہ جب ہم کسی ٹارگٹ پر ایک
کرنے کی باتیں شروع کرتے ہیں تو اپنے آپ انگریزی میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ م
چنا کہ ہم تم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

کمانڈو شیروان نے بھی اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہم بھارتی فوج کے ایمونیشن کے کانوائے کو عین اس وقت دھماکوں سے اڑانے کی
کر رہے تھے جب کانوائے کی ساری گاڑیاں پل پر پہنچ گئی ہوں"

گوالے نے کہا۔

"یہ کام مجھے مشکل لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسا کیسے ممکن ہے کہ ہم فوجی گاڑیوں
میں اس وقت دھماکے کروانے میں کامیاب ہو سکیں جب وہ پل کے اوپر سے گزر رہی
ہوں؟"

میں نے گوالے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بھائی غلام محمد یہ سارا کام ہم خود ہی کرلیں گے۔ تمہیں صرف ہماری تھوڑی سی مدد
ہوگی۔"

گوالے کا نام غلام محمد تھا کہنے لگا۔

"میں آپ لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ بھارتی غاصب فوجیوں کے
اور پل کو اڑاتے ہوئے اگر میں خود بھی اڑ جاؤں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی
گا۔"

میں نے اس سے کہا۔

"لیکن نوبت نہیں آئے گی۔ ایمونیشن کے ٹرکوں کے ساتھ نہ تم اڑو گے نہ ہم
گے صرف فوجی ٹرک اڑیں گے۔ بھارتی فوجی اڑیں گے اور پل اڑے گا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آپ مجھے حکم کریں"

گوالے غلام محمد نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا۔ اسے کیا کرنا تھا کمانڈو شیروان نے
پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا۔ یہ سارا پروگرام کمانڈو شیروان کے ذہن میں پہلے
تیار تھا۔ میں نے بھی کمانڈو ایکشن کی تفصیل کو بڑے غور سے سنا۔ میرے حساب
نڈو شیروان نے کانوائے کو اڑانے کا جو پلان بنایا تھا وہ اس اعتبار سے حرف آخر تھا
کے سوائے ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ گوالے مجاہد نے کمانڈو شیروان کی
پوری توجہ سے سنا۔ جب شیروان نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتا دو۔ کوئی دقت ہو تو بتا دو"

گوالے مجاہد نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ صرف آپ لوگوں کو گوالوں کے بھیس میں ملٹری بر
میں جانے کے بعد ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی ہوگی کہ کسی فوجی کو آپ پر ذرا سا بھی ش
پڑے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

بات یہ تھی کہ جس رات پل پر سے فوجی کانوائے نے گزرنا ہوتا تھا اس روز
کینٹین یعنی لنگر میں شام کے وقت بھی فالتو دودھ سپلائی ہوتا تھا کیونکہ دس پندرہ
کے فوجیوں کے لئے چائے بنانی ہوتی تھی۔ اس روز جمعے کا دن تھا۔ دوسرے روز ہ
اور ہفتے کی رات کو ایمونیشن لے کر بھارتی فوجیوں کے کانوائے نے پل پر سے گزر
اور پل سے آدھی فرلانگ پیچھے کانوائے نے آدھ گھنٹے کے لئے پہاڑی سڑک کے کن
رکنا تھا اور کانوائے کے پچاس کے قریب فوجیوں کو پراٹھے اور چائے سپلائی کرنا
جس رات کانوائے نے گزرنا ہوتا تھا اس شام کو غلام محمد گوالا دودھ کے تین ولٹو
لے کر جاتا تھا۔ یہ ولٹوہے اس نے ایک خچر پر رکھے ہوتے تھے اور اس کے ساتھ
ایک بھائی بھی ہوتا تھا۔ طے یہ ہوا کہ کل شام کو اس کے ساتھ فالتو ولٹوہے لے
اور کمانڈو شیروان گوالوں کے بھیس میں جائیں گے۔ غلام محمد وہاں یہ ظاہر کرے گا
کا بھائی بیمار تھا اس لئے یہ اس کے خالہ زاد گوالے بھائی ہیں جو اس کے ساتھ د
ولٹوہے اٹھا کر لائے ہیں۔ ہمیں دوسرے روز شام کو گوالے غلام محمد کے گھر پہنچنا
پورا منصوبہ طے کرنے کے بعد ہم واپس آگئے۔ میں نے کمیں گاہ میں آ
شیروان سے کہا۔

"اب ہمیں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پھٹنے والے ایسے دھماکہ خیز مواد کی
ہے جو بارود کی سنکوں کی شکل میں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں اتنا موقع نہیں ملے گا
باری دس پندرہ ٹرکوں میں بارودی سنکیں لگا سکیں۔ اس کے لئے چھوٹے سے
انتہائی طاقتور ڈیوائس ہونا چاہئے کیا آپ لوگ ایسا کوئی انتظام کر سکیں گے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے ٹھکانوں پر بھی شب
مارتے رہتے ہیں۔ ہم ان سے حاصل کیا ہوا اسلحہ ہی ان کے خلاف استعمال کرتے
ہمارے پاس انتہائی طاقتور اور جدید ترین ایسے ڈیوائس موجود ہیں میں تمہیں دکھاتا
"

کمانڈو شیروان اٹھ کر تہہ خانے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبے کا ڈھکنا
کر میرے سامنے رکھ دیا ڈبے کے اندر نسواری رنگ کے کیپسول تھے۔ کمانڈو
ان نے ایک کیپسول نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور کہنے لگا۔

"یہ چھوٹا سا کیپسول اس قدر طاقتور بم ہے کہ اس کا دھماکہ پوری بلڈنگ کے پرخچے
تا ہے۔ یہ ایک کیپسول ہم ایمونیشن کے ہر ٹرک میں موقع پا کر ڈال دیں گے۔ اس
ت ہمارے ریموٹ کنٹرول کے ساتھ ہوگا۔ یہ ریموٹ ریڈیو ویوز سے کنٹرول ہوتا
"

اس نے مجھے ڈبے کے نیچے سے ایک چھوٹے کیلکولیٹر کی طرح کا ریموٹ کنٹرول
کر دکھایا۔ اس پر سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے کتنے ہی بٹن بنے ہوئے تھے۔ کمانڈو
ہا۔

"یہ بیس پوائنٹ ہیں۔ ان کو باری باری دبا کر ہم بیس کیپسول بموں کے دھماکے کر
یں۔ یہ ہائی ٹیکنیکل ڈیوائس بھارتی فوج کو بھی پچھلے سال ہی سپلائی ہوئے ہیں۔ یہ
کل نے بھارت کو دوسرے جدید اسلحے کے ساتھ دیئے ہیں جسے بھارت کشمیر میں
نوں کے گھروں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔"

کمانے جیب میں سے اپنا وہ ریموٹ کنٹرول نکالا جس کے ساتھ پل کے دوسرے
کے نیچے گارڈروں کے ساتھ لگے ہوئے بموں کا رابطہ تھا اور جس کے ایک بٹن
سے ان بموں نے پھٹ جانا تھا۔ یہ ریموٹ پرانے ماڈل کا تھا اور اس کے لئے

اریل کے تار کا ہونا ضروری تھا۔ جب کہ کمانڈو شیروان کے ریموٹ کنٹرول سے
شعاعیں نکال کر کیپسول کے بموں میں دھماکہ پیدا کرتی تھیں۔ ان کے لئے ایر
تاروں کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"ہم یہ سارے کیپسول بم ساتھ لے چلیں گے ہو سکتا ہے کانوائے میں بہ
ہی ہوں"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

اس روز ہم دونوں نے اپنا حلیہ کشمیر کے دیہاتی گوالوں جیسا بنا لیا۔ کمانڈو
خود بھی کشمیری تھا۔ اسے کشمیر کے گوالوں کے کلچر کا پورا علم تھا۔ ہم نے ویسا ہی
بنایا۔ ہاتھوں میں ایک ایک چھڑی رکھ لی جس سے گوالے بھینسوں وغیرہ کو ہانکا کرتے
سر پر گوالوں والی پرانی میلی کچیلی ٹوپیاں رکھ لیں۔ اس روز ہم نے شیو بھی نہ بنائی
میں بان یعنی پیال کے بنے ہوئے جوتے پہن لئے اور خچروں پر بیٹھ کر دن کے دو
گوالے غلام محمد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم اس کے گھر پہنچے تو دن کے چار بج رہے تھے۔ کیپسول بموں کا ڈبہ کمانڈو
کے لمبے فرن کی جیب میں تھا۔ ریموٹ کنٹرول بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس
اس نے ایک پستول بھی رکھ لیا تھا جو آٹومیٹک تھا اور ایک بار ٹریگر دبانے سے بیر
تھا۔ یہ آٹومیٹک پستول آج کل کے کلاشنکوف کی طرح کا تھا مگر اس کا سائز چھوٹا تھا
لینسر والا ریوالور اور پل کے دوسرے سرے کی بنیادوں میں لگے ہوئے بموں کا ر
کنٹرول میری جیب میں تھا۔ گوالہ غلام محمد ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کمانڈو
کیپسول بموں کا ڈبہ کھول کر دکھایا اور کہا۔

"ان میں سے ایک ایک کیپسول ہمیں کانوائے کے ہر ٹرک میں ڈال دینا ہو گا
کے بعد ریموٹ کے بٹن دبانے سے یہ بم پھٹتے چلے جائیں گے اور ان کے ساتھ ٹر
بھرا ہوا گولہ بارود بھی دھماکوں سے پھٹنا شروع ہو جائے گا۔"

والے غلام محمد بڑے غور سے کیپسول بموں کو دیکھنے لگا۔

"مجھے تو یہ دوائی کی گولیاں لگتی ہیں۔"

کمانڈو شیروان مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ اتنے طاقتور بم ہیں غلام محمد کہ اگر اسے کسی چار منزلہ عمارت کی بنیادوں میں
رکھ دیا جائے تو بٹن دبانے سے دھماکے کے ساتھ پوری بلڈنگ کے پرخچے اڑ جائیں
گے۔"

غلام محمد نے بڑی عقلمندی کی بات کی کہنے لگا۔

"تو پھر یہ بم آپ لوگوں نے پل کے اوپر چھپا کر کیوں نہیں ڈال دیئے؟"

کمانڈو شیروان نے جواب دیا۔

"صرف پل کے اوپر رکھ دینے سے اتنے طاقتور فولادی پل پر دھماکہ تو ضرور ہو گا مگر
پل کو اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرکوں کے پھٹنے سے
نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ٹرکوں کے دھماکوں کے ساتھ پھٹنے سے پورا پل اڑ جائے گا۔ تمہیں
یہاں ایسا انتظام کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو اتنا موقع مل جائے کہ ایک ایک
کیپسول ہم ایک ایک ٹرک میں ڈالتے چلے جائیں۔"

غلام محمد کہنے لگا۔

"اس کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ ٹرک ڈرائیوروں اور ٹرکوں کی ساتھ چلنے
والے دوسرے بھارتی فوجیوں کو چائے پراٹھے تقسیم کرنے والے لانگریوں کے ساتھ تم
میں سے بھی کوئی ایک شامل کر دیا جائے۔"

"کیا ایسا ہو سکے گا؟" میں نے پوچھا۔

غلام محمد نے کہا۔

"میں کینٹین کے انچارج صوبیدار ہری کرشن سے کہہ کر تم میں سے کسی ایک کو
چائے پراٹھے فوجیوں میں بانٹنے کی اجازت دلا دوں گا"

اس دوران غلام محمد کی بیوی بھینسوں اور گائیوں کا دودھ دوہتی رہی۔ سورج غروب
ہونے تک دودھ کے تین ولٹوہے دودھ سے بھر کر تیار ہو چکے تھے۔ غلام محمد نے ہماری

طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"تم لوگ بالکل گوجر لگ رہے ہو"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم ایسا ہی حلیہ بنانا چاہتے تھے۔"

"تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم گوجر نہیں ہو۔"

سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی دو خچروں پر ولٹوہے لاد دیئے گئے۔ ایک خچر
کمانڈو شیروان کو ہم نے دودھ والے ولٹوہے کے پاس بٹھادیا۔ دوسرے خچر پر دو ولٹو
لدے ہوئے تھے۔ میں اور غلام محمد خچروں کے آگے آگے پیدل ہی چل پڑے۔ غلام
گوالے کے گھر سے بھارتی فوجی کینٹین زیادہ دور نہیں تھی اور راستہ بھی زیادہ دشوار گ
نہیں تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہم فوجی کینٹین کے باہر کھڑے خچروں پر سے دودھ
ولٹوہے اتار رہے تھے۔ لنگر خانے میں سے ایک ڈوگرہ صوبیدار نکل کر ہماری طرف
اس نے غلام محمد کے ساتھ ہم دونوں کو دیکھا تو اس سے پوچھا۔

"غلام محمد یہ لوگ کون ہیں آج تمہارا بھائی ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

غلام محمد نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"صوبیدار صاحب جی! میرا بھائی بیمار ہو گیا ہے یہ میرے خالہ کے لڑکے ہ
ہندواڑے میں دودھ بیچتے ہیں۔ ہم سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے کہا آج زیادہ د
پہنچانا ہے تم ہی میری مدد کرو۔"

میں اور کمانڈو شیروان بڑے معصوم سے چہرے بنا کر کھڑے تھے۔ ہم نے ڈوگر
صوبیدار کو بڑے ادب سے سلام کیا اور بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگے۔ صوبیدار نے غلام
سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو دودھ کے ولٹوہے اندر لنگر خانے میں رکھواؤ اور یہیں رہنا را
تمہاری ضرورت ہوگی۔"

غلام محمد کانوائے گزرنے کی رات کو لنگر خانے میں ہی رہتا تھا اور لنگر کے د

گریوں کے ساتھ کانوائے کے سپاہیوں کو چائے اور پراٹھے تقسیم کرنے میں ان کی مدد
کرتا تھا۔ ہم نے ولٹوہے باری باری اٹھا کر لنگر خانے کے اندر ایک طرف رکھ دیئے۔ لنگر
خانے میں تنور گرم تھا اور ایک آدمی تنور پر بیٹھا چھوٹی چھوٹی روٹیاں لگا رہا تھا۔ تین چار
چولہے تھے۔ ایک چولہے پر بڑا سا کالا دیگچہ رکھا ہوا تھا جس میں چائے پک رہی تھی۔ لنگر
خانے میں ایک لکڑی کی میلی کچیلی سی لمبی میز اور لوہے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ان پر کچھ
فوجی بیٹھے چائے پی رہے تھے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ غلام محمد نے آنکھ
سے ہمیں اشارہ کیا۔

ہم اس کے ساتھ ہی لنگر خانے سے باہر نکل آئے اور ایک طرف ہو کر زمین پر بیٹھ
گئے۔ اتنے میں ایک کالے رنگ کا سکھ فوجی آیا۔ اس کے ساتھ ایک اردلی بھی تھا۔ میں
نے اس کے عہدے کی پٹی دیکھی' اس پر تین پھول بنے ہوئے تھے۔ یہ کیپٹن تھا۔ لنگر
کے باہر کا بلب خوب روشن تھا غلام محمد نے اور ہم نے بھی اٹھ کر سکھ فوجی کو سیلوٹ کیا۔
سکھ فوجی رک گیا۔ غلام محمد سے کہنے لگا۔

"غلام محمد یہ لوگ کون ہیں؟"

غلام محمد نے وہی وضاحت پیش کردی۔ سکھ فوجی کے چہرے پر خشونت کے آثار
تھے۔ اس نے اپنے اردلی کو آرڈر کیا۔

"ان دونوں کی تلاشی لو۔"

اردلی لمبے ڈگ بھرتا ہمارے پاس آیا اور اس نے ہماری تلاشی لینی شروع کردی۔
پہلے میرے فرن کی جیبوں کو دیکھا پھر ہاتھ لگا لگا کر میرے سارے جسم کو ٹٹولا کہ کہیں میں
نے اپنے جسم کے ساتھ کوئی پستول ریوالور وغیرہ تو نہیں باندھا ہوا ہے۔ میری جیب میں
کچھ نہیں تھا۔ اسی طرح اس نے کمانڈو شیروان کی بھی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں سے
بھی کچھ نہ نکلا۔ اردلی نے سکھ فوجی سے کہا۔

"سر! کچھ نہیں ہے۔"

سکھ فوجی نے غلام محمد سے کہا۔

"اس بار تو میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ آگے سے کانوائے والے دن اپنے ساتھ
صرف اپنے بھائی کو لایا کرو۔ بھائی نہ آسکے تو کسی کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں، سمجھے؟"

"یس سر۔ سمجھ گیا سر! غلطی ہوگئی اب یہ غلطی نہیں ہوگی سر!"

سکھ فوجی اردلی کے ساتھ کینٹین کے اندر چلا گیا۔ ہمارے پاس ریموٹ کنٹرول بم
تھے۔ کیپسول بموں والا ڈبہ بھی تھا۔ ایک آٹومیٹک پستول کمانڈو شیروان کے پاس تھا۔ ایک
ریوالور اور ریموٹ کنٹرول میرے پاس بھی تھا۔ مگر ہماری جیبوں میں سے ان میں سے
ایک بھی شے برآمد نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں تلاشی کا پہلے ہی خدشہ تھا۔ چنانچہ
ہم نے فوجی لنگر خانے کے قریب آکر ان چیزوں کو ایک درخت کے نیچے جھاڑیوں میں چھپا
کر رکھ دیا تھا۔ رات کا اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے یہ چیزیں وہاں کسی کو نظر نہیں آ سکتی
تھیں۔

جب سکھ فوجی اندر کینٹین میں چلا گیا تو کمانڈو شیروان آہستہ سے بولا۔

"خدا کا شکر ہے کہ عین وقت پر ہم نے ساری چیزیں جھاڑیوں میں چھپا دی تھیں
ورنہ مارے گئے تھے۔ یہ چیزیں ہمیں جھاڑیوں میں آدھی رات کو اس وقت اٹھانی تھیں
جب ملٹری کانوائے نے وہاں پہنچنا تھا اور ان میں چائے وغیرہ تقسیم ہونی شروع ہونی تھی۔"
میں اور شیروان وہیں زمین پر لنگر خانے کے باہر بیٹھے رہے۔ غلام محمد گوالا اندر لنگر خانے
میں ڈانگرویوں کا کام کاج میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ رات کے نو بجے غلام محمد اندر سے اپنے
اور ہمارے لئے بھی تین تین روٹیاں اور دال سے بھرا ہوا تام چینی کا پیالہ لے کر آ گیا۔
ہم زمین پر ہی بیٹھے بیٹھے کھانے لگے۔ ہم آپس میں دبی زبان میں باتیں بھی کرتے جا رہے
تھے۔ غلام محمد کہنے لگا۔

"یہ سکھ فوجی ٹینک رجمنٹ کا ہے۔ پل کے دونوں سروں پر جو ٹینک کھڑے ہیں
سکھ فوجی ان کا افسر ہے۔ ذرا سخت مزاج کا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تمہیں واپس نہ بھیج
دے۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"کانوائے ٹھیک کتنے بجے یہاں پہنچ جاتا ہے۔؟"

غلام محمد نے کہا۔

"کبھی رات کو بارہ بجے اور کبھی ساڑھے بارہ بجے پہنچ جاتا ہے۔ پچھلی بدھوار کو
ساڑھے گیارہ بجے ہی آگیا تھا۔"

ہم خاموشی سے دال روٹی کھاتے رہے۔ غلام محمد نے کہا۔

"تمہیں بڑی احتیاط سے سارا کام کرنا ہوگا اگر کسی نے تمہیں بم ٹرکوں میں رکھتے
دیکھ لیا تو سمجھ لو کہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔"

میں نے کہا۔

"غلام محمد! تم اس کی بالکل فکر نہ کرو یہ کام اتنی رازداری اور صفائی سے ہوگا کہ
بھارتی فوجیوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ غلام محمد بھولا بھالا سا کشمیری گوجر تھا اور وہ کچھ ڈرا ہوا تھا کہ کہیں
معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ کمانڈو شیروان نے بھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم اطمینان رکھو۔ ہمارے کام کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

"اگر یہ سب کچھ ہو گیا اور ٹرک پل پر جاتے ہی ایک ایک کر کے پھٹنے لگے تو اس
کے بعد پل تباہ ہو جائے گا۔ کہیں بعد میں بھارتی فوجیوں کو ہم پر شک تو نہیں پڑ جائے گا کہ
ہم نے ٹرکوں میں بم لگائے تھے؟"

کمانڈو شیروان نے جواب دیا۔

"ہم پر یا تم پر شک پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو ایک حادثہ سمجھا جائے گا
یہی تصور کیا جائے گا کہ کسی ٹرک ڈرائیور یا ٹرک کے اوپر پہرہ دینے والے فوجی کی
غلطی سے ایسا ہوا ہے۔ یا کسی ٹرک کے زیادہ اچھلنے سے ٹرک میں رکھے ہوئے کسی دستی
بم کا پن نکل گیا اور بم کے پھٹنے سے دھماکہ ہوا اور اس بم نے سارے ٹرک کو اور اس
کے باقی کے ایمونیشن سے لدے ہوئے ٹرکوں کو اڑانا شروع کر دیا یہ ایک قدرتی بات
ہے کہ اگر ایمونیشن کا ایک ٹرک پھٹتا ہے تو اس کے آگے والا یا پیچھے جو ٹرک آ رہا ہے وہ

بھی اس دھماکے کی وجہ سے پھٹ سکتا ہے۔ یوں ایک چین ری ایکشن شروع ہو گیا او سارے ٹرک اڑ گئے۔ ہم پر یا تم پر کسی طرح سے بھی شک شبہ نہیں پڑے گا۔"

غلام محمد خاموشی سے روٹی کھاتا رہا۔

کھانے کے بعد ہم نے تام چینی کے مگوں میں لنگر خانے کی چائے بھی پی۔ اس دوران رات کے گیارہ بج گئے۔ کچھ فاصلے پر پل کے اس والے سرے پر روشنی ہو رہی تھی اور پل کے پاس ہی ایک بہت بڑا ٹینک کھڑا تھا۔ اس کی گن کی نالی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ تین چار فوجی رائفلیں لئے ادھر ادھر پہرہ دے رہے تھے۔ دو سپاہی پل پر چل کر گشت لگا رہے تھے۔

اسی طرح مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ رات کے بارہ بج گئے اور وہاں کوئی کانوائے نہ آیا۔ کسی طرف بھی کوئی ایسے آثار نظر نہ آئے کہ پیچھے سے کوئی کانوائے آ رہا ہے۔ غلام محمد لنگر خانے کے اندر ہی تھا اور برتن وغیرہ صاف کر رہا تھا۔ تین فوجی لانگری بھی اس کے ساتھ برتن دھو رہے تھے۔ یہ شیشے کے گلاس اور مگ تھے جنہیں دھویا جا رہا تھا۔ ا گلاسوں اور مگوں میں کانوائے کے فوجیوں میں چائے وغیرہ سپلائی کی جاتی تھی۔

کمانڈو ہم لنگر خانے کے باہر زمین پر اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان ک لگا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کانوائے نہ آئے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم اگلی بار بدھوار کو آ جائیں گے۔ سکھ فوجی نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ غلام محمد کا بھائی بدھوار کو بھی بیمار ہی رہے گا اور اس کے ساتھ ہم ہی دودھ لے آئیں گے۔"

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ پل کے سرے پر جو فوجی تھے ان میں کچھ ہل چل پیدا ہوئی۔ پل کے سرے پر جو چیک پوسٹ تھی شاید اس کے فوجی ٹیلی فون پر پیچھے کانوائے کے آنے کی اطلاع آ گئی تھی۔ ایک فوجی لمبے لمبے ڈگ بھرتا لنگر خانے کی ط

آیا۔ اس نے لنگر خانے کے باہر سے ہی آواز دے کر کہا۔

"لانس نائیک آتما رام تیاری پکڑ لو آدھے گھنٹے میں کنوائے پہنچ رہا ہے۔"

یہ سن کر ہماری تسلی ہو گئی۔ اندر سے لانس نائیک آتما رام کی آواز آئی۔

"فکر نہیں حوالدار۔ سب ٹھیک ہے۔"

لنگر خانے میں سے تلے ہوئے پراٹھوں کی خوشبوئیں آنے لگی تھیں۔ غلام محمد اندر کام میں لگا ہوا تھا۔ کسی وقت وہ باہر آتا تو ہماری طرف بھی ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ ہم زمین پر ٹانگیں پھیلائے اس طرح بیٹھے تھے جیسے ہمیں کسی قسم کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لنگر خانے کے باہر اندر والی لکڑی کی لمبی میز نکال کر لگا دی گئی اور اس پر تام چینی کے مگ اور شیشے کے گلاس لا کر رکھ دیئے گئے۔ غلام محمد نے دو ٹوکریاں لا کر میز پر رکھ دیں۔

تھوڑی دیر بعد پل کی طرف سے دو فوجی مارچ کرتے آئے اور لانس نائیک آتما رام کو بلا کر پوچھا۔

"چلو آتما رام سامان لے کر چلو۔ کانوائے پیچھے ہالٹ ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ فکر نہیں۔"

دونوں ٹوکروں میں چینی کے مگ اور گلاس ڈال دیئے گئے۔ ایک ڈانگری اندر سے ایک ٹوکری اٹھا کر لے آیا۔ اس ٹوکری میں پراٹھے پڑے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان نے مجھے اشارہ کیا۔ میں چپکے سے اٹھ کر اندھیرے میں پیچھے جھاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ جھاڑیوں قریب ہی تھیں۔ میں جھاڑیوں کے پاس اس طرح بیٹھ گیا جیسے پیشاب کرنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ میں نے جھاڑیوں میں سے دونوں ریموٹ کنٹرول اپنا ریوالور' کمانڈو شیروان کا پستول اور کیپسول بموں والا چھوٹا سا ڈبہ اٹھا کر اپنے لمبے کرتے کی لمبی جیب میں رکھا اور بڑے اطمینان سے اٹھ کر ازار بند باندھنے کی اداکاری کرتے ہوئے واپس کمانڈو شیروان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

بیٹھتے ہی میں نے بڑی احتیاط سے کمانڈو شیروان کا پستول اس کو دے دیا۔ اس نے پستول اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ ریوالور اور ریموٹ کنٹرول اور کیپسول بموں والا

چھوٹا ڈبہ میں نے اپنی جیب میں ہی رہنے دیا۔

غلام محمد اندر سے تھال میں پراٹھے لا کر ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ پروگرام کے مطابق اس نے ہمیں آواز دے کر کہا۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ اٹھ کر کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ چلو اٹھو"

ہم جلدی سے اٹھ کر غلام محمد کے پاس آ گئے اور ہم نے ایک ایک ٹوکری اٹھالی۔ ڈانگری لنگر خانے سے چائے سے بھری ہوئی دو بڑی بڑی تام چینی کی چینکیں باہر لے آیا۔

"غلام محمد!! اسے پکڑو اور لے چلو"

غلام محمد نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم دونوں نے ایک ایک ٹوکری کیوں اٹھا رکھی ہے۔ ایک آدمی دونوں ٹوکریاں اٹھالے اور دوسرا یہ چینک پکڑ کر میرے ساتھ چلے۔"

میں نے مگوں اور شیشے کے گلاسوں والی دونوں ٹوکریاں اٹھالیں۔ کمانڈو شیروان چائے کی بڑی کیتلی اٹھالی۔ دوسری کیتلی غلام محمد نے پکڑلی۔ پراٹھوں والی ٹوکری بھارتی ڈانگری نے اٹھالی اور بولا۔

"چلو اوئے ڈبل سے چلو۔ کانوائے کے جوان بیٹھے چائے پراٹھوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

غلام محمد اور بھارتی ڈانگری آگے آگے اور میں اور کمانڈو شیروان ان کے پیچھے لگے۔ ہم پل کی طرف سے پیچھے جاتی سڑک کی طرف چل رہے تھے۔ وہاں پہاڑی ٹیلے دیوار تھی۔ ہم سڑک پر آ گئے تھے۔ سڑک پر کہیں کہیں اوپر کر کے ٹیلے پر کھمبے لگے جن پر بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ سڑک چھوٹی تھی جیسی کہ پہاڑی علاقوں میں ہوا ہے مگر تار کول کی بنی ہوئی پختہ تھی۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے پہاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں کانوائے کے ٹرک نظر آ گئے۔ یہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ سڑک پر بجلی کے انڈوں والے کھمبے پیچھے رہ گئے تھے۔ ملٹری کانوائے کے ٹرکوں کی ہیڈ لائٹیں بجھی ہوئی تھیں۔ ٹرکوں کے سامنے فوجی دو دو تین تین کی ٹولیاں

کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ تین چار فوجی سڑک کی دوسری طرف پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک فوجی پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ان فوجیوں میں سے ایک فوجی نے اونچی آواز میں کہا۔

"فالم ہو جاؤ اوئے راشن آ گیا ہے"

فوجی سڑک پر ٹرکوں کے سامنے لالٹین لگا کر بیٹھ گئے اور ہم نے ان میں پراٹھے اور چائے بانٹنی شروع کر دی بھارتی ڈانگری ہر فوجی کو ایک ایک پراٹھا دیتا جاتا تھا میں اور غلام محمد مگ اور خالی گلاس ان کے آگے رکھتے چلے گئے۔ پھر ہم کیتلی سے ان کے مگ اور گلاس بھرنے لگے۔ میں چائے ڈالتے ہوئے آخری ٹرک کے قریب چلا گیا۔ میں نے کانوائے کے ٹرک گن لئے تھے یہ کل گیارہ ٹرک تھے۔ ہر ٹرک کے آگے مشین گن لگی ہوئی تھی۔ اس وقت کسی ٹرک پر کوئی فوجی نہیں تھا۔ سب فوجی چائے پینے میں لگے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر مذاق بھی کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بھارتی فوجی ڈانگری جو ہمارے ساتھ آیا تھا وہ بھی فوجیوں میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ غلام محمد اور کمانڈو شیروان مجھ سے دس قدموں کے فاصلے پر قطار میں بیٹھ کر چائے پینے والے فوجیوں کے پاس کھڑے تھے اور جس فوجی کا چائے کا گلاس یا مگ خالی ہو جاتا تھا اس میں دوبارہ چائے ڈال دیتے تھے۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میری چائے کی چینک خالی ہو چکی تھی۔ میں کھسک کر ٹرکوں کے پیچھے جو پہاڑی کی دیوار اور ٹرکوں کے درمیان چھوٹی سی گلی بنی ہوئی تھی وہاں آ گیا۔ چائے کی خالی چینک میرے ہاتھ میں تھی۔ ٹرکوں پر ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کسی بھی وقت ادھر کوئی فوجی آسکتا تھا۔ مگر بھارتی فوجی سارے کے سارے ٹرکوں کی دوسری طرف سڑک پر بیٹھے چائے پینے اور پراٹھے کھانے میں مصروف تھے۔

میں نے چینک آخری ٹرک کے عقب میں نیچے رکھ دی۔ جیب سے پلاسٹک کا ڈبہ نکال کر کھولا اور اس میں سے ایک کیپسول بم نکال کر آخری ٹرک کی ترپال کی ایک درز

میں سے ٹرک کے اندر ڈال دیا۔ اسی طرح میں جلدی جلدی ایک ایک کیپسول بم
اور ٹرکوں کے اندر رکھتا آگے بڑھتا گیا۔ چھوٹا سا کیپسول ٹرک میں کسی بھی جگہ سے
ڈالنا مشکل کام نہیں تھا۔ ترپال کی رسیوں اور اس کے سوراخوں میں سے میں بڑی آ
سے کیپسول اندر ڈال سکتا تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کسی طرف سے کوئی
اچانک آکر مجھے ایسا کرتے دیکھ نہ لے۔ مگر مجھے اسے خطرے سے بے نیاز ہو کر یہ کام
تھا اور میں نے گیارہ کے گیارہ ٹرکوں میں گیارہ بموں کے کیپسول ڈال دیئے۔

اس کے ساتھ ہی میں تیز تیز قدم اٹھاتا آخری ٹرک کے پاس آگیا جہاں میں
چائے کی خالی چینک زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ ٹرکوں کے پیچھے اندھیرا تھا جس کی وجہ
دو ٹرکوں کے درمیان جو تھوڑی سی خالی جگہ تھی وہاں سے میں سڑک پر بیٹھے ہ
بھارتی فوجیوں کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے چائے کی خالی چینک اٹھائی اور ٹرک
پیچھے سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

اس وقت تک فوجی لوگ چائے پی چکے تھے اور سگریٹ لگائے اگلے تین چار
کے جوان ٹرکوں کے پاس آکر ٹائروں کو جھک کر دیکھ رہے تھے اور ان پر پڑی ہوئی تر
کی رسیاں کھینچ کھینچ کر دیکھ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔
بڑے ٹھیک وقت پر باہر نکل آیا تھا۔ غلام محمد اور کمانڈو شیروان ٹوکروں میں مگ او
گلاس ڈالتے ہوئے بار بار گردن موڑ کر آخری ٹرک کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ انہوں
مجھے سڑک کے اندھیرے میں آخری ٹرک کے پیچھے سے نکلتے دیکھا تو یقیناً انہوں
اطمینان کا سانس لیا ہوگا۔ میں خالی چینک اٹھائے جلدی جلدی چل کر ان کے پاس
چینک زمین پر رکھ کر میں بھی خالی برتن ایک ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ کمانڈو شیروان
زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"ہو گیا؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"او کے"

ایک ٹوکری کمانڈو شیروان نے اٹھائی۔ ایک ٹوکری غلام محمد نے اٹھائی۔ میں نے
دونوں خالی چینکیں ہاتھوں میں پکڑیں اور واپس لنگر خانے کی طرف چل پڑے۔ بھارتی
فوجی ڈانگری ابھی تک وہیں کھڑا ایک سکھ فوجی جوان سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم دونوں اس
کے قریب سے گزرے تو ڈانگری نے غلام محمد سے کہا۔

"غلام محمد! چینکوں کو دھو کر رکھنا"

غلام محمد نے فوراً جواب دیا۔

"اچھا جی"

لنگر خانے میں آکر ہم نے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ وہاں دو باورچی موجود تھے
جو چیزوں کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ غلام محمد کے ساتھ ہم بھی برتنوں کو دھونے میں
لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں ٹرکوں کے انجنوں کے سٹارٹ ہونے کی اور انہیں سائیڈ پر
سے نکالنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اب ہمیں یہاں سے چلے جانا ہوگا"

غلام محمد نے آہستہ سے کہا۔

"میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ پیچھے نہیں رہوں گا۔"

اس کے پیچھے رہ جانے سے معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ اس کے
دو آدمی جو ساتھ آئے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ کمانڈو شیروان نے غلام محمد سے
کہا۔

"چلو تم بھی ہمارے ساتھ چلو"

برتنوں کو صرف پانی سے ہی صاف کرنا تھا۔ ہم نے برتنوں کو ایک طرف لگا دیا اور
لمبے کرتوں کے دامن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے لنگر خانے سے باہر آگئے۔ غلام محمد نے دودھ
کے خالی ولٹوہے پہلے ہی باہر رکھے ہوئے تھے۔ ایک ولٹوہا اس نے اٹھا لیا۔ دو ولٹوہے خچر پر
لادے اور ہم تینوں فوجی لنگر سے واپس چل پڑے۔

اس وقت دور سے فوجی کانوائے کے پہلے ٹرک کی بتیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ابھی ب
ٹرک پل سے سوڈیڑھ سوگز کے فاصلے پر تھا۔ ہم تیز تیز چل رہے تھے اور خچر کو بھی تیز تیز
چلا رہے تھے۔ جب ہم اندھیرے میں آگئے تو ایک طرف ہو کر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گئے
کمانڈو شیروان نے کچھ سوچ کر غلام محمد سے کہا۔

”تم نکل جاؤ۔ تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں“

بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ ہم فوجی لنگر کے قریب ہی ہیں اور ٹرکوں کے دھما
اور شعلے دیکھ کر وہ کہیں گھبرا کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جس سے ہم کسی مصیبت
پھنس جائیں۔ غلام محمد نے خچر پر اپنا ولٹوہا بھی رکھا اور وہاں سے تیز تیز چلتا نکل گیا۔

ہماری نظریں پل کے سرے پر لگی ہوئی تھیں جہاں سرچ لائٹ کی روشنی ہو رہ
تھی۔ میں نے اپنا ریموٹ کنٹرول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے دو
ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اپنے ریموٹ کنٹرول کے گیارہ بٹن دبا کر
کانوے کے ٹرکوں کو دھماکے سے اڑانا تھا۔ میں نے اپنے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر پل
کے دوسرے سرے کی بنیادوں میں جو بم کی سٹکیں لگائی تھیں ان کو اڑانا تھا۔ یہ بڑ
ہیجانی لمحے تھے۔ یہ خیال ہم دونوں کو بار بار دماغ میں آکر پریشان کر رہا تھا کہ اگر کسی انس
غلطی کی وجہ سے بم نہ پھٹ سکے تو ہمارا سارا مشن دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

فوجی کانوائے کے پہلے تین ٹرک پل پر چڑھ چکے تھے اور بڑی آہستہ رفتار کے
پل پر سے گزر رہے تھے۔ کمانڈو شیروان نے کہا۔

”تم اپنا بٹن میرے پہلے بٹن دبانے کے بعد دباؤ گے۔“

”اوکے“

میں نے اپنے نفسیاتی ہیجان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں اس
کے کئی کمانڈو آپریشنز کامیابی سے کر چکا تھا مگر نہ جانے کیوں اس آپریشن کے وقت
نفسیاتی دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔

کانوائے کے ٹرک آہستہ آہستہ بے معلوم رفتار کے ساتھ پل پر آگے کی

رینگ رہے تھے۔ پل کافی لمبا تھا نیچے برساتی نالے کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ دور اندھیرے میں
ہمیں پل نظر نہ آتا اگر پل کے دونوں سروں پر لگی ہوئی سرچ لائٹوں کی روشنیاں ان پر نہ
پڑ رہی ہوتیں۔ جب کنوائے کے پورے ٹرک پل کے اوپر آگئے تو میں نے دیکھا کہ ابھی
پل کے دوسرے سرے تک کم از کم تین چار ٹرکوں کا فاصلہ باقی تھا۔ میں نے کمانڈو
شیروان سے کہا۔

”کمانڈو اب کیا سوچ رہے ہو۔ اگلا ٹرک اڑا دو“

کمانڈو شیروان پر بھی ہیجانی کیفیت طاری تھی اس نے کہا۔

”میرے پہلا بٹن دبانے سے تم اپنے بٹن کو دبا دینا۔ اوکے۔ میں بٹن پریس کرنے لگا
ہوں۔“

میں اندھیرے میں کمانڈو کی انگلی کو نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس نے ریموٹ کنٹرول کے
ایک بٹن پر رکھی ہوئی تھی۔ میری نگاہیں سب سے پہلے ٹرک پر لگی ہوئی تھیں جس کی
عقبی سرخ بتی مجھے دور سے لال انگارے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اچانک ایک شعلہ سا
بھڑکا۔ ایک بجلی سی چمکی اور پھر ایک دھماکہ کی گونج سنائی دی۔ پہلا ٹرک اڑ چکا تھا۔ اس
کے ساتھ ہی میں نے اپنے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ اس بٹن کے دبانے کے بعد مجھے کوئی
دھماکہ سنائی نہ دیا۔ پہلے ٹرک کے شعلے ابھی دوسرے ٹرک تک نہیں آئے تھے۔ کانوائے
کے ٹرک رک گئے تھے۔ اچانک دوسرے ٹرک میں بھی دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی
پل کا اگلا حصہ نیچے بیٹھ گیا۔ اب وہاں یہ صورت بن گئی کہ ایمونیشن کے ٹرک پھٹ رہے
تھے۔ ان میں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ٹرک کی باڈیوں کے ٹکڑے اڑ رہے
تھے اور وہ بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے ٹکرا ٹکرا کر پل کے ساتھ ہی نیچے گر
رہے تھے۔ پچھلے تین ٹرک ابھی تک پل کے پہلے سرے کے پاس ہی تھے۔ مجھے دوسرے
ٹرکوں کے شعلوں کی روشنی میں ان میں سے تین فوجی چھلانگیں لگاتے نظر آئے۔ اتنے
میں ان تینوں ٹرکوں میں ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور تینوں ٹرکوں کے پل کے ساتھ ہی
نیچے اڑ گئے۔ اب وہاں آگ اور شعلوں اور دھوئیں کی ایک آبشار سی پل کے نیچے

ٹرکوں کو لے کر گر رہی تھی۔ وہاں اب کوئی پل نہیں تھا۔ نیچے برساتی نالے میں ٹرکوں کے
ڈھانچوں میں ابھی تک دھماکے ہو رہے تھے۔ ان کا اسلحہ ابھی تک پھٹ رہا تھا۔

اب ہمیں بھی وہاں نہیں ٹھہرنا تھا۔

ہم رات کے اندھیرے میں پہاڑی راستوں' گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے گزر کر
اپنی کمیں گاہ پر پہنچ گئے۔ ہمارا کمانڈو آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ہم نے ٹارگٹ مار لیا تھا
اس پل کو تباہ کر دیا تھا جس کے راستے کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کئے جانے والا
گولہ بارود اور اسلحہ آتا تھا۔ میں اور کمانڈو شیروان اگلے دو تین دن خفیہ کمیں گاہ میں
چھپے رہے۔ کیونکہ پل کی تباہی کے بعد وادی میں بھارتی فوج اور ملٹری انٹیلی جنس کی
سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ اس پل کی تباہی نے کشمیری مجاہدین کے حوصلے بلند کر دیئے
تھے اور وہ پہلے سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بھارتی فوجی قافلوں پر حملے کر رہے تھے۔
ہمارے مخبر نے آکر اطلاع دی کہ فوج نے قریبی گاؤں کے کچھ آدمیوں کو پکڑ لیا ہے
غلام محمد گوالے کو نہیں پکڑا تھا۔

تیسرے دن ہمیں خبر ملی کہ بھارتی فوج کے ایک دستے نے ہندواڑہ کے علاقے
ایک گاؤں کو آگ لگادی ہے اور عورتوں کی بے عزتی کی ہے اور گاؤں کے مسجد کے
صاحب کو پکڑ کر ٹارچر سنٹر میں لے گئے ہیں۔ کمانڈو شیروان نے غصے میں کہا۔

"ہمیں امام صاحب کو بھارتی ٹارچر سیل سے ہر حالت میں نکالنا ہو گا اور ان فوجیوں کو
جہنم واصل کرنا ہو گا۔ جنہوں نے بے گناہ کشمیریوں کے گھر جلائے ہیں اور مسلمان عورتوں
کی بے عزتی کی ہے۔"

میں کمانڈو کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ فوجی کس کیمپ سے آئے تھے؟"

کمانڈو نے اسی وقت مخبر کو بلا لیا اور اس سے یہی سوال پوچھا۔ اس نے
ہندواڑہ کے قصبے سے دو میل پیچھے وادی کے جنگل میں ڈوگرہ رجمنٹ کا کیمپ ہے۔
فوجی اسی کیمپ سے آئے تھے۔ ہمیں یہ بھی سراغ مل گیا کہ امام مسجد کو اسی کیمپ

کے ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے اور اس کو سخت اذیت دی جا رہی ہے۔ اور اس سے پل تباہ
کرنے والے مجاہدوں کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ میں نے کمانڈو سے کہا۔

"ہمارا فرض ہے کہ جو کام ہم نے سرانجام دیا تھا اس کے عوض موت کے منہ میں
جانے والے امام مسجد کو بھارتیوں کی قید سے نکالا جائے۔ میں آج ہی رات کو فوجی کیمپ
کے مشن پر جانے کو تیار ہوں۔"

کمانڈو کہنے لگا۔

"ہمیں سب سے پہلے ہندواڑہ کے فوجی کیمپ کی پوری تفصیل معلوم ہونی چاہئے۔
میں کل ہی اپنے آدمی کو اس طرف بھیجتا ہوں"

دوسرے روز کمانڈو اپنے ایک خاص مجاہد جاسوس کو ہندواڑہ کے فوجی کیمپ کی
طرف روانہ کر دیا۔ یہ مجاہد جاسوس دوسرے روز دوپہر کے وقت واپس آیا اس نے کہا۔

"فوجی کیمپ ہندواڑہ کی باؤلی کے پاس واقع ہے۔ وہاں لکڑی کی ایک بارک ہے۔
ایک کوارٹر گارڈ ہے اور بارک کے کونے میں پتھروں سے بنائی گئی ایک کوٹھڑی ہے۔ یہ
کوٹھڑی ٹارچر سیل ہے۔ یہاں کشمیری مجاہدین کو لا کر انہیں غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا
ہے۔ امام مسجد کو بھی اسی کوٹھڑی میں قید کیا گیا ہے۔"

کمانڈو نے پوچھا۔

"ہندواڑہ کے اس بھارتی فوجی کیمپ میں فوج کی نفری کتنی ہے۔"

مجاہد جاسوس نے کہا۔

"سو ڈیڑھ سو کے قریب بھارتی فوجی اس کیمپ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"سیکورٹی کی کیا پوزیشن ہے؟"

مجاہد جاسوس کی زبانی معلوم ہوا کہ فوجی کیمپ چونکہ عارضی ہے اس لئے اس کے
ارد گرد کوئی دیوار نہیں ہے۔ صرف خاردار تار کی باڑ لگا دی گئی ہے۔ اس کا صرف
ایک ہی گیٹ ہے جہاں ایک فوجی دن رات پہرے پر موجود رہتا ہے۔ گیٹ کے اندر کی
طرف دو مشین گن پوسٹیں ہیں۔ کوارٹر گارڈ کے باہر فوجی گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی

جگہ ہے۔ اور رات کو کیمپ کے گرد دو تین فوجی ڈوگرے گشت لگاتے رہتے ہیں۔ کمانڈو نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"ہمیں آج رات ہی اٹیک کر دینا چاہئے۔"

ہمارے پاس ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ ہونے والے انتہائی طاقتور کیپسول سائز کے دس پندرہ بم ابھی موجود تھے۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"ہمیں اپنے کمانڈو آپریشن پر تھوڑا مزید غور فکر کرنا ہوگا۔ آج رات کا پروگرام ہمیں ملتوی کر دینا چاہئے۔"

کمانڈو شیروان بھی سوچنے لگا۔ اس کو محسوس ہوا کہ واقعی اس مشن کے لئے جرات اور دلیری کے ساتھ ساتھ عقلمندی کی بھی ضرورت ہے اور ہمیں پوری منصوبہ بندی کر کے کمیں گاہ سے نکلنا چاہئے۔ دوسرا سارا دن ہم ہندواڑہ فوجی کیمپ کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے۔ اس دوران کمانڈو نے اپنے ایک مجاہد کو جو بہترین فوٹو گرافر بھی تھا ہندواڑہ کے بھارتی فوجی کیمپ کی تصویریں اتارنے کے لئے بھیج دیا۔ یہ مجاہد رات کو واپس آیا۔ وہ کشمیری چرواہے کے بھیس میں دو بھینسیں لے کر فوجی کیمپ کے آس پاس پھرتا رہا تھا اور خفیہ کیمرے سے تصویریں بھی اتارتا رہا تھا۔

اس نے پندرہ بیس تصویریں اتاری تھیں۔ ان تصویروں کی روشنی میں ہم نے ہندواڑہ فوجی کیمپ کا ایک نقشہ تیار کر لیا اور ساری منصوبہ بندی کر لی کہ ہمیں کس طرف سے اس بھارتی کیمپ میں داخل ہونا ہوگا اور وہاں کیا کچھ کرنا ہوگا۔ اس میں جس بات کو ہم نے سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت دی تھی وہ امام مسجد کو کیمپ کی اذیت گاہ یعنی پتھر کی کوٹھڑی سے نکالنا اور اسے واپس اس کے گھر پہنچانا تھا۔ یہ مشن کوئی آسان مشن نہیں تھا ہمیں دشمن کے مورچوں میں گھس کر مولوی صاحب کو نکال کر لانا تھا۔ اس کے لئے

خاص حکمت عملی اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اور ہم نے اپنی طرف سے ہر قسم کے
خطرات اور خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک آپریشن تیار کیا تھا۔ جب ہم نے لائن
آف ایکشن تیار کرلی تو میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اس مشن کے لئے ہمیں جس اسلحہ کی ضرورت ہوگی اس میں ہینڈ گرنیڈ لائٹ
مشین گنیں اور ایک راکٹ لانچر بہت اہم ہیں۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"یہ سارا اسلحہ ہمارے پاس موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ایک لائٹ مشین
گن ساتھ رکھ لیں گے"

میں نے کہا۔

"ایک لائٹ مشین گن تمہارے پاس ہوگی۔ ایک میرے پاس ہوگی۔ چھ سات ہینڈ
گرنیڈ تمہارے پاس ہونے چاہئیں میرے پاس بھی اتنے ہی گرنیڈ ہوں گے۔ راکٹ لانچر
ایک ہی کافی ہے جو میں اپنے پاس رکھوں گا۔ لیکن میں دن کے وقت اس فوجی کیمپ کو
دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ہم نے دوسرے روز کا وقت طے کرلیا۔ دوسرے روز صبح صبح سورج نکلنے کے بعد
ہم چرواہوں کے بھیس میں ایک ایک بکری ساتھ لے کر ہندواڑہ کے بھارتی فوجی کیمپ کی
طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ہم ایک گھاٹی اور دو پہاڑی ٹیلوں کے دامن میں سے گزرنے
کے بعد ہندواڑہ کیمپ کے جنگل میں آگئے۔ کمانڈو شیروان اس سارے علاقے سے اچھی
طرح واقف تھا۔ ہم نے ایک چھوٹی دوربین اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بکریوں کو اپنے ساتھ
چلاتے ہم بھارتی فوجی کیمپ کے سامنے کی طرف ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیبے کے
آکر رک گئے اور درختوں کے پتے توڑ توڑ کر اپنی اپنی بکری کو ڈالنے لگے۔ پھر ہم
ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان دوربین لگا کر کیمپ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر
نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کیمپ کی جنوب کی طرف سے کیمپ میں داخل ہونا چاہئے

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ سامنے کی جانب فوجی کیمپ کے گیٹ کے پیچھے
مشین گن پوسٹ صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا گن مین بھی دکھائی دے رہا تھا جو ڈوگرہ
تھا۔ اس نے سر پر کلغی دار سبز رنگ کی فوجی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ کیمپ کے اندر ایک
جانب تین فوجی ٹرک اور ایک جیپ کھڑی تھی دو فوجی جوان تیز تیز قدموں سے ایک
طرف جارہے تھے۔ میں نے کیمپ کے جنوب کی طرف دیکھا۔ ادھر لمبی بارک کی دوسری
جانب ایک کوٹھڑی دکھائی دی جس کے باہر ایک فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے کمانڈو
شیروان سے کہا۔

"تم نے کیمپ کے جنوب میں وہ کوٹھڑی دیکھی ہے؟"

کمانڈو بولا۔

"میں نے یہ کوٹھڑی دیکھ کر ہی تمہیں کہا تھا کہ ہم جنوب کی طرف سے کیمپ میں
داخل ہوں گے۔ مولوی صاحب یقیناً اس کوٹھڑی میں بند ہیں۔"

میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹالی۔ کمانڈو نے کہا۔

"اسے فرن کی جیب میں رکھ لو۔ یہاں کوئی بھی ڈوگرہ فوجی گھومتا ہوا آسکتا ہے۔"

میں نے دوربین کو جیب میں چھپالیا۔ ہماری بکریاں ہمارے قریب ہی درختوں کی کٹی
ہوئی شاخوں کے پتے کھا رہی تھیں۔

"کسی اور چیز کو دیکھنے کی ضرورت تو نہیں؟"

کمانڈو نے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"اب کیا پوچھنا ہے۔ کیمپ سامنے ہے رات کو خاردار باڑھ کاٹ کر اندر گھس
جائیں گے۔ اپنی طرف سے وہ ساری احتیاط برتیں گے۔ جو ایک تربیت یافتہ کمانڈو کو برتنی
چاہئے۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

کمانڈو شیروان اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو پھر واپس چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

ہم نے اپنی اپنی بکری کی رسی تھامی اور دوسری جانب گھاٹی میں اترنے لگے۔ دوپہر کے

بعد کمانڈو شیروان کا ایک خاص مجاہد ہمارے لئے اسلحہ بوری میں ڈال کر لے آیا۔ دو ریوالور
مشین گنیں اور ان کا میگزین تھا۔ ایک راکٹ لانچر تھا جس کے ساتھ چار راکٹ تھے۔
ہینڈ گرنیڈ تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ریموٹ کنٹرول والے دس بارہ کیپسول بم
تھے۔ کمانڈو نے ایک خاص آدمی کو ہندواڑہ کیمپ کی طرف یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا
ہوا تھا کہ امام مسجد کیمپ والی کوٹھڑی کے ٹارچر سیل میں ہی ہے یا اسے کسی دوسری جگہ
پہنچا دیا گیا ہے۔ شام کو اس آدمی نے واپس آکر بتایا کہ ہماری اطلاع کے مطابق مولوی
صاحب کیمپ کے اندر ہی ہیں اور کوٹھڑی والے ٹارچر سیل میں انہیں بڑی وحشیانہ اذیتیں
دی جا رہی ہیں اور رات کو ان کی چیخوں کی آوازیں آتی ہیں۔ یہ سن کر ہمارا خون کھول
اٹھا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا ہمیں اس کیمپ کے کسی بھارتی فوجی کو زندہ نہیں
چھوڑنا چاہئے۔ ان لوگوں نے ہندواڑہ کے گاؤں کے مکانوں کو نذر آتش کر کے نہ جانے
کتنے بے گناہ کشمیری مسلمانوں کو زندہ جلا دیا ہے اور عورتوں کی بے حرمتی کی ہے۔

کمانڈو پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ کہنے لگا۔

"میرے دوست! ایسا ہی ہوگا۔"

اس رات ہم نے کشمیری چرواہوں کا بھیس بدلنے کی بجائے فل کمانڈو وردیاں پہن
لیں۔ سیاہ تنگ پتلونیں، اوپر سیاہ جیکٹیں، گھٹنوں تک چڑھے ہوئے سیاہ بوٹ کمر کے ساتھ
بندھی ہوئی میگزین کی بیلٹیں اور سروں پر بندھے ہوئے سیاہ رومال ہم نے اپنے چہروں پر
سیاہ رنگ کی لکیریں ڈال لی تھیں۔ ایک مجاہد کمانڈو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔
دیہاتی کشمیری کے لباس میں تھا۔ ہم رات کے اندھیرے میں خچروں پر بیٹھ کر اپنے مشن پر
نکل کھڑے ہوئے۔ ہماری جیکٹوں کے پاؤچ میں چھ چھ ہینڈ گرنیڈ تھے۔ کاندھوں کے ساتھ
ایک ایک لائٹ مشین گن لٹک رہی تھی۔ راکٹ لانچر اور چاروں راکٹ میں نے اپنے
خچر پر آگے رکھے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان کی جیکٹ کے پاؤچ میں بارہ کیپسول بم
والا پیکٹ اور ریموٹ کنٹرول بھی تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس بھرا ہوا سائی لینسر
ریوالور اور ایک کمانڈو چاقو تھا۔ ایک پستول کمانڈو شیروان کے پاس تھا۔ خاردار تار

والا پلاس میری بیلٹ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

وہ رات بڑی اندھیری تھی۔

آسمان پر تارے بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑی راستوں پر تاریکی چھائی ہوئی
تھی۔ ہمارے خچر آہستہ آہستہ ہندواڑہ کے بھارتی فوجی کیمپ کی طرف چلے جا رہے تھے۔
کمانڈو شیروان کا خچر آگے تھا۔ اس کے پیچھے میرا اور میرے خچر کے پیچھے اپنے مجاہد کا خچر
تھا۔ ہندواڑہ تک کا پہاڑی علاقہ ہمارے لئے کوئی نیا راستہ نہیں تھا۔ میں اس سے پہلے بھی
اس علاقے میں کشمیری حریت پرست مجاہدوں کے ساتھ مل کر بھارتی غاصب فوجیوں کے
خلاف کئی کامیاب معرکے لڑ چکا تھا۔ اور کمانڈو شیروان تو رہنے والا ہی اس علاقے کا تھا۔

اپنی خفیہ کمیں گاہ کی پہاڑی سے نکلنے کے بعد ہم نے رات کے اندھیرے میں خچروں
کو بائیں جانب ایک وادی کو جانے والی پگ ڈنڈی پر ڈال دیا۔ کشمیر کی خوبصورت جنت
نظیر پہاڑیوں کی ڈھلانوں اور دور نیچے وادی میں کہیں کہیں کسی گاؤں کی بتی ٹمٹماتی نظر
آرہی تھی۔ ہم خاموشی سے چل رہے تھے۔ کبھی کبھی ضرورت کے وقت کوئی بات کر لیتے
تھے۔ پہاڑی پگ ڈنڈیاں اور راستے غیر ہموار ہوتے ہیں اور ان پر خچر ہی آسانی سے چل
سکتے ہیں۔ یہاں پر گھوڑوں کے پاؤں بھی پھسل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پہاڑی خچروں کو
ان گھاٹیوں اور پہاڑی ڈھلانوں میں چلنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف
خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کسی وقت ہمیں چھو کر گزر
جاتے تھے۔ ایک وادی اور ایک پہاڑی درے میں سے گزرنے کے بعد سامنے ہندواڑہ کی
وادی اور وادی کا جنگل شروع ہو گیا۔ یہ جنگل میدانی جنگلوں کی طرح نہیں تھا۔ یہ پہاڑی
جنگل تھا جہاں ڈھلانوں پر اور باہر کو نکلی ہوئی چٹانوں پر بھی درخت ہی درخت اگے ہوئے
تھے۔ ایک جگہ پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ قریب ہی ڈھلان پر دھان کے کھیت تھے جو چھوٹی
چھوٹی سیڑھیوں کی طرح بنے ہوئے تھے۔ پہاڑی چشمے سے نکلا پانی نالے کی شکل میں ان
کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ ہم یہاں سے بھی خاموشی سے گزر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم
جنگل سے باہر نکل کر وادی کے درمیان سے گزرنے والی ایک چھوٹی سی سڑک پر آگئے۔

سڑک پر بجری بکھری ہوئی تھی۔ ہم نے خچروں کو جلدی جلدی سڑک پر سے گزارا اور سامنے کی پہاڑی کی چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ اس پہاڑی کی دوسری طرف باؤلی والے تودے کے دامن میں ہندواڑہ کا بھارتی فوجی کیمپ تھا۔ پہاڑی کی چڑھائی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم جھاڑیوں اور چنار کے درختوں کے نیچے سے ہو کر جا رہے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی پر آکر دوسری طرف اترنے لگے تو کچھ فاصلے پر نیچے باؤلی کے بلند تودے کے پہلو میں ہمیں ہندواڑے کے بھارتی فوجی کیمپ کی روشنی نظر آنے لگی۔

ہمارے خچر سنبھل سنبھل کر اترائی اتر رہے تھے۔ جب ڈھلان ختم ہو گئی اور ہمیں زمین پر کتنے ہی کٹے ہوئے درختوں کے تنے ادھر ادھر پڑے نظر آئے تو کمانڈو شیروان نے اپنا خچر روک کر ہمیں بھی اپنے منہ سے ایک پرندے کی ہلکی سی آواز نکال کر رکنے کا اشارہ کیا۔ میں اور مجاہد اپنے خچروں پر بیٹھے کمانڈو شیروان کے پاس آکر رک گئے۔ کمانڈو شیروان نے آہستہ آواز میں کہا۔

"ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ اب ہم میں سے کوئی نہیں بولے گا۔ ہم صرف اپنے مخصوص اشاروں میں بات کریں گے۔ ہمیں کھانسی اور چھینک کو منہ میں کپڑا ڈال کر روکنا ہو گا۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

میں نے اور اپنے کشمیری مجاہد نے ہاتھ اوپر اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

"کوئی سوال نہیں، کوئی اعتراض نہیں"

کمانڈو شیروان نے آہستہ سے کہا۔

"گو۔ گو"

اور ہمارے خچر ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے۔ ابھی ہم نے ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ نہیں ڈالا تھا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہماری آنکھیں رات کے گھپ اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں اور ہم ایک دوسرے کے جسموں کے خاکے آسانی سے دیکھ رہے تھے۔ کمانڈو شیروان کو معلوم تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ پر اس نے مجھے بھی بتا دیا تھا کہ کمانڈو ایکشن فوجی کیمپ کے کسی خاص حصے سے شروع

جائے گا۔ جہاں درختوں کے کٹے ہوئے تنے زمین پر بکھرے پڑے تھے ہم ان کی دوسری طرف سے ہو کر گزر گئے۔ یہ درخت بھارتی فوجیوں نے وادی میں اپنی فوجی بارکیں بنانے کے لئے بے دریغی سے کاٹ ڈالے تھے۔

فوجی کیمپ کی روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ اس جگہ پہنچ کر کمانڈو شیروان میں اور ہمارا ساتھی کشمیری مجاہد خچروں سے اتر پڑے۔ ہم خچروں کی باگیں تھامے پیدل چلنے لگے۔ ایک خشک برساتی نالہ آگیا۔ اس میں روڑے اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہم اس میں سے بھی گزر گئے۔ نالے کے دوسرے کنارے سے باہر نکل کر دیکھا کہ فوجی کیمپ کے جنوبی حصے کی خاردار باڑ ہم سے بمشکل بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر تھی۔ باڑھ کی دیوار زمین سے دس پندرہ فٹ بلند تھی۔ اس میں خاردار تار کے گچھے نہیں تھے۔ بلکہ خاردار تار کو کھینچ کر اونچی دیوار سی بنا دی گئی تھی۔ ایک طرف لکڑی کے کھمبے پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ کمانڈو شیروان نے اپنے خچر کی باگ کشمیری مجاہد کو پکڑا دی اور مجھے بھی ایسا کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھی اپنا خچر مجاہد کے حوالے کر دیا۔ کمانڈو نے مجاہد کو خاص اشارہ کیا۔ وہ خچروں کو ایک طرف اندھیرے میں لے گیا۔ اسے وہاں بیٹھ کر ہماری واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

میں اور کمانڈو شیروان ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم بھارتی فوجی کیمپ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ سامنے خاردار باڑ کی دیوار تھی اور بائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پر فوجی بارک کی دیوار آکر ختم ہوتی تھی۔ یہ بھارتی فوجی بارک کی عقبی اور کونے والی دیوار تھی۔ ہمیں جو کچھ کرنا تھا وہ ہم دونوں کو پہلے ہی معلوم تھا۔ کمانڈو نے مجھے ایک اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ میں اسی جگہ بیٹھا رہوں۔ کمانڈو شیروان کسی چیتے کی طرح پتھر کے قریب والی جھاڑیوں کے اندر گھس گیا۔ اس کا مشن یہ تھا کہ اس نے فوجی کیمپ کی اس عقبی دیوار کے ساتھ اندر کی جانب کھڑی فوجی گاڑیوں اور فوجی سامان اور کوارٹر گارڈ کی چھت کے اوپر کیپسول بموں کو اس طرح اچھال کر پھینکنا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آگے کی جانب اس جگہ پر پہنچ سکیں جہاں کوارٹر گارڈ کی گاڑیاں کھڑی تھیں

اور فوجی رات کی ڈیوٹی پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ بم چونکہ کیپسول کے سائز کے
تھے۔ ان کے گرنے کی کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ہوتی بھی تو ڈیوٹی پر
موجود فوجیوں کو یہی لگتا کہ جیسے درختوں پر سے کوئی خشک پھل یا کوئی خشک ٹہنی ٹوٹ کر
گری ہے۔

میں رات کے اندھیرے اور خاموشی میں پتھر کے پیچھے ایک بہادر اور ذمے دار کمانڈو
کی طرح چوکنا ہو کر بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں عقاب کی آنکھوں کی طرح سامنے اور دائیں
بائیں اندھیرے میں فضا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کسی کسی وقت میں اچانک گردن پیچھے
گھما کر بھی دیکھ لیتا تھا۔ میرے ایک کندھے پر راکٹ لانچر لگا تھا۔ چاروں راکٹ میرے
پاس ہی زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ لائٹ مشین گن میرے ہاتھ میں تھی۔ میری کمانڈو
وردی سیاہ تھی۔ چہرے کی سفید رنگت کو کیمو فلاج کرنے کے لئے چہرے پر سیاہ لکیریں
پڑی تھیں۔ سر پر سیاہ رومال بندھا ہوا تھا اندھیرے میں سوائے میری آنکھوں کے کچھ
اور کچھ نظر نہیں آسکتا تھا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک رات گزرتی جارہی تھی۔

فوجی کیمپ کی طرف سے کسی فوجی کے اونچی آواز میں کسی کو ہالٹ کہنے کی آواز آئی
تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر خیال آیا کہ یہ ہالٹ کمانڈو شیروان کو نہیں کہا گیا۔ اسے
کیمپ کے اندر جانے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی اور آواز کیمپ کے اندر کچھ فاصلے سے آئی
تھی۔ میں نے احتیاط کے طور پر لائٹ مشین گن کو کاندھے سے لٹکا لیا اور سائی لینسر لگا
ریوالور نکال کر مضبوطی سے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ہنگامی صورت حال پیدا ہو جانے
ریوالور کے فائر کا دھماکہ پیدا نہیں ہونا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم دھماکہ خیز فائرنگ
پوزیشن میں نہیں تھے۔ میں ایک ایک سانس گن رہا تھا۔ کمانڈو شیروان ابھی تک واپس
نہیں آیا تھا۔ خطرہ یہی تھا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیا جائے اور فوجی اسے گولی نہ مار دیں۔ رات
کے وقت فوجی کیمپوں کے اردگرد چھپ چھپ کر آنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے
حکم ہوتا ہے۔ کمانڈو شیروان کو گئے پندرہ بیس منٹ ہو گئے تھے۔ مجھے یہ پندرہ بیس منٹ

گھنٹے محسوس ہوئے تھے۔

اچانک میں نے سامنے کیمپ کی خاردار دیوار کے پاس کسی چیز کو دیکھا کہ رینگ کر
خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ آگے کو جا رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو یہ کوئی آدمی تھا۔ یہ
آدمی کمانڈو شیروان ہی ہو سکتا تھا میرے دیکھتے دیکھتے یہ رینگتا ہوا سایہ مڑا اور جہاں میں
بیٹھا تھا اس طرف رخ پھیر کر رینگنے لگا۔ میں نے ریوالور پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط
کر لی۔ سایہ قریب آیا تو وہ کمانڈو شیروان ہی تھا۔ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں نے بارہ کے بارہ کیپسول بم خاردار تاروں کی دیوار کے ساتھ ساتھ اور کوارٹر
گارڈ کی چھت پر ڈال دیئے ہیں۔"

ہم بڑی دھیمی آواز بلکہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"کیمپ کے اندر کی کیا پوزیشن ہے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"سیکورٹی گارڈ جگہ جگہ ڈیوٹی پر ہیں ٹارچر سیل کے باہر کا کچھ پتہ نہیں دور سے کچھ
نظر نہیں آیا۔"

"ہمیں ٹارچر سیل کی طرف ایڈوانس کرنا ہوگا۔"

"اوکے۔ گو"

میں اور میرے پیچھے پیچھے تھوڑا دائیں جانب ہو کر کمانڈو شیروان بڑے پتھر کی اوٹ
سے نکلے اور اندھیرے میں بھارتی فوجی کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار کے جنوب کی
طرف رینگنے لگے۔ ہم کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے تاروں سے کوئی پندرہ بیس فٹ کے
فاصلے پر آکر رک گئے۔ ہماری عقابی آنکھیں رات کے اندھیرے میں تاروں کو اور تاروں
کے پیچھے فوجی بارک کی کونے والی دیوار کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہاں کوئی نقل
و حرکت معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ بارک کے کونے والی دیوار کے اوپر ایک بلب روشن تھا
اس کی روشنی بارک کے سامنے کی جانب پڑ رہی تھی۔ کمانڈو شیروان تیزی سے رینگ کر
میرے قریب آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ ذرا سا دبایا۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ میں نے سر نیچے

زمین کے ساتھ لگا کر دونوں جانب دیکھا۔ ایک پٹرول پارٹی آرہی تھی یہ دو فوجی سپاہی تھے
جو باتیں کرتے مزے مزے سے خاردار تاروں کی دیوار کے ساتھ چلے آرہے تھے۔ انہیں
ہم سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر سے گزرنا تھا۔

ہم نے اپنے سر بلکہ ٹھوڑیاں زمین کے ساتھ لگا رکھی تھیں اور نظریں پٹرول پارٹی
کے دونوں سپاہیوں پر جمی تھیں۔ ایک سپاہی کسی بات پر ہنسا۔ دوسرے نے اسے کچھ کہا
دونوں خاموش ہو گئے اور خار دار تاروں کو ایک دوبار جھک کر دیکھتے ہوئے آگے نکل
گئے۔ جب وہ اندھیرے میں کافی دور چلے گئے تو کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ایک ہی پٹرول پارٹی ہے میں جا کر تاروں کو کاٹتا ہوں۔"

"کمانڈو شیروان نے مجھ سے تار کاٹنے والا پلاس لیا اور رینگتا ہوا خاردار دیوار کی
طرف بڑھا۔ وہ ایک جگہ لیٹ کر تاروں کو کاٹنے لگا۔ جب تاروں کو خاص انداز میں کاٹ
کر دیوار میں گزرنے کے لئے راستہ بن گیا تو اس نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا۔ اس کا ہاتھ
سائے کی طرح اوپر نیچے ہوتا دیکھتے ہی میں کہنیوں کے بل تیزی سے رینگ کر اس کے
پاس آگیا۔

ہم جلدی سے خاردار تاروں والی دیوار کے سوراخ میں سے گزر کر دوسری طرف
نکل گئے۔ دوسری طرف جاتے ہی ہم نے کٹی ہوئی تاروں کو پھر سے اوپر اٹھا کر وہ شگاف
بند کر دیا۔ پٹرول پارٹی کے سپاہی اندھیرے میں اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم تیزی سے
بارک کی دیوار کے ساتھ لگ کر اس جانب رینگنے لگے جس طرف وہ ٹارچر سیل تھا۔ جہاں
امام صاحب قید تھے۔ کیونکہ ہمیں سب سے پہلے انہیں وہاں سے نکالنا تھا۔ اب کمانڈو
شیروان آگے آگے رینگ رہا تھا۔ کیونکہ اسے ساری لوکیشن کا علم تھا۔ میں رینگتے ہوئے
راکٹ لانچر کو بھی آگے آگے لے جا رہا تھا۔ وہاں چونکہ گھاس تھی اس لئے ہماری
راکٹ لانچر کے آگے کھسکنے کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ راکٹ لانچر تین ساڑھے تین
فٹ کی پرنالے جتنے سائز کی نالی کی طرح تھا جس کے پیچھے راکٹ کو چلانے والا ٹریگر لگا
تھا۔ یہ راکٹ میدان جنگ میں کاندھے پر رکھ کر دشمن کے کسی ٹینک یا گولہ بارود کے

ذخیرے پر فائر کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ آدمی زیادہ سے زیادہ تیس چالیس گز
کے فاصلے پر سے ٹارگٹ پر راکٹ فائر کرے۔ اس سے زیادہ فاصلے پر راکٹ کا نشانے پر
لگنا مشکوک ہو جاتا تھا۔ چاروں راکٹ میں نے لائٹ مشین گن کی سلنگ کے ساتھ اپنی
پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ بارک کی دیوار ختم ہو گئی۔ کمانڈو شیروان نے ہاتھ سے اپنے
دائیں ہاتھ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور خود اس طرف رینگتا ہوا چلا گیا۔ میں اس کے
پیچھے تھا۔ ہم آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ ٹارچر سیل والی کوٹھڑی ہمیں سامنے نظر آنے
لگی۔ اس کے آگے کی جانب روشنی تھی۔ پیچھے اندھیرا تھا۔ ہم اب سانس روک روک کر
آگے بڑھ رہے تھے۔ جب کوٹھڑی کی دیوار پانچ فٹ رہ گئی تو کمانڈو شیروان نے مجھے رکنے
کا اشارہ کیا۔ میں وہیں رک گیا۔ کمانڈو شیروان دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ دیوار کے کونے
پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ چونکہ دیوار کی دوسری طرف جدھر ٹارچر سیل کا دروازہ تھا روشنی
تھی اس لئے کمانڈو شیروان کا سر مجھے اس روشنی کے پس منظر میں سائے کی طرح دکھائی
دے رہا تھا۔ کمانڈو نے اپنا سر آگے کر کے دیوار کی دوسری جانب دیکھا۔

پھر اس نے سر میری طرف گھمایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں پیچھے ہو جاؤں۔ میں
جلدی سے اٹھا رینگتا ہوا تین چار قدم پیچھے چلا گیا۔ یہاں جنگلی جھاڑیاں تھیں دوسرے
لمحے کمانڈو شیروان بھی رینگ کر میرے پاس آگیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"دو فوجی ہیں۔ ایک سیل کے آگے ٹہل رہا ہے۔ دوسرا سٹول پر بیٹھا ہے۔ دونوں
کے پاس برین گنیں ہیں"

میں نے کمانڈو کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم اس طرف سے دیوار کے ساتھ رہو۔ میں دوسری طرف سے ان دونوں کو
ٹھکانے لگاتا ہوں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میری مدد کو آجانا۔"

"اوکے"

یہ کہہ کر کمانڈو دیوار کی ایک طرف اور میں دوسری جانب رینگنے لگا۔ دوسری طرف
ٹارچر سیل کو کونے پر جہاں دیوار مڑ جاتی تھی وہاں اندھیرے میں ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

میں رینگتا ہوا قریب گیا۔ دیکھا کہ یہ ٹائر تھے جو ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ میں ٹائروں کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ دیوار ختم ہو رہی تھی۔ دوسری طرف روشنی میں سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ میرے لئے وہاں گھات لگانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ صرف ٹائروں کا ڈھیر ہی تھا مگر یہ فاصلے پر تھا۔ میں نے تین سیکنڈ سوچا اور ٹائروں کی اوٹ میں بیٹھنے کا فیصلہ کرکے میں ان کے پیچھے اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اس لمحے گارڈ ڈیوٹی پر تعینات فوجی سپاہیوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے راکٹ لانچر چاروں راکٹ اور برین گن کندھے سے اتار کر قریب ہی زمین پر رکھ دی تھی۔ اس وقت میری جیکٹ کی جیب میں چھ گرنیڈ تھے۔ چھ گرنیڈ کمانڈو ایکشن شروع ہونے سے پہلے کمانڈو شیروان نے لے کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لئے تھے۔ کمانڈو چاقو بھی میری بیلٹ کے ساتھ لگا تھا۔ مگر میں نے سائی لینسر والا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہاں بھی مجھے وہی کام کرنا تھا اور اسی حکمت عملی کو دہرانا تھا جو اس سے پہلے میں دو تین مرتبہ کر چکا تھا۔ اس کے سوائے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک طرف سے نکل کر میں بڑی آسانی سے برین گن کا برسٹ مار کر دونوں فوجیوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔ مگر ہمیں وہاں فائرنگ کے دھماکے نہیں کرنے تھے۔ فائرنگ کی آواز سے سارا کیمپ بیدار ہو جاتا اور ہم ٹارچر سیل سے مولوی صاحب کو نہیں نکال سکتے تھے۔ ہمیں ہر کام خاموشی اور کوئی آواز پیدا کئے بغیر کرنا تھا۔ صرف ایک آواز ضرور پیدا کرنی تھی۔

اور میں نے اس آواز کو پیدا کرنے کے لئے زمین پر سے ایک روڑا اٹھا کر زور سے ٹارچر سیل کی پتھریلی دیوار کے ساتھ مارا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ روڑا دیوار سے ٹکرا کر ٹارچر سیل کی سامنے کی جانب جا پڑا۔ اس کی بھی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فوجی تیز تیز چلتا دیوار کے کونے پر نمودار ہوا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں ان ٹائروں کے ڈھیر کے پاس لانا چاہتا تھا۔ اس دوران میرے اندازے کے خلاف دوسرا فوجی بھی دیوار کے کونے میں سے نکل کر وہاں آگیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے یہ آواز کیسی تھی؟"

"حوالدار یہی دیکھ رہا ہوں۔"

دوسرے فوجی نے جھک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میرے لئے ان دونوں کو سنبھالنا مشکل نظر آرہا تھا۔ مگر مجھے ہر حالت میں ان دونوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ میں ٹائروں کے ڈھیر کے پیچھے اندھیرے میں پنجوں کے بل الرٹ ہو کر بیٹھا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ دونوں فوجی ایک دوسرے کے پیچھے ادھر ادھر دیکھتے ٹائروں کے ڈھیر کے قریب آکر رک گئے۔

اتنے میں ان میں سے ایک نے مجھے اندھیرے میں خدا جانے کیسے دیکھ لیا۔ شاید اس نے میری چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے وہ مجھے اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنی برین گن کی طرف بڑھا۔ اس نے برین گن اٹھائی ہی تھی کہ میں نے ریوالور سے اس پر یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔ ریوالور پر سائی لینسر لگا تھا۔ ٹھک ٹھک کی آواز آئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ دوسرا فوجی جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو گرتے بعد میں دیکھا پہلے اس نے ریوالور کی مخصوص سائی لینسر والی آواز سن لی تھی۔ وہ ایک دم سیدھا ہو گیا اور برین گن سے ہوائی فائر کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے کھڑے ہو کر پوائنٹ بلینک رینج سے یکے بعد دیگرے اس کے سینے کو نشانہ بنا کر تین گولیاں فائر کر دیں۔ گولی خواہ ریوالور کی ہو خواہ رائفل کی ہو۔ جب وہ جسم میں لگتی ہے تو اس کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا جسم سن ہو جاتا ہے میں نے ایک فوجی پر دو گولیاں فائر کی تھیں اور دوسرے پر تین گولیاں فائر کی تھیں دونوں نیچے گر پڑے تھے۔ میں انہیں برین گن کا ٹریگر دبانے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی برین گن کا ٹریگر دبا کر برسٹ فائر کر دیتا تو اس کے دھماکوں کی آواز سے کیمپ کے سیکورٹی گارڈ فوراً بھاگ کر ادھر آجاتے اور ہمارا مشن ہی ناکام ہو جاتا اور ممکن تھا کہ ہم زندہ بھی نہ بچتے۔ ایسی صورت حال میں مجبوراً کمانڈو شیروان کو دوسری طرف سے بھی لائٹ مشین گن کے برسٹ فائر کرنے پڑتے اور سارا کیمپ بیدار ہو جاتا۔ پھر ہم سارے کیمپ میں

ریموٹ کنٹرول کے بموں کے دھماکوں سے چاہے آگ لگا دیتے مگر ہم مولوی صاحب کو ٹارچر سیل سے نکال کر نہ لے جا سکتے تھے۔ یہ کام پھر بے حد مشکل ہو جاتا اور ہم جس مقصد کو لے کر وہاں آئے تھے وہ پورا نہ ہوتا۔

میں دوڑ کر دونوں فوجیوں کے سر پر جا پہنچا۔ اور ان کی برین گنیں ان کے نیم مردہ ہاتھوں سے پکڑ کر الگ کر دیں۔ اتنے میں کمانڈو شیروان بھی دبے پاؤں چلتا وہاں آگیا۔ میں نے احتیاط کے طور پر ریوالور کی ایک ایک گولی دونوں فوجیوں کی کھوپڑیوں میں اتار دی۔

کمانڈو شیروان بیٹھ گیا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا وہ سرگوشی میں بولا۔

"دروازے کی طرف آجاؤ۔ ادھر اب کوئی نہیں ہے۔"

ہم دیوار کے ساتھ لگ کر چلتے ٹارچر سیل کے دروازے کے قریب آکر رک گئے۔

یہاں دروازے کے اوپر لکڑی کے ڈنڈے کے ساتھ بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ ہمیں اس کی روشنی میں ٹارچر سیل کا دروازہ کھول کر یا اس کے تالے کو توڑ کر اندر داخل ہونا اور مولوی صاحب کو باہر نکالنا تھا۔ ہم نے ٹارچر سیل کے سامنے والی خالی جگہ کا جائزہ لیا۔ ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ کسی دوسرے سیکورٹی گارڈ یا پٹرول پارٹی کے جوان نے ریوالور کے سائی لینسر والے فائروں کی آواز نہ سن لی ہو۔ فوجی اس آواز کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ جب کسی طرف سے ہمیں کوئی فوجی اس طرف آتا نظر نہ آیا تو میں نے کمانڈو شیروان کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود ٹارچر سیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے رنگ میں ریوالور کی نالی ڈالی اور اسے اپنی طرف دو تین بار زور سے کھینچا مگر تالا نہ ٹوٹا۔ کمانڈو شیروان نے غصے میں آہستہ سے کہا۔

"کیا کر رہے ہو؟ اس پر فائر کرو۔"

فائر میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں نے تالے پر گولی چلائی تو سائی لینسر کی وجہ سے ریوالور کی اپنی آواز تو کم ہوگی مگر جب گولی لوہے کے تالے سے لگے تو دگنی آواز پیدا ہوگی۔ لیکن وقت بھی نازک تھا۔ کیمپ میں اس وقت کوئی بھی فوجی ادھر آسکتا تھا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور لوہے کے موٹے تالے پر ریوالور کا فائر کر دیا۔ تالا

ٹوٹ گیا مگر اس کی کافی اونچی چھنچھناہٹ کا شور پیدا ہوا۔ کمانڈو شیروان دوڑ کر آگیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ اندر تنگ کوٹھڑی میں بڑی دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اس دھیمی روشنی میں ہمیں ایک شرعی ڈاڑھی مونچھوں والا نیم عریاں آدمی فرش پر اوندھا پڑا نظر آیا۔ یہ ہندواڑے کے اس گاؤں کے امام صاحب تھے جیسے بھارتی فوجیوں نے آگ لگادی تھی اور جس کی مسجد کو شہید کر کے امام کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ ہم نے جلدی سے انہیں بلایا۔ مولوی صاحب کے جسم پر صرف ایک شلوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جسم پر جگہ جگہ خون جما ہوا تھا۔ ناک سے بھی خون بہہ بہہ کر جم رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ کمانڈو شیروان نے انہیں آواز دی۔ مگر مولوی صاحب بے ہوش تھے یا شہید ہو چکے تھے۔ کمانڈو نے ان کے دل پر کان لگایا۔ کہنے لگا۔

"امام صاحب زندہ ہیں"

اور کمانڈو شیروان نے مولوی صاحب کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ جیسے ہی ہم دروازے کی طرف بڑھے باہر سے فوجیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"تالا ٹوٹا ہوا ہے۔"

دوسرے فوجی نے گالی دے کر کہا۔

"کشمیری کمانڈو ہیں۔ اندر ہوں گے اٹیک کرو"

ٹارچر سیل کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور جیسے ہی چھ سات بھارتی فوجی اندر گھسے ہم نے اپنی لائٹ مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔ بھارتی فوجی وہیں ایک دوسرے پر الٹ الٹ کر گرتے چلے گئے۔ باہر بھی بھارتی فوجی تھے۔ انہوں نے پوزیشنیں لے کر باہر سے فائر کھول دیا۔ ان کا اندھا دھند فائر کوٹھڑی کے دروازے پر آرہا تھا۔

کمانڈو نے بے ہوش مولوی صاحب کو کاندھے پر ڈالا اور مجھے چیخ کر کہا۔

"پورے سیکشن کے فوجی لگتے ہیں۔ ان پر گرنیڈ پھینکو میں مولوی صاحب کو لے کر جاتا ہوں۔"

میں بھارتی فوجیوں کی لاشوں کے اوپر سے کود کر دروازے کی دیوار کے پاس گیا جیکٹ کی جیب سے ہینڈ گرنیڈ نکال کر پن نکالا اور اسے باہر پھینک دیا۔ میں نے اسی طرح چار ہینڈ گرنیڈ باہر سامنے اور دائیں بائیں اچھالے جن کے دھماکوں نے باہر کی پوزیشنوں میں بیٹھے فائرنگ کرتے فوجیوں کو تو خاموش کردیا مگر ان دھماکوں سے پورا فوجی کیمپ بیدار ہوگیا۔ ہر طرف سے شور وغل کی آوازیں آنے لگیں اور ہمیں ایسے لگا جیسے کیمپ۔ کی ہر جانب سے ہم پر چھوٹے بڑے اسلحے کا فائر شروع ہو گیا ہے۔

میں لائٹ مشین گن کے برسٹ مارتا ٹارچر سیل کے باہر آگیا اور گولیوں کی بوچھاڑ چاروں طرف مارنے لگا۔ اس دوران کمانڈو شیروان مولوی صاحب کو کاندھے پر ڈالے کوٹھڑی سے نکل کر پیچھے کی جانب اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا دوڑا۔ کیمپ میں ہر طرف روشنی ہوگئی تھی۔ اور کسی قریبی مورچے سے مشین گن کی فائرنگ بھی شروع ہو گئی تھی۔ گولیاں دیواروں اور درختوں سے چیختی ہوئی ٹکرا ٹکرا کر پھٹ رہی تھیں۔ میں لائٹ مشین گن کی بوچھاڑ میں مارتا پیچھے ہٹتا چلا جارہا تھا۔ اچانک میری دائیں جانب پھر اس کے ذرا آگے یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرنیڈ گرتے ہی پھٹ گئے۔ لوہے کے ٹکڑے چیختے ہوئے میرے سر کے اوپر سے گزرے۔ میں جھک کر خاردار تاروں کی طرف دوڑا کمانڈو شیروان مجھ سے پہلے وہاں تک پہنچ چکا تھا۔ ایک دم سے خاردار تاروں والی دیوار کے اوپر روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے اور ساری دیوار اور بارک دن کی طرح روشن گئی۔ اس روشنی میں بھارتی فوجیوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اب مشین گن رائفلوں اور برین گنوں کا فائر سیدھا ہم پر آنا شروع ہوگیا۔ میں زمین پر لیٹ گیا۔ لانچر میرے کاندھے سے نکل کر ایک گز پرے جا پڑا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ روشنی جو راؤنڈ فائر ہوئے تھے وہ پیراشوٹ والے روشنی راؤنڈ تھے اور آہستہ آہستہ نیچے آ تھے۔ ان کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ میں نے اس روشنی میں دیکھا کہ بارک اور خاردار تاروں والی دیوار کے ساتھ گیٹ کی جانب سے فوجیوں کی قطار قطاریں فائرنگ کرتی ہماری طرف تیزی سے دوڑی چلی آرہی تھیں۔ یہ فوجی فائرنگ

کی طرح تیزی سے بل کھاتے سانپوں کی طرح دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

میں نے چیخ کر کمانڈو سے کہا۔

"کمانڈو! نکل جاؤ"

اس کے ساتھ ہی میں نیلنگ پوزیشن میں (گھٹنوں کے بل) ہوگیا۔ لانچر میں ایک راکٹ لوڈ تھا۔ میں نے پہلا راکٹ قریبی بارک کی طرف سے آتے فوجیوں کو نشانے میں لے کر فائر کردیا۔ راکٹ ان کے درمیان دھماکے سے پھٹا۔ دھماکے کے ساتھ شعلے بلند ہوئے اور اس کی روشنی میں مجھے بھارتی فوجیوں کے جسم اڑتے نظر آئے۔ میں نے دوسرا راکٹ اسی پوزیشن میں بیٹھے رخ بدل کر گیٹ کی طرف سے آتے فوجیوں پر فائر کردیا۔ اس طرف بھی راکٹ دھماکے سے پھٹا اور نہ جانے کتنے فوجیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ میں خاردار تاروں کی طرف دوڑا۔ روشنی والے راؤنڈ نیچے آکر بجھ گئے تھے۔ مجھے کمانڈو شیروان نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک تین اور روشنی راؤنڈ فائر ہوئے اور میں نے ان کی روشنی میں کمانڈو کو مولوی صاحب کے کاندھے پر ڈالے خاردار تاروں کے شگاف ہی سے باہر کی طرف نکلنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ اس دوران وہاں اور فوجی نمودار ہوئے۔ اور پہلے کی طرح مشین گن اور رائفلوں کا فائر ہماری طرف آنے لگا۔ میں رینگ رینگ کر تاروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب دو ہینڈ گرنیڈ میرے قریب دھماکوں سے پھٹے تو میں نے لیٹے لیٹے باقی چاروں راکٹ بھی پوزیشن بدل بدل کر بھارتی فوجیوں پر فائر کردیئے فوجی کیمپ۔ میں ہر طرف دھماکے شعلے دھواں اور شور وغل مچا ہوا تھا۔ میں نے راکٹ لانچر ایک طرف پھینکا اور لیٹے لیٹے رینگنے لگا۔ اچانک کیمپ میں یکے بعد دیگرے قیامت خیز دھماکے شروع ہو گئے۔ یہ دھماکے خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ آگے گیٹ کی طرف ہوتے جا رہے تھے۔ ہر دھماکے کے ساتھ شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے اور اڑتے انسانوں کی چیخیں سنائی دیتیں۔ کمانڈو شیروان ریموٹ کنٹرول سے کیپسول بموں کو اڑا رہا تھا۔ پھر ایک دھماکہ کوارٹر گارڈ کی طرف ہوا جس کی روشنی میں مجھے ایک جیپ اوپر کو اچھل کر ٹیڑھی ہو کر زمین پر گرتی نظر آئی۔ میں اٹھ کر تاروں کے شگاف کی طرف

دوڑا۔ اتنے میں فوجی بارک میں بھی ایک دھماکہ ہوا اور بارک کی چھت اڑ گئی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے فوجی کیمپ پر بمباری ہو رہی ہے۔ سارے کے سارے کیپسول بم پھٹ کر جتنی تباہی مچا سکتے تھے مچا چکے تھے مگر یہ کوئی ایک دو فوجی مورچے نہیں تھے۔ پورا فوجی کیمپ تھا۔ جہاں نہ فوج کی کمی تھی نہ اسلحہ اور گولہ بارود کی کمی تھی۔ اندھیرا ہو گیا۔ اندھیرے میں یکے بعد دیگرے دو گولے آکر پھٹے۔ یہ ٹینک کے گولے تھے بھارتی اب روشنی راؤنڈ فائر نہیں کر رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا مقابلہ کشمیری کمانڈو کی پوری کمپنی سے ہے اور ان کے پاس راکٹ لانچر بھی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے چلائے ہوئے روشنی راؤنڈز کی روشنی میں ہم ان کے سپاہیوں پر راکٹ فائر کر سکیں۔

مجھے خاردار تاروں میں وہ جگہ اندھیرے میں نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے تاریں کاٹ کر ہم نے شگاف ڈالا تھا۔ میرے سارے ہینڈ گرنیڈ اور راکٹ ختم ہو چکے تھے۔ میرے پاس صرف لائٹ مشین گن اور اس کا میگزین ہی باقی تھا۔ جب ٹینک کے گولے میرے اردگرد پھٹے اور پتھر اور لوہے کے ٹکڑے چیخ چیخ کر اڑنے لگے تو میں زمین پر لیٹ گیا اور اندھیرے میں دائیں بائیں اور سامنے کی جانب فائرنگ شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ میں کانٹے والی تاروں کی دیوار کی طرف بھی کھسکتا جا رہا تھا کوئی گولہ پھٹتا تو اس کی روشنی میں مجھے دیوار کے تار نظر آ جاتے۔ ایک بار گولہ پھٹا تو مجھے تاروں میں ایک سوراخ دکھائی دے گیا۔ بھارتی فوجیوں کو اب میں بھی شاید نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ فائرنگ میری دائیں جانب ہو رہی تھی اور اس طرف سے گولیاں چیختی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ٹینک کی باری بند ہو گئی۔

میں تاروں میں ٹوٹی ہوئی جگہ دیکھ چکا تھا۔ میں اندھیرے میں اٹھ کر اس طرف پڑا۔ اور تیزی سے شگاف میں سے دوسری طرف نکل گیا۔ مجھے کمانڈو شیروان نظر ... میں نے یہی سمجھا کہ وہ مولوی صاحب کو نکال کر لے گیا ہے۔ میں نے شگاف سے ... لائٹ مشین گن کندھے پر ڈالی اور اندھیرے میں درختوں کی طرف دوڑا ابھی

... کافی دور تھا کہ کسی طرف سے ٹینک کا گولہ آ کر مجھ سے دس بارہ قدم آگے پھٹا۔ میں نے گولے کی چیخ کی آواز پہلے سن لی تھی۔ میں نے زمین پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ گولا دھماکے سے پھٹا پتھر اور لوہے کے ٹکڑے زناٹے سے ادھر ادھر بکھر گئے۔ کچھ مٹی میرے اوپر بھی گری۔ میں لیٹا ہوا تھا بچ گیا۔ دوڑ رہا ہوتا تو میں اڑ گیا تھا۔

میں دوبارہ دوڑنے کے لئے اٹھا تو عین اس وقت کیمپ کی جانب سے اکٹھے تین روشنی راؤنڈ ایک کے بعد ایک فائر ہوئے جن کی روشنی میں گھاس کے تنکے تک نظر آنے لگے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ ابھی روشنی راؤنڈز کی روشنی بجھی نہیں تھی اور میں بیٹھے زمین سے باہر نکلے ہوئے پتھروں کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ میرے سامنے اور دائیں بائیں کی جانب سے زبردست فائرنگ کے ساتھ کتنے ہی بھارتی فوجی دوڑتے ہوئے چھلانگیں لگاتے ہوئے میرے سامنے آ گئے۔ ان کی رائفلوں اور برین گنوں اور سٹین گنوں کے رخ میری طرف تھے۔ ان کا سیکشن کمانڈو ہاتھ میں پستول پکڑے میری طرف آیا اور اس نے آتے ہی مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ میں انہیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تو چرواہا ہوں۔ میرا حلیہ فل کمانڈو کا حلیہ تھا۔ میری شکل میرے کپڑے اور میرے پاس جو اسلحہ تھا وہ گواہی دے رہا تھا کہ میں خطرناک کمانڈو ...

سیکشن کمانڈو ٹھڈے مارتے مارتے تھک گیا تو دوسرے فوجیوں نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔ فوراً میری تلاشی لیتے ہوئے میرا ریوالور، لائٹ مشین گن کمانڈو چاقو اور بیلٹ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لی۔ میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے اور کھینچتے ہوئے کیمپ کے گیٹ کی طرف لے جانے لگے۔ اس دوران روشنی راؤنڈ بجھ گئے مگر فوجی کیمپ کی طرف کافی روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں مجھے کیمپ کے کئی جگہوں سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا اور ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ جیسے فوجی چلا رہے ہیں۔ آگ بجھ چکی تھی مگر دھواں اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ فوجی کیمپ کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ ہمارے کیپسول بموں نے گیٹ

کا ایک حصہ اڑا دیا تھا۔ فوجی ادھر ادھر دوڑ دوڑ کر کریٹ باہر نکال رہے تھے۔ شاید یہ اسلحہ کے کریٹ تھے۔ مجھے دھکا دے کر فوجی ٹرک میں گرا دیا گیا۔ چھ سات مسلح بھارتی فوجی بھی اندر آ گئے اور ٹرک ایک طرف کو چل پڑا۔

مجھے ٹرک میں اس طرح سے بٹھایا گیا تھا کہ میں بھارتی فوجیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ یہاں میرے دونوں ہاتھ رسیوں سے پشت کی طرف باندھ دیئے گئے۔ اس وقت مجھے کمانڈو شیروان کا خیال آ رہا تھا۔ خدا کرے کہ وہ مولوی صاحب کو لے کر نکل گیا ہو۔ ضرور وہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ یہ لوگ اسے گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ اگر گرفتار کرتے تو وہ بھی میرے ساتھ ہوتا۔ پھر مجھے اپنے اس مجاہد کمانڈو کا بھی خیال آیا جو خچر لے کر کمیں گاہ سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اسے ہم نے پیچھے درختوں کے نیچے اندھیرے میں بٹھا دیا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ مولوی صاحب پر بھارتیوں نے اتنا تشدد کیا ہو گا کہ وہ ہمارے ساتھ بھاگ نہیں سکیں گے۔ چنانچہ ہم انہیں خچر پر بٹھا کر اپنے مجاہد کے ہمراہ کسی دوسرے خفیہ پہاڑی راستے سے کمیں گاہ کی طرف روانہ کر دیں گے۔ خدا کرے کہ یہ مجاہد کمانڈو اور کمانڈو شیروان مولوی صاحب کو لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

مجھے اب اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔ میرے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا وہ میرے سامنے تھا اور یہ سلوک میرے ساتھ کئی بار ہو چکا تھا۔ مجھے کسی فوجی انٹیروگیشن سنٹر یا کسی ٹارچر سیل میں لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں مجھ پر ٹارچر کیا جائے گا۔ ایسی ایسی اذیتیں ایسے ایسے گھناؤنے طریقوں سے دی جانے والی تھیں کہ جن کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں یہ تمام اذیتیں برداشت کرنے کے لئے اپنے اپ کو تیار کر چکا تھا۔ ایک تو مجھے دشمن کا انتہا درجے کا ٹارچر برداشت کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ دوسرے میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا ظاہر ہے میں بھارتی فوجیوں کی حراست میں تھا اور میں نے اپنے ساتھی کمانڈو کے ساتھ مل کر بھارتیوں کا تقریباً سارا فوجی کیمپ تباہ کر دیا تھا اور نہ جانے ان کے کتنے فوجی جوان اور افسر ہلاک کر دیئے تھے۔ میرا ایک باقاعدہ کمانڈو ہونا

میرے لباس اور ایکشن سے ثابت ہو چکا تھا۔ اب یہ سوچنا احمقانہ بات تھی کہ یہ لوگ میری طرف سے ذرا سا بھی غافل ہوں گے اور میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو سکوں گا۔ اگرچہ دشمن کی حراست سے فرار ہونا میرا حق تھا اور میرا فرض بھی تھا اور میں نے فرار کے طریقے بھی سوچنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن اس وقت میرا ذہن دشمن فوجیوں کے ہاتھوں پکڑے جانے اور کمانڈو شیروان کے کامیابی کے ساتھ مولوی صاحب کے ساتھ وہاں سے نکل جانے سے پریشان تھا اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں بھارتیوں کی قید سے کیسے فرار ہو سکوں گا۔

ٹرک پہاڑی راستوں پر رات کے اندھیرے میں چلا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجی مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ ایک دو نے غصے میں آ کر مجھے تھپڑ بھی مارے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے تم پاکستانی کمانڈو ہو کشمیریوں کی مدد کرنے آئے تھے۔ ہم تمہیں ایسا مزا چکھائیں گے کہ اپنے باپ کا نام بھی بھول جاؤ گے۔

ان میں دو سکھ فوجی بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے نہ تو مجھے گالی دی اور نہ تھپڑ ہی مارے لیکن میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سکھ فوجی میری صرف اتنی ہی مدد کر سکتے ہیں کہ مجھے مارنے پیٹنے اور گالیاں دینے میں ہندو فوجیوں کا ساتھ نہ دیں۔ ٹرک پہاڑ کی اترائی اترنے کے بعد ہموار سڑک پر آ گیا تھا۔ ٹرک کے اوپر ترپال کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ صرف دروازے پر ترپال نہیں تھی جہاں سے پہاڑوں کی رات کی سرد ہوا اندر آ رہی تھی اور اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا ٹرک ایک طرف مڑ گیا۔

یہ کوئی اور بھارتی فوجی کیمپ تھا۔ یہاں ٹرک پر سے مجھے کھینچ کر اتارا گیا۔ فوجی مجھے دھکے دیتے ٹھڈے مارتے کیمپ کے کوارٹر گارڈ میں لے گئے اور اندر دھکیل کر اس کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔ باقی کی رات میں نے فرش پر بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر گزاری۔ دروازے کے آگے دو مسلح بھارتی فوجی ہاتھوں میں سٹین گنیں لئے ساری رات پہرہ دیتے رہے جب دن نکلا تو چھ سات فوجی مارچ کرتے ہوئے آئے کوارٹر گارڈ

کے سامنے زمین پر زور سے پاؤں مار کر رک گئے۔ ان کے آگے آگے ایک صوبیدار میجر تھا۔ وہ کوارٹر گارڈ کی جیل کی طرف بڑھا۔ باہر جو فوجی پہرے پر کھڑا تھا۔ اس نے فوراً تالا کھول دیا۔ صوبیدار میجر نے اندر آتے ہی میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا۔ آنکھوں پر پٹی بندھنے سے پہلے میں نے اس کے کاندھے پر ایک سٹار ایک پھول اور ایک پٹی کا صوبیدار میجری کا نشان دیکھ لیا تھا۔ میرے ہاتھ انہوں نے رات کو ہی کھول دیئے تھے۔ یہاں پھر رسی سے پشت پر باندھ دیئے۔ مجھے کسی گاڑی میں دھکیل کر بٹھا دیا گیا۔ دو فوجیوں نے دونوں طرف سے میرے بازو پکڑ رکھے تھے۔ جب گاڑی کا دروازہ بند ہو گیا اور باہر سے گاڑی کے دروازے کو لاک کرنے کی آواز آئی تو انہوں نے میرے بازو چھوڑ دیئے۔

یہ گاڑی بھی کوئی ٹرک لگ رہا تھا۔ اس کے انجن کی آواز ٹرک کے انجن جیسی تھی۔ پہاڑی اترائی چڑھائی کے رستوں پر یہ ٹرک دیر تک سفر کرتا رہا۔ پھر ہموار سڑک آگئی لگتا تھا ٹرک میدانی علاقے میں آگیا ہے۔ میدانی علاقے میں ٹرک کافی زیادہ رفتار سے دیر تک چلتا رہا۔ مجھے فضا میں گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ٹرک کشمیر کی ٹھنڈی پہاڑیوں سے نکل کر پنجاب کے میدانوں میں سفر کر رہا ہے۔ ایک بار پھر پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ مگر یہاں پہاڑوں والی ٹھنڈی ہوا نہیں تھی۔

ایک جگہ ٹرک آخر رک گیا۔

ٹرک سے نکال کر دو فوجی میرے بازو کو پکڑ کر مجھے چلاتے ہوئے ایک بند بند سی فضا میں لے آئے۔ پھر انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ ہاتھ کی رسیاں بھی کھول دیں۔ یہ ایک نیم روشن لکڑی کی چھت والا کمرہ تھا جس کا فرش خالی تھا۔ کمرہ چھوٹا سا تھا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا۔

ایک صوبیدار میجر میرے سامنے کھڑا مجھے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔

"وہ لیٹرین ہے۔ ادھر نلکہ لگا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ کمرے میں لیٹرین کا دروازہ بھی تھا۔ میں اس طرف گیا وہاں نلکے سے بالٹی میں پانی گر رہا تھا۔ یہاں میں نے منہ ہاتھ دھویا اور واپس آکر فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا تو دو فوجی آگئے۔ ایک برین گن لے کر دروازے پر کھڑا رہا۔ دوسرے نے دو روٹیاں جس پر دال پڑی ہوئی تھی میرے ہاتھ میں تھما دیں اور مارچ کرتا باہر نکل گیا۔ دروازہ ایک بار پھر مقفل کر دیا گیا۔ میں نے دونوں روٹیاں کھالیں۔ کمرے کی دیواریں پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ان میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ دن کی روشنی صرف بند دروازے کی درزوں میں سے اندر آرہی تھیں۔

میں نے ایک درز میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر مسلح فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ سامنے کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ بھی کوئی فوجی کیمپ ہی تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ مجھے کچھ کچھ شک ہو رہا تھا کہ انہیں میرے سابقہ ریکارڈ کا علم ہو گیا ہے اور اس وجہ سے وہ مجھ سے زبردست انٹیروگیشن کرنے کے واسطے جموں یا اس سے بھی آگے پنجاب کے کسی ملٹری انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر میں لے جا رہے ہیں۔ اور مجھ سے وہ سب کچھ پوچھنا چاہتے ہیں جو مجھے معلوم ہے اور وہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں جو مجھے معلوم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی بڑی اہم تھی کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں کشمیری کمانڈو نہیں ہوں کیونکہ میں نے ٹرک میں فوجیوں سے جو دو ایک باتیں کی تھیں اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ میں کشمیری نہیں ہوں۔ کیونکہ میں کشمیری میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ مجھے پاکستانی کمانڈو ہی سمجھ رہے تھے۔ اور ایک ایسے پاکستانی کمانڈو کا بھارت کی ملٹری انٹیلی جینس کے ہاتھ آجانا کوئی معمولی بات نہیں تھی جو ان کے اسلحہ سے لدے ہوئے جہازوں ایمونیشن کے ذخیروں فوجی ٹرینوں اور نہ جانے کتنے فوجی کیمپوں کو دھماکوں سے برباد کر چکا ہو۔

میرا خیال تھا یہاں سے وہ مجھے کسی دوسری جگہ لے جا کر پوچھ گچھ شروع کریں گے لیکن وہ مجھے آگے نہ لے گئے اور اس جگہ پوچھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ وہاں

پہنچنے کے ایک دن بعد شروع ہوا۔ انہیں شاید دوسرے شہر سے دو تین خاص اور بڑے ماہر، تجربہ کار اور بوچڑ قسم کے فوجی افسروں کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ دن اور رات کوٹھڑی میں کسی نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ دن کے وقت دال روٹی دی گئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی ویسی ہی دو روٹیاں اور دال دی گئی۔ رات کو بھی یہی کچھ کھانے کو دیا گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ اگلے دن کوٹھڑی میں چار فوجی داخل ہوئے۔ ان میں دو عام سپاہی تھے۔ اور دو فوجی افسر تھے۔ ان میں سے ایک کیپٹن اور دوسرا میجر کے رینک کا تھا۔ کیپٹن ڈوگرہ تھا اور میجر مدراسی لگتا تھا۔ پوچھ گچھ کی ابتداء بظاہر بڑے پیار محبت سے ہوئی۔ ڈوگرہ کیپٹن کا اردو بولنے کا لہجہ جیسے کانگڑے کا تھا جب کہ میجر کا لہجہ مدراسیوں والا تھا۔ جس طرح وہ اردو بول رہے تھے وہ نہیں لکھوں گا۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے پوچھا انہیں عام اردو زبان میں لکھتا جاؤں گا۔ سپاہی اپنے ساتھ ایک ایک کرسی بھی لائے تھے جو انہوں نے میرے سامنے ڈال دیں اور پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس برین گنیں لے کر اٹینشن کھڑے ہو گئے۔ کیپٹن اور میجر میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مدراسی میجر زیادہ تجربہ کار اور ہوشیار تھا۔ بیٹھتے ہی اس نے میری طرف دیکھا اور پیچھے کھڑے سپاہیوں سے پوچھا۔

"تم نے ہمارے پاکستانی جوان کو کھانے کو کیا دیا تھا؟"

ایک سپاہی نے فوراً جواب دیا۔

"سر لنگر سے دال روٹی لا کر دیا تھا۔"

اسے ڈانٹ کر کہا۔

"جنگلی! یہ تمہاری طرح کا دال کھانے والا فوجی جوان نہیں ہے۔ یہ پاکستان کا فوجی جوان ہے۔ اسے حلال گوشت کیوں نہیں لا کر دیا؟"

سپاہی نے فوراً کہا۔

"یس سر! اب حلال گوشت کا راشن لا کر دے گا سر!"

اس کے بعد مدراسی میجر نے بڑی معذرت کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جوان ان سے غلطی ہو گئی۔ آج سے تمہیں حلال گوشت ملے گا۔"

میں نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں پاکستانی فوج کا جوان نہیں ہوں۔ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ سری بات یہ ہے کہ آپ مجھ پر پاکستانی کمانڈو ہونے کا الزام لگانے کی ناکام کوشش نہ ریں۔"

ڈوگرہ کیپٹن نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"جوان! اگر تم کشمیری مجاہد ہو تو تم کشمیری زبان میں بات کیوں نہیں کر سکتے؟ تمہیں شمیری زبان بولنا ہی نہیں آتی پھر تم کشمیری مجاہد کیسے ہو سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں مشرقی پنجاب کا مسلمان پنجابی ہوں اور کشمیر کے جہاد میں صرف اسلامی جذبے تحت شریک ہوا تھا۔ میرا پاکستان سے یا پاکستانی فوج سے کوئی تعلق نہیں۔"

مدراسی میجر نے جیب سے چمڑے کا بٹوہ نکالا۔ اسے ایک طرف سے کھولا۔ اس میں بھرے ہوئے تھے ایک سگار میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے انگریزی میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم سگار شوق سے پیتے ہو۔ یہ لو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم زی زبان بڑی روانی سے بول لیتے ہو اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ تم ہندی اور سنسکرت جانتے ہو اور گجرات کاٹھیاواڑ کی گجراتی زبان اچھی طرح سمجھ اور بول لیتے ہو۔"

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ ان لوگوں کو میرے تمام سابقہ ریکارڈ کا علم ہو چکا تھا۔ نے انگریزی میں جواب دینے کی بجائے اپنی اردو زبان میں ہی کہا۔

"مجھے نہ سنسکرت آتی ہے نہ میں گجراتی زبان جانتا ہوں اور نہ مجھے سگار پینے کا شوق بہتر ہو گا کہ آپ الٹے سیدھے ہتھکنڈے آزمانے کی بجائے مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے ی طرح پوچھیں۔ اگر مجھے معلوم ہوا تو بتا دوں گا۔"

میجر اور کیپٹن نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ مدراسی نے سگار والا بٹوہ بند کر دیا۔ خود بھی سگار نہ سلگایا۔ کہنے لگا۔

"دوست! تم تو خوامخواہ ناراض ہو گئے ہو۔ لگتا ہے اس وقت تمہارا موڈ ٹھیک نہیں

ہے۔ اچھا پھر ملیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ لوگ کوٹھڑی سے چلے گئے۔ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا اور باہر دو فوجی دروازے کے آگے ٹہل کر پہرہ دینے لگے۔ لکڑی کی چھت والے اسی چھوٹے سے کوٹھڑی نما کمرے میں کوئی کھڑکی، کوئی روشندان نہیں تھا۔ میں صرف دروازے کی ایک آدھ درز میں سے باہر کی تھوڑی سی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ چونکہ یہ میدانوں سے ذرا اوپر کی جانب پہاڑی علاقہ تھا اس لئے وہاں میدانی علاقوں والی گرمی اور حبس نہیں تھا۔ کشمیر کی پہاڑیوں والی سردی بھی نہیں تھی۔ دو دن گزر گئے۔ کوئی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے نہ آیا۔ اس دوران مجھے تین وقت آلو گوشت کا سالن اور تازہ روٹیاں ملتی رہیں۔ تین وقت لنگر کی چائے بھی مل جاتی۔ تیسری رات کو ایک ساڑھی والی نوجوان عورت اندر آ کر میرے پاس بوریئے پر بیٹھ گئی۔ اب رات کو میرے کمرے میں لیمپ روشن کر دیا جاتا تھا۔ اس عورت کے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ یہ ہندو عورت تھی رنگ کھلتا ہوا تھا جسم بڑا پرکشش تھا نقش خوبصورت تھے۔ آنکھیں بھی سحر انگیز تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عورت ان لوگوں نے ہی مجھے سیدھی راہ سے بھٹکانے اور اپنی راہ پر لانے کے لئے بھیجی ہے۔

عورت نے آتے ہی بڑی صاف اردو میں کہا۔

”میں جانتی ہوں تم یہی سمجھ رہے ہو گے کہ مجھے یہاں کے کیپٹن اور میجر صاحب نے ہی تمہارے پاس بھیجا ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔ مجھے کیپٹن اور میجر صاحب نے ہی تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تمہارا دل بہلانے کے لئے نہیں بلکہ تمہیں صرف یہ سمجھانے کے لئے کہ ان لوگوں کے آگے ہٹ دھرمی سے کام نہ لینا۔ یہ دونوں جلاد ہیں یہ تم سے دو تین باتیں پوچھنا چاہتے ہیں ان باتوں کے بتانے سے تمہارے عزت اور عہدے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ لیکن اتنا ضرور ہو گا کہ تم انتہائی ہولناک اذیت اٹھانے سے بچ جاؤ گے۔“

میں اس ہندو عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”شریمتی جی! تم اپنی جگہ پر ہو سکتا ہے ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں یہ لوگ مجھ سے ایسی باتیں پوچھنا چاہتے ہیں جن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس

نے اگر ہٹ دھرمی سے کام نہ بھی لیا تو یہ لوگ میرا اعتبار نہیں کریں گے۔“

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری صاف گوئی سے خوشی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا نام سوشیلا ہے۔ تم مجھے شریمتی کی بجائے سوشیلا کہہ کر مخاطب کرو گے تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔“

اس نے بڑی بے باکی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دباتے ہوئے بولی۔

”ان لوگوں نے مجھے تمہارے پاس تمہیں خوش کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کیونکہ مجھے اس حقیقت کا علم ہے کہ پاکستانی فوج کے کمانڈو بڑے اعلیٰ کردار کے انسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کردار پر ذرا سا بھی داغ نہیں آنے دیتے۔ وہ بڑے پاک باز اور بہادر ہوتے ہیں۔ لیکن میرے دوست یہ بات میں تمہیں اپنے طور پر بتانا چاہتی ہوں کہ یہ لوگ تمہیں ایک دم نہیں ماریں گے۔ تمہیں خود بھی نہیں ماریں گے۔ بلکہ تمہارے جسم اور تمہاری روح کو اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں گے کہ تم خود موت کی خواہش کرنے لگو گے۔ یہ پھر بھی تمہیں نہیں ماریں گے میں نے اس کیپٹن اور اس مدراسی میجر جیسا سنگ دل اور انسان کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے والا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

”سوشیلا صاحبہ بہتر یہ ہے کہ تم بھی اپنا یہ بھاشن بند کر کے واپس میجر اور کیپٹن کے پاس چلی جاؤ۔ تم ناحق میرا سر کھا رہی ہو۔“

سوشیلا اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہاری بھلائی کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ تم ایک بار پھر میری باتوں پر غور کرنا۔ میں کل آؤں گی۔“

وہ چلی گئی تو میں آنکھیں بند کر کے لکڑی کے فرش پر جو بوریا ان لوگوں نے لا کر بچھا دیا ہوا تھا اس پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو مجھے بھنا ہوا گوشت اور اس کے ساتھ تین تندوری

روٹیاں دی گئیں۔ ساتھ کھیر بھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ قربانی کا بکرا پال رہے ہیں۔ جو کچھ کھلا رہے ہیں سب ایک ایک کر کے نکال لیں گے۔ میں چونکہ ہر قسم کے تشدد اور ٹارچر کے ہر غیر انسانی حربے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا اس لئے مزے سے سب کچھ کھاتا پیتا رہا۔ دوسرے دن بھی میری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کوئی مجھ سے کچھ پوچھنے نہیں آتا تھا۔ ایک فوجی سپاہی کھانا اور چائے لے کر آتا اور چلا جاتا۔ دوسری رات کو سوشیلا پھر آگئی۔

اس رات اس نے بڑے بھڑکیلی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس میں سے اس کا پیٹ صاف نظر آرہا تھا۔ پیٹ تو بھارت میں ہر ساڑھی پہننے والی عورت کا نظر آتا تھا مگر سوشیلا کا کچھ زیادہ ہی نظر آرہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لئے پوری تیاری کر کے آئی ہے۔ آتے ہی میرے پاس بیٹھ گئی کہنے لگی۔

"میجر صاحب اور کیپٹن صاحب تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم بڑے بہادر اور کریکٹر والے پاکستانی کمانڈو ہو۔"

میں نے وہیں اس کی بات کاٹ دی۔

"اپنا جملہ درست کرلو۔ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"تم جو کچھ بھی ہو واقعی مجھے بھی بڑے اچھے لگتے ہو۔"

وہ میرے قریب ہوگئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر محبت سے سہلانے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تم نے جو بات کرنی ہے وہ کرو اور یہاں سے واپس چلی جاؤ۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

سوشیلا نے میری بات کو جیسے بالکل نہیں سنا تھا۔ کہنے لگی۔

"ان لوگوں نے تمہارا جو حال کرنا ہے اس کو سوچ کر ہی میری آتما کانپنے لگتی ہے۔ میں تمہیں بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں کہ انہیں جو یہ پوچھنا چاہتے ہیں بتادو پھر یہ تمہیں

یں کہیں گے۔ کم از کم میری خاطر اپنے آپ کو موت کے حوالے نہ کرو۔"

میں ہنس پڑا۔

"کمال ہے تم میری کیا لگتی ہو جو میں تمہاری خاطر ایسا کروں؟ اور پھر میں انہیں وہ ھ کیسے بتا سکتا ہوں جو مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ تو مجھے پاکستانی کمانڈو سمجھ رہے ہیں ر مجھ سے پوچھیں گے کہ میرے ساتھی پاکستانی کمانڈو انڈیا میں اور خاص طور پر جموں شیر میں کہاں کہاں پر ہیں۔ میں نہ پاکستانی کمانڈو ہوں۔ نہ میرا کوئی ساتھی یہاں پر ہے۔ ر میں ان کے سوالوں کے ان کی مرضی کے موافق جواب کیسے دے سکتا ہوں؟"

یہاں سوشیلا نے وہ بات ظاہر کر دی جس کے بارے میں مجھے پہلے ہی شک پڑ چکا تھا۔ نے لگی۔

"یہاں کی ملٹری انٹیلی جنس کے پاس تمہارا سارا پرانا ریکارڈ پہنچ چکا ہے۔ کیپٹن بترہ ر میجر راما راؤ کو تمہارے بارے میں ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ تمہاری ساری فائل ان ے پاس موجود ہے۔ تم نے گجرات، دلی، ترچنا پلی اور ناگ پور میں انڈین ملٹری کو جو دست نقصان پہنچایا ہے اور ان کے جتنے فوجیوں کو مارا ہے اس کا ایک ایک ریکارڈ ان پاس ہے۔ تم کس بات سے کیسے انکار کرو گے؟ جب کہ دلی کے اخباروں میں چھپنے والی ری تصویر کے تراشے بھی فائل میں لگے ہوئے ہیں۔"

میں خاموشی سے اس ہندو عورت سوشیلا کی باتیں سن رہا تھا جو بالکل صحیح تھیں۔ و کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ نے اس عورت کو اسی لئے میرے پاس سارا ڑ بریف کر کے بھیجا تھا کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا کوئی کمانڈو ایکشن ان لوگوں چھپا ہوا نہیں ہے۔ اور ان کے پاس میرا فل ریکارڈ موجود ہے جو ایک مصدقہ دستاویز ان کا خیال تھا کہ شاید اس عورت کے ذریعے میں ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر ہو جاؤں۔ مگر یہ بات میرے اصول کے خلاف تھی۔ ٹھیک ہے اگر انہیں معلوم ہو کہ میں کمانڈو ہوں اور میں نے بڑی تباہی مچائی تھی تو میں اس سے انکار نہیں کروں اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں پاکستانی کمانڈو ہوں جب کہ یہ ایک

حقیقت بھی تھی۔ میں نے سوشیلا سے کہا۔

"مجھے اب جو کچھ کہنا ہے وہ میں کیپٹن بترہ ' میجر راما راؤ کے سامنے ہی کہوں گا۔ تمہارا اب بار بار میرے پاس آنا بیکار ہے جاؤ۔"

سوشیلا نے دوچار بار مجھے سمجھانے کی کوشش کی اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مدراسی میجر راما راؤ اور ڈوگرہ کیپٹن بترہ آگئے۔ ان کے ساتھ دو فوجی تھے جنہوں نے لوہے کی دو کرسیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ کرسیاں میرے سامنے رکھ دی گئیں۔ میجر اور کیپٹن ان پر بیٹھ گئے۔ فوجی دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ڈوگرہ کیپٹن نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے بتایا کہ میرے بارے میں ان کے پاس فل ریکارڈ موجود ہے اور یہ کہ میں اپنے پاکستانی کمانڈو ہونے کا انکار نہیں کر سکتا۔

"اس لئے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ جو ہم تم سے پوچھیں تم ہمیں بتادو۔ صرف تم سے دو تین سوال ہی پوچھیں گے۔ تمہیں زیادہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

ہاں مدراسی میجر نے میری طرف جھک کر کہا۔

"ہمیں صرف یہ بتادو کہ تمہارے دوسرے پاکستانی کمانڈو یہاں کہاں پر چھپے ہوئے ہیں اور تمہارا اگلا کمانڈو آپریشن کیا تھا؟" بس صرف یہی دو آسان سے سوال ہیں ہمیں کے جواب دے دو اور اس کے بعد تم آزاد ہو۔ بے شک واپس اپنے ساتھیوں کے پاس چلے جاؤ۔ اگر پاکستان جانا چاہتے ہو تو ہم تمہیں خود بارڈر کراس کرا دیں گے۔"

یہ سوال مجھ سے دلی ترچنا پلی اور گوالیار کے ٹارچر سنٹروں میں کئی بار پوچھے گئے اور میں نے ان کا ایک ہی جواب دیا تھا کہ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ کشمیری ضرور ہوں اور دشمن کے ساتھ جنگ کرنا میرا۔ مذہبی اور انسانی حق ہے۔ جب میں یہاں بھی یہی جواب دیئے تو کیپٹن بترہ اور میجر راما راؤ کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

راما راؤ بولا۔

"چلو ہمیں یہی بتادو کہ کشمیری مجاہدوں کے کمانڈو شیروان کا خفیہ اڈہ کہاں پر

ے بعد ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کہاں ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو کبھی نہیں بتاؤں گا۔"

اس پر مدراسی میجر کا چہرہ غصے سے اور کالا ہو گیا۔ انگریزی میں مجھے گالی دی اور میرے ہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ ایک بار تو میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔ میں ی مدراسی کی گردن ایک سیکنڈ میں توڑ سکتا تھا لیکن وہ مقام ایسا نہیں تھا۔ اس کی گردن نے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کے مرنے کے بعد کوئی دوسرا راما راؤ آجاتا۔ میں یہ بے تی برداشت کر گیا اب دونوں نے مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے اپنے پ کو سمیٹ لیا اور ان کی مار کھاتا رہا۔ جب وہ تھک گئے اور ہانپنے لگے تو چلے گئے۔ رے روز مجھے اس پہاڑی فوجی کیمپ کے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں اذیت ئے اور غیر انسانی ٹارچر کے ہر قسم کے آلات پڑے تھے۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیسا ہا وحشیانہ سلوک کیا؟ یہ میں آپ کو بیان نہیں کر سکتا۔ ایک گھنٹے کے ٹارچر کے بعد میں ی تکلیف برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ٹارچر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

بھارتی ملٹری انٹیلی جینس کے اس فوجی کیمپ میں چار ٹارچر سیل تھے۔ ہر ٹارچر سیل تشدد کے الگ الگ آلات رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ٹارچر سیل میں بجلی کے دیئے جاتے تھے اور انسانی جسم کے نازک حصوں پر بجلی لگائی جاتی تھی۔ ایک ٹارچر میں چھت کے ساتھ الٹا لٹکا کر نیچے آگ جلا کر دھونی دی جاتی تھی۔ ایک ٹارچر سیل مجھے لکڑی کے شکنجے میں جکڑ کر میری ٹانگوں اور بازوؤں کو اس طرح سے کھینچا گیا کہ کہ میری ٹانگوں اور بازوؤں کے جوڑ الگ ہو رہے ہیں۔ ہر ٹارچر سے پہلے اور ہر ٹارچر اور مجھ سے کہا جاتا کہ اب بھی اگر میں انہیں اپنے ساتھی پاکستانی کمانڈو کے بارے میں نڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کے بارے میں بتادوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر میرا

ہر بار یہی جواب ہوتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وحشیانہ اور طرح طرح کے تشدد کی وجہ سے میرا ذہن بھی ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

کسی وقت مجھے لگتا کہ میں ایک صحرا میں ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ فوجی جیپ کے پیچھے بندھے ہیں اور جیپ مجھے کھینچتی ہوئی صحرا میں بھاگی جا رہی ہے۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں گردن تک دلدل میں دھنسا ہوا ہوں اور دلدل کے اندر کیڑے میرے جسم کو کاٹ رہے ہیں یہ سب کچھ میں بے ہوشی کی حالت میں نہیں بلکہ ہوش کی حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ جب درد اور اذیت کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی تو میں واقعی بے ہوش ہو جاتا۔ اس بھیانک ٹارچر کے دوران مجھے صرف ایک بات کی خوشی تھی کہ میں ہر قسم کا تشدد برداشت کر رہا ہوں مگر میں نے اپنی زبان بالکل نہیں کھولی اور دشمن کو کچھ نہیں بتایا۔ اس بات پر ہندو فوجی افسر اور زیادہ غضب ناک ہو کر مجھ پر وحشیانہ تشدد کا عمل دوبارہ شروع کر دیتے یہ سلسلہ پندرہ دن تک چلتا رہا۔

میرا وزن بھی کم ہو گیا تھا اور جسم پر چاقو، چھریوں اور سگریٹ کے داغوں کے جابجا زخم ابھرے ہوئے تھے۔ اس دوران ہندو عورت سوشیلا ایک بار بھی نہ آئی۔ جب مجھ پر ٹارچر کرتے ہوئے بیس پچیس دن گزر گئے اور وہ لوگ میری زبان نہ کھلوا سکے تو میجر راما راؤ نے مجھے پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔ میری پھانسی کی اطلاع دینے شریمتی سوشیلا آئی۔ رات کا وقت تھا۔ میں ٹارچر سیل میں زمین پر پڑا تھا۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو درد نہ کر رہا ہو۔ لیکن میں درد کو برداشت کر رہا تھا۔ اس بار جو مجھ پر تشدد کیا گیا وہ پہلے تمام ٹارچروں سے نمبر لے گیا تھا۔ یہ ایسا تشدد تھا کہ ایک بار تو اس نے میری روح کو بھی ہلا دیا تھا۔ لیکن میرا مقصد عظیم تھا۔ مجھے اپنے خدا کی رحمت پر بھروسہ تھا۔ جب انسان کسی نیک اور عظیم مقصد کے لئے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور اسے اپنے خدا پر یقین بھی ہو تو پھر تکلیف آدھی رہ جاتی ہے۔

دروازہ کھلا اور سوشیلا ایک مسلح سپاہی کے ساتھ کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھ سے تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی۔ تم ناحق تکلیف اٹھا رہے ہو۔ اگر تم ان لوگوں کو اپنے دو چار ساتھیوں کے ٹھکانے بتا دو تو اس عذاب سے بچ جاؤ گے۔ ابھی وقت ہے۔"

میں نے اسے کہا کہ اگر میرے جسم کے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تو میں یہ غداری کبھی نہیں کروں گا۔ سوشیلا مجھے سیدھی راہ سے بھٹکانے کی کوشش کرتی رہی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میرا عزم چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ہے تو کہنے لگی۔

"تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کل سورج نکلنے کے ساتھ ہی تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا اب بھی تم اپنی ضد پر اڑے رہو گے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے میں پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لوں گا مگر اپنے ساتھیوں کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔"

سوشیلا نے کہا۔

"اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ کیپٹن بترہ اور میجر راما راؤ کسی اذیت ناک طریقے سے تمہیں پھانسی پر چڑھائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو گے۔ سنو یہاں بیچ دو ٹیلوں کے درمیان پہاڑی نالہ بہتا ہے ان ٹیلوں کے درمیان فوج نے اپنی سہولت کے واسطے لکڑی کا ایک چھوٹا سا پل بنا رکھا ہے۔ جلاد تمہیں پل کے درمیان کھڑا کر دے گا پھر تمہاری گردن میں رسی ڈال دی جائے گی۔ تمہارے منہ پر کالا نقاب نہیں ڈالا جائے گا۔ تمہارے پاؤں کے ساتھ بھی وزن نہیں باندھا جائے گا۔ کیونکہ وزن باندھنے سے تمہاری موت جلد واقع ہو جائے گی۔ اور کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ تمہارے مرنے کا منظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب جلاد تمہیں پل پر سے نیچے دھکا دے گا تو رسی کا پھندا نیچے گرنے سے تمہاری گردن میں کس جائے گا اور تم پل اور بہتے ہوئے نالے کے درمیان لٹک جاؤ گے اور تڑپنے لگو گے۔ تمہاری زبان باہر نکل آئے گی تمہاری آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ تمہارے پاؤں کے ساتھ چونکہ وزن نہیں بندھا ہوا ہو گا اس لئے

تمہیں اتنا زیادہ جھٹکا نہیں لگے گا کہ تمہاری گردن کے مہرے ایک دم الگ ہو کر تمہیں موت کی نیند سلادیں۔ تمہیں صرف اپنے وزن کا ہی جھٹکا لگے گا اور تمہاری ایک دم موت واقع نہیں ہوگی۔ تم رسی کے ساتھ پل کے نیچے جھولتے رہو گے۔ تڑپتے رہو گے اور کیپٹن بترہ اور میجر راما راؤ پل کی ایک طرف کرسیوں پر بیٹھے بیئر پیتے ہوئے تمہیں تڑپتا دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔ کیا تمہیں ایسی اذیت ناک موت گوارا ہے۔؟"

میں نے اپنے بدن سے اٹھتی درد کی لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی راہ میں میں ایک ہزار بار ایسی موت کو گلے لگانے کو تیار ہوں۔ یہ بات تم اپنے کافر کیپٹن اور میجر کو بھی جا کر بتادو۔"

سوشیلا خاموشی سے اٹھی اور چل دی۔

میرا خیال تھا کہ یہ ان لوگوں کی گیدڑ بھبکی ہے۔

اور یہ مجھ سے کشمیری مجاہدوں کے خفیہ ٹھکانوں کے راز معلوم کرنے کی ایک آخری وشش ہے لیکن دن نکلتے ہی جب دو فوجی کوٹھڑی میں آکر مجھے باہر لے گئے تو مجھے شک ا کہ کہیں واقعی ان لوگوں نے مجھے پھانسی چڑھانے کا پروگرام تو نہیں بنایا ہوا۔ اس کے جود مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی مجھے دو ایک بار جان سے مار دینے ا دھمکی دی گئی تھی۔

ان فوجیوں نے میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے تھے اور مجھے دونوں طرف سے بازوؤں ے پکڑ کر ساتھ چلاتے ہوئے فوجی کیمپ کے عقب میں لے گئے۔ یہاں پہلے سے ایک لح فوجی گارڈ میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ ان دو سپاہیوں نے مجھے اس فوجی گارڈ کے الے کردیا۔ فوجی گارڈ کے سپاہی میرے دائیں بائیں ہو گئے تھے۔ میں ان کے گھیرے ں تھا۔ اس وقت دن ابھی نکلا ہی تھا۔ میں نے پہلی بار اس فوجی کیمپ کے بیرونی ماحول کو کھا۔ اس کیمپ میں تین چار بارکیں تھیں۔ فوجی جیپیں اور گاڑیاں جگہ جگہ کھڑی یں۔ کیمپ کے عقب میں جس طرف یہ مسلح گارڈ مجھے لے جا رہی تھی اونچی پتھریلی ار تھی۔ اس میں ایک دروازہ لگا تھا۔ دروازے پر بھی مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ وازے سے باہر نکلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ اردگرد بھورے رنگ کی خشک اونچی نیچی اڑیاں تھیں۔ یہ مجھے جموں کا علاقہ لگ رہا تھا۔ ان پہاڑیوں پر کشمیر کی پہاڑیوں والے ہ اور چنار کے درخت نہیں تھے۔ کچھ پہاڑیاں بالکل خشک اور بنجر تھیں۔ کچھ پہاڑیوں

کی ڈھلانوں پر جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ بھارت کی کسی رجمنٹ کی یونٹ کے یہ فوجی
مجھے تیز تیز چلاتے بلکہ دھکیلتے ہوئے تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر ایک ٹیلے کے اوپر لے
آئے۔

میں نے دیکھا کہ ٹیلے پر ڈوگرہ کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ ٹیلے پر بنے ہوئے
سیمنٹ کے چھوٹے سے چبوترے پر میز کرسی لگائے بیٹھے ہیں۔ میز پر بیئر کی دو بوتلیں رکھی
ہوئی ہیں اور دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک گلاس ہے۔ دونوں بیئر پی رہے ہیں۔
مدراسی میجر کے منہ میں سگار دبا ہوا ہے۔ مجھے ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔
رات کو سوشیلا نے جو منظر بیان کیا تھا وہ مجھے سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس ٹیلے کی دوسری
طرف اسی طرح کا ایک اور ٹیلا تھا۔ دونوں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان
لکڑی کا ایک پل تھا۔ نیچے ضرور پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا مجھے پانی کے زور شور سے بہنے کی
آواز سنائی دے رہی تھی۔ پل کے پاس بھی دو مسلح فوجی رائفلیں لئے کھڑے تھے۔
مدراسی میجر راما راؤ نے منہ سے سگار نکالا اور میری طرف اپنی پیلی پیلی بے رحم آنکھوں
سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابھی تمہارے پاس زندگی کا آخری ٹائم ہے۔ اگر اب بھی تم ہمیں اپنے ساتھی
کمانڈوز اور کمانڈر شیروان کے خفیہ ٹھکانے کا پتہ بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دے گا۔"

اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈوگرہ کیپٹن نے کہا۔

"تم خوامخواہ ان لوگوں کے لئے مر رہے ہو۔ جن کا پتہ ہمیں آج نہیں تو کل لگ
جائے گا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ابھی چند منٹوں کے بعد تمہاری لاش لکڑی کے پل کے
لٹکی تڑپ رہی ہوگی۔ اب بھی وقت ہے ہمیں اور کسی کمانڈو کا نہ سہی صرف کمانڈر
شیروان کے خفیہ ٹھکانے کا بتا دو۔ ہم تمہیں ابھی چھوڑ دیں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ کار
پر بٹھا کر بیئر پلائیں گے۔ بڑا اچھا ناشتہ کرائیں گے اور تم جہاں جانا چاہو گے ہمارا آدمی
تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔"

یہ لوگ سچ مچ مجھے اپنی طرف سے مارنے والے تھے۔ کیونکہ میرا یہ ایمان تھا

گی اور موت اللہ کی طرف سے ہے اور صرف اسی کے حکم سے موت آتی ہے اور
ت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو پھر ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا
فرق نہیں پڑ سکتا۔ میں نے ڈوگرہ میجر سے کہا۔

"میری زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرا وقت آ گیا ہے تو پھر
کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر موت کا وقت نہیں آیا تو پھر تمہاری ساری فوج بھی مجھ پر
کھول دے تو میں نہیں مر سکتا۔"

ڈوگرہ کیپٹن نے مدراسی میجر کی طرف دیکھا۔ مدراسی میجر نے بائیں جانب کھڑے دو
ہیں کو اشارہ کیا۔ یہ دونوں فوجی پہلے سے جیسے تیار تھے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے
ا اور پل کی طرف لے گئے پل کے سرے پر جو دو فوجی کھڑے تھے ان میں سے ایک
کا رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا اور وہ ڈوگرہ نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے اس فوجی کے حوالے
تے ہوئے پہلے فوجی نے اونچی آواز میں کہا۔

"نائیک گنگا داس! میجر صاحب کا آرڈر ہے اس کو لٹکا دو۔"

کھلتی رنگت والے نائیک گنگا داس نے زور سے زمین پر پاؤں مار کر اونچی آواز میں

"یس سر! صوبیدار صاحب"

نائیک گنگا داس نے میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کی رسیاں کھول دیں۔ اس
نا چار مسلح فوجی سپاہی مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ میں نے نائیک گنگا داس سے

"اگر تم لوگ مجھے پھانسی پر چڑھانے لگے ہو تو میرے ہاتھ کیوں کھول رہے ہو؟"

لنگا داس نائیک نے اونچی آواز میں کہا۔

"اس لئے کہ جب تم پل کے نیچے لٹکو تو تم خوب تڑپو۔ کمینے کشمیری کمانڈو! تم لوگوں
ہیں بہت پریشان کیا ہے چلو۔"

مجھے سوشیلا کی بات یاد آ گئی اس نے کہا تھا کہ نہ میرے بازو باندھے جائیں گے نہ

میرے پاؤں کے ساتھ ریت کی بوریاں باندھی جائیں گی۔ تاکہ میں ایک ہی جھٹکے میں
گردن ٹوٹنے سے مر نہ جاؤں۔ جب گلے میں پھندا کس جائے گا اور میں نیچے لٹکا ہوا
ہاتھوں سے گردن کا پھندا پکڑوں گا اور میری ٹانگیں تڑپیں گی تو کیپٹن اور میجر میری اس
حالت کو دیکھ کر خوب مزہ لیں گے اور بیئر پیتے ہوئے میری موت کے طول ہوتے منظر سے
خوب لطف اندوز ہوں گے۔ نائیک گنگا داس نے وہیں میری گردن میں رسے کا پھندا ڈال
دیا۔ پھندے میں موٹی سی گرہ لگی ہوئی تھی۔ مگر ابھی پھندا میری گردن میں پوری طرح
سے کسا نہیں گیا تھا۔ نائیک گنگا داس مجھے پکڑ کر لکڑی کے پل پر چل پڑا۔

ہمارے پیچھے پیچھے دو فوجی ہاتھوں میں رائفلیں لئے چل رہے تھے۔ اس وقت مجھے
یوں لگا کہ بس واقعی میری موت کا وقت آگیا ہے۔ لیکن کمانڈوز اتنی آسانی سے نہیں مرا
کرتے۔ اگر وہ مرتے بھی ہیں تو اپنے ساتھ دشمن کے چھ سات آدمیوں کو لے کر مرتے
ہیں۔ مگر وہاں میرے فرار ہونے اور دشمن کے چھ سات آدمیوں کو ہلاک کرنے کے بظاہر
کوئی حالات نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نہتا تھا میری گردن میں رسی پڑی تھی۔ دو مسلح
بھارتی سپاہی میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جس نائیک گنگا داس نے مجھے رسی سے پکڑ
رکھا تھا اس کے کاندھے پر بھی سٹین گن لٹک رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھا۔ نیچے پہاڑی
نالے کا پانی بڑے زور شور سے آگے کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا
تھا۔ سورج مشرق کی پہاڑیوں کے اوپر آگیا ہوا تھا اور چاروں طرف دن کا اجالا پھیلا ہوا
تھا۔ میں پل پر سے چھلانگ لگانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری گردن میں رسی تھی اور
رسی کا سرا نائیک گنگا داس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھ کر کہا۔

"یا میرے اللہ پاک! اگر تیری یہی رضا ہے تو میں حاضر ہوں۔ میرے گناہ بخش
دینا۔"

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے میرے مرحوم والد صاحب کی شکل آگئی میں ان
کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے جہاد کشمیر میں شریک ہونے مقبوضہ کشمیر کی خون اور آگ
اگلتی وادی میں آیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے والد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میاں جی! میں نے آپ کی وصیت پر جتنا ہو سکا عمل کیا۔ مگر میں کشمیر کو بھارتی قبضے
آزاد نہیں کرا سکا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے پاس آرہا ہوں۔ میرے حق میں
ریں کہ اللہ پاک مجھے بخش دے۔"

لکڑی کا چھوٹا سا پل ہمارے چلنے سے ہل رہا تھا۔ یہ مختصر سا پل تھا اور دوسرے ٹیلے
جھاڑیاں وہاں سے صاف نظر آرہی تھیں۔ مجھے پل کے عین درمیان میں لا کر کھڑا کر دیا
پل کے پہلوؤں کی جانب رسے بندھے ہوئے تھے۔ نائیک گنگا داس نے جلدی سے
موٹی اور مضبوط رسی کو پل کے رسے کے ساتھ کس کر باندھ دیا جس کے دوسرے
ے کا پھندا میری گردن میں پڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے
کا ایک آخری موقع ہاتھ سے گنوا دیا تھا۔ میں نائیک گنگا داس کو ایک طرف گرا کر اس
ہاتھ سے رسی کا سرا چھڑا کر پل کے اوپر سے نیچے نالے میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ مگر
میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اب رسی کا ایک سرا میری گردن میں پھندا بن کر پڑا تھا اور
سرا پل کے رسے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اب اگر میں چھلانگ لگاتا ہوں تو میری
ن کو زبردست جھٹکا لگتا اور ایسے بھی میری موت یقینی تھی۔ پھندا گردن میں کسا ہوا
تھا مگر اتنا کھلا بھی نہیں تھا کہ میں اس میں سے اپنا سر باہر نکال سکتا۔ پھر پھندے میں
موٹی گرہ پڑی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ میری بائیں جانب پل کے شروع والے سرے کے قریب چبوترے
یوں پر بیٹھے بیئر پیتے ہوئے بڑی اشتیاق بھری نظروں سے آگے کو جھک کر میری
کا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ مجھے ان کے چہرے
میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ لکڑی کا پل بھی مختصر سا تھا۔ جس وقت نائیک
اس نے مجھے پل پر ایک جگہ بالکل کنارے پر لا کر کھڑا کیا تو دونوں ڈوگرہ سپاہیوں نے
ائفلوں کے سیفٹی کیچ آگے کو کھینچ کر اس کی نالیاں میری طرف کر کے اس طرح
لی جیسے مجھ پر فائر کرنے لگے ہوں۔ نائیک گنگا داس نے مجھ سے ہنس کر کہا۔
"فکر نہ کرو۔ یہ تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ ہم تو تمہیں پل کے ساتھ لٹکا کر پھانسی

دینے والے ہیں تاکہ تم تڑپ تڑپ کر مرو ایک دم سے نہ مر جاؤ۔ یہ اس لئے فال ان ہو
گئے ہیں کہ تم کہیں بھاگ نہ جاؤ۔"

مجھے جہاں کھڑا کیا گیا تھا اس کے نیچے پہاڑی نالے کا پانی شور مچاتا بہہ رہا تھا۔ یہ نالہ
سیلابی لگتا تھا پانی اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا کہ اس کی موجوں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔
چبوترے کی طرف سے میجر راما راؤ کی کرخت آواز آئی۔

"نائیک گنگا داس! اس کو لٹکاتے کیوں نہیں جانگلی؟"

نائیک گنگا داس نے فوراً بلند آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سر!"

نائیک گنگا داس نے فوراً میری گردن کا پھندا جو ابھی تک ڈھیلا تھا کس دیا اور دائیں
بائیں رائفلیں لئے پوزیشن میں کھڑے فوجیوں سے کہا۔

"رائفلوں کا منہ اوپر کرلو اب تمہیں پوزیشن لینے کی ضرورت نہیں میں اسے نیچے
گرانے لگا ہوں"

دونوں فوجیوں نے رائفلوں کی نالیاں اوپر کرلیں اور پل پر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ
گئے۔ نائیک گنگا داس نے میری گردن میں پڑی ہوئی رسی کے پھندے کی گرہ کو جو بالکل
میرے حلق کے نیچے تھی پیچھے ہٹا دیا اور میرے کان کے قریب منہ لا کر پھندا ٹھیک کر
ہوئے آہستہ سے مجھے ایک ایسی بات کہہ دی جس کو سن کر میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ مجھ
اپنے کانوں پر اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے ایسا فقرہ سنا ہے۔ نائیک گ
داس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ جب تم نیچے گرو گے تو تمہارے گردن کی رسی کی گرہ کھل جا
گی۔"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ یونہی میری گردن میں پڑے ہوئے
بہت ڈھیلے پڑے ہوئے پھندے کو انگلیوں سے ادھر ادھر کر رہا تھا۔ میری حیرت
آنکھوں میں جو سوال تھا اس کو گنگا داس نے پڑھ لیا تھا میری آنکھوں میں جو سوال تھا

مجھ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ اگر تمہیں مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے
ر تم مجھے موت کے منہ سے بچانا چاہتے ہو تو میرے آزاد ہو کر پل کے نیچے گرنے کے
تمہارا کیا ہو گا؟ میجر راما راؤ اور کیپٹن تبرہ تو صاف سمجھ جائیں گے کہ تم نے جان
کر میری گردن میں پھندا ڈھیلا رکھا ہو گا اور وہ تمہیں اس وقت شوٹ کر دیں گے۔
کا جواب مجھے جو ملا وہ یہ تھا۔ نائیک گنگا داس نے آہستہ سے کہا۔

"میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان ہوں مجھے بھی تمہارے پیچھے نالے میں چھلانگ لگانی
ے گی۔"

اس نے بظاہر میری گردن میں پھندا کس دیا اور دور چبوترے پر کرسیوں پر بیٹھے میجر
اراؤ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میجر صاحب! حکم کریں"

میجر راما راؤ کی غصے بھری آواز آئی۔

"جانگلی کے بچے۔ اسے لٹکا دو۔"

"یس سر!"

اور اس کے ساتھ ہی نائیک گنگا داس نے دھکا دے کر گرا دیا۔ میں نیچے گرا۔ میری
دن کو بڑا معمولی سا جھٹکا لگا اور رسی کھل کر میری گردن سے الگ ہو کر اوپر کو رہ گئی
یں نیچے نالے کے شور مچاتے پانیوں میں گر پڑا۔ مجھے اپنے پیچھے کوئی دو سیکنڈ کے وقفے
بعد کسی اور شخص کے نالے میں گرنے کی آواز آئی۔ یقیناً یہ نائیک گنگا داس ہی تھا
نے کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور جس نے میری گردن میں پڑا ہوا پھندا مجھے نیچے
انے سے پہلے کھول دیا تھا۔

اب اوپر سے ہر قسم کے فائر کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ ان میں پستول کے فائر تھے
یناً کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ کر رہے تھے۔ سٹین گنوں کے فائر تھے اور رائفلوں
دھماکے بھی تھے۔ گولیاں میرے آگے اور پیچھے گر رہی تھیں مگر خدا بھلا کرے اس تیز
ر پہاڑی نالے کا۔ وہ اس قدر تیز بہہ رہا تھا کہ "آناً" فاناً" مجھے اپنی سمندر ایسی اوپر کو

اٹھتی ہوئی موجوں کی لپیٹ میں لے کر کہیں کا کہیں لے گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد نالہ پہاڑی کے پہلو میں ایک طرف کو مڑ گیا۔ اس موڑ نے مجھے دشمن کی فائرنگ سے محفوظ کر دیا۔ مگر نالے کا پانی اس قدر تیز رفتار تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ سر اٹھا کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے اپنے فوراً بعد نالے میں کودنے والا مسلمان فوجی کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ کو نالے کے ہیجان خیز بہاؤ کے حوالے کر دیا۔ صرف اتنی کوشش ضرور کرتا رہا کہ پانی میں ڈوبنے نہ پاؤں۔ اس کے لئے صرف کبھی کبھی مجھے ایک دو بار ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے تھے۔

نالہ ایک پہاڑی کو پیچھے چھوڑ کر دوسرے ٹیلے کے پہلو سے گذرتا ہوا دور بہت بڑے پہاڑوں کے درمیان تنگ درے میں داخل ہو گیا۔ پانی کا بہاؤ یہاں بھی بڑا تیز تھا۔ دونوں جانب اونچے پہاڑ تھے جن کی چوٹیوں پر اگے ہوئے درخت چھتریوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر سر پیچھے گھما کر دیکھا تو مجھے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر پانی کی لہروں میں ایک انسانی سر اوپر نیچے ہوتا ہوا بڑھتا دکھائی دیا۔ یہ سوائے اس مسلمان فوجی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ گولیوں کے دھماکے دور ہوتے ہوئے بند ہو گئے تھے۔ نالہ پہاڑی درے میں دونوں جانب کے پتھروں سے ٹکراتا شور مچاتا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں نالے کا پانی کافی گہرا معلوم ہوتا تھا۔ میرے پاؤں نیچے زمین سے نہیں لگ رہے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ نالہ مجھے دشمن کے کیمپ سے جتنی دور اور جتنی جلدی بہا کر لے جا سکتا ہے بہا کر لے جائے۔ اونچے پہاڑوں کا درہ ختم ہو گیا۔ آگے تھوڑی کھلی جگہ تھی۔ یہاں نالے کا بہاؤ تھوڑا کم ہو گیا۔ میں نے ہاتھوں سے تیرنا شروع کر دیا۔

میں نے پیچھے دیکھا۔ ایک انسان تیزی سے تیرتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ نالے کے دونوں کنارے ابھی تک اونچے تھے اور وہاں جگہ جگہ بھورے رنگ کی نوکیلی چٹانیں جگہ جگہ باہر نکلی ہوئی تھیں۔ نالہ ان چٹانوں کے درمیان آگے ہی آگے بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں تیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر یہ جموں کے آگے کا علاقہ ہے تو یہ نالہ ضرور پنجاب کے کسی دریا میں جا کر گرتا ہو گا اور دریا ستلج یا بیاس یا راوی ہی ہو سکتا تھا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کون سے علاقے میں ہوں۔ علاقہ پہاڑی تھا مگر یہ سرسبز اور گھنے جنگلوں والی پہاڑیاں نہیں تھیں۔ میرے پیچھے پیچھے آنے والا مسلمان فوجی، جو اس بھارتی فوجی یونٹ میں نائیک گنگا دین کے نام سے سروس میں تھا اور جس نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا اور مجھے نالے میں گرانے سے پہلے میرے کان میں کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور تمہارے پیچھے میں بھی نالے میں کود رہا ہوں، اب تیرتے تیرتے میرے ریب آگیا تھا مگر پانی کا بہاؤ ہمارے درمیان فاصلہ اس سے زیادہ کم نہیں ہونے دے رہا ھا۔

اس نے تیرتے تیرتے اونچی آواز میں مجھے کچھ کہا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ا نے اس کی آواز ضرور سنی تھی مگر پانی کی تیز رفتار موجوں کے شور میں اس کے الفاظ ھ میں نہیں آئے تھے۔ نالے کا پاٹ ایک بار پھر سمٹنے لگا۔ سامنے اونچی اونچی پہاڑیاں ب آرہی تھیں۔ نالہ ان پہاڑیوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نالہ پہاڑیوں میں سے کسی پہاڑی کے پہلو سے گذرتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ لیکن تھوڑی آگے جا کر ایک عجیب بات ہوئی۔ پہاڑیوں کے پاس جاتے ہی نالہ ایک پہاڑی سرنگ داخل ہو گیا۔ جب میں نے نالے کی موجوں کو پہاڑی سرنگ کے تاریک دہانے میں دیکھا تو زور زور سے ہاتھ پاؤں مار کر کنارے کی طرف جانے کی کوشش کی مگر ب نہ ہو سکا۔ ایک تو دونوں جانب چٹانی کنارے اونچے تھے دوسرے نالے کے پانی کا سرنگ کے پاس آکر بے حد تیز ہو گیا تھا۔ نالہ شور کے ساتھ دھڑ دھڑاتا ہوا سرنگ ل ہو گیا اور اس کے ساتھ میں بھی سرنگ میں تھا۔

سرنگ میں پہلے تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پانی کی تیز رفتار موجیں مجھے درخت کی ٹہنی ح بہائے لئے جا رہی تھی۔ یہاں بھی نالے کی گہرائی کافی تھی اور میرے پاؤں زمین ں لگ رہے تھے۔ بند سرنگ میں پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے ہیبت ناک سنسناہٹ ہی تھی۔ ایک بار موجیں مجھے سرنگ کے کنارے کی طرف لے گئیں اور میں زور نگ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور اسی طرح

تیرنے لگا کہ سرنگ کے درمیان میں ہی رہوں۔

مجھے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنے پیچھے آنے والے مسلمان فوجی کی خبر لیتا۔ مجھے اس کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے بعد وہ بھی نالے کے تیز بہاؤ کے ساتھ سرنگ میں داخل ہو گیا ہو گا۔ میں پہاڑی سرنگ کی تاریکی میں پانی میں گردن تک ڈوبا تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا خطرہ تھا کہ کہیں آگے جاکر پانی سرنگ کی چھت تک نہ پہنچ جائے۔ سرنگ کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ایک مقام پر تو وہ اتنی نیچی ہو گئی تھی کہ تیرتے ہوئے میرے ہاتھ اس سے ٹکرا گئے تھے۔ یہ بات میرے لئے تشویش کا باعث تھی۔ اگر نالے کا پانی سرنگ میں بھر گیا تو میرا بچنا ناممکن تھا۔ پانی کے ساتھ بہتے بہتے اور تیرتے ہوئے اندھیرے میں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ سرنگ دو تین جگہوں سے بائیں جانب گھوم گئی تھی۔ یہ نالہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کسی بہت بڑے پہاڑی سلسلے کے نیچے ہی نیچے خدا جانے کس طرف چلا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پانی کے بہاؤ میں زیادہ تیزی آگئی ہے۔ پانی سرنگ کے اندر اس طرح ایک ریلے کی طرح بہنے لگا تھا جیسے وہ ڈھلان پر بہہ رہا ہو۔ کسی آنے والے خطرے کے پیش نظر میں نے سرنگ کے کناروں کی دیوار کو پکڑنے کی کوشش کی کہ کسی جگہ باہر نکلے ہوئے پتھروں کو پکڑ کر رک جاؤں مگر سرنگ کی دیوار پر میرا ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ پانی کا ریلا زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا مگر میں سوائے بے بس تنکے کی طرح سرنگ کے اندر تیز رفتار پانی کے بہاؤ میں بہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاؤں تہہ میں پتھروں سے ٹکرانے لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ زمین ڈھلانی ہے۔ اس کا مطلب تھا سرنگ نیچے کی طرف ہو گئی تھی۔ پھر مجھے شور سا سنائی دیا۔

یہ ایسا شور تھا جیسے پانی کی بہت بڑی چادر اوپر سے نیچے گر رہی ہو۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آگے کوئی آبشار تھی۔ میں نے پوری طاقت کے ساتھ اچھل کر سرنگ کی دیوار کو پکڑنے کی کوشش کی مگر پانی کا ریلا مجھے بہا کر آگے لے گیا۔ سرنگ میں دور

روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی بڑھتی گئی۔ پھر سرنگ روشن ہو گئی۔ پانی کا شور بھی زیادہ بلند ہو گیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا پانی کے زبردست ریلے نے مجھے سرنگ کے اندر اچھال کر باہر پھینک دیا میں زمین پر گرنے کی بجائے ہوا میں بلند ہوا اور پھر قلابازیاں کھاتا نیچے ہی گرتا ہی چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں پانی کے ایک بہت بڑے تالاب میں گرنے والا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو گیند کی طرح لپیٹ لیا اور پھر زور سے پانی میں گر گیا اور پانی کے اندر ہی اندر گرتا چلا گیا۔

میرے پاؤں پانی کی تہہ میں پتھروں سے ٹکرائے۔ میں اپنے آپ کو تیزی سے اوپر انے لگا۔ بازوؤں کو اوپر سے نیچے کرتے ہوئے جب میں نے پانی میں سے سر باہر نکالا تو یکھا کہ میں ایک بہت بڑے تالاب میں یا جھیل میں ہوں اور میرے دائیں جانب تالاب ے کافی بلندی پر پہاڑی سرنگ میں سے پانی کی بہت بڑی چادر آبشار کی طرح نیچے تالاب ں گر رہی تھی۔ میں اس آبشار کے اوپر سے ہو کر نیچے گرا تھا۔ اگر نیچے آبشار کے پاس روں پر گرتا تو میری ہڈیاں چور چور ہو جاتیں مگر پانی کے نیچے کو تیزی سے آتے ہوئے یلے نے مجھے اچھال کر ان پتھروں سے دور تالاب میں گرا دیا تھا۔

اب میں نے ایک اور انسان کو تالاب میں تیر کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس تیرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر آواز دی مگر وہاں آبشار کا شور اتنا زیادہ تھا کہ مجھے کچھ پتہ ل سکا کہ اس آدمی نے جو یقیناً مسلمان فوجی اور میرا محسن ہی تھا مجھے کیا کہا ہے۔ ا نما تالاب کی سطح چونکہ ہموار تھی اور پانی کا بہاؤ بھی پر سکون تھا اس لئے تیرتے ے میں نے مڑ کر دیکھا۔ مسلمان فوجی میری طرف تیرتا چلا آرہا تھا اور اشارے سے ائیں جانب ہو جانے کے لئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ خود بھی بائیں جانب ہو گیا تھا۔ بائیں جھیل کا کنارا تھا۔ میں بھی کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے نارے پر پہنچ گئے۔ پہلے میں کنارے پر نکلا میرے بعد مسلمان فوجی بھی کنارے پر یہاں کافی سرکنڈے تھے۔ میں اٹھ کر اپنے محسن کی طرف گیا۔ میرا جسم ٹارچر کی ے درد کر رہا تھا مگر ٹھنڈے پانی نے اس درد کو کافی دبا دیا تھا۔ دوسرے میں نوجوان

تھا اور مضبوط جسم والا بلکہ کسرتی اور کمانڈو جسم والا تھا اور میرا جسم تکلیفوں اور سختیوں کو سہہ سہہ کر لوہا بن گیا ہوا تھا۔ اس بار مجھ پر اتنا زیادہ تشدد کیا گیا تھا کہ کئی بار درد میری برداشت کی حد سے باہر ہو گیا تھا۔ میں قریب گیا تو میں نے اپنے محسن کو پہچان لیا۔ یہ وہی گنگا داس بھارتی فوجی تھا جس نے کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ سرکنڈوں کے پاس بیٹھا پانی قمیض اتار کر نچوڑ رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

میں نے اس سے کہا۔

"اگر تم مسلمان ہوں تو بھارتی فوج میں ہندو بن کر بھرتی ہوئے تھے؟"

اس نے اپنی فوجی قمیض جھاڑ کر دوبارہ پہنتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی جوان۔ پہلے یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کون سا علاقہ ہے؟"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہم کٹھوا کی پہاڑیوں میں ہیں اور یہ جھیل آگے جا کر کانگڑہ کی وادی میں داخل ہو جاتی ہے۔"

ابھی ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ہمیں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میرے فوجی دوست نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے ادھر نکل چلو"

اور وہ میرے آگے آگے سرکنڈوں میں دوڑ پڑا۔ میں اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اوپر ہیلی کاپٹر سے ہمیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بولا۔

"یہ ڈوگرہ انفنٹری ڈویژن کا ہیلی کاپٹر ہو گا۔ وہ ہماری تلاش میں ہے"

جس علاقے میں ہم دوڑے جا رہے تھے وہاں درخت بھی نہیں تھے۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ وہ بھی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر فوجی دوست بیٹھ گیا اور اس

نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھے تھے اور ہماری نگاہیں اوپر آسمان پر تھیں۔ بائیں جانب کی پہاڑیوں کے اوپر سے ایک کے بعد ایک دو فوجی ہیلی کاپٹر گڑگڑاتے ہوئے نمودار ہوئے اور جھیل کے اوپر چکر لگانے لگے۔

فوجی دوست نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا یہ لوگ ہماری تلاش میں ضرور آئیں گے۔ فکر نہ کرو۔ بس یہیں بیٹھے رہو۔"

فوجی ہیلی کاپٹر جھیل کے اوپر کافی نیچے آ کر چکر لگا رہے تھے۔ پھر وہ اس طرف آ گئے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم جھاڑیوں کے اندر جتنا گھس سکتے تھے گھس گئے۔ ہیلی کاپٹر کافی نیچے آ کر دائرے کی شکل میں چکر لگا رہے تھے۔ مگر انہوں نے ہمیں نہ دیکھا۔ جھاڑیوں کے اندر چھپے ہونے کی وجہ سے ہم انہیں نظر نہیں آئے تھے۔ آہستہ آہستہ ہیلی کاپٹر اوپر اٹھتے گئے اور پھر جدھر سے آئے تھے اس طرف چلے گئے۔ جب وہ پہاڑیوں کی دوسری طرف ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میرے مسلمان فوجی دوست نے کہا۔

"اس طرف انڈیا کی پندرہ ماؤنٹین ڈویژن کی یونٹوں کے کیمپ ہیں۔ ہمیں اس علاقے سے دور رہ کر نیچے ہوشیار پور کی طرف نکلنے کی کوشش کرنی ہو گی۔ یہ ہیلی کاپٹر اس بات کی نشانی ہیں کہ ہماری آٹھ ڈوگرہ رجمنٹ کے فوجی ہماری تلاش میں ہیں اور انہوں نے تمہارے اور میرے فرار کی کٹھوعہ کے فوجی کیمپ کو بھی وائرلیس پر خبر کر دی ہو گی۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ہم ابھی تک جھاڑیوں میں ہی بیٹھے تھے۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

"دوست! پہلے اس راز پر سے پردہ ہٹاؤ کہ تم ڈوگرہ یونٹ میں ہندو بن کر کیسے بھرتی ہوئے جبکہ بقول تمہارے تم مسلمان ہو اور ایک مسلمان ہونے کے ناطے تم نے مجھے دشمن کے منہ سے بچایا ہے۔"

وہ بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر ہندو بن کر انڈیا کی فوج میں بھرتی ہونا چاہے تو ضرور اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ ایسا ناممکن ہے۔ ڈاکٹری چیک اپ میں اس کا مسلمان ہونا فوراً ظاہر ہو جائے گا۔"

"پھر تم ڈوگرہ یونٹ میں ہندو فوجی گنگا داس بن کر کیسے رہ رہے تھے؟"

"وہ بولا۔

"میرا نام نور دین ہے۔ مجھے گھر میں سارے محبت سے نور کہتے تھے۔ میرا باپ فسادات کے وقت نوجوان تھا اور ریاست مالیر کوٹلہ کے ایک کارخانے میں فٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں اور سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا بڑا قتل عام ہوا تھا مگر ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمان بچے رہے تھے۔ میرے باپ کی شادی مالیر کوٹلہ میں ہی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ فرید کوٹ میں آکر ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہو گیا۔ میں اپنے ماں باپ کی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوا اور بڑی منتوں کے اس دنیا میں آیا تھا۔ میں ابھی سکول میں ہی پڑھتا تھا کہ میرے ماں باپ مجھے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ آگے کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ مختصر مختصر یہ ہے کہ میں جوان ہو گیا اور ایک سکھ کے کارخانے میں کلرک ہو گیا جب بھارتی فوجیوں نے کشمیر میں نہتے اور مظلوم مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی اور کشمیری حریت پرست ان کے مقابلے پر نکل آئے تو میں بھی کشمیر کے محاذ پر پہنچ گیا اور اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ بھارتی فوجیوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب میں نے دیکھا کہ بھارتی فوجی جن کشمیری مجاہدین کو پکڑ کر ٹارچر سنٹروں میں لے جاتے ہیں تو وہاں سے ان کی لاشیں بھی واپس نہیں آتیں اور انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے تو میں نے سوچا کہ کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہئے جس پر عمل کر کے میں اپنے کشمیری مجاہدوں کی بھارتی فوجی ٹارچر سنٹروں میں مدد کر سکوں اور انہیں وہاں سے فرار ہونے میں مدد دے سکوں۔ چنانچہ میں ہندو بن کر ڈوگرہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میں کس طریقے سے بھرتی ہوا؟ یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ بہرحال میں نائیک گنگا اس کے نام سے ڈوگرہ فوج میں رہ کر قیدی ہونے والے کشمیری مجاہدوں کی

جتنی مدد کر سکتا تھا کرتا رہا۔ میں انٹیلی جنیس میں تھا۔ یہاں اس کیمپ میں ہی تھا جہاں تمہیں انٹیروگیشن کے لئے لایا گیا تھا۔ مگر تمہارے گرد سیکورٹی اتنی سخت تھی کہ جس دوران تم پر بے پناہ تشدد ہوتا رہا میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں پھانسی دی جانے والی ہے اور پھانسی نالے کے پل پر لٹکا کر دی جائے گی تو میں نے اپنے مدراسی میجر راما راؤ کے پاس جا کر سلیوٹ کیا اور کہا کہ سر مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنے ہاتھ سے اس پاکستانی کمانڈو کو پھانسی دوں۔ کیونکہ جموں میں پاکستانی کمانڈوز نے میرے بڑے بھائی کے سارے خاندان کو ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے یہ جھوٹی کہانی میجر راما راؤ کو اتنا ڈراما کر کے سنائی کہ اس نے مجھے اجازت دے دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں نے جان بوجھ کر تمہارے گلے میں ڈالے گئے پھندے کو ایسی گرہ لگائی کہ جیسے ہی تمہیں پل پر سے نیچے دھکا دوں تمہاری گردن رسی کے پھندے سے آزاد ہو جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بعد مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور پھر میرے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کیا جائے گا کہ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ تمہارے پیچھے میں بھی پل پر سے چھلانگ لگا دوں گا۔ بس یہ ہے میری کہانی۔"

نائیک نور دین نے اپنی کہانی ختم کی ہی تھی کہ فضا میں ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ نائیک نور دین نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے فوج نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہاں سے نکلو"

ہم اٹھ کر ایک طرف دوڑے تو ٹیلوں کے اوپر فوجی ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ ہم جلدی سے بیٹھ کر ساکت ہو گئے۔ ہیلی کاپٹر ہمارے اوپر سے ہو کر گزر گیا۔ ہم دوبارہ دوڑ پڑے۔ نائیک نور دین جھاڑیوں میں سے نکل کر ایک چھوٹی پہاڑی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ پہاڑی کے پاس آکر رک گئے۔ نائیک نور دین نے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا اور بولا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بھارتی فوجی ہماری تلاش میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کسی طریقے سے ان پہاڑیوں سے نکل جانا چاہئے۔ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف کیا ہے؟"

نائیک نور دین کہنے لگا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ان ٹیلوں کے پیچھے دریا بہتا ہے۔"

فضا میں اچانک تیز سیٹی کی چیخ بلند ہوئی اور پھر ہم سے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ نائیک نور دین نے گھبرا کر کہا۔

"یہ مارٹر گن کا گولہ تھا۔ یہاں سے بھاگو"

ہم دوڑتے ہوئے پہاڑی کے پیچھے آ گئے۔ میں حیران تھا کہ بھارتی فوجی ہمارا سراغ لگاتے مارٹر گنیں لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ مارٹر فائر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جاری تھا۔ یہ بھارتیوں کی حماقت تھی۔ مارٹر گولوں کے دھماکوں سے ہم الرٹ ہو گئے تھے۔ نائیک بولا۔

"پہاڑی کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔"

وہاں دوسرا کوئی محفوظ راستہ بھی نہیں تھا۔ مارٹر گنوں کے گولے ہمارے دائیں بائیں پھٹ رہے تھے۔ ہم پہاڑی ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ ڈھلان پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم ان کی آڑ لے کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ مارٹر گنوں کے گولے یہاں تک نہیں آ رہے تھے۔ ہم پہاڑی کی آدھی چڑھائی چڑھ چکے تھے کہ مارٹر کا فائر رک گیا۔ ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ چوٹی پر ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں جھاڑیاں اور درخت کثرت سے اگے ہوئے تھے۔ سامنے کی جانب درختوں کے پیچھے ایک چٹانی دیوار تھی۔ ہم نے چٹان کے پاس جا کر دوسری جانب دیکھا۔ نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ یہ دریا ایسا ہی تھا جیسے دریا پہاڑیوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا پاٹ چوڑا نہیں تھا مگر پانی کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ ہم چٹان کے پاس بیٹھ گئے۔ نائیک نے نیچے دریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دریا کی دوسری جانب پنجاب کی ترائی کا علاقہ ہے۔"

"یہ دریا آگے کس طرف جاتا ہے؟" میں نے پوچھا

نائیک بولا۔

"اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ دریا آگے جا کر کسی اور دریا جاکر گر جاتا ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر ہم کسی طرح اس دریا کے پار پہنچ جائیں تو بھارتی فوجیوں سے نجات مل سکتی ہے جو ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہے۔"

فضا میں سناٹا طاری تھا۔ یہ خاموشی بڑی پر اسرار لگ رہی تھی۔ ہم چٹان سے نیچے تک اترنے کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ یہاں اترائی بالکل سیدھی تھی اور اس کا قوی امکان تھا کہ ہم نے اگر جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر بھی نیچے اترنے کی کوشش کی تو دریا کے کنارے جو نوکیلے چٹانی پتھر جگہ جگہ ابھرے ہوئے ہیں سیدھے ان پر جا کر یں گے اور ہماری فوری موت واقع ہو جائے گی۔ نائیک نور دین کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے پہاڑی کی دوسری جانب جا کر دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے ادھر اترائی اتنی ناک نہ ہو"

ہم اٹھے ہی تھے کہ ہمیں کچھ آدمیوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ یہ فوجی بوٹوں بھاری آواز تھی۔ نائیک بولا۔

"یہ انڈین فوجی ہیں۔ یہ تو ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔"

ہم گھبراہٹ میں چٹان کی طرف دوڑے۔ ابھی چٹان کے قریب ہی تھے کہ پیچھے سے ا/برین گن کا برسٹ آیا۔ گولیاں سامنے چٹان سے ٹکرائیں۔ ہم جلدی سے بیٹھ گئے۔ رتی فوجیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں گرنیڈ مارو"

دوسرا لمحے ایک گرنیڈ ہمارے آگے تین چار گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں گرا۔ میں ج تک نہیں سمجھ سکا کہ نائیک نور دین نے ایسا کیوں کیا تھا۔ گرنیڈ کا پن کھینچ کر جب

اسے پھینکا جاتا ہے تو وہ دس پندرہ سیکنڈ کے بعد پھٹ جاتا ہے۔ یہ ہینڈ گرنیڈ تو ار
فاصلے پر پھینکا گیا تھا اور تین چار سیکنڈ اسے راستے میں لگ گئے تھے۔ اسے چار پانچ
میں دھماکے سے پھٹنا تھا اور یقینی بات تھی کہ یہ گرنیڈ پھٹ کر ہمارے چیتھڑے اڑا دیـ
کیونکہ ہم اس کے بالکل قریب تھے۔

ایک سیکنڈ کے اندر اندر نائیک نور دین نے اچھل کر گرنیڈ کے اوپر چھلانگ لگا دی۔
وہ بالکل گرنیڈ کے اوپر جا کر لیٹ گیا اور بولا۔

"دریا میں کود کر نکل جاؤ"

اس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوا۔ ہینڈ گرنیڈ پھٹ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرے
محسن اور جہاد کشمیر کے سرفروش مجاہد نائیک نور دین کے جسم کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ میں
چٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ پیچھے سے مجھ پر مشین گن کے برسٹ فائر ہو رہے تھے۔ میری
زندگی ابھی لکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے کوئی گولی نہ لگی ورنہ گولیوں کی بارش میں
میرا بچنا ناممکن تھا۔ چٹان کے کنارے پر آتے ہی میں نے نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

میں نے اپنے آپ کو پوری طاقت سے آگے کی طرف اچھالا تھا تاکہ دریا کے پانی میں
گروں دریا کے کنارے نوکیلے پتھروں پر نہ گروں۔ میں پتھروں سے تھوڑی ہی دور دریا
میں گرا اور اس کی تیز رفتار لہروں میں غائب ہو گیا۔ میں اپنے زور پر دریا کی تہہ میں اتر
تھا۔ چونکہ دریا یہاں زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میرے پاؤں بڑے زور سے تہہ کے پتھروں پر
کر لگے لیکن پانی کے دباؤ اور بہاؤ نے مجھے زخمی ہونے سے بچا لیا۔ میں پانی کے اندر
اندر تیزی سے ہاتھ پاؤں چلاتا دور نکل گیا۔ سانس روکنے کی مجھے کافی مشق تھی۔ جب
میرا دم گھٹنے لگا تو میں نے اوپر آکر سر پانی سے باہر نکالا۔ میں جہاں ابھرا تھا وہاں دریا یا
پہاڑی نالے کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا اور ٹیلے دور دور چلے گئے تھے۔ پانی یہاں بھی تیز رفتار
سے آگے کی طرف جا رہا تھا۔ میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ آگے ہی آگے بہتا چلا جا رہا تھا
کچھ دور جانے کے بعد مجھے آسمان پر ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں
گردن موڑ کر دیکھا۔ ایک فوجی ہیلی کاپٹر اوپر منڈلا رہا تھا۔ میں غوطہ لگا گیا اس طرح

لے لگاتا کبھی سر باہر نکالتا میں دریا میں دور سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہاڑیاں
پیچھے رہ گئیں اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ دریا میدانی علاقے میں داخل
گیا تھا۔ میں دریا کی ایک بہت تیز موج پر بہتا ہوا دریا کے عین درمیان میں تیر رہا تھا۔
دونوں جانب دریا کے کنارے کافی دور تھے۔ میں دریا کے دائیں جانب کے کنارے
طرف اپنے آپ کو لانے کی کوشش کر رہا تھا مگر دریا کی تیز موج جس پر میں سوار تھا
رفتار گھوڑے کی طرح مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہی تھی۔ آسمان پر ایک جانب سے
لوں نے آکر سورج کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ میں کنارے کی طرف جانے کی سر توڑ
شش کر رہا تھا۔ میں بڑا اچھا تیراک تھا لیکن بھارتی ملٹری انٹیلی جینس نے ٹارچر سنٹروں
مجھ پر جو بہیمانہ تشدد کیا تھا اس نے میری جسمانی حالت کمزور کر دی تھی اور میں تیرتے
تے تھک جاتا تھا۔

اس جدوجہد میں کافی وقت گزر گیا اور دریا کا بہاؤ مجھے اور آگے لے گیا۔ بادل جو
سمان پر ٹکڑوں کی شکل میں آئے تھے اب پوری طرح چھا گئے تھے اور سورج غائب ہو گیا
۔ آخر ایک طویل جدوجہد کے بعد میں کنارے تک آنے میں کامیاب ہو گیا۔ کنارے پر
کر میں وہیں سرکنڈوں میں پڑا ہانپتا رہا۔ جب جسم میں کھوئی ہوئی توانائی کچھ واپس آئی تو
اور دریا کا کنارا جو اونچا تھا اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک اجاڑ
قہ تھا۔ کہیں کسی آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ زمین بھی ویران ویران تھی۔ دور بہت دور
ختوں کے جھنڈ سے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ پتہ نہیں تھا میں کس
قے میں نکل آیا ہوں۔ اتنا ضرور یقین تھا کہ یہ مشرقی پنجاب کا علاقہ یا یہاں سے مشرقی
اب کا میدانی علاقہ شروع ہو رہا ہے۔ کیونکہ کھیت وہاں کہیں نہیں تھے۔ انسان بھی دور
ر تک نظر نہیں آتا تھا۔ دریا کے کنارے کچے تھے اور ان کے نیچے دوسری طرف بیل
یوں اور گڈوں کے گزرنے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک طرف چل پڑا۔

موسم گرما تھا۔ بادلوں کی وجہ سے خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ میرے گیلے کپڑے چلتے
اپنے آپ خشک ہو گئے۔ میرے پاؤں میں ربڑ کے بوٹ تھے جن میں پانی بھر گیا تھا۔

میں نے بیٹھ کر بوٹ اتار کر اندر سے پانی جھاڑ کر نکالا اور انہیں پہن کر دوبارہ چلنے لگا۔ حلیہ یہ تھا کہ ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھ چکی تھیں۔ سر کے بال بھی گردن تک آ گئے بدن پر ایک پرانی خاکی رنگ کی قمیض اور نیچے نسواری رنگ کی بوسیدہ سی پتلون جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ میرے پاس کوئی چاقو بھی نہیں تھا۔ ریوالور نہیں تھا۔ یہ دونوں چیزیں بھارتی فوجیوں نے تلاشی کے وقت مجھ سے چھین کر اپنے میں کر لی تھیں۔ یہ میں جانتا تھا کہ اگر یہ مشرقی پنجاب ہے تو پھر یہ سکھوں کا علاقہ ہے زبان کی مجھے کوئی دقت اور پریشانی نہیں ہو گی۔ میں پنجابی بول کر اپنے آپ کو ہندو ظاہر سکتا تھا۔

دریا کے ساتھ ساتھ چلتے میں کافی دور نکل آیا

درختوں کے وہ جھنڈ جو دور سے دھندلے نظر آ رہے تھے اب صاف نظر آنے تھے۔ کھیت بھی شروع ہو گئے جن میں گندم کی فصل ابھی سر سبز ہی تھی اور اس کی شروع نہیں ہوئی تھی۔ گرمی کی وجہ سے کہیں کہیں فصل پیلی ہو رہی تھی۔ مجھے پیچھے ایسی آواز آئی جیسے دو تین آدمی دوڑتے چلے آ رہے ہوں۔ میں نے جلدی سے کر دیکھا۔ دریا کے کنارے ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتے چلا آ رہا تھا۔ گھوڑے کی سے گرد اڑ رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑ سوار قریب آیا تو دیکھا یہ ایک اکالی سکھ تھا جس نے لمبا زرد چولا پہن رکھا تھا سر پر مخروطی پگڑی تھی جس فولادی چکر لگے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھی دوسرے ہاتھ میں لمبا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے دیکھ کر رک جائے گا اور مجھ سے پوچھے گا کہ میں ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ مگر اکالی سکھ اسی طرح گھوڑا دوڑاتا میرے قریب سے نکل گیا۔ صرف میرے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے مجھ پر گہری نگاہ ضرور ڈالی تھی۔

جب اکالی سکھ گھوڑ سوار آگے نکل گیا تو میں بھی چل پڑا۔ میں واقعی مشرقی میں آ گیا تھا۔ اور یہ دریا یا تو بیاس تھا یا ستلج تھا۔ کچھ اور آگے جانے کے بعد سر سبز

ہر طرف سر سبز کھیت تھے۔ دریا کے کنارے کنارے ذرا نیچے کی جانب ٹاہلیوں کے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ان ٹاہلیوں پر بور آ رہا تھا اور ان کی بڑی دھیمی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹاہلیوں پر نئی کونپلیں اور ہرے ہرے نئے پتے آئے ہوئے کھیتوں میں سکھ کسان نظر آنے لگے تھے۔ ایک گاؤں آ گیا۔ مگر وہ دریا سے دور تھا۔ مکان تھے۔ ایک سکھ بھینسوں کو لئے دریا کی طرف آ رہا تھا۔

میں دریا کے کنارے سے اتر کر کھیتوں کے ساتھ جو پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی اس پر لگا ایک دیہاتی عورت سامنے سے آ رہی تھی۔ اس نے سر پر جانوروں کے چارے کی گٹھا رکھی تھی۔ میں پگ ڈنڈی سے ہٹ گیا۔ وہ میرے قریب سے گذر گئی۔ عورت کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ ایک کھیت کے قریب سے گذرا تو دیکھا کہ وہاں چل رہا تھا۔ بیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوئے اور وہ گول دائرے میں آہستہ گھوم رہا تھا۔ رہٹ کی گدی پر ایک تیرہ چودہ سال کا سکھ لڑکا چھڑی ہاتھ میں لئے تھا۔ وہ چھڑی کو رہٹ کی لکڑی پر آہستہ آہستہ بجاتا جا رہا تھا۔ رہٹ کا پانی نیچے ٹنڈوں سے چوبچے میں گر رہا تھا۔ چوبچہ بھرا ہوا تھا۔ اس میں سے پانی نیچے کھیتوں کی جاتے نالے میں گر رہا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا کنوئیں کا پانی پیا۔ لڑکا رہٹ کی گدی پر بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ پانی وغیرہ پی کر میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔

لڑکے نے چھڑی سے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"ادھر ہے۔"

لڑکے نے جس طرف اشارہ کیا تھا میں اس طرف چلنے لگا۔ زیادہ کرید کر میں نے سٹیشن کے بارے میں اس لئے نہ پوچھا کہ وہ مجھے بالکل ہی اجنبی نہ سمجھ بیٹھے۔ میں نے اسٹیشن پر جا کر خود بخود پتہ چل جائے گا کہ میں مشرقی پنجاب کے کس علاقے میں میں کھیتوں کھیت چلتا گیا۔ راستے میں ایک اور گاؤں آیا جس کے باہر جوہڑ میں بھینسیں نہا رہی تھیں۔ ایک سکھ ریہڑے کے پہیئے کی مرمت کر رہا تھا۔ یہ گاؤں بھی پیچھے

رہ گیا۔ دور سے ریلوے کا سگنل نظر پڑا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں اسے برداش
کئے ہوئے تھا۔ مگر جسم کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ سٹیشن آ گیا۔ چھوٹا سادہ سا سٹیشن تھ
اس کا نام عجیب سا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ تھوڑے سے مسافر پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے۔ ان
میں سکھ بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔

ایک قلی سے میں نے بڑے طریقے سے بات کر کے معلوم کیا کہ یہاں سے آگے
کی طرف امرتسر کا سٹیشن تیس پینتیس میل ہے۔ پیچھے ایک برانچ لائن جالندھر کی طر
جاتی ہے۔ جالندھر میرے لئے خطرناک شہر تھا۔ میں نے امرتسر اپنے مجاہد کے پاس جانے
فیصلہ کیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین کچھ دیر بعد آ گئی۔ ٹرین مسافروں سے بھری ہو
تھی۔ میں اس میں بغیر ٹکٹ ہی سوار ہو گیا۔ تیس پینتیس میل کا سفر اس ریل گاڑی
دو گھنٹے میں طے کیا اور امرتسر کے سٹیشن پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ راستے میں ٹکٹ چیک کر
والا ٹی ٹی نہیں آیا تھا۔ ورنہ میرے لئے مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔ امرتسر سٹیشن سے با
نکلنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں سٹیشن کے گیٹ سے نکلنے کی بجائے میں ریلو
لائن کے ساتھ ساتھ چھ ہرسہ کی طرف چلنے لگا۔ ریگو برج سے ذرا پہلے ریلوے یارڈ
دیوار ایک جگہ سے تھوڑی سی توڑ کر لوگوں نے آنے جانے کے لئے راستہ بنا دیا ہوا تھا
میں اس میں سے باہر نکل گیا۔

سامنے ریلوے کوارٹروں کے پیچھے جی ٹی روڈ تھی۔

جی ٹی روڈ کی دوسری جانب دائم گنج کی آبادی تھی۔

ہمارا خفیہ مجاہد اسی آبادی میں رہ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ امرتسر میں گرمیوں
وسم شروع ہو چکا تھا۔ آسمان پر بادل آگے نکل گئے تھے اور دھوپ چمکنے لگی تھی۔ پہلے
نے سوچا کہ سیدھا اپنے مجاہد کے گھر چلا جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے وہ گھر پر نہ
چنانچہ میں اس سینما ہاؤس کی طرف چل پڑا جہاں اپنا مجاہد کام کرتا تھا۔ سینما ہاؤس میں
یکھا ہوا تھا اور مجھے اس کا کمرہ بھی معلوم تھا جہاں وہ اپنی چیزیں وغیرہ رکھا کرتا تھا۔
ہاؤس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں وہاں پہنچ کر اس کے پہلو میں جو کمرے بنے
ئے تھے ان کا سرسری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھا تو دیکھا کہ اپنے مجاہد کے
ے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں وہاں سے کسی سے اس کے بارے میں پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔
سے جی ٹی روڈ پر آ گیا اور کھیتوں میں سے ہوتا ہوا دائم گنج کی آبادی میں اس گلی میں
جہاں مجاہد کا مکان تھا۔ مکان پر بھی تالا پڑا تھا۔

گلی میں صرف دو دکانیں تھیں۔ ایک پنساری کی اور دوسری پان سگریٹ والے کی
تھی۔ ان دکانوں کے باہر چارپائیوں پر دو سکھ اور تین چار ہندو نوجوان بیٹھے میری
غور سے دیکھنے لگے۔ میں خاموشی سے الٹے پاؤں گلی میں واپس ہو گیا۔ دو قدم ہی
ہوں گا کہ ایک مکان کے اندر سے دو آدمی نکل کر میرے سامنے آ کر اس طرح کھڑے ہو
یسے میرا راستہ روک رہے ہوں۔ دونوں ہندو تھے۔ ایک بھاری بدن کا تھا جس نے
ر کا کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ دوسرا جوان آدمی تھا اور پتلون قمیص میں تھا۔ اس پتلون
لے آدمی نے ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے

مجھے روک کر پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کون ہوں؟ میں اس کے لہجے اور
دوسرے آدمی کے دیکھنے کے انداز سے سمجھ گیا کہ یہ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں اور معاملہ
گڑبڑ ہے۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"میں خالصہ کالج کا سٹوڈنٹ ہوں۔ ہوسٹل میں رہتا ہوں۔ راستہ بھول کر ادھر آ گیا
تھا۔ مجھے یہ بتائیں کہ خالصہ کالج کے ہوسٹل کو یہاں سے کوئی راستہ نکلتا ہے؟"

بھاری بدن والے آدمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میری آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر بولا۔

"تم۔۔ سے ملنے آئے تھے۔ اس کا مکان پر تالا دیکھ کر واپس جا رہے ہو"

اس نے مجاہد کا وہ ہندو نام لیا تھا جس نام سے وہ وہاں رہ رہا تھا۔ میں نے اجنبی بن کر
کہا۔

"جس آدمی کا آپ نے نام لیا ہے میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ میں تو خالصہ کالج
ہوسٹل کا راستہ بھول کر ادھر نکل آیا ہوں۔ آپ لوگ کون ہیں اور مجھ سے ایسے سوال
کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

اب دوسرے جوان آدمی نے پتلون کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں
ریوالور تھا۔

"چپکے سے ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن چلو۔ تم سے دو ایک سوال پوچھیں گے اور
تمہیں ہوسٹل میں پہنچا دیں گے۔ آؤ"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ بھاری بدن والے ہندو نے جس مکان سے یہ دونوں
نکلے تھے اس مکان کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"پریتم سیاں اپنے آدمی لے کر باہر آ جاؤ۔"

مکان کی بیٹھک میں سے تین پولیس کانسٹیبل باہر نکل آئے۔ ان میں ایک سکھ
اور دوسرے دو ہندو تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ میں پھنس گیا تھا۔ نہ ان پر
کرنے کی پوزیشن میں تھا اور نہ بھاگ ہی سکتا تھا۔ سوچا پھنس تو گیا ہوں ایک کوشش

کر کے دیکھ لینی چاہئے شاید ہوا میں چلایا ہوا تیر نشانے پر جا کر بیٹھ جائے۔ میں نے لہجے میں
تھوڑا رعب اور آواز میں ذرا دبدبہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ مجھے ہائی جیک کر رہے ہیں میں خالصہ کالج سٹوڈنٹ یونین کا سیکرٹری
ہوں۔ کالج کے سارے سٹوڈنٹ تمہارے پولیس سٹیشن پر دھاوا بول دیں گے۔ کیونکہ
میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے"

بھاری بدن والے کھدر پوش مہاشے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"شرجی۔ میرا خیال ہے بابو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ سٹوڈنٹ یونین کا معاملہ ہے کہیں
الٹی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔"

دوسرے جوان آدمی نے جس کو کھدر پوش خفیہ سروس والے نے شرما جی کہہ کر
بلایا تھا۔ کہنے لگا۔

"لالہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ پھر ایسا کرتے ہیں کہ اندر چل کر اس سے دو چار
سوال پوچھ کر ڈائری بھر لیتے ہیں تاکہ ہماری ڈیوٹی بھی پوری ہو جائے۔"

میں دل میں خوش ہو گیا کہ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا اور
یہ لوگ سٹوڈنٹ یونین کے نام سے ڈر گئے تھے۔ شرما جی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"چلو بابو یار بیٹھک میں آجاؤ دو تین سوالوں کے جواب لکھو اور ہماری کارروائی بھی
پوری ہو جائے گی"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"مگر میں ایک منٹ سے زیادہ اندر نہیں ٹھہروں گا"

کھدر پوش بولا۔

"ارے یار دو سوال پوچھنے ہیں تم سے۔ ایک منٹ میں فارغ کر دیں گے تمہیں۔
آجاؤ۔"

میں ان کے ساتھ مکان کی بیٹھک میں آگیا۔ کھدر پوش اور شرما تو میرے ساتھ ہی
بیٹھک میں آئے۔ تینوں کانسٹیبل مکان کے باہر ہی کھڑے ہو گئے۔ اندر آنے کے بعد

پولیس آفیسر شرما نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ میرا نام کیا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں انڈیا کے ایک پرانے ایکٹر ترلوک کپور کا نام آیا میں نے کہہ دیا۔

"ترلوک کپور"

کھدر پوش کہنے لگا۔

"تمہاری پنجابی یہاں کے ہندوؤں والی پنجابی نہیں ہے۔ کہیں تم لاہور کے رہنے والے تو نہیں ہو؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ لوگ مجھے کسی جال میں پھنسانے کے لئے اندر لائے تھے۔ میں نے پنجابی میں دو چار الفاظ شامل کرتے ہوئے کہا کہ میں ہندو ہوں۔ میرے پتا جی لاہور کے رہنے والے تھے اس لئے میری پنجابی زبان پر لاہور کا اثر ہے۔ پولیس افسر شرما نے کھدر پوش سے کہا

"لالہ ذرا اس کی پتلون اتروا کر تو دیکھو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان"

ایک بار واقعی میرے پاؤں تلے کی زمین ہل گئی۔ یہ لوگ مجھے اس مقصد کے لئے بیٹھک میں لائے تھے۔ میں نے اپنے حواس بیدار رکھے اور ان پر برس پڑا کہ کیا وہ مجھے کوئی پاکستانی جاسوس سمجھتے ہیں؟ میں انکل جالندھر پولیس کے ڈی ایس پی ہیں۔ میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔ شرما بولا۔

"مہاشہ جی ہم تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ ہم تو اپنا شک دور کرنا چاہتے ہیں کہ تم کہیں مسلمان تو نہیں ہو۔ اگر تم ہندو ہو تو تمہیں پتلون اتروانے میں کیا اعتراض ہے؟"

اس کے باوجود جب میں نے احتجاج کیا تو شرما نے آواز دے کر تینوں کانسٹیبل اندر بلا لئے اور انہیں حکم دیا۔

"اس کی پتلون اتار دو"

دو سپاہیوں نے اپنی رائفلوں کا رخ میری طرف کر دیا اور تیسرا سپاہی میری پتلون اتارنے کے لئے میری طرف بڑھا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ زبردست احتجاج کرتا رہا

لیکن جب میرا یہ راز کھل گیا کہ میں مسلمان ہوں تو میں نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اب جب کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو میں بھی آپ سے اب کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ میں اصل میں کشمیری مسلمان ہوں۔ میرا ایک رشتے دار امرتسر میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ میں اس سے ملنے سری نگر سے آیا تھا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ وہ امرتسر میں نہیں ہے۔ میں واپس سٹیشن پر جا رہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں آپ مجھے کشمیری حریت پسند سمجھ کر جیل میں نہ ڈال دیں۔ میں نے جھوٹ بولا اور اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر دیا۔ یہ بالکل سچی بات ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔"

مگر میری اس وضاحت کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ پولیس افسر شرما نے کانسٹیبل پریتم سنگھ سے کہا۔

"اس کو ہتھکڑی لگا کر تھانے لے چلو"

بات ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ تھانے میں پہنچنے کے بعد دوسری خطرناک بات شروع ہونے والی تھی جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس وقت مجھے ہتھکڑی ڈال دی گئی اور سپاہی دائم گنج کی آبادی میں سے مجھے گزارتے ہوئے علاقے کے پولیس سٹیشن لے گئے۔ وہاں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

یہ ایک نئی مصیبت مجھ پر آن پڑی تھی جس سے مجھے ہر حالت میں نکلنا تھا مگر بظاہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی تک تو شاید یہ لوگ مجھے مشتبہ کشمیری حریت پسند ہی سمجھ رہے تھے لیکن اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ بہت جلد ان پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ میں انتہائی خطرناک کشمیری مجاہد اور کمانڈو ہوں جس کی تباہ کن کاروائیوں کا سلسلہ سری نگر سے لے کر جنوبی ہند اور گجرات کاٹھیاواڑ تک پھیلا ہوا ہے۔

حوالات میں دو اور مجرم بھی تھے یہ دونوں سکھ تھے۔ ایک پہلوان ٹائپ کا سکھ تھا دوسرا کم عمر نوجوان سکھ تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ پولیس مجھے کشمیری مجاہد ہونے کے پکڑ کر وہاں لے آئی ہے تو پہلوان سکھ کہنے لگا۔

"یہ لوگ تمہیں بہت ماریں گے۔ خبردار اپنے ساتھیوں کے نام پتہ نہ بتانا۔"

میں خاموش رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہندو جمعدار ہمیں دو دو روٹیاں اور دال دے گیا۔ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی۔ دال بدذائقہ تھی اور روٹیاں بھی جلی ہوئی تھیں مگر میری بھوک مٹ گئی۔

دن ڈھل رہا تھا کہ مجھے تھانے کی حوالات سے نکال کر قیدیوں کی لاری میں بٹھایا اور سیدھا امرتسر جیل میں پہنچا دیا۔ امرتسر جیل میری دیکھی ہوئی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی یہاں لایا گیا تھا اور یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس بات کو بہت عرصہ گذر چکا تھا۔ جیل کا وارڈن بھی نیا تھا وہاں کسی نے مجھے نہ پہچانا۔ رات کے وقت مجھے اسی تنگ سے کمرے میں لے جایا گیا اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ میں اپنے بیان پر قائم رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں عام کشمیری مسلمان ہوں اور اپنے ایک کشمیری رشتے دار سے ملنے امرتسر آیا تھا۔ پولیس کے ڈر سے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر دیا۔ میرا کشمیری مجاہدین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھ پر تشدد شروع ہو گیا۔

امرتسر جیل کے ٹارچر سیل سارے انڈیا میں مشہور ہیں۔ یہاں تشدد کرنے کے ایسے آلات موجود ہیں کہ جن کو دیکھ کر ہی آدمی پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھ پر تشدد کے ہر قسم کے آلات استعمال کئے گئے مگر میں اپنے بیان پر قائم رہا۔ ایک ہفتے کے بعد میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ جیسے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ میں جیل کی کوٹھری میں فرش پر تقریباً نیم بے ہوش پڑا رہتا۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ ہمارا دائم گنج میں سپائینگ کی خفیہ ڈیوٹی ادا کرنے والا مجاہد بدقسمتی سے سری نگر کی پہاڑیوں میں کمانڈر شیروان کو وائرلیس پر کوئی پیغام بھیجتے ہوئے پکڑ لیا گیا تھا۔ اور پولیس اس کے مکان کے آس پاس چھپ کر بیٹھ گئی تھی کہ اگر اس کا کوئی ساتھی اس سے ملنے آئے تو اسے بھی پکڑ لیا جائے۔

پولیس نے مجھے اسی بنا پر پکڑ لیا تھا۔

امرتسر جیل پہلے بھی میری دیکھی ہوئی تھی۔ پہلے بھی یہاں سیکورٹی بہت سخت تھی اب میں نے دیکھا کہ حفاظتی انتظامات پہلے سے زیادہ سخت تھے اور جیل کا چھوٹا آہنی گیٹ

بھی بند رہتا تھا اور مسلح گارڈ اندر اور باہر پہرے پر موجود ہوتی تھی۔ مجھے یہاں سے ہر حال فرار ہونا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک امرتسر جیل کے حکام کو میرے پورے تباہ کن ریکارڈ کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مجھے ابھی تک پاکستانی کمانڈو ہی سمجھا جا رہا تھا جو پاکستان سے مقبوضہ کشمیر میں آ کر کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے جہاد میں شامل ہو گیا تھا۔ میں اس سے پہلے سارے انڈیا میں کیسی کیسی تباہ کن کمانڈو کارروائیاں کر چکا تھا اس بارے میں امرتسر جیل کے حکام کو ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ مجھ پر تشدد کا سلسلہ جاری تھا۔ مجھے ہر قسم کی اذیت پہنچائی جا رہی تھی اور مجھ سے معلوم حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اس طرح جب ایک مہینہ گذر گیا اور جیل کے حکام مجھ سے کسی قسم کی معلومات حاصل نہ کر سکے تو مجھے ٹارچر سیل سے نکال کر قیدیوں کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے اتنی آزادی میسر آ گئی تھی کہ میں دن کے وقت قیدی کوٹھڑی سے نکل کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ ورانڈے میں تھوڑی دیر بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے بہت غور کیا۔

کئی ترکیبیں سوچیں مگر ہر بار اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں سے کسی منصوبہ بندی کے تحت فرار ہونا ناممکن ہے۔ میں وہاں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے امرتسر جیل سے فرار ہو کر اپنے ساتھی مجاہدوں کے پاس وادی کشمیر میں پہنچنا تھا۔ میں نے اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں بہت سوچ بچار کیا۔ لیکن فرار کا کوئی راستہ بظاہر دکھائی نہ دیا۔ آخر میں نے ایک دلیرانہ فیصلہ کیا۔

یہ فیصلہ کمانڈو اس وقت کرتا ہے جب اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اپنی جان پر کھیل کر بلکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر فل ایکشن کے ساتھ دشمنوں کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کرنے کا فیصلہ تھا۔ اس میں صرف ایک فی صد زندہ بچ نکلنے کی امید تھی۔ باقی ننانوے فی صد موت ہی موت تھی۔ لیکن میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے اس فیصلے کی روشنی میں جیل کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میری نگاہ زیادہ تر جیل کے بڑے گیٹ پر تھی جو کبھی کبھار سپلائی کا ٹرک آتے وقت یا کسی افسر

کی گاڑی گذارنے کے لئے ہی کھلتا تھا۔ باقی آمدورفت اس آہنی گیٹ کے چھوٹے دروازے میں سے جاری رہتی تھی۔ امرتسر جیل کے باہر کا علاقہ میرے لئے نیا نہیں تھا۔ ایک تو میں اپنے سکول کے زمانے میں امرتسر شہر میں کافی پھرتا پھراتا رہا تھا۔ دوسرے میں ایک بار یہاں سے فرار ہو چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ جیل کے جنوب مشرق کی جانب امرتسر کا مشہور کمپنی باغ ہے جہاں سے ایک سڑک مجیٹھ کی طرف جاتی ہے۔ مجیٹھ میرا آبائی قصبہ تھا۔ وہاں سے میں بٹالہ گورداسپور اور جموں کی ترائی کے علاقے کی طرف بھاگ سکتا تھا۔ سوال صرف جیل کی چار دیواری سے نکلنے کا تھا۔

میں کسی خاص موقع کی تلاش میں تھا۔ آخر قدرت کو مجھ پر رحم آگیا اور اس نے میرے لئے ایک موقع فراہم کر دیا۔ اس روز صبح ہی سے جیل میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ بارکوں کے آگے پانی کا چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا۔ جیل کے مین گیٹ سے چیف وارڈن کے آفس تک صحن میں سرخ رنگ کی بجری بچھا دی گئی تھی۔ جیل کے ملازموں نے باقاعدہ وردیاں پہن لی تھیں۔ معلوم ہوا کہ پنجاب کے جیل خانہ جات کا کوئی وزیر جیل کے معائنے کے لئے آرہا ہے۔ میں نے اپنے ذہن میں تیزی سے فرار کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ زیادہ منصوبہ بندی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس مجھے ایک دم ایکشن کے میدان میں کود پڑنا تھا۔ پھر تخت یا تختہ۔ زندگی یا موت۔!

اس روز ہمیں بھی مشقت پر لگا دیا گیا۔ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کے کچے صحن میں جھاڑو دینے اور کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کر بڑے ڈرموں میں ڈالنے پر لگ گیا۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب جیل کا بڑا آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ چیف وارڈن اور سپرنٹنڈنٹ جیل اور دوسرے اہل کار وغیرہ گیٹ کے اندر باہر قطار میں کھڑے ہو کر وزیر جیل خانہ جات کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے پہلے سے سوچ لیا تھا۔ چنانچہ میں ہاتھ میں جھاڑو پکڑے کھسک کر اس سائبان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا جہاں گاڑیاں وغیرہ پارک کی جاتی تھیں۔ اتنے میں دور سے ہوٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ جیل کے عہدے داروں میں ہل چل سی مچ گئی۔ وہ پھولوں کے ہار اور گلدستے لئے گیٹ کے

قریب آگئے۔ ہوٹروں کی آوازیں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد چار موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے جو ایک گاڑی کے آگے آگے آہستہ موٹر سائیکل چلاتے آرہے تھے۔ جیسے ہی وزیر جیل خانہ جات کی گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی فضا منتری جی کی جے کے نعروں سے گونج اٹھی۔ سب لوگ وزیر کی گاڑی کے اردگرد ہجوم بنا کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ وزیر کی گاڑی چیف وارڈن کے آفس کے آگے کھڑی ہو گئی تھی۔ پیچھے تین گاڑیاں تھیں ان میں سے ایک وزیر کے باڈی گارڈ کا دستہ تھا دوسری گاڑیوں میں بھی کچھ محکمے کے لوگ اور اخبار نویس بیٹھے تھے۔ یہ تینوں گاڑیاں سائبان کے نیچے آکر کھڑی ہو گئیں۔ باڈی گارڈ سٹین گنیں اٹھائے۔ وزیر صاحب کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ دوسری گاڑیوں میں جو لوگ بیٹھے تھے وہ بھی ادھر کو چل دیئے۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق اسی لمحے سے کمانڈو ایکشن شروع کرنا تھا۔ میں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ جیل کا آہنی گیٹ ابھی تک کھلا تھا اور بند نہیں ہوا تھا۔ تینوں گاڑیاں سائبان کے نیچے خالی کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو کے ڈرائیور وہاں سے اس طرف چلے گئے تھے جہاں وزیر صاحب کے استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا اور باری باری ان کے گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ ایک گاڑی کا ڈرائیور گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ دبلا پتلا ہندو تھا۔ میں جھاڑو دیتا ہوا گاڑی کی دوسری طرف آگیا۔ میں نے گاڑی میں جھانک کر دیکھا۔ گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بھارت میں تیار کی گئی تھی اور سیاہ رنگ کی چھوٹی گاڑی تھی۔ میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ قدرت مجھے اس سے زیادہ وقت دے ہی نہیں سکتی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اس لمحے کر گزرنا تھا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ فاصلے پر جیل کے دو چار جمعدار کھڑے تھے۔ ان کی توجہ بھی وزیر کے استقبال کرنے والوں کی طرف تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر نگاہ ڈالی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی ہوا کہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک سٹین گن پڑی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ قدرت میرے ساتھ اور کیا مہربانی کر سکتی تھی۔ میں جھاڑو دیتا گاڑی کے عقب میں آگیا۔ یہاں آتے ہی میں نے گاڑی کے ڈرائیور کو آواز دے کر کہا۔

"لالہ جی یہاں آکر دیکھیں۔ گاڑی نیچے سے لیک کر رہی ہے۔"

دبلے پتلے ڈرائیور نے جو بونٹ سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"سر! یہاں آکر دیکھیں۔ نیچے پٹرول گر رہا ہے"

ڈرائیور نے تعجب سے کہا۔

"یہاں پٹرول کہاں سے آگیا"

اور سگریٹ ایک طرف پھینک کر گاڑی کے پیچھے آگیا گاڑی کے پیچھے سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے اس ڈرائیور کو صرف ایک ضرب لگانی تھی۔ میری قسمت کا فیصلہ صرف اس ایک ضرب پر تھا۔ اگر ڈرائیور میری ضرب سے آواز نکالے بغیر گر پڑتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے تو میرے سامنے راستہ صاف تھا کیونکہ جیل کا گیٹ ابھی تک کھلا تھا۔ میں گاڑی کے نیچے سر ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔

"تم پیچھے ہٹو مجھے دیکھنے دو۔ کہاں تیل لیک ہو رہا ہے"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"سر نیچے دیکھیں۔ بڑا تیل گر رہا ہے"

ڈرائیور وردی پوش تھا اور اس نے سرکاری ڈرائیوروں والی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اس نے ٹوپی اتاری اور گاڑی کے نیچے دیکھنے کے لئے جھکا۔ جیسے ہی وہ جھکا میں نے اس کی گردن پر اس جگہ جہاں گردن کی ہڈیوں کے مہرے کھوپڑی کی ہڈی میں جا کر مل جاتے ہیں پوری طاقت سے مکا مارا۔ میری ضرب شدید تھی۔ میرے ایسے کسرتی بدن والے تربیت یافتہ کمانڈو کا مکا لوہے کے ہتھوڑے سے کم طاقت والا نہیں تھا۔ ڈرائیور نیچے گر پڑا۔ میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ بے ہوش ہوا ہے کہ نہیں اس کی ٹوپی جو زمین پر گر پڑی تھی اٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی انجن سٹارٹ کیا۔ گاڑی گیئر کو پیچھے ہٹا کر پہلے گیئر میں ڈالا اور گاڑی کو تیزی سے سائبان کے نیچے سے نکال کر

جیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار اور گارڈ کے سپاہیوں نے منتری کے ساتھ آنے والی گاڑی پر لگے ہوئے کانگریسی جھنڈے کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے۔ جب میں تیزی سے ان کے سامنے سے گاڑی نکال کر گیٹ سے نکلا تو انہوں نے جھک کر گاڑی کے اندر دیکھا۔ میرا کرتا پاجامہ جیل کے قیدیوں والا تھا مگر سر پر ڈرائیور کی کیپ تھی۔ ڈرائیور کی کیپ نے انہیں ایک لمحے کے لئے مغالطے میں ڈالا اور اس ایک سیکنڈ کے وقفہ میں میری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ گیٹ سے نکل گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم پیچھے کیا ہوا۔ کس نے مجھے پہچانا۔ کس نے سائبان کے نیچے ڈرائیور کی لاش دیکھی۔ کون میرے پیچھے بھاگا۔ میں ننانوے فی صدی والی موت کے منہ سے نکل آیا تھا۔ موت اب بھی میرے سر پر ضرور منڈلا رہی تھی۔ لیکن اس کا امکان پچاس فی صد تھا۔ پچاس فی صد میرے نکل جانے کا امکان بھی تھا۔ بڑی سڑک پر پہنچنے سے پہلے جیل کے گیٹ کے آگے جو کچی سڑک تھی اور جس پر سرخ رنگ کی بجری پڑی تھی اور کہیں کہیں منتری جی کے استقبال کے لئے جھنڈیاں بھی لگی تھیں وہ سڑک میری گاڑی نے آناً فاناً پار کرلی۔ سڑک کی بجری گاڑی کے نیچے زور زور سے ٹکرا کر شور مچاتی رہی اور میں گاڑی کو لے کر بڑی سڑک پر آگیا۔

یہاں سے میں اس سڑک پر جانا چاہتا تھا جو کمپنی باغ کی مال روڈ کہلاتی تھی اور جہاں آگے جا کر ایک سڑک مجیٹھ کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس سڑک کا نام بھی مجیٹھ روڈ ہی تھا مگر جلدی میں اور تیز رفتاری میں گاڑی اس طرف نہ نکال سکا اور گاڑی اس سڑک پر پڑ گئی جو ڈاک خانے کی اور ریالٹو سینما کے آگے سے ہوتی ہوئی بڑے ہسپتال کی طرف چلی جاتی تھی۔ اس طرف سے بھی میں بڑے ہسپتال سے آگے جا کر مجیٹھ روڈ کی طرف نکل سکتا تھا۔ سڑک پر ٹریفک ضرور تھی مگر میں نے گاڑی کی رفتار کم نہ کی اور جس قدر مہارت سے ٹریفک میں سے گاڑی کو نکال سکتا تھا نکال کر لئے جا رہا تھا۔

کرسٹل ریسٹوران کے پاس آکر میں نے گاڑی کو بڑے ہسپتال کی طرف ڈال دیا۔ یہاں آکر پہلی بار مجھے پیچھے موٹر سائیکلوں کے ہوٹر کی آوازیں سنائی دیں۔ جیل خانہ جات

کے منتری کے موٹر سائیکل سوار میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ میں نے اس گاڑی کو بدلنے کا
فیصلہ کر لیا۔ میں گاڑی سے نکل کر پیدل نہیں چل سکتا تھا۔ میں قیدیوں کے لباس میں
تھا۔ کہیں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ میں نے ہسپتال کے دروازے کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں دو
تانگے اور ایک رکشا کھڑا تھا۔ میں نے گاڑی ہسپتال کی کمپنی باغ کی سائیڈ والی دیوار کی
طرف گھما دی۔ اس طرف آگے جا کر ہسپتال کا دوسرا چھوٹا دروازہ آتا تھا۔

میری نظر دور سے ایک ایمبولینس پر پڑی جو آ کر ابھی ابھی کھڑی ہوئی تھی اور اس
کے اندر سے تین آدمی ایک سٹریچر پہ پڑے مریض کو نکال کر ہسپتال کے دروازے کی
طرف بڑھ رہے تھے۔ ایمبولینس کا ڈرائیور اتر کر سٹریچر کے ساتھ ہی ہسپتال کے چھوٹے
دروازے کی طرف بڑھا کہ اس کے دوسرے پٹ کو بھی کھول دے۔ میں نے تیزی سے
قریب جا کر گاڑی کو بریک لگائی۔ گاڑی سے نکل کر ایمبولینس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ
گیا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گیئر لگا کر ریس دی اور ایمبولینس کو لے کر رام
باغ کی طرف گاڑی کو ڈال دیا۔ میں ڈرائیوروں والی ٹوپی اتار کر دوسری سیٹ پر رکھ دی
تھی۔

اس علاقے میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔

میں گاڑی کو لے کر کمپنی باغ کی سڑک پر پوری رفتار سے چلاتا چھوٹی نہر کے پل پر
سے ہوتا ہوا مجیٹھ روڈ پر نکل آیا۔ اب موٹر سائیکلوں کے ہوٹروں کی آواز سنائی نہیں دے
رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہاں سے آگے مجھے
سارے راستے کا علم تھا۔ مجیٹھ روڈ پر میں ایمبولینس کی گاڑی کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ جو
کوئی دیکھتا یہی سمجھتا کہ میں کسی مریض کو ہسپتال لئے جا رہا ہوں۔ میں اس ایمبولینس سے
بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہسپتال کے چھوٹے دروازے پر منتری کی گاڑیوں
کے ساتھ آنے والی پولیس کی گاڑی کو خالی دیکھ کر وہ لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں وہاں
سے ایمبولینس لے کر فرار ہو گیا ہوں۔ مگر مجیٹھ روڈ پر کوئی دوسری گاڑی کہیں نہیں
تھی۔ وہاں یا تو ایک دو رکشا نظر آئے یا بیل گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ یا دو تین سکھ

سائیکل پر سوار چلے جا رہے تھے۔ میں پرانے پل پر سے بھی گزر گیا۔ مجیٹھ روڈ چھوٹی
سڑک تھی جس کی دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ ہوٹروں کی آوازیں بالکل سنائی
نہیں دے رہی تھیں۔ میں سامنے لگے آئینے میں سے برابر پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ پیچھے سڑک
دور تک خالی تھی۔ میں نے ایمبولینس کی رفتار ہلکی کر دی اور ایک طرف گھما کر اسے
جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ مجھے ایمبولنس کے اندر والی آمنے سامنے کی سیٹوں پر کچھ
سفید چادریں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اندر گھس کر انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہاں
مجھے کھدر کا کرتا پاجامہ مل گیا شاید کسی مریض کا اتارا ہوا تھا۔ میں نے قیدیوں والے
کپڑے اتار کر کھدر کا کرتہ پاجامہ پہن لیا اور ایمبولنس کو چلاتا وہاں سے بھی آگے نکل
گیا۔

آگے کچھ فاصلے پر بڑی نہر کا ریلوے پل تھا۔ اس پل پر سے ریل گاڑی گزرتی تھی۔
اس وقت پل خالی تھا۔ میں پھاٹک عبور کر کے پل کی دوسری طرف آ گیا۔ وہاں سڑک کچی
اور مزید چھوٹی ہو گئی تھی۔ یہ کچی سڑک مجیٹھ قصبے میں سے گزرتی ہوئی آگے گورداسپور
کی طرف جاتی تھی۔ ایمبولینس کو وہاں چھوڑ کر پیدل چلنا خطرناک تھا۔ میں گاڑی کی رفتار
ہلکی کر کے اسے کچی سڑک پر آگے بڑھاتا گیا۔ کھیتوں میں سکھ کسان ہل چلاتے اور کہیں
مویشیوں کا چارہ کاٹتے نظر آ رہے تھے۔ ایمبولنس ان کے قریب سے گزرتی تو وہ آنکھیں
اٹھا کر ایمبولینس کی طرف دیکھتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

مجیٹھ قصبہ آ گیا۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ چھوٹی شہید بہن کلثوم یاد آ گئی۔ اپنے مرحوم
والد صاحب یاد آ گئے۔ دل کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ مجیٹھ گاؤں بھی پیچھے رہ گیا۔ یہاں سے
کچی سڑک گورداسپور جانے والی پکی سڑک سے آ کر مل جاتی تھی۔ میں ایمبولینس کو لے
کر پکی سڑک پر آ گیا۔

دور سے ایک ریلوے سٹیشن کو دیکھا جہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ انجن کا رخ
گورداسپور کی طرف تھا۔ میں نے گاڑی کو کھیتوں میں چھوڑ کر ٹرین میں سوار ہو جانے کا
فیصلہ کیا اور ایمبولینس کو تیزی سے چلاتا ریلوے سٹیشن کے قریب کھیتوں کے کنارے

جھاڑیوں کی اوٹ میں روک دیا۔ میں جھاڑیوں میں سے ہو کر ریلوے لائن پر آگیا اور سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ ٹرین کھڑی تھی۔ یہ چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا۔ مسافر ڈبوں میں چڑھ رہے تھے۔ انجن نے سیٹی بجائی۔ میں ریلوے لائن پر دوڑ پڑا۔ دوسری طرف انجن کی چھک چھک کی آواز بلند ہوئی اور ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ میں اپنی رفتار بھی تیز کر دی اور گاڑی کے آخری ڈبے میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ گارڈ کا ڈبہ تھا۔

گارڈ سکھ تھا۔ وہ ڈبے کے دروازے پر کھڑا انجن کی طرف منہ کر کے سبز جھنڈی ہلا رہا تھا۔ مجھے اسی نے ہاتھ سے پکڑ کر ڈبے میں سوار کرایا تھا۔ کہنے لگا۔

"اوئے ماماں گھروں چھیتی نکل آنا تھا۔"

میں نے کہا۔

"سردار جی دیر ہو گئی"

میں گارڈ کے لکڑی کے بڑے بکس کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ سکھ گارڈ اس وقت تک دروازے میں ہی کھڑا سبز جھنڈی ہلاتا رہا جب تک کہ گاڑی پلیٹ فارم سے نہیں نکل گئی۔ پھر وہ جھنڈی لپیٹ کر دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر رجسٹر کھول کر اس پر کچھ اندراج کرنے لگا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

رجسٹر ایک طرف رکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے تم؟"

میں نے کہا۔

"جی جانا تو مجھے جموں ہے سردار جی۔ پتہ نہیں یہ گاڑی کہاں تک جاتی ہے"

سردار نے سخت لہجے میں کہا۔

"تو تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ تم کون سی گاڑی میں سوار ہوئے ہو؟ اوئے ٹکٹ لیا ہے تم نے؟

میں نے کہا

"جی نہیں۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا"

گارڈ نے اپنی وردی والی بش شرٹ کی بڑی جیب میں سے کاپی نکالی اور بولا۔

"نکالو دس روپے بارہ آنے۔ میں تمہیں ابھی جموں کا ٹکٹ بنا دیتا ہوں چلو۔ میں تم سے آدھا جرمانہ لے لوں گا۔ نکالو نو روپے"

میں نے یونہی اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا اور حیران ہو کر کہا۔

"سردار جی میرے پاس دس روپے کا نوٹ تھا۔ بھاگتے ہوئے لائن پر گر گیا ہے"

سکھ گارڈ نے میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ بولا۔

"میں تم ایسے داؤ سفر کرنے والوں کی ایک ایک رگ پہچانتا ہوں۔ اگلے سٹیشن پر میں تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔"

میں نے ایک ایسی دردناک گھریلو کہانی گھڑ کر اسے سنائی کہ سادہ دل سکھ گارڈ کا دل پسیج گیا۔ کہنے لگا۔

"کوئی گل نہیں کاکا۔ میں تمہیں اپنے ڈبے میں بٹھا کر جموں لے چلوں گا فکر نہ کرو"

میں اس اعتبار سے مطمئن ہو گیا کہ میں ٹرین میں بغیر ٹکٹ محفوظ رہ کر سفر کر سکوں گا۔ لیکن اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ آگے کسی سٹیشن پر پولیس ٹرین کو محاصرے میں لے کر مجھے گرفتار نہ کرے۔ مگر یہ خطرہ ہر حالت میں مجھے مول لینا ہی تھا۔

ٹرین چلتی رہی۔ سکھ گارڈ بڑا رحم دل آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ایک سٹیشن پر مجھے کھانا بھی کھلایا۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے ٹرین جموں توی کے سٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں نے سردار صاحب کا شکریہ ادا کیا اور نمستے کہہ کر ٹرین سے اترنے لگا تو سکھ گارڈ بولا۔

"اوئے ٹھہر جاؤ۔ گیٹ سے کیسے باہر نکلو گے؟ تمہارے پاس تو ٹکٹ نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں باہر نکال دوں گا۔"

سکھ گارڈ مجھے اپنے ساتھ سٹیشن کے باہر نکال کر لے گیا اور کہنے لگا۔

"آگے سے کبھی دوڑ کر گاڑی پکڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب جاؤ۔"

اس وقت رات ہو چکی تھی۔

میں رات جموں میں نہیں گذارنا چاہتا تھا۔ اور رات کو سری نگر کی طرف کوئی لاری نہیں چلتی تھی۔ میں ٹرکوں کے اڈے پر آگیا کہ کسی ٹرک میں بیٹھ کر ہی اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ٹرک مال لے کر جموں سے رات کو بھی سری نگر کی طرف چلتے رہتے تھے۔ ٹرکوں کے اڈے پر صرف ایک ٹرک کھڑا تھا جس طرف خالی بوریاں یعنی باردانہ لادا جا رہا تھا۔ ایک آدمی اپنی نگرانی میں مال لدوا رہا تھا۔ اس نے جموں کے ہندوؤں والی ٹوپی اور تنگ موری کا پاجامہ اور چھوٹا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس کے پاس ایک سکھ بھی کھڑا تھا جو ٹرک کا ڈرائیور لگتا تھا۔ میں ہندو لالے سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ وہاں سے ہٹ گیا تو میں نے سکھ ڈرائیور سے کہا کہ سری نگر میں میری ماتا جی سخت بیمار ہیں۔ میرے پاس لاری کا کرایہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھ سری نگر تک لے جائیں آپ کی بڑی کرپا ہو گی سکھ نے تھوڑی تھوڑی پی رکھی تھی۔ ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"کیا ناؤں ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔

"نرائن داس۔ جموں اپنے بھیا جی سے ملنے آیا تھا۔ وہ تو ملا نہیں۔ سارے پیسے خرچ ہو گئے۔"

سکھ ڈرائیور نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جوان آدمی ہو کہیں محنت مزدوری کر کے کرایہ بنا لیتے۔ چلو کوئی بات نہیں تمہیں ٹرک کے پیچھے بیٹھنا ہو گا۔ آگے میرے ساتھ میرا کلینر اور ٹھیکدار بیٹھے گا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ کی بڑی کرپا ہے سردار جی۔ میں پیچھے ہی بیٹھ جاؤں گا۔"

ٹرک تہہ در تہہ لگی خالی بوریوں سے منہ در منہ بھر گیا تھا۔ میں نے پیچھے بوریوں میں اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی اور بیٹھ گیا۔ ٹرک کا پچھلا دروازہ نہیں تھا۔ ایک تین فٹ اونچی لکڑی کا تختہ تھا جو پیچھے لگا دیا گیا۔ میں تختے اور بوریوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

ٹرک سری نگر کی طرف چل پڑا۔

عام لاریاں جو جموں سے سری نگر جاتی ہیں وہ راستے میں پیر پنجال یا کد ٹبوت میں رات گزارتی ہیں مگر یہ ٹرک وہ ساری رات اور اگلا سارا دن چلتا رہا۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد ہم مقبوضہ کشمیر کی وادی میں داخل ہو گئے تھے۔ میں بڑا مطمئین تھا کہ اپنے مجاہد ساتھیوں کے پاس پہونچنے والا ہوں۔ ٹرک ایک پہاڑی اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنے لگتا۔ ایک وادی آتی۔ گذر جاتی۔ پھر دوسری وادی اور گہری گھاٹیاں اوپر سے نظر آنے لگیں۔ سڑک تیسرے پہر سری نگر کے نواحی پہاڑی علاقے میں داخل ہوا تو ایک جگہ رک گیا۔ میں ٹرک کے پیچھے بوریوں کے درمیان اونگھ رہا تھا۔ ساری رات کشمیر کی پہاڑی سرد ہواؤں کے تھپیڑوں نے سونے نہیں دیا تھا۔ بوریاں بندھی ہوئی تھیں ورنہ میں ان میں سے دو تین بوریاں اپنے اوپر کر لیتا۔ اس وقت ٹرک کی رفتار پہلے ہی ہلکی تھی اور وہ ایک پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے کے بعد ڈھلان پر اترنے لگا تھا۔ کہ اچانک اسے بریک لگے اور وہ آہستہ آہستہ پہاڑی سڑک کی بائیں جانب ٹیلے کی دیوار کے ساتھ آکر رک گیا۔ راستے میں بھی ٹرک کئی جگہوں پر رکا تھا۔ کہیں محصول دینے کے لئے۔ کہیں ٹیکس دینے کے لئے اور کہیں ڈرائیور اور ٹھیکے دار چائے وغیرہ پینے کے لئے ٹرک روک لیتے تھے۔

میں یہی سمجھا کہ ڈرائیور نے چائے پینے کے لئے ٹرک کو روکا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ عقب میں پہاڑی سڑک پر دونوں جانب کوئی چائے کا کھوکھا یا دوکان نظر نہ آئی۔ اتنے میں آگے سے بھاری قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ چونک پڑا۔ کیونکہ یہ آواز فوجی بوٹوں کی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چار پانچ ڈوگرہ فوجی پیچھے آگئے۔ ان میں ایک حوالدار میجر تھا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"کون ہو تم؟ سری نگر کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے بتایا کہ میرا نام نرائن داس ہے۔ سری نگر کے ہندواڑہ محلے میں میری

پنساری کی دکان ہے۔ میں نے کچھ ایسے اعتماد سے یہ باتیں کیں کہ ڈوگرہ حوالدار میجر ٹرک کے ٹھیکدار اور ڈرائیور سے جو ان فوجیوں کے ساتھ ہی پیچھے آئے تھے کہنے لگا۔

"چلو جاؤ۔ آگے کسی فالتو آدمی کو ٹرک پر مت بٹھانا۔ تمہیں پتہ نہیں ادھر کشمیری گوریلے اٹیک کرتے رہتے ہیں۔"

ہندو ٹھیکدار اور سکھ ڈرائیور نے بڑی لجاجت سے کہا کہ وہ آئندہ کبھی کسی فالتو آدمی کو ٹرک پر نہیں بٹھائیں گے۔ ٹرک چل پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت نازل ہوتے ہوتے دور ہو گئی۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ ٹرک پہاڑی سڑک پر تھوڑی دور تک چلتا رہا۔ پھر ایک طرف ہو کر رک گیا۔ میں نے سوچا کہ پھر ڈوگرہ فوجیوں نے چیکنگ کے لئے روک لیا ہو گا۔ مگر اس دفعہ ڈوگرہ فوجیوں کی بجائے ٹرک کا ڈرائیور اور ہندو ٹھیکدار آ گئے۔ ہندو ٹھیکدار نے مجھے آرڈر دینے کے انداز میں کہا۔

"چلو یہاں اتر جاؤ۔ تمہارے لئے ہم کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے۔ آگے پھر فوجی چیک پوسٹ ہے۔"

سکھ ڈرائیور کہنے لگا۔

"یہاں نیچے گھاٹی میں ایک راستہ سری نگر کو جا نکلتا ہے۔ ہم تمہیں اس سے آگے نہیں لے جا سکتے۔ فوج زبردست چیکنگ کر رہی ہے۔ چلو اترو یہاں۔"

میں خاموشی سے ٹرک سے اتر پڑا۔ میرے اترتے ہی ٹرک آگے روانہ ہو گیا۔ میں نیچے گھاٹی میں اترنے کی بجائے پہاڑی سڑک پر ایک طرف ہو کر چل پڑا۔ کشمیر کی پہاڑیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ابھی سورج ان پہاڑیوں کے اوپر ہی تھا اور دن کی روشنی تھی۔ ان پہاڑیوں کو میں پہچانتا تھا۔ ان کی دوسری طرف سری نگر کی وادی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مجھے ایک پہاڑی کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ یہ میں نے غلطی کی تھی کہ اس پہاڑی سڑک پر پیدل چل پڑا تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں نے کہا تھا کہ ادھر کشمیری گوریلوں کا اٹیک ہوتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ علاقے ڈوگرہ فوجی یونٹ کی فوجی سرگرمیوں کی زد میں تھا اور ان کی فائٹنگ پٹرول پارٹیاں ضرور آس پاس موجود ہوں گی۔ لیکن میں نے سوچا کہ دوسری

پہاڑی کی ڈھلان پر نیچے گھاٹی میں اتر جاؤں گا۔

میں ایک موڑ گھوم کر پہاڑی سڑک کی دوسری جانب آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے پہاڑی کے سامنے لگے ہوئے تین بہت بڑے فوجی ٹرک کھڑے ہیں۔ دس بارہ ڈوگرہ فوجی سڑک پر برین گنیں لئے کھڑے اوپر پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں وہیں سے واپس ہونے لگا تو ایک فوجی نے مجھے دیکھ لیا اور برین گن کا رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہالٹ۔ کون ہو تم؟"

میں رک گیا۔ تین فوجی دوڑ کر میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے کہانی گھڑ کر انہیں سنانی شروع کی تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کشمیری مسلمان ہو؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں جی۔ میں ہندو ہوں۔ میرا نام نرائن داس ہے۔ میں---"

دوسرے فوجی نے جو لانس نائیک تھا پہلے فوجی سے کہا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ کشمیری گوریلا ہے۔ اس کی پتلون اتار کر دیکھو"

دوسرے لمحے انہیں میرے مسلمان ہونے کا پتہ چل گیا۔ ایک ڈوگرے نے چلا کر

ا۔

"پکڑ لیا ہے گوریلا صاحب--!"

دوسرے فوجی بھی دوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے مجھے مکے اور ٹھڈے مارنے روع کر دیئے۔ پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے اس طرف لے گئے جدھر ٹرک کھڑے تھے۔ ان کوں میں فوجی نہیں تھے۔ اوپر ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایمونیشن اور راشن غیرہ ہو گا۔ یہ سپلائی کے ٹرک تھے جو آگے وادی میں بھارتی فوجی یونٹوں میں جا رہے ے۔ مجھے اگلے ٹرک میں دو فوجیوں کے درمیان پھنسا کر بٹھا دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ کسی رناک کشمیری مجاہد کی تلاش میں تھے جس کے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ اس جگہ

موجود ہے اور انہوں نے مجھے وہی کشمیری گوریلا سمجھ کر پکڑ لیا تھا۔ ٹرک سڑک پر آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگے۔ میں اگلے ٹرک میں تھا۔ ہمارے پیچھے دوسرے دونوں ٹرک آرہے تھے۔ میں دو بھارتی فوجیوں کے درمیان پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ تیسرا بھارتی فوجی ٹرک ڈرائیور تھا جو ٹرک چلا رہا تھا۔ ایک فوجی نے میری گردن دبوچ کر مجھے گالی دے کر کہا۔

"تم لوگوں نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ ابھی تمہیں مزا چکھاتے ہیں"

دوسرے فوجی نے کہا۔

"اس کو باہر نکال کر شوٹ کر دو"

پہلے فوجی نے میری گردن چھوڑ دی اور بولا۔

"یونٹ میں لے جا کر پہلے اس سے دوسرے گوریلوں کے ٹھکانے کا تو پتہ چلا لیں۔ اس کے بعد اس کی گردن کاٹ ڈالیں گے۔ گولی اس پر ضائع نہیں کریں گے۔"

تینوں بھارتی فوجی ٹرک ایک پہاڑی سے اتر کر دوسری پہاڑی کے گرد سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ اچانک اوپر سے تڑا تڑ فائر آنا شروع ہو گیا۔ ڈرائیور فوراً بریک لگا کر چیخا

"کشمیری گوریلے ادھر بھی ہیں۔ نیچے اتر کر پوزیشنیں سنبھالو۔"

دونوں فوجی مجھے پکڑ کر میرے ساتھ ہی ٹرک میں سے باہر نکل کر جھاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایک فوجی نے برین گن کی نالی میری گردن کے ساتھ لگا دی تھی۔ دوسرا فوجی اور ٹرک ڈرائیور دونوں اوپر کی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ دوسرے ٹرکوں میں جو بھارتی فوجی بیٹھے تھے انہوں نے بھی ٹرکوں سے چھلانگیں لگا دی تھیں اور ٹرکوں سے دور ہٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں لے کر اوپر دھڑا دھڑ فائرنگ کرنے لگے تھے۔ اوپر سے مشین گنوں کا فائر آرہا تھا۔ گولیاں ٹرکوں سے ٹکرا کر پھٹ رہی تھیں۔ یہ کشمیری مجاہد تھے جو گھات میں بیٹھے ان سپلائی والے ٹرکوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک اوپر سے یا علی اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے اور تین چار گرنیڈ آ کر ٹرکوں

ے ٹکرائے اور یکے بعد دیگرے دھماکوں سے پھٹے۔ ایک گرینڈ ٹرک کی ترپال کے اوپر پھٹا جس نے ٹرک میں ایک خوفناک دھماکے کے بعد آگ لگا دی اور اس کے بعد اس فوجی ک میں دھماکے شروع ہو گئے۔ ٹرک کا چھوٹا بڑا ایمونیشن پھٹ رہا تھا۔

اب میں ان بھارتی فوجیوں کا قیدی نہیں تھا۔ میں اپنے اصلی کمانڈو روپ میں آگیا ۔ جس فوجی نے میری طرف برین گن تان رکھی تھی میں نے نیچے سے ہاتھ مار کر اس برین کو اوپر کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی برین گن کو پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ کو گرا ہی تھا کہ میں نے اس پر ایک برسٹ مارا۔ وہ اچھلا اور نیچے ڈھلان میں لڑھک ۔ دوسرے دونوں فوجیوں نے اپنی گنوں کا رخ میری طرف کیا ہی تھا کہ میں نے ان پر گن کی بوچھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔ دونوں بھارتی فوجی وہیں الٹے ہو گئے۔ اس بعد میں سڑک کنارے کی جھاڑیوں میں دوسرے بھارتی فوجیوں کی طرف دوڑا جو پھٹتے ے ٹرک کے شعلوں اور دھماکوں سے بچنے کے لئے سڑک کی دوسری طرف دوڑ گئے ور وہاں پوزیشنیں سنبھال کر اوپر کی طرف بے مقصد گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ مجھے ک دوسری طرف صاف نظر آرہے تھے اور میری زد میں تھے۔ میں نے برین گن ی اور ان پر اندھا دھند برسٹ فائر کرنے لگا۔ یہ چھ سات فوجی تھے اور میرے میں تھے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا۔

ب نیچے سے بھارتی فوجیوں کی فائرنگ رک گئی تو پہاڑی کے اوپر سے ایک بار پھر ر اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور میں نے دس بارہ کشمیری حریت پرست گوریلوں کو ی کی آڑ لیتے بکھری ہوئی پوزیشن میں نیچے اترتے دیکھا۔ ایک بھارتی فوجی ٹرک ں جل رہا تھا۔ دوسرے دونوں ٹرک اسی طرح کھڑے تھے۔ میں برین گن لے کر ں سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ میں نے برین گن اوپر اٹھا کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ ئیری گوریلے میری طرف آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے کشمیری میں نے لگے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا۔

کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"اس سوال کے جواب کے پیچھے ایک بڑی لمبی داستان ہے دوستو! بس تم یہی سمجھ لو کہ میں مسلمان ہوں۔ اور تمہارے کمانڈر شیروان کا ساتھی ہوں"

پھر میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو وہ جوش میں آکر نعرے لگانے لگے۔ ان میں سے دو نے مجھے پہچان لیا تھا۔ انہوں نے مجھے باری باری گلے لگایا۔ پھر ٹرکوں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ دونوں ٹرکوں میں مشین گنیں' سٹین گنیں' راٹ لانچر' راکٹ لانچروں کے راکٹ' مارٹر گنیں' مارٹر گنوں کے گولوں کے کریٹ بھرے ہوئے تھے۔

کشمیری گوریلوں کے لیڈر نے کہا۔

"ان ٹرکوں کو آگے لے چلو۔"

میں بھی ان کشمیری مجاہدوں کے ساتھ ایک ٹرک میں بیٹھ گیا اور جنگی ہتھیاروں سے بھرے ہوئے دونوں ٹرک آگے کی طرف چل پڑے۔ اس وقت سورج سری نگر کی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا اور وادیوں پر ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا۔ کوئی ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹرکوں کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں دوسرے کشمیر مجاہد بھی ادھر ادھر سے نکل کر آ گئے۔ ٹرکوں میں سے اسلحہ اور جنگی ہتھیاروں کے کری باہر نکال کر اوپر لے جائے جانے لگے۔ اس دوران کچھ مجاہد پیچھے پہاڑی کی ڈھلان جھاڑیوں کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھے رہے کہ اگر پیچھے کوئی بھارتی فوجی گاڑی یا ٹرک آ تو اسے وہیں راکٹ لانچر سے راکٹ فائر کر کے اڑا دیں۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر بھارتی ٹرکوں کا سارا ایمونیشن کشمیری حریت پرست مجاہد کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔ رات میں نے ان کشمیری مجاہدوں کے ساتھ ہی گزاری دوسرے دن ان میں سے دو مجاہد جنہوں نے مجھے کمانڈر شیروان کے پاس کئی بار دیکھا مگر میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا مجھے ساتھ لے کر پہاڑی راستوں میں سے گذرتے ہو کمانڈر شیروان کی خفیہ کمیں گاہ میں پہنچ گئے۔ کمانڈر شیراون نے مجھے دیکھتے ہی گلے لیا۔ میں نے شیروان کو اپنی روئیداد مختصراً بیان کی اور کہا۔

"کمانڈر! مجھے بتاؤ ہمارا اگلا کمانڈو مشن کون سا ہے؟"

کمانڈر شیروان نے جیب سے چھوٹا سا کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"آج رات قاضی کنڈ کی پہاڑیوں کی جانب سے ایک بھارتی فوجی کنوائے آرہا ہے۔ ہمیں گھات لگا کر اسے برباد کرنا ہے"

میں نے کمانڈر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پرجوش انداز میں کہا۔

"انشاء اللہ! یہ بھارتی فوجی کانوائے سری نگر نہیں پہنچ سکے گا۔"

اسی رات کے اندھیرے میں ہم چار کمانڈوز دوسرے کشمیری مجاہدوں کے ساتھ اپنے ٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہماری منزل قاضی کنڈ کی پہاڑیاں تھیں جن میں ایک سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی پہاڑیوں میں سے اتر کر سرینگر کے میدانوں میں داخل ہوتی تھی۔ ہمیں جو اطلاع ملی اس کے مطابق یہ ملٹری ٹرکوں کا کانوائے درہ حاجی پیر کی طرف سے آرہا تھا۔ یہ کل ڑے ٹرک تھے جن میں دوسرے فوجی سازو سامان کے علاوہ مارٹر گنوں اور مارٹر توپ ولوں کا بھاری سٹاک سرینگر کی بھارتی چھاؤنی میں لایا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجی سرینگر کے ر آس پاس کے گاؤں میں مسلمان کشمیریوں کے مکان مارٹر فائر سے تباہ کرتے تھے۔ گاؤں پر انہیں شک پڑتا تھا کہ یہاں کشمیری حریت پسند چھپے ہوئے ہیں، وہ اس گاؤں اچانک چھاپہ مارتے تھے۔ تلاشی لیتے تھے۔ عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے۔ ذرا سی مت پر مردوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے تھے اور اس کے بعد گاؤں سے کچھ فاصلے پر جا کر ر توپوں کے فائر سے پورے گاؤں کے مکانوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔ چنانچہ ان ں کو راستے میں ہی تباہ کرنا بہت ضروری تھا۔ ہم چار تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ میں' ڈر شیروان اور دو دوسرے کشمیری گوریلے' ہمارے علاوہ تین کشمیری مجاہد تھے۔ یہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ ہم نے کشمیری کسانوں کا بھیس بدل رکھا ور خچروں پر سوار قاضی کنڈ کی طرف جانے والے پہاڑی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ں سے کسی نے پرانا کمبل اور کسی نے کھیس جسم کے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کمبلوں

اور کھیسوں کے اندر ہم نے سٹین گنیں چھپا رکھی تھیں۔ ہم ان پہاڑیوں میں سارا
سفر کرتے رہے۔ رات کو ایک جگہ آرام کیا۔ اگلے روز پھر سفر شروع ہو گیا۔ ہم قاضی
کنڈ کے پرانے پل والے موڑ پر پہنچ کر گھات لگانا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہماری اطلاع
مطابق بھارتی کانوائے کو تیسرے دن دوپہر کے بعد وہاں سے گذرنا تھا۔

رات کو تین گھنٹے ہم نے آرام کیا اور منہ اندھیرے خچروں پر سوار ہو کر اپنے سفر
چل پڑے۔ دوسرے دن شام کو ہم قاضی کنڈ کی پہاڑیوں میں سے گذر رہے تھے۔ کمانڈر
شیروان نے دوربین سے اوپر پہاڑی سڑک کو دیکھا اور دوربین مجھے دے کر کہا۔

"اوپر جو سڑک نظر آرہی ہے اس کے پیچھے پرانا پل ہے جو انگریزوں کے زمانے کا
ہوا ہے۔ ہمیں وہاں گھات لگا کر بیٹھنا ہوگا۔"

میں نے دوربین لگا کر دیکھا۔ دور اوپر پہاڑی کے پہلو میں ایک سڑک بل کھاتی گذ
رہی تھی۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کمانڈر
شیروان سے کہا۔

"پرانا پل یہاں سے پیچھے کتنی دور ہوگا؟ اور کیا وہاں گھات لگانے کے لئے کو
موزوں جگہ ہوگی"

شیروان بولا۔

"پل کے اوپر ڈھلان پر چنار کے بے شمار درخت ہیں۔ ان درختوں میں بڑی ا
گھات لگائی جاسکتی ہے۔"

باقی دونوں کمانڈو نے ہمارے خیال کی تصدیق کی اور ہم نے اللہ کا نام لے کر پہا
سڑک کی طرف خچروں کو ڈال دیا۔ راستہ کافی دشوار تھا۔ راستے میں درخت
جھاڑیاں تھیں۔ چھوٹے بڑے پتھر اور چٹانیں تھیں۔ سیدھا راستہ کوئی نہیں تھا۔ ہمار
خچر ہر قسم کی رکاوٹوں میں سے گذرتے ہوئے پہاڑی کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔
علاقے میں کوئی بھارتی فوجی کیمپ نہیں تھا۔ اس لئے ہم آزادی سے سفر جاری ر
ہوئے تھے۔ دیکھنے میں راستہ زیادہ لمبا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اوپر سڑک پر پہنچتے پہنچتے
شام ہو گئی۔ سورج قاضی کنڈ کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جس کی وجہ سے پہاڑ

ی اس جانب جہاں ہم تھے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سڑک پکی تھی اور اس پر سے صرف ایک
ک ہی گذر سکتا تھا۔ دو ٹرک برابر برابر ہو کر نہیں گذر سکتے تھے۔ اس سڑک پر پبلک
اڑیوں کی ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ صرف فوجی کانوائے ہی آتے جاتے تھے۔ سرینگر سے
ر فوجی کانوائے آتا تھا تو درہ حاجی پیر کی طرف سے آنے والے کانوائے کو وہیں روک لیا
اتا تھا۔ درہ حاجی پیر سے جو کانوائے آتا تھا اس کے لئے سری نگر کے میدانوں تک سڑک
دوسری کسی گاڑی کو سڑک پر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہ سارا کام پرانے پل پر
ایک فوجی مورچہ تھا وہاں وائرلیس کے ذریعے انجام پاتا تھا۔

ہم نے سڑک کے اوپر چنار کے درختوں میں ایک جگہ کیمپ لگا لیا اپنے اردگرد
رختوں کی شاخیں کاٹ کر مصنوعی جھاڑیوں کا حصار بنا لیا۔ ہمیں وہیں رات گذارنی
ی۔ دوسرے دن اسلحے سے لدے ہوئے فوجی ٹرک دوپہر کے بعد کسی بھی وقت گذرنے
الے تھے۔ ہمارے مخبروں نے بتایا تھا کہ یہ چار بڑے ٹرک ہیں۔ ان کے آگے پیچھے ایک
ک سیکورٹی گارڈ کی جیپ ہو گی۔ جس میں مسلح فوجی ہوں گے اور مشین گنیں بھی لگی
ی ہوں گی۔ رات ہم نے درختوں کے نیچے کیمو فلاج کر کے بنائے گئے کیمپ میں
ذاری۔ دوسرے دن ہم گھات لگا کر بھارتی فوجی کانوائے کا انتظار کرنے لگے۔ دن گذر
ا۔ شام آگئی مگر کوئی کانوائے نہ آیا۔ کمانڈر شیروان بھی پریشان تھا۔ کہنے لگا۔

"کہیں کانوائے کا ٹائم اور روٹ تو نہیں بدل دیا گیا؟ مگر دوسرا روٹ تو کوئی بھی نہیں
۔ اگر کانوائے کے ٹرکوں کو گذرنا ہے تو وہ اسی سڑک پر سے گذر کر سری نگر جائیں
"

"ہو سکتا ہے ٹائم بدل دیا گیا ہو۔ کوئی وجہ ہو گئی ہو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہی ہیں۔ آج
ا تو ممکن ہے کل کسی وقت کانوائے آجائے۔"

جب اس سے اگلا دن بھی گذر گیا اور کانوائے نہ گذرا تو کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"ہمیں اپنا آدمی بھیج کر صحیح صورت حال کا پتہ لگانا چاہئے۔"

چنانچہ اسی وقت ایک کشمیری مجاہد کو تیار کیا گیا کہ وہ پیچھے جا کر معلوم کرے کہ
ے کب آنے والا ہے۔ یہ کشمیری مجاہد بھی کشمیری کسان کے بھیس میں تھا اور اس

علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ اسی وقت اپنے مشن پر نکل گیا۔

اس دوران ہم لوگ سڑک کے اوپر گھات لگا کر بیٹھے رہے کہ اگر کانوائے کے ٹرک نظر آجائیں تو ان پر حملہ کر دیا جائے۔ ہمارے پاس سٹین گنوں کے علاوہ دستی بم بھی تھے اور ٹینک شکن راکٹ اور راکٹ لانچر بھی تھے۔ ہم اس روز بھی سارا دن گھات لگائے بیٹھے رہے۔ کوئی کانوائے نہ آیا۔ شام کو ہمارا کشمیری مجاہد واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں سے بہت پیچھے کنڈال کے شیوا مندر کے قریب پہاڑی تودہ گرنے سے سڑک بند ہو گئی ہے جس کی وجہ سے فوجی کانوائے وہیں رکا ہوا ہے۔

کمانڈر شیروان نے پوچھا۔

"کیا تم نے وہ جگہ دیکھی ہے جہاں پہاڑی تودہ گرنے سے سڑک بند ہو گئی ہے"

مجاہد بولا۔

"جی ہاں۔ میں وہ سارا علاقہ دیکھ کر آیا ہوں۔ سڑک پر پہاڑی تودہ گرنے سے ایک اور پہاڑی بن گئی ہے۔ فوجی جوان مٹی پتھر ہٹانے میں لگے ہوئے ہیں۔"

"اسلحے سے لدے ہوئے فوجی ٹرک کہاں کھڑے ہیں؟"

اس کے جواب میں کشمیری مجاہد نے کہا۔

"ان ٹرکوں پر سے گولہ بارود اور فوجی سازو سامان اتار کر کنڈال کے شیوا مندر کے نیچے سٹاک کر دیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" کمانڈر شیروان نے پوچھا۔ "کیا شیوا مندر کے نیچے کوئی ایمونیشن ڈمپ ہے؟"

کشمیری مجاہد کہنے لگا۔

"سر! شیوا مندر کے نیچے بہت بڑا ایمونیشن ڈمپ ہے۔ میری اطلاع کے مطابق اسلحہ اور گولہ بارود کے اس ذخیرے میں سے ہی اوپر سیاچین گلیشئر کے بھارتی مورچوں کو ایمونیشن سپلائی کیا جاتا ہے اور کشمیر کے محاذ پر اسی ذخیرے سے گولہ بارود ٹرکوں میں بھر کر کانوائیوں کی شکل میں سری نگر لایا جاتا ہے۔"

کمانڈر شیروان نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں درخت کی شاخوں کو کاٹنے کی بجائے درخت کو ہی جڑ سے اکھاڑ ڈالنا چاہئے کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"بڑا اچھا خیال ہے۔"

پھر میں نے کشمیری مجاہد سے پوچھا کہ شیوا مندر کے تہہ خانے میں کتنی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود سٹاک کیا ہوا ہو گا۔ اس نے کہا۔

"سر! وہاں ہمارے ایک کشمیری ساتھی نے مجھے بتایا ہے کہ اتنا بڑا ایمونیشن کا ذخیرہ سارے کشمیر میں کسی اور جگہ پر نہیں ہے۔ کشمیر اور سیاچین کے بھارتی مورچوں اور یونٹوں کو اسی ڈپو سے گولہ بارود سپلائی ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑا گولہ بارود کا ذخیرہ ہے۔ اور مندر کے نیچے اس لئے بنایا گیا کہ کسی مخبر کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہی ہے ہمارے حریت پسند جگہ جگہ موجود ہیں۔"

میں نے کشمیری مجاہد سے ایک اور سوال کیا۔

"اس شیوا مندر میں کس کی پوجا ہوتی ہے۔ شیوا کے نام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں شوجی کی پوجا ہوتی ہو گی"

"جی ہاں۔ وہاں شولنگ کی پوجا ہی ہوتی ہے۔ شیوجی کی مورتیوں کی بھی پوجا ہوتی ہے اور شیو دیوتا کے سر پر جو کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے اس کی بھی پوجا ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ علاقہ تو دور دراز پہاڑیوں میں واقع ہے۔ پھر پوجا کرنے والے کہاں سے آتے ہیں؟"

کشمیری مجاہد نے جواب دیا۔

"سر! ہر روز شام کے وقت آس پاس کے پہاڑی دیہات میں جو ہندو رہتے ہیں وہ جلوس کی شکل میں ڈھول بجاتے بھجن گاتے مندر میں آتے ہیں اور شیو دیوتا کی پوجا کرنے

کے بعد واپس چلے جاتے ہیں مندر چھوٹا سا ہے مگر سارے علاقے میں بڑا مشہور ہے اس کا ایک مہنت پجاری ہے جو لوگوں سے نذرانے وصول کرتا ہے اور انہیں مٹھائی اور پھول کا شرادھ دیتا ہے۔"

میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"کمانڈر! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میرے ساتھ آؤ"

ہم دونوں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر کیمو فلاج کئے ہوئے کیمپ کے اندر آ گئے۔ ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے کمانڈر۔ فیصلہ کرنے اور اس پر عمل کرنے کا وقت ہے۔ میں نے شیوا مندر کے بھارتی ایمونیشن ڈپو کو اڑانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گھات لگا کر ایک ایک دو دو ٹرک اڑانے سے بہتر ہے کہ اسلحہ بارود کا وہ ذخیرہ ہی اڑا یا جائے جہاں سے یہ اسلحہ اور بارود ٹرکوں میں بھر بھر کر سیاچین میں پاکستانی فوجیوں اور مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندی کے خلاف استعمال کرنے کے لئے سپلائی کیا جاتا ہے۔"

کماندر شیروان بولا۔

"اس کے لئے ہمیں بڑی ہوشیاری سے کوئی پلان بنانا ہو گا۔ کیونکہ اتنے بڑے اسلحہ ڈپو کی حفاظت کے لئے بھارتی فوجی کمانڈ نے سیکورٹی کا زبردست انتظام کیا ہوا ہو گا"

میں نے کہا۔

"اس مشن کے لئے ہمیں ایک مختلف طریقہ کار استعمال کرنا ہو گا۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ پتہ چل جانے کی صورت میں ہم وہاں پر موجود بھارتی کیمپ کے ہر قسم کے اسلحہ سے لیس فوجیوں کا زیادہ دیر تک مقابلہ کر سکیں"

"تو پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

میں نے کہا۔

"ہم بھیس بدل کر وہاں جائیں گے"

"بھیس تو ہم نے اب بھی کشمیری کسانوں کا بدلا ہوا ہے۔ اور کون سا بھیس بدلیں گے؟"

میرے ذہن میں ایک پورا منصوبہ آگیا ہوا تھا۔ مگر میں ابھی یہ منصوبہ کمانڈر شیروان کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! سب سے پہلے تو ہمیں اپنے دو کمانڈو کو بھیج کر مندر کے ایمونیشن ڈمپ کی سیکورٹی کے بارے میں مکمل سروے کروانا ہو گا کہ وہاں دن کے وقت گارڈ کی تعداد کتنی ہوتی ہے۔ رات کے وقت کہاں کہاں گارڈ متعین ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گشتی پارٹی رات کو پٹرولنگ پر نکلتی ہے تو اس کا روٹ کون سا ہوتا ہے۔ ان تمام امور کی ہمارے پاس مکمل رپورٹ ہونی چاہئے اس کے بعد ہی ہم اس مشن پر نکل سکتے ہیں اور اس کے بعد ہی میں تمہیں بتا دوں گا کہ ہمیں وہاں کس بھیس میں جانا ہو گا۔"

کمانڈر شیروان نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس طرح تو دیر لگ جائے گی اور ہو سکتا ہے اس دوران سڑک کی مرمت بھی ہو جائے اور گولہ بارود لے کر ایک کانوائے سری نگر کی طرف روانہ بھی ہو جائے۔ میں نے کہا۔

"ہمارے آدمی کی اطلاع کے مطابق سڑک پر جو پہاڑی تودہ گرا ہے اس کو صاف کرنے میں اور سڑک کو پھر سے ٹریفک کے لئے بحال کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور لگ جائے گا۔ اور دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے جہاں سے فوجی ٹرک اسلحہ لے کر سری نگر جائیں۔ ایک ہفتہ بہت ہے۔ ہمیں اگر کل تک شیوا مندر کے بھارتی کیمپ کی مکمل سروے رپورٹ مل جاتی ہے تو ہم پرسوں اپنا مشن شروع کر دیں گے۔ میرے اندازے کے مطابق ہمیں اپنے مشن کے مکمل کرنے میں ایک دن سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

کمانڈر شیروان مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے دونوں کمانڈو ابھی سروے مشن پر نکل جاتے ہیں۔ یہ کل تک پوری رپورٹ لے آئیں گے۔"

ہمارے دونوں کشمیری کمانڈو جو ہمارے ساتھ آئے تھے اسی وقت سروے مشن پر نکل گئے۔ کمانڈوز کے ایکشن فوری ہوتے ہیں۔ وہاں بحث مباحثے نہیں کئے جاتے۔ حکم ملتا ہے اور اس پر ساتھ ہی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت دونوں کشمیری کمانڈو گئے تھے۔ وہ دوسرے دن صبح صبح ہمارے پاس سیکورٹی کی پوری رپورٹ لے کر واپس بھی آگئے۔ اگر وہ سڑک کے راستے جاتے تو انہیں ٹارگٹ تک پہنچنے اور واپس آنے میں تین دن لگ جاتے۔ لیکن وہ شارٹ کٹ پہاڑی راستوں سے ہو کر گئے تھے اور ایک دن کا راستہ انہوں نے دو گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔

انہوں نے واپس آکر جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق بھارتی کیمپ میں تیس چالیس فوجیوں پر مشتمل صرف ایک کمپنی ہی متعین تھی۔ کیونکہ وہاں سوائے ایمونیشن ڈپو کے اور کوئی دوسری فوجی انسٹالیشن یعنی فوجی تنصیبات نہیں تھیں۔ اس کمپنی کے ذمے صرف ایمونیشن ڈمپ کی سیکورٹی کی حفاظت تھی۔ اور چونکہ یہ علاقہ ان کے اندازے کے مطابق کشمیری حریت پسندوں سے بہت دور تھا اس لئے وہاں فوج کی زیادہ نفری تعینات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رپورٹ کے مطابق ایمونیشن کا ذخیرہ شیوا مندر میں جہاں شو دیوتا اور اس کی پتنی پاروتی کی بڑی مورتیاں تھیں ان کے نیچے ایک بہت بڑے تہہ خانے میں سٹاک کیا ہوا تھا۔ یہ تہہ خانہ پہاڑی کے اندر ایک قدرتی غار کی شکل میں تھا جو تین اطراف سے بند تھا صرف ایک طرف سے غار میں جانے کا راستہ تھا جس کا دروازہ مندر میں رکھی ہوئی شیوا پاروتی کی بڑی مورتیوں کے عقب میں بنی ہوئی ایک دیوار میں واقع تھا۔ اس دروازے پر چار بھارتی فوجی پوری طرح مسلح ہو کر چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ اس طرف پوجا کرنے والے ہندو یاتریوں کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مندر کی جس طرف پتھریلی سیڑھیاں تھیں اس کے بالکل سامنے ایک فوجی بیرک تھی جہاں کمپنی کے جوان رہتے تھے۔ ان کا لنگر خانہ بھی وہیں پر تھا اور ٹرک بھی اسی طرف آکر ٹھہرتے تھے اور وہیں ان میں گولہ بارود وغیرہ لاد کر انہیں سری نگر اور سیاہ چین کے بھارتی مورچوں کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ یہ جگہ سری نگر سے اتنی دور تھی اور اتنی محفوظ تھی

کہ یہاں کسی قسم کا کوئی حادثہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے کشمیری کمانڈو سے پوچھا۔

"جو ہندو یاتری شام کو شیوا مندر میں شولنگ اور شیوا پاروتی کی پوجا کرنے آتے ہیں وہ کہاں آکر ٹھہرتے ہیں؟"

کشمیری کمانڈو نے جواب دیا۔

"انہیں رات کو تو ٹھہرنا نہیں ہوتا۔ شام کے وقت ڈھول ڈمرو بجاتے گاتے ناچتے آتے ہیں۔ مندر میں آکر پوجا پاٹھ کرتے ہیں اور وہیں سے ناچتے گاتے واپس اپنے پہاڑی دیہات کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"مندر کے پجاری کی کوٹھڑی کہاں پر ہے؟"

کشمیری کمانڈر نے کہا۔

"اس کی کوٹھڑی مندر کے صحن کے کونے میں ہی ہے۔"

جب میں نے پوری رپورٹ سن لی تو کمانڈو شیروان اور دونوں کشمیری کمانڈوز کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ منصوبہ ایسا تھا کہ اس کی کامیابی کے کافی امکانات تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے علاوہ وہاں کی صورت حال میں دوسرا کوئی منصوبہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں تھا کہ ہم کمانڈو اٹیک کر کے پوری انڈین کمپنی کا مقابلہ کر سکتے۔ جبکہ ان کے پاس اسلحے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ابھی دن کا پہلا پہر ہی تھا۔ ہم نے اپنے مشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ منصوبے کے مطابق ہم نے مسلمان کشمیری دیہاتیوں والا لباس اتار کر ہندو دیہاتیوں والا لباس یعنی شلوار کی جگہ تنگ موہری والے پاجامے پہن لئے۔ لمبے کرتے تو وہاں ہندو مسلمان دونوں ہی پہنتے تھے۔ ناگ منی کے جنگلی پودے میں ٹماٹروں ایسا پھل لگتا جس کا گودا سرخ ہوتا ہے۔ یہ بڑا پکا رنگ ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے سروں پر مٹی ڈال کر بالوں کو سادھوؤں کے بالوں کی طرح بنایا۔ چہروں پر بھی تھوڑی تھوڑی راکھ مل لی۔ ماتھے پر ناگ منی کے پھل توڑ کر اس کے سرخ رنگ سے لمبے لمبے تلک لگائے۔ جنگلی پھولوں کے ہار بنا کر گلے میں ڈال لئے یوں ہم

نے بالکل ہندو یاتریوں والا خلیہ بنا لیا۔ باقی کشمیری مجاہدوں کو ہم نے اس جگہ رہنے کی ہدایت کی اور ہم چاروں کمانڈو شیو جی پاروتی کے بھگت بن کر یاتریوں کی شکل میں اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ ہمارے پاس کیا کچھ تھا؟ یہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہم چار کمانڈو تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک آٹو میٹک جرمن پستول تھا جس پر سائی لینسر لگے ہوئے تھے۔ ہر پستول میں بیس بیس گولیوں والے لمبے میگزین چڑھے ہوئے تھے۔ ایک ایک کمانڈو چاقو تھا۔ ہمارے ایک کمانڈو ساتھی کے خچر کے ساتھ ایک تھیلا بندھا ہوا جس میں ایک درجن دستی بم۔ چار سٹین گنیں اور ان کے میگزین کی بیلٹس تھیں۔

میرے پاس انتہائی زور دار دھماکے سے پھٹنے اور آگ لگانے والی پلاسٹک ٹیپ تھی جس کی مدد سے میں ترچنا پلی کے انڈین نیوی کے جہاز اور ناگ پور کے فائیو سٹار ہوٹل میں تباہی مچا چکا تھا اور انڈین آرمی کی ایک اسلحہ سے بھری ہوئی ریل گاڑی کو بھی بھک سے اڑا چکا تھا۔ یہ پلاسٹک ٹیپ میں نے خود تیار کی تھی اور اس کے لگانے اور چلانے میں مجھے انتہائی مہارت حاصل تھی۔ ہم چاروں خچروں پر سوار ہو کر صبح کے وقت اپنی قاضی کنڈ کی کمیں گاہ بلکہ عارضی جنگلی کیمپ سے نکلے تھے۔ ہمارا چوتھا کمانڈو ساتھی جس کے پاس دستی بموں اور سٹین گنوں والا تھیلا تھا ہم سب سے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چلا آرہا تھا۔ اس کو ہم نے ہنگامی حالات پیدا ہو جانے کی صورت میں ہمیں حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کے لئے پیچھے رکھا ہوا تھا۔

دوسرا کشمیری کمانڈو آگے آگے تھا اور پہاڑیوں کے شارٹ کٹ راستے پر لے جانے میں ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم نے کئی گھاٹیاں' درے' کھائیاں اور چھوٹی چھوٹی وادیاں عبور کیں۔ ایک جگہ ہماری بائیں جانب تیز رفتاری سے بہتا ہوا دریا بھی آگیا۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور چلتے رہے۔ پھر ایک جانب پہاڑیوں کے درمیان آکر چڑھائی چڑھنے لگے۔ اس طرح مختصر ترین پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے ہم تین گھنٹوں میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے۔ ہمارے گائیڈ کشمیری کمانڈو نے دور سے ہمیں ایک پہاڑی ٹیلے

کی ڈھلان پر ایک چٹان باہر کو نکلی ہوئی دکھائی جس کے اوپر مخروطی مینار والا مندر تھا۔ مندر کا کلس چمک رہا تھا اور زعفرانی رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے کہا۔

"یہی شیو پاروتی کا وہ مندر ہے جس کے نیچے قدرتی پہاڑی تہہ خانے میں ایمونیشن اور فوجی اسلحہ کے انبار پڑے ہوئے ہیں۔"

ہم نے اپنے خچر روک لئے۔ میں نے اور کمانڈر شیروان نے دور بین کی مدد سے شیو پاروتی مندر کو دیکھا۔ اس کے چبوترے پر ہمیں تین سادھو آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے دور بین خچر کے گلے میں لٹکے ہوئے تھیلے میں چھپا دی اور خچروں کو آگے بڑھا دیا۔ یہ فاصلہ بہت قریب لگتا تھا لیکن وہاں تک پہنچنے میں بھی ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔

شیو پاروتی مندر سے کوئی ایک فرلانگ دور ہی ہم خچروں سے اتر پڑے۔ صرف ہمارا چوتھا کشمیری کمانڈو ساتھی خچر پر بیٹھا رہا۔ ہم نے دور بین والا تھیلا بھی اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے پاس دستی بموں اور سٹین گنوں والا تھیلا پہلے سے ہی تھا۔ کمانڈر شیروان نے اسے ہدایت کی۔

"تم مہم سے دور رہ کر ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے ہمیں اپنی نگاہ پر رکھو گے۔ اگر کوئی ہنگامی صورت پیدا ہو گئی تو تم ہمیں فائرنگ سے کور دو گے۔ جب تک کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہ ہو جائے تم ہمارے نزدیک نہیں آؤ گے۔ تم سمجھ گئے ہو گے؟"

"یس سر! سمجھ گیا ہوں۔"

"او کے۔ ہم جاتے ہیں۔ تم اس وقت ہمارے پیچھے آنا جب ہم تمہاری نظروں سے اوجھل ہونے لگیں۔ ہم نے اپنے خچر چھوڑ دیں گے۔ ٹارگٹ پر پہنچ کر تم بھی اپنا خچر چھوڑ دو گے۔"

ہم نے خچر چھوڑ دیئے تھے۔ ان خچروں نے اپنے آپ اپنے مالک کے گاؤں پہنچ جانا تھا۔ ہم تین آگے آگے تھے۔ میں' شیروان اور ہمارا گائیڈ تیسرا کشمیری گوریلا۔ ہم پہاڑی راستوں پر پیدل چل رہے تھے۔ ہم سب شیو پاروتی کے یاتریوں کے حلیے میں تھے۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے بالکل خاموش ہو گئے۔ ہم میں سے ہر کوئی یہی سوچ رہا تھ
اگر ہم رات کو شب خون مارتے ہیں تو ان چار فوجیوں کو کیسے اپنے راستے سے ہٹایا جا
ہے۔ کمانڈر شیروان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پلاسٹک بم کا زیادہ سے زیادہ دورانیہ کتنا ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے کا وقفہ دیا جا سکتا ہے۔"

اور کم سے کم؟" کشمیری کمانڈو نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔

"کم سے کم اتنا ہی وقفہ دیا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی بم لگا کر باہر آسکے اور واردات
جگہ سے محفوظ علاقے تک پہنچ سکے۔"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"اگر ہم ان چاروں سنتریوں کو ہلاک کرتے ہیں تو پلاسٹک بموں کو صبح ہونے
پہلے پھٹ جانا چاہئے۔ اگر ہم انہیں صرف بے ہوش کر کے اندر جاتے ہیں تو دورا
زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ایسا کرنا نہیں چاہئے۔ ہم کر بھی نہیں سکتے کیونکہ ہو
آجانے کے بعد یونٹ کا عملہ ایمونیشن کی چیکنگ ضرور کرے گا۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ان لوگوں کو اتنا ٹائم دینے کی کیا ضرورت ہے ہمیں کسی نہ کسی طرح
خانے کے اندر جا کر پلاسٹک بم چپکانے ہیں۔ اس کے بعد صرف آدھ گھنٹے کا وقفہ د
ہو گا۔ آدھ گھنٹے میں ہم ان پہاڑیوں میں کسی محفوظ مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ ا
میں کوئی شک نہیں کہ اتنا بڑا اسلحہ کا ذخیرہ پھٹنے سے پہاڑوں میں زلزلے آنا شروع
جائیں گے"

کمانڈر شیروان نے گردن موڑ کر نیچے پہاڑی نشیب میں دیکھا اور پھر میری طرف
کر کے آہستہ سے بولا۔

"ان سنتریوں تک پہنچنے کے لئے اس مندر سے ہی نیچے اترنا ہو گا۔ دوسرا کوئی راستہ
ھے نظر نہیں آتا"

کشمیری کمانڈو گائیڈ نے آہستہ سے کہا۔

"سر! دوسری طرف سے ایک پہاڑی پگ ڈنڈی دروازے تک آتی ہے۔ یہ پگ
ڈی کافی چوڑی ہے۔ پیچھے سڑک ہے ٹرک اس سڑک پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فوجی
ان اسلحہ اور گولہ بارود کے کریٹ سروں پر اٹھا کر ٹرکوں سے لاتے اور لے جاتے
ں۔"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

یا خیال ہے۔ ہمیں آج رات اٹیک کر دینا چاہئے"

ں اور کشمیری کمانڈو گائیڈ کنکھیوں سے تہہ خانے کے دروازے پر اٹن شن کھڑے بھارتی
تریوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے کشمیری کمانڈو سے پوچھا۔

ہاری کیا رائے ہے؟"

نے کہا۔

"سر! ہم جب بھی اٹیک کریں گے یہاں چار سنتری اسی طرح کھڑے ہوں گے۔ بہتر
کل کی بجائے آج رات ہی حملہ کر دینا چاہئے۔"

میں نے کمانڈر شیروان کا ہاتھ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔

"اوکے کمانڈر! ہم آج رات اٹیک کریں گے۔ ٹائم رات کے دو بجے کے بعد کا
۔"

دو بجے کے بعد کا وقت ہم کمانڈو لوگ حملے کے لئے اس لئے رکھا کرتے تھے کہ
ن کی فطرت ہے کہ خواہ وہ کیسی ہی سخت ڈیوٹی پر کیوں نہ ہو اس وقت اس پر قدرتی
ر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ جاگنے اور سونے کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ کمانڈر
ان بولا۔

"ٹھیک ہے ہمیں اپنے ریزرو ساتھی کو خبر کر دینی چاہئے"

میں نے کہا۔

"یہ کام میں کرتا ہوں۔ دوسرے میں پیچھے سے جا کر وہ جگہ بھی دیکھ آؤں گا جہاں سے ہمیں پہاڑی پگ ڈنڈی پر سے ہو کر تہہ خانے کے دروازے تک آنا ہو گا"

کمانڈر شیروان بولا۔

"تم پگ ڈنڈی کی جانب سے آؤ گے"

پھر کشمیری کمانڈو گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اور تم پہاڑ کی ڈھلان کی طرف سے اوپر آؤ گے میں اس مندر کی دیوار والی سیڑھیوں سے ٹارگٹ تک پہنچوں گا۔ میں اس طرف والے دو فوجیوں کو اپنے نشانے کی زد میں لے کر دو فائر کروں گا۔ تم دوسری طرف سے آ کر دوسرے دو فوجیوں کو ختم کر دو گے۔"

پھر اس نے کشمیری کمانڈو گائیڈ سے کہا۔

"تم آدھا گھنٹہ پہلے نیچے ڈھلان کی جھاڑیوں اور پتھروں میں آ کر چھپ کر بیٹھ جاؤ گے۔ اگر ہم میں سے کسی کا نشانہ خطا ہو جائے گا تو اسے تم فائر کر کے ہلاک کر دو گے۔ ریزرو کمانڈو کچھ فاصلے پر ٹیلے کے درختوں میں چھپ کر بیٹھا ہو گا۔ اگر صورت حال بگڑ جاتی ہے تو وہ مشین گن کی اندھا دھند فائرنگ کر کے ہمیں فرار ہونے کا موقع مہیا کرے گا۔ کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے سائی لینسر والے پستولوں کی آواز نیچے بارک میں کسی فوجی جوان کو جگا دے۔ یا کوئی فوجی پہلے سے جاگ رہا ہو اور وہ اسے سن لے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے دو سنتریوں کے گرنے کے ساتھ ہی دوسرے فوجی خطرے بھانپ کر فائرنگ شروع کر دیں اور فائرنگ کی آواز سے بارک کے سارے فوجی بیدار ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں ٹھیک ٹھیک نشانوں پر پستول کے فائر کرنے ہوں گے۔ یہ ہمارے تربیت اور تجربے کا امتحان ہے۔ ہمیں اسی دن کے لئے تربیت دی گئی ہے۔ ہمارا ن

ی حالت میں بھی خطا نہیں جانا چاہئے اور چاروں بھارتی سنتریوں کو ایک ساتھ گرانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے مر کر گرنے میں دو سیکنڈ کا وقفہ پڑ سکتا ہے۔ اس سے ہ وقفہ پڑ گیا تو نہ صرف یہ کہ ہمارا مشن ناکام ہو جائے گا بلکہ ہم بھی گھیرے میں ئیں گے۔"

کمانڈر شیروان نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"دوست! یہ دونوں کام ہم دونوں نے کرنے ہیں اور ہم دونوں تجربہ کار تربیت یافتہ نشانے باز ہیں۔ ہمارے پستول سے نکلی ہوئی گولی ٹھیک نشانے پر جا کر لگے گی۔ ہمارے ں سے گولی نکلتی ہی نشانے پر لگنے کے لئے ہے"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو" میں نے کہا

"اء اللہ ایسا ہی ہو گا"

ری کمانڈو گائیڈ کہنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں اگر خدا نہ کرے آپ میں سے کسی کا نشانہ سنتری کے عین وقت ھر ادھر ہل جانے سے خطا ہو گیا تو اسے میں اپنے فائر کی زد میں لے لوں گا۔ اول تو ن سنتری چوکیداروں کی طرح ادھر ادھر چل پھر کر پہرہ نہیں دیتے۔ وہ ایک جگہ پر ن کر اٹن شن کھڑے ہوتے ہیں اور یہ بڑا آسان نشانہ ہوتا ہے۔"

اتنے میں شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ اس دوران نیچے سے اردگرد کے گاؤں کے ں کے بھجن کرتن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"دوسرے یاتری آ رہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے ریزرو کمانڈو ساتھی کے پاس جا کر اپنا سارا پلان بتا دو۔ ہم اسی جگہ بیٹھے ہیں"

میں اٹھا اور جھوم جھوم کر گاتے ہوئے مندر سے باہر نکل گیا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ علوم تھا کہ اپنا چوتھا ریزرو کمانڈو ساتھی بائیں جانب ٹیلے کی ایک جانب کسی جگہ کر بیٹھا ہو گا۔ میں اسی طرف آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ یہاں اندھیرا تھا پتھر اور جھاڑیاں رخت تھے ایک جگہ سے ہمارا ساتھی کمانڈو اچانک نکل کر میرے سامنے آ گیا۔

"سر! کیا بات ہے؟"
اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ میں نے اسے وہیں ایک طرف اندھیرے میں بٹھا لیا اور اسے سارا پلان بتانے کے بعد کہا۔

"آج رات دو بج کر پانچ منٹ پر ہمارا کمانڈو آپریشن شروع ہو جائے گا۔ اپنی گھڑی میری گھڑی سے ملا لو۔"

ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیا۔ میں نے اسے سارا حدود اربعہ بتا دیا اور کہا کہ جب ہم سنتریوں کو ہلاک کرنے کے بعد تہہ خانے میں جائیں گے تو وہ ایسی جگہ پر سٹین گن لے کر گھات میں بیٹھ جائے گا جہاں سے دروازہ اس کے بالکل سامنے ہو گا۔

"ہمیں تہہ خانے کے اندر زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگیں گے۔ ہمیں صرف وہاں حساس جگہوں پر پلاسٹک کی ٹیپیں ہی لگانی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے سر ہم پوری طرح سے الرٹ رہے گا"

میں نے اسے بتایا کہ آپریشن کے فوراً بعد ہم لوگ نیچے پرانی بارہ دری کے پاس ملیں گے۔ وہاں سے ہم کسی دوسری جگہ جائیں گے۔ اس کے بعد میں واپس مندر میں آ گیا جہاں گاؤں کے یاتریوں نے شور مچا رکھا تھا۔ خوب ڈمرو بجا کر رقص کر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان اور کشمیری گائیڈ کمانڈو ایک طرف صحن میں بیٹھے تھے۔ ہم سب یاتریوں کے بھیس میں تھے کوئی ہمیں دیکھ کر بالکل نہیں پہچان سکتا تھا کہ ہم کتنے خطرناک کمانڈو ہیں اور وہاں کس قدر خطرناک مشن پر آئے ہوئے ہیں۔

یاتریوں کا ہنگامہ وہاں رات دس بجے تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ ہم بھی مندر سے نکل کر پہاڑی کی دوسری جانب ایک جگہ درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم اپنے ساتھ چنے اور گڑ لائے تھے۔ ہم تینوں نے چنے اور گڑ کھائے مندر کے نل پر جا کر باری باری پانی پیا اور واپس اسی جگہ پر آ کر چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے بھی اپنی گھڑیاں ملا لی تھیں۔ ہماری تینوں گھڑیوں پر وقت ایک ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ گیارہ بج گئے۔ پھر بارہ بج گئے۔ پھر رات کا

بج گیا۔ ہمیں جنگل میں چھپ کر مشکل سے مشکل حالات میں وقت گذارنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ ہمیں نہ کوئی دقت محسوس ہو رہی تھی نہ نیند آ رہی تھی۔ انڈو کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جہاں اسے جاگنا ہوتا ہے وہاں وہ جاگتا ہے وہاں ں کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ جہاں اسے سونا ہوتا ہے وہ لکڑی کے شہتیر کی طرح ہے اور سو جاتا ہے۔ پھر اسے دین دنیا کی کوئی خبر نہیں ہوتی اور ایک گھنٹہ سو کر بارہ ں کے جگراتے کی نیند پوری کر لیتا ہے۔ اس وقت پاکستان کے نوجوانوں کو ایسے ہی بننے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے دشمن بہت ہیں۔ دوست کم ہیں۔ اسے شمنوں سے ہوشیار رہ کر اپنے وطن پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔

جب رات کے ٹھیک دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تو ہم اپنی اپنی گھڑیوں کی چمکتی ہوئی کو دیکھ رہے تھے۔ جب سوئی نے پانچ منٹ ظاہر کئے تو ہم اللہ کا نام لے کر اٹھ ہوئے۔ اپنے اپنے پستول ہم نے پندرہ منٹ پہلے ہی چیک کر لئے تھے۔ ہم تینوں دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ خدا کو یاد کیا۔ کلمہ شریف پڑھا میں نے آہستہ سے کہا۔

"دوستو! ہم اسلام کی حرمت کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے مشن پر جا ں۔ زندہ رہے تو پرانی بارہ دری میں ملاقات ہو گی۔ مر گئے تو اگلے جہان میں ملیں

ا کرو کہ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو اپنے ٹارگٹ کو مار کر شہید ہوں۔ اللہ بیلی!"

ات کے اندھیرے میں ہم تینوں اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف نکل گئے۔ کمانڈر کو مندر کی جانب سے پہاڑی ڈھلان پر نیچے اتر کر اپنے ٹارگٹ کے دو بھارتی کو فائر کر کے مارنا تھا۔ مجھے پگ ڈنڈی کی طرف سے آ کر دوسرے دو سنتریوں کو تا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی پوزیشنوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کوئل کی آواز ائر کرنے کا وقت مقرر کرنا تھا۔ کوئل کی آواز کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان نے اپنی کے دو سنتریوں کو مار گرانا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی طرف کے دو سنتریوں کرنے تھے۔ ہم لوگ اندھیرے میں بھی نشانے پر فائر جھونکنے میں ماہر تھے۔ ہمیں

اندھیری راتوں میں اپنے ٹارگٹ پر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے کی سخت تربیت دی گئی تھی۔
میں اپنی پوزیشن پر جا کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ذرا نیچے تہہ خانے کے دروازے والی ذرا باہر کو نکلی ہوئی چٹان کا چبوترہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں چاروں سنتری دو ایک جانب اور دو دروازے کی دوسری جانب اٹن شن کھڑے تھے۔ ان کی سٹین گنیں ان کے ہاتھوں میں تھیں مجھے یقین تھا کہ کمانڈر شیروان ہی اور ہمارا کشمیری گائیڈ کمانڈر بھی اپنی اپنی پوزیشنوں پر موجود ہوں گے۔ میں نے الٹی گنتی شروع کر دی۔ دس سے نو آٹھ اور پیچھے کی طرف گنتی کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے اپنی طرف کے دونوں سنتریوں کو نشانہ میں لینے کی مشق کر لی تھی۔

ٹھیک جب الٹی گنتی کرتے کرتے میں نے اپنے منہ سے کوئل کی ایسی آواز نکالی جیسے بڑی دور کسی درخت پر کوئل بولی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اللہ کا نام لے کر اپنی طرف کے دونوں اٹن شن کھڑے بھارتی سنتریوں میں سے پہلے ایک کو پستول کی زد میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دوسرے سنتری پر فائر کر دیا۔ مجھے اپنے پستول کے بند فائر کی آواز کے ساتھ دو اور فائروں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف کے دونوں سنتری بھی ایک پیچھے کو اور دوسرا منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ یہ دونوں فائر کمانڈر شیروان نے کئے تھے جو ٹھیک ٹارگٹ پر جا کر لگے تھے۔

جیسے ہی چاروں سنتری گرے ہم جھاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ سے نکل کر نیچے چبوترے پر آ گئے۔ ہم نے سب سے پہلے گرے ہوئے بھارتی سنتریوں کو چیک کیا۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ انہیں گولیاں کہاں لگی تھیں مگر ان کی نبضیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ مر چکے تھے۔

ہم نے انہیں گھسیٹ کر اندھیرے میں ایک طرف ڈال دیا اور دروازے کو دیکھا۔ دروازہ لوہے کا تھا اور تالا لگا ہوا تھا۔ کمانڈر شیروان نے قمیض کے اندر سے لوہے کا چھوٹا راڈ نکالا۔ اسے تالے کے کنڈے میں ڈال کر اپنی طرف کو جھٹکا دیا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ پتھر کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ نیچے ایک کافی بڑا قدرتی غار تھا جہاں ہر

قسم کا فوجی اسلحہ گولہ بارود اور مارٹر گنوں کے گولے اور مارٹر گنیں، گرنیڈوں کے کریٹ اور راکٹ اور راکٹ لانچر بھاری تعداد میں تھے' اتنا اسلحہ اور گولے بارود کا ذخیرہ میں نے بھارت کی کسی چھاؤنی کے ایمونیشن ڈمپ میں نہیں دیکھا تھا۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

میں نے جیب سے سیاہ رنگ کی پلاسٹک کی ٹیپ نکالی جو چوڑی سکاچ ٹیپ کی طرح رنگ کی شکل کی تھی۔ اس ٹیپ کے ساتھ انتہائی دھماکہ خیز مواد چمٹا ہوا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو۔ میں ٹیپ لگا کر آتا ہوں"

شیروان کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں مدھم روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں نے خاص خاص مقامات پر دھماکہ خیز پلاسٹک کی ٹیپ چپکائی اور کمانڈر شیروان کے پاس تیزی سے آ کر کہا

"نکل چلو۔ کام ہو گیا ہے۔"

ہم نے دروازے کو آہستہ سے بند کیا اور اندھیرے میں جھک کر چلتے ہوئے اوپر ٹرک کی طرف جانے کی بجائے نیچے پہاڑی کے نشیب میں اترنے لگے۔ ڈھلان اترنے کے بعد ہمارا ریزرو کمانڈو بھی آ گیا کہنے لگا۔

"کیا کام ہو گیا؟"

"ہاں ہمارے پیچھے پیچھے ہمیں کور کر کے چلے آؤ"

ہم جتنی جلدی اترائی اتر سکتے تھے اترتے چلے گئے۔ ٹیلے کی ڈھلان ختم ہو گئی۔ کمانڈر شیروان نے مجھ سے پوچھا۔

"پلاسٹک بموں کا کتنا ٹائم رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔

"صرف آدھا گھنٹہ"

"میرے خدا! یہ تو بہت تھوڑا وقت ہے" کمانڈر شیروان بولا

میں نے کہا۔

"میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا یہ میری مجبوری تھی"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"بیس منٹ ابھی ہیں۔ اس دوران میں ہم کافی دور نکل جائیں گے۔"

ہم تینوں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ہم پہاڑی کی اترائی اتر چکے تھے۔ پھر ایک درے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چٹانوں کے درمیان بڑا تنگ اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا راستہ تھا۔ اندھیرے میں ہم جھاڑیاں ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک ٹیلے کا موڑ گھومے تو آگے چھوٹی سی وادی آ گئی جہاں ستاروں کی روشنی میں سفیدے کے چھریرے چھریرے اوپر کو اٹھے ہوئے درختوں کی قطار نظر آئی۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہمیں یہاں رک کر ٹارگٹ کے اڑنے کا انتظار کرنا چاہیئے"

ہم تینوں ایک جگہ زمین پر بیٹھ گئے۔ میرے حساب سے پلاسٹک بموں کو پھٹ کر اسلحہ کے سارے ذخیروں کو تباہ کرنے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ کمانڈر شیروان اور میں اندھیری رات میں بائیں جانب دوسری پہاڑی کے اوپر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

اچانک ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی زمین ہلنا شروع ہو گئی۔ ہم تینوں کمانڈو زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ ہم نے سر اٹھائے ہوئے تھے اور اندھیرے میں اندازے سے شیو پاروتی مندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس طرف بلا کا چمک پیدا ہوئی کہ ہماری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پھر ایک کڑاکا ہوا اور مندر کی جانب جیسے پہاڑ پھٹ گیا اور اس میں سے شعلے نکل کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ اب ایک قیامت آ گئی تھی۔ اتنے زور دار دھماکے ہو رہے تھے جیسے پہاڑیاں اور ٹیلے پھٹ رہے ہوں۔ راکٹ شوکریں مارتے اوپر کو فائر ہو رہے تھے۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ آگ کے شعلوں کا رنگ کبھی سرخ کبھی نیلا اور کبھی سفید ہو رہا تھا۔ زمین ہل رہی تھی۔ زمین کے اندر گڑگڑاہٹ کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ جس ٹیلے کے نیچے گولہ بارود کا ذخیرہ تھا وہ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ شیو پاروتی کا

مندر بھی ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

کمانڈر شیروان نے بے اختیار نعرہ لگایا

"اللہ اکبر! یا علی"

اس کے جواب میں ہم نے بھی بے اختیار نعرہ لگایا

"اللہ اکبر! یا علی"

آسمان پر آتش بازی کا منظر تھا۔ نیلے سرخ سفید شعلوں نے سارے علاقے کو دن کی طرح روشن کر دیا تھا۔ کمانڈر شیروان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے نکل چلنا چاہیئے"

اس دوران ہمارا چوتھا ریزرو کمانڈو بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ ہم اٹھے اور پہاڑی کی اترائی اترنے لگے۔ ہم تیز تیز اتر رہے تھے اور جھاڑیوں پتھروں کو پھلانگتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ شارٹ کٹ راستہ تھا۔ آدھے گھنٹہ میں ہم پہاڑی کی دوسری جانب ایک سڑک پر نکل آئے۔ آسمان شعلوں سے اسی طرح روشن تھا۔ دھماکوں کی آوازوں سے اردگرد کی پہاڑیوں میں ایسی گونج پیدا ہو رہی تھی جیسے سارے علاقے کی پہاڑیاں آتش فشاں بن کر پھٹ رہی ہوں۔ اب دور سے مشین گن فائر کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ بھارتی کیمپ کے فوجی شاید اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ یہ سڑک وہی تھی جس پر سے بھارتی فوجی کانوائے ایمونیشن کی سپلائی لے کر سری نگر جایا کرتے تھے۔ سڑک آگے جا کر نیچے اترائی میں اتر گئی تھی۔

نیچے وادی شروع ہو جاتی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ کسی کسی وقت ایمونیشن کے پھٹتے گولوں کی وجہ سے آسمان پر چمک پیدا ہو جاتی تھی جس سے وادی ایک لمحے کے لئے روشن ہو کر ہمیں راستہ دکھا دیتی تھی۔

سری نگر کی وادی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم دو کمانڈو سڑک کی ایک جانب اور دو کمانڈو سڑک کی دوسری جانب چل رہے تھے۔ ہمارا ریزرو کشمیری کمانڈو جس کے

پاس سٹین گنیں اور دستی بم تھے وہ ہم سے تھوڑا ہٹ کر اس طرح چل رہا تھا کہ سڑک پر کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خطرناک صورت پیدا ہو جانے کی صورت میں ہماری حفاظت کے لئے ہم سے فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ اچانک سامنے سڑک کے موڑ پر کسی ٹرک کی آواز آئی۔ پھر اس کی بتیاں نظر پڑیں۔ ہم جلدی سے سڑک کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ ایک فوجی ٹرک تھا جو پوری رفتار سے چلا آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور ٹرک آرہا تھا۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے دیکھ رہے تھے۔ پورے چار فوجی ٹرک تھے جن میں فوجی مشین گنیں لگائے کھڑے تھے۔ ٹرک بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔ یہ اس طرف جا رہے تھے جدھر سے دھماکوں کی آوازیں اور شعلوں کی چمک ابھی تک آسمان پر بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔

جب فوجی ٹرک گزر گئے تو ہم سڑک کو چھوڑ کر نیچے گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں سے ہماری خفیہ پناہ گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ جب ہم پناہ گاہ میں پہنچے تو ہمارے مجاہد حریت پسند ساتھی جاگ رہے تھے۔ وہ دھماکوں کی ہلکی ہلکی گونج سن رہے تھے اور آسمان پر چمکتی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جاتے ہی نعرہ لگایا۔

"اللہ اکبر یا علی!"

پناہ گاہ نعروں کی آواز سے گونج اٹھی۔

کمانڈر شیروان نے ہم سب کو کامیابی سے مشن مکمل ہو جانے پر مبارک باد دی اور کہا

"اللہ کی مدد ہمارے ساتھ تھی۔ ورنہ یہ ٹارگٹ اتنا آسان نہیں تھا۔ اب کم از کم ایک مہینے تک یہاں بھارتی فوج کو ایمونیشن کی تازہ سپلائی نہیں مل سکے گی اور یہی ہمارا مشن تھا"

میں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ بھارتی فوج اس تباہی کا بدلہ سری نگر کے دیہات میں کشمیری مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا کر اور معصوم کشمیریوں کو شہید کر کے لے گی

کمانڈر شیروان بولا۔

"ہمیں اس کے مقابلے کے لئے بھی تیار رہنا ہو گا ابھی تم سب لوگ سو جاؤ۔ صبح دیکھیں گے انڈین آرمی کیا کرتی ہے اور ہمیں اس کے جواب میں کیا کارروائی کرنی ہوگی"

ہم تینوں کمانڈو وہیں زمین پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ دن کافی نکل آیا تھا جب کمانڈر شیروان نے اپنے غار سے نکل کر ہمیں جگا دیا۔ اس کے ساتھ ایک کشمیری کمانڈو بھی تھا جس نے سٹین گن اٹھا رکھی تھی۔

کمانڈر شیروان میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انڈین آرمی کی ایک یونٹ کے فوجی وادی کے دیہات میں مکانوں کو مارٹر گنوں کے فائر سے تباہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہئے۔"

کمانڈر شیروان بولا۔

"ہمارے ساتھی نیچے سڑک پر جیپ میں تیار بیٹھے ہیں۔ تم بھی نیچے آجاؤ۔"

میں اسی طرح اٹھا۔ کونے میں رکھی ہوئی سٹین گن اٹھائی اور اللہ پاک کے نام کا ورد کرتا پناہ گاہ سے نکل کر گھاٹی اتر کر نیچے کچی پہاڑی سڑک پر آگیا۔ یہاں ایک سویلین جیپ کھڑی تھی۔ اس میں ہمارے پانچ مجاہد عام کشمیری شہریوں کے لباس میں اپنی لمبی قمیضوں کے اندر سٹین گنیں چھپائے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان بھی دوسری طرف سے آگیا۔ میں اور کمانڈر شیروان بھی عام کشمیری شہریوں کے لباس میں تھے۔ کمانڈر شیروان جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر اور میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنا اپنا اسلحہ لمبے کشمیری کرتوں کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ لباس سے ہم جنگلاتی لکڑی کا کاروبار کرنے والے ٹھیکیدار لگ رہے تھے۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ سٹارٹ ہوئی اور تیزی سے پہاڑی سڑک پر نیچے کی طرف جانے لگی پہاڑ کے کچھ موڑ کاٹنے کے بعد ہم ایک وادی میں آگئے دور درختوں میں ساتھ ساتھ دو تین گاؤں نظر آئے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا

تھا۔ فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک دور سے دھماکے کی گونج سنائی دی۔ یہ مارٹر توپ کے گولے کا دھماکہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک جگہ سے دھواں اوپر کو اٹھا اور لوگوں کے شور کی آوازیں آئیں۔ کمانڈر شیروان نے اس طرف جیپ ڈال دی۔

میں نے کہا۔

"وہاں فوج کی نفری زیادہ ہو گی۔ ہمیں گھات لگانی چاہئے۔"

"کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تم دیکھتے جاؤ"

جیپ اونچے اونچے سفیدے کے درختوں کے پاس پہنچی تو وہاں ایک طرف تین فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے جیپ ایک چٹان کے پیچھے لا کر کھڑی کر دی۔ ہم چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ کمانڈر شیروان نے دور بین لگا کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ پھر دور بین مجھے دے دی اور کہا۔

"گاؤں کا ایک مکان بھی نہیں بچا"

میں نے دیکھا کہ گاؤں کے تقریباً سارے مکان جو لکڑی کے تھے ڈھے چکے تھے اور کچھ مکانوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دو فوجی ایک طرف سٹین گنیں لئے پوزیشنوں میں کھڑے تھے اور وقفے وقفے سے برسٹ فائر کر رہے تھے۔ ہمارے ایک کمانڈو نے کہا۔

"سر! یہ لوگ ٹیلے والی سڑک سے واپس کیمپ میں جائیں گے۔ ہمیں وہاں سڑک پر پوزیشنیں سنبھال کر ان کا انتظار کرنا چاہئے تاکہ ان میں سے ایک بھی بھارتی فوجی زندہ واپس نہ جانے پائے۔"

یہ سنتے ہی کمانڈر شیروان اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو اوپر والی پہاڑی سڑک پر"

ہم سب لوگ یعنی چاروں کمانڈو اور چار حریت پسند مجاہد جیپ میں بیٹھے اور جیپ پہاڑی راستے پر تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگی۔ کوئی دس منٹ بعد ہم چڑھائی چڑھ کر پہاڑی ٹیلے پر ایک جگہ جیپ روک کر اتر پڑے۔ جیپ کو سڑک سے ہٹا کر درختوں

اور جھاڑیوں میں چھپایا۔ مجاہدوں نے دستی بم رائفلیں اور سٹین گنیں اٹھالیں۔ ہم نے کمانڈوز نے بھی چھ چھ دستی بم اور سٹین گنیں لیں اور سڑک کے اوپر پہاڑی ڈھلان پر جھاڑیوں کے پیچھے مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ سڑک کی ایک جانب پہاڑ کی ڈھلان تھی۔ دوسری جانب گہری گھاٹی تھی۔ ہم بھارتی گاڑیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے دوربین سے گاؤں کے باہر دو فوجی ٹرک دیکھے تھے جو اوپر سے کھلے تھے اور ان میں ایک ایک فوجی مشین گن لگائے کھڑا تھا۔ میں نے اپنے مجاہدوں کو ہدایت کر دی تھی کہ جیسے ہی بھارتی فوجی ٹرک سڑک پر ہماری رینج میں آئیں ان پر دستی بموں کی بارش کر دینی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سٹین گنوں اور رائفلوں کا فائر کھول دینا ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گذرتا معلوم ہو رہا تھا۔

ہم بکھر بکھر کر ڈھلان کے پتھروں کے پیچھے پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔ آخر ہمیں دور سے ٹرکوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے منہ سے کوئل کی آواز نکال کر سب کو الرٹ کر دیا۔ پھر پہاڑی موڑ پر ایک بھارتی فوجی ٹرک نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دوسرا ٹرک تھا۔ دونوں ٹرک اوپر سے کھلے تھے۔ دونوں ٹرکوں میں بھارتی فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ آگے کی جانب ایک ایک فوجی مشین گن لگائے کھڑا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم پوری طرح سے الرٹ ہو گئے چڑھائی پر آکر فوجی ٹرکوں کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ دونوں ٹرکوں کے درمیان پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگلا ٹرک جیسے ہی ہماری رینج میں آیا میں نے اور کمانڈر شیروان نے یکے بعد دیگرے تین تین دستی بم پن نکال کر ٹرک پر پھینکے۔ چھ میں سے پانچ دستی بم اگلے ٹرک میں گرے اور گرتے ہی زبردست دھماکے ہوئے۔ میں نے ایک بھارتی فوجی کو اچھل کر ٹرک سے باہر گرتے دیکھا۔ اس دوران دوسرے مجاہدوں نے دوسرے ٹرک پر دستی بموں کی بارش کر دی اور ساتھ ہی رائفلوں اور سٹین گنوں کا فائر کھول دیا۔ دونوں ٹرکوں میں افراتفری مچ گئی۔ ایک ٹرک میں آگ لگ گئی۔ بھارتی فوجیوں میں سے تین فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودتے دیکھے گئے۔ ان سب کی نفری دس گیارہ تھی۔ ان میں دو آفیسر بھی تھے۔ انہوں نے بھی سڑک

پر پوزیشن لے لی اور پہاڑی ڈھلان پر جہاں ہم گھات لگائے ہوئے تھے مشین گن کے برسٹ فائر کرنے لگے۔

مگر وہ پہاڑی کے نشیب میں تھے۔ ہم اوپر پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے فائرنگ جاری رکھی۔ دستی بم بھی پھینکتے رہے اتنے تیز فائر اور دستی بموں کی بارش نے بھارتی فوجیوں کو دوسری طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ سب مارے گئے تھے۔ صرف تین فوجی زندہ تھے جو سڑک کی گھاٹی کی طرف اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ ان کی نالائقی تھی۔ انہیں بھاگنا ہی تھا تو سڑک پر پیچھے کی جانب بھاگنا چاہئے تھا۔ اس طرح وہ بہت جلد ہماری رینج سے باہر ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ گھاٹی میں اترنے لگے۔ انہیں گھاٹی میں اترتا دیکھ کر کمانڈر شیروان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور ہم سب گھات میں سے نکل کر نعرے لگاتے ڈھلان سے اتر کر سڑک پر آگئے اور دائیں بائیں سٹین گنوں کی بوچھاڑیں مارتے سڑک کے کنارے آگئے۔ تینوں بھارتی فوجی نیچے گھاٹی میں جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اترائی سیدھی تھی۔ ہم نے اوپر سے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ دیکھتے دیکھتے تینوں بھارتی فوجی ہماری گولیاں کھا کر وہیں الٹ گئے اور پھر بے جان پتھروں کی طرح نیچے گہری کھائی میں لڑھکتے چلے گئے۔

ایک ٹرک پہلے سے جل رہا تھا۔ دوسرے ٹرک کو آگ نہیں لگی تھی لیکن اس کی باڈی کا پچھلا حصہ اڑ گیا تھا۔ ہم نے اس ٹرک میں لگی ہوئی مشین گن اور چار رائفلیں اپنے قبضے میں کیں اور اس ٹرک کو بھی آگ لگا دی۔ وہاں سے ہم جیپ میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوئے۔ وادی میں آکر کمانڈر شیروان جیپ سے اتر گیا۔ اس نے مجھے بھی اتار لیا اور باقی مجاہدوں سے کہا۔

"تم لوگ اپنے اڈے پر جاؤ۔ ہم گاؤں پر جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے کتنے بھائی شہید ہوئے ہیں"

مجاہد جیپ لے کر خفیہ پناہ گاہ کی طرف اور ہم پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑے۔ گاؤں وہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ پر تھا۔ گاؤں میں کہرام مچا تھا۔ بھارتی فوجیوں نے

مارٹر فائر سے سارے مکان مسمار ہو گئے تھے لکڑی کے مکان تھے۔ کئی ایک میں ابھی تک آگ لگی ہوئی تھی اور دیہاتی کشمیری آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہم عام کشمیری شہریوں کے لباس میں تھے۔ ایک طرف دو بوڑھی عورتیں زمین پر بیٹھی روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔ ایک بوڑھا روتے ہوئے انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا ہم ان عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

کمانڈر شیروان کشمیری زبان میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ عورتیں اور بوڑھا کشمیری اسے اپنی زبان میں کچھ بتا رہا تھا۔ میں کشمیری زبان روانی سے بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن سمجھ لیتا تھا۔

کشمیری عورتوں اور بوڑھے نے کمانڈو شیروان کو بتایا کہ بھارتی فوجی ان کی جوان بیٹی جمیلہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان کے جوان بیٹے کو شہید کر دیا ہے گاؤں کے پندرہ آدمی شہید کر دیئے گئے تھے جن میں چار بچے اور دو عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کی لاشیں گاؤں کی مسجد کے صحن میں پڑی تھیں۔ بوڑھے کشمیری نے بتایا کہ تین فوجی تھے جن میں ایک کیپٹن فوجی تھا۔ وہ ڈوگرہ تھا۔ انہوں نے ان کے جوان بیٹے کو گولی مار کر شہید کر دیا اور جمیلہ کو سب کے سامنے گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ڈالا اور اغوا کر کے لے گئے۔ ان کی بیٹی روتی رہی، چیختی رہی۔ مگر وہاں ان کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ گاؤں کے سب جوان شہید کر دیئے گئے تھے۔

کمانڈر شیروان نے پوچھا کہ وہ تینوں فوجی کس طرف گئے تھے۔ کیونکہ جن دو بھارتی فوجی ٹرکوں کو ہم نے تباہ کیا تھا ان کے ساتھ کوئی جیپ نہیں تھی۔ بوڑھے کشمیری نے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"اس طرف گئی تھی جیپ ادھر کوئی بھارتی فوجی چھاؤنی ہو گی۔ ہائے یا اللہ ہم کیا کریں کس کے پاس فریاد لے کر جائیں؟"

کمانڈر شیروان نے بوڑھے کشمیری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بابا! تمہاری بیٹی ہماری بیٹی ہے۔ کشمیر کی بیٹی ہے۔ ہم جمیلہ کو بھارتی درندوں سے چھڑا کر،

لائیں گے اور ان تینوں بھارتی فوجیوں کے سر بھی کاٹ کر ساتھ لائیں گے جنہوں نے ہماری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

یہ کہہ کر کمانڈر شیروان اٹھ کر مجھے ایک طرف لے گیا۔ کمانڈر نے بوڑھے کشمیری سے بہت بڑا وعدہ کر لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کمانڈر شیروان ایک سچا کشمیری مسلمان مجاہد ہے۔ وہ جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔ شیروان نے مجھ سے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ جمیلہ بیٹی کو ڈوگرہ فوجی گلمرگ روڈ کی طرف لے گئے ہیں۔ وہاں ایک بھارتی فوجی کیمپ ہے۔ پہاڑی نالے کے کنارے کچھ فوجیوں کی بارکیں اور کچھ فوجی افسروں کے لئے فلیٹ بھی بنائے گئے ہیں۔ ہم جمیلہ کو وہاں سے نکال کر لائیں گے"

میں نے کہا۔

"پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ فوجی کس رجمنٹ کے تھے۔ اور ان کا حلیہ کیا تھا؟"

شیروان بولا۔

"بوڑھے نے مجھے بتایا ہے کہ ان میں ایک کیپٹن تھا۔ وہ ڈوگری زبان بولتا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر سورج گرہن کا نشان تھا یہ نشانیاں کافی ہیں۔ باقی ہم خود معلوم کر لیں گے۔ ہمیں ابھی گلمرگ فوجی چھاؤنی کی طرف چلنا ہو گا۔"

وہاں سے ہم واپس اپنی خفیہ پناہ گاہ میں آگئے۔ اپنے ساتھیوں کو اپنے نئے مشن کے بارے میں بتایا۔ تمام مجاہد ہمارے ساتھ چلنے کے لئے بے چین تھے۔ مگر یہ بڑا نازک مشن تھا۔ اس مشن پر ہم جلوس بنا کر نہیں جا سکتے تھے۔ یہاں ہمیں جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینا تھا۔ کمانڈر شیروان نے ساتھی مجاہدوں سے کہا۔

"ہمیں صرف ایک اور ساتھی کمانڈو کی ضرورت ہوگی اور کمانڈو ہاشم! تم ہمارے ساتھ چلو گے۔"

یہ وہی کشمیری مجاہد کمانڈو تھا جو شیو پاروتی مندر والے ایمونیشن ذخیرے کے مشن

ہیں حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کی خاطر ہمارے ساتھ گیا تھا۔ یہ بھی دوسرے کشمیری مجاہدوں کی طرح بے حد نڈر دلیر اور سمجھدار کمانڈو تھا اور تقریباً ہر مشن پر ہمارے ساتھ جاتا تھا۔ ہمارے مزاج اور ہماری حکمت عملیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کہنے لگا۔

"الحمد للہ سر! میں خوش نصیب ہوں کہ اپنی بہن کو دشمنوں سے چھڑانے اور دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے آپ کے ساتھ جا رہا ہوں"

شیروان نے کہا۔

"ہم آدھ گھنٹے بعد اپنے نئے مشن پر نکل رہے ہیں۔ جو تیاری کرنی ہے کر لو۔ گڑ اور چنوں کا تھیلا ساتھ رکھ لینا۔ دوپہر کا کھانا ہم جنگل میں ہی کھائیں گے۔"

ہم نے اپنا لباس وہی کشمیری شہریوں والا ہی رکھا۔ صرف اپنے اپنے آٹومیٹک پستولوں ں نیا میگزین بھر لیا۔ کمانڈو ہاشم نے بھی اپنا پستول اور کمانڈو چاقو قمیض کے اندر چھپا یا۔ منہ ہاتھ دھویا دو نفل ادا کر کے خدا سے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور پھر ہم پ میں بیٹھ کر اپنے مشن پر گلمرگ کی طرف جاتی روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیپ را ایک مجاہد چلا رہا تھا۔

ں کی ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ ہمیں گلمرگ روڈ پر پہاڑی نالے والی بھارتی چھاؤنی یا رتی فوجی کیمپ کے پاس چھوڑ آئے۔ سری نگر سے گلمرگ کی طرف جاؤ تو چڑھائی رع ہو جاتی ہے اور سردی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ یہ بہار کا موسم تھا لیکن گلمرگ کی ب سری نگر کے مقابلے میں زیادہ سردی پڑتی تھی۔ اس لئے ہم نے گرم اونی سویٹر اور کے اوپر چمڑے کی جرسیاں پہن رکھی تھیں۔ ہمیں اپنے ساتھ کمبل یا بستر وغیرہ رکھنے ضرورت نہیں تھی۔ کمانڈو کو کمبلوں آرام دہ بستروں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ برفانی ں میں بھی برف کھود کر اندر گڑھا بنا کر رات گذار لیتا ہے۔ اس کے لئے گرم سویٹر رم جرسی ہی کافی ہوتی ہے۔ سڑک پر معمولی سی ٹریفک تھی۔ جیپ سڑک پر بڑی ا سے چلی جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم کشمیر کے حسین ترین پہاڑی علاقے میں سے

گذر رہے تھے۔ مگر آج کشمیر کا یہ جنت نظیر حسن اداس تھا۔ اس کے حسین چہرے سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے بچے اپنے وطن کی آزادی اور اسلام کی جرات کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔

ہم نے ایک جگہ جنگل میں بیٹھ کر تھوڑے سے چنے اور گڑ کھایا۔ چشمے کا پانی پیا اور دوبارہ اپنے مشن کی طرف چل پڑے۔ مزید دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ چھوٹا سا پہاڑی نالہ آگیا جو وادی میں ایک طرف اونچے پہاڑوں کے درمیان سے بہتا چلا آرہا تھا۔ یہ کافی چوڑا نالہ تھا اور پہاڑی دریا لگتا تھا۔ اس کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ ٹریفک اس پل پر سے گذر کر دوسری طرف جاتی تھی۔ ہماری جیپ بھی پل پار کر کے پہاڑی نالے کے دوسرے کنارے پر آگئی۔ یہاں ہمیں دریا کے کنارے کنارے کشادہ سرسبز میدان میں کچھ فوجی بارکیں اور پہاڑی ڈھلان پر کچھ چھوٹی چھوٹی کوارٹروں ایسی کوٹھیاں دکھائی دیں۔

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔" اب اس نے ڈرائیور مجاہد سے کہا۔

"دوست! اب تم جیپ لے کر واپس جاؤ گے"

"ٹھیک ہے کمانڈر!"

ہم جیپ سے اتر گئے اور مجاہد ڈرائیور جیپ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ کمانڈو زیادہ
باتیں اور بحث مباحثہ نہیں کیا کرتے۔ ان کے لیڈر کا آرڈر ہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ قریباً ناممکن ہوتا تھا۔ میں نے شیروان سے بالکل نہ پوچھا کہ یہاں ہم جس مجاہد کے پاس جا
لیڈر نے کہا یہ کام کرنا ہے کمانڈو نے کہا یس سر! اور وہ کام کر ڈالا۔ جیپ چلی گئی تو ہم ہے ہیں اس کا نام کیا ہے۔
تینوں کمانڈو یعنی میں، کمانڈر شیروان اور کمانڈو ہاشم پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ اوپر کی ب بھارتی فوجی کیمپ کافی پیچھے رہ گیا تو ہم نالے سے ہٹ کر ڈھلان کی وادی میں داخل
طرف چلنے لگے۔ میں اب اس پہاڑی نالے کو دریا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ ہمارے میدانی گئے۔ یہاں زمین اونچی اور کہیں نشیبی تھی۔ کہیں کہیں گھاٹی تھی۔ چنار اور سفیدے
درخت تھے۔ زعفران کے چھوٹے چھوٹے کھیت بھی تھے۔
علاقوں میں دریا کا تصور وہ نہیں ہوتا جو پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ ہم سیب اور ناشپاتیوں کے
ہم پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان چلتے اس مقام پر آگئے باغوں میں سے بھی گزرے۔ یہاں کشمیری باغبان اور کسان اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔
جہاں ہمارے بائیں ہاتھ کو زمین اونچی ہونی شروع ہو جاتی تھی۔ کافی آگے جا کر تین چار جانب اونچی جگہ پر لکڑی کے چند ایک دیہاتی مکان نظر آئے۔ شیروان نے کہا۔
فوجی بیرکیں تھیں۔ ان سے آگے دس بارہ کوارٹر نما فلیٹ تھے۔ شاید یہ فیملی والے فوجی وہاں جا رہے ہیں"

افسروں کے لئے بنائے گئے تھے۔ فوجی بارکوں کے آگے خار دار تاروں والی کوئی پانچ فٹ اونچی دیوار تھی اس سے آگے فوجی کیمپ تھا۔ جہاں فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور ایک جگہ کوارٹر کے آگے رجمنٹ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہم جب بھارتی فوجی کیمپ سے بھی آگے نکل گئے تو میں نے کمانڈر سے پوچھا۔

"شیروان بھائی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

کمانڈر نے کہا۔

"اپنے ایک حریت پسند مجاہد کے ہاں جا رہے ہیں"

کشمیر کا بچہ بچہ اس وقت حریت کے جذبے سے سرشار تھا۔ کشمیر کا ہر گھر حریت پسندوں کی آماجگاہ تھا۔ یہ کشمیر کے بیٹے تھے جو مادر وطن کی حرمت، آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لئے کافر دشمن سے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر کے بیٹھی ہوئی بھارتی فوج سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کے وسائل کم تھے۔ جب کہ بھارتی فوج تربیت یافتہ پیشہ ور فوج تھی اور اس کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس کے باوجود کشمیری حریت پسندوں کی جرات و دلیری کے کارناموں کی دوسرے ملکوں تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ جس فوجی کو پتہ چلتا تھا کہ اس کی پوسٹنگ کشمیر میں ہو رہی ہے اس کا چہرہ اتر جاتا تھا۔ رنگ زرد ہو جاتا تھا اور اس کے گھر میں ماتم کی فضا بن جاتی تھی۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ سے بھارتی فوجی کا زندہ واپس آنا

اس دوران شیروان نے کمانڈو ہاشم کو ہدایت کی تھی کہ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک طرف کو ہو کر چلتا رہے۔ تاکہ اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو وہ ہمیں خبردار بھی کر سکے اور فائرنگ کھول کر ہماری مدد بھی کر سکے۔ جب ہم گاؤں کے لکڑی کے پرانے مکانوں کے علاقے میں داخل ہوئے تو کمانڈو ہاشم اوپر سے ہو کر ہمارے پاس آگیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کس مجاہد کے گھر جا رہے ہیں۔ گاؤں کے چند ایک مکان تھے۔ مکانوں کی چھتوں اور صحن میں کہیں کہیں شلجم کے چھلکے اور سرخ مرچیں دھوپ میں سکھانے کو ڈال رکھی تھیں۔ یہاں بادام اور اخروٹ کے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ہم ایک جگہ اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ شیروان نے کمانڈو ہاشم سے کہا۔

"جا کر دیکھو شعبان گھر پر ہی ہے؟"

کمانڈو ہاشم لکڑی کے مکانوں کی طرف جاتی پگ ڈنڈی کی طرف ہو گیا۔ ہم درخت کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ اخروٹ کا درخت بہت گنجان ہوتا ہے اور اس کا تنا بھی کافی موٹا ہوتا ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کمانڈو ہاشم ایک مکان کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ آدمی جو کشمیری مجاہد شعبان ہی ہو سکتا تھا وہیں صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور کمانڈو ہاشم واپس ہماری طرف آنے لگا۔

کمانڈر شیروان بھی ادھر کو ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے شعبان کو پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارا مجاہد گھر پر ہی مل گیا ہے۔ اچھا ہوا"

اتنی دیر میں کمانڈو ہاشم ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا کہنے لگا۔

"لیڈر! شعبان نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سیب کے باغ والی کوٹھڑی میں میرا انتظار کرو۔ میں آرہا ہوں"

ہم اس وقت کوئی بات کئے بغیر اٹھ کر سیب کے باغ کی طرف چل دیئے۔ سیب کے باغ کی دوسری طرف چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی جس کے باہر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ جو خالی پڑا تھا۔ ہم کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر دری پر بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ کے بعد مجاہد شعبان بھی آگیا۔ خوبصورت صحت مند کشمیری نوجوان تھا۔ شیروان نے اس سے میرا

تعارف کرایا اور ساری بات بیان کر دی۔ مجاہد شعبان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میں ان تینوں بھارتی فوجیوں کا پتہ لگا لوں گا ان میں جو ڈوگرہ کیپٹن ہے اور جس کے ماتھے پر گرہن کا نشان ہے اگر وہ اسی بھارتی کیمپ میں ہے تو وہ ہمارے انتقام کی آگ سے بچ نہیں سکے گا۔ ہماری بہن جمیلہ اسی کے پاس ہے تو وہ نالے والے کوارٹروں میں ہی ہوگی۔ میں ابھی ان سب کا سراغ لگانے جاتا ہوں۔ تم لوگ اس کوٹھڑی میں میرا انتظار کرنا۔"

مجاہد شعبان باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے شیروان سے پوچھا۔

"شعبان اتنی جلدی اتنا مشکل سراغ کیسے لگائے گا؟"

"اس کے اپنے آدمی فوجی کیمپ میں کام کرتے ہیں اور افسروں کے کوارٹروں میں بھی آتے جاتے ہیں"

ہم کوٹھڑی میں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ مجاہد شعبان دن کے ساڑھے گیارہ بجے گیا تھا۔ دوپہر کے تین بجے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"ڈوگرہ فوجی کیپٹن کا نام دین دیال شرما ہے۔ جمیلہ کو اس نے اپنے کوارٹر میں ہی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ جو دو بھارتی فوجی جمیلہ کو اغوا کر کے لائے تھے ان میں ایک حوالدار اور ایک لانس نائیک ہے۔ ان کے نام حوالدار کامو رام اور لانس نائیک کانشی رام ہے۔ دونوں رات کو ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر میں ضرور حاضر ہوتے ہیں۔ اس وقت ڈوگرہ کیپٹن شراب پیتا ہے اور یہ دونوں اس کے اردلی کے طور پر اس کی خدمت بجالاتے ہیں"

میں حیران رہ گیا۔ مجاہد شعبان پوری تفصیل کے ساتھ مکمل رپورٹ لے آیا تھا۔

روان نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا خیال ہے؟ ہم آج رات اٹیک کریں گے"

کمانڈر شیروان کی عادت تھی کہ جب وہ ٹارگٹ کے سامنے پہنچ جاتا تھا اور حالات نارمل ہوتے تھے تو پھر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر اسے گوارا نہیں ہوتی تھی۔ وہ فوراً ایکشن شروع کر دیتا تھا۔ چونکہ میں نے کمانڈر شیروان کے ساتھ ایک عرصہ گزارا تھا۔ اور میں اس کی اس عادت سے واقف تھا اس لئے میں نے فوراً جواب دیا۔

"یس لیڈر! میں تیار ہوں"

اس کے بعد ہم نے مجاہد شعبان کے ساتھ مل کر کمانڈو آپریشن کی پوری سکیم تیار کی۔ منصوبہ کوئی پیچیدہ نہیں تھا۔ بالکل صاف تھا مگر دلیرانہ منصوبہ تھا اور اس کے ہر قدم پر موت کو پچھاڑنا تھا۔ موت سے مقابلہ کرنا تھا۔ موت کو شکست دینی تھی۔ ٹارگٹ مارنے سے پہلے ہرگز نہیں مرنا تھا۔ کمانڈو ہاشم کو ہم نے کور دینے یعنی ہمارے لئے کچھ فاصلے پر رہ کر حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کی ڈیوٹی دی تھی۔ ہم نے اپنے پاس ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو اور سائی لینسر والے آٹو میٹک پستول ہی رکھے تھے۔ باقی سٹین گن اور ہینڈ گرنیڈ کمانڈو ہاشم کے پاس رکھے جانے تھے۔

کمانڈو شعبان ہمیں اپنے گھر اس لئے نہیں لے گیا تھا کہ گاؤں میں بھارتی سی آئی ڈی کے آدمی آتے جاتے رہتے تھے۔

اور شیو پاروتی مندر والے ایمونیشن کے ذخیرے کی تباہی کے بعد اس سارے علاقے میں سی آئی ڈی کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ کیونکہ فوج ابھی تک کسی کمانڈو کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ وہاں کوٹھڑی میں باتیں کرتے اور منصوبے کی تفصیلات پر غور کرتے رات ہو گئی مجاہد شعبان وہیں ہمارے لئے کھانا اور سبز چائے سے بھرا ہوا سماوار لے آیا۔ کھانا کھانے کے بعد رات کے آٹھ بجے مجاہد شعبان حالات کا جائزہ لینے اور اپنے آدمیوں سے بات کرنے کے لئے چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔

"ڈوگرہ کیپٹن دین دیال کے آفیسرز کوارٹر میں رات کے دس بجے شراب کی محفل لگنے والی ہے۔ کشمیری لڑکی جمیلہ اسی کوارٹر کے ایک کمرے میں بند ہے۔ ڈوگرہ کیپٹن کے دونوں فوجی ساتھی حوالدار اور لانس نائیک شراب کی اس

محفل میں اس کے ساتھ ہوں گے۔ ہمارا ایک مجاہد نوکر کے بھیس میں وہاں موجود ہوگا۔ وہ کوارٹر کے کمرے کے عقب میں آکر دو بار ماچس کی تیلی جلا کر ہمیں آل کلیئر کا سگنل دے گا۔ بس اس کے بعد آپ لوگوں کو اٹیک کر دینا ہوگا۔ اور جو کچھ کرنا ہوگا کر دینا ہوگا۔ یہ بتائیں کہ آپ کشمیری لڑکی کے ساتھ ان تینوں ڈوگرہ فوجیوں کو پکڑ کر کیسے اس کوٹھڑی تک لائیں گے۔ اگر وہ شراب کے نشے میں دھت بھی ہوں گے تو ممکن ہے یہاں تک آتے آتے انہیں ہوش آجائے آپ انہیں وہیں ہلاک کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"کمانڈو شعبان! ہم نے مشن شروع کرنے سے پہلے جمیلہ کے بوڑھے ماں باپ کے آگے قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کی بیٹی جمیلہ کو کافروں کی قید سے آزاد کروا کر لے آئیں گے اور ساتھ ہی جن بھارتی فوجیوں نے کشمیر کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ اس کی بے حرمتی کی ہے ان کے سر بھی کاٹ کر لائیں گے۔ چنانچہ تم بے فکر رہو ہمارے ساتھ ڈوگرہ کیپٹن اور دونوں بھارتی فوجی نہیں ہوں گے بلکہ ان کے سر بوری میں بند کر کے ساتھ لے آئیں گے۔ اس طرح ہمارا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور اپنا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا"

مجاہد شعبان نے اس کے بعد کوئی سوال نہ کیا۔ شیروان مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دوست! چلنے سے پہلے ہر ایک چیز چیک کر لی جائے۔ ہم اسی سویلین کپڑوں میں ہی جائیں گے۔ ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ شعبان تمہیں شام کے وقت ساتھ لے جا کر ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دکھا لائے گا۔"

جب سورج غروب ہو گیا اور شام کا اندھیرا چھانے لگا تو ہم شعبان کے ساتھ دیہاتی کپڑوں کے لباس میں ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دیکھنے کے لئے نکل پڑے۔ مجاہد شعبان ہمیں پہاڑی رستوں سے لے جا رہا تھا جہاں سے ہمیں رات کے وقت گذرنا تھا۔ یہ بھارتی پ کی فوجی بارکوں کا عقب تھا اور یہاں جنگلی جھاڑیاں اور درخت بہت تھے۔ مجاہد

شعبان نے ہمیں ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دکھایا جو چھوٹی سی کوٹھی کی طرح تھا۔ آگے پیچھے چھوٹا لان تھا۔ اس کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ کیونکہ یہ جگہ بھارتی کیمپ میں ہی تھی اور اس کے پیچھے خاردار تار کی دیوار تھی۔ شعبان ہمیں ایک گھاٹی میں سے نکال کر لایا تھا۔ جس طرف کانٹے دار تار والی دیوار میں ایک آدمی کے گزرنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کے پچھواڑے بادام کے درخت تھے۔ یہاں ایک چھوٹی سی چٹان زمین سے نکل کر کوئی پندرہ فٹ اوپر چلی گئی تھی۔ چٹان کے نیچے ایک شگاف تھا۔ شعبان نے کہا۔

"تم لوگ یہاں چھپ کر رات کے دس بجنے کا انتظار کر سکتے ہو"

پھر اس نے دور سے ہمیں کوارٹر کے گرد لگی ہوئی گارڈینیا کی جھاڑیاں دکھا کر کہا۔

"وہ جہاں انار کا درخت ہے۔ وہاں سے تم باڑھ پھلانگ کر اندر جا سکتے ہو۔ کونے والا کمرہ باتھ روم ہے۔ اس کے ساتھ وہ کمرہ ہے جہاں کشمیری لڑکی کو قید کیا ہوا ہے۔ تم باتھ روم کے دروازے سے اندر داخل گے۔ کیونکہ باقی تمام کمروں کے دروازے اندر سے بند ہوتے ہیں۔ ہمارا آدمی رات کو شراب کی پارٹی شروع ہونے سے پہلے اندر آکر باتھ روم کے دروازے کی کنڈی کھول دے گا۔ اس کے بعد سب کچھ تمہیں اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔ اب واپس آجاؤ۔"

ہم جن راستوں سے گئے تھے ان ہی راستوں پر چلتے ہوئے واپس سیب کے باغ والی کوٹھڑی میں آگئے۔ اور رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شعبان چلا گیا تھا ہم نے اس سے نائلون کا سیاہ رنگ کا بڑا تھیلا منگوا کر رکھ لیا تھا۔ اس تھیلے میں ہمیں ڈوگرہ کیپٹن اور دونوں بھارتی فوجیوں کی سر کاٹ کر لانے تھے۔ میں نے آج تک کسی دشمن کا بھی سر نہیں کاٹا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈر شیروان نے بھی پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم بھارتی فوجیوں کے سر کیسے کاٹیں گے۔ اگرچہ ہمارے پاس بڑے کمانڈو چاقو موجود تھے مگر گردن کاٹنے کے لئے کسی کلہاڑی ایسی شے کی ضرورت ہوا

ہے۔ بہرحال اس موضوع پر میں نے کمانڈر شیروان سے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔ ہم اپنے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات طے کرنے اور ایک ایک نقل و حرکت کی ریہرسل کرتے رہے۔ جب ہماری گھڑیوں نے ایک ساتھ رات کے پورے دس بجائے تو کمانڈر شیروان نے کہا۔

"چلو شیرو! جن کافروں نے ہمارے بھائیوں کو قتل کیا ہے اور ہماری ماؤں' بہنوں کو بے عزت کیا ہے ان سے بدلہ چکانے کا وقت آگیا ہے"

ہم تینوں کمانڈو اللہ کا نام لے کر سیب کے باغ والی کوٹھڑی سے نکل آئے۔ باہر گلمرگ کے قرب وجوار کی رات سرد اور کہر آلود تھی۔ کہرے کی وجہ سے آسمان پر چمکنے والے ستارے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہم نے گرم جرسیاں اور جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ لباس کشمیری دیہاتیوں والا تھا۔ کھدر کے لمبے کرتے اور نیچے شلواریں۔ پاؤں میں کینوس کے جوتے تھے تاکہ چلتے وقت قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔ ہم نے جس طرف سے جانا تھا اور جس فارمیشن میں چلنا تھا یہ سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ کمانڈر شیروان آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دو قدموں کا فاصلہ ڈال کر میں چل رہا تھا۔ کمانڈو ہاشم ہم سے پانچ قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ہمارے پہلو میں ہمارے متوازی چل رہا تھا۔ رات اندھیری اور کہر آلود تھی لیکن ہماری آنکھیں راتوں کے اندھیرے کی عادی تھیں۔ جس طرح چیتا اندھیری رات میں بھی اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے اسی طرح ہم بھی اندھیری رات میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھ سکتے تھے۔ درخت جھاڑیاں چھوٹے بڑے پتھر' نشیب' گھاٹیاں اور پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی دھندلی نیم تاریک وادی ہمیں برابر نظر آرہی تھی۔ جب ہم ایک گھاٹی میں سے گزر کر خاردار تار کی دیوار کے سوراخ میں سے نکل کر اوپر آئے تو ہمیں دور فوجی بارک کی روشنیاں اور آفیسرز کوارٹر کی روشنی نظر آئی۔ ہم ایک خاص زاویے سے پھیل کر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے چلتے چلتے بادام کے درختوں کے نیچے آکر رک گئے۔ اب کمانڈو ہاشم بھی ہمارے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا۔ ہم سب کی نظریں کچھ فاصلے پر ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کی عقبی دیوار کے اوپر جلتے بلب پر

لگی تھیں۔ اس بلب کی روشنی عقبی دیوار اور غسل خانے کے پچھلے دروازے پر پڑ رہی تھی کمانڈر شیروان نے آہستہ سے کہا۔

"باتھ روم کے دروازے میں داخل ہوتے وقت ہم دور سے نظر آسکتے ہیں ہمیں دوسری طرف سے آنا ہوگا"

پھر اس نے کمانڈو ہاشم کو ہدایت کی۔

"تم گارڈینیا کی باڑھ کے پیچھے پوزیشن لے کر ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کرو گے۔ اگر اس دوران کوئی دوسرا آدمی غسل خانے کے دروازے کی طرف آتا نظر آیا تو تم اس پر فائر نہیں کرو گے۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ چیتے کی طرح تیزی سے رینگ کر اس کے عقب میں پہنچو گے اور اسے دبوچ لو گے اور اس سے پہلے کہ اس کی آواز نکلے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دو گے۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

کمانڈو ہاشم نے کہا۔

"نو سر۔ کوئی سوال نہیں کوئی اعتراض نہیں"

"اوکے۔ گو"

اور اس کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان کوارٹر کی طرف بڑھا۔ میں اس کے بالکل پیچھے تھا۔ آٹو میٹک پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ پلاسٹک کا تھیلا میں نے اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ اس خیال سے مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ جب ہم واپس آجائیں گے تو ہمارے ساتھ معصوم اور مظلوم کشمیری لڑکی جمیلہ بھی ہوگی اور پلاسٹک کے تھیلے میں دشمنوں کے تین کٹے ہوئے سر بھی ہوں گے۔ اپنی عزت غیرت' اپنے وطن کے ناموس اور اپنے دین اسلام کی حرمت کی خاطر دشمن سے جنگ کرتے ہوئے جب ہم دشمن کا سر کاٹتے ہیں تو اس سے ہمیں ایک طرح کی روحانی خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی خوشی ہے کہ جس طرح خدانخواستہ اگر کوئی غنڈہ بدمعاش ہماری بیٹی کو ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے کپڑے پھاڑ کر اٹھا کر لے جائے اور ہم تعاقب کر کے اس غنڈے بدمعاش کو قتل کر دیں اور اپنی بیٹی کو چھڑالیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے

خود شہید ہو جانے یا کافر کا سر قلم کر دینے سے جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک شہید اور غازی کا رتبہ ہے۔ اور اسلام میں ایک مسلمان کے دو ہی مقام ہیں۔ غازی یا شہید۔

اندھیرے اور سرد رات کے کہرے میں چلتے ہوئے ہم ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کے گرد لگی ہوئی جھاڑیوں کی باڑھ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ باتھ روم کا دروازہ ہم سے بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر تھا۔ کمانڈر شیروان نے کمانڈو ہاشم کو اشارہ کیا۔ وہ دو قدم دوڑ کر ایک طرف گیا اور باڑھ کی جھاڑیوں کے پیچھے مورچہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کمانڈر شیروان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ میں سامنے کی طرف سے جاؤں گا۔ تم دوسری طرف سے باتھ روم والے دروازے پر آؤ گے۔ ہمیں یقین تھا کہ اپنے آدمی نے باتھ روم کے دروازے کی اندر سے کنڈی کھول دی ہوگی۔

ہم زمین پر منہ کے بل لیٹ گئے تھے اور باڑھ پھلانگنے کے بعد زمین پر کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں دوسری طرف ہو گیا جدھر اندھیرا تھا۔ میں دوسری طرف سے نصف قطر کا چکر لگا کر دروازے کی طرف آیا تو میں نے دیکھا کمانڈر شیروان زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بلند کر کے لہرایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آجاؤ۔ سب ٹھیک ہے۔ ادھر سے میں نے اور سامنے کی جانب سے کمانڈر شیروان نے باتھ روم کے دروازے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ گھاس شبنم سے گیلی اور ٹھنڈی تھی مگر ہمیں اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ہمارے مشن کی گرمی نے ہمارے جسموں کو بھی گرم کر دیا ہوا تھا۔ انسان کے سامنے کوئی بڑا تعمیری مقصد ہو تو پھر راستے کی کوئی رکاوٹ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پھر نہ سردی گرمی کچھ کہتی ہے نہ بھوک پیاس پریشان کرتی ہے۔ آدمی جب روپے پیسے کے لالچ میں زمین جائیداد کے لالچ میں کسی کو قتل کرنے جاتا ہے تو اس کا ضمیر ہر قدم پر اس کی ملامت کر رہا ہوتا ہے لیکن جب ایک انسان اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کا نام بلند رکھنے کی خاطر کافر دشمن سے جنگ کرنے کے لئے جاتا ہے تو اس کا ضمیر اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس کو روحانی

طاقت عطا کرتا ہے اور فرشتے اس غازی کی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔

میری بھی اس وقت یہی کیفیت تھی۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے اللہ کی رضا کے لئے کر رہے تھے۔ اللہ کی خاطر کر رہے تھے۔ یقین کریں اس وقت موت ہمیں چیونٹی سے بھی کم تر اور بے وقعت معلوم ہو رہی تھی۔ اگر آپ کو موت کا خوف ہے تو اپنے ہر کام کو اپنے ہر فعل کو اللہ کی رضا اور اللہ کی خوشنودی کے لئے وقف کر دیں۔ آپ کو موت کے خوف سے نجات مل جائے گی۔ میں اور کمانڈر شیروان زمین پر کہنیوں کے بل رینگتے رینگتے باتھ روم کے عقبی دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے لیٹے لیٹے دروازے کو ہاتھ سے اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہم باتھ روم میں داخل ہو گئے۔ باتھ روم کی بتی جل رہی تھی۔ ہم بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے کیونکہ دروازہ کھلنے سے باتھ روم کی تیز روشنی باہر آنے لگی تھی۔ ہم نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

چھوٹا سا باتھ روم تھا مگر اس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ہم دبے پاؤں دوسرے دروازے کی طرف بڑھے جو بند تھا اور جس کی دوسری طرف سے آدمیوں کے بولنے کی اور کسی وقت قہقہے کی آواز آجاتی تھی۔ کوشش کے باوجود ہمیں دروازے میں کوئی سوراخ یا ایسی درز نہ مل سکی جس میں جھانک کر ہم دوسری جانب کا منظر دیکھ سکتے۔ دروازہ نیچے فرش سے دو انچ اونچا رکھا گیا تھا۔ ہم باتھ روم کے فرش پر لیٹ گئے اور گال فرش کے ساتھ لگا کر دو انچ کی درز میں سے دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف کا منظر یہ تھا کہ صوفے پر دو فوجی بیٹھے تھے ایک فوجی میز کے قریب کھڑا میز پر کبابوں یا آلو کی ٹکیوں کی پلیٹ رکھ رہا تھا۔ یہ لانس نائیک کی وردی میں تھا۔ باقی دو فوجی جو صوفے پر بیٹھے تھے ان میں سے ایک کیپٹن کی وردی اور دوسرا حوالدار کی وردی میں تھا۔ عجیب بات تھی رات کے دس بجے بھی انہوں نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے چونکہ کشمیر میں ایمرجنسی کے حالات تھے اس لئے فوجی اس وقت تک اپنی وردیوں میں رہتے ہوں جب تک کہ وہ سونے کے لئے بستر پر نہیں لیٹتے۔ میز پر شراب کے تین گلاس پڑے تھے۔ لانس نائیک نے کباب کی پلیٹ میز پر رکھ دی اور اپنے گلاس میں شراب ڈال کر ذرا پرے

ہو کر بیٹھ کر پینے لگا۔ کیپٹن کی وردی والا یقیناً ڈوگرہ کیپٹن دین دیال شرما ہی تھا۔ یہ تینوں وہی بھارتی فوجی تھے جنہوں نے گاؤں کو مارٹر گنوں سے اڑایا تھا۔ بے گناہ کشمیریوں کو ہلاک کیا تھا۔ اور کشمیری لڑکی جمیلہ کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ ہم فرش سے آہستہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کمانڈر شیروان نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"تینوں وہی کافر ہیں ہم زیادہ دیر تک باتھ روم میں نہیں رہ سکتے۔ یہ لوگ شراب پی رہے ہیں اور یہ لوگ بار بار پیشاب کرنے اندر آئیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمارا ایکشن کیا ہونا چاہئے؟"

شیروان بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ سب سے پہلے ہمیں باہر کا جائزہ لینا ہوگا کہ باہر کوئی سنتری گارڈ ڈیوٹی پر تو نہیں ہے"

ہم آہستہ سے باتھ روم کا عقبی دروازہ کھول کر باہر لان میں نکل آئے اور دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے دوسری طرف جا کر جھانک کر دیکھا۔ یہ کوارٹر کے سامنے والا حصہ تھا۔ برآمدے میں بتی جل رہی تھی مگر وہاں کوئی سنتری نہیں تھا۔ آگے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ باغیچے کا چھوٹا سا گیٹ تھا۔ گیٹ پر کوئی دروازہ نہیں لگا تھا۔ جھاڑیوں کو تراش کر آنے جانے کا راستہ بنایا ہوا تھا۔ ہم وہیں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔

"گارڈ ڈیوٹی پر کوئی نہیں۔ یہ ہمارے لئے اچھا شگون ہے۔ مگر ہمیں یہ پتہ چلنا چاہئے کہ کشمیری لڑکی بھی یہاں موجود ہے کہ نہیں"

میں نے کہا۔

"شعبان نے کہا تھا کہ جمیلہ باتھ روم کے ساتھ والے جنوبی کمرے میں بند رہے۔ چلو اس طرف چل کر دیکھتے ہیں"

ہم دیوار کے ساتھ پنجوں اور گھٹنوں کے بل چیتوں کی طرح چلتے باتھ روم کے

دروازے کے آگے سے گزر کر دوسری طرف جو کمرہ تھا اس کی دیوار کے بائیں آکر رک گئے۔ ادھر کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف زمین سے چار فٹ اونچی ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ سرد رات کا کہر پتلے بادل کی طرح کوارٹر کے لان میں آگیا تھا۔ اس کہرے نے ہمیں چھپا لیا تھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سلاخوں کے پیچھے کھڑکی کے پٹ تھے۔ جو بند تھے۔ شیروان نے انگلی سلاخوں میں ڈال کر کھڑکی کے پٹ کو اندر کو دھکیلا۔ کہنے لگا۔

"کھڑکی کی کنڈی لگی ہوئی ہے"

اچانک کھڑکی کے پیچھے سے ایک مرد کی دھیمی آواز آئی۔ میں نے شیروان کو اشارہ کیا ہم نے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگا دیئے۔ اندر کوئی مرد فوجی اردو میں کہہ رہا تھا۔

"کچھ کھاؤ۔ راشن نہیں کھاؤ گی تو بھوکی مر جاؤ گی"

تب ایک لڑکی کی آواز آئی لڑکی نے خدا کا واسطہ دیتے ہوئے کشمیری لہجے کی اردو میں کہا۔

"مجھے کچھ نہ کہنا۔ اگلے مہینے میری شادی ہونے والی ہے۔ خدا کا واسطہ ہے خدا کے لئے مجھے کچھ نہ کہنا"

اور لڑکی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ مرد کی آواز پھر آئی۔

"اگلے مہینے والی شادی کو بھول جاؤ۔ آج رات تمہاری تین آدمیوں سے شادی ہوگی۔ لو تھوڑا کھا لو تاکہ تمہارے اندر طاقت آجائے"

کمانڈر شیروان نے کان پیچھے ہٹا لئے اس کا چہرہ کہرے میں تانبے کی طرح تمتما رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ "ہم اندر چلیں گے۔"

ہم کہرے کی چادر میں تیز تیز قدم اٹھاتے باتھ روم کے دروازے پر آکر رک گئے۔ کمانڈر نے دروازے کے ساتھ کان لگایا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔

"اندر کوئی نہیں"

اور وہ دروازہ کھول کر باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باتھ

روم میں آگیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم باتھ روم کے فرش پر لیٹ کر دوسرے دروازے کی نچلی دو انچ کی درز میں سے دوسری طرف دیکھنے لگے۔ کمرے میں صرف ڈوگرہ کیپٹن اور حوالدار ہی بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ تیسرا آدمی لانس نائیک کشمیری لڑکی کے کمرے میں ہی تھا سامنے دیوار میں جو دروازہ تھا وہ کھلا اور اندر سے ڈوگرہ لانس نائیک باہر آیا۔ ڈوگرہ کیپٹن نے نشے میں جھومتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری ہیما مالینی نے کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں؟"

لانس نائیک بولا۔

"سر! آلو کی ٹکیاں اس کے پاس رکھ آیا ہوں صبح سے بھوکی ہے۔ اپنے آپ کھائے گی"

کمانڈر شیروان جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باتھ روم کے بلب کی روشنی میں شیروان کا سرخ و سفید چہرہ ایسے سرخ ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے فحش گالی دے دی ہو۔ اس نے آٹومیٹک پستول نکال کر اس کا میگزین بڑی احتیاط سے چیک کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں مجھے کہا۔

"دوست! ہم اٹیک کریں گے"

میں نے بھی اپنا آٹومیٹک پستول نکال لیا۔ میگزین چیک کیا۔ ہم موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ کمانڈر شیروان نے جو فیصلہ کر لیا تھا اب اس پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ باتھ روم کا یہ دروازہ بند ضرور تھا مگر اس کو باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ہمیں صرف اسے کھولنا ہی تھا۔ شیروان نے ایک دم سے دروازہ کھول کر نعرہ لگایا۔ "اللہ اکبر"

میں نے نعرہ لگایا۔ "یا علی"

اس کے ساتھ ہی ہمارے آٹومیٹک پستولوں میں سے گولیوں کی بوچھاڑیں نکلنے لگیں۔ سائی لینسروں کی وجہ سے دھماکوں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ تینوں بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ ہمارے نشانوں کی زد میں تھے۔ ایک ایک ڈوگرے

فوجی کے جسم سے ایک سیکنڈ میں چھ چھ سات سات گولیاں پار ہو گئیں۔ ڈوگرہ کیپٹن صوفے پر ہی الٹ گیا۔ لانس نائیک بھارتی فوجی صوفے کے پیچھے کھڑا تھا وہ اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔ بھارتی حوالدار کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ گلاس گولی لگنے سے چکنا چور ہو گیا۔ دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں سے نکل گئیں۔ وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔ شیروان نے ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ میں دوڑ کر کمرے کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے پاس گیا۔ اسے کھول کر باہر دیکھا۔ باہر خاموشی چھائی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس دوران کمانڈر شیروان اس کمرے میں چلا گیا تھا جس کے اندر کشمیری لڑکی جمیلہ قید تھی۔ وہ لڑکی کو نکال کر باہر لے آیا۔ لڑکی حواس باختہ سی ہو رہی تھی۔ اس نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں دیکھیں تو دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

کمانڈر شیروان نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔

اس نے کہا۔

"میرا نام جمیلہ ہے آپ حریت پسند مجاہد بھائی ہیں نا؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہاں بہن۔ ہم حریت پسند مجاہد ہیں۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔"

کمانڈر شیروان اس سے کشمیری میں بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! صرف ایک منٹ کے لئے تم اس کمرے میں واپس چلی جاؤ۔ ہمیں ان ڈوگرہ کافروں کے ساتھ ایک ایسا سلوک کرنا ہے۔ جسے تم شاید دیکھ نہ سکو گی۔"

جمیلہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ کہنے لگی۔

"مجھے اس کمرے سے ڈر لگتا ہے"

میں نے کہا۔

"بہن! صرف ایک منٹ اندر چل کر بیٹھو۔ جلدی کرو۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے"

جمیلہ ڈرتے ڈرتے جس کمرے میں قید تھی اسی کمرے میں واپس چلی گئی۔ شیروان نے مجھے کہا۔

"تھیلا نکال کر میرے پاس آجاؤ۔"

"مگر ذرا ٹھہرو"

کمانڈو شیروان نے اس خیال سے کہ جمیلہ دروازہ کھول کر وہ منظر نہ دیکھ لے جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ دروازے کو باہر سے چٹخنی لگا دی۔ تینوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے پستول جیب میں ڈالا اور کمانڈو چاقو نکال لیا۔ مجھے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ سب سے پہلے اس نے ڈوگرہ کیپٹن کی لاش کو سیدھا کیا۔ اس کے کاندھے پر کیپٹن رینک کے تین سٹار لگے ہوئے تھے۔ اس کے سر میں تین گولیاں آرپار ہو گئی تھیں۔ شیروان نے لاش کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر ڈالا اور جس طرح بکرے کو ذبح کرتے ہیں بالکل اسی طرح اتنی طاقت اور زور سے چاقو اس کی گردن پر چلایا کہ ریڑھ کی ہڈی کے کٹنے کی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ دوسرے لمحے ڈوگرہ کیپٹن کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ شیروان نے میری طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

"تم میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اس کافر کی گردن کاٹ ڈالو"

میرے قریب صوفے کے نیچے ڈوگرہ حوالدار کی لاش پڑی تھی مجھ پر جیسے دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشمیر کی تمام لڑکیوں کی بے حرمتی کرنے والا اور بے گناہ کشمیریوں کو ہلاک کر کے ان کے گھروں کو مارٹر گولوں سے تباہ کرنے والا یہی ایک ڈوگرہ حوالدار ہے۔ میں نے بڑا چاقو جس کے آدھے پھل پر دندانے بھی ہوتے ہیں لاش کی گردن کے نیچے رکھ کر اس کے سر پر ایک پاؤں رکھا اور پوری طاقت سے چاقو کو اوپر کی جانب جھٹکا دیا۔ دوسرے جھٹکے پر ڈوگرہ حوالدار کی گردن اس کے دھڑ سے الگ ہو گئی۔ اس وقت کمانڈر شیروان تیسرے ڈوگرہ فوجی کی گردن الگ کر چکا تھا۔ ہم نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے سر پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ رسی سے بند کیا۔ تھیلے کو نائلون کی رسی سے باندھ کر میں نے اپنے کندھے پر ڈالا اور نائلون کی رسی اپنی کمر کے گرد

باندھ دی۔ میں دروازہ کھول کر کشمیری لڑکی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ دروازے کے پاس ہی فرش پر نیم بے ہوش پڑی تھی۔ شیروان بھی اندر آگیا اس نے پانی کا جگ لا کر لڑکی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ لڑکی ہوش میں آگئی۔ لگتا تھا کہ اس نے دروازے میں سے ہمیں ڈوگروں کی گردنیں کاٹتے دیکھ لیا تھا اور دہشت کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی۔

شیروان نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"نکل چلو"

شیروان آگے میں لڑکی جمیلہ کو لے کر پیچھے تھا۔ ہم تیز تیز چلتے باتھ روم میں سے ہو کر دوسرے دروازے سے باہر عقبی لان میں آئے اب ہمیں رینگ رینگ کر جانے کی ضرورت نہیں تھی ۔ رات اسی طرح سرد اور کہر آلود تھی۔ کہرا ہمارے چھپاؤ کے لئے کافی تھا۔ ہم نے دوڑ کر گارڈینیا کی جھاڑیوں کو پار کیا اور بادام کے درختوں کی طرف بھاگنے لگے۔ کشمیری لڑکی جمیلہ کے جسم میں نئی توانائی آگئی تھی ۔ وہ بھی ہمارے ساتھ دوڑ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی اسے کافروں کی قید سے نکال کر لے جا رہے ہیں۔ اب اس کی عزت وحرمت محفوظ ہے۔

بادام کے درختوں میں ایک طرف سے کمانڈو ہاشم دوڑ کر ہمارے پاس آگیا۔ کشمیری لڑکی کو ہمارے ساتھ دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ ہمارے ساتھ ہے"

کمانڈر شیروان نے جمیلہ سے کشمیری زبان میں کہا۔

"بہن اللہ نے تمہیں کافروں سے محفوظ کر دیا ہے ہمارے ساتھ چلتی چلی جانا۔ جہاں ہم دوڑیں گے تمہیں بھی دوڑنا ہوگا۔ جہاں ہم خطرہ دیکھ کر چھپ جائیں گے تمہیں بھی چھپ جانا ہوگا اور کوئی آواز نہیں نکالنی ہوگی۔ میرے پیچھے آجاؤ۔"

کمانڈر شیروان نے جمیلہ کو اپنے پیچھے کر لیا۔ اس کے پیچھے میں اور میرے ساتھ کمانڈو ہاشم تھا۔ ہم سرد رات کی خاموشی میں تیز تیز چل رہے تھے۔ کمانڈو ہاشم نے

میرے تھیلے کو ہاتھ سے چھو کر کہا۔

"کافروں کے سر کاٹ کر لے آئے ہو۔ یہ ہماری سب سے بڑی فتح ہے۔ میں نے سائی لینسروں والے پستولوں کی آوازیں سن لی تھیں دشمن نے تو کوئی فائر نہیں کیا نا؟"

"بالکل نہیں ہمیں یہی ڈر تھا اگر وہ فائر کر دیتے تو اس کے دھماکوں سے بارکوں کے سنتری ہوشیار ہو کر ضرور ادھر کو آجاتے۔"

اگرچہ ہم تیز تیز چلتے ہوئے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن کمانڈر شیروان نے ہماری آوازیں سن لیں وہ رک گیا۔ اس نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کیوں بولتے ہو؟ کیوں بولتے ہو؟"

ہم پھر اسی فارمیشن میں تیز تیز چلنے لگے۔ ہم واپسی پر بھی انہی گھاٹیوں کھائیوں اور چٹانی پتھروں کی درمیان سے ہوتے ہوئے سیب کے باغ میں آگئے۔ یہاں کوٹھڑی کے اندر مجاہد شعبان کمبل اوڑھے بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر کوٹھڑی سے باہر آگیا۔ کہنے لگا۔

"لڑکی کہاں ہے؟"

جمیلہ پیچھے میرے ساتھ تھی۔ جمیلہ کو دیکھ کر شعبان نے اللہ تیرا شکر اللہ تیرا شکر تین بار کہا۔ جمیلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔ میرے کاندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے کو دیکھ کر نفرت سے کہا۔

"کافروں کے سر لائے ہو۔ شاباش۔ ان سروں کو دلی پردھان منتری کو بھجوا دینا۔"

ہم کوٹھڑی میں بیٹھ گئے تھے ۔ شیروان نے شعبان سے کہا۔

"ہم راتوں رات یہاں سے نکل جائیں گے۔ جمیلہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس کے لئے جتنی جلدی کچھ کھانے کو لا سکتے ہو لے آؤ۔ کیونکہ آگے ہمارا سفر بڑا لمبا ہے۔"

شعبان بولا۔

"ابھی آتا ہوں"

وہ چلا گیا۔ جمیلہ کے چہرے سے ابھی خوف کے اثرات ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شیروان سے کشمیری میں پوچھا۔

"کافروں کے سر ہمیں زمین میں دبا دو۔ مجھے ڈر لگتا ہے"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ جن بھارتی فوجیوں نے جمیلہ بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ ہم ان کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ ہی لائیں گے۔ یہ سر ہمیں تمہارے بابا کو دکھانے ہوں گے۔ اس کے بعد ہمیں ان کے ساتھ جو سلوک کرنا ہوگا کریں گے۔ اب تم اس بارے میں ہم سے کوئی سوال نہ پوچھنا او کے؟"

جمیلہ خاموش ہو گئی مجاہد شعبان چھ سات روٹیاں اور ساگ ان کے اوپر ڈال کر لے آیا۔ ساتھ پانی کی صراحی بھی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی جتنی روٹی کھا سکتے تھے کھائی۔ پانی پیا۔ زیادہ سے زیادہ وہاں آدھا گھنٹہ آرام کیا اور مجاہد شعبان سے کہا کہ اب ہم آگے کو چلتے ہیں۔ شعبان کہنے لگا۔

"صبح ہوتے ہی تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے قتل کی سب کو خبر ہو جائے گی اور جب لاشوں کے سر بھی غائب ہوں گے تو فوج کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ یہاں کے مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے گی"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ڈوگرہ فوجیوں کے سر غائب دیکھ کر ان پر دہشت بھی ضرور طاری ہو جائے گی۔ اس بار وہ یہاں کے مسلمان کشمیریوں پر سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالیں گے"

مجاہد شعبان بولا۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن میں تمہیں یہ کہنے والا تھا کہ اس بھیانک قتل کا پتہ لگتے ہی بھارتی فوج کے جوان تمہاری تلاش میں نکل پڑیں گے یہاں اتنے گھنے جنگل بھی نہیں ہیں۔ اور سری نگر یہاں سے کافی دور ہے۔ تم لڑکی کو ساتھ لے کر کہاں مارے مارے پھرتے رہو گے۔"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے"

مجاہد شعبان نے کہا۔

"یہاں سے دو میل نیچے پہاڑی نالہ وادی میں بہتا ہے۔ وہاں ہمارے اپنے کچھ ماہی گیر رہتے ہیں۔ تمہیں ان سے ایک بڑی کشتی مل سکتی ہے۔ تم دریائی راستے سے ایک تو محفوظ ہو گے دوسرے بہت جلدی سری نگر کی وادی میں پہنچ جاؤ گے۔ کیونکہ پہاڑی نالے بہترین اور مختصر ترین راستوں سے دریاؤں تک جاتے ہیں۔"

مجھے اور کمانڈر شیروان کو شعبان کی تجویز پسند آئی۔ شیروان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ابھی ماہی گیروں کے گاؤں کو چلتے ہیں"

اور واقعی ہم اس وقت کوٹھڑی سے نکلے اور ماہی گیروں کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ مجاہد شعبان ہمارے ساتھ تھا۔ راتوں رات ہم ماہی گیروں کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہاں نالہ قریب ہی بہہ رہا تھا۔ یہ وادی تھی نالے کا پاٹ چوڑا تھا اور کشمیری ماہی گیروں کی کچھ چھوٹی بڑی کشتیاں بھی کناروں پر کھڑی تھیں۔ شعبان ہمیں کشتیوں کے پاس چھوڑ کر خود ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ جمیلہ نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی مگر سردی زیادہ تھی۔ میں نے اسے اپنی گرم جیکٹ اتار کر پہنا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی شعبان ایک کشمیری ماہی گیر کو لے کر آ گیا۔ ان لوگوں نے کشمیری میں کچھ باتیں کیں۔ ہم ایک ذرا بڑی کشتی میں بیٹھ گئے جس پر آدھی چھت پڑی تھی۔ شعبان نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تم لوگ نالے کے بہاؤ پر سفر کرو گے۔ تمہیں صرف چپوؤں اور ڈانڈ سے کشتی کو کناروں سے ٹکرانے سے بچانا ہوگا۔ یہاں سے نالہ وادی کی ڈھلان میں بہتا ہے اور پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ تم لوگ تین یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹوں میں سری نگر کی وادی میں پہنچ جاؤ گے جہاں یہ نالہ دریائے جہلم میں گرتا ہے۔ کشتی کو تم وہاں ایک طرف باندھ دینا۔ ہمارے آدمی کل خود آکر کشتی واپس لے آئیں گے۔ اللہ بیلی"

ہم نے کشتی نالے کے بہاؤ پر ڈال دی۔ پانی کا یہاں واقعی بڑا زور تھا۔ نالہ ڈھلان میں بہتا تھا۔ کشتی نے تیزی سے سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف کمانڈو ہاشم نے ڈانڈ پکڑے کھڑا تھا دوسرے طرف میں نے چپو سنبھال رکھے تھے۔ ہاشم کشتی کی سمت سیدھی رکھتا تھا اور میں کشتی کو کنارے کی طرف جانے سے روکتا تھا۔ یہ وادی تھی اونچی نیچی پہاڑی جگہ نہیں تھی۔ کوئی گھاٹی اور آبشاریں بھی نہیں تھیں۔ یہ سارا پہاڑوں کی تلیٹی کا علاقہ تھا۔ ہماری کشتی بہتی چلی جا رہی تھی۔ ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا میں نے کشتی میں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ خطرہ تھا کہ کل تک اس میں بدبو پیدا ہونے لگے گی۔ کمانڈر شیروان نے کہا تھا کہ ہم صبح ہونے سے پہلے پہلے جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے گھر پہنچائیں گے اور ساتھ ہی اس کے باپ کو ڈوگروں کے کٹے ہوئے سر بھی دکھا دیں گے ۔ اس کے بعد ہمارا پروگرام سری نگر سے کچھ فاصلے پر پہاڑی پر جو ڈوگرہ فوج کا گیریزن تھا اس گیریزن میں ان کٹے ہوئے سروں کے تھیلے کو پھینکنے کا تھا۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی ۔ جمیلہ کو ہم نے کشتی میں ایک طرف سلا دیا تھا۔ شیروان نے اس کے اوپر اپنی جیکٹ بھی ڈال دی تھی کیونکہ سردی زیادہ تھی۔

رات کے ٹھیک سوا تین بجے ہمیں دور سے سری نگر شہر کی بتیاں جھلملاتی نظر آنے لگیں۔ یہاں نالہ دریا میں گرتا تھا پانی کا بہاؤ زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ کمانڈر شیروان نے ہاشم سے کہا۔

"آگے دریا ہے۔ کشتی کو بائیں جانب والے کنارے کی طرف لے آؤ"

کمانڈو ہاشم نے کشتی کے مہار کو ایک طرف موڑ دیا۔ میں چپوؤں کو اس طرح چلانے لگا کہ کشتی کنارے کی طرف آجائے۔ آخر کشتی کنارے پر آگئی۔ کمانڈو ہاشم نے رسی ہاتھ میں لے کر کنارے پر چھلانگ لگا دی اور رسی کو کھینچ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ ہم نے جمیلہ کو جگا دیا۔ شیروان نے جیکٹ پہن لی جمیلہ نے میری جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اتارنے لگی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ "یہ ایک بھائی کا تحفہ سمجھ کر اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔"

ہم اندھیرے میں کشتی سے اتر کر سری نگری کی طرف چلنے لگے۔ جمیلہ کا گاؤں سری نگر شہر سے چھ سات میل مشرق کی جانب تھا۔ یعنی جس راستے پر ہم جا رہے تھے پہلے جمیلہ کا گاؤں آتا تھا۔ اس کے بعد سری نگر شہر کے مضافات شروع ہو جاتے تھے یہ راستہ کمانڈر شیروان کا دیکھا بھالا تھا۔ جمیلہ بھی ان راستوں سے واقف تھی۔ ہم ایک گھنٹے تک پہاڑی راستے پر چلتے رہے۔ اس کے بعد جمیلہ کا گاؤں آگیا۔ جلے ہوئے تباہ حال گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ جمیلہ نے کہا۔

"نیچے گھاٹی کے کنارے میری خالہ کا گھر ہے اماں بابا وہیں ہوں گے ۔ مجھے وہاں لے چلو"

ہم جمیلہ کو لے کر اس کی خالہ کے مکان پر آگئے ۔ مکان بند تھا۔ جمیلہ نے دروازے کو کھٹکھٹایا اندر سے اس کے بابا کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے اس وقت؟"

جمیلہ نے جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابا! میں ہوں جمیلہ"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دروازہ کھلا اس کے ماں باپ اور خالہ اور خالہ کا بیٹا باہر آگئے ۔ ماں باپ کے گلے لگ کر جمیلہ بے اختیار روئے جا رہی تھی۔ جب ان کا جی کچھ ہلکا ہوا تو کمانڈر شیروان نے جمیلہ کے باپ سے کہا۔

"بابا! ہمیں اندر لے چلو۔ ہم تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔"

اندر لکڑی کی دیواروں والے مکان کی کوٹھڑی میں لالٹین روشن کر دی گئی۔ ادھر ادھر فرش پر گرم دریاں اور لحاف پڑے تھے۔ جمیلہ کا باپ اماں خالہ اور اس کا بیٹا ہمارا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کمانڈر شیروان نے نائلون کا تھیلا مجھ سے لے کر کھولا اور اسے الٹا دیا۔ اس کے اندر ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے تین سر بکرے کی سریوں کی طرح گرے۔ ڈوگرہ فوجیوں کے چہرے نیلے پڑ چکے تھے۔ وہ سب ان سروں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"بابا! میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر رہا ہوں۔ یہ تینوں کٹے ہوئے سر ان ڈوگرہ فوجیوں کے ہیں جنہوں نے جمیلہ بہن کو اغوا کیا تھا تمہاری بیٹی اور ہماری بہن کی عزت محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہماری بہن کی بے حرمتی کرتے ہم نے ان کے سر کاٹ کر دھڑ سے الگ کر دیئے تھے۔ اچھا خدا حافظ! اب ہم چلتے ہیں ابھی ہمیں ایک اور ذمے داری پوری کرنی ہے۔"

جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے حوالے کر کے ہم اپنے خفیہ پہاڑی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم اپنے خفیہ اڈے پر پہنچے آسمان پر صبح کی سفیدی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ پہاڑی غار کے اندر جاتے ہی لحاف اوڑھ کر لکڑی کے شہتیروں کی طرح گہری نیند سو گئے۔ کمانڈو کو جب موقع ملے وہ اپنی نیند پوری کر لیتا ہے۔ ہم دو راتوں سے نہیں سوئے تھے۔ چنانچہ جب سو کر اٹھے تو آدھا دن گزر چکا تھا۔

ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ نائلون کے تھیلے میں سے ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سر نکال کر ان کا معائنہ کیا۔ کٹے ہوئے سروں کا رنگ سیاہ پڑنے لگا تھا اور ان میں سے بدبو بھی آنا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے اسی وقت اپنا آدمی بھیج کر بازار سے سپرٹ کی تین بڑی بوتلیں منگوائیں ساری سپرٹ ٹین کے کنستر

میں انڈیل دی اور پھر ڈوگرہ فوجیوں کے تینوں سر اس میں ڈال دیئے۔ تینوں سر سپرٹ میں ڈوب گئے۔ ہمارے دوسرے مجاہد ساتھی بھی ہمارے پاس بیٹھے ڈوگروں کے سروں کو دیکھ کر ہمیں مبارک بادیاں دے رہے تھے۔ شیروان کمانڈر نے کہا۔

"تم لوگوں میں سے ایک مجاہد نے سوال کیا تھا کہ میں نے ان کافروں کے سروں کو اتنا سنبھال کر کیوں رکھا ہوا ہے۔ میں اس سوال کا جواب اب دیتا ہوں۔ میں سروں کو عبرت کا نشان بنا کر بھارتی فوجی گیریزن کے فوجیوں تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کشمیری مجاہد اپنی بے عزتی اور بے حرمتی کا بدلہ لینا جانتے ہیں۔ اگر وہ مرد ہیں تو ہم اس سے میدان جنگ میں ہی لڑیں۔ اگر وہ ہماری عزتوں اور غیرتوں کو للکاریں گے تو ان سب کا حشر ان تین ڈوگرہ فوجیوں ایسا ہو گا"

سب نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

میں اور کمانڈر شیروان اور کمانڈو ہاشم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے شیروان سے پوچھا کہ اس کا منصوبہ کس نوعیت کا ہے۔ اور سکیم کی فارمیشن کیا ہو گی۔

کمانڈر شیروان نے مجھے اور کمانڈو ہاشم کو اپنی سکیم سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"انڈین آرمی کی آرٹلری رجمنٹ کا فوجی یونٹ یہاں سے چھ میل دور ایک پہاڑی کے اوپر گیریزن میں مقیم ہے۔ یہ یونٹ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں بھارتی جارحانہ کارروائیوں کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ ہم رات کے وقت اس گیریزن کے کوارٹر گارڈ کے سامنے ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا پھینکیں گے۔ وہاں تھیلا پھینکنے سے سارے گیریزن کو بہت جلدی معلوم ہو جائے گا کہ گلمرگ کی چھاؤنی میں جن فوجیوں کے دھڑ ملے تھے یہ ان ہی

کے سر ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ایک خط بھی لکھ کر تھیلے میں ڈال دیں گے کہ
یہ سر تم لوگوں کے لئے عبرت بھی ہے اور انتباہ بھی۔ جنگ کے محاذ پر ہم آمنے
سامنے آکر لڑیں گے۔ یا تم مر گئے یا ہم شہید ہو گئے۔ لیکن اگر تم ہماری ماؤں'
بہنوں' بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلنے کی ناپاک حرکت کرو گے تو تمہارا یہی انجام
ہو گا۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہیں"

شیروان نے کمانڈو ہاشم سے کہا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اس مضمون کا ایک خط لکھ کر تیار کرو"

کمانڈو ہاشم دوسری کوٹھڑی میں چلا گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"رات کس وقت جانے کا پروگرام ہے؟"

شیروان نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہی رات کے دو بجے یہاں سے نکلیں گے۔ رات کا پچھلا پہر اس قسم کے
کمانڈو آپریشن کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔"

کمانڈو ہاشم ایک پرچہ لکھ کر لے آئے۔ پرچے پر انگریزی اور اردو میں وہی مضمون
لکھا تھا جو کمانڈر شیروان نے اسے بتایا تھا۔ شیروان نے پرچہ پڑھا۔ پھر مجھے پڑھنے کو دیا
میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک لکھا ہے"

ہم نے رات کے بارہ بجے سماوار میں سبز چائے تیار کروائی چائے کے ساتھ نمکین قلچے
کھائے۔ اپنے اپنے پستولوں اور سٹین گنوں کی صفائی کی۔ اس مشن پر ہم اپنی اپنی سٹین
گنیں بھی ساتھ لے جا رہے تھے۔ شیروان کمانڈو ہاشم کو اس مشن پر ساتھ نہیں لے جا رہا
تھا۔

"ہاشم کی ہمیں ضرورت نہیں ہوگی۔ جتنے کم آدمی ہوں گے اتنی ہی ہمیں
آسانی ہوگی۔ ہمیں کسی کا مقابلہ تو کرنا نہیں۔ کٹے ہوئے سروں والا تھیلا
پہاڑی کی بلندی سے گریزن کے کوارٹر گارڈ میں پھینکنا ہے۔ ہم دو ہی کافی ہوں
گے"

"کیا تم نے گیریزن پہلے سے دیکھا ہوا ہے؟"

شیروان بولا۔

"ایک بار نہیں۔ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ہمیں گیریزن کی کس
طرف جانا ہے اور کس مقام پر سے تھیلا نیچے پھینکنا ہے"

جب رات کا ڈیڑھ بج گیا تو ہم نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سر سپرٹ کے
کنستر سے نکال کر انہیں پرانے کپڑوں سے خشک کیا۔ ان کو نائلون کے تھیلے میں ڈالا۔
ساتھ ہی لفافے میں لکھا ہوا پرچہ بھی ڈال کر رکھ دیا۔ لفافے کے باہر گیریزن کمانڈر کے
لئے لکھا اور نیچے کشمیر کے حریت پرست مجاہد لکھ دیا۔ ہمارے پاس ایک ایک آٹو میٹک
پستول' ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو' ایک ایک سٹین گن اور کچھ فالتو میگزین تھا۔ دستی بم
رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمانڈو ہاشم نے ہمارے لئے دو خچر تیار کر دیئے تھے۔ ٹھیک
دو بجے رات ہم خچروں پر بیٹھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ پہاڑیوں میں چھ میل کا
راستہ تھا۔ شیروان ایک مختصر راستے سے لے جا رہا تھا۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے
ٹارگٹ پر پہنچ گئے انڈین آرٹلری یونٹ کا یہ کیمپ یا گیریزن ایک چھوٹی سی چھاؤنی کی
طرح تھا۔ چاروں طرف خاردار تاروں والی اونچی دیوار تھی۔ کھمبوں پر تھوڑے تھوڑے
فاصلے پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ یہ گیریزن چھوٹے ٹیلے کے اوپر تھا۔ اس کی ایک جانب
نیچے فوجی بارکوں کے باہر بھی روشنی ہو رہی تھی۔

ہم نے خچر کچھ فاصلے پر چھوڑ دیئے تھے۔ ان خچروں کو اپنے آپ واپس چلے جانا تھا۔ کمانڈر
شیروان اور میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ہمارا لباس اس وقت کشمیری دیہاتیوں والا

نہیں تھا۔ ہم نے پتلونیں اور گرم جرسیاں اور جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ رات سرد تھی مگر ہمیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ کمانڈو مشن کی گرمی نے ہمارے خون کو گرم رکھا ہوا تھا۔ شیروان اس طرف سے چڑھائی چڑھ رہا تھا جدھر ٹیلے پر گیریژن کا کوارٹر گارڈ تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے چڑھائی چڑھتے ہوئے گیریژن کی کانٹے دار دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ کمانڈر شیروان مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔

یہ چونکہ کوئی فوجی پکٹ یا فوجی مورچہ نہیں تھا اس لئے یہاں رات کے وقت گشتی پارٹی کا امکان بہت کم تھا۔ ہم نے ایک جگہ رک کر کچھ دیر انتظار بھی کیا کہ اگر کوئی پٹرولنگ پارٹی یہاں گشت پر ہے تو پتہ چل جائے گا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی پارٹی ادھر نہ آئی تو ہم دیوار کے ساتھ جھک کر کوارٹر گارڈ والے ٹیلے کی طرف چلنے لگے۔ وہاں ایک جگہ اونچائی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ ان درختوں کے نیچے خاردار تار کی دیوار کی دوسری جانب کوارٹر گارڈ تھا جہاں برآمدے کے باہر گول دائرے کے اندر رجمنٹ کا جھنڈا کھمبے پر لگا ہوا تھا اور ایک سنتری گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا میرے پاس تھا۔ شیروان نے درختوں کے پاس آکر آگے کو جھک کر نیچے کوارٹر گارڈ کے صحن کو دیکھا۔ پھر تھیلا میرے ہاتھ سے لے کر اسے کوارٹر گارڈ کے صحن کی طرف اچھال دیا۔ ہم وہیں کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی تھیلا ڈیوٹی پر کھڑے سنتری کے پیچھے گرا۔ اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور دوڑ کر تھیلے کو اٹھایا۔ اسے کھول کر الٹا کیا۔ اندر سے تینوں ڈوگروں کے کٹے ہوئے سر اور خط والا لفافہ باہر گر پڑا۔ کٹے ہوئے سروں کو دیکھتے ہی سنتری نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"نکل چلو"

ہم نیچے کو دوڑ پڑے۔ ادھر کسی جگہ کوئی مشین گن پوسٹ تھی۔ گنر نے فائر کھول دیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا گولیوں کے برسٹ کس طرف سے آرہے ہیں اور کس طرف پڑ

رہے ہیں۔ ہم ڈھلان پر زیادہ تیز دوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایک اور مشین گن فائر کرنے لگی۔ نیچے فوجیوں کے دوڑنے بھاگنے ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک اوپر تلے دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ یہ چھتری والے روشنی راؤنڈ تھے۔ ساری پہاڑیاں' پہاڑیوں کی ڈھلانیں روشن ہو گئیں۔ ہم نیچے اترتے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے۔ ہم وہیں جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ روشنی راؤنڈ آہستہ آہستہ نیچے آرہے تھے۔ جب وہ نیچے آکر بجھ گئے اور ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا تو ہم اٹھ کر تیز تیز چلنے لگے۔ شیروان نے کہا۔

"ہم گھاٹی کی طرف نہیں جائیں گے۔ مشین گن پوسٹ اسی طرف ہے"

اب رائفلوں کا فائر بھی آنے لگا تھا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا ہمیں روشنی راؤنڈ کی روشنی میں دیکھ لیا گیا تھا۔ کمانڈر شیروان دائیں طرف کو گھوم گیا۔ اس طرف نشیب میں گہری کھائی کے کنارے کنارے ایک پہاڑی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ ہم اسی پگ ڈنڈی پر دوڑ پڑے۔ فائر ہمارے سروں کے اوپر آرہا تھا۔ ہم نے بھی پستول نکال لئے تھے۔ مگر ابھی تک جوابی فائر نہیں کیا تھا۔ فائر کے انداز سے لگتا تھا کہ ایک پارٹی ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"ہمیں گھاٹی کی طرف سے ہو کر نکل جانا چاہئے"

مگر کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہم ٹھیک جا رہے ہیں"

کمانڈر شیروان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ یہ بات نہ مجھے معلوم تھی نہ کمانڈر شیروان کو معلوم تھی۔ وہ ٹیلے کے پہلو میں سے ہو کر سامنے والی بڑی چٹان کے عقب میں جانا چاہتا تھا۔ میں اس کی بائیں جانب تھا۔ جیسے ہی وہ دائیں جانب مڑا۔ پیچھے سے مشین گن کا برسٹ فائر ہوا۔ کمانڈر شیروان چلتے چلتے رک گیا۔ پھر منہ کے بل گر پڑا۔ میں اسے اٹھانے کے لئے جھکا۔ مگر کشمیر کا یہ جیالا سپوت جہاد کشمیر کا بے باک دلیر مجاہد کمانڈر

شیروان اب کبھی نہ اٹھنے کے لئے گرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا ہاتھ شہید کے لہو میں سرخ ہو گیا۔ ابھی تک میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ شیروان شدید زخمی ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں کے فائر میں گھاٹی میں اتر گیا۔ جیسے جیسے میں گھاٹی میں آگے بڑھ رہا تھا فائرنگ کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ گھاٹی دوسرے ٹیلے کے دامن میں جا نکلتی تھی۔ یہ مختصر پہاڑی رستہ کمانڈر شیروان نے ہی مجھے دکھایا تھا۔ مجھے اس ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف جانا تھا۔ کمانڈر شیروان کا جسم مجھے بے جان اور ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس کی نبض دیکھنے سے ڈر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا شیروان شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں اسے کاندھے پر ڈالے آہستہ آہستہ ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہ بڑا دشوار کام تھا۔ چڑھائی مشکل تھی میرے کاندھے پر شیروان کے جسم کا بوجھ بھی تھا۔ مگر میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں ایک ہاتھ سے جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔ دور پیچھے گیریزن والی پہاڑی کی طرف دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ مگر ان کی روشنی مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ میں تھک گیا سانس لینے کے لئے میں نے کمانڈر شیروان کو وہیں جھاڑیوں میں لٹا دیا۔ ابھی پچھلے پہر کا اندھیرا تھا میں نے شیروان کی گردن پر ایک طرف انگلی رکھ دی۔ مجھے کسی وقت لگتا کہ کمانڈر شیروان کا دل دھڑک رہا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر کہرے کے جیسے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے شیروان کو کاندھے پر ڈالا اور ٹیلے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ جس وقت میں ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا تو آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ ٹیلے کی دوسری جانب کشادہ وادی سحر کے نیلے دھندلکے میں نظر آ رہی تھی ۔ وادی کے آخر میں وہ پہاڑیاں تھیں جہاں ہماری خفیہ پناہ گاہ تھی ۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں

گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ صبح کاذب کی نیلی روشنی سپیدہ سحر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان کے جسم کو غور سے دیکھا۔ اس کی جرسی اور جیکٹ لہو سے سرخ ہو رہی تھی۔ مشین گن کا برسٹ اس کے پیٹ میں سے گزر گیا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر نور سا آگیا تھا۔ کمانڈر شیروان شہید ہو چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کشمیر کے اس غیور بیٹے کی زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔

عجیب بات ہے شیروان کا جسم لاش کی طرح نہیں اکڑا تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی نرم اور نیم گرم تھا جیسے زندہ انسان کا ہوا کرتا ہے۔ صبح کی سپیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ سفیدی سرخی مائل ہونے لگی۔ مشرقی افق پر پہاڑیوں کے پیچھے سرخ روشنی کا غبار سا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ پھر سورج کے سرخ قرص کا لرزتا جھلملاتا ہوا کنارا آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہو گیا۔ جیسے جیسے سورج طلوع ہو رہا تھا اس کی سرخ روشنی گلابی رنگ اختیار کر رہی تھی۔

پھر یہ گلابی رنگ سنہری ہو گیا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو کر میرے سامنے آگیا۔ اس وقت میرے سامنے دو سورج تھے۔ ایک سورج مشرقی پہاڑیوں کے افق پر طلوع ہو رہا تھا اور دوسرا سورج شہید کمانڈر شیروان کی پیشانی سے طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے جھک کر شہید کی دمکتی ہوئی چمکتی ہوئی پیشانی کو چوم لیا۔ مجھے شہید کے جسد خاکی سے جنت کے پھولوں کی خوشبو آئی۔

اس وقت مجھے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آگیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ جو مومنین اللہ تعالیٰ کی خاطر جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور ان کو اپنے رب کی طرف سے رزق پہنچتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

ہمارا مشن موت کا مشن تھا۔ کمانڈر شیروان اپنا مشن پورا کر کے اللہ کی راہ میں شہید

ہو گیا تھا اور موت اسے تلاش ہی کرتی رہ گئی تھی۔ میں نے زندہ شہید کے جسد خاکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور وادی میں اترنے لگا۔ طلوع ہوتے سورج کی سنہری کرنیں شہید کی پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ شہید شیروان کے جسم سے ایک نئے سورج کی سنہری کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ آزادی کشمیر کا سورج تھا۔ کشمیر کے بہادر بیٹوں کی قربانیوں اور شہادتوں کا سورج تھا۔ جس نے بہت جلد طلوع ہو کر سارے کشمیر کو آزادی کی نورانی کرنوں سے منور کرنا تھا۔

جیسے ہی ہم تینوں کمانڈو شیو پاروتی مندر کے قریب پہنچے ہم نے ترنگ میں آکر جھوم جھوم کر گانا شروع کر دیا۔

جے جے شو شنکر

کانٹا لگے نہ کنکر

کہ پیالہ تیرے نام کا پیا

چونکہ مجھے ہندو دیو مالا اور ان کی دیوی دیوتاؤں کی تاریخ پر کافی عبور حاصل تھا اس لئے یہ تین بول میں نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیئے تھے اور ہم اکٹھے مل کر گا رہے تھے۔ اس وقت مندر کے باہر صرف تین چار یاتری ہی بیٹھے تھے۔ ایک سادھو بھی ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔

پجاری اپنی کوٹھڑی کے آگے چارپائی پر کمبل اوڑھ کر بیٹھا ناریل کی گڑگڑی پی رہا تھا۔ انہوں نے ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس طرح یاتری وہاں اکثر ماتھا ٹیکنے آتے ہی رہتے تھے۔

ہم اسی طرح جھوم جھوم کر گاتے مندر کے اندر چلے گئے۔ اندر شیو دیوتا اور اس کی پتنی پاروتی کی مورتیاں تھیں۔ ان کے آگے جا کر ہم نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا۔ اور پھر اسی طرح گاتے ہوئے باہر صحن میں آکر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں سے ہمیں مندر کی دائیں جانب والی وہ دیوار نظر آ رہی تھی جہاں مندر کے تہ خانے کا دروازہ تھا جس کے آگے چار انڈین فوج کی کسی یونٹ کے سنتری پہرہ دے رہے تھے۔

طرف کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اس طرح یاتری وہاں اکثر ماتھا ٹیکنے آتے ہی رہتے تھے۔

ہم اس طرح جھوم جھوم کر گاتے مندر کے اندر چلے گئے۔ اندر شیو دیوتا اور اس کی پتنی پاروتی کی مورتیاں تھیں۔ ان کے آگے جا کر ہم نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا۔ اور پھر اسی طرح گاتے ہوئے باہر صحن میں آکر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے

جہاں سے ہمیں مندر کی دائیں جانب والی وہ دیوار نظر آ رہی تھی جہاں مندر کے تہ خانے کا دروازہ تھا جس کے آگے چار انڈین فوج کی کسی یونٹ کے سنتری پہرہ دے رہے تھے۔

ہم اپنی طرف سے بڑے بے نیاز ہو کر بلکہ مگن ہو کر بیٹھے تھے جیسے ہمیں سوائے شو پاروتی کی پوجا اور بھگتی کے اور کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ جب کہ حقیقت میں ہمیں شو پاروتی کی پوجا سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا اور ہم وہاں کوئی اور ہی مشن لے کر آئے تھے جس کے کامیاب ہونے کی صورت میں شو پاروتی کے مندر کے بھی پرخچے اڑ جانے تھے۔ ہم تینوں جہاں بیٹھے تھے وہاں ارد گرد کوئی اور آدمی نہیں تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تہ خانے کا یہی دروازہ ہے نا؟"

کشمیری گائیڈ کمانڈو بولا۔

"یہی دروازہ ہے۔ اس کے اندر سیڑھیاں ہیں جو نیچے پہاڑی کے قدرتی غار میں جاتی ہیں۔ وہاں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے ہیں"

کمانڈر شیروان بھی کنکھیوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا جو ہم سے تھوڑی دور ذرا نیچے پہاڑی کی ڈھلان پر باہر کو نکلی ہوئی چٹان کے چبوترے پر تھا۔ کشمیری گوریلے گائیڈ نے کہا۔

"چاروں سنتری ہر وقت یہاں موجود ہوتے ہیں۔ آٹھ آٹھ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں۔"

میں دروازے اور اس کے ارد گرد کے ماحول کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں بیک وقت ان چاروں سنتریوں کو قابو کرنا ہو گا۔ جو آسان کام نہیں ہے۔ یہ کوئی معمولی پہریدار نہیں ہیں۔ انڈین آرمی کے تربیت یافتہ پیشہ ور فوجی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا تعلق کمانڈو فورس سے ہو"؟

ہم تھوڑی دیر کے لئے بالکل خاموش ہو گئے۔ ہم میں سے ہر کوئی یہی سوچ رہا ت
اگر ہم رات کو شب خون مارتے ہیں تو ان چار فوجیوں کو کیسے اپنے راستے سے ہٹایا جا
ہے۔ کمانڈر شیروان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پلاسٹک بم کا زیادہ سے زیادہ دورانیہ کتنا ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے کا وقفہ دیا جا سکتا ہے۔"

اور کم سے کم؟" کشمیری کمانڈو نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔

"کم سے کم اتنا ہی وقفہ دیا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی بم لگا کر باہر آسکے اور واردات
جگہ سے محفوظ علاقے تک پہنچ سکے"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"اگر ہم ان چاروں سنتریوں کو ہلاک کرتے ہیں تو پلاسٹک بموں کو صبح ہونے
پہلے پھٹ جانا چاہئے۔ اگر ہم انہیں صرف بے ہوش کر کے اندر جاتے ہیں تو دورا
زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ویسا کرنا نہیں چاہئے۔ ہم کر بھی نہیں سکتے کیونکہ ہو
آجانے کے بعد یونٹ کا عملہ ایمونیشن کی چیکنگ ضرور کرے گا۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ان لوگوں کو اتنا ٹائم دینے کی کیا ضرورت ہے ہمیں کسی نہ کسی طرح
خانے کے اندر جا کر پلاسٹک بم چپکانے ہیں۔ اس کے بعد صرف آدھ گھنٹے کا وقفہ د
ہو گا۔ آدھ گھنٹے میں ہم ان پہاڑیوں میں کسی محفوظ مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ ا
میں کوئی شک نہیں کہ اتنا بڑا اسلحہ کا ذخیرہ پھٹنے سے پہاڑوں میں زلزلے آنا شروع
جائیں گے"

کمانڈر شیروان نے گردن موڑ کر نیچے پہاڑی نشیب میں دیکھا اور پھر میری طرف
کر کے آہستہ سے بولا۔

"ان سنتریوں تک پہنچنے کے لئے اس مندر سے ہی نیچے اترنا ہو گا۔ دوسرا کوئی راستہ
ہمیں نظر نہیں آتا"

کشمیری کمانڈو گائیڈ نے آہستہ سے کہا۔

"سر! دوسری طرف سے ایک پہاڑی پگ ڈنڈی دروازے تک آتی ہے۔ یہ پگ
ڈی کافی چوڑی ہے۔ پیچھے سڑک ہے ٹرک اس سڑک پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فوجی
ان اسلحہ اور گولہ بارود کے کریٹ سروں پر اٹھا کر ٹرکوں سے لاتے اور لے جاتے
ں۔"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

یا خیال ہے۔ ہمیں آج رات اٹیک کر دینا چاہئے"

ں اور کشمیری کمانڈو گائیڈ نکھیوں سے تہہ خانے کے دروازے پر اٹن شن کھڑے بھارتی
تریوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے کشمیری کمانڈو سے پوچھا۔

ہاری کیا رائے ہے؟"

نے کہا۔

"سر! ہم جب بھی اٹیک کریں گے یہاں چار سنتری اسی طرح کھڑے ہوں گے۔ بہتر
کل کی بجائے آج رات ہی حملہ کر دینا چاہئے۔"

میں نے کمانڈر شیروان کا ہاتھ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔

"اوکے کمانڈر! ہم آج رات اٹیک کریں گے۔ ٹائم رات کے دو بجے کے بعد کا
ہے"

دو بجے کے بعد کا وقت ہم کمانڈو لوگ حملے کے لئے اس لئے رکھا کرتے تھے کہ
ن کی فطرت ہے کہ خواہ وہ کیسی ہی سخت ڈیوٹی پر کیوں نہ ہو اس وقت اس پر قدرتی
ر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ جاگنے اور سونے کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ کمانڈر
ان بولا۔

"ٹھیک ہے ہمیں اپنے ریزرو ساتھی کو خبر کر دینی چاہئے"

میں نے کہا۔

"یہ کام میں کرتا ہوں۔ دوسرے میں پیچھے سے جا کر وہ جگہ بھی دیکھ آؤں گا جہاں سے ہمیں پہاڑی پگ ڈنڈی پر سے ہو کر تہہ خانے کے دروازے تک آنا ہوگا"

کمانڈر شیروان بولا۔

"تم پگ ڈنڈی کی جانب سے آؤ گے"

پھر کشمیری کمانڈو گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اور تم پہاڑ کی ڈھلان کی طرف سے اوپر آؤ گے میں اس مندر کی دیوار والی سیڑھیوں سے ٹارگٹ تک پہنچوں گا۔ میں اس طرف والے دو فوجیوں کو اپنے نشانے کی زد میں لے کر دو فائر کروں گا۔ تم دوسری طرف سے آکر دوسرے دو فوجیوں کو ختم کرو گے۔"

پھر اس نے کشمیری کمانڈو گائیڈ سے کہا۔

"تم آدھا گھنٹہ پہلے نیچے ڈھلان کی جھاڑیوں اور پتھروں میں آکر چھپ کر بیٹھ جاؤ گے۔ اگر ہم میں سے کسی کا نشانہ خطا ہو جائے گا تو اسے تم فائر کر کے ہلاک کر دو گے ریزرو کمانڈو کچھ فاصلے پر ٹیلے کے درختوں میں چھپ کر بیٹھا ہوگا۔ اگر صورت حال بگڑ جاتی ہے تو وہ مشین گن کی اندھا دھند فائرنگ کر کے ہمیں فرار ہونے کا موقع مہیا کرے گا۔ کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے سائی لینسر والے پستولوں کی آواز نیچے بارک میں کسی فوجی جوان کو جگا دے۔ یا کوئی فوجی پہلے سے جاگ رہا ہو اور وہ اسے سن لے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے دو سنتریوں کے گرنے کے ساتھ ہی دوسرے فوجی خطرہ بھانپ کر فائرنگ شروع کر دیں اور فائرنگ کی آواز سے بارک کے سارے فوجی بیدار ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں ٹھیک ٹھیک نشانوں پر پستول کے فائر کرنے ہوں گے۔ یہ تربیت اور تجربے کا امتحان ہے۔ ہمیں اسی دن کے لئے تربیت دی گئی ہے۔ ہمارا

ی حالت میں بھی خطا نہیں جانا چاہئے اور چاروں بھارتی سنتریوں کو ایک ساتھ گرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے مر کر گرنے میں دو سیکنڈ کا وقفہ پڑ سکتا ہے۔ اس سے وقفہ پڑ گیا تو نہ صرف یہ کہ ہمارا مشن ناکام ہو جائے گا بلکہ ہم بھی گھیرے میں یں گے۔"

کمانڈر شیروان نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"دوست! یہ دونوں کام ہم دونوں نے کرنے ہیں اور ہم دونوں تجربہ کار تربیت یافتہ شانے باز ہیں۔ ہمارے پستول سے نکلی ہوئی گولی ٹھیک نشانے پر جا کر لگے گی۔ ہمارے سے گولی نکلتی ہی نشانے پر لگنے کے لئے ہے"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو" میں نے کہا

اء اللہ ایسا ہی ہوگا"

ی کمانڈو گائیڈ کہنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں اگر خدا نہ کرے آپ میں سے کسی کا نشانہ سنتری کے عین وقت ر ادھر ہل جانے سے خطا ہو گیا تو اسے میں اپنے فائر کی زد میں لے لوں گا۔ اول تو ں سنتری چوکیداروں کی طرح ادھر ادھر چل پھر کر پہرہ نہیں دیتے۔ وہ ایک جگہ پر ن کراٹن شن کھڑے ہوتے ہیں اور یہ بڑا آسان نشانہ ہوتا ہے۔"

اتنے میں شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ اس دوران نیچے سے ارد گرد کے گاؤں کے ں کے بھجن کرتن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"دوسرے یاتری آرہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے ریزرو کمانڈو ساتھی کے پاس جا کر اسے سارا پلان بتا دو۔ ہم اسی جگہ بیٹھے ہیں"

یں اٹھا اور جھوم جھوم کر گاتے ہوئے مندر سے باہر نکل گیا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ علوم تھا کہ اپنا چوتھا ریزرو کمانڈو ساتھی بائیں جانب ٹیلے کی ایک جانب کسی جگہ کر بیٹھا ہوگا۔ میں اسی طرف آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ یہاں اندھیرا تھا پتھر اور جھاڑیاں خت تھے ایک جگہ سے ہمارا ساتھی کمانڈو اچانک نکل کر میرے سامنے آگیا۔

"سر! کیا بات ہے؟"
اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ میں نے اسے وہیں ایک طرف اندھیرے میں بٹھالیا اور اسے سارا پلان بتانے کے بعد کہا۔

"آج رات دو بج کر پانچ منٹ پر ہمارا کمانڈو آپریشن شروع ہو جائے گا۔ اپنی گھڑی میری گھڑی سے ملالو۔"

ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں کا وقت ملالیا۔ میں نے اسے سارا حدود اربعہ بتا دیا اور کہا کہ جب ہم سنتریوں کو ہلاک کرنے کے بعد تہہ خانے میں جائیں گے تو وہ ایسی جگہ پر سٹین گن لے کر گھات میں بیٹھ جائے گا جہاں سے دروازہ اس کے بالکل سامنے ہوگا۔

"ہمیں تہہ خانے کے اندر زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگیں گے۔ ہمیں صرف وہاں حساس جگھوں پر پلاسٹک کی ٹیپیں ہی لگانی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے سر ہم پوری طرح سے الرٹ رہے گا"

میں نے اسے بتایا کہ آپریشن کے فوراً بعد ہم لوگ نیچے پرانی بارہ دری کے پاس ملیں گے۔ وہاں سے ہم کسی دوسری جگہ جائیں گے۔ اس کے بعد میں واپس مندر میں آگیا جہاں گاؤں کے یاتریوں نے شور مچا رکھا تھا۔ خوب ڈمرو بجا کر رقص کر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان اور کشمیری گائیڈ کمانڈو ایک طرف صحن میں بیٹھے تھے۔ ہم سب یاتریوں کے بھیس میں تھے کوئی ہمیں دیکھ کر بالکل نہیں پہچان سکتا تھا کہ ہم کتنے خطرناک کمانڈو ہیں اور وہاں کس قدر خطرناک مشن پر آئے ہوئے ہیں۔

یاتریوں کا ہنگامہ وہاں رات دس بجے تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ ہم بھی مندر سے نکل کر پہاڑی کی دوسری جانب ایک جگہ درختوں کے نیچی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم اپنے ساتھ چنے اور گڑ لائے تھے۔ ہم تینوں نے چنے اور گڑ کھائے مندر کے نل پر جا کر باری باری پانی پیا اور واپس اسی جگہ پر آکر چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے بھی اپنی گھڑیاں ملالی تھیں۔ ہماری تینوں گھڑیوں پر وقت ایک ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ گیارہ بج گئے۔ پھر بارہ بج گئے۔ پھر رات کا

بج گیا۔ ہمیں جنگل میں چھپ کر مشکل سے مشکل حالات میں وقت گذارنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ ہمیں نہ کوئی دقت محسوس ہو رہی تھی نہ نیند آرہی تھی۔ ماںڈو کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جہاں اسے جاگنا ہوتا ہے وہاں وہ جاگتا ہے وہاں ں کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ جہاں اسے سونا ہوتا ہے وہ لکڑی کے شہتیر کی طرح ہے اور سو جاتا ہے۔ پھر اسے دین دنیا کی کوئی خبر نہیں ہوتی اور ایک گھنٹہ سو کر بارہ ں کے جگراتے کی نیند پوری کرلیتا ہے۔ اس وقت پاکستان کے نوجوانوں کو ایسے ہی بننے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے دشمن بہت ہیں۔ دوست کم ہیں۔ اسے شنوں سے ہوشیار رہ کر اپنے وطن پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔

جب رات کے ٹھیک دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تو ہم اپنی اپنی گھڑیوں کی چمکتی ہوئی ں کو دیکھ رہے تھے۔ جب سوئی نے پانچ منٹ ظاہر کئے تو ہم اللہ کا نام لے کر اٹھ ہوئے۔ اپنے اپنے پستول ہم نے پندرہ منٹ پہلے ہی چیک کر لئے تھے۔ ہم تینوں ے دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ خدا کو یاد کیا۔ کلمہ شریف پڑھا میں نے آہستہ سے کہا۔

'دوستو! ہم اسلام کی حرمت کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے مشن پر جا ں۔ زندہ رہے تو پرانی بارہ دری میں ملاقات ہوگی۔ مرگئے تو اگلے جہان میں ملیں

ماکرو کہ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو اپنے ٹارگٹ کو مار کر شہید ہوں۔ اللہ بیلی!"

ات کے اندھیرے میں ہم تینوں اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف نکل گئے۔ کمانڈر کو مندر کی جانب سے پہاڑی ڈھلان پر نیچے اتر کر اپنے ٹارگٹ کے دو بھارتی کو فائر کر کے مارنا تھا۔ مجھے پگ ڈنڈی کی طرف سے آکر دوسرے دو سنتریوں کو نا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی پوزیشنوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کوئل کی آواز فائر کرنے کا وقت مقرر کرتا تھا۔ کوئل کی آواز کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان نے اپنی کے دو سنتریوں کو مار گرانا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی طرف کے دو سنتریوں کرنے تھے۔ ہم لوگ اندھیرے میں بھی نشانے پر فائر جھونکنے میں ماہر تھے۔ ہمیں

اندھیری راتوں میں اپنے ٹارگٹ پر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے کی سخت تربیت دی گئی تھی۔
میں اپنی پوزیشن پر جا کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ذرا نیچے تہ خانے کے دروازے والی ذرا باہر کو نکلی ہوئی چٹان کا چبوترہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں چاروں سنتری دو ایک جانب اور دو دروازے کی دوسری جانب اٹن شن کھڑے تھے۔ ان کی سٹین گنیں ان کے ہاتھوں میں تھیں مجھے یقین تھا کہ کمانڈر شیروان ہی اور ہمارا کشمیری گائیڈ کمانڈر بھی اپنی اپنی پوزیشنوں پر موجود ہوں گے۔ میں نے الٹی گنتی شروع کر دی۔ دس سے نو آٹھ اور پیچھے کی طرف گنتی کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے اپنی طرف کے دونوں سنتریوں کو نشانہ میں لینے کی مشق کر لی تھی۔

ٹھیک جب الٹی گنتی کرتے کرتے میں نے اپنے منہ سے کوئل کی ایسی آواز نکالی جیسے بڑی دور کسی درخت پر کوئل بولی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اللہ کا نام لے کر اپنی طرف کے دونوں اٹن شن کھڑے بھارتی سنتریوں میں سے پہلے ایک کو پستول کی زد میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دوسرے سنتری پر فائر کر دیا۔ مجھے اپنے پستول کے بند فائر کی آواز کے ساتھ دو اور فائروں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف کے دونوں سنتری بھی ایک پیچھے کو اور دوسرا منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ یہ دونوں فائر کمانڈر شیروان نے کئے تھے جو ٹھیک ٹارگٹ پر جا کر لگے تھے۔

جیسے ہی چاروں سنتری گرے ہم جھاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ سے نکل کر نیچے چبوترے پر آگئے۔ ہم نے سب سے پہلے گرے ہوئے بھارتی سنتریوں کو چیک کیا۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ انہیں گولیاں کہاں لگی تھیں مگر ان کی نبضیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ مر چکے تھے۔

ہم نے انہیں گھسیٹ کر اندھیرے میں ایک طرف ڈال دیا اور دروازے کو دیکھا۔ دروازہ لوہے کا تھا اور تالا لگا ہوا تھا۔ کمانڈر شیروان نے قمیض کے اندر سے لوہے کا چھوٹا راڈ نکالا۔ اسے تالے کے کنڈے میں ڈال کر اپنی طرف کو جھٹکا دیا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ پتھر کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ نیچے ایک کافی بڑا قدرتی غار تھا جہاں ہر

قسم کا فوجی اسلحہ گولہ بارود اور مارٹر گنوں کے گولے اور مارٹر گنیں، گرنیڈوں کے کریٹ اور راکٹ اور راکٹ لانچر بھاری تعداد میں تھے، اتنا اسلحہ اور گولے بارود کا ذخیرہ میں نے بھارت کی کسی چھاؤنی کے ایمونیشن ڈمپ میں نہیں دیکھا تھا۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

میں نے جیب سے سیاہ رنگ کی پلاسٹک کی ٹیپ نکالی جو چوڑی سکاچ ٹیپ کی طرح رنگ کی شکل کی تھی۔ اس ٹیپ کے ساتھ انتہائی دھماکہ خیز مواد چمٹا ہوا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو۔ میں ٹیپ لگا کر آتا ہوں"

شیروان کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تہ خانے میں مدھم روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں نے خاص خاص مقامات پر دھماکہ خیز پلاسٹک کی ٹیپ چپکائی اور کمانڈر شیروان کے پاس تیزی سے آکر کہا

"نکل چلو۔ کام ہو گیا ہے۔"

ہم نے دروازے کو آہستہ سے بند کیا اور اندھیرے میں جھک کر چلتے ہوئے اوپر ٹرک کی طرف جانے کی بجائے نیچے پہاڑی کے نشیب میں اترنے لگے۔ ڈھلان اترنے کے بعد ہمارا ریزرو کمانڈو بھی آگیا کہنے لگا۔

"کیا کام ہو گیا؟"

"ہاں ہمارے پیچھے پیچھے ہمیں کور کر کے چلے آؤ"

ہم جتنی جلدی اترائی اتر سکتے تھے اترتے چلے گئے۔ ٹیلے کی ڈھلان ختم ہو گئی۔ کمانڈر شیروان نے مجھ سے پوچھا۔

"پلاسٹک بموں کا کتنا ٹائم رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔

"صرف آدھا گھنٹہ"

"میرے خدا! یہ تو بہت تھوڑا وقت ہے" کمانڈر شیروان بولا

میں نے کہا۔

"میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا یہ میری مجبوری تھی"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"بیس منٹ ابھی ہیں۔ اس دوران میں ہم کافی دور نکل جائیں گے۔"

ہم تینوں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ہم پہاڑی کی اترائی اتر چکے تھے۔ پھر ایک درے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چٹانوں کے درمیان بڑا تنگ اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا راستہ تھا۔ اندھیرے میں ہم جھاڑیاں ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک ٹیلے کا موڑ گھومے تو آگے چھوٹی سی وادی آ گئی جہاں ستاروں کی روشنی میں سفیدے کے چھریرے چھریرے اوپر کو اٹھے ہوئے درختوں کی قطار نظر آئی۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہمیں یہاں رک کر ٹارگٹ کے اڑنے کا انتظار کرنا چاہئے"

ہم تینوں ایک جگہ زمین پر بیٹھ گئے۔ میرے حساب سے پلاسٹک بموں کو پھٹ کر اسلحہ کے سارے ذخیروں کو تباہ کرنے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ کمانڈر شیروان اور میں اندھیری رات میں بائیں جانب دوسری پہاڑی کے اوپر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

اچانک ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی زمین ہلنا شروع ہو گئی۔ ہم تینوں کمانڈو زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ ہم نے سر اٹھائے ہوئے تھے اور اندھیرے میں اندازے سے شیو پاروتی مندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس طرف بلا کی چمک پیدا ہوئی کہ ہماری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پھر ایک کڑاکا ہوا اور مندر کی جانب جیسے پہاڑ پھٹ گیا اور اس میں سے شعلے نکل کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ اب ایک قیامت آ گئی تھی۔ اتنے زور دار دھماکے ہو رہے تھے جیسے پہاڑیاں اور ٹیلے پھٹ رہے ہوں۔ راکٹ شوکریں مارتے اوپر کو فائر ہو رہے تھے۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ آگ کے شعلوں کا رنگ کبھی سرخ کبھی نیلا اور کبھی سفید ہو رہا تھا۔ زمین ہل رہی تھی۔ زمین کے اندر گڑگڑاہٹ کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ جس ٹیلے کے نیچے گولہ بارود کا ذخیرہ تھا وہ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ شیو پاروتی کا

مندر بھی ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

کمانڈر شیروان نے بے اختیار نعرہ لگایا

"اللہ اکبر! یا علی"

اس کے جواب میں ہم نے بھی بے اختیار نعرہ لگایا

"اللہ اکبر! یا علی"

آسمان پر آتش بازی کا منظر تھا۔ نیلے سرخ سفید شعلوں نے سارے علاقے کو دن کی طرح روشن کر دیا تھا۔ کمانڈر شیروان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے نکل چلنا چاہئے"

اس دوران ہمارا چوتھا ریزرو کمانڈو بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ ہم اٹھے اور پہاڑی کی اترائی اترنے لگے۔ ہم تیز تیز اتر رہے تھے اور جھاڑیوں پتھروں کو پھلانگتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ شارٹ کٹ راستہ تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہم پہاڑی کی دوسری جانب ایک سڑک پر نکل آئے۔ آسمان شعلوں سے اسی طرح روشن تھا۔ دھماکوں کی آوازوں سے اردگرد کی پہاڑیوں میں ایسی گونج پیدا ہو رہی تھی جیسے سارے علاقے کی پہاڑیاں آتش فشاں بن کر پھٹ رہی ہوں۔ اب دور سے مشین گن فائر کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ بھارتی کیمپ کے فوجی شاید اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ یہ سڑک وہی تھی جس پر سے بھارتی فوجی کانوائے ایمونیشن کی سپلائی لے کر سری نگر جایا کرتے تھے۔ سڑک آگے جا کر نیچے اترائی میں اتر گئی تھی۔

نیچے وادی شروع ہو جاتی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ کسی کسی وقت ایمونیشن کے پھٹتے گولوں کی وجہ سے آسمان پر چمک پیدا ہو جاتی تھی جس سے وادی ایک لمحے کے لئے روشن ہو کر ہمیں راستہ دکھا دیتی تھی۔

سری نگر کی وادی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم دو کمانڈو سڑک کی ایک جانب اور دو کمانڈو سڑک کی دوسری جانب چل رہے تھے۔ ہمارا ریزرو کشمیری کمانڈو جس کے

پاس سٹین گنیں اور دستی بم تھے وہ ہم سے تھوڑا ہٹ کر اس طرح چل رہا تھا کہ سڑک پر
کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خطرناک صورت پیدا ہو جانے کی صورت میں ہماری حفاظت
کے لئے ہم سے فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ اچانک سامنے سڑک کے موڑ پر کسی ٹرک کی
آواز آئی۔ پھر اس کی بتیاں نظر پڑیں۔ ہم جلدی سے سڑک کنارے جھاڑیوں کی اوٹ
میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ ایک فوجی ٹرک تھا جو پوری رفتار سے چلا آرہا تھا۔ اس کے
پیچھے ایک اور ٹرک آرہا تھا۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے دیکھ رہے تھے۔ پورے چار فوجی ٹرک
تھے جن میں فوجی مشین گنیں لگائے کھڑے تھے۔ ٹرک بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔ یہ
اس طرف جا رہے تھے جدھر سے دھماکوں کی آوازیں اور شعلوں کی چمک ابھی تک آسمان
پر بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔

جب فوجی ٹرک گزر گئے تو ہم سڑک کو چھوڑ کر نیچے گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں سے
ہماری خفیہ پناہ گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ جب ہم پناہ گاہ میں پہنچے تو ہمارے مجاہد حریت پسند
ساتھی جاگ رہے تھے۔ وہ دھماکوں کی ہلکی ہلکی گونج سن رہے تھے اور آسمان پر چمکتی
روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جاتے ہی نعرہ لگایا۔

"اللہ اکبر یا علی!"

پناہ گاہ نعروں کی آواز سے گونج اٹھی۔

کمانڈر شیروان نے ہم سب کو کامیابی سے مشن مکمل ہو جانے پر مبارک باد دی اور
کہا

"اللہ کی مدد ہمارے ساتھ تھی۔ ورنہ یہ ٹارگٹ اتنا آسان نہیں تھا۔ اب کم از کم
ایک مہینے تک یہاں بھارتی فوج کو ایمونیشن کی تازہ سپلائی نہیں مل سکے گی اور یہی ہمارا
مشن تھا"

میں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ بھارتی فوج اس تباہی کا بدلہ سری نگر کے دیہات
میں کشمیری مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا کر اور معصوم کشمیریوں کو شہید کر کے لے گی
کمانڈر شیروان بولا۔

"ہمیں اس کے مقابلے کے لئے بھی تیار رہنا ہو گا ابھی تم سب لوگ سو جاؤ۔ صبح
دیکھیں گے انڈین آرمی کیا کرتی ہے اور ہمیں اس کے جواب میں کیا کارروائی کرنی ہوگی"

ہم تینوں کمانڈو وہیں زمین پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی ہم نیند کی آغوش میں
چلے گئے۔ دن کافی نکل آیا تھا جب کمانڈر شیروان نے اپنے غار سے نکل کر ہمیں جگا دیا۔
اس کے ساتھ ایک کشمیری کمانڈو بھی تھا جس نے سٹین گن اٹھا رکھی تھی۔

کمانڈر شیروان میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انڈین آرمی کی ایک یونٹ کے فوجی وادی کے دیہات
میں مکانوں کو مارٹر گنوں کے فائر سے تباہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہئے۔"

کمانڈر شیروان بولا۔

"ہمارے ساتھی نیچے سڑک پر جیپ میں تیار بیٹھے ہیں۔ تم بھی نیچے آجاؤ۔"

میں اسی طرح اٹھا۔ کونے میں رکھی ہوئی سٹین گن اٹھائی اور اللہ پاک کے نام کا ورد
کرتا پناہ گاہ سے نکل کر گھاٹی اتر کر نیچے کچی پہاڑی سڑک پر آگیا۔ یہاں ایک سویلین
جیپ کھڑی تھی۔ اس میں ہمارے پانچ مجاہد عام کشمیری شہریوں کے لباس میں اپنی لمبی
قمیضوں کے اندر سٹین گنیں چھپائے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی
بات نہیں کر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان بھی دوسری طرف سے آگیا۔ میں اور کمانڈر
شیروان بھی عام کشمیری شہریوں کے لباس میں تھے۔ کمانڈر شیروان جیپ کی ڈرائیونگ
سیٹ پر اور میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنا اپنا اسلحہ لمبے کشمیری کرتوں
کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ لباس سے ہم جنگلاتی لکڑی کا کاروبار کرنے والے ٹھیکیدار لگ
رہے تھے۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ سٹارٹ ہوئی اور تیزی سے
پہاڑی سڑک پر نیچے کی طرف جانے لگی پہاڑ کے کچھ موڑ کاٹنے کے بعد ہم ایک وادی میں
آگئے دور درختوں میں ساتھ ساتھ دو تین گاؤں نظر آئے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا

تھا۔ فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک دور سے دھماکے کی گونج سنائی دی۔ یہ مارٹر توپ کے گولے کا دھماکہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک جگہ سے دھواں اوپر کو اٹھا اور لوگوں کے شور کی آوازیں آئیں۔ کمانڈر شیروان نے اس طرف جیپ ڈال دی۔

میں نے کہا۔

"وہاں فوج کی نفری زیادہ ہو گی۔ ہمیں گھات لگانی چاہئے۔"

"کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تم دیکھتے جاؤ"

جیپ اونچے اونچے سفیدے کے درختوں کے پاس پہنچی تو وہاں ایک طرف تین فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے جیپ ایک چٹان کے پیچھے لا کر کھڑی کر دی۔ ہم چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ کمانڈر شیروان نے دوربین لگا کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ پھر دوربین مجھے دے دی اور کہا۔

"گاؤں کا ایک مکان بھی نہیں بچا"

میں نے دیکھا کہ گاؤں کے تقریباً سارے مکان جو لکڑی کے تھے ڈھے چکے تھے اور کچھ مکانوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دو فوجی ایک طرف سٹین گنیں لئے پوزیشنوں میں کھڑے تھے اور وقفے وقفے سے برسٹ فائر کر رہے تھے۔ ہمارے ایک کمانڈو نے کہا۔

"سر! یہ لوگ ٹیلے والی سڑک سے واپس کیمپ میں جائیں گے۔ ہمیں وہاں سڑک پر پوزیشنیں سنبھال کر ان کا انتظار کرنا چاہئے تاکہ ان میں سے ایک بھی بھارتی فوجی زندہ واپس نہ جانے پائے۔"

یہ سنتے ہی کمانڈر شیروان اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو اوپر والی پہاڑی سڑک پر"

ہم سب لوگ یعنی چاروں کمانڈو اور چار حریت پسند مجاہد جیپ میں بیٹھے اور جیپ پہاڑی راستے پر تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگی۔ کوئی دس منٹ بعد ہم چڑھائی چڑھ کر پہاڑی ٹیلے پر ایک جگہ جیپ روک کر اتر پڑے۔ جیپ کو سڑک سے ہٹا کر درختوں

اور جھاڑیوں میں چھپایا۔ مجاہدوں نے دستی بم رائفلیں اور سٹین گنیں اٹھالیں۔ ہم نے کمانڈوز نے بھی چھ چھ دستی بم اور سٹین گنیں لیں اور سڑک کے اوپر پہاڑی ڈھلان پر جھاڑیوں کے پیچھے مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ سڑک کی ایک جانب پہاڑ کی ڈھلان تھی۔ دوسری جانب گہری گھاٹی تھی۔ ہم بھارتی گاڑیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے دوربین سے گاؤں کے باہر دو فوجی ٹرک دیکھے تھے جو اوپر سے کھلے تھے اور ان میں ایک ایک فوجی مشین گن لگائے کھڑا تھا۔ میں نے اپنے مجاہدوں کو ہدایت کر دی تھی کہ جیسے ہی بھارتی فوجی ٹرک سڑک پر ہماری رینج میں آئیں ان پر دستی بموں کی بارش کر دینی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سٹین گنوں اور رائفلوں کا فائر کھول دینا ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گذرتا معلوم ہو رہا تھا۔

ہم بکھر بکھر کر ڈھلان کے پتھروں کے پیچھے پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔ آخر ہمیں دور سے ٹرکوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے منہ سے کوئل کی آواز نکال کر سب کو الرٹ کر دیا۔ پھر پہاڑی موڑ پر ایک بھارتی فوجی ٹرک نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دوسرا ٹرک تھا۔ دونوں ٹرک اوپر سے کھلے تھے۔ دونوں ٹرکوں میں بھارتی فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ آگے کی جانب ایک ایک فوجی مشین گن لگائے کھڑا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم پوری طرح سے الرٹ ہو گئے چڑھائی پر آ کر فوجی ٹرکوں کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ دونوں ٹرکوں کے درمیان پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگلا ٹرک جیسے ہی ہماری رینج میں آیا میں نے اور کمانڈر شیروان نے یکے بعد دیگرے تین تین دستی بم پن نکال کر ٹرک پر پھینکے۔ چھ میں سے پانچ دستی بم اگلے ٹرک میں گرے اور گرتے ہی زبردست دھماکے ہوئے۔ میں نے ایک بھارتی فوجی کو اچھل کر ٹرک سے باہر گرتے دیکھا۔ اس دوران دوسرے مجاہدوں نے دوسرے ٹرک پر دستی بموں کی بارش کر دی اور ساتھ ہی رائفلوں اور سٹین گنوں کا فائر کھول دیا۔ دونوں ٹرکوں میں افراتفری مچ گئی۔ ایک ٹرک میں آگ لگ گئی۔ بھارتی فوجیوں میں سے تین فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودتے دیکھے گئے۔ ان سب کی نفری دس گیارہ تھی۔ ان میں دو آفیسر بھی تھے۔ انہوں نے بھی سڑک

پر پوزیشن لے لی اور پہاڑی ڈھلان پر جہاں ہم گھات لگائے ہوئے تھے مشین گن کے برسٹ فائر کرنے لگے۔

مگر وہ پہاڑی کے نشیب میں تھے۔ ہم اوپر پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے فائرنگ جاری رکھی۔ دستی بم بھی پھینکتے رہے اتنے تیز فائر اور دستی بموں کی بارش نے بھارتی فوجیوں کو دوسری طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ سب مارے گئے تھے۔ صرف تین فوجی زندہ تھے جو سڑک کی گھاٹی کی طرف اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ ان کی نالائقی تھی۔ انہیں بھاگنا ہی تھا تو سڑک پر پیچھے کی جانب بھاگنا چاہئے تھا۔ اس طرح وہ بہت جلد ہماری رینج سے باہر ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ گھاٹی میں اترنے لگے۔ انہیں گھاٹی میں اترتا دیکھ کر کمانڈر شیروان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور ہم سب گھات میں سے نکل کر نعرے لگاتے ڈھلان سے اتر کر سڑک پر آگئے اور دائیں بائیں سٹین گنوں کی بوچھاڑیں مارتے سڑک کے کنارے آگئے۔ تینوں بھارتی فوجی نیچے گھاٹی میں جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اترائی سیدھی تھی۔ ہم نے اوپر سے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ دیکھتے دیکھتے تینوں بھارتی فوجی ہماری گولیاں کھا کر وہیں الٹ گئے اور پھر بے جان پتھروں کی طرح نیچے گہری کھائی میں لڑھکتے چلے گئے۔

ایک ٹرک پہلے سے جل رہا تھا۔ دوسرے ٹرک کو آگ نہیں لگی تھی لیکن اس کی باڈی کا پچھلا حصہ اڑ گیا تھا۔ ہم نے اس ٹرک میں لگی ہوئی مشین گن اور چار رائفلیں اپنے قبضے میں کیں اور اس ٹرک کو بھی آگ لگا دی۔ وہاں سے ہم جیپ میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوئے۔ وادی میں آکر کمانڈر شیروان جیپ سے اتر گیا۔ اس نے مجھے بھی اتار لیا اور باقی مجاہدوں سے کہا۔

"تم لوگ اپنے اڈے پر جاؤ۔ ہم گاؤں پر جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے کتنے بھائی شہید ہوئے ہیں"

مجاہد جیپ لے کر خفیہ پناہ گاہ کی طرف اور ہم پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑے گاؤں وہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ پر تھا۔ گاؤں میں کہرام مچا تھا۔ بھارتی فوجیوں

مارٹر فائر سے سارے مکان مسمار ہو گئے تھے لکڑی کے مکان تھے۔ کئی ایک میں ابھی تک آگ لگی ہوئی تھی اور دیہاتی کشمیری آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہم عام کشمیری شہریوں کے لباس میں تھے۔ ایک طرف دو بوڑھی عورتیں زمین پر بیٹھی روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔ ایک بوڑھا روتے ہوئے انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا ہم ان عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

کمانڈر شیروان کشمیری زبان میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ عورتیں اور بوڑھا کشمیری اسے اپنی زبان میں کچھ بتا رہا تھا۔ میں کشمیری زبان روانی سے بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن سمجھ لیتا تھا۔

کشمیری عورتوں اور بوڑھے نے کمانڈو شیروان کو بتایا کہ بھارتی فوجی ان کی جوان بیٹی جمیلہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان کے جوان بیٹے کو شہید کر دیا ہے گاؤں کے پندرہ آدمی شہید کر دیئے گئے تھے جن میں چار بچے اور دو عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کی لاشیں گاؤں کی مسجد کے صحن میں پڑی تھیں۔ بوڑھے کشمیری نے بتایا کہ تین فوجی تھے جن میں ایک کیپٹن فوجی تھا۔ وہ ڈوگرہ تھا۔ انہوں نے ان کے جوان بیٹے کو گولی مار کر شہید کر دیا اور جمیلہ کو سب کے سامنے گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ڈالا اور اغوا کر کے لے گئے۔ ان کی بیٹی روتی رہی' چیختی رہی۔ مگر وہاں ان کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ گاؤں کے سب جوان شہید کر دیئے گئے تھے۔

کمانڈر شیروان نے پوچھا کہ وہ تینوں فوجی کس طرف گئے تھے۔ کیونکہ جن دو بھارتی فوجی رکوں کو ہم نے تباہ کیا تھا ان کے ساتھ کوئی جیپ نہیں تھی۔ بوڑھے کشمیری نے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"اس طرف گئی تھی جیپ ادھر کوئی بھارتی فوجی چھاؤنی ہو گی۔ ہائے یا اللہ ہم کیا کریں کس کے پاس فریاد لے کر جائیں؟"

کمانڈر شیروان نے بوڑھے کشمیری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بابا! تمہاری بیٹی ہماری بیٹی ہے۔ کشمیر کی بیٹی ہے۔ ہم جمیلہ کو بھارتی درندوں سے چھڑا کر،

لائیں گے اور ان تینوں بھارتی فوجیوں کے سر بھی کاٹ کر ساتھ لائیں گے جنہوں نے ہماری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

یہ کہہ کر کمانڈر شیروان اٹھ کر مجھے ایک طرف لے گیا۔ کمانڈر نے بوڑھے کشمیری سے بہت بڑا وعدہ کر لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کمانڈر شیروان ایک سچا کشمیری مسلمان مجاہد ہے۔ وہ جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔ شیروان نے مجھ سے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ جمیلہ بٹی کو ڈوگرہ فوجی گلمرگ روڈ کی طرف لے گئے ہیں۔ وہاں ایک بھارتی فوجی کیمپ ہے۔ پہاڑی نالے کے کنارے کچھ فوجیوں کی بارکیں اور کچھ فوجی افسروں کے لئے فلیٹ بھی بنائے گئے ہیں۔ ہم جمیلہ کو وہاں سے نکال کر لائیں گے"

میں نے کہا۔

"پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ فوجی کس رجمنٹ کے تھے۔ اور ان کا حلیہ کیا تھا؟"

شیروان بولا۔

"بوڑھے نے مجھے بتایا ہے کہ ان میں ایک کیپٹن تھا۔ وہ ڈوگری زبان بولتا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر سورج گرہن کا نشان تھا یہ نشانیاں کافی ہیں۔ باقی ہم خود معلوم کر لیں گے۔ ہمیں ابھی گلمرگ فوجی چھاؤنی کی طرف چلنا ہوگا۔"

وہاں سے ہم واپس اپنی خفیہ پناہ گاہ میں آ گئے۔ اپنے ساتھیوں کو اپنے نئے مشن کے بارے میں بتایا۔ تمام مجاہد ہمارے ساتھ چلنے کے لئے بے چین تھے۔ مگر یہ بڑا نازک مشن تھا۔ اس مشن پر ہم جلوس بنا کر نہیں جا سکتے تھے۔ یہاں ہمیں جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینا تھا۔ کمانڈر شیروان نے ساتھی مجاہدوں سے کہا۔

"ہمیں صرف ایک اور ساتھی کمانڈو کی ضرورت ہوگی اور کمانڈو ہاشم! تم ہمارے ساتھ چلو گے۔"

یہ وہی کشمیری مجاہد کمانڈو تھا جو شبھو پاروتی مندر والے ایمونیشن ذخیرے کے مشن

میں حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کی خاطر ہمارے ساتھ گیا تھا۔ یہ بھی دوسرے کشمیری مجاہدوں کی طرح بے حد نڈر دلیر اور سمجھدار کمانڈو تھا اور تقریباً ہر مشن پر ہمارے ساتھ جاتا تھا۔ ہمارے مزاج اور ہماری حکمت عملیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کہنے لگا۔

"الحمد للہ سر! میں خوش نصیب ہوں کہ اپنی بہن کو دشمنوں سے چھڑانے اور دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے آپ کے ساتھ جا رہا ہوں"

شیروان نے کہا۔

"ہم آدھ گھنٹے بعد اپنے نئے مشن پر نکل رہے ہیں۔ جو تیاری کرنی ہے کر لو۔ گڑ اور چنوں کا تھیلا ساتھ رکھ لینا۔ دوپہر کا کھانا ہم جنگل میں ہی کھائیں گے۔"

ہم نے اپنا لباس وہی کشمیری شہریوں والا ہی رکھا۔ صرف اپنے اپنے آٹومیٹک پستولوں ...ں نیا میگزین بھر لیا۔ کمانڈو ہاشم نے بھی اپنا پستول اور کمانڈو چاقو قمیض کے اندر چھپا ...ا۔ منہ ہاتھ دھویا دو نفل ادا کر کے خدا سے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور پھر ہم ...پ میں بیٹھ کر اپنے مشن پر گلمرگ کی طرف جاتی روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیپ ...ا ایک مجاہد چلا رہا تھا۔

...ں کی ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ ہمیں گلمرگ روڈ پر پہاڑی نالے والی بھارتی چھاؤنی یا ...رتی فوجی کیمپ کے پاس چھوڑ آئے۔ سری نگر سے گلمرگ کی طرف جاؤ تو چڑھائی ...رع ہو جاتی ہے اور سردی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ یہ بہار کا موسم تھا لیکن گلمرگ کی ...ب سری نگر کے مقابلے میں زیادہ سردی پڑتی تھی۔ اس لئے ہم نے گرم اونی سویٹر اور ...کے اوپر چمڑے کی جرسیاں پہن رکھی تھیں۔ ہمیں اپنے ساتھ کمبل یا بستر وغیرہ رکھنے ...ضرورت نہیں تھی۔ کمانڈو کو کمبلوں آرام دہ بستروں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ برفانی ...ں میں بھی برف کھود کر اندر گڑھا بنا کر رات گذار لیتا ہے۔ اس کے لئے گرم سویٹر ...رم جرسی ہی کافی ہوتی ہے۔ سڑک پر معمولی سی ٹریفک تھی۔ جیپ سڑک پر بڑی ...ا سے چلی جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم کشمیر کے حسین ترین پہاڑی علاقے میں سے

گذر رہے تھے۔ مگر آج کشمیر کا یہ جنت نظیر حسن اداس تھا۔ اس کے حسین چہرے سے
خون بہہ رہا تھا اور اس کے بچے اپنے وطن کی آزادی اور اسلام کی جرات کی خاطر اپنی
جانیں قربان کر رہے تھے۔

ہم نے ایک جگہ جنگل میں بیٹھ کر تھوڑے سے چنے اور گڑ کھایا۔ چشمے کا پانی پیا اور دوبارہ
اپنے مشن کی طرف چل پڑے۔ مزید دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ چھوٹا سا پہاڑی نالہ آگیا جو
وادی میں ایک طرف اونچے پہاڑوں کے درمیان سے بہتا چلا آرہا تھا۔ یہ کافی چوڑا نالہ تھا
اور پہاڑی دریا لگتا تھا۔ اس کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ ٹریفک اس پل پر سے گذر کر دوسری
طرف جاتی تھی۔ ہماری جیپ بھی پل پار کر کے پہاڑی نالے کے دوسرے کنارے پر
آگئی۔ یہاں ہمیں دریا کے کنارے کنارے کشادہ سرسبز میدان میں کچھ فوجی بارکیں اور
پہاڑی ڈھلان پر کچھ چھوٹی چھوٹی کوارٹروں ایسی کوٹھیاں دکھائی دیں۔

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔" اب اس نے ڈرائیور مجاہد سے کہا۔

"دوست! اب تم جیپ لے کر واپس جاؤ گے"

"ٹھیک ہے کمانڈر!"

افسروں کے لئے بنائے گئے تھے۔ فوجی بارکوں کے آگے خار دار تاروں والی کوئی پانچ فٹ
اونچی دیوار تھی اس سے آگے فوجی کیمپ تھا۔ جہاں فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور ایک
جگہ کوارٹر کے آگے رجمنٹ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہم جب بھارتی فوجی کیمپ سے بھی آگے
نکل گئے تو میں نے کمانڈر سے پوچھا۔

"شیروان بھائی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

کمانڈر نے کہا۔

"اپنے ایک حریت پسند مجاہد کے ہاں جا رہے ہیں"

کشمیر کا بچہ بچہ اس وقت حریت کے جذبے سے سرشار تھا۔ کشمیر کا ہر گھر حریت پسندوں کی
آماجگاہ تھا۔ یہ کشمیر کے بیٹے تھے جو مادر وطن کی حرمت، آزادی اور اسلام کی سربلندی
کے لئے کافر دشمن سے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر کے بیٹھی ہوئی بھارتی فوج سے جنگ کر
رہے تھے۔ ان کے وسائل کم تھے۔ جب کہ بھارتی فوج تربیت یافتہ پیشہ ور فوج تھی اور
اس کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس کے باوجود کشمیری حریت پسندوں کی جرات و دلیری
کے کارناموں کی دوسرے ملکوں تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ جس فوجی کو پتہ چلتا تھا کہ اس
کی پوسٹنگ کشمیر میں ہو رہی ہے اس کا چہرہ اتر جاتا تھا۔ رنگ زرد ہو جاتا تھا اور اس کے

ہم جیپ سے اتر گئے اور مجاہد ڈرائیور جیپ لے کر واپس روانہ ہوگیا۔ کمانڈو زیادہ گھر میں ماتم کی فضا بن جاتی تھی۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ سے بھارتی فوجی کا زندہ واپس آنا
باتیں اور بحث مباحثہ نہیں کیا کرتے۔ ان کے لیڈر کا آرڈر ہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تقریباً ناممکن ہوتا تھا۔ میں نے شیروان سے بالکل نہ پوچھا کہ یہاں ہم جس مجاہد کے پاس جا
لیڈر نے کہا یہ کام کرنا ہے کمانڈو نے کہا یس سر! اور وہ کام کر ڈالا۔ جیپ چلی گئی تو ہم ہے ہیں اس کا نام کیا ہے۔
تینوں کمانڈو یعنی میں، کمانڈر شیروان اور کمانڈو ہاشم پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ اوپر کی ب بھارتی فوجی کیمپ کافی پیچھے رہ گیا تو ہم نالے سے ہٹ کر ڈھلان کی وادی میں داخل
طرف چلنے لگے۔ میں اب اس پہاڑی نالے کو دریا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ ہمارے میدانی گئے۔ یہاں زمین اونچی اور کہیں نشیبی تھی۔ کہیں کہیں گھاٹی تھی۔ چنار اور سفیدے
علاقوں میں دریا کا تصور وہ نہیں ہوتا جو پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ درخت تھے۔ زعفران کے چھوٹے چھوٹے کھیت بھی تھے۔ ہم سیب اور ناشپاتیوں کے
ہم پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان چلتے اس مقام پر آگئے باغوں سے بھی گذرے۔ یہاں کشمیری باغبان اور کسان اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔
جہاں ہمارے بائیں ہاتھ کو زمین اونچی ہونی شروع ہو جاتی تھی۔ کافی آگے جا کر تین جانب اونچی جگہ پر لکڑی کے چند ایک دیہاتی مکان نظر آئے۔ شیروان نے کہا۔
فوجی بیرکیں تھیں۔ ان سے آگے دس بارہ کوارٹر نما فلیٹ تھے۔ شاید یہ فیملی والے فوجی وہاں جا رہے ہیں"

اس دوران شیروان نے کمانڈو ہاشم کو ہدایت کی تھی کہ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک طرف کو ہو کر چلتا رہے۔ تاکہ اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو وہ ہمیں خبردار بھی کر سکے اور فائرنگ کھول کر ہماری مدد بھی کر سکے۔ جب ہم گاؤں کے لکڑی کے پرانے مکانوں کے علاقے میں داخل ہوئے تو کمانڈو ہاشم اوپر سے ہو کر ہمارے پاس آگیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کس مجاہد کے گھر جا رہے ہیں۔ گاؤں کے چند ایک مکان تھے۔ مکانوں کی چھتوں اور صحن میں کہیں کہیں شلجم کے چھلکے اور سرخ مرچیں دھوپ میں سکھانے کو ڈال رکھی تھیں۔ یہاں بادام اور اخروٹ کے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ہم ایک جگہ اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ شیروان نے کمانڈو ہاشم سے کہا۔

"جا کر دیکھو شعبان گھر پر ہی ہے؟"

کمانڈو ہاشم لکڑی کے مکانوں کی طرف جاتی پگ ڈنڈی کی طرف ہو گیا۔ ہم درخت کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ اخروٹ کا درخت بہت گھنجان ہوتا ہے اور اس کا تنا بھی کافی موٹا ہوتا ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کمانڈو ہاشم ایک مکان کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ آدمی جو کشمیری مجاہد شعبان ہی ہو سکتا تھا وہیں صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور کمانڈو ہاشم واپس ہماری طرف آنے لگا۔

کمانڈر شیروان بھی ادھر کو ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے شعبان کو پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارا مجاہد گھر پر ہی مل گیا ہے۔ اچھا ہوا"

اتنی دیر میں کمانڈو ہاشم ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا کہنے لگا۔

"لیڈر! شعبان نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سیب کے باغ والی کوٹھڑی میں میرا انتظار کرو۔ میں آرہا ہوں"

ہم اس وقت کوئی بات کئے بغیر اٹھ کر سیب کے باغ کی طرف چل دیئے۔ سیب کے باغ کی دوسری طرف چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی جس کے باہر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ جو خالی پڑا تھا۔ ہم کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر دری پر بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ کے بعد مجاہد شعبان بھی آگیا۔ خوبصورت صحت مند کشمیری نوجوان تھا۔ شیروان نے اس سے میرا

تعارف کرایا اور ساری بات بیان کر دی۔ مجاہد شعبان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میں ان تینوں بھارتی فوجیوں کا پتہ لگا لوں گا ان میں جو ڈوگرہ کیپٹن ہے اور جس کے ماتھے پر گرہن کا نشان ہے اگر وہ اسی بھارتی کیمپ میں ہے تو وہ ہمارے انتقام کی آگ سے بچ نہیں سکے گا۔ ہماری بہن جمیلہ اسی کے پاس ہے تو وہ نالے والے کوارٹروں میں ہی ہو گی۔ میں ابھی ان سب کا سراغ لگانے جاتا ہوں۔ تم لوگ اس کوٹھڑی میں میرا انتظار کرنا۔"

مجاہد شعبان باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے شیروان سے پوچھا۔

"شعبان اتنی جلدی اتنا مشکل سراغ کیسے لگائے گا؟"

"اس کے اپنے آدمی فوجی کیمپ میں کام کرتے ہیں اور افسروں کے کوارٹروں میں بھی آتے جاتے ہیں"

ہم کوٹھڑی میں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ مجاہد شعبان دن کے ساڑھے گیارہ بجے گیا تھا۔ دوپہر کے تین بجے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"ڈوگرہ فوجی کیپٹن کا نام دین دیال شرما ہے۔ جمیلہ کو اس نے اپنے کوارٹر میں ہی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ جو دو بھارتی فوجی جمیلہ کو اغوا کر کے لائے تھے ان میں ایک حوالدار اور ایک لانس نائیک ہے۔ ان کے نام حوالدار کامو رام اور لانس نائیک کانشی رام ہے۔ دونوں رات کو ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر میں ضرور حاضر ہوتے ہیں۔ اس وقت ڈوگرہ کیپٹن شراب پیتا ہے اور یہ دونوں اس کے اردلی کے طور پر اس کی خدمت بجالاتے ہیں"

میں حیران رہ گیا۔ مجاہد شعبان پوری تفصیل کے ساتھ مکمل رپورٹ لے آیا تھا۔ شیروان نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا خیال ہے؟ ہم آج رات اٹیک کریں گے"

کمانڈر شیروان کی عادت تھی کہ جب وہ ٹارگٹ کے سامنے پہنچ جاتا تھا اور حالات نارمل ہوتے تھے تو پھر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر اسے گوارا نہیں ہوتی تھی۔ وہ فوراً ایکشن شروع کر دیتا تھا۔ چونکہ میں نے کمانڈر شیروان کے ساتھ ایک عرصہ گزارا تھا۔ اور میں اس کی اس عادت سے واقف تھا اس لئے میں نے فوراً جواب دیا۔

"لیس لیڈر! میں تیار ہوں"

اس کے بعد ہم نے مجاہد شعبان کے ساتھ مل کر کمانڈو آپریشن کی پوری سکیم تیار کی۔ منصوبہ کوئی پیچیدہ نہیں تھا۔ بالکل صاف تھا مگر دلیرانہ منصوبہ تھا اور اس کے ہر قدم پر موت کو پچھاڑنا تھا۔ موت سے مقابلہ کرنا تھا۔ موت کو شکست دینی تھی۔ ٹارگٹ مارنے سے پہلے ہرگز نہیں مرنا تھا۔ کمانڈو ہاشم کو ہم نے کور دینے یعنی ہمارے لئے کچھ فاصلے پر رہ کر حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کی ڈیوٹی دی تھی۔ ہم نے اپنے پاس ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو اور سائی لینسر والے آٹومیٹک پستول ہی رکھے تھے۔ باقی سٹین گن اور ہینڈ گرینیڈ کمانڈو ہاشم کے پاس رکھے جانے تھے۔

کمانڈو شعبان ہمیں اپنے گھر اس لئے نہیں لے گیا تھا کہ گاؤں میں بھارتی سی آئی ڈی کے آدمی آتے جاتے رہتے تھے۔

اور شیو پاروتی مندر والے ایمونیشن کے ذخیرے کی تباہی کے بعد اس سارے علاقے میں سی آئی ڈی کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ کیونکہ فوج ابھی تک کسی کمانڈو کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ وہاں کوٹھڑی میں باتیں کرتے اور منصوبے کی تفصیلات پر غور کرتے رات ہو گئی مجاہد شعبان وہیں ہمارے لئے کھانا اور سبز چائے سے بھرا ہوا سماوار لے آیا۔ کھانا کھانے کے بعد رات کے آٹھ بجے مجاہد شعبان حالات کا جائزہ لینے اور اپنے آدمیوں سے بات کرنے کے لئے چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔

"ڈوگرہ کیپٹن دین دیال کے آفیسرز کوارٹر میں رات کے دس بجے شراب کی محفل لگنے والی ہے۔ کشمیری لڑکی جمیلہ اسی کوارٹر کے ایک کمرے میں بند ہے۔ ڈوگرہ کیپٹن کے دونوں فوجی ساتھی حوالدار اور لانس نائیک شراب کی اس

محفل میں اس کے ساتھ ہوں گے۔ ہمارا ایک مجاہد نوکر کے بھیس میں وہاں موجود ہوگا۔ وہ کوارٹر کے کمرے کے عقب میں آکر دو بار ماچس کی تیلی جلا کر ہمیں آل کلیر کا سگنل دے گا۔ بس اس کے بعد آپ لوگوں کو اٹیک کر دینا ہوگا۔ اور جو کچھ کرنا ہوگا کر دینا ہوگا۔ یہ بتائیں کہ آپ کشمیری لڑکی کے ساتھ ان تینوں ڈوگرہ فوجیوں کو پکڑ کر کیسے اس کوٹھڑی تک لائیں گے۔ اگر وہ شراب کے نشے میں دھت بھی ہوں گے تو ممکن ہے یہاں تک آتے آتے انہیں ہوش آجائے آپ انہیں وہیں ہلاک کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"کمانڈو شعبان! ہم نے مشن شروع کرنے سے پہلے جمیلہ کے بوڑھے ماں باپ کے آگے قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کی بیٹی جمیلہ کو کافروں کی قید سے آزاد کروا کر لے آئیں گے اور ساتھ ہی جن بھارتی فوجیوں نے کشمیر کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ اس کی بے حرمتی کی ہے ان کے سر بھی کاٹ کر لائیں گے۔ چنانچہ تم بے فکر رہو ہمارے ساتھ ڈوگرہ کیپٹن اور دونوں بھارتی فوجی نہیں ہوں گے بلکہ ان کے سر بوری میں بند کر کے ساتھ لے آئیں گے۔ اس طرح ہمارا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور اپنا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا"

مجاہد شعبان نے اس کے بعد کوئی سوال نہ کیا۔ شیروان مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دوست! چلنے سے پہلے ہر ایک چیز چیک کر لی جائے۔ ہم اسی سویلین کپڑوں میں ہی جائیں گے۔ ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ شعبان تمہیں شام کے وقت ساتھ لے جا کر ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دکھلائے گا۔"

جب سورج غروب ہو گیا اور شام کا اندھیرا چھانے لگا تو ہم شعبان کے ساتھ دیہاتی پڑوں کے لباس میں ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دیکھنے کے لئے نکل پڑے۔ مجاہد شعبان ہمیں پہاڑی رستوں سے لے جا رہا تھا جہاں سے ہمیں رات کے وقت گذرنا تھا۔ یہ بھارتی پ کی فوجی بارکوں کا عقب تھا اور یہاں جنگلی جھاڑیاں اور درخت بہت تھے۔ مجاہد

شعبان نے ہمیں ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دکھایا جو چھوٹی سی کوٹھی کی طرح تھا۔ آگے پیچھے
چھوٹا لان تھا۔ اس کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ کیونکہ یہ جگہ بھارتی کیمپ میں ہی تھی
اور اس کے پیچھے خاردار تار کی دیوار تھی۔ شعبان ہمیں ایک گھاٹی میں سے نکال کر لایا
تھا۔ جس طرف کانٹے دار تار والی دیوار میں ایک آدمی کے گزرنے کے لئے جگہ بنی ہوئی
تھی۔ ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کے پچھواڑے بادام کے درخت تھے۔ یہاں ایک چھوٹی سی
چٹان زمین سے نکل کر کوئی پندرہ فٹ اوپر چلی گئی تھی۔ چٹان کے نیچے ایک شگاف تھا۔
شعبان نے کہا۔

"تم لوگ یہاں چھپ کر رات کے دس بجنے کا انتظار کر سکتے ہو"

پھر اس نے دور سے ہمیں کوارٹر کے گرد لگی ہوئی گارڈینیا کی جھاڑیاں دکھا کر کہا۔

"وہ جہاں انار کا درخت ہے۔ وہاں سے تم باڑھ پھلانگ کر اندر جا سکتے ہو۔
کونے والا کمرہ باتھ روم ہے۔ اس کے ساتھ وہ کمرہ ہے جہاں کشمیری لڑکی کو
قید کیا ہوا ہے۔ تم باتھ روم کے دروازے سے اندر داخل ہو گے۔ کیونکہ باقی
تمام کمروں کے دروازے اندر سے بند ہوتے ہیں۔ ہمارا آدمی رات کو شراب
کی پارٹی شروع ہونے سے پہلے اندر آکر باتھ روم کے دروازے کی کنڈی
کھول دے گا۔ اس کے بعد سب کچھ تمہیں اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر کرنا
ہو گا۔ اب واپس آجاؤ۔"

ہم جن راستوں سے گئے تھے ان ہی راستوں پر چلتے ہوئے واپس سیب کے باغ والی
کوٹھڑی میں آگئے۔ اور رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شعبان چلا گیا تھا ہم نے
اس سے نائلون کا سیاہ رنگ کا بڑا تھیلا منگوا کر رکھ لیا تھا۔ اس تھیلے میں ہمیں ڈوگرہ کیپٹن
اور دونوں بھارتی فوجیوں کی سرکاٹ کر لانے تھے۔ میں نے آج تک کسی دشمن کا بھی سر
نہیں کاٹا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈر شیروان نے بھی پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ میں اب
میں سوچ رہا تھا کہ ہم بھارتی فوجیوں کے سر کیسے کاٹیں گے۔ اگرچہ ہمارے پاس بڑے
کمانڈو چاقو موجود تھے مگر گردن کاٹنے کے لئے کسی کلہاڑی ایسی شے کی ضرورت ہو

ہے۔ بہرحال اس موضوع پر میں نے کمانڈر شیروان سے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔
ہم اپنے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات طے کرتے اور ایک ایک نقل و حرکت کی
ریہرسل کرتے رہے۔ جب ہماری گھڑیوں نے ایک ساتھ رات کے پورے دس بجائے تو
کمانڈر شیروان نے کہا۔

"چلو شیرو! جن کافروں نے ہمارے بھائیوں کو قتل کیا ہے اور ہماری ماؤں'
بہنوں کو بے عزت کیا ہے ان سے بدلہ چکانے کا وقت آگیا ہے"

ہم تینوں کمانڈو اللہ کا نام لے کر سیب کے باغ والی کوٹھڑی سے نکل آئے۔ باہر
گلمرگ کے قرب وجوار کی رات سرد اور کہر آلود تھی۔ کہرے کی وجہ سے آسمان پر چمکنے
والے ستارے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہم نے گرم جرسیاں اور جیکٹ پہنے ہوئے
تھے۔ لباس کشمیری دیہاتیوں والا تھا۔ کھدر کے لمبے کرتے اور نیچے شلواریں۔ پاؤں میں
کینوس کے جوتے تھے تاکہ چلتے وقت قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔ ہم نے جس طرف سے
جانا تھا اور جس فارمیشن میں چلنا تھا یہ سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ کمانڈر شیروان
آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دو قدموں کا فاصلہ ڈال کر میں چل رہا تھا۔ کمانڈو ہاشم ہم
سے پانچ قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ہمارے پہلو میں ہمارے متوازی چل رہا تھا۔ رات
اندھیری اور کہر آلود تھی لیکن ہماری آنکھیں راتوں کے اندھیرے کی عادی تھیں۔ جس
طرح چیتا اندھیری رات میں بھی اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے اسی طرح ہم بھی اندھیری رات
میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھ سکتے تھے۔ درخت جھاڑیاں چھوٹے بڑے پتھر' نشیب' گھاٹیاں اور
پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی دھندلی نیم تاریک وادی ہمیں برابر نظر
آرہی تھی۔ جب ہم ایک گھاٹی میں سے گزر کر خاردار تار کی دیوار کے سوراخ میں سے
نکل کر اوپر آئے تو ہمیں دور فوجی بارک کی روشنیاں اور آفیسرز کوارٹر کی روشنی نظر آئی۔
ہم ایک خاص زاویے سے پھیل کر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے چلتے چلتے بادام
کے درختوں کے نیچے آکر رک گئے۔ اب کمانڈو ہاشم بھی ہمارے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا۔
ہم سب کی نظریں کچھ فاصلے پر ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کی عقبی دیوار کے اوپر جلتے بلب پر

گئی تھیں۔ اس بلب کی روشنی عقبی دیوار اور غسل خانے کے پچھلے دروازے پر پڑ رہی تھی کمانڈر شیروان نے آہستہ سے کہا۔

"باتھ روم کے دروازے میں داخل ہوتے وقت ہم دور سے نظر آسکتے ہیں
ہمیں دوسری طرف سے آنا ہو گا"

پھر اس نے کمانڈو ہاشم کو ہدایت کی۔

"تم گارڈینیا کی باڑھ کے پیچھے پوزیشن لے کر ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کرو گے۔ اگر اس دوران کوئی دوسرا آدمی غسل خانے کے دروازے کی طرف آتا نظر آیا تو تم اس پر فائر نہیں کرو گے۔ تمہارا کام یہ ہو گا کہ چیتے کی طرح تیزی سے رینگ کر اس کے عقب میں پہنچو گے اور اسے دبوچ لو گے اور اس سے پہلے کہ اس کی آواز نکلے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دو گے۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

کمانڈو ہاشم نے کہا۔

"نو سر۔ کوئی سوال نہیں کوئی اعتراض نہیں"

"اوکے۔ گو"

اور اس کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان کوارٹر کی طرف بڑھا۔ میں اس کے بالکل پیچھے تھا۔ آٹومیٹک پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ پلاسٹک کا تھیلا میں نے اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ اس خیال سے مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ جب ہم واپس آجائیں گے تو ہمارے ساتھ معصوم اور مظلوم کشمیری لڑکی جمیلہ بھی ہو گی اور پلاسٹک کے تھیلے میں دشمنوں کے تین کٹے ہوئے سر بھی ہوں گے۔ اپنی عزت غیرت' اپنے وطن کے ناموس اور اپنے دین اسلام کی حرمت کی خاطر دشمن سے جنگ کرتے ہوئے جب ہم دشمن کا سر کاٹتے ہیں تو اس سے ہمیں ایک طرح کی روحانی خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی خوشی ہے کہ جس طرح خدانخواستہ اگر کوئی غنڈہ بدمعاش ہماری بیٹی کو ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے کپڑے پھاڑ کر اٹھا کر لے جائے اور ہم تعاقب کر کے اس غنڈے بدمعاش کو قتل کر دیں اور اپنی بیٹی کو چھڑالیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے

خود شہید ہو جانے یا کافر کا سر قلم کر دینے سے جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک شہید اور غازی کا رتبہ ہے۔ اور اسلام میں ایک مسلمان کے دو ہی مقام ہیں۔ غازی یا شہید۔

اندھیرے اور سرد رات کے کہرے میں چلتے ہوئے ہم ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کے گرد لگی ہوئی جھاڑیوں کی باڑھ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ باتھ روم کا دروازہ ہم سے بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر تھا۔ کمانڈر شیروان نے کمانڈو ہاشم کو اشارہ کیا۔ وہ دو قدم دوڑ کر ایک طرف گیا اور باڑھ کی جھاڑیوں کے پیچھے مورچہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کمانڈر شیروان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ میں سامنے کی طرف سے جاؤں گا۔ تم دوسری طرف سے باتھ روم والے دروازے پر آؤ گے۔ ہمیں یقین تھا کہ اپنے آدمی نے باتھ روم کے دروازے کی اندر سے کنڈی کھول دی ہو گی۔

ہم زمین پر منہ کے بل لیٹ گئے تھے اور باڑھ پھلانگنے کے بعد زمین پر کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں دوسری طرف ہو گیا جدھر اندھیرا تھا۔ میں دوسری طرف سے نصف قطر کا چکر لگا کر دروازے کی طرف آیا تو میں نے دیکھا کمانڈر شیروان زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بلند کر کے لہرایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آجاؤ۔ سب ٹھیک ہے۔ ادھر سے میں نے اور سامنے کی جانب سے کمانڈر شیروان نے باتھ روم کے دروازے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ گھاس شبنم سے گیلی اور ٹھنڈی تھی مگر ہمیں اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ہمارے مشن کی گرمی نے ہمارے جسموں کو بھی گرم کر دیا ہوا تھا۔ انسان کے سامنے کوئی بڑا تعمیری مقصد ہو تو پھر راستے کی کوئی رکاوٹ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پھر نہ سردی گرمی کچھ کہتی ہے نہ بھوک پیاس پریشان کرتی ہے۔ آدمی جب روپے پیسے کے لالچ میں زمین جائیداد کے لالچ میں کسی کو قتل کرنے جاتا ہے تو اس کا ضمیر ہر قدم پر اس کی ملامت کر رہا ہوتا ہے لیکن جب ایک انسان اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کا نام بلند رکھنے کی خاطر کافر دشمن سے جنگ کرنے کے لئے جاتا ہے تو اس کا ضمیر اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس کو روحانی

طاقت عطا کرتا ہے اور فرشتے اس غازی کی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔
میری بھی اس وقت یہی کیفیت تھی۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے اللہ کی رضا کے لئے کر رہے تھے۔ اللہ کی خاطر کر رہے تھے۔ یقین کریں اس وقت موت ہمیں چیونٹی سے بھی کم تر اور بے وقعت معلوم ہو رہی تھی۔ اگر آپ کو موت کا خوف ہے تو اپنے ہر کام کو اپنے ہر فعل کو اللہ کی رضا اور اللہ کی خوشنودی کے لئے وقف کر دیں۔ آپ کو موت کے خوف سے نجات مل جائے گی۔ میں اور کمانڈر شیروان زمین پر کہنیوں کے بل رینگتے رینگتے باتھ روم کے عقبی دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے لیٹے لیٹے دروازے کو ہاتھ سے اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہم باتھ روم میں داخل ہو گئے۔ باتھ روم کی بتی جل رہی تھی۔ ہم بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے کیونکہ دروازہ کھلنے سے باتھ روم کی تیز روشنی باہر آنے لگی تھی۔ ہم نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔
چھوٹا سا باتھ روم تھا مگر اس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ہم دبے پاؤں دوسرے دروازے کی طرف بڑھے جو بند تھا اور جس کی دوسری طرف سے آدمیوں کے بولنے کی اور کسی وقت قہقہے کی آواز آ جاتی تھی۔ کوشش کے باوجود ہمیں دروازے میں کوئی سوراخ یا ایسی درز نہ مل سکی جس میں جھانک کر ہم دوسری جانب کا منظر دیکھ سکتے۔ دروازہ نیچے فرش سے دو انچ اونچا رکھا گیا تھا۔ ہم باتھ روم کے فرش پر لیٹ گئے اور گال فرش کے ساتھ لگا کر دو انچ کی درز میں سے دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف کا منظر یہ تھا کہ صوفے پر دو فوجی بیٹھے تھے ایک فوجی میز کے قریب کھڑا میز پر کبابوں یا آلو کی ٹکیوں کی پلیٹ رکھ رہا تھا۔ یہ لانس نائیک کی وردی میں تھا۔ باقی دو فوجی جو صوفے پر بیٹھے تھے ان میں سے ایک کیپٹن کی وردی اور دوسرا حوالدار کی وردی میں تھا۔ عجیب بات تھی رات کے دس بجے بھی انہوں نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے چونکہ کشمیر میں ایمرجنسی کے حالات تھے اس لئے فوجی اس وقت تک اپنی وردیوں میں رہتے ہوں جب تک کہ وہ سونے کے لئے بستر پر نہیں لیٹتے۔ میز پر شراب کے تین گلاس پڑے تھے۔ لانس نائیک نے کباب کی پلیٹ میز پر رکھ دی اور اپنے گلاس میں شراب ڈال کر ذرا پرے

ہو کر بیٹھ کر پینے لگا۔ کیپٹن کی وردی والا یقیناً ڈوگرہ کیپٹن دین دیال شرما ہی تھا۔ یہ تینوں وہی بھارتی فوجی تھے جنہوں نے گاؤں کو مارٹر گنوں سے اڑایا تھا۔ بے گناہ کشمیریوں کو ہلاک کیا تھا۔ اور کشمیری لڑکی جمیلہ کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ ہم فرش سے آہستہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
کمانڈر شیروان نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔
"تینوں وہی کافر ہیں ہم زیادہ دیر تک باتھ روم میں نہیں رہ سکتے۔ یہ لوگ شراب پی رہے ہیں اور یہ لوگ بار بار پیشاب کرنے اندر آئیں گے۔"
میں نے کہا۔
"ہمارا ایکشن کیا ہونا چاہئے؟"
شیروان بولا۔
"میرے ساتھ آؤ۔ سب سے پہلے ہمیں باہر کا جائزہ لینا ہو گا کہ باہر کوئی سنتری گارڈ ڈیوٹی پر تو نہیں ہے"
ہم آہستہ سے باتھ روم کا عقبی دروازہ کھول کر باہر لان میں نکل آئے اور دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے دوسری طرف جا کر جھانک کر دیکھا۔ یہ کوارٹر کے سامنے والا حصہ تھا۔ برآمدے میں بتی جل رہی تھی مگر وہاں کوئی سنتری نہیں تھا۔ آگے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ باغیچے کا چھوٹا سا گیٹ تھا۔ گیٹ پر کوئی دروازہ نہیں لگا تھا۔ جھاڑیوں کو تراش کر آنے جانے کا راستہ بنایا ہوا تھا۔ ہم وہیں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔
"گارڈ ڈیوٹی پر کوئی نہیں۔ یہ ہمارے لئے اچھا شگون ہے۔ مگر ہمیں یہ پتہ چلنا چاہئے کہ کشمیری لڑکی بھی یہاں موجود ہے کہ نہیں"
میں نے کہا۔
"شعبان نے کہا تھا کہ جمیلہ باتھ روم کے ساتھ والے جنوبی کمرے میں بند ہے۔ چلو اس طرف چل کر دیکھتے ہیں"
ہم دیوار کے ساتھ پنجوں اور کہنیوں کے بل چیتوں کی طرح چلتے باتھ روم کے

دروازے کے آگے سے گزر کر دوسری طرف جو کمرہ تھا اس کی دیوار کے بائیں آکر رک گئے۔ ادھر کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف زمین سے چار فٹ اونچی ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ سرد رات کا کہر تیلے بادل کی طرح کوارٹر کے لان میں آگیا تھا۔ اس کہرے نے ہمیں چھپا لیا تھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سلاخوں کے پیچھے کھڑکی کے پٹ تھے۔ جو بند تھے۔ شیروان نے انگلی سلاخوں میں ڈال کر کھڑکی کے پٹ کو اندر کو دھکیلا۔ کہنے لگا۔

"کھڑکی کی کنڈی لگی ہوئی ہے"

اچانک کھڑکی کے پیچھے سے ایک مرد کی دھیمی آواز آئی۔ میں نے شیروان کو اشارہ کیا ہم نے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگا دیئے۔ اندر کوئی مرد فوجی اردو میں کہہ رہا تھا۔

"کچھ کھاؤ۔ راشن نہیں کھاؤ گی تو بھوکی مر جاؤ گی"

تب ایک لڑکی کی آواز آئی لڑکی نے خدا کا واسطہ دیتے ہوئے کشمیری لہجے کی اردو میں کہا۔

"مجھے کچھ نہ کہنا۔ اگلے مہینے میری شادی ہونے والی ہے۔ خدا کا واسطہ ہے خدا کے لئے مجھے کچھ نہ کہنا"

اور لڑکی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ مرد کی آواز پھر آئی۔

"اگلے مہینے والی شادی کو بھول جاؤ۔ آج رات تمہاری تین آدمیوں سے شادی ہوگی۔ لو تھوڑا کھالو تاکہ تمہارے اندر طاقت آجائے"

کمانڈر شیروان نے کان پیچھے ہٹا لئے اس کا چہرہ کہرے میں تانبے کی طرح تمتما رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ "ہم اندر چلیں گے۔"

ہم کہرے کی چادر میں تیز تیز قدم اٹھاتے باتھ روم کے دروازے پر آکر رک گئے۔ کمانڈر نے دروازے کے ساتھ کان لگایا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔

"اندر کوئی نہیں"

اور وہ دروازہ کھول کر باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باتھ

روم میں آگیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم باتھ روم کے فرش پر لیٹ کر دوسرے دروازے کی نچلی دو انچ کی درز میں سے دوسری طرف دیکھنے لگے۔ کمرے میں صرف ڈوگرہ کیپٹن اور حوالدار ہی بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ تیسرا آدمی لانس نائیک کشمیری لڑکی کے کمرے میں ہی تھا سامنے دیوار میں جو دروازہ تھا وہ کھلا اور اندر سے ڈوگرہ لانس نائیک باہر آیا۔ ڈوگرہ کیپٹن نے نشے میں جھومتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری ہیمامالنی نے کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں؟"

لانس نائیک بولا۔

"سر! آلو کی ٹکیاں اس کے پاس رکھ آیا ہوں صبح سے بھوکی ہے۔ اپنے آپ کھائے گی"

کمانڈر شیروان جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ باتھ روم کے بلب کی روشنی میں شیروان کا سرخ وسفید چہرہ ایسے سرخ ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے فحش گالی دے دی ہو۔ اس نے آٹومیٹک پستول نکال کر اس کا میگزین بڑی احتیاط سے چیک کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں مجھے کہا۔

"دوست! ہم اٹیک کریں گے"

میں نے بھی اپنا آٹومیٹک پستول نکال لیا۔ میگزین چیک کیا۔ ہم موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ کمانڈر شیروان نے جو فیصلہ کر لیا تھا اب اس پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری ہوگیا تھا۔ باتھ روم کا یہ دروازہ بند ضرور تھا مگر اس کو باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ہمیں صرف اسے کھولنا ہی تھا۔ شیروان نے ایک دم سے دروازہ کھول کر نعرہ لگایا۔ "اللہ اکبر"

میں نے نعرہ لگایا۔ "یا علی"

اس کے ساتھ ہی ہمارے آٹومیٹک پستولوں میں سے گولیوں کی بوچھاڑیں نکلنے لگیں۔ سائی لینسروں کی وجہ سے دھماکوں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ تینوں بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ ہمارے نشانوں کی زد میں تھے۔ ایک ایک ڈوگرے

فوجی کے جسم سے ایک سیکنڈ میں چھ چھ سات سات گولیاں پار ہو گئیں۔ ڈوگرہ کیپٹن صوفے پر ہی الٹ گیا۔ لانس نائیک بھارتی فوجی صوفے کے پیچھے کھڑا تھا وہ اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔ بھارتی حوالدار کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ گلاس گولی لگنے سے چکنا چور ہو گیا۔ دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں سے نکل گئیں۔ وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔ شیروان نے ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ میں دوڑ کر کمرے کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے پاس گیا۔ اسے کھول کر باہر دیکھا۔ باہر خاموشی چھائی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس دوران کمانڈر شیروان اس کمرے میں چلا گیا تھا جس کے اندر کشمیری لڑکی جمیلہ قید تھی۔ وہ لڑکی کو نکال کر باہر لے آیا۔ لڑکی حواس باختہ سی ہو رہی تھی۔ اس نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں دیکھیں تو دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

کمانڈر شیروان نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔

اس نے کہا۔

"میرا نام جمیلہ ہے آپ حریت پسند مجاہد بھائی ہیں نا؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہاں بہن۔ ہم حریت پسند مجاہد ہیں۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔"

کمانڈر شیروان اس سے کشمیری میں بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! صرف ایک منٹ کے لئے تم اس کمرے میں واپس چلی جاؤ۔ ہمیں ان ڈوگرہ کافروں کے ساتھ ایک ایسا سلوک کرنا ہے۔ جسے تم شاید دیکھ نہ سکو گی۔"

جمیلہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ کہنے لگی۔

"مجھے اس کمرے سے ڈر لگتا ہے"

میں نے کہا۔

"بہن! صرف ایک منٹ اندر چل کر بیٹھو۔ جلدی کرو۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے"

جمیلہ ڈرتے ڈرتے جس کمرے میں قید تھی اسی کمرے میں واپس چلی گئی۔ شیروان نے مجھے کہا۔

"تھیلا نکال کر میرے پاس آجاؤ۔"

"مگر ذرا ٹھہرو"

کمانڈو شیروان نے اس خیال سے کہ جمیلہ دروازہ کھول کر وہ منظر نہ دیکھ لے جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ دروازے کو باہر سے چٹخنی لگا دی۔ تینوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے پستول جیب میں ڈالا اور کمانڈو چاقو نکال لیا۔ مجھے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ سب سے پہلے اس نے ڈوگرہ کیپٹن کی لاش کو سیدھا کیا۔ اس کے کاندھے پر کیپٹن رینک کے تین سٹار لگے ہوئے تھے۔ اس کے سر میں تین گولیاں آرپار ہو گئی تھیں۔ شیروان نے لاش کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر ڈالا اور جس طرح بکرے کو ذبح کرتے ہیں بالکل اسی طرح اتنی طاقت اور زور سے چاقو اس کی گردن پر چلایا کہ ریڑھ کی ہڈی کے کٹنے کی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ دوسرے لمحے ڈوگرہ کیپٹن کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ شیروان نے میری طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

"تم میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اس کافر کی گردن کاٹ ڈالو"

میرے قریب صوفے کے نیچے ڈوگرہ حوالدار کی لاش پڑی تھی مجھ پر جیسے دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشمیر کی تمام لڑکیوں کی بے حرمتی کرنے والا اور بے گناہ کشمیریوں کو ہلاک کر کے ان کے گھروں کو مارٹر گولوں سے تباہ کرنے والا یہی ایک ڈوگرہ حوالدار ہے۔ میں نے بڑا چاقو جس کے آدھے پھل پر دندانے بھی ہوتے ہیں لاش کی گردن کے نیچے رکھ کر اس کے سر پر ایک پاؤں رکھا اور پوری طاقت سے چاقو کو اوپر کی جانب جھٹکا دیا۔ دوسرے جھٹکے پر ڈوگرہ حوالدار کی گردن اس کے دھڑ سے الگ ہو گئی۔ اس وقت کمانڈر شیروان تیسرے ڈوگرہ فوجی کی گردن الگ کر چکا تھا۔ ہم نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے سر پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ رسی سے بند کیا۔ تھیلے کو نائلون کی رسی سے باندھ کر میں نے اپنے کندھے پر ڈالا اور نائلون کی رسی اپنی کمر سے [illegible]

باندھ دی۔ میں دروازہ کھول کر کشمیری لڑکی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ دروازے کے پاس ہی فرش پر نیم بے ہوش پڑی تھی۔ شیروان بھی اندر آگیا اس نے پانی کا جگ لا کر لڑکی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ لڑکی ہوش میں آگئی۔ لگتا تھا کہ اس نے دروازے میں سے ہمیں ڈوگروں کی گردنیں کاٹتے دیکھ لیا تھا اور دہشت کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی۔

شیروان نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"نکل چلو"

شیروان آگے میں لڑکی جمیلہ کو لے کر پیچھے تھا۔ ہم تیز تیز چلتے باتھ روم میں سے ہو کر دوسرے دروازے سے باہر عقبی لان میں آئے اب ہمیں رینگ رینگ کر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رات اسی طرح سرد اور کہر آلود تھی۔ کہرا ہمارے چھپاؤ کے لئے کافی تھا۔ ہم نے دوڑ کر گارڈینیا کی جھاڑیوں کو پار کیا اور بادام کے درختوں کی طرف بھاگنے لگے۔ کشمیری لڑکی جمیلہ کے جسم میں نئی توانائی آگئی تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ دوڑ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی اسے کافروں کی قید سے نکال کر لے جا رہے ہیں۔ اب اس کی عزت و حرمت محفوظ ہے۔

بادام کے درختوں میں ایک طرف سے کمانڈو ہاشم دوڑ کر ہمارے پاس آگیا۔ کشمیری لڑکی کو ہمارے ساتھ دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ ہمارے ساتھ ہے"

کمانڈر شیروان نے جمیلہ سے کشمیری زبان میں کہا۔

"بہن اللہ نے تمہیں کافروں سے محفوظ کر دیا ہے ہمارے ساتھ چلتی چلی جانا۔ جہاں ہم دوڑیں گے تمہیں بھی دوڑنا ہوگا۔ جہاں ہم خطرہ دیکھ کر چھپ جائیں گے تمہیں بھی چھپ جانا ہوگا اور کوئی آواز نہیں نکالنی ہوگی۔ میرے پیچھے آجاؤ۔"

کمانڈر شیروان نے جمیلہ کو اپنے پیچھے کر لیا۔ اس کے پیچھے میں اور میرے ساتھ ساتھ کمانڈو ہاشم تھا۔ ہم سرد رات کی خاموشی میں تیز تیز چل رہے تھے۔ کمانڈو ہاشم نے

میرے تھیلے کو ہاتھ سے چھو کر کہا۔

"کافروں کے سر کاٹ کر لے آئے ہو۔ یہ ہماری سب سے بڑی فتح ہے۔ میں نے سائی لینسروں والے پستولوں کی آوازیں سن لی تھیں دشمن نے تو کوئی فائر نہیں کیا نا؟"

"بالکل نہیں ہمیں یہی ڈر تھا اگر وہ فائر کر دیتے تو اس کے دھماکوں سے بارکوں کے سنتری ہوشیار ہو کر ضرور ادھر کو آجاتے۔"

اگرچہ ہم تیز تیز چلتے ہوئے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن کمانڈر شیروان نے ہماری آوازیں سن لیں وہ رک گیا۔ اس نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کیوں بولتے ہو؟ کیوں بولتے ہو؟"

ہم پھر اسی فارمیشن میں تیز تیز چلنے لگے۔ ہم واپسی پر بھی انہی گھاٹیوں کھائیوں اور چٹانی پتھروں کی درمیان سے ہوتے ہوئے سیب کے باغ میں آگئے۔ یہاں کوٹھڑی کے اندر مجاہد شعبان کمبل اوڑھے بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر کوٹھڑی سے باہر آگیا۔ کہنے لگا۔

"لڑکی کہاں ہے؟"

جمیلہ پیچھے میرے ساتھ تھی۔ جمیلہ کو دیکھ کر شعبان نے اللہ تیرا شکر اللہ تیرا شکر تین بار کہا۔ جمیلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔ میرے کاندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے کو دیکھ کر نفرت سے کہا۔

"کافروں کے سر لائے ہو۔ شاباش۔ ان سروں کو دلی پردھان منتری کو بھجوا دینا۔"

ہم کوٹھڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ شیروان نے شعبان سے کہا۔

"ہم راتوں رات یہاں سے نکل جائیں گے۔ جمیلہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس کے لئے جتنی جلدی کچھ کھانے کو لا سکتے ہو لے آؤ۔ کیونکہ آگے ہمارا سفر بڑا لمبا ہے۔"

شعبان بولا۔

"ابھی آتا ہوں"

وہ چلا گیا۔ جمیلہ کے چہرے سے ابھی خوف کے اثرات ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شیروان سے کشمیری میں پوچھا۔

"کافروں کے سر ہمیں زمین میں دبا دو۔ مجھے ڈر لگتا ہے"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ جن بھارتی فوجیوں نے جمیلہ بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ ہم ان کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ ہی لائیں گے۔ یہ سر ہمیں تمہارے بابا کو دکھانے ہوں گے۔ اس کے بعد ہمیں ان کے ساتھ جو سلوک کرنا ہوگا کریں گے۔ اب تم اس بارے میں ہم سے کوئی سوال نہ پوچھنا اوکے؟"

جمیلہ خاموش ہوگئی مجاہد شعبان چھ سات روٹیاں اور ساگ ان کے اوپر ڈال کر لے آیا۔ ساتھ پانی کی صراحی بھی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی جتنی روٹی کھا سکتے تھے کھائی۔ پانی پیا۔ زیادہ سے زیادہ وہاں آدھا گھنٹہ آرام کیا اور مجاہد شعبان سے کہا کہ اب ہم آگے کو چلتے ہیں۔ شعبان کہنے لگا۔

"صبح ہوتے ہی تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے قتل کی سب کو خبر ہو جائے گی اور جب لاشوں کے سر بھی غائب ہوں گے تو فوج کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ یہاں کے مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے گی"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ڈوگرہ فوجیوں کے سر غائب دیکھ کر ان پر دہشت بھی ضرور طاری ہو جائے گی۔ اس بار وہ یہاں کے مسلمان کشمیریوں پر سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالیں گے"

مجاہد شعبان بولا۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن میں تمہیں یہ کہنے والا تھا کہ اس بھیانک قتل کا پتہ لگتے ہی بھارتی فوج کے جوان تمہاری تلاش میں نکل پڑیں گے یہاں اتنے گھنے جنگل بھی نہیں ہیں۔ اور سری نگر یہاں سے کافی دور ہے۔ تم لڑکی کو ساتھ لے کر کہاں مارے مارے پھرتے رہو گے۔"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے"

مجاہد شعبان نے کہا۔

"یہاں سے دو میل نیچے پہاڑی نالہ وادی میں بہتا ہے۔ وہاں ہمارے اپنے کچھ ماہی گیر رہتے ہیں۔ تمہیں ان سے ایک بڑی کشتی مل سکتی ہے۔ تم دریائی راستے سے ایک تو محفوظ ہو گے دوسرے بہت جلدی سری نگر کی وادی میں پہنچ جاؤ گے۔ کیونکہ پہاڑی نالے بہترین اور مختصر ترین راستوں سے دریاؤں تک جاتے ہیں۔"

مجھے اور کمانڈر شیروان کو شعبان کی تجویز پسند آئی۔ شیروان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ابھی ماہی گیروں کے گاؤں کو چلتے ہیں"

اور واقعی ہم اس وقت کوٹھڑی سے نکلے اور ماہی گیروں کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ مجاہد شعبان ہمارے ساتھ تھا۔ راتوں رات ہم ماہی گیروں کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہاں نالہ قریب ہی بہہ رہا تھا۔ یہ وادی تھی نالے کا پاٹ چوڑا تھا اور کشمیری ماہی گیروں کی کچھ چھوٹی بڑی کشتیاں بھی کناروں پر کھڑی تھیں۔ شعبان ہمیں کشتیوں کے پاس چھوڑ کر خود ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ جمیلہ نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی مگر سردی زیادہ تھی۔ میں نے اسے اپنی گرم جیکٹ اتار کر پہنا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی شعبان ایک کشمیری ماہی گیر کو لے کر آگیا۔ ان لوگوں نے کشمیری میں کچھ باتیں کیں۔ ہم ایک ذرا بڑی کشتی میں بیٹھ گئے جس پر آدھی چھت پڑی تھی۔ شعبان نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تم لوگ نالے کے بہاؤ پر سفر کرو گے۔ تمہیں صرف چپوؤں اور ڈانڈ سے کشتی کو کناروں سے ٹکرانے سے بچانا ہوگا۔ یہاں سے نالہ وادی کی ڈھلان میں بہتا ہے اور پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ تم لوگ تین یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹوں میں سری نگر کی وادی میں پہنچ جاؤ گے جہاں یہ نالہ دریائے جہلم میں گرتا ہے۔ کشتی کو تم وہاں ایک طرف باندھ دینا۔ ہمارے آدمی کل خود آکر کشتی واپس لے آئیں گے۔ اللہ بیلی"

ہم نے کشتی نالے کے بہاؤ پر ڈال دی۔ پانی کا یہاں واقعی بڑا زور تھا۔ نالہ ڈھلان میں بہتا تھا۔ کشتی نے تیزی سے سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف کمانڈو ہاشم نے ڈانڈ پکڑے کھڑا تھا دوسرے طرف میں نے چپو سنبھال رکھے تھے۔ ہاشم کشتی کی سمت سیدھی رکھتا تھا اور میں کشتی کو کنارے کی طرف جانے سے روکتا تھا۔ یہ وادی تھی اونچی نیچی پہاڑی جگہ نہیں تھی۔ کوئی گھاٹی اور آبشاریں بھی نہیں تھیں۔ یہ سارا پہاڑوں کی تلیٹی کا علاقہ تھا۔ ہماری کشتی بہتی چلی جا رہی تھی۔ ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا میں نے کشتی میں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ خطرہ تھا کہ کل تک اس میں بدبو پیدا ہونے لگے گی۔ کمانڈر شیروان نے کہا تھا کہ ہم صبح ہونے سے پہلے پہلے جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے گھر پہنچائیں گے اور ساتھ ہی اس کے باپ کو ڈوگروں کے کٹے ہوئے سر بھی دکھا دیں گے ۔ اس کے بعد ہمارا پروگرام سری نگر سے کچھ فاصلے پر پہاڑی پر جو ڈوگرہ فوج کا گیریزن تھا اس گیریزن میں ان کٹے ہوئے سروں کے تھیلے کو پھینکنے کا تھا۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ جمیلہ کو ہم نے کشتی میں ایک طرف سلا دیا تھا۔ شیروان نے اس کے اوپر اپنی جیکٹ بھی ڈال دی تھی کیونکہ سردی زیادہ تھی۔

رات کے ٹھیک سوا تین بجے ہمیں دور سے سری نگر شہر کی بتیاں جھلملاتی نظر آنے لگیں۔ یہاں نالہ دریا میں گرتا تھا پانی کا بہاؤ زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ کمانڈر شیروان نے ہاشم سے کہا۔

"آگے دریا ہے۔ کشتی کو بائیں جانب والے کنارے کی طرف لے آؤ"

کمانڈو ہاشم نے کشتی کے مہار کو ایک طرف موڑ دیا۔ میں چپوؤں کو اس طرح چلانے لگا کہ کشتی کنارے کی طرف آجائے۔ آخر کشتی کنارے پر آگئی۔ کمانڈو ہاشم نے رسی ہاتھ میں لے کر کنارے پر چھلانگ لگا دی اور رسی کو کھینچ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔
ہم نے جمیلہ کو جگا دیا۔ شیروان نے جیکٹ پہن لی جمیلہ نے میری جیکٹ پہن رکھی تھی۔
وہ اتارنے لگی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ "یہ ایک بھائی کا تحفہ سمجھ کر اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔"

ہم اندھیرے میں کشتی سے اتر کر سری نگری کی طرف چلنے لگے۔ جمیلہ کا گاؤں سری نگر شہر سے چھ سات میل مشرق کی جانب تھا۔ یعنی جس راستے پر ہم جا رہے تھے پہلے جمیلہ کا گاؤں آتا تھا۔ اس کے بعد سری نگر شہر کے مضافات شروع ہو جاتے تھے یہ راستہ کمانڈر شیروان کا دیکھا بھالا تھا۔ جمیلہ بھی ان راستوں سے واقف تھی۔ ہم ایک گھنٹے تک پہاڑی راستے پر چلتے رہے۔ اس کے بعد جمیلہ کا گاؤں آگیا۔ جلے ہوئے تباہ حال گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ جمیلہ نے کہا۔

"نیچے گھاٹی کے کنارے میری خالہ کا گھر ہے اماں بابا وہیں ہوں گے ۔ مجھے وہاں لے چلو"

ہم جمیلہ کو لے کر اس کی خالہ کے مکان پر آگئے ۔ مکان بند تھا۔ جمیلہ نے دروازے کو کھٹکھٹایا اندر سے اس کے بابا کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے اس وقت؟"

جمیلہ نے جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابا! میں ہوں جمیلہ"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دروازہ کھلا اس کے ماں باپ اور خالہ اور خالہ کا بیٹا باہر آگئے ۔ ماں باپ کے گلے لگ کر جمیلہ بے اختیار روئے جا رہی تھی۔ جب ان کا جی کچھ ہلکا ہوا تو کمانڈر شیروان نے جمیلہ کے باپ سے کہا۔

"بابا! ہمیں اندر لے چلو۔ ہم تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔"

اندر لکڑی کی دیواروں والے مکان کی کوٹھڑی میں لالٹین روشن کر دی گئی۔ ادھر ادھر فرش پر گرم دریاں اور لحاف پڑے تھے۔ جمیلہ کا باپ اماں خالہ اور اس کا بیٹا ہمارا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کمانڈر شیروان نے نائلون کا تھیلا مجھ سے لے کر کھولا اور اسے الٹا دیا۔ اس کے اندر ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے تین سر بکرے کی سریوں کی طرح گرے۔ ڈوگرہ فوجیوں کے چہرے نیلے پڑ چکے تھے۔ وہ سب ان سروں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"بابا! میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر رہا ہوں۔ یہ تینوں کٹے ہوئے سران ڈوگرہ فوجیوں کے ہیں جنہوں نے جمیلہ بہن کو اغوا کیا تھا تمہاری بیٹی اور ہماری بہن کی عزت محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہماری بہن کی بے حرمتی کرتے ہم نے ان کے سر کاٹ کر دھڑ سے الگ کر دیئے تھے۔ اچھا خدا حافظ! اب ہم چلتے ہیں ابھی ہمیں ایک اور ذمے داری پوری کرنی ہے"

جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے حوالے کر کے ہم اپنے خفیہ پہاڑی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم اپنے خفیہ اڈے پر پہنچے آسمان پر صبح کی سفیدی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ پہاڑی غار کے اندر جاتے ہی لحاف اوڑھ کر لکڑی کے شہتیروں کی طرح گہری نیند سو گئے۔ کمانڈو کو جب موقع ملے وہ اپنی نیند پوری کر لیتا ہے۔ ہم دو راتوں سے نہیں سوئے تھے۔ چنانچہ جب سو کر اٹھے تو آدھا دن گزر چکا تھا۔

ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ نائلون کے تھیلے میں سے ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سر نکال کر ان کا معائنہ کیا۔ کٹے ہوئے سروں کا رنگ سیاہ پڑنے لگا تھا اور ان میں سے بدبو بھی آنا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے اسی وقت اپنا آدمی بھیج کر بازار سے سپرٹ کی تین بڑی بوتلیں منگوائیں ساری سپرٹ مین کے کنستر

میں انڈیل دی اور پھر ڈوگرہ فوجیوں کے تینوں سر اس میں ڈال دیئے۔ تینوں سر سپرٹ میں ڈوب گئے۔ ہمارے دوسرے مجاہد ساتھی بھی ہمارے پاس بیٹھے ڈوگروں کے سروں کو دیکھ کر ہمیں مبارک بادیاں دے رہے تھے۔ شیروان کمانڈر نے کہا۔

"تم لوگوں میں سے ایک مجاہد نے سوال کیا تھا کہ میں نے ان کافروں کے سروں کو اتنا سنبھال کر کیوں رکھا ہوا ہے۔ میں اس سوال کا جواب اب دیتا ہوں۔ میں سروں کو عبرت کا نشان بنا کر بھارتی فوجی گیریزن کے فوجیوں تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کشمیری مجاہد اپنی بے عزتی اور بے حرمتی کا بدلہ لینا جانتے ہیں۔ اگر وہ مرد ہیں تو ہم اس سے میدان جنگ میں ہی لڑیں۔ اگر وہ ہماری عزتوں اور غیرتوں کو للکاریں گے تو ان سب کا حشر ان تین ڈوگرہ فوجیوں ایسا ہو گا"

سب نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

میں اور کمانڈر شیروان اور کمانڈو ہاشم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے شیروان سے پوچھا کہ اس کا منصوبہ کس نوعیت کا ہے۔ اور سکیم کی فارمیشن کیا ہو گی۔

کمانڈر شیروان نے مجھے اور کمانڈو ہاشم کو اپنی سکیم سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"انڈین آرمی کی آرٹلری رجمنٹ کا فوجی یونٹ یہاں سے چھ میل دور ایک پہاڑی کے اوپر گیریزن میں مقیم ہے۔ یہ یونٹ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں بھارتی جارحانہ کارروائیوں کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ ہم رات کے وقت اس گیریزن کے کوارٹر گارڈ کے سامنے ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا پھینکیں گے۔ وہاں تھیلا پھینکنے سے سارے گیریزن کو بہت جلدی معلوم ہو جائے گا کہ گلمرگ کی چھاؤنی میں جن فوجیوں کے دھڑ ملے تھے یہ ان ہی

کے سر ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ایک خط بھی لکھ کر تھیلے میں ڈال دیں گے کہ یہ سر تم لوگوں کے لئے عبرت بھی ہے اور انتباہ بھی۔ جنگ کے محاذ پر ہم آمنے سامنے آکر لڑیں گے۔ یا تم مرگئے یا ہم شہید ہو گئے۔ لیکن اگر تم ہماری ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلنے کی ناپاک حرکت کرو گے تو تمہارا یہی انجام ہو گا۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہیں"

شیروان نے کمانڈو ہاشم سے کہا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اس مضمون کا ایک خط لکھ کر تیار کرو"

کمانڈو ہاشم دوسری کوٹھڑی میں چلا گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"رات کس وقت جانے کا پروگرام ہے؟"

شیروان نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہی رات کے دو بجے یہاں سے نکلیں گے۔ رات کا پچھلا پہر اس قسم کے کمانڈو آپریشن کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔"

کمانڈو ہاشم ایک پرچہ لکھ کر لے آئے۔ پرچے پر انگریزی اور اردو میں وہی مضمون لکھا تھا جو کمانڈر شیروان نے اسے بتایا تھا۔ شیروان نے پرچہ پڑھا۔ پھر مجھے پڑھنے کو دیا میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک لکھا ہے"

ہم نے رات کے بارہ بجے سماوار میں سبز چائے تیار کروائی چائے کے ساتھ نمکین قلچے کھائے۔ اپنے اپنے پستولوں اور سٹین گنوں کی صفائی کی۔ اس مشن پر ہم اپنی اپنی سٹین گنیں بھی ساتھ لے جا رہے تھے۔ شیروان کمانڈو ہاشم کو اس مشن پر ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔

"ہاشم کی ہمیں ضرورت نہیں ہوگی۔ جتنے کم آدمی ہوں گے اتنی ہی ہمیں آسانی ہوگی۔ ہمیں کسی کا مقابلہ تو کرنا نہیں۔ کٹے ہوئے سروں والا تھیلا پہاڑی کی بلندی سے گیریزن کے کوارٹر گارڈ میں پھینکنا ہے۔ ہم دو ہی کافی ہوں گے"

"کیا تم نے گیریزن پہلے سے دیکھا ہوا ہے؟"

شیروان بولا۔

"ایک بار نہیں۔ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ہمیں گیریزن کی کس طرف جانا ہے اور کس مقام پر سے تھیلا نیچے پھینکنا ہے"

جب رات کا ڈیڑھ بج گیا تو ہم نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سر سپرٹ کے کنستر سے نکال کر انہیں پرانے کپڑوں سے خشک کیا۔ ان کو نائلون کے تھیلے میں ڈالا۔ ساتھ ہی لفافے میں لکھا ہوا پرچہ بھی ڈال کر رکھ دیا۔ لفافے کے باہر گیریزن کمانڈر کے لئے لکھا اور نیچی کشمیر کے حریت پرست مجاہد لکھ دیا۔ ہمارے پاس ایک ایک آٹومیٹک پستول' ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو' ایک ایک سٹین گن اور کچھ فالتو میگزین تھا۔ دستی بم رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمانڈو ہاشم نے ہمارے لئے دو خچر تیار کر دیئے تھے۔ ٹھیک دو بجے رات ہم خچروں پر بیٹھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ پہاڑیوں میں چھ میل کا راستہ تھا۔ شیروان ایک مختصر راستے سے لے جا رہا تھا۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے انڈین آرٹلری یونٹ کا یہ کیمپ یا گیریزن ایک چھوٹی سی چھاؤنی کی طرح تھا۔ چاروں طرف خاردار تاروں والی اونچی دیوار تھی۔ کھمبوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ یہ گیریزن چھوٹے ٹیلے کے اوپر تھا۔ اس کی ایک جانب نیچے فوجی بارکوں کے باہر بھی روشنی ہو رہی تھی۔

م نے خچر کچھ فاصلے پر چھوڑ دیئے تھے۔ ان خچروں کو اپنے آپ واپس چلے جانا تھا۔ کمانڈر روان اور میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ہمارا لباس اس وقت کشمیری دیہاتیوں والا

نہیں تھا۔ ہم نے پتلونیں اور گرم جرسیاں اور جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ رات سرد تھی مگر ہمیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ کمانڈو مشن کی گرمی نے ہمارے خون کو گرم رکھا ہوا تھا۔ شیروان اس طرف سے چڑھائی چڑھ رہا تھا جدھر ٹیلے پر گیریزن کا کوارٹر گارڈ تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے چڑھائی چڑھتے ہوئے گیریزن کی کانٹے دار دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ کمانڈر شیروان مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔

یہ چونکہ کوئی فوجی پکٹ یا فوجی مورچہ نہیں تھا اس لئے یہاں رات کے وقت گشتی پارٹی کا امکان بہت کم تھا۔ ہم نے ایک جگہ رک کر کچھ دیر انتظار بھی کیا کہ اگر کوئی پٹرولنگ پارٹی یہاں گشت پر ہے تو پتہ چل جائے گا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی پارٹی ادھر نہ آئی تو ہم دیوار کے ساتھ جھک کر کوارٹر گارڈ والے ٹیلے کی طرف چلنے لگے۔ وہاں ایک جگہ اونچائی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ ان درختوں کے نیچے خاردار تار کی دیوار کی دوسری جانب کوارٹر گارڈ تھا جہاں برآمدے کے باہر گول دائرے کے اندر رجمنٹ کا جھنڈا کھمبے پر لگا ہوا تھا اور ایک سنتری گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا میرے پاس تھا۔ شیروان نے درختوں کے پاس آکر آگے کو جھک کر نیچے کوارٹر گارڈ کے صحن کو دیکھا۔ پھر تھیلا میرے ہاتھ سے لے کر اسے کوارٹر گارڈ کے صحن کی طرف اچھال دیا۔ ہم وہیں کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی تھیلا ڈیوٹی پر کھڑے سنتری کے پیچھے گرا۔ اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور دوڑ کر تھیلے کو اٹھایا۔ اسے کھول کر الٹا کیا۔ اندر سے تینوں ڈوگروں کے کٹے ہوئے سر اور خط والا لفافہ باہر گر پڑا۔ کٹے ہوئے سروں کو دیکھتے ہی سنتری نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"نکل چلو"

ہم نیچے کو دوڑ پڑے۔ ادھر کسی جگہ کوئی مشین گن پوسٹ تھی۔ گنر نے فائر کھول دیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا گولیوں کے برسٹ کس طرف سے آرہے ہیں اور کس طرف پڑ

رہے ہیں۔ ہم ڈھلان پر زیادہ تیز دوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایک اور مشین گن فائر کرنے لگی۔ نیچے فوجیوں کے دوڑنے بھاگنے ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک اوپر تلے دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ یہ چھتری والے روشنی راؤنڈ تھے۔ ساری پہاڑیاں' پہاڑیوں کی ڈھلانیں روشن ہو گئیں۔ ہم نیچے اترتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ ہم وہیں جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ روشنی راؤنڈ آہستہ آہستہ نیچے آرہے تھے۔ جب وہ نیچے آکر بجھ گئے اور ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا تو ہم اٹھ کر تیز تیز چلنے لگے۔ شیروان نے کہا۔

"ہم گھاٹی کی طرف نہیں جائیں گے۔ مشین گن پوسٹ اسی طرف ہے"

اب رائفلوں کا فائر بھی آنے لگا تھا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا ہمیں روشنی راؤنڈ کی روشنی میں دیکھ لیا گیا تھا۔ کمانڈر شیروان بائیں طرف کو گھوم گیا۔ اس طرف نشیب میں گہری کھائی کے کنارے کنارے ایک پہاڑی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ ہم اسی پگ ڈنڈی پر دوڑ پڑے۔ فائر ہمارے سروں کے اوپر آرہا تھا۔ ہم نے بھی پستول نکال لئے تھے۔ مگر ابھی تک جوابی فائر نہیں کیا تھا۔ فائر کے انداز سے لگتا تھا کہ ایک پارٹی ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"ہمیں گھاٹی کی طرف سے ہو کر نکل جانا چاہئے"

مگر کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہم ٹھیک جا رہے ہیں"

کمانڈر شیروان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ یہ بات نہ مجھے معلوم تھی نہ کمانڈر شیروان کو معلوم تھی۔ وہ ٹیلے کے پہلو میں سے ہو کر سامنے والی بڑی چٹان کے عقب میں جانا چاہتا تھا۔ میں اس کی بائیں جانب تھا۔ جیسے ہی وہ دائیں جانب مڑا۔ پیچھے سے مشین گن کا برسٹ فائر ہوا۔ کمانڈر شیروان چلتے چلتے رک گیا۔ پھر منہ کے بل گر پڑا۔ میں اسے اٹھانے کے لئے جھکا۔ مگر کشمیر کا یہ جیالا سپوت جہاد کشمیر کا بے باک دلیر مجاہد کمانڈر

شیروان اب کبھی نہ اٹھنے کے لئے گرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا ہاتھ شہید کے لہو میں سرخ ہوگیا۔ ابھی تک میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ شیروان شدید زخمی ہوگیا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں کے فائر میں گھاٹی میں اتر گیا۔ جیسے جیسے میں گھاٹی میں آگے بڑھ رہا تھا فائرنگ کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ گھاٹی دوسرے ٹیلے کے دامن میں جانکلتی تھی۔ یہ مختصر پہاڑی رستہ کمانڈر شیروان نے ہی مجھے دکھایا تھا۔ مجھے اس ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف جانا تھا۔ کمانڈر شیروان کا جسم مجھے بے جان اور ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس کی نبض دیکھنے سے ڈر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا شیروان شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہوگیا ہے۔ میں اسے کاندھے پر ڈالے آہستہ آہستہ ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہ بڑا دشوار کام تھا۔ چڑھائی مشکل تھی میرے کاندھے پر شیروان کے جسم کا بوجھ بھی تھا۔ مگر میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں ایک ہاتھ سے جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔ دور پیچھے گیریزن والی پہاڑی کی طرف دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ مگر ان کی روشنی مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ میں تھک گیا سانس لینے کے لئے میں نے کمانڈر شیروان کو وہیں جھاڑیوں میں لٹا دیا۔ ابھی پچھلے پہر کا اندھیرا تھا میں نے شیروان کی گردن پر ایک طرف انگلی رکھ دی۔ مجھے کسی وقت لگتا کہ کمانڈر شیروان کا دل دھڑک رہا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر کہرے کے جیسے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے شیروان کو کاندھے پر ڈالا اور ٹیلے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ جس وقت میں ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا تو آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ ٹیلے کی دوسری جانب کشادہ وادی سحر کے نیلے دھندلکے میں نظر آرہی تھی ۔ وادی کے آخر میں وہ پہاڑیاں تھیں جہاں ہماری خفیہ پناہ گاہ تھی ۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں

گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ صبح کاذب کی نیلی روشنی سپیدہ سحر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان کے جسم کو غور سے دیکھا۔ اس کی جرسی اور جیکٹ لہو سے سرخ ہو رہی تھی۔ مشین گن کا برسٹ اس کے پیٹ میں سے گزر گیا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر نور سا آگیا تھا۔ کمانڈر شیروان شہید ہو چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کشمیر کے اس غیور بیٹے کی زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔

عجیب بات ہے شیروان کا جسم لاش کی طرح نہیں اکڑا تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی نرم اور نیم گرم تھا جیسے زندہ انسان کا ہوا کرتا ہے۔ صبح کی سپیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ سفیدی سرخی مائل ہونے لگی۔ مشرقی افق پر پہاڑیوں کے پیچھے سرخ روشنی کا غبار سا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ پھر سورج کے سرخ قرص کا لرزتا جھلملاتا ہوا کنارا آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہوگیا۔ جیسے جیسے سورج طلوع ہو رہا تھا اس کی سرخ روشنی گلابی رنگ اختیار کر رہی تھی۔

پھر یہ گلابی رنگ سنہری ہوگیا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو کر میرے سامنے آگیا۔ اس وقت میرے سامنے دو سورج تھے۔ ایک سورج مشرقی پہاڑیوں کے افق پر طلوع ہو رہا تھا اور دوسرا سورج شہید کمانڈر شیروان کی پیشانی سے طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے جھک کر شہید کی دمکتی ہوئی چمکتی ہوئی پیشانی کو چوم لیا۔ مجھے شہید کے جسد خاکی سے جنت کے پھولوں کی خوشبو آئی۔

اس وقت مجھے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آگیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ جو مومنین اللہ تعالیٰ کی خاطر جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور ان کو اپنے رب کی طرف سے رزق پہنچتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

ہمارا مشن موت کا مشن تھا۔ کمانڈر شیروان اپنا مشن پورا کر کے اللہ کی راہ میں شہید

ہو گیا تھا اور موت اسے تلاش ہی کرتی رہ گئی تھی۔ میں نے زندہ شہید کے جسد خاکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور وادی میں اترنے لگا۔ طلوع ہوتے سورج کی سنہری کرنیں شہید کی پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ شہید شیروان کے جسم سے ایک نئے سورج کی سنہری کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ آزادی کشمیر کا سورج تھا۔ کشمیر کے بہادر بیٹوں کی قربانیوں اور شہادتوں کا سورج تھا۔ جس نے بہت جلد طلوع ہو کر سارے کشمیر کو آزادی کی نورانی کرنوں سے منور کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆